لٹل ریڈ رائڈنگ ہڈ گرل

فرض کریں کہ انصار عباسی صاحب دفتر سے اپنے گھر واپس جا رہے ہیں کہ راستے میں رک کر ایک ٹھیلے والے سے پھل لے کر اپنی گاڑی کی طرف واپس پلٹتے ہیں لیکن اسی اثناء میں ٹھیلے پہ لگا بم پھٹ جاتا ہے اور انصار عباسی سمیت بیس لوگ لقمہ ء اجل بن جاتے ہیں۔ لوگ افسوس کریں گے کہ انصار عباسی صاحب لا علمی میں کس طرح مارے گئے۔

اب یہی واقعہ ایک اور طرح سے پیش آتا ہے۔ انصار عباسی ساحب جس گروہ پہ تنقید کرتے ہیں اسکی طرف سے انہیں قتل کی دھمکیاں مل چکی ہیں وہ گاڑی میں جا رہے ہیں ۔ ٹھیلے والے کے پاس رک کر پھل خرید ہورہے ہوتے ہیں کہ ایک موٹر سائیکل پاس آ کر رکتی ہے اس پہ سوار افراد ان سے پوچھتے ہیں کہ کیا وہ انصار عباسی ہیں اور انکو گولی کا نشانہ بنا کر فرار ہوجاتے ہیں اگلے دن انکو دھمکی دینے والی تنظیم اس واقعے کی ذمہ داری قبول کر لیتی ہے۔

کیا ان دو واقعات پہ رد عمل ایک جیسا ہوگا؟

جی نہیں۔ پہلے واقعے میں پاکستان کے سیکیوریٹی کے حالات اور انکی وجوہات ڈسکس ہونگیں۔  دوسرے واقعے کو پاکستانی جرنلزم پہ اندوہناک وار کہا جائے گا۔ اور ہر شخص جو انکا نظریاتی طور پہ کتنا ہی مخالف ہو اس بات سے انکار نہیں کرے گا کہ جرنلسٹ کی حیثیئت سے انکا قتل ایک سانحے سے کم نہیں۔ یہ آزاد  صحافت پہ حملہ ہے۔

دھیرج رکھیں، انصار عباسی صاحب ابھی زندہ ہیں۔ خدا انہیں طویل عمر دے۔

بس یہیں سے ملالہ کا ملال شروع ہوتا ہے۔

ملالہ کی کہانی سن کر

لٹل ریڈ رائڈنگ ہڈ گرل

  کی کہانی یاد آتی ہے جسے اسکی ماں باسکٹ میں کھانے کی اشیاء دے کر بیمار نانی کے پاس جنگل کے اس طرف بھیجتی ہے اور راستے میں اسے ایک بھیڑیا مل جاتا ہے۔

ملالہ ، ملال یہ نہیں ہے کہ تمہیں کس نے ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بنایا۔ نہ ہی یہ ملال ہے  کہ اسلام کا نام لینے والوں نے یہ دعوی کیا کہ انہوں نے تمہیں گولی ماری۔ بہت عرصہ ہوا لوگ مر رہے ہیں اور ہم یہ دعوے سن رہے ہیں۔ نہ ہی یہ ملال ہے کہ انہوں نے یہ کہا کہ چونکہ تم نے شریعت کے خلاف جا کر کام کیا اس لئے تم اس سزا کی حقدار ہو۔ شرعی معاملات کو نافذ کرنے کے لئے اب ہمارے یہاں ٹھیلے پہ سبزی بیچنے والا بھی بے قرار ہے یہ جانے بغیر کہ شریعت کس چڑیا کا نام ہے۔  نہ ہی مجھے اس بات کا ملال ہے کہ طالبان نے کہا کہ کیا ہوا تم بچ گئ وہ دوبارہ تمہیں مارنے کی کوشش کریں گے۔ ہم دیکھ چکے کہ وہ اپنی بات میں کتنے اٹل ہیں۔

 میں تمہیں اتنا ہی جانتی ہوں جتنا میڈیا کے ذریعے پتہ چلا۔ یہاں بہت سارے لوگ معاشرے کی تباہ ہوتی اقدار کے بارے میں فکر مند ہیں مجھے تمہارے بارے میں جان کر کیا کرنا۔ وہاں وادی ء سوات میں بے شمار لڑکیاں ہونگیں جو اپنی تعلیم پہ فکر مند ہونگیں۔ جنہیں اپنے ساتھ یہ دوسرے درجے کا سلوک پسند نہیں ہوگا۔ بس یہ کہ تم ان لڑکیوں کے لئے ایک علامت بن گئیں۔ زیادہ تر لوگ تو اس علامت کو درپیش خطرے سے صدمے میں آئے۔

 در حقیقت میں تم سے زیادہ تمہارے والدین کی بہادری کی قائل ہوں۔ آخر تمہارے والدین نے تمہیں گیارہ سال کی عمر میں اس قسم کی مضامین لکھنے کی اجازت کیوں دی جس میں تم لڑکیوں کی تعلیم کی بات کرو وہ بھی ایسے علاقے میں، اس عہد میں جب کہ صرف اس فتوی کے آنے کی دیر تھی کہ بحیثیئت عورت پیدا ہونا ایک غیر شرعی عمل ہے۔ آخر انہوں نے تمہیں وہ سبق کیوں نہیں پڑھایا جو ہمارے یہاں اس وقت خواتین کو پڑھایا جانا پسند کیا جاتا ہے؟

لیکن پھر بھی مجھے ایک ملال سا ہے۔ اور اس کے ذمہ دار وہ لوگ نہیں جنہوں نے تمہیں گولی ماری بلکہ وہ لوگ ہیں جو اس واقعے کے بعد سامنے آتے ہیں۔

لوگوں کا ایک گروہ کہتا ہے کہ طالبان نے یہ نہیں کیا امریکہ نے کیا ہے فوج نے کیا ہے۔ لیکن اس کے اگلے ہی لمحے وہ کہتے ہیں کہ کیا آپکو معلوم ہے کہ ملالہ  کی فیورٹ شخصیت اوبامہ ہے، یا یہ کہ کیا آپ نے ملالہ کے مضامین پڑھے ہیں؟ انہیں پڑھے بغیر آپ ملالہ کو مظلوم کیوں سمجھتی ہیں؟  ڈرون حملوں میں  بچے مارے جاتے ہیں آپ اسکی مذمت نہیں کرتیں تو ہم ملالہ کی مذمت کیوں کریں؟ پاکستان میں ایک نہیں لاکھوں ملالائیں ہیں ہم صرف اسکی مذمت کیوں کریں؟ وہ ہمارے یہاں کی ایک اور مختاران مائ ہے۔  ہم کیوں نہ کہیں کہ عافیہ صدیقی اور جامعہ حفصہ کی لڑکیوں سے اگر آپکو ہمدردی نہیں تو ہمیں بھی ملالہ سے ہمدردی نہیں؟

آخر ملالہ نے ایسا کون سا کام کیا ہے جس پہ اسکی اتنی شہرت ہے؟  ہمارے یہاں تو ایسی لاکھوں ذہین لڑکیاں ہیں۔ عین اسی وقت دوسرا سوال پوچھتے ہیں کہ وہ جو مضامین اس نے لکھے ہیں اس عمر کا بچہ تو لکھ ہی نہیں سکتا۔ اس عمر میں بچے نہ ایسی زبان استعمال کرتے ہیں اور نہ اتنا سوچتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں کہ دراصل اس کے ساتھ جو ہوا اس کے اصل ذمے دار وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسکی باتوں پہ اس کی حوصلہ افزائ کی۔

یہیں پہ دل ٹھنڈا نہیں ہوتا بلکہ یہ تک کھوج کر نکال لاتے ہیں کہ کیا ہم جانتے ہیں کہ ملالہ کے دیندار دادا نے ملالہ کے سیکولر نظریات رکھنے والے والد کو

اسکے کفر

کی وجہ سے نوجوانی میں گھر سے باہر نکال دیا تھا۔

ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں، جو کہتے ہیں کہ طالبان تو وجود ہی نہیں رکھتے یہ تو امریکیوں کا پھیلایا ہوا وہم ہے۔  لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پھر آپ طالبان کی مذمت کرنے سے کیوں گھبراتے ہیں تو پھر ایک آئیں بائیں شائیں۔

اس وقت ایک چودہ سالہ لڑکی برطانیہ کے کسی ہسپتال میں ہوش و خرد سے نا آشنا کسی بستر پہ مشینوں کے سہارے پڑی ہے۔ وہ اگر ایک طویل علاج کے بعد زندگی کی طرف لوٹ بھی آئے تو یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کس حد تک تندرست ہوگی۔

لیکن میرے جیسے دلوں میں یہ خیال کروٹیں لے رہا ہے کہ بستر پہ پڑا وہ وجود ایک چودہ سالہ لڑکی کا ہے یا چونسٹھ سال کے ملک کا ہے۔

11:02 AM

، امریکہ, پاکستان, تعدلیم, حملہ, خواتین, طالبان, فوج, لٹل ریڈ رائڈنگ ہڈ گرل, ملالہ

مختار کا اسکول

مختار ، صفائ کرنے والی کا بیٹا ہے۔ وہ پانچویں جماعت میں پڑھتا ہے۔  ماسی کا کہنا تھا کہ اس کا بچہ خاصہ ذہین ہے کلاس میں ہمیشہ فرسٹ آتا ہے لیکن اسکول میں ٹیچر دو دو ہفتوں تک نہیں آتے اور بچے اسکول جا کر کھیل کود کر واپس آجاتے ہیں۔ بچہ اس وجہ سے اسکول جانے میں دلچسپی نہیں لیتا۔ میں اسے پرائیویٹ اسکول میں داخل کرانا چاہتی ہوں۔ میں نے اس سے کہا کہ تم اسے پڑھنے کے لئے صبح میرے پاس چھوڑ دو۔ دوپہر میں وہ اسکول چلا جائے گا۔ لیکن پرائیویٹ اسکول میں داخل مت کرانا۔ اس وقت تم جوش میں کرادوگی۔ چند مہینے کے بعد تمہارے پاس پیسے نہیں ہونگے تو تم اسے وہاں ہٹا لوگی اور اس طرح اسکی تعلیم ختم ہوجائے گی۔

ویسے بھی غریب بستیوں میں کھلے پرائیویٹ اسکولوں میں ٹیچرز خود بمشکل میٹرک پاس ہوتے ہیں۔ انہیں برائے نام تنخواہ ملتی ہے وہاں پہ بھی یہی ہوگا جو یہاں ہوتا ہے، لوگ تمہاری جہالت کا فائدہ اٹھائیں گے۔  میرے اس مشورے کے دو مہینے بعد مختار میرے پاس پہلی دفعہ پڑھنے کے لئے آیا۔

گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہوئے ایک مہینہ ہو چکا تھا لیکن اردو کی کتاب کے ابھی صرف تین سبق پڑھائے گئے تھے۔ حساب کا پہلا باب جیسے تیسے ہوا تھا۔ انگریزی کی حالت سب سے بری تھی۔ اس کے باوجود کہ اب گورمنمنٹ اسکولز میں انگریزی پہلی جماعت سے پڑھائ جاتی ہے۔ بچہ انگریزی کے سادہ ترین جملے مثلاً دز از آ ڈاگ اور دیٹ از ہر پینسل تک نہیں بول سکتا۔ یاد رہے مختار اپنی کلاس کا سب سے تیز بچہ ہے۔

ہفتہ بھر پڑھانے اور یہ جاننے کے بعد کہ دس دن سے انہیں کوئ استاد پڑھانے نہیں آیا۔ میں نے مختار کے اسکول جا کر خود صورت حال جاننے کا فیصلہ کیا۔ یہ اسکول میرے گھر کے نزدیک ہی ہے۔

اسکول کے باہر تو ایک اسکول کا نام لکھا تھا لیکن اندر داخل ہونے پہ چوکیدار نے استفسار کیا کہ کس اسکول جانا ہے اس احاطے کے اندر تین اسکول موجود ہیں۔ ایک عمارت میں تین مختلف اسکول، مجھے یہ سن کر اتنا ہی تعجب ہوا جتنا کہ یہ جان کر ہوتا ہے کہ ایک عورت نے ایک ساتھ پانچ  بچے جنم دئیے۔ ایسی کیا مصیبت ہے کہ گورنمنٹ ایک ہی علاقے میں ایک ہی عمارت میں تین مختلف اسکول چلا رہی ہے۔ یقیناً کچھ مال پانی کا چکر ہوگا۔

ان تینوں اسکولوں کے آفس اور اسٹاف الگ ہیں۔ وہاں کھڑے ہو کر میں نے اندازاً اشارہ کر دیا کہ اس اسکول جانا ہے لیکن آفس تک فاصلہ طے کرتے ہوئے میں یکسو ہو چکی تھی۔ پہلا آفس سیکنڈری اسکول کا تھا۔ اسکا نام کچھ اور تھا۔ وہاں سے میں دوسرے اسکول گئ جو کہ پرائمری تھا معلوم ہوا کہ یہی مختار کا اسکول ہے۔  ہیڈ مسٹریس صاحبہ سے ابتدائ معلومات لیں تو مزید معلوم ہوا کہ انکے اسٹاف میں پانچ اساتذہ ہیں۔ ہر استاد کے ذمے ایک کلاس ہے وہی سارے مضمون پڑھاتا ہے۔ ان میں سے بھی ایک استاد کا حال مہیں تبادلہ ہو گیا ہے اس لئے مختار کی کلاس باقاعدگی سے نہیں ہو پا رہی ہے۔ الیکشن متوقع ہیں اور الیکشن کے سلسلے میں اساتذہ کی ڈیوٹی لگتی ہے اس لئے بچے کھچے اساتذہ بھی اس کام میں لگنے کا امکان ہے۔ یعنی الیکشن کمیشن الگ سے اپنے لئے عارضی کارکن نہیں رکھ سکتا۔ اسکے لئے بچوں کی تعلیم قربان کی جاتی ہے۔

میرے سوال پہ کہ استاد تو حال ہی میں گئے ہیں جبکہ یہی حالت گرمیوں کی چھٹی سے پہلے بھی تھی۔ انکے پاس کوئ جواب نہ تھا۔ جب میں نے کہا کہ نئے سیشن کو شروع ہوئے دو مہینے سے زیادہ ہو گئے ہیں اور ایک ڈیڑھ مہینے بعد ششماہی امتحان شروع ہونگے جبکہ سلیبس اپنی ابتدائ حالت میں ہے تو جواب ملا کہ آپ کو اطلاع غلط ہے۔ ہم تو انیس سبق پڑھا چکے ہیں۔ یہ کہہ کر ایک استانی جی اٹھیں اور باہر چلی گئیں پھر اردو کی کتاب لےکر واپس داخل ہوئیں۔ اس میں کتاب کے فہرست والے صفحے پہ انیس اسباق میں نشان لگے ہوئے تھے۔ میں نے کہا یہ نہیں ہو سکتا۔ میں ان نشانات کو تسلیم نہیں کر سکتی۔ اگر پڑھایا ہوتا تو اس بچے کو تین سبق کے علاوہ کچھ تو آتا جبکہ وہ فرسٹ آتا ہے۔ جن تائثرات کے ساتھ اس گیارہ سال کے بچے نے مجھے سب بتایا وہ جھوٹ نہیں ہو سکتے۔

 جناب، اسکے بعد بیانات کا سلسلہ چلا۔ یہ لوگ تو اپنے بچوں کو پرائیویٹ اسکول میں پڑھانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا اس لئے کہ وہ جاہل ہیں اور سمجھتے ہیں کہ گورنمنٹ اسکول میں تو پڑھائ ہوتی نہیں اس لئے محلے کے پرائیویٹ اسکول میں داخل کرا دیں۔ ورنہ خود سوچیں جس کے پاس کحانے کو پیسے نہیں وہ پرائیویٹ اسکول میں کیسے پڑھائے گا۔ پھر آپ نے اپنے اسکول میں بچوں کے لئے کوئ تحرک نہیں رکھا وہ یہاں آکر کیا کریں۔ استاد تک تو انہیں ملتا نہیں۔

ایک استاد نے کہا کہ بچے اتنے گندے حلئیے میں آتے ہیں۔ اتنے گندے بچوں کو کیسے پڑھایا جائے۔ اور میں صفائ دیتی ہوں کہ یہ کچی بستی میں نالے کے کنارے رہنے والے، جنکے ماں باپ گھروں صفائ کا کام کر کے بمشکل اپنا کھانے پینے کا خرچہ اٹھاتے ہیں وہ کیسے انہیں صاف ستھرے یونیفارمز اور جوتوں میں بھیج سکتے ہیں۔

او جی آپکو نہیں معلوم یہاں تو کسی بچے کو ایک تھپڑ مار دو تو انکے ماں باپ یہاں ہنگامہ کرنے کو کھڑے ہوتے ہیں ۔ اس پہ میں کہتی ہوں ، وہ بیچارے ویسے ہی ماں باپ سے بری طرح پٹتے رہتے ہیں اب انکو مار کر کیا کرنا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ انہیں یتیم بچے سمجھ کر پڑھا لیا کریں۔ یہی سوچ کر پڑھا لیا کریں کہ کل آقپکا معاشرہ آجکے مقابلے میں اس لئے بہتر ہوگا کہ یہ بچے سمجھدار ہونگے۔لیکن آپ دیکھیں اتنے بچوں کو کوئ کب تک پیار سے پڑھا سکتا ہے؟ ایک اور بہانہ سامنے آتا ہے۔

میں نے مسکراتے ہوئے انہیں دیکھا، میری اطلاع کے مطابق مختار کی کلاس میں کل سات بچے ہیں جن میں سے دو تین تو روز غیر حاضر ہوتے ہیں۔  آپکے اسکول میں شاید کل سو بچے ہیں۔ ایک کلاس میں چار بچوں کو ہینڈل کرنا کیا مشکل ہے۔ میں یونیورسٹی میں ایک وقت میں سوا سو بچوں کو پڑھاتی رہی ہوں یہی نہیں میں نے خود گورنمنٹ اسکول سے پڑھا ہے اور ہماری کلاس میں پچاس اسٹوڈنٹس تھے۔ حتی کہ ترقی یافتہ ممالک میں ایک استاد کے پاس پندرہ سے بیس اسٹوڈنٹ ہوتے ہیں اس لحاظ سے آپ کے پاس تو کافی گنجائش ہے جبکہ اگر آپ یہ دیکھیں کہ اس اسکول کے ساتھ ایک اتنی بڑی کچی آبادی ہے۔ غریب لوگ ہیں گورنمنٹ اسکول کی کوئ فیس ہی نہیں، آپکے پاس تو کافی بچے ہونے چاہئیں لیکن ایسا ہے نہیں۔ آپ کو تو کوشش کرنی چاہئیے کہ آپکے اسکول میں زیادہ سے زیادہ بچے آئیں۔ دل میں سوچا کہ کوشش کرنی چاہئیے کہ اپنی تنخواہ کو حلال کریں۔

اس پہ ایک کھسیانی مسکراہٹ۔

معاملے کا اہم پہلو یہ ہے کہ گورنمنٹ پرائمری اسکول کے ایک استاد کی تنخواہ سولہ سترہ ہزار ہوتی ہے۔ جبکہ ادھر سٹی یا بیکن ہاءوس جیسے پرائیویٹ اسکولز میں بھی تقریباً  اتنی ہی تنخواہ ہوتی ہے۔ وہ اپنے اساتذہ سے خوب کام لیتے ہیں۔ دن کا ایک لمحہ ضائع نہیں جانے دیتے۔ کلاس رومز میں کیمرے تک موجود ہوتے ہیں تاکہ پرنسپل اپنے کمرے سے تمام کلاس رومز کو چیک کرتی رہے کہ اساتذہ آرام سے بیٹھے ہیں یا پڑھا رہے ہیں۔ ان اسکولوں کے مقابلے میں گورنمنٹ اساتذہ پہ کام کا سرے سے کوئ دباءو ہی نہیں۔ ان اساتذہ  سے  نتیجہ خیز کام لینے والا کوئ نہیں۔ کوئ اس چیز کا ذمہ دار نہیں کہ یہ اساتذہ اسکول کی چار دیواری میں کیا کر رہے ہی

قارئین ، اب یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پورے تعلیمی نظام میں کون کتنا سنجیدہ ہے۔

میرے وہاں جانے سے یہ ہوا کہ مختار کی کلاس کو ایک استاد نے توجہ دینا شروع کی۔ انگریزی میں اسے دو مضامین لکھوائے گئے۔ یہ دونوں مضامین نہ صرف ناقص تھے بلکہ استاد نے اسکول کے موضوع پہ جو مضمون لکھوایا اس کے لئے یہ بھی زحمت نہ کی کہ لفظ سیکنڈری کی جگہ پرائمری ہی کر دیتا کہ مختار پرائمری اسکول میں پڑھتا ہے۔  ناءون، پروناءون اور ایجیکٹو کی تعریفیں اور مثالیں لکھوائ گئیں البتہ انکی کسی بھی قسم کی مشق ندارد۔ حالانکہ یہ سب اساتذہ، ایجوکیشن میں بیچلرز کی اضافی ڈگری رکھتے ہیں۔ میتھس کی کتاب کچھ آگے بڑھی۔

چند دنوں بعد میں پھر جاءونگی۔ اور اب میں سوچتی ہوں کہ اگر ہم صرف اتنا کر لیں کہ اپنے علاقے میں موجود گورنمنٹ اسکولز کو جا کر چیک کریں اور انکے اساتذہ سے گفتگو کریں تو ان پہ دباءو پڑتا ہے کہ وہ اپنے کام کے معیار کو بہتر کریں۔ اس تحریر کا مقصد بھی یہی ہے کہ آپ بھی اس مہم میں شامل ہو جائیں۔  اس بات سے قطع نظر کہ آپکے خاندان کے بچے اس میں ہیں یا نہیں۔  اپنے علاقے  کے گورنمنٹ اسکول کےا ساتذہ  سے ملیں، کلاسز کو دیکھیں اور اگر موقع ملے تو یہ سب کام کسی بچے سے پہلے سے معلومات حاصل کر کے کریں۔ آپ میں سے جسے موقع ملتا ہے وہ جائے یا پھر علاقے میں نوجوانوں کی ایک ٹیم بنا لیں جو اسکولوں کا جائزہ لے۔

گورنمنٹ اسکول میں پڑھنے والے بچے بھی ہمارے ہی بچے ہیں اگر غریب بچوں کو بہتر تعلیم ملے تو ہی ہم معاشرے میں تبدیلی کی امید رکھ سکتے ہیں۔

11:39 PM

استاد, اسکول, پاکستان, پرائمری, تعلیم, کراچی, گورنمنٹ, نظام

مفاد سے آگے

شادی کے کارڈز بانٹنا اور شاپنگ ، اس میں اتنی مصروف رہی کہ مجھے یاد ہی نہ رہا کہ آج آسٹریلیا اور پاکستان کا ٹی ٹوئنٹی میچ ہے۔ میں اپنی ساتھی خاتون کو نارتھ ناظم آباد چھوڑنے کے لئے جب فائیو اسٹار کے سگنل پہ پہنچی تو ٹریفک رکا ہوا تھا۔ رات کے سوا دس بج رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ شادیوں کی ٹریفک کا رش ہے۔ کیونکہ اس طرف درجنوں شادی ہالز ایک قطار میں موجود ہیں۔ لیکن سگنل کھل کے ہی نہ دے رہا تھا۔

 پندرہ منٹ بعد مجھے فضا میں پاکستان کے جھنڈَے لہراتے نظر آئے اور کچھ لڑکے ادھر ادھر بھاگتے دکھائ دئیے۔  تھوڑی دیر بعد ہماری گاڑی چوک پہ لڑکوں کے ایک ہجوم کے درمیان، دوسری گاڑیوں کے ساتھ پھنسی ہوئ تھی۔ لڑکوں کی تعداد یہی کوئ ایک ڈیڑھ ہزار ہوگی۔ آتشبازی ہو رہی تھی، لڑکے ہارن بجا رہے تھے۔ صاف لگ رہا تھا کہ انکے ذہن میں کوئ خاص پروگرام نہیں۔ بس ٹریفک کو روک کر انہیں مزہ آرہا تھا۔ اس اثناء میں ایک لڑکے نے عین گاڑی کے سامنے آکر پستول نکالا اور ہوائ فائرنگ شروع کر دی۔ آج بچ جائیں تو بڑی بات ہے۔ میں نے سوچا، اگر ذرا بھی اندازہ ہوتا تو اس طرف کا رخ نہ کرتے۔

چالیس منٹ کے اس ہنگامے میں پھنسے رہنے کے بعد نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ واپسی پہ میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ لیکن ایک چیز جس نے میری توجہ لی وہ یہ کہ نوجوانوں کے اس منتشر، چارجڈ لیکن بے مقصد ہجوم میں کسی بھی سیاسی جماعت کا جھنڈا نہیں تھا۔ صرف پاکستان کے تین چار جھنڈے نظر آئے۔ عجیب یوں لگی کہ اس سے پہلے نوجوان کوئ بھی موقع ہو ایم کیو ایم کا جھنڈا لانا فرض عین سمجھتے تھے۔

یہی نہیں اس سے دو دن بعد جب میں عزیز آباد کے قریبی علاقے میں گئ تو وہاں ایک پارک میں لوگوں کا ہجوم ایک بڑی سی اسکرین پہ میچ دیکھ رہا تھا۔ ہر تھوڑی دیر بعد ہجوم نعرے لگاتا اور جھنڈے لہراتا لیکن یہ جھنڈے صرف پاکستان کے جھنڈے تھے۔

کیا کوئ تصور کر سکتا ہے کہ کراچی میں ایسا ہو گا۔ ایسا کیوں ہوا؟

الیکشن ، مستقبل قریب میں متوقع ہیں۔ اس لئے اکثر لوگوں سے اس حوالے سے بات ہوتی ہے۔ کس جماعت کو ووٹ دینا چاہئیے اور کیوں؟ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ سب سیاستداں چور ہیں اس لئے ہم الیکشن والے دن بیلٹ پیپر پر مہر اس طرح لگائیں گے کہ وہ خراب ہو جائے اور کوئ ہماری جگہ جعلی ووٹ نہ ڈال سکے۔

میں نے پوچھا کہ اس سے کیا ہوگا؟ ووٹ کی گنتی ہوگی تو وہ امیدوار جیت جائے گا جسکے سب سے زیادہ ووٹ ہونگے چاہے اسے پانچ سو ووٹ ملیں۔

ایم کو ایم کو اس صورت حال کا سامنا کیوں کرنا پڑ رہا ہے؟

 اس کی وجوہات اتنی واضح ہیں کہ  عقل و خرد سے عاری شخص بھی بتا سکتا ہے۔ ایم کیو ایم کے حامی کو اب ایم کیو ایم اور دیگر سیاسی جماعتوں میں کوئ فرق نظر نہیں آتا۔  سب چور ہیں ، سب اپنی تجوریاں بھرنا چاہتے ہیں۔ ہر سیاسی جماعت پہ مفاد پرست طبقے کا قبضہ ہے۔ یہ مفاد پرستی، ذاتی مالی مفاد سے جڑی ہے۔  جب ایم کیو ایم کا نام آتا ہے تو بابر غوری جیسے نام آتے ہیں جو پارٹی میں شامل ہوئے تو کیا تھے اور آج انکی جائدادیں امریکہ میں موجود ہیں۔

یوں جاگیرداری اور معاشرے کے استحصال کے خلاف آواز اٹھانے والے خود جاگیر داری کے نشے میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ اسکی بنیادی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ پاکستان کی ہر دوسری سیاسی جماعت کی طرح، ایم کیو ایم نے بھی اپنے تھنک ٹینک یعنی حلقہ ء دانشوراں کو مضبوط کرنے کے بجائے شخصی سیاست کی راہ اپنا لی۔ یہ سیاست کا اگرچہ ایک آسان راستہ ہے لیکن بھونڈا راستہ ہے اور جمہوری روح سے دورہے۔ مفاد پرست طبقہ ایک شخصیت کو خوش کر کے فائدے اٹھاتا ہے۔ اس طرح سے جمہور کی آواز کہیں دور رہ جاتی ہے۔

تنظیم نے جس شخصیت کومرکزی شخصیت کے طور پہ چنا وہ اس ملک کی سرحدوں میں ایک طویل عرصے سے نہیں آیا۔ انہیں یہاں کے بارے میں جو بھی اطلاع ملتی ہے وہ کسی کے ذریعے سے ملتی ہے انہیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ مصطفی کمال کے بنائے ہوئے پلوں نے شہر کا نقشہ تبدیل کر کے کیا سے کیا کر دیا ہے۔ اڑتی خبریں ملتی ہیں کہ وہ خود ہوش و خرد سے عاری ہو چکے ہیں۔ اور در حقیقت اس وقت تنظیم کو پاکستانی ایجنسیز چلا رہی ہیں۔

اس وقت تنظیم کو لائق اور عالم افراد کے قحط کا سامنا ہے۔ کسی بھی سیاسی جماعت میں ایسے لوگوں کی شمولیت کو دیکھا جانا چاہئیے جو کہ زندگی کے مختلف میدانوں مِن مہارت رکھتے ہوں تاکہ ہمیں امید ہو کہ افراد کا یہ مجموعہ ہمارے مسائل سے کیسے نبرد آزما ہوگا۔  زیادہ تر افراد جو تنظیم کی سیکولر پالیسی کی وجہ سے اس سے بہتر امیدیں رکھتے تھے اب اس سے دور ہو چکے ہیں۔ اس طرح سے ایم کیو ایم بحیثیئت ایک سیاسی جماعت کراچی کے نوجوانوں کو کوئ مثبت امید ، راستہ اور سرگرمی دینے میں آہستہ آہستہ ناکام ہو رہی ہے۔ اور اسکی یہ ناکامی، نوجوانوں کو دوسری انتہا کی طرف لے جارہی ہے جو کہ مذہبی انتہا پرستی ہے۔

تنظیم کو اس حقیقت کو تسلیم کرکے مثبت سمت میں کام کرنا چاہئیے۔ انہیں اب اس چیز کو بھی تسلیم کرنا چاہئیے کہ محض پیپلز پارٹی سے اچھے تعلقات استوار کر کے یا صدر زرداری کو خوش رکھ کر یہ ممکن ہے کہ وہ آئیندہ الیکشن میں اسمبلی کے اندر اپنا وجود قائم رکھنے میں کامیاب ہو جائیں، ممکن ہے انہیں مالی مفادات مل جائیں لیکن اس سے وہ عوامی سطح پہ اپنی حیثیئت کم کرتے جا رہے ہیں۔

مجھے اپنے سیاستدانوں کی اس کوتاہ اندیشی پہ حیرت ہوتی ہے کہ وہ محض اپنے مالی مفاد کو محفوظ کرتے ہوئے اپنے  زیادہ فائدہ مند مستقبل کی قربانی دینے سے گریز نہیں کرتے۔ حالانکہ اگر وہ اپنے مالی مفاد میں تھوڑی سی کمی لے آئیں اور اسے عوامی فلاح پہ خرچ کریں تو وہ ایک لمبی مدت تک عوامی پذیرائ سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور زیادہ کما سکتے ہیں۔

بہر حال، باقی سب سے قطع نظر ایم کیو ایم کو یہ سمجھ لینا چاہئیے کہ ایسے ملک میں جہاں سیاست پہ جاگیردار کا سب سے بڑا حق ہے اور جہاں یہ جاگیردار، ملک کی مضبوط طاقت یعنی فوج سے بھی مضبوط روابط رکھتا ہے۔ وہاں وہ اپنی بقاء کی جنگ عوام کی حمایت کے بغیر نہیں لڑ سکتی۔ لیاری امن کمیٹی، اسکا سب سے بڑا ثبوت ہے۔  جو منظر پہ اچانک ابھری اور اب کراچی کے امن و امان میں اپنا حصہ رکھتی ہے یعنی جب چاہے اس شہر کا امن ہلا سکتی ہے حالانکہ اسکا اثر لیاری سے آگے نہیں۔

سو انہیں عوام کے لئے کام کرنا پڑے گا، انہیں ترجیح دینی ہوگی اور تنظیم کو مفاد پرست طبقے سے ہی نہیں شخصی سیاست سے بھی باہر نکالنا ہوگا۔ انہیں دلجمعی سے ایک حلقہ ء دانشوراں قائم کرنا ہوگا جسے سوچ وبچار کی آزادی دینی ہوگی۔ لیکن  اگر وہ ریاستی قوتوں سے ہڈی لے کر اس سے خوش ہیں تو یاد رکھیں کہ کل وہ باہر ہونگے جبکہ دیگر طاقتیں اسی طرح کھیل میں شامل رہیں گی جیسے وہ پچھلے تریسٹھ سال سے ہیں۔

11:44 AM

الطاف حسین, امن کمیٹی, ایم کیو ایم, پاکستان, پیپلز پارٹی, جاگیر داری, زرداری, سیاست, کراچی, لیاری, مفاد

کہانی میں ٹوئسٹ

ماما ،  مجھے آپکو ایک اہم بات بتانی ہے۔

ہمم، پہلے کھانا ختم کرو۔

ماما، یہ بہت اہم بات ہے۔

اچھا کیا ہے یہ اہم بات؟

ماما آپکو پتہ ہے سب مٹی سے بنا ہے۔

اچھا ، کیا سب مٹی سے بنا ہے؟

انسان، بندے، سب مٹی سے بنے ہیں۔

یہ کس نے بتایا؟

مس نگہت نے۔ آج دینیات کا پیریڈ تھا ناں۔ مس نگہت نے بتایا کہ انسان کیسے بنا۔

اچھا تو مٹی سے انسان کیسے بنا؟

جی ہاں، اللہ میاں نے فرشتوں سے کہا کہ مجھے کچھ مٹی لاکر دو۔ جب فرشتوں  نے مٹی لا کر دی تو اللہ میاں نے اس سے انسان بنایا اور پھر اس میں روح ڈال دی۔

اچھا ، یہ تو انسان بنانے کا بڑا آسان طریقہ ہے۔

آپکو پتہ ہے ماما، شیطان جو ہوتا ہے نا وہ بہت برا ہوتا ہے۔ اس نے اللہ میاں سے کہا کہ انسان نہیں بناءو لیکن جب اللہ میاں نے انسان بنا لیا توکہنے لگا کہ دیکھنا اب میں کیسے انسان کو بری بری باتیں سکھاءونگا اور اسے برا بناءونگا۔

اچھا، شیطان ایسا ہے۔ وہ انسان کو کیسے برا بنا دیتا ہے؟

وہ کہنے لگا کہ میں انسان کو نماز نہیں پڑھنے دونگا اور نہ ہی اسے کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنے دونگا۔ ایسے وہ برا بناتا ہے۔

اچھا یہ تو واقعی بڑا برا ہے۔

ماما، اتنا برا ہے کہ اس نے کہا کہ وہ اللہ میاں کو پانی میں پٹخ دے گا۔ یہ جملہ تخیل کی پرواز تھا اور شیطان کو حتی الامکان برا ثابت کرنے کی انتہائ کوشش۔

کس نے کہا یہ؟

ہممم، سر کھجایا اور پھر جواب دیا۔ چور نے۔ تخیل کی پرواز کے دوران شیطان کا خیال ذہن سے پھسل گیا۔

لیکن چور تو چوری کرنے آیا تھا یا اللہ میاں سے کشتی لڑنے۔

ماما، چور بہت برا ہوتا ہے۔ موضوع کو ٹال کر دوسری طرف لے جانے کی کامیاب کوشش۔

ہاں ہوتا تو ہے۔

کسی کی بھی چیز اس سے پوچھے بغیر نہیں لینی چاہئیے۔ یہ چوری ہوتی ہے۔

ہمم، یہ بات تو صحیح ہے۔

مشعل یہ باتیں کرتے ہوئے سوچ رہی ہے کہ کہانی میں یہ ٹوئسٹ کیسے آیا۔

ماما جانتی ہیں لیکن بتائیں گی نہیں۔

10:02 PM

اللہ, انسان, تخلیق, شیطان, کہانی, مذہب

ڈنگ ڈونگ

ہر اچھا اور برا وقت گذر جاتا ہے کل کا دن بھی گذر گیا۔ ایک اور چبھتی ہوئ یاد۔ فیس بک پہ اب تک اسکی  چبھن باقی ہے۔ جب بھی ہم روائیتی حریف کے سامنے ہوتے ہیں دنیا کو لگ پتہ جاتا ہے کہ آج  کیا ہونے والا ہے۔ کسی زمانے میں شیر کی آ٘د کا پتہ رن کے کانپنے سے چلتا تھا۔ کس شیر کی ٘آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے اب یہ کام میڈیا انجام دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب روڈ پہ سے گذری تو حیران تھی کہ اتنا چھوٹا شامیانہ لگا کر اور اتنی ساری کرسیاں بچھا کر کس تقریب کا اہتمام ہو رہا ہے۔ نوجوان اب بھی ایم کیو ایم کے اتنے دیوانے ہیں۔ واپسی پہ معمہ حل ہوا،  شامیانے کا سائز اسکرین کے سائز جتنا تھا اور کرسیاں ہی کیا لوگ اسکے چاروں طرف کھڑے تھے۔

گھر واپس آکر دیکھا کہ لاءونج کا صوفہ ٹی وی سے ایک نامعقول فاصلے پہ رکھا ہوا ہے اور آگے پیر ٹکانے کے اسٹول رکھے ہوئے ہیں۔ آنکھیں جمی ہیں، میچ چل رہا ہے۔

مجھے تو ٹی ٹوئینٹی میچ  کرکٹ کا ساشے پیکٹ لگتا ہے۔ آخر اسکے لئے گیارہ کھلاڑیوں کی کیا ضرورت ہے؟ یعنی رومال بنانے کے لئے پورا تھان لیں۔ یہ اسی صورت نظر انداز کیا جا سکتا ہے جب فیس بک اور ٹوئٹر بھی ساتھ ساتھ رواں دواں ہوں۔

فیس بک سے اندازہ ہوا کہ میچ میں پاکستان کی ہار کا منظر ابھرتے ہوئے ہی کچھ کمزور دل حضرات ٹی وی کے آگے سے اٹھ گئے۔ کچھ نے جائے نماز سنبھالی لیکن میچ کے اختتام پہ کچھ دہرئیے والے کلمات کہتے پائے گئے۔ پاکستانی کھلاڑیوں کو سوچنا چاہئیے کہ انکی وجہ سے کچھ لوگ دعا اور رب دونوں سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ جسکا عذاب انکے سر پہ ہوگا۔ کچھ خواتین رونے لگ گئیں اور کچھ کے بچوں کی شامت آئ یعنی طویلے کی بلا بندر کے سر۔ اس دلچسپ صورت حال کی عکاسی کے لئے میں نے کچھ اسٹیٹس چوری کئے ہیں۔ حاضر ہیں۔

Feel like giving two chammats to the team

Kia game on hai? I didnot feel do :(

کوئ بات نہیں، بچہ سمجھ کر جیت دے دی، اگلی باری میں دیکھنا۔

پس ثابت ہوا کہ ٹُلّر ہر واری نہیں چل سکدا۔

اور جیسا کہ میں میچ شروع ہونے سے پہلے کہہ چکا تھا نتیجہ وہی نکلا

Chalo toss hu, jeetay or match tum! Baat baraber hoi :)

Lo Ji,

Pakistan har gaya.

Allah Hafiz

To

boost the performance levels for time being, Pakistani team must

presume for time being that they are working in a 3 hour long commercial

Prepare yourself for this song.

Tum Jeeto yaan haaroo

sunooooo

humain tum say piyar ha

Shahid

Afridi didn't work, lets send Shakeel Afridi with polio drops, and then

a drone attack + seal operation on top of that. All over!

اس سے بڑی زیادتی اور کیا ہوگی فراز

ہم جیتیں تو وارم اپ، وہ جیتیں تو سپر 8

کس عقیدت سے آئوٹ ھوتے ھیں

واہ وا واہ

کس عقیدت سے آئوٹ ھوتے ھیں

ھار جانا ثواب ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ھو جیسے

کیا رحمان ملک پاک بھارت میچ کا سودا کرنے گیا؟ رقم بٹورنے کا اچھا موقع سمجھتے ہوے؟

پاکستانی ٹیم کو کسی کوچ کی نہیں، بلکہ ایک اچھے سائیکیٹریسٹ کی ضرورت ہے۔

اور قارئِن، اس دھلائ سے فارغ ہو کر لوگ ایک دفعہ پھر خداکی طرف رجوع کرتے ہیں۔ کیوں؟ یہ نہیں معلوم۔

I am watching Madni Tv now !!!

میری دلچسپی تو کرکٹ میں اس وقت سے ختم ہو گئ ہے جب سے پاکستان میں کرکٹ کرپشن اپنے عروج پہ پہنچا۔ لیکن اس دفعہ جس چیز کی وجہ سے مجھے بار بار اسکرین کو دیکھنا پڑا۔ وہ ڈنگ ڈونگ کا اشتہار ہے۔ میرے بچپن سے یہ اب میری بیٹی کے بچپن تک آپہنچا۔ جب اشتہار اختتام پہ پہنچتا ہے تو بلی چوہوں کی پٹائ لگانے کے بعد اپنا ڈنگ ڈونگ ببل کا ذخیرہ لیتی ہے اور وہی سونگ گاتی ہے۔ میں سوچتی تھی کہ یہ نہیں پتہ چلتا کہ کون سا سونگ گاتی ہے؟ کچھ عرصے بعد ایک خیال آیا کہ یہ ڈنگ ڈونگ گاتی ہے۔ اب بھی یقین نہیں کہ یہ خِال درست تھا یا غلط۔

 اس میچ کے دوران ڈنگ ڈونگ ببل کا اشتہار پاکستان کی مختلف زبانوں میں آتا رہا۔

اور میں ہر دفعہ کمپیوٹر اسکرین سے نظریں پھیر سنتی کہ یہ اب کون سی علاقائ زبان ہے اور اس میں کیا الفاظ استعمال ہوءے ہیں۔ لیکن کل سے پہلے شاید ہی کبھی شک ہوا ہو کہ یہ اشتہار یا تو یہودیوں نے بنایا ہے یا پھر را کے ایجنٹوں نے۔

ایک مبصر کا کہنا تھا کہ ہر کھلاڑی کے آءوٹ ہونے پہ یہ اشتہار آیا اور بلی خوشی سے ناچتی پھری۔ بعض حقائق بڑی دیر سے پتہ چلتے ہیں۔

اب پھر ایک سوال ذہن میں ہے۔ اگر بلی نے چوہوں کی پٹائ لگائ اور ڈنگ ڈونگ لے کر اس نے پھر وہی سونگ گایا۔ تو اس دفعہ اس نے کون سا سونگ گایا؟ جواب منتخب کریں۔

۱

ڈنگ ڈونگ

۲

تم جیتو یا ہارو

سنو

ہمیں تم سے پیار ہے

۳

لخ لعنت

10:28 AM

انڈیا, ایم کیو ایم, پاکستان, ٹی وی, حریف, سری لنکا, کراچی, کرکٹ, معاشرہ, میچ, میڈیا

ریبیز اور اسکا عالمی دن

ایک عام خیال یہ ہے کہ

ریبیز

نامی بیماری صرف کتے کے کاٹنے سے ہوتی ہے۔ لیکن اور بھی بہت سے گرم خون والے جانور ہیں جن سے یہ بیماری ہو سکتی ہے۔ ان میں  گھوڑے، بندر، لومڑی، رکون، نیولا، بھیڑیا، بلیاں، خرگوش اور چمگادڑ بھی اس فہرست میں شامل ہیں۔ جی ہاں انکے کاٹنے سے بھی انسان ریبیز کا شکار ہو سکتا ہے۔ ریبیز ایسا مرض ہے جو ریبیز سے متائثر جانوروں سے انسان میں منتقل ہوتا ہے۔ اسکے جراثیم جانور کے تھوک میں یا اعصاب میں ہوتے ہیں۔ انسان سے انسان میں اگرچہ یہ ممکن نہیں لیکن ٹرانسپلانٹ سرجری کے بعد بعض لوگوں میں ریکارڈ کیا گیا۔ یعنی ایک ریبیز سے متائثر شخص کا کوئ عضو اگر غیر متائثر شخص کو لگا دیں تو اسے ہو سکتی ہے۔

اس طرح،  پہلے جانور کو ریبیز ہوتی ہے اور پھر وہ اس قابل ہوتا ہے کہ انسان میں منتقل کر سکے۔ اس لئے ہر کتے کے کاٹنے سے ریبیز نہیں ہوتا بلکہ صرف اس کتے کے کاٹنے سے ہوتا ہے جو اس مرض میں مبتلا ہو۔

اس مرض کا پہلا دستاویزی ثبوت، دو سو قبل از مسیح میں ملتا ہے۔ جہاں ایک کتے کے کاٹے سے مرض کی علامات ظاہر ہوئیں۔  اٹھرہویں صدی سے پہلے تحقیق کے لئے جانور کی زبان کاٹ کر محفوظ کر لی جاتی تھی۔ یہ بعد میں معلوم ہوا کہ درحقیقت اسکے جراثیم دماغی خلیات میں ہوتے ہیں زبان میں نہیں۔

دنیا بھر میں ہر سال تقریباً پچپن ہزار امواتیں ریبیز کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ جنکی اکثریت ایشیاء اور افریقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ ستانوے فی صد ریبیز کے کیسز ، کتے کے کاٹنے کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

ریبیز لاطینی زبان کا لفظ ہے جسکا مطلب ہے پاگل پن۔ کیونکہ یہ مرض جب اپنی انتہائ حالت پر پہنچتا ہے تو مریض جنونی حرکتیں کرنے لگتا ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ اس مرض کا وائرس دماغ پہ اثر انداز ہوتا ہے اور اس میں سوجن پیدا کر دیتا ہے۔ مرض جب اس شدت پہ پہنچ جائے تو مریض چند دنوں کے اندر ختم ہوجاتا ہے۔

یہ وائرس دماغی اعصاب کے ذریعے سفر کرتا ہوا دماغ تک پہنچتا ہے۔ یوں کاٹے جانے والے مقام سے فاصلے کی بنیاد پہ اس مرض کے ظاہر ہونے میں اتنا وقت لگتا ہے۔ یہ مقام جتنا دماغ سے قریب ہوگا اور جتنا زیادہ کاٹنے کا زخم گہرا اور بڑا ہوگا اتنا جلد مرض کی علامتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور اس طرح چند دنوں سے لیکر چند مہینوں میں مرض کی علامتیں ظاہر ہو سکتی ہیں۔

مرض ظاہر ہونے کی کم سے کم مدت چار دن اور زیادہ سے زیادہ مدت چھ سال ریکارڈ کی جا چکی ہے۔

علامتیں  ظاہر ہونےسے پہلے اگر حفاظتی ٹیکے لے لئے جائیں تو مرض میں مبتلا ہونے کے امکانات ختم ہوجاتے ہیں  وائرس کے دماغ میں پہنچ جانے کی صورت میں یا علامات ظاہر ہونے کے بعد یہ ٹیکے یا کوئ اور دوا کام نہیں کرتی۔

مرض کی علامات

؛

مرض کی ابتدائ علامات میں پہلے مرحلے میں، طبیعت گری سی محسوس ہوتی ہے۔ سر درد اور بخار ہو جاتا ہے آہستہ درد ہونا شروع ہوتا ہے، دوسرے مرحلے میں مریض اشتعال میں آجاتا ہے، غیر معمولی جوش، تناءو اور پانی کا خوف بھی ظاہر ہونے لگتا ہے۔ جانور ہونے کی صورت میں وہ ذرا سی حرکت میں اتنا اشتعال میں آسکتا ہے کہ کاٹ لے۔  مریض عجیب و غریب حرکتیں شروع کر دیتا ہے۔ تیسرے مرحلے میں، فالج کا اثر ہو سکتا ہے۔ پاگل پن کی علامتوں کے ساتھ مریض کومے میں چلا جاتا ہے۔ علامات ظاہر ہونے کے دو سے چند دن کے اندر موت واقع ہوجاتی ہے۔ موت عام طور سے اعضائے تنفس کے کام چھوڑ دینے کی وجہ سے ہوتی ہے۔

بچاءو

؛

 ریبیز سے محفوظ رہنے کے لئے، ریبیز پیدا کرنے والے جانور کے کاٹنے کے فوراً بعد ٹیکے لگوانا ضروری ہیں۔ ریبیز کا موئثر بچاءو یہ ٹیکے ہیں اگر ایک دفعہ علامات ظاہر ہوجائیں تو مریض کو بچانا ممکن نہیں رہتا۔

اگرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ جانور کو پکڑ کر اس میں بیماری تشخیص کی جائے اگر وہ ریبیز کا شکار نہیں ہے تو ٹیکے لگوانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن عام طور پہ کتے کے کاٹے کے واقعات آوارہ کتوں کے ہوتے ہیں جو کاٹنے کے بعد بھاگ جاتے ہیں اور انہیں ڈھونڈھ نکالنا آسان نہیں ہوتا۔ اگر یہ کوئ پالتو کتا ہے اور اسکی ویکسینیشن باقاعدہ ہوتی  ہے تو پھر ریبیز کے امکانات نہیں ہوتے۔

اٹھارہ سو پچاس میں ریبیز سے بچاءو کے ٹیکے وجود میں آئے۔ لوئ پاسچر اور ایمائل روکس کے سر اسکی دریافت کا سہرا جاتا ہے۔  یہ ویکسین متائچرہ جانور کے دماغی خلیات سے بنائ گئ تھی۔ انیس سو سڑسٹھ میں  جدید ویکسین وجود میں آئ۔ یہ نہ صرف سستی ثابت ہوئ بلکہ بنانے کا طریقہ بھی آسان تھا۔  ترقی یافتہ ممالک میں پالتو کتوں کے لئے ویکسینیشن ضروری ہے اس طرح امریکہ میں اب پالتو کتوں کی وجہ سے ریبیز عموماً نہیں ہوتی بلکہ اسکے ہونے کی بنیادی وجہ چمگادڑیں ہیں۔

بچاءو کے لئے جسب ذیل طریقے اختیار کئے جائیں۔

پالتو جانوروں مثلاً کتے، گھوڑے، خرگوش اور بلیوں کی ویکسینیشن کرائ جائے۔

گھریلو جانوروں پہ نظر رکھی جائے کہ وہ کس طرح کا رویہ رکھتے ہیں۔

آوارہ پھرنے والے جانوروں سے دور رہا جائے اور انہیں چھونے سے گریز کیا جائے۔

پاگل کتا نظر آنے کی صورت میں فوراً انتظامیہ کو اطلاع دی جائے۔

اگر ریبیز پیدا کرنے والے جانور کاٹ لیں تو زخم کو فوراً صابن ملے پانی سے اچھی طرح پانچ منٹ تک دھوئیں تاکہ زیادہ سے زیادہ جراثیم دھل جائیں اور جسم میں داخل نہ ہو سکیں۔ اگر ٹنکچر آئیوڈین یا الکوحل موجود ہو تو اس سے بھی دھو لیجئیے۔ جسم کے سوراخوں جیسے منہ اور ناک کے نتھنے اور آنکھوں کو بھی اچھی طرح پانی سے دھو لیں۔   ڈاکٹر سے فوری رجوع کریں۔

کتے کے کاٹنے کے فوراً بعد بچاءو کے لئے ٹیکے لگوانے چاہئیں۔ پہلے  جو ٹیکے استعمال کئے جاتے تھے وہ عام طور پہ چودہ دن تک مسلسل لگانے پڑتے تھے وہ بھی پیٹ میں۔ پیٹ میں موجود چربی کی موٹی تہہ اس ٹیکے کو جسم میں کنٹرولڈ مقدار میں داخل ہونے دیتی تھی۔  لیکن اب زیادہ مءوثر ٹیکے موجود ہیں جنہیں پیٹ میں نہیں لگانا پڑتا بلکہ بازو پہ لگاتے ہیں اور نہ روزانہ بلکہ چودہ دن میں چار دفعہ لگایا جاتا ہے۔ البتہ یہ کہ پیٹ میں لگانے والے ٹیکے سستے پڑتے ہیں۔

علاج

؛

کیا ریبیز ہو جانے کے بعد اسکا علاج ممکن ہے؟

ریبیز کے علاج کے لئے کوششیں اور

تحقیق

  جاری ہے۔ اس سلسلے میں پروٹوکول ترتیب دیا گیا جسکے نتائج حوصلہ افزاء ہیں لیکن واقعی کامیاب نہیں۔ اس طریقے سے اب تک چند افراد کو بچایا جا چکا ہے۔ اس سلسلے میں پہلا کیس ایک بچی کا تھا۔ جین گیز نامی اس بچی کو سن دو ہزار چار میں ایک چمگادڑ نے انگلی پہ معمولی سا کاٹ لیا تھا۔ جسے اس وقت صاف ستھرا کر کے چھوڑ دیا گیا کہ معمولی سا زخم ہے۔ تقریبا ایک مہینے بعد جینا میں بیماری کی علاتیں ظاہر ہونا شروع ہوئیں۔ اسے ہسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹڑ اسکے اعصابی رد عمل کو دیکھ کر پریشان تھے کہ معمولی بخار سے ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ پھر اسکے گھر والوں کو خیا آیا کہ اسے کچھ دن پہلے چمگادڑ نے کاٹ لیا تھا۔ جینا گیز ریبیز کا شکار ہو چکی تھِ اور اب ٹیکے کا استعمال اسے بچا نہیں سکتا تھا۔ اس لئے ڈاکٹرز نے خاندان والوں کی اجازت سے جینا کو کچھ عرصے کے لئے بے ہوش کر دیا یعنی اسے کومے والی صورت میں لے گئے جہاں دماغ کام کرنا بند کر دیتا ہے اس طرح دماغی خلیات کو تباہ ہونے سے بچایا جا سکتا ہے اسکے بعد جینا کو اینٹی وائرل دوائیں دے کر اسکے جسم کو اس قابل بنایا گیا کہ وہ قدرتی طور پہ ریبیز کے خلاف اینٹی باڈیز بنا سکے۔ چند دنوں کے بعد جب جسم میں اینٹی باڈیز بننے کا عمل شروع ہو گیا تو جینا کو کومے سے واپس لایا گیا۔

جینا کو مکمل طور پہ صحت یاب ہونے میں لمبا عرصہ لگا لیکن وہ اب زندگی کی تمام سرگرمیوں میں حصہ لے سکتی ہے سوائے چند ایک کے۔ یہ پروٹوکول

مل واکی پروٹوکول

کہلاتا ہے۔ اب تک چار افراد اس طریق علاج سے بچائے جا چکے ہیں۔ ابھی اس پہ تحقیق جاری ہے کہ کیا واقعی اس پروٹووکول سے ہی مریض بچے یا انکے بچنے کی وجوہات کچھ اور ہیں۔

دنیا بھر میں ریبیز سے آگہی کا عالمی دن اٹھائیس ستمبر کو منایا جاتا ہے۔  اس حوالے سے یہ تحریر معلومات عامہ کے لئے ہے۔

11:07 AM

احتیاط, اعصاب, ٹیکے, ریبیز, طب, عالمی دن, علاج, کتا، ممالیہ. گرم خون, مرض, ویکسینیشن

کیا واقعی؟

اب کچھ بھی لکھنے سے پہلے اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ رسول اللہ پہ بنائے جانے والی فلم کے متعلق میرا کیا خیال ہے۔

 ٹیکنالوجی کے اس زمانے میں کسی بھی قسم کا فضول مواد نیٹ پہ ڈالنا کسی بھی شخص کے لئے کوئ مشکل کام نہیں۔ اسکی مثال وہ فحش مواد ہے جو خود مغربی معاشرے کے لئے ایک مصیبت سے کم نہیں۔

ہمارے یہاں اس فلم کے اوپر غم غصے کا ہونا بجا ہے۔ اسکی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اسلام  کے پیغمبر، کوئ تصوراتی شخصیت نہیں ہیں۔ انکی یہی خوبی جہاں ایک مسلمان کے لئے بے حد کشش کا باعث بنتی ہے وہاں نہ ماننے والوں کے لئے تنازعوں کا کھڑا کرنے کا باعث بھی بنتی ہے۔

میرے نزدیک یہ فلم

آزادی ء

اظہار

رائے

کے ضمن میں نہیں آتی بلکہ اسکا تعلق ہیٹ میٹیریئل یعنی نفرت انگیز مواد سے ہے۔  سو اس سلسلے میں مسلمانوں کا یہ مطالبہ اپنی جگہ درست ہے کہ اسے نیٹ پہ سے ہٹایا جائے کیونکہ یہ مسلم دنیا سے نفرت کا اظہار کرتی ہے۔ اور جب تک اسے نیٹ پہ سے نہیں ہٹایا جائے گا۔ مسلم دنیا یہ تسلیم کرنے میں حق بجانب رہے گی کہ یہ نفرت انگیز مواد ، مسلم دنیا کو مشتعل کرنے کے لئے پیش کیا گیا ہے۔

مسلم دنیا  اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہے؟

یہ ایک اہم سوال ہے۔ ایک اجتماعی حل تو یہ ہے  کہ تمام مسلم ممالک کو اس سلسلے میں متحد ہو کر کسی ایسے بین الاقوامی قانون کے لئے کوشش کرنی چاہئیے جس سے اس قسم کے نفرت انگیز مواد کا پھیلاءو ممکن نہ رہے۔

لیکن اس سے پہلے ہمیں بحیثیئت پاکستانی خود سے بھی پوچھنا چاہئِے کہ کیا ہم دوسرے مذاہب کی تکریم کرتے ہیں۔ کیا ہم دوسرے انسانوں کو یہ آزادی دیتے ہیں کہ وہ اپنے مذہب پہ جیسے دل چاہے عمل کریں۔

کل میری نظر ایک مضمون پہ سے گذری جو کسی مغربی لکھاری کا لکھا ہوا تھا اور انہوں نے اس میں بے شمار چیزیں گنوائیں جو مسلمان ، غیر مسلموں کے لئے کہتے ہیں اور جو نفرت انگیز مواد میں شامل ہونا چاہئیے۔ جب ہم دل آزاری کے اس مرحلے سے بغیر کسی قباحت کے گذر جاتے ہیں تو اپنی باری میں پہ ہم کیوں پریشان ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے رسول کی تکریم ہو تو ہمیں اپنے اعمال کی بھی نگہداشت کرنی چاہئیے۔

ON CHRISTIANS Hasan Rahimpur Azghadi of the

Iranian Supreme Council for Cultural Revolution: Christianity is “a

reeking corpse, on which you have to constantly pour eau de cologne and

perfume, and wash it in order to keep it clean.”

http://www.memritv.org/clip/

en/1528.htm

— July 20, 2007.

Sheik Al-Khatib al-Baghdadi: It is permissible to spill the blood of

the Iraqi Christians — and a duty to wage jihad against them.

http://www.memri.org/report/

en/0/0/0/0/0/0/5200.htm

— April 14, 2011.

Abd al-Aziz Fawzan al-Fawzan, a Saudi professor of Islamic law, calls

for “positive hatred” of Christians. Al-Majd TV (Saudi Arabia),

http://www.memritv.org/clip/

en/992.htm

— Dec. 16, 2005.

ON SHIITES The Egyptian Cleric Muhammad Hussein Yaaqub: “Muslim

Brotherhood Presidential Candidate Mohamed Morsi told me that the

Shiites are more dangerous to Islam than the Jews.”

www.memritv.org/clip/en/

3466.htm

— June 13, 2012.

The Egyptian Cleric Mazen al-Sirsawi: “If Allah had not created the Shiites as human beings, they would have been donkeys.”

http://www.memritv.org/clip/

en/3101.htm

— Aug. 7, 2011.

The Sipah-e-Sahaba Pakistan video series: “The Shiite is a Nasl [Race/Offspring] of Jews.”

http://www.memri.org/report/

en/0/0/0/0/0/51/6208.htm

— March 21, 2012.

ON JEWS Article on the Muslim Brotherhood’s Web site praises jihad

against America and the Jews: “The Descendants of Apes and Pigs.”

http://www.memri.org/report/

en/0/0/0/0/0/51/6656.htm

— Sept. 7, 2012.

The Pakistani cleric Muhammad Raza Saqib Mustafai: “When the Jews are

wiped out, the world would be purified and the sun of peace would rise

on the entire world.”

http://www.memri.org/report/

en/0/0/0/0/0/51/6557.htm

— Aug. 1, 2012.

Dr. Ismail Ali Muhammad, a senior Al-Azhar scholar: The Jews, “a source of evil and harm in all human societies.”

http://www.memri.org/report/

en/0/0/0/0/0/51/6086.htm

— Feb. 14, 2012.

ON SUFIS A shrine venerating a Sufi Muslim saint in Libya has been

partly destroyed, the latest in a series of attacks blamed on

ultraconservative Salafi Islamists.

http://www.bbc.co.uk/news/

world-africa-19380083

— Aug. 26, 2012.

عوام کی مذہب کے نام پہ  سلطان راہی بننے کی لگن دیکھتے ہوئے سیاستداں بھی

اس سے کم فائدہ نہیں اٹھاتے۔ کیونکہ مذہب کا نام لے کر کسی کو قتل کر دیں یا کسی کی زمین چھین لیں یا کسی کو قید کرا دیں یہ کوئ مشکل کام نہیں۔ معاشرہ بھی اسے برا نہیں سمجھتا۔ جو اس چکر میں پھنستا ہے اسکی جاں بخشی اس ملک کی سرحدوں کے باہر ہی ممکن ہو پاتی ہے۔ سو وہ لوگ جو آجکل خواب میں بھی اپنے ہاتھ میں

تلوار اور سامنے گستاخ کا سر دیکھتے ہیں انکو بلور صاحب نے پیغام دیا ہے

کہ گستاخ فلم بنانے والے کے سر کی قیمت انہوں نے رکھ دی ہے۔ جسے ہو شوق

جائے کرے شکار اسے۔ اس طرح صوبہ ء سرحد میں موجود طالبان کو انہوں نے

ایک سخت چیلینج دیا ہے۔ دیکھتے ہیں طالبان  کیا زیادہ سخت سزا اس گستاخ کے

لئے رکھتے ہیں۔ بلور صاحب سے معذرت کے ساتھ کیا یہ پیغام تشدد، شدت پسندی

اور نفرت انگیز جذبات کو ہوا دینے والا نہیں ہے۔

ہمیں دیکھنا چاہئیے کہ مغربی ممالک میں کئ دہائیوں سے بسنے والے لوگوں کی

زندگی کیا ان مغربی لوگوں نے اجیرن کی ہوئ ہے۔ کیا وہ انکے سامنے انکے نبی

کی توہین کرتے ہیں۔ مجھے آج تک کوئ ایک شخص مغرب میں ایسا نہیں ملا جس نے

مجھ سے میرا مذہب پوچھا ہو یا میرا مذہب جاننے کے بعد کوئ توہین آمیز

ریمارک دیا ہو۔

کسی بھی ایسے گستاخ کے سر کی قیمت رکھ کر یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں پاگلوں کی کمی نہیں۔ کیا سلمان رشدی کے سر کی قیمت رکھنے کے بعد لوگوں نے مرنے کے ڈر سے گستاخی کرنے کی جراءت نہیں کی؟

مجھے یقین ہے کہ یہ اس سلسلے کا آخری واقعہ نہیں ہوگا جیسا کہ مجھے کارٹونز والے معاملے میں بھی یقین تھا کہ یہ سلسلہ ایسے نہیں رکے گا۔

  اب ہم پاکستان کی طرف آتے ہیں۔ کل ہمارے یہاں یوم عشق رسول  ایسے منایا گیا کہ لوٹ مار کے واقعات کے ساتھ چھبیس افراد اپنی جان سے گئے۔ یہ وہ بے گناہ ہیں جنہیں کوئ شہید بھی نہیں کہتا۔ مذہبی رجحان رکھنے والے لوگوں نے اس پہ مذمت سے زیادہ اس پہ مذمت کی کہ میڈیا نے پر امن ریلیوں کی کوریج کے بجائے ہنگامے کی کوریج زیادہ کی۔ مجھے جس چیز پہ انتہائ افسوس رہا وہ یہ کہ سوائے فضل الرحمن صاحب کے کسی اور مذہبی تنظیم نے جاں کے زیاں پہ اپنے افسوس کا اظہار نہیں کیا۔ حتی کہ سوشل میڈیا پہ موجود دائیں بازو کا پروپیگینڈہ کرنے والوں کی اکثریت اس وقت ایسے خاموش ہوئ جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ جیسے یہ واقعہ پاکستان میں نہیں مریخ پہ پیش آیا ہو، جیسے مرنے والے ہمارے ہم مذہب اور ہم وطن نہیں بلکہ کسی جنگل میں شیر اور ہاتھی کے درمیان لڑی جانے والی جنگ میں کچلی ہوئ گھاس تھے۔

آخر یہ کیسے ہوا کہ اتنے لوگ ہلاک ہو گئے؟

ایک اسٹیٹس میری نظر سے فیس بک پہ گذرا۔ جس میں لکھنے والے نے لکھا کہ ریلیاں انتہائ پر امن تھی۔ ان میں ہر طرح کے لوگ شامل تھے لیکن معاملہ ان جگہوں پہ خراب ہوا جہاں افغان مہاجرین نے ریلیوں میں شرکت کی۔ یہ افغان توڑ پھوڑ اور ہلاکتوں میں شامل تھے۔ اسکے ساتھ ہی اسلام آباد کے ہنگامے کی تصویر تھی۔

تب مجھے یاد آیا کہ بے نظیر کے مرنے پہ کراچی میں ملیر کے علاقے میں سب سے زیادہ ہنگامہ ہوا۔ لوگوں نے کہا کہ انکے گھروں میں گھس کر نہ صرف لوٹ مار کی گئ بلکہ خواتین کو اٹھا لیا گیا۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے اس کا ذمہ دار افغان مہاجرین کو بتایا۔

ادھر کراچی میں میری آج ایک صاحب سے بات ہوئ جو حافظ قرآن ہیں اور لیاری کے علاقے میں رہتے ہیں۔ انکا کہنا تھا کہ وہ عینی گواہ ہیں کہ کل صدر کے علاقے میں جو لوٹ مار اور جلاءو گھیراءو ہوا وہ لیاری کے امن کمیٹی والوں کا کیا دھرا ہے۔  چند سال پہلے بھی کراچی پیپر مارکیٹ میں آگ لگانے کا ذمہ دار امن کمیٹی کو بتایا گیا تھا۔ حتی کہ اس وقت کی جانے والی لوٹ مار کا سامان بعد میں لیاری کے ایک گودام سے بر آمد بھی کیا گیا۔ یہ پیپر مارکیٹ صدر کے ساتھ ہی ہے۔

 میں نے حیران ہو کر ان صاحب سے پوچھا، لیکن میڈیا اس سلسلے میں کچھ نہیں بتا رہا اور امن کمیٹی والوں کا اس سارے معاملے سے کیا تعلق؟

کہنے لگے، امن کمیتی کی خبریں میڈیا نہیں دے سکتا۔ مزید یہ کہ  یہ سب ایجنسیز یعنی پاکستانی فوج کے ایماء پہ ہوا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ عوام مذہب کے نام پہ بڑھکوں اور قتل و غارت گری سے بھرپور ڈرامہ دیکھ کر اپنا خون گرم رکھے۔ کیونکہ وہ ایک طرف عوام کو مذہب کے نام پہ طیش میں لاتے ہیں اور دوسری طرف امریکہ بہادر کو جتاتے ہیں دیکھا، ہم نے کتنی مصیبتیں جھیل کر آپکو اپنے علاقے میں تحفظ دیا ہوا ہے۔ اور آپ ہمارے لئے کیا کرتے ہیں۔ اس سے نہ صرف فوج بلکہ حکومت کے بھی پو بارہ ہیں۔

سوسائٹی میں وہ جن لوگوں کو استعمال کر سکتے ہیں انہوں نے کیا، ایک طرف افغان ذرائع انکے قابو میں  دوسری طرف کراچی میں جو قوتیں انکے قابو میں ہیں ان سے بھی حتی الامکان کام لیا ہے۔ مذہبی جماعتیں جہاد کے نام پہ انکے قابو میں ایسے آتی ہیں جیسے تر نوالہ۔

مجھے تو انکی بات پہ شبہ ہی تھا یہ تو آئے دن کا معمول ہے کہ جب کچھ سمجھ نہیں آتا تو کہہ دیتے ہیں کہ اس میں ایجنسیز شامل ہیں۔  لیکن آج صبح جب میں نے کیانی صاحب کا یہ بیان ٹی وی پہ سنا کہ ہم دہشت گردی کے خلاف جہاد جاری رکھیں گے تو میں نے سوچا کہ جہاد اور جنگ میں معمولی سا فرق ہے وہ چاہتے تو اوبامہ کی طرح لفظ جنگ استعمال کر سکتے تھے۔ لیکن در حقیقت اس میں اتنا ہی فرق ہے جتنا خدا حافظ اور اللہ حافظ میں ہے۔ عوام کو کتنی آسانی سے سمجھ میں آیا کہ اللہ حافظ سے ہی اللہ ہمیں حفاظت دے گا۔ کیونکہ مسلمانوں کے خدا کا نام اللہ ہے۔ خدا تو ہر کس و ناکس کا ہو سکتا ہے۔ ہر کسی کا خدا خاص امت کا خدا کیسے ہو سکتا ہے۔ کیانی صاحب نے بڑا ناپ تول کر بولا۔

یہ پاک فوج ہے جس نے مذہبی شدت پسندی کا بیج بویا، اسکی آبیاری کی، اسے تناور بنایا، اسکے سائے میں بیٹھ کر اپنے لئے گلشن بنائے اور اب بھی اسکا کردار شفافیت سے محروم ہے۔

کیا واقعی؟ پاکستانی فوج  اب تک اس نشے کا شکار ہے کہ وہ بوتل کے جن کو جب چاہے گی اندر کر لے گی اور جب چاہے گی باہر کر لے گی۔ وہ جب چاہے گی مولوی صاحب کی خدمات حاصل کرے گی اور جب چاہے گی مولوی صاحب کو ایک طرف کر دے گی۔ کیا مولوی صاحب اتنے ہی بے وقوف ہیں؟

10:31 PM

، معاشرہ, آزادی, اسلام, افغان, پاکستان, توہین, دہشت گردی, رسول, سیاست, شہید, فوج, قتل, کراچی, کیانی, مذہب, مغرب, مولوی

توہین کا غم

جہاں تین سو لوگ ایک دن میں جل کر مرجائیں اور کوئ سنوائ نہ ہو کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ مزدوروں کے حق میں کوئ تحریک نہ چلے۔ محنت کشوں کے لئے موجود ہمارے پالیسی سازوں کے اونچے اونچے محلوں پہ پتھر مارنے کے لئے ایک ہاتھ حرکت میں نہ آئے۔  جہاں ایک فلم  بننے کے ایک سال بعد اااس وقت اس پہ احتجاج شروع ہو جس وقت اسکا عربی ورژن ریلیز ہو۔ یہی نہیں بلکہ لوگ  سوشل میڈیا پہ یہ پیغام شیئر کر رہے ہوں کہ توہین پیغمبر کی سزا ، بس سر سے تن جدا، بس سر سے تن جدا، بس سر سے تن جدا۔ جہاں اس بات پہ خوشی منائ جارہی ہو کہ کراچی میں سفارت خانے پہ حملے میں ضائع ہونے والی جان، دراصل بازی لے جانے والے شخص کی ہے۔

ایسے زمانے میں چھٹی کا دن اور اس سے منسلکہ تفریح اسکے علاوہ کیا رہ جاتی ہے کہ آپ گھر میں سوئیں اور سوتے ہی رہیں۔ مر جائیں مرنے سے پہلے۔

لیکن اس اتوار میں نے یہ نہیں کیا۔ میں کسی بھی اتوار کو یہ کرنا پسند نہیں  کرتی۔ جب سے مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ زندگی انسان کی وہ سب سے قیمتی شے ہے جو اسے دوبارہ نہیں ملے گی۔ صرف ایک بارملے گی۔ اس احساس کے بعد سونا کافی مشکل لگتا ہے۔ ذرا سوچیں اس ایک زندگی میں وہ کیا دلچسپ کام ہیں جو ہم کر سکتے ہیں۔ جن سے کسی کو کوئ نقصان نہیں۔ جن سے کسی کی توہین نہیں ہوتی، جن سے دل تشکر کے احساس سے بھر جاتا ہے کہ خدا نے ہمیں زندگی جیسی نعمت سے نوازا۔

میں  کتابوں کی ایک دوکان پہ چلی گئ۔ یہاں نئ کتابیں کم اور پرانی زیادہ ہوتی ہیں۔ کتنی پرانی؟ اسکا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ ایک صاحب نے بتایا کہ وہ علامہ راشد الخیری کے ایک رشتے دار کے ہمراہ اس دوکان پہ موجود تھے۔ وہاں انیس سو تیس میں چھپنے والی انکی سوانح عمری مل گئ۔ جس میں ان صاحب کے دادا کے بچپن کی تصویریں بھی شامل تھیں۔

کتابیں چھانتے ہوئے، ایک کتاب نظر آئ جس پہ مصنف کا نام لکھا تھا، مرزا غلام احمد۔ میں نے سوچا یہ تو کچھ سنا سنا سا نام لگتا ہے۔ ہاتھ میں اٹھا کر دیکھا تو یاد آیا کہ فیس بک پہ روزانہ ہی ان کے دین سے ہشیار کروایا جاتا ہے۔ اور میں انہی کا نام بھول گئ۔ مجھے یقین ہے کہ میں آخری عمر میں الزائمر کا شکار ہونگی۔ اسے اٹھا کر رکھ دیا۔ اپنے مذہب کی تفصیلات یاد نہیں رہتیں، انہیں پڑھ کر کیا کرونگی جبکہ دنیا میں ہر روز کے حساب سے دلچسپ باتیں علم میں آتی ہیں۔

اسی ڈھیر میں  میں ایک اور کتاب مرزا بشیر احمد کی تھی۔ یہ بھی ایک دم خستہ حال ہو رہی تھی۔ جسے ان کتابوں کے حوالے دینا ہوں وہ خریدے۔  یہ سوچ کر ہنسی آئ کہ  قادیانیوں کے خلاف تحریک چلانے والوں کو معلوم نہیں انکا لٹریچر، لوگوں کی لا علمی کی وجہ سے ابھی تک دوکانوں پہ موجود ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دوکاندار نے بھی کبھی ان کتابوں میں دلچسپی نہ لی ہوگی۔ شاید اسے معلوم ہی نہ ہوگا کہ وہ قادیانیوں کا لٹریچر رکھتا ہے۔ اور اگر معلوم ہوا بھی تو اس نے سوچا ہوگا کہ جیسے اور لوگ اپنا دینی لٹریچر خریدتے اور پڑھتے ہیں ایسے ہی کوئ قادیانی بھی خرید لے گا۔ اسے کیا، یہ اس کا کاروبار ہے۔ جیسے فیکٹری میں کام کرنے والوں کو اس علم سے کیا غرض تھی کہ اگر آگ لگی تو وہ وہاں سے زندہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہونگے یا نہیں۔  انہیں کام چاہئیے تھا اور اسکے بدلے میں پیسے۔

وہاں ایک اور کتاب موجود تھی جس میں بتایا گیا تھا کی آغا خان اسمعیلیوں کے خدا کیسے؟ میں نے ایک نظر اس پہ ڈالی۔ آغا خانی ہمارے یہاں کی امیر  ترین اقلیت ہیں۔ کوئ انکو کافر قرار دے کر مار سکتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔کیا؟  اس میں بھی  آغا خانیوں کے دین پہ لعنت بھیجی گئ تھی۔ لیکن شاید ننانوے فی صد آغا خانیوں کو اردو لٹریچر پڑھنے سے کوئ شغف نہیں۔

نئ کتابوں پہ ایک نظر ڈالتے ہوئے میری نظر ایک کتاب پہ رکی۔ یہ خوشگوار اسلامی ازدواجی تعلقات پہ تھی۔ مجھے خیال آیا کہ ایک دوست کی شادی ہونے والی ہے انہیں تحفے میں دی جا سکتی ہے۔ لیکن پہلے اسے کھول کر تو دیکھوں کہ اس میں لکھا کیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم ایسی کتابوں میں اسلام کے حوالے سے کیا لکھا ہوتا ہے۔ اسلام کس طرح ازدواجی تعلقات کو خوشگوار بنانے میں مدد کر سکتا ہے۔

میں نے کتاب درمیان سے کھول لی۔ کس قسم کی عورت سے شادی کرنی چاہئیے؟ یہ صفحہ میرے سامنے تھا۔ احادیث اور قرآنی آیات کے حوالے موجود۔  مصنف نے جو کوئ مولانا تھے حدیث سے ثابت کیا کہ ویسے تو رسول اللہ نے دیندار عورت کو ترجیح دینے کو کہا ہے لیکن عورت کا خوب صورت ہونا ضروری ہے اگر عورت خوب صورت نہ ہو تو شوہر کا دل دوسری عورتوں میں لگا رہے گا۔ جسے سفید رنگت اور خوب صورت آنکھوں والی عورت دنیا میں مل گئ جو اپنے شوہر کا خیال رکھتی ہو اسے گویا دنیا ہی میں حور مل گئ۔

ان کے نزدیک عورت کا کنوارہ ہونا ضروری ہے۔ بیوہ  یا طلاق یافتہ عورت کا دل اپنے پہلے شوہر کے خیال میں ڈوبا رہتا ہے اور وہ دوسرے شوہر کے حقوق خوشدلی سے پورے نہیں کر سکتی۔ بکواسو، میں نے سوچا۔ جس پیغمبر نے اپنے سے پندرہ سال بڑی ایک بیوہ عورت کے ساتھ اپنی نوجوانی کے پچیس سال گذارے ہوں اور جسکی صرف ایک بیوی کنواری اور باقی سب پہلے سے شادی شدہ ہوں اسکے نام پہ یہ بات کرنا جھوٹ نہیں تو اور کیا ہے۔ آگے صفحے پلٹتی ہوں۔

بانجھ عورت سے شادی نہیں کرنی چاہئیے۔  رسول اللہ سے منسوب ایک حدیث کے حوالے سے بتایا گیا کہ اگر کسی عورت کے متعلق پہلے سے پتہ ہو کہ وہ بانجھ ہے تو اس سے شادی نہ کرو۔ میرا دل ٹوٹ  سا گیا۔ میں نے وہ کتاب بند کر کے وہیں واپس رکھ دی۔

میں ایک عورت ہونے کے ناطے سوچتی ہوں۔ کیا میں صرف بچے پیدا کرنے کا ایک آلہ ہوں۔ کیا میرے جذبات نہیں، خواہشات نہیں۔ کیا بانجھ عورت کو شادی کا حق نہیں جبکہ وہ جسمانی طور پہ ایک دم درست ہو؟

کیا یہ منسلکہ حدیث صحیح ہو سکتی ہے؟ آخر ہمیں کیوں تامل ہے کہ حدیثوں کے ذخیرے میں بہت غلطیاں ہیں جن سے لوگ اس ہستی کا مذاق اڑاتے ہیں جس کے لئے آپ  کو کسی کا سر تن سے جدا کرنے میں کوئ عار نہیں۔

میں کتاب کی دوکان سے واپس آئ، اور اب میرے دماغ میں آگ سے پیچھا چھڑانے والے لوگوں کی چیخوں کے ساتھ اس عورت کا غم بھی شامل ہے جو بانجھ ہے، بچے پیدا نہیں کر سکتی اور کوئ اس سے شادی بھی نہیں کر سکتا۔ گو غم اور چیخ، سانجھے ہیں لیکن کچھ انسان اپنی توہین کروا کر غمزدہ رہنا کیوں پسند کرتے ہیں؟

9:56 AM

اسلام, پاکستان, رسول اللہ, شادی, علامہ راشد الخیری, عورت, قادیانی, مذہب, معاشرہ

انا للہ

ٹورنٹو میں، میں کچن میں انڈہ فرائ کر رہی تھی۔ فرائ پین  سے دھواں اٹھا ہی تھا کہ ایک الارم بجنے کی آواز سارے گھر میں پھیل گئ۔ میں نے حیران ہو کر سوچا کہ یہ کس قسم کا الارم بجا اور کیوں؟ گھر کے ایک فرد کی آواز سنائ دی کہ کچن کے  باہر لاءونج میں چھت پہ سینسر موجود ہے اسکے پاس بٹن پہ ہاتھ مار دیں۔ الارم بند ہوجائے گا۔ دھویں سے بجا ہے اور بار بار بجے گا۔

کنیڈا میں جنگل اور یوں  لکڑی بہت ہے۔ گھر زیادہ تر لکڑی کے بنے ہوتے ہیں۔ اگر سیمنٹ اور اینٹ سے بنائے جائیں تو بھی اندرونی آرائش میں لکڑی استعمال ہوتی ۰ہے اس طرح شدید سردیوں میں یہ گرم رہتے ہیں۔ لکڑی جلدی آگ پکڑتی ہے اس پہ طرہ یہ کہ بجلی وافر مقدار میں دستیاب ہونے کی وجہ سے چولہے زیادہ تر بجلی کے ہوتے ہیں۔ روائیتی چولہوں سے الگ یہاں موجود جدید چولہوں پہ شیشے کی طرح کے مادے کی ایک تہہ موجود ہوتی ہے۔ یہ چولہے دیکھنے میں اور استعمال میں سادہ ہوتے ہیں  ان سے تپش بھی آسانی سے کنٹرول ہوتی ہے، آگ کے شعلے بھی نہیں ہوتے اس لئے نسبتاً محفوظ ہیں۔  لیکن سب سے بڑا خطرہ اس وقت ہوتا ہے جب انہیں بند کرنا بھول جائیں۔ مسلسل جلتے رہنے کی صورت میں یہ آتشزدگی کا باعث بن سکتے ہیں اس لئے ہر گھر میں آگ کا الارم موجود ہوتا ہے۔

یہی نہیں، کثیر المنزلہ بلڈنگزمیں نہ صرف الارم موجود ہوتے ہیں بلکہ ہر تھوڑے عرصے بعد آگ لگنے کا مصنوعی ڈرامہ رچا کر مکینوں کو اپنے اپارٹمنٹس سے بھاگ کر کم وقت میں نیچے پہنچنے کی مشق بھی کرائ جاتی ہے۔ ابھی دو ہفتے پہلے میں اسکائپ پہ اپنی ایک کینیڈا میں مقیم دوست سے بات کر رہی تھی تو پھولی ہوئ سانسوں کے درمیان انہوں نے بتایا کہ وہ ابھی آگ لگنے کی مشق سے واپس آرہی ہیں۔ انکا اپارٹمنٹ گیارہویں منزل پہ ہے۔ جہاں سے انہیں سیڑھیوں کے راستے بھاگنا پڑا۔

ایسی بلڈنگز میں یہ الارم فائر بریگیڈ کے محکمے سے جڑے ہوتے ہیں۔ خطرے کی پہلی علامت کے چند منٹوں کے اندر یہ جائے واقعہ پہ موجود ہوتے ہیں۔ میرے ایک عزیز نے اپنے اپارٹمنٹ میں پوری پکانے کا واقعہ بتایا، جس کا دھواں اپارٹمنٹ سے نکل کر کوریڈور میں پھیل گیا تھا۔ گھر میں موجود کسی مہمان نے نادانستگی میں اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول دیا تھا۔  چند منٹ میں فائر بریگیڈ کی دو گاڑیاں اور ایک ایمبولینس موجود تھی جبکہ پوری بلڈنگ کے لوگ باہر نکال دئیے گئے تھے۔

اصل واقعہ پتہ چلنے کے بعد انہیں ان تینوں گاڑیوں کے آنے جانے کا خرچہ دینا پڑا۔

یہ واقعات بتانے کا مقصد صرف یہی ہے کہ یہ کتنی تکلیف دہ بات ہے کہ کراچی میں ایک فیکٹری میں تین سو سے زائد لوگ، فیکٹری میں آگ سے جل کر مر جائیں۔ تین سو انسان جن سے جڑے تین سو خاندان بھی تھے۔ ابھی بھی مرنے والوں کی تعداد اس سے زیادہ ہو سکتی ہے۔ دماغ کو گھما دینے والے اس سانحے کے بعد مجھ جیسے لوگ جو بیرون ملک یہ سب دیکھ کر آتے ہیں انہیں کیا یہ احساس نہیں ہوتا کہ ہم کس معاشرے کا حصہ ہیں جہاں انسان کو انسان نہیں سمجھا جاتا۔

 ذرا چشم تصور سے اس انسان کی بے بسی دیکھئیے جو کہ ایک ایسی کھڑکی کے سامنے تین منزل اوپر سے کود کر جان بچانے کی فکر میں ہو جسکے آگے لوہے کا ایک جنگلہ اسے زندگی سے دور کرنے کے لئے موجود ہو۔ اور دنیا میں کوئ ایسی طاقت، کوئ ایسا نظام موجود نہ ہو جو اسے کھڑکی سے نظر آنے والی،  سامنے موجود کھلی فضا میں لے جا سکے۔

سچ پوچھیں تو مجھ سے اس پہ انا للہ و انا الیہ راجعون بھی نہیں پڑھا جاتا۔ کیا میں خدا کے پاس اس طرح واپس جانا چاہتی ہوں، ایسی بے کسی ، بے بسی اور تکلیف کی موت۔

ہم اس شہر کے مکین، ایک ہی محلے سے سترہ جنازے اٹھنے کے بعد، اپنی ہر قسم کی مصروفیت میں بھی مسلسل  یہ سوچ رہے ہیں کہ کیا ہم کسی ایسے واقعے کے دوبارہ پیش آنے سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ محفوظ رہ سکتے ہیں اگر ہم یہ جان لیں کہ یہ واقعہ کیوں پیش آیا اور ان وجوہات کے تدارک کے لئے کام کریں۔

یہ واقعہ کیوں پیش آیا؟

اسکی مختلف ممکنہ وجوہات بتائ جارہی ہیں۔

نمبر ایک، بجلی فراہم کرنے والے جنریٹر میں خرابی کی وجہ سے آگ لگی۔  بجلی کی شدید کمی اب ہمارے لئے کوئ راز کی بات نہیں۔  عوام نے اس کا حل جنریٹرز میں ڈھونڈھا ہے۔ اس سے جہاں ایک طرف جنریٹرز در آمد کرنے کے ایک نئے کاروبار کو وسعت ملی اور اس سلسلے میں ایک نئ مارکیٹ وجود میں آئ وہاں حکومت بھی کسی دباءو سے آزاد ہو گئ۔ جب لوگوں نے اپنی پریشانیوں کے حل نکال ہی لئے ہیں تو حکومت کو کیا ضرورت کے وہ بجلی پیدا کرنے کے نئے منصوبے بنا کر بجلی پیدا کرنے والے ان جنریٹرز کی در آمد کرنے والے لوگوں کے پیٹ پہ لات مارے۔ انکے روزگار کو بند کرنے کے امکان پیدا کرے۔ حکومت اس سلسلے میں خاصی عوام دوست واقع ہوئ ہے۔

کراچی میں ایسی درجنوں مارکیٹس ہیں جہاں بجلی کی عدم موجودگی میں دوکانوں میں موجود جنریٹرز کام کرتے ہیں ، یہ عمارتیں ایک دم بند ہیں اور کسی بھی حادثے کی صورت میں یہاں حد سے زیادہ جانی و مالی نقصان ہو سکتا ہے۔ مثلاً گل پلازہ، صدر یا رابی سینٹر، طارق روڈ۔ ایک عام دن میں، بجلی کی لوڈ شیڈنگ کے وقت جب یہ جنریٹرز چلنا شروع ہوتے ہیں تو ان مارکیٹس کے اندر سانس لینا مشکل ہوجاتا ہے۔

دوسری اہم وجہ یہ بتائ جاتی ہے کہ تنخواہ بانٹنے کا دن تھا اور سیکوریٹی کی وجہ سے تمام داخلی دروازے بند کر دئے گئے تھے اسکے علاوہ، سیکیوریٹی کی ہی وجہ سے کھڑکیوں پہ لوہے کے جنگلے موجود تھے۔

جانی و مالی سیکیوریٹی اس وقت ہمارے ملک کے سر فہرست مسائل میں سے ایک ہے۔ اسکی وجہ سے غیر ملکی تو دور ملکی سرمایہ کار کاروبار کرتے ہوئے ڈرتا ہے۔ اور اسکی وجہ سیاسی اور معاشی دونوں ہیں۔ سیاسی سطح پہ لوٹ مار کرنے والے مجرمان کو نہ پکڑا جاتا ہے اور نہ انہیں سزا ہوتی ہے۔ یہ مجرمان جو ہر سیاسی پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ معاشی سطح پہ ایسے ذرائع موجود نہیں جو لوگوں کو روزگار دیں نتیجتاً وہ لوٹ مار کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اسکی وجہ معاشرتی بھی ہے۔ ایک ایسے نظام میں جہاں لوٹ مار ہر سطح پہ موجود ہو اور لوگ اخلاقی اصولوں کی پامالی کرے ذرا نہ گھبراتے ہوں۔ وہاں اندھیر نگری ہی جنم میں آتی ہے۔ یہ سب عوامل لوگوں میں انکے سرمائے کے لئے عدم تحفظ پیدا کرتے ہیں۔ چونکہ نظام انہیں تحفظ دینے میں ناکام رہا ہے اس لئے وہ اپنے تئیں اسی طرح کے حل نکالتے ہیں۔ یہ فیکٹری ہی کیا خود میرے گھر کی ہر کھڑکی پہ لوہے کا جنگلہ موجود ہے۔

یہاں مجھے ایک دفعہ پھر کینیڈا یاد آتا ہے جہاں گھروں کی کھڑکیوں پہ کسی بھی قسم کے جنگلے کا تصور نہیں۔ یہی نہیں بلکہ گھر کے باہر چہار دیواری کا تصور کوئ خاص نہیں۔ انہیں فکر نہیں کہ لوگ باہر سے انکا گھر اور گھر والی دیکھ لیں گے۔ اگر کوئ سڑک  دیکھے تو اندازہ تک نہ ہو کہ کون سا گھر کہاں ختم ہو رہا ہے۔ گھر کے اطراف میں جو کھلے صحن ، گیراج یا ڈرائیو وے موجود ہیں اس میں بچوں کے کھلونوں سے لے کر گاڑیاں تک سبھی چیزیں پھیلی رہتی ہیں لیکن کوئ چیزوں کو ہاتھ تک نہیں لگاتا۔ لوگ  صرف وہی چیزیں اٹھا سکتے ہیں جو گھر کے باہر فٹ پاتھ پہ موجود ہوں۔

تیسری اہم وجہ اس قسم کی فیکٹریز کا فائر بریگیڈ سے کوئ ڈائریکٹ تعلق نہ ہونا ہے۔

چوتھی اہم وجہ فیکٹریز میں آگ بجھانے کے آلات کا نہ ہونا اور مزدروں کو اس بات کی تربیت نہ ہونا ہے کہ ان آلات کو بوقت ضرورت کیسے استعمال کیا جائے۔ اور نہ ہی انکی اس بات کی تربیت ہونا کہ ایمرجینسی کی صورت میں وہ کس طرح کم سے کم وقت میں فیکٹری کو خالی کر سکتے ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ فیکٹری مالکان مزدوروں کے تحفظ کی فکر نہیں کرتے اور اس پہ اپنا سرمایہ خرچ نہیں کرنا چاہتے۔ اخباری اطلاع یہ بھی ہے کہ مشرف دور کے بعد سے سندھ میں ملز کی اس طرح کی انسپکشن نہیں ہوئیں جن میں مل کے مزدوروں کو دئے گئے ماحول پہ رپورٹ بنتی اور اسکے لئے وزیر اعلی قائم علی شاہ نے انکار کر دیا تھا۔

 اس نکتے سے اس واقعے کو دیکھئیے۔ اس فیکٹری سے زیادہ تر مصنوعات باہر کے ممالک جاتی تھیں۔ یہ خاصی بڑی فیکٹری تھی۔ آتشزدگی کے نتیجے میں یہ فیکٹری مکمل طور پہ تباہ ہو چکی ہے۔ اس میں موجود تمام مال ختم ہو چکا ہے۔ خود مل مالکان پہ چونکہ لاپرواہی کا مقدمہ دائر ہے اس لئے وہ اپنی جان بچانے کو فرار ہیں۔  اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر محنت کش کو یا مزدور کو تحفظ نہیں دیں گے تو سرمایہ اور سرمایہ کار دونوں ہی داءو پہ لگے رہیں گے۔ پھر مل مالکان، وقتی فائدے کے لئے دور کی کیوں نہیں سوچتے؟ اگر وہ یہ سوچتے کہ وزیر اعلی جائے بھاڑ میں ہم اپنی فیکٹری میں یہ انتظام رکھیں گے کہ مزدوروں کو پتہ ہو کہ آگ لگنے کی صورت میں انہیں آگ کیسے بجھانا ہے۔ ایمرجینسی میں نکلنے کے راستے کون سے ہونے چاہئیں۔ فیکٹری میں مختلف سامان کی اسٹوریج کیسی ہونی چاہئیے کہ کسی حادثے کے پیش آنے کی صورت میں کم سے کم نقصان ہو۔ تو یہ فیکٹری آج بھی چل رہی ہوتی۔

کیا اسکی وجہ یہ ہے کہ عام طور پہ لوگ کسی حادثے کے لئے نہ ذہنی طور پہ تیار نہیں ہوتے اور نہ ہی اسکے لئے کوئ متوقع لائحہ ء عمل سوچ کر رکھتے ہیں بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ بس ہر چیز اللہ کے کرم سے درست رہے گی۔ اس حادثے کی ایک اور وجہ کاروباری طرز فکر کی غیر موجودگی بھی نکلتی ہے۔ وہ طرز فکر جو یہ سمجھ دے کہ محض مال اور سیٹھ کا رشتہ ہی اہم نہیں بلکہ اس میں وہ لوگ بھی اہمیت رکھتے ہیں جو مال اور سیٹھ کے درمیان تعلق قائم رکھتے ہیں۔ انہیں تحفظ دئیے بغیر کیسے کوئ اپنی جان اور اپنے مال کا تحفظ کر سکتا ہے۔

اس طرح،  اس واقعے کے پیش آنے کی کوئ ایک وجہ نہیں ہے۔ اس میں پورا نظام شامل ہے کیونکہ پورا نظام منفی طرز فکر پہ چل رہا ہے۔ اس لئے جب کوئ حادثہ ہوتا ہے تو اتنا ہی اندوہناک ہوتا ہے کہ ذہن اسے تسلیم کرنے میں بھی وقت لیتا ہے۔ نہیں معلوم کہ فکر کی اس نہج کو تبدیل ہونے کے لئے کتنی جانوں کی قربانی دینی ہوگی۔ بے شک ہمیں پلٹ کر اللہ ہی کی طرف جانا ہے۔ لیکن قتل کا سامان کرنے والوں کو جہنم رسید کرنے کے بعد یا خود جہنم کا ایندھن بننے کے بعد۔

11:36 PM

آتشزدگی, بجلی, پاکستان, حادث, فیکٹری, کراچی, کینیڈا, لوڈ شیڈنگ, مزدور, معاشرہ, موت

شاعر کا پروگرام

شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی نے ایک نہایت غیر انقلابی حرکت کی یعنی کہ مر گئے۔ یہ جملہ پڑھ کر ایک زیر لب مسکراہٹ ابھری اور نظر آگے بڑھ گئ۔  خواجہ احمد عباس نے یہ تحریر جوش صاحب کے متلعق لکھی اور مزے کی تحریر ہے۔  لکھتے ہیں کہ انکی شاعری  اور انکی ذات میں اتنا جوش، جوانی اور تازگی تھی کہ لگتا تھا کہ وہ اپنا برا چاہنے والوں کو مار کر مریں گے۔

شاید اس لئے کہ جوش صاحب نے ایک دفعہ دعا مانگی کی کہ

معشوق کہے کہ آپ ہمارے ہیں بزرگ

وہ دن ہمیں یارب نہ دکھانا ہر گز

بڑے لوگوں کی باتیں بڑی۔ انکا تذکرہ بھی کریں تو بات میں خود بخود گلاب کھلتے ہیں۔ اپنی شعر گوئ کے بارے میں جوش کا خیال تھا کہ شاعری نے خود میرا پیچھا کیا اور نو برس کی عمر میں پکڑ لیا۔ عاشق تھے لیکن انسان دوست زیادہ تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

کہتا ہے کون پھول سے رغبت نہ چاہئیے

کانٹے سے بھی مگر تجھے نفرت نہ چاہئیے

نثر میں اس خیال کو اس طرح ادا کرتے ہیں کہ ' ایک مدت سے میرے سینے میں انسان کے باپ یعنی حضرت آدم کا دل دھڑک رہا ہے'۔ ویسے سنتے ہیں کہ جناب مولانا مودودی انکے ہم نشیں  رہے ہیں۔

:)

یہ ساری تمہید، جوش صاحب کی ایک نظم پڑھانے کے لئے باندھی۔ میں نے یہ نظم اس وقت پڑھی جب آنرز فرسٹ ایئر کی طالب علم تھی۔ شعبہ ء کیمیاء سے ایک سالانہ رسالہ نکلا جس میں یہ شامل تھی۔ اسکے بعد وہ رسالہ شاید دوبارہ نہیں نکلا۔

نظم کا نام ہے 'پروگرام'۔ آئیے پڑھتے ہیں۔

پروگرام

اے شخص ، اگر جوش کو تو ڈھونڈھنا چاہے

وہ پچھلے پہر حلقہ ء عرفاں میں ملے گا

اور صبح کو وہ ناظر نظارہ قدرت

طرف چمن و صحن بیاباں میں ملے گا

اور دن کو وہ سرگشتہ ء اسرار و معانی

شہرِ ہنر و کوئے ادیباں میں ملے گا

اور شام کو وہ مرد خدا رند خرابات

رحمت کدہ ء بادہ فروشاں میں ملے گا

اور رات کو وہ خلوتی ء کاکل و رخسار

بزم طرب و کوچہ ء خوباں میں ملے گا

اور ہوگا کوئ جبر تووہ بندہ ء مجبور

مردے کی طرح کلبہ ء احزاں میں ملے گا

واہ واہ، بہت خوب۔

5:15 PM

ادب, اردو، شاعری, انقلاب, جوش ملیح آبادی, معاشرہ, مودودی

چار ستمبر، یوم حجاب

ایک ساٹھ سالہ خاتون انتہائ غصے میں بتا رہی تھیں کہ وہ کسی مجبوری کی بناء پہ بس سے سفر کر رہی تھیں۔ بس والا اتنی تیز بس چلا رہا تھا اور مسافروں کو اتارنے کے لئے بھی بس آہستہ کرتا لیکن روک نہیں رہا تھا۔ یہ دیکھ کر انہوں نے اس سے کہا دیکھ بھال کر چلاءو۔ کیونکہ کچھ سال پہلے وہ چلتی بس سے گر کر اپنا ہاتھ تڑوا بیٹھی تھیں۔  اس پٹھان ڈرائیور نے انکی نصیحت پہ عمل کرنے کے بجائے ان سے کہا دوپٹہ سر سے اوڑھ کر بیٹھو۔ طیش میں انہوں نے بس ڈرائیور کو کہا  کہ تو کیا میرا باپ لگتا ہے۔ تیرا قصور نہیں، تیری ماں کا قصور ہے نہ اس نے اپنی عزت کرائ ہو گی نہ تجھے اسکی تربیت دی کہ تو کسی اور عورت کی عزت کرے۔ شاید اور کچھ بھی کہا ہوگا۔ خیر اسی وقت اس سے بس رکوائ اور اتر گئیں۔

یہاں ڈرائیور کی لسانی شناخت بتانی ضروری ہو گئ کہ اگر اردو اسپیکنگ ہوتا تو غصے میں کہتا' جاءو جاءو، ایسی نوابی ہے تو بس کے بجائے ٹیکسی سے سفر کیا کرو'۔ یہ ابھی ایک ہفتے پہلے کراچی میں پیش آنے والا واقعہ ہے۔

مجھے اس وقت کیوں یاد آیا؟

ابھی تفصیل سے بتاتی ہوں۔  چند دن پہلے میں ایک دفعہ پھر گوادر گئ تقریباً دس مہینے بعد۔ اس دفعہ مجھے ماحول میں ایک واضح تبدیلی محسوس ہوئ۔ اول تو ہری پگڑی والے لوگ دیکھے جو کہ موٹر سائکلوں پہ پھر رہے تھے۔ یہ تو میں پچھلی ایک پوسٹ میں بتا چکی ہوں کہ یہ جو گوادر کی دیواروں پہ مذہبی اجتماعات کی دعوتیں لکھی نظر آرہی ہیں۔ یہ کسی نئ سمت کا اشارہ کر رہی ہیں جو یقیناً مکران کے ماحول کو تبدیل کرے گا۔ اور اس دفعہ یہ تبدیلی واضح نظر آرہی تھی۔

کیونکہ پھر میرے ساتھ دو واقعات ہوئے۔

پہلا واقعہ دلچسپ ہے۔ ہوا کچھ یوں  کہ جس جگہ ہم رہائش پذیر تھے وہ جگہ سمندر سے چند قدم کے فاصلے پہ تھی۔

ساتھ ہی ایک پہاڑ ہے۔ میں جب بھی یہاں جاتی تھی تو اس پہاڑ کے ساتھ سمندر کنارے ضرور تنہا بیٹھتی کہ ایک دم مراقبے کا مزہ آجاتا۔ یوں معلوم ہوتا کہ میں زمین پہ نہیں بلکہ کائینات کے کسی لامتناہی نکتے سے زمین کو دیکھ رہی ہوں۔ پھر یہاں سے پتھرلیے فوسلز جمع کرتی اور گھر واپس آجاتی۔ گوادر میں یہ میری سب سے اہم اور بڑی عیاشی ہوتی۔ اسکے لئے میں ساڑھے سات سو کلومیٹر کا پر مشقت سفر کر کے یہاں آتی ہوں۔ اب یہ مشغلہ میری بیٹی کو بھی پسند آتا ہے۔

اس دن میرے ساتھ میری بچی، پالتو کتا اور مقامی بچے درجن بھر موجود تھے۔ ہم جلوس کی شکل میں پہاڑ کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اگرچہ میری خواہش تو یہ تھی کہ یہ بچے ساتھ میں نہ ہوتے تاکہ تھوڑی دیر اپنے مراقبے کا مزہ لیتی۔  لیکن بہر حال بچے بہت زیادہ مشتاق تھے ساتھ چلنے کے۔ شاید اسکی ایک وجہ کتے کا ہمارے ساتھ ہونا بھی تھا۔ کتا بھی خوش تھا۔ بار بار تھوڑی دور تک دوڑ کر جاتا۔ اپنے پیشاب کی بو چھوڑتا اور پھر خوشی سے اچھلتا کودتا واپس آتا۔ پیشاب کی بو سے اسکے حصے کی زمین میں اضافہ جو ہو رہا تھا۔

راستے میں ایک صاحب نے قریب سے گذرتے ہوئے موٹر سائیکل روکی اور کہنے لگے۔ آپ اس طرح اکیلے نہ پھریں آجکل سیکیوریٹی کا مسئلہ ہے۔ میں نے اسکا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا میں صرف پہاڑ کے ساتھ جا کر سامنے والی جگہ پر جا کر واپس آجاءونگی۔ نہ بستی کی طرف جاءونگی اور نہ یہاں سے زیادہ دور۔ مجھے بھی اس بات کا احساس ہے۔  وہ خاموش ہو کر واپس پلٹ  گیا۔

ابھی چند ہی گز طے کئے ہونگے کہ ایک صاحب موٹر سائیکل پہ آئے انکے پیچھے ایک گن بردار شخص بیٹھا ہوا تھا۔ میں ٹھٹھک کر رک گئ۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کہاں جا رہی ہیں۔ میں نے انگلی کے اشارے سے بتایا کہ بس وہاں تک جا رہی ہوں۔ پھرمزید سوالات کے جواب دینے سے پہلے میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔  پتہ چلا کہ وہ پولیس سے تعلق رکھتا ہے۔ کس کے ساتھ آئ ہیں، کس جگہ رہ  رہی ہیں قسم کے سوالات کے بعد اس نے کہا کہ ہمیں اطلاع ملی کہ ایک انگریز عورت ادھر اکیلے پھر رہی ہے۔ مجھے ہلکی سی ہنسی آئ۔ آپ نے دیکھ لیا میں انگریز نہیں ہوں۔ ہاں وہ اس نے آپکے حلئے کو دیکھ کر کہا ہوگا۔ حلئے سے شاید اس کی مراد پیروں کے جاگرز اور سر کی ٹوپی ہوگی۔ دراصل یہ پسماندہ علاقہ ہے یہاں اس حلئے کو ہی انگریز سمجھ لیتے ہیں۔  بات یہ ہے کہ سیکوریٹی کا مسئلہ ہے آپ زیادہ دور تک نہ جائیں۔ میں نے اسے تسلی دی۔ میں بس سامنے ہی سے پتھرلے کر واپس آجاءونگی۔ یہاں کراچی میں پڑھنے لکھنے والے بچوں کو تحفے میں مجھے یہ پتھر دینا پسند ہیں۔

پھراس جگہ پہنچ کر ان بچوں کے ساتھ چند منٹ رک کر پتھر ڈھونڈھے اور جلدی ہی واپسی کا راستہ لیا کیونکہ میں نے دیکھا کہ وہ دونوں ایک چٹان پہ بیٹھے ہم لوگوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ ایسے میں میرے دل دھڑکا بھی کم ہوگا اور انکی ڈیوٹی بھی ختم ہوگی۔

اگلے دن گھر کے سامنے ساحل پہ بچی کے ساتھ چلی گئ۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں ماضی میں یعنی تین چار سال پہلے میں ایک ڈیڑھ میل تک تنہا چہل قدمی کر چکی ہوں۔ مقامی لوگوں سے گپ شپ کی اور کبھی کوئ مسئلہ نہیں ہوا۔ اس دن جب میں اپنی بچی اور محلے کے دیگر بلوچی بچوں کے ساتھ اپنے گھر واپس آنے لگی تو ایک موٹر سائیکل قریب سے گذری جس پہ دو افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے موٹر سائیکل کو آہستہ کیا۔ میں کچھ ہوشیار ہوئ۔ پھر ان میں سے ایک نے نفرت بھری نظر مجھ پہ ڈال کر کہا جاءو جا کر کچھ پہنو۔

قارئین کی تسلی کے لئے میں اس وقت تیراکی کے مغربی لباس میں نہیں تھی۔ بلکہ پاکستانی سوتی شلوار قمیض پوری آستین کا پہنے ہوئے تھی اور دھوپ سے بچنے کے لئے ڈھائ گز کے سوتی دوپٹے کو سر سے لپیٹ کر منہ بھی اطراف سے ڈھکا ہوا تھا۔ سو میں نے حیرانی سے انکی طرف دیکھا اور پھر غور کیا کہ وہ کچھ کیا ہو سکتا ہے جو میں پہنوں۔ سمجھ آیا کہ برقعہ قسم کی چیز ہی اب اس کے بعد بچ جاتی ہے۔

  دس سال سے یہاں آرہی ہوں اور اتنے لمبے عرصے کے تجربے کے بعد میں اس علاقے کو کافی بہتر سمجھتی تھی۔ مقامی لوگ مچھیرے ہیں جو اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ وہ خود کیسے بھی رہیں دوسروں کے کام میں مداخلت نہیں کرتے۔ حتی کہ عین اس وقت جب کراچی میں کسی ہوٹل میں بیٹھ کر سر عام شراب نہیں پی جا سکتی تھی یہاں ایسی کوئ منادی نہ تھی۔  اس وقت میں ساحل پہ تنہا بیٹھ کر گھنٹوں سمندر کی آتی جاتی لہریں دیکھا کرتی تھی۔ کراچی  کی مٹی سے جنم لینے کے باعث سمندر کی محبت میرے اندر ہمیشہ مءوجزن رہی ہے۔

 یہ وہ وقت تھا جب  یہاں کوئ مدرسہ  نہ تھا۔ پھر کوسٹل ہائ وے کی تعمیر کے ساتھ ہی زمین کے ایک بڑے رقبے پہ ایک بڑا مدرسہ وجود میں آگیا۔ اور اب جیسے جیسے یہاں مذہبی ماحول کو شہہ مل رہی ہے ویسے ویسے یہ شدت پسندی ماحول کا حصہ بن رہی ہے۔ معاشرے کے کمزور طبقات ہمیشہ شدت پسندی کا پہلا نشانہ ہوتے ہیں۔ تاکہ دوسرے لوگ ان سے سبق سیکھیں۔ خواتین اس لئے سب سے پہلا نشانہ بنتی ہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گوادر میں یہ مذہبی شدت پسندی کون متعارف کرا رہا ہے؟ کیا بلوچستان کے مسائل کا حل مذہبی شدت پسندی کو ہوا دینے میں ڈھونڈھاجا رہا ہے؟

حیرت ہوتی ہے کہ گوادر میں ایک اچھا ہسپتال موجود نہیں ہے۔ اسکی وجہ سے عورتوں کو کس قدر مصائب کا سامنا ہے اسکا اندازہ اس عورت سے لگائیں جس نے بتایا کہ ابھی چند مہینے پہلے اسکی بچی پیدائیش کے دوران مر گئ۔ کوئ ماہر ڈاکٹر نہ تھا کہ وہ زندہ پیدا ہو پاتی۔ کسی ماہر ڈاکٹر کے موجود نہ ہونے سے وہ لیبر میں اتنا زیادہ عرصہ رہی کہ  اسے فسچولا ہو گیا۔ شوہر بھائ کے پاس چھوڑ گیا وہاں سے وہ کراچی کے جناح ہسپتال پہنچی جہاں ایک مہینہ علاج میں ناکامی کے بعد اسے کراچی کے مضافات میں واقع، کوہی گوٹھ کے فسچولا  ہسپتال بھیجا گیا وہاں وہ تین مہینے رہی اسکے تین آپریشن ہوئے  اور ابھی بھی بالکل تندرست نہیں ڈاکٹر نے اسے تین مہینے بعد پھر بلایا ہے۔

حیرانی ہوتی ہے ناں کے جس شہر میں عورتیں محفوظ طریقے سے بچہ نہ پیدا کر سکیں وہاں عورتوں کو پردے کی تبلیغ کرنے والے پیدا کئے جائیں۔ ایک بڑا مدرسہ بنانے والے تو موجود ہوں لیکن ہسپتال کا کوئ انتظام نہ ہو۔ یہی نہیں یہاں کوئ ڈھنگ کا اسکول موجود نہیں ہے۔ لیکن کوسٹل ہائ وے پہ جاتے ہوئے سنسان پہاڑوں پر خوبصورت ٹائلز کی بنی ہوئ بڑی مساجد نظر آئیں گی جو کہ پچھلے دو سالوں میں عرب بھائیوں کی فیاضی سے تعمیر ہوئ ہیں۔ اتنے سنسان علاقوں میں ان مساجد کا کیا کام؟

 ایک صاحب کا کہنا ہے کہ عرب اسکول کی تعمیر کے لئے پیسے خرچ نہیں کرتے وہ مسجدیں اور مدرسے بناتے ہیں بہت زیادہ فیاضی اگر کبھی دکھائ تو شاید ہسپتال بنا دیں لیکن اسکول، نو وے۔

عرب ہمارے ملک میں اسکے علاوہ کس چیز پہ پیسہ خرچ کرتے ہیں؟

اس کا اندازہ اس خبر سے ہوگا کہ ایک عرب شیخ ایک بلوچ کو پیسے دے رہے ہیں کہ وہ سو بچوں کو پیدا کرنے کا ریکارڈ قائم کر کے گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں اپنا نام ڈال لے۔ اس سلسلے میں وہ بلوچ تیئیس شادیاں کر چکا ہے اسکے ترانوے بچے پیدا ہو چکے ہیں۔ ہر تھوڑے دنوں بعد ایک بیوی کو طلاق دے کر ایک اور شادی کر لیتا ہے۔ طلاق یافتہ بیوی کو وہ عرب پیسہ دیتا ہے کہ وہ اپنی باقی زندگی عسرت میں نہ گذارے۔

  اس بلوچ کو یہ یاد نہیں کہ اسکا کون سا بچہ کس بیوی سے ہے اسکے لئے اسے اپنی ڈائری دیکھنی پڑتی ہے۔ اور نہ اسے یہ معلوم ہوگا کہ اسکا کوئ بچہ پڑھتا لکھتا بھی ہے یا نہیں۔ یہ شخص پہلے فوج میں رہ چکا ہے اور ٹانگ سے معذور ہونے کے بعد وہاں سے نکل آیا۔ ہو سکتا ہے آپ میں سے کچھ کو اس سے کراہیئت آئے اور کچھ ہنس دیں ۔ لیکن ایک دفعہ پھر یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ مسلمان مرد ، اپنی عورتوں کو کیا سمجھتے ہیں؟

خیر ہم موضوع کی طرف واپس پلٹتے ہیں۔ کراچی میں آجکل جماعت اسلامی کے زیر اہتمام چار ستمبر کو یوم حجاب منانے کی تیاریاں زور شور سے جاری ہیں۔ شہر میں ہر جگہ خواتین کو حجاب کی تلقین کے بینرز ملیں گے۔ یہی نہیں روزنامہ جنگ کے اس  دفعہ کے اتوار میگزین میں بھی، میں نے دیکھا کہ یوم حجاب کے حوالے سے چار مضامین موجود ہیں۔ گوادر میں میرے ساتھ پیش آنے والا واقعہ آپ پڑھ چکے۔ ملک ہی نہیں باقی دنیا میں بھی مسلمان مردوں کی شدت پسندی کو ہوا دینے والی یہ مذہبی جماعتیں ہیں اور کوئ نہیں۔ شاید اسی لئے بنگلہ دیش میں سیاسی جماعتوں پہ پابندی لگا دی گئ ہے کہ وہ اپنے نام کے ساتھ کوئ مذہبی نام استعمال نہیں کریں گی۔

اس بات کو خآطر میں لائے بغیر کہ ہمارے ملک میں عورتوں کی حالت کتنی دگرگوں ہیں۔ جماعت اسلامی کے زیر اہتمام منائے جانے والے اس طرح کے یوم مجھے تو مردوں کو مزید شدت پسندی کی ترغیب دیتے ہوئے ہی لگتے ہیں۔ جس وقت وہ یہ پیغام دیتے ہیں کہ حجاب عورت کی عزت کا ضامن ہے اس وت وہ مردوں کو بین السطور یہ پیغام دے رہے ہوتے ہیں کہ اگر کوئ عورت بے حجاب ہے تو اسکی عزت پہ حملہ کوئ بری بات نہیں۔ اسکے ساتھ یہی ہوگا، کیونکہ مذہب اسکے بارے میں یہ پیشن گوئ کر چکا ہو۔ چاہے مذہب نے اس بات کو نکتہ بھی نہ بنایا ہو۔

بالکل ایسے ہی وہ انفوگرافکس جس میں مردوں سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو کس لباس میں دیکھنا پسند کریں گے۔ اور انتخاب میں شدید برقعے سے لیکر جینز ٹی شرٹ میں ملبوس خواتین دکھا دی جاتی ہیں۔ ایسے جیسے بازار میں آپ مختلف برانڈز کے کیچپ دیکھ رہے ہوں۔ پھر انہیں غیرت کے طعنے دے کر کہا جاتا ہے کہ دراصل تمہاری بیوی کو کس قدر حجاب میں ہونا چاہئیے۔ چاہے وہ اسکی اہلیت نہ رکھتے ہوں کہ اپنے خاندان کے معاشی مسائل حل کر سکیں لیکن ان میں یہ اہلیت ضرور پیدا کی جاتی ہے کہ وہ اپنی بیوی کے لباس پہ غضب کی نظر رکھیں۔

جماعت اسلامی سمیت، ہر مذہب کا ڈھنڈورہ پیٹنے والی جماعت سے ایک ہی سوال ہے کہ وہ کبھی خواتین کے حالات میں بہتری کے لئے بھی کچھ کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں یا مردوں کو خواتین کے نام پہ ہی غیرت دلاتے رہیں گے۔  معاشرے کو خواتین کے لئے مزید غیر محفوظ بنانے کے فول پروف انتظامات کرتے رہیں گے۔ یہ ملک جو پہلے ہی مسائلستان بنا ہوا ہے کیا اسکے مسائل میں وہ مثبت طریقے سے کوئ کمی لا سکتے ہیں۔ کیونکہ فلسفہ ء جہاد سے لے کر مرد و خواتین کی جہالت تک ہر ایک میں  وہ برابر کے حصے دار ہیں۔

آخری اہم سوال لوگوں کو خدا کے قہر اور عذاب سے ڈرانے والے کیا خود خدا کے عذاب اور قہر سے ڈرتے ہیں؟

 کیونکہ انکی پھیلائ ہوئ شدت پسندی کی وجہ سے جتنی انسانی جانیں جاتی ہیں اسکے ذمہ دار وہ ہوتے ہیں۔ جب کسی عورت پہ تیزاب پھینکا جاتا ہے، جب کوئ عورت کاروکاری کا شکار ہوتی ہے، جب کسی عورت کو اس لئے نشانہ بنایا جاتا ہے کہ وہ انکے متعارف کرائے گئے فلسفہ ء حجاب پہ یقین نہیں رکھتی۔ ہر  ہر صورت میں وہ عذاب کے مستحق ہوتے ہیں اور ہونگے۔  خدا کے عذاب سے بچنے کے لئے وہ خود کیا کریں گے؟ کیونکہ جو تم کروگے وہ ہم کریں گے۔

10:23 AM

بلوچستان, پاکستان, خواتین, شدت پسندی, گوادر, معاشرہ, یوم حجاب

جیت کس کی ہوگی؟

یہ میرا آنرز کا پہلا سال تھا۔ عمر یہی کوئ سترہ سال۔ میں نے اپنا پریکٹیکل ختم کیا اور سامان دھو کر رکھنے لگی۔ اس دن ہم نے

رنگ بنانے کا بنیادی طریقہ

سیکھا تھا۔ اسکی دلچسپ بات یہ تھی کہ تیزابی پانی میں یہ گلابی رنگ دیتا تو اساسی پانی میں یہ اورنج رنگ کے ساتھ سبز چمک دیتا۔ جو بڑی خوبصورت معلوم ہوتی۔ اسکی ٹیسٹ ٹیوب کو میں نے خوب رگڑا۔ لیکن اس مرکب کا ایک چھوٹا سا غیر محسوس ٹکڑا تہہ میں ایسا چپک گیا تھا کہ نکلنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔  اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے اس ٹیسٹ ٹیوب کو سکھا کر اوپر سے کاغذ کے ایک گولے سے بند کر کے اپنے بیگ میں رکھ لیا۔

گھر پہنچتے ہی چھوٹی بہن نے خوشی کا نعرہ مارا۔ اسکی عمر یہی کوئ چار پانچ تھی۔ اور وہ ہر روز اپنی سائینس کی ٹیچر کے فرمودات سنایا کرتی تھیں اورروز کے حساب سے حاصل ہونے والی اپنی  معلومات کو فوری طور پہ شیئر کرنا فرض عین سمجھتی تھیں کہ اس سے ہم سب کے منہ کھلے رہ جاتے۔ ہماری اس بے مثل ایکٹنگ سے وہ اپنے آپکو ایک علامہ سے کم نہیں سمجھتی تھیں۔ لیکن آجکا دن ان کی علمیت ہی کیا انکے مشاہدات  پہ بھاری تھا۔ کیونکہ اس سازش میں قدرت ہی نہیں انکی ہر دلعزیز ہمشیرہ بھی شامل تھیں۔ ہر دلعزیز اس لئے کہ زیادہ اچھی اداکاری کرتی تھیں۔

میں نے کھانے وغیرہ سے جب فراغت پائ تو انہیں بتایا کہ آج میرے پاس ایک جادو ہے انکے لئے۔  بیگ سے ٹیسٹ ٹیوب نکالی۔ ایک پیالے میں صابن کا پانی یعنی اساسی محلول تیار کیا اور اس بظاہر خالی ٹیسٹ ٹیوب میں ڈال دیا۔ انکے تجسس بھرے چہرے پہ ایک گہری سنجیدگی ابھری اور وہ میرے جادو کے سامنے چت ہو گئیں۔ اس خالی ٹیسٹ ٹیوب میں اب اورنج رنگ کا محلول موجود تھا جس میں سبز دلکش چمک موجود تھی۔

تو جناب، مجھے بچپن سے ولی بننے کا بہت شوق تھا۔ لوگوں کے دلوں کے راز جان لوں، جائے نماز کے نیچے سے پیسے بر آمد کر لوں، جو خواب دیکھوں سچ ثابت ہو، جسے جو دعا دوں وہ پوری ہوجائے۔ کائینات کے ہر علم سے آگاہ ہوجاءوں۔ اس کوشش میں اولیاء اکرام کی سوانح حیات پڑھیں۔ تاکہ انکے تجربات سے مستفید ہوں۔

تھوڑے بڑے ہونے پہ پتہ چلا کہ صرف تقوی وغیرہ سے کام نہیں چلے گا۔ وظیفوں کا گھوٹا بھی لگانا پڑے گا۔ لیجئِے جناب اب ہر روز کئ ہزار دفعہ درود شریف تو خدا جانے کتنی دفعہ اور اسماء کا ورد بھی شامل ہو گیا۔ ادھر چکی کی مشقت بھی جاری تھی۔ یعنی دنیاوی حقیر علوم , سائینس وغیرہ سے بھی نجات ممکن نہ تھی کہ  اس سلسلے میں تعلیمی اداروں کو روانہ ہوتے، فیس بھرتے، امتحان دیتے۔

 یہ وہ زمانہ تھا جب ہماری سائینس کی کتابوں میں پہلا سبق ان مسلمان سائینسدانوں کا شامل ہوا جنہوں نے سائینس کی دنیا پہ وہ عظیم احسانات کئے جس سے اب کئ ہزار سالوں کے لئے ہماری آنے والی نسلوں پہ سے یہ فرض ہٹ گیا۔

ایک طرف اولیاء اکرام کی سحر ناک ہستیاں ، لیکن انکے وظائف کے ساتھ یہ مسئلہ کہ جسے بخشیں بس اسی کو سمجھ میں آوے اور کرے تو ٹھینگا پاوے بلکہ وظائف کا اثر الٹا ہونے کی صورت میں دماغ میں خلل بھی ہو جاوے اور موکل اور جن ایسا قابو پاوے کہ کسی کو کچھ سمجھ میں نہ آوے۔ دل تو اس خبر سے بھی پگھلا جاتا کہ  خدا کے کلام کی برکت پانے کے لئے، ملک کا حکمراں تک ڈنڈا کھانے کو آوے۔

دوسری طرف سائینس کی کرشمہ سازیاں، تھوڑی بہت تربیت پاویں ، کوشش کرتے جاویں اور ایک دن ایسا آوے کہ خود بھی کوئ وظیفہ ، یعنی فارمولا، نظریہ یا ایجاد  بنانے کے قابل ہو جاویں۔ لیکن حکمران ایسا سامان کر جاویں کہ اسے حاصل کرنے میں ہم خون کے آنسو بہاتے جاویں اور ہرگز نہ حاصل کر پاویں۔

اگرچہ لوگوں نے بڑا زور دیا کہ ہمارا مذہبی تصوف بڑے بڑے کمالات دکھا سکتا ہے۔ اسکے بعد دنیا کو کسی علم کو حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر جناب ادھر تو لفظ 'سکنا' کے بجائے 'موجود' تھا۔ ادھر بے یقینی اور ادھر آنکھوں دیکھا یقین۔ ادھر جتنا سر مارو اسرار ہیں کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتے ، ہر چھوٹے سے قدم کے بعد حلق سے نکلنے والے مشکل الفاظ کی بھر مار، ادھر جتنا آگے بڑھو اتنا ہی اسرار کی دنیا کھل کر سامنے چلی آرہی ہے۔ ادھر ہر نعرہ ء تعجب کے بعد سبحان اللہ نکلتا ہے ادھر سبحان اللہ کہنے کے بعد نعرہ ء مستجاب۔

یہی نہیں آنکھوں دیکھی یہ کہ ہمارا تصوف ہی کیا دنیا کے ہر مذہب میں ایسے اسرار موجود۔ دنیا کے ہر مذہب میں خدا سے اپنی مرضِی کے کام کروانے کے وظائف حاضر۔ جیت کس کی ہونی تھی؟ میں بھی اپنی ہمشیرہ کی طرح سائِنس کے سامنے چت ہو گئ۔ فرق یہ تھا کہ وہ لا علمی میں ہوئ اور میں علم کے ساتھ اور علم کے ساتھ ہونا افضل ہے۔

آج بھی اعمال وظائف کی کتاب سرہانے دھری ہے۔ سوچتی ہوں اسکا حشر حضرت سلمان کی لاٹھی والا نہ ہوجائے۔ آخری دفعہ  آزمائیشی طور پہ محبوب کو قابو کرنا چاہا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنا بنا کر چھوڑتا۔ اس سراب سے یوں نکل آئے جیسے بارش کے بعد سورج نکلتا ہے۔ زیادہ واضح ، چمکدار اور گرم۔ ہم قصور انکا سمجھتے تھے  اپنا نکل آیا۔ محبوب اپنے طور پہ سمجھتے ہونگے کہ وہ تاریک راہوں میں مارے گئے لیکن حقیقت میں یہ روشنی کی مار تھی۔

 وظائف کی اس دنیا کے اسیر اتنے ہیں کہ ایک  سے بات شروع کریں دو چار سو اور نکل آئیں گے۔

  مجھے یاد ہے ان دنوں لانڈھی کے علاقے میں خاصے حالات کشیدہ تھے۔ مجھے اپنی ایک عزیزہ کے ساتھ زندگی میں پہلی دفعہ  اس طرف ضروری کام سے جانا پڑا۔ باتوں کا سلسلہ روکنے کے لئے میں نے کہا بس اب چلتے ہیں حالات خراب ہیں، میں اس علاقے سے مناسب طور پہ واقف بھی نہیں اور ہم دو خواتین کو گاڑی خود لے کر جانی ہے۔ اندھیرا ہوجائے گا تو مشکل ہوگی۔ صاحب خانہ کہنے لگے کہ بھئ گھبرانے کی کیا بات ہے آیۃ الکرسی پڑھ کر دم کر لینا۔ میں تو روز صبح آیۃ الکرسی کا دم کر کے نکلتا ہوں آج تک کسی اچکے نے میرے اوپر ہاتھ نہیں ڈالا۔

 معاملات نازک تھے ورنہ کہتی کہ لوگوں کی ایک کثیر تعداد ہوگی جو آیۃ الکرسی پڑھ کر گھر سے نہیں نکلتی اور آج تک کسی نے ان پہ ہاتھ نہیں ڈالا۔ اگر حفاظت محض آیۃ الکرسی کے پڑھنے سے ہوجاتی تو سزا اور قانون وجود نہ رکھتے اور قاضی صاحب کسی کھاتے میں ہوتے ۔ ایسے میں جو لٹتا تو صاف پتہ چل جاتا کہ یہ ہے وہ ناہنجار جو آیۃ الکرسی نہیں پڑھتا۔ اسی کو درے جڑے جاتے۔ یوں ٹارگٹ کلرز اور طالبان کو منہ چڑا کر بھاگ جاتے۔ ادھر فوجیوں کی سخت تربیت کی ضرورت نہ رہتی بلکہ فوج ہی کی ضرورت نہ رہتی۔ سرحد پہ لائین سے لوگ تسبیح لے کر بیٹھ جاتے اور آیۃ الکرسی پڑھا کرتے۔

ابھی دو سال پہلے مولانا صاحبان نے شہر میں ایک پمفلٹ بٹوایا کہ ملک میں بد امنی اور بے سکونی کی بنیادی وجہ آوارہ عورتیں ہیں۔ ایک تو انکا سد باب کیا جائے دوسرا یہ کہ سورہ والشمس اتنی ہزار دفعہ لوگ گروہ بنا کر پڑھیں۔ ان دنوں ہم جہاں جاتے پتہ چلتا کہ والشّمس کا ورد ہو رہا ہے۔ لیکن پھر بھی آوارہ عورتیں جیت گئیں یعنی ملک اسی طرح بد امنی کا شکار رہا۔

چونکہ آجکل وظائف کا فیشن ہے اس لئے ہر مسئلے کا حل ایک وظیفہ ہے جو ہر کسی کو معلوم ہے۔ جس طرح لوگ پہلے بیمار کو طبی مشورے مفت دیتے تھے اب لوگ مفت وظیفہ بتاتے ہیں۔ یہاں اسی سال کا بوڑھا انسان ہسپتال میں ہو یا خاتون بچے کی ڈلیوری کے سلسلے میں ہسپتال میں، گھر میں یا سلام کا ورد شروع ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد بوڑھآ آدمی مر جاتا ہے۔ یہ کہہ کر تسلی دیتے ہیں کہ انکی تو عمر ہی مرنے کی تھی۔   اور خاتون نارمل ڈلیوری کے بعد گھر میں موجود، جس روح کا آنا ہوتا ہے آکر رہتی ہے، ہم کہتے ہیں۔

مر کر بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے کا سوال بعد میں اٹھتا ہے مرنے کے بعد بھی وظائف کی ایک بھرمار رہتی ہے۔ کسی شخص کی موت کا اعلان ہوتے ہیں سات دفعہ سورہ بقرہ لازمی، اکتالیس دفعہ سورہ یسین، پھر خدا جانے کتنی بار سورہ ء ملک، پھر کئ لاکھ بار کلمہء طیب کا ورد، پھر پچیس ہزار بار قل شریف۔ کس واسطے کہ مرنے والے کی مغفرت ہو اور قبر میں آرام سے رہے۔ چاہے مرنے والا خدا پہ مناسب یقین بھی نہ رکھتا ہو۔ لیکن اس سامان کے بغیر اسکی رخصتی ممکن نہیں۔ یوں وہ لوگ جو دیار غیر میں رہتے ہیں اور وہیں دفن ہوتے ہیں یا وہ جن کا خاندان چھوٹا ہے انکے شدید خسارے میں رہنے کے امکان زیادہ ہیں۔

 صفر کا مہینہ آتا ہے تو سورہ مزمل کا وظیفہ، سارے سال کی بیماریوں اور مصائب سے چھٹکارا۔ لیکن پھر بھی احتجاج کے دوائیں مہنگی ہو رہی ہیں، ڈاکٹر لا پرواہ۔ حکومت ناکارہ، مصائب کا کوئ شمار نہیں۔

رجب سے رمضان تک جو وظائف ہیں انکا فوکس گناہوں سے نجات پانا ہے اعمال سے نہیں بلکہ وظائف سے۔ اگرچہ رمضان کے گیارہویں، بارہویں روزے پہ لڑکیوں کے رشتے کرانے کا وظیفہ بھی آتا ہے۔ پھر بھی والدین کو رشتے کرانے والے اداروں کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔ لڑکیوں کو سنگھار کر کے چائے لے کر مہمانوں کے سامنے جانا پڑتا ہے اور میٹرک کس سن میں کیا تھا، بتانا پڑتا ہے۔

 شب براءت میں گناہوں کی بخشش کا وظیفہ، لمبی حیات کا وظیفہ، آفات و بلیات کو دفع کرنے کا وظیفہ، قبر کے عذاب سے نجات کا وظیفہ۔ ان سارے وظائف کی وجہ سے گناہوں کے کرنے کا حوصلہ ہے کہ بڑھا جاتا ہے اور مرنے کا خوف دل سے جاتا رہتا ہے۔

  یہی نہیں یا علیم پڑھیں علم حاصل کریں، کراچی گرامر اسکول، ماما پارسی، آئ بی اے یا فاسٹ پہ لعنت بھیجیں۔

 یا اول پڑھیں اور اولاد نرینہ حاصل کریں، سورہ ء واقعہ پڑھیں رزق حاصل کریں، جنت حاصل کرنے کے وظائف بے شمار، خدا کو راضی کرنے کے بھی اتنے ہی وظائف۔ اس سے بھی دل کی تسلی نہیں ہوتی یا یہ کہ آپکا فطری رجحان ریاضی یا شماریات کی جانب ہے تو وہ وظائف اختیار کریں جن میں ثواب کی گنتی بتائ گئ ہے مثلاً تین دفعہ سورہ ء اخلاص پڑھیں سال بھر کے قرآن کی تلاوت کا ثواب۔ باقی کا قرآن کیوں نازل کیا گیا، یہ معمہ حل طلب۔ فلاں دن کا روزہ رکھ لیں سال بھر کے روزوں کا ثواب۔ فلاں مہینے کا عمرہ کر لیں، حج کا ثواب۔ لیجئِے اس مہینے لوگ جوق درجوق عمرے کے لئے جا رہے ہیں۔ سعودیوں کے مزے، زائد آمدنی عمرے کے بہانے ہو رہی ہے۔

میں تو اللہ پاک بے نیاز کا شکر ادا کرتی ہوں۔ بر وقت ولی بننے کا ارادہ موقوف کر دیا۔ ورنہ وظائف کی سیچوریشن کے اس زمانے میں مقابلہ کرنا بڑا مشکل ہوجاتا۔ ہم تو اسی میں خوش، سنگ مر مر پہ تیزابی پانی ڈالو تو کاربن ڈائ آکسائیڈ گیس پیدا ہوتی ہے۔ بچوں، جار کو الٹا کر کے اسے جمع کرو کیونکہ یہ ہوا سے بھاری ہوتی ہے۔

بچے یہ سیکھنے کے لئے کوچنگ سینٹرز کے باہر ہزاروں روپے دے کر ہزاروں کی تعداد میں کھڑے ہیں جبکہ ماں باپ کسی وظیفے کی تسبیح لئے کھڑے ہیں کہ انکا بچہ اے ون گریڈ میں کامیاب ہو اور میڈیکل یا انجینیئرنگ میں داخلہ ہوجائے۔ قارِئین اکرام، اندازہ کریں جیت کس کی ہوگی؟

۔

12:34 AM

بچے, پاکستان, تصوف, تعلیم, ثواب, خواتین, دعا, رنگ, سنگ مر مر, شادی, علاج, کوچنگ سینٹرز, گناہ, مذہب, وظائف

مسیار نکاح

اپنے پہلے شوہر کے انتقال کے فوراً بعد وہ سعودی عرب میں ایک طویل عرصہ گذار کر پاکستان واپس آگئیں۔ جب گفتگو کے دوران مجھے پتہ چلا کہ انکی دوسری شادی کو بھی پانچ چھ سال کا عرصہ گذر چکا ہے لیکن انکے شوہر انکے ساتھ نہیں رہتے بلکہ اپنی پہلی مرحوم بیوی کے بچوں کے ساتھ اپنے گھر میں رہتے ہیں اور وہ اپنے پہلے شوہر کے بچوں کے ساتھ اپنے گھر میں رہتی ہیں تو مجھے نہایت اچنبھا ہوا۔

 یہ کیسا میاں بیوی کا تعلق ہے؟ میں نے بالکل پاکستانی ذہن سے سوچا۔ ایک تو یہی بات قابل اعتراض ہے کہ پچاس سال سے اوپر کی خاتون دوسری شادی کرے وہ بھی وہ جسکے پانچ بچے ہوں۔ بڑی بیٹی کی شادی ہو چکی ہو۔  اور دونوں ساتھ بھی نہ رہیں۔ کیونکہ اگرہمارے  یہاں کوئ خاتون دوسری شادی کرتی ہے تو بنیادی مقصد تحفظ اور پیسہ ہوتا ہے۔

لیکن گھر واپس آ کر میں نے سوچا، کیا شادی محض معاشرتی تحفظ اور معاشی حالات کو مستحکم رکھنے کے لئے کی جاتی ہے؟

 اسکے چند دنوں بعد ایک محفل میں ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ کسی نے تذکرہ چھیڑ دیا کہ یہ جو سنّی، شیعوں کو

متعہ نکاح

پہ اتنا برا بھلا کہتے ہیں  یہ اپنے سنّی مسیار نکاح کی بابت کیوں نہیں بات کرتے۔ ایک دفعہ پھر میں نے ہونّق ہو کر پوچھا کہ یہ

مسیار نکاح

کیا ہوتا ہے؟

 جواب ملا یہ بھی متعہ سے ملتی جلتی چیز ہوتی ہے آپ جا کر نیٹ پہ دیکھ لیں یا اپنے کسی اسکالر سے پوچھیں۔ تس پہ کسی اور نے بتایا کہ ایک صاحب نے کئ اسلامی مدرسوں کو مسیار نکاح کی بابت لکھا کہ انہیں معلومات بہم پہنچائ جائیں لیکن انہیں کہیں سے جواب نہیں ملا۔ اس لئے وہ نہیں جانتے کہ مسیار نکاح کیا ہوتا ہے البتہ یہ معلوم ہے کہ یہ سنّی نکاح کی ایک قسم ہے جو کچھ شیعہ متعہ نکاح سے مشابہت رکھتی ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ اس سارے کے بعد میں نے رات گھر واپس آکر نیٹ گردی کی۔ جناب، تو یہ

اسلامی نکاح

کی ایک قسم ہے۔

 تمام تر مطالعے کے بعد یہ بات سامنے آئ کہ مسیار نکاح اسلام میں حلال ہے۔ نہ صرف مسلمان آپس میں بلکہ اہل کتاب سے بھی کر سکتے ہیں۔ یہ عام نکاح سے کس طرح مختلف ہوتا ہے؟ یہ متعہ نکاح سے کیسے مختلف ہوتا ہے؟

نکاح مسیار، ایسا اسلامی معاہدہء نکاح ہے جس میں ایک خاتون اپنی مرضی سے اپنے بہت سارے حقوق سے دستبردار ہو جاتی ہے۔ مثلاً شوہر کے ساتھ رہنا، اگر اسکی ایک سے زائد بیویاں ہیں تو اوقات کی برابر تقسیم، نان نفقہ یعنی شوہر اسے گذر بسر کے لئے کوئ خرچہ نہیں دے گا اگرچہ کہ اسے بھی دونوں فریقین کی مرضی سے معاہدے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ ہی وہ رہائش مہیا کرے گا۔

 مہر کی رقم فریقین کی مرضی سے طے کی جاتی ہے۔ مہر اسلامی نکاح میں وہ رقم ہے جو لڑکی کو ادا کی جاتی ہے چاہے نکاح کے وقت یا نکاح کے بعد کسی بھی وقت لڑکی کے طلب کرنے پہ۔

یعنی عورت، اپنے والدین کے گھر یا اپنے ذاتی گھر میں رہتی ہے۔ شوہر اس سے ملنے کے لئے جاتا ہے جیسا وقت دونوں فریقین چاہیں منتخب کریں۔

شادی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے عام طور پہ عورت پالتی ہے۔ مجھے یہ نہیں پتہ چل سکا کہ آیا ان بچوں کا باپ کی وراثت پہ حق ہوتا ہے یا نہیں۔

 نکاح کے بعد بیوی اگر ان سب چیزوں کے لئے دعوی کرے تو اسکا دعوی صحیح ہوگا۔ اب اسکا انحصار شوہر پہ ہے کہ وہ اسے نتیجے میں یہ تمام اشیاء دے یا طلاق دے کر چھٹی پائے۔

اس ضمن میں اسلامی علماء کے درمیان اختلاف ہے کچھ اسے اخلاقی طور پہ اچھا نہیں سمجھتے اگرچہ حلال سمجھتے ہیں۔

الالبانی

کے نزدیک یہ نکاح اسلامی روح سے متصادم ہے اس لئے ناجائز ہے۔ اسلامی شادی کی روح یہ بیان کی جاتی ہے کہ فریقین ایک دوسرے سے محبت کریں اور ایکدوسرے سے روحانی خوشی حاصل کریں۔  اگرچہ عملی سطح پہ ہم دیکھتے ہیں کہ محبت کی شادی ہمارے یہاں ایک لعنت سے کم نہیں اور ہم بنیادی طور پہ یہی سمجھتے ہیں کہ اسلامی شادی کا مقصد ایک مرد کی جنسی ضروریات کا حلال طریقے سے پورا ہونا ہے اور عورت محض جنس کا ایک ذریعہ ہے۔

 الالبانی کے نزدیک اسکے نتیجے میں ایک خاندان تشکیل نہیں پاتا اور نہ ہی عورت کو تحفظ مل پاتا ہے اور نہ ہی بچے ایک مستحکم خاندان سے آگاہ ہو پاتے ہیں۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ یہ شادیاں طلاق پہ ختم ہوتی ہیں کیونکہ مرد عام طور پہ یہ شادی اپنی جنسی ضرورت کے لئے کرتا ہے۔

متعہ اور مسیار نکاح میں صرف ایک فرق نظر آتا ہے اور وہ یہ کہ متعہ ایک مقررہ مدت کے لئے کیا جاتا ہے مدت کے اختتام پہ معاہدے کی تجدید کی جا سکتی ہے۔

 اب فقہے سے ہٹ کر ہم دیکھنا چاہیں گے مسیار نکاح کی ضرورت کیسے وجود میں آئ۔ آج کے زمانے میں یہ عرب ریاستوں بالخصوص سعودی عرب اور مصر میں عام ہے۔ جہاں امیر مرد وقت گذاری کے لئے یہ شادیاں کرتے ہیں۔ اسکی وجہ یہ بتائ جاتی ہے کہ یہاں عام اسلامی نکاح کے لئے مرد پہ بہت زیادہ معاشی دباءو ہوتا ہے۔

وہ عورتیں جنکی  شادی اس وجہ سے نہیں ہو پارہی ہو کہ کوئ مرد انکی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں مثلاً  بوڑھی یا بیوہ عورتیں یا وہ عورتیں جن پہ اپنے والدین یا بہن بھائیوں کی ذمہ داریاں ہیں۔ یہ سب مسیار نکاح سے مستفید ہو سکتی ہیں۔ اگرچہ اس بات کے امکان زیادہ ہیں کہ یہ مردوں کی زیادہ جنسی آزادی کا باعث بنیں گی اور معاشرے میں خآندانی استحکام کو نقصان پہنچائیں گی۔

یہ عین ممکن ہے کہ یہ نکاح اسلام سے پہلے بھی رائج ہو۔ اسلامی قوانین کی اکثریت عرب کے قبائلی معاشرے سے تعلق رکھتی ہے۔ ان میں سے بیشتر کو اصطلاحی طور پہ تبدیل کیا گیا ہے۔

 پاکستان، ہندوستان کے بر عکس عرب میں شادی کے بعد بیوی کو الگ گھر میں رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں مشترکہ خاندانی نظام ہندءووں کے زرعی معاشرے کی وجہ سے آیا جسکا عرب میں کوئ خاص تصور نہیں۔ اگر کوئ پاکستانی، مشترکہ خاندانی نظام کو بہتر سمجھتا ہے تو اسے جان لینا چاہئیے کہ یہ عرب میں نہیں ہوتا۔ اس لئے اسلامی ثقافت کا حصہ نہیں ہے۔

چونکہ اس نکاح کا بنیادی مقصد صرف جنسی ضرورت کو پورا کرنا ہی نظر آتا ہے اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں جنس کی بڑی اہمیت ہے اور اسے بنیادی انسانی ضرورت سمجھا جاتا ہے۔ یوں عام اسلامی نکاح کے ساتھ اس قسم کے نکاح کی بھی گنجائش رکھی گئ ہے۔   یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ عرب معاشرہ جنس کے معاملے میں اتنا ہی کھلا ہے جتنا کہ مغربی معاشرہ جس کی بے حیائ پہ ہم ہر وقت لعن طعن کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ عرب میں یہ باہر گلیوں میں نظر نہِں آتا۔ لیکن گھروں میں یہ اس سے کہیں زیادہ شدید حالت میں موجود ہے۔

قرآن پڑھتے ہوئے بھی میں اکثر سوچتی ہوں کہ جب ایک چھ سال کا عرب بچہ اسے پڑھتا ہوگا تو کیا وہ اسکے معنی نہیں سمجھتا ہوگا قرآن ایک ایسی کتاب جس میں جنس اور شادی کے معاملات کو کافی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

اسکے ساتھ ہی یہ خیال بھی آتا ہے کہ جب بھی ہمارے یہاں یہ مسئلہ سر اٹھاتا ہے کہ ہائ اسکول یا کالج کی سطح پہ بچوں کو جنس سے آگہی دینا ضروری ہے تو سب سے زیادہ مذہبی حلقے اسکے خلاف شور مچاتے ہیں۔ آخر یہ تضاد کیوں؟

آخر ایسا کیوں ہے کہ ویسے تو ہمارے یہاں عرب معاشرتی اقدار کو اسلامی معاشرتی اقدار کہہ کر پیش کیا جاتا ہے۔ عرب ثقافت کو اسلامی ثقافت کا متبادل سمجھا جاتا ہے۔  لیکن جب ان اقدار کی باری آتی ہے جو عرب کے ایک کھلے معاشرے کو پیش کرتے ہیں تو ہم صم بکم ہوجاتے ہیں ۔ اس وقت ہم عرب معاشرے کو پاکستانی معاشرے سے الگ کیوں سمجھتے ہیں؟

11:24 AM

اسلام, بچے, پاکستان, جنس, حقوق, خواتین, سنی, شادی, شیعہ, عرب, متعہ, مذہب, مسیار نکاح, معاشرہ

دلیل کے دشمن

انہیں اور ہیں کون  بہکانے والے

یہی آنے والے، یہی جانے والے

 لیکن بات جب اندیشے کی حد سے نکلتی ہے تو جادو کی حدوں میں داخل ہوجاتی ہے شاید اسی لئے کہتے ہیں جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے۔ یعنی جادو جب بولتا ہے تو دنیا میں کچھ بھی باقی رہے اگلے کا سر باقی نہیں رہتا۔ جی ، میرا شارہ عقل ہی کی طرف ہے۔ ایک شخص جسے گمان ہو گیا ہو کہ اس پہ جادو کیا گیا ہے۔ اس کو کوئ بھی عقل کی بات سمجھاوی جاوے ہرگز اسکی عقل میں سما نہ پاوے۔

لوگ کہتے ہیں جادو برحق ہے اسکا نہ ماننے والا کافر ہے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ اس قول کی ترویج کرنے والا یقیناً جادو کا توڑ جانتا ہے جبھی اپنے قول میں اتنا اٹل ہے۔

علم کی کمی سے اس کا تعلق نہیں۔  اچھے اچھے با شعور لوگ اس مرض میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ اس لئے نہ صرف یہ کہ جادو کا توڑ کرنے والوں کا کاروبار خوب پھل پھول رہا ہے بلکہ اب تو مختلف چینلز پہ بھی اسکے اثرات دور کرنے کے طریقے بتاءے جاتے ہیں۔

لیکن جب اخبار کے ایڈِٹوریل صفحے پہ ایسے مضامین ملیں جیسا کہ ابھی دو ہفتے پہلے کے ایکسپریس اخبار میں ایک ایڈوکیٹ اعوان صاحب کا مضمون تھا تو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔  شاید وہ عاملوں وغیرہ کی برائ میں لکھنا چاہ رہے تھے لیکن اس سے پہلے انہوں نے، انہی پرانے فرسودہ خیالات کی تصدیق میں لکھا جو کہ جنات کے لئے رائج ہیں۔ یعنی جنات ہوتے ہیں وہ گھوڑے کی لید، گوبر یا ہڈی وغیرہ کھاتے ہیں۔ وہ مسلمان بھی ہوتے ہیں تو ہندو بھی۔ انکا بھی یوم حساب ہوگا ، مسلمان جن چھتوں پہ رہتے ہیں اور غیر مسلم جنات سنسان مقامات پہ۔ ان سب حقائق پہ آمنا و صدقنا کہنے کے بعد انہوں نے جب عاملوں اور تعویذ کرنے والوں کو برا بھلا کہنا شروع کیا تو یہ بات ایک دم مذاق لگی۔

جب ایک شخص جادو اور جنات پہ یقین رکھتا ہے تو اسی کے بعد اس پہ یہ نوبت بھی آتی ہے کہ وہ ان عاملوں سے جو جنات پہ قابو پا لینے کا ہنر جانتے ہیں اور جادو کا توڑ کرتے ہیں، ان کی خدمات کا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔

رسول اللہ نے جادو کا توڑ بتایا اور وہ ہے معوذتین سورتیں۔ ایک آسان  اور سادہ سا حل۔ یہ ذہن میں رکھنا چاہئیے کہ ڈیڑھ ہزار سال پہلے جب یہ جادو کا مرض بالکل عام تھا۔ معاشرے کو اس وباء سے نکالنے کے لئے یہ حل نفسیاتی لحاظ سے چنا گیا ہوگا۔ لیکن جیسا کہ ہم عملی سطح پہ دیکھتے ہیں کہ جو دماغ جادو کو بر حق جانتا ہے اسکی تسلی اس باب میں محض ان سورتوں سے نہیں ہوتی۔  وہ کسی پہنچے ہوئے عامل کی تلاش میں رہتا ہے۔ جادو جیسی اسرارکے رس  سے بھری چیز کی  کسی غیر اسراری عمل سے کیسے تسلی ہو سکتی ہے۔ حالانکہ یہ اسرار بھی کم نہیں کہ کیسے چند الفاظ کے بولنےسے جادو ٹوٹ جاتا ہے لیکن جب تک الو کا خون، بکرے کے شانے کی ہڈی، قبر کی مٹی، آدھی رات کا سناٹا، سیہ کا کانٹا، کالے رنگ کا کپڑا اور اس قماش کی دیگر اشیاء شامل نہ ہوں سچ پوچھیں تو اسرار کا اصرار بڑھے جاتا ہے۔

جادو کی کہانی بہت پرانی ہے۔  جب انسان نے پہلے پہل اپنے ماحول میں دلچسپی لینا شروع کیا۔ اس نے بولنا سیکھا، اس نے اپنے خیالات دوسروں تک پہنچانا سیکھا تو اس نے اپنے طور پہ یہ فرض کیا کہ اسکے اردگرد کے ماحول کو غیر مرئ طاقتیں کنٹرول کرتی ہیں۔ کیونکہ اسے کوئ بارش برساتا نظر نہیں آتا۔ اسے معلوم نہیں ہوا کہ زلزلے کیسے آتے ہیں۔ وہ نہیں جانتا کہ کیسے شکار کی فراوانی ہوتی ہے اور کیسے قحط آجاتے ہے۔

چونکہ وہ سوچ سکتا تھا  اس لئے اس نے جانا کہ ان طاقتوں کی توجہ کا مرکز وہ خود یعنی انسان ہے۔  اس نے یہ بھی فرض کیا کہ اسکے مصائب اور اسکی خوشیاں سب انہی کے مرہون منت ہیں وہ بارش بھی لاتے ہیں اور طوفان بھی۔ اس نے یہ بھی فرض کیا کہ جب یہ طاقتیں اس سے خوش ہوتی ہیں توکھانے کو اچھا ملتا ہے، زندگی سہولتوں سے بھرپور رہتی ہے، شکار ملتا ہے ، بہتر پناہ ملتی ہے   اور جب ناراض ہوتی ہیں تو بادل گرجتے ہیں، سیلاب آتے ہیں ، زلزلے آتے ہیں، آندھیاں چلتی ہیں، بیماریاں آتی ہیں، کھانے کو نہیں ملتا۔

یہاں پہنچ کر اس نے یہ بھی فرض کیا کہ اگر وہ چاہے تو ان طاقتوں کو اپنے قابو میں لا سکتا ہے تب وہ اس کے فائدے کے کام کریں گی اور اسکے نقصان میں جانے والے کام نہیں ہونگے۔ ان ماورائ طاقتوں کو قابو میں لانے کی سوچ نے جادو کو جنم دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی سوچ نے دوسری طرف سائینس کو بھی جنم دیا۔

جادو اور سائینس

دو جڑواں لیکن متضاد خیالات کے ساتھ وجود میں آئے۔ لیکن سائینس نے اپنی بنیاد دلیل پہ رکھی, کسی ماورائ طاقت سے الگ دلیل جو قدرتی قوانین کو ایک دوسرے سے جوڑے۔ یعنی اگر ہم کسی عمل کے ہونے کے طریقے کو جان لیں تو اس پہ قابو پا سکتے ہیں۔ اگر ہم جان لیں سیلاب اور قحط کیسے آتے ہیں تو ہم ان پہ قابو پا لیں گے۔ اگر ہم جان لیں کہ ہم بیمار کیوں ہوتے ہیں تو بیماری پہ قابو پا لیں گے۔

دلیل کے ساتھ چلنے میں ایک بظاہر نقصان اسرار کے ٹوٹ جانے کا ہوتا ہے۔ اسرار، جو ہم پہ حکومت کرتا ہے اور جب یہ ٹوٹ جاتا ہے تو ہم اس پہ حکومت کرتے ہیں۔ اس مرحلے پہ پہنچ کر کیا آپکو یہ نہیں لگتا کہ ہم میں سے کچھ لوگ اسرار کے غلام بنے رہنے میں لذت پاتے ہیں اور کچھ لوگ اسرار کو محمود غزنوی کی طرح ڈھا دینے میں۔

آئیے ایک ویڈیو دیکھتے ہیں۔ دلیل کے دشمن۔

11:14 PM

ایکپریس اخبار, پاکستان, جادو, دلیل, سائینس, عامل, معاشرہ

جن پہ ناز ہے

یہ پوسٹ میں نہیں آپ لکھ رہے ہیں۔ میں ایک حصے دار ہوں۔ کرنا یہ ہے کہ آپ اس میں وہ نام ڈالیں جنہیں آپ سمجھتے ہیں کہ وہ بین الاقوامی سطح پہ اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے پاکستان کے لئے وجہ ء افتخار ہیں۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ میم۔

میم سے آتے ہیں محمد علی جناح۔

عبدالستار ایدھی

حکیم محمد سعید

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی

گاما پہلوان

نورجہاں

مہدی حسن

جہانگیر خان

صادقین

گل جی

عمران خان

اس وقت جلدی میں یہ نام یاد آئے۔ باقی آپ شامل کریں۔

10:36 AM

آزادی, پاکستان, تحریک

سموسہ انصاف سے فحاشی انصاف تک

چلیں جناب،

چیف جسٹس صاحب

نے جماعت اسلامی  کے سابق امیر جناب قاضی حسین احمد صاحب کی درخواست پہ ٹی وی چنلز کی بے حیائ کا نوٹس لے لیا ہے اور پیمرا کو فی الفور فحش چینلز بند کرنے کی ہدایت کی گئ ہے۔ میں نے ایک نظر جلدی سے چینلز دیکھے کہ فحش والے کو بند ہونے سے پہلے دیکھ لوں۔ لیکن یہ سب تقریباً وہی ہیں جو کافی عرصے سے چل رہے ہیں۔ ان میں بھی غیر ملکی اب خاصے کم ہیں جبکہ دیسی کافی زیادہ ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دیسی چینلز میں سے کوئ فحش ہے۔

میرا تو خیال ہے کہ ملک میں اب تمام اداروں کو ختم کر کے بس چیف جسٹس صاحب کی صوابدید پہ چھوڑ دینا چاہئیے۔ کیونکہ سپریم کورٹ نے پچھلے دنوں پنجاب میں سموسوں کی قیمتوں میں استحکام لانے کا نوٹس لیا۔ جس سے عوام کے سنگین مسائل میں اچانک کمی واقع ہوئ۔ اور سموسہ انصاف کی اصطلاح سے کان روشناس ہوئے۔

 فحاشی کے خلاف اس عدالتی حکم کے بعد اب وہ دن دور نہیں جب انڈونیشیا کی طرح ہمارے یہاں بھی حلال ٹی وی شوز ہوا کریں گے۔ اس وقت تو چند ایک ہی شوز ایسے ہیں جنہیں حلال کہا جا سکتا ہے۔ ان میں سے سر فہرست عامر لیاقت حسین اور مایاخان کے شوز ہی ہونگے۔

مزید یہ بھی سنا گیا کہ چونکہ چیف جسٹس صاحب کو معلوم نہیں کہ کون کون سے پروگرام فحش ہیں اس لئے جناب انصار عباسی اور جناب اوریا مقبول جان کو اس چیز کا فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ اگر یہ اطلاع درست ہے تو پھر ہر ایسا پروگرام فحش زد میں آ سکتا ہے جس میں خواتین سر پہ دوپٹہ نہ لئے ہوئے ہیں۔ خواتین ایک بار پھر ہشیار باش ہوں۔

ایک مبصر کا کہنا ہے کہ خواتین کے سینیٹری پیڈز کے اشتہارات دراصل فحش ہوتے ہیں اور انہیں فیملی کے ساتھ نہیں دیکھا جا سکتا۔ ایک مدت تک میرا خیال بھی یہی تھا۔ پھر ایک دن مجھے پتہ چلا کہ پاکستانی خواتین کی ایک بڑی تعداد کو یہی نہیں پتہ کہ ناپاکی کے دنوں میں اپنے آپکو صاف ستھرا کیسے رکھا جائے؟  اور اس وجہ سے وہ ایسے جنسی امراض کا شکار ہوجاتی ہیں جس کا نتیجہ بانجھ پن بھی ہو سکتا ہے۔ آخر انہیں اس بارے میں کیسے آگاہ کیا جائے؟

فحاشی کا تصور کتنا باریک ہو سکتا ہے۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت بھی ہوا جب

فسچولا

سے متعلق ایک دستاویزی فلم کی ایڈیٹنگ ہو رہی تھی اور اس میں ایک خاتون کو دکھایا گیا جو کہ کھڑی ہوئ تھی لیکن زمین پہ اس کا پیشاب پھیل رہا تھا۔ اعتراض ہوا کہ یہ منظر نامناسب ہے۔ اسے کاٹ دیا جائے۔ ذہن میں رہے کہ فسچولا ایک ایسا مرض ہے جس سے خاص طور پہ دیہی علاقوں کی خواتین دو چار ہوتی ہیں کیونکہ یہ بچے کی پیدائش میں دیر ہونے کی وجہ سے لاحق ہوتا ہے۔ نتیجے میں کسی خاتون کو اپنے بول بزار پہ اختیار نہیں رہتا اور یہ اسکے جسم سے مسلسل بہتے رہتے ہیں۔ لیکن حیاء کا تقاضہ ہے کہ اسے زمین پہ بہتے ہوئے نہ دکھایا جائے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ٹی وی پہ ڈرامہ آرہا تھا امجد اسلام امجد کا لکھا ہوا۔ شاید پہلا ڈرامہ تھا  جس میں ہیروئِن کو چھاتی کا کینسر ہوجاتا ہے۔ میری ایک استاد نے دوسری استاد سے اس وقت گفتگو کرتے ہوئے کہا ٹی وی پہ کس قدر بے حیائ پھیل گئ ہے۔ ہیروئین کو مرض بھی دکھایا تو بریسٹ کینسر کا۔ حالانکہ یہی بریسٹ کینسر اب پاکستان سمیت دنیا بھر میں خواتین کی ہلاکت کا بڑا باعث ہے۔

سوال یہ درپیش ہوتا ہے کہ وہ کون سا سستا ترین ذریعہ ہو سکتا ہے جس سے آبادی کے بڑے حصے کو معلومات پہنچائ جا سکتی ہوں۔ یقیناً الیکٹرونک میڈیا۔

جب میں بلوچستان کے ایک چھوٹے سے ساحلی قصبے ارمارہ میں جسکی آبادی بمشکل دس ہزار ہوگی۔ لوگوں کو جھونپڑا ہوٹل میں ڈش کے ذریعے انڈیئن فلمیں دیکھتے ہوئے دیکھتی ہوں تو میرے ذہن میں یہی خیال آتا ہے کہ الیکٹرونک میڈیا کی پہنچ کتنی دور افتادہ جگہوں تک ہے۔

پھر ایک اور سوال ابھرتا ہے۔ فحاشی اور بے حیائ کی ایک مستقل تعریف کیا ہو گی؟

ٹی وی ڈرامے میں بریسٹ کینسر کا بیان کسی زمانے میں فحاشی ہو سکتا ہے جبکہ آج ہمیں یہ معلومات عام کرنے کی ضرورت ہے کہ خواتین اس مہلک مرض سے کیسے بچاءو کر سکتی ہیں۔

ایک اور اہم سوال، بے حیائ کا نشانہ خواتین ہی کیوں بنتی ہیں۔ سر سے دوپٹہ اترا نہیں کہ بے حیائ کا لیبل نازل۔  جو خاتون بغیر آستین کا لباس پہن لے وہ مہا بے حیاء۔ اپنی شلواروں کو کھجانے والے مرد ، ہونٹوں پہ زبان پھیرنے والے مرد، خواتین کو گھورنے والے مرد، خواتین پہ آوازیں کسنے والے مرد، انکے جسمانی خد و خال کا چٹخارے لے کر تذکرہ کرنے والے مرد،  یہ سب بے حیاء کیوں نہیں کہلاتے۔ یہ سب مرد کیا معاشرے میں فحاشی نہیں پھیلا رہے ہیں۔ حتی کہ روڈ پہ کسی جھگڑے کے دوران جب مرد ایکدوسرے کی ماءووں اور بہنوں کے چیتھڑے اڑا رہے ہوتے ہیں تو بھی کسی کو ذرا توفیق نہیں ہوتی کہ انہیں روکے۔ در حقیقت قاضی صاحب ، عامر لیاقت حسین جیسے بے حیاء شخص کے ٹی وی پہ آنے کے خلاف کوئ درخواست دائر نہیں کرتے لیکن انہیں کسی خاتون کے بے حیاء لباس میں آنے پہ اعتراض ہوگا۔  بے حیائ کے یہ عملی مناظر ہمارے معاشرے میں عام ہیں۔ انکا خیال قاضی حسین صاحب کو کب آئے گا۔ اوریا مقبول جان اور انصار عباسی اسکے بارے میں کب لکھیں گے تاکہ میری نظر میں بھی معتبر بنیں۔

خیر، ایک دورِ حکومت، جماعت اسلامی کا فوج کے زیر سایہ گذرا اور اب شاید جماعت اسلامی عدلیہ کے ذریعے حکومت کرنا چاہے گی۔

نوٹ؛ چند دنوں کے لئے خاکسار ایسے علاقوں میں رہے گی جہاں انٹر نیٹ کی سہولت موجود نہیں ہے اس لئے اس تحریر کے تبصرے اشاعت میں کچھ وقت لیں گے۔

11:59 PM

الیکٹرونک میڈیا, انصار عباسی, اوریا مقبول جان, پاکستان, جmجماعت اسلامی, فحاشی

سائینس کا بحران

پاکستان میں کوئ سیاسی یا معاشرتی انقلاب آئے یا نہ آئے، سائینسی انقلاب دستک دے چکا ہے۔  ایک کے بعد ایک نوجوان سائینسداں اور انکی ایجادیں ایسے سامنے آرہی ہیں جیسے  بغیر دانت والے منہ سے پان کی پیک نکلتی ہے۔ ایک ایجاد  ابھی ابھی سامنے آئ ہے۔ ملاحظہ کریں۔

   اس حیرت ناک ایجاد کے ساتھ ہی ایک اور نوجوان سائینسدان کے خیالات سننے کو ملے۔ جسے ہمارے ایک فیس بک کے ساتھی  نے شیئر کیا۔ جس سے ہم بیک وقت رنجیدہ بھی ہوتے ہیں اور تفریح بھی لیتے ہیں۔ اگر مذہب میں عامر لیاقت ایک نئ علامت ہیں تو سائینس میں بھی عامر لیاقتوں کی کمی نہیں ہے۔  دل کو ایک اندیشہ سا لگا ہوا ہے کہ ہو نا ہو یہ وینا ملک کو استغفار سے روکنے کا نتیجہ ہے کہ سائینس کا دجال ہمارے یہاں نازل ہو گیا۔ آئیے یہ ویڈیوز باری باری دیکھتے ہیں۔

پہلی ویڈیو میں ہمارے

بوٹنسٹ

بارش لانے کا ایک نسخہ بتا رہے ہیں اور اینکر خاتون اس بات کی تصدیق کر رہی ہیں کہ بادل آجانے کے بعد اگر خواتین گھروں میں جھاڑو پھیریں تو بارش برس کر رہتی ہے۔ تو سنئیے کہ بارش کس طرح جھاڑو دینے سےلائ جا سکتی ہے۔

ہمارے نوجوان بوٹنسٹ یہیں پہ بس نہیں کرتے بلکہ اپنے تفکر پہ نیوٹن کے کشش ثقل کے قانون کو بھی نشانہ بنا ڈالتے ہیں۔ ہیں جناب، یہ بھی کوئ سمجھ میں آنے والی بات ہوئ کہ  ایک ہزار کلو گرام کا جسم اور ایک کلوگرام کا جسم ایک ہی رفتار سے زمین پہ گرے۔ نیوٹن کے اس قانون کو اب تک کیسے لوگ صحیح تسلیم کرتے آرہے ہیں؟ آئینسٹائین نے ایسوں کے لئےکہا تھا کہ

“A clever person solves a problem. A wise person avoids it.”

ایک چالاک شخص ایک مسئلے کو حل کرتا ہے لیکن عقل مند اس سے دور رہنا پسند کرتا ہے۔

جس طرح سلاد کی سیزننگ چاہئیے ہوتی ہے اس طرح ہمارے یہاں اب کوئ بھی چیز مذہب کی سیزننگ کے بغیر نہیں ہو سکتی اسکا نمونہ ہمارے یہی بوٹنسٹ پیش کرتے ہیں اور اپنے خیالات میں برکت کے لئے آخیر میں ایک مذہبی تائثر بھی جمع کرتے ہیں۔

اہم سوال یہ ہے کہ اب اس وقت جبکہ بجلی کا بحران اپنے عروج پہ ہے۔ پاکستانیوں کی توجہ سائینس کی طرف کیوں مبذول ہو گئ ہے؟ سائینس کا بحران پیدا کیا گیا ہے یا یہ مکافات عمل ہے ؟ سائینس نے انتقام لیا ہے؟

یا کیا انہوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ سائینس ہی انکے مسائل کو حل کر سکتی ہے۔ شاید وہ آئیسٹائین کے ایک اور مقولے پہ عمل کرنا چاہتے ہیں جس میں اس نے کہا کہ اگر آپ اپنے بچوں کو ذہین بنانا چاہتے ہیں تو انہیں پریوں کی کہانیاں سنائیں اور اگر اور زیادہ بنانا چاہتے ہیں تو اور زیادہ کہانیاں سنائیں۔

“If you want your children to be intelligent, read them fairy tales. If you want them to be more intelligent, read them more fairy tales.

اور سائینس انکے لئے پریوں کی کہانیوں سے کم نہیں۔ ایک تضادات سے بھرپور تعلیمی نظام رکھنے کے بعد تو سائینس پریوں ہی کی کہانی لگتی ہے۔ جس میں پری ہاتھ میں جادو کی چھڑی لئے ہوتی اور خبیث جادوگرنی جھاڑو پہ گھومتی پھرتی ہے۔ یہ جھاڑو آج نجانے کیوں بار بار ذکر میں داخل ہو رہی ہے۔ شاید جھاڑو واقعی بارش کا شگن ہو۔ یہاں تو سائینسداں یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ پاکستان کو شاید قحط سالی کا سامنا کرنا پڑے۔

کچھ لوگوں کے خیال میں عوامی سطح پہ اس قدر زیادہ محرومی کا احساس بڑھ چکا ہے کہ لوگ ہر اس تماشہ دکھانے والے کے گرد جمع ہو جاتے ہیں جس سے انہیں ذرا بھی توقع ہوتی ہے کہ وہ انکا مسیحا بن سکتا ہے۔ یہ بھی ایک عبرت کا مقام ہے کہ ہم ہر تماشہ دکھانے والے کو پذیرائ دینے کو تیار ہیں۔ یعنی

تیرے انتظار میں کس کس سے پیار میں نے کیا

پانی سے چلنے والی کار کے قصے میں آغا وقار ہی کا نام نہیں آتا بلکہ عبدالقدیر خان صاحب بھی میڈیا میں کچھ زیادہ مثبت انداز سے سامنے نہیں آ سکے۔ ایک متوقع مسیحا نے دوسرے تسلیم شدہ مسیحا کو ٹھکانے لگانے کا بند و بست کر ڈالا۔

 عبد القدیر خان صاحب کا نام اگر چہ کہ سدرۃ المنتہی کا درجہ رکھتا ہے جس سے آگے جانے کی جراءت پرویز مشرف نے ہی کی۔ لیکن اب ان کا سحر بھی ٹوٹتا دکھائ دیتا ہے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب پاکستان نے ایٹمی دھماکہ کیا تھا۔ اس وقت خان صاحب کا نام پیچھے ڈال کر ڈاکٹر ثمر مبارک کا نام اخبارات کی زینت بن گیا تھا۔ نواز شریف نے ڈاکٹر ثمر مبارک کو مبارک باد دی۔ نوے کی دہائ میں جب ایسا ہوا تو کراچی کے عوام کی اکثریت نے اسے نواز شریف کی کراچی سے تعلق رکھنے والے اس سائینسدان سے لسانی عصبیت کو وجہ جانا۔

اس وقت کچھ دوستوں نے دبے لفظوں میں کہا کہ دراصل خان صاحب اتنے نیک نہیں جتنے جانے جاتے ہیں اور نہ ہی اتنے بڑے سائینسداں۔ جو لوگ انکے قریب رہتے ہیں وہ انکی شخصی سطحیت کے واقعات سناتے ہیں۔ لیکن اسے انکے خلاف بنی جانے والی سازشوں کا جال سمجھا گیا۔

پھر اسکے کافی عرصے بعد مجھے ایک بلاگ کا لنک ملا۔ جس میں اے کیو خان پہ خاصہ عجیب الزام لگایا گیا تھا۔ سالوں پہلے بھیجے گئے اس لنک کو مجھے تلاش کرنا پڑا۔ اس وقت تو میں نے اسے ہونہہ کہہ کر ایک طرف ڈال دیا تھا۔

یہ ہے اسکا لنک

۔ ان لوگوں کے لئے جن کے لئے ڈاکٹر عبد القدیر خان ایک انسپیریشن کی حیثیئت رکھتے ہیں۔ ان سے بے حد معذرت۔

 خیر آئیسٹائین ایک اور مزے کی بات کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا جیسی ہم بناتے ہیں ہمارے تخیل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اسے اپنے خیالات کو تبدیل کئے بغیر تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔

The world as we have created it is a process of our thinking. It cannot be changed without changing our thinking.”

میں سوچ رہی تھی کہ اگر ہم یہ سوچ لیں کہ ہمیں تبدیل ہونا ہے، ہمیں اپنی دنیا تبدیل کرنی ہے تو ہم تبدیلی کا آغاز کس نکتے سے کریں گے؟

10:43 PM

آئینسٹائیں, آغا وقار, ایٹم بم, پاکستان, سائینس, عبد القدیر خان, قانون, نواز شریف, نیوٹن

ہود بھائ کی سازش

کہتے ہیں ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔  لیکن ضرورت کی مجبوری دماغی خلل  بھی پیدا کرتی ہے۔ اس سے ایجاد میں  شوخی ء تمنا  ہوتی ہے اور اگر مناسب تعداد میں ہم نوا مل جائیں تو دھمال ڈالنے کا لطف سوا ہوتا ہے۔ میرے جیسے مجبور بھی سر اٹھا کر دیکھنے لگتے ہیں کہ ایجاد کی ماں اب کیا جنم دیں گی۔ فی الحال تو ہفتہ بھر سے زائد ہو گیا اور ایک دفعہ پھر ٹاک شوز کو رواں رکھنے کے لئے ایک کے بعد ایک ڈرامہ ہونے کے علاوہ لیبر روم سے کچھ بر آمد نہیں ہو رہا۔ ایک دفعہ پھر میڈیا اینکرز بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے لئے کھڑے ہیں اور ایک دفعہ پھر کچھ بڑے لوگوں کو آمنے سامنے پہنچا دیا گیا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر عبد القدیر اور پروفیسر ڈاکٹر عطا الرحمن۔

 سواس دفعہ لپیٹے میں ہمارے ایٹمی سائینسداں بھی نہ بچ سکے ۔  لگتا ہے ان سب کو پرویز ہود بھائ کی بد دعا لگی ہے۔ یوں مجھے شبہ ہے کہ آغا قادر نامی ڈپلومہ انجینیئر کو شہہ دینے والے حامد میر یا عبد القدیر خان نہیں بلکہ

پرویز ہود بھائ

ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ آغا قادر کی اس متوقع نوبل ایجاد پہ سب سے پہلے انہی کا اعتراض میں نے پڑھا۔ انہوں نے یہ ٹریپ تیار کیا ہے۔ ملک کے سائینسدانوں  کو لنگڑی دینے کا۔ خیر یہ کانسپیرینسی تھیوری ایک مذاق ہے۔ شوخی ایجاد تمنا کا کانسپیرینسی تھیوری سے بڑا گہرا تعلق ہے۔

اس ایجاد کی خبر سامنے آتے ہی  فخر و انبساط کے نعرے اٹھے۔ نعروں کی اس گونج میں جس نے بھی اپنی آواز بلند کی منہ کی کھائ۔ لوگوں کو اس پہ ہی ملک دشمن عنصر ہونے کا شبہ اٹھا۔ جہاں لکچھ لوگ بگڑ بیٹھے کہ یہ کیا پاکستانی کوئ بھی کارنامہ انجام دیں لوگ اس میں کیڑے نکالنے لگ جاتے ہیں دوسری طرف فزکس کے قوانین کی بقاء کی جنگ لڑنے والے اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ تو تھرمو ڈائنامکس کے پہلے قانون سے متصادم ہے۔ حامیوں نے یہ نہیں کہا کہ تو کیا ہوا آئینسٹائین کے قوانین نیوٹن کے قوانین سے متصادم تھے۔   فزکس کا یہ قانون فزکس کے لئے صحیح ہوگا۔ ہم میٹا فزکس پہ ، فزکس سے زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ مجھے تو درحقیقت یہ جاننے میں دلچسپی ہے کہ انہوں نے کس کے دئیے ہوئے وظیفے سے چمتکار کر دکھایا۔

دنیا میں پانی سے کار چلانے کا یہ پہلا دعوی نہیں۔

پہلے جتنے مدعی

گذرے ان میں سے زیادہ تر لوگ فراڈ نکلے۔ مغرب میں فراڈ نکلنے پہ کسی کو قومیت کا جذباتی دھچکا نہیں لگتا۔ اس لئے فراڈ کی نشاندہی کرنا کار ثواب کی جگہ کار علم ٹہرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا فراڈ پاکستان میں ہونا مشکل ہے۔ اس لئے ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے البتہ یہ کہ معصوم لوگوں کی ہمارے یہاں کمی نہیں۔ جیسے ایک معصوم حامد میر ہیں جنہوں نے پچھلے تمام مدعیوں کو فراڈ کہنے کے بجائے اپنے انٹرویو میں انکے خلاف سازشوں کا ماحول تیار کرنے کو ترجیح دی۔

 اب تک اس سلسلے میں جو سائینس بیان کی گئ ہے اس میں پانی کوبجلی سے توڑ کر ہائڈروجن گیس تیار کی جاتی ہے۔ یہ عمل الیکٹرولیسس یا برق پاشیدگی کہلاتا ہے۔ پانی کی اس تحلیل سے ہائڈروجن گیس اور آکسیجن  گیس کاآمیزہ پیدا ہوتا ہے جو آکسی ہائڈروجن کہلاتا ہے۔ جسے براءون گیس یا ایچ ایچ او بھی کہتے ہیں۔

 آغا وقار صاحب کا کہنا ہے کہ انہوں نے ایک ایسا نظام بنا لیا ہے جس میں نہ صرف پانی ٹوٹ کر ہائڈروجن اور آکسیجن گیسز بنائے گا بلکہ یہ دونوں گیسز توانائ پیدا کرنے کے عمل سے گذر کر دوبارہ پانی میں تبدیل ہوجائیں گی۔  یہاں یہ یہ نکتہ قابل غور ہے کہ پانی ٹوٹتے وقت جتنی توانائ لیتا ہے اتنی ہی توانائ پانی کو ان گیسز کو ملا کر بنانے کے لئے چاہئیے ہوتی یعنی مجموعی تعامل اس طرح ہوگا۔

 پانی کے مالیکیول کو بنیادی اجزاء میں توڑنے کے لئے جو توانائ درکار ہوگی وہ الگ ہے جو کہ آغا وقار کی ایجاد میں بیٹری سے حاصل کی جارہی ہے اور بقول انکے بیٹری کی توانائ جنریٹر سے حاصل ہوگی ابتداء میں بعد میں جب کیمیائ تعامل چل پڑے گا تو نہیں چاہئیے ہوگی۔ واضح رہے  کہ پیٹرولیئم مرکبات کی صورت میں زنجیری تعامل چلتا ہے اور توانائ کی زیادہ مقدار تعامل کی ابتداء میں چاہئیے ہوتی ہے جب ایک دفہ تعامل چل پڑتا ہے تو وہ زنجیر کی شکل جاری رہتا ہے۔

چونکہ پانی توڑنے کے لئے توانائ بیٹری سے حاصل کی جارہی ہے اس لئے سامنے جو نظر آرہا ہے وہ یہ کہ گاڑی ایک ان ڈائریکٹ ذریعےسے  دراصل بیٹری کی بجلی سے چل رہی نہ کہ پانی سے۔

لیکن آغا وقار اسے سامنے کی بات قرار نہیں دیتے بلکہ انکا دعوی ہے کہ اس میں ایک راز ہے جو وہ اگر کھول دیں تو پھر پروڈکٹ انکے ہاتھ سے نکل جائے گی۔

 یہاں

فیئول سیلز

ہوتے ہیں جن میں ہائڈروجن استعمال کی جاتی ہے۔ یہ فیئول سیلز گاڑیوں میں استعمال ہو رہے ہیں۔ ہائڈروجن حاصل کرنے کا کمرشل ذریعہ عام طور سے قدرتی گیس یا پیٹرول مرکبات ہوتے ہیں۔ انہیں توڑ کر ہائڈروجن حاصل کی جاتی ہے۔ اس طرح فیئول سیلز کا بنیادی فائدہ کم آلودہ فضا نظر آتی ہے۔ کیونکہ ہائدروجن جلنے سے کاربن کے آکسائیڈز پیدا نہیں ہوتے جوکہ فضائ آلودگی کا بنیادی سبب ہوتے ہیں۔ فیئول سیلز پہ چلنے والی گاڑیوں کے انجن میں تبدیلی لانی پڑتی ہے۔ پانی کو سورج کی شعاعوں کی مدد سے بھی توڑآ جا سکتا ہے اس سلسلے میں تجربات جاری ہیں ۔ سمندری پودے یہ کام انجام دیتے ہیں لیکن کمرشل سطح پہ اس وقت کوئ سستا طریقہ موجود نہیں۔

آغا وقار صاحب کا ایک انٹرویو اور حامد میر صاحب کے ساتھ انکی سیر دیکھی، پانی سے چلانے کے لئے اس گاڑی کو کرائے پہ حاصل کیا گیا۔ نہ حامد میر صاحب نے اپنی گاڑی پیش کی نہ ان صاحب نے اپنی گاڑی استعمال کی نہ ہی انکے کسی دوست یا قائل شخص نے انہیں اپنی گاڑی دی۔ انٹرویو میں وہ بے دھڑک ایک کے بعد ایک پیچیدہ سائینسی اصطلاحات استعمال کرتے رہے جن سے عام لوگ واقف نہیں۔ یعنی ایک مبصر کا یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ بس نیوکلیئر فیوژن کی اصطلاح باقی بچ گئ۔ ڈپلومہ ہولڈر انجینیئر آغا وقار اپنی 'ایجاد؛ کے بارے میں اتنے زیادہ پر اعتماد ہیں کہ انہوں نے ہمارے محترم استاد پروفیسر ڈاکٹر عطاالرحمن کا بھی ٹیسٹ لے ڈالا۔ 'کیا آپکو معلوم ہے کہ ہائڈروجن گیس کہاں سے آتی ہے؟ مجھے معلوم ہے کہ استاد محترم کا حس مزاح بڑا اچھا ہے اور وہ یقیناً اس سے محظوظ ہوئے ہونگے۔

انٹرویو کے دوران مسلسل زور اس بات پہ رہا کہ حکومت اس سلسلے میں فنڈنگ کرے۔ بقول آغا وقار ، وہ اس پراجیکٹ پہ سوا کروڑ روپے خرچ کر چکے ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ انہیں اسکی تشہیر سے پہلے کم از کم دو گاڑیوں کو مستقل پانی پہ کر دینا چاہئیے۔ سوا کروڑ روپے خرچ کرنے والے شخص کے لئے دو سیکنڈ ہینڈ گاڑیاں ایک ، ڈیڑھ لاکھ کی خریدنا مشکل نہیں۔

وہ لوگ جو ان کی اس 'ایجاد' کے قائل ہو چکے ہیں کم ازکم انہیں تو اپنی گاڑیاں پانی  پہ کر دینی چاہئیں۔ خاص طور پہ حامد میر صاحب۔ وہ کم از کم اپنی گاڑی کے لئے تو فنڈنگ کر ہی سکتے ہیں۔ تاکہ لوگ اس کے قائل ہو کر اسے خریدنا شروع کریں اسکے بعد ہی کمرشل سطح پہ اسکی پیداوار کا سوال اٹھتا ہے۔

  میرا تو آغا وقار سے اس سارے موضوع سے ہٹ کر ایک معصوم سا سوال ہے کہ انکے بقول ڈسٹلڈ واٹر کی بوتل تو دس روپے کی مل جائے گی یہ کم بخت پینے کے پانی کی بوتل اتنی مہنگی کیوں ملتی ہے؟

خیال یہ آرہا ہے کہ اس سے آگے کیا ہوگا؟ کیا آغا وقار میڈیا سے باہر کچھ ثابت کر پائیں گے۔ اگر وہ ثابت نہ کر پائے تو ڈاکٹر عبد القدیر خان جیسے پائے کے سائینسدانوں کا کیا ہوگا۔ پی سی آئ آر کے چیئرمین کس گنتی میں گنے جائیں گے؟ ہود بھائ کی مسکراتی تصویر میں انکی مسکراہٹ کتنی بڑھ جائے گی؟ کیا پروفیسر ڈاکٹر عطاالرحمن ، آغا وقار کو یاد رکھیں گے؟

اور عام لوگ ، کیا عام لوگ تھرمو ڈائنامکس کا پہلا قانون،

قانون بقائے توانائ

بھول پائیں گے۔ توانائ نہ پیدا کی جا سکتی ہے نہ فنا کی جا سکتی ہے یہ بس ایک شکل سے دوسری شکل ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

4:00 PM

آغا قادر, سائینس, عبد القدیر خان، پاکستان, عطاالرحمن, فزکس، پانی, کار, گاڑی, ہود بھائ

و تعز من تشاء؟

عزت ہمارے خطے میں ایک بہت اہم لفظ ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جو کسی بھی معمولی سی بات پہ خطرے میں پڑجاتی ہے اور اگر اسے خطرے میں نہیں پڑنا ہو تو آپ کروڑوں کی کرپشن کر ڈالیں یا منافقت کے جتنے چاہیں لبادے اوڑھ ڈالیں معاشرے میں آپکی عزت کو کوئ نقصان نہیں پہنچتا۔

مثلاً پسند کی شادی جسے عام طور سے محبت کی شادی سے ملا دیا جاتا ہے اس سے والدین کی عزت خاک میں مل جاتی ہے۔ شادی بیاہ پہ اگر خواتین قیمتی کپڑے نہ پہنیں تو مرد کی عزت کم ہونے کا اندیشہ دامنگیر ہوتا ہے۔ مردوں کے مقابلے میں خواتین کی عزت زیادہ خطرے میں رہتی ہے۔ یوں اگر کوئ خاتون بچاءو بچاءو چیخے تو پہلا خیال بھی یہی آتا ہے کہ عزت خطرے میں ہے چاہے وہ چوہے یا چھپکلی کو دیکھ کر چیخ رہی ہو۔

ایک زمانے میں لاچار مرد اپنی عزت بچانے کے لئے پگڑی اتار کر واسطے دیا کرتا تھا۔ خواتین کی عزت دوپٹے کے ساتھ وابستہ تھی اور گبرو مرد اس دوپٹے کی حفاظت کے لئے جان لٹا دیتے تھے۔  دوپٹہ تو اسکارف میں تبدیل ہو گیا لیکن پگڑی سرے سے نا پید ہو گئ۔

ذرا سانس لے کر وضاحت کر دوں کہ یہ تحریر  دوپٹے اور پگڑی  کے بالترتیب ارتقاء اور عنقا ہو جانے کے متعلق نہیں۔ کیونکہ یہاں سے پگڑی کے نایاب ہوجانے کی وجوہات پہ غور کے بجائے دوپٹے اور اسکارف کے تقدس پہ بات جا سکتی ہے۔ جس پہ نہ صرف پہلے بھی سیر حاصل بحث ہو چکی ہے بلکہ مزید سیر کے لئے آئندہ الگ سے بحث ہو سکتی ہے۔

بات ہے عزت کی۔ عزت کیا چیز ہے؟

میں اسکی کوئ جامع تعریف کرنے سے معذور ہوں۔ لیکن لوگوں کو یہ کہتے اکثر سنتی ہوں کہ یہ اسکی دین ہے جسے پروردگار دے۔ یعنی خدا ہی عزت دینے والا ہے حالانکہ خدا کا دعوی ہے کہ وہی ذلت دینے والا بھی ہے لیکن اکثر عناصر اسکا سہرا اپنے سر پہ باندھنا پسند کرتے ہیں تاکہ کچھ لوگ عزت بچانے کے چکر میں ان کے قابو میں رہیں۔

عزت پہ شعراء اکرام نے بہت کم لکھا ہے لیکن ذلت کو خوب موضوع بحث بنایا ہے۔ حالانکہ دونوں ہم قافیہ الفاظ ہیں۔

اب کوئ اس پہ کیا دلیل کرے

جس کو چاہے خدا ذلیل کرے

 عزت کی تعریف کرنا کیوں مشکل ہے؟ اسکی بنیادی وجہ اس کے دعوے دار ہیں۔

اس لئے ایٹم بم کا دھماکا کرنے کے بعد بھی ہم سنتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں اس عزت سے نوازا۔ ادھر ایک ڈیرے دار طوائف بھی اپنے لباس کی نوک پلک درست کرتے ہوئے ایک ادا سے کہتی ہے کہ بس آج جو بھی مرتبہ ہےعزت ہے وہ خدا کی عطا ہے۔ دونوں ہی اپنی جگہ درست ہیں اگر ہم اس پہ یقین رکھتے ہیں کہ سبھی کچھ خدا کا دیا ہوا ہے سبھی راحتیں، سبھی کلفتیں۔

لیکن پھر بھی ہم اس طوائف کی بات پہ ہنستے ہیں اور اس سیاستداں کی بات پہ فخر سے سینہ پھلا لیتے ہیں۔

اسکی وجہ شاید یہ ہے کہ عزت کا تعلق عام طور پہ معاشرے میں موجود اچھائ اور برائ کے معیار سے بڑا تعلق رکھتا ہے۔ طوائف کا پیشہ، نیچ  سمجھا جاتا ہے اس لئے وہ اپنے پیشے میں جتنی بھی کامیابی حاصل کرے۔ چاہے لوگ اسکی ایک جھلک کے لئے اپنا دین اور ایمان لٹا دینے کو تیار ہوں۔ اسکے ابرو کے اشارے پہ عاشق پہاڑ تو کیا آسمان کو زیر کر لے لیکن جب بھی وہ یہ کہے گی کہ یہ سب عزت خدا کی دی ہوئ ہے تو ہم  ہنستے ہیں۔

اسکے بر عکس، ہم ایک ایسا ہتھیار بنا لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جو چشم زدن میں انسانوں کی ایک بڑی آبادی کو ختم کر سکتا ہے تو ہمیں انتہائ فخر اس لئے محسوس ہوتا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اب ہم دشمن پہ سبقت حاصل کر لینے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور میدان جنگ میں وہ ہمیں آسانی سے ہرا نہیں سکتا۔ چونکہ ہم ہار نہیں سکتے اس لئے ہم عزت دار ہونگے۔ جس شخص نے یہ حاصل کرنے میں ہماری مدد کی وہ بھی ہماری عزت کا مستحق ہے۔ وہ شخص بھی یہی کہے گا کہ یہ عزت خدا کی دی ہوئ ہے ۔ ہم اسکا احترام کرتے ہیں۔ ہم اسکی بات کو سچ جانتے ہیں۔

عزت کے دعوے دار اور عزت کے پرستار دونوں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ اہمیت اس نکتے کی ہے جس پہ عزت کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔

 گاءوں کے چوپال میں درد بھری آواز میں ماہیا گانے والا میراثی کہلاتا ہے اس کا سماجی مرتبہ نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ لیکن جب آواز کا یہ جادو نورجہاں جنگ کے گیتوں میں دکھاتی ہے تو ملکہ ء ترنم کا خطاب پاتی ہے۔ کس میں ہمت کے انہیں میراثن کہہ دے۔

عزت کے بارے میں آج جاننے کی خواہش اس وقت سوا ہو گئ جب ایک جگہ پڑھا کہ ڈاکٹرعامر لیاقت کو جب خدا نے عزت دی ہے لوگ اسکی بات سنتے ہیں ، لوگوں پہ اسکی بات کا اثر ہوتا ہے تو دوسرے لوگ اسے برا کیوں کہتے ہیں؟  لوگ کیوں چاہتے ہیں کہ انہیں رمضان میں تبلیغ کے عمل سے روک دیا جائے۔ نہ صرف ان صاحب نے لکھا بلکہ دیگر صاحبان نے اسے شیئر بھی کیا۔

آج پھر میں نے سوچا کہ خدا کی دی ہوئ عزت کیا چیز ہوتی ہے؟  اگر ایسا ہے تو زرداری سے بےزاری کیوں؟ ان کی عزت بھی خدا کی دی ہوئ ہے۔ اس عقیدے کے مطابق یہ مرتبہ انہیں محض لوگوں کے ووٹ سے حاصل نہیں ہوا۔  لوگوں کے ایک بڑے حلقے میں انکا اثر ہے۔ لوگ انکی بات سنتے ہیں ان پہ اثر ہوتا ہے۔ یہی بات الطاف حسین، نواز شریف، عمران خان حتی کہ ملا عمر اور اوبامہ کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ اور چونکہ ان سب کو ملی ہوئ عزت کو خداکی دین سمجھنا چاہئیے تو ہمیں انکی عزت بھی کرنی چاہئیے اور انکے متعلق برا نہیں کہنا چاہئیے۔

کیا ہمیں اس بات کی فکر کرنی چاہئیے کہ یہ سب لوگ جس چیز کی تبلیغ کرتے ہیں اسکے لئے عملی طور پہ کچھ کرنے کی خواہش رکھتے ہیں یا نہیں؟  یا آسان الفاظ میں جب خدا کسی کو عزت اور مرتبہ دے دے اور لوگوں پہ اس کا اثر قائم ہو جائے تو کیا اسکے خلاف آواز بلند کرنا خدا کے خلاف جانا ہوتا ہے؟

8:17 PM

الطاف حسین, اللہ, اوبامہ, پاکستان, رمضان, زرداری, عامر لیاقت, عمران خان, مذہب, معاشرہ, ملا عمر, نواز شریف

پولیو کے خلاف جہاد

ہر دفعہ پولیو مہم کے ساتھ ہی خبروں  اور اعتراضات کا ایک سلسلہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ کیوں؟

خبر یہ ہے کہ کراچی میں پولیو مہم سے تعلق رکھنے والے ایک ڈاکٹر کو مار دیا گیا۔  یہ واقعہ سہراب گوٹھ کے علاقے میں موجود الآصف اسکوائرکے نزدیک  پیش آیا جہاں افغان مہاجرین اور پشتونوں کی آبادی زیادہ ہے۔ کراچی میں جن لوگوں نے ان قطروں کو پلانے سے انکار کیا ، وہ بھی عام طور پہ انہی گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ خیبر پختونخواہ میں ہی پولیو کی مہم کو سب سے زیادہ خطرات لا حق ہوتے ہیں۔ اسکی بنیادی وجہ ان گروہوں میں آگہی اور تعلیم کی کمی ہے۔

دوسری طرف اس مہم کو نہایت سنگدلی کے ساتھ مذہب اور جہاد سے جوڑ دیا گیا ہے۔  برین واشنگ اس طرح ہوتی ہے کہ چونکہ ہم کافروں کے خلاف جہاد کر رہے ہیں اس لئے وہ اس ویکسین کے ذریعے ہمیں ختم کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ویکسین کے مقابلے میں سر درد کی گولیوں سے یہ کام کرنا زیادہ آسان ہوگا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ دوسری کسی بھی دوا کو چھوڑ کر محض اس ویکسین کو پکڑ لیا گیا ہے۔ شاید یہ کہ عام طور پہ اس ویکسین کی مہم چلانے کے لئے تعلیم یافتہ لوگوں کو استعمال کیا جاتا ہے اور مخصوص عناصر نہیں چاہتے کہ تعلیم کا کوئ بھی مثبت پہلو سامنے آئے۔

 آج ہم اس تحریر میں

ویکسین

ہی پہ بات کریں گے۔

ویکسین کیا ہوتی ہے؟

ویکسین ایک ایسا مرکب ہوتا ہے جو انسانی جسم کے دفاعی نظام کو مختلف بیماریوں کے لئے بہتر بناتا ہے۔ یہ مرکب جن مختلف طریقوں سے تیار کیا جا سکتا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

نمبر ایک؛

جس بیماری کے خلاف دفاع حاصل کرنا ہو اسی کے کمزور یا مردہ جراثیم سے۔ جراثیم کو مردہ  یا کمزور کرنے کے لئے کیمیکلز، حرارت، تابکاری یا اینٹی بائیوٹکس استعمال کی جاتی ہیں۔ پولیو کی ویکسین اسی طریقے سے تیار ہوتی ہے۔

نمبر دو؛

وہ جراثیم جو زہر خارج کرتے ہیں اس زہر سے مشابہت رکھنے والے کسی مرکب سے تیار کی جاتی ہیں۔ ٹیٹنس اور کالی کھانسی کی ویکسین اسی طریقے سے تیار کی جاتی ہے۔

نمبر تین؛

 جراثیم کی بیرونی سطح پہ پائ جانے والی پروٹینز کی ساخت سے مشابہت رکھنے والے مرکبات کی مدد سے۔ ہیپاٹائٹس بی کی ویکسین اس طریقے سے تیار ہوتی ہے۔

 ویکسین بنانے کے دیگر طریقے بھی استعمال میں آ رہے ہیں جنکی تفصیل میں ہم اس وقت نہیں جا رہے۔

ویکسین انسانی جسم میں کیسے کام کرتی ہے؟

انسانی جسم میں بیماریوں کے خلاف دفاع کے لئے ایک مربوط نظام موجود ہے جسے ہم امیون سسٹم کہتے ہیں۔ یہ نظام اپنے جسمانی خلیوں کو پہچانتا ہے  لیکن جیسے ہی کوئ اور ایجنٹ جسم میں داخل ہوتا ہے جو کہ اس جسم کا نہیں ہوتا وہ اسکے خلاف حرکت میں آجاتا ہے۔ اگر جراثیم طاقتور ہوتے ہیں تو وہ اس نظام پہ حاوی ہو جاتے ہیں اور انسان کو بیمار کر دیتے ہیں اگر ان جراثیم کی تعداد ایک مخصوص مقدار سے کم ہوتی ہے یا انکا زہریلا پن کم ہوتا ہے تو جسم کا دفاعی نظام اسے زیر کر لیتا ہے اور انسان کو بیماری سے بچا لیتا ہے۔

زیادہ تر حالات میں انسان کا یہ دفاعی نظام اس ایجنٹ کو برباد کرنے کے ساتھ اسکی ساخت یاد کر لیتا ہے۔ اس طرح جب وہ جراثیم دوبارہ جسم میں داخل ہوتے ہیں تو انسانی جسم کا یہ دفاعی نظام تیزی سے ایکشن میں آتا ہے اور انہیں فی الفور ختم کر دیتا ہے۔

جب انسان نے جراثیم کے بارے میں جانا اور اسے انسانی جسم کے اس دفاعی نظام کے کام کرنے کے طریقے کے بارے میں پتہ چلا تو اس نے اس سے فائدہ اٹھانے کا سوچا۔ یوں ویکسین وجود میں آئ۔ ویکسین انسانی جسم کو بیمار ہونے سے پہلے ہی تحفظ دیتی ہے اس طرح یہ دیگر ادویات کے مقابلے میں کہیں موءثر ہوتی ہیں۔ محض معمولی سی مقدار زیادہ تر حالات میں تا عمر تحفظ دیتی ہے یا پھر ایک مخصوص عرصے کے لئے تحفظ دیتی ہے۔ زیادہ تر ویکسین سستی ہوتی ہیں۔ چونکہ ترقی یافتہ ممالک میں ہی اتنے فنڈز ہوتے ہیں کہ لوگوں کی صحت پہ خرچ کئ جا سکیں تو عام طور پہ تحقیقاتی ادارے بھی ان ملکوں میں پھیلی ہوئ بیماریوں پہ توجہ کرتے ہیں اور غریب ملکوں میں عام بیماریوں کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اس وجہ سے غریب ملکوں کی بیماریوں کے خلاف سستا علاج ڈھونڈھنا مشکل ہوتا ہے۔

پولیو ویکسین

کیا ہے؟

 انیس سو چھتیس میں فارملڈی ہائیڈ کے ذریعے پولیو جراثیم کو مردہ کر کے ویکسین بنائ گئ۔ اسے بنانے والے سائینسدان نے اسے اپنے اوپر اپنے کچھ ساتھیوں اور تین ہزار بچوں پہ آزمایا۔ ان میں سے کچھ بچوں کو اس سے الرجی ہو گئ، لیکن کسی بچے کو پولیو نہیں ہوا۔ اس لئے یہ ویکسین کامیاب نہ کہلائ جا سکی۔ کچھ اور تجربات کئے گئے جو کامیاب نہ ہوئے۔

ایک اور گروپ  نے جان اینڈر کی سربراہی میں تحقیقات کی اور اسکے نتیجے میں وہ پولیو کے جراثیم کاشت کرنے میں کامیاب ہوئے۔ جان اینڈر کو اس سلسلے میں نوبل پرائز بھی ملا۔

انیس سو باون  اور تریپن میں امریکہ میں تقریبا نوے ہزار لوگ پولیو سے متائثر ہوئے۔ جسکی وجہ سے اسکی ویکسین کی تیاری کی طرف خصوصی توجہ کی گئ۔ جو ویکسین ملی اسے پہلی دفعہ انیس سو پچاس میں ایک آٹھ سالہ لڑکے پہ آزمایا گیا۔ کامیابی کے بعد مزید انیس بچوں کو دی گئ۔  انیس سو پچپن میں اسکا اعلان کیا گیا۔

جوناس ساک، سائینسدان جس نے پہلی دفعہ انجیکشن والی پولیو ویکسین بنائ، بے غرض والدین کی بچی جس نے اپنا بازو پیش کیا نئ ویکسین کی آزمائش کے لئے

اور اب اس بیماری کا امریکہ سے خاتمہ ہوچکا ہے۔ سن دو ہزار میں چین اور آسٹریلیا سے اسکے خاتمے کا اعلان ہوا اور دو ہزار دو میں یوروپ میں اسکے خاتمے کا اعلان ہوا۔ اس کے باوجود ان تمام علاقوں میں بچوں کو پولیو کی ویکسین دی جاتی ہے۔ دنیا میں اس وقت صرف چار ملک ایسے ہیں جہاں پولیو موجود ہے ان ملکوں میں نائجیریا، افغانستان، انڈیا اور ہمارا ملک پاکستان بھی شامل ہے۔ ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں چند عناصر اسے ختم کرنے کی راہ میں حائل ہیں اور نہیں چاہتے کہ بچوں کو اس ویکسین کے قطرے ملیں۔

پولیو ویکسین دو طرح

کی ہوتی ہے۔ ایک  انجکشن کے ذریعے دی جاتی ہے اور اس میں پولیو کے مردہ جراثیم استعمال ہوتے ہیں۔ پولیو ویکسین کی دوسری صورت قطروں کی شکل میں استعمال ہوتی ہے یہ کمزور کئے گئے جراثیم سے تیار ہوتی ہے۔ اس دوسری ویکسین کو ایسے علاقوں میں دیا جاتا ہے جہاں پولیو کا وبائ مرض بننے کا امکان ہوتا ہے۔ چونکہ یہ منہ کے ذریعے دی جاتی ہے اصل بیماری پیدا کرنے والے جراثیم بھی منہ کے ذریعے داخل ہوتے ہیں اس لئے زیادہ مءوثر ہوتی ہے۔ جسم سے جب فضلہ خارج ہوتا ہے تو یہ اس فضلے میں بھی خارج ہوتے ہیں جہاں سے یہ دوسرے انسانوں کو بھی پہنچ سکتے ہیں۔ اس طرح سے انہیں بغیر ویکسینیشن کے ہی تحفظ حاصل ہو سکتا ہے۔

پولیو ویسکین کےاجزاء کیا ہوتے ہیں؟

قطروں والی ویکسین کے اجزاء اس طرح ہیں۔ بیماری کے جراثیم کی مختلف اقسام  اور ان کے علاوہ بہت کم مقدار میں اینٹی بائیوٹکس ہوتی ہیں جو عام طور پہ نیو مائسین یا اسٹرپٹو مائسین ہوتی ہیں اس میں کوئ اور محفوظ کرنے والا کیمیکل استعمال نہیں ہوتا۔

OPV is usually provided in vials containing 10-20 doses of vaccine. A single dose of oral polio vaccine (usually two drops) contains 1,000,000 infectious units of Sabin 1 (effective against PV1), 100,000 infectious units of the Sabin 2 strain, and 600,000 infectious units of Sabin 3. The vaccine contains small traces of

antibiotics

—

neomycin

and

streptomycin

—but does not contain

preservatives

.

قطروں والی ویکسین میں چند قباحتیں ہیں۔ سب سے پہلی تو یہ کہ پولیو کے نیم مردہ جراثیم اتنی طاقت حاصل کر لیں کہ تندرست جراثیم کے برابر ہو جائیں اس طرح وہ بیماری پھیلانے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ یعنی اندازاً ساڑھے سات لاکھ میں سے ایک بچہ اس کا شکار ہو سکتا ہے  اور یہ بھی ان بچوں میں ہوتا ہے جن کا دفاعی نظام کمزور ہوتا ہے یا اس میں اس بیماری کے جراثیم کے خلاف ایجنٹس بنانے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

دوسرا سب سے اہم مسئلہ اس ویکسین کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا ہوتا ہے۔ گرم ملکوں میں یہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ نیم مردہ جراثیم کی وجہ سے ویکسین کا درجہ ء حرارت کم رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔

کیا ویکسین دینے کے باوجود بچے اس بیماری کا شکار ہو سکتے ہیں؟

بعض صورتوں میں ویکسین بہت موءثر ثابت نہیں ہوتی۔ مثلاً بعض افراد میں بیماری کے جراثیم کے خلاف اینٹی باڈیز بنانے کی صلاحیت نہیں ہوتی اس لئے وہ ویکسینیشن کے باوجود بیماری کا شکار ہو سکتے ہیں۔ دوسری اہم وجہ ٹیکوں کے لگانے کے وقت یعنی ٹائم ٹیبل کا دھیان نہ رکھنا، تیسری اہم وجہ ویکسین کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے وقت انہیں ٹھنڈا رکھنے میں ناکام رہنا۔

کیا پولیو ویکسین سے بانجھ پن پیدا ہوتا ہے؟

جی نہیں پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن اس سلسلے میں نہ صرف سرٹیفیکیٹ جاری کر چکی ہے بلکہ پمفلٹس تقسیم کرا چکی ہے کہ پولیو ویکسین نہ صرف معیاری ہے بلکہ اس طرح کے کوئ امکانات نہیں ہیں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئیے کہ تمام ترقی یافتہ ممالک میں یہ ویکسین بچوں کو دی جاتی ہے کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے شہریوں کو بانجھ کر رہے ہوں دوسری طرف یہ ویکسین انیس سو پچاس کی دہائ سے دی جارہی ہیں۔ آج ساٹھ سال بعد بھی ایسی کوئ تحقیق یا مشاہدہ سامنے نہیں آ سکا۔

بانجھ پن کی دیگر متعدد وجوہات ہیں جنکی طرف یہ عناصر کام کرنے کو تیار نہیں ہوتے اور ان میں سب سے پہلی وجہ ماحولیاتی آلودگی ہے۔ کاشتکاری کے لئے فرٹیلائزرز کا استعمال، کیڑے مار ادویات یہ سب بھی تو بانجھ پن پیدا کر سکتی ہیں حتی کہ ذہنی تناءو بھی بانجھ پن پیدا کر سکتا ہے۔ انکے خلاف کیوں نہیں کوششیں ہوتیں۔

کیا پولیو ویکسین کے لئے بچوں کا خون چاہئیے ہوتا ہے؟

جی نہیں ، پاکستان میں جو ویکسین دی جاتی ہے یہ قطروں کی صورت میں ہوتی ہے اور اس کے لئے کسی بھی قسم کے انجکشن یا خون کے سیمپل کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔

  پاکستان میں بچوں کی ویکسینیشن کے لئے دو سال کی عمر تک مندرجہ ذیل چارٹ پہ عمل کیا جاتا ہے۔  پانچ سال کی عمر تک ڈی پی ٹی اور پولیو کے قطروں کا ایک بوسٹر دیا جاتا ہے۔ اسکے علاوہ بچوں کو ٹائیفائڈ کے بوسٹر بھی دئے جاتے ہیں جو ہر تین سال کے وقفے سے لگتے ہیں۔ ہیپاٹائٹس اے کے بھی ٹیکے میسر ہیں جو لگوانے چاہئیں۔

  اینٹی جن

عمر

 بی سی جی کا ٹیکہ دائیں ہاتھ پہ اوپر کی جانب جلد کے نیچے لگے گا۔ پولیو کے دو قطرے پلائے جائیں گے اور ہیپاٹائیٹس بی سے بچاءو کے انجکش بائیں ران کے گوشت میں لگیں گے۔

 پیدائش کے فوراً بعد

 پانچ بیماریوں کے خلاف ٹیکے لگیں جو اس طرح ہیں، ڈی پی ٹی کا ٹیکہ، ہیپاٹاٹئیس بی کا ٹیکہ اور ایچ آئ بی،  اسکے علاوہ پولیو ویکسین کے دو قطرے۔

 چھ ہفتوں پہ

 وہی پانچ بیماریوں کے ٹیکے جو چھ ہفتوں پہ لگائے گئے اور پولیو ویکسین کے دو قطرے۔

 دس ہفتوں پہ

 وہی پانچ بیماریوں کے ٹیکے جو پہلے لگے تھے اور پولیو ویکسین کے دو قطرے

 چودہ ہفتوں پہ

 نمونیا کا ٹیکہ جو کہ دائیں ران میں لگے گا

 چھ ہفتوں پہ

 نمونیا کا ٹیکہ بائیں ران میں لگے گا

 دس ہفتوں پہ

 نمونیا کا ٹیکہ بائیں ران میں لگے گا

 چودہ ہفتوں پہ

   خسرہ کا ٹیکہ جو الٹے ہاتھ پہ لگے گا

 نو مہینے پہ

 خسرہ کا ٹیکہ اور چکن پاکس کا ٹیکہ

 پندرہ مہینے پہ

پولیو

کے جراثیم بیمار شخص کے فضلے کے ذریعے ایک شخص سے دوسرے شخص کو پھیل سکتے ہیں۔ بالخصوص ہمارے ملک میں جہاں لوگ ہاتھ دھونے یا صفائ رکھنے سے نا آشنا ہوتے ہیں اور جہاں ایک بڑے علاقے میں بیت الخلاء کا یا سیوریج نظام کا کوئ تصور نہیں ہوتا۔ اس بیماری کے تیزی سے پھیلنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔

یاد رکھیں پولیو کی بیماری میں اگر بچہ مرنے سے بچ جائے تو بھی اسکے معذور ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ معذوری،  دماغی معذوری سے جسمانی معذوری تک کوئ بھی شکل لے سکتی ہے۔ بچہ ایسی حالت میں بھی جا سکتا ہے کہ بستر پہ کروٹ نہ لے سکے اور اپنا ہاتھ ہلا کر اپنے جسم پہ سے ایک مکھی بھی نہ ہٹا سکے۔ ایسا معذور انسان ایک خاندان کی معیشت پہ نہ صرف بوجھ ہوتا ہے بلکہ چونکہ وہ اپنی کفالت کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تو دیگر رشتے دار بھی اس میں دلچسپی نہیں لیتے۔ یہ میں آنکھوں دیکھی بتا رہی ہوں کہ کس طرح والدین بلک بلک کر دعا کرتے ہیں کہ ذہنی طور پہ معذور اولاد کو انکی زندگی ہی میں موت آجائے۔ خاص طور پہ اگر یہ اولاد لڑکی ہو تو دیگر ہزار طرح کی پیچیدگیاں کھڑی ہوتی ہیں۔

پھر کیوں نہ ہم اپنی ساری کوششیں اس بات کی طرف مرکوز رکھیں کہ ہمارے بچے صحت مند رہیں۔

بچوں کو پیدا کرنے کا فریضہ تو جانور بھی انجام دیتے ہیں لیکن انہیں صحت مند زندگی حاصل کرنے میں مدد دینا اور انکے لئے اپنے معاشرے کو محفوظ بنانا یہ عمل ایک ذمہ دار انسان ہی انجام دے سکتا ہے۔

11:15 PM

اپاہج, بانجھ پن, بچے, بیماری, پاکستان, پولیو, صحت, معاشرہ, معذور, ویکسین

ہے کون سا فرق ایسا؟

سحری، افطار، پھر عید کی تیاریاں اور ساتھ ہی ثواب کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہی رمضان کی کشش بڑھانے کو کم نہ تھا کہ اس دفعہ وینا ملک نے اپنے استغفار کا بھی اعلان کر دیا اور وہ بھی عین رمضان میں۔ ہم تو سمجھے، شاید اس لئے کہ رمضان میں ہر نیک عمل کا ثواب زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن لوگوں نے اس استغفار کے خلاف مہم چلا دی اور اب سنتے ہیں کہ یہ استغفار عوام تک نہیں پہنچ پائے گا۔ عوام تک کیا اب خدا تک بھی اسکا پہنچنا مشکل ہےیہ رمضان پیکیج تھا اب اگلے سال تک دیکھتے ہیں  کیا یہ استغفار ہو پائے گا۔ سوری وینا، ٹرائ نیکسٹ ٹائم۔

لوگ کہتے ہیں کہ شیطان کو رمضان میں بند کر دیا جاتا ہے۔ لیکن عامر لیاقت حسین کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ انہیں لوگ رمضان میں اتنا زیادہ اس لئے پسند کرتے ہیں کہ وہ شیطان کو بہت مِس کرتے ہیں۔ البتہ انکی دعا کرانے پہ لوگوں پہ گریہ کیسے طاری ہوجاتا ہے یہ معمہ حل طلب ہے۔

http://www.youtube.com/watch?v=iiyG1pSlzpo&feature=related

 مجھے عامر لیاقت سے نجانے کیوں عجیب سی مخاصمت ہے حالانکہ ان کے فتوے، فتوے کم اور لطائف زیادہ لگتے تھے۔ ایک دفعہ مجھے یاد ہے ان سے کسی نے پوچھا کہ کیا شیعوں کی سنیوں سے شادی ہو سکتی ہے۔ کہنے لگے کیوں نہیں، سین سے سنی، شین سے شیعہ اور شین سے شادی۔ کیا مسئلہ ہے بھئ۔ ان سے پہلے حروف تہجی کو فتوی کے لئے کسی نے استعمال نہیں کیا۔ لیکن اتنا پروگریسو ہونے کے باوجود جب کوئ انہیں برا کہتا ہے تو مجھے یک گونہ تسلی رہتی ہے۔

وینا کے پروگرام پہ احتجاج اور عامر لیاقت کو خوش آمدید پہ جب میں سوال کرتی ہوں تو ایک جواب آتا ہے کہ اسکی وجہ وینا کی عریاں تصاویر ہیں۔ بس یونہی خیال آیا کہ جسم کی عریانیت اور زبان کی عریانیت میں سے کون گھٹیا درجے پہ ہے؟

اس لئے شیطان کا بطور خاص اس مہینے میں بند ہوجانا میرے لئے کم از کم بڑا سوالیہ نشان رکھتا ہے۔ ہم جو کچھ اس مہینے مشاہدہ کرتے ہیں کیا وہ اس روایت پہ پورا اترتا دکھائ دیتا ہے۔ کون سا شیطان بند ہوتا ہے۔ وہ جس نے خدا کے حکم پہ آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا جسکا نام عزازیل ہے یا وہ جو ہر انسان کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور خدا کی طرح ہر لمحے اسکے ساتھ رہتا ہے اور صورت حال اس طرح رہتی ہے، اک طرف اسکا گھر اک طرف میکدہ۔ اک طرف محتسب اور اک طرف رند۔

خیر، ابھی کل ہی میں طارق روڈ پہ گاڑی پارک کرنے کی جگہ تلاش کر رہی تھی ایک جگہ ملی اسکے پاس چند سیکنڈ کو کھڑا کر کے سوچا کہ یہاں ذرا سناٹا سا ہے اس لئے مناسب نہیں لگ رہا۔ اتنے میں ایک بڑے میاں نازل ہو گئے کہ یہیں گاڑی پارک کرو۔ آگے کہیں  کروگی تو آجکل تو لوگ گاڑی کے شیشے بھی کاٹ لیتے ہیں۔ میں نے یہ سن کر گاڑی موڑی، بڑے میاں کو ناراض چھوڑا اور شاہراہ عام پہ آگئ۔ دور سہی، لیکن شیشہ کٹنے کا امکان کم ہے۔

ڈکیتیوں اور سر راہ لوٹ لینے کے واقعات میں چشم زدن میں اضافہ ہو گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ نیا ٹرینڈ یہ ہے کہ لوگ جو شاپنگ کر کے لوٹتے ہیں وہ بھی کوئ لوٹ لیتا ہے۔ چونکہ شیطان بند ہے اس لئے کم از کم اس مہینے تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب ہمارے بھائ بندوں میں سے کوئ کرتا ہے وہ بھی مسلمان۔  لیکن ان دونوں میں ہے کون سا فرق ایسا؟

یوں اس مہینے پرچون فروشوں، قصائیوں ، درزیوں، بوتیکس اور کپڑے کی دوکان والوں میں مقابلہ کرایا جائے تو ڈاکو اور چور اچکے سب سے زیادہ مصروف نظر آتے ہیں۔ یہ نہیں معلوم کہ ان میں سے شیطان کی دی ہوئ ذمہ داری کون اچھی طرح نبھاتا ہے۔

کیا واقعی شیطان بند ہوتا ہے؟ شاید نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ گوشت کی قیمت میں پہلی رمضان کو نہیں تو دوسرے دن ضرور اضافہ ہوجائے گا۔  قیمت کے اس اضافے سے دودھ اور پھل بھی متائثر ہونگے۔  یہ پیکیج شاید شیطان رمضان کی چھٹیوں سے پہلے طے کر جاتا ہے۔ شیطان، رمضان کی تیاریاں شب براءت میں شروع کرتا ہے جب ہم رات کو جاگ کر اپنے گناہ بخشوا رہے ہوتے ہیں وہ ہمارے نئے گناہوں کا نصاب تیار کر لیتا ہے۔

کیا واقعی شیطان بند ہوتا ہے؟ شاید ہاں۔ کیونکہ رمضان کی آمد کے ساتھ ہی نصیحتوں اور تبلیغ کا ایک ریلہ داخل ہوچکا ہے۔ ہر ایک اس میں بھی مصروف ہے۔ اسکا بھی بڑا ثواب ہے اور اسکا ثواب الگ جو وہ بتلا رہے ہیں۔  فیس بک وغیرہ کی آمد سے ثواب حاصل کرنا اب پہلے سے کہیں آسان ہے صرف ایک کلک پہ ثواب کا سلسلہ جاری۔ کیا لفظ کلک قرآن میں آیا ہے؟ کیا انٹر نیٹ کی پیشن گوئ اس میں موجود ہے؟ یہ سب جانے بغیر لوگ دھڑا دھر ثواب کی کلِکس کئے جا رہے ہیں۔ یہ دوڑ عین اس وقت متائثر ہوتی ہے جب شیئر کرنے کا لنک ہم جیسے شیطانوں کے پاس پہنچتا ہے۔

ان تمام نصیحتوں سے الگ جو مذہبی کتابوں کا خلاصہ نکال کر تیار کی جاتی ہیں۔ کل کی ایک نصیحت یاد آرہی ہے۔ ایک خاتون نے نصیحت کی کہ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ زندگی کو آسان کرو اگر ہر وقت مصروف رہوگے تو خدا کی عبادت کیسے کروگے۔ اگر دن میں اپنی ساری توانائ دنیا کمانے میں لگا دوگے تو رات کو تہجد کیسے پڑھوگے؟  آسان زندگی کے اس فلسفے پہ ایک بزرگ خاتون نے خاصہ احتجاج کیا۔ میں نے کہا ہمارے کراچی میں تو لوگ کاروبار شروع ہی آدھے دن کے بعد کرتے ہیں۔ یہ شاید ڈاکٹر صاحب کی نصیحت کا کمال ہے۔ توانائ دن میں نہیں رات میں خرچ ہونی چاہئیے۔

ادھر رمضان کے لئے وظائف کا چارٹ بھی تیار ہے۔ اگر انسان ان سب پہ عمل کر لے تو سال بھر کے لئے گناہوں کی آزادی صاف نظر آتی ہے۔ مثلاً تین دفعہ قل شریف پڑھ لیں ایک قرآن کا ثواب، میرے جیسے دماغ میں تو آتا ہے کہ بس سارا دن قل شریف ہی پڑھتے رہنا چاہئیے ایکدن میں کتنے ہی قرآنوں کا ثواب ملے گا جبکہ اصل کو ایک دن میں پڑھکر ختم کرنا ہی ناممکن ہوتا، ادھر رمضان میں ایک قرآن ختم کر لیں سال بھر کی تلاوت کا ثواب۔

 چونکہ رمضان میں ثواب کئ گنا بڑھ جاتا ہے اس لئے لوگ عام زندگی کی چھوٹی موٹی نیکیاں بھی رمضان کے لئے چھوڑے رکھتے ہیں۔ مثلاً زکوۃ بچا کر رکھتے ہیں کہ اس مہینے دینے کا ثواب ہے۔ ایک صاحب نے رستے میں ایک پتھر دیکھا اٹھا کر ایک طرف کرنے کا سوچا تھا ہی کے خیال آیا کہ ابھی مغرب کے بعد رمضان کے چاند کا اعلان ہو جائے تو ہٹائیں گے۔ ثواب زیادہ ہوگا۔

کیا شیطان واقعی بند ہوتا ہے؟ تو یہ اوٹ پٹانگ تحاریر کون لکھتا ہے؟

رمضان میں ایسی اوٹ پٹانگ تحاریر پڑھنے کا کوئ ثواب نہیں۔ اس لئے آپ جلدی سے اپنی تسبیح پکڑئیے اور یہ بتائیے وہ کون سا اسم یا وظیفہ ہے جسکے پڑھنے سے انسان انٹر نیٹ سے دور رہتا ہے؟ جب تک میں ایک سادہ سا حساب کر لوں وینا ملک اور عامر لیاقت میں ہے کون سا فرق ایسا؟

1:10 AM

ثواب, رمضان, روزے, صوم, عامر لیاقت حسین, قرآن, کراچی, گناہ, مذہب, وینا ملک

سوشل میڈیا: چیلوں کا میلہ

تصور کریں کہ ایک شخص جو کہ اس ملک کے کسی مضافاتی علاقے میں رہا ہو جہاں زندگی کی اشد ضرورت کی اشیاء بھی نایاب ہوں۔ جس نے کبھی کسی فائیو اسٹار ہوٹل کی شکل نہ دیکھی ہو، کبھی سگریٹ پیتی عورت سے بہ نفس نفیس ملاقات نہ کی ہو، کبھی ایک عورت کو ایک مرد سے معانقہ کرتے نہ دیکھا ہو بلکہ کسی عورت کا گھر سے باہر نکلنا ہی شدت سے برا سمجھتا ہو۔ اسے آپ اچانک ایسی تقریب میں پہنچا دیں جہاں اسکی دنیا کی یہ ساری قباحتیں موجود ہوں، جن کا اس نے زندگی میں تصور تک نہ کیا ہو۔

  مزے کی بات یہ ہے کہ تقریب کا نام تو سوشل میڈیا میلہ ہو جو پاکستان کے حوالے سے ہو۔ لیکن اس میں صرف وہ لوگ چھائے ہوں۔  جو اس ملک کے عام آدمی کی زبان نہیں بولتے۔ اسکے مسائل سے صرف اتنی دلچسپی رکھتے ہیں کہ اسے کسی اور جگہ استعمال کر کے اپنی دولت اور شہرت میں اضافہ کیا جا سکے۔ کیا یہ بے حسی، سفاکی اور خود غرضی کا دوسرا نام نہیں۔

سوشل میڈیا میلہ کے نام سے یہ تقریب کراچی میں  منعقد ہوئ۔ جس میں ایک اطلاع کے مطابق شہر کے اشرافیہ اور امریکی سفارتخانے کے عہدے داروں نے شرکت کی۔ میں اس میں نہیں گئ مجھے اس طبقے کے رنگ ڈھنگ معلوم ہیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ عام طور پہ یہ تقریبات اشرافیہ کے بیرون ملک  عہدے داروں سے تعلقات کو بڑھانے کے لئے منعقد ہوتی ہیں۔ اس میں تالیاں بجانے کا کام میں کیوں کروں؟ اس لئے اس ترغیب کے باوجود کہ اس میں اردو زبان کے حوالے سے بھی کوئ سیشن رکھاجائے گا میں نہیں گئ۔

مجھے اس چیز سے، اس منافقت سے بڑی تکلیف ہوتی ہے کہ جس سوشل میڈیا کو تبدیلی کا اہم ذریعہ سمجھا جا رہا ہے اسکے کرتا دھرتا انگریزی کے علاوہ کسی زبان کو اہمیت دینے کو تیار نہیں۔ پاکستان میں سوشل میڈیا کیوں کوئ موئثر کردار ادا کرنے سے قاصر ہے اس لئے کہ یہ سوشل نہیں ہے۔ ایک گیند مخصوص حلقوں میں گھومتی رہتی ہے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

حالانکہ ہمارے یہ کرتا دھرتا اتنے وسائل رکھتے ہیں کہ چاہتے تو گوگل کو اردو سپورٹ کے لئے مجبور کروالیتے آخیر گوگل فارسی، عربی حتی کہ تیلگو زبان تک کو سپورٹ کرتا ہے۔

یہی نہیں یہ سارے کرتا دھرتا در حقیقت دل سے یہ چاہتے ہی نہیں کہ ایک عام آدمی کو درپیش مسائل حل ہو جائیں یا وہ اسکے حل میں اپنا حصہ ڈال سکیں حالانکہ ان میں سے ہر ایک اتنی اہلیت اور وسائل رکھتا ہے کہ یہاں تبدیلی کا سیلاب آجائے۔ لیکن ایسی تبدیلی کا کیا فائدہ کہ ان میں اور عام آدمی میں برسوں کی محنت سے ٹہرایا ہوا فرق کم ہو جائے۔

 یہ اشرافیہ جن میں ہمارے دانشور بھی شامل ہیں، فکشن لکھنے والے بھی شامل ہیں اور اپنے لکھے پہ دنیا سے انعامات لینے والے بھی شامل ہیں، دستاویزی فلمیں بنانے والے بھی شامل ہیں، این جی اوز سے تعلق رکھنے والے بھی شامل ہیں۔

یہ سب لوگ، اسی عام آدمی کی وجہ سے اپنی زندگیوں میں رنگینی حاصل کرتے ہیں۔ اگر انہیں ہم اپنی زندگی کے دکھ نہ سنائیں تو یہ کون سا فکشن لکھیں گے۔ اگر ہم اپنے مسائل کو حل کرنے کی قوت حاصل کر پائیں تو یہ انہیں دور کرنے کے لئے کہاں سے غیر ملکی امداد حاصل کریں گے۔ ہم اور ہماری تکلیفیں انکے لئے خوش قسمتی کے دروازے کھول دیتی ہیں لیکن اس کے باوجود جب یہ ہمارے سامنے کبھی اتفاقاً آکر کھڑے ہوتے ہیں تو یہ کیوں اس بات کی علامت بنے رہتے ہیں کہ یہ ہم میں سے نہیں۔ البتہ یہ ہمارے مسائل کے حل کے لئے کوشاں ضرور ہیں۔ کتنے عظیم لوگ ہیں جو ہم بے چاروں کو شعور دینا چاہتے ہیں، ہمیں ایک آسان زندگی دینا چاہتے ہیں، ہمیں بنیادی انسانی حقوق دلوانا چاہتے ہیں لیکن ان کا ہم سے کوئ تعلق نہیں ہے۔ وہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں یہ ان کا ہم پہ اور اس معاشرے پہ احسان ہے۔

ایسی تقریبات میں جان بوجھ کر پیدا کیا جانے والا طبقاتی فرق مجھے انتہائ مکروہ لگتا ہے۔ مجھے ذاتی طور پہ نہ بغیر آستین کے کپڑوں سےخار ہے۔ اگر میرا رنگ خوب سفید ہوتا تو شاید میں بھی کبھی کبھار پہن لیتی۔ نہ ہی مجھے خواتین کا سگریٹ پینا عجیب لگتا ہے دیہاتی عورتیں بھی پیتی ہیں، حتی کہ میں ان عورتوں اور مردوں کو بھی نظر انداز کر دیتی ہوں جو ایکدوسرے کو خوش آمدید کہنے کے لئے معانقہ کرتے ہیں۔ یہاں دیہاتوں میں عورت اور مرد مصافحہ کرتے ہیں۔

لیکن مجھے اس چیز پہ حیرت ہوتی ہے کہ اسی معاشرے میں جہاں ایک انتہا یہ ہوتی ہے کہ عورت دس گز کے برقعے میں بھی باہر نہیں نکل سکتی وہاں دوسری انتہا یہ ہوتی ہے کہ خواتین سگریٹ ہاتھ میں دبائے، کھلے ڈلے کپڑے پہنے کسی مرد سے گلے مل رہی ہوتی ہیں۔ خواتین کے اس انداز پہ بھی مجھے اعتراض نہیں۔ ایک شخص اپنے لئے جو چاہے پسند کرے۔ اپنی ذاتی زندگی جیسے چاہے گذارے۔  لیکن طرہ یہ ہوتا ہے کہ یہ خواتین اس ملک کی پسی ہوئ خواتین کے حقوق کی بات کرتی ہیں۔ ایک عام آدمی لازماً یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ ہماری عورت جب دس گز کے برقعے سے باہر نکلے گی تو یہ عورت بن جائے گی۔ یہ عورت جو اسکے نزدیک بے حیاء عورت ہے۔ اس سے انکے کاز کو کوئ فائدہ نہیں پہنچتا۔ سوائے اسکے کہ انکا یہ لباس طبقاتی فرق کو قائم رکھنے میں معاون ہوتا ہے وہ کسی بھی مثبت مقصد کے لئے ایک رول ماڈل نہیں بنتیں۔ ایک ایسا رول ماڈل جسے دیکھ کر ایک کمزور عورت یہ سوچے کہ اگر میں کوشش کروں تو ایسی عورت بن سکتی ہوں، ایسی زبردست صلاحیتوں والی عورت۔ البتہ یہ کہ وہ اپنے سر کا اسکارف اور کس کے باندھ لیتی ہے۔

اس جگہ پہ آ کر ہمیں اپنی سرحد متعین کرنی پڑے گی۔ کیا ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس ملک کی عورتیں تعلیم حاصل کریں، معاشی استحکام حاصل کریں، اپنی زندگی پہ اپنا اختیار حاصل کریں، اپنے فیصلے خود کرنے کی قوت حاصل کریں۔ صحت حاصل کریں، بچے کتنے پیدا کریں گی یہ حق حاصل کریں، یا ہم یہ چاہتے ہیں کہ وہ سگریٹ۔ پیئیں، شراب پیئیں، کم کپڑے پہنیں، مردوں کے برابر اس طرح ہوں کہ انکے گال چومیں یا گلے لگیں۔

اسی طرح کیا ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس ملک میں معیاری اور بنیادی تعلیم سب کا حق ہو یا ہم یہ چاہتے ہیں کہ چونکہ ہم بہتر معاشی حالت رکھتے ہیں اس لئے ہمارے بچے تو معیاری تعلیم حاصل کر لیں لیکن جو نہیں کر سکتے ہیں ہم انکا مذاق اڑائیں۔ حالانکہ انکا نہ کر پانا اس فرسودہ نظام کی وجہ سے ہے جسکی وجہ سے ہم مضبوط اور وہ کمزور ہیں۔ ہم خود ہی اس ملک میں کئ طرح کے تعلیمی طبقات بنائیں۔ کسی کواردو میڈیئم گورنمنٹ کے ناکارہ اسکول دیں کسی کو انگلش میڈیئم اعلی اسکول عنایت کریں۔ اور پھر اردو میڈیئم کو حقارت سے دیکھیں اور ان سے دور خود صرف اس لئے اڑے اڑے پھریں کہ انگلش بول سکتے ہیں لکھ سکتے ہیں چاہے اسکے علاوہ ککھ نہ جانتے ہوں۔

اسی طرح بحیثیئت ایک لبرل پاکستانی کیا ہم اس ملک میں اس بات کی آزادی کے خواہشمند ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے مذہب پہ آزادی سے عمل کر سکے، بلا تفریق، مذہب، جنس، زبان، اور نسل کے ہم میں سے ہر ایک کو تعلیم کا اور صحت کا حق حاصل ہو، ہم میں سے ہر ایک کے  پاس با عزت روزگار ہو، ملک کا قانون ہر ایک شہری کو برابر کی نظر سے دیکھے اور اس کے فیصلوں پہ عمل در آمد ہو، ہر شہری کی جان ، مال اور عزت محفوظ ہو۔ ہم دنیا میں دہشت گرد ملک کے طور پہ نہ پہچانے جائیں، ہمارے لوگ خود کو بموں سے نہ اڑائیں ہم بات بے بات جان لینے اور جان دینے پہ نہ تیار رہیں۔ ہمارے یہاں درجنوں لوگ روزانہ بے گناہ تاریک راہوں میں نہ جان گنوائیں۔ ہماری عورتوں کے ساتھ اجتماعی زیادتی نہ ہو۔ ایک عورت کو باہر نکلنے ، چلنے پھرنے زندگی برتنے کی آزادی ہو۔ یا ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں بس شراب پینے کی آزادی ہو۔

ہمارے اس طبقے کو جو انگریزی بولتا ہے سمجھتا ہے اور انگریزی میں اظہار کرنا پسند کرتا ہے اورمزید یہ کہ اپنے آپکو دانشور سمجھتا ہے، سمجھتا ہے کہ مسائل کی وجوہات اور صحیح حل اسے معلوم ہیں۔ اسے یہ بھی تو طے کرنا چاہئیے کہ آخر انکا کاز درحقیقت ہے کیا۔

اب وقت آگیا ہے کہ ہمارے ملک میں تبدیلی کا ڈھول پیٹنے والے سوچیں کہ دراصل وہ  کیا چاہتے ہیں؟

بہرحال انکے چاہنے سے الگ، سوشل میڈیا کسی کے اشاروں پہ نہیں چل سکتا۔ یہ عام آدمی سے چلتا ہے اور اگر کوئ اسے اپنے اشاروں پہ چلانا چاہتا ہے تو اسے عوامی بننا پڑے گا۔ یہی دیوار کا لکھا ہے۔

1:39 AM

اردو, انگریزی, بلاگنگ, پاکستان, خواتین, سوشل میڈیا, قانون, لبرل, مذہب

دروازہ پچکاں

بلوچستان میں معدنیات کی ایک کان پہ جانے کا اتفاق ہوا تو بہت ساری دلچسپ باتوں کا اندازہ ہوا۔  بلوچستان کا زیادہ تر علاقہ پہاڑوں پہ مشتمل ہے وہ بھی بنجر پہاڑ۔ ان پہاڑوں کو دیکھ کر خیال کیا جا سکتا ہے کہ یہ کسی زمانے میں سمندر کے پانی سے ڈھکے ہوئے تھے اور جب یہ پانی غائب ہوا تو سمندر میں پوشیدہ یہ پہاڑ ظاہر ہو گئے۔ یہ کام ہزاروں سال پہلے ہوا ہوگا۔ اب یہ بظاہر بنجر پہاڑ، اپنےاندر خزانوں کو چھپائے ہوئے ہیں۔ یہ خزانے  پر اسرار تو نہیں  لیکن لگتا ہے کہ ان پہ کسی آسیب کا سایہ ہے۔ یہ آسیب ان خزانوں کو باہر آنے نہیں دیتا ، دروازہ بند رکھتا ہے اور اسکا پہرہ دار ہے۔

ہمارے بلوچ ساتھی نے ہمیں معلومات دیں کہ اس علاقے میں لوہا، تانبا، بیریئم اور دیگر دھاتوں کے ذخائر پائے جاتے ہیں۔ ہم نے جب انٹر نیٹ کی طرف توجہ کی تو

پتہ چلا

کہ لوہا، تانبا، کرومیئم، بیرائٹ، فلورائیٹ اور مختلف طرح کے سنگ مر مر ہی نہیں سونا بھی یہاں سے نکالا جاتا ہے۔

   سونا جیسی زمین نہیں بلکہ سونے کی کانیں بھی بلوچستان میں موجود ہیں۔ یہ سونا ایک چینی کمپنی نکال رہی ہے۔ سونا،  تانبے کے ذخائر کے ساتھ عام طور سے ملتا ہے۔ سونے اور تانبے کے یہ ذخائر،

ریکو ڈک

جوکہ ایک چھوٹآ سا قصبہ ہے چاغی ڈسٹرکٹ ، بلوچستان میں پائے جاتے ہیں۔

 ہم جس علاقے میں موجود تھے یہ بیلہ کے قریب ہے۔ یہاں سے ماربل کی بڑی مقدار نکالی جا رہی ہے۔ ہمارے بلوچ ساتھی نے جن کا نام ہم انیس بلوچ فرض کر لیتے ہیں ہمیں بتایا کہ وہ علاقے جو سمندر کے ساتھ ہیں وہاں عام طور پہ ماربل نہیں ہوتا ، جو ہوتا ہے وہ اچھے معیار کا نہیں ہوتا۔ سمندر کا پانی اسے خراب کر دیتا ہے۔ ادھر بیلہ کی طرف اس کے بقول زیر زمین قدرتی گیس پائ جاتی ہے جو کہ زیادہ تر ماربل کی چٹانوں کو پھاڑ دیتی ہے۔ جس سے ماربل کا معیار اچھا نہیں رہتا۔

چٹان کی پھٹی ہوئ تہیں

انیس نے ہمیں مزید بتایا کہ ماربل کی  کانوں سے پیداوار اتنی اچھی حاصل نہیں ہو پاتی کیونکہ ہمارے پاس ماربل کی کان کنی کے لئے جدید مشینیں موجود نہیں ہیں۔ عام طور پہ چٹانوں کو توڑنے کے لئے ڈائینامائیٹ استعمال ہوتا ہے جس سے چٹان تباہ ہو جاتی ہے اور بڑے سائز کا پتھر نہیں ملتا۔ انیس بلوچ کا کہنا تھا کہ تقریباً پچھتر فی صد پیداوار تباہ ہوجاتی ہے جبکہ باہر کے ممالک میں یہ تناسب نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔

مشینیں کیوں نہیں ہیں، جبکہ بلوچستان کو قدرتی وسائل سے مالا مال زمین سمجھا جاتا ہے۔ انیس کا کہنا تھا کہ حکومت زراعت کے لئے قرضہ دیتی ہے لیکن معدنیات کے لئے نہیں۔ لوگ اپنے طور پہ کام کرتے ہیں اور یہ بھاری بھرکم مشینیں نہیں خریدسکتے۔

حکومت کیوں ایسے قوانین نہیں بناتی کہ معدنیات کے لئے بھی قرضہ فراہم کیا جائے۔ اس پہ انیس بلوچ نے ہنستے ہوئے کہا یہ حکومت کہاں ہے یہ تو قبضہ گروپ ہے۔ ابھی ادھر زہری کی جو کانیں ہیں ، زرداری کی کوشش ہے کہ اس پہ اس کا قبضہ ہوجائے۔

یہ تو تھے ایک بلوچ کے خیالات۔ میرے خیال سے تو سرداری نظام ہر چیز پہ حاوی ہے۔ یہ کانیں سردار کی مرضی کے بغیر کوئ استعمال نہیں کر سکتا۔

سارا دن پہاڑ پہ ایک گرم دن اس طرح گذارا کہ لو چل رہی تھی اور ہم چٹائیوں سے بنے ایک شیڈ کے نیچے چٹائیوں پہ بیٹھے ہوئے تھے۔ کان پہ زیادہ تر مزدور پٹھان اور انتظامیہ سرائکی اور بلوچ تھی۔

دن کے تین بجے تک اس بات کے قوی امکان پیدا ہو چلے تھے کہ ہمیں لو لگ جائے گی۔ تب ہمارے میزبان ہمیں قریب واقع ایک چشمے پہ لے گئے۔ یہ جگہ درختوں سے گھری ہوئ تھی۔ زمین سے مختلف سمتوں سے پانی رس رس کر جمع ہورہا تھا اور اس نے ایک نالے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہ چشمہ چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد زمین میں غائب ہو رہا تھا۔

چشمے کا پانی یہاں زمین میں غائب ہو رہا ہے

 صاف ستھرے اس پانی کو ہم نے پینے کی بھی جراءت کی۔ اگرچہ اس میں کائ کی مہک شامل تھی اور اسکے ارد گرد بن جانے والے جوہڑوں میں مینڈک بھی موجود تھے۔  لوگوں نے بالخصوص بچوں نے اس میں اشنان کرنے کی سعی بھی کی۔ اپنی اس کوشش میں وہ اس حد تک کامیاب رہے کہ پانی میں پاءوں پھیلا کر لیٹ گئے۔ اشنان اس لئے کہ غسل میں میرا خیال ہے زیادہ پانی خرچ ہوتا ہے۔

اگر کائ کی مہک نہ ہو تو اس پانی کا کاروبار بھی کیا جا سکتا ہے۔ میں نے سوچا۔ ماں کے دودھ جیسا خالص پانی، ایک بلوچ محاورہ ہے۔ بلوچستان میں پینے کا پانی اہمیت رکھتا ہے کہ یہاں میٹھے پانی کا کال ہے۔

بہر حال پہاڑوں پہ بادل گرجنے کی ہلکی سی آواز آئ تو ہم نے اپنا ڈیرہ سمیٹا کہ ان علاقوں میں سیلابی پانی انتہائ تیزرفتاری سے کسی بھی وقت دھاوا بول سکتا ہے اور اس میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ کسی گاڑی کو اپنے ہمراہ لے جائے۔ ابھی ہم کچے میں ہی تھے موبائل فون بجا۔ اطلاع ملی کہ اس کان پہ بارش ہو گئ جہاں ہم ابھی ایک گھنٹہ پہلے موجود تھے۔  موسم بہتر ہو چلا تھا۔

وہاں سے واپسی پہ ایک گاءوں کے نزدیک ایک

ہوائ چکی

دیکھی یعنی ونڈ مل جسکے ساتھ عورتیں کپڑے دھو رہی تھیں۔ معلوم ہوا کہ مشرف کے دور میں یہ پن چکی یہاں لگائ گئ تھی۔ جسکی مدد سے کنویں سے پانی نکالا جاتا ہے۔

 انیس بلوچ کے خیال میں مشرف کی پالیسی معدنیات کے حوالے سے اچھی تھیں۔ اس کے دور میں اس سمت میں کام بھی ہوا لیکن اب کوئ پرسان حال نہیں۔

 اوتھل کے قریب جب ہم ایک دوکان سے پانی لے رہے تھے ایک عورت گاڑی کے نزدیک آکر بھیک مانگنے لگی۔ یہ ایک سرائکی عورت لگ رہی تھی۔ وہیں پہ ایک صاحب دوکان پہ کھڑے باتیں کر رہے تھے خالص کارخانے دار دہلوی انداز میں۔

اور گاڑی میں مشعل، دیگر بلوچی بچوں کو بتا رہی تھی کہ اسے بلوچی آتی ہے۔ پھر اس نے ایک جملہ بول کر دکھایا بلوچی لب و لہجے میں۔ دروازہ پچکاں۔ ہمارے ساتھیوں نے اسے داد دی اور ان میں سے کسی نے پوچھا، تمہیں اسکے مطلب پتہ ہیں۔ اس نے کہا، ہاں دروازہ کھول دو۔

بلوچستان کی  بھی اس وقت یہی آواز ہے، دروازہ پچکاں۔ دروازہ کھول دو ترقی کی طرف، آگہی کی طرف۔

1:17 AM

بلوچستان, چاغی, چین, ریکو ڈک, سونا, صنعت, ماربل, مشرف, معدنیات, ہوائ چکی

جرمنز کا پاکستانی وزیر سے مذاق

ہوا تو کچھ خاص نہیں ، میرا مطلب  پاکستان میں ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں اور دنیا نے جب سے انٹر نیٹ جیسا چوپال بنایا ہے یہاں کوئ خبر محدود نہیں رہتی۔ حتی کہ یہ لوگوں کے بیڈ رومز ہی نہیں بیت الخلاء کی خبریں نکال لاتی ہے۔

کہا یہ جارہا ہے

کہ ہماری ایک وفاقی وزیر نے جب اپنےفضلے میں ایک ثابت دوا کی گولی پائ تو انہیں نہایت تشویش ہوئ کہ یہ دوا کی گولی جو انہوں نے کھائ تھی، پورے نظام انہضام سے گذر کر کیسے ثابت نکل آئ۔ اس کا مطلب اس گولی کے ساتھ کچھ مسئلہ ہے۔ اپنی منسٹری کے ماتحت چلنے والے دواءوں کی ریگولیشن کے ادارے اور شاید  اس دوا کی مستقل ضرورت کی وجہ سے انہوں نے فوری تحقیقات کا حکم دے دیا۔

ایک شکایت نامہ متعلقہ ادارے کو بھیجا گیا۔ کوالٹی کنٹرول کے چیئرمین  نے آرڈرز جاری کئے جسے وصول کرتے ہی ڈرگ انسپکڑز کراچی اور اسلام آباد میں اس دوا کے سیمپل جمع کرنے دوڑے۔

خیر جناب،  یہ دوا جو کہ کتھئ رنگ کی تہہ چڑھی ہوئ ایک گولی ہے اور اسکے ایک طرف  '

عدالت تیس

' لکھا ہوتا ہے ایک جرمن کمپنی تیار کرتی ہے اور یہ ہائ بلڈ پریشر یا انجائینا کی تکلیف میں استعمال ہوتی ہے جب لیبارٹری پہنچی تو وہاں موجود تجزیہ کار کو خاصہ صدمہ ہوا  کہ کسی نے بھی یہ دیکھنے کی زحمت نہیں کی کہ اس گولی میں دوا کا ایکٹو جز یعنی

نیفےڈیپن

اس خول میں ایک لیزر سے کئے ہوئے سوراخ میں موجود ہوتا ہے۔ یہ دوا اس سوراخ میں سے نکل جاتی ہے لیکن خول ویسے کا ویسا ہی فضلے میں آجاتا ہے۔

 اس گولی کے بنانے والوں نے تو بڑی دماغی عرق ریزی کے بعد اسےاس طرح تیار کیا تاکہ یہ دوا جسم میں اس طرح خارج  ہوکہ اخراج قابو میں رہے اور دیر تک ہوتا رہے۔ لیکن یہی چیز ہمارے یہاں تشویش پھیلانے کا سبب بن گئ۔

بس لیزر سے کئے گئے اس سوراخ نے یہ سارا وبال کھڑا کر دیا حالانکہ اس دوا کے ساتھ موجود اطلاعی پرچے میں بھی لکھا ہوا ہے کہ اسے لیزر سوراخ میں داخل کیا گیا ہے۔ کسی نے نہ وہ اطلاعی پرچہ پڑھا اگر پڑھا تو سمجھا نہیں اور نہ ہی انٹر نیٹ کے اس زمانے میں کسی نے ایک بٹن دبا کر اسکی خصوصیات جاننے کی کوشش کی۔ یوں جرمنز کی بنی ہوئ اس دوا نے وزیر صاحبہ کے گھر بلکہ بیت الخلاء سے لیبارٹری تک کا سفر طے کر ڈالا۔

اب سازشی لوگ تو کہہ رہے ہیں کہ یہ وزیر صاحبہ کیسے اس وزارت کو چلا رہی ہیں وہی نہیں بلکہ کنٹرول یونٹ کے چیئر مین اور دیگرانسپکٹرز بھی اتنے ہی جاہل نکلے۔ یہ دوا مارکیٹ میں دس سال سے موجود ہے اور انہیں یہ تک معلوم نہ تھا کہ یہ کیسے عمل کرتی ہے۔

 لیکن جرمنز کا کیا ہوا یہ مذاق ہمیں بالکل پسند نہیں آیا۔

11:38 AM

، کراچی, اسلام آباد, پاکستان, جرمن, عدالت تیس, فارمسسٹ, فارمسیوٹیکل کمپنیز, کوالٹی کنٹرول, لیزر, نیفےڈیپن

افواج پاکستان کا خرچہ

دی گارڈیئن نے ایک رپورٹ دی ہے جس میں تمام دنیا کے ممالک کے اپنی افواج پہ آنےوالے خرچے کا تناسب دیا گیا ہے۔ یہ تناسب اس ملک کے جی ڈی پی کے فی صد سے نکالا گیا ہے۔ اور اسے دیکھ کر مجھے تھوڑی سی حیرانی ہوئ۔ یعنی جی ڈی پی کے حساب سے سب زیادہ خرچ کرنے والا ملک بھلا کون ہے؟ نہ ہم اور نہ امریکہ بلکہ سعودی عریبیہ کو یہ اعزاز حاصل ہوا سعودی عرب اپنے جی ڈی پی کا دس اعشاریہ ایک اپنی افواج پہ خرچ کرتا ہے۔  سعودی عرب کے بعد عمان اور متحدہ عرب امارات آتے ہیں  جو بالترتیب آٹھ اعشاریہ پانچ اور چھ اعشاریہ نو فی صد خرچ کرتے ہیں جبکہ اسرائیل چھ اعشاریہ پانچ خرچ کرتا ہے۔  اسکے بعد امریکہ صاحب بہادر آتے ہیں جو چار اعشاریہ آٹھ خرچ کرتا ہے۔

حیرت انگیز طور پہ پاکستان صرف دو اعشاریہ آٹھ خرچ کرتا ہے جبکہ انڈیا دو اعشاریہ سات خرچ کرتا ہے۔ افغانستان جیسا غریب، بد حال ملک بھی  پاکستان سے زیادہ خرچ کرتا ہے یعنی تین اعشاریہ سات فی صد۔ ہائیں تو یہ پاکستانی فوج کو کس نے بدنام کیا ہوا ہے کہ ملکی بجٹ کا سفید ہاتھی ہے۔ کچھ کا کہنا ہے کہ افواج پاکستان کی اصل کمائ تو سلالہ ڈیل جیسی ڈیلوں میں ہوتی ہے۔

خیر جہاں یہ حیرانی ہوئ کہ دراصل

پاکستان اپنی افواج

پہ اتنا خرچ نہیں کرتا جتنا پروپیگینڈہ ہے وہاں یہ بھی حیرانی بھی ہے کہ سعودی عرب، عمان اور متحدہ امارات کس لئے اپنی افواج پہ اتنا خرچ کرتے ہیں۔ اگر اسکی وجہ اسرائیل ہے تو یاد رہے کہ اسرائیل سعودی عرب اور عمان کے مقابلے میں خاصہ کم کرتا ہے۔

یہ ڈیٹا جاری کیا ہے

اسٹاک ہوم پیس انٹرنیشنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

نے۔

مزید تفصیل کے لئے

یہ لنک

دیکھئیے۔

Military spending by country

All prices in $m, 2010 prices unless otherwise stated. Click heading to sort table.

Download this data

Country

▴

1988

2010

2011

2011 current prices

% of GDP, 1988

% of GDP, 2010

SOURCE:

SIPRI

Figures are in US $m., at constant 2010 prices and exchange rates, except for the last figure, which is in US$m. at 2011 prices and exchange rates

". ." = data unavailable. "Blank" = country did not exist or was not independent during all or part of the year in question

Afghanistan

. .

576

781

878

. .

3.8

Albania

. .

190

185

197

5.6

1.6

Algeria

672

5,671

8,170

8,665

1.7

3.6

Angola

. .

3,501

3,281

3,647

. .

4.2

Argentina

4,397

3,476

3,167

3,295

2.0

0.9

Armenia

395

384

414

4.2

Australia

13,228

23,221

22,955

26,706

2.1

1.9

Austria

3,285

3,513

3,305

3,589

1.3

0.9

Azerbaijan

1,476

2,794

3,104

2.9

Bahrain

243

776

883

878

5.0

3.4

Bangladesh

456

1,298

1,367

1,436

1.0

1.1

Belarus

768

709

598

1.4

Belgium

7,939

5,233

5,136

5,593

2.6

1.1

Belize

5

15

15

16

1.0

1.1

Benin

69

. .

. .

. .

2.3

. .

Bolivia

. .

328

316

352

. .

1.7

Bosnia-Herzegovina

220

226

246

1.2

Botswana

193

352

344

371

4.9

2.4

Brazil

19,902

34,384

31,576

35,360

2.1

1.6

Brunei

349

391

373

414

6.6

3.2

Bulgaria

. .

894

722

790

. .

1.9

Burkina Faso

57

124

129

139

1.9

1.3

Burundi

44

. .

. .

. .

3.1

. .

Cambodia

66

175

177

192

1.3

1.6

Cameroon

197

354

321

347

1.3

1.6

Canada

19,339

23,109

23,082

24,659

2.0

1.5

Cape Verde

11

8

9

10

1.9

0.5

Central African Rep.

. .

52

. .

. .

. .

2.6

Chad

. .

226

226

242

. .

2.7

Chile

2,913

6,579

7,392

8,040

5.0

3.2

China, P. R.

. .

121,064

129,272

142,859

. .

2.1

Colombia

2,177

10,422

10,290

10,957

1.5

3.6

Congo

. .

134

. .

. .

. .

1.1

Congo, Dem. Rep.

. .

184

211

239

. .

1.3

Costa Rica

0

0

0

0

0.0

0.0

Croatia

1,016

1,037

1,091

1.7

Cuba

. .

. .

. .

. .

. .

. .

Cyprus

525

478

494

537

5.7

2.1

Czech Rep.

2,498

2,254

2,479

1.3

Czechoslovakia

7,678

. .

Côte d’Ivoire

185

388

325

357

1.2

1.6

Denmark

4,519

4,504

4,515

4,859

2.1

1.5

Djibouti

70

. .

. .

. .

7.0

. .

Dominican Rep.

141

359

325

341

0.9

0.7

Ecuador

420

2,094

2,209

2,308

2.0

3.6

Egypt

5,246

4,289

4,107

4,285

6.5

2.0

El Salvador

552

224

211

222

7.7

1.1

Equatorial Guinea

. .

. .

. .

. .

. .

. .

Eritrea

. .

. .

. .

. .

Estonia

330

336

371

1.7

Ethiopia

563

298

286

328

8.1

0.9

Fiji

43

51

. .

. .

2.2

1.6

Finland

2,515

3,400

3,656

3,978

1.6

1.4

France

65,266

59,098

58,244

62,535

3.6

2.3

Gabon

. .

125

. .

. .

. .

0.9

Gambia

2

. .

. .

. .

0.9

. .

Georgia

454

371

426

3.9

German DR

10,804

. .

Germany

63,629

45,075

43,478

46,745

2.9

1.4

Ghana

26

125

96

98

0.3

0.4

Greece

6,968

7,162

7,502

8,155

4.2

2.3

Guatemala

349

170

182

200

0.4

Guinea

. .

. .

. .

. .

. .

. .

Guinea-Bissau

. .

. .

. .

. .

. .

. .

Guyana

4

29

28

30

2.0

2.1

Haiti

8

0

0

0

0.1

0.0

Honduras

. .

170

170

185

. .

1.1

Hungary

4,262

1,351

1,287

1,385

3.8

1.0

Iceland

0

. .

. .

. .

0.0

. .

India

16,705

46,086

44,282

48,889

3.6

2.7

Indonesia

1,405

4,663

5,220

5,709

0.9

0.7

Iran

1,776

. .

. .

. .

2.0

. .

Iraq

. .

3,581

5,568

5,845

. .

2.4

Ireland

774

1,274

1,207

1,302

1.2

0.6

Israel

12,659

14,242

15,209

16,446

15.6

6.5

Italy

35,274

35,532

31,946

34,501

2.3

1.7

Jamaica

. .

106

. .

. .

. .

0.8

Japan

46,447

54,641

54,529

59,327

1.0

1.0

Jordan

966

1,367

1,310

1,368

9.4

5.0

Kazakhstan

1,502

1,648

1,794

1.1

Kenya

853

603

507

516

2.9

1.9

Korea, North

. .

. .

. .

. .

. .

. .

Korea, South

13,262

27,572

28,280

30,799

4.5

2.7

Kuwait

3,361

4,715

5,178

5,640

8.2

3.6

Kyrgyzstan

202

. .

. .

4.4

Laos

. .

16

. .

. .

. .

0.3

Latvia

260

267

295

1.1

Lebanon

278

1,633

1,657

1,754

1.2

4.2

Lesotho

29

71

54

57

3.8

3.1

Liberia

. .

8

. .

. .

2.4

0.9

Libya

. .

. .

. .

. .

. .

. .

Lithuania

410

405

444

1.1

Luxembourg

173

. .

. .

. .

1.1

. .

Macedonia, FYR

130

121

132

1.4

Madagascar

66

57

64

72

1.3

0.7

Malawi

21

. .

. .

. .

1.5

. .

Malaysia

1,293

3,859

4,223

4,587

2.4

1.6

Mali

55

177

180

194

2.2

1.9

Malta

40

59

59

64

1.2

0.7

Mauritania

48

. .

. .

. .

4.5

. .

Mauritius

9

14

9

10

0.2

0.1

Mexico

2,284

5,414

5,723

6,022

0.5

0.5

Moldova

18

18

21

0.3

Mongolia

. .

55

70

81

6.3

1.1

Montenegro

75

80

88

1.9

Morocco

1,734

3,161

3,186

3,342

4.1

3.5

Mozambique

72

. .

. .

. .

5.3

. .

Myanmar

. .

. .

. .

. .

2.1

. .

Namibia

397

403

427

3.9

Nepal

60

255

241

259

0.9

1.4

Netherlands

12,850

11,277

10,945

11,781

2.8

1.4

New Zealand

1,797

1,606

1,566

1,792

2.0

1.2

Nicaragua

. .

44

53

55

. .

0.7

Niger

. .

47

. .

. .

. .

0.9

Nigeria

543

1,990

2,215

2,410

0.8

1.0

Norway

5,221

6,390

7,083

7,744

2.9

1.5

Oman

2,397

4,895

4,074

4,291

18.3

8.5

Pakistan

3,657

5,661

5,685

6,282

6.2

2.8

Panama

150

0

0

0

2.1

0.0

Papua New Guinea

77

42

49

61

1.3

0.4

Paraguay

. .

154

206

250

. .

0.9

Peru

. .

1,958

1,978

2,098

. .

1.3

Philippines

1,959

2,438

2,225

2,417

2.5

1.2

Poland

7,982

8,781

9,149

9,705

2.5

1.9

Portugal

3,346

4,821

4,285

4,670

2.7

2.1

Qatar

. .

. .

. .

. .

. .

. .

Romania

8,966

2,086

1,945

2,145

4.3

1.3

Russia

331,111

58,644

64,123

71,853

15.8

3.9

Rwanda

41

74

74

75

1.6

1.3

Saudi Arabia

19,743

45,245

46,219

48,531

15.2

10.1

Senegal

111

200

. .

. .

2.0

1.6

Serbia

845

805

949

2.2

Seychelles

15

9

9

9

4.3

1.3

Sierra Leone

8

25

24

26

0.7

1.2

Singapore

2,622

8,323

8,302

9,475

4.8

3.7

Slovak Rep.

1,130

968

1,058

1.3

Slovenia

772

668

715

1.6

Somalia

. .

. .

. .

. .

. .

. .

South Africa

6,335

4,631

4,827

5,108

4.0

1.3

South Sudan

. .

. .

597

. .

Spain

14,611

14,744

13,984

15,178

2.0

1.0

Sri Lanka

434

1,500

1,403

1,557

2.4

3.0

Sudan

847

. .

. .

. .

3.6

. .

Swaziland

16

124

115

123

1.1

3.0

Sweden

7,155

5,886

5,960

6,811

2.6

1.3

Switzerland

6,602

4,115

4,618

5,436

1.7

0.8

Syria

1,168

2,346

2,490

2,495

7.3

4.1

Taiwan

8,474

9,067

8,888

9,717

5.0

2.1

Tajikistan

. .

. .

. .

. .

Tanzania

100

250

253

255

1.4

1.2

Thailand

3,170

4,846

5,114

5,521

2.9

1.5

Timor Leste

31

24

27

4.9

Togo

65

57

55

59

3.1

1.7

Trinidad & Tobago

. .

. .

. .

. .

. .

. .

Tunisia

347

563

583

614

2.3

1.4

Turkey

9,918

17,649

18,687

17,871

2.9

2.4

Turkmenistan

. .

. .

. .

. .

UAE

. .

16,062

. .

. .

. .

6.9

UK

53,751

58,099

57,875

62,685

4.1

2.6

USA

540,415

698,281

689,591

711,421

5.7

4.8

Uganda

69

280

247

253

2.5

1.6

Ukraine

3,710

3,747

4,078

2.7

Uruguay

833

788

803

902

3.2

2.0

Uzbekistan

. .

. .

. .

. .

Venezuela

. .

3,363

3,115

2,385

. .

0.9

Viet Nam

840

2,672

2,487

2,675

7.1

2.5

World total

1,511,141

1,622,888

1,624,506

1,727,513

Yemen

. .

. .

. .

. .

Yemen, North

702

. .

Yemen, South

. .

. .

Yugoslavia (former)

. .

. .

Zambia

317

276

285

306

2.4

1.7

Zimbabwe

198

98

147

153

5.0

1.3

11:44 PM

افواج, امریکہ, بجٹ, بین الاقوامی, پاکستان, خرچہ, دی گارڈیئن, فہرست, ممالک

خوشدلی کے راستے

میں فرسٹ ایئر آنرز کی اسٹوڈنٹ تھی جب وہ میرے پاس آیا۔ وہ اس وقت آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا اور خاصہ ذہین۔ نہ صرف ذہین بلکہ شریر بھی تھا۔ وہ اکیلا نہیں آیا تھا بلکہ اسکے ساتھ ایک بہن اور دو بھائ بھی  تھے۔ وہ ان میں سب سے بڑا تھا۔ باقی بہن بھائ بھی اچھے ذہین بچے تھے۔ یہ سب مجھ سے ٹیوشن پڑھنے آتے تھے۔ ذہین بچوں کو پڑھانے میں کسے مزہ نہیں آتا۔ مجھے تو پیسوں کی ضرورت بھی تھی۔ وہ سب مجھ سے پڑھ کر خوش تھے۔ انکے گھر والوں کو ایک تسلی اور بھی تھی اور وہ یہ کہ یہاں ان سے کوئ اس بابت سوال نہیں کرتا تھا کہ وہ قادیانی ہیں۔ اتنے بڑے علاقے میں وہ واحد قادیانی خاندان تھا۔ اگرچہ کسی نے کبھی انکے لئے سخت رویہ اختیار نہیں کیا تھا لیکن ایک چحوٹی جگہ ہونے کی بناء پہ لوگ بطور خاص یہ بات جانتے تھے کہ وہ قادیانی ہیں۔

ان کے دادا نے اپنا قادیانی لٹریچر بھی پڑھنے کو دیا۔ انہی کی دی ہوئ سر ظفراللہ کی سوانح حیات بھی پڑھی لیکن اب مجھے یاد بھی نہیں ہے۔  ہم میں سے کوئ بھی قادیانی نہ ہو سکا۔  پڑھنے کو تو عیسائیوں کا تبلیغی مواد بھی پڑھا۔ خدا جانے کون بھیج دیا کرتا تھا۔ لیکن ہم میں سے کسی کو عیسائ ہونے کی بھی چاہ نہ ہوئ۔

آئیندہ ایک ڈیڑھ سال میں وہاب کا قد مجھ سے بھی بڑھ گیا۔  لیکن وہ اسی طرح مسکراتا اپنا کام کرتا رہتا۔ میٹرک کے امتحان میں اس نے اے ون گریڈ لیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب تھوک کے حساب سے اے ون گریڈ بھی نہیں آتے تھے۔ مجھے بھی خوشی تھی کہ میرے اسٹوڈنٹ کے بیاسی فی صد نمبر آئے ہیں۔ لیکن افسوس بھی تھا۔

وہاب میں اب آپ کو انٹر میں نہیں پڑھا سکوں گی کیونکہ خود میری پڑھائ اب پہلے سے زیادہ وقت لیتی ہے۔ایسی صورت میں کہ میں صبح سات بجے کی نکلی ہوئ  یونیورسٹی سے گھر واپس شام کو  ساڑھے پانچ بجے آتی ہوں دیگر بچوں کو ٹیوشن پڑھانے، گھر کے کاموں اور اپنی پڑھائ کے ساتھ اتنا وقت نہیں بچتا کہ آپکے ساتھ بیٹھ کر تمام مضامین کے نوٹس بناءوں۔ انٹر میں زیادہ محنت چاہئیے ہوتی ہے۔ میٹرک تک پڑھانے کے لئے مجھے بالکل تیاری نہیں کرنی پڑتی تھِی۔اس لئے اب بہتر یہ ہے کہ کسی کوچنگ سینٹر کو جوائن کر لو۔ تم ایک ذہین بچے ہو اور میرے چکر میں تم اپنا وقت خراب نہ کرو۔

وہاب کے لئے یہ بڑا صدمہ تھا اس کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا جب ایک ہفتے بعد اسکی والدہ میرے پاس آئیں۔ ایک ہفتہ ہو گیا ہے وہ بستر پہ خاموشی سے پڑا رہتا ہے۔ کہتا ہے پڑھوں گا تو باجی سے پڑھوں گا۔ بیٹا کسی طرح وقت نکال کر اسے پڑھا دو۔  آنٹی میں نے کہا اس وقت میرے پاس جو بچے ہیں انہیں پڑھاتے پڑھاتے رات کو ساڑھے آٹھ بج جاتے ہیں۔ اسکے بعد دیگر کام بھی کرنے ہوتے ہیں ۔ یقین کریں میں صبح پانچ بجے کی اٹھی ہوتی ہوں نیند سے میری آنکھیں بند ہو رہی ہوتی ہے۔ میں آپ کو بالکل ایمانداری سے بتا رہی ہوں کہ اس سے وہاب کے امتحانی گریڈ پہ اچھا اثر نہیں پڑے گا۔ آپ اسے سمجھائیے، زندگی میں انسان بہت سے لوگوں سے ملتا ہے۔ دنیا کسی ایک انسان پہ آ کر ختم نہیں ہوتی۔ وہ خاموش ہو گئیں۔

اس ساری کوشش کے باوجود وہاب کے گریڈز اچھے نہ ہو سکے۔ مجھے لگا کہ وہ ہر جگہ جا کر عدم تحفظ کا شکار رہتا تھا۔ اور یہ عدم تحفظ کا احساس اسے اس عقیدے کی بناء پہ ملا تھا جس میں وہ پیدا ہوا تھا۔

حالانکہ انسانوں کی اکثریت عموماً وہ مذہب رکھتی ہے جس میں وہ پیدا ہوتی ہے۔ اور اسے تبدیل کرنے کی جراءت بھی ان میں ایک خاص عمر سے پہلے نہیں پیدا ہوتی۔ دنیا کے ہر مذہب سے لا تعلقی اختیار کر لینا یا دہریہ ہوجانا، اسے تبدیل کرنے سے زیادہ آسان ہوتا ہے۔ مذہب سے آزادی حاصل کرنے والے یہ عمل احتجاج میں یہ کرتے ہیں۔ ورنہ مذہب اگر اپنی رو میں چلتا رہے تو کسی کو اسے چھوڑنے کی کیا ضرورت۔ ہر گناہ کے بعد توبہ کر لی۔ دنیا کے ساتھ آخرت کی بھی حفاظت کر لی، اگر وہ ہوئ تو نقصان نہ رہے۔

ہم اس محلے سے نکل آئے۔ وہاب کے بارے میں مجھے آخری اطلاع جو ملی وہ یہ تھی کہ اسکے انٹر میں باسٹھ فی صد نمبر آئے۔ تعلیمی کارکردگی میں نمایاں کمی  سے زیادہ جس چیز سے مجھے تکلیف پہنچی وہ یہ تھی کہ وہاب شخصی طور پہ متوازن نہیں رہا۔ بس وہاب اب پہلے جیسا نہیں رہا۔ اسے یہ فکر زیادہ رہتی ہے کہ لوگ قادیانی ہونے کی وجہ سے اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ماں نے ایسے کہا کہ مجھے لگا میں مجرم ہوں۔ وہ ان کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔

وہ ابتداً میرے پاس آیا تو اسکی آنکھوں میں شرارت اور ذہانت کی چمک تھی۔ مجھے وہ اپنی ان خوبیوں کی بناء پہ بے حد پسند تھا۔ لیکن  اسکی ان خوبیوں کی حفاظت نہ ہو سکی۔

 اقلیت بن کر رہنا کوئ آسان کام نہیں، بالخصوص مذہبی اقلیت اور پھر ایسی جگہوں پہ جہاں مذہب بنیادی پہچان بتایا جاتا ہو۔ میں بچپن میں سوچا کرتی تھی کہ آخر سب لوگ ہمارے جیسے کیوں نہیں ہو جاتے۔ ہم جو سچائ پہ ہیں، ہم جو سب سے بہتر ہیں۔ ہم جو سب سے زیادہ ہیں۔

اب  یہ سوچتی ہوں کہ آخر ہم سب اپنے اپنے راستوں پہ چل کر خوشدلی کے ساتھ کیوں نہیں رہ سکتے؟ اس طرح ہماری شخصیات اندرونی ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ ہو جائیں گی اور ہم بہت سارے ایسے انسانوں سے مستفید ہو پائیں گے جو زمین پہ خدا کی تخلیق کا عمدہ نمونہ ہوتے ہیں۔

11:43 PM

اقلیت, اکثریت, پاکستان, قادیانی, مذہب, معاشرہ

بد نظر کی نذر

ہم ایک تقریب میں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ایک جوڑا داخل ہوا انکے ساتھ انکی دو مہینے کی بچی بھی موجود تھی۔ میں نے اسے گود میں لیا تو دیکھا کہ اسکے ماتھے پہ کاجل سے گول نشان بنا ہوا ہے۔  مجھے معلوم ہے کہ کاجل کا یہ نشان بری نظر سے بچانے کے لئے لگایا جاتا ہے اور اسے نظر بٹّو بھی کہتے ہیں۔ میں نے حیرانی سے اسلامیات میں ماسٹرز کی ہوئ ماں  سے پوچھا کہ آپ بھی  نظر بٹّو پہ یقین رکھتی ہیں۔

میز کے ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگوں میں بحث شروع ہوئ اور گفتگو اس طرف مڑ گئ  کہ بری نظر ہوتی ہے بعض نے کچھ احادیث اور روایات کا سہارا لیا۔ کچھ نے واقعات سنانا شروع کئے۔

 میں نے تو صرف ایک ہی بات کہی۔ میری بچی  بچپن سے اکثر لوگوں کو بڑی پسند آتی رہی ہے۔ جب بھی گھر سے باہر نکلتے تو لوگ اسکی حرکتیں دیکھ کر یہ ضرور کہتے کہ گھر جا کر اسکی نظر اتار دیجئیے گا۔   میں نے کبھی نظر نہیں اتاری۔ حتی کہ بیمار بھی پڑی جیسا کہ بچے بیمار ہو ہی جاتے ہیں۔ میں ہمیشہ وجہ پہ غور کرتی کہ ایسا کیوں ہوا پھر علاج اور احتیاط۔  یعنی نظر میں نے پھر بھی نہیں اتاری۔

 اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ہمشیہ یہی سوچتی رہی کہ گورے جنکی اکثریت مذہب پہ یقین نہیں رکھتی اور انکے بچے بڑے پیارے بھی ہوتے ہیں، بیمار بھی ہوتے ہیں۔  انہیں نظر اتارنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تو ہمارے یہاں ہر شخص کو یہ عارضہ کیوں لاحق ہے۔ مجھے بھی دیکھنا چاہئیے کہ کیا نظر اتارے بغیر چارہ نہیں۔ جواب یہ ہے کہ نظر اتارے بغیر بھی  زندگی کم از کم اس طرح گذر سکتی ہے جس طرح اوروں کی گذرتی ہے۔

کہتے ہیں کہ اچھی صورت بھی کیا بری شے ہے جس نے ڈالی بری نظر ڈالی۔ لیکن ایک سوکھا ساکھا، سست بچہ جو آثار سے ہی لگتا ہے کہ غذا کی کمی کا شکار ہے اسکے ماں باپ بھی کہتے ہیں کہ اسے نظر لگتی ہے۔ بچے کے گلے میں دو چار تعویذ اگر لوگ تعویذ پہ یقین نہیں رکھتے تو کوئ قرآنی آیت یا اللہ کے نام کا دم درود۔

بچے تو بچے بڑے افراد بھی  بد نظری کے تعویذ پہنے ہوتے ہیں یا نظر اترواتے ہیں۔ مثلاً بچے کی پڑھائ پہ نظر لگ گئ ہے۔ جیسا پہلے دل لگاتا تھا ویسا نہیں لگاتا۔ لڑکی پہ نظر ہو گئ ہے  اتنی اچھی شکل کی ہے لیکن کہیں شادی کی بات ہی نہیں ٹہرتی۔ لڑکی نے بھاگ کر شادی کر لی، نظر لگ گئ ورنہ تو بڑی فرماںبردار ہوا کرتی تھی۔ کسی نے نظر لگادی شوہر اتنا چاہتا تھا اب کسی اور عورت کے چکر میں پڑگیا ہے۔ مرد کو نظر لگ گئ کیسا بھاگ دوڑ کر کام کرتا تھا اب تو آئے دن بیمار رہتا ہے۔  حتی کہ ایک بڑی بی نے بتایا کہ کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئ۔ اب کیا بتائیں، لوگوں کی نظر لگ گئ کہ اس عمر میں بھی کتنا چلتی پھرتی ہیں۔ ورنہ راستے میں پڑا کیلے کا چھلکا کیا ہمیں نظر نہیں آتا۔ چلتا ہوا کاروبار ٹھپ ہو گیا، نظر لگ گئ ہے۔ انسانوں سے ہٹ کر ہر دوسری گاڑی کے پیچھے ایک کالے کپڑے کی لیر لٹکتی نظر آئے گی۔ کس واسطے تاکہ گاڑی بری نظر سے بچی رہے۔ زیر تعمیر عمارات پہ ماشاءاللہ کی تختی پہلی اینٹ کے ساتھ لگ جاتی ہے۔ اکثر کے ساتھ ہمیشہ کے لئے لگ جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

نظر کا تصور صرف مسلمانوں میں نہیں دنیا میں ہر جگہ پایا جاتا ہے اور ہر مذہب میں اس کے لئے کچھ نہ کچھ کہا گیا ہے۔ اس کی ابتدائ تاریخ مشرق وسطی سے ملتی ہے۔ یونانی فلاسفرز کی تحریروں میں بھی اس حوالے سے تصورات ملتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ بد نظری کا یہ نظریہ سکندر اعظم کے ساتھ مشرقی ملکوں کی طرف سفر کر گیا۔ اس طرح سے اس متائثر زیادہ تر علاقے عرب اور ایشیاء سے تعلق رکھتے ہیں۔  یوروپ میں یہ ان علاقوں سے آیا جو میڈیٹیرینیئن علاقوں سے ملے ہوئے تھے جبکہ امریکہ میں یہ یوروپی تسلط کے ساتھ داخل ہوا۔

آخر لوگ نظر بد پہ کیوں یقین رکھتے ہیں۔ کیونکہ انسان ہمیشہ سے ان دیکھے کے خوف میں مبتلا رہا ہے  اور ساتھ ہی ساتھ وہ کسی بھی قسم کے نقصان سے محفوظ رہنا چاہتا ہے۔ اس لئے کسی برے حادثے یا واقعے کے بعد اگر اسکا تجزیہ صحیح طور پہ کرنے سے قاصر ہو تو اسکا ذہن کسی ماورائ تصور کی طرف جاتا ہے۔  اب اگر یہ برا واقعہ بظاہر خدا کی ناراضگی یا قہر نہیں ہے تو اسکی وجہ لازماً کسی کی بری نظر ہی ہو سکتی ہے۔

دنیا کے مختلف حصوں میں بری نظر سے بچنے کے مختلف ٹوٹکے ہیں۔ جیسے دروازے پہ گھوڑے کی نعل لٹکانا یا ترکی میں

ایول آئ

بڑی مشہور چیز ہے۔ جو نیلے شیشے سے بنی آنکھ ہوتی ہے اور ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہے، بازار میں خوب بکتی ہے۔ یہ نیلی آنکھ بد نظر کو واپس اس کے دیکھنے والے پہ بھیج دیتی ہے۔

 ادھر افریقہ کے کچھ حصوں میں ایک ہاتھ کی شبیہہ ملتی ہے جسکے درمیان میں بالعموم ایک آنکھ ہوتی ہے۔ یہ

ہمسا

کہلاتا ہے۔  یہ بھی بد نظر سے تحفظ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مسلمان اسے حضرت فاطمہ کا ہاتھ کہتے ہیں اور عیسائ حضرت مریم کا ہاتھ قرار دیتے ہیں۔

جہاں کچھ خطوں میں نیلی، ہری آنکھوں والے لوگ بد نظر قرار پاتے ہیں وہاں کچھ خطوں میں نیلی یا ہری آنکھوں والے لوگ نظر سے سب سے زیادہ متائثر ہونےوالےجانے جاتے ہیں۔

 ایسے مصائب کا  تعلق خدا یا خداءوں کی بھیجی گئ مصیبت سے نہیں بلکہ ایک انسان کی نظر کی مصیبت سے ہوتا ہے۔ یعنی اگر خدا کے عذاب اور قہر سے بچ بھی جائیں تو بھی ہمارے ہم جنس کا صرف دیکھ لینا ہی مار ڈالتا ہے۔ اس طرح دراصل ہم ایک انسان کے اندر ایک عجیب سے برائ تلاش کر لیتے ہیں جسکا اسکے ذاتی اخلاق یا خواہش سے کوئ تعلق نہیں ہوتا۔ کوئ مہمان گھر سے آکر گیا اور اسکے بعد اسے بچے کو بخار ہو گیا تو بس مہمان کی نظر میں ہی کوئ خرابی ہوگی۔ جبکہ اسے معلوم تک نہیں ہوتا کہ اسکے متعلق کیا تصور باندھ لیا گیا ہے۔

اب یقیناً لوگ مقدس تاریخ میں سے حوالے نکال کر لائیں گے کہ فلاں حدیث کے مطابق ایسا ہوا اور فلاں روایت میں یہ کہا گیا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اس وقت کا عرب معاشرہ جس حد تک انقلاب کو برداشت کرنے کے لئے تیار تھا اتنے ہی انقلابی نظریات پیش کئے گئے۔ اور بہت سے خیالات کو نہیں چھیڑا گیا کہ انکی تفصیلات میں جانا عام لوگوں کو سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اور عوام الناس کو بس انکے توڑ کے لئے کچھ مذہبی حل بتا دئیے گئے۔ اسی میں سے ایک تصور نظر بد کا بھی ہے۔

ایسا ہونا بہت مشکل ہے کہ ایک بچہ کبھی بیمار نہ پڑے اسی طرح یہ ہونا بھی بہت مشکل ہے کہ کوئ شخص اپنی زندگی میں کسی قسم کی مشکلات کا سامنا نہ کرے۔ انسان جتنا چاہے نیک ہو، واقعات اچھے یا برے پیش آتے ہی ہیں۔ اب رسول اللہ نے گیارہ شادیاں کیں لیکن جو اولاد نرینہ ملی وہ ابتدائ عمر میں ہی دنیا سے گذر گئ۔ اس طرح قریش نے انہیں لا ولد ہونے کا طعنہ دیا۔  تو کیا یہ  نظر بد تھی یا خدا کی ناراضگی۔ یقیناً ایسا نہیں تھا۔

سو کوئ اپنے بچے کو نظر بٹو لگائے، مرچیں سات بار گھما کر جلائے، سل کا بٹہ لے کر سات بار گھمائے، یا سورہ کوثر باری باری پڑھ کر دونوں گالوں پہ پیار کر لے، عمارت یا گاڑی پہ ماشاء اللہ لکھ کر لگائے یا ہر اچھی چیز کو دیکھ کر ماشاء اللہ کہے۔ سب کے نتائج عموماً ایک جیسے ہی نکلتے ہیں یعنی اگر فلو کا موسم چلا ہوا ہے تو بچے کو فلو ضرور ہوگا۔

بد نظری سے متعلق یہی سوچ جب آگے بڑھتی ہے تو لوگ دم ، دعا، تعویذ کے چکر میں ایسا الجھتے ہیں کہ پھر زندگی میں کرنے اور سوچنے کو کچھ باقی نہیں رہتا۔ ہاتھوں میں کئ طرح کے پتھر یا اسموں کی انگوٹھیاں ہوتی ہیں۔ ہر آنے جانے والے رشتے دار کے متعلق اندازے لگائے جاتے ہیں کہ کس کی نظر بری تھی، آخیر میں یہ  بظاہر معمولی نظر آنے والی سوچ انسان کے اندر سے اعتماد ختم کر دیتی ہے۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بات نظر بد سے چلتی ہے اور جادو تک جاتی ہے۔ کہتے ہیں جادو برحق ہے۔ اگر ایسا ہی بر حق ہوتا تو دنیا میں بڑے سے بڑے کام اسی کے زور پہ نکال لئے جاتے اور چند جادوگر اس دنیا کے سیاہ و سفید کے مالک بن جاتے۔ مگر ستم ظریفی دیکھئیے کہ دنیا کے سیاہ سفید کے مالک وہ بنے جن کے ہاتھوں میں یا تو تلواریں تھیں یا پھر کتابیں۔

کیا جادو کوئ حقیقت رکھتا ہے؟

11:04 PM

ایول آئ, بچے, بد نظری, جادو, مذہب, معاشرہ, ہمسا

توقع کی مداخلت

جب توقع ہی اٹھ گئ غالب

کیا کسی کا گلہ کرے کوئ

ہاں تو اپنے ملک کے سیاسی نظام سے کوئ توقع نہیں یعنی کوئ تعمیری توقع نہیں رہی۔ لیکن سیاست کے چینل پہ ایک کے بعد ایک دھوم مچا دینے والے ڈرامے اس تسلسل سے آتے ہیں کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ ابھی ایک ڈرامہ اپنے انجام تک پہنچ بھی نہیں پاتا اور ہم اندازہ ہی لگا رہے ہوتے ہیں کہ اب کیا ہوگا، کوئ اور ڈرامہ حاضر ہوجاتا ہے اور پرانا بھول کر نئے  پہ دھمال شروع ہو جاتا ہے۔

اب جو یہ  نیا ڈرامہ چلا جس نے سیاستدانوں سے لے کر میڈیا کے افراد اور عدلیہ تک کو اپنے کرداروں میں شامل کر لیا ہے۔ یہ آگے کس طرح چلے گا۔ کیا مہر بخاری اور لقمان مبشر پہ ہی نزلہ گر کر صاف ہو جائے گا یا کچھ بڑے نام بھی اس میں ایک کے بعد ایک شامل ہونگے۔

قارئین یہ جاننے کے لئے ہم نے اپنے ایک دوست سے رجوع کیا۔ یہ ایک ماہر مستقبلیات ہیں۔ اور انکی پیشن گوئیاں بجلی کے بارے میں اکثر درست ہوتی ہیں۔ یعنی انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ لوڈ شیڈنگ کے نئے اوقات کیا ہونگے۔ آج سے دو سال پہلے انہوں نے پیشن گوئ کی تھی کہ گیس، ڈیزل اور پیٹرول یکساں قیمتوں پہ آجائیں گے۔ جو آج بالکل صحیح ثابت ہوئ۔ اگرچہ کہ میں اس وقت بڑا ناراض ہوئ کہ یہ کیا مذاق ہے اب جبکہ میں نے اپنی گاڑی کو آپکے مشورے پہ گیس پہ کروالیا ہے تو آپ یہ پیشن گوئ کر رہے ہیں۔ ایسی باتوں پہ وہ عموماً ایک مجذوبانہ سیاسی مسکراہٹ دے کر رہ جاتے ہیں لیکن ہماری تسلی کے لئے کہا کہ تب بھی آپ کو فائدہ رہے گا، گیس پہ گاڑی زیادہ فاصلہ طے کرتی ہے۔

 اس کے علاوہ موسم کے بارے میں بالکل درست اندازہ لگاتے ہیں۔ کچھ حاسدی کہتے ہیں کہ وہ انٹر نیٹ سے خبریں لے کر دیتے ہیں۔ لیکن انداز صوفیوں والا بنا رکھا ہے۔ چلیں صحیح انکی بات مان بھی لی جائے لیکن یہ اگر اتنا ہی آسان ہوتا تو ڈان اخبار کی موسم کی پیشن گوئیاں  درست کیوں نہیں ہوتیں۔

خیر موضوع کو طوالت سے بچانے کے لئے واپس آتے ہیں کہ یہ جو بیٹوں کی جنگ چل پڑی ہے تو کس کا بیٹا بچے گا اور کس کا جائے گا۔ ہمارے مجذوب دوست کا کہنا تھا کہ جس بیٹے میں جان ہوگی وہ بچ جائے گا لیکن امکان غالب یہ ہے کہ ارسلان افتخار کو سزا ہوگی۔

وہ کیوں وہ تو چیف جسٹس کا بیٹا ہے؟ میں نے ایک دفعہ پھر حیرانی کا اظہار کیا۔

وہ اس لئے کہ باقی سب کو عبرت ہو کہ اب ان کا انجام بھی کچھ اچھا نہیں ہونے والا۔ وہ عدالت جو اپنے خون کو بھی معاف نہ کرے وہ آزاد ہے جو دل چاہے کرے۔

یعنی کسی بڑے کھیل کو ارسلان افتخار کے نام پہ شروع کیا گیا ہے؟

نہیں تو انہوں نے کہا ارسلان پہ جو الزامات لگائے گئے ہیں وہ درست معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ کہ وہ اس کی سزا پائے گا۔ چیف صاحب سرخرو ہونگے لیکن اسکے بعد وہ عدلیہ کے ذریعے ایک ایک کی کُٹ لگائیں گے۔

یہ سب کس کے ایماء پہ ہورہا ہے؟

انہوں نے شہادت کی انگلی اٹھا کر آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ یہاں کسی کے ایماء پہ کچھ نہیں ہوتا جو صورت حال سے فائدہ اٹھا لے ایماء اسی کا ہو جاتا ہے۔ اس واضح صوفیانہ جواب کو سن کر میں نے ایک واضح غیر شرعی سوال کرنے کی کوشش کی۔

اچھا یہ بتائیں کہ چیف جسٹس صاحب کیا واقعی اپنے بیٹے کی دن دونی اور رات چوگنی ترقی سے ایک دم لا علم تھے۔ مجھے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی۔ پنجاب کے ذات برادی، خاندان جیسی مضبوط روایات والی زمین پہ چوہدری صاحب کو یہ شک نہیں ہوا کہ ان کا بیٹا آخر کس کاروبار سے اتنے کما رہا ہے یہ وہی بیٹا ہے جسکی نوکری کے لئے انہیں پرویز مشرف کا طعنہ سننا پڑا۔ جبکہ ایک عام باپ کو بھی شک ہوجاتا۔

اس سوال پہ انہوں نے کمپیوٹر کی طرف منہ موڑ کر کہا کہ اب انکا مخصوص وظائف کا وقت شروع ہوا چاہتا ہے۔ جس کے دوران مداخلت پہ اس کا وبال مداخلت کرنے والے پہ پڑ سکتا ہے۔

جس کی توقع ہی اٹھ چکی ہو وہ کیا مداخلت کرے گا۔ اس لئے خود ہی اٹھ آئے۔

12:35 AM

ارسلان افتخار, پاکستان, پنجاب, چیف جسٹس, عدلیہ

اعلی میں گھٹالا

یہ واقعہ مشہورطبیعیات داں

نیلز بوہر

سے منسلک کیا جاتا ہے۔ نیلز بوہر پچھلی صدی کے عظیم سائینسدانوں میں سے ایک تھا۔ اپنی سائینسی خدمات کے سلسلے میں انہیں فزکس کے میدان میں

نوبل پرائز

بھی ملا۔ قسمت کا ایسا دھنی نکلا کہ اسکے چھ بیٹوں میں سے ایک کو نوبل پرائز ملا۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اس کے بیٹے کے نوبل پرائز کا اسکی قسمت سے کیا تعلق۔ مجھے بھی نہیں معلوم، میں نے تو اپنے معاشرتی چلن میں یہ لکھا ہے۔

قصہ خواں کہتے ہیں کہ  فزکس کا پرچہ تھا اور ممتحن نے سوال پوچھا کہ ایک

بیرو میٹر

کی مدد سے کیسے ایک بلند عمارت کی اونچائ ناپی جا سکتی ہے۔ ممتحن نے جس جواب کے لئے سوال پوچھا تھا، وہ یہ تھا کہ بیرو میٹر سے زمین کی سطح پہ دباوء معلوم کیا جائے پھر اس عمارت کی چھت پہ دباءو معلوم کیا جائے اور ان دونوں کے فرق کو ایک فارمولے میں رکھ کر عمارت کی بلندی پتہ چلا لی جائے۔

شاید نیلز بوہر نے اس مہم پسند طالب علم کی طرح سوچا جو اپنی مہم جوئ کا شوق اپنے استاد پہ نکالتا ہے، کیوں نہ ممتحن کو تپایا جائے اور جواب لکھ مارا کہ ایک رسی لے کر اس میں بیرو میٹر باندھ لیا جائے۔ عمارت کی چھت سے اس بیرو میٹر کا زمین تک چھوڑا جائے زمین کی سطح سے چھت تک اس رسی کی لمبائ ناپ لی جائے اور اس میں بیرومیٹر کی اونچائ شامل کر لی جائے۔

ممتحن اتنا بھنایا کہ طالب علم کو فیل کر دیا۔  طالب علم نے احتجاج کیا کہ یہ اسکے ساتھ زیادتی ہے۔ کسی غیر جانب دار شخص سے اسکی تحقیقات کرائ جائے۔ ایک  کمیٹی معاملے کی تحقیقات کے لئے بیٹھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جواب تو درست ہے لیکن اس میں فزکس کہیں نہیں ہے۔ لہذا طالب علم کو ایک موقع اور دیا جائے تاکہ وہ فزکس میں اپنی مہارت ثابت کر سکے۔

 طالب علم سے کہا گیا کہ اسکے پاس چھ منٹ ہیں۔ اگر وہ اس کا فزکس کے مطابق جواب دے دے تو اس کے حق میں فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

کچھ لوگ ہر حال میں ڈرامہ پیدا کرنے کے ماہر ہوتے ہیں۔  شاید نیلز بوہر کی فطرت میں کچھ ڈرامہ بھی تھا۔ یا شاید ہر سائنسداں تھوڑا بہت ڈرامہ کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ طالب علم خاموش ہو گیا۔ لیکن گھڑی کی سوئیاں نہیں۔ اس لئے ایک دفعہ پھر اسے یاد کرایا گیا کہ اسکے پاس اب بہت کم وقت ہے۔

 نیلز بوہر نے جواب دیا کہ دراصل اسکے ذہن میں کئ ممکنہ جواب ہیں اور وہ طے کر رہا ہے کہ کسے پہلے بیان کرے۔ یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ خالی ذہن ہی نہیں بھرا ہوا ذہن بھی شیطان کا چرخہ ہوتا ہے۔ اس چرخے کی مضبوطی دیکھ کر وہ یوں گویا ہوا۔

بیرو میٹر کو عمارت کی چھت پہ لے جا کر وہاں سے نیچے پھینکا جائے۔ چھت سے زمین تک فاصلہ طے کرنے میں جو وقت لگا ہو اسے نوٹ کر کے فارمولہ لگایا جائے تو بلندی معلوم ہو جائے گی۔ البتہ بیرومیٹر کے بچنے کی امید نہیں۔

ایسا بھی کر سکتے ہیں کہ اگر سورج نکا ہوا ہو تو بیرو میٹر کی اونچائ نوٹ کر کے اسکے سائے کی لمبائ لے لیجئیے پھر عمارت کے سائے کی لمبائ نوٹ کر لیں اسکے بعد تو ایک بالکل سادہ نسبت کے ذریعے عمارت کی اونچائ معلوم کی جا سکتی ہے۔

پھر اس نے اپنا داہنا گال کھجایا، شاید مسکراہٹ چھپانے کے لئے اور بولا

لیکن اگر آپ ایک دم درست لمبائ جاننا چاہتے ہوں تو بیرو میٹر کو ایک رسی کے ذریعے ٹانگ کر اس کا پینڈولم بنا لیں۔ پھر زمین  اور عمارت پہ الگ الگ اسے جھلائیے۔ اور دونوں جگہوں پہ ریسٹورنگ فورس معلوم کر کے فارمولا لگا دیں۔ لیجئیے جناب بلندی معلوم ہو جائے گی۔

تمام کمیٹیوں کے ارکان میں ایک بات مشترک ہوتی ہے سب سکون سے ہر ناروا کو بھی روا سمجھ کر سنتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں فیصلے کا اختیار انکے پاس ہے۔ یہ سوچ کرنیلز بوہر نے کہا اگر عمارت میں چھت تک جانے کے لئے ایمرجنسی سیڑھیاں موجود ہیں تو بیرو میٹر لے کر سیڑھیوں پہ چڑھ جائیے۔ اور ہر منزل پہ بیرو میٹر کی بلندی ناپتے جائِے اور آخیر میں اسے جمع کر لیں۔ عمارت کی بلندی پتہ چل جائے گی۔

پھر اس نے ذرا رک کرسانس لی اور چہرہ سنجیدہ کیا جیسے ایک مقدس بات کہنے جا رہا ہو۔ اگر کسی روائیتی اور بور طریقے کو اپنانا چاہتے ہیں تو زمین پہ  بیرو میٹر رکھ کر دباءو معلوم کریں اور اسی بیرو میٹر سے عمارت کی چھت دباءو معلوم کریں  اور دونوں کے فرق کو ملی بار سے فٹ میں تبدیل کر لیں۔ عمارت کی بلندی علم میں آجائے گی۔

آخر میں اس نے فیصلہ کن پینترا بدلا۔ لیکن چونکہ ہمیں ہمیشہ یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ کھلے ذہن سے سائینسی طریقہ ء کار کو سوچو تو میں عمارت کے نگراں کے پاس جاءونگا اور کہونگا کہ کیا وہ مجھے عمارت کی بلندی بتا سکتا ہے اگر ہاں تو میرے پاس ایک نیا بیرو میٹر ہے وہ اسکا ہوگا۔

قصہ خواں اسکے بعد خاموش ہوتا ہے۔ کیا کمیٹی کے حواس یکجا رہے؟ کیا کمیٹی نے متفقہ طور پہ اسے پاس کر دیا؟ کیا واقعی پوت کے پیر پالنے میں نظر آتے ہیں؟

اس قصے کے بارے میں دو خبریں ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ سب سے پہلے انیس سو پچپن میں

ریڈرز ڈائجسٹ

میں شائع ہوا اور دوسرا یہ کہ اس کا نیلز بوہر سے کوئ تعلق نہیں۔

۔

۔

۔

۔

۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار

اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

اب آپ جان چکے ہونگے کہ یہ معاملہ محبت تک ہی محدود نہیں کئ اور معاملات میں بھی ہوتا ہے مثلاً عظمت۔ کچھ تو لوگ بڑے کارنامے انجام دے کر عظیم ہو ہی جاتے  ہیں اور کچھ داستانیں ان میں مزید شامل ہو جاتی ہیں۔ ایسے کے سچ نکالنا مشکل ہی نہیں غیر دلچسپ اور گناہ کے برابر  ہو جاتا ہے۔

12:01 AM

بیرو میٹر, پینڈولم, سائینس, طبیعیات, فزکس, معاشرہ, نوبل پرائز, نیلز بوہر

حتی کہ جانور بھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

جب انسان ، جبر سے گھبرا جاتا ہے تو علامتوں کا سہارا لیتا ہے۔ یہ علامتیں جانوروں سے لے کر مظاہر قدرت، کچھ بھی ہو سکتی ہیں۔ لیکن ان میں معنوں کا ایک جہاں بند ہوتا ہے۔

جبر کے زمانے میں یہ عام ہے لیکن آزادی کے زمانے میں یہ علامتیں تخیل کی اڑان بن جاتی ہیں جیسے بچوں کو ایسی کہانیاں سنانا جن میں جانوروں کو کردار بنا کر اخلاقی نصیحتیں منتقل کی جاتی ہے۔ اور بچے  بالکل حیران نہیں ہوتے کہ جانوروں کی مائیں بھی انہیں چیزیں گم کرنے پہ ڈانٹتی ہیں۔ انہیں بھی اسکول جانا پڑتا ہے، ریچھ بھی چوری کر کے شہد کھاتا ہے، کوے کو چڑیا اپنے گھونسلے سے جلتی ہوئ لکڑی مار کر بھگا دیتی ہے، لومڑی کیسے چالاکی سے شیر کو کنوئیں میں گرا دیتی ہے اور کچھوا ، خرگوش سے کیسے جیت جاتا ہے۔ بچوں کو یہ کہانیاں اسی لئے پسند ہوتی ہیں۔ یہ سوچنے کے لئے کہ  حتی کہ جانور بھی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

حتی کہ جانور بھی، یہ جملہ بچپن کی حدوں میں ہی گونجتا نہیں رہ جاتا بڑے بھی بعض اوقات یہ سوچتے ہیں  اور پھر تحقیق بھی کرتے ہیں کہ وہ کیا افعال ہیں جن میں جانور انسانوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔  اس طرح سے وہ انسانوں میں اخلاقیات کا ارتقاء تلاش کرتے ہیں۔

میرے بچپن میں پڑوسن نے مرغیاں پالی ہوئ تھیں اور فرصت میں وہ پوری تفصیل سے بتاتیں کہ ان مرغیوں کا آپس میں کیا تعلق یا رشتہ بنتا ہے۔ کون کس کی پھوپھی اور چاچی ہے۔ اس سے مجھے تسلی رہتی کہ دنیا میں دراصل

وہی نظام

جاری ساری ہے جو ہم انسانوں میں ہے یہ وحدت کا احساس بچوں کو ماحول سے جڑا رکھنا میں بڑا کار آمد ہوتا۔ اور پھر وقت کے ساتھ کایا کلپ ہوتی ہے اور تمام بنیادی احساسات کی جگہ کس طرح حقیقتیں اپنا حصہ بنا لیتی ہیں یہ ایک دلچسپ کہانی لگتی ہے۔

 بعض مذاہب جو جنموں کی کہانی سناتے ہیں، ان میں یہ تصور تک بھی ہے کہ انسان اپنے اعمال کی بنیاد پہ اگلے جنم میں کسی جانور کے روپ میں بھی آ سکتا ہے۔ اعمال کو ہم ایک طرف رکھ دیتے ہیں اگر ہم اپنی موجودہ خصوصیات کی بناء پہ کسی جانور سے اپنی مماثلت جاننا چاہیں تو ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

یہ کھیل

کھیلیں۔ بس کھیل ہی ہے عقیدے کی جنگ لڑنے نہ بیٹھ جائیے گا۔

ہم سوچتے ہیں کہ کیا جانوروں کے خاندان ہوتے ہیں؟

جی ہاں بعض جانور اپنا پورا سماجی ڈھانچہ رکھتے ہیں۔ مثلاً ڈولفنز کے بچوں کی دیکھ بھال تین چار مادائیں مل کر کرتی ہیں اور وہ ماں کی مددگار ہوتی ہیں ایسے ہی جیسے انسانوں میں مشترکہ خاندانی نظام میں ہوتا ہے بلکہ نانیاں اور خالائیں بھی اس عمل میں حصہ لیتی ہیں۔ حتی کہ گاءوں دیہاتوں میں محلے دار خواتین بھی شامل ہوتی ہیں۔ ہاتھی کے بچوں کو بھی سب ہاتھی مل جل کر سنبھالتے ہیں۔

چیونٹی اور

شہد کی مکھی

تو اس سلسلے میں مثالی منظم معاشرہ رکھتی ہیں کہ ہر ایک کو اپنے فرائض پتہ ہوتے ہیں۔ ان دونوں جنسوں کے معاشرے کی سب سے لاڈلی رکن عام طور پہ  ملکہ ہوتی ہے۔ شہد کی مکھیوں کی ملکہ اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ وہ کن انڈوں کو سہے گی۔ فرٹیلائزڈ انڈوں سے مادہ مکھیاں پیدا ہوتی ہیں اور غیر فرٹیلائزڈ انڈوں سے نر پیدا ہوتے ہیں۔ نر کا سوائے ملاپ کرنے کے اور کوئ کام نہیں ہوتا۔  نر مکھیاں ملاپ کے فوراً بعد مر جاتی ہیں۔ ملکہ انڈے دینے کا فرض سنبھالتی ہے اور باقی مادہ مکھیاں شہد بنانے اور چھتے کو محفوظ رکھنے کا کام انجام دیتی ہیں۔ اس طرح چھتے کا کنٹرول مادہ مکھیوں کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ اور یوں یہ ایک مدر سری نظام قرار پاتا ہے۔

جانوروں کو خوش ہوتے تو دیکھا ہی ہوگا۔ جب وہ چہچہاتے ہیں، گاتے ہیں یا اچھلتے کودتے ہیں ایکدوسرے کو کریال کرتے ہیں۔ لیکن کیا جانور اداس بھی ہوتے ہیں۔  جانور بھی اس مشکل سے دوچار ہوتے ہیں بالخصوص جب انکا قریبی ساتھی نہ رہے یا انکا پالنے والا گذر جائے۔  بعض اوقات وہ اتنے اداس ہوتے ہیں کہ کھانا پینا بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ حتی کہ جاں سے گذر جاتے ہیں۔

 پرندوں کا گانا گاتے تو سب ہی نے سنا ہوگا، اپنی مادہ کو لبھانے کے لئے وہ تان سین بن جاتے ہیں۔ حتی کہ سمندر کی تہوں میں ڈولفنز اور سمندر ہی میں دنیا کا سب سے بڑا ممالیہ جانور وہیل بھی گیت گاتا ہے۔ بعض جانور تو حتی کہ انسانوں کی  موسیقی سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ جی ہاں مارمو سیٹ بندر اور پانڈا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ موسیقی میں تبدیلی کو فوراً محسوس کر لیتے ہیں۔

انسانی طرز زندگی تیزی سے تبدیل ہو چلا ہے سو اب یوگا کرتے ہوئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا جانور یوگا کرتے ہیں؟ کچھ منچلوں کا خیال ہے کہ جانور بھی یوگا کرتے ہیں اس کے لئے انہوں نے کچھ

تصویری ثبوت

اکٹھا کئے ہیں۔ میں تو یہ تصاویر دیکھ کر یہ سوچتی ہوں کہ کہیں انسانوں نے جانوروں سے تو یوگا نہیں سیکھا۔ کیونکہ یوگا کی تاریخ خاصی قدیم ہے اتنی ہی جتنی ان مذاہب کی جو الہامی نہیں بلکہ مظاہر قدرت سے مسحور ہونے والے انسانوں نے انہیں جنم دیا۔

 کیا جانوروں میں بھی روشن خیال اور روایت پسند جانور ہوتے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ یہ نظریاتی فرق ان میں بھی پیدا ہو چلا ہے مثلاً  گائے، اونٹ اور بکری اب تک انہی روایات پہ قائم ہیں البتہ یہ کہ انہوں نے دوسرے جانوروں کو اس قسم کی تبلیغ نہیں شروع کی کہ کولہو کا بیل بنے رہنا عین منصب حیوانی ہے۔ اسکی وجہ شاید یہ ہو کہ انکی پہنچ فیس بک تک آسان نہیں۔ انسان انہیں اتنا پسماندہ سمجھتے ہیں کہ اپنے کمپیوٹر کے پاس انہیں پھٹکنے نہیں دیتے۔ مرغی کی روایت پسندی نیچے دی گئ تصویر سے واضح ہے کہ سرتاج کرسی پہ بیٹھے ہیں اور وہ اپنی محبت کا ثبوت اپنے دئے گئے انڈوں کی صورت پیش کر رہی ہے۔

 انکے مقابلے میں بندروں اور ہاتھیوں میں کچھ روشن خیالی پیدا ہوئ ہے۔ ہاتھی تو اب مصوری تک کرنے لگے ہیں جبکہ بندر  سائینسدانوں کے ساتھ تحقیق میں مصروف  ہے۔ چونکہ پردہ اور خواتین کی تعلیم ان کا مسئلہ کبھی نہیں رہے اور ہم اس سے ناواقف ہیں کہ انکے یہاں مشرق اور مغرب کی اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں یا نہیں اس لئے انکی روشن خیالی کے بس یہی معیار نکالے جا سکتے ہیں۔

کیا  جانوروں نے کوئ اخلاقی ترقی کی ہے یا بس انسانوں کی طرح سلسلہء روزوشب میں ہی الجھے ہوئے ہیں؟ بعض

عیسائ مبلیغین

یقین رکھتے ہیں کہ جانوروں کی بھی روحیں ہوتی ہیں اور انکے لئے بھی ایک جنت ہوگی۔  انکے یقین کی بنیاد ان جانوروں پہ قائم ہے جو ذہین ہوتے ہیں اور اپنی ذہانت کو اپنے مالک کے لے فائدے کے لئے استعمال کرتے ہیں جیسا کہ کتّا۔  ہمارے مبلغین تک شاید  یہ خیال ابھی پہنچا نہیں ہے لیکن پہنچ جائے تو وہ کس جانور کو جنت میں پہنچائیں گے؟

میں اس خیال کے حامیوں میں سے نہیں ہوں۔ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو پھر

جناتی مسائل

اٹھ کھڑے ہونگے۔ میرا محتاط خیال ہے کہ اس خیال پہ مجھے بھٹکا ہوا نہیں کہا جائے گا۔ جانوروں کا رد عمل جاننے کی ضرورت نہیں۔ انکا تعلیم کا بجٹ سرے سے رکھا ہی نہیں جاتا۔

جانوروں کو احتیاط سے سڑک پار کرتے ہوئے تو اکثر دیکھا ہی ہوگا کہ کیسے پہلے دائیں  دیکھتے ہیں پھر دائیں دیکھتے ہیں  تیزی سے بھاگتے ہوئے روڈ پار کرتے ہیں اور بچ جائیں تو بائیں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور پھر منہ اٹھا کر بائیں کو ہی چل دیتے ہیں۔ اللہ تیرا لاکھ شکر ہے لاکھوں جانیاں پائیاں مار سکے نہ کوئ۔

کیا جانور ٹیکنالوجی کی ترقی سے متائثر ہوئے ہیں۔ جی ہاں اس کا ثبوت وہ کتیا ہے جو خلاء میں بھیجی گئ یہ جانچنے کے لئے کہ کیا انسان خلاء میں سفر کر سکتا ہے۔

لائیکا

نامی یہ کتیا خلاء میں سفر کے آغاز کے چند ہی گھنٹے بعد مر گئ۔ لیکن انسان کے خلاء میں جانے کے لئے راستہ کھول گئ۔ حالانکہ موت کا ایک دن مقرر ہے اور پھر ہم اس خلاء سے گذر کر ہی آسمانوں تک پہنچیں گے لیکن انسان نجانے کیوں ہوس کا مارا ہے کہ غیب کو غائب ہو کر نہیں دیکھنا چاہتا۔ بہر حال لائیکا اپنے پیچھے  ایک بار پھر یہ سوال چھوڑ گئ کہ کیا جانوروں کے لئے کوئ جنت ہونی چاہئیے؟

  کیا  انٹر نیٹ  ان کے لئے بھی تبدیلی کا باعث بنا ہے؟ جی ہاں حتی کہ جانور بھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

:)

نوٹ نمبر ایک: یہ تحریر قطعی بھی ایک علامتی تحریر نہیں ہے۔ اس لئے کوئ انسان کسی بھی قسم کے دل آزار معنی اخذ کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اپنی دل آزاری کی صورت میں وہ خود ذمہ دار ہونگے۔

نوٹ نمبر دو: اگر اس تحریر سے کسی جانور کی دل آزاری ہوتی ہے تو اسے یہ جان لینا چاہئیے کہ یہ سب انسانوں کے لئے لکھا گیا ہے اور اسکے پڑھنے کے لئے نہیں ہے۔

اس کے ساتھ ہی لاحول ولا قوت۔ حتی کہ جانور بھی بلاگ پڑھنے لگے ہیں۔

12:44 PM

اخلاق, ادب, بندر, تبلیغ, جانور، لائیکا، کتیا, ڈولفنز, سمندر, علامت, گیت, مصور, ہاتھی

عدم کا وجود

بچوں کے سوالات کا سلسلہ جب شروع ہوتا ہے تو وہ یہ سوال ضرور کرتے ہیں کہ وہ کیسے والدین کے پاس آئے۔ والدین کی اکثریت بچوں کے سادہ ذہن کو ایک سادہ سا جواب دیتی ہے کہ کسطرح کوئ فرشتہ یا پری انہیں ایک تحفے کی صورت پہنچا گیا۔  میری بیٹی نے ایک دن میری معلومات میں یوں اضافہ کیا ، آپ کو پتہ ہے ماما، کچھ بچوں کو نرس بھی لے کر آتی ہیں اور ایسی صورت میں ماما کو ہسپتال میں ہونا پڑتا ہے کیونکہ نرس ہسپتال میں ہی ہوتی ہے۔ جب میں نے اس معلومات کا ذریعہ دریافت کیا تو انہوں نے مجھے ٹی وی کا ایک اشتہار دکھایا۔ جس میں ایک نرس ایک چھوٹا سا بچہ لے کر آتی ہے۔  ٹی وی والدین کی بہت ساری مشکلوں کو اس طرح آسان بھی کرتا ہے۔

میں آپ سے کوئ ایسا مشکل سوال نہیں کرنے جارہی۔ یہ ایک بالکل آسان سا سوال ہے  اور یہ میرے ذہن کی پیداوار بھی نہیں ہے۔ بلکہ اسے میں نے جس ویڈیو سے اٹھایا ہے وہ بھی ساتھ میں موجود ہے۔

سوال یہ تھا کہ درخت کہاں سے اپنا وجود حاصل کرتے ہیں۔

ابتداً لوگوں نے کہا زمین سے غذائیت لیتے ہیں، زمین کی مٹی استعمال کرتے ہیں اور اس طرح بڑے ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن سوال کرنے والے نے ایک سائینسداں کا حوالہ دیا جس نے ایک ایک بیج لگایا ، مٹی کو تول لیا اور پھر پانچ سال تک اس پودے کی دیکھ بھال کی اس طرح کہ مٹی بالکل بھی ضائع نہ ہو۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پانچ سال بعد مٹی کے وزن میں ساٹھ گرام کی کمی واقع ہوئ جبکہ پودے نے ستر کلو گرام وزن حاصل کیا۔ پس ثابت ہوا کہ مٹی سے پودا جسامت حاصل نہیں کرتا۔

پھر لوگوں نے خیال ظاہر کیا کہ پانی کی وجہ سے ہے۔ محض پانی سے مادہ نہیں بن سکتا۔ اس کے بعد یہ کہا گیا کہ  سورج کی روشنی کی توانائ مادے میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ آکسیجن کا اس سے کوئ تعلق ہے شاید، کچھ نے اس خدشے کا اظہار کیا۔

لیکن نہیں، پودوں کو بڑھنے کے لئے ایک چیز اور بھی چاہئیے ہوتی ہے اور وہ ہے کاربن ڈائ آکسائیڈ۔ پودے سورج کی روشنی کی موجودگی میں  کاربن ڈائ آکسائیڈ سے اپنی غذا تیار کرتے ہیں، یہ عمل فوٹو سنتھیسزیعنی شعاعی ترکیب کہلاتا ہے۔ اس طرح وہ بڑے ہوتے جاتے ہیں اور جسامت حاصل کرتے ہیں۔ ادھر دلچسپی کی بات یہ ہے کہ ہم، انسان سانس کے ذریعے کاربن ڈائ آکسائیڈ خارج کرتے ہیں یوں ہمارے اندر جو کمی واقع ہوتی ہے وہ پودے کی بڑھوتری کی صورت نمودار ہوتی ہے۔

۔

۔

۔

بس ایسے آہستہ آہستہ ہم درخت بن جاتے ہیں۔ ایک پرانا مشاہدہ، الفاظ کے چاک پہ نئ صورت ابھرتا ہے۔

اس خیال پہ مبنی یہ دلچسپ ویڈیو دیکھنا نہ بھولئیے گا۔

http://richannel.org/collections/2012/veritasium#/where-do-trees-come-from

11:28 PM

آکسیجن, پودے, درخت, سائینس, شعاعی ترکیب, فوٹو سنتھیسز, کاربن ڈائ آکسائیڈ

مائ ڈیئر مولانا صاحب

میں پارلر میں موجود تھی جب وہاں پہ کام کرنے والی ایک خاتون کا فون بجا۔ فون پہ بات کر کے اس نے بند کیا اور اپنی دوست کو بتایا کہ شہر کے فلاں حصے میں جہاں اس کا گھر ہے ہنگامہ ہو گیا ہے اور ان کے شوہرآفس نہیں جا سکتے اس لئے آج چھٹی کر کے گھر میں رہیں گے۔

اب کس نے کیا یہ ہنگامہ؟  کسی نے  پوچھا۔ کراچی میں ہنگامے روز کے معمولات میں شامل ہیں۔

 ہماری  طرف کون کرے گا یہی ملّے۔  اس عورت  نے ایک کراہیت سے جواب دیا۔

 ہنگامے کراچی میں اور لوگ بھی کرتے ہیں کراہیت مولانا صاحب کے حصے میں کیوں آئ؟

آخر خواتین ملّاءوں سے اتنا کیوں چڑتی ہیں؟

اس کے لئے دماغ پہ زور ڈالنے کی قطعی ضرورت نہیں۔ ایک گھر میں بچے فاقوں سے گذر رہے ہوں، شوہر کی آمدنی گھر کے اخراجات پورے کرنے کے قابل نہ ہو اور ان حالات میں اگر کوئ عورت یہ سوچے کہ وہ گھر سے باہر نکل کر کچھ پیسے محنت کر کے کما لے تو اس خیال سے ہی مولانا صاحب کا دین اسی وقت خطرے میں پڑ جائے گا۔  انکے خیال میں ایک عورت ایک حرم سے بس دوسرے حرم کا ہی سفر کر سکتی ہے یہی اس کا مقدر ہے۔ اور وہ فوراً فتوی دیں گے کہ نیک عورت وہ ہے جو گھر کے اندر بند رہے  سوائے مرض الموت کے اسے گھر سے نکلنے کی ضرورت نہیں۔

جو تھوڑے سے بہتر ہونگے وہ فتوی دیں گے کہ باہر نکلنے کے لئے برقعہ پہننا ضروری ہے لیکن یاد رہے روزی روزگار کی ذمہ داری اسلام نے عورت پہ نہیں ڈالی۔

کیوں مولانا صاحب میں کیوں برقعہ پہنوں؟

  چالیس ڈگری سینٹی گریڈ پہ برقعے کے تصور سے مجھے اپنا آپ برا لگتا ہے، مولانا صاحب سے نفرت ہو جاتی ہے اور خدا سے بیر۔ جو انتہائ قدرت رکھنے کے باوجود اتنا بے بس تھا کہ مجھے آزادی سے کھلی فضا میں سانس لینے کے لائق نہیں بنا سکا۔ اگر اسے مجھےکپڑوں کے باوجود کوکون کی طرح برقعہ میں ہی لپیٹ کر رکھنا منظور تھا تو اسے کم سے کم میرا جسمانی نظام ہی اسکے مطابق بنانا چاہئیے تھا۔ وہ قادر مطلق ہے پھر اسے آزمائش کے سارے سخت مرحلوں سے مجھے ہی کیوں گذارنا مقصود تھا اور ان سخت مراحل کے باوجود مزے کی زندگی دنیاوی اور دنیا کے بعد مردوں کے حصے میں۔ خدا کس قدر امتیازی سلوک رکھتا ہے اپنی مخلوقات میں۔

اسلام پہ قائم رہنے کے لئے میں سوچتی ہوں کہ ایسا عقل سے عاری خدا مولانا صاحب کو ہی مبارک ہو۔  مجھے اکیسویں صدی میں ایک جینیئس خدا چاہئیے۔ ساتھ ہی مجھے خیال آتا ہے کہ مولانا صاحب کے بند دماغ سے اپنے خدا کو کیوں دیکھوں۔ میرے خدا کو میرے شایان شاں ہونا چاہئیے۔ اگر میں زمین ہوں تو اسے آسمان ہونا چاہئیے میں جتنی  زبردست ہوں اسے مہا زبردست ہونا چاہئیے۔

اچھا اب آگے بتاتی ہوں کہ دنیا کے واقعات کیسے پیش آتے ہیں۔ جن سے مولانا صاحب کا خدا لا علم معلوم ہوتا ہے۔

 فرض کریں کہ کوئ عورت سات بچوں کی ماں ہے اور اسکے شوہر کا انتقال ہوجاتا ہے۔ لیکن مولانا صاحب کے دین کے مطابق ایک نیک عورت ہے یعنی تمام زندگی گھر سے باہر قدم نہیں رکھا تو صحیح اسلامی حل یہ ہوگا کہ عدت ختم ہونے پہ ایک اور شوہر کرے۔ اس شوہر سے بھی اس کے پانچ بچے ہو جاتے ہیں لیکن وہ شوہر ، پہلے شوہر کے بچوں کو نہ اپنے ساتھ رکھنے کو تیار ہے اور نہ ہی انکی کسی بھی قسم کی ذمہ داری لینے کو تیار ہے۔ اسلامی تعلیمات میں سوتیلا باپ انکا ذمہ دار ہے بھی نہیں۔  ان بچوں کے رشتے دار بھی اس قابل نہیں کہ انہیں سپورٹ کر سکیں۔ ان میں سے جو بچیاں ہیں چاہے وہ چھ برس کی ہوں انکی تو فوراً شادی کر دینی چاہئیے کیونکہ اسلامی تعلیمات کی جو روشنی مولانا صاحب کے طفیل ملتی ہے اس میں ایک عورت کی پیدائش کا مقصد شادی اور بچوں کی پیدائیش کے سوا کچھ نہیں ہے۔

 اب عورت جھلا کر مولانا صاحب سے پوچھ سکتی ہے کہ  آخر ساری زندگی گھر کی چہار دیواری میں بند رہنے اور مسلسل بچے پیدا کرنے کے بعد میرے ہی حصے میں دوزخ کیوں زیادہ آئے گی۔ مولانا صاحب فرمائیں گے بد بخت تیری اسی زبان درازی کی وجہ سے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ یہ دوسرا شوہر چند سالوں بعد ایک دن ناراض ہو کر تین دفعہ طلاق کہتا ہے اور اب اس گھر میں اس عورت کے لئے کوئ جگہ نہیں۔ اسکے حصے میں خوش قسمتی سے معمولی سی مہر کی رقم آجائے تو اسے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئیے۔  اسکے علاوہ کچھ نہیں۔

اب ان پانچ بچوں کاکیا ہوگا؟

 ایک دفعہ پھر مولانا صحاب کی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جو بچیاں ہیں انکی فی الفور شادی کر دی جائے اس سے فرق نہیں پڑتا کہ چھ سال کی لڑکی کی پچاس سال کے مرد سے کر دیں۔ آپ جانتے ہیں پھر اسلامی تاریخ بیان کی جائے گی جو دراصل عرب ثقافت اور تاریخ ہوگی۔ وہ بھی ڈیڑھ ہزار سالہ پرانی۔

اب یہ عورت تیسرا شوہر تلاش کرے گی۔ لیکن جو کام وہ نہیں کر سکتی، وہ یہ کہ خود کام کرے پیسے کمائے اور اپنے بچوں کے مستقبل کو زیادہ محفوظ بنائے تاکہ یہ سب بچے اسکے قریب رہیں اور بہتر اور کار آمد انسان بنیں۔

کیوں؟

کیونکہ مولانا صاحب کے قائم کردہ معاشرے میں وہ ایک جانور کی طرح نہ کوئ قابلیت رکھتی ہے نہ ہنر،  نہ مرتبہ۔ مولانا صاحب اگر اسے کبھی مثال کے لئے پیش بھی کرتے ہیں تو کھلے ہوئے گوشت کی صورت یا بغیر ریپر کی  وہ ٹافی جس پہ مکھیاں بھنبھنا رہی ہو۔ اس سے زیادہ دیکھنے اور سوچنے کی سکت مولانا صاحب میں نہیں ہے۔ وہ اگر چاہے بھی تو کیا کرے گی۔ مولانا صاحب سے بغاوت کرے گی تو زیادہ سے زیادہ بغیر مذہبی تعلقات کے اپنے آپکو فروخت کے لئے پیش کرے گی۔ ایک بے ہنر اور ان پڑھ عورت اسکے علاوہ کیا کرے گی۔

واضح کر دوں کہ فرض کرنے کے علاوہ یہ ایک سچا واقعہ ہے۔

اس صورت حال پہ مولانا صاحب یا انکے چیلوں کو ذرا شرم نہیں آئے گی۔  دنیا تو ہے ہی آزمائش کی جگہ۔ وہ ایک اور فتوی جاری کرتے وقت فرما دیں گے۔ یہ ہم نہیں جانتے کہ یہ آزمائش واقعی خدا کی طرف سے ہے یا مولانا صاحب کی طرف سے۔ وہ کہتے ہیں قرآن یہ کہتا ہے اور حدیث یہ کہتی ہے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں مولانا صاحب کہ عہد نبوی میں صحابہ متع کرتے تھے اور عورتیں غربت کی وجہ اناج کے ایک پیالے پہ متع کرتی تھیں۔ یہ نکاح چند دن یا چند مہینے رہتا اور پھر ختم ہوجاتا۔ متع کرنے والی یہ عورتیں نکاح سے پہلے مردوں کو دیکھتیں اور ان سےپورا معاملہ طے کرتیں۔ یقین نہ ہو تو سیرت النبی میں یہ واقعہ پڑھ لیجئیے۔

آج بھی اسلام میں متع کے بارے میں دو مخلف فرقے موجود ہیں ۔ سنیوں کے نزدیک جائز نہیں شیعوں کے نزدیک جائز ہے۔ آج شیعوں کے ایران میں جسم فروشی کی صنعت کو متع کی وجہ سے تحفظ حاصل ہے۔ لیکن آج کے ایران میں خواتین بغیر اسکارف کے نہیں رہ سکتیں۔ ہے نا، مذاق۔

نیک عورت  کے پیمانے بھی کتنے مختلف ہیں۔ وہ اس تصویر سے واضح ہیں۔

 اس تصویر سے  پتہ چلتا ہے کہ سب سے نیک مسلمان عورت وہ ہوگی جو مافوق الفطرت مخلوق کی طرح کسی کو نظر نہیں آئے گی۔ اس سے ہم مندرجہ ذیل نتائج اخذ کرتے ہیں۔

 نیک عورت وہ ہے جس کی نہ آواز سنائ دے اور جو اپنے گھر میں ایسے بند رہے کہ کسی کو خبر بھی نہ ہو کہ وہ پیدا بھی ہوئ تھی ایسے گھروں سے شادی کارڈ ملے گا تو اس پہ دلہن کا نام موجود نہیں ہوگا۔ یعنی یہ عورتیں عہد نبوی کی عورتوں بلکہ رسول کی بیویوں سے بھی زیادہ نیک ہوئیں۔ اگر نیکی کے اس ورژن کی مزید تفصیل میں گھسا جائے تو سب سے نیک عورت وہ ہوئ جسے خدا دنیا میں جانے کی نوید دے مگر وہ دنیا میں آنے سے انکار کر دے یعنی پیدا ہونے سے انکاری ہوجائے۔

نیکی کا اگلا ہلکا معیار یہ ہے کہ برقعہ پہن کر گھر سے نکل سکتی ہے وہ بھی محرم کے ساتھ لیکن جسم کا کوئ حصہ نظر نہ آئے۔ ہاتھوں میں دستانے، پیروں میں موزے اور آنکھوں پہ نقاب  میں جالیاں۔ سوچتی ہوں عہد نبوی میں رفع حاجت کے لئے جنگل میں جانا پڑتا تھا۔ اس وقت گھروں میں بیت الخلاء نہیں ہوتے تھے۔ خواتین پہلے سے برقعہ پہن کر بیٹھ جاتی ہونگیں یا فوری ضرورت پیش آجائے تو برقعے کی طرف بھاگتی ہونگیں۔ پیٹ خراب ہونے کی صورت میں مقام ضرورت پہ ایک خیمہ گاڑ دیا جاتا ہو گا۔

نیکی کا اگلا معیارچہرہ ،  ہتھیلی اور پیر کھلے رہ سکتے ہیں۔ مردوں سے ضرورت کے لئے بات کی جا سکتی ہے فیس بک پہ تبلیغی چیٹنگ شاید کی جا سکتی ہے کیونکہ جادو صرف آواز میں ہوتا ہے تحریر میں نہیں۔ اور مذہبی گفتگو کے وقت تو شیطان کوسوں دور رہتا ہے۔ حالانکہ جدید تحقیق کہتی ہے کہ خواتین کی تحریر میں بھی راغب ہوجانے والے مردوں کے لئے جادو ہوتا ہے۔  اس لئے بعض خواتین کو دیکھتی ہوں کہ برقعہ پہن کر کلائیوں پہ موزے کی طرح کے ٹائیٹس پہن لیتی ہیں کیوں کہ اگر کسی وجہ سے برقعہ کھسک جائے تو کلائ نہ نظر آ سکے یہ ستر میں شامل ہے۔

عہد نبوی میں جبکہ کپڑا ہی بمشکل ملتا تھا وہ بھی عام لوگ نہیں خرید پاتے تھے اس وجہ سے نبوت سے پہلے غریب لوگ حرم کا طواف ننگے ہو کرکرتے تھے۔  خیر، جب عرب میں کپاس نہیں پیدا ہوتی تھِی تو یہ ٹائیٹس کیسے بنائ جاتی ہونگیں؟

چاہے گھٹنوں تک اسکرٹ پہنیں، شراب پیئیں یا ایک کے بعد ایک  طلاق اور شادیاں کرتی رہیں لیکن سر پہ اسکارف ضرور ہونا چاہئیے۔ عورت کے بال میں جادو ہے۔ بال نہیں نظر آنا چاہئیے۔ اس پہ تو صرف ایک ہی خیال آتا ہے کہ کوئ عورت اگر ساری زندگی گنجا رہنے کا فیصلہ کر لے تو کیا اسکارف کی پابندی اس پہ سے ہٹ جائے گی۔ کیا گنجی عورت بال والی عورت سے زیادہ نیک ہوگی ؟ کیا ایک گنجی عورت، ایک مسلمان عورت کی علامت نہیں بن سکتی؟ کیا خدا عورت کو گنجا نہیں پیدا کر سکتا تھا؟

قابل غور بات یہ ہے کہ دنیا کے تمام ممالک  میں اگر خواتین کی حالت کا موازنہ کیا جائے تو اسلامی ممالک کی خواتین سب سے زیادہ بد حال نکلیں گی معاشی اور سماجی حساب سے۔  معیشت کے لئے وہ اپنے شوہر یا باپ کی محتاج ہوتی ہیں۔ شوہر علاج کرانے سے انکار کر دے تو معمولی بیماری میں بھی جان دے سکتی ہے۔ اگر شوہر نکال باہر کرے یا باپ کا سایہ نہ رہے تو یہ عورت دربدر ہوجاتی ہے لیکن اپنے آپ کو بچا نہیں سکتی۔  معاشی اور سماجی دباءو ایسا ہے کہ اپنی صحت کے بارے میں نہیں سوچ سکتی ۔ کیا یہ توقع کی جانی چاہئیے کہ یہ عورت اپنے گھر میں بیٹھ کر بچوں کی بہترین تربیت کرے گی  ایک لا علم عورت جس طرح کی تربیت کر سکتی ہے وہ ویسی ہی کر پاتی ہے سو آبادی میں نکمے لوگوں کی ایک کثیر تعداد کی غلط تربیت کا الزام بھی اسی پہ ڈالا جاتا ہے۔

 دیکھا جائے تو شاید آئ کیو کی سطح پہ بھی مسلمان عورت دنیا کی دیگر عورتوں میں سب سے زیادہ پسماندہ ہوگی کیونکہ آئ کیو محض خدا کی دین نہیں ماحول اور دماغی صلاحیتوں کو استعمال کرنے سے بھی تشکیل پاتا ہے۔ جبکہ سب سے بہتر مسلمان عورت وہ ہوتی ہے جو اپنی عقل ہرگز استعمال نہ کرے۔

 کہتے ہیں کہ پردہ ایک عورت کو محفوظ کرتا ہے اس کا مذاق پاکستان ہی میں وہ ثقافتیں اڑاتی ہیں جہاں خواتین سب سے زیادہ پردے میں رہتی ہیں اور جہاں سب سے زیادہ جرائم خواتین کے خلاف ہوتے ہیں۔

ادھرپردے کے لئے ایسی مہم چلی ہوئ ہے کہ لوگ ہر آڑی ترچھی دلیل لانے کو بے قرار۔ جیسے ہر عورت اگر حجاب پہن لے تو بس سارے مسائل حل۔ دنیا ایک دم جنت کا نمونہ بن جائے گی۔ ہر مولوی  لڑکا چند حسین آنکھوں پہ عشقیہ اشعار لکھ کر ایک خوبصرت لڑکی کو پس منظر میں رکھ کر ایک تصویر بناتا ہے اور اسے اپنے اسٹیٹس پہ ڈالتا ہے اور اسکے بعد اگلے اسٹیٹس میں مسلمان بہنوں کو اس قسم کے پغام دیتا ہے۔

  نوبل پرائز ملنے پہ کسی نے توکل کرمان کو جھوٹے منہ بھی نہ پوچھا ہمارے ملک میں لیکن ہلیری کلنٹن سے ایوارڈ وصول کرتے وقت جب توکل کرمان نے حجاب پہ فخر کیا تو ماشاء اللہ کی صداءووں کے ساتھ انکی تصویر سوشل میڈیا پہ موجود تھی۔

حالانکہ اس سے پہلے یہ ماشاء اللہ ان حسین خواتین کی تصاویر کے ساتھ ہوتا جو میک اپ سے مزین چہرے پہ خوبصورت ریشم کا اسکارف باندھے ہوتیں۔ یعنی بس اسکارف  یا دوپٹہ سر پہ ہونا چاہئیے اسکے بعد مولوی لڑکوں کا دل پھینکنا بالکل جائز اور اسلامی ہوتا ہے۔ اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ لوگ دین کو کس قدر سطحی طور پہ سمجھتے ہیں۔

 اب اس تفصیل سے گذرنے کے بعد یہ تو یقین ہو جاتا ہے کہ مولانا صاحب بھی جدید ٹییکنالوجی کے دلدادہ ہیں۔  فیس بک پہ اپنی ہم خیال، با حجاب خواتین کے اسٹیٹس پہ ہی جزاک اللہ، ماشاء اللہ نہیں کہتے بلکہ انکی فرینڈز کی لسٹ میں بے شمار نامحرم خواتین کی بے حجاب  تصاویر اور نام محض یاد دہانی کے لئے ہوتے ہیں کہ انکو راہ راست پہ لانا ہے۔ اس طرح آپ صرف انکے فرینڈز کی لسٹ دیکھ کر ہی انکی زندگی کے اعلی مقاصد نہ صرف گن سکتے ہیں بلکہ یوم آخرت میں انکو حاصل ہونے والی نیکیوں کو بھی آڈٹ کر سکتے ہیں اس کو کہتے ہیں چپڑی وہ بھی دو دو۔

اب اصل سوال یہ ہے کہ کیا ایک ایسا معاشرہ ممکن ہے جہاں عورت اور مرد دو ایک دم الگ دنیاءووں کے باسی ہوں ایسے کہ وہ ایک دوسرے سے کوئ کمیونیکیشن نہ کر سکیں سوائے اپنے محرموں کے؟

 یہاں کراچی میں ایک مینا بازار ہے جہاں خواتین دوکاندار اور خواتین ہی خریدار ہوتی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خواتین کے اس بازار میں زیادہ تر خواتین کے زیر جامہ فروخت ہوتے ہیں۔ اور میں نے یہ دیکھا ہے کہ یہ زیر جامے  مرد سیلز مین انہیں سپلائ کرتے ہیں اور وہ اپنی دوکان پہ بیٹھےان سے کاروباری ڈیل کرتی ہیں۔ ایک کلف لگے ہوئے کپڑے پہن کر بنے ٹھنے مولانا صاحب کو وہاں خواتین سے دوکان کا کرایہ وصول کرتے دیکھا۔ جو ان خواتین سے حسب مرتبہ مذاق بھی کرتے جا رہے تھے۔

اسکی داستان الگ ہے کہ ان زیر جاموں کو کون مرد سیتے ہیں۔ یعنی مولانا صاحب کے حرم کی خواتین بھی مردوں کے ہاتھ کے سلے ہوئے زیر جامہ پہنتی ہیں۔ اس لئے کہ خواتین  ماہر کاریگر اس مقصد کے لئے اتنی تعداد میں دستیاب نہیں ہیں۔ پھر کس حجاب کا پروپیگینڈہ ہوتا ہے، کس حیاء کے نعرے بلند ہوتے ہیں اور کون سے پردے کا اہتمام ہوتا ہے۔

تو مولانا صاحب،کیا آپ نے کبھی محسوس کیا کہ پاکستانی عورتوں کی اکثریت کیوں آپ سے نفرت کرتی ہیں اس لئے نہیں کہ آپ ٹام کروز کی طرح اسمارٹ نہیں یا رانجھے کی طرح بانسری نہیں بجا سکتے یا ہٹلر کی طرح دنیا پہ چھا جانا چاہتے ہیں  اس لئے بھی نہیں کہ آپ انہیں کھلے بازءووں والی قمیض نہیں پہننے دیتے یا آپ انہیں اپنی مرضی کا مرد منتخب نہیں کرنے دیتے، مرضی کی شادی نہیں کرنے دیتے  یا آپ انہیں تعلیم نہیں حاصل کرنے دیتے یا پھر آپ انہیں پیسہ کما کر خوشحال نہیں ہونے دیتے۔

 صرف اس لئے مائ ڈیئر مولانا صاحب کہ آپ انکے کے ہر سنگین سے سنگین مسئلے سے نظر چرا کر ان کے نظر آنے والے بال اور گوشت پہ نظر گاڑے بیٹھے رہتے ہیں۔ جیسے وہ بس بال اور گوشت کا مجموعہ ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ آپکی ساری تبلیغ، خدا اور قیامت کے سارے ڈراوے، دوزخ کی آگ اور عذاب کے تمام اعلانات کے باوجود آپکو اشتہاروں میں کھلے گلے پہنے عورتیں نظر آتی ہیں ، اسکول بم سےاڑا دینے کے باوجود آپکو تعلیمی اداروں میں زیادہ سے زیادہ عورتیں نظر آتی ہیں، گھر میں رکے رہنے اور محرم کو ساتھ رکھنے کی ہمہ وقت تلقین کے باوجودعورتیں اکیلے ایک ملک سے دوسرے ملک ، ہوائ جہاز کے سفر کر رہی ہیں۔ عورتیں گاڑیاں چلا رہی ہیں، عورتیں جہاز اڑا رہی ہیں، عورتیں شیمپو کے اشتہاروں میں اپنے جادو بھرے بال اڑارہی ہیں، عورتیں ڈیٹنگ کر رہی ہیں، عورتیں اپنے سینیٹری پیڈز بیچ رہی ہیں وہ بھی ٹی وی پہ۔

کیا یہ سب مرتد ہو چکی ہیں یا یہ سب آپکے خلاف بغاوت ہے یا خدا کے خلاف بغاوت ہے؟ کیا جدید طرز زندگی کو تسلیم کئے بغیر آپ انہیں اپنے خدائ فتووں سے روک سکتے ہیں؟ یااااااااااااااا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کیا عورتوں کا خدا کوئ اور ہے اور آپکا کوئ اور؟

11:12 PM

اسلام, پاکستان, پردہ, حجاب, خواتین, لڑکیاں, لڑکے, مذہب, ملّا, مولوی

ملغوبہ

نسیمہ کی عمر اسکی ماں کے بقول چودہ پندرہ سال ہے۔ دبلی پتلی، زرد رو نسیمہ پہلے کبھی کبھی اسکول کی چھٹی والے دن صفائ کے کاموں میں اپنی ماں کی مدد کے لئے ساتھ آیا کرتی تھی۔ لیکن جب اسکی تائ نے زور ڈالا کہ بس اب چھ مہینے میں وہ اسکی شادی کرا کے لے جائے گی تو ماں نے اسکا اسکول چھڑایا اور شادی کی تیاری کے لئے زیادہ گھروں میں زیادہ کام کر کے زیادہ پیسے جمع کرنے کے لئے روز ہی اسے اپنے ساتھ لانے لگی۔

نسیمہ کی چھوڑی ہوئ تعلیم کو جاری رکھنے کے لئے میری ساس نے اسے پڑھانا شروع کر دیا۔ اور اب بعض ناگذیر وجوہات کی بناء پہ آج کل نسیمہ مجھ سے پڑھ رہی ہے۔ یوں چھٹی کلاس کی اردو کی کتاب میرے ہاتھ لگی۔ اپنی والی تو میں چند ایک کے علاوہ بھول گئ کہ اس میں کیا کیا تھا لیکن چھٹی کلاس کی اردو کی اس کتاب کو دیکھ کر مجھے جھٹکا ضرور لگا۔

تینیتیس اسباق میں سے آٹھ مذہبی معلومات یا شخصیات کے بارے میں ہیں جنہیں بآسانی اسلامیات کی کتاب میں تاریخ اسلام کے ضمن میں ڈالا جا سکتا تھا۔

آٹھ اسباق ، وطن سے متعلق ہیں جنہیں بآسانی سوشل اسٹڈیز میں ڈالا جا سکتا تھا۔ دھیان میں رہے کہ چھٹی کلاس میں سوشل اسٹڈیز اور اسلامیات کے مضامین الگ سے موجود ہیں۔

 ایک سبق اخلاقیات پہ بھی ہے جو مہمان نوازی کے متعلق ہے اور یہ بھی دراصل عہد نبوی کا ایک واقعہ ہے۔

ایک سبق اقوال زریں پہ ہے جسکے سولہ میں سے، سب سے پہلا قرآن کی ایک آیت کا ترجمہ ہے اور دس اقوال دراصل احادیث ہیں، تین صحابہ اکرام کے اقوال ہیں، ایک شیخ سعدی کا اور ایک یحیی برمکی کا۔ یعنی مذہب اور ملک  سے باہر نہ کوئ دنیا بستی ہے اور نہ کوئ شخصیات ہیں اور انکے اقوال۔

کیا دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں زبان اسی طرح سکھائ جاتی ہے؟

اردو کی کتاب جسے دراصل صرف اردو زبان اور ادب کے متعلق ہونا چاہئیے تھا وہ آدھی سے زیادہ مذہب اور حب الوطنی کے ملغوبے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ صرف ایک ادبی شخصیت کا تذکرہ ہے اور وہ ہیں ڈپٹی نذیر احمد، شاید انہیں یہ مقام توبۃ النصوح کی وجہ سے ملا ہو۔ نصاب بنانے والوں سے صرف یہ پوچھنا چاہونگی کہ اردو کے لئے ایک علیحدہ نصاب کی کیا واقعی ضرورت ہے؟

کیا زبان سکھانے کے یہی طرائق ہوتے ہیں؟ اور کچھ نہیں تو انگریزی زبان کے زبان سکھانے کے طریقوں کو ہی دیکھا جا سکتا ہے۔

اس میں ہماری کلاسک کہانیوں کے کچھ حصے ڈالے جا سکتے تھے۔ سعدی کی حکائیتیں ڈالی جا سکتی تھی۔ اردو میں ذخیرہ ء ادب اتنا محدود نہیں کہ اردو کی کتاب کا پیٹ بھرنے کے لئے اسلامیات اور مطالعہ پاکستان کے موضوعات ڈالے جائیں۔ دنیا کی دیگر تہذیبوں کی کہانیوں کے ترجمے ڈالے جا سکتے تھے۔ مزید ڈرامے ڈالے جا سکتے تھے۔ سفر نامے ڈالے جا سکتے تھے، دنیا کی مشہور شخصیات کی سوانح عمری کے حصے ڈالے جا سکتے تھے۔ پاکستان سے باہر، مذہب سے باہر لوگوں کے بارے میں جاننا کچھ گناہ نہیں۔ بلکہ پاکستان بننے سے پہلے اس زمین پہ کئ عظیم شخصیات گذری ہیں انکے متعلق ڈالا جا سکتا ہے۔

یہ سب باتیں انہیں بھی پتہ ہونگیں، لیکن نیت یہ ہوگی کہ ثواب اور حب الوطنی زیادہ سے زیادہ کمایا جائے۔

یہی نہیں، یہ وہ سطح ہے جہاں پہ بچے محاوروں اور کہاوتوں کے استعمال سے آشنا ہوتے ہیں اس لئے اسباق کی زبان اس سے کہیں بہتر اور دلچسپ بنائ جا سکتی تھی۔

بہر حال، اس کتاب کو پڑھنے کے بعد میں سوچتی ہوں، کہ اگر اسلامیات، سوشل اسٹڈیز اور اردو کو ملا کر ایک مضمون بنا دیا جائے تو نہ صرف کم اساتذہ درکار ہونگے بلکہ اسکول ٹائم بھی کم ہوجائے گا۔ ایک گھنٹے کا فرق تو آئے گا ہی۔ اس طرح سے بجلی بچے گی ،لوگ چھوٹی موٹی صنعتیںچلانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اور کچھ نہیں تو بچے کسی درزی یا مکینک کے پاس چھوٹے بن کر اپنے فالتو وقت میں کچھ آمدنی حاصل کریں گے۔ بچیاں اپنی ماءووں کے ساتھ زیادہ گھروں میں جھاڑو پونچھا کریں گی۔ جو اس ملغوبہ نسل سے تو زیادہ عملی ثابت ہوگی۔  کیا یہ خیال غلط ہے؟

4:36 PM

اردو, اسلامیات, پاکستان, تعلیم، نصاب, حب الوطنی, سوشل اسٹڈیز, مذہب, وطن

جامعہ کراچی کے گدھ

بچے اگر ماں باپ کا نام روشن کریں تو یہ والدین کے لئے قابل فخر بات ہوتی ہے لیکن اگر والدین بھی کوئ قابل فخر کارنامہ انجام دیں تو کیا اولاد کا سر بھی فخر سے بلند نہیں ہو جاتا ہے؟

  یہی تعلق ان جگہوں سے ہوتا ہے جہاں سے ہم تعلیم حاصل کرتے ہیں جہاں سے ہم اپنے ہونے کا مطلب سمجھتے ہیں۔ بقول سکندر اعظم، میرا جسمانی باپ مجھے اس دنیا میں لایا اور استاد یعنی میرا روحانی باپ مجھے واپس آسمانوں پہ لے گیا۔ ہماری مادر علمی اگر ترقی کے زینوں پہ نظر آئے تو ہم بھی فخریہ کہتے  ہیں کہ یہ ہے وہ ادارہ جہاں سے ہم نے تعلیم حاصل کی۔

اورمیرا نہیں نجانے کتنے افراد کا یہ احساس اس وقت چکنا چور ہوا جب جامعہ کراچی ایچ ای سی کی ملک کی دس بہترین تعلیمی اداروں کی فہرست میں جگہ نہ پا سکی۔

ایک بار پھروہی سوال کیا وہ اسکی حقدار ہے؟

کسی بھی تعلیمی ادارے میں تدریسی عمل ریڑھ کی ہڈی کی حیثیئت رکھتا ہے۔ ملک کی سب سے بڑی یونیورسٹی کے تدریسی عملے میں زیادہ تر تعداد ان اساتذہ کی ہے جو نہ صرف پی ایچ ڈی  نہیں ہیں بلکہ جنہیں مستقل ہونے کا اعزاز بھی حاصل نہیں۔ یہ

کو آپریٹو ٹیچرز

کہلاتے ہیں۔  ایک مستقل استاد کی نسبت انہیں برائے نام  تنخواہ ملتی ہے اور کسی قسم کے  دوسرے فوائد حاصل نہیں ہوتے، مثلاً سالانہ چھٹیاں۔ انہیں جس وقت چاہے نکال کر باہر کیا جا سکتا ہے۔

ان کو آپریٹو اساتذہ کا انتخاب کیسے عمل میں لایا جاتا ہے؟

ضرورت مند ڈپارٹمنٹ کے نوٹس بورڈ پہ ایک نوٹس لگا دیا جاتا ہے۔ ظاہرسی بات ہے کہ اسے وہی جان پاتے ہیں جو روزانہ اس ڈپارٹمنٹ سے گذرتے ہیں۔ ڈپارٹمنٹ سے تعلق نہ رکھنے والے اس سے آگاہ نہیں ہو پاتے۔ اس طرح اسکی اطلاع بہت محدود لوگوں کو ہوتی ہے اور ان کی بڑی تعداد وہ ہوتے ہیں جو اس وقت ڈپارٹمنٹ میں موجود ہوتے ہیں۔

انتخاب ، ڈپارٹمنٹ کا چیئر مین سینیئر اساتذہ کے مشورے سے کرتا ہے۔ اس طرح کو آپریٹو ٹیچرز کا انتخاب سینیئر اساتذہ کی پسند نا پسند پہ ہوتا ہے۔ کیونکہ بہر حال ان ٹیچرز کو سینیئر اساتذہ کے ماتحت کام کرنا ہوتا ہے۔ اکثر اوقات یہ سینیئر اساتذہ کے زیر نگرانی نام نہاد ایم فل یا پی ایچ ڈی کے طالب علم ہوتے ہیں۔ یونیورسٹی میں ڈپارٹمنٹس میں کی جانے والی  پی ایچ ڈی کی کوالٹی پہ پھر کبھی بات ہوگی۔

  انکی صورت میں سینیئر اساتذہ کو ایک غلام مل جاتا ہے جو اپنی نوکری پکی کروانے کے چکر میں انکے ہر اشارے پہ ناچتا رہتا ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ بد ترین بات یہ ہوتی ہے کہ ان  کو آپریٹو  ٹیچرز کی تعلیمی استطاعت عموماً ماسٹرز ہوتی ہے۔

اگرڈپارٹمنٹ سے باہر کا کوئ پی ایچ ڈی کو آپریٹو ٹیچر کے طور پہ کام کرنے کے لئے آ بھی جائے تو سینیئر اساتذہ اپنی سازشی ذہانت کے وہ کرشمے دکھاتے ہیں کہ وہ بھاگ لینے میں ہی عافیت جانے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اس وقت جامعہ میں سینیئر اساتذہ کی زیادہ تر کھیپ اوسط سے نیچے کی صلاحیتوں پہ مبنی اشخاص کی ہے جو ذرا بھی با صلاحیت شخص سے ڈر جاتے ہیں۔

تو ان بےچارے کوآپریٹو اساتذہ یا طالب علموں کو سینیئرٹیچر کے آگے دم مارنے کی بھی مجال نہیں ہوتی کیونکہ اوّل انکی تعلیمی استطاعت ہی نہیں ہوتی  دوئم یہ کہ باہر کی دنیا کا کچھ تجربہ بھی نہیں ہوتا سوئم یہ کہ اپنے استاد کے آگے کوئ کیسے  دم مار سکتا ہے لازماً اسے انکے کرپشن میں شامل ہونا پڑتا ہے۔

سمسٹر کے شروع میں ہر سینیئرٹیچر اپنی مرضی کا کورس لیتا ہے اور اپنی مرضی کا کو آپریٹو ٹیچر تاکہ اس کارسوخ مضبوط رہے۔  اور وہ ایک ہی رٹے ہوئے کورس کو سالوں پڑھاتا رہے، اپنی کاہلی اور کم علمی کی وجہ سے زیادہ محنت نہ کرے۔  یہ سینیئر اساتذہ جس سیاسی پارٹی کی لابنگ کرتے ہیں کو آپریٹو ٹیچر کو بھی اسکی کرنی پڑتی ہے۔ اوریہی چیز سیاسی پارٹیوں کی مضبوطی کا باعث بھی بنتی ہے۔ اگر نہ کریں تو ہر برے نتائج کا الزام اس پہ جائے۔  اس لئے اس امر پہ حیرت نہیں ہونی چاہئیے کہ اتنی بڑی یونیورسٹی میں کو آپریٹو ٹیچرز ، مستقل اساتذہ سے تعداد میں زیادہ رہتے ہیں۔

انہی کو آپریٹو ٹیچرز کی وجہ سے سلیکشن بورڈ میں تاخیر ہوئ چلی جاتی ہے۔ کیونکہ اس طرح کو آپریٹو ٹیچر کا مدت تجربہ بڑھتا رہتا ہے اور سینیئر اساتذہ چالاک عقابوں کی طرح اس پہ نظر رکھے رہتے ہیں کہ انکے امیدوار کو لانے کے لئے کون سا موقع مناسب ہے اس وقت سلیکشن بورڈ بٹھایا یا یہ کہ اس دوران انکا امیدوار ہر جائز نا جائز طریقے سے ایم فل یا پی ایچ ڈی کر لے تاکہ اس کا سی وی بہتر ہو جائے۔

ادھر کو آپریٹو ٹیچر بھی امید کے سہارے دن گذارے جاتا ہے۔ حالانکہ یونیورسٹی کے قواعد کی رو سے جیسے ہی کسی ٹیچر کی جگہ خالی ہو اس کے لئے سیلیکشن بورڈ ہونا چاہئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دس  دس سال تک ایک کو آپریٹو ٹیچر کام کئے جاتا ہے۔

پانچ ، چھ سال تک سلیکشن بورڈ کا نہ بیٹھنا ایک معمول کی کارروائ ہے۔ اس سال جو سلیکشن بورڈ بیٹھا وہ چھ سال کے بعد بیٹھا تھا۔  دلچسپ امر یہ ہے کہ زیادہ تر کو آپریٹو ٹیچرز فیل ہو گئے۔ یہ فیل ہونے والے کو آپریٹو ٹیچرز گذشتہ چھ سال سے پڑھا رہے تھے اور ہم امید کر رہے تھے کہ جامعہ کراچی پاکستان کے دس بہترین تعلیمی اداوں میں آئے گی۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ فیل ہوجانے والے یہ امیدوار پھر بھی کو آپریٹو ٹیچر کے طور پہ اپنا کیریئر جاری رکھتے ہیں۔

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے، تاریکی  کی وجہ ، وہ اجتماعی شعور  ہے جو تمام خود غرض اور مفاد پرست لوگوں کے اتحاد کا نتیجہ ہے اور نظام پہ حاوی ہے۔

8:43 AM

استاد, انتخاب, پاکستان, تعلیم, جامعہ کراچی, سلیکشن بورڈ, کراچی, کو آپریٹو ٹیچر, یونیورسٹی

سڑک سے سڑک تک

پرانے زمانے میں کہاوت تھی کہ ایک مرد کی قوت کمائ اسکے گھر کے عورتوں کے سونے کے زیورات سے پتہ چلتی ہے۔ شاید خواتین نے مشہور کر رکھی ہو تاکہ ان کے مرد انہیں خوب سونے کے زیورات بنا کر دیں لیکن کسی ملک کی خوشحالی کی داستان اسکی سڑکیں سب سے پہلے سناتی ہیں۔

میں نے جب بارہ دن پہلے استنبول کی سڑک پہ پاءوں رکھا تو دور تک سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پہ ٹیولپس کے رنگ برنگے پھول لہرا رہے تھے۔ اس منظر نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔ میرے شہر میں تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ اب کس پھول کا موسم ہے۔ اس شہر کے باسیوں کی خوش قسمتی پہ رشک آیا۔  پھولوں کا سنگھار ہی کافی نہیں۔ سڑکیں صاف ستھری ہیں۔ کم از کم ترکوں کو یہ پتہ ہے کہ کچرا کیا ہوتا ہے اور اسے کہاں ہونا چاہئیے۔

جب گاڑی نے پہئیے گھمائے تو میں نے دیکھا کہ روڈ پہ جتنی گاڑیاں ہیں شاید ہی ان میں کوئ خستہ حال گاڑی ہو۔ رکشے جیسی سستی سواری، یہاں لوگ نہیں جانتے کیا ہوتی ہے۔ کسی کو چنگ چی رکشہ چائینا سے منگا کر اپنا کاروبار جمانے کا خیال نہیں آیا۔ بسیں یہاں بھی چلتی ہیں لیکن بسوں کی چھتوں پہ لوگ ندارد۔ منی بسوں کا وجود نہیں، جتنی بسیں ہیں سب بڑی، صاف اور چمکیلی۔

جو ٹرام میں نے دس سال پہلے دیکھی تھی وہ اب بھی چل رہی ہے اتنی ہی صاف۔ کہیں پان کے نشانات نہیں،  لوگ پان کے بجائے شراب کا نشہ کرتے ہیں۔ اس نشے میں کچھ تھوکنا نہیں ہوتا بلکہ نشے کو اور زیادہ خوب صورت کر دیا جاتا ہے۔

انطالیہ ائیر پورٹ سے ہمیں دو سو کلو میٹر کے فاصلے پہ ایک قصبے میں جانا تھا۔ ترکی کے ایک بڑے شہر سے لیکر اس چھوٹے سے قصبے تک ہمیں کوئ گدھا گاڑی، اونٹ گاڑی، رکشہ، چنگ چی رکشہ، منی بس حتی کہ ایف ایکس جیسی چھوٹی گاڑیاں بھی نظر نہ آئیں۔

استنبول میں چار دنوں کے دوران چار فقیر نظر آئے جبکہ انطالیہ میں ایک جگہ ایک فقیر دیکھا۔ وہاں بھی سگنل بند ہونے پہ خواتین اور لڑکے پھول بیچتے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک پہ بھی مجھے شبہ نہیں ہوا کہ وہ سڑک کنارے کھڑے کار والوں سے جسم فروشی کے معاہدے کر رہا ہے۔ ایسا ہر گز نہیں کہ وہاں یہ کام نہیں ہوتا مگر اس طرح نہیں۔

انطالیہ سے دو سو کلو یٹر کے فاصلے  پہ موجود قصبہ، کاش ایک چھوٹا سا پہاڑی قصبہ ہے۔ یہاں نوجوانوں کے پاس موٹر سائکلز دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ خواتین بھی چلاتی ہیں۔  اس لئے کہ پہاڑی پر پیچ  راستوں پہ یہ خاصی مددگار رہتی ہیں بالخصوص جب کسی ایک شخص کو سفر کرنا ہو۔

ترکی کا گروتھ ریٹ پچھلے دس سالوں میں پانچ سے چھ فی صد رہا ہے اور مجھے کاغذ پہ لکھی اس تحریر پہ یقین ہے۔ دس سال پہلے نیلی مسجد، آیہ صفیاء، یا انکے درمیان موجود زیر زمین حوض کے لئے مجھے سڑک کنارے قطار نہیں لگانی پڑی تھی۔ لیکن اس دفعہ اتنی لمبی قطاریں موجود تھیں کہ آیہ صفیاء کے اندر داخل ہونے میں ہی ایک گھنٹہ لگ جاتا۔ پچھلے دس سالوں میں سیاحت میں ترکی خاصے آگے گیا ہے۔ اسکی وجہ ترکی کا سیاحوں کے لئے دوستانہ ماحول ہے۔  خاص طور پہ خواتین سیاحوں کے لئے محفوظ ماحول ہے جس کا میں اپنے ملک  کا باشندہ ہونے کے باوجود تصور نہیں کر سکتی۔

یہاں آتے جاتے ہوئے بعض اوقات مجھے انتہائ رش میں پھنسنا پڑ گیا مگر ارادتاً تو کیا کسی مرد کا غلطی سے بھی ہاتھ نہیں لگا۔ واپس آنے کےاگلے دن میں کراچی میں  سڑک کے کنارے لگے سبزی بازار میں شام کے وقت موجود تھی اور سوچ رہی تھی کہ سڑک پہ چلتے ہوئے اپنے آپکو سمیٹنا کیا صرف ایک خاتون کا فرض ہے۔

ترکی کی ایک اہم صنعت گاڑیوں کی تیاری ہے جس کی بیرون ملک خاصی مانگ  ہے آمدنی کے اہم ذرائع میں یہ بھی شامل ہے۔

جبکہ ہمارے یہاں کوشش یہ کی جارتی ہے کہ صنعت کے نام پہ جو کچھ موجود ہے وہ بند ہو جائے۔ کوئ سرمایہ کار غلطی سے بھی پاکستان کا رخ نہ کرے۔ آنے والی خواتین کو ہم پردے اور چہار دیواری کے سبق پڑھائیں۔ کیا سیاح، کیا سرمایہ کار، کوئ اس ملک کا رخ کرتے ہوئے بھی گھبرائے۔  ہم محض دوسرے ملکوں کی اشیاء کے سیلز مین بن کر رہ جائیں۔ چائینا کی چیزیں بیچیں ، وہاں سے جنریٹر اور یو پی ایس اور بیٹریاں لائیں کیونکہ حکومت بجلی کی پیداوار بڑھانے سے قاصر ہے، ہماری گارمنٹس  فیکٹریاں بنگلہ دیش روانہ ہو جائیں،  ہم  اپنی مقامی صنعتیں بند کریں اور انڈیا کی چیزیں فروخت کریں۔ ہم اپنا خام مال باہر بھیج دیں ، لیکن اپنے ملک کے کاریگر کو اپنی کاریگری دکھانے کا موقع نہ دیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا سرمایہ کار اب چین، بنگلہ دیش، انڈیا  اور ملائیشیاء کی طرف دیکھ رہا ہے۔

صنعتوں کے بند ہونے کی وجہ سے بے روزگاری کی شرح میں اضافہ ہورہا ہے۔ اس طرح چیزوں کا عام آدمی کی پہنچ سے باہر ہونے کی وجہ انکا مہنگا ہونا ہی نہیں ہے بلکہ قوت خرید کا کم ہونا بھی ہے۔

ترکی  نے پچھلے سالوں میں سینٹرل ایشیاء کی ریاستوں سے تیل کے معاہدے بھی کئے ہیں جن سے اسے خاصہ معاشی استحکام حاصل ہوا ہے جبکہ ہمارا ایران کے ساتھ گیس کا معاہدہ بھی برسوں لٹکا رہا۔

استنبول سے روانہ ہوتے وقت میں نے اپنے ہم سفر سے پوچھا کہ کیا ترکی میں گھر خریدنے کی اجازت ہے۔ جواب ملا ہاں بالکل خرید سکتی ہیں۔ کیا آپ لینا چاہتی ہیں؟ ہاں، سرمایہ ہو تو، میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور یہ چیز عنقا ہے ہمارے پاس۔ ترکی نے مجھے اپنا سرمایہ لگانے کو تیار کر لیا۔

میں بارہ دن کے بعد واپس استنبول ائیر پورٹ میں جہاز میں بیٹھی ٹیک آف کا انتظار کر رہی تھی کہ میں نے دیکھا ہمارے آگے ایک کے بعد ایک چھ جہاز رن وے پہ داخل ہوئے اور اڑ گئے۔ چھٹے نمبر پہ جب ہمارا جہاز اڑنے والی جگہ پہ پہنچا تو میں نے اپنے پیچھے آنے والے جہازوں پہ نظر کی جہاں تک نظر نے ساتھ دیا سات جہاز نظر آئے جو ہمارے پیچھے رینگ رہے تھے۔ اور انہیں ہمارے بعد باری باری فضا میں تتلیوں کی طرح اڑنا تھا۔ یعنی ہر تین منٹ بعد اس رن وے سے ایک جہاز اڑ رہا تھا۔ یہ ایک مصروف ائیر پورٹ ہے۔ جتنا مصروف ائیر پورٹ ہے اتنا  ہی زیادہ آمدنی کا باعث ہوگا۔

استنبول ائیر پورٹ پہ نجانے کتنے جہاز بھی موجود تھے جب ہم نے استنبول سے پرواز کی۔  نیچے نظر کی  تو شہر کی جگمگاہٹ دیکھ کر یہ بتا سکتی تھی کہ استنبول شہر کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ کتنے پل ہیں جو یوروپ والے حصے کو اس حصے سے ملاتے ہیں جو ایشیاء میں ہے۔

صبح پانچ بجے جب جہاز کراچی کی حدوں میں داخل ہوا تو میں اوپر سے دیکھ کر بتا سکتی تھی کہ اس وقت شہر کے کن حصوں میں لوڈ شیڈنگ ہو رہی ہے۔ جہاز نے کراچی ائیر پورٹ پہ لینڈ کیا۔ یہاں چھ جہاز کھڑے نظر آئے۔ ائیر پورٹ پہ سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف ہمارا جہاز حرکت میں تھا۔ اندر داخل ہوئے تو ایک بے رونق ، زرد فضا جس میں گرم جوشی یا حرکت نام کو نہیں۔

باہر نکلے تو زرد چہروں کے بچوں کا ہجوم ، اتنے ہی پیلے چہروں والی خواتین سروں  سے دوپٹہ سختی سے لپیٹے، آنے والے مسافروں میں اپنوں کو تلاش کر رہی تھی۔  میرے آگے سات سے نو سال کی عمر کی تین بچیاں برقعہ پہنے جا رہی تھیں۔ جن کے زرد چہروں کو نورانی کہہ کر انکے رشتے دار صدقے واری ہو رہے تھے۔ ہمارے پیچھے ایک خاندان عمرہ کر کے لوٹ رہا تھا۔  ائیر پورٹ کے احاطے میں جا بجا استعمال کی ہوئ اشیاء کے کارٹنز یا ریپرز ادھر ادھر پڑے ہوئے تھے۔ دو غیر ملکی گورے اپنے سامان کی ٹرالی کو دھکا دے کر اس ڈھلواں پہ چڑھانے کی سخت کوشش میں تھے جو کناروں سے ٹوٹی ہوئ تھی۔ سڑک کی وہی حالت تھی جو بحیثیت مجموعی ہمارے ملک کی ہے۔

سڑک پہ مجھے خیال آیا کہ ابھی دوپہر کو اس سڑک پہ سب سے زیادہ ہجوم موٹر سائکل والوں کا ہوگا۔ شہر میں ٹرانسپورٹ مافیا کی وجہ سے کئ دہائیوں سے کوئ بھی حکومت ٹرانسپورٹ کا کوئ متبادل نظام لانے میں ناکام رہی ہے۔ اس مافیا کے کرتا دھرتا ہماری اسمبلیوں کا حصہ بھی ہوتے ہیں اس لئے کوئ بھی حکومت اس معاملے کو زیر غور لانے میں بھی دلچسپی ظاہر نہیں کرتی۔  لوگوں نے چائینا سے درآمد کی ہوئ سستی موٹر سائیکل میں اپنی مشکل کا حل نکالا ہے۔ حکومت اس سے خوش معلوم ہوتی ہے کہ اس سے اسے جنرل سیلز ٹیکس کے علاوہ دیگر ٹیکسز بھی مل رہے ہونگے۔

روزانہ بڑھتی ہوئ تیل کی قیمتوں کی وجہ منی بسز کے کرائے اب عام انسان کی پہنچ سے دور ہو رہے ہیں اسکا حل لوگوں نے چنگ چی رکشے میں نکالا ہے۔ جس فاصلے کے لئے منی بس پندرہ روپے لیتی ہے اس سے زیادہ فاصلے کے لئے چنگ چی دس روپے لیتا ہے۔ کراچی جیسے بڑے شہر میں ایک شخص کا روزانہ دو بسیں، ایک طرف کے فاصلے کے لئے بدلنا کوئ خاص بات نہیں۔  منی بس کے بجائے چنگ چی سہی۔ لیکن ٹرانسپورٹ کے ذرائع جتنے چھوٹے ہوتے جاتے ہیں ٹریفک اتنا زیادہ بے ہنگم ہوتا جاتا ہے۔

جو لوگ یہ بھی افورڈ نہیں کر سکتے وہ سائکل چلاتے ہیں۔ اسکے باوجود سڑک پہ کوئ خاتون سائیکل یا موٹر سائکل چلاتے نظر نہیں آئے گی۔ سڑک بتاتی ہے کہ خواتین اور مرد میں کتنا فرق ہے۔

غریب آدمی سامان ڈھونے کے لئے گدھا گاڑی استعمال کرتا ہے۔ یوں جب سگنل بند ہوتا ہے تو ہمارے ملک کی جی ڈی پی کی شرح دیکھنے کے لئے وزیر اقتصادیات کا بیان پڑھنا ضروری نہیں ہوتا۔ سب سے زیادہ تعداد لش پش کرتی فور وہیل گاڑیوں کی  یا حکومت کی سرپرستی میں چلنے والی صاف ستھری بڑی گاڑیوں کی نہیں بلکہ دو پہیوں کی سواری ہوتی ہے۔ اس لئے جب  وہ یہ  فرماتے ہیں کہ اس سال پاکستان کا گروتھ ریٹ چار فیصد رہا اور اگلے سال چھ فی صد ہونے کی امید ہے تو انکے اس بیان پہ نظر ڈالنے کا بھی دل نہیں چاہتا۔ نجانے وہ کس پاکستان کی گروتھ ریٹ کی بات کرتے ہیں۔ اگر ہمارے پاکستان کی تو جھوٹے کا منہ کالا۔

تو جناب، سڑک، کسی بھی ملک کی سڑک اسکی خوشحالی کی داستان سناتی ہے۔اسکے سیاستدانوں کے جھوٹ سچ بتاتی ہے، اسکے لوگوں کی ترجیحات بتاتی ہے، اسکے لوگوں کا اخلاق بتاتی ہے۔ سڑک کسی ملک  کا، کسی شہر کا آئینہ ہوتی ہے۔ یقین نہیں آتا تو کچھ دیر کو اپنے شہر کی سڑک کے کنارے کھڑے ہوجائیں۔

10:38 PM

استنبول, پاکستان, ترقی, ترکی, ٹرانسپورٹ, سڑک, کراچی, گروتھ ریٹ, معیشت

پاکستان سے ترکی

زیر زمین حوض کی راہداریوں میں گھومتے ہوئے گائڈ نے بتایا کہ اگر اس پانی میں پتھر پھینکیں تو دوبارہ استنبول ضرور آتے ہیں۔ مارکیٹنگ اسٹریٹجی، میں نے سوچا اور گائڈ کا دل رکھنے کو ایک سکہ پانی میں اچھال دیا۔ وہ ان سکوں میں جا کر مل گیا جو صاف پانی کی تہہ میں چمک رہے تھے۔  یہ سب سکے جمع ہو کر منافع میں جاتے ہونگے۔ میں نے دل میں پکے بنئیے کی طرح حساب لگایا۔

کون ایسا ہوگا جو دوبارہ استنبول نہ آنا چاہے۔ اگر کسی کو یہاں ہر گلی میں سینکروں سال پرانی تاریخی عمارت سے دلچسپی نہ ہو تو یہاں کے کھانے اسے کھینچ لائیں گے۔ اور کچھ نہیں توباسفورس کا وہ پل کھینچ لائے گا جو ایشیا کو یوروپ سے ملاتا ہے۔ یہاں آکر پتہ چلے گا کہ جب یوروپ کا حسن ایشیاء کے حسن سے ملتا ہے تو کیا دلکش نقش ابھرتے ہیں۔ استنبول میں شاید دنیا کے خوبصورت ترین لوگ بستے ہیں۔ اتنے خوبصورت چہرے میں نے مغرب میں نہیں دیکھے۔

  اسکے بعد دنیا کے مختلف حصوں میں گئے اور یہ دیکھا کہ پانی کو سکے دینے کا رواج ہر جگہ ہی ہے۔ کسی زمانے میں جب پانی دیوتا تھا تو اسے راضی رکھنے کے لئے ایک نوجوان لڑکی دینا بھی ایک رواج ہوا کرتا تھا۔ ہر دیوتا کو عورتیں بڑی پسند ہوتی ہیں قربانی کے لئے۔  تمدن میں ترقی کے ساتھ  ساتھ ہر دو کی حیثیئت میں فرق آیا ۔ جدید انسان صرف سکے عطا کرتا ہے وہ بھی اپنی خوشی کے واسطے۔

ٹورنٹو جیسے جدید شہر کے جدید شاپنگ مال میں نصب فوارے کے اردگرد جمع ہو جانے والے پانی میں بھی سکے جھلملا رہے تھے۔  شاید خیال یہ ہوتا ہے کہ پانی میں پیسے ڈالیں اور اپنی کوئ دلی خواہش بھی اسکے ہمراہ ڈال دیں۔ پانی اپنے بہاءو میں اسے قبولیت کے دروازے تک لے جائے گا۔

ایک لمبا عرصہ گذرنے کے بعد اس سکے نے اپنی قیمت ادا کی اور میں ایک دفعہ پھر استنبول میں موجود ہوں۔  رات بھر سفر کی مصروفیت میں رہنے کے بعد اگلا دن بس یونہی سا گذرا۔ موسم کے ساتھ تعلق نبھانے کی کوششیں۔ سارا دن بارش ہوتی رہی۔ درجہ ء حرارت ویسے ہی کم تھا۔ پندرہ ڈگری سینٹی گریڈ۔ کراچی والوں کے لئے سردی ہی ہے لیکن بارش کے بعد استنبول والے بھی گرم کپڑے پہنے نظر آئے۔ یہاں ابھی سردی رخصت نہیں ہوئ۔

اس سے اگلے دن لمبی قطارمیں لگ کر نیلی مسجد کے اندر قدم رکھا۔ یہ قطار جوتے اتار کر تھیلی میں رکھنے کے لئے تھی۔ حیرانی ہوئ کہ پچھلی دفعہ تو ایسی کوئ قطار نہ تھی۔ لوگوں کا رش بہت زیادہ تھا۔ وجوہات یہ معلوم ہوئیں کہ ایک تو اتوار تھا اور دوسرے ترکی کے قومی دن کی چھٹی کی وجہ سے مقامی لوگ اور سیاح سبھی موجود تھے۔ مسجد کے اندر تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔

 داخلی دروازے پہ پلاسٹک کی تھیلیاں مل رہی تھیں جن میں جوتے ڈال  کر مسجد کے اندر داخل ہو سکتے ہیں بس پہن کر نہیں پھر سکتے۔ یہ اتا ترک کا سیکولر ترکی ہے یہاں ایسی ہی دلچسپ باتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مسجد کے احاطے میں اس موقع پہ مختلف پروڈکٹس کے اشتہارات لگے ہوئے تھے لیکن ان میں سے ایک بھی خواتین کے پردے یا جہاد پہ نہیں تھا جو کہ ہمارے ملک کے پسندیدہ موضوعات ہوتے ہیں۔

غیر ملکی خواتین کھلی ٹانگوں اور بیشتر خواتین ننگے سر کے ساتھ مسجد کے اندر موجود تھیں مگر طیب اردگان صاحب نے ابھی تک اس اہم مسئلے کی طرف نظر نہیں کی کہ کیسے مسجد کی حرمت خواتین کی اس حرکت کی وجہ سے خراب ہوتی ہے۔

استنبول تقریباً ویسا ہی ہے جیسا میں نے اسے پہلی دفعہ دیکھا۔ بس اس قہوے والے کی دوکان اپنی جگہ پہ نہیں تھی جہاں ترکش چائے پیتے ہوئے ایک پرندے نے میرے کپڑوں پہ بیٹ کر دی تھی اور میرے ترکش دوست نے اسے خوش نصیبی جانا تھا۔

نوجوان جوڑے اسی طرح ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے پھر رہے ہیں۔ ایکدوسرے کے ہاتھ سہلا رہے ہیں اور کانوں میں سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ انکی ساتھی خواتین میں حجاب اور بغیر حجاب ہر طرح کی خواتین موجود ہیں۔ جدید محبت نے یہ سب رسومات توڑ دی ہیں کم از کم ترکی کو دیکھ کر یہی لگتا ہے۔ ہر طرح کی خواتین کانوں میں ہونے والی سرگوشیوں سے شرماتی ہیں کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ شرماتے ہوئے وہ اور زیادہ حسین لگتی ہیں۔

وہی مسجد کے پاس قبلہ ء حاجات  یعنی جام و سبو بھی موجود ہیں۔ اسکی ایک سادی سی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ شہر کے اس حصے میں سب سے زیادہ تاریخی عمارات موجود ہیں مثلاً نیلی مسجد، آیہ صفیاء، ٹوپ کاپی محل، گرانڈ بازار، اسپائس بازار اور پرانے شہر کی فصیلیں سب ایکدوسرے سے قریب ہیں۔ اگر آپ پیدل چلنے کے شوقین ہیں اور ساتھ میں بچے یا بوڑھے ہم سفر موجود نہیں تو بآسانی گھوم پھر کر دیکھ سکتے ہیں۔ اس حصے میں ہوٹل بھی بہت زیادہ ہیں کیونکہ سیاحوں کا وقت بچتا ہے۔ سیاحوں کی اکثریت مغربی معاشرے سے آتی ہے اس لئے  بنتی نہیں ہے بات مئے و ساغر لئے ہوئے۔ اس لئے بھنو پاس آنکھ رکھنی ہی پڑتی ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ سیاح ترکی کی معاشی ترقی میں ایک اہم حیثیئت رکھتے ہیں سیاحت ترکی کی آمدنی کا ایک اہم حصہ ہے۔ حکومت سیاحوں کو مشکلات میں نہیں ڈال سکتی ہے۔ ہمم، لیکن شراب پینے اور بیچنے کی آزادی پورے ترکی کے لئے عام ہے۔ جسے نہیں پینا، وہ بیچتا ضرور ہے مگر پیتا نہیں۔

شہر میں ٹرام بھی چلتی ہے۔ لوگوں کی اکثریت اس سے سفر کرتی ہے۔ دنیا کے ہر حصے میں لوگ سستے طریقے سے سفر کرنا چاہتے ہیں۔ مہنگا طریقہ اسی وقت اختیار کرتے ہیں جب حکومت میں بھیڑئیے لوٹ کھسوٹ کے علاوہ کچھ کرنا نہ جانتے ہوں اور لوگ جو کچھ بھی کریں اس میں انکی ذاتی دلچسپی اور مفاد کے علاوہ کچھ اور شامل نہ ہو۔ اس طرح سے کراچی جیسے پونے دو کروڑ آبادی والے شہر میں شہر کے اندر چلنے والی ٹرین کو تقریباً ختم کر دیا گیا ہے۔ اسکی وجہ ٹرانسپورٹ مافیا کو فائدہ پہنچانا رہا۔ اس سے پہلے کراچی میں ٹرام سروس بھی بھٹو کے زمانے میں کچھ اور لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لئے ختم کی گئ۔ ریل کی پٹٹریاں تک لوگ اکھاڑ کر لے گئے۔ جہاں باقی ہیں وہاں لوگوں نے ناجائز تجاوزات اس طرح پٹٹریوں کے پاس قائم کر لی ہیں کہ آئندہ پچاس سالوں میں ان سے یہ زمین واپس لینا ناممکن نظر آتا ہے۔

بھیڑیوں کے ساتھ مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں دور اندیشی اور ویژن کی کمی ہوتی ہے اور وہ سونے کے انڈے دینے والی مرغی اور ایک عام مرغی میں نہ صرف فرق نہیں کر سکتے بلکہ اس سے مستفید ہونے کے صحیح طریقے بھی نہیں جانتے۔ یہی حال ہماری اسمبلیوں میں موجود بھیڑیوں کا ہے۔ وہ اس ملک سے بہت زیادہ کما سکتے ہیں مگر صرف اسی پہ غدر مچاتے رہتے ہیں جو قدرت انہیں مہیا کر دیتی ہے۔

سفر کی باقی روداد بعد میں موقع ملنے پہ۔ اب تک کے لئے بس اتنا ہی۔

12:52 AM

استنبول, پاکستان, ترکی, تہذیب, ٹرام, سیکولر, کراچی, مذہب

اقبال اور مولوی

کچھ اشعار اقبال کے فیس بک کی دنیا میں گردش میں ہیں۔ میں نے کلیات اقبال کھولا یہ دیکھنے کے لئے کہ کیا یہ واقعی اقبال کے ہیں تو یہ ایک نظم بانگ درا میں  مل گئ۔ طویل نظم آرام سے پڑھیں۔

اک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی

تیزی نہیں منظور طبیعت کی دکھانی

شہرہ تھا بہت آپکی صوفی منشی کا

کرتے تھے ادب ان کا اعالی و ادنی

کہتے تھے کہ پنہاں ہے تصوف میں شریعت

جس طرح کے الفاظ میں مضمر ہوں معانی

لبریز مئے زہد سے تھی دل کی صراحی

تھی تہہ میں کہیں دُرد خیال ہمہ دانی

کرتے تھے بیاں آپ کرامات کی اپنی

منظور تھی تعداد مریدوں کی بڑھانی

مدت سے رہا کرتے تھے ہمسائے میں میرے

تھی رند سے زاہد کی ملاقات پرانی

حضرت نے میرے ایک شناسا سے یہ پوچھا

اقبال، کہ ہے قمری شمشاد معانی

پابندی ء شریعت میں ہے کیسا؟

گو شعر میں ہے رشک کلیم ہمدانی

سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا

ہے ایسا عقیدہ اثر فلسفہ دانی

ہے اسکی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا

تفصیل علی ہم نے سنی اسکی زبانی

سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادت میں داخل

مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اڑانی

کچھ عار اسے حسن فروشوں سے نہیں ہے

عادت ہے یہ ہمارے شعراء کی پرانی

گاتا ہے جو شب کو تو سحر کو ہے تلاوت

اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی

لیکن یہ سنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے

بے داغ ہے مانند سحر اس کی جوانی

مجموعہء اضداد ہے ، اقبال نہیں ہے

دل دفتر حکمت ہے، طبیعت خفقانی

رندی سے بھی آگاہ، شریعت سے بھی واقف

پوچھو جو تصوف کی تو منصور کا ثانی

اس شخص کی تو ہم حقیقت نہیں کھلتی

ہوگا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی

القصہ بہت طول دیا وعظ کو اپنے

تا دیر رہی آپکی یہ تغز بیانی

اس شہر میں جو بات ہو اڑ جاتی ہے سب میں

میں نے بھی سنی اپنی احبّاء کی زبانی

اک دن جو سر راہ ملے حضرت زاہد

پھر چھڑ گئ باتوں میں وہی بات پرانی

فرمایا شکایت وہ محبت کے سبب تھی

تھا فرض مرا راہ شریعت کی دکھانی

میں نے یہ کہا کوئ گلہ مجھ کو نہیں ہے

یہ آپ کا حق تھا زرہ قرب مکانی

خم ہے سر تسلیم مرا آپ کے آگے

پیری ہے تواضع کے سبب میری جوانی

گر آپکو معلوم نہیں میری حقیقت

پیدا نہیں کچھ اس سے قصور ہمہ دانی

میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا

گہرا ہے میرے بحر خیالات کا پانی

مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں

کی اسکی جدائ میں بہت اشک فشانی

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے

کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

11:34 AM

شاعری, علامہ اقبال, مولوی, نظم

جنّاتی مسائل

وہ ایک مستند دہرئیے تھے۔ یعنی صرف لوگ ہی یہ رائے انکے بارے میں نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ بھی اسکا وقتاً فوقتاً اعلان کرتے تھے۔ یہ میری ان سے ابتدائ ملاقاتوں کی بات ہے۔  ایک عمومی رائے کے بر عکس وہ راقم کے بارے میں یہ رائے رکھتے تھے کہ تم ایک روایت پسند مسلمان ہو۔

 اگرچہ اس پہ کچھ بنیاد پرست مسلمانوں کو بڑا غصہ آتا ہے۔ لیکن  انکے نزدیک  ڈیڑھ ہزار سال پرانے مذہب پہ عمل کرنا روایت پسندی ہی ہے۔ ہمارے ایک اور ساتھی کا کہنا ہے کہ اسلام ڈیڑھ ہزار سال پرانا نہیں بلکہ ابتدائے کائینات سے صرف ایک ہی مذہب تھا اور وہ اسلام ہے۔ اگر وہ یہ بات سنتے تو یہی کہتے کہ  میاں، پھر تو یہ اربوں سال پرانا ہو گیا۔ یعنی اس سے زیادہ مستند روایتی اور کیا چیز  ہوگی۔

دہریئے پن کے علاوہ ان میں ہر وہ خوبی موجود تھی جو ایک ایماندار انسان میں ہونا چاہئیے۔ اس میں دل کی نرمی سر فہرست ہے۔ لیکن چونکہ یہ تحریر انکی شخصیت کے بارے میں نہیں۔ اس لئے ہم آگے چلتے ہیں۔

مجھے روایت پسند مسلمان جان کر ایک دن انہوں نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔ میں اس ساری چیز سے گریزاں تھی۔ اور یہ کہہ کر ٹال دیا کہ مجھے آپکے نظریات پہ کوئ اعتراض نہیں ، آپ بھی میرے نظریات کو نشانہ نہ بنائیں۔ کہنے لگے اچھا ایک بات بتاءو، جنات پہ یقین رکھتی ہو؟

سائینس غیر زمینی، ذہین مخلوق پہ تحقیق کے لئے زر کثیر لگا چکی ہے۔ ہم بھی سوچتے ہیں کہ کوئ نہ کوئ مخلوق انسان کے علاوہ ہو گی۔ تو پھر یہ بات تسلیم کر لینے میں کیا حرج کہ جنّات بھی موجود ہونگے۔ میں نے اپنا بیان دیا۔ ویسے بھی جنات پہ ایمان رکھنے یا نہ رکھنے سے ایمان پہ کوئ اثر نہیں پڑتا۔ جنات کا میری عام زندگی سے کوئ تعلق نہیں۔ میں آج تک جن چند جنوں سے ملی ہوں۔   ان  پہ  یہ جناتی کیفیت کبھی کبھی طاری ہوتی ہے۔ اس لئے وہ با قاعدہ جنوں میں نہیں آ سکتے۔  بات آئ گئ ہوگی۔

 محمد علی مکی

نے اپنے بلاگ پہ دوسرے سیاروں پہ ذہین مخلوق یا انسان جیسی مخلوق کا موضوع کھولا تو مجھے جنات پہ یہ بحث یاد آئ۔ اور انکی تحریر سے نئے سوال اٹھ کھڑے ہوئے۔ جو میں نے وہاں ڈالنے کے ساتھ اپنے بلاگ پہ بھی ڈال دئیے۔

 اسکی ایک بے کار سی وجہ یہ ہے کہ میری ذہنی ساخت مقلّد سے زیادہ سائینسی ہے۔ میں ہر خیال کو سوال کے ساتھ دیکھتی ہوں۔ مثلاً کل شام تک بچی ٹھیک تھی ایسا کیوں ہوا کہ رات بھر الٹی دست لگے رہے؟ ایسا کیوں کہ ہر بار کرپٹ لوگ ہمارے ووٹوں سے منتخب ہو کر آتے ہیں؟ ایسا کیوں کہ ہمارے ملک میں اعلی تعلیم پہ ایک ادارہ بنا کر اس پہ اتنا فنڈ لگایا جائے اور اسکول کی تعلیم کو نظر انداز کیا جائے؟ ایسا کیوں کہ مارچ میں جو ارہر کی دال آتی ہے وہ جلدی گلتی ہے جبکہ جو ارہر کی دال نومبر میں آتی ہے وہ گل کر نہیں دیتی؟

اگرچہ حکومت اور معاشرے نے اتحاد باہمی سے اس فضا کو قائم رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے کہ جس سے لوگوں میں سوال پیدا کرنے کی اہلیت پیدا ہو نے پہ قدغن لگائ جائے مگر انسانی تاریخ کہتی ہے کہ فرعون کے گھر موسی ضرور پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے جہاں اور سوالات پیدا ہوتے ہیں وہاں جنّات پہ بھی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

چونکہ خدا کی کتاب میں یہ تذکرہ ہے کہ جنات  موجود ہیں۔ اور چونکہ ہمارے مسلمان دینی عالم ہی نہیں مسلمان سائینسی عالم بھی ہر بات کو قرآن یعنی خدا کی آخری کتاب تک لے جانے پہ بضد رہتے ہیں اس لئے کچھ جوابات کی چاہت بھی ہوئ۔ جن میں سے آج کچھ جنّات کے متعلق ہیں۔

ادھر ایسی احادیث ہیں جن کے مطابق  رسول اللہ سے جنات کے قبائل آکر ملے اور مسلمان ہوئے ان میں سے بعض تو حضرت نوح کے زمانے کے تھے۔  یعنی جنات طویل العمر ہوتے ہیں۔ ایک اور روایت کے مطابق انسانوں کو جنات سے شادی نہیں کرنی چاہئیے۔

 روحانی شخصیات جو کہ جنوں کو انکی اصل حالت میں دیکھنے کا دعوی کرتی ہیں ان کا کہنا ہے کہ انکی جسمانی ساخت انسانوں سے بالکل الگ ہے۔ یہی نہیں، انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئ ہے اور جنات کی آگ سے۔ شیطان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بھی اصل میں ایک جن ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انسان سے پہلے زمین پہ جنات آباد تھے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں، جتنے دماغ اتنے خیالات۔ لیکن مکی کی باتوں سے مجھے خیال آیا کہ اگر جنات مسلمان ہوتے ہیں تو یہ بات اتنی سادہ نہیں رہتی۔ اس خیال کے ساتھ ہی بہت سارے سوالات میرے جیسے بے دماغ لوگوں کے ذہن میں آتے ہیں۔ مثلاً

اگر جنات مسلمان ہوتے ہیں تو یہودی، عیسائ، ہندو اور بدھ بھی ہوتے ہونگے۔ حتی کہ قادیانی بھی ہوتے ہونگے۔ کیا انکے یہاں بھی کافر قرار دینے کی مہم چلتی ہونگیں؟ یا وہ اس معاملے میں انسان کے مقلد ہیں؟

کیا انکے یہاں بھی مسلمان جنات کے علاوہ باقی سب ترقی یافتہ ہونگے؟

کیا انکے یہاں بھی امریکہ، اسرائیل اور سعودی عربجیسی طاقتیں موجود ہیں یا وہ ہمارے والوں پہ ہی گذارا کرتے ہیں؟

کیا انکے یہاں بھی مختلف احادیث کی روشنی میں مختلف فرقے ہونگے؟

کیا انکے بھی آپس میں جہاد ہوتے ہیں یا وہ ہمارے جہادوں میں ہی حصہ لے کر اپنی تسلی کرتے ہیں؟

کیا انکے ہاتھ ہوتے ہیں جن کے ناف پہ باندھنے اور نہ باندھنے کی وجہ سے مسلمان جنوں کے فرقے وجود میں آتے  ہوں؟

کیا انکی خواتین کے کان اور ناک ہوتی ہے جن پہ حجاب ٹہر سکے؟ کیا انکے یہاں مدنی اور مکی برقعے ہوتے ہیں؟

کیا جنات خواتین آدھی آستین یا بغیر آستین کے کپڑے پہنتی ہیں جن پہ مرد جنات بے غیرت کہلائے جائیں؟

کیا انکے یہاں بھی گل احمد اور الکرم کی لان کے اشتہار آتے ہیں، جن کی عریانیت پہ احتجاج کرنے کے واسطے خفیہ ورکنگ ویمن کی تنظیم  کروڑوں روپوں کے بینرز بنواتی ہے؟

کیا ان کے یہاں بھی غریب جنات عورتیں ان کروڑوں روپوں کے بینرز کے نیچے کھڑی ہو کر غربت کی وجہ سے اپنی عصمت کا سواد کرتی ہیں؟

کیا جنات خواتین اپنے گھروں میں بند رہنے پہ اللہ کی رحمت کی حقدار ٹہرتی ہیں؟

کیا مرد جنات اپنی خواتین کوقابو میں رکھنے کے فلسفوں پہ عمر گذارتے ہیں اور مولانا جنات انکی مدد اسی طرح کرتے ہیں جیسے ہمارے والے کرتے ہیں؟

ایک روایت کے مطابق ہماری پھینکی ہوئ ہڈیوں پہ سے اپنا کھانا چننے والے جنات کیا امیر اور غریب ہوتے ہیں؟

کیا انکے یہاں بھی نیک جنات کی قبر پہ مزار بنتے ہیں یا وہ نیک انسان کی قبر سے ہی گذارا کرتے ہیں؟

جنات تبلیغ کے لئے کسی اور سیارے پہ جاتے ہیں یا رائے ونڈ ہی آتے ہیں؟

انسانوں کے تبلیغی اجتماعات میں جنات موجود ہوتے ہیں لیکن وہ  انسان  کو تبلیغ کیوں نہیں کر سکتے ؟

اگر وہ زمین کے علاوہ کسی اور سیارے پہ آباد ہیں انکے نماز اور روزے کے اوقات اور اس سے متعلق فقہ بھی الگ ہوگا۔ کیا انکے اپنے امام ہیں یا وہ انسانوں کے اماموں سے گذارا کرتے ہیں؟

اگر جنات مسلمان ہوتے ہیں تو عقیدہ ء آخرت انکے لئے بھی ہوگا۔ انکو بھی اعمال نیک و بد کا حساب دینا ہوگا۔

کیا انہیں بھی حوریں ملیں گی؟ چونکہ  وہ آگ سے بنے ہیں تو یقیناً انکی جنت کی ساخت اور حوریں الگ خصوصیات رکھتے ہونگے۔ کیا انکی ایک الگ جنت ہوگی؟

چونکہ وہ آگ سے بنے ہیں تو انکی دوزخ بھی الگ ہوگی اب انہیں اس دوزخ میں تو رکھا نہیں جا سکتا جس کی آگ کا خوف انسانوں کو دلایا جاتا ہے۔  کیا انکے لئے آگ کا ہی عذاب ہے یا کسی اور چیز کا؟

آخر خدا نے جنوں کو کیوں تخلیق کیا جبکہ انسان فساد کرنے کو کافی تھا؟

 نوٹ؛ اس سلسلے میں قارئین میں سے  کسی کے ذہن میں کوئ اور سوال ہو تو ضرور شامل کرے۔ اگر کوئ جواب دینا چاہتا ہے تو سو بسم اللہ۔

11:13 AM

اسلام, انسان, جن, جنات, عیسائ, فقہ, مذہب, مسائل, معاشرہ, ہندو, یہودی

زندہ رشوت، مردہ بخشش

ہمارے 'محبوب صدر' نے  جب بن بلائے مہمان کے طور پہ بھارت جانے کا قصد کیا تو  دشمنوں نے جو اللہ کے کرم سے انکے کم نہیں، جس میں انکی شکل کا کم اور عقل کا حصہ زیادہ نظر آتا ہے۔  ان پہ الزام لگایا کہ وہ بھارت سے کوئ خفیہ ڈیل کرنے جا رہے ہیں۔

اگرچہ انہوں نے بار بار کہا کہ انکے اس دورے کا مقصد اجمیر شریف کی زیارت کے علاوہ کچھ نہیں ، جہاں وہ اپنی بیگم کی منت پوری کریں گے۔ ارے جناب، تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں اور یہ سیاستداں بھینگے کی۔ جس طرف کی دکھاتے ہیں اس طرف مقصود نہیں ہوتا۔

 ڈرانے والے تو انہیں کئ بار ڈرا چکے ہیں کہ مرنے والوں کا اتنا تذکرہ اچھا شگن نہیں۔ اگر مرنے والے نے بھی انہیں اس شدت سے یاد کیا تو  اس ملک کا، پیپلز پارٹی کا اور ننھے بلاول کا کیا ہوگا۔ لیکن  زرداری صاحب  بھی اپنے نام کے ایک ہی ہیں۔ ایک دفعہ ٹھان لی تو بس انڈیا جا کر ہی دم لیا۔ یہی نہیں جتنا لمبا دورہ مقصود تھا اتنا ہی رکھا اس میں وطن میں سو سے زائد فوجیوں کی سیاچن حادثے میں ہلاکت بھی رخنہ نہ ڈال سکی۔ وہ جانتے ہیں موت کا ایک دن مقرر ہے اور اجمیر شریف وہی جاتا ہے جسکا بلاوا آتا ہے۔

اسکی وجہ کچھ دل جلے یہ بتاتے ہیں کہ اب انکے مسائل کا حل نہ سپریم کورٹ کے پاس ہے نہ سوئس بینکوں کے پاس ، اب اگر انکے مسائل کا حل کسی عالم گوگیا پاشا کے پاس ہی ہے۔  بڑے لوگوں کی باتیں بڑی۔ اگر انکو کوئ بتا دے کہ آپ کسی کار کے حادثے میں کریں گے تو وہ دعا کریں گے کہ لیموزین جیسے ماڈل کی نئ کار ہو۔

اس لئے ملکی روحانی باباءوں کو انہوں نے بنظر حقارت  بھی نہ دیکھا۔  حتی کہ ہمارے ملک میں جہاں مزاروں اور مجاوروں کی کمی نہیں۔ وہ خود ایک سیاسی خاندان کے مجاور ہیں، انکے وزیر اعظم ایک روحانی خاندان کے مجاور۔ ہر دو خاندان کی سیاسی اور روحانی طاقت اتنی زیادہ ہے کہ مخالفین ایڑی چوٹی کا زور لگا دینے کے باوجود انکی شہرت میں کوئ کمی نہ لا سکے۔ مزاروں کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ زندہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

خیر، اس سب کے باوجود قرعہ ءفال اجمیر والوں کے نام کیوں نکلی؟

 محبوب صدر کا کہنا ہے کہ بیوی کی منت پوری کرنے آئے ہیں۔ ایک ایسے نازک وقت میں جب کہ ملک کا ملک انکے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے وہ پرائے دیس میں کیوں فاختائیں اڑا رہے ہیں اسکا جواب تو خلیل خاں ہی دے سکتے ہیں یا وہ۔ فی الوقت تو ان کے ہم وطن ااس ایک کروڑ ڈالر یعنی تقریباً نوے کروڑ کی رقم پہ طعنہ زن ہیں جو انہوں نے اجمیر کے مزار کے نام کی ہے۔ اگر یہ رقم وہ وطن میں ان زندہ لوگوں کے نام کر دیتے جن پہ دن بہ دن انکی ناکام طرز حکومت کی وجہ سے زندگی کے دروازے بند ہو رہے ہیں تو شاید انہیں اجمیر شریف جانے کی ضرورت پیش نہ ہوتی جو زندہ لوگوں کے دلوں میں رہتے ہیں انہیں مُردوں سے مدد نہیں چاہئیے ہوتی ۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مرنے کے بعد انہیں پاکستان میں شاید دو گز زمین نہ ملے، اس لئے اپنے لئے اجمیر میں بعد از مرگ زمین ان پیسوں کے عیوض بک کرائ ہے۔ تاکہ اس مجاور کا مزار وہاں بنے۔  ارے نہیں صاحب،  زمین نے کوئ گناہ ثواب کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔ سبھی اس کے کنوئیں میں جاتے ہیں۔ خاک وہیں پہنچتی ہے جہاں کا خمیر ہوتا ہے۔ کیا چشتی صاحب انکی ہمراہی قبول فرمائیں گے؟

یہ اجمیر والے بزرگ معین الدین چشتی  جو ہیں انہوں نے کاہے کو انہیں بلاوا بھیجا  اسکا بھی اندازہ نہیں۔  لوگوں کا اندازہ ہے کہ اللہ والوں کی بھی شاناں ہوتی ہیں۔ جسے نواز دیں۔ بس ایسی ہی باتوں سے اللہ والوں سے دل ہٹ سا جاتا ہے۔ خیر ایک معتقد نے بتایا کہ کچھ دنوں کے لئے ملک کو نحوست سے پاک کرنے کے لئے چشتی صاحب نے ایسا کیا باقی دنوں کے لئے کیوں نہیں کیا، ان مخصوص دنوں میں کیا بات تھی؟

کیا اجمیر کے مزار میں قیام پذیر چشتی صاحب، زرداری صاحب کا یہ دان قبول کر لیں گے یا انکے منہ پہ دے ماریں گے۔ اسکا نتیجہ بھی وقت ہی بتائے گا۔

ابھی یہ نہیں معلوم کہ زرداری صاحب نے یہ پیسے اپنی ذاتی جیب سے دئیے ہیں یا ہمارے ٹیکس سے۔ اگر ہمارے ٹیکس سے دئیے ہیں تو کم از کم مجھے احتجاج کا حق حاصل ہے۔ میں نے انہیں ٹیکس کی صورت میں یہ رقم اس مقصد کے لئے نہیں دی تھی۔

ہمارے شہزادے بلاول بھی والد صاحب کے ہمراہ تھے۔ سنا ہے کہ وہاں کے شہزادے راہول گاندھی کو انہوں نے اپنی سلطنت آنے کی دعوت دی ہے۔ انہیں آنا بھی چاہئیے یہ دیکھنے کے لئے ہم پاکستانی کتنے بڑے دل کے مالک ہیں کہ اپنے بچے مار کر دوسروں کے مزاروں پہ چڑھاوے چڑھاتے ہیں اس لئے کہ ہم منت کی صورت میں کئے جانے والے وعدے سے نہیں پھر سکتے۔ لیکن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ووٹ کی صورت میں کئے گئے وعدے اوراعلی عہدے پہ لئے گئے حلف کی ہماری نظر میں کوئ اہمیت نہیں ہوتی۔

 بس یونہی خیال آرہا ہے، سیاست میں تصوف تو ہوتی ہے کیا تصوف میں سیاست ہوتی ہے؟ کیا معین الدین چشتی صاحب رشوت لیتے ہیں؟

3:58 PM

آصف زرداری, اجمیر شریف, انڈیا, پاکستان, تصوف, سیاست, معین الدین چشتی

ایک نوحہ

پورے ایک سال گذرنے کے بعد مجھے داءود انجینیئرنگ کالج کراچی سے خط ملا کہ وہ جو آپ نے سال بھر پہلے ہمارے اشتہار کے سلسلے میں درخواست بھیجی تھی لیکچرر شپ کے لئے، اسکے انٹرویو ہو رہے ہیں آپ آجائیے۔

مقررہ تاریخ پہ صبح ساڑھے آٹھ بجے ہم وہاں موجود تھے۔ گھنٹہ بھر انتظار کے بعد اطلاع ملی کہ ابھی تھوڑی دیر میں ایک تحریری امتحان ہو گا۔ ممتحن آجائیں تو آپکو بلاتے ہیں۔ اسکے دو گھنٹے بعد پتہ چلا کہ ٹیسٹ کا ارداہ موقوف ہو گیا ہے۔ اب صرف انٹرویو ہونگے۔ انٹرویو بورڈ کے سارے ارکان آجائیں تو انٹرویو کا سلسلہ شروع ہوگا۔

 سہانی صبح ڈھل چکی نجانے کب تم آءوگے۔

دن کے دو بجے ہم سب امیدوار دھوپ سے بھرے لان میں بیٹھے، آتی ہوئ کھانوں کی ان قابوں کو دیکھ رہے تھے جو اس کمرے میں جارہی تھیں جہاں انٹرویو ہونا تھا۔ دن کو تین بجے پہلا امیدوار اندر طلب ہوا۔ پون گھنٹے بعد وہ باہر نکلا پندرہ منٹ کے بعد دوسرا امیدوار طلب ہوا۔ ہم وہاں پہ کوئ پندرہ لوگ موجود تھے۔

میں نے ایک آسان سا حساب کیا کہ شام کو پانچ چھ بجے تک کیا صورت حال ہوگی۔  میری توقع کے مطابق شام کو پانچ بجے دو امیدواروں کے انٹرویو کے بعد ہمیں اطلاع دی گئ کہ آج انٹرویو ختم کئے جاتے ہیں  اسکی نئ تاریخ سےآپ کو جلد آگاہ کیا جائے گا۔

تین سال۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کے بعد وہ نئ مبارک تاریخ آئ۔ ایک دفعہ پھر امیدوار وہاں موجود ، اس دفعہ پہلے سے کم۔ کچھ اس دوران دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئے ہونگے۔ یہ کوئ محبوب کی زلف تو نہ تھی کہ اسی کو سر کرنے میں گذار دیتے۔

 ایک دفعہ پھر یہ پیغام کہ ابھی ایک تحریری ٹیسٹ ہوگا۔  لیکن اس دفعہ ریکارڈ توڑنے یا  رکھنے کے لئے ہمیں ڈھائ گھنٹے کے بعد  ٹیسٹ کے لئے بلا ہی لیا گیا۔ ٹیسٹ لینے والے نے پوچھا آپ سب کے پاس کاغذ اور قلم ہے۔ سب کے پاس قلم تھے لیکن ایسا کوئ معتبر کاغذ نہ تھا جس پہ ٹیسٹ دیا جا سکے۔ ہم سب بےوقوفوں کو کالج کی اس غربت کا اندازہ ہی نہ تھا۔ ہم نے اپنے آپ تف بھیجی اور شرمندگی سے سرجھکا دئیے۔ انہوں نےطنزیہ مسکراہٹ سے ہمیں ذلیل کرتے ہوئے کہا اچھا انتظار  کریں آپکو کاغذ فراہم کیا جاتا ہے۔ ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد ہم سب کو ایک ایک کاغذ دیا گیا۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔

اب آگے ہنسنا منع ہے کیونکہ اسکے بعد ان صاحب نے کہا ایسا ہے کہ میں  کچھ سوالات املا کرا دیتا ہوں وہ آپ اپنے پاس لکھ لیجئیے۔ پھر انہوں نے چار سوال املا کرائے۔ فی البدیہہ املا کرائے جانے والے سوالات میں غلطیاں تھیں جن کی نشاندہی پہ متعلقہ صاحب نے انتہائ بڑکپن کا ثبوت دیتے ہوئے انہیں تبدیل کر دیا۔ ایسی بڑائ کی تعریف کرنا بے جا نہیں۔

آدھ گھنٹے بعد ہم سے کاغذ ، معاف کیجئیے گا ٹیسٹ پیپر لینے کے بعد ہمیں باہر کا راستہ دکھا دیا گیا۔ بعد کے واقعات سے یہ بد گمانی پیدا ہوتی ہے کہ ان ٹیسٹ پیپرز کو ہمارے نکلتے ہی کوڑے دان میں ڈال دیا ہوگا۔ کمزور اور حقیر لوگ بد گمانیوں کا جلد شکار ہوتے ہیں۔

 کراچی میں چالیس ڈگری کی گرمی میں ایک دفعہ پھر ہم بنجر لان میں بیٹھے انٹرویو کی پکار کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک دفعہ پھر کھانے کی قابیں اندر جا رہی تھی۔ اس دفعہ یہ ہانڈیاں تھیں۔ منتظمین کو ہانڈیوں سے فراغت پانے میں شام کے چار بج گئے۔

میں اٹھی اور کلرک کے پاس گئ۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ میں اپنے گھر فون کر کے اطلاع کر دوں کے میں دیر سے آءونگی، میں اپنا موبائل فون گھر بھول آئ ہوں۔ ہاں ہاں کیوں نہیں۔ وہ مجھے سازش کر کے اس کمرے میں لے گیا جہاں بورڈ کے ارکان انٹرویو لینے کے بہانے موجود پاکستان کا مطلب کیا، ھذا من فضل ربی بتا رہے تھے۔ کلرک ذہنیت ایسی ہی ہوتی ہے خود سامنے آکر کچھ نہیں کرتے بس سازشیں کرتے ہیں یا سازش کرنے والے کا ساتھ دیتے ہیں۔

کمرے میں اس وقت تک مرغن کھانوں کی خوش بو بھری ہوئ تھی۔ ایسا نہیں کہ میرا دل جلانے کے لئے اس خوشبو کو وہاں قید کر کے رکھا گیا تھا۔ وجہ یہ تھِی کہ ایئر کنڈیشنڈ چلنے کی وجہ سے یہ خوشبو باہر نہیں جا سکتی تھی۔ کمرہ ایک دم جنت نظیر محسوس ہو رہا تھا۔  یہ صرف اس منحوس ایئر کنڈیشنڈ کی وجہ سے تھا ورنہ نہ وہاں حوریں تھیں اور نہ شہد کی نہریں۔ اس خوشبو سے مجھے اپنے پیٹ میں ہونے والی گُڑ گُڑ کی آواز آئ۔ یہ اس پانی کی تھی جو میں کئ گھنٹے سے چالیس ڈگری کی گرمی کی شدت کو لان کے ایک سوکھے درخت کے نیچے بیٹھ کر کم کرنے کے لئے پی رہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ پانی کیوں پیٹ میں گڑ گڑ کرتا ہے اور کھانا نہیں کرتا۔

میری حیرانی دیکھئیے، وہاں میرے وہ بلند باتیں کرنے والے سینیئر اساتذہ بھی موجود تھے جن سے میں نے پڑھا تھا۔  خوش گپیاں چل رہی تھیں۔بروٹس  یو ٹو۔ میں نے اپنی حیرانی کو چھپانے کے لئے منہ پھیر لیا۔  یہ وہ لوگ ہیں جو باہر کی دنیا میں اس کرپشن کا رونا روتے ہیں جو یہاں فرشتے عالم بالا سے آکر کرتے ہیں۔ ان دس لوگوں میں سے کوئ ایک شخص ایسا نہیں تھا جسے احساس ہو کہ وہ وہاں کس کام کے لئے موجود ہیں۔

شام کو ساڑھے پانچ بجے کلرک نے باہر آکر اعلان کیا کہ انٹرویو ملتوی کر دئے گئے ہیں نئ تاریخ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔ میرے اس دن کا اختتام سن اسٹروک پہ ہوا۔ وہ رات میں نے بخار اور الٹیوں میں گذاری۔

 سات سال، سات سال سے زائد عرصہ گذر گیا۔ اسکی نئ تاریخ کا اعلان نہیں ہوا۔ کیا داءود انجینیئرنگ کالج میں ان سات سالوں میں کوئ کیمسٹری کا ٹیچر پڑھا نہیں رہا۔ کیا واقعی؟

خیر جناب، داءود انجینیئرنگ کالج تو بے حد خراب ریپوٹیشن رکھنے والا کالج ہے۔ آئیے کراچی شہر کی سب سے مایہ ناز انجینیئرنگ یونیورسٹی کی طرف۔ جہاں ہمارے شہر سے انٹر میں پاس ہونے والے طالب علموں کی کریم داخلہ لیتی ہے۔ جن کا چناءو بہترین رزلٹ اور داخلہ ٹیسٹ میں بہترین کارکردگی کے بعد ممکن  ہوتا ہے۔ کیا سوچتا ہوا گا ایک طالب علم کس قدر شاندار دنیا میں قدم رکھنے والا ہے وہ۔

اخبار میں اشتہار آیا کہ انہیں ایک اسسٹنٹ پروفیسر چاہئیے۔ ماسٹرز ہونے کی صورت میں چار سال کا تدریسی تجربہ، پی ایچ ڈی ہونے کی صورت میں کوئ تجربہ درکار نہیں۔ میں نے بھی اپلائ کر دیا۔ پی ایچ ڈی ہوں، ڈیڑھ سال کا تدریسی تجربہ بھی ہے۔ اور بین الاقوامی جرنلز میں چھپے ہوئے  مقالے بھی۔ ایک مضبوط پس منظر، میں نے بےوقوفی سے سوچا۔

چند ماہ بعد خط ملا کہ اس سلسلے میں تحریری امتحان ہوگا۔ تاریخ مقررہ پہ گئے۔ کمرہ ء امتحان میں امیدواروں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ ان میں سے تین چار لوگ پی ایچ ڈی بھی تھے لیکن ان میں سے کسی کے پاس تدریسی تجربہ نہیں تھا۔ میں نے سوچا  اب بھی میرا پلہ بھاری ہے۔ ٹیسٹ کے لئے چھپے ہوئے پرچے ملے۔ اسے حل کیا۔ ٹیسٹ بھی اچھا ہوا تھا۔

میں خوش خوش واپس آگئ۔ کافی مہینے گذر گئے کوئ اطلاع نہیں۔ این ای ڈی سے تعلق رکھنے والے ایک سینیئر استاد سے معلوم کیا تو کہنے لگے کہ اپائینٹمنٹس تو کب کے ہو گئے۔ میرا دل ٹوٹا، انہیں انٹرویو کے لئے تو بلانا چاہئیے تھا۔ آخر انہوں نے امیدواروں کی شارٹ لسٹنگ تو کی ہوگی۔ محض تحریری امتحان کے بعد ہی تو اپائنٹ نہیں کر لیا ہوگا۔

پھر ذرا اور خبر لی تو معلوم ہوا کہ کراچی یونیورسٹی میں تدریس کے دوران ایک خاتون کو لیگ  تھیں میری جن کی نالائقیوں کا انکے طالب علم ہمیشہ رونا روتے نظر آتے۔ ان کا اپائینٹمنٹ ہو گیا ہے۔ یہ خاتون ایم فل تھیں یعنی نان پی ایچ ڈی۔ انکے پاس کوئ بین الاقوامی پبلی کیشن نہیں تھی۔ ایسا کیسے ہو گیا میں نے ان سینیئر ساتھی سے، جو اب مرحوم ہو چکے ہیں پوچھا۔ کہنے لگے میں نے معلوم کیا تھا۔ پتہ چلا کہ ہم پی ایچ ڈی کو رکھ کر کیا کریں گے۔ ہمارے کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کی ہیڈ ماسٹرز ہیں اور ایک اتنے زیادہ پڑھے لکھے شخص کو رکھ لیں تو ایک مصیبت ہو گی۔ ہمیں ڈپارٹمنٹ چلانا ہے۔ بھئ ہمیں تو اسٹوڈنٹس کو ہلکی پھلکی کیمسٹری پڑھوانی ہے یہاں کوئ تحقیقی کام تھوڑی کروانا ہے۔

ایچ ای سی کس ملک کی یونیورسٹیز کے لئے قوانین وضع کرتی ہے یہ نہیں معلوم۔

داءود انجیئرنگ کالج تو ویسے بھی سیاسی جماعتوں کا اکھاڑہ ہے کسی گنتی میں نہیں۔ لیکن این ای ڈی انجینیئرنگ یونیورسٹی کراچی بھی ایچ ای سی کی

اس فہرست

میں شامل نہیں جو ملک کی دس بہترین یونیورسٹیز ہیں۔

کیا یہ مکافات عمل ہے؟

کیا یہ  میری بد دعا ہے؟

یہ ان میں سے کوئ چیز نہیں۔ لیکن ہمارے تعلیمی ادروں کے کرتا دھرتاءوں کے منہ پہ ایک طمانچہ ہے جو لکھ کر دیا گیا ہے۔ کیا اسکی شدت کسی کو محسوس ہو گی۔ جی نہیں، کسی کو نہیں ہوگی کیونکہ یہ سارے کرتا دھرتا جانتے ہیں کہ کسی میں ہمت نہیں کہ ان سے سوال کر سکے۔ کون کرے گا ان سے سوال وہ جو خود مفاد پرستی کی لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہیں۔ ایک ننگا دوسرے ننگے سے کیا پوچھے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی اپنی سطح پہ ہر ادارے کو کرپشن کے لحاظ سے پاکستان بنایا ہوا ہے۔ جو حشر پاکستان کا ہے وہی ان اداروں کا۔

میں تو صرف یہ سوچ رہی ہوں کہ مجھے این ای ڈی انجینیئرنگ یونیورسٹی سے ہمدردی کرنی چاہئیے یا انکے لئے دعا کرنی چاہئیے۔

2:40 PM

ایچ ای سی, این ای ڈی انجینیئرنگ یونیورسٹی, پاکستان, تحقیق, تعلیم, داءود انجینیئرنگ کالج, کراچی

تقدس سے باہر-۵

گذشتہ سے پیوستہ

مکہ کو جو عزت حاصل تھی  وہ کعبے کی وجہ سے تھی۔ اور فوٹون سمجھتا ہے کہ  آج بھی انکی عزت اور تقدس کی وجہ وہی ہے۔ ورنہ اس میں غلط کیا ہے کہ

پڑھتا ہوں تو کہتی ہے یہ خالق کی کتاب

ہے مثل ِ یہودی یہ سعودی بھی عذاب

اس قوم کے بارے میں قمر کیا لکھئے

کعبے کی کمائ سے جو پیتی ہو شراب

قریش کا خاندان اسکی وجہ سے عرب پہ حکومت کرتا تھا۔ اور ہمسائیگان خدا، بلکہ آل اللہ یعنی خاندان الہی کہلاتے تھے۔انکی عزت کی وجہ یہ تھی کہ وہ کعبہ کے مجاور اور کلیہ بردار تھے۔  اس تعلق سے قریش کا کاروبار پھیلتا گیا۔ یہاں تک کے متعدد محکمے اور بڑے بڑے مناصب قائم کئے گئے۔ اسی وجہ سے خاندان بنو امیہ اور بنو ہاشم  ایکدوسرے کے حریف تھے اور اسلام آنے کے بعد بھی مختلف مواقع پہ ان دونوں قبائل کے اس جدی پشتی رجحان کی وجہ سے فساد ہوئے۔

اس پس منظر میں قریش نے دین اسلام کی مخالفت کی اسکی وجوہات کچھ اس طرح سامنے آتی ہیں۔

اسلام انکے آبائ دین کے خلاف تھا۔ تند خو قوموں کا مزاج ہوتا ہے کہ انکی مخالفت زبانی مخالفت نہیں ہوتی۔ اس لئے انہوں نے ہر طرح کا ظلم روا رکھا۔

اس تسلسل میں آگے دیکھیں تو دوسرا سبب یہ تھا کہ مختلف خداءووں اور کعبے پہ ان کے حق ملکیت کا ایک طلسم قائم تھا جس سے قریش کی عظمت، اقتدار اور عالمگیر اثر کا قائم تھا۔ اسلام کے ساتھ اسکے ختم ہونے کا اندیشہ تھا۔  اس لئے جس کو زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا اس  نے زیادہ مخالفت کی۔ یہ تو ہم آجکی سیاست میں بھی دیکھتے ہیں۔

ابو لہب رءوسائے قریش میں شامل تھا۔ اسکے علاوہ بھی  اسلام کےنمایاں  دشمنوں میں رءوسائے قریش نمایاں  نظر آتے ہیں۔ان کا خیال تھا کہ نبوت کا منصب اگر کسی کو ملنا ہی ٹہرا تو اسکے حقدار مکہ یا طائف کا کوئ رئیس ہونا چاہئیے تھا۔

اسکے علاوہ ریاست کے منتظم کے ساتھ دولت اور اولاد کا ہونا ضروری ہے۔ یہ خیال کیا جاتا رہا کہ جس شخص کے اولاد نہ ہو اسے آخرت میں برکت نہیں مل سکتی۔  اولاد سے مرد کسی شخص کے لڑکے۔ اس لحاظ سے رسول اللہ دونوں اوصاف سے خالی تھے۔ تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ منتظم بن جائیں۔

ایک اور وجہ جو بیان کی جاتی ہے وہ قریش کی عیسائیوں سے بڑی نفرت تھی۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ حبش کا جو بادشاہ کعبے کو ڈھانے آیا تھا وہ عیسائ تھا۔  ادھر اسلام اور نصرانیت میں کافی چیزیں مشترک ہیں اس لئے قریش کو خیال ہوا کہ محمد یہاں عیسائیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

ایک اور سبب خاندانی رقابت تھا۔ عتبہ بن ابی معیط جو آپکا سب سے بڑا دشمن تھا اور جس نے نماز کی حالت میں آپ پہ اونٹ کی اوجھڑی لا کر ڈالی تھی، اموی تھا۔ رسول اللہ کا تعلق بنو ہاشم سے تھا۔ ابو جہل کی ایک تقریر سے اس دشمنی کا پتہ چلتا ہے ایک دفعہ اخنسا بن شریق نے ابو جہل سے رسول اللہ کے بارے میں رائے پوچھی تو اس نے کہا

ہم اور آل بنو ہاشم ہمیشہ حریف رہے۔ انہوں نے مہمانداریاں کیں تو ہم نے بھی کیں، انہوں نے خون بہا دئیے تو ہم نے بھی دئیے۔ انہوں نے فیاضیاں کیں تو ہم نے  ان سے بڑھ کر کیں۔ یہاں تک جب ہم نے انکے کاندھے سے کاندھا ملا دیا تو اب بنو ہاشم پیغمبری کے دعویدار ہیں۔ خدا کی قسم ہم اس پیغمبر پہ ہرگز ایمان نہیں لا سکتے۔

سب سے بڑا سبب یہ بھی تھا کہ رسول اللہ بت پرستی کی برائیوں کے ساتھ انکی کرپشن سے بھی پردہ اٹھاتے جاتے جو انہیں اپنی شہنشاہی کی توہین لگتا۔ مثلاً ابو لہب نے حرم کعبہ کی ملکیت میں سونے کا ایک ہرن تھا اسے نکال کر بیچ ڈالا تھا۔ رءوسائے عرب کی اکثریت جھوٹ بولتی تھی اور یہ دیگر بد اخلاقیوں کا بھی اسی شدت سے شکار تھے۔

کرپشن اور معاشرتی نا انصافی نے معاشرے میں شدید مایوسی پھیلائ ہوئ تھی اور نچلا طبقہ بڑی تعداد میں موجود ہوتے ہوئے بھی موجود  نہیں تھا۔

ایک سوال یہ بھی اٹحتا ہے کہ آخر قریش نے ابتداء ہی میں رسول اللہ کو ختم کر کے ان سے نجات کیوں نہیں پالی۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ قریش مسلسل جنگوں میں تباہ ہو چکے تھے۔ کیونکہ کوئ بھی لڑائ کسی ایک گروہ تک محدود نہ رہتی نہ ایک نسل تک۔  جب تک اس کا بدلہ نہ لیا جاتا  انتقام کی آگ بجھ نہ پاتی۔ رسول اللہ کے ساتھ ایسا کرنے کی صورت میں پھر ایسی جنگ چھڑ جاتی۔

معاشرہ ویسے ہی غرباء کے لئے سخت تھا۔ رسول اللہ کے اعلان نبوت کے جواب میں ان غرباء اور کمزوروں کی بڑی تعداد نے انکی طرف رخ کیا۔ قریش نے ان پہ سخت مظالم کی انتہا کر دی۔  عالم یہ تھا کہ ابو جہل نے اپنی کنیزحضرت بسینہ کو اتنا مارا کہ انکی آنکھیں جاتی رہیں۔ اسی طرح کے مظالم دیگر غلاموں اور کنیزوں پہ توڑے گئے۔ لیکن پھر بھی انہوں نے رسول اللہ کا ساتھ نہ چھوڑا۔

فوٹون سوچتا ہے کوئ اپنی آخری امید کا جسے اس پہ یقین ہو، اعتماد ہو کبھی ساتھ نہیں چھوڑتا۔

ان سب حالات کے مطالعے کے بعد فوٹون یہ دیکھتا ہے کہ مجموعی طور پہ عرب کے حالات اس نہج کے تھے ک ان میں کسی مصلح کا اٹھنا ضروری ہو گیا تھا۔ اور اس موقع پہ رسول اللہ نے بڑی حکمت سے اس قوم کو نئ سمت دی۔

جاری ہے

نوٹ؛ اس تحریر کی تیاری میں جس کتاب سے مدد لی گئ ہے وہ مولانا شبلی نعمانی کی  سیرت النبی ہے۔ اسکے پبلشر ہیں الفیصل ناشران و تاجران کتب۔

شبلی نعمانی کی سیرت النبی

یہاں

سے ڈاءونلوڈ کیجئیے۔

7:45 PM

اسلام, تاریخ, رسول اللہ, عرب, محمد, مسلمان, معاشرہ

سنڈریلا

اچھا تو ہوا یوں کہ میں نے اپنی بچی کے لئے بازار سے کافی ساری اردو کی کہانیاں خریدیں۔ لیکن ان سب میں مجھے کچھ مسائل مشترکہ لگے۔

الفاظ کے درمیان فاصلہ اتنا کم ہے کہ ایک بچہ جو ابھی اردو سیکھنے کے بالکل ابتدائ مراحل میں ہے اسے انہیں الگ الگ پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے۔

کہانیوں میں غیر ضروری تفصیلات ہیں ۔ جس سے وہ خاصی لمبی ہوجاتی ہیں۔  چھوٹے بچے اگر کہانی بہت لمبی ہو اسے پڑھنے میں دلچسپی نہیں لیتے۔

ابتدائ کلاس کے بچوں کے حساب سے کہانیوں کی زبان آسان نہیں ہے۔

کہانیوں میں تسلسل کی کمی لگتی ہے۔

الفاظ کا چناءو کم درجے کا ہے۔

یہ تو تھیں ان کہانیوں کی بنیاد  خامیاں۔ اس لئے ایک دن مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں یہ کہانیاں اپنی بچی کے لئے خود لکھوں۔ اس سلسلے میں پہلی کہانی سنڈریلا پہ لکھی ہے۔ یہ ان پیج میں لکھی گئ ہے۔ اس لئے کہ میں اسکے پرنٹس نکال کر جب چاہے کسی کو دے سکوں۔ ورڈ میں فونٹ نوری نستعلیق نہیں آتا۔

 الفاظ کے درمیان فاصلہ رکھا ہے تاکہ بچہ ہر لفظ کو الگ پہچان سکے۔ الفاظ کو غیر ضروری طور پہ جوڑنے سے احتراز کیا گیا ہے۔ مثلاً اسکے کو اس کے لکھا گیا ہے۔ یہ لہانی پہلی جماعت کے حساب سے لکھی گئ ہے۔ کہانی میں کچھ ڈرائنگز نیٹ سے لے کر ڈالی گئ ہیں۔ جب بچہ کہانی سن لے تو اس میں رنگ بھرے۔ میری بچی کو تصویروں میں رنگ بھرنے کا بہت شوق ہے۔ اس لئے میں نے یہ کام کیا۔

بے کار کے خیالات سے پرہیز کیا ہے۔ یعنی یہ نہیں لکھا کہ سوتیلی مائیں تو بس ایسے ہی ہوتی ہیں۔ چاہیں تو روز ایک صفحہ کرائیں ، اور اسکے ساتھ تصویر پہ رنگ بھی کروائیں۔ کہانی سنانے کے بعد اپنے بچے سے کہانی کے متعلق سوالات ضرور پوچھیں۔ اور اگر وہ سوال کرتا ہے تو اسکے تسلی بخش جوابات دیں۔ جن سوالوں کے جواب نہیں دینا چاہتے انکے متعلق یہ نہ کہیں کہ یہ سوال نہیں کرنا چاہئیے۔  انکی عمر کے حساب سے کوئ آسان سا جواب تلاش کریں جو اصل حقائق سے دور نہ ہو۔ اگر وہ سوال نہیں کرتا ، تو اس سے پوچھیں، کوئ سوال؟

چلیں، تو یہ پہلی کہانی ہے ۔ یہ کہانی ایک کلاسک کہانی ہے، سنڈریلا کے متعلق۔ ہم سب نے اپنے بچپن میں سنی۔ اب ہمارے بچوں کی باری ہے۔  پریوں اور کوہ قاف کی دنیا کی کہانیاں نہ صرف بچوں کو پسند آتی ہیں بلکہ یہ انکے تخیل کو مہمیز کرتی ہیں۔ تخیل کی پرواز پہ پھر کبھی گفتگو ا۔ اس وقت سنڈریلا کی روائیتی کہانی اردو میں۔

9:49 AM

ادب, بادشاہ, بچے, پری, جادوئ, سنڈریلا, کہانیاں, مشعل

احساس کی برکت

بازار میں انار دیکھے تو دیگر پھلوں کے ساتھ  اسے بھی خریدنے کا سوچا۔ قیمت پوچھی،  معلوم ہوا کہ ڈیڑھ سو روپے کلو ہیں۔  انار کی قیمت اسی عدد کے آگے پیچھے گھومتی رہتی ہے۔ گھر کے سب لوگوں کو انار بہت پسند ہیں۔ خاتون خانہ کو سب کی پسند کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اس لئے میں نے دوکاندار کو اسے بھی تول دینے کو کہا۔

میری برابر کھڑی خاتون سیب لے رہی تھیں اور انکے ساتھ ایک میری بیٹی کا ہم عمر بچہ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنی ماں سے  کہا کہ وہ بھی انار لینا چاہتا ہے۔ ماں نے کہا نہیں بہت مہنگے ہیں ۔ ہم سیب لے رہے ہیں۔ بچے نے ضد کی اور ماں نے اسے جھڑک دیا۔

میں نے ایک انار اور چنا اور دوکاندار سے کہا کہ اسے بھی ساتھ میں تول دے۔ جب تک وہ تول کر نکالتا وہ لوگ ادائیگی کر کے آگے بڑھ گئے۔ میں نے اس بچے کو پیچھے سے آواز دی اور وہ انار اسکے ہاتھ میں تھما دیا۔ یہ دیکھ کر اسکی ماں نے کہا نہیں واپس دو۔ اور مجھ سے کہنے لگیں بچے تو بس ایسی ہی ضد کرتے ہیں۔ میں نے کہا نہیں یہ میری طرف سےآپکے بچے کے لئے تحفہ ہے میری اپنی بچی بھی اتنی ہی بڑی ہے۔ یہ کہہ کر میں دوسری سمت پلٹ گئ۔

چار پانچ ماہ گذرے ہونگے کہ ایک دن روڈ سے گذرتے ہوئے ایک پھلوں کی دوکان کو دیکھ کر میں نے سوچا پھل خرید لینے چاہئیں۔ میں پھلوں کی دوکان پہ موجود تھی۔ پھل لیتے ہوئے میری بچی کی نظر اسٹرابیریز پہ بڑی۔ اسے اسٹرا بیریز بڑی پسند ہیں۔ ابھی اسٹرابیریز کا موسم شروع ہوا تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ اس وقت لینا درست نہیں ایک تو مہنگی ہونگیں دوسرا ذائقہ بھی بہتر نہیں ہوگا۔ لیکن بچی کے ضد کرنے پہ میں نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ ڈیڑھ سو روپے پاءو ہیں۔ یعنی چھ سو روپے کلو۔ قطعی نہیں، میں نے سوچا۔ بہت مہنگی ہیں بیٹا۔ یہ کہہ کر باقی خریداری کی ادائیگی کر دی۔

بیٹی صاحبہ بہت ناراض ہوئیں۔ کہنے لگیں کیا آپ دو اسٹرابیری بھی نہیں لے سکتیں۔ میں نے پھر سمجھایا، ابھی بہت مہنگی ہیں، کچی بھی ہیں، دس بارہ دن بعد یہ اور پک جائیں گی اور سستی بھی ہوجائیں گی تو لیں گے۔ میں ان والدین میں سے ہوں جو بچوں کو حقیقی دنیا کے قریب رکھنا چاہتے ہیں اس لئے اس چیز میں حرج نہیں سمجھتی کہ انہیں پتہ ہو کہ والدین انکے لئے کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں۔ 'ماما صرف دو'۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا۔ اب مجھے غصہ آگیا۔ دوکاندار صرف دو نہیں دیتے۔ اس طرح بازار میں ضد نہیں کرنی چاہئیے ورنہ اگلی بار آپ بازار نہیں آ سکیں گی۔ یہ کہہ کر سامان اٹھا کر ہم گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

گاڑی ابھی اسٹارٹ ہی کی تھی کہ میں نے دیکھا پٹھان دوکاندار دوڑا ہوا ہماری طرف آرہا ہے۔ خیال آیا کہ پیسے تو کم زیادہ نہیں ہو گئے۔ وہ آیا تو میں نے کھڑکی کے شیشے نیچے کر دئے۔ اسکے مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ اسکا ہاتھ کھڑکی سے اندر آیا اور اس نے میری بچی کے ہاتھ میں تین اسٹرابیریز تھما دیں۔ مجھے فوراً ہی انار والا واقعہ یاد آگیا۔ میں نے اس دوکاندار کا شکریہ ادا کیا۔

گاڑی کو دوبارہ روڈ پہ ڈالتے ہوئے میں نے اپنی بچی کو بتایا کہ  یہ بالکل ضروری نہیں کہ آئیندہ آپ  کو کوئ دوکاندار اس طرح چیزیں دے، جب کوئ اجنبی کوئ چیز دیتا ہے تو اسے انکار کرنا  چاہئیے ہر اجنبی شخص اچھا نہیں ہوتا اور جب لے لیں تو اسکا شکریہ ضرور ادا کرنا چاہئیے اس سے دینے والے کو خوشی ہوتی ہے کہ آپ اسکے احساس کو جانتے ہیں۔

لیکن دل میں مجھے خیال آیا کہ ایک انار کے بدلے تین اسٹرابیریز۔ اگر کسی کام کو کرتے وقت نیت میں اخلاص ہو، انسان بے غرض ہو اور اسے کسی صلے یا ستائیش کی تمنا نہ ہو تو وہ کام  بھی زندگی کے بڑھتے ہوئے سفر میں پلٹ کر آپکو شکریہ ضرور کہتا ہے۔ بس انسان اور موقع بدل جاتے ہیں۔ اسی کو برکت کہتے ہیں۔

8:47 AM

اسٹرابیری, انار, کراچی, مشعل, معاشرہ

دلدار کا وفادار

بس میں نے دال بگھار کر اپنا کچن کا کام ختم ہی کیا تھا کہ فون بجا۔ اٹھایا تو ایک ادیبہ دوست تھیں۔ سلام دعا کے فوراً بعد ہی کہنے لگیں ، 'آفس سے فون کر رہی ہوں یہ پوچھنا تھا کہ شرمین عبید کو ایوارڈ ملا اس بارے میں آپکا کیا خیال ہے؟'۔  مستقل قارئین کو تو معلوم ہی ہے کہ میرا اس بارے میں کیا خیال ہے۔

میں نے ان سے دریافت کیا کراچی میں لٹریچر فیسٹول ہوا کیا آپ اس میں گئ تھیں۔ کہنے لگیں ، مجھے دعوت نامہ تو نہیں ملا تھا لیکن کسی اور ذریعے سے خبر ملی ، میں نے کوشش کی لیکن وہ اس قدر کونے میں ہے کہ جا نہیں سکی۔ البتہ کانفرنس میں آئے چند غیر ملکی ادیبوں سے میری کہیں اور ملاقات ہوئ۔  ان میں سے ایک نے مجھ سے کہا کہ آخر اردو لکھنے والے اس روئیے کے خلاف احتجاج کیوں نہیں کرتے۔ آخر یہ کیسے ہوتا ہے کہ اتنا بڑا مجمع اکٹھا ہو اور اس میں اردو کو اور اسکے لکھنے والوں کو نظر انداز کیا جائے۔

لیکن میں آپ سے شرمین عبید کے متعلق پوچھ رہی ہوں۔ وہ اپنے موضوع کی طرف واپس پلٹیں۔

میں ایک ایسی فلم کے بارے میں کیا رائے دوں۔ جسکی تخلیقی زبان وہ ہے جو ملک کے دو فیصد سے بھی کم لوگ بولتے اور سمجھتے ہیں۔ جو بولتے اور سمجھتے ہیں انکی اکثریت مراعات یافتہ طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ  یہ سب دیکھ کر' کیا جاہلیت ہے' کہہ کر اپنی دنیا میں گم  ہو جاتے ہیں۔  یہ وہ فلم ہے جو کسی نے اب تک پاکستان میں نہیں دیکھی۔ البتہ یہ کہ اسکا موضوع پاکستان کے ماحول سے لیا گیا ہے اور بنانے والی خاتون کی جائے پیدائش پاکستان ہے۔

کیا آپ نے فلم دیکھی ہے؟ میں نے ان سے پلٹ کر سوال کیا۔ جواب نفی میں ملا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ آپکو کسی ذریعے سے مل گئ ہوگی۔ انہوں نے فرمایا۔ جی نہیں اسکے حقوق کسی غیر ملکی چینل کے پاس محفوظ ہونگے ایسے نہیں ملے گی۔ اخبار سے اطلاع ملی کہ موصوفہ اب اسے اردو میں ڈھالنے کا کام کریں گی۔ حالانکہ فلم کی پہلی ریلیز کے وقت اس میں اردو سب ٹائٹل دالے جا سکتے تھے۔

کیا یہ ہمارا المیہ نہیں کہ ہمارے جو لوگ علم کے وسائل تک زیادہ پہنچ رکھتے ہیں دنیا سے انکی واقفیت زیادہ ہوتی ہے وہ محض اپنے نام و نمود کے لئے عوامی زبان کے بجائے اس زبان کو ترجیح دیتے ہیں جو اس ملک کے لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ اس لئے کہ انکی ترجیح بین الاقوامی منڈی ہوتی ہے اور اس ملک کی زمین نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ محض ایک نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اردو صحافت اور اردو ادب، انگریزی صحافت اور انگریزی ادب ایک دوسرے سے کس قدر چاند اور سورج کی دوری پہ موجود ہیں۔

آج ایک عام بیس سالہ نوجوان جب نسیم حجازی کے ناول پڑھ کر مذہبی جذبے سے سرشار ہو رہا ہوتا ہے تو عین اسی وقت ایک انگریزی جاننے والا اسی عمر کا نوجوان محمد حنیف کے

اے کیس آف ایکسپلوڈنگ مینگوز

پڑھ کر ہماری سیاسی اور ثقافتی زبوں حالی کی وجوہات کو جان رہا ہوتا ہے۔ کم از کم اس میںمخالف بات کو سننے کا حوصلہ تو پیدا ہوتا ہے۔

 اردو اخبار جنگ کا اتوار کا میگزین پڑھ کر جب ایک عام پاکستانی عورت، روائیتی فرماں بردار بیوی، بیٹی، بہن  اور بہو بننے کے طریقے سیکھ رہی ہوتی ہے تو انگریزی اخبار کے اتوار کے میگزین کو پڑھنے والی عورت یہ جان رہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی مونٹیسوری کی تعلیم میں کیسے مدد کر سکتی ہے، کوئ خاتون اپنے معذور بچوں کی کیا مدد کر سکتی ہے،  اپنے آپ کو چھاتی کے کینسر سے کیسے بچا سکتی ہے، اپنی روزانہ کی زندگی میں کارآمد مشغلے کیسے اختیار کر سکتی ہے اگر وہ پیشہ ور خاتون ہے تو کیسے ملازمت کے دوران جنسی ہراسمنٹ سے بچ سکتی ہے، یہ جان سکتی ہے کہ اسکے ملک میں دیگر پڑھی لکھی خواتین کیا کر رہی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

یہی نہیں اگر کسی بھی کتاب فروخت کرنے والی جگہہ کا جائزہ لیں تو وہاں اردو میں سب سے زیادہ مذہبی کتابیں ملیں گی۔ جب کہ انگریزی کتابوں میں دنیا کے ہر موضوع پہ ہر طرح کی کتابیں نظر آئیں گی۔

کیا یہ طبقہ یہ سوچتا ہے کہ کیوں عمیرہ احمد ایک اکثریت کو پسند ہے اور کیوں محمد حنیف کو پاکستان میں ایک محدود  طبقے کے علاوہ کوئ نہیں جانتا۔ جب محمد حنیف لکھتے وقت یہ سوچتے ہونگے کہ کس طرح انکے لکھے کو بین الاقوامی سطح پہ دیکھا جائے گا اس وقت عمیرہ احمد کیا یہ سوچتی ہوگی۔ عمیرہ احمد اس وقت اردو کی معروف لکھاری ہیں اور وطن میں لوگوں کی ایک کثیر تعداد ان سے واقف ہے۔ عمیرہ احمد نے اپنا سفر خواتین اردو ڈائجسٹ سے شروع کیا اور محمد حنیف نے امریکہ کے پبلشنگ ادارے سے۔ عمیرہ احمد کو پاکستان میں توجہ ملی اور محمد حنیف عالمی سطح پہ مداح حاصل کرنا چاہتے ہونگے۔ ایک نے عوامی رجحان کو دیکھتے ہوئے لکھا دوسرے نے  تیسری دنیا سے تعلق رکھنے والے پاکستان کے دلچسپ حقائق کو اس دنیا کے سامنے پیش کیا جہاں لوگ اس ملک کے بارے میں متجسس رہتے ہیں کہ یہاں پہ دہشت گردی کیسے پھل پھول رہی ہے۔ صرف تجسس، ایک جاہل معاشرے کو اسکی جاہلیت کا طعنہ دینے کا تجسس۔

ادھر پاکستانی بلاگنگ کی دنیا دیکھیں۔ اردو سے کہیں زیادہ بلاگز انگریزی میں ہیں۔ انگریزی بلاگنگ میں پیسے ملنے کے امکانات زیادہ ہیں، شہرت کے امکانات زیادہ ہیں۔ آپ ایک بین الاقوامی دنیا میں موجود ہوتے ہیں۔ زیادہ تبصرے، زیادہ ویوز۔ مگر اس سے پاکستان میں عوامی تبدیلی کیا پیدا ہو سکتی ہے؟

جیسی نیت ویسا پھل۔

 نتیجے میں ایک طبقے سے سلمان تاثیر پیدا ہوتے ہیں اور دوسرے سے جو اکثریت میں ہے ممتاز قادری اور اس پہ پھول برسانے والے پیدا ہوتے ہیں۔ جب سلمان تاثیر مارے جاتے ہیں تو انکا طبقہ حیران رہ جاتا ہے کہ یہ کیسے ہو گیا۔ وہ اس بات پہ دہشت زدہ ہوتا ہے کہ اس ملک میں عدم برداشت کس قدر بڑھ گئ ہے۔ لیکن وہ اس حقیقت کو جاننے سے دور رہتا ہے کہ اس معاشرتی روئیے میں انکا اپنا رویہ شامل ہے۔

میں اگر اس تلخ حقیقت کو اس طرح بیان کروں تو شاید کچھ لوگوں کو شدید لگے گا۔ لیکن یہ کہ ہمارے اس طبقے کی کیفیت اس شخص سے مختلف نہیں جو اپنے زخم کو کرید کرید کر ہرا رکھتا ہے کیونکہ اسے اس زخم کو سہلانے اور اسکی وجہ سے لوگوں کی توجہ حاصل کرنے میں، مزہ آتا ہے۔ یہاں تو شہرت بھی ملتی ہے۔ لیکن دھیان رہنا چاہئے کہ ایک زخم کو کرید کر ہمیشہ ہرا رکھا جائے تو وہ ناسور بن جاتا ہے۔

اس ملک میں تبدیلی کا عمل اس وقت تک شروع نہیں ہو سکتا جب تک کہ تبدیلی کی خواہش کا اظہار کرنے والے اپنی زبان وہ نہیں کر لیتے جو عوام کی زبان ہے۔ یہ حقیقت تو اب برطانیہ جیسے ملک نے بھی سمجھ لی ہے اور

اپنی پہلی اردو ویب سائیٹ

بھی بنا لی۔

 یہ بات اتنی مضحکہ خیز لگتی ہے کہ آپ جنہیں تبدیلی سے روشناس کرانا چاہتے ہیں۔ انکے متعلق آپ ہر ایرے غیرے نتھو خیرے سے اسکی زبان میں بات کرتے ہیں لیکن ان سے انکی زبان میں بات نہیں کرتے۔ انکے مسائل کے حل کے لئے ہر ٹام اینڈ جیری سے مشورہ لیتے ہیں لیکن مسائل کے یہ حل کبھی انکے سامنے نہیں رکھتے اور نہ ہی اسکے لئے خود کوشش کرتے ہیں۔

خیر، میں آجکل ایک کتا پال رہی ہوں  وہ بھی

بیلجیئن شیفرڈ

جیسا۔ یہ کتا بے حد ذہین اور وفادار جانور ہوتا ہے۔ لیکن اگر اسے انسانوں کے ساتھ گھلنے ملنے کا موقع نہ ملے اور کوئ اس سے محبت کا اظہار کرتے ہوئے روزانہ کچھ وقت اسکے ساتھ نہ گذارے تو یہ حد سے زیادہ خونخوار بن جاتا ہے۔ اور معمولی باتوں پہ حملہ کرنے کو تیار رہتا ہے۔  یہی نہیں اسے اندازہ ہو جائے کہ مالک مجھے قابو نہیں کر سکتا تو وہ مالک پہ قابو پا لیتا ہے۔ مجھے اسے اپنا مطیع بنانےاور اسکی صلاحیتوں کواپنے حق میں رکھنے کے لئے، اسے نہ صرف احساس تحفظ دینا ہو گا بلکہ اسے یقین دلانا ہوگا کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں اور اسکی زبان سمجھتی ہوں۔ کہتے ہیں بیلجیئن شیفرڈ احسان فراموشی نہیں کرتا۔

اس لئے میں تو چلی اسکی زبان سمجھنے اور اسے اپنی سمجھانے۔

11:55 AM

اردو, اردو ویب سائیٹ, برطانیہ, بی بی سی, بیلجیئن شیفرڈ, پاکستان, عمیرہ احمد, محمد حنیف. انگریزی

باتونی پنکھا

وہ سونے کے کپڑے پہن کر ادھر ادھر ٹہل رہی تھیں۔ پھر میرے کمرے میں چلی آئیں۔ 'ماما آپ سو رہی ہیں'۔ 'نہیں، میں تھوڑا سا تھک گئ ہوں اور انتظار کر رہی ہوں۔ بابا آجائیں تو ہم کھانا کھائیں۔ لیکن آپکے سونے کا وقت ہو چکا ہے۔ اب آپ سو جائیں'۔ 'ماما، مجھے کون سلائے گا'۔ ' ارے یار میں نے انکے کمرے تک جانے کی سستی میں کہا۔ 'اچھا ادھر ہی سو جاءو۔ جب بابا آئیں گے تو تمہیں تمہارے بستر پہ پہنچا دیں گے۔ وہ جلدی سے میرے پہلو میں آگئیں۔ 'اب باتیں بالکل نہیں خاموشی سے آنکھیں بند کرو اور سو جاءو۔ میرا اس وقت بولنے کا موڈ نہیں ہے۔ ہلنا جُلنا نہیں میرا انگوٹھا زخمی ہے۔ اندھیرے میں تم اس پہ اپنا ہاتھ یا ٹانگ مار دوگی'۔ 'ماما، میں تھوڑی سی دیر کے لئے سءوونگی" ٹھیک ہے میں نے جواب دیا۔ جب بچہ ایک دفعہ سو جائے تو پھر تو سوئے گا۔

دس سیکنڈ بعد آواز آئ۔

 'ماما، یہ پنکھا مائے مے، مائے مے بول رہا ہے'، 'ہوں'۔ پھر خاموشی اور کروٹیں لینے کی آوازیں۔ ' ماما ، اب یہ پنکھا بائے باں، بائے باں کر رہا ہے'۔ 'ہاں ، لیکن اب تمہاری آواز نہیں آنی چاہئیے، ورنہ  یہاں سے باہر'۔ میں نے پھر دھمکی دی۔

بیس سیکنڈ بعد۔

 ماما، یہ پنکھا، گیں گاں ، گیں گاں بول رہا ہے۔ ماما، یہ پنکھا اپنا مائینڈ بدلتا ہے تو الگ طریقے سے بولنے لگتا ہے'۔ مشعل میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ باتیں نہیں کریں گی اور خآموشی سے آنکھیں بند کر کے سوئیں گی'۔  'ماما، میں باتیں نہیں کر رہی ہوں۔ پنکھا باتیں کر رہا ہے۔ ویسے بھی میں نے کہا تھا کہ میں تھوڑی سی دیر کے لئے سوءونگی۔ میں سو چکی اب جا رہی ہوں'۔ یہ کہہ کر وہ بستر سے پھسلیں اور یہ جا وہ جا۔

میں نے سوچا، چلیں دس منٹ کے لئے اب آنکھیں بند کر کے خاموشی سے پڑی رہونگی۔ سو تکئے میں منہ چھپا کر لیٹ گئی۔ لیکن اب بھی کوئ باتیں کر رہا ہے۔ مائے مے، مائے مے۔ یہ پنکھا تو واقعی باتیں کرتا ہے۔

11:39 PM

بچے, مشعل, معاشرہ, نیند

پاکستان؟

آج جب گھر سے نکلی تو ٹی وی پہ قومی ترانے چل رہے تھے۔ فیس بک پہ لوگ تیئیس مارچ جیسے قومی دن پہ اپنے  جذبات سے فضا کو پرجوش بنائے ہوئے تھے۔  گھر سے باہر نکل کر بس جمعہ بازار تک گئ ، سبزیاں لینے اور یہ طلسم ٹوٹ گیا۔

ہوا یوں کہ جب میں نے امرود والے کے اس دعوے کے رد میں کہ اس نے بقول اسکے بہترین امرود رکھے ہیں۔ ایک بھی داغ دار نہیں ہوگا۔ ایک کے بعد ایک چار داغدار امرود نکال کر واپس رکھے تو بازار ان نعروں کی آواز سے گونج اٹھا جو سڑک سے آرہی تھیں۔ دوکاندار کی داغدار زبان رک گئ اور اسکی توجہ روڈ پہ ہو گئ۔ میں نے بھی مڑ کر دیکھا  بلا کسی خوف کے کہ کوہ قاف میں تو موجود نہیں ہوں۔ ایک کے بعد کئ منی بسیں گذریں جن پہ لوگوں کا ہجوم جئے سندھ نیشنلسٹ پارٹی کے جھنڈے لئے بیٹھا وہ نعرے لگا رہا تھا جنکے مطلب  اور معنی سے وہ خود بھی آگاہ نہیں تھے۔ مجھے بھی سمجھ نہیں آرہے تھے۔ یہ گاڑیاں شہر کے اس حصے کی طرف سے آرہی تھِں جہاں سندھی بلوچ گوٹھ ہیں۔ یہ وہ عوام ہے جو پیچھے پلٹ کر دیکھ نہیں سکتی۔ اس لئے نہیں کہ پتھر کی بن جائے گی اس لئے کہ اسے پیچھے دیکھنا ہی نہیں آتا۔ دیکھنا تو اسے آگے بھی نہیں آتا۔ جو انکے جدی پشتی رہ نما دکھا دیں وہی دِکھنے لگتا ہے۔

گھر آکر شہر کے حالات جاننے کا تجسس ہوا کہ ایک دوست سے ملنے کا وعدہ تھا۔ معلوم ہوا کہ  سندھ کی آزادی کا مطالبہ رکھنے والی اس ریلی کے شرکاء کی وجہ سے شاہراہ فیصل پہ بد ترین ٹریفک جام ہے۔ اور اس رکے ہوئے ٹریفک میں مسلح افراد نے لوٹ مار شروع کی ہوئ ہے۔

یہ جئے سندھ کی اس سلسلے میں پہلی ریلی نہیں تھی۔ ابھی چار دن پہلے بھی میں انکی ایسی ہی ریلی میں پھنسی اور جہاں جانے کا ارادہ تھا اسے ترک کے واپس آگئ۔

میں نے اپنا گھر سے نکلنے کا خیال منسوخ کیا۔ اور سوچنے لگی کہ ایک طرف بلوچستان میں آزادی کی نام نہاد جنگ سردار لندن، فرانس اور امریکہ میں بیٹھ کر لڑ رہے ہیں۔ دوسری طرف خیبر پختون خواہ میں انتہا پسندوں نے تحریک چلائ ہوئ ہے کہ انکے علاقے کی علاقہ غیر والی حیثیت بحال کر کے اسے حکومت  پاکستان کے رائج قوانین سے نہ صرف نجات دی جائے بلکہ باقی کے ملک میں بھی انکی مرضی کا نظام حکومت لایا جائے۔ جسے وہ شرعی حکومت کا نام دیتے ہیں۔ ادھر خدا بہتر جانتا ہے کہ کس کی شہہ پہ اچانک جئے سندھ والوں کو سندھ کی آزادی کے نعرے پہ دوبارہ کھڑا کر کے کراچی میں اودھم مچانے کی اجازت دے دی گئ ہے۔ ابھی چند دن پہلے کراچی میں کسی خفیہ ہاتھ نے کراچی کی دیواروں پہ مہاجر صوبے کا مطالبہ بھی لکھنے کی کوشش کی۔  ادھر پنجاب  میں جنوبی پنجاب باقی پنجاب سے اپنا حق مانگ رہا ہے۔ ادھر باقی پنجاب نئے سرے سے مسلمان ہونے کی کوششوں میں مصروف ہے۔

اب ذہن میں ایک سوال اٹھتا ہے۔ یہ ملک یہاں کی بنیادی اقوام کو چاہئیے یا نہیں؟

مجھ سے ایک بزرگ نے دریافت کیا کہ یوم پاکستان کیوں منایا جاتا ہے؟ میں نے مطالعہ پاکستان میں برسوں پڑھے ہوئے جواب کو طوطے کی طرح دوہرا دیا۔ اس دن دو قومی نظرئیے کی بنیاد پہ پاکستان بنانے کا مطالبہ ایک قرارداد کی صورت میں مسلمانوں کی طرف سے متفقہ طور پہ پیش کیا گیا تھا۔ پھر پاکستان کا پہلا آئین بھی اسی دن پیش ہوا۔

انہوں نے دریافت کیا لیکن جس دن بنگلہ دیش بنا۔ نہ صرف اس قرارداد سے تعلق رکھنے والا  پاکستان اس دن ختم ہو گیا تھا بلکہ واقعی اگر کوئ دو قومی نظریہ تھا تو وہ بھی اس دن غلط ثابت ہوا۔  رہا آئین تو اس  پہلے کے بعد کئ آئین آئے۔ یہ آئین جسکی بگڑی ہوئ شکل اب موجود ہے۔ جو بھٹو نے بنایا۔ اسے قوم کو دینے کے بعد چوبیس گھنٹوں میں اس میں پہلی ترمیم ہوئ، جو بھٹو ہی نے کی تھی مخالفین کو دبانے کے لئے۔ اس لئے ان دونوں وجوہات کی بناء پہ تو اب اس دن کو بالکل نہیں منانا چاہئیے۔ کیوں مناتے ہو تم لوگ یہ دن؟

کیوں مناتے ہیں ہم یہ دن، کیا اس لئے کہ قومی ترانوں کو گانے کی پریکٹس ہو سکے یا اس لئے کہ اپنی منافقت کی ہم مزید مشق کر سکیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ اگلی نسلوں میں اپنی پوری آب و تاب سے منتقل نہ ہو سکے؟

ملک کی سیاسی حالات کی ابتری کا اندازہ لگانے کے لئے مزید اشارے دیکھیں۔ گیلانی صاحب عدالت کے زور دینے پہ بھی سوئس حکومت کو خط لکھنے کے لئے تیار نہیں۔ انکے بقول وہ صدر صاحب کی پیٹھ میں چھرا نہیں مار سکتے۔ یہ نہ کر کے وہ  پاکستان کے سینے میں چھرا مار رہے ہیں اسکا انہیں ذرہ برابر بھی احساس نہیں بلکہ پرواہ بھی نہیں۔

 اعتزاز احسن جو ججوں کی بحالی تحریک میں آگے آگے ہو رہے تھے۔ جسکی وجہ اب یہ سمجھ میں آتی ہے کہ وہ بس مشرف کے لکھے کو مٹانا چاہتے تھے۔ اس کیس میں انہوں نے بھی اپنے ضمیر کی شاید صحیح قیمت وصول کر لی ہے۔ کہتے ہیں عدالت کو گیلانی صاحب کے گدی نشیں ہونے کا تو خیال کرنا چاہئیے۔

یہی نہیں، ادھر برہمداغ بگتی کے اوپر سے سارے مقدمات واپس۔ کیوں جناب؟ اس لئے کہ بلوچستان کہیں پاکستان سے الگ نہ ہوجائے۔ پھر پاکستان کے  یہ چھوٹے چھوٹے لوگ کیوں سزائیں بھگتتے ہیں اس لئے کہ وہ کسی نواب خاندان سے نہیں۔ ہم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ پولیس اور عدالت کا نظام ہی ختم کر کے اس عذاب سے جان چھڑائیں۔

طالبان سے مذاکرات کر کے انکے مطالبات پہ غور ہونا چاہئیے۔ وہ کس لئے؟ کیونکہ ملک میں امن اسی طرح قائم ہو سکتا ہے کہ جنونیوں سے بھی خوشگوار تعلقات رکھے جائیں۔

ادھر کل زرداری صاحب  کو تاحیات صدر منتخب کیا جائے گا۔ وہ کیوں بھئ؟ کیونکہ اگر وہ پاکستان کھپے کا نعرہ نہیں لگائیں گے تو جئے سندھ والے تو سندھ کو پاکستان سے الگ کر کے لے جائیں گے۔

یہ پاکستان کیا کاغذ پہ ایک نقشے کا نام ہے؟

پاکستان کیا کسی قرارداد کا نام ہے؟

پاکستان کیا کسی نظرئیے کا نام ہے؟

پاکستان کیا ایک کرکٹ ٹیم کا نام ہے؟

حقیقت کچھ یوں نظر آتی ہے کہ یہاں کے حکمرانوں کو، سرداروں کو، جاگیرداروں کو، نوابوں کو اگر اسکے چھوٹے چھوٹے حصے بنا کر  وہاں کا والی وارث بنادیا جائے تو نہ صرف یہ اسے اپنی خوش قسمتی جانیں گے بلکہ انکے زیر سایہ آنے والے عوام بھی اس نشے میں کئ نسلیں زمین پہ رینگ کر گذار لیں گے۔

آخر ہم یوم پاکستان کیوں مناتے ہیں؟ جبکہ ہم پاکستان پہ یقین نہیں رکھتے۔

جب ہم الگ ہو جائیں گے تو کس حصے کا نام پاکستان ہوگا اور کیا وہاں یوم پاکستان منایا جائے گا؟

اور  اب آخری سوال وہ کیا چیز ہے جو پاکستان کو جوڑ کر رکھ سکتی ہے؟ دائیں بازو والے شاید ایک دفعہ پھر اسکاجواب مذہب دیں لیکن میرے خیال میں شاید ایٹم بم۔ کیونکہ الگ ہوتے ہوئے  ان قوتوں کو یہ بھی تو سوچنا پڑے گا کہ آخر ایٹم بم کس کے حصے میں جائے گا۔

11:52 PM

آزادی, ایٹم بم, بلوچستان, پاکستان, پنجاب, جئے سندھ, خیبر پختونخواہ, سندھ, طالبان, قرارداد, کراچی, یوم پاکستان

صداقت کی وراثت

جن سے مل کر زندگی سے محبت ہو جائے وہ لوگ آپ نے دیکھے نہ ہوں مگر ایسے بھی ہیں۔

ڈاکٹر شیر شاہ

کا شمار انہی لوگوں میں کیا جا سکتا ہے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں وراثتی رہ نماء سیاست کے نام پہ لوگوں کو قتل کرتے ہوں اور اپنے مفاد کے لئے ہر ظلم روا رکھتے ہوں۔ جہاں حکمرانی کے نام پہ اپنی  اور اپنی نسلوں کی عیاشی کے سامان کئے جاتے ہوں۔ جہاں غریب کی غربت کو بیچ کر اپنے لئے خزانے جمع کئے جاتے ہوں۔ جہاں اشرافیہ کا طبقہ دولت اور شہرت دونوں ہی اپنے حلقے میں بانٹتا پھرتا ہو اور معاشرے کے کمزور طبقے کے حصے میں ترس اور حقارت کے سوا کچھ نہ آتا ہو۔ وہاں ان جیسے لوگوں کا موجود ہونا ایک معجزہ لگتا ہے۔

آخر ایسے انسان ایک خود غرض معاشرے کے کینوس پہ کس طرح نمودار ہوجاتے ہیں۔ اسکا بڑا کریڈٹ اس بات کو جاتا ہے کہ والدین اپنے بچوں کے سامنے کون سی زندگی پیش کرتے ہیں۔اور اسے پیش کرتے وقت وہ عملی طور پہ اسکی صداقت پہ خود کتنا پورا اترتے ہیں۔

مجھے انکی شخصیت، پاکستانی خواتین کے لئے انکی گراں مایہ خدمات اور ان سے دردمندی رکھنے کی وجہ سے ہی نہیں پسند بلکہ یہ بھی پسند ہے کہ ہمہ وقت حالت کام میں رہنے کے باوجود انکی زندہ دلی اپنی جگہ رہتی ہے۔  ایک گائناکولوجسٹ کے طور پہ وہ اپنی بے لوث خدمات کے لئے کئ بین الاقوامی ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔ لیکن انکا اصل ایوارڈ وہ خواتین ہیں جنہیں انہوں نے زندہ درگور ہونے سے بچا لیا۔

ڈاکٹر شیر شاہ کا ایک مضمون مجھے ایک دوست کی توسط سے ملا۔ یہ مضمون ڈان اخبار میں چھپ چکا ہے۔ اسکا اردو ترجمہ یہاں حاضر ہے۔ ڈاکٹر شیرشاہ کا یہ مضمون انکے والد صاحب کے حوالے سے ہے۔

اسکین شدہ صفحات کو بہتر طور پہ دیکھنے کے لئے ان پہ کلک کیجئِے۔

3:32 PM

ابو ظفر آزاد, پاکستان, خواتین, ڈاکٹر شیر شاہ سید, کراچی, کوہی گوٹھ ہسپتال, گائناکولوجسٹ

اے بی او ، خون کا نظام

لہو کے دو رنگ، یہ ایک فلم کا نام ہے۔ لہو کے دو رنگ ہوتے نہیں ایک ہی ہوتا ہے، چمکدار سرخ۔ اگر یہ سرخ کے بجائے کچھ اور ہوتا تو دنیا بھر کے ادب اور سیاست پہ انتہائ گہرے اثرات مرتب ہوتے۔ جن پہ اس وقت روشنی ڈالنا ممکن نہیں۔

 اس لئے اگر قتل کی کسی وارادت کی جگہ پہ مختلف افراد کے خون کے  دھبے ملیں تو وہ تمام بادی النظر میں ایک ہی نظر آئیں گے۔ لیکن ان دھبوں سے کم از کم یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ موقعہ ء واردات پہ کتنے لوگ موجود تھے۔ وہ ایسے کہ ان دھبوں کا بلڈ گروپ معلوم کر لیا جائے۔

لیب میں بلڈ گروپ معلوم کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ انڈا ابالنا۔  لیکن ٹہریں پہلے ہمیں خون کے مختلف گروپس پہ بات کر لینی چاہئیے۔

خون کے ان گروپس کی درجہ بندی خون کے سرخ ذرے پہ موجود انٹی جن کی وجہ سے ممکن ہے۔ سرخ ذرات پہ موجود یہ اینٹی جنز  پروٹین، کاربو ہائیڈریٹس، گلائیکو پروٹینز یا گلائیکو لِپِڈز کے بنے ہوئے ہو سکتے ہیں۔ اسکا انحصار اس بات پہ ہے کہ وہ خون کا کون سا گروہ بناتے ہیں۔

 انکی بنیاد پہ خون کے تیس نظام سامنے آتے ہیں جن میں چھ سو مختلف اقسام کے اینٹی جنز معلوم کئے جا چکے ہیں۔ ان نطاموں میں سے کافی سارے نایاب ہیں یعنی بہت کم انسانوں میں پائے جاتے ہیں۔ بعض کچھ نسلوں ہی میں پائے جاتے ہیں۔

خون کی درجہ بندی کا ایک نظام جو بہت عام ہے

اے بی او

نظام کہلاتا ہے۔

 اس نظام میں خون کے سرخ ذرے پہ دو طرح کے اینٹی جنز ہو تے ہیں۔ ایک اے اور دوسرا بی۔ لیکن، معاملہ یہیں نہیں رکتا۔ خون کا تیسرا گروپ جو اس درجہ بندی میں سامنے آتا ہے وہ یہ کہ یہ دونوں اینٹی جنز ایک ساتھ سرخ ذرے پہ موجود ہوں تب یہ گروپ اےبی کہلاتا ہے اور چوتھی شکل یہ ہوتی ہے کہ یہ دونوںاینٹی جنز، سرخ  ذرے پہ غیر موجود ہوں۔ غیر موجودگی ریاضی کی زبان میں زیرو کہلاتی ہے اور زیرو ہوتا ہے گول بالکل او کی طرح,اس لئے یہ او گروپ کہلاتا ہے۔ مزید وضاحت کے لئے نیچے موجود چارٹ دیکھئیے۔

اب آپ سوچیں گے کہ گروپ پازیٹو اور نیگیٹو کیسے ہوتا ہے؟

 اسکی وجہ سرخ ذرے پہ ایک اور اینٹی جن کی موجودگی ہوتی ہے جو آر ایچ فیکٹر کہلاتا ہے۔ سو خون کے جس ذرے پہ آر ایچ فیکٹر موجود ہوگا وہ پازیٹو گروپ ہوگا اور جس پہ نہیں ہوگا وہ نیگیٹو کہلائے گا۔

اس طرح سے اے پوزیٹو کا مطلب ہوا اے اینٹی جن کے ساتھ آر ایچ فیکٹر بھی موجود ہے جبکہ اے نیگیٹو کا مطلب ہے اے اینٹی جن موجود اور آر ایچ فیکٹر غیر موجود۔

اس طرح سے او پازیٹو کا مطلب ہے اے اور بی اینٹی جن غیر موجود اور آر ایچ فیکٹر موجود ہے۔ یہی فارمولہ اس نظام کے باقی گروپس کے لئے بھی درست ہوگا۔

بچوں میں خون کا کون سا نظام ہوگا؟

 اسکا کچھ انحصار والدین میں موجود نظام پہ بھی ہے۔ اکثر لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ ماں کا گروپ اے ہے باپ کا گروہ اے ہے لیکن بچے کا گروپ او ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

ہمارے جسم میں  موجود خصوصیات کا کوڈ ان دھاگوں میں موجود ہوتا ہے جنہیں

کروموسومز

کہتے ہیں۔

 یہ کروموسومز ہمیں وراثت میں ملتے ہیں. انسان میں ہر خلئِے میں انکی تعداد تئیس جوڑے ہوتی ہے۔  ہر کروموسوم دو دھاگوں سے مل کر بنتا ہے۔ ان میں سے ایک باپ کی طرف سے آتا ہے اور دوسرا ماں کی طرف سے۔ ان دھاگوں پہ سمجھ لیں کہ انفارمیشن کے نقطے بنے ہوتے ہیں۔ بالوں کے رنگ کے نقطے موجود ہیں تو خون کے گروپ کے بھی۔ انہیں سائینسی زبان میں

ایلِل

کہتے ہیں۔  ان میں سے جو حاوی ہو جاتا ہے بچے کو وراثت میں وہی خصوصیت ملتی ہے۔ وراثت میں ملنے والی خصوصیات معاشرتی رجحان نہیں دیکھتیں۔  اس لئے ماں یا باپ کسی کی بھی خصوصیات لینے میں آزاد ہوتی ہیں۔

ایک ماں جو بلڈ گروپ 'بی' رکھتی ہے۔ اسکے بلڈ گروپ میں دو طرح کے ایلل ہو سکتے ہیں۔  ایک' بی' اور 'او'، او کا مطلب ہم جانتے ہیں کچھ نہیں۔ اگر ایک ایلِل بی ہے اور دوسرا کچھ نہیں تو نتیجہ 'بی' نکلے گا۔ دوسرا سیٹ ہوگا، بی اور بی۔ دو 'بی' مل کر 'بی' ہی بنائیں گے۔

اس طرح سے سیٹ کچھ اس طرح بنیں گے۔

او اور او= او

بی اور او= بی

اے اور او= اے

اے اور بی= اے بی

اے اور اے= اے

بی اور بی= بی

اس سارے معمے کو اس تصویر کی مدد سے آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔

تصویر میں باپ کا گروپ 'اے' ہے جس میں دو ایلل ہیں 'اے اور ' او'۔ ماں کا بلڈ گروپ 'بی' ہے جس میں دو ایلل ہیں 'بی' اور 'او'۔ یہ چار ایلل جب ملتے ہیں تو چار مختلف سیٹس دیتے ہیں۔ جن سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ بچہ اس بات کی اہلیت رکھتا ہے کہ ان چار میں سے کوئ بھی ایلل سیٹ لے لے۔ زیادہ مضبوط جینز عام طور پہ حاوی رہتی ہیں۔ لیکن کبھی کبھی کمزور جین کا بھی زور چل جاتا ہے۔ لہذا اے اور بی گروپ رکھنے والے وا؛لدین کے یہاں  'او' گروپ رکھنے والے بچے کی پیدائش ممکن ہے۔

بلڈ گروپ معلوم ہونے کا فائدہ کیا ہے؟

اسکا فائدہ یہ ہے کہ انتقال خون کی صورت میں ایک شخص کو درست خون ملتا ہے۔ اگر خون کا گروپ ایک جیسا نہ ہو تو جو شخص خون لیتا ہے اسکے

خون کے سرخ ذرات ٹوٹنے

لگتے ہیں اور اسکی موت واقع ہوجاتی ہے۔  انتقال خون کے لئے صرف بلڈ گروپ کا ایک جیسا ہونا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات انکی کراس میچنگ بھی کی جاتی ہے تاکہ کسی بھی اور طرح کے رد عمل سے بچا جا سکے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ خون میں موجود دیگر اینٹی جنز آپس میں نہ ملتے ہوں۔

بعض بیماریاں خون کے گروپ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اگر خون کا گروپ پتہ ہو تو اسکی روک تھام کی جا سکتی ہے۔ مثلاً ایک حاملہ عورت جس کے خون کا گروپ منفی ہو اگر اسکے ہونے والے بچے کا گروپ مثبت ہو تو اسکے جسم میں بچے کے اینٹی جنز کے خلاف اینٹی باڈیز پیدا ہوجاتی ہیں جو بچے کے لئے نقصان دہ ہوتی ہیں۔ اور اس سے بچے کی موت واقع ہوسکتی ہے۔ بیسویں صدی میں طب کے شعبے میں ہونے والی کامیابی میں یہ کامیابی بھی شامل ہے کہ ماءووں کو ایک انجکشن دینے سے بچے کی زندگی بچائ جا سکتی ہے۔ اگر یہ انجکشن نہ دیا جائے تو ایسی عورت کے یہاں ہمیشہ مردہ بچے پیدا ہونے کے امکانات ہونگے۔

کیا انتقال خون کے لئے دینے والے اور لینے والے کے خون کے گروپس کا ایک جیسا ہونا ضروری ہے؟

اگر کوئ ایمرجنسی ہو اور خون کی بہت کم مقدار دینی ہو تو ایسا ہمیشہ لازمی نہیں ہوتا۔  لیکن اسکے بھی اصول ہیں۔

اے گروپ رکھنے والے، اے گروپ کا خون لے سکتے ہیں۔ 'بی' والے 'بی' کا، اے بی والے، اے بی کا۔ لیکن یہ تینوں گروپس 'او' گروپ بھی لے سکتے ہیں۔  کیونکہ 'او' کا مطلب ہے کوئ اینٹی جن نہیں ہے۔ یعنی کسی قسم کا ضد رد عمل پیدا ہونے کا امکان نہیں۔او گروپ کسی اور گروپ کا خون نہیں لے سکتا۔ کیونکہ اسکے پاس کوئ اینٹی جن موجود نہیں ہے۔  گروپ 'اے بی' سے تعلق رکھنے والے 'اے' اور 'بی' دونوں گروپ قبول کر سکتے ہیں۔ کیونکہ انکے پاس دونوں اینٹی جنز موجود ہوتے ہیں۔ یہ 'او' گروپ کا خون بھی لے سکتے ہیں۔

صرف اے بی او نظام ہی نہیں دیکھا جاتا بلکہ آر ایچ فیکٹر بھی ضروری ہے۔ آر ایچ فیکٹر مثبت رکھنے والے صرف مثبت گروپ کو خون دے سکتے ہیں۔ کیونکہ انکے پاس مثبت اینٹی جن موجود ہوتا ہے۔ آر ایچ منفی رکھنے والے مثبت اور منفی دونوں کو دے سکتے ہیں کیونکہ انکے پاس کوئ آر ایچ اینٹی جن نہیں ہوتا۔

ان دونوں کو عوامل کو ملائیں تو نتیجہ کچھ یوں نکلتا ہے۔ 'منفی او' گروپ رکھنے والے ہر ایک خون دے سکتے ہیں اس لئے یونیورسل ڈونر کہلاتے ہیں اور گروپ'مثبت اے بی' ہر گروپ لے سکتے ہیں اس لئے یونیورسل ایکسیپٹر کہلاتے ہیں۔

کیا بلڈ گروپ تبدیل ہو سکتا ہے؟

نارمل حالات میں ایک انسان کا بلڈ گروپ زندگی بھر تبدیل نہیں ہوتا۔ لیکن یہ تبدیل ہو سکتا ہے۔ اسکی چند ایک صورتیں ہیں۔  ہڈیوں کے گودے میں اگر تبدیلی ہو تو بلڈ گروپ تبدیل ہوجاتا ہے۔ کیونکہ  وہ خلیات جو خون بناتے ہیں وہ ہڈی کے گودے میں ہوتے ہیں۔ اگر یہ خلیات بدل جائیں تو خون کا گروپ بھی بدل جائے گا۔ یوں کینسر کا ایسا علاج جس میں ہڈیوں کا گودا تبدیل ہوتا ہے ۔ مریض کے خون کے گروپ میں تبدیلی لا سکتا ہے۔ اگر گودا دینے والے کے خون کا گروپ مختلف ہو۔ اور یہ بالآخر وہی ہوجاتا ہے جو گودا دینے والے کا ہوتا ہے۔

اسکے علاوہ یہ اس وقت بھی ممکن ہے جب جسم میں خود دفاعی نظام کی بیماری پیدا ہو جائے۔ اس صورت میں جسم کا دفاعی نظام اپنے ہی خلیات کو پہچاننے سے انکار کر دیتا ہے اور انہیں تباہ کرنے لگ جاتا ہے۔ اس طرح خون کو مخصوص گروپ دینے والے اینٹی جنز تباہ ہو جاتے ہیں اور خون کا گروپ بدل جاتا ہے۔

قارئین، یہ تھیں کچھ ابتدائ، دلچسپ اور مختصر معلومات خون کے بارے میں۔ امید ہے کچھ نہ کچھ آپ کو ضرور سمجھ آیا ہوگا اور یہ آپکے لئے عملی طور پہ کارآمد ثابت ہونگیں۔

ارے ہاں ہم تو یہ بتا رہے تھے کہ خون کا گروپ کیسے معلوم کرتے ہیں۔ لیکن یہ تحریر اتنی لمبی ہو گئ۔ اس لئے پھر کبھی۔

:)

4:15 PM

انتقال خون, اینٹی باڈیز, اینٹی جن, اے بی او نظام، ہیمو لیسس, خون, کینسر, گروپس, ہڈی کا گودا

لہو کے رنگ شخصیت پہ

آپ کسی کو پہلا پہلا محبت نامہ بھیجیں اور وہ یہ لکھ بھیجے کہ ہم دونوں کی راہیں ایک نہیں ہو سکتیں۔ میرے خون کا گروپ اے ہے اور آپکا او۔ جو لوگ  او گروپ رکھتے ہیں وہ مغرور ہوتے ہیں جبکہ اے گروپ والے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ پڑھتے ہی آپ اس دن کو لعنت بھیجیں گے جب یہ معلوم ہوا کہ خون ایک طرح کا نہیں ہوتا بلکہ اسکے گروپس ہوتے ہیں اسکے بعد آپ کسی جاننے والے کا نمبر کھڑکھڑائیں گے کہ یار ایک رپورٹ بنا دو جس میں میرا خون کا گروپ اے ہو۔

پریشان نہ ہو ہوں ایسا ہونے کے امکانات جاپان ، کوریا اور مشرق بعید میں ہی ہیں۔ جہاں بوڑھے سے لے کر بچے تک خون کے گروپ میں دلچسپی رکھتے ہیں۔  کیونکہ اس سے وہ مقابل کی شخصیت جاننا چاہتے ہیں۔ اس لئے آپ جتنی بار چاہیں محبت کی بازی کھیلئیے۔ ہم اور آپ تو یہی سمجھتے ہیں کہ خون کا گروپ صرف اس وقت معلوم ہونا ضروری ہے جب کسی انسان کو انتقال خون کی ضرورت پیش آجائے ورنہ  بیٹھ کر سکھ چین کی بانسری بجا۔

جاپان میں خون کا گروپ

پوچھنے کی روایت لوگوں کے آسمانی برج پوچھنے سے زیادہ ہے حتی کہ بعض جگہ پہ ملازمت کی درخواست میں خون کا گروپ بتانا ضروری ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض ممالک میں فیس بک اپنے استعمال کرنے والوں کو خون کے گروپ  کا آپشن بھی دیتی ہے، دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا۔

مزید باتوں سے پہلے ہم پہلے یہ دیکھ لیں کہ جاپانی خون کے مختلف گروپس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ خون کہ یہ گروپس اے بی او نظام سے لئے جاتے ہیں یعنی  خون کی درجہ بندی کا وہ نظام جس میں خون کے بنیادی چار گروپس ہیں۔ اے، بی، او اور اے بی گروپس۔

اے گروپ؛

یہ گروپ رکھنے والے معتبر، ایماندار، با اصول،صابر، ذمہ دار ہوتے ہیں۔ انکی ایک اور خوبی اکملیت پسندی ہے یعنی کام کو اس طرح کرنا کہ اس میں کوئ کمی نہ رہ جائے۔ وہ باہر سے پر سکون نظر آتے ہیں لیکن اندرونی طور پہ مضطرب رہتے ہیں۔  یہ اچھی جمالیاتی حس رکھتے ہیں۔ اکثر شرمیلے اور حساس ہوتے ہیں۔

منفی خصوصیات؛ نازک مزاج، لوگوں سے کٹ کر رہنے والے، ضدی لوگ جو تناءو کا شکار ہو جاتے ہیں۔

بی گروپ؛

یہ بڑے مستحکم مزاج ہوتے ہیں۔اپنے اہداف حاصل کرنے میں جنون کی حد تک دلچسپی رکھتے ہیں۔ جو کام شروع کرتے ہیں اسے اپنے وقت میں بہترین طریقے سے ختم کر کے ہی دم لیتے ہیں۔ یہ گروپ رکھنے والے افراد زندگی اپنے طور پہ گذارتے ہیں۔

منفی خصوصیات؛ خود غرض، سست، معاف نہ کرنے والے، ناقابل بھروسہ، غیر ذمہ دار لوگ۔

اے بی گروپ؛

یہ خاصے دلچسپ لوگ ہوتے ہیں۔ قابل اعتبار، ایماندار لوگوں کی مدد کرنے پہ تیار، خوداعتماد۔ کہا جاتا ہے کہ یہ افراد دوہری شخصیات رکھتے ہیں۔ شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ ان میں اے اور بی دونوں گروپ والے افراد کی خصوصیات پائ جاتی ہیں۔

منفی خصوصیات؛ ناقد، فیصلے کی صلاحیت سے محروم، خود غرض، گھٹیا لوگ۔

او گروپ؛

یہ گروپ رکھنے والے افراد بڑے تخلیق کار ہوتے ہیں۔ خوداعتماد اور مشہور ہوتے ہیں۔ انہیں مرکز نگاہ بننے میں مزہ آتا ہے۔ سماجی طور پہ متحرک یہ لوگ کسی کام کو شروع کرنے میں ہمیشہ پہل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ رہنمائ کے خواص رکھتے ہیں۔ یہ جو کام شروع کریں اسے ختم بڑی مشکل سے کرتے ہیں۔

منفی خصوصیات؛ باتونی، مغرور، حاسدی، غیر مہذب۔

اب ان خواص کو سامنے رکھتے ہوئے آپ بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کون سا خون کا گروپ کس کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔

اے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اے اور اے بی کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھتا ہے۔

بی، بی اور اے بی کے ساتھ بخوشی چلتا ہے

اے بی، ہر ایک کے ساتھ نبھا لیتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اے بی گروپ رکھنے والے افراد باقی دوسرے گروپ والوں کا خون بھی قبول کر سکتے ہیں اور یونیورسل ایکسیپٹر کہلاتے ہیں۔

اور گروپ رکھنے والے او اور اے بی کے ساتھ راضی بازی رہتے ہیں۔

سائینس، اس تمام تفصیل پہ کچھ خاص یقین نہیں رکھتی اگرچہ کہ اس ضمن میں ڈیٹا اکٹھا کر کے

نتائج

نکالنے کی کوشش کی گئ لیکن چند ایک حقائق کے علاوہ کچھ ثابت نہ ہو سکا۔

توہم پرستی اور عقیدے میں اتنا ہی معمولی فرق ہے ایک کو جانچنے کی کوشش کی جا سکتی ہے دوسرے کے بارے میں یہ سوچنا بھی محال ہے۔

نیچے چارٹ میں دئیے گئے ممالک میں خون کے مختلف گروپس کے پائے جانے کی شرح موجود ہے۔ اور اس سے آپ بھی اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ وہم کس حد تک درست ہوسکتا ہے۔

کیونکہ اس سے ایک بات پتہ چلتی ہے وہ یہ کہ او گروپ ساری دنیا میں کثیر تعداد پایا جاتا ہے۔ لیکن کیا اسی شرح سے خود اعتماد اور مشہور لوگ بھی پائَے جاتے ہیں ایسے لوگ جو پہل کرنے میں آگے ہوں؟

ملک

آبادی

O+

A+

B+

AB+

O-

A-

B-

AB-

آسٹریلیا

21,262,641

40.0%

31.0%

8.0%

2.0%

9.0%

7.0%

2.0%

1.0%

آسٹریا

8,210,281

30.0%

33.0%

12.0%

6.0%

7.0%

8.0%

3.0%

1.0%

بیلجیئم

10,414,336

38.0%

34.0%

8.5%

4.1%

7.0%

6.0%

1.5%

0.8%

برازیل

198,739,269

36.0%

34.0%

8.0%

2.5%

9.0%

8.0%

2.0%

0.5%

کینیڈا

33,487,208

39.0%

36.0%

7.6%

2.5%

7.0%

6.0%

1.4%

0.5%

زیک ریپبلک

10,532,770

27.0%

36.0%

15.0%

7.0%

5.0%

6.0%

3.0%

1.0%

ڈنمارک

5,500,510

35.0%

37.0%

8.0%

4.0%

6.0%

7.0%

2.0%

1.0%

ایسٹونیا

1,299,371

30.0%

31.0%

20.0%

6.0%

4.5%

4.5%

3.0%

1.0%

فن لینڈ

5,250,275

27.0%

38.0%

15.0%

7.0%

4.0%

6.0%

2.0%

1.0%

فرانس

62,150,775

36.0%

37.0%

9.0%

3.0%

6.0%

7.0%

1.0%

1.0%

جرمنی

82,329,758

35.0%

37.0%

9.0%

4.0%

6.0%

6.0%

2.0%

1.0%

ہانگ کانگ

7,055,071

40.0%

26.0%

27.0%

7.0%

0.3%

0.2%

0.1%

0.1%

آئس لینڈ

306,694

47.6%

26.4%

9.3%

1.6%

8.4%

4.6%

1.7%

0.4%

انڈیا

1,166,079,217

36.5%

22.1%

30.9%

6.4%

2.0%

0.8%

1.1%

0.2%

آئر لینڈ

4,203,200

47.0%

26.0%

9.0%

2.0%

8.0%

5.0%

2.0%

1.0%

اسرائیل

7,233,701

32.0%

34.0%

17.0%

7.0%

3.0%

4.0%

2.0%

1.0%

نیدر لینڈز

16,715,999

39.5%

35.0%

6.7%

2.5%

7.5%

7.0%

1.3%

0.5%

نیوزی لینڈ

4,213,418

38.0%

32.0%

9.0%

3.0%

9.0%

6.0%

2.0%

1.0%

ناروے

4,660,539

34.0%

42.5%

6.8%

3.4%

6.0%

7.5%

1.2%

0.6%

پولینڈ

38,482,919

31.0%

32.0%

15.0%

7.0%

6.0%

6.0%

2.0%

1.0%

پرتگال

10,707,924

36.2%

39.8%

6.6%

2.9%

6.0%

6.6%

1.1%

0.5%

سعودی عرب

28,686,633

48.0%

24.0%

17.0%

4.0%

4.0%

2.0%

1.0%

0.3%

جنوبی افریقہ

49,320,000

39.0%

32.0%

12.0%

3.0%

7.0%

5.0%

2.0%

1.0%

اسپین

40,525,002

36.0%

34.0%

8.0%

2.5%

9.0%

8.0%

2.0%

0.5%

سوِئیڈن

9,059,651

32.0%

37.0%

10.0%

5.0%

6.0%

7.0%

2.0%

1.0%

ترکی

76,805,524

29.8%

37.8%

14.2%

7.2%

3.9%

4.7%

1.6%

0.8%

برطانیہ

61,113,205

37.0%

35.0%

8.0%

3.0%

7.0%

7.0%

2.0%

1.0%

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

307,212,123

37.4%

35.7%

8.5%

3.4%

6.6%

6.3%

1.5%

0.6%

خون کے یہ گروپس کس طرح وجود میں آئے سائینس اس بارے میں اپنے نظریات رکھتی ہے لیکن کچھ سوالات ہم ضرور پوچھنا چاہیں گے۔

کیا تقسیم کرو حکومت کرو، یہ پالیسی خدا نے بھی اپنائ ہے۔ اس لئے بظاہر سرخ سیال نظر آنے والا  خون تک  جدا کر ڈالا۔

؟

خون کے گروپس کیا خدا نے اس لئے بنائے ہیں کہ بیسویں صدی میں خون بیچنے اور خریدنے کا کاروبار ہو سکے؟

کیا یہ گروپ اس لئے بنائے گئے کہ انکی بنیاد پہ انسانوں کی خصوصیات معلوم کی جا سکیں؟

یا یہ انسان کے ارتقاء کے دوران وجود میں آئے؟

11:52 PM

انتقال خون, جاپان, خون, شخصیت, کوریا, گروپس, مشرق بعید, معاشرہ, وہم

آپکی ہمدردی میں

مرد جب اپنے دکھ کی داستان سنانا شروع کرتا ہے تو وہ کسی ایک عورت کے متعلق نہیں ہوتی۔ بلکہ اس میں کئ عورتیں شامل ہوتی ہیں۔ سر فہرست اماں، بہنیں اور وہ یعنی بیگم۔  اس لئے کہا جاتا ہے کہ ناکام مرد کے پیچھے کئ خواتین ہوتی ہیں۔ ویسے یہ ایک پروپیگینڈہ ہے۔ اسکی صداقت کا اندازہ دنیا میں کامیاب مردوں کی تعداد سے لگایا جا سکتا ہے۔

خوفزدہ نہ ہوں یہ پوری تحریر مردوں کی ہمدردی میں لکھی گئ ہے۔

:)

کچھ لسانی ماہرین کا کہنا ہے کہ بیگم دراصل بے غم کی استعمال شدہ شکل ہے۔ لیکن ارتقاء  سے انحراف کرتے ہوئے، بیگم کے بھی غم ہوتے ہیں۔ بیگم کے غم مردوں کے متعلق نہیں بلکہ مردوں سے تعلق رکھنے والی عورتوں سے متعلق ہوتے ہیں یا پھر لان کے پرنٹس۔

وہ پوچھتے ہیں کہ اندرون خانہ مردوں پہ ظلم ہوتے ہیں انکا بھی سد باب ہونا چاہئیے۔ دو مرغوں اور ایک مرغی کو ایک دڑبے میں بند کر کے ایک طرف رکھ دیں اور پھر جب اس میں دھماچوکڑی ہو تو کہیں کہ  مرغوں نے بڑا پریشان کیا ہوا  ہے۔ نہ جناب یہ شکایت درست نہیں۔

لیکن پھر بھی ہم اصل وجہ سے صرف نظر کرتے ہوئے جو کہ ہمارا قومی خاصہ ہے۔ اس سلسلے میں مختلف مردوں کے آزمائے ہوئے گُر بتاتے ہیں۔

اگرایک مرد نے ابتدائ زندگی میں ہی اپنی صلاحیتیں استعمال کر کے دولت کا ایک انبار جمع کر لیا تھا یاوہ منہ میں سونے ، چاندی کا چمچ لے کر پیدا ہوا توہر دروازہ اس کے لئے کھلتا جائے گا۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ دولت سے سکون نہیں خریدا جا سکتا۔ وہ ابھی جان لیں گے کہ انکا زندگی کا عملی تجربہ کتنا کم ہے۔

پیسہ پھینک تماشہ دیکھ کے مصداق،  بیگم کے اکاءونٹ میں فروری میں ایک خطیر رقم جمع کرادے اور خموشی سے اپنے کاموں میں لگ جائے۔ اب دیکھئیے کہ یہ وظیفہ کیسےاسے بے غم کرتا ہے۔

فروری کے مہینے سے نئ لان کے نمائش کے اشتہار آنا شروع ہوتے ہیں جو امید ہے کہ اپریل کے وسط تک جاری رہیں گے۔ بیگم اس دوران اس میں مصروف رہیں گی ۔ نمائیش سے کپڑے خرید کر درزی کو پہنچانا، اور انکے لئے میچنگ کی لیس خریدنا پھر درزی سے اسکے ڈیزائین پہ سیر حاصل بحث کرنا، اس سرگرمی کے بعد اتنا سرور رہے گا کہ اگر کوئ لڑنے پہ آمادہ ہو تو بھی اسکے منہ لگنے کو دل نہ چاہے گا۔ پہلا نشہ، پہلا خمار۔ نیا پیار ہے نیا انتظار، کیا کر لوں میں اپنا حال اے دل بے قرار۔  جینے کی امنگ پیدا ہوتی ہے صرف اس لئے کہ جب تک کپڑے بن کر آئیں ہم شگفتہ نظر آئیں۔ آخر لوگ ہمارا چہرہ ہی تو دیکھتے ہیں۔

اپریل کے درمیان میں نئ سرگرمی شروع ہوگی۔  درزی کے پاس سے کپڑے بن کر آئیں گے، پھر پہن کر انکی فٹنگ چیک ہوگی، اس دوران  سب کی بلا درزی کے سر پڑی رہے گی۔  کس کو فکر کے وہ سارا دن کس حرافہ کے ساتھ رہے۔

مئ کا مہینہ ان کپڑوں کی نمائیش کے لئے مختلف پارٹیز میں گذرے گا، ساتھ ہی ساتھ پارلر والوں کی بھی آمدنی میں اضافہ رہے گا۔ جون کے مہینے میں ساون کے کپڑوں کی تیاری ہو گی جولائ میں افطار پارٹیز اور عید کے کپڑوں کی تیاری۔ ستمبر میں مڈ سمر کے پرنٹ آجائیں گے۔ خزاں بہت چھوٹا سا مہینہ ہوتا ہے اس لئے اس دوران ہی سردیوں کے گرم کپڑوں کی تیاری شروع ہو گی۔ دسمبر، جنوری آجکل شادیوں کے لئے انتہائ مناسب خیال کئ جاتے ہیں اور جناب ایک بار پھر فروری آ گیا۔ پچھلے سال کے تجربے کے بعد اسے معلوم ہونا چاہئِے  کہ اب کیا کرنا ہے۔

بیگم جب بھی نئے کپڑے پہن کر سامنے آئیں تو شاندار کہنا نہ بھولیں، وقتاً فوقتاً معلوم کرتے رہیں کہ آج نیا جوڑا کیوں نہیں پہنا۔ بیگم کو زیادہ مصروف رکھنا ہو تو درزی یا پارلر والوں کے کاموں میں نقص نکال دیں اور انہیں درزی یا پارلر تبدیل کرنے کا مشورہ دے دیں۔ اگرسونے پہ سہاگا چاہتے ہیں تو جون جولائ کی چھٹیوں کے لئے بیوی اور اماں کو باہر بھیج دیں مگر خیال رکھیں کہ دونوں مختلف مقامات پہ جائیں۔

اگر آپ مڈل کلاس سے تعلق رکھتے ہیں تو اصل مصیبت آپکے لئے ہے۔ یہاں آکر ہم مردوں کو تین جماعتوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ عقل مند روائیتی مرد، بے وقوف روائیتی مرد اور غیر روائیتی مرد۔

عقل مند روائیتی مرد کمپیوٹر پہ مصروف رہتا ہے۔ چاہے وہ فیس بک پہ چیٹنگ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن شکل ایسی بنا کر رکھیں گے کہ کوئ اہم پروجیکٹ چل رہا ہے۔  اگر یہ پروجیکٹ بر وقت مکمل نہ ہوا تو گھر والوں کو آٹے دال کا بھاءو پتہ چل جائے گا۔ لہذا بیوی کو یہ شکایت نہیں رہتی کہ اماں کے پاس زیادہ وقت گذارتے ہیں، بہنوں کی فکر میں مرے جاتے ہیں اور نہ اماں بہنوں  کو یہ شکوہ رہتا ہے کہ شادی کے بعد ایک دم بیوی کا غلام ہو گیا ہے۔ ہم تو سوچ بھی نہ سکتے تھے یہ ایسا نکلے گا۔ شادی سے پہلے تو یوں ہوا کرتا تھا۔ یہ سب چالاکیاں بیوی کی سکھائ ہوئ ہیں۔ ایک کمپیوٹر ہزار بلائیں ٹالتا ہے۔

بے وقوف روائیتی مرد تعداد میں سب سے زیادہ ہوتے ہیں یہ سمجھتے ہیں کہ بس واقعی میں کائینات کی لگامیں انکے ہاتھ میں ہیں اور اگر کوئ چیز انکے قابو میں نہیں آئ تو اس سے انکی مردانگی کو بھاری نقصان پہنچے گا۔ نتیجتاً انکی کمزوری یعنی مردانگی کو ہر فریق نشانہ بنائے رکھتا ہے اور انکا ہر دن روز عذاب بنا رہتا ہے۔ یہ اپنی روائیت پسندی چھوڑ نہیں سکتے اس لئے اس حالت میں صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے عمر یونہی تمام ہوتی ہے۔ مرتے وقت بھی فکر رہتی ہے کہ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے۔ لیکن پھر بھی انکے لئے حوروں کی تسلی ایک قوی امید ہوتی ہے بیگم کو کبھِ کبھی اسکی دھمکی بھی دینے کی کوشش کرتے ہیں مگر بیگم کا رد عمل ایسا ہی ہوتا ہے کہ ہونہہ جا کر تو دکھاءو، دوسرے ہی دن بھاگ جائے گی اس سے تو دوزخ ہی بھلا۔ ان میں سے جو زیادہ چھوٹے دل ہوتے ہیں وہ بہتر حوروں والا راستہ لیتے ہیں۔

غیر روائیتی مرد کو ان سب باتوں کی کیا فکر۔ وہ اور انکی بیگم ایک ساتھ صبح گھر سے نکلتے ہیں۔ بچوں کو اسکول چھوڑتے ہوئے اپنے اپنے آفس کو روانگی۔ اب سارا دن گھر میں امّاں کا راج۔ شام کو بیگم کی اماں کے گھر سے بچوں کو لیتے ہوئے گھر پہنچے۔ یہاں آ کر خاتون خانہ بچوں کو نہلانے دھلانے، ہوم ورک کرانے اور رات کے کھانے کے چکروں میں ایسا الجھیں گی کہ انہیں پتہ ہی نہیں چلے گا کہ شوہر صاحب کتنی دیر اماں کے پاس بیٹھے رہے۔ اماں کو بھی یک گونہ تسلی رہتی ہے کہ بیٹے کی آمدنی بیگم کے نخرے اٹھانے میں خرچ نہیں ہو رہی۔

آخیر میں بچ جاتے ہیں غریب مرد۔  یہ فساد اور جھگڑے تو انکی زندگی کی رونق اور تفریح ہیں۔ زندگی کی تلخی کو مزید تلخیوں سے ملاتے ہیں اور یہ اکثر ان مردوں کے بارے میں سوچ کر حیران ہوتے ہیں کہ یہ کیسے مرد ہیں جو لڑے بغیر یا کسی لڑائ میں پڑے بغیر اپنی زندگی گذارتے ہیں۔ یہ جینا بھی کوئ جینا ہے للّو۔ ڈو نہ کیا تو پھر کیا جیا۔

5:39 PM

اماں, بیوی, پاکستان, جھگڑا, خواتین, شادی, لڑائ, مرد, معاشرہ

کہنے دیں

نبیلہ

نے صرف  سسٹم سے بغاوت نہیں کی اور نہ ہی صرف یہ کیا کہ محسن پہ تیزاب پھینک کراس کے چھکے اڑا دئیے۔ بلکہ اس  البیلی نار نے مجھے بھی میرے متوقع موضوع سے ہٹا دیا۔

کیا نبیلہ نے کوئ برا کام کیا؟

جناب، اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ خربوزے نے خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ پہلے خربوزے نے کبھی یہ خیال ہی نہیں کیا تھا کہ دوسرا خربوزہ بھی اسے دیکھ کر رنگ پکڑے گا اور وہ بھی وہی والا جو اسکا ہے۔ خربوزے نے یہ خیال کیوں نہیں کیا۔ یہ ہم اور آپ کیا جانیں۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ جو بکرے نے ماری ہے بکری کو سینگ تو بکری بھی مارے گی بکرے کو سینگ۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس قسم کے واقعات میں مرد مجرم شاید ہی گرفت میں آتے ہوں۔ لیکن نبیلہ دھر لی گئ۔ کوئ بات نہیں نبیلہ پہلی دفعہ ناتجربے کاری میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ تم سے پہلے کسی عورت نے یہ کیا بھی تو نہیں تھا۔ اس لئے تمہاری معلومات بھی نہیں ہونگیں۔ آہستہ آہستہ تم بھی سیکھ جاءوگی کہ صحیح وار کہاں سے کرنا چاہئیے ایسے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

 اور پھر جس نظام میں تم ہو وہاں تمہاری ہمت پہ داد دینے والے کم اور برا بھلا کہنے والے زیادہ ہونگے۔  مرد مجرموں کو خفت کے اس مرحلے سے نہیں گذرنا پڑتا۔ انکے لئے تو یہ ایک اعزاز ہوتا ہے کہ کسی ایسی عورت کا دماغ درست کر دیا جو ان  پہ توجہ نہیں دے رہی تھی۔

یہ تو میں تسلیم کرتی ہوں کہ اس ملک میں پنجاب کی مٹیار سے زیادہ با ہمت اور جراءت مند کوئ اور عورت نہیں۔ اس لئے ہیر اور سوہنی دونوں کردار یہیں تخلیق ہوئے۔

اندازہ ہے کہ نبیلہ اس وقت کسی تھانے میں چھترول کھا رہی ہوگی، خاندان والے اسے کوسنے دے رہے ہونگے۔  خاندان کی عزت خاک میں مل گئ ہوگی۔

 یقین ہے کہ اس میں دو چیزوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ایک ٹیکنالوجی اور دوسرا معاشرے کی حد سے بڑھی ہوئ منافقت اور حقائق سے مسلسل فرار۔ یہ نہیں معلوم کہ  معاشرے کے تارو بود کی  حفاظت کرنے والے کس کو  عاق کریں گے۔

لیکن ہمیں یہ تو کہنے دیں کہ  رانجھن، رانجھن کردی، میں آپے رانجھن ہو گئ۔ جاننا صرف یہ ہے کہ جب ہیر ، رانجھا ہو گئ تو رانجھے پہ کیا گذری؟

10:44 AM

پاکستان، نبیلہ، پنجاب, تیزاب, حقوق, خواتین, رانجھا, معاشرہ, ہیر

آبگینوں کے خواب

کل ساری دنیا میں خواتین کا عالمی دن منایا جائے گا۔ نہیں معلوم کہ تاریخ کے کس مقام پہ خواتین کا درجہ اس درجے پہ آگیا جہاں انکے  حقوق کے لئے تحاریک چلانے کا سلسلہ شروع ہوا۔

پاکستان میں ایک سال نہیں صرف ایک ماہ کے واقعات کا جائزہ لیجئیے۔

کراچی میں پچھلے ایک ماہ میں ایک لڑکی  اجتماعی زنا بالجبر کا شکار ہوئ۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بے پردہ پھرتی ہوگی نامناسب کپڑے پہنتی ہوگی اس لئے یہ کسی مرد کا حق بن گیا کہ اسے اس طرح بے عزت کرے۔ لیکن اسی ایک مہینے میں تقریباً تین بچیوں کو جنکی عمریں  پانچ سے چھ سال کی تھیں زنا بالجبر کا نشانہ بنایا گیا۔ اس جملے میں زنا بالجبر کا لفظ زائد ہے۔ اس عمر کی بچی کو نہ یہ معلوم ہوگا کہ اسکے ساتھ جو بربریت ہوئ ہے اسے کیا کہا جاتا ہے نہ یہ کہ اسکے ساتھ یہ کیوں کیا گیا ہے اور نہ ہی اغواء کے وقت اسے معلوم ہوگا کہ اس پہ اب کیا ستم ٹوٹ سکتا ہے۔

 کیا شہر میں کوئ آواز اٹھی؟

 نہیں  اس پہ آواز اٹھانے کا وقت نہیں۔ ابھی عافیہ ڈے تو منا لیں۔

اسی ایک مہینے میں مظفر گڑھ میں ایک خاتون کو بازار میں برہنہ کر کے پھرایا گیا۔ کیا کسی نے احتجاج کیا کہ یہ بے حیائ بند کرو۔ کیا یہ بے حیائ نہیں کہلاتی؟

جی نہیں یہ ان سب علاقوں کے رسم و رواج ہیں۔ جھگڑوں میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ نزلہ تو گرتا ہی کمزور عضو پہ ہے۔

اسی ملک میں ایک ماہ میں تقریباً چھ خواتین پہ تیزاب پھینکا گیا۔ یہ سب کسی مرد کی انتقامی کارروائ کا نشانہ بنیں۔ کیا کوئ مجرم گرفتار ہوا؟ کیا کسی کو سزا ملی؟

 نہیں یہ سب نہیں ہو سکا۔ کیونکہ مجرم یہ قبیہہ فعل کرنے کے بعد پردہ ء غیب میں چلے گئے۔

کیا کسی نے اس پہ احتجاج کیا؟

 نہیں۔

کیا اس پہ احتجاج کی ضرورت ہے؟

 نہیں ، یہ خواتین ہی کا قصور ہوتا ہے کہ ان پہ تیزاب پھینکا جاتا ہے۔ اگر وہ اس طرح رہیں، اگر وہ یہ کریں، اگر وہ اس طرح کپڑے پہنیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اور اگر اس موضوع پہ بنائ گئ فلم کو ایوارڈ مل جائے تو فلم بنانے والی خاتون صرف اس لئے سی آئ اے کی ایجنٹ قرار پائے کہ اس نے ایسا موضوع کیوں اٹھایا جس سے پاکستان بدنام ہوتا ہے۔ حالانکہ اسے ایجنٹ قرار دینے کی دیگر وجوہات نکالی جا سکتی ہوں۔  لوگ جلدی جلدی اپنا اسٹیٹس اپ ڈیٹ کریں گے شرمین عبید کو ایوارڈ پاکستان کے منہ پہ ایک طمانچہ۔

 اور کل میں نے خبر سنی کہ ایک خاتون پہ تیزاب پھینک دیا گیا چوبیس گھنٹے گذرنے کے بعد بھی ہمارے کسی نوجوان کا کوئ بیان نہیں۔ یہ تیزابی طمانچے پاکستان کے منہ پہ کون مار رہا ہے؟ تیزاب بنانے والے، پھینکنے والے ان پہ فلم بنانے والے یا خواتین؟

یہ تیزاب پھینکنے والے مرد اپنے خاندانوں کے ساتھ اس زمین پہ موجود ہوتے ہیں ، رہتے ہیں، شادیاں کرتے ہیں انکے بچے ہوتے ہیں۔ اسی طرح زمین پہ پیر مار کر سینہ تان کر چلتے ہیں لیکن کسی شخص کو انکے گریبان پکڑنے کی ہمت نہیں ہوتی حتی کہ انکے گھر والے تک انہیں کسی وعظ یا نصیحت کرنے کی جراءت نہیں رکھتے یا شاید وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں کسی نصیحت کی ضرورت ہی نہیں۔

اسی مہینے کا واقعہ ہے کہ اقلیتی ہندو لڑکی کو جبراً مسلمان کر کے اسکی ایک مسلمان لڑکے سے شادی کرا دی جاتی ہے وہ ہندو لڑکی رنکل کماری سے سید فریال شاہ بن جاتی ہے۔ انٹر نیٹ پہ مبارکباد کی ویڈیوز چل جاتی ہیں۔ اگر ملک میں کوئ فکر کی آواز اٹھتی ہے تو یہ کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مغربی میڈیا اسے پاکستان کا امیج بگاڑنے کے لئے استعمال کرے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جو اپنی لڑکیوں کی پسند کی شادی پہ انہیں کاری قرار دے کر قتل کر دیتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو مایا خان کو شہہ دیتے ہیں کہ پارکوں میں ملنے والے جوڑوں کو ہراساں کریں۔ ہم پارکس میں یہ بے حیائ نہیں پھیلنے دیں گے۔  لیکن جب معاملہ ایک اقلیتی لڑکی کا آتا ہے تو ساری اخلاقیات کا دیوالہ نکل جاتا ہے اور اسکی جگہ ایک مست نعرہ، نعرہ ء تکبیر آجاتا ہے۔ ایک ہندو لڑکی کو مسلمان کر کے ایک مسلمان لڑکے سے شادی کرادی اس ثواب میں جتنے لوگ شامل ہوجائیں کم ہیں۔ اس لئے بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کو ہر دل بے قرار۔ ہندءووں کی ایک لڑکی کو عقد نکاح میں لے آنا ہندوستان فتح کرنے سے کم نہیں۔ بابری مسجد کا بدلہ لے لیا۔

یہ نہیں معلوم کہ عورت کو بیوی بنا لینا یا اس سے جنسی تعلق  قائم کر لینا، مرد کی فتح کیوں قرار پاتا ہے جبکہ وہ عورت اس فاتح سے دل سے نفرت کرتی ہو۔

۔

۔

۔

کیا آپکو معلوم ہے کہ اگر ایک عورت خوشبو لگا کر باہر نکلتی ہے تو جنت کی خوشبو اسے لاکھوں میل دور تک نہیں ملتی، کیا آپ جانتے ہیں کہ اپنی بچیوں کو حیا عادی بنانے کے لئے انہیں بچپن سے  پردے کی عادت ڈال دینی چاہئیے، کیا آپکو معلوم ہے کہ با اختیار عورت رکھنے والے معاشرے ناسور بن جاتے ہیں۔ کیا آپکو معلوم ہے کہ میراتھن ریس میں عورتوں کا دوڑنا بے حیائ ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ خوشگوار ازدواجی زندگی کا راز عورت کی برداشت اور اپنے آپکو جھکا لینے میں ہے۔

 یہ ساری معلومات مجھے نیٹ کی دنیا میں آجکے نوجوان مردوں کی گفتگو کے نتیجے میں ملتی ہیں باقی جو اوپر خبریں میں نے لکھی ہیں وہ اخبار سے ہی مل پاتی ہیں اس پہ ہمارے نوجوان کچھ لکھنا پسند نہیں کرتے۔  اس سے پاکستان کا امیج خراب ہوتا ہے وہ انتہائ دور اندیش ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ سب سی آئ اے والے کراتے ہیں۔ وہ سی آئ اے کی کسی ایسی سازش کا شکار ہونے والے نہیں ہیں۔

شرمین عبید کا کہنا ہے کہ اپنے خوابوں کو مت چھوڑیں۔ میں اشرافیہ سے تعلق رکھنے والی اس خاتون کی ایسی باتوں میں نہیں آتی۔ کل اگر میں کسی  مشکل میں پھنس جاءوں تو یہ صاحبہ تواس پہ دستاویزی فلم بنا کر اپنی شہرت کھری کر لیں گی۔ انکے تعلقات کی پہنچ پہنچ کہاں تک ہوگی۔ یہ فلم تو کسی غیر ملکی چینل پہ اپنی قیمت وصول کرے گی۔ میرے ہم وطن تو وہ دستاویزی فلم دیکھ تک نہیں پائیں گے۔ اور وہ حسین کپڑوں میں کیوٹ شکل کے ساتھ ایک اور ایوارڈ وصول کرنے کے لئے چھم سے اسٹیج پہ موجود ہونگیں۔ گوروں کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگا کہ کیا تیزاب سے جھلسنے والی عورت اور یہ عورت ایک ہی ملک کی باسی ہیں۔  وہ اس معمے میں ہی پھنس کر رہ جائیں گے کہ اگر ایسا ہے تو یہ کیونکر ممکن ہے۔ جبکہ یہاں ہم وطن مجھ پہ گذرے ہر ستم کو سی آئ اے کی سازش بنا کر معاملہ ہوا کر دیں گے۔

اس لئے میں اپنے خوابوں کو آبگینوں کی طرح سنبھالے اپنے ہم وطنوں سے ہی پوچھتی ہوں منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے؟

4:21 PM

آسکر, ایوارڈ, پاکستان, تیزاب, خواتین, زنا, شرمین عبید, عالمی دن, کراچی

تقدس سے باہر-۴

گذشتہ سے پیوستہ

ایک انتہائ پسماندہ اور غریب معاشرے میں رسول اللہ نے جنم لیا۔ دنیا جنہیں محمد کے نام سے جانتی ہے۔ خود انکے ابتدائ حالات خاصے مخدوش رہے۔ انکا تعلق بنو ہاشم کے قبیلے سے تھا جو قریش میں افضل قبیلہ سمجھا جاتا تھا لیکن عبدالمطلب کے انتقال کے بعد انکے حالات بھی بہتر نہ رہے۔

 والد کا انتقال آپکی پیدائش سے پہلے ہو گیا۔ عرب روایات کے تحت آپکی پرورش ماں سے الگ ایک دیہاتی علاقے میں ہوئ۔ چھ سات سال کی عمر میں والدہ کے پاس پہنچے لیکن چند مہینوں کے بعد انکا بھی انتقال ہو گیا۔ دادا نے کفالت سنبھالی لیکن جلد ہی وہ بھی داغ مفارقت دے گئے لیکن اپنے بیٹے ابو طالب کو بھتیجے کی دیکھ بھال کی ذمہ داری دے گئے۔ عبدالمطلب کے انتقال کے بعد حالات تبدیل ہوئے بنو ہاشم کے رتبے میں کمی آگئ اور حریف خاندان بنو امیہ حاوی آگیا۔

دس بارہ برس کی عمر میں آپ بکریاںچرایا کرتے تھے۔ جو کہ عربوں کا اہم پیشہ تھا۔ تقریباً بارہ برس کی عمر میں اپنے چچا  ابو طالب کے ساتھ تجارت کا سفر کیا۔

اس سفر میں وہ واقعہ پیش آیا جسے مختلف راویوں نے بیان کیا ہے۔ یہ عیسائ راہب بحیرہ سے ملنے کا واقعہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بحیرہ نے آپکی نبوت کی پیشن گوئ کی تھی۔ یوروپین موءرخین کا کہنا ہے کہ یہاں سے محمد نے مذہب کے حقائق و اسرار سیکھے۔ اور ان بنیادی نکات پہ اسلام کی بنیاد رکھی۔ شبلی تو اس واقعے کے پیش ہونے کے بارے میں بھی شک رکھتے ہیں۔

بہر حال یہ بات تو ثابت ہے کہ تجارت کی غرض سے آپ نے کافی ممالک کے دورے کئے اور مختلف طرز معاشرت کا نہ صرف ذاتی تجربہ کیا بلکہ لوگوں سے معلومات بھی لیں۔ فوٹون کے خیال میں  آپ جیسے ذہین شخص نے ان تمام معاشروں  کے تناظر میں اپنے معاشرے کو  دیکھا ہو گا اور یہ اندازلگایا ہوگا کہ انکے معاشرے کی تنزلی کے اسباب کیا ہیں۔

دعوی ء نبوت سے پہلے آپکے معمولات میں لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر ایک پہاڑی غار میں تنہا وقت گذارنے کا عمل شامل تھا۔ ایک مغربی مءورخ اسے اس  طرح بیان کرتا ہے۔

سفر و حضر میں ہر جگہ محمد کے دل میں ہزاروں سوال پیدا ہوتے تھے۔ میں کیا ہوں؟ یہ غیر متناہی عالم کیا ہے؟ نبوت کیا شے ہے؟ میں کن چیزوں کا اعتقاد کروں؟ کیا کوہ حرا کی چٹانیں، کوہ طور کی سر بفلک چوٹیاں، کھنڈر میدانکسی نے ان سوالوں کا جواب دیا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ بلکہ گنبد گرداں گردش لیل و نہار، چمکتے ہوئے ستارے، برستے ہوئے بادل کوئ ان سوالوں کا جواب نہیں دے سکا۔

اس ساری فکر کو  ہم اپنے مذہب کے لحاظ سے دیکھیں تو عبادت جیسی چیز تک محدود کر دیتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ نبوت جیسی پر اسرار طاقت اللہ نے آپکو دینے سے پہلے سے عبادت کا عادی بنایا۔ جبکہ فوٹون جیسا غیر مذہبی شخص  اسے انکی دانش سے منسلک کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ انہوں نے اس تمام عرصے میں یکسو ہو کر سوچ و بچار کی کہ وہ اپنی قوم کو اس جہالت اور غربت سے کیسے نکالیں۔

بطور نبی آپ اپنی قوم کو حضرت موسی کی طرح لے کرکسی اور ملک نکل جاتے یا حضرت عیسی کی طرح صرف تبلیغ پر اکتفا کرتے۔ لیکن آپکو عرب کی بہتری کے لئے، عرب میں رہ کر  کام کرنا تھا ااور اسکے لئے تدبراور تدریج کی ضرورت تھی۔

انکے اس تفکر کا نتیجہ یہ نکلا کہ مذہب کا انسان کی نفسیات اور اعمال پہ گہرا اثر ہوتا ہے اور مذہبی نظریات کے ذریعے اسے سدھانا آسان ہوتا ہے۔ خاس طور پہ اگر اسے یہ ترغیب دی جائَ کہ اچھے اعمال کا مرنے کے بعد اچھا ہو گا اور برے اعمال کے نتیجے میں مرنے کے بعد برا نتیجہ ہوگا۔ مرنے کے بعد ایک ابدی زندگی ہے جس میں انسان اپنے اعمال کے نتائج بھگتے گا۔ یہی نہیں بلکہ ایک ایسا مذہب جو کسی ایک نکتے کے گرد گھومتا ہو وہ انسانوں کو زیادہ متحد کر سکتا ہے یوں توحید کا نظریہ، شرک کے نظرئیے پہ حاوی ہوجاتا ہے۔ کئ خداءووں کے بجائے ایک خدا انسانوں کو ایکدوسرے کے قریب کر سکتا ہے۔ شرک کی ہر طرح سے مذمت کی گئ اور توحید کو ہر طریقے سے مضبوط بنانے کے لَئے جدو جہد کی گئ۔ شرک کی مذمت اور توحید کی مضبوطی کے ساتھ ہی عرب کو اس بات کے لئے تیار کیا گیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ وہ اپنے پرانے رسم و رواج کی زنجیریں توڑ ڈالے۔ اور مذہب اس سلسلے میں سب سے کڑا امتحان ہوتا ہے۔ اس لئے پہلی کاری ضرب مذہبی نظریات پہ لگی۔

 فوٹون اپنے خیال کی تصدیق کے لئے دیکھتا ہے  کہ جب رسول اللہ اپنی نبوت کا اعلان کرتے ہیں تو اس میں جو لوگ ابتداء میں داخل ہوتے ہیں  ان میں ایک امر مشترک تھا کہ وہ قریش کے مناصب اعظم میں سے کوئ منصب نہ رکھتے تھے۔  اس معاشرے کے غریب اور پسے ہوئے لوگ تھے جنکی معاشرے میں کوئ حیثیت نہ تھی۔ مثلا عمار، خباب، ابو فکیہہ، صہیب وغیرہ کو دولت و جاہ کے دربار میں جگہ نہیں مل سکتی تھی۔ اس بناء پہ رسول اللہ کا مذاق اڑایا جاتا کہ یہ ہیں انکے ماننے والے۔ قریش کے رئیس ہنس کر کہتے

یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے ہم لوگوں کو چھوڑ کر احسان کیا ہے۔ سورہ انعام ۱

اہل قریش کے نزدیک انکا افلاس انکی تحقیر کا باعث تھا جبکہ اسی کی وجہ سے وہ حلقہ ء اسلام میں سب سے پہلے داخل ہوئے۔ انکو یہ ڈر نہ تھا کہ اگر اسلام میں داخل ہو گئے تو کوئ منصب جاتا رہے گا۔ ان کے لئے یہ زندگی اور موت کا مسئلہ تھا اگر وہ جیت جاتے تو معاشرے میں انکی حیثت قائم ہوجاتی ورنہ وہ پہلے سے بھی زیادہ کمزور بنا دئیے جاتے۔

جاری ہے ۔

نوٹ؛ اس تحریر کی تیاری میں جن کتب سے مدد لی گئ ہے وہ یہ ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی کی کتاب سیرت النبی، اسکے پبلشر ہیں الفیصل ناشران و تاجران کتب اور مولانا صفی الرحمن مبارکپوری کی الرحیق المختوم جسکے پبلشر ہیں المکتبہ السلفیہ لاہ

شبلی نعمانی کی سیرت النبی

یہاں

سے ڈاءونلوڈ کیجئیے۔

الرحیق المختوم

یہاں سے ڈاءونلوڈ کریں۔

۔

12:36 AM

اسلام, الرحیق المختوم, اللہ, تاریخ, رسول, سرت النبی, شبلی, عرب, محمد

ایک شہر، تین اجتماعات

ابھی تقدس سے باہر کے لئے لکھی گئ ایک تحریر کے حوالہ جات کو ایک آخری نظر سے دیکھنا چاہ رہی تھی کہ اس اتوار کے ندیم ایف پراچہ کے

مضمون

پہ نظر پڑ گئ۔ مضمون مزے کا تھا۔

گذشتہ دنوں کراچی میں چند دلچسپ اجتماعات ہوئے۔ ایک  کراچی لٹریچر فیسٹیول،  اسکے متوازی چلنے والا دوسرا دفاع پاکستان کا اجتماع اور تیسرا پاکستان کی سیاسی تاریخ میں کسی سیاسی جماعت کی طرف سے خواتین کے لئے کیا گیا پہلا اجتماع۔

کراچی لٹریچر فیسٹیول

کے بارے میں کیا کہوں، کراچی کے سب سے پوش علاقے ڈیفینس ہاءوسنگ سوسائیٹی کے بھی ایک دور افتادہ  کونے میں منعقدہ کسی تقریب کے لئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ اسکے منعقد کرنے میں یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ کہیں غلطی سے بھی کوئ ایرا غیرا نتھو خیرا ایسا اس میں  نہ آجائے جس کا ہائ کلاس سے کوئ تعلق نہ ہو، اردو لکھنے پڑھنےوالے اس سے جتنا دور رہیں اتنا اچھا ہے ، ایسا نہ ہو کہ عام لوگوں کو اس سے کوئ انسپیریشن حاصل ہو جائے یا یہ کہیں واقعی پاکستان میں لٹریچر کو عام نہ کر ڈالے۔ اور صورت حال کچھ ایسی بنی رہتی ہے  کہ ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں۔ وہ تو تقریب کے احوال اردو میں اتنی تفصیل سے نہیں پہنچ پاتے اس لئے لوگوں کو پتہ نہیں چل پاتا کہ اس بہانے کیسے کیسے غیر ملکی ایجنٹ ہمارے یہاں گھوم پھر کر چلے جاتے ہیں۔

دوسرا اجتماع

دفاع پاکستان

والوں کا تھا۔

مقام تھا اسکا قائد اعظم کا مزار۔ خدا جانے کیوں چونسٹھ سال کے بعد قائد اعظم کے سر پہ سب سوار ہونے کو تیار ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ سب کیا دھرا انہی کا تھا اس لئے مر کر بھی چین نہیں پا سکتے۔ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ بہت پاءوں پھیلا کر سو لئے کنج مزار میں۔  ایک کے بعد ایک اجتماع وہیں ہو رہا ہے۔ اب انہیں بھی لگ پتہ گیا ہوگا  بالکل براہ راست کے پاکستان میں ہو کیا رہا ہے۔

دفاع پاکستان کے متعلق میرا خیال تھا کہ جماعۃ الدعوۃ والے کر رہے ہیں۔ جی وہی جماعت جس پہ حکومت کی طرف سے پابندی ہے۔ پھر شہر میں لگے اشتہاروں سے پتہ چلا کہ جماعت اسلامی والے بھی شامل ہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ شیخ رشید جیسی سیاسی ہستی  اور اعجاز الحق بھی تشریف لا رہے ہیں۔

اوہ تو یہ آئ ایس آئ والوں کا جلوہ ہے۔ میں نے ہی نہیں بیشتر دیگر لوگوں نے بھی یہی خیال کیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہم میں کوئ غیر معمولی ذہانت پائ جاتی ہے۔ بلکہ آپ نے اس سکھ کا لطیفہ تو سنا ہوگا جو ایک الماری پہ فدا ہو گیا تھا۔ لیکن دوکاندار اسے دینے کو تیار نہیں تھا کہ ہم سکھوں کو نہیں دیتے۔ پھر اسکے بعد وہ کئ دفعہ ہندو ، عیسائ اور مسلمان کے بھیس بدل کر اسکے پاس پہنچا۔ لیکن ہر دفعہ اس نے ایک ہی جواب دیا۔ ہم سکھوں کو نہیں دیتے۔ 'او تجھے پتہ کیسے لگ جاتا ہے کہ میں سکھ ہوں'۔ سکھ نے عاجز آکر پوچھا۔ 'تم ہر دفعہ فریج کو الماری کہتے ہو'۔ دوکاندار نے عجز سے جواب دیا۔

دفاع پاکستان میں ہونا کیا تھا وہی پاکستان کے دشمنوں کی آنکھیں پھوڑ دینے کا دعوی، جبکہ یہاں ابھی ہمیں ہی کچھ نظر نہیں آرہا۔ تاریخ سے گن گن کر ان واقعات کے حوالے جن سے خون میں ویسا ہی ابال پیدا ہو جیسا باسی کڑھی میں پیدا ہوتا ہے۔  اور پھر انتقام در انتقام سے انکی بینڈ بجانے کا تہیہ۔ اللہ جانتا ہے کہ مجھے نہیں معلوم ، یہاں بینڈ سے کیا مراد ہے۔

اس اجتماع میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی، اسکی وجہ یہ تھی کہ لٹریچر فیسٹیول والوں کے مقابلے میں دفاع پاکستان والوں کو اپنے پیغام کے عام ہونے کا کوئ خوف نہ تھا۔ حالانکہ انکا پیغام سنا ہے کہ حرف بحرف نفرت کا پیغام تھا۔ لیکن اسے سننے کے لئے لوگ ون ڈی، ٹو کے اور ڈبلیو گیارہ جیسی بسوں سے بآسانی پہنچ سکتے تھے۔ حتی کہ جو اس میں شامل نہیں ہونا چاہتے تھے وہ بھی اس جگہ سے اسے سنے بغیر نہیں گذر سکتے تھے۔ تقریریں کرنے والے اور سننے والے انگریزی نہیں اردو میں رواں تھے۔ کیونکہ انکی دل سے خواہش تھی کہ وہ جس جذبے سے بول رہے ہیں وہ جذبہ انکے سامعین کے رگ و ریشے میں اتر جائے اور جب جلسہ ختم ہو تو یہاں موجود ہر شخص ایک مرد مجاہد ہو۔ موسیقی سے اجتناب کیا گیا اور صرف اپنی بغلیں اور دوسروں کی اینٹ سے اینٹ بجانے پہ ہی اکتفا کیا گیا۔

سب سے اہم بات یہ تھی کہ جلسے کی پوری کارروائ میں ایک بھی خاتون موجود نہ تھی۔ دفاع جیسا اہم موضوع خواتین کی سمجھ میں کیا خاک آئے گا۔ انہیں تو اپنے دفاع کے لئے بھی بچاءو بچاءو کا نعرہ بلند کرنا پڑتا ہے۔ پھر اللہ کا کوئ بندہ انکا دفاع کرتا ہے یہ الگ بات کے اللہ ہی کا ایک اور بندہ انہیں مورچہ بند ہونے پہ مجبور کرتا ہے۔ یوں اگر خواتین کے دفاع کی بات ہو رہی ہو تو بھی کہانی آخیر میں دو مردوں کے درمیان جنگ کی صورت بن جاتی ہے۔

قسمت کی یہ ستم ظریفی کراچی جیسے ظالم شہر میں ہی نظر آسکتی ہے کہ کہاں تو ایک مقام پہ خون کی ندیاں بہائ جا رہی تھیں کہاں اسی مقام پہ ایک ہفتے بعد بھنگڑے ڈالے جا رہے تھے۔  میں تو بھنگڑے جیسا محتاط لفظ استعمال کر رہی ہوں لیکن لوگوں کے خیال میں اس کے لئے درست لفظ مجرا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ مرد اگر مجرا کر رہے تو بھی کبھی وہ محفل سماع جیسا نیک نام حاصل کرتا ہے، کبھی جدید موسیقی جیسے راک اینڈ رول کہلاتا ہے  یا کبھی شغل اور لوک ڈانس  وغیرہ کہلاتا ہے مثلاً خٹک ڈانس، بھنگڑا۔ اً لیکن خواتین اگر شغلاً بھی ہاتھ پیر ، کولہے ہلا لیں مثلاً لڈی بھی ڈال لیں تو اسے مجرے جیسا پُر شوق نام کیوں دیا جاتا ہے؟

اچھا بہر حال ناقدین کی نظر میں خواتین کا مجرا کرایا گیا ۔ کچھ لوگوں کو یہ اعتراض ہے کہ وہ بھی ننگے سر۔ یعنی اگر سر پہ دوپٹہ ہوتا تو اتنا مکروہ نہ ہوتا۔

بہر حال جلسہ کیوں کہ خواتین سے متعلق تھا اس لئے جو رنگینی اس میں نہ ہوتی وہ کم ہوتی کہ وجود زن سے ہے تصویر کائینات میں رنگ۔ دفاع پاکستان کے خون کے دھبے دھونے کے لئے یا یہ کہ منتظمین نے دفاع پاکستان والوں کے سینے پہ مونگ دلنے کے لئے خواتین کو اسی مقام پہ چوڑیاں بیچیں، پہنائیں اور مہندیاں بھی لگوائیں۔

پونے دو کروڑ کی آبادی رکھنے والے شہر کی خواتین کی توجہ حاصل کرنا ایک  نئے رجحان یا تبدیلی کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں سیاسی پارٹیاں اس بات پہ متفق ہوتی ہوں کہ  ملک کے بعض حصوں میں خواتین کو ووٹ نہیں ڈالنے دیا جائے گا۔ اس میں مسلم لیگ سے لے کر پی ٹی آئ والے بلکہ اے این پی بھی شامل ہوتی ہے۔ وہاں خواتین کی بحیثیت ووٹر آءو بھگت ہونا اانکے لئے خاصہ پر جوش ہے۔

خواتین کے مسائل کے حوالے سے اگرچہ کچھ زیادہ نہیں کہا گیا۔

جلسہ

کراچی میں ہوا تھا اور یہاں خواتین کی بڑی تعداد ملازمت پیشہ ہے جو مختلف صنعتوں میں نہ صرف کام کر رہی ہیں بلکہ گھریلو صنعتیں بھی چلا رہی ہیں۔ انکے مسائل بھی اسی حساب سے ہیں۔  بہر حال ہم اس آواز میں شامل ہیں  کہ خواتین پہ تیزاب پھینکنے والوں کے لئے سزائے موت سے کم سزا نہیں ہونی چاہئیے۔

اچھا تو ان تین اجتماعات کے بعد میں کیا سوچ رہی ہوں؟ بس یہ کہ خواتین اور مرد وں کے دلوں تک پہنچنے کے لئے کتنے مختلف راستے اختیار کرنا پڑتے ہیں۔ کیا کسی ایک سیاسی پارٹی کے لئے یہ دونوں راستے بیک وقت اختیار کرنا ممکن ہے؟

9:18 PM

ادب, اردو، انگر, ایم کیو ایم, پاکستان, خواتین, دفاع, ڈیفینس ہاءوسنگ سوسائیٹی, سیاست, فیسٹیول, کراچی, لٹریچر

بلوچستان؛ سرادر کی فوج یا فوج کی سرداری

 امریکیوں نے آزاد بلوچستان کے لئے اپنی سینیٹ میں ایک قرارداد پاس کی۔ وجہ یہ ہے کہ خنجر چلے کسی پہ تڑپتے وہ ہیں، سارے جہاں کا درد انکے جگر میں ہے۔ اسکی دوسری وجہ یہ ہے کہ جنگ ہو یا دوسرے ممالک کے حصے بخرے کرنے کا معاملہ یہ دونوں ہی مشغلے انہیں بھاتے ہیں۔ انکے جنگی بحری بیڑے سمندروں پہ حاضر رہتے ہیں اور انکے مقاصد میں آسانی پیدا کرنے والے صحافی اور سیاستداں اپنی زمینوں میں سرنگیں بنائے انکے منتظر۔

بی بی سی اردو سروس میں وسعت اللہ خان صاحب کا ایک مضمون بلوچستان کے متعلق پڑھ رہی تھی۔  جسے پڑھ کر مجھ جیسے پاکستانی کو لگتا ہے کہ یا تو باغی بلوچ سرداروں نے املا کرایا ہے یا پھر امریکی کانگریس مین نے اپنی قرارداد کے ساتھ اس قسم کے مضامین بھی نتھی کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ بلوچستان کے ساتھ سیاسی غلطیاں اور زیادتیاں ہوئ ہیں لیکن کیا ان سیاسی غلطیوں اور زیادتیوں میں وہ سردار شامل نہیں جو آج آزاد بلوچستان کا نعرہ بلند کر رہے ہیں۔

پچھلے چونسٹھ سال میں اگر حکومت پاکستان کی ملی بھگت سے بلوچستان میں سڑکوں کا جال نہیں بچھا، انگریزی میڈیم اسکول نہیں بنائے گئے، ہسپتال قائم نہیں ہوئے تو کیا پچھلے چونسٹھ سال میں  مری، بگتی اور مینگل سردار اس جہد مسلسل میں اپنی جانیں گنواتے رہے کہ انکے ہم قوموں کو یہ زندگی کی سہولیات مل جائیں۔ یہ بات سوچتے ہوئے بھی ہمیں شرمندگی ہوتی ہے کہ آزاد بلوچستان کا نعرہ بلند کرنے والے یہ سردار آزادی صرف اپنے لئے چاہتے ہیں۔ اور اسکے لئے انہوں نے کیا امریکہ اور کیا لندن ہر جگہ ان لابیز سے گٹھ جوڑ کیا ہوا ہے جو انکے مقاصد تک انہیں پہنچا سکیں۔

یہ سب سردار ااور انکی نسلیں پاکستان ہی نہیں پاکستان سے باہر بھی عیاشی کرتی رہیں اور رونا اس بات کا رہا کہ بلوچستان کے ساتھ بڑی زیادتی ہوتی ہے۔ جس بلوچ کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے اس سے کیا مینگل، کیا بگتی اور کیا مری ان سب سرداروں میں سے کسے دلچسپی ہے؟

ان لوگوں کی دلچسپی اگر کسی چیز میں ہے تو وہ یہ کہ بلوچستان میں قدرتی دولت کے جو بھی ذخائر ہیں اسکی آمدنی ان میں اس طرح تقسیم  ہو جائے کہ  کسی اور کے حصے میں آنے نہ پائے۔ یہ 'کسی اور' جسے وہ اپنی قوم کے سامنے پیش کرتے ہیں ہر وہ شخص ہوتا ہے جو بلوچ نہیں ہے۔ دوسری قومیتوں کا خوف پیدا کر کے اپنے خوفزدہ لوگوں کو کس چیز سے خوفزدہ کرتے ہیں۔  کیا ایک عام بلوچ کو اس بات سے ڈرنا چاہئیے کہ وہ اپنے سردار کی گولی کھا کر بے گناہ مرنے کے اعزاز سے محروم ہوگا اور فوج کی گولی سے مارا جائے گا۔ فوج کی گولی سے مرنا حرام موت اور سردار کی گولی سے مرنا رتبہ ء عالی ہے۔

اختر مینگل صاحب جو اس وقت کسی ترقی یافتہ ملک میں بیٹھے گلچھرے اڑا رہے ہونگے کیا انکے منصوبوں میں کبھی بلوچستان میں سڑک بنانے، اسکول بنانے اور ہسپتال بنانے کے منصوبے شامل رہے۔ کیا انکے مطالبات میں کبھی یہ چیز شامل رہی کہ انکے صوبے کے عوام کو یہ سہولیات دی جائیں۔ نواب بگتی کے پوتے براہمداغ بگتی فرماتے ہیں کہ آزاد بلوچستان ایک اٹل حقیقت ہے۔ ذرا وہی اپنے دادا کے بلوچوں پہ احسان گنوا دیں۔ کوئ ایک اسکول، کوئ ایک روڈ، کوئ ایک ہسپتال ، کوئ ایک  عوامی فلاح کا کام جو ایڈوینچر کے شوقین انکے دادا نے بلوچوں کو عظیم قوم بنانے کے لئے انجام دیا۔  بخدا، مجھ جیسا ہر پاکستانی ان سے نا آشنا ہے۔ چلیں وسعت اللہ خان صاحب ہی بتا دیں کہ سرداروں نے اپنی قوم پہ جو احسانات کئے یا کرنے کی کوشش کی۔ جسکی بنیاد پہ آج بلوچ قوم کو انکے پیچھے کھڑے ہو کر آزاد بلوچستان کی جنگ لڑنی چاہئیے۔ جی وسعت اللہ خان صاحب، ہم سب ان کارہائے نمایاں کو جاننے کے لئے بے تاب ہیں۔

اس وقت بھی بلوچستان کی صورت حال کا نقشہ ایسا کھینچا جاتا ہے جیسا کہ بنگلہ دیش کا سقوط کے وقت تھا۔ حالانکہ بنگلہ دیش اور بلوچستان اور بنگلہ دیش میں ایک واضح فرق موجود ہے اور وہ یہ کہ بنگلہ دیش میں آزادی کے لئے عوامی شعور موجود تھا اور انہیں معلوم تھا کہ انہیں آزادی کے بعد کیا کرنا ہے۔ بلوچستان میں عوام اس بات سے واقف ہی نہیں کہ انسان شعور رکھتا ہے۔ انکی بڑی تعداد گٹکے اور چرس کے کے نشے میں گم ہے۔  یہی نہیں بنگالی ، بنگالی قومیت کا مضبوط تصور رکھتے تھے، انکی زبان اور ادب موجود تھا۔  بلوچستان میں بلوچ قومیت کا تصور ہی چند سرداروں تک محدود ہے جو کہ اپنے مفادات کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ اپنی مٹی یا اپنے لوگوں سے وفاداری کی جنگ انہیں کیا معلوم۔ بھلا کوئ کیڑے مکوڑوں کی خود مختاری کے لئے لڑتا ہے۔

دوسری ظالمانہ حقیقت یہ ہے کہ بلوچستان کی آبادی کا ایک بڑا حصہ تو پشتون ہیں۔ پھر یہاں کی آبادی کا دوسرا بڑا حصہ ان قبائل سے تعلق رکھتا ہے جو لاسی کہلاتے ہیں اور اپنی بنیاد میں یہ سندھی بلوچ ہیں۔ اسکے بعد یہاں پنجابیوں کی باری آتی ہے جو کہ بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ ایک ایسے بلوچستان کو کس آزاد ملک میں تخلیق کیا جائے گا۔

اچھا ہم یہ تصور کر لیتے ہیں کہ یہ خود غرض، ظالم سردار عوامی حمایت کے ساتھ آزاد بلوچستان حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے. کیونکہ فوج نے ان کو آزادی سے محروم کر رکھا ہے۔  تو انکے آزاد ملک کا انتظام کون چلائے گا۔ وہ کیڑے مکوڑے تو نہیں چلا پائیں گے جو انہوں نے پچھلے چونسٹھ سالوں میں اپنی غلامی کے کوکون میں محفوظ کر کے اپنی بادشاہت کی تسکین کے لئے رکھے ہوئے ہیں۔ پھر یقیناً یہ امریکی سینیٹرز یا لندن کے صحافی آکر ہی انکی مدد کریں گے۔ ایک دفعہ پھر قدرتی دولت میں انہیں ساجھے دار بنانا پڑے گا۔ تو اب کیا مسئلہ ہے؟

مجھ جیسے پاکستانیوں کو یہ بھی سمجھنا ہے کہ سردار اپنی رعایا پہ زندگی تنگ کر دے انہیں انسان تسلیم کرنے سے انکار کر دے، انکے خاندان کے خاندان ختم کر دے تو کوئ نکتہ ء اعتراض نہیں ابھرتا۔ کوئ اللہ کا بندہ نہیں کہتا کہ انسانی حقوق کی پاسداری کی جائے اور ان زمینی فرعونوں کے خلاف کارروائ کی جائے۔ لیکن جب سیاسی بساط پہ چالیں چلی جاتی ہیں , فوج یا حکومتی ایسے رد عمل پہ امریکی کانگریس مین قرار دادیں پاس کرتے ہیں تو کیا مینگل، کیا بگتی اور کیا وسعت اللہ خان سب ہی ایک آواز ہو جاتے ہیں۔

جس طرح پاکستانیوں کو کسی چیز سے نفرت دلانے کے لِئے ایک ہی نعرہ کافی ہے کہ یہ امریکیوں نے کیا ہے اسی طرح یوں معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان سے باہر ایک حلقہ صرف یہ نعرہ لگانے میں دلچسپی رکھتا ہے کہ یہ ظلم پاکستانی فوج کا کام ہے۔ کیا ان دو انتہائ صورتوں کے درمیان پاکستانی عوام کے لئے کوئ امید موجود ہے؟

11:59 AM

آزادی, امریکہ, بگتی, بلوچستان, پاکستان, قرارداد, مری, معاشرہ, مینگل, وسعت اللہ خان

اہم تعلیمی مسئلہ، رمضان کی چھٹیاں

فروری کا مہینہ صرف ویلینٹائینز ڈے کا مہینہ نہیں۔ جب کچھ جوڑے سوچتے ہیں کہ انکے آنگن میں بچوں کی صورت پھول کھلیں گے۔ بلکہ ان والدین کے لئے بھی لمحہ ء فکریہ  ہے جن کے بچے موجود ہیں اور انہیں اسکول میں داخلہ چاہئیے۔ جیسے میری بیٹی اب اپنی مونٹیسوری ختم کر کے پہلی جماعت میں جائے گی۔ میرے لئے اہم سوال ہے  کس اسکول میں؟

ابھی مہینہ بھر پہلے میں اپنی بچی کی مونٹیسوری ٹیچر پہ خفا ہوئ کہ یہ کیا طریقہ ہے ایک کے بعد ایک پہاڑے رٹائے جا  رہے ہیں۔ ایک مونٹیسوری کے بچے کے لئے چھ تک پہاڑے یاد کرنا بالکل ضروری نہیں ہے۔  سال کے بارہ مہینوں سے لے کر جانوروں، پھولوں، سبزیوں، پرندوں اور خدا جانے کن کن چیزوں  کے ناموں کے ہجے انگلش اور اردو میں۔ یہ تو زیادتی ہے۔ جواب ملا کیونکہ ماما پارسی اور بی وی ایس میں داخلے کے وقت یہ سب پوچھا جاتا ہے۔  اور پھر وہ پہلی جماعت میں ان بچوں کو جب لے لیں گے تو یہ سب دو سال بعد پڑھائیں گے۔ میں ناراض ہو کر بھی ہنس دی۔ ان سے کوئ نہیں پوچھے گا کہ آپکا پہلی جماعت کا سلیبس کیا ہے اور آپ نے کیوں والدین کو مجبور کیا کہ وہ آپکے داخلہ ٹیسٹ کے لئے اپنے بچوں سے انکا بچپن چھین لیں۔

اچھا وہ والدین کیا کریں جنہیں اپنے بچوں کو ان اسکولوں میں داخل نہیں کروانا ہے۔ وہ بھیڑ چال میں پھنسے ہوئے سر پکڑے بیٹھے ہیں۔

ان مشنری اسکولوں کی طرف والدین کے بھاگنے کی ایک بنیادی وجہ انکا بہتر طریقہ ء تعلیم اور مناسب فیس ہے۔ کہنے کو ہمارے ملک میں لوگوں کا ایک پسندیدہ مشغلہ اپنے مذہب کی تبلیغ اور جہاد ہے  لیکن تعلیمی میدان میں بہتر کارکردگی اور مناسب فیس جو اسکول دیتے ہیں وہ عیسائ تبلیغیوں کے ہاتھوں چلنے والے اسکول ہیں۔ مذاق؟ میں نہیں کر رہی یہ حقیقت ہے۔

کراچی کے علاقے نارتھ ناظم آباد میں جنریشنز نامی اسکول ہے جو علاقے میں بڑی اچھی شہرت رکھتا ہے۔ ایک وجہ بہتر تعلیمی معیار اور دوسری وجہ اسکول انتظامیہ کا مذہبی رجحان۔ تمام خواتین اساتذہ کا اسکارف پہننا ضروری ہے۔ فیس ہے اس اسکول کی تقریباً دس  ہزار ماہانہ، داخلہ پیکیج تقریباً پچاس ساٹھ  ہزار بنتا ہے۔

جبکہ ماما پارسی، سینٹ جوزف، سینٹ پال، سینٹ لارنس،  بی وی ایس، سینٹ پیٹرکس ان سب اسکولوں کی ماہانہ فیس تین سے چار  ہزار بنتی ہے اور اس بات کا میں آپکو یقین دلادوں کہ جنریشنز کی تعلیمی کارکردگی ان تمام مشنری اسکولوں سے بہتر نہیں ہے سوائے اسکے کہ یہاں پڑھنے کے بعد آپکا بچہ گھر میں یہ اعلان کرے گا کہ امّاں آپ آدھی آستین کی قمیض نہیں پہن سکتیں، یہ غیر اسلامی ہوتا ہے۔

جنریشنز سے ہٹ کر فاءونڈیشن اسکول بھی فیس کی مد میں اس سے زیادہ مطالبات رکھتا ہے۔ ادھر بیکن ہاءوس اور سٹی اسکول بھی اپنی ابتداء آٹھ ہزار سے کرتے ہیں۔ ہر سال ان اسکولوں کی فیس میں دس فی صد اضافہ ہوتا ہے۔ یعنی اگر ایک بچہ ان اسکولوں سے میٹرک کر رہا ہے تو دس سال بعد اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسکی کتنی فیس ہوگی۔

  مشنری اسکولوں کے لئے اتنی کم فیس میں اتنی معیاری تعلیم اور ڈسپلن پیدا کرنا کیسے ممکن ہو جاتا ہے؟ اس میں بھی کوئ کفار کی سازش سمجھ میں آتی ہے۔ کیونکہ ہمارے عمران خان بھی جب ایک تعلیمی ادارہ بناتے ہیں تو اسکی فیس کم رکھنا ممکن نہیں ہو پاتا۔

اب ہم اپنے بنیادی مسئلے کہ طرف واپس آتے ہیں۔ ہمارا بچہ کس اسکول میں جائے گا۔ یہ تمام مشنری اسکول میرے گھر سے اتنے فاصلے پہ ہیں کہ ایک اسکول وین کو اسکول شروع ہونے سے تقریباً سوا گھنٹے پہلے اسے گھر سے لینا ہوگا اور جب وہ اسے گھر واپس چھوڑے گی تو دن کے ساڑھے تین بج رہے ہونگے۔ مجھے اپنی بیٹی اس ساری مشقت کے لئے چھوٹی لگتی ہے۔ میں سوچتی ہوں اس ساری محنت کے بعد بچے کے پاس کتنا وقت بچے گا کہ وہ اپنے ماحول پہ بھی ایک نظر ڈال لےاور یہ جانے کے کتاب اور اسکول سے الگ بھی ایک دنیا اسکے اطراف میں بستی ہے۔

اس سارے بحران کی وجہ حکومت کی ناقص تعلیمی پالیسی ہے اگر کوئ تعلیمی پالیسی ہے تو۔ ہر سال تعلیمی سیشن شروع ہونے سے پہلے حکومت کا سر درد پچھلے کئ سالوں سے صرف ایک مسئلہ لگتا ہے اور وہ یہ کہ رمضان کے پورے مہینے چھٹیاں دی جائیں یا نہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ڈیڑھ ہزار سال کے بعد اب کوئ نئے رمضان آنا شروع ہوئے ہیں۔ یہی قوم رمضان میں پیٹ پہ پتھر باندھ کر جنگیں لڑتی تھی اور اسی قوم کے منتظمین یہ چاہتے ہیں کہ رمضان میں اب اسکول بند رہیں تاکہ قوم زیادہ خشوع خضوع سے رمضان میں روزے رکھ سکے۔  چونکہ تعلیم کے دیگر معاملات پہ سوچنے کے لئے کچھ نہیں رہا۔ اس لئے اس سال پھر صرف ایک مسئلہ ہے کہ گرمیوں کی چھٹیاں جولائ میں ہوں یا جون میں۔ کیونکہ رمضان جولائ کے اخیر میں شروع ہو رہے ہیں۔

لوگ پھر بھی  ہم سے پوچھتے ہیں کہ جناب جہادی اور تبلیغی سوچ کیسے علمی سرگرمیوں کو متائثر کر سکتی ہے؟

 ہم والدین حکومت سے یہ سوال نہیں کر سکتے کہ اسکے لئے یہ کیوں ممکن نہیں کہ ہر یونین کونسل میں صرف ایک معیاری اسکول بنا دے جس کی فیس غریب طبقے کے لئے ادائیگی کے قابل ہو۔ جہاں میرٹ پہ داخلہ ہو اور ہر امیر یا غریب کا بچہ صرف میرٹ پہ داخلہ پا سکے۔ جہاں اساتذہ بچوں کو تعلیم دینے کے لئے باقاعدگی سے اسکول آ سکیں۔ ہم تو اب یہ عیاشی بھی نہیں چاہ رہے ہیں کہ ہر بچے کو تعلیم دی جائے۔ لیکن جو اپنے آپکو اہل ثابت کر رہے ہیں انکے لئے تو کچھ کیا جائے۔  کچھ کو تو دی جائے۔

اسکی وجہ یہ ہے کہ ابھی ہفتہ بھر پہلے گھر میں صفائ کا کام کرنے والی ماسی نے بتایا کہ اسکا بچہ گورنمنٹ اسکول میں پڑھتا ہے۔ کتنی مشکل سے اسے اسکول بھیجتی ہوں اور ایک ہفتے سے اسکول میں کوئ پڑھائ نہیں ہوئ کیونکہ کوئ ٹیچر ہی نہیں آرہا۔ یہ کراچی میں واقع گورنمنٹ اسکول کا حال ہے۔ دور دراز کے علاقے تو کسی گنتی میں نہیں جہاں اسکول صرف کاغذ پہ موجود ہیں اورانہیں بھوت اسکول کہا جاتا ہے۔

 سر دست پیٹ بھرے لوگوں اور انتظامیہ دونوں کے نزدیک اہم تعلیمی مسئلہ یہ ہے کہ گرمیوں کی چھٹیاں رمضان سے  پہلےیا بعد میں۔ جب تک انتظامیہ اس معاملے پہ سوچ و بچار کر کے فارغ ہو  میں اپنے بیلینس کا حساب ایک دفعہ پھر لگاءوں  میری بیٹی کو اس سال پہلی جماعت میں داخلہ لینا ہے۔

5:06 PM

اسکول, پاکستان, پرائیویٹ, تعلیم، بچے, رمضان, گورنمنٹ, مذہب, مونٹیسوری

سائینس کا مومن

سائینس اور بالخصوص کیمیاء پڑھنے والوں کے لئے

کیکولے

کا نام اجنبی نہیں۔ کیکولے کے حصے میں بینزین مالیکیول کی ساخت کی دریافت کا سہرا جاتا ہے۔ جسکے بعد کیمیاء میں ایرومیٹک مرکبات کی ایک نئ گروہ بندی سامنے آئ۔  یہ مرکبات ڈبل بانڈز رکھتے ہیں لیکن یہ ڈبل بانڈ رکھنے والے مرکبات کی نسبت نہ صرف کہیں زیادہ مضبوط ساخت رکھتے ہیں بلکہ انکے کیمیائ تعاملات بھی ان سے مختلف ہوتے ہیں۔

کیکولے نے اسے کیسے حل کیا؟

یہ اسے معلوم تھا کہ بینزین میں چھ کاربن ہوتے ہیں اور چھ ہائڈروجن، جبکہ کاربن ایک وقت میں چار ایٹموں سے جڑ سکتا ہے۔ اس طرح سے اس مالیکیول کی ساخت بنانا ایک لاینحل مسئلہ بن گیا تھا کہ  چھ کاربن اور چھ ہائڈروجن اگر ایک زنجیر کی شکل میں ہوں بھی تو بچ جانے والی ویلینسیاں کیسے پوری کی جائیں۔

اسی ادھیڑ بن میں اسکی لیب اسکے لئے خانقاہ بن چکی تھی۔ پھر ایک دن اس عالم میں اسکی آنکھ لگ گئ۔

خواب

میں کیا دیکھتا ہے کہ ایک سانپ ہے جس نے اپنے منہ میں اپنی دم لی ہوئ ہے۔ اور اس طرح ایک حلقہ بنا ہوا ہے۔ آنکھ کھلی تو  وہ جان چکا تھا کہ بینزین ایک کھلی زنجیر کا مالیکیول نہیں ہے بلکہ ایک بند حلقہ ہے۔ بچ جانے والے الیکٹران

حلقے پہ بادل کی طرح گھومتے رہتے ہیں اسی میں اسکی زائد مضبوطی کا راز چھپا ہے۔

خواب بشارت، خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ، لیکن کیکولے کو یہ حصہ کیوں ملا؟

کانسٹینٹن فالبرگ

ایک کیمیاء داں، کول تار کو نئے طریقے سے استعمال کرنے کے طریقوں پہ کام کر رہا تھا ایک  تھکا دینے والے دن وہ آفس سے ہاتھ دھوئے بغیر گھر آیا اور کھانا کھاتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس میں ایک مٹھاس ہے اس نے اپنی بیوی سے پوچھا تو اس نے صاف انکار کر دیا کہ کوئ مٹھاس شامل نہیں کی۔ فالبرگ نے اپنے کالے ہاتھ دیکھے کچھ سوچا اور اگلے دن پھر جا کر اپنی لیب میں لگ گیا۔ یہ مٹھاس

سیکرین

کی تھا شکر کی طرح کی ایک مصنوعی مٹھاس جو شکر نہیں ہوتی اور کول تار میں موجود ہوتی ہے۔

 ا

لیکزینڈر فلیمنگ

، ایک حیاتیات داں جراثیم پہ تحقیق کر رہا تھا۔ جراثیم پہ تحقیق کرنے کے لئے انہیں خاص قسم کی پلیٹوں پہ اگانا پڑتا ہے جنہیں پیٹری ڈش کہتے ہیں۔ جیسے جیسے انکی آبادی بڑھتی ہے پلیٹوں پہ گچھے نمودار ہوتے ہیں۔ جنہیں مختلف تحقیقات کے لئے کام میں لایا جاتا ہے۔ وہ ایک بہت اچھا تحقیق داں تھا لیکن لیب اتنی صاف نہیں رکھ پاتا تھا۔ ایک دفعہ وہ ان ساری پلیٹوں کو ایک جگہ جمع کر کے چھٹیوں پہ چلا گیا جب واپس لوٹا تو کیا دیکھتا ہے کہ جراثیم کی ایک پلیٹ پہ پھپھوند لگ گئ تھی۔ جب اس نے غور کیا تو اسے اندازہ ہوا کہ پھپھوند نے ان جراثیم کو کھا لیا ہے جو اس نے اگائے تھے۔ یہ ایک بہت بڑی دریافت تھی۔

ایک پلیٹ پہ جراثیم کی اگائ ہوئ آبادیاں

 فلیمنگ نے پھپھوند میں سے اس مرکب کو الگ کیا اور اسے پینسلین کا نام دیا۔ لیکن وہ اسے اس مقدار میں نکالنے میں ناکام رہا جس سے اسے کسی بیماری کے خلاف استعمال کیا جا سکے۔  اس مرکب پہ ایک اور کیمیاء داں نے کام کیا اور پینسلین کو زیادہ مقدار میں خالص کرنے کے قابل ہوا اس طرح سے اسکی دریافت کے دس سال بعد وہ دوا سامنے آئ جس نے لاکھوں لوگوں کو ان بیماریوں سے بچایا جو جراثیم سے ہوتی ہیں۔ یہ پہلی اینٹی بائیوٹک یا ضد حیاتیات دوا تھی۔

تابکاری

 کی دریافت بھی ایک ایسے ہی اتفاقی حادثے کا نتیجہ تھی۔ جس سے آج دنیا کے بڑے ممالک میں نہ صرف بجلی پیدا کی جا رہی ہے بلکہ علاج میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ دل کے مریضوں کا دل چلانے والا پیس میکر بھی اسکے موءجد کی ایک  غلطی کی وجہ سے اپنی موجودگی سامنے لانے میں کامیاب ہوا۔ آج دنیا بھر میں لاکھوں لوگ اسے استعمال کرتے ہیں۔

یہ تو چند مثالیں ہیں جو مجھے اس وقت یاد آئیں۔ سائینس کی دنیا میں ایسے بہت سے واقعات بھرے ہوئے ہیں۔ جنہیں جان کر

خوشی ہوگی، حیرانی ہوگی۔ آپ میں سے شاید کچھ کہیں کہ انسان محنت کرے تو اسکا صلہ اسے ضرور ملتا ہے۔

فلیمنگ کا کہنا تھا کہ اتفاقی دریافت ان ذہین لوگوں کے حصے میں آتی ہے جو اسکے لئے پہلے سے تیار ہوتے ہیں۔ اتفاقی

 دریافت ہی نہیں ایک اچانک مل جانے والے اچھے موقع سے بھی وہی فائدہ اٹھا پاتے ہیں جو ذہنی طور پہ فائدہ اٹھانے کے

لئے تیار ہوتے ہیں

 لیکن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایک لمحے کے لئے سوچیں اگر میں ان سارے سائینسدانوں کے اصل نام دینے کے بجائے مسلمان نام دے

دوں۔ کیکولے کو خلیل بنادوں، فلیمنگ کو فہیم کر دوں  اور آپ اس تحریر کو دوبارہ سے پڑھیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ میں سے کچھ کہہ اٹھیں گے مومن جب کام کرنے کا ارادہ کرتا ہے خدا اسکی فہم و فراست بن جاتا، خدا اسکی آنکھ بن جاتا ہے، خدا اسکے ہاتھ بن جاتا ہے اور اسے  ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔

 ہممم، انسان اگر سچ کی جستجو کے لئے کام کرنے کا ارادہ کرے تو اللہ اسکا رتبہ مومن کے برابر کر دیتا ہے۔ پھر وہ اسکی فہم و فراست بن جاتا ہے، اسکی آنکھ بن جاتا ہے، اسکے ہاتھ بن جاتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔

10:39 AM

الیکزینڈر فلیمنگ, بینزین, پاکستان, پینسیلین, روحانیت, سائینس، خدا, سیکرین, کیکولے, مذہب

تقدس سے باہر-۳

گذشتہ سے پیوستہ

عرب معاشرہ اس وقت بنیادی طور پہ جن مسائل کا شکار تھا وہ معاشرتی اور معاشی دونوں تھے۔

معاشرتی مسائل دراصل معاشی حالات کی دین تھے یا جیسا کہ قبائلی نظام کا خاصہ ہوتا ہے انسان کی آزاد روی کو روکنے کے لئے وہ شخصی بت تراشتی ہے اور عام انسان کی قدر کم کرتی ہے۔ یہ قبائلی معاشرہ جیسا کہ دنیا کے بیشتر حصوں میں رواج ہے مرد کی سربراہی میں چلتا تھا۔ ایسے میں اگر عورت کی کوئ حیثیت متعین ہوتی تھی تو وہ بھی مرد کی نسبت سے۔ اور مرد سے اسکا ایک تعلق مسلم سمجھا جاتا ہے وہ ہے جنسی تعلق۔

سو اس عرب معاشرے میں عورت کی حیثیت جنس کے گرد گھومتی تھی۔  اگر اسے کچھ قبائل میں عزت حاصل تھی تو اسکی بنیادی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اسکی طرف مرد کا جنسی التفات زیادہ ہوتا تھا۔  یوں قبائل کے درمیان اگر عورت کی وجہ سے جنگ بپا ہوجاتی تو اسی کی وجہ سے امن بھی قائم ہوجاتا۔

طبقہ ء اشرافیہ میں عورت کے لئے ضروری تھا کہ ولی کی اجازت کے بغیر نکاح نہ کرے۔   اسکے علاوہ جنسی تعلق کے جو طریقے رائج تھے وہ نہ صرف آجکے اسلامی معاشرے میں زنا کی ضمن میں آتے ہیں بلکہ انکا مقصد بھی عیاشی یا جنس تک سستے طریقے سے پہنچنے کے علاوہ کچھ نہیں لگتا۔

عورت اپنے مرد کی جاگیر تصور کی جاتی یہی وجہ ہے کہ جنگ میں ہارنے والے فریق کی عورتیں فاتح قوم کے حرم میں داخل کی جاتیں۔ باپ کے مرنے پہ ماں بیٹے کی ملکیت تصور ہوتی۔

یہ تو آزاد عورتوں کا حال تھا۔  عرب قبائلی نظام میں لونڈیوں اور غلاموں کا رواج بھی تھا۔ لونڈی صرف گھریلو امور میں مددگار نہ ہوتی بلکہ چونکہ اسکی حیثیت ایک فروخت شدہ انسان کی ہوتی اس لئے مالک جب چاہے اس سے جنسی تعلق قائم کر لیتا۔ پیدا ہونے والی اولاد کا مرتبہ آزاد عورت سے پیدا ہونے والی اولاد کے مقابلے میں  کم ہوتا۔ اس سب کے بعد مالک جب چاہے اسے کسی بھی نئے مالک کے حوالے کر سکتا تھا۔

معاشرے میں مرد کی اہمیت مسلم تھی اور اولاد سے مراد بالعموم مرد اولاد ہوتی تھی۔ لڑکیوں کو اولاد تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ اس لئے اگر ایک شخص کی درجن بھر بیٹیاں ہوتیں اور لڑکا نہ ہوتا تو اسے بے اولاد ہی سمجھا جاتا۔ جیسا کہ سورہ کوثر میں اللہ تعالی ، رسول اللہ کو تسلی دیتے ہیں کہ تمہارا دشمن ہی بے اولاد مرے گا۔ حالانکہ اس وقت رسول اللہ کی بیٹیاں موجود تھیں۔ لیکن بیٹے کی وفات پہ رسول اللہ کے غم کو ہلکا کرنے کے لئے یہ الفاظ کہے گئے۔ اگر ہم فوٹون کی نظر سے دیکھیں تو یہ رسول اللہ کی وہ کوشش لگتی ہے جو انہوں نے معاشرے میں خواتین کی حیثیت بلند کرنے کے لئے کی۔ یعنی انسان کا نام اور عزت اولاد کی محتاج نہیں ہوتی بلکہ اسکے اپنے اعمال اسے اس قابل بناتے ہیں کہ لوگ اسے تا دیر عزت اور احترام سے یاد رکھیں۔ اس لئے قرآن کی زبانی یہ کہا گیا کہ بے شک تمہارا دشمن ہی بے اولاد رہے گا۔ وہ دشمن جو نبی کی اس جدو

جہد میں رکاوٹ تھے جو وہ اس معاشرے کے گرے پڑے، کمزور انسانوں کے لئے کر رہے تھے۔

زیادہ بیٹے زیادہ عزت کا باعث ہوتے کیونکہ قبائلی جنگوں میں وہ لڑنے کے کام آتے تھے۔ زیادہ لڑکے، زیادہ لڑنے والے ہاتھ زیادہ جان کا نذرانہ پیش کرنے والے لوگ۔ جبکہ لڑکیاں اس صورت میں زیادہ کار آمد نہ ہوتیں سوائے اسکے جنگ کے میدان میں مردوں کے حوصلے بڑھانے کے لَئے جنگی گیت گائیں یا زخمی سپاہیوں کی دیکھ ریکھ کر لیں۔ معاشرہ اس قدر زیادہ مرد کے حق میں بڑھا ہوا تھا کہ غیرت کو بنیاد بنا کر بعض قبائل میں لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیا جاتا۔

جنگ ان قبائل کا پسندیدہ مشغلہ تھی اور انکی اقتصادی حالات کی خرابی کا ذمہ دار بھی۔ زراعت اور گلہ بانی دو ممکنہ ذرائع آمدنی تھے۔ عرب کا یہ خطہ زراعت کے حساب سے اتنا زرخیز نہیں تھا کہ اس پہ انحصار کیا جا سکتا۔ اس لئے آمدنی کا بڑا ذریعہ تجارت تھی یا زائرین جو مکہ آیا کرتے تھے۔

جہاں تک صنعتوں کا تعلق ہے عرب اس میدان میں ساری دنیا سے پیچھے تھے۔ اگر کسی جگہ کپڑے کی بنائ یا چمڑے کی دباغت کی ابتدائ صنعتیں پائ جاتی تھیں تو یہ وہی علاقے تھے جو زیادہ جدید تہذیبوں کے قریب واقع تھیں۔ عرب کے اس خطے میں بالکل موجود نہ تھیں۔  خواتین بھی اپنے طور پہ اس معاشی جدو جہد کا حصہ تھیں وہ سوت کاتنے کا کام کرتیں اور آمدنی پیدا کرتیں۔ لیکن تین قابل احترام مہینوں کو چھوڑ کر سال کے نو مہینے جاری رہنے والی جنگ پہ بیشتر آمدنی لٹا دی جاتی اور یوں عام انسان فقر اور فاقے سے باہر نہ نکل پاتا فقر کا عالم یہ تھا کہ پہننے کو کپڑے اور کھانے کو خوراک موجود نہ تھی۔

جنگ اس قدر دلچسپ مشغلہ تھا کہ عربی ادب کا ایک بڑا حصہ اسکے لئے وقف تھا۔ اس میں جنگوں کے حالات سچ جھوٹ ملا کر لکھے جاتے اور اپنے قبائل کے بہادر جنگی لوگوں کی تعریفوں کی شان میں قصیدے کہے جاتے تاکہ قوم میں لڑنے کا جذبہ قائم رہے۔ شعراء کی اس لئے عرب معاشرے میں بڑی حیثیت تھی۔ جنگ کے یہ قصےمغازی کہلاتے تھے۔

یوں اس معاشرے کی جو بنیادی خرابیاں فوٹون کو سمجھ میں آتی ہیں وہ اقتصادی، جنگی اور جنسی افراط و تفریط ہے۔ ان کا

شرک یا توحید سے کیا تعلق بنتا ہے؟ فوٹون اس پہ سوچتا ہے فوٹون جو اپنے بنیادی نظریات میں ایک لا دین شخص ہے۔

جاری ہے۔

نوٹ؛ اس تحریر کی تیاری میں جن کتب سے مدد لی گئ ہے وہ یہ ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی کی کتاب سیرت النبی، اسکے پبلشر ہیں الفیصل ناشران و تاجران کتب اور مولانا صفی الرحمن مبارکپوری کی الرحیق المختوم جسکے پبلشر ہیں المکتبہ السلفیہ لاہ

شبلی نعمانی کی سیرت النبی

یہاں

سے ڈاءونلوڈ کیجئیے۔

الرحیق المختوم

یہاں سے ڈاءونلوڈ کریں۔

4:29 PM

الرحیق المختوم, جنگ, سیرت النبی، اسلام, عرب, عورت،, مذہب, معاشرہ

وہ ایک سجدہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

قوم کو پھر کرکٹ کے بخار نے گھیر لیا ہے۔  آجکا دن بہت سے لوگوں کے لئے آزمائیش کا دن ہے کہ ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر۔ یہاں کرکٹ کے شائقین کی وضاحت کے لئے یہ واضح کردوں کہ کفر سے میری مراد کرکٹ نہیں ہے۔ شعراء اور مولانا صاحبان میں ایک یہی قدر مشترک ہے دونوں ایک ہی چیز کو کفر کہتے ہیں مگر نیت کے فرق کے ساتھ۔ لمحہ ء موجود میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو یا نبی سلام علیک  پڑھنے کے بجائے کرکٹ کے میدان میں حاضری دئیے ہوئے ہیں۔ پھر شاید احساس گناہ سے باہر نکلنے کے لئے فیس بک پہ عید میلاد النبی مبارک کے پیغامات لکھ لکھ کر ڈال رہے ہیں۔

کچھ لوگ  منہ کا مزہ بدلنے کو اس بحث میں بھی حصہ لئے ہوئے ہیں کہ کیا عید میلاد النبی منانا درست ہے۔ مجھے تو صرف ایک اعتراض ہے اور وہ یہ کہ ولادت رسول تو صحیح تاریخ کو منائیں۔

فیس بک سے سرسری گذرنے کے بعد ہم حقیقی زندگی میں واپس آئے اور ایک صاحب سے دریافت کیا کہ آج کے میچ کے بارے میں انکا کیا خیال ہے؟

جواب ملا ، آج کے مبارک دن، پیغمبر کے یوم ولادت پہ فرنگیوں کو شکست فاش ہوگی۔

اچھا ہم نے سکون کا سانس لیا۔  پھر تو قوم شکر ادا کرنے کے لئے سجدے میں گر جائے گی۔

انہوں نے 'وہ مارا' کا نعرہ بلند کیا اور ٹی وی پہ نظر جمائے ہم سے سوال کیا، قوم اٹھی کب تھی؟

اس وقت سے میں یہ سوچ رہی ہوں وہ ایک سجدہ اتنا لمبا کیوں ہے؟

3:49 PM

انگلینڈ, پاکستان, ٹیسٹ میچ, دبئ, ربیع الاول, سجدہ, عید میلاد النبی, فتح, کرکٹ

تقدس سے باہر-۲

گذشتہ سے پیوستہ

اس مقام پہ یہ ضروری لگتا ہے کہ ہم اپنے بنیادی کردار کا کوئ نام رکھ لیں۔ فوٹون کیسا ہے؟ فوٹون دراصل روشنی کے وہ یونٹس ہوتے ہیں جن میں وہ سفر کرتی ہے۔  روحانیت کہتی ہے کہ یہ کائینات روشنی سے بنی ہوئ ہے حتی کہ خدا بھی ایک نور ہے۔

سائینس کہتی ہے کہ انسان ان ستاروں سے بنا ہوا ہے جو اربوں سال پہلے ختم ہو چکے ہیں۔ تو یہ روشنی میں بھی ہوں اور آپ بھی۔

فوٹون، عرب کے اس تعارف کے بعد آگے بڑھتا ہے اور یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ رسول اللہ کی بعثت کے وقت عرب میں رائج مذاہب کون سے تھے اور کیا اسلام ان سب سے الگ کوئ اجنبی دین تھا جو آیا اور چھا گیا۔

عرب میں اس وقت مختلف طرح کے مذہاب رائج تھے۔ بعض قوانین فطرت کو سب کچھ سمجھتے تھےبعض خدا کے قائل تھےلیکن قیامت اور جزا و سزا کے انکار کرنے والے، بعض جزا و سزا کے بھی قائل تھے لیکن نبوت سے انکاری۔ قرآن کے الفاظ میں یہ کیسا رسول ہے کہ کھاتا پیتا ہےاور بازار میں چلتا پھرتا ہے۔ انکا خیال تھا کہ اگر کوئ نبی ہو سکتا ہے تو اسے فرشتہ ہونا چاہئیے تمام حاجات انسانی سے مبرّا۔ فوٹون سمجھتا ہے کہ چونکہ انسان نبی کو ایک خدائ نمائندہ سمجھتا ہے اس لئے وہ اسے انسان اور خدا کے مابین کوئ مخلوق ماننا چاہتا ہے۔

اس طرح سے مختلف قبائل تھے جو مختلف ستاروں اور سیاروں کی پرستش کیا کرتے تھے۔مشہور بتوں کے نام تھے۔ لات، عزّی، منات،ودّ، سواع، یغوث، یعوق۔ سب سے بڑا بت 'ہبل' تھا۔ جو کعبے کی چھت پہ نصب تھا۔ قریش لڑائیوں میں اسکی جے پکارتے تھے۔ جیسے آجکل مسلمان لڑائیوں میں اللہ اکبر یا شیعہ یا علی کہتے ہیں۔ فوٹون کو اس نام پہ ہبل ٹیلی اسکوپ یاد آجاتی ہے۔ لیکن وہ اپنے اس خیال کو جھٹک دیتا ہے۔ جدید دنیا کے یہ آلات خدا نہیں ہیں اگرچہ ہبل ٹیلی اسکوپ کائینات کے عظیم راز کھولتی ہے لیکن وہ انسان کی بس ایک مددگار ہے۔ اسکا خدا نہیں۔ انسان اسکے مشاہدے سے اپنے نتائج اخذ کرتا ہے اور یہ مشین اس میں دخل اندازی نہیں کرتی۔ دیکھا جائے تو ہبل کا بت اس سے بھی کم تر تھا۔ مگر انسانی یقین نے اسے خدا بنا رکھا تھا۔

عرب میں اس بت پرستی کا بانی ایک شخص عمرو بن لحئ کو بتایا جاتا ہے۔ وہ حرم کا متولی تھا۔ اس سے پہلے جرہم حرم کے متولی تھے۔ عمرو نے ان سے لڑ کر انہیں نکال باہر کیا۔

خانہ کعبہ کی عرب سیاست اور معاشرے میں بڑی اہمیت تھی۔ جن قبائل کو اسکے انتظام کے لئے مناسب حاصل تھے دراصل اسکی حکومت ہوتی تھی۔ حج کے لئے آنے والے زائرین کی آمد سے علاقے کے لوگوں کو آ٘مدنی ہوتی تھی۔ آج بھی حج کے لئے آنے والے زائرین سعودی عرب کی آمدنی کا بڑا ذریعہ ہیں۔ اگرچہ بیسویں صدی کے وسط میں تیل کی دریافت نے انکی دولت میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ اس وقت اسکے لئے بھی قوانین بنائے ہوئے تھے مثلاً بیرون حرم سے شہر آنے والے اپنا کھانا نہیں لا سکتے تھے۔ کہ اسکا کھانا مذہب کی رو سے درست نہ ہوتا۔ کپڑوں کے لئے یہ کہ  حمس سے کپڑوں کے علاوہ اگر کپڑے نہ ہوں تو طواف برہنہ کرنا پڑتا۔

بہر حال عمرو ایک دفعہ شام گیا وہاں لوگوں کو بتوں کی پوجا ہوتے دیکھی۔ حیران ہوا اور دریافت کیا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ لوگوں نے کہا یہ حاجت روا ہیں، لڑائیوں میں فتح دلاتے ہیں، قحط پڑتا ہے تو پانی برساتے ہیں۔ عمرو حرم کا متولی تھا اور فوٹون کو لگتا ہے کہ خاصہ ذہین بھی اسنے وہاں سے چند بت لئے اور اور کعبے کے آس پاس قائم کئے۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ اس سے کعبے کی اہمیت اور بڑھے گی اور چونکہ وہ کعبے کا متولی ہے اس لئے اسے زیادہ فائدہ ہوگا۔

کعبہ ایک بڑی عبادت گاہ ہونے کی وجہ سے اہمیت رکھتا تھا۔ اسکی اہمیت حضرت ابراہیم سے منسوب ہونے کی وجہ سے بھی تھی۔ وہاں سارے عرب سے قبائل آیا کرتے تھے۔ یہ قبائل جب یہاں حج کو آتے تو واپس جاتے ہوئے حرم کے پتھر اٹھا لیتے۔ ان پتھروں کو با برکت سمجھتے ہوئے ان پہ کعبے میں موجود بتوں کی شکل تراشتے اور انکی عبادت کرتے۔ اس طرح سے بت پرستی یہاں سے نکل کر سارے عرب میں پھیل گئ۔

کیا اللہ اسلام کا متعارف کرایا ہوا معبود  ہے؟

اگرچہ کہ عرب بت پرست تھے۔ لیکن انکے دل سے یہ خیال کبھی نہیں گیا کہ برتر اور عظیم قوت ان سب سے الگ ہے اور وہ ایک ہے۔ تمام مشرک قومیں ایک برتر قوت کا تصور رکھتی ہیں۔ ہندو بھی جسے بھگوان کہتے ہیں وہ کائینات کی سب سے عظیم قوت ہے۔ اس خالق کو وہ اللہ کہتے تھے۔ قرآن انکی اس کیفیت کو اس طرح بیان کرتا ہے

پھر جب یہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ ہی کو خلوص کے ساتھ پکارتے ہیں پھر جب خدا انکو نجات دے کر خشکی کی طرف پہنچا دیتا ہے تو تو شرک کرنے لگتے ہیں [ عنکبوت، ۴]۔

مئورخین کہتے ہیں کہ اللہ جو صفا کے کتبوں میں ہلّہ لکھا ہوا ہے۔ نباتی وہ دیگر باشندگان عرب شمالی کے نام کا ایک جز تھا مثلاً زید اللہی۔۔۔۔۔۔۔۔ نباتی کتبات میں اللہ کا نام ایک علیحدہ معبود کے طور پہ نہیں ملتا۔ لیکن صفا کے کتبات میں ملتا ہے۔ متاخریرین مشرکین مکہ میں اللہ کا نام عام ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اللہ کانام جو پہلے مختلف معبودوں کے لئے استعمال ہوتا تھا رفتہ رفتہ بعد کے زمانے میں صرف ایک عظیم معبود  کے لئے بطور علم کے مخصوص ہو گیا۔

فوٹون نے سوچا، ارے یہ کیا اللہ نام کا معبود تو پہلے سے موجود تھا۔

نصرانیت یعنی عیسائیت، یہودیّت اور مجوسیت یہ تینوں مذاہب بھی عرب میں ایک خاصی مدت سے موجود تھے۔ عیسائیت اتنی ترقی کر چکی تھی کہ مکہ میں ایسے لوگ موجود تھے جو عبرانی زبان میں انجیل پڑھ سکتے تھے، مثلاً ورقہ بن نوفل جنہوں نے پہلی وحی کے بعدرسول اللہ کی نبوت کی تصدیق کی۔ متعدد ایسے لوگ تھے جنہوں نے ملک شام جا کر اسکی تعلیم پائ تھی۔ یہودیوں کے متعدد قبائل تھے  حتی کہ یہود نے مدینہ پہ قابو پا لیا تھا۔ تورات کی تعلیم کے لئے متعدد درسگاہیں قائم تھیں  جن کو بیت المدارس کہتے تھے۔ قلعہ خیبر کی تمام آبادی یہودی تھی۔

اہل کتاب کی روائیتیں مکہ میں رواج پا چکی تھیں۔ اس لئے قرآن کے وہ واقعات جن میں بنی اسرائیل کا تذکرہ ہوتا کفار انکے متعلق کہتے کہ کوئ یہودی محمد کو یہ سب سکھاتا ہے۔

ان سب کے علاوہ دین ابرہیمی بھی موجود تھا یعنی وہ دین جوتوحید خالص پہ مبنی تھا۔ ایسے صاحب عقل لوگ موجود تھے جو بت پرستی کو ایک برائ سمجھتے تھے اور حق کی تلاش میں تھے۔

ابن اسحق نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ کسی بت کے سالانہ میلتے میں ورقہ بن نوفل، عبداللہ بن حجش، عثمان بن ایحویرث اور زید بن عمرو شریک تھے دفعتاً ان لوگوں کے دل میں خیال آیا کہ یہ کیا بیہودہ پن ہےکہ ہم ایک پتھر کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ جو نہ سنتا ہے نہ دیکھتا ہے نہ کسی کا نقصان کر سکتا ہے نہ فائدہ پہنچا سکتا ہے۔  اگرچہ اس مرحلے پہ فوٹون ایک لا دین ہونے کے ناطے یہ  سوچتا ہے کہ ایک ان دیکھا واحد خدا بھی تو یہ سب نہیں کرتا پھر وہ لوگ کس خدا کو تلاش کرنا چاہتے تھے؟

یہ چاروں قریش کے خاندان سے تھے۔ ورقہحضرت خدیجہ کے پھوپھی زاد بھائ، زید حضرت عمر کے چچا، عبداللہ حضرت حمزہ کے بھانجے، عثمان عبدالعزی کے پڑ پوتے تھے۔

زید بنعمرو دین ابراہیمی کی تلاش میں شام گئے وہاں یہودیوں اور عیسائ پادریوں سے ملے مگر تسلی نہیں ہوئ۔ دل میں کہا کہ میں دین ابراہیم کا مذہب قبول کرتا ہوں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ نے نبوت سے پہلے حضرت زید کو دیکھا تھا۔ اور ان سے دوستی بھی تھی۔ یہ وہ صاحب تھے کہ جب کوئ اپنی بیٹی کو زندہ دفن کرنے کا ارادہ کرتا تو اس سے بچی کو مانگ لیتے اور خود اسکی پرورش کرتے۔

انکے علاوہ باقی تینوں لوگ عیسائ ہو گئے۔

بعثت رسول کے قریب امیہ بن ابی الصلت نامی طائف کا ایک مشہور رئیس اور شاعر تھا۔ وہ بھی بت پرستی کا شدید مخالف تھا۔ کتابوں میں مذکور ہے کہ امیہ نے آسمانی کتابیں پڑھی ہوئ تھیں اور دین ابراہیمی  اختیار کر لیا تھا۔

امیہ کا دیوان اب بھی موجود ہے۔ وہ غزوہ ء بدر تک زندہ رہا۔ عتبہ جو رئیس مکہ اور امیر معاویہ کا نانا تھا  جب مسلمانوں کے خلاف جنگ میںمارا گیا تو امیہ نے ایک پر درد مرثیہ لکھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی وجہ سے امیہ نے اسلام قبول نہیں کیا۔

رسول اللہ کو امیہ کی شاعری پسند تھی اور اسے سنتے ہوئے انہوں نے کہا کہ، 'امیہ مسلمان ہوتے ہوتے رہ گیا'۔ یہ شاید امیہ کی شاعری میں موجودان نظریات کی وجہ سے تھا جس کی جھلک اسلام کے بنیادی نظریات میں نظر آتی ہے۔ فوٹون نے خیال کیا۔ رسول اللہ پہ تنقید کرنے والے ایک طبقے کا خیال ہے کہ محمد نے اپنے بنیادی نظریات ایسے ہی مقامات سے لئے۔

دین ابراہیمی کو ہی دین حنیفی بھی کہا جاتا ہے۔ کیوں کہا جاتا ہے اسکے بارے میں قطعیت سے نہیں کہا جا سکتا۔  ایک رائے یہ ہے کہ حنیف، حنف سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے انحراف۔ مفسرین کے نزدیک چونکہ بت پرستی سے انحراف ہے اس لئے حنیفی کہلایا۔ ایک اور رائے میں عبرانی اور سریانی زبان میں حنیف کے معنی منافق یا کافر کے ہیں۔  ممکن ہے کہ یہ لقب بت پرستوں نے دیا ہو اور توحید پرستوں نے فخریہ قبول کیا۔

ان کے علاوہ چند لوگ اور تھے جو اس وقت بت پرستی سے منکر ہو چکے تھے۔ اس بناء پہ اہل یوروپ کا کہنا ہے کہ توحید خالص کا تصور اسلام سے پہلے عرب میں موجود تھا۔ شبلی صاحب ایک حیرانی میں پوچھتے ہیں کہ پھر اسلام کے ظہور پہ اتنا ہنگامہ کیوں ہوا؟

فوٹون اس مرحلے پہ سمجھتا ہے کہ توحید خالص کے لئے تحریک چلانے والی سوچ بعثت نبوی سے پہلے پیدا ہو چکی تھی سوال یہ تھا کہ پہلا پتھر کون مارے؟ لیکن فوٹون کے لئیے اہم بات یہ ہے کہ آخر اس تصور کے حق میں تحریک چلانے کی ایسی کیا ضرورت آ پڑی تھی؟

جاری ہے

۔

نوٹ؛ اس تحریر کی تیاری میں جن کتب سے مدد لی گئ ہے وہ یہ ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی کی کتاب سیرت النبی، اسکے پبلشر ہیں الفیصل ناشران و تاجران کتب اور مولانا صفی الرحمن مبارکپوری کی الرحیق المختوم جسکے پبلشر ہیں المکتبہ السلفیہ لاہور۔

8:12 PM

ابراہیم, اسلام, بعثت نبوی, حنیف, رسول اللہ, شبلی نعمانی, عرب, عیسائیت, فوٹون, مجوسیت, محمد, مذہب, یہودیت

تقدس سے باہر-۱

تغیر کو پسند کرنا انسانی مزاج ہے۔ اسکے باوجود کہ دنیا کی تمام تہذیبیں اپنے زوال تک تغیر کے خلاف جد و جہد کرتی رہیں۔ اس لئے کہ تغیر کے ساتھ ایک ان دیکھا خوف موجود ہوتا ہے جبکہ جمود سے مانوسیت پیدا ہوجاتی ہے۔ جمود کچھ انسانوں کو اتنا چالاک کر دیتا ہے کہ وہ معاشرے پہ قابو پا لیتے ہیں اور اسے جمود سے باہر نہیں نکلنے دیتے۔

معاشرتی جمود کے خلاف انسان ہی آواز اٹھاتے ہیں۔ کبھی یہ انبیاء ہوتے ہیں، کبھی اولیاء ، کبھی مصلح اور کبھی انقلابی۔ ایک لا دین شخص کی نظر سے دیکھیں تو ان سب میں کوئ فرق نہیں ہوتا۔ لیکن پھر بھی وہ انکی ذہنی قوتوں، مشاہدات اور انکی حکمت عملی کا قائل ہوتا ہے اور ایک دیندار شخص سے زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ خدا پہ یقین رکھنے والا جس حکمت عملی اور ذہانت کو خدا کی عطا کردہ صفت سمجھتا ہے اوراللہ کے کام اللہ ہی جانے کہہ کر فارغ ہوتا ہے وہاں ایک لادین شخص، اسے اس شخص کے ذاتی وصف میں شمار کرتا ہے اور تجسس میں مبتلا ہوتا ہے کہ ایک اتنا بڑا انقلاب لانا اس کے لئے کیسے ممکن ہوا۔

اگر ہم رسول اللہ کو ایک لادین شخص کی نظر سے دیکھیں تو ہمیں انکی حکمت اور حکمت عملی دونوں سے متائثر ہونا پڑتا ہے۔ رسول اللہ کے اعلان نبوت سے پہلے اس معاشرے کی حالت دیکھیں جہاں وہ موجود تھے۔

اب ہم اس شخص کے ساتھ چلتے ہیں جو انہیں نبی تسلیم نہیں کرتا اور نہ یہ سمجھتا ہے کہ کوئ غیبی طاقت انکی مدد کر رہی تھی کیونکہ وہ کسی غیبی طاقت کے وجود پہ یقین ہی نہیں رکھتا۔  پہلے ہمیں اس معاشرتی پس منظر کو دیکھنا پڑے گا جس میں رسول اللہ نے آنکھ کھولی۔

اگرچہ کہ مورخین عرب کا دعوی ہے کہ عرب کے کچھ حصے ایک زمانے میں خاصی ترقی کر گئے تھے اور اسکے آثار بعض آثار قدیمہ سے بھی ملتے ہیں۔ لیکن عرب کے اصلی تمدن و تہذیب میں یہ حالت نہ تھی۔ اسکا ثبوت اسکی زبان سے مل سکتا ہے۔ عربی خاصی وسیع زبان ہے لیکن جن چیزوں کا تعلق تمدن اور اسباب معاشرت سے ہوتا ہے ان کے لئے خالص عربی الفاظ نہیں ہیں۔بلکہ ایران یا روم سے مستعار لئے گئے ہیں۔ مثلاً درہم وہ دینار غیر زبان کے الفاظ ہیں درہم یونانی لفظ ہے جو کہ انگریزی میں ڈرام ہو گیا۔ چراغ جیسی معمول شے کے لئے لفظ چراغ کو سراج بنایا گیا۔ کوزہ کے لئے کوئ لفظ نہیں کوزہ کو کوز کر لیا گیا۔ لوٹے کو ابریق کہتے ہیں جو آب ریز سے بنایا گیا۔ تشت بھی ایک فارسی لفظ تھا جسے عربی میں طست کر لیا گیا۔ پیالہ کو کاسہ کہتے ہیں یہ فارسی سے لیا گیا۔ پائجامہ کو سروال کہتے ہیں جو شلوار کی بگڑی ہوئ شکل ہے۔

جب ایسی ایسی چھوٹی باتوں کے لئے الفاظ نہ تھے تو تمدن کے بڑے سامان کے لئے کہاں سے لفظ آتے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب نے کسی زمانے میں جو ترقی کی تھی وہ ارد گرد کے ممالک سے متائثر ہو کر کی تھی سو جو علاقے دور تھے وہ اپنی اصل حالت پہ رہ گئے۔

احادیث صحیححہ سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ کے زمانے تک عیش و عشرت کے سامان بہت کم تھے۔ اس زمانے میں گھروں میں رفع حاجت کے لئے جائے ضرور تک نہ ہوا کرتی تھی اور خواتین بھِ رفع حاجت کے لئے گھروں سے باہر جایا کرتی تھیں۔ ترمذی باب الفقر میں ہے کہ اس وقت تک چھلنیاں نہ ہوا کرتی تھِ اور بھوسے کو اناج سے الگ کرنے کے لئے پھونکوں سے اڑایا جاتا تھا۔۔ جو بچ جاتا وہی آٹا کہلاتا تھا۔ احادیث سے ہی پتہ چلتا تھا کہ اس وقت رات کو گھروں میں چراغ نہیں جلاتے تھے۔ ابو داءود میں ایک صحابی سے روایت ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں تھا لیکن میں نے کبھی آپ سے حشرات الارض کے حرام ہونے کا نہیں سنا۔ اگرچہ محدثین کہتے ہیں کہ ایک راوی کے نہ سننے سے یہ لازم نہیں ہوتا کہ واقعی میں اسکی حرمت نہیں تھی۔ لیکن اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے عرب حشرات الارض کھاتے تھے۔ عرب تاریخ اور ادب میں یہ واضح طور پہ موجود ہے کہ عرب کھنکھجورا، گوئے، گرگٹ اور جانوروں کا چمڑا بھی کھاتے تھے۔

جاری ہے

۔

نوٹ؛ اس تحریر کی تیاری میں مولانا شبلی نعمانی کی کتاب سیرت النبی سے مدد لی گئ ہے۔ اسکے پبلشر ہیں الفیصل ناشران و تاجران کتب۔

8:53 PM

اسلام, ایران, خدا, روم, سیرت النبی, عربی, فارسی, لا دین, محمد, مذہب, معاشرہ

چینل کا چورن

چلئیے جناب، اطلاع ملی کہ مایا خان کا مسئلہ اس طرح حل کیا گیا کہ ان سے غیر مشروط معافی نامہ کا کہا گیا جس سے انہوں نے انکار کر دیا۔ سماء چینل کی انتظامیہ نے انہیں الگ کر دیا اور انکا مارننگ شو ختم کر دیا۔ انکی ذمہ داری ختم ہوئ اور اس طرح چینل نے اپنی ساکھ پہ آنچ نہ آنے دی۔

لیکن کیا یہ ایک سنجیدہ حل ہے؟ اور آیا یہ کوئ حل ہے یا مزید ڈرامہ؟

مایا خان کو

جس شو

کی وجہ سے الگ کیا گیا۔ اسے دیکھتے ہوئے سوالات اس طرح کے بنتے ہیں کہ کیا پاکستان میں میڈیا، پرائویسی قوانین سے واقف ہے؟ کیا لوگوں کے اخلاقی معیار کو متعین کرنا میڈیا کے صحافیوں کی ذمہ داری ہے؟  کیا میڈیائ صحافیوں کا کام خبر بنانا ہے یا خبر کو پہنچانا  ہے؟

دوسرا خیال جو آتا ہے کہ خودچینلز کی اپنی کوئ میڈیا پالیسی ہوتی ہے یا نہں یا یہ کہ چینلز کی کوئ میڈیا پالیسی ہونی چاہئیے یا نہیں؟ یہ سوال میرے ذہن میں اس وقت آیا جب  میں مایا خان ہی کے ایک پروگرام کی کلپس دیکھ رہی تھی جس میں وہ ایک ایسے صاحب کے ساتھ ہیں جن کا دعوی ہے کہ انہیں رسول اللہ کی زیارت ہوئ بلکہ انکے بدن پہ ، حتی کہ بیگم کے پکائ ہوئ روٹیوں پہ بھی کلمہ طیبہ ابھر آتا ہے یہی نہیں بلکہ انہیں غیب سے کچھ تبرکات بھی ملے ہیں۔ پاکستان جیسے ملک میں جہاں لوگ مذہبی غلو کا شدت سے شکار ہیں ایسے پروگرام پیش کرنا ایک ٹی وی چینل کی کس پالیسی میں آتا ہے۔ سو قارئین، اب یہ جاننے کو دل کرتا ہے کہ کیا میڈیائ صحافی یا اینکر پرسنز ، چینل انتظامیہ کی پالیسی سے الگ کام کرتے ہیں۔ کیا چینل کی انتظامیہ اس وقت تک کاٹھ کا الو بنی رہتی ہے جب تک عوامی شدید رد عمل سامنے نہ آئے؟

  ایک طرف چینل کا دعوی ہے کہ وہ عوامی ایشوز کو سامنے لائیں گے، لوگوں کو شعوری طور پہ بیدار کریں گے دوسری طرف انہی کے چینل سے اس طرح کے شوز آتے ہیں جو لبرل اور روشن خیال ہی نہیں بعض دینی حلقوں کے لئے بھی مسخرے پن سے کم نہیں۔

تو جناب یہ ٹی وی چینلز کیا بیچ رہے ہیں٫ عوام میں بیداری کے لئے جدید دنیا سے واقفیت یا وہی کاروباری نکتہ ء نظر سے عوام میں مشہور عطائ حکیموں کے چورن۔

7:42 PM

پرائیویسی, چینل, سماء, لبرل, مایا خان, مذہب, میڈیا

سن یاس یا مینو پاز

اب اسے تغیر کہیں یا یہ کہ جس طرح کائینات میں ہر چیز اپنے انجام کی طرف کی بڑھتی ہوئ محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح انسان کا جسم بھی توڑ پھوڑ اور تبدیلی کا شکار ہوتا ہے ٹھیک اس دن سے جب وہ جنم لیتا ہے۔

خواتین میں یہ عمل خاصہ واضح ہوتا ہے۔ اور بلوغت کے بعد  انکی طبعی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جب وہ تولیدی لحاظ سے سرگرم ہوتی ہیں یعنی بچے پیدا کر سکتی ہیں اور دوسرا حصہ وہ ہوتا ہے جب وہ اس دور سے گذر جاتی ہیں اورایسا کرنے کے قابل نہیں ہوتیں۔

بلوغت میں داخل ہونے کے بعد جسم میں ہارمون اس طرح پیدا ہوتے ہیں کہ ماہانہ نظام باقاعدہ رہے ۔ ہر مہینے کچھ تعداد میں انڈے پیدا ہوں۔ اگر وہ بار آور ہو جائیں تو عورت ماں بننے کے مرحلے میں داخل ہو جائے ۔ جسکے دوران ہارمون اس ترتیب میں آجاتے ہیں کہ بچے کی نمو سے لے کر اسکے دودھ پلانے تک کا مرحلہ بحسن و خوبی طے ہو جائے۔

خواتین میں انڈوں کی یہ تعداد انکی پیدائیش کے وقت تمام عمر کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔ جب رحم میں انڈے ختم ہو جاتے ہیں تو جسم کو اشارہ ملتا ہے کہ اب ہارمون کا مخصوص کھیل بھی ختم ہوا۔ یہ مرحلہ

سن یاس یا مینو پاز

کہلاتا ہے۔

خواتین کی اکثریت مینو پاز تک پہنچنے سے پہلے اسکی علامتوں سے گذرتی ہے۔ لیکن بعض خواتین اس سے اچانک دوچار ہو جاتی ہیں۔ اور انہیں یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ حاملہ ہو گئیں ہیں اس لئے ماہانہ نظام منقطع ہو گیا ہے لیکن چند مہینوں میں پتہ چل جاتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔

خواتین میں ماہانہ نظام ختم ہونے کی ایک اوسط عمر پینتالیس سے ساٹھ سال ہے۔ اسکی علامتیں پہلے سے ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ماہانہ نظام کا بے قاعدہ ہونا، خون ضائع ہونے کی زیادتی, بعض اوقات لوتھڑوں کا خارج ہونا، خون بہت دنوں تک خارج ہوتے رہنا، بہت زیادہ گرمی لگنا، جلد کا خراب ہونا۔

عمر کے علاوہ وہ خواتین جنکی بچہ دانی آپریشن کے نتیجے میں الگ کر دی گئ ہو وہ بھی تیزی سے سنیاس کا شکار ہوتی ہیں چاہے یہ عمل کتنی ہی نوجوانی کے عالم میں کیا گیا ہو۔ کم عمر خواتین میں سنیاس کی وجوہات مزید ہو سکتی ہیں مثلاً اینڈو میٹریوسس، بچہ دانی میں رسولیاں ہونا یا تولیدی اعضاء کا کینسر، زیادہ وزن رکھنے والی خواتین، سگریٹ نوش خواتین، کیمو تھراپی سے گذرنے والی خواتین، بیمار خواتین ، وہ جنکے خاندان میں یہ سلسلہ موجود ہو ، تھائرائید غدود میں خرابی، ذیابیطس میلائٹس، یا خود دفاعی رد عمل۔ خواتین کی اکثریت میں وجہ  نامعلوم  ہوتی ہے۔

جڑواں خواتین بھی سن یاس کا کم عمری میں شکار ہو جاتی ہیں لیکن انہیں اپنی ساتھی خاتون کی اووریز کا کچھ حصہ ٹرانسپلانٹ کر کے اووریز کی کارکردگی کو دوبارہ بحال کیا جا سکتا ہے۔

سن یاس کے بعد یا اس سے گذرتے وقت بعض خواتین شدید علامات سے گذرتی ہیں۔ مثلاً ہاٹ فلیشز ہونا یعنی جسم میں کہیں کہیں آگ سی محسوس ہونا، پیروں میں رینگن محسوس ہونا، بہت زیادہ پسینہ آنا بالخصوص رات کے وقت، بعض کو ٹھنڈے پسینے آتے ہیں، کمزوری یا تھکن کا شکار ہونا۔ نیند نہ آنا، یاد داشت کا متائثر ہونا، شوہر سے جسمانی تعلق سے اجتناب برتنا۔

 ان سب علامتوں سے زیادہ نقصان پہنچانے والی چیز ایسٹروجن کے ختم ہوجانے کی وجہ سے آسٹیو پوریسس کے بڑھنے کا امکان ہے۔

سن یاس کے فوراً بعد ہڈیوں کے کمزور ہونے کی شرح تیزی سے بڑھ جاتی ہے جبکہ میٹا بولزم کی رفتار آہستہ ہوجانے کی وجہ سے وزن میں بھی اضافہ ہوجاتا ہے اور خاص طور پہ پیٹ بڑھ جاتا ہے۔

ادھر آہستہ آہستہ مثانہ بھی کمزور ہونے لگتا ہے اور یوں ذرا سے دباءو پہ پیشاب کے قطرے خارج ہوجاتے ہیں یا پھر مثانے پہ قابو نہ ہونے کی وجہ سے بار بار حاجت محسوس ہوتی ہے۔

ایک اہم تبدیلی کسی خاتون کے مزاج میں آتی ہے اور سن یاس کے ابتدائ زمانے میں شدید ڈپریشن ہو سکتا ہے۔ خواتین کو لگتا ہے کہ اب چونکہ وہ بچے پیدا کرنے کے قابل نہیں رہیں اس لئے انکی نسوانیت ختم ہو گئ ہے۔ وہ ایک ناکارہ وجود بن گئ ہیں۔ اب وہ کسی کام کی نہیں رہیں اور محض ایک  کچرا بن گئ ہیں۔ ان معاشروں میں جہاں عمر رسیدگی کو حقارت سے دیکھا جاتا ہے اور  جوان افراد ، درمیانی عمر کے افراد کو اپنے سے کمتر سمجھتے ہیں وہاں خواتین میں یہ ڈپریشن زیادہ ہوتا ہے۔

سن یاس کیوں لاحق ہوتا ہے اسکی طبعی وجوہات ہم نے بتا دیں۔ یہ کیوں ضروری ہے اسکی وجہ ارتقائ سائینسدانوں کے نزدیک انسانی معاشرے کی مضبوطی کی بنیاد ہے۔ تاکہ ایک نسل دوسری نسل کے آگے بڑھنے میں مددگار ہو اور اس طرح انسانی آبادی بھی قابو میں رہے اور یہ کہ مضبوط انسانی نسل مضبوط انسانی جسم کے ساتھ آئے۔

یعنی قدرت  کے نزدیک عورت صرف بچے پیدا کرنے کی مشین نہیں ہے اور عمر کے ایک حصے میں وہ اسے فرصت دیتی ہے تاکہ وہ دیگر سرگرمیوں میں بھی کھل کر حصہ لے سکے۔ اسی طرح عورت اور مرد کا ساتھ رہنا صرف جسمانی تعلق کے لئے نہیں ہوتا بلکہ قدرت اسکے علاوہ بھی انسان سے کچھ چاہتی ہے۔

 ایسا نہیں ہوتا کہ عورت سن یاس میں داخل ہونے کے بعد فوراً بعد ختم ہو جائے  اگر وہ اپنی صحت کا خیال رکھے تو اسکے بعد بھی نصف صدی کی زندگی گذار سکتی ہے۔

اس لئے وہ خواتین جو سمجھتی ہیں کہ وہ سن یاس میں داخل ہو چکی ہیں انہیں فوراً اپنے ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہئیے۔ تاکہ وہ اس بات کی تصدیق کر سکے کہ ایسا ہوا ہے۔

وہ خواتین جو اپنی چالیسویں سالگرہ منا رہی ہیں انہیں احتیاطاً آسٹیو پوریسس سے بچاءو کے لئے طبی امداد لینا شروع کر دینا چاہئیے۔ ویسے بھی خواتین کو ابتدائ عمر سے ہی کیلشیئم والی غذاءووں کو زیادہ استعمال کرنا چاہئیے۔ اپنی بچیوں پہ توجہ دیں اور انکی غذا میں کیلشیئم اور فولاد کی مقدار کا دھیان کریں۔ تاکہ وہ مستقبل میں نہ صرف صحت مند ماں بنیں بلکہ اپنا بڑھاپا بیماریوں اور معذوری سے محفوظ گذاریں۔

مینوپاز کے دوران جب ہاٹ فلیشز زیادہ ہوتے ہیں اپنی غذا پہ دھیان دینا چاہئیے۔ ایسی اشیاء زیادہ مقدار میں استعمال کرنے سے گریز کریں جن میں اینٹی ایسٹروجن مرکبات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً چائے، سبز چائے، اخروٹ، بروکلی، اور ایسی اشیاء زیادہ استعمال کریں جن میں ایسٹروجن ہوتے ہیں۔ زیادہ ایسٹروجن کے لئے گوشت، انڈے، دودھ، دہی، ،

السی کے بیج

یا اسکا پاءوڈر، ،گاجریں اور ٹماٹر وغیرہ استعمال کریں۔ السی کے بیج مسلسل کئ مہینوں تک استعمال نہ کریں بلکہ وقفہ دیں۔  اسکا پاءڈر ایک چائے کے چمچ سے زیادہ روزانہ نہ لیں۔  گرم جگہوں پہ نہ رہیں۔ ہلکے ڈھیلے سوتی کپڑے پہنیں۔

ایسا نہ کریں کہ کوئ چیز بالکل ترک کر دیں۔ مثلاً اخروٹ کھانا بالکل ہی چھوڑ دیں۔ اخروٹ کھائیں تو تھوڑی گاجریں  بھی کھالیں یا دودھ بھی پی لیں اس طرح غذا متوازن رہے گی۔

اس طرح اس عمر میں متوازن غذا کا ذرا مختلف تصور اپنے لئے سیٹ کریں۔

وہ خواتین جو پیشاب خارج ہونے کے عارضے میں مبتلا ہیں وہ ایک آسان سی ورزش کر سکتی ہیں جو

کیگل ورزش

کہلاتی ہے اور  ہر عمر کی خواتین حتی کہ حاملہ خواتین کے لئے بھی کار آمد ہے۔ اور بہت آسان ہے۔ اسے کرنے کے لئے ایک خاتون کو اپنے پیٹ کے نچلے حصے کے عضلات کو سمجھنا ہوگا۔

پیشاب کرتے ہوئے اگر بیچ میں ایکدم روکنا ہو تو جو عضلات کھینچے جاتے ہیں۔ انہیں فالتو وقت میں کھینچنے کی مشق کریں۔ یہ ایسی مشق ہے جووہ کسی بھی کام کو کرتے ہوئے کر سکتی ہیں چاہے پڑھ رہی ہوں یا ٹی وی دیکھ رہی ہوں۔ شروع میں کم تعداد میں کریں مثلاً ایک وقت میں پانچ دفعہ ان عضلات کو کھینچیں اور چھوڑ دیں۔ پھر آہستہ آہستہ تعداد بڑھاتی جائیں۔

سن یاس کے بعد بھی ایک خوشحال زندگی گذاری جاتی ہے فرق یہ ہے کہ اسکے بعد حاملہ ہونے کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے دنیا کے بیشتر حصوں میں خواتین سنیاس کو اپنے لئے آزادی کی علامت سمجھتی ہیں۔

وہ خواتین جو کم عمری میں سن یاس کا شکار ہو جاتی ہیں ان میں آسٹیو پوریسس کا خطرہ زیادہ بڑھ جاتا ہے کیونکہ ایسٹروجن کی کمی کی وجہ سے زیادہ کم عمری میں ہڈیاں کمزور ہونے لگ جائیں گی۔ اس صورت میں ممکن ہے کہ آپکا ڈاکٹر آپکو ہارمون تھراپی کا مشورہ دے۔ یہ طریقہ ء علاج ایک زمانے میں کافی رائج ہوا۔ پھر مختلف نتائج کی بناء پہ روک دیا گیا آجکل پھر سے تجویز کیا جانے لگا ہے۔ اس وقت یہ ہارمونز مختلف طرح کی شکلوں اور منبع کے موجود ہیں۔ ان میں سے کون سا ایک خاتون کے لئے مناسب ہے اسکا فیصلہ ایک ڈاکٹر ہی کر سکتا ہے۔

جو خواتین اس طریقہ ء علاج کو لے رہی ہیں انہیں اپنی غذا کا دھیان رکھنا چاہئیے۔  ہارمون سپلیمنٹ کے ساتھ وٹامن بی کمپلیکس والی غذاءووں کا باقاعدہ استعمال کریں اور آسٹیو پوریسس کی دواءووں اور کیلشیئم والی غذاءووں کا بھی خیال رکھیں۔ آسٹیو پوریسس کے بارے میں جاننے کے لئے

یہاں دیکھئیے

۔

ہر تھوڑے عرصے بعد اپنے کچھ ٹیسٹ ضرور کرواتی رہیں۔ مثلاً

چھاتی کے کینسر

کے لئے میمو گرافی کیونکہ سنیاس کے بعد چھاتی کے کینسر کا خدشہ بڑھ جاتا ہے، اسی طرح پیڑو یا بچہ دانی کے کینسر کو معلوم کرنے کے لئے پیپ اسمیئر ٹیسٹ اور پیلوک الٹرا ساءونڈ چاہئیے ہوتے ہیں۔ اگر ہارمون تھراپی لے رہی ہوں تو یہ ٹیسٹ کروانا اور بھی ضروری ہوتا ہے۔ تاکہ ہارمونز کا کوئ بھی ضمنی اثر فوراً علم میں آجائے۔

سن یاس کے بعد خواتین میں دل کے امراض کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ مختلف ہارمونز کی وجہ سے جو تحفظ حاصل تھا وہ ختم ہوجاتا ہے۔ اس لئے دل کے امراض کے بنیادی ٹیسٹس بھی ایک خاتون کے لئے ضروری ہو جاتے ہیں۔

ہڈیوں کو بہتر بنانے کے لئے ورزش اور چہل قدمی ضروری ہے۔ روزانہ تیس منٹ کی چہل قدمی ہڈیوں اور عضلات کے لئے آب حیات ہے۔ ورزش کے لئے وزن اٹھانے والی ورزشوں کو ترجیح دیں جس سے اعضاء میں کھنچاءو پیدا ہو۔ اگر کوئ خاتون دل کے کسی عارضے میں ، یا کسی اور بیماری میں مبتلا ہیں تو اپنے ڈاکٹر کے مشورے کے بغیر کوئ ورزش شروع نہ کریں۔

خِواتین کے لئے ورزش کے حوالے سے ایک علیحدہ تحریر لکھنے کا ارادہ ہے۔ اس وقت تک انتظار کریں۔

11:06 AM

پاکستان, چھاتی کا کینسر, خواتین, سن یاس, صحت, کمزور, مینو پاز, ہارمون تھراپی, ہارمونز, ہڈیاں, ورزش

میڈیا کے عقاب

سنتے ہیں کہ ضیاء الحق صاحب کے زمانے میں ساحل سمندر پہ جانے والے جوڑوں سے نکاح نامہ طلب کرنے کے لئے وہاں پولیس والے عقاب کی طرح منڈلاتے رہتے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے تو کیا ہوتا ہے۔ عقاب ناپید ہو جاتا ہے اور روح فنا رہتی ہے۔ مولوی صاحب کے مزے رہتے ہیں کہ دے دھڑا دھڑ نکاح پڑھا رہے ہیں کہ عورت اور مرد کا ایک ساتھ تفریح کے لئے نکاح نامہ ہونا ضروری ہے۔ معاشرے میں میاں بیوی کے علاوہ کوئ رشتہ اور تعلق باقی نہیں رہتا اور جنسیات کے علاوہ کوئ انسانی مسئلہ وجود نہیں رکھتا۔

جب ہم نے جامعہ کراچی میں قدم رکھا تو سنا کہ یہ کام وہاں اسلامی جمعیت طلبہ کے ذمے تھا۔ کہنے والے کہتے کہ وہ تو بھلا ہو آل پاکستان مہاجر اسٹوڈنٹس آرگنائیزیشن  کا جمعیت کے بھائ بندوں کے منہ سے نہ صرف یہ نوالہ چھین لیا بلکہ وہ جو ہر مرد کو مخاطب کرنے سے پہلے بھائ کا لاحقہ یا سابقہ اور خاتون کے نام سے پہلے بہن کہنا فرض عین  ہوا کرتا تھا وہ بھی لغت سے نکل گیا۔  ورنہ عالم یہ تھا کہ ہماری رشتے دار خاتون  اپنے ماموں کے ساتھ یونیورسٹی آنرز میں داخلے کے لئے پہنچیں تو انہیں جمعیت کے اسکواڈ کے سامنے حلفیہ بیان دینا پڑا کہ وہ جس مرد کے ساتھ ہیں وہ انکے ماموں ہیں۔

جماعتی روح جب بیدار ہوتی ہے سینوں میں تو عقابی روح والی کیفیات کیوں طاری ہو جاتی ہیں یہ مجھے نہیں معلوم؟

شاعر کہتا ہے کہ جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں ادھر ڈوبے اُدھر نکلے ، اُدھر ڈوبے ادھر نکلے۔ شاعر کی اس بات کو میں دماغ کا خلل نہیں سمجھتی۔ پوری طرح سے یقین رکھتی ہوں۔

ضیائ پولیس سے جمعیت میں یہ روح پہنچی، پنجاب یونیورسٹی میں اب تک قائم ہے۔ لیکن جامعہ کراچی سے  جمعیت کا کنٹرول  ختم ہوا۔   اہل ایمان انکے جھنڈے تلے سے نکل کر میڈیا میں آگئے۔ اور شکل کچھ یوں بنی کہ ہرچینل سے عقاب نکلے گا تم کتنے عقاب مارو گے یا خدا جانے تم جتنے عقاب ماروگے۔

مایا خان ان عقابوں میں ایک ہیں۔ ڈیڑھ دو مہینے پہلے میں جیسمین منظور کا ایک شو دیکھ رہی تھیں وہ پولیس لاک اپ میں موجود ایک شخص پہ سخت ناراض ہو رہی تھیں اور غصے میں کہہ رہی تھیں کہ عدالت تمہیں بعد میں سزا دے گی میں تمہیں مار مار کر درست کر دونگی۔ اور میرے جیسا ناظر حیران بیٹھا کہ ایک اینکر پرسن کس طرح ایک پولیس کسٹڈی میں موجود ایک ملزم تک بآسانی رسائ حاصل کر کے اسے درست کرنے کی دھمکی دے رہا ہے۔

ہمارا ملک کسی حیرت کدے سے کم نہیں۔ اس لئے ہر تھوڑے دنوں بعد حیرانی کے نئے تجربے سے گذرنا پڑتا ہے۔ اس دفعہ اس ریس میں مایا خان جیت گئیں۔ مجھے انکا شو دیکھنےسے بالکل دلچسپی نہیں۔ فیس بک کی وجہ سے دیکھنا پڑا کہ کیا ہو گیا ہے بھئ۔

کیا دیکھتی ہوں کہ دو خواتین ہنستی مسکراتی ایک بینچ پہ بیٹھی ہوئ ہیں۔ ویڈیو کے لنک کو کلک کیا تومیڈیا سے تعلق رکھنے والی خواتین کا ٹولہ جن میں سے کچھ مغربی لباس میں  اپنے مرد ساتھیوں کے ساتھ پارک میں تفریح کے لئے آئے ہوئے جوڑوں کے تعاقب میں یوں سرگرداں  جیسے ہم سانگھڑ کی جھیلوں کے پاس ایک دفعہ مگر مچھ تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ کراچی کے پارکس میں اب تک مگرمچھ نہیں چھوڑے گئے یہ شاید پہلا تجربہ کیا تھا میڈیا کے مگرمچھ چھوڑنے کا۔ وقت انتہائ مناسب، مگرمچھ سرد دنوں میں صبح صبح سرد پانی سے نکل کر ساحل پہ  دھوپ  سے اپنے آپکو سینکتے ہیں۔ ہمارا یہ ٹولہ ملک بے حیائ کی دھوپ میں سنِکنے واے جوڑوں کی تلاش میں تھا۔

پارک میں موجود لوگ ایسے سراسمیہ  کہ جیسے وہ سوئس بینکوں سے اپنا روپیہ نکال کر پارک میں بیٹھے گن رہے تھے۔ یا ایکدوسرے کو خود کش جیکٹس پہنا رہے تھے۔ اسی پہ بس نہیں ہماری اینکر نے ایک نقاب پوش خاتون کو ایسے پکڑ لیا جیسے وہ ان کا پرس چھین کر بھاگی ہو۔

پارکس میں اکثر ایسے جوڑے نظر آتے ہیں۔ انکی اکثریت لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھتی ہے۔ اشرافیہ کے بچوں کو حجاب پہن کر اپنے آپکو چھپانے سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ انکے لئے زیادہ پر تعیش جگہیں موجود ہیں۔ وہ ان عوامی پارکس میں کیا کریں گے۔ مڈل کلاس بچے زیادہ تر مخلوط اداروں میں پڑھتے ہیں انہیں میل ملاقات کے لئے پارکس میں وقت ضائع کرنے کی فرصت نہیں۔ لے دے کر لوئر مڈل کلاس بچ جاتی ہے۔ بظاہر تو یوں لگتا ہے کہ میڈیا کے ان شکاریوں کو اسی وجہ سےاتنی ہمت ہوئ۔ ورنہ یہ سب خواتین و مرد اپنے سے بڑے لوگوں کے جائز اور ناجائز لو افیئرز سے خوب اچھی طرح واقف ہوتے ہیں مگر انکے سامنے انکی وہی حالت ہوتی ہے جس کے لئے مناسب لفظ استعمال کرنے کے لئے منا بھائ ایم بی بی ایس والے کی ٹپوری لغت کی مدد لینی پڑے گی۔

خیر، اس ٹولے میں اگر کسی شخص کی کمی مجھے محسوس ہوئ تو ایک مولوی صاحب کی تھی۔ اگر وہ ساتھ ہوتے اور گپ شپ لگاتے جوڑوں کو وہیں پکڑ کر  نکاح پڑھا دیتے تو یہ منظر نہ صرف ڈرامے کے کلائمیکس پہ پہنچ جاتا بلکہ  والدین خود ہی آئیندہ کے لئے حفاظتی اقدامات اٹھا لیتے۔  یوں کہ پسند کی شادی ہمارے والدین کے لئے ایک تازیانے سے کم نہیں ہوتی۔ چاہے اپنے بچوں کی شادی اپنی  پسند سے کروانے کے لئے وہ ایک مرد کو چالیس سال کا کر دیں۔ یا لڑکی کی شادی اسکی عمر سے دگنے، جاہل مرد سے کر دیں۔

شادی ہمارے یہاں ایک رومانی تعلق نہیں بلکہ ایک  جسمانی  اور کاروباری تعلق کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کے اصل فریق شادی کرنے والے مرد عورت نہیں والدین ہوتے ہیں۔

ادھر خدائ نظام میں بڑی خرابیاں ہیں، مثلاً خدا ایک بے حس اور عاقبت نا اندیش کاریگر کی طرح اپنے کوزے پہ انسان تخلیق کئے جا رہا ہے وہ یہ تک خیال نہیں کرتا کہ اماں کو کترینہ کیف اور مادھوری جیسی بہو چاہئیے۔ آنے والے انسان کے بچے خوبصورت ہونے چاہئیے۔ وہ خود جمیل ہے لیکن جمال کو محفوظ کرنے کے منصوبے نہیں بناتا۔  سو جو لڑکیاں حسن کے اس معیار پہ پوری نہیں اترتیں لیکن انسانی تقاضوں کی وجہ سے چاہتی ہیں کہ انہیں بھی صنف مخالف کا ساتھ نصیب ہو وہ کیا کریں۔ وہ لڑکیاں کیا کریں؟ جنکے والدین کے پاس دینے کے لئے لمبا چوڑا جہیز نہیں ہے، وہ لڑکیاں کیا کریں؟ وہ لڑکے کیا کریں جو اپنے جبلی تقاضوں سے مجبور صنف مخالف کے پیچھے بھاگتے پھر رہے ہیں مگر والدین کو ابھی انکا صحیح بھاءو نہیں مل پا رہا۔  معاشرتی سطح پہ اتنے بڑے انسانی مسئلے کو اس وقت کوئ سمجھنا نہیں چاہتا۔

سو اگر اس غیر فطری ماحول میں نوجوان یہ نہ کریں تو کیا کریں؟

 میری یادداشت میں ایک ذاتی واقعہ ہے جس میں ایک باپ کو جب اسکے لڑکے کی شکایت کی گئ کہ وہ کس طرح ہماری بیٹی کو آتے جاتے چھیڑتا ہے اور اس سے اس لڑکی کی ریپوٹیشن خراب ہو رہی ہے اور اسکی شادی میں مسئلہ ہو جائے گا تو اسی شام کو لڑکے کے ابا اپنے لڑکے اور قاضی کو لے کر انکے گھر پہنچے۔ اور اپنے بیٹے سے آٹھ سال بڑی لڑکی کو گھر کے کپڑوں میں شادی کر کے اپنے گھر لے آئے۔ انکا بیٹا اس وقت بی کام کر رہا تھا۔ آج اس خوشحال  جوڑے کے تین بچے ہیں۔

والدین جو خود اپنے آپکو کسی بھی اخلاقی سدھار سے ماوراء سمجھتے ہیں وہ کس بل بوتے پہ اپنی اولاد کو سدھار سکتے ہیں۔  وہ کیسے یہ نعرہ بلند کر سکتے ہیں کہ والدین کو دھوکا نہ دو۔ آپ اپنی اولادوں کو، اپنی نسلوں کو دھوکا دے رہے ہیں جناب آپ کو بھی دھوکا ہی ملے گا۔

ادھر، میڈیا جو خود کسی اخلاقی پابندی کا اپنے آپکو ذمہ دار نہیں سمجھتا اور پروگرام کی ریٹنگ کے لئے ہر گری ہوئ حرکت کرنے کو تیار ہے۔ اگر اسکے نمائیندوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ لوگوں کو درست کرنے کا ٹھیکا لے کر خدائ فوجدار بن جائیں تو عوام تو ان سے کہیں زیادہ مضبوط اور تعداد میں زیادہ ہیں وہ کیوں نہ انہیں درست کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔

اگر کیمرہ کریو کے ساتھ موجود اس ٹولے کے آگے چند نوجوان آ کر کھڑے ہوجاتے کہ یہ کیا بے حیائ ہے کہ خواتین ٹی شرٹ اور ٹراءوژرز جیسے مغربی لباس میں پارک میں مردوں کے ساتھ  سر عام بھاگتی پھر رہی ہیں تو کیا ہوتا؟ مجھے تو مزہ آتا، اگرچہ کہ مجھے انکے اس لباس سے کوئ تکلیف نہیں ہوتی۔ لیکن ایسے دو رُخے لوگوں کے ساتھ یہی ہونا چاہئیے۔ آپکے لئے ہر چیز جائز اور صحیح لیکن اپنے آپ سے کمزور شخص کو دبانے کا کوئ موقع آپ ضائع نہ جانے دیں اور بنیں بڑے کردار والے مبلغ اور مصلح۔

وقتی فائدہ اور دور اندیشی میں یہی فرق ہے۔ دور اندیشی کہتی ہے کہ کوئ بھی ایسا قدم کیوں اٹھاءو جو خود پہ پڑے تو سہا نہ جائے۔ وقتی فائدہ کہتا ہے بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لو کل کی کل دیکھی جائے گی۔

لیکن ٹیکنالوجی کی ترقی نے کل کو آنے سے روک دیا ہے، یہاں ہر گذرا ہوا دن، ہر آنے والا دن ہر چیز آج بن گئ ہے۔آج سے نکل پائیں گے تو کل دیکھیں گے۔ پچیس سال پہلے کی ضیائ پولیس، اب میڈیا پہ آ گئ ہے۔ نگاہ منتظر ہے کہ جمیل اور جمیلہ اب کیا راستہ چنیں گے؟

11:23 AM

اے پی ایم ایس او, پارک, پاکستان, ریٹنگ، جمعیت, کراچی, مارننگ شو, مایا خان, میڈیا

جا چھوڑ دیا

میں انکے پاس خالصتاً کاروباری سلسلے میں موجود تھی۔ لیکن جیسا کہ ہماری روایات ہیں ملنے والے سےپہلے ادھر ادھر کی ایک آدھ بات کر لی جاتی ہے۔ ہمارے درمیان بچوں کی بات آ گئ۔ انکے چار بچے تھے سب سے بڑی پندرہ سال ی بچی اور سب سے چھوٹی سات آٹھ سال کی۔  اپنے اکلوتے بارہ سالہ بچے کے متعلق انہوں نے بتایا کہ وہ قرآن حفظ کر رہا ہے۔ تیسری جماعت تک اسکول میں پڑھا لیکن چونکہ ہم نے اسکی پیدائیش پہ یہ ارادہ کیا تھا کہ اسے قرآن حفظ کرائیں گے اس لئے وہاں سے نکال کر اسے مدرسے میں ڈال دیا۔

حلئیے سے ایک فیشن ایبل خاتون، جنکی بھنوئیں بنی ہوئیں، بال کندھے تک ترشے ہوئے اور رنگے ہوئے، ہونٹوں پہ ہلکی سی لپ اسٹک کی تہہ جمی ہوئ، جدید تراش خراش کے کپڑے پہنے ہوئے، کیا اس خاتون سے کوئ توقع کر سکتا ہے کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو ایک جدید اسکول سے نکال کر ایک مدرسے میں ڈال دے گی؟

وہ اکیلی نہیں، میں انگلش ڈپارٹمنٹ میں انگریزی  پڑھانے والی ایک خاتون سے ملی جنہوں نے انگریزی لسانیات میں ماسٹرز کیا ہوا تھا۔ انکی بچی ایک انگلش میڈیئم اسکول میں پڑھ رہی تھی ایک ذہین بچی، انکی اکلوتی اولاد۔ اس عرصے میں وہ جماعت اسلامی سے متائثر ہو گئیں۔ خود حجاب لینا شروع کیا اپنی بچی کا اسکول چھڑایا۔ یونیورسٹی سے کئ سال کی چھٹی لی، گھر پہ ایک مولوی صاحب کی خدمات لی گئیں اور بچی کو حفظ کرانے سے لگا دیا۔ اب تیرہ سال کی عمر میں انکی بچی فافظہ قرآن ہے۔ جہاں سے کہیں فر فر سنا دے گی لیکن اسکے معانی کیا ہیں اس سے آگاہ نہیں۔

حفظ کرانے کا فیشن اسّی کی دہائ میں متعارف ہوا۔ اس سے پہلے بہت کم بچے حفظ کرتے تھے۔ حفظ کرانے والے مدرسے اسّی کی دہائ میں مشرومز کی طرح سے ایک دم اگ آئے۔کسی بھی روڈ سے گذر جائیں ایک نہ ایک ایسا مدرسہ ضرور نظر آجائے گا۔ مجھے یقین ہے ساری دنیا میں پاکستان اس معاملے میں اول نمبر پہ ہوگا جہاں بچوں کی ایک کثیر تعداد اس وقت قرآن حفظ کر رہی ہے اور سب سے زیادہ مدرسے اس ضمن میں موجود ہیں۔

لوگ کیوں اتنا زیادہ حفظ قرآن کی طرف راغب ہوئے؟ اسکا جواب بڑھتی ہوئ انتہا پسندی میں ہے۔

اس سے پہلے  مدرسے بہت کم ہوتے تھے اور اکثر بچے خاندان کے کسی بزرگ سے ہی قرآن ناظرہ پڑھا کرتے تھے یا پھر محلے کی کوئ فارغ ضعیف خاتون یہ کام انجام دیتی تھیں یوں عمر کے اس حصے میں انہیں یہ سرگرمی حاصل رہتی۔

یہ ہمارے مرد حق، جنرل ضیاءالحق کا دور تھا۔  ان مدرسوں کے قیام کے لئے فنڈ کہاں سے آئے ہونگے۔ اسکا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ یہ یقیناً ہمارے سعودی کرم فرماءوں کی ہم جیسی گنہاگار قوم پہ نظر عنایت ہوگی کہ حافظ بچوں کی وجہ سے ہی ہم بخشے جائیں۔ کیونکہ زیادہ تر ان مدرسوں کا فقہ سعودی فقہ سے متائثر تھا۔ مثلاً اقراء حفظ مراکز میں بچوں کی ماءوں سے بات کرنے سے گریز کیا جاتا ہے اور اصرار ہوتا ہے کہ کسی مرد کو بھیجیں۔

میں نے خود بھی سعودی فنڈ سے چلنے والے ایک مدرسےسے ناظرہ قرآن کی تعلیم لی۔ اور اب مجھے حیرت ہوتی ہے کہ کیسے ہمارے مدرسے کے منتظمین نے اچانک یہ فیصلہ صادر کیا کہ یا تو اسکول کی تعلیم حاصل کرو یا پھر اس مدرسے میں ناظرہ قرآن پڑھو۔

میں نے ان خاتون سے پوچھا کہ قرآن حفظ کرنے کے بعد آپ نےاپنےبچے کی باقی زندگی کے لئے کیا سوچا ہے۔ جواب ملا ہم نے تو ہمیشہ خدا پہ توکل کیا ہے۔ وہی کوئ راستہ نکالے گا۔

ہمم، میں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ یہ جو کاروباری معاہدہ ہم کرنے جا رہے ہیں اس کے لئے بھی تو آپ نے کوئ منصوبہ بندی کی ہے ناں ۔ بغیر منصوبہ بندی کے تو کوئ اتنا بڑا قدم نہیں اٹھاتا۔ اسے تو آپ نے خدا توکل پہ نہیں چھوڑا۔ پھر اپنے بچے کو کیسے آپ نے اس طرح چھوڑ دیا؟

ایک کمزور آواز میں جواب آیا ، ہو سکتا ہے کل وہ کوئ بڑا عالم دین بن جائے۔

میں نے آواز کی اس کمزوری کو جان کر  ان سے پوچھا نہیں کہ مودودی صاحب کے بارے میں کیا خیال ہے وہ حافظ  قرآن نہیں تھے لیکن عالم دین کی صف میں کھڑے ہیں۔ ایک بڑی تعداد میں عالم دین ہیں جو حافظ قرآن نہیں۔ عالم دین بننے کے لئے دین کی سمجھ ہونا ضروری ہے جس کتاب کی طرف رجوع کرتے ہیں اس زبان کا سمجھ میں آنا ضروری ہے اس لئے جو بات ہماری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ بجائے اسے حفظ کرنے میں وقت لگانے کے عربی زبان سیکھنے میں وقت لگایا جائے تو بات ہے سمجھ کی۔

کیا بچوں کو قرآن حفظ کرانے سے دین کی کوئ خدمت ہوتی ہے؟

  ہم ٹیکنالوجی کے اس دور میں ہیں کہ قرآن  با ترجمہ کمپیوٹر پہ اس طرح موجود ہے آپ جب چاہیں کسی حوالے سے کوئ آیت نکال لیں۔ قرآن پہلے سے زیادہ محفوظ ہے۔

کیا واقعی قرآن حفظ کرنے والے بچے کے چالیس یا ستر رشتے دار بخشے جائیں گے یا اسکے والدین کو روز قیامت عام معافی مل جائے گی؟

اگر یہ سچ ہوتا تو قرآن یہ کیوں کہتا کہ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔

یا اس لئے کہ حافظ قرآن کو معاشرے میں خاص احترام حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے کہ شاعر بھی یہ کہتا نظر آتا ہے کہ

اے خال رخ یار تجھے ٹھیک بناتا

جا چھوڑ دیا حافظ قرآں سمجھ کے

لیکن شاعر تو جناب شاعر ہوتا ہے اسکی بات کا کیا بھروسہ۔

اب ایک نیا سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسے ادارے کیوں نہیں اتنی بڑی تعداد میں بن جاتے جہاں عربی زبان سکھائ جائے تاکہ اپنی مذہبی کتاب تک ہر مسلمان کی پہنچ آسان ہو جائے اور خدا کی کتاب کو وہ بغیر کسی ذریعے کے سمجھ پائے۔ ایسے ہی جیسے دنیا کی کسی اور عوامی کتاب کو ہم سجھتے ہیں۔ قرآن حفظ کرنے میں کم از کم پانچ سال لگتے ہیں ، عام طور پہ تین چار سال کے بچے کو مدرسے کے حوالے کیا جاتا ہے۔  اگر اس جذبے سے دن رات عربی زبان سیکھائ جائے تو اس میں بے پایاں مہارت پیدا ہو جائے۔

اسکے جواب کے لئے کسی ذہنی تگ و دو کی ضروت نہیں۔ ہمیں ایک بہتر مسلمان دیکھنے کے خواہشمند خدا اور اور ہمارے درمیان ڈائریکٹ ڈائلنگ پسند نہیں کرتے ورنہ انکا وجود بے مصرف ہو جائے انکی بڑائ جھوٹی قرار پائے  اور انکے روزگار کو بھاری زک پہنچے۔

6:40 PM

اسلام, پاکستان, حفظ, زبان, عربی, قرآن, مدرسہ, مذہب, ناظرہ

تہہ جام

سگنل کی لائٹ سرخ ہوئ تو میں نے گاڑی کی رفتار آہستہ کرتے ہوئے روک دیا۔ یہ کرتے ہوئے میری نظر فٹ پاتھ پہ بیٹھی تین لڑکیوں پہ پڑی۔ سات آٹھ سال کی یہ لڑکیاں اپنے درمیان کوئ چیز رکھے کھارہی تھیں اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک لڑکی کا چہرہ اور تاثرات مجھے صاف نظر آرہے تھے۔

کھانے کے دوران باتیں کرتے ہوئے تھوک نے اسکے گلابی ہونٹوں کو مزید گلابی کر دیا تھا۔ اسکے گال موسم میں خنکی کی وجہ سے لالی لئے ہوئے تھے۔ کسی نے اسکے بالوں کو بلیچ کر دیا تھا اور یہ سنہری کالے بال اسکی نیلاہٹ لئے ہوئ آنکھوں کے ساتھ ایک دل کش منظر تخلیق کر رہے تھے۔ میں بس اسے دیکھتی ہی رہی۔  بہت زور سے ہنستے ہوئے دفعتاً اسکی آنکھیں میری آنکھیں سے چار ہوئیں۔ اب ان میں حیرانی اور شرم بھی گھل گئ تھی۔ اجنبی لوگوں کے دیکھنے پہ بچے اکثر شرما جاتے ہیں۔ میرے ہونٹوں پہ ہنسی ابھر آئ۔ وہ ہنس کر ہاتھ ہلانے لگی۔ میرا ہاتھ بھی اظہار مسرت میں اٹھا اور ہلنے لگا۔

سگنل کھل چکا تھا۔ اسکا ہاتھ اب بھی ہل رہا تھا۔ حالانکہ ہم دونوں میں مسکراہٹ کے تبادے کے علاوہ کوئ دنیاوی کاروبار نہ ہوا تھا۔ سودو زیاں سے لاپرواہ صرف قدرت ہوتی ہے۔ ڈوبتا ہوا  سورج بغیر کسی خراج کے آسمان پہ دھنک بکھیرتا ہے، آبشار کے گرتے پانی میں روشنی بغیر کسی ستائیش کے قوس و قزح بناتی ہے، چاند ، ستارے آسمان کو سجانے کا کوئ کرایہ نہیں لیتے۔ قدرت فیاض ہے۔ کبھی کبھی انسان بھی ایسا ہی فیاض ہوتا ہے۔ میں بھی ایک فیاض  مسکراہٹ کو لئے آگے بڑھ گئ۔

میرے برابر بیٹھی تیرہ سالہ بچی نے جو آسٹریلیا میں پیدا ہوئ اور پلی بڑھی ہے مجھ سے پو چھا یہ لڑکیاں یہاں کیا کر رہی تھیں۔ میں چونک کر اس دنیا میں واپس آئ، جہاں ہر پل کیوں  اور کیسے کے سانپ منہ پھاڑے بیٹھے ہوتے ہیں۔

وہ یا تو بھیک مانگ رہی ہونگیں یا پھر سگنل پہ کھڑی گاڑیوں کے شیشے صاف کرتی ہونگیں۔ میں نے ڈرائیونگ کے تمام افعال منعکسہ کو بغیر سوچے سمجھے انجام دیتے ہوئے جواب دیا۔

مجھے یہ جان کر بے حد افسوس ہوا کہ اتنی پیاری بچی یہ کام کرتی ہوگی۔ ایسا کیوں ہے؟ اس نے مجھ سے پوچھا۔

میں اسے تیسری دنیا کے ایک غریب ملک پاکستان کی معیشت اور اسکے باشندوں پہ اسکے اثرات سمجھانے لگی۔

اس ساری معاشی فلاسفی کے درمیان ایک سوچ ذہن میں رینگ گئ جب خوب صورتی پہ برا وقت پڑتا ہے تو دیکھنے والوں کے دل  نرم کیوں ہو جاتے ہیں؟

10:20 PM

آسٹریلیا, بچے, پاکستان, زیادتی, کراچی, گداگری

پیر کی بیوہ

آج کے اخبار میں بڑی دلچسپ خبریں ہیں ۔ پاکستان کے سیاسی حالات ایک دفعہ پھر ،اک نئے موڑ پہ لے آئے ہیں حالات مجھے کی تصویر بن گئے ہیں۔ خیر کوئ بات نہیں، ہم ہر کچھ عرصے بعد اسی طرح نئے اور نازک موڑ پہ کھڑے ہوتے ہیں اب ہمیں ایسے موڑوں پہ کھڑے رہنے کی عادت ہوگئ ہے۔ نہ ہوں تو عجیب سی بے چینی طاری ہو جاتی ہے۔

ڈان اخبار کے پہلے صفحے پہ کورٹ کی طرف سے حکومت کو دئیے گئے نکات کا خلاصہ ہے۔  مجھے سپریم کورٹ کے چھ نکات سے کوئ خاص دلچسپی نہیں۔ سپریم کورٹ کے حالیہ اقدامات یونہی ہیں کہ گرتی ہوئ دیواروں کو ایک دھکا اور دو۔

گیلانی صاحب یا زرداری صاحب اگر عرصہ ء چار سال کے بعد نا اہل قرار پا جائیں تو کیا اور نہ پائیں تو کیا۔  جہاں اتنا برداشت کیا وہاں ایک سال  کیا معنی رکھتا ہے۔ گیلانی صاحب تو ایسے  مجاور ہیں کہ وزیر اعظم ہاءوس سے نکلیں گے تو یادوں کے مزار پہ بیٹھ  کر گل ہائے عقیدت پیش کرنے لگ جائیں گے۔ اس کام کے لئے پہلے انہیں ایوان صدر جانا پڑتا تھا۔ تب انکی  پسندیدہ قوالی میرا کوئ نہیں ہے تیرے سوا کی جگہ، بعد میں کچھ اس طرح ہوگی کہ نصیب آزما چکا، قسمت آزما رہا ہوں، کسی بے وفا کی خاطرمزدا چلا رہا ہوں۔

اس موقع پہ جہاں انگلی کٹا کر شہیدوں میں شامل ہونے والے ایک ہلچل میں ہیں کہ انکی کٹی انگلی ضائع نہ ہو جائے اور کہیں نہ کہیں انکو بھی پذیرائ مل جائے وہاں اندرون خانہ نئے الیکشن کے فوری انعقاد کے پیش نظر نگراں حکومت میں اپنے مقام کے لئے کوشاں گِدھ پرواز کے لئے تیار ہیں۔ مجھے انکی پروازوں سے بھی دلچسپی نہیں۔ اس سے زیادہ دلچسپی تو مجھے ان گِدھوں سے ہے جو پاکستان اور انڈیا میں اس لئے مر گئے کہ انہوں نے جن جانوروں کا گوشت کھایا تھا وہ ایک ایسی  دوا استعمال کر چکے تھے جو گِدھوں کے کے لئے سم قاتل ثابت ہوئ۔ یہ گوشت انہوں نے حلال ذریعے سے حاصل کیا تھا لیکن پھر بھی راس نہ آیا اور یہ گِدھ تاریک راہوں میں مارے گئے۔ اب شاید نایاب نسل میں شامل ہو جائیں۔

میں ایک انسان ہوں ، جانوروں سے بس اتنی ہی ہمدردی کر سکتی ہوں۔ ویسے بھی ہمدردی زیادہ کروں یا کم، جانوروں کو اس سے فرق نہیں پڑتا۔ وہ شعور کی اس سطح پہ نہیں جہاں اس قسم کے احسانات کو یاد رکھ سکیں۔

میرے لئے سب سے دلچسپ خبر پاکستانی سیاست کے ایک اہم کردار پیر پگارا کے انتقال کی ہے۔ کل نفس ذائقہ الموت۔ ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ انکی عمر نوے سال سے زیادہ تھی دستاویزات کے مطابق صرف تراسی یعنی  ۸۳ سال کے تھے۔ مرنے کے لئے ایک جائز عمر۔  تراسی سال کی عمر میں بیمار شخص کا مرنا کوئ ایسی سنسنی نہیں رکھتا۔ پھر مجھے کیوں اتنی دلچسپی ہو رہی ہے؟

کیا اس لئے کہ مرنے کے بعد مرنے والے کے ساتھ اگلی دنیا میں کیا ہوگا؟ میں اور آپ اندازے ہی لگا سکتے ہیں۔ چاہے ہم نے وہ کتاب ازبر کر لی ہو جس کا عنوان ہے مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے مجھے نہیں معلوم کہ وہ اگلی دنیا میں بھی حروں کے سردار ہونگے یا نہیں، وہاں بھٹو کے خلاف کسی چلائ جانے والی مہم کا حصہ ہونگے یا نہیں۔

۔

۔

مجھے دراصل اس لڑکی کے بارے میں جاننے کی بڑی خواہش ہے کہ جس سے پیر صاحب نے چھ سات سال پہلے شادی کی تھی۔ ایک نو عمر، اخباری اطلاعات کے مطابق سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی جس نے پیر صاحب کے دو جڑواں بچوں کو بھی جنم دیا۔

اب جبکہ پیر پگارا اس دنیا میں نہیں رہے۔ اس لڑکی کا کیا ہوگا۔ اب اسکی عمر پچیس چھبیس سال ہو گی۔ اس نو عمری میں پیر پگارا کی بیوہ کا اعزاز حاصل کرنے والی لڑکی اب کیا کرے گی؟

کوئ ہے جو مجھے اسکی خبر لادے۔

ہائے رباں، میں تجسس سے بے حال ہوں۔

2:16 PM

انتقال, بیوی, پاکستان, پیر پگارا, ذوالفقار علی بھٹو, زرداری, موت, یوسف رضا گیلانی

پھر ٹیگے گئے

یہ عرفان احمد شفقت نے گلے میں ٹیگ کا ڈھول ڈال دیا ہے۔ اس لئے بجا رہے ہیں۔

مستقبل کے بارے میں جتنے سوالات ہیں وہ سب انتہائ مشکل لگتے ہیں۔ کیا پتہ کب دل بدل جائے اور ہم  گوتم بدھ کی طرح سب تیاگ کر کسی مختلف دنیا میں جا نکلیں۔ اس لئے اس ٹیگ کے اکثر سوالات ذرا اوکھے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن سب کے جوابات دینے کی کوشش ضرور کی ہے۔

2012ء میں کیا خاص یا نیا کرنا چاہتے ہیں؟

 اس سال  لکھنا چاہتی ہوں۔ سنجیدگی سے وہ جو کافی عرصے سے لکھنے کی سوچ میں ہوں۔ لیکن اس سے پہلے کچھ پڑھنا بھی چاہتی ہوں۔ کچھ چیزیں جو پہلے نہیں پڑھیں۔ ایک فہرست ہے جسے عملی رکھنے کے لئے میں نے خاصہ مختصر رکھا ہے۔  ہیمنگوے کے کچھ ناول، مزید جارج آرویل کے دو ناول

نائینٹین ایٹی فور

،

اینیمل فارم

۔ کچھ کو پورا کرنا ہے مثلاً ایلڈوس ہکسلے کا

بریو نیو ورلڈ

،

وار اینڈ پیس

۔ کچھ چیزیں جاننا چاہتی ہوں مثلاً یہ کہ گھر بیٹھ کر سٹہ کیسے کھیلتے ہیں۔

:)

۔

2012ء میں کس واقعے کا انتظار ہے؟

کسی خاص واقعے کا انتظار نہیں,  ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا۔

۔ 2011ء کی کوئی ایک کام یابی؟

-کامیابی اور ناکامی بالکل نسبتی اصطلاحیں لگتی ہیں۔  سو یہ کامیابی کم نہیں ابھی تک زندہ ہیں اور صحت مند ہیں،  خود کو اور دوسروں کو بم سے نہیں اڑایا، کسی مالیاتی کرپشن کا حصہ نہیں، کسی انسان کا حق نہیں کھایا نہ چھینا، کوئ نئ سیاسی جماعت نہیں بنائ، انقلاب کا نعرہ نہیں لگایا، کینیڈا جا کر غائب نہیں ہوئے۔ حالانکہ اس میں سے بیشتر کاموں کا بڑا دل چاہا۔

۔ 2011ء کی کوئی ایک ناکامی؟

- کوئ ایک وقت ورزش اور چہل قدمی کے لئے مقرر نہ ہو سکا۔

۔ 2011ء کی کوئی ایک ایسی بات جو بہت یادگار یا دل چسپ ہو؟

 - کینیڈا گئے،ایک اردو بلاگر سے ملاقات کی، زندگی میں نئ چیزیں ، نئے لوگ نئ ثقافت دیکھی۔  وہاں کے شہر،  کیوبک سٹی میں چار سو سیڑھیاں چڑھ کر پہاڑ کے اوپر گئے اور ساڑھے تین سو سیڑھیاں اتر کر نیچے واپس آئے۔ وہ دن بڑا دلچسپ اور یادگار رہا۔

۔ سال کے آغاز پر کیسا محسوس کررہے ہیں؟

 - ویسا ہی جیسے نئے دن کے آغاز پہ کرتے ہیں۔

تم کو بھی ہم دکھائیں  کہ مجنوں نے کیا کیا

فرصت کشا کش غم پنہاں سے گر ملے

۔ کوئی چیز یا کام جو 2012ء میں سیکھنا چاہتے ہوں؟

- ایک چھوٹی سی چیز جو آئیندہ دو تین مہینوں میں سیکھنا چاہتی ہوں وہ ہے،

اسکرین ریکارڈنگ

۔ اسکے علاوہ مہ رخوں سے ملنے کے لئے مصوری سیکھنا ہے۔ مہ رخوں سے میری مراد کچھ دلچسپ اور مزے کے لوگ ہیں۔ مصوری کا مطلب ایسے کام جن میں انہیں دلچسپی ہو۔ اس لئے کہ تقریب ملاقات  ، فیس بکنگ سے زیادہ مزیدار لگتی ہے۔ یہ الگ بات کہ جب دلچسپ اور مزے کے لوگوں کا کردار بنانے لگتی ہوں اس پہ پورا اترنے والے چھوٹے بچے ہوتے ہیں۔

:)

مزید جن افراد کوٹیگنا چاہونگی وہ ہیں ریاض شاہد، راشد کامران، فہد کہر، عدنان مسعود، شاکر عزیز، غلام مصطفی خاور، شعیب صفدر اور نام یاد نہیں آ رہے۔

11:02 PM

اسکرین ریکارڈنگ, اینیمل فارم, ٹیگ, جارج آرویل, شفقت احمد عرفان, کینیڈا, کیوبک سٹی, نائینٹین ایٹی فور, ناول, ہیمنگوے

نیا سال

جس طرح ہر تہوار کے کچھ  رسوم اور آداب ہوتے ہیں اسے منانے کے لئے. اسی طرح نئے سال  کو خوش آمدید کہنے کے انداز ہوتے ہیں۔ مثلاً کچھ لوگ اسے محبوب دلنواز کے ساتھ منانا چاہتے ہیں۔ اسکے لئے مناسب مقام و طعام کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ کچھ دوستوں کے ساتھ منانا چاہتے ہیں انہیں  مقام اور مشروب چاہئیے ہوتا ہے۔ کچھ کو نہ دوست چاہئیے ہوتے ہیں نہ محبوب، وہ زمانے کو دکھانا اور ہلانا چاہتے ہیں۔ انہیں مقام اور کچھ گولہ بارود چاہئے ہوتا ہے۔ کچھ آگ سے کھیلنے کے شوقین ہوتے ہیں اور آتشبازی سے دل بہلاتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے کم درجے پہ وہ نوجوان ہوتے ہیں جو موٹر سائیکل کے سائیلینسر ہٹا کر سڑکوں پہ دوڑتے پھرتے ہیں۔ صرف سڑکوں پہ دوڑنے کے ہم نہیں قائل، جو پھٹپھٹا کر سنائ نہ دے وہ سائیکل کیا ہے۔

ہم نئے سال کی پہلی رات کیا کرتے ہیں؟

شروع کےتین چار گھنٹے اندازہ لگاتے رہتے ہیں کہ یہ فائرنگ کی آواز تھی یا آتشبازی کا پٹاخہ۔  کراچی میں جنم لینے اور پیدائیش کے بعد سے اب تک اس شہر سے جڑے رہنے کی وجہ سے یہ ایک انتہائ دلچسپ مشغلہ لگتا ہے بالکل ایسے ہی جیسے بعض مردوں کو یہ اندازہ لگانے میں لطف آتا ہے کہ سامنے سے گذرتی خاتون شادی شدہ ہے یا نہیں۔

باقی ساری دنیا میں جہاں نئے سال پہ فائرنگ اور آتشبازی کے پٹاخوں کا نادر نمونہ نہیں چلایا جاتا،ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ محض نشے میں دھت ہو کر اپنے ہی پیشاب اور قے میں لوٹیں لگانے سے کیا خاک مزہ آتا ہوگا۔ نئے سال کے آغاز کو مناتے ہوئے تین افراد کراچی میں مارے گئے۔ اس پہ ہمیں کوئ افسوس نہیں، خوشی کے اظہار کے لئے گولی اور آتشبازی میں  مرنے کا مقام، شراب کے نشے میں دھت ہو کرکسی نالے یا موری میں پڑے رہنے کے مقام سے کہیں اعلی معلوم ہوتا ہے۔ سلام ان پہ جنہوں نے اظہار اور اس دوران انتقال کے لئے معروف روائیتی  و مثالی پاکستانی طریقوں کو اپنایا۔

۔

۔

۔

نئے سال کا آغاز چونکہ ہماری روایت نہیں بلکہ نئے معاشرتی رکھ رکھاءو کی دیگر لا تعداد اداءووں کے ساتھ یہ بھی مغرب کی دین ہے۔ اس لئے اسے منانے کے طور طریقوں پہ اب تک اتفاق نہیں پیدا ہو پایا۔ جہاں سے یہ ہمارے یہاں آیا انہوں نے اسکے ساتھ ایک پخ یہ بھی لگا رکھی ہے کہ آنے والے سال کے لئے کوئ قرار داد بھی رکھی جائے۔ میں نے  کچھ قرار دادوں کا اندازہ لگایا ہے۔ تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

حکومتی قرارداد، عوام کے لئے فوری بنیادوں پہ کم قیمت  چنوں کی فراہمی تاکہ وہ چنوں سے گیس پیدا کر سکیں۔ چنا گیس امید کی جاتی ہے کہ سی این جی کی نسبت زیادہ تسلسل کے ساتھ فراہم کی جا سکے گی۔ اس سلسلے میں مزید گیس پیدا کرنے والی روائیتی اشیاء پہ بھی غور کیا جائے گا، مثلاً گوبھی اور مولی۔ ادرک اور کالے نمک کے استعمال پر پابندی عائد کی جائے گی۔

تحریک انصاف، تمام لوٹوں کو ایک جگہ جمع کرنے کی کوششوں میں کامیاب ہو گی۔ لوٹوں کے

پائڈ پائیپر

، عمران خان کا یہ احسان قوم جلد ہی ووٹوں کی صورت میں اتارے گی۔ اگچہ اب تک یہ ایک سوال ہی ہے کہ جمع کئیے ہوئے لوٹوں کو کیسے ری سائیکل کیا جائے گا۔

خفیہ طاقتیں، میمو گیٹ نامی چوہے کو تین چار مہینے اور دوڑائیں گی جب تک انکے پیچھے دوڑنے والی بلیاں انکی پسند کے پنجروں میں نہ پہنچ جائیں۔

تمام سیاسی جماعتوں کا اب ایک موسیقی کا ونگ بھی ہوگا۔ اس طرح ملک میں فن اور فنکار کی اہمیت بڑھنے کا امکان ہے ۔

اسکے علاوہ چند پیشنگوئیاں جو بالکل درست ثابت ہونگیں۔

 اس سال  ملک کی زیر بحث مشہور زندہ شخصیات، زرداری،   مشرف، الطاف حسین، عمران خان، اور وینا ملک رہیں گی۔ مردہ شخصیات میں سید ابوالاعلی مودودی اور بھٹو کے درمیان مقابلہ جاری رہے گا۔

رواں سال بھی یہ طے نہیں ہو پائے گا کہ قائد اعظم سیکولر تھے یا مولانا۔

بے نظیر بھٹو کے قاتل کی تلاش جاری رہے گی۔

عوامی گفتگو میں مشہور الفاظ کچھ اس طرح ہونگے، چور، جھوٹے، بے غیرت، کرپشن، لوٹے، انصاف ، تحریک اور تحریک انصاف۔

اس سال بھی اس برہمن کا پتہ نہ چل پائے گا جو ہر سال کے آغاز پہ عشّاق کو تسلی دے کر روانہ ہوتا ہے کہ یہ سال اچھا ہے۔ اسکی وجہ سے عشاق کی تعداد میں روز افزوں اضافہ جاری رہے گا۔

پاکستان بلاگ ایوارڈز والے ایک دفعہ پھر فرحان دانش کو بہترین اردو بلاگر کا ایوارڈ دیں گے تاکہ اردو بلاگرز میں صحیح سے رن کا میدان چھڑے اور وہ بلاگنگ سے تائب ہو جائیں یا پھر انگریزی میں بلاگنگ کریں۔

میں کیا کرونگی؟

 میں سر سید جیسی عظیم ہستی پہ اپنی تحاریر کو مکمل کرونگی۔

:)

آپ سب کو نیا سال مبارک ہو۔ وائے افسوس کہ غالب نے نئے سال کے متعلق برہمن کے ارشاد کے سوا کچھ نہیں فرمایا لیکن امید کرتے ہیں عشاق کے علاوہ ہمیں بھی کچھ بہتر ملے گا۔

11:31 AM

اردو, ایوارڈز, بلاگنگ, پاکستان, غالب, قائد اعظم, کراچی, نیا سال, نیو ایئر نائٹ

شیر، درخت اور وہ

بال کترنے سے مردہ ہلکا نہیں ہوتا۔ اصل حقیقت تو مردہ ہی بتا سکتا ہے یا مردہ اٹھانے والا۔ ہم آپ تو محض گمان ہی کر سکتے ہیں۔  لیکن کچھ محاوروں تک پہنچ آسان ہوتی ہے یعنی ہاتھ کنگن کو آر سی کیا، سامنے نظر آرہا ہے۔

مجھے کیا آپ میں سے بھی کچھ کو یاد ہو گا جب اردو بلاگنگ کی دنیا میں ایک محاورے پہ دھمال مچی تھی۔ محاورہ تھا لکھے موسی پڑھے خدا۔ ایک بلاگی ساتھی نے اپنے پچاس سال پرانے ایک استاد کے توسط سے اس محاورے کو غلط بتایا اور کہا کہ اصل محاورہ ہے لکھے مُو سا پڑھے خود آ۔ معتقدین نے واہ واہ کی۔ مجھے بے قراری ہوئ تو میں نے اسے مختلف لغات میں دیکھا اور ہر کسی میں یہی ملا،  لکھے موسی پڑھے خدا۔

بلاگی ساتھی کا کہنا تھا کہ اس کا مطلب ہے بال جیسا باریک لکھنا کہ خود ہی پڑھ سکے۔ میرا خیال تھا کہ یہ محاورہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب تحریر اتنی خراب ہو کہ خود بھی نہ پڑھ سکے خدا ہی پڑھے کیونکہ وہی علیم و خبیر ہے۔

عوامی مبصرین نے موسی والے محاورے کو نبی اور خدا دونوں کی شان میں گستاخی قرار دیا۔  ایک ایسی  صالح حکومت کے آنے کی دعا کی جو لغت سے خلاف مذہب محاورے نکال کر باہر کرے۔ اور ایک دفعہ پھر ان بلاگی ساتھی کے لئے عوامی دعائے خیر کہ اصل محاورے سے روشناس کیا۔

ہم نے سوچا جان بچی، ایمان بچا اور دنیا میں کیا چاہئیے۔

توحید پہ یقین رکھنے والوں کے لئے میں یہ سمجھتی تھی کہ خدا کے سوا باقی سب محبوب ، بت ٹہرتے ہیں اس لئے اردو شاعری بتوں اور صنم پہ زیادہ بات کرتی ہے۔ لیکن دلوں کو جھانکیں  تو ایسا نہیں نظر آتا۔

یہ  اگر ایک محاورے میں خدا اور موسی کی حفاظت کرتا ہے تو دوسرے میں شیر کی حفاظت پہ بھی کمر بستہ نظر آتا ہے۔ محاورہ ہے بلی شیر کی خالہ ہوتی ہے۔ کیونکہ شیر درخت پہ نہیں چڑھ سکتا بلی چڑھ جاتی ہے۔ ہم نے مذاقاً کہا کہ یہ محاورہ غلط ثابت ہو گیا ہم نے ایسی دستاویزی فلمیں دیکھی ہیں جن میں شیر درخت پہ قیلولہ فرماتے ہیں۔

ہمارے ایک مبصر جو کہ ویسے ہمارے بلاگ کی طرف تھوکنا  بھی پسند نہ کریں اس بات پہ ایسے جوش میں آئے کہ  اپنے تھوک اور شیر کو  ہمارے علم اور جہالت  پہ قربان کر دیا۔ اول تو شیر درخت پہ چڑھ نہیں سکتا چار سو پاءونڈ وزنی ہوتا ہے اور اگر بالفرض محال ایسا ہوتا بھی ہے تو مادہ ہی چڑھ سکتی ہے نر نہیں۔  انہوں نے فرمایا۔ شیرنیوں کو ایشوریا رائے کی طرح اپنے وزن کا خیال رہتا ہے۔ اس خیال سے مجھے خاصہ حسد محسوس ہوا۔

 چنانچہ، شیر پنجاب کے آجکل کے نازک حالات کو ایک طرف کیا، حالیہ پر کشش سونامیوں سے بھی منہ موڑا اور یو ٹیوب پہ ایک ویڈیو کو جا لیا۔ شیر وہ بھی نر، درخت پہ اپنے شکار سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ پھر فاتحانہ جذبے سے اسے جواب  میں ڈال دیا۔

اس پہ دوسرا بیان آیا کہ سیدھے درخت پہ نہیں چڑھ سکتا، ٹیڑھے پہ چڑھ جاتا ہے۔ یہ خاصیت شیر اور ہمارے درمیان ملتی جلتی ہے۔ حالانکہ میرا وزن شیر کے چار سو پاءونڈ کا چوتھائ بھی نہیں ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ٹیڑھے درخت پہ ہی  جم کر چڑھ پاتے ہیں۔ سیدھے درخت کو صراط مستقیم سمجھ کر اس کا ارادہ بھی نہیں کرتے۔ کیا شیر جیسا بہادر جانور بھی صراط مستقیم سے گھبراتا ہے؟

باتوں میں لگا کر انہیں یہاں تک تو لائے کہ ٹیڑھے درخت پہ چڑھ جاتا ہے لیکن اب اس کا کیا ہو کہ انہی مبصر کو یہ  شیر کی توہین لگی کہ شیر اپنے بچے کھالیتا ہے۔ حالانکہ اس پہ لغت والوں کو زیادہ اعتراض ہونا چاہئیے کہ اس سے یہ محاورہ مشکوک لگتا ہے، شیر کا ایک بھلا۔ ایک بھلا، اگر وہ شیر کی دسترس سے بچ جائے۔

  شیر بے چارے پہ کیا موقوف، یہاں

ایسے جانوروں کی ایک فہرست

ہے جو اپنے بچے کھالیتے ہیں انسانوں کی طرح بیچتے نہیں۔ معاشی سطح پہ حیوان ، انسان سے کہیں پیچھے ہیں۔ جہاں یہ ان جانوروں کی بے غرض طبیعت کا حصہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنے پرائے کی تمیز نہیں کرتے۔ کچھ لوگ اسے حیوانی جبلت بھی کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ اندیشہ ہے کہ شیر کو حیوان کہنے پہ بلاگنگ کی دنیا کسی انقلاب سے دوچار نہ ہوجائے۔

شیر اس فعل کو خوب سوچ سمجھ کر انجام دیتا ہے کہ شیرنیوں کو شکار کی اور بچوں کی حفاظت کی ذمہ داری دے کر وہ زیادہ وقت  اپنی تولیدی صلاحیتوں اور اپنی حکومت کی حفاظت کے غور و فکر میں گذارتا ہے۔  جب شیرنیوں کو اس پہ اعتراض نہیں تو کسی اور کو وہ بھی ایک انسان کو اس پہ تاءو کھانے کی کیا ضرورت۔ میری اس بات کو بعض طبقے کسی خاص طبقے کی طرف اشارہ نہ سمجھیں۔ بخدا شیر ایسا ہی ہوتا ہے۔

   بات یہ ہے کہ شیر کسی انتخابی پارٹی کا نشان ضرور ہو سکتا ہے۔ لیکن خود شیر کو انتخابات میں کھڑے ہونے سے دلچسپی نہیں۔ وہ آمریت کو بغیر کسی شرمندگی کے پسند کرتا ہے۔ اسے دھاڑنا  آتا ہے جس سے جنگل کے جانور ایک دم قابو میں آجاتے ہیں  وعدے کرنا نہیں آتا کیونکہ جنگل کے جانور نہیں جانتے کہ وعدہ کیا ہوتا ہے وفا کسے کہتے ہیں۔ اس لئےکوئ اسکے شخصی معاملات کی جتنی کرید کرے۔ شیر کو اس سے فرق نہیں پڑتا۔ ویسے بھی شیر طاقت کے استعمال پہ اتنا زیادہ یقین رکھتا  ہے کہ شیر کا منہ چوم کر طمانچہ کھانا پڑتا ہے۔ کس سے؟  اس میں نر مادہ کی تخصیص  نہیں اسی سے جس کا منہ چوما ہوتا ہے میرا مطلب شیر ہے۔

۔

۔

محاوروں کے سلسلے میں مزید چُل اٹھی اور کچھ اور کے بخئیے ادھیڑے ہیں۔ متائثرہ قارئین سے پیشگی معذرت۔

زیادہ بولنے والا ڈھول کی طرح خالی ہوتا ہے یہ ایک محاورہ ہے اسکا رد ہے زیادہ وہی بولتا ہے جسکے پاس بولنے کے لئے کچھ ہوتا ہے۔

غیر جانبداری ایک اچھا وصف ہے، یہ ایک خیال ہے اسکے مخالفین کا کہنا ہے کہ غیر جانبداری کا مطلب ہے کہ آپ ظالم اور مظلوم دونوں کو یکساں سمجھتے ہیں۔

اور سب سے مشہور جو بولنے سے پہلے تولتا ہے وہ عقلمند ہوتا ہے نہیں جناب، جو بولنے سے پہلے تولتا ہے وہ غیر مخلص ہوتا ہے۔

12:28 AM

ایشوریا رائے, ایمان, بلی, توحید, خدا, شیر, موسی

اچھی بلاگ پوسٹس

متھ کا سائینس اور شماریات سے کوئ تعلق نہیں۔  یہ خیالات کچھ مخصوص ماحول میں تقویت پا جاتے ہیں اور پھر انہیں پھاڑ کر ہی ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے متھ بسٹر کی اصطلاح   گھڑنی پڑی۔

متھ کیا ہے؟ اسکی تعریف میں جائے بغیر ایک مثال دیتی ہوں۔ اگر کسی جوڑے کے یہاں لگاتار بیٹیاں ہوئے جا رہی ہیں اور انہیں یہ فکر ہے کہ بغیر وارث کے ہی اپنی سلطنت چھوڑنی پڑے گی تو آخری بچی کا نام بشری رکھ دیں۔ انشاءاللہ، اسکے بعد بیٹا ہوگا۔ ویسے یہ ایک متھ ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بشری ون، بشری ٹو قسم  کے سیکوئیلز کے بعد بھی آپکا کام نہ بنے۔

بلاگنگ میں بھی اسی طرح کی بہت ساری متھس ہیں۔ بالخصوص اردو بلاگنگ میں۔ مثلاً اچھی پوسٹ وہ ہے جس پہ بہت سارے تبصرے ہوں۔ یا اچھی پوسٹ وہ ہے جسے بہت سارے لوگ ویو کرتے ہوں۔

اب ہم دیکھیں تو اس معیار پہ وہ تحاریر زیادہ آئیں گی جن میں ہمارے یہاں مذہب کے ایک خاص ورژن سے ہٹ کر لکھی جانے والی تحاریر پہ مخالفین نے مناظرہ کیا ہو۔ انسانی زندگی میں دلچسپی کے مقامات اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ اس لئے ان تمام تحاریر کو اچھی بلاگ پوسٹ کے زمرے میں کیا اس لئے رکھا جائے کہ ان پہ تبصرے زیادہ ہیں یا انکو ایک مدت میں بار بار لوگوں نے دیکھا ہے۔ اس لئے میری نظر میں یہ رائے ایک متھ ہے۔

پھر اچھی بلاگ پوسٹ کیا ہوگی؟

اچھی بلاگ پوسٹ وہ ہونی چاہئیے جسے آپ بھول جائیں مگر اس پہ ویوز آتے رہیں۔ محض سال بھر بعد وہ ایک بچکانہ بات نہ لگے۔

میں کچھ پھولوں کے بیج کینیڈا سے لیکر آئ۔ یہاں زمین کے حوالے کرنے سے پہلے میں نے انکے بارے میں سرچ کرنا ضروری سمجھا۔ ایک کے بعد ایک جب انکے نام سرچ پہ ڈالے تو درجنوں بلاگز سامنے آگئے۔ یہ بلاگز سالوں پہلے لکھے گئے تھے۔ مگر آج بھی میں نے انہیں کھولا اورانہیں مددگار پایا۔

میں انہیں اچھے بلاگز سمجھتی ہوں۔ ایک دفعہ ان بلاگز پہ جانے کے بعد میں نے انہیں یاد رکھا کہ تاکہ مزید مدد کے لئے دوبارہ انہیں دیکھ سکوں۔ ان میں سے کچھ معلومات بہترین ثابت ہوئ اور اس طرح میرا ان پہ اعتماد قائم ہوا۔

اسی طرح بلاگ لکھنے کے لئے موضوعات کا انتخاب۔ اس سلسلے میں بیرون ملک ویب سائیٹس سے آپ جتنی چاہیں مدد لیں لیکن اگر آپ اپنے معاشرے میں صحیح سے جذب نہیں ہوئے تو بلاگ کا موضوع ہمیشہ ایک مسئلہ رہے گا۔ باہر دیکھنے سے پہلے اپنے آپ کو یعنی اپنے ماحول کو خوب اچھی طرح سمجھ لیں۔

آپ باہر سے وہ خیال لا کر یہاں نہیں بو سکتے ہیں جس کے لئے یہاں کا موسم سازگار نہیں۔ مثلاًبیوی کو خوش رکھنے کے دس مغربی طریقے یہاں نہیں چل سکتے جو مغرب میں زیر استعمال ہیں۔ یہاں کا شوہر اس بارے میں فکر مند نہیں ہوتا کہ کپڑے دھوتے وقت ہلکے اور گہرے رنگ کے کپڑے الگ الگ دھونا چاہئیں۔ اور بیگم صاحبہ ، میاں صاحب کا یہ سگھڑاپہ دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھیں گی۔  یہ اسکا درد سر نہیں۔ اسے اپنے کپڑے صحیح جگہ اور مقام پہ چاہئیے ہوتے ہیں۔ اس لئے صابن کے اشتہاروں میں وہ بیویاں خوش ہوتی ہیں جنکے شوہر انکے دھلے ہوئے کپڑوں کی تعریف کرتے ہیں۔

اچھی تحریر کے لئے لوگوں سے ملیں جلیں، عوامی جگہوں پہ جائیں، ٹی وی کو وقت دیں مگر اسی طرح جیسے کسی کتاب کو پڑھتے وقت آپ اندازہ لگاتے ہیں کہ اسکا ہر حرف پڑھنا ہے یا بس سرسری سا۔ اخبار پڑھیں اور کتابیں ضرور۔

اپنے آپ سے ملاقات کیجئیے اور جانئیے کہ خود آپکی دلچسپی کس رخ میں ہے۔ یہ بالکل ضروری نہیں کہ چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی۔ آپ اپنی دلچسپی کے میدان میں جادوئ صلاحیتیں رکھتے ہیں۔اور الگ سمت میں چل کر ہوا کو بھی اسی سمت میں چلنے پہ مجبور کر سکتے ہیں۔

چلیں پھر ہم کچھ بلاگنگ متھس کی فہرست بناتے ہیں۔

اچھی بلاگ پوسٹ، زیادہ تبصرے

اچھی بلاگ پوسٹ، زیادہ ویوز

اچھی بلاگ پوسٹ، جس سے زیادہ مبصرین متفق ہوں

اچھی بلاگ پوسٹ، جس میں کسی کی دل شکنی نہ ہو

اچھی بلاگ پوسٹ،  جو معاشرے کے رجحانات کے مطابق ہو

اور اگر کچھ آپکے ذہن میں ہو تو جمع کیجئیے۔

10:10 AM

اردو, بلاگر, بلاگنگ, بیوی, پاکستان, سماجیات, شوہر, کراچی

مریم کا بیٹا اور میری بیٹی

بوہری بازار سے گذرتے ہوئے میری نظر ایک  بڑے سے ہرے رنگ کے درخت پہ پڑی جس پہ سجاوٹ کی اشیاء ٹنگی ہوئ تھیں۔ اوہ کرسمس آنے والا ہے مجھے خیال آیا۔ یہ منظر آنکھوں کو بڑا بھلا لگا۔ میری بیٹی بھی شور مچاتی ہے 'کرسمس ٹری' نظر آرہا ہے کہیں سانتا کلاز بھی تحفے لئے کھڑا ہوگا۔ بچوں کو ہر الف لیلوی چیز میں کشش محسوس ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک اتفاق ہے یر سال اسکی سالگرہ ایکدن پہلے پچیس دسمبر کو منانا پڑتی ہے، اس دن ہمارے یہاں قائد اعظم ڈے جو ہوتا ہے۔ حضرت عیسی کی طرح یہ بات بھی یقین سے نہیں کہی جا سکتی کہ یہ قائد اعظم کی صحیح تاریخ پیدائیش ہے۔

کراچی کا یہ حصہ بالخصوص مجھے بہت پسند ہے۔ یہاں جو ثقافتی رنگا رنگی نظر آتی ہے وہ شاید ہی ملک کے کسی حصے میں نظر آتی ہو۔ عیسائ، ہندو، پارسی، آغاخانی، ، بوہری اور بھانت بھانت کے دیگر مذاہب اور زبانیں بولنے والے خرید و فروخت میں مصروف۔ خواتین اسکرٹس، ساڑھی، شلوار قمیض، دوپٹہ، بغیر دوپٹہ، برقعہ، بغیر برقعہ ہر طرح کے کپڑوں میں ملبوس اور موجود۔ یہیں ، چند غیر ملکی بھی نظر آسکتے ہیں جو سستی، عوامی  اور اچھی خریداری کے لئے یہاں کا رخ کرتے ہیں۔

یہاں کی عمارتوں پہ گوتھک اثر نظر آتا ہے کہ بیشتر خوبصورت عمارتیں انگریزوں کے دور میں بنی ہیں۔ لوگوں کا ہجوم جس سے میں بچپن میں خوفزدہ ہو جاتی تھی اور گاڑیوں کا ہجوم جن سے میں اب خوفزدہ ہو جاتی ہوں۔

کراچی  کے بازار میں کراچی پہ صدقے واری ہونے کے بعد جب میں رات کو اپنا کمپیوٹر کھولتی ہوں تاکہ اپنے فیس بک دوستوں کی سرگرمیاں دیکھ سکوں تو سائیڈ پہ ایک اشتہار نمودار ہوتا ہے۔ بائیکاٹ کرسمس یہ مسلمانوں کا تہوار نہیں۔  کچھ اس طرح کی تصاویر شیئر کی ہوئ نظر آتی ہیں جن پہ لکھا ہے کہ 'میری کرسمس' نہ کہیں یہ کہنے سے آپ دائرہ اسلام سے باہر ہو جائیں گے۔

میں دائرہ اسلام سے باہر نکالے جانے کے خوف میں جلدی سے 'میری کرسمس' کے معنی ویکیپیڈیا پہ چیک کرتی ہوں۔ یہاں بڑی دلچسپ معلومات ہیں۔ مثلاً حضرت عیسی کی پیدائیش کا سال یقین کے ساتھ متعین نہیں یہ سن دو یا سات  قبل از عیسی ہے۔

چوتھی صدی میں پہلی دفعہ حضرت عیسی کی پیدائیش کا دن پچیس دسمبر رکھا گیا۔ اسکے  انتخاب کے بارے میں متضآد رائے ہیں۔ مثلاً یہ حضرت عیسی کے حمل قرار پا جانے کی تاریخ سے ٹھیک نو مہینے بعد رکھی گئ۔ صدیوں پرانے دیہاتی میلے کی تاریخ کو سامنے رکھ کر نکالی گئ۔ یا پھر یہ کہ رومن  موسم سرما کے تہوار کے مد نظر تجویز کی گئ۔

خود اس تاریخ میں اتنے اختلاف ہیں کہ اکثریت اسے پچیس دسمبر کو مناتی ہے، ایک اور بڑی تعداد چھ جنوری کو جبکہ بعض ممالک میں سات اور انیس جنوری کو مذہبی جوش و جذبے اور احترام سے گذاری جاتی ہے اور اس سلسلے میں چھٹی ملتی ہے۔

اسکے پس منظر کو سامنے رکھیں تو یہ دراصل ایک ایسا تہوار بن گیا ہے جس میں حضرت عیسی سے پہلے کو تہوار کو ضم کر کے عیسائیت اور سیکولیرزم کا ملغوبہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

جدید صنعتی دور میں اسکی اہمیت یوں ہے کہ چھٹی ملتی ہے،اچھا کھانا کھایا جاتا ہے، خاندان جمع ہوتے ہیں، تحائف کا تبادلہ ہوتا ہے اور کاروباری مواقع بڑھتے ہیں۔

اب

میری کرسمس کے معنوں

کی طرف آئیں۔ وکیپیڈا کے مطابق،

The word "Christmas" originated as a compound meaning "

Christ

's

mass

". It is derived from the

Middle English

Cristemasse

, which is from

Old English

Crīstesmæsse

, a phrase first recorded in 1038.

[6]

Crīst

(

genitive

Crīstes

) is from

Greek

Khrīstos

(Χριστός), a translation of

Hebrew

Māšîaḥ

(מָשִׁיחַ), "

Messiah

"; and

mæsse

is from Latin

missa

, the celebration of the

Eucharist

. The form "Christenmas" was also historically used, but is now considered archaic and dialectal;

سادہ سی اردو میں یہ کہ کرسمس دراصل دو الفاظ کا مجموعہ ہے جس کا مطلب ہے کرائسٹ کا کھانا یعنی 'میری کرسمس' کا مطلب خدا کا کھانا مبارک ہو۔ اور اس سارے چکر میں مجھے کہیں بھی یہ بات پڑھنے کو نہیں ملی کہ'میری کرسمس' کا مطلب ہے خدا نے کرائسٹ کو جنا۔ جبکہ کرائسٹ کا مطلب ہے مسیحا۔

تو جناب، ہمارے مذہبی جذبے میں بڑھے ہوئے لوگ کچھ کہنے سے پہلے اس چیز کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے کہ اپنی بنیادی معلومات درست کر لیں۔ دائرہ اسلام سے خارج کرنے سے پہلے یہ تو سوچنا چاہئیے کہ اسلام کا دائرہ آخر کتنا چھوٹا یا کتنا بڑا ہے۔ اگر وہ نہیں سوچیں گے تو جسے باہر نکال رہے ہیں وہ ضرور سوچے گا۔

اسکے ساتھ ہی 'میری کرسمس' ان لوگوں کو جو اسے منا رہے ہیں۔ خدا اس زمین پہ انسانوں کو خوشیوں کے ہر گذرتے لمحے سے محظوظ ہونے کی نعمت دے اور میری بیٹی کو پانچویں سال گرہ مبارک ہو۔ وہ مجھ سے پوچھتی ہیں کہ آپ اللہ میاں کے تحفے کو کیا تحفہ دیں گی؟

میں اپنے بچے کو ایک ایسی دنیا تحفے میں دینا چاہتی ہوں جہاں لوگوں میں بنیادی برداشت ضرور ہو کہ یہی محبت اور امن کی ضرورت ہے۔ یہ بات انہیں سمجھ میں نہیں آتی لیکن یہ انہیں سمجھنا پڑے گی۔

مریم کا بیٹا محبت کا پیغام لے کر آیا تھا اور یہ ستم ظریفی ہے کہ آج دو ہزار سال بعد بھی مجھے اپنے بیٹی کے لئے اسی تحفے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

9:35 AM

اسلام, بوہری بازار, پاکستان, کرائسٹ, کراچی, مسلمان, مشعل

عوامی سونامی

کوئ کہتا ہے کہ جیسے عوام ہوتے ہیں ویسے ہی حکمراں ان پہ نافذ ہوتے ہیں کچھ کا ارشاد ہے کہ جیسے حکمراں ہوں عوام بھی ویسے ہی ہو جاتے ہیں۔

اب ایک تازہ خبر ہاتھ لگی ہے۔ جس سے ہم کچھ اس قابل ہوئے ہیں کہ ان دو میں سے ایک قول کو قول صحیح قرار دیں۔ ہوا یوں کہ قصور یہ پنجاب کے ایک شہر کا نام ہے کسی کا قصور نہیں۔  یہاں تحریک انصاف کا جلسہ آج منعقد ہوا۔ جس میں تحریک انصاف کے انصاف کے مطابق عوام کو بھی بیٹھنے کے لئے کرسیاں فراہم کی جاتی ہیں۔

عوام کو کرسیوں پہ بٹھانے کے لئے  پہلے کبھی کسی نے کیوں نہیں سوچا۔ یہ ہم نے بارہا سوچا۔ اسکا اندازہ آج  ہوا جب جلسے کے اختتام پہ عوام کرسیاں لے کر فرار ہو گئے۔

ہم نے قصور کے عوام سے دریافت کیا کہ انہوں نے ایسا قصور کیوں کیا؟ لوگ عاشقی میں عزت سادات گنواتے ہیں انہوں نے محض کرسی کے لئے یہ بدنامی مول لی۔  ایک بڑی اکثریت نے اس کا الزام ایک نامعلوم قلندر پہ ڈالا۔

کرسی، کرسی کر گئ سب کو قلندر کی یہ بات

تو اگر اسکی نہیں لیتا نہ لے اپنی تو لے

نا معلوم قلندر کا اتا پتہ معلوم کرنے کی کوشش ہم نہیں کر رہے فائدہ کیا ہم بھی دانا ہیں حضرت۔

کچھ نے کہا ہم نے تو نشانی کے طور پہ یہ کرسیاں محفوظ کر لی ہیں۔ جب وہ اپنی کرسی سنبھالیں گے تو انہیں دکھا کر ہم کہیں گے کہ کبھی ہمارے اور آپکے درمیان کرسی کا تعلق تھا۔ وہ تعلق جو تعلق سے بڑھ کر تھا۔ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔

کچھ ان کرسیوں کو تفصیلی طور پہ خود  چیک کرنا چاہتے تھے کہ ان پہ کس جگہ آئ ایس آئ کی چھاپ لگی ہوئ ہے۔ تاکہ سند حاصل ہو جائے۔ وہ قتل تو کرتے ہیں تو لیکن لوگوں کو اندازے لگانے کے مواقع کے ساتھ۔ یقین سے وہ خود بھی نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے کیا ہے۔

کچھ نےسوال کیا  کہ کرسی میں ایسی کیا کشش ہوتی ہے کہ سب کرسی کی دوڑ میں لگے رہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ نے بتایا کہ کئ گھنٹے ہو گئے کرسی  لے کر دوڑ رہے ہیں لیکن ابھی تک قلبی اور جیبی کیفیت جوں کی توں ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ بیچ ڈالیں، سنا ہے آٹھ سو روپے کی ہے ایک کرسی۔  جیبی کیفیت ضرور تبدیل ہو جائے گی، سنا ہے کہ قلب کی کیفیت کا جیب کی کیفیت سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔

کرسی کی درگت اور تحریک انصاف کے تعلق پہ شاعری میں نئ اصلاحات سامنے آرہی ہیں۔  ایک شاعر نے کہا ہے کہ

لوٹا، کرسی اور طوفان

عمران خان، عمران خان

 کراچی میں کچھ لوگوں کو دلچسپی  ہے یہ جاننے سے کہ کیا جلسوں کی کرسیوں کی انشورنس کروائ جاتی ہے۔ اگر نہیں کروائ جاتی تو کرسی فراہم کرنے والوں کا کیا ہوگا۔ انکو اطلاع ہو کہ جلسے کے لئے کرسیاں قصوری صاحب نے خرید کر فراہم کی تھی۔ گھوڑے کے منہ سے خبر لانے والوں کا کہنا ہے کہ یہ انہوں نے اپنی متوقع حکومت میں اپنی متوقع کرسی کا صدقہ نکال کر خریدی تھیں، ایک کروڑ ساٹھ ہزار کا صدقہ، اندازہ کریں کہ اصل کرسی کی قیمت کیا وصولی جائے گی۔

عمران خان کہہ رہے ہیں کہ قصور سے اب اس سونامی کا رخ کراچی کی طرف ہے۔  سوال پوچھنے والے پوچھ رہے ہیں کون سی سونامی، کرسیوں کی سونامی۔ یہ اس قوم میں اب سوال کرنے کی عادت جڑ پکڑ رہی ہے جو ایک صحیح شگن نہیں بالخصوص سیاست کے لئے۔

یہاں ہمارے شہر کراچی میں پچیس دسمبر کو جلسے کے انعقاد کے لئے ہر کرسی پہ آیت الکرسی پڑھی جا رہی ہے تاکہ وہ محفوظ رہیں۔ اندیشہ ہے کہ جلسہ شروع ہونے سے پہلے اس سلسلے میں ایک اجتماعی دعا بھی کروائ جائے گی۔

ادھر شہر کی فرنیچر مارکیٹ والے پہلے خوش تھے دھڑا دھڑ، ادھر ادھر سے کرسیاں منگا کر اسٹاک جمع کر رہے تھے۔ کرسیوں کی مارکیٹ میں اضافے کا امکان تھا۔ بس ایک مرد کراچی، قصوری صاحب جیسا ڈھونڈھا جا رہا تھا۔ لیکن قصور کے عوامی جوش و خروش کو دیکھ کر انکا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ وسوسہ ہے کہ کہیں منتظمین کا ارادہ نہ بدل گیا ہو۔ سواب نہیں معلوم کہ کراچی میں جلسے کے عوام دری پہ بیٹھے گی یا پھر کرسی ملے گی۔

عوامی سطح پہ کرسیوں کی اس چھینا جھپٹی نے ایک بات ثابت کر دی کہ جیسے حکمراں ہوں عوام بھی ویسے ہی ہو جاتے ہیں۔ آپ بتائیے صحیح ہے یا غلط؟

8:45 AM

پاکستان, پنجاب, جلسہ, ریلی, سونامی, عمران خان, قصور, کراچی, کرسی

حاصل، لا حاصل

تمام لکھنے والے انسان کے متعلق لکھتے ہیں اور لکھنا چاہتے ہیں۔ جب وہ ظاہری طور پہ ایسا نہیں کرتے جب بھی وہ ایسا ہی کر رہے ہوتے ہیں۔ کیونکہ انسان اس کائینات میں جس چیز کو سب سے زیادہ جاننے کی  خواہش رکھتا ہے وہ بھی حیرتناک طور پہ خدا نہیں انسان ہے۔

بانو قدسیہ

کا ناول ہے 'راجہ گدھ'۔ ایک ناول جس میں انسان کی نفسیات کو شاید رزق کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کی گئ ہے۔ بانو قدسیہ ایک کہنہ مشق لکھاری اور ہمارے ملک کی ایک بڑی ادیبہ ہیں۔ خوش قسمتی سے اپنے پڑھنے والوں پہ اپنا اثر بھی رکھتی ہیں۔ کیونکہ غضب کے لکھنے والے تو ہوتے ہیں مگر پڑھنے والوں کو اپنے اثر میں لے آنا یہ ہر ایک کی قسمت نہیں ہوتی۔

انکے اس ناول سے میں نے ایک اصطلاح کا تعارف لیا، عشق لا حاصل۔ لا حاصل کا عشق انسان کو دیوانگی میں مبتلا کر دیتا ہے مجھے انکی تحریر سے یہ سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن یہ سمجھ نہیں آتا کہ عشق میں حاصل اور لا حاصل کی حد تمیز کہاں ہوتی ہے۔

عشق لا حاصل نہیں ہو سکتا۔ جو لا حاصل ہو وہ عشق نہیں ہو سکتا۔ اور ریاضی کے اس کلئیے سے تو ہم واقف ہیں کہ صفر سے جو چیز ضرب کھائے وہ صفر ہو جاتی ہے۔

ویسے عشق کا حاصل کیا ہوتا ہے؟ عرفان ذات، میرے خیال سے اگر عشق انسان کو عرفان ذات نہیں دیتا تو یہ عشق نہیں ہوتا۔

 انکے ناول میں رزق حلال اور حرام کے انسانی نفسیات پہ اثرات کا مطالعہ بھی آتا ہے۔ ہو سکتا ہے اسے پڑھنے والے بیشتر قاری اس سے متفق ہوں۔ مگر چند ایک اختلاف بھی رکھتے ہونگے۔ جیسے میں۔

کیونکہ عملی دنیا میں جو ہم دیکھتے ہیں وہ اس سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ایسے بہت سے لوگ ہیں جو کہ حلال زندگی نہیں گذارتے لیکن انکی اولاد یہ رجحان نہیں رکھتی۔ مثلا حضرت ابراہیم کے والد ایک بت تراش تھے جبکہ حضرت ابراہیم ایک بت شکن۔

 اس طرح رزق حلال انسان میں روحانی اطمینان تو پیدا کرتا ہے لیکن دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو حلال کماتے کھاتے ہیں پھر بھی سخت ترین دنیاوی آزمائیشوں میں گھرے رہتے ہیں اور یہ پے درپے آزمائیشیں ان سے دل کا سکون چھین لیتی ہیں۔ اور انسان یہ کہنے پہ مجبور ہو جاتا ہے کہ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے ہیں۔

کیا انسانی اخلاق یا تقدیر کا تعلق رزق سے ہوتا ہے ؟

کیا حلال رزق کھانے والے اعلی اخلاقی کردار رکھتے ہیں اور حرام کھانے والے  رذیل کردار؟ کیا حلال کھانے والے آسان تقدیر رکھتے ہیں اور حرام کھانے والے مشکل؟

کیا حلال اور حرام رزق انسان کے ڈی این اے پہ اثر انداز ہوتا ہے؟ کیا مکافات عمل واقعی کوئ وجود رکھتا ہے؟

انسانی نفسیات یا مختلف رویوں کے ماءخذ، لکھنے والے کے لئے اسرار کی اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک انسان یا انسانوں پہ مشتمل ایک معاشرہ کیوں ایک خاص رویہ یا رجحان رکھتا ہے؟ انسان نہ چاہتے ہوئے بھی کیوں ان چیزوں کا شکار ہو جاتا ہے جو اسے نا پسند ہوتی ہیں اور کیوں پسند کی چیزیں اس کی پہنچ میں نہیں آپاتیں؟ کیا یہ سب تقدیر ہے؟ لیکن کیا انسانوں کے لئے کوئ خاص قدرتی نہج موجود ہے؟ کیا سورج چاند ستاروں کی طرح انسان کے لئے بھی کوئ ایک مقررہ رستہ ہے یا اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے قدرت انہیں  الگ نظر سے دیکھتی ہے؟ قدرت اپنا یہ پیمانہ کس طرح مقرر کرتی ہے؟

 کل میں ایک اردو بلاگ سے گذری۔ یہاں  بلاگر نے اپنی اس تفصیلی پوسٹ میں جنس سے متعلق مختلف چیزوں پہ اپنے خیالات کو پیش کرتے ہوئے لکھا کہ جو بچے نفرت کے رشتے سے پیدا ہوتے ہیں وہ ذہنی طور پہ غیر متوازن شخصیت رکھتے ہیں اور صحت مند نہیں ہوتے۔

مصنف جنسی تعلق کو عبادت کے مقابل لاتا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ اگر عبادت میں خشوع و خضوع نہ ہو تو عبادت رائگاں ہوتی ہے۔ جنسی عمل میں بھی اگر صداقت نہ ہو تو یہ کمزور انسانوں کو وجود میں لاتا ہے اور کمزور انسان کمزور معاشرے کو جنم دیتا ہے۔ انکی اس تحریر سے میں نتیجہ نکالتی ہوں کہ ایک ایسے تعلق، جس میں جذباتی وابستگی نہ ہو، محبت نہ ہو، حاصل  لا حاصل کے برابر ہوتا ہے۔

اگر عشق لا حاصل دیوانگی دیتا ہے اور اگر نفرت کا تعلق کمزور انسان  اور اگر یہ انسان کے ڈی این اے کو بھی متائثر کرتے ہیں تو یہ سلسلہ زنجیر کی مانند چلتے رہنا چاہئیے اور مستقبل ہمیں تاریک نظر آنا چاہئیے۔ لیکن ہمارے دلوں پہ امید کیوں دستک دیتی ہے۔ اور ہم مستقبل سے اپنے لئے کیوں خوشی چاہتے ہیں؟

10:32 PM

اردو, اردو بلاگرز, بلاگر, بلاگنگ, جنس, ہوس

بچوں سے بڑوں تک

میری بچی نے جیسے ہی سامنے پڑا ہوا کھلونا اٹھایا اسکی ہم عمر میزبان بچی نے لپک کر اسکے ہاتھ سے لینے کی کوشش کی۔ یہ دیکھ کرمشعل نے اس پہ اپنی گرفت اور سخت کر دی۔ 'مجھے یہ اچھا لگ رہا ہے میں اس سے کھیلونگی'۔ اس نے احتجاج کیا۔ میزبان بچی نے کہا نہیں یہ میرا ہے۔ میں اس سے کھیلتی ہوں ۔ ماں نے کہا وہ تمہارے گھر مہمان آئ ہے تھوڑی دیر میں چلی جائے گی۔ تم اسکے ساتھ کھیل لو لیکن بچی نے یہ تسلیم نہیں کر کے دیا۔ میں نے مشعل کو سمجھایا کہ یہ تمہارا نہیں ہے اسکا ہے۔ واپس رکھ دو۔ لیکن اسے یہ بات نہیں سمجھ آ رہی تھی کہ سامنے اتنے سارے کھلونے موجود ہیں تو وہ کیسے ان میں سے کسی کو ہاتھ نہیں لگا سکتی۔

یہ سب کچھ ترقی یافتہ،  پہلی دنیا کے اس حصے میں ہو رہا تھا جہاں ٹی وی پروگرامز میں یہ نصیحت بچوں کو ہی نہیں والدین کو بھی بار بار کی جاتی ہے کہ شیئر کرو، شیئر کرنے کی عادت ڈالیں۔ چاہے وہ بارنی شو ہو یا ڈورا دی ایکسپلورر۔

 صرف یہی ایک گھر نہیں،  بلکہ ہم وہاں رہتے ہوئے جس گھر میں بھی گئے وہاں بچوں کا کم و بیش یہی رویہ تھا۔ گھروں میں ہر طرح کے کھلونوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا لیکن میزبان بچے کو یہ فکر کہ آنے والا مہمان بچہ کہیں اسکے کھلونوں سے کھیلنے نہ لگے۔ اکثر بچے اس کے لئے مار پیٹ پہ آمادہ۔ وہ کھیلنے سے زیادہ اس باتکے لئے فکر مند تھے کہ نیا آنے والا بچہ کہیں انکی چیزوں پہ قابض نہ ہو جائے۔ چیزیں انکے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

اسکے چند مہینے بعد ہم پاکستان میں

گوادر

جیسی پسماندہ جگہ پہ موجود تھے۔ نیم دیہاتی سا علاقہ جہاں بچے سارا سارا دن گلیوں میں گھومتے رہتے ہیں ایک دوسرے کے گھروں میں ٹہلتے رہتے ہیں۔ یہ نہیں معلوم چلتا کہ یہ حقیقتاً کس بچے کا گھر ہے۔  انکی دنیا میں  بہت محدود تعداد میں کھلونے ہیں۔ مگر حیرت انگیز طور پہ میں نے یہاں یہ گردان نہیں سنی کہ یہ میرا ہے۔

در حقیقت کسی بچے کو اسکی فکر ہی نہیں تھی کہ کیا میرا ہے۔ وہ صرف کھیلنا چاہتے ہیں آزادی سے، گھر میں، گلیوں میں، سمندر کنارے، مٹی سے، پانی سے، دوسرے بچوں سے۔

مگر دونوں جگہ کے  بڑے اپنے بچوں سے اتنے مختلف کیوں ہیں؟

8:53 AM

بچے, بلوچستان, پاکستان, شریک, کھیل, گوادر, مشعل

وینا ملک ہائے ہائے

اظہار بھی مشکل ہے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے

مجبور ہیں اف اللہ، چپ رہ بھی نہیں سکتے

ویسے تو خاموشی سنا ہے ہزار بلائیں ٹالتی ہیں۔ لیکن یہ محاورہ خاصہ پرانا ہو گیا ہے۔ جدید لغت کہتی ہے،  سب کہہ دو۔ لیکن ہوا یہ کہ وینا ملک کے موجودہ سنسنی خیز انداز پہ عوام ایک گوماگوں حالت میں ہیں۔ سب دیکھ سکتے ہیں اور دیکھ رہے ہیں لبوں میں انگلیاں دبائے پرسب کہہ نہیں سکتے اور کہنے کو اتنا کچھ ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کھوہ میں جا کر نکالیں۔  حسین جب  دکھ دیتے ہیں تو ایسے جان لیوا دکھ دیتے ہیں جنہیں کبھی رو کر اور کبھی ہنس کر سہنا پڑتا ہے۔

یہ سب باتیں تو ڈھکے چھپے انداز میں تقریباً سبھی کے پاس پہنچ چکی ہیں کہ وینا ملک کو تحریک انصاف میں شامل ہوجانا چاہئیے کہ انہوں نے اپنے

تمام اثاثے ظاہر

کر دئیے ہیں۔

کچھ لوگوں نے عدالت عالیہ سے مطالبہ کیا ہے کہ وینا ملک کی شہریت کینسل کی جائے اس پہ کچھ اور لوگوں نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ عدالت عالیہ کو وینا ملک کو عدالت میں بلا کر اس بات کی تصدیق چند مفتیوں کے سامنے کرنی چاہئیے کہ آیا وہ انکی تصویر ہے بھی یا نہیں۔

ادھر عمران خان بار بار عندیہ دے رہے ہیں کہ وہ اپنے اثاثے ظاہر کریں گے اور چند دانا کہہ رہے ہیں کہ

ظاہر وہ سب کریں پر نہ خدا کرے کہ یوں

یہ تصویر ایک عجیب معمہ سی بن گئ ہے. حالانکہ اسے ان تصویروں کے خانے میں رکھا جا سکتا تھا جو ناصح کا منہ بند کرنے کے لئے پیش کی جاتی ہیں۔

یا تنگ نہ کر ناصح ناداں مجھے اتنا

یا چل کر دکھا دے دہن ایسا، کمر ایسی

پر ایسا کیوں ہے کہ مجھ ایسے اوسط روایت پسند پاکستانی کو جسے اسے دیکھ کر منہ چھپانا چاہئیے  اسے دیکھ کر ہنسی  آنے لگتی ہے۔ کیا یہ تصویر پہ موجود الفاظ آئ ایس آئ کا کمال ہے۔

آخر اس پہ آئ ایس آئ کیوں لکھا گیا ہے؟

کیا اسکا مطلب ہے ایسے آئ ہے؟

کیا میمو گیٹ اسکینڈل کی طرح وینا ملک کی اس کھُلی تصویر میں کوئ پوشیدہ پیغام چھپا ہوا ہے۔ اس تصویر کا حقانی کون بنے گا؟

کیا ہماری محبوب آئ ایس آئ اتنی ترغیب دینے والی ادا رکھتی ہے؟

کیا آئ ایس آئ اپنے حسن کی داد پانے کو کچھ بھی کر سکتی ہے؟

کیا آئ ایس آئ اتنی دلیر اور جراءت مند ہے؟

کیا آئ ایس آئ کی پروڈکٹس اتنی دل لبھانے والی ہوتی ہیں کہ دوسرے اپنے اوپر قابو نہیں رکھ سکتے؟

کیا آئ ایس آئ استعمال کرنے والے اوسان خطا کرنے والی قوت حاصل کر لیتے ہیں؟

یا اسکا مطلب ہے کہ ہشیار باش آئ ایس آئ کی اس نئ پروڈکٹ سے بچ کر دکھائیں؟

 وینا ملک نے پہلے کہا کہ آئ ایس آئ کا نام تو یونہی دل پشوری کے لئے لکھا گیا تھا کیونکہ انڈیا میں کسی کو چھینک بھی آجائے تو وہ آئ ایس آئ کا نام لیتا ہے۔ لیکن اپنے تازہ ترین بیان میں وہ اس سے پھر گئیں۔ ایسے ہی جیسے مرتے وقت آنکھیں پھر جاتی ہیں۔ زمانے بھر کے حسینوں میں کچھ ادائیں کتنی مشترکہ ہوتی ہیں۔ اس لئے آرٹ مشترکہ وراثت کہلاتا ہے۔

  دنیا میں پچاس ادارے ایسے ہیں جنکا نام آئ ایس آئ ہے۔ انکا کہنا اب یہ ہے۔ یہ پٹی غالباً انکے وکیل نے پڑھائ ہے۔ حالانکہ وہ شرما کر یہ بھی کہہ سکتی تھیں کہ یہ اتفاق ہی ہے کہ میرے محبوب کے نام کا مخفف بھی آئ ایس آئ ہے مگر ایک تو اس سے انکی پبلک ڈیمانڈ میں کمی آجاتی۔ دوسرا یہ کہ تصویر کا تعلق اب تک کبیر شرما سے ہی جوڑا گیا ہے شرم سے نہیں۔  شرم، شرما اور اس تصویر کو اکٹھا کرنے سے فریم خاصہ ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔ نیوڈ آرٹ کو سراہنے کے لئے شرم ایک بے جا چیز ہے۔ جس نے کی شرم اسکے پھوٹے کرم۔

سنتے ہیں کہ وزیر داخلہ

رحمن ملک

کو اس بارے میں تحقیات کا حکم ہے۔ تحقیقات شروع کرنے سے پہلے انہوں نے یقین دلایا کہ انہوں نے یہ تصویر نہیں دیکھی ہے اور 'اگر' وینا ملک کی کوئ ایسی تصویر موجود ہے تو انکے خلاف کارروائ ہو گی، 'سخت کارروائ'۔ یہ دھمکی انکے منہ سے بالکل وہی تائثر دے رہی ہے جو امریکہ کو دھمکی دیتے وقت معلوم ہوتا ہے۔

میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تحقیق کی وجہ سے رحمن ملک صاحب کو یہ تصویر دیکھنا پڑے گی۔ اسکا گناہ کس کے سر جائے گا؟

یہ نہیں معلوم کہ تحقیق کس بات کی کریں گے۔ اس کی کہ تصویر اصلی ہے یا نقلی؟ یا یہ کہ اسے توہین آئ ایس آئ کہا جائے کہ توہین حُسن؟

وینا ملک اس سے پہلے بھی ایسے صدمے دے کر خود کمال مہارت سے اپنے آنسو بہا اور دوسروں کے پونچھ چکی ہیں۔ چال چلن کہتا ہے کہ اگر وہ میدان سیاست میں صدق دل سے قدم رکھ دیں توعمران خان کے چھکے چھڑا دیں گی۔ آخر ان دونوں میں فرق ہی کیا ہے۔ وہ آ کے بیٹھے ہیں میکدے میں، وہ اٹھ کےآئے ہیں میکدے سے اور دونوں پہ ہی آئ ایس آئ کی چھاپ ہے۔ بس چند ندامتی آنسو ، سر پہ دوپٹہ، امریکہ کے خلاف نعرے وینا ملک ہائے ہائے کو وینا ملک آئے آئے میں تبدیل کر دے گا۔

  اب صرف یہی دلچسپ بات نہیں کہ اس دفعہ وہ کیسے اس سے جان چھڑاتی ہیں بلکہ یہ بھی کہ تخلیق کار کیسے اس ہائ اینٹرٹیمنٹ کو استعمال کر پاتے ہیں۔ کیونکہ اس راہ میں نکتہ ء تخلیق کچھ زیادہ واضح مقامات پیچ و خم سے گذر کر آ رہا ہے۔ ایسے میں تخلیقی الجھن یہ ہے کہ اس خطرناک چلمن کے کتنے قریب ہوں جو صاف دکھے بھی نہیں اور کچھ چھپے بھی نہیں مزید یہ کہ تخلیق کار کا دین و دل اپنی جگہ قائیم رہیں۔

پاکستانی زبان و بیان میں ایک نئ علامت بن کر ابھرنے والی اداکارہ کی ایک پچھلی ایک یاد۔

10:30 PM

اداکارہ, انڈیا, پاکستان, تحریک انصاف, رحمن ملک. عمران خان, عریانیت, وینا ملک

کراچی میں محرم

اب یہ تو دینیات والے جانیں یا سوشیالوجی والے کہ کیسے مختلف رسوم و رواج مذاہب میں نہ صرف شامل ہوجاتے ہیں بلکہ اسکے جوش و خروش میں اضافے کا باعث بن جاتے ہیں مثلا میٹھی عید پہ سویاں یا شیر خورمہ بننا اور محرم میں حلیم بنانا۔

محرم میں حلیم کیوں بنایا جاتا ہے؟

اسکے بارے میں جو روایت ہم تک پہنچتی ہے وہ کچھ یوں ہے کہ قافلہ ء حسین  جب ظلم یزید کا شکار دریائے فرات کے کنارے خیمہ زن تھا تو غذا کی کمی کو پورا کرنے کے لئے بچا کھچا تمام اناج ملا کر کھانا پکایا گیا تھا۔ اب یہ ارتقاء ہی کہلائے گا کہ شدید الم کے عالم میں بنایا جانے والا کھانا ہزار سال بعد حلیم جیسی لذیذ شے میں تبدیل ہو گیا اور آج ہم حلیم نائٹ مناتے ہیں۔

میری ایک جاننے والے خاتون ایک دن کہنے لگیں کہ سنّی مذہب میں ایک بنیادی بات بڑی اچھی ہے۔ وہ کیا؟ ہم نے استفسار کیا ۔ جواب ملا، وہ یہ کہ تمام مذہبی رسومات کھانے پینے سے تعلق رکھتی ہیں۔ گیارہویں شریف ہو، عید، بقر عید ہو یا رمضان شب براءت۔ ہر ایک کے ساتھ کھانا پینا جڑا ہوا ہے۔ اب محرم ہی کو دیکھ لو سنّی اس میں بھی حلیم پکاتے ہیں، کھلاتے ہیں اور کھاتے ہیں۔ حلیم تو حلیم، شربت کتنا بانٹتے ہیں۔

مگر یہ کام تو شیعہ بھی کرتے ہیں۔ ہم نے تو شیعوں کا حلیم بھی خوب کھایا ہے۔ میں نے انکی بات پہ حیرانی کا اظہار کیا۔ کہنے لگیں ارے پہلے انکے جتنی محنت تو کرو۔ پورے ڈھائ مہینے مجلسوں میں پے در پے شرکت کرنا، ڈھائ مہینے سوگ کے کرب میں مبتلا رہنا اور پھر کھانا پینا کرنا۔ اگر ایک دفعہ اس سارے عمل سے گذر جاءو تو پتہ لگ جائے گا۔ کتنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس کے مقابلے میں سنّی ہونا آسان اور مزے کا کام ہے۔

اچھا تو پھر یہ بات آپ بھی تسلیم کریں کہ صدیوں سے اس واقعے کو تصوراتی طور پہ قائم کرنا اور پھر اسکی منظر کشی میں سننے والوں کو شامل کرنا اس فعل نے انکی تخلیقی سلاحیتوں کو اتنی جلا دی ہے کہ آج پاکستان، ہندوستان میں نمایاں لکھنے والوں کی بڑی تعداد شیعہ مذہب سے تعلق رکھتی ہے۔ میں نے ان سے کہلوانا چاہا۔ لیکن اسکے بعد تخیل اور تخلیق پہ ایک الگ گفتگو چلی۔ جو اس تحریر کے دائرے سے باہر ہے۔

بہر حال ایک سوال یونہی ذہن میں آگیا کہ کیا عقیدہ اپنے ماننے والوں پہ کوئ بنیادی اثر چھوڑتا ہے؟

 سنی اور شیعہ دونوں ہی محرم الحرام مناتے ہیں گو کہ الگ نظریات کے ساتھ لیکن اس سے شہر میں بڑی ہمہ رنگیت اور رونق  رہتی ہے۔ بقر عید کے مہینے سے ہی دوکانوں پہ کالے کپڑوں کا اسٹاک لگ جاتا ہے۔ اس دفعہ میرے ذہن سے بالکل نکل ہی گیا تھا اور بازار جا کر میں نے سوچا کہ اس دفعہ سردیوں میں لگتا ہے کہ کالا رنگ فیشن کے افق پہ چھایا رہے گا ہر دوکان پہ یہ رنگ ڈھیروں ڈھیرہے۔ لیکن نہیں یہ محرم کی تیاری تھی۔

ہم جہاں رہتے ہیں یہاں قریبی ہر نکڑ پہ امام بارگاہ موجود ہے۔ محرم  سے لے کر ربیع الاول تک ان امام بارگاہوں میں بڑی رونق رہتی ہے۔ امام بارگاہوں پہ روشنی کا خاص انتظام ہوتا ہے۔ اور ساتھ ساتھ اب سیکیوریٹی کا بھی۔ اگرچہ قریبی امام بارگاہ تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پہ ہے لیکن رات کو ایک بجے بھی میں نعرہ ء حیدری سن سکتی ہوں۔

اب سے چند سال پہلے تک سنّی بھی ان جلوسووں میں شرکت کرتے رہے ہیں۔ پانچ چھ سال پہلے مجھے بھی نو محرم کو صدر کے علاقے میں جسے شاید محلہ خراساں کہتے ہیں رات گذارنے کا موقع ملا۔ ایک شیعہ دوست ساتھ میں تھے۔ سبیلیں لگی ہوئ ہیں۔ شربت بٹ رہا ہے۔ لوگ ایک قافلے کی صورت کالے کپڑے پہنے رواں ہیں۔  زنجیروں کا ماتم ہو رہا ہے۔ تعزئیے آ جا رہے ہیں۔ بچے ،خواتین ، بوڑھے جوان سب ان میں شریک ہیں۔  ساری کمیونیٹی اکٹھا ہے۔ سب اپنی سرگرمیوں میں مصروف۔ باہر نکلے تو  قائد اعظم کے مزار کے پاس دیگیں لائن سے لگی ہوئیں جانے کتنی۔ حلیم کی تیاری زوروں پہ۔

اب اس سارے قصے میں حلیم پھر سے آگیا۔ حالانکہ  محرم کا بنیادی الم کا موضوع پانی کی عدم دستیابی وہ بھی ایسی کہ دریا کا پانی چند گز کے فاصلے پہ موجیں مار رہا ہے مگر اس تک پہنچنے کے لئے خون کا دریا پار کرنا ہے۔

اور جبکہ ہمارے شیعہ دوست بتا رہے تھے کہ کس طرح انکا سلسلہ ء نسب کس امام سے جا کر ملتا ہے۔ میں اپنی والدہ کا بچپن دیکھ رہی تھی جو لکھنوء میں گذرا۔ اور جہاں انکے بقول محرم میں چاہے گھر والے جائیں یا نہ جائیں ہم بہن بھائ مجلسوں میں جاتے تھے تبرکات کھانے کے لئے چپکے سے گھر سے فرار ہو کر۔

اس وقت ایسی کوئ منادی نہیں تھی کہ  شیعہ مجالس میں سنّی نہیں جائیں گے۔ لکھنوء میں تعزئیے بڑے خوبصورت بنائے جاتے تھے اور انکے والد یعنی ہمارے نانا اپنے بچوں کو تعزئیے دکھانے بھی لے جاتے تھے۔ان تعزیوں اور جلوسوں کا تذکرہ رجب علی بیگ نے بڑے اہتمام سے اپنی ایک تحریر میں کیا ہے۔ یہ تقسیم ہندوستان کے خاصے بعد کی بات ہے۔ آجکل تو وہاں بھی ان جلوسوں پہ پابندی ہے۔

البتہ یہ کہ میرے والد صاحب ہجوم والی جگہوں پہ بچوں کو نہیں جانے دیتے۔ انہیں اس بات  کی پریشانی رہتی تھی کہ بچے ادھر ادھر نہ ہو جائیں۔ ہم   نےبھی مختلف پالے ہوئے خوف کی بناء پہ کبھی والدین کی آنکھوں میں دھول جھونک کر  ان جلوسوں کو دیکھنے کی کوشش نہ کی۔

ادھر لکھنوء میں تو تعزئیے سنّی بھی بنایا کرتے تھے۔ خود میرے بچپن میں، یہاں کراچی میں ایک دوست کے گھر میں محرم میں اجرت پہ تعزئیے بناتے تھے۔ انکے گھر میں، میں نے بڑے خوبصورت تعزئیے رکھے دیکھے۔ مجھے تو وہ اس وقت پریوں کے گھر لگا کرتے تھے۔

وقت گذر گیا، ہر طرح کا وقت گذر ہی جاتا ہے۔ اب بھی اس شہر میں حلیم کی دیگیں چڑھتی ہیں، بچے سبیلوں کے چندے مانگتے ہیں، شربت بانٹا جاتا ہے۔ لیکن اب دل میں یہ خوف رہتا ہے کہ دیکھیں کہاں سے کس وقت دھماکے کی یا فساد کی خبر آتی ہے۔

روڈ پہ میں نے بڑے بڑے بینرز لگے دیکھے عشرہ ء عمر و حسین۔ مذہبی رواداری پیدا کرنے کی ایک اچھی مثبت کوشش۔ اس بات کو دوہراتے ہوئے کہ نہ ایک نظریہ مکمل طور پہ ختم کیا جا سکتا ہے اور نہ دوسرا نظریہ مکمل طور پہ چھا سکتا ہے۔ اختلاف میں خوبصورتی ہے۔ ہم  نعرہ ء حیدری کے درمیان حلیم کھاتے ہیں۔ پانی کے لئے یہ کہ پانی پیو تو یاد کرو پیاس حسین کی۔

11:15 AM

پاکستان, تعزیہ, حلیم, سنّی, شیعہ, کراچی, لکھنوء, محرم الحرام

میرے مسائل اور انکا حل

جس طرح ماہر جدی پشتی حکیم یہ دعوی کرتے نظر آتے ہیں کہ ہر مرض کاعلاج موجود ہے اسی طرح میں بھی کہہ سکتی ہوں کہ ہر مسئلے کا حل موجود ہے۔

حالانکہ کبھی کبھی گمان گذرتا ہے کہ اکثر ہمارے مسائل اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ انکے حل ہمارے پاس نہیں ہوتے۔ اس طرح سے انسان مکڑی کی طرح خلوت کی زندگی گذارنے کے بجائے چیونٹیوں کی طرح سماجی جانور بننے پہ مجبور ہو جاتا ہے۔

اگر آپ یہ جانتے ہیں کہ آپکے کسی مسئلے کا حل کہاں سے ملے گا تو یہ ایک خوش قسمتی ٹہرتی ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ ذریعہ آپکی پہنچ میں ہے یا نہیں۔

مجھے بھی آجکل کچھ مسائل کا سامنا ہے۔ مسئلہ نمبر ایک تو یہ کہ میرے بلاگ کی فیڈز مختلف ایگریگیٹر پہ آنا بند ہو گئیں۔ سب سے پہلے میں یہ بات اردو سیارہ پہ نوٹ کی۔ خیال گذرا کہ انہیں مجھ سے کچھ دبی دبی سی شکائیتیں رہتی ہیں۔ اس لئے شاید اب جان چھڑانی چاہی ہو۔ لیکن نہیں اس بد گمانی کے ساتھ یہ بھی تھا کہ انکی بلاگر لسٹ پہ میرا نام اور اسکی فیڈ اب بھی موجود ہے۔

فیس بک پہ یہ الجھن عرض کی تو جناب محمد بلال محمود صاحب نے خیال ظاہر کیا کہ ہو سکتا ہے فیڈ برنر کے ساتھ کچھ مسئلہ ہو۔ انکے دئیے ہوئے لنک پہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ اگر آپکا بلاگ ۵۱۲ کلو بائیٹس سے زیادہ بڑھ جاتا ہے تو آپکی فیڈ بند ہو جائے گی اور یہ دوبارہ اسی صورت بحال ہو گی جب اس میں توسیع کی جائے۔ اسکے لئے طریقہء کار دیا ہوا تھا۔ اس پہ عمل کیا۔  توسیع تو مل گئ لیکن پتہ تبدیل ہو گیا۔ یہ نیا پتہ عثمان، کو دیا کہ سیارہ کی انتظامیہ کو دے دیں۔ کیونکہ ہم نے ان سے جس پتے پہ  رابطہ کیا اس پہ  جواب ندارد۔ عثمان نے اطلاع دی کہ وہ دے چکے ہیں۔ شاگرد عزیز کا شکریہ۔

اب اس بات کو بھی کافی دن گذر گئے ہیں۔ اس لئے اپنے قارئین سے گذارش ہے کہ اس بلاگ سے رابطے میں رہنے کے لئے چاہیں تو سبسکرائیب کر لیں ۔

ادھر ٹی بریک والوں سے بھی بات کی جس دن انہیں ای میل بھیجی اسی دن جواب آگیا کہ آپ اپنا بلاگ ایڈریس بھیجیں ہم چیک کرتے ہیں کیا مسئلہ ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انکے اپنے گوگل کے ساتھ مسائل چل رہے ہیں اور وہ اسے نبٹا رہے ہیں۔ اسکے بعد وہ ہمارے مسئلے کو دیکھیں گے۔

خیر مستقل قارئین کا بے حد شکریہ کہ وہ اس بلاگ سے رشتہ استوار رکھے ہوئے ہیں۔

دوسرا مسئلہ ذرا دلچسپ ہے۔  بلاگ سے ہٹ کر ایک تحریر کے لئے کچھ تحقیق کرنی ہے۔ اسکے لئے ان لوگوں کا تعاون درکار ہے جنکے والدین یا بزرگ انیس سو سینتالیس میں تقسیم کے نتیجے میں پاکستان آئے اور جو مشرقی پنجاب یا راجستھان سے تعلق رکھتے ہوں۔ میں ان سے گفتگو کرنے میں دلچسپی رکھتی ہوں۔ اگر آپکے ارد گرد کوئ ایسا شخص موجود ہے تو میں اس سے اسکائپ کے ذریعے  یا کسی ایسے ذریعے سے بات کرنا پسند کرونگی جس تک وہ بآسانی پہنچ سکیں اور انکا کوئ خرچہ بھی نہ ہو۔ مجھ سے رابطے کے لئے یہ ای میل ایڈریس ہے۔

 aniqaamar@yahoo.com

آجکل ایک بلاگی ساتھی کے کینیڈا میں مقیم ایک بزرگ سے اسی طرح، اس موضوع پہ بات ہو رہی ہے

اس مسئلے کا ایک اور حل بھی سامنے آیا جب کسی نے مجھے یہ بتایا کہ کراچی میں

اورل ہسٹری

کے نام سے ایک پروجیکٹ پہ

سٹیزن آرکائیو

والے کام کر رہے ہیں اور انکے پاس ایسے لوگوں کے ریکارڈ کئے ہوئے انٹرویوز اور تصویریں موجود ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ انکے پاس ایسے لوگوں سے رابطہ کرنے کے لئے پتے بھی موجود ہوں۔ انکے ایک نمائیندے سے معلومات کیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ انہیں ای میل کر کے درخواست بھیجیں۔ وہ ضرور اسکا جواب دیں گے۔

بات تو صحیح ہے انہوں نے یہ ہسٹری جمع تو اسی لئے کی ہو گی کہ جو اس سے مستفید ہونا چاہے اسے آسانی سے مل جائے۔ چنانچہ انہیں ایک ای میل کر دی۔ اب دو دن سے منتظر ہوں کہ کیا وہ بھیجتے ہیں جواب میں۔

ہر مسئلے کا حل موجود ہے نہیں ہے تو نکل آئے گا۔ نہ نکلے تو ایک مسئلے کو کیا دل سے لگا کر بیٹھیں رہیں۔ اگلے والے کو پکڑ لیں۔ بعض اوقات اگلے والوں پہ کام کرنے سے پیچھے والے خود درست ہو جاتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟

12:02 PM

اردو, اسکائپ, اورل ہسٹری, بلاگنگ, پاکستان, تقسیم ہندوستان, سٹیزن آرکائیو, فیڈ برنر, کراچی, کینیڈا

سوشل میڈیا کے عہد میں محبت

شاعر نے صحیح کہا تھا کہ مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ۔

تصور کریں، چند سال پہلے جو شخص آپکی محبت میں مبتلا ہونے کے دعوے کرتا ہو وہ ایک دن یہ بہانہ بنا کر آپکی زندگی سے چھلاوے کی طرح غائب ہو جائے کہ میں اپنے والدین سے بغاوت نہیں کر سکتا، اماں بیلن سے پٹائ لگادیں گی ابا اٹھک بیٹھک کرنے سے لگا دیں گے۔  پھوپھی کی بیٹی کے نندوئ کو ہماری شادی پہ شدید اعتراض ہوگا۔  محلے کا کتا آپکو دیکھ کر عجیب طرح سے بھونکتا ہے۔ آپ مدنی برقعہ پہن کر چل نہیں پائیں گی  جبکہ والد صاحب کو اس برقعے میں کیٹ واک کرتی بہو چاہئیے۔ آپکی نشیلی آنکھیں پہلے عشق کی یاد دلاتی ہیں، ہم کہاں تک اسے یاد کرتے جائیں۔  چڑیل یا لنگور منگیتر کو یہ آئیڈیا زہر لگتا ہے۔

پھر ایک عرصے کے بعد جب اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا کہہ کر اپنے کام دھندوں میں لگ جاتے ہیں، وہ اچانک فیس بک پہ نمودار ہوتا ہے اور یہ جاننا چاہتا ہے کہ آپ وہی ہیں ناں جن سے کبھی دل کا رشتہ استوار ہوا تھا۔ اور جب آپ اسکا جواب اثبات میں دیتے ہیں تو وہ اگلا پیغام اس طرح کا دیتا ہے میں آجکل فلاں ملٹی نیشنل کمپنی میں سالانہ لاکھوں روپے کما رہا ہوں۔ ایک خوبصورت اور محبت کرنے والی بیوی ہے اور دو انتہائ پیارے بیٹے۔ بس یہ سب اللہ کا فضل و کرم ہے۔

اگر آپ ایک مرد ہیں تو ایسا شاذ ہی ہوگا کہ آپ پہ ایک زمانے میں واری کوئ خاتون  آپکو فیس بک پہ ڈھونڈھ نکالے محض یہ بتانے کے لئے کہ اسکا شوہر ایک مالدار شخص ہے حسین بچے ہیں جو اعلی اسکولوں میں پڑھتے ہیں اور پروردگار کے کرم سے اسے دنیا کی ہر آسائیش میسر ہے۔ لیکن پھر بھی ایسا ہو تو آپ کیا کریں گے؟

کیا عشق کے عین، شین اور لام قسم کی تحاریر پہ دو حرف بھیج کر پروردگار کا شکر ادا کریں گے کہ بر وقت شادی کر کے آجکے دن اپنی ساکھ بچا لی۔ اپنے جیون ساتھی پہ ایک پیار بھری نظر ڈالیں گے جس سے وہ بےساختہ پوچھ بیٹھے گا کہ بدلے بدلے میرے سرکار نظر آتے ہیں اور آپ زیر لب گنگنائیں گے یہ اسکی دین ہے جسے پروردگار دے۔

کوئ شخص اگر نوجوانی میں مر جائے تو یاد کرنے والوں کے دل میں ہمیشہ جوان رہتا ہے مگر خدا ایسا دشمن کے ساتھ بھی نہ کرے کہ محبت یوں ڈراءونا بھوت بن کر سامنے آکھڑی ہو۔ اور آپ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کریں کہ چلو اچھا ہوا بارہ آنے کا گلاس یعنی ایک دل ہی ٹوٹا، مستقبل بچا رہا۔ دل کے متعلق تو غالب نے پہلے ہی تاکید کر رکھی ہے  اور لے آئیں گے بازار سے اگر ٹوٹ گیا۔ اور جہاں میں کون ایسا ہے جو غالب کا طرفدار نہیں۔

ویسے اکثر یہ سوال بھی ذہن میں آتے ہیں کہ یہ اللہ کا فضل و کرم مطلقاً کیا چیز ہوتی ہے؟ کیا ایسی چیز جو ایک شخص کے لئے ستم کا باعث بن جائے دوسرے کے لئے فضل اور کرم کہلائ جا سکتی ہے؟ کیا اللہ کا فضل وکرم کوئ آفاقی چیز نہیں؟ کیا دوسری محبت آجانے کے بعد پہلی محبت حرف غلط کی طرح مٹ جاتی ہے؟ چلیں اچھا اگر مٹ بھی جاتی ہو تو کیا پہلی محبت پہ اپنی موجودہ خوشحالی اور خوشی و انبساط کو ظاہر کرنا ضروری ہوتا ہے؟

کتا کچھ لوگوں کو دیکھ کر عجیب طریقے سے کیوں بھونکتا ہے؟

پھوپھی کی بیٹی کا نندوئ ایسے مواقع پہ اتنا مددگار کیوں ہوتا ہے؟

بچپن کا / کی منگیتر اتنی اچانک کہاں سے وارد ہوجاتا / ہو جاتی ہے؟

جو والدین کے خلاف بغاوت نہیں کر سکتے وہ حکومت کے خلاف بغاوت کرنے پہ کیوں آمادہ رہتے ہیں؟

برقعے میں کیٹ واک سکھانے کے ادارے کیوں نہیں ہیں؟

شراب کو حرام کہنے والے نشیلی آنکھوں پہ کیوں فدا رہتے ہیں؟

پہلی اور دوسری محبت کا فیصلہ کیا تاریخ دیکھ کر ہوتا ہے؟

واللہ، بس اسی لئے مجھے فلسفہ ء محبت کی گہرائیوں میں جانے سے گریز رہا۔

 اب یہ نہ سمجھئیے گا کہ

 بلاگنگ کر رہا ہوں، کبھی فیس بک پہ جا رہا ہوں

کسی بے وفا کی خاطر سوشل میڈیا آزما رہا ہوں

مجھے تو صرف یہ کہنا ہے اللہ تیرا شکر ہے۔

3:05 PM

سوشل میڈیا، آئیسٹائین, عشق, فیس بک, محبت

تبدیلی کا ایوارڈ

بلاگرز کی اکثریت

بلاگ ایوارڈز

میں مصروف ہے۔ میں نے اسے پہلے نظر انداز کئے رکھا کہ میرے ذاتی خیال میں ایوارڈز میں لابنگ کا خاصہ حصہ ہوتا ہے اور جب بلاگ ایوارڈز والے خود ہی کہہ رہے ہیں کہ ووٹ کے لئے اندھا دھند لوگوں پہ چڑھ دوڑیں تو یہ تو ہمارے ایک دوست کے بقول جمہوری ایوارڈ ہو گئے۔ اور پاکستان کی  جمہوریت ہم سب کی دیکھی بھالی ہے۔  پھر ایک اور ساتھی کے اصرار پہ نومینیشن کی کوشش کی، ایجنٹ آف چینج کی کٹیگری میں اپنے بلاگ کو ڈالنے کی ہمت کی۔ یہ نومینیشن شاید ہماری کسی غلطی کی وجہ سے نہ ہو سکی۔ اب ہم آرام سے ہیں۔

سو آجکل فیس بک پہ لوگ ووٹ مانگتے نظر آتے ہیں۔ ان سے جان چھڑانے کے لئے لوگوں نے اپنی دیواروں پہ یہ نہیں لکھا کہ دیکھو یہاں کتا پیشاب کر رہا ہے۔ البتہ جعلی ووٹ ڈالنے کے طریقے بتا دئیے ہیں۔ ہائو سوئیٹ۔ میں نے نوٹ کیا کہ اسکے بعد ووٹ مانگنے کے اسٹیٹس کم نظر آئے۔

ایک بلاگ اسٹیٹس ایسا بھی نظر آیا جو اپنے لئے نہیں میڈیا کے ایک مشہور صاحب کے لئے ووٹ مانگ رہا تھا۔ یہ صاحب انگلش میں بلاگنگ کرتے ہیں۔  کیا آپکو نہیں لگتا کہ جب انسان دنیا میں بہت کچھ حاصل کر لیتا ہے تو اسے کم از کم چھوٹی موٹی چیزوں کو اس لئے چھوڑ دینا چاہئیے کہ خاص طور پہ نوجوان کم از کم اسی کی تگ و دو میں مصروف رہیں۔ آخر تبدیلی کا عمل کہاں سے شروع ہوگا؟ جن کی طرف سے یہ اسٹیٹس تھا وہ پاکستان میں انقلابی تبدیلی کے خواہاں ہیں۔

ویسےسوشل میڈیا پاکستان میں کافی سرگرم ہے۔ لیکن پاکستان میں اسکے وہ اثرات نظر نہیں آتے جو ہم باقی ممالک میں دیکھتے ہیں۔ کیونکہ سوشل میڈیا پہ جو لوگ تبدیلی کے متعلق بہت زیادہ بات کرتے ہیں یہ وہ ہیں جو اپنے رابطے کی زبان اردو کو اپنی سوچ کی ترسیل کے لئے استعمال نہیں کرتے۔

اس سے میں تو یہی اندازہ لگاتی ہوں انہیں عوامی پیمانے پہ تبدیلی کی خواہش نہیں۔ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ عوام کے دیوتاءووں میں تبدیلی آجائے،ایسی تبدیلی جس میں انکے طبقے کو کوئ نقصان نہ پہنچے۔

اس لئے جب

شعیب صفدر

صاحب نے یہ بتایا کہ پچھلے سال ان ایوارڈز کی انتظامیہ کی توجہ انہوں نے اس طرف دلائ کہ اردو بلاگنگ بھی اپنا ایک منحنا وجود رکھتی ہے اور اسکے لئے بھی کسی خاص ایوارڈ کا اعلان ہونا چاہئیے۔  انتظامیہ نے انکی اس التماس پہ اردو کے لئے بھی ایک حصہ مختص کیا ۔ تو اس سے مجھے برصغیر میں انگریزوں کا دور یاد آگیا۔ ان سے بھی بر صغیر کے عوام کے لئے ایسی ہی درخواستیں کرنی پڑتی تھیں۔ انکا بنیادی مسئلہ تو یہ تھا کہ وہ یہاں سے تعلق نہیں رکھتے نہ جسمانی نہ جذباتی۔

مزے کی بات یہ ہے کہ یہ وہی اردو زبان ہے جسے بچانے کا ایجنڈا تحریک پاکستان کا حصہ تھا۔ تحریک کی صرف ایک چیز یاد رہی پاکستان کا مطلب کیا اور باقی سب بھول گئے۔ اسی پہ آج تک سارے جھگڑے چل رہے ہیں۔

میں اپنے ایک اور دوست کو یہ بات بتا رہی تھی کہنے لگے یہ ایوارڈز کروا کون رہا ہے۔ میں نے بتایا کہ یہ گوگل والے مرکزی کردار ہیں۔ کہنے لگے جو کروا رہے ہیں یہ سب سی آئ اے کے ایجنڈے پہ کام کرتے ہیں۔ انہیں عوام سے کیا مطلب، انکا مقصد پاکستان میں خواص کو خوش اور مصروف رکھنا ہے۔ اس لئے وہ اردو کی طرف کیوں توجہ کریں گے؟ کیا آپ نے یہ نہیں نوٹس کیا کہ اردو کو اب تک گوگل پہ سپورٹ حاصل نہیں۔ اردو میں بلاگنگ کرنے کے لئے مقامی نوجوانوں کے تجربات کی بھٹی سے گذرنا پڑتا ہے۔ وہ تپے ہوئے تھے۔ حالانکہ وہ بلاگر بھی نہیں ہیں۔

ہاں لیکن وہ کہتے ہیں کہ اردو مواد اتنا موجود نہیں ہے۔ میں نے دفاع کیا۔ اچھا تو تیلگو مواد موجود ہے جو بھارت کی علاقائ زبان ہے۔ انہوں نے مجھ سے سوال کیا۔ جس خطے میں انہیں جیسی تبدیلی چاہئیے ہوتی ہے وہ ویسی ہی سپورٹ رکھتے ہیں۔ یہاں ابھی وہ عوامی سطح کی تبدیلی نہیں چاہتے، اس لئے سوشل میڈیا پہ انگریزی کا قبضہ ہے۔ انگریزی کا جو نہ صرف اشرافیہ کے رابطے کی زبان ہء بلکہ جو ان اشرافیہ کو بیرونی طاقتوں سے فنڈنگ حاصل کرنے میں بھی مدد دیتی ہے۔ آپ کوشش کر لیں کہ اردو بلاگنگ کو آسان بنانے کے لئے کہیں سے فنڈنگ مل جائے۔ نہیں ملے گی۔ یہ انکا دعوی ہے۔ لیکن میں ایسی کوشش نہیں کرنے جا رہی۔ اسکی وجہ میرا ٹیکنیکلی زیرو ہونا ہے۔

یہ بیرونی طاقتوں کی بات تو ایک طرف خود اردو بلاگنگ انتہائ مخدوش حالت میں ہے۔ حالانکہ میرے اندازے کے مطابق اسے کوئ دس سال کا عرصہ ہو رہا ہے۔ لیکن اردو بلاگنگ نے جو مواد دیا ہے وہ قطعی ایسا نہیں کہ کوئ اس سے بار بار مستفید ہونے کے لئے آئے۔ قطعی غیر متائثر کن۔

اب اردو بلاگرز کو دیکھیئے، ان کی اکثریت ناپختہ ذہن کی مالک ہے یا یہ کہ وہ اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو پچھلے چالیس سالوں کی سیاسی اور مذہبی جدو جہد کے نتیجے میں آئ ہے یا یہ کہ انکی اکثریت بلاگنگ کو غیر سنجیدہ لیتے ہیں۔اور وہ انتہائ بے کار کی باتوں پہ بخوشی اپنا وقت لگاتے ہیں۔ اسکا فیصلہ میں آپ پہ چھوڑتی ہوں۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ چند ایک بلاگز کو چھوڑ کر انگریزی بلاگرز بھی کوئ تیر نہیں مار رہے ہیں۔ لیکن یہ کہ بہرحال انگریزی بلاگرز موضوعات کا تنوع رکھتے ہیں۔ کل ہی ایک خاتون بلاگرہ سے ملاقات ہوئ جنکے بلاگ کا موضوع ہے گملوں میں پودے کیسے اگائیں۔

جبکہ اردو بلاگز صرف دو طرح کے رجحانات رکھتے ہیں ایک جگت بازی، یعنی آئیے مل کر مذاق اڑائیں اور اگر وہ کوئ اور اردو بلاگر ہو جو مشترکہ طور پہ برا لگتا  ہو تو رنگ چوکھا دوسرا، آئیے مذہب کی تبلیغ کریں۔

ایک اور سوچ یہ ہے کہ اردو بلاگرز لگتا ہے

اردو سیارہ

کے لئے لکھتے ہیں۔ہم خیال بلاگرز ایکدوسرے کی ہاں میں ہاں ملا کر داد و تحسین کے ڈونگرے برساتے ہیں اور اللہ اللہ خیر صلّا۔  یہی وجہ ہے کہ اردو بلاگرز کے درمیان چپقلش اتنی بڑھ جاتی ہے کہ سیارہ پہ بلاگرز کے گروپ بن جاتے ہیں۔ بلکہ گروپ والی میری یہ بات بھی غلط ہی ہوگی کہ سیارہ بظاہر ایک خاص طبقے کا مرکز لگتا ہے چاہے وہ ایسا شعوری طور پہ  نہ کرتے ہوں۔

نتیجتاً اکثریت کے مزاج کے خلاف بات کرنے والے کو سیارہ سے باہر ہونا پڑتا ہے بعض دفعہ انکی انتظامیہ ایسا کرنے پہ مجبور ہوتی ہے اور بعض اوقات وہ بلاگر ہی اس جنجال پورے سے نکلنے میں عافیت سمجھتا ہے۔ ہر دو صورت میں وہ بلاگر اردو بلاگنگ چھوڑ دیتا ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ انگریزی بلاگنگ کے کسی ایگریگیٹر پہ یہ صورت حال پیدا ہوئ ہو اور لوگ اس ایگریگیٹر پہ صرف لڑائ کا مزہ لینے جاتے ہوں۔ اس لئے میں اسے ناپختہ رجحان میں رکھتی ہوں۔ اپنے آپکو بین الاقوامی سطح پہ دیکھنے کے بجائے کسی کچی آبادی کے کسی متوقع ڈیڈ اینڈ پہ دیکھنا اور خوش ہونا کہ خدا کا شکر ہے یہ دنیا یہی تک ہے اور میں اس چھوٹی سی دنیا میں محفوظ و مامون ہوں۔

ہم واپس ایوارڈز کی طرف آتے ہیں، ویسے تو ایوارڈز بانٹنا کوئ آسان کام نہیں۔

اگر آپ پاکستان میں کسی تبدیلی کے خواہاں ہیں تو ان ایوارڈز میں ووٹ ڈالتے وقت بلاگ کی کارکردگی کو ضرور دیکھیں ، چاہے آپ بلاگر کے نانا یا بھانجے یا دوست یا قبیلے کے ہوں اگر آپ اپنا یہ ووٹ صرف دوستی کا خراج ادا کرنے کے لئے دیتے ہیں تو پھر یاد رکھیں کہ جب حکمرانوں کی باری آئے گی تب بھی آپ یہی کریں گے۔

کیا میں امید کروں کہ کسی ایسے بلاگ کو ایوارڈ نہیں ملے گا جسے اس فہرست میں دیکھ کر میں سوچوں کہ اسے کس وجہ سے ایوارڈ ملا؟ اور اسکا پہلا جواب ہو اقرباء پروری۔

10:51 AM

اردو, اردو سیارہ, اقرباء پروری, انگریزی, ایوارڈذ, بلاگر, بلاگنگ, پاکستان, گوگل

مہمان کچھوے

 کیا آپ کراچی کی ایک اہم خوبی سے واقف ہیں جو آپ نہیں جانتے مگر کچھوے جانتے ہیں؟

دنیا کے بڑے شہروں میں کراچی کو ایک امتیازی حیثیت یہ بھی حاصل ہے کہ اسکے ساحل کو سبز سمندری کچھوے انڈے دینے کے لئے پسند کرتے ہیں۔

یہ کچھوے تیزی سے ختم ہوتی ہوئ حیاتیاتی نسل میں شامل ہیں۔ عالمی تحفظ حاصل ہونے کے بعد انہیں بچانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ اور وہ ساحل جہاں یہ انڈے دیتے ہیں وہاں انکے انڈوں اور نکلنے والے بچوں کو بچانے کا معقول انتظام کیا جاتا ہے۔

کراچی کے سینڈز پٹ کے ساحل پہ ایک ایسی ہی حفاظتی حیات گاہ موجود ہے۔

یہاں مجھے چھ سال پہلےدسمبر کی ایک سردرات جانے کا اتفاق ہوا۔ ساحل پہ رات کو دو بجے ہم یہ دیکھنے کے لئے موجود تھے کہ انڈوں سے کچھووں کے بچے کیسے نکلتے ہی سمندر کی طرف دوڑ لگاتے ہیں اور کیسے مادہ کچھوا انڈے دیتی ہے۔ تین بچوں کو مٹی کے ایک گڑھے سے سمندر کی طرف جاتےدوڑ لگاتے دیکھا۔ یہ اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ بآسانی آپکی ہتھیلی پہ سماجائیں۔

ایک کچھوا انڈے دینے کی تکلیف میں مبتلا ایک ریت کا گڑھا بنائے اسکے سرے پہ بیٹھا تھا۔ ان مناظر کو دیکھنے کے بعد دسمبر کی سمندری سرد ہواءووں کی چھیڑ چھاڑ ذرا بری نہ لگ رہی تھی۔

جی ہاں، یہ کچھوے اتنی ہی بڑی تعداد میں یہاں کا رخ کرتے ہیں کہ نومبر اور ددسمبر کی راتوں میں آپ بھی وہاں جانے کا منصوبہ بنا سکتے ہیں۔ ان مہینوں میں یہ یہاں آتے ہیں انڈے دینے اور پھر چند دن بعد ساحل انکے بچوں سے بھرا ہوتا ہے کہ ہر مادہ تقریباً سو انڈے دیتی ہے۔  امید ہے کہ آپکو کوئ نہ کوئ کچھوے کی سرگرمی دیکھنے کو مل جائے گی۔ جیسا کہ ہمیں کل ایک بار پھر حاصل ہوئ۔

کل شام کو خبر ملی کہ ایک اسکول کے بچے رات کو وہاں پہنچ رہے ہیں اور ہم اور مشعل چاہیں تو قسرت کی اس فیاضہ سے مستفید ہوسکتے ہیں۔ آتا ہو تو ہاتھ سے جانے نہ دیجیئو۔ ہم نے فوراً ہاں کہا۔

ہم اور مقامی اسکول کے یہ بچے تقریباً سوا آٹھ بجے تک سینڈز پٹ کی ایک ہٹ میں اکٹھا ہوئے۔ بچوں کو انکی ٹیچرز نے پہلے بٹھا کر کھانا کھلایا۔ ہم مشعل کو پہلے ہی کھلا چکے تھے۔ پھر نگراں وائلڈ لائف کے آفیسر نے بچوں کو مصروف رکھنے کے لئے سوالوں جواب کئے۔ بچوں کی عمر یہی کوئ آٹھ نو سال کے درمیان تھی۔ اس دوران انکا آدمی ساحل پہ یہ پتہ لگا آیا کہ کوئ کچھوا کہاں موجود ہے۔ سمندر جب ہائ ٹائڈ پہ ہو تو کچھووں کو ساحل تک پہنچنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس لئے توقع ہوتی ہے کہ ہائ ٹائڈ کے وقت وہ ضرور ساحل کا رخ کریں گے۔

لکھنے کے شوقین ہر جگہ قلم کاغذ پکڑ لیتے,

پاکستان کے سمندر میں

دو طرح

کے سمندری کچھوے پائے جاتے ہیں ایک

اولیو ریڈلی کچھوے

اور دوسرے

سمندر سبز کچھوے

۔  اولیو ریڈلی کچھوے چھوٹے ہوتے ہیں، یعنی محض چالیس کلو گرام کے۔ انکا رنگ اولیو یعنی  گہرے زیتون کے رنگ کا ہوتا ہے ان پہ دھاریاں ہوتی ہیں اور انکی موجودگی کو ریڈلی نامی سائینسداں نے معلوم کیا۔

سبز کچھوے بڑے ہوتے ہیں اوسط وزن تقریباً ایک سو پچاس کلوگرام کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ انکا رنگ سرمئ ہوتا ہے۔ پھر یہ سبز کچھوے کیوں کہلاتے ہیں؟

اس لئے کہ انکے جسم میں پائ جانے والی چربی خوبصورت سبز رنگ کی ہوتی ہے۔ اسکا یہ رنگ خیال کیا جاتا ہے کہ سمندری پودے کھانے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ سبز کچھوا سمندری پودے اور کائ وغیرہ کھاتا ہے۔

یہ سمندری کچھوے زمینی کچھووں سے مختلف ہوتے ہیں کہ انکے ہاتھ پاءووں کی جگہ تیرنے میں مدد دینے کے لئے چپو سے ہوتے ہیں انہیں فلپرز کہتے ہیں۔ زمینی کچھووں کی طرح سندری کچھوے نہ اپنا سر اپنے خول کے اندر کر سکتے ہیں نہ فلپرز اور نہ دم۔ اس لئے انہیں شارک اور ڈولفنز بڑے آرام سے شکار کر سکتی ہیں۔ یہ سمندری جال میں پھنس کر ہلاک ہو سکتے ہیں یا ٹرالرز اور بوٹس کے نیچے کا بلیڈ انہیں ختم کر سکتا ہے۔

کچھووں کا خول انکی پسلیوں سے بنا ہوتا ہے اور کارٹونز فلموں کی طرح کچھوے اپنا خول چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ یہ اچھا تیر سکتے ہیں لیکن ساحل کی ریت پہ انہیں چلنے کے لئے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے اور ہر دو تین گز کے فاصلے پہ رک کرسکون کی سانس لینی پڑتی ہیں۔

سمندر میں بھی سانس لینے کے لئے ان کچھووں کو سمندر کی سطح پہ آنا پڑتا ہے۔ گوادر میں سمندر کی سطح پہ آنے والے کچھووں کو میں نے دیکھا کہ وہ کیسے سطح پہ ڈول رہے ہوتے ہیں۔

چونکہ مادہ کچھوا ہی انڈے دیتے ہیں اس لئے مادہ کچھوا ہی ساحل پہ آتی ہے۔ نر کچھوا کبھی ساحل نہیں دیکھ پاتا اس لحاظ سے مادہ کچھوے کا علم نر کچھوے کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن انکے یہاں معلومات عامہ کے امتحانات ہی نہیں ہوتے ہی نہیں ہوتے اس لئے مادہ کچھوا اسکا فائدہ نہیں اٹھا پاتی۔

کہتے ہیں کہ مادہ کچھوہ جس جگہ انڈے دے ، دوبارہ انڈے دینے کے لئے اسی ساحل کا رخ کرتی ہے۔ جب یہ ان ساحلوں پہ پہنچتی ہیں تو وائلڈ لائف کے لوگ انکے فلپرز پہ ایک ٹیگ پیوست کر دیتے ہیں۔ یہ ٹیگ نہ صرف انکی پہچان کے لئے کار آمد ہوتا ہے بلکہ اس کی وجہ سے سمندر میں انکی موجودگی بھی معلوم کی جا سکتی ہے۔

یہ کچھوے آخر کیوں اتنی تیزی سے ختم ہو رہے ہیں۔ اسکی وجہ انسان اور اسکی سرگرمیاں ہیں۔ اول تو بعض ممالک میں کچھووں کے بچوں کا سوپ بہت پسند کیا جاتا ہے۔ اور یہ ایک قیمتی خوراک ہوتی ہے۔ کود کچھووں کے گوشت کی بڑی مانگ ہے۔ ہمارے ساحل پہ انہیں پکڑنے کی ممانعت ہے لیکن اطلاع ہے کہ ساحل سے چند میل کے فاصلے پہ ٹرالر انہیں پکڑتے ہیں اور ٹرالر کے اندر ہی انکا گوشت علیحدہ کر کے کیماڑی پہنچا دیا جاتا ہے جہاں پر پھر انہیں کوئ نہیں پوچھتا۔

دوسرا یہ کہ ساحل پہ موجود کتے بلیاں یا تو انکے انڈوں کو کھالیتے ہیں یا پھر نکلنے والے بچوں کا شکار کرتے ہیں۔  ساحل پہ موجود کچرے میں پھنس کر بھی بعض اوقات یہ بچے زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ ادھر سمندر میں پہنچ جانے والے بچے بھی ایک خاص عمر تک پہنچ کر اپنے شکاریوں سے محفوظ رہ پاتے ہیں۔ یوں ہزار بچوں میں سے ایک ہی بچ پاتا ہے جو بلوغت تک پہنچے۔

کچھوے کی آمد کی اطلاع کے ساتھ ہی بچوں نے لائن بنائ۔ انکی ٹیچرز ان پہ عقابی نظریں رکھے ہوئے تھیں کہ رات کی تاریکی میں کوئ بچہ ادھر ادھر نہ ہو جائے۔ کچھوے روشنی اور شور  سے بھاگتے ہیں۔ اس لئے اتنے بچوں کی موجودگی کے باوجود کامیاب خاموشی برقرار رہی۔

تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے ہم وہاں پہنچے۔ سمندر سے اس جگہ تک کچھوے کے رگڑ کر آنے والے نشانات کا راستہ موجود تھا۔  کچھوا اپنا گڑھا بنانے میں مصروف تھا۔ ویڈیو اور کیمرے کی لائیٹس سے گھبرا گیا۔ ادھر وائلڈ لائف والوں نے اسے پکڑ لیا کہ اسے ٹیگ کر لیا جائے۔

بچوں کی چیخیں نکل گئیں۔ مشعل  تیزی سے مشاق فوٹوگرافر کی طرح تصاویر لینے میں مصروف ہو گئ۔ ادھر اسکول کی ٹیچرز انتہائ تشویشناک حالت میں بچوں کو کچھوے سے دور رکھنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ جبکہ کچھوا ایک بے ضرر اور شرمیلا جانور ہے۔

وائلڈ لائف کے عملے نے کچھوے کو قابو کر کے چیک کیا کہ وہ ٹیگ ہوا ہے یا نہیں۔ ٹیگ نہ پاکر انہوں نے اسکے فلپر میں ایک دھاتی ٹیگ پیوست کیا ، اسکی لمبائ نوٹ کی، اکتالیس اعشاریہ تین پانچ۔ پھر اسے آزاد چھوڑ دیا۔

ٹیگ کرنے کے لئے ہشیار

   اس ہنگامے سے گھبرا کر خلوت پسند کچھوے نے انڈے دینے کا ارادہ ترک کیا اور سمندر کی راہ لی۔ جب وہ اپنے کھودے ہوئے گڑھے سے باہر کی طرف چلا تو بچوں اور انکی ٹیچرز نے جلدی سے دور تک اسکے لئے راستہ صاف کر دیا۔ اور لائن بنا کر خود بھی واپسی کے سفر پہ روانہ ہو گئے کہ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ہم اسکے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ کچھوے نے بیچ میں دو مرتبہ رک لگا کہ اپنے فیصلے پہ نظر ثانی کرنے کاسوچا لیکن چونکہ دستاویزی فلم بنانے والا عملہ اسکے ساتھ ساتھ تھا اس لئے یہ  سوچ بھی عملی جامہ نہ پہن سکی۔ پھر وہ آگے بڑھ کر سمندر کی تاریکی میں گم ہو گیا اور ہم روشنیاں بُجھا کر شہر کی تاریکی میں۔

توقع ہے کہ وہ پھر لوٹ کر آئے گا۔ لیکن اپنے ان معصوم اور شرمیلے مہمانوں کے لئے ہمیں اپنے ساحل صاف رکھنے ہونگے۔ اور ان لوگوں پہ کڑی نظر رکھنی ہوگی جو اپنے تھوڑے سے فائدے کے لئے  ان نایاب جانوروں کی نسل کے لئے خطرہ بن رہے ہیں۔

کبھی الوداع نہ کہنا

9:08 PM

اسکول, بچے, پاکستان, تعلیم, ساحل, سبز کچھوے, سمندر, سینڈز پٹ, کراچی, مشعل, وائلڈ لائف

لبیک یا کپتان

ضیاء الحق کے دور میں جلا وطنی اختیار کرنے والی پیپلز پارٹی کی رہنما خاتون جب انیس سو اٹھّاسی میں وطن واپس آرہی تھیں تو پاکستان میں یہ نعرہ گونج رہا تھا۔

بے نظیر

آئے گی انقلاب لائے گی۔ جس وقت بے نظیر نے لاہور ائیر پورٹ پہ قدم رکھا۔ لوگوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی جو نعرہ لگا رہی تھی۔ بے نظیر آئ ہے انقلاب لائ ہے۔ بے نظیر آئیں، دو دفعہ حکمرانی پہ فائز ہوئیں، اور اس دنیا سے چلی بھی گئیں۔ انقلاب نہ آنا تھا نہ آیا۔ نعرے لگوانے والے اپنا اپنا حصہ لے کر الگ ہوئے اور نعرہ لگانے والے پھر ایک کنارے بیٹھ گئے کہ کب انکی ضرورت دوبارہ پڑتی ہے۔

وطن عزیز میں ایک دفعہ پھر اسی قسم کے نعروں کا زور ہے۔ اس دفعہ انقلاب کے ان نعروں کے لئے عمران خان کا نام تجویز کیا گیا ہے۔ اسکی وجوہات پہ بھی لوگوں کلو غور کرنا چاہئیے۔ لیکن جب دعوت دیا ہوا, انقلاب سر پہ کھڑا ہو تو ان باتوں کا ہوش کہاں رہتا ہے۔

عمران خان کے لاہور میں ہونے والے جلسے کے بعد انکے حامیوں نے اور اس نادیدہ ہاتھ کے کھلاڑیوں نے جو اقتدار کا ہما اپنے پاس رکھتا ہے انکی تحریک کو اگر وہ کوئ ہے  تحریک پاکستان سے اور انکی شخصیت کو قائد اعظم اور بھٹو سے تشبیہہ دینا شروع کر دی ہے۔

ابھی بھی خیر ہے کہ اسے دنیا کی سب سے بڑی انقلابی تحریک ، تحریک اسلام سے نہیں ملایا گیا۔ 'آ رینکنگ آف دی موسٹ انفلوئینشل پرسن ان دا ہسٹری' کو ترتیب دیتے ہئے جب مائیکل ہارٹ

رسول اللہ کو پہلا نمبر

دیتا ہے تو وہ انہیں نبی کی حیثیت س نہیں ایک انسان کی حیثیت سے دیکھتا۔ دنیا کے سو اہم با اثر افراد میں شامل ہمارے نبی، اپنے پیروکاروں کے لئے کوئ مثال نہ بن سکے۔ کیونکہ انکی ذہانت، ، بصیرت ، انتظامی صلاحیتیں سب ماورائ طاقت کے سامنے ماند پڑ گئیں۔ انکی ذات عقیدت کے غلاف میں ایسی لپیٹی گئ کہ اب انکا پیروکار انکے لئے کسی کی جان تو لے سکتا ہے۔ لیکن انکی تحریک کی فلاسفی کو سمجھنے کو تیار نہیں۔

اس متنازعہ موضوع کو ہم ایک طرف رکھتے ہیں۔

اور صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس وقت جن شخصیات اور تحاریک کا تذکرہ جوش و خروش سے لیا جا رہا ہے کیا وہ اتنی کامیاب رہیں۔ کہ ہم امید کریں کہ انکی طرز پہ جو تحاریک چلائ جائیں گی وہ بھی کامیابی سے ہمکنار ہونگیں۔

تحریک پاکستان کا مقصد، کیا مسلمانوں کے لئے محض ایک علیحدہ ریاست بنانا تھا یا مسلمانوں کی ایک ایسی فلاحی ریاست بنانا مقصود تھا جہاں ملک کا ہر شہری اپنے بنیادی حقوق برابری کی بنیاد پہ حاصل کر سکے۔ اگر محض ریاست بنانا مقصد تھا تو یہ تحریک پاکستان کے قیام کے ساتھ ختم ہو جانی چاہئیے تھی۔ لیکن یہ بات صحیح نہ ہوگی کیونکہ تحریک کے دوران عوام سے کچھ وعدے بھی کئیے گئے تھے۔ جن پہ پاکستان بننے کے بعد ، انکی سمت میں کام کرنے سے ہی عمل ہو سکتا تھا۔

جس طرح میں عمران خان کی لاہور والی تقریر میں تاریخی اعلانات کا انتظار کرتی رہی مگر تقریر ختم ہو جانے کے بعد بھی وہ سامنے نہ آسکے۔ اسی طرح قیام پاکستان کے فوراً بعد قوم نے بھی مسلم لیگی رہنماءووں بالخصوص قائد اعظم سے تاریخی اعلانات کی توقع رکھی ہو گی مگر وہ سامنے نہ آسکے۔ انہوں نے اس تاریخی موقع پہ اگر کچھ کہا تو قوم اب اسے تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔

یہ بھی قائد اعظم کی بد قسمتی یا ناکامی ہے کہ انہیں بانی ء پاکستان کا خطاب تو دیا جاتا ہے لیکن انکی شخصیت کے اکثر پہلو نہ صرف عوام سے چھپائے جاتے ہیں بلکہ انکے ارشادات تک کو حذف کا جاتا ہے۔   کیا مصطفی کمال پاشا اتا ترک کے ساتھ ترک ایسا ہی کرتے ہیں۔ قائد اعظم بحیثیت بانی ء پاکستان ، پاکستانیوں کے خیال و فکر پہ اتنا رسوخ بھی نہیں رکھتے جتنا کہ گاندھی، ہندوستانیوں پہ رکھتے ہیں۔

کیا قائد اعظم ایک ناکام سیاستداں یا ایک ناکام حاکم یا ایک ناکام رہ نماء  اعلی ثابت ہوئے؟

تقسیم ہندوستان کے فوراً بعد

جواہر لال نہرو

کی سربراہی میں ہندوستان میں زمینداری نظام ختم کرنے کا انقلابی فیصلہ کیا گیا۔  ہم کسی بھی ایسے فیصلے سے محروم رہے۔ کیونکہ لیگی رہنماءووں کا مقصد پاکستان کا حصول ہر قیمت پہ  تھا انہوں نے مذہبی جماعتوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے مذہب کو استعمال کیا، پھر مغربی پاکستان میں زمینداری نظام بہت مضبوط تھا سو انہوں نے جاگیرداروں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ان سے بھی ڈیل کی، ادھر نارتھ انڈیا کے لوگ جو سب سے زیادہ بے تاب تھے ان کے نوابوں کو بھی ایک آسرا دیا۔ بھان متی کے کنبے میں عملی اقدامات کے لئے گنجائش ہی نہیں بچی تھی۔

وہ بس شدت سےایک علیحدہ ملک چاہتے تھے مگر انکے پاس اس ملک کو چلانے کے لئے کوئ حکمت عملی پہلے سے موجود نہ تھی۔ انہیں یہ تک معلوم نہ تھا کہ جب پاکستان وجود میں آجائے گا تو انہیں سویت بلاک کے ساتھ تعلقات مضبوط کرنا ہونگے یا امریکن مفادات کو دیکھنا ہوگا۔

کیا قائد اعظم ایک کامیاب رہنما رہے؟

کیا جو وعدہ انہوں نے کیا اسے پورا کر دکھایا؟

نہیں۔ سوائے یہ کہ حکومت سازی کا حق مسلمانوں کے چند گروہوں کے پاس آگیا، ہندوستانی عام مسلمان ۔ پاکستانی عام مسلمان کہلایا، وہ کسی انقلابی تبدیلی سے نا آشنا رہا۔

اب پاکستان کی دوسری کرشماتی شخصیت پہ بات کرتے ہیں جن سے عمران خان کو ملایا جا رہا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو، ایک ذہین تعلیم یافتہ انسان جو عمران خان کے بر عکس سیاست کے ایوانوں میں خاصی جدو جہد کے بعد مقام اعلی تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ وہ بنیادی طور پہ سوشلسٹ نظریات سے متائثر تھے اس لئے انہوں نے ملک کے رجحان کو دیکھتے ہوئے اسلامی سوشلزم کا نعرہ بلند کیا۔

لیکن جب انہیں لگا کہ اقتدار کا ہما انکے سر پہ بیٹھنے کے بجائے کہیں اور کا رخ کر رہا ہے تو انہوں نے صبر سے کام لینے کے بجائے، ادھر ہم ادھر تم کا نعرہ بلند کیا۔

اسٹیبلشمنٹ نے انکا ساتھ دیا۔ یہ وہ اسٹیبلشمنٹ تھی جومغربی پاکستان کی حکمرانی چاہتی تھی۔ کیوں؟ اسکی وجوہات روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ دیگر اور حقائق کے ساتھ اسٹیبلشمنٹ شاید اس بات کے لئے راضی نہ تھی کہ  معمولی جسامت اور شکل و صورت کے بنگالی ان پہ حکومت کریں۔

یہ در حقیقت تاریخی جھوٹ ہے کہ بھٹو کی تحریک انقلابی تحریک تھی اور اسے عوامی پذیرائ حاصل تھی۔ کیونکہ جمہوری قواعد میں عوامی پذیرائ مجیب الرحمن کو حاصل تھی۔ لیکن اسٹیبلشمنٹ نے اسکا ساتھ نہ دیا۔ بنگالی الگ ہو گئے۔

بنگالیوں نے الگ ہونے کے بعد سیکولر بنگلہ دیش کی بنیاد رکھی۔ آج انکی کرنسی کی قیمت ہم سے زیادہ ہے۔ اسکے باوجود کہ وہ ہر کچھ عرصے بعد سیلاب جیسی قدرتی آفت کا شکار ہوتے ہیں۔ پستہ قد، کم صورت بنگالی اپنا استحکام حاصل کرنے میں

کامیاب ہوئے۔

بھٹو کو مغربی پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کی حمایت حاصل تھی، سو بنگلہ دیش بننے کے بعد ان سب کو کسی انکوائری کے سامنے حاضر ہونے اور اس سارے واقعے کے وقوع پذیر ہونے کی وجوہات معلوم کرنےکے بجائے انہیں حکومت کرنے کا حق دیا گیا۔

کیا بھٹو ایک کامیاب سیاستداں تھے؟

انہوں نے جو نعرہ دیا کیا اسے پورا کر دکھایا؟

انہوں نےاسلامی سوشلزم اور روٹی کپڑا مکان کا نعرہ دیا۔ وہ اسے پورا نہیں کر پائے۔ پاکستان کسی بھی انقلابی تبدیلی سے نا آشنا رہا۔ مغربی پاکستان کے جذبے ٹھنڈے ہوئے اور بھٹو اپنے انجام سے دوچار ہوئے۔

پاکستان میں ایک اور تحریک چلی جس نے زبردست عوامی حمایت حاصل کی۔ اور اس نے کراچی شہر کا مزاج ہی بدل دیا۔ لوگوں نے دیوانہ وار اسکے لئے کام کیا۔ وہ ایم کیو ایم کی تحریک تھی۔ لیکن یہ تحریک بھی اسٹیبلشمنٹ کا شکار ہوئ۔ اور اس سے جو امیدیں وابستہ تھیں وہ اب تک پوری نہ ہو سکیں۔

اب انقلاب کا نعرہ ایک دفعہ پھر۔

عمران خان کی حالیہ تقریر میں  وہی وعدے اور وہی دعوے جوقیام پاکستان سے اب تک دوہرائے گئے ہیں اسکے علاوہ کیا تھا۔

چند اہم نکات جو مجھے یاد آرہے ہیں۔

ہم پولیس کو غیر سیاسی کریں گے کیسے؟ کیا آپ پاکستانی مزاج سے تعصب کا باہر نکال دیں گے۔  جو کراچی میں لوگ سمجھتے ہیں کہ عمران خان کے مزاج میں بھی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ  اسّی کی دہائ میں کراچی کے لوگوں کا شدید مطالبہ تھا کہ پولیس مقامی ہونی چاہئیے۔ اور پنجاب سے پولیس بھرتی کا سلسلہ بند ہونا چاہئیے کیا ایسا ممکن ہوا۔ کیا یہ مذاق نہیں تھا کہ کراچی شہر کی پولیس میں بڑی تعداد پنجاب سے ہو۔ کرپشن کی ایک بڑی وجہ تو یہی بنتی ہے کہ پولیس مقامی نہ ہو۔

دوسرا اہم نکتہ اس تقریر کا، خواتین کی تعلیم ایمرجینسی بنیادوں پہ عام کی جائے گی۔  اور۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ انہیں انکا شرعی حق دیا جائے گا۔

یہ شریعت کے مسائل اسی وقت کھڑے کئے جاتے ہیں جب نیت میں کھوٹ ہو۔ ایک تعلیمیافتہ عورت کے معاشی استحکام کا آپ بندو بست کریں گے یا پاکستانی علماء کی شریعت کے مطابق انہیں ایمرجینسی میں تعلیم دینے کے بعدگھرتک محدود کریں گے۔ کیا ملازمت پیشہ خواتین کے بچوں کی دیکھ بھال کے لئے ریاستی سطح پہ ادارے قائم کریں گے۔ کیا ایک تعلیم یافتہ عورت کو فیصلہ سازی میں شامل کریں گے یا پھر جنوبی ایشیائ اسلامی شریعت کے مطابق اسے مرد کا تابعدار بنائیں گے؟ کیا ایک عورت کا اپنی پسند کے مرد سے شادی کا اختیار دیں گے یا پھر وہی ولی اور کفو والا مسئلہ چلے گا؟  سو یہ کہنا کہ شرعی حقوق دیں گے یہ کافی مشکوک  بیان ہے۔

سب سے اہم بیان جس پہ انہوں نے زور دیا اور جو انکے مطابق غریب دیہات کے مسائل کی جڑ ہے وہ پٹواری نظام ہے اسے وہ تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔

لیکن اصل مسئلہ جسکی طرف سے وہ تجاہل عارفانہ برت رہے ہیں وہ

وہی زمینداری نظام

ہے جسکے خلاف قاءد اعظم نے بھی بر وقت فیصلہ کرنے سے گریز کیا۔ جب تک کوئ شخص اس نظام کے خلاف نہیں کھڑا ہوگا اسکے انقلاب کا ہر نعرہ جھوٹا ہوگا۔ اس نظام کی جڑیں ہلائے بغیر غریب کی فلاح کی بات کرنا یونہی ہے جیسے کینسر کے مریض کو درد کم کرنے والی دواءووں پہ رکھنا۔ درد کم کرنے کی یہ دوائیں شوکت خانم کینسر ہسپتال کے لئے کام کر سکتی ہیں لیکن پاکستان کے لئے نہیں۔

یہ نہیں معلوم کہ ہمارے ملک میں جواہر لال نہرو کون بنے گا۔

دوسری طرف ہم یہ سمجھتے ہیں کہ عمران خان اسی اسٹیبلشمنٹ کا ڈالا ہوا دانہ ہیں جو وہ عوام کو سراب کے پیچھے دوڑانے کے لئے ڈالا کرتی ہے۔ ورنہ عمران خان کے جلسے میں نہ انکے لئے شاہی کرسی ہوتی اور نہ مجمعے کے لئے کرسیاں۔ تبدیلی کے سیلاب کی باتیں سنہری کرسیوں پہ بیٹھ کر نہیں کی جاتیں اور نہ اشرافیہ کے لاڈلوں کے ساتھ۔ اور نہ ہی کوئ ایسی جماعت تبدیلی کا باعث بن سکتی ہے جس میں  ملکی انٹیلیجنس کے نمائندے شامل ہو رہے ہوں۔ کیونکہ اب تک ہم نے یہ نہیں سنا کہ عمران خان کوئ ایسی روحانی طاقت رکھتے ہیں کہ جو انکی جماعت میں شامل ہو جائے اسکی قلبی حالت چشم زدن میں بدل جاتی ہے۔ ابھی تک کسی نے یا شیخ یا عمران کا نعرہ مار کر دھمال نہیں ڈالا۔ کیونکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ یا شیخ کون ہے۔

 اسٹیبلشمنٹ ایسا کیوں کرتی ہے کہ جب عوام حد سے زیادہ تبدیلی کی خواہش کرنے لگتے ہیں وہ انکے سامنے اپنی پسند کے ایک شخص کو کھڑا کر دیتی ہے؟

جواب بالکل سادہ ہے وہ یہ چاہتے ہیں کہ رند کے رند رہیں اور ہاتھ سے جنت بھی نہ جائے۔ انکے مفادات کو ٹھیس بھی نہ پہنچے اور لوگ بھی کچھ عرصے کے لئے مطمئن ہو جائیں کہ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ۔ بس اسی نکتے پہ کامیابی سے پچھلے باسٹھ سال سے پاکستان کو چلایا گیا ہے۔

تاریخ کہتی ہے کہ انقلاب کسی کے مفادات کی نگرانی نہیں کرتا۔جو مفادات کی حفاظت کرے وہ چالاکی تو ہو سکتی ہے انقلاب نہیں۔ انقلاب جب آتا ہے تو کمزور طاقتور بن جاتا ہے ، غریب، کو مالداروں کے مال تک رسائ ہوتی ہے۔ انقلاب جب آتا ہے تو ساری دنیا کو عجم یعنی گونگا کہنے والے عرب اسی دنیا کا علم ہر ذریعے سے جمع کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ اپنے آپکو کم سمجھتے ہیں جبھی تو اکٹھا کرتے ہیں۔

انقلاب کے لئے، کیا عمران خان، جواہر لال نہرو بننے کو تیار ہیں اور پاکستان میں زمینی اصلاحات کریں گے۔ پٹواری نظام کے بجائے کیا وہ کسان کی حق ملکیت کو تسلیم کروائیں گے۔ کیا وہ کمزوروں کے داتا بنیں گے، دیوتا بنیں گے  یا کمزوروں کو طاقتور بنائیں گے تاکہ انکی رسائ اپنے حصے کے مال میں تو ہو۔ اگر نہیں تو ایک دفعہ پھر چہرے بدل کر نظام کو بدلنے کی کوششیں عوام کو مبارک ہوں۔ ہم آپکو لبّیک کہتے ہیں یا کپتان۔ لبّیک یا کپتان۔

4:06 PM

انقلاب, بنگالی, بنگلہ دیش, پاکستان, ذوالفقار علی بھٹو, سیاست, عمران خان, قائد اعظم

دس ڈالر میں

ابھی ڈھونڈھ ہی رہی تھی تمہیں یہ نظر ہماری

کہ تم آگئے اچانک۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

زندگی میں محبوب سے لے کر بس تک پہ یہ بات صادق آسکتی ہے۔ لیکن ہمارے ساتھ یوں ہوا کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ٹہریں پہلے یہ بتادوں کہ قصہ کیا چل رہا تھا۔

ہم گوادر ہی میں تھےرات کو واپسی کے سامان کو صبح کے سفر کے لئے پیک کر کے نادر بلوچ کے یہاں پہنچ گئے کہ ان  کی بھاوج کے یہاں اس دن صبح ایک نئے بچے کی آمد ہوئ تھی۔ خیال تھا کہ انہیں مبارکباد دے کر ، کراچی واپسی کے لئے خدا حافظ کہہ دیں۔

نادر کی بیوی ،خدیجہ بڑے تپاک سے ملی۔  میں نے اسے بتایا کہ اسکا بیٹا بڑا شیطان ہے پچھلی دفعہ اس نے مجھے کیکڑوں کی لڑائ دکھائ تھی۔ اور کیکڑے کے بچے کندھے پہ رکھ کر پھر رہا تھا۔ 'ہاں یہ بہت شیطان ہے۔ اب اسکو گوادر کے سب سے مہنگے اسکول میں داخل کرا دیا ہے۔ فیس اسکا بہت زیادہ ہے۔  نادر کی آمدنی تو زیادہ نہیں کبھی کام ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا۔ میرے بھائ نے کہا کہ وہ اسکا اسکول کا خرچہ اٹھائے گا'۔

بڑا اسکول کہتے وقت اسکے چہرے پہ بڑا فخر تھا۔  اسکا بیٹا اویس، دوڑا دوڑا گیا اور اپنی کتابیں کاپیاں اٹھا لایا مجھے دکھانے کے لئے۔ میں نے انہیں بڑے شوق سے دیکھا۔ وہ مونٹیسوری کی لگ رہی تھیں۔  اسے تھوڑا بہت لکھنا آگیا تھا۔ میں نے پوچھا کون سی کلاس میں پڑھتے ہو۔ اپنے ٹوٹے پھوٹے دانتوں والی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ 'ایڈوانس میں، ایڈوانس میں'، اسکی مراد شاید مونٹیسوری کا آخری سال تھا۔

اس لمحے اچانک مجھے خیال آیا کہ میری ایک  نو عمر پاکستانی نژاد کینیڈیئن دوست نے چند ماہ پہلے مجھ سے کہا تھا کہ وہ پاکستان میں ایک بچے کا تعلیمی خرچہ اٹھانا چاہتی ہے ، کیا میں کسی مستحق بچے کی تلاش میں مدد کر سکتی ہوں۔ میں اس وقت سے ایک بچے کو ڈھونڈھ رہی تھی جو پڑھنے لکھنے میں واقعی دلچسپی رکھتا ہو۔ اور اسکی تعلیم کی راہ میں صرف پیسے کی کمی حائل ہو۔

گھر میں آنے والی ماسیوں کے بچوں کو میں نے اس لسٹ سے نکال دیا تھا کہ ان میں سے کچھ مقامی اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ انکے والدین مار مار کر بھیجتے ہیں مگر یہ پڑھ کر نہیں دیتے۔

سو، میں نے خدیجہ سے پوچھا کہ اسکی بیٹی کون سے اسکول میں پڑھتی ہے۔ کہنے لگی یہیں سُر بندر کے گورنمنٹ اسکول میں۔ اس اسکول کے متعلق مجھے اندازہ تھا کہ انتہائ بے کار ہے ۔ متعدد لڑکیاں یہاں سے دوسری تیسری پڑھ کر چھوڑ چکی ہیں۔ اور انہیں دس تک گنتی بھی نہیں آتی۔اس لئے میں نے اس سے کہا تم عائیشہ کو بھی کیوں نہیں بحریہ ماڈل اسکول میں داخل کرا دیتیں۔

'عنیقہ، اسکی فیس بہت زیادہ ہے، چار ہزار داخلہ فیس ہے'۔ اس نے ذرا منہ پھیلا کر کہا تاکہ مجھے اندازہ ہو کہ کتنی زیادہ ہے۔ چھ سو روپے مہینے کے ہیں' اس دفعہ اس نے چھ سو پہ زور دیا اور  مزید کہا صرف وردی آٹھ سو روپے کی ہے'۔ نادر تو اتنا نہیں کر سکتا'۔  میں خاموش بیٹھی رہی۔

یہاں کراچی میں ایسے اسکول ہیں جنکی ماہانہ فیس پچیس ہزار روپے ہے۔ اور ایسے اسکول تو عام ہیں جہاں داخلہ فیس پچاس ہزار سے زائد ہے۔ کیا خدیجہ جیسوں کو معلوم ہے کہ جتنی انکی ماہانہ آمدنی نہیں پاکستان کے کچھ علاقوں میں اتنی ایک بچے کے اسکول کی فیس ہوتی ہے۔

ویسے اچھا ہی ہے اسے معلوم نہیں۔ ورنہ یہ صدمہ شاید اسے زندگی کے سکھ سے دور  کر دے۔

چلو عائشہ کی فیس کا بند و بست ہم کر دیتے ہیں۔ میں نے اس سے کہا۔ 'نئیں نئیں، عنیقہ، تکلیف نہ کرو۔'۔ 'مجھے کوئ تکلیف نہیں ، مجھ سے کسی نے کراچی میں کہا تھا کہ وہ ایک بچے کو پڑھانا چاہتا ہے۔  پیسے وہ دے گا۔ میں نہیں۔  اس لئے مجھے کوئ تکلیف نہیں پہنچ رہی۔ ' نئیں پھر بھی تم ایسا نہ کرو'۔ دیکھو اگر تم نہیں لوگی تو کوئ اور لے لے گا۔ تم چاہتی ہو کہ تمہاری بیٹی ایک اچھے اسکول میں  پڑھے تو موقعے سے فائدہ اٹھا لو۔ یقین رکھو، نہ یہ پیسے میرے ہیں ، نہ میں یہ کسی سے مانگ رہی ہوں اور نہ مجھے اس میں کوئ تکلیف ہے'۔ تھوڑی پس و پیش  کے بعد وہ خاموش ہو گئ۔ خاموشی نیم رضامندی ہوتی ہے۔ اٹھتے وقت میں نے نادر سے بات کی کہ وہ عائشہ کو بھی اسی اسکول میں داخل کرا دے۔ داخلہ فیس اور تین مہینے کی فیس اسکے ہاتھ میں رکھی اور نصیحت کی کہ اسکول کارڈ اور ٹیسٹ رپورٹس سنبھال کر رکھے کہ جو شخص پیسے دے گا وہ انہیں دیکھنا چاہتا ہے۔

میں چلنے لگی تو نادر نے ہاتھ مصافحے کے لئے آگے بڑھا دیا۔ اسکے انداز میں تشکر نمایاں تھا۔ میں جو غیر مردوں سے ہاتھ ملانے سے گریز کرتی ہوں۔ اسکے بڑھے ہوئے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیتی ہوں۔ میرے اندر احساس ندامت تھا کہ اس سارے سلسلے میں میرا عملی حصہ نہ ہونے کے برابر ہے پھر بھی انہیں اپنا احسان مند بنا رہی ہوں۔

گھر واپس آکر میں نے سوچا کہ ڈالرز میں داخلہ فیس تقریباً پچاس ڈالر بنتی ہے اور ماہانہ فیس میں  اگر دیگر خرچے بھی ڈال لیں تو دس ڈالر بنتے ہیں۔ میری دوست نے کہا تھا کہ وہ پچاس ڈالرتک مہینے کے اس مد میں دے سکتی ہے۔ اتنے پیسوں میں تو ایک اور بچے کا خرچ نکل سکتا ہے۔ کیونکہ مجھے نادر کی بھانجی کا بھی خیال آیا جو عائشہ کی ہم عمر ہے۔ اسکا باپ اسکی ماں کو بھائ کے پاس چھوڑ گیا ہے نہ طلاق نہ خرچہ۔

کراچی آکر میں نے اپنی دوست کو ای میل کی۔ وہ فوراً تیار ہو گئ۔ اس طرح دو بچیوں کے لئے ایک بہتر اسکول کا بند و بست ہو گیا۔

آپ میں سے بیشتر نہیں جانتے ہونگے کہ کینیڈا میں ایک وقت کا اوسط معیار کا کھانا  دس ڈالر میں مل جاتا ہے۔  درحقیقت کراچی کے بہترین ہوٹل میں بھی ایک وقت کا اچھا کھانا اتنے پیسوں میں مل جاتا ہے۔ صرف دس ڈالر میں، میں محسن کی قطار میں اور اگلا احسان مندی کی قطار میں۔

کسی  کے ایک وقت کا کھانا ، کسی دوسرے کے پورے مہینے کے اسکول کا خرچہ۔ قدرت کا مذاق ہے یا انسانوں کا؟

10:03 PM

اسکول, بچے, بحریہ ماڈل اسکول, بلوچستان, بلوچی, پاکستان, تعلیم, کینیڈا, گوادر

گوادر میں بقر عید

انسان فطرتاً تغیر پسند ہے اسی فطرت کی وجہ سے جنت سے بے دخلی پسند کی اور زمین جیسی پست جگہ کو اپنے تخیل کی اڑان کے لئے مناسب پایا۔ اقبال نے اسی زمین سے خدا سے یہ مکالمہ کیا کہ

تیرے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا ، نہ وہ دنیا

یہاں مرنے کی پابندی، وہاں جینے کی پابندی

وائے افسوس اقبال کی اس آزاد روی کو زمانہ شناس لوگوں نے زنداں کا رخ دکھایا۔ اگر انسان کو اتنی ہی آزادی مل جائے کہ وہ کسی دل پسند موقع سے مستفید ہو لے تو وہ خوش قسمت کہلائے گا۔ سو میں ہوں۔

بقر عید سے محض چار دن پہلے مجھے اطلاع ملی کہ چاہوں تو عید کراچی سے باہر منا سکتی ہوں۔ کتنے باہر؟ یہی کوئ سات سو کلو میٹر۔ موسم کیسا ہوگا وہاں؟ بدلتے موسم کو ذہن میں رکھا۔ جواب ملا ایسا ہی جیسا کراچی کا ہے اور یہی نہیں کراچی جیسا سمندر بھی ملے گا۔ را عقلمند اشارہ کافی است۔ بھئ صاف کیوں نہی کہہ دیتے کہ آئیں چلیں اس دفعہ عید گوادر میں مناتے ہیں۔ ہم بھی یہ کہتے ہیں ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں،اس دفعہ عید ذرا مختلف انداز میں۔

تو جناب، جمعہ کے مبارک دن ہم اپنے جمع جتھہ سامان کے ساتھ کوسٹل ہائ وے پہ رواں دواں تھے۔ شہر سے نکلے تو سڑک پہ اسکول کی بسوں کا رش تو تھا ہی لیکن سوزوکیاں بھی چلتی نظر آئیں جن میں جانور جا رہے تھے۔ یعنی بکرا منڈی رات بھر کھلی رہی جبھی صبح ساڑھے سات بجے لوگ خریداری کر کے لوٹ رہے ہیں۔ شہر کے مکینوں کا یہ فخر بے جا نہیں کہ یہ شہر کبھی نہیں سوتا۔

جانور اندر لوگ باہر

اہل ہوس کے ہزار رستے ہوں مگر گودار جانے کا زمینی رستہ بس ایک ہی ہے اور وہ ہے کوسٹل ہائ وے۔ اس ہائ وے تک کراچی سے پہنچنے کے لئے آر سی ڈی ہائ وے سے ہو کر گذرنا پڑتا ہے۔ اور آر سی ڈی ہائ وے کا رستہ حب شہر سے نکلتا ہے۔ یوں کراچی، حب، وندر سےہوتے ہوئے جب اوتھل پہنچتے ہیں تو کوسٹل ہائ وے شروع ہوتی ہے۔ یہاں تک پہنچنے میں تقریباً پونے دو گھنٹے لگتے ہیں۔

حب شہر سے نکل کر جب سومیانی کے قریب تھے تو خانہ بدوشوں کی بستیاں نظر آئیں۔ جنکے پاس مٹی کے بڑے بڑے الٹے پیالےسے بنے ہوئے تھے۔ ان پیالوں میں لکڑی کو بند کر کے جلاتے ہیں تاکہ کوئلہ بنے۔ کوئلے کی اس تہوار میں بڑی مانگ ہوتی ہے کہ ہر گھر میں کچھ نہ کچھ بار بی کیو ہوتا ہے۔ میں نے انکی تصویریں بنائیں اس نصیحت کے ساتھ کہ خواتین کی نہ بنائیے گا۔ قبائلی اس پہ بڑا ناراض ہوتے ہیں۔ معلوم ہے، بھئ معلوم ہے۔ تو بھی پاکستان ہے میں بھی پاکستان ہوں۔

کوئلے کی تیاری

رستے میں دو جگہ رکے۔ ایک ہنگول دریا کے مقام پہ مگر مچھ دیکھنے کے لئے جو وہاں نہیں ملے۔ نومبر میں جبکہ ٹھنڈ ابھی ساحلی پٹی پہ شروع نہیں ہوئ۔ مگر مچھ کا دوپہر تک وہاں موجود ہونا ویسے بھی مشکل ہی تھا۔

پہاڑ کی تہہ میں خراماں دریائے ہنگول

آگے ہم ماکولا کے قریب پیٹ پوجا کے لئے رکے۔ سالن ہمارے پاس موجود تھا۔ پانی کی بوتلیں بھی حاضر تھیں بس روٹی چاہئیے تھی وہ گرما گرم مل گئ وہاں موجود ایک جھونپڑا ہوٹل سے۔ جنت کے عوض دانہ ء گندم برا سودا نہیں، میں نے زمین پہ پھیلی چٹائ پہ اپنے پاءوں پھیلاتے سوچا۔

شام کو چھ بجے ہم گوادر کی مضافاتی بستی سر بندر میں اپنا سامان گاڑی سے اتار رہے تھے۔ ابھی سامان اتار کر فارغ ہوئے کہ لوڈ شیڈنگ کے اوقات شروع ہو گئَے۔  اوپر پانی کی ٹینکی میں پانی نہیں، گھر مہینوں سے بند پڑا ہوا۔ ہمارے پاس اسکے علاوہ کوئ چارہ نہیں کہ صبر سے لائٹ آنے کا انتظار کریں۔ لائٹ اس علاقے میں پانچ سال پہلے ہی آئ ہے۔ اس چھوٹے سے قصبے میں ابھی لوگ اسکے اتنے عادی نہیں کہ اس کے یوں چلے جانے پہ خفا ہو کر کہیں کہ یوں نہ مل مجھ سے خفا ہو جیسے، ساتھ چل موج ہوا ہو جیسے۔

چھت کا رخ کیا۔  گھر سمندر کے بالکل کنارے ، کشتیاں دور تک سمندر کے پانی میں ٹہری ہوئیں۔ اگر اقبال ہوتے تو کہتے کہ اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے، سرخ سرخ قمقمے قطار اندر قطار۔ یہ جلتے بجھتے قمقمے ان کشتیوں پہ سمندر میں شکار کے وقت مختلف اشاروں کی زبان کے طور پہ استعمال ہوتے ہیں لیکن اس وقت انہوں نے سمندر اور لوڈ شیڈنگ کی تاریکی میں ایک سماں باندھ  دیا تھا۔ اوپر آسمان  پہ آلودگی نہ ہونے کی وجہ سے ستارے جیسے ہنس رہے تھے۔ ٹمٹماتے، جھلملاتے، نزاکت سے کانپتے اترا رہے تھے۔ ایسی سحر انگیز اترتی رات صرف سُر بندر کے حصے میں ہی آ سکتی ہے۔

دو گھنٹے بعد لائٹ نے درشن کرائے۔ ہم نے یوں پرنام کیا کہ فوراً دوڑ کر پانی کی موٹر آن کی۔ سب نے مل کر جلدی جلدی صفائ شروع کی  تاکہ رات کو سونے کا انتظام ہو سکے۔ پڑوسی نے بھی مدد کی۔ رات کا کھانا انکے یہاں سے آپہنچا۔ حالانکہ کہا بھی تھا کہ ہم کراچی سے دو وقت کا کھانا ساتھ لے کر چلے ہیں۔ لیکن بلوچ اپنی روایت سے مجبور۔

اگلے دن تفصیلی طور پہ صفائ کر کے تمام چیزیں اپنے مقامات پہ پہنچائیں۔ کھانے پینے کے چکر سے فارغ ہوئے۔ بکرے کا دیدار ہوا۔ جو کہ میزبان ہمارے لئے لے چکے تھے۔ یہاں قربانی کے لئے بکرے کا رواج ہے جبکہ کراچی میں گائے پہ زیادہ لوگوں کا دل آتا ہے۔ یہ تو پہاڑی بکرا ہے، میں نے اپنے ساتھی سے کہا۔ 'لوگ کہتے ہیں کہ پہاڑی بکرے کا گوشت سخت ہوتا ہے اور اس میں ہلکی سی بد بو ہوتی ہے'۔ اب اس وقت تو یہی ہے۔ یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ کم عمر ہے اسکا گوشت نرم ہوگا۔ 'چلیں یہی سہی۔ ہمیں تو قربانی کی رسم نبھانی ہے ، میں یونہی ایک خیال بتا رہی تھی'۔

مشعل کو پہلے ہی نادر بلوچ نے ڈرا دیا تھا کہ بکرا بڑا خطرناک ہے ٹکر مارتا ہے اس سے دور رہنا۔ مشعل نے بکرے کے تیور دیکھے تو بالکل اسکے قریب جانے سے انکار کر دیا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش بھی کہ بیٹا  پہاڑی بکرا اس برج کی علامت ہے جس سے تم اور تمہاری اماں دونوں تعلق رکھتے ہیں۔

شام کو محلے کی خواتین آگئیں۔ انکی بیشتر تعداد کو اردو بالکل نہیں آتی۔ میری ترجمان

نازنین

تو اپنے شوہر کے پاس مسقط جا چلی گئ۔ لیکن دو ایسی لڑکیاں نکل آئیں جو ٹوٹی پھوٹی اردو بول سکتی تھیں۔ بس وہ دونوں بے چاری ترجمہ کرتی رہیں۔ بلوچی زبان پہ فارسی کا اثر ہے ویسے بھی اردو کی بہن زبان ہے۔ اس لئے کہیں نہ کہیں میں بھی بلوچی پکڑ ہی لیتی۔ اس سے وہ خواتین بڑی متائثر ہوئیں کہ تھوڑی بہت بلوچی مجھے آتی ہے۔

میں ان کے لئے کچھ تحائف لے کر گئ تھی جس سے وہ بڑی خوش ہوئیں۔ چلتے چلتے کہنے لگیں کہ تم عید پہ مہندی لگاتی۔ ہاں، میں نے گردن ہلائ۔ کیا مہندی یہاں ملتی ہے۔ جواب ملا مہندی یہاں ملتی، دس روپے کی ٹیوب ملتی۔ کل ہم لائے گی اور تمہیں اور مشعل کو لگائے گی۔

پتہ نہیں کیا چیز ہوگی اور یہ کیا لگائے گی۔ میں نے دل میں سوچا۔ اگلے دن دوپہر میں ہم گوادر شہر کی طرف چلے گئے۔ وہاں سنگھار پہاڑی کے ساحل کی طرف اترے اور سورج ڈوبنے کا نظارہ کیا۔ ایک خوبصورت اور پر سکون ساحل جو سورج ڈوبنے کے وقت ہر طرف سے جلنے لگا۔ ساحل سے اس آگ کی لپٹیں آسمان کے مرکز کی طرف پہنچے جا رہی تھیں۔ آگ اور پانی کا یہ ملن چاند ایک طرف کھڑا دیکھ رہا تھا۔ سورج اور چاند کا بیک وقت ایسا طلوع اور غروب بھی بس گوادر میں ہی نظر آ سکتا ہے۔ بعض لوگوں کو اپنی خوبیوں اور خوش قسمتی  کا اندازہ نہیں ہوتا اور بعض جگہوں کو بھی۔

غروب آفتاب کے وقت طلوع مہتاب

رات دس بجے جب کھانا کھا کر سُر بندر واپس پہنچے اور میں ابھی سوئ ہوئ مشعل کو سونے کے کپڑوں میں ڈال رہی تھی کہ وہ لوگ مہندی لے کر پہنچ گئیں۔

اوہ، مشعل تو سو گئ۔ اب مجھے ہی اپنے ہاتھوں میں ان سے نقش و نگار بنوانے پڑیں گے۔ وہ اتنے شوق سے آئیں ہیں کیسے منع کر دوں۔ گھر والے میرا المیہ جان کر مسکرا رہے تھے۔ میرا ہاتھ، ہاتھ میں لے کر اس نے مہندی کی کون جیسا کہ ہم کراچی میں کہتے ہیں جب چلانی شروع کی تو خاصہ اچھا ڈیزائین بنا ڈالا۔ یہ تم نے کہاں سے سیکھا؟ میں نے پوچھا۔  اسکول سے۔ اس نے سر جھکائے جھکائے بتایا۔  بڑا اچھا اسکول ہے۔ پڑھنا لکھنا چاہے سکھائے نہ سکھائے مہندی لگانا سکھا دی۔ ہنسنے لگیں۔ کیا میں عید کے کپڑے لائ ہوں اس نے پوچھا۔ ہاں، ہاں سب لائ ہوں اور چوڑیاں بھی؟ ہاں چوڑیاں بھی۔

مشعل کی مہندی رکھ کر وہ چلی گئیں۔

میں عید کی نماز والوں کے کپڑے استری کرنے لگی۔ اور مشعل کے کپڑوں تک اس قدر نیند آ رہی تھی کہ میں نے سوچا کہ صبح اٹھ کر کر لونگی۔

بستر پہ لیٹی تو مسلسل لوگوں کے کچھ زور سے پڑھنے کی آواز آرہی تھی۔ یہ ذکری ہیں۔ گوادر میں مسلمانوں کے دو فرقے پائے جاتے ہیں ایک نمازی اور دوسرے ذکری۔ نمازی نماز پڑھتے ہیں اور ذکری نماز نہیں پڑھتے صرف ذکر کرتے ہیں۔ جس جگہ وہ ذکر کرتے ہیں وہ ذکر خانہ کہلاتی ہے۔ جو کہ ہمارے گھر سے خاصی قریب تھی۔ اس لحاظ سے گوادر میں بڑی مذہبی رواداری پائ جاتی ہے۔

لیکن اپنی تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے امید کی جاتی ہے کہ یہ مذہبی ہم آہنگی بس کچھ اور سالوں کی بات ہے وجہ یہ کہ اس دفعہ میں نے وہاں ایک بہت بڑا بورڈ دیکھا جس پہ لکھا تھا تبلیغی اجتماع گاہ اور اس پہ ایک تیر کا نشان بنا ہوا تھا۔ یعنی مقام کی نشان دہی۔ کافی ساری کشتیوں پہ اس دفعہ میں نے جماعت اسلامی کے جھنڈے دیکھے۔ آج سے آٹھ سال پہلے جب میں گوادر گئ تو وہاں کوئ بڑا مدرسہ نہیں تھا لیکن اب وہاں ایک بہت بڑا دارالعلوم ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کتنے وقت میں گودار کی دیواروں پہ ذکری کافر، نمازی کافر، سنی کافر اور شیعہ کافر جیسے نعرے وجود میں آتے ہیں ابھی تو وہاں، ہندءووں کے ایجنٹوں کے نام ،  پاکستان مردہ باد اور پاکستان زندہ باد جیسے نعروں کی اکثریت ہے۔

بہر حال ذکری  ساری رات ذکر کرنے کے بعد، فجر سے پہلے قربانی کے فریضے سے فارغ ہو جاتے ہیں۔

صبح لوگ قصبے کی عید گاہ میں نماز عید کے لئے جمع ہوئے۔  لائوڈ اسپیکر کا انتظام خاصہ خراب تھا۔ کچھ کو آواز پہنچی اور کچھ نمازیوں کو آواز نہیں پہنچی۔ نماز کی ادائیگی میں مسئلہ ہوا اور نماز کے اختتام پہ کچھ نمازیوں نے مطالبہ کیا کہ دوبارہ نماز پڑھائ جائے یعنی لوٹائ جائے۔ یوں نماز دوبارہ پڑھی گئ۔

یہاں ہمارے ساتھ کیا ہوا کہ آٹھ بجے ہم نے سوچا کہ مشعل ابھی سو رہی ہے اسکے کپڑے استری کر لئیے جائیں۔ لیکن یہ کیا؟ عین اسی وقت لائٹ چلی گئ۔ کوئ بات نہیں ایک دو گھنٹے میں اجائے گی۔ دل کو تسلی دی۔  مگر وہ نہ آئ۔ حتی کہ بارہ بجے دو پہربکرا قربان ہو گیا۔ میں نے احتیاطاً مشعل کے لئے دو زرق برق کپڑے رکھ لئیے تھے جو اس وقت کام آ گئے۔

بکرے کے حصے کیسے بنوانے ہیں آپکو؟ سوال آیا۔  کیسے حصے؟ میں نے دریافت کیا۔'یہاں کا طریقہ یہ ہے کہ سارے گوشت کے تین حصے کر دئیے جاتے ہیں ایک غریبوں اور ہمسایوں کا دوسرا رشتہ داروں کا اور تیسرا اپنے لئے'۔ مزید تفصیل حاصل ہوئ۔  اچھا کراچی میں تو قصائ بس گوشت بنانے کا کام کرتا ہے۔ خیر ہم وہی کریں گے جو یہاں رائج ہے۔ جب روم میں ہو تو وہی کرو جو رومی کرتے ہیں۔

سارے گوشت کو اچھی طرح ملا دیا گیا پھر اسکے برابر کے حصے لگے، اس میں سے غریبوں کا حصہ کر کے وہاں موجود لوگوں نے اسے بھیجنے کے لئےخود ہی حصے بنا کر بھیج بھی دئیے۔ چلیں جی اس ذمہ داری کی بھی چھٹی ہوئ۔  گوادر میں غربت زیادہ ہے۔ لیکن، اچھی بات یہ ہے کہ سمندر کے کنارے ہونے کی وجہ سے کوئ بھوکا نہیں مرتا کہ سمندر سب کو کھانا تو دیتا ہے۔ لیکن مچھلی کے علاوہ کھانے کی دیگر اشیاء عام انسان کی پہنچ سے باہر ہیں۔ دیگر جانوروں کا گوشت ایک عیاشی ہے۔ قربانی بہت کم لوگوں نے کی۔ اس لئے جانوروں کی وہ چہل پہل نہیں تھی جو کراچی میں نظر آتی ہے۔

بکرے کے سری پائے پھینک دئیے گئے اور اوجھڑی کو اسی وقت سامنے سمندر میں لے جا کر دھو کر صاف کر لیا گیا۔ رات کو جب میں نے رخسار سے پوچھا کہ آج کیا پکایا تو جواب ملا اوجھڑی۔ مجھے ایک جھٹکا لگا۔ کراچی میں اوجھڑی پھینک دی جاتی ہے۔ البتہ سری پائے بنوا کر رکھ لیتے ہیں۔ اوجھڑی کی وجہ سے شہر میں آلائیشیں پھیل جاتی ہیں۔ مگر یہاں سب نے پہلے دن اوجھڑی پکائ۔ کہنے لگی نادر بلوچ سے کہا تھا کہ آپکو اوجھڑی کا سالن دے دے۔ لیکن کہنے لگا کہ عنیقہ کہاں اوجھڑی کھائے گی۔

میں ہنسنے لگی۔ میں اوجھڑی کھاتی ہوں۔ اچھی طرح پکی ہو تو بڑے مزے کی ہوتی ہے لیکن عید والے دن، ذبح کئے ہوئے جانور میں اتنا کچھ ہوتا ہے کہ ہم لوگ اوجھڑی بالکل نہیں کھاتے۔ جب بھی کھاتے ہیں خرید کر پکاتے ہیں۔ بعد میں، میں نے اپنی اور انکی اس ادا پہ غور کیا تو خیال آیا  اسکی وجہ شاید اسکی صفائ کی پیچیدگی ہے۔ سمندر ہمارے پاس ہے لیکن ایک تو بڑی دور ہے دوسرا پونے دو کروڑ آبادی کے لوگ اگر اسے عید پہ اوجھڑی دھونے کے لئے استعمال کریں تو سوچ لیں کیا ہوگا۔

اپنے حصے میں آنے والے گوشت پہ سے چربی اچھی طرح صاف کی۔ یوں اس گوشت میں مزید ڈیڑھ دو کلو کی کمی واقع ہو گئ۔ نادر سے ڈرتے ڈرتے بات کی کہ کہیں اسے برا نہ لگے کہ وہ اگر چاہے تو یہ چربی لے سکتا ہے ورنہ ہم اسے پھینک ہی دیں گے۔ چربی کا یہ ڈھیر وہ بخوشی لے گیا۔

سارا دن گھر محلے بچوں سے بھرا رہا یا خواتین وقفے وقفے آتی رہیں۔ بچوں کے لئے تو گھر کے لیونگ روم میں موجود چھ ضرب چار فٹ کا جھولا سب سے بڑی کشش تھا۔ ایک وقت میں آٹھ دس بچے اس پہ لدے مزے لے رہے ہوتے۔ خواتین کے لئے شاید صوفے میں بڑی کشش تھی۔ وہ ایک دن میں دو دو بار آتیں۔ شام تک بچوں کے اس ہنگامے کی وجہ سے تھکن ہو گئ۔ اگرچہ اس دن میں نے ایک بلوچی لفظ سیکھا۔ بورو، مطلب باہر جاءو۔

عید گاہ کی طرف لوگوں کی روانگی

مشعل بچوں کے اس ہجوم میں کہیں غائب تھی۔ کبھی کبھی مجھے اسکی شکستہ بلوچی جملوں کی آوازیں آتیں۔ وہ زبان سیکھنے کے معاملے میں کافی تیز ہے۔ محض دو دن میں بلوچی لہجہ اور جملے سیکھ لئے تھے۔ جہاں الفاظ نہیں آتے وہاں لہجے سے کام چلاتی۔

آنے والی مہمان خواتین کے آگے جب میں نے دودھ سویاں رکھیں تو وہ اسے کھاتے ہوئے بادام کی ہوائیاں نکال کر ایک طرف رکھنے لگیں مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اس بات سے واقف نہیں کہ بادام بھی کوئ چیز ہوتی ہے۔

لائیٹ اب تک لا پتہ تھی۔ معلوم یہ ہوا کہ پی ایم ٹی اڑ چکا ہے۔ واپڈا والوں سے بات ہوئ ہے وہ اس پہ کام کر رہے ہیں رات تک آئے گی۔ رات مطلب، گیارہ بجے آئ۔ کبھی آپ نے نوٹ کیا کہ صحیح وقت کے بجائے رات، صبح،  دوپہر کہہ لیا جائے تو ذمہ داریوں کے تناءو سے کیسے نجات مل جاتی ہے۔

رات کے لئے میں نے پلاءو بنانے کے پروجیکٹ پہ کام شروع کیا۔ گوشت کا قورمہ تیار کر لیا اور چاول ابالنے کی باری آئ تو پتہ چلا کہ سلنڈر میں گیس ختم ہو گئ ہے۔ اسے کہتے ہیں غربت میں آٹا گیلا۔ عید کی چھٹی گیس کہاں سے ملے گی۔ یہ ایک الگ کہانی کہ پلاءو کس طرح اپنی منزل کو پہنچا۔ بہر حال ہم نے اسے کھایا بھی اور پڑوسیوں کو بھی دیا۔ اور ہاں نہ گوشت میں بُو تھی اور نہ ہی یہ سخت تھا۔ مزے سے گھنٹہ بھر میں گل گیا۔

بجلی رات کو شکر ہے کہ گیارہ بجے آگئ۔ یوں گوشت  ریفریجریٹر میں گیا۔

رات کو بارہ بجے جب ہم بستر پہ ڈھیر ہوئے تو ذکری ورد کی آوازیں ایک بار پھر آ رہی تھیں۔ یہ شاید تین راتوں تک جاری رہے۔ میں نے سوچا۔  سارا دن کے ہنگامے میں پتہ ہی نہ چلا کہ ہم ایک تہوار پر اپنے شہر، گھر اور رشتے داروں سے دور ایک اجنبی جگہ پر ہیں۔ انسان اگر مختلف کاموں میں شدید مصروف ہو تو ایسے خیالات کیسے راستہ پائیں۔ خالی ذہن چاہے افراد کے ہوں یا قوم کے شیطان کا گھر ہی بنتے ہیں۔

گوادر کے متلعق مزید تحاریر پڑھنے کے لئے اس لنک پہ جائیں۔

ساحل کے ساتھ

10:57 AM

، خواتین, بچے, بقر عید, بلوچستان, بلوچی, پاکستان, سر بندر, سفر, سنگھار, سیاحت, عیدالضحی, کراچی, گوادر, مشعل, مکران

بیٹی یا بیٹا؟

آپکو بیٹی چاہئیے یا بیٹا؟

تمام حیاتیات اپنے آپکو آگے بڑھانے کے لئے مختلف طریقے اختیار کرتی ہیں۔ جو حیات پسماندہ ہے وہ غیر جنسی طریقے سے اپنی نسل کو بڑھاتی ہے. ان میں عام طور پہ نر اور مادہ کی تخصیص نہیں ہوتی۔ جبکہ اعلی حیاتیات جنسی طریقے سے بڑھاتی ہے اور وہ نر اور مادہ صنفیں رکھتی ہے۔ سائینس کے نزدیک نر اور مادہ کا امتیاز بس اسی لئے ہے۔ کیونکہ جنسی طریقے سے زیادہ مضبوط نسل سامنے آتی ہے۔

انسان کا شمار سائینسی لحاظ سے تو ہوتا ہی اعلی حیات میں ہے بلکہ تمام مذہبی و ادبی ذرائع میں بھی انسان کو فوقیت دی جاتی ہے۔ لیکن جب ہم انسانی سطح پہ آتے ہیں تو یہاں انسان نے اپنے علیحدہ معیارات بنا رکھے ہیں۔ سب سے پہلا فرق تو جنس کی بنیاد پہ آتا ہے۔

ایک جنس دوسری جنس کے ساتھ کیا برتاءو رکھتی ہے اس کی بنیاد پہ ایک معاشرے کے اندر بہت سارے رسوم و رواج اور رجحانات جنم لیتے ہیں۔

مثلا ہمارے پڑوسی ملک بھارت میں شادیوں پہ لڑکیوں کو دئیے جانے والے جہیزاور دوسری طرف معاشرتی سطح پہ  لڑکیوں کو ہی نہیں انکے والدین کو بھی مختلف رسوم و رواج کے ذریعے  کمتر ہونے کا احساس دلانا ان چیزوں نے مل کر وہ بھیانک شکل اختیار کی کہ لوگوں کو عافیت اس میں نظر آئ کہ ایک لڑکی کو پیدائیش کے فوراً بعد مار دیا جائے۔ جب الٹرا ساءونڈ کی ٹیکنیک  کی مدد سے بچے کی جنس متعین کرنے میں مدد ملنے لگی تو ان بھارتیوں نے اس پہ اظہار گرمجوشی اس طرح  کیا کہ اب پیدائیش کے بعد نہیں بلکہ پیدائیش سے پہلے ہی لڑکیوں سے فراغت پا لی جاتی ہے۔

قدرت بڑی منتقم مزاج ہے۔ اور اسکا انتقام بڑا سخت ہوتا ہے۔ آج دو ہزار گیارہ میں بھارت میں ایسے علاقے موجود ہیں جہاں لڑکیوں کی کمی کی وجہ سے  لڑکوں کی شادیاں نہیں ہو پارہی ہیں۔ اسکا ایک حل تو یہ نکالا گیا کہ دوسرے علاقوں سے لڑکیاں خرید کر لے آتے ہیں۔

اسکے اپنے معاشرتی مسائل ہوتے ہیں کس طرح یہ انجان بولی اور ثقافت رکھنے والی لڑکیاں ایک اجنبی ماحول اور شوہر کے ساتھ گذارا کرتی ہیں۔ اسکا دوسرا بھیانک حل جو اب سامنے آیا ہے اس میں ایک لڑکی کسی ایک بھائ سے شادی کرتی ہے لیکن  در حقیقت اسے تمام بھائیوں کی بیوی بننا پڑتا ہے۔ یہ ایک حقیقت آجکے بھارت کے کچھ حصوں میں ایک کھلا راز ہے جسے سب جانتے ہیں مگر کوئ نہیں جانتا۔ پانڈءووں کی کہانی کو جنم دینے والی اس زمین پہ

مشترکہ بیوی

کے تصور کی  آبیاری ہونا کیا مشکل ہے۔

اس مثال سے پتہ چلتا ہے کہ کسطرح ترجیحات ایک معاشرے کے رسوم و رواج بلکہ اسکی روح تک کو متائثر کرتی ہیں۔

لوگوں نے بڑی چھان پھٹک کی، اندازے لگائے کہ کیا کوئ طریقہ ایسا ہے جس سے پتہ چل جائے کہ بیٹا کیسے پیدا ہو۔ میری ایک دوست کی والدہ کا کہنا تھا کہ مرد اگر زیادہ عمر میں شادی کریں تو انکے یہاں بیٹیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ کچھ کا خیال ہے کہ وہ خواتین جنکی کمر کولہوں کے مقابلے میں زیادہ پتلی ہوتی ہے انکے یہاں بیٹیاں زیادہ ہوتی ہیں، کچھ اسکا تعلق وراثت سے جوڑتے ہیں۔ جس خاندان میں لڑکے زیادہ ہوں وہاں لڑکے زیادہ پیدا ہوتے ہیں۔ مگر آپ اور میں ان سب کے غلط ہونے کی ایک نہیں کئ مثالیں سامنے لے آئیں گے۔

لیکن پھر بھی خیال آتا ہے کہ آخر کوئ تو ایسی بات ضرور ہوگی جسکی بناء پہ انسانی جسم میں موجود ایک زندگی اپنی جنس کا تعین کرتی ہوگی۔ بالکل ایسے ہی جیسے  جسم کے باقی افعال کے لئے خدا نے ایک راستہ متعین کیا ہے اسکے لئے بھی ہوگا تو۔

یہ خواہش کوئ غیر فطری نہیں کہ جہاں اللہ نے بیٹیاں دی ہیں وہاں بیٹا بھی ہو۔ لیکن صرف اسی کو زندگی کا مقصد بنا لینا درست نہیں۔ اب اس سوچ کو آگے بڑھاتے ہوئے غور کرتی ہوں کہ ایسے کون سے جوڑے ہیں جنکے یہاں بیٹے زیادہ ہیں اور ایسے کون سے جوڑے ہیں جنکے یہاں بیٹیاں زیادہ ہیں۔ سوچنے لگی کہ وہ مرد جو اسٹریس کا شکار ہوتے ہیں انکے یہاں بیٹیاں زیادہ ہوتی ہیں۔

میں نے مرد کو کیوں پکڑا؟

اس لئے کہ سائینس مطابق،  بچے کی جنس کا تعین کرنے میں

مرد کے کروموسومز

فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔

ابھی اس سوچ کے لئے مثالیں اکٹھی ہی کر رہی تھی کہ  تین دن بعد ایک مضمون پڑھنے کو ملا۔ جس میں کچھ تحقیق دانوں نے یہ نتائج پیش کئے کہ وہ

عورتیں جو اسٹریس

کا شکار زیادہ ہوتی ہیں انکے یہاں بیٹیاں ہوتی ہیں۔ یہ انہوں نے اپنی شماریات کا اندازہ بتایا ہے۔ اس مضمون میں یہ نہیں بتایا گیا کہ آیا انکے شوہروں کے روئیے کو بھی اس میں شامل رکھا گیا تھا یا نہیں۔

خیر جناب، اب یہ مت سمجھ لیجئے گا کہ بس ہر وقت مست رہنے سے لوگوں کی ایک بڑی تعداد کا یہ مسئلہ حل ہوجائے گا۔ یہ کارخانہ ء حیاتیات عورت اور مرد دونوں کو مل کر چلانا ہے۔ اس لئے دونوں کی تعداد کا توازن میں ہونا ضروری ہے۔

ہو سکتا ہے کہ سائینس داں کوشش میں ہوں کہ اس بہانے خواتین حالت حمل میں تناءو کا شکار نہ ہونے کی کوشش کریں۔ اگر آپکے شوہر بیٹے کی شدید خواہش میں آپکو زچ کر کے رکھے ہوئے ہیں تو انہیں یہ تحریر پڑھا دیجئیے۔ ممکن ہے کم از کم بچے کے آنے تک آپ سکون سے رہ پائیں۔

12:14 AM

بھارت, بیٹا, بیٹی, پاکستان،, جنسی امتیاز

کرائے کے ٹٹّو

ہمارے ملک میں جیسے ریلیوں کا وبائ مرض پھوٹ پڑا ہے۔ جمعے کے با برکت  دن جناب نواز شریف نے اس سلسلے میں پہلی علامت ظاہر کی۔ یہ با برکت دن منتخب کرنے کی وجہ سے صاحبان کشف نے انکی اگلی منزل جدہ بتائ ہے۔  سبحان اللہ۔

آج عمران خان  ریلیز کا چالیس سالہ ریکارڈ توڑنا چاہتے ہیں ویسے تو اللہ میاں نے انہیں چاندی کا چمچ منہ میں دے کر پیدا کیا ہے اور نزاکت نازنینوں کے بنانے سے نہیں بنتی، خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آہی جاتی ہے۔ ایسے ہی بادشاہ بننے کی خواہش بھی کسی جگر رکھنے والے شخص کے ذہن میں ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ ہمارے ہر دلعزیز شہزادے پہ اس وقت بادشاہت کا نور اترا ہوا ہے۔ ایسا نور جس میں لوگ ان سے یہ تک پوچھنے سے قاصر ہیں کہ زمام اقتدار سنبھالنے کے بعد آپ کریں گے کیا۔ آپکے منصوبوں کی کچھ تفصیل۔ واللہ علیم و خبیر۔

ادھر الطاف حسین جنہیں ذوالفقار مرزا کے ڈنڈے سے جناب صدر نے ایسا سُدھایا ہے کہ وہ انکے لئے ہر خدمت انجام دینے کو تیار ہیں چاہے انکا ووٹ بینک اسکے خلاف ہو۔ ان کو بھی بر وقت یہ خیال باور کرایا گیا کہ انکی فی الفور 'حکمت عملی' کیا ہونی چاہئیے۔یہ دونوں ریلیز جمہوریت یعنی صدر صاحب کے خلاف سازش ہیں اس لئے ایک ضد ریلی کا بند وبست انکی طرف سے بھی ہے جس میں انہوں نے دینی جماعتوں سے بھی شرکت کی دعوت کی ہے۔ نیکی کے کاموں میں باہم ہو جاءو۔

دینی جماعتیں ابھی ممتاز قادری غازی کو رہا کرانے کی ریلیوں میں مصروف ہیں۔ انکی ریلی کا موضوع ہمیشہ کی طرح ایک ہی ہے نفاذ شریعت۔ یہ جملہ اتنا پر اثر ہے کہ ڈنگی کے مچھر ہوں یا سیلاب، وال اسٹڑیٹ پہ قبضہ ہو یا شعیب ملک کی شادی ہر جگہ کام کرتا ہے۔  اطیعواللہ و اطیعوالرسول۔

ہر ریلی کے مریض کے منہ سے ایک ہی آواز برآمد ہو رہی ہے 'ہاکستان بچاءو۔ جبکہ پاکستان آہستہ آہستہ بدبدا رہا ہے مجھے میرے دوستوں سے بچاءو۔

ریلیوں کے جراثیم کس نے پھیلائے ہیں؟ اسکا کیا تدارک ہے؟ اسکا کون سا مریض بچے گا؟ بچ جانے والا مریض ہمارے کسی کام کا ہوگا یا اپنے ڈاکٹر کے اشارے پہ ناچے گا؟

ان تمام سوالوں کے جواب جاننے کے لئے، ایک چالیس روزہ چلّہ کاٹنے کی ضرورت ہے جسکے لئے ایک سنسان جگہ کی چاہئِے۔ اٹھارہ کروڑ آبادی والے ملک میں یہ جگہ کہاں ملے گی۔ اگر لوگوں کے ذہن سے کوئ جگہ اتری ہوئ ہے تو اس پہ، سیلاب، ڈنگی کے مچھر،  مجاہدین یا بیرونی طاقتوں کا قبضہ ہے؟ ہم کیا کریں، کیا ہم بھی کوئ ریلی نکالیں؟

ہم عوام کے پاس ریلیاں نکالنے کے ہزار بہانے ہیں مگر ہر دفعہ روپے کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے۔

جو طاقتیں ان ریلیوں کو منعقد کرانے میں دلچسپی لے رہی ہیں ان سے صرف اتنا کہنا  ہے کہ ہم بھی پڑے ہیں راہوں میں۔ اجی ، آزما کر تو دیکھئیے ہم بھی جاندار ڈائیلاگز بول سکتے ہیں، آپکی ڈگڈگی پہ آئیٹم رقص پیش کر سکتے ہیں۔ ریلی کیا ریلہ لا سکتے ہیں۔ خدا گواہ ہے ہم بھی قرآن پہ ہاتھ رکھ کر قسم کھا سکتے ہیں کہ کبھی ایک روپئیے کی بھی کرپشن نہیں کی۔ اگر کی تو مرے پہ سو درے۔ ہم بھی پاکستان کو بچانا چاہتے ہیں اگرچہ کہ اب تک اپنا مال، جان، عزت، گھر، شرافت، علم اور دوسری بے شمار اشیاء بچانے میں ناکام رہے ہیں لیکن ہمیں یقین ہے کہ ہم پاکستان بچانے میں کامیاب ہونگے۔ انشاءللہ۔

گو کہ ہمیں اکثر یہ بھی خیال آتا ہے کہ ہم کون سا پاکستان بچائیں گے وہ جو قائد اعظم نے بنایا، وہ جو انیس سو اکہتر میں دو ٹکڑے ہوا پھر بھی پاکستان کہلایا، وہ جس نے ایک فلاحی ریاست بننے کے بجائے جہاد کو اپنی معیشت بنایا۔ سر، آپ تو جانتے ہیں کہ یاد ماضی عذاب ہوتا ہے اور اسکا حل حافظہ چھین لینے میں ہی ہے جس میں سنا ہے کہ آپ ماہر ہیں۔

یقین کریں عزت مآب، ان سب کرائے کے ٹٹءووں سے ہم کہیں بہتر ٹٹو ثابت ہونگے۔ ہم تعداد میں زیادہ ہیں تو کیا اتنے ہی بے ضرر ہیں جتنی درخت کی چڑیاں یا آنگن کی گئیاں۔ جہاں باندھ دیں گے بندھ جائیں گے اور جدھر کو اڑا دیں اڑ جائیں گے۔ بخدا ہمیں دانہ پانی، ایک چھوٹا سا آسمان اور صحن کے کھونٹے کے علاوہ بس ایک چیز اور چاہئیے۔ آپکے ان چہیتے ٹٹءووں کے لئے ایک اصطبل اتنی دور جہاں سے یہ ہمیں نظر نہ آسکیں۔ و تعز من تشاء تزلّ من تشاء۔

9:32 AM

الطاف حسین, انقلاب, پاکستان, جہاد, ذوالفقار مرزا, ریلی, سیاست, عمران خان, لاہور, نواز شریف

زبان کی تان

میں نے اپنی بچی کی  مونٹیسوری کی ہیڈ سے کہا کہ آپ نے آجکل اردو حروف کو واءو کے ساتھ ملانے کی مشق شروع کرائ ہے۔ اسے میں نے دیکھا اور میرے خیال سے یہ بچوں کے لئے خاصہ الجھن کا باعث ہے۔ وہ کیسے؟ انہوں نے دریافت کیا۔ دراصل اردو میں واءو کے ساتھ تین مختلف طرح کی آوازیں نکلتی ہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے انہوں نے میری بات پہ ایک مسکراہٹ دی۔ واءو کے ساتھ ایک ہی آواز نکلتی ہے۔ جی نہیں، میں نے انکی بات سے انکار کیا اور انکو مثال دی۔ ابھی آپ نے بچوں کو جن آٹھ الفاظ کی مشق کرائ ہے۔ ان میں اس طرح کے الفاظ ہیں، جانو، توڑو، روکو اور اسکے ساتھ ہی الفاظ ہیں جوتا ، آڑو اور چاقو۔ ان میں واءو کے ساتھ الگ آواز ہے۔ وہ حیران سی ہوئیں ، کہاں ایک جیسی آواز ہی تو ہے۔ 'ایک جیسی نہیں ہے، جب کسی بچے کو مشق کرائیں گے تو بچہ اگر ذرا بھی ذہین ہوگا  وہ اس پہ احتجاج کرے گا۔جیسے میری بچی نے کیا اور پھر میں نے پیش لگا کر اسے فرق بتایا'۔

دیکھیں میں اپنی بات کو آسان کرتی ہوں۔ میں نے انہیں قائل کرنے کے لئے کہا۔ رو، رَو اور رُو یہ تینوں الفاظ الگ ہیں الگ معنی رکھتے ہیں۔ اعراب لگا دینے سے معنی الگ ہو جاتے ہیں۔ اب وہ خاموش اور سنجیدہ تو ہوئیں  لیکن اب بھی انکی خواہش یہ تھی کہ کسی طرح میری بات غلط ثابت ہو جائے اور وہ اپنی لا علمی کی شرمندگی سے بچ جائیں۔ وہ اپنی ایک ٹیچر کی طرف دیکھ کر درپردہ کہنے لگیں کہ آءو اور مجھے اس مصیبت سے نجات دلاءو۔  ٹیچر نے فوراً اس ان کہی درخواست پہ لبیک کہا اور زبان پہ فتوی دیا۔ 'اردو میں تو اعراب ہوتے ہی نہیں، اعراب تو عربی میں ہوتے ہیں'۔

اگر میں آپکی اس بات کو صحیح مان لوں تو آپ نے بچوں کو جو اردو کا قاعدہ دیا ہے اس میں اعراب والی مشقیں کیوں ہیں۔ اس میں پیش اور بغیر پیش کی آوازیں الگ الگ موجود ہیں۔ آپکی اردو کی ورک بک میں آڑو کے اوپر پیش لگا ہوا ہے۔ غالباً آپ نے اسے دھیان سے نہیں دیکھا۔ اور یہ بچے جب پانچویں چھٹی تک پہنچیں گے تو انہیں اردو کے مشکل الفاظ کے اوپر اعراب لگانے کی مشق بھی کرائ جائے گی ۔ اتنی اردو مجھے آتی ہے۔ میں نے انکی بات رد کی۔

میں آپ سے صرف اتنی درخواست کرونگی کہ آپ واءو آواز کے  کم از کم دو حصے کر دیں ایک میں پیش کے ساتھ اور دوسرے میں پیش کے بغیر اس طرح بچوں کو پتہ چل جائے گا کہ چاقُو، چاقُو کیوں ہے اور چاقََو کیوں نہیں ہے۔ انہوں نے مجھے ٹالنے کے لئے کہہ دیا کہ ٹھیک ہے ہم اس پہ غور کریں گے۔

غور کرنے کے بعد غالباً انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ سارا مسئلہ آڑو اور چاقو کی وجہ سے ہے۔ اگلی مشقوں میں سے ان الفاظ کو نکال باہر کر دیا۔

یہ وہ اسکول ہے کہ جب میں اپنی بچی کا وہاں ایڈمشن کرارہی تھی تو انہوں نے مجھے اپنے اسکول میں تدریس کی پیش کش کی تھی۔ اب انہیں احساس ہو چلا ہوگا کہ یہ انکے لئے کتنا خطرناک ہوتا۔ میں نے ان سے معذرت کی تھی کہ مجھے اتنی چھوٹی کلاسز کو پڑھانے کا تجربہ نہیں اگر وہ چاہیں تو میں انکے اسکول میں رضاکار کے طور پہ خدمت انجام دے سکتی ہوں۔ رضاکارانہ خدمات کا تصور پاکستان میں اتنا عام نہیں۔ اس لئے انہوں نے اس سے فائدہ اٹھانے کا سوچا بھی نہیں۔

بہر حال، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسکولوں میں اردو پڑھانے کا طریقہ کتنا  بے کار اور توجہ سے خالی ہے۔ غالباً بچوں کو الفاظ کی تصویری شکل یاد کرا دی جاتی ہے۔ اس لئے وہ اردو میں بے حد کمزور ہوتے ہیں۔  انگریزی جس کا ملک میں اتنا شہرہ ہے وہ بھی بحیثیت زبان نہیں سکھائ جاتی بلکہ  رٹائ جاتی ہے۔ نتیجتاً وہ بھی نہیں آتی ۔ ایک شخص جو بڑی روانی سے انگریزی بول رہا ہوتا ہے  اس نے بھی کسی انگریزی بول چال سکھانے والے ادارے سے مدد لی ہوتی ہے۔ اس طرح کی تدریس سے نہ ہی وصال صنم ہو پاتا ہے اور نہ ہی خدا مل پاتا ہے۔

حالانکہ اسی ملک میں ٹاٹ پہ بیٹھ کر پڑھنے والے بچوں کی انگریزی بھی اچھی ہوتی تھی اور اردو بھی۔ وجہ یہ ہوئ کہ  ناکارہ اور نااہل افراد کے حوالے قوم کا مستقبل کر دیا گیا۔ جتنی زیادہ دونوں زبانوں میں کمزوری بڑھ رہی ہے اتنا ہی زیادہ واویلہ ہو رہا ہے کہ انگریزی زبان میں تعلیم کیوں؟

خیر، اردو زبان کی اپنی گرامر ہے ، انگریزی کی طرح حروف کی آوازیں بھی ہیں، اعراب ہیں اور انکی مدد سے بچوں کو ہجّے لگانے کی تیکنیک سکھائ جائے جیسا کہ ایک زمانے میں رواج تھا اور جیسا کہ اب بھی انگریزی کے لئے اختیار کیا جاتا ہے تو اردو بھی بچوں کے لئے آسان ہو جائے۔ لیکن زبان کی سائینس کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ سو حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح ایک اسکول کا پورا عملہ اس بات سے ناواقف نکلا کہ اردو میں اعراب ہوتے ہیں انکی وجہ سے آواز میں فرق آتا ہے۔ اسکے بجائے انہوں نے میری معلومات کو درست کرنا پسند کیا۔ آنکھ نہ دیدہ کاڑھے کشیدہ۔

3:20 PM

آواز, اردو, اعراب, انگریزی, بچے, پاکستان, تعلیم, زبان, مونٹیسوری

سوءر کے بال

انکی باتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ اور اس میں فل اسٹاپ آنے کی جلد امید بھی نہیں کی جا سکتی تھی کہ معاملہ انکے شوہر اور شوہر کے گھر والوں کا تھا۔ میں انہیں دبے الفاظ میں اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس وقت جبکہ آپ کینیڈا میں ہیں اور شوہر کے گھر والے پاکستان میں۔ آپ اپنے گھر پہ اکیلے راج کر رہی ہیں۔ شوہر کے سب بہن بھائ یہاں سے ہزاروں میل دور اپنی دنیا میں مگن ہیں انکے اوپر انہیں کچھ خرچ بھی نہیں کرنا پڑتا تو وہ کیوں انکے تذکرے سے اپنے گھر کی فضا مکدر کرتی ہیں۔ کبھی کبھی شوہر کو محض شوہر نہ سمجھا کریں بلکہ محبوب دلنواز سمجھ کر بھی آءو بھگت کیا کریں اس سے تعلقات پہ کافی مثبت اثر پڑتا ہے لیکن ہر دفعہ وہ ماضی سے کوئ قصہ نکال کر اسکا پوسٹ مارٹم کرنے بیٹھ جاتیں۔

اسی گفت و شنید میں جو کہ میرے لئے گفت کم اور شنید زیادہ تھی، اچانک ٹی وی لاءونج سے بچوں کے جھگڑنے کی آواز آئ۔ پھر مشعل انتہائ ناراض حالت میں وہاں سے برآمد ہوئیں۔ 'میں کارٹون دیکھ رہی تھی کہ ریان نے ٹی وی بند کر دیا'۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اور ریان کی ماں نے غصیلی نظروں سے ریان کو دیکھا۔ جسکی تاب نہ لاتے ہوئے ریان نے ترنت جواب دیا،'ٹی وی پہ گندہ کارٹون آرہا تھا۔ میں نے بند کر دیا'۔  کینیڈا میں بچوں کا بڑا مشہور چینل ہے

ٹری ہاءوس

، مجھے حیرت ہوئ کہ ایسا کون سا گندہ کارٹون ہے جو اس چینل سے آرہا ہے۔

بچے کی اس بات پہ ماں نے اطمینان کا سانس لیا۔ 'وہ دراصل یہ گورے تو ایسے غلیظ ہیں کہ انہوں نے پگز تک پہ کارٹونز بنائے ہوئے ہیں۔ پگز کا پورا خاندان اس کارٹون میں موجود ہے۔ جب ٹی وی پہ وہ کارٹون آتا ہے تو ہم ٹی وی بند کر دیتے ہیں۔ اور ریان کو بھی یہی ہدایت ہے اس لئے اس نے بند کر دیا'۔ پگز یعنی سوءر۔

میں نے زبان کھولنے کی کوشش کی اور پھر خاموش ہو گئ۔ رات ہی ان سے سیدوں کے اعلی ہونے پہ کچھ زیادہ بات ہو گئ تھی۔  اس وقت دوبارہ دینی بحث میں جانے کا موڈ نہیں تھا۔ میں انکے یہاں چند دن کے لئے مہمان تھی اور پہلے کچھ خاص علیک سلیک بھی نہ تھی۔

لیکن یہ سوال اپنی جگہ ذہن میں موجود  کہ قرآن میں سوءر کا گوشت کھانا منع ہے۔ یعنی حلال نہیں حرام ہے۔ لیکن اسکے علاوہ کہیں ایسی کوئ بات نہیں کہی گئ کہ سوءر کا دیکھنا بھی منع ہے۔ یا یہ بتانا منع ہے کہ سوءر کے بھی ماں باپ اور بچے ہوتے ہیں۔ در حقیقت وہ بھی اسی فضا میں سانس لیتے ہیں جس میں ہم سانس لیتے ہیں تو کیا یہ ساری فضا غلیظ ہو گئ ہے۔ اب ہم کیسے سانس لیں گے۔

پھر یہ کہ گوشت تو شیر اور بھیڑئیے کا بھی کھانا منع ہے یعنی حرام ہے پھر کیا وجہ ہے کہ ان سے منسوب حکائیتیں تک بچوں کو سنائ جاتی ہیں۔ آخر سوءر کے ساتھ یہ امتیازی سلوک کیوں؟ آپ نہ کھائیں یہ الگ بات ہے تقریباً تمام مسلمان سوءر کا گوشت نہیں کھاتے وہ بھی جو شراب پی لیتے ہیں۔  لیکن ایسا کیا کہ اسکا کارٹون تک نہ دیکھیں۔

اکثرہمارے ملک میں موجود شدت پسندی کی جڑیں امریکہ، انڈیا، ایران اور سعودی عرب سے جوڑی جاتی ہیں۔ لیکن مشتبہ قوتوں میں ، میں ایک قوت اور شامل کرنا چاہونگی اور وہ ہیں مغربی ممالک کی شہریت اختیار کرنے والے پاکستانی۔ جب سے پاکستانی ان مغربی ممالک میں جا کر آباد ہوئے ہیں ان کی اکثریت نے پاکستان کو اپنے مذہبی خلاء کو پورا کرنے کی جگہ سمجھ لیا ہے۔ نہ صرف وہاں کی ہر تشنگی کو یہاں مٹاتے ہیں۔ جیسے وہاں کے بے حیاء ماحول میں رہ کر انکا دل شدت سے چاہتا ہے کہ پاکستان میں کاش لڑکیاں حجاب کے ساتھ پیدا ہوں۔ کیا سائینس اس سلسلے میں جینیٹک انجینیئرنگ کے کمال دکھا سکتی ہے؟ وہ پوچھنا چاہتے ہیں۔

اسی طرح وہاں رہ کر مذہب میں باریکیاں نکالنے کا بڑا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ، وہاں دو بنیادی طبقے پیدا ہو جاتے ہیں ایک وہ جو وہاں کے رنگ میں ان سے زیادہ رنگ جاتا ہے اور دوسرا وہ جو پہلے سے بھی زیادہ مذہبی ہو جاتا ہے۔ اور ہر طرح کے مذہبی وہم انہیں تنگ کرنے لگتے ہیں۔ درمیانی راہ چلنے والے  نسبتاً کم ہوتے ہیں۔

مثلاً وہیں ایک پاکستانی خاتون کو میں نے اپنے شوہر سے یہ کہتے سنا کہ اسلام میں گھر کے کام بیوی پہ فرض نہیں اگر کرے تو مرد پہ احسان ہے۔ نہ ہی اسکے والدین کی خدمت اسکا فرض ہے۔ اسلام میں بیوی کا فرض ہے کہ بچے پیدا کرے اور شوہر کی ضرورت پوری کرے۔

لیجئیے اسلام کا یہ ورژن، اگر وطن عزیز میں رہنے والی خاتون بتاتیں تو شوہر بعد میں پہلے سسرال والے انہیں انکی اوقات یاد دلا دیتے۔ کن ہواءوں میں ہیں اسلام میں اسی لئے مرد کے لئے چار شادیاں رکھی گئ ہیں۔

خیر ہم لوٹ کر دوبارہ سوءر پہ آتے ہیں۔ یہاں پاکستان میں تو کچھ لوگ سوءر کا نام بھی منہ سے نہیں نکالتے اور کہہ دیتے ہیں وہی جانور جو گُو کھاتا ہے۔ اگر وہ والا محاورہ کہنا ہو کہ فلاں کی آنکھ میں تو سوءر کا بال ہے تو اسکی جگہ کہتے ہیں اسکی آنکھ میں تو اُسکا بال ہے۔ جو پوچھیں کس کا؟ تو جواب ملے گا وہی جو گوُ کھاتا ہے۔ کچھ لوگوں کو سوءر کے بجائے خنزیر کہنا زیادہ مناسب لگتا ہے۔ سوءر کہتے ہوئے زبان کے آگے خندق آجاتی ہے لیکن خنزیر سے روانی رہتی ہے۔ مجھے اس ترجیح کی وجہ نہیں معلوم۔

 ایک عزیز بزرگ آج سے تیس سال پہلے کا قصہ سنا رہے تھے کہ وہ دبئ میں تھے اور بچوں کے ایک اسکول میں پڑھاتے تھے۔  اسکول لائیبریری کے لئے باہر سے کتابیں منگوانے کے لئے فہرست طلب کی گئ مختلف اساتذہ نے اس میں کتابوں کے نام ڈال دئیے۔ اور اس طرح سے باہر سے کتابیں آئیں لیکن ان میں سے کچھ کتابوں کو فوری طور پہ واپس بھجوایا گیا۔ وجہ اسکول کی عرب ایڈمنسٹریشن نے یہ بتائ کہ کتابوں میں سوءر کی تصویریں ہیں۔

بس جہاں اور اوٹ پٹانگ سوالات ذہن میں آتے ہیں ان میں  یہ بھی چلے آئے کہ پاکستان کے دیہاتوں میں سوءروں کے ساتھ کیا کیا جاتا ہے؟ شہر کے بچے اگر سوءر دیکھناچاہیں کہ کیسا ہوتا ہے تو کیا کریں؟ کوئ سر پھرا بچہ یہ پوچھے کہ سوءر کے بچے بھی کیوٹ ہوتے ہیں، انکی ماما بھی انکو پیار کرتی ہیں تو کیا اسکا جواب یہ دیں  کہ سوءر کے بال بچوں سے تمہیں کیا، وہ تو خود مارے شرمندگی کے ایکدوسرے سے منہ چھپائے پھرتے ہیں کہ پیدا کیوں ہو گئے۔

11:12 PM

پاکستان, پاکستانی, ٹری ہاءوس, حرام, حلال, سوءر, شدت پسندی, کارٹون, کینیڈا, مسلمان, معاشرہ

کتے کی موت

ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے,  کیسے؟ یہ نہیں معلوم۔

تاریخ بنانے والے کی موت بھی تاریخ کا حصہ بن جاتی ہے۔ اسی طرح اکثر متنازع شخصیات کی موت بھی وجہ ء تنازعہ کو جنم دیتی ہے۔ اس لئے کہ مرنے والے کے پیچھے بھی لوگوں کے گروہ بن جاتے ہیں ایک اگر اسکی موت کو کتے کی موت قرار  دیتا ہے تو دوسرا اسے رحمۃ اللہ علیہ بنانے میں کوئ کسر نہیں چھوڑ رکھتا۔

اس وقت اس بات کی تفصیل میں جانے سے گریز کرتے ہیں کہ کتے کی موت میں ایسی کیا بات ہے کہ دشمن اگر رسوا کن انداز میں مرے تو اسے کتے کی موت قرار دیا جائے۔ کیونکہ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ کتا بھی ایسے ہی جان دیتا ہے جیسے بلی، گھوڑا یا ہاتھی  حتی کہ انسان۔

کتے کو اتنا حقیر کیوں سمجھا جاتا ہے؟ کیا کتا اس بات سے واقف ہے کہ  انسان کی نظر میں وہ اتنا حقیر ہے اگر وہ ہے تو سبق سکھانے کے لئے روزانہ انسان کو کاٹنے کی مہم پہ کیوں نہیں نکلتا؟ کیا یہ کوئ ایک کتا ہے یا سب کتے ہیں؟ کیا کتوں میں تعلیمی شرح انسانوں سے بھی گئ گذری ہے؟ کیا کتوں میں بھی امیر اور غریب کے طبقات موجود ہیں اور وہ انکی نفسیات پہ اثر ڈالتے ہیں؟ کیا انسان پہ کتوں کی امارت اور غربت سے فرق پڑتا ہے؟  نہ نہ یہ بات اس وقت نہیں کسی یوم کتا پہ کریں گے۔

پاکستان کی تاریخ میں دو پاکستانی شخصیات کو ایسی ہی اموات کا سامنا کرنا پڑا۔

ذوالفقار علی بھٹو کو قتل کے ایک مقدمے میں پھانسی کی سزا ہوئ۔  حامی آخری وقت منتظر رہے کہ بیرونی طاقتیں اسے رکوا دیں گی لیکن ایک دن منہ اندھیرے جلاد نے تختہ ء دار  کھینچا اور پاکستان کی ایک متنازع شخصیت کو اسکے انجام تک پہنچا دیا۔

ایول جینیئس، میرے ایک عزیز بزرگ کا کہنا تھا، بے حد ذہین آدمی مگر نیت خراب۔ وہ بے حد زیرک انسان تھے لیکن ذہانت کو منفی سطح پہ زیادہ استعمال کیا۔ انہوں نے پاکستانی سیاست میں عوامیت کو داخل کیا۔ لیکن ان پہ پاکستان توڑنے کے الزام لگے انہیں مغرور اور خود پسند شخص کہا گیا۔

مذہبی جماعتوں کے نزدیک وہ فاسق تھے ایک ایسا شخص جو مجمعے میں کھڑا ہو کر کہہ دے کہ میں شراب پیتا ہوں لوگوں کا خون نہیں تو فاسق ہی ہوا ناں۔ لیکن یہ کریڈٹ بھی انکے حصے میں گیا کہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا۔ وہی قادیانی جسکے ایک فرد کو قائد اعظم نے اپنی مملکت کا وزیر خارجہ بنایا بغیر یہ سوچے کہ وہ مسلم ہے یا غیر مسلم۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کو پاکستان کے لئے ایٹمی ہتھیار بنانے پہ راضی کرنے والے وزیر اعظم کو کہا گیا کہ انہوں نے یہ سب کچھ اپنے اوپر سے پاکستان کو دو لخت کرنے کے داغ کو دھونے کے لئے کیا۔ پاکستان ایٹمی طاقت بن گیا۔ بھٹو کا نام  اس سلسلے میں پیچھے چلا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کا نام آگے آگیا۔

لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ مذہبی جماعتوں کے دباءو میں آگئے تھے۔ یا یہ کہ وہ اپنے اقتدار کا استحکام ہر قیمت پہ چاہتے تھے۔ یوں اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگانے والا رہنما مذہبی جماعتوں سے املا لینے لگا۔ انہوں نے ہی مذہبی جماعتوں کے دباءو پہ پاکستان میں جمعے کی چھٹی متعارف کرائ۔ جو کہ ملکی اقتصا دیات پہ بھاری ثابت ہوئ۔ لیکن مذہبی جماعتوں کو خوش رکھنے کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ بالآخر تمام سیاسی جماعتوں نے مل کر نظام مصطفی کے نفاذ کی تحریک چلائ اور فوج نے اس بہانے اقتدار سنبھالا۔

بھٹو کی پھانسی کے دن جہاں ایک طبقے نے خس کم جہاں پاک کا نعرہ بلند کیا وہاں ایسے بھی لوگ تھے جو اس خبر کی تاب نہ لا سکے اور خود کشی کر لی۔ ایک کے نزدیک وہ کتے کی موت مارا گیا دوسرے کے نزدیک شہید کی موت۔

قاتل کی یہی سزا ہونی چاہئیے تھی، قاتل کیسے شہید ہو سکتا ہے؟ لوگوں نے سوال اٹھائے۔ لیکن انکے مزار پہ لوگوں کی ایک تعداد اپنی دعاءووں کی قبولیت کی منتظر رہتی ہے۔ لوگ تو بکھرے ہوئے پھولوں سے بھی کرامتیں جوڑتے ہیں۔ اللہ کی باتیں اللہ ہی جانے۔

پاکستانی تاریخ کی سب سے مضبوط شخصیت

جنرل ضیاءالحق

ثابت ہوئے۔ اپنے سب سے بڑے ممکنہ دشمن کو پھانسی پہ پہنچا کر مذہبی جماعتوں کو نفاذ شریعت کی لالی پاپ دئے رکھی ادھر فوج کو امریکہ کا حلیف بنا کر روس کے خلاف جنگ میں افغانیوں کے ساتھ شامل ہوئے۔ جی اُسی امریکہ کا جسکے منہ کالا ہونے کی آج دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ پھر وہی اللہ کی باتیں اللہ ہی جانے۔

بھٹو اور ضیاءالحق ایک یادگار تصویر

پاکستانی معاشرے میں ہیروئین، کلاشنکوف اور لاکھوں کی تعداد میں افغان مہاجرین آئے جو اپنے ساتھ اپنی ثقافت لے کر آئے، وہ آئے اور چھا گئے۔ ضیاءالحق نے پاکستانی طاقت کے کھیل میں بڑا جم کر کھیلا۔ اگر طیارہ نہ پھٹتا یا پھاڑا نہ جاتا تو شاید آج وہ کرنل  قذافی کی ٹکر پہ ہوتے۔

ہر عروج کو زوال دیکھنا ہوتا ہے۔ بالآخر وہ دن بھی آیا جب پاکستانی عوام نے ٹی  وی پہ غلام اسحق خاں کی زبانی یہ اعلان سنا کہ ہمارے ملک پہ گیارہ سال سے قابض ہمارے محبوب صدر ہوا میں طیارہ پھٹنے سے جاں بحق ہو گئے۔  جائے حادثہ سے ایک جبڑا ملا جسکی شناخت محبوب صدر کے جبڑے کے طور پہ کی گئ۔ اور اس جبڑے کی آخری رسومات عمل میں لائیں گئیں۔

مجھے یاد ہے کہ محلے میں کچھ لوگ ٹی وی پہ جاری تدفین کی لائیو ٹرانسمیشن پہ آنسوءووں سے رو رہے تھے۔ تقریب کی کمنٹری کرنے والے صاحب اظہر لودھی بار بار رقّت کا شکار ہو رہے ہیں۔

ٹی وی پہ جاری ٹرانسمیشن میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ جائے تدفین پہ آئے ہوئے تھے۔ کچھ کے نزدیک میلے میں شرکت کرنے آئے تھے کیونکہ اس دن پاکستان میں چھٹی تھی، کچھ کے نزدیک عقیدت اور صدمے میں آئے تھے۔

  عین اسی وقت کچھ لوگ خوش تھے ایک مکار ڈریکولا صفت شخص سے جان چھوٹی۔ وہ شخص جس نےذاتی اقتدار کے لئے پاکستان کو مذہب کی انتہا پسندی میں جھونک دیا ایک آسیبی دور جسکے ختم ہونے پہ خیر کی کچھ امید تھی۔ وہ جس نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لئے مذہب کو بری طرح استعمال کیا۔ جس نے پاکستان کو جہاد کا مرکز بنا دیا اور اپنی نوجوان نسل کو ہیروئین اور اسلحے کا نشہ دیا یا پھر جنگی جنون۔

اس نے پاکستان کو روشن مستقبل دینے کے بجائے ایک دہشت گرد ملک بنانے کی بنیاد رکھی۔ اس نے پاکستانی معاشرے کو ایک منجمد اور بند معاشرے میں تبدیل کیا۔ اس نے پاکستانی فوج کو ڈالرز کا چسکا دیا او معاشرے میں کرپشن کو بڑھاوا۔ جنرل ضیاء الحق پہ ملکی تباہی کے سنگین الزامات ہیں۔

سو ایک طبقے کے نزدیک وہ کتے کی موت مارے گئے۔ خدا نے انکا دنیا میں ہی انجام دکھلا دیا۔ بہادر شاہ ظفر کو تو دو گز زمین وطن میں نہ ملی۔ ضیاءالحق کے لئے زمین موجود تھی مگر جسم نہ مل رہا تھا نامعلوم کس کے جبڑے پہ اکتفا کرنا پڑا۔ انکی قبر اگرچہ کہ شاہ فیصل مسجد کے ساتھ موجود ہے مگر اس پہ کوئ شاذ ہی جاتا ہے۔ مر گئے مردود نہ فاتحہ نہ درود۔ لیکن اپنے حامیوں کے لئے انکی موت ایک شہید کی موت تھی۔ ایک فوجی جو دوران ملازمت جان دے وہ ایک شہید کی موت مرا۔ ہم کیا کہیں، اللہ کی باتیں اللہ ہی جانے۔

زندگی نے ہمیں ایک دفعہ پھر واقعات کا چشم دید گواہ بنایا۔  اتنا کہ ہم نے دیکھا، کس طرح رات کے اندھیرے میں امریکن طیارے پاکستان کی حدود میں اتنی احتیاط سے داخل ہوئے جسکے لئے کہتے ہیں کسی کوکانوں کان خبر نہ ہونا۔  اور ایک ایسے شخص کو موت کی نیند سلا گئے بلکہ اسکی لاش بھی ساتھ لے گئے، جو ایک عرصے سے روپوش تھا مگر دنیا ہلائے ہوئے تھا۔

ایک غیر پاکستانی جس پہ پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد فدا تھی۔ پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد کا پسندیدہ مجاہد جس مکان میں کئ سال سے اپنے لمبے چوڑے خاندان سمیت چھپا ہوا تھا اسی میں مارا گیا۔ مخالفین خوش کہ کتے کی موت مارا گیا۔ وہاں بیٹھا دوسروں کے بچے مروا رہا تھا اور اپنے تین بیویوں سے پیدا کر رہا تھا۔  حامیوں نے اسے شہید کی موت قرار دیا۔ مجاہد اگر کفّار کے ہاتھوں مارا جائے تو شہید ہے۔ کئ سوالات پیدا ہوئے۔ بڑی گرما گرمی رہی۔ سب سے اہم بات یہی رہی کہ کیا فرزند زمین نے

اسامہ

کو شہادت کے رتبے تک پہنچانے میں اپنا خاموش کردار ادا کیا؟ کیونکہ انکے ہاتھوں مرتا تو شہادت مشکوک ٹہرتی۔ ایک دفعہ پھر، اللہ کی باتیں اللہ ہی جانے۔

لیبیا کے صدر کرنل قذافی کوایک عرصے تک پاکستان میں سرکاری سطح پہ ہی نہیں عوامی سطح پہ بھی خاصی مقبولیت  حاصل رہی۔

یاسر عرفات، بھٹو اور کرنل قذافی

کہتے ہیں انیس سو چوہتّر میں بھٹو صاحب نے سرزمین پاکستان پر ہونے والی اسلامی سربراہی کانفرنس کے موقعے پر، انکی اس بات سے خوش ہو کر کہ پاکستان کو بھی ایٹمی طاقت بننا چاہئیے انکے نام پہ لاہور اسٹیڈیئم کا نام قذافی اسٹیڈیئم رکھ دیا تھا۔ جو آج تک یونہی چلا آرہا ہے۔  حالانکہ قذافی سوشلسٹ قوتوں سے انسیت رکھتے تھے لیکن انکے امریکہ مخالف جذبات کو ہم سب بڑی اچھی نظر سے دیکھتے تھے۔ ہم پاکستانی بس ایسے ہی ہوتے ہیں،  جس پہ ایک دفعہ صدقے واری ہو جائیں، پھر وہی بھاگ جائے تو بھاگ جائے ہم پیچھے نہیں ہٹتے۔ جس سے زیادہ محبت ہو اسے شہید کروانے میں خاصی دلچسپی لیتے ہیں۔ یہ ہماری طرف سے محبت کا آخری ایوارڈ ہے۔

خیر جناب، ٹرکوں کے پیچھے قذافی صاحب کی تصاویر ہم نے بھی دیکھی ہیں۔ دو ہزار نو میں افریقیوں کی طرف سے 'شاہوں کے شاہ' کا لقب ملنے میں ہم نے زیادہ دلچسپی نہیں لی۔  اسکی وجہ قذافی کا اپنی حفاظت کے لئے خواتین دستوں کو رکھنا تھا۔  خواتین محافظ دستے توبہ توبہ، سٹھیا ہی گئے ہیں۔ حالانکہ اس وقت تک وہ ساٹھ سال کے بھی نہ ہوئے تھے۔ مگر انکی اس حرکت کی وجہ سے ایک پھٹکار لوگوں کو انکے چہرے پہ نظر آتی تھی۔

یہ بھی بڑی عجیب بات سنی کہ قذافی نے لیبیا میں اسلامی قوانین نافذ کر رکھے تھے۔ مثلاً چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا، شادی شدہ جوڑوں کا شادی کرنے تک کنوارہ ہونا ضروری تھا، ملک کے ایک بہت محدود علاقے سے ہٹ کر باقی ماندہ ملک میں خواتین کا گھر سے نکلنا ممنوع تھا۔ خواتین کا بغیر گھر کے مردوں کے گھر سے نکلنا ممنوع تھا۔ یہ سب روائیتی پاکستانی نکتہ ء نگاہ سے کافی پسندیدہ چیزیں ہیں لیکن خواتین محافظین کا اپنی حفاظت کے لئے رکھنا کافی عجیب نفسیات کا باعث سمجھا جاتا ہے۔ چاہے روائیتی پاکستانی ہوں یا غیر روائیتی پاکستانی۔ ان خواتین محافظین نے انکی یہاں مقبولیت کو متائثر کیا۔

مغرب نے انکے خلاف پروپیگینڈے میں، میں اسے پروپیگینڈہ ہی کہونگی۔ کیونکہ میں بھی اس پاکستانی نسل سے تعلق رکھتی ہوں جو جنگی ترانے یاد کرتے ہوئے عمر کے اس حصے میں پہنچا ہے اور صرف جنگ سے وابستہ افراد کو ہی ہیرو سمجھتے ہیں اور اگر وہ مسلمان ہوں تو پھر انکی ماورائ حیثیت پہ صدق دل سے ایمان لاتے ہیں۔

ہاں تو ان پہ الزام ہے کہ انہوں نے کیمیائ ہتھیار رکھے ہوئے تھے۔ اگرچہ عراق پہ حملے کے بعد مغرب کی نظر میں انکا دماغ کافی سیدھا ہوا لیکن بہرحال ملک پہ بیالیس سال تک حکومت رکھنا اچھی بات نہیں سمجھی گئ۔ شاید بنیادی حسد کی وجہ یہی تھی کہ تمام مغربی ممالک ایک ہو گئے۔ اب اگر انہوں نے اپنے قوانین ایسے بنا لئے ہیں کہ کوئ شخص چند سال سے زیادہ نہ ٹک سکے تو اس میں قذافی جیسے آمروں کا کیا قصور۔ آج امریکہ میں ہونے والے احتجاجی مطاہروں کے بعد ہم سوچتے ہیں کہ ایک کی جمہوریت اور دوسرے کی آمریت میں آخر فرق ہی کیا ہے ؟

وال اسٹریٹ پہ قبضہ کرو، امریکیوں کا احتجاج

ان پہ الزام رہا کہ اگرچہ تیل کی آمدنی سے انہوں نے لیبیا کے عوام کی معاشی حیثیت کو مستحکم کرنے کی کوشش کی لیکن سب سے زیادہ دلچسپی انہوں نے اپنی اور اپنے خاندان کی مالی حالت کو مستحکم اور سدا قائم رکھنے کے لئے کی۔

قذافی کی سوانح حیات اپنے اندر بڑی دلچسپی رکھتی ہے۔ لیبیا کے علاقے سرت میں ایک چھوٹے سے قبیلے جو کہ گدڑیوں کا پس منظر رکھتا ہے اس میں جنم لینے والے اس شخص نے انیس اکسٹھ میں فوجی اکیڈمی جوائین کی  یہاں سے گریجوایٹ کیا۔ اور حیران کن طور پہ انیس سو انہتّر میں صرف آٹھ سال بعد عین عالم نوجوانی  یعنی انتیس سال کی عمر میں لیبیا کی حکومت کا تختہ الٹ کر حکومت پہ قابض ہو گئے ، پھر اسکے بعد بیالیس سال تک اس ملک کے سیاہ اور سفید کے مالک بنے رہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے ملک میں ایسا کوئ منصوبہ نہ تھا جس میں قذافی یا انکے خاندان کو مالی منفعت نہ پہنچتی ہو۔

انکے شاہانہ طرز زندگی پہ بڑی تنقید کی جاتی ہے۔ یہ تنقید کرتے ہوئے لوگ بھول جاتے ہیں کہ وہ شاہوں کے شاہ تھے  انہیں اپنے لئے یہ خطاب پسند تھا۔ بہرحال، انہوں نے اپنے عوام کو کچھ تو دیا۔  ہماری طرح اپنے آپکو سجدے کروا کر کیڑے مکوڑوں کی طرح تو نہیں چھوڑ دیا تھا۔ لیکن بہر حال ملک کے مشرقی حصے کی معاشی حالت انتہائ دگرگوں بتائ جاتی ہے اور اس وجہ سے عوامی سطح پہ انکے خلاف مہم چلانے کی گنجائیش موجود تھی۔ ہم ابھی اس عوامی شعور سے محروم ہیں جو ملک پہ اپنا حق سمجھتا ہو۔ عوام کی اکثریت سمجھتی ہے کہ ملک دراصل زرداروں اور شریفوں کا ہے اور انکا شکریہ کہ وہ انکا نام یاد رکھتے ہیں۔

قذافی اپنے آپکو خبروں میں رکھنے کا ہنر جانتے تھے یا یہ کہ ایک طبقے کے مطابق انہیں اپنے آپکو خبروں میں رکھنے کا جنون تھا۔ اپنی ذات کے لئے، وہ ایک جنونی تھے۔

سوڈان میں جب مسلم حکمراں ، حکومت میں آئے تو قذافی نے سوڈان کو پیش کش کی وہ لیبیا میں ضم ہو جائے۔ سوڈان نے یہ پیش کش ٹھکرا دی اور اپنے ملک کے عیسائیوں سے امن کا معاہدہ کر لیا۔ یہ بات انہیں بہت ناگوار گذری۔ اسکے بعد انہوں نے دیگر ملکوں کے ساتھ یہ کوشش کی کہ ایک عظیم اسلامی ریاست کی بنیاد ڈالی جائے۔ کہنے والے اسے بھی انکے اس دماغی فتور سے جوڑتے ہیں کہ ان میں ایک بڑے رقبے پہ حکمرانی کا جذبہ تھا اور اسی لئے وہ اسکے لئے اتنے کوشاں تھے۔

اب یہ بات بھی بڑی عجیب لگتی ہے کہ کہاں وہ اسلامی مملکت کے قیام کا خواب دیکھتے ہوں اور کہاں وہ نظریاتی طور پہ سوشلسٹ ہوں اور علاقے کی سوشلسٹ قوتوں سے انکے اچھے مراسم رہے ہوں۔

آٹھ مہینے پہلے جب لیبیا میں جمہوریت لانے کے بہانے انکے خلاف باغیوں کو کمک دی گئ تو کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ امریکہ اس بہانے لیبیا کا تیل حاصل کرنا چاہتا ہے۔ کچھ کا کہنا تھا کہ دنیا کی سلامتی کو کرنل قذافی کی دیوانگی سے لاحق خطرات سے نجات دلانا چاہتا ہے۔  لیکن بعد کے حالات نے دکھایا کہ اقتدار کا جنون قذافی میں اتنا بڑھ گیا تھا کہ انہوں نے اپنے ملک کے لوگوں پہ حملہ کر ڈالا۔ پھر یوں ہوا کہ دیوانہ مارا گیا۔

آج جب ٹی و ی پہ ویڈیوز اور خبریں آرہی ہیں تو لیبیا کے عوام قذافی کی موت پہ خوشیاں مناتے نظر آتے ہیں۔ جس باغی کے کپڑوں پہ انکے خون کے نشان ہیں وہ کہتا ہے کہ میں اسے زندگی بھر نہیں دھوءونگا اور اسے سنبھال کر رکھونگا۔ عوام پہ جب جنون طاری ہوتا ہے تو تخت اور تختے میں زیادہ فرق نہیں رہتا۔

بہرحال، میں بحیثیت پاکستانی کچھ الجھن میں ہوں۔ آیا امریکہ کے خلاف کھڑے ہونے والے مسلم جنگجو کی موت پہ افسوس کرنا چاہئیے۔ افسوس کرنا چاہئیے کہ دنیا کی سب سے بڑی دہشت گرد ریاست ایک دفعہ پھر اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہوئ۔ ایک دفعہ پھر ایک مسلم اکثریتی ملک کا مسلم حکمراں ہار گیا۔ یا بحیثیت ایک انسان یہ سوچ کر خوش ہوجاءوں کہ ایک خود پسند بادشاہ اپنی طبیعت کے جبر کا شکار اپنے انجام کو پہنچا۔ اب اسکے عوام اپنی زندگیوں کو اس دھارے میں لانے میں کامیاب ہونگے جو وہ چاہتے تھے۔ جسکے لئے انہوں نے تن من دھن کی بازی لگادی۔ میری یہ الجھن کیسے رفع ہوگی؟ کیا کہوں کیا یہ کہ مجنوں قذافی کتے کی موت مارا گیا۔  یا پھر یہ کہ قذافی کو مرتبہ ء شہادت دوں۔ کیا اللہ کی باتیں اللہ ہی جانتا ہے۔

آخر مخلوق کو خدا یہ حق کیوں نہیں دیتا کہ وہ بھی اسے جان لیں؟ کیا خدا کے یہاں جمہوریت نہیں ، آمریت ہے؟ پھر آمر سے جھگڑا کیوں؟ پھر اس بات کا رولا کیوں کہ انسان خدا بننا چاہتا ہے۔ آخر انسان کے سامنے ایک پسندیدہ مکمل ماڈل خدا ہی کا تو ہے۔

اُف اتنے سوالات، سوال کرنے سے انسان ہونا ثابت ہوتا ہے کبھی خدا سوال نہیں کرتا۔ کیونکہ اللہ کی باتیں اللہ ہی جانے۔

11:58 AM

اسامہ بن لادن, پاکستان, جہاد, دہشت گردی, ذوالفقار علی بھٹو, ضیاءالحق, عبدالقدیر خان, قادیانی, کرنل قذافی, لیبیا

ضرب المثل اشعار

 گفتگو ہو کہ تحریر ، اسی وقت مزہ دیتی ہے جب اس میں تشبیہات، استعارات، روزمرہ، محاورے، کہاوتیں اور ضرب الامثال روانی سے اور مناسب مقامات پہ استعمال کئیے جائیں۔ ورنہ پھر اچھی بھلی بات بھی  واعظ کا وعظ لگنے لگتی ہے۔  دور حاضر کا ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ لوگ اپنی گفتگو میں الفاظ کامحدود علم رکھنے کی وجہ سے انہیں کئ طرح سے استعمال نہیں کر پاتے جبکہ باقی چیزیں تو جیسے ختم ہی ہو گئ ہیں۔ اس لئے  گفتگو سننے کا مزہ جاتا رہا اور اب ہر ایک اپنی لگی بندھی سناتا ہے۔

مجھے یاد ہے ایک تحریر میں، میں نے مولوی مدن کی مثال استعمال کی تو ایک طبقہ بڑا ناراض ہوا کہ مولوی صاحب کا مذاق اڑایا ہے آپ نے۔ حالانکہ یہ اردو کا ایک محاورہ ہے وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ اور یہ جس شعر سے آیا ہے وہ آپکو نیچے ملے گا۔

آپ خود حساب لگا سکتے ہیں کہ سارا دن میں آپ کتنی طرح کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، کتنے محاورے یا استعارے یا اشعار سے اسکی زینت کرتے ہیں۔

ایک کتاب ہاتھ لگی جس کا نام ہے اردو کے ضرب المثل اشعار اسکی تالیف کی ہے جناب محمد شمس الحق نے اور اسے چھاپا ہے ادارہ ء یادگار غالب نے کراچی سے۔

ضرب المثل اشعار یعنی ایسے اشعار جنکی شہرت ایسی بڑھی کہ مثال کے لئے استعمال ہونے لگے۔  اس کتاب میں ان اشعار کی تعداد تقریباً ہزار کے قریب ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ کتاب کے حصے کر دئیے گئے ہیں۔ پہلے حصے میں وہ سارے اشعار ہیں جنکے شعراء کے نام معلوم ہیں، دوسرے حصے میں وہ جو ایک سے زائد شعراء سے منسلک کئے جاتے ہیں، تیسرے میں جنکے خالق کا نام معلوم نہیں اور آخیر میں وہ جن کا ایک ہی مصرعہ معلوم ہے۔

اب یہاں اس کتاب سے میں نے چند شعر نکالے ہیں۔ بہت زیادہ مشہور اشعار کو شامل نہیں کیا۔ جب تک آپ اس کتاب کو نہیں خرید پاتے اس انتخاب سے محظوظ ہوں۔

در پے ہے عیب جُو ترے، حاتم تو غم نہ کر           دشمن ہے عیب جُو تو خدا عیب پوش ہے     شاہ حاتم

فکر معاش، عشق بتاں، یاد رفتگاں         اس زندگی میں اب کوئ کیا کیا کیا کرے       سودا

جو کہ ظالم ہو وہ ہرگز پھولتا پھلتا نہیں         سبز ہوتے کھیت دیکھا ہے کبھو  شمشیر کا     سودا

دن کٹا، جس طرح کٹا لیکن            رات کٹتی نظر نہیں آتی     سید محمد اثر

تدبیر میرے عشق کی کیا فائدہ طبیب          اب جان ہی کے ساتھ یہ آزار جائے گا        میر تقی میر

اب تو جاتے ہیں بت کدے سے میر         پھر ملیں گے اگر خدا لایا      میر تقی میر

 میرے سنگ مزار پر فرہاد          رکھ کے تیشہ کہے ہے، یا استاد        میر تقی میر

شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں          عیب بھی کرنے کو ہنر چاہئیے        میر تقی میر

بہت کچھ ہے کرو میر بس          کہ اللہ بس اور باقی ہوس          میر تقی میر

مر گیا کوہ کن اسی غم میں           آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل ہے         میر تقی میر

یا تنگ نہ کر ناصح ناداں، مجھے اتنا          یا چل کے دکھا دے ، دہن ایسا، کمر ایسی            مہتاب رائے تاباں

ٹوٹا  کعبہ کون سی جائے غم ہے شیخ           کچھ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا       قائم چاند پوری

کی فرشتوں کی راہ ابر نے بند         جو گنہ کیجئیے ثواب ہے آج     میر سوز

ہشیار یار جانی، یہ دشت ہے ٹھگوں کا           یہاں ٹک نگاہ چوکی اور مال دوستوں کا         نظیر اکبر آبادی

پڑے بھنکتے ہیں لاکھوں دانا، کروڑوں پنڈت، ہزاروں سیانے

جو خوب دیکھا تو یار آخر، خدا کی باتیں خدا ہی جانے           نظیر اکبر آبادی

ٹک ساتھ ہو حسرت دل مرحوم سے نکلے         عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے       فدوی عظیم آبادی

رکھ نہ آنسو سے وصل کی امید      کھاری پانی سے دال گلتی نہیں      قدرت اللہ قدرت

بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھالیا      پھر اس چمن میں بوم بسے یا ہما رہے        مصحفی

ہزار شیخ نے داڑھی بڑھائ سن کی سی           مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی        انشا

اے خال رخ یار تجھے ٹھیک بناتا      جا چھوڑ دیا حافظ قرآن سمجھ کر        شاہ نصیر

آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اٹھ بھی کھڑے ہوئے

میں جا ہی ڈھونڈھتا تیری محفل میں رہ گیا        آتش

لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب

زباں بگڑی تو بگڑی تھی، خبر لیجئیے دہن بگڑا          آتش

مشاق درد عشق جگر بھی ہے، دل بھی ہے     کھاءوں کدھر کی چوٹ، بچاءوں کدھر کی چوٹ    آتش

فصل بہار آئ، پیو صوفیو شراب    بس ہو چکی نماز، مصلّا اٹھائیے    آتش

زاہد شراب پینے سے کافر ہوا میں کیوں     کیا ڈیڑھ چلو پانی میں ایمان بہہ گیا        ذوق

ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدر سخن          کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر     ذوق

اسی لئے تو قتل عاشقاں سے منع کرتے ہیں    اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کاررواں ہو کر     خواجہ وزیر

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل        کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا        غالب

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے     ایسا بھی کوئ ہے کہ سب اچھا کہیں جسے    غالب

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے     بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے      غالب

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد         پر طبیعت ادھر نہیں آتی     غالب

گو واں نہیں ، پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں         کعبے سے ان بتوں کو نسبت ہے دور کی       غالب

دام و در اپنے پاس کہاں      چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں         غالب

کوچہ ء عشق کی راہیں کوئ ہم سے پوچھے       خضر کیا جانیں غریب، اگلے زمانے والے         وزیر علی صبا

اذاں دی کعبے میں، ناقوس دیر میں پھونکا        کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا              محمد رضا برق

الجھا ہے پاءوں یار کا زلف دراز میں    لو آپ  اپنے دام میں صیاد آ گیا         مومن

شب ہجر میں کیا ہجوم بلا ہے      زباں تھک گئ مرحبا کہتے کہتے      مومن

لگا رہا ہوں مضامین نو کے انبار      خبر کرو میرے خرمن کے خوشہ چینوں کو         میر انیس

نسیم دہلوی، ہم موجد باب فصاحت ہیں       کوئ اردو کو کیا سمجھے گا جیسا ہم سمجھتے ہیں         اصغر علی خاں فہیم

وہ شیفتہ کہ دھوم ہے حضرت کے زہد کی    میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے         شیفتہ

ہر چند سیر کی ہے بہت تم نے شیفتہ        پر مے کدے میں بھی کبھی تشریف لائیے          شیفتہ

فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں، پر کچھ کچھ        بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیب داستاں کے لئے        شیفتہ

کیا لطف، جو غیر پردہ کھولے     جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے     دیا شنکر نسیم

دینا وہ اسکا ساغر مے یاد ہےنظام       منہ پھیر کر اُدھر کو، ادھر کو بڑھا کے ہاتھ        نظام رام پوری

گرہ سے کچھ نہیں جاتا، پی بھی لے زاہد    ملے جو مفت تو قاضی کو بھی حرام نہیں          امیر مینائ

وہ جب چلے تو قیامت بپا تھی چار طرف        ٹہر گئے تو زمانے کو انقلاب نہ تھا     داغ

دی موء ذن نے شب وصل اذاں پچھلی رات          ہائے کم بخت کو کس وقت خدا یاد آیا         داغ

سب لوگ جدھر وہ ہیں ادھر دیکھ رہے ہیں     ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں           داغ

پان بن بن کے مری جان کہاں جاتے ہیں         یہ مرے قتل کے سامان کہاں جاتے ہیں    ظہیر الدین ظہیر

ہم نہ کہتے تھے کہ حالی چپ رہو          راست گوئ میں ہے رسوائ بہت          حالی

دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار    جب تک شراب آئے کئ دور ہو گئے     شاد عظیم آبادی

خلاف شرع شیخ تھوکتا بھی نہیں    مگر اندھیرے اجالے میں چوکتا بھی نہیں  اکبر الہ آبادی

دیکھ آءو مریض فرقت کو  رسم دنیا بھی ہے، ثواب بھی ہے           حسن بریلوی

تمہیں چاہوں، تمہارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں

   مرا دل پھیر دو، مجھ سے یہ جھگڑا ہو نہیں سکتا   مضطر خیر آبادی

افسوس، بے شمار سخن ہائے گفتنی         خوف فساد خلق سے نا گفتہ رہ گئے        آزاد انصاری

توڑ کر عہد کرم نا آشنا ہو جائیے      بندہ پرور جائیے، اچھا ، خفا ہو جائیے         حسرت موہانی

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں     یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری        اقبال

اقبال بڑا اپدیشک ہے ، من باتوں میں موہ لیتا ہے    گفتار کا یہ غازی تو بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا      اقبال

کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موج دریا کا حریف      ورنہ میں بھی جانتا ہوں کہ عافیت ساحل میں ہے     وحشت کلکتوی

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن         بھولتا ہی نہیں عالم تیری انگڑائ کا       عزیز لکھنوی

بڑی احتیاط طلب ہے وہ ۔ جو شراب ساغر دل میں ہے

 جو چھلک گئ تو چھلک گئ، جو بھری رہی تو بھری رہی    بینظیر شاہ

دیکھ کر ہر درو دیوار کو حیراں ہونا       وہ میرا پہلے پہل داخل زنداں ہونا        عزیز لکھنوی

چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا       چال سے تو کافر پہ سادگی برستی ہے       یگانہ چنگیزی

وہ آئے بزم میں اتنا تو برق نے دیکھا     پھر اسکے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی       مہاراج بہادر برق

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئ      اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئ      عزیز الحسن مجذوب

اب یاد رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی   یاروں نے کتنی دور بسائ ہیں بستیاں    فراق گو رکھپوری

داور حشر میرا نامہ ء اعمال نہ دیکھ   اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں     محمد دین تاثیر

امید وصل نے دھوکے دئیے ہیں اس قدر حسرت

کہ اس کافر کی 'ہاں' بھی اب 'نہیں' معلوم ہوتی ہے   چراغ حسن حسرت

اعتراف اپنی خطاءووں کا میں کرتا ہی چلوں        جانے کس کس کو ملے میری سزا میرے بعد      کرار نوری

وہ لوگ جن سے تری بزم میں تھے ہنگامے    گئے تو کیاتری بزم خیال سے بھی گئے       عزیز حامد مدنی

ایک محبت کافی ہے      باقی عمر اضافی ہے     محبوب خزاں

مری نمازہ جنازہ پڑھی ہے غیروں نے      مرے تھےجن کے لئے، وہ رہے وضو کرتے    آتش

ایسی ضد کا کیا ٹھکانا، اپنا مذہب چھوڑ کر       میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا

محبت میں لٹتے ہیں دین اور ایماں         بڑا تیر مارا جوانی لٹا دی

پاپوش میں لگائ کرن آفتاب کی      جو بات کی،  خدا کی قسم لاجواب کی

3:35 PM

ادارہ, ادب, اردو, اشعار, پاکستان, زبان, شاعری, ضرب المثل, غالب, کراچی, محمد شمس الحق, یادگار

جنوبی پنجاب سے ایک کہانی

ادب دنیا کی کسی بھی زبان میں تخلیق ہو اسکی سب سے اہم خوبی یہ ہوتی ہے یا ہونی چاہئیے کہ وہ اپنے عہد کی نمائیندگی کرتا ہے اسکے بغیر ادب مردہ ہے، بے جان ہے، بے اثر ہے اور محض تفریح ہے۔

آجکا پاکستان ، بم، بارود،  بے حسی، افلاس اور شدت پسندی کے دھند میں کچھ اس طرح چھپ گیا ہے کہ یہ دھند اب لکھنے والے ہی ہٹا سکتے ہیں۔ وہ لکھنے والے جو خوفزدہ ہیں۔  لکھنے والا اگر خوف زدہ ہو تو وہ کیا نوید دے سکتا ہے، وہ کیا جدو جہد پیدا کر سکتا ہے، وہ کیا انقلاب لا سکتا ہے، وہ کیا سوچ پیدا کر سکتا ہے۔  لیکن ہم اب بھی پر امید ہے، ہر خوف اپنی انتہا پہ بے خوفی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

پاکستان کی موجودہ فضا میں ، پنجاب  میں پیدا ہونے والی تبدیلیاں خاصی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ وہ صوبہ ہے جو پاکستان کی ساٹھ فی صد آبادی کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ وراث شاہ، بلھے شاہ، اقبال، فیض، عدم، ثریا ملتانیکر، اقبال بانو، نورجہاں، ملکہ ء پکھراج، احمد ندیم قاسمی، منشا یاد اور نجانے کتنے ہی تخلیق کاروں کو، فنکاروں کو جنم دینے والی یہ زمین تمام تر نا مساعد حالات اور بڑھتی ہوئ شدت پسندی کے باوجود ابھی بھی بنجر نہیں ہوئ۔ اس زمین میں اب بھی ہیر کی بغاوت موجود ہے اور سوہنی کی استقامت۔

گذشتہ دنوں، میری نظر سے محمد اقبال دیوان کی لکھی ہوئ کہانی 'شہر کو سیلاب لے گیا' گذری۔ کہانی جنوبی پنجاب کی معیشت اور معاشرت دونوں سے تعلق رکھتی ہے۔ کہانی انقلاب کے ان نعروں سے تعلق رکھتی ہے جو کبھی مذہبی شدت پسند لگاتے ہیں، کبھی انکے مخالفین لگاتے ہیں، کبھی سیاستدان لگاتے ہیں۔ سب اپنے مفاد کے وقت ان نعروں میں پناہ لیتے ہیں۔ کیا انقلاب نعروں پہ سوار ہو کر آتا ہے؟ جنوبی پنجاب میں انقلاب کے ان نعروں کا پس منظر کیا ہے؟

کہتے ہیں ہر جھگڑے کی بنیاد زر ، زمین یا زن ہوتی ہے۔ اقبال دیوان کی یہ کہانی موجودہ پاکستان میں ان تینوں عوامل کو کس طرح اکٹھا کرتی ہے اسکے لئے آپکو یہ طویل کہانی پڑھنی پڑے گی ۔ جو کہ آصف فرخی صاحب کے مرتب کردہ ادبی پرچے دنیا زاد میں شائع ہوئ ہے۔ اسکے پبلشر ہیں شہرزاد۔ دنیا زاد کے اس حصے کا نام ہے جل دھارا، حصے کا نمبر ہے انتیس۔

کہانی کے کچھ صفحات آپکی دلچسپی کے لئے اسکین کئے ہیں۔  تو آئیے پڑھتے ہیں۔  اس زمین کے نام جس کے باسیوں کے لئے ایک ہی پیغام ہے۔ مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا۔

نوٹ؛ بہتر طور پہ دیکھنے کے لئے تصویر پہ کلک کریں۔

اس بلاگ پہ دنیا زاد میں شائع شدہ مزید تحاریر کے لئے یہ لنکس دیکھ سکتے ہیں۔

نیا پاکستان، آدھا طالبان

زر، زمین، زن

خدا، انسان کا ہتھوڑا

ایک ادیب کے مشورے

12:14 PM

ادب, اقبال دیوان, انقلاب, پاکستان, پنجاب, جنوبی پنجاب, جہاد, شدت پسندی, کہانی, معاشرہ

حجاب، جزاک اللہ

جب ہم نے کینیڈا کےحسین شہر کیوبک سٹی میں سیاحوں کی رہنمائ کرنے والے ادارے سے معلوم کیا کہ  شہر میں جاری میلے کی کیا نوعیت ہے اور ہمیں کیا کرنا چاہئیے تو اس نے بتایا کہ میلہ شہر کے پرانے حصے میں ہو رہا ہے۔ کیوبک سٹی کی مشہور آبشار پہ آج رات سالانہ آتشبازی کا خوبصورت مظاہرہ ہونے والا ہے لیکن گاڑی پارک کرنے کے لئے آپکو وہاں کم از کم ڈیڑھ گھنٹہ پہلے پہنچنا ہوگا۔ اسکے علاوہ پرانے شہر میں آج ایک سرکس بھی ہو رہا ہے ہر سال ہوتا ہے اور یہ نہ صرف مفت ہوتا ہے بلکہ بہت شاندار۔

ہم نے آتشبازی پہ سرکس کو ترجیح دی، اسکی وجہ پھر کسی تحریر میں۔ ہم وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے وہاں موجود تھے۔ لوگوں کا ایک جم غفیر۔ جہاں تک نظر اٹھائیں لوگ نظر آرہے تھے۔ اسکا انتظام ایک فلائ اوور کے نیچے کیا گیا تھا۔ ہر عمر کے عورت مرد اور بچے موجود۔

میں ایک پاکستانی خاتون دھڑکتے دل کے ساتھ وہاں موجود کہ یا الہی کہاں پھنس گئے۔ عورتوں کے لئے کوئ الگ انتظام نہیں۔ سب لوگ کھڑے ہیں، بیٹھنے کی بھی جگہ نہیں۔

مگر پھر غور کیا، میرے اردگرد کوئ بھی عورت ہراساں نہیں تھی۔ ہر طرح کی سیاح عورتیں، مقامی فرانسیسی نسل کی حسین عورتیں، مختصر ترین کپڑوں میں اوراٹھارہویں صدی کے طویل عریض کپڑوں میں۔ سب خوش، بے فکر۔ پھر میرا دل کیوں دھڑک رہا تھا کہ ابھی کوئ چلتے چلتے ہاتھ نہ مار دے، چٹکی نہ لے لے، کوئ فحش بات کہتا ہوا نہ گذر جائے اور نہیں تو یہ ہی نہ کہہ ڈالے کہ دوپٹہ سر سے اوڑھو۔

شو شروع ہونے سے پہلے گھپ اندھیرا کر دیا گیا اب صرف سرکس والوں کی روشنیاں دائرے میں گھوم رہی تھیں۔ لیکن سب لوگ اب بھی مطمئن، میرے علاوہ کوئ بھی بے چین نہ تھا۔ اوہ خدا، اندھیرا، اتنے مرد و عورت ایک جگہ پہ۔ آخر یہاں آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ایک گھنٹے بعد یہ واقعی شاندار سرکس ختم ہوا۔ سوائے جانوروں کی پرفارمنس کے اس میں سب کچھ تھا اور پرفارمرز کی شاندار پرفارمنس وہ بھی مفت۔ کوئ نا خوشگوار واقعہ پیش نہ آیا کوئ عورت کسی مرد کو ڈانٹتی پھٹکارتی نظر نہ آئ اور نہ خواتین نےخود بخود اپنا ایک الگ گروہ قائم کیا۔ ہلکی سی روشنی ہوئ۔

اب یقیناً نکلتے ہوئے دھکے لگیں گے۔ یا اللہ اب کیا ہوگا۔ اس ہجوم میں تو میرے ساتھی بھی نجانے کہاں گم ہو گئے، میرے ہمراہ نہیں۔ میں ہجوم کے ساتھ اپنی بچی کے اسٹرولر کو آہستہ آہستہ دھکا دیتی، محتاط انداز میں باہر روڈ پہ نکل آئ۔ درحقیقت کچھ بھی نہ ہوا۔ کوئ عورت گھبرائ ہوئ، سراسمیہ نہ تھی۔ دس منٹ بعد وہ جگہ ایسے صاف تھی جیسے یہاں کچھ  ہوا ہی نہ تھا۔ لیکن شاید خوف پاکستانی عورت کے اندر گوندھ دیا جاتا ہے۔

اسکے کچھ عرصے بعد میں پاکستان روانہ ہوئ۔ جہاز میں میری پڑوسی خاتون ، اپنے تین بچوں  اور شوہر کے ساتھ پشاور جا رہی تھیں۔ لگ بھگ پینتالیس کی پر کشش خاتون۔ ریشم کے نفیس کپڑوں اور گلے میں شیفون کا دوپٹہ ڈالے ہوئے۔ سفیدی مائل ہاتھوں پہ عنابی نیل پالش لگی ہوئ۔ بال تراشے ہوئے۔ کینیڈا میں گذشتہ دس سال سے مقیم، روزانہ اپنے بچوں کو خود ہائ وے کی پندرہ منٹ ڈرائیو کر کے اسکول پہنچانے والی خاتون۔ وہ تین سال بعد اپنی بیمار والدہ کو دیکھنے جا رہی تھیں۔  انہیں ایک دن اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں رکنا تھا اور پھر وہاں سے پشاور روانگی تھی۔

پائلٹ نے اعلان کیا کہ آئیندہ دس منٹ میں ہم اسلام آباد ائیر پورٹ پہ اترنے والے ہیں۔ انہوں نے اپنا ہینڈ بیگ کھولا شیفون کا دوپٹہ لپیٹ کر اس میں رکھا اور ایک بڑی سی چادر نکال  کر اسے اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا۔

کفار کے مردوں کے درمیان گلے میں دوپٹہ ڈال کر پھرنے والی خاتون نے اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ایک بڑی سی چادر نکال لی۔  حالانکہ ہمارے ملک میں سرکاری طور پہ اسکی کوئ پابندی نہیں۔ اور اسلام آباد ملک کا دارالخلافہ بھی ایسی کوئ ثقافت نہیں رکھتا۔

میں کراچی ایئر پورٹ پہ اترتی ہوں۔  میں نوٹ کرتی ہوں کہ اکثرمردوں کی نظریں خواتین کا بڑی دور تک تعاقب کرتی ہیں۔ اس سے فرق نہیں پڑتا کہ وہ اسکارف لئے ہوئے ہیں یا جینز شرٹ میں ہیں۔ میری بچی بھاگ کر اپنے باپ سے لپٹ جاتی ہیں۔ میرے شوہر مجھ سے ہاتھ ملاتے ہیں اور میرا ماتھا چومتے ہیں۔ لوگ اس منظر میں بھی بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ میں ہمیشہ اس پہ خجل ہو جاتی ہوں۔ حالانکہ وہ اسی طرح اپنی ماں اور بہنوں کا بھی استقبال کرتے ہیں۔ کیونکہ انکی زندگی کا بیشتر حصہ پاکستان سے باہر گذرا ہے۔

شہر میں داخل ہوتی ہوں۔  روڈ پہ بڑے بڑے بینرز لہرا رہے ہیں۔ عالمی یوم حجاب، چار ستمبر۔ اسکے چند دن بعد جب ملک میں عافیہ ڈے منایا جا رہا تھا۔ کراچی سے محض چند سومیل کے فاصلے پہ لاکھوں افراد سیلاب کے پانی میں گھرے ہوئے تھے۔ سیلاب جس نے انکی عورتوں کو گھر کی چار دیواری سے باہر لا کھڑا کیا تھا۔ کھلے آسمان کے نیچے پانی سے پناہ تلاش کرتی عورتیں، اپنی بقاء کی جنگ لڑتے ہوئے پاکستانی عوام سے حجاب کی نہیں کھانے کی طلبگار ہیں۔ یاد رہے یہ وہ ملک ہے جہاں پچھلے سال بھی سیلاب آیا تھا اور اگلے سال بھی آنے کی توقع ہے۔ اب وہی عالمی یوم حجاب منانے والے عوام سے اس آفت کے شکار لوگوں کے لئے صدقہ خیرات مانگ رہے تھے۔ انہوں نے پچھلے سال بھی مانگا اور امید ہے اگلے سال بھی مانگیں گے۔

ادھر نیٹ کی دنیا میں مختلف فورمز پہ مرد حضرات اس بات پہ اتنے متفکر نہیں کہ آخر سیلاب جیسی قدرتی آفات سے لڑنے کے لئے بھیک مانگنے، لوگوں کو بھیک کا عادی بنانے  اور بھیک بانٹنے کے بجائے کوئ باوقار منصوبہ بندی کی جائے۔ مردوں کی ایک بڑی تعداد جن ویڈیوز اور تصویروں کو ایکدوسرے سے شیئر کررہی ہے، پسندیدگی کے لئے کلک کر رہی ہے، جزاک اللہ کے نعرے بلند کر رہی ہے وہ خواتین کے حجاب کے متعلق ہے۔ مردوں کا یہ جوش و خروش دیکھ کر حیرانی بھی ہوتی ہے، ہنسی بھی آتی ہے اور تشویش بھی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں جب روم جل رہا تھا تو نیرو بیٹھا بانسری بجا رہا تھا۔ کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا۔

ایک ایسی ہی ویڈیو پہ جس میں یہ پیغام دینے کی کوشش کی گئ تھی کہ جینز اور شرٹ میں ملبوس خواتین کی مرد عزت نہیں کرتے بلکہ اسکارف اور عبایہ پہننے والی خواتین کی عزت کرتے ہیں اور اس طرح حجاب کرنے والی خواتین مردانہ دسترس سے محفوظ ہوتی ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ مغربی معاشرے میں جہاں خواتین مختصر ترین کپڑوں میں پھر رہی ہوتی ہیں  وہاں کے مرد ایسی نظریں جمائے نہیں بیٹھے ہوتے ہیں جیسی ہمارے یہاں اچھے خاصے کپڑے پہنے ہوئے خاتون پہ بیٹھے ہوتے ہیں۔ جواب ملتا ہے اس لئے کہ وہاں  مرد اتنی پھیلی ہوئ فحاشی کی وجہ سے اسکے عادی ہو گئے ہیں۔ میں نے وہاں یہ جواب دینے سے گریز کیا کہ پھر کیا حرج ہے کہ یہاں  بھی مردوں کو عادی بنانے کے لئے فحاشی پھیلا دی جائے۔ تاکہ وہ کچھ دوسرے مسائل پہ بھی یکسو ہو کر توجہ کر سکیں۔

خواتین کی بے حیائ اور حجاب کے ان نعروں پہ تقاریر لکھنے والے مرد حضرات اکثر سب کے سب مغرب کی عورت کی تصویریں دیتے ہیں اور انکے معاشرے کا رونا روتے ہیں مگر یہی مرد حضرات اپنے ملک کی عورت کی تصاویر دیکھنے سے محروم رہتے ہیں۔ اور مسلسل اس عالم تبلیغ میں یوں لگتا ہے کہ پاکستان میں دنیا کی بے حیا ترین خواتین پائ جاتی ہیں اور دنیا کے سب سے زیادہ غیرت مند مرد۔ ایک ناقابل یقین، مگر کلنگ کامبینیشن۔

یہ سب چیزیں تو اب روز کے قصے ہیں۔ مجھے کچھ عرصہ پہلے ایک جرمن سے اپنی گفگتو یاد آتی ہے یہ اس وقت کی بات ہے جب میں دنیا کے حقائق سے ناآشنا ایک ٹین ایجر ہی تھی اور میں نے اس سے بڑے فخر سے کہا تھا ہمارے یہاں عورت کو عزت حاصل کرنے کے لئے اپنی صلاحیت اور علم کا زور نہیں دکھانا ہوتا اسے عزت ملتی ہے کیونکہ وہ ایک عورت ہے۔ مجھے لگا تھا کہ اس نے حیرانی سے میری بات سنی۔ مگر اب احساس ہوتا ہے اس نے سوچا ہوگا، اونہہ کنوئیں کے مینڈک۔

حقیقت یہ ہے کہ اس پاکستان میں عورت کو صرف دوپٹے، اسکارف اور عبایہ کی وجہ سے عزت ملتی ہے۔ اگر ایک عورت رات کو محفل شراب میں مصروف رہے لیکن صبح اپنے سر پہ دوپٹہ جما کر نکلے تو اس سے زیادہ قابل عزت عورت کوئ اور نہیں وہ بھی نہیں  جو آپکے بچوں کا علاج کرتی ہو، انہیں تعلیم دیتی ہو آپکے مسائل کے حل کے لئے کوشاں ہو بس دوپٹہ سر پہ نہ لیتی ہو۔ یہی وجہ ہے ہماری پارلیمنٹ میں موجود خواتین ارکان کی اکثریت ملکی مسائل پہ کام کرنے کے بجائے ہمہ وقت اپنے دوپٹے صحیح  کرتی نظر آتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب پنجاب کی ایک تعلیمی درسگاہ میں نقاب پوش مرد لوہے کے  سرئیے لے کر اندر گھس جاتے ہیں تو قابل تشویش بات ان مردوں کا اندر گھس کر ان بچیوں کو ہراساں کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس خبر پہ پنجاب کے رہنے مرد کا یہ تبصرہ ہوتا ہے کہ کیا ہوا اگر کچھ مردوں نے بے حیائ روکنے کے لئے یہ حرکت کر ڈالی۔

ویسے یہ بھی بڑا عجیب مشاہدہ ہے کہ خواتین کے حجاب کے سلسلے میں جس صوبے کے لوگ سب سے زیادہ چست نظر آتے ہیں وہ پاکستان کا صوبہ  پنجاب ہے۔

آئیے آج میں آپکو حقیقی پاکستانی خواتین کی تصویریں بھی دکھاتی ہوں۔ جنہیں دیکھنے سے حجاب کی مہم میں پیش پیش افراد شاید محروم ہیں۔ انہیں دیکھیئے اور بتائیے کہ کیا اس ملک کی عورت کو عالمی یوم حجاب کی ضرورت ہے۔ کیا اسے یہ چاہئیے کہ فرزند زمین حجاب کی ویڈیوز کو شیئر کریں ، فارورڈ کریں اور ان پہ جزاک اللہ کہیں۔

6:52 PM

آفات, پاکستان. مذہب. شدت پسندی, پنجاب, جزاک اللہ, حجاب, خواتین, سیلاب, مرد, مسائل, معاشرہ

متفق علیہ

تحقیق کی بازی میں کچھ لوگوں نے بالآخر شرکت کر ہی لی اور وہ سوال کرتے ہیں کہ ایسا کیوں کہ ڈینگی نے صرف لاہور کو ہی نشانہ بنا لیا ہے۔ حالانکہ صاف پانی کا ذخیرہ اسلام آباد میں بھی پایا جاتا ہے۔ ہم نے بھی لوگوں سے یہ سوال شیئر کیا۔ اسکے مختلف طبقہء فکر نے مختلف جواب دئیے۔

امریکہ مخالفین  کا خیال ہے کہ  امریکہ نے ابھی پاکستان کے خلاف خاموش جراثیمی جنگ کا آغاز کیا ہے۔ سپہ سالار اور حاکم وقت اس سے آگاہ ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ اس حملے کا تابڑ توڑ جواب کیسے دئیے جائے۔ کھل کر اس لئے نہیں بتاتے کہ کہیں عوام گھٹنے نہ ٹیک دیں۔

میرا خیال ہے کہ سپہ سالار اور حاکم وقت کو پتہ نہیں ہے ہو سکتا ہے آئ ایس آئ اس سے آگاہ ہو۔ لیکن ابھی انکے بولنے کا وقت نہیں آیا۔ جب پیسے ختم ہو جاویں گے تب بولیں گے۔ ویسے اگر ہم اس حملے کا منہ توڑ جواب دیں تو کس مرض کے جراثیم امریکہ بھیجیں گے؟

بائیں جماعت والوں کا کہنا ہے کہ طالبان کا جراثیمی حملہ ہے۔ انہیں ڈینگی وائرس اگانا آگئے ہیں۔ پہلے مرحلے میں وہ چاہتے ہیں کہ خواتین حیادار کپڑے پہنیں۔ مچھر کو حکم ہے کہ چہرے اور ننگے بازءووں پہ جم کر کاٹے تاکہ لگ پتہ جائے۔

ابھی ایسے وائرس کاشت کے مرحلوں سے گذر رہے ہیں جن کے علاج میں مردوں کو داڑھی رکھنا پڑے گی۔ خواتین کو گھر کی چار دیواری میں بیٹھنا ہوگا۔  مردوں کو چار شادیاں کرنی پڑیں گی۔ موسیقی  ختم کرنا ہوگی اسکول مٹانے ہونگےوغیرہ وغیرہ۔ وہ بھی جان گئے ہیں کہ جو وائرس سے مر رہا ہو اسے خودکش حملہ آور سے کیوں مروائیں. اور وزیر اعلی پنجاب کے اس بیان کے بعد کہ ہم تو طالبان کے نظریاتی ساتھی ہیں ہمارے سوبے میں تو دھماکے نہ کریں۔ انہیں لوگوں بالخصوص خواتین کو راہ راست پہ لانے کا یہ مناسب طریقہ نظر آیا ہے۔

میرا کہنا ہے کہ طالبان ایسی غیر اسلامی کارروائ نہیں کر سکتے۔ انہوں نے اسکی ذمہ داری بھی قبول نہیں کی ہے۔ انکی یہی خوبی تو مجھے بے حد پسند ہے جو کرتے ہیں اسکی ذ٘مہ داری لیتے ہیں۔

جماعت اسلامی کا نعرہ ہے کہ یہ عذاب الہی ہے۔  اندرون خانہ کی اطلاع ہے کہ لاہور میں اس وجہ سے ہے کہ ریمنڈ ڈیوس وہیں سے رہا ہوا تھا اور شریف برادران کی رضامندی سے ہوا۔ اس لئے لاہور کے حصے میں یہ بلا آئ۔

میرا نعرہ ہے کہ یہ عذاب الہی ہے۔ پہلے ریمنڈ کی شکل میں آیا اب مچھر کی شکل میں۔ اس سے پہلے نمرود کا خاتمہ بھی ایک مچھر نے کیا تھا۔ نمرود غیرت مند  تھا ایک مچھر سے مر گیا۔ سو اس وباء میں مرنے والے غیرتمند ہونگے اور بچ جانے والے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عذاب الہی کا شکار۔ ان حالات میں زندہ رہنے والے بے غیرت نہیں تو اور کیا ہیں۔

ویسے ان عذابی مچھروں کا نشانہ کچھ صحیح نہیں اب تک شریف برادران بچے ہوئے ہیں۔

پنجاب سے کچھ آوازیں اس طرح آئیں کہ کراچی میں ایک دہشت گرد پارٹی کو بین ہونا چاہئیے۔ انکی دہشت کی وجہ سے کراچی کے ڈینگی مچھر لاہور کی طرف نکل گئے۔

میرآواز ہے کہ یہ دراصل مچھر نہیں ہیں بلکہ کراچی کے تلنگے ہیں۔ کسی زولوجسٹ سے مدد لے کر انکی صحیح شناخت کی جائے تاکہ ہم کراچی سے انکو قابو میں رکھنے کے طریقے بھیج سکیں۔ ویسے وہ چاہیں تو مختلف مافیاز سے بھی مدد لے سکتے ہیں۔ جو انہیں کراچی میں پسند ہوں۔

کپڑوں کے تاجر، ڈینگی کی ادویات اور ٹیسٹ کرنے والے، ڈاکٹر، حکیم اور عطائ، مچھر مار اسپرے کرنے والے،  دعا تعویذ کرنے والے، ان سب  کا خیال ہے کہ انکی کوئ نیکی کام آگئ۔ آجکل کاروبار زوروں میں ہے۔ خواتین پوری آستین کے کپڑے پہن رہی ہیں زیادہ کپڑا خرچ ہو رہا ہے۔ ادھر مچھر کو کنٹرول کرنے اور علاج معالجے کے ضمن میں وہ کون سا طریقہ ہے جسے لوگ نہیں آزما رہے ہیں۔ اللہ تیرا شکر ہے، مالک جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔

میں بھی سوچتی ہوں میری کوئ نیکی کام آگئ۔ لاہور میں نہیں کراچی میں موجود ہوں۔ اچھا ہوا لاہور والوں کو اچھے وقتوں میں رشتے سے انکار کر دیا۔ بچت ہو گئ۔ یا اللہ تیرے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے ہم ہی عقل کے کورے سمجھ نہیں پاتے۔

میں ان میں سے ہر ایک سے متفق ہوں۔ جب انسان سب سے اتفاق کر لے تو اسے خود زیادہ نہیں کرنا پڑتا۔ جو کرتے ہیں دوسرے کرتے ہیں۔ یا عذاب کرتے ہیں۔ اس سال میں نے یہ سب سے قیمتی بات سیکھی ہے۔

میں ان میں سے ہر ایک سے متفق ہوں۔ اور آرام کر رہی ہوں۔

Just chill,

آئے کچھ ابر، کچھ شراب آئے

اسکے بعد آئے جو عذاب آئے

7:30 PM

آئ ایس آئ, پاکستان, ریمنڈ ڈیوس, کراچی, لاہور, مچھر, نواز شریف

اف جوئیں۔۔۔۔۔۔۔۔

اسکول جانے والوں بچوں کے والدین کے جہاں دیگر مسائل ہوتے ہیں وہاں سب سے خوفناک ، دل دھڑکا دینے والی وجہ  جس سے انہیں اور انکے بچوں دونوں کو سخت شرمندگی ہوتی ہے وہ سر کی جوئیں ہیں۔

ویسے تو جوئیں ساری دنیا میں لوگوں کے ہوتی ہیں لیکن گرم ممالک کی آب و ہوا انہیں خوب راس آتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ گھریلو سطح پہ جتنی چاہے احتیاط کی جائے ایسا ہو ہی جاتا ہے کہ ہم کسی دن دیکھتے ہیں کہ ہمارا بچہ بری طرح سے اپنا سر کھجا رہا ہے۔ یہ ایک اہم علامت ہے کہ سر میں جوءووں نے جگہ بنا لی ہے۔ اگر اب بھی نظر انداز کریں تو یہ جوئیں گرمی کی وجہ سے کسی دن سر کے اوپر مٹر گشت کرتی نظر آئیں گی۔ اور ہلکی سی ہوا بھی بالوں میں چپکے انکے  سفید انڈوں کی ایسی نمائیش کرے گی کہ لوگ گھبرا کر آپکے بچے کو خود سے دور کر دیں گے۔

یہاں کراچی میں کچھ پرائیویٹ اسکولوں نے یہ پالیسی بنا لی ہے کہ سر میں جوءووں کی موجودگی کے شک کی بناء پہ اسی وقت بچے کو گھر واپس بھیج دیتے ہیں۔ جو نہ صرف بے جا سختی ہے، بلکہ بچے کی سبکی اور دیگر بچوں کی طرف سے اسکی چھیڑ کا باعث بن جاتی ہے۔

یہاں میں فی الوقت ان اسکولوں کے تذکرے میں نہیں جانا چاہتی جو کہ اس قسم کے قوانین کا نفاذ کر کے یہ تائثر دینا چاہتے ہیں کہ انکا اسکول ڈسپلن اور قواعد کے لحاظ سے کس قدر بہترین ہے۔ انسانی قدر و قیمت بھی کوئ چیز ہے۔ لیکن یہ ضرور کہنا چاہونگی کہ کسی اسکول انتظامیہ کو یہ حق نہیں ہونا چاہئیے کہ وہ محض اس وجہ سے بچے کو کلاس سے نکال کر گھر واپس بھیج دیں۔ بچہ بہرحال وہاں تعلیم کے لئے ہے اور اس طرح سے اسکی تدریس کا جو نقصان ہوتا ہے اسکی ذمہ داری اسکول پہ عائد ہوتی ہے اور محکمہ ء تعلیم کو اس سلسلے میں نوٹس لینا چاہئیے کہ وہ کون سی اہم وجوہات ہو سکتی ہیں جنکی بناء پہ ایک اسکول اپنے کسی صحت مند طالب علم کو کمرہ ءجماعت میں بیٹھنے سے روک دے۔

جوئیں، کسی کی جمالیاتی حس کو ناگوار گذر سکتی ہیں، صفائ پسند طبیعت کو بری لگ سکتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مچھر،  یا کچھ اور حشرات کی طرح کوئ بیماری نہیں پھیلاتیں۔

اگر اسکول انتظامیہ چاہے تو وہ پہلے سے احتیاطی تدابیر کروا سکتی ہیں مثلاً وہ والدین کو یہ نوٹس بھیج سکتی ہے کہ  ہفتہ وار چھٹیوں کے دوران بچے کے سر کو کسی جوئیں مار شیمپو سے دھویا جائے اور گیلے بالوں میں باریک کنگھی پھیری جائے۔ اس طرح سے اگر کوئ جوں اتفاقاً چڑھ جائے تو وہ نکل جائے گی۔  پوری جماعت ایکدن اس طرح کے عمل سے گذرے گی تو جوءوں کے پھلنے کے امکانات خاصے کم ہو جائیں گے۔

بچیوں کے لئے یہ لازمی کیا جائے کہ اگر انکے بال بڑے ہیں تو وہ انہیں باندھ کر رکھیں اس طرح بندھے ہوئے بالوں سے جوءوں کی منتقلی مشکل ہو جاتی ہے۔ بچوں کو آپس میں سر جوڑ کر بیٹھنے سے منع کریں۔

والدین کو بتایا جائے کہ ہفتے کے آخری دن جو کہ پاکستان کے زیادہ تر اسکولوں میں جمعہ کا دن ہوتا ہے بچوں کی صفائ کے سلسلے میں معائنہ ہوگا۔ اس طرح ان پہ دباءو رہے گا کہ وہ اپنے بچوں کی صفائ کا خیال رکھیں۔ یہ نوٹس انہیں تعلیمی سال شروع ہونے کے ساتھ ہی دیا جائے نہ کہ معائنہ ہونے سے ایک دن پہلے۔

بچوں کو وقتاً فوقتاً جسمانی صفائ کے متعلق بتانے کے لئے استاد کو اہتمام کرنا چاہئیے۔

اسکولوں سے ہٹ کر والدین اکثر پریشان نظر آتے ہیں کہ وہ  جوءوں سے نجات پانے کے لئے کیا کریں؟

اس سلسلے میں، میں نے انٹر نیٹ سے مدد لی ۔ مزید یہ کہ اس میں میرے ذاتی تجربات بھی شامل ہیں کیونکہ میں خود ایک بچی کی ماں ہوں۔ اس لئے امید ہے کہ یہ طریقے کارآمد ہونگے۔

شیمپو سے؛

سب سے پہلے یہ واضح کر دوں کہ ایک دفعہ جوئیں سر میں داخل ہو جائیں تو ماں کو بڑی محنت کرنی پڑتی ہے کیونکہ جوئیں مارنے والے شیمپو چاہے وہ کتنا ہی دعوی کریں کہ لیکھوں اور جوءوں سے مکمل نجات وہ مکمل صفائ نہیں کرتے۔

جوئیں مارنے والے شیمپو میں عموماً

میلاتھائیاون

، کیڑے مار دوا ایک مخصوص مقدار میں شامل ہوتی ہے۔ تاکہ وہ سر کے بالوں یا جلد کو زیادہ نقصان نہ پہنچائے۔ یہ دوا لیکھوں یعنی جوءوں کے انڈوں کا خاتمہ نہیں کرتی۔ جوءوں کا خاتمہ بھی صرف چھتیس فی صد تک کرتی ہے۔ بعض جوءوں میں ان دواءوں کے لئے مزاحمت بھی ہوتی ہے اور وہ اس سے نہیں مرتیں۔ اگر مر جائیں تو کچھ عرصہ بعد باقی رہ جانے والے انڈوں سے نئ جوئیں پیدا ہوجاتی ہیں اور ایک دفعہ پھر بچہ سر کھجا رہا ہوگا۔

اسلئے جوئیں مارنے کے لئے کوئ بھی طریقہ استعمال کریں ایک روائیتی طریقہ ہر صورت استعمال کرنا پڑے گا اور وہ ہے باریک کنگھی کا استعمال۔

یہ باریک کنگھی ذرا دیکھ بھال کر لیں عام پلاسٹک کی کنگھیاں جو نرم دانتوں کی ہوتی ہیں اور دانتوں کے درمیان فاصلہ زیادہ ہوتا ہے آپکا مسئلہ حل نہیں کریں گی۔ دانتوں کے درمیان کم سے کم فاصلہ ہونا چاہئیے اور پلاسٹک کو سخت ہونا چاہئیے۔ پلاسٹک کے علاوہ، یہ کنگھیاں لکڑی اور دھات کی بھی مل جاتی ہیں۔ مسلسل استعمال سے دانتوں کے درمیان فاصلہ پیدا ہو جاتا ہے انہیں پھینک کر دوسری لے لیں۔ یہاں کراچی میں انڈیئن باریک کنگھیاں مل جاتی ہیں یہ پاکستانی کنگھی سے مہنگی ہوتی ہیں مگر کام میں بہت بہتر ہوتی ہے۔

اگرچہ میں پاکستانی مصنوعات کو ترجیح دیتی ہوں لیکن اس نکتے پہ انڈیئن کنگھی ہی لینا پسند کرتی ہوں۔ اس کنگھی کے سلسلے میں ایک بات اور بتادوں کے جب بھی دور دراز کے سفر کو نکلیں اپنے سامان میں یہ کنگھی رکھنا مت بھولیں۔

اب طریقہ ء استعمال دیکھ لیں۔ بچے کو نہلانے سے پہلے بالوں میں ہلکا سا تیل لگا کر کنگھا کر کے بال اچھی طرح سلجھا لیں۔ اب شیمپو کو  بالوں میں لگا لیں۔ بالوں کو سر کے آگے نہ لٹکائیں۔ بلکہ جس طرح آپ نے کنگھا کیا تھا اسی سمت رہنے دیں۔ دی ہوئ ہدایات کے مطابق اتنی دیر رہنے دیں۔ اب اسی طرح بالوں کو پریشان کئے بغیرپیچھے کی سمت رکھے ہوئے بالوں کو نرمی سے پانی سے دھو ڈالیں۔ اب دوبارہ بالوں میں پہلے موٹا کنگھا یا برش پھیر کر انہیں سلجھا لیں۔ اگر آپ نے ان ہدایات پہ عل کیا تو بال بہت زیادہ الجھے ہوئے نہیں ہونگے۔

جب بال خوب اچھی طرح سلجھ جائیں اور کنگھے کو ان میں چلنے میں ذرا دشواری نہ ہو تو سر کےحصے کر لیجئیے اور ہر سمت سےباریک کنگھی کوسر کی جلد سے لے کر بالوں کے آخری سرے تک  پھیرتے چلے جائیں۔ ہر دفعہ کنگھی پھیرنے کے بعد اسے اچھی طرح اپنے سنک پہ جھٹک لیں تاکہ اگر دانتوں کے درمیان کوئ جوں پھنس گئ ہو تو وہ نکل جائے۔ یہ عمل تین سے چار بار کریں، کانوں کے اوپری حصے کی طرف خاص طور پہ کہ جوئیں زیادہ تر یہاں پہ یا گدی کے پاس جمع ہو جاتی ہیں۔

شیمپو دو تین دن کے وقفے سے استعمال کریں لیکن کنگھی آپ ہر روز نہلانے کے دوران پھیر سکتی ہیں۔ بچہ لازمی طور پہ چیخے چلائیں گا۔ لیکن اپنا دل کڑا رکھیں۔ بعد میں ہیئر ڈرائیر کی گرم ہوا سے بال خشک کر لیجئیے۔ یہ گرم ہوا امید ہے بچ جانے والی جوءوں کا کاتمہ کر دے گی مگر اسے اتنا زیادہ استعمال نہ کریں کے بالوں کو مردہ ہی کر دے۔ ایک خاص فاصلے پہ رکھ کر استعمال کیجئیے۔

قدرتی طریقہ؛

جو لوگ بالوں کے معاملے میں حساس ہیں وہ پوچھتے ہیں شیمپو کے علاوہ کوئ قدرتی طریقہ نہیں۔ بالکل ہے۔  ہمارے ملک میں کچھ لوگ تارا میرا کا تیل استعمال کرتے ہیں۔ باہر کے ممالک میں ٹی ٹری آئل یا اس میں زیتون کا تیل ملا کر استعمال کیا جاتا ہے۔ مجھے ان طریقوں کی افادیت کے متعلق نہیں پتہ۔

لیکن تیل کے علاوہ بھی طریقے ہیں۔

عام شیمپو سے بال شیمپو کرنے کے بعد بالوں میں تھوڑا سا منہ صاف کرنے والا لسٹرین جروں سے سارے بالوں میں لگا لیں چند منٹ لگا رہنے دیں بالوں کو ہلکے سے پانی سے دھوئیں اور باریک کنگھی پھیر لیں۔ لسٹرین سے جوئیں نیم بے ہوش ہو جاتی ہیں۔

ایک اور طریقہ ہے میونیز بالوں میں اچھی طرح لگا کر چھوڑ دیں۔ جی وہی میونیز جو کھانوں میں استعمال کرتے ہیں۔اس سے بھی جوئیں گھٹن کا شکار ہو جاتی ہیں۔ لیکن  میونیز کو صاف کرنے کے لئے بالوں کو اچھی طرح شیمپو کرنا پڑے گا۔  گیلے بالوں میں باریک کنگھی پھیرنا مت بھولیں۔

اگر بال روکھے ہیں تو شیمپو کرنے کے بعد بالوں کے سرے پہ کنڈیشنر لگا لیں ۔ یاد رکھیں کنڈیشنر کو کبھی بھی بالوں کی جڑوں میں نہ لگائیں۔ نہ وہ شیمپو استعمال کریں جن میں کنڈیشنر بھی ہوتا ہے۔ کنڈیشنر آپکے بالوں کی جڑوں کو کمزور کرتا ہے۔

ایک دفعہ یہ یقین ہونے کے بعد کہ اب بالوں میں جوئیں نہیں رہیں۔ آرام سے نہ بیٹھ جائیں دس دن کے بعد دوبارہ اس عمل کو دوہرائیں اور کنگھی کو چیک کریں اگر اس میں کوئ جُوں آتی ہے تو اسے پھر دوہرائیں تاکہ اسکے دئے ہوئے انڈوں سے جو نئ جوئیں بنی ہیں وہ نکل جائیں۔ ایک جوں روزانہ دس انڈے دے سکتی ہے۔  انڈے سے جوئیں نکلنے میں تقریباً ایک ہفتہ اور ان جوءوں کو انڈے دینے کے قابل بننے میں دس دن لگتے ہیں۔

بچے کے سر میں جوئیں ہونے کا مطلب یہ کہ گھر کے ہر فرد کو جوئیں ہو سکتی ہیں۔ احتیاظاً گھر کے سب افراد اس عمل کو کریں۔ تاکہ ایک دفعہ سارا گھر صاف ہو جائے ورنہ پھر کسی شخص کی جوئیں نا پسندیدہ پھیلاءو کا باعث بن جائیں گی۔  اسکے لئے آپکو گھر والوں کو مطلع کرنا پڑے گا کہ گھر پہ کس طرح کا حملہ ہو چکا ہے۔

یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ بری اطلاع دینا آسان کام نہیں۔ لیکن  زندگی میں مسائل کم رکھنے کے لئے اس سے مفر ممکن نہیں۔ اب آپکے سر میں کھجلی شروع ہو چکی ہے تو سب سے پہلے ایک باریک کنگھی خریدئیے، وہی دشمنوں کی بنی ہوئ۔

 :)

 Malathion

Antilice shampoo

8:08 PM

اسکول, انڈیا, اینٹی لائیس, بچے, جوئیں, شیمپو, صفائ, کنگھِی, میلاتھائیاون

امن اور خواتین

آج کی تازہ خبر اب شام کے سات بجے پرانی ہو چکی ہے مگر فیس بک پہ کسی نے بھی اس بارے میں سانس تک نہیں لی تو مجھے اندازہ ہوا کہ آجکی تازہ خبر پاکستان نہیں پہنچی۔

پہنچ بھی کیسے سکتی ہے اس خبر میں دو نقص ہیں۔ ایک تو یہ خواتین کی کامیابی کی داستانوں میں سے ہے اور دوسرا یہ امن سے بھی تعلق رکھتی ہے۔

پاکستان میں خواتین سے متعلق جو خبرجگہ لیتی ہے وہ کسی مغربی ملک میں چہرے کے حجاب پہ پابندی کی خبر ہوتی ہے۔ اپنی بیٹی کو ناشتہ کراتے ہوئے میں نے یونہی سرسری سی نظر اخبار پہ ڈالی تو بزنس ریکارڈر اور ڈان دونوں کے اولیں صفحے پہ یہ خبر موجود تھی کہ

اس سال امن کا نوبل انعام

تین خواتین کے حصے میں آیا ہے۔ ان میں دو خواتین ایلن جونسن اور لیماہ گبووی افریقہ کے ملک لائبیریا سے تعلق رکھتی ہیں۔ جبکہ تیسری خاتون نہ صرف عرب ہیں بلکہ مسلم ہیں اور یمن سے تعلق رکھتی ہیں توکل کرمان۔

بہتّر سالہ ا

یلن جونسن

،

لائبیریا

کی پہلی منتخب جمہوری صدر ہیں۔ لائبیریا، سن انیس سو انّاسی سے خانہ جنگی کا شکار ملک ہے خانہ جنگی جس نے  تقریباً دو لاکھ لوگوں کو نگل لیا۔ دو ہزار تین میں ایلن جونسن کے عہدہ سنبھالنے کے بعد سے حالات میں خاطر خواہ تبدیلی آئ ہے۔

دوسری خاتون،  خواتین کے حقوق کے لئے کام کرنے والی

لیماہ رابرٹا گبووی

بھی اسی ملک سے تعلق رکھتی ہیں۔ انہوں نے اپنے ملک کی مسلم اور عیسائ خواتین کو متحد کیا تاکہ وہ ملک کے حالات بدلنے کے عمل میں حصہ لے سکیں۔ اس سے پہلے انہوں نے زنا کے خلاف بھی ایک لمبی مہم میں حصہ لیا۔ انکے پانچ بچے ہیں۔

عرب خاتون

توکل کرمان المخلافی

جوکہ یمن کےآمرانہ نظام  کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے صدر عبدالصالح کے خلاف احتجاجات کو منظم کرنے میں بھرپور حصہ لیا۔  انکے تین بچے ہیں۔ نوبل انعام کی کمیٹی کے خیال میں عرب ممالک میں آنے والی تبدیلی کی لہر وہاں کی خواتین کے مرہون منت ہے۔

یہ عرب اور افریقہ سے نکل کر ہم اپنے ملک کی طرف دیکھتے ہیں۔ ہم بھی تو تیس سال سے جنگ میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہماری عورتوں کو کیوں خیال نہیں آتا کہ انکے بچے  محض جنگ کا ایندھن بننے کے لئے پیدا نہیں ہوتے۔  یہ جنگ ہو یا قدرتی آفات سب سے زیادہ مصائب کا شکار کون ہوتا ہے عورت۔ جب گھر کا کمانے والا نہیں رہتا تو ایک جاہل اور معاشی طور پہ کمزور بدحال عورت کو کن اندوہناک حالات سے نہیں گذرنا پڑتا۔

ایک عورت جس نے گھر کی چہار دیواری کے علاوہ دنیا ہی نہیں دیکھی ہوتی سیلاب اور زلزلے سے گذرنے کے بعد جب لاوارث ہوتی تو کیسی قیامت اس پہ گذرتی ہے کیا اسکا اندازہ کوئ لگا سکتا ہے۔

ایک عورت کس طرح تڑپ تڑپ کر زچگی کے دوران جان دیتی صرف اس لئے کہ اسے کوئ طبی امداد نہیں دینے والا ہوتا۔

 آخر اسے کیوں نہیں خیال آتا کہ وہ بھی اپنے ملک میں امن  کے قیام اور خوشحالی کی جدو جہد میں حصہ لے سکتی ہے۔ معاشرے کے امن استحکام اور خوشحالی کا مطلب اسکے لئے ایک آسان،  دکھ اور اذیت سے آزاد زندگی ہوتا ہے۔

آخر وہ کب تک اس سماج کے بنے ہوئے ظالمانہ نظام کا حصہ بنی رہے گی؟

آپ نے دیکھا، یہ خواتین جو اپنے بچوں کی ماں بھی ہیں وہ کس طرح اپنے اردگرد کی دنیا کو اپنے بچوں کے لئے محفوظ بنا رہی ہیں۔  آخر ہم کب اس بات پہ جمع ہونگے کہ ہمارے بچوں کو بھی ایک پُر امن معاشرہ نصیب ہو۔ وہ نام نہاد جہاد اور ٹارگٹ کلنگ میں نہ مارے جائیں، انہیں سیلاب کے پانیوں کا کفن نہ نصیب ہو اور نہ اپنے جسموں کو بم سے اڑائیں۔

  اے میرے دیس کی آدھی آبادی تم بھی اپنی بقاء کے لئے اٹھ کھڑی ہو۔ ہمیں بھی امن چاہئیے۔ ہم بھی جینا چاہتے ہیں۔ ہم بھی اس سرزمین پہ لہلہاتے پھولوں کے درمیان اپنے بچوں کو پھلتے پھولتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہمیں بھی جانوروں جیسے نہیں انسانوں جیسے حقوق چاہئیں۔ ہم بھی اپنے اوپر ظلم کرنے والوں کے لئے سزا چاہتے ہیں۔ آخر ہم ان سب سے دور کیوں رہیں۔

آپ نے دیکھا ، ان عورتوں کے بھی گھر ہیں بچے ہیں، گھریلو زندگی ہے لیکن کیا یہ چیز انکے راستے کی دیورا بنی۔

یقین رکھیں اس ملک میں امن اب خواتین ہی لا سکتی ہیں۔ اور انہیں اسکا حصہ بننا پڑے گا، جان رکھیں آنے والا زمانہ خواتین کی مضبوطی کا زمانہ ہے۔ انہیں اپنی انتظامی صلاحیتوں کو اپنے علم اور زندگی کے عملی تجربات سے نکھارنا ہوگا۔

دوسری طرف ہمارے ملک میں بھی امن اورخوشحالی کے تمام منصوبوں میں خواتین کو واضح طور پہ شامل کیا جائے انکی تعداد کو بڑھایا جائے جس میں معاشرے کے ہر طبقے سے خواتین کی نمائیندگی لی جائے۔ تاکہ یوں نہ ہو کہ طبقہ ء اشرافیہ سے تعلق رکھنے والی خواتین اپنے مردوں کے اشارے پہ حکومتی نظام کا حصہ بنی رہیں اور انکی حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہ ہو۔

ہمیں کٹھ پتلیاں نہیں خود اعتماد , جراءت مند اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھنے والی خواتین اپنی نمائِندگی کے لئے چاہئیں۔ وہ خواتین جو زندگی کی جدو جہد کی جنگ لڑ کر آئ ہوں۔

بہر حال یہ ایک مزے کی خبر ہے۔

8:26 PM

افریقہ, امن, ایلن جونسن سر لیف, پاکستان, توکل کارمان, خواتین, عرب, لائبیریا, لیماہ غووی, نوبل انعام

حال کا قال

محبت ایک معمہ ہے۔ جو سمجھ کر بھی سمجھایا نہیں جا سکتا۔ دنیا میں  کتنے ہی لوگوں نے اسکی تعریف بیان کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جب بھی کوئ انسان اس جذبے کی شدت سے گذرتا ہے وہ اسے ناکافی خیال کرتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پہ گایا نہیں جاتا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اسکا علم کسی کو نہیں کہ یہ کس ساز پہ گایا جا سکتا ہے اور کس پہ نہیں۔لوگ کہتے ہیں کہ محبت اپنا اپنا تجربہ ہے مگر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جب کوئ اپنے پیارے کو یاد کرتا ہے تو باقی سب اپنے پیاروں کی یاد میں گم ہوجاتے ہیں۔ یوں کیوں ہوتا ہے کہ کسی ایک سے محبت کرتے ہیں مگر پھر خود پوچھتے ہیں کہ تجھ سے کی ہے کہ زمانے سے کی ہے محبت میں نے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ایک محبت میں ہیر رانجھن رانجھن کرتے خود ہی رانجھن ہو جاتی ہے اور یہی محبت انسان  میں ایسا غرور پیدا کر دیتی ہے کہ شعلہ خاک ہوجاتا ہے مگربکھرتا نہیں۔ نہ تپش ، نہ دھواں یوں جیسے کچھ ہوا نہیں۔

میں جب پندرہ سولہ سال کی تھی تو سسّی پنہوں اور سوہنی مہینوال کی عشق کی داستانوں سے بڑا متائثر تھی۔  اب بھی ہوں، اسکی وجہ مجھے یہی سمجھ میں آتی ہے کہ ان داستانوں میں عورت عزم واستقلال کی تصویر نظر آتی ہے۔ میں بہادر اور پر عزم خواتین سے اُنسیت رکھتی ہوں۔

خیر، اگر ان داستانوں میں سے انتخاب کو کہیں تو میرے لئے شاید سسّی، سوہنی پہ فوقیت رکھتی ہوگی۔ اسکی وجہ شاید یہ ہوگی کہ میں نے بلوچستان کے بیکراں دہشت بھرے دشت دیکھے ہیں جہاں سوہنی، پنہوں کی تلاش میں نکلی تھی لیکن چڑھا ہوا چناب نہیں دیکھا۔ مگر یہ کہ میں سمندر کے کنارے رہتی ہوں مجھے تو دریا بھی وہی سمجھ آتا ہے جو پہاڑوں کو کاٹ کر ریزہ کر رہا ہو۔ پتھروں سے ٹکرانے کی جراءت کررہا ہو۔

 محبت کے ان تمام قصوں پہ جو قصہ راج کرتا ہے۔ وہ واقعہ ء معراج ہے۔ یاد نہیں آرہا کس نے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم آسمان تک گئے اور واپس آگئے۔ خد ا کی قسم اگر میں ہوتا تو اس بلندی سے کبھی واپس نہ آتا۔

اس کیفیت کے لئے ناصر کاظمی نے کہا کہ

بس ایک منزل ہے ابولہوس کی ہزار رستے ہیں اہل دل کے

یہی تو فرق ہے مجھ میں اس میں گذر گیا میں، ٹہر گیا وہ

محبت ایک مقام پہ نہیں رکتی اسلئے یہ کائینات اور اس میں موجود ہر ذرہ گردش میں ہے۔ واقعہ ء معراج سے متعلق صابری برادران کی ایک قوالی ہے۔ جو میری پسندیدہ ہے۔ اپنے بچپن سے لیکر آج تک اسکی پسندیدگی میں کوئ کمی نہیں آئ۔  محفل سماع کے متعلق جو بھی نظریات ہوں ان سے قطع نظر، نجانے کیوں ایسا ہوتا ہے کہ اس قوالی کو سن کر میرے روئیں بھی سنسنانے لگتے ہیں۔  خدا بہتر جانتا ہے یہ عقیدت ہے، محبت ہے، اسرار کی انتہا ہے، شاعری کی خوبی ہے یا انتہائے وصل کا تصور۔ لیکن اس  کیفیت سے گذرتے ہوئے مجھے ان لوگوں کی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے جو مست ہو کر ناچنے لگتے ہیں۔ جسے حال کہتے ہیں۔

کیفیت چشم اسکی مجھے یاد ہے سودا

ساغر کو میرے ہاتھ سے لیجیئو کہ میں چلا

6:01 PM

اسلام, پنہوں, تصوف, رسول, سسی, سوہنی, صابری قوال, عشق, عورت, قوالی, محبت, محمد. پاکستان, مہینوال, ناصر کاظمی

ستارہ کھوپڑی

بچوں کے ساتھ پڑھنا ایک خاصہ دلچسپ عمل ہوتا ہے۔   میں اپنی بچی کے ساتھ  ہر ہفتے آنے والا  بچوں کا میگزین ینگ ورلڈ پڑھ رہی تھی۔ اور اس میں سے جو چیزیں انکی سمجھ آ سکتی تھیں انہیں آسان الفاظ میں ڈھال رہی تھی۔ اس پہ موجود ڈرائینگز  انکو دکھائیں کہ وہ اس میں سے کیا کیا چیزیں بنا سکتی ہیں۔

صفحے پلٹتے ہوئے میری نظر ایک مضمون پہ جا پڑی۔

دی اسٹار اسکل

۔ چاند چہرہ ستارہ آنکھیں۔ سنییں، دیکھیں اور پڑھیں۔ لیکن ستارہ کھوپڑی۔ یہ کیا جادو نگری ہے۔

عنوان ایسا تھا کہ میں اسے پڑھنے لگی یہ ایک بچے کی کھوپڑی کے بارے میں تھا جو میکسیکو کے آس پاس کہیں سے ملی۔ پھر ماورائ  ریسرچ کرنے والے اداروں تک پہنچی اور اس مضمون کے مطابق ایک ماورائ تحقیق سے متعلق تحقیقداں    نے یہ کہا کہ یہ کھوپڑی نو سو سال پہلے اس علاقے میں رہنے والے ایک بچے کی ہے۔ جس کے ساتھ پائے جانے والی کھوپڑی غالباً اسکی ماں کی ہے۔

اس کھوپڑی یں دلچسپی اس وقت بڑھی جب اندازہ لگانے والوں نے اسے ایک ایسے بچے کی کھوپڑی قرار دیا بچہ جو  کسی غیر زمینی مخلوق سے تعلق رکھتا ہے۔ امکان ہے کہ یہ مکمل طور پہ ایلیئن مخلوق نہیں بلکہ انسانی عورت کے ساتھ ایلیئن مخلوق کے رابطے سے اس نے جنم لیا۔ اسکی وجہ اس کھوپڑی کی ساخت میں بے انتہا توازن یا ہم شکلیت یعنی جسے ہم انگریزی اصطلاح میں کہیں کہ سمِٹری ہے۔اسکے علاوہ بقول انکےاسکے  ڈی این اے میں بھی غیر زمینی مخلوق کے آثار ملتے ہیں۔ مزید تحقیقات جاری ہیں۔ مضمون اس پِغام کے ساتھ ختم ہوا۔ میرے اندر کا بچہ اسے پڑھ کر ایک پر اسرار دنیا کے دھندلکوں میں کھو گیا۔

غیر زمینی مخلوق کی مغربی معاشرے میں وہی حیثیت ہے اور لوگوں کی اس میں وہی دلچسپی ہے جو ہمارے معاشرے میں جنات، بھوت یا آسیب کی ہے۔ یہ الگ بات کہ مغرب اپنے اس خیال کو اتنی عزت دیتا ہے کہ اس پہ تحقیقیاتی رپورٹس بھی بنتی ہیں فنڈ بھی خرچ ہوتا ہے۔  جبکہ ہمارے جنات اور آسیب بس توہمات کے کارخانے کی پیداوار رہ جاتے ہیں۔  امیروں کے وہم بھی اپنی ایک شان رکھتے ہیں۔

اپنے اندر کے بچے کو جھٹک کر ایک طرف کیا جو چاند کو پکڑنا چاہتا ہے، بادلوں کے تعاقب میں رہتا ہے، تتلیوں کی طرح اڑتا ہے اور ماورائ کہانیوں سے خوش ہوتا ہے۔ یہ معلومات میرے لئے خاصی مشکوک تھیں۔ ایک انگریزی اخبار میں ایسی غیر معیاری تحریر کیسے وہ بھی بچوں کے حصے میں؟

انگریزی کا اپنا ایک رعب ہوتا ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ انگریزی مواد کو چھاننا پھٹکنا آسان ہوتا ہے۔ اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں یہ حد سے زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ اس لئے غلطی کی توقع کم ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک دو روز بعد جب وقت ملا تو اسٹار اسکل کو نیٹ پہ چیک کیا۔

پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے اسٹار اسکل کا نام کیوں دیا گیا؟

اس لئے کہ عہد قدیم سے یہ خیال موجود ہے کہ  سیارہ زمین کے علاوہ کائینات میں کہیں کوئ اور مخلوق موجود ہے جو زمین پہ آتی جاتی ہے۔ اپنی اس آمدو رفت کے دوران وہ یہاں زمینی انسان سے رابطہ کرتی ہے۔ کچھ خواتین اس مخلوق کی وجہ سے حاملہ بھی ہوجاتی ہیں۔

چونکہ خیال یہ تھا کہ یہ مخلوق کہیں ستاروں سے آتی ہے اس لئے یہ  بچہ اسٹار چائلڈ اور یہ کھوپڑی، اسٹار اسکل کہلائ۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہ مخلوق جب انکے بچے دنیا میں پیدا ہوتے ہیں تو ایکدن انہیں واپس لیجاتی ہے۔ کیوں لیجاتی ہے یہ نہیں معلوم۔

 اس ستارہ کھوپڑی والے بچے کی ایک عام پسندیدہ کہانی یوں بنتی ہے کہ اسکی زمینی ماں نے اسے اس مخلوق کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے بچے کو زہر دے دیا اور آخیر میں خود بھی خود کشی کر لی۔ بچے کے پاس پائے جانے والی دوسری کھوپڑی اسکی ماں کی ہے۔

یہ مغربی لوک کہانی کا ٹیکنالوجی کے زمانے سے ملن کی ایک عمدہ مثال ہے۔

وکیپیڈیا کے مطابق

اس قسم کی ساری معلومات کی حیثیت ایک اندازے سے زیادہ نہیں وہ بھی ایک خاص طبقے کی طرف سے ہے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ بچے کا سر اپنی عمر کے حساب سے اس لئے زیادہ بڑا ہے کہ وہ پیدائیشی طور پہ کسی جینیاتی بیماری میں مبتلا تھا جیسے

ہائیڈرو سفالس

۔ اس بیماری میں سر میں پانی جمع ہونے کی وجہ سے سر کی ہڈیاں پھیل جاتی ہیں اور سر نارمل جسامت سے بڑاہو جاتا ہے۔

  اسکا ڈی این اے چیک کیا گیا جو قطعی انسانی ڈی این اے ہے۔ اس میں باپ کی طرف سے وائ کروموسومز اور ماں کی طرف سے ایکس کروموسومز موجود ہیں یعنی وہ ایک لڑکا تھا۔ مزید تحقیق کے لئے اسکا

مائ ٹو کونڈریا

چیک کیا گیا۔ یہ مائ ٹو کونڈریا وہ اطلاعات رکھتا ہے جو ماں کی طرف سے آتی ہیں۔ مائ ٹو کونڈریا  پہ تحقیقات ایک انسان کا وہ سلسلہء نسب بتاتی ہیں جو ماں سے چلتا ہے۔ ماں کی ماں اور پھر اسکی ماں۔ ہمم,  قدرت عورت کے لئے ایک ترجیح نہیں رکھتی؟

:)

  کسی انسان کی ابتداء کے بارے میں معلوم کرنے کے لئے اس مائ ٹوکونڈریا کو چیک کیا جاتا ہے۔ اسکے ذریعے انسانوں کے گروہوں کے ابتدائ علاقے کا اندازہ ہوتا ہے۔ یوں انکی گروہ بندی ہوتی ہے۔ یہ بچہ اس گروہ بندی میں گروہ

ہیپلو گروپ سی

میں شامل ہے۔ جبکہ اسکے ساتھ پائے جانے والی عورت کا گروپ,

ہیپلو گروپ اے

ہے اسکا مطلب وہ اسکی ماں نہیں ہے۔ یہ دونوں گروہ ہیپلو سی اور ہیپلو اے

قدیم امریکی باشندوں

کے ہیں۔

لیکن اب بھی لوگوں کا ایک گروہ اس بات کا منتظر ہے کہ کسی طرح یہ بچہ ایک غیر زمینی، خلائ مخلوق ثابت ہو جائے۔

مشرق ہو یا مغرب لوگوں کے بنیادی جذبات، احساسات، توقعات، خوشیاں، خوف اور وہم کتنے ملتے جلتے ہیں۔ اسکا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم ان سے ملتے ہیں یا انکے بارے میں غیر جانبدار ذرائع سے علم حاصل کرتے ہیں۔

بہر حال ینگ ورلڈ میں کس طبقے کی نمائندگی میں یہ تحریر لکھی گئ۔ کیا آپ اسکا جواب دے سکتے ہیں۔ اشارے اسی تحریر میں موجود ہیں۔

 :)

Star skull

Mitochondria

DNA

Haplogroup

Wikipedia

Young world

10:44 AM

اسٹار اسکل, امریکہ, بچے, پاکستان, تحقیق, ڈان اخبار, ڈی ا ین اے, سائینس, مائ ٹو کونڈریا, ینگ ورلڈ رسالہ

وہ دیکھو

کبھی کبھی موضوعات میں قرعہ اندازی کرنی پڑتی ہے۔ آج تین موضوع ذہن میں تھے۔ لیکن فال آل پارٹیز کانفرنس کے نام نکلی۔ ایک شاعر نے کہا تھا کہ اسکا چہرہ ہے کہ حافظ کی بیاض، ایسے چہرے سے کوئ فال نکالی جائے۔  سو جس کانفرنس میں ہماری پیاری وزیر خارجہ حنا ربانی کھر موجود ہوں۔ اسی سے کوئ فال نکالنی چاہئیے تھی۔  سب منتظر بھی رہے۔ سنتے ہیں کہ چھ گھنٹے سے زائد کا ٹائم لگا اس فال کو نکالنے میں۔

اسکی وجہ باخبر ذرائع کے مطابق یہ تھی کہ تقریباً ساٹھ رکنی اس کانفرنس میں جب بھی کوئ فال نکالی جاتی۔ اس پہ مندوبین کا متفق ہونا مشکل ہوتا۔ اس میں ہمارے فارسی شاعرحافظ صاحب یا حنا ربانی کھر کا کوئ قصور نہیں، نہ ہی شرکاء کا۔ اصل میں خستہ حال بیاض کا پرنٹ صحیح نہ تھا۔ جیسے ہی صفحہ پلٹو،ٹوٹنے لگتا۔ ارادہ انہیں جہنم رسید کرنے کا، صفحہ دیوان کا۔ اس لئے یہ دقّت پیدا ہوئ۔

اب جو فال نکلی ہے اسکا مطلب بھی لوگ ایکدوسرے سے پوچھتے پھر رہے ہیں۔ حافظ صاحب تو آکر بتانے سے رہے۔ یہ الگ بات کہ کوئ روحانی شخصیت ان سے یہ راز اگلوا لے۔  مردوں کو بلانے کے روحانی طریقے بھی ہوتے ہیں جس میں وہ خاموشی سے اٹھ آتے ہیں ہمیشہ گڑا مردہ کھود کر نہیں نکالتے۔ شرط یہ ہوتی ہے کہ مردے کو واپس بھیجنے کا وظیفہ بھی آنا چاہئیے۔ توقع ہے کہ یا تو ہمارے امریکی مہربان یہ وظیفہ جانتے ہونگے یا پھر ہمارے سالار۔ واپس کس کا مردہ جائے گا، وہی جو آیا تھا۔ آپ سمجھے حافظ صاحب کا، نہیں انکا صرف دیوان کام کا ہے۔

حافظ صاحب

کو مرے ہوئے سات سو سال ہو رہے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ انہیں اپنا دیوان اب یاد بھی ہوگا کہ نہیں۔ ہو سکتا ہے وہ یہ سن کر ہی بھونچکا رہ جائیں کہ حسین چہروں کو چھوڑ کر لوگ انکے دیوان سے یہ کام لیتے ہیں۔ حافظ صاحب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

میں رکتی ہوں، ہم دراصل آل پارٹیز کانفرنس پہ بات کر رہے تھے۔ یہ حافظ صاحب خدا جانے کیوں آگئے۔

قوم کو اس کانفرنس سے بڑی امیدیں تھیں۔ خود ہم بھی کچن کی چھریاں تیز کر کے بیٹھے تھے۔ جبکہ ادھر لاکھوں سیلاب زدگان کہہ رہے تھے کہ ان چھریوں کی میخیں بنوا لو جن میں ہمارے خیمے گڑ جائیں گے۔ لیکن ہم نے کہا نہیں۔ ہم اس موقع پہ فوج کو تنہا نہیں چھوڑیں گے۔ اور سارا دن اقبال اور فیض کو حفظ کرتے رہے۔ جنگ کے دنوں میں قوم کے عظیم سپوت سامنے آتے ہیں اور امن کے دنوں میں بدترین۔ اگر عظیم بننے کا ایک موقعہ ہاتھ لگ رہا ہے تو بہتی گنگا میں ہاتھ کیوں نہ ڈالیں۔

ادھر  دائیں بازو والے بھی نعرہ ء تکبیر کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ مرگ انبوہ جشنے دارد۔ سنا ہے پرنٹنگ پریس میں کفار سے جنگ کے نعرے تک پرنٹ ہو چکے تھے کہ اس دفعہ تو ہوا ہی ہوا۔ ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق۔

لیکن کانفرنس ختم ہو گئ۔ اب سب ایکدوسرے سے پوچھ رہے ہیں کہ کانفرنس کی متفقہ قرارداد کا مطلب کیا ہے؟ آیا اس سے امریکہ خوفزدہ ہوگا یا نہیں۔  اپنا اپنا ہوتا  ہے۔ کیا طالبان کو منایا جارہا ہے یا امریکہ کو۔  یہ کیا بات ہوئ، کہیں پہ نگاہیں کہیں پہ نشانہ۔ اگر امریکہ سے جنگ نہ کی تو پھر کیا جیا۔ خوشحال پاکستانی کیسے جنگ لڑنے کی ہمت کر سکتے ہیں، فوج کو بس اتنا ہی ڈرامہ مقصود تھا، اب ڈالرز صراط مستقیم پہ چلیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔

کوئ میری رائے جاننا چاہتا ہے۔ غالب کہہ گئے ہیں کہ آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں۔ اور میر کی تقلید میں یہ کہنے کو دل چاہتا ہے کہ پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے، جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے۔ شعر کی تشریح سے پہلے سارے استعارے سمجھنا ضروری ہیں۔ اس میں باغ سے غالباً امریکہ  مراد ہے اور گل سے کون ہے۔ یہ مجھے نہیں معلوم۔ یوں تشریح کا سبق تو بند ہوا۔

  گھر کے ایک  پرانے کیسٹ پلیئر سے بچ رہ جانے والی واحد کیسٹ بر آمد ہوئ۔ لگا کر دیکھا تو بج بھی رہی تھی۔ رفیع کے گانے ہیں۔ ایک پرانا گانا بھی ہے۔ کچھ گانے جب بھی بجتے ہیں انکی آب و تاب میں کمی نہیں آتی۔ تال ایسا میل کرتا ہے کہ ہر زمانے کے لئے زندہ، ہر نسل کے لئے کار آمد۔ بعض سیاسی گانے بھی یہی تاثیر رکھتے ہیں۔ جب بجتے ہیں نئ امید اور پرانے نتائج لاتے ہیں۔ یہ گانا انکی نذر جو اعلان جنگ کے منتظر رہے۔

10:21 PM

آل پارٹیز کانفرنس, امریکہ, پاکستان, جنگ, حنا ربانی کھر, سیلاب, طالبان, غالب, فوج, میر تقی میر. حافظ

روحانی تجربہ

اگر میں آپ سے پوچھوں کہ کیا کبھی آپکو کوئ روحانی تجربہ ہوا ہے تو ایک پاکستانی مسلمان ہونے کے ناطے آپ میں سے اکثر فورا اپنے ماضِی کو کھنگالیں گے  اور کچھ اس طرح کے خیال ذہن میں آئیں گے کہ کسی بابا، مجذوب یا اللہ والے سے کوئ ایسی ملاقات ہوئ جس میں اس نے کوئ پیشن گوئ کی اور وہ پوری ہو گئ۔ یا اس نے کوئ بات بتائ جو بالکل درست نکلی۔ کیا یہ روحانی تجربہ ہوتا ہے؟

یہ خیال مجھے اس وقت آیا جب میں عمران خان کی کتاب کے اقتباسات پڑھ رہی تھی جو اس اتوار کے روزنامہ ایکسپریس کے میگزین میں موجود ہے۔ جس میں عمران خان کے روحانی تجربات کے عنوان سے ایک تحریر موجود ہے اس میں انہوں نے ایک پیرنی، ایک جھلے بابا اور ایک دو اور شخصیات کا تذکرہ کیا ہے۔ کچھ ایسی پیشنگوئیوں کا جنہیں میں روحانی پیشنگوئ کم اور زندگی کا مشاہدہ زیادہ سمجھتی ہوں۔

مشاہدے کی قوت اگر زندگی کے تجربات کے ساتھ مل جائے تو یہ وجدان کا روپ دھار لیتی ہے جیسے میری والدہ، جنکے بارے میں ہم سب متفق ہیں کہ وہ جو کہہ رہی ہیں وہ ہوجائے گا۔ لیکن اسکے باوجود ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ روحانی شخصیت ہرگز نہیں ہیں۔ یہ انکی مختلف معاملات سے وابستگی، زندگی کا حاصل اور خاصی مشاہداتی نظر ہے جو انکی باتوں کو صحیح ثابت کر دیتی ہے۔ ورنہ وہ ایک عام خاتون ہیں جو عام لوگوں سے زیادہ محنتی اور معاملہ فہم ہیں۔

یہ روحانی تجربات ہر مذہب  کے ماننے والے کو حاصل ہوتے ہیں۔ عیسائ ، ہندو حتی کہ افریقہ کے جنگلوں میں رہنے والے نیم وحشی قبائل کو بھی۔ اور اس وجہ سے نفسیات میں ایک میدان ان روحانی تجربات کے لئے بھی کھلا ہے بلکہ نفسیات مذہب اسکے عقائد اور سرگرمیوں کو بھی

سائینس کی نظر

کھنگالتی ہے۔

البتہ حیرت سے مجھے اس وقت گذرنا پڑتا ہے جب دنیا کی مایہ ناز یونورسٹیز سے پڑھے لکھے اشخاص کو ایسی باتیں کرتے سنتی ہوں۔ مثلاً آکسفورڈ یونیورسٹی سے پڑھے ہوئے بے نظیر بھٹو اور عمران خان۔

میرے گھر کی ماسیاں بھی کچھ ایسی روحانی شخصیات کا تذکرہ کرتی ہیں۔ اور اپنی زندگی میں تبدیلی کے لئے انکی طرف دیکھتی ہیں۔

بے نظیر بھٹو

، اقتدار کے دوام کے لئے ڈنڈے کھانے ایک پیر کے پاس جایا کرتی تھیں، بازو پہ بندھے امام ضامن، بکروں۔ مرغیوں، گائے کے صدقے۔ لیکن جس دن انکو قتل ہونا تھا اس دن کوئ امام ضامن بند نہ باندھ سکا۔

عمران خان کی زندگی میں بقول انکے تبدیلی کا باعث بھی کچھ ایسی شخصیات بن گئیں۔ انکی زندگی میں کس تبدیلی کا باعث بن گئیں۔ یہ مجھے نہیں معلوم۔ کیا یہ تبدیلی کہ وہ خوبصورت خواتین کے ساتھ وقت گذارنے والے پلے بوائے سے بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ ایک ذمہ دار شخص بن گئے۔  انہوں نے اپنی شہرت اور دولت کو بہتر طور پہ عقل کے ساتھ استعمال کیا۔ ایسا ہر سمجھ دار شخص کرتا ہے خاص طور پہ گلیمر کی دنیا کا وہ  شخص جو اپنے بڑھاپے کو بھی اپنے شخصی سحر میں مبتلا دیکھتا ہے۔  لیکن کیا انکی بنیادی خصوصیات میں کوئ تبدیلی آئ۔ میرا خیال ہے کہ بنیادی شخصی خواص وہی رہے بس انکی سمت تبدیل ہوئ۔انجلینا جولی اور بل گیٹس یہ سب کچھ بلکہ اس سے زیادہ بغیر کسی روحانی تجربے کے کر رہے ہیں۔ ادھر جنید جمشید بھی کچھ ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ کیا یہ انکی روحانی تبدیلی ہے؟

طبقہ ء امراء اور طبقہ ء غرباء میں کافی باتیں ملتی جلتی ہوتی ہیں، کم از کم روئیے میں بڑی مماثلت ہوتی ہے۔ میں اپنے طور پہ یہ نتیجہ اخذ کرتی ہوں۔

لیکن ایک سوال جو میرے ذہن میں اکثر ابھرتا ہےاور جو میں آپ سے بھی پوچھنا چاہونگی  کہ مافوق الفطرت واقعات کے پیش آئے بغیرکیا کوئ روحانی تجربہ یا کیفیت ممکن نہیں؟ لیکن پہلا سوال وہی ہے کیا آپکو اپنی زندگی میں کوئ روحانی تجربہ ہوا ہے؟

10:32 PM

پاکستان, روحانیت. روحانی. تجربہ, عمران خان, مذہب،تبدیلی, نفسیات, واقعات

اوسٹیو پوریسس-۳

گزشتہ سے پیوستہ

ہم وہ ہوتے ہیں جو ہم کھاتے ہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اوسٹیوپوریسس سے بچاءو میں سب سے اہم چیز غذا ہے اور دوسری اہم چیز جسمانی طور پہ مصروف رہنا۔ یہ دونوں چیزیں طرز زندگی میں آتی ہیں۔

ہم یہ نہیں کھاتے، ہم اس طرح نہیں کھاتے، ہم اس وقت اور اس موسم میں یہ چیزیں کھاتے ہیں اور یہ چیزیں نہیں کھاتے۔ ان سب سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ کیا ہم وہ سب کھاتے ہیں جو جسم کو صحت مند رکھنے میں مدد دے۔

یہ بات ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہماری

غذا کو صحت بخش

ہونا چاہئیے اس میں وہ تمام بنیادی غذائ اجزاء ہونے چاہئیں جنکی  ہمارے جسم کو روزانہ ضرورت ہوتی ہے، یعنی پروٹین یا لحمیات، کاربو ہائیڈریٹس یانشاستہ، معدنیات اور وٹامنز یا حیاتین۔ ایک متوازن یا صحت بخش غذا کا اہرام دن بھر میں ہماری مختلف غذائ اجزا کی مقدار ضرورت کے مطابق اس طرح بنے گا۔

ہماری آبادی کی بیشتر آبادی خراب غذائ اہمیت رکھنے والی غذا کھاتی ہے۔ اسکی ایک وجہ اگر غربت ہے تو دوسری جہالت۔

غربت ایک عورت کے لئے زیادہ سخت ثابت ہوتی ہےاسکی وجہ یہ ہے کہ ابھی بھی بہت سے گھرانوں میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کو کم غذا ملتی ہے۔ اس بات کو دھیان میں رکھے بغیر کے ایک عورت اگر صحت مند ہوگی تو خاندان مضبوط اور خوشحال ہوگا۔

دنیا کے زیادہ تر حصوں میں لوگ ہر کھانے میں ایک بنیادی غذا ایسی رکھتے ہیں جو سستی ہوتی ہے۔ مثلاً گندم، چاول، آلو  یا مکئ۔ یہ بنیادی غذا جسم کی روزانہ کی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ لیکن یہ ایک فرد کو صحت مند رکھنے کے لئے کافی نہیں۔ لحمیات جو جسم کی نشو ونما میں حصہ لیتے ہیں، چکنائ اور نشاستہ توانائ دیتے ہیں حیاتین  اور معدنیات جسم کی حفاظت اور ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کرتے ہیں۔

عورت کو بالخصوص حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو پانچ اہم حیاتین اور معدنیات چاہئیے ہوتے ہیں۔جو یہ ہیں، لوہا، فولک ایسڈ، کیلشیئم، آئیوڈین اور وٹامن اے۔

بر سبیل تذکرہ، آئرن کی کمی یعنی

انیمیا

کی بیشتر پاکستانی خواتین شکار ہوتی ہیں۔ آئرن یا لوہا ان اشیاء میں زیادہ ہوتا ہے۔ گوشت، انڈے، مچھلی، مٹر، پھلیاں مثلاً سیم اور لوبیا۔

سبزیوں میں بند گوبھی، سبز پتوں والی سبزیاں، آلو، شکر قند، پھول گوبھی، شلجم، مسور۔

پھل اور بیج میں، سورج مکھی کے بیج، کدو کے بیج، انناس، ، خشک پھل مثلاً چھوہارے، خوبانیاں، اسٹرابیری۔

غریب یا ایسے علاقوں میں جہاں زیادہ غذائ اشیاء دستیاب نہیں ہوتیں آئرن حاصل کرنے کے آسان طریقے استعمال کئیے جا سکتے ہیں۔  لوہے کے برتنوں میںکھانا پکائیں اور پکاتے ہوئے اس میں ٹماٹریا لیموں کا رس شامل کر لیں۔ تو برتن کا آئرن کھانے میں شامل ہو جائے گا۔

لوہے کا صاف ستھرا ٹکڑا جو خالص لوہے کا ہو۔ کھانا پکاتے ہوئے اس میں ڈال دیں۔

لیموں کے رس میں لوہے خالص لوہے کی بنی ہوئ کوئ چیز دال دیں جیسے لوہے کی کیل اسے تھوڑی دیر اس میں پڑا رہنے دیں اور پھر اسکا لیمونیڈ بنا کر پی لیں۔

اوسٹیوپوریسس کے حوالے سے

کیلشیئم

ایک اہم جز ہے ہم اس پہ تفصیل سے بات کرتے ہیں۔ خواتین کے لئے

کیلشیئم اہم

ہے کیونکہ بچپن میں یہ ایک لڑکی کو صحیح طور پہ بڑا ہونے میں مدد دیتا ہے۔ اسکے کولہوں کو اتنا چوڑا ہونے میں مدد دیتا ہے کہ بڑے ہو کر وہ بچے کو محفوظ طریقے سے جنم دے سکے۔

حمل کے زمانے میں کیلشیئم نہ صرف بچے کی ہڈیوں کے لئے ضروری ہوتا ہے بلکہ اس کی وجہ سے ماں کی ہڈیاں اور دانت محفوظ رہتے ہیں۔ بڑھاپے میں یہ خواتین کو اوسٹیوپوریسس سے بچاتا ہے۔  صرف اوسٹیوپوریسس ہی نہیں تحقیقات اس خیال کی بھی حامی ہیں کہ

کیلشیئم بعض اقسام کے کینسر

سے بھی تحفظ دیتا ہے۔

کیلشیئم حاصل کرنے کے لئے دودھ یا اسکی مصنوعات مثلاً کھویا،  پنیر اور دہی استعمال کریں۔ دودھ کی خوشبو یا دہی کا ذائقہ پسند نہ ہو تو اس میں پھل شامل کر لیں یہ کیشیئم جذب ہونے کی صلاحیت کو بھی بڑھاتے ہیں۔

انڈے میں کیلشیئم ہی نہیں وٹامن ڈی بھی بڑی مقدار میں ہوتا ہے۔ روزانہ ہر شخص ایک انڈہ بالکل آرام سے کھا سکتا ہے زردی سمیت۔ سوائے اسکے کہ ڈاکٹر نے کسی وجہ سے منع کیا ہ۔ ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ خواتین کو انڈہ نہیں کھانا چاہئیے یا یہ کہ انڈہ گرم ہوتا ہے۔ یہ دونوں بے بنیاد ہیں۔

سمندری غذا، مثلاً شیل فش، سیمن مچھلی، سارڈین مچھلی ہڈیوں سمیت۔

پھلیاں خصوصا

سویا پھلی

جس سے

ٹافو

  بنتا ہے۔ جو چایئینز کھانوں میں کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ ٹافو میں ایسٹروجن بھی اچھی مقدار میں پایا جاتا ہے۔اگر آپ  کو دودھ میں موجود

لیکٹوز کی وجہ سے اسے ہضم

کرنے میں مسئلہ ہوتا ہے تو ٹافو یا دہی استعمال کر لیں۔

ٹافو کیک

سبز پتوں والی سبزیاں , بروکلی،انجیر، بادام، تل اور  اورنجز۔

ہڈیوں کا گودا اگر آپکو کولیسٹرول کا مسئلہ نہیں ہے تو آرام سے لے سکتے ہیں  بالخصوص نوجوان بڑے مزے سے کھا سکتے ہیں۔

اور یہ بات تو آپ اکثر سوچتے ہونگے کہ پرانے زمانے کی خواتین میں اوسٹیوپوریسس اتنا عام کیوں نہیں تھا؟

جناب ایک تو پان کھانے کی عادت، جس میں چونا استعمال ہوتا تھا اور دوسرا گھروں میں صحن۔ جہاں سے دھوپ سارا دن ملتی تھی۔ جی ہاں چونا ، کیلشیئم حاصل کرنے کا ایک آسان ذریعہ ہے۔ اور کھلے صحن وٹامن ڈی کا ذخیرہ۔

کیلشیئم حاصل کرنے کے اور آسان،  سستے ذریعے بھی ہیں۔

ہڈیوں یا انڈے کے چھلکوں کو کچھ دیر کے لئے سرکہ یا لیموں کے رس میں بھگو دیں پھر اس ماٰئع کو کسی بھی قسم کے کھانے کی تیاری میں استعمال کریں۔

جب ہڈیوں کا سوپ تیار کریں تو اس میں تھورا سا لیموں ، یا سرکہ یا ٹماٹر شامل کر دیں۔ ہڈیوں سے کیلشیئم نکل کر آپکے سوپ میں شامل ہو جائے گا۔

انڈے کے چھلکے کو بالکل باریک سفوف میں پیس لیں۔ اور پکاتے وقت کھانے میں ملا لیں، دوبارہ وہی بات کہ  اگر اس میں سرکہ، لیموں کا رس یا ٹماٹر ڈال لیں گے تو یہ کیلشیئم آسانی سے جذب ہو جائے گا۔

ایک خاتون کو عمر کی چوتھی داہئ میں داخل ہونے سے پہلے اپنی کیلشیئم کی مقدار کو نظر میں رکھنا چاہئیے۔ کیلشیئم کی یہ مقدار اندزاً بارہ سو ملی گرام ہے۔ جو کہ ہم دودھ ، پھلوں، میووں ، گوشت اور سبزی ہر ذریعے سے حاصل کر سکتے ہیں۔ خوراک سے کیلشیئم کے ملی گرام کا اندازہ لگانے کے لئے نیچے ایک ٹیبل موجود ہے۔ چیک کیجئیے کہ آپکی روزانہ کی خوراک میں کتنا کیلشیئم موجود ہوتا ہے۔

کیلشیئم ملی گرام

خوراک

300

ایک کپ دودھ

350

 چھ اونس دہی

240

ایک اونس چیڈر چیزیا پنیر

265

دو سلائیس پراسسڈ پنیر

120

چوتھائ کپ کاٹیج پنیر

85

آدھا کپ آئس کریم

370

آٹھ سارڈین مچھلی کین والی

285

آدھا کپ ٹافو

40

آدھا کپ بھیگے ہوئے بھیگے ہوئے  چنے

95

چوتھائ کپ بادام

43

ایک کھانے کا چمچ بادام کا مکھن

اس سے آگے بات آتی ہے ورزش کی ۔ سو یہ تحریر ابھی جاری ہے۔

نوٹ؛ اس تحریر کی تیاری میں دیگر ذرائع کے علاوہجس کتاب سے مدد لی گئ ہے اسکا نام ہے۔

جہاں عورتوں کے لئے ڈاکٹر نہ ہو

۔ یہ کتاب پاکستان نیشنل فورم آن ویمینز ہیلتھ کے زیر اہتمام شائع ہوئ ۔

5:23 PM

آئرن, اہمیت, اوسٹیوپوریسس, خواتین, صحت بخش, غذا, فولاد, کیلشیئم, کینسر, لوہا, متوازن, ہڈی

قصہ ایک گرم دن کا

ابھی ہمیں وہاں پہنچے کچھ دن  ہوئے تھے کہ ٹورنٹو میں ایسی گرمی پڑی کہ کہ ڈاءون ٹاءون یعنی وہاں کا آئ آئ چندریگر روڈ سنسان ہو گیا۔ نہ بندہ نہ بندے کی ذات۔ یہ سناٹا اس خوف کی وجہ سے تھا جو وہاں کے محکمہء موسمیات نے پھیلایا تھا۔ اس میں چنداں حیرت نہیں ہونی چاہئیے کہ وہاں یہ کام محکمہ ء موسمیات کرتا ہے۔  نہ معلوم کیوں وہاں کے محکمہء موسمیات کی موسم کے بارے میں خبریں ایک دم درست نکل آتی ہیں۔ لگتا ہے کوئ بڑا پہنچا ہوا پیر پکڑ رکھا ہے انہوں نے۔

خوف کے طاری ہونے کی وجہ یہ  ہے کہ مسلسل آسائیشوں میں رہنے  اور خوف سے پاک زندگی گذارنے کی وجہ سے ان مغربی ممالک کے لوگوں کے دل بہت چھوٹے اور ہمت بچپن سے ہی بوڑھی ہوتی ہے۔ جب شاہینوں کے بجائے ممولے پیدا ہوں تو یہی ہوا کرتا ہے۔ کندن تو بھٹی میں تپنے کے بعد ہی بنتا ہے۔ جبکہ یہاں لوگوں کی اکثریت مر کر ہی بھٹی کا منہ دیکھ پاتی ہے۔ اس حالت میں جب تمام اعضاء جواب دے چکے ہوتے ہیں۔ یہ دیکھنا بھی کوئ دیکھنا ہے۔

لیکن رکئِے، ہمارا شاعر کہتا  ہے کہ ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر، ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئ۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں آج تک کوئ ایسی بیسٹ سیلر بک نہیں دیکھی جو مرنے کے بعد لکھی گئ ہو۔ اس کا اعزاز بھی صرف ہمیں حاصل ہوا کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا جیسی تہلکہ آمیز کتاب ہمارے ہی لوگوں نے پیش کی۔ مغرب دیکھ لے روحانیت میں کون بڑھا ہوا ہے وہ کہ ہم۔

اپنے فخر کے قصے دوہرانے کو کئ نسلیں باقی ہیں، اس لئےمیں خلاف طبیعت قصہ مختصر کرتی ہوں۔ ایک ایسی گرمی میں جبکہ ٹورنٹو میں چیلیں تک اپنے گھونسلوں میں ایئر کنڈیشنڈ لگوا چکی تھیں کہ کینیڈا میں بجلی کی بڑی فراوانی ہے اسکی بہتات کی وجہ سے کئ بجلی پیدا کرنے والے اسٹیشنز بند پڑے ہوئے ہیں۔ جب شام کو لُو چلنا بند ہوئ۔ میں نے کچن کا کچرا سمیٹا اور اسے گھر کے باہر موجود ڈرم میں ڈالنے کے لئے آئ۔

ان ڈرمز میں پورے ہفتے کچرا جمع کرنا پڑتا ہے۔  کھانے پینے کی چیزیں ایک  الگ ڈرم میں اور کاغذ گلاس قماش کی چیزیں دوسرے ڈرم میں۔ ہر علاقے کی ایک تاریخ ہوتی ہے اس تاریخ کو وہاں سے کچرا اٹھایا جاتا ہے۔ مکینوں کو یہ کچرے کا ڈرم روڈ کے ساتھ فٹ پاتھ پہ رکھنا ہوتا ہے تاکہ کوڑا اٹھانے والا ٹرک بآسانی اسے اٹھا لے۔ مایا کے تین روپ جبکہ کاہلی کے سو روپ ہوتے ہیں جو ایسے ہی ترقی یافتہ ممالک میں نظر آتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کے اوپر کام کا زیادہ سے زیادہ بوجھ ڈال کر انتظامیہ آرام سے پڑی مکھیاں مارتی ہیں اور مکھیاں مارنے میں اپنی ان کوششوں کو بیان کرنے سے نہیں چوکتی۔ ڈھٹائ کی بھی حد ہوتی ہے۔ مگرنہیں صاحب، یہاں  بے حیائ ہی نہیں ڈھٹائ کی بھی ساری حدیں پار ہو چکی ہیں۔ اسی لئے تو کمبخت مارے اپنا ویزہ آسانی سے نہیں دیتے کہ ہماری ساری پول پٹی کھل کر دنیا کے سامنے آجائے گی۔

اچھا انکی غیبت ایک طرف۔ میں نے پہلا ڈرم کھولا تو اس میں کاغذ  اور گتے موجود تھے۔ سوچا اسی میں ڈالدوں۔ کاہل قوم کچھ تو کیا کرے اور کچھ نہیں تو کھانے پینے کی چیزوں سے کاغذ، گتے اور ٹن الگ کیا کرے۔ پھر ان بھتّوں کا خیال آِیا جو ایسی تمام سبز سوچوں پہ پابندی لگانے کے لئے موجود ہیں انہیں یہاں فائن کہتے ہیں۔ سو دوسرے ڈرم کو کھولا اور ابھی اس میں ڈالنے کا قصد کیا ہی تھا کہ اعصاب منعکسہ نے ایک زور کا جھٹکا دیا اور ہاتھ کیا میں خود ایک فٹ پیچھے ہٹ گئ۔ ڈرم میں تو کوئ عجیب ساجانور دبک کر بیٹھا ہوا تھا۔

یہاں گلہریاں بڑی چھلانگیں لگاتی پھرتی ہیں وہ بھی خوب بڑی بڑی۔ لیکن یہ جانور گلہری سے بڑا تھا۔ بلی یہ ہو نہیں سکتی کیونکہ یہاں بلی اور کتے  کو وہ آزادی نہیں جو ہم نے انہیں دے رکھی ہے۔ بعضے حاسدی تو کہتے ہیں کہ ہم نے انہیں ایوان حکومت تک میں بٹھا رکھا ہے۔ ویسے یہ قومیں ان جانوروں سے محبت کے بڑے دعوے کرتی ہیں۔ اب کیا کہیں ایسے کھُلے جھوٹ پہ تو تُف بھیجنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔

اچھا تو وہ جانور بلی بھی نہیں تھا، پھر دھیان آیا کہ رات ہی کوئ بتا رہا تھا کہ جلا ہوئے پزا  ڈرم کے اوپر رکھ دیں یہاں ایک رکون آتا ہے رات کو وہ کھالے گا۔ یہ

رکون

تھا اور اسی چکر میں آیا، اس کا شاید توازن خراب ہوا اور وہ اس میں گر گیا۔ ڈرم خاصہ بڑا تھا اس لئے وہ باہر نکلنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میں نے کینیڈا میں بیٹھ کر اپنی سازشی فطرت کو تسکین دینے کے لئے  پوری پاکستانی ذہانت اس واقعے کو سمجھنے میں لگائ۔ امریکہ کا ہاتھ اس میں ہو تو ہو طالبان کا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس واقعے میں نہ اب تک کوئ مرا نہ اسکی ذمہ داری انہوں نے لی ۔ امریکہ کے پڑوس میں رہتے ہوئے امریکہ مخالف جذبات کو کچلا تو ہمیں صرف ایک ہی بات سمجھ میں آئ کہ رکون کو ان حالات سے نبٹنے کی تربیت کما حقہ نہیں دی گئ۔

اس سے اچھے تو ہمارے آزاد کتے بلیاں ہیں۔ ایسی تربیت ہے کہ اول تو دن کے وقت روڈ کراس نہیں کرتے رات کو کرتے ہیں۔ اور رات کو بھی خاصی احتیاط سے کام لیتے ہیں یوں وہ بھی اسی رفتار سے بڑھ رہے ہیں جس رفتار سے ہم۔ سڑک پہ ہفتہ دس دن میں کسی بلی یا کتے کی سو بار کی کچلی لاش نظر آئے تو ہم اسے ایکسیڈنٹ کہتے ہیں۔ حادثہ نہیں۔ حادثے کی پرورش میں وقت برسوں لگاتا ہے جبکہ ایکسیڈنٹ فی الفور ہو جاتا ہے۔ یہاں کیمسٹری کا ایک قانون یاد آرہا ہے۔ لیکن ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں۔ رکون کی تربیت کیمسٹری پڑھانے سے نہیں شروع ہو سکتی۔

ہم نے فوراً گھر کے اندر داخل ہو کر ڈرم میں رکون کی موجودگی کا اسی طرح اعلان کیا جس طرح مسجد سے  گمشدہ بچہ ملنے کی اطلاع دی جاتی ہے یعنی گلا پھاڑ کر۔ اندر موجود، پہلے کے پاکستانی اور اب کے کینیڈیئنز میں ایک سراسیمگی پھیل گئ۔ اب کیا ہوگا؟

اب تو آپ سمجھ گئے ہونگے کہ خمار گندم ہی نہیں ہوتا ہر جگہ کی گندم کے اور بھی اثرات ہوتے ہیں جو طبیعتوں پہ انداز ہوتے ہیں اور اس ادا سے کہ گویا ہمیشہ سے ایسے ہی تھے۔ دروازہ بند کر دیا آپ نے، رکون جارحیت پسند ہوتے ہیں؟ خاتون خانہ نے ہمیں  اطلاع دی یعنی کہ ایک پاکستانی کو۔ اسے ہم نے اپنے اوپر یعنی پاکستان پہ حملہ سمجھا۔   'ڈرم کا دروازہ؟ نہیں کیا، رکون بہت بد حال ہو رہا  تھا، میرا تو خیال ہے کی چالیس ڈگری میں ڈرم کے اندر بیک ہو چکا ہے اس نے توایک مسکین سی نظر کی یہ بتانے کو کہ وہ زندہ ہے اور دوبارہ منہ دبا لیا'۔ ہو سکتا ہے کہ اپنے سامنے ایک پاکستانی جارح کو دیکھ کراسکا  یہ حشر ہوا ہو۔ کیونکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ رکون کو اپنا سبز پاسپورٹ دکھانے کا ہمیں ذرا خیال تک نہیں آیا تھا۔

نہیں گھر کا دروازہ؟ 'گھر کا دروازہ، کیوں نہ کھلا چھوڑ دیں ہمیں معلوم ہے اس وقت رکون امریکہ بنا ہوا ہے۔ اس کے پاس نہ طاقت ہے نہ وقت  کہ وہ کھلے دروازوں کو جھانکنے کی زحمت کرے۔ قیامت،  سمجھتی ہیں آپ، قیامت کا دن۔

آج ٹورنٹو میں اڑتیس ڈگری

درجہ ء حرارت تھا وہ بھی

اڑتالیس سال کے بعد

۔ اور آج ہر کینیڈیئن نے جو ٹورنٹو میں رہتا ہے کم از کم اڑتیس دفعہ یہ جملہ کہا ہوگا، کتنی گرمی ہے، اٹس ٹو ہاٹ۔ یہ ہے تو اڑتیس ڈگری لیکن محکمہ ء موسمیات نے کہا ہے کہ مرطوب نہ ہونے کی وجہ اڑتالیس ڈگری محسوس ہو گا'۔ میں نے ایک کراچی والے نے اس میں جتنی حقارت ڈال سکتا تھا ڈال کر کہا۔

ہم نے آج تک گرمی کو یا تو درجہ ء حرارت میں ناپا یا محسوس کیا۔ کبھی بیان کوبڑھاوا دینے کے لئے ان دونوں کا اختلاط نہیں کروایا۔ ہمیشہ ہر سال تاریخی گرمیوں سے نبٹنے کے بعد ہم نے فخر کیا کہ دیکھا اسے بھی گذار آئے۔ یہ نہیں کہ پہلے سے بے سدھ پڑ گئے محکمہ ء موسمیات پہ۔

طے یہ پایا کہ صاحب خانہ کے آنے کا انتظار کیا جائے۔ اگر اس وقت تک رکون نکلنے میں کامیاب نہ ہوا تو صاحب خانہ کو معلوم ہے کہ گھر میں ایک بڑا ڈنڈا کہاں ہے وہ اس سے ڈرم کو ٹیڑھا کر دیں گے اور اس طرح رکون کے بھاگنے کی کچھ سبیل پیدا ہو گی۔

کچھ منٹ گذرے ہونگے کہ وہ آگئے۔ ڈرم ٹیڑھا ہوا اور رکون اس میں سے اس طرح نکل بھاگا کہ تمام تماشائ یہ منظر دیکھنے کی کوشش ہی کرتے رہ گئے۔

گھر میں کچھ سکون ہوا۔ پورے ٹورنٹو میں یہ واحد گھر تھا جہان ایک دن میں دو مصیبتیں نازل ہوئیں۔ ایک گرمی اور دوسرے رکون۔

اب ہم

جادو ٹی و ی

پہ بیٹھے وطن عزیز میں اینکرز کی پھیلائ گرمی کا زور دیکھ رہے تھے کہ ایک عزیزہ کی آمد ہوئ۔ بچوں نے انہیں دروازے پہ ہی آج کے دلچسپ قصے کی رننگ کمنٹری سنا ڈالی۔ جائے ایکسیڈنٹ کا معائینہ بھی کر وا ڈالا۔ واقعات کی ترتیب اور گہرائ کو جان کر جب وہ گھر میں داخل ہوئ تو پھٹ پڑیں۔

یہ آپ لوگوں نے کیا کیا؟ رکون کو بھگا دیا؟ تو پھر ہم کیا کرتے؟ میں نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ '

۹۱۱

پہ اطلاع کرتے ناں اور ٹی وی والوں کو فون کر دیتے۔ وہ آتے اس سارے واقعے کی فوٹیج بنتی اور اس وقت ہم یہ جادو دیکھنے کے بجائے' انہوں نے  ٹی وی پہ نظر آنے والے پاکستانی چہروں کو بغض سے دیکھتے ہوئے کہا۔ 'ہم اس وقت ٹی وی پہ اپنی فوٹیج دیکھ رہے ہوتے ۔ ہم کیا اس وقت پورا ٹورنٹو اسے دیکھ رہا ہوتا کہ ہم نے کس ذمہ داری سے ایک رکون کی جان بچائ. لوکل میڈیا پہ تاریخی گرمی کے بعد یہ دوسری سب سے بڑی خبر ہوتی جو مسلسل دوہرائ جارہی ہوتی'۔

ہاں، ہم نے سوچا بات تو ٹھیک ہے۔ اس رکون کو تو اب تک یاد بھی نہ ہوگا کہ کہ ہم نے اسکی جان بچائ۔ رکون تو رکون ہاتھی بھی ایسی انسانی نوازشیں یاد نہیں رکھتا جبکہ کہتے ہیں کہ ہاتھی کی یادداشت بڑی اچھی ہوتی ہے۔ ہمارے سیاستداں تک یاد نہیں رکھتے کہ کون انہیں مسند اقتدار پہ لے کر آیا۔ یہ فوٹیج بنتی تو کم از کم لوگوں کو تو یاد رہتا، کینیڈا کے لوگوں کو۔

پھر یہاں وطن میں چینلز کی بھرمار ہے مگر آج تک کسی پہ بھولے سے بھی ہماری باری نہیں آئ۔ مرنے والوں کی ہی باری آتی ہے یا مارنے والوں کی ہم چونکہ کسی میں شامل نہیں اس لئے محروم ہیں۔ آنکھ ایک نہیں کجلوٹیاں نو نو۔

لیکن عین اسی لمحے ہمیں کینیڈیئن میڈیا کی غربت اور عسرت پہ افسوس ہوا۔ انکے نظام  اور سیاستدانوں کی کاہلی  اور عاقبت نا اندیشی پہ حیرت بھی ہوئ۔ میڈیا، ریاست کے پانچویں ستون کو انہوں نے رکونزکے متعلق خبریں بنانے پہ لگایا ہوا ہے۔ چھی چھی۔ استغفراللہ۔

ان سے تو ہم ہی اچھے انسانوں  کو انسانوں کے پیچھے اور حیوانوں کو حیوانوں کے پیچھے ہی لگایا ہوا ہے کبھی کبھی حیوان انسان کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ تو یہ انکا پاگل پن ہوتا ہے میرا مطلب انسان کا کہ وہ حیوان کے سامنے آتا کیوں ہے۔ لیکن کیا  کبھی ایسا سنا کہ انسان حیوان کے پیچھے۔ ایک انسان کی یہ تذلیل صرف انہی ملکوں میں ممکن ہے۔ بس یہ سر زمین ایسے ہی اوٹ پٹانگ واقعات کی زمین ہے اس لئے لوگ کہتے ہیں کہ ایک بار دیکھا ہے دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے۔

10:27 AM

آئ آئ چندریگر روڈ, امریکہ, ٹورنٹو, رکون, سیاحت, طالبان, کراچی, کینیڈا, گرمی, معاشرہ

تکون سے چوکور تک

صرف چھ سال پہلے ابتدائ جنوری کے ایک سرد دن جو کراچی والوں کو کوئٹہ سے پہنچنے والی سربیائ ہواءووں کے طفیل  مل جاتے ہیں۔ میں کراچی میں ہوٹل پرل کانٹی نینٹل کے لاءونج میں اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ لاءونج میں کھڑی اپنے دیگر ساتھیوں کا انتظار کر رہی تھی کہ سامنے اوپر سے آنے والی لفٹ کا دروازہ کھلا۔ ایک چھریرے بدن کا شخص تیزی سے برآمد ہوا۔ اس نے ہم رنگ ٹراءوژرز اور شرٹ پہنے ہوئے تھے۔ بال کچھ گھنگھریالے سے چہرے کی تفصیل میں جانے سے پہلے میری نظر اسکی کمر کے گرد پٹکے پر پڑ گئ۔ اس میں ایک پستول اپنے غلاف میں  لٹک رہا تھا۔

اسلحہ نجانے کیوں مجھے سحر زدہ کر دیتا ہے۔ وہ شخص میرے سامنے سے نکلا، ہوٹل کے داخلی دروازے پہ پہنچا وہاں موجود دربان نے ایستادہ ہو کر ماتھے پہ ہاتھ لے جا کر سلام  کا اشارہ کیا۔ وہ اسی بے نیازی سے گذرتا ہوا باہر موجود ایک قیمتی گاڑی میں بیٹھ کر اوجھل ہو گیا۔

میری نظر میں اسکا پستول جھولتا رہا ایسے ہی جیسے عاشق کی نظر میں محبوب کے کان کا بالا ہلتا رہے۔ کسی نے میرے کان میں سرگوشی کی،  'عمران خان کو دیکھا'۔ 'آں'۔ میرا منہ کھل کر بند ہوا۔ یاد آیا، میں نے کیوں اسکے چہرے کی تفصیلات پہ نظر نہیں کی۔ وہ عمران خان تھے۔ تحریک انصاف کے چیئرمین۔ لعنت ہو مجھ پہ ایک پستول نے مجھے اتنا بے خود کر ڈالا۔ ایک پورے قد کے شخص کو دیکھنے سے محروم رہ گئ۔ جبکہ وہ میرے اتنے قریب سے گذرا۔

ابھی چند دن پہلے ٹی وی سرفنگ کے دوران میں ایک چینل پہ رکی، عمران خان سے مجاہد بریلوی اپنی مشہور زیر لب مسکراہٹ سجائے پوچھ رہے تھے کہ اب جبکہ آپ سیاست میں ہیں اور کراچی کی سیاست میں ہر سیاسی جماعت کے پاس اسلحہ بردار گروپ موجود ہے آپ جب یہاں سیاست کریں گے تو اسلحہ استعمال  نہیں کریں گے۔ عمران نے اپنی روائیتی مسکراہٹ سے اس طرح کا جواب دیا کہ میں کراچی میں اپنے ساتھیوں کو اسلحہ استعمال کرنے کی اجازت بالکل نہیں دونگا۔ میں نے انکی بات سنی اور مسکرا کر آگے بڑھ گئ۔ جدید دنیا میں ایک فائدہ ہے ناں۔ بٹن دباءو، اور آگے نکل جاءو۔ کوئ منظر، جھوٹ، سچ، فریب، بیان، ادا،  تفریح نگاہ میں زیادہ دیر نہیں رہ سکتی۔ یہاں بہت سی دوکانیں ہیں اور انکے اپنے لبھانے والے انداز۔

اسلحے کی بات آگے چلی تو  ذکر ہمارے ہمارے ایک

ساتھی کا

  جنکا خیال ہے کہ میڈیا سے بچے ہتھیار چلانا سیکھ رہے ہیں۔ پاکستانی بچوں کے متعلق  یہ کہنا صحیح ہے کیا؟  وہ پاکستان جہاں گذشتہ تیس سال سے جنگ جاری ہے۔

میں نے تو پہلی دفعہ اخبار میں دیکھا کہ کلاشنکوف کوئ ہتھیار ہوتا ہے۔ اس میں اخبار کا کیا قصورپھر سنا کہ افغان جہاد میں کون کون سے ہتھیار استعمال ہو رہے ہیں پھر خودکار ہتھیاروں کے استعمال کی عینی گواہ بنی۔ پھر آپریشن کلین اپ کے دوران پتہ چلا کہ کون کون سے ہتھیار کہاں کہاں سے برآمد ہوئے۔ پھر اخبارات سے اسلحہ اسمگلنگ کی رپورٹس سے پتہ چلا کہ کس کس قسم کے ہتھیار کی اسمگلنگ ہوتی ہے۔ یہ ملک کے کس رخ سے کس رخ کی طرف ہوتی ہے۔

عمران خان کی متائثر کن تصاویر جن میں وہ گولیوں کی بیلٹ لگائے شمالی علاقہ جات میں کہیں بیٹھے ہیں یا پھر پرویز مشرف اپنے کمانڈو کے یونفارم میں ایک پستول کو جانچ پرکھ رہے ہیں۔ ان تصاویر کو دیکھ کر اور اپنے نام نہاد دشمنوں کی سازشیں جان جان کر میرے اندر بڑی شدت سے یہ خواہش جنم لیتی کہ اے کاش میں بھی دشمن کو ان ہتھیاروں سے تہس نہس کر ڈالوں۔ پھر جیسے جیسے ہم جہاد اور جنگ میں آگے بڑھےمیری ہتھیاروں کے متعلق معلومات میں بھی ماشاءاللہ کافی اضافہ ہوا حالانکہ خدا شاہد ہے کہ میں نے کبھی بھی انکے متعلق سرچ کرنے کی شمہ برابر بھی کوشش نہ کی تھی۔

ایک عرصے تک یہی سمجھ میں آیا  کہ پسماندہ معاشرے، قبائلی نظام اور اسلحہ ایک تکون تشکیل دیتے ہیں۔ لیکن آج  روزنامہ ڈان میں

ایک دلچسپ خبر

پہ نظر پڑی۔ خبر کے مطابق

صومالیہ

جو کہ اس وقت دنیا کے غریب ترین ممالک میں سے ایک ہے وہاں قرآن شریف کی تلاوت کے ایک مقابلے میں بچوں کو انعام میں ہتھیار دئیے گئے۔ پہلا انعام اے کے ۴۷ اور جی بی پی ۴۵۰، دوسرے نمبر پہ آنے والے کو اے کے ۴۷ اور جی بی پی ۳۲۰ دئیے گئے۔ تیسرے نمبر پہ آنے والے کو دو ایف ون ہینڈ گرینیڈ دئیے گئے۔

جنوبی صومالیہ کا بڑا حصہ الشہاب گروہ کے کنٹرول میں ہے۔  یہ گروہ اپنے علاقے میں میوزیکل رنگ ٹونز، فلموں، فٹبال براڈ کاسٹ ، شادیوں کے موقع پہ ناچ گانے پہ پابندی لگا چکا ہے۔ اسکے علاوہ علاقے میں عربی کے علاوہ کوئ اور زبان دوکانوں کے سائن کے لئے نہیں لکھی جا سکتی۔ سزائووں میں ہاتھ پاءووں کاٹنا یا سنگساری شامل ہیں۔

شاعر نے کہا تھا کہ عشق نے ہم کو تکونا کر دیا، ورنہ ہم بھی آدمی چوکور تھے۔ میں، پسماندہ معاشرے، قبائلی نظام اور اسلحے کی تکون کو سوچتی ہوں چوکور کر دوں پھر خیال آتا ہے کہ چوکور کو تکونا تو عشق نے کر دیا۔ اس تکون کو چوکور کون سا جذبہ کر رہا ہے۔

3:45 PM

اسلام, اسلحہ, انعام, بچے, پاکستان, پرویز مشرف, صومالیہ, عمران خان, قرآن, مذہب, مسلمان

اوسٹیوپوریسس-۲

گذشتہ سے پیوستہ

اب جبکہ ہم

اوسٹیو پوریسس

کی  ممکنہ وجوہات پہ ایک نظر ڈال چکے ہیں تو یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ یہ وہ مرض ہے جو آہستہ آہستہ جڑیں پکڑتا ہے اور انسان کو دیمک کی طرح کھا لیتا ہے۔ ابتداء میں اسکی علامات ظاہر نہیں ہوتیں۔ اور جب ظاہر ہوتی ہیں تو مرض خاصی شدت اختیار کر چکا ہوتا ہے۔

اگر یہ کسی دوا یا مرض کی پیچیدگی سے  ہو ا ہو تو معالج کو پہلے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اوسٹیوپوریسس ہونے کے امکانات کتنے ہیں اور اسکے لئے کیا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن خواتین کے معاملے میں ایسا ہو نہیں پاتا۔ وہ سمجھتی ہیں کہ جب تک وہ چل پھر رہی ہیں سب ٹھیک ہے۔ لیکن ہڈیوں یا عضلات میں رہنے والا دھیما دھیما درد آہستہ آہستہ اسی طرف لے جاتا ہے۔

اکثر ہم لوگوں سے سنتے ہیں کہ ہوا تو کچھ بھی نہیں تھا معمولی سی چوٹ تھی اور ہڈی ٹوٹ گئ۔ کبھی کبھی فرد متعلقہ خود حیران ہوتا ہے۔ اسکے ذہن میں کوئ چوٹ ، کوئ حادثہ نہیں ہوتا لیکن ایکسرے بتاتا ہے کہ ہڈی میں فریکچر ہے۔ یہ اوسٹیوپوریسس کی طرف اہم اشارہ ہے۔ خواتین میں کولہے کی ہڈی کا ٹوٹنا بھی عموماً اوسٹیوپوریسس کی وجہ سے ہوتا ہے۔

اوسٹیوپوریسس کی شناخت کے لئے ڈاکٹر آپکے خاندان میں اس قسم کے حادثات کے بارے میں معلومات کرتا ہے اور کچھ ٹیسٹ کرواتا ہے جس میں خون کے بنیادی ٹیسٹ ہوتے ہیں۔ اسکے علاوہ سب سے اہم ٹیسٹ بون منرل ڈینسیٹی ٹیسٹ ہوتا ہے۔ جس سے ہڈیوں کی مضبوطی پتہ چلتی ہے۔ خواتین کے لئے انکی عمر اور سن یاس سے پہلے ظاہر ہونے والی علامتیں اہمیت رکھتی ہیں۔ سن یاس کے بارے میں ہم آئیندہ کسی تحریرمیں تفصیل سے لکھیں گے۔

بون منرل ڈینسیٹی ٹیسٹ

ایک طرح کا ایکسرے ہوتا ہے۔ بعض اوقات کچھ مخصوص ہڈیوں کا ہوتا ہے اور بعض اوقات جسم کی تقریباً سبھی ہڈیوں کو چیک کرتے ہیں۔  ان ایکسرے کو پھر دوسرے ایکسریزکے تقابل  سے جانچا جاتا ہے۔ ایک ایکسرے وہ ہوتا ہے جس میں آپکی جنس، عمر اور جسامت کے انسان ہوتا ہے دوسرا ایکسرے وہ ہوتا ہے جس میں ایک نوجوان شخص ہوتا ہے جو کہ آپکی جنس اور جسامت کا ہوتا ہے اس طرح سے اندازہ لگایا جاتا ہے کہ ایک نوجوان کے مقابلے میں ہڈیاں کتنے نقصان سے دو چار ہیں۔  آپکی ہڈیوں کو اس عمر میں کیسا ہونا چاہئے تھا اور اب یہ اس سے کتنی زیادہ خراب ہیں۔ اس طریقے میں خامی یہ ہے کہ یہ پہلے سے پیشنگوئ نہیں کر سکتا۔ ہڈیوں کو نقصان پہنچ جانے کے بعد ہی بتا سکتا ہے کہ کتنا نقصان پہنچ چکا ہے۔ ڈاکٹر اسکی مدد سے اندازہ لگا سکتا ہے کہ آئیندہ ںے والے سالوں میں یہ چیز کتنی بڑھ سکتی ہے۔

اوسٹیوپوریسس کی شناخت کے لئے

الٹرا ساءونڈ

کو بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسکے علاوہ کچھ

بائیو مارکرز

جنکی شناخت سے پتہ چلتا ہے کہ آپکی ہڈیوں کی حالت اب کیا ہے۔

ایک دفعہ یہ حقیقت معلوم کر لی جائے کہ ایک فرد اوسٹیو پوریسس کا شکار ہے تو اگلا مرحلہ علاج کا آتا ہے۔ اگر اوسٹیو پوریسس زیادہ بڑھ چکا ہے اور اسکی وجہ سے مستقل تکلیف رہنے لگی ہے تو درد  کم کرنے کی دوائیں دی جاتی ہیں۔ درد کم کرنے والی ادویات کے اپنے ضمنی اثرات ہوتے ہیں۔ کچھ دوائیں معدے کی اندرونی جھلی کومتائثر کرتی ہیں۔ اور ایک لمبے عرصے تک انہیں استعمال کرنے سے نظام انہضام کے مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ جدید تحقیقات ایسی دوائیں سامنے لے آئ ہیں جو اس تکلیف کو پیدا نہیں کرتیں۔ لیکن درد کو کم کرنے والی یہ ادویات آہستہ آہستہ اپنا اثر کھو دیتی ہیں۔ ادھر اوسٹیوپوریسس بھی آہستگی سے بڑھتا رہتا ہے۔

اوسٹیوپوریسس کی رفتار کو قابو میں رکھنے کے لئے دواءووں کی سطح پہ دو اسٹریٹجیز اپنائ جاتی ہیں۔ ایک ہڈی کو اندرونی طور پہ مضبوط کرنے کی دوائیں اور دوسرا اسے گھلنے سے بچانے کی دوائیں۔

ہڈی کی مضبوط تعمیر کے لئے، کیلشیئم کے سپلیمنٹس استعمال کروائے جاتے ہیں جو عموماً وٹامن ڈی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ کیلشیئم کے یہ سپلیمنٹس، کاربونیٹس، سٹریٹس، لیکٹیٹس یا گلوکونیٹس  کی شکل میں دستیاب ہوتے ہیں۔ کیلشیئم سٹریٹس، لیکٹیٹس اور گلوکونیٹس پانی میں حل پذیر ہوتے ہیں اور آسانی سے جذب ہوجاتے ہیں۔ کیلشیئم کاربونیٹس کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ پانی میں حل نہیں ہوتے۔ انہیں حل ہونے کے لئے تھوڑا سا تیزابی ماحول چاہئیے ہوتا ہے اس لئے کیلشیئم کاربونیٹس لیتے ہوئے وٹامن سی یا کوئ پھل ساتھ میں لے لیا جائے تو بہتر ہے۔

اوسٹیوپوریسس کے بہت زیادہ بڑھ جانے کی وجہ سے یا ہڈی کے زیادہ کمزور ہونے کی صورت میں ایک اور دوا

پیری ٹیراٹائڈز

تجویز کی جاتی ہے جو کہ پیراتھائرائیڈ غدود کے ہارمون کی طرح عمل کرتا ہے۔

مخصوص حالتوں میں سوڈیئم فلورائیڈ یا

اسٹرانشیئم رینیلیٹ

بھی تجویز کئے جاتے ہیں۔

دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ

ہڈی گھلنے

کے عمل کو کم کیا جائے اور اسکے لئے ہڈی کی بیرونی تہہ کو امداد دی جائے۔ اس سلسلے میں

بائیو فاسفونیٹس

استعمال کروائے جاتے ہیں۔ یہ آسانی سے جذب نہیں ہوتے اس لئے اسے ایکدم  خالی پیٹ لینا ہوتا ہے۔ اس لئے صبح سویرے کا وقت اچھا ہوتا ہے۔ پورے ایک گلاس پانی کے ساتھ کیونکہ یہ خاصے تیزابی ہوتے ہیں اور حلق یا

غذا کی اوپری نالی میں جلن

پیدا کر سکتے ہیں۔ اسے کھڑے ہو کر لینا چاہئیے۔ اسے کھانے کے ایک گھنٹے بعد تک لیٹنا نہیں چاہئیے۔ تاکہ یہ جلد سے جلد معدہ میں پہنچ جائے۔ اور غزائی کی نالی جلن سے محفوظ رہے۔

بائیو فوسفونیٹس اب مختلف پیکنگ میں دستیاب ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسے ہیں  جو روزانہ کے بجائے، ہفتے میں صرف ایک دفعہ لینا ہوتا ہے مثلاً

فوسا میکس

، دوسری طرح کی دوا

بون ویوا

، جسے مہینے میں ایک دفعہ لینا ہوتا ہے۔ وہ لوگ جنہیں منہ سے کھانے میں مسائل ہیں انکے لئے یہ ایک اور شکل میں دستیاب ہے اور اسے سال میں صرف ایک دفعہ لینا پڑتا ہے۔

خواتین کے سلسلے میں

ہارمون تھراپی

استعمال کی جا سکتی ہے۔ یہ جسم سے ختم ہو جانے والے ہارمون ایسٹروجن کو توازن میں رکھنے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ اس سے نہ صرف سن یاس کی علامتوں کو آرام ملتا ہے بلکہ ہڈیوں کے گھلنے کے عمل کو بھی قابو میں لایا جا سکتا ہے۔ ہارمون تھراپی علاج میں خاصی احتیاط کی ضروت ہوتی ہے اور اسے صرف ایک ڈاکٹر ہی تجویز کر سکتا ہے۔  اس طریقہ ء علاج میں جسمانی صحت کے کچھ پیرا میٹرز کو ہر تھوڑے عرصے میں چیک کروانا لازمی ہوتا ہے تاکہ یہ مشاہدہ کیا جاتا رہے کہ اس طریقہ ء علاج سے کوئ نقصان تو نہیں پہنچ رہا۔

اوپر بیان کی گئ دواءووں میں سے کوئ بھی دوا ڈاکٹر کے مشورے کے بغیر ہرگز استعمال نہیں کرنی چاہئے۔ کیونکہ وہی بتا سکتا ہے کہ آپکی انفرادی حالت کو دیکھتے ہوئے کیا ہونا چاہئیے۔ اسکے علم میں مریض کی صحت کے تمام ایشوز ہوتے ہیں۔

یہ ساری دوائیں یا سپلیمنٹس اوسٹیوپوریسس کی رفتار کو کم کر سکتے ہیں لیکن اسے مکمل طور پہ روک نہیں سکتے۔

اس میں مزید بہتری لانے کے لئے طرز زندگی میں تبدیلی لانا ضروری ہے اور صحت بخش غذا بھی۔ بلکہ اوسٹیوپوریسس سے بچنے کے لئے ابتدائی عمر سے ہی غذا اور طرز زندگی پہ توجہ دینا ضروری ہے۔

اوسٹیو پوریسس کے حوالے سے ایک صحت مند طرز زندگی کیا ہوتا ہے اور کون سی غذائیں جسم کو مضبوط بناتی ہیں۔ اپنے اندازے اور تجربے  بتائیے۔ اس موضوع پہ اس سلسلے کی

اگلی تحریر

پڑھنا نہ بھولئیے۔

4:19 PM

الٹراساءونڈ, اوسٹیو پوریسس, ایکس رے, بون میرو ڈینسیٹی, بون ویوا, فوسا میکس, مینوپاز, ہارمون تھراپی

اوسٹیو پوریسس-۱

 ہسپتال میں  ایک لڑکی لنگڑاتی ہوئ آئ اور میرے برابر  بیٹھ گئی۔  عمر یہی کوئ ستائیس اٹھائیس سال۔ ہم دونوں میں وقت گذاری کے لئے بات چیت شروع ہوگئ۔ تب میں نے اس سے پوچھا کہ اسے کیا تکلیف ہے۔ کہنے لگی میرا خیال ہے کہ مجھے کیلشیئم کی کمی ہو گئ ہے۔ اچھا، اس خیال کی کیا وجہ ہے؟ میں نے دلچسپی لی۔

میری شادی کو تین سال ہوئے ہیں۔ دو بچے ہیں۔ پہلا بچہ ابھی چار مہینے کا بمشکل تھا کہ دوسرے بچے نے اپنی آمد کا اعلان کر دیا۔ میں اسے اپنا دودھ بھی پلاتی تھی۔  چھ مہینے کی عمر میں پہلے بچے کا  دودھ چھڑانا پڑا۔

 دوسرے بچے کو میں نے چھ مہینے تک دودھ پلایا کہ میرے پیر میں تکلیف شروع ہو گئ۔ پہلے یہ کم تھی آہستہ آہستہ یہ اتنی بڑھ چکی ہے کہ میں چل نہیں سکتی۔ سب لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کیا ہوگیا ہے۔

میں نے پہلے بچے سے لے کر اب تک اس بات کا خیال نہیں رکھا کہ مجھے کیلشیئم زیادہ چاہئیے ہوگا۔ اب ہڈیوں کے ایکسرے کرائے ہیں ڈاکٹر دیکھیں کیا کہتا ہے۔ میں نے ایک نظر اسکی رپورٹس پہ ڈالی۔ ہر چیز صحیح تھی۔ ایکسرے بھی صحیح تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ ڈاکٹر کے پاس سے واپس ہو تو مجھے ضرور بتانا کہ اس نے کیا کہا۔ ڈاکٹر کے پاس سے واپس ہوتے ہوئے اس نے کہا کہ اسکا اندازہ صحیح تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اسے کیلشیئم کی کمی ہو گئ ہے۔

یہ تو ایک نوجوان خاتون کی کہانی تھی۔

دوسری طرف ہم اپنے ارد گرد بہت ساری زیادہ عمر کی خواتین کو دیکھتے ہیں جو چلنے پھرنے سے معذور ہوتی جا رہی ہیں اور اسکی وجہ ہڈیوں کی  کمزوری  یا جوڑوں کی خرابی بتاتی ہیں۔ بعض افراد کی پیٹھ پہ عمر کے ساتھ

کھُب

نکل آتا ہے۔

پیٹھ پہ نکل آنے والا کھب

ہڈیوں میں یہ کمزوری زیادہ تر

اوسٹیوپوریسس

کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اوسٹیو پوریسس یعنی سوراخدار ہڈیاں۔  اگر آپ نے جانوروں کی ہڈیاں دیکھی ہیں تومشاہدہ کیا  ہوگا کہ ان میں باریک باریک سوراخ پائے جاتے ہیں اگر یہ باریک سوراخ بڑے ہو جائیں تو ہڈیاں بھربھری ہو جاتی ہیں۔ انکی دیواریں پتلی ہو جاتی ہیں اور وہ نرم پڑ جاتی ہیں۔ معمولی سی ٹھیس انہیں توڑ سکتی ہے۔ انسان زیادہ نقل و حرکت کے قابل نہیں رہتا۔ اور یہ چیز اسکی مدت زندگی میں کمی کا بڑا سبب بن جاتی ہے۔

اوپر کی ہڈی صحت مند ہے جبکہ نیچے والی اوسٹیو پوریسس کا شکار ہے

ذہن میں اس طرح کے سوالات آتے ہیں کہ وہ کیا وجوہات ہیں جن کی بناء پہ اوسٹریو پوریسس شروع ہوتا ہے، اسکا کیا علا ج ہے کیا اس سے بچاءو ممکن ہے، کن لوگوں کے اس میں مبتلا ہونے کا امکان زیادہ ہے۔ ہم باری باری ان سب پہ ایک نظر ڈال لیتے ہیں۔

زیادہ تر یہ خاندانی سلسلے سے جڑا ہوتا ہے لیکن ماحول، غذا اور بعض دوائیں اسکا باعث بن جاتی ہیں۔ ہڈیوں کی ساخت میں کیلشئم سب سے زیادہ استعمال ہوتا ہے اور پھر فاسفورس۔ اس لئے اگر کیلشیئم کی کمی ہو جائے تو ہڈیاں کمزور ہو جاتی ہیں۔ ہڈیوں کی کمزوری اور مضبوطی کا پیمانہ ہڈیوں میں دھاتوں کی  کثافت یا مقدار ہے یعنی

بون منرل ڈینسٹی

۔ اگر یہ زیادہ ہے تو ہڈی مضبوط اور اگر یہ کم ہے تو ہڈی کمزور ہو گی۔

کون لوگ زیادہ شکار ہوتے ہیں؟

جنکے خاندان میں انکے امکان زیادہ ہوتے ہیں۔ تمام دنیا میں دیکھا جائے تو یوروپی اور ایشیئن لوگ زیادہ متائثر ہوتے ہیں۔ مردوں کے مقابلے میں خواتین، موٹے لوگوں کے مقابلے میں دبلے افراد، کولڈ ڈرنکس حد سے زیادہ استعمال کرنے والے، بعض دوائیں استعمال کرنے والے مثلاً خون کو پتلا کرنے والی دوا ہیپارن، اعصاب کی دوا فینا بارباٹول اور بعض

اسٹیرائڈز

۔  وہ لوگ جو چلنے پھرنے سے گھبراتے ہوں، سستی برتتے ہوں  یا کسی بیماری کے نتیجے میں یا اسکے بعد ایک طویل عرصے تک چلنے پھرنے سے قاصر ہوں۔

نوجوان خواتین میں اسکی وجہ مستقل حمل کی یا بچوں کو دودھ پلانے کی حالت میں رہنا ایک بڑی وجہ ہے۔ بچہ جب ماں کے جسم میں پرورش پاتا ہے تو وہ ماں کے کیلشیئم کے ذخائر کو بہت زیادہ استعمال کرتا ہے۔ اسے اس سے غرض نہیں ہوتی کہ ماں کی خوراک میں زائد کیلشیئم شامل ہے یا نہیں۔ اگر ماں اپنی خوراک کے ذریعے زائد کیلشیئم حاصل نہیں کرتی تو وہ یہ کیلشیئم ماں کی ہڈیوں سے لینا شروع کر دیتا ہے۔ یہی قانون قدرت ہے۔ جسکے نتیجے میں ماں کی ہڈیاں گھلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ ہڈیوں کی اس کمزوری پہ خوراک اور اضافی کیلشیئم سے قابو پایا جا سکتا ہے۔

دودھ  کا ایک اہم جز کیلشیئم ہوتا ہے اس لئے دودھ پلانے والی مائیں اگر اپنی خوراک میں کیلشیئم کی مقدار کا خیال نہ رکھیں تو اس دودھ کے لئے بھی ہڈیاں قربانی دیتی ہیں اور یہ  زچگی کے بعد انہیں مزید کمزور بنا دیتا ہے۔

خواتین میں اوسٹیو پوریسس کی دوسری اہم وجہ

مینو پاز

یا سن یاس ہے۔ جسکے نتیجے میں انکا ماہانہ نظام بند ہو جاتا ہے۔ خواتین کا تولیدی نظام ایک ہارمون

ایسٹروجن

پہ انحصار کرتا ہے۔ یہ خواتین کے ماہانہ نظام سے لے کر حمل قرار پانے اور بچے کی تولید تک ہر مرحلے میںشامل ہوتا ہے۔ یہ خواتین کے جسم کے ہر حصے میں پایا جاتا ہے۔ یہ انکی جلد کو خوبصورتی دیتا ہے اور جسم کو تناسب۔ اسکے ساتھ ہی یہ انکے جسم میں کیلشیئم کے جذب ہونے کے عمل میں بھی مدد کرتا ہے۔

عمر کے ساتھ ایک مرحلے میں آکر یہ ہارمون ختم ہونا شروع ہوتا ہے تو یہ نظام بھی اپنے خاتمے پہ پہنچتا ہے۔  اس سے جہاں اور مسائل جنم لیتے ہیں وہاں کیلشیئم کا کم یا نہ جذب ہونا بھی ہے جس سے ہڈیوں کی کمزوری کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔

وہ نوجوان خواتین جنکا ماہانہ نظام ہر ماہ نہیں ہوتا بلکہ کسی خامی کی وجہ سے اس میں دو دو تین مہینوں بلکہ بعض اوقات سال کا بھی وقفہ آجاتا ہے انکی ہڈیاں بھی اسی وجہ سے جلد کمزور ہو سکتی ہیں۔ خواتین کے ہارمونل نظام کی یہ خامی عام طور پہ قابل علاج ہوتی ہے۔

کینسر کے لئے ہونے والی کیمو تھراپی کی وجہ سے بھی مینوپاز ہو سکتا ہے اور بعض طبی حالتیں ایسی ہوتی ہیں جنکی وجہ سے خواتین کی بچہ دانی نکال دی جاتی ہے نتیجتاً ہڈیاں کمزور ہو جاتی ہیں۔

ہارمون کی کمی ہونے کے بعد بعض اوقات کیلشیئم کے سپلیمنٹ لینے  یا کیلشیئم والی خوراک وافر مقدار میں لینے سے بھی کوئ فرق نہیں پڑتا اور ہڈیوں کی یہ کمزوری اپنی رفتار سے جاری رہتی ہے۔ مینو پاز کے بعد خواتین کی ہڈیوں کی کثافت میں دو سے چار فیصد سالانہ کے حساب  سے کمی آسکتی ہے۔

اوسٹیو پوریسس کی دیگر وجوہات میں سگریٹ نوشی، شراب نوشی، ورزش نہ کرنا، ، کیلشیئم والی غذائیں کم استعمال کرنا، کم غذائیت کی حامل خوراک لینا، نظام انہضام میں خرابی کی وجہ سے غذا ئ اجزاء کا صحیح طور پہ جذب نہ ہونا، مردوں میں مردانہ ہارمون ٹیسٹو اسٹرون میں کمی جوعموماً عمر کے ساتھ آتی ہے۔ مختلف غدود کے افعال میں خرابی مثلاً تھائرائڈ گلینڈ کے افعال میں خرابی جسکے نتیجے میں یہ

تھائرائڈ ہارمون زیادہ

پیدا کرتا ہے یا

کم پیدا

کرتا ہے۔ ماحول میں بھاری دھاتوں کی آلودگی مثلاً کیڈمیئم سے بھی ہڈیاں کمزور ہونے لگتی ہیں۔

روماٹائڈ ارتھرائٹس

کی وجہ سے بھی یہ ہو سکتا ہے جس میں ہاتھوں اور پیروں کی ہڈیاں مڑ جاتی ہیں، اور گردوں کی خرابی کی وجہ سے بھی۔ خون میں خرابی کی وجہ سے بھی مثلاً

لیوکیمیا

،

ہیموفیلیا

اور

تھیلیسمیا

کی وجہ سے بھی لاحق ہو سکتی ہے۔

ایک اور اہم وجہ

وٹامن ڈی کی کمی

ہے۔ وٹامن ڈی، جسم میں کیلشیئم کے جذب ہونے کے لئے ضروری ہے۔ وٹامن ڈی کی کمی ان سرد ممالک میں زیادہ ہوتی جہاں دھوپ کم نکلتی ہے اسکے علاوہ اگر نظام انہضام میں خرابی ہو تو اسکا مناسب انجذاب نہیں ہو پاتا۔

اسکے علاج اور بچاءو کے حوالے سے یہ تحریر ابھی

جاری ہے

۔

11:56 AM

اوسٹیوپوریسس, ایسٹروجن, تھائرائڈ, ٹیسٹواسٹرون, خواتین, فاسفورس, کیلشیئم, مینوپاز, وٹامن ڈی

دھتکارا ہوا شاعر

وارننگ؛ یہ تحریر خاصی حد تک ناشائستہ مواد پہ مشتمل ہے۔ صرف شائستہ تحاریر پڑھنے والے اگر اسے پڑھتے ہیں تو مزاج میں پیدا ہونے والی کراہت کے ذمہ دار وہ خود ہونگے۔  حساس طبیعت رکھنے والے اس سے گریز کریں۔

اس وارننگ کے بعد میں خود کو اخلاقی طور پہ آزاد سمجھتی ہوں اور موضوع کی طرف آتی ہوں ۔ یہ ایک ایسے شاعر کے متعلق ہے جس نے اپنی شاعری کے لئے ایک نہایت دھتکارا ہوا موضوع چنا، جس پہ شاعر تو کجا عام افراد بھی اشاروں کنایوں میں ہی بات کرنا چاہتے ہیں۔ دنیا کے معیاری ادب میں اسکے لئے کوئ جگہ نہیں، اور یہی وجہ ہے کہ اردو کے اس شاعر کو شاعرانہ خوبیاں رکھنے کے باوجود آج شاید ہی کوئ جانتا ہو۔ انکے اشعار زیادہ تر سینہ بہ سینہ چلے آنے والے اشعار ہیں۔

  جب ، میں نے جاننا چاہا کہ انکا کوئ  دیوان موجود ہے تو معلوم ہوا کہ امریکہ کی واشنگٹن ڈی سی کی لائبریری میں اسکا ایک نسخہ موجود ہے۔ یہ جان کر کہ امریکہ کی ایک لائبریری میں انکے دیوان کا ایک  نسخہ موجود ہے آتش شوق بھڑک اٹھی۔ میں نے کوشش کی کہ کوئ اس نسخے کی نقل کروا کر وہاں سے لے آئے۔ لیکن ہوا یوں کہ مجھے کراچی میں ہی انکے دو مختلف دیوان مل گئے۔ جو کہ بھارت میں شائع ہوئے۔

برازیات

کا یہ شاعر شیخ باقر علی یا جعفر علی قصبہ رودلی کا رہنے والا چرکین تخلص کرتا تھا اور اسی نام سے مشہور ہوا۔ چرکین کا کیا مطلب ہے اسکے لئے اردو کی کوئ بہتر لغت دیکھئیے۔

 اس سے آپکی وسعت الفاظ بہتر ہوگی۔

:)

مرزا قادر بخش صابر انکے بارے میں لکھتے ہیں کہ

چرکین تخلص ایک شخص ظریف، شوخ مزاج، ساکن لکھنوء کا۔ وہ ہمیشہ سخن پاکیزہ کا دامن نجاست معنوی سے آلودہ رکھتا ۔ یعنی مضامین بول و بزار  اس طرح شعر میں باندھتا کہ زمین سخن کو گُوہ گڑھیا بنا دیتا۔ اسکی قوت شامہ یک قلم باطل ہو گئ تھی کہ اس غلاظت سے بے دماغ نہ ہوتا تھا۔ انصاف تو یہ ہے کہ ابیات میں ہر چند گوہ اچھالتا اور کاغذ کے ہر گوشے میں پیشاب کی نالی بہاتا تھا لیکن کوئ لطیف مزاج اس سے دماغ بند نہ کرتا تھا اور کوئ پاکیزہ طبع اس سے گھن نہ کھاتا تھا۔ گویا بحر شعر نے اس نجاست کو بہا دیا تھا۔

شرط سلیقہ ہے ہراک امر میں

عیب بھی کرنے کو ہنر چاہئیے

انکے بارے میں خاصی کہانیاں مشہورہیں۔ کہا جاتا ہے کہ میاں چرکین بہت بلند پایہ شاعر تھے۔ کلام بہت عمدہ اور پاکیزہ ہوتا تھا۔ مگر لوگ آپکا کلام چرا کر اپنے نام سے پڑھا کرتے تھے۔ جسکی وجہ سے میاں چرکین نے عاجز آ کر اپنی شاعری کا رنگ بدل دیا اور ایسے اشعار کہنے لگے جس میں گندگی کا ذکر ضرور ہوتا۔ لیکن اس کلام میں بھی تمام شاعرانہ صفات بدرجہ ء اتم موجود ہوتی تھیں۔ یہ بہرحال ایک کہانی ہی ہے مکمل صداقت نہیں۔ شاعرانہ خوبیوں کے لئے کچھ نمونہ ء کلام حاضر ہے۔

سلسل البول کی مانند رہے ڈاک رواں

اتنے خط لکھوں زمانے سے ہو کاغذ عنقا

رو زو شب ہگنے سے تم اسکے خفا رہتے تھے

مہترو خوش رہو، چرکیں نے وطن چھوڑا ہے

روک کر گھوڑے کو اس نے مری تربت پہ کہا

لید کرنی ہو تو کرلے تُو یہی تھوڑی سی

قبر پہ آکے بھی اس بت نے نہ مُوتا افسوس

کام کچھ اپنے  نہ مرگ شب ہجراں آئ

اپنے ہی سڑے ٹکڑوں پہ کی ہم نے قناعت

چکھا نہ متنجن کسی نواب کے خواں کا

مقصود عالم مقصود جو کہ ایک طرح سے

غالب

کے شاگرد تھے انہیں چرکین کی نادر ترکیبوں ، الفاظ، فقرے اور محاوروں نے کھینچا ہوگا جو اب نہیں بولی جاتی اور انہوں نے چرکین کے مرنے کے پچیس سال بعد انکا کلام ایک جگہ اکٹھا کر کے اسے دیوان کی شکل دی۔ یوں یہ محفوظ ہوا مگر لوگوں کی لائبریریوں میں نمایاں جگہ نہ پا سکا۔

انکی بولی دیوان خانے یا شائستہ آنگن کی نہیں نالی، کوڑا گھر، سنڈاس، بول و بزار وغیرہ کی ہے۔ بول و بزار کے علاقے کے الفاظ جنکے سلسلے میں لوگ خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ انکو چرکین نے اپنے کلام میں محفوظ کیا اور بیت الخلاء کے آداب کی ایک اہم دستاویز چھوڑی۔

چرکین نے بول و بزار کے مضامین کے لئے سوقیانہ یا کوئ خراب زبان نہیں لکھی۔انکا کلام معیاری اردو میں ہے۔ یہ وہی زبان ہے جو اس زمانے میں آتش، ناسخ اور مصحفی وغیرہ کی تھی۔ایک ایک مصرعہ تراشا ہوا، شعر میں چستی اور زائد یا بھرتی کے الفاظ سے پاک مضامین آلودہ لیکن کلام میں غضب کی روانی ہے۔ چرکین کے کلام کو بلا تعصب، صبر اور برداشت سے پڑھے بغیر انکے فن کی قدر نہیں جانی سکتی۔

بقول اردو کے مایہ ناز ادیب

شمس الرحمن فاروقی

،

اگر کلام کے ذریعے جنسی لذت پیدا کرنے یا حاصل کرنے کی شرط کو اہم قرار دیں تو چرکین کا کوئ شعر مشکل سے فحش کہلائے گا۔خلاف تہذیب ہونا اور بات لیکن کوئ شعر ایسا نہیں کہ اسے بچوں یا بہو بیٹیوں کے سامنے پڑھایا نہ جا سکے یا انکے سامنے پڑھا نہ جا سکے۔

لیکن ہمیں پھر بھی کلام کی اس نوعیت پہ حیرت یا تعجب ہوتا ہے۔ کچھ اور لوگوں کو کچھ اور باتوں پہ ہوتا ہے مثلاً

بائرن

کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ نوالہ منہ میں ڈالنے، چبانے اور حلق سے اتارنے کو اس قدر غیر نفیس فعل سمجھتا تھا کہ کسی عورت کو کچھ کھاتے پیتے نہ دیکھ سکتا تھا۔ جبکہ جرمن ناول نگار

پیٹرک سسکنڈ

لکھتے ہیں کہ

میں اپنے بچپن میں یہ سوچ سوچ کر حیران رہ جاتا تھا کہ ناولوں کے کرداروں کو کبھی بیت الخلاء جاتے کیوں نہیں دکھایا جاتا۔ اسی طرح پریوں کے قصے ہوں یا اوپرا، ڈراما ہو یا فلمیں یا پھر بصری آرٹ کی مختلف شکلیں ان میں کسی کو بھی رفع حاجت کی ضرورت کیوں نہیں پیش آتی۔ انسان کی زندگی میں پیشاب یا پاخانے کا عمل جو زندگی کا سب اہم اور انتہائ ضروری معمول ہے وہ آخر آرٹ کی دنیا میں اپنی جگہ کیوں نہیں بنا سکا۔

قادر بخش صابر مزید لکھتے ہیں کہ

اوائل حال میں تو اس نے یہ وضع ہزل سمجھ کر اختیار کی یعنی مذاق میں۔ لیکن رفتہ رفتہ اس قال کو حال بنا لیامدام لباس چرک پہنتا اور ایسی میلی کچیلی وضع رکھتا کہ اجنبی اس کو سچ مچ کا حلال خور سمجھتے۔حق یہ ہے کہ جو ابتداء میں کہتا تھا وہ آخر میں کر دکھایا۔ آخر الامر لال بیگ کی صحبت اور گوگا پیر کی ہم نشینی کے شوق میں شہر کے پاکیزہ مقامات سے بھاگ کر صد ہا آرزو کا ٹوکرا سر پر رکھے ہوئے بہ طریق پا تراب کے جنگل کے کسی کوڑے پر اول منزل کی۔

مزید شعر حاضر ہیں

خیال زلف بتاں میں جو پیچ کھاتے ہیں

مروڑے ہو ہو کے پیچش کے دست آتے ہیں

کسی کے پاد سے اڑتے نہ کنکری دیکھی

اڑائے دیتا ہے چرکیں پہاڑ پھسکی سے

وہ جنتی ہے مرے جو مرض سے دستوں کے

ہے یہ ثواب تو باز آئے اس صواب سے ہم

عبث بدنامیوں کا ٹوکرہ سر پر اٹھانا ہے

لگانا دل کا بس جھک مارنا اور گُو کا کھانا ہے

چرکین سے کسی نے ایک دفعہ کہا کہ دنیا کے ہر موضوع کوبول و بزار کی زبان میں بیان کر سکتے ہو تو ذرا حضرت علی کی بہادری کو بیان کر دکھاءو۔ شعر ملا۔

رن میں جس دم تیغ کھینچی حیدر کرّار نے

ہگ دیا دہشت کے مارے لشکر کفار نے

یہ مصرعہ اس طرح بھی ملتا ہے،  ہڑبڑا کر ہگ دیا ، لشکر کفار نے۔

نوٹ اس تحریر کا ماخذ ابرار الحق شاطر گورکھپوری کا مرتب کردہ دیوان چرکین ہے جس میں انہوں نےچرکین کا ادبی پس منظر اور تاریخ بھی دی ہے اور جس کا مقدمہ شمس الرحمن فاروقی نے لکھا ۔

6:45 PM

ابرار الحق شاطر, ادب, اردو, بائرن, برازیات, بھارت, پیٹرل سسکنڈ, چرکین, شاعری, شمس الرحمن فاروقی, فحش, لکھنوء

میں مر گئیاں

کراچی جغرافیائ لحاظ سے صحرا کا حصہ ہے۔  سمندر کی قربت اور شہر بننے کے عمل نے اسکی صحرائ حالت کو خاصی حد تک چھپا دیا مگر موسم میں ایک ثبات ہے جو اسکے اس پس منظر کی چغلی کھاتا ہے۔ یہاں ایک ہی موسم غالب رہتا ہے اور وہ ہے گرمی کا۔ بقول یوسفی کراچی میں اگر تینتیس ڈگری درجہ ء حرارت جون میں ہو تو گرمی اور اگر یہی ٹمپریچر دسمبر میں ہو تو سردی۔

اس لئے کراچی میں نہ محکمہ ء موسمیات پہ کسی کی توجہ ہوتی ہے اور نہ کسی موسم کی خاص تیاری۔ بس کیلینڈر دیکھ کر ہم سوچتے ہیں کہ اب کون سا موسم منانا چاہئیے۔ سو لان کے کپڑے پہن کر اخروٹ، چلغوزے اور مونگ پھلیاں صرف اس لئے کھانے پڑتے ہیں کہ دسمبر شروع ہو چکا ہے۔

اسی طرح آسمان پہ اگر بادل کی چار ٹکڑیاں  اکٹھا ہو جائیں تو فوراً بیسن میں پانی ملا لیتے ہیں اور کڑہائ چولہے پہ چڑھ جاتی ہے۔ مبادا تیز ہوا کے چلنے سے بادل بکھر جائیں۔ اور یہ مناسب موقع ہاتھ سے نکل جائے۔

اس لئے کسی کو حیرت نہیں ہونا چاہئیے کہ اس شاعری کے تخلیق کار کا تعلق بھی کراچی سے ہے جس نے لکھا وہ میرے نصیب کی بارشیں کسی اور چھت پہ برس گئیں۔ اس لحاظ سے کراچی والے خوش نصیب ہیں کہ امریکہ کے بعد انہیں بعض معاملات میں نصیب کی کارفرمائ بھی نظر آتی ہے۔

شاید اس کی وجہ بہادر شاہ ظفر سے متائثر ہونا ہو انہوں نے بھی اپنی جلا وطنی کی واضح وجہ کمپنی نہیں نصیب پہ ڈالی۔ کتنا ہے بد نصیب ظفر دفن کے لئے، دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں۔ ہم کراچی والوں نے اس دو گز زمین کا بھی حل ڈھونڈھ نکالا ہے۔ اور سوا گز کی بوری اچھی طرح اسکا متبادل ثابت ہوئی ہے۔ ایک جلا وطنی کا خرچہ بچتا ہے جس سے زر مبادلہ محفوظ رہتا ہے دوسرا بوری کی شکل میں مقامی اشیاء کی کھپت میں اضافہ ہونے سے معیشت مستحکم ہونے کے امکان بڑھ جاتے ہیں۔

صحرائ خطے سے تعلق کی وجہ سے کراچی والوں کو بارش سے وہی والہانہ لگاءو ہوتا ہے جو صحرا کے رہنے والے ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ سردی کی نسبت ساون ہمارے یہاں ہر دو چار سال میں حاضری دے دیتا ہے۔  بس اتنی کہ بعض موقع پرست کہتے رہ جاتے ہیں کہ اے ابر کرم آج اتنا برس، اتنا برس کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

یہ موقع پرست دوکان پہ بیٹھا سوداگر بھی ہوتا ہے اور وہ بھی جنکی سوداگری حسن و عشق کے معاملات میں ہوتی ہے یعنی دل دے دے دل لے کر۔

لیکن جیسا کہ ہماری حکومتوں کا انداز رہا ہے وہی لڑکیوں کی مشرقی ماءووں والا، وہ ہماری خوشیوں کو ایک حد سے آگے بڑھنے نہیں دیتیں۔ اگلے گھر جائیں گی تو گذارا کیسے ہوگا سختیوں کی عادت ہونی چاہئیے۔ اس کے لئے ان  کی منصوبہ بندی ہمیشہ تیار ہوتی ہے  ایسے ہی حکومت کی بھی ہوتی ہے یعنی نہیں ہوتی۔

ہم سوچیں کہ بارش میں ذرا فلاں رشتے دار کے یہاں محفل جما لی جائے وہاں وہ بھی ہونگے یا ہونگیں تو گھر سے باہر نکلتے ہی سڑکوں پہ حکومت اور قدرت کے گٹھ جوڑ سے اتنا پانی ہوتا ہے جتنا کہ چناب میں سوہنی کے کچے گھڑے پہ تیرتے وقت تھا۔ ہم تاریخ سے عبرت پکڑتے ہوئے فوراً واپس ہو لیتے ہیں آخر گاڑی کی محبت بھی کوئ چیز ہے۔ وا حسرتا، ہم ان سے فون پہ عشق بگھارنے کی کوشش کر لیں گے۔ گھر آکر پتہ چلتا ہے فون میں ڈائل ٹون نہیں وہ مر چکا ہے۔

ہم سوچتے ہیں کہ کوئ بات نہیں اے محبت زندہ باد ، موبائل فون کے سستے پیکیج آخر کس دن کام آئیں گے۔ معلوم ہوتا ہے لائن پہ اتنا رش ہے کہ  بات نہیں ہو سکتی۔ اتنی دیر میں اطلاع ملتی ہے کہ گھر کے باہر بجلی کا تار گر پڑا ہے یا فلاں کی بیرونی دیوار گر پڑی ہے یا فلاں درخت زمین پہ آرہا۔ دل چاہتا ہے کہ ٹی وی پہ شہر کی خیر خبر معلوم کر لیں کیبل والے کا تار ٹوٹ چکا ہے، فون لائین میں خرابی کی وجہ سے انٹر نیٹ نہیں چل سکتا۔ اسکے بعد؟

یہ ایک اہم سوال ہے اسکے بعد؟ یہ چاہتے ہو ساکنان شہر عشق میں رہو بسو، نہ راس آ سکی تمہیں وہاں کی آب و ہوا تو پھر۔ اوروں کا نہیں پتہ ہم بیٹھے چھوٹی پرچیوں پہ لکھ رہے ہیں قاف قاف آسمان صاف۔ ہماری ساس صاحبہ کا کہنا ہے کہ ادھر بھوپال میں جہاں انکا بچپن گذرا، جب بارش تھمنے کا نام نہیں لیتی تھی تو وہاں لوگ یہ پرچیاں لکھ کر درختوں پہ ٹانگ دیتے تھے۔

آہ صحرائ محبت، کہاں تو ریت کے بگولے دیوانہ وار اٹھتے ہیں اور باریک باریک ذرے نشتر کی طرح روح  کو اس طرح چھلنی کر ڈالتے ہیں کہ سب ملیا میٹ۔ اس عالم میں سوائے یہ کہنے کے اور کچھ باقی نہیں رہتا ، تیرے عشق نچایا کر کے تھیّا تھیّا، چھیتی آویں وے طبیبا نئیں تے میں مر گئیاں اور کہاں پانی کے چند چھینٹے پڑے  یہ ریت ایسی بیٹھتی ہیں , اس میں وہ گل و گلزارپھوٹ پڑتے ہیں جو وہم و گمان میں نہیں ہوتے۔ آہ صحرائ محبت، آہوئے بے اختیار۔ لیکن ایک بات مجھے سمجھ نہیں آتی یہ جس جگہ کوئ بس نہیں چلتا وہاں تعویذ ٹوٹکے کیسے کام کر جاتے ہیں۔ خیر، یہ میری آخری پرچی ہے قاف قاف آسمان صاف۔ اب دیکھئیے ,  آسمان کیسے صاف ہوگا۔

6:50 AM

آسمان, بارش, پاکستان, تباہی, صحرا, عشق, کراچی, محبت

پاکستانی سینی میں چین کی چینی

کل صبح بارہ بجے تک میری چائینیز کی کلاس ہے جو بھی کام ہوگا اسکے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ میرے ایک دوست نے اطلاع دی۔ زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم۔ کیا ہوا کسی چائینیز کو اپنا محبوب بنا لیا ہے۔ کیونکہ ہمارے خطے میں مادری زبان کے علاوہ اگر کسی زبان کو لوگ دل سے سیکھنا چاہتے ہیں تو وہ انگریزی ہے نہ کہ چائینیز۔  جواب ملا نہیں چین جا کر کچھ کاروبار کرنے کا ارادہ ہے۔

سو میں  نے ان سے کچھ ابتدائ معلومات لیں۔ کراچی میں چند ایک ادارے ہیں جہاں یہ سکھائ جاتی ہے۔ پانچ چھ استاد ہیں جنہوں نے یہ فریضہ اٹھایا ہوا ہے۔ اور وہ آجکل بڑے مصروف ہیں۔ ان کی زیادہ تعداد چین سے تعلق رکھتی ہے۔

پھر اس کے بعد کسی اور سے بات ہو رہی تھی۔ پتہ چلا کہ وہ اپنے بچے کو کالج کی تعلیم کے لئے ہانگ کانگ بھیج رہے ہیں۔ ایک دفعہ پھر حیرانی سے گذرنا پڑا۔ لوگ لندن، کینیڈا، امریکہ بھیجتے ہیں آپ ہانگ کانگ بھیج رہے ہیں۔ جواب ملا، وہ زمانہ گیا جب خلیل خان فاختہ اڑایا کرتے تھے آجکل انہوں نے فاختائیں آزاد کر کے اس خطے میں ڈیرہ ڈال لیا ہے۔  چین ، ہانگ کانگ۔

نائن الیون کے بعد امریکہ نے دہشت گردی کے خلاف جنگ لڑنے میں اپنا سرمایہ لگایا، ذہن لگایا۔ لیکن کہنے والے اسے ستم گر کہتے رہے۔ مغربی ممالک نے دہشت سے نبٹنے کے لئے دہشت زدہ پالیسیز بنائیں۔  یوں آج اس واقعے کے دس سال بعد دنیا میں سرمائے  اور اعتماد کے سفر میں ایک واضح تبدیلی نظر آتی ہے۔ یہ مغرب سے مشرق کی طرف چل پڑا ہے۔ مغرب کا عالم یہ ہے کہ یہ اڑی اڑی سی رنگت، یہ کھلے کھلے سے گیسو، تری صبح کہہ رہی ہے تیری رات کا فسانہ اور مشرق آخر مشرق ہے۔

ان مشرقی ممالک میں اسلامی ممالک شامل نہیں۔ اگر ہم بہت کوشش کریں تو ترکی، ملائیشیا یا انڈونیشیا کا نام لے سکتے ہیں۔ جنکی معیشت بہتر حالت میں ہے۔ ان میں سے ترکی نسبتاً  مضبوط ہے اور بہتر مستقبل کی طرف دیکھتا ہے۔

پاکستان کے دگرگوں سیاسی حالات اور حکمرانوں کی عدم دلچسپی نے سرمایہ کاروں کا اعتماد ختم کیا ہے۔ ایک طرف بجلی کی کمی ہے دوسری طرف شفاف نظام کا رونا۔ بالخصوص کراچی میں کاروبار کو چلانے کے لئے جس اعتماد اور تحفظ کی ضرورت ہوتی ہے وہ پچھلے تین سال میں ناپید ہو گیا ہے۔

 ہمارے سرمایہ کار اپنا سرمایہ تیزی سے ملک سے باہر منتقل کر رہے ہیں جیسے ملائیشیا ۔ سرمائے کی اس منتقلی سے ہمارے ملک میں روزگار کے مواقع کم ہونگے اور مہنگائ مزید بڑھے گی۔ جس سے ایک عام انسان جس کا جینا مرنا اسی زمین سے وابستہ ہے متائثر ہوگا بلکہ ہو رہا ہے۔ اس لئے جب کراچی میں کاروباری استحکام کی بات ہوتی ہے تو یہ دراصل ہر گروہ کی بقاء کی بات ہوتی ہے۔

عالمی کساد بازاری میں، امید کی ایک کرن چین میں سرمایہ کاری ہے۔ چین اس وقت معاشی طور پہ مستحکم ہے ایک ابھرتی ہوئ

نئ معاشی طاقت

۔  میں نگینہ گلی، صدر میں موجود تھی۔ وہاں ایک نگینہ فروش نے بتایا کہ وہ آجکل چین سے نگینے لے کر آ رہا ہے پہلے وہ بنکاک جاتا تھا۔  اس وقت جو چین سے کاروبار کرے وہ فائدے میں ہےاس نے ایک راز مجھ سے شیئر کیا۔ چین چھا رہا ہے۔ انکی تجارتی اور سرمایہ کاری کی پالیسیاں حوصلہ افزاء ہیں۔ ویزہ بھی آسانی سے مل جاتا ہے۔ آپکا پاسپورٹ مہینوں قطار میں نہیں پڑا رہتا۔ چند دن لگتے ہیں۔ آپ وہاں آفس لے سکتے ہیں۔ کمپنی کھول سکتے ہیں۔ بس صرف ایک خرابی ہے پاکستانیوں کو چینی زبان نہیں آتی اور چینی کوئ اور زبان نہیں بول سکتے۔ چینی نہ صرف کاروباری ذہانت رکھتے ہیں بلکہ وہ اس میں خاصے چالاک ہیں۔ اس چالاکی سے نبٹنے کے لئے زبان آنا ضروری ہے۔

آپکو بچپن میں سنی ہوئ وہ کہانیاں یاد ہیں جس کا مرکزی خیال اس نکتے کے گرد گھومتا  ہے کہ زمین کے نیچے دفن خزانے کسی ایک جگہ نہیں رہتے یہ چلتے رہتے ہیں اور آواز دیتے ہیں ہم یہاں ہیں۔ انکی آواز پہ  دھیان دینے والا اور انہیں سمجھنے والا انہیں حاصل کر لیتا ہے۔ یہی حال زمین کے اوپر موجود خزانوں کا ہے۔ سرمایہ وہاں جاتا ہے جہاں مزید سرمایہ ہوتا ہے اور جہاں یہ گردش کی حالت میں رہے۔ مایا کو مایا ملے کر کے لمبے ہاتھ، حرکت میں برکت ہے۔

اب اس سارے قصے سے کیا ہم یہ سمجھیں کہ پاکستان کے صوبے سندھ میں اسی مستقبل کا ویژن رکھتے ہوئے اسے تمام اسکولوں میں سال دو ہزار تیرہ سے چھٹی کلاس سے

لازمی مضمون

کے طور پہ پڑھایا جائے گا۔ یاد رہے اسی کی دہائ میں مرد مومن کے ویژن پہ اسکولوں میں عربی زبان بھی پڑھانے کی کوشش کی گئ تھی۔

  اس حکومتی فیصلے کے بارے میں لوگوں کی رائے مختلف ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ  کیا اسے بھی اسی طرح سکھایا جائے گا جس طرح صوبے میں اردو، انگریزی یا سندھی زبانیں سکھائ جاتی ہیں۔ جو اول تو سکھائ نہیں جاتیں بلکہ پڑھائ جاتی ہیں۔ دوئم جہاں جہاں پڑھائ جاتی ہیں وہاں مقصد امتحان پاس کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے ساری زندگی اردو پڑھنے والوں کو اردو لکھنا پڑھنا نہیں آتی، انگریزی کے چند مضامین اور خطوط یاد ہوتے ہیں اور سندھی رسم الخط سے نقطوں کی وجہ سے آشنائ ہو جاتی ہے۔ یہ سندھی زبان، صوبے کے اسکولوں میں پانچ سال تک لازمی پڑھائ جاتی ہے۔

پھر یہ کہ چینی زبان سکھانے کے لئے اساتذہ کہاں سے آئیں گے۔ حکومتی ذرائع کا کہنا ہے کہ اس کے لئے چین سے اساتذہ لئے جائیں گے۔ اور پاکستان میں بھی اساتذہ کو تربیت دی جائے گی۔ یقیناً ان چینی اساتذہ کوجان کا تحفظ دینے پہ بھی حکومت کو  وسائل خرچ کرنا پڑیں گے۔ ادھرسال بھر کے عرصے میں کیا تربیت کے بعد ایسے ماہر اساتذہ تیار کر لئے جائیں گے جو دوسروں کو زبان سکھانے کے قابل ہوں۔ یہاں کچھ لوگ ہو سکتا ہے کہ کچھ اس قسم کے ڈائیلاگ بولنا چاہیں کہ ہمت کرے انسان تو کیا کام ہے مشکل۔ جس سے میں اپنے ہم وطنوں کی حد تک اتفاق نہیں کرتی۔ جو محض ڈائلاگز بول کر ہر پیچیدہ صورت حال سے باہر نکلنا چاہتے ہیں۔ یوں مسائل اپنی جگہ رہتے ہیں اور کاغذ کے پلندے وزن حاصل کرتے رہتے ہیں۔ یہاں ڈائیلاگز نہیں ٹھوس عمل چاہئیے۔

مزید یہ کہ کیا تمام طالب علموں کے لئے چینی زبان سیکھنے کا کوئ فائدہ واقعی  ہے بھی یا نہیں۔ اسکا جواب میں آپ پہ چھوڑتی ہوں۔

میں اپنے پالیسی سازوں کے شر پسند ذہن سے سوچوں  تو یہ کہتا ہے کہ اس میں بھی سرمائے کی منتقلی کا چکر ہے۔ بس یہ کہ مشرق یا مغرب میں جانے کے بجائے یہ کچھ حکومتی اراکین کی جیب کا رخ کرے گا۔ اور وہ یہ کہہ کر فارغ ہونگے، ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش وقت ہوئے اور چل نکلے۔

8:07 PM

پاکستان, تعلیم, چین, چینی, زبان, سندھ, طاقت, کراچی, مشرق, معاشی, معیشت, مغرب, نائن الیون

محب وطن پاکستانی کے نام

جہاز کے لمبے سفر اکثر سوتے ہوئے گذارتے ہیں۔ رات کا وقت ہو تو باہر دیکھنے کے لئے ہوتا ہی کیا ہے۔ اس لئے اندر دیکھنے کے لئے خاصہ وقت ہوتا ہے۔ وہ بھی اگر آپ جہازی سفر میں نہ سونے کے عارضے میں مبتلا ہوں  تو پھر وقت بچھآ رہتا ہے۔

میں نے جب سفر شروع کیا تو ذوالفقار مرزا جنہیں کھلبل مرزا کہنا زیادہ مناسب لگتا ہے اپنے نئے بیانات سے نہ صرف خود رو کر فارغ ہو چکے تھے بلکہ  پاکستان جیسی ایک بکھری ہوئ قوم کو سمٹ چکے تھے۔ اور اسے ایک نکتہ ء اتحاد دے چکے تھے۔ اس لئے جب کراچی واپس پہنچ کر لوگوں سے ملنے کی فرصت ملی تو ایک کے بعد ایک مریضِ جنگ انہی کا فسانہ سناتا رہا۔

یہ وہی مرزا صاحب ہیں جنہوں نے محض تین چار مہینے پہلے کراچی کے مہاجروں کو بھوکے ننگے کہہ کر ایک بڑے حلقے کی طرف سے داد پائ تھی پھر متحدہ کے احتجاج پہ انکی معذرتی ویڈیو آئ۔ انکی شہرت صرف پاکستان کے متعصب ماحول  کے پسندیدہ جاندار ڈائلاگ اور ان پہ بے مثال ایکٹنگ ہی نہیں۔ بلکہ یہ  بھی ہے کہ وہ اپنی پسماندہ قوم کو با عزت ذریعہ روزگار، دنیا سے لڑنے کے لئے علم یا ہنر دینے کے بجائے اسلحہ دیتے ہیں۔ تین سال میں تین لاکھ اسلحے کے لائسنس انہوں نے شاید انڈیا یا امریکہ سے جنگ کے لئے کراچی میں  عنایت فرمائے۔ کچھ لوگ تو یہ کہتے ہوئے ملے کہ ذوالفقار  بھٹو نے پہلی دفعہ پاکستان توڑنے میں اپنا بہترین حصہ ڈالا اور ذوالفقار مرزا دوسری دفعہ پاکستان کو توڑنے کی طرف کامیابی سے لے جارہے ہیں۔

ایسے میں میری نظر سے ایک اسٹیٹس گذرا کہ کراچی میں لبرل اور سیکولر جماعتوں نے یہ حشر کیا ہے اس وجہ سے قوم لبرلزم اور سیکولیرزم سے نفرت کرتی ہے۔ کراچی ملک کے جنوب میں واقع ہے اور ملک کے شمال میں مذہب پرست جماعتوں نے جو بہشت قائم کی ہے وہ ہمارے بھولے ساتھی کی نظر سے پوشیدہ ہے۔ شاید اس لئے کہ انہوں نے ابھی بہشت جانے کا فیصلہ نہیں کیا ہے۔

کون ہے پاکستان میں لبرل اور سیکولر۔  عوامی نیشنل پارٹی یا پیپلز پارٹی ؟

پاکستان میں جناب صرف دو طاقتیں ہیں ایک قبائلی نظام کی پروردہ اور دوسری غیر قبائلی نظام کی پروردہ۔ ان میں سے اول الذکر اکثریت میں ہے اور موءخر الذکر اپنا ایک بہت کمزور وجود رکھتی ہے۔ جس پہ کبھی لبرلزم کی مہر لگائ جاتی اور کبھی سیکولیرزم کی۔ پاکستان کے ٹوٹ جانے کے بعد یعنی بنگلہ دیش بن جانے کے بعد باقی کے پاکستان کا نام بدلنا چاہئیے تھا۔ لیکن بہر حال اسے ایسے ہی رہنا دیا گیا۔ اس موجودہ پاکستان کی حدوں میں رہنے والی اقوام ایک قبائلی مزاج رکھتی ہیں۔ اسے کبھی مذہبی جماعتیں استعمال کرتی ہیں اور کبھی ان کی سیاسی جماعتیں۔ ان مذہبی جماعتوں یا ان سیاسی جماعتوں کے درپردہ مقاصد ہمیشہ ایک رہتے ہیں اور وہ یہ  کہنظام چند ہاتھوں اور خاندانوں  کے سامنے سر نگوں رہے۔ اور اسکی فلاح کے لئے انہیں کسی کے سامنے جوابدہ نہ ہونا پڑا۔ اس لئے اپنے روئیے میں اے این پی، پیپلز پارٹی یا جمعیت علمائے اسلام کچھ مختلف نہیں۔

کراچی باقی ماندہ ملک سے الگ کیوں لگتا ہے۔ اس لئے کہ یہاں لوگوں کی کثیر تعداد اس طبقے سے تعلق رکھتی ہے جو اس قبائلی نظام پہ یقین نہیں رکھتی بلکہ اس پہ  تنقید کرتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو تقسیم ہندوستان کے بعد سنٹرل انڈیا سے یہاں آکر آباد ہوئے۔ آباد اس لئے ہوئے کہ انہوں نے حدود پاکستان سے باہر آزادی کی جنگ لڑ کر حدود پاکستان کے اندر رہنے والی اقوام کو آزاد ملک کا تحفہ دیا۔ اور اسکے بعد یہ سمجھا کہ اب اس ملک پہ ہمارا بھی حق ہے۔  اپنے اس حق کی راہ ہموار کرنے کے لئے انہوں نے بھی مذہب کا سہارا لیا۔  اسلام ہمارے درمیان تعلق کی  مضبوط وجہ ہے انہوں نے بیان کیا۔ وہ اسلام جو حدود پاکستان میں رہنے والی اقوام کی ترجیح اس وقت نہیں تھا۔ وہ تو اپنے چند سرداروں کی پسند نا پسند دیکھتے تھے۔ جب نیت درست نہ ہو تو کبھی اچھا نتیجہ نہیں نکلتا۔ کم سے کم تریسٹھ سال کے بعد اتنا تو تسلیم کرنا چاہئیے۔

کراچی کا مسئلہ لبرل ، سیکولر یا مذہب نہیں۔ قبائلی اور غیر قبائلی نظام کا ٹکراءو ہے۔

یہ بات عجیب لگتی ہے کہ کراچی سے باہر کے لوگ اپنے تجزئیے کو درست قرار دیتے رہیں اور وہ کبھی کراچی کے اندر رہنے والے اردو اسپیکنگ لوگوں کی بات پہ غور کرنے کو تیار نہ ہو۔ اسکی دو دلچسپ مثالیں میں نے حال میں دیکھیں۔ ایک جاوید چوہدری صاحب کا ایک مضمون کراچی کے بارے میں جو انہوں نے کراچی سے سینکڑوں میل دور بیٹھ کر لکھا جس میں فراہم کی گئ معلومات ایک ایسے ایس ایچ او کی تھیں جو ملتان سے تعلق رکھنے والا محب وطن شخص تھا۔ یہ معلومات اگر کراچی کے اورنگی ٹاءون سے تعلق رکھنے والا اردو اسپیکنگ شخص فراہم کرتا تو انہیں شاید یقین نہیں آتا۔ یا پھر انہوں نے اس قوم کی نفسیات ستعمال کرتے ہوئے ایک ملتانی شخص کی معلومات دیں کہ اگر غیر کراچی ، غیر اردو اسپیکنگ ہوگا تو لوگ اسکی بات پہ زیادہ دھیان دیں گے اور یوں اس پہ میں نے ایک تبصرہ پڑھا جو کچھ اس طرح تھا کہ یقین نہیں آتا مگر کرنا پڑتا ہے۔ یہ تبصرہ کرنے والے بھی بڑے صوبے سے تھے۔ انہیں یقین کی اس منزل تک جاوید چوہدری ہی پہنچا سکتے تھے۔ عنیقہ ناز کراچی والا نہیں۔

جاوید چوہدری صاحب نے اس میں راز یہ کھولا تھا کہ کراچی میں اس وقت اے این پی، پی پی اور ایم کیو ایم کی مافیاز طاقت کی جنگ لڑ رہی ہیں۔ میں اس میں کچھ اور چیزیں اپنے سینیئر صحافی کی معلومات کے لئے ڈالنا پسند کرتی مگر مسئلہ وہی کہ میں ملتان سے تعلق نہیں رکھتی۔

اسکی دوسری دلچسپ مثال میں نے اس وقت دیکھی جب ٹی وی پہ پاکستان میں انسانی حقوق  تنظیم کے چیئر مین جناب اقبال حیدر نے اکشاف کیا کہ کہ ایم کیو ایم روز اول سے ایک فاشسٹ جماعت ہے۔ میں تناءو کے اس ماحول میں ایسے شخص سے ایسے غیر ذمہ دارانہ بیان کی امید نہیں رکھتی جبکہ پاکستان کے بڑے شہر کو لاحق خطرات ملک کی سلامتی کا مسئلہ بن گئے ہوں۔

 تاریخ تو کہتی ہے کہ انیس اسی کی دہائ کے آخیر میں جب ایم کیو ایم کا جنم ہوا تو اس وقت مہاجروں کے طبقے کے بڑے جید دانشوروں ، ادباء ، شعراء اور علماء نے اس میں حصہ لیا اور اسکے لئے کام کیا تو کیا وہ سب فاشزم کے لئے کام کر رہے تھے یعنی اس میں رئیس امروہوی جیسے نام بھی آتے ہیں۔  تو ان سب لوگوں کو کیا اچانک یہ خناس بھا گیا تھآ کہ انکی ایک علیحدہ سیاسی جماعت ہونی چاہئِے۔ وہ سب فاشسٹ بن گئے تھے اور ان میں اگر کوئ محب وطن بچا تو وہ اقبال حیدر جیسے لوگ تھے۔

  اب جاوید چوہدری صاحب پھر کسی نان کراچی ذریعے کو استعمال کرتے ہوئے یہ لکھیں کہ در اصل ایم کیو ایم کو اس وقت زبردست عوامی طاقت حاصل تھی تو پھر کچھ صاحبان کو یقین نہ کرتے ہوئے بھی یقین کرنا پڑے گا۔

سو جاوید چوہدری صاحب ایک نظر اس طرف بھی۔

ایک پروپیگینڈہ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ ہم یعنی کراچی سے بنیادی تعلق نہ رکھنے والے کراچی میں امن اور استحکام چاہتے ہیں۔ میں اسے پروپیگینڈہ ہی سمجھتی ہوں۔ اس میں کوئ سچائ نظر نہیں آتی۔ اس لئے کہ جب مرزا صاحب یہاں کے مہاجروں کو بھوکے ننگے آنے والے لوگ قرار دیتے ہیں تو ان میں سے کوئ انکی تصحیح نہیں کرتا کہ ان بھوکے ننگے لوگوں نے آپکی ابتدائ اکنامکس چلائ تھی ، جب مرزا صاحب امن کمیٹی والوں کو اپنے بچے قرار دیتے ہیں اور انکے یہ لاڈلے شیر شاہ میں جا کر نہتے لوگوں کو فائرنگ کا نشانہ بنا کر زندگی سے محروم کر دیتے ہیں تو بھی وہ فاشسٹ قرار نہیں پاتے۔ حتی کہ خود انکی پارٹی کے نبیل گبول صاحب ایک ٹی وی انٹرویو میں کہتے ہیں کہ اس وقت لیاری میں کم از کم دو ہزار گھروں میں اسلحہ بڑی تعداد میں موجود ہے تب بھی انہیں پاکستان توڑنے کی سازش کرنے والوں میں شامل نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ ایک داد و تحسین کا سلسلہ ہے کہ تھمنے میں نہیں رہا۔ کیوں ایسا ہوتا ہے کہ پشتون رہ نما شاہی سید جب زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ فرماتے ہیں کہ کراچی کا تالا کسی کے پاس بھی ہو اسکی چابی ہمارے پاس ہے۔  کوئ اسکی مذمت نہیں کرتا کہ یہ پاکستان کی توڑنے کی سازش ہے۔ انیس سو چھیاسی اور دو سو گیارہ میں علی گڑھ کالونی اور قصبہ کالونی پہ حملہ کرنے والے فاشسٹ نہیں کہلاتے۔

ایسا فرق کیوں ہے؟

جب ایک زمین کو اپنا ساجھا سمجھنے والے  قبائلی ایک  دوسری زمین سے تعلق رکھنے والےغیر قبائلی سے ٹکراتا ہے تو ایک قبائلی کی ہمدردی دوسرے قبائلی کے لئے ہوتی ہے۔ ایک قبائلی اپنے آپکو اپنی زمین کا زیادہ وفادار سمجھتا ہے، وہ اپنے آپکو زیادہ زمین کا حاکم سمجھتا ہے۔ اس وقت وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اسے کس طرح بنیادی انسانی حقوق سے اسکے رہنما محروم رکھ رہے ہیں۔  اس زمین کے کسی گوشے کی اسے حاکمیت نصیب نہیں ۔ بلکہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ کہیں اس کا قبیلہ طاقت کی اس جنگ میں کم نہ ثابت ہو۔ اس لئے کراچی میں سیکولر کہلانے والی اے این پی کے زیر سایہ مزہبی شدت پسند تحریک طالبان والے بھی ہنسی خوشی رہتے ہیں۔ اس لئے کراچی میں پنجاب کے رہنے والے اپنے قبائلی ساتھی پشتونوں کی ہر کمزوری سے صرف نظر کرتے ہیں، اسی لئے کراچی میں نہ صرف پنجابی پختون اتحاد نامی سیاسی جماعتیں بنتی ہیں بلکہ دہشت کی فضا کو ہموار رکھنے کے لئے پی پی اور اے این پی اتحاد بھی سامنے آتا ہے۔ یعنی بلوچ ، سندھی اور پٹھان اتحاد۔

پھر اسکے بعد لبرل اور سیکولر اور مذہب کا نکتہ اٹھانا کس کھاتے میں۔  ایک قبائلی ملک کے شمالی علاقوں میں مذہبی شدت پسندوں کے فاشزم کو پسندیدگی سے دیکھتا ہے۔ مگر وہی قبائلی ملک کے جنوبی حصوں می نام نہاد سیاسی فاشزم کا شور مچاتا ہے۔

نیت درست نہ ہو تو انجام درست نہیں ہوتا۔ ملک بننے کے تریسٹھ سال بعد بھی اس ملک کی حدوں میں رہنے والی اقوام یہ نہیں سیکھ سکیں۔ اس پہ دعوی ہے حب الوطنی اور غیرت مند ہونے کا۔ جو اپنی شکست سے نہ سیکھ سکے اسے بے غیرت کہا جاتا ہے۔ یقین نہ ہو تو کسی بھی لغت میں اٹھا کر دیکھ لیجئیے۔

جاوید چوہدری یہ بھی کہتے ہیں کہ کراچی بیروت بننے جا رہا ہے۔ ایک دفعہ پھر ان سے معذرت۔ پاکستان ایک لمبے عرصے سے بیروت بن چکا ہے تو کراچی کے بیروت بننے میں کیا مسئلہ۔

کیا کراچی کے حالات درست ہو پائیں گے۔ مستقبل قریب میں اس کا جواب ہے نہیں۔ قبائلی جنگیں سینکڑوں سال جاری رہتی ہیں۔ جب تک اسلحہ سرد نہ پڑ جائے اور لڑنے والے ہاتھ ختم نہ ہو جائیں یا کوئ اور بیرونی طاقت اس سے فائدہ نہ اٹھالے۔

جب تک اسلحہ کچھ قوموں کا زیور قرار پاتا رہے گا۔ ان حالات میں کوئ بہتری نہیں آنے والی۔ اسلحے پہ کون پابندی لگائے گا۔ مذہبی جماعتیں جو جہاد کی پرچاری ہیں یا پی پی اور اے این پی جیسی جماعتیں جنکے ثقافتی پس منظر میں اسلحے کی اہمیت آکسیجن جیسی ہے۔

آج ہی میں نے سنا کہ ٹی وی کے ایک اینکر پرسن نے ایم کیو ایم کے لوگوں کو نتھ بریگیڈ قرار دیا۔ پھر مجھے کسی اور نے یہ قصہ سنایا کہ انیس سو پینسٹھ کی جنگ میں جہاں اور جنگی ترانے مشہور ہوئے وہاں ایک اور گانا بڑا چلا پاکستان میں اور وہ تھا جنگ کھیل نہیں زنانیاں دا۔ معاہدہ ء تاشقند کے وقت ہندوستانی وزیر اعظم شاستری نے اس گانے کو نا پسند قرار دیتے ہوئے اس پہ پابندی لگانے کا مطالبہ کیا۔

نصرت جاوید کے اس کمنٹ پہ پاکستان ہی میں لوگوں نے بڑا جراءت مندانہ فعل کہا۔ کیا آپ نے کبھی ببول میں انگور لگے دیکھے ہیں۔ ایسے  غیر ذمہ دار اور چھچھورے لوگ جب حب الوطنی کا نعرہ لگاتے ہیں تو کس قدر جعلی لگتے ہیں۔ یہ پاکستان کے استحکام کی دعائیں بھی مانگتے ہیں مگر کچھ اور تو چھوڑیں اپنے آپکو نسلی تعصب کے اظہار سے نہیں روک پاتے۔ یہ اس ملک کے باسی ہیں جو اپنی آزادی کے محض پچیس سال بعد دو ٹکڑے ہوا۔ اور اندرا گاندھی نے اس دن کہا کہ آج نظریہ ء پاکستان کو خلیج بنگال میں ڈبو دیا گیا۔

اگر کوئ واقعی کراچی کے حالات بہتر کرنا چاہتا ہے تو اسے سب سے پہلے اپنے اوپر پابندی لگانی ہو گی۔ وقت آگیا ہے کہ ہم اس ملک کے  معاشی استحکام کے لئے کام کریں۔ موجودہ حالات میں اگر ہوش کے ساتھ دیکھیں تو کراچی میں سب سے زیادہ کس کا نقسان ہوا ہے۔ سندھی اور بلوچ اقوام تو ابھی اپنے ہونے نہ ہونے سے واقف نہیں۔ کراچی میں بسنے والے ان چالیس لاکھ پشتونوں کا سب سے زیادہ نقصان ہوا ہے۔ جو تعلیمی سطح پہ کم ترین ہیں، اور معاشی لحاظ سے کمزور۔ وہ یہاں سبزی بیچتے ہیں، چوکیداری کرتے ہیں، مالی بنتے ہیں ، ڈرائیوری کرتے ہیں ان مکی اکثریت روزانہ کی تنخواہ پہ کام کرتی ہے۔ جب کراچی بند ہوتا ہے، جب تندور بند رہتا ہے ، جب بازار میں کاروبار نہیں ہوتا تو سب سے زیادہ اس کمیونٹی کو نقصان ہوتا ہے۔ نسلی تعصب نے ان لوگوں کو کیا دیا ہے۔  ذوالفقار مرزا نے اگر تین سال میں تین لاکھ اسلحے کے لائیسنس دئیے تو کیا یہ لائیسنس سندھی اور بلوچی عوام کی تمام زندگی کا آسرا بن گئے۔ کیا یہ انکی نسلوں کی بقاء کی ضمانت بن گئے۔ یہاں میں ایم کیو ایم کا تذکرہ نہیں کر رہی کہ اسکے ووٹ بینک میں شامل لوگ ایک دفعہ نہیں کئ دفعہ تبدیلی کے عمل سے گذر چکے ہیں۔

اگر نسلی تعصب کو اسی طرح جواں رکھنا ہے تو استحکام پاکستان کو بھول جائیے۔ اور اپنے آپکو محب وطن کہنے سے گریز کریں۔

دوسری طرف یہ کیسے ممکن ہے  کہ ایک سیاسی جماعت کے دہشت گرد تو آپ سے شاباش حاصل کریں اور دوسری جماعت کے دہشت گرد کو آپ فاشسٹ کہیں۔ اگر ایک قوم پہ آپکی پسندیدہ اقوام راکٹ لانچر لے کر حملہ آور ہو جائیں تو لازمی طور پہ وہ قوم مڑ کر کسی فاشسٹ سے ہی مدد لے گی یا آپکی منتیں سماجتیں کرے گی۔ آپ جو کسی ایسے واقعے کے ظہور پانے کے ہی قائل نہیں ہوتے۔

یہ کہنا بھی اب بےکار لگتا ہے کہ یہ سب سیاسی جماعتوں کا کیا دھرا ہے۔  ذوالفقار مرزا یا نصرت جاوید کو شاباش دینے والا منہ ایک عام آدمی کا ہے کسی سیاستداں کا نہیں۔

 یہ کیسے ہو سکتا ہے  کہ وزیرستان میں اسلحہ بنانے کی فیکٹریاں قائم ہوں اور کراچی میں ایک سیاسی جماعت کو فاشسٹ قرار دیا جاتا رہے۔

اگر کوئ شخص اپنے آپکو محب وطن کہتا یا سمجھتا ہے تو اسے غیر قانونی اسلحے کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا چاہئیے۔ اسلحہ رکھنے کا حق صرف فوج کو ہے یا پولیس کو اسکے علاوہ کسی کو نہیں۔

لیکن  میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ کم از کم میری زندگی میں کوئ ایسا قانون بننے والا نہیں اور اگر بن جائے تو کاغذ کی حدوں سے باہر نکلنے والا نہیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ حب الوطنی کے دعوے کرنے والوں میں سے کوئ اسکے لئے نہیں اٹھ کھڑا ہوگا۔

میں نصیحت کرنے کے عمل میں نہیں، نہ خواہش کرنے کی حالت میں۔  میں صبر سے بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرتی ہوں، اس میدان میں جہاں کھیل ، کھلاڑی اور تماش بینوں کے درمیان کچھ زیادہ فرق نہیں۔ اس افراتفری میں، میں احساس خوف سے باہر ہوں۔ اس لئے نہیں کہ میں افتخار عارف کی نظم بارہویں کھلاڑی کا بارہواں کھلاڑی ہوں۔ بلکہ اس لئے کہ اس کھیل کا اختتام میرے کہیں بعد ہے۔ قبائلی جنگیں بڑا خون بہا لیتی ہیں۔ ان میں صرف کسی نامعلوم کا نہیں میرا اور آپکا خون بھی شامل ہوگا۔

6:10 PM

استحکام, پاکستان, دہشت گردی, ذوالفقار بھٹو, ذوالفقار مرزا, کراچی

دوران پرواز

تمہیں اس سے کیا یہ میری زندگی ہے۔ یہ وہ جملہ ہے جو ہم چاہے کتنی ہی بے غرضی اور مہربانی سے زندگی گذاریں ہمیں ایکدن بولنا ہی پڑتا ہے۔ ہماری یہ زندگی جسے ہم یا دوسرے کامیاب سمجھیں یا ناکام۔

ناکام زندگی گذارنے کے طریقوں پہ نجانے کیوں توجہ نہیں دی جاتی۔ کامیاب زندگی گذارنے کے طریقوں پہ دنیا میں خدا جانے کتنی کتابیں اور تحاریر لکھی گئیں۔ زیادہ تر ہاتھوں ہاتھ لی گئیں۔ پُر جوش قارئین انہیں پڑھ کر کہتے ہیں۔ یہ کیا بکواس ہے یہ تو ہمیں پہلے سے معلوم تھا۔ انہیں پہلے سے معلوم ہوتا ہے مگر پھر بھی وہ حسب خواہش کامیابی حاصل نہیں کر پاتے ۔ لکھنے والے کو بھی پہلے سے معلوم ہوتا ہے مگر پھر بھی وہ خاصہ کامیاب رہتا ہے۔ اپنے بتائے ہوئے گروں پہ عمل کر کے نہیں، انہیں لکھ کر۔

خیر۔ میں آجکی

ڈیل کارنیگی

نہیں ہوں۔ اس لئے آگے چند باتیں جو لکھنے جا رہی ہوں ان پہ عمل کرنے سے پہلے مزید چار لوگوں سے مشورہ کر لیجیئے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش نہ کریں کہ ایک ڈیل کارنیگی چار افراد کے برابر ہوتا ہے۔ مجھے ڈیل کارنیگی کا صحیح وزن معلوم نہیں ہے۔

اگر وہ چار لوگ اس پہ عمل نہ کرنے کا مشورہ دیں تو بھی انکی بات ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دینے میں کوئ حرج نہیں کیونکہ انہیں اس سے کیا یہ آپکی زندگی ہے۔ یاد رکھیں مشورہ سب سے کریں مگر کریں وہی جو آپکا دل چاہے۔ ویسے تجربے کی بات ہے کہ اگر آپ یاد نہیں رکھیں گے تو بھی آپ یہی کریں گے۔

 اس تحریر میں پیش کئیے گئے خیالات قطعی طور پہ عام، افراد کے لئے ہیں۔ مجرمانہ جھکاءو رکھنے والے یا ذہنی بیمار اسے پڑھنے سے گریز کریں یہ مفاد عامہ کے لئے کہا جا رہا ہے۔

ہاں تو ، پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ کیجئیے جو آپکا دل چاہے جو آپکو پسند ہو۔ اور اسے اکثر کیجئیے۔ اس میں لوگوں کو دھمکانا، گلی کے نکڑ پہ لڑکیوں پہ سیٹیاں بجانا، بم مارنا اور اس قماش کی دیگر حرکات شامل نہیں۔ اگر ایسا کرنے کا دل بہت زیادہ چاہ رہا ہے تو کرنے سے پہلے لڑکیوں کے والدین یا کسی مافیا سے رابطہ کریں۔

اگر آپکو کوئ چیز یا صوت حال پسند نہیں آرہی تو اسے بدل دیں۔ اسمیں دوسروں کا ایمان، نظریات ، دل، کپڑے اور گھر  ، آپکے والدین اور معاشرہ وغیرہ شامل نہیں۔ کیونکہ ان میں سے اکثر چیزیں آپکی دسترس سے باہر ہیں۔ لیکن آپ اپنی جاب بدل سکتے ہیں، اپنا دل بدل سکتے ہیں۔ اپنا گھر، کپڑے، شوہر، بیوی، شیمپو کا برانڈ یا برش بدل سکتے ہیں بچے نہیں بدل سکتے انکا اسکول بدل سکتے ہیں، مستقبل بدل سکتے ہیں اماں یا ابا بدل سکتے ہیں ۔ بیک وقت دونوں نہیں بدل سکتے۔ حتی کہ اپنا نظریہ بدل سکتے ہیں مگر ایمان نہیں۔ کم از کم دوسروں کو دکھانے کے لئے اسے ویسا ہی رہنے دیں بلکہ اس بارے میں زیادہ سخت ہو جائیں۔

اپنی محبت کو گلیوں ، چوباروں، تعلیمی اداروں میں ڈھونڈھنا بند کر دیں۔ وہ آپکے منتظر ہیں مگر اسی وقت ملیں گے جب آپ وہ کام کریں گے جو آپکو دل سے کرنا پسند ہیں۔ وہ آپکی پسند کے راستے پہ موجود ہیں۔

زندگی کو ہر وقت تجزئیے کے ترازو پہ نہ رکھے رہیں۔ یہ بہت سادہ ہے اور اسکی خوب صورتی سادگی میں ہے۔ دل کو کبھی کبھی تنہا چھوڑنے کو اسی لئے کہتے ہیں۔ جتنا چھانتے ہیں اتنا کرکرا ہوتا ہے۔  بالخصوص جہاں مٹی ہو وہاں اس سے گریز کریں۔

اپنے دل، دماغ اور بازءووں  کو زندگی میں نئ چیزوں کو گلے لگانے کے لئے ہمیشہ تیار رکھیں۔ اس میں صنف مخالف کے انسان شامل نہیں۔

اختلاف سے مت گھبرائیں، اسی میں ہی نئے امکان ہیں اگرکوئ سمجھے۔

لوگوں سے دریافت کریں کہ انکی زندگی میں کون سا خواب انہیں مہمیز رکھتا ہے، پر جوش بناتا  ہے۔ خود وہی خواب  دیکھنے کی ضرورت نہیں اپنے خواب بنئیے اور دوسروں کو اس میں شریک کریں۔ اپنے خواب بیان کرنے سے نہ جھجھکیں۔ یہ آپکو سمت دیتے ہیں اور دوسروں کو حوصلہ۔

سفر کریں، گم ہو جانے سے، کھو جانے سے نہ ڈریں۔ سفر کی سنسنی اور ان دیکھے کو جاننے کا جوش کیا ہوتا ہے اسے جاننے سے محروم نہ رہیں۔ یہ بھی ایک موقع اور تجربہ ہوتا ہے۔  زندگی صرف آپکے متعلق ہی نہیں ان سے بھی تعلق رکھتی ہے جن سے آپ ملتے ہیں جنکے ساتھ آپ زندگی میں نئے امکانات تخلیق کرتے ہیں۔ اس لئے لوگوں سے ملئیے اور زندگی کے نئے پہلو تخلیق کیجئیے۔ سفر کیجئے جیسے ہوا کرتی ہے۔ ہر باریک سوراخ سے گذر جائیں۔ چٹانوں کو چھو ڈالیں اور پانی کو اڑا لے جائیں۔

زندگی میں اکثر چیزیں صرف ایک دفعہ آتی ہیں انہیں ضائع نہ کریں۔ اس لئے جب کوئ موقع ملے اس سے مستفید ہوں۔ کل ہو یا نہ ایک بات ہے اور  یہ کہ کل اسکے ساتھ ہو یا نہ ہودوسری بات۔

زندگی بہت مختصر ہے۔ اپنے خوابوں کے لئے گذارئیے اپنے جنون اور جذبوں کے لئے گذارئیے اس سے پہلے کہ یہ آپکو گذار دے۔ اور اس جنون ، جذبے اور خواب میں گم ہو جانے سے کون روک سکتا ہے یہ زندگی آپکی ہے۔ اڑیں بغیر خوف کے یہ اڑان، نئے آسمانوں اور جہانوں کی طرف لے جائے گی جہاں اس سے پہلے کوئ نہیں گیا ہوگا۔ دکھا دیں ٹھینگا ان سب کو جو اڑنا نہ جانیں۔

یہ ساری تقریر اس وقت بیان کرنے کا مقصد کیا ہے۔ کچھ نہیں صرف یہ کہ یہ گانا سننے کا دل چاہ رہا تھا۔ چاہیں تو آپ سن لیں اور چاہیں تو نہیں۔ ورنہ مجھے اس سے کیا یہ آپکی زندگی ہے۔

8:40 PM

پاکستان, ڈیل کارنیگی، ابھیشک بچن, زندگی, سونم کپور, کراچی, معاشرہ, موسیقی

تکلف بر طرف

کراچی میں حالات اتنے خراب ہیں۔ میں اپنے شوہر صاحب سے  بات کرنا چاہ رہی تھی مگر رابطہ نہ ہو سکا۔ انہیں ای میلز بھیجیں ، جواب ندارد۔ دو دن بعد تنگ آکر  دوبارہ انہیں فون کیا۔

یہاں کینیڈا کی وسعت اتنی ہے کہ ایک ملک میں کئ ٹائم زون ہیں۔ پہلے ہم ٹورنٹو میں تھے تو ٹائم زون الگ تھا۔ جب ہم سسکاچوین پہنچے تو ٹائم زون تبدیل ہو گیا۔ یہ ٹورنٹو سے دو گھنٹے پیچھے ہے۔ جب میں نے فون کیا تو اس وقت یہاں اگرچہ عین دو پہر کا وقت تھا مگر کراچی میں رات کا ایک بج رہا تھا۔

موصوف نے فون اٹھایا تو آواز سے لگ رہا تھا کہ سوتے ہوئے اٹھے ہیں۔ خیریت کے چند جملوں کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔  میزبان پاکستانی خاتون وہیں موجود تھیں۔ کہنے لگیں بڑی جلدی بند کر دیا آپ نے۔ میں نے کہا ہاں، جب میں نے ان سے کہا کہ آپ نے تین دن سے پریشان کیا ہوا ہے۔ ادھر شہر کے حالات اتنے خراب ہیں۔ کم از کم انٹر نیٹ تو جاری حالت میں رکھیں۔ فرمانے لگے، انٹر نیٹ کی لائن خراب ہے۔  آپ نے مجھے رات کو ایک بجے نیند سے جگا کر پریشان کر دیا۔ بس میں نے انکی نیند کا خیال کرتے ہوئے خدا حافظ کر دیا۔

میری میزبان خاتون کہنے لگیں۔ یہ آپ دونوں ایکدوسرے سے کچھ زیادہ ریزروڈ نہیں رہتے۔ میں نے حیران ہو کر انکی طرف دیکھا۔ آپکو یہ شبہ کیوں ہوا؟  جواب ملا، کیونکہ آپ دونوں ایکدوسرے سے آپ کر کے بات کرتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ کیسے نکل سکتا ہے؟ میں نے حیرانی سے دریافت کیا۔

دیکھیں ناں، میں اپنے شوہر کو آپ کہتی ہوں اور وہ مجھے تم کہتے ہیں۔ لیکن آپ دونوں ایکدوسرے کو آپ کہتے ہیں۔ اوہ، مجھے ہنسی آئ۔ ہم نے اپنی شادی کی ابتداء میں کچھ چیزیں طے کی تھیں۔ مثلاً یہ کہ ایکدوسرے کو بہتر ین  اور برابر کے طریقے پہ مخاطب کریں گے اور یہ کہ ایکدوسرے کو ایکدوسرے کے خاندان کے طعنے نہیں دیں گے اور نہ اپنے رشتے داروں کی وجہ سے ایک دوسرے سے لڑائیاں کریں گے۔ ہمیں جب بھی لڑنے کی خواہش ہوئ تو اپنے زور بازو پہ لڑیں گے۔  بس اس وجہ سے لڑنے کی نوبت نہیں آ سکی۔

اب انہیں لازماً ایک اور سوال کرنا چاہئیے تھا کہ پھر آپ دونوں ایکدوسرے سے کیا باتیں کرتے ہیں۔ اور اس طرح تو ثابت ہوتا ہے کہ آپ لوگ ایک دوسرے سے کافی ریزروڈ ہونگے۔ کیونکہ ایک  مشاہدہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے درمیان زیادہ گہرا رشتہ اور تعلق ہوتا ہے جنکے درمیان کی جانے والی غیبت کسی مشترکہ شخص کے بارے میں ہو۔ اپنے اس مشاہدے سے میں دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔

اگر بات سمجھ نہیں آ رہی ہو تو آزما لیجئیے۔ کوئ شخص، جس سے آپکے تعلقات بس یونہی سے چل رہے ہوں۔ اسکے ساتھ کسی دن گپ شپ کریں اور جان بوجھ کر کسی ایسے شخص کی برائیاں شروع کر دیں جو اسے نا پسند ہو۔ بس چند دنوں میں ہی اسکے اور آپکے درمیان تکلفات کی بڑی دیواریں گر جائِں گی۔

 یہ بھی ایک عام سا مشاہدہ ہے کہ پاکستان میں اکثر شوہر حضرات اپنی بیویوں کو تم کہہ کر مخاطب کرتے ہیں جبکہ بیویاں اپنے شوہروں کو آپ کہتی ہیں یا کسی احترام کے نام سے مخاطب کرتی ہیں مثلاً شوہر اگر پی ایچ ڈی ہے یا طب سے تعلق رکھتا ہے تو ڈاکٹر صاحب، انجینیئر ہے تو انجینیئر صاحب جیلر ہے تو جیلر صاحب۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ شوہر کی طرف سے زیادہ قربت اور محبت کی وجہ سے ہے یا بیوی کی طرف سے جھجھک ہے  یا  روایت اور رواج یا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

دوسری طرف نئ نسل کے بیشتر شادی شدہ جوڑے ایسے بھی ہیں۔ جو ایکدوسرے کو تم سے مخاطب کرتے ہوئے بھی ملتے ہیں۔ کیا یہ انکے درمیاں زیادہ قربت کی نشانی ہے۔ ہمم شاید نہیں، کیونکہ لڑتے ہوئے بھی وہ ایکدوسرے کو تم ہی کہتے ہیں بلکہ بعض دفعہ حقارت کے لئے تو سے بھی مخاطب کرتے ہیں۔

میاں بیوی سے ہٹ کر آجکل میں دیکھتی ہوں کہ ہم عمر ٹین ایجر دوست چاہے لڑکے ہوں یا لڑکیاں جب اپنی قربت کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو ایکدوسرے کو تُو سے مخاطب کر کے بڑا خوش ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات تو بے تکلفی میں گالیاں بھی استعمال ہوتی ہیں کہ جیسے گالیاں چاٹ مصالحہ ہیں۔ اور یوں وہ زمانے گئے جب شاعر اپنے محبوب سے شکوہ کرتا نظر اتا تھا کہ یوں ہر بات پہ کہتے ہو کہ تو کیا ہے، تمہی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے۔ آج کا شاعر مسکراتا ہے اور بتاتا ہے کہ پہلے آپ پھر تم ہوئے پھر تُو کا عنواں ہو گئے۔

سو، کیا انداز تخاطب سے لوگوں کے درمیان تعلقات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یا یہ طرز معاشرت اور انسان کے ماحولیاتی رکھ رکھاءو کو ظاہر کرتا ہے۔ ایکدوسرے کو اچھے الفاظ سے مخاطب کرتے ہوئے کیا ہم ایکدوسرے کے قریب نہیں ہو سکتے؟

قومیں آپس میں جب ملتی ہیں تو زبان میں نئے انداز آتے ہیں۔ لیکن زبان کی تہذیب سے ایک قوم کی ذہنی سطح بھی سامنے آتی ہے۔ حضرت علی نے کہا تھا کہ ہر شخص اپنی زبان کے نیچے چھپا ہوتا ہے بولو تاکہ پہچانے جاءو۔ جس لمحے ہم بولنا شروع کرتے ہیں چاہے وہ دنیا کا کوئ اعلی ترین موضوع ہو یا گھٹیا ترین۔ ہماری زبان ہمارے پس منظر کو کھول دیتی ہے۔

لیکن اتنی سنجیدہ اور بھاری  بات سے الگ یہاں اصل بات تو یہ پوچھنی تھی کہ کیا ایکدوسرے کو احترام کے الفاظ سے مخاطب کرنے سے اجنبیت پیدا ہوتی ہے، برقرار ہتی ہے  یا بے تکلف الفاظ استعمال کرنے سے قربت جنم لیتی ہے دل کھل جاتے ہیں۔

8:32 PM

اردو, پاکستان, ٹورنٹو, زبان, سسکاچوین, کینیڈآ, گالیاں, گفتگو, ماحول, معاشرہ

آتشی شہرکے خاک خیالات

سوال یہ ہے کہ کراچی کی آگ کیسے بجھ سکتی ہے۔ میرے نزدیک اسکے چند حل ہیں جو اتنے آسان ہیں جتنا حلوے کا کھانا۔ اس نازک موقع پہ حلوے کی تاریخ میں جانا صحیح نہیں ہے۔ اس لئے آگے چلتے ہیں۔

پہلے مرحلے میں آپ اخبار پڑھنا چھوڑ دیں اور ٹی وی کی خبروں اور ملکی حالات پہ آنے والے شوز سے اجتناب کریں۔ جب زندگی اتنی ہی بے وقعت ہے تو وقت گذارنے کے لئے کھانے کی تراکیب والے چینلز دیکھیں۔ کسی سیانے نے کہا ہے کہ کچھ نہ کھا کر مرنے سے کچھ کھا کر مرنا بہتر ہے۔ اگر اس صورت کا سامنا کرنا ہی پڑ رہا ہے تو لخت جگر کودوسرے جہاں بھیجنے سے پہلے جگر بھوننے کا طریقہ سیکھ لیجئیے۔

بیشترآگ تو اسی سے بجھ جائے گی۔

اگر ابھی بھی نظر آرہی ہے تو  یہ نظر کا فتور ہے۔ کسی ماہر امراض چشم سے رجوع کریں۔ لیکن ماہر امراض چشم سے ملنے کے لئے جانے سے پہلے اپنی تمام اہم چیزوں کے بارے میں وصیت لکھ دیں۔ اہم دستاویزات کے متعلق گھر والوں کو بتا دیں کہ کہاں رکھی ہیں۔ قرضداروں کے نام اور قرض کی مقدار کسی مناسب جگہ لکھ کر رکھ دیں۔ تاکہ آپکے بعد اسے کوئ وصول کر سکے۔

اگر آپ ایک بلاگر ہیں تو اپنا پاس ورڈ کسی قریبی عزیز کو بتا دیں تاکہ بعد ناگہانی اطلاع کے وہ آپکے متعلق اپ ڈیٹ دے سکے۔ گھورئیے نہیں، سو بار چمن اجڑا، سو بار بہار آئ، دنیا کی سڑی رونق تیری یاد نے بڑھائ، شاعر سے معذرت۔

اگر آپ اردو بلاگر ہیں تو اردو سیارہ پہ دعا کے لئے ایک پوسٹ لکھنا نہ بھولئیے گا۔ فیس بک پہ ایک اسٹیٹس کافی ہے۔ ٹوئٹر پہ ٹوئیٹ کرنے سے پرہیز کریں۔ مبادا جو کام گھر سے دس میل دور ہونا ہے وہ گلی کے نکڑ پہ ہو جائے۔

گھر والوں سے کہا سنا معاف کروا لیجئِے۔ اپنے اوپر آیۃ الکرسی کا دم کر لیجئے اور سارے راستے یا حفیظ دوہراتے رہیں۔ مایوسی کفرہے امید رکھیں کہ آپ اپنا چشمہ بنوا کر پہننے کے قابل ہو جائِں گے۔ جس سے آپکو کراچی کی بجھی ہوئ آگ نظر آئے گی۔

اگر آپ مذہبی رجحان رکھتے ہیں تو رمضان کا مقدس مہینہ ہے اعتکاف میں بیٹھ جائیے۔ ابھی تک یہ اطلاع نہیں آئ کہ کسی مسجد سے اغواء کی کوئ واردات ہوئ اور مغوی کسی بوری میں بغیر سر کے پایا گیا۔ اس سے کچھ بد گمانی پالنے والے یہ نہ سمجھیں کہ میں کراچی کے دہشت گردوں کو کوئ نیا خیال دے رہی ہوں۔  آپ مانیں یا نہ مانیں، کراچی میں بحران پیدا کرنے سے پہلے نامعلوم دہشت گرد ہر آئیڈئیے کو خوب اچھی طرح چھان پھٹک چکے ہیں۔ لیکن بے گناہ مرنے پہ آمادہ  افراد اس ساری چھان پھٹک سے ناواقف ہیں اس لئے دہشت گردوں کے ذہن رسا کو پانے تک انہیں اپنے طور پہ یہ ساری مشق کرنی پڑے گی تاکہ اگر مارے جائِں تو کسی گناہ کے عیوض۔

اگر آپ اخبار پڑھنے کی علت سے جان نہیں چھڑانا چاہتے کیونکہ اس میں حکیموں ، ضرورت رشتہ اور ٹیوشن کے اشتہارات بھی آتے ہیں یا آپ ٹی وی کے ٹاک شوز سے منہ نہیں موڑ سکتے کہ اس سے آپکے ہمیشہ کم رہنے والے بلڈ پریشر کو خاصہ افاقہ رہتا ہے تو کراچی کی آگ بجھانے کے لئے روزانہ صبح اٹھ کر دس سرد آہیں بھرا کریں یہ سرد آہیں اگر اجتماع کی صورت بھری جائیں تو زیادہ بارآور ثابت ہونگیں۔آہ بھرتے وقت سب لوگ ایک قطار میں اس طرح بیٹھیں کہ آمنے سامنے نہ ہوں۔ منہ کو گول کھولیں اور اپنے جسم کی ساری ہوا باہر پھینک دیں۔ دس دفعہ اس طرح کرنے کے بعد ایک نعرہ بلند کریں خس کم جہاں پاک۔ اس طریقے پہ دس منٹ تک عمل کریں۔ عمل کے بعد خاموشی سے اپنے اپنے گھر کی راہ لیں۔

اگر آپ دس ایسے عام  افراد جمع کرنے میں کامیاب ہو جائیں جو مختلف قرآنی آیات اور احادیث کے حوالے دئیے بغیر پانچ منٹ تک خاموش رہ سکتے ہوں تو امید ہے اسے کامیابی سے کر پائیں گے۔ ورنہ اس سے پہلے ہی آپکے گھر میں دھے پٹاس شروع ہو جائے گی۔ یہ آگ چاہے بجھے یا نہ بجھے، کچھ اور آتش اگلتے ڈریگون سامنے آجائیں گے۔ آپ اپنی زندگی میں ہی جہنم کے نظارے دیکھ لیں گے۔ اس سے ایمان تو مستحکم ہوتا ہے مگر جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اس وقت ہمارا ممتح نظر کراچی کی آگ ہے جہنم کی نہیں تو اس سے بچنے کی کوشش کریں۔ یاد رکھیں عمل کے دوران خاموش رہنا بے حد ضروری ہے۔

اسکے علاوہ لسی کا جگ بنا کر ہمیشہ اپنے پاس رکھیں۔ ٹاک شوز کے درمیان اسکے ہلکے ہلکے گھونٹ لیتے رہیں۔ ایسے لسوڑے حالات پہ تبادلہ خیال سنتے ہوئے لسی ہی سکون دے سکتی ہے۔

اگر آپ کراچی میں رہتے ہوئے اپنی زندگی کے بارے میں فکرمند ہیں تو یہ جان تو اک دن جانی ہے، اس جاں کے زیاں کا افسوس ہی کیا۔ حق بحقدار رسید۔

اگر آپ کراچی آنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو ہر راہ جو ادھر کو جاتی ہے مقتل سے گذر کر جاتی ہے۔ کہہ کر اپنے اہل خانہ سے امام ضامن بندھوائیں۔ انسان کو ان حالات میں آنے والے خطرات کا مقابلہ کھلی آنکھوں اور  بند زبان سے کرنا چاہئیے۔ مسلسل زیر لب دعا کریں کہ آپکی باری آنے تک 'نامعلوم' قاتل کے بازو درد کرنے لگیں۔

یہ ' نا معلوم ' قاتل بھی فالتو وقت میں مسکراتے ہونگے کہ زمانے بھر میں رسوا ہوں مگر اے وائے نادانی لوگ کتنی معصومیت سے ہمیں نا معلوم کہہ دیتے ہیں۔ ہم سے اچھے تو اردو شعراء کے قاتل ہیں جنکے نام صرف انہیں نہیں ایک زمانے کو معلوم ہیں۔ اس موقع پہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر کراچی کے محکمہ ء پولیس کی دسترس میں شعراء کے قاتل آجائیں تو وہ بھی نامعلوم ہو جائیں گے۔ یہاں معلوم کرنے والی بات صرف ایک ہے اور وہ یہ کراچی پولیس کی لگامیں کسی کے پاس ہیں یا یہ بے لگام ہے۔

یہ تو کچھ اس خاکسار کے ذہن میں آنے والے خاک خیالات تھے۔ اگر آپ انہیں مذاق سمجھتے ہیں تو  یہ اندازہ لگانے میں کوئ تکلف نہیں کہ آپ ہمالیہ کے پہاڑوں سے کراچی پہ ایک نظر ڈال رہے ہیں۔ ذرا دھیان سے عالی جناب، شہر کراچی سطح سمندر سے صرف چوبیس فٹ بلند ہے۔ اور ہمالیہ سے ہزاروں فٹ نیچا ۔

اتنی بلندی سے جب آپ اس شہر کو دیکھتے ہیں تو سوائے حبیب بینک پلازہ  اور کنارے پہ ہلچل مچاتے سمندر کے اور کچھ نظر میں آتا نہیں۔ سڑک پہ چلتے انسان بیٹری سے چلتے کھلونے نظر آتے ہیں اور انکے گھر ماچس کی ڈبیاں۔

خوامخواہ دل چاہتا ہے کہ کھلونے توڑ کر دیکھیں کہ اسکے اندر کیا چیز اسے چلاتی ہے اور ماچس کی ڈبیاں ہلا کر معلوم کریں کہ اس میں تیلیاں ہیں یا خالی ہیں۔ یہاں تیلیوں سے میری وہی مراد ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ ایک شاعر نے اس خظرے سے خبردار کرتے ہوئے کہا ہے کہ آگ سے کھیلنا اچھا نہیں فراز،جل جائوگے تو پھر کس سے فریاد کروگے۔ یہاں فراز سے مراد ہر زید بکر ہے۔

اب اہم سوال یہ ہے کہ کیا آپ سب کو آیۃ الکرسی یاد ہے؟ اور اسکا ترجمہ؟ چلیں اس سے کوئ فرق نہیں پڑتا۔ بڑا وقت ہے یاد کر لیجیئے۔ کیونکہ اگلے الیکشنز تک کراچی کی آگ جواں ہے اور پیہم ہے۔

9:13 PM

پاکستان, تعصب, زبان, فساد, قومیت, کراچی, لسان, معاشرت, معیشت

قبائلی نظام اور معاشی و معاشرتی پسماندگی

سسکاچُوین

،

کینیڈا

کا ایک صوبہ ہے جو کہ

پریری

علاقے میں شامل ہے۔ کینیڈا کے دو اور صوبے اس  علاقے میں شامل ہیں جو

البرٹا

اور

مینی ٹوبا

ہیں۔ اسکے علاوہ کسی حد تک اس میں

برٹش کولمبیا

بھی شامل ہے۔ پریری سے ایک جانور یاد آرہا ہے۔  اسے کہتے ہیں

پریری ڈاگ

۔ لیکن اس پریری علاقے کا اس کتے کے نام کے چوہے نما جانور سے کوئ تعلق نہیں۔

پریری

دراصل ایک گھاس کا نام بھی ہے جو

نارتھ امریکہ

کے بعض علاقوں میں میں بکثرت پائ جاتی ہے یہ علاقے میدانی علاقے ہیں، زراعت کے لئے مناسب۔ لیکن یہاں معدنیات بھی پائ جاتی ہیں۔ البرٹا، کینیڈا کے امیر ترین صوبوں میں شامل ہے اس لئے کہ یہاں تیل جیسی معدنی دولت کے بڑے ذخائر موجود ہیں۔

اس وقت یہ تحریر سسکاچُوین صوبے سے لکھی جارہی ہے اس لئے ہم امیروں کی نہیں غریبوں کی بات کریں گے۔ سسکاچُوین کینیڈا کا ایک غریب صوبہ ہے۔ اتنا غریب ہے کہ ٹورنٹو سے لوگ یہاں آکر رہنا پسند نہیں کرتے۔ اتنا غریب ہے کہ یہاں پہنچ کر آپکو وہ مقامی لوگ اکثرنظر آئیں گے جو کینیڈا کے قدیم باشندے ہیں یعنی

ریڈ انڈیئنز

۔ اتنا غریب ہے کہ کینیڈیئن امیگریشن حاصل کرنے کے بعد اگر آپ یہاں ایک سال گذار لیں تو اپنے پورے خاندان کو کینیڈا بلا سکتے ہیں۔ یہ لالچ

اونٹاریو

صوبہ آپکو نہیں دے گا۔ جہاں

ٹورنٹو

واقع ہے۔

دنیا میں ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے چاہے وہ محبت ہو، نفرت ہو، خوف ہو یا لالچ۔ یہ قیمت ادا کیجئِے یہ جذبات پیدا ہو جائیں گے یہ قیمت ادا کیجئیے یہ جذبات ختم ہو جائیں گے۔ اس طرح ہر چیز کی ایک وجہ بھی ہوتی ہے جو بعض اوقات واضح ہوتی ہے اور بعض اوقات ایسے چھپ جاتی ہے کہ محبت کرنے والے پہ، نفرت کرنے والے پہ، خوف یا لالچ رکھنے والے پہ بھی واضح نہیں ہوتی۔ لیکن سسکاچُوین صوبہ اتنا مشکل نہیں یہاں اسکی وجوہات کے بارے میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس علاقے میں سال کے چھ مہینے شدید سردی رہتی ہے جس میں زیادہ تر وقت یہاں برفباری  ہوتی ہے اس دوران کچھ اگایا نہیں جا سکتا۔ اس قدرتی حالت سے الگ، یہ ان علاقوں میں بھی شامل ہے جہاں ریڈ انڈیئنز سب سے زیادہ آباد ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یوروپ سے کینیڈا ہجرت کرنے والوں نے ان ریڈ انڈیئنز پہ بڑے ظلم ڈھائے اور انہیں اس بیابان علاقے کی طرف دھکیل دیا۔ یہی نہیں انہیں ایسی لتوں میں مبتلا کر دیا جس سے وہ نسل در نسل نجات نہیں پا سکے۔ ان میں سے ایک لت نشہ آور اشیاء کا استعمال ہے۔

 بعض لوگوں کے خیال میں وہ کاہل بھی ہیں اور اپنی حالت تبدیل کرنے کے لئے کچھ نہیں کرتے۔ بعض کا موءقف ہے کہ انہیں جان بوجھ کر پسماندہ رکھا گیا ہے۔ حکومت کی طرف سے انہیں چند نام نہاد سہولتیں دے کر مزید کاہل بنادیا گیا ہے اور ان میں سے کچھ کرنے کی امنگ کو ختم کر دیا گیا۔ بہر حال اطراف میں نظر آنے والے یہ مقامی باشندے دیگر لوگوں کے مقابلے میں پسماندہ سے لگتے ہیں۔

ریڈ انڈیئنز کو انیس سو اسّی کے اوئل  میں سرکاری طور پہ

فرسٹ نیشنز

کا نام دیا گیا۔ فرسٹ نیشنز میں دیگر اقلیتیں بھی شامل ہیں۔ یہ اصطلاح زیادہ مقبول نہ ہو سکی۔ اسکے بجائے لوگوں نے اپنے قبائل کے نام کو اپنی شناخت بنانے پہ ترجیح دی۔

یہ ریڈ انڈیئنز یہاں اس وقت آکر آباد ہوئے جب کولمبس نے امریکہ دریافت کیا اور وہاں کے مقامی باشندوں کو انڈیئنز کہا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ وہ انڈیا پہنچ گیا ہے۔ ان اقوام کے ظلم سے بچنے کے لئے مقامی باشندے کینیڈا کی طرف ہجرت کر گئے۔

یوروپی اقوام نے جب کینیڈا کا رخ کیا تو ابتداً مقامی باشندوں نے ان کا خاصہ ساتھ دیا۔  لیکن ہوا یہ کہ ان یوروپی اقوام نے اٹھارہویں صدی کے دوران یہاں پائے جانے والی ایک قسم کی بھینس جسے بائ سن کہتے ہیں اسکا بے دریغ شکار کیا۔

بائ سن پہ ان مقامی انڈیئنز کا کافی انحصار تھآ۔ وہ نہ صرف اس سے خوراک حاصل کرتے تھے بلکہ اسکی کھال انکے لئے لباس کا ذریعہ تھی۔

اندھا دھند شکار کے نتیجے میں یہ جانور اپنے خاتمے کے قریب پہنچ گیا، اس کا سب سے اندوہناک اثر انڈیئنز پہ ہوا اور انہیں شدید ترین قحط سے گذرنا پڑا جسکے دوران ہزاروں افراد ہلاک ہوئے اور ہزاروں نے نقل مکانی کی۔  اپنی زمینیں چھوڑیں جس پہ وہ کاشت کاری کرتے تھے اس پہ دیگر اقوام نے قبضہ کر لیا۔

یوروپی اقوام جو کہ اس وقت اپنی حکومت بنا چکے تھے اپنے عدالتی طریقے رائج کر چکے تھے انکا اپنا پولیس کا انتظام تھا۔ یہ سارے انتظامات مقامی انتظامات سے بالکل الگ تھے۔ اس طرح مقامی انتظامات تباہی سے دوچار ہوئے دوسری طرف انہوں نےان انڈیئنز  سے کئ معاہدے کئے۔ لیکن اس سے انکی حالت میں کوئ تبدیلی نہیں آ سکی۔ ان معاہدوں سے تنگ آ کربعض قبائل نے ان معاہدوں پہ دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اس ساری صورت حال کے بعد انڈیئنز میں احتجاج پیدا ہوا۔ کئ تحریکیں چلیں، انڈیئنز کو دبانے کے لئے ہر طرح کا نسخہ آزمایا گیا جس میں قتل و غارت گری بھی شامل ہے۔

پھر انہیں ضم کرنے کی کوشش یہ کی گئ کہ یوروپی اقوام کا متعارف کرائ ہوئ ثقافت کو اپنانے کے لئے ان پہ زور ڈالا گیا۔ جسے اب وہ کینڈیئن ثقافت کہتے تھے۔  یوروپی النسل لوگ جو کہ اکثریت میں تھے اس طریقے کو صحیح سمجھتے تھے۔ کیونکہ اپنے آپکو وہ ہر لحاظ سے مقامی انڈیئنز سے برتر خیال کرتے تھے۔

ضم کرنے کی ان کوششوں میں ایک انتہائ درجے کی خراب شکل اس وقت پیدا ہوئ۔ جب ان پر یوروپی نظام رکھنے والےاسکولوں میں تعلیم دینے کے لئے قوت کا استعمال ہوا۔اسکے لئے ایسے اسکول قائم کئے گئَ جہاں ان بچوں کو والدین سے الگ رکھا جاتا تھا۔ مبصرین کے نزدیک یہ ان بچوں میں انڈیئن روح کو ختم کرنے کی کوشش تھی۔

پابندی عائد کی گئ کہ وہ اپنی زبان نہیں بولیں گے بولنے پہ انہیں سزا ملے گی۔ چونکہ یہ اسکول زیادہ تر مختلف چرچز کے زیر انتظام تھے اس لئے ان پہ یہ پابندی بھی لگائ گئ کہ وہ اپنے بنیادی عقیدے پہ عمل نہیں کریں گے۔ ظاہر سی بات ہے کہ  اسے ثقافتی  اور نسلی قتل کہا جائے گا۔

اسکولوں میں مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے طالب علم بڑی تعداد میں جنسی زیادتی کا شکار ہوئے، صفائ کی حالت بہتر نہ ہونے کی وجہ سے ٹی بی جیسا مہلک مرض پھیلا۔ بیسویں صدی کے آغآز میں کینیڈا کو ایک ترقی یافتہ ملک بنانے کے جذبے نے جنم لیا۔ بالآخر انیس سو ساٹھ میں ان اسکولوں کو بند کر دیا گیا۔ سرکاری طور پہ معافی مانگی گئ۔ اور نئے معاہدے ہوئے۔

انیس ساٹھ میں انڈیئنز کو ووٹ دینے کا حق ملا۔ انیس سو انہتر میں انکی امتیازی حیثت کو ختم کر کے انہیں دیگر کینڈیئنز کے ساتھ ضم کرنے کا ایکٹ سامنے آیا۔

اسکے بعد مقامی انڈیئنز کے مختلف قبائل سے مختلف معاہدوں کی لمبی فہرست ہے ۔ مثلاً آج اکیسویں صدی کے کینیڈا میں کیوبک صوبے کی حکومت نے کری قبائل سے معاہدہ کیا  اور صوبے میں ہائڈرو الیکٹرک ذرائع کو استعمال کرنے پہ کیوبک حکومت کری قبیلے کی حکومت کو تین اعشاریہ چار بلین ڈالر ادا کرے گی۔

اس بات پہ مجھے

بلوچستان

کے

قبائلی سردار

یاد آتے ہیں جو حکومت پاکستان سے بلوچستان سے نکلنے والی گیس کی قیمت وصول کرتے ہیں اور اپنے صوبے کی فلاح کے لئے نہیں بلکہ اپنے بچوں اپنی نسل کی فلاح کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اگر اس رقم  کے لین دین میں اونچ نیچ ہو تو وہ اسے بلوچستان کے عوام  سے ظلم قرار دیتے ہیں۔

آجکے کینیڈا میں بھی ان مقامی انڈیئنز یا آجکی زبان میں فرسٹ نیشنز کے مسائل دیگر تمام کینیڈیئنز سے کہیں زیادہ ہیں اور سنگین ہیں۔ یہ شاید ایک لمبے عرصے تک دبائے جانے کا اثر ہے۔ تعلیمی شرح کم اور غربت زیادہ ہےان میں بے روزگاری شرح زیادہ ہے۔ جرائم کی شرح زیادہ ہے، وہ نشہ آور اشیاء کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں۔  مجھے کوئ بتا رہا تھآ کہ برفباری دنوں میں برف میں ملنے والی لاشیں زیادہ تر مقامی انڈیئنز کی ہوتی ہیں جو نشے کی گرمی میں برف میں زیادہ دور تک نکل آتے ہیں اور واپس پہنچنے سے پہلے راستے میں ٹھنڈ کی وجہ سے مر جاتے ہیں۔

حالت حمل میں الکوحل کے استعمال

کی وجہ سے پیدا ہونے والے ذہنی اور جسمانی لحاظ سے پسماندہ  بچوں کی تعداد ان میں کہیں زیادہ ہے۔  اسکے ساتھ خودکشی کا رجحان زیادہ ہے جبکہ جنسی زیادتی کی شرح بھی زیادہ ہے۔

انکا عرصہ ء حیات بھی دیگر کینیڈیئنز کے مقابلے میں کم ہے۔ مردوں میں یہ تقریباً آٹھ سال کم ہے جبکہ خواتین میں ساڑھے پانچ سال کم ہے۔

ان مقامی انڈیئنز کے گینگز اب ایک اور سنگین مسئلہ بنتے جا رہے ہیں۔ جو جرائم میں ملوث ہوتے ہیں۔ یہ غربت کی وجہ سے جنم لیتے ہیں۔ یہ گینگز زیادہ تر ونی پگ اور مینیٹوبا میں پائے جاتے ہیں۔

اس تمام صورت کی وجہ یہ خیال کی جاتی ہے کہ لا محدود قسم کے اختیارات قبائلی سردار کے پاس ہونے کی وجہ سے وسائل صحیح طور پہ استعمال نہیں ہو پاتے۔ کیا خیال ہے یہی صورت ہمارے  ملک کی نہیں جہاں نظریات کچھ بھی ہوں، عملی طور پہ قبائلی سرداری نظام نافذ ہے ؟

میں نے سسکاچُوین میں کیا کیا؟ یہ جاننے کے لئے اگلی تحریروں کے منتظر رہئیے۔ خدا حافظ  پاکستان۔

Saskatchewn

Alberta

Manitoba

Quebec

Tribal system

10:34 PM

بلوچستان, پاکستان, پسماندگی, ثقافت, سسکاچوین, فرسٹ نیشنز, قبائلی نظام, قبیلے, کینیڈا, معاشرہ, معیشت

جشن آزادی کے نام

چھنّو خالہ کی آنکھ میں ہی نشہ نہیں باتوں اور اداءووں میں بھی ایک نشہ ہے۔ وہ اپنی اس طاقت سے واقف ہیں۔ اور اسے جتانے کا کوئ موقع جانے نہیں دیتیں۔ اگر ایسا کوئ موقع کچھ دنوں تک نہ ملے تو موقع ایجاد کر لیتی ہیں وہ اچھی طرح سمجھتی ہیں  کہ مستقبل کی درست پیشن گوئ کرنے کا درست طریقہ یہ ہے کہ اسے خود ڈیزائین کیا جائے۔

چھنّو خالہ کی سالگرہ آنے والی تھی۔ لیکن سالگرہ سے دو ہفتے پہلے پتہ چلا کہ انہیں تو فوری طور پہ ملک سے باہر جانا ہے۔ اس لئے انہوں نے مستقبل کی ڈیزائیننگ میں تبدیلی کی اور اعلان کیا کہ وہ اپنی سالگرہ دیار غیر میں اکیلے گذارنے کے بجائے دو ہفتے پہلے گھر والوں کے ساتھ منائیں گی۔ یہ سنتے ہی گھر کے ایک سال سے پانچ سال کے بچوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئ اور وہجذبہ پیدا ہو گیا جسکے آگے کوئ چاکلیٹ اور کوئ آئس کریم بند نہیں باندھ سکتی تھی۔

بچوں کی اس خوشی کی صحیح وجہ  معلوم کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔ لیکن کچھ اندازے ہیں۔ مثلاً اس عمر کے بچوں کو ہر ہنگامے سے دلچسپی ہوتی ہے چاہے وہ سالگرہ کا ہو یا برسی کا۔ شاید بچے ااس چیز کا بہتر ادراک رکھتے ہیں کہ ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق، نوحہ ء غم نہ سہی نغمہ ء شادی ہی سہی۔

اپنی سالگرہ والے دن چھنو خالہ تو صبح صبح آفس روانہ ہو گئیں جب انکی عوام ابھی سو ہی رہی تھی اس وارننگ کے ساتھ کہ شام کو گھر میں سب تیار رہیں۔ ادھر سارا دن گھر میں بچوں کی یہ ٹولی طوفان اٹھائے رہی۔ بڑے بھی انکی اس سرگرمی میں شامل ہونے پہ مجبور رہے۔ یہ ٹولی ہر تھوڑی دیر بعد ہیپی برتھ ڈے کا گانا گاتی اور چھنو خالہ کو ایک عظیم تحفہ دینے کے بارے میں بآواز بلند سوچتی رہی۔ گھر میں بہت سارے ردی کاغذ پھیل گئے جن پہ بچوں کے بقول چھنو خالہ بنائ جا رہی تھیں۔ انہیں  تصاویر میں سے کچھ بچوں نے اتفاق رائے سے منظور کر لیں۔ اس منظوری اور اس پہ اتفاق رائے کی وجوہات ، کائنات کے آغاز جیسے مسئلے کی طرح نا معلوم ہیں۔

شام کو جب چھنو خالہ نے گھر میں قدم رکھا تو بچوں نے انکا پر جوش خیر مقدم کیا۔ انکے کمرے کے باہر عوام کا ہجوم  کھڑا تھآ صرف اس لئے کہ جب چھنو خالہ تیار ہو کر اپنے کمرے سے باہر نکلیں تو وہ واءو کہہ سکے۔اگر ایشوریا رائے یہ منظر  دیکھ لیتی تو اس کا سارا غرور حسن خاک میں مل جاتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بچے یہ چیز جانتے ہیں کہ ترجیحات کا تعین کیسے کیا جاتا ہے۔ یہ عنصر بڑے ہونے کے ساتھ اکثر بچوں میں سے کیسے غائب ہو جاتا ہے؟

خالہ کے سولہ سنگھار کر کے باہر برآمد ہونے پہ ایک بچی نے بے تاب ہو کر کہا کہ اس نے انکے لئے ایک شاندار تحفہ بنایا ہے پھر اس نے اپنے اسکول بیگ سے ایک مرا تڑا کاغذ نکال کر اسے سیدھا کیا اور بغیر کسی جھجھک کے انکے حضور پیش کر دیا۔

اس پہ ایک گول دائرہ بنا ہوا تھا۔ اس میں دو نکتے اور ایک قوس موجود تھی اور اسکے اوپر چار لکیریں  نیچے ایک مستطیل اور اس مستظیل سے ملی ہوئیں دو مزید لکیریں تھیں۔ ویسے تو آپ ان ہدایات پہ خود بھی مصوری شروع کر سکتے ہیں۔ حسینوں سے ملاقات کے لئے کسی زمانے میں مصوری آزمودہ سمجھی جاتی رہی ہے۔ یہ اس زمانے کا کمال ہے کہ ہر ایرا غیرا بلا کوئ ہنر پیدا کئے کسی حسین سے ملنا چاہتا ہے۔ بہر حال، چھنو خالہ کا اس سے زیادہ خوبصورت پورٹریٹ کبھی کسی نے نہ بنایا تھا۔ کچھ سادہ بچے بڑے ہو کر بھی انسان بننے کا عمل اتنا ہی آسان سمجھتے ہیں۔

فرط خوشی سے چھنو خالہ کی باچھیں کھلی ہوئ تھیں۔  سالگرہ کے لئے مہمان آنا شروع ہو گئے تھے کہ چھنو خالہ کو خیال آیا کہ وہ سالگرہ کی سجاوٹ کے لئے ایک بڑا سا غبارہ لائیں تھیں جس  پہ خوبصورت رنگ ، نقش و نگارکے ساتھ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو لکھا ہوا تھا۔ انہوں نے یہ غبارہ لا کر تقریب کے کمرے کے ایک کونے میں وزن کے ساتھ ٹکا دیا۔

غبارے کو دیکھتے ہی کمرے کی فضا تبدیل ہو گئ۔  بچوں میں ایک بھنبھناہٹ دوڑ گئ۔ یہ غبارہ کس کا ہے۔ دفعتاً ، ایک بچے نے اسکی ڈوری کو پکڑا اور جرائت رندانہ کا مظاہرہ کیا۔ یہ میرا ہے، دوسرے نے کہا یہ میرا تیسرے بچے نے اسے رستم کی بے خوفی سے اٹھایا اور دوڑ لگا دی۔ جو بچے بھاگ سکتے تھے وہ اس بچے کے پیچھے بھاگے باقیوں نے رونا دھونا شروع کر دیا۔ وہ غبارہ مجھے چاہئیے۔

گھر والوں میں سے کچھ نے غبارہ دیکھتے ہی اس آنے والےلمحے کے متعلق جان لیا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ خود چھنو خالہ پہ اس وقت کائینات کے کئ عظیم راز چشم زدن میں وا ہوئے۔ مگر اب پچھتائے کیا ہوت۔ ان بچوں میں اس غیر ارتقائ تبدیلی کو  پہلے اشاروں سے قابو کرنے کی کوشش کی گئ، پھر پیار سے کہ اپنا مارتا ہے تو بھی دھوپ مارتا ہے، پھر کچھ بچوں کو موقع سے اٹھا کر ٹائم آءوٹ کر دیا گیا آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ طبیعت الگ بےزار کہ ساری تقریب میں کبھی ایک کبھی دوسرے بچے کو چپ کراتے رہے۔  چھنو خالہ نے خود اس لمحے کو کوسا جب انہوں نے وہ غبارہ خریدا تھا۔ آخیر میں اس غبارے کو ایک الماری میں بند کر دیا گیا۔

مختلف کمروں سے والدین کی پھٹکاروں اور بچوں کے احتجاج کی آوازیں آرہی ہیں۔ غبارہ ایک الماری میں بند ہے۔ میں  بچا ہوا کیک اڑا رہی ہوں۔ اور سوچ رہی ہوں، سارا دن مل جل کر  گانا گانے والے اور زورو شور سے  سالگرہ منانے والے  بچوں کو کس بات نے مصیبت میں ڈال دیا۔

independence day

freedom celebrations

freedom movement

intelligent planning

designing future

6:12 PM

پاکستان, ترقی, جشن آزادی, چودہ اگست, سیاست, قومیت, لالچ، طاقت

چوہے کا سوال

چوہوں کے ساتھ ریس میں ایک نقصان ہے اور وہ یہ کہ اگر آپ فاتح ہوں تو بھی ایک چوہے ہی ہوتے ہیں۔

یہ جملہ کہنے والا لگتا ہے کہ چوہوں کے ساتھ ریس لگانے سے منع کرنا چاہتا ہے۔ سو اب چوہوں کے ساتھ ریس لگانا ضروری ٹہرا۔ سوال یہاں اس منادی کی وجہ معلوم کرنا نہیں۔ اگر ہم یہ کریں گے تو نتیجتاً ایک دفعہ پھر معتوب ٹہریں گے کہ مخلوقات میں سے کچھ کو اعلی اور کچھ کو کمتر جانتے ہیں۔  اس لئے ہم ایک براہ راست سوال رکھتے ہیں آخر چوہا اتنا حقیر کیوں جانا جاتا ہے؟

  کچھ لوگ سادہ سا جواب دیں گے اس لئے کہ اسکا دل اتنا سا ہوتا ہے ذرا سا ہش کرو اور بھاگ جاتا ہے, ہونہہ چوہے کا سا دل۔ لیکن یہ کہتے وقت لوگ اسکی پھرتی کو مد نظر نہیں رکھتے۔  داد دینے سے مت چوکیں۔ اتنی پھرتی تو بس آپکی حرکات منعکسہ میں ہی ہو سکتی ہے آپ میں نہیں۔

کیا آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ چوہا بھاگتا نہیں ہے بلکہ چھپ جاتا ہے اور جیسے ہی آپکی توجہ ہٹتی دیکھتا ہے فورا آموجود ہوتا ہے۔ اس سے لگتا ہے کہ چوہے کے اندر ایک دفاعی ذہانت پائ جاتی ہے۔ وہ گوریلا جنگ لڑنے کے فن سے واقف ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ انسان نے گوریلا جنگ کا فن چوہے سے سیکھا ہو مگر چوہوں کو ادنی مخلوق سمجھتے ہوئے اس کا کریڈٹ اسے دینے کے بجائے گوریلے کو دے دیا۔ اس سے انسانی ذہن کی چلتر بازی سامنے آتی ہے کہ اس نے اپنی ہم شکل مخلوق کو ترجیح دی۔ اس انسانی ادا پہ ہم واہ واہ کریں گے مگر اس سے چوہوں کی جو حق تلفی ہوئ ہے اس پہ ہم نالاں بھی ہیں۔

کیا ایسا معاشرہ ممکن ہے جہاں انسان چوہے کے حق میں آواز بلند کر سکے اس کے ساتھ جو نا انصافی ہوئ ہے اسے سامنے لا سکیں۔ شاید نہیں، کیونکہ خود چوہوں کو اس سے کوئ دلچسپی نہیں۔ انسان اگر انکے لئے لڑ لڑ کر مر جائے تو بھی چوہے اسے در خور اعتناء نہیں سمجھیں گے۔ آیا یہ انکا طرز تغافل ہے یا ادائے بے نیازی۔ یہ جاننے کے لئے دو قسم کے شاعر چاہئیے ہونگے ایک انقلابی اور دوسرے رومانی۔

کیا چوہوں کو شاعری سے دلچسپی ہوتی ہے۔ یہ مجھے نہیں معلوم لیکن چوہوں کو موسیقی سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت وہ کہانی ہے جس میں جادوگر اپنی بانسری بجاتا چلا جاتا ہے اور چوہے اسکے پیچھے ناچتے، کودتے، اچھلتے اتنے مست جاتے ہیں کہ انہیں اپنا انجام تک نظر نہیں آتا۔ موسیقی کے لئے چوہوں کی ان خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

یہاں پہ کچھ ذہن یہ کہنا چاہیں گے کہ وہ بانسری دراصل جادگر کی بانسری تھی۔ تو کیا ہوا، ہوا کرے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ چوہوں نے اس پہ ایک شاندار رقص درویشاں کا مظاہرہ کیا۔ جو جادوگر خود نہیں کر سکتا تھا۔ جس سے متائثر ہو کر ایک شہر کے لوگوں نے اپنے بچے بھی اسی جادوگر کے حوالے کر دئیے۔ جادو گر نے کبھی ایک لفظ شکرئیے کا بھی نہیں پھُوٹا، انسان ایسا ہی بلا کا احسان فراموش ہوتا ہے اور پھر دوسروں پہ نام دھرتا ہے۔

سو چوہے پپو سالے سے بہتر ہیں وہ ڈانس کر سکتے ہیں۔ پھر بھی انسان انہیں حقیر کیوں سمجھتا ہے۔ شاید اس لئے کہ چوہے خوبصورت نہیں ہوتے۔  کسی انسان نے اس بد صورت بات سے بچنے کے لئے ایک خوبصورت بات کہی کہ خوبصورتی دیکھنے والے کی نظر میں ہوتی ہے۔

کیا چوہوں کو اس بات کی فکر ہے کہ وہ خوبصورت نہیں ہیں۔ بادی النظر میں لگتا ہے کہ ایسا نہیں ہیں۔ چوہوں کو کبھی بھی فیئر اینڈ لولی قسم کی کریموں کو استعمال کرتے نہیں دیکھا وہ تو اسے سونگھتے تک نہیں۔ اپنا ایک شریک حیات ڈھونڈھنے کے لئے ہزاروں کو نہیں دیکھتے پھرتے۔ پھر دیکھیں کہ چوہے ایک ایک جھول میں آٹھ آٹھ بچے دیتے ہیں چند مہینوں میں وہ اپنے بچوں کے پر دادا بن جاتے ہیں اور اگر وہ حکمرانی کی طرف توجہ دیں تو چند سال میں انسان کونکال باہر کریں۔  یہ ان کا فقیری انداز ہے جس کی بناء پہ انسان اپنی بھونڈی حکمرانی کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ کیا اب بھی کسی کو شک ہے کہ وہ خوبصورت نہیں۔

چوہے احسان فراموش ہوتے ہیں اور جس چھلنی میں کھاتے ہیں اسی میں سوراخ کرتے ہیں۔ یہ ان پہ ایک سنگین الزام ہے۔ در اصل چوہے کترنے کے معاملے میں ذرا جزباتی واقع ہوئے ہیں۔ کترنے کے عمل کو وہ چیلینج سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ ہر چھلنی انہیں یہ کہتی نظر آتی ہے کہ ہزار دانت سے نکلا ہوں اپنی سختی سے، جسے ہو زعم آئے کتر لے مجھے۔

انکی نفسیات کا یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ جنگل کے بادشاہ شیر کو بھی اسکا جال کتر کر آزاد کروالیتے ہیں مگر اس پہ احسان نہیں دھرتے۔ کبھی آپ نے سنا کہ چوہوں نے شیر کے اوپر بموں سے حملہ کیا ہو کہ ابے سالے تجھے آزاد کرایا تھا اور آج ہم پہ دھاڑ رہا ہے۔ چوہے سالے کی حقیقت سے واقف ہیں۔

دنیا کی کسی مذہبی کتاب میں شاید ہی چوہوں کے بارے میں کوئ تذکرہ موجود ہو۔ دنیا کا کوئ مذہب چوہوں کے بارے میں فکر مند نہیں اسی لئے چوہے بھی اپنے بارے میں زیادہ فکرمند نہیں انہیں مل جائے تو ریشم کے کپڑوں میں اور بیکریوں کے من و سلوی میں بھی رہ لیتے ہیں نہیں تو غلاظت کے گٹر بھی کوئ بری جگہ نہیں۔ دما دم مست قلندر۔

لیکن انسانی زبانی اور سینہ بہ سینہ چلی آنے والی تاریخ میں چوہوں کے متعلق کچھ واقعات موجود ہیں جن میں سے زیادہ تر میں انکی توہین کی گئ ہے۔ یہ بڑی زیادتی ہے کہ کسی کے دانتوں کا بدلہ اسکی عزت سے لیا جائے۔ چوہوں نے اس توہین کا بدلہ لیا  اور ہیضے کے جراثیمی ہتھیار کے ساتھ انسانوں پہ حملہ آور ہوئے۔ پوری پوری آبادیوں کو نگل لیا۔ اور انسان کچھ نہ کر سکا۔ بقاء کی جنگ میں چوہا انسان پہ بھاری رہا مگر پھر بھی چوہا کہلایا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اس کا نام ہی چوہا ہے۔

تاریخ کے اس مرحلے پہ انسان نے چوہوں سے

کثیر الہلاکتی ہتھیاروں

کا تصور لیا لیکن چوہوں کی نفسیاتی برتری دیکھئیے کہ انسان یہ ہتھیار انسان کے خلاف تو استعمال کر سکا مگر کبھی چوہوں کے خلاف نہیں کر سکا، انہیں مارنے کے لئے اسے وہی روٹی کا لالچ دینا پڑتا ہے۔ روٹی چوہوں کی سب سے بڑی کمزوری ہے اور اگر روٹی نہ ہو تو وہ کیک بھی شوق سے کھالیتے ہیں لیکن کبھی کیک دینے والے ہاتھوں کو چاٹتے نہیں ہمیشہ کترتے ہیں۔

بعض خواتین چوہوں سے بڑا ڈرتی ہیں۔ چوہے بھی ایسی خواتین سے بہت ڈرتے ہیں۔ سو جب وہ ڈر کر ایک نعرہ ء خوف ہائے اللہ لگا کر ریس لگاتی ہیں  تو چوہے استغفراللہ کہہ کر ریس لگا دیتے ہیں۔ یہ ریس عام طور پہ مخالف سمتوں میں ہوتی ہے اس لئے اسکا صحیح فیصلہ کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ کبھی کبھی چوہے اس آسمانی مصیبت سے اتنا گھبرا جاتے ہیں کہ بجائے مخالف سمت بھاگنے کے خاتون پہ ہی چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ اس اقدام قتل میں اگر وہ بچ بھی جائیں تو گھر کی کچھ چیزیں دو چوہوں کے درمیان کچومر بن جاتی ہیں۔ محلے والے الگ سمجھتے ہیں کہ میاں صاحب ، بیگم صاحبہ کی کُٹ لگا رہے ہیں۔ یوں میاں صاحب کو ہتک عزت اور مختلف این جی اوز سے بچنے کے لئے میدان میں کودنا پڑتا ہے۔ کچھ شوہر حضرات اس موقع کو محلے والوں پہ اپنی دھاک جمانے کے لئے استعمال کرتے ہیں اور شام کے وقت ہجوم دوستاں میں بیگم کی حد سے پرے پرے  چپکے چپکے کہتے ہیں باتوں کے بھوت چوہوں سے مانتے ہیں۔

خیر، ایک خاتون نے چار چوہے مارے اور خاندان بھر نے انکی پیٹھ ٹھونکی۔ جب چوہے سمجھتے ہیں کہ وہ  کسی انسان کا قلع قمع کرچکے تو وہ اپنی خوشی کا اظہار کیسے کرتے ہیں؟  سوچیں، لیکن یہ سوچنے سے پہلے آپکو روحانی طور پہ چوہا بننا پڑے گا اسکے بغیر آپ سمجھ نہیں سکتے کہ چوہا آخر کیا کرے گا۔ کیا کہا، لعنت ہو چوہے کے بارے میں ہم کیوں سوچیں۔ چوہے نے بھی یہی کہا تھا  کہ میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں۔ ششش،  ہشیار باش، چوہا آپکے سیدھے ہاتھ پر موجود ہے اور چوہے نہ صرف ڈھیٹ ہوتے ہیں بلکہ بڑے متجسس بھی۔

نوٹ؛

یہ انٹ شنٹ تحریر ایک چوہے نےای میل کی ہے۔ معمولی ردو بدل کے ساتھ ہم اسے اپنے بلاگ پہ ڈال رہے ہیں یہ دیکھنے کے لئے ہم میں سے کتنے لوگ  چوہوں کی پرواہ کرتے ہیں۔

Reflexive actions

Weapons of mass destruction

Biological weapons

Mouse and rats

9:53 PM

اردو, بلاگنگ, جنگ, چوہے, خواتین, زبان, نفسیات

کرشماتی درخت، آپ کے پاس

میرے بچپن میں ہمارے سامنے والے گھر میں کئی درخت لگے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک درخت کی شاخیں سہرے کی لڑیوں کی طرح جھکی رہتی تھیں۔ اس پہ پھلواری کا موسم آتا تو درخت سفید پھولوں سے لد جاتا یہ پھول آہستہ آہستہ لمبی پھلیوں میں تبدیل ہوجاتے۔ میری ان میں دلچسپی یہیں تک تھی۔

یہ پھلیاں ، اس گھر کے رہنے والے بڑے شوق سے پکاتے اور کھاتے تھے۔ مجھے نجانے کیوں بالکل پسند نہ تھیں۔ میرے گھر میں شاید ہی کبھی پکائ گئ ہوں۔ انہیں نہ کھانے کا مجھے کبھی بھی افسوس نہیں رہا۔ لیکن ابھی کل ہی ایک دوست نے ایک ای میل بھیجی جس میں اس درخت کے بارے میں حیران کن معلومات تھیں۔ شہزاد بسرا کا لکھا ہوا یہ مضمون جس درخت کے بارے میں ہے اسے پاکستان میں

سونجنا یا سہانجنا

کہتے ہیں۔

چونکہ یہ معلومات میرے علم میں پہلے نہ تھیں اور خدا کا شکر ہے کہ مذہب کی طرح سائینس پہ کسی کی اجارہ داری نہیں نہ کسی گروہ کا یہ زور کہ ایک طبقے کے علاوہ کسی کو یہ باتیں سمجھ نہیں آ سکتیں۔ اس لئے میں نے مزید معلومات کے لئے انٹر نیٹ کا سہارا لیا۔

یہ درخت کرشماتی درخت کہلاتا ہے۔ کرشمہ اسکے خواص میں ہے ۔ یہ جنوبی ایشیا اور مشرق بعید کے ممالک میں عام پایا جاتا ہے جبکہ افریقہ کے کچھ ممالک میں بھی ملتا ہے۔

اسکی شہرت کا تاریخی پس منظر سینیگال سے شروع ہوتا ہے جہاں قحط کے زمانے میں چرچ کی طرف سے اسے متعارف کرایا گیا۔ یہاں یہ بات شاید کچھ عجیب لگے کہ ہمارے دینی مدارس اور مساجد تو اس قسم کی کسی سرگرمی میں حصہ نہیں لیتے۔ لیکن دلچسپی کی بات یہ ہے کہ مغرب میں سائینس کے اندر پادریوں کا حصہ بھی شامل ہے۔ انسانوں میں جینیاتی وراثت کا نظریہ پیش کرنے والا سائینسداں

گریگر مینڈل

، ایک پادری تھا۔ اس پہ آپ غور کریں ، میں آگے چلتی ہوں۔

سونجنا کے درخت کا ہر حصہ اپنی اہمیت رکھتا ہے۔ ہر حصے کو غذا کو طور پہ استعمال کیا جا سکتا ہے اور اسکی کاشت بھی بآسانی سخت حالات میں ہو سکتی ہے۔  اس طرح دنیا میں خشک سالی سے پیدا ہونے والی غذائ کمی کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک بہترین انتخاب ہے۔ اسکے غذائ خواص کے بارے میںسینہ بہ سینہ چلی آنے والی اکثر باتیں درست ثابت ہوئیں۔ آجکی دنیا میں اس درخت کے اوپر خاص توجہ دی جا رہی ہے۔

سب سے پہلے ہم اسکے غذائ خواص دیکھ لیتے ہیں۔

اوپر دئیے گئے چارٹ میں اسکے غذائ خواص کے بارے میں دعوے دیکھے جا سکتے ہیں۔

دودھ کے مقابلے میں سترہ گنا زیادہ کیلشیئم موجود ہے لیکن تحقیق کہتی ہے کہ پتوں اور تنے میں پایا جانے والا کیلشیئم، کیلشیئم آگزیلیٹ کی شکل میں ہوتا ہے اورانسانی جسم میں جذب ہونے کے قابل نہیں ہوتا۔ یہ بات ابھی نامعلوم ہے کہ بیان کردہ کیلشیئم میں یہ کیلشیئم شامل ہے یا نہیں۔

اسکے علاوہ دہی کے مقابلے میں نو گنا زیادہ پروٹین ہوتا ہے۔ جانوروں کو جب غذا کے طور پہ استعمال کرایا گیا تو انکے وزن میں بتیس فی صد اضافہ دیکھا گیا جبکہ دودھ میں تینتالیس سے پینسٹھ فی صد اضافہ سامنے آیا۔

گاجر کے مقابلے میں چار گنا زیادہ وٹامن اے پایا جاتا ہے۔

کیلے کے مقابلے میں پندرہ گنا زیادہ پوٹاشیئم پایا جاتا ہے۔

پالک کے مقابلے میں انیس گنا زیادہ فولاد پایا جاتا ہے۔

 اسکے تازہ پتوں کو پالک کی طرح استعمال کیا جا سکتا ہے، پکایا جا سکتا ہے اور خشک کر کے سفوف بنا کر بھی رکھا جا سکتا ہے۔  یعنی سلاد سے لیکر سالن تک بنایا جا سکتا ہے جبکہ سفوف بعض جگہوں پہ سوپ بنانے میں استعمال ہوتا ہے۔ اسکی پھلیاں بھی پکائ جاتی ہیں حتی کہ جڑوں کو بھی غذا کے طور پہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ البتہ جڑوں میں ایک زہریلا الکلائیڈ اسپائروچن پایا جاتا ہے۔ لیکن اسکی مقدار خاصی کم ہوتی ہے اس کے برے اثرات جڑوں کو بہت زیادہ مقدار میں استعمال کرنے سے ہی سامنے آ سکتے ہیں۔

بچوں کو دودھ پلانے والی مائیں اگر اسے اپنی غذا میں شامل رکھیں تو دودھ کی کمی نہیں ہونے پاتی اور وہ صحت بخش ہوتا ہے۔ اس کے لئے انہیں تین بڑے کھانے کے چمچے اسکے پتوں کا سفوف لینا ہوگا۔

دن بھر میں اسکے پتوں کا پچاس گرام سفوف پورے دن کی غذائ ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس طرح جسم میں غذا کے مختلف اجزاء کی کمی نہیں ہو پاتی۔ جس کے لئے گوشت یا پھل جیسی قیمتی اشیائے خوراک استعمال کرنے کی ضرورت نہیں رہتی اور ایک غریب شخص اپنی غذائ ضروریات بآسانی پورا کر سکتا ہے۔

بیجوں سے تیل حاصل کیا جاتا ہے جبکہ تیل نکالنے کے بعد جو بیجوں کی کھلی یا کیک بچ جاتا ہے اسے پانی صاف کرنے کے کام لایا جا سکتا ہے۔

 اسکی انتہائ دلچسپ خوبی اسکی پانی صاف کرنے کی صلاحیت ہے جس سے پاکستان سمیت جنوبی ایشیاء کے دیگر ممالک کے اکثر لوگ ناواقف ہیں۔

پانی صاف کرنے کے لئے بیجوں کو خشک کر کے اسکے چھلکوں کو ہلکا ہلکا کوٹ کر الگ کر لیا جاتا ہے، حاصل ہونے والے سفید مغز کو کوٹ کر اسکا سفوف تیار کیا جاتا ہے۔ اس سفوف کے پچاس گرام سے ایک لٹر پانی صاف کیا جا سکتا ہے۔ پانی صاف کرنے کے لئے سفوف کو پانی میں اچھی طرح ہلائیں اور پھر تھوڑی دیر کے لئے چھوڑ دیں۔ بس پانی صاف۔

پانی صاف کرنے کی ویڈیو حاضر ہے۔

اب جبکہ آپ یہ طریقہ سیکھ چکے ہیں تو آپ کے ذمے دو ذمہ داریاں آتی ہیں۔ اول یہ کہ خود یہ درخت اپنے گھر میں یا باہر لگائیں اور گائوں دیہاتوں میں اسکے درخت لگانے کے لئے لوگوں کو ترغیب دیں۔ دوسرا یہ کہ پینے کا صاف پانی ہمارے ملک کے بنیادی مسائل میں سے ایک ہے۔ اسکے لئے اس ویڈیو کے بیان کئے گئے طریقے سے اپنے اردگرد کے لوگوں کو آگاہ کریں۔

 مجھے تو پانی ابال کر پینا خاصہ جھنجھٹ لگتا ہے لیکن کیا کریں اکیسویں صدی کے پاکستان میں اگر انسان طبقہ ء اشرافیہ سے تعلق نہیں رکھتا تو منرل واٹر پینے کے بجائے پانی ابالتا ہے غریب شخص ابال بھی نہیں سکتا۔ اور ہر سال لاکھوں لوگ پیٹ کے امراض کا شکار ہوتے ہیں۔ اگر انہیں ان بیجوں کا سفوف بنانا سکھا دیا جائے تو کم از کم اس مشکل سے تو انہیں نکالا جا سکتا ہے۔ پتوں کا محفوظ شدہ سفوف خوراک کی تنگی کے زمانے میں استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔

اس درخت کو اگانےکے دو آسان طریقے ہیں پہلا اسکے بیج کے ذریعے اور دوسرا اسکی قلموں کے ذریعے۔ درخت میں پہلے سال پھول آجاتے ہیں دوسرے سال اسکی فصل زیادہ اچھی ہوتی ہے۔ اگر اسے بڑھتا چھوڑ دیں تو یہ دس میٹر تک بلند درخت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اسکی کانٹ چھانٹ کرکے اسے ایک دو میٹر تک اونچا رکھتے ہیں۔ تاکہ سائز اتنا رہے جہاں تک ہاتھ جا سکے۔

سونجنا کے مختلف حصوں کے مختلف طبی اور سائینسی فوائد ہیں جنکی تفصیلات میں ہم اس وقت نہیں جارہے۔ آپ دئیے گئے لنکس پہ دیکھ سکتے ہیں۔

پیسے کمانے والوں نے اس سے بھی فاِئدہ اٹھانے کا سوچ لیا۔ اسکے پتوں کا سفوف کیپسول کی شکل میں بھی دستیاب ہے۔ اسکی مارکیٹنگ کے لئے نیٹ پہ مختلف ویب سائیٹس موجود ہیں۔ قدرت نے ہمارے اس علاقے کو اس درخت کا مسکن چنا ہے تو ہمیں اسکی قدر کرنی چاہئیے۔

Moringa oleifera

silviculture

Spirochin

Alkaloid

Breast feeding

Senegal

Calcium oxalate

لنکس؛

http://www.moringausa.com/

http://moringaforlife.com/

http://www3.sympatico.ca/truegrowth/moringa.html

۔

8:48 PM

Moringa oleifera silviculture, Spirochin, پاکستان, جنوبی ایشیا, خشک سالی, خواتین, درخت, سہانجنا, سونجنا, طب, غذا کی کمی, قحط

چندہ اور ثواب

 کینیڈا میں ایکدن مجھے ای میل ملی کہ رمضان کا مہینہ ہے مجھے یہاں  کمیونٹی افطار میں شریک ہونے کا تجربہ کرنا چاہئیے۔ اس سلسلے میں دو نام دئیے گئے ایک

اثناء

اور دوسرا روائیتی مساجد میں ہونے والے افطار کے اجتماعات۔

حسب عادت ادھر ادھر سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ایک خاندان ابھی تین چار دن پہلے ہی اثناء کے کمیونٹی افطار میں شرکت کر کے آرہا تھا اور انتہائ نالاں تھا۔

اثناء یہاں کینیڈا میں مسلمان کمیونٹی کا ایک ادارہ ہے جس نے اپنے اوپر کچھ ذمہ داریاں لی ہوئ ہیں جو آپ انکی ویب سائیٹ پہ دیکھ سکتے ہیں۔ انکی شاخیں مختلف جگہوں پہ قائم ہیں۔ یہ اپنے انداز میں لبرل سمجھے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اثناء کی طرف سے اسلامی کیلینڈر جاری کیا جاتا ہے۔ جس میں چاند کا حساب جدید سائینسی طریقوں پہ کیا جاتا ہے۔ اور پہلے سے اسکی تاریخ مشتہر کر دی جاتی ہے  یعنی شعبان کے مہینے میں معلوم تھا کہ رمضان کس دن شروع ہونگے۔ افسوس یہاں پشاور کی قاسمی مسجد اور اسکے مولانا صاحبان موجود نہیں۔ ورنہ چاند ہمیشہ ایکدن پہلے ہوتا۔

ہاں تو، انکے نالاں ہونے کی بھی وجوہات تھیں۔ اول انہوں نے کہا کہ وہاں کھانے کے وقت انتہائ افراتفری تھی۔ پاکستانی خواتین سب کی سب اسکارف پہنے ہوئے تھیں۔ اور سب کو نماز سے زیادہ افطار اور کھانے کی چیزوں کی فکر تھی۔ آپکو معلوم ہے یہ سب لوگ یہاں برسوں سے رہ رہے ہیں لیکن کھانے پہ جس طرح ٹوٹ پڑتے ہیں وہ قابل شرمندگی ہوتا ہے۔ کیا پاکستانی ہونا جینز میں چلتا ہے؟ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

دوسرا اہم شکوہ یہ تھا کہ اثناء کو مسلمانوں کی طرف سے چندے کی مد میں ایک ایک شخص ہزاروں لاکھوں ڈالر دیتا ہے اس حساب سے انکے انتظامات انتہائ بے کار تھے۔ آخر یہ لوگ اتنے پیسوں کا کیا کرتے ہیں۔ اگر انہیں افطار کرانے کا طریقہ سیکھنا ہے تو جا کر کراچی کی سڑکوں کو افطار کے وقت دیکھیں کہ لوگ کتنی فیاضی سے اور قرینے سے سڑک کے کنارے دسترخوان سجائے ہوتے ہیں۔ انکی اس بات پہ مجھے رمضان میں سڑک کنارے عوامی افطار یاد آگئے جو اب کراچی کا ایک ثقافتی نشان بنتے جا رہے ہیں۔

اس مقام سے ایک اہم موضوع نے جنم لیا۔ وہ ہیں مساجد اور مدارس کو چندے کی مد میں حاصل ہونے والی خطیر رقومات اور انکا استعمال ہیں۔

ادھر پاکستان میں ہوش سنبھالنے سے اکثر مساجد کو تعمیر ہوتے دیکھتے آرہے ہیں وہ اب تک تعمیر ہو رہی ہیں اور اب تک چندہ چل رہا ہے۔ اکثر مساجد میں چندے کا بکس ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ یہاں کینیڈا میں بھی مساجد میں اور دیگر مذہبی اداروں میں خطیر رقم چندے کے طور پہ جمع کی جاتی ہے۔ لیکن ان تمام اداروں سے یہ حساب کتاب کون رکھتا ہے کہ وہ اس رقم کا کیا کرتے ہیں۔

اچھا، حساب کتاب رکھنا تو ایک موضوع ہے دوسرا موضوع یہ ہے کہ جو لوگ ہزاروں لاکھوں ڈالر ان مدارس اور مساجد کو دیتے ہیں وہ آخر پاکستان میں دیگر شعبوں کے اوپر کیوں خرچ نہیں کرنا چاہتے۔ سمجھ میں آتا ہے یہ سارا ثواب کا پروپیگینڈہ ہے۔ آج اگر کوئ مولانا صاحب حساب کتاب لگا کر بتا دیں کہ ایک شخص کو مستقل روزگار کا ذریعہ مہیا کرنا مسجد یا مدرسے کو چندہ دینے سے زیادہ ثواب رکھتا ہے تو لوگوں کا رجحان اس طرف ہو جائے گا۔ ان لوگوں سے ہٹ کر جو جانتے ہیں ثواب طاعت و زہد ، پر طبیعت ادھر نہیں آتی۔

وطن عزیز میں تو ہم لوگوں کی جہالت کو روتے ہیں۔  ان ترقی یافتہ ممالک کو ہجرت کر جانے والے  لوگوں کی کثیر تعداد اعلی تعلیم یافتہ ہوتی ہے۔ لیکن جب صدقے زکوات اور دیگر پیسوں کو خرچ کرنے کی بات آتی ہے تو معذرت کے ساتھ یہ لوگ بھی کسی ویژن یا دور اندیشی  کا مظاہرہ نہیں کرتے۔

آج کے پاکستان میں ایک عام شخص کو مساجد یا دینی مدارس کی زیادہ ضرورت ہے یا ہسپتال اور اسکولوں کی، بنیادی ہنر سکھانے والے اداروں کی یا حفظان صحت سکھانے والی مہموں کی یا روائیتی روزگار کے طریقوں سے ہٹ کر نئے روزگار کے ذرائع پیدا کرنے کی۔

غیر ممالک میں مقیم پاکستانیوں کو ذرا اس طرف بھی توجہ کرنی چاہئیے۔ آپ  چند لوگ مل کر پاکستان میں ایسے اداروں کی بنیاد رکھ سکتے ہیں جہاں آپ کے پیسے زیادہ بہترین طریقے سے انسانیت کے کام آ سکتے ہیں۔  کسی نے سینکڑوں سال  پہلے کہا تھا کہ پل بنا ، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا۔ آپ لکیر کے فقیر بننے کے بجائے کچھ الگ راستے بنا سکتے ہیں۔ زمانہ آگے نکل آیا ہے۔ ضروریات مختلف ہو گئ ہیں۔ ثواب کمانے میں بھی اگر جدت طرازی آجائے، تخلیق کاری ہو جائے، تو کیا مضائقہ ہے۔ آخر بیرون ملک رہنے سے آپ کو جو ایکسپوژر حاصل ہوتا ہے اسے آپ اپنے پیسے کے ساتھ جوڑ کر کیوں نہیں اس ملک کو دیتے۔

ISNA

ramazan

muslim community

canada

community iftar

10:51 PM

canada, islamic association, isna, افطار, رمضان, روڈ, روزہ, کراچی, کینیڈا

جھوٹ بولے کوا کاٹے

رافعہ میری سینیئر کو لیگ ہیں اور دوست بھی۔ جب تک پاکستان میں رہیں  انکی نظریاتی ہمدردی جماعت اسلامی سے رہی۔ چند سال پیشتر وہ ہجرت کر کے کینیڈا آ گئیں۔ گذشتہ دنوں کینیڈا میں ان سے ملاقات ہوئ۔  یہاں بھی وہ اسکارف اور عبایہ پہنتی

ہیں۔ انکی سترہ سالہ اور چودہ سالہ بیٹی بھی سر پہ اسکارف لیتی ہیں۔

یہاں میں جس پاکستانی سے بھی ملتی ہوں اس سے یہ سوال ضرور کرتی ہوں کہ اسے یہاں کیسا لگتا ہے۔ یہی سوال ان سے بھی پوچھا۔ کہنے لگیں جنت کا تصور بھی کچھ ایسا ہی ہے جیسا ہم یہاں حقیقی زندگی میں دیکھتے ہیں۔ بچوں کو وظیفہ ملتا ہے ہمارے بیشتر اخراجات تو اس سے ہی طے ہو جاتے ہیں۔ اسکے علاوہ شہریوں کے دیگر حقوق ہیں۔ مثلاً اسکول کی تعلیم مفت ہے۔ مجھے آپنے بچوں کی تعلیم پہ نہیں خرچ کرنا پڑتا۔ یونیورسٹی تعلیم کے لئے حکومت قرضے دیتی ہے۔ روزگار نہ ہو تو وظیفہ ملتا ہے۔ گھر میں کوئ بچہ معذور ہو تو بے شمار رعائیتیں ملتی ہیں۔ فلاحی ریاست کا اگر کوئ تصور ہے تو یہ ریاست اس پہ پوری اترتی ہے۔

ہم کام کرتے ہیں مگر زندگی کی دیگر تفریحات کے لئے وقت ملتا ہے۔ اپنے گھر کے سامنے موجود ہرے بھرے ٹیلے کی طرف اشارہ کر کے انہوں نے کہا۔ سردی میں اس پہ برف جمی ہوتی ہے میں اور میرے بچے اس پہ اسکیٹنگ کرتے ہیں۔ یہ

گرمی کا موسم ہے آجکل ہم باقاعدگی سے پارک جاتے ہیں مختلف تفریحی مقامات کے لئے رعائیتی پاسز بھی موجود ہیں۔

اب رمضان آنے والا ہے آپکو تو پاکستان اس موقع پہ بڑا یاد آتا ہوگا۔ رمضان منانے کا لطف تو وہاں پہ ہے۔ میں نے پوچھا۔ انکی بچی کہنے لگی نہیں تو یہاں رمضان زیادہ اچھے ہوتے ہیں۔ ہماری بلڈنگ میں کافی مسلمان ہیں۔ رمضان میں ہم افطاری لے کر مسجد چلے جاتے ہیں۔ وہاں دیگر فیملیز کے ساتھ روزہ افطار کرتے ہیں۔ مسجد میں بھی افطاری کا انتظام ہوتا ہے۔ روزانہ مفت سحری اور افطار ہوتا ہے۔ آخری عشرے میں جاگنے والی راتوں میں محفل شبینہ ہوتا ہے۔ ہم وہیں راتیں

گذارتے ہیں، بڑی رونق رہتی ہے۔

ہاں انہوں نے کہا پاکستان کی ایک چیز بڑی یاد آتی ہے اور وہ رمضان سے پہلے  ، رمضان کی وجہ سے چیزوں کی قمیتوں میں ہوش ربا اضافہ۔ بس یہ یہاں نہیں ہوتا۔  رحمت کی یہ قسم یہاں دستیاب نہیں

پاکستان میں لوگ کہتے ہیں کہ ان مغربی ممالک میں اس وقت تک آپکو قبول نہیں کیا جاتا جب تک آپ ان جیسے نہ ہوجائیں۔ یہاں کینیڈا میں یہ عالم ہے کہ ہجرت کر کے آئے ہوئے مسلمانوں کی تعداد اس قدر بڑھ چکی ہے کہ وہ یہاں اداروں کی پالیسیز پہ اثر انداز ہونے لگے ہیں۔انکی ایک بچی کے اسکول میں تو پچاس فی صد بچے مسلمان ہیں۔ میں نے اسکے اسکول کے کنووکیشن کی تصویر دیکھی اور ناموں سے اندازہ کیا کہ کون کون مسلمان ہیں۔

اسکول ہی نہیں اکثر ادارے ایسے ہیں جہاں مسلمانوں کی بڑی تعداد ہونے کی وجہ سے وہ اپنی پالیسیز میں تبدیلیاں لائے ہیں۔ کینیڈیئن پارلیمنٹ میں مسلمان ممبران موجود ہیں۔

کیلگیری کا تو میئر بھی مسلمان ہے۔

اسکے علاوہ کینیڈا میں بچوں کے اسلامی اسکول الگ سے ہیں جہاں یہاں کا منظور شدہ اسکول کا کورس بھی ہے اور ساتھ میں اسلامیات اور قرآن کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ ٹورنٹو میں ان

اسلامی اسکولوں

کی قابل تذکرہ تعداد موجود ہے۔

اگر صورت حال یہ ہو کہ صرف وہی لوگ رہ پاتے ہوں جو اپنے مذہب اور ثقافت کی قربانی دیتے ہیں تو یہ تبدیلی کیسے ممکن ہے کہ جس جگہ آج سے تیس سال پہلے حلال گوشت ملنا تقریباً نا ممکن تھا وہاں اب یہ بآسانی دستیاب ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ پاکستانی خواتین اور مرد شلوار قمیض میں عوامی جگہوں پہ نظر آجائیں۔ سو، یہ کہانی سنانے والے یا تو ان علاقوں سے واقف نہیں یا پھر جان بوجھ کر ڈنڈی مارتے ہیں۔ یہ جھوٹ کیوں بولنے پہ مجبور ہیں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

میرے سامنے موجود ایک چھبیس ستائیس سالہ نوجوان نے جو اٹھارہ سال کی عمر میں پاکستان سے کینیڈا پہنچا ،  جب بڑے جذبے سے کہا کہ دنیا میں کوئ ملک کینیڈا کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کوئ ایک ایسا ملک ایسا نہیں جہاں اتنی بڑی تعداد میں مختلف قومیتوں اور مذاہب کے لوگ اتنی ہم آہنگی سے رہ رہے ہوں۔ میں اسے رد نہیں کر سکی۔ میں نے اس سے پوچھا یہاں مختلف مذاہب اور قومیتوں کے لوگ بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ پھر بھی ایک ساتھ رہ رہے ہیں۔ پاکستان میں ایک ہی مذہب کے لوگ اکثریت میں ہیں۔ پھر بھی ایسا ممکن کیوں نہیں ہوا؟ اس فخر سے پاکستان میں رہنے والے کیوں محروم ہیں۔

اس نوجوان نے مجھے ایک جانا پہچانا جواب دیا۔ جو پہچان پہ ہے ناز تو پہچان جائیے۔

canada, pakistan, toronto, islam,  culture, islamic school,religion, ramazan, calgary, extremism,

6:07 PM

اسکول, اسلام, پاکستان, ٹورنٹو, خواتین, رمضان, کیلگیری, کینیڈا, مسلمان, میئر

خواب اور حقیقت

زیارت رسول اللہ ایک ایسی دین ہے جسکی کچھ لوگ بڑی خواہش کرتے ہیں۔ اسکے لئے مختلف وظائف بھی ملتے ہیں۔ جنہیں بتانے والے کہتے ہیں کہ یہ بڑے مجرب وظیفے ہیں اور ان سے خواب میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت یقینی ہے۔ اگرچہ میرا حقیر ذہن یہ سمجھ نہیں پاتا کہ جس رسول کے لائے ہوئے دین کی پاسداری ایک شخص کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتا وہ اسکی خواب میں زیارت سے کیوں مشرف ہونا چاہتا ہے.

کسی شخص کی نیکی کے لئے اسکا یہ بیان ہی کافی ہوتا ہے کہ اسے خواب میں رسول اللہ کی زیارت ہوئ۔

یہی نہیں ، ایسے واقعات بھی خبروں میں آتے ہیں جن میں مختلف لوگ رسول اللہ کی خواب میں بشارتوں کے ذریعے دیگر لوگوں کو خوب بے وقوف بناتے ہیں بلکہ بعض اوقات یہ چیز زندگی سے ہاتھ دھونے کا بہانہ بھی بن جاتی ہے۔

زیارت رسول کے بارے میں مختلف بزرگان دین کی روایات ملتی ہیں۔ اور ذہن میں کچھ سوالات ابھرتے ہیں مثلاً یہ روایات کس حد تک درست ہیں۔ جبکہ علماء یہ بھی فرماتے ہیں کہ شیطان ، رسول اللہ کا چہرہ اختیار نہیں کر سکتا اور جو خواب میں انہیں دیکھتا ہے دراصل اس نے حقیقت میں انہیں دیکھآ۔

کچھ دنوں پہلے فریئر ہال ، کراچی میں پرانی کتابوں کے بازار سے گذرتے ہوئے ایک چھوٹی سی کتاب ہاتھ لگی۔ جس کا نام ہے اسلام یا مسلک پرستی۔ یہ مسجد توحید ، کیماڑی، کراچی سے شائع ہوئ۔ اسکے مصنف منور سلطاں کا کہنا ہے کہ انہوں نے مختلف اسلامی فرقوں کا مطالعہ کیا۔ کچھ سے انکی وابستگی بھی رہی۔ سب سے لمبی وابستگی تبلیغی جماعت سے رہی۔ جس پہ وقت ضائع ہونے کا انہیں افسوس بھی ہے بالآخر اپنے ایک تبلیغی رفیق کے مختلف سوالات پوچھنے پر انہوں نے اپنے خیالات کو کتابی شکل میں لانے کا فیصلہ کیا تاکہ بھٹکے ہوئے لوگوں کو صراط مستقیم پہ لا سکیں۔

اس کتاب کے موضوعات دلچسپ ہیں۔ کیونکہ مولوی صاحب نے لکھے ہیں اس لئے انہوں نے دینی انداز میں خوب لتے لئے ہیں۔ ہر مخالف نظرئیے رکھنے والے کی طرح انہیں بھی اندیشہ لا حق ہے کہ انہیں کافر قرار دیا جائے گا مگر یہ اطمینان ہے کہ وہ خدا کے حضور سرخرو ہونگے۔

  کتاب کے اسکین شدہ صفحات حاضر ہیں۔ پڑھئیے اور سوچئیے، اسلام یا مسلک پرستی۔ بہتر طور پہ دیکھنے کے لئے تصاویر پہ کلک کیجئیے۔

9:46 PM

اسلام, تبلیغی جماعت. مذہب, خدا، اللہ, خواب, رسول, زیارت, مسلک پرستی, منور سلطاں

سیاح بلائیں

بنکاک میں ہم دو دن کے لئے تھے۔  یہاں میری دلچسپی جس چیز میں سب سے زیادہ تھی۔ وہ یہاں سے کچھ فاصلے پہ موجودتیرتا ہوا بازار تھا۔ جسے فلوٹنگ مارکیٹ کہتے ہیں۔ صبح ہمیں سات بجے ہوٹل سے نکلنا تھا۔  رات جب ہم سونے کی تیاری کر رہے تھے تو اچانک  کھانے کے بعد مشعل کو الٹی ہو گئ۔   وہ کچھ سست تھی لیکن باقی سب ٹھیک لگ رہا تھا۔ ڈھائ سال کا بچہ سفر سے تھک گیا ہوگا۔

صبح جب ہم گاڑی میں سوار ہونے لگے تو میں نے سوچا کہ  میں اور مشعل رک جاتے ہیں باقی لوگ چلے جائیں۔ لیکن سب کہنے لگے کہ اس میں کرنا کچھ نہیں ہے۔ گاری ایئر کنڈیشنڈ ہے وہ بالکل لیٹ کر جا سکتی ہے۔ اور وہاں بوٹ میں بیٹھے رہنا ہوگا۔ دو پہر تک واپس ہوٹل میں ہونگے۔ سو،  احتیاطاً او آر ایس، الٹی کی دوا اور گلوکوز  اپنے بیک پیک میں ڈالا اور چل دئیے۔

ہمیں وہاں پہنچنے میں دو گھنٹے لگے۔ گاڑی سے اتر کر ایک بوٹ میں بیٹھ گئے۔ یہ ایک نہر ہے جسکے دونوں اطراف گھر موجود ہیں۔ ان گھروں کے درمیان آمدو رفت کشتیوں سے ہوتی ہے۔ اسی پہ ذرا آگے بڑھیں تو کشتیوں میں لوگ دوکانیں سجائے نظر آتے ہیں۔  کسی زمانے میں یہاں واقعی اصلی مارکیٹ موجد تھی وقت کے ساتھ وہ ختم ہو گئ۔ کشتیوں میں یہ دوکانیں دراصل سیاحوں کی کشش کے لئے دوبارہ سجائ گئ ہیں۔ ان سے مقامی باشندوں کودلچسپی نہیں۔

بہر حال، ہم کشتیوں کی اس مارکیٹ سے گذر رہے تھے۔ گرمی خاصی بڑھ چلی تھی۔ ہم نے اپنی اپنی چھتریاں کھول رکھی تھیں۔ اس تیرتی ہوئ مارکیٹ سے گذرتے ہوئے کنارے پہ موجود ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں چائے پینے کا خیال آیا۔ اسی کے ساتھ ایک دوکان تھی جس میں بچوں کے کھلونے اور دیگر اشیاء موجود تھیں۔ میں مشعل کو وہ دکھانے لے گئ۔ چند ایک چیزیں لے کر میں اسکی ادائیگی کی لائن میں تھی کہ میرے ساتھ کھڑی مشعل زمین پہ بیٹھی اورایکدم بے ہوش ہو گئ۔  میں نے جلدی سے جھک کر اسے سیدھا کیا، سر کو جھکایا پھر جلدی سے بیگ سے گلوکوز نکال کر اسکے منہ میں ٹھونسا اور پانی کے قطرے ڈالنے لگی۔

ادھر سے مشعل کے بابا دوڑتے ہوئے آئے اور دوسری طرف ایک تھائ خاتون جلدی سے بھاگتی ہوئ آئ۔ اور کہنے لگی تمہیں ایمبولینس چاہئیے۔ وہ سامنے کھڑی ہے۔ ہم دونوں نے اسے اٹھایا اور ایمبولینس کی طرف دوڑ لگائ۔ یہ دراصل ایک کار تھی۔ ایسی دو کاریں اور یہاں موجود تھیں۔ ایمبولینس میں ڈالتے ہی ڈرائیور نے سائرن آن کیا اور ہم ہسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ ہسپتال پہنچنے میں ہمیں دس منٹ سے بھی کم وقت لگا۔ فوراً ہمیں ایمرجینسی میں لے جایا گیا۔ اس وقت تک مشعل تھوڑی بہتر حالت میں تھی۔ مگر چہرہ اترا ہوا تھا۔

یہ ایمرجینسی سیکشن ایسا تھا، جیسا کہ کراچی کے کسی بہترین پرائیویٹ ہسپتال کا ایمرجینسی یونٹ ہوتا ہے۔ ہر بیڈ کے ساتھ مشینیں اور آلات تھے۔ ماحول صاف ستھرا، نرسیں موجود۔ وہاں انہوں نے اسے ایک بیڈ پہ لٹایا، چیک کیا اور اسے او پی ڈی میں بچوں کے ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا۔

یہ حصہ الگ تھا۔ ہم ایمرجینسی یونٹ سے باہر نکلے اور او پی ڈی کی طرف بڑھے۔ پیچھے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں لی ہوئ چھتری کھولی اور ہمارے سروں پہ سایہ کئے ہوئے او پی ڈی تک لے گیا۔ او پی ڈی کے حصے میں ایئر کنڈیشنڈ کی ٹھنڈک موجود تھی۔ نرسز گلابی یونیفارمز میں موجود تھیں۔ ریسیپشن کے حصے میں تین خواتین اور ایک مرد موجود تھے۔ تینوں خواتین نے اسمارٹ سا گلابی روائیتی تھائ لباس پہنا ہوا تھا۔ اس اسمارٹ لباس کے ساتھ انکے گلوں میں موتیوں کی ایک لڑی اور کانوں میں ہلکے آویزے تھے۔ اپنی روائیتی نرم تھآئ زبان میں انہوں نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ مشعل کی فائل تیار کی۔ ڈاکٹر کا نام دیا۔ اور ہمیں ساتھ موجود ہسپتال کے گائڈ کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا۔ یہاں لوگ تمیز سے بینچ پہ بیٹھے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

دو لوگوں کے بعد ہمیں اندر بلا لیا گیا۔ گلابی یونیفارم اور سفید گاءون میں دلکش مسکراہٹ والی ڈاکٹر نے چیک کیا تمام معلومات لیں اور ہمیں بتایا کہ یہ وائرل انفیکشن ہے۔ ہو سکتا ہے شام تک بخار اور دست بھی آجائیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کوئ اینٹی بائیوٹک نہیں دی جارہی ہے۔ دودھ بند کر دیں۔ نرم غذا کے ساتھ او آر ایس اور الٹی کی دوا دیتے رہیں۔ اگر بخار ہو جائے تو یہ دوا الگ سے ہے۔ اسی وقت شروع کرادیں۔

دوا ہسپتال کی فارمیسی سے ملی۔  دوا مفت تھی۔ یہ ایک پرائیویٹ ہسپتال نہیں بلکہ گورنمنٹ ہسپتال تھا۔ ہم ہسپتال سے نکلے تو گویا مسمرائِزڈ حالت میں تھے۔

تھائ لینڈ کی سب سے بڑی صنعت سیاحت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس سیاحت کی فروغ میں یہاں پیشہ ور خواتین کی آسان  دستیابی اور شراب کی آزادی شامل ہے۔

لیکن اس واقعے سے ایک شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ سیاحت صرف خواتین اور شراب کے سہارے نہیں چل سکتی۔  ایک خاندان جو بچوں کے ساتھ موجود ہو اسکے لئے پیشہ ورخواتین کی دستیابی کیا اہمیت رکھتی ہے۔ آپ نے پڑھا کہ ہسپتال میں ہمارے ساتھ کیسا وی آئ پی سلوک ہوا۔ اسکی وجہ یہ  تھی کہ ہم انکا ذریعہ ء روزگار تھے۔ ذریعہ ء روزگار کی عزت نہ کی جائے تو انسان خود عزت سے محروم ہو جاتا ہے۔

میں دوبارہ اگر تھائ لینڈ جانا چاہوں تو اب مجھے بالکل عار نہ ہوگا۔ وجہ سستی رہائیش، سستا کھانا، سستی اور آسان ٹرانسپورٹ، صحت کے کسی بھی ایمرجینسی مسئلے سے نبٹنے کے لئے ڈاکٹر اور ہسپتال فوراً موجود، عام لوگ معاون و مددگار۔ اور سب سے بڑھکر رات کو بارہ بجے میں اور میری ساتھی خاتون ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتے ہیں بغیر کسی خوف کے۔ راستہ بھول جانے سے کوئ اندیشے لا حق نہیں ہوئے۔ یہ احساس نہیں تھا کہ ابھی کوئ ہاتھ سے پرس چھین کر فرار ہو جائے گا۔ اسلحے کے زور پہ ہر چیز سے محروم ہو جائیں گے۔ اگر خاتون ہیں تو آتے جاتے لوگ دھکے یا ہاتھ ماریں گے، سیٹیاں بجائیں گے، زبان پھیریں گے یا آنکھ ماریں گے، ہجوم والی جگہوں پہ بم پھٹنے کا خیال نہیں۔ احساس تحفظ کے

بغیرسیاحت میں کوئ کشش نہیں پیدا ہو سکتی۔

اپنے ملک کو سیاحت کے لئے مناسب مقام بنانے کا مطلب یہ ہے کہ آپکے ملک میں وہ تمام چیزیں جو آپکوبے حد خوبصورت لگتی ہیں، جنکی تاریخی یا روائیتی اہمیت ہے، جن سے قدرت نے صرف آپکو نوازا ہے انہیں دوسرے ممالک کے باشندوں کے ساتھ شیئر کریں۔ اس شیئرنگ کے  نتیجے میں وہ آپکے ملک میں رہتے ہیں اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے خریداری کرتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں اور جو چیزیں یہاں پسند آتی ہیں وہ یہاں سے خرید کر لے جاتے ہیں۔ ان تمام مراحل پہ وہ پیسے ادا کرتے ہیں۔ اس طرح یہ سیاح  ملک میں پیسہ لے کر آتے ہییں۔ سیاحت کے نتیجے میں مختلف روزگار بھی جنم لیتے ہیں۔ مثلاً سیاح اپنے ساتھ آپکے ملک کی کوئ نہ کوئ نشانی لےجانا چاہتے ہیں یا گھر والوں کے لئے تحفے لے جانا چاہتے ہیں۔ اس طرح سے ان چیزوں کی پیداوار بڑھانا پڑتی ہے۔

 اب اس ملک کی ذہانت  ہے کہ کسطرح اس سیاح سے یہ پیسے خرچ کرواتے ہیں اور کیسے اسے واپس جا کر اس ملک کے لئے مزید سیاح یعنی مزید کاروبار لانے پہ سوچنے پہ مجبور کرتے ہیں۔

خیر سیاحت کے نکتے سے عام سے سوالات ہیں جو آپ چاہیں تو صرف سوچتے رہیں یا چاہیں تو انکا اظہار کریں۔ پاکستان میں وہ کون سی جگہیں ہیں جنہیں آپ سیاحوں کے لئے پر کشش سمجھتے ہیں یا انہیں پر کشش بنایا جا سکتا ہے۔ وہ کون سی پروڈکٹس ہیں جو آپ  سمجھتے ہیں سیاح آپکے ملک سے خریدنا پسند کریں گے۔

10:55 PM

pakistan, tourism, بنکاک, پاکستان, تھائ لینڈ, سیاح, سیاحت, فلوٹنگ مارکیٹ

ایبنارمل تفریح اور ایبنارمل مذاق

پچھلے چند سالوں میں بھیک مانگنے والے جس گروہ میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے وہ ہیجڑوں کا ہے۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے تک شاذ ہی ہیجڑے دیکھنے کو ملتے تھے۔ لیکن اب کراچی کے ہر سگنل پہ پانچ چھ موجود ہوتے ہیں۔ کیا واقعی پاکستان میں زنخوں کی پیدائیش اسی رفتار سے ہو رہی ہے۔

اگر ایسا ہے تو کوئ تحقیق ہونی چاہئیے کہ ہمارے یہاں یہ ابنارمیلیٹی کیوں اتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ پہلے سے موجود تحقیق کہتی ہے کہ  کسی انسان کا قدرتی طور پہ مخنث پیدا ہونا ، اسکی شرح خاصی کم ہے اس سے خاصی کم ہے جتنا کہ ہم اس وقت کراچی کی سڑکوں پہ دیکھتے ہیں۔

اس لئے یہی سمجھا جا سکتا ہے کچھ لوگوں نے اسے بھیک مانگنے کا طریقہ سمجھ لیا ہے۔ اسکے علاوہ جو خیال مزید آتا ہے اور عینی شواہد اسکی تصدیق بھی کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ ان افراد کی بڑی تعداد اس دھندے کی آڑ میں یا توجسم فروشی کا دھندہ کرتی ہے یا پھر مردوں کا دل بہلانے کا کام کرتی ہے۔ ان میں سے ہیجڑوں کا روپ دھارنے والے زیادہ تر لوگ درحقیقت مرد ہوتے ہیں۔ یوں یہ عناصر دراصل ہم جنس پرستی کا حصہ ہیں۔ جو ہمارے معاشرے میں ہمیشہ سے ہی موجود ہے۔

 ہمارے یہاں خواتین کا جسم فروشی کے دھندے میں آنا جتنا برا عمل سمجھا جاتا ہے اتنا ایک مرد کا آنا یا  مخنث کا آنا برا نہیں سمجھا جاتا۔ اسکا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ اگر خواتین کے گروہ اس طرح بن ٹھن کر سر عام اپنے گاہک تلاش کرنے نکل کھڑے ہوں تو اس پہ واویلہ مچ جائے گا۔ کسی آنٹی شمیم کو پکڑنے اور عبرت ناک سزا دینے  کے لئے محلے والے بے  قرار ہونگے۔ مذہبی جماعتیں انکی ہمنوا ہونگیں۔ جبکہ مرد  یا مخنث اپنے آپکو ہم جنسیت کے لئے سر عام پیش کر رہے ہوتے ہیں اور کوئ انہیں لعن طعن تک نہیں کرتا۔ میں اکثر دیکھتی ہوں کہ جب ایک ہیجڑا کسی گاڑی والے سے راز و نیاز کی باتیں کر رہا ہوتا ہے تو دوسرے گاڑی والے مسکراہٹ دبائے ان پہ نظر رکھے ہوتے ہیں۔

آجکل ٹی وی شوز میں بھی ہیجڑوں کے اوپر خاص توجہ ہے۔ ہر تھوڑے دنوں بعد کوئ نہ کوئ ایسا ہی شخص خوب تیار شیار کسی ٹاک شو میں بیٹھا ناز نخروں سے باتیں کر رہا ہوتا ہے اور اینکر پرسن بھی کچھ فلرٹی سے انداز میں انکی معیت کا فائدہ اٹھا رہا ہوتا ہے۔ مجھے یہ خیال آتا ہے کہ اگر اسی طرح کوئ خاتون سولہ سنگھار کئے ناز و ادا سے باتیں کر رہی ہوں تو ہمارے ملک میں کتنی کھلبلی مچے۔

کیا ہمارا مجموعی طرز عمل کچھ ایبنارمل نہیں؟ یعنی جس مخلوق پہ سنگھاراور ادائیں سجتی ہیں اور اسے قدرتی حق حاصل ہے اس کے لئے تو فتوے جاری ہوتے رہیں اور کسی مرد  یا کسی ہیجڑے کے سولہ سنگھار اور ناز و ادا کو پسندیدگی کی سند حاصل ہو جائے۔

 اگر کوئ خاتون بغیر آستین کا بلاءوز اور ساڑھی پہن کر، پوری سج دھج کے ساتھ ، اٹھلا اٹھلا کر ٹی وی  اسکرین پہ کسی کو ڈارلنگ اور کسی کو چندا کہے تو بے حیائ اور یہی کام کوئ ہیجڑا یا مرد کرے تو تفریح۔ ایک ایسی ہی تفریح کی

ویڈیو حاضر ہے۔

خیر، یہ ہمارے معاشرے کی دو رخیت ہے۔  ہماری اس دو رخیت کا فائدہ ہمیشہ سے دوسرے اٹھاتے چلے آئے ہیں۔ اس سلسلے میں تازہ ترین مذاق امریکن سفارت خانے نے اس وقت کیا جب انہوں نے پاکستان کے ہم جنس پرست افراد کے لئے

ایک پارٹی

منعقد کی۔ کچھ لوگ یہ سمجھنے سے قاصرہیں کہ امریکن سفارت خانے  نے اس پارٹی کے انعقاد میں اتنی دلچسپی کیوں لی۔ امریکن سفیر نے اس موقع پہ خطاب کرے ہوئے ہم جنس پرست افراد کے حقوق کی حفاظت کے عزم کا اظہار کیا۔

میں اس پزل کو حل کرنے کی کوشش کرتی ہوں تو بس ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ کہ امریکی سفارت خانے نے اس دفعہ پہلی بار یہ سوچا کہ کوئ کام تو ہمارے عوامی رجحان کے مطابق کرنا چاہئیے۔ سو انہوں نے امریکی انداز میں اس کا اہتمام کر ڈالا۔

ایک  ثبوت کے لئے یہ ویڈیو حاضر ہے۔

۔

اب آپ سے دو  سنجیدہ سے سوال ہیں۔ آپ چاہیں تو اسے غیر سنجیدگی سے لے لیں۔ کیا امریکن سفارت خانے نے ہمیشہ کی طرح پاکستانیوں کو سمجھنے میں غلطی کی؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس سے پاکستان  اور امریکہ کے تعلقات میں بہتری آئے گی؟

﻿

11:12 AM

امریکہ, بیگم نوازش علی, پاکستان, میٹنگ, ہم جنس پرستی, ہیجڑے

بلندی سے

محبوب آپکے قدموں میں ہو تو دنیا قدموں کے نیچے لگتی ہے۔ لیکن اس میں کچھ قباحتیں ہیں۔ مثلاً ایک ایسے عامل کامل کی کھوج لگانا جو محبوب کو ان دیکھی بیڑیوں سے باندھ کر آپکے قدموں میں لے آئے۔ لیکن اس سے پہلے یہ کہ خدا نے آپکو اس جگر کے ساتھ پیدا کیا ہوا جس سے رائج الوقت طریقے سے ہٹ کر آپ کسی سیاستداں کے بجائے کسی انسان سے محبت کر سکیں۔

ایسا ہونا مشکل ہے کیونکہ آئینسٹائین کے نظریہ ء اضافیت کی طرح محبت کا بھی ایک نظریہ اضافیت ہے اور وہ یہ کہ اگر آپ کسی سیاستداں کو محبوب بنانے کے سنگین امتحان سے نکل آئیں تو اس بات کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں کہ آپ خود سیاستداں بن جائیں گے۔ محبت اور سیاست میں کیا تعلق ہے یہ جاننا کچھ مشکل نہیں مگر بتانا آسان نہیں۔

اچھا، میں اس پوسٹ میں نہ محبوب کو قدموں میں لانے کے لئے کوئ وظیفہ بتا رہی ہوں اور نہ سیاست میں جائز اور ناجائز کی حدیں مقرر کر رہی ہوں۔ کیونکہ ہر محبوب کی تسخیر کے لئے ایک علیحدہ وظیفہ چاہئیے ہوتا ہے اور سیاست میں جائز اور ناجائز کی حدیں تو بڑے بڑے مفتی مقرر نہ کر سکے۔ چہ پدی چہ پدی کا شوربہ۔

البتہ دنیا قدموں میں لانے کا ایک آسان طریقہ بتا سکتی ہوں۔ اسکے لئے آپکو کینیڈا کے شہر ٹورنٹو آنا پڑے گا۔ اور یہاں موجود

سی این ٹاور

کے ٹکٹ گھر سے صرف تیس ڈالر یعنی مبلغ ڈھائ ہزار پاکستانی روپوں کا ٹکٹ لینا ہوگا۔ اسکے بعد ٹاور کی بلندی پہ لے جانے والی لفٹ کے لئے ڈیڑھ سے دو گھنٹے قطار میں کھڑا ہونا پڑے گا۔

بس پھر دنیا آپکے قدموں میں ہوگی۔ کم از کم کچھ وقت کے لئے محسوس یہی ہوگا۔

:)

یہ کچھ مہنگا طریقہ ضرور ہے لیکن جان رکھیں کہ ہر آسان طریقہ مہنگا ضرور ہوتا ہے۔ شوق کا تو کوئ مول نہیں ہوتا۔ ہم بھی دو گھنٹے لائن میں کھڑے رہنے کے بعد اس ٹاور کی بلندی پہ پہنچنے کے قابل ہوئے۔ ٹاور اور بلڈنگ میں ایک معمولی سا فرق ہوتا ہے۔ ٹاور کثیر المنزلہ نہیں ہوتا۔ نہ اس میں آفس ہوتے ہیں نہ اپارٹمنٹس نہ شاپنگ مالز نہ کوئ اور کمرشل سرگرمی۔ تین سال پہلے دنیا کے بلند ترین ٹاور کے عہدے سے ہٹائے جانے والا ٹاور محض چھتیس سال پہلے وجود میں آیا۔

اسکی تعمیر میں تقریباً سوا تین سال لگے۔

اسے ہر سال لاکھوں لوگ اسی طرح قطار میں کھڑے ہو کر اور ٹکٹ لے کر دیکھتے ہیں۔ اس طرح نہ صرف کینیڈیئن حکومت کو اربوں کی آمدنی ہوتی ہے بلکہ یہ کینیڈا کی ایک پہچان بن گیا ہے۔

کینیڈا کی پہچان بن جانے والے اس ٹاور کو انیس سو پچانوے میں دی امریکن سوسائیٹی آف سول انجینیئرنگ نے جدید دنیا کے سات عجائبات میں شامل کیا۔

کینیڈا کی پہچان بن جانے والے اس ٹاور کی بلندی تقریباً ایک ہزار آٹھ سو پندرہ فیٹ یعنی تقریباً پانچ سو تریپن میٹر ہے۔ یہ ٹاور ریکٹر اسکیل پہ آٹھ اعشاریہ پانچ کے درجے کا زلزلہ برداشت کر سکتا ہے۔ یہ اپنی اصلیت میں ایک ریڈیو ، ٹی وی کمیونیکیشن پلیٹ فارم ٹاور ہے لیکن بنانے والوں نے اسے سیاحت کی نظر سے بھی دیکھا۔ سو، انیس سو چھیئتّرمیں اس پہ آنے والی تعمیری لاگت تریسٹھ ملین کینیڈیئن ڈالر تھی جو کہ اسکی تعمیر کی پندرہ سال کے اندر وصول ہو گئ۔

سیاح اسکی ایک سو سینتالیسویں منزل تک جا سکتے ہیں جو کہ اسکائ پوڈ کہلاتی ہے۔ اوپر جانے کے لئے چھ لفٹس موجود ہیں جن کی بیرونی سطح شیشے کی ہے یوں اوپر جاتے ہوئے باہر کے بدلتے مناظر نظر میں رہتے ہیں۔ لفٹ جب اوپر کی طرف سفر کرتی ہے تو بائیس کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چند سیکنڈز میں مشاہداتی منزل تک پہنچا دیتی ہے۔ اس دوران اکثر لوگوں کو کانوں سے حلق میں ہلکے ہلکے بلبلے پھٹتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں یا کان میں ہلکا سا دباءو آتا ہے۔ سب سے پہلے مشاہداتی منزل پہ لیجاتے ہیں۔ یہاں دوربینیں لگی ہوئ ہیں جن سے چیزیں زیادہ صاف دکھتی ہیں۔  اس مقام  سے ارد گرد کی بلند عمارتوں کی چھتیں نظر آتی ہیں۔ گاڑیاں کھلونا اور انسان روبوٹ لگتے ہیں

اس سے اوپر اسکائ پوڈ ہے۔ یہاں بھی دائرے میں شیشے کی دیوار بنی ہوئ ہے۔ یہ مشاہداتی سطح سے تینتیس منزلیں اوپر ہے۔ موسم صاف ہو تو ایک سو ساٹھ کلومیٹر تک کا علاقہ دیکھا جا سکتا ہے۔ اس میں نیاگرا آبشار سے اٹھنے والا پانی کا دھواں بھی شامل ہے۔ یہاں کھڑے ہو کر زمین قدموں تلے تھرتھراتی ہوئ محسوس ہوتی ہے۔ اس تھرتھراہٹ میں ایک عجیب سا سرور ہے۔ یوں بلندی پہ پہنچنا آسان سہی لیکن بلندی پہ ٹہرے رہنا آسان نہیں۔

اسکائ پوڈ سے واپس ہوئے تو ایک لفٹ اس سطح پہ لے گئ جسے گلاس فلور کہتے ہیں۔  گلاس فلور زمین سے تین سو بیالیس فیٹ اونچا ہے۔ درحقیقت مجھے اس فرش کو دیکھنے کی خواہش تھی۔

گلاس فلور یعنی شیشے کے فرش سے نظر آنے والا پارک

شیشے کا فرش، اسکا تذکرہ حضرت سلیمان کے قصے میں بھی ملتا ہے۔ جب ملکہ صبا انکے دربار میں داخل ہوتی ہیں تو سمجھتی ہیں کہ فرش پہ پانی پھیلا ہوا ہے اور اپنے لباس کو اوپر اٹھا لیتی ہیں۔ اس وقت انہیں بتایا جاتا ہے کہ یہ فرش شیشے کا بنا ہوا ہے۔ جس سے وہ اس سلطنت کے رعب میں آجاتی ہیں۔ میں بھی اس ملکہ کی اس کیفیت سے گذرنا چاہتی تھی۔

ہزاروں سال پرانے اس قصے کو عملی طور پہ دیکھنے کی خواہش جاگی تو میں نے ایک چیز پہ توجہ نہیں کی اور وہ ٹاور کی بلندی تھی۔ شیشے کا یہ فرش دنیا میں بنائے جانے والے شیشے کے فرشوں میں اس لئے منفرد ہے کہ سب سے زیادہ بلندی پہ ہے۔ یہاں لوگ اس فرش پہ لیٹے ہوئے تصویریں بنا رہے تھے۔ بیٹھے ہوئے کھڑے ہوئے۔ انہیں سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کس زاوئیے سے اسکی تصویر لیں۔  کچھ لوگ اس پہ پیر رکھنے سے بھی گریز کر رہے تھے۔ حالانکہ یہ فرش یہ مکمل شیشے کا فرش نہیں بلکہ اسٹیل کے فریم میںتقریباً چار ضرب تین فیٹ کے ری انفورسڈ شیشے ایک ترتیب میں لگے ہوئے ہیں جو  تقریباً چوبیس اسکوائر میٹر کا رقبہ بناتے ہیں۔ یہ فرش کئ ٹن وزن برداشت کر سکتا ہے۔

 اس فلور گلاس سے زمین کی سطح پہ واقع پارک کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ گلاس فلور کے کمرے سے باہر نکلیں تو دائرے میں دھاتی جالی لگی دیوار سامنے آتی ہے۔ اس سے نہ صرف باہر کا نظارہ کیا جا سکتا ہے

بلکہ ہوا کی شدت سے بھی لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔

جالیوں کے باہر وہ جزیرہ جو ایئر پورٹ کے طور پہ استعمال ہوتا ہے

ٹاور کے نزدیک واقع وہ جزیرہ صاف نظر آتا ہے جہاں صرف ایک ائیر پورٹ قائم ہے۔ اس ائیر پورٹ پہ پہنچنے کے لئے

 کشتی سے آنا پڑتا ہے۔ یہاں سے جہاز ملک کی اندرونی پروازوں کے لئے آتے جاتے ہیں۔ ہم نے بھی چند جہازوں کو ٹیک آف کرتے اور لینڈ کرتے دیکھا۔ جزیرے کی لمبائ میں رن وے موجود ہے۔ جہاں پانی جزیرے کو چھوتا ہے وہاں سے رن وے شروع ہوتا ہے اور اگلے سرے پہ جہاں ساحل پانی سے ملتا ہے رن وے ختم ہو جاتا ہے۔ اردگرد بادبانی کشتیاں سمندر میں ڈولتی پھر رہی تھیں۔

ٹاور کی زمینی سطح کے ساتھ ہی ایک اسٹیڈیئم ہے جسے

روجرز سینٹر

کہتے ہیں۔ اس اسٹیڈیئم پہ حرکت کرنے والی چھت موجود ہے جو اسے ڈھک لیتی ہے۔ ہم اتنی دیر وہاں موجود رہے کہ ایک دفعہ کھلی چھت دیکھی اور دوسری دفعہ بند چھت۔

اس سینٹر کی خاص بات یہ بھی ہے کہ یہاں ٹورنٹو کے مسلمان عیدین کی نماز ادا کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے اسکا کرایہ ادا کیا جاتا ہے۔

اسٹیڈیئم    کی ادھ کھلی چھت

اسٹیڈئم کی بند چھت

واپسی پہ لفٹ ایک شاپنگ سینٹر میں لے جا کر چھوڑتی ہے۔ لیکن خیال رہے کہ یہ جیب لوٹنے کا ایک شریف بہانہ ہوتا ہے۔ یہاں چار ڈالر میں ملنے والی ٹی شرٹ سترہ ڈالر کی مل رہی تھی۔ اس شرٹ کی خاص بات یہ اس پہ موجود سی این ٹاور کے الفاظ تھے۔ سو اس جگہ اور اس لیبل کی قیمت تیرہ ڈالر میں ادا ہوتی ہے۔ باقی چیزوں کا بھی یہی حال ہے۔

کچھ لوگ زندگی میں آنے والے چیلینجز کا سامنا کرنے سے کتراتے ہیں۔ کچھ آنے والے چیلینجز کا سامنا پامردی سے کرتے ہیں اور کچھ لوگ ان چیلینجز کو خود تخلیق کرتے ہیں اور پھر دنیا کو حیران کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں نے اس ٹاور میں بھی چیلینج ڈھونڈھ لیا۔ یہ لوگ اسکائ پوڈ کی بیرونی سطح  کو فتح کرتے ہیں۔ دھیان رہے اس تھرل کے لئے علیحدہ سے ٹکٹ ہے اور اسکی اجازت ہر روز نہیں ہوتی۔

سی این ٹاور اور روجرز سینٹر رات کے وقت

۔

اس بلندی تک جانے کا کیا فائدہ؟

ایک تو گھنٹوں قطار میں کھڑے رہنے سے صبر کی اعلی صفت پیدا ہوتی ہے۔ یقین جانیں محض قطار میں کھڑے رہنے سے برداشت کی صفت پیدا کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ گھنٹوں کھڑے رہنے اور تیس ڈالر خرچ کرنے کے بعد کچھ لوگ جب حیرانی سے پوچھتے ہیں کیا اسی واسطے چھانے تھے بیابان بہت اور آپ صم بکم کھڑے رہیں تو آپ کی قلندری زیادہ واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔

فائدہ یہ بھی ہے کہ بلندی کا رعب دل سے ختم ہو جاتا ہےاور زمین اہم لگتی ہے۔ وہ زمین جو ٹھوکرکھا کر گرے ہوئے انسان کو ایک دفعہ پھر کھڑے ہونے کا حوصلہ دیتی ہے۔ یوں دنیا قدموں تلے پڑے رہنے کے بجائے سنگ سنگ چلتے ہوئے بھلی لگتی ہے۔ خیال آرہا ہے کہ قدموں تلے پڑی دنیا دیکھ کر جو عظیم خیالات پیدا ہوتے ہیں کیا وہی خیالات قدموں تلے پڑے محبوب کو دیکھ کر بھی ہوتے ہیں؟

اگر ہاں تو آپ اپنی ذات میں خود ایک سی این ٹاور ہیں۔ اسے دیکھنے کے لئے یہاں آنے کی کوئ ضرورت نہیں۔

8:22 PM

پاکستان, ٹورنٹو, روجرز سینٹر. سی این ٹاور, کینیڈا

حسد

آجکل کینیڈا میں موسم گرما ہے۔ لیکن مجھے تو بہار کا موسم لگتا ہے۔ ہر جگہ  طرح طرح کے پھول ، قطار اندر قطار، سرخ، اودے، نیلے پیلے ہر طرح کے پیرہن میں۔ ایک دو نہیں، ایک پودے پہ درجنوں گلاب۔ سڑک کنارے بچھی گھاس میں بھی ننھے ننھے پھول مسکراتے جھانک رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں ہم یہاں بھی ہیں۔

گھروں کے آگے سجی ہریالی تو سمجھ میں آتی ہے کہ گھر والوں کاذوق اور محنت ہے لیکن عام  سڑکوں پہ یہ محنت کون کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ شہری حکومت کی طرف سے پھولوں کے گملے روزانہ کی بنیاد پہ سجانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ایک ٹرک اپنے حصے کے گملے لے کر چلتا ہے اور انہیں انکے مقررہ مقام پہ رکھتا جاتا ہے یوں ایک عام پول پہ بھی پھولوں کے گچھے لہراتے نظر آتے ہیں۔ ہم پھولوں کے سوداگر ہیں اور سودا سچا کرتے ہیں۔

سوچ سکتے ہیں کہ امیر ملکوں کے پاس اتنے پیسے بچ جاتے ہیں کہ ان اللے تللوں پہ بھی خرچ کئیے جا سکیں۔ لیکن نیت کی بھی بات ہے۔ نیت صاف منزل آسان۔

شاید یہی وجہ ہے کہ کینیڈا کا شمار دنیا کے

ان پانچ ممالک

میں ہوتا ہے جہاں لوگ خوش باش اور خوش مزاج بھی ہیں۔ یہ سب خوشیاں، خوشحالی اور معاشرے میں وسائل کی منصفانہ تقسیم سے جڑی ہیں۔ ایک بھوکا ننگا، فکروں کا مارا، بم اور راکٹ لانچر کے سائے میں جینے والا شخص کیا خوش مزاج ہوگا اور خوش باش۔

اس معاشرے میں بھی لوگ کے درمیان دولت کا فرق موجود ہے۔ وہ لوگ جو کم کماتے ہیں انہیں حکومت کی طرف سے بے شمار رعائیتیں حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً بچوں کے لئے زیادہ وظیفہ۔ اس طرح انکی کم آمدنی کو پورا کیا جاتا ہے۔ جتنی آمدن زیادہ ہوتی ہے ٹیکس بھی اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ ایسا  نہیں ہوتا کہ آپ فارم ہاءوس میں محل بنا کر رہیں اور یہ کہہ کر ٹیکس نہ دیں کہ یہ تو فارم ہاءوس ہے۔ اور پاکستان کی طرح یہ بھی نہیں ہے کہ ٹیکس کا بوجھ صرف مڈل کلاس تنخواہ دار یا کاروباری طبقہ اٹھائے، قبیلوں کےسردار گلچھرے اڑائیں، غریب قسمت پہ شاکر ، معاشرے کے انصاف  اور بندوں کی کارکردگی سے مطمئن، اپنے گردے بیچے یا خودکشی کرے۔

بے روزگار افراد کو حکومت کی طرف سے وظیفہ ملتا ہے۔ بے گھر افراد کے لئے بھی شیلٹر ہاءوس موجود ہیں۔ اسکے باوجود لوگ بھیک مانگتے نظر آ سکتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے وظیفے کی رقم  کو نشے پانی پہ اڑا دیتے ہیں۔ بھیک مانگتے ہیں اور پھر کسی دن خودکشی کر لیتے ہیں۔ بھیک مانگنے والی قوموں کی داستان بھی اس سے مختلف نہیں ہوتی۔

خواتین اسکارف پہنے بھی نظر آتی ہیں اور منی اسکرٹ پہنے بھی۔ لیکن کینیڈیئنز کو تو چھوڑیں۔ وہ تو ہیں ہی بے حیا۔ ہمارے پاکستانی دیسی بھائ بھی یہ سب دیکھنے کے باوجود لب سیئے رہتے ہیں۔ یہ نہیں کہتے کہ ٹانگیں ڈھک لو دوپٹہ پہن لو۔ جس کا دل زیادہ جلتا ہے وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ جاتا ہے ۔ انہیں میں سے شاید کچھ لوگ انٹر نیٹ پہ جا کر پاکستانی خواتین کو اخلاقی پاسداریوں کا درس دیتے ہیں، اس بات پہ افسوس کرتے ہیں کہ پاکستان میں اب تک شریعت کا نفاذ کیوں نہیں ہوا اور پھر دوبارہ کسی شاپنگ مال میں جا کر مغرب کی بے حیائ کے چشم دید گواہ بنتے ہیں۔

کیا میں  وطن کو یاد کرتی ہوں۔

شاید نہیں، بس جب ٹی وی دیکھتی ہوں تو یاد آتا ہے۔ مثلا ان دس دنوں میں ایک بھی ایسا واقعہ نہیں سنا کہ کسی خاتون کے ساتھ اجتماعی زنا بالجبر کا واقعہ پیش آیا ہو۔ لیکن ابھی ایکدن پہلے ہی ٹی و ی سے خبر سنی کہ ویہاڑی ایک بارہ سالہ لڑکی کو اس سانحے سے گذرنا پڑا۔  مردوں کی کسی ٹولی نے کسی خاتون کو چوک پہ برہنہ نہیں کیا۔ لیکن یہ خبر بھی دس دن پہلے وطن سے ہی ملی۔ خیر، اسکی وجہ یہ شاید مغرب کی بے حیائ ہی ہوگی۔

 مجھے اپنے اندر بھی خاصی تبدیلیاں محسوس ہوتی ہیں۔ مثلاً میں اور میری بچی روزانہ قریبی پارک جا کر اسکول ٹائم کرتے ہیں۔ اس وقت پارک میں کوئ نہیں ہوتا۔ لیکن میں خاصی بے خوف رہتی ہوں۔  اسی بے خوفی کی وجہ سے میں نے آجکل اپنے سونے کے کچھ زیورات بھی پہنے ہوئے ہیں۔  مجھے اپنے ہینڈ بیگ میں موجود پیسوں کی بھی فکر نہیں ہوتی۔ خدا جانے میں آجکل اتنی بہادر کیوں ہو گئ ہوں۔

 سنگین نامعلوم حالات کے پیش آجانے کے اندیشے سے دل  ہر وقت عام رفتار سے زیادہ دھڑکتا رہتا تھا۔ وہ بھی خاصہ سنبھلا لگتا ہے۔ گھر کے لوگ دیر سے آتے ہیں تو یہ خیال تک نہیں آتا کہ ٹی وی کھول کر شہر کے حالات جان لیں۔ یہاں زیادہ تر پاکستانی کینیڈا یا ٹورنٹو کے حالات سے با خبر رہنے کے بجائے پاکستانی چینلز دیکھتے رہتے ہیں۔

اور پھر ہم سے پوچھتے ہیں پاکستان کب رہنے کے لائق جگہ بنےگا۔

ادھر ایک ساتھی نے کہا کہ پاکستان سے آنے والی خبروں  کوسن کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا کہ اس پہ افسوس کیا جائے یا ہنسا جائے۔ ایک خبر ملی کہ لوگوں نے دو ڈاکوءوں کو پکڑ کر اتنی پٹائ لگائ کہ پولیس کو آ کر چھڑانا پڑا۔ لیجئیے ساری دنیا میں پولیس کو ڈاکوءووں سے لوگوں کو بچانا پڑتا ہے ہمارے یہاں الٹی گنگا بہتی ہے۔ تازہ واقعہ ، کراچی میں کمشنری نظام بحال ہونے کی خوشی میں شاہی سید صاحب نے دعوت کا اہتمام کیا اور اس میں جناب ذوالفقار مرزا سے بہ اصرار تازہ کلام کی فرمائیش کی گئ۔ انہوں نے اپنے مفاہمتی بھائ کے اصرار پہ ایسا پر اسرار، سحر ناک الفاظ کا جادو پھونکا کہ  پندرہ انسانوں نے اپنی قربانی پیش کر دی۔ اب آپ بتائیے اس پہ ہنسا جائے یا رویا جائے۔

میں پاکستانی ذہن کے ساتھ جواب دیتی ہوں۔ آپ لوگ کینیڈا کی خبریں کیوں نہیں دیکھتے۔ جواب ملتا ہے۔ یہاں کی خبریں بھی کوئ خبریں ہوتی ہیں۔ نہ گولی، نہ دستی بم، نہ راکٹ لانچر نہ لاشیں نہ ان میں وہ تخلیقی جوہر موجود کہ  ان سب چیزوں سے بھی لطیفے بنا لیں۔

پھر بھی، یہ کوئ بات نہیں کہ اب اپنے جنمی ملک واپس جانے کا ارادہ نہیں پھر بھی وہاں کےمعاملات کی کرید میں رہیں  وہ بھی ایسی کہ اس سے ہماری اور بد تری سامنے آئے۔

یہ پاکستانی ، اپنی مرضی سے یہاں ہجرت کر چکے ہیں ۔ اس ہجرت پہ افسوس کرتے ہیں مگران میں سے شاید ہی کوئ پلٹ کر واپس آئے۔  ایئر پورٹ پہ ایک خاتون مجھ سے کہنے لگیں کہ عرصہ ء پانچ سال کے بعد تین ہفتے کے لئے پاکستان آئ تھی۔ خدا کا لاکھ شکر ادا کرتی ہوں کہ بر وقت پاکستان چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔

ہمم،   مجھے لگتا ہے کہ میں حاسدی بھی ہو گئ ہوں، اور کسی ایک شخص سے نہیں پورے ملک سے حسد میں مبتلا ہوں۔ کیا اسکی وجہ کینیڈا کے پولز پہ لہرانے والے پھولوں کے گچھے ہیں،   شاہی سید کی دعوت عام، ذوالفقار مرزا کا تازہ کلام یا ایئر پورٹ پہ ملنے والی خاتون ہیں۔

10:07 PM

پاکستان, پاکستانی, ذوالفقار مرزا, شاہی سید, شدت پسندی, فسادات, کراچی, کینیڈا

زمین اور زبان

جو ستارے ہم دیکھتے ہیں وہ لاکھوں برس پہلے ختم ہو چکے ہوتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں وہاں ایک تارہ دمک رہا ہے مگر حقیقتاً وہاں اس وقت شاید اسکی راکھ ہوتی ہے جو نئ کائیناتوں کی تشکیل میں حصہ لینے کو تیار ہوتی ہے۔  ہر عروج اپنے زوال سے دو چار ہوتا ہے ۔ مگر ایسی بھی اشیاء ہیں جو بغیر کسی عروج کو دیکھے زوال کی نظر ہو جاتے ہیں۔ پاکستان ان میں سے ایک ہے۔ کوئ دن جاتا ہے کہ ہم اس طرح کی خبریں سنیں گے۔

پاکستان میں عدالتی نظام ختم کر کے جرگہ نظام قائم کر دیا گیا۔ یہ زیادہ موئثر اور پاکستانیوں کے قومی مزاج سے زیادہ قریب ہے۔ اس میں ہر مسئلے کا حل خواتین کی لین دین یا انکی لباسی اور بے لباسی سے بآسانی  نکالا جا سکتا ہے۔ جیل وغیرہ کا خرچہ بچے گا۔ عدالتی کارروائیوں اور انتظام پہ جو خرچہ آتا ہے وہ الگ ختم ہو گا۔

پاکستان میں جدید تہذیب کے اسکولوں کو ختم کر کے مدرسوں کا نظام ترتیب دیا جا رہا ہے۔ اس سے زیادہ بہتر اور با اخلاق انسان وجود میں آئیں گے۔ جو معاشرے کی بنیادیں ہلانے سے پرہیز کریں گے۔ مدرسے برین واشنگ کی تیکنیک سے زیادہ بہتر طور پہ واقف ہیں۔

پاکستان میں جدید طبی سہولتوں سے آراستہ ہسپتالوں کو ختم کر کے ہزاروں سال پرانے حکمت خانے کھولنے کی اجازت دی جائے گی۔ انکی دواءووں کے اجزاء مقامی درختوں یا جانوروں سے حاصل کئے جائیں گے اور یوں مغرب کی دواءووں کی حکمرانی ختم ہوگی۔ کیا ہوا اگر شرح اموات بڑھ جائیں گی۔ مرنے والوں کی موت اسی طرح لکھی ہوگی۔ ان حکمت خانوں میں بنیادی طور پہ مردوں کی قوت بڑھانے پہ توجہ دی جائے گی۔

پاکستان میں جدید ٹرانسپورٹ کی سہولتیں ختم کی جارہی ہیں۔ سوائے صدر مملکت اور وزیر اعظم کے کسی کو باہر کا سفر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بیرون ملک لوگوں سے میل جول پاکستانی معاشرے کے لئے تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔ اپنے گھر سے دس میل دور سفر کے لئے حکومت سے خصوصی اجازت نامہ لینا ہوگا۔ جس میں اس سفر کی وجوہات بیان کی جائیں گی۔ اگر وہ قابل قبول ہوئیں تو اجازت ملے گی۔ اس طرح سے پیٹرول وغیرہ کی بچت ہوگی اور ہم پیٹرول میں زیادہ خود کفیل ہونگے۔ جو ہمارے حکمرانوں کے کام آئے گا۔ تاکہ وہ مکمل ذہنی عیاشی کے ساتھ حکومت کر سکیں۔

پاکستان میں زراعت اور چند بنیادی صنعتوں کے بعد باقی سب کی چھٹی کی جارہی ہے۔ وہ بنیادی صنعتیں کون سی ہونگیں اسکا انحصار اس بات پہ ہوگا کہ ہمارے صدر، وزیر اعظم اور حکومت کے اہم اراکین کن کن صنعتوں کے مالک ہیں۔

یہ سارے خیالات پڑھنے میں کچھ عجیب و غریب لگیں گے۔ لیکن اگر آپ ایسے پاکستانی ہیں جو ابھی تازہ تازہ کسی ترقی یافتہ ملک میں وارد ہیں ۔ اور اپنی آمد کے بعد پاکستان سے جو خبریں وصول کرتا ہے اس میں شہر کراچی میں تین چار  دنوں کے اندر سو سے زائد افراد کی ایک گروہ سے دوسرے گروہ پہ دستی بموں اور راکٹ لانچر سے ہلاکت کی خبریں سنتا ہے۔ پھر سنتا ہے کہ کراچی میں کمشنری نطام بحال کر دیا گیا ہے۔ وہ کمشنری نظام جسے تخلیق کرنے والے ممالک نے اسے اپنے ملک سے نکال باہر کیا۔ وہ اسے انتظامی معاملات چلانے کے لئے مناسب نہیں سمجھتے۔

پھر سنتا ہے کہ حکومت کے وڈے بد معاشوں میں سے ایک بدمعاش یعنی ذوالفقار مرزا اس قتل و غارت گری کے منصوبے میں شامل رہے۔ یہ وہی صاحب ہیں جن پہ اس سے پہلے بھی شہر کے غنڈوں ، اسمگلرز اور مافیا کے دیگر عناصر سے اس شہر کے سکون کو تہہ و بالا کرنے کے الزامات لگتے رہے۔ اور صدر زرداری نے اس وقت تناءو کو کم کرنے کے لئے مرزا صاحب کو کچھ وقت کے لئے انڈر گراءونڈ ہونے کا مشورہ دے کر حالات کو اپنے قابو میں کیا۔ اور پھر دوبارہ اپنے شیطانی کارندے کو آزادی دے دی۔

 میں ایسا کیوں سوچتی ہوں ؟

اسکی وجہ شاید جینیٹک ہے۔ میرے والدین نے اس پاکستان کی زمین سے جنم نہیں لیا۔ میں  اس زمین سے صرف پیدائشی تعلق رکھتی ہوں۔  میں تعریف کے لحاظ سے وہ مہاجر ہوں، جسکی تہذیب میں لڑائ جحگڑوں میں اسلحے کا استعمال شرفاء کا دستور نہیں۔ میرے یہاں مردوں کے کئے کی سزا میں نہ عوتوں کو ونی کیا جاتا ہے نہ کاروکاری ہوتی ہے نہ ان کی شادی قرآن سے ہوتی ہے، نہ انہیں ذہنی لحاظ سے بنجر سمجھا جاتا ہے۔

میری تہذیب میں جھگڑوں اور تنازعوں کے فیصلے جرگے میں نہیں ہوتے۔ میرے آباء کسی اور نسل سے نفرت میں اتنے نہیں بڑھے کے ان پہ راکٹ لانچر سے حملے کرتے ہوں اور انکے گھر جلا دیتے ہوں۔ یاد رہے کہ میں انیس سو چھیاسی میں اسی طرح کے واقعات دیکھ چکی ہوں جو آج دو ہزار گیارہ میں دوہرائے گئے۔

سو مجھے ان تمام چیزوں سے بے حد تکلیف ہوتی ہے۔ اور جب میں اپنی تکلیف کا اظہار کرتی ہوں تو دیگر لوگوں کو اس اظہار سے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔

انکے اور میرے درمیان  ایک بڑا فرق ہے اور وہ یہ کہ میں اور وہ تہذیباً دو مختلف ثقافتوں کے نمائندے ہیں۔ وہ قبائلی نظام اور سوچ و فکر کے پروردہ ہیں اور میں  ترقی پسند سوچ کی پروردہ ۔

جب آپ یہ خبر سنتے ہیں کہ کراچی میں ایک گروہ نے دوسرے گروہ پہ دستی بموں اور راکٹ لانچر سے حملہ کر دیا۔ پھر سنتے ہیں کہ کراچی میں کمشنری نظام بحال کر دیا گیا، پھر سنتے ہیں کہ سندھ میں فنکشنل لیگ اور پیپلز پارٹی ایم کیو ایم کی چھوڑی ہوئ وزارتوں پہ بندر بانٹ کر رہی ہیں۔ یہ دونوں پارٹیز بنیادی طور پہ سندھی لسانی گروہ کی نمائیندگی کرتے ہیں۔ پھر سنتے ہیں کہ پیپلز پارٹی اور اے این پی نے مفاہمت کی سیاست پہ اتفاق کیا ہے یعنی کراچی میں پیپلز پارٹی خود تو جو کچھ کرے گی وہ کرے گی اے این پی کو بھی کھلی چھوٹ دے گی اس طرح  کراچی کی سب سے بڑی لسانی آبادی کا دماغ درست رکھا جائے۔ اے این پی، پشتون لسانی گروہ کی نمائیندگی کرتی ہے۔ پھر اسکے بعد لازماً ایم کیو ایم کے اندر موجود عناصر بھی انتقامی کارروائ کریں گے۔ یہ وہی ایم کیو ایم ہے جو کراچی میں لسانی عصبیتوں کی حکمرانی کی وجہ سے وجود میں آئ۔

تو اسکے بعد آپ کچھ بھی سوچیں، میں یہ سوچتی ہوں کہ پاکستان کے لئے سب سے مناسب نظام قبائلی نظام ہے۔ یہ یہاں کی اکثریت کا قومی مزاج ہے۔ اور جو لوگ اس نظام سے مطابقت میں مشکل محسوس کرتے ہیں انہیں پاکستان چھوڑ کر کسی اور ملک کی شہریت اختیار کرنی چاہئیے۔ لیکن اپنی بَک بَک سے باز رہنا چاہئیے۔

یا خدا، کیا میں ایسا کر سکتی ہوں؟ کیا میں اس زمین سے اتنی لا تعلق رہ سکتی ہوں جس میں میرا جنم ہوا؟

8:06 AM

ایم کیو ایم, اے این پی, پاکستان, پیپلز پارٹی, تقسیم, عصبیت, کراچی, مہاجر

خدا ، انسان کا ہتھوڑا

پچھلے دنوں بلاگستان کی دنیا میں تصور خدا پہ گفتگو کچھ لوگوں کے دماغ پہ ہتھوڑا بن کر برس پڑی۔ حالانکہ ہم ہمیشہ سے سنتے آئے ہیں کہ دل نہ کسی کا توڑو، دل کے اندر رب رہتا ہے۔  دل میں قیام پذیر خدا بڑی مختلف خصوصیات رکھتا ہے۔ یہ رہتا تو دل جیسے مشتبہ مقام پہ ہے ، جہاں ایک آسانی یہ ہے کہ جب ذرا گردن جھکائ دیکھ لیا وہاں یہ خدا انسانی تلون مزاجی سے بھی نبرد آزما رہتا ہے۔  یہ مصروف اور جفاکش خدا تخت دل سے کائینات پہ حکمرانی کرتا ہے اور یہ آسان حکمرانی نہیں ہے۔

  لیکن اکثریت کا خدا دماغ میں رہتا ہے۔ ان میں سے وہ الگ ہیں جن پہ عقل پرستوں کا الزام لگتا ہے وہ تصور خدا کی بنیادیں پرکھتے ہیں۔ جو خدا کے وجود کو ڈھونڈھ رہے ہیں ان پہ کوئ قانونی  یا اخلاقی حد جاری کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ سو خدا نے بھی اس سلسلے میں کوئ قانون نہیں بنایا۔

لیکن دوسرا گروہ جس کا خدا اسکے دماغ میں رہتا ہے یہ وہ ہیں جو خدا پہ اپنے پختہ یقین کا دعوی کرتے ہیں۔ لیکن یہ وہ خدا ہے جسے استعمال کرنے کے دماغی جواز ڈھونڈھے جاتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جو اپنی دماغی صلاحیتیں دوسروں کے ایمان کو پرکھنے میں لگاتے ہیں۔  سمجھتے ہیں کہ خدا نے انہیں اس عظیم ذمہ داری کے لئے چن لیا ہے۔ یوں کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔ اسکی جڑیں کافی دور تک پھیل جاتی ہیں۔

دماغ میں قید ہو جانے والا یہ خدا، اپنے اوپر ہونے والی گفتگو سے ڈر جاتا ہے۔ کیونکہ اس سے منسوب مفادات کی ڈور ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لازماً یہ اسی وقت منصب خدا کے لئے نا اہل قرار پا جاتا ہے۔ اور اگرچہ، اظہار آزادی ء رائے اچھی بات لگتی ہے، لیکن کچھ لوگوں کے اوپر پابندی ہونی چاہئیے کہ وہ خدا کی محبت اور اسکی تبلیغ سے اجتناب کریں۔ یہ خدا کے مثبت وجود کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔

آہ، اس مرحلے پہ لگتا ہے کہ  آفاقی قوانین کو ترتیب دینا کتنا مشکل ہے۔ جن انسانوں نے ایسے قوانین ترتیب دئیے انہیں سلام۔ اب یہ ایک الگ ہوم ورک ہے کہ ان آفاقی قوانین  کی فہرست بنائیں جو انسانوں نے ترتیب دئیے۔

فہمیدہ ریاض

، اردو کی معروف ادیبہ ہیں۔ ادب کی ترقی پسند صنف کی طرف ان کا جھکاءو ہے۔ انکی تخلیقات، شاعری، افسانوں اور مختلف مضامین کی صورت موجود ہیں۔  تصورخدا اور الہامی نظریات کا پس منظر لئے ہوئے انکی ایک تحریر نظر سے گذری۔ دنیا زاد کے شمارے بعنوان جل دھارا  میں شائع ہوئ۔ اس کہانی کا عنوان میرے ذہن سے اتر گیا۔ اور چونکہ اس وقت میں پاکستان میں موجود نہیں۔اس لئے اسکا عنوان نکالنا ممکن نہیں۔ دنیا زاد کے ایڈیٹر ہیں جناب

آصف فرخی

اور پبلشر ہیں شہر زاد۔

لیکن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اسکے چند اسکین شدہ صفحات میرے پاس موجود ہیں۔ ان قارئین سے معذرت جو اسکین شدہ صفحات سے گھبراتے ہیں۔ فہمیدہ ریاض کی یہ کہانی بعض ذہنوں پہ ہتھوڑا ثابت ہو سکتی ہے۔ ان سے بھی معذرت۔

بہتر طور پہ دیکھنے کے لئے تصویر پہ کلک کیجئِے۔

6:03 PM

آصف فرخی, ادب, خدا, دنیا زاد, شہر زاد, فہمیدہ ریاض, مذہب

کھنڈالہ میں

میرا کمپیوٹر ہیک نہیں ہوا اور نہ ہی  میں نے بلاگنگ  ترک کی ہے۔ کیونکہ  میں نے توبہ ابھی نہیں کی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ گو ہاتھ میں جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے رہنے دے ابھی ساغر و مینا میرے آگے۔

بات یہ ہوئ کہ اپنا ساغر ومینا یعنی لیپ ٹاپ اٹھائے اٹھائے ہم پاکستان کی سرحدوں سے باہر نکل آئے۔  پاکستان میں آجکل سفر کی دو سمتیں رائج الفیشن ہیں۔ ایک پاکستان کی شمالی سمت اور دوسری دنیا کی مغربی سمت۔

اب چونکہ میں پاکستان کے شمال میں نہیں تو آپ اس سے بآسانی یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ میں اس وقت  دنیا کے مغرب میں ہوں۔ وہی مغرب جو ہماری بد دعاءووں، لعنتوں اور نفرتوں کے باوجود کسی اللہ لوکی ، کسی مجذوب کی طرح اپنی دھن میں مگن چلا جا رہا ہے۔ حالانکہ شاعر نے اس پہ بھی کچھ فرمایا ہوا ہے کہ اپنی دھن میں رہتا ہوں ، میں بھی تیرے جیسا ہوں۔ لیکن اس شعر سے صرف یہ پتہ چل پاتا ہے سب اپنی اپنی دھن میں ہیں۔

اس طرح نکل آنے کی بنیادی وجہ ایک پیغام کا وصول پانا اور اس پہ ہمارا تبادلہ ء خیال تھا۔ جو کم و بیش اس گانے کی طرح تھا۔

تو جناب، اس وقت ہم  کینیڈا میں ہیں۔ اور کینیڈیئن ہائ کمشنر کو لکھے گئے اپنے خط کے مطابق یہاں کے معاشرے  کی جڑیں کھنگال  رہے ہیں۔ جن سے خوشحالی اور امن کی کونپلیں جنم لیتی ہیں۔ مجھے اپنے ملک میں اسکی قلمیں لگانی ہیں۔

5:13 PM

پاکستان, پاکستانی, خواتین, کینیڈا, مشرق, معاشرہ, مغرب

انقلاب کا اسقاط

آپکو بتاءووں یہاں مجھے کینیڈا آ کر اندازہ ہوا کہ ہمارا نظام تعلیم کتنا ناقص ہے۔

کیوں ایسا کیا ہو گیا؟

بس یہاں آکر مجھے اتنا وقت مل جاتا ہے کہ اپنا کتاب پڑھنے کا شوق پورا کروں یا دستاویزی فلمیں دیکھوں۔ پاکستان میں تو نوکری کے نام پہ غلامی کراتے تھے۔ گھر آکر بھی کام جاری رہتا تھا۔  ابھی چند دن پہلے میں نے فرانس کی ایک ملکہ

ماریا اینٹونیٹ

کے بارے مِں ایک دستاویزی فلم دیکھی۔

وہی ملکہ جسکے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے قحط کے دنوں میں روٹی نہ ملنے پہ کیک کھانے کا مشورہ دیا؟

ہاں وہی۔

لیکن اسکے بارے میں یہ بات غلط منسوب ہے۔

ہاں آپکا کہنا صحیح ہے۔ یہ بات خاصی متنازعہ ہے۔

لیکن ایسے افسانے ہی تاریخ کو دلچسپ بناتے ہیں، اچھا پھر کیا ہوا؟

تین چار دن بعد لنچ بریک میں ہم لوگ گپ شپ کر رہے تھے تو میں نے اس کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ ادھر سے ایک چینی لڑکی آئ کہ تم لوگ اس ملکہ کا تذکرہ کر رہے ہو جسکے سولہ بچے تھے۔ میں نے اسکی تصحیح کی کہ اسکے سولہ نہیں چار بچے تھے۔ سولہ بچے اسکی ماں کے تھے۔ پھر ایک انڈیئن اس میں شامل ہوا کہ کس طرح اس ملکہ پہ مظالم ہوئے۔ اتنے میں ایک کیوبا کی لڑکی آگئ وہ بھی انقلاب فرانس کے بارے میں بات کرنے لگی۔ آپ سوچیں، میں نے اب تک کی زندگی میں انقلاب فرانس کے بارے میں تفصیل سے چار دن پہلے پڑھا تھا۔

تو ایسا کیوں ہوا کہ آپ نے محض چار دن پہلے یہ چیز پڑھی؟

وہ اس لئے کہ اسکول میں ہمیں سوشل استڈیز یا جغرافیہ نہیں پاکستان اسٹڈیز پڑھائ جاتی تھی۔ اسکول سے لیکر ہائیر کلاسز تک ہم پاکستان اسٹڈیز پڑھتے رہے جس میں سارا زور دو قومی نظرئیے پہ رہا۔ اور سچ بتاءووں اتنا عرصہ کینیڈا میں رہنے کے بعد میرا اس نظرئیے سے یقین اٹھ سا گیا ہے۔

اچھا، ایسا کیوں ہوا؟

آپ سوچیں یہاں اتنی قومیتوں کے لوگ رہتے ہیں بالکل ہم آہنگی کے ساتھ۔ ایک ہی میز پہ تین لوگ بیٹھے ہوتے ہیں۔ ایک سوءر کا گوشت کھاتا ہے دوسرا حلال اور تیسرا سبزی خور۔ سب مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے ایک جگہ رہ رہے ہیں ناں۔ اس لئے کہ سب کی اقتصادیات صحیح ہیں۔ سب کو پیسہ مل رہا ہے؟

ہمم، میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ایک چوبیس ، پچیس سال کا شخص جس نے اپنی تمام تعلیم پاکستان میں حاصل کی۔ پاکستان سے باہر نکل کر چند برس دوسری قوموں کے ساتھ رہا اور ایسا ہو گیا۔  برسوں سب گھول کے پلایا گیا تو ضائع ہو گیا؟

اس نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ مجھے اس وقت اتنی شرمندگی  ہوئ ان لوگوں کی معلومات ہر چیز کے بارے میں مجھ سے کہیں بہتر ہیں۔ آخر ہمیں یہاں کیا  پڑھایا جاتا ہے۔ ادب ہمیں نہیں معلوم ہوتا کیا بلا ہے، جغرافیہ ہمارا کمزور، تاریخ میں ہمیں صرف تحریک پاکستان پڑھائ جاتی ہے وہ بھی اپنے مطلب کی۔ حتی کہ اسلامیات میں ہمیں پچاس ، سو صفحوں کی ایک کتاب پوری زندگی پڑھائ جاتی  رہی۔ وہ بھی اپنے مطلب کی۔  دنیا کے مختلف ادیان کا تعارف تو چھوڑیں ہم اسلامی تاریخ سے بھی جان بوجھ کر لا علم رکھے جاتے ہیں۔ موسیقی، مصوری سے ہم نا آشنا۔ ہم ایک لگے بندھے علم کے علاوہ کچھ نہیں جانتے، ارد گرد پھیلی دنیا کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔  سوچیں ذرا، چوبیس ، پچیس سال کی عمر میں، سوفٹ ویئر انجینیئر ہونے کے باوجود مجھے انقلاب فرانس کے بارے میں کھکھ بھی نہیں پتہ تھا۔ اور یہ  چین ، ہمارے پڑوسی انڈیا اور حتی کہ کیوبا تک کے لوگوں کو پوری کہانی ازبر تھی۔

لیجئیے یہ انقلاب فرانس کی کہانی ہمیں اگر ازبر ہوتی تو ہم آنے والے انقلاب کی راہیں تک رہے ہوتے؟ بس یہی تو چلن ہیں، اسی طرح انقلاب کا اسقاط ہوتا ہے۔

7:47 AM

اسلام, انقلاب, پاکستان, فرانس

ایسے کیوں؟

آج کا دن کوئ پوسٹ لکھنے کا ارادہ نہیں تھا۔ اگلے سات آٹھ دن کے لئے مصروفیات کا تناسب کچھ نکل آیا ہے کہ بلاگ کی طرف زیادہ نظر نہ ہو پائے۔ بہر حال، اطلاع ملی کہ مکی صاحب نے اپنے بلاگ کو

سیارہ سے الگ

کرنے کی درخواست کی ہے۔ کیوں کی ہے ، یہ وہ بہتر جانتے ہونگے۔ لیکن میں اپنی ذاتی حیثیت میں انکے اس فعل سے مطمئن نہیں۔

کوئ آئیڈیئل معاشرہ وہ نہیں ہوتا جہاں سب ایک جیسی سوچ رکھتے ہوں۔ ایک مقولہ ہے کہ جہاں سب ایک جیسی سوچ رکھتے ہوں وہاں کسی کے پاس کرنے کو کچھ خاص نہیں ہوتا۔ دنیا میں وہی معاشرے ترقی کی طرف جاتے ہیں اور مثبت  طرز زندگی کی طرف گامزن ہوتے ہیں جہاں تنوع ہوتا ہے۔ انسانوں کا، بنیادی فکرات کا اور بنیادی اعمال و کردار کا۔

اگر ایک خاص سوچ کسی معاشرے پہ طاری کر دی جائے تو ایک شدت پسندی کو جنم دیتی ہے۔  اس شدت پسندی کو قابو میں رکھنے کے لئے اسکی مخالف قوت کا موجود رہنا ضروری ہے اور معاشرے کی ایک قوت کو مہمیز رکھنے کے لئے دوسری  مخالف قوت کو حاضر رہنا چاہئیے۔

جمہوریت کی ساری خوبی یہی ہے کہ معاشرے کے ہر طبقے کو آواز اٹھانے کی اجازت ہوتی ہے جو آمریت یا مارشل لاء میں نہیں ہوتی۔

اگر آج ہمارے ملک میں عدم برداشت کا رویہ اپنے عروج پہ ہے تو اسکی جڑیں ضیاء الحق کی اس گیارہ سالہ حکومت میں ملتی ہیں جب پاکستان کے بد ترین مارشل لاء میں ایک نظرئیے کو پروان چڑھانے کے لئے تمام ریاستی وسائل بروئے کار لائے گئے۔ اسکے نتیجے میں دوسرا مخالف گروہ ختم کر دیا گیا یا خاموش کرا دیا گیا۔ اور اب یہ عالم ہے کہ نہ لوگوں میں علم ہے، نہ برداشت، ترقی تو دور۔ ترقی اور فلاحی ریاست ایک مبہم خواب کے سوا کچھ نہیں۔ ہم معاشی اور معاشرتی سطح پہ دن بہ دن تنزلی کا شکار ہیں۔

ہم مسلسل آمریت کے زیر سایہ رہنے سے مزاجاً خود بھی آمر ہو چکے ہیں۔ رہی سہی کسر، متعارف کرائے گئے جذبہ جہاد نے پوری کی اور اب ہماری اکثریت میں یہ اہلیت ہے کہ وہ ظلم میں ہٹلر اور چنگیز خاں کو بھی مات دے دے۔

ہماری ایک پوری نسل نہیں جانتی کہ اسکے باہر کی دنیا میں کیا ہوتا ہے، اس دنیا میں کیسی کیسی ثقافتیں، مذاہب موجود ہیں۔ اور اسی دنیا میں کیسے کیسے ممالک ہیں جہاں مختلف النوع مذاہب اور ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک ساتھ رہتے ہیں مگر سکھ چین کے ساتھ، زندگی میں آگے کی سمت چلے جا رہے ہیں۔

عدم برداشت کا رویہ آخر کیسے ختم ہوگا؟ ایسے کہ لوگوں کو اپنے مخالف کی بات سننے کی عادت پڑے۔ ایسے کہ انہیں معلوم ہو کہ وہ کوئ پھنّے خان نہیں ہیں۔ دنیا میں عظیم لوگ انکے مذہب، فرقے، ذات ، برادری، نسل اور لسان سے الگ ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ وہ سب اسی دنیا کے دسترخوان سے اپنا روزی روزگار حاصل کرتے ہیں۔ ایسے کہ انہیں معلوم ہو کہ وہ خود کتنے حقیر ہو چکے ہیں۔ جس سوچ پہ انہوں نے اپنے آپکو کھڑا کیا ہے وہ حضرت سلیمان کی وہ دیمک کھائ ہوئ لاٹھی بن چکی ہے۔ کہ جب گرے گی تو پتہ چلے گا کہ وہ مر چکے ہیں۔

بلاگستان کی اکثریت، اس پاکستانی نسل سے تعلق رکھتی ہے جو خود کچھ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ سوائے دوسروں پہ کیچڑ اچھالنے کہ وہ بھی مذہب کے نام پہ۔ دیکھنے کو انکی زندگیاں بھی ان مسائل سے بھری پڑی ہوئ ہیں جن سے ایک عام پاکستانی دوچار ہے۔ مگر اسے حل کرنے کی طرف تو دور انکا تذکرہ تک کرنے میں انکی دلچسپی نہیں۔ ان کا غم اگر ہے تو یہ کہ ہمارے ملک میں ہم جنس پرست کیا کیر رہے ہیں؟ یہ ہم جنس پرستی ایک علاقے کی ثقافت کا سینکڑوں برس سے حصہ ہے مگر اس پہ روشن خیال کا نام لے کر ماتم کرنے میں ایک عجیب مزہ آتا ہے۔ یہ نہیں جانتے کہ اس علاقے میں خواتین کو حقیر بنائے جانے سے ہم جنس پرستی کے مسئلے نے وہاں شدت پکڑی ہے۔

یہی لوگ ، یہ نہیں جاننا نہیں چاہتے کہ پاکستان کی عورتوں کی ایک بڑی تعداد اوسٹیو پوریسس کی وجہ معذوری کا شکار ہو رہی ہے ، بچے پولیو کی وجہ سے معذور ہو رہے ہیں۔ دنیا کے تقریباً دو سو ممالک میں پاکستان ان آخری ممالک میں شامل ہے جہاں مرنے والوں بچوں کی تعداد سب زیادہ ہے۔ یہ سوچ کر انہیں اپنے اوپر شرمندگی نہیں ہوتی کہ پاکستان کے ایک دیہات میں ایک عورت اپنی چھاتی کا زخم چھپائے چھپائے پھرتی رہی، شرم کی وجہ سے حتی کہ اسکی چھاتی کینسر کی وجہ سے پھٹ گئ ۔ تشویشناک بات یہ نہیں ہے کہ ایک پچاس سالہ عورت کو اسکے دس سال کے بچے کے سامنے برہنہ گلیوں میں پھرایا گیا۔ انکے نزدیک انکے ملک کی اہم اور تشویشناک خبر یہ نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ کسی جگہ  منافقوں کے پیدا کردہ نام نہاد مجاہدین کو متوقع تباہی پھیلانے میں متوقع کامیابی کیوں حاصل نہیں ہو پائ۔

ہم جنس پرستی کیا ہے؟ قدرتی طریقوں سے منہ موڑ کر ایسی طرز کو اختیار کرنا، جس میں نسل انسانی کو کوئ فائدہ نہیں۔ جس سے نسل انسانی آگے  نہیں بڑھتی۔ ایک ایسی بے سمت عیاشی جس سے بدلے میں کوئ مثبت چیز نہیں بر آمد ہوتی۔

فدائیوں اور نام نہاد مجاہدین کی فتح کی دعائیں مانگنا بھی فکراً ہم جنس پرستی سے الگ چیز نہیں۔ قدرتی طرز زندگی سے انحراف۔ ایسے عمل کا حصہ بننا جس میں نسل انسانی کی ہماری پاکستانی نسل کی بقاء نہیں تباہی ہے۔

یہ ہے ہماری موجودہ نسل کی اکثریت جو اس وقت اس بلاگستان کا حصہ ہے۔

اس عالم میں اگر کوئ اس روش سے ہٹ کر بات کہنا چاہ رہا ہے تو اسے اختیار ملنا چاہئیے۔ اسے اپنا اختیار استعمال کرنا چاہئیے۔ ہم سب کی تربیت ہونی چاہئیے کہ ہم ایکدوسرے کی غلط ترین بات کو سنیں ، اسے برداشت کریں۔ اس پہ سوچیں اور ہمیں نہیں پسند تو تو آگے بڑھ جائیں۔ ہمیں اب لوگوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کو دبانے سے روکنے کی کوشش میں حصہ ڈالنا پڑے گا۔ اس لئے نہیں کہ ہم بعیّنہ وہی خیالات رکھتے ہیں جیسے کہ وہ رکھتے ہیں بلکہ اس لئے کہ ہم ایک متوازن معاشرے کے طور پہ پنپ سکیں۔

توازن، کسی ایک قوت کے حاوی ہونے میں نہیں۔ توازن تمام قوتوں کے ایک ساتھ موجود رہنے سے پتہ چلتا ہے۔ کم از کم کائینات اپنے مظاہر میں یہی کہتی نظر آتی ہے۔

تو

مکی صاحب

، میں تو نہیں سمجھتی کہ آپکو بلاگستان سے علیحدہ ہونے کی ضرورت ہے۔    باقی کچھ لوگوں کا یہاں رد عمل ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ برصغیر میں اسلام محمد بن قاسم لے کر آیا کیا انکی اس غلط فہمی کی تصحیح ضروری نہیں ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ محمود غزنوی ایک عظیم مسلمان فاتح تھا۔ کیاانکی اس غلط فہمی کی تصحیح ضروری نہیں کہ وہ ایک بہترین جنگجو تھا۔ اور بس۔

وہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان اگر ایک اسلامی ملک بن گیا تو یہاں عورتیں جسم فروشی نہیں کریں گی، لوگ ہم جنس پرست نہیں ہونگے، شراب نہیں پی جائے گی، زنا نہیں ہوگا، جھوٹ نہیں ہوگا،  چوری نہیں ہوگی۔ امن وامان ہوگا، شیر اور بکری ایک گھاٹ سے پانی پئیں گے۔ یہاں سے وہاں تک صرف  مسلمان پائیں گے وہ بھی کسی ایک فرقے کے۔  فرقہ واریت پہ جنگ ختم ہو جائے گی۔

وہ سمجھتے ہیں کہ اگر لوگوں کے گروہ خدا کا انکار کریں تو اس سے انکا ایمان خطرے میں پڑ جائے گا۔ حالانکہ انکاا کرنے والے بھی ہزاروں سال سے موجود ہیں اور ایمان والے بھی اپنے ایمان پہ جمے ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب، کمزوری انکے ایمان میں ہے یا مضبوطی انکار کرنے والے کے بیان میں۔ اسکا ایک اور مطلب ہے کیونکہ وہ اپنے ایمان کا دفاع کرنے سے آگاہ نہیں اس لئے انہیں انکار کرنے والے سے ڈر لگتا ہے۔ اسکی ایک اور وجہ ہے وہ اپنے ایمان میں کشش نہیں پیدا کرتے بلکہ ہیبت پیدا کرتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ ہیبت سے دل مسحور کئے جا سکتے ہیں۔

کیا انہِیں اس چیز پہ مجبور نہ کیا جائے کہ اصل کتابوں کی طرف رجوع کرو۔ اور اپنے ایمان کو مضبوط۔ جو ایمان ایسے ہر کس و ناکس کے بیان پہ ڈول جائے اسے سپلیمنٹس کی بے حد ضرورت ہے۔ اسے یہ معلوم ہونے کی بے حد ضرورت ہے کہ وہ کیوں کمزور ہے اور اسے کیسے مضبوط ہونا ہے۔ اسے معلوم ہونا چاہئیے کہ انکار کرنے والا کیا دلائل رکھتا ہے جسکی بناء پہ وہ اسے، مضبوط ایمان والے کو چت کر دیتا ہے۔ اور مضبوط ایمان کا دعوی کرنے والے یہ کہنے کے علاوہ کچھ نہیں کہہ پاتے کہ اپنا علاج کرائیے۔ حالانکہ  انہیں دوسروں کو یہ مشورہ دینے کی نہیں اپنے علاج کی آپ ضرورت ہے۔ اور انکا علاج اپنے دین سے خود آگہی حاصل کرنے میں ہے جو وہ نہیں کر پاتے اور نہ کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ دین اس سلسلے میں خاصہ کڑا ہے۔

کیا انہیں یہ نہیں بتایا جائے کہ جب تک معاشرے میں انصاف نہیں ہوگا اور معاشی خوشحالی نہیں ہوگی ان میں سے کوئ چیز ختم نہیں ہوگی اور نہ کوئ نئ مثبت چیز جنم لے گی۔  سوائے اسکے کہ ہم منافقین کے گروہ در گروہ تخلیق کریں۔

انہیں معلوم ہونا چاہئیے کہ جب تک انسان زندہ ہے، ان کے خیالات اور زندگی سے انکے مطالبات ایک دوسرے سے الگ رہیں گے۔ یہی اس دنیا کا حسن ہے، آزمائیش ہے،اور مقصود۔

جب ہی  کائینات میں تین قوتیں بر سر پیکار نظر آتی ہیں۔ خدا ، انسان اور شیطان۔ اگر ان میں سے صرف ایک قوت بچ جائے تو کائینات میں نہ نمو ہوگا نہ استحکام۔

9:40 AM

جسم فروشی, جمہوریت, ضیاءالحق, مکی، پاکستان، شدت پسندی، مذہب، خواتین, ہم جنس پرستی

جلوے کا حلوہ

بدلتے وقت کے ساتھ الفاظ اپنے معنی بدل دیتے ہیں ۔ الفاظ ایکسٹرنل یو ایس بی ہوتے ہیں۔ یہ وہ انسانی عضو ہوتے ہیں  جو جسم کے ساتھ جسمانی طور پہ منسلک نہیں ہوتے۔ سو انسان کی ذہنی سوچ کے ساتھ یہ بھی بظاہر وہی ہوتے ہیں مگر معنوں میں وہ نہیں رہتے۔ مگر

عطاءالحق قاسمی صاحب

شاید اس سے واقف نہیں۔ اس لئے جب صدر زرداری نواز شریف کو مولوی  نواز شریف کہتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ کیونکہ نواز شریف شراب نہیں پیتے، ڈانس نہیں کر سکتے اور خواتین کے ساتھ تعلقات نہیں بناتے اس لئے زرداری نے انہیں مولوی کہا ہوگا۔ عطاء صاحب الفاظوں سے پیچھے رہ گئے۔ در حقیقت عطاء الحق قاسمی صاحب، حرم کا مطلب بھی بھول گئے ہیں۔ حالانکہ یہ اب تک اپنے اصل معنوں کے ساتھ رائج ہے۔

ڈانس تو پپو سالا بھی نہیں کر سکتا ، لیکن وہ مولوی پپو سالا نہیں کہلاتا۔  شراب پینے والے کہتے ہیں کہ بات شراب نہ پینے میں نہیں  بلکہ پی کر نہ لڑکھڑانے میں ہے۔  اب کیا کیا جائے، وہ بن پئیے ہی  بد مست ہاتھی بنے ہوءے ہیں پی لیں تو خدا جانے کیا حشر ڈھا دیں۔ گمان ہے کہ اکثر لوگوں کو گناہ کرنے پہ عذاب ہوتا ہے اور کچھ کو نہ کرنے پہ۔ خواتین کے متعلق میں کچھ نہیں کہتی۔ ایک

انگریز خاتون صحافی

نے بہت کچھ کہا ہے مگر سب بکواس ہوگی۔ خواتین ایسی باتیں مردوں کی نفرت میں کہتی ہیں۔ خاص طور پہ گوری عورتیں تو پاکستانی مرد رہ نماءووں کی کم آمیزی کا بدلہ اسی طرح لیتی ہیں۔

صدر زرداری نے اپنے تازہ بیان سے قوم کو ایک نئے امتحان میں ڈال دیا ہے اور لگتا ہے کہ ہر ایک دو تصویریں لے کر بیٹھا ہوا ہے اور مقامات فرق معلوم کر رہا ہے۔ نواز شریف اور مولوی نواز شریف میں۔ حالانکہ آج کل نواز شریف اس حالت میں ہیں کہ مقامات آہ فغاں بآسانی معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ مگر یہ تو ساری دنیا جانتی ہے کہ پاکستانی کوئ آسان کام نہیں کرتے۔ اگر قسمت کوئ آسان کام ہمارے اوپر ٹھونس ہی دے تو کوشش کرتے ہیں کہ  اسے پہلے مشکل بنادیا جائے پھر ہم اس سلسلے میں کچھ کریں۔ لوگ بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑاتے ہیں اور اس پہ فخر کرتے ہیں ہم گھوڑوں میں بحر ظلمات نکالتے ہیں ، اور پھر بھی کوئ نعرہ ہائے تحسین بلند نہ کرے تو اسے گھوڑا بلکہ گدھا بنا دیتے ہیں۔

خیر، تازہ ترین سوال یہ ہے کہ صدر زرداری نے مولوی نواز شریف کا لقب انہیں کیوں دیا؟

کیا اس لئے کہ ایک زمانے میں وہ بڑے ہو کر  وزیر اعظم نہیں امیر المومنین بننا چاہتے تھے۔

اس لئے کہ وہ ہمارے مقدس مقامات پہ اتنا عرصہ گذار چکے ہیں اور وہاں انکے اتنے قلبی تعلقات ہیں کہ انہیں اب مولوی نہ کہا جائے تو اس ناہنجار قوم پہ ہتک عزت کا دعوی کر دینا چاہئیے۔

اس لئے کہ  وہ رائے ونڈ جیسے مقدس مقام کے پہلو میں اپنے فارم ہاءوس میں رہتے ہیں۔ اس فارم ہاءوس کو کچھ بد طینت بادشاہ کا محل کہتے ہیں  جبکہ وہ نہییں جانتے کہ فارم ہاءوس پہ تو ٹیکس بھی واجب نہیں ہوتا۔ اور مولوی صاحب کو بالآخر جنت میں جانا ہے تو دنیا میں کیا وہ جنت کا مزہ چکھ نہیں سکتے۔ جبکہ کسی سُرخے شاعر نے یہ مسئلہ بھی کھڑا کر رکھا ہے کہ

آپکو جنت اور مجھے دوزخ عطا ہوگی

بس اتنی سی بات پہ کیا محشر بپا ہوگی

ایسے عقل کے اندھوں کے لئے تو محشر دنیا میں ہی بپا ہونی چاہئیے۔ یہ ہے نئے مولوی صاحبان کا ایجینڈا بمعہ ایک ڈنڈا۔

 اچھا تو کیا اس لئے کہ وہ مرد مومن مرد حق  مولوی ضیاءالحق کی ان سائینسی کوششوں کا کامیاب نتیجہ ہیں جس میں وہ ایک ماں اور ٹیسٹ ٹیوب کے بغیر ایک نظریاتی اولاد پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔انکی اس دانش سے حیران ہو کر بعض ان دیکھی قوتوں کو انکا جہاز فضا میں پھاڑنا پڑا۔ ناکام لوگ ، کامیاب لوگوں کے ساتھ یہی سلوک روا رکھتے ہیں۔

کیا اس لئے کہ وہ اپنے آقائے سیاست کے فلسفے اور باقیات کو کمال صبر اور جراءت سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ اور انکی وفاداری کا ثبوت یہ ہے کہ وہ پاکستان کی سالمیت تو کیا خود پاکستان کو کسی خاطر میں نہیں لاتے۔

میں ان پیش کئے گئے نظریوں سے کسی طور مطمئن نہیں۔ بھلا یہ بھی کوئ باتیں ہیں جن پہ کسی کو مولوی کہہ دیا جائے۔ میں تو آج تک مولوی، حلوے وغیرہ سے شغف رکھنے والے اس بے ضرر شخص کو سمجھتی رہی جس سے اگر کوئ خار کھاتا ہے تو وہ بچے جو قرآن ناظرہ کی تعلیم حاصل کر رہے ہوتے ہیں۔ اماں مولوی صاحب کو حلوہ بنا کر بھیجتی ہیں اور مولوی صاحب ڈنڈے یا پائپ سے بھی پٹائ لگا دیں تو اماں جان فرط عقیدت سے انکے دست و بازو کو دیکھتی ہیں۔ کیا محنت کی ہے میرے بچے پہ۔ ماں صدقے ، ماں واری۔ اور مزید حلوہ نذر کرتی ہیں۔ مولوی صاحب  اپنی سادگی کے باعث حلوے اور عقیدت سے بہلے رہتے تھے۔ ادھر بچے کے سینے میں انتقام کا ایک الاءو روشن رہتا ہے اور حلوے کی محبت۔ یہ روائیتی مولوی صاحب تھے اور یہی روائیتی مولوی صاحب بنانے کا طریقہ۔

مگر اب لگتا ہے امتداد زمانہ سے مولوی کے معنی تبدیل ہو گئے ہیں۔

سو کچھ کا کہنا ہے کہ بچپن میں مولوی صاحب کے ڈنڈے کو زرداری صاحب اب تک نہیں بھولے۔ اور اس کا تعلق کچھ کچھ اڈیپس کمپلیکس سے ملتا ہے۔ فرائڈ کو کیونکہ مولوی صاحب میسر نہیں تھے اس لئے وہ اسکا کوئ مناسب سا نام نہ رکھ پایا۔ مولوی صاحب کا ڈنڈا، طالب علم کی پیٹھ اور اماں جان کا حلوہ وہ بھی مولوی صاحب کے لئے۔ اس مثلث کے کیا اتنے سنگین نتائج نکل سکتے ہیں۔ اس پہ تو ایک فلم بن سکتی ہے۔

کوئ کہہ رہا تھا کہ مولوی اب ایک شخص نہیں کیفیت کا نام ہے. یہ کچھ خاص لوگوں پہ جن میں خاص جینیاتی ریسپٹر ہوتے ہیں کسی بھی وقت طاری ہو سکتی ہے۔ اس وقت آپکو پتہ چلتا ہے کہ ایسے ویسے لوگ کیسے کیسے ہو گئے۔ یہ عجیب اثر ہے کہ اس کیفیت میں  لوگ ہر قسم کی غیر اسلامی حرکات اور سکنات کے لئے اپنے آپکو آمادہ پاتے ہیں۔  لیکن منہ سے اسلام اسلام ہی نکلتا ہے۔

کچھ اور لوگوں کا خیال ہے کہ مرد مومن اپنے کامیاب تجربے کے بعد اسکے سائینسی رازوں سے کسی مرد ناداں کو مطلع کر گئے تھے۔ وہی والے جنکے متعلق اقبال بہت عرصہ پہلے با خبر کر چکے تھے کہ مرد ناداں پہ کلام نرم و نازک بے اثر۔ لیکن اس وقت بھی ہماری انٹیلیجنس ایجنسیز کے یہی لچھن تھے۔  اقبال نےخفگی میں کہا بھی کہ تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن۔ انٹیلیجنس والوں نے اسے پیش سے پڑھکر سازشوں کے جال بننا شروع کر دئیے۔ اور اپنے پرائے ہر ایک کے لئے بُن ڈالے۔ آجکل اپنے والے ادھیڑنے کی کوششوں میں ہیں۔ سو اسکے بعد  عام لوگوں میں مولوی کیفیت کو ابھارنا اور پھیلانا  نیت اور فتور نیت کے ساتھ جڑ گیا۔ جب جب نیت میں فتور آئے کوئ شخص تب تب مولوی بن جاتا ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ فوج کے خلاف محاذ آرائ کی وجہ سے انہیں یہ عظیم لقب ملا۔ اگرچہ کہ ہمیں اب تشویش ہو چلی ہے کہ ایک تو طالبان کے لئے نرم گرم جذبہ رکھنے پہ ہی نواز شریف کو لوگوں کے طعنے سننے پڑ رہے تھے اور حالت یہ تھی کہ جب سے تونے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے سنگ ہر شخص نے ہاتھوں میں اٹھا رکھا ہے۔ وہاں نواز شریف نے یقیناً کسی بد خواہ کے کہنے پہ فوج سے اڑنگا لے لیا۔ اگر انہوں نے کبھی دھوبی کے کتے کی زندگی دیکھی ہوتی تو اس  مرحلہء سودوزیاں پہ انہیں سمجھنے کی آسانی بہم ہوتی ہے۔  یہ فارم ہاءوس میں رہنے کا نقصان ہے۔

دوسری طرف وہ لوگ جو  طالبان اور فوج کو ایک ہی سکے کے دو رخ سمجھتے رہے اور بیک وقت ان دونوں کی زلف کے اسیر ہیں اور اس وجہ سے نواز شریف کو بھی عزیز رکھتے تھے۔ اب  انکے لئے مرحلہ ء سخت ہے کسے عزیز رکھیں کس کو مستعفی چاہیں۔

لیکن بات وہیں آکر رک جاتی ہے کہ یہ تمغہ  نواز شریف کو کیوں دیا گیا ہے۔ نورجہاں یا معین اختر کو کیوں نہیں دیا گیا۔

کچھ اور کھوجی، اسکے تانے بانے پنجابی طالبان کی پنجاب حکومت کے ساتھ خوشگوار تعلقات میں دیکھتے ہیں۔ یہ بری بات ہے۔ حاسدی ہی ایسا کر سکتے ہیں و من شرّ حاسد اذا حسد۔ جذبہ ء مفاہمت کو عام کرنے والے لوگوں کو یہ بات کرنا زیبا نہیں۔

کچھ اور لوگ اسکی وجہ مفتی رانا ثناءاللہ کو گردانتے ہیں۔ یعنی طویلے کی بلا بندر کے سر۔ اس پہ رانا ثناء اللہ  صاحب کے عقیدت مند مجھ سے ناراض نہ ہو جائیں میں نے انہیں قطعاً بندر نہیں کہا۔ یہ محاورہ بنانے والے کی نیت کی خرابی ہے۔ وہ ہر مسکین کو بندر سمجھانا چاہتا ہے۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ایک ایسا مفتی جو لوگوں کے واجب القتل ہونے پہ فتوی دینے کو تیار رہتا ہو۔ اور قتل ہو بھی جاتا ہو تو اس کا گرو تو مولوی ہی کہلائے گا۔ زرداری صاحب، سلمان تاثیر کا غم کھائے بیٹھے تھے اور ابھی رانا ثناء اللہ  کے فتوے اور سلمان تاثیر کے قتل کے مابین گتھیاں سلجھ بھی نہ پائں کہ رانا ثناء اللہ نے اس دفعہ بابر اعون کو بھی واجب القتل قرار دے دیا۔ بابر اعوان صاحب کا نہیں معلوم کس کھوہ میں بیٹھے ہیں البتہ رانا ثناء اللہ سنا ہے مونچھوں کی اصلی گھی سے مالش کراتے ہیں۔ مونچھیں ہوں تو رانا ثناء اللہ جیسی ہوں ورنہ نہ ہوں۔

دیکھا آپ نے حلوہ کھانے والے مولوی صاحب، خدا غارت کرے زمانے کی بد چلنی وغیرہ کو کہ  قتل وغیرہ سے بھی پہچانے جانے لگے ہیں۔ حلوے سے اٹھنے والے مولوی صاحب کا خمیر اب خدائ جلوے کے برابر ہو چکا ہے۔ جسکے بارے میں خدا کہتا ہے کہ تاب نہ لا سکو گے ہمارے جلوے کی۔

عطاء الحق قاسمی صاحب، نے آخر میں صدر زرداری کی اس تقریر کو غیر صدارتی قرار دیا ہے۔ میں اس سے اتفاق کرتی ہوں۔ صدر زرداری کو اسکا حل ، حلوے میں نکالنا چاہئیے تھا جلوے میں نہیں۔ ہو سکتا ہے مولوی صاحب کی یادداشت کام کرنے لگ جاتی۔ لیکن ایسا ہوتا تو عطاء الحق قاسمی جیسا سینیئر قلم کار اور مجھ جیسا نو آموز لکھنے والا  کس چیز کے متعلق لکھتے۔  انہی کے دم سے ہیں آباد یہ قلم کے مے خانے۔ یہ مصرعہ ابھی تخلیق کیا ہے۔ میں اسکا دوسرا مصرعہ جوڑتی ہوں۔ آپ حلوہ  سوچئیے اور قسمت میں ہو تو جلوہ۔

3:45 PM

پاکستان, پنجاب, زرداری, صدر, طالبان, مولوی, نواز شریف

ٹھرکی

شادی کے پندرہ دن بعد ہم دونوں سیر وتفریح کی غرض سے ترکی روانہ ہوئے۔  ہمارا وہاں قیام پندرہ دن کے لئے تھا۔ اس لئے ایک گائڈڈ ٹور لے لیا جس میں چھ شہر شامل تھے۔ یوں ہم ان پندرہ دنوں میں گھڑی پہ نظر رکھے، بسوں اور ٹور گائیڈز کے پیچھے دوڑتے رہے اور ان شہروں میں جابجا بکھری ہوئ تاریخِ کو ازبر کرتے رہے۔  یہ ہمارا ہنی مون نہیں بلکہ اسٹڈی ٹور ثابت ہوا۔

استنبول

پہنچنے کے دوسرے دن جب ہم

نیلی مسجد

،

آیہ صوفیہ

اور

ٹوپ کاپی کا محل

دیکھ کر فارغ ہوئے تو سہ  پہر کو ہم استنبول کے

گرانڈ بازار

کی طرف نکل گئے۔ یہ سب جگہیں ہماری رہائش گاہ اور ایکدوسرے سے اتنے قریب تھیں کہ ہم پیدل ہی چکر لگا رہے تھے۔

جیسے ہی ہم گرانڈ بازار میں داخل ہونے لگے میرے شوہر صاحب نے کہا کہ آپ ذرا اس گلی کو چیک کریں میں ابھی آتا ہوں۔ میں گلی میں سیدھی چلتی چلی گئ۔ گرانڈ بازار خاصہ بڑا بازار ہے کہا جاتا ہے کہ اس مِں چار ہزار سے زائد دوکانیں ہیں۔ خوبصورتی اس بازار کی یہ ہے کہ ایک چھت تلے دور تک پہلا ہوا ہے اسکی چھت میں گنبد اور محرابیں بنی ہوئ ہیں۔ جن پہ خوبصورت، رنگین نقش و نگار ہیں۔ جو کہ ترک قدیم تعمیری ثقافت کا حصہ ہے۔

صراط مستقیم پہ کوئ زیادہ دور مستقل مزاجی سے چل پائے یہ کم ہوتا ہے۔ راستے کے  موڑ کے اسرار اپنی جانب کھینچ لیتے ہیں۔

میں بھی ایک گلی میں مڑ گئ۔

دوکاندار آوازیں لگا لگا کر اپنی جانب متوجہ کرانا چاہتے تھے۔ لیکن انہیں اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ میں ہوں کہاں کی۔ انکی اکثریت نجانے کیوں مجھے عرب سمجھ رہی تھی اور وہ بار بار کہہ رہے تھے اسماء، اسماء۔ جیسے ہمارے یہاں پٹھان ہر نوجوان لڑکی کو شمائلہ کہتے ہیں۔

اسی شور میں ایک دوکاندار نے کہا آر یو فرام پاکستان، کراچی۔ میں خوشی میں رک گئ۔ ترکی میں زبان بڑا مسئلہ ہے۔ یوروپی نقوش رکھنے والے ترک انگریزی سے تقریباً نابلد ہیں۔ استنبول، ترکی کا ایک بڑا سیاحتی شہر ہے اس سمیت باقی پانچ شہروں میں بھی زبان ایک مسئلہ رہی۔ خریداری کے لئے کیلکولیٹر استعمال ہوتا ہے۔ بیشتر لوگ انگریزی گنتی بھی نہیں جانتے۔ یہ دوکاندار دو تین دفعہ کراچی آ چکا تھا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں جو بتایا وہ یہ تھا کہ وہ کراچی سے قالین لا کر یہاں بیچتا ہے۔ اسکے علاوہ زینب مارکیٹ ، کراچی سے چیزیں لے کر آتا ہے اس سے انہیں بڑی آمدنی ہوتی ہے۔

خیر جناب، اس دوکاندار سے باتیں بگھارنے کے بعد جب میں پلٹی تو وہی ہوا ، جسکی توقع کی جانی چاہئیے تھی۔ میں راستہ بھول چکی تھی۔

کوئ انگریزی نہیں جانتا تھا، زیادہ لوگوں سے راستہ پوچھ کر میں اپنے آپکو مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی اس لئے طے کیا کہ باہر جانے کے لئے کسی ایک سیدھے راستے پہ چلتے چلے جانا چاہئیے۔ ترکیب کامیاب رہی۔ میں بازار سے باہر نکل آئ۔ لیکن یہ وہ دروازہ نہیں تھا جہاں سے اندر داخل ہوئے تھے۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد کوشش کی کہ نیلی مسجد کے مینار نظر آجائیں۔ استنبول کی پہچان خوب صورت نیلی مسجد ہے۔ لیکن زمین آسمان کی سرحدیں اس نظارے  سے محروم تھیں۔ یعنی میں خاصی دور نکل آئی تھی۔

اب رسک لینا ہی پڑے گا۔ میں نے ایک جوس کارنر قسم کی دوکان پہ رک کر ایک جوس کا ڈبہ لیا اور اس بہانے دوکاندار سے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ نیلی مسجد کس طرف ہے۔ اسے انگریزی بالکل نہیں آتی تھی۔ اس نے ایک اور شخص کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بھی اشاروں ہی سے سمجھا ۔ اور پھر اشاروں میں اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ سمجھ میں آئ کہ اس طرف سیدھے چلتے رہنا ہے۔

کوئ دس منٹ چلنے کے بعد نیلی مسجد کے مینار نظر آئے۔ اب میں ہوٹل تک پہنچ سکتی تھی۔ خاصی دیر ہو چکی تھی اور میرا خیال تھا کہ موصوف ہوٹل پہنچ چکے ہونگے۔ ریسیپشن سے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ ابھی نہیں آئے۔ چابی میرے پاس نہیں تھی۔ متعلقہ شخص بھی وہاں نہیں تھا۔ میں لابی میں رک گئ۔

وہاں ایک پندرہ سولہ سال کی لڑکی اپنی ماں کے ساتھ موجود تھی۔ ان سے باتیں شروع ہوئیں۔ جب انہیں پتہ چلا کہ میں اپنے شوہر کو گرانڈ بازار میں کھو آئ ہوں تو بے اختیار زور زور سے ہنسنے لگیں۔ پندرہ دن کی دولہن شوہر گم کر کے آرہی ہے۔ ماں اپنی بیٹی کی ایسی ہی باتیں بتانے لگی وہ یہودی النسل خواتین اسرائیل سے گرمیوں کی چھٹیاں  گذارنے آئے ہوئے تھیں۔

پاکستان میں تو ہم نے صرف را کے ایجنٹوں کا نام سنا ہے کبھی کسی یہودی سے ملاقات نہ ہونے پائ۔

تھوڑی دیر میں متعلقہ شخص آیا اور مجھے کمرے تک چھوڑ گیا کہ وہ چابیوں کا نچارج تھا۔

میں جا کر بالکونی میں کھڑی ہو گئ۔ تاکہ شوہر صاحب کو آتے ہوئے دیکھ سکوں۔ عقل مندی کا تقاضہ تھا کہ وہ ہوٹل واپس آئیں۔ نیچے سڑک پہ نظر جمائے جمائے مجھے احساس ہوا کہ ترکی ہمارے ملک سے کس قدر مختلف ہے حالانکہ یہاں کی آبادی کی اکثریت مسلمان ہے۔ سڑک پہ خواتین مغربی مختصرلباس میں گھوم رہی ہیں۔ ایک لڑکی منی اسکرٹ، گہرے گلے اور بغیر آستین کی ٹی شرٹ پہنے اپنے ساتھی مرد کی کمر میں ہاتھ ڈالے جا رہی ہے۔ اسی روڈ پہ ایک لڑکی عبایہ اور اسکارف پہنے اپنے ساتھی مرد کا ہاتھ پکڑے چل رہی ہے جبکہ مرد کا ہاتھ اسکی کمر میں حمائل ہے۔ سر عام اپنی خواتین سے التفات دکھانا چاہے وہ حجاب میں ہوں یا بے حجاب، محرم ہوں یا نامحرم ترکی میں برا نہیں سمجھا جاتا۔ روڈ کے کنارے گھنے درختوں کے نیچے نوجوان جوڑے ایک دوسرے کی بانہوں میں گم ہیں۔ وہ اتنے گم تھے کہ، انکے چہرے نظر نہیں آرہے تھے۔

ایک  گھنے درخت کے نیچے ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ نظر آرہا ہے۔ ایسے رسیٹورنٹ استنبول میں بہت ہیں۔ جن میں اچھی شراب اور جوس سب دستیاب ہیں۔ ارد گرد کی میزوں پہ لوگ اپنے مطلب کے مشروب سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

یہ اتنی عجیب جگہ ہے کہ ٹوپ کاپی محل جسے ایک میوزیم میں تبدیل کیا جا چکا ہے۔ اور اسکے ایک حصے میں اسلامی نوادرات کا مجموعہ ہے۔ جس میں رسول پاک کے موئے مبارک سے لیکر وہ قرآن پاک موجود ہے جسکی تلاوت حضرت عثمان وقت شہادت کر رہے تھے۔ اور اس حصے میں احترام کے پیش نظر ہر وقت قرآن پاک کی تلاوت ہوتی رہتی ہے۔ باہر اس سے چند گز کے فاصلے پہ ریسٹورنٹ میں لوگ ترکی کے مشہور ڈونلڈ اور شیش کباب بیئر اور سرخ شراب کے ساتھ بیٹھے کھا رہے ہیں۔ ادھر نیلی مسجد کے اردگرد پھیلے پارک میں نوجوان انگوروں کی بیلوں تلے ایک دوسرے کو فسانہ ء عشق سنانے میں مصروف۔

شاید اسی کے لئے شاعر نے کہا کہ

بھوں پاس قبلہ ء حاجات چاہئیے

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہئیے

ترکی تو ٹھرکی ہے۔ کسی نے ترکی جانے سے پہلے میرے کان میں سرگوشی کی تھی۔

 یہیں ایسی دوکانیں بھی نظر آتی ہیں جہاں دیواروں پہ اسلامی طغرے نصب ہیں اور جہاں کسی بھی قسم کا نشہ آور مشروب نہیں ملتا۔ اذان تمام مساجد سے ایک وقت میں ہوتی ہے اور اسکا وقت مقرر ہے۔ تمام مساجد میں خواتین کے لئے جگہ موجود ہے۔ تمام مساجد کے ساتھ صاف ستھرے وضو خانے موجود ہیں۔ تمام وضو خانوں کے ساتھ صاف ستھرے بیت الخلاء موجود ہیں۔

چھ مختلف شہروں کو بسوں کے سفر کے ذریعے دیکھا۔ ترکی ایک جدید ترقی یافتہ ملک ہے۔ ترکی ترقی میں کسی مغربی ملک سے کم نہیں۔ سیاحتی نظام اتنا مضبوط ہے کہ کسی جگہ ہمیں ایک منٹ کی بھی دیر نہیں ہوئ۔ کوئ افراتفری نہیں۔ ٹرانسپورٹ انتہائ منظم،  روڈ صاف ستھرے، ہوٹلز صاف ستھرے ، کھانا بہترین، جو انکے ٹور میں موجود ہے وہ سب مہیا ہوگا۔

  سوائے کونیہ کے جہاں مولانا رومی کا احترام بہت زیادہ ہے۔ کسی اور شہر میں سر عام شراب پینے پہ کوئ منادی نہیں۔ اور اناطولیہ کا گائڈ کونیہ کے لوگوں کو منافق کہتا ہے۔ گھروں میں شراب پیتے ہیں باہر نہیں۔

آج مجھے ترکی پھر یاد آیا۔ جب میں دیکھتی ہوں کہ پاکستان کے شدت پسند مذہبی عناصر ترکی کے حالیہ الیکشن میں اسلام پسندوں کی لگاتار تیسری بار کامیاب ہونے کی خوشی کواپنی فتح سمجھتے ہیں ۔

ترکی کی اسلام پسند حکومت اپنے عوام کی مذہبی طرز زندگی پہ زور زبردستی نہیں دکھاتی۔ وہ مسجد کے زیر سایہ خرابات دینے کو معیوب نہیں سمجھتی۔ کیا ایسی اسلام پسندی ہمارے مذہبی حلقوں کے حلق سے نیچے اتر سکتی ہے۔

آئیے دیکھتے ہیں کہ ترکی میں تیسری بار اسلام پسندوں کی آنے والی حکومت کا منشور کیا ہے۔

جسٹس پارٹی کے طیب اردگان ،  ترکی کے موجودہ وزیر اعظم اپنا

ویژن ۲۰۲۳

پیش کرتے ہیں۔

اس کے تحت وہ ترکی کو دنیا کا بے مثال ملک بنانا چاہتے ہیں۔ وہ ترکی کو دنیا کی پہلی دس معیشتوں میں لا کر کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ برآمدات میں اضافہ، اوسط آمدنی میں اضافہ، غیر ملکی تجارت میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ جسکے نتیجے میں توقع ہے کہ مزید تین کروڑ نوجوانوں کو روزگار ملے گا۔ اس منصوبے میں توانائ بڑھانے اور بچانے کے منصوبے شامل ہیں۔ خارجہ پالیسی کے لئے ترکی کو یوروپی یونین کا فعال ترین کارکن بنایا جائے گا۔ وہ یوروپی یونین جو ترکی کو یوروپ کا حصہ تسلیم کرنے سے ہچکچاتی ہے۔ ترکی عالمی امن و استحکام کو بڑھانے میں اپنا فعال ترین کردار ادا کرنا چاہتا ہے۔ اسکے تحت عوام کے لئے معالجین یعنی ڈاکٹرز  کی تعداد میں اضافہ کیا جائے گا اس ویژن میں یہ چیز شامل ہے کہ کوئ ایک ترک شہری بھی ایسا نہ ہو جسےہیلتھ انشورنس حاصل نہ ہو۔ٹرانسپورٹ کے شعبے میں گیارہ ہزار کلو میٹر ریلوے لائن بچھانے کا منصوبہ ہے۔ایسی بندرگاہ بنانے کا منصوبہ ہے جو دنیا کی پہلی دس بندر گاہوں میں شامل ہو۔ ہوائ جہاز کہ صنعت میں خود کفالت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ دو ہزار تئیس تک ترکی کو دنیا کا پانچوں بڑا سیاحتی مرکز بنایا جائے گا۔ جس سے اسے پچاس ارب ڈالر کا ریوینیو ملے گا۔

یہ پورا ویژن، ترکی کو معاشی، سطح پہ مضبوط بنانے کے ارادے کو ظاہر کرتا ہے۔ کساد بازاری کے اس دور میں جب دہشت گردی اور جنگ کی وجہ سے ہماری معیشت بد حالی کا شکار ہے۔ ترکی اس وقت دنیا کی بلند ہوتی ہوئ معیشتوں میں سے ایک ہے۔

اس ویژن دو ہزار تئیس میں جو ترکی کی اسلام پسند جماعت کی طرف سے پیش کیا گیا ہے ایسی کوئ ایک شق نظر نہیں آتی جس میں ملک میں نظام شریعت کے قیام زور دیا گیا ہو۔ جس میں جہاد اور جہادی قوتوں کی پشت پناہی کا عزم کیا گیا ہو۔ جس میں دفاعی طاقت کو بڑھانے کا اظہار ہو۔  جس میں اسکولوں یا تعلیمی سطح پہ نصاب کو اسلامی بنانے کا ارادہ ظاہر کیا گیا۔ جس میں خواتین کو چادر اور چار دیواری میں بند کرنے کا عندیہ دیا گیا ہو۔ جس میں مغربی قوتوں سے نفرت کا اظہار کیا گیا ہو۔

ایک ایسے ترکی میں جو اب سے چند سال پہلے میں نے دیکھا اور جو اب بھی کم و بیش ایسا ہی ہے کہ میرے ایک عزیز پچھلے سال وہاں گئے اور اسے ویسا ہی پایا۔ جیسا میں نے دیکھا تھا۔ اسلام پسندوں کی کامیابی کیا وہ معنی رکھتی ہے جو ہمارے یہاں کے شدت پسند سمجھ رہے ہیں اور سمجھانا چاہتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ ہمارے مذہب پرست وہاں کی عام زندگی کو دیکھیں تو ترکوں کے اسلام پہ لعنت بھیج کر فی الفور انہیں کافر قرار دے دیں گے۔

میں تو سمجھتی ہوں کہ ہم میں سے ہر وہ شخص جو ترکی جانے کے وسائل برداشت کر سکتا ہو اسے ضرور صرف چار دن ہی سہی استنبول میں ضرور گذارنے چاہئیں۔ بالخصوص وہ جو شدت پسندوں سے ہمدردی کا رجحان رکھتے ہیں۔ انہیں وہاں جا کر اندازہ ہوگا کہ باوجود تمام آزادی اور مذہب کے عدم پروپیگینڈے کے ترکی میں مذہب پسند اپنی مرضی کی زندگی گذار رہے ہیں۔ اور غیر مذہب پسند اپنی مرضی کی۔ ترکی ایک سیکولر ملک ہے۔

کہیں پر بھی لوگوں نے ہمیں اس وجہ سے اہمیت نہیں دی کہ ہم پاکستانی مسلمان ہیں۔ کسی نے ہم سے ہمارا فقہ نہیں پوچھا۔ کسی نے ہم سے دینی مسائل پہ بات نہیں کی۔ کسی کو فکر نہیں تھی کہ ہم نماز پڑھتے ہیں یا نہیں، ہم شراب پیتے ہیں یا نہیں۔ میں سر پہ دوپٹہ اوڑھتی ہوں یا نہیں۔ کوئ میری نماز کی وجہ سے مجھ پہ صدقے واری نہیں ہو رہا تھا۔ کوئ مجھے شراب نہ پینے کی وجہ سے ستائشی نظروں سے نہیں دیکھ رہا تھا۔  کسی کو ملت اسلامیہ کے پارہ پارہ ہوجانے کا صدمہ نہیں تھا۔ کسی کو خلافت کی تجدید سے دلچسپی نہیں تھی۔

یہ بھی حیرانی کی بات ہے جسٹس پارٹی نے الیکشن کے دوران مذہب کو اپنی تشہیری مہم میں استعمال نہیں کیا۔ بلکہ انکا موٹو ترکی کی مجموعی ترقی رہا۔

کیا یہاں مجھے یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ ہمارے یہاں مذہبی جماعتیں کیا رول ادا کرتی ہیں اور وہ ملکی سطح پہ کسی بھی قسم کے ویژن سے کیسے بالکل محروم ہیں۔ اتنی محروم ہیں کہ ایسا کوئ قانون بنانے میں مدد نہیں کر سکتیں جسکی رو سے خواتین کو سر عام برہنہ پھرانے والے کے لئے عبرت ناک سزا رکھی جا سکے یا خواتین پہ تیزاب پھینکنے والوں کو خوفناک انجام کے سامنے کا ڈر ہو۔ درحقیقت وہ اور انکے پیروکار ایسے واقعات کی مذمت تک کرنے سے گھبراتے ہیں۔ یہ مذہبی جماعتیں نوجوانوں کو ملک کی ترقی کی توانائ بنانے کے بجائے اپنے مفادات کی جنگ کو جہاد کا نام دے کر ان نوجوانوں کو اس کا ایندھن بناتی ہیں۔

میں حیران ہوتی ہوں۔ جب یہ لوگ ترکی کے اسلام پسندوں کی ترکی میں فتح پہ تالیاں بجاتے ہیں تو آخر یہ کیا سوچ رہے ہوتے ہیں۔ کیا سوچتے ہیں یہ لوگ؟  سمجھ میں نہیں آتا کہ ٹھرکی کون ہے؟

7:05 PM

آیہ صوفیہ, استنبول, پاکستان, ترکی, ٹوپ کاپی محل, حکومت, سیاست, سیکولر, طیب اردگان, مذہب, نیلی مسجد

چھاتی کا کینسر

میں خواتین کے خاص ملبوسات کے اسٹور پہ ایک ساتھی خاتون کے ساتھ موجود تھی۔ جب میری ساتھی خاتون نے مجھے ٹہوکا دیا۔ ان خاتون کو کچھ خاص چیز چاہئیے۔ انہوں نے سرگوشی کی۔ اسکی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ لڑکی عبایہ پہنے ہوئے تھی اور سر پہ سختی سے اسکارف باندھا ہوا تھا۔ لیکن اس چھبیس ستائیس سال کی پیلاہٹ مائل سفید رنگت والی لڑکی کے چہرے پہ نظر پڑتے ہی میری نگاہ اسکی آنکھوں کے گوشوں  میں گم آنسوءووں پہ ٹہر گئ۔

میری چھٹی حس نے کہا ، وہ چھاتی کے کینسر کا شکار ہے۔ اسکی ایک چھاتی کو آپریشن کر کے کاٹ کر نکالا جا چکا ہے ۔ ابھی اسکی کیمو تھراپی یا چل رہی ہے یا حال میں ختم ہوئ ہے۔ جسکی وجہ سے اسکے سر کے سارے بال جھڑ چکے ہیں اس لئے اس نے اتنی سختی سے اسکارف لپیٹ رکھا ہے۔

یہ سب باتیں،  پلک جھپکتے میں  میرے ذہن میں آگئے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ میں اس بارے میں تفصیل سے پڑھ چکی ہوں جو معلومات مجھے حاصل ہوتی ہیں انہیں یاد رکھتی ہوں۔ جبکہ میری ساتھی خاتون کو اس بارے میں اتنا علم نہیں تھا  اس لئے وہ سمجھیں کہ وہ لڑکی اپنے جسم کی ساخت کو بہتر بنانے کے لئے کوئ خاص قسم کا زیر جامہ چاہتی ہے۔

ہم دونوں، اپنے علم کی بنیاد پہ دو مختلف رائے  پہ پہنچے۔ اس اثناء میں اسٹور کا دروازہ کھلا اور ایک اور لڑکی اندر داخل ہوئ۔ وہ اس لڑکی کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئ اور ایک دم گلے لگ گئ۔  وہ دونوں دوستیں بہت عرصے بعد مل رہی تھیں۔ لیکن اسکے گلے لگتے ہی عبایہ والی لڑکی رونے لگ گئ۔ اسے اسٹول پہ بٹھا کر دوست اس کا احوال پوچھنے لگی۔

یوں انکی ہلکی ہلکی باتوں سے پتہ چلا کہ اس لڑکی کی شادی کو پانچ سال ہوئے ہیں ۔ تیسرے بچے کی پیدائش کے تین مہینے بعد اسے لگا کہ چھاتی میں گٹھلی ہے۔ ڈاکٹر کو دکھایا ٹیسٹس ہوئے اور پتہ چلا کہ اسے چھاتی کا کینسر ہو گیا ہے۔

 وہ نوجوان لڑکی اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے اپنی دوست سے کہہ رہی تھی۔ ابھی تو میرے بچے بہت چھوٹے ہیں۔ حالانکہ وہ خود بھی اس مرض کے لئے چھوٹی تھی۔ پچھلے چھ مہینے میں ، میں چھ خواتین کے بارے میں سن چکی ہوں کہ وہ اس کا شکار ہو گئیں۔

 پاکستان میں ہر نو میں سے ایک خاتون اس جان لیوا بیماری کا شکار ہوتی ہے۔ لاحق ہونے کی صورت میں کسی ترقی یافتہ ملک کی نسبت جان سے گذرنے کا امکان بھی کہیں زیادہ ہوتا ہے۔

کسی بھی قسم کا کینسر ہونے کی سب سے بنیادی وجہ زندگی گذارنے کا انداز ہے اور دوسری اہم وجہ خاندان میں  اس مرض کا پایا جانا ہے۔

بریسٹ کینسر جن خواتین میں پائے جانے کا زیادہ امکان ہے وہ یہ ہیں۔

جن کے خاندان میں یہ مرض پہلے کسی کو ہو چکا ہو، ماں اور باپ دونوں کی طرف سے۔ ایک غلط خیال یہ ہے کہ صرف ماں کے خاندان میں  پایا جائے تو ہی امکان ہوتا ہے۔

وراثتی طور پہ ہی منتقل نہیں ہوتا۔ بلکہ  دیگر خواتین بھی زیادہ رسک پہ ہوتی ہیں۔ ان میں وہ جو بے اولاد ہوں۔ یا جنکے بچے تیس سال کی عمر کے بعد ہوئے ہوں۔

جنکے مخصوص ایام کم عمری میں ہی شروع ہو گئے ہوں جیسے دس گیارہ سال کی عمر میں۔

جنکے مخصوص ایام زیادہ عرصے تک چلتے رہے ہو۔ جیسے پچپن سال کی عمر کے بعد بھی۔

سن یاس یعنی ایام بند ہو جانے کے بعد اسکے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اس طرح نوجوان خواتین کے مقابلے میں زیادہ عمر کی خواتین زیادہ شکار ہوتی ہیں۔

جو خواتین اپنے بچوں کواپنا دودھ نہیں پلاتی ہیں  وہ  زیادہ خطرے میں ہوتی ہیں۔

وہ خواتین جو شراب نوشی کرتی ہیں۔

امکان زیادہ ہونے کا ایک مطلب یہ ہے کہ ایسی خواتین کو معمولی علامتوں کو بھی سنجیدگی سے لینا چاہئیے۔ یہ بالکل ضروری نہیں کہ اگر خاندان میں کسی کو ہو چکا ہو تو لازماً دوسری خواتین کو بھی ہوگا ۔  اسی طرح جنکے اولاد نہیں یا جنہوں نے اپنے بچوں کو دودھ نہیں پلایا انہیں ضرور ہوگا۔ انہیں نہیں  بھی ہو سکتا اور اسکو ہو سکتا ہے جس کے ایک درجن بچے ہوں جن میں سے ہر ایک کو اس نے دودھ پلایا ہو۔  جنکے خاندان میں کسی کو کبھی نہیں ہوا انکو بھی ہونے کے امکانات ہوتے ہیں اور اس طرح ایک اور وجہ طرز زندگی نکل آتی ہے۔

آپ کس طرح زندگی گذارتے ہیں اس پہ آپکی صحت کا دارومدار ہوتا ہے۔ بریسٹ کینسر کے سلسلے میں وہ خواتین جو  غذا کو رکھنے کے لئے پلاسٹک کی اشیاء کا استعمال کرتی ہیں زیادہ اس کا شکار ہوسکتی ہیں۔ پانی کی بوتل جو دھوپ میں دیر تک رکھی رہے زہر بن جاتی ہے۔ ان دوکانوں سے جہاں یہ باہر دھوپ میں رکھی ہوتی ہیں لینے سے گریز کریں اور دوکانداروں کو نصیحت کریں کہ پانی کی بوتلوں کو اور دیگر کھانے پینے کی اشیاء جو پالسٹک پیکنگ میں ہوتی ہیں دھوپ میں نہ رکھیں۔ اسی طرح مائکرو ویو اون میں کھانا گرم کرنے کے لئے پلاسٹک کی اشیاء کا استعمال، ہوٹل سے کھانے یا روٹی لانے کے لئے پلاسٹک کی تھیلوں یا پلاسٹک کے برتن کا استعمال یہ سب ایک خطرہ ہے آپکی صحت کے لئے۔

تنگ زیر جامہ کا استعمال، چھاتیوں میں خون کی ترسیل کو آہستہ کر دیتا ہے۔ جس سے زہریلے مواد کے جمع ہونے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ یہ یاد رہنا چاہئیے کہ خواتین میں تولیدی ہارمون کا سب سے زیادہ ذخیرہ چھاتیوں اور بچہ دانی میں پایا جاتا ہے۔ یہ ہارمون دیگر  زہریلے مرکبات کو بھی آسانی سے دوست بنا لیتا ہے۔ یوں آہستہ آہستہ ان میں کینسر کے خلئیے جنم لینے لگتے ہیں۔ صرف چھاتی ہی نہیں اکثر لوگوں کو ازار بند ٹائیٹ باندھنے کی عادت ہوتی ہے یہ بھی کینسر کو جنم دے سکتا ہے۔ کوشش کریں رات کو سوتے وقت ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنیں۔

ہم وہ ہوتے ہیں جو ہم کھاتے ہیں۔ ایک کہاوت ہے۔ لیکن درست ہے۔ سادہ کھانوں کی عادت ڈالیں۔ کھانا جتنا بھونا جاتا ہے، تلا جاتا ہے، بیک کیا جاتا ہے یا کوئلوں پہ سینکا جاتا ہے اتنا اس میں زہریلے مرکبات زیادہ بنتے ہیں۔ یعنی ایسے مرکبات جو کینسر پیدا کر سکتے ہیں۔

سادہ کھانا کھائیے، تازہ پھل اور سبزیوں کو اپنی روز کی خوراک کا حصہ بنائیے۔ بازار سے لانے کے بعد سبزی اور پھلوں کو اچھی طرح دھولیں۔ تاکہ ان پہ موجود کیمیائ کھاد اور جراثیم کش ادویات  اچھی طرح صاف ہو جائیں۔

تیل یا چکنائ کا ستعمال کم کریں۔ تیل یا چکنائ میں زہریلے مرکبات جذب کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اسے جسم میں زیادہ دیر تک رکھ سکتے ہیں۔ یوں خلیوں کے عمل میں رکاوٹ ڈال سکتے ہیں۔

اپنے وزن کو مقررہ حدوں کے اندر رکھنے کی کوشش کریں۔ سو بیماریوں کی ایک بیماری موٹاپا ہے۔

لائف اسٹائل میں سب سے اہم چیز ورزش ہے۔  اگر ہم ایک ایسی زندگی گذارتے ہیں جس میں حرکت کم ہوتی ہے تو ہمارے جسم کے تمام حصوں تک خون کی ترسیل مناسب نہیں ہو پاتی۔ وہ حصے جہاں خون کی ترسیل آہستہ ہوتی ہے وہاں زہریلے مرکبات کے جمع ہونے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ ورزش ہمیں یہ فائدہ دیتی ہے کہ جسم کے تمام اعضاء حرکت میں آتے ہیں۔ اور بہتر خون اور آکسیجن حاصل کرتے ہیں۔

خواتین عام طور پہ سمجھتی ہیں کہ گھریلو امور کو انجام دینا ہی ورزش ہے۔ یہ خیال اتنا درست نہیں ہے۔ ورزش کے نتیجے میں آپکے دل کی دھڑکن بڑھنی چاہئیے۔ اور جسم کے تمام اعضاء کو کام کرنا چاہئیے۔ چھاتی کے کینسر سے بچاءو کے لئے ایسی ورزشیں کیجئیے جسکے نتیجے میں آپکے بازو اور چھاتیوں میں کھنچاءو پیدا ہو۔

خواتین کی ورزش کے حوالے سے ہم کسی اگلی پوسٹ میں بات کریں گے۔

چھاتیوں کی جانچ ہر مہینہ ایام مخصوصہ ختم ہونے کے بعد ایک خاتون خود بھی کر سکتی ہے۔ اسکے لئے چھاتیوں اور اپنی بغل کے غدودوں کو چیک کرنا ہوتا ہے۔ ان میں کسی بھی قسم کی گٹھلی کی موجودگی یا درد کی صورت میں قابل اعتماد ڈاکٹر سے رجوع کریں۔ بیشتر خواتین خاص طور پہ وہ جو شادی شدہ نہیں ہوتیں  بے جا شرم کی وجہ سے اتنا بڑھا لیتی ہیں کہ پھر یہ علاج سے باہر ہو جاتا ہے۔ اگر کینسر کا اثر لمف نوڈز یا ہڈی کے گودے تک بڑھ جائے تو یہ ایک خطرناک حالت ہوتی ہے۔

 چھاتی ایک خطرناک جگہ ہے۔ یہاں ایسٹروجن اور چربی سب سے زیادہ موجود ہونے کی وجہ ایک معمولی عام گٹھلی بھی اگر اسکا علاج نہ کیا جائے تو کینسر کا باعث بن سکتی ہے۔

چھاتی میں اگر گٹھلی محسوس ہو تو اسکی گرم سینکائ کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ گرم سینکائ جسم کے اندرونی زخم کو کینسر کے زخم میں تبدیل کر سکتی ہے۔  مستند ڈاکٹر سے رجوع کریں۔ اگر ڈاکٹر میمو گرافی ٹیسٹ کرانے کا مشورہ دے تو بلا تاخیر کرائیے۔

چھاتی میں موجود تمام گٹھلیاں کینسر نہیں ہوتیں۔ اس لئے گٹھلی موجود ہونے کی صورت میںجب تک ٹیسٹس کی رپورٹ نہ آجائیں اور ڈاکٹر کوئ حتمی رائے نہ دے دے۔ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔

چھاتی کے کینسر کی تشخیص میمو گرافی کے ذریعے کی جاتی ہے۔ اس میں خاص ٹیکنیک کے ذریعے چھاتی کا ایکسرے اور الٹرا ساءونڈ ہوتا ہے۔ اور مٹر جتنے چھوٹے سائز کی گٹھلی کا بھی پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ میموگرافی ایک مہنگا ٹیسٹ ہے اسکی فیس تین سے پانچ ہزار روپے تک ہو سکتی ہے۔ ہر جگہ یہ سہولت میسر بھی نہیں ہے۔ پاکستان میں تیزی سے پھیلتے اس جان لیوا مرض کی تشخیص کے لئے اس ٹیسٹ کوجہاں سستا کرنے کی ضرورت ہے۔ وہاں اس امر کی بھی ضروت ہے کہ ایسی موبائل وینز ہوں جو دیہی علاقوں میں جا کر وہیں پہ یہ ٹیسٹ انجام دے سکیں۔

کراچی میں ، میں نے سنا کہ ڈاکٹر شیر شاہ کی زیر نگرانی سول ہسپتال میں ایک ایسی وین بنائ جا چکی ہے۔

کچھ گٹھلیاں ایسی جگہ موجود ہوتی ہے جہاں سے وہ اس ایکسرے میں بھی نہیں آپاتیں۔ لیکن ایسے کیسز بہت کم ہوتے ہیں۔ زیادہ تر حالات میں اس ٹیسٹ سے خاصی مدد مل جاتی ہے۔

پینتالیس سال کے بعد احتیاطاً میمو گرافی کرا لینی چاہئیے۔ وہ خواتین جو سن یاس میں داخل ہو چکی ہیں انہیں ۔ میموگرافی کرانی چاہئیے۔ تاکہ اس قسم کی کسی صورت حال کو ابتداء ہی میں پکڑا جا سکے۔

مرض اگر زیادہ پھیل گیا ہو تو سی ٹی اسکیننگ بھی کی جاتی ہے۔ تاکہ مزید متاثرہ حصوں کی تفصیلات سامنے آجائیں۔ اس کا درست مشورہ ایک ڈاکٹر ہی دے سکتا ہے۔

ایک دفعہ گٹھلی کا مقام پتہ چل جائے تو اسکی حتمی تشخیص کے لئے بائیوپسی کی جاتی ہے۔ اسکے لئے گٹھلی میں سرنج داخل کر کے تھوڑا سا مواد حاصل کرتے ہیں جسے بعد ازاں کینسر سیلز کی موجودگی معلوم کرنے کے لئے چیک کیا جاتا ہے۔ یہ نیڈل بائیوپسی بھی کہلاتی ہے۔ اسکے علاوہ اوپن بائیوپسی بھی کی جاتی ہے۔

اسکے

علاج

کا انحصار مرض کی شدت اور مریض کی حالت پہ ہوتا ہے۔ اگر مرض ابتدائ حالت میں ہو تو ریڈیو تھراپی یعنی شعاعوں کے ذریعے علاج،  کیمو تھراپی یعنی دواءوں کے ذریعے علاج  یا لمپیکٹومی یعنی گٹھلی کو آپریشن کے ذریعے الگ کردیتے ہیں۔ زیادہ محفوظ صورت حال میں رہنے کے لئے بعض اوقات  میسٹیکٹومی یعنی متائثرہ حصے کو مکمل طور پہ کاٹ کر الگ کر دینے  سے مرض سے چھٹی حاصل کی جا سکتی ہے۔  بعض اوقات دو مختلف طریقے ایک ساتھ استعمال کئے جاتے ہیں۔ اگر یہ بعد کے مراحل میں داخل ہو جائے تو مریض کا عرصہ ء حیات ہی بڑھانے کی کوشش کی  جا سکتی ہے۔

کیمو تھراپی یا ریڈیو تھراپی کے ذیلی اثرات خاصے شدید ہوتے ہیں۔ اسکے لئے پہلے سے ذہنی طور پہ مریض اور گھر والوں کو تیار رہنا چاہئیے۔

علاج کے لئے ایک ڈاکٹر جو بھی مشورہ دے بہتر ہے کہ اسے شروع کرنے سے پہلے کسی اور ڈاکٹر سے بھی مشورہ لے لیا جائے۔ صرف بریسٹ کینسر ہی نہیں بلکہ کسی بھی سنگین مرض میں ایک سے زائد ڈاکٹر سے مشورہ ایک مریض کا حق ہے۔

جن مریضوں کی چھاتی الگ کر دی جائے انکے لئے یہ خاصہ مورال کم کر دینے والا سانحہ ہوتا ہے۔ عورت کی ظاہری خوب صورتی میں اسکی ظاہری ساخت کو ہر معاشرے میں بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ چھاتی کاٹ کر الگ کر دینے کی صورت میں  ایک عورت کی ظاہری خوبصورتی اس سے خاصی متائثر ہوتی ہے۔  بعض آپریشن کے ذریعے چھاتی کی ساخت کو بہتر کیا جا سکتا ہے۔ اسکے علاوہ اب ایسے زیر جامے موجود ہیں جو دیکھنے  میں اسکی ظاہری شخصیت کو کم نہیں کرتے۔ لیکن بہر حال اسکا نفسیاتی اثر رہتا ہے۔

کسی بھی قسم کے کینسر کے مریض کو ہماری توجہ، محبت اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔  ایک عورت جب اس سانحے سے گذرتی ہے تو اسکا خاصہ امکان ہوتا ہے کہ اس کا جیون ساتھی اس سے منہ موڑ جائے، علاج کا خرچہ گھرانے پہ بوجھ بن جاتا ہے۔ خاص طور پہ ہمارے معاشرے میں جہاں عورتیں معاشی طور پہ خود کفیل نہیں ہوتیں اور اپنے تمام مسائل اور وسائل کے لئے اپنے گھر والوں کی طرف دیکھتی ہیں۔  خواتین کو اس نظام میں وہ اہمیت حاصل نہیں جو ایک مرد کو حاصل ہوتا ہے تو ایک بیمار ، اور جسمانی ساخت سے محروم عورت کا یہ مہنگا علاج کروانے کی ہمت بھی ہر کسی میں نہیں ہو پاتی۔

یہ بھی ہوتا ہے کہ مریض کے ڈپریشن سے دیگر لوگ گھبرا جائیں اور وہ بھی حوصلہ چھوڑ دیں۔ ترقی یافتہ ملکوں میں اس صورت حال سے نبٹنے کے لئے رضاکاروں کے گروپ ہوتے ہیں یا ہسپتال ہی میں ایسے یونٹ ہوتے ہیں جہاں مریض اور اس  کے اہل خانہ کی بھی نفسیاتی  تربیت ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات جاننا ضروری ہے کہ بریسٹ کینسر کا شکار، مرد بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان میں اسکی شرح غیر معمولی طور پہ کم ہوتی ہے۔

چھاتی کے کینسر کی مریض عورت کو  بھی توجہ، محبت اور حوصلہ چاہئیے ہوتا ہے۔ اسے بے جا شرم  کی وجہ سے اس سے محروم نہ کریں۔

نوٹ؛ اس مضمون کی تیاری میں مختلف ذرائع سے مدد لی گئ ہے۔ پھر بھی کسی قسم کی غلطی کی نشاندہی یا مزید معلومات کے لئے مشکور ہونگی۔

12:00 AM

پاکستان, چھاتی کا کینسر, خواتین, علاج, کینسر, مرض, مریض

بنا ہے عیش۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ٹی وی پہ ایک خبر گذر رہی تھی کہ کراچی میں  پاکستان کی سب سے بڑی فوڈ اسٹریٹ کا افتتاح ہو گیا ہے۔ ہمیں بھی خواہش ہوئ کہ  لاہور کی فوڈ اسٹریٹ کے درشن تو حاصل کر چکے۔ اب دیکھیں کہ کراچی کی فوڈ اسٹریٹ کیسی ہے جس کا نام ہے

پورٹ گرانڈ

۔ نام سے تو شاہوں کی چیز لگتی ہے، لیکن کراچی کی فوڈ اسٹریٹ شاہانہ کیسے ہو سکتی ہے؟  تین دن  ارادے باندھنے اور توڑنے کے بعد بالآخر ہم گھر سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

ایکسپریس وے سے نیچے اترے تو پولیس کی گاڑیاں موجود تھیں۔ ٹریفک بالکل رینگ رہا تھا۔ لگتا ہے ہم نے غلط دن چن لیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بند ہو۔ اگلے دن معلوم ہوا کہ لیاری کے معروف باکسر ابرار حسین شاہ کو کوئٹہ میں ٹارگٹ کلنگ میں مار دیا گیا۔ ٹریفک کے ہجوم سے باہر نکلے ہوٹل بیچ لگژری کی طرف گاڑی مڑی تو مجھے حیرانی ہوئ۔ یہ فوڈ اسٹریٹ اتنی خاص الخاص جگہ پہ کیوں ہے۔ یہاں عام لوگ کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ اسے تو کسی عوامی جگہ پہ ہونا چاہئیے تھا۔

لیکن آگے چل کرجب شہر کی جدید ماڈل کی گاڑیاں  نظر آنے لگیں تو دل میں اور وسوسے آنے لگے۔ ہم تو عوامی ہونے کے چکر میں کچھ ایسے اہتمام سے نہ نکلے تھے۔ لیکن داخلی دروازے پہ اترتے ہی ہمارے سب وسوسے حقیقت کا روپ دھار چکے تھے۔

کراچی کے اور بیرون ملک ڈیزائینرز کے کپڑوں میں ملبوس لوگ، اپنے شیر خوار بچوں سے انگریزی میں گفتگو فرماتے لوگ۔ ہمارا دل تو یہ منظر دیکھ کر ہی ہٹ سا گیا۔

داخلہ ٹوکن فی آدمی تین سو روپے کا، اگر اندر کچھ کھالیں تو دو سو روپے اس میں سے منہا ہو جائیں گے یعنی ایڈ جسٹ ہو جائیں گے۔ اگر نہیں کھاتے تو آپ کا ہی نقصان ہے واپس نہیں ملیں گے۔ چھوٹے بچوں کے لئے رعایت۔ چھوٹے سے کیا مراد ہے یہ معلوم نہیں ہوا۔ ہمیں مل گئ۔ ہماری بیٹی ابھی چار سال کچھ مہینے کی ہے۔

داخل ہوتے ہی سامنے ایک چھوٹا سا شاپنگ ایریا بنا ہوا ہے جہاں مغربی ملبوسات اور   مغربی پرفیوم کی دوکان نظر آئ، جس پہ بڑا بڑا  لکھا تھا ماشاء اللہ۔ باقی دوکانوں کو دیکھنے کی ہم نے ضرورت محسوس نہیں کی۔ اندازہ ہو چلا تھا کہ کراچی کے طبقہ ء اشرافیہ یعنی ایلیٹس کے ذوق نظر کو سامنے رکھتے ہوئے مال مصالحہ رکھتی ہونگیں۔

ادھر اس طرف بڑھے جہاں ایک قطار میں کھانے پینے کی دوکانیں بنی ہوئیں ہیں تو  زیادہ تر بیرون ملک فاسٹ فوڈ کی دوکانیں نظر آئیں مثلاً ون پوٹیٹو، ٹو پوٹیٹو، اومور کا آئس کریم پارلر، سوشی جاپانی کھانا اور اسی طرح کی چنداور دوکانیں۔ سمندر کے ساتھ والے حصے پہ شیشے کی چھوٹی سی دیوار بنادی گئ ہے۔ اسکے ساتھ نوجوانوں کی ٹولیاں بیٹھی ہوئیں تھیں۔ خوش باش، آسودہ اور پر تعیش زندگی گذارنے والے نوجوان۔

چونکہ ہم لوگ بالکل بھی سینڈ وچز اور برگر کھانے کے موڈ میں نہیں تھے تو نظر انتخاب وہاں کی واحد مقامی کھانوں کی ایک دوکان پہ پڑی شیخ عبدالغفار کباب ہاءوس۔  لوگوں کی اکثریت کے ساتھ  شاید یہی مسئلہ تھا۔ اس وجہ سے وہاں خاصہ رش تھا۔ پتہ چلا کہ چالیس منٹ بعد باری آئے گی کہ بیٹھنے کی جگہ ملے۔

ہم نے سوچا اس سے تو بہتر ہے کہ انسان، بار بی کیو ٹونائٹ چلا جائے۔ وہ یہاں سے نزدیک ہے۔ لیکن پھر ٹوکن کے پیسوں کا خیال آیا اور رک گئے۔ چالیس منٹ مشعل کے ساتھ آرٹ اینڈ کرافٹ  فار کڈز میں گذارے۔

باری پہ اندر گئے۔ مزید صدمہ، مینو میں صرف چار  چیزیں شامل تھیں۔  آرڈر دیا۔ آدھ گھنٹے بعد جب وہ آئیں تو اندازہ ہوا کہ سرونگ خاصی کم ہے ایک شخص ، خاص طور پہ ایک مرد پیٹ بھر کے نہیں کھا سکتا۔ مزید کے لئے آرڈر دیا۔ کھانا بالکل عام مزے کا۔ پیسے چار سو روپے فی پلیٹ۔ تیس روپے ایک چپاتی۔

باہر نکل کر سوچا کہ سامنے گولا گنڈے والا کھڑا ہے اسے ٹرائ کرنا چاہئیے۔ لاہور کی فوداسٹریٹ پہ بڑے مزے کا ، خوب بڑا گولا گنڈا بناتا ہے۔ اپنے بچپن میں بھی گولے گنڈے پہ جان دیتے تھے۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہو اکہ ایک گلاس میں  برف چور کر کے بھر کے اوپر سے مختلف سیرپ ڈال کر دے رہے ہیں۔ گولے گنڈے کی یہ توہین برداشت نہ ہوئ۔ ان سے پوچھا کہ ڈنڈی پہ نہیں ملے گا۔ فرمایا، ہم اسٹک پہ نہیں لگاتے۔

چناچہ ہم وہاں سے سٹک گئے۔ پر تعیش زندگی کے عادی لوگوں کے نخرے دیکھے۔ اور واپسی کا سوچا۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ حساب لگایا کہ گھر پہنچنے میں ساڑھے گیارہ بج جائیں گے۔ساڑھے نو سے، ساڑھے گیارہ بجے والا لوڈ شیڈنگ کا ٹائم ختم ہو جائے گا۔ بس اس آءوٹنگ میں ایک مثبت  بات یہی نکلے گی۔

داخلی دروازے سے باہر کھڑے ویلے پارکنگ سے گاڑی کے باہر آنے کا انتظار کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ فٹ پاتھ پہ تین خواتین بڑے بڑے مدنی برقعے پھیلائے فٹ پاتھ پہ بیٹھی تھیں۔ انکے پاس ایک آٹھ نو سال کی بچی کھڑی تھی۔ اس نے بھی کالے رنگ کا عبایہ پہنا ہوا تھا اور اسکارف باندھا ہوا تھا۔

ایک طرف مغربی اور جدید لبادوں میں ملبوس فیشن ایبل خواتین کی لمبی قطار، درمیان میں ، میں اور دوسری طرف مدنی برقعے جو کہ ایک ایک بچی بھی پہنے ہوئے تھی۔  میں نے سوچا ہم تینوں ہی یہاں آکر مایوس ہوئے ہونگے۔ مدنی برقعے، مغربی لبادوں کو دیکھ کر اور مجھے بے حجاب دیکھ کر، مغربی لبادے مدنی برقعوں کو دیکھ کر یہ بھی یہاں موجود ہیں اور میں یہ سوچ کر  کہ کیا اب حکام کے پاس ہم جیسے عوام کے لئے پروجیکٹس ختم ہو گئے ہیں۔ شہر میں ہم اکثریت میں ہیں اور کثیر سرمائے سے عیاشی کے پروجیکٹس اقلیت کے لئے۔

جن  افضل لوگوں کے لئے آپ نے یہ سب کچھ بنایا، انہیں تو اب بھی اس میں کوئ قابل ذکر بات نہیں نظر آئے گی سوائے اسکے کہ لیٹسٹ ٹرینڈز فیشن کے دیکھنے اور دکھانے ہوں تو یہاں آجائیں۔  اندازہ ہے یہ اس طبقے کے نوجوان کو مصروف رکھنے کے لئے تیار کی گئ ہے۔ جو چائے کی پیالی میں طوفان اٹھائیں یا بیٹھ کر نیرو کی طرح بانسری بجائیں۔ البتہ یہ کہ الکوحل اور نشہ آور اشیاء پہ پابندی ہے۔ یہ زیادتی ہے۔ اس ماحول اور طبقے کے ساتھ۔

عام لوگوں کے لئے اول تو یہاں پہنچنا ہی مشکل ہے۔ یہاں پہنچ جائیں تو اس مہنگے، بے مزہ کھانے پہ اتنا کیوں خرچ کریں۔ پاکستان تو دور، فی الحال تو اسے کراچی کی بھی سب سے بڑی فوڈ اسٹریٹ نہیں کہا جا سکتا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ بوٹ بیسن کی فوڈ اسٹریٹ چلے جائیں۔ وہ کہیں گے، اتنی دیر میں یہ بات سمجھ میں آئ۔ بوٹ بیسن آپکے لئے ، پورٹ گرانڈ ہمارے لئے۔

لیکن خیر، ہمارے کراچی کے بلاگرز چاہیں تو ایک میٹ اپ یہاں رکھ لیں۔  سمندر کے کنارے تازہ ہوا کے ساتھ رات کو پورٹ کی روشنیاں دیکھیں۔ احتیاط سے گفتگو فرمائیں۔ دل چاہے تو کچھ ہلا گلا کریں اور کھانے میں اپنے ٹوکن کے دو سو روپے استعمال کریں ۔ الگ سے کچھ خرچ کرنے کی ضرورت نہیں۔

شاپنگ ایریا میں وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ غیر شادی شدہ، خوش شکل، خوش پوش، انگلش بہتر طور پہ بول لینے والے نوجوان چاہیں تو کسی اعلی خاندان کی حسینہ سے میل جول پیدا کرنے کے لئے یہاں پہ کوشش کر سکتے ہیں. ۔

اسکی مشہوری کرنے والے ادارے اپنا سلوگن تبدیل کر لیں۔ پاکستان میں ایلیٹس کے لئے مخصوص سب سے بڑی فوڈ اسٹریٹ۔ جسکی تعمیر میں امریکہ، اٹلی اور تھائ لینڈ کے ماہر اداروں نے حصہ لیا ہے۔

اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو عوام وہاں پہنچ کر صدمے کا شکار ہوتے رہیں گے۔ اور واپس آ کر کہیں گے  سب شہنشاہوں نے پیسے کا سہارا لے کر، ہم غریبوں کی بھوک کا اڑایا ہے مذاق۔ عوام کی بھوک کا مذاق اڑانا، اشرافیہ کے مستقبل کے لئے اچھا نہیں ہے۔ یہ تمام الہامی و اساطیری دانش کا کہنا ہے۔

شام آرہی ہے، ڈوبتا سورج بتائے گا

تم اور کتنی دیر ہو ، ہم اور کتنی دیر

7:42 PM

پاکستان, پورٹ گرانڈ, فوڈ اسٹریٹ, کراچی, گولا گنڈا, لاہور

زر، زمین، زن

کہتے ہیں  دنیا میں تمام جھگڑوں کا باعث تین چیزیں ہیں۔ زر، زمین اور زن۔ مجھے نہیں معلوم کہ نظریاتی اور مذہبی جھگڑے انکے درمیان کہاں فٹ ہوتے ہیں۔ اس لئے ممکن ہے کہ یہ مقولہ، معاشرتی جھگڑوں پہ زیادہ جچتا ہو۔

آپ میری اس رائے سے اختلاف کریں یا انکار، اس سے فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ جھگڑے اپنی رفتار سے جاری ہیں اور جاری رہیں گے۔ آج ایک وجہ کو ختم کریں کل کسی اور نام سے اٹھ کھڑے ہونگے۔ اس لئے عقلمند لوگ، پرانے جھگڑے نہیں نبٹاتے۔  یہ جتنے پرانے ہوں، اتنی ہی مہارت سے لٹکائے رکھے جا سکتے ہیں۔ یوں بہت سے لوگوں کی دانش اور مہارت کا سکہ جما رہتا ہے۔ اگر پرانے جھگڑے  فی الفور نبٹا دئیے جائیں۔ تو ہر نئے جھگڑے پہ نئ مہارت حاصل کرنی پڑے گی۔ اس سے ارتقاء کی رفتار بڑھ جانے کا اندیشہ ہوگا۔ جس سے نئ مخلوقات سامنے آئیں گی۔ وہ دعوی کریں گی کہ یہ  جھگڑا ہمارا ہے اور ہم اسے بہتر طور پہ حل کر سکتے ہیں۔ لیجئیے  پھر نسلی تفاخر کی جگہ بننا مشکل ہو جائے گی۔ اس طرح، معاشرے کے تارو پود بکھر جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے۔

تارو پود کے بکھرنے  سے ، غریب، ترقی پذیر معاشروں کو سب سے زیادہ ڈر لگتا ہے۔ کیونکہ ان تاروں کے بکھرنے میں  تبدیلی کا کرنٹ بہتا ہے۔ انہیں واپس انہی بنیادوں پہ ایستادہ نہیں کیا جا سکتا۔ جس سے پرانے جھگڑے مر جاتے ہیں۔ اتنے مانوس صیاد سے ہو گئے ہیں اب رہائ ملی تو مر جائیں گے۔  اور پود کے متعلق مجھے بھی کچھ اندیشہ ہائے دراز لا حق ہیں۔ پورب جاءو یا پچھم، وہی کرم کے لچھن۔

اس سلسلے کو یہیں فل اسٹاپ لگا کر اپنے اصل موضوع کی طرف واپس آتے ہیں۔ زر، زمین اور زن۔

پچھلے دنوں میں نے دوتحریریں پڑھیں۔ ایک مصری  ادیب

علاء الاسوانی

کی کہانی اور دوسرے ایک پاکستانی ادیب محمد اقبال دیوان کی کہانی۔ ایک کے پیچھے مصر  کا پس منظر اور اسکے سیاسی، معاشی و معاشرتی حالات جھانک رہے ہیں اور دوسرے میں پاکستان اپنی انہی تلخ حقیقتوں کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن ان دو تحریروں میں ایک چیز مشترک لگتی ہے وہ مرد کا عورت سے رشتہ۔ اور یوں لگتا ہے دنیا کا  ہر انقلاب ان دونوں کے اس رشتے سے ہو کر گذرتا ہے۔ تو کیا دنیا کا ہر جھگڑا زر، زمین اور زن کے گرد گھومتا ہے۔

میری تو خواہش تھی کہ اقبال دیوان کی کہانی کو پورا ڈال دیتی ہے۔ کہ اس میں آجکا پاکستان جھلکتا ہے۔ لیکن یہ تیس صفحوں پہ مشتمل ہے۔

علاء الاسوانی کی تحریر کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی مسئلہ ہے۔ اس لئے دونوں کہانیوں کے کچھ صفحات کے اسکین شدہ حصے ہی مل پائیں گے۔ آج مصری ادیب کو پڑھیں۔ مصر کی تہذیب میں ویسے ہی  بڑی سحر انگیزیاں ہیں اسکے ادیب کا سحر دیکھیں۔ یہ حصہ انکے ناول

عمارت یعقوبیان

کے  دوسرے باب سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ مترجم ہیں محمد عمر میمن۔  شائع ہوا ہے دنیا زاد میں۔ اب دنیا زاد والوں کو مجھے اپنے ایڈورٹائزنگ سیکشن کاحصہ سمجھنا چاہئیے۔

:)

یہ اسکین شدہ صفحات ہیں۔ بہتر طور پہ پڑھنے کے لئے تصویر پہ کلک کیجئیے۔

8:10 PM

ادب, انقلاب, پاکستان, شدت پسندی, علاء الاسوانی, عورت, مرد, مصر

ایک لیڈی ڈاکٹر کی ڈائری

احمد فراز نے کہا تھا کہ کیوں مانگ رہے ہو کسی بارش کی دعائیں، تم اپنے شکستہ در و دیوار تو دیکھو۔

جس طرح بارش کا پانی مکان میں موجود ہر کمزوری کو عیاں کر دیتا ہے اور چھپانے کو کچھ باقی نہیں بچتا۔ اسی طرح پچھلے سال سیلاب نے ہماری معاشرتی اور معاشی ہر کمزوری کو سامنے لا کھڑا کیا۔ اسی میں سے ایک دیہی خواتین کی حالت زار ہے۔

دیہی خواتین جنہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انکی اپنی عمر کتنی ہے، وہ کتنے بچے پیدا کر چکی ہیں، ابھی کتنے اور پیدا ہونگے،  اگر حاملہ ہیں تو کتنا عرصہ گذر چکا ہے، اکثر اوقات اپنے بچوں کی تعداد سے بھی نا واقف ہوتی ہیں، نہیں جانتیں کہ انکے بچوں کی عمر کتنی ہے، انہیں اور انکے بچوں کو اگلے وقت کھانا ملے گا یا نہیں۔ سارا سارا دن انکے بچے جانوروں کے بچوں کی طرح کس کس گلی کی مٹی میں رلتے ہیں۔ یہ سب وہ نہیں جانتی، اور اس لئے وہ پاکستان کی قابل فخر روائیتی خواتین ہیں۔

اگر شہر کی کوئ عورت خواتین کے مسائل پہ بات کرنا چاہتی ہے تو یقیناً مغربیت پھیلانا چاہتی ہے۔ مغرب کی آزادی ء نسواں کی تحریک سے متائثر ہوگی اس لئے کہ افسردہ ترین بات یہ ہے کہ مغرب کے ذریعے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں کون سی کمزوری کس سطح تک ہے۔ کیونکہ نہ ہم اپنے معاشرے سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں۔ کوئ زبردستی ہمیں یہ سب سنا دے تو  نہ ہم انہیں تسلیم کرنا چاہتے ہیں ، نہ انہیں اپنے معاشرے کے لئے برا سمجھتے ہیں، نہ ان میں تبدیلی کے خواہشمند ہیں۔

سو میرے جیسی عام عورت جو نہ کسی این جی او سے تعلق رکھتی ہے نہ طبقہ ء اشرافیہ سے، اسے بھی یہ  کہنے سے بھی گریز نہیں کرتے کہ خود تو ایک بچہ پیدا کرتی ہے باقی ملک کی عورتوں کے لئے چاہتی ہے کہ ایک بھی بچہ نہ پیدا کرے، مردوں سے نفرت کرتی ہے۔ جبکہ وہ اس بات سے ناواقف ہوں کہ میرا ایک بچہ کیوں ہے۔ اب ان ذہنوں کا کیا کیا جائے؟ یہ بات بھی حیران کن ہے کہ جیسے ہی ایک خاتون، خواتین کو پیش آنے والے مسائل کا تذکرہ کرتی ہے ایک خاص طبقے کے مرد اس سے یہ معنی کیسے اخذ کر لیتے ہیں کہ اس خاتون کو مردوں سے نفرت ہے۔

یہ سب تبصرے ان  عام مردوں کے ہوتے ہیں جو غیرت مند ہوتے ہیں اسے بے حس پڑھا جائے۔

جو با شعور ہوتے ہیں اسے با سرور پڑھا جائے۔

جو روایت پسند ہوتے ہیں اسے اذیت پسند پڑھا جائے۔

جو مذہب پرست ہوتے ہیں اسے مذہب کش پڑھا جائے۔

جو معاشرے کا استحکام چاہتے ہیں اسے انکی انا کا استحکام پڑھا جائے۔

مگر یہ سب پڑھنے سے پہلے ایک  لیڈی ڈاکٹر کی ڈائری کے چند اوراق ضرور پڑھئیے جو انہوں نے سیلاب زدہ علاقے میں لوگوں کو طبی امداد فراہم کرتے ہوئے لکھے۔

ڈاکٹر نگہت شاہ کی اس تحریر کا ترجمہ ڈاکٹر آصف فرخی نے کیا ہے۔ عنوان اس کا ہے خیر پور ریلیف کیمپ۔ شائع ہوا ہے دنیا زاد کے مجموعے، 'جل دھارا' میں۔ پبلشر ہیں  اسکے شہر زاد۔

یہ اسکین شدہ صفحات ہیں۔ بہتر طور پہ دیکھنے کے لئے ان صفحات کو کلک کریں۔

9:21 PM

پاکستان, خواتین, خیر پور, دنیا زاد, دیہی, ڈاکٹر آصف فرخی, ڈاکٹر نگہت شاہ, سیلاب, شہرزاد, کراچی

بینک الحبیب فی الروایت المحدود

خواتین سے متعلق موضوعات کچھ زیادہ ہی ہیں۔ سوچتی ہوں ایک ہفتہ ء خواتین منانا پڑے گا۔ سب سے پہلے اپنے بالکل پاس سے شروع کرتی ہوں۔

کوئ چار پانچ سال پہلے میں نے سوچا کہ گھر کے قریب کسی بینک میں اکاءونٹ کھول کیا جائے۔ گورنمنٹ بینکس اکثر مشکوک رہتے ہیں سو نظر انتخاب بینک الحبیبب پہ پڑی۔ جب میں نئے اکاءونٹ کے لئے فارم لے آئ تو کسی نے  کہا کہ ایک اطلاع آپکو ہو کہ بینک الحبیب اپنے عملے میں کسی خاتون کو نہیں رکھتے۔ میں نے سوچا ٹھیک کہہ رہے ہیں میں نے بھی برانچ میں کسی خاتون کو نہیں دیکھا۔

چند دنوں بعد میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئ جو بینک الحبیب میں کام کرتے تھے۔ ان سے دریافت کیا کہ سنا ہے آپ کے بینک میں خواتین کو جاب نہیں دی جاتی۔ ناراضگی سے کہنے لگے۔ بینک الحبیب ایک بہت بڑا ادارہ ہے۔ ہمارے سیٹھ، دنیا کا اور کاروبار کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔

تو اس بیچ انکی کیا رائے ہے؟ میں نے اشتیاق سے پوچھا۔ وہ کہتے ہیں کہ ملازمت کی ذمہ داری خواتین پہ نہیں آتی۔

اس بات کا فیصلہ وہ کیسے کر سکتے ہیں؟ میں نے پھر سوال داغا۔ کہنے لگے انہیں کاروبار کا تجربہ ہے، دنیا دیکھی ہے۔ میں نے کہا، دنیا تو میں نے بھی دیکھی ہے۔ آپ بھی ابھی فوراً گھر سے نکل کر دیکھ سکتے ہیں کہ شہر میں ایک بڑی تعداد ان خواتین کی ہوتی ہے جنکے مرد رشتے دار نہیں ہوتے۔ خواتین جنکے شوہر مرجاتے ہیں اور انکے بچے بھی ہوتے ہیں۔ خواتین جن کے مرد اتنا نہیں کما پاتے کہ انکی کمائ سے گھر عزت کے ساتھ چل سکے۔ کیا انہیں لاوارث چھوڑ دیا جائے۔ وہاں بنگلہ دیش میں تو

یونس صاحب

، انہی عورتوں کی وجہ سے ایسا نظام چلانے میں کامیاب ہوتے ہیں کہ خواتین کی خوشحالی کمیونٹی کی خوشحالی بن جائے اور نوبل پرائز حاصل کر لیتے ہیں ادھر آپکے سیٹھ  خدا جانے  کون سی دنیا دیکھنے کے بعد ایسی دانش سے بھر پور پالیسی بناتے ہیں۔

  ایسی بات پہ انہیں دیوار سے لگنا پڑا۔ سو اس سے چپک کر کہنے لگے اسکی وجہ ایک اور بھی ہے۔ وہ کیا ہے؟

جو وجہ انہوں نے بتائ وہ دیوار سے لگنے کے بعد کھائ میں گرنے والی تھی۔ ایسی وجہ بینک الحبیب کا نمک کھانے کے بعد ہی پیش کیا سکتی تھی۔

خواتین کی وجہ سے دفتری ماحول خراب ہوتا ہے۔ کام کی رفتار سست ہوتی ہے اور معیار خراب۔ پھر دفتری عملہ بےکار کے چکروں میں الجھا رہتا ہے۔ جس سے لوگوں کے اخلاقیات خراب ہوتے ہیں۔

  اگرچہ مجھے لوگوں کو انکے خاندانی حوالے دینا مناسب نہیں لگتا۔  لیکن جب مرد حضرات غیر خواتین کے بارے میں اتنے غیر ذمہ دارانہ بیانات دیں تو انکی قریبی خواتین کی یاد دلانا ضروری ہو جاتا ہے۔ تس پہ میں نے ان سے کہا کہ دو سال پہلے آپکی چھوٹی بہن نے ہاءوس جاب مکمل کیا اور پچھلے دو سال سے وہ آن جاب ہے۔ اکثر رات کو بھی ہسپتال میں رکنا پڑتا ہے کیا آپ سمجھتے ہیں کہ انکی وجہ سے ہسپتال کا ماحول خراب ہو رہا ہے۔ اس پہ انہوں نے مجھے گھورا اور کہا کہ بہر حال بینک الحبیب کی پالیسی یہی ہے۔ ہم کیا کر سکتے ہیں۔

میں نے یہ کہنا مناسب نہیں سمجھا کہ آپ ایک آسان سا کام کر سکتے ہیں اور وہ یہ کہ اپنے سیٹھ کی اس بے وقوفانہ پالیسی کا دفاع کرنا چھوڑ دیں۔ دیوار اور کھائ سے نجات پانے کا آسان اور ہزاروں سال سے آزمودہ نسخہ۔

اس وقت میں نے اس بینک میں اکاءونٹ کھولنے کا ارادہ ختم کردیا۔ یہ کھلی منافقت ہے کہ ایک بینک خواتین سرمایہ کاروں کا سرمایہ تو لینے کو تیار ہو لیکن بدلے میں انہیں نوکری کی سہولت دینے کو تیار نہ ہو۔ یعنی میرا سرمایہ میری ہم جنسوں کے استعمال میں نہیں آ سکتا۔ تف ہے ایسے بینک پہ۔

قسمت کا چکر،  گذشتہ دنوں ایسی مجبوری آن پڑی کہ ہمیں ایک جوائینٹ اکاءونٹ کھولنا پڑ گیا۔ میں اور میرے شوہر دونوں ایک ساتھ بینک گئے اور اپنا عندیہ بتایا کہ ایک جوائینٹ اکاءونٹ کھولنا ہے۔ جو ہم دونوں کے نام پہ ہوگا لیکن اسے دراصل انہیں ہینڈل کرنا ہوگا۔ میرے شوہر صاحب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ نو پرابلم، وہاں موجود شخص نے کہا۔ اور فارم نکال کر خود بھرنے بیٹھ گیا۔ جب اس نے لکھنا شروع کیا تو سب سے پہلے میرے شوہر کا نام لکھا۔ میرے شوہر صاحب نے پھر اسکی تصحیح کی کہ پہلے میری بیگم کا نام ڈالا جائے فرمایا۔ کسی کا نام بھی پہلے ہو کوئ فرق نہیں پڑتا۔ یہ آپکا جوائینٹ اکاءونٹ ہے۔ اچھا وہ خاموش ہو گئے۔

دس پندرہ دن بعد  میں نے کریڈٹ کارڈ کے لئے درخواست دی۔  فارم بھر کر دیا۔ کہنے لگے اس پہ توآپکا نام لکھا ہے۔ اکاءونٹ تو آپکے شوہر کے نام پہ ہے۔ منٹو کی طرح اس وقت میرا دل چاہا کہ اس پہ ایک چھوٹا سا ایٹم بم پھینک دوں۔ ابھی دس دن پہلے تو آپ کہہ رہے تھے کہ اس سے کوئ فرق نہیں پڑتا۔ اور آج پڑتا ہے۔

ایسا کریں ناں ہم کریڈٹ کارڈ آپکے شوہر کے نام پہ جاری کر دیتے ہیں اور اسکے ساتھ آیک سپلیمینٹری کارڈ بھی ایشو کر دیتے ہیں۔ جوآپ استعمال کر سکیں گی۔

کیا آپکو یاد نہیں کہ آپکو بتایا گیا تھا کہ عملی طور پہ یہ میرا اکاءونٹ ہے۔ میں غصے میں مینیجر کے پاس گئ۔ کہنے لگے، مسکرا کر۔ آپ کا اور آپکے شوہر کا پیسہ ایک ہی تو ہے اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کریڈٹ کارڈ کس کے نام پہ ہے۔ جی، آپ مجھے یہ فلاسفی سمجھا رہے ہیں۔ یہ اکیسویں صدی ہے اور اس سے بہت فرق پڑتا ہے کہ کریڈٹ کارڈ کس کے نام پہ ہے۔ آپ یہ نہیں سمجھ رہے ہیں کہ کریڈٹ کارڈ میری ضرورت ہے۔ میں ملک سے باہر جاءوں تو کیا کرونگی۔

کیوں آپکے شوہر آپکے ساتھ نہیں جائیں گے۔

مسٹر مینیجر، یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ وہ میرے ساتھ جائیں۔ مجھے پہلے سمجھ لینا چاہئیے تھا کہ بینک الحبیب، جہاں خواتین کو نوکری نہیں دی جاتی۔ وہاں خواتین کلائینٹس کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوگا۔

نہیں نہیں، آپ ہماری قابل قدر کلائینٹ ہیں لیکن ایسا ہے کہ اکاءونٹ بنتے وقت آپکے شوہر کا نام پہلے آگیا ہے۔ پھر یہ کہ عام طور پہ کریڈٹ کارڈ شوہر کے نام پہ ہوتا ہے۔

جن خواتین کی شادی نہیں ہوتی یا بیوہ ہوتی ہیں انہیں آپ لوگ کریڈٹ کارڈ ایشو کرتے ہیں۔

جی ہاں کرتے ہیں، مگر اس صورت میں شوہر کا نام نہیں ہوتا۔

اس میں ہمارا قصوور، ان صاحب سے کہا بھی۔ مگر وہ اپنی بات پہ اڑ گئے کہ اس سے فرق نہیں پڑتا۔

جی بس ہمارے معاشرے میں رواج ہے کہ جب جوائینٹ اکاءونٹ کھولا جاتا ہے تو پہلے شوہر کا نام ہوتا ہے۔ اس لئے اس نے دھیان نہیں دیا۔

عجیب بات ہے عملے میں کوئ خاتون موجود نہیں پھر بھی اسکا دھیان ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔  ایسا نہ ہو اسٹاف کا دماغ صحیح جگہ رکھنے کے لئے بینک کو صرف مرد حضرات کے لئے بینکنگ مخصوص کرنی پڑے۔ نئیں اس میں تو ان کا نقصان ہو جائے گا۔ وہ یہ کر سکتے ہیں کہ طالبانی قوتوں کے ہاتھ مضبوط کریں اور خواتین کے بجائے حوروں کے لئے بینکنگ کریں۔ میں نے یہ صرف سوچا، لیکن ان سے اتنا ہی کہا کہ

دھیان نہیں دیا، جبکہ ہم اس سے کہہ رہےتھے کہ ہمیں اس طرح چاہئیے۔

جی بس، میں معذرت خواہ ہوں یہ غلطی ہو چکی ہے۔

ٹھیک ہے میں کھڑی ہو گئ۔ اگر آپ مجھے میرے نام سے کریڈٹ کارڈ نہیں دے سکتے تو میں اپنی ساری انویسٹمنٹ واپس لے کر اپنا اکاءونٹ بند کرنا چاہونگی۔

اس بات پہ انکے مزاج ٹھکانے آئے۔ نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ چلیں ہم دیکھتے ہیں اس سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔ آپ ایساکریں کہ کل آ کر معلوم کر لیں۔

اگلے دن انہوں نے اطلاع دی کہ ٹھیک ہے آپکو کریڈٹ کارڈ جاری کر دیا جائے گا۔ اگر میرے پاس وقت ہوتا تو ایک دفعہ پھر میں بینک الحبیب پہ تف بھیج دیتی۔

اگلے دن میں پھر اس سلسلے میں انکے پاس موجود تھی۔ اس دفعہ انہوں نے فارم خود بھرنا شروع کیا۔ نام کے لئے جب ٹائٹل کے انتخاب کا خانہ آیا تو خواتین کے لئے تین آپشنز موجود تھے۔ مس، مسز یا مز۔ جب وہ مسز کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا رہے تھے تو میں نے ان سے کہا کہ مسز نہیں مز۔

لیکن انہوں نے حیرانی سے کہا آپ تو شادی شدہ ہیں۔ جی ہاں شادی شدہ ہوں اور ایک خوشگوار شادی شدہ زندگی گذار رہی ہوں۔ لیکن بینک کو اس بات کی فکر نہیں ہونا چاہئیے کہ میں شادی شدہ ہوں یا نہیں ۔ اور اسٹاف کو پتہ ہونا چاہئیے کہ خواتین شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی یہ آپشن استعمال کر سکتی ہیں۔ اکیسویں صدی کے بینک الحبیب کو یہ تو سیکھنا پڑے گا۔

اب میں انتظار میں ہوں کریڈٹ کارڈ کے نہیں، بلکہ اسکے کہ اپنی اگلی اہم بینکنگ، بینک الحبیب کے ساتھ نہ کروں۔ اور موقع ملتے ہی یہاں سے بھاگ لوں۔

8:41 PM

اکاءونٹ, بینک الحبیب, پاکستان, خواتین, روایت, کراچی, کریڈٹ کارڈ

بے ننگ و نام

اس وقت جبکہ میں یہ لائینیں لکھ رہی ہوں۔ میرے چاروں طرف اندھیرا ہے۔  اگر آپ اکیسویں صدی کے پاکستانی ہیں تو سمجھ گئے ہونگے، یہ  اندھیرا چراغوں میں روشنی نہ ہونے کے باعث ہے۔  آٹھ گھنٹے روزانہ بجلی یہ آنکھ مچولی ہمارے ساتھ کھیلتی ہے۔ میں اپنے اردگرد رہنے والوں سے پوچھتی ہوں کیا ایسا ممکن ہے کہ ہم اپنی باقی کی زندگی میں کوئ ایسا دن جی پائیں کہ سارا دن بجلی موجود رہے؟ وہ ہنس دیتے ہیں، چپ ہو جاتے ہیں۔ کسی کے پردے کی خاطر نہیں بلکہ اس لئے کہ تقدیر پہ  راضی برضا ہیں ۔

لیکن کیا کے ای ایس سی کے ان چار ہزار ملازمین کو بھی تقدیر پہ راضی ہوجانا چاہئیے۔ جنہیں کے ای ایس سی وسائل نہ ہونے کی وجہ سے بوجھ قرار دیتی ہے اور انہیں ملازمت سے فارغ کرنا چاہتی ہے۔ کیا واقعی کے ای ایس سی اتنی کنگال ہے کہ وہ چھوٹے گریڈ کے مزدوروں کی تنخواہ ادا نہ کر سکے۔ آئیے دیکھتے ہیں اس میں کتنا سچ ہے۔

پاکستان ٹو ڈے میں شائع ہونے والی

ایک رپورٹ

کے مطابق  نجی ملکیت میں جانے کے بعد کے ای ایس سی کی نئ انتظامیہ نے بجلی کی فراہمی کو بہتر بنانے کے بجائے ، کمپنی کی بہتری کے لئے جس نکتے پہ زور دیا وہ اشرافیہ کے طبقے کے لئے پر تعیش روزگار کا مہیا کرنا ہے۔ یوں کے ای ایس سی مزدوروں کی تنخواہ تو ادا کرنے کے قابل نہیں ۔ وہ انکی تحریک کے خلاف کروڑوں روپے خرچ کر کے اشتہارات  چلا سکتی ہے مگر وہ انہیں ملازمت پہ رکھنے سے قاصر ہے۔

یہاں ایک فہرست ہے جس میں چند چیدہ چیدہ شخصیات کے منظور نظر کس طرح اسی کنگال کے ای ایس سی سے  اپنی راتیں شب برات اور دن عید کر رہے ہیں۔

نوید حسنین ، پی ایم ایل کیو کے ایم این اے ہمایوں اختر  کے قریبی رشتے دار گروپ ہیڈ آف ریکوری کے طور پہ انتیس لاکھ لے رہے ہیں۔

نیات حسین، جو کہ پی پی کی ایم این اے شیری رحمن کے ایک رشتے دار ہیں، ٹیکنیکل گروپ ہیڈ کے طور پہ پچیس لاکھ روپے سے بہر مند ہو رہے ہیں۔

آئ ایس آئ کراچی کے سابق ہیڈ بریگیڈیئر مظہر احمد  اور ریاٹائرڈ بریگیڈیئر مسعود احمد، سیکیوریٹی چیف کے طور پہ پندرہ، پندرہ  لاکھ روپے ماہانہ لے رہے ہیں۔ انکی تقرری ایوان صدر سے براہ راست ہوئ۔

عاسر منظور، گروپ ہیڈ آف ہیومین ریسورسز کی حیثیت میں بیس لاکھ روپے ماہانہ لے رہے ہیں۔ یہ پہلے اتفاق فونڈری میں کام کرتے رہے۔ وہی اتفاق فونڈری جو شریف برادران کی ملکیت ہے۔ منظور صاحب پہ یہ الزام بھی ہے کہ وہ کے ای ایس سی انتظانیہ اور ورکرز کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔

ضرار ناصر خان، جنرل مینیجر، عاسر کے بہنوئ ہیں انکی خوش قسمتی کے اٹھارہ مہینوں میں دو بار ترقی کے مزے چکھے۔ جبکہ انکی تقرری غیر قانونی سمجھی جاتی ہے۔ وہ بھی پانچ لاکھ حاص کرنے میں کامیاب۔

ایم کیو ایم کے صوبائ وزیر، عادل صدیقی کے بھائ آصف حسین  سات لاکھ تنخواہ لے رہے ہیں۔

اٹھارہ ریٹائرڈ فوجی کرنلز، کمپنی میں کام کرتے ہوئے پانچ لاکھ مہینہ تنخواہ لے رہے ہیں۔

ایم کیو ایم سے تعلق رکھنے والی ممبر اسمبلی ، شہر کے مشہور صنعت کار کی بیگم اور شو بز میں نام کمانے والی خاتون، خوشبخت شجاعت کے فرزند ارجمند جناب شہباز بیگ بطور ٹریننگ ڈائریکٹر، کنگال کے ای ایس سی سے پانچ لاکھ ماہانہ تنخواہ لے رہے ہیں۔

پی پی کے پیر مظہر الحق کے صاحبزادے بھی پانچ لاکھ روپے حاصل کرنے کی گنتی میں ہیں۔

یہ تقریباً ساڑھے سات سو لوگوں میں سے چند لوگوں کے نام ہیں جو کے ای ایس سی میں سیاسی جانبداریوں کے نتیجے میں موجود ہیں اور جنہیں لاکھوں روپے دے کر، کے ای ایس سی کے حکام سمجھتے ہیں کہ اب بیٹھ کر چین کی بنسی بجائیں

کے ای ایس سی کے وہ ملازمین جو اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہے ہیں وہ ہنر مند ہیں جنکی تنخواہیں دس سے تیس ہزار کے درمیان ہیں۔

اس رپورٹ کو پڑھ کر چند سوال ذہن میں اٹھتے ہیں ۔ مثلاً ایسا کیوں ہے کہ ملک بھر میں جتنی ایگزیکیٹو پوسٹس ہوتی ہیں جہاں کام کرنے کو ککھ نہیں ہوتا اور پیسہ ہُن کی طرح برستا ہے یہ ساری پوسٹس چند خاندانوں کے درمیان کیسے بٹتی رہتی ہیں۔

یہ کیا بات ہوئ کہ  وہ لوگ جو ہنر مند ہوں جن پہ دراصل ایک ادارہ چل رہا ہو ان کے راضی یا ناراضی ہونے کی تو پراوہ نہ ہو اور وہ جو عہدے اور روپوں سے آگے کچھ نہیں جانتے انہیں راضی رکھنے کی کوشش میں تن من دھن سب لگا دیا جائے۔

یہ کہ ادارہ اپنے اصل کام پہ تو خرچ کرنے کو تیار نہ ہو۔ یعنی کے ای ایس سی بجلی کی پیداوار بڑھانے کے بارے میں تو کچھ خرچ کرنا نہ چاہتی ہو،  لیکن چند لوگوں کو خوش کرنے کے لئے اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ ان پہ لگادے۔

کہانی یہیں پہ بس نہیں ہوتی۔ کے ای ایس سی کے پاس ان سارے اللے تللوں کے بعد جو پیسہ بچتا ہے وہ اپنے انہی نچلے طبقے کے ملازمین کے خلاف مہم چلانے اور اشتہار بازی پہ خرچ کرنے کو بھی غیر اخلاقی نہیں سمجھتی۔ وہ ملازمین، جو اس ملازمت سے علیحدہ ہوں تو اپنے خاندان کے لئے انکے پاس کچھ نہ ہو۔

مختلف سیاسی جماعتوں  سے استفادہ حاصل کرنے والے بادشاہ اور شہزادے یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ سونے کے انڈے دینے والی مرغی کو زندہ رکھنا ضروری ہوتا ہے وہ اگر اپنی عیاشیوں میں سے صدقے کے برابر بھی کمی کر لیں تو نچلے طبقے کی زندگی میں آسانیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

اس معاملے کا مزید دلچسپ پہلو اس وقت سامنے آتا ہے جب مولوی صاحب بھی فتوی جاری کرتے ہیں کہ کے ای ایس سی کی انتظامیہ کے خلاف ورکرز کی تحریک غیر اسلامی ہے۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ  یہ بے ننگ و نام ہے۔

11:07 PM

پاکستان, کراچی, کے ای ایس سی, لوڈ شیڈنگ, مزدور

جانور وں کی تفریح

یہ آج کا قصہ نہیں۔ ہمیشہ کا دستور ہے کہ بلاگستان کی دنیا ویسے تو کراچی سے متعلق معمولی خبروں کے حوالے تلاش کرتی ہے اور اس سلسلے میں امّت جیسے  جانبدار صحافت کرنے والے اخبار کے حوالوں سے بھری تحاریر اکثر و بیشتر نمودار ہوتی ہیں ۔ لیکن کل کراچی میں جس طرح رینجرز کے ہاتھوں ایک نوجوان کو دل سوز طریقے مارا گیا اس پہ یہ سارے عناصر خاموش ہیں۔ شاید انہیں علم ہی نہیں کہ کس بربریت کے ساتھ کراچی کے ایک تفریحی پارک میں ایک نوجوان کو جو کہ اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا، موت کی گولی نصیب ہوئ۔

اس جانبداری کی وجہ یہ ہے کہ اس واقعے سے ایم کیو ایم کی مٹی پلید کرنے کا کوئ موقع نہیں بن رہا تھا۔ جبکہ ہماری بلاگی دنیا کی اکثریت اس بڑی جگہ سے تعلق رکھتی ہے جہاں پہ کراچی کی صرف وہ خبر پہنچ پاتی ہے جس کے ساتھ ایم کیو ایم  لگا ہو۔ اسکی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہی عناصر جو متعصب دل و دماغ کے ساتھ تمام انسانی احساسات سے محروم ہو چکے ہیں۔ انہیں یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں اس سے ایجنیسیز کا وقار مجروح نہ ہو جائے۔ ان ایجنسیز کا جس میں انکے پیارے بڑی تعداد میں شامل ہونگے۔

نتیجہ یہ ہے کہ اس خبر کو شاید اردو بلاگی دنیا میں  صرف ان لوگوں نے سنا ہوگا جو کراچی سے تعلق رکھتے ہیں وہ بھی اردو اسپیکنگ۔ نسلی تعصب آپ جانتے نہیں کیا ہوتا ہے، تو اب دیکھ لیجئیے۔

ان سب بے چاروں کو انکی حالت پہ چھوڑتے ہوئے، یہ چیز سمجھنے سے کم از کم میں قاصر ہوں کہ اس نہتے نوجوان کو سر عام گولی مارنے کی کیا ضرورت تھی۔ خروٹ آباد، کوئٹہ کے واقعے میں انہوں نے بات بنائ کہ وہ پانچوں چیچنز انہیں شبہ تھا کہ دہشت گرد تھے۔  یہ سوچا جا سکتا ہے کہ وہاں رینجر اہلکار خود کش حملہ آور کے ہونے کے احساس سے خوفزدہ ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنے دفاع میں گولی چلا دی۔ اگرچہ کہ یہ بھی ایک کمزور دلیل ہی ہو سکتی ہے۔ سیکیوریٹی اہل کاروں کی تربیت آخر کس چیز کی ہوتی ہے۔

لیکن کراچی کے ایک بھرے پرے پارک میں ایک تلنگا سا نوجوان چھ سات رینجرز کے اہل کاروں کے درمیان مارا جائے اس طرح مارا جائے کہ وہ ہر ایک سے زندگی کی بھیک مانگ رہا ہو۔ یہ پورا منظر دیکھا نہیں جا سکتا۔ اس نوجوان پہ بھی الزام لگایا گیا  کہ وہ ڈکیتی یا چھیننے جھپٹنے کے واقعے میں ملوث تھا۔ یہ مان لیا جائے کہ وہ چور تھا ڈاکو تھا لیکن وہ رینجرز کے قابو میں آچکا تھا۔ فوٹیج بتاتی ہے کہ وہ نہتا بھی تھا۔ تو رینجرز کے بہادروں کو چھٹانک بھر کے لڑکے پہ یہ مردانگی دکھانے کی کیا ضرورت تھی؟

کیا انکی اس نفسیات کے پیچھے وہی نسلی تعصب تھا جو ہماری بلاگی دنیا میں بھی نظر آتا ہے، کیا یہ طاقت کا شو آف تھا یا یہ کہ  تیس سال سے مسلسل حیوانی سطح پہ سفر کرتے کرتے ہمارے اندر اب جینیاتی  میوٹیشن ہو چکی ہے اور دلی تسکین اور تفریح بس انسان کے خون  سے حاصل ہو سکتی  ہے زندہ انسان کے بہتے خون سے۔

میں آدھے درجن جانوروں کے درمیان ایک نوجوان کی ویڈیو دکھانے سے معذور ہوں۔ در حقیقت میں خود بھی دیکھ نہیں پائ۔

11:32 PM

جہاد, سیکیوریٹی, عصبیت, کراچی، رینجرز، پاکستان, کلفٹن پارک, نسلی امتیاز

جن پہ تکیہ تھا

کچھ کتابوں کے کچھ صفحات اسکین کر کے ڈالنے کا ارادہ ہے۔ سوچا کس سے شروع کیا جائے۔

ٹی وی پہ آجکل ایک ٹاک شو میری دلچسپی لئے ہوئے ہے۔ یہ ہے سی این بی سی سے نشر ہونے والا پروگرام ایجینڈا تین سو ساٹھ۔ اسکی پہلی خوبی تو مجھے اسکے میزبان لگتے ہیں ۔ دو میزبان، دونوں  نوجوان۔ لیکن جتنی سادگی سے وہ اپنے مہمان کو گرفت میں لاتے ہیں ، وہ مزے کی چیز ہے۔ خاص طور پہ اسکا ایک میزبان عبدالمعید جعفری، اتنے سادہ اور پپو والے انداز میں کسی بھی گرم سوال کو اٹھالیتا ہے کہ شاید مہمان کو توقع بھی نہیں ہوتی۔

ابھی کچھ دنوں پہلے عمران خان اس پروگرام میں موجود تھے۔ معید ، نے اسی سادگی سے  پوچھا۔ یہ ہم مانتے ہیں کہ آپ میں کوئ کرپشن نہیں۔ لیکن الیکشن میں آپکو کسی نہ کسی کو تو ساتھ رکھنا پڑے گا۔ آپ کرپشن نہیں کرتے نہ اسلحہ استعمال کرتے ہیں لیکن کراچی کے دھرنے میں آپ نے سنی تحریک کی حمایت استعمال کی۔ انکی شہرت تو یہ نہیں ہے۔ پھر الیکشن میں یا اسکے بعد آپ کیا کریں گے۔

اس سوال پہ مجھےایک کتاب یاد آگئ۔  اسکا نام ہے مولانا مودودی کی تقاریر۔  جماعت اسلامی نے انیس سو پچاس میں پنجاب میں ہونے والے انتخابات میں حصہ لیا۔ جس کے لئے مولانا مودوددی صاحب نے انتھک محنت کی۔ انہوں نے اس سلسلے میں کیا اسٹریٹجی اپنائ ، وہ ان صفحات سے ظاہر ہے۔

 لیکن انتخابات کے بعد ہوا کیا۔ اسکا اندازہ اس صفحے سے لگایا جا سکتا ہے۔

نوٹ؛

تصاویر بہتر طور پہ دیکھنے کے لئے ان پہ کلک کیجئیے۔

3:44 PM

الیکشن, ایجینڈا تین سو ساٹھ، ٹاک شو, پاکستان, جماعت اسلامی, سیاست, عمران خان, مودودی

دروغ دروغ

کہتے ہیں جھوٹ کے پاءوں نہیں ہوتے اس لئے یہ زیادہ دیر قائم نہیں رہ پاتا لیکن کچھ اور لوگ کہتے ہیں کہ ایک سچ اپنے تسمے باندھ ہی رہا ہوتا ہے کہ جھوٹ ساری دنیا کی سیر کر کے آجاتا ہے۔ اب ایمانداری سے بتائیے آپکو کونسا کنکشن پسند آئے گا۔

جھوٹ بولا ، بنایا یا بَکا ہی نہیں جاتا بلکہ پکڑا بھی جاتا ہے۔ مگر کچھ لوگ اسے گھر پہنچا کر بڑا خوش ہوتے ہیں اور ہرجگہ سینہ پھلائے پھرتے ہیں کہ جھوٹے کو اسکے گھر تک پہنچایا، جھوٹا نہ ہوا محلے کی سب سے خوبصورت لڑکی ہو گیا۔

خوبصورت لوگ وہ بھی جنس مخالف کے اگر جھوٹ بولیں تو بالکل برا نہیں لگتا۔ خواتین کے معاملے میں جتنی کم عمر ہوں جھوٹ بولتے ہوئے اتنی حسین لگتی ہیں۔ مشرقی خواتین کو ماچو مردوں کا جھوٹ پسند آتا ہے۔ منمناتے ہوئے جھوٹے سے ڈپارٹمنٹ کے پیچھے والی دوکان سے صرف چھولوں کی پلیٹ منگوائ جا سکتی ہے۔ وہ بھی اسی کے خرچے پہ۔

یوں

بولے تو سہی جھوٹ ہی بولے وہ بلا سے

ظالم کا لب و لہجہ دل آویز بہت ہے

اس ظالم اور اسکے جھوٹ پہ اردو شاعری میں دیوان کے دیوان لکھے جا چکے ہیں۔ جو لگتا ہے کہ سب کے سب جھوٹ کے پلندے ہونگے۔ لیکن شاعر انہیں نسخہ ہائے وفا کہتے ہیں۔

جھوٹ کے پتلے بھی ہوتے ہیں۔ یہ  صرف جھوٹ سے بنے ہوتے ہیں اور جھوٹ کے پل بناتے رہتے ہیں۔ اگر وہ جھوٹ نہ بولیں تو پیٹ اپھر جائے۔ انکا نہیں پل بنوانے والوں کا۔ یہ دوسروں کو اتنی آسانی سے جھوٹا بناتے ہیں کہ بننے والے کو اپنے جھوٹا ہونے پہ صداقت کا احساس ہوتا ہے۔ انکا نعرہ ہوتا ہے کہ جھوٹ اتنا بولو کہ سچ معلوم ہونے لگے۔ ایسے لوگ اچھے درباری موءرخ ثابت ہوتے ہیں۔ اپنے زمانے میں بڑا نام کماتے ہیں۔ مگر بعد کے زمانے کے موءرخ ان سے دشمنی دکھاتے ہیں۔ اس طرح یہ سراب کی مانند مٹ جاتے ہیں۔ یوں ایک جھوٹا موءرخ دوسرے جھوٹے موءرخ کے حق میں سم قاتل ہوتا ہے۔  اس قتل و غارت گری کے بعد  تاریخ کا مضمون پڑھنے میں آسانی بھی ہوتی ہے اور دشواری بھی۔کیوں اس لئے کہ کس کا یقیں کیجئیے کس کا نہ کیجئیے۔ لائے ہیں اسکی بزم سے یار خبر الگ الگ۔  اس لئے ہم کتابوں کے بجائے سینہ بہ سینہ اور منہ بہ منہ چلی آنے والی تاریخ کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ سینہ اور منہ وہ جو ہمارے قبیلے کا ہو۔

حیران کن طور پہ، جھوٹ کے دفتر بھی ہوتے ہیں۔ جبکہ ایک عمر ہم یہی سمجھتے رہے کہ دفتر میں جھوٹ ہوتا ہے۔ دیکھا خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا۔ ایسے موقعوں پہ یقین آتا ہے کہ لا علمی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ آخر کو ہم اس آگ کے دریا کو آگ کا دریا پڑھتے ہوئے پار کر آئے۔

مگر گھبرائیے نہیں جھوٹ ایکدم خالص نہیں ہوتا زیادہ تر باتیں جھوٹ سچ کے زمرے میں آتی ہیں۔ یعنی تھوڑا سا پگلا تھوڑا سیانا۔ اسی میں عافیت ہے۔

کسی زمانے میں  لوگ باگ عاجز تھے کہ جھوٹا مرے نہ شہر پاک ہو۔ بعد میں نہ معلوم وجوہات کی بناء پہ شہر پاک کرنے کی کوششیں ترک کر دی گئیں۔  کچھ لوگوں کو اس روایت سے اختلاف ہے کہتے ہیں کہ شہر نہیں ایک ملک تھا اور ایک نہیں سب ہی جھوٹے تھے۔   اللہ کی باتیں اللہ ہی جانے ہم تو یہ جانتے ہیں کہ جھوٹے کے آگے سچا روتا ہے۔  جہاں سچا روتا ہوا واپس آتا ہے وہاں جھوٹا ہنستا ہوا نکل جاتا ہے۔

اگر آپ اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ جھوٹے کا منہ کالا اور سچے کا بول بالا تو  اس جھوٹ کی ناءو نہیں چل سکتی۔  اس جھوٹ کی پوٹ اس دن کھلے گی جس دن جھوٹا بات بنا لے گا اور پانی میں آگ لگا لے گا۔ اس لئے کہنے والوں نے اڑائ کہ سچے مر گئے جھوٹوں کو تاپ بھی نہ آئ۔ یہاں مرنے والوں سے میری مراد وہ

صحافی سلیم شہزاد

نہیں ہے، اور جھوٹے کون ہیں اس بارے میں ، میں اشارتاً بھی بات نہیں کرنا چاہتی۔ جسکو ہو دین و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں۔

ہم اور تیری گلی سے سفر، دروغ دروغ

کہاں  دماغ ہمیں اس قدر، دروغ دروغ

وضاحت؛

اس تحریر کی انسپیریشن فیروز اللغات سے حاصل کی گئ، سچی مچی۔

10:18 PM

آئ ایس آئ, پاکستان, جھوٹ, دروغ, صحافت, صحافی، آزادی, طالبان

او رے گیمی بولے تو اوری گیمی

وہ کاغذ کی کشتی وہ بارش کا پانی تو یاد ہوگا۔ لیکن کاغذ  ، ہاتھ اور خوشی کا تعلق،  بچپن کی ان کشتیوں  پہ نہیں ختم ہوتا۔  یہ مجھے اس وقت پتہ چلا جب ہمیں ایک جاپانی استاد ملے۔ یہاں وہ پہنچے تو انکی بیگم بھی ہمراہ تھیں۔ یہ  ستّر سالہ خاتون اکیلے یہاں کیا کرتی رہتی ہیں۔ جاپانی تو خدا پہ یقین نہیں رکھتے،  ایسا بھی نہیں کہ تسبیح گھماتے ہوئے آخری وقت کے سہل ہو جانے کا بندو بست کرتی رہتی ہوں۔ ہمارے شہر میں کوئ ڈھنگ کی تفریحی جگہ، میوزیم یا لائبریری کچھ بھی تو نہیں ہے۔ رشتے دار بھی نہیں کہ انکی غیبت کر کے وقت گذاریں، زبان بھی انہیں یہاں کی نہیں آتی کہ نوکروں سے حال احوال معلوم کرتی رہیں۔  آخر یہ کیا کرتی رہتی ہیں۔

کسی نے بتایا  بیشتر اوقات کاغذ کے کھلونے تیار کرتی ہیں۔ جب ایک معقول تعداد میں بن جاتے ہیں تو انہِن جاپان کے کسی اسکول بھجوا دیتی ہیں۔ کس قدر عجیب سنَکی ہوئ قوم ہے۔ کس قدر غیر دلچسپ چیز میں وقت لگاتی ہیں۔ کھلونے وہ بھی کاغذ کے۔

کاغذ کی جاپان میں بڑی اہمیت ہے۔ ہم چند لائینیں لکھ کر کاغذ کو پھینک دینے میں کوئ حرج نہیں سمجھتے۔ ہمارے جاپانی پروفیسر، جب کچھ سمجھانے بیٹھتے تو کاغذ کا سینٹی میٹر بھی نہ بچ پاتا۔ جب تک وہ اچھی طرح بھر نہ جاتا دوسرے صفحے پہ نہیں لکھتے تھے۔

خیر، میں کاغذ کے کھلونوں کے متعلق بتا رہی تھی۔ جاپانی زبان میں اس کے لئے ایک لفظ مخصوص ہے اور وہ ہے

اوریگیمی

۔ اس مخصوص طریقے میں کاغذ کو اس طرح تہیں دی جاتی ہیں کہ وہ ایک کھلونے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

اگرچہ کہ اسکے آغاز کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کیا جا سکتا کہ کاغذ کو محفوظ رکھنا مشکل ہوتا ہے اور اسکے قدیم نسخے اس وجہ سے دستیاب نہیں۔ اس لئے چین اور یوروپ کا بھی نام لیا جاتا ہے کہ وہاں پہ  یہ ایک ہزار عیسوی کے دوران موجود تھی۔ لیکن ثبوت اس کا موجود ہے کہ اس کا باقاعدہ آغاز جاپان میں سترہویں صدی میں ہوا اور انیسویں صدی میں اسکی شہرت جاپان سے باہر پھیلنا شروع ہوئ۔ ایہارا سائکاکو ایک کی نظم میں کاغذ کی تتلیوں کا تذکرہ ہے یہ سترہویں صدی کا ایک جاپانی شاعر ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً ایک ہزار عیسوی میں میں جاپان میں شادیوں میں کاغذ کو تہہ کر کے تتلیاں بنانے کی روایت موجود تھی۔

اوریگیمی کے لئے جاپان میں مخصوص کاغذ استعمال ہوتا ہے جسے واشی کہتے ہیں۔ یہ مخصوص کاغذ اس طرح تیار کیا جاتا ہے کہ  تہوں کو برداشت کر سکے ۔ یہ ڈھائ سینٹی میٹر سے پچیس سینٹی میٹر تک کے سائز میں ملتے ہیں۔ عام طور پہ ایک سطح سفید اور دوسری رنگدار ہوتی ہے لیکن ڈیزائن والے کاغذ بھی ملتے ہیں۔

روائیتی جاپانی اوریگیمی سے الگ  کاغذ کے علاوہ کسی بھی ایسی چیز کو استعمال کر سکتے ہیں جس کی تہہ بنائ جا سکے اور وہ تہہ قائم رہ سکے۔ مثلاً ایلومینیئم فوائل۔ ایک اور خاص مادہ ملتا ہے جس میں ایلومینیئم فوائل کے اوپر ٹشو کو اچھی طرح چپکا لیا جاتا ہے۔ اسکے علاوہ  ہمم، نوٹوں کا کاغذ بھی استعمال ہو سکتا ہے۔

اگرچہ کے روائیتی اوریگیمی میں اوزار استعمال کرنے کا تصور نہیں۔ لیکن تہوں کو بہتر بنانے کے لئے اسکیل اور ٹوئزر کی مدد لی جا سکتی ہے۔ ہاتھ کی انگلیاں ناکافی پڑ رہی ہوں تو کلپس کام میں لائے جا سکتے ہیں۔

اوریگیمی سے حرکت کرنے والے کھلونے بنائے جا سکتے ہیں اس طرح کے انکی حرکت کے لئے آپ اپنے ہاتھ کی انگلیاں استعمال کر سکیں۔ جیسے ہاتھ کی پتلیاں ہوتی ہیں۔ اس طرح ایک اڑتا ہوا پرندہ یا کھلتا ہوا پھول بنانا کوئ مشکل کام نہیں۔

سہہ جہتی کھلونے بنانا بھی اوریگیمی میں ممکن ہے، جبکہ تہوں کو بالکل واضح رکھنے کے بجائے نرمی کا تائثر دینے کے لئے کاغذ کو بھگویا جا سکتا ہے۔

معذور بچوں کی دلچسپی کے لئے ایسی اوریگیمی کے طریقے بھی موجود ہیں جن میں کاغذ کی تہہ کو پلٹا نہیں جاتا۔ اس طرح تہہ کے اندر پیچیدگی نہیں پیدا ہو پاتی۔ اور ایک ذہنی طور پہ سست بچے کو بھی یہ کرنا آسان ہوتی ہے۔ اس طرح اوریگیمی ذہنی طور پہ معذور بچوں کے لئے بھی ایک دلچسپ مشغلہ ثابت ہو سکتی ہے۔

بہت سارے حصوں کو الگ الگ  بنا کر کسی چیز کی مدد سے جوڑا جا سکتا ہے اس طرح ایک خاصہ بڑا ماڈل تیار ہو سکتا ہے۔

 اب اتنی تفصیلات کے بعد آپ  کے اندر اگر تھوڑی سی بھی خواہش پیدا ہوئ ہے کچھ بنانے کی تو اس سادہ سے ماڈل سے شروع کریں۔

مزید کے لئے ان لنکس کو دیکھیں

http://www.langorigami.com/

http://www.en.origami-club.com/

اور جب مہارت حاصل ہو جائے تو یہ ویڈیو دیکھنا مت بھول جائیے گا۔ اس سے آپکو پتہ چلے گا کہ جاپانی ذہنی اور جسمانی مشقت کے کیوں عادی ہوتے ہیں۔ وہ اس نشے کا شکار قوم ہے۔ جیسے ہم جنگ کے نشے میں چور ہیں وہ محنت کے نشے میں مست ہیں۔ ہماری اکثریت ایکدوسرے کو جعلی نصیحتوں کے علاوہ کوئ مشغلہ پالنے میں دلچسپی نہیں رکھتی اور وہ مشغلے کے طور پہ ایک کاغذ کے پرزے پہ بھی اتنی محنت کر ڈالتے ہیں۔

اس کا فائدہ کیا ہوگا؟ جسم سے فاسد خون نکالنے کے لئے ایک زمانے میں جونکیں استعمال کی جاتی تھیں۔ دماغ سے فاسد خیالات  دور رکھنے کے لئے اسے کسی تخلیقی کام میں مصروف کر لیں اس سے آپکی تخلیقی صلاحیت کو جِلا ملے گی۔ تخلیقی کام ایسا ہو جسے کر کے آپکو خوشی اوردوسروں کو حیرانی ہو تو کیا بات ہے۔ تحقیق کہتی ہے کہ جو لوگ تخلیقی کاموں میں لگے رہتے ہیں وہ اپنے آپ سے زیادہ باہردیکھنے لگتے ہیں تاکہ انسپیریشن ملنے کا کوئ لمحہ ضائع نہ چلا جائے۔

لیکن کچھ لوگ اتنی زیادہ تانکا جھانکی کرتے ہیں کہ باہر سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ سو یہ بھی ممکن ہے کہ کاغذ کی تہیں لگاتے ہوئے آپ کی  اپنی تہیں کھلنے لگ جائیں۔ اور آپ اپنے آپ سے ملاقات کے قابل ہو سکیں۔

اگر آپ استاد ہیں تو کلاس میں  دلچسپی پیدا کرنے کے لئے مددگار اور طالب علم  متائثر الگ ہونگے۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ گرمیوں کی طویل چھٹیوں میں اپنے گھر کے بچوں کو مصروف رکھیں آجکل بہت سے والدین اسکی تلاش میں ہونگے ۔

وہ پوچھتے ہیں آخر گرمیوں کی چھٹیاں اتنی لمبی کیوں ہوتی ہیں؟

4:40 PM

اوریگیمی, بچے, پاکستان, جاپان, چھٹیاں, کاغذ, گرمیاں

سرکشی

ایک لفنگا ایک باغ میں گھس گیا۔ دیکھا کہ درخت پھلوں سے لدے ہیں۔ تو ان پہ چڑھ کر کبھی ایک پہ کبھی دوسرے پہ پھل توڑ کر کھاتا رہا۔ پھر بہت سے پھل جمع کر لئے کہ ساتھ لے جائے۔

اتفاق کی بات ہے اس وقت  باغ کا مالک وہاں آگیا۔  اس نے ایک اجنبی کو درخت پر چڑھتے دیکھا تو پوچھا۔ تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو۔ وہ بولا۔ باغ میں آیا تھا دیکھا درختوں پہ پھل لگے ہیں کچھ توڑ کر پیٹ بھرا اور کچھ ساتھ لئے جا رہا ہوں۔ دیدہ دلیری کی انتہا تھی۔ مالک نے کہا اول تو یہ بتاءو کہ تم باغ میں آئے کیسے  اور پھل تم نے کیسے چرائے؟

بولا، باغ تو باغ ہے۔ اس میں آنے کی اجازت کی کیا ضرورت۔ یہ درخت اللہ کا، یہ پھل اللہ نے پیدا کئے، میں بھی اللہ کا بندہ ہوں، مجھے اختیار ہے جو دل چاہے کروں۔ تم کون ہوتے ہو مجھے ٹوکنے والے۔ چوری اور سینہ زوری۔

بعض لوگ سچ بات کو مان کر نہیں دیتے۔ بات کو اس طرح گھما دیتے ہیں کہ جیسا وہ سوچتے ہیں ویسی دلیلیں ہو جائیں۔ انکے پاس اصول، انصاف، ایمانداری کسی بات کی کوئ اہمیت نہیں ہوتی۔ انکے نزدیک انہیں کھلی چھٹی ہے۔

ہاتھ پاءوں کے مضبوط ہونگے تو لڑنے بھڑنے پہ آمادہ یہ نہ ہو سکے تو پیٹھ میں چھرا گھونپنے کی کوشش کریں گے۔ بس کسی طرح ہمارا مطلب نکل آئے۔

باغ کا مالک ہکا بکّا اس شخص کے سامنے کھڑا تھا۔ اور الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے جا رہا تھا۔ آخر باغ کے مالک نے کہا۔ میاں ہوش کے ناخن لو، چوری کا مال یہی چھوڑ کے اپنے گھر جاءو، یہ وہ بڑی رعایت ہے جو میں تمہارے ساتھ کر سکتا ہوں۔

چور میاں اکڑ گئے بولے۔ یہ اللہ کا مال ہے اور اسکا کوئ بندہ بھی کھا سکتا ہے۔ یہ سن کر باغ کے مالک سے رہا نہ گیا۔ اپنے آدمیوں کو آواز دی۔ ایک رسی منگوائ اور چور کو درخت سے باندھ دیا۔ جب وہ بندھ گیا تو ایک ڈنڈا منگوایا اور خوب ڈنڈے اسکے اوپر پڑے۔ اب جو مار پڑی تو چور صاحب نے شور مچانا شروع کیا۔ ارے ظالموں اللہ سے ڈرو۔ کیوں مجھے مارے ڈالتے ہو۔ باغ کے مالک نے کہا۔ چلاتے کیوں ہو۔ مار پڑتی ہے تو پڑنے دو۔ اللہ کا ایک بندہ اللہ کے دوسرے بندے کو اللہ کے بنائے ہوئے ڈنڈے سے پیٹے تو واویلا کس بات کا؟ میرے دوست جو تمہارا فلسفہ ہے اسی پہ عمل کر رہا ہوں۔ تمہیں کوئ اعتراض نہیں ہونا چاہئیے۔ آخر اس نے توبہ کی اور رہا ہو کر اپنے گھر گیا۔

آدمی بڑا خود غرض ہوتا ہےاسے اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا لیکن دوسرے کی آنکھ کا تنکا وہ دیکھ لیتا ہے۔ غرض اسے اندھا بنا دیتی ہے۔ اپنا مقصد پورا کرنے کے لئے وہ برے بھلے کی تمیز بھلا دیتا ہے۔ اسی کو ظلم کہتے ہیں۔ ظالم ظلم کرتا ہے تو کبھی نہیں سمجھتا کہ اس سے ظلم ہو رہا ہے۔ بلکہ طرح طرح سے اسکی تاویلیں کر کے اپنے آپکو راستی پر ٹہراتا ہے۔ یہی شیطان کا بہکاوا ہے۔ معاف کرنا اور صبر کرنا دو بڑی اچھی عادتیں ہیں۔ لیکن جب دیکھو کہ ظالم ظلم پہ دلیر ہو رہا ہے اور موذی تکلیف پہنچانے کے در پے ہے تو حکم ہے کہ پھر پوری قوت سے اسے روکو اور کیفر کردار تک پہنچاءو۔ ورنہ امن اور سکون درہم برہم ہو جائے گا اور زندگی میں توازن نہیں رہے گا۔ ظلم سہنے میں بھی ظالم کی مدد ہوتی ہے۔

ماخذ۔ کتاب روشنی، مصنف شاہ بلیغ الدین، اردو اکیڈمی سندھ۔

8:57 PM

اخلاقیات, اسلام, پاکستان, سندھ, شاہ بلیغ الدین, مذہب

مستی

سارے رند اوباش جہاں کے تجھ سے بے خود میں رہتے ہیں

بانکے ، ٹیڑھے، ترچھے، تیکھے سب کا تجھ کو امام کیا

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا، رات کو تھا مے خانے میں

جبہ، خرقہ، کرتا، ٹوپی، مستی میں انعام کیا

4:08 PM

پاکستان, جنت, حور, مرد, مسلمان

نیا پاکستان، آدھا طالبان

اگر آپ عنوان دیکھ کر یہاں آئے ہیں تو مایوسی ہوگی۔ میں اس پہ کچھ نہیں لکھ رہی۔ محض دل پشوری ہے۔ جسٹ اے مارکیٹنگ ٹِرک۔ مجھ سے پہلے بھی کچھ لوگ یہ حرکت کر چکے ہیں۔ اس لئے اس میں کوئ تخیل کی پرواز نہیں ہے۔  کوئ وعظ بھی نہیں ہے۔

اور اگر اس عنوان کے سہارے کچھ بھی پڑھنے کے لئے تیار ہیں تو یقین رکھیں کہ آج آپکو کچھ مزے کا پڑھنے کو ملے گا۔ کیونکہ آج جن صفحات میں آپکو شریک کرنا چاہ رہی ہوں۔ وہ

منٹو

سے متعلق ہیں۔ لکھا ہے اسے

منشا یاد

صاحب نے ادبی سلسلے

دنیا زاد

کے  بائیسویں شمارے ،  سیاہ تارہ میں یہ شائع ہوا ہے۔ اسکے ایڈیٹر ہیں جناب

ڈاکٹر آصف فرخی

۔

یہ مضمون اپنے اسلوب میں مزاح اور طنز رکھتا ہے۔ لیکن جس چیز کی طرف میری توجہ زیادہ گئ۔ وہ منٹو کی ایک معصوم سی فرمائیش ہے ایک چھوٹےسے ایٹم بم کی۔ کس واسطے؟

اب دیکھیں منٹو صاحب نے جس سلاست اور روانی سے یہ فرمائیش کی ہے۔ اگر میں لکھوں تو، زن آزاد، روشن خیال کافر اور پڑھی لکھی جاہل قرار پاءوں۔ اس سے اشارہ سمجھنے والے سمجھ جائیں گے کہ بڑا ادیب  آخر کیسے جنم لیتا ہے۔

لوگ پوچھتے ہیں کہ انیس سو اسّی سے پہلے کا پاکستان کیا زیادہ ترقی یافتہ تھا۔  ترقی یافتہ تھا یا نہیں، البتہ  اس زمانے میں مرد لکھاریوں کا پسندیدہ موضوع خواتین کا پردہ اورانکے شرعی فرائض  نہیں ہوتے تھے۔

منٹو صاحب کا یہ خط اس میں انگریزی میں موجود ہے۔ اسکے مطابق انہیں ایک چھوٹا سا ایٹم بم چاہئیے ان مردوں کے لئے جو سڑک کے کنارے قدرتی ضرورت سے فارغ ہوتے ہیں۔ اسکے لئے وہ کیا اہتمام کرتے ہیں اسے میں اردو میں ترجمہ نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن اپنے چند نامی گرامی بلاگرز سے جنہیں ان موضوعات سے دلچسپی ہے درخواست کرونگی کہ ایک نظر ادھر بھی۔  اس کا ترجمہ وہ اپنے بلاگ پہ شائع کر سکتے ہیں۔ اس سے حاصل ہونے والی شہرت پہ میں کوئ دعوی نہیں کرونگی۔ اس کا اعجاز منٹو صاحب کو جاتا ہے یا منشا یاد کو۔ میری حیثیت تو محض پیمبر کی سی ہے۔ وہ بھی وہ، جسکے بارے میں شاعر کہتا ہے کہ

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا

زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

  آئیے ، پڑھتے ہیں۔

۔

3:20 PM

آصف فرخی, پاکستان, دنیا زاد, دہشت گردی, طالبان, منٹو, منشا یاد

شہید تیرا قافلہ تھما نہیں رکا نہیں

اسی طرح رات کو ٹی وی چلا کر کسی بلاگ پہ تبصرہ لکھ رہی تھی کہ اطلاع ملی  شاہراہ فیصل پہ دھماکہ ہو گیا۔ آدھ گھنٹے بعد معلوم ہوا کہ پی این ایس مہران میں بارہ ، پندرہ دہشت گرد گھس گئے۔ س سے آگے اب ایک دنیا واقف ہے کہ کیا ہوا؟

وہ بارہ پندرہ دہشت گرد جو ایک وقت میں بیس بائیس ہو گئے تھے محض تین نکلے باقی کے سب بھاگ گئے۔ انکی تعداد دو سے لیکر آٹھ تک ہے۔ اربوں روپے مالیت کے قیمتی جہاز تباہ ہوئے۔ دس فوجی اہلکار شہید ہوئے۔

ایک طبقہ خوش ہے کہ  فوج نے پاکستانی عوام کو جس طرح تیس سال پہلے بے وقوف بنا کر ایک جنگ میں دھکیلا، ملک کی ثقافت اور مستقبل کو  داءو پہ لگایا آج اسے خود مزہ چکھنے کو ملا۔ دوسرا طبقہ خوش ہے کہ جس طرح ہمارے مجاہدین کے خلاف مہم چلائ گئ ، انہیں شہید کیا گیا، نتیجے میں اچھا تھپڑ پڑا۔ ایک اور طبقہ خوش ہے کہ کیونکہ لگتا ہے بالآخر ہمیں امریکہ سے دو بدو لڑنے کا موقع ملے گا۔ آہا، کندن بننے کے دن آنے والے ہیں۔ کندن بننے کے بعد یقیناً اقوام عالم میں ہم سونے کے بھاءو تولے جائیں گے۔

یہاں ہمارے کچھ ساتھی ایسے ہیں جو دو سال پہلے اس خیال کے شدید مخالفین میں سے تھے کہ کراچی میں طالبان اپنی جڑیں پھیلا رہے ہیں۔ آج وہ سب خاموش ہیں۔ یہاں ہمارے کچھ ساتھی ایسے بھی ہیں جنہیں پنجابی طالبان کی اصطلاح پہ کف آنے لگتا تھا۔ آج وکی لیکس کہہ رہی ہیں کہ پنجاب میں طالبان کو جمانے کے لئے لاکھوں ڈالر خرچ ہوئے۔ آج وہ بھی  خاموش ہیں۔

ایسے ہر واقعے کے بعد ٹی وی پہ مبصرین کی ایک بڑی فوج دستیاب ہو جاتی ہے۔

 ایسے ہی ایک ٹاک شو میں ، فوج کے ایک اعلی ریٹائرڈ افسر اتنے جذباتی ہوئے، فرمانے لگے پاکستان کی حفاظت دو قوتیں کر رہی تھیں۔ پھر کچھ سوچ کر انہوں نے اس میں ایک اور قوت کا اضافہ کیا ۔ یہ قوتیں فوج، پٹھان اورخدا ہیں۔  اندازہ ہے کہ آخر میں شامل ہونے والی قوت خدا کی ہوگی۔ لیکن پچھلے دس سال میں فوج اور پٹھان کو لڑا دیا گیا اور اس طرح ملک کے دفاع کو کمزور کر دیا گیا۔

چلیں فوج تو پاکستانی انسٹی ٹیوشنز میں شامل ہے۔ لیکن کسی قوم کو جاہل اور معاشی طور پہ کمزور رکھ کر۔ ملک میں بسنے والی دیگر قوموں سے الگ کر کے دین و ملت کی حفاظت پہ معمور کر دینا، کہاں تک درست ہے؟

اگر ہم اس بات کو  من وعن تسلیم کر لیں کہ دہشت گردی کی اس فضا کی ساری جڑ امریکہ ہے۔  تب بھی یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ اس میں جو لوگ حصہ لیتے ہیں اور استعمال ہوتے ہیں وہ ہمارے ہی لوگ ہیں۔ کیا امریکہ میں ہونے والی کسی دہشت گردی میں کوئ امریکی شامل ہوتا ہے۔ حتی کہ ممبئ میں ہونے والی دہشت گردی کے واقعے میں بھی پاکستانی یہاں سے وہاں پہنچے۔ لیکن افسوس، ہمارے یہاں دہشت گردی کے ہر واقعے کوانجام دینے والا ایک پاکستانی ہی ہوتا ہے۔ اسکے باوجود کہ یہاں ہزاروں کی تعداد میں امریکی موجود ہیں یہ فریضہ سر انجام دینے کے لئے انہیں پاکستانی مل جاتے ہیں۔ آج تک کسی خود کش حملے میں کوئ امریکی نہیں پھٹا نہ ہی کوئ انڈین۔

یہ لوگ کیوں ان لوگوں کے ہاتھوں استعمال ہوتے ہیں۔ اسکی دو واضح بنیادی وجوہات ہیں۔ تعلیم کی کمی اور بے روزگاری۔ اسکی تیسری سب سے اہم وجہ ہمارے شمالی علاقہ جات کے عوام کو اس فریب میں مبتلا رکھنا کہ وہ بہادر اور جنگجو ہیں۔ ان پہ دین اور ملک کی کڑی ذمہ داری ہے۔  اس خوبی کے بعد انہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، وہ بہادر ہیں بچے کے کان میں اذان سے پہلے گولی کی آواز جاتی ہے۔

کیا ایک قوم بننے کے عمل کے لئے یہی نظریات کارآمد ہوتے ہیں؟ یہ بات ہمیں آدھا پاکستان گنوانے کے بعد بھی سمجھ نہِیں آسکی۔ بنگالیوں کو انکی جسامت اور مذہب کے بارے میں  کے طعنے دینے والے ان سے شکست کھا گئے۔

آزاد علاقوں کے پشتونوں کو ایک پر فریب احساس برتری میں مبتلا کر دیا گیا۔ اور اپنی اس آزادی میں وہ کسی قانون کے پابند نہیں رہے۔ ہونا تو یہ چاہئیے تھا کہ آزادی کے بعد انہیں پاکستان کی دیگر اقوام کے ساتھ مین اسٹریم میں لانے کی کوششیں غیر محسوس طریقے سے شروع کی جاتیں۔ تاکہ تبدیلی کا عمل آہستگی سے شروع ہو جاتا۔ لیکن کسی نے اس صورت کو تبدیل کرنے میں دلچسپی نہیں لی۔  البتہ انکی اس حالت سے لوگوں نے فائدہ اٹھایا۔ اس طرح کے انہیں  کوئ دور رس  فائدہ نہیں پہنچا۔  حتی کہ جنت تک پہنچے اور پہنچانے کے لئے بھی یہی راستہ استعمال کیا گیا۔

انکی اس آزاد حیثت کا فائدہ اٹھا کر دنیا بھر کے جنگجو وہاں پہنچ کر اکٹھا ہوتے ہیں۔ اسلحہ کا آزادنہ استعمال ، آزادنہ تیاری، اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ اگر اس میں کوئ کمی تھی تو وہ عوامی پذیرائ کی۔ وہ ماشااللہ سے پچھلے تیس سالوں کی شبانہ روز محنتوں سے انہیں ایسی ملی کہ ، تیس سال کی داستان تو ایک طرف، پچھلے دس سالوں میں پینتیس ہزار عام پاکستانیوں کے انکے ہاتھوں ختم ہونے کے باوجود ختم نہ ہوئ۔

وہ کہتے ہیں کہ امریکہ دہشت گردی کروا رہا ہے۔ یہ نہیں سوچتے کہ امریکہ لیبیا میں تو القاعدہ کے ہاتھ مضبوط کر رہا ہے دوسرے ملک میں کیسے اسکے خلاف جنگ کر رہا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اگر ایک ملک میں وہ اسکی مدد کر رہا ہے تو دوسرے ملک میں القاعدہ کے رہنما اس کے دشمن ہونگے۔

آج سے تیس سال پہلے فوج نے امریکہ کا ساتھ دینے کے لئے جہاد کا فلسفہ پھیلایا، اور جہادی کاروبار میں خوب پھلی پھولی، آج سے پندرہ سال پہلے فوج کی سرپرستی میں، امریکہ کی آشیرباد سے طالبان کو افغانستان میں داخل کیا گیا، آج سے دس سال پہلے فوج کی مرضی سے پاکستان امریکہ کی مدد کر کے جنگ کے کاروبار میں شامل ہوا۔ دراصل ہماری فوج اور امریکہ ایک دوسرے کے حلقہ ء اثر میں تین دہائیوں سے چلے آرہے ہیں۔ کس لئے ایک اپنے رسوخ کے لئے دوسرا ڈالرز کے لئے۔

اس لئے جب جنرل کیانی نے کہا کہ خوشحالی کے لئے عزت و وقار پہ سودانہیں کریں گے تو مجھے یہ سوچنا پڑا کہ انکا مخاطب فوج کے اعلی عہدے دار ہیں۔ عوام کے پاس نہ خوشحالی ہے نہ عزت اور نہ وقار۔

آج مرنے والا بھی شہید ہے مارنے والا بھی شہید ہے۔ پی این ایس مہران ، کراچی کے واقعے میں  دس شہید فوج کے اور تین شہید دہشت گردوں کے۔ عام پاکستانی  کنفیوز ہے۔ اسے خودکش حملہ آور کا کاز انتہائ نیک لگتا ہے۔ مرنے والوں کا بھی کوئ قصور نہیں۔ یوں شہیدوں کا قافلہ نہ تھمتا ہے نہ رکتا ہے۔

اس سارے واقعے کے بعد جس چیز سے مجھے شدید تکلیف پہنچی وہ لیفٹیننٹ یاسر عباس کی والدہ کی حکومت سے یہ درخواست کہ انکے شہید بیٹے کو نشان حیدر دیا جائے۔

یہ صحیح ہے کہ نوجوان اکلوتے بیٹے کی موت والدین کے لئے ایک بڑا سانحہ ہوتی ہے۔ لیکن ایک ایسے واقعے میں جس میں مزید نو لوگ شہید ہوئے ہیں جد وجہد کرتے ہوئےآخر وہ بھی تو کسی کے بیٹے ہیں۔ یاسر عباس شہید کا خاندان فوج کے اعلی افسران کے لوگوں پہ مشتمل ہے۔ انہیں معلوم ہوگا کہ اس راستے میں یہ کڑے امتحان آتے ہیں۔ پھر ایسی کم بات کیوں کی؟ مجھے نجانے کیوں یقین سا ہے کہ انکی والدہ کو کسی اور نے یہ درخواست کرنے کے لئے کہا ہے۔ ایک ماں کا دل اتنا چھوٹا اور خود غرض نہیں ہو سکتا کہ وہ صرف اپنے بیٹے کے بارے میں سوچے۔

ابھی اس واقعے کی انکوئری نہیں ہوئ۔ ہم تک جو میڈیا کے ذریعے اطلاعات پہنچی ہیں۔ اگر ان سب کو درست تسلیم کیا جائے۔ یہ مان لیا جائے کہ اس میں فوج کے اعلی افسران کی کوتاہی شامل نہیں، اس واقعے کا باعث انکی کوتاہ اندیشی  اور نکما پن نہیں ہے۔ اور جیسا کہ ہم سمجھ رہے ہیں اسکے بر عکس انہوں نے  دہشت گردوں کو ناکام کر دیا۔ اور انہیں لعنت ملامت کرنے کے بجائے انکا مورال بلند کرنے کی ضرورت ہے۔  اسکے بعد بھی اگر نشان حیدر کا مستحق کوئ شخص نظر آتا ہے تو ایک کرنل کا بیٹا یاسر عباس شہید نہیں بلکہ وہ رینجراہلکار خلیل ہے جس نے یہ جان کر بھی کہ دہشت گرد کے ہاتھوں میں گرینیڈ موجود ہیں اسے اپنی گرفت سے آزاد نہیں کیا۔

کیا ہم اسکی اس قربانی اور جوانمردی سے اس لئے گریز کریں کہ وہ اعلی  دولت مند خاندان سے تعلق نہیں رکھتا اور اپنی حیثیت میں کم رینک پہ تھا۔

شہید تیرا قافلہ تھما نہیں رکا نہیں۔ مگر اسے اب رکنا چاہئیے، شہادت سے پہلے مقام بصیرت پہ۔

11:02 AM

پاکستان, پی این ایس مہران, خلیل, دہشت گردی, رینجر, طالبان, فوج, کراچی, نشان حیدر, وکی لیکس, یاسر عباس

عِمّی ڈارلنگ

 میں سگنل کے سرخ ہونے کی وجہ سے رکی ہوئ اپنی لین کے کھلنے کا انتظار کر رہی تھی کہ میرے کانوں سے میگا فون پہ ابھرنے والی آواز ٹکرائ۔ آج ہمیں پاکستان کو بچانے کے لئے نکلنا ہے۔ ڈرون حملے پاکستان کی سالمیت پہ حملہ ہیں۔ تقریباً دس گز لمبائ پہ پھیلے شامیانے، چار میزوں اور آٹھ کرسیوں کے ساتھ تین افراد موجود تھے۔ پیغام دینے والا، پشتون لب و لہجے میں عوام کے جذبات ابھارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور رات کے ساڑھے آٹھ بجے سگنل کے اطراف میں موجود درجنوں منی بسوں میں اور انکی چھتوں پہ سوار  چند افراد اسے خالی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ یہ سب دن بھر کی تھکن لے کر گھر جا رہے تھے اور اس خیال سے لرزاں تھے کہ گھر میں ایک مہیب اندھیرا، بچوں کا رونا دھونا، پانی کا نہ ہونا، کھانے کی فکرات یہ سب انکی آمد کی منتظر ہونگیں۔

میرے سامنےبالکل آگے ایک سوزوکی میں کسی گارمنٹ فیکٹری سے واپس آنے  والی مفلوک الحال خواتین  بھی اسی اس فکر میں غلطاں تھیں۔ تھکن انکے چہرے کا مستقل حصہ تھی۔ ان میں سے کسی نے جھانکنے کی بھی زحمت نہیں کی کہ کیا اعلان ہو رہا ہے کون پاکستان کی سالمیت پہ سودا نہیں ہونے دے گا۔ انکا مسئلہ یہ نہیں ہے۔

اس سے ایکدن پہلے بھی میں اس سگنل پہ موجود تھی۔ اس دن جیسے ہی میں نے سگنل کھلنے پہ اپنا راستہ لیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ آگے ٹریفک جام ہے۔ اس روڈ پہ عام طور پہ کم ٹریفک ہوتا ہے اس وقت۔ میں نے خطرہ محسوس کرتے ہی گاڑی کو روڈ کے بائیں جانب کیا۔ اور جو پہلی گلی نظر آئ اس میں لے لی۔ آگے جا کر پتہ چلا کہ آگے بنارس چوک پہ شدید احتجاج جاری ہے۔ بنارس چوک کے چاروں طرف پشتون آبادی ہے۔ وہ احتجاج کر رہے تھے  پاکستان کی سالمیت  یا ڈرون حملوں کے لئے نہیں بجلی کی لوڈ شیڈنگ کے خلاف۔ چوبیس گھنٹوں سے بجلی نہیں تھی۔

لوڈ شیڈنگ، کراچی جیسے صنعتی شہر کے لئے ڈرون حملوں جیسی حیثیت رکھتی ہے۔ اور یہ حملے امریکہ کی طرف سے نہیں ہماری معیشت کی بد حالی اور ہماری ناقص پالیسیوں کی وجہ سے ہے۔

چونکہ بعض حلقوں کی طرف سے یہ پیشن گوئ شدو مد سے کی جا رہی ہے کہ اگلا الیکشن عمران خان بھاری اکثریت سے جیت جائیں گے۔ خود عمران خان بھی اس بارے میں خاصے پُر یقین ہیں کہ وہ بھٹو کی طرح الیکشن کا منظر نامہ تبدیل کر دیں گے۔ اب یہ تو مستقبل بتائے گا۔ لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ  بھٹو کے بر عکس عوام سے زیادہ خواص میں مقبولیت رکھتے ہیں۔ وجہ انکی غیر دیسی شہرت ہے۔ خواص کو دیسی نہیں غیر دیسی چیزیں زیادہ پسند آتی ہیں۔

 میری دلچسپی بھی اس میں تھی کہ عمران خان کراچی میں کیسا دھرنا دینے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اگرچہ مجھے اس بات پہ بھی حیرت ہوتی ہے کہ ڈرون حملوں پہ دھرنا دینے والے رہنما خودکش حملوں پہ ایک بھی ریلی نہیں نکال پاتے۔

میرے ایک عزیز فیصل آبادی  دوست نے پوچھا کہ آخر آپ عمران خان کو کیوں ووٹ نہیں دینا چاہتیں۔ نیو جنریشن، آجکی یوتھ اسکے ساتھ ہے۔؟ نیو جنریشن، میں نے ان سے کہا۔ نیو جنریشن اگر پرانی جنریشن کی ڈکٹو کاپی ہو تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کوئ ابا جی، چا چا جی موجود ہیں یا کوئ  علی  اور عِمّی موجود ہے۔ ابا جی اور چاچا جی کو جماعت اسلامی اور نواز شریف پسند تھے ، اپنے دینی رجحان کے باعث۔ بچوں کوعمران خان پسند ہے اسی قسم کے دینی رجحان کے باعث البتہ یہ کہ وہ ظاہراً ایک ماڈرن حلیہ رکھتے ہیں۔ آخر یہاں یوتھ ، زید حامد پہ بھی اسی وجہ سے فدا ہے۔

اچھا انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تو پھر کس چیز سے فرق پڑتا ہے۔؟  فرق پڑتا ہے پارٹی ایجینڈا سے۔ اور معاف کیجئیے گا کہ انکے پاس سوائے اس نعرے کہ کہ یوتھ ہمارے ساتھ ہے اور کوئ قابل ذکر نعرہ نہیں۔

وہ کرپٹ نہیں ہے'۔ یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ ابھی انہیں اتنا اختیار کہاں ملا ہے۔  سوائے اسکے کہ وہ اپنا ذاتی ہسپتال کامیابی سے چلاتے ہیں. اور کیا آپ نہیں سمجھتے کہ پاکستان میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اپنا کاروبار بہترین طریقے سے چلاتے ہیں۔  اپنی انفرادی حیثت میں کرپٹ نہیں ہیں اور معاشرے کے پریشان حال لوگوں کے لئے کوشاں ہیں مثلاً

ایس آئ یو ٹی

کے

ڈاکٹر ادیب رضوی

۔

کہنے لگے کہ ایجینڈا کیا ہوتا ہے؟ وہ امریکہ کے خلاف ہیں، اسلام کے نفاذ میں دپچسی رکھتے ہیں، کرپشن ختم کرنا چاہتے ہیں، تعلیم یافتہ ہیں ۔ آکسفورڈ سے پڑھے ہوئے ہیں، دنیا دیکھی ہے۔ میں ہنستی ہوں، آکسفورڈ کی پڑھی ہوئیں تو بے نظیر بھی تھیں انکا بیٹا بھی وہیں پڑھ رہا ہے ہمارے طبقہ ء اشرافیہ کے بچے ملک سے باہر ایسے ہی اداروں میں پڑھتے ہیں۔

دنیا دیکھنے کے باوجود انکی ذہنی کیفیت ایک ٹین ایجر لڑکے جیسی ہی ہے۔ پیغمبری حاصل کرنے والی عمر میں انہیں اسلام یاد آیا وہ بھی وہ اسلام جو انکی والدہ نے انکے اندر بچپن میں ڈالا تھا۔ اور اب پچھلے کچھ عرصے سے امریکہ سے نفرت بھی کر رہے ہیں کچھ اس طرح کے اپنے ہسپتال کے لئے فنڈ وہیں سے جمع کر کے لاتے ہیں۔ امریکہ سے نفرت کا اظہار دائیں بازو کی سیاست کا اہم حصہ ہے۔ اس میں کوئ ویژن نہیں ہے۔ ملک میں اس وقت اتنے زیادہ لوگ اسلام کے نفاذ کے لئے کام کر رہے ہیں اس میں سے ایک وہ بھی سہی۔ چلیں سب ذاتی اعمال، کمزوریاں اور جھکاءو ایک طرف رکھ دیں۔ ان کا پارٹی ایجنڈا کیا ہے؟ کیا آپکو معلوم ہے؟

اسکے بعد ہماری گفتگو ایک دوسرے کو کچھ اخلاقی پند و نصائح پہ ختم ہو جاتی ہے۔

میں دھرنے والے دن کافی منتظر رہی کہ کوئ اطلاع آئے۔ چینلز خاموش رہے اگر اطلاع آئ تو یہ کہ پاکستان کی تاریخ میں واحد دھرنا جس میں ڈیزائینر کے کپڑے پہننے والوں نے سب سے زیادہ شرکت کی۔ لیکن انکی یہ شرکت بھی مغرب کے بعد ہی ممکن ہو سکی۔

کل کراچی میں چوالیس ڈگری درجہ ء حرارت تھا۔ ہماری یہ مار ڈالنے والی مرطوب گرمی بڑی شہرت رکھتی ہے۔ اس میں ڈیزائینر کے کپڑے پہننے والے اشرافیہ کے طبقے سے تعلق رکھنے والے  مغرب کے بعد بھی اپنے ایئر کنڈیشنڈ گھروں کو چھوڑ آنا اہمیت رکھتا ہے۔ ادھر سنی تحریک نے بھی اپنی حمایت کا اعلان کیا۔ اسکے علاوہ مذہبی جماعتوں  مثلاً جماعت اسلامی  نے بھی شرکت کی۔ اور یوں اندازہ ہے کہ رات دس بجے دھرنے میں پانچ سے آٹھ ہزار لوگوں موجود تھے۔ یہ اندازہ ڈان چینل نے لگایا۔ صبح دس بجے پنڈال خالی تھا ایک دم غریب کی جیب کی طرح۔ اطلاع ہے کہ شام کو چار پانچ بجے گرمی کم ہونے پہ دھرنا دوبارہ شروع ہوگا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈرون حملوں میں مرنے والوں کی زندگی ، دھرنا دینے والوں کے لئے کتنی اہمیت رکھتی ہے۔

پونے دو کروڑ آباد رکھنے والا شہر، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ چالیس لاکھ کی پشتون آبادی رکھتا ہے۔ وہ پشتون آبادی جو ڈرون حملوں سے براہ راست متائثر ہے۔ وہ پشتون آبادی جسکے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ زیادہ مذہبی رجحان رکھتی ہے وہ پشتون آبادی جسکے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ زیادہ امریکہ مخالف ہے۔ اس میں سے اگر ایک فیصد لوگ بھی اس میں شامل ہوتے تو مجمع چالیس ہزار سے زائد کا ہوتا۔

اگر دھرنا دینے والے سنجیدہ ہوتے تو دھرنا نیٹِو جیٹی کے پل پہ نہیں نیٹو سپلائ کے راستے پہ ہوتا۔ جو اس پل سے زیادہ دور نہیں۔

عمی ڈارلنگ کا بیان آیا کہ آج ثابت ہو گیا کہ پاکستان کے عوام خود مختار پاکستان چاہتے ہیں۔

پاکستان کے عوام کون ہیں وہ جو منی بسوں کی چھتوں پہ سفر کرتے ہیں جنکے گھروں میں چوالیس ڈگری کی گرمی پہ دو دن سے بجلی نہیں ہے یا وہ جنکے متعلق یہ کہا جائے کہ تونے دیکھے ہیں کہاں لوڈ شیڈنگ کے رنگ، تو کبھی میرے گھر اتر شام کے بعد۔ وہ جنکے لئے دھرنا ایک ایڈوینچر ہوگا۔ یا وہ مزدور جنہوں نے دھرنے میں کرسیاں لگا کر مزدوری نہ ملنے پہ ٹھیکے دار کی پٹائ لگادی۔

 عِمّی ڈارلنگ کہتے ہیں کہ عوام خود مختار پاکستان چاہتے ہیں۔

جبکہ  عِمّی ڈارلنگ عوام اس وقت اس عورت کی طرح ہو گئے ہیں جو زندگی کی جنگ میں اپنی عزت اور عصمت بیچنے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ جو خودکشی کرنے کے لئے تیار بیٹھا ہو اسے ڈرون حملوں میں مرنے پہ کیا اعتراض۔

12:43 PM

خودکش حملے, دھرنا, ڈرون حملہ, سپلائ, عمران خان, کراچی, مہنگائ, نیٹو, نیٹو جیٹی پل

نو مور گھپلا

تم ہر غلیظ کام کرنے کو تیار رہتی ہو۔ اس لئے بار بار بیمار پڑتی ہو'۔ میں نے ڈاکٹر کے پاس واپس آتے ہوئے ایک دفعہ پھر مشعل کو صفائ کی اہمیت کے بارے میں بتانا چاہا۔ وہ اے سی کے ایکدم نزدیک ہو کر اس  سے آنے والی ہوا کے سامنے منہ کھول کر بیٹھی ہوئ تھیں۔ 'اب دیکھو، کھانسی ہو رہی ہے تمہیں اور تم اے سی کے سامنے منہ کھول کر بیٹھی ہوئ ہو'۔

میری اس بات پہ وہ ذرا پیچھے ہو کر بیٹھ گئیں۔ 'تم سُوں سُوں کر رہی ہو ناں۔ تمہاری ناک دوبارہ بہنا شروع ہو گئ ہے۔ مگر تمہیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا'۔ میں نے انہیں ناک سکوڑتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ جواب ملا 'ناک تھوڑی بہہ رہی ہے۔ میں تو ہوا سونگھ رہی ہوں۔ اس لئے سُوں سُوں کر رہی ہوں'۔ پھر انہوں نے اپنے موءقف مضبوطی پیدا کرنے کے لئے مصنوعی سُوں سُوں کی آواز نکالی۔

 نو مور گھپلا۔  اب تم خاموشی سے ہاتھ سے ناک صاف کروگی۔ ٹشو لو فوراً''۔ ٹریفک اتنا ابتر ہو رہا تھا کہ میں نے اپنی توجہ روڈ پہ کر لی۔ گاڑی میں خاموشی ہو گئ۔

مشعل کو لگا کہ میں ناراض ہو گئ ہوں۔ 'ماما، کیا میں ایک اچھی بچی ہوں'۔ انہوں نے میرے جذبات کا اندازہ لگانے کے لئے ایک آزمودہ جملہ بولا۔ ماما کیا کہہ سکتی ہیں۔ در حقیقت ایک چار سالہ بچے کی اس بات پہ دنیا کی کوئ بھی ماں کیا کہہ سکتی ہے۔ میں نے بھی جذباتی جواب دیا۔ 'بالکل، آپ ایک اچھی بچی ہیں ، مگر کبھی کبھی گھپلا کرتی ہیں'۔ 'کیا اللہ میاں مجھے

گناہ

دیں گے۔ وہ میرے ہاتھ پہ زخم لگا دیں گے۔ پھر میں آپکو کیسے چھو سکوں گی'۔  اگر ایک طرف اللہ میاں ہوں اور دوسری طرف مسلمان ماں تو وہ کیا کرے گی؟

میں نے فوراً اللہ میاں کا دفاع کیا۔ 'نہیں وہ بچوں کو گناہ نہیں دیتے'۔ 'پھر وہ بچوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں'۔  ہمم، میں نے ایک گاڑی کو اوور ٹیک کیا۔ اسکے پیچھے کافی دیر سے پھنسے ہوئے تھے۔ 'بچوں کی ماما کو کہتے ہیں کہ بچوں کا سمجھا دیں'۔ ' کیا سمجھا دیں؟'۔ 'یہی کہ بچوں کو اپنی ماما کی بات سننی چاہئیے اور جیسا وہ کہیں ویسا ہی کرنا چاہئیے'۔ 'کیا میں آپکی بات سنتی ہوں'۔ انہوں نے تجاہل عارفانہ سے پوچھا۔ 'آپ بتائیے آپ میری بات سنتی ہیں؟'۔ میں نے سوال کیا۔  وہ خاموش ہو گئیں۔ 'سوری ماما، میں آئیندہ آپکی ہر بات سنونگی ۔ جیسا آپ کہیں گی میں ویسا ہی کرونگی'۔ ہمم'۔ ایسے وعدے روز ہی ہوتے ہیں۔ مگر وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا۔

'تو کیا آپ یہ اللہ میاں کو بتا دیں گی؟'۔' ہاں میں انہیں بتا دونگی'۔ 'کیا اللہ میاں آپکی بات سنتے ہیں'۔ 'ہاں وہ ماما کی بات سنتے ہیں'۔ اور آپ سے بات بھی کرتے ہیں'۔ 'ہاں وہ ماما کو بتاتے ہیں کہ بچوں کو کیا بتانا ہے'۔ میرے اوپر ایک پیغمبرانہ سرشاری طاری ہو گئ۔  گاڑی میں ایک دفعہ پھر خاموشی۔

ماما،  میں دادا جی کو بہت مِس کرتی ہوں'۔ ایسے جذباتی ڈائیلاگز بولنے میں وہ بہت ماہر ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ سب کارٹونز دیکھنے کا اثر ہے۔ مگر کارٹونز تو آجکل سب بچے دیکھتے ہیں۔ انکے یہاں پریکٹیکل ایپلیکیشن زیادہ ہے۔ 'ماما، میں انہیں بہت لو کرتی ہوں'۔ 'ہاں مجھے معلوم ہے'۔ میں نے فضا میں خطرے کی بو سونگھی، میرے لئے کوئ ٹریپ کوئ چاہِ خس تیار ہو رہا ہے۔ 'ماما، آئ پرامس میں آپکی ہر بات مانونگی۔ آپ اللہ میاں سے کہیں وہ دادا جی  کو واپس کر دیں'۔

ساری الہامی فضا، دھڑ دھڑ دھڑام ہو گئ۔ گربہ کشتن روز اول۔ اچھا تو یہ وجہ ہے کہ جھوٹی نبوت کے دعویدار مرد اتنے زیادہ اور  انکے مقابلے میں عورتیں برائے نام۔ عورتوں کی ابتدائ  آزمائیش انکے  بچے کرتے ہیں۔ میں نے گھر کے آگے گاڑی روکتے ہوئے سوچا۔ توبہ میری۔

دل سے نکال دیجئیے احساس پیغمبری

مرجائیے، الہام کا دعوی نہ کیجئیے

1:13 AM

بچے, جھوٹے نبی, خواتین, مسلمان, مشعل

روایت، مشرق اور خواتین

ایک دفعہ میں نے اپنے سسر صاحب سے پوچھا، ابّی ، آپ کو  امی کی کیا چیز اچھی لگی کہ آپ نے ان سے اس دور میں پسند کی شادی کی۔ جب والدین کی پسند کی شادیاں ہوا کرتی تھیں۔ اس پہ انہوں نے انکی کوئ خصوصیت بتانے کے بجائے کہا کہ میں نے اس وقت محسوس کیا کہ وہ میری سول میٹ ہیں یعنی روح کی ساتھی، اور مجھے ان سے شادی کرنی چاہئیے۔ ایک روح نے دوسری روح کو پہچان لیا۔

میں انکی زندگی میں بہت بعد میں آئ۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وہ اعتماد کے رشتے میں جڑے ہوئے تھے۔ شاید ہی کوئ بات ہو جو وہ ایک دوسرے کو نہ بتاتے ہوں، شاید ہی کوئ جگہ ہو جہاں وہ ایک ساتھ نہ جاتے ہوں۔ شاید ہی انکی زندگی میں کوئ ایسا شخص ہو جسے وہ دونوں نہ جانتے ہوں۔ وہ دونوں ایک ہی سکے کے دو رخ تھے۔ اسکے باوجود کے ان دونوں میں عمومی اختلافات پائے جاتے تھے جو ہر دو انسان میں ہوتے ہیں۔ مگر وہ انکے تعلق کی گرہ پہ کبھی اثر انداز نہیں ہوئے۔

میری ساس اپنے وقت کی ذہین طالبہ، کراچی یونیورسٹی سے ماسٹرز میں گولڈ میڈل حاصل کرنے والی ایک ورکنگ خاتون، زندگی میں بھی کامیاب رہیں۔ میرے عزیز اور دوست سب ان دونوں پہ رشک کرتے تھے۔ اور پھر مجھ پہ، ساس سسر اچھے ملے ہیں تمہیں۔ جب دیکھو ایک ساتھ، ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہوئے۔

کہتے ہیں کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اور ناکام مرد کے پیچھے کئ عورتوں کا ہاتھ۔  یہ عورت یا عورتیں کوئ بھی ہو سکتی ہیں۔ لیکن اگر خواتین کی کامیابی کا ایسا کوئ تصور ہو تو خواتین کی کامیابی صرف دو مردوں پہ منحصر ہوتی ہے۔ اور وہ ہیں انکے باپ یا شوہر۔

کامیاب مردوں سے ہٹ کر کامیاب عورتوں کے بارے میں  معیار خاصے مختلف ہوتے ہیں۔ حسین عورت کامیاب ہے، ناز ادا دکھانے والی عورت کامیاب ہے،  کسی کی نظر میں آنکھ کے آنسو کو منہ میں جمع کر کے رکھنے والی  خاموش عورت کامیاب ہے، باپ، بھائ اور شوہر کی رضا پہ سر تسلیم کرنے والی عورت کامیاب ہے، بیٹوں کے اوپر راج کرنے والی عورت ، شوہر کو ہر جا و بے جا اخلاقی ہتھکھنڈوں سے کاٹھ کا الو بنا کر رکھنے والی عورت کامیاب ہے، جس عورت کو ساری زندگی  کچھ نہ کرنا پڑے اور گھریلو یا کرائے کے خادم اسکی سبزی نما حالت کو برقرار رکھنے کے لئے کام کرتے رہیں  وہ کامیاب ہے، سونے سے لدی پھدی عورت کامیاب ہے۔

خواتین کے ساتھ کامیابی کی کچھ ایسے ہی حکائیتیں ہیں۔

یہ حکائیتیں جن پہ اکثر مرد بڑی دلجمعی سے اپنی رائے دیتے ہیں۔ اتنی دلجمعی سے کہ  رائے دیتے وقت اپنی ماءووں کو بھول جاتے ہیں اور بعض چاند سے رومانس کرنے والی سادہ یا حقائق سے نا آشنا  خواتین مذہبی جوش و خروش کے ساتھ یقین رکھتی ہیں جب تک کہ انہیں اسی نا آشنائ میں خود کسی اندوہناک صورت حال کا سامنا نہ کرنا پڑجائے۔

خیر، وہ عورتیں جنہیں ہم دنیا کے افق پہ چمکتے دیکھتے ہیں اور ایک عالم جنہیں جانتا ہے، کیا انہیں کامیاب کہنا چاہئیے یا نہیں؟ مثلاً

اندرا گاندھی

یا برما کی نظر بند سیاسی خاتون

آنگ ساں سو کائ

،

بیگم بلقیس ایدھی

یا

ارون دھتی رائے

،

بے نظیر بھٹو

یا

مارگریٹ تھیچر

   ،

قراۃ العین حیدر

یا

عصمت چغتائ،

پروین شاکر

یا ملکہ ء ترنم

نورجہاں,۔

مجھے تو مصر کی ملکہ

قلو پطرہ

خاصی پسند آتی ہے ایک ایسے وقت میں جب بادشاہت صرف خاندان کے مردوں کا حصہ تھی اس نے سلطنت حاصل کی اور اسے قائم رکھا، ایک سحر انگیز ملکہ۔ بھوپال کی ولی عہد شہزادی

عابدہ سلطان،

حیران کن خاتون۔ نہ صرف مسلمان بلکہ ایک عورت جو تہتّر شیروں کا شکار کر لے، لائیسنس یافتہ پائلٹ جو اپنی گاڑی کے ہر پرزے کو بدل سکتی ہو۔ خیر بھوپال کی کیا بات ہے، ہندوستان کی واحد ریاست جہاں یکے بعد دیگرے پانچ مسلمان خواتین کامیابی سےحکمراں رہیں۔ پانچویں خاتون نے برطانیہ کے بادشاہ کے آگے رو  کر، بے ہوش ہو کر اس بات کو منوایا کہ اگلا حکمران اس کا پوتا نہیں سب سے چھوٹا بیٹا ہوگا۔

جھانسی کی رانی

یا

رضیہ سلطان

، عزم اور ہمت کی داستان۔

اور اگر اسلامی تاریخ دیکھیں تو

حضرت خدیجہ

ایک کاروباری خاتون جو اپنی شادی کے لئے رشتہ دیتی ہیں اور نبی کو وحی کے وقت حوصلہ۔

حضرت عائشہ

جنہوں نے جنگ بھی لڑی۔

میں روایت پسند ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ صرف قورمے کی ترکیب کی حد تک۔ اگر کوئ قورمے میں  دہی کی جگہ ٹماٹر ڈال دے تو اسے کڑاہی گوشت کہونگی قورمہ نہیں۔ اگر کوئ خاتون شیر کے شکار کی شوقین ہو تو کسی روایت پسند کی طرح اسے زن آزاد یا عورت نما مرد نہیں بلکہ چیلینج قبول کرنے والی مہم جُو خاتون کہونگی۔

میں مشرقی بھی ہوں لیکن صرف اتنی جتنا مشرق پسند ہے۔ یعنی محبوبہ کی گلی کے کتے سے راہ ورسم بڑھانا،  سارے زمانے کو رازداں کرلینا، جب وہ سامنے آئیں تو عمران ہاشمی کی طرح تنہائ کا فائدہ بھی اٹھالیں اور پھر گھبراہٹ کے مارے بھاگ کر اماں کی پسند کی ہوئ شمائلہ کو خاتون خانہ بنا لیں۔ جتھے دا کھوتا اتھے آ کھلوتا۔ یہ گھبرایا ہوا ہیرو اور وہ الہڑ سادہ مٹیار۔ خاتون خانہ کا شرما کر کہنا اللہ وہ بہت اچھے ہیں اور سادہ مٹیار کا در فٹے منہ کہنا۔ آہ ، مشرق۔ آہ مشرق۔ مغرب میں یہ بات کہاں مولوی مدن جیسی۔

روایت، مشرق اور خواتین پہ یاد آیا کہ میرے ذاتی خیال میں، اس وقت بہترین روائیتی، مشرقی پاکستانی خاتون کی خصوصیات رکھنے والی، کوئ صاحبہ نہیں صاحب ہیں۔  اور وہ ہیں، ہمارے اور آپکے

یوسف رضا گیلانی

۔ ان دونوں میں مماثلت نکالنا آپکا ہوم ورک ہے۔

آج کا دوسرا ہوم ورک۔  آج کی دنیا میں جبکہ خواتین ہر منظر پہ موجود ہیں اپنی پسندیدہ خاتون کا نام بتائیے۔  اس میں آپکی قریبی رشتے دار خواتین شامل نہیں ہیں۔ اسکے علاوہ وہ کوئ بھی ہو سکتی ہیں، ہو سکتا ہے ہم انہیں نہ جانتے ہوں ، ایک تعارف آپکی طرف سے اس پہ ہم آپکے شکر گذار ہونگے۔ باقی ہم اندازہ کریں گے کہ وہ آپ کو کیوں پسند ہیں۔

فی امان اللہ۔

5:02 PM

ارون دھتی, اندرا گاندھی, بے نظیر, خدیجہ, عائشہ, عابدہ سلطان, عصمت چغتائ, قراۃ العین حیدر, قلوپطرہ, یوسف رضا

ایک ادیب کے مشورے

لکھنا ایک فطری صلاحیت ہے؟

ہو سکتا ہے۔ در حقیقت میں بھی اس چیز پہ یقین رکھتی ہوں کہ انسان کرنے پہ آئے تو کیا نہیں کر سکتا۔ بس یہ کہ اگر آپ فطری رجحان نہیں رکھتے تو آپکو محنت زیادہ کرنی پڑے گی فطرت پہ حاوی ہونے کے لئے۔

لکھنے کی کوشش کریں تو لکھاری بن ہی جاتے ہیں لیکن کیا آپ اچھے لکھاری بن سکتے ہیں۔

اگر آپ لکھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں تو اس کا سادہ سا مطلب یہ ہے کہ آپ میں یہ فطری رجحان موجود ہے۔  اکثر لکھنے والے اس بلاک کا تذکرہ کرتے ہیں جس کے نتیجے میں انکے اندر لکھنے کا محرک نہیں رہتا۔ اگر اسکی وجہ یہ ہے کہ آپ جذباتی طور پہ اپنی توجہ مرکوز نہیں کر پا رہے تو امید ہے کہ اس جذباتی دباءو کے ہٹتے ہی آپ دوبارہ رواں ہونگے بلکہ پہلے سے زیادہ رواں ہونگے۔  اسکی ایک اور وجہ ہے اور وہ یہ کہ ٹوپی میں سے خرگوش نکالنے کے لئے ٹوپی میں خرگوش کا موجود ہونا ضروری ہے۔ یعنی جس طرح شہد کی مکھی پھولوں کا رس جمع کر کے شہد بناتی ہے۔ اب وقت ہے کہ کچھ جمع کیا جائے۔

 لکھنا صرف انگلیوں کا کمال نہیں کہ انگلیاں کرائے پہ بھی لی جا سکتی ہیں۔ اس کا تعلق بصیرت سے ہے بلکہ بصیرت سے زیادہ شہادت سے۔ اس شہادت سے جسکے نتیجے میں آپ یا تو شاہد ہوں یا مشہود، شہید نہیں۔ شہید ہونے کے بعد اگر آپ کچھ لکھیں تو اسکی جہت اتنی الگ ہوگی کہ عام انسان اسے سمجھنے سے قاصر ہوگا۔ اس لئے ہم عزت اور احترام سے شہید کو دفناتے ہیں خود شاہد یا مشہود بنتے ہیں پھر  رمز بھرے بھید لکھتے ہیں  جو حکائیتیں، داستانیں یا شاعری وغیرہ کہلاتے ہیں۔

ہوا یوں کہ آج ایک کتاب تلاش کرتے کرتے ایک اور کتاب ہاتھ آگئ۔ تلاش کا عمل بس اسی وجہ سے آسان نہیں رہتا بلکہ اس میں ایک عجیب اسرار اور رنگینی پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ کچھ اور چیزیں بھی اپنے آپکو تلاش کروالیتی ہیں۔

اسے یونہی کھولا تو سامنے  مصری ادیب نجیب المحفوظ کی تحریر موجود تھی۔ ایک اچھا لکھاری کیسے بنا جائے۔ نوجوان ادیبوں کے نام یہ کام کے مشورے ہیں۔  اسے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا کہ فرصت ملتے ہی اسکین کیا جاوے اور اپنے بلاگ پہ چپکایا جاوے۔

نجیب محفوظ

ایک نوبیل انعام یافتہ ادیب ہیں۔ مصر سے تعلق ہے۔ یوں ایک خیال اور آیا کہ ہمارے یہاں اچھے ادیبوں کا کتنا قحط ہے۔ لیکن پھر رّدِ خیال آیا کہ جب محدود زمین اور آسمان کا تعارف ہو تو پرندوں کو اونچی اور وسیع اڑانوں کی عادت بھی تو نہیں رہتی۔

یہ کتاب دراصل ایک ادبی مجموعہ ہے جو

ڈاکٹر آصف فرخی

ہر سہ ماہی پہ نکالتے ہیں۔ انکے ان ادبی مجموعوں کی خاص بات یہ ہے کہ یہ ہمیشہ کسی موضوع کا احاطہ کرتے ہیں۔ نام ہے انکے اس سلسلے کا 'دنیا زاد' اور چھاپتے ہیں اسے شہر زاد والے ۔ اس مخصوص مجموعے کا عنوان ہے 'قدیم حسن'۔

12:33 AM

آصف فرخی, ادب, اردو, انور احسن صدیقی, شاعری, نثر, نجیب محفوظ

لُک آنجن

مکی صاحب کی

ایک پوسٹ

پڑھی جسکے اخیر میں وہ لکھتے ہیں کہ

ایک بات یقینی ہے کہ میں کسی ” ہستی ” کو تلاش کر کے اس کا شکریہ ضرور ادا کروں گا کہ مچھلی، بندر یا کسی کیڑے کی

 بجائے میرا ارتقاء انسان کی صورت ہوا

یاد آیا کہ ایک شکریے سے وابستہ  خیال کہیں اور بھی تو کچھ سال پہلے پڑھا تھا۔ آپ کے مطالعے کے لئے حاضر ہے۔ بھولے قارئین یہ نہ سمجھیں کہ یہ مصنف کی آپ  بیتی ہے۔ یقین دلادوں کے جس وقت لکھاری نے یہ لکھا وہ صاحب اولاد نہیں تھا۔ کراچی کے ایک ادبی پرچے میں شائع ہونے والا  فکاہیہ یہ رہا۔

بہتر دیکھنے کے لئے تصویر پہ کلک کیجئے۔

11:34 PM

ادب, ارتقاء, اردو, خدا, عنیقہ, فکاہیہ, لک آنجن, مکی

سونا، اک جنوں

سائینس کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔  انسان نے اسے تجسس، خوف، لالچ اور ضد جیسے جذبوں سے گوندھا ہے۔ کچھ نے اس میں خدا کو ڈھونڈھنے کے لئے اپنا حصہ ڈالا اور کچھ نے رد کرنے کے لئے۔ کہانی کسی بھی ارادے سے شروع کی گئ۔ انجام  یہ ہوا کہ خدا انسانوں کے ساتھ جوا ہی نہیں کھیلتا بلکہ کبھی کبھی اپنے پانسے ادھر ادھر بھی ڈال دیتا ہے۔

  یہ کہانی ہیمبرگ کے

ہیننگ برینڈ

  کی ہے۔ برینڈ فوج میں ایک جونیئر آفیسر تھا۔ کیمیاء سے لگاءو رکھتا تھآ۔ اسکی پہلی  بیوی کا جہیزاتنا تھا کہ فوج کی نوکری چھوڑنے کے بعد وہ الکیمیا پہ کام کر سکتا تھا۔

الکیمیا

، کیمیاء کی وہ ابتدائ شکل ہے جس میں ایک کیمیاداں کا مقصد عام دھاتوں کو سونے میں تبدیل کرنا ہوتا تھا یا پھر کوئ ایسی دوا جو تمام امراض کا علاج کر دے جسے

اکسیر

کہا جائے۔ یہ شاید خضر کے آب حیات سے متائثر خیال تھا۔ وہ الکیمیسٹ تھا۔ عربوں کو سونےسے بڑی انسیت تھی ۔ یوں  انہوں نے سونے کی تلاش میں کیمیاء میں خاصی دلچسپی لی اور کیمیائ تعاملات کے بنیادی طریقے متعارف کرائے۔

سونا انسان کو ہمیشہ مسحور کرتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائ انسان سوچتا تھا کہ خدا کی جلد یقیناً سونے سے بنی ہوگی یا وہ سونے کی طرح چمکیلا ہوگا۔ انسانی خدا بھی اپنے لباس  اور اشیائے استعمال مِیں سونے کا بے دریغ استعمال کرتے تھے۔

قدیم انسان تو یہ بھی سوچتا تھا کہ سورج پگھلا ہوا سونا ہے جسکی سنہیری چمک زمین تک پہنچتی ہے۔ یوں یہ خیال کیا جانے لگا کہ جو چیزیں سنہری نظر آتی ہیں ان کا کوئ نہ کوئ تعلق سونے سے ضرور ہوگا۔

برینڈ بھی اس پتھر کی تلاش میں تھا جو کسی عام دھات کو سونے میں تبدیل کر دے۔ فلاسفرز اسٹون یا جسے ہم اردو میں پارس کہتے ہیں۔ اس نے اپنی پہلی بیوی کی ساری جائداد اس میں جھونک دی۔ مگر کچھ بھی نہ ملا۔

اس کے مرنے کےبعد برینڈ نے دوسری شادی کی ایک مالدار عورت سے۔ ایک دفعہ پھر وہ سونے کے تعاقب میں تازہ دم تھا۔ لیکن اس دفعہ اس نے پچھلے تمام تجربات سے ہٹ کر ایک نئ چیز پہ اپنی توجہ مرکوز کی۔ یہ تھا سنہرا، پیلا انسانی پیشاب۔

کہا جاتا ہے کہ برینڈ نے اس کے لئے ہزاروں لٹرز پیشاب استعمال کیا، پچاس بالٹیاں ، ساڑھے پانچ ہزار لٹر پیشاب۔

اسکے بعد مختلف کہانیاں ہیں۔ مستند یہ ہے کہ برینڈ نے اس پیشاب کو خوب اچھی طرح ابالا۔ اس میں سے دھواں نکلنا شروع ہوا۔ جسے اس نے ڈسٹل کر کے الگ کر لیا۔ بچ ہوئے پیسٹ میں  ٹھنڈا ہونے پہ  ایک مادہ جم گیا جس میں سے سبز رنگ کی روشنی نکل رہی تھی۔ یہ روشنی آگ سے نکلنے والی روشنی کے برعکس ٹھنڈی روشنی تھی۔  یہ سولہ سو تیس میں پیدا ہونے والے کیمیاداں کے لئے ایک حیران کن مشاہدہ تھا۔

یہ سبز روشنی خارج کرنے والا مادہ 'فاسفورس' تھا۔ انسانی پیشاب میں فاسفورس موجود ہوتا ہے فاسفیٹ آئین کی شکل میں۔ اندازاً ایک لٹر میں ایک گرام فاسفورس ہوتا ہے۔ جی یہ وہی فاسفورس ہوتا ہے جو ہماری ہڈیوں کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جسے دیا سلائ سے لیکر دھماکہ خیز اشیاء بنانے میں استعمال کیا جاتا ہے۔

سائینس میں دو طریقے ہیں تحقیق کے۔ یا تو نظریہ پہلے جنم لیتا ہے اور اسکا مشاہدہ عملی سطح پہ بعد میں جانچا جاتا ہے۔ یا  مشاہدات پہلے موجود ہوتے ہیں اور انہیں جوڑ کر ایک نظریہ تخلیق کیا جاتا ہے تاکہ حقائق کے لئَے دلیل لائ جا سکے۔

برینڈ نے انجانے میں جو کیمیائ طریقہ نکالا اسکی دلیل سائینسی سطح پہ یہ بنی کہ پیشاب میں موجود فاسفیٹ کو جب خوب اچھی طرح گرم کیا جاتا ہے تو آکسیجن پیشاب میں ہی موجود کاربن کے دیگر مرکبات سے تعامل کر کے فاسفیٹ میں سے خارج ہو جاتی ہے اور اس طرح فاسفورس عنصر کی حالت میں بچ جاتا ہے۔ دو سو اسی ڈگری درجہ ء حرارت پہ یہ پگھلی ہوئ حالت میں ہوتی ہے جبکہ ٹھنڈا ہونے پہ چوالیس ڈگری کے قریب یہ ٹھوس حالت میں آجاتی ہے۔

فاسفیٹ کی کچ دھات سے فاسفورس حاصل کرنے کے لئے آج بھی یہ طریقہ استعمال کیا جاتا ہے فرق یہ ہے کہ کاربن سے تعامل کرانے کے لئے کاربن کوک استعمال کی جاتی ہے۔

1. (NH

4

)NaHPO

4

—› NaPO

3

+ NH

3

+ H

2

O

2. 8NaPO

3

+ 10C —› 2Na

4

P

2

O

7

+ 10CO + P

4

دوسری جنگ عظیم میں برینڈ کے ہیمبرگ پہ گولہ باری کی گئ۔ ان بموں میں وہی ظالم فاسفورس تھا جسے برینڈ نے انجانے میں دریافت کیا تھا۔

برینڈ کا کیا ہوا؟ وہ اسی طرح ناکام و نامراد رہا۔ دنیا آج تک پارس حاصل نہیں کر سکی۔ البتہ کیمیاء اس ترقی پہ پہنچ گئ کہ آج انسان کی زندگی میں اسکی پیدائیش سے لیکر موت تک ہر چیز میں اس کا دخل ہے۔  اس سفر میں کیمیاء خود پارس بن گئ۔

  مزید معلومات کے لئے یہ دستاویزی فلم دیکھئیے۔

4:21 PM

الکیمسٹ, الکیمیاء, برینڈ ہیننگ, پارس, جرمنی, سائینس, فاسفورس, ہیمبرگ

یاد کا جادو

ہمارے گھر کے مسائل کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس پہ جنات کا سایہ ہے'۔ 'تو آپ اسے بدل کیوں نہیں دیتے'۔ نجمہ خالہ نے اپنے ماموں کی اس بات کو جیسے کسی گنتی میں ہی نہیں رکھا۔ 'ارے بھئ، ہمارے دادا کا گھر ہے وہ۔ اب اس میں ہماری چوتھی پشت رہ رہی ہے'۔ ماموں نے انہیں یاد دلانے کی کوشش کی۔ 'ائے چھوڑیں، ہردوسرا شخص کسی بیماری کا شکار ہے ہر تیسرا شخص ذہنی طور پہ بیمار ہے چوتھی پشت رہ رہی ہے۔ پانچویں پشت باقی بچے گی تو رہے گی۔ ہمیں دیکھیں، تیس سال کے عرصے میں چار گھر خریدے اور ان میں رہے پھر بدل دئیے'۔  خالہ نے پرس میں اپنا موبائل فون تلاش کرتے ہوئے کہا۔

'یہ جائیداد کا خریدنا بڑا مشکل کام ہے'۔  ماموں نے جان چھڑانی چاہی۔ 'ماموں آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں ۔ میں ایک عورت ہوں، شوہر کے انتقال کو بھی سترہ سال ہو گئے۔ انکے بعد بھی دو گھر میں نے  یکے بعد دیگرے خریدے۔ انہیں تلاش کیا، اس چکر میں اسٹیٹ ایجنٹس کے ساتھ درجنوں گھر دیکھے۔ پھر جا کر پسند آئے۔ اسکے بعد وہاں جانے سے پہلے انکی مرمت، رنگ و روغن اور ان میں کچھ تبدیلیاں بھی کرائیں۔ یہ سب کام میں نے اکیلے کیا'۔ خالہ نے فخر سے کہا۔ 'کرنے پہ آئے تو انسان کیا نہیں کر سکتا'۔ میں خاموشی سے گفتگو سنتی رہی۔ خیال تھا کہ بات کسی طرح گھوم کر جنات پہ پہنچے گی۔ اور ہم جان سکیں گے کہ اس گھر میں جنات کا کیسے پتہ چلا؟ وہ کیا کرتے ہیں؟ کس نے انہیں دیکھا؟ اور یہ سارے مصائب انکی وجہ سے کیوں ہیں؟؟؟؟؟؟

یہ خالہ ہماری سگی خالہ نہیں۔ بس ہماری اماں سے کچھ بچپن کی دوستی کا تعلق  ہے۔ سو ہمارے بچپن میں بھی ساجھا کر لیا ۔

تو تم بڑی عقلمند سمجھتی ہو اپنے آپکو'۔ ماموں نے ایک بھولپن سے اپنی بھانجی سے کہا۔

اس مرحلے پہ کسی نے گفتگو کا رخ موڑ دیا۔ 'ہماری اماں کا انتقال ایک سو سات سال کی عمر میں ہوا'۔ ماموں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ بس اب میری باری تھی۔ جنات ہاتھ نہیں آئے تو کیا ہوا عمر کا حساب بھی کچھ کم نہیں۔ 'ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟'  'ہاں آپ لوگوں کو کیسے یقین آ سکتا ہے آپ نے انہیں کہاں دیکھا؟ پھر آجکی نسل کو ایسی باتوں پہ یقین کہاں آتا ہے' 'میں نے انہیں دیکھا تھا۔ اپنے بچپن میں، وہ ایک بہت کام کاجو خاتون تھیں'۔ میں نے نکتہ ء اعتراض کو واضح کرنے کی کوشش کی۔ 'پہلی دفعہ لکھنوء سے پاکستان آئیں تو گھر بھر کی رضائیاں کھلوا کر بیٹھی ہوئیں تھیں۔ اتنی تندرست اور صحیح تھیں کہ  خود بیٹھی ان میں ڈورے ڈال رہی تھیں یا ڈلوا رہی تھیں۔ میں تو یقین نہیں کر سکتی کہ وہ ایک سو سات سال کی تھیں'۔

ہم ہیں ان کے بیٹے اور بتا رہ ہیں کہ ایک سو سات سال کی تھیں۔ ہم صحیح ہوں گے یا آپ'۔ وہ اپنے دھیمے لہجے میں گویا ہوئے۔

انکی سب سے بڑی بیٹی یعنی خالہ کی امی کی عمر اس وقت پچھتر سال کے قریب ہے۔  آپکی امی یعنی خالہ کی نانی ، انکی شادی میں نے سنا ہے کہ اس وقت کے مروجہ طریقے کے مطابق چودہ پندہ سال کی عمر میں ہو گئ تھی۔ اب اگر آپکی امی زندہ ہوتیں تو زیادہ سے زیادہ نوے سال کی ہوتیں۔ اب جبکہ انکے انتقال کو پانچ سال ہو گئے ہیں میرا اندازہ ہے کہ انکی عمر پچاسی سال ہوگی'۔ میں نے حساب کتاب کے تیز رفتار گھوڑے دوڑا دئیے۔

یہ تم سے کس نے کہا کہ انکی بیٹی کی عمر اس وقت پچھتر سال ہے۔ وہ میری بہن ہیں۔ مجھ سے پندرہ سال بڑی۔ میں اس وقت پچھتر سال کا ہو چکا ہوں۔ ماموں نے ایک اور اعتراض کیا۔

لیجیئے جناب عمر کا ایک نیا چکر شروع ہوا۔ میں نے کہا خالہ آپکی بھانجی ہیں۔ یہ لوگ سن چونسٹھ میں پاکستان آئے ہیں ۔ خالہ کی امی یعنی آپکی بڑی بہن کہتی ہیں کہ جس وقت وہ یہاں آئیں تو آپ گیارہ بارہ سال کے تھے۔ اب یہ بات تو ہم نے اتنی تسلسل سے سنی ہے کہ  غلط نہیں ہو سکتی' ۔ تائید کے لئے میں نے انکی بھانجی اور بڑی بہن کی طرف دیکھا ان لوگوں نے گردن ہلائ، تائید میں۔' اب آپ بتائیے ، اگر آپ اس وقت پچھتر سال کے ہیں تو سن چونسٹھ میں آپکی عمر، ایک سادہ سے حساب سےپچیس سال کے قریب بنتی ہے۔ پھر تو آپکو ہر چیز  خاصی  یاد ہونی چاہئیے'۔

ماموں ، میری شکل دیکھنے لگے۔ بہن کی ہجرت کے حوالے سے انکا خاکہ زیادہ واضح نہیں تھا۔ یہ بات تو ماننی پڑتی کہ ایک پچیس سال کے شخص کو یہ چیزیں درستی سے یاد ہوں۔ خاص طور پہ اپنی بڑی بہن کے متعلق۔' نہ آپ پچھتر سال کے ہیں اور نہ آپکی امی کا انتقال ایک سو سات کی عمر میں ہوا۔ آپکی عمر اس وقت ساٹھ سال کے قریب ہے، آپکی بڑی بہن پچھتر سال کی اور امی کا انتقال پچاسی سال کی عمر میں ہوا'۔

بڑی عجیب خواتین ہیں آپ۔  یہ کراچی میں گندم کہاں سے آتا ہے؟'۔ یہ کہہ کر ایک بھولپن سے مسکرانے لگے۔ شاید سوچ رہے ہوں کہ عمر رفتہ کا حساب تو بڑا آسان ہے پھر ہم کاہے کو ایک گورکھ دھندے میں پھنسے رہے۔

دو ہفتے بعد میں نے سنا کہ واپس جا رہے ہیں اپنے وطن بھارت۔

سوچا ایک دفعہ پھر ملاقات کی جائے۔ ایک دفعہ پھر اسی کمرے میں لیکن اس دفعہ مختلف لوگ بیٹھے تھے۔ گفتگو کچھ ماضی اور مستقبل کے دو نہ چھونے والے دائروں میں گھوم رہی تھی۔ کبھی چھلانگ کر اس طرف کبھی چھلانگ لگا کر اس طرف۔ ایسے میں اسے حال کے کرداروں کی انگلی پکڑنی پڑتی۔ ماموں نے ایک آہ بھری۔ 'پینتالیس سال ہو گئے ہماری بہن کو ادھر آئے تو ہم پہلی دفعہ آنے میں کامیاب ہوئے۔ اب دیکھیں آ پاتے ہیں یا نہیں'۔ 'ارے نہیں صاحب، خدا آپکو لمبی عمر دے۔ سنا ہے آپکی والدہ  نے بھی کافی لمبی عمر پائ تھی'۔

اسی بچوں جیسی سادگی سے کہنے لگے، 'جی ہاں ماشاءاللہ ایک سو سات سال کی عمر میں انتقال ہوا انکا'۔

وہ جھوٹ نہیں کہہ رہے تھے۔ یادداشت کے طلسم ہوش رُبا میں کہیں کہیں انسان پتھر کا ہو جاتا ہے۔ نہ اس سے آگے دیکھ پاتا ہے نہ پیچھے۔

11:29 AM

آزادی, بھارت, پاکستان, تقسیم, جنات, کراچی, لکھنوء

علم اور عمل

جب حضرت سفیان ثوری کی والدہ نے ان سے فرمایا کہ بیٹے علم حاصل نہ کرو تو صرف اتنی ہی بات انہوں نے نہیں کہی۔ انہوں نے فرمایا کہ بیٹے علم حاصل کرو تو اس پہ عمل کرنے کی کوشش کرو ورنہ قیامت کے دن یہ تمہارا علم تمہارے لئے حساب کتاب کے دروازے کھولدے گا۔ حضور اکرم صلعم کے ایک ارشاد کا مطلب ہے کہ دو آدمیوں نے میری کمر توڑ دی ایک جاہل دیندار نے دوسرے بے عمل عالم نے۔

علم اگر برتا نہ جائے تو پھر ایسے علم سے کیا فائدہ۔ اللہ نے انبیاء کو علم عطا کیا تو انہوں نے علم کو برتا اور اس پہ عمل کر دکھایا۔ علم اگر آدمی میں اچھے برے کی تمیز اور عمل کی تحریک نہ پیدا کر سکے تو ایسا علم بے کار ہے۔ قرآن علم کا سرچشمہ ہے۔ اللہ کے رسول کو جب یہ علم وحی کے ذریعے عطا ہوا تو آپ نے اسکے ایک ایک لفظ پہ عمل کر کے دکھایا اسی لئے قرآن کہتا ہے کہ آپ مومنوں کے لئے نمونہ ہیں۔

علم اور عمل میں فرق ہو تو ایک طرح کی منافقت ہےبلکہ کھلی منافقت۔ علم سکھاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو۔آدمی اللہ سے ڈرنے کے بجائے سرکش ہو جاتا ہے۔سیدھی راہ چھوڑ کر الٹی راہ چلنے لگتا ہے۔ علم دھوکے اور ریاکاری سے روکتا ہے اور اگر کوئ علم حاصل کرنے کے بعد بھی ریاکار ہوجائے تو کیا کہا جائے۔

حضرت حسن بصری، تاریخ اسلام کی ایک بڑی شخصیت اکثر اپنے نفس پہ خفا ہوتے اور اپنے آپکو جھڑک کر کہتے حسن بصری، تو  پرہیز گاروں اور اطاعت گذاروں جیسی باتیں کرتا ہے مگر تیرے کام تو جھوٹوں ، منافقوں اور دکھاوا کرنے والوں کے سے ہیں۔ سن لے اور خوب اچھی طرح سن لے کہ یہ اللہ سے محبت  رکھنے والوں کی صفت نہیں کہ وہ سراپا اخلاص اور تمام تر ایثار نہ ہوں۔

یحیی بن معاذ سے پوچھا گیا کہ آدمی اخلاص والا کب ہوتا ہے۔ فرمایا جب اسکی عادت دودھ پیتے بچے کی سی بن جائے۔ کوئ اسے اچھا کہے تو خوش نہ ہو۔ برا کہے تو برا نہ منائے۔

حضرت ابراہیم ادھم کہتے ہیں کہ جو شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ لوگ اسے اچھا کہیں وہ نہ اللہ سے ڈرنے والا ہے نہ صاحب اخلاص۔

جسکی نیت نیک ہوگی اس کا عمل بھی ویسا ہوگا۔علم وہ جوہر ہے جو نیت کو نیک اور عمل کو بہتر بناتا ہے۔ اسی لئے قرآن کہتا ہے کہ وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ جو علم نہیں رکھتے دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ علم اللہ کی صفات میں سے ایک ہے ۔

جو صاحب علم ہوتا ہے اسکی ذمہ داریاں بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ حضرت عیسی نے لوگوں سے پوچھآ۔ جانتے ہو ولی اللہ کون ہوتا ہے؟ لوگوں نے کہا نہیں آپ بتائیے۔

فرمایا کہ وہ جو اپنے علم پہ عمل کرے۔

یہ ایک تحریر ہے جو شاہ بلیغ الدین کی کتاب روشنی سے مستعار لی گئ۔ میرے بچپن میں ہماری صبح کا آغاز ریڈیو سے مثنوی مولانا روم کے ترجمے سے ہوتا تھا اور اسکے بعد شاہ بلیغ الدین کا پانچ دس منٹ کا پروگرام روشنی چلا کرتا تھا۔ مولانا صاحب اپنے دھیمے لہجے میں اپنی بات کرتے جاتے اور ہم اپنے اسکول کی تیاری۔

علم کے ساتھ عمل نہ ہو تو یہ منافقت ہے۔ یہ بات میں نے اپنی سوچ سے کہیں لکھی تھی۔ لیکن آج جب میں نے اس کتاب کو دوبارہ کھولا تو لگا کہ شاید میں نے لا شعوری طور پہ یہ جملہ محفوظ کر لیا تھا۔ میرے شعور نے مجھے بتایا کہ دراصل یہ جملہ  اپنی پوری معنویت میں یہاں استعمال کرنا ہے۔

عالم بے عمل، کیا تبلیغ کا حق رکھتے ہیں؟

8:59 PM

انتہا پسندی, پاکستان, جہالت, دکھاوا, ریاکاری, ریڈیو, شاہ بلیغ الدین, مثنوی, مولانا روم

آج یا کبھی نہیں؟

کل پہلی دفعہ جیو چینل پہ کامران خان کی زبانی سنا کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہم پاکستانی دہشت گردی اور انتہا پسندی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ آج یا کبھی نہیں۔

یہ وہی چینل ہے جو انتہا پسندوں کو ہیرو بنانے کا شاید ہی کوئ لمحہ ضائع جانے دیتا ہو۔ ایک طرف امن کی آشا اور دوسری طرف انتہا پسندوں کی بھاشا۔ میڈیا نے انتہا پسندی کو پھیلانے میں بڑی سرگرمی سے کام کیا۔ اور اب وہی اپنے اوپر لگے اس دھبے کو دھو سکتے ہیں۔

خیر، دیر آید درست آید۔ کامران خان کہتے ہیں کہ اب ہمیں سوچنا چاہئیے کہ دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی دہشت گردی کی بڑی کارروائ ہوتی ہے ایسا کیوں ہوتا ہے کہ دہشت گرد کا تعلق یا تو پاکستان سے ہوتا ہے یا پھر وہ پاکستان سے پکڑا جاتا ہے۔

اسکی وجہ بالکل سامنے ہے اور وہ یہ کہ دنیا بھر میں پائے جانے والے سینتالیس کے قریب اسلامی ممالک میں پاکستان وہ واحد ملک ہے جہاں پہ عوام ان انتہا پسندوں اور دہشت گردوں کی حمایت کے لئے کمر بستہ ہے۔ یقین نہ ہو تو پچھلے چار مہینے کی بلاگستان کی پوسٹس اٹھا کر دیکھ لیں۔ خاص طور پہ سلمان تاثیر کے قتل کے بعد تحاریر اور انکے تبصرے۔

ہر دہشت گرد اور انتہا پسند ہمارا ہیرو۔ ہم اسکے پیش کئے گئے نظرئے پہ جان دینے اور لینے کو بے قرار۔ جب وہ بم مار کر درجنوں لوگوں کو ایک ساتھ موت کی نیند سلا دیتا ہے تو اول ہمیں یقین نہیں آتا کہ یہ ہمارے ہیرو کے کسی ساتھی نے کیا ہوگا یقیناً کسی نے اسے پھنسایا ہوگا۔ اور اگر دنیا کے دباءو پہ ہم یقین کر لیں تو ہم انا لللہ پڑھ کر دعا کرتے ہیں کہ  اللہ اسکی مغفرت کرے۔ جب وہ کسی کو قتل کر کے سرخرو ہوتا ہے تو ہم اس کا مقدمہ لڑ کر اسے رہا کرانے کو بےتاب۔ جب وہ کسی اور ملک میں گرفتار ہو تو ہم سجدے میں  کہ خدا کوئ چمتکار دکھائے اور وہ رہا ہو جائے۔ آخر کسی دہشت گرد اور انتہا پسند کو کیا چاہئیے۔  یہی عقیدت اور غیر مشروط محبت و وفاداری۔ جس میں دُھت ہمیں یہ خیال تک نہیں آتا کہ تین سال میں تین ہزار سے زائد پاکستانی امریکیوں کے ہاتھوں نہیں انہی 'محبوبوں' کے ہاتھوں زندگی سے محروم ہوئے۔ ہمارے مستقبل کے متوقع حکمراں عمران خان بھی ڈرون حملوں کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں مگر ان خود کش بمبار کے لئے کوئ ریلی نہیں نکالتے۔

لیکن دنیا ہمارے بارے میں کیا سوچتی ہے؟ آئیے اسکے لئے ایک کہانی کے آخری دو صفحات پڑھتے ہیں۔ کہانی کے لکھنے والے ہیں

ڈاکٹر شیر شاہ سید

۔ ڈاکٹر صاحب پاکستان کے ایک مایہ ناز گائیناکولوجسٹ  ہی نہیں ان لوگوں میں ہیں جنہوں نے پاکستانی خواتین کی فلاح بہبود کے لئے اپنی زندگی کو ایک مشن بنایا ہوا ہے۔ اگر عمران خان کو شوکت خانم ہسپتال  بنانے اور چلانے پہ پاکستان کی حکمرانی پیش کی جا سکتی ہے تو مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر شیر شاہ بھی اسکے مضبوط امیدوار ہو سکتے ہیں۔

انکی گوناگوں خوبیوں میں ایک خوبی ایک اچھا ادیب ہونا بھی ہے۔ انکی کہانیوں کے کئ مجموعے منظر عام پہ آچکے ہیں۔ یہ صفحات  انکے تازہ ترین مجموعے 'دل نے کہا نہیں' کی کہانی  'نفرت کی تصویر'  سے لی گئے ہیں۔

ڈاکٹر شیر شاہ کا کہنا ہے کہ اس مجموعے کی تمام کہانیاں حقائق سے جڑی ہوئ ہیں۔ اور نرا فکشن نہیں ہیں۔ تمام کہانیاں ہمارے آجکے پاکستان سے تعلق رکھتی ہیں۔ کتاب کے پبلشر ہیں شہر زاد اور قیمت ہے دو سو روپے۔

یہ دو صفحات حاضر خدمت ہیں۔

بہتر طور پہ پڑھنے کے لئے تصویر کو کلک کریں۔

10:14 AM

اسامہ بن لادن, انتہا پسندی, جیو, دل نے کہا نہیں, دہشت گردی, ڈاکٹر شیر شاہ سید, کامران خان, کتاب, میڈیا

سمندر سے آگے

ہر دفعہ ریسائکلنگ پہ دل جمعی کے ساتھ یکسو ہو کر کچھ لکھنے بیٹھ ہوتی ہیں۔ حالات حاضرہ میں کچھ ایسی ری سائکلنگ ہوتی ہے کہ دل جمع ہو تو ہو خیالات منتشر ہو جاتے ہیں۔ اور ہر انتشار سے گذرتا لمحہ کہتا ہے یہاں سے پہلے یہاں سے پہلے۔ میں ایک کمزور انسان ہوں ، ابھی کچھ عرصے پہلے تک چالیس کلو اور آجکل بیالیس کلو وزن پہ رہتی ہوں۔ اس صورت میں ہر چھٹانک بھر ترغیب بھی انتشار پھیلا دینے کے لئے کافی ہوتی ہے۔

یوں دن کے ساڑھے بارہ بجے جب پتہ چلا کہ اسامہ بن لا دین اب قصہ ء پارینہ بن چکے ہیں تو ایک مثالی مسلمان کی طرح اختتامیہ کلمہ پڑھنے کے بجائے یہ سوچنے بیٹھ گئ کہ آخر اس لمحہ ء موت کی مہورت کیسے نکالی گئ۔ کیوںکہ اس واقعے میں مقام کی اہمیت اپنی جگہ لیکن وقت کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔

حکومت پاکستان کا ایک کھوکھلا سا دعوی ہے کہ اسے اس آپریشن سے آگہی نہیں تھی۔ ایک معمولی سی ذہنی ورزش بھی اس ڈھول کا پول کھول دینے کے لئے کافی ہے۔

خوش امید لوگ جنہیں اسامہ سے اسلام کی سر بلندی اور مسلمانوں کی فتح کی امیدیں وابستہ تھیں وہ امید کرتے ہیں کہ ابھی کچھ دن گذریں گے اسامہ پھر ایک ویڈیو بیان جاری کر کے اس دعوے کی دھجیاں اڑا دے گا۔

میں ان خوش امیدوں میں نہیں ہوں۔ میرا تو خیال ہے کہ اسامہ  کافی عرصے پہلے مر چکا تھا۔  اب امریکنز اسکی باقیات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ڈی این اے ٹیسٹ سے جب یہ بات پایہ ء ثبوت کو پہنچ چکی تو انہوں نے ایک ڈرامہ اپنی قوم میں جان ڈالنے اور اپنے آپکو فاتح قرار دینے کے لئے انجام دے ڈالا۔ اب ان باقیات کو خاک بنا کر ماءونٹ ایورسٹ پہ اڑایا جائے یا سمندر کے حوالے کیا جائے لیکن اسکی تصاویر اور ویڈیو جاری نہیں کی جا سکتیں۔

اسامہ کے نجانے کب کے انتقال پہ میں نے اب شاعری کرنے کی کوشش کی۔ اساتذہ سے درخواست ہے کہ دل تھام کر پڑھیں اور چاہیں تو اس میں اصلاح کر دیں۔ شاعری میں،  میرے قابل اصلاح ہونے میں اتنے ہی شبہات ہیں جتنے اسامہ کے زندہ یا مردہ ہونے پہ۔ کلام حاضر ہے۔

اسامہ مر گیا لیکن ابھی بھی یاد آتا ہے

وہ ہر بات پہ کہنا کہ یہ ہوگا تو یوں ہوگا

پیدا ہوا عرب میں رہا امریکہ اور افغان میں

روٹھا جو امریکہ سے تو لڑا پھر جا کے افغان میں

مرنے میں اسکے ایک راز ہے چھپا ہوا

مدفن چنا سمندر کوجو مر گیا پاکستان میں

تم بھی مرے وہ بھی مرا، ہو گیا انصاف پر

ہم کیوں مرے ایسے صنم، ہم تھے وزیرستان میں

ادھر ایک گروہ کا خیال ہے کہ  دہشت گردی کے خلاف جنگ کے تمام فریقوں کے درمیان ڈیل ڈن ہو گئ ہے۔ اسامہ ، امریکہ میں کہیں دنیا کی  جنت کے مزے لے رہے ہونگے ، افغان طالبان اب سکون کا سانس لیں گے دولت بھی ملی ہوگی، امریکہ فاتح کی حیثیت سے سرخرو واپس جائے گا۔ پاکستانی طالبان بھی اپنا حصہ پائیں گے۔ انکے حامی بھی خوش رہیں گے یہ سوچ کر کہ امریکہ جھوٹ کہہ رہا ہے اسامہ زندہ ہے اور اگر مر بھی گیا تو کیا ہوا شہادت کی موت ہوئ، لڑتے ہوئے مرا۔ پاک فوج بھی دامن پہ کوئ داغ نہ خنجر پہ کوئ خوں، ایک مستحکم حالت میں۔ انہوں نے یا آئ ایس آئ نے کچھ نہیں کیا۔ حکومت پاکستان سارے واقعے سے لا علم۔ دائیں بازو کی مذہبی جماعتیں ایک اور مظلوم حاصل کرنے میں کامیاب۔

اس سارے سلسلے میں کون نقصان میں رہا۔ وہ لوگ جنہیں ایک عام انسان کی طرح اولادوں کی شادیاں کر کے ان سے خدمت کرواکے طبعی موت مرنے کی خواہش تھی وہ شہید بالجبر نہیں ہونا چاہتے تھے۔ میں اور اس معاشرے کے وہ  لوگ نقصان میں رہے جو یہاں اقتصادی استحکام اور خوشحالی چاہتے تھے۔ اس لئے کہ وہ دنیا کے کسی بھی سہولت سے آراستہ ملک کے بجائے اپنے ملک میں رہنا چاہتے ہیں۔ جو  اپنے بچوں کے لئے ایک پر امن مستقبل کے خواب دیکھتے ہیں جہاں وہ سائینس، آرٹ اور انجینئرنگ پڑھیں اور اپنی صلاحیتوں کو اور اپنے آپکو خوف سے آزاد رہ کر جانیں۔ دنیا کی اور قوموں کے سامنے ثابت کریں گے پاکستانی مائیں بھی اپنے بچوں کی شاندار تربیت کرنے کی اہلیت رکھتی ہیں وہ انکی صلاحیتوں کا اجاگر کرنا جانتی ہیں۔ وہ لڑکیاں نقصان میں رہیں جنکے اسکول اڑائے گے اور جنہیں انسانیت سکھانے کے بجائے نسوانیت سکھانے پہ زور رہا۔ یا وہ لڑکے نقصان میں رہے جنہیں ستاروں پہ کمندیں ڈالنے کے بجائے بموں کی گرد بنا دیا گیا، جنکے دلوں میں امید کی جوت جگانے کے بجائے موت  کے رمز یاد کرائے گئے۔

وہ والدین نقصان میں رہے جنہوں نے اپنے بڑھاپے کے سہاروں کو پھلتے پھولتے دیکھنے  کے بجائے قبر تک پہنچایا۔ اور آج اپنے ویران گھروں میں آسیب کی طرح پھرتے ہیں۔

رسم دنیا یہ ہے کہ جب کوئ مسلمان دنیا سے گذر جائے تو اختتامیہ کلمات کہے جائیں۔  لیکن میں سوچتی ہوں کہ اگر ہر صبح ہم اپنے آپکو کہیں ، اپنے آپ کے لئے اختتامیہ کلمات کہیں، انا للہ و انا الیہ راجعون۔  بے شک ہم اللہ کی طرف سے آئے ہیں اور لوٹ کر اسی کی طرف جانا ہے، تو ہمارے لئے کتنا آسان ہو جائے ہر مسلمان کے واسطے انہیں ادا کرنا۔ چاہے وہ اسامہ ہو یا سلمان تاثیر۔

لیکن ہمیں ایمان تازہ کرنے کی مصروفیت میں اسکی فرصت نہیں۔ خدا کو بھی اسکی فکر نہیں۔ ہم نہیں جانتے، ہمارا مدفن زمین ہو یا سمندر، اس سے آگے کیا ہے؟ صرف یہ معلوم ہے۔  اللہ الصمد۔ اللہ بے نیاز ہے۔

12:23 PM

اسامہ بن لادن, افغانستان, امریکہ, پاکستان, جہاد, دہشت گردی, عرب, مسلمان, موت

روایت ہے کہ

ٹی وی چینلز کی سرفنگ کرتے ہوئے میرا ہاتھ ایک چینل کے لئے رک گیا۔ یہاں پہ اینکر پرسن مختاراں مائ کے ساتھ موجود تھے ۔ وہی مختاراں مائ جو اجتماعی زنا کا شکار ہوئ، جس کا مقدمہ تقریباً نو سال چلا اور بالآخر سوائے ایک ملزم کے باقی سب با عزت بری ہو گئے۔

اینکر پرسن نے اپنی بات کے آغاز میں اپنی مثال دی کہ وہ خود کتنا چیف جسٹس افتخار چوہدری کے خلاف تھے انہوں نے کتنے ہی پروگراموں میں انکے خلاف بات کی لیکن جب وہ عدالت سے انصاف مانگنے گئے تو انہیں انصاف ملا۔ اس لئے مختاراں مائ کے سلسلے میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اسکے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔

لیجئیے جناب، میں اپنی مثال دوں کہ میں نے پاکستان میں اعلی سطح تک کی تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کی، کامیاب ہوئ اور اس طرح یہ بات غلط ثابت ہوتی ہے کہ پاکستان میں تعلیم کے سلسلے میں خواتین کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ یہ سب پروپیگینڈہ ہے۔

جس وقت میں یہ سب کہونگی، میرے سامنے

گوادر کے ساحل کے ساتھ رہنے والی نازنین

، پاکستان کی لاکھوں عورتوں کا جلوس لے کر دھرنا مار کر بیٹھ جائے گی اور کہے گی کتنی جھوٹی ہو تم اور خود غرض۔ صرف اپنی دنیا میں رہتی ہو۔ میں کراچی سے سینکڑوں میل دور رہنے والی نیم خواندہ لڑکی سے ڈر جاتی ہوں۔

اس معاملے میں, جس میں لقمان مبشر خاصی وسعت قلب رکھتے ہیں میرا دل اتنا سا ہے۔ لقمان مبشر اپنے دیگر مہمانوں کے ساتھ مصروف بہ عمل جو اپنی زبان اور علم کے مظاہرے سے ہی لگ رہے تھے کہ کیا اپروچ رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب کا اصرار اس بات پہ رہا کہ اس کا تو میڈیکل ہی آٹھ دن بعد ہوا۔ اگر اس کا میڈیکل آٹھ دن بعد ہوا تو یہ کس کی کوتاہی تھی، یہ سوال کرنے والا ان سے کوئ نہ تھا۔ زنا بالجبر کے کیسز میں  بر وقت میڈیکل کی سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔

یہ سب این جی اوز کا کھیل ہے مظفر گڑھ میں اتنی بڑی تعداد میں این جی اوز کھل گئ ہیں۔ ان سے یہ سوال نہیں کیا گیا کہ اتنی بڑی تعداد میں این جی اوز کراچی میں کیوں نہیں ہیں۔ اس قسم کے جرائم شہروں سے زیادہ پاکستان کے پسماندہ علاقوں میں کیوں  ہوتے ہیں، یہ بھی نہیں معلوم۔ تین روایت پسند مرد، کئ روائیتیں۔

اگلے دن میں پھر اسی کام میں مصروف ثناء بُچہ کو پکڑ لیتی ہوں۔ یہاں کچھ کام کی گفتگو جاری ہے۔ کیا اسکی وجہ یہ ہے  کہ ثناء بُچہ نے اپنا ہوم ورک محنت سے کیا اور کچھ کام کے لوگوں سے کام کی بات نکلوانے میں کامیاب ہو گئیں یا  یہ کہ اینکر پرسن ایک خاتون ہیں پاکستان کی ایک ماڈرن خاتون ، کسے معلوم؟

اس گفتگو سے ایک عام آدمی کو پتہ چلتا ہے کہ در حقیقت ہمارے یہاں جرم ہونے کے بعد تحقیقی پہلے مرحلے یعنی ایف آئ آر سے لیکر شواہد جمع کرنے تک کا کام نا اہل لوگوں کے پاس ہے۔

عدالتیں شواہد پہ کام کرتی ہیں انہیں مادی ثبوت چاہئیے ہوتے ہیں۔ اور کسی مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے پولیس کے محکمے کو شواہد اکٹھا کرنے ہوتے ہیں۔ اور استغاثہ انہیں ثبوت کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ اگر شواہد اور ثبوت موجود نہیں ہیں تو آپ پہ جو گذرا اسکی کوئ اوقات نہیں چاہے اسکی وجہ سے آپ کی زندگی ختم ہو جائے۔

یہ کوئ پہلا کیس نہیں جسے ثبوت اور شواہد کے ناکافی ہونے کی بناء پہ اس نتیجے کا سامنا کرنا پڑا ہو یہاں نامی گرامی دہشتگردوں سے لے کر، غبن کرنے والے، کرپشن میں شامل افسران اور طبقہ ء اشرافیہ سے لے کر مافیاز کے  کرتا دھرتا تک یہی طریقے آزماتے ہیں۔ ایف آئ آر کو ہی اس طرح درج کیا جاتا ہے کہ انصاف کم سے کم ہو پائے۔ اور با اثر شخص یا تو بچ نکلے یا پھر اسے کم سے کم نقصان پہنچے۔

یہ سب کوئ راز کی بات نہیں، ان سے ہمارا سابقہ پڑتا ہی رہتا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص اپنی زندگی میں اس حیرانی سے گذرتا ہے کہ فلاں شخص کیسے قانونی سزا سے بچ گیا۔

دوسری طرف ہم جب اس مقدمے کی نوعیت دیکھتے ہیں تو یہ زنا بالجبر کے گرد گھومتا ہے۔ زنا بالجبر طاقت کے مظاہرے سے منسلک جرم ہے۔ پاکستانی معاشرہ ایک پدر سری معاشرہ ہے۔ اسکے بڑے حصے میں خواتین کسی مرد کی جاگیر کا حصہ ہیں۔ اگر دو مردوں کے درمیان طاقت کا کھیل چل پڑے تو اسکی سزا ان مردوں سے تعلق رکھنے والی خواتین کے حصے میں زیادہ آ تی ہے۔ یوں ونی ، کارو کاری سے لیکر پنچایت اس بات کا اختیار رکھتی ہے کہ کسی عورت کو ایسی سزا بھی دے ڈالے۔ کسی مرد سے تعلق رکھنے والی خواتین کی یہ بے حرمتی سب سے بڑی ذلت سمجھی جاتی ہے، نتیجتاً جو اسے کرے گا وہ زیادہ طاقتور ٹہرے گا۔

ایک اورعام صورت یہ ہو سکتی ہے کہ  چونکہ مردوں کی اکثریت کا ذہنی رخ اس طرح متعین کیا جاتا ہے کہ وہ کسی عورت کو اپنے سامنے کوئ چیز نہیں سمجھتے، اس لئے جب کبھی انکی طاقت کسی عورت کے سامنے کم پڑتی نظر آئے تو وہ یہ جرم کرکے اس کا دماغ صحیح کریں۔

روانڈہ، بوسنیا، ویتنام کی جنگوں میں اور دور کیوں جائیں تقسیم ہندوستان اور تقسیم پاکستان  عمل کے دوران طاقت کے اس شو آف کا کئ لاکھ خواتین شکار ہوئ۔ جنگوں میں عورتوں کو یہ اذیت بھی اٹھانی پڑتی ہے۔ ان کا تھا کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا۔

اس لئے ہمیں یہ دیکھ کر حیران نہیں ہونا چاہئیے کہ زنا بالجبر کے واقعات میں ایک اکثریت بالخصوص مردوں کی کیوں خاموش رہتی ہے جبکہ یہ وہی مرد ہوتے ہیں جو عورتوں کے متعلق اپنے انتہا پسند جذبات  کو اپنی غیرت سمجھتے ہیں۔

عدالتیں بھی اسی نظام کے پروردہ مردوں پہ مشتمل ہیں۔ تو اگر ایک طبقہ یہ مطالبہ کرتا ہے کہ خواتین ججز کو ایسے  مقدمات میں شامل رکھا جائے، پولیس  اور عدالتی نظام کی اس تربیت کا انتظام کیا جائے کہ وہ انصاف کے حصول کے لئیے اپنے آپکو ذہنی طور پہ توازن میں رکھ سکیں، وہ کیا غلط کہتا ہے۔ دور دراز کے علاقوں میں تو ایسے جرائم کو پولیس اسٹیشن میں رپورٹ کرنے کے قابل تک نہیں سمجھا جاتا۔

دنیا کے کتنے ہی آزاد معاشرے سے تعلق رکھنے والی عورت کیوں نہ ہو اسکے لئے اس سے زیادہ تکلیف دہ اور ذلت آمیز چیز کوئ اور نہیں ہو سکتی۔

پاکستان میں ہر آٹھ گھنٹے میں اجتماعی زیادتی کا ایک واقعہ ہوتا ہے۔  ہونے والے واقعات میں سے تقریباً ستر فی صد رپورٹ نہیں ہوتے۔ شکار ہونے والی لڑکیوں میں سے تینتالیس فی صد کی عمر سولہ سال سے کم ہوتی ہے۔ یہ وہ عمر ہے جس میں کسی لڑکی کو جو ہمارے معاشرے سے تعلق رکھتی ہو بآسانی ہراساں کیا جا سکتا ہے اور انہیں خاموش رہنے پہ مجبور کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان  میں رجسٹر کیسز میں سے دو تہائ پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کا محض یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ وہاں یہ جرائم زیادہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ ہم کہہ چکے ہیں کہ ستر فی صد واقعات رپورٹ نہیں ہوتے۔ اس کا ایک اور مطلب بھی نکالا جا سکتا ہے کہ پنجاب میں  ایسے جرائم کو رجسٹر کرانے کی شرح زیادہ ہے۔

پاکستان اس حساب سے دنیا کا واحد ملک نہیں ہے۔ ہمارا پڑوسی ملک انڈیا اس میں ہم سے آگے ہے۔

دارالحکومت دہلی

میں خواتین سورج ڈوبنے کے بعد گھر سے نہیں نکل سکتیں۔ گلیوں میں  ہوس کے مارے گینگسٹرز کا راج ہوتا ہے۔ وہ بھی پدر سری معاشرہ رکھتے ہیں، وہ بھی فیوڈل سوچ سے آزاد نہیں ہو سکے، انکے یہاں بھی انتہا پسندی اپنے عروج پہ ہے۔ لیکن ہندو مذہب کے بنیادی عقائد کے مطابق عورت کو مرد کی شانتی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ مرد دیوتا ہے عورت  داسی۔

 ان میں اور ہم میں نظریاتی فرق ہے جس کی بناء پہ ایک طبقہ کہتا ہے کہ ہم نے یہ ملک حاصل کیا۔ اگر یہ درست ہے تو کیا اس فرق کو ہمارے روئیے میں نہیں نظر آنا چاہئیے۔

ایسا کیوں ہے کہ  دہشت گردی کی جنگ میں مصروف عافیہ صدیقی کے ساتھ ہونے والے جنسی ہراسمنٹ کی تو مذمت کی جائے، اس کی مظلومیت کے تو واسطے دئیے جائیں۔ اسکے بچوں کی تو فکر ہو۔ لیکن اپنے ملک میں، اپنی سرحدوں کے اندر رہتے ہوئے اپنے ہی ملک کی ہم مذہب، ہم زبان  عام گھریلو عورتوں کے تحفظ کی خاطر مناسب قانون سازی کے لئے آواز نہ بلند کی جائے۔ یہ بھی تو قوم کی بیٹیاں ہیں، انکے بچے بھی تو بچے ہوتے ہیں۔ اور کون جانے ان میں سے کس میں واقعی قوم کی عظیم بیٹی بن دکھانے کا حقیقی جذبہ موجود ہو۔ مگر اس سلسلے میں ایک مجرمانہ خاموشی اختیار کی جاتی ہے تاکہ ان لوگوں تک کوئ این جی او پہنچے اور پھر یہ کہیں کہ یہ سب تو این جی اوز کا کھیل ہے۔

کوئ معاشرہ اگر اپنے تمام طبقات کے لئے انصاف نہیں چاہے گا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ پنپ سکے، ، خوش حال ہو، مستحکم ہو۔ اسکے ساتھ انصاف کیا جائے۔ نہیں، ایسا ممکن نہیں۔

4:14 PM

پاکستان, ثناء بچہ, خواتین, دہشت گردی, زنا بالجبر, عافیہ صدیقی, لقمان مبشر, مختاراں مائ, میڈیا

رو چھجّو رو

معین اختر اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ سب لوگوں نے اپنے اپنے طور پہ سوگوارانہ جذبات کا اظہار کیا۔ جہاں اکثریت نے یہ کہا کہ پاکستان میں  تفریحی میڈیا ایک بڑے نقصان سے دو چار ہو گیا وہاں یہ بھی سننے میں آیا کہ ایسا کیوں ہے کہ ہمارے درمیان سے ہنسنے ہنسانے والے لوگ اٹھتے جا رہے ہیں۔

 معین اختر کے انتقال  کا ملال اپنی  جگہ لیکن شاعر کہتا ہے کہ عام ہوئ شہر میں دانشوری مرتبہ ء اہل ہنر بھی گیا۔ بالکل یہی صداقت  ہنسے ہنسانے پہ بھی صادق آتی ہے۔ جہاں ہمارے ہنسنے ہنسانے کے ساماں کرنے کو حکومت کی مشینری کا ہر پرزہ 'چالو' ہو ، جہاں حزب اختلاف بھی مزاح کے حقے کو گرم رکھنے میں کوئ کسر نہ چھوڑتی ہو، غنڈے اور بدمعاش بھی مذاق ہی مذاق میں اپنا نشانہ چیک کرتے رہتے ہوں،  وہاں معین اختر کو جینے کے لئے کیوں مجبور کیا جائے۔

خدا حافظ معین اختر، ہم اب زندہ مذاق کے دور میں رہتے ہیں۔

اور جب تک کسی مذاق میں خود ایک فریق کے طور پہ موجود نہ ہوں اس وقت تک قسم لے لیجئیے بھائ میاں ، مزہ نہیں آتا۔ جس نے زندہ مجرا دیکھا ہو اسکے لئے  اسکرین پہ آنے والی منی اور شیلا کی ادائیں کوئ معنی نہیں رکھتیں چاہے وہ  بد نام ہونے اور لٹانے کے لئے کتنا ہی کیوں نہ تیار ہوں۔

آج ہم ، ہمہ وقت چھجو کے چوبارے پہ حاضر، جہاں بھانت بھانت کے بھانڈ اپنی پٹاری کھولے بیٹھے ہیں۔ اس میں سے ایک ناگ نکلتا ہے اور ہمارے آگے جھومنے کے بجائے ہمیں اپنا اسیر کر لیتا ہے اور ہم اسکے آگے جھومتے ہیں۔

  ایک طرف معین اختر ہاف پلیٹ  میں انور مقصود کے نپے تلے ڈائیلاگ بول رہے ہوں اور دوسری طرف فیصل رضا عابدی، زرداری اسکرپٹ کو سامنے رکھ کر بہے جارہے ہوں، کھلے جارہے ہوں، بکھرے جا رہے ہوں کہ ایوان صدر کے عملے کی تعداد ہم کیسے کم کر سکتے ہیں ہم نے عوام سے وعدہ کیا ہے کہ روزگار انکو انکے گھر کی دہلیز پہ دیں گے۔ کیا انور مقصود اتنا شاندار، رواں اور اوریجینل آئیڈیا لا سکتے ہیں اور اس پہ فیصل رضا عابدی کی پرفارمنس، آپ ہی منصفی سے سوچیں ہم کیوں نہ سیٹیاں بجائیں، ووووں۔

وجود زن سے صرف تصویر کائنات میں ہی رنگ نہیں بلکہ دنیا کا بیشتر مزاح خواتین کے متعلق ہی لکھا گیا ہے۔ اسکی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسے لکھنا آسان ہوتا ہے اور یہ زیادہ چٹپٹا اور دل کھینچ لینے والا ہوتا ہے۔ یہ دیکھیں ایک اور لائیو پرفارمنس۔

   یہ تو تاریخ میں درج ہو گیا کہ وعدے کوئ قرآن اور حدیث ہیں کہ پورے کئے جائیں۔  چلیں ہم بھی مانتے ہیں کہ حدیث اور قرآن کی تو انکی نظر میں اہمیت نہیں جو اسے دن رات دوہراتے ہیں۔ آپ کو کیا ضرورت پڑی کہ آپ اسکی پاسداری کریں۔ لیکن ذرا اس تقریر میں صدر صاحب کے ڈائیلاگز اور انکی پرفارمنس ملاحظہ فرمائیں۔ شاندار۔

بلوچستان کے وزیر اعلی کے اس ڈائیلاگ کا کہ  ڈگری ، ڈگری ہے اصلی ہو یا جعلی۔  اس کا کوئ جواب ڈھونڈھ لائیں۔ اتنا ہٹ ہوا کہ اس پہ بے شمار طرحی ایس ایم ایس بنے۔  اس ویڈیو میں انہی بلوچستان کے وزیر اعلی کی پرفارمنس، لاجواب ہے۔ اور اس سے ہنس ہنس  کر پیٹ میں بل نہ پڑ جائیں تو جو چور کی سزا وہ اسے لوڈ کرنے والے کو۔

ایم کیو ایم نے  پاکستان کو ناجائز اسلحے سے پاک کرنے کا بل اسمبلی میں پیش کیا اور حکومت نے اسے بغیر کسی مخالفت کے اسٹینڈنگ کمیٹی کو بھیج دیا۔  ایک ایسا ملک جہاں عام گھر میں بیٹا  پیدا ہونے کی حیرانی  پہ، کسی خاتون کو شادی کے بعد گھر لے آنے پہ دولہا کے متعلقین کی خوشی سے بد حالی کا اظہار،  حتی کہ نئے  وزیر قانون کا اپنے صوبے میں استقبال،  ہر قسم کے اسلحے کی ہوائ فائرنگ سے ہوتا ہے۔ وہاں یہ بل کیا  معنی رکھتا ہے۔ سوچیں ، ہنسیں اور اس عوامی مظاہرے سے محظوظ ہوں۔

ہمارا یہ نیا مزاح لکھنے والے اور پرفارم کرنے والے لوگ ابھی ایک لمبے عرصے تک زندہ رہیں گے۔ ابھی ہم بہت ہنسیں گے۔ کہتے ہیں جو قوم اپنے اوپر نہیں ہنس سکتی وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ ہم نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں ہم اپنے اوپر ہنس ہنس کر تھک چکے ہیں بلکہ بور ہو چکے ہیں۔ لیکن ترقی ہمارے پاس نہیں پھٹکتی۔  بہت سارے اور مقولوں کی طرح یہ بھی غلط ہی لگتا ہے۔ اب ایک چکر رو کر دیکھتے ہیں۔ رو چھجّو رو۔

9:24 PM

انتقال, بلوچستان, پاکستان, زرداری, فیصل رضا عابدی, معین اختر, وزیر اعلی

صومالی قزاق اور لیلی

لیلی ایک دس سالہ بچی کا نام نہیں بلکہ خوف اور بے بسی کی کیفیت کا نام ہے۔ وہ ایک عام بچی نہیں، بلکہ   جدو جہد اور امید کے مابین ڈولتی  ہمت کی علامت ہے۔ اس نے شاید سند باد جہازی کی کہانیوں میں ہی

سمندری قزاقوں

کے بارے میں پڑھا ہوگا اور اسے گمان بھی نہ ہو گا کہ وہ زمین پہ رہتے ہوئے انکے ظلم کا شکار ہو جائے گی۔

وہ سنڈریلا ، باربی, کوہ قاف کی دیومالائ کہانیوں کی عمر سے ابھی باہر نہیں آئ اس لئے خواب دیکھ رہی ہے کہ اسکے ارد گرد کے لوگ، اسکی قوم کے لوگ اسکے باپ کے موت کے پنجے سے چھڑا لائیں گے۔ اور وہ صرف خواب ہی نہیں دیکھتی بلکہ اس چیز کے لئے بھی تیار ہے کہ اپنے باپ کی رہائ کے لئے اپنا گردہ بیچ دے۔

اسکے باپ کی صومالی قزاقوں سے رہائ کے لئے اب صرف پانچ کروڑ روپے چاہئیں۔ وہ اس حادثے میں اکیلے نہیں جہاز کے دیگر عملے میں مصری اور انڈینز بھی شامل ہیں۔ تاوان کی کل رقم تقریباً بیس کروڑ بنتی ہے جس میں سے مصری اور انڈیئنز اپنا حصہ ادا کر چکے اور اب پاکستان کی باری ہے۔

لیلی کے رشتے دار سوال کرتے ہیں کہ ایک کھلاڑی کی شادی پہ ہماری ایک وزیر سونے کا تاج دے سکتی ہیں مگر پاکستانیوں کی رہائ کے لئے حکومت کوئ دلچسپی نہیں لے رہی۔

ایک ایسے ملک میں جہاں اربوں روپوں کا غبن اور کرپشن ہوتا ہو جہاں لوگوں کو اپنا بینک بیلینس تک یاد نہ ہو۔ وہاں میں اگر صرف پانچ کروڑکہا جائے تو کیا غلط ہے۔ اگر ایسے دس لوگ صرف پچاس پچاس لاکھ روپے دے دیں تو لیلی کو  میڈیا کے سامنے آنسو نہ بہانا پڑیں۔

پتہ نہیں کیوں میں بھی لیلی کی اس  کوہ قاف کا حصہ ہوں مجھے۔ مجھے بھی یقین  ہے اس کے والد

کیپٹین وصی حسن

صومالی قزاقوں کے پنجہ ء موت سے نکل آئیں گے اور وہ ایک دفعہ پھر ہنسی خوشی  نئے خواب بُنے گی۔

آپ بھی شریک ہو سکتے ہیں۔ مندرجہ ذیل معلومات استعمال کر کے، قزاقوں کی دی گئ مدت اب ختم ہونے کے قریب ہے۔

 اکاءونٹ نمبر؛

1066-0081-009278-01-9

بینک الحبیب لمیٹڈ

بفرزون برانچ ، کراچی

صومالی قزاقوں کی یہ سرگرمیاں پچھلے کئ سالوں سے جاری ہیں۔  یہ قزاق، بنیادی طور پہ صومالیہ سے تعلق رکھتے ہیں جو کہ بر اعظم افریقہ کا حصہ ہے۔ قزاقوں کی اس سرگرمی کا باعث کئ باتوں کو بتایا جاتا ہے۔ مثلاً ملک میں سیاسی عدم استحکام اور  کئ سالوں تک جاری خانہ جنگی جسکی وجہ سے عملاً کوئ حکومت نہیں۔ یا صومالی مچھیروں کی انتقامی کارروائ ان غیر ملکی ٹرالرز کے خلاف جو کہ انکے سمندری حصے میں  آکر اتنی زیادہ مچھلیاں پکڑتے تھے کہ انہوں نے سمندر کو مچھلیوں سے خالی کر دیا اور اس سے مقامی مچھیروں کا ذریعہ ء روزگار ختم ہو گیا۔

ان قزاقوں میں تین طرح کے لوگ شامل ہیں

۔

مقامی مچھیرے، جنہیں سمندر سے پوری واقفیت ہے اور یہ قزاقوں کا ماسٹر مائینڈ ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ باہر کی بوٹس کو انکے ساحل کے قریب سے گذرنے کا کوئ حق نہیں۔

 سابق فوج کے افراد جو پہلے اپنے جنگی سرداروں کے لئے لڑا کرتے تھے اب اس کام میں شامل ہو گئے۔

تیکنیکی مددگار جو تیکنیکی آلات کو دیکھتے ہیں مثلاً

جی پی ایس

۔

یہ صومالی قزاق اپنی سمندری حدودوں کے قریب سے گذرنے والے پانی کے جہازوں پہ قبضہ کر لیتے ہیں اور پھر لاکھوں ڈالر تاوان کا مطالبہ کرتے ہیں۔

صومالیہ ایک مسلمان اکثریتی ملک ہے  لیکن غربت یہاں کا بنیادی مسئلہ ہے۔ قزاقوں کو ایک لمبے عرصے سے اتنی کامیابی سے حملہ کرتے دیکھ کر ذہن میں کئ سوال پیدا ہوتے ہیں۔   پہلا سوال تو ذہن میں یہی آتا ہے کہ ان قزاقوں کو اسلحہ کہاں سے ملتا ہے۔ اندازہ ہے کہ اسلحہ انکے پاس یمن اور موغادیشو کے رستے سے آتا ہے۔ دوسرا خیال یہ آتا ہے کہ تاوان کی رقم ادا کیسے کی جاتی ہے۔ تاوان کی رقم ڈالرز کی شکل میں ادا کی جاتی ہے اور ہیلی کاپٹر کے ذریعے جہاز تک پہنچائ جاتی ہے۔

قزاقوں کے ذریعے آئ آمدنی نے علاقے کے معاشی حالات کو بہت بہتر کر دیا ہے۔ بہترین گھر بنے، تفریحی مقامات وجود میں آئے، مختلف اشیائے زندگی کی ڈیمانڈ بنی انکی مارکیٹ وجود میں آئ اور یوں خوشحالی نے جگہ بنائ۔ خوش شکل لڑکیوں کو بھی مالدار بحری قزاقوں کی رفاقت ملی۔

مقامی آبادی کے لوگ اس چیز سے خوش ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انکے سمندر کے ماحول کو جو نقصان پہنچایا گیا اس طرح وہ اسکی قیمت وصول کر رہے ہیں۔ لیکن انہیں بھی چند شکایات ہیں اور ان میں سر فہرست قزاقوں کا  نشہ آور اشیاء  اور اسلحے کا بے دریغ استعمال۔

قزاقوں کی اس مصیبت سے وہاں سے گذرنے والے جہاز خطرے سے دوچار رہتے ہیں۔ اس علاقے کی پوزیشن ایسی ہے کہ یہاں سے ہر سال ہزاروں پانی کے مال بردار اور مسافر جہاز گذرتے ہیں۔ یوں یہ منظر بیک وقت قزاقوں کے لئے خوشحال زندگی کی نوید بنتے ہیں اور پانی کے جہاز سے وابستہ لوگوں کے لئے ایک مسلسل خطرہ۔ اسکے علاوہ کاروباری حلقوں کی سرگرمیاں بھی اس سے متائثر ہوتی ہیں اور اعتماد دگرگوں ہوتا ہے۔

اس ساری بظاہر دہشت ناک صورت حال کے باوجود ان قزاقوں کی پیدائیش کا ایک مثبت اثر محسوس ہو رہا ہے اور وہ صومالیہ اور اسکے ارد گرد کے سمندر کی ماحولیاتی زندگی  کی بحالی ہے۔ صومالیہ سے منسلک کینیا میں رواں سال  مچھلی کی بہترین پیداوار رہی۔  اسکی وجہ،  بحری قزاقوں کے خوف کی وجہ سے باہر کے ٹرالرز کا شکار سے دور رہنا ہے۔

خوف، شکار ہو جانے والوں کو کمزور بنا سکتا ہے مگر استعمال کرنے والوں کو مضبوط۔ دیکھنا یہ ہے کہ دنیا اس دہشت گردی پہ قابو پانے کے لئے کیا راستہ نکالتی ہے۔

ایک دفعہ پھر لیلی کو اس خوف سے باہر نکالنے کے لئے آگے آئیے۔

8:06 AM

افریقہ, بحری جہاز, پاکستان, صومالیہ, قزاق, کیپٹین وصی حسن, لیلی, ماحولیاتی آلودگی

تُف ہے

خبر محض خبر نہیں ہوتی۔ ہر خبر اپنے معاشرے کی بہترین عکاس ہوتی ہے۔ جیسے آدم خور خاندان کی خبر۔ رپورٹ کہتی ہے کہ صرف دو تین لوگ نہیں بلکہ پورا خاندان مردہ انسانوں کو کھانے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ عرصے سے یہ فعل انکے یہاں جاری تھا۔   خاندان کے ایک بچے نے کہا کہ ماں باپ کی علیحدگی کے بعد میرا باپ میرے جسم کے نازک حصوں کو مجروح کرتا تھا۔ بڑے ہو کر اسے لگا کہ اسکی مردانہ قوت کم ہے سو اس نے مردہ انسانوں کا گوشت کھانا شروع کیا۔ بہر حال  رپورٹ لکھنے والے صحافی کے خیال میں ابھی بھی یہ ایک معمہ ہے کہ وہ مردہ انسانی گوشت کیوں کھاتے تھے اور کیوں انکے ارد گرد کے لوگوں نے اتنے لمبے عرصے سے پولیس کو اسکی رپورٹ نہیں کی۔

 دوسری خبر اپنے بلاگستان سے ملی یہ لڑکیوں کے کنوارے ہونے سے متعلق ہے۔ جیسا کہ مجھے توقع تھی کہ یہاں پہ یہ ، یہ لوگ موجود ہونگے اور یہ تبصرے ہونگے۔ عین وہی ہوا۔ لیکن حیرانی مجھے وہاں موجود دو تبصروں پہ ہوئ۔

ایک عبداللہ نامی مبصر، جنہوں نے ایک دلچسپ سوال رکھا کہ خواتین کے کنوارے ہونے پہ جتنی دلچسپی دکھائ جارہی ہے اتنی مردوں کے کنوارے ہونے کے ٹیسٹ کے بارے میں کیوں نہیں ہے۔  یہ مخصوص قبائلی مزاج کا طبقہ اس بات کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ کیونکہ بات ہے سمجھ کی یہ وہی طبقہ ہے جو مردوں کی بے راہروی پہ تو فخر فرماتا ہے اور عورت کے حیادار ہونے پہ زور ڈالتا رہتا ہے۔

تف ہے ایسی ذہنیت پہ اور اسکو پروان چڑھانے والوں پہ۔ اور اگر کوئ منصف خدا موجود ہے تو اسے ایسے لوگوں کو انکے قرار واقعی انجام کا مناسب بندو بست کر کے رکھنا چاہئیے۔

خواتین کے کنوارپن کی شادی کے وقت تصدیق ہونی چاہئیے اور مردوں کی نہیں۔ انہیں چھوٹ ہے  وہ جتنے استعمال شدہ ہوں چاہے جائز یا ناجائز طریقے سے انکا کنوارہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ واہ، جناب واہ ، آپکی انہی اداءوں پہ درے لگانے کو دل کرتا ہے۔

دوسرا تبصرہ ایک ڈاکٹر صاحب کا ہے۔ حیرت ہے انہوں نے کس ادارے سے میڈیکل کی ڈگری لی ہے۔ میں پی ایم اے والوں سے گذارش کروں گی کہ وہ ایسے ڈاکٹرز کو جو مسیحا ہونے کے نام پہ دھبہ ہیں اور جو انسانیت تو دور اپنے علم سے ہی پوری طرح واقف نہیں انہیں اس طرح کی اہم ڈگریاں دینے سے گریز کرے۔

در حقیقت یہ بات کوئ بھی ڈاکٹر بتا سکتا ہے کہ خواتین کےکنوارے ہونے کے لئے جو خصوصیت بتائ جاتی ہے وہ جہالت پہ مبنی ہے اور بعض خواتین میں یہ محض معمولی بھاگ دوڑ سے ختم ہو سکتی ہے۔

 میرے علم میں بھی یہ بات داکٹر شیر شاہ کے ایک مضمون کے حوالے سے آئ جو نہ صرف پاکستان کے مایہ ناز گائناکولوجسٹ ہیں بلکہ دنیا کے ان بہترین سو گائناکولوجسٹس میں شامل ہیں جنہوں نے اپنی کمیونٹی کی خواتین کی صحت اور ترقی کے لئے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

اگر ڈاکٹر شیر شاہ جیسے لوگوں سے دنیا واقف نہ ہوں اور صرف اس بلاگ کے لکھنے والے سے یا اس  پہ تبصرہ کرنے والے مردوں سے ملے ہوں تو انکے نزدیک پاکستان صرف ایسے مردوں پہ مشتمل ہوگا جہاں حیوان رہتے ہیں۔

پردہ ءبکارت یا اس سے منسلکہ تمام متھس، قبائلی اقوام کی خصوصیت ہیں۔ صرف یوروپ کے قبائل ہی نہیں ، عرب کے بیشتر قبائل اور پاکستان کے بھی قبائلی علاقوں میں عورت کو اس امتحان سے گذرنا پڑتا ہے۔

البتہ جیسا کہ قبائلی اقوام کی شان ہوتی ہے مردوں کو نیکی کے کسی ایسے امتحان سے نہیں گذرنا ہوتا۔ وہ خدا کے پاس ایڈوانس میں نیکیاں جمع کرا کے آئے ہوتے ہیں۔ ان سے پوچھا جائے کہ تم کنوارے ہوں تو جواب ملے گا کہ ہماری مرضی ہم بتائیں یا نہ بتائیں۔ سوال پوچھنے والا البتہ روشن خیال کی گالی سے نوازا جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ ان تمام قبائلی علاقوں کے مرد تو ہر طرح کی عیاشی کر سکتے ہیں مگر انکی عورتیں قابل ترحم زندگی گزارتی ہیں۔ وہ اپنے پوشیدہ امراض کے متعلق کسی عورت تک کو بتانے سے گھبراتی ہیں۔ کیا یہ بات قابل ترحم نہیں کہ ایک عورت اپنے پردء بکارت کا آپریشن کرانے بیٹھی ہو تاکہ اسکی قدر و قیمت برقرار رہے چاہے اسکے حصے میں آنے والا مرد دنیا کا اوباش ترین مرد ہو۔

اگر زانی مرد کسی عورت کے حصے میں آتا ہے تو قرآن کی یہ آیت دہرا دی جاتی ہے کہ زانیوں کے لئے زانی۔ حالانکہ زندگی کا ہلکا سا تجربہ رکھنے والے لوگ بی جانتے ہیں کیسی کیسی پردے دار متقی عورتوں کے شوہر کس قدر آوارہ نکلے۔ اور کیسے کیسے متقی مرد عورت کے معاملے میں آزمائے گئے۔ کیا واقعی یہ لوگ تفیہم قرآن سے واقف ہیں؟

  میں اس بلاگ کو پڑھ کر اسکے تبصروں کو جان کر اب تک حیران ہوں کیا جہالت کی کوئ انتہا ہو سکتی ہے۔ کوئ نہیں ہو سکتی۔ نیکی کی انتہا ہو سکتی ہے مگر بدی کی نہیں۔

حضرت عمر کے پاس ایک صاحب آئے اور کہنے لگے کہ میری بیٹی کنواری نہیں ہے اسکی شادی ہونے جارہی ہے کیا میں اسکے ہونے والے شوہر کے علم میں یہ بات لے آءوں۔ آپ نے فرمایا جس بات کا پردی اللہ نے رکھا اسے تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں۔ حتی کہ رسول اللہ نے اپنے آخری خطبے میں کہا کہ بچہ جسکے بستر پہ پیدا ہو گا اس کا کہلائے گا۔

صاحب بلاگ کی اس تحریر اور اسکے اعلی تبصروں کی وجہ سے اگر کسی عورت کی زندگی تباہ ہوتی ہے تو یقیناً اسکا گناہ ان سب لوگوں کے سر ہوگا۔ خدا ہمیں انفرادی دین کی اس برتری کے جذبے سے محروم رکھے جو معاشرے کو بدی کا گڑھ بنادیں۔   اللہ ہمیں لوگوں کی زندگی میں آسانی پیدا کرنے کی توفیق دے۔ آمین۔

یہ وہ دعا ہے جو اکثر اشفاق احمد مرحوم مانگا کرتے تھے اور عجیب بات یہ ہے کہ اسکے سنگین تبصرہ نگاروں میں بابا اشفاق احمد کے چاہنے والے بڑی تعداد میں ہیں۔ ہائے نام نہاد عاشق، عاشق تو دور صرف انسان ہی بن جائیں تو بہت۔

اور ہاں،  اب ہمیں اس بات پہ تو قطعاً حیران نہیں ہونا چاہئیے کہ اس آدم خور گھرانے کی خبر ایک لمبے عرصے تک کیوں نہیں ہو سکی۔

3:58 PM

اسلام, پاکستان, عرب, عورت, قبائلی نظام, قرآن, کنوار پن, مرد

تعلیم کے لئے جہاد

ایک مبصر کا کہنا ہے کہ

تعلیم کے لئے جنگ

نہیں تعلیم کے لئے جہاد کی اصطلاح استعمال ہو تو لوگ تعلیم کی طرف زیادہ متوجہ ہونگے۔ لگتا ہے یہ سچ ہے۔

ہم اکثر اپنے ملک کی تعلیمی حالت کی زبوں حالی کا رونا سنتے ہیں۔ ہمارے احباب علم و دانش اس بات پہ فکر مند رہتے ہیں کہ ہم علمی سطح پہ قحط الرجال کا شکار ہیں اور ہمارے احباب محفلاں گپ بازی ، اپنی اس کمی کو چند پڑھے لکھے لوگوں کا مذاق اڑانے کی کوششوں میں اپنا وقت لگاتے ہیں۔ کیونکہ انکے پاس اس وقت کی قلت ہے جس سے وہ اپنی اس کمی کو پورا کر پائیں۔

خیر جناب یہ میرے سامنے اس وقت دو پی ایچ ڈی کے تھیسس پڑے ہیں۔ ان پہ بات کرنے کی بہت ساری وجوہات ہیں۔ اول یہ کہ ہمارے سب سے بڑے صوبے کی سب سے مایہ ناز یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے حصول کے لئے جمع کرائے گئے۔ دونوں ہی تھیسس، اپنے موضوع کے لحاظ سے پاکستان میں تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں۔

دونوں تھیسس اپنی ضخامت کے لحاظ سے قابل توجہ ہیں۔ ایک کوئ سوا چار انچ بلند ہے اور دوسرا تقریباً تین انچ۔ یعنی دیکھنے والے کو ایک دم دبدبے میں لے آتا ہے۔ ایک تھیسس کوئ آٹھ سو صفحات پہ مشتمل ہے اور دوسرا کوئ پانچ سو صفحات پہ۔

تحقیقی ضابطوں سے نا آشنا لوگ سمجھیں گے کہ کیا زبردست محنت کی گئ ہوگی لیکن یہاں میں یہ اطلاع دیتی چلوں کہ اپنی پی ایچ ڈی کے دوران مجھے اس سلسلے میں انتہائ تناءو میں رہنا پڑا کہ ایک

اچھے تھیسس

کو زیادہ سے زیادہ دو سو صفحات پہ مشتمل ہونا چاہئیے اور اسکا زیادہ سے زیادہ حصہ آپکے اپنے کام پہ ہونا چاہیے نہ کہ دوسروں کی محنت کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے۔ یہ میرے ساتھ کوئ امتیازی سلوک نہ تھا بلکہ دنیا میں معیاری رائج طریقہ یہی ہے۔

ان موضوعات پہ اس قدر دلجمعی کے ساتھ کام کیا گیا ہے کہ تعلیمی موضوع پہ لکھے جانے والے ایک تھیسس میں ایک خاص علاقے کے کھانوں کی تراکیب تک موجود ہیں۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ دونوں تھیسس غیر معیاری ہیں ہیں۔

خیر ، اس میں طالب علم نہیں ان کا سپر وائزر زیادہ قصوروار ہے۔ پی ایچ ڈی کرانے والا استاد  اپنے طالب علموں کا معیار اپنے حساب سے بناتا ہے۔

ہمارے لئے ان کا موضوع زیادہ دلچسپی رکھتا ہے۔ خاص طور پہ اس کا آخری حصہ جس میں پاکستان میں تعلیمی حالات کو بہتر کرنے کی تجاویز و سفارشات ہیں۔ ان میں سے چیدہ چیدہ سفارشات یہاں نقل کر رہی ہوں۔ یہ دکھانے کے لئے کہ ہمارے سب سے بڑے صوبے  کی سب سے بڑی جامعہ میں سوچنے کا انداز کیا ہے۔ ایک اور اہم بات یہ کہ یہ تھیسس ضیاءالحق کے زمانے کے نہیں ابھی حال ہی میں پاس ہوئے ہیں۔

سفارشات؛

اپنے مدارس، کالجوں یا جامعات کے معلمین و معلمات کے انتخاب میں انکی سیرت و اخلاقی اور دینی حالت کو انکی تعلیمی قابلیت کے برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ اہمیت دیں اور آئیندہ کے لئے معلمین کی تربیت میں بھی اسی مقصد کے مطابق اصلاحات کریں۔

مقاصد تعلیم اور نصاب تعلیم کی تدوین و ترتیب اس طرح کی جائے کہ تمام افراد چاہے وہ ڈاکٹر ہوں یا انجینیئر استاد ہوں یا وکیل تاجر ہوں یا کسی اور شعبے سے سے متعلق اپنے پیشے میں مہارت کے علاوہ اول و آخر صحیح مسلمان ثابت ہوں۔ یعنی ہر تعلیمی سطح پر تشکیل اور تنقید نصاب میں تلاوت آیات تزکیہ اور کتاب حکمت کی تعلیم کو اساسی حیثیت حاصل ہو۔

تشکیل سیرت کو کتابی علم سے زیادہ اہمیت دی جائے۔

ہر سطح کے نصاب میں عربی زبان کو  لازمی مضمون کی حیثیت دی جائے تاکہ طلبہ اسلام کی اصل روح کو پوری طرح سمجھ سکیں۔ مجموعی طور پہ ابتدائ ، ثانوی اور اعلی سطح کے نصابات کی ترویج کے حوالے سے مسلم مفکرین کے افکار خصوصاً سید مودودی کی کتاب تعلیمات کو پیش نظر رکھیں۔

عورتوں کی تعلیم میں اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہئیے کہ انکی اصل  اور فطری ذمہ داری زراعتی فارم، کارخانے اور دفاتر چلانے کے بجائے گھر چلانے اور انسان سازی کی ہے۔

ایسی تعلیم جو ہماری نسلوں کو غیر مسلم بناتی جا رہی ہے اس تعلیم میں اتنی ترمیم کر دی جائے جس سے ارتداد و بے دینی کے سیلاب کا انسداد ممکن ہو سکے۔ اسکے لئے مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے 'نظام تعلیم کی وحدت' کا نظریہ پیش کیا ہے۔ اس تعلیمی خاکے میں ہر بات کو تفصیلی جواب موجود ہے اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

طلبہ کویہ باور  کرانا چاہئیےکہ  وہ علوم و فنون  اور تہذیب و ثقافت کے تعمیری پہلوءوں میں یوروپ کے استاد و رہنما رہے ہیں اور یوروپ نے ان ہی کے دکھائے ہوئے راستوں پر چل کر آج کے نئے علم اور ترقی کی منزل پائ ہے۔ اس لئے نئ سائینس اور ٹیکنالوجی کو اپنانا گویا اپنے ہی سرمائے کی بازیافت کے مصداق ہے۔

مندرجہ بالا سفارشات کی تفصیلات و جزیات کے لئے مولانا سید مودودی کے اصلاح تعلیم کے مقالاجات اور مختلف کتب سے رہنمائ حاصل کی جا سکتی ہے۔

جن اداروں سے استفادہ حاصل کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہیں۔ ادارہ ء تعلیم و تحقیق تنظیم اساتذہ پاکستان لاہور، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد۔ پاکستان ایجوکیشن فائونڈیشن اسلام آباد، ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور۔

ہمیں آئیندہ نسلوں کا مستقبل تابناک بنانے کے لئے اسلامی تعلیم کو اپنانے میں کوئ لمحہ ضائع نہیں کرنا چاہئیے اوردوسروں کی غلامی کا طوق گلے سے اتار دینا چاہئیے۔

چونکہ یہ تھیسس اپنی اپنی سطح پہ قبول کئے جا چکے ہیں تو کیا واقعی ہمارے تعلیمی نظام کو سدھار کے لئے یہ چیزیں درکار ہیں؟

 میرا خیال ہے اس میں واقعی ایک کمی ہے اور وہ یہ کہ تعلیم کے لئے جہاد کا اعلان کیا جائے۔

3:45 PM

پاکستان, پی ایچ ڈی, تحقیق, تعلیم, تھیسس, سید مودودی, لاہور, مقالہ, مولانا سید مناظر احسن گیلانی

الم نشرح

ایم کیو ایم  کے پنجاب میں جلسہ کرنے کے بارے میں مختلف قیاسات جاری تھے۔ میں اتوار بازار میں سبزی لے رہی تھی جب دو دوکانداروں کو جوش و خروش سے اس پہ  بات کرتے سنا کہ آج دیکھو پنجاب میں کیا ہوتا ہے۔ دماغ پہ زور ڈالا ، پنجاب میں ایسا کیا ہونے جا رہا ہے جس سے کراچی کے سبزی فروشوں کو دلچسپی ہو۔

جلسہ ہو گیا۔ اس بارے میں بھی مختلف خیالات ہیں۔ کچھ کے نزدیک ناکام تھا اور کچھ اسے کامیاب کہتے ہیں۔ ناکام کہنے والوں کے نزدیک اس میں لوگوں کی تعداد اتنی نہ تھی اور کامیاب کہنے والوں کے نزدیک اس جلسے سے ایم کیو ایم نے اپنی آواز تو پنجاب تک پہنچا دی ہے اور دوسرا یہ کہ ایک ایسے وقت میں جبکہ ملک کی دیگر سیاسی جماعتیں اپنے علاقوں میں محدود ہوتی جارہی ہیں اور وفاق کی ترجمانی کرنے کے بجائے لسانی طبقوں کی نمائمندگی کرتی ہوئ نظر آتی ہیں۔ یہ ایک مثبت قدم ہے کہ ایم کیو ایم اپنی جنم بھومی سے نکل کر دوسرے علاقوں میں بھی قدم جمانے کی کوشش کر رہی ہے دلچسپ امر یہ ہے کہ ایم کیو ایم نے دوسری سیاسی جماعتوں کے بر عکس  لسانی سیاست سے آغاز کیا تھا۔

میں اس جلسے کی کامیابی یا ناکامی کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتی اور نہ ہی میں ایم کیو ایم کی اس حالیہ سرگرمی میں کوئ خاص دلچسپی رکھتی ہوں ۔ لیکن بحیثیت ایک  پاکستانی میں یہ ضرور جاننا چاہتی ہوں کہ ایم کیو ایم نے اپنے اس جلسے میں ایسی کون سی کشش  اپنے نئے متوقع ووٹروں کے لئے رکھی ہے جس سے وہ اپنے پرانے نظام کے پرانے گھاگ اور لسانی طور پہ قریب رہ نماءووں کو چھوڑ کر انکے پیچھے ہو لیں۔

سیاسی پارٹیاں ایسی کشش اپنے منشور کے ذریعے پیش کرتی ہیں۔

 پارٹی مینیفیسٹو یا منشور ایک بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ جس کی بد قسمتی سے ہمارے یہاں کوئ شناخت نہیں۔ ہماری سیاست، پارٹی منشور کے گرد گھومنے کے بجائے شخصیات کے گرد گھومتی ہے۔ سیاست کی اس طرز کی بناء پہ ہم جمہوریت کی اصل روح سے اب تک دور ہیں اور اس چلن پہ ہمیشہ دور رہیں گے۔

عوام کے ذہن کو چند رہ نماءووں کی شخصیت کا اسیر بنا لیا جاتا ہے اور اسکے بعد عوام کے  لئے ہر دروازہ بند اور رہنماءووں کے لئے ہر دروازہ کھلتا جاتا ہے۔

پاکستانی سیاست میں یہ چلن شاید ذوالفقار علی بھٹو کی 'شہادت' کے بعد زیادہ واضح طور پہ شروع ہوا۔ اس سے پہلے تحریک پاکستان میں قائد اعظم کی شخصیت  مرکز بنی رہی۔ قیام پاکستان کے وقت ہمارے پاس واضح طور پہ ایک منصوبہ موجود نہ تھا کہ نئ مملکت کس طرح کام کرے گی۔ قائد اعظم موجود تھے۔  نئ مملکت کے قیام کے تقریباً تیرہ ماہ بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور اسکے ساتھ ہی ہمارا شیرازہ بکھرگیا۔

آج کے پاکستان میں ہم اس بات سے واقف نہیں کہ مختلف پارٹیز کے منشور کیا ہیں۔ لیکن ہم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ اس پارٹی کا کون سا شخص وہ طوطا ہے جس میں پارٹی کی جان ہے۔

یہ پیپلز پارٹی ہے۔ اسکے سربراہ زرداری ہیں جو سب پہ بھاری ہیں۔ انکا پلہ بھاری ہے کیونکہ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے جسکا فیصلہ ہم آسانی سے نہیں کر سکتے انکے پچھلے تمام بڑے رہنما شہید ہو چکے ہیں۔ ان شہید رہنماءووں کے مزار پہ نئ سیاسی امنگیں رکھنے والے آشیرباد کے لئے حاضریاں دیتے ہیں۔ عوام اپنے ازلی مسائل کے حل کے لئے ان مزاروں پہ حاضر ہوتے ہیں شاید انہیں یاد دلاتے ہیں کہ کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔ میرا اندازہ تو کہتا ہے کہ مردہ لوگ اپنے جسم کے ساتھ اپنی یادداشت بھی بھلا دیتے ہیں۔ لیکن اس بات کے لئے میرے پاس  کوئ ثبوت نہیں۔ وہ شاید یہ بھی یاد دلانا چاہتے ہیں کہ  جو مسائل اپنی زندگی میں حل نہیں کر سکے اسکے لئے اب آپکے پاس وقت ہوگا اب ذرا کوشش کر لیں۔ اس سے بہرحال ایک بات ثابت ہوتی ہے، عوام موت کے بعد کی زندگی پہ یقین رکھتے ہیں جبکہ رہ نما نہیں رکھتے۔

یہ مسلم لیگ ہے، اسکے اتنے ٹکڑے ہیں اوریہاں، وہاں، جہاں، تہاں گرے ہوئے ہیں کہ انہیں بھی شخصیات کی وجہ سے پہچانا جاسکتا ہے منشور کی وجہ سے نہیں۔ یہ مسلم لیگ نون ہے اسے پہلے ابا جی چلایا کرتے تھے آجکل سعودی حکومت کے تعاون سے چل رہی ہے۔ خوف خدا کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا ہے اس لئے پنجاب کی مڈل کلاس جو کہ مذہبی رجحان زیادہ رکھتی ہے انکی طرف مائل ہے۔ رائے ونڈ کے تبلیغی اجتماعات کی برکت سے یہ جماعت اب تک پاکستان میں جمہوریت کا عمل سازگار رکھنے کی کوششوں میں سرگرداں فرینڈلی اپوزیشن کا کردار بحسن و خوبی ادا کر رہی ہے یہ جماعت  اپنے دو شریف بھائیوں کے اتحاد کا اعلی نمونہ پیش کرتی ہے۔ اس لئے ان سے امیدیں لگانے میں اتحاد پاکستان کی امید نظر آتی  ہے۔

یہ مسلم لیگ قاف ہے۔ پہلے اسے مشرف کی جماعت سمجھا جاتا تھا۔ پھر مشرف کو اڑنگا لگا کر گرانے والی جماعت سمجھا گیا، پھرقاتل لیگ کے نام سے مشہور ہوئ۔ آجکل نہ تین میں ہے نہ تیرہ میں۔ اسکی پہچان الہی خاندان کے دو سپوت ہیں۔ مشاہد حسین صاحب نے بڑی کوشش کی کہ انکا نام بھی ہوجائے، لیکن انکی گوری رنگت اور اچھے خاصے نین نقش کے باوجود دلہن وہی جو پیا من بھائے۔ ہر کسی کو خدا ایسی سحر انگیز شخصیت نہیں دیتا کہ لوگوں کا دماغ ماءوف ہو جائے۔ یہ امتحان بھی کسی کسی کا ہوتا ہے۔

یہ مسلم لیگ فنکشنل ہے، اسکے اس نام کی وجہ شاید پیر پگارا صاحب کی ذات ہے۔ اسّی سال کی عمر میں انکے سب سے چھوٹے جڑواں بچوں کی عمریں شاید پانچ چھ سال ہیں اس لئے اس کا نام فنکشنل رکھا گیا ہے۔ اپنے مریدوں کو جب زیارت کا موقع دیتے ہیں تو دیدار کا ٹیکس لیتے ہیں۔ مرید تحفوں سے لدے پھدے آتے ہیں اور دعاءووں سے سر سبز جاتے ہیں۔ اپنے بنیادی مسائل کو وہ پیر صاحب کی کرامت سے خدا کا لکھا سمجھ کر آسانی سے جھیل جاتے ہیں۔ جبکہ پیر صاحب نئے تعلقات استوار کرتے ہیں۔ مرید پیج پگارا کے نعرے لگاتے ہیں۔

یہ اے این پی ہے۔ کسی زمانے میں بائیں بازو کی سیاست کرنے والوں میں شامل تھی آج اسمگلرز اور مافیا کے مفاد کی نگرانی کرتی ہے۔  انکے پاس باچہ خان کی یادوں کے سوا کچھ نہیں بچا۔ سب اسمگلرز اور مافیا سمیٹ لے گئے۔ افسوس، باچہ خان شہید نہ ہوئے۔ اب انکی تصویر کسی رقّت آمیز نعرے کے بغیر استعمال ہوتی ہے۔

یہ تحریک انصاف ہے، سنا ہے کہ پنجاب کے نوجوانوں میں مقبول ہونے والی جماعت ہے۔ اگرچہ کہ اسکے لیڈر پنجاب یونیورسٹی میں پنجاب کے نوجوانوں کے ہاتھوں دھوکے سے پٹ گئے۔ لیکن  پھر بھی اپنی والدہ کی یاد میں بنائے جانے والے ہسپتال کو کامیابی سے چلانے اور کرکٹ میں پاکستان کو ایک دفعہ ورلڈ کپ دلانے کے احسان میں ان سے یہ مضبوط امید کی جاتی ہے کہ وہ پاکستان کی سیاست کا بھی نقشہ بدل دیں گے۔ انکا منشور تو دور انکی جماعت کے کسی اور عہدے دار سے بھی ہم واقف نہیں۔ عمران خان کی سحر انگیز شخصیت نے کسی اور کو سامنے آنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

یہ ایم کیو ایم ہے، کراچی میں مڈل کلاس کی نمائیندہ جماعت۔ یہ پہلے مہاجر قومی مومنٹ تھی۔ اسکے وجود میں آنے کی وجہ یہ تھی کہ اس مملکت خداداد  کے جتنے بھی فرزند زمین تھے وہ وقتاً فوقتاً اپنی اپنی باری پہ یہ کہہ چکے تھے اور کہتے ہیں  کہ یہ ہم تھے جنہوں نے ان مہاجروں کو پاکستان میں جگہ دی، پناہ دی، احسان کیا۔ ان سب کو یہ یاد دلانے کے لئے کہ پاکستان اپنے وجود میں آنے سے پہلے ہندوستان تھا۔ اور اسے پاکستان بنانے کے لئے ایک لمبی جنگ لڑی گئ۔ ان علاقوں میں جہاں پاکستان نہیں بنا۔ تو اس بھولی بسری یادداشت کا ایک حصہ اس جماعت کی شکل میں آگیا۔  جب اسلحے، دنگے فساد اور طاقت میں یہ جماعت پاکستان کے دیگر فرزند زمین کے برابر آ گئ تو اب یہ چکر شروع ہوا کہ یہ تو لسانی جماعت ہے اور ہم تو سیاست کے ڈگری ہولڈرز۔  ایک دفعہ پھر اس جماعت کے مہاجروں نے قربانی دی اور اسکا نام متحدہ رکھنے پہ متحد ہو گئے۔ مسئلہ اب بھی حل نہیں ہوا۔ فریقین کے درمیان اب جھگڑا اس بات کا اٹھ کھڑا ہوا کہ نشانہ کس کا اچھا ہے۔ استاد کا یا شاگرد کا۔

اس جماعت کے اس نعرے سے مجھے بالکل تکلیف نہیں ہوتی کہ جفا کروگے، جفا کریں گے، وفا کروگے، وفا کریں گے، ہم آدمی ہیں تمہارے جیسے جو تم کروگے وہ ہم کریں گے۔ کیونکہ سماجی سائینسدانوں کا یہ کہنا ہے کہ انسان سماجی جانور ہے۔  لیکن جب میں یہ نعرہ دیکھتی ہوں کہ ہم کو منزل نہیں رہنما چاہئیے۔ تو پھر یہ کہنے کو دل چاہتا ہے کہ اتنے وزن  کا نہیں چاہئیے۔ بات میں وزن ہونا چاہئیے، لیڈر میں نہیں۔ دوسرے یہ کہ جب تقریر کرے تو یہ فرق واضح ہونا چاہئیے کہ کوئ شیعہ ذاکر وعظ کر رہا ہے یا پاکستان میں انقلاب کی بات ہورہی ہے۔ تقریر کے درمیان دو جملوں میں اتنا لمبا وقفہ ہوتا ہے کہ لوگ کہتے ہیں قدرتی ضرورت سے فارغ ہونے گئے تھے۔ مجھے امید ہونے لگتی ہے اگلے جملے تک انقلاب برپا ہو چکا ہوگا۔ اس لئے فوراً رفو چکر ہو جاتی ہوں۔ ہمیشہ اگلے دن کے اخبار سے تقریر کا متن پتہ چلتا ہے۔  یوں دستک انقلاب، صرف الطاف پہ میں راضی نہیں۔ خیر،  آجکل انہیں بھی نعرہ انقلاب لگانے سے فرصت نہیں۔ انقلاب کیسے آئے گا اسکی کیا ترجیحات ہونگیں ، اس سے ہم لا علم ہیں۔

اچھا، یہ پاکستان کی مذہبی جماعتیں ہیں، ان کی خوشش قسمتی یہ ہے کہ انہیں منشور بنانے کی قطعاً کوئ ضرورت نہیں انکا منشور صرف اسلام ہے۔ بجلی کی کمی ہو، تعلیم کا بحران ہو، بے روزگاری ہو،، عوام کے لئے کسی صحت پالیسی کی عدم موجودگی، فضائ آلودگی، سیلاب و زلزلہ، پاکستانی خواتین کی بڑھتی ہوئ فحاشی، پاکستانی مردوں کا لمحہ ء فکر و پریشانی،    پاکستانی خواتین کا کاروکاری میں مرنا ہو  یا ایک بڑی تعداد کا چھاتی کے کینسر سے مرنا ہر مسئلے کا ایک جواب۔ الحمد للہ ہم نے ماضی میں بھی، ماشاللہ سے حال میں بھی اور انشاءاللہ مستقبل میں بھی اس عزم کا اظہار کیا ہے، کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے کہ صرف اسلام ہمارے تمام مسائل کا حل ہے۔ الحمد للہ، غیرت مند مسلمان ہمارے ساتھ ہیں۔

خوش قسمتی سے یا بد قسمتی سے وطن عزیز میں صرف طالبان ایسے ہیں جن کے منشور سے ہمیں آگہی حاصل ہے یعنی ہم تو دھماکے سے مر جائیں گے صنم تجھ کو بھی نہ چھوڑیں گے۔ یہ وہ ہیں جس پہ مرتے ہیں اسے مار رکھتے ہیں۔ انکی اس ادا پہ ایک طبقہ نثار ہے۔ لیکن ایک دفعہ پھر خوش قسمتی سے یا بد قسمتی سے طالبان اس سیاسی عمل پہ یقین نہیں رکھتے جسکے لئے منشور کی ضرورت پڑے۔

یہ سب باتیں آپکو پہلے سے پتہ ہونگیں۔ اپنے اپنے رجحان کے باعث کچھ کم ، کچھ زیادہ۔ لیکن اس مختصر جائزے کے بعد یہ اندازہ لگانے میں مشکل نہیں ہوتی کہ پاکستانی عوام کے بھولپن کی وجہ سے شخصیات کا تسلط قائم ہے اور اس طرح وہ چیز جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کوئ سیاسی پارٹی عوام کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لئے کیا اسٹرٹجی اپنانا چاہتی ہے اسکی طرف جانے سے ان پارٹیز کی بچت ہو جاتی ہے۔

 ایسے ہی آج خیال آیا کہ کہ پارٹیز تو منشور بتانے سے قاصر ہیں کیوں نہ ہم عوام ہی ایک منشور ترتیب دے ڈالیں اور انکے حضور پیش کریں کہ جناب سوئیمبر رچانے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ ہمیں کیا چاہئیے۔ اس لئے شروع کرتے ہیں خدا کے با برکت نام سے۔  ایک دو تین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

11:03 PM

ایم کیو ایم, پاکستان, پیپلز پارٹی, پیر پگارا, جمہوریت, طالبان, مسلم لیگ

تعلیم کے لئے جنگ

 یہ صرف چار سال پہلے کی بات ہے , مجھے وفاقی اردو یونیورسٹی میں  پڑھانے کا اتفاق ہوا۔ یہ یونیورسٹی پہلے کالج تھی جہاں پوسٹ گریجوایٹ کی سطح پہ تعلیم دی جاتی تھی۔ بعد میں شاید اسے یہ سوچ کر یونیورسٹی کی سطح تک ترقی دی گئ کہ یہ پاکستان کی واحد یونیورسٹی ہوگی جہاں ذریعہ ء تعلیم اردو میں ہوگا۔

مگر ہوا کیا؟  یونیورسٹی کے بیشتر اساتذہ وہی تھے جو کالج کے زمانے سے پڑھا رہے تھے۔ تقریباً سبھی ماسٹرز کی ڈگری رکھتے تھے۔ تقریباً سبھی کسی علمی تحقیق سے وابستہ نہ تھے، کسی نے کبھی کسی سیمینار یا کانفرنس میں شرکت نہیں کی تھی۔ انکا کوئ تحقیقی مقالہ موجود نہ تھا۔ در حقیقت انکی اکثریت اس بات سے واقف ہی نہ تھی کہ تحقیقی مقالہ ہوتی کیا بلا ہے۔ انہیں صرف اس بات پہ ناز تھا کہ انکی مدت ملازمت کو اتنا عرصہ ہو چکا ہے۔

یونیورسٹی کے اوپر چند مذہبی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کا راج بلکہ قبضہ تھا۔ انکی پسند کے شخص کے علاوہ کسی کا ٹہرنا نا ممکن تھا۔ یہ اساتذہ تدریسی سرگرمیوں میں کم اور سازشی سرگرمیوں میں زیادہ مصروف رہتے۔ اس مذہبی گروہ کے افراد بات بے بات پہ خدا کو یاد کرتے اور اخلاقی حالت یہ کہ یونیورسٹی کے پتے پہ اگر کسی کا کوئ خط آتا تو انکے پاس  سے گذر کر آتا۔ وہ اسے کھولتے، پڑھتے اور مناسب سمجھتے تو وہ متعلقہ شخص کو ملتا ورنہ جیسے دل چاہے اسکی اطلاعات کو استعمال کرتے۔

 اسے یونیورسٹی کا درجہ ملے ہوئے پانچ سال کا عرصہ ہو رہا تھا۔ مگر فارمیسی کی پریکٹیکل لیبز ہونے کا سامان نہ تھا۔  کیمسٹری کی لیب میں کیمیکلز نکالنے کے وہ چھوٹے چھوٹے چمچے موجود نہیں تھے جو

اسپےچولا

کہلاتے ہیں حقیر ترین چیز جن کی قیمت اس وقت دس پندرہ روپے ہوگی۔ ساٹھ اسٹوڈنٹ کی لیب میں دو اسپے چولا اور تین برنرز۔ باقی سامان کا بھی یہی حساب، لٹمس پیپر جیسی روز کے استعمال کی سستی ترین شے کیمسٹری کے چیئر مین سے مانگ کر لائ جاتی۔

میری اس طرف بار بار توجہ دلانے پہ ہماری چیئر پرسن جو کیمسٹری ڈپارٹمنٹ سے لا کر یہاں مقرر کی گئ تھیں۔ اور جو کسی بھی قسم کی تحقیق تو دور تدریسی عمل میں بھی کئ سالوں سے شامل نہ تھیں۔ سخت آگ بگولہ ہوئیں اور کہنے لگیں کہ پچیس سال سے ہم پڑھا رہے ہیں ہمیشہ کیمیکلز نکالنے کے لئے کاغذ پھاڑ کر اسکی ڈوئ بنائ آپکے بڑے نخرے ہیں اسپے چولا ہونا چاہئیے۔ میرے جیسے جونیئر استاد نے یہ احمقانہ دلیل سنی اور خاموش ہو گیا۔

ماں باپ اپنی جان مار کر اپنے بچوں کو ان یونیورسٹیز میں بھیجتے ہیں۔ یونیورسٹی میں پڑھنے والے کراچی کے بیشتر نوجوان  گھر واپس جا کر ٹیوشن پڑھاتے ہیں اور تب اپنے تعلیمی اخراجات کو پورا کرنے کے قابل ہو پاتے ہیں۔ لیکن میں آپکو یہ بات وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ جس طرح کا معیار تعلیم میں نے اس یونیورسٹی میں دیکھا اور جو لیبز کی حالت تھی۔ یہاں  دی جانے والی ڈگری، جعلی ڈگری کے برابر ہی تھی۔

ماسٹرز ڈگری کے حامل یہ اساتذہ، اپنے سالوں پرانے لیکچرز پڑھا رہے تھے۔ شعبے کے ایک سینیئر ٹیچر نے انتہائ ناقص کتابچہ کیمسٹری کی رہنمائ کے لئے تحریر کر رکھا تھا اور نئے آنے والے تمام ٹیچرز پہ فرض تھا کہ وہ اسی کتابچے سے تجربات کی تھیوری اور طریقہ لکھوائیں۔  میں نے اسے ایک طرف رکھا اور ذاتی طور پہ اپنی لیب کے لئے ایک کتابچہ خود تیار کیا اس اطلاع پہ ان سینیئر ٹیچر نے فوری ایکشن لیا۔ چیئر پرسن نے فوراً طلب کر کے  کہا، آپ اپنے کتابچے کو ابھی رہنے دیں۔ اگلے سال اسے دیکھیں گے۔ ابھی پرانے کتابچے  کو ہی استعمال کروائیے۔ انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ بحیثیت یونیورسٹی ٹیچر وہ اس بات کا حق نہیں رکھتیں کہ سلیبس کے علاوہ میرے طریقہ ء تدریس میں دخل دیں اور مجھے کسی خاص کتاب کے استعمال پہ مجبور کریں۔ مجھے معلوم تھا لیکن ہر دفعہ کی طرح پھر خاموش ہوئے۔

یونیورسٹی کا نام اگرچہ اردو یونیورسٹی تھا مگر یہاں اردو میں تعلیم نہیں دی جا سکتی تھی۔ کیونکہ اردو میں سائینس کی کتب ہی کتنی موجود ہیں۔ سو اسکے قیام کا بہانہ، دراصل بش کے اس بہانے کی طرح تھا جو اس نے عراق پہ حملے کے لئے کیا تھا۔

خیر، ایک ایسی ناگفتہ بہ حالت میں جبکہ  تعلیمی سرگرمیوں پہ خرچ کرنے کے لئے پیسے نہ تھے۔  ہمارے مذہبی ٹولے کی ملی بھگت سے یونیورسٹی میں انکے پسندیدہ با ریش وائس چانسلر کی آمد ہوئ تو انہوں نے پہلا اور آخری کام اپنی سوابدید پہ   یہ کیا کہ  وائس چانسلر آفس کے لئے نئے گلاس منگوائے کیونکہ پرانے گلاسوں کی شکل انکے خیال میں ان گلاسوں سے مشابہ تھی جن میں شراب پی جاتی ہے۔ یعنی وہ جام جیسے تھے۔ ان گلاسوں کی تبدیلی کے بعد وائس چانسلر اپنی عاقبت سنوارنے کے مشکل مرحلے سے نکل کر عالم سکون میں آگئے۔ باقیوں کا رقص بے خودی بھی شروع ہوا، اس دھن پہ، سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا۔

ایسا نہیں ہے کہ صرف مذہبی طبقہ ہی ایسی کرپشن کرتا ہے ۔ غیر مذہبی بھی کرتے ہیں۔ لیکن یہ چیز اس وقت اتنی بد تر مذاق کی صورت لگتی ہے جب ایک شخص اپنے آپکو زیادہ مذہبی ثابت کر رہا ہو، اس پہ فخر کرتا ہواور دوسروں پہ نفرین بھیج رہا ہو پھر اس ساری نفرین کے بعد وہ وہی کرپشن زور و شور سے کرے جو دوسرے لوگ بغیر مذہبی و اخلاقی پند و نصائح کے کرتے ہیں۔

اب لیبز تو سامان کی کمی کی وجہ سے ہو نہیں پاتی تھیں۔ لے دے کر تھیوری کی کلاسز ہی منعقد ہوتیں اس کے بعد ہمارے پاس خاصہ وقت ہوتا۔ گیارہ بارہ گھنٹے ہر ہفتے کے کریڈٹ آرز کے بعد تو خاصہ وقت ہوتا ہے۔  ایکدن میں نے اپنی چیئر پرسن سے کہا کہ میرے پاس خاصہ وقت ہوتا ہے اور میں سوچتی ہوں کہ فارغ ہونے کے بعد کچھ اس طرح ورک شیڈول ترتیب دوں کہ کراچی یونیورسٹی جا کر کسی تحقیقی پروجیکٹ پہ کام شروع کردوں۔ اس طرح جو پبلیکیشن بنے گی اس میں اردو یونیورسٹی کا نام بھی آئے گا۔ میری ماسٹرز کی ہوئ پچیس سالہ تجربے کی حامل سینیئر استاد نے اپنے سر کا اسکارف صحیح کیا اور کہنے لگیں جب آپکو اپائینٹمنٹ لیٹر ملا تو اس پہ کیا لکھا تھا؟ پھر میرے سوالیہ تائثر پہ انہوں نے بیان کیا کہ اس میں  یہ لکھا تھا کہ یونیورسٹی کو ایک استاد چاہئیے یا یہ لکھا تھا کہ انہیں ایک تحقیق داں چاہئیے۔ یہ ایک تحقیقی ادارہ نہیں یونیورسٹی ہے۔ اب آپ ریسرچ  کو بھول جائیں۔

آپ میں سے کچھ لوگوں کو اب  سمجھ آئے گا صرف بلاگی دنیا میں ہی اس قبیل کے لوگوں  نہیں بلکہ اس مملکت خداداد میں جہاں نکل جائیں وہاں یہ اسپی شی موجود ہے۔

ایک مایہ ناز یونیورسٹی کی، ایک اہم ڈپارٹمنٹ کی چیئر پرسن، یہ کہتی ہے کہ یونیورسٹی کا تحقیق سے کیا تعلق تو اس چیئر پرسن کو کسی کالج یا اسکول میں ہونا چاہئیے، یونیورسٹی میں نہیں۔  یونیورسٹی کی بنیاد کا مقصد ہی تحقیق کو تعلیم سے جوڑنا ہوتا ہے۔

آخر یونیورسٹی کی اس دگرگوں حالت کا کون ذمہ دار تھا۔ کون اس بات کا ذمہ دار تھا کہ وہ یونیورسٹی کے معیار پہ نظر رکھے، وہ اس بات کو جانچے کہ یونیورسٹی اپنے طلبہ کو جن سہولیات کو پہنچانے کا دعوی کر رہی ہے آیا وہ ایسا کر پا رہی ہے یا نہیں، اتنے عرصے میں یہاں سے جتنے طالب علم اپنی تعلیم مکمل کر کے نکلے یقیناً وہ تعلیمی سطح پہ انتہائ گھٹیا معیار رکھتے تھے۔ بیرون ملک تو کیا اپنے ہی ملک کی کسی بہتر یونیورسٹی کے طالب علم سے مقابلہ نہ کر پاتے۔ لیکن اس میں کس کا قصور تھا۔ کیا اس طالب علم کا یا اس بات کا کہ اس یونیورسٹی کے اندر موجود لوگوں کے ایک گروہ کو پتہ تھا کہ وہ جو دل چاہے کرتے رہیں۔ ان سے پوچھ گچھ کرنے والا کوئ نہ ہوگا۔

یہ کوئ واحد یونیورسٹی نہ ہوگی، مشرومز کی طرح اگ آنے والی یونیورسٹیز کی ایک تعداد اسی قطار میں کھڑی ہوگی۔

یونیورسٹیز کے معیار کو کیسے جانچنا چاہئیے؟ یونیورسٹیز کو کیسے اس بات کا پابند بنانا چاہئیے کہ وہ بہتر نتائج دیں؟ یونیورسٹیز کے اساتذہ کو کیسے مجبور کیا جائے کہ وہ اپنے آپکو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کریں؟ یونیورسٹیز کو آزاد تعلیمی ماحول دینا کس کی ذمہ داری ہے؟ یہ امر کیسے باور کرایاجائے کہ یونیورسٹیز کو سچی اور معیاری تحقیق سے جڑا رہنا چاہئیے؟

میں نے کچھ ہنگامہ بپا کرنے کے بعد یونیورسٹی چھوڑ دی۔ اس دوران بارہا مختلف صاحب علم لوگوں سے پوچھا اور یہ سوال میں اب بھی اپنے ملک کے اس دانشور طبقے سے پوچھنا چاہتی ہوں جو اس ملک میں تعلیم کی حالت پہ  فکر مند رہتے ہیں۔ کیا آپ واقعی تعلیمی زبوں حالی پہ فکر مند ہیں؟

آج ایچ ای سی کو ختم کرنے پہ احتجاج جاری ہے۔

ایچ ای سی کے دامن پہ داغ بھی ہیں اور کامیابیاں بھی۔

ملک میں زیادہ تعداد میں یونیورسٹیز کھولنے اور زیادہ سے زیادہ طلباء کو پی ایچ ڈی کی ڈگری دینے کے چکر میں معیار کا کوئ خیال نہیں رکھا گیا۔  یونیورسٹیز میں تحقیقی سہولیات مہیا کرنے کے بارے میں کوئ دلچسپی نہیں لی گئ۔ جہاں تھوڑی بہت ہو رہی ہے،  انہیں اس بات پہ مجبور کرنے کے لئے کوئ منصوبہ نہیں بنایا گیا کہ وہاں ایسی تحقیق کو پذیرائ ملے جو ہمارے ملک کے لئے کار آمد ثابت ہو۔ باہر سے آنے والی فنڈنگ بشمول اسکالر شپس کو منظور نظر افراد اور اداروں کی نذر کیا گیا۔ ملک میں پی ایچ ڈی کرنے والے افراد کو کھپانے کے لئے کوئ منصوبہ بندی نہیں کی گئ۔

ان میں سے بیشتر باتوں کو یہ کہہ کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ کرپشن ہمارے ملک کا مزاج ہے۔ بہت کم ایسا ہو پاتا ہے کہ حق دار کو اسکا حق ملے۔ اور کچھ  نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔ غریب ممالک میں، تبدیلی یک لخت نہیں آتی۔ ادارے جیسے جیسے پختگی کی طرف بڑھتے ہیں زیادہ بہتر ہو جاتے ہیں۔

 اسکے ساتھ ایچ ای سی کے حصے میں تمغے جاتے ہیں۔ بیرون ملک سے پاکستانی طلباء طالبات کے لئے اسکالر شپس حاصل کی گئیں، ریسرچ کے لئے فنڈنگ ملی۔ سب سے بڑھکر یہ کہ بیرون ملک سے غیر ملکی اساتذہ آئے جنکی وجہ سے یہاں طلباء طالبات کو مہمیز ملی اور اندازہ ہوا کہ باہر کس طرح اساتذہ اپنی تدریسی سرگرمیوں کو دلچسپ بناتے ہیں اور کیسے انہیں اپنی تحقیق کے ساتھ جوڑتے ہیں۔

پاکستان سے کثیر تعداد میں طلباء طالبات باہر گئے، انہیں ایک نئ، مختلف دنیا دیکھنے کو ملی۔  وہ نئ ثقافتوں کو دیکھ کر

 واپس آئے اور لازماً یہ صورت  ملک میں پھیلتی ہوئ انتہا پسندی کو روکنے میں سازگار ہو سکتی ہے اور کسی قوم کی بالغ نظری کی بنیاد بن سکتی ہے۔

ان اسکالرشپس سے  ملک کے دوردراز کے علاقوں کے لوگ بھی مستفید ہوئے۔ ایسے لوگ بھی باہر اعلی تعلیم کے لئے گئے جو کبھی تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ وہ وظیفے پہ اتنی اعلی تعلیم حاصل کر پائیں گے۔

اب بجائے یہ کہ ایچ ای سی کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے اقدامات کئیے جاتے۔ حکومت نے ہمیشہ کی طرح اپنی ناعاقبت اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے اسے ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ انکا کہنا ہے کہ وہ اسے صوبوں کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔

پیپلز پارٹی جو اپنے آپکو ایک وفاقی جماعت کہتی ہے وہ خدا جانے دن بہ دن ایسےفیصلے کیوں کر رہی ہے جو اسے ایک وفاقی جماعت کے بجائے ایک علاقائ جماعت بنائے دے رہے ہیں۔

اب شاید وہ لمحہ آن پہنچا ہے کہ ہم اپنے کچھ مسئلوں کو جنگی نوعیت کا قرار دے کر ان پہ پورے جذبے کے ساتھ کام کریں اور ان میں سب سے پہلا مسئلہ تعلیم کا ہے اسلام کا نہیں۔ صوبوں کو اسکول کی تعلیم کا حق حاصل ہے انہیں اسکی ترویج کے لئے جان لگانی چاہئیے۔

پولیو کے ٹیکوں کی طرح پرائمری سطح کی تعلیم کے لئے ایک ٹارگٹ مقرر کرنا چاہئیے کہ آئیندہ پانچ  سال میں ہمارا ہر بچہ اسکول کی اتنی تعلیم حاصل کرے گا اخبار پڑھ سکے اور اپنی زبان میں خط لکھ سکے۔ جب صوبے اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو جائیں تو انہیں ہائیر ایجوکیشن کی ذمہ داری دی جائے۔ فی الوقت تو یہ فیصلہ صرف دو پس منظر رکھتا ہوا لگ رہا ہے۔ ایک جعلی ڈگری کی شناخت کی وجہ سے ایچ ای سی پہ عتاب اور دوسرے صوبوں کو تعلیم کی مد میں ملنے والے فنڈ میں زیادہ خرد برد کے آسان مواقع حاصل کرنا۔ صوبوں کی سطح پہ جہاں علاقائ اثر زیادہ گہرا ہو گا، خرد برد اور غبن کے مواقع زیادہ آسان ہونگے۔

11:36 PM

اردو یونیورسٹی, ایچ ای سی, پاکستان, تعلیم, سائینس, کراچی, کراچی یونیورسٹی, کیمسٹری

دریافت نایافت

بچے انسانی سوچ و فکر کے ارتقائ سفر کا بہترین مطالعہ بن سکتے ہیں۔ آجکل میں دیکھتی ہوں کہ کیسے میری چار سالہ بیٹی اپنے مشاہدے اور ضروریات کے مطابق اپنے خدا اور اسکی صفات کا ادراک حاصل کر رہی ہے۔

اس نے اب سے چند مہینے پہلے جب مونٹیسوری اسکول کا سفر شروع کیا تو وہ گھر سے جس اللہ کا تصور لے کر وہاں گئ تھی وہ اس سے محبت کرنے والا تھا۔ تحفے تحائف دیتا تھا اور اسکی ماں کی کسی بات سے خوش ہو کر تحفے میں انہیں اس جیسی پیاری بٹیا تحفے میں دے ڈالی۔ وہ جانتی ہے وہ خدا کا تحفہ ہے۔

لیکن اس خدا کے ساتھ مسائل تھے۔ اول ، وہ اسے نظر نہیں آتا تھا، دوئم اس نے ذاتی طور پہ اسے کچھ نہیں دیا تھا۔ وہ صرف ماما کے ذریعے اطلاع دیتا تھا کہ وہ مشعل کو پسند کرتا ہے۔ اس کے لئے روزانہ چاند، سورج ، ستارے نکالتا ہے، مگر یہ سارے کام بہت خفیہ طریقے سے ہوتے ہیں۔

ماما کہتی ہیں کہ کھانا اللہ دیتا ہے لیکن اس میں بھی جان نہیں لگتی کیونکہ بظاہر تو یہ ماما ہوتی ہیں جو بازار سے چیزیں لے کر آتی ہیں، گھر میں پکاتی ہیں اور میز پہ سجاتی ہیں۔ ایسے اللہ کو زیادہ یاد رکھنے کا کیا فائدہ، جو دوسروں سے پتہ چلتا ہے۔ پھر یہ کہ اس نرم خو، بے ضرر اللہ کا اوروں پہ رعب نہیں پڑتا۔

اسکول جانے کے کچھ عرصے بعد اسے ایک اور طرح کے اللہ میاں کا پتہ چلا۔ یہ وہ اللہ تھا جو گناہ دیتا ہے شرارتی بچوں کا، برے لوگوں کا دماغ صحیح کر دیتا ہے اور جو اچھے لوگ ہیں ان پہ بھی نظریں رکھتا ہے کہیں کوئ بد تمیزی نہ کر دیں۔  یہ اللہ مشعل کے مزاج سے میل کھاتا تھا۔ انہیں پسند آیا۔

شروع  شروع میں انہوں نے اسے خاطر میں نہ لانے کا خیال کیا اور گناہ دینے کی ذمہ داری خود اٹھانے کی کوشش کی۔ اور جب بھی انہیں لگتا کہ انکی شان میں گستاخی کی گئ ہے وہ فوراً وارننگ دیتیں کہ صحیح ہو جائیں ورنہ میں گناہ دے دونگی۔ آپ نے مجھے ڈانٹا، میں آپکو بہت گناہ دونگی۔

چند دنوں میں انہیں اندازہ ہوا کہ انکے  خود گناہ دینے سے لوگوں پہ کچھ ایسی دہشت طاری نہیں ہوتی، الٹا لوگ ہنستے ہیں۔

اللہ کا رعب اور دبدبہ، اپنے مفاد کے لئے استعمال کرنے کا نسخہ ء کیمیاء انہیں بھی سمجھ میں آ گیا۔ اب وہ کسی سے ناراض ہوتیں تو اپنی دو ہتھیلیاں جوڑ کر اٹھاتیں اور زور سے کہتیں کہ اللہ میاں انہیں گناہ دے دیں۔ اگر کوئ ان کی اس ادا پہ مسکراتا تو اسے زیادہ سخت گناہ کی وعید ملتی۔ زیادہ تر لوگوں نے انکی اس ادا پہ توجہ دی۔ یعنی اس طریقہ میں کامیبای کے آثار نظر آئے۔

پھر کسی نے ایک دن ان سے دریافت کیا  کہ گناہ کیا ہوتا ہے؟ انہوں نے اپنی تھوڑی کو کھجایا، سر پہ شہادت کی انگلی سے کئ دفعہ دستک دی پھر آنکھیں پھیلا کر جواب دیا، گناہ ایک زخم ہوتا ہے۔  اشفاق احمد بھی شاید اسی طرح کی بات کہتے۔ مزید پتہ چلا کہ جو لوگ بات نہیں مانتے انہیں اللہ میاں زخم لگا دیتا ہے اور اس میں سے پھر بہت خون نکلتا ہے۔ بہت تکلیف ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنے چہرے پہ انتہائ کربناک تائثر پیدا کرے ہوئے کہا۔

لیکن پھر یہاں سے کہانی میں ٹوئسٹ پیدا ہوا۔ اگر مشعل اللہ میاں کا تحفہ ہے اور اللہ میاں اس سے محبت کرتے ہیں اور اللہ میاں ماما سے بھی محبت کرتے ہیں تو اللہ میاں ایک اتنا تکلیف والا، خون بہنے والا زخم کیسے دے سکتے ہیں۔

اس خیال کے اظہار کے  بعد مشعل ، ناراض ہوئیں اور گناہ کی نوید دیتی ہوئ چل گئیں، لیکن کچھ ہی دن گذرے تھے کہ انہوں نے اپنی کہانی میں ایک کردار کا اضافہ کیا۔

اور یہ کردار تھا شیطان کا۔  کھانے کی میز پہ جب سب کسی ایسی گفتگو میں لگ جاتے جو انکی دلچسپی کی نہ ہوتی تو اب وہ خدا سے گناہ دینے کی درخواست کے بجائے زورزور سے کہتیں، سب خاموش ہو جائیں، جو کھانے کے دوران بات کرتا ہے اسکا کھانا شیطان کھاتا ہے۔ پھر شیطان بڑا کار آمد ثابت ہونے لگا۔  تیز نہیں چلنا چاہئیے، ورنہ شیطان ساتھ چلتا ہے۔ دن میں بستر پہ نہیں لیٹنا چاہئیے شیطان بھی ساتھ لیٹ جاتا ہے۔ ہر وہ کام جو وہ چاہتی تھیں کہ انکے منسلکہ لوگ نہ کریں اس سے براہ راست منع کرنے کے بجائے شیطان سے وابستہ کر دیتیں۔ اس طرح وہ خود بچ جاتیں اور جس کسی کو لعنت دینی ہوتی وہ شیطان کو دیتا۔

ہر وقت شیطان کے ذکر سے گھبرا کر، ایک دن دادی اماں نے پوچھا آخر یہ شیطان کون ہے کیوں ایسا کرتا ہے؟ انہوں نے اپنے نگٹس کو کیچپ میں ڈبوتے ہوئے نہایت تشویشناک سنجیدگی سے کہا دادی اماں، شیطان بہت برا 'شخص' ہوتا ہے۔ کیا برا کام کرتا ہے؟ جواب ملا، آپکو نہیں پتہ بہت برے کام کرتا ہے۔ مثلاً کیا کرتا ہے؟ وہ ناں انہوں نے نگٹ کے اوپر سے کیچپ کو چاٹا۔ وہ ناں ، دوسروں کے نگٹس کھا جاتا ہے، کیچپ میں پانی ملا دیتا ہے، صوفے پہ پانی گرا دیتا ہے، کھانے کی ٹیبل پہ پانی گرا دیتا ہے اور پانی کے گلاس میں اسٹرا ڈال کر گُڑ گُڑ کرتا ہے۔ بہت خراب ہوتا ہے بالکل بد تمیز۔

لیکن جیسا کہ  بیان سے لگ رہا ہے اور اسے جلد ہی مشعل نے بھی محسوس کر لیا کہ شیطان کی عادات و اطوار بہت کچھ انکی عادت و اطوار سے ملتی جلتی ہیں۔ ایک دفعہ پھر انہیں اللہ میاں کی طرف رجوع کرنا پڑا۔  اس دفعہ عقلمندی دکھاتے ہوئے انہوں نے اللہ میاں کے دو حصے کر دئیے۔ ایک اچھے اللہ میاں ہیں۔ جو تحفے وغیرہ دیتے ہیں اور دوسرے اللہ میاں بہت خطرناک ہیں وہ تیر کی طرح سیدھا رکھتے ہیں گناہ وغیرہ دے کر۔ گناہ تو اب آپ سمجھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ سو اب وہ اپنے عقائد میں زرتشتوں سے خاصی قریب ہے یعنی خدا دو طرح کے ہوتے ہیں ایک نیکی کا خدا یزداں اوردوسرا بدی کا خدا اہرمن۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ مسلمانوں کے خدا تک انکی رسائ کیسے ہوتی ہے۔

8:22 PM

اللہ, اہرمن, خدا, زرتشت, شیطان, مشعل, یزداں

ساحل کے ساتھ-۱۰

گذشتہ سے پیوستہ

یہ ایک ڈائیوو کی ائیر کنڈیشنڈ اور باہر سے خاصی بہتر نظر آنے والی بس تھی مگر اندر داخل ہوتے ہی ایک شدید گھٹن کا احساس ہوا۔ کوئ ایک خاتون نظر نہ آرہی تھی۔ سیٹ تک پہنچنے کے لئے جو قدم بڑھائے تو معلوم ہوا کہ درمیانی راستے سے لیکر بس کے پچھلے حصے میں سامان ٹھنسا پڑا ہے۔ حالانکہ بس کے نچلے حصے میں جگہ تھی  لیکن معلوم ہوا کہ وہاں گنجائش ختم ہو گئ ہے۔آخر گوادر میں ایسا کیا ملتا ہے۔

گھٹن کے احساس کی وجہ بس میں کپڑوں کی زیادہ موجودگی تھی۔ کھڑکیوں پہ پڑے لال رنگ کے مصنوعی ریشم کے موٹے پردے جن پہ اسی کپڑے کی چوڑی چوڑی جھالریں لٹک رہی تھیں۔ بس کی چھت پہ بھی یہی کپڑا منڈھا ہوا تھا۔ کھڑکیوں کے درمیانی وقفے پہ مصنوعی لال بڑے بڑے پھولوں کے گچھے آویزاں۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد خوب گھیر داربلوچی کپڑوں میں ملبوس انکے سربڑے بڑے پگڑسے سجے۔

سامان پہ سے چھلانگ لگنے کی مہارت دکھاتے ہوئے، میں نے بیٹھتے ہی اپنی کھڑکیوں کے پردوں کو جہاں تک ممکن تھا سمیٹ دیا۔ باہر گھپ اندہیرا تھا مگر پھر بھی نجانے کیوں ایک تسلی سی ہو گئ۔ میں باہرمحسوس ہونے والی  وسعت کو بس میں شامل سمجھ رہی تھی۔

مجھے اپنا ترکی کا سفر یاد آیا۔ پندرہ دن میں ہم نے چھ شہر دیکھے۔ رات بھر ایسی ہی بسوں میں سفر کرتے تھے اور دن میں تفریح۔ لکن ان بسوں میں اندر سامان کے نام پہ صرف بیک پیک ہوتا تھا۔ ایک مناسب ہوائ سفر کی اکانومی کلاس کا مزہ۔ دوران سفر چائے یا جوس اور بسکٹس یا مونگ پھلیاں تواضع میں شامل ہوتیں۔ ان بسوں کی سب سے بڑی خوبی وقت کی پابندی تھی۔ ترکی کا سیاحوں کا پسندیدہ مقام ہونے میں ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا بڑا حصہ ہے۔

بس چل پڑی تو لوگوں نے شور مچانا شروع کیا۔ فلم لگاءو، اوئے فلم لگاءو۔ فلم کا شاید انتظام نہ تھا اس لئے موسیقی مہیا کی گئ۔ اور اس کا آغاز بلوچی موسیقی سے ہوا۔

ہم، ہمراہ لائے کھانے سے فارغ ہوئے۔ مشعل سو گئ انکے ابا  بھی آنکھیں موند کر پڑ گئے۔ میں ان بد قسمتوں میں سے ہوں جن کا دوران سفر سونا محال ہوتا ہے۔ اور جب منی اتنے زور وشور سے بد نام ہو رہی ہو تو کون کافر سو سکتا ہے۔ یوں بلوچی گانوں کے بعد انڈین گانوں کی باری آئ۔ بس میں سب جیسے نشے میں دھت تھے۔

اے شمع ، تیری عمر طبیعی ہے ایک رات

ہنس کر گذار یا اسے رو کر گذار دے

یہ سائکل جاری تھا۔ کچھ بلوچی اور کچھ انڈیئن گانے ہر دو کے درمیان، منی کی بدنامی کا سریلا، بھڑکیلا اور رسیلا بیان۔ بلوچی اور انڈیئن، دونوں ہی گانے عشق مجازی کے شیرے میں ڈوبے ہوئے۔ لیکن دونوں میں ایک فرق تھا۔ بلوچی گانوں میں گانے والی ایک بھی عورت نہ تھی۔ جبکہ انڈیئن گانے عورت اور مرد دونوں کی آوازوں میں تھے۔ یہ فرق شاید غیرت کے فرق کی وجہ سے تھا۔

تقریباً پون گھنٹے کے بعد بس  پہلی رینجرز کی چوکی پہ رکی۔  کنڈیکٹر نے نعرہ مارا سب اپنے بیگز لے کر نیچے اتر جاءو۔ بس میں سے ایکسرے مشین نظر آرہی تھی۔ میں نے سوچا اتنے سامان سے لدی گاڑی میں سے ہر ایک شخص اپنا سامان چیک کرائے گا تو کم ازکم دو گھنٹے یہیں خرچ ہو جائیں گے۔ پھر مشعل کے بابا کو دو ہینڈ کیری اور ایک بڑا بیگ چیک کروانا ہو گا بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔  بے چارے سامان ہی ڈھوتے رہیں گے۔

لیکن لگا کسی نے کنڈیکٹر کی بات نہیں سنی۔ دو تین دفعہ اس نے اور کہا۔ سب یونہی گل محمد بنے پڑے رہے۔ زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد۔ پھر رینجرز کا ایک آدمی اندر آیا، ایک ٹارچ کی بے قابو روشنی ادھر ادھر پھینکی۔ بیگ چیک کراءو اوئے سب۔ چھ سات لوگوں  رضاکارانہ طور پہ اٹھے۔ ان میں ہمارے صاحب بھی شامل تھے۔ ہمارے سامنے جو دس بارہ لوگ بیٹھے تھے وہ اپنے جثّے سے ایجنسیز کے لوگ رہے تھے وہ اسی طرح پڑے رہے۔ سب نے اپنے ساتھ ایک ایک بیگ لیا۔ دس منٹ میں سب واپس آگئے۔ مردم پورے۔ بس دوبارہ چل پڑی۔ کیا ایکسرے مشین سے گذارا تھا۔ نہیں ، ایسا کچھ نہیں ہوا۔

پاکستان زندہ باد۔

گوادر ساحلی شہر ہونے کی بناء پہ اسمگلروں کا پسندیدہ مقام ہے۔ اٹھارویں صدی میں سمندری سچے موتیوں کے قزاق تھے۔ اور اکیسویں صدی میں اسمگلرز۔ جب تک کوسٹل ہائ وے نہی بنی تھی۔ کراچی تک پہنچنا آسان نہ تھا۔ ایران سے سرحد ملی ہوئ ہے۔  ویزے کی ضرورت نہیں۔  یوں گوادر ڈسٹرکٹ میں ایران کی مصنوعات چھائ ہوئ تھیں۔ چاہے وہ چائے پینے کے معمولی کپ ہوں، کھانے کا تیل ہو یا گاڑیوں کا تیل۔ بہت سارے گوادریوں کی شادیاں بھی ایران میں ہوئ ہیں۔

پٹرولیئم مصنوعات ایران سے اسمگل ہو کر آتی تھیں اب بھی آتی ہیں البتہ دیگر ضروریات زندگی میں اب پاکستانی اشیاء آ گئ ہیں۔ گوادر میں تین چار سال پہلے ایک سپر مارکیٹ بھی کھل گئ ہے۔

دو ہزار تین میں جب میں گوادر پہنچی تو گوادر میں پٹرول کی قیمت کراچی کے مقابلے میں تقریبا آدھی تھی۔ پہلے یہ اسمگل شدہ تیل ٹرالرز کے ذرہعے پہنچایا جاتا تھا، پھر ہائ وے بننے کے بعد گوادر سے پٹرول اسمگل ہو کر بسوں وغیرہ کے ذریعے کراچی آتا رہا۔

لیکن ہوا یہ کہ کراچی پہنچانے کے لئے عام طور پہ انہی بسوں کے خفیہ خانوں میں پٹرول موجود ہوتا تھا۔  جب کئ دفعہ ایسا ہوا کہ پٹرول کی ٹنکیاں زیادہ گرمی کی وجہ سے پھٹ گئیں  اور ائیر کنڈیشنڈ بس ہونے کی وجہ سے پوری پوری بسوں کو آگ لگ گئ۔ تو پٹرول کی اسمگلنگ میں کمی آئ۔ پھر یہ کہ ایران اور پاکستان مین پٹرول کی قیمتوں میں قابل منافع فرق نہیں رہا۔ لیکن ابھی بھی ڈیزل کی اسمگلنگ جاری ہے۔  ایرانی مصنوعات کا معیار بھی گھٹیا ہوتا ہے۔ گاڑی میں مسائل پیدا کرتا ہے۔

گوادر کے مقامی لوگوں کا کاروبار یا تو مچھلیوں سے متعلق ہے یا اسمگلنگ سے متعلق۔  مشرف دور میں گوادر میں ریئل اسٹیٹ کا کاروبار عروج پہ تھا۔ سنتے ہیں کہ باہر سے لوگ بوریوں میں پیسے بھر کر لاتے تھے۔ زمین خریدنے کے لئے۔ جس جگہ میں نے مٹی کے بنے ہوئے چند مکانات دیکھے تھے۔ محض دوتین سالوں میں وہاں ایسے گھر کھڑے ہو گئے جو کراچی میں ڈیفینس کے علاقے میں نظر آتے ہیں۔ اعلی برانڈ کی کاریں حتی کہ عام لوگوں کے پاس سیٹیلائیٹ فون ہوا کرتے تھے۔ لوگوں کی بہتات کی وجہ سے پرل کانٹی نینٹل نے ایک خوبصورت عمارت بھی اپنے ہوٹل کے لئے بنائ۔ لیکن حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔ اب وہاں سناٹا ہے۔ بلبل نے آشیاں چمن سے اٹھا لیا،اسکی بلا سے بوم بسے یا ہُما رہے۔

لوگ ایک دفعہ پھر اسمگلنگ کی طرف متوجہ ہوئے۔ مہینے میں ایک لانچ تین چار چکر لگا لے تو چار پانچ لاکھ روپے بن جاتے ہیں۔ جس بس میں ہم جا رہے تھے اسکے متعلق بھی اطلاع تھی کہ اس میں ڈیزل جا رہا ہے۔ ڈیزل کے علاوہ، شراب کی بھی اسمگلنگ ہوتی ہے۔ یہاں سر عام پینا کوئ برائ نہیں۔

رات کو ڈھائ بجے ارمارہ پہنچے۔ بس کے بیشتر لوگ حوائج سے فارغ ہونے کے لئے اتر گئے۔ میں بھی اتر گئ۔  ایک  دفعہ پھر ایک لڑکا دوڑتا ہوا آیا۔ لیڈیز ادھر ہے۔ میں اسکے ساتھ گئ۔ ہوٹل کے پچھواڑے میں ایک کمرہ جس میں کوئ کھڑکی نہ تھی صرف ایک دروازہ تھا۔ اور فرش پہ چٹائیاں پڑی تھیں۔ یہ کیا ہے۔ کھانے کا کمرہ عورتوں کے لئے۔ میں نے اس سے کہا کہ لیڈیز کا واش روم کہاں ہے۔ وہ میری بات  پہ کچھ حیران سے ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے واش روم کے ہونے پہ تعجب تھا یا لیڈیز کے واش روم کے ہونے پہ تعجب تھا۔

 میں اسے حیرانگی میں چھوڑ کر واپس ہونے لگی تو تاحد نظر پھیلے ہوئے اندھیرے اور ویرانے میں مجھے ایک بہت عجیب سا احساس ہوا۔ جہاں روشنی کی حد ختم ہو رہی تھی اور اندھیرے کا راج شروع ہو رہا تھا وہاں  ایک کے بعد ایک ، دور تک گٹھریاں سی رکھی ہوئ تھیں۔ لیکن غور سے دیکھنے کے بعد میں نے اپنا سر جھٹکا یہ گٹھریاں نہیں ایکدم زندہ سلامت انسان تھے۔ ہر غیرت سے بھرپور انسان بھی  چند حیاتیاتی عوامل سے جان نہیں چھڑا سکتا۔  مجھے قدرت اللہ شہاب کی کتاب شہاب نامہ میں ان کا سکھوں کے متعلق بیان یاد آگیا۔

بس میں واپس آکر مجھے خیال آیا کہ مشعل کو اٹھا کر اسے بھی فارغ کرا لینا چاہئیے۔ مبادا رستے میں انہیں ضرورت محسوس ہو تو بس رکوانے میں بڑی مشکل ہو جائے گی۔ انکے جوتے تلاش کرنے کے لئے سیٹ کے نیچے ہاتھ مارا تو ایک عجیب سا پھل میرے ہاتھ میں آگیا۔ سخت اور روئیں دار۔ یہ کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے اسے روشنی میں نکال کر دیکھا۔ یہ کیوی فروٹ تھا۔ ایران میں پیدا ہوتا ہے اور کراچی میں سو روپے سے زائد صرف ایک پھل ملتا ہے۔ اس کا سائز ایک مرغی کے انڈے کے برابر ہوتا ہے۔ اب جو میں نے روشنی لے کر نیچے جھانکا تو متعدد سیٹوں کے نیچے اسکے کریٹ موجود تھے۔

سب لوگ واپس آئے۔ مردم پورے کا نعرہ بلند ہوا اور بس روانہ۔

اگلی چوکی صبح چار بجے کے وقت ملی۔ جیسے ہی بس رکی۔ رینجرز کے ایک صاحب اندر داخل ہوئے۔ ڈرائیور سے کہنے لگے کتنے ہزار لٹر ڈیزل جا رہا ہے۔ سر جی جتنے میں یہ بس چل جائے۔ میں بس کے ڈیزل کی بات نہیں کر رہا انکی کر رہا ہوں جو تم چوری سے  لے کر جاتے ہو۔ اس نے ٹھیٹھ پنجابی لہجے میں کہا۔ 'نہیں جناب اور تو کوئ ڈیزل نہیں ہے'۔ 'سب پتہ ہے مجھے'۔ ڈرائیور خاموش ہو گیا۔   پھر وہ اسی طنطنے میں آگے بڑھا۔ ایک آواز آئ۔ میں میجر ہوں اور یہ دس نوجوان میرے ساتھ ہیں۔ ایک ہاتھ بڑھا اس میں ایک کارڈ تھا۔ دیکھنے والے نے اسے ایک نظر دیکھا۔ سلیوٹ مارا۔ آگے آکر سب کے چہروں پہ ایک لائٹ ڈالی اور بس سے اتر گیا۔

اسکے بعد ایک اور چوکی،  اب ہم حب کی حدود میں داخل ہوگئے تھے۔ لوگوں نے فجر کی نکلتی ہوئ نماز پڑھی۔ کیونکہ روشنی پھیل چکی تھی۔ اسکے آدھ گھنٹے بعد ٹھیک آٹھ بجے ہم کراچی کے مضافات میں واقع یوسف گوٹھ کے بسوں کے اڈے پہ موجود تھے۔ اس سفر میں ہمیں گیارہ گھنٹے لگے جس کے متعلق دعوی بس پر لکھا تھا کہ سات گھنٹے لے گا۔

کہتے ہیں پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھنا چاہئیے پتھر کے ہو جاتے ہیں۔ مگر ایسا کوہ قاف میں ہی ہوتا ہے۔ شادمند دل پلٹ کر پیچھے ضرور دیکھتا ہے یہ کہنے کو کہ

سیر کی، خوب پھرے، پھول چنے، شاد رہے

باغباں جاتے ہیں ہم، گلشن تیرا آباد رہے

مشعل اٹھ چکی تھی۔ اس نے زندگی میں پہلی دفعہ دیکھا کہ دور دور تک رنگ برنگی خالی بسوں کی لائینیں لگی ہوئ ہیں۔  کہنے لگی۔ ماما کیا ہم یہاں سے صرف ایک بس لے سکتے ہیں وہ پنک والی، وہ مجھے پسند آرہی ہے۔ نہیں میرے بچے یہ کھلونے نہیں ہیں۔ ماما نے ایک روکھا سا جواب دیا۔

اڈے پہ ٹیکسیوں اور رکشوں کی بھر مار تھی۔ اور اترتے ہی وہ نقشہ بنا کہ، اٹھا جو مینا بدست ساقی، رہی نہ پھر تاب ضبط باقی، تمام  مے کش  پکار اٹھے، یہاں سے پہلے، یہاں سے پہلے۔

ہم نے اپنی جیب ٹٹولی اور  ایک زمانہ ء قدیم کی کالی پیلی ٹیکسی نما کھٹارے میں اپنا سامان رکھنا شروع کیا۔ اور مشعل گنگنانے لگی، منّی  ڈارلنگ تیرے لئے۔ ہائیں میں نے اسے  دیکھا ، یہ تو رات بھر سوتی رہی تھی۔

ختم شد

9:35 AM

ارمارہ, اسمگلنگ, ایران, بلوچستان, بلوچی, پاکستان, ڈیزل, کراچی, کیوی فروٹ, گانے, گوادر, ممشعل, یوسف گوٹھ

شکریہ

دیکھیں لکھنے تو جا رہی تھی سلسلہ، ساحل کے ساتھ، کی اگلی قسط۔ لیکن جتنی دیر میں نئی پوسٹ کے لئے صفحہ کھلتا میں نے سوچا اردو سیارہ دیکھ لوں۔ بس وہاں سے ایک بلاگ پہ گئ۔ اور جب اسکی آخری سطروں تک پہنچی تو لگا کہ میری انگلیوں میں دوران خون اتنا تیز ہو چکا ہے کہ اب میں آج کچھ اور نہیں لکھ سکتی۔ لیجئیے یہ چند لائنیں آپ کے لئے بھی حاضر ہیں۔

جب کسی معاشرے سے عورت کو غائب کردیا جاتا ہے تو زندگی بھی اپنی تمام تر خوبصورتی کے ساتھ آہستہ آہستہ تحلیل ہونا شروع ہوجاتی ہے جس کے نتیجے میں اس معاشرے کا تمدن بھی زندگی کے ساتھ ساتھ تحلیل ہوتا رہتا ہے اور آخر کار ایسی قوم دوسری قوموں کے لیے ” آفت ” بن جاتی ہے، عورت ہر معاشرے کی زندگی کی نبض ہے، جہاں عورت نہیں، وہاں معاشرہ  نہیں۔

یہ لائینز آپ نے پڑھیں۔ اسکے لکھنے والے مصنف

مکی صاحب

ہمارے مایہ ناز اردو بلاگر ہیں۔ انہوں نے اپنے بلاگ پہ تبصرے کا آپشن بند کر دیا ہے۔  اس لئے مجھے اپنے بلاگ پہ لکھنا پڑ رہا ہے۔

تو جناب مکی، آپ اس  کمزور اور خوفزدہ پاکستانی معاشرے  میں زندگی کی بچی کھچی علامتوں میں سے ایک ہیں۔ آپ کا بہت شکریہ۔

10:51 PM

اردو, انتہا پسندی, بلاگر, بلاگنگ, پاکستان, سماج, عورت, مکی

جائز دعائیں

کھیل اپنے اختتام پہ پہنچا۔  اگرچہ بظاہر ہر کھیل کا بنیادی اصول یہ لگتا ہے کہ جو جیتا وہی سکندر۔ لیکن کھیلوں کے مقابلے کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ فتح یا شکست  جس راستے  سے کسی فریق تک پہنچتی ہے اسکی بھی اتنی ہی اہمیت ہوتی ہے۔  شاندار کھیل، حریفوں کے داءو پیچ اور فتح یا شکست کو وقار سے سہنا یہ سب چیزیں بھی تو شائقین کو اپنی گرفت میں رکھتی ہیں۔ بہر حال کسی ایک کو جیتنا ہوتا ہے اور دوسرا شکست سے ہمکنار ہوتا ہے۔

سچ پوچھیں ، میں ان لوگوں میں شامل تھی جو کہ یہ توقع نہیں رکھتے تھے کہ پاکستانی ٹیم سیمی فائنل تک پہنچ پائے گی۔ ایک ٹیم جو چند مہینے پہلے بد ترین بحران سے گذری۔ جس کے کھلاڑیوں پہ جوئے اور میچ فکسنگ کے مقدمات چل رہے ہوں۔ وہ اگر یہ پرفارمنس بھی دے تو بڑی بات ہے۔

کرکٹ وہ کھیل ہے جو انفرادی صلاحیتوں سے نہیں بلکہ ٹیم اسپرٹ کے ساتھ کھیلا جاتا ہے۔ کیا ہمارا اپنے کھلاڑیوں سے یہ توقع رکھنا جائز ہے کہ وہ ایک بحران سے گذرنے کے بعد چند مہینوں میں اپنے اندر اتنی یگانگت، ایک دوسرے پہ اعتماد ، ایکدوسرے کی صلاحیتوں سے آگہی پیدا کر لیں گے، وہ ہم آہنگی پیدا کر لیں  کہ ورلڈ کپ جیسے اعصابی تناءو والے مقابلے میں ہر قسم کا دباءو جھیل جائیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔  چاہے اس کے لئے سترہ کروڑ لوگ دعا کریں۔ خدا کی سنت یہ نہیں کہ ساری دنیا کے لوگ یہ دعا کریں کہ سارس کی ہاتھی کی طرح سونڈ نکل آئے تو وہ انکا اپنے اوپر یقین برقرار رکھنے کے لئے ایسا کرے۔ یہ دعا جائز نہیں۔

چلیں میں نے فائنل کے لئے دو ٹیمیں منتخب کی تھیں۔ سری لنکا اور نیوزی لینڈ۔ نیوزی لینڈ تو نکل گئ۔ سری لنکا کے بارے میں کیا خیال ہے؟

11:26 PM

انڈیا, پاکستان, سری لنکا, سیمی فائنل, کر کٹ, موہالی

اُف

ڈیڑھ سال پہلے کینیڈا میں مقیم عزیزوں کے بے حد اصرار پہ وزٹ ویزہ کے لئے درخواست دی۔ ڈھائ مہینے انتظار کے بعد   ایک کاغذ ملا جس پہ ویزہ نہ دینے کی بہت ساری وجوہات بیان کی گئ تھیں۔ ہمارے حصے میں جو آئ اسکے مطابق انہیں شبہ تھا کہ ہم کینیڈا جا کر واپس پاکستان نہیں آئیں گے۔

پہلے تو مجھے خیال گذرا کہ مشعل کے ابا کا ہمارے ساتھ نہ جانا ایک وجہ ہو گا۔ حالانکہ درخواست دیتے وقت میں اسے خاصہ مثبت نکتہ سمجھ رہی تھی۔ کہ جب پاکستان میں ہماری اتنی اہم چیز یعنی جیون ساتھی موجود ہیں تو میں کینیڈا سے واپس آنے پہ مجبور ہونگی۔ لیکن بعد میں مختلف لوگوں نے کہا کہ وہ سوچیں گے آپ کے شوہر سے تعلقات اچھے نہیں اور بچی کو ساتھ لے جا کر انکے ملک میں پناہ گزیں ہونگی۔

کیا امیگیریشن عملے نے بھنگ پی ہوئ ہوگی؟ میں نے نعرہ مارا۔ میری تعلیمی اہلیت اور پیشہ ورانہ قابلیت ایسی ہے کہ اگر کینیڈیئن امیگریشن کے لئے درخواست کروں تو انہیں مجھے دینی پڑے گی . اب تک میرے جتنے ساتھی تھے انہیں مل چکی ہے۔ کیا وہ اتنا نہیں سمجھ سکتے کہ میں وہاں غیر قانونی طور پہ کیوں رہنا چاہونگی جبکہ میں اسے قانونی طور پہ حاصل  کر سکتی ہوں۔

لیکن یقین رکھیں، احمق صرف پاکستان میں ہی نہیں پائے جاتے۔  اتنی بھاگ دوڑ اور خرچے کے بعد ایک فارم ملتا ہے جس  میں بیان کی گئ شقوں میں سے ایک کے اوپر ٹک مارک لگا ہوتا ہے۔  ہم تقریباً پندرہ ہزار روپے خرچ کر کے بے نیل و مرام۔ اس وقت عہد کیا کہ آئیندہ کبھی کینیڈا کے لئے اپلائ نہیں کریں گے۔ ارے ہمارے کچھ پیاروں اور  نیاگرا فال کے علاوہ ایسا کیا ہے کہ انکے ملک کا چکر ہم  لگائیں۔

اب ایک دفعہ پھر انہی کینڈیئن نژاد پاکستانیوں کا دباءو ہے ، یار آپ ایک دفعہ پھر درخواست دیں۔ اس دفعہ کا خرچہ ہمارے ذمّہ۔ میں کہتی ہوں ہمارے بنیادی حالات پہلے جیسے ہی ہیں۔ مشعل کے ابا پھر ساتھ نہیں جا سکتے۔ میری تعلیم قابلیت اور دیگر چیزیں بھی ویسی ہی ہیں میں ایسا کوئ کام نہیں کر پائ جو کسی ملک کا امیگریشن عملہ میری آمد کے لئے تمام مقامی قوانین کو ایک طرف کردے۔ پاکستان میں اسی طرح دھماکے ہو رہے ہیں۔ ملک اسی طرح کرپشن کے لئے مشہور ہے۔  ہم اسی طرح غریب ہیں کہ لوگ ہمارے بارے میں سوچیں کہ یہ کہیں آ کر ہمارے پیسوں پہ نہ پڑجائیں۔

حالانکہ اس دفعہ بھی  میں کینیڈا میں غیر قانونی طور پہ بالکل نہیں رکنا چاہتی۔  میں ہمیشہ ایک  کمزور پاکستانی رہی  ہوں اس لئے قانون پسند ہوں۔ پھر بھی، اب لوگوں سے پوچھتی ہوں کہ آخر میں کیوں امید رکھوں، وہ اس دفعہ ویزہ دے دیں گے۔

کیا اس لئے کہ ہم نے ریمنڈ ڈیوس کو رہا کر دیا ہے؟

کیا اس لئے کہ ہم ورلڈ کپ جیت جائیں گے؟

کیا اس لئے کہ جمہوریت پچھلے تین سال سے کامیابی کے ساتھ اپنا تسلسل جاری رکھے ہوئے ہیں؟

کیا اس لئے کہ انہیں ترس آجائے گا کہ میں نے اپنے کچھ عزیزوں کو ایک مدت سے نہیں دیکھا اور وہ بھی مجھ سے ملنا چاہتے ہیں؟

میں ہر سوچ کو تولتی ہوں اور ردّی سمجھ کر جھٹک دیتی ہوں۔ پھر سوچتی ہوں، کیا  گرمی میں دماغ  کا دہی بنوانے نکلوں۔

نوٹری کے پاس، اپنے گھر سے دس میل دوربینک اور اتنی ہی دور ٹی سی ایس آفس۔ ایک دفعہ پھر ہزاروں میں روپے پھینک دوں۔ ایک اور نشان زدہ کاغذ کے حصول کے لئے۔ اُف

5:52 PM

canadian visit visa, امیگریشن, پاکستان, خاتون, کراچی, کینیڈا

آگے سے ہٹ جا

جس شدت سے پاکستانی تیس مارچ کے منتظر ہیں۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ پاکستان کم از کم تیس مارچ تک اپنی سالمیت کی جنگ پہ کوئ سودا نہیں کرے گا۔ اوراس دوران آپکو شاید ہی یہ جملہ سننے کو ملے کہ پاکستان بس اب ٹوٹنے ہی والا ہے۔

مختلف کاروبار حیات ماند پڑ گئے ہیں۔ اور شاعر کہتا ہے

عشق کچھ پڑ گیا ہے ٹھنڈا سا

آج کل امتحان ہے پیارے

سن رہے ہیں کہ سیمی فائنل والے دن آدھی چھٹی ہوگی۔ اور یہ بھی کہ اس دن لوڈ شیڈنگ نہیں ہوگی۔ اتنی خوش خبریوں کے بعد ہماری ایک بزرگ خاتون کا کہنا ہے کہ پاکستان کو سیمی فائنل جیت جانا چاہئیے۔ کیوں؟ کیونکہ، انہوں نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا،  پھر فائنل والے دن بھی لوڈ شیڈنگ نہیں ہوگی۔

اسکی وجہ تیس مارچ کو دو ازلی دشمنوں انڈیا اور پاکستان کے درمیان ہونے والا میچ ہے جو کانٹے کا ہو یا نہ ہو کانٹوں پہ ضرور ہوگا۔ دونوں ممالک کے درمیان ہونے والے میچ کی دو اہم خصوصیات ہیں۔

اول ہارجانے کے بعد  افسوس ہوتا ہے کہ ہمارا ہاتھ ایٹم بم چلانے والے بٹن پہ کیوں نہیں۔ جیت جانے کے بعد بھی یہی افسوس ہوتا ہے۔ دوم میچ سے پہلے، دوران اور ہار جیت کے بعد، جہادی روح  جوانوں میں بیدار رہتی ہے۔ بغیر کسی زائد خرچے کے۔

اب کھیل میں دو ہی چیزیں ہو سکتی ہیں یا تو ہم جیتیں گے۔ اور ہر پاکستانی فتح کے نشے میں چور گانا گائے گا ہم ہیں پاکستانی ہم تو جیتیں گے۔ آگے سے ہٹ جا۔ یا پھر میرے منہ میں خاک ہم ہار جائیں گے تو اسکے بعد میں تو را کا ایجنٹ قرار ہی پاءونگی لیکن شاہد آفریدی تیرا کیا ہوگا میرے پٹھان۔  گو طالبان نے ابھی تک کرکٹ کو غیر اسلامی نہیں قرار دیا۔ لیکن اسلامی یا غیر اسلامی ہر دو صورت میں وہ سینے پہ بم باندھ کر پھرنے والے ہیں۔

جنوبی ایشیا میں اور بالخصوص پاکستان میں ورلڈ کپ  کا مقابلہ ایک مرض کی صورت پھیل جاتا ہے سو جو اس کھیل میں دلچسپی نہیں لینے کا دعوی کرتے وہ بھی اسکور پوچھتے نظر آتے ہیں۔ اس حالت میں مریض خود سے، رشتے داروں سے، دوستوں سے حتی کہ محبوب سے بھی شرط لگانے کو تیار رہتا ہے۔

یہ ایک وائرل مرض ہے اپنا سائیکل ختم ہونے پہ ختم ہو جاتا ہے لیکن اختتام کے بعد صورت زیادہ سنگین ہو جاتی ہے اور اکثر مریض واہی تباہی بکنے لگتے ہیں۔

کچھ بیانات کی پیشن گوئ ہم بھی کر رہے ہیں۔

غیرت مند پاکستانیوں نے ہندوءوں کو انکی سر زمین پہ شکست دے دی۔

اللہ نے مسلمانوں کو ہندءووں کی سر زمین پہ سرخ رو کیا۔

سترہ کروڑ عوام کی دعائیں رنگ لائیں۔

دودھ پینے والے گوشت کھانے والوں سے کیسے جیت سکتے ہیں۔

جیت کی صورت میں انڈینز کو اسلامی انتہا پسندوں  کے  حملوں کا ڈر تھا۔

سٹے باز کھلاڑیوں کو نکالنے کے بعد ٹیم اپنی فارم میں واپس۔

سینے پُھلا دئیے ہمارے شیروں نے۔

ریمنڈ ڈیوس کی رہائ کی ڈیل میں پاکستان کو جتانا شامل تھا۔

بمبئ کے مسلمان انڈر ورلڈ ڈان داءود ابرہیم نے میچ کو مسلمانوں کے حق میں فکس کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔

زرداری نے میچ پہ پیسے لگائے تھےکیسے ہار سکتے تھے ۔

 اس تاریخی فتح کے موقع پہ ہمیں عافیہ صدیقی اور انکے بچوں کو نہیں بھولنا چاہئیے۔ عافیہ تیری عظمت کو سلام۔

بلوچستان اور وزیرستان میں امن کے لئے کرکٹ کے میدان قائم کئیے جائیں۔

انقلاب آوے ہی آوے، عمران خان تم جیو ہزاروں سال۔

ہارنے کی صورت میں زیادہ مزے کے ڈائیلاگ ہونگے۔

یہ کھلاڑی ہیں ہی ,\*\*\*\*\*\*\*\*\*\*۔ ان ستاروں کی جگہ پہ مناسب الفاظ کے لئے ہمارے کچھ بلاگرز یا مبصرین مدد کر سکتے ہیں۔

پیسے کھائے ہیں۔ کس نے؟ پچاس فی صد لوگ، کھلاڑیوں نے۔ پچاس فی صد لوگ زرداری نے یا حکومت نے۔

بال ٹھاکرے کی دہشت ہو گئ تھی ہمارے کھلاڑیوں پہ،  یہ سٹے باز چوہے ہیں۔

جب تک اسلامی شریعت نافذ نہیں ہوگی، سترہ کروڑ دعاءووں میں کوئ اثر نہیں ہوگا۔ ہم اسی طرح ہندءووں سے ، عیسائیوں سے یہودیوں سے شکست کھاتے رہیں گے۔

اس میں سی آئ اے والوں کا ہاتھ ہے۔ ریمنڈ ڈیوس کو سینتالیس دن تک جیل میں رکھا اس کا انتقام لیا ہے۔

اس میں را اور موساد کے ایجنٹ شامل ہیں۔

وینا ملک کا انتقام ہے، اس نے انڈیئینز بُکیز سے ملی بھگت کر کے قوم سے انتقام لیا ہے۔ اسکے خلاف کارروائ کی جائے۔

ہارپ ٹیکنالوجی کی مدد سے پچ کا موڈ تبدیل کر دیا گیا، جب پاکستان کھیلا اس وقت ہوا میں نمی  بڑھا دی گئ یا گھٹا دی گئ۔

کھلاڑیوں کو ہپنا ٹائز کر دیا گیا۔

کھلاڑیوں پہ یا کھیل کے میدان پہ جادو کیا گیا تھا۔ میں نے خود دیکھا کہ ہندو کھلاڑی کچھ بد بدا رہے تھے۔ ہندو تو ویسے بھی جادو ٹونے میں کمال رکھتے ہیں۔ جادو برحق ہے۔

طالبان کو چاہئیے کہ اب کرکٹ کے میدانوں کو اڑانا شروع کر دیں۔

موہالی کے میدان میں رکھا ہی اس لئے گیا تھا کہ پاکستانیوں کا جیتنا محال ہو جائے۔

امریکہ کا ہاتھ ہے، امریکہ اگلا ورلڈ کپ اپنے یہاں رکھنا چاہتا ہے۔

بے غیرت پاکستانیوں، تمہیں ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی بد دعا لگی ہے۔ تم کیا ورلڈ کپ جیتوگے۔

انقلاب، آوے ہی آوے۔

ایسی منحوس قوم کیا انقلاب لائے گی پہلے اپنی کرکٹ میں توانقلاب لے آئے۔ انکی تو یہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ انکی تو وہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ٹوئٹر پہ کچھ اس طرح کی ٹوئٹس ہونگیں۔

ہندوءوں پہ لعنت ہو

مسلمانوں پہ لعنت ہو

حکومت پہ لعنت ہو

زرداری پہ لعنت ہو

لعنت سے رسول اللہ نے منع فرمایا۔

جماعتیوں پہ لعنت ہو

لبرلز پہ لعنت ہو

آج دو قومی نظریہ ثابت ہو گیا۔

آج دو قومی نظریہ موہالی کے میدان میں دفن ہو گیا۔

سو قارئین، پاکستانیوں کی خوبی یہ ہے کہ خدا پرست ہی نہیں خدائ خصوصیات بھی رکھتے ہیں یعنی

ہو گئے خوش تو فرشتوں سے کرائے سجدے

آگئے طیش میں تو فردوس میں رہنے نہ دیا

میرے مبصرین کہیں گے۔

مسلمانوں کی اس عظیم فتح پہ تو آپ جیسے لبرلز کو بڑا صدمہ ہوا ہوگا۔

امن کی آشا والے دیکھ لیں ہندءووں نے ہمیں ہرا کر دم لیا۔ کیا جذبہ ء خیر سگالی کے لئے ہار نہیں سکتے تھے۔

کیمسٹری کے چار فارمولے یاد کرنے والوں کو کیا پتہ، کہ ہارپ ٹیکنالوجی موسم تو موسم، انسانی ذہن کو بھی تبدیل کر سکتی ہیں۔ ان لنکس کو اور پڑھو، ہا ہا ہا۔

پاکستان کے بال ٹھاکرے کا تذکرہ نہیں کیا میڈم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ابے بولتا کیوں نہیں، پاکستان کا بال ٹھاکرے کون ہے

اپنے شہر کے غنڈوں سے پوچھو۔

کس کے پی پی پی، ایم کیو ایم یا اے این پی۔

وہ جو بھتہ لیتے ہیں

اور وہ جو اغواء برائے تاوان کرتے ہیں

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو۔

بکتے ہو، اپنے صوبے کے دہشت گردوں کو دیکھو۔۔۔۔۔۔۔۔۔

یہ تعصب ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اردو بلاگستان کی دنیا میں

یہ ڈفر صاحب کے بلاگ پہ ایک نظم ملی ہے یہ ایک سچے انقلابی شاعر سلیم فاروقی نے لکھی ہے۔ انکی وصیت ہے کہ جو اسے پڑھے وہ اسے اپنے بلاگ کی زینت ضرور بنائے ورنہ اس پہ عذاب ہوگا۔ وما علینا الاالبلاغ۔

جب بیانات اس نوعیت پہ پہنچ جائیں تو سمجھ لیجئیے کہ  مریض کو افاقہ ہے۔ اب آپ اپنے روزمرہ کے کام بلا جھجھک جاری رکھ سکتے ہیں۔

ادھر اطلاعات ہیں کہ شہر میں گولیوں کے دام بڑھ گئے ہیں اور لوگ انہیں ذخیرہ کرنے میں مصروف ہیں۔ اب اگر پاکستان جیت جاتا ہے تو نقار خانے میں طوطیوں کا کیا کام۔ طوطیوں کو ٹوئٹر، فیس بک اور بلاگز استعمال کرنا پڑیں گے۔ اور اگر نہیں جیتا تو اگلے چند دن ٹارگٹ کلنگ میں مرنے والوں کی تعداد میں اضافہ  متوقع ہے۔  کچھ لوگوں کے طوطے اڑ جائیں گے۔ خوف کی وجہ سے گھر میں رہنا ہوگا۔ ٹوئٹر، فیس بک اور بلاگز استعمال کرنا پڑے گا۔ یوں ثابت ہوگا کہ یہ سب ایجادات امت  مسلمہ یعنی پاکستانیوں کے خلاف سازش ہیں۔

۔

۔

۔

۔

اچھا اس ساری واہی تباہی کو ایک طرف رکھیں میں سوچ رہی تھی ورلڈ کپ کون جیتے گا۔ میرے خیال سے سری لنکا یا نیوزی لینڈ۔ کیا کہا پاکستان کیوں نہیں؟ تو پھر لگا لیں ایک شرط۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

7:47 AM

اردو, انڈیئیز, انڈیا, بلاگستان, بلاگنگ, پاکستان, پاکستانی, پنجاب, شاہد آفریدی, طالبان, کراچی, کرکٹ, کھیل

ساحل کے ساتھ-۹

گذشتہ سے پیوستہ

یہ گوادر میں مرنے والے کیا

ذکری

تھے؟ نہیں، نہیں، نمازی تھے۔ ہمم، تو یہ بھی نہیں سوچا جا سکتا کہ مذہب کی وجہ سے نشانہ بنایا گیا۔ انہیں یقین تھا کہ ایجنسی والوں نے مارا ہے۔ یہ ہنگامہ کرنے والے لوگ بہت تھوڑے سے ہیں۔ سب کو باہر سے پیسہ ملتا ہے۔ ایجینسی والوں نے سوچا ہوگا کہ لوگوں کو لاپتہ کرنے میں پیچیدگیاں زیادہ ہیں۔ پکڑو اور ماردو۔ یہ ان کا خیال تھا۔

 یہاں میں نمازی اور ذکری کا فرق بتاتی چلوں۔ بلوچستان میں عمومی طور پہ اور ڈسٹرکٹ گوادر میں بالخصوص مسلمانوں کا ایک فرقہ پایا جاتا ہے جو ذکری کہلاتا ہے۔ ذکری، کراچی میں بھی پائے جاتے ہیں اسکے علاوہ ایران میں بھی موجود ہیں۔  انکے فرقے کے بانی کے طور پہ ایک شخص

محمد جونپوری

کا نام لیا جاتا ہے۔ زکریوں کے عقیدے کے مطابق وہ امام مہدی ہیں۔ کچھ کے خیال میں وہ ایک صوفی تھے اور ذکری دراصل صوفی ازم کی کسی تحریک سے متائثر ہو کر وجود میں آیا۔

ذکری اور نمازی میں فرق جیسا کہ نام سے اندازہ ہو تا ہے، نماز کا ہے۔ ذکری نماز کی جگہ ذکر کرتے ہیں۔ یہ مذہب تقریباً پانچ سو سال پرانا ہے۔  ذکرکے اوقات مقرر ہیں۔ جس جگہ ذکر کیا جاتا ہے اسے ذکر خانہ کہا جاتا ہے۔ یہ عمارت مسجد کا ظاہری حلیہ نہیں رکھتی کسی گھر کا کوئ کمرہ بھی ہو سکتی ہے۔ اگرچہ کہ میسر مواد کہتا ہے کہ ذکری دن میں پانچ دفعہ نماز کی جگہ پانچ دفعہ ذکر کرتے ہیں۔ مگر عملی طور پہ میں دیکھتی ہوں کہ ایسا اجتماع ہفتے میں ایک بار ہوتا ہے۔

ذکریوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حج بھی کرتے ہیں لیکن وہ رمضان کی ستائیس تاریخ کو گوادر شہر کے قریب واقع ایک اور شہر تربت میں موجود ایک مقام کی زیارت کو جاتے ہیں یہ مقام کوہ مراد میں واقع ہے۔ جہاں انکے مطابق امام مہدی کبھی رہ چکے ہیں۔ اسے زیارت بھی کہا جاتا ہے اور اسکے اعمال حج سے ملتے جلتے ہوتے ہیں سنتے ہیں کہ وہاں ایک کنواں بھی موجود تھا جو اب خشک ہو چکا ہے۔ یہ آب زم زم کے وزن پہ چاہ سم سم کہلاتا تھا۔

یوں ، مجھے سن دو ہزار تین میں اسکے متعلق جان کر حیرانی ہوئ کہ قادیانیوں کی طرح سے انہیں غیر مسلم کیوں نہیں قرار دیا گیا۔ آج سن دو ہزار گیارہ میں ذکریوں کو اپنے تحفظ کے متعلق خدشات ہیں۔ اور لوگ علی الاعلان اپنے آپ کو ذکری کہنے سے ہچکچاتے ہیں۔ اسکی وجہ آپ جانیں؟

جب سے کوسٹل ہائ وے بنی ہے مختلف اسلامی گروپوں کا یہاں نفوذ آسان ہو گیا ہے۔ سن دو ہزار تین میں جب میں یہاں پہلی دفعہ آئ تھی۔ کوئ بڑا مدرسہ موجود نہ تھا۔ چھوٹے درس قرآنی کے مدرسے ہوں تو ہوں۔ کوسٹل ہائ وے کی تکمیل کے دوران ہی  زمین کا ایک بڑا ٹکڑا ایک مذہبی تنظیم کے حوالے کیا گیا۔ اب اس پہ ایک خاصی بڑی عمارت موجود ہے۔

ان گروپوں نے ذکری فرقے کو خلاف اسلام قرار دینے کی جد و جہد شروع کر دی ہے۔ کچھ بلوچوں کے خیال میں ذکریوں کو غیر مسلم قرار دینے کی سازش بھی پنجابیوں کی ہے۔

خیر، یہاں تک آنے کے بعد آپکو یہ تو سمجھ آرہا ہوگا کہ عام سنّی مسلمان نمازی کہلاتا ہے۔ ابھی تک نمازی اور ذکری ایک دوسرے سے معاشرتی تعلق رکھتے ہیں۔ انکی آپس میں رشتے داریاں ہیں اور وہ آپس میں شادیاں بھی کرتے ہیں۔ کیونکہ عقائد کے فرق کے باوجود وہ اپنے آپکو ایک ہی سمجھتے ہیں یعنی بلوچ۔

اچھا ، اس ہڑتال سے ہمارے واپسی کے منصوبے پہ کچھ ایسا ہی بھونچکا  اثر پڑا جیسا آدم کا دانہ ء گندم کھانے کے بعد دنیا کے حالات پہ پڑا۔  لوگ بڑے فخر اور بے نیازی سے کہتے ہیں کہ ہمیں سیاسی موضوعات اور گفتگو پسند نہیں آتے۔ مگر یہ سیاسی حالات لمحے بھر میں ہماری  ترجیحات،  امیدوں اور خدشات کو یکدم تبدیل کر دیتے ہیں اور بالکل پرواہ نہیں کرتے کہ ہم انکے متعلق کیسے خیالات رکھتے ہیں۔ دیکھا جائے تو جنت سے ہمارا نکالا جانا بھی سیاست شیطاں ہی تھی۔

اب کہاں تو ہم میٹھی سویوں کی خوشبو میں غرق  تھے۔ اس خیال سے مہمیز تھے کہ رات کو  چھت پہ بیٹھ کر ستاروں کی کہکشاءوں سے مزین آسماں کی رونق  کو  دیر تک نرگس کی آنکھ سے دیکھیں گے کہ کراچی میں آسماں تک پہنچنے سے پہلے ہی نظر دھویں کی آلودگی میں گم ہو جاتی ہے۔ یہی آسماں ہوتا ہے مگر اس قدر آباد نہیں۔ کہاں ہمارے خیال دل افروز کی ایسی دھجیاں بنیں کہ وہ خود خشک سویوں کی شکل میں آگیا۔ ستاروں کا خیال ذہن آسمانی سے بھک سے اڑ گیا۔ ہم اب روحانی طور پہ کراچی میں تھے۔

وہ لوگ رخصت ہوئے تو ہم دونوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ہماری موجودگی اتوار کے دن کراچی میں ہونا لازمی تھی۔   اگر دودن ہڑتال  وجہ سے رکتے ہیں تو اتوار کو ہی نکل پاتے۔  یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ادھر ہڑتال کی وجہ سے اگلے دن ٹرانسپورٹ بھی نہیں ہو گی ۔ اس لئے واپسی کا منصوبہ اسی لمحے بنانا تھا ۔

وہاں سے کراچی کے لئے چلنے والی بس ساڑھے آٹھ بجے روانہ ہونی تھی۔ جو دراصل گوادر شہر سے یہاں آتی ہے۔ اس وقت ساڑھے چھ بج رہے تھے۔

چلیں جناب، پہلے بکنگ آفس سے معلوم کرنا پڑے گا کہ بس میں تین افراد کے لئے جگہ بھی ہے یا نہیں۔ وہ یہ کہہ کر روانہ ہوئے۔

کراچی کی منی بسوں میں دن رات لمبے لمبے سفر کرنے کے باوجود میں پاکستان میں شہروں کے درمیان چلنے والی بسوں کے سفر سے اب تک محروم رہی تھی۔  اور اب کن حالات میں اس سفر کے امکان پیدا ہوئے۔ شام ، سات بجے اطلاع ملی کہ بکنگ ہو گئ ہے۔ ساڑھے آٹھ بجے روانگی ہے۔ بس والوں کا کہنا ہے کہ سات گھنٹے میں کراچی پہنچ جائیں گے۔

سویاں اٹھا کر رفیق بلوچ کے حوالے کیں۔ جلدی جلدی، بھاگم بھاگ چار دن کی پھیلائ گرہستی کو سمیٹا۔ رات کے کھانے کے لئے روٹی اور آملیٹ تیار کر کے باندھا۔ کچن کو صاف ستھرا کیا کہ بعد میں آنے والوں کو پریشانی نہ ہو۔ اب ہم گوادر سے کراچی بس کے سفر کے لئے تیار تھے۔

صرف دو سیٹیں ملیں۔ ہڑتال کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ لوگ یہاں سے نکلنا چاہ رہے ہیں اور بس بھری ہوئ ہوگی۔ یعنی مشعل ساری رات ہم دونوں کی گود میں پھیل کر سوئیں گی۔

ساڑھے آٹھ بجے ہم بس کے اڈے پہ کھڑے تھے۔ رفیق بلوچ میرے پاس آیا اور ایک تھیلا میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ اس میں گوادر کی مٹھائ ہے۔ اس نے کچھ جھجھکتے ہوئے کہا۔ مٹھائ، میں نے اسکی کیلوریز کا حساب لگایا۔ پھر اپنے پہ تف بھیجی، جدید شہری انداز زندگی کے متائثرین، جذبات کو بھی کیلوریز میں دیکھتے ہیں۔

ایک جانی پہچانی منزل کی طرف، جانے پہچانے راستوں پہ ایک  انجان سفر شروع ہونے کو تھا۔  دیکھیں تو ہر سفر ہی اپنے اختتام تک انجان رہتا ہے، جیسے زندگی کا سفر۔ لیکن بعض اوقات یا تو راستوں میں اتنے طلسم  ہوتے ہیں کہ راستےمیں ہونے کا احساس دل سے نکل جاتا ہے جیسے

ایلس ان دا ونڈر لینڈ

یا پھر انگریزی کا ایک محاورہ اختتام اچھا ہو تو سب اچھا ہوتا ہے، سفر بھی گذر ہی جاتا ہے۔

ساڑھے نو بجے رات کو پاکستان کےمعیاری طریقہ ء تاخیر کے مطابق بس آئ۔ میں نے مشعل کو گود میں سنبھالا، اور ذرا عالم جوش میں گوادر کے ساحل سے بس میں قدم رکھا، یوں جیسے کولمبس نے امریکہ کے ساحلوں پہ پیر دھرے ہوں۔ میرا گوادر سے کراچی پہلا بس کا سفر۔

جاری ہے

6:59 PM

بلوچ, بلوچستان, ذکر خانہ, ذکری, قادیانی, کوسٹل ہائ وے, گوادر, محمد جونپوری، کراچی, نمازی

قصہ کہانی

ٹوئٹر سے پیغام ملا۔  صبر۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ پیغام انقلاب نہیں تھا۔ ہمم، تو پیغام ملا کہ تیئیس مارچ کو بچوں کو اپنی تاریخ سے واقفیت پیدا کرانے کے لئے قصہ کہانی کے نام سے ایک پروگرام بنایا گیا ہے۔ شرکت کے خواہشمند رجسٹریشن کروالیں۔ دئیے گئے فون نمبر پہ رجسٹریشن کرالی۔ خدا کا شکر ادا کیا  جس نے ان انسانوں کو ہمت اور فکر دی جن سے ہمارے  آج میں یہ آسانیاں ہیں۔ اور اپنی بیٹی کی رجسٹریشن کرالی۔

پروگرام کا وقت صبح ساڑھے دس بجے تھا۔ اور مقام

فریئر ہال

کراچی تھا۔ منتظمین کا تعلق

دی سیٹیزن آرکائیو آف پاکستان

سے تھا۔ فریئر ہال کراچی کی ان تاریخی عمارتوں میں سے ہے جو مجھے بے حد پسند ہیں اور ان سے بڑی دلچسپ یادیں وابستہ ہیں۔

یہ پاکستان کے قیام سے پہلے سر ہنری بارٹل ایڈورڈ فریئر کے اعزاز میں تعمیر کی گئ تھی جنہوں نے اپنے عہد میں کراچی کی معاشی ترقی کے لئے بڑا کام کیا۔ اس عمارت کی بے حد شاندار بات یہ ہے کہ اسکی چھت  کو مشہور مصور

صادقین

نے اپنی مصوری کے شاہکاروں سے سجایا ہے اور اسکی خوبصورتی کو صرف دیکھ کر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ اتنی خوبصورت ہے کہ بہت دیر تک سر اٹھائے رکھنے پہ بھی تکلیف نہیں ہوتی۔ نہ جسمانی نہ روحانی۔ اسے دیکھ کر لگتا ہے کہ ہماری تاریخ میں اب بھی کچھ نام ایسے ہیں جن پہ ہم فخر سے سر اٹھا سکتے ہیں۔

مجھے خوشی ہوتی ہے کہ ایسے کئ نام میرے شہر سے تعلق رکھتے ہیں۔ مجھے خوشی ہوتی ہے کہ فریئر ہال جیسی منفردعمارت مجھ سے زیادہ دور نہیں۔ جب چاہوں وہاں جا کر سر اٹھا لوں۔

خیر، جناب ہم ماں بیٹی وہاں پہنچے۔  تو انکی ٹیم موجود تھی۔ اور بچوں کی ایک بڑی تعداد بھی۔ جس طرح کا انتظام تھا اسکے حساب سے بچوں کی تعداد مناسب تھی۔ اپنے حساب سے یہ ایک مختلف کوشش تھی۔ نہ یہاں بچوں کے جھولے تھے نہ کھیل اور ہلڑ بازی کے دیگر ذرائع۔ بس انہیں ایک جگہ بیٹھ کر باتیں سننی تھیں۔ بچوں میں چارسال سے لیکر تیرہ چودہ سال کے بچے شامل تھے، ساتھ ہی انکے والدین بھی تھے۔

قیام پاکستان کے حوالے سے اور کراچی کے پس منظر سے تعلق رکھتی تصاویر کی نمائیش بھی ساتھ میں تھی کچھ ماڈلز بھی بچوں کی دلچسپی کے لئے رکھے گئے۔

پروگرام کا آغاز پاکستان کے قومی ترانے سے ہوا۔ روایت سے بغاوت تھی کہ اسے تلاوت قرآن پاک یا نعت رسول مقبول سے نہیں کیا گیا۔ یہاں تو میں اسیے سیمینارز میں شرکت کر چکی ہوں جو کسی غیر ملکی سائینسداں کے سائینسی کام سے متعلق ہوتا ہے اور ایک گروہ کا اصرار ہوتا کہ اس کا آغاز قرآن پاک کی تلاوت سے ہو بالخصوص وہ جنہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اس سائینسداں کا سائینسی کام کس چیز کے متعلق ہے۔

اس ترانے میں موسیقی کے کچھ راگ ڈال کر اسے ذرا انفرادیت دینے کی کوشش کی گئ تھی جس سے ترانے کی موسیقی تو دب گئ اور راگ کھل گیا۔ مجھے تو یہ کوشش کچھ ایسی سمجھ میں نہیں آئ۔

یوم پاکستان کے حوالے سے ایک چھوٹی سی دستاویزی فلم دکھائ گئ۔ پھر بچوں کے ایک رسالے سے ایک نظم پڑھی گئ۔ پھر انہیں مذہبی رواداری کے پس منظر میں ایک کہانی سنائ گئ۔ وقفے وقفے سے بچوں کو دعوت دی گئ کہ وہ اگر کچھ سنانا چاہیں تو سامنے آئیں۔ بچوں نے اس مرحلے میں بڑی دلچسپی لی۔ پھر اسکے بعد بچوں سے ایک سادہ کوئز کیا گیا۔ صحیح جواب بتانے وال بچوں کو انعامات دئیے گئے۔

 اگرچہ مشعل نے ہر اس لمحے ہاتھ اٹھا کر جوش و خروش سے کھڑا کیا جب جب سب بچوں نے اٹھایا۔ لیکن یہ سوالات ابھی انکے لئے تھے نہیں انہیں تو معلوم بھی نہ ہوگا کہ قرارداد پاکستان کس نے پیش کی گئ قسم کے سوالوں کے کیا جواب ہیں۔ بہرحال انکے جذبے کو دیکھ کر مجھے اطمینان رہا۔

پھر اسکے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ یعنی بجلی چلی گئ۔ یوں پروگرام کا اختتام  اچانک ہو گیا۔ نیم اندھیرے میں ہم سب نے ترانہ پڑھا اور میں نے نوٹ کیا کہ بچوں کو زیادہ اچھی طرح یاد تھا۔ بچوں نے خاصی سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ اور یہ محسوس ہوا کہ اگر ایسے پروگرام ہوں جن میں بچوں کو بھی کچھ کرنے کے مواقع حاصل ہوں وہ اس میں دلچسپی لیتے ہیں، چاہے وہ تاریخ جیسا بظاہر خشک نظر آنے والا موضوع ہو۔ شرط یہ ہے کہ ہم انہیں موقع دیں اور ان پہ اعتماد کریں۔ نجانے کیوں مجھے یقین ہے کہ یہ آنے والی نسل پاکستان کی موجودہ نسل سے بہتر ہوگی۔

پاکستان بن گیا، ٹوٹ بھی گیا، مزید شکست و ریخت کے مراحل میں ہے۔ گذشتہ باسٹھ سالوں میں ہم نے اپنے ہی ہم وطنوں سے زبان کی لڑائ لڑی، حقوق کی لڑائ لڑی، مذہب کی لڑائ لڑی۔ ذلت و خواری کی ان لڑائیوں میں بلا مبالغہ لاکھوں  لوگ مارے گئے۔  اتنے بہت سے کام اچانک ہی نہیں نبٹ گئے۔ ہم گذشتہ باسٹھ سالوں سے یہی کچھ کرنے میں مصروف ہیں۔ اور اس سے اکتاتے نہیں۔ ہمارے خون میں سب کو ٹھکانے لگا دینے کی گرمی دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔ اور ہم تنزلی کے نئے کنوءوں میں گرتے ہی جا رہے ہیں۔

میں گھر واپس آ رہی تھی تو سوچ رہی تھی کہ نجانے وہ دن کب آئے گا جب میرے جیسے والدین کو فسادات اور ہنگاموں کی وجہ سے ہونے والی اچانک چھٹیوں کے لئے اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں سے یہ نہیں کہنا پڑے گا کہ روڈ خراب ہو گیا ہے بیٹا آج گاڑی اس پہ چل نہیں پائے گی۔ اس لئے آج اسکول کی چھٹی ہے۔

بچوں کو مرنے کے متعلق بتانا مشکل ہوتا ہے۔ یہ بتانا مشکل ہوتا ہے کہ بم کیسے پھٹتا ہے۔ کیوں کچھ برے لوگ بار بار بم پھاڑتے ہیں، گاڑیاں جلاتے ہیں، گولی مار دیتے ہیں۔ بچوں کو ہی کیا اکثر خود کو بتانا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ نجانے میرے جیسے لوگوں کی یہ مشکل کیسے آسان ہوگی۔ کیا اسکے لئے کوئ منصوبہ بنایا جا سکتا ہے۔ کوئ قرارداد پاس ہو سکتی ہے۔

کاش وہ دن آئے جب یہ سب باتیں قصہ کہانی ہو جائیں۔ جب ہم اپنی آنے والی نسل کے سامنے شرمندہ کھڑے ہوں کہ ہمارے پاس تمہیں سنانے کے لئے کوئ دل فریب کہانی نہیں۔ کچھ جھوٹ تھے میرے بچوں، ہم نے انہیں مٹانے میں زندگی صرف کی۔  تمہارا دل چاہے تو عبرت کے لئے ہمیں اپنے ماضی کا حصہ بنے رہنے دو اور تمہارا دل چاہے تو حرف مکرر کی طرح مٹا دو۔ ہر داغ ہے اس دل پہ اک داغ ندامت۔

4:40 PM

بچے, پاکستان, تیئیس مارچ, خواتین, دی سیٹیزن آرکائیو آف پاکستان, صادقین, فریئر ہال, کراچی, یوم پاکستان

حاصل کھیتی

پچھلے چند مہینوں سے یہ حالت ہے کہ کچھ لکھنے سے پہلے یہ نہیں سمجھ میں آتا کہ کس پہ لکھوں۔ اسکی وجہ تیزی سے بدلتی دنیا ہے،،اور اتنی ہی تیزی سے اس کا ہمیں متائثر کرنا ہے۔ اب صورت کچھ اس مال یعنی جدید بازار کی طرح بن چکی ہے  جہاں سامان کی افراط اور ورائیٹی بے پناہ ہو اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا خریدیں۔ خیر، یہ آسانی  پھر ہوتی ہے کہ آپ اپنی جیب کی حالت بلکہ موجودہ حالات میں حالت زارکو سامنے رکھتے ہوئ کچھ ضروریات کو جمنے کا موقع دیں اور کچھ خواہشات کا گلا گھونٹ دیں۔ اس طرح کچھ خواہشات تو یہ کہتی نظر آتی ہیں کہ

رات ہم  بھی کھڑے تھے تیری محفل میں چھپ کر

جیسے تصویر لگادے کوئ دیوار کے ساتھ

یا

مجھ تک کب اسکی بزم میں آتا تھا دور جام

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اور ضروریات الہڑ مٹیاروں کی طرح شوخیاں دکھاتی ہیں اور دلربائ سے دعوی کرتی ہیں

کہتے ہیں عمر رفتہ کبھی لوٹتی نہیں

جا، میکدے سے میری جوانی اٹھا کے لا

لیکن اس رفتار سے ضروریات اور خواہشات پہ لکھوں تو یہ پوسٹ کچھ گلوبل معیشت کے مذاق پیہم  کی تحریر بن جائے گی۔ نہ ، نہ، اطمینان رکھیں یہ میرا موضوع نہیں ہے۔

میں تو باغبانی کے نتائج پہ لکھنا چاہ رہی تھی۔ کل جب میں ایمپریس مارکیٹ میں نئے موسم کے بیج لے رہی تھی تو مجھے خیال آیا کہ میں پچھلے موسم کی حاصل کھیتی کے بارے میں تو لکھ دوں۔

اچھا  تو میرے پرانے اور مستقل قارئین کو، جو کہ اس بلاگ کی پارہ صفتی سے نہیں گھبراتے اور امید بہار سے پیوستہ ہیں۔

ان کو یاد ہوگا

کہ میں نے جوش و خروش میں کچھ سبزیاں اگانے کی کوشش کی تھی۔

ان میں سب سے کامیاب، سلاد پتہ، ہرا دھنیا، بروکلی رہی۔ جنوری سے ہم نے سلاد پتہ اور دھنیا استعمال کرنا شروع کیا روزانہ کی بنیاد پہ۔ سلاد پتہ توکچھ پڑوسیوں اور رشتے داروں کو بھی  بھیجا۔ ہرا دھنیا اب خشک ہو گیا۔ لیکن سلاد پتہ ابھی بھی کام آرہا ہے۔

ٹماٹر پہ فصل پکنے کے وقت کیڑا لگ گیا۔ یہ تصویر میں نظر آرہا ہے۔

ہرا دھنیا

سلاد پتہ

ترئ کی بیل نے چلنا شروع کیا تھا کہ کراچی میں ٹھنڈ کی لہر پڑنا شروع ہو گئ۔ اسے میں سردی کہہ کر کچھ لوگوں کو طعنہ زنی کا موقع نہیں دینا چاہونگی۔ لیکن اس سے نہ صرف کراچی والوں کی بلکہ اس بیل کی  بھی جان نکل گئ، وہ ٹھٹھرے اور یہ ٹھٹھرکر رہ گئ۔

شملہ مرچ  کے پودے بھی اسی انجام کو پہنچے ۔ لیکن میں نے ایک دفعہ پھر شملہ مرچ لگائ ہے یہ دیکھنے کے لئے کہ آیا واقعی موسم کا اثر ہے یا شملہ مرچ کو کچھ سایا چاہئیے ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک آدھ پودا جسے بروکلی کے چوڑے پتوں کا سایا ملا پھل پھول گیا۔

بروکلی

بروکلی کے پھول

سیم کی پھلی سے بھی متوقع نتائج نہ ملے۔ یعنی توقع تھی کہ کلو کے حساب سے ملیں گی۔ مگر یہ حد پاءو سے آگے نہ بڑھی۔  میرا خیال ہے ، پانی کا کچھ مسئلہ رہا۔ ٹماٹر کے صرف تین پودوں کے لئے جگہ نکل سکی۔ یہ بڑی نسل کے ٹماٹر تھے۔ اب میں نے طے کیا ہے کہ چھوٹی نسل کے ٹماٹر لگانے چاہئیں۔

اچھا اس دفعہ، میرے پلان میں چھوٹی ہری مرچ، پیلی شملہ مرچ،  بھنڈی، کریلے، ککڑی، ترئ، ہرا دھنیا، اور آزمائیشی طور پہ بیگن شامل ہیں۔

سوایک  دن گملوں کو درست کرنے میں لگا۔ اور کل کا دن بیج بونے میں۔ اب دیکھیں اس دفعہ کیا ہوتا ہے۔

سبزیوں کے تذکرے کے بعد شریفوں کا تذکرہ۔ شریفوں سے یہ مت سمجھئیے گا کہ میں اس پوسٹ کو بھی دیدہ دانستہ سیاسی رخ دینے کی کوش کر رہی ہوں۔ آپ جانتے ہیں اس بلاگ کا نام دوسرا رخ نہیں ہے۔ یہ وہ پھل ہے جو بازار میں نظر تو آتا ہے مگر بہت کم۔ اس دفعہ شریفے غیر معمولی طور پہ بڑی جسامت کے تھے۔ جن میں تین ہمیں ملے اور تین کسی نے باہر سے ہاتھ ڈال کر توڑ لئے۔ لوٹے ہوئے شریفے تو پہنچ سے باہر ہیں جو ہمیں ملے ان شریفوں کا دیدرا کر لیں۔

10:38 AM

باغبانی، ایمپریس مارکیٹ، کراچی، شریفہ، سلاد پتہ، مرچ، بروکلی، پھول،دھنیا، ٹماٹر، بھنڈی، کریلے، بیگن،

ساحل کےساتھ-۸

گذشتہ سے پیوستہ

اگلے دن کے لئے میں نے صاحب سے درخواست کی کہ مشعل کو تیراکی کے لئے سمندر میں لے جانے کا وقت نکالیں۔ تاکہ انکے اس سوال سے نجات ملے کہ سوئمنگ کب کریں گے اور ہمارا ان سے کیا گیا وعدہ بھی پورا ہو۔ ہم کوئ اہل سیاست تو نہیں کہ ہمارے وعدے قرآن حدیث نہ قرار پائیں۔ تس پہ انہوں نے ایک خالصتاً سیاسی بیان دیا۔  ابھی تو جا رہا ہوں دوپہر کے کھانے تک واپسی ہوگی۔ تب دیکھیں گے۔

:)

  اس سطر سے وہ قاری تو واپس ہونگے جو صرف غیر سیاسی تحاریر پڑھنا چاہتے ہیں۔ لیکن کیا کروں، سیاست کی تعریف بھی کچھ ایسی اوکھی ہی سی ہے۔ چاہے تو کھانے کی ترکیب سے بھی جھانکنے لگے۔

:)

ہم دونوں ماں بیٹی جب اپنے کاموں سے فارغ ہوئے تو پلان کیا کہ گھر کے سامنے ساحل کا چکر لگا کر آتے ہیں۔  صبح  لو ٹائڈ ہو چکی تھی۔ اور اب پانی آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ ہم نے ساحل کے ایک طرف پڑے پتھروں میں جھانک تانک شروع کی۔  اور ساحل پہ منہ بند  اور منہ کھلی سیپیوں کا معائنہ۔  لیجیئے منہ بند سیپیوں پہ ایک شعر یاد آگیا۔

بھیجی ہیں اس نے پھولوں میں منہ بند سیپیاں

انکار بھی عجب ہے، بلاوا بھی ہے عجب

مجھے خیال آ رہا تھا کہ ساحل پہ موجود مقامی لوگ بھی سوچتے ہونگے کہ یہ خاتون اور یہ چھوٹی سی بچی پتھروں میں گھسی کیا کرتی رہتی ہیں اور ان پتھروں کی تصویریں بھی بناتی ہیں۔  کیوں؟

ساحل پہ مقامی لوگ اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ رات شکار کے لئے گئ کشتیاں اب واپس آرہی تھیں۔ ان سے مچھلیاں اتار کر ساحل تک پہنچائ جارہی تھی۔ کشتیوں سے یہ مچھلیاں عام طور پہ گدھا گاڑی میں اتاری جاتی ہیں جس کے لئے گدھا گاڑی کو سمندر کے اندر جانا پڑتا ہے۔ اب جو یہاں جیٹی بن رہی ہے تو اسکے مکمل ہونے کے بعد ان گدھا گاڑیوں کی ضرورت  نہیں رہے گی۔ گدھوں کی فطرت کا اندازہ ہے کہ  گدھے تو اس بارے میں سوچیں گے نہیں۔ ہم ہی سوچتے ہیں کہ  گدھے کیا کریں گے؟

ایک طرف کچھ لوگ ایک جال کی مرمت میں لگے تھے، کچھ کشتیوں کے بیرونی پیندے کی رگڑ کر صفائ ہو رہی تھی۔  بچے کھیل رہے تھے۔ گرمیاں ہوتی تو یہ بچے سمندر میں تیراکی کے کمالات دکھاتے۔ اسکے لئے انہیں کسی تربیت کی ضرورت نہیں۔ مچھلی کے جائے کو تیرنا کون سکھائے۔ موسم ٹھنڈا ہو چلا تھا۔ آسمان پہ بادل آگئے تھے میں نے سوچا آج بھی مشعل کا تیراکی کا پروگرام نہیں ہو سکے گا۔ پانی ٹھنڈا ہے۔

بچوں کے تخیل کی پرواز کی حد نہیں ہوتی،  خاص طور پہ بات اگر کھیل کی ہو تو ایجاد تمنا کی منزل سر نگوں ہونے میں کیا دیر لگتی ہے۔

کنچے کھیلنا زیادہ دلچسپ ہوتا ہے یا انہیں دیکھنا

ساحل پہ کھیلنے والے بچے ہمارے نزدیک آگئے۔ تب میں نے دیکھا کہ ان میں سے دو کے پاس کیکڑے کے بچے ہیں۔ جو یہاں بکثرت پائے جاتے ہیں۔

لوٹائڈ میں جب سمندر اپنے اندر موجود چٹانوں کو بے پردہ کر دیتا ہے تویہ چٹانوں پہ  آرام کرتے نظرآتے ہیں۔ ساحل پہ  کیکڑے اتنی تیزی سے کھدائ کرتے ہیں اور ریت کی ڈھیریاں بنا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ بعض ساحلوں پہ اس قدر زیادہ ہوتے ہیں کہ ساحل ریت کی ان ڈھیریوں سے اور انکے درمیان بنی باریک لکیروں سے ڈھک جاتا ہے۔

دونوں بچوں نے اپنی انگلیوں میں ان کیکڑوں کو پکڑا اور مجھے کیکڑوں کی لڑائ دکھائ۔ لڑائ کیا تھی انکے بازو ایکدوسرے میں پھنس گئے تھے۔ پھر فرمائشی پروگرام پہ میں نے اس لڑائ کی تصویریں بنائیں۔

ایک دوسرے میں الجھے ہوئے کیکڑے اب حرکت کرنے سے معذور ہیں۔ یہ منظر کس کی یاد دلاتا ہے؟

اس ویڈیو میں بھی کیکڑوں کی ایک لڑائ ہے۔

بچوں کے ساتھ ہم نے ساحل پہ ریس لگائ پھر گیلی ریت پہ دائرے بنانے کی کوشش کی۔ جو خاصی کامیاب رہی۔ مقامی بچوں کو بھی یہ کھیل پسند آیا۔ سو ان تمام اٹھکھیلیوں کے بعد  بچوں کے انٹرویو کی باری آئ۔ یہ بچے بہت ٹوٹی پھوٹی اردو بول سکتے تھے۔ کچھ بچے اسکول بھی جاتے ہیں ۔ ان میں سے ایک پہلی اور دوسرا تیسری میں پڑھتا تھا۔ پہلی والا بچہ بارہ تک گنتی پڑھ سکتا تھا اور تیسری والا اٹھارہ تک۔ بہت بڑا فرق ہے مگر کہاں؟

تمہارا نام کیا ہے؟ میں نے ایک بچے سے پوچھا۔ میرا نام جیوا ہے۔ دوسرے بچے نے کہا جیوا اسکا نقلی نام ہے اصلی نام ہےمراد۔ اچھا اسکا نام تو تم نے مجھے بتا دیا۔ تمہارا نام کیا ہے۔ میرا نام اسامہ ہے۔ اس نے اسکے ساتھ ایک قلابازی کھائ۔ اور تمہارا نقلی نام کیا ہے؟ مجھے ذرا دلچسپی محسوس ہوئ۔ میرا نقلی نام ہے مشرف۔  وہ منہ کھول کے ہنسا۔ جس میں کچھ دانتوں کی جگہ خالی تھی اور کچھ نئے دانت جھانک رہے تھے۔ میں بھی دل کھول کے ہنسی۔ قسمت کی ستم ظریفی یا لوگوں کا حس مزاح؟

اسامہ عرف مشرف اپنے کیکڑے کے ساتھ

دیکھی نہیں ہے تونے کبھی زندگی کی لہر،،اچھا تو جا عدم کی صراحی اٹھا کے لا

 ہم گھر واپس آئے۔ حسب توقع مشعل کا سوئمنگ پروگرام کینسل ہو گیا۔ کھانے کے بعد تھوڑی دیر چھت پہ ہلکی دھوپ اور خوبصورت ویو سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ دوپہر ڈھلنے کا وقت آیا تو میں نے سوچا کہ سویوں کے پیکٹ ویسے ہی رکھے ہیں۔ ابھی پکا کر کچھ محلے میں بھجوا دیتی ہوں کچھ ہم شام کی چائے پہ کھا لیتے ہیں۔ رات کو مشعل کے سونے کے بعد سامان باندھنا شروع کریں گے۔ اگلی صبح ہمیں روانہ ہونا تھا۔

ابھی میں سویاں بھون ہی رہی تھی کہ پڑوسی بلوچ آگئے۔ یہ لوگ باتیں کر رہے تھے۔ اور میں انکی باتیں سن رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ گوادر میں کل سے دو دن کی ہڑتال ہے۔

کیوں؟ تین مہینے پہلے دو لوگوں کو گوادر سےایجنیسی والوں نے اٹھایا تھا اور آج انکی لاشیں ملی ہیں۔ لوگ غصے میں ہیں۔

ایجنسی والوں نے کیوں اٹھایا؟ اٹھائے جانے سے ہفتہ بھر پہلے مرنے والوں نے گوادر میں ایک جلسے میں تقریریں کی تھیں۔

تقریروں میں کیا کہا؟ وہی باتیں جو قوم کو جوش میں دلانے کے لئے کی جاتی ہیں۔ احساس دلانے کے لئے کہ انکے ساتھ کیا زیادتی ہوتی ہے۔

مرنے والے گوادر سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن ان کا کہنا تھا کہ گوادر میں جب بھی ہنگامہ ہوتا ہے باہر سے لوگ آکر کرتے ہیں ہم تو مچھیرے ہیں ہم تو خود ان سے عاجز ہے۔ پہلے ہمارے علاقے میں بالکل کوئ ہنگامہ نہیں ہوتا تھا۔ اب یہ باہر والا آکر سب بند کرا دیتا ہے۔ روز ہڑتال، روز سب بند۔ ہم کہاں سے کھائے گا۔

یہ باہر کے لوگ کون ہیں؟ یہ بھی بلوچی ہیں مگر ان کا تعلق اوپر کے علاقے سے ہے۔

ابھی چند مہینے پہلے ایک مہاجر لڑکے کو گولی مارا۔ وہ بچپن سے یہاں رہ رہا تھا۔  بلوچی سیٹھ کو اپنا ابو کہتا تھا۔ ادھر لوگوں نے اسکو بڑا سمجھایا کہ واپس جاءو ابھی حالات صحیح نہیں ہے۔ جب صحیح ہو تو واپس آنا۔ مگر بڑا اڑیل، کہنے لگا بس یہیں رہے گا۔  اب یہاں سے مر کر جائے گا۔ مہروں میں گولی لگی۔ وہ بلوچی سیٹھ اسے لے کر کراچی گیا۔ بچ گیا پر اب معذور ہے۔ بستر سے اٹھ نہیں سکتا۔ اس کا بڑا افسوس ہوتا ہے۔

کب تم بھٹکے، کیوں تم بھٹکے، کس کس کو سمجھاءوگے

اتنی دور تو آ پہنچے ہو اور کہاں تک جاءوگے

جاری ہے

12:28 AM

Gawadar, بچے، بلوچی, بلوچستان, پاکستان, تیراکی, کراچی, کھیل, کیکڑے, گوادر, ہڑتال

بھڑاس

قصہ تو تازہ ہے مگر الفاظ وہی پرانے۔ غیرت، شرم، بکاءو مال، پاکستانی۔ میں کوشش کروں بھی تو ان الفاظ سے اپنی اس تحریر کو محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ مگر میں یہ کوشش کروں بھی تو کیوں؟ جبکہ میری یہ تحریر ایک خالص پاکستانی دماغ اور پاکستانی پس منظر میں لکھی جارہی ہے۔

ملک کے زر مبادلہ میں تقریباً تئیس کروڑ کا ظاہری اضافہ ہوا ہے اور در پردہ کتنے، ہم نہیں جانتے اور لوگ اس پہ خوش ہونے کے بجائے ایک دوسرے کو بکاءو مال کہہ رہے ہیں۔ لوگ کہہ رہے ہیں کہ اس میں ہماری جیت ہوئ ہے۔ امریکہ کو پتہ چل گیا کہ ان کا جھوٹ ہم نے پکڑ لیا ۔ اور اس پہ ہمارا دباءو اتنا تھا کہ اسے دیت کی سطح پہ آنا پڑا۔ اس سے دنیا کو اسلامی قوانین کے فرینڈلی ہونے کا بھی پتہ چلا ہے۔ وغیرہ وغیرہ

ادھر مولوی صاحبان تو تقریباً پھنس چکے ہیں۔ ایک طرف اینٹی امریکن نعرے بلند کرنے کا دل چاہ رہا ہے  اور دوسری طرف ستم ظریف نےانہی کی چال ان پہ واپس کر دی ہے۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ کس لئے یوم مذمت اور یوم احتجاج منانا چاہتے ہیں۔ جبکہ کچھ لوگ اسے بے غیرتی قرار دے رہے ہیں۔

حالانکہ غیرت کیا ہے؟ پاکستانی دماغ سے سوچیں۔ میں بحیثیت ایک عورت، لوگوں کے ہجوم میں اپنے شانوں پہ پڑا دوپٹہ اتار کر ایک طرف رکھ دوں تو بھی مجھے بے غیرتی کے طعنے ملیں گے۔ لیکن غیرت کیا ڈھائ گز کے دوپٹے میں موجود ہوتی ہے ۔ یہ تو ڈیڑھ دو سو میں کہیں بھی مل جائے گا۔ دوبارہ لوں، اور پھر سے سراور شانوں پہ سجا لوں، غیرت واپس۔

غیرت کیا ہے؟ اپنے سے بے بس اور کمزور شخص کو کاروکاری یا غیرت کے نام پہ قتل کر دینا اور ملک کی اسمبلی میں بیٹھ کر اس پہ فخر کرنا کہ ہم اپنی عورتوں کو غیرت کی وجہ سے قتل کر دیتے ہیں۔ لیجئیے، کسی جانور کو قتل کریں یا ذبح اس کا غیرت سے کیا تعلق۔ اس کا تعلق تو صرف ہارمونز سے بنتا ہے۔ کیا ہارمونز غیرت ہیں۔ یہ بھی آجکل لیبارٹریز میں تیار کئے جارہے ہیں جب دل چاہیں خرید لیں۔ غیرت حاصل۔

غیرت کیا ہے؟

یہ کہ ہم اپنے ہی ہم وطن، ہم مذہب شخص کو زندگی کی اس کمتر حالت میں رکھیں۔ جہاں وہ نالی کا کیڑا بنا رینگتا رہے۔ اور اپنی بقاء کے لئے ہر نالے میں گرنے کو تیار رہے۔ اور جب بھی وہ اس نالے سے باہر نکلنے کی کوشش کرے ہم اسے غیرت کے ڈنڈے سے دوبارہ اسی نالے میں گرادیں۔ کیا بے حسی غیرت کہلاتی ہے۔

معزز قارئین، میں غیرت کو بحیثیت پاکستانی، انہی معنوں میں جانتی ہوں۔

سو دوبارہ اپنے اسی قصے کی طرف لوٹتی ہوں۔ پاکستانی ذہن کہتا ہے کہ اگر اس سے مجھے فائدہ نہیں پہنچا تو یہ دیکھو کہ  کہ اس سے فائدہ کس کس کو پہنچا۔ سب سے پہلے اوپر سے شروع کریں۔ چونکہ ورثاء نے خون بہا لینے کا فیصلہ کیا ہے تووفاقی حکومت، صوبائ حکومت اور عدالت اس قصے سے شرعی طور پہ خارج ہو جاتے ہیں۔ یوں ان میں کا ہر فریق دینی اور دنیاوی اعتبار سے حالت سکون میں ہے۔ مسلم لیگ نون کے ایک رہ نما نے تو رات ایک ٹی وی شو میں کہہ بھی دیا کہ جب ہم توہین رسالت کے قانون کی حفاظت پہ کمر بستہ ہیں تو ہمیں دیت کے قانون کی بھی حفاظت کرنی چاہئیے۔ ابھی دو تین روز میں یہ شریعت باقی لوگوں کو بھی سمجھ میں آجائے گی کہ امیر آدمی کا قاتل کیسے بچ سکتا ہے اور قوانین میں کیسے اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ غریب شیطان بچ کر نہ نکلنے پائے۔

نواز شریف  نے تو سیدھے لندن کے ہسپتال میں پناہ لی۔ شہباز شریف انکی عیادت کو گئے۔ باقی کچھ لوگوں نے نوافل ادا کئیے ہونگے کہ ریمنڈ ڈیوس نامی گرہ 'کامیابی' سے کھلی۔ کچھ لوگوں نے اسکے نام کا ٹوسٹ کر کے محفل ناءو نوش سجائ ہوگی۔

فیضان اور فہیم اب واپس نہیں آ سکتے۔ زندگی کے حیلے ہوتے ہیں اور موت کے بہانے۔ انکی موت اسی طرح لکھی تھی جیسے سلمان تاثیر کی موت اس طرح لکھی تھی اور شہباز بھٹی کو اس طرح مرنا تھا۔ یہ بات انکے ورثاء کو سمجھ آگئ۔ کروڑوں روپیہ ایسے شخص کے سامنے رکھا ہو جس نے کبھی لاکھوں روپیہ اکٹھا نہ دیکھا ہو تو سمجھ ایک دم راکٹ کی طرح کام کرنے لگتی ہے۔ اگر شک ہو تو تجربہ کر کے دیکھ لیں۔ مگر آپ کریں گے نہیں۔  میں بھی نہیں کر سکتی۔ اس میں اخلاقیات کی مضبوطی نہیں ہماری معاشیات کی کمزوری ایک بڑی وجہ ہے۔

لوگ مرنے کے بعد کی زندگی کا تذکرہ کرتے ہیں،  جنت کی بات کرتے ہیں کیا وہاں ہوائ جہاز ہونگے، کیا اعلی برانڈز کے کپڑے اور جوتے ملیں گے، کیا ہوم تھیٹر ہوگا، کیا مرسڈیز ہوگی۔ یہ سب امریکہ میں ملے گا۔ اسکے لئے رضوان جنت کی اجازت نہیں چاہئیے۔ امریکن پاسپورٹ چاہئیں۔ بابر نے صحیح تو کہا تھا۔ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔ خدا دنیا کو دوبارہ نہیں بنائے گا۔ جنت بنائ تو کیا۔ سو ڈیل طے کرنے والوں نے بڑے خلوص سے کام کیا اور ورثاء کو امریکن پاسپورٹ بھی دلائے۔ اللہ انکے عمل میں برکت دے۔ حق بحقدار رسید۔

ادھر ہلیری کلنٹن نے پاکستانیوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ نے اس سلسلے میں کوئ پیسے نہیں دئیے۔ لیجئیے اگر معاملہ ظاہری طور پہ نظر آنے والے بیس بائیس کروڑ کا ہے تو یہ ایسی کون سی بڑی رقم ہے کہ ہم امریکہ  کے مشکل وقت میں کام آنے پہ خرچ نہ کر سکیں۔ ہم ان سے کھربوں روپے لے کر کھا چکے ہیں۔ اب اس حقیر رقم کے لئے امریکہ ادائیگی کرے یہ تو ہماری 'غیرت' کے منافی ہے۔ مجھے یقین ہے وہ سچ کہہ رہی ہیں۔

نقصان میں کون رہا؟

عبادالرحمن۔ کاش لوگ اپنی موت کا انداز چننے کے لئے ہی آزاد ہوتے تو عباد الرحمن گاڑی کے نیچے کچل کر مرنے کے بجائے، ریمنڈ ڈیوس کے ہاتھوں مرنے کو ترجیح دیتا۔ مگر یوں نہ ہوا۔ اور وہ بے چارہ تو جیسے تاریک راہوں میں مارا گیا۔ کہاں لوگوں کو کروڑوں مل گئے اور کہاں عبادالرحمن کسی کو یاد بھی نہیں رہتا۔ وہ بھی تو امریکنوں کی وجہ سے مارا گیا۔ کل کا دن اسکے ورثاء پہ بھی بھاری رہا ہوگا۔  ورنہ آجکے اخبار میں اسکے ورثاء کا بھی سرٹیفیکیٹ چھپتا کہ ہم اتنے کروڑکا یہ معاوضہ بغیر کسی لالچ اور دباء کے لے رہے ہیں۔

سب سے زیادہ بے وقوف تو شمائلہ نکلی۔ اس نے اپنے شوہر فہیم کے مرنے کے بعد دلبرداشتہ ہو کر خود کشی کر لی۔ کسی نے کہا اسکی موت کا ذمہ دار میڑیا ہے۔ میڈیا نے اس قصے کو اس جذباتی سطح پر کر دیا کہ وہ اسکی تاب نہ لا سکی۔ اسی کو سائینس کی زبان میں سروائیول فار دا فٹسٹ کہتے ہیں۔

اسکے ورثاء سے بھی ایک پاکستانی دماغ کو ہمدردی ہے۔ قبر کی مٹی میں مل کر مٹی ہوجانا اور پھر روز محشر کے انصاف کا انتظار کرنا یہ بہتر تھا یا ایک امیر کبیر بیوہ بن کر دوسرے لوگوں کی آنکھ میں کھٹکنا۔ پاکستانی دماغ، شمائلہ کو جھٹک کر ایک طرف کر دیتا ہے۔ حرام موت میں برکت کیسے ہو سکتی ہے۔

اور کسے نقصان ہوا؟ شاہ محمود قریشی کے بارے میں کیا خیال ہے؟ نادیدہ ہاتھوں کے لئے استعمال ہوئے۔ انکی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ کچھ قوتوں کو دباءو بڑھا کر ایک بہتر ڈیل لینے میں آسانی ہوئ ہو۔ لیکن آخر میں تو شاہ صاحب دھوبی کا کتا بن گئے۔ نہ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے۔ بے نظیر کے مزار پہ ہاتھ جوڑنا بھی کام نہ آیا۔ لگتا ہے بے نظیر کو مرنے کے بعد سیاسی قوت تو ملی مگر زیادہ روحانی قوت حاصل نہ ہوئ۔

امریکہ کو بھی کچھ نقصان ہوا۔ افغانستان میں امریکیوں کی لاپرواہی سے مرنے والوں افغانیوں کو خون بہا میں دو بھیڑیں ملیں۔ جبکہ ہمارے یہاں کروڑوں روپے خرچ ہوئے۔ اسکا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ امریکی افغانیوں کے مقابلے میں ہماری زیادہ عزت کرتے ہیں۔

لیکن میں زیادہ دیر تک پاکستانی دماغ سے سوچ نہیں پاتی اور واپس اپنی جون میں آتی ہوں۔ یہاں لوگ اکثر دعا اور بد دعا کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ ہر دوسرا شخص پہلے شخص سے کہتا ہے دعاءووں میں یاد رکھئیے گا۔ کیا یہ سب کچھ اس لئے تو نہیں ہوا کہ یہ کچھ بد دعائیں ہیں پاکستانیوں پہ بحیثیت قوم۔ تو اب اکیسویں صدی میں جبکہ ہم ایک غریب قوم ہیں اور ہمارے دشمن امیر قوم ہیں۔ اب کیا ہوگا؟

 امیر اقوام، اپنے لوگوں کے ہاتھوں ہونے والے قتل و خوں پہ ہمارے ہاتھوں پہ کچھ پیسے رکھیں گے اور ہمارے جنگل سے اپنے گھر واپس جا کر دنیا کی عمدہ شراب سے ٹوسٹ کریں گے۔

کیا آپ اور میں ایسا کر سکتے ہیں؟ نہیں، اس میں ہماری معیشت کی کمزوری نہیں اخلاقیات کی مضبوطی ہے۔ شراب اسلام میں حرام ہے۔

5:29 PM

Raymond Dawis, امریکہ, دیت, ریمنڈ ڈیوس، پاکستان, شمائلہ, عباد الرحمن, غیرت, فہیم, فیضان, قصاص, ورثاء

انصاف کا قتل

اس خبر سے پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد کو شدید دھچکہ پہنچا کہ امریکن ایجنٹ ریمنڈ ڈیوس  جو کہ دو پاکستانیوں کے قتل میں ملوث تھا۔ اس کو بری کر دیا گیا۔ اگرچہ کہ ہر چیز قانونی طور پہ طے پائ گئ۔  اسکے لئے اسلامی قانون دیت کو استعمال کیا گیا۔ مقتولین کے اٹھارہ ورثاء کو اس ڈیل کے نتیجے میں بیس کروڑ روپے ملے۔ اور اسکے علاوہ انہیں تین فیملی ویزے بھی دئیے گئے۔  اور یوں بظاہر انہوں نے خون بہا لے کر ایک قاتل کو معاف کر دیا۔

لیکن کیا یہ انصاف ہے، یا انصاف کا قتل؟ نہیں یہ اسلامی قوانین کا مذاق ہے جس کے اڑانے میں ہمارا  نظام سارے کا سارا شامل ہے۔ یہ وہ کام ہے جو ہم ہمیشہ کرتے آئے ہیں۔ یعنی مذہب کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرنا۔ یہ آج ریمنڈ کے لئے استعمال ہو گیا۔ واہ رے اللہ میاں ۔

7:02 PM

Raymond Davis, امریکہ, پاکستان, پنجاب, ریمنڈ ڈیوس, سی آئ اے, قانون, قتل, لاہور

ساحل کے ساتھ-۷

گذشتہ سے پیوستہ

جب نازنین مجھے آئ لو یو کا جواب بتا چکی تو اس نے ایک زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ محفل میں بے قرار حقے کو اپنے سامنے کیا۔ اسکی نے کواپنے دوپٹے کے آنچل سے صاف کیا۔  اور اپنے ہونٹوں میں دبا لیا۔ پروین شاکر نے کہا تھا کہ

پلکوں سے اسکے پونچھ دوں، میں آج کی تھکن

کل کے سفر میں آج کی گرد سفر نہ جائے

یقیناً یہ کام بھی انہوں نے اپنے دوپٹے سے کیا ہوگا۔

دوپٹے کے یوں تو ہزاروں استعما ل ہیں لیکن  برصغیر میں دوپٹہ بڑا رومانوی کردار رکھتا ہے۔ شاعری ہو، سیاست ہو یا مذہب ہر جگہ دوپٹے کی بڑی جگہ ہے۔

دوپٹہ قاتل چیز ہی نہیں بلکہ اسکی خاطر قتل تک ہو جاتے ہیں۔  یوں تھر کے صحرا میں منہ پہ دوپٹے کا ایک لمبا گھونگھٹ کاڑھے سر پہ پانی کی گگری بلکہ اوپر تلے  دو تین گگریاں رکھے کیٹ واک کی حسیناءووں کو مات دیتیں، پیروں تلے دھنسنے والی ریت پہ مورنی کی طرح چلنے والی سخت جان خواتین ہوں یا شہروں میں دوپٹے کو اپنی آرائیش کا ایک حصہ بنانے والی خواتین۔  ہر ایک دوپٹے سے  قابو کرنا جانتی ہے۔

نازنین نے اسکے ساتھ ہی ایک گہرا کش لے کر دھواں چھوڑ دیا۔ یہ دائرے میں گھومتا دھواں جب میرے سامنے کی فضا میں پھیلا تو سچ کہوں کہ میرا بڑی شدت سے دل چاہا کہ میں خود ایک ایسا تجربہ کر کے دیکھوں۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ اس قصبے میں کوئ ہسپتال اور ڈسپینسری نہیں۔ چکرا کر گرنے کی صورت میں باقی لوگوں کو بڑی پریشانی ہوگی۔ اس تجربے کی خواہش کا گلا گھونٹ کر میں نے اس سے کہا۔  اس میں تمباکو ہے ناں؟ اس میں ، اس نے ایک دفعہ پھر بے نیازی سے دھواں چھوڑا۔ اس میں تمباکو، چرس، افیون، اور پتہ نہیں کون کون سے زہر ہوتے ہیں۔ ہم اسے گُڑاکو کہتے ہیں۔

برا ہوتا ہے صحت کے لئے۔ میں نے ناصح بننے کی کوشش کی۔ یہ تو مجھے پتہ تھا کہ نازنین، میرے دل میں نہیں جھانک سکتی۔ سو ناصح بننے کا کردار اخلاقی اعتبار سے سب سے اعلی ، آسان  اور متائثر کن کردار، میں نے ادا کرنے میں ذرا حرج نہیں سمجھا۔

معلوم ہوا کہ اسکا شوہر بھی یہی کہتا ہے۔ مگر وہ کہتا ہے کہ بچے کے لئے اچھا نہیں ہے۔ میں کہتی ہوں جب بچہ ہوگا تو چھوڑ دونگی، اس نے حقے کو ذرا صحیح پوزیشن پہ لاتے ہوئے اس میں اپنا بیان جمع کیا۔ مگر نازنین، میں نے دخل دیا۔ بچے کی پیدائیش کے بعد نہیں بلکہ  اس وقت جب بچہ ماں کے جسم میں زندگی کا آغاز کرتا ہے اس وقت سے یہ اسکے لئے زیادہ برا ہوتا ہے۔ دھواں کچھ دیر کے لئے اسکے منہ میں بند ہو گیا۔ اس نے میرے چہرے پہ آنکھیں روکیں اور جیسے اسے سمجھ میں آگیا کہ اب کیسے مجھے چت کرنا ہے۔ مسکرائ اور گویا ہوئ، مگر مجھے اچھی طرح پتہ ہے ابھی میرے کو کوئ بچہ نہیں ہے۔

میں نے ہار ماننے کی اداکاری کی۔

اچھا، تم لوگ کتنی عمر سے حقہ پینا شروع کرتے ہو۔ ایک دفعہ پھر نازنین ہنسی۔ اس نے میری بات کا ترجمہ کیا۔ باقی لوگ مسکرائے کچھ تبادلہ ء خیال ہوا۔ پھر وہ ایک لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی۔ اس نے تو ایک سال کی عمر سے پینا شروع کیا تھا۔ ہمارے یہاں، اس کی کوئ عمرنہیں۔

ایک گھریلو حقہ

 بس مجھے خیال آیا کہ یہی نازنین، کراچی میں جینز اور بغیر آستین کی شرٹ پہنے یہی کام کر رہی ہو تو لوگوں کا ایک گروہ اسے روشن خیالی کے کھاتے میں ڈال کر یہ کہے گا کہ یہ ہے وہ آزادی جو شہر کی روشن خیال عورتیں، مغرب سے مرعوب ہمارے لوگ ہماری عورتوں کے لئے چاہتے ہیں۔ ہماری عورتیں سر عام سگریٹ پیئیں اور دھواں اڑا کر خوش ہوں۔ لیکن یہاں اس مقام پہ یہ ایک روایت ہے، رواج ہے، شغل ہے۔ کوئ برائ نہیں، کوئ مسئلہ نہیں، کوئ روشن خیالی نہیں۔

غذا کا معیاری نہ ہونا، اور تمباکو نوشی شاید وہ چیزیں ہیں جنکی وجہ سے یہ عورتیں اپنی اصل عمر سے کہیں بڑی لگ رہی تھیں۔ اپنی تمام تر کشش کے باوجود، نازنین کا چہرہ اس شادابی سے محروم تھا جو ایک اکیس بائیس سال کی صحت مند لڑکی کے چہرے سے پھوٹتی ہے۔

وہیں رفیق کی بہن بیٹھی تھی۔ جسکا شوہر چار سال پہلے اسے بھائ کے پاس چھوڑ کر چوتھی شادی کر چکا ہے۔ اسکی پہلی دو بیویاں مر چکی ہیں۔  تیسری بیوی، اسکی بہن کا سب سے چھوٹا بیٹا، ایک سال کا ہے۔ چار سال میں اسکے تین اور بچے ہوئے ہیں۔ اس کا مجازی خدا، سال میں ایک دفعہ آکر یہ فریضہ پورا کرتا ہے۔ بچے، رفیق پال رہا ہے۔ یہ ہے وہ بے اختیار مثالی عورت، جس کے مٹنے کے تصور سے روایت پسندوں کو ٹھنڈے پسینے آجاتے ہیں۔

ان لوگوں نے اپنے ہاتھ کے کڑھے ہوئے دوچ دکھائے۔ ان میں سے ایک کی قیمت دس ، پندرہ ہزار ہے، مجھے بتایا گیا۔  یقیناً ہوگی، ان پہ ہاتھ سے باریک کشیدہ کاری ہوئ تھی اور لاتعداد چھوٹے چھوٹے شیشے چمک رہے تھے۔ نازنین کہنے لگی شادی پہ ایسے تیس جوڑے دئیے جاتے ہیں۔ اور سونا بھی ۔ کتنا سونا دیتے ہیں؟ لڑکے کی ماں دیتی ہے، تیس تولے۔ تمہارے یہاں شادی پہ لڑکی کو کیا ملتا ہے؟ اس نے بڑی آن بان سے ان جوڑوں کو تہہ کرتے ہوئے مجھ سے دریافت کیا ۔

ہم، میں نے ایک گہری سانس لی۔ ہمارے یہاں، شادی پہ لین دین لڑکی والوں کے لئےبڑی مشکل چیز ہے۔ لڑکی کی ماں صرف لڑکی کو نہیں بلکہ دولہا، اسکے گھر والوں، اسکی بھابیوں اور بہنوئیوں کو بھی کپڑے دیتی ہے، جہیز دیتی ہے، لڑکی کو سونا دیتی ہے، شادی والے دن باراتیوں کو کھانا دیتی ہے۔ یہ سن کر وہ سناٹے میں آگئ ۔ ماتھے پہ بل ڈال کر کہنے لگی۔ یہ سب کچھ لڑکی کی ماں کرتی ہے تو پھر لڑکے کی ماں  کیا کرتی ہے؟ وہ ، جو انکی حیثیت ہوتی ہے وہ کرتے ہیں، حیثیت ہوتی ہے توسونا دیتے ہیں  ورنہ نہیں دیتے، کپڑے دیتے ہیں لیکن انکی تعداد لڑکی والوں سے کم ہی ہوتی ہے، ولیمہ کرتے ہیں، اور نخرے کرتے ہیں۔ نخرہ سمجھتی ہو تم، میں نے اسے پھر چھیڑا۔

ایک بات جو مجھے جان کر حیرت ہوئ، وہاں خواتین کا ضبط تولید کے طریقوں میں دلچسپی تھی۔ بچے انہیں چار سے زیادہ نہیں چاہئیں۔ مختلف خواتین نے اس سلسلے میں جو مدد لی اسکے نتائج سے وہ مطمئن نہیں۔ ایک عورت نے کہا، دیکھو میں کتنی موٹی ہو گئ ہوں۔ ان گولیوں کی وجہ سے۔ بہر حال، اس چھوٹے سے قصبے کی ان بند خواتین کا بچوں کی تعداد کے سلسلے میں فکرمند ہونا بھی ایک تبدیلی ہی ہے۔

رفیق کی بیوی اور نازنین نے اذان کے ساتھ اٹھ کر عصر کی نماز پڑھی۔ میں نے انہیں مطلع کیا کہ میں رخسانہ اور طیبہ کے گھر جانا چاہتی ہوں۔ کیا وہ میرے ہمراہ ہونگیں۔ نازنین تو میرا ساتھ دینے کو فوراً تیار ہوگئی۔ رفیق کی بیوی کچھ سوچنے لگی۔ میں نے پوچھا کیا تمہارا اس سے جھگڑا ہے۔  مترجم نے بتایا کہ وہ کہہ رہی ہے ایسی کوئ بات نہیں،  ہم انکے یہاں بس کسی تقریب میں جاتے ہیں۔ خیر پھر وہ بھی چلنے کو تیار ہو گئ۔

لیکن نازنین کہنے لگی پہلے میری امی سے تو مل کر جاءو۔ وہ یہیں قریب میں رہتی ہے۔ جب تک میرا ویزہ نہیں آتا۔ میں اسی کے پاس رہونگی۔

ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ تمہارے پاس کوئ چادر نہیں ہے؟ نازنین نے پوچھا۔ نہیں۔ تم جب کراچی سے آتی ہو تو سفر کے دوران بھی چادر نہیں لیتیں؟ نہیں، میں اپنی گاڑی سے آتی ہوں یا جہاز سے، اسکی ضرورت نہیں سمجھتی۔ پھر میں نے اپنے سوتی سوٹ کے دوپٹے کو پھیلا کر اسے دکھایا۔ یہ ڈھائ گز کا دوپٹہ کافی نہیں، وہاں کراچی میں تو بعض خواتین دوپٹہ بھی نہیں اوڑھتیں۔ ہاں ، ہاں میں جانتی ہوں نازنین نے جلدی سے کہا۔ ادھر مسقط میں بھی عورتیں فراکیں بھی پہنتی ہیں اور چھوٹے چھوٹے کپڑے پہنتی ہیں۔ مجھے ساڑھی بہت پسند ہے میں نے ادھر مسقط میں ساڑھی پہنی تھی، میں وہاں شلوار قمیض بھی پہنتی ہوں۔ مگر یہاں ابا کہتا ہے کہ بلوچی کپڑا پہنو۔ یہ سب سے اچھا ہوتا ہے۔ تمہیں اچھا نہیں لگتا ہمارا لباس۔ میری آواز ابھری، بہت اچھا ہے لیکن بات یہ ہے  اور یوں ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

کہانی مختصر۔ ہم رخسانہ کے گھر پہنچے، اور مجھے سمجھ میں آیا کہ رخسانہ، سماجی حیثیت میں ان سے خاصی کم ہے اس لئے شاید انکا آپس میں زیادہ میل جول نہیں ہوگا۔

رخسانہ کے گھر کی کھانا پکانے کی جگہ

 مہمانداری کی پہلی نشانی حقہ سامنے لایا گیا۔ دونوں خواتین نے اس حقے کی نے  پہ اپنا دوپٹہ لپیٹ کر پیا ایک اور امتیازی رویہ۔ مزید تواضع ہوئ، اورنج شربت کے چار گلاس اور ایک پلیٹ  بھر کر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔چھالیہ سپاری۔ میں نے معذرت کرتے ہوئے اسے پانی کی بوتل دکھائ۔ میں اسکے علاوہ کوئ اور پانی پیءونگی تو بیمار پڑ جائونگی۔ یہاں تو کوئ ڈاکٹر بھی نہیں۔ اس لئے شربت نہیں پی سکتی۔ نازنین نے میرے اس مسئلے کو سمجھا اور گردن ہلا کر کہا۔ ادھر میری بہن  مسقط سے آتی ہے تو وہ بھی یہ پانی نہیں پیتی۔ بوتل کا پیتی ہے۔

دیکھیں، بالکل معمولی تعلیم اور ایک ذرا باہر کی دنیا دیکھنے سے اسکی شعوری پہنچ کتنی بدل گئ تھی۔ میں نے سوچا۔

 رخصت ہونے لگے  تو پلیٹ  میں بھری سپاریاں دونوں مہمان خواتین نے آپس میں بانٹ لیں۔ اور ہم باہر نکل آئے۔ جہاں مشعل ایک گوادری بچی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، بچوں کے ایک جلوس کی قیادت کر رہی تھی۔  اس جلوس کو باریک مٹی کی دھول نے اپنی لپیٹ میں لیا ہو تھا۔ ہمارا مستقبل، تمام نفرتوں سے، طبقاتی فرق سے بے نیاز آزادی کے مزے لوٹ رہا تھا۔

 بچے اس نامعلوم ابدیت سے جب یہاں آتے ہیں تو خالی ہوتے ہیں اور ابدیت کا مظہر ہوتے ہیں۔ دنیا انہیں محدودیت سے آگاہ کراتی ہے۔ وتایو فقیر نے کہا کہ دوزخ میں کوئ آگ نہیں ہم اپنے حصے کی آگ اپنے ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ دنیا میں یہ آگ کہاں سے آتی ہے؟

رات سب کاموں سے فارغ ہو کر، کمپیوٹر پہ تصاویر لوڈ کرتے ہوئے، میں نے سمندر کی آواز کو دل لگا کر سنا۔ ہمارے اور اس آواز کے درمیان صرف ایک رات کا ساتھ اور تھا۔ رات جوتاریکی کی علامت ہے در حقیقت اپنے اندر خدائ خوبی رکھتی ہے۔ یہ ہر فرق کو اندھیرے کی شفقت سے مٹا کراپنے دامن میں پناہ دیتی ہے ہررنگ  مٹ جاتا ہے اور صرف حدیں باقی رہ جاتی ہیں۔ شاید اس لئے رب کائنات نے رات کی عبادت میں خود کو چھپا دیا۔ تاریک رات، دن سے کہیں زیادہ عظیم ہے۔ یہ ہمیں روشنی کی اہمیت سمجھاتی ہے، یہ ہمیں دعا کے انداز سکھاتی ہے، ملاقات کے آداب بتاتی ہے، یہ بے سکونی کو سکون سمجھاتی ہے اور سکون کو شورش، یہ راز رکھنا بتاتی ہے اور راز کھوجنا بھی، یہ پگھلنا سکھاتی اور پگھلانا بھی ۔

مجھ کو پانا ہے تو ہر لمحہ مجھے طلب نہ کر

رات کے پچھلے پہر مانگ دعا ہوں میں بھی

جاری ہے

7:43 PM

،Gawadar, بلوچستان, پاکستان, پروین شاکر, تمباکو،, حقہ, خواتین, روشن خیالی, کراچی, گوادر, مذہب, معاشرہ

ایک سونامی چاہئیے

اطلاع  ملی کہ جاپان میں شدید زلزلے کے ساتھ سونامی آگئ۔  نیوکلیئر پاور پلانٹ سمیت متعدد مقامات شدید نقصان سے دوچار۔ پاکستان میں کچھ لوگ کف افسوس مل رہے ہونگے کہ یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ یہ سب کچھ ہمارے یہاں ہوتا۔  قدرتی آفات کے نام پہ ہمارے یہاں کچھ لوگوں کی رال ٹپکنے لگ جاتی ہے۔ امداد جو ملتی ہے۔

خیر، اس وقت تو میں یہ خبر پڑھ کر سر دھن رہی ہوں کہ  وزیر داخلہ سندھ ذوالفقار مرزا آج سب سندھ اسمبلی میں داخل ہوئے تو ان کا ڈیسکیں بجا کر گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔  اسکی وجہ یہ نہ تھی کہ انہوں نے کراچی میں ٹارگٹ کلنگ کو روکنے کے لئَ کوئ موءثر قدم اٹھا ڈالا تھا، یہ انکا سر درد نہیں۔ اسکی وجہ یہ بھی نہیں تھی کہ وہ موجودہ عہد حکومت کے دوران ہونے والے کراچی میں سنگین واقعات مثلاً پچھلے سال محرم میں ہونے والی دہشت گردی اور لوٹ مار،  کے مجرمین کو وصل جہنم کر آئے تھے اور نہ ہی اسکی وجہ یہ تھی کہ وہ بحیثیت وزیر داخلہ سندھ میں جرائم کی سرکوبی کرنے میں کامیاب رہے اور کراچی سمیت پورے سندھ میں انہوں نے جرائم پیشہ لوگوں لو اپنے انجام تک پہنچادیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ پورے کراچی میں پچھلے تین سالوں میں نہ صرف  ڈکیتیوں سے لے کر اغواء برائے تاوان کے واقعات میں اضافہ ہوا ہے بلکہ ٹارگٹ کلنگ میں ہزاروں لوگ مارے جا چکے ہیں۔

تو پھر انکی پذیرائ کی وجہ کیا ہے؟  اسکی وجہ یہ ہے کہ لیاری کے جرائم پیشہ عناصر کو پیپلز پارٹی کی حفاظت کی چادر اوڑھائ۔ یہ یقیناً سندھ میں پیپلز پارٹی کی ایک بڑی کامیابی ہے۔ یوں ،

پچھلے سال شیر شاہ

میں ہونے والے قتل و غارت گری کے مجرموں کو پہلے امن کمیٹی کا تحفظ دیا گیا  اور پھر پیٹھ تھپک کر شاباش دے دی گئ۔ اور اس عمل کو پیپلز پارٹی کے ممبران اسمبلی کی حمایت حاصل رہی۔ انکا کہنا کہے کہ اس طرح وہ لیاری کے جرائم پیشہ افراد کو مین اسٹریم میں لا رہے ہیں۔ مرنے والے جائیں جہنم میں۔ ویسے بھی انکی اکثریت اردو بولنے والوں سے تعلق رکھتی ہے۔ انکی پرواہ اگر کسی کو کرنی چاہئیے تو وہ ایم کیو ایم ہے۔ پیپلز پارٹی کیوں کرے۔ سب کو اپنے تعصب کی جنگ لڑنی ہے۔

اپنی ایک عوامی تقریر میں وہ فرماتے ہیں کہ

یہ بات بھی کوئ ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ کراچی میں اغواء برائےتاوان اور لوٹ مار کی وارداتیں اب صوبائ حکومت کی سرپرستی میں ہو رہے ہیں۔ اغواء برائے تاوان اور ڈاکے، فیوڈل سسٹم کے کرتا دھرتاءوں کا نشان امتیاز رہے ہیں۔ اور اب شاید ایم کیو ایم سے متائثر ہو کر انہوں نے بھتے کو بھی اپنے منشور میں شامل کر لیا ہے۔ ایم کیو ایم اپنے اس امیج کو دھونے کی کوشش کر رہی ہے تو پیپلز پارٹی نے اسے حاصل کر لیا۔

اس روئیے کے بعد پاکستانی معاشرے کے مختلف لوگ خدا جانے کس منہ سے یہ بات کرتے ہیں کہ ایم کیو ایم تعصب کی سیاست کرتی ہے فاشسٹ ہے۔ اور ہم نہیں ہیں۔ یہاں سب ایک حمام میں ننگے ہیں۔

ہماری حکمراں جماعت کے حصے میں یہ کارنامہ بھی آیا کہ سپریم کورٹ آف پاکستان کے فیصلے کے خلاف انہوں نے سندھ میں ہڑتال کال کی اور اسے کامیاب بنانے کے لئے ایکدن میں نو سے زائد افراد مارے گئے۔ شہر میں گاڑیوں کو نذر آتش کیا گیا۔ اور انتہائ دلچسپی کی بات یہ کہ ہمارے محبوب صدر کے گھر بلاول ہاءس کے سامنے ہی ایک بس کو جلایا گیا۔ یہ بات تو ہمارے قارئین کو ضرور پتہ ہوگی کہ صدر صاحب، پیپلز پارٹی کے کو چیئر مین ہیں۔ یوں جیالوں کی آزادی، عدلیہ کی آزادی پہ سبقت لے گئ۔

یہ بات ہمارے علم میں نہیں کہ  سپریم کورٹ کے فیصلے کے خلاف ہڑتال کی 'دانشمندانہ، جیالی اور جوسی تجویز' پہ ملکی کال دینے کے بجائے کراچی کو کیوں چنا گیا؟

 خیر، ملکی سیاست پہ ایک ہلکی سی نظر سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ پاکستان میں آزاد غنڈوں کا کوئ تصور نہیں رہا۔ ہر غنڈہ ، بدمعاش شخص کام پہ لگا ہوا ہے۔ کسی نہ کسی سیاسی یا مذہبی تنظیم سے وابستہ ہے۔ مذہبی جماعتوں نے انہیں مجاہد کا نام دیا ہے اور سیاسی جماعتوں نے کارکنوں کا۔

میری عزیز دوست نے اپنے جواں العمر بھائ اور  چار چھوٹی بچیوں کے باپ کے ایسے ہی قتل پہ  آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ جو لوگ سیاسی غنڈوں کے ہاتھوں قتل ہوتے ہیں۔ انکے لئے انصاف کی داد رسی کس سے چاہیں؟

میرے پاس اس کا جواب نہیں۔ میں تو خوداپنے ملک میں کسی سیاسی سونامی کی منتظر ہوں۔

11:15 PM

Karachi, امن کمیٹی, پاکستان, پیپلز پارٹی, ٹارگٹ کلنگ, جاپان, سپرہم کورٹ, سونامی, کراچی, لیاری, ہڑتال

ساحل کے ساتھ-۶

صبح میکینک واپس چلا گیا۔ ہم نے طے کیا کہ آج بدھ ہے جمعے کی صبح ہم بھی نکل جائیں گے بس سے۔ گاڑی یہیں چھوڑ دیں گے۔ کم از کم گھر میں کھڑی ہے۔ یہاں ایک صاحب دیکھ بھال کے لئے موجود ہیں۔ یوں اس مسئلے کا ایک عارضی حل نکل آیا۔ تھوڑا وقت ملا تو ہم ایک دفعہ پھر پہاڑ کے اس طرف چکر لگا آئے۔ واپس آ کر کھانے کے بعد کا پلان یہ بنا کہ میں اور مشعل محلے کے ایک دو گھروں کا چکر لگا لیں۔

ایک اور خوبصورت منظر ساحل، سمندر اور افق کے پہاڑ اور ایک ڈولتی ناءو

ایک گھر سے ایک دن صبح کا ناشتہ اور رات کا کھانا آیا تھا۔ وہاں نہ جانا تو بد اخلاقی ہوگی۔ شام کو چار بجے ہم دونوں نکلے۔ ایک مقامی صاحب سے مدد چاہی۔ قصبہ، یونہی اٹکل پچو انداز میں بنا ہوا ہے۔ گلی وغیرہ کا تصور بالکل خام حالت میں ہے پانچ  ہزار سال پرانے موئن جو داڑو کا جو نقشہ بیان کیا جاتا ہے وہ اس سے بہتر ہوگا۔ اب بھی دوبارہ اس گھر میں جانا چاہوں تو کسی کی مدد درکار ہوگی۔

گھر میں داخل ہوئ تو بکری کے پیشاب کی بدبو نے استقبال کیا۔ چھوٹے سے گھر میں تین کمرے اور انکے آگے برآمدہ تھا۔بالکل چھوٹے سے کچے صحن میں چار پانچ بکریاں بندھی ہوئیں تھیں۔ خوشحالی کی ایک نشانی۔ یہ ایک خوشحال گھر تھا جہاں علیحدہ سے باورچی خانے موجودتھا۔

ہم میزبان کے کمرے میں داخل ہوئے جو بیک وقت خوابگاہ اور ڈرائینگ روم اور ٹی وی کے کمرے کے طور پہ بھی استعمال ہوتا ہوگا۔ بہر حال یہاں ایسے گھر بھی موجود ہیں جہاں ایک ہی کمرے میں پندرہ لوگ سوتے ہیں۔ خواتین بچے، بوڑھے، شادی شدہ، غیر شادی شدہ سب۔

تین بچیاں تیرہ چودہ سال کی عمر کی بیٹھی ہوئیں تھیں اور تین خواتین۔ میرے گھر میں داخل ہوتے ہی دو اور خواتین آگئیں۔ ایک عورت کشیدہ کاری میں مصروف تھی اور باقی سب خوش گپیوں میں انکے درمیان میں حقہ موجود تھا۔ جس سے وہ سب باری باری کش لے رہی تھیں۔ یوں حقہ محفل میں گردش میں تھا۔ ان میں سے کسی کو اردو نہیں آتی تھی۔ ان بچیوں کو آتی تھی مگر انہیں بولنے میں بہت ہچکچاہٹ تھی۔

دس منٹ بھی نہ گذرے ہونگے کہ ایک اورعورت ایک بے حد اسمارٹ برقعے میں اندر داخل ہوئ۔ یہ نازنین تھی ہماری مترجم۔ پانچ سال پہلے جب میری اس سے ملاقات ہوئ تھی تو وہ پندرہ سال کی ہوگی۔ پانچ جماعتیں پڑھنے کے بعد شادی ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔تم نے پڑھنا کیوں چھوڑ دیا۔ میں نےاس سے پوچھا۔ ابا نے کہا بس اتنا کافی ہے۔ تو تم نے ابا سے یہ کیوں نہیں کہا کہ میں آگے پڑھونگی اور الیکشن میں کھڑے ہو کر

زبیدہ جلال

کی طرح اسمبلی میں لیڈر بنونگی۔  تھپڑ مارے گا، ابا۔ اس نے ہتھیلی کو کھڑآ کر کے تھپڑ کی شدت بیان کرنے کی کوشش کی تھی۔  بلوچی اسٹائل میں سیدھا، کھڑا جواب۔ وہ زبیدہ جلال کو سخت نا پسند کرتا ہے۔ کیوں؟ وہ کہتا ہے عورت کو یہ سب نہیں کرنا چاہئیے۔ اچھا میں خاموش ہو گئ تھی۔

آج وہی نازنین میرے سامنے موجود تھی شادی کو تین سال ہو گئے۔ بچہ نہیں ہے کوئ۔ کیسے ہوگا، میں اپنے شوہر کے پاس بہت کم رہی ہوں۔ وہ مسقط میں ہوتا ہے اسکا سارا خاندان مسقط میں ہے۔

یہ بھی دلچسپ تھا کہ باوجود اسکے کہ وہاں چھوٹی عمر کی بچیاں بھی موجود تھیں۔ انہیں کسی بھی طرح کی گفتگو کرنے میں کچھ مسئلہ نہ تھا۔ انکا یہ تصور نہ تھا کہ یہ باتیں بچوں کے سامنے کرنے کی نہیں۔

ہمم، مگر شادی اس نے گوادر میں کی۔ میں نے اس سے کرید کی۔  ہاں کہتا ہے رشتے دار تو سب ادھر ہے۔

گوادر

، ایک لمبے عرصے تک عمان کے زیر تسلط رہا۔ انیس سو اٹھاون میں حکومت پاکستان نے بعوض تیس لاکھ امریکن ڈالر اسے عمان سے خریدا۔  اس وجہ سے یہاں کے طرز بودو باش پہ عربی ثقافت کا اثر ہے۔ اکثر لوگوں کے عزیز اقارب مسقط میں ہیں۔ اور آنا جانا رہتا ہے۔

 تمہارے شوہر نے تمہیں اب تک مسقط نہیں بلایا؟ ویزہ نہیں دے رہے وہ لوگ۔ میرے شوہر کو بڑا غصہ ہے۔ ویسے میں دو دفعہ وہاں گئ ہوں۔ دو تین مہینوں کے لئے۔  عربی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میں نے اس سے ہمدردی کی۔ فون آتا ہے اس کا؟ ہاں دن میں کئ دفعہ۔ اس نے کئ دفعہ پہ زور دیا۔ اچھا،  میں تو سمجھتی تھی کہ بلوچی مرد بہت کم رومینٹک ہوتے ہیں۔ لو،  اس نے بلوچی میں ایک عورت کو میری بات کا ترجمہ کر کے بتایا، اور ہنسنے لگی۔ پاکستان میں جتنی قومیتیں بستی ہیں ان میں سب سے زیادہ رومینٹک بلوچی مرد ہوتے ہیں، نازنین نے دعوی کیا۔ مجھے نجانے کیوں لگا کہ یہ دعوی، شماریات کے ان نتائج کی طرح تھا جو موقع پہ ہی بنائے جاتے ہیں۔ نازنین شاید یہ کہہ رہی تھی کہ بلوچی عورت بڑی حساس ہوتی ہے۔ مگر عورتیں تو سبھی بڑی حساس ہوتی ہیں۔ جب ہی تو خداوند نے تخلیق کی ذمہ داری انہیں دی۔

اچھا، میں نے اسے مزید چھیڑا۔ تو تمہارارومینٹک شوہر تمہیں دن میں کتنی دفعہ آئ لو یو کہتا ہے؟ کوئ گنتی نہیں۔ اس نے ہاتھ اٹھا کرجھٹکا۔ اسکے ہاتھ کی جنبش میں ایک فخر تھا۔ دن میں کتنی دفعہ لکھ کر ایس ایم ایس کرتا ہےاور رات کو جب فون پہ بات کرتا ہے تو دس دفعہ کہتا ہے۔ میں ہنس رہی تھی۔ باقی لڑکیاں اور عورتیں بھی صرف آئ لو یو سمجھ کر مسکرا رہی تھیں۔ انہیں آئ لو یو سمجھ میں آرہا تھا۔

میں نے رفیق بلوچ کی بیوی کی طرف اشارہ کیا اچھا اس سے پوچھ کر بتاءو اسکا شوہر کہتا ہے اسے آئ لو یو۔  اس نے بلوچی میں اس سے پوچھا اور پھر کہنے لگی اسکا شوہر کیوں کہے گا۔ آئ لو یو۔

کیا مطلب، تمہارا شوہر کیوں کہتا ہے؟ میرا شوہر اس لئے کہتا ہے کہ مجھے معلوم ہے کہ آئ لو یو کا کیا جواب ہے۔

سچ پوچھیں تو مجھے گفتگو اب ایک فلسفے کی طرف جاتی ہوئ لگی فلسفہ ء رومانس۔ آئ لو یو کا کیا جواب ہوتا ہے۔ میں نے اپنے دماغ کو ٹٹولا۔

آپ بھی سوچیں۔

یہاں میں اس کہانی کو ذرا سسپنس میں رکھنے کے لئیے کچھ ادھر ادھر کی اطلاعات ڈالتی ہوں۔ مثلاً نازنین کا برقعہ۔ وہ دبلی پتلی لمبی لڑکی تھی۔ جسکے نین نقش تو تھے ہی خوب کٹیلے، لیکن ان سب پہ اس کا انداز گفتگوبھاری تھا۔ جس میں ایک بانکپن اور غرور تھا۔ ایسا غرور جو الجھنے کی دعوت دیتا ہے۔ اور جب الجھ جائیں تو مزہ آنے لگتا ہے۔

ہاں تو اس کا برقعہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ برقعہ، اس فیوڈل نظام میں اعلی طبقے کی خواتین کی نشانی ہے۔ یہاں جتنے اعلی خاندان سے تعلق، اتنا ہی خواتین پردے میں ہونگیں۔ اسلام سے

پہلے بھی برقعہ

موجود تھا مگر صرف طبقہ ء اشرافیہ یعنی دولتمند گھرانوں کی خواتین پہنتی تھیں۔ نچلے طبقے کی خواتین اسکا استعمال نہیں کرتی تھیں۔ یوں انسانوں کی خوشحالی انکی خواتین کے رہنے سہنےسے پتہ چل جاتی تھی اب بھی بیشتر اوقات خواتین سے ہی مردوں کی کمانے کی استطاعت پتہ چلتی ہے۔

خیر اسکا برقعہ بڑا اسٹائلش تھا۔

کالے رنگ کا خوبصورت فال کا کپڑا، جو جسم کی تراش کے حساب سے اوپر سے فٹنگ میں تھا اور نیچے سے گھیردار، تنگ آستینیں جن پہ فیروزی ستاروں اور ریشم کا نفیس کام کیا ہوا تھا۔ اسکے اسکارف کے ایک سرے پہ بھی وہی کام بنا ہو تھا۔ جو منہ سے لپٹنے کے بعد گردن پہ پھیل جاتا۔ اور جس میں سے اسکی قاتل سرمہ لگی ہوئ

آنکھیں جھانکتی

رہتیں۔

 میں نے اس سے پوچھا، کیا یہ برقعہ تم نے کراچی سے لیا ہے۔ جواب ملا نہیں مسقط سے۔ اوہ لگ رہا ہے۔ کراچی میں، میں نے کبھی اتنا خوبصورت برقعہ نہیں دیکھا۔ میں نے اسے سراہا۔

خیر ہم کہاں تھے، آئ لو یو کے جواب پہ۔ سو میں نے اس سے پوچھا کہ آئ لو یو کا کیا جواب ہوتا ہے؟ سر پہ ہاتھ رکھ کر اس نے ایک بے نیازی سے اسے جھٹکا پھر بلوچی حسینہ  مسکرائ اور ایک ادا سے منہ پھیر کر بولی۔ آئ لو یو کا جواب ہوتا ہے آئ لو یو ٹو۔

مار ڈالا۔

وہ تیرہ چودہ سالہ بچیاں دوپٹے میں منہ گھسا کر ہنسنے لگیں ان میں سے ایک نے جلدی سے حقے کی نے تھامی اور زور زور سے دو تین کش لے ڈالے۔

تمہیں تو بڑی انگریزی آتی ہے۔ میں لاجواب ہو گئ۔ تمہیں کیسے پتہ چلا کہ آئ لو یو کا جواب آئ لو یو ٹو ہوتا ہے۔ کہنے لگی، جہاں سے اردو سیکھی ہے وہیں سے اس کا جواب بھی پتہ چلا۔ یعنی انڈین  ڈراموں سے؟ ہاں وہیں سے۔ اس نے بلوچی لہجے میں ہاں پہ زور دیا۔ یہ رفیق کی بیوی بالکل ٹی وی نہیں دیکھتی، نہ اسے اردو آتی ہے اور نہ آئ لو یو کا جواب۔

زندگی کے اس لمحے تک، میں اسٹار پلس کے ڈراموں میں کبھی کوئ مثبت پہلو نہیں نکال سکی تھی۔ لیکن اس دن میں نے تسلیم کیا کہ ان ڈراموں میں ایک خوبی تو ہے اور وہ یہ کہ تمدن کی دنیا سے دور رہنے والے بھی ایک دوسرے کو آئ لو یو کہہ سکتے ہیں۔ غیرت میں عورت کے  قتل  پہ فخر کرنے والے بھی محبت کے اس ظاہری اظہار کی سمجھ رکھنے لگے ہیں اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ انہیں اپنے ساتھی کو پیار بھری کوئ بات کہنی چاہئیے۔ یہ تبدیلی کتنی غیر محسوس طریقے سے آئ ہے، کتنی آہستگی سے کہ بہت سارے لوگوں کو اسکی خبر بھی نہ ہو سکی۔ شاید آئ لو یو اور آئ لو یو ٹو کہنے والے بھی اپنی اس تبدیلی سے نا آشنا ہیں۔

۔

۔

۔

خیال آیا کہ کیا میں اپنے مرد قارئین سے صرف یہ پوچھ سکتی ہوں کہ انہوں نے اپنی قریبی خواتین کو جس میں انکی مائیں ، بہنیں، بیویاں اور بیٹیاں اور دیگر رشے دار  خواتین شامل ہیں، انکو آخری دفعہ کب کہا کہ وہ ان سے محبت کرتے ہیں؟

جاری ہے

11:16 PM

اردو, اسٹار پلس, بلوچ, بلوچستان, پاکستان, خواتین, ڈرامے, عمان, عورت, گوادر, مسقط

ساحل کے ساتھ-۵

 گذشتہ سے پیوستہ

اندھیرا پھیل چلا تھا جب میں مشعل کو رات کا کھانا کھلا کر فارغ ہوئ۔ پتہ چلا کہ محلے سے دو خواتین ملنے کے لئے آئ ہیں۔ عبایہ پہنے ہوئے جب وہ اندر آئیں تو مجھے لگا کہ ان میں سے ایک سے پہلے مل چکی ہوں۔ طیبہ، یہی نام ہے ناں تمہارا۔ میں نے ان میں سے ایک سے کہا۔ وہ ایکدم مسکرائ۔ میں سمجھی  تم مجھے بھول گئ۔ ارے نہیں، میں اتنے عرصے بعد یہاں آئ ہوں تم اتنی بڑی ہو گئیں۔

طیبہ، اپنی بڑی بہن اور چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ آئ تھی۔ اسکی عمر یہی کوئ چودہ پندرہ سال ہوگی۔ اسکی بڑی بہن اس سے کوئ دو تین سال بڑی تھی۔ نام تھا اس کا فرض کریں کہ رخسانہ۔

تم لوگوں کو اردو کیسے آتی ہے؟  ڈارمے دیکھتے ہیں اور فلمیں کیبل پہ۔ اس سے آئی ہے۔ کیبل یہاں کوئ چار سال پہلے آیا ہے۔ اور چار سال کے حساب اردو فرسٹ کلاس۔  جو چینلز یہاں آتے ہیں وہ زیادہ تر انڈین یا ایرانی ہیں۔ ایرانی اس لئے کہ گوادر سے ایرانی سرحد زیادہ دور نہیں۔ اور انڈین کس لئے، یہ نہ معلوم یا معلوم؟  پاکستانی چند چینلز آتے ہیں ان میں سے ایک دو خبروں کے ہیں۔ ڈرامے کا کوئ چینل نہیں ہے۔ لازماً ان لوگوں کی اردو پہ ہندی کا اثر ہے۔ جب ہی ایک بچے نے مجھ سے پوچھا کیا تم پتنی ہو؟

جتنی دیر وہ میرے پاس بیٹھی رہی۔ رخسانہ اپنی دوچ ، خواتین کا خاص بلوچی لباس،  کی جیب میں سے موبائل نکال کر دیکھتی رہی۔  یہ مجھے پتہ چل گیا کہ تم ہو بڑی مالدار، موبائل فون ہے تمہارے پاس۔ میں نے اسے چھیڑا۔ لیکن یہ بتاءو، جب  تمہیں پڑھنا نہیں آتا تو تم کیسے موبائل کو چیک کرتی ہو۔ ہنسنے لگی۔

ہلکے پھلکے مذاق کے بعد میں نے گفتگو کو قائم رکھنے کو پوچھا ، تو تم لوگ تین بہنیں چار بھائ ہو۔ نہیں ہم چار بہنیں اور چار بھائ تھے۔ بڑی بہن  مر گئ۔

میں خاموش ہو گئ۔ اچھا کیسے مر گئ۔ وہ اسکی شادی ہو گئ تھی۔ وہ پھر خاموش ہو گئ۔ ہمم، بچے کی پیدائش کے سلسلے میں مر گئ۔ نہیں اسے میرے گھر والوں نے زہر دے دیا تھا۔ اس نے اتنے سادہ اورعام لہجے میں کہا زہردے دیا تھا، جیسے گھر میں کسی چوہے کے مرنے مارنے کا تذکرہ ہو،  میں دنگ رہ گئ۔ ایک سال پہلے وہ مری۔ اندازاً اٹھارہ انیس سال کی ہوگی۔

مگر تمہارے گھر والوں نے اسے زہر کیوں دیا؟  وہ اسے اپنا شوہر پسند نہیں تھا۔ اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ کیوں؟ وہ اس سے بہت بڑا تھا۔ پہلے بھی اسکی دو شادیاں ہوئیں تھیں۔ وہ اسکی تیسری بیوی تھی۔

تمہیں کیسے پتہ گھر والوں نے اسے زہر دیا تھا؟ یہاں سب کو یہ بات پتہ ہے۔ وہ ہمارے گھر رہنے آئ ہوئ تھی۔ بس ایک دن مر گئ۔

غیرت بڑی چیز ہے جناب۔ اسکے آگے ایک اٹھارہ انیس سال کی لڑکی کیا اوقات ہے۔ اسی صوبے کے ممبرقومی اسمبلی نے ایک دفعہ کہا تھا کہ غیرت پہ قتل ہماری روایت ہے۔ اور اس بات سے ہم سب اچھی طرح واقف ہیں کہ خواتین کے سلسلے میں روایت توڑی نہیں جا سکتی اور جو جہاں ہے وہاں سے وہ حتی المقدور حصہ لیتا ہے۔ جو عملی طور سے نہیں کر پاتے وہ زبان سے کرتے ہیں۔

بلوچ بغاوت کرنا چاہتے ہیں مگر نہیں جانتے کہ کس کے خلاف بغاوت کرنی چاہئیے اور یوں کچھ روحیں شب انتظار کے مختصر ہونے کے انتظار میں برزخ میں ہیں۔

میں نے بات بدلنے کو کہا۔ تم دونوں کی منگنی ہو گئ کیا۔ دونوں شرما گئیں، نہیں ابھی تو نہیں۔ اچھا یہ بتاءو تمہارے یہاں لڑکی کو کیسے پسند کرتے ہیں۔ نہیں، ہمارے یہاں پسند کی شادی نہیں ہوتی رخسانہ نے فوراً میری بات کاٹی۔ مجھے معلوم ہے تمہارے یہاں ایسے نہیں ہوتا۔ میں پسند کی شادی کا نہیں کہہ رہی یہ پوچھ رہی ہوں کہ ایک لڑکی کو لڑکے والدین جب دیکھتے ہیں تو وہ کس چیز کو پسند کرتے ہیں۔ شکل صورت، ابا کا کام یا اسکی پڑھائ۔ کیسے انہیں کوئ لڑکی پسند آتی ہے۔

طیبہ کی بڑی بہن نے پہلے سوچا اور پھر بڑے مدبرانہ انداز میں کہنے لگی۔ ہمارے یہاں اس لڑکی کو پسند کرتے ہیں جو عزت میں زیادہ ہو۔ کون عزت میں زیادہ ہوتی ہے؟  میں نے پھر سوال داغا۔ جواب، وہ جسے گھر کے سارے کام آتے ہوں، کڑھائ سلائ آتی ہو، جانوروں کو دیکھ لیتی ہو۔

اس پہ میں نے طیبہ سے کہا، طیبہ تمہارا کیا ہوگا۔ تمہاری شکل تو اچھی ہے لیکن عزت تو تمہاری بڑی بہن کی زیادہ ہے اسے سب کام آتے ہیں اور تمہیں صرف جھاڑو دینا آتی ہے۔ اسکی شادی تو ہو جائے گی تم کیا کروگی۔ میں نے اسکی طرف دیکھ کر سوالیہ انداز میں بھنوئیں اچکائیں۔ جواباً اس نے بھی اپنی بھنوئیں شرارت میں ہلائیں۔  ہاں میں کیا کرونگی، مجھے تو صرف جھاڑو دینا آتی ہے۔

جب چلنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں تو اصرار کیا کہ ہمارے گھر بھی ضرور آنا۔ چلتے چلتے، بڑے شوق سے کمرے کے درمیان لٹکے ہوئے جھولے کی طرف دیکھنے لگیں۔ بیٹھنا چاہو تو بیٹھ جاءو۔ ادھر محلّے کے اور بچے بھی اس جھولے میں بیٹھنے کے لئے آتے ہیں۔ مجھے بھی پسند ہے۔

ٹوٹ جائے گا؟ نہیں ٹوٹے گا۔ یہ لوہے کی زنجیر بڑی مضبوط ہے۔ میں نے زنجیر کو ہلایا۔  میں، مشعل اور اسکے ابّا تینوں ایک ساتھ اس جھولے پہ لیٹ جاتے ہیں نہیں ٹوٹتا۔ میں نے حوصلہ دینے کو کہا۔ نہیں، انہوں نے پھر سوچا اور انکار کر دیا شاید شرم مانع تھی۔  پھر کمرے کے دروازے سے باہر نکلتے نکلتے یک لخت طیبہ پلٹی اور آ کر جھولے پہ بیٹھ گئ۔ بچپن اتنی آسانی سے ہاتھ ہلا کراور دامن جھاڑ کر رخصت نہیں ہوتا اور بعض لوگوں  سے کبھی نہیں۔

پتہ چلا کہ شافٹ یہاں صحیح نہیں ہو سکتی اور فیصلہ یہ کیا ہے کہ کراچی سے نئ لا کر لگائیں۔ اب ہمیں واپسی کا پروگرام سیٹ کرنا تھا۔ مکینک صبح کی بس سے واپس جا رہا تھا۔ گاڑی کے بغیر ہم بھی یہاں کچھ کرنے کے قابل نہیں۔ کراچی کی طرح یہاں ٹرانسپورٹ کی سہولت نہیں۔

رات کو کھانے کی میز پہ مکینک صاحب بھی موجود تھے۔ معلوم ہوا کہ گوادر میں لوگوں نے انہیں بلوچ ماننے سے انکار کردیا۔

کیسا بلوچ

ہے، نہ شراب پیتا ہے، نہ  افیون چرس لیتا ہے نہ گٹکا کھاتا ہے ۔  چھالیہ بھی نہیں کھاتا۔ تو بلوچی نہیں ہو سکتا۔ مکینک شرماتا ہوا کہہ رہا تھا کہ ادھر کراچی میں بھی لوگ کہتا ہے کہ تم کیسے مکینک ہو کسی قسم کا نشہ نہیں کرتے۔

مجھے چین یاد آگیا۔ چین سے تجارت میں جیتنے کے جذبے میں انگریزوں نے چینیوں کو افیون کی لت لگائ۔ چین نے دو جنگیں لڑیں جو

افیون کی جنگیں

کہلاتی ہیں۔ ہانگ کانگ کے جزیرے سے ہاتھ دھونا پڑا۔ یوں ایک پوری صدی چین ذلت اور شرمندگی کے نشے میں دھت رہا۔ انیس سو گیارہ میں شہنشاہیت کے خاتمے کے ساتھ چین ری پبلک بنا۔ مزید سیاسی اصلاحات ہوئیں۔ ماءو زے تنگ کی سخت پالیسیز سامنے آئیں۔ اور افیون کے نشے میں

دھت قوم

  جاگی اور ایسی جاگی کہ آج بھی خاموشی سے دنیا کی عظیم قوم بننے سے لگی ہوئ ہے۔

جاری ہے

10:25 PM

افیون, بلوچستان, چین, خواتین, غیرت, قتل, کراچی, گوادر, منشیات

شرمندگی کے بول

حالیہ کچھ سالوں نے ہمیں ٹریجڈیز کے علاوہ کچھ نہیں دیا۔ ایک نیا المیہ۔ پاکستان میں اقلیتی امور کے وزیر شہباز بھٹی کو سورج کی روشنی میں قتل کردیا گیا۔ یعنی اب قتل کرنے کے لئے کسی کرامت کی ضرورت نہیں۔ قاتل کو کف آستین اور دامن کے داغ چھپانے کی بھی ضرورت نہیں۔

اہل طاقت کے پاس مذمتی بیانات کا وہی پرانا سلسلہ اور اہل فکر کے پاس مستقبل کی پریشان کن تصاویر اور وسوسے۔ یقین نہیں آتا کہ یہ ہے وہ پاکستان جہاں ایک سال میں تین ہزار کے لگ بھگ لوگ دہشت گردی کے حملوں کا شکار ہوئے اور اڑسٹھ خود کش حملے ہوئے۔ اور اہل طاقت اسی طرح طاقت کی رسہ کشی میں مصروف ہیں۔ کوئ اس آگ اور خون اگلنے والی عفریت کو قابو نہیں کرنا چاہتا۔

شہباز بھٹی کے قتک کے ساتھ ہی مختلف قیاس آرائیوں کا سلسلہ ایک دفعہ پھر شروع ہو گیا۔ مذہبی علماء نے اس قتل کی حسب معمول مذمت کی اور پھر سے نجانے کتنی لاکھویں دفعہ یہ جملہ دوہرایا گیا کہ ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے۔ انہوں نے ایک دفعہ پھر اس قتل کے تانے بانے امریکہ سے جوڑے۔

 اس دفعہ ہم اس حلقے میں شامل ہیں جو مذہبی علماء سے یہ سوال کرنا چاہتا ہے کہ پاکستان میں کیا مذہب کو اپنے جنون کے اظہار کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا؟  اگر وہ سمجھتے ہیں کہ بیرونی طاقتیں ملک میں فرقہ واریت کی بنیاد پہ فساد کو جنم دینے کی کوشش کر رہی ہیں تو وہ اس بات کی وضاحت بھی کریں کہ اب تک مذہبی انتہا پسندی کو ختم کرنے کے لئے انہوں نے کیا کیا؟ انہوں نے لوگوں کے اندر قوت برداشت پیدا کرنے کے لئے کیا کیا؟ انہوں نے مذہبی رواداری پیدا کرنے کی جو عملی کوششیں کی ہیں ان سے ہمیں آگہی کیوں نہیں اور ہم اب تک اسکے ثمر سے کیوں محروم ہیں؟

ایک اور سیاسی نکتہ رکھنے والا گروہ بھی ہے جو اس قتل کی ذمہ داری حکمراں طبقے کی اعلی قیادت پہ ڈالتا ہے۔ کیونکہ اب تک یہ مسئلہ لا ینحل ہے کہ سلمان تاثیر کے باڈی گارڈز میں قادری کی شمولیت کیوں کی گئ جبکہ اسکے خیالات کسی سے چھپے ہوئے نہ تھا۔ دوئم سلمان تاثیر کے قتل کی شہادتیں صحیح قانونی طریقے سے کیوں نہیں جمع کی گئیں۔

اب یہی مسئلہ شہباز بھٹی کے قتل کے ساتھ نظر آرہا ہے۔ قتل کی دھمکیوں کے باوجود قتل کے وقت، سیکیوریٹی انکے پاس موجود نہ تھی۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ شہباز بھٹی ان لوگوں میں شامل ہیں جو سلمان تاثیر کے قتل کی تفتیش میں دلچسپی لے رہے تھے۔

 اسکے باوجود کہ تحریک طالبان نے اسکی ذمہ داری لی ہے یہ حسب توقع ایسے  پیچیدہ سیاسی قتل میں شامل ہو جائے گا جس کے مجرمین کے بارے میں ہمیں کبھی نہیں پتہ چلتا۔

ہردو نکتے سے الگ، اگر پاکستان میں امن و امان کی صورت حال کو بہتر بنانا ہے، اور اسے کسی بھی مثبت سمت کی طرف لے جانا ہے تو ایک طرف ہمیں  آزادی فکر کو ترویج دینی ہوگی جس کے لئے برداشت بنیادی چیز ہے۔ اس کے لئے مذہبی جماعتوں کو اپنے یوٹوپیا سے باہر آنا ہوگا۔ کیونکہ اسکے بغیر اصل مسائل کو کارپٹ کے نیچے چھپایا جاتا رہے گا۔

دوسرے ہمیں اپنے سیاسی نظام کو نئے سرے سے تشکیل دینا ہوگا جہاں واقعی عوام کی حکومت عوام کے ذریعے سے ہو، جہاں اہل اقتدار، دولت کی ہوس میں اقتدار سے چمٹے نہ رہیں اور ایکدوسرے کے خلاف سازشوں کے جال بنتے رہیں اس طرح کہ انہیں ملکی اور عوامی مفادات کی ذرہ بھر فکر نہ ہو۔ اور جہاں تبدیلی کے لئے فوج کی حمایت درکار نہ ہو۔

شہباز بھٹی، ہم آپ سے شرمندہ ہیں۔ ہم پاکستان کے کمزورعوام آپکو بچانے کے لئے کچھ نہ کر سکے۔

10:48 AM

اسلام, اسلام آباد, اقلیت, پاکستان, پیپلز پارٹی, تحریک, شہباز بھٹی, طالبان, مذہب

ہرجائ کا لوٹا

آج میں مشعل کو اسکول سے لینے کے لئے جب گھر سے نکلی تو روڈ کی حالت دیکھ کر سمجھ نہیں آیا کہ اتنی افراتفری کیوں ہے۔ جہاں صرف ایک منی بس چلتی ہے وہاں خالی منی بسز کی قطار لگی ہوئ ہے۔ ٹریفک بری طرح جام۔ خیر مجھے زیادہ دور نہیں جانا تھا، اس لئے بچت ہو گئ۔ واپسی میں  بھی صورت حال کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ گھر پہنچ کر پتہ چلا کہ پٹرول پمپس بند کر دئیے گئے ہیں۔ لوگ شدید احتجاج کی حالت میں ہیں کچھ علاقوں میں فائرنگ بھی ہوئ ہے۔

 چند گھنٹوں بعد اطلاع ملی کہ حکومت کی طرف سے 'دباءو' کے بعد پمپس دوبارہ کھل گئے ہیں۔ ٹریفک جام ختم ہوا۔ لیکن ابھی تک خبر گردش میں ہے کہ پیٹرول مصنوعات کی قیمتوں میں آج کسی بھی وقت تقریباً نو فی صد اضافے کا اعلان کر دیا جائے گا۔ اور پیٹرول پمپس نے یہ حرکت زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے لئے کی تھی۔

 پیٹرولیئم مصنوعات کی قیمتوں میں اضافہ اس لئے دل دہلا دیتا ہے کہ اسکے بعد زندگی میں استعمال ہونے والی ہر چیز کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ یعنی اندازاً کم از کم نو فیصد کا اضافہ صرف کار چلانے میں ہی نہیں بلکہ کاروبار حیات چلانے میں بھی۔

مہنگائ کا یہ طوفان کس طرف جا رہا ہے؟ کیا ہم اپنے سیاسی نظام سے یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ اس طوفان کے آگے بند باندھ سکے۔ ایسا لگتا تو نہیں۔

 ابھی تو ایکد وسرے کے آگے بند باندھ رہے ہیں۔ نواز شریف جو اصولوں کی سیاست کرنے میں خاصی 'شہرت' رکھتے ہیں۔ انہوں نے مڈ ٹرم الیکشن کے لئے راہ ہموار کرنی شروع کر دی ہیں۔ اسکے لئے انہیں کچھ اصولوں کی قربانی دینی پڑی۔ اور لوٹا کریسی کی تہمت اٹھانی پڑی۔ لیکن اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ پیپلز پارٹی ہمیشہ  اپنے شہیدوں کی فہرست گنواتی ہے لیکن اسکے مقابلے میں اصولوں کی قربانی زیادہ بڑی قربانی ہے، شرافت کی شہادت زیادہ بڑی شہادت ہے۔ امید ہے پیپلز پارٹی اس وار کو سہہ نہیں پائے گی۔

 جمہوریت کا کیا ہوگا؟ یہ کہاں جائے گی، کس کو منہ دکھائے گی۔ اس کو چھوڑیں ابھی اس شعر کا مزہ لیں۔

وہ کہیں بھی گیا ، لوٹا تو میرے پاس آیا

بس یہی بات ہے اچھی میرے ہرجائ کی

ہرجائ کے پاس لوٹا ہو تو دل کو تسلی رہتی ہے۔ آخر میں کچھ تو ملے گا۔ لیکن ہرجائ کون ہے اور لوٹا کس کا ہے؟

جہاں تجزیہ نگار کہتے ہیں کہ عوام ملک کی دونوں بڑی پارٹیز سے مایوس ہو چکے ہیں وہاں در پردہ قوتوں نے نئ قیادت کے لئے نام سوچنا شروع کر دئیے ہیں۔

مخدوم شاہ محمود قریشی سابق وزیر خارجہ ایجنسیز کے متوقع امیدوار کہے جا رہے ہیں اور عمران خان ملک کے سب سے بڑے میڈیا گروپ جیو کے امیدوار۔ شاہ صاحب تو جا کر شہید بے نظیر بھٹو کے مزار پہ حاضری دے کر روحانی آشیر باد بھی لے آئے۔ عمران خان، کامران خان کے ساتھ مل بیٹھے۔

ایجنسیز اور میڈیا میں سے جیت کس کی ہوگی؟

یہ سوال عوام سے نہیں ہے۔ عوام تقدیر کی پابند ہے۔ میں یہ سوچتی ہوں کہ کل جب پیٹرول اسی روپے اور ڈیزل چھیاسی روپے ہوگا تو میں کیا ترک کر کے اپنے مالی خسارے پہ قابو پاءونگی۔

11:40 PM

پاکستان, پروین شاکر, پیپلز پارٹی، ، emranعمران خان, پیٹرول, کامران خان, کراچی, مہنگائ, نواز شریف

ساحل کے ساتھ-۴

گذشتہ سے پیوستہ

رات کو تین بجے میکینک صاحب کے پہنچنے پہ یہ تناءو کم ہوا کہ گاڑی کا کیا ہوگا۔ اگلے دن ناشتے کے بعد وہ دونوں تو گاڑی کے ساتھ مصروف ہو گئے دوپہر تک یہ اعلان ہوا کہ گاڑی کی شافٹ ٹوٹ گئ ہے۔ اب یا تو ویلڈ ہو گی یا نئ لگے گی۔ نئ گوادر میں نہیں مل سکتی۔ ویلڈ ہونے کے امکان بھی نہ ہونے کے برابر ہیں اتنی سہولت وہاں حاصل نہیں کہ شافٹ کو صحیح پیمائش کے ساتھ جوڑا جا سکے۔  لیکن بہر حال وہ جا رہے ہیں کسی کی بائیک پہ مزید معلومات لینے کے لئے۔

میں نے اس دوران گھریلو امور انجام دئیے۔ ناشتے کی تیاری، کچن اور گھر کی صفائ، دوپہر کے کھانے کی تیاری، مشعل کی پڑھائ، پھر دوپہر کا کھانا، دوبارہ کچن کی صفائ۔ کمپیوٹر پہ تصاویر لوڈ کیں، کیمرے کی بیٹری چارج پہ لگائ۔ اسکے بعد جب مشعل کے اور خود کے صاف ہونے کی باری آئ تو سوچا کہ ساحل کا چکر لگا کر ذرا اور اچھی طرح گندے  ہو جائیں۔ سو ہم دونوں ماں بیٹی نے سر پہ دھوپ سے بچنے کے لئے ٹوپا لگایا، ساحل پہ پھرنے کے لئے مناسب چپل پہنیں کہ ہمارا ارادہ کچھ ہائیکنگ کرنے کا بھی تھا۔ میں نے ایک بیگ میں کیمرہ، پینے کے پانی کی بوتل، کچھ بسکٹ،بینڈ ایڈ اور وائپیس لیئے اسے کندھے پہ لٹکایا اور ہم دونوں باہر نکل گئے۔

گھر کے ساتھ ایک پہاڑ ہے ۔ جسکے قدموں میں ساحل کی موجیں آکر کھیلتی ہیں، سر پٹختی ہیں اور پتھروں سے ٹکرا کر اپنے موتی توڑتی ہیں پہاڑ سے چھوٹی بڑی چٹانیں ٹوٹ کر پانی میں ایستادہ ہیں  انکے پاس لا تعداد گول گول ہر شکل اور ساخت کے پتھر موجود ہیں۔ پہاڑ کے ساتھ  جیٹی بننے کی وجہ سے ان پتھروں کا  ایک بڑا ذخیرہ اسکے نیچے دب گیا۔ شور مچاتی لہروں کے ان پتھروں  سے ٹکراءو اور شرارت کے درمیان ترقی کی دیوار آ گئ۔   ایک خوبصورت منظر  تمام ہوا اور ایک نئ امید کھڑی ہو گئ۔ کیا یہ دی جانے والی قیمت اپنی صحیح قدر حاصل کر پائے گی؟

سو ہم بھی خاک سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ تونے وہ گنج ہائے گراں ما کیا کئے۔ لیکن اندازہ کہتا ہے کہ کیا کیئے ہونگے۔ خاک میں مل کر نئ خاک تشکیل دی ہوگی۔ اور کیا۔

 مجھے بتایا گیا کہ جہاں سے جیٹی کے روڈ کی حد ختم ہو رہی ہے وہاں یہ اب بھی موجود ہے۔ زیر تعمیر روڈ سطح ساحل سے  خاصہ اونچا ہے۔ بڑے بڑے پتھروں کو  ٹرالر سے لا کر پہاڑ کے ساتھ بچھایا گیا ہے اور اس پہ مٹی کی تہہ جمائ گئ۔ ابھی یہ اس مرحلے سے گذر رہا ہے۔ نچلے حصے کو لو ٹائڈ کے وقت مقامی لوگ  بیت الخلاء کے طور پہ استعمال کرتے ہیں۔ ہائ ٹائڈ میں غلاظت سمندر میں چلی جاتی ہے۔ سمندر کا مد و جذر چاند سے ربط کوہی نہیں تلاش کرتا بلکہ اپنے ساحل کواجلا رکھنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔

ہم دونوں اس روڈ پہ چلتے چلے گئے۔ مشعل کو یہ روڈ اچھا لگا کہ اس پہ وافر مقدار میں اڑانے کے لئے مٹی موجود تھی۔ پہاڑ کی نا ہموار اور مشکل سطحوں پہ کہیں کہیں نظر آنے والی نباتاتی حیات کی کھوج میں انکو سر کرلینے والی ضدی اور ہٹیل بکریاں جگالی کر رہی تھیں۔ شاید اسی لئے بکری ایک آسمانی برج کا علامتی نشان ہے۔

راستے میں ایک نیا تعمیر شدہ مزار نظر آیا۔ یہ میں نے پہلے یہاں نہیں دیکھا تھا روڈ کی تعمیر کے ساتھ مستقبل پہ نظر رکھنے والوں نے اسکے پھلنے پھولنے کے امکان بھی دیکھے ہونگے ۔ ایسے مزار بیک وقت مستقبل کے خوف اور  بہتر امید کا  ایک نشان ہوتے ہیں۔ ہم سے آگے دو بلوچی خواتین جا رہی تھیں جو اس مزار کی عمارت میں داخل ہو گئیں۔ یہ کاروبار، کبھی ماندہ نہیں جاتا۔ جب بادشاہ انصاف سے آگاہ نہ ہو تو نہ معلوم فقیر کی تربت پہ عوام کا رش رہنا کوئ قابل حیرانی بات نہیں۔ تقریباً چار پانچ سو گز چلنے کے بعد روڈ سمندر کے اندر مڑ گیا اور ہم پہاڑ کی طرف اتر گئے۔

پتھروں کا زیادہ بڑا ذخیرہ تو زیر تعمیر روڈ میں دب چکا ہے۔ مگر اب بھی کچھ یہاں باقی ہے۔ ان پتھروں میں سے وہ پتھر زیادہ دلچسپ ہیں جن پہ رکاذ موجود ہیں۔ ایسے بہت سے رکاذی پتھر میں نے یہاں اس وقت جمع کئیے جب مشعل دنیا میں نہیں آئ تھی۔ یہ اب بھی میرے خزانے میں شامل ہیں۔

یہ رکاز زیادہ تر سیپیوں کے ہیں۔ یہاں پہاڑ زیادہ تر مٹی کے ہیں۔ اس پہاڑ کے اوپری حصے سے مٹی کے جو ٹکڑے گرتے ہیں وہ سمندر کے پانی سے پہلے نرم ہوجاتے ہیں۔ ان پہ اگر کوئ سمندری سیپی چپکی رہ جائے تو وقت کے ساتھ سیپی کے باقیات جھڑ جاتے ہیں اور اسکے نشان باقی رہ جاتے ہیں۔

دنیا کی تاریخ میں ان رکاذات کا بڑا حصہ ہے۔ اس وقت دنیا کے سب سے بڑے نا پید ہو جانے والے جانور ڈائینا سور بھی اپنے رکاذات کی مدد سے دریافت کئے گئے ہیں۔ ان سے جہاں ہمیں یہ اندازہوتا ہے کہ دنیا میں حیات اندازاً کتنی پرانی ہے اور اس حیات میں سے کتنے ایسے ہیں جو اب نہیں یا کتنے ایسے ہیں جو اب بالکل بدل گئے ہیں ارتقاء کی وجہ سے۔ وہیں یہی رکاذ، کہیں زمین کی تہوں میں تیل کی دولت بھر دیتے ہیں، پتھروں میں ہیرے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ لاکھوں سال پرانی خاک یا زمین کی تہوں میں سے اسے ڈھونڈھ نکالنا  ایک علم بھی ہے اور انسان کے شوق پیہم کا ثبوت بھی۔

مجھے معلوم تھا مشعل کو یہ جگہ پسند آئے گی۔ ایسا ہی ہوا۔ کم از کم مشعل کو یہ پتہ چل گیا کہ رکاذ یا

فوسلز

کیا ہوتے ہیں۔ ہم دونوں نے مل کر سیپیاں اور رکاذی پتھر جمع کئیے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کو تحفے میں دینے کے لئے۔ ایک خوبصورت چھوٹا سا رکاذی پتھر مشعل کی اسکول ٹیچر کے لئے۔ اپنے سی شلیز کے ذخیرے میں سے مشعل نے کسی کو کچھ بھی دینے سے صاف انکار کر دیا۔  'اس وقت میں اچھی بچی نہیں ہوں، میں کچھ شیئر نہیں کر سکتی'۔

جس طرح ایک انسان ہمہ وقت ہر ایک کے لئے اچھا نہیں ہو سکتا اسی طرح ایک انسان ہر وقت  اچھا بھی نہیں ہو سکتا۔ البتہ اسے تیار رہنا چاہئیے کہ وہ یہ جملہ سنے گا کہ وہ اچھا نہیں ہے۔ مشعل نے اسکی تیاری کر لی۔ بچے ظالمانہ حد تک صاف گو کیوں ہوتے ہیں؟

یہیں سے مجھے ایک دلچسپ چیز، مرجان کا ایک ٹوٹا ہوا ٹکڑا ملا۔ پاکستان کے ساحلوں میں بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں سمندر میں مرجان کی چٹانیں نہیں ہیں۔ لیکن پتھروں کے اس ڈھیر میں، میں نے اسے پا لیا۔ ہمم ، تو ایسا نہیں ہے کہ بالکل نہیں ہے۔ موجود ہیں لیکن یہ کہ مرجان، سمندر کے پانی کی حرارت اور آلودگی سے بہت متائثر ہوتے یں۔

یہ جگہ

مراقبے

کے لئے بھی بڑی اچھی ہے۔ سمندر کی آواز کو بعض اوقات مراقبے کی مشقوں میں استعمال کیا جاتا ہے  توجہ کے ارتکاز کے لئے۔ سمندر میں ایک وسعت اور اسرار ہوتا ہے اور اسکی آوازمیں ایک ردھم،  ولولہ اور امید۔ اسکی لہروں میں وہ طاقت ہوتی ہے کہ سخت چٹانوں کو ریزہ کر دیتی ہیں۔ لیکن اس میں وہ طلسم بھی ہوتا ہے جو اسی ریزے کو بیش قیمت موتی میں  تبدیل کر ڈالتا ہے۔

ہمارے علاوہ یہاں کوئ اور نہ تھا۔  ایک بھرپور وقت گذار کر ہم لوٹے۔ کچے روڈ پہ ٹرکس پتھر اور مٹی لے کررواں۔ اکّا دکّا لوگ نئے بننے والے بند کے کنارے پہ کھڑے منظر میں مگن۔ اجنبی ہونے کے ناطے  ایک اشتیاق بھرے تجسس سے دیکھتے ہیں اور بس۔ ہم پلٹے اور آبادی کے قریب پہنچ کر روڈ کے ڈھلان سے اترنے لگے۔ ایک پر سکون مچھیروں کی آبادی ہمارے سامنے پھیلی ہوئ تھی جس کے کنارے وہ گھر تھا جہاں اس وقت ہماری رہائیش تھی۔ میری نظریں اس تمام منظر سے گذرتی ہوئیں اس گھر کی پچھلی دیواروں پہ رک گئیں۔ اس پہ کوئلے سے بڑے بڑے حروف میں پنجابیوں کے متعلق گالی نما تضحیک آمیز جملہ لکھا ہوا تھا۔ یہ میں نے پہلے یہاں کبھی لکھا ہوا نہیں دیکھا تھا۔ کبھی گوادر کی کسی دیوار پہ نہیں۔ اس پہ کسی پنجابی قاری کو سیخ پا ہونے کی ضرورت نہیں ۔ بلوچستان اور سندھ کے اندرونی علاقوں میں ہر غیر مقامی کو پنجابی سمجھا جاتا ہے۔ ورنہ اس مکان کے مکین اور نہ مالک کوئ بھی پنجابی نہیں۔

 اس دیوار پہ یہ لکھا دیکھ کر شاید تھوڑی سی دیر کو میرے اندر تشویش کی ایک لہر اٹھی۔ لیکن پچھلے دو دنوں کی یادداشت نے اسے فوراً دھودیا۔

میں اسے اپنے کمیرے میں محفوظ کرنا چاہتی تھی مگر معلوم ہوا کہ بیٹری بے جان ہے اسے چارجنگ کی ضرورت ے۔ بیٹری عمر رسیدگی کے مراحل طے کر رہی ہے۔ اوربہت کم مدت کے لئے چارج ہوتی ہے۔ اسے تو ، ایک دفعہ پھر چارج کر لونگی اس کا طریقہ مجھے آتا ہے۔ لیکن قوموں کو کس طرح چارج کیا جاتا ہے، یہ جاننا ابھی باقی ہے۔ اس دیواری نوشتہ پہ بی ایس او اور بی ایل اے بھی لکھا تھا۔

یہ بی ایس او اور بی ایل اے کیا ہیں؟

جاری ہے

12:27 PM

بلوچ لبریشن آرمی, بلوچستان, پاکستان, پنجاب, سندھ, فور وہیل ڈرائیو, گوادر, مشعل

خواتین اور بلاگنگ

مصر میں تبدیلی کا سہرا جن لوگوں کے سر جاتا ہے ان میں خواتین بلاگرز بھی شامل ہیں۔ بلاگستان کے ایک طبقے کی زبان میں وہ خواتین  نان کمیٹڈ ہیں جو اپنی گھر میں رہتے ہوئے کسی بھی ایسی چیز سے تعلق رکھنا چاہیں جو ان میں کسی بھی سطح کا شعور پیدا کرنے کے قابل ہو مثلاً بلاگنگ جیسی مفت شے۔ وہ خواتین جو  شادی شدہ ہیں انہیں  چاہئیے کہ ڈائجسٹ پڑھیں یا اسٹار پلس کے ٹی وی پروگرام  مثلاً ساس بھی کبھی بہو تھی دیکھ کر زندگی کے باقی دن پورے کریں۔  لیکن خواتین اگر خدا انہیں ہمت دے تو بلاگنگ نہ کریں جناب۔ یہ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔

مزید دلچسپ ٹرینڈز بھی ہمارے یہاں ہی دیکھے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ہمارے یہاں احترام کے لائق کون خواتین ہوتی ہیں؟ جی نہیں وہ خواتین نہیں جو کسی علمی مرتبے پہ یا کسی مقام پہ اپنی صلاحیت کی بناء پہ پہنچی ہوں نہ ہی وہ جو اپنی صلاحیتوں سے اپنے ارد گرد کے لوگوں کی زندگی میں آسانی پیدا کرنا چاہ رہی ہوں یا دوسروں میں تحرک ہی پیدا کر دیں، نہیں وہ بھی نہیں جو کسی دباءو کا شکار اور کمزور شخص کی آواز بن جائیں اور وہ بھی نہیں جو صرف یہ کام انجام دینے لگیں کہ ایک جگہ کا کار آمد علم دوسری جگہ پہنچانے لگ جائیں۔

ہمارے یہاں کسی خاتون کو اگر احترام حاصل کرنا ہے تو ایک بالکل آسان سا نسخہ ہے حجاب پہننا شروع کر دے۔ اور ابھی اندازہ ہوا کہ سب سے کم سطح پہ یہ کہ اپنا نام ہی حجاب رکھ لے۔ بس اسکے بعد ان خاتون کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ کریں گے دوسرے کریں گے۔ احترام اور ستائیش  اس طرح نکل کر بہے گا کہ اس میں دھل کرعام مٹی بھی زم زم کی گیلی ریت بن جائے گی۔

 میں ان تمام ملکوں میں چلنے والی تحریکوں کی تصاویر دیکھتی ہوں جہاں مردوں کے دوش بدوش عورتیں کھڑی نعرہ زن ہیں۔ سوچتی ہوں مردوں کے شانہ بشانہ کھڑی ان احتجاج کرنے والی عورتوں کو ہمارے یہ مرد کس فہرست میں رکھتے ہونگے قابل احترام یا نا قابل احترام۔ اس نیچے والی تصویر میں یقیناً وہ خواتین قابل احترام ہونگیں جنہوں نے اسکارف پہنا ہوا ہے اور جس خاتون نے نہیں پہنا ہوا وہ ناقابل احترام۔

اسماء محفوظ

ایک بلاگر جو مصر میں تبدیلی کے بہاءو کو تیز تر کرنے میں شامل رہی۔ وہ اپنے گھر سے کمیٹڈ ہے یا نان کمیٹڈ، گھر اور گھریلو رشتوں کو اہمیت دینے والی ہے یا خود غرض۔  ہمارے یہاں ابھی پیٹ بھرے خیالات کا بہاءو اس طرح ہے۔

انکے دوست نے اپنی گھریلو مصروفیات کی وجہ سے بلاگنگ اور نیٹ سرفنگ سے معذرت کی ہے اس تحریر کے تبصروں میں لوگوں نے انکے اس اقدام کو ان لوگوں نے بہت سراہا جو گھر اور گھر میں بسنے والے لوگوں کی اہمیت سے واقف ہیں اور ان لوگوں نے اس فعل کو غیر اہم اور دقیانوس قرار دیا جو دوسروں کو کچھ نہیں سمجھتے انکے لئے انکا اپنا آپ ہی سب کچھ ہوتا ہے

چلیں جناب، اگر آپ گھر اور گھر میں بسنے والوں کی اہمیت سے واقف ہیں تو فوراً بلاگنگ جییسے قبیح فعل سے جان چھڑائیں ورنہ آپ ان لوگوں میں شامل ہونگے جو دوسروں کو کچھ نہیں سمجھتے اور آپکا اپنا آپ ہی آپ کے لئے اہمیت رکھتا ہے۔ یہ تبصرہ لکھنے والے اور اس پہ واہ واہ کرنے والے اس سے مستثنی ہیں۔ اگر انہوں نے  بلاگنگ چھوڑ دی اور دوسروں نے واہ واہ کرنا  تو بلاگنگ کی دنیا کو راہ راست پہ کون رکھے گا۔

11:03 AM

اردو, اسما محفوظ, بلاگنگ, پاکستان, خواتین, مصر

ساحل کے ساتھ-۳

گذشتہ سے پیوستہ

شام کے سوا چھ بج رہے تھے جب ہم پسنی سے کوئ بیس کلو میٹر کے فاصلے پہ شادی کور کی چیک پوسٹ پہ پہنچے۔  ٹرک ایل طرف رکا تو تھوڑے ہچکولے کھا کر گاڑی بھی رک گئ۔  ٹرک ڈرائیور نے معلومات درج کروائیں۔ ہماری گاڑی کی حالت تو سب پہ ظاہر تھی۔  تقریباً دو گھنٹے  ٹرک کے ساتھ رینگتے ہوئے ہم نے سوچا کہ ٹرک والوں سے بات کی جائے ہو سکتا ہے وہ ہمیں گوادر تک لے جانے پہ راضی ہو جائیں۔ وہ بھی تو گوادر جا رہے ہیں۔ بس یہ کہ انہیں پسنی میں زیادہ دیر کے لئے نہ رکنا ہو۔

سو وہ گاڑی سے اتر کر ان سے باتیں کرنے لگے۔ مجھے اس وقت ڈوبتے سورج کا منظر بے حد اچھا لگا اور میں نے سب بھول کر سوچا کہ اگر فلش آف کر کے لوں تو شاید بالکل ایسا ہی آجائے جیسا نظر آ رہا ہے۔ پہلی تصویر لی۔ اتنی دیر میں وہ واپس آ کر بیٹھے۔ گاڑی کے چلنے تک میں نے ایک اور تصویر لی۔ اور جب گاڑی اسٹارٹ ہو کر چلی ہی تھی کہ پیچھے سے سیٹیوں کی آواز آنے لگی۔

ٹرک اور گاڑی ایک دھچکے سے رکے۔ ایک سپاہی ہماری طرف تیزی سے دوڑتا ہوا آیا۔ آپکی گاڑی سے تصویر لی گئ ہے۔ جی میں گڑ بڑا گئ۔ دیکھے بغیر بھی جان سکتی ہوں کہ پڑوسی مجھے کن نظروں سے گھور رہے ہونگے۔

خیر، میں نے سپاہی محترم سے کہا کہ میں سورج کی تصویر بنا رہی تھی چاہیں تو آپ دیکھ سکتے ہیں۔ اسکے ساتھ ہی میں نے کیمرہ انکی طرف بڑھا دیا۔ اس نے کیمرہ نہیں لیا۔ بس میرے چہرے پہ ایک لحظہ نظر جمائے رہا۔ پھر کہنے لگا کسی یونیفارم والے کی تصویر تو نہیں لی۔ جی نہیں۔ ٹھیک ہے پھر آپ جا سکتے ہیں۔ 'دیکھا آپ سے کہا بھی تھا کہ چیک پوسٹ کی تصویر نہیں لینی ہے۔  شریف آدمی تھا چھوڑ دیا۔ ورنہ خوب درگت بناتے ہیں'۔ 'میں نے چیک پوسٹ کی لی بھی کہاں تھی۔ اسے میری معصومیت کے اعتماد پہ یقین تھا اس لئے چھوڑ دیا'۔ سچ پوچھیں تو کیمرہ بچ جانے پہ میں نے بھی دل میں شکر ادا کیا۔

لاکھ کوشش کی مگر نکل کر ہی رہے،،گھر سےیوسف، خلد سے آدم ، تیری محفل سے ہم

راستے میں ایک جگہ ہمارے محسنین چائے پینے کے لئے رکے اور بالآخر  رات کو گیارہ بجے گوادر سے بیس بائیس میل دورآباد ہماری منزل، مضافاتی آبادی کے باہر ٹرک رک گیا۔  ڈرائیور نے اتر کر آگے جانے والے راستے کا معائینہ کیا اور پھر معذرت کرلی۔ اندر آبادی میں  نہیں جا سکتے۔ روڈ مکمل نہیں بنا ہوا اور ٹرک کے پھنس جانے کا اندیشہ ہے ورنہ ہم ضرور آپکو گھر تک پہنچا کر گوادر جاتا۔

 ہم تو راستے بھر ویسے ہی انکے احسان پہ حیران ہوتے  چلے آرہے تھے۔ اس ویرانے میں سوا دو سو کلومیٹر تک ایک لوڈڈ رینج روور کو کھینچ کر لے جانے کا  احسان اگر دنیا میں کوئ کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے تو وہ شاید ایک بلوچ کا حوصلہ ہی ہو سکتا ہے۔ اس ٹرک میں موجود تینوں افراد بلوچ تھے۔  بلوچ اپنی مہمانداری کے لئے مشہور ہیں اور اپنی وسعت قلب کے لئے بھی۔ پھر آخر ایسا کیوں کہ اس صوبے کے اندر ان لوگوں کو ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بنایا جائے جو بلوچ نہیں لیکن جو وہاں انکے ساتھ حیات کی سختیوں میں شریک ہونے کے لئے موجود ہیں؟

روڈ کے کنارے کھڑے کھڑے، تھوڑی دیر میں ایک گاڑی نظر آئ۔  سوار بلوچ نے کہا میں آگے ایک کام سے جا رہا ہوں اگر آپ دس منٹ انتظار کر لیں تو واپسی میں میری گاڑی میں جا سکتے ہیں۔ سامان تو ہم پہلے ہی سیٹ کر چکے تھے۔ جتنی دیر ہم وہاں اس کا انتظار کرتے رہے۔ جو بھی گاڑی وہاں سے گذری اس نے ہماری خیریت دریافت کی۔ حسب وعدہ وہ شخص آگیا۔ سردی اتنی نہیں تھی جتنی ہوا تیز چل رہی تھی۔ ضروری سامان  ساتھ لیا اور اس میں بیٹھ گئے۔ گھر وہاں سے  ڈیڑھ دو کلو میٹر سے زیادہ دور نہیں تھا۔

 گھر پہنچ گئے۔ شاید ایک سال کے بعد کھلا تھا۔ ہر چیز پہ  مٹی کی موٹی تہہ جمی تھی۔

مشعل بھی اٹھ چکی تھی۔ اسے جھاڑو دینا اور ڈسٹنگ کرنا بے حد پسند ہے۔ مستقبل میں وہ ماسی بن کر قوم کی خدمت کرنے میں بہت زیادہ دلچسپی رکھتی ہیں۔ ہر جگہ اتنی مٹی جمع دیکھ کر انکے دل کی کلی کھل گئ۔ اور اس وقت جبکہ ہم پلان بنا رہے تھے کہ رات کے اس وقت، اتنی تھکی ہوئ حالت میں ہم کیا کیا کر سکتے ہیں وہ بار بار یاد دہانی کرا رہی تھیں کہ وہ اب بڑی اور سمجھدار ہو چکی ہیں اور ہمارے شانہ بشانہ کام کرنے کو تیار ہیں۔ والدین کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ  ایک چار سالہ بچے کی ان رضاکارانہ خدمات کو کتنی سختی سے ٹھکرانا پڑتا ہے۔ یوں کام گھٹنے کے بجائے اور بڑھ جاتا ہے۔

بہرحال بیڈ روم کی صفائ، صاحب نے سنبھالی، کچن کی میں نے تاکہ کھانا گرم کر کے پیٹ پوجا کی جائے۔  حیات میں شریک ہونا  شاید اسی کو کہتے ہیں۔ مشعل دونوں جگہوں کے درمیان دوڑتی رہیں تاکہ جہاں موقع ملے وہ گھس جائیں اور بزور قوت اپنا حق صفائ حاصل کریں۔ ہماری قسمت کی کمزوری کہ انہیں کہیں سے ایک گندہ کپڑا اور ٹوٹی ہوئ جھاڑو بھی مل گئ تھی۔

صبح کے لئے پروگرام یہ بنا کہ کراچی میکینک کو فون کر کے پہلی بس سے یہاں آنے کو کہا جائے۔ کیونکہ گوادر میں کوئ اچھا مکینک  ملنا ممکن نہیں۔ پھر گاڑی کو گھر کے گیراج تک لانے کا بندو بست ہو۔ پھرگھر کی اچھی طرح صفائ کی جائے۔

اس واضح منصوبے کے بعد ہم نے اپنے اوپر سے دن بھر کی گرد جھاڑی اور ہر اندیشے سے بے نیاز ہو کر بستر پہ پڑ گئے۔ گھر سے چار پانچ گز کی دوری پہ سمندر کی لہریں، ساحل سے راز ونیاز میں مشغول تھیں۔ کہتے ہیں

رات بھر کوئ نہ سوئے تو سنےشور فغاں

چاند کو درد سناتا ہے سمندر اپنا

لیکن ایک لمبے دن کے بعد رات کے ایک بجے تھکن نے ہر جذبہ ء  تجسس کو بھی سلا دیا  تھا یہ ممکن نہ تھا کہ کسی کا درد سننے کے لئے ہم جاگتے رہیں۔ سو اسے لوری سمجھ کر گہرری نیند کے مزے لئے۔

صبح گاڑی گھر تک کیسے پہنچی؟ اس کے لئے وہاں زیرتعمیر جیٹی کا شکریہ کہ اسکی وجہ سے ایک ٹریکٹر مل گیا جو مقامی بلوچوں کی مدد سے اسے کھینچ کر گھر تک لے آیا۔

اب میکینک کا انتظار تھا۔ جو اسی رات تین بجے  آنے والی بس سے پہنچ رہا تھا۔ یہ اس کا گوادر کا پہلا سفر تھا۔ اور وہ خاصہ پُر جوش تھا۔ یوں جیسے کراچی میں کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرنے والے کو تھائ لینڈ جانے کا پیغام ملے۔

جاری ہے

12:04 PM

بلوچ, بلوچستان, پاکستان, تھائ لینڈ, ساحل, سفر, کراچی, گوادر, مشعل

پھنس گئے بچّو

ادھر عرب دنیا میں حالات نہایت دلچسپ تبدیلیوں سے گذر رہے ہیں  اور محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ ادھر ہمارے یہاں ریمنڈ ڈیوس کا مسئلہ امریکہ اور پاکستان دونوں کے لئے سانپ کے حلق میں اٹکی چھچھوندر بن گیا ہے، نہ اگلتے بنے نہ نگلتے بنے۔  یعنی کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے۔

یہ معاملہ اپنی بنیاد ہی میں بڑا عجیب ہے۔ ایک امریکی شخص لاہور کے مصروف علاقے میں دن دھاڑے دو افراد کو فائرنگ کر کے قتل کر دیتا ہے۔ تحقیقات سے یہ مشاہدات سامنے آئے کہ امریکی شخص کی گاڑی میں جدید اسلحہ تھا، اسکے علاوہ مختلف نقشے اور دیگر چیزیں تھیں جن سے اس اندازے کو تقویت ملتی ہے کہ موصوف کا تعلق امریکن انٹیلیجنس ایجنسیز ہے۔

لیکن کچھ باتیں جو عجیب لگتی ہیں کہ مارے جانے والے افراد کے پاس بھی اسلحہ موجود تھا۔ جو کہ لائیسنس یافتہ تھا۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ دو نوجوان اسلحہ لیکر موٹر سائیکل پہ کیوں پھر رہے تھے جو امریکن کے ہاتھوں مارے گئے۔

حالات کہتے ہیں کہ مبینہ امریکی شخص جسکا نام ریمنڈ ڈیوس بتایا جاتا ہے اور اسکے اس نام پہ بھی شبہ ہے کہ اصلی نہیں ہے۔ کیونکہ انٹیلیجنس ایجنٹس کے اصلی نام شاید انہیں خود بھی یاد نہ رہتے ہوں۔ اس نے اپنی گاڑی سے ان نوجوانوں پہ اس طرح فائرنگ کی کہ وہ کھڑے ہوئے تھے اور زیادہ تر گولیاں پیچھے سے یا اطراف سے لگیں۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ لوگ آگے بالکل بے خبر کھڑے تھے تو ریمنڈ ڈیوس کو ایسی کون سی ضرورت پڑی کہ اس نے ان پہ اس طرح گولی چلا دی۔ وہ پاگل نہیں ہے۔ اگر وہ پاگل ہوتا تو قتل کے اس مقدمے میں سے اس کا نکلنا آسان ہوتا  پاگل مجرم کو پاگل خانے بھیجا جاتا ہے ۔

تو یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے۔ اور اندازہ کہتا ہے کہ ان دو نوجوانوں کو چارے کے طور پہ ریمنڈ ڈیوس کے آگے ڈال دیا گیا۔ ڈالنے والوں کو اندازہ تھا کہ بات اسی طرح چلے گی جس طرح کے وہ ہمارے سامنے آئ یعنی وہ ماریں جائیں گے۔ یوں اس معاملے میں ایک اور قوت کی موجودگی سونگھی جا سکتی ہے۔

ریمنڈڈیوس کے ہاتھوں پیش آنے والا یہ واقعہ بادی النظر میں اچانک پیش آنے والا واقعہ نہیں لگتا۔

اس واقعے کے اثرات کیا ہوئے؟

یہ پتہ چلا کہ ریمنڈ ڈیوس کے پاس سے جی پی ایس چپس بر آمد ہوئے جنہیں فاٹا کے علاقے میں پتھری کہا جاتا ہے۔ یہ پتھری دراصل ڈرون حملوں کے ٹارگٹس متعین کرتی تھی۔ یوں ایک متوقع بات یہ ہوئ کہ ریمنڈ کے جیل میں پہنچنے کے بعد سے ڈرون حملے نہیں ہوئے۔

اس میں کوئ شک معلوم نہیں پڑتا کہ  ریمنڈ ڈیوس امریکن مفادات کے لئے پاکستان میں ایسے کام کر رہا تھا جو پاکستان کے مفاد میں نہیں جاتے۔ یوں ریمنڈ کو ایسے مقدمے میں ٹریپ کر لینا جس سے اس کا بچ نکلنا ممکن نظر نہیں آتا  اس سے کس کو ہمدردی ہو سکتی ہے۔ صیاد کبھی کبھی اپنے دام میں آجاتا ہے۔ اس عالم میں صیاد سے ہمدردی، اسکا ماضی اور حال دیکھ کر کی جاتی ہے۔

اب عالم یہ ہے کہ امریکن حکومت اسے اپنا ایجنٹ قبول نہیں کر سکتی اور اسے اس طرح بے یار و مددگار چھوڑا بھی نہیں جا سکتا۔  میرا ذاتی مشورہ تو انہیں یہی ہے کہ جس طرح جنرل ضیاءالحق کو مروانے کے لئے ایک امریکی سفارت کار کی قربانی دی گئ۔ امریکہ اگر دہشت گردی کے خلاف جنگ جاری رکھنا چاہتا ہے تو اسے ایک دفعہ پھر اپنے ایجنٹ کی قربانی دینی پڑے گی بلکہ امریکن نیک نامی اسی میں ہے کہ وہ ریمنڈ ڈیوس پہ پاکستانی عدالت میں مقدمہ چلنے دے اور عدالتی فیصلہ کا انتظار کرے اور جو بھی فیصلہ سامنے آئے اسے کھلے دل سے تسلیم کرے۔  چاہے وہ اسے پھانسی دینے کا ہو۔ امریکہ اس معاملے میں جتنا دباءو ڈالے گا اتنا ہی یہ اس کے لئے نقصاندہ ہو گا خاص طور پہ پاکستانی عوام میں امریکن تائثر کے لئے۔

میں لوگوں سے پوچھتی ہوں آخر امریکہ ایسا کیوں نہیں کرتا۔ آخر وہ ریمنڈ ڈیوس کو بچانے کے لئے ہر جائز اور ناجائز طریقہ کیوں استعمال کرنا چاہتا ہے۔ جان کیری صاحب پاکستان پہنچتے ہیں۔ مقتولین کے ورثاء کو خون بہا دینے کی باتیں ہو رہی ہیں ہلیری کلنٹن ناراض ہیں کہ پاکستان کو اینٹی امریکہ جذبات کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئیے۔

جواب ملتا ہے کہ یہ امریکہ کے لئے انتہائ شرمندگی کی بات ہوگی کہ اسکی انٹیلیجنس کا شخص اور وہ اسے بچا نہ سکے۔ اس طرح تو انکی انٹیلیجنس کی دہشت اور رعب بالکل ختم ہو جائے گا۔

لیکن لگتا ہے کہ امریکنز نے اردو کا یہ محاورہ نہیں سنا کہ وہ دن گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ آجکل امریکنز  کا عالم یہ ہے کہ اپنے کان پہ بیٹھی مکھی نہیں اڑا سکتے۔ آخر اب لوگ ان کے دباءو میں کیوں آئیں۔

دوسری طرف وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان انکا اہم اتحادی ہے۔ اسکو آنکھیں دکھانے کا وقت اب گذر چکا ہے۔

یہی بات، پاکستانی حکومت کو بھی سمجھنی چاہئیے۔ دہششت گردی کی اس جنگ میں ہمیں امریکہ کی ضرورت اتنی نہیں جتنی ضرورت امریکہ کو ہماری ہے۔

خیر،اب اگر پاکستان ریمنڈ ڈیوس کو عدالت کے حوالے کر کے آرام سے ہے توامریکہ زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتا ہے۔

آپکا کیا خیال ہے؟

کیا امریکہ، ریمنڈ ڈیوس کو خود ہی مروادے گا تاکہ پاکستانی مزید نہ جان سکیں؟

ریمنڈ ڈیوس کو اگرعدالت پھانسی کی سزا دیتی ہے تو کیا امریکہ اسے قبول کر لے گا؟

کیا اس وجہ سے امریکہ اور پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ سکتی ہے؟

کیا دنیا بھر میں پیش آنے والے واقعات کے تسلسل میں امریکہ ریمنڈ ڈیوس کے مسئلے پہ پاکستان سے جنگ کر سکتا ہے؟

یہ خفیہ قوت کون ہو سکتی ہے جس نے ریمنڈ ڈیوس کے لئے ان دو نوجوانوں کا بند و بست کیا؟

-

-

-

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے

پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

11:01 PM

امریکہ, پاکستان, جی پی ایس چپ, ریمنڈ ڈیوس, غالب, فاٹا, لاہور

ساحل کے ساتھ-۲

گذشتہ سے پیوستہ۔

کوسٹل ہائ وے پہ کچھ دور چلنے کے بعد پہلی رینجرز کی چوکی پڑی۔ یہاں گاڑی کا نمبر, اپنا نام اور منزل مقصود  درج کروانا پڑتا ہے۔  گاڑی رکی ہوئ تھی اور قریب کھڑے سپاہی سے مشعل نے تعلقات بنانے کی کوشش کی۔ وہ بھی نزدیک آگیا پھر مجھ سے کہنے لگا میری بھی اتنی بڑی ایک بیٹی ہے۔  پوچھا کہاں سے تعلق ہے جواب ملا راولپنڈی سے۔

یہاں مجھے نصیحت کر دی گئ تھی کہ کسی بھی ایسی سیکیوریٹی کی جگہ یا اس سے تعلق رکھنے والے شخص کی تصویر بالکل نہیں بنانا۔ سو میں مشعل اور سپاہی کی باتیں سنتی رہی۔ وہ شاید اپنی پنڈی میں رہنے والی بیٹی سے باتیں کر رہا تھا۔

ہمیں دن کے کھانے کے لئے ارماڑہ پہ رکنا تھا۔ امیدتھی کہ دوپہر ڈیڑھ دو بجے تک پہنچ جائیں گے۔ راستے میں کنڈ ملیر کے خوبصورت ساحل کو چھونے کے لئیے رکے۔

پھر یہ کہ راستے میں جو پٹھان کے ہوٹل ملتے ہیں ان میں یا تو بیت الخلاء نہیں ہوتا یا قابل استعمال نہیں ہوتا۔

اس سلسلے میں خواتین کے حیاتیاتی نظام کے متعلق وہی نظریات ہیں جو مریخ کے رہائیشیوں کے زہرہ کے رہنے والوں کے متعلق ہونگے۔

انگریزی شاعر، بائرن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ نوالہ حلق میں ڈالنے، چبانے اور حلق سے اتارنے کو اس قدر غیر نفیس فعل سمجھتا تھا کہ کسی عورت کو کچھ بھی کھاتے دیکھ نہ سکتا تھا۔ جو کھاتے نہ دیکھ سکتا ہو وہ یہی سوچتا ہو گا کہ بیت الخلاء کی خواتین کو کیا ضرورت۔

لیکن چونکہ قدرت ان نظریات پہ یقین نہیں رکھتی تو ہم سب نے ان سے فراغت کے لئے بھی راستے کے ٹیلے چنے۔

ارماڑہ کے ساحل پہ پچھلے ایک سال میں ایک پٹھان کا ہوٹل بن گیا ہے جو عام طور پہ پاکستان میں ہائ ویز کے کنارے ہوتے ہیں۔ میں نے گاڑی سے کھانے کا سامان اور پانی لیا، مشعل ہاتھ پکڑا اور اندر کی طرف چلی۔ ایک بارہ تیرہ سالہ پٹھان بچہ دوڑتا ہوا آیا۔ اور ایک طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔ لیڈیز ادھر اے۔ میں نے اسے دیکھا، پھر  اپنے ہاتھ میں کھانے کے سامان کو اور پھر پیچھے گاڑی کو بند کرنے والے صاحب کو۔ نہیں ہم سب یہاں میز پہ کھائیں گے۔ میں نے ہوٹل کے مرکزی ہال کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں کرسیاں اور میزیں  بھی موجود تھیں اور فرشی دسترخوان بھی بچھا ہوا تھا۔

جتنی دیر میں صاحب ہاتھ دھو کر فارغ ہوتے میں نے ہوٹل کے اطراف کا جائزہ لیا۔ سامنے ایک چھوٹی سی کمرہ نما جگہ پہ لکھا تھا چپل منہ ہے۔ میں نے اسے ڈی کوڈ کرنے کی کوشش کی یہ کیسا محاورہ ہے۔ کس کا منہ چپل ہے۔ پھر اس میں جھانک کر دیکھا۔ یہ ایک وضو خانہ تھا اور لکھنے والے نے شاید چپل  پہن کر اندر جانا منع ہے لکھنے کی کوشش کی تھی۔

ارماڑہ، گوادر اور کراچی کے  تقریباً وسط میں ہے۔  یہاں سے پسنی تقریباً دو گھنٹے اور وہاں سے گوادر ڈیڑھ گھنٹے۔ یوں تین بجے جب ہم گاڑی میں سوار ہوئے تو تقریباً ساڑھے تین گھنٹے کا سفر باقی تھا۔

گاڑی سو میل کی رفتار سے سیدھے ہموار روڈ پہ دوڑے جا رہی تھی۔ گاڑی چلانے والے صاحب جیسے ٹرانس کی حالت میں بیٹھے تھے یا مراقبہ کر رہے تھے۔ میں اگرمخاطب کرتی تو صاف لگتا کہ  کسی دور دراز کے خلائ سیارے سے جواب آ رہا ہے۔ ہونٹوں پہ وہی مسکراہٹ جو

گوتم بدھ

کو نروان کے بعد حاصل ہوئ اور انہیں شاید اپنی پیدائیش پہ۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ انڈیا نے ۱۹۷۴ میں جو پہلا ایٹمی دھماکا کیا تھا وہ بھی

اسمائیلنگ بدّھا

کہلاتا ہے۔ معلوم نہیں بدھا اس دھماکے پہ عالم برزخ میں مسکرائے یا تلملائے۔  یا مغل اعظم کا یہ گانا دیکھتے رہے کہ تمہاری دنیا سے جا رہے ہیں اٹھو ہمارا سلام لے لو۔

لیکن اس ساری

تپسیا

میں کہیں سے

اپسرا مانیکا

آ گئیں۔ رشی کا دھیان توڑنے کے واسطے۔  اور آواز آئ۔ اوہ یار۔ کیا ہوا؟  گاڑی سائیڈ پہ کرنے دیں۔ شاید شافٹ ٹوٹ گئ ہے یا کلچ پلیٹ۔ گاڑی ایک سآئیڈ میں ہو گئ۔ گیئر فری ہو گیا ہے اور اب گاڑی نہیں چل سکتی۔ ہم کراچی سے تقریبا سوا چار سو کلو میٹر کے فاصلے پہ گوادر سے تقریباً سوا دو سو کلومیٹر دور تھے۔ قسمت کی خوبی دیکھئیے، ٹوٹی کہاں کمند۔

اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ میں خاصی رجائیت پسند ہوں۔ سر پہ ہاتھ مارنے کے بجائے مجھے خیال آیا کہ شکر ہے کنڈ ملیر کے علاقے میں یہ نہیں ہوا ورنہ پہاڑی پیچ و خم  اور ڈھلانوں میں پھنس جاتے اوربڑا برا ہوتا۔ ابھی تو گوادر تک میدانی علاقہ ہے۔

اب جو آپشنزتھے ان میں سے ایک یہ کہ گاڑی کو  ٹو کرنے والا مل جائے تو کراچی تک کھینچ کر لے جائ جائے ۔ یہ نا ممکن تھا پچھلا سارا رستہ پہاڑی چڑہائیوں اترائیوں کا تھا اور یہ فاصلہ نہ صرف زیادہ بلکہ رسکی بھی تھا ۔  سوا چار سو کلو میٹرکا فاصلہ کوئ کھینچنے پہ راضی نہیں ہو گا۔  گوادر تک بھی کوئ کیسے ٹو کر سکتا ہے۔ گاڑی اتنی بڑی ہے۔ اسے کوئ ٹرک ہی کھینچ سکتا ہے۔

 ویرانے میں گفتگو شروع ہوئ۔ اچھا ایک بات تو طے ہے۔ ہمیں کراچی واپس جانا ہے تاکہ آپ اور مشعل کم از کم آرام سے ہو جائیں۔ گاڑی کو یہی چھوڑنا پڑے گا۔ وہاں سے میکینک لے کر واپس آتے ہیں۔

کراچی واپس کیسے جائیں گے۔ گوادر سے چلنے والی بس رات  نو بجے سے پہلے نہیں نکلے گی اور یہاں  بارہ بجے تک پہنچے گی۔

اس وقت شام کے چار بج رہے ہیں۔ اس ویرانے میں کسی گاڑی سے لفٹ لینی پڑے گی۔ لیکن اس سے پہلے تمام قیمتی اور ضروری سامان دو بیگز میں کر لیا جائے۔ باقی سب گاڑی میں چھوڑنا پڑے گا۔

 ہم نئ صورت حال کے لئے تیار ہونے لگے۔ مشعل کو بڑا صدمہ ہوگا وہ اس وقت سو رہی تھی۔ میں نے سوچا۔ آجکل گوادر میں کاروباری سرگرمیاں ایک دم ماند پڑ گئ ہیں اس لئے روڈ پہ کافی دیر بعد کوئ گاڑی نظر آتی تھی۔ پتہ نہیں اب کیسے کوئ گاڑی کراچی کے لئے ملے گی۔

سامان کو دوبارہ ترتیب کر کے فارغ ہوئے تھے کہ قریب سے آٹے کی بوریوں سے لدا ایک مقامی طرز کا ٹرک گذرا۔ ڈرائیور نے ہاتھ ہلا کر خیریت دریافت کی۔ یہ تو خود اتنا لدا ہوا ہے یہ ہمیں کیا گودار تک کھینچ کر لے جائے گا۔ میں نے سوچا۔ اور مزید سوچا۔ اگر ہم گوادر پہنچ جائیں تو گاڑی ایک محفوط مقام پہ ہوگی اور ہم تناءو سے آزاد۔ مگر کیسے؟

 توقع کے بر خلاف ٹرک آگے جا کر رک گیا۔ تین افراد باہر آئے۔ صورت حال جان کر انہوں نے پسنی تک ٹو کرنے کی پیش کش کر دی۔ پسنی میں رینجرز کی چوکی ہے وہاں چھوڑیں گے تو گاڑی زیادہ محفوظ رہے گی۔ اور ہم وہاں سے کراچی کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ ایک امید باندھ کر گاڑی  کو ٹرک کے ساتھ رشتہ ء ضرورت  کی ڈور سے باندھ دیا گیا۔ ہوا اتنی تیز تھی کے گاڑی کا بونٹ اڑا جا رہا تھا۔ بہر حال ٹرک کے پیچھے بہت سوں کی تصوراتی مثالی مسلمان خاتون کی طرح گاڑی چل پڑی۔

 اسٹیئرنگ سختی سے پکڑے، گاڑی اور ٹرک کے درمیان تنی رسی پہ آنکھیں جمائے صاحب سے میں نے ایک ماہر ٹی وی اینکر کی طرح پوچھا، کہاں آپ سو میل کی رفتار سے اڑے جا رہے تھے اور ا ب آپکو زیادہ سے زیادہ چالیس کی رفتار سے رینگنا پڑ رہا ہے۔ خرگوش سے کچھوے کی اس کایا کلپ پہ آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں ؟ اس ظالمانہ سوال پہ انہوں نے ایک نگاہ صحیح انداز ، یعنی مار سوٹئ ایہہ والے انداز سے دیکھا اور منہ پھیر لیا۔

یوسف اسکو کہوں، اور کچھ نہ کہے، خیر ہوئ

گر بگڑ بیٹھےتو میں لائق تعزیر بھی تھا

جاری ہے۔

6:48 PM

انڈیا, ایٹمی دھماکہ, بدھا, بلوچستان, پاکستان, سفر, فور وہیل ڈرائیو, کراچی, گوادر

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

فصل قضایا، اقامت عدل، بسط امن، رفع نزاع کے لئیے متعدد ولاۃ حکام کی ضرورت تھی۔ اسکے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد صحابہ کو مختلف مقامات کا حاکم و والی مقرر فرما دیا۔ ان ولاۃ یا گورنروں کا تقرر ملک کی وسعت اور ضروریات کے لحاظ سے ہوتا تھا۔ رسول اللہ کے زمانے میں عرب کے جو حصے اسلام کے زیر سایہ تھے اسکے پانچ حصے تھے اور ان میں سے ہر ایک حصہ کے لئیے علیحدہ گورنر تھے

عموماً جب کسی مہاجر کو کہیں کا عامل مقرر کرتے تو اسکی کے ساتھ ایک انصاری کا بھی تقرر فرماتے۔

ان فرائض کو ادا کرنے کے لئے سب سے زیادہ تبحر علمی، وسعت نظر اور اجتہاد کی تھی۔ اس بناء پر آپ ان لوگوں کے تبحر علمی  اور طرز عمل کا امتحان لیتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ   کو روانہ فرمایا تو پہلے انکی اجتہادی قابلیت کے متعلق اطمینان فرمایا ترمذی میں ہے کہ

رسول اللہ نے جب معاذ بن حبل کو یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا کس چیز سے مقدمات کا فیصلہ کروگے۔ انہوں نے کہا قرآن مجید سے۔ آپ نے فرمایا اگر اس میں وہ فیصلہ تم کو نہ ملے ۔ انہوں نے کہا کہ احادیث سے پھر آپ نے فرمایا کہ احادیث میں بھی اس کے متعلق ہدایت نہ ملے تو انہوں نے کہا میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا ۔ اس پہ آپ فرمایا اس خدا کا شکر ہے جس رسول کے رسول کو اس چیز کی توفیق دی جس  کو خود اس کا رسول محبوب رکھتا ہے۔

 لیکن اہل عرب کے دلوں کو مسخر کرنے کے لِئے ان تمام چیزوں سے زیادہ رفق و ملاطفت نرمی اور خوش خوئ کی ضرورت تھی۔ جنکی آمیزش سیاست اور حکومت کے اقتدار کے ساتھ تقریباً نا ممکن ہو جاتی ہے۔اس لئے رسول اللہ گورنروں کو بار بار اس طرف متوجہ فرماتے۔ چنانچہ جب معاذ بن جبل کو ایک صحابی کے ساتھ یمن کی گورنری پرروانہ فرمایا تو پہلے دونوں کو عام طور سے وصیت فرمائ

آسانی پیدا کرنا، دشواری نہ پیدا کرنا، لوگوں کو بشارت دینا ان کو وحشت زدہ نہ کرنا،باہم اتفاق رکھنا اور اختلاف نہ کرنا۔

اس پہ بھی تسکین نہ ہوئ تو معاذ بن جبل جب رکاب میں پیر ڈال چکے تو ان سے خاص طور پہ یہ الفاظ فرمائے۔

لوگوں کے ساتھ خوش خلقی کے ساتھ برتاءو کرنا۔

 یہ رسول اللہ کی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ اخیر زمانے میں جب صحابہ عمال حکومت کے مظالم دیکھتے تو ان کو سخت تعجب ہوتا اور وہ رسول اللہ کی تلقینات کے ذریعے انکو روکتے تھے چنانچہ ایک بار ہشام بن حکیم بن حزام نے دیکھا کہ شام کے کچھ نبطی دھوپ میں کھڑے ہیں انہوں نے اسکی وجہ پوچھی۔ لوگوں نے کہا جزیہ وصول کرنے کے لئے ان پہ یہ سختی کی جا رہی ہے انہون نے یہ سن کر کہا

میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا کہ خدا ان لوگوں کو سزا دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے تھے۔

 کشف الدجی بجمالہ

 بدر الدجی بکمالہ

حسنت جمیع خصالہ

صلو الیہ وآلہ

حوالہ

یہ تحریر مندرجہ ذیل حوالے کی مدد سے تیار کی گئ ہے۔

سیرۃ النبی، مصنف؛ علامہ شبلی نعمانی، جلد دوم، صفحہ ۴۵۔

7:35 PM

اسلام, پاکستان, ربیع الاول, رسول اللہ, سیرۃ النبی, محمد, مذہب

ساحل کے ساتھ

پانچ دن بعد جب ہم لوٹے تو حالات وہی تھے۔  یعنی  مبارک صاحب اسی طرح صدر  بنے رہنے پہ مصر، انکے دل میں وہم تھا کہ گذر ہی جائے گی میرے بغیر بھی لیکن، بہت اداس ، بہت بے قرار گذرے گی جبکہ عوام نے رولا پایا ہوا تھا، جا جا میں تو سے نہیں بولوں۔

امریکہ اسی طرح ریمنڈ ڈیوس پہ تاءو دکھا نے میں مصروف، پاکستانی حکومت اسی طرح ٹال مٹول سے کام چلا کر ہر ایک فریق یعنی امریکہ 'عوام' اور خواص کو مطمئن رکھنا چاہ رہی تھی۔  لوگ اسی طرح 'انقلاب دور است' کو خوش آمدید کہنے کی دھنیں تیار کر رہے تھے تاکہ وقت ضرورت اس جھنجھٹ میں نہ پڑنا پڑے اور کچھ تو تیاری پہلے سے ہو۔ مختصراً سورج اسی طرح مشرق سے نکل رہا تھا اور مغرب میں گم ہو رہا تھا جیسے سالہا سال سے کرتا چلا آیا ہے۔

لیکن، ہم ایک اور دلچسپ سفر سے ہو کر گذر آئے۔

ایک روسی ادیب کا کہنا ہے کہ تمام خوشحال خاندانوں کی کہانیاں ایک جیسی ہوتی ہیں اور غریب خاندانوں کی الگ الگ۔  سی طرح تمام ترقی یافتہ جگہوں کے سفر کی کہانیاں ایک جیسی ہوتی ہیں اور پسماندہ  جگہوں کا جب بھی قصد کریں الگ داستانیں بنتی ہیں۔ خاص طور پہ ایسی جگہیں جو معاشی اور اسکے ساتھ آنے والی معاشرتی تبدیلیوں سے گذر رہی ہوں۔

  سو ایک دفعہ پھر پاکستان کے شورش زدہ اور سب سے پسماندہ صوبے بلوچستان کا رخ کیا، ہماری منزل گوادر کا ایک مضافاتی علاقہ تھا۔ بیٹی صاحبہ بھی ساتھ تھیں۔ صبح سویرے ہم نکلے تو موسم بڑا سہانا تھا۔ کراچی میں اسے موسم بہار کہنا چاہئیے۔ بادل آسماں پہ دفعہ ایک سو چوالیس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے من وتو کا فرق مٹائے ہوئے ایک دوسرے میں گھلے ملے جا رہے تھے۔  کراچی شہر کے صنعتی ماحول کی حدوں سے باہر نکلے تو ہوا میں ایک تازگی اور الہڑ پن تھا۔

گاڑی سے گوادر جانے کے لئے صرف ایک راستہ ہے، کوسٹل ہائ وے۔ یوں اس روڈ پہ چلتے ہوئے گوادر کراچی سے تقریباً ساڑھے چھ سو کلو میٹر کے فاصلے پہ ہے۔ شروع کے تقریباً سو کلو میٹر آر سی دی ہائ وے پہ سفر کرنا پڑتا ہے پھر وندر سے آگے جا کر کوسٹل ہائ وے شروع ہو جاتی ہے۔ راستے میں جو اہم بستیاں آتی ہیں ان میں اُرماڑہ اور پسنی کی نیول بیسز شامل ہیں۔

View Larger Map

 میں پہلے بھی کئ دفعہ یہاں جا چکی ہوں لیکن اس دفعہ  بلوچستان کے  مخدوش حالات کو  ذاتی طور پہ جاننے کے لئے میں  نے سفر میں شامل ہونے کا ارادہ کیا۔ مشعل کے اسکول سے ایک ہفتے کی چھٹی لی۔ اس مہم پہ انہیں جو کچھ سیکھنے کو ملتا وہ اسکول کی چار دیواری میں کبھی نہیں مل سکتا۔  آغاز سفر میںوہ خود بھی بے حد بے چین تھیں اور ہر دس منٹ کے بعد پوچھتیں کہ کیا بیچ  یعنی ساحل آگیا؟  کیا آنے والا ہے؟ کیا میں اب اپنا سوئمنگ کاسٹیوم پہن سکتی ہوں؟ کیا ہم وہاں پہ سی شیلز جمع کریں گے؟ کیا وہاں پہ مرمیڈ ہوگی؟ کیا میں ایک چاکلیٹ کھا سکتی ہوں؟ پھر ایک  جگہ بیٹھے بیٹھے غنودگی طاری ہوتی۔ یوں ایک فل اسٹاپ لگتا اورجاگنے پہ وہی  سوال ایک نئ ترتیب میں آجاتے۔

اُرماڑہ سے پہلے ہنگول کا علاقہ آتا ہے۔ یہاں پاکستان کا سب سے بڑا نیشنل پارک ہے اور ہنگول دریا بھی گذرتا ہے۔ اس پہ گذرنے والے پل کے ساتھ پچھلے دو سالوں میں ایک ریسٹ ہاءوس بنا دیا گیا ہے۔ پل پہ سے گذرتے ہوئے ہم نے سوچا کہ واپسی کے سفر میں ایک رات اس ریسٹ ہاءوس میں گذاریں گے  تصویریں بنائیں گے، کچھ فاصلے پہ

  دریا کے ساتھ

  پہاڑوں میں واقع ایک قدیم مندر کو دیکھ کر آئیں گے جہاں ہر سال موسم بہار میں ہندو بڑی تعداد میں مذہبی رسومات کی ادائیگی کے لئے آتے ہیں۔ یہ ہنگلاج کا مندر یا نانی مندر کہلاتا ہے۔

اسکے علاوہ

دریا میں مگر مچھ

ہیں جو روزانہ دریا کنارے دھوپ کھانے کے لئے صبح سے لیٹ جاتے ہیں انکا دیدار بھی کریں گے۔

کوسٹل ہائ وے سمندری ساحل کے ساتھ ساتھ ہے سو کہیں کہیں سمندر بالکل صاف نظر آتا ہے اور کہیں کہیں پہاڑوں کی اوٹ لے لیتا  ہے۔ اس راستے کا سب سے خوبصورت حصہ کُنڈ ملیر کے آس پاس آتا ہے جو اُرماڑہ سے پہلے ہے۔ یہاں کاریگران قدرت نے پہاڑوں کو تراش کر ایلس کا ونڈر لینڈ بنایا ہوا ہے۔ مشعل نے ان پہاڑوں کو دیکھ کر کہا۔' یہ تو کوئین کا ہاءوس ہے ماما'۔ فوٹو گرافرز کے لئے یہاں بڑے شاندار مناظر ہیں۔ اسکے علاوہ فیشن شوٹس کے لئے پہاڑ ایک بہترین پس منظر کا کام انجام دے سکتے ہیں۔ ایک ماڈل میں نے بھی استعمال کی تھی اور اچھی تصویریں ملی تھیں  لیکن وہ تصویریں کہیں کھو گئیں۔ یہ نئ تصاویر حاضر ہیں۔

کنڈ ملیر کے قریب

کنڈ ملیر

کنڈ ملیر کے قریب

گاڑی کے اندر سے لی گئ ایک تصویر

پہاڑ جیسا کہ آپ نے تصویروں میں دیکھا، برہنگی کی حد تک بنجر ہیں۔  ہریالی سے ڈھکے ہوئے پہاڑ تو اپنے لباس کی زینت کی وجہ سے خوب صورت لگتے ہیں لیکن یہ بنجر پہاڑ وہ خوبصورتی رکھتے ہیں جس کے لئے شاید آرٹسٹ نیوڈ پینٹنگز بناتے ہیں۔

اس پہ مجھے یاد آیا کہ ہمارے ٹی وی کے مشہور میزبان اور لکھاری انور مقصود صاحب کے بارے میں سنتے ہیں کہ وہ بھی مصوری سے شغف فرماتے ہیں اور  انکی تصاویر کی بڑی مانگ ہے۔  یہ بھی کہیں پڑھا کہ ایک دفعہ جناب ضیا ءالحق صاحب نے ان سے انکی پینٹنگز کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں جواب دیا کہ میری پینٹنگز آپ دیکھ نہیں پائیں گے۔ مزید استفسار پہ کہا کہ میری ماڈلز بہت غریب ہوتی ہیں۔ اتنی غریب کہ انکے پاس پہننے کو کپڑے بھی نہیں ہوتے۔

کیا بلوچستان اتنا ہی غریب ہے یا پسماندہ؟

جاری ہے۔

10:18 AM

انور مقصود, بلوچستان, پاکستان, ضیاءالحق, کراچی, کوسٹل ہائ وے, گوادر

کافکا کی ایک کہانی

فرانز کافکا

میرا پسندیدہ ادیب ہے۔ کیوں پسند ہے؟ اس کا کوئ واضح جواب میرے پاس نہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے مجھے چیکو فلیور کی آئس کریم پسند ہے۔ مگر نہیں پتہ کہ کیوں پسند ہے۔ یا بالکل ایسے ہی جیسے میں لوگوں کی مسکرانے کی ادا کو سب سے پہلے محسوس کرتی ہوں معلوم نہیں کیوں۔

محمد عاصم بٹ کا کہنا ہے کہ انہیں کافکا اس وقت بھی پسند تھا جب انہوں نے اسے پڑھا نہیں تھا۔ شاید میں بھی کچھ ایسا ہی کہنا چاہوں۔ محمد عاصم بٹ  کون ہیں؟ انہوں نے کافکا کی کہانیوں کا اردو ترجمہ کیا ہے ۔ کہانیوں کے اس مجموعے کو جنگ پبلشرز نے شائع کیا ہے۔ نام ہے اسکا کافکا کہانیاں۔

 کافکا اٹھارہ سو تراسی میں پراگ، جرمنی میں پیدا ہوا اور انیس سو چوبیس کو ویانا کے نزدیک ایک سینی ٹوریم میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے اپنی کافی تحاریر کو تلف کر دیا۔ مرنے سے پیشتر اس نے اپنے دوست سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اسکی تمام تحاریر کو چاہے وہ مکمل ہوں یا نا مکمل جلا دیا جائے۔ مگر دوست نے اس خواہش کو رد کر دیا اور اسے جو بھی تحریر ملی اسے چھپوا دیا۔ صرف اکتالیس سال عمر پانے والے اس ادیب نے ادب کی دنیا میں انمٹ نشان چھوڑے ہیں۔

کافکا کی ایک تحریر آپکے لئے اسکین کی ہے۔ اس تحریر کے انتخاب کی پہلی وجہ اسکا مناسب سائز میں ہونا ہے یعنی محض تین صفحات۔ باقی وجوہات آپ کھنگالئیے۔

12:44 AM

ادب, اردو, پراگ, جرمنی, جنگ پبلشرز, کافکا, محمد عاصم بٹ

تخیّل کی تجّلی

ایک بلاگ پہ پڑھا کہ انقلاب کو فیس بک اور ٹیوٹر کی ضرورت نہیں ہوتی۔

بنیادی تبدیلی  کے لئے لوگوں کا تبدیلی کی خواہش رکھنا ضروری ہے۔ پھر یہ احساس رکھنا بھی ضروری ہے کہ نظام میں کہاں خرابی ہے اور اسے تبدیل کرنا ہے۔ کس طریقے سے تبدیل کرنا ہے وہ کسی نصاب کا محتاج نہیں، یہ ایک ارتقائ عمل ہوتا ہے۔

 کسی بھی نظام کے لوگوں یا آسان الفاظ میں عوام کو اس چیز کی آگہی ضروری ہے کہ وہ اگر تبدیلی کی خواہش رکھتے ہیں تو انکے اس احساس میں کتنے لوگ انکے ساتھ شامل ہیں۔ یہ انہیں مہمیز کرتا ہے اور اجتماعی احساس کو بڑھاتا ہے یہاں میں دانستہ اجتماعی شعور کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہتی۔  یہ علم آج کے زمانے میں ہم آج کے ذرائع تبادلہ ء خیال سے ہی حاصل کر سکتے ہیں۔

  یوں ایک عمل،  ان ذرائع کو استعمال کئے بغیر جتنا وقت لے سکتا ہےغیر مرئ موجوں پہ چل کے وقت سے جیت سکتا ہے اور حیران کن طور پہ بہت کم وقت میں بپا ہو سکتا ہے۔ اس لئے آج کے زمانے میں ہم سنتے ہیں کہ فلاں ملک میں نیٹ یا ٹوئٹر پہ پابندی لگا دی گئ۔ خود ہمارے ملک میں یہ ہو چکا ہے۔

شاعر انقلاب،

جوش ملیح آبادی

، کے زمانے میں یہ سب کچھ نہ تھا۔ حکومت  لکھنے والوں کے قلم سے ڈرا کرتی تھی۔ اسکی زد پہ ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے شاعر جوش بھی تھے۔ ایک ایسے ہی موقع پہ جب پولیس انکے گھر کی تلاشی لے چکی تھی۔ انکے قلم سے اس نظم نے وجود لیا۔ نظم کا نام ہے تلاشی۔

جس سے امیدوں میں بجلی، آگ ارمانوں میں ہے

اے حکومت، کیا وہ شے ان میز کے خانوں میں ہے

بند پانی میں سفینے کھے رہی ہے کس لئے

تو مرے گھر کی تلاشی لے رہی ہے کس لئے

گھر میں درویشوں کے کیا رکھا ہے بد نہاد

آ مرے دل کی تلاشی لے کہ بر آئے مراد

جس کے اندر دہشتیں پر ہول طوفانوں کی ہیں

لرزہ افگن آندھیاں تیرہ بیابانوں کی ہیں

جس کے اندر ناگ ہیں اے دشمن ہندوستان

شیر جس میں ہونکتے ہیں، کوندتی ہیں بجلیاں

چھوٹتی ہیں جس سے نبضیں افسر و ارژنگ کی

جس میں ہے گونجی ہوئ آواز طبل جنگ کی

جس کے اندر آگ ہے، دنیا پہ چھا جائے وہ آگ

نار دوزخ کو پسینہ آجائے وہ آگ

موت جس میں دیکھتی ہے منہ اس آئینے کو دیکھ

 مرے گھر کو دیکھتی کیا ہے میرے سینے کو دیکھ

ہائے شاعر کے تخیل کی  تجلّیاں اور بجلیاں۔

  اسکے ساتھ ہی چند دنوں کے لئے اجازت۔ کیونکہ اب کچھ دنوں تک اس بستی کے اک کوچے میں رہیں گے جو کراچی سے دور ایک افتادہ مقام پہ بغیر انٹر نیٹ کے بسا ہوا ہے۔ اپنے ساتھ اردو لغت، دیوان غالب، اور چند نا مکمل پڑھی ہوئ کتابیں لے جا رہی ہوں۔ ارادے تو بڑے باندھے ہیں دیکھیں کتنے تکمیل کو پہنچتے ہیں۔ خدا حافظ۔

11:15 PM

انٹر نیٹ, انقلاب, پاکستان, ٹوئٹر, ٹیکنالوجی, جوش ملیح آبادی, کراچی

ایک شادی

دیکھئیے عشاق پاتے ہیں بتوں سے کیا فیض

اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

یہ ہے وہ افواہ جو ہر سال جنوری کے آغاز پہ ہم سنتے ہیں۔ اور عشاق پہ نظر گاڑ کر ایسے بیٹھ جاتے ہیں جیسے عشاق بتوں پہ۔ اس لئے نہیں کہ دیکھیئے عشاق پاتے ہیں بتوں سے کیا فیض بلکہ اس لئے کہ برہمن کا کہا بالکل غلط ثابت ہو جائے۔ اور ہم پھر جپھیاں ڈال کر کہیں، چیٹر، یو آر آ چیٹر۔

لیکن افسوس یہ سب شیطانی ارمان دل کے دل میں ہی رہ گئے اور عشاق نے سجا دکھا کر کھبا دے مارا۔ یہ تو آپ جان چکے ہونگے کہ ہمارے محبوب صدر نے ایک دفعہ پھر عشق کے گھوڑے پہ سواری کی ، اسے قابو کیا اور سرخ رو ہوئے  اور یہ سب اس طرح کیا کہ دائیں ہاتھ سے انگوٹھی پہنانے کی خبر بائیں ہاتھ کو نہ ہوئ۔ لوگوں کو کچھ اندازہ اس وقت ہوا جب ہماری خاتون اول کی سیکیوریٹی کے لئے صدر صاحب نے صدر اوبامہ سے درخواست کی۔

اک برہمن نے اسکی پیشنگوئ کئ ماہ پہلے کر دی تھی۔   ہمارے شیطانی چرخے کو لگتا ہے کہ یہ برہمن اس قسم کی پیشنگوئیاں، واقعہ پیش آنے کے بعد اور عوام الناس کے کانوں میں پڑنے سے پہلے کرتا ہے تاکہ تیل اور تیل کی دھار دیکھنے میں آسانی رہے۔ اگر تیل کی دھار  نظر میں رکھیں تو اپنا تیل کم نکلتا ہے۔

ہمیں کیا کسی بھی مسلمان  پاکستانی کو

انکی دوسری شادی

پہ کوئ اعتراض نہیں۔ایک پاکستانی مسلمان کا کہنا ہے کہ انہوں نے شرعی کام تو کیا۔ ایک اور کا کہنا ہے کہ اگر وہ بے نظیر کی زندگی میں ہی یہ ہمت کر ڈالتے تو بھی یہ شرعی ہی ہوتا۔ اس سے میرا مقصد، یہ کہنا نہیں کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ یہ شادی ہو چکی ہے اورپہلے سے مصروف تجزیہ نگاروں  کو جو تحریر اسکوئر، مصر اور لاہور سے ریمنڈ ڈیوس کے ریمانڈ کی خبروں میں سے خبریں نکال رہے تھے، پتہ چلا کہ انکی آنکھوں کے سامنے سے ہاتھی نکل گیا اور

خبر نہ ہوئ

۔

خیر، اہل پاکستان کے لئے یہ ایک خوشخبری ہے جو مدت بعد ملی۔ بالآخر زرداری صاحب نے امریکہ کا داماد بن کر دکھا دیا۔ خاتون اول،  سیاسیات میں برطانیہ سے پی ایچ ڈی کر چکی ہیں۔ امریکہ میں بطور فزیشن کام کرتی ہیں۔  امریکن شہریت کی حامل یہ خاتون، بحیرہ ء روم کے ساحلوں پہ واقع کسی ملک سے تعلق رکھتی ہیں لوگوں کا کہنا ہے کہ بحیرہ ء روم کا یہ علاقہ کراچی کے جیل روڈ پہ واقع ہے۔ یوروپ اور امریکہ میں جائدادوں کی مالک ہیں۔ خوش شکل ہیں اور لگتا ہے کہ خوش امید بھی۔ لوگ سوچ رہے ہیں کہ یہ شادی سیاست کی وجہ سے ہوئ ہے یا محبت یا دولت کی وجہ سے۔

اب اندازے لگانے والے اندازے لگاتے رہیں۔ کچھ لوگوں کو اس بات کا افسوس ہے کہ شادی دبئ میں ہونے کی وجہ سے اس موقع پہ ہونے والے صدقے کے بکرے اور دیگر جانور و طیور بھی اسی ملک میں گئے جو پہلے سے اتنا امیر ہے۔ اب کم از کم   زرداری صاحب کو شادی کا باقاعدہ اعلان کر کے دعوت ولیمہ دینی چاہئیے۔ کہ اہل وطن بھی پلاءو کی خوشبو سونگھ سکیں۔ بم کے بجائے بھنگڑے کی بات کر سکیں اور نوحوں کے بجائے جئے بنڑے گا سکیں۔

آخر آصف علی زرداری کی دوسری شادی میں ہمیں اتنی دلچسپی کیوں ہو گئ۔ بات یہ ہے کہ نیٹ پہ سرچ کرتے ہوئے جب ہم ایک لنک پہ پہنچے تو یہ ہمیں تنویر زمانی کے

فیس بک پیج

پہ لے گیا اور وہاں ہمیں یہ پتہ چلا کہ زمانی بیگم پیپلز پارٹی کے لئے آب حیات بن کر آئ ہیں۔ کارکنوں کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر زمانی کی شکل میں ایک بار پھر پارٹی کو قدرت نے بے نظیر سے نوازا ہے اور وہ دن دور نہیں جب تنویر زمانی ملک کی وزیر اعظم ہونگیں۔

پھر ان لوگوں کا کیا ہوگا جنہوں نے بلاول ہمارا وزیر اعظم کے نعرے لگانے کی پریکٹس بھی کر لی تھی۔ نہیں ، نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ بتائیے فرزند زمین ہمارے شہزادے  بلاول زرداری بھٹو کے مقابلے میں دختر رُوم یہ مقابلہ جیت سکتی ہیں؟

-

-

-

شاعر کہتا ہے کہ

بتائیں ہم کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا

پلاءو کھائیں گے احباب، فاتحہ ہوگا

اس کے پہلے مصرعے میں تصحیح کی گنجائش ہے۔ جو چاہے کرے۔ لیکن نجانے کیوں مجھے اس وقت یہ شعر یاد آ رہا ہے کہ

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی

دیوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

3:56 PM

امریکہ, پاکستان, تنویر زمانی, زرداری

فرنچ بیچ پہ پاکستانی

سمندر ہمیشہ یکساں حالت میں نہیں رہتا۔ کبھی اسکا پانی ساحل پہ دور تک پھیل جاتا ہے اور کبھی اس طرح سمٹتا ہے کہ اسکے اندر موجود چٹانیں اور ان پہ موجود سمندری مخلوقات ظاہرہو جاتی ہیں۔ یہ عمل دن میں دو بار ہوتا ہے اور اسے

سمندر کا مد و جذر

  کہتے ہیں۔

جب سمندر جذر کی حالت میں ہو یعنی پانی سمٹ کر پیچھے چلا جائے تو تحقیق دانوں کو بہت کچھ دیکھنے کو مل سکتا ہے۔  چٹانوں کے کونے کھدروں میں ٹہرا پانی ان میں پھنسی چھوٹی چھوٹی مچھلیاں اور سمندری گھونگھے اور سیپ، سمندری پودے۔

ایک ایسے ہی وقت ہمارا گروپ سمندر کی ان چٹانوں سے سمندری پودوں کو ادھیڑنے میں مصروف تھا تاکہ ان پہ تحقیق کر کے انسانوں کے لئے کار آمد مرکبات نکالے جا سکیں۔

کچھ لوگ کام میں اور کچھ آرام کی حالت میں تھے۔ جب ہمارا آرام کا وقت آیا تو ہم ساحل کے ساتھ ریت کے محل بنانے اور ایک دوسرے کے ساتھ چھیڑ خانیوں میں مصروف ہو گئے۔ کسی نے  ساحل کے ایک طرف انگلی اٹھا کر کہا وہ اس طرف

فرنچ بیچ

ہے۔ وہاں عام لوگوں کا جانا منع ہے۔ وہاں بڑی اچھی ہٹس ہیں اور بڑا اچھا ویو۔ میں نے اس طرف دیکھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئ۔

عام آدمی کو اپنے کام سے کام رکھنا چاہئیے اسی میں اسکی بقاء ہے۔

جب دنیا میں بہت اچھے سمندری ویوز دیکھ چکے جن میں گوادر کا سحر انگیز سمندری ویو بھی شامل ہے تو ابھی گذشتہ دنوں پیغام ملا کہ آپ چاہیں تو فرنچ بیچ پہ ایک پورا دن بلکہ رات بھی گذار سکتی ہیں۔

رات کی تجویز کو تو بچوں کی زیادہ تعداد کی وجہ سے نظر انداز کر دیا۔ البتہ دن گذارنے کے لئے وہاں روانہ ہوئے۔ فرنچ بیچ ساحل کے اس حصے کا نام ہے جو اس قطار میں شامل ہے جہاں ہاکس بے اور پیرا ڈائز پوائینٹ  موجود ہیں۔

یہاں ایک گاءوں ہے جس کی زمین پہ یہ ہٹس شہر کی اشرافیہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ خوبصورت ہٹس کے ساتھ بہت سارے پام، ناریل، اور کھجور کے درخت موجود ہیں۔ ساحل کی خوبی یہ ہے کہ سمندر کی ریت اور چٹانیں  ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ کراچی کے سی ویو پہ صرف ریت ہے۔ پھر یہ کہ وہ کافی عوامی جگہ ہے۔ جبکہ یہاں بغیر کسی مداخلت کے خاندان کے ساتھ دن گذارنے کی سہولت موجود تھی۔

یہاں کے ساحل کی ایک خوبی اور بھی ہے، کراچی کے باقی ساحلوں سے غروب آفتاب کا نظارہ کیا جا سکتا ہے طلوع آفتاب کا نہیں۔ جبکہ اس ساحل سے طلوع آفتاب کا منظر دکھائ دیتا ہے غروب کا نہیں۔

:)

شاید اسی لئے اشرافیہ کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ تمام دن، ادھر ادھر گھومتے کچھ تصاویر اکٹھی کیں۔ آپ کے لئے بھی حاضر ہیں۔

بچوں کا جمع کیا ہوا ہرمٹ کریبز کا خزانہ

ساحل کی گیلی ریت فنکاری کے نمونے دکھانے کے لئے اچھی جگہ اور بچوں کے لئے ایک قدرتی سلیٹ

خوبصورت ناریل کے درخت

ائے محتسب نہ پھینک ارے محتسب نہ پھینک، ظالم، شراب ہے ارے ظالم شراب ہے

ہاتھ دھو لیں کھانے کا وقت ہوا چاہتا ہے

 توانائ بچائیے، کباب اور شیر مال ایک ساتھ گرم کریں

ایک سالگرہ بھی منائ گئ

 کتوں نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا اور تصویری سیشن میں ادائیں دکھائیں۔ یوں معلوم ہوا کہ کتے میں بھی عصری آگہی موجود ہے۔

12:14 PM

پاکستان, پیرا ڈائز پوائینٹ, ساحل, سمندر, فرنچ بیچ, کراچی, مخلوقات, ہاکس بے

انصاف کا راستہ

تین پاکستانی شہریوں کو پاکستان کے ایک بڑے شہر لاہور میں دن دھاڑے موت کی نیند سلا دینے والے امریکی شہریوں کو امریکہ نے اپنے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

اس پورے واقعے میں عینی شاہدین کے بیانات اور مرنے والوں کے خاندان والوں، امریکی سفارتخانے سے تعلق رکھنے والوں کے بیانات سے مختلف ہیں۔

ریمنڈ ڈیوس کا کہنا ہے کہ موٹر سائیکل سوار ڈاکو تھے جبکہ دیگرشواہد اس بات کے حق میں نہیں جاتے۔ انصاف کا تقاضہ تو یہی ہے کہ قانون کو اسکا کام کرنے دیا جائے۔ واقعے کی تحقیق ہو، امریکی  ملزم شہری اس الزام سے اپنی بریت ثابت کر لیں تو رہائ پائیں اور اگر ایسا نہ ہو تو قرار واقعی سزا۔

ہمیں یقین ہے کہ جرم ثابت ہونے پہ پاکستانی عدالت زیادہ سے زیادہ انہیں عمر قید کی سزا دے سکتی ہے یا بہت ہمت کر کے کوئ انقلابی فیصلہ کر لے تو سزائے موت، مگر چھیاسی سال کی قید نہیں۔ ہم یہ بھی سوچتے ہیں کہ اگر امریکن کوشش کریں اور پاکستانی طریقے استعمال کریں تو ملزموں کا بری ہونا بھی کوئ ایسا مشکل نہیں۔ پھر یہ حوالگی والی بات خاصی غیر انسانی لگتی ہے۔

ریمنڈ ڈیوس کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنے آپکو بے گناہ ثابت کرے اور اگر وہ ایسا نہیں کر پائے تو اسے اپنی سزا کا سامنا کرنا چاہئیے۔ امریکی حکومت کو صدر باراک اوبامہ کے وہ الفاظ یاد رکھنے چاہئیں جس میں انہوں نے کہا کہ

اس دنیا میں بہت دکھ، درد، بدی اور شر موجود ہے۔ لیکن ہمیں نیک نیت اور منکسر المزاج ہو کر یہ یقین رکھنا چاہئیے کہ ہم دنیا کو ہر قسم کی بدی سے نجات دلا سکتے ہیں۔

لوگوں کو اس انصاف تک پہنچنے سے روکنا جس سے انکو ذہنی و روحانی اطمینان اور تسلی ہو کہ انکے ساتھ انصاف کیا گیا ، بدی کی ہی ضمن میں آتا ہے۔  اوبامہ حکومت کو پتہ ہونا چاہئیے کہ ہمیں نہ صرف انکی نیک نیتی اور منکسر المزاجی پہ شک ہے بلکہ انکے اس قسم کے مطالبات سے ہمیں اس پہ بھی شک ہوتا ہے کہ آیا وہ دنیا کو ہر قسم کی بدی سے نجات دلانا چاہتے ہیں یا اس میں شیر کا حصہ ڈالنا چاہتے ہیں۔

11:24 PM

امریکہ, اوبامہ, پاکستان, ریمنڈ ڈیوس, شہری, قتل, لاہور

انقلاب اے انقلاب

تیونس سے بھڑکنے والی آگ کے شعلے مصر تک جا پہنچے۔  تیونس کے صدر زین العابدین بن علی نے مشتعل عوام سے بھاگ کر سعودی عرب میں پناہ لی۔ فرانس نے انہیں پناہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔  ادھر مصر میں ہزاروں لوگوں نے حسنی مبارک کی حکومت کے خلاف احتجاج میں حصہ لیکر ناراضگی کا جمعہ منایا۔ یوں نماز جمعہ کے بعد احتجاجی ہجوم سے نبرد آزما صدر حسنی مبارک نے کرفیو کا نفاذ کر دیا۔

لوگوں کو اس احتجاج کے لئے جمع کرنے میں جدید ٹیکنالوجی نے بڑا حصہ لیا۔ پچھلے دو دنوں میں

انٹر نیٹ سرگرمی

مصر میں اتنی زیادہ رہی کہ حکومت نے انٹرنیٹ پہ پابندی لگا دی۔ اس سے پہلے سے متائثرکاروباری حلقے کو سخت نقصان پہنچا۔

  دونوں ملکوں میں جو قدر مشترک ہے وہ آمریت کا ایک طویل عرصے تک اقتدار پہ قابض رہنا اور اسے قائم رکھنے کے لئے اپنی قوم کو ہر طرح کے دباءو میں رکھنا،  بد ترین معاشی حالات اور ایک ہی ملک کے اندر مختلف طبقات کے اندر غیر متوازن فرق۔ عوام کو جاہل رکھا جا سکتا ہے مگر بھوکا نہیں۔

تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ یہ عمل یمن اور اردن میں بھی دوہرائے جانے کا امکان ہے اور جلد یا بدیر سعودی عرب بھی اسکی لپیٹ میں آئے گا۔  یوں عرب دنیا ایک بڑی تبدیلی سے دوچار ہونے جا رہی ہے۔  طویل شخصی حکومتوں کے عادی نظام کس نئ سمت میں جائیں گے یہ دیکھنا ابھی باقی ہے۔

ان انقلابات کو دیکھ کر پاکستان میں کچھ لوگوں نے یہ امید لگائ ہے کہ شاید ہم بھی ایسے ہی کسی انقلاب کی طرف گامزن  ہونے والے ہوں۔ لیکن کیا عوام کسی انقلاب کی طرف جانے کو تیار ہیں۔  آئیے دیکھتے ہیں یہ ویڈیو۔

11:47 PM

آمریت, احتجاج, پاکستان, تیونس, عرب, مسلمان, مصر

مرض، مریض اور مسیحا-۲

گذشتہ سے پیوستہ

ابھی چند دن پہلے عرصہ ء پانچ سال کے بعد مجھے اس ہسپتال میں جانے کا دوبارہ اتفاق ہوا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئ کہ ہسپتال اسی طرح صاف ستھرا تھا جس طرح چارسال پہلے جبکہ یہ اپنی تعمیر کے ابتدائ مراحل میں تھا۔

جتنی دیر  ہم موجود رہے انہوں نے اپنی ٹیم کے ساتھ چار خواتین کا آپریشن کیا۔ ایک کا پہلے ہو چکا تھا۔ اور اس دوران  مختلف کام بھی نبٹاتے رہے۔

ہسپتال میں محض فسچولا کا علاج ہی نہیں ہوتا بلکہ عورتوں کے جملہ امراض کا علاج بھی کیا جاتا ہے جن میں  حمل ، زچگی، ،سن یاس اور بانجھ پن شامل ہیں۔

شاید اسی لئے اسکا نام 'عورتوں کا ہسپتال' رکھا گیا ہے۔

علاج کی غرض سے آنے والی خواتین کا علاج مفت کیا جاتا ہے ۔ صرف مریض ہی نہیں بلکہ تیماردار کو مفت کھانا فراہم کیا جاتا ہے۔ یوں یہاں ایک کینٹین بھی ہے جہاں سے ہسپتال کا عملہ ہی نہیں ڈاکٹر صاحبان بھی وہی کھانا کھاتے ہیں۔

فسچولا کے مریضوں کے لئے ایک علیحدہ وارڈ ہے

یہاں  مڈوائفری کا کورس کرانے کے انتظامات بھی ہیں اور نرسنگ کی تربیت کا بھی انتظام بھی۔ یوں مقامی گوٹھوں کی بلوچ لڑکیوں کو کافی تعداد میں اس میں دلچسپی لیتے دیکھا۔ ان تربیتی کورسوں کے علاوہ مقامی گوٹھ کی دلچسپی رکھنے والی خواتین کی مفت ابتدائ تعلیم کے لئے بھی ایک گوشہ مختص کیا گیا ہے جسے سندھ ایجوکیشن فاءونڈیشن چلا رہا ہے۔

سندھ ایجوکیشن فاءونڈیشن کی استاد اپنے کمرہ ء جماعت میں

بچوں کے لئے ایک چھوٹا سا پارک

اگر آپ کے نزدیک کوئ خاتون محض  پیسوں کی وجہ سے علاج کرانے سے ہچکچاتی ہیں تو انہیں اس ہسپتال کا پتہ ضرور دیجئیے۔ ہسپتال مختلف ڈونیشنز سے چلتا ہے اگر آپ بھی دینا چاہیں تو اس میں شامل ہو سکتے ہیں۔

ایک پسماندہ ملک کی پسماندہ خواتین کے لئے یہ ہسپتال ترقی کی ایک علامت ہے۔ مزید معلومات کے لئے یہ ویڈیو دیکھئیے۔

ہسپتال کے مختلف حصوں سے گذرتے ہوئے میری نظر ایک زمین کے نیچے جاتے ہوئے راستے پہ پڑی۔ بتایا گیا کہ اس کا نام ہم نے مصطفی کمال بائ پاس رکھا ہے۔ کیونکہ مصطفی کمال اتنی تیزی سے بائ پاس بنوا رہے تھے جس زمانے میں ہمیں اسے بنانا پڑا۔ مگر ضرورت کیا پڑی تھی اسے بنانے کی؟ دراصل مقامی گوٹھ کے لوگوں نے  اعتراض کیا تھا کہ اس ہسپتال کی وجہ سے گوٹھ کے اندر چلنا انکے لئے مشکل ہو گیا ہے۔ اس لئے ہسپتال کی زمین میں سے انہیں راستہ دینا پڑا۔ یوں دو ٹکڑے ہونے کے بعد دوسرے ٹکڑے سے رابط کے لئے یہ بائ پاس بنانا پڑا۔

ہمم، یہ دلوں کے درمیان بائ پاس بنانے سے پہلے زمین میں بھی بائ پاس بنانا پڑتے ہیں۔

:)

4:45 PM

بانجھ پن, خواتین, ڈاکٹر شیرشاہ سید, صحت, فسچولا, کراچی, کوہی گوٹھ

مرض، مریض اور مسیحا-۱

گل بانو، بلوچستان کے دور افتادہ گاءوں کی رہنے والی  لڑکی مقامی روایات کے تحت تیرہ سال کی عمر میں شادی کے بندھن میں باندھ دی گئ۔ اگلے سال وہ ماں بننے کے مراحل میں تھی۔ اسکی زندگی میں افسوسناک صورت حال نے اس وقت جنم لیا جب وہ بچے کی پیدائیش کے عمل سے گذر رہی تھی۔ کم عمری اور نا تجربے کار دائ  کی وجہ سے  کی اس نے چار دن اس تکلیف میں گذارے ۔

بچے کی پیدائیش کے بعد گل بانو کو احساس ہوا کہ پیشاب اور پائخانہ اسکے جسم سے بغیر کسی کنٹرول کے ہر وقت رس رہے ہیں۔ یہ ایک تکلیف دہ ہی نہیں شرمندہ کر دینے والی صورت حال تھی۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے اور اسکا کیا علاج ہے۔

گل بانو اپنی جھونپڑی میں قید ہو کر رہ گئ۔ تین سال اس حالت میں گذرے۔  اس مایوسی میں امید کی کرن اسکا شوہر تھا۔ وہ خوش قسمت تھی کہ اس کے شوہر نے اسکا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ ایک دن اسکے شوہر کو کراچی میں موجود ایک ہسپتال کا پتہ چلا جہاں نہ صرف اسکی بیوی کا علاج مفت ہو سکتا تھا بلکہ تیماردار کی حیثیت سے اسکو بھی سپورٹ حاصل ہوجاتی۔

گل بانو کو چارپائ پہ ڈالا گیا تاکہ اسے اٹھا کر گاءوں کے قریب سے گذرنے والی سڑک تک پہنچایا جا سکے۔ دو دن اور رات کے سفر کے بعد وہ سڑک تک پہنچے۔ جہاں سے ایک ٹویوٹا ہائ لکس پک اپ میں آٹھ گھنٹے کا سفر کرنے کے بعد وہ کراچی کے نزدیک کوہی گوٹھ پہنچے۔ جہاں وہ ہسپتال تھا۔

یہاں نو مہینے کے دوران گل بانو کے چھ آپریشن ہوئے اور وہ اپنے جسم پہ  شرمندگی کے سوراخ بھرنے میں کامیاب ہو گئ۔

فسچولا وہ پیچیدگی ہے جو بچوں کی ڈلیوری کے دوران پیدا ہو سکتی ہے خاص طور پہ اس وقت جبکہ ڈیلیوری میں زیادہ وقت لگ جائے۔ یوں بچے کی حرکت کی وجہ خواتین کے اندرونی اعضاء پھٹ جاتے ہیں اور ان میں سوراخ ہو جاتے ہیں۔ ان سوراخوں سے پیشاب پائخانے کا اخراج اندرونی اعضاء میں ہونے لگتا ہے اور ان پہ سے ایک عورت کا جسمانی کنٹرول ختم ہو جاتا ہے۔

مسلسل اخراج کی وجہ سے جسم کے اوپری حصے پہ آبلے پڑ جاتے ہیں۔ بچہ دانی سوکھ سکتی ہے، بانجھ پن پیدا ہو سکتا ہے ، مایوسی، ڈپریشن اور سٹریس بڑھتا ہے۔ اکثرعورتوں کو انکے شوہر لا وارث چھوڑ دیتے ہیں اور گھر والے یا دیگر لوگ مسلسل بدبو کی وجہ سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔

کوہی گوٹھ میں واقع یہ ہسپتال جس کا نام عورتوں کا ہسپتال ہے۔

ڈاکٹر شیرشاہ سید

کی زیر نگرانی چلنے والا ایک ہسپتال ہے اس کے قیام کے لئے انہوں نے فنڈز اکٹھے کئیے۔ انہوں نے کوشش کی کہ کمیونیٹی کی بنیاد پہ خواتین کی صحت کے

  مسائل کے بارے میں احساس پیدا کیا جائے

متعلقہ ویڈیو یہاں حاضر ہے۔

جاری ہے۔

4:24 PM

بلوچستان, پاکستان, خواتین, ڈاکٹر شیرشاہ سید, صحت, فسچولا, کراچی, کوہی گوٹھ

ازموں کی دھند یا دھندہ

ستمبر کی ستمگر گرمی کے دن، میں منی بس میں خواتین کے رش کے درمیان گھسی خدا سے اس دعا کی قبولیت کی منتظرکہ اپنا بس اسٹاپ جلدی سے آجائے۔ اچانک کانوں میں قرآن کی تلاوت کی آواز ٹکراتی ہے۔ دیکھتی ہوں ایک کونے میں ایک حجاب دار برقعے میں ملبوس خاتون  کے برابر ایک چھ سات سال کا بچہ سیپارہ کھولے بیٹھا ہے اور پڑھ رہا ہے وہ خاتون اسکی تصحیح کراتی جاتی ہیں۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد اس بچے کی چھٹی ہوتی ہے اور اسکے فوراً بعد وہ خاتون اپنے پڑوس میں بیٹھی ہوئ خاتون سے مخاطب ہوتی ہیں۔

کیا آپ مسلمان ہیں؟ وہ خاتون اس حملے کے لئےتیار نہ تھیں ایک شش و پنج میں انکے حجاب دار چہرے کو پڑھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہنے لگیں کہ جی ہاں میں مسلمان ہوں۔ فرمایا، سچ سچ، پورے یقین سے بتائیے کیا آپ مسلمان ہیں؟ جی ہاں الحمد للہ میں مسلمان ہوں۔ تو پھر، حجاب والی خاتون نے کہا ، آپ نے ناخن کیوں بڑھائے ہوئے ہیں اور نیل پالش کیوں لگائ ہوئ ہے۔ مسلمان عورت کو اس طرح نہیں کرنا چاہئیے۔ وہ خاتون انہیں ہکا بکا دیکھتی رہیں۔ پھر انہوں نے ان سے کہا وعدہ کیجئیے کہ ابھی آپ گھر جا کر اپنے ناخن کاٹ کر نیل پالش صاف کر لیں گی۔

وہ کہنے لگیں لیکن آپ کا اس سے کیا تعلق؟ جواب،  دوسروں کو برائ سے روکنا چاہئیے۔ ایک مسلمان کو دوسروں کو برائ سے روکنا چاہئیے۔ وعدہ کریں، آپ مجھ سے وعدہ کریں۔ آپ میری بہت اچھی بہن ہیں میں آپکی بہت اچھی دوست ہوں مجھ سے اللہ کے نام پہ  وعدہ کریں کہ آپ گھر جا کر جو میں نے کہا وہی کریں گی۔ کہیئے ہاں ایسا ہی کریں گی۔ یہ بات انہوں نے اتنے تسلسل سے کہی کہ ان دوسری خاتون نے کہا اچھا، میں ایسا ہی کرونگی۔

بس رکی اور وہ حجاب دار خاتون اپنے بچے کا ہاتھ پکڑ کر نیچے اتر گئیں۔ وہ دوسری خاتون میری دوست تھیں۔

اگلے دن انکے ناخن کٹے ہوئے اور صاف تھے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا چلیں آپ نہ صرف  مسلمان ہو گئیں بلکہ کاسمیٹکس کا خرچہ بھی بچا۔ انہوں نے مجھے حیرانی سے دیکھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ گھر جاتے ہی کاٹ دونگی اور صاف کر لونگی۔ گھر آتے ہی میں نے پہلا کام یہی کیا۔ میں نے ان سے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ اب ساری زندگی ناخن نہیں بڑھاءونگی یا نیل پالش نہیں لگاءونگی۔ میری مسکراہٹ معدوم ہو گئ۔

یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ان دونوں میں، مجھے کون بہتر لگا۔ اس نے جس نے وعدے کی پاسداری کی یا وہ حجاب دار خاتون جو نمود و نمائش کی دلدادہ نظر آئیں اور انہوں نے محض ایک معمولی چیز پہ اگلے شخص کا ایمان جانچنا شروع کر دیا۔

  ناخن بڑھانا یا اسے نیل پالش سے رنگنا، اس کا مسلمان ہونے سے کوئ تعلق نہیں۔  میراروشن خیال ذہن کہتا ہے کہ نیل پالش سے وضو نہیں ہوتا۔ اس لئے نماز ادا کرنے میں مسئلہ ہوگا۔ سو اگر کوئ خاتون اس حالت میں ہو کہ اس پہ نماز ساقط ہو جائے تو وہ نیل پالش لگا سکتی ہے۔ یا اگر وہ یہ اہتمام کر سکتی ہے کہ ہر نماز سے پہلے نیل پالش ہٹا لے تو کوئ قباحت نہیں۔ اسی طرح ناخن بڑھانا صحت اور صفائ کے اصولوں سے تعلق رکھتا ہے۔

میں یہ بھی سوچتی ہوں کہ ایک چھ سات سال کے بچے کو دوران سفر اپنے ماحول اور ارد گرد کی دنیا میں دلچسپی لینے کے بجائے تلاوت قرآن میں مصروف رکھنا شدت پسندی کے سوا کچھ نہیں۔

 میری اس طرح کی تحاریر پڑھ کر ایک روایت پسند صاحب کسی اور فورم پہ جاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اس عورت کو جب چار شوہر کرنا پڑیں گے تو اسے پتہ چلے گا کہ روشن خیالی کیا ہوتی ہے۔ اُس روشن خیال مرد کی بیٹی جب ہر روز ایک نیا بوائے فرینڈ پکڑ کر گھر لائے گی تو پتہ چلے گا کہ روشن خیالی کیا ہوتی ہے۔ ہم خیال پیٹھ ٹھونکتے ہیں کیا اعلی ارشاد ہے۔

میں انکے اس روئیے کوبھی شدت پسندی میں ڈالتی ہوں۔ ایک ایسی شدت پسندی جو حقائق اور مسائل کو منطقی نظر سے دیکھنے کے بجائے اپنے ثقافتی پس منظر یا وراثتی پس منظر سے نہ صرف دیکھنا چاہتی ہے بلکہ اسکے خلاف کسی بھی خیال کو بزور طاقت یا زبان ایکدم ختم کر دینا چاہتی ہے۔ چاہے وہ اس شخص کو ذاتی سطح پہ جانتے بھی نہ ہوں۔ لیکن وہ اس سے ذاتی انتقام کے خواہش مند ہیں۔

   یہاں سے میں اس سوال کے جواب میں اپنا حصہ ڈلنا چاہونگی کہ روشن خیالی یا شدت پسندی کو میں کیسے لیتی ہوں۔

روشن خیالی کا الٹ روایت پسندی ہے۔ مگر مطلق

روایت پسندی

کوئ چیز نہیں اگر ایسا ہوتا تو ہم اب بھی غاروں میں رہتے۔ دنیا یوں نہیں ہوتی، جیسی اب ہے۔

ہمارے بزرگ لال اینٹوں کے پکے مکانات میں رہتے تھے ہم کنکریٹ اور سیمنٹ کے بنے مکانات میں رہتے ہیں۔ ہمارے پرکھ ہل چلاتے تھے ہم ٹریکٹر چلاتے ہِیں، ہمارے آبائ گھر ہوتے تھے جہاں نسلیں پلتی تھیں۔  آج ہم ٹک کر ایک ملک میں نہیں رہ پاتے، ہمارے گھروں میں صحن ضرور ہوتا تھا مگر آج صحن ہونا ایک عیاشی ہے۔ محض پچاس برس پہلے کی دنیا دیکھئیے اور آج کی،  روایات ہی نہیں رہن سہن ، طور طریقے اور اقدار سب تبدیل ہو گیا ہے۔

یہ تبدیلیاں یوں لگتا ہے کہ خاموشی سے آتی ہیں مگر دراصل یہ انسانوں کی ضرورت کی وجہ سے آتی ہیں۔ ضرورت اگر شدید ہو تو تبدیلی میں بھی شدت ہوتی ہے۔

تبدیلی مختلف الخیال گروہوں کے آپس میں ملنے سے بھی آتی ہے۔ ایک گروہ جب دوسرے گروہ کو زیادہ خوشحال یا آسان زندگی گذارتے دیکھتا ہے  تو شعوری یا لاشعوری طور پہ  تبدیلیوں کو اپنانے لگتا ہے۔

تبدیلی اگر خاموشی یا ہمواری سے آئے تو معاشرے کے بنیادی اجزاء اپنی جگہ باقی رہتے ہیں۔ لیکن یہی تبدیلی اگر اچانک آئے تو بہت ساری چیزیں کھو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے جیسے زلزلہ آجائےتو کیا ہوگا؟ بالخصوص اگر رات کے وقت آجائے تو ہم زیادہ نقصان سے دوچار ہونگے۔

اگر ایک معاشرہ لمبے عرصے تک آہستگی سے ہونے والی تبدیلوں کا خوگر نہ رہے تو پھر تبدیلی زلزلے کی صورت آتی ہے۔

جب بھی کوئ تبدیلی اپنا رستہ بناتی ہے تو اسے پہلے سے بے ہوئے رستے سے الگ ہونا پڑتا ہے چاہے یہ عمل آہستہ ہو یا تیز۔ اسی طرح لا شعوری تبدیلیاں تو بہت بعد میں پتہ چلتی ہیں مگر شعوری تبدیلیوں کے لئے معاشرے کو کڑے فیصلے کرنا پڑتے ہیں۔

یوں انسانوں میں دو بنیادی گروہ پیدا ہو جاتے ہیں ایک وہ جو اسی پرانے طریقے پہ قائم رہنا چاہتا ہے کیونکہ اسے  نئے راستوں کا ڈر ہوتا ہے۔ وہ نئ چیلینجنگ صورت حال کے سامنے سے ڈرتا ہے۔ دوسری طرف وہ گروہ ہوتا ہے جو اس نئ صورت حال کو آزما کر اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔اور وہ اس کے لئے مختلف خطرات سے نبردآزما ہونے سے نہیں ڈرتا۔

مطلق روایت پسندی کوئ چیز نہیں۔ آپ میں سے بیشتر لوگ اپنی آبائ زمینوں کو چھوڑ کر نئ زمینوں پہ نئے آشیانے بنائے بیٹھے ہیں۔ آپ میں سے بیشتر لوگ اب اپنے پرکھوں کی زمینوں کو پلٹ کر نہیں جانا چاہتے۔ یہ کوئ بری بات نہیں ۔ انسانوں کو جامد نہیں رکھا گیا۔ یوں جمود کا تعلق روایت پسندی سے بنتا ہے۔

جب ہم  نئ چیزوں سے آشنا ہوتے ہیں تو ہمیں بہت احتیاط  اور تفکر سے کام لینا پڑتا ہے۔ کیونکہ اسی سے ہماری بقاء وابستہ ہوتی ہے۔

اگر ہم جنگل میں موجود ہوں اور کسی ایسی طرف موجود ہوں جہاں سے ہمیں اپنا راستہ خود متعین کرنے کی ضرورت پڑے تو ہم اپنے پچھلے تمام تجربات اور آگے پیش آنے والے امکانات کے ساتھ راستہ بناتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ایک ایسی صورت میں، آپ اور میں ساتھ ہوں۔ آپ روایت پسند ہوں اور چاہتے ہوں کہ جو پگڈنڈی  ملی ہوئ ہے اسی پہ چل کر اگر کچھ ملے تو ملے ورنہ خالی ہاتھ رہنا بہتر ہے۔

میں اس چیز پہ راضی نہیں ہوتی اور سوچتی ہوں کہ اب تک زندگی میں جتنا علم اور تجربہ حاصل کیا ہے اسکو استعمال کرتے ہوئے اس سمت بھی دیکھناچاہئیے جسے نہیں دیکھا، لگتا ہے کہ اس طرح ہم پہلے سے بہتر حالت میں ہونگے۔ لیکن نہیں آپ میرے اس خیال کے مخالف ہو جاتے ہیں۔ پہلے مجھے  پیش آنے والے ممکنہ نتائیج سے ڈراتے ہیں، پھر زبانی کلامی برا بھلا کہتے ہیں،   ہو سکتا ہے کہ دل ہی دل میں دعا بھی کریں کہ ایسے برے حالات سے سابقہ پڑے کہ دماغ ٹھکانے آجائیں۔

اسکی الٹ ایک صورت حال  یہ ہوتی کہ میں  بھی آپکو ممکنہ نتائج  سے ڈراءوں،آپکو  سخت اور سست، ڈرپوک اور بزدل کہوں اور ضد پہ آءوں تو آپکو آپکی حالت پہ چھوڑوں اور خود قصد سفر کر لوں۔

سو خیالات کے اس بنیادی فرق سے آپ اور میں  ہم سفر نہیں رہتے بلکہ دو علیحدہ راہوں کے راہی بن جاتے ہیں۔

اگر صورت حال اتنی سادہ رہے تو کیا برائ ہے؟

لیکن یہاں  کہانی میں ٹوئسٹ آتا ہے اور کہانی لکھنے والا ہم دونوں کے بیچ ایک ایسی چیز ڈال دیتا ہے جس سے ہم دونوں کا مفاد یا زندگی کی بنیادی شرائط وابستہ ہوتی ہیں۔

 ہر چیز کہانی نہیں ہوتی اور فکشن کہانی سے زیادہ تلخ اور سنگین ہوتا ہے۔ یوں ہم دونوں کے بیچ ایک نہیں کئ جہتیں نکل آتی ہیں جس کی وجہ سے ہم ایکدوسرے کو دفع دور نہیں کر پاتے۔

جنگل میں ہم ایک دفعہ پھر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔

مطلق روایت پسندی کوئ چیز نہیں۔ کسی چیز کو پرانی عینک سے دیکھتے رہنے کے بجائے نئ عینکوں کا استعمال ہو سکتا ہے کہ وہ گوشے سامنے لے آئے جو ہم نے پہلے محسوس نہیں کیئے۔ ہمم، اس بات کا ڈرتو ہوتا ہے  کہ نئ عینکوں سے ہمیں جو نظر آئے گا ہو سکتا ہے وہ بہت مہلک ہو۔ لیکن نظر آنا اور چیز ہے اور اس  نظر آنے والی چیز کو ذہانت سے اپنے فائدے اپنے استحکام کے لئے استعمال کرنا اور چیز ہے۔ یہی میرے نزدیک روشن خیالی ہے۔ روشن خیالی صرف دیکھنے کے انداز کا نام ہے اس لئے یہ کہنا کہ مطلق روشن خیالی کیا ہوتی ہے لا یعنی بات ہے۔

ہم یہ پوچھ سکتے ہیں کہ مطلق

لبرلزم

یا آزدی کیا ہوتی ہے؟

مطلق لبرلزم اپنا وجود نہیں رکھتا بالکل ایسے ہی جیسے مطلق روایت پسندی اپنا وجود نہیں رکھتی۔ اگر ایک انسان کسی دوسرے انسان کو جب اس کا دل چاہے قتل کر کے کھانا شروع کر دے تو  ایسی آزادی کوئ معنی نہیں رکھتی۔

چونکہ میرے اور آپکے بیچ کچھ ایسی چیزیں ہیں جو مشترکہ ہیں جو ہمیں ایک دوسرے کے اثر سے آزاد نہیں ہونے دیتیں تو ہم مطلق آزادی کا تصور نہیں کر سکتے۔ اسی لئے انسانی معاشروں میں قانون نام کی چیز وجود میں آتی ہے۔ تاکہ ہر شخص آزادی کے مزے سے اس طرح آشنا ہو سکے کہ دوسرے کی آزادی متائثر نہ ہو۔

جب پاکستانی معاشرے میں بنیادی تبدیلیوں کی بات ہوتی ہے اسے کسی طرح لبرلزم سے جوڑ دیا جاتا ہے اور پھر مغرب کی مثالیں پیش کرنا آسان ہوتا ہے۔ پاکستان میں لبرلزم کا وجود نہیں ۔ یہاں معتدل یا موڈریٹ خیالات رکھنے والا طبقہ مٹنے کے مراحل میں ہے اس لئے لبرلزم کا شور مچانے والے اسے صرف فیشن کے طور پہ استعمال کرتے ہیں۔ ایک ڈراوا ، ایک وہم  کہ اگر آپ روایت پسندوں کی پسند پہ نہیں چلتے تو یہ ہے وہ المناک انجام جو سامنے آ ئے گا۔ یوں اصل مسائل مختلف ازموں کی دھند میں لپیٹ دئیے گئے ہیں۔ یہ دھند کچھ لوگوں کا دھندہ چلانے میں خاصی مددگار ہوتی ہے۔ اگر یہ دھند ہٹ جائے تو کچھ دھندے مندے ہو جائیں۔

9:52 PM

پاکستان, روشن خیالی, لبرلزم

تشدد

دیکھیں آپکو یہ نہیں کہنا چاہئیے کہ مارنا پیٹنا اچھا نہیں ہے۔   فرض کریں کہ آپ خواتین پہ ہونے والے تشدد کا تذکرہ کرتی ہیں تو اکثریت اسے ریجیکٹ کر دے گی کہ یہ ہمارے یہاں نہیں ہوتا۔ یا ہم نے تو کبھی کسی کو کرتے نہیں دیکھا۔ کوئ آپکو صحیح جواب نہیں دے گا۔ آپ اسی خیال کو ذرا اور طریقے سے کر سکتی ہیں۔ مثلا کیسے؟ میں نے اپنی آنکھیں اس روشن چہرے والی لڑکی کے چہرے پہ جمائیں۔ جو ایم بی بی ایس کرنے کے بعد فل برائیٹ کے اسکالر شپ پہ امریکہ روانہ ہوئ اور وہاں سے سوشل ہیلتھ سائینس پر ڈگری لے کر لوٹی۔ اور اب پاکستان کے دیہاتوں اور شہروں میں اس حوالے سے مختلف پروجیکٹس پہ کام کر رہی ہے۔ مثلاً آپ ان سے پوچھیں کہ تشدد کیا ہوتا ہے؟

 آپ میری بات سمجھ رہی ہیں ناں۔

 میں خاموشی سے اسکی باتیں سنتی رہی۔ وہ لوگ جو نئ وسعتیں دیکھ کر لوٹتے ہیں انکی باتیں خاموشی سے سننی  چاہئیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری پرانی سرحدیں نئ وسعتوں سے مل پائیں۔

تشدد کیا ہوتا ہے؟ یہ ہے آج کا سوال۔

 میں نے آج کل میں ایک کتاب پڑھی۔ یہ کتاب ابھی حال ہی میں کراچی میں منعقدہ، کتاب میلہ سے لی تھی۔ میں نے اسے خالد جاوید کا ناول سمجھ کر لیا لیکن یہ انکے افسانوں کا مجموعہ نکلا۔ خالد جاوید ایک ہندوستانی ادیب ہیں۔ انکے دو افسانے میں نے پہلے پڑھے تھے اور ان سے کافی متائثر ہوئ۔ مجموعہ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ خالد جاوید موت  کے  کہانی کار ہیں۔ انہوں نے اپنی تقریبا ہر کہانی میں موت کو مختلف انداز سے زندگی سے جوڑا ہے۔

مگر یہاں انکی ایک کہانی 'روح میں دانت کا درد' کے چند اقتباسات حاضر ہیں۔ کہانی میں سے اقتباسات کو الگ کرنا خاصہ بے رحمی کا کام ہے، یعنی یہ بھی ایک تشدد ہے۔  یہ اقتباسات ہمارے موضوع تشدد سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہم نفرت کر سکتے ہیں، ہم کسی کو بھی نفرت کا موضوع بنا سکتے ہیں۔ یہ تشدد ہے۔ دانتوں کا کیڑا اندر ہی اندر نہ جانے کون سی سرنگ بنا رہا تھا۔ ایک منہ سے دوسرے منہ تک بدبودار آندہیاں چل رہی تھیں۔ انکے آلودہ جھکڑوں میں کیا کیا  نہ مٹ جائ گا۔ مگر زندہ رہنے کے لئے نفرت کو برداشت کرنا پڑے گا۔

اگر تشدد ہی ہر مسئلے کا حل تھا تو سڑی ہوئ داڑھ نکلوا کر پھینک دینے سے زیادہ اسے سینت سینت کر پیوند لگا لگا کر رکھنا زیادہ معنی خیز تشدد تھا۔

یقیناً یہ سب جاہلانہ تھا۔ جہالت، بد ذوقی، نا سمجھی اور بد دماغی، یہ سب کتنی حقیر اور نظر انداز کر دینے کے قابل چیزیں تھیں۔ مگر جب یہ چیزیں تمہاری زندگی میں منظم طریقے سے داخل ہوتی ہیں اور باقاعدگی سے اپنے وجود کا احساس دلاتی ہوئ تمہارے کاندھے سے کاندھا ملا کر کھڑی ہو جاتی ہیں تب تشدد اور نفرت کی یہ قسم پیدا ہوتی۔ خطرناک، چالاک اور ٹچا تشدد جو اپنی طرف اٹھی ہوئ ایک خشمگیں آنکھ کا بدلہ بھی دوسرے سے چہرے پر دعا پڑھوا کر لیتا ہے۔

انفرادی اور اجتماعی تشدد الگ الگ  شے نہیں ہیں۔

کبھی کبھی وہ اپنے مرے ہوءوں سے مدد مانگتا۔ اور یقیناً یہ بھی تشدد ہے۔ دنیا جہاں سے ماوراء ان پاک روحوں کو دوبارہ گھسیٹ کر کھینچ کر دنیا میں لانا ان سے دنیا کے کاموں کی مدد لینا انکی روحوں کو شدید کرب اور چڑچڑاہٹ میں مبتلا کر دینے کے علاوہ اور کیا تھا ؟ یہ تشدد کا حصار تھا جو اپنی ماہیت میں دنیا کے رنگ و ریشے میں سما گیا تھا۔

4:22 PM

ادب, اردو, انڈیا, خالد جاوید, سوشل ہیلتھ سائینس, فل برائیٹ اسکالر شپ

جہاں عورتوں کے لئے ڈاکٹر نہ ہو

ایک زمانے میں جب بر صغیر پاک و ہند میں صرف اعلی طبقات کی خواتین کو اتنی تعلیم دینے کا رواج تھا کہ وہ شوہر کو خط لکھ لیں یا گھر کا حساب کتاب کر لیں تو ان تعلیم یافتہ لڑکیوں کو بابل کے گھر سے وداع ہوتے وقت بہشتی زیور کتاب کی ایک جلد بھی ہمراہ دی جاتی تاکہ وہ فرمانبرادر بیوی کی حیثیت سے اپنا گھر بنانا سیکھیں۔

خیر جناب، زمانے کے انداز بدلے گئے، مسائل بھی بدل گئے ہیں۔

میری نظر سے ایک کتاب گذری۔ جس کا نام ہے 'جہاں عورتوں کے لئے ڈاکٹر نہ ہو'۔یہ کتاب صحت کارکنوں اور عورتوں کے لئے ایک رہ نما کتاب ہے۔ اگر آپ کسی خاتون کو ایسی کتاب دینا چاہتے ہیں جو اسکی زندگی میں آسانی پیدا کرے اور اسے اپنے آپ سے آگہی دے اور دیگر خواتین کے لئے مددگار بنائے تو یہ کتاب ایک بہترین تحفہ ہوگا۔

یہ کتاب انگریزی

سے ترجمہ کی گئ ہے۔ اصل مصنفین اے آگسٹ برنز، رونی لووچ، جین میکسویل، کیتھرائین شاپیرو ہیں۔ شہری خواتین کو تو عام طور پہ طبی امداد مل جاتی ہے مگر دیہی خواتین کے لئے بر وقت طبی امداد ملنا مشکل ہوتا ہے جبکہ ہم یہ بات اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ خواتین کی صحت مند زندگی خاندان کی تنظیم اور خوشحالی کے لئے بے حد ضروری ہے۔

اس منفرد کتاب کی تیاری میں تیس ملکوں کی خواتین نے حصہ لیا ہے۔ دنیا کی متعدد زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ کتاب کے کنوینر

ڈاکٹر شیر شاہ سید

کا کہنا ہے کہ اس کتاب کی مدد سے آپ صرف اپنی اور اپنے خاندان کی عورتوں کی صحت ہی کی دیکھ بھال نہیں کر سکتیں بلکہ اپنے محلے اور برادری کی دوسری عورتوں کی بھی مدد کر سکتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ ایسی کتاب نہیں جسے صرف ایک عورت استعمال کر سلے۔ یہ ہر عورت کی کتاب ہے سب عورتوں کی کتاب ہے۔

کتاب ملنے کا پتہ ہے۔

پاکستان نیشنل فورمز آن ویمینز ہیلتھ

نیشنل سیکریٹیریٹ، پی ایم اے ہاءوس

گارڈن روڈ، کراچی

ای میل

 pnfwh@yahoo.com

مجھے بھی انہوں نے اس کتاب کی دو جلدیں دیں کیونکہ یہ کتاب دو حصوں پہ مشتمل ہے۔ ایک کتاب کا سیٹ انہوں نے پڑھنے کے لئے دیا اور دوسرا میں نے ان سا مانگا۔ اپنے عزیز گھرانے کو تحفے میں دینے کے لئے۔

سو آئیندہ چند مہینوں  میں آپکو اس کتاب سے بھی کچھ پڑھنے کے لئے ملے گا۔ آئیے آج کا اقتباس دیکھتے ہیں۔

ایک بہتر دنیا کے لئے اپنے بچوں کی تربیت کیسے کریں

زندگی کے پہلے لمحے سے ہم اپنے بچوں کی جس طرح تربیت کرتی ہیں، وہی، اس بات کا تعین کرتی ہے کہ ہمارے بچوں کی سوچ کیا ہوگی اور بڑے ہونے پہ انکی عملی زندگی کیسی ہوگی۔

ماں ہونے کی حیثیت سے ہم اپنے بچوں کو ہر روز تعلیم دیتی ہیں

جب ہم اپنے شوہروں اور بیٹوں کو کھانا پہلے دیتی ہیں تو ہم اپنے بچوں کو یہ سکھاتی ہیں کہ لڑکیوں اور عورتوں کی بھوک کی کم اہمیت ہوتی ہے۔

جب ہم صرف اپنے بیٹوں کو اسکول بھیجتی ہیں تو ہم اپنے بچوں کو یہ تعلیم دیتی ہیں کہ لڑکیاں ان مواقع کی مستحق نہیں جو جو تعلیم حاصل کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔

جب ہم اپنے بیٹوں کو یہ سکھاتی ہیں کہ سخت اور تند و تیز مزاج مردانگی کی علامت ہےتو ہم تند و تیز مزاج والے مرد تیار کرتی ہیں۔

جب ہم اپنے پڑوسی کے گھر میں ہونے والے تشدد اور مار پیٹ کے خلاف نہیں بولتیں تو ہم اپنے بیٹوں کو تعلیم دیتی ہیں کہ مرد کے لئے اپنی بیوی اور بچوں کو مارنا جائز ہے۔

ماں ہونے کی حیثیت سے ہم اپنے بچوں کی فطرت تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

ہم اپنے بیٹوں کی اس طرح تربیت کر ہیں کہ وہ مہربان، رحم دل اور درد مند بنیں تاکہ وہ بڑے ہو کر مہربان، نرم دل اور درد مند باپ اور بھائ ثابت ہوں۔

ہم اپنی بیٹیوں کو یہ تعلیم دے سکتی ہیں کہ وہ اپنی قدر و قیمت اور اہمیت  پہچانیں۔ اسی طرح وہ دوسروں سے بھی یہی توقع کریں گی کہ وہ انکی قدر کریں گے اور اور انہیں اہمیت دیں گے۔

ہم اپنے بیٹوں کی تربیت کر سکتی ہیں کہ وہ گھر کے کام کاج میں حصہ لینے میں فخر محسوس کریں تاکہ ان کی بہنوں، بیویوں اور بیٹیوں پر بہت زیادہ کام کا بوجھ نہ پڑے۔

ہم اپنی بیٹیوں کی یہ تربیت کر سکتی ہیں کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کریں یا کوئ ہنر سیکھ لیں تاکہ وہ اپنا بوجھ خود اٹھا سکیں۔

ہم اپنے بیٹوں کو یہ تعلیم دے سکتی ہیں کہ وہ تمام عورتوں کا احترام کریں اور ذمہ دار ازدواجی رفیق ثابت ہوں۔

ایک بہتر دنیا کی تعمیر کے لئے ہم اپنے بچوں کی تربیت کر سکتی ہیں۔

4:29 PM

پاکستان, خواتین, دیہی, ڈاکٹر شیر شاہ, صحت, کراچی

میں کیوں بلاگ لکھتی ہوں

ہوا یوں کہ میں نے ایک سفر نامہ لکھا۔  لکھنے کے بعد میں جنگ اخبار کے میگزین سیکشن کے مدیر کو بھیجا کہ کیا وہ اسے اپنے اخبار کے میگزین میں چھاپ سکتے ہیں۔  انہوں نے جواب دیا کہ ہم اسے چھاپ دیں گے آپکے پاس جو تصویری مواد ہے وہ بھی بھیج دیں۔ میں نے انہیں وہ بھی بیج دیا۔ انہوں نے وہ چھاپنا شروع کر دیا۔ انکے میگزین کے ایک فل صفحے پہ وہ سفر نامہ نو اقساط میں شائع ہوا۔

لیکن یہ دیکھ کر مجھے شدید صدمہ ہوا کہ انہوں نے  چھ سات قسطوں تک تو ایک لفظ کی بھی ایڈیٹنگ نہیں کی لیکن جس صفحے سے مشرف کا نام آیا اس سے انہوں نے انتہائ بھونڈی ایڈیٹنگ کی اور مجھے مطلع تک نہ کیا۔ مجحے سمجھ نہیں آیا کہ اس لائن کو اڑانے کی کیا ضرورت تھی کہ وہاں مشرف کے نام کی افتتاحی تختی لگی ہوئ تھی۔ لیکن یہ شاید جنگ گروپ کی پالیسی کا حصہ تھا۔ اسی طرح انسانی اسمگلنگ میں شامل ایک شخص کا قصہ جس سے میری ملاقات ہوئ غائب کر دیا۔ چند اور دلچسپ باتیں کٹ گئیں۔

 مجھے یہ بات قطعاً پسند نہیں آئ، ان کے/کی ایڈیٹر کی ایڈیٹنگ کا معیار یہ تھا کہ یہ سفر ہم دو لوگوں نے ایک رینج روورگاڑی سے کیا تھا مگر آخری قسط میں انہوں نے ہم دونوں کو جہاز سے واپس بھجوا دیا اور گاڑی کا قصہ ہی گول ہو گیا کہ گاڑی کہاں گئ۔ جبکہ اس گاڑی کی وجہ سے ہمیں سفر میں بہت ایڈوینچر سے گذرنا پڑا اور اس پوری تحریر میں اس کا بڑا بیان تھا۔

حیرت ہے ایک شخص آپکو، چھپنے سے پہلے  پورا پلندہ ایک ساتھ دے دیتا ہے آپ اسے دو مہینے سے اوپر اپنے میگزین میں ایک بڑی جگہ دیتے ہیں اور آپ اسے یہ تک نہیں بتاتے کہ آپ اس میں کیا ترمیمات کرنا چاہتے ہیں۔ اس بد ترین ایڈیٹنگ سے پڑھنے والے قارئین کے ذہن میں اگر کسی خامی کا خیال آیا تو یقیناً وہ اس نے  مصنف کے کھاتے میں ڈالی ہوگی۔ حالانکہ یہ ان ایڈیٹر کی اہلیت کا اظہار تھا۔  اس وقت میں نے تہییہ کیا کہ آئیندہ اپنی تحاریر یوں ضائع نہیں کرنی۔  کوئ بھی عقل سے خالی شخص کسی کی بھی تحاریر کی ایڈیٹنگ کرنے بیٹھ جائے اس لئے کہ اس ادارے نے اسے ملازمت دی ہوئ ہے یا اس ادارے کی یہ پالیسی ہے۔ میرے پاس اگر موقع ہے تو ایسے لوگوں پہ کیوں انحصار کروں۔

کچھ دنوں بعد مجھ سے کسی نے کہا کہ آپ بلاگنگ کیوں نہیں کرتیں۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اس طرف سوچا ہی نہ تھا۔ جناب یہ دیکھنے کے لئے کہ کیا اردو میں بلاگنگ ہوتی ہے سرچ ورڈذ ڈالے تو بلاگستان تک پہنچے۔ مگر یہاں پہنچ کر شدید مایوسی ہوئ۔  یوں لگا کہ اردو بلاگنگ دائیں بازو والوں کے قبضے میں ہے۔ اور لبرل تو دور یہاں تو موڈریٹ ویوز کا قحط ہے۔

سوچا یہاں تو بڑا زلزلہ پیدا کرنے کی گنجائیش ہے اور لکھنا شروع کر دیا۔

نوٹ؛

یہ تحریر پوسٹ کرنے کے بعد جب اردو سیارہ پہ گئ تو اندازہ ہوا کہ وہاں مشہوری کے لئے ایک نیا مقالہ موجود ہے۔  کیونکہ میں یہ کہانی کسی تبصرے میں انکے حوالے کر چکی ہوں۔ اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ بلاگستان میں کس شخصیت کے اوپر سب سے زیادہ مقالے حتی کہ تھیسس تک لکھا گیا ہے۔ اور بلاگ ٹریفک بڑھانے کے گُروں میں ایک گُر یہ بھی ہے کہ اس قسم کا مقالہ لکھ ڈالیں۔

:)

قارئین؛ چونکہ یہ  دونوں  مضامین باہمی مشاورت اور رونمائ حاصل ہوئے بغیر لکھے جا چکے ہیں اس لئے اب آپ ان دو تحاریر کا مزہ ایک ساتھ لیں۔

7:07 PM

اردو, بلاگستان, بلاگنگ, جنگ, سماجیات

ایک کتاب اور کچھ اقتباسات-۷

گذشتہ سے پیوستہ

اس برتری کے باوجود جو انگریز خواتین کو اپنی مشرقی بہنوں پر تعلیم اور شستہ کمالات کی وجہ سے حاصل ہے، میں مشرقی خواتین کے حسن کو ترجیح دینے پر مجبور ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ میرے انگریز قارئین میرے ذوق سلیم کو قومی عصبیت پر محمول کریں گے۔ ہم سب اپنے اپنے ملک ، آب و ہوا، رسم و رواج، مجلسی آداب اور اداروں کو جانبدارانہ نظر سے دیکھنے کا  میلان اور رجحان رکھتے ہیں۔اانگریز میری اس کمزوری کو، اگر یہ کوئ کمزوری ، تو اچھی نگاہ سے دیکھیں گے اور مجھے معاف فرما دیں گے۔ خالص چٹّا رنگ، نیلگوں آنکھیں، سنہرے بال جو انگلستان میں بہت پسند کئے جاتے ہیں، مشرق کے مذاق میں خوبی کے بجائے نقص سمجھے جاتے ہیں۔ مشرق میں رنگ کی صلاحیت سیاہ چمکدار آنکھیں اور کالے بال عورت کے محاسن میں داخل ہیں اور انہیں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ انگریز خواتین مصنوعی حسن کاری میں جو تعلیم  اور ذہنی نشو نما کا نتیجہ ہے، مشرقی خواتین سے اس قدر آگے بڑھی ہوئ ہیں کہ دونوں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تعلیم کا اثر ہے کہ انگلستان کی خواتین ستھری تمیز ، مجلسی آداب کی شستگی اور اہلیت کار سے مزین ہیں اور انہیں اوصاف کی وجہ سے انہوں نے معاشرے میں اپنی جگہ حاصل کر لی ہے اور خانگی اور سماجی حلقوں میں صنف نازک  کے فرائض ادا کرنے کی ذمے داری سنبھال لی ہے۔ لیکن جتنی تعریف میں دیگر معاملات میں انکی خوش ذوقی کی کرتا ہوں انکے شام کے لباس کی وضع قطع کی جو انہوں نے اختیار کر رکھی ہے نہیں کر سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ معاملہ عادت، قومی رواج اور تعلیم کا ہے مگر مشرق کا رہنے والا لباس کی اس ننگی وضع میں شرم و حیا کی کمی محسوس کرے گا۔

قارئین کی دلچسپی کے لئے یہاں میں ایک اس زمانے کی یورپی خاتون کی تصویر ڈال رہی ہوں۔ یہ تصویر اس کتاب کا حصہ نہیں ہے۔ یہ یاد رہے کہ یوروپ میں مختصر کپڑوں کے فیشن نے پچاس کی دہائ کے بعد جنم لیا۔

میں نے انگلستان میں دیکھا کہ یہاں ہر  بے انصافی کا مداوا ہے۔ ہر شخص کو اپنے حقوق طلب کرنے کا استحقاق ہے اس کے علاوہ کوئ بھی آدمی خواہ سماج میں اسکی حیثیت کچھ ہی کیوں نہ ہو بلا مقدمہ چلائے مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا نہ سزا پا سکتا ہے۔ جن حالات  کا ذکر میں اس سے قبل کر چکا ہوں ان سے اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے  کہ ہندوستان کے ایک بڑے حصےمیں ایسا نہیں ہے۔ یہاں ہندوستان میں بلا کسی سوال کے ایک ایسی عدالت کا قیام ضروری ہے جہاں ان لوگوں کو جو انگریزی قانونی عدالتوں کے حلقہ ء اثر میں نہیں آتے کسی جرم کے عائد کئیے جانے پر یا برطانوی افسران کے ہاتھوں اپنے حق کی پامالی پر غیر جانبدارانہ اور کھلی عدالتی کارروائ کا مطالبہ کرنے یا اپنے  نقصان کی تلافی کے لئے ثبوت دینے کا موقع مل سکے۔ ایسی عدالت کا نہ ہونا برطانوی ہند کے نظم و نسق پر ایک طرح کا دھبہ ہے۔ مجھے علم ہے کہ لوگوں میں گہری بے اطمینانی اور بے چینی کی وجہ یہی ہے۔

یہ بات مجھے عجیب سی معلوم ہوتی اور اس اصول کے خلاف بھی جس کے تحت برطانوی ہند کے نظم و نسق کے ہر محکمے اور ہر شاخ میں مساوی اور مناسب کارکردگی پیدا کرنے کے لئے مسلمہ قابلیت کے آدمی اور عدالتوں میں بہترین تربیت یافتہ قانون داں جج رکھنا تو ضروری سمجھا جائے مگر ایک بڑی تعداد کے مشکل اور اہم معاملات کے لئے قانونی کارروائیوں کا انصرام  گورنر جنرل کے ایجنٹ جیسے شخص کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جائے جو بیشتر فوجی ملازمت کا آدمی ہوتا ہے۔ اگرچہ اسے عام طور پر سیاسی امور کا تجربہ ضرور ہوتا ہے مگر وہ قانون کی تعلیم سے بے بہرہ اور نابلد ہوتا ہے۔

اگر میری تحریر نے میرے ہم وطنوں میں ، انگلستان اور عام طور پہ یوروپ کے سفر کا شوق پیدا کیا تو مجھے بڑی خوشی ہوگی ان ممالک کو دیکھے بغیر مغربی تہذیب کا ٹھیک ٹھیک تصور ممکن  نہیں۔ اس تہذیب نے یوروپ کی اقوام کے لئے کیا کیا اور کر رہی ہے اور ان قوموں کے ذریعہ سے مشرق اور مغرب میں کیا فائدے پہنچا رہی ہے اس کا علم  بھی بلا دیکھے نہیں ہو سکتا۔ غیر ممالک اور دوردراز مقامات کے سفر اور مختلف مذاہب کے رسم و رواج اور اخلاق و آداب کی حامل قوموں کے میل ملاپ اور ان میں گھل مل کر رہنے سے خیالات میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور تعصب جو نا واقفیت کا نتیجہ ہوتا ہے ، دور ہوتا ہے۔ میرے بیشتر ہم وطن اور ہم مذہب اس وہم میں ہیں کہ مذہبی اصول لازماً توڑنا پڑیں گے، یوروپ کے سفر پر معترض ہوتے ہیں جبکہ ترکی ، عرب اور مصر کے مسلمان یوروپ آتے ہیں۔ عیسائیوں کے شہروں میں رہتے اور یوروپ کے معاشرے میں گھلتے ملتے ہیں مگر انکے مذہب کو ٹھیس نہیں لگتی۔ پھر ہندوستان کے مسلمان کو اس قسم کے شکوک اور شبہات کیوں ہونے چائیں۔ یہ لوگ بھی ایسے ہی کٹّر مسلمان ہیں جیسے ہندوستانی مسلمان، مگر اس قسم کے وہم میں مبتلا نہیں۔ میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ یوروپ کے قیام میں انہیں کوئ دشواری پیش نہیں آئے گی۔ انہیں صرف شراب سے جسے پینے پر بغیر مرضی کے مجبور نہیں کیا جاتا اور سوءر کے گوشت سے بچنا ہوگا۔ ہندوستان کی طرح یوروپ میں بھی اسلامی احکام کے ساتھ زندگی گذار سکتے ہیں جتی کہ اسلامی طریقہ پہ ذبیحہ کا انتظام بھی ہو سکتا ہے۔

اسکے ساتھ ہی اقتباسات کے اس سلسلے کا اختتام ہوتا ہے۔

12:10 PM

، حافظ حامد احسن, ایک کتاب اور کچھ اقتباسات-ہندوستان, خواتین, مسلمان, یوروپ

ایک نظم

11:28 AM

اردو, پاکستان, شکیل جعفری, نظم

ایک کتاب اور کچھ اقتباسات-۶

گذشتہ سے پیوستہ

مارسیلز کی ظاہری حالت دیکھ کر بہت متائثر ہوا۔ یہ یوروپ کا پہلا شہرتھا جو میں نے دیکھا۔ اس جگہ مغربی تہذیب و تمدن کی پہلی جھلک دیکھنے میں آئ۔ سڑکوں سے گذرتے ہوئے نئے نئے اور طرح طرح کے نظارے سامنے آئے۔ جی بہت خوش ہوا۔ قدم قدم پر کوئ نہ کوئ نمایاں اور نئ دلچسپی کی چیز ملتی ہر عمارت شاندار تھی۔ ایک محل کے دروازے سے گذر ہوا۔ اس پر خوبصورت جھاڑیوں کی نظر افروز روشنی ہو رہی تھی، کوئ آرائیش ایسی نہ تھی جو باقی رہ گئ ہو۔ یوروپ کے طور طریق سے نا واقفیت  کی بناء پہ میں پہلے یہ سمجھا کہ یہ محل کم از کم مارسیلز کے گورنر کی رہائیش گاہ ہوگا ۔ اصل میں وہ ایک مسافر خانہ اور عوامی تفریح کا ہوٹل تھا۔ دوسری جگہ ایک بڑی عمارت کے سامنے آدمیوں کا ہجوم نظر آیا۔ خیال گذرا کہ کسی عوامی یا قومی اہم واقعے کی یاد منانے کے لئے لوگ جمع ہیں۔ تحقیق پر پتہ چلا کہ کہ دن بھر کے کام کے بعد لوگ تفریح کے لئے آئے ہیں۔

گھوم  گھوم کر شاندار سڑکیں، گلیاں، چوراہے اور تفریح گاہیں دیکھتا رہا۔ نہ جی گھبرایا نہ تکان محسوس ہوئ۔ یہاں پہلی بار مجھے تھیٹر دیکھنے کا موقع ملا۔ اگرچہ موسیقاروں اور اداکاروں کی زبان نہیں سمجھتا  تھا، پھر بھی پردوں کے مناظر اداکاروں کے لباس ، روشنی اور موسیقی نے حیرت میں ڈالدیا۔

پہلی بات جو محسوس ہوئ وہ یہ ہے کہ یہاں اور ہندوستان میں انگریز کے مزاج اور برتاءو میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہندوستان میں جن انگریزوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے وہ سرکاری ملازم ہیں۔ ہر طبقے کے آدمی بشمول شرفاء انکے برتاءو میں ایک حد تک رعونت ، درشتی اور استحقار کی آمیزش محسوس کرتے ہیں۔ یہ بات انگلستان میں کسی جگہ دیکھنے میں نہیں آئ۔ ہندوستان میں دیسی باشندوں کے ساتھ انگریز کا برتاءو ایسا نہیں ہے جیسا کہ ایک مہذب ترین ملک کے شہریوں کا ہونا چاہئیے۔ بلکہ اس برتاءو سے قریب تر ہے اور زیادہ لگّا کھاتا جو رومیوں کا مفتوح

کارتھج

والوں کے ساتھ تھا۔ اگر میں اپنے ہم وطنوں کے خیالات کی صحیح ترجمانی کر رہا ہوں تو بلا خوف و تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ برطانوی راج کی غیر  ہر دلعزیزی اور اس سے نفرت جو برطانیہ کے زیر نگیں ملکوں میں پیدا ہو گئ ہے وہ انگریزوں کے نظم و نسق کے محض ان طریقوں کا نتیجہ ہے جو انہوں نے گذشتہ چند برسوں سے حکومت کرنے کے لئے اختیار کر رکھے ہیں۔

آخری قسط اسکے بعد

:)

جاری ہے

10:56 PM

حافظ حامد احسن, کارتھج, ہندوستان، انگریز، مارسیلز, یوروپ

ایک کتاب اور کچھ اقتباسات-۵

گذشتہ سے پیوستہ؛

لندن  پہنچنے پر اول اول مجھے یقین نہیں آیا کہ ہم دنیا کے عظیم ترین دارالحکومت میں ہیں۔ مجھے باور کرا دیا گیا تھا کہ لندن ایک بڑا اور عالی شان شہر ہے مگر

'اے بسا  آرزو کہ خاک شدہ'

یہاں کالے کلوٹے مکانوں اور دود کش چمنیوں کے سوا کچھ  کچھ نہیں پایا۔

چیرنگ کراس اسٹیشن پر پہنچے۔ کسٹم کے افسروں نے اسباب کی جانچ کی۔ حقہ کے تمباکو پر قیمت کا سولہ گنا محصول لگایا۔ تمباکو تقریباً اکیس پونڈ تھا جس کی قیمت ہندوستان میں چار شلنگ کے قریب ہوتی  مگر قیمت کا سولہ گنا محصول دینا پڑا۔ چاندی کی جو چیزیں ہمارے پاس تھیں انکی قیمت کا ایک تہائ محصول لیا گیا۔

پہلی منزل میں چند گھنٹے ٹہرنے کے بعد تیسری منزل پر کمرے مل گئے۔ جہاں جھولے کے ذریعے پہنچائے گئے۔ ہمیں اس ایجاد کا پہلے سے کوئ تجربہ نہ تھا۔ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں، جو خود بخود چلنے لگی اور خدا جانے کہاں لئے جا رہی تھی بیٹھ کر اوپر جانے سے جو حیرت ہوئ اسکا اندازہ قارئین شاید کر سکیں۔ ہم میں سے ایک صاحب پر، یہ دیکھ کر کہ ایک متحرک کمرے میں بند ہیں جس میں نکلنے کی بظاہر کوئ امید نہیں اور بے بسی کی حالت  میں بند ہیں، خوف طاری ہو گیا۔

جھولے کے رکنے اور اس سے جلدی نجات  پانے پر دماغ کو کچھ سکون ہوا۔ اوپر پہنچ کر دیکھا کہ بالائ منزل کے آدمی نہ خود نیچے جاتے ہیں نہ نچلی منزل منزل کے آدمیوں کو اوپر بلاتے ہیں، مگر ایک نلکی کے ذریعہ آپس میں بات چیت کرتے ہیں۔ یہ دوسری چیز تھی جس نے ہمیں اچنبھے میں ڈال دیا۔ ان سب چیزوں سے واقف قارئین اس بات پر کہ میں نے ان کا ذکر خاص طور سے کیوں کیا، اتنا ہی تعجب کریں گے جتنا مجھے ان چیزوں کو پہلی مرتبہ دیکھ کر ہوا تھا لیکن انہیں یہ بات ملحوظ رہے کہ میں مشرق کے ایک ایسے باشندے کے تائثرات بیان کر رہا ہوں جو تمام عمر مغرب کے تمدن اور ایجادات سے نا آشنا رہا اور انہیں پہلی بار دیکھے۔

یوروپ میں صنف نازک کی خدمات سے جس طرح فائدہ اٹھایا جاتا ہے اس کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ مثلاً مجھے یہ دیکھ کر بہت تعجب ہو اکہ چیرنگ کراس ہوٹل میں دفتری اوردوسرے تمام کام مکمل طور پر مستورات کے ہاتھ میں ہیں۔ میرے ملک میں اگرچہ اعلی طبقے کی خواتین کو باستثنائے خاص لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا ہے مگر انہیں تعلیم اس اس غرض سے قطعی نہیں دلائ جاتی کہ وہ کسی دفتر میں کام کریں یا کسی اور حیثیت میں ملازمت کریں جہاں انہیں مردوں سے خلط ملط ہونے کا موقع پیش آئے یا عوام کے سامنے چہرہ کھولنا پڑے۔ انکو صرف مذہب یا عربی، فارسی ادب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اگرچہ یہ تعلیم عام زندگی کے لئے بہت کم مفید ہے تاہم مشرقی خواتین کی تنہائ کی گھریلو زندگی میں انکے  لئے مسرت اور سکون کا خاصہ سامان مہیا کر دیتی ہے۔ پردے کے متعلق انگریزی اور مشرقی خیالات ایکدوسرے سے بالکل مختلف اور متضاد ہیں۔ مسلمان خاوند اپنی بیوی کو کسی مجمع میں شرکت کی اجازت کبھی نہیں دے گا۔ مسلمان خاتون اگر کبھی اپنے خاوند یا قریبی رشتے دار کے علاوہ کسی غیر مرد کے سامنے  چہرہ کھول کر آجائے تو وہ رشتے دار مردوں ، عورتوں دونوں کی نظر میں ذلیل و خوار ہو جائے گی۔ کوئ بھی لالچ اسے غیر مرد کے سامنے آنے پر آمادہ نہیں کر سکتی، نہ ہی خاوند یہ گوارا کرے گا کہ اسکی بیوی اسکی زندگی میں روزی کمائے۔

جہالت اور بے علمی کے جس گھڑے میں ہندوستانی خواتین کی اکثریت گری ہوئ ہے اسے لکھے بغیر آگے نہیں بڑھنا چاہتا۔ رواج کے مطابق انکی بڑی تعداد تعلیم سے قطعی محروم ہے۔

نیچے طبقے کے لوگوں کی ذہانت اور عام معلومات پر بڑا تعجب ہوا۔ ہندوستان میں اسکے بالکل بر عکس ہے۔ یہاں کوچوان اور ٹیکسی چلانے والے اپنی نشست پر بیٹھے اخبار پڑھتے ملیں گے۔ عام واقعات اور معاملات پر اپنی رائے بھی بتائیں گے۔ یہ بات اور ہے کہ انکی رائے کسی قابل بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ آپ اس ملک کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے جہاں گھریلو خادمائیں جنگ فرانس پہ گفتگو کر سکتی ہوں اور جغرافئیے کی کافی معلومات رکھتی ہوں۔

شب باشی کے کمرے میں ایک جلد انجیل کی رکھی تھی۔ سونے کے کمروں کا بند و بست اور انتظام کرنے والی خاتون نے میرے ایک ساتھی کو انجیل پڑھتے دیکھا اور یہ جان کر کہ ہم مسلمان  ہیں انکی طبیعت کے مذہبی میلان پر بہت شکر گذاری کا اظہار کیا، حالانکہ یہ حضرت استعجابًا ورق گردانی کر رہے تھے۔

جاری ہے

11:03 PM

چیئرنگ کراس اسٹیشن، لندن، انڈیا، خواتین فرانس، ہندوستان،انک

ایک کتاب اور کچھ اقتباسات-۴

گذشتہ سے پیوستہ

قاہرہ کو دیکھ کر مایوسی ہوئ۔ میں نے اس کے متعلق سن رکھا تھا کہ دنیا کے بہترین شہروں میں سے ایک شہر ہے لیکن ہندوستان کے اچھے قسم کے  شہروں سے کسی طرح بہتر نہیں پایا۔ فرانسیسی بازار اس کا بہترین حصہ  ہے اور گھنا آباد ہے، شہر کا باقی حصہ پرانا، ٹوٹا پھوٹا اور گندہ تھا۔ نائب السلطنت کی شاہی عمارتیں مصریوں کے نزدیک بہترین عمارتوں میں ہوں تو ہوں مگر میری نظر میں ایسی نہیں ہیں۔ شاہان مغلیہ کی بنائ ہوئ دہلی، آگرہ، اور دیگر مقامات کی عمارتوں کے مقابلے میں بہت گھٹیا ہیں۔ انکی شان و شوکت انکے خوبصورت نقشے اور قابل تعریف تناسب اس زمانے کے بڑے بڑے ماہرین تعمیر کو بھی حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ نائیبین سلطنت کے مقبرے ، قلعہ کے اندر نائب السلطنت کا محل اور مسجد ، خود قلعہ اور شہر کا محل بہت شاندار عمارتیں ہیں۔ مسجد خاص طور سے خوبصورت ہے۔ اس کے نقش و نگار بہت عمدہ ہیں۔

سفر کرتے ہوئے اسکندریہ پہنچے۔ کرایہ پر خچر چلانے والے لڑکوں کی سینہ زوری سے بہت لطف اٹھایا۔ میرے دو دوست اول باہر نکلے اور دو لڑکوں کو اشارہ سے بلایا مگر انکے آس پاس اتنے جمع ہو گئے  کہ ان کے لئے کسی خچر پر بھی سوار ہونا مشکل ہو گیا۔ ہر لڑکا قریب کے خچر کو ہٹا کر اپنا خچر بڑھا لاتا۔ ممکن سے ممکن  جو افراتفری ہو سکتی تھی وہ تھی۔ لڑکے الٹی سیدھی انگریزی میں خچروں کی تعریف کرتے 'میرا خچر  انگریزی جانتا ہے۔' 'میرا خچر انگریز سر پٹ بھگاتا ہے'، 'خچر دلکی چال چلتا ہے' ، 'ہندوستانی جانتا ہے'۔

سلطان کی مملکت کے اس حصے کو دیکھ کر  سلطنت کی ترقی کے بارے میں ہمارے اعتماد میں اتنا ہی اضافہ ہوا جتنا عرب کو دیکھ کر کم ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سر زمین عرب کو مقدس سمجھنے اور اس کے تقدس کو لا دینی اثرات سے محفوظ رکھنے کے علاوہ اس ملک سے اچھی آمدنی کی بھی امید نہیں۔ غالباً اسی وجہ سے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی۔ شریف اور مقامی سردار اپنے اسلاف کے طور طریق پر حکومت کرنے کے لئے آزاد  چھوڑ دئیے گئے ہیں۔ مختلف خانوادے یا قبائل اب سے دس صدی قبل کے حقوق سے مستفید ہو رہے ہیں۔

جاری ہے

7:29 PM

انڈیا, تاریخ, حافظ حامد احسن, عرب, قاہرہ, مصر

ایک کتاب اور کچھ اقتباسات-۳

گذشتہ سے پیوستہ

جدہ میں؛

 جس طریقے سے مسافروں کے سامان کی جانچ پڑتال کی گئ وہ ذلت آمیز اور شرمناک تھا۔ سرکاری ملازم لوہے کی سلاخیں ہاتھوں میں لئیے گھومتے تھے اور ہر مقفل صندوق کو توڑ ڈالتے تھے۔ ہر بنڈل کی جانچ کرتے اور سامان پر من مانا محصول لگاتے۔ بعض صورتوں میں تو کُل کا کُل سامان نکال پھینکا۔ اگر ایک ہی قسم کی دس چیزیں تھی تو ان میں سے ایک خود لے لی اور باقی واپس کر دیں۔ اگر مختلف چیزیں ہوتیں تو ہر چیز پر ایک خاص رقم دینی پڑتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان  کے پاس محصول لگانے کا کوئ قاعدہ قانون نہ تھا بلکہ بلا تفریق لوٹ مار کا اندھا دھند نظام تھا۔ بھڑک دار ، خوشنما اور گہرے رنگ کی چیزوں پر بھاری محصول لگاتے۔ اپنی جہالت کی وجہ سے جو چیز ظاہر میں زیادہ خوش نما ہوتی اسے زیادہ قیمتی سمجھتے۔ صندوقوں اور پلندوں کی چیزوں کو الٹ پلٹ کے کے ادھر ادھر پھینک دیتے۔ یہ کام اتنی بری طرح کرتے کہ لوگوں کو غصہ آجاتا۔ سامان کو قرینے سے لگا کر دوبارہ باندھنے اور بند کرنے میں کافی وقت لگتا اور خاصی محنت کرنی پڑتی۔

شریف مکہ نے دس اچھی طرح مسلح شتر سوار ہمارے خرچ پر عنایت فرمائے۔ نائب الشریف کے بھی چار پانچ قوی الجثہ اور مضبوط غلام ساتھ تھے۔ نواب صاحب کے ملازموں میں سے بہت سوں کے پاس ہتھیار تھے۔ چونکہ ہمارے قافلہ کی شہرت عام ہو گئ تھی اس لئے اور بھی کچھ آدمی جو مدینہ جانا چایتے تھے شریک قافلہ ہو گئے۔ ان میں تین ایسی حیثیت کے آدمی تھے کہ ہر ایک کو دس سواروں کا حفاظتی دستہ شریف مکہ نے دیا تھا۔ اس طرح انہوں نے تیس خوب مسلح اور اچھے شتر سوار عنایت فرمائے۔ اب ہماری ایک مضبوط جماعت ہو گئ جو لٹیروں کا اچھی طرح مقابلہ کر سکتی تھی۔

شریف محسن نے یہ نائب الشریف کا نام ہے، جو ہماری  حفاظت کے ذمے دار تھے، مندرجہ بالا تدابیر کے علاوہ حفاظت کے ایک اور ذریعے سے، جو اتفاق سے راستہ میں مل گیا تھا فائدہ اٹھانا مناسب سمجھا۔

اس وقت مکہ میں ایک شخص تھا جس کا لقب 'شیخ الحرامی' تھا اور وہ ڈاکوءوں اور چوروں کا بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ شخص لٹیرے قبائل کے شریر ترین قبیلے سے تعلق رکھتا ہے اور اسکا اثر اتنا زیادہ ہے کہ قافلہ میں محض اسکی موجودگی ، حملے سے حفاظت کی ضامن ہوگی۔ یہ عمر رسیدہ آدمی تھا اور گھٹیا قسم کے کپڑے پہنے تھا۔ اسکی شرکت قافلے کی حفاظت کے ذریعوں میں ایک اہم اضافہ تھا

مجھے اس بات کابڑا احساس ہے کہ بدو لٹیروں کے قبائل ، عرب کے لئے مصیبت بنے ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان انکی وحشیانہ عادات کو دبانے اور انکو صحیح راہ پہ لانے کے لئے کوئ قدم نہیں اٹھائیں گے۔ کیونکہ انہیں قابل احترام خیال کیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک مختصر سی مسلح فوج بلا کسی دقت کے انکو ٹھیک کر سکتی ہے۔ یہ امر باعث افسوس ہے کہ ملک کے تجارتی اور زراعتی وسائل کو ان پر اور سلطان کے عقیدت مندانہ مذہبی جذبے پر قربان کیا جا رہا ہے۔ اگر ان قبائل کو زندگی کا صحیح راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا جائے تو ملک کے تجارتی اور زرعی مرکز بن جانے میں کوئ رکاوٹ نہ ہو جس سے عام طور پر ساری دنیا کو اور خاص طور سے اس ملک کی اچھی اور امن پسند رعایا کو بہت فائدے پہنچیں۔

جاری ہے

6:08 PM

انڈیا, ترکی, ٹونک, حافظ حامد احسن, لندن, مدینہ, مکہ

ایک کتاب اور کچھ اقتباسات-۲

گذشتہ سے پیوستہ

اگلے دن دوپہر کو نائب الشریف، دس بہت بد شکل، بد ہیئت آدمی جنکی صورت پر بدمعاشی ٹپکتی تھی میرے پاس لائے۔ یہ آدمی پرانے کمبل یا پرانے قالین کے ٹکروں کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے تھا۔ انکے پاس توڑے دار بندوقیں اور خنجر تھے۔ اس اس ہیئت میں خطرناک غنڈے معلوم ہوتے تھے۔ مجھے انکے لٹیرے ہونے میں ذرا شک نہ تھا۔ میں سمجھا کہ نائب الشریف نے انہیں واردات کرتے ہوئے پکڑا ہے اور ہمیں دکھانے کے لئے لائے ہیں۔ میں نے ان سے اپنے شبہے کی تصدیق چاہی، انہوں نے خدا کی قسم کھا کر کہا کہ میرا شبہ غلط ہے یہ لٹیرے نہیں اسکے بر عکس اونچی حیثیت کے آدمی ہیں۔

میں نے ان سے پھر پوچھا کہ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ ان میں کے سب لٹیرے اور خونی نہیں ہیں؟ تو انہوں نے خدا اور رسول کی قسم کھا کر کہا کہ میرا شبہ غلط ہے، یہ وہ حفاظتی دستہ ہے جسے محترم شریف مکہ نے بھیجا ہے۔ انکو حکم ہے کہ آپ کی ہر طرح کی خدمت انجام دیں۔ یہ ابھی مکہ سے آئے ہیں اور اونتوں کے چارے کے لئے دام مانگتے ہیں

مجھے اپنی غلطی پہ تعجب ہوا ، انکی ڈاکوءوں ایسی ہیئت پر۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے بہت سے ساتھی انہیں ڈاکو سمجھ کر گھبرا گئے۔

مکے سے مدینہ جاتے ہوئے؛

کبھی کبھی ریگستان کے نیم وحشی، ننگی پہاڑیوں پہ کھڑے یا گھومتے نظر آجاتے۔ مجھے تعجب ہوتا تھا کہ ایسے ملک میں جہاں پتھروں اور ریت کے ٹیلوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ لوگ اپنے نیم سیر اونٹوں اور بھیڑوں کے لئے چارہ کہاں سے حاصل کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ریگستان کے یہ سپوت ان سر سبز مقامات کو جانتے ہیں جہاں انکے جانوروں کے لئے تازہ پانی اور ہریالی مل سکتی ہے۔ کبھی یہ بد نصیب پڑاءو اٹھ جانے کے بعد آتے اور جو بچی کھچی چیزیں ہم پھینک دیتے انہیں بین لیتے، خواہ حلال کئے ہوئے جانوروں کے فضلات ہوتے یا ہڈیاں اور چھیچھڑے یا روٹی اور سبزی کے ٹکڑے۔ میں نے دیکھا کہ جو کچھ ملتا اسے اٹھا لیتے اور ایسے شوق سے کھاتے کہ معلوم ہوتا کہ مہینوں سے انکے منہ میں کوئ چیز نہیں گئ۔ حقیقت میں یہ ریگستان کے مہتر تھے اور وہی کام کرتے جو گدھ مردہ جانوروں کو کھا کر کرتے ہیں۔

گھٹنوں تک لنگوٹی کے سوا انکے جسم پہ کوئ کپڑا نہ ہوتا، عورتیں بھی یہی پہنتی تھیں البتہ اسکے علاوہ سینے کو سہارا دینے کے لئےایک دوسرا چیتھڑا سینہ پر بھی باندھ لیتیں۔ یہ دھجّی اسی کام کے لئے باندھی جاتی تھی۔ انکے لباس کا جُز نہ تھی۔ انکے سر کے بال گرد میں اٹے اور الجھے ہوئے ہونگے۔ ایسے بال بجائے آرائیش اور سنگھار کے انکے لئے وبال ہوتے ہونگے۔ انکو سر پر جمائے رکھنے کے لئے کیچڑ تھوپ لیتیں یا کپڑے کی دھجّی سے باندھ لیتیں۔ یہ دھجّی کہاں اور کس طرح حاصل کرتیں یہ نہیں بتایا جا سکتا۔

یہ نیم وحشی جو اس خوفناک ملک کے ریگستانی علاقے میں آباد ہیں،حبشی نسل کے معلوم ہوتے ہیں۔ جو کسی طرح عرب میں آ کر آباد ہو گئے ہیں۔ انکی زبان بدءووں سے مختلف ہے۔ بدو خالص عربی بولتے ہیں اور نسبتاً ان سے زیادہ شریف ، خوش رو اور صاف رنگ کے ہیں۔

جاری ہے

7:33 PM

انڈیا, ترکی, ٹونک, حافظ حامد احسن, لندن،مکہ

ایک کتاب اور کچھ اقتباسات

ایک سو اڑتیس سالہ پرانی کتاب کا ایک اردو ترجمہ ہاتھ لگا۔  ایک سو اٹھاَئیس صفحات پہ مبنی  بالشت بھر کی اس کتاب کا انگریزی نام ہے۔

Pilgrimage to the Caaba  and Charing Cross

اسکا نام اردو میں روداد سفر حج اور زیارت لندن رکھا گیا ہے۔ یہ کتاب انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوئ۔ کتاب کے مصنف حافظ احمد احسن صاحب ہیں اور اسکا اردو ترجمہ جناب مصطفی علی مارہروی نے کیا۔ کتاب کی اشاعت لندن کی ڈبلیو ایچ ایلن اینڈ کمپنی نے کی۔اردو ترجمہ، ورثہ والوں نے شائع کیا ہے۔

 مصنف ٹونک ریاست کے نواب کے معتمد و معاون تھے۔ قتل کے ایک مقد مے میں پھنسا کر نواب صاحب کو ریاست کی حکمرانی سے محروم کیا گیا۔ جلا وطن ہوئے۔ بعد ازاں انگریز حکومت سے اجازت حاصل کر کے حج کے سفر پہ روانہ ہوئے۔ نواب صاحب تو وطن لوٹ آئے لیکن مصنف حج کے بعد لندن  کے لئے روانہ ہوئے۔ تاکہ اپنے نواب صاحب پہ ہونےوالے ظلم کے خلاف توجہ انگریز حکومت کوتوجہ دلا سکیں۔ کتاب کاشروع کا حصہ اس سازش کے متعلق ہے جس کے ذریعے نواب صاحب کو ریاست سے محروم کیا گیا۔ مقدموں میں پھنسانا اور قانون سے اپنی مرضی کے فوائد حاصل کرنا، طاقت کے کھیل میں ایسی سازشیں ہمیشہ بروئے کاررہی ہیں۔

اٹھارہ سو ستّتر میں یہ سفراختیار کیا گیا۔ کتاب میں سے کچھ دلچسپ اقتباسات حاضر ہیں۔

سمندر کے عجائبات کا حال کانوں میں پڑا ہوا تھا۔ میرے دل و دماغ ان سے اتنے متائثر ہو چکے تھے کہ باوجود اپنی تکلیف کے جنکا نقشہ کھینچنے کی کوشش بے کار ہے۔ میں مسلسل اپنے چاروں طرف دیکھتا رہا کہ شاید سمندر کے دیوزاد اور عجیب و غریب شکل و صورت کی چیزیں نظر آجائیں۔ مجھے یقین دلایا گیا تھا کہ سمندر ایسی چیزوں سے آباد ہیں۔ مگر مجھے پردار مچھلیوں کے علاوہ کوئ عجیب چیز نظر نہیں آئ۔ یہ مچھلیاں اسی عرض البلد میں پائ جاتی ہیں اور ٹکریاں بنا کر سمندر میں ایک جگہ سے دوسری جگہ اڑتی دکھائ دیتی ہیں۔ انکی پرواز عام طور پہ سے بیس فٹ کے قریب ہوتی ہے۔ میں نے  ایک ایسی زندہ چیز بھی دیکھی جو سمندر میںپورے کھلے ہوئے گلاب کے پھول کی مانند ہوتی ہے۔ مگر جب نکالی گئ تو سفید رنگ کی نیم شفاف گودے دار چیز تھی۔

فوج ایک ترک افسر کے زیر کمان ہے جو مکہ کا پاشا کہلاتا ہے۔ انتظامی اور عدالتی امور شریف مکہ کے ہاتھ میں ہیں۔ شریف، سلطان ترکی کے مقرر کردہ مکہ کے والی اور حاکم ہیں۔ ان کا نام عبداللہ ہے۔ انتہائ مہذب، شائیستہ اور وجیہہ آدمی ہیں۔ عرب کے تمام بدو انکا احترام کرتے ہیں۔ اور انکے حکم کے سامنے سر جھکاتے ہیں اپنا سردار اور مذہبی پیشوا سمجھتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کو عرب کا والی کہا جا سکتا ہے۔

مکہ کو پانی ایک نہر سے ملتا ہے۔ یہ نہر بغداد کے مشہور خلیفہ ہارون رشید کی بیوی زبیدہ نے بنوائ تھی۔ انہی کے نام موسوم ہے۔ یہاں کے آدمی ریشمی اور اونی بھڑکدار کپڑے پہننے کے شوقین ہیں۔ کپڑا فرانس اور انگلستان  سے آتا ہے۔ مگر یہاں کے نا واقف لوگ قسطنطنیہ کا سمجھتے ہیں۔ کپڑے پر ملک اور کارخانہ کے نام کے باوجود انہیں یقین نہیں آتا کہ دوسرے ملکوں کا بنا ہوا ہے۔

اور قارئین اسکے ساتھ ہی لائیٹ چلی گئ۔ باقی اقتباسات بعد میں۔

جاری ہے۔

6:14 PM

انڈیا, ترکی, ٹونک, حافظ حامد احسن, لندن, مکہ

جمہور یا جانور

دوپہر کا وقت تھا۔ میں بازار میں تھی۔ ایک پتھارے والے کے پاس ایک من پسند لیس دیکھ کر رک گئ۔ بھاءو تاءو کرنے کے بعد جب میں نے اپنا پرس کھولا تو اس میں ہزار کا نوٹ تھا۔  لیس پچھتر روپے کی بن رہی تھی جبکہ اسکے پاس ہزار کا کھلا نہیں تھا۔ چھان پھٹکنے پہ ایک پچاس روپے کا نوٹ برآمد ہوا۔ میں نے وہ دوکاندار کو دیا کہ زر ضمانت کے طور پہ رکھے میں واپسی میں باقی پیسے دیکر لیس لے لونگی۔

واپسی میں دیکھا تو اسکا پتھارا ایک چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ پڑوس کے دوکاندار سے پوچھا کہنے لگا نماز پڑھنے گیا ہے ابھی دس منٹ میں آجائے گا۔ تب اچانک میں نے وہیں کھڑے کھڑے اپنے ارد گرد نظر ڈالی۔ تمام دوکاندار اپنے اپنے گاہکوں کے ساتھ مصروف تھے۔ جن کے پاس نہیں تھے وہ چیزیں قرینے سے رکھ رہے تھے۔ یہ دوکانیں کپروں کی بھی تھیں، زیورات کی بھی اور پھل اور سبزی والوں کی بھی۔ اس عوامی ہجوم میں ہر ثقافتی گرو سے تعلق رکھنے والے لوگ موجود تھے۔ مہاجر، پٹھآن، پنجابی، افغانی۔

اور پھر اسی تسلسل میں مجھے رات ٹی وی پہ آنے والا ایک پروگرام یاد آگیا۔ جس  کے میزبان حامد میر، اور مہمانوں میں ہارون رشید اور انصار عباسی شامل تھے۔ اور ہمارے دونوں مدبر صحافیوں کا کہنا تھا کہ پاکستان کے اٹھانوے فی صد افراد شرعی قوانین کا نفاذ چاہتے ہیں اور جو لوگ جمہور کی رائے کا احترام نہیں کرتے انہیں ایسے ہی انجام سے دوچار ہونا پڑے گا یعنی اگر وہ گورنر ہے تب بھی اسکا اپنے محافظ کے ہاتھوں مارا جانا قابل صدمہ نہیں۔

اس وقت میں نے اپنے اس بازار کے تمام لوگوں کو دیکھا جو بازار کے بیچوں بیچ واقع مسجد میں نماز ادا کرنے کے بجائے اپنے اپنے کاروبار میں مصروف تھے۔ نماز دین کا سب سے اہم رکن اسکی ادائیگی سے جان چرانے والے ملک میں شرعی قوانین کا نفاذ چاہتے ہیں۔ شاید لوگ صحیح کہتے ہیں اٹھانوے فی صد شماریات کے نتائج موقعے پہ ہی بنائے جاتے ہیں۔ جیسی ضروت ویسے نتائج۔

جمہور کون ہے؟ تھری پیس سوٹ میںملبوس نک سک سے ایک دم درست، زندگی کی تمام سہولتوں کو استعمال کرنے والے، ہر ممکنہ وسیلے کے نزدیک،  بغیر ریش اور باریش افراد جو میڈیا کی لائم لائٹ میں رہنے کے چسکے سے آشنا ہیں یا روزانہ کی بنیاد پہ کپڑا بیچنے والا، سبزی بیچنے والا ، کینو بیچنے والا۔

امریکہ میں ایک سروے کے مطابق ، کم از کم بیس فی صد امریکی افراد اس بات پہ یقین رکھتے ہیں کہ صدر باراک حسین اوبامہ مسلمان ہیں۔ جبکہ ہم پاکستانی جانتے ہیں کہ اوبامہ ہر اتوار کو چرچ اپنی ہفتے وارعیسائ عبادت کے لئے جاتے ہیں۔ اور در حقیقت وہ مسلمان نہیں بلکہ عیسائ ہیں البتہ انکے والد مسلمان تھے۔

میں نے ایک امریکی شہریت کے حامل پاکستانی سے پوچھآ، لیکن اتنے زیادہ امریکی اتنا غلط کیوں سوچتے ہیں جبکہ وہ پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ انکا کہنا تھا کہ  امریکیوں کی بڑی تعداد سنجیدہ چیزیں نہیں پڑھتی بلکہ ریئلیٹی ٹی وی جیسے پروگرامز کی اسیر ہے۔ ایک امریکی گھر میں ہر وقت ٹی وی چلتا ہے۔  جو لوگ اس سے کوئ خبر حاص کرنا چاہتے ہیں وہ بھی نہیں حاصل کر پاتے کیونکہ میڈیا کی ترجیح لوگوں کو درست  خبریں دینا نہیں، انہیں ٹُن رکھنا ہے۔ ہمم، اسی لئے تو امریکی حیران ہوتے ہیں کہ لوگ ان سے نفرت کیوں کرتے ہیں۔

پاکستانی میڈیا بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں۔ اور جب ہم میڈیا پہ نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ایک اور چیز کا داراک ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اردو میڈیا اور انگریزی میڈیا بالکل دو الگ قوموں کو ظاہر کرتے ہیں۔

یہ جنگ اخبار تھا جس میں، میں نے سب سے پہلے ایک کالم نگار کے کالم میں یہ بات پڑھی کہ اب جبکہ دنیا جان گئ ہے کہ پاکستان میں آنے والا زلزلہ اور سیلاب امریکہ کے ہارپ کی وجہ سے آئے ہیں۔ امریکہ کو پاکستان سے معافی مانگنی چاہئیے۔

میں انگریزی اخبار بھی پڑھتی ہوں۔ جب  جنگ جیسے موءقر اردو اخبار میں اس چیز کا باعث ہارپ کو قرار دیا جا رہا تھا۔ اس وقت انگریزی اخبار ڈان میں ملک کے مایہ ناز دو سائینس کے عالموں ڈاکٹر عطاء الرحمن اور ڈاکٹر ہود بھائ کے درمیان اس بات پہ زوردار بحث چل رہی تھی کہ ہارپ ایک ہوّے کے سوا کچھ نہیں۔

حیرت تو ہوتی ہے کہ ان دو عالموں نے کسی اردو اخبار کو اس پہ بحث کرنے کے لئے اپنا میدان نہیں چنا۔

یہی نہیں، اگر ہم اتوار کے دن کا جنگ  اور ڈان میگزین اٹھائیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اردو اخبارات کس قدر کم معیار کے مضامین لکھتے ہیں اور انکی ہمیشہ ایک خاص سمت ہوتی ہے۔

یہی اردو اخبار، اس شدت پسندی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں جو پاکستان کو دیمک کی طرح کھا رہا ہے۔ آخر یہ صحافی کیا کریں ۔ ان کی کیا پیشہ ورانہ تربیت ہے یہ کتنی ریسرچ کرتے ہیں ان میں سے کتنوں نے اپنے آپکو بیرونی دنیا کے علم سے جوڑا ہوا ہے۔ کتنے ایسے ہیں جو بیرونی مواد کو ترجمہ کر کے اردو میں لانے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

یہ کرایسس انگریزی صحافیوں کے ساتھ بھی ہے لیکن انہیں انگریزی مواد کو کٹ اینڈ پیسٹ کرنے کی آسانی حاصل ہے۔

ادھر انگریزی اخبار کا فوکس ہمارے ایلیٹس یعنی طبقہ ء اشرافیہ ہے۔ اگر ڈان میں ان دو سائینسدانوں کے درمیان بحث ہوئ تو اس سے ہمارا اردو داں طبقہ انجان ہے۔ انگریزی زبان جاننے کا ایک فائدہ ہے اور وہ یہ کہ دنیا میں اس وقت جتنا علم کا دھماکا آیا ہوا ہے وہ سب انگریزی میں دستیاب ہے۔ وہ چاہے ادب ہو یا سیاست یا سائینس۔

اردو داں طبقے کی اکثریت تو بم دھماکے کی ہی اصطلاح سے واقف ہے اور ان  تک وہی پہنچ پاتا ہے جو اردو میڈیا انہیں فراہم کر سکتا ہے۔ اردو میڈیا کو عوامی تبدیلی یا ترقی سے دلچسپی نہیں۔ انہیں سینسیشن چاہئیے۔ چاہے وہ مذہب کے نام پہ ملے۔

کتنے ٹی وی اینکر ایسے ہیں جو جدید معلومات یا ریسرچ سے فائدہ اٹھاتے ہوں۔ شاید کوئ نہیں۔ جب ادھر ادھر کی چیزیں ہی اٹھانی ہوں تو آسانی سے جو ملے گا وہی حاضر ہوگا۔ اور اردو میں آسانی سے مذہب سے متعلق کتابیں ہی دستیاب ہیں چاہے وہ درست نکتہ ء نظر سے لکھی گئ ہوں یا غیر درست۔

ایلییٹس یا طبقہ ء اشرافیہ نہیں چاہتے کہ عام آدمی ان جیسا معیارزندگی رکھے یا ان جیسی معلومات ہی رکھ لے۔ وہ اس بات پہ ہنس سکتے ہیں کہ پاکستانی کتنے بے وقوف ہیں کہ زلزلے کو ہارپ کا لایا ہوا سمجھتے ہیں لیکن وہ اس قوم کو اردو میں ہارپ کے متعلق بتانے کی جدو جہد میں نہیں پڑیں گے۔

قوم اردو سمجھتی ہے اسے اردو میں جو مواد اور ذہن مل رہا ہے وہ اسی کے مطابق سوچتی ہے۔ اردو میں زیادہ تر مذہبی لٹریچر دستیاب ہے۔ کوئ ایک معیاری سائینس کی کتاب نہیں۔ پاکستان میں گذشتہ دس سالوں میں اردو ادب میں کوئ معیاری ناول یا ادیب سامنے نہیں آیا۔ ہمارے آج کے نوجوان کو بھی اشفاق احمد کو ہی پڑھنا پڑ رہا ہے۔ فیس بک پہ دھڑا دھڑ اشفاق احمد کے اقتباسات دستیاب ہیں۔

آجکے عہد میں کون اردو ادب لکھے گا۔ شاید کوئ نہیں۔ کیونکہ معاشرہ جب اظہار کے خوف سے گذر رہا ہو اور لوگ ایک دوسرے کو زبان درازی سے رکنے کی تلقین کر رہے ہوں تو اس صورت میں کس میں جراءت ہوگی کہ حقیقت لکھے فکشن کی صورت میںُُ۔ انگریزی داں طبقے کی عوامیت اتنی کم ہے کہ وہ پاکستان سے متعلق پُر اثر ادب شاید ہی لکھ پائے۔ اشرافیہ، بس نوم چومسکی، ڈکنس اور دستوووسکی اور دیگر فلسفہ ء حیات کو پڑھ کر اپنے ڈرائینگ رومز کی ڈسکشنز کو مزےدار بناتے ہیں۔

تو جب ایک شخص دوسرے کو قتل کرتا ہے۔ اور ملک میں جس طبقے کو یعنی عدلیہ کو عدل اور انصاف پھیلانے کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے وہ اس قاتل پہ پھول نچھاور کرتے ہیں تو ہمیں کیوں حیرت ہوتی ہے۔

جب ملک میں طبقاتی تعلیمی نظام چلے گا تو نتیجہ وہی ہوگا جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔اردو میڈیا کہتا ہے کہ جب جمہور کی بات کے خلاف کام ہوگا تو کسی کا قتل ہونا کوئ ایسی بری بات نہیں۔ کیونکہ جمہور ہم ہیں اس لئے ہم جو کہہ رہے ہیں وہ صحیح ہے۔ انگریزی میڈیا اپنے ڈرائینگ روم میں دنگ بیٹھا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟

ادھر میں  پتھارے والے کے مسجد سے واپس آنے کے انتظار میں بازار میں ادھر اُدھر گھوم کر جن  کو دیکھ رہی ہوں، یہ کون ہیں جمہور یا جانور؟

6:26 PM

اسلام, انتہا پسندی, انصار عباسی, پاکستان, جنگ, حامد میر, ڈان, سلمان تاثیر, مذہب, ہارون رشید

جگسا پزل

کچھ لوگ دسمبر اور جنوری کی درمیانی رات کو سال بھر کا جوش نکال کر ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ اب سارا سال بھنگ ملے یا چرس، بجلی کی لوڈ شیڈنگ ہو یا پیٹرول کی قیمت اور بجلی کی قیمت میں کانٹے کا مقابلہ چل پڑے، انکے لئے سب برابر ہے۔ لیکن کچھ لوگ ہرروز کچھ نیا کے چکر میں  نئےسال کی قرار داد بناتے اور پھر سارا سال اس قرارداد کا تعاقب کرتے نظر آتے ہیں۔میں نے بھی کچھ قراردایں بنانے کی کوشش کی مگر آخر میں اللہ مالک ہے کہہ کر اپنی بیٹی کے ساتھ

جگسا پزل

بنانے بیٹھ گئ۔

جب اپنے غم سے یوں فراغت ہو گئ تو دوسروں کے خیال بھی دل میں آئے، اپنے ایک دوست سے پوچھا کہ ہمارے محبوب صدر نے کیا قرارداد بنائ اپنے لئے۔ کہنے لگے آپکو معلوم نہیں نجومیوں نے اس سال انکی دوسری شادی کی پیشن گوئ کی ہے۔ تو اب انکے پاس ایک نہیں کئ قراردادیں ہونگیں۔  اچھا خدا مسبّب الاسباب ہے  یعنی اس سال اس بہانے ہم خوشی کے شادیانے بجائیں گے۔

ادھررحمان ملک کے بارے میں تو شرطیہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ سورہ اخلاص سمیت چاروں قل ،سورہ فاتحہ، آیۃ الکرسی اور دعائے قنوت   کے حفظ کے کریش کورس پہ لگ جائیں گے۔ مبادا گیلانی صاحب اسی طرح سال کے اخیر میں دستیاب رہے تو کیبنٹ کے اجلاس میں ایکدوسرے کی پھبتی اڑانے کے لئے وہ نشانے پہ نہ آ سکیں۔

لیکن لگتا یوں ہے کہ 'قدرت' کو  گیلانی صاحب کے ہاتھوں انکی یہ توہین پسند نہیں آئ۔ اور صورت حال کچھ اس طرح سامنے آئ کہ گیلانی صاحب کو اخلاص چھوڑ کرجل تو جلال تو آئ بلا کو ٹال تو کی تسبیح گھمانا پڑ رہی ہے۔

سال کے شروع میں پٹرولیئم مصنوعات پہ یکدم نو فیصدی کا اضافہ ،عوام کو اشارہ ہے کہ باقی سال سورہ یس حفظ کر لیں موت کی سختی کم کرتی ہے۔

مذہبی جماعتیں پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ کا نعرہ گاتے ہوئے توہین رسالت کے قانون کے زیر زبر پیش کی حفاظت میں لگی رہیں گی یہ انکی بڑی امید اور سہارا ہے۔ اور اگلے کئ سالوں کے لئے 'اہم ملکی معاملات' پہ انکی گرفت مضبوط رکھے گا۔

نواز شریف جمہوریت کی  ریل کو ڈی ریل ہونے سے بچانے میں مصروف رہیں گے انہیں ڈی ساخت پسند نہیں بلکہ اپنے چہرے کی طرح گول' او ' ساخت چاہئیے تاکہ  جمہوریت کی ریل ایک دائرے میں گھومتی رہے ۔

طالبان خاتون کے کامیاب خود کش حملے کے بعد پاکستان میں مردوں کو بچانے میں کامیاب ہو جائیں گے وہ لوگ جو اپنی کم جہیز لانے والی بہوءووں سے نالاں ہیں اور چولہے وغیرہ پھٹنے کا انتظار کرتے ہیں یا وہ لوگ جو اپنی بیٹیوں کو ونی کرنے یا کاروکاری کرنے کے چکر میں رہتے ہیں یا جائداد کے بٹوارے میں پڑنے کے بجائے قرآن سے شادی کروا دیتے ہیں۔  اب طالبان کے مراکز کے آگے لائن بنا کر کھڑے ہونگے۔ لوگوں کے ہجوم میں خواتین کا پھٹنا، بالکل مناسب ہوگا۔ کیونکہ اسکے بعد اعضاء میں وہ تناسب نہیں رہتا جن سے ہارمونز کا کھیل شروع ہو سکے۔

ادھر ایم کیو ایم ، حکومت سے اپنے  نعرہ ء علیحدگی پہ  رقص بسمل  کرے گی ۔   حکومت سے علیحدہ ہونے کے بعد امید ہے کہ انہیں ریہرسل کا زیادہ وقت ملے گا۔ یہ بھی امکان ہے ک ایک پیس کے رد و بدل ، اور کچھ  معلوم و نا معلوم لوگوں کے مقامات بعد از حیات طے کرنے کے بعد حکومت دوبارہ انہیں اپنے اتحادیوں میں شامل کر لے۔

مولانا فضل الرحمن کے متعلق لوگوں نے اڑائ ہے کہ انکی صدر صاحب سے ڈیل ہو گئ ہے۔ وہ وزارت عظمی مانگ رہے تھے۔ بالآخر عظمی پہ معاملہ ٹہر گیا۔

وزارت میں سے عظمی کے نکل جانے کے بعد گیلانی صاحب کیا کریں گے؟  سن رہے ہیں کہ پچھلے ہفتے کا سارا کھڑاگ انہیں لائن حاضر کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔ یعنی ذوالفقار مرزا کے سندھ میں ایم کیو ایم مخالف بیانات کا سلسلہ زرداری صاحب کی وفاداری سے جا کر مل رہا ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ نجومیوں نے غلطی سے دوسری تبدیلی کو دوسری شادی سمجھ لیا ۔ واللہ اعلم۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ ایک زرداری سب پہ بھاری۔

جگسا پزل

بھی بناتے بناتے آتا ہے۔ اب آپکی باری ہے۔

1:10 PM

ایم کیو ایم، نواز شریف, پاکستان, رحمان ملک, زرداری, فضل الرحمن, گیلانی

زمانے کی ہوا

لیجئیے ایک اور سال ہاتھ ہلا کر ، دامن جھاڑ کر رخصت ہو گیا۔ میں نے جب جاتے سمے اسکی انگلیوں کو چھونا چاہا تو یونہی رخ موڑے موڑے کہنے لگا۔

تو ہے گر مجھ سے خفا  خود سے خفا ہوں میں بھی

مجھ کو پہچان، کہ تیری ہی ادا ہوں میں بھی

یہاں کس کو اتنی فرصت کہ ایسی پہیلیوں میں پڑے۔

ایک کہانی کار نے ڈرامہ لکھ کر پروڈیسر کے حوالے کیا۔ انہوں نے ایک نظر اس پہ ڈالی اور گویا ہوئے۔ بہت خوب، بہت زبردست، بس ڈرامے کے انجام میں اگر ہیروئین کی موت پنکھے سے لٹک کر خود کشی کرنے کے بجائے پستول کی گولی سے دیکھائ جائے تو بہتر ہوگا۔ جو حکم آپکا، کہانی کار نے عاجزی کا اظہار کیا، مگر اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ پرڈیوسر نے انہیں دیکھا اور شان بے نیازی سے کہا، گولی کی آواز سے لوگ جاگ جائیں گے اور پتہ چل جائے گا کہ ڈرامہ ختم ہو گیا ہے۔

   یوں فضا میں ڈزا ڈز گولیوں کی آواز آئ اور پرانا  سال جلدی سے یہ کہتا ہوا اڑن چھو ہوا۔

ثبت ہوں دست خموشی پہ حنا کی صورت

نا شنیدہ ہی سہی ، تیرا کہا ہوں میں بھی

اس پہ گولیوں کی بوچھار تڑا تڑ۔ نہ دست خموشی ہوگا نہ یہ بک بک۔ سال نو نے جنم لیا۔ تاریخ بدل گئ اور کیا ہوا؟ حالات کے آئینے میں وہی عکس ہیں اور ارد گرد وہی حالات۔ میں پلٹ کر آخری سانس لیتے دست خموشی سے دریافت کرتی ہوں، اس جمود سے زندگی گذارنے کا کیا فائدہ جسے گولیوں کی آواز سے توڑنا پڑے۔ لیکن سب کیلینڈر کے نئے سال کو خوش آمدید کہنے میں مصروف ہیں۔

میں جب جذبہ ء خیر سگالی کا مظاہرہ کرنے کو اس نئے سال سے ہاتھ ملانا چاہتی ہوں تو فرماتا ہے کہ

جانے کس راہ چلوں، کون سے رخ مڑ جاءوں

مجھ سے مت مل ، کہ زمانے کی ہوا ہوں میں بھی

یہ تو اس نے چیلینج کردیا۔ کیا کروں سال کہن کا نوحہ بنوں یا زمانے کی ہوا؟

3:44 PM

پاکستان, سال نو, کراچی, مظہر امام

کراچی، کتابوں کا میلہ

کراچی میں ایکسپو سینٹر میں کتابوں کا میلہ جاری ہے۔ وقت  کو کھینچ تان کر اتنا کیا کہ اس میں سے آج وہاں جانے کا وقت نکال ہی لیا۔ ہم دو خواتین چاہتے تھے کہ بچوں کو ایسی جگہوں پہ ضرور جانا چاہئیے۔

ادھر میری بیٹی کو تو باغیوں کا سرغنہ بننے کا شوق ہے اُدھر باقی چار بچے کل ہی سات سمندر پار سے ایک لمبا سفر طے کر کے یہاں پہنچے۔ ابھی سفری تھکن اور جیٹ لیگ سے باہر بھی نہیں نکلے کہ ہم انہیں ساتھ لے گئے۔

یوں میں ایک اسٹال پہ، میری ساتھی خاتون دوسرے اسٹال پہ، میری بیٹی صاحبہ اپنی ہم عمر بچی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بڑوں کی سرپرستی سے آزاد رہ کر میلہ دیکھنے کی خواہش مند۔ باقی بچے نیم حالت نیند اور تھکن میں۔

اب یہ خاصہ چیلینجنگ کام بن گیا تھا کہ کتابیں بھی دیکھتے جائیں اور بچوں کی حدود بھی متعین کرتے جائیں۔

ایک وقت مشعل نے کہیں سے ایک کتاب لا کر ہاتھ میں تھما دی کہ وہ انہیں لینا ہے کیونکہ اس میں بہت بیوٹی فل اسٹیکرز ہیں اور ایک مر میڈ کی تصویر بھی موجود ہے۔ یہ کتاب ٹیچرز کے لئے تھی، یا بڑے بچوں کے لئے۔ پھر ایک بحث و مباحثے کے بعد ان سے لیکر واپس رکھنے لگے تو سوال پیدا ہوا کہ اسے کہاں رکھا جائے۔ چاروں طرف اسٹالز تھے اور اب انہیں یہ یاد نہیں تھا کہ کہاں سے اٹھائ ہے۔ خیر جناب، اس طرح کے حالات سے گذرنے کے بعد ہم نے سوچا کہ جلدی جلدی ایک نظر ڈال کر نکل چلیں۔

  اس دفعہ ایک بات جو میں نے محسوس کی کہ اردو کتابوں کا خاصہ بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ ان میں روائیتی اردو ناول یا فکشن کی کتابیں یا اسلامی کتابیں ہی نہیں تھیں بلکہ بچوں کے لئے اردو میں بڑی کتابیں موجود تھیں کہانیوں سے لے کر عام معلوماتی اور سائینسی کتابیں بھی۔ شاید پچھلے کچھ عرصے میں ان کتابوں کی اشاعت میں اضافہ ہوا ہے۔ یوں انگریزی کتابیں اتنی نہیں تھیں جتنی کہ پہلے نظر آتی تھیں۔ کتابوں پہ رعایت کچھ خاص نہیں اس سے زیادہ تو اردو بازار میں مل جاتی ہے۔

اس بھاگ دوڑ میں، میں نے بھی یونہی کچھ کتابیں لے لیں۔ ان میں ایک کتاب شاہ بلیغ الدین کی روشنی ہے۔ دوسری تہذیبی نرگسیت، حالانکہ میں اسے نیٹ پہ پڑھ چکی ہوں مگر مصنف کو کاپی رائیٹ کا حق دیتے ہوئے خریدی۔ اس سے یقیناً راشد کامران صاحب کو خوشی ہوگی۔

شہرزاد پبلشر پہ تمام ادبی کتابوں پہ  پچاس فی صد رعایت تھی۔ وہاں سے خالد جاوید کا ایک ناول  'تفریح کی ایک دوپہر' لیا نجانے کیوں مجھے اسکا عنوان دلچسپ لگا۔ ایک مجموعہ کشمیری کہانیوں کا لیا جو حمرہ خلیق نے بیان کی ہیں۔ لیکن وہاں مجھے ایک کتاب اور ملی، جو اپنے عنوان سے بہت دلچسپ لگی اسکا نام ہے نوجوان ناول نگار کے نام خط۔

مشعل کے لئے میں نے پچھلے مہینے کافی ساری کتابیں لیں بلکہ اس دفعہ انکی سالگرہ پہ انکے کلاس فیلوز کو تحفے میں ایک ایک کتاب دی۔ لیکن  فیروز سنز پہ بچوں کی کہانیوں کا  خزانہ موجود تھا۔  ہر کتاب تیس روپے کی اور ان پہ کچھ رعایت بھی۔  سو، کچھ کتابیں انکے لئے پھر لیں لیکن اس بار،  یہ سب اردو میں تھیں۔

گھر آکر سب سے پہلے کتاب 'نوجوان ناول نگار کے نام خط' نکال کر سرسری سی دیکھی۔

 یہ ایک کتاب کا ترجمہ ہے۔ جس میں ناول نگاری کے اجزائے ترکیبی بیان کئے گئے ہیں۔ ابتدائیے میں مترجم لکھتے ہیں کہ

یہ اجزائے ترکیبی یا رموز، علی الترتیب یہ ہیں، اسلوب، راوی اور بیانیہ مکان، زمان یا وقت، حقیقت کی سطحیں، انتقالات اور کیفی زقندیں، چینی ڈبے یا روسی گڑیاں، پوشیدہ حقیقت اور کم یونی کیٹنگ وے سلز۔

آخر میں وہ نوجوان کو نصیحت کرتا ہے کہ

میرے  عزیز دوست، میں جو کہنے کی کوشش کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ تم نے ہر وہ چیز جو میرے خطوں میں ناول کی وضع کے بارے میں پڑھی ہے اسے بھول جاءو، بس کمر باندھ کر بیٹھ جاءو اور لکھنا شروع کردو۔

7:54 PM

خالد جاوید, شہر زاد, فکشن, فیروز سنز, کتابوں کا میلہ, کراچی, ناول

سر سید، تبیین الکلام اور علی گڑھ

گذشتہ سے پیوستہ

سر سید اپنی نو عمری سے یہ دیکھ رہے تھے کہ عیسائ مشنری کے علماء ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں اور مسلمانوں سے مناظرہ اور مباحثہ کرتے پھرتے ہیں۔ مسلمان علماء بھی ان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اسکی وجہ سے ایک جانب تو لوگ ان مشنریز کے زیر اثر آنے سے بچ گئے تھے مگر دوسری جانب یہ فریقین کے درمیان تلخی کا باعث بنتا تھا۔ جبکہ سر سید اپنے فہم پہ سمجھتے تھے کہ ان دونوں فرقوں کے عقائد میں فرق زیادہ نہیں ہے۔ جتنےدونوں طرف کے مولویوں نے بنا رکھے ہیں۔

اس پہ انہیں خیال آیا کہ ایسی کتاب لکھنی چاہئیے جس سے پتہ چلے کہ بائبل اورقرآن دونوں آسمانی کتابیں بہت سے معاملات میں ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان علماء جو کہ تحریف کی وجہ سے بائبل کو سراسر غلط سمجھتے ہیں اور عیسائ علماء جو قرآن کو سرے سے آسمانی کتاب تسلیم کرنے کو تیار نہیں  ان میں اس گمراہی کی اصلاح ہونی چاہئیے۔

اسے لکھنے کے لئے سرسید نے تفصیلی طور پہ بائبل کا مطالعہ کیا، عبرانی زبان سے واقفیت پیدا کی۔ تاکہ اسے اصل زبان میں پڑھ کر معلوم کریں کہ عیسائیوں نے کہاں کہاں تحریف کی ہے۔

عیسائ تین خداءووں کے قائل ہیں جبکہ بائبل میں تثلیث کا تذکرہ نہیں ملتا۔ اسی طرح مسلمان نسخ آیت قرآنی کے قائل ہیں لیکن سر سید نےنے اپنی کتاب تبین الکلام اور خطبات احمدیہ میں ثابت کیا کہ قرآن حکیم کی کوئ آیت منسوخ نہیں ہوئ۔

بہر حال عیسائیت اور اسلام کے تعلق پہ انہوں نے کتاب تبیین الکلام لکھی۔ اس بارے میں مسلمانوں اورعیسائیوں دونوں میں شبہات اٹھے۔ سر آرنلڈ کے خط کے جواب میں سر سید لکھتے ہیں کہ

بایں ہمہ مجھ کو یقین ہے کہ میری زندگی میں عام مسلمانوں کی گالیوں اور نفرت سے مجھے نجات نہ ملے گی۔ عیسائ بھی میری تفسیر سے خوش نہیں ہو سکتے کہ جس طرح میں انجیل کی تعلیم کو صحیح اور درست سمجھتا ہوں اسی طرح تثلیث کے مسئلے کا قائل نہیں اس لئے کہ میں انجیل میں کہیں اسکی تائید یا وجود نہیں پاتا ہوں۔

مجھ کو یقین ہے کہ  مذہب اسلام صحیح ہے اور اسکی صحت اور وجود دونوں انجیل سے ثابت ہیں۔ اس لئے مجھے کچھ پرواہ نہیں کہ کسی گروہ کے لوگوں کو خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائ خوش کروں۔ میں حق پہ ہوں اور اس خدا کو خوش کرنا چاہتا ہوں جس کے روبرو سب کو ایک دن جانا ہے۔ البتہ یہ میری خواہش رہی ہے کہ مسلمان اور عیسائیوں میں محبت پیدا ہو کیونکہ قرآن مجید کے موافق اگر کوئ فرقہ ہمارا دوست ہو سکتا ہے تو وہ عیسائ ہیں۔

وقت کے دھارے سے گذرتے ہوئے سر سید احمد خان کو یہ احساس ہوا کہ جب تک ہندوستان میں علم کی روشنی نہیں پھیلتی انکے ترقی کرنے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ ادھر علوم جدیدہ، کے خزانے انگریزی میں دستیاب تھے۔ مسلمان انگریز سے نفرت کرتے تھے اور انگریزی سیکھنے کی طرف مائل نہ تھے۔ جبکہ ہندو بھی صرف اسی قدر انگریزی سیکھنے میں دلچسپی رکھتے تھے جو ملازمت کے حصول کو آسان بنادے۔

ان علوم کی طرف توجہ دلانے کی غرض سے سر سید نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک سائینٹیفک سوسائیٹی کا قیام عمل میں لایا جائے۔ جس کا اہم کام، اہم علمی و سائینسی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرا کے انکی اشاعت ہو۔

اس طرح سے ۱۸۶۳ میں غازی پور، جہاں سر سید بغرض ملازمت موجود تھے، میں یہ سوسائٹی وجود میں آئ۔ اس وقت کے وزیر ہند کو اسکا پیٹرن بنایا گیا، پنجاب اور یوپی کے گورنر اسکے وائس پیٹرن بنے۔ ملک بھر سے رئیس اور علم دوست لوگوں کو اسکا ممبر بنایا گیا۔

سر سید اگرچہ اس سوسائیٹی کے روح رواں تھے مگر انہوں نے خود کو اسکا سیکریٹری کہلوانا پسند کیا۔

اس سلسلے میں انہوں نے مختلف شہروں کا دورہ کیا تاکہ اسے متعارف کرایا جا سکے۔

 انہی بنیادوں پہ انہوں نے غازی پور میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا۔اسکی تعمیر کے لئے چندہ اکٹھا کیا گیا اور اسّی ہزارروپے کی لاگت سے ایک شاندار عمارت تعمیر کی گئ۔ اس مدرسے کا موجودہ نام وکٹوریہ ہائ اسکول ہے۔ ۱۸۶۴ میں سر سید کا تبادلہ غازی پور سے علی گڑھ ہو گیا۔

علی گڑھ جاتے ہوئے وہ سائینٹیفک سوسائیٹی کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ اور علیگڑھ میں علاقے کے رئیسوں سے چندہ اکٹھا کر کے  اسکے لئےایک عالی شان عمارت تعمیر کروائ۔

اس انسٹیٹیوٹ میں ہر ماہ علمی اجلاس اور مذاکرے ہوتے۔ مختلف موضوعات پہ لیکچر کا اہتمام کیا جاتا۔ سائینسی آلات کی مدد سے مختلف سائینسی علوم کی وضاحت اور تشریح کی جاتی۔ بہت سی کتابوں کے تراجم ہوئے۔ مفید اور علمی کتابوں کی ایک لائبریری قائم کی گئ۔

حالی لکھتے ہیں کہ رئیسہ ء بھوپال نواب سکندر بیگم نے سر سید کی خدمات کے اعتراف میں ایک قیمتی انگوٹھی بطور تحفہ بھجوائ جسے سرسید نے ایک ہزارروپے میں بیچ کر ساری رقم انسٹیٹیوٹ کے فنڈ میں جمع کروادی۔ سر سید نے تبیین الکلام کی طباعت کے لئےآٹھ ہزار روپے اس زمانے کے لحاظ سے  کثیر رقم خرچ کر کے اپنا پریس خریدا تھا۔ وہ بھی اس انسٹیٹیوٹ کے حوالے کیا اور یوں سوسائیٹی کی کتابیں، اخبار، رسالے اور اطلاع نامے اسی پریس سے چھپنے لگے۔

اس ادارے کے دارالمطالعہ میں لندن اور ہندوستان کے اطراف و جوانب کے اٹھارہ انگریزی اور چھبیس اردو اخبارات و رسائل آیا کرتے تھے جو اس وقت کے لحاظ سے ایک خاصی بڑی تعداد تھی۔ یوں اسکی روشنی ملک کے طول و عرض میں اہل بصیرت تک پہنچنے لگی۔

جاری ہے

12:11 PM

انڈیا, پاکستان, پنجاب, تاریخ, تبیین الکلام, سائینٹیفک سو سائیٹی, سر سید, علی گڑھ, غازی پور

جناح اور تحریک پاکستان، یادوں کا مزار

قائد اعظم جوانی میں

قائد اعظم اور مسلم لیگی رہ نما

قائد اعظم اپنے دوستوں کے ساتھ

قائد اعظم کی پہلی بیوی، ایمی بائ جو انکی والدہ کی پسند تھیں اور شادی کے کچھ عرصے بعد انتقال کر گئیں جبکہ وہ لندن میں اپنی وکالت کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

قائد اعظم کی دوسری بیوی رتی بائ، جن سے انہوں نے پسند کی شادی کی۔ ان سے انکی اکلوتی اولاد دینا جناح تھیں۔

قائد اعظم اپنی بہن فاطمہ جناح کے ساتھ

قائد اعظم اور فاطمہ جناح اپنے دوستوں کے ساتھ

قائد اعظم اپنی اکلوتی بیٹی دینا کے ساتھ

قائد اعظم اپنی بیٹی اور بہن کے ساتھ

 قائد اعظم اپنے خاندان کے لوگوں کے ساتھ

قائد اعظم حیدرآباد دکن کی خواتین کے ساتھ

1:08 PM

ایمی بائ, پاکستان, تحریک پاکستان, حیدر آباد دکن, رتی بائ, سیاست, قائداعظم, کراچی, گاندھی, محمد علی جناح

اختیار

میں گھر سے نکلی اور ابھی گاڑی تک پہنچ ہی رہی تھی کہ  پڑوسیوں کی بہو صاحبہ مل گئیں۔ سلام دعا کے بعد انہوں نے شکوہ کیا کہ اب تو ہم سے ملنا ہی نہیں ہو پاتا، پھراصرار کہ ذرادیر کو ان کے ساتھ بھی بیٹھ جائیں۔ میں نے سوچا  مشعل تو اپنے بابا کے ساتھ ہے۔ موقع اچھا ہے۔ چلیں کچھ وقت انکے ساتھ بھی گذار لیا جائے۔

باتوں باتوں میں میں نے پوچھا آپ کی شادی کو تو چار سال ہو رہے ہونگے۔ بچوں کا پلان نہیں ہے ابھی۔ کہنے لگیں نہیں ہماری طرف سے تو ایسا  کچھ نہیں ہے۔ ایک دفعہ آثار بنے مگر تیسرے مہینے ہی ختم ہو گیا۔ اب ڈاکٹر کہتے ہیں کہ میری ایک ٹیوب بند ہے اور ایک کھلی۔ ادھر میرے شوہر کے ساتھ جرثوموں کا بھی کچھ مسئلہ ہے۔ میں نے انہیں تسلی دی۔ ایک ٹیوب کھلی ہے تو بھی بڑی بات ہے۔ ایک ہی راستہ چاہئیے ہوتا ہے اور ایک ہی اسپرم۔

 پھر ان سے پوچھا کہ وہ اس سلسلے میں کیا کچھ کروا چکی ہیں تاکہ اندازہ تو ہو انکا اپنے بارے میں علم کتنا ہے۔

اس بارے میں بتاتے وہ دفعتًا کہنے لگیں کہ آپ تو ادھر ادھر آتی جاتی ہیں۔ کسی اچھی گائینا کولوجسٹ کا پتہ ہے تو مجھے بتائیں۔ میں نے انہیں ایک گائیاکولوجسٹ کا پتہ دیا کہ ان سے ضرور ملیں۔ اور پھر کہا کہ اور اگر ایسے بھی کچھ نہ ہو تو

ٹیسٹ ٹیوب بے بی

کر والیں۔ کراچی میں اب بآسانی ہوتا ہے۔ اور یہ جن گائیناکولوجسٹ کا پتہ میں نے آپکو دیا ہے یہ بھی کرتی ہیں اور دیگر جگہوں کے مقابلے میں انکے پاس خرچہ کم آتا ہے۔ ویسے تو زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن  یاد رکھیں ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے لئے بھی خواتین کی عمر خاصی اہمیت رکھتی ہے۔

جواب ملا آپکی سب باتیں اپنی جگہ صحیح مگر میرے شوہر ٹیسٹ ٹیوب بے بی کو غیر اسلامی کہتے ہیں۔ اچھا، میں نے ان سے کہا پاکستان میں جس طرح کیا جاتا ہے یہ سارا عمل اس میں اسے غیر اسلامی نہیںکہا جا سکتا۔ خیر، یہ انکا ذاتی فیصلہ ہے۔ ہر ایک کا اپنا فقہ۔ آپ کوئ بچہ کیوں نہیں گود لے لیتیں۔ ایک دفعہ پھر سرد آہ۔ وہ کہتے ہیں کہ سگے بہن بھائیوں کے علاوہ کسی کا بچہ گود نہیں لیا جا سکتا۔ وہ بڑا ہو کر نامحرم ہو جائے گا۔  انکے تو ایک ہی بھائ ہیں انکی بھی ایک ہی بچی ہوئ اسکے بعد کوئ اولاد نہیں۔ ادھر میرے بہن بھائیوں میں بھی کوئ اب بچے پیدا کرنے کے حالات میں نہیں۔ یہ تو نہیں ہو سکتا۔

میں نے ان پہ ترس کھایا۔ ہمدردی کے الفاظ بولے اور نکل آئ۔ انسان صرف ایک دفعہ زندگی جیسی نعمت پاتا ہے اور اس میں بھی وہ  سب لوگوں کی اطاعت میں وہ بھی نہیں کر پاتا۔ جس سے کوئ اخلاقی قدر ختم نہیں ہوتی۔ معاشرہ غیر مستحکم نہیں ہوتا۔ صرف اسکی زندگی میں خوشی سے جینے کا تحرک پیدا ہوتا ہے۔

والدین بننا، دنیا کی سب سے بڑی خوشی ہے۔  مرد یا عورت کواپنی زندگی میں شادی کو ترجیح دینا چاہئیے۔ اس لئے نہیں کہ آپکو ایک ساتھی ملے گا۔ بلکہ اس لئے بھی کہ یہی وہ پاک طریقہ خدا نے رکھا ہے جس کے ذریعے نسل انسانی آگے بڑھتی ہے۔

شادی شدہ جوڑوں میں سے تقریباً پندرہ فیصد افراد کسی بھی وجہ سے بے اولادی کا شکار ہوتے ہیں۔ شادی کے ایک سال بعد تک اگر آپکے یہاں اولاد کے آثار نہیں تو فوراً گائیناکولوجسٹ سے رابطہ کریں۔ بے اولادی کے ٹیسٹ مرد کے لئے بھی کرانا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ عورت کے لئے۔ مرد کا ٹیسٹ بہت سستا اور آسان ہوتا ہے۔ بے اولادی کی وجہ مردوں کے اندر بھی اسی نسبت سے ہوتی ہے جتنی کہ عورتوں میں۔

اگر کسی بھی وجہ سے خدا آپکو بچوں جیسی نعمت سے نہیں نوازتا تو دل چھوٹا نہ کریں۔ یہاں لا تعداد بچے ماں کی گرم گود اور باپ کی شفقت کے منتظر ہیں۔ اپنے دل میں نرمی پیدا کیجئیے اور انہیں گود لے لیں۔

بچے، زندگی میں سب سے بڑا تحرک ہیں۔ وہ آپکو، آپکی زندگی کی ان باریکیوں سے آشنا کراتے ہیں جن سے بحیثیت انسان بھی آپ اس وقت تک آشنا نہیں ہو پاتے جب تک انکی معصوم مسکراہٹ اور بے لاگ تجزیہ کی قوت آپکو نہیں ملتی۔ انکے ساتھ رہنا ایک بالکل مختلف دنیا ہے۔  وہ  دنیا میں  امید کا نشان اور خدا کا سب سے انمول تحفہ ہیں۔ وہ بچے بھی جو آپ نے پیدا نہیں کئیے لیکن خدا نے انکی محبت سے آپکے دلوں کو معمور کیا۔ پیدا کرنا آپکے اختیار میں نہیں مگر سنوارنا،سنبھالنا اور محبت کرنا یہ آپکے اختیار میں ہے۔

11:08 AM

ایڈاپشن, بچے, پاکستان, ٹیسٹ ٹیوب بےبی, کراچی

خدا کے قریب

رمضان کا مہینہ تھا اور تیرہ اگست کا دن کہ مجھے اپنی بیٹی کے اسکول سے نوٹس ملا۔ کل سکول میں چودہ اگست منایا جا رہا ہے اور یہ بات خوشی کا باعث ہوگی کہ آپ اپنے بچے کو قومی لباس میں بھیجیں۔ میری بچی کے پاس یوں تو شلوار قمیض ہیں مگر مجھے خیال آیا کہ اگر ہرے سفید رنگ میں بنا لیا جائے تو موقعے کی مناسبت سے اچھا ہے۔ گھر میں سفید شلوار اور دوپٹے کا کپڑا موجود ہے قمیض کا لینا پڑے گا۔ باقی سلائ مجھے خود آتی ہے  گھنٹے بھر میں سل جائے گا۔  کل وہ تیار ہو کر بڑی اچھی لگے گی۔ میں فوراً گھر کے قریب لگنے والے بچت بازار چلی گئ۔

بازار میں سب سے پہلی دوکان ملی جو افغانی پٹھان کی تھی۔ اسکے پاس مجھے ہرے سفید پرنٹ میں اپنے مطلب کا کپڑا مل گیا پوچھا کیا حساب ہے۔ کہنے لگا ایک سو تیس روپے گز۔ میں نے کہا، ساری مارکیٹ میں یہ کپڑا عام ہے اور سو روپے گز ملتا ہے۔ کہنے لگا کہ لیکن ہے بھی تو ہرے سفید رنگ میں۔ یہ افغانی پٹھان کتنے تیز کاروباری ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا اور  اس سے کہا کہ سو روپے گز نہیں دوگے تو نہیں لونگی۔ کسی اور جگہ سے لے لونگی۔ خیر، وہ راضی ہو گیا۔ کہنے لگا کتنا چاہئیے۔ میں نے جواب دیا۔ دو گز ، یہ کہہ کر میں اپنا پرس چھاننے لگی اور وہ خاموشی سے کپڑا ناپ کر کاٹنے لگا۔ اتنے میں ذرا فاصلے پہ بیٹھا اسکا اسسٹنٹ لڑکا جسکی عمر انیس بیس سال ہوگی، کلین شیوڈ، آکر میرے سامنے بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ باجی رمضان کا مہینہ ہے کیا ہمیں نیک اور اچھا نہِں بننا چاہئیے۔

میں نے یہ جملہ سن کر سر اٹھایا۔ میں نے صبح اٹھ کر سحری کی تھی۔ نماز پڑھی، تھوڑا سا سیپارہ پڑھا اپنے روز کے امور انجام دئیے۔ اس دوران کسی مرد کو ترغیب دینے کی کوشش کی نہ خیال آیا، نہ جھوٹ بولا ، نہ غیبت کی نہ چوری اور نہ غبن، نہ کسی پہ بہتان لگایا، نہ تہمت دھری، نہ کسی کی حق تلفی کی، نہ کسی کو نقصان پہنچایا، نہ اپنی نیکیوں کا ڈھنڈھورا پیٹا نہ کسی اور سے اسکی نیکیوں کا حساب پوچھا۔  صرف اس دن ہی نہیں بلکہ بقیہ تمام دنوں میں ، میں نے  ہمیشہ اپنے آپکو ان تمام اخلاقی برائیوں سے دور رکھنے کی کوشش کی۔

یہ مجھے بالکل نہیں جانتا، پھر یہ مجھ سے یہ سوال کیوں کر رہا ہے؟

میں نے اسکی آنکھوں میں دیکھا اور سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں سمجھ آگیا کہ وہ مجھے دوپٹہ سر سے اوڑھنے کے بارے میں نصیحت کرنے والے ہیں۔ میں نے اس سے ترنت کہا۔ رمضان کا مہینہ ہے کیا تمہیں نیک اور اچھا نہیں بننا چاہئیے۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ تم نیکی اور اچھی کے اس درجے پہ پہنچ گئے ہوں جہاں تم دوسروں سے یہ سوال کرو۔ وہ ایکدم خاموش میری طرف خالی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

حالات کی یہ صورت اسکے ذہن میں نہیں تھی۔ اتنی دیر میں اس پہلے دوکاندار نے صورت حال کو بھانپا اور جلدی سے کپڑے کی تھیلی میرے ہاتھ میں دی۔ یہ کہتے ہوئے کہ سب کو نیک اور اچھا بننا چاہئیے۔ سب کو ضرورت ہے۔

راہ چلتی کسی انجان خاتون سے یہ کہنے والے آپ کون ہوتے ہیں؟ آپ کون ہوتے ہیں کہ آپ کسی بھی خاتون کو کھڑے ہو کر اس بات پہ لیکچر دینے بیٹھیں کہ اسے اسلام کے مطابق کیسی زندگی گذارنی چاہئیے۔ جبکہ وہ اپنے کام سے  لگی ہوئ ہو۔ آپ اس سے واقف نہیں، اسکے شب وروز نہیں جانتے۔

کیا اس لئے کہ کسی بحر بیکراں کے عالم نے آپکے کانوں میں یہ طلسم پھونکا کہ اب آپ نیکی اور اچھائ کی اس معراج پہ پہنچ گئے ہیں جہاں اب آپکو حق ہے جسے چاہیں اسے دین کی اپنی سمجھ عطا کرتے جائیں۔ یا خدا نے آپکو الہام کیا ہے۔ خاص طور پہ اگر آپ ایک مرد ہیں تو اب آپکو یہ خدائ حق مل گیا ہے کہ ہر عورت کو خدا کے اس حکم سے آگاہ کریں جو اسکے متعلق ہے۔

کل ہی فیس بک پہ میری پوسٹ ایک سودے کا سواد میں جو کہ وکی لیکس کے بارے میں ہے۔ ایک صاحب تبصرہ کرتے ہیں کہ خدا کس قسم کی خواتین کے قریب ہوتا ہے؟

وہ جو گھر میں رہ کر اپنے بچوں کی تربیت میں لگی ہو۔

ایک دفعہ میں پھر حیران ہوئ کہ اسکی یہاں کیوں ضرورت۔ اس پوری پوسٹ کا اس ساری چیز سے کوئ تعلق نہیں۔  ان موصوف نے اسی پہ بس نہیں کی بلکہ ایک اور اسٹیٹس کے تھریڈ پہ اسے ڈالا۔ یعنی اتنا اہم تھا کہ اسے دو جگہ ڈالنا پڑا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ وہ موصوف میرے فیس بک دوستوں میں شامل نہیں ہیں۔  فوری طور پہ انہیں تائیدی رکن بھی مل گئے۔ کیونکہ یہ اسٹیٹس کس کا تھا ایک خاتون کا۔ اورجب انہیں گھر میں بٹھا کر  خالصتاً بچوں کی پرورش میں مصروف ماں  بنا لیں گے تو ہزار نفلوں کا بیٹھے بٹھائے محض چند ِکلکس پہ ثواب مل جائے گا۔

کیا کہوں، کہ ان موصوف نے اپنے ماں باپ کے پیسوں پہ عیاشی کر کے آرام کی زندگی گذاری ہوگی۔ ورنہ اگر تھر کی گرمی میں کمر سے بچہ باندھ کر روڈ کوٹتی عورتوں کو دیکھتے تو معلوم ہوتا کہ خدا کن عورتوں کے قریب ہوتا ہے۔ ریگستانوں میں میلوں دور سے اپنے گھر والوں کے لئے پینے کا پانی لاتی عورت کو دیکھتے تو معلوم ہوتا کہ خدا کن عورتوں کے قریب ہوتا ہے۔

اسی ریگستان میں جب مرد سینکڑوں فٹ گہرا کنواں کھودرہا ہوتا ہے تو عورت اس سے مٹی لے لے کر پھینک رہی ہوتی ہے اور یوں سارا دن اسکے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ کراچی کی مضافاتی بستیوں سے گھنٹوں کا فاصلہ طے کر کے گارمنٹ فیکٹریوں میں کام کر کے اپنے بچوں کو پالتی عورت کو دیکھتے تو معلوم ہوتا کہ خدا کن عورتوں کے قریب ہوتا ہے۔

اقبال نے کہا تھا کہ ہند کے شاعر و افسانہ نویس صورت گر، آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار، یہاں اقبال صاحب نے نجانے کیوں ہند کے  ان لوگوں کو تذکرہ نہیں کیا جن پہ جب اسلام کی پاسداری کا شوق چڑھتا ہے تو فورا اپنی منجنیقوں کا رخ عورتوں کی طرف موڑ لیتے ہیں۔ اور تان لا کر توڑیں گے لبرلزم پہ۔

لا علم، صرف چند الفاظ سیکھ لیتے یہ تک نہیں جانتے کہ انکی ارد گرد کی دنیا میں ہو کیا رہا ہے۔ کیا  تھر میں روڈ کوٹنے والی عورت یہ سب کچھ لبرلزم کی وجہ سے کرتی ہے۔ نیو کراچی سے تعلق رکھنے والی عورت کسی گارمنٹ فیکٹری میں دھاگے کاٹنے لبرلزم کی وجہ سے جاتی ہے، کیماڑی کی بندرگاہ پہ برف سے ٹھنڈے جھینگوں اور مچھلیوں کو صاف کر کے اپنی انگلیاں گلاتی عورت ہوئی سب کچھ لبرلزم کی وجہ سے کرتی ہے۔ یہ تو بہت محدود مثالیں ہیں اگر حقیقی زندگی کو برتیں تو ان گنت مثالیں اور رخ ہیں جنہیں جاننے والے جانتے ہیں۔

کیوں کی جاتی ہیں یہ لایعنی باتیں ہر وقت اس لئے کہ ایک طبقے کی عورت تو یہ تمام سختیاں سہتی رہے اور پھر بھی اس خوف کا شکار رہے کہ خدا اسکے قریب ہے یا نہیں اوردوسرے طبقے کی عورت کو اس ذریعے سے بالکل ختم کر دیا جائے کہ اگر اسکے علاوہ کچھ بھی کیا تو خدا تمہارے قریب نہیں ہوگا۔

یہ سب پیٹ بھرے  نئے مسلمانوں کے خیالات جدیدہ ہیں جو کسی کو کچھ سوچنے کے قابل نہیں رکھنے نہیں دینا چاہتے۔ وہ اور انکے بحر بیکراں کے عالم ہیں ناں سب کچھ سوچنے اور کہنے کے لئے۔

نوٹ؛ فی الوقت اس پوسٹ پہ تبصرے پبلش نہیں کئیے جائیں گے۔

12:01 AM

اسلام, پاکستان, تھر, خواتین, کراچی, مسلمان مرد

ایک سودے کا سواد

کارا فلم

فیسٹیول والوں کی طرف سے کراچی میں بین الاقوامی فلموں کا میلہ جاری تھا کہ ایک دن ہمیں ایک دوست کی دستاویزی فلم میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ حالات کچھ ایسے بنے کہ  کچھ مراعات کی وجہ سے ہمیں ایکدن کی فلمیں دیکھنے پہ رعایت بھی مل گئ۔ انکی دستاویزی فلم دیکھ کر فارغ ہوئے اور پھر کچھ اور فلمیں لگاتار دیکھ ڈالیں۔ اب ایک ایسا شخص جو دو ڈھائ گھنٹے کی فلم ٹکڑوں میں یا ٹہل ٹہل کر دیکھتا ہواسکے لئے سارا دن سینما اسکرین کے آگے گذار دینا ایک درد سر ہی بننا تھا۔ شام کو چار بجے جب ایک اور فلم دیکھنے کے لئے بیٹھے تھے تو میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ لائیٹس بند ہوتے ہی آنکھیں بند کر کے پڑ جاءونگی۔ یہ ایک دستاویزی فلم تھی اور نام بھی ایسا غیرروائیتی سا۔

باءولنگ فار کولمبائین

۔  کون دیکھے گا۔ خدا جانے اس  میلے کے منتظمین کن بنیادوں پہ  فلمیں منتخب کرتے ہیں۔  صبح سے اب تک میں وہ بنیاد تلاش کرنے میں ناکام ہو چکی تھی۔

فلم شروع ہوئ اور لائیٹس بند ہونے کے بعد بھی میری آنکھیں بند نہ ہو سکیں۔

 کیا مزے کی فلم ہے۔ میلے کی منتظمین کی تمام خامیاں پس پردہ چلی گئیں۔ اور یوں لگا کہ سارے دن کی قیمت وصول ہو گئ۔ دستاویزی فلم اور اس قدر دلچسپ، کیا ممکن ہے اگر یہ دیکھنا ہو تو یہ فلم ضرور دیکھیں۔  جہاں فلم میکر امریکہ میں مار دھاڑ کے بڑھتے ہوئے جحانات کی چھان پھٹک کرتا ہے وہاں وہ اسے اتنے پر مزاح انداز میں پیش کرتا ہے کہ پردے پہ سے نظر ہٹانا ممکن نہیں۔  یہ جگتیں نہیں، نہ پھبتیاں بلکہ اس ساری چیز کے لئے خاصی ریسرچ کی گئ ہے جو فلم کا مواد دیکھ کر ہی پتہ چلتی ہے۔ جہاں فلم میکر اپنے موضوع کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے وہاں وہ اس چیز کا پروپیگینڈہ کرتا بالکل نظر نہیں آتا کہ امریکی عظیم قوم ہیں۔ یہ فلم میکر مائیکل مور سے میرا پہلا تعارف تھا۔

 وہ ایک دستاویزی فلم میکر ہے اور انکے کریڈٹ پہ اسکے علاوہ بھی دیگر فلمیں جن میں وہ امریکن معاشرے کی سرجری کرتے نظر آتے ہیں۔

تو کیا میں مائیکل مور کا تعارف یا اس فلم کا ریویو لکھنے جا رہی ہوں۔ نہیں جناب ، ایسا کچھ نہیں ہے۔ بلکہ ہوا یوں کہ جب میں نے یہ خبر سنی کہ وکی لیکس کے بانی اسانژ نے خود کو  گرفتاری کے لئے پیش کر دیا ہے اس مقدمے کا سامنا کرنے کے لئے جسکے متعلق خیال یہی کیا جاتا ہے کہ انکی لیکس کو لگام دینے کے لئے گھڑا گیا ہے۔ تو ساتھ ہی یہ خبر بھی آگئ کہ اسانژ کی ضمانت ہو گئ ہے۔ اور اس  ضمانت  میں حصہ ڈالنے والے مائیکل مور بھی ہیں۔ بیس ہزار ڈالر ضمانت کی رقم میں ڈالتے ہوئے آخر مائیکل مور نے کیا سوچا؟

 مائیکل مور کہتا ہے کہ

I am publicly offering the assistance of my website, my servers, my domain names and anything else I can do to keep WikiLeaks alive and thriving as it continues its work to expose the crimes that were concocted in secret and carried out in our name and with our tax dollars.

یعنی میں اپنی ویب سائیٹ، اپنے سرور، اپنے ڈومین اور ہر وہ چیز جو وکی لیکس کو زندہ اور متحرک رکھے اسکی پیش کش کرتا ہوں جب تک کہ یہ، ان جرائم کو سامنے لانے کا کام کرتی رہے گی جو کہ ہمارے نام اور ہمارے ٹیکس کے ڈالرز سے خفیہ طور پہ کئے جاتے رہے۔

وکی لیکس کیا چاہتے ہیں؟

WikiLeaks states that its "primary interest is in exposing oppressive regimes in Asia, the former Soviet bloc, Sub-Saharan Africa and the Middle East, but we also expect to be of assistance to people of all regions who wish to reveal unethical behaviour in their governments and corporations."

 وکی لیکس کا کہنا ہے کہ انکی بنیادی دلچسپی   ایشیا، سابق سوویئت بلاک، صحرائ افریقہ اور مشرق وسطی کی جارحانہ حکومتوں کا پول کھولنے میں ہے۔ لیکن ہم تمام خطوں کے لوگوں کی مدد کرنے کی توقع کرتے ہیں جو کہ اپنی حکومتوں اور کارپوریشنز کے غیر اخلاقی رویوں کو سامنے لانا چاہتے ہیں۔

یہ سائیٹ وکی پیڈیا کی طرح ہے جس پہ کوئ بھی جا کر راز افشاء کر سکتا ہے اور افشا شدہ رازوں کا تجزیہ کر سکتا ہے۔ چاہے تو ایڈٹ بھی کر سکتا ہے۔ لیکن انکا وکی پیڈیا سے کوئ تعلق نہیں۔

 اسکے بانی

جولین اسانژ

کے بارے میں امریکی اراکین پارلیمنٹ اور سینیٹ اور امریکی معاشرے کے دیگر معززین کے بیانات اگر ہم پڑھیں تو حیران رہ جاتے ہیں۔ یہ بیان ویسے ہی ہیں جن سے بچنے کے لئے ہم اپنے بلاگ کے تبصروں میں کچھ اخلاقی نصیحتیں یا دھمکیاں لکھتے ہیں۔مثلاً اس کتیا کے بچے کو  غیر قانونی طور پہ شوٹ کر دینا چاہئیے۔ مزید یہ کہ وہ ایک ذہنی، نفسیاتی مریض ہے، دماغ چلا ہوا ہے اسکا، وہ ایک دہشت گرد ہے۔ اسکے ساتھ بالکل اسی طرح نبٹنا چاہئیے جیسا کہ القاعدہ اور طالبان کے ساتھ کیا گیا۔ وکی لیکس دہشت گردوں کی تنظیم ہے۔

مائیکل مور کے خیال میں وہ یقیناً دہشت گردہے جو ان  جھوٹے امریکیوں پہ دہشت لائے ہوئے ہے جنہوں نے امریکی قوم  کو تباہ کردیا اور دوسروں کو بھی۔ اب جنگ کے ان شیدائیوں کے لئے  اگلی جنگ کرنا اتنا آسان نہیں رہا۔ جھوٹ بولنا اب آسان نہیں رہا۔ مائیکل کے خیال میں وکی لیکس وجود میں آئ اس لئیے کہ امریکی مین اسٹریم جرنلزم نے اپنی ذمہ داریاں ادا نہیں کیں۔ حیرت ہے دنیا بھر کی صحافتی دنیا وہ کچھ نہیں کر سکی جو وکی لیکس نے کیا۔

وہ سمجھتے ہیں کہ اگر آج سے دس سال پہلے وکی لیکس کا وجود ہوتا تو صدر بش عراق پہ اس بہانے سے حملہ نہ کر پاتے کہ وہاں بڑی تباہی کے اسلحہ کا ذخیرہ ہے۔

مجھے تویوں لگتا ہے امریکی سفیر ہالبروک پہ بھی وکی لیکس کی دہشت تھی۔ وکی لیکس کے دباءو کی وجہ سے انکے دل کی بڑی شریان سے خون لیک کر گیا۔ اور وہ چٹ پٹ چلے گئے۔

ادھر روسی میڈیا میں خبر گرم ہے کہ

امن کا نوبل پرائز جولین اسانژ

کو دینے کی تجویز زیر غور ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر ایسا ہوا تو اس سال کسی صحیح شخص کو یہ انعام ملے گا۔

جولین اسانژ کو دنیا بھرکےپچاس با اثر لوگوں میں شامل کیا گیا ہے جبکہ اسے ان پچیس افراد میں بھی رکھا گیا ہے جو اپنی مستقبلیاتی ذہانت کی وجہ سے دنیا کو بدل کر رکھ سکتے ہیں۔

کیا دنیا کی تاریخ اور ترجیحات بدلنے کو ہیں؟ کیا جولین اسانژ اس بدلی ہوئ دنیا کا ایک نمائندہ ہے؟ کیا دنیا بھر کے انسانوں کو اب جنگ کی معیشت سے نجات مل جائے گی؟

اگر ان سب سوالوں کا جواب ہاں میں ہے تو مائیکل مور نے بیس ہزار ڈالر میں بڑا سستا سودا کیا۔ کیا خیال ہے؟

12:29 PM

آسٹریلیا, امریکہ, پاکستان, جولین اسانژ, عراق, کارا فلم فییٹیول, کراچی, مائیکل مور, ہالبروک, وکی لیکس

زندہ روشنی-۲

گذشتہ سے پیوستہ

بائیو لیئو می نیسنس سے جو روشنی پیدا ہوتی ہے وہ ٹھنڈی روشنی بھی کہلاتی ہے کہ یہ زیادہ توانائ نہیں رکھتی۔ بہت کم دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ یہ توانائ تھرمل اخراج سے ہو، جس سے کہ گرمی پیدا ہوتی ہے۔

گہرے پانیوں میں رہنے والی نوے فی صد مخلوقات یہ روشنی پیدا کرتی ہیں یا اسے استعمال کرتی ہیں۔ وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ گہرے سمندروں میں اتھاہ تاریکی ہوتی ہے۔ تو آخر اپنے ماحول اور آپس میں تعارف کیسے حاصل ہو۔ یوں یہ بزبان روشنی ہوتا ہے۔

سمندری مخلوقات زیادہ تر نیلی یا سبز روشنی پیدا کرتی ہیں کہ سمندر کا نمکین پانی انہیں آسانی سے منتقل کر دیتا ہے۔ لیکن کچھ جاندار، سرخ، پیلی اور انفرا ریڈ روشنی بھی پیدا کرتے ہیں۔

زمین پہ یہ عمل خاصے کم جانداروں میں ہوتا ہے۔ جگنو ،

گلوورمز

، کچھ حشرات،

لاروا

،

اینیلڈز

،

ایرایکنیڈز

اور کچھ بیکٹیریا اور

پھپھوند

بھی یہ روشنی پیدا کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ بعض مخلوقات اپنی اس خصوصیات کو صرف رات کے وقت ہی ظاہر کرتی ہیں اور ایک

دوری عمل

سے گذرتی ہیں۔ یعنی دن کے وقت کچھ اور رات کے وقت کچھ اور۔

گلو ورم

ایک اینیلڈ

اس عمل کا بنیادی مقصد تو توجہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔   پروین شاکر نے کہا کہ

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں

بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے

بچوں کی طرح دیگر جاندار بھی توجہ حاصل کرنے کا فن سیکھتے ہیں۔  کبھی اداءوں سے اور کبھی کچھ مختلف خصوصیات پیدا کر کے۔ روشنی  میں انسان کے لئے شاید سب سے زیادہ کشش ہے۔ حضرت موسی بھی جسے روشنی سمجھ کر بڑھے تھے وہ خدائے پاک کی تجلی تھی۔ مگر میرا یہ بیان غلط ہوگا اگر میں یہ نہ کہوں کہ دیگر جاندار بھی روشنی کے لئے رد عمل ظاہر کرتے ہیں۔ کچھ اس سے محظوظ ہوتے ہیں اور کچھ اس سے خوفزدہ۔ کچھ اسے گفتگو کی زبان کے طور پہ استعمال کرتے ہیں۔

 اس طرح بائیولومی نیسنس کے جو فائدے نظر آتے ہیں وہ یہ ہیں۔

اپنی برادری کے جاندار کو اپنی طرف راغب کرنا، اس طرح زوجگی کا مرحلہ آسان ہوتا ہے۔ اور بہت دور سے بھی ایک جاندار کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ اسکا جوڑی دار کہاں موجود ہے۔ تو یہ روشنی ملن کی روشنی ہوئ۔ یہ روشنی صرف ملن کی نہیں موت کی روشنی بھی ہو سکتی ہے اگر جاندار اپنے شکار کو رجھانے کے لئے اس روشنی کا اخراج کر رہا ہے تو وہ اپنے شکار کی نفسیات سمجھتا ہے۔ یوں ایسی روشنی کی طرف لپکنے والے جلد ہی زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں اور جیت چالاکی کی ہوتی ہے۔ سو چمکتا جو نظر آتا ہے سب سونا نہیں ہوتا۔

کچھ جاندار اپنے بچاءو کے لئے اس روشنی کو خارج کرتے ہیں کہ انکے شکاری جاندار اس روشنی سے خوفزدہ ہوجاتے ہیں۔ جیسے ہی شکاری جاندار قریب آتا ہے۔ شکار ہونے والا جاندار یہ روشنی خارج کرتا ہے اور وہ بھاگ جاتا ہے۔ یہ عمل کچھ اسکوئڈز میں پایا جاتا ہے۔

یہاں

ایک کیچوے کے بارے میں بھی یہی کہانی موجود ہے۔

کچھ جاندار خود تو یہ خاصیت نہیں رکھتے مگر انکے جسم پہ ایسے بیکٹیریا موجود ہوتے ہیں جو یہ روشنی پیدا کرتے ہیں۔ یہ جاندار اپنے بدن پہ موجود ان بیکٹیریا سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور دوسرے جانداروں کو دھوکے سے شکار کر لیتے ہیں۔اینگلر فش یہ تیکنیک  کیسے استعمال کرتی ہے۔  یہ ویڈیو حاضر ہے۔

کچھ جاندار

مثلاً بلیک ڈریگن فش اس

روشنی کو ٹارچ

کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اور اسکی مدد سے شکار تلاش کرتے ہیں۔

بیکٹیریا اس عمل کو

کورم سینسنگ

کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ کورم سینسنگ جیسا کہ اصطلاح سے ظاہر ہوتا ہے بیکٹیریا کی ایک مخصوص تعداد یا کم از کم مخصوص تعداد ہوتی ہے۔ جو انہیں اپنی بقاء کے فیصلے ، ، مجموعی طور پہ کرنے کے لئے چاہئیے ہوتی ہے۔ اس سے یوں لگتا ہے کہ بیکٹیریا میں بھی جمہوری طرز عمل کسی حد تک پایا جاتا ہے۔ مذاق بر طرف، جب بیکٹیریا ایک مخصوص تعداد پہ پہنچ جاتے ہیں تو وہ روشنی کے اخراج سے ظاہر کرتے ہیں کہ اب ہم متفقہ فیصلے کرنے کے لئے تیار ہیں۔

 بائیو لیئومی نی سینس پیدا کرنے والی مخلوقات،اس سلسلے میں بھی اپنی انفرادی خصوصیات رکھتی ہیں۔ سو وہ مختلف طول موج کی روشنیوں کا اخراج کرتے ہیں، جن کی مدت اخراج، اور وقفہ ء اخراج مختلف ہوتا ہے۔

کیا ہمیں اپنے رب کی ان نشانیوں پہ حیرت کا اظہار کر کے سجدہ ء شکر بجا لانا چاہئیے اور اسکی صناعی کو تسلیم کر کے بیٹھ جانا چاہئیے۔ خدا نے انسان کو اس خمیر سے نہیں بنایا۔

اہل تحقیق، قدرت کے ان مظاہر کو انسانوں کی فلاح اور بہبود میں کام لانا چاہتے ہیں۔ یہ یقیناً نشانیاں ہیں کہ انسان مزید کیا کچھ کر سکتا ہے۔ سو اس عمل کو جان لینے کے بعد انسان میں یہ خواہش پیدا ہوئ کہ ہم خدا کی طرف سے عطا کردہ ان نشانیوں یا علامتوں کو بطور انسان اپنے کن مقاصد میں استعمال کر سکتے ہیں۔

انسان کا خیال ہے کہ وہ

جینیٹک انجینیئرنگ

سے مختلف جانوروں یا پودوں یا زندگی کی دوسری حالتوں میں روشنی پیدا کرنے والے جینز ڈال سکتا ہے۔ اس طرح وہ انہیں مختلف مقاصد کے لئے کام میں لا سکتا ہے۔

مثلاً ایسے درخت پیدا کئے جا سکتے ہیں جو روشنی پیدا کرتے ہوں اور انہیں سڑکوں کے کنارے لگایا جا سکے۔ اور اس طرح اسٹریٹ لائٹس کی شکل میں ضائع ہونے والی توانائ بچائ جا سکے۔

ایسی فصلیں اور گھریلو پودے جنہیں جب پانی کی ضرورت ہو روشنی خارج کریں۔ اس طرح پانی کی بچت ہوگی۔

غذائ اجناس میں جراثیم کی آلودگی  یعنی بیکٹیریا آسانی سے معلوم کیئے جا سکیں گے۔

قیدیوں اور ذہنی مریضوں میں ایسے شناختی نشان پیدا کئے جا سکیں جو فرار ہونے کی صورت میں انکی نشاندہی کر سکیں۔

اور ہاں مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کرنے والی فلم میں

'اویٹار'

میں  کیا آپ نے بائیو لومی نیسنس کا استعمال دیکھا، اگر یاد نہیں آرہا تو

پھر سے دیکھیں

۔ اس میں موجود خلائ مخلوق کے جسم پہ منور نشانات شاید اس خیال سے متائثر ہوں۔ ریسرچ کہتی ہے کہ انسان بھی ایک حد میں روشنی کا اخراج کرتا ہے۔

پڑھئیے یہ تحریر

۔

 ۔

۔

۔

اقبال اپنی نظم جگنو کے آخر میں سوال رکھتے ہیں کہ

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو

ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشی ازل ہو

اس سوال کا جواب آپ پہ چھوڑتے ہوئے، مزید مطالعے کے لئے دیکھئیے یہ لنکس۔

یہ کتاب

  http://www.oregonlive.com/environment/index.ssf/2009/08/flamboyant\_deepsea\_worms\_disco.html

نیلی ٹائڈ

http://www.scientificamerican.com/slideshow.cfm?id=bioluminescent-avatar&photo\_id=A2922CB3-A0F2-C2E4-154E3CF177F773FB

http://www.scientificamerican.com/slideshow.cfm?id=bioluminescent-avatar&photo\_id=A2922CB9-D6FF-DE0E-E98AE3D4C9862ECF

http://www.quantum-immortal.net/physics/biolum.php

6:46 PM

اقبال, بائیو لومی نیسنس, جگنو, جینیٹک انیجینیئرنگ, زندہ روشنی

زندہ روشنی-۱

میری بچپن کی یادوں میں

اقبال کی ایک نظم جگنو

بھی ہے جسے میں خوب لہک لہک کر پڑھا کرتی تھی۔

جگنو کی روشنی ہے کاشانہ ء چمن میں یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

کیا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا، یا جان پڑ گئ ہے مہتاب کی کرن میں

یہ ایک

لمبی نظم

ہے۔ آگے کسی بند میں اقبال لکھتے ہیں کہ

پروانہ ایک پتنگا، جگنو بھی اک پتنگا

وہ روشنی کا طالب، یہ روشنی سراپا

  اس حقیقت کو اسی طرح قبول کرنے کے بجائے کہ قدرت نے

جگنو کو چمک

دی اور پروانے کو بے نوری، اللہ کے کام اللہ ہی جانے۔ کچھ کیمیا دانوں نے اس عمل کو جاننے جی کوشش کی کہ دونوں میں یہ فرق کیسے پیدا ہوتا ہے۔ آخر خدا نےایسا کیا راز اس میں رکھا کہ جگنو ہمیں رات کے وقت چمکتا نظر آتا ہے۔

جگنو

معلوم ہوا کہ بعض جانداروں کو قدرت نے ایک خاص عمل پیدا کرنے کی صلاحیت دی ہے۔ جسکے نتیجے میں انکاجسم منور ہو جاتا ہے۔ سائینس کی زبان میں یہ عمل

بائیو لومی نی سنس

کہلاتا ہے۔

بائیو کا مطلب زندہ اور لومن کا مطلب روشنی یعنی زندہ روشنی یا زندگی سے پیدا ہونے والی روشنی۔ یہ روشنی جانداروں میں ایک کیمیائ عمل کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ جگنو،

اینگلر فش

اور دیگر کچھ جانداروں میں  موجود مرکب

لوسی فیرن

اور خامرے

لوسی فیریز

سے یہ کیمیائ عمل وجود میں آتا ہے۔،

اب

یہ عمل

تصویر میں دیکھا جا سکتا ہے کہ لوسی فیرن نامی مرکب، اس خامرے لوسی فیریز کی موجودگی میں زیادہ توانائ کا حامل مرکب آکسی لوسی فیرن بناتا ہے جو کہ روشنی کی ایک مخصوص مقدار کو خارج کرنے کے بعد کم توانائ والے آکسی لوسی فیرن میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ بات ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ ہر زیادہ توانائ والا نظام کم توانائ والی حالت کو پسند کرتا کیونکہ یہ اسے مستحکم بناتا  ہے، یہ اس کائینات کا ایک سادہ سا اصول ہے۔

لیکن جگنو ہی صرف ایک ایسا جاندار نہیں جو یہ روشنی پیدا کر سکتا ہے بلکہ گہرے سمندروں  کی اتھاہ تاریکیوں میں رہنے والی سمندری مخلوقات کی ے تقریباً نوے فی صد تعداد بائیولومینیسنس پیدا کرتی ہے۔ کیونکہ یہی وہ طریقہ ہے جس سے وہ ایکدوسرے کو اپنی موجودگی سے آگاہ کر سکتے ہیں۔

تو کیا  بائیو لومینیسنس کچھ مخلوقات میں گفتگو کا ایک طریقہ ہے؟

یہ ایک جیلی فش سے خارج ہونے والی روشنی کا کرشمہ ہے۔

جاری ہے۔

6:40 PM

اقبال, بائیو لومی نیسنس, جگنو, جینیٹک انیجینیئرنگ, زندہ روشنی

بزرگ ہونا

پچھلے چند دن کچھ قریبی شادیوں کی مصروفیت میں گذرے۔ پھر کچھ دوستوں کی شادیاں بھی اس میں شامل ہو گئیں۔ اور یوں میں شادیوں کے ہاتھوں یرغمال ہو گئ۔ شادیوں کی اس بھاگ دوڑ سے ہٹ کر ایک نکاح کی تقریب دلچسپ رہی۔

کراچی میں اب یہ رواج ہو گیا ہے کہ نکاح کی تقریب ایک دو روز پہلے قریبی رشتے داروں کی موجودگی میں ہو جاتی ہے اور رخصتی بعد میں شادی ہال یا لان سے ہوتی ہے۔ فائدہ یہ کہ رخصتی کی تقریب میں کچھ دیر سویر ہو تو کوئ پریشانی نہیں ہوتی۔

یوں ایکدن ہم ایک نکاح کی تقریب میں بھی شامل تھے۔ نکاح کی یہ تقریب گھر پہ ہوئ اور تمام خواتین و حضرات ایک ہی جگہ موجود تھے۔

قاضی صاحب کے آنے کے بعد فارم بھرنے کا مرحلہ شروع ہوا۔ پہلے دولہا اور انکے گواہان کے نام پتے لکھے گئے پھر دولہن کی باری آئ۔ نام پوچھا گیا۔ جواب ملا رومیصہ احمد خان۔ قاضی صاحب نے کہا صرف دولہن کا نام بتائیں۔ جواب ملا کہ یہ صرف دولہن کا نام ہے۔ انہوں نے اسی سنجیدگی سے کہا یہ دولہن کا نام کیسے ہو سکتا ہے۔ میں صرف رومیصہ لکھ رہا ہوں۔ لیکن آپ صرف رومیصہ کیسے لکھ سکتے ہیں۔ دولہن کا پورا نام رومیصہ احمد خان ہے۔ دستاویزات میں یہی نام ہے۔ لیکن انہوں نے کہا کہ احمد خان تو والد صاحب کا نام ہوگا۔ جبکہ اس وقت صرف دولہن کا نام چاہئیے۔ پھر حاضرین محفل میں سے کسی نے مداخلت کی یہ والد صاحب کے نام کے ساتھ بھی ہے اور دولہن کے نام کے ساتھ بھی ہے۔ دولہن کا نام شناختی کارڈ میں یہی ہے۔ چلیں جناب، عوام کے بے حد اصرار پہ قاضی صاحب بہ مجبوری رومیصہ احمد خان لکھنے پہ تیار ہوئے۔

 اب  باقی گواہان اور وکیل کے نام اور پتے لکھے گئے اور مہر کی مقدار لکھ کر باقی فارم کے بارے میں قاضی صاحب نے کہا اسے چھوڑ دیں اس سارے پہ ایک کراس لگ جائے گا۔

یہ سن کر میرے کان کھڑے ہوئے۔ کیونکہ دولہن صاحبہ نے نکاح سے پہلے مجھ سے کہا تھا کہ میں نکاح کے وقت وہاں موجود رہوں اور نکاح کی جو شقیں ہیں انہیں بھرنے پہ اصرار کروں۔ میں نے دولہن سے کہا مگر میں  یہ کیسے کر سکتی ہوں۔ جانے دو یار، سب کا نکاح ایسے ہی ہوتا ہے۔

کہنے لگیں میں نہیں جانے دے سکتی۔ مجھے یاد ہے آپکے نکاح پہ کیا ہوا تھا۔

دراصل میرے نکاح پہ ، دودن پہلے میرے سسر صاحب نے نکاح فارم کی ایک کاپی کروائ اور کہا کہ وہ پینسل سے بھر کر یہ کاپی دیں گے اور اصل نکاح فارم اسی طرح بھرا جائے گا۔ جب وہ فارم واپس آیا تو ہم سب کو ایک خوشگوار حیرت ہوئ کہ انہوں نے فارم کی ایک ایک شق کو پر کیا تھا۔ اور شق نمبر اٹھارہ جسکے تحت طلاق کا حق بیوی کو تفویض کیا جاتا ہے اس میں ہاں لکھا تھا۔ اسکے بعد ایک اور شق جس میں پوچھا گیا تھا کہ کس صورت میں بیوی طلاق کی درخواست کر سکتی انہوں نے لکھا کہ اگر وہ اپنے شوہر کو نا پسند کرتی ہو۔

ہم میں سے  کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ فارم اس طرح بھرا جائے گا اور ایک عمومی طریقہ یہی ہے کہ تمام شقوں پہ ایک کراس ڈال دیا جاتا ہے۔ خیر یہ میرے سسر صاحب کے کھلے دل کے ہونے کی ایک نشانی تھا۔   میرے گھر سے کسی نے ان سے یہ مطالبہ نہیں کیا تھا۔ یہ انکا مجھے سب سے پہلا تحفہ تھا۔

لیکن دولہا والوں سے اس چیز کا مطالبہ کرنا ذرا مشکل لگتا ہے۔ عمومی حالت یہ ہے کہ انکا پلّہ بھاری ہوتا ہے۔ خیر جب نکاح فارم بھرا جا چکا تو دولہن کی والدہ نے دستخط ہونے سے پہلے کہا کہ وہ اسے دیکھنا چاہتی ہیں اور فارم قاضی صاحب سے لے کر میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں تھوڑی دیر پہلے ہونے والی گفتگو سے یہ اشارہ سمجھ گئ کہ مجھے کیا کہنا ہے۔ ایک نظر اس فارم پہ ڈالی اور کہا کہ میں یہ درخواست کرنا چاہتی ہوں کہ چاہے سارے فارم پہ آپ کراس ڈال دیں لیکن شق نمبر اٹھارہ میں ہاں لکھ دیں۔ ایک دم محفل میں سنّاٹا  ہو گیا اور پھر بھنبھناہٹ۔

یہ شق نمبر اٹھارہ کیا ہے؟ میں نے پڑھ کر سنایا۔ کیا بیوی کو طلاق کا حق تفویض کردیا گیا ہے؟ باراتیوں میں سے ایک صاحب نے کہا یہ تو غیر شرعی ہے۔ اسکی کوئ اہمیت نہیں۔ یہاں ہمارے خاندان کی جتنی خواتین بیٹھی ہیں۔ انہوں نے سبکے نام گنوائے ان سے پوچھیں کسی کے نکاح میں ایسا نہیں کیا گیا۔ سب ہنسی خوشی رہ رہی ہیں۔

اس پہ میں نے ان سے کہا کہ چونکہ یہ فارم اور اسکی شقیں حکومت پاکستان کی منظورہ شدہ ہیں اور کسی بھی قانونی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں اس لئے انکا بھرنا ضروری ہے۔ اس وقت ہم اسکے شرعی اور غیر شرعی پہلو میں نہیں پڑ رہے۔ حکومت پاکستان نے اگر یہ رکھا ہے تو اسکا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک دفعہ پھر سب خاموش۔

پھر دوسرے باریش صاحب جو دولہا کے بھائ تھے بولے۔ یہ حق تو خلع کے برابر ہوتا ہے اور اسے غیر شرعی کہنا درست نہیں۔ میں تو نہیں سمجھتا کہ اسے ہاں کہہ دینے سے کوئ فرق پڑتا ہے۔ پھر ہنس کر کہنے لگے کہ آج ہی اخبار میں اسکے بارے میں ایک مضمون پڑھا  کہ تمام شقوں کو بھرنا چاہئیے۔ مگر ان رشتے دار نے پھر مداخلت کی، باقی تو کسی کا بھی نہیں ہوا۔ آخر وہ بھی تو رہ رہے ہیں۔ میں نے ان سے کہا فکر نہ کریں۔ پھر اپنے شوہر صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ میرے نکاح کے فارم میں بھی یہ شق بھری گئ ، ہاں کے ساتھ۔ اتنا عرصہ ہو گیا ہماری شادی کو اور ہم خدا کا شکر ہے باہمی ہم آہنگی کے ساتھ رہ رہے ہیں۔

آخرطے ہوا کہ معاملہ دولہا پہ چھوڑ دیا جائے۔ دولہا نے کہا، مجھے تو کوئ اعتراض نہیں۔

 یوں ایجاب و قبول کا سلسلہ شروع ہوا۔ دعا ہے کہ دونوں اسی طرح ہم آہنگی اور سمجھ داری سے زندگی گذاریں۔

میں اپنے گھر واپس آتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ یہ میرے سسر صاحب کی وسعت قلبی اور سمجھداری تھی جس نے آج مجھے اتنا حوصلہ دیا کہ میں نے ایک اور لڑکی کو یہ حق لینے میں مدد کی۔

معاشرے کے بگاڑ اور سنوار میں بزرگوں کے روئیے،  فیصلے اور دور اندیشی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ آنے والی نسل کو مضبوطی سے کھڑے ہونے کے قابل بناسکتے ہیں اور وہی انہیں کمزور کر کے بھٹکنے کے لئے چھوڑسکتے ہیں۔ آج میرے سسر صاحب  کو اس دنیا کو چھوڑےتین مہینے ہو رہے ہیں۔  دعا ہے کہ خدا ہمیں کردار اور عمل کی مضبوطی دے  تاکہ ہم انکے انسانی قدروں کے مضبوط بنانے کے عمل کو جاری رکھیں۔

5:57 PM

اسلامی نکاح, پاکستان, خلع, طلاق, کراچی

یوریکا، میں نے پا لیا

سرکاری اسکول کی کارکردگی کے معائینے کو ایک انسپکٹرصاحب پہنچے اور ایک کلاس کا معائینہ کرتے ہوئے انہوں نے کلاس کے سب سے ذہین بچے سے پوچھا۔ 'ہمم، یہ بتاءو سومنات کا مندر کس نے توڑا؟'۔ گڈو میاں کا چہرہ فق ہو گیا۔ ایکدم روہانسے ہو گئےہکلاتے ہوئے کہنے لگے،' سر، قسم لے لیجئیے، میں نے  نہیں توڑا'۔

انسپکٹر حیران ہوا کلاس ٹیچر سے کہنے لگا یہ گڈو میاں کیا کہہ رہے ہیں۔ ٹیچر نے انکی شکل دیکھی اور فرمایا' گڈو ایک بہت ذہین اور تمیز دار بچہ ہے میں اسے ذاتی طور پہ جانتا ہوں۔ یہ کبھی کسی توپھوڑ یا شرارت میں شامل نہیں ہوتا'۔

انسپکٹر نے انہیں ترحم والی نظروں سے دیکھا اور ہیڈ ماسٹر کے پاس پہنچا۔ اور انہیں گڈو میاں اور انکے ٹیچر کے جوابات سے مطلع کیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے پوری سنجیدگی سے انکی بات سنی اور ایک خاموشی کے بعد بولے۔' میں خود بھی اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ گڈو ایسا بچہ نہیں ہے۔ میں اسے اور اسکے ٹیچر کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ گڈو نے آج تک ایسا توڑ پھوڑ کا کوئ کام نہیں کیا۔

اب تو انسپکٹر صاحب کو اور تاءو آیا۔ اپنے آفس پہنچے اور محکمہ ء تعلیم کے نام خط لکھ ڈالا۔ اور اس میں تمام واقعے کا تذکرہ لکھا۔جواب آیا۔ محترم ہمیں آپکا خط ملا۔ اس میں کچھ توڑ پھوڑ کا تذکرہ تھا۔ اس لئے ہم نے اسے محکمہ ء تعمیرات کو بھیج دیا۔ امید ہے وہ آپکو تسلی بخش جواب دیں گے۔

یہی گڈو جب  اسی تعلیمی نظام کے زیر سایہ پل کر بڑے ہوئے تو ملک میں ایک خاص نظریاتی ماحول تشکیل پا چکا تھا۔ اسکی رو سے ملک کے اندر مروجہ مذہبی  تاریخ اور چیدہ چیدہ واقعات کے علاوہ تمام باتیں قابل سزا ٹہریں۔ ان سزاءووں کی بھی مختلف سطحیں بنادی گئیں تھیں۔ ملک کے انتظامی معاملات ہوں یا خارجہ امور، باشندوں کا رہن سہن ہو یا میل ملاپ، تفریح ہو یا تحقیق، ادب ہو یا تخلیق کا کوئ بھی میدان، وہ اس اثر سے خالی نہ تھا۔ اور نظام ان گڈو میاءووں سے بھرا ہواتھا۔ یوں سب ہنسی خوشی رہ رہے تھے۔

مگر ایک دن ٹیکنالوجی اپنی ڈھٹائ کی وجہ سے ملک میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئ۔

گڈو میاں اور انکے ساتھیوں کے لئے یہ بڑا لمحہ ء فکریہ تھا۔ اس سے معاشرے کے تار پود بکھرنے کا اندیشہ تھا۔ سو وہ اپنی بساط بھر کوششیں کرنے میں مصروف ہو گئے۔ یعنی کسی طرح تار وپود بچ جائیں وہ جو اس نظام کے تحت بنائے گئے جس میں انکی پرورش ہوئ تھی۔

لیکن ٹیکنالوجی اتنی خبیث چیز تھی کہ وہ ایکدن اسکا سر کاٹ کر قلع قمع کرتے اور دوسرے دن پھر وہ سر پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتی۔ یہ ایک راز تھا۔ جو گڈو میاں اور ہمنواءووں کی سمجھ سے باہر تھا۔ اسکا حل انکے نزدیک بس اسکا سر کاٹنا ہی ٹہرا تھا۔ یوں ملک میں سر کاٹنے کے مختلف طریقوں پہ بحث  اور عملدر آمد شروع ہوا۔

ایک دفعہ، گڈو میاں اور ساتھیوں نے اس ساری صورت حال پہ تبادلہ ء خیال کے لئے میٹنگ بلائ۔ جس میں ظاہری سی بات ہے کہ صرف وہ لوگ شامل تھے جو سر کاٹنے کے عمل سے متفق تھے۔ اس میں کسی نے یہ خیال پیش کیا کہ چونکہ ٹیکنالوجی سرحد پار کسی علاقے سے آئ ہے اس لئے اسکا سر کاٹنے کے مناسب طریقے بھی انکے پاس ہونگے۔ یہ سوچنے کے بعد انہوں نے اپنے درمیان سے سب سے زیادہ سرگرم شخص کو ملک سے باہر بھیجا۔ تاکہ اس راز سے پردہ اٹھ سکے۔

وہ شخص ایکدن بعد ہی واپس آگیا۔ گڈو میاں خوش ہوئے انہیں اپنے ساتھی کی ذہانت پہ مکمل یقین تھا۔

لیکن ساتھی نے بتایا کہ وہ جیسے ہی سرحد سے باہر نکلا اسے ایک شخص ملا۔ اس نے جب اس سے بات کی تو اس شخص نے بتایا کہ وہ ٹیکنالوجی کے خالق ہیں۔ سو وہ وہیں رک کر اس سے معلومات حاصل کرنے لگا۔ اس نے بڑی عجیب بات کی اور کہا کہ  مسلسل فکر اور عقل کے استعمال سے عقل اس سطح تک پہنچ جاتی ہے جہاں یہ وجدان کا روپ دھار لیتی ہے۔ بس پھر اسکے بعد مسائل کے حل بھی سامنے آنے لگتے ہیں۔

پھراس شخص نے اپنے ایک دانشور کا قصہ سنایا کہ کس طرح وہ پانی کے ٹب میں بیٹھا نہا رہا تھا کہ ایک مسئلے کے بارے میں اس پہ ایکدم وجدان طاری ہوا۔ اور وہ فکر کی سر خوشی کے عالم میں یہ تک بھول گیا کہ وہ کپڑے نہیں پہنے ہوا اور اسی حالت میں گھر سے باہر نکل کر ناچنے  اور گانے لگا۔

یوریکا، یوریکا

، میں نے پا لیا، میں نے پا لیا۔

وہ کہہ رہا تھا کہ جب تک انسان فکر میں اتنا نہ ڈوب جائے کہ اپنی ذات کو بھول جائے کسی کام کی چیز کا حاصل ہونا مشکل ہے۔ فکر کی اس گہرائ سے جب کوئ پردہ ہٹتا ہے تو انسان مست ہو کر ناچ اٹھتا ہے۔ اس کیفیت کو اب ہم یوریکا کہتے ہیں۔

گڈو میاں اور ہمنواءووں کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ روہانسے ہو کر بولے تو کیا اب ہمیں ننگا ہو کر گلی میں ناچنا پڑے گا۔

اسکے بعد کیا ہوا؟

کہانی ابھی جاری ہے۔ کیا گڈو میاں اور ہمنوا اصل راز جاننے میں کامیاب ہو  گئے؟ کیا ٹیکنالوجی کا قلع قمع ہو گیا؟ کیا وہ لوگ ایک دفعہ پھر ہنسی خوشی رہنے لگے؟  یہ جاننے کے لئے پڑھئیے گڈو میاں کے کارنامے۔

11:13 AM

ارشمیدس، یوریکا, انتہا پسندی, پاکستان, تعلیم

منی بدنام ہوئ----استغفراللہ

اکثر ایسی میلز یا فیس بک پہ ویڈیوز ملتی ہیں۔ جنکا مقصد تو بظاہر یہ لگتا ہے کہ لوگوں کے اندر یہ احساس پیدا کیا جائے کہ وہ مذہبی طور پہ کتنے نکمے ہیں۔ اور ان سے اس سلسلے میں کیا کیا کوتاہیاں ہوتی ہیں۔ لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے یہ بہت مسخرہ پن لگتا ہے کہ ایک طرف وینا ملک ٹھمکے لگاتیں سلمان خان سے داد و تحسین وصول کررہی ہیں اور پس منظر میں حمد سے ملتی جلتی چیز سنائ دے رہی ہے۔ اس تمام ویڈیو کو دیکھنے کے بعد کیا ایک عام شخص مذہبی غیرت کھا کر اس تمام مواد کو واہیات کہہ کراٹھ جاتا ہے یا  استغفراللہ کہہ کر ہل من مزید کہتا ہے۔ ایسی ایک ویڈیو میں نے فیس بک پہ دیکھی۔ ابتداً تو صرف شروع کے کلپس دیکھ کر چھوڑ دی کہ بے کار کا قصہ ہے۔ لیکن  عوام الناس کو اپنی بلّو کے لئے لائن لگاتے ہوئے  ساتھ ساتھ  وینا ملک  پہ غیرت کھاتے دیکھا تو سوچا دیکھیں تو وینا ملک کرنٹ پاکستانی سینسیشن، آخر کیا چیز ہے۔ جس پہ منی بد نام ہو رہی، اور ہر کس و ناکس استغفراللہ  بھی پڑھ رہا ہے اور اسی دلجمعی سے وینا ملک کی ویڈیوز یو ٹیوب پہ جمع ہوئ جا رہی ہیں۔ جنہیں لاکھوں کی تعداد میں دیکھا بھی جا رہا ہے۔

ایک ایسی ویڈیو حاضر ہے۔ کیا استغفراللہ کہہ دینے سے یا ان کلپس کے پیچھے حمد نما شاعری لگانے سے انہیں دیکھنا جائز ہو جاتا ہے۔

2:05 PM

انڈیا, بگ باس, پاکستان, سلمان خان, وینا ملک

باسی کڑھی

آجکل ذاتی مصروفیات کچھ ایسی ہیں کہ وقت  سب سے زیادہ اہم سوال بن گیا ہے۔ تو نئ پوسٹ کے بجائے ایک بہت پرانی پوسٹ معمولی تبدیلیوں کے ساتھ حاضر ہے۔ نہایت پرانے قارئین کے علاوہ کون اس سے آگاہ ہوگا۔ اس سے قدیم ہونے  کا اندازہ لگانے میں مدد ملے گی۔

آَئیے پڑھتے ہیں۔

ہمارے گھر سے ملحقہ پچھلا پلاٹ ایک نا مکمل اسٹرکچر کے ساتھ خدا معلوم کب سے خالی پڑا تھا۔ ایکدن گھر میں کچھ لوگوںجن میں, میں بھی شامل ہوں نے منصوبہ بنایا کہ گھر کی پچھلی دیوار میں ایک شگاف کر کے راستہ بنا لیا جائے اور اس خالی پلاٹ پر مرغیاں پال لی جائیں یا بکریاں۔ اس طرح سے ہمیں آرگینک انڈے اور دودھ مل جائیں گے اور ہمارے گھر میں صفائ کے مسائل بھی نہ کھڑے ہونگے۔

آپ لوگ تو واقف ہیں کہ آجکل مغربی دنیا میں لفظ آرگینک معاشی خوشحالی کی علامت ہے۔ جنہیں ہم دیسی انڈے کہتے ہیں انہیں وہ آرگینک پروڈکٹ کہتے ہیں۔مرغیاں خالی پلاٹ کی صفائ کرتی پھریں گی اور بکریاں یہاں وہاں کدکڑے لگائیں گی۔ اور خوشی خوشی تازہ دودھ دیں گی۔ روزانہ ملاوٹی دودھ کی قیمت میں اضافہ کا سن کر جو خون جلتا ہے وہ پھر چہرے پہ شادابی کا باعث بنے گا۔ اور اپنے غیر ملکی دوستوں پہ رعب بھی جمائیں گے کہ ہم تو آرگینک انڈے کھاتے ہیں اور دودھ پیتےہیں۔

غریب تیرے خواب۔ اس تجویز کا آنا تھا کہ برسوں سے خوابیدہ کارخانہء قدرت میں حرکت ہوئ اوردودن بعد کھٹپٹ کی آواز پہ

کھڑکی سے جو جھانکا تو کیا دیکھتے ہیں کہ خالی پلاٹ پر اگے ہوئے جنگل جھاڑ پر کلہاڑیاں چل رہی ہیں۔لیجئے ابھی دو دن پہلے ہی تو ہم نے کچھ منصوبے بنائے تھے۔ خیر آنا تیرا مبارک تشریف لانے والے۔ اگر معلوم ہوتا کہ آپ کے آنے کے لئے کچھ ایسے بے ضرر منصوبے پردہءخیال پہ ظہور پذیر ہونے چاہئیں تو برسوں پہلے سوچ لیتے یا بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ برسوں نہ سوچتے۔ لیکن جناب قدرت نے اسی پر بس نہیں کی اور ہمیں مستقبل میں کسی بھی منصوبہ بنانے کے ارادے سے باز رکھنے کے لئے آئندہ چند مہینوں کا پروگرام بھی بنا لیا گیا۔اب چاہے ہم سے جیسی بھی قسم لے لیں ہم اس سارے پلان سے ناواقف تھے۔

ایکدن باورچی خانے میں حلوہ پکاتے ہوئے چمچہ ایک پلیٹ میں رکھا اور چند منٹوں کے لئے وہاں سے غائب ہو کر جو دوبارہ نمودار ہوئے تو عجب ماجرہ تھا، پورا چمچہ باریک چیونٹیّوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی ایک جھرجھری پورے بدن میں دوڑ گئ۔ فوراً ایک اینٹی انسیکٹ اسپرے کیا۔ اور اپنے تئیں سمجھا کہ نمرود کی فوج کا صفایا کر دیا۔ اسی دن شام کو دودھ کے ایک قطرے پہ پھر چینوٹیوں کے ایک لشکر کا حملہ ہوا۔ آئندہ ایک ہفتے میں ہم نے ایک کے بعد ایک کئ لشکر غارت کیے۔ مگر یہ تو لگ رہا تھا کہ اتنا ہی ابھریں گے جتنا کہ دبا دیں گے۔

ادھر پڑوس میں مکان کی تعمیر تیزی سے جاری تھی ادھر ہم اتنی ہی جاں فشانی سے چیونٹیّوں سے نبرد آزما مگر کچھ ہوتا نظر نہیں آرہا تھا۔اب روزمرہ کے انسیکٹ کلر پر سے اعتماد اٹھ چلا تھا۔ ادھر یہ بھی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ عذاب ہم پہ کہاں سے اور کس سلسلے میں نازل ہوا ہے۔

کچھ عرصے چیونٹیوں کی لاتعدا قطاروں کو صاف کرنے کے بعدہم نے یہ فیصلہ کیا کہ پورے گھر پر ایک ساتھ یلغار کی جائے تاکہ اس مصیبت سے نجات ہو۔ گھر کے چاروں طرف بنیاد کے ستھ ساتھ چونا ڈالا گیا اور لان میں چیونٹیاں مار دوا ڈالی گئ۔ کچھ دنوں کے لئے سکون ہوا مگر چاردن بعد وہی کہانی۔ یعنی ڈھاک کے تین پات۔

اب گھر کے باہر چونا ڈالنے کے بجائے چیونٹی مار دوا ڈالی گئ۔ پھر کچھ سکون ہوا۔ مگر کچھ دنوں بعد ہم پھر اپنی پرانی حالت پہ واپس آگئے۔ پھر مختلف ذرائع سے پتہ چلا کہ اینٹی انسیکٹ کا اتنا استعمال ہمارے خود کے لئے بہتر نہیں۔ جہاں ان سے مختلف قسم کی الرجیز ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے جن میں سرفہرست دمہ ہے وہاں یہ نہ صرف کینسر کا باعث بھی ہو سکتے ہیں بلکہ بانجھپن بھی پیدا کرتے ہیں۔ یا خدا اب کیا کریں۔

ادھر پڑوسیوں کا مکان تکمیل کو پہنچ رہا تھا اور اب اس پر رنگ و روغن ہو رہا تھا۔ ایک دن دل میں اتنا گداز پیدا ہوا کہ خدا سے شکوہ کناں ہوئے۔ یا اللہ ہمارا اس پلاٹ پر ْتو دلوں کے حال بہتر جانتا ہے۔ قبضہ کرنے کا کوئ ارادہ نہ تھا وہ تو صرف ایک خیال تھا۔ اور اگر ہم اس پر عمل کر بھی لیتے تو یقین جان کہ جس دن ان کی آمد کے آثار ہوتے ہم وہ مرغیاں اور بکریاں کسی کی دعوت میں استعمال کر لیتےممکن ہے انہی کی دعوت کردیتے۔ اس مکالمہء صفائ کے بعد جب سوچنا شروع کی تو لگا کہ دماغ کے انجن نے کام کرنا شروع کیا۔ اب جو غور کیا تو اندازہ ہوا یہ چیونٹیاں پڑوسیوں کے گھر کی تھیں۔ انہوں نے جو جنگل صاف کیا تو یہ ہمارے گھر آدھمکیں۔

 سوال یہ تھا کہ ان سے جان کیسے چھڑائ جائے۔ یکدم خیال آیاآخر ہم انٹرنیٹ کیوں نہیں استعمال کرتے۔ دماغ کے جالے لگتا تھا کہ ایکدم صاف ہو گئے۔  دو دن نیٹ پرخوب سرچ ماری اور بالآخر ایک نتیجے پہ پہنچ گئے۔ اگلے دن بازار سے بورک ایسڈ لےکر آئے دیکھنے والوں نے کہا ۔ اور کیرم بورڈ وہ کہاں ہے۔ وہی کھیلنے کے لئے ہم نے ہمیشہ بورک ایسڈ استعمال کیاہے۔ ایسے تبصروں پر ہم نے غور نہیں کیا یہ لوگ ہمیشہ چیونٹی کاٹے پر روتے ہیں اور اس کا ذمہ دار بھی ہمیں سمجھتے ہیں۔

ہم نےاسی سنجیدگی سے چینی کاشیرہ تیار کیا اور اس میں بورک ایسڈ کو ملادیا۔ پھر اسے چھوٹی چھوٹی پلاسٹک کی پیالیوں میں نکالا اور چینٹیوں کے بل جو ہم اس سارے عمل سے پہلے نشان زدہ کر چکے تھے ان کے قریب لے جا کر رکھ دیا۔ اگلے دن ماسی نے ہمیں اطلاع دی کہ پیالیوں میں کچھ رکھا ہے اس میں چیونٹیاں آرہی ہیں۔ آنے دو ہم نے شان بے نیازی سے جواب دیااور ایک میگزین پڑھتے رہے۔ اطمینان قلب دنیا کی سب سے بڑی چیز ہےاسی سے اعتماد پیدا ہوتا ہے۔۔' انہیں وہاں سے ہلانا نہیں۔' ہم نے اسے نصیحت کی۔ گھر میں کھلبلی مچ گئ۔ لیجئے اب تو چیونٹیّوں کو انکے دروازے پر ہی غذا مل رہی ہے اب دیکھئیے گا کیسی یلغاریں ہوتی ہیں ۔ کسی نے کہا کہ اب یقیناً ہمیں دوسرا گھر دیکھ لینا چاہئے۔ وہ دن دور نہیں جب یہاں صرف چیونٹیوں کا راج ہو گا۔ اور ہاتھیوں کا آنا منع ہوگا۔ میں نے لقمہ دیا۔

آہستہ آہستہ چیونٹیوں کی قطاریں ہر شکر کی پیالی کے ساتھ بندھ گئیں۔ صبح سے شام تک چیونٹیاں آرہی ہیں چیونٹیاں جا رہی ہیں اور ہم ہیں کہ ٹی وی پہ کھانا پکانے کی ترکیبیں دیکھ رہے ہیں۔۔رسالوں کو چاٹ رہے ہیں اب ہمارے شوہر صاحب کی پریشانی شروع ہوئ۔ 'یہ کیا ہو رہا ہے اس دفعہ آپ نے اینٹی انسیکٹ بھی نہیں لیا اور نہ ہی چیونٹیوں کا کوئ اور علاج ہو رہا ہے'۔ خاموش میں نے انگلی سے اشارہ کیا۔ اگرچہ چیونٹیوں کے کان نہیں ہوتے مگر تجربات یعنی چیونٹیوں کےذاتِی تجربات سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ ماحول میں اپنے خلاف ہونے والی ہر کارروائ سے آگاہ ہو جاتی ہیں خوش قسمتی سے قدرت نےعورتوں سمیت ہر جاندار کو اس حس سے نوازا ہے۔

اچھا جناب اب میرے شوہر صاحب سوچ رہے تھے کہ میں نے شاید کوئ روحانی عمل شروع کیا ہو اہے ۔ اور کچھ عرصہ لگے گا جب میں اپنی غلطی تسلیم کر لونگی کہ اس قسم کے مسائل حقیقت کی دنیا میں رہ کر ہی حل ہو سکتے ہیں۔ باقی لوگ شاید سوچتے تھے کہ میں نے اپنی کاہلی کے اوپر بڑی ذہانت سے پردہ ڈالا ہوا ہے۔ یوں ایکدن جب یہ موضوع جب دوبارہ زیر بحث آیا تو پھر توپوں کا رخ میری جانب ہوا۔

لوگ میری خاموشی اور سکون سے نالاں تھے۔ میں نے جب ان سے مزید پندرہ دن کی مہلت چاہی تو وہ ایکدم پھٹ پڑے۔ چیونٹیاں نہ ہوئیں طالبان ہوگئیں۔ اب میں ہر ایک چیونٹی سے درخواست کرنے سے رہی یہ لیجئے دوا اور خدا کے لئے غارت ہو جائیں۔ خیر اجلاس میں میں نے سب کو یقین دلایا کہ میں کوئ روحانی عمل نہیں کر رہی ہوں۔ میں بورک ایسڈ بذریعہ شیرہ چیونٹیوں کو دے رہی ہوں، بورک ایسڈ ان کا معدہ ہضم نہیں کرتا اور معدہ پھٹ جانے کے نتیجے میں وہ اس دار فانی سے کوچ کر جاتی ہیں۔ 'تو کیا اب ایک ایک چیونٹی کے مرنے کا انتظار کیا جائے گا اور اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ ان کے انڈوں سے چیونٹیاں پیدا نہیں ہونگیں۔ ' تابڑ توڑ سوالات۔

میری تیاری بھی مکمل تھی۔ بات یہ ہے کہ اس شیرہ کو چیونٹیوں نے اپنے بل میں بھی لے جا کر جمع کیا ہو گا اور اسے ان کی ملکہ بھی استعمال کرے گی جو ان کے بل میں انڈے پیدا کرنے کی ذمہ داری اٹھاتی ہے اب جب وہ ہی نہیں رہے گی تو نئ چیونٹیاں کہاں سے آئیں گی۔ پھر ہم نے بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے ان کی توجہ چیونٹیوں کی قطاروں میں ہونے والی واضح کمی کی طرف دلائ۔ لوگوں نے اس فرق کو محسوس تونہیں کیا تھا لیکن ہمیں کچھ دنوں کی مہلت ضرور مل گئ۔ آج اس بات کو اس ایک سال ہوگئے۔ اب ہمارے گھر میں کبھی کبھار کوئ چیونٹی اس لئے نظر آجاتی ہے کہ بچوں کو بتایا جا سکے یہ ہوتی ہے چیونٹی جس کے کبھی کبھی پر نکل آتے ہیں۔ اس تمام محنت سے ہم نے یہ سیکھا کہ جس کا کام اسی کو ساجھے۔ اگر آپ برائ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تو اسکا خیال دل میں پال لینا ہی مصیبت بن سکتا ہے۔

نوٹ: اس طریقےکو طالبان کے خلاف استعمال کرنے والے نتائج کے خود ذمہ دار ہونگے۔

ریفرنس؛

چیونٹیوں سے بچاءو

11:06 PM

آرگینک غذا, بورک ایسڈ, چیونٹیاں

نو سے پانچ

میں اپنی ایک عزیزہ سے ملنے انکے گھر رات کو نو بجے پہنچی پتہ چلا کہ ابھی تک آفس سے واپسی نہیں ہوئ۔ وہ ایک سوفٹ ویئر انجینیئر ہیں اور ایک سوفٹ ویئر ہاءوس میں کام کرتی ہیں۔ رات کو دس بجے انکی واپسی ہوئ۔ لیکن آفس ٹائم ختم نہیں ہوا تھا کہ اب وہ گھر میں رات کو دیر تک بیٹھ کر کام کریں گی۔ وہ بتانے لگیں کہ اگر چار گھنٹے کی بھی نیند مل جائے تو عیاشی سمجھی جاتی ہےاور یہ انکا روز کا معمول ہے۔ اسکی وجہ سے صحت پہ جو اثرات ہیں وہ الگ ہیں۔ آپ تصور کر سکتی ہیں کہ جو شخص میرے ما تحت کام کرتا ہے وہ آفس چھ بجے چھوڑدیتا ہے اور اسکی تنخواہ مجھ سے بیس ہزار روپے زیادہ ہے۔ انہوں نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ در حقیت میرے ماتحت پانچ لڑکے کام کرتے ہیں۔اور وہ سب شام کو چھ بجے کے بعد نہ صرف کام کرنے کو تیار نہیں ہوتے بلکہ کام کا معیار ایسا ہوتا ہے کہ مجھے ہی اسے بھگتنا پڑتا ہے۔ لوگ بڑے بڑے ادروں سے پڑھ کر آرہے ہیں بڑے مطالبات ہیں انکے مگر کام کے نام پہ ایک چھوٹے سے مسئلے سے نہیں نبٹ سکتے ایک پریزینٹیشن کا کہہ و جان نکل جاتی ہے انکی اور یہ سب میرے ہم عمر لوگ ہیں۔ میں ٹیم لیڈر ہوں اور نتیجے میں کام کا سارا لوڈ میرے اوپر پڑ جاتا ہے۔

 میری ایک اور دوست جو کہ کسی اور سوفٹ ویئر ہاءوس میں کام کرتی ہیں انکی کہانی بھی یہی کہ رات کو نو دس بجے گھر سے واپسی ہوتی اور صبح ساڑھے سات بجے تک گھر سے نکل جاتی ہیں۔ یہ بتاءو تمہاری اب شادی ہونے والی ہے تب یہ سب کیسے چلے گا۔ میں نے پوچھا۔ ایسے ہی چلتا ہے۔ جو شادی شدہ کولیگز ہیں وہ بھی تقریباً اسی وقت تک جا پاتی ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صبح نو بجے سے شام پانچ بجے تک کی جاب کا کوئ تصور نہیں رہا۔ سوائے سرکاری داروں کے تمام غیر سرکاری ادارے اپنے تنخواہ دار طبقے کا خون چوس لینا چاہتے ہیں۔ مقررہ وقت سے الگ رک کر زیادہ کام کرنے والوں کے لئے یعنی اوور ٹآئم کا کوئ تصور نہیں اور یوں اب زائد کام، زائد تنخواہ کا کوئ تصور نہیں رہا۔ ان کام کرنے والوں کے کوئ بنیادی حقوق نام کی چیز نہیں۔

حتی کہ میڈیا سے تعلق رکھنے والے لوگ جو معاشرے کی زبوں حالی کا رونا روتے نہیں تھکتے۔معاشرے کو کرپشن سے پاک کرنے کا عزم دوہراتے ہیں، نا انصافیوں کو دور کرنے کی باتیں کرتے ہیں  وہ خود بھی ان سوفٹ ویئر ہاءوسز کو چلا رہے ہیں مگر انکے یہاں کام کرنے والوں کے ایسے کسی حق کا خیال نہ کرنا انکی شخصی دوہریت کو ظاہر کرتا ہے جو ماشااللہ ہمارے معاشرے میں کثرت سے پائ  جاتی ہیں۔ چار لوگوں کے سامنے بیٹھ کر اخلاقی تقاریر کرنے میں کسے مزہ نہیں آتا۔ عملی طور پہ وہ انہی اخلاقی اصولوں کا مذاق اڑا رہے ہوتے ہیں۔

خاص طور پہ جب وہ خواتین کو اتنے طویل وقت کے لئے روک رکھتے ہیں تو کیا انہیں خیال ہوتا ہے کہ یہ عورت ایک ماں بھی ہے، اسے اپنی گھریلو ذمہ داریاں بھی دیکھنا ہونگیں اور دیکھنا چاہئییں۔ گھر کسی معاشرے کی اکائ ہوتا ہے۔ اس اکائ کی ساخت کو محفوظ اور بہتر بنانے کے لئے ہمارے یہاں کیا ہو رہا ہے۔ جواب یہ ہے کہ کچھ نہیں۔ خواتین کو ملازمت میں ترجیح دی جاتی ہے اس لئے کہ وہ خاموشی سے گدھے گھوڑے کی طرح کام کرتی رہیں گی۔ ادھر خواتین کے لئے سب سے زیادہ اہمیت نوکری اور تنخواہ ہی کی نہیں ہوتی بلکہ ادارے میں اگر انہیں ماحول محفوظ لگے تو وہ جاب سوئچ کرنے سے گریز کرتی ہیں کہ اگلی جگہ خدا جانے کیسا ماحول ملے یوں وہ رسک لینے سے گھبراتی ہیں۔ دوسری طرف ہماری خواتین کو پیشہ ورانہ میدان میں داخل ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تو وہ اپنی حق تلفی کے سلسلے میں بلکہ کسی بھی سلسلے میں زبان کھولنے سے گھبراتی ہیں۔ یوں کام کا ایک غیر ضروری بوجھ اٹھاتی ہیں اور دب کر بھی رہتی ہیں۔ تیسری طرف جب سے عالمی مارکیٹ میں کساد بازاری کا رجحان پیدا ہوا ہے۔ آجر، اپنے اجیروں کی تعداد کو کم سے کم رکھتے ہوئے اتنا ہی کام کروانا چاہ رہے ہیں۔تاکہ انکا سرمایہ زیادہ خرچ نہ ہو اور منافع کی شرح برقرار رہے یوں انکی اس ڈریکولا والے انداز کے خلاف بولنا اپنی نوکری سے ہاتھ دھونے کے مترادف ہے۔

کیا ترقی یافتہ ممالک میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ مجھے آسٹریلیا میں کچھ وقت گذارنے کا موقع ملا اور یہ دیکھ کر حیرانی ہوئ کہ تقریباً تمام مارکیٹ سات بجے شام کو بند ہوجاتی ہے۔ آفس کے اوقات صبح نو سے پانچ۔ کبھی ہی ایسا موقع ہوتا ہے کہ دیر تک رکنا پڑے۔ ہفتے میں دو دن کی چھٹی۔ جس میں ایک خاندان کے تمام لوگ سیر و تفریح کا پروگرام بناتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے یہ سب کچھ کیوں۔ اس لئے کہ خاندان کو ایک ساتھ وقت گذارنے کا موقع ملے اور اس طرح معاشرے کی اکائ یعنی ایک خاندان مطمئن اور توازن سے بھر پور زندگی گذارے۔

میری وہی عزیزہ، ابھی چند مہینے پہلے  امیگریشن کے بعد کینیڈا چلی گئیں۔ ایک چیز سے خوش ہیں کہ  وہ شام کو چھ بجے اپنے گھر میں ہوتی ہیں، کھانا بناتی ہیں، ٹی وی دیکھتی ہیں۔ رات کا کھاناہم سب مل کر کھاتے ہیں۔ یہاں زندگی بہت ریلیکس ہے۔ ہر ہفتے کو ہم کہیں نہ کہیں گھومنے جاتے ہیں۔

حتی کہ تھائ لینڈ جیسے ملک میں جو کہ ترقی یافتہ ممالک مِں شامل نہیں اور شہروں میں شاید ہر عورت کام کرتی ہوگی۔ اس بات پہ توجہ دی جاتی ہے کہ خواتین اپنے آپکو آفس میں ہی نہ خرچ کر ڈالیں بلکہ اپنے گھر کے لئے بھی خود کو بچا کر رکھیں۔

ہمارے یہاں ایسا کوئ تصور نہیں۔ کوئ ایسی دستاویز جس میں کام کرنے کے زیادہ سے زیادہ اوقات بیان کئے گئے ہوں۔ کسی کو اس بات کی چنداں فکر نہیں کہ ملازمت پیشہ خواتین  کے مسائل کی طرف بھی نظر کرے۔ ظاہر ہے جہاں بات روٹی کے گرد ہی گھوم رہی ہو وہاں اس قسم کے مسائل میں کس کو دلچسپی ہو سکتی۔ اور خواتین کے مسائل کو تو کسی گنتی میں ہی نہیں رکھا جاتا، زیادہ سے زیادہ یہ کہہ دیا جائے گا کہ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ خواتین کام نہ کریں انہیں گھر کی ملکہ بن کر رہنا چاہئیے۔ یہ انکا کام نہیں۔ حالانکہ ملازمت پیشہ خواتین کا بڑا حصہ اپنے خاندان کی معاشی کمزوریوں کی بناء پہ کام کرنے پہ مجبور ہوتا ہے۔مگر یہ سب کہنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ جب روٹی نہیں خرید پاتے تو کیک خریدنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی۔ جب زراعت کا زمانہ تھا عورت گھر کی کھیتی باڑی میں اپنے حصے کا کام کرتی تھی اور برابر سے کرتی تھی۔ اب انڈسٹریئل زمانہ ہے اس میں بھی کسی کے لئے رعایت نہیں اور سب کو کام کرنا پڑتا ہے۔

کس کو فکر کہ ایک کام کرنے والے پہ کام کا کتنا بوجھ ڈالا جا سکتا ہے۔  ان  پریشان لوگوں کا کوئ پر سان حال نہیں اور نہ شاید کوئ اسکا احساس کرتا ہے۔  حکومتی عناصر اور ہمارے پالیسی ساز ذہن معاشرے کے استحکام کے لئے پالیسیاں بنانا کب شروع کریں گے۔جس طرح معاشرے میں اور ظلم اور زیادتیوں کو قبول کر کے بس زندہ رہنے کی رسم نبھانے کی عادت ڈال لی گئ ہے وہیں اس ظلم کے خلاف بھی کوئ آواز اٹھانے والا نہیں ۔

11:14 AM

آسٹریلیا, امیگریشن, پاکستان, تھائ لینڈ, سوفٹ ویئر ہاءوسز, کراچی, کینیڈا, ملازمت پیشہ خواتین

عید قرباں کراچی میں

ہر طرف گائے بکریوں کا شور ہے۔ رات کے آٹھ بجتے ہی لڑکے اپنے اپنے جانوروں کی رسیاں تھامے روڈ پہ نکل آتے ہیں اور پھر انکی ریس شروع ہوتی ہے۔ گھنگھرءووں کی چھم چھم، جانوروں کی میں میں ، باں باں اور بھیں بھِیں اور لڑکوں کی فرط جوش میں نکلتی چیخیں اور نعرے دیکھ کر اسپین کی بل فائیٹنگ کے میدان یاد آجاتے ہیں۔  مگر واپس آجائیے، یہ اسپین نہیں پاکستان کا شہر کراچی ہے۔ اور خیال اغلب ہے کہ یہ ساری مشق یہ معلوم کرنے کے لئے ہوتی ہے کہ یہ جانور پل صراط پہ صحیح کارکردگی کا مظاہرہ کر پائے گا یا نہیں۔ میں اس سب  کو برا  کہنے کی جراءت نہیں کرسکتی مگر میرے جیسے کمزور دل ڈرائیورز پہ یہ وقت پل صراط پہ چلنے سے کم نہیں ہوتا۔

میں نے کہا بقر عید تو دراصل مردوں کا تہوار ہے۔ بکرا منڈی جانا ، پھر اسکا ایک تفصیلی معائنہ کرنا،  جانوروں کی تفصیلات حاصل کرنا، کیا عمر ہے کہ ہمارے یہاں قربانی کا جانور اور محبوب دونوں بالی عمر کے ہی پسند کئیے جاتے ہیں، کوئ شرعی عیب تو نہیں چاہے خود شریعت پہ عیب ہوں مگر قربانی کے جانور میں کوئ عیب میں ہونا چاہئیے ورنہ دنیا تُھو تُھو کرے گی، منہ کھلوا کر دانت گننا یہ خاصہ خطرے کا کام ہوتا ہے کہ جانور آپکی انگلیاں نہ گننے لگ جائے۔ اس لئے قربانی ان جانوروں کی ہوتی ہے جو کبھی مکتب نہ گئے ہوں۔ شاید افضل بھی انہی کی ہو۔ پھر چلا کر دیکھنا کہ الہڑ مٹیار کی طرح چلتا ہے کہ نہیں۔ لیکن اس چال میں چلن کا بانکپن ہونا چاہئیے۔ ورنہ کہیں ضعف چلن کی وجہ سے مسائل کھڑے ہوجائیں، خاص طور پہ گئیوں کا ضعف چلن ہمارے یہاں غیرت کا مسئلہ بن سکتا ہے جس میں قانون بھیگی بلی بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔   پھر قیمت کا تعین اور اس پہ بحث۔ اسکے بعد اپنی حد سے باہر جاتا دیکھکر اسے چھوڑنا، اپنی حد میں آتا دیکھ کر سوچنا کہ مبادا اس سے اچھا کوئ اور جانور مل جائے اور دوسرے کی حد میں جاتا دیکھ کر تائسف میں پڑنا کہ سال بھر اس نے ہم سے بہتر مال بنایا۔ اس طرح پوری بکرا منڈی کا ایک سیر حاصل تجزیہ جسکے بعد آپ محض میں میں اور بھیں بھیں  سن کر بتا سکتے ہیں کہ یہ کسی سرائیکی دوکاندار کا جانور ہے یا سندھ کے میدانوں سے آیا ہے۔ آیا خالص پاکستانی جینز رکھتا ہے یا کسی فرنگی ملک کے شاندار جینز میں بھی حصے دار ہے۔ یہاں بہت سارے سوالات کھڑے ہوتے ہیں مگر انہیں بٹھا دیتے ہیں کہ  عید پہ  قربانی بے زبان ، معصوم، 'سیدھی' سادی گئیوں اور بکریوں کی جائز  ہے ہماری نہیں۔

ایک دفعہ آپ جانور کے مالک ہو جائیں تو اسے اپنے محلے یعنی گھر تک پہنچانا بھی ایک مرحلہ ہوتا ہے۔ جانورلے جانے والی گاڑیوں کے مالکان سے حساب طے ہونے کے بعد جب اس کھلی گاڑی میں دوستوں کے ہجوم اور جانور کے ساتھ پیچھے جالی میں ٹنگ کر سہراب گوٹھ سے روانہ ہوتے ہیں اور  شہر کے درمیان سے گذرتے ہیں تو ایک خمار چڑھتا ہے جسے گائے کے پیشاب کی دھاراور گوبر کی بدبو بھی نہیں اتار سکتی۔

پھر گھر پہنچ کر ایک خلقت ، میرا پیا گھر آیا کے نعرے لگاتی، آپکے جانور کے دیدار کوبھاگی چلی آتی ہے۔ جانور کو گاڑی سے اتارتے وقت انتہائ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ نہ معلوم کیوں، اس بات کا احساس جانور کو بھی ہوتا ہے کہ یہ بھاگ نکلنے کے سنہری مواقع میں سے ایک ہے۔  جانوروں میں پلاننگ کرنے کے خامرے نہیں ہوتے اس لئے بہت محدود تعداد ہی ایسا کر پاتی ہے اور جب بھی کرتی ہے بغیر پلاننگ کے ہوتا ہے۔ اس لئے جہاں چاہے منہ اٹھائے دوڑ پڑتی ہے۔ ایسے موقع پہ آُپکے پاس بھی اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ یہ سوچیں کہ میں اگر گائے یا بکرا  ہوتا تو دوڑ کر کہاں جاتا۔ نتیجتاً ایسے کسی واقعہ کے پیش آنے کی صورت میں آپ اسی طرف ہو لیتے ہیں جہاں جانور جاتا ہے۔ باقی زمانہ بھی چلو تم ادھر کو گائے ہو جدھر کو کی تصویر بن جاتا ہے۔ ایسا وقت پھر مجھ جیسے ڈرائیور کے لئے روز قیامت بن جاتا ہے۔ کیونکہ میری بھی اس سلسلے میں کوئ پلاننگ نہیں ہوتی۔ اگر کوئ جانور میرے سامنے بھاگا چلا آرہا ہوتو میں بالکل صم بکم ہو جاءونگی۔ یہاں تک آپکو پتہ چل گیا ہوگا کہ پلاننگ کسے کہتے ہیں اور یہ بقاء اور قضا کے لئے کتنی ضروری ہے۔

اب فرض کیا کہ جانور کے سیدھے میرا مطلب سدھائے ہوئے ذہن میں ایسی کوئ بات نہیں آتی تو یہ مرحلہ بخیر و خوبی طے پا جاتا ہے۔ اور آپ اسے اسکی مرضی کے ساتھ اپنے گھر کے سامنے یا اندرکسی کھونٹے سے باندھ دیتے ہیں۔  اب کچھ لوگ جنہیں سیدھے سادے، شریف جانور پسند ہیں تو وہ نہایت حیا سے آنکھیں پٹپٹاتی گائے کی اس ادا پہ دل ہی دل میں نثار ہوتے رہتے ہیں۔

اگر جانور بھاگ جائے اور ستارےآپکے حق میں ہوں تو آپ اسے اپنی اور محلے والوں کی تگ و دو کے بعد دوبارہ پکڑ لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ انسانی معالات کے بر عکس ایسی بھاگی ہوئ گائے پہ فخر و غرور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔  پھڑکنیاں کھاتا ہوا  دل اپنے جانور کی اس ادا پہ قتل ہوتا رہتا ہے کہ کیا جاندار چیز ہے، ظالم لگتا ہے کمان سے نکلا تیر ہے۔

 اسکے بعد کیا ہوتا ہے اسے پڑھنے کے لئے پہلے پیرا پہ واپس جائیں۔

جانور کا کھانے پینے انتظام کرنا بھی  دیہاتوں سے وابستہ ہمارے رومانی تصورات کو نکھار دیتا ہے۔  ہمارے شہر میں اکثر گھر کنالوں اور مرلوں پہ نہیں بنے ہوئے اس لئے شہر کی گلیاں اس زمانے میں آدھی رہ جاتی ہیں کہ آدھی گلی میں ان جانوروں کی باپردہ رہائیش کے لئے کیمپس بنا دئیے جاتے ہیں۔ جہاں محلے کے مخنچو، چھٹنکو، دادا، ہیرو اور بدمعاش سب حسب ذوق و شوق حاضری دیتے ہیں۔  اور ادائے جانوراں سے شغل فرماتے ہیں۔

لیکن اسکے ساتھ ایک نہایت دلچسپ مرحلہ اپنے جانوروں کی سجاوٹ ہے۔ پورے شہر میں جا بجا جانوروں کی آرائیشی اشیاء کی دوکانیں ان دنوں سج جاتی ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ  اپنے جانوروں کو سجانے سنوارنے میں ہمارے مرد کتنی دلچسپی رکھتے ہیں۔ بعض اوقات گھر کے پرانے جانوروں کو ان قربانی کے جانوروں سے جیلسی محسوس ہوتی ہے۔ شہری خواتین اس چیز کو زیادہ دل سے نہیں لگاتیں۔ انکا خیال ہوتا ہے کہ اس بہانے ان پہ رہنے والی کڑی نظر بٹ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میٹھی عید پہ جس قدر پردے اور خواتین سے متعلق دیگر امور کا تذکرہ رہتا ہے بقر عید پہ یہ رجحان تقریباً ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے فلمی اداکارائیں بھی اس مہینے اپنا کوئ اسکینڈل بنوانے میں دلچسپی نہیں لیتیں۔

  ان دوکانوں پہ گلوں کے ہار، سینگوں میں ٹانگنے کی اشیاء، پیٹھ پہ بچھانے کی مختلف طرح کی چادر نما چیزیں، گلوں کی گھنٹیاں اور پیروں کے گھنگھرو شامل ہوتے ہیں۔ کچھ شوقین اس سب سے پہلے مہندی کی رسم بھی کرتے ہیں۔  گھنگھرو پہن کر جب جانور ٹھمک ٹھمک کر روڈ پہ چلتا ہے تو اس سے لا محالہ دل سے صدا نکلتی ہے کہ پائیل میں گیت ہیں چھم چھم کے تو لاکھ چلے رہ گوری تھم تھم کے اسکے علاوہ ڈرائیورز کو بھی یہ خبر ہو ہی جاتی ہے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔  چونکہ خواتین کے لئے بجنے والا زیور پہن کر چلنا درست نہیں تو یہ آرزو بھی یہ گئیاں اور بکرے بکریاں پوری کرتے نظر آتے ہیں۔ اس بات کے ہم اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ کوئ خاتون کوئ چھنا چھن کرنے والا زیور پہن بھی لیں تو ہماری آنکھیں کسی گائے کا تصور کرتی رہتی ہیں۔

بقر عید پہ عشّاق کیا کرتے ہیں؟ میٹھی عید کی طرح گلی کے نکڑ یا چھت سے تاکا جھانکی یا فیس بک پہ ایک تحریری عید مبارک کے بجائے اس عید پہ موقع ہوتا ہے کہ آپ گائے کا حصہ لیکر انکے گھر پہنچ جائیں۔ بکرے کی ران یا گائے کا دس کلو کا پورا ایک بغیر ہڈی کا ٹکڑا انکے گھر والوں کو آپکے قدموں پہ ڈھیر کر دےگا۔ یہ کوئ مغرب نہیں کہ ڈائریکٹ محبوب پہ ہلہ مارا جائے۔  یہ مشرق ہے مشرق۔  ایک دفعہ گھر والوں کا دل مٹھی میں آجائے تو سمجھیں کہ اب محبوب چاہے بھی توآپ کے کھونٹے سے جان چھڑانی مشکل ہے۔ اسکے گھر والے اسے آپکے یہاں باندھ کر رہیں گے۔  البتہ اپنے گھر والوں کو اس ران یا گوشت کے ٹکڑے کی منزل آپ کہاں بتائیں گے یہ آپکی ذہانت اور محبت کی گہرائ پہ منحصر ہے۔

 عید میں سے اس تمام تر تفریح نکل جانے کے بعد خواتین کے لئے اس عید میں جو بچ جاتا ہے۔ وہ کچن میں نظر بند ہونا ہے۔ اس کے لئے وہ یا تو سال بھر کی جمع کی ہوئ ترکیبیں آزماتی ہیں یا پھر انکی اس بوریت کو دور کرنے کے لئے مختلف برانڈز کے تیار مصالحوں سے پرچون کی دوکانیں بھر جاتی ہیں۔ اس سے پھوہڑ عورتیں ہی نہیں سگھڑ مرد بھی بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنی سلیقہ مندی کی داد پاتے ہیں۔ اسکے علاوہ خاندان میں چلی آنے والی سینہ بہ سینہ تراکیب بھی ہوتی ہیں۔  ہم بھی کھانا پکانے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ ہمارے پاس جتنی تراکیب ہیں سب خاندانی ہیں  اس لئے انہیں افشا نہیں کیا جا سکتا۔ یوں ہماری مجبوری صرف مملکت یا کائینات کےراز افشا کرنا رہ جاتی ہے۔

لیکن ایک آسان سی ترکیب تو میں آپکو بتا سکتی ہوں۔ حسب مرتبہ گوشت لیجئیے اس میں حسب ذائقہ تمام مصالحہ جات ملا لیں۔ حسب وزن گوشت کچا پپیتا ملا دیں۔ حسب میسر وقت اسے پڑا رنے دیں اور پھر سیخوں پہ لگا کر بار بی کیو کر لیں۔  آپ کہیں گے یہ تو ہم بھی بتا سکتے ہیں۔ تو جو تراکیب  سینہ بسینہ نہ چلیں وہ بس ایسی ہی ہوتی ہیں۔ اب آپکو پتہ چل گیا ہوگا کہ خاندان کس طرح بنتے اور سنبھالے جاتے ہیں۔

میرے پیارے قارئین، یہ کراچی میں بقرعید کا ایک دھندلا سا خاکہ تھا۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ ہمارے یہاں بقر عید ایک انڈسٹری ہی نہیں سارے کمرشل مصالحوں سے بھرپور ایک تہوار ہے اس لئے اتنا ہِٹ جاتا ہے۔

9:15 AM

بقر عید, پاکستان،, کراچی, مسلمان تہوار، جانور

بچوں کی ابتدائ تعلیم

کراچی میں سی آئ ڈی کی بلڈنگ پہ شدید دھماکہ ہوا۔ پوری عمارت تباہ، پندرہ سے زائد لوگ ہلاک۔ سوسے زائد زخمیوں کی بڑی تعداد سر پہ چوٹ کا شکار۔ ایک کلومیٹر کے علاقے میں دو سو سے زیادہ گھر تباہ۔  بس اس سے آگے میں اس پہ کچھ نہیں لکھنا چاہتی۔ البتہ ان لوگوں میں سے ہوں جو سوچتے ہیں کہ اس قتل و غارتگری، جنگ و جدل کو کیا ہمارے بچوں کو بھی بھگتنا پڑے گا۔ کون ان دہشت گردوں کے ہاتھوں کو روکے گا اورکون انکے منجمد دماغوں کو زندگی کی قدر کرنے کی تحریک دے گا۔

-

-

-

-

میری ایک تبصرہ نگارماں ہیں اور ہر ماں کی طرح چاہتی ہیں کہ وہ اپنی بچی کی زندگی میں وہ سب آسانیاں دیں جو وہ دے سکتی ہیں۔ بچوں کے بارے میں سب سے پہلے تعلیم کا سوال اٹھتا ہے۔

 ذمہ دار والدین فکر مند رہتے ہیں کہ وہ اپنے بچے کی تعلیم کن بنیادوں پہ استوار کریں۔ کراچی میں  بعض اسکولوں میں بچوں کی پیدائیش کے فوراً بعد رجسٹریشن کرانا ضروری ہوتی اور بعض بچے سوا سال کی عمر میں  اسکول میں داخل کرا دئیے جاتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ والدین کی اکثریت نہیں جانتی کہ یہ اسکول نہیں بلکہ پلے اسکول ہوتے ہیں۔ ان پلے اسکولوں میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ماں باپ اپنے بچوں کو گھروں میں کرا سکتے ہیں۔ کیونکہ اس عمر میں بچوں کو کھیل ہی کھیل میں اپنے ماحول سے آگہی دی جاتی ہے اور زندگی کے ابتدائ ادب آداب سکھائے جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں ماءووں کی اکثریت چونکہ گھروں میں رہتی ہے اور انکے لئے اسکا وقت نکالنا مشکل نہیں بلکہ یہ انکی پہلی ترجیح ہونی چاہئیے۔ لیکن بد قسمتی سے ہماری ماءووں کی اکثریت یا تو خود ان پڑھ ہوتی ہے، وہ خود ہی اپنے ماحول سے آگاہ نہیں ہوتی تو وہ اس سلسلے میں چاہنے کے باوجود کچھ کرنے سے معذور ہوتی ہے۔

وہ مائیں جو اتنی پڑھی لکھی ہیں کہ کمپیوٹر استعمال کر سکیں  اور انکے گھروں میں کمپیوٹر موجود بھی ہے انہیں اپنے آپکو خوش قسمت سمجھتے ہوئے اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہئیے۔ ٹیکنالوجی کے صحیح استعمال سے آپ اپنے بچے کو اپنے گھر کے اندر اس سارے طریقے سے واقف کرا سکتے ہیں جو کہ والدین بہت زیادہ فیسوں کی ادائیگی اور دن رات کے تناءو کے بعد حاصل کرتے ہیں۔ دنیا ایک گلوبل ولیج بن چکی ہے اور ہم اس ٹیکنالوجی کے استعمال سے اپنے بچوں کو وہ تمام علم دے سکتے ہیں جو ترقی یافتہ ممالک میں دیا جاتا ہے۔ یوں ٹیکنالوجی نے تمام انسانوں کو برابر کی سطح پہ لا کھڑا کیا ہے۔

بچوں کی پہلی انسپیریشن انکے ماں باپ ہوتے ہیں۔ اگر گھر میں والدین کتابوں میں دلچسپی لیتے ہیں تو بچے بھی دلچسپی لینے لگتے ہیں انہیں کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔  اس لئے سب سے پہلے خود پڑھنے کی عادت ڈالنہ چاہئیے۔

بچوں ک تربیت میں ایک چیز کا خیال ضروررکھنا چاہئیے کہ جب بھی آپکا بچہ کوئ نئ چیز سیکھتا ہے چاہے وہ کتنی معمولی کیوں نہ ہو اسکی حوصلہ افزائ ضرور کریں۔ جب وہ آپکی ہدایات پہ عمل کرتا ہے اسے ڈھیر سارا پیار کریں اور خوب ساری تعریف۔ والدینکو بچوں کے سامنے لڑائ جھگڑے سے گریز کرنا چاہئیے۔ تعریف، محبت اور تحفظ کا احساس بچوں کے سیکھنے کے عمل کو مہمیز کرتے ہیں۔ ہر بچہ فطری طور پہ اپنے والدین کو خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ اور ذرا سی تربیت سے وہ ہر کام آپکی مرضی کے مطابق کرنے لگتا ہے۔ سو تعریف اور محبت سب سے بڑی رشوت ہے۔

میں نے اپنی بچی کی ابتدائ تعلیمی سرگرمیوں کے لئے نیٹ گردی سے بڑا فائدہ اٹھایا اور آج بھی اٹھا رہی ہوں۔

بچوں کے سامنے چیزیں دوہراتے رہنے سے وہ اسے یاد کر لیتے ہیں۔ پھر انہیں رٹوانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کمپیوٹر پہ چیزوں کو دوہرانا آسان ہوتا ہے۔  بچوں کو چیزیں یاد کروانے کے بجائے انکے سامنے چیزیں دوہرائیں، ایک ہی ویڈیو بار باردکھائیں۔ مگر اس میں وقفہ رکھیں۔ ایکدن ایک چیز کروالی اور دوسرے دن دوسری۔ کتاب کو بار بار انکے سامنے رکھ کر پڑھیں۔ انہیں مارنے پیٹنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ لیکن اسکے لئے آپکے اندر ایک خوبی کا ہونا ضروری ہے اور وہ ہے صبر۔

میں نے اپنی بیٹی باقاعدہ تعلیم شروع کرنے کے لئے ڈیڑھ سال کی عمر میں

اس لنک

کا انتخاب کیا۔ اس سے پہلے وہ چھوٹے بچوں کے پزل کرتی تھی۔ یہ پزلز ابتدا میں تو مجھے  بیرون ملک سے آنے والے مہمانوں نے لا دئیے تھے۔  لیکن اب کراچی میں لکڑی کے یہ پزل بآسانی دستیاب ہیں۔ یہ مخلتف ساختیں کٹی ہوتی ہیں اور ان میں پلاسٹک کی میخ لگی ہوتی ہے جس سے بچے انہیں اٹھا کر دئیے ہوئے بورڈ پہ جما لیتے ہیں۔ لکڑی کے یہ پزل مختلف جانوروں سے لے کر انگریزی اور اردو کے حروف اور گنتی کے اعداد میں بھی مل جاتے ہیں۔ اعداد یا حروف کی باری تو بہت بعد میں آتی ہے پہلے بچوں کو بالکل سادہ سے پزل سے شروع کرائیں۔ جن کی بیرونی ساخت کم پیچیدہ ہو۔ جیسے جیسے وہ اسے کرنے میں مہارت حاصل کر لیں پیچیدہ پزل کروانا شروع کر دیں۔

ڈیڑھ سال کی عمر میں، مشعل نے بارنی شو دیکھنا شروع کیا۔ اور اسکی ایک ویڈیو

سانگز ان دا پارک

اسکی پسندیدہ ویڈیو تھی۔ یہ ویڈیوز کسی بھی اچھے ویڈیو سینٹر سے بآسانی دستیاب ہیں۔ کراچی میں رینبو سینٹر میں صرف پچاس روپے میں ایک ڈی وی ڈی مل جاتی ہے۔ ہمم، لیکن یہ پائیریٹڈ ہوتی ہیں۔

جب ہم سب گھر والوں کو بارنی کی موجود ساری ویڈیوز یاد ہو گئیں اور ہم اس قبل ہو گئے کہ اسکے گانوں کی دھن ترتیب دے سکیں اور اسکے گانے

آئ لو یو

پہ ہم ہرروز مشعل کے ساتھ دن میں چھ دفعہ پرفارم کرتے تو اس وقت

ڈورا دی ایکسپلورر

نے زندگی کی اس گتھی کو سلجھایا۔ بارنی نے جہاں مشعل کو انگلش زبان سے واقفیت دی بچوں کے ناز و انداز سکھائے وہاں

ڈورا

نے مسائل  اور انکے حل کی طرف مشعل کی توجہ مبذول کروائ۔ مجھے بھی یہ ویڈیوز خاصی پسند ہیں یہ نہ صرف بچوں کی دماغی صلاحیتوں کو مہمیز کرتی ہیں بلکہ انہیں کافی کچھ سیکھنے میں مدد کرتی ہیں۔ یہیں سے مشعل کی زندگی میں یہ جملہ داخل ہوا , آئ ڈِڈ اٹ۔ اسکے بعد مشعل نے کافی انگریزی اس سے سیکھی بلکہ اسپینش بھی۔ اسے اسپینش گنتی بھی دس تک یاد ہو گئ تھی۔ انکی پسندیدہ

ڈورا سیوز مر میڈ کنگ ڈم

بلا مبالغہ دو مہینے تک روزانہ دو دفعہ چلتی تھی۔ اور اسے دیکھنے کے دوران انکی کمنٹری بھی، اب یہ ہونے والا ہے۔ اس میں مشعل کا پسندیدہ سین ڈورا کا ایک مرمیڈ میں تبدیل ہونا تھا۔

لیکن اس دوران ہمارا باقاعدہ تعلیمی سلسلہ بھی جاری رہا۔ اینیمل زو سے ہم نے انگریزی کے بڑے حروف سیکھے۔ جبکہ مونٹیسوری میں پہلے چھوٹے حروف سکھائے جاتے ہیں یہ پتہ چلتے ہی میں نے چھوٹے حروف کی ویڈیو تلاش کی اور میں ایک اور مزے کی سائیٹ پہ پہنچی جسکا نام ہے

سپر سمپل سونگز

۔ یہاں پہ

گنتی کے اعداد

سکھانے  کے لئیے مدد ملی۔ اور یہیں سے دنوں کے نام سیکھے۔ یہاں بچوں کے لئے مزے کی انگلش نظمیں اور سرگرمیاں موجود ہیں۔  انگلش نظموں کے لئے مجھے ایک اور سائیٹ بے حد پسند ہے جو ہے

کلّن کی سائیٹ

۔

ہمم، لیکن مونٹیسوری کی جس چیز سے اکثر والدین بڑے مرعوب ہوتے ہیں اور انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اسے بچوں کو کسطرح سکھائیں۔ وہ ہیں انگریزی حروف کی آوازیں یعنی

فونیٹک ساءونڈز

۔ اسکے لئے بہت ساری سائیٹس موجود ہیں ابتداً جو سائیٹ مل وہ

ایک ایسی خاتون

کی تھی جو اشاروں کی زبان بھی اپنی بچی کو ساتھ ساتھ سکھا رہی تھیں۔ اس طرح مشعل نے بھی کچھ اشارے سیکھے۔ یوں آوازوں والا مرحلہ نہایت ہمواری سے طے ہوا۔ مونٹیسوری جانے والے بچوں کی ماءووں کو یقین نہیں آتا تھا کہ مشعل نے حروف کی آوازیں گھر پہ سیکھی ہیں۔

رنگوں کی پہچان، مہینوں کے نام اور چھوٹے چھوٹے انگریزی سوال و جواب کے لئے ایک اور دلچسپ سائیٹ ہے نام ہے اسکا

بزی بیورز

۔ اسی طرح ایک اور دلچسپ سائیٹ ہے نام ہے اسکا،

لیٹس اسٹارٹ اسمارٹ

۔

اردو حروف کے لئے پریشانی ہوئ۔ جو

ایک آدھ سائیٹ

ملیں وہ اتنی دلچسپ نہ تھیں۔ اگرچہ کہ میں نے انہیں پھر بھی مشعل کو دکھایا۔ اسکے لئے ایک ویڈیو میں نے خود بھی بنائ جو

اس لنک

پہ موجود ہے۔

یہ تو تھی اس نیٹ گردی کی ایک مختصر داستان، جو کہ خاصی طویل ہے لیکن یہ پوسٹ اس سے زیادہ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔  آجکل ہم  تصویروں میں فرق معلوم کرنا، ،جگسا پزل اور بھول بھلیاں کر رہے ہیں۔ یہ نیٹ پہ بھی موجود ہیں۔ نیٹ پہ بچوں کے لئے ایکٹیویٹیز کا ایک خزانہ موجود ہے۔ بس اسے آپکا وقت اور دلچسپی چاہئیے۔

ان تمام چیزوں کے ساتھ میں نے جس چیز کا خیال رکھا وہ یہ کہ بچی کے سوالوں کے آسان مگر صحیح جوابات ہونے چاہئیں۔ جو کچھ بھی ہم اپنی زندگی میں کر رہے ہوتے ہیں اسے آسان الفاظ اور آسان خیال میں بتاتے رہیں۔

میں سوچتی ہوں کہ  سوائے اسکے کہ بچوں کو اسکول میں دوسرے بچوں کی سنگت ملتی ہے اور وہ اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اگر آپ پڑھے لکھے والدین ہیں اور آپ کے پاس وقت ہے تو اس عمر میں بچوں کو اسکول بھیجنا بالکل ضروری نہیں۔  اپنی عمر کا یہ حصہ ہم میں سے بہت کم کو اور بہت ٹوٹا پھوٹا یاد ہوتا ہے۔ مگر اپنے بچوں کے ساتھ مونٹیسوری پڑھنا اسے سحر انگیز بنا دیتا ہے۔

یہ تحریر امن ایمان کی فرمائیش پہ لکھی گئ ہے۔ امن ایمان میرا خیال ہے کہ آپکے سوال کا جواب آپکو مل گیا ہوگا۔

9:51 AM

بارنی, بزی بیورز, پاکستان, ڈورا, کراچی, مشعل, مونٹیسوری

اوپن ہارٹ

میری ایک محقق دوست جرمنی سے واپس آئیں تو ان سے ملاقات ہوئ۔  باتوں باتوں میں وہاں کے قصے چھڑے تو بتانے لگیں کہ جب میں نے اپنی جرمن پروفیسر کو بتایا کہ ہمارے ساتھ جو میرے کولیگ موجود ہیں انکی اوپن ہارٹ سرجری ہو چکی ہے۔ تو وہ پوچھنے لگیں کہ کہاں ہوئ تھی۔ میں نے بتایا پاکستان میں۔ ایکدم کندھے اچکا کر کچھ حقارت سے کہنے لگیں کہ کیا پاکستان میں ڈاکٹرز اوپن ہارٹ سرجری کر لیتے ہیں اور وہاں ہوتی ہے۔ اس سے میری دوست کے دل کو دکھ پہنچا۔ جرمن مغرور اور اکھڑ ہوتے ہیں۔ یہ اکثر سننے میں آتا ہے۔ لیکن جب کوئ آپکے سامنے آپکے وطن کا تذکرہ حقارت سے کرے تو رنج تو ہوتا ہے۔

 ان کا یہ طرز عمل شاہد انکی لا علمی پہ مبنی تھا۔ جب لوگ اپنے آپ میں گم ہو جائیں تو اکثر وہ اپنے علم سے نہیں بلکہ لا علمی سے دوسروں کا دل دکھاتے ہیں یا انکے لئے تکلیف کا باعث بنتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ پہلی دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کو پچھلے کچھ سالوں سے معاشی بحران کا سامنا ہے جسکے نتیجے میں وہ اپنے باشندوں کو بنیادی سہولیات مناسب طور پہ نہیں دے پا رہے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اسکی وجہ سے بے روزگاری کی شرح میں انتہائ اضافہ ہوا ہے اور یوں لوگوں کو اب ویسی آسانیاں میسر نہیں جیسی پہلے تھیں۔ بعض ممالک میں گورنمنٹ کے ہسپتالوں میں تین تین سال تک کی لمبی لائن لگی ہوئ ہے۔

یوں دنیا کے وہ ممالک جو سستی طبی سہولیات اور بہتر نتائج دے سکتے ہیں۔ وہ پہلی دنیا کے عوام کی توجہ حاصل کر رہے ہیں۔

انڈیا میں تو

یہ باقاعدہ ایک صنعت کی حیثیت اختیار کر گئ ہے۔ ٹیسٹ ٹیوب بے بی پیدا کرنا ہو، سر پہ مصنوعی بال لگوانے ہیں، دانتوں کا نیا سیٹ بنوانا ہے، گردوں کی پیوند کاری کروانی ہے ۔ لوگ اب ان ملکوں کا رخ کرتے ہیں۔ انڈیا میں تو یہ ایک صنعت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ آنے والا اپنے ساتھ ڈالرز لے کر آتا ہے۔ وہ جب اسے روپوں میں تبدیل کرتا ہے تو اسے زیادہ پیسے حاصل ہوتے ہیں۔ لوگ سیر تفریح کرتے ہیں، اپنا کام کرواتے ہیں، ایک نئ جگہ سے آشنائ حاصل کرتے ہیں اور خوش خوش اپنے ملک واپس جاتے ہیں۔ یہ کہلاتی ہے طبی سیاحت۔ اس سارے کے بعد بھی انکا کل خرچہ، انکے ملک میں ہونے والے خرچے سے خاصہ کم ہوتا ہے۔

انڈیا میں ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے لئے رضاکار بھی بآسانی مل جاتے ہیں۔ غریب عوام اپنے اعضاء بیچنے کے لئے تیار ہے۔ ادھر پاکستان میں۔ لاہور میں بآسانی گردے مل جاتے ہیں۔ اور شہر میں یہ کاروبار ملک کے دیگر حصوں کے مقابلے میں بہت سرگرمی سے چل رہا ہے۔ میں خود ایسے لوگوں سے مل چکی ہوں جو پاکستان سر پہ بال لگوانے یا دانتوں کے علاج کے لئے آئے تھے۔

انڈیا کے علاوہ اس خطے میں

تھائ لینڈ

بھی کام کر رہا ہے۔ پاکستان میں بھی یہ صنعت پھلنے پھولنے کے امکانات ہیں اورکئ ڈاکٹرز اس سمت میں کام بھی کر رہے ہیں۔  اگرچہ  ہم مہنگائ کی وجہ سے مختلف سہولیات کو اپنے سے دور ہوتا محسوس کر رہے ہیں کہ ہم روپوں میں کما کر روپوں میں خرچ کرتے ہیں۔ لیکن یہ ان لوگوں کو سستی لگتی ہے جو ڈالرز لے کر ان جگہوں کا رخ کرتے ہیں۔  یہ تو آپ جانتے ہی ہونگے کہ آجکل ایک ڈالر، پاکستانی تقریباً چھیاسی روپوں کا بن رہا ہے۔ میں جس اسپیشلسٹ کی آٹھ سو روپے فیس سن کر سوچ میں پڑ جاتی ہوں وہ ڈالر میں دس ڈالر سے بھی کم ہوتی ہے۔ پہلی دنیا کے بازاروں میں دس ڈالر میں اچھے سیب شاید آٹھ دس آجائیں مگر ایک اچھا ڈاکٹر نہیں ملے گا۔

آپکو لگا کہ ان جرمن یونیورسٹی پروفیسر کو ہمارے خطے کے بارے میں کچھ کم آگاہی نہیں۔ بلکہ شاید وہ اپنے ہی خطے کے ان لوگوں کے بارے میں بھی واقف نہیں جو نیرنگی ء زمانہ سے نبرد آزما ہونے کے لئے ہر ممکن طریقہ کام لا رہے ہیں۔ لیجئیے انہیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ انڈیا کے انڈر ورلڈ ڈان داءود ابراہیم کی اوپن ہارٹ سرجری بھی کراچی میں ہوئ، آپس کی بات ہے ہمیں بھی

اسی لنک

سے پتہ چلا۔

اب یہ بتائیے کہ ایکدوسرے سے آگاہ رہنے کے لئے دنیا کے لوگوں کو کیا کرنا چاہئیے۔ایک  بات تو میں بتا دیتی ہوں۔ اپنے دلوں کو اوپن کر لیجئیے، اس سے پہلے کہ اوپن ہارٹ سرجری کی باری آئے۔ باقی اب آپکی باری ہے۔

5:03 PM

انڈیا, اوپن ہارٹ سرجری, پاکستان, تھائ لینڈ, جرمنی, داءود ابراہیم, کراچی, لاہور

ٹونی بلیئر کی سالی کا مسلماں ہونا

ایک دہرئیے اور ایک خدائے واحد کا یقین رکھنے والے شخص کے درمیان بحث چھڑ گئ۔ گھمسان کا رن چھڑنے کے بعد وہ دونوں اٹھے تو دہریہ خدا کا قائل ہو چکا تھا اور قائیل خدا، دہریہ ہو چکا تھا۔

 اس صورت حال سے ملتا جلتا ایک مصرعہ ہمارے ہاتھ لگا اور ہم آج تک اس کا دوسرا مصرعہ تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ مصرعہ کچھ یوں ہے،  ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا۔ کچھ مصرعے جوڑے۔ مثلاً

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک

ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا

کوئ میرے دل سے پوچھے تیرے تیر نیم کش کو

ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا

نقش فریادی ہے کس کی شوخیء تحریر کا

ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا

 جاتی ہے کوئ کش مکش اندوہ عشق کی

ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا

عجب واعظ کی دینداری ہے یارب

ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا

پیران کلیسا ہوں کہ شیخان حرم ہوں

ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا

دیکھنا تقریر کی  لذت کہ جو اس نے کہا

ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا

کچھ جو سمجھا میرے شکوے کو تو رضواں سمجھا

ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا

کچھ اور بھی اٹکل پچو ہیں لیکن ایک تو یہ پوسٹ طویل ہو جائے گی دوسرے یہ کہ وارث صاحب ہمیں شاعری کے طول و عروض سکھانے کے بجائے دعا کرنے بیٹھ جائیں گے کہ اس حالت میں دعا ہی کام آ سکتی ہے۔ لیکن انکے دل کی تشفی کے لئے یہ واضح کرنا از حد ضروری ہے کہ اس چیز کا ہمیں احساس ہو چلا تھا کہ اس سے معنی و مطالب جتنے پھلیں پھولیں۔ کسی  بھی مجوزہ شعر میں وزن نہیں ہے۔ شاعری کیا ہے بات میں وزن کا ہونا۔ اس لئیے ایک دفعہ پھر اس مصرعے کو ہاتھ میں پکڑے بیٹھے تھے کہ اپنے ایک ساتھی پہ توجہ گئ۔

کیا دیکھتے ہیں کہ کمپیوٹر کے سامنے آنکھیں پھاڑے بیٹھے ہیں۔  اضطراری حالت میں  کبھی ہاتھ تھوڑی کے نیچے رکھتے ہیں، کبھی ایک فرضی داڑھی کو سہلاتے اور درست کرتے ہیں، کبھی کانوں کا مسح کرتے ہیں اور کبھی شہادت کی انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کرتے  ہیں۔ ہر دو افعال کے درمیان مسکراتے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ سب نیکی علامت ہے مگر میرے شیطانی دل میں آئ کہ خاموشی سے انکے پیچھے  پہنچ جاءوں کہ کس سائیٹ سے مستفید ہو رہے ہیں۔  سوچا کہ انکی عمر کا تقاضہ ہے کبھی کبھی کے تصور میں برائ کیا ہے۔ لیکن عین اسی لمحے انہوں نے ہمیں دیکھ لیا۔ اب چونکہ ہم بھی انہیں ہی دیکھ رہے تھے اس لئے مجبوراً پوچھنا پڑا کہ کیا بات ہے بڑے پر جوش نظر آرہے ہیں۔ کہنے لگے، آپکو پتہ ہے

ٹونی بلیئر کی سالی مسلمان ہو گئ۔

تو اس میں اتنا خوش ہونے کی کیا بات ہے لگ رہا ہے کہ آپکی ہونے والی  سالی آپکے ہاتھ پہ  مشرف بہ اسلام ہوئ ہیں۔ اس بات پہ انکا چہرہ لال ہو گیا اور باچھیں کھل گئیں فوری طور پہ تو یہی سمجھ آیا کہ ایک مشرقی، کنوارے مرد کو سالی کے تذکرے پہ اسی طرح حیا کا مظاہرہ کرنا چاہئیے۔

  کہنے لگے، انشاللہ، ہمارے اعمال درست رہے تو خدا ہمیں بھی کسی ایسی نیکی کی توفیق دے گا۔ جی ہاں، میں سمجھ رہی ہوں۔ اس بہانے آپ کسی گوری خاتون سے شادی کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے آپ ٹونی بلیئر سے ایک میٹنگ کر لیں باہمی دلچسپی کے  امور پہ گفت و شنید کے لئے۔ بارے آپکے علم میں آجائے کہ وہ کون سی نیکی ٹونی بلیئر نے کی کہ اسکے نتیجے میں اتنی نیک سالی انہیں ملی۔

مذاق بنا رہی ہیں آپ میرا،  اہل کتاب خاتون سے تو مسلمان مرد کا شادی کرنا جائز ہے۔ اہل کتاب کا مسلمان مرد سے شادی کرنا جائز ہے تو مسلمان مرد انہیں مسلمان کیوں کرتے ہیں، میں ہنسی۔ آپکے عمران خان نے بھی جمائمہ خان کو مسلمان کر کے شادی کی تھی۔ پھر انکی علیحدگی ہو گئ اور وہ خاتون ایک مغربی خاتون کی طرح اپنے شب و روز اپنے وطن میں گذارنے لگیں۔ عمران خان یا انکی بیگم  کے تذکرے پہ وہ ایکدم لال ٹماٹر ہوئے۔ دیکھیں، وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ کوئ شخص مسلمان ہونے کے بعد اپنے شب و روز کیسے گذارتا ہے یہ آپکا سر درد نہیں ہے۔ خاص طور پہ کسی نو مسلم اہل کتاب خاتون کے متعلق اس طرح بات کرنا تو اخلاقی طور پہ کوئ اچھی بات نہیں۔ پھر وہ اٹھے اور دراز سے چھری نکالی۔  میں نے چستی سے اپنے اور دروازے کے درمیان ، انکے اور دروازے کے درمیان اور پھر اپنے اور انکے درمیان فاصلے کو نظروں سے ناپا اور سوچا کہ تمام فاصلے انتہائ مناسب ہیں اور اگر میں ذرا بھی جسمانی پھرتی سے کام لوں تو فرشتوں کے حساب سود زیاں والے انٹرویو سے جلدی سامنا ہونے سے بچا جا سکتا ہے۔

اس لئے ایک دفعہ پھر ہمت کڑی کر کے  اخلاقی گراوٹ کا مظاہرہ کیا۔ یہ بتائیے کہ ایک نو مسلم اہل کتاب خاتون کو جب آپ تمام رعائیتیں دینے کو تیار ہیں تو کئ اور جدی پشتی مسلمان خواتین کو جو مشرقی روایات کی خاصی حد تک علمبردارہیں کیوں ہر وقت اسلام کے دائرے سے باہر کرنے پہ  کمر بستہ رہتے ہیں یہی سلوک آپکا جدی پشتی مسلمان مردوں کے ساتھ بھی ہے۔ آخر کیوں؟

جواباً وہ چھری کی نوک پہ سیب کی ایک قاش پھنسا کر میرے ذرا قریب آ گئے۔  ایسے ہی جدی پشتی مسلمانوں نے مسلمانوں کی عزت کا جنازہ نکال ڈالا ہے۔ اب ان جیسے روشن خیال ڈھیٹ دیکھ لیں پاسباں ملیں گے کعبے کو صنم خانے سے۔ پھر سیب کی اس قاش کو کچر کچر چبانے لگے۔

میرا تو خیال ہے کہ آجکل کے حالات دیکھتے ہوئے ٹونی بلیئر کی سالی کا مسلمان ہونا ہی اسکے روشن خیال اور ڈھیٹ ہونے کا ثبوت ہے۔ میں نے اپنے دوپٹے کے پلو کو  تفکر میں مروڑا۔  لیکن پھر اچانک ہی  میرے منہ سے ایک ہلکی پر جوش چیخ نکلی۔ واءو، یوریکا شعر مکمل ہو گیا۔

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے بھائ میاں

ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا

انہوں نے مجھے ترس کھانے والی نگاہوں سے دیکھا۔ اور جا کر اس خبر کو دوسرے جدی پشتیوں کو اس طعنے کے ساتھ فارورڈ کرنے لگے کہ  بے حیا ، شرم کر۔

-

-

-

چھری واپس دراز میں ، سیب پیٹ میں۔ میں اپنی جگہ محفوظ۔ لیکن یہ کیسی سرگوشی ہے؟

اب بھی وزن پورا نہیں ہوا۔

شاعری کیا ہے بات میں وزن کا پیدا ہونا۔

مجھے تو لگتا ہے یہ مصرعہ کسی کی سازش ہے یا بد دعا۔

11:23 AM

اقبال, انگریز, برطانیہ, ٹونی بلیئر, غالب, لارن بوتھ, مومن

مہنگائ کے مارے

مہنگائ کا عفریت ہم سب کو نگلنے کے لئے تیار بیٹھا ہے۔ مگر سلام ہے ہماری قوم پہ کہ نہایت استقامت سے تقدیر پہ راضی بہ رضا ہے۔ حالانکہ شاعر مشرق فرما کر جا چکے کہ تقدیر کے پابند ہیں نباتات، جمادات۔ اب ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ ہم نباتات ہیں یا جمادات۔

ویسے تو ہر تھوڑے دنوں میں ہی چیزوں کی قیمتیں بدل جاتی ہیں۔ اور پچھلے سال کی قیمتوں کا بیان معلوم ہوتا ہے کہ قصہ ء پارینہ ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ گوشت ڈھائ سو روپے کلو تھا اب سوا تین سو روپے کلو ہے۔

عید کے فوراً بعد ، گھر میں کچھ ایسے مسائل آ کھڑے ہوئے کہ میں فوری طور پہ بازار نہ جا سکی۔ تقریبا آٹھ دن بعد جب فرج نے اعلان کیا کہ ذخیرہ کی ہوئ تمام سبزیاں ختم ہو گئیں ہیں تو میں نے جمعہ بازار کا رخ کیا۔

لیکن وہاں داخل ہوتے ہی حیرت کا دھچکہ لگا۔ پیاز پچاس روپے کلو، آلو چالیس روپے، ٹماٹر اسی روپے، بھنڈی اسّی روپے، اور لوکی جیسی معصوم سبزی  بھی پچاس روپے کلو۔

سوچا، قوم عید منا رہی ہے۔ منڈی میں مال پہنچا نہیں ہوگا۔ لیکن اگلے پانچ دن بعد بھی جب حالات یہی رہے اور دوکاندار کلو کے بجائے پاءو میں بھاءو بتاتے نظر آَئے۔ پندرہ روپے پاءو ٹنڈے  اور پندرہ روپے پاءو بیگن۔ تو کیا اب ہم سبزی بھی پاءو کے حساب سے خریدیں گے؟

  میں نے اپنے خیال پہ نظر ثانی کی۔ قوم عید نہیں منا رہی، خود کشی کرنے کو تیار بیٹھی ہے۔ لیکن قوم پہ نوحہ پڑھنے کے علاوہ میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں نے گھر آ کر سوچا اور اسی دن مالی کو اس بات کا احساس دلاتے ہوئے کہ اسکی لاپرواہی سے گھاس میں چھوٹے چھوٹے جنگلی پودے نکل آئے ہیں۔ مجھے خیال آیا کہ یہ سب محنت کیوں۔ کیا اس لئے کہ گرمیوں میں کچھ موتئیے کے پھول آجائیں اور سردیوں میں رات کی رانی مہکے۔  اس چھوٹے سے لان کی ہری بھری گھاس دیکھ کر لوگ کہیں گھاس تو بڑی اچھی ہے آپ کی۔ یا فرن کے ایک قطار میں لگے پودوں کی خوش نمائ دیکھوں اور منی پلانٹ کے بڑے بڑے پتوں پہ نثار ہوتی رہوں۔

اسی دن میں نے فیصلہ کیا کہ پانی کی عظیم نعمت اور زمین کا یہ چھوٹا سا ٹکڑا ، اپنے صحیح استعما ل میں آنا چاہئیے۔ ترجیحات کا تعین  نئے سرے سے ہونا چاہئیے۔ اگر ہمارے حکمراں، ہمارے رہ نما، ہمارے دانشور، ہمارے بوڑھے اور ہمارے جوان اس بات کو محسوس نہیں کر پا رہے تو مجھے تو اپنے طور پہ اپنی ترجیحات متعین کر نے کی آزادی ہے۔

 میں اسی وقت نیٹ پہ بیٹھی کہ کراچی میں اچھے بیج کہاں ملیں گے۔ کیونکہ اس سے پہلے ایک دفعہ کیا گیا میرا تجربہ بیج اچھے معیار کے نہ ہونے کی وجہ سے فیل ہو گیا تھا۔

زیادہ تر پتے جو حاصل ہوئے وہ پرانے شہر کے تھے۔ جہاں کی گلیوں سے میری اتنی واقفیت نہیں اور وہاں گاڑی کی پارکنگ کا سنگین مسئلہ بھی رہتا ہے۔ ایک بلاگ پہ سرچ کرتے ہوئے مجھے ایک موبائل نمبر ملا جو کسی توفیق پاشا کا تھا۔

اگلے دن صبح میں نے انہیں فون کیا۔ انگیج تھا۔ پھر میں سوچنے لگی باقی کے نمبروں میں سے کس سے بات کروں کہ میرا فون بج اٹھا۔ یہ

توفیق پاشا

تھے۔ انہوں نے دریافت کیا کہ کیا میں نے انہیں فون کیا تھا۔ میں انکے اخلاق سے متائثر ہوئ، انہیں اپنا مسئلہ بتایا۔

 معلوم ہوا کہ وہ ٹی وی کے کسی چینل سے جس کا نام میں اس وقت بھول گئ ہوں باغبانی کا ایک پروگرام  باقاعدگی سے کرتے ہیں۔ خیر، انہوں نے مجھے

ایمپریس مارکیٹ

اور سبزی منڈی کے قریب ایسی دوکانوں کے بارے میں بتایا۔ جہاں سے وہ بیج لیتے ہیں۔ اسکے علاوہ ڈیفینس میں لوٹیا کی دوکان موجود ہے۔

ایمپرہس مارکیٹ کراچی

 میں نے ڈیفینس والا پتہ نظر انداز کیا کہ چیزیں امکان یہی ہے کہ زیادہ قیمتوں کی ہونگیں۔

اگلے دن ایمپریس مارکیٹ صدر کا رخ کیا، وہاں پہ عبداللہ سیڈ اسٹور تلاش کرنا مشکل نہ تھا۔ ایمپریس مارکیٹ اپنے ماحول کی وجہ سے مجھے خاصی پسند ہے۔ حالانکہ اس مارکیٹ میں پہلی دفعہ میں اپنی شادی کے بعد گئ۔

جناب وہاں سے مجھے بیج مل گئے۔ شملہ مرچ ہری اور لال، کھیرا، ٹماٹر، تورئ، سیم، بروکلی، سلاد پتہ،ہرا دھنیا، اسکے علاوہ موسمی پھولوں کے بیج۔ اگلے دن صبح مشعل کو اسکول چھوڑا اور واپسی پہ کھاد والے کے پاس  سے دو طرح کی کھاد لی۔ ایک گٹر کی کھاد کہلاتی اور دوسری اوجھڑی والی۔ اور ایک بوری ریت کی بھی۔  یہ سب سامان لے کر گھر لوٹی۔ گھر آ کر خالی گملوں کو نکال کر انہیں پنیری کے لئے تیار کیا یعنی مٹی اور کھاد ڈالی۔ باقی گملوں کے بارے میں کڑا فیصلہ کیا کہ کس میںسے پودے ہٹانے ہیں۔ لان میں ایک موتئیے کا جھاڑ ایک کونے سے نکلوایا۔ ایک پودا کافی ہے۔ یہ یاد رکھنے کو کہ موتئیے کا پھول ایسا ہوتا ہے۔ اسکی جگہ تورئ کے بیج ڈالدئیے۔ایک کیاری سے للّی کے پھول کے پودے سارے نکلوا دئیے۔ گملے میں ایک پودا کافی ہے۔ اور اسکی جگہ ہرا دھنیا لگا دیا۔ایک تین فٹ اونچے گملے میں سیم کے بیج لگا دئیے ہیں اور ایک پلاسٹک کی ڈھائ فٹ اونچی بالٹی میں کھیرے کے بیج۔  پھر مالی سے کہا کہ فرن کے سارے پودے ہٹانے ہیں اسکی جگہ سلاد پتہ اور بروکلی لگا دیں گے۔ فرن کے تذکرے پہ اسکا دل ٹوٹا۔ کہنے لگا باجی، اب سارا لان ایسا مت کر دیجئیے گا۔ دل میں سوچ رہا ہوگا کہ کیا لان کے اوپر ہلاکو خان بنی ہوئ ہیں۔ لیکن اسے خبر ہونی چاہئیے کہ جب ملک میں اندہیر نگری چوپٹ راج ہو تو ہلاکوءوں کی عید ہوتی ہے۔ اچھا، باقی سارے بیجوں کو گملوں میں لگا دیا کہ انکی پنیری تیار ہو جائے۔  پھر سوچیں گے کہ انہیں کہاں فٹ کرنا ہے یا انکے لئے مزید گملے لے کر پچھلے صحن میں ڈال دئیے جائیں۔

کچھ پودے نکل آئے ہیں۔ اب آگے کے مسائل شروع ہو رہے ہیں۔ ایک بلی کہیں سے رات کو آجاتی ہے جو مختلف جگہوں پہ گملوں اور زمین کو کھود دیتی ہے۔ بغیر یہ خیال کئیے کہ اس میں ننھے ننھے پودے ہیں۔ اپنی غلاظت کو چھپانے کے لئے مناسب مقام تلاش کرتی پھرتی ہے۔ ایک دفعہ پھر میں نے پھر نیٹ پہ سرچ کی کہ بلی کو کیسے بھگایا جائے۔  اور نتیجے میں اگلے دن زمیں پہ پسی ہوئ کافی کا پوڈر پھیلا دیا۔  اس کے لئے میں اپنے شوہر صاحب کی کافی پینے کی عادت کی شکر گذار ہوں۔ وہ روز اپنی کافی پیستے ہیں اور پھر ایک لمبا کپ بلیک کافی کا تیار کرتے ہیں۔  بغیر دودھ اور شکر کی یہ کافی نہ صرف اچھی کھاد ہے بلکہ بلیاں بھی اسکی بو سے بھاگتی ہیں۔

آجکل روزانہ صبح اٹھ کر اپنے ننھے پودوں کی قامت میں ا ضافے اور صحت کو دیکھتی ہوں اور اس دن کے خواب سجاتی ہوں جب کم از کم سبزی میں خود کفالت کو حاصل کرونگی۔

رہے ملکی حالات تو اس پہ بعد میں گفتگو ہوگی۔ تھرڈ ورلڈ  ملک میں رہنے کا فائدہ ہے کہ آپکو دنیا کی بے ثباتی پہ سوچنے کا یا تو موقع نہیں ملتا یا پھریقین نہیں رہتا۔

11:48 PM

ایمپریس مارکیٹ, باغبانی, توفیق پاشا, ڈیفینس, کراچی, مشعل

گا میرے منوا

یہ نئ نسل اس انداز سے نکلے سر بزم

کہ موءرخ سے گنہگار نہ ہونے پائے

لیکن تاریخ کی کلاس لینے کے بعد مصطفے  زیدی نے کبھی سوچا کہ  افتادگی ء زمانہ سے چکرائی ہوئی نسل کو قابو میں رکھنے کے لئے کیا کرنا چاہئیے۔ ایک ذہن میں آنے والے خیال کو  تو اس ویڈیو میں ددیکھ سکتے ہیں۔

جب چکرایا ہوا سر اپنے ماحول میں واپس پہنچتا ہے تو اپنا حال دیکھ کر اسے حال آجاتا ہے۔ کچھ لوگ اسکے لئے روحانی علاج تجویز کرتے ہیں اور کچھ کا کہنا ہے کہ چونکہ موسیقی روح کی غذا ہے اس لئے بہترین روحانی علاج گانا ہے۔ دانا کہتے ہیں کہ گائیے ، رونا اور گانا کسے نہیں آتا۔ لیکن ایسی سنی سنائ باتوں میں مت آجائیے گا کہ ایسا بھی ہوتا ہے۔

گانا جنوبی ایشیا کی ثقافت کا حصہ رہا ہے اور ایک قوم کی مذہبی عبادات کا قصہ بھی۔ یہاں کی سنگیت کی تاریخ اتنی شاندار رہی ہے کہ مائیکل جیکسن نے بھی اپنی فنی مہارت کو اس کے ساتھ مدغم کرنے کا مزہ لیا۔

یقین آیا، یہ مائیکل جیکسن ہے۔

ہمم لیکن پھر تاریخ۔ تاریخ ایک چلمن کی طرح راستے میں کیوں کھڑی ہو جاتی ہے۔ آئیے تاریخ اور چلمن کے درمیان تعلق نکالنے کی کوشش کرتے ہیں

  اس نتیجے کو سنگیت سے ضرب دیں۔  اگر کوئ تعلق نہ نکل پائے تو اس تحریر کو دوبارہ سے پڑھیں اور مکمل تجزئیے کے لئے ویڈیوز کو دوبارہ دیکھنا مت بھول جائیے گا۔ تعلق نکل آنے کی صورت میں  بے شمار فوائد ہیں۔ فوری طور پہ لاحول پڑھنے کا ایک صحیح موقع ملے گا۔  مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگی،  آپ،  ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو والی صورت سے باہر نکل آئیں گے۔ معاشی حالات بہتر بنانے کے لئے مالشئیے کا کاروبار برا نہیں عالمی کساد بازاری میں اس قسم کے پیشوں سے مستقل ذریعہ ء روزگار رہنے کا امکان رہتا ہے۔

چلیں پھر گانا شروع کریں۔

ایک

دو

تین

گا میرے منوا گاتا جا رے

12:55 PM

تاریخ, سنگیت, مصطفی زیدی, موسیقی

اسباب بغاوت ہند اور لائل محمڈنز آف انڈیا-۲

گذشتہ سے پیوستہ

ہنگامے کے دنوں میں کچھ مسلمان علماء نے ایسے مضامین اور رسالے لکھے جن میں عیسائیوں کو نصاری کہا گیا تھا۔ انگریز حاکموں نے اسکا برا مانا۔ انہوں نے سمجھا کہ جیسے یہودی حقارت میں حضرت عیسی کو ناصری کہتے ہیں اسی طرح مسلمان لکھنے والوں نے عیسائیوں کی توہین کی ہے اور یہ لوگ دل سے مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ انگریزوں کا رد عمل اس سلسلے میں اتنا شدید تھا کہ انہوں نے بعض ایسے علماء اور مصنفین کو پھانسی دے دی۔ سر سید نے فوری طور پہ ایک رسالہ نصاری لفظ کی تحقیق پہ لکھا اور یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں نے جو عیسائیوں کو نصاری لکھا ہے تو اسکی مشتق ناصری نہیں بلکہ نصر ہے۔ یہ قرآن سے بھی ثابت ہے۔ قرآن میں کہیں ناصرہ کے قریہ کا تذکرہ نہیں آیا۔ بلکہ حضرت عیسی اور انکے حواریوں کے نصاری ہونے کا بیان اس طرح آیا ہے کہ حضرت عیسی نے کہا من انصاری الی اللہ تو حواریوں نے کہا نحن انصاراللہ۔ سورہ مائدہ میں ارشاد ربانی ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو پائے گا اہل کتاب میں سب سے زیادہ مسلمانوں کا دوست انکو جنکا قول ہے کہ ہم نصاری ہیں انہوں نے اس مضون کا ترجمہ انگریزی میں کروایا اور سب انگریز حاکموں کو اسکی نقل بھیجی۔ یہ مضمون اردو ااور انگریزی اخبارات میں بھی چھپوایا۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد لفظ نصاری کا قصہ ختم ہوا اور اس بناء پہ مسلمانوں کو سزائیں دینے کا سلسلہ بند ہوا۔

اسی وقت انگریز اور ہندو مصنفین نے بھی تحاریر کا سلسلہ شروع کیا ہوا تھا اور ان میں سے اکثر کا مءوقف یہ تھا کہ مسلمان مذہباً عیسائیوں کے دشمن ہیں انکا مذہب انہیں عیسائیوں کے خلاف جہاد کرنے کی تعلیم دیتا ہے بلکہ عیسائیوں کے خلاف جہاد ان پہ مذہباً فرض ہے۔ وہ انگریزی حکومت کے خیر خواہ ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ پروپیگینڈہ انتہائ زہریلا تھا اور اس سے مسلمانوں کا ہندوستان میں بطور مسلمان رہنا مشکل نظر آرہا تھا۔ یہ تباہی بالکل سامنے تھی اور واضح ہوتی جارہی تھی۔ سر سید ان الزامات کا اثر زائل کرنے کمر بستہ ہوئے۔ انہوں نے رسائل کا ایک سلسلہ شروع کیا جس کا نام لائل محمڈنز آف انڈیا رکھا۔ اس میں پہلے تو انہوں نے دلائل سے ثابت کیا کہ مذہب کی رو سے ہندوستان کی تمام اقوام میں صرف مسلمان ہی ایسی قوم جو انگریزوں کی وفادار ہو سکتی ہے

قرآن اور احادیث کا حوالہ دیا کہ جسطرح مسلمان اپنے رسول پہ ایمان رکھتے ہیں اسی طرح وہ حضرت عیسی اور بائبل پہ یقین رکھتے ہیں. اسلام کسی ایسے گروہ یا جماعت کے خلاف جہاد کی اجازت نہیں دیتا جو انکے مذہبی فرائض کی ادائیگی میں مخل نہ ہو۔ پھر سر سید نے ہندوستان بھر سے ایسے مسلمانوں کے کوائف اکٹھا کئے جو ہنگامے کے دنوں میں انہی کی طرح انگریزوں سے خیر خواہی اور ہمدردی کا رویہ رکھا اور انکی حفاظت کے لئے اپنی اور اپنے گھر والوں کی جانوں کی قربانی دی۔

انگریزوں کا ایک عام عقیدہ اس وقت یہ تھا کہ اسلام اور تہذیب و شائیستگی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سر سید نے دلیلیں اور مستند حوالے اکٹھے کرکے یہ ثابت کیا کہ اسلام اور صرف اسلام ہی سب سے بڑھ کر تہذیب و شائیستگی، خوش اخلاقی اور دوسروں سے ہمدردی کا سبق دیتا ہے۔

یہ رسالے ظاہر ہے مسلمانوں کی طرفداری میں لکھے گئے تھے اس لئے سر سید لکھتے ہیں کہ۔

ہاں یہ بات تو مجبوری کی ہے کہ میری پیدائیش ہندوستان میں ہوئ اور میں بلاشبہ مسلمان ہوں اور مسلمانوں کا ذکر خیر اس کتاب میں لکھتا ہوں۔

سر سید کی ہمہ گیر اور مختلف النوع قومی جد وجہد کے لئے مولانا صلاح الدین احمد اپنے تبصرے میں لکھتے ہیں

ایک معرکہ ء عظیم ہے جس کے مختلف محاذوں پہ بیک وقت یورش جاری ہے اور دفاع بھی۔ اور بڈھا سپہ سالار ایک ہاتھ میں دوربین اور دوسرے میں شمشیر عمل لئے ہر مورچے پر مثل برق پہنچتا اور مثال ابر گرجتا ہے۔

جاری ہے

4:08 PM

اسباب بغاوت ہند, اسلام, انڈیا, انگریزی حکومت, جنگ آزادی, سر سید احمد خان, لائل محمڈنز آف انڈیا, مسلمان

اسباب بغاوت ہند اور لائل محمڈنز آف انڈیا-۱

گذشتہ سے پیوستہ

اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی کے بارے میں سر سید کا مئوقف تھا کہ یہ نہ تو ملکی بغاوت تھی نہ کوئ سازش بلکہ محض سپاہیوں کی حکم عدولی تھی

ان کارتوسوں

کے سبب جس میں اطلاع یہ تھی کہ گائے اور سوءر دونوں کی چربی شامل تھی اور جسے استعمال سے پہلے دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا۔ یہ چیز انگریز حکومت کی مختلف پالیسیوں سے پہلے سے شاکی ہندو اور مسلمان دونوں کے جذبات بھڑکانے کا باعث بنی۔ اس  نے پھیل کر مسلمانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور ایک عام تائثر یہ بنا کہ یہ سب مسلمانوں کا کیا دھرا تھا۔

اپریل ، ۱۸۵۸ میں مراد آباد واپس پہنچتے ہی انہوں رسالہ

اسباب بغاوت ہند

لکھنے کا کام شروع کیا۔جس میں انہوں نے شواہد کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ اس میں ساری غلطی انگریز حکومت کی تھی۔ انہوں نے ہندوستانیوں کے جذبات و احساسات کو اپنے روئیے اور ناروا سلوک بری طرح مجروح کیا ہوا تھا۔ سپاہی اور دسرے لوگ انگریزوں کے خلاف جذبات سے بھرے ہوئے تھے کارتوسوں کے قصے نے جلتی پہ تیل کا کام کیا اور یہ ہنگامہ اچانک بھڑک اٹھا۔

سر سید نے اس نازک وقت میں وہ تمام الزامات جو لوگوں کے خیال میں حکومت پہ عائد ہوتے تھے دلیری اور جراءت کے ساتھ بیان کر ڈالے۔ یہی نہیں بلکہ اسکی پانچ سو کاپیاں سن ۱۸۵۹ میں تیار کر والیں۔ وہ اس رسالے کو لندن میں ارکان پارلیمنٹ کو بھیجنا چاہتے تھے تاکہ انہیں صحیح صورت حال سے آگاہی ہو۔

انکے دوستوں اور خیر خواہوں نے انکو اس اردے سے باز رکھنا چاہا۔ لوگوں نے مشورہ دیا ان کتابوں کو جلا ڈالو اور اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈالو۔

سرسید نے کہا کہ

میں ان باتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا ملک اور قوم اور خود گورنمنٹ کی خیر خواہی سمجھتا ہوں۔ پس ایک ایسے کام پر جو سلطنت  اور رعایا دونوں کے لئے مفید ہو مجھ کو کچھ گزندبھی پہنچ جائے تو گوارا ہے۔

انہوں نے ہمت کی اور اسکی پانچ سو کم کاپیاں ارکان پارلیمنٹ اور برطانوی حکومت اور انڈیا آفس میںتقسیم کرنے کی غرض سےبذریعہ ڈاک بھیج دیں۔ ایک کاپی گورنمنٹ آف انڈیا کو خاص گورنر جنرل کے ملاحظہ کے لئے پیش کر دی گورنر جنرل نے اسکا ترجمہ کروا کے مندرجات کا جائزہ لیا اور کونسل میں ممبران کے اجلاس میں اس پر بحث کی۔اگر چہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ یہ تحریر اصلاح احوال کے لئے ہے۔ لیکن کونسل کے اک ممبرسیل بیڈن کو جو اس وقت سیکریٹری خارجہ تھا اس پہ شدید اعتراضات ہوئے اور اس نے نہ صرف اس تحریر کو بغاوت پہ محمول کیا۔ بلکہ مصنف پہ مقدمہ چلا کر ضابطے کی کارروائ عمل میں لانے کا کہا۔ ۔

بیڈن نے سرسید سے ملاقات کے دوران تلخی کا مطاہرہ کیا اور کہا کہ وہ اگر اپنے عمل میں مخلص ہوتے تو اسکی اشاعت نہ کرواتے اور تحریر صرف گورنر جنرل کو پیش کرتے۔ جب سر سید نے بتایا کہ پورے ہندوستان میں اسکی ایک کاپی گورنر جنرل کو بھیج ہے اور ایک دو کاپیاں انکے پاس محفوظ ہیں اور باقی سب لندن بھجوا دی گئ ہیں تو اسے یقین نہ آیا۔ تحقیق ہوئ اور سر سید کی بات درست نکلی۔ بیڈن کے دل سے بد گمانی دور ہوئ اور وہ انکا دوست بن گیا۔

لندن میں اس رسالے کے متعدد ترجمے ہوئے اور اہل سیاست اور اہل حکومت میں اس پہ بحث ہوئ۔ لیکن بالآخر وہ سر سید کے نکتہ ء نظر کے قائل ہو گئے۔

اس رسالے میں انہوں نے یہ بھی لکھا کہ گورنر جنرل کی کونسل میں کوئ مقامی رکن موجود نہیں اس لئے اعلی انتظامی سطح پہ ہندوستانیوں کی نمائیندگی اور انکے نکتہ نظر کے اظہار کی کوئ صورت نہیں۔ انہوں نے مقامی باشندوں کی شمولیت پہ زور دیا اور انکی یہ تجویز مان لی گئ۔ لارڈ لٹن کے دور میں سر سید کو گورنر جنرل کی کونسل کا رکن نامزد کیا گیا۔ اسی رسالے سے مسٹر ہیوم کے ذہن میں انڈین نیشنل کانگریس قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔

جاری ہے

4:06 PM

روڈ پہ

مشعل کو بڑا مزہ آتا ہے جب کسی کو ڈانٹ پڑ رہی ہو۔ اور اگر اسے ذرا بھی شبہ ہو کہ کسی کو ڈانٹ پڑنے والی ہے تو وہ موقع پہ جم جاتی ہے سو بعض اوقات گھر میں لوگوں کو اس وجہ سے ڈانٹ موءخر کرنی پڑتی ہے۔ کیونکہ انکی موجودگی کی وجہ سے ڈانٹ میں وہ کڑک نہیں پیدا ہو پاتی جس کا اثر تا دیر رہے۔

کسی شخص کو بے وقوف کہنا وہ عیاشی ہے جسے وہ وقتاً فوقتاً حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ اس لئے جب بھی کسی کو بے وقوف کہا جائے وہ ہمیشہ وجہ پوچھتی ہیں کہ اسے بے وقوف کیوں کہا گیا۔ اسکا مقصد عبرت حاصل کرنا نہیں بلکہ دوبارہ کسی سے بھی اس حرکت کے سرزد ہونے پہ انکا سب سے پہلے بے وقوف کہنے کی تیاری ہے۔

اپنی مونٹیسوری آتے جاتے ہوئے، دن میں ایک وقت وہ میرے ساتھ اور دوسرے وقت اپنے ابا کے ساتھ ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی ابا کی زیادہ مصروفیت کی وجہ سے دونوں وقت یہ میری ذمہ داری ہو جاتی ہے۔ رستہ بھر ہم دونوں باتیں کرتے جاتے ہیں اس میں انکا حصہ زیادہ ہوتا ہے لیکن زبان کے ساتھ وہ خود بھی بہت متحرک رہتی ہیں اس لئے ڈرائیونگ کے دوران  ہر تھوڑی دیر بعد مجھے کوئ نصیحت کرنی پڑتی ہے۔  مثلاً سیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھو، چہرہ آگے کی طرف رکھو، گاڑی سے ہاتھ باہر بالکل نہیں نکالنا، پیچھے والی سیٹ پہ جانے کی کوشش نہ کرو، پیچھے سے آگے آنے کی حماقت نہیں کرنا، چلتی گاڑی میں پانی خود سے نہیں پینا وغیرہ وغیرہ۔

ابھی تین چار دن پہلے جب میں نے ایک موٹر سائیکل والے کو اپنے برابر سے مسکراتے ہوئے نکلتے دیکھا تو  روڈ سے نظر ہٹا کر ان پہ ڈالی، وہ کھلی کھڑکی سے ہاتھ باہر نکالے پاس سے گذرنے والوں سے جذبہ ء خیر سگالی کا مظاہرہ کر رہی تھِں۔ میں  بالکل اصل والے غصے میں چنگھاڑی۔ مشعل کتنی دفعہ منع کیا ہے چلتی گاڑی میں سے ہاتھ باہر نہیں نکالا کرو، بالکل یاد نہیں رکھتیں تم۔ انہوں نے میرے چہرے کے تائثرات دیکھے اور پھر سیٹ پہ بیٹھ گئیں۔ کچھ منٹ خاموشی رہی۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا وہ دونوں ہاتھ گود میںرکھے ، منہ پھلائے ڈیش بورڈ کو تک رہی تھیں۔ اس وقت میں نے انکے حواسوں کو مہمیز کرنے والا جملہ بولا۔ ارے یہ کیا؟ فوراً ہی آواز آئ کیا ہوا ماما؟ یہ بس پہ اتنے سارے لوگ چڑھے بیٹھے ہیں۔ کراچی میں یہ منظر روز کا منظر ہے۔ لیکن میں نے مشعل کی توجہ  اس طرف کرائ۔ محض گاڑی کے ماحول کے تناءو میں کمی کے لئے۔

کتنے بے وقوف لوگ ہیں چھت پہ بیٹھے ہیں، کتنا خطرناک ہے یہ گر بھی سکتے ہیں۔ میں نے یہ سارے ڈائیلاگز بولے کہ مشعل کے پسندیدہ ہیں۔ انہوں نے بھی اپنی تشویش کا اظہار کیا یہ تو بے وقوف لوگ ہیں ایسا تو نہیں کرنا چاہئیے۔ ہم تو اپنی گاڑی کے اندر بیٹھے ہیں۔ ہے ناں ماما۔ اگریہ گر جائیں تو چوٹ لگ سکتی ہے پھر ڈاکٹر کے پاس جانا پڑے گا۔ وہاں ڈاکٹر انجکشن لگائے گا پھر روئیں گے کہ تکلیف ہو رہی ہے۔ مشعل نے اپنی آپ بیتی کو شامل کر کے ایک پورا ڈرامہ کھڑاکر لیا۔ اسکول پہنچنے تک بے وقوف لوگوں، ہسپتال اور ڈاکٹر کے تذکرے میں ہم الجھے رہے۔ اسکے بعد سے وہ روڈ پہ ایسی گاڑیوں کو نظر میں رکھتیں کہ پھرلوگوں کو بے وقوف کہنے کا موقع ملے گا۔

 آج صبح بھی جب ہم ایک چورنگی سے مڑے تو سامنے ایک رکشہ جا رہا تھا۔ میں نے تو دھیان نہیں دیا کہ روڈ کہ باقی پیرامیٹرز کو دھیان میں رکھنا تھا۔ لیکن مشعل کی آواز آئ۔ کتنا بے وقوف بچہ ہے رکشے کے اوپر بیٹھا ہے ایسا تو نہیں کرنا چاہئیے۔ یہ گر بھی سکتا ہے، اسے چوٹ بھی لگ سکتی کتنا خنّاک ہے۔ ماما ہم تو ایسا نہیں کرتے ناں۔ میں نے دیکھا کہ رکشے کی چھت پہ ایک گیارہ بارہ سال کا بچہ جیسے تخت طاءوس پہ بیٹھا ہوا تھا۔  زیر لب مسکراہٹ سے کہا ہمم، ہم ایسا نہیں کرتے۔ پھر سوچا ہم ایسا کیسے کر سکتے ہیں ہم اسکے مقابلے میں بہتر سہولیات زندگی رکھتے ہیں۔  لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ جو میری بچی کو پتہ ہے  یہ  پورا سچ نہیں ہے۔ اور مشعل کو اس پورے سچ کو جاننے میں وقت لگے گا۔ پھر وہ سامنے دیکھتے دیکھتے،  میری طرف مڑی۔ اور کہنے لگی، ماما لگتا ہے رکشے کے اندر جگہ نہیں ہوگی۔ میں نے کچھ حیرانی، کچھ مادرانہ فخر اور خوشی سے اپنی بیٹی کو دیکھا۔ یہ وہ خصوصیت ہے جومیں اس میں چاہتی ہوں۔ وجوہات پہ غور کرنا، جو نظر نہیں آرہا، اسکے بارے میں بہتر اندازہ لگانا اور پھر نتیجہ نکالنا۔

12:08 PM

ٹریفک, کراچی, مشعل, مونٹیسوری

دل کی زبان

اپنے قارئین سے معذرت، جیسا کہ آپ نے محسوس کیا ہو گا کہ اس پوسٹ کے ساتھ کچھ مسئلہ ہے۔ یہ پوسٹ میں نے آج صبح لکھی اور ابھی مکمل بھی نہ تھی کہ اٹھنا پڑا لیکن سیو کرنے کے بجائے پبلش کا بٹن دبا دیا۔  اب میں نے اسے مکمل کر دیا ہے۔

مزاروں کی مسلم آبادی میں بڑی اہمیت رہی ہے۔ جہاں شب برات کی عبادت میں قبرستان جانا ضروری ہے وہاں تصوف کے مختلف سلسلے اپنے اپنے انداز میں مزاروں پہ عرس منعقد کرتے ہیں اور عام لوگ اپنی خواہشوں کو ناممکنات میں سے سمجھ کر انہی مزاروں کا رخ کتے ہیں کہ صاحبان مزار جو کہ اب انکےعقیدے کے مطابق روحانی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں ، اس کائینات کے خالق اعلی کے پاس انکی درخواست ذاتی طور پہ پہنچا سکیں اوراسکے لئے سفارش بھی کر سکے۔ ایک بڑی تعداد کو یقین ہے کہ انکے بیشتر مسائل اسی طرح حل ہوئے۔

لیکن مزار کے ان روحانی سلسلوں سے ہٹ کر جن پہ میں کچھ ایسا یقین نہیں رکھتی یہ لوگوں کو اپنی زندگی کی یکسانیت سے نجات دیتے ہیں۔  بر صغیر کی ہزار سالہ تاریخ میں انکا وجود مرکز میں رہا ہے اور ان صوفیوں نے اسلام کی سادگی سے عام لوگوں کو متعارف کرایا بجائے علماء کے علم نے۔ یہ انداز یہاں کے باشندوں کے ثقافتی انداز کے بھی قریب تھا۔ میلہ ٹھیلہ، طرح طرح کے لوگ کا ہجوم اور انکی عقیدت  کے مختلف مناظر۔ مجھے یہ مزار انسانی فطری آزادی کی چاہت نظر آتے ہیں۔

یہاں ایسی ایسی خواتین بھی عالم رقص میں نظر آتی ہیں جن کا سایہ بھی کبھی کسی نے عام زندگی میں نہیں دیکھا ہوتا۔ ایک عام عورت کی حیثیت وہ اپنی ذات کا کوئ استحقاق نہیں رکھتیں لیکن ایک جناتی مخلوق کا سایہ ان کی حکمرانی کے جذبے کی تسکین کرتا ہے۔ تمام زندگی ایسی چہار دیواری میں زندگی گذارنے والیاں سال میں ایک دفعہ کسی مزار پہ پہنچنے کا موقع حاصل کرتی ہیں اور پھر رج کر اپنی جسمانی آزادی کو استعمال کرنے کا مزہ چکھتی ہیں۔ ان پہ کسی جن کا سایہ ہے یا وہ گھٹن کا شکار ہیں۔ یہ کوئ نہیں جانتا، سب دور سے کھڑے تماشہ دیکھتے ہیں۔ وہ حالت حال میں ہے۔

پورے پورے خاندان، بڑی بڑی گاڑیاں پکڑتے ہیں اور مزارات کا رخ کرتے ہیں۔ خیمے لگاتے ہیں اور تین چار دن یا اس سے بھی زیادہ وقت گذارتے ہیں۔ مختلف قسم کے عقائد کا فرق رکھنے کی وجہ سے کچھ لوگ ان تمام رسومات کو غیر اسلامی سمجھتے ہیں۔ میرا بھی ذہنی رجحان اس سمت نہیں۔ آج تک جن مزارات پہ گئ۔ اسکا مقصد وہاں پہ موجود خلقت کو محسوس کرنا ہی رہا۔ لیکن اپنے آپ سے ایک سوال کرتی ہوں کہ کیا اس تمام عمل سے لا تعلق رہنے کی وجہ سے میں اپنے آپکو اس کام کے لئے تیار پاتی ہوں کہ کسی مزار پہ جا کر ایک خودکش جیکٹ کے ذریعے خود کو اڑادوں۔ تاکہ لوگ اپنے مسائل کے حل کے لئے ان مردہ ہستیوں کے مزار پہ جا کر میرے عقیدے کے مطابق غیر اسلامی حرکات نہ کریں۔ شرک نہ کریں، بدعت نہ کریں۔ اور اگر وہ ایسا کریں گے تو ہم بزور طاقت انہیں ایسا کرنے سے روکیں گے۔

افسوس، میں ایسا کچھ نہیں کر سکتی۔ میں انکے عقیدے کا مذاق اڑا سکتی ہوں، میں ان سے بحث اور دلیل بازی کر سکتی ہوں۔ اور بے زار ہو کر انہیں انکے حال پہ چھوڑ سکتی ہوں۔ لیکن یہ وہ کام ہے جو میں نہیں کر سکتی۔ اور معزز قارئین یہ سارے آپشنز جو میں نے آپکو بتائے ہیں یہ بھی میں ہر ایک کے ساتھ نہیں کرونگی۔ مجھے معلوم ہے کہ انسانوں کو اپنی زندگی میں کچھ ایسے موقعے اور جگہیں چاہئیے ہوتی ہیں۔ جہاں وہ اپنے جذبات مکمل طور پہ بہا سکے، جہاں وہ اپنی کم مائیگی کو فراموش کر سکے، جہاں وہ یہ یقین کر سکے کہ خدا اب بھی اس سے تعلق رکھتا ہے۔ بس ذرا کوئ ڈھنگ کا شخص خدا کے پاس اسکی وکالت کرتا رہے۔ وہ ناچتے ہیں کہ مینوں نچ کے یار مناون دے، وہ گاتے ہیں بلھے شاہ کی جاناں میں کون۔ مزراوں کے تخت سے حکمرانی کرنے والے یہ مردہ حاکم کبھی انکے دل کی زبان بول گئے تھے وہ آج تک اسکی لے کو اپنا محسوس کرتے ہیں۔ وہ اس صوفی بزرگ کا کلام گاتے ہیں، وہ ایک نظر آنے والے وکیل کو سجدے کرتے ہیں، وہ دل بھر کے روتے ہیں اور اپنے آپکو ایک نظر نہ آنے والی دنیا کے حوالے کر کے آخیر میں شانت ہو جاتے ہیں اس دریا کے ڈیلٹا کی طرح جو سمندر سے بس ملنے والا ہوتا ہے اس یقین کے ساتھ کہ اب اسکا سفر تمام ہوا اور سمندر کی ذمہ داری شروع ہو گئ۔

پھر یہ کون لوگ ہیں جنہوں نے پاکستان میں آزادی کے ان چھوٹے چھوٹے جزیروں کو اپنی بربریت کے لئے چنا ہے۔

اگر وہ اپنے عمل میں اتنے ہی مخلص ہوتے تو اس تمام کی وجوہات یعنی معاشرتی نا انصافی، غربت اور جہالت کو ختم کرتے۔ جب تک وہ یہ نہیں کریں گے انہیں یہ حق حاصل نہیں کہ وہ انسان کو اسکے منتخب کردہ اظہار سے روکیں۔ انہیں دیوانوں کی طرح ناچنے دیں، گانے دیں،  رونےدیں۔  جنگل کے مور کی طرح، اس سے پہلے کہ وہ اپنے وجود میں موجود ان بد ہیئت پیروں سے آگاہ ہوں جو انکے دل سے  زندگی کی خوبصورتی کا سرور چھین لیتے ہیں۔ خدا کے لئے انکے دلوں سے آزادی کا یہ ہلکا سا احساس مت چھینیں، ورنہ یہ انہیں درندہ بنا دے گا۔

اگر آپ انہیں تبدیل کرنا چاہتے ہیں تو پھر انکی زندگی سے کم مائیگی کے احساس کو نکالیں انہیں اس چیز کا فخر دلائیں کہ وہ خدا کے کنبے میں شامل ہیں اور ابھی آپ جیسے زندہ لوگ ان کے حقوق کی جنگ لڑنے کو تیار ہیں۔ اور آپ انکے دل کی زبان سمجھتے ہیں۔

بابا فرید گنج شکر کے

مزار پہ دھماکہ

، کئ افراد ہلاک اور زخمی۔

با با فرید کا کلام۔

11:39 AM

اسلام, با با فرید گنج شکر بخش, بدعت, پاک پتن, شرک, مزار

کتےپہ ایک نظر

کتے پہ پطرس شاہ بخاری نے جو کچھ لکھا اسکے بعد کسی اور کی ہمت نہیں ہو سکتی تھی کہ اتنی سادگی اور فصاحت سے کتوں سے واقف کراتا  کہ ہم تو ہم کتےتک عش عش کر اٹھے۔

اپنے مضمون 'کتے' میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

کتوں کےبھونکنے پہ مجھے سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ انکی آواز سوچنے کے تمام قوی معطل کر دیتی ہے۔ خصوصاً جب کسی دوکان کے نیچے سے ان کا ایک پورا خفیہ جلسہ سڑک پہ آ کر تبلیغ کا کام شروع کر دے تو آپ ہی کہیئے ہوش و حواس ٹھکانے رہ سکتے ہیں۔ کچھ انکا شور کچھ ہماری صدائے احتجاج زیر لب، بے ڈھنگی حرکات و سکنات، حرکات انکی سکنات ہماری۔ اس ہنگامے میں دماغ کام کر سکتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی مجھے نہیں معلوم اگر ایسے موقع پر دماغ کام کرے بھی تو کیا تیر مارے گا۔ بہر صورت کتوں کی یہ پرلے درجے کی نا انصافی میرے نزدیک ہمیشہ قابل نفرین رہی ہے۔ اگر انکا ایک نمائیندہ شرافت کے ساتھ ہم سے آ کر کہہ دے کہ عالی جناب سڑک بند ہے تو خدا کی قسم ہم بغیر چوں چرا کئے واپس لوٹ جائیں گے۔ اور یہ کوئ نئ بات نہیں ہے۔ ہم نے کتوں کی درخواست پر کئ راتیں سڑکیں ناپنے میں گذار دی ہیں۔

مگر انسانی تاریخ کا یہ حسن ہے کہ کسی ایک نکتے یا شخص پہ آکر جامد نہیں ہو جاتی۔ اور یہ حقیقت کئ لوگوں کو حوصلہ دیتی ہے کہ ہل من مزید۔ یوسفی صاحب نے بھی کتوں سے دل پشوری  کی۔ اپنی کتاب 'خاکم بدہن'  کے ایک مضمون 'سیزر، ماتا ہری اور مرزا' میں لکھتے ہیں کہ

کتوں کے ساتھ وہ خصوصیت سے تعصب برتتے ہیں اور اپنی بات کی پچ میں ایک سے ایک دلیل پیش کرتے ہیں مثال کے طور ایک دن کہنے لگے

جس گھر میں کتا ہو، اس گھر میں چور ہی نہیں ، رحمت کے فرشتے بھی داخل نہیں ہو سکتے۔

چور کا داخل نہ ہونا تو سمجھ میں آتا ہے، مگر رحمت کے فرشتوں کو کیا ڈر ہے؟

اس لئے کہ کتا ناپاک ہوتا ہے

مگر کتے کو صاف ستھرا بھی تو رکھا جا سکتا ہے۔ انگریزوں کو دیکھیئے، صبح  و شام نہلاتے ہیں۔

اپلے کو اگر صبح و شام صابن سے دھویا جائے تو کیا پاک ہو جائے گا؟

مگر سوال یہ ہے کہ کتا ناپاک کیسے ہوا؟

کج بحثی کوئ تم سے سیکھے۔ اللہ بخشے نانی جان کہا کرتی تھیں کہ کتے کے منہ میں سوءر کی رال ہوتی ہے۔

لیجیئِے آپ نے ناپاکی کی ایک اچھوتی توجیہہ تلاش کر لی۔

بھائ میرے ایک موٹی سی پہچان بتائے دیتا ہوں۔ یاد رکھو ہر وہ جانور جسے مسلمان کھا سکتے ہیں، پاک ہے۔

اس لحاظ سے مسلمان ممالک میں بکروں کو اپنی پاکی و طہارت کے سبب خاصہ نقصان پہنچا ہے۔

بکنے والے بکا کریں۔ مسلمانوں نے ہمیشہ کتے کو کتا ہی کہا ہے۔ بڑے آدمیوں کے نام سے نہیں پکارا۔

بڑے آدمیوں کی ایک رہی۔ آپ نے سنا نہیں نسلاً سب کتے ایک زمانے میں بھیڑئیے تھے۔ آدمی کی صحبت میں انکا بھیڑیا پن جاتا رہا۔ مگر خود آدمی------------۔

دیکھو تم پھر لٹریچر بولنے لگے۔ علموں بس کریں او یار۔

لیکن کتوں پہ تذکرہ یہاں آ کر نہیں رکتا۔ ایک ویڈیو دیکھ کر مجھے  خیال آیا کہ کتوں کا تصوف میں بھی بڑابیان ہے۔ آئیے ایک محفل سے ہم بھی کچھ سعادت حاصل کرتے ہیں۔

10:48 PM

، تصوف, پطرس شاہ بخاری, کتے, مسلمان, مشتاق احمد یوسفی, مولانا طاہر القادری

سر سید اور اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی-۲

گذشتہ سے پیوستہ

اٹھارہ سو اٹھاون کے شروع میں سر سید کلکٹر کے ہمراہ بجنور واپس پہنچے۔ گھر کا قبضہ حاصل کیا۔ کئ لوگ جو ہنگامے کے دنوں میں سر سید کے دشمن ہو گئے تھے اور انکی جان کے درپے تھے۔ اب پریشان تھے۔ سرسید نے انکی سفارشیں کیں اور انکی گلو خلاصی کرائ۔

ہنگامے کے دنوں میں سر سید کی خدمات کی وجہ سے حکومت نے انہیں ضلع بجنور مین مسلمان باغی کی ضبط شدہ جاگیر بطور انعام دینا چاہی۔ مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ وہ بڑا کام  اس وقت یہی سمجھتے تھے کہ ایسے وقت میں ان سے کوئ امر شرافت اور اسلام کی ہدایت کے بر خلاف سر زد نہیں ہوا۔

دسمبر اٹھارہ سو نواسی میں ایجوکیشنل کانفرنس میں تقریر کے دوران اس سانحے کا تذکرہ کرتے ہوئے سر سید نے لکھا کہ

غدر کے بعد نہ مجھ کو اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب کے تلف ہو نے کا۔ جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا تھا اور غدر کے دوران ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پہ گذرا اسکا رنج تھا۔--------- جب بعوض وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سادات نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپے سے زیادہ مالیت کا تھا مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میرے دل نے کہا کہ مجھ سے زیادہ نالائق دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پہ تو یہ بربادی ہو اور میں انکی جائیداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔

اپریل اٹھارہ سو اٹھاون میں سر سید صدالصدور کے عہدے پہ ترقی پا کر مراد آباد میں تعینات ہوئے۔ اسکے علاوہ انہیں اس اسپیشل کمیشن کا ممبر بھی نامزد کیا گیا جو ضبط شدہ جائیدادوں کی عذر داریوں کا فیصلہ کرنے کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ مراد آباد میں متعدد ضبط شدہ جائیدادیں واگذار ہوئیں۔ مراد آباد کے ایک مسلمان رئیس مولانا عالم علی جو مشہور عالم، طبیب اور محدث تھے انہوں نے ہنگامہ آرائ کے دنوں میں چند یورپیئن عورتوں اور بچوں کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی مگر باغیوں نے زبر دستی گھر میں گھس کر ان عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا تھا۔ اس میں مولانا بے قصور اور بے بس تھے مگر انگریز حکام کو ان پہ سازش کا شبہ تھا۔ جب انگریزوں کی عملداری دوبارہ قائم ہوئ تو وہ مواخذے اور سزا کے ڈر سے روپوش ہو گئے۔ سر سید نے انکے بارے میں انگریز حکام کے شکوک رفع کئے اور انکی بے گناہی ثابت کر کے انہیں مواخذے سے بچا لیا۔ ضابطے کی کارروائ کے بعد انہیں بری کر دیا گیا۔ اس طرح جہاں جہاں سر سید کا بس چلا مسلمانوں کی مدد کی اور انکی مصیبتوں کو کم کیا۔ مراد آباد  کے قیام کے دوران سر سید نے تاریخ سرکشی بجنور تحریر کی اور مئ اٹھارہ سو ستاون سے اپریل اٹھارہ سو اٹھارہ سو اٹھارہ اٹھاون تک ضلع بجنور میں جو واقعات پیش کآئے ان کو تاریخ وار ترتیب اور پوری تفصیل کے ساتھ لکھا۔ اس میں وہ تمام خط و کتابت بھی شامل ہے جو اس دوران انکے اور انگریز حکام کے درمیان ہوئ یا نواب محمود خان اور ہندو چوہدریوں نے انکے ساتھ کی۔

اٹھارہ سو ستاون کے ہنگامے کے بعد جب انگریزوں کی عملداری دوبارہ قائم ہوئ تو انگریزوں نے مسلمانوں کو بالخصوص اپنے غیض و غضب کا نشانہ بنایا۔اور باغی قرار دئیے جانے کے لئے مسلمان ہونا کافی تھا۔ انگریزوں نے حکومت مسلمانوں سے لی تھی اس لئے وہ انہیں ہی اپنا حریف اور دشمن سمجھتے تھے۔ اور اس سارے ہنگامے کا ذمہ دار مسلمانوں کو ہی سمجھتے تھے۔ وہ اس پہ یقین رکھتے تھے کہ یہ ساری سازش مسلمانوں کی ہے۔ حالانکہ ہنگامے کی وجوہات اور اس کے آغاز میں ہندو بھی اس میں شامل تھے۔ بعد میں ہندءووں نے موقع سے فاءدہ اٹھایا اور انگریزوں کی خیر خواہی کی آڑ میں مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ یہ سب چیزیں مل کر مسلمانوں کو ہمہ گیر تباہی کی طرف لئے جا رہی تھیں۔ سر سید معاملے کی سنگینی سے آگاہ تھے اور اسکے تدارک کے لئے انہوں نے رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھا۔ اس رسالے کی تفصیلات اس سے منسلکہ اگلی تحریر میں دیکھئیے گا۔

4:30 PM

اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی, اسباب بغاوت ہند, بحنور, دہلی, سر سید

سر سید اور اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی-۱

سر سید کو بجنور میں بطور صدر امین دو سال چار ماہ گذرے تھے کہ دس مئ اٹھارہ سو ستاون کو یکایک وہ خوں ریز لڑائ شروع ہوئ جسے انگریزوں نے بغاوت اور غدر کا نام دیا اور مسلمان مورخین نے جنگ آزادی کا۔ ہنگامے کی وجوہات ایسی تھیں کہ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں انگریز حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ مسلمانوں کی نفرت زیادہ شدید تھی۔ مقامی لوگ بے قابو ہو کر ان انگریز مردوں اور بچوں کو بھی موت کے گھاٹ اتارنے لگے جو انگریزی فوج کا حصہ نہ تھے اور جن کا جنگ سے تعلق نہ تھا۔ اس طرح کے تقریباً بیس گھرانے بجنور میں تھے۔ سر سید نے انکی حفاظت کی ٹھان لی۔ بجنور کے کلکٹر مسٹر شیکسپیئر کی متفکر بیگم سے سر سید نے کہا کہ

جب تک ہم زندہ ہیں آپکو گھبرانا نہیں چاہئیے۔ جب آپ دیکھیں کہ میری لاش کوٹھی کے باہر پڑی ہے اس وقت گھبرانے میں مضآئقہ نہیں۔

اس مصیبت میں انہوں نے کئ راتیں اپنے ساتھیوں کے ساتھ جاگ کر  ، اور مسلح پہرہ دیتے ہوئے گذاریں۔ایک دن جب سب کا باغیوں کے ہاتھوں مارا جانے کا پورا یقین تھا۔ سر سید تنہا اس جماعت کے پاس گئے اور نواب محمود خان جو انکا سرغنہ تھا اس سے  کی اور کہا کہ چند انگریزوں کے مارے جانے سے کیا ہاتھ آئے گا۔ بہتر ہے کہ انہیں صحیح و سالم یہاں سے جانے دو۔ اور تم ملک کے مالک بن جاءو۔

سر سید ان دنوں کا احوال لککھتے ہیں کہ

مجھ سے اگر کچھ اچھی خدمت یا وفاداری گورننٹ کی ہوئ تو وہ بالکل میں نے اپنے مذہب کی پیروی میں کی۔ میں نے جو کچھ کیا اپنے خدا اور رسول کی اطاعت کی۔

نواب محمود خان بجنور پہ قابض ہو گیا۔ لیکن اس سے پہلے انگریز خاندانوں کو بحفاظت نکالا جا چکا تھا۔ اس نے سر سید کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے انکار کر دیا جس پہ اس نے انہیں انکی سرکاری رہائیش گاہ سے نکال دیا۔ سر سید یہاں سے کسی طرح جان بچا کر نکلے اور میرٹھ پہنچے تو پاس چھ پیسے اور پہنے ہوئے پھٹ کرتے کے سوا کچھ نہ تھا۔ پانچ ماہ تک سر سید میرٹھ میں رہے اتنے میں دہلی سے خبریں آئیں کہ انگریزی فوج نے شہر پہ قبضہ کر لیا۔ مسلمانوں کو بے دریغ مارا جا رہا ہے۔ سر سید کے ماموں اور ماموں زاد بھائ مارے گئے۔ انکے انتہائ عزیز دوست امام بخش صہبائ گولی کا نشانہ بن گئے۔ خود سرسید کا گھر لوٹ لیا گیا۔

انکی بوڑھی والدہ نے گھر سے بھاگ کر اپنی ایک پرانی جاننے والی عورت زیبن کے گھر میں پناہ لی۔ جسکی دیکھ بھال وہ کیا کرتی تھیں۔ سر سید جب مہینوں بعد اپنی والدہ سے ملے تو انہیں دیکھتےہی والدہ نے کہا۔ تم کیوں یہاں چلے آئے یہاں تو لوگوں کو مارے ڈالتے ہیں۔ تم جاءو۔ ہم پہ جو گذرے گی گذر جائے گی۔ سر سید نے انہیں تسلی دی کہ وہ قلعے کے انگریزوں سے مل کر آرہے ہیں۔ اور انکے پاس حاکموں کی چٹھیاں ہیں۔ معلوم ہوا کہ دو دن سے پانی نہیں پیا۔ تو پانی کی تلاش میں نکلے۔ قلعے سے پانی لے کر دوبارہ وہاں پہنچے تو راستے میں زیبن ملی۔ وہ سڑک پہ بیٹھی ہوئ تھی۔ اور پاس مٹی کا آب خورہ اور صراحی تھی۔ وہ پانی کی تلاش میں نکلی تھی۔ ہاتھ سے اشارہ کر کے گھر کی طرف کہا کہ بیوی یعنی والدہ پیاسی ہیں۔ سر سید نے انہیں پانی پلایا اور پھردوڑے ہوئے گھر گئے۔ وہاں خالہ اور والدہ کو پانی دیا۔ گھر سے باہر سواری کا انتظام کرنے نکلے تو دیکھا کہ زیبن مری پڑی ہے۔ آخر سرکاری ڈاک لے جانے والی شکرم میں اپنی والدہ اور خالہ کو لے کر میرٹھ آئے۔

وہاں چند روز بیماری کے بعد انکی والدہ کا انتقال ہو گیا۔

جاری ہے

4:26 PM

اٹھارہ سو ستاون جنگ آزادی, انڈیا, پاکستان, دہلی، بجنور, سر سید احمد خان

کایا کلپ

اپنی بچی کے ساتھ یو ٹیوب پہ قومی نغمات کو چھانتے پھٹکتے, میں ایک گانے کی ویڈیو پہ پہنچی۔ آپ میں سے بیشترلوگ اس گانے سے واقف ہونگے۔ میں نے اپنے طور پہ کوشش کی تو معلوم ہوا کہ یہ گانا انیس سو ستاون میں پاکستان کی فلم بیداری میں شامل تھا۔ آئیے یہ گانا دیکھتے ہیں۔

یہ گانا سنتے سنتے مجھے خیال آیا کہ ایک ایسا گانا ہندوستان کے حوالے سے بھی تھا۔ اسے بھی سننا چاہئیے۔ میں نے ذرا اور چھان پھٹک کی تو یہ گانا بھی مل گیا۔ یہ ہے فلم جگریتی کا گانا۔ اور یہ فلم انیس سو چون میں بنائ گئ۔

ذہن میں سوال آیا کہ ایک میوزک، ایک جیسی شاعری دو مختلف ملکوں کے لئے، دو مختلف تحرکات کے گانے کیوں ہیں؟ کیا کسی پاکستانی نے اس وقت کاپی کیا تھا۔

دونوں گانوں کے تبصرے پڑھتے ہوئے ایک تبصرہ ملا۔ جس میں مبصر نے معلومات دیں کہ دونوں فلموں کو ایک ہی شخص نے پروڈیوس کیا جس کا نام سید رضوی تھا۔ انہوں نے ہندی فلم انیس سو باون میں رتن کمار کے نام سے بنائ۔ بعد میں پاکستان منتقل ہو جانے پہ انہوں نے یہ فلم دوبارہ بنائ سید رضوی کے نام سے۔ اس پاکستانی فلم کا نام بیداری تھا۔

دونوں گانوں کو سنیں۔ اگر اس مبصر کی بات صحیح ہے اور یہ ایک ہی شخص  کی پروڈیوس کی ہوئ فلم ہے تواسے کہتے ہیں کایا کلپ یا قلب ماہیت۔

11:37 PM

انڈیا, بیداری, پاکستان, جگریتی, کایاکلپ

شک اور یقین

 شک کرنا ایک اچھی عادت ہے یا بری۔ یہ میں نہیں کہہ سکتی۔ لیکن یہ مشورہ اکثر دوسروں کودیا کہ شکی مرد سے شادی بالکل نہیں کرنی چاہئیے چاہے وہ منگنی پہ ہیرے کی انگوٹھی دے۔ البتہ شکی  بیوی، ضرور شوہر کا مورال بڑھاتی ہے۔ اگر آپ اپنی مجرد زندگی میں باوجود کوشش صادق کے، کوئ معمولی افیئر چلانے میں بھی ناکام رہے ہیں اور عالم یہ ہے کہ یاد ماضی عذاب ہے یارب چھین لے مجھ سے حافظہ میرا۔  تو ایک شکی مزاج خاتون سے شادی کر لیجِئے۔ وہ آپکے ماضی کو ایسا رنگین بنادیں گی کہ آپ خود گنگنانے لگیں گے جیسا اب ہے میرا ماضی کبھی ایسا تو نہ تھا۔

  صرف ماضی ہی نہیں شک کی تخلییقی صلاحیتوں سے آشنا لوگ آپکے حال کو بھی بدل ڈالنے پہ قدرت رکھتے ہیں۔

 ابھی اپنے حال کا قصہ بتاتی ہوں۔ ایک صاحب نے میل کی  کہ چونکہ آپکا نام فارسی زبان سے لیا گیا ہے اور آپکے بقول کسی ایرانی خاتون کے نام پہ ہے اس لئے میں آپکو شیعہ سمجھتا تھا۔ لیکن اب پتہ چلا کہ آپ لا مذہب ہیں۔  پہلے شک کی وجہ تو انہوں نے کھل کر بتادی۔  دوسرے شک کی وجہ تو نہیں معلوم  لیکن میراشک  ہے کہ یہ ان تحاریر کا گہرا تجزیاتی نچوڑ ہے جو آجکل 'ہم' سر سید پہ لکھ رہے ہیں۔  انکے شکوک کی پیداواری صلاحیت سے انجان رہنے کے لئے  میں نے انہیں لکھ دیا کہ آئیندہ مجھے میل نہ کریں۔  عقل کل نے کچھ بھانپ کر بات اس یقین تک پہنچائ کہ اس زہنیت کی بناء پہ عورتوں کی گواہی آدھی رکھی گئ ہے۔ اب میرے پچھلے ایک سال اور چند مہینوں پہ مشتمل ماضی کے حصے دار ہونے کی وجہ سے یہ بات آپ کے لئے تعجب خیز نہیں ہونی چاہئیے کہ میں نے انکی ذہنیت سے مزید لا علم رہنے کا یقین پیدا کرنے کے لئے انکے ای میل ایڈریس کو رپورٹ اسپیم میں ڈال دیا۔ لا علمی بڑی نعمت ہے۔

شکوک اور شبہات  کی کھچڑی کس دماغ میں نہیں پلتی۔ شاعر تو اس قدر شکی ہوتے ہیں کہ پوری شاعری شک کی پیداوار کہی جا سکتی ہے۔ محض  محبوب کے پاءوں دُکھنے کی شکایت پہ غالب نے فرما دیا کہ

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں

دُکھتے ہیں آج اس بت نازک بدن کے پاءوں

ایک ایسی ہی کیفیت میں شاعر کہتا ہے کہ

مجھ تک کب اسکی بزم میں آتا تھا دور جام

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

ایک اور جگہ یہی حضرت اپنے محبوب کی شکی طبیعت کا افسانہ بناتے ہیں کہ

پینس میں گذرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے

کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

 اب مداحین غالب، غالب کے مرقد پہ جا کر یہ رولا ڈالنے کی کوشش نہ کریں کہ کیسے کیسے لوگ آپکے بارے میں ایسی ویسی ہجو کر رہے ہیں۔  یقین رکھیں کہ وہ شک اور یقین کی منزل سے بالا مقام پہ ہیں۔ اوراس یقین  نے میرے اندر یہ سب لکھنے کی ہمت پیدا کی ہے۔

 ادھر میر تقی میر نے تو پوری کائینات کو توہم کا کارخانہ قرار دیا اور کہتے ہیں کہ

یہ توہم کا کاخانہ ہے

یاں وہ ہےجو اعتبار کیا

اس سے مجھے شک ہوتا ہے اور کچھ کو یقین ہوگا کہ وہ لامذہب تھے۔ تاریخ کہتی ہے کہ انکے اجداد شیعہ تھے۔ نمعلوم خود وہ اس بارے میں کیا گمان رکھتے تھے۔ اب یہ عقدہ روز قیامت کے لئے چھوڑ رکھتے ہیں۔ آخر اس طویل دن کو کس سرگرمی کے ساتھ گذاریں گے۔

اور تو اور سائینس جیسے ماڈرن اور جدید علم میں بھی ہر خیال کسی شک سے جنم لیتا ہے۔ اور اسے یقین تک پہنچانے کے عمل کو انہوں نے تحقیق جیسا معتبر نام دے رکھا ہے۔ وہ لوگ جو سائینس میں ناکام رہے ہیں اسکی وجہ انہیں اب بآسانی سمجھ میں آتی ہوگی۔

اب میرے نفسیات کا محدود علم کہتا ہے کہ شک کی جڑیں یا تو تحت الشعور میں پھوٹتی ہیں یا لا شعور میں۔ اسکی بنیادی وجہ یہ ہے کہ میں نہ صرف نفسیات کی ان اصطلاحوں کے ہجے جانتی ہوں۔ بلکہ اس سے شک ہوتا ہے کہ شک کی اہلیت رکھنے کے لئے شعور کا ہونا ایک لازمی عنصر ہے۔ جو لوگ اس سے محروم ہوتے ہیں انہیں لوگ پاگل یا پاگل دا پتر کہتے ہیں۔ ہر دو صورت میں محروم یقین کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے۔ سو اس سے یقین پیدا ہوتا ہے کہ یقین کے لئے شعور کا ہونا کچھ لازمی نہیں۔ یہ جڑیں جب ادھر ادھر پھیلتی ہیں تو شک اپنے جامے سے باہر ہو کر اوروں کو بھی نظر آنے لگتا ہے ۔ بالکل ایسے، جیسے سینہ ء شمشیر سے باہر ہے دل شمشیر کا ، میں ہوتا ہے۔

ادھر ہمارے ایک   بلاگر کے تحت الشعورکی جڑیں جب اپنے تبصروں سے پھوٹیں تو سر تبصرہ ہمیں بھی ایک شک کا پتہ دے گئیں۔   اور وہ یہ کہ عبداللہ اور عنیقہ ناز ایک ہی شخصیت کے دو رخ ہیں۔ مجھے شک ہے کہ وہ ابن صفی کے عمران سیریزکے کردار ایکسٹو سے بہت متائثر ہیں۔ عمران اور ایکسٹو ایک شخصیت کے دو رخ۔ لیکن یہ خیال اس سے بڑھ کر ہے۔ ایک شخصیت  کبھی مرد بن جاتی ہے اور کبھی عورت۔ کبھی بلاگر اور کبھی مبصر۔ زبردست۔ شک کرنے والا ذہن بڑی زبردست تخلیقی صلاحیتیں رکھتا ہے۔  اب مجھے یقین ہے کہ  لوگ عبداللہ کے تبصروں کو زیادہ شک سے پڑھیں گے۔ میری تحاریر تو ویسے بھی آدھی گواہی کے سلسلے میں آتی ہیں۔ سو عبداللہ کسے خوش ہونا چاہئیے؟

خیر نیٹ کی دنیا شکوک کا پینڈورا بکس ہے۔ کبھی بند نہیں ہوتا اور ایک کے بعد ایک پیدا ہوتا رہتا ہے۔ ایک شک پیدا ہوتا ہے کہ کچھ عرصے بعد استعمال کنندہ اپنے اوپر بھی شک کرنے لگے گا۔ اس وقت تک کے لئے میں نفسیات کے کچھ اور الفاظ کے ہجے سیکھنا چاہونگی۔

لاریب، شک سے ہے وجود کائنات میں رنگ۔  کسی کو شک ہے کہ انقلاب آنے والا ہے وہ روز اس امید پہ اخبار خریدتا ہے اور ٹی وی کے ٹاک شوز دیکھتا ہے کہ سب سے پہلے وہ یہ خبر سنے کہ اج پاکستان کے اسٹنیڈرڈ وقت کے مطابق اس وقت تاج اچھالیں جائیں گے اور اس وقت تخت گرائے جائیں گے۔ تممام کارروائ براہ راست نشر ہوگی۔ کچھ کو یقین ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ سب بہلانے کی باتیں ہیں۔ وہ روز اخبار چھاپتے ہیں اور کوئ نیا چینل کھولتے ہیں۔

کچھ کو شک ہے کہ ہماری اصل حکومت واشنگٹن میں ہے کچھ کو یقن ہے کہ ہمارا اصل دارالحکومت افغانستان میں بنے گا۔ حکومتی سطح پہ شک کے کاروبار میں کبھی مندی نہیں ہوتی۔ کچھ کو شک ہے کہ خود کش دھماکے امریکہ کروا رہا ہے،  سیلاب امریکہ لے کر آیا ہے،عمران فاروق کو امریکہ نے مروایا ہے، ٹارگٹ کلنگ میں امریکن ایجنسیز کام کر رہی ہیں۔ طالبان امریکن ایجنٹ ہیں۔ حکومت وقت امریکن ایجنٹ ہے۔ کئ شک کرنے والے پچھلے ڈھائ سال سے موجودہ حکومت کو کسی بھی وقت جاتا دیکھ رہے ہیں۔  مگرحکومتی ارکان کا یقین دیکھ کر مجھے اس شک پہ شک ہوتا ہے۔ ادھر معاشیات سے دلچسپی رکھنے والوں کو شک ہے کہ کرکٹ ٹیم کی میچ فکسنگ کا قصہ، صدر صاحب کے ذرائع آمدنی کم کرنے کی سازش تھی۔

عام لوگوں کے شکوک بھی عام سے ہوتے ہیں۔ مثلاً ڈبے کا دودھ نری ملاوٹ ہے اور کچھ نہیں۔ کچھ کو شک ہے کہ گائے کا کھلا دودھ کوئ چیز نہیں۔ عرصہ ہوا گایوں نے دودھ دینا چھوڑ دیا ہے اور وہ سفید چیز جو ہم پیتے ہیں وہ صرف ہارمونز ہیں جو گائے کو انجیکٹ کئے جاتے ہیں۔

بعض شکوک بہت معصوم ہوتے ہیں مثلاً آدھی رات کو فیس بک پہ ایک انجان خاتون یا مرد سے چیٹنگ کے بعد یہ سوچنا کہ یہ عمل اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔ اور محض اسی شک پہ باقی رات نوافل ادا کرنا۔

مذہبی شکوک، عام طور پہ کافر ہونا، کافر نہ ہونا، مشرک ہونا مشرک نہ ہونا، بدعتی ہونا اور بدعتی نہ ہونے کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔

میرے بھی ہیں کچھ شکوک، مثلاً گھوڑا اور دریائ گھوڑا اب سے پچاس ہزار سال پہلے سیامی جڑواں تھے۔ تہذیبوں کی جنگ میں دونوں میں نظریاتی اختلاف پیدا ہوا۔ اور وہ الگ ہو گئے۔  سو اب زمینی گھوڑے میں مادہ ہی بچے کو جنم دیتی ہے جبکہ دریائ گھوڑے میں نر۔ یہاں ان لوگوں کا خیال دل میں آ سکتا ہے جو گھوڑے کی پیٹھ پہ پیدا ہوئے۔ لیکن مجھے شک ہے کہ  اس میں کچھ پردہ نشینوں کے نام اس طرح آئیں گے کہ یقیناً ثقافتی جنگ چھڑ جائے گی۔

میرے باقی شکوک بھی اسی طرح نقص امن کا باعث ہو سکتے ہیں۔ اس لئے میں انہیں اپنی سوانح حیات میں لکھنا چاہونگی جو بعد از مرگ شائع ہوگی۔ یعنی میرے شعور کی موت کے بعد۔ یاد رکھیں شعور کی جو موت ہے وہ فرد کی حیات ہے۔

شکوک کا ازالہ عملی طور پہ کوئ چیز نہیں۔ شک ایک دفعہ جنم لے لے تو یہ سو سکتا ہے مگر مر نہیں سکتا۔

نوٹ؛ اس تحریر پہ تبصرہ ضرور کیجئیے گا اورکرنے سے پہلے برائے مہربانی تعریف کے ڈونگرے ذرا کھل کر بر سائیے گا ورنہ مجھے شک رہے گا کہ آپ مجھ سے جیلس ہو رہے ہیں۔ اور میں یقیناً اسے آپکی ایروگینسی سمجھونگی۔  کچھ لوگوں کو شک ہو سکتا ہے کہ جب ہم اتنی تعریفیں کر لیں گے تو اصل موضوع پہ بات کرنے کی ہمت کہاں ہوگی۔ ہم صرف مدہم الفاظ میں اپنے شکوک ظاہر کر سکتے ہیں۔ یقیناً، یہی تو 'ہم' چاہتے ہیں۔

10:20 PM

بلاگنگ, شک, غالب

فرزند زمین

تین دن پہلے رات کے وقت لیاری ایکسپریس وے سے نیچے اترے اور کراچی پورٹ ٹرسٹ  سے آگے جا کر جو ایک سڑک پہ مڑے تو ایک قطار میں کئ ٹرالرز ایک لمبی لائن میں  کھڑے ہوئے تھے۔ یہ نیٹو کے سپلائ ٹرکس ہیں جنہیں شاید یہاں روک دیا گیا ہے۔ ایک ساتھی نے کہا۔ پاکستان نے نیٹو افواج کی سپلائ لائن بند کر دی ہے۔ اور ہم لوگ حساب لگانے لگے کہ اس وقت کتنے اسطرح کے ٹرالرز کراچی سے پاکستان کی شمالی سرحد تک یا تو سفر میں ہونگے یا اسی طرح کھڑے ہونگے شاید ہزاروں میں۔ یہ قدم پاکستان نے اس وقت اٹھایا ، جب پچھلے ہفتے افغان سرحد کے اس طرف سے پاکستانی سرحد پہ میزائل مارے گئے اور اسکے نتیجے میں تین پاکستانی فوجی مارے گئے۔

سپلائ لائن کے بند ہونے سے ٹرالرز درہ خیبر کے پاس اور بعد میں کوئٹہ میں بھی اکٹھے ہوئے جا رہے تھے۔  کچھ ٹرالرز کو مقامی افراد نے تباہ کر دیا یا جلا دیا۔

یہ کوئ پہلی دفعہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی یہ ٹرکس لوٹے جاتے رہے ہیں اور انکا سامان مقامی مارکیٹوں میں فروخت کیا جاتا رہا ہے۔ کچھ عرصے پہلے تک اگرچہ جلانے والوں کا تعلق

طالبان سے

بتایا جاتا تھا۔ لیکن  ایک نجی محفل میں ان اطلاعات کی باز گشت بھی سنائ دی کہ آجکل قبائلی سرداروں کے بڑے مزے آئے ہوئے ہیں اور لوٹ مار کے اس عمل میں  فلاں فلاں سردار کی چاندی ہوگئ ۔ یہ سردار خیبر پختونخواہ اور بلوچستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ طالبان کے نقش قدم پہ وہ بھی روانہ ہوئے اور اس سے پہلے کے طالبان انہیں ہتھیائیں وہ کیوں نہ دام کھرے کریں۔ میں نے سوچا کیا مجھے حیران ہونا چاہئیے؟  یا کہنا چاہئیے کہ جیسے کو تیسا؟ کسی طرح تو خبیث امریکیوں کو نقصان پہنچے اب فرزند زمین یہی طریقہ جانتے ہیں تو یہی سہی۔

 یہ سامان اشیائے خور دو نوش سے لیکر جدید ہتھیاروں تک ہر چیز پہ مشتمل ہے۔  اور سرحدی علاقوں سے لے کر یہ اشیاء کراچی میں بھی دستیاب ہیں۔ چلیں اس بہانے ہمارے لوگوں کو امریکہ کی جدید ترین ٹیکنالوجی اور عیاشی کا سامان ہاتھ آتا ہے۔ برائ کیا ہے۔

لوٹی ہوئ اشیاء کی فروخت کی ایک مارکیٹ

 میں ایک

غیر ملکی رپورٹ

سے گذر رہی تھی  جس میں یہ اطلاعات موجود تھیں کہ کسطرح نیٹو کے یہ ٹرکس لوٹ مار کا نشانہ بن رہے ہیں۔ اور انکے سامان سے پاکستانی کس طرح مستفید ہو رہے ہیں۔ اس پہ ہونے والے تبصرے دلچسپ تھے۔ یہ تبصرے جن میں امریکی تبصرہ نگار بھی شامل تھے۔ انکا غضب کا نشانہ پاکستانی عوام اور امریکی حکام دونوں تھے۔ جہاں ایک طرف پاکستانی چور اچکے، بد دیانت ، لوٹ مار کرنے والی  قوم ٹہری وہاں امریکی حکومت بے وقوف ٹہری جو اپنے عوام کی فلاح پہ پیسے خرچ کرنے کے بجائے چوروں کو اپنا اتحادی بنائے ہوئے جنگ کئے جا رہی ہے۔ بقول کئ مبصروں کے اگر جنگ پہ خرچ کئے جانے والے یہ پیسے ملک میں خرچ کئے جائیں تو امریکی عوام اس وقت جس معاشی بحران کا شکار ہیں۔ اس سے بچا جا سکتا ہے۔

اگر ان تبصروں میں سے شناخت اور خبر کا پس منظر ہٹا دیا جائے تو کم و بیش یہی الزامات پاکستانی بھی اپنے امریکی حلیفوں پہ لگاتے ہیں اور کچھ ان سے ملتی جلتی وجوہات کی بناء پہ اپنی حکومت سے عاجز ہیں۔

پاکستان میں ایک حلقے نے حکومت کے اس قدم کو جمہوری حکومت کی طاقت کی فتح قرار دیا۔ ایک اور حلقے نے اسے سپہ سالار پرویز کیانی کے حوصلے سے جوڑا۔ ہر نظر اپنی اپنی روشنی تک جا رہی ہے۔ بہر حال اس تحریر کے پڑھنے تک طورخم کے بارڈر سے یہ پابندی اٹھا لی گئ ہو گی۔

  سرداروں سے متعلق ایک دلچسپ خبر اور ہے۔ معروف بلوچی سردار اکبر بگتی کے بیٹے نے مشرف کو قتل کرنے والے کو

ایک ارب روپے کی زمین

یعنی ہزار ایکڑ کینال زمین  دینے کا اعلان کیا ہے۔ غالب اور نیک  اندازہ ہے کہ یہ زمین انکی اس وراثت میں سے ہی دی جائے گی جو نسل ہا نسل سے انکی ملکیت ہے۔

چلیں بلوچی عوام سے تو مشرف ہی بھلے، مارے گئے تو اسی بہانے کسی کو سردار کی زمین میں سے ہزار ایکڑ ملیں گے۔ عوام کا کیا ہے وہ  تو دکھاوے کا زخم ہیں جس کے بہانے ہمدردی حاصل کی جاتی رہے اور جسے بوقت ضرورت اپنے اغراض کے لئے سہلا سہلا کر اور مکروہ بنایا  جاتا رہے۔ مشرف کے اس طرح مرنے کے بعد یہ کہنا کتنا قابل فخر ہوگا کہ ایک قابل فخر سردار باپ کے بیٹے نے اپنے باپ کے نام نہاد قاتل سے بدلہ لینے میں پرکھوں کی ہزار ایکڑ زمین کی بھی پرواہ نہیں کی۔

لیکن جن مظلوموں کے خون سے انکے محترم والد کے  اور خود انکے ہاتھ رنگے ہوئے ہیں۔ ان کا بدلہ لینے کے لئے عوام کس زمین کا دان دیں۔

10:39 PM

افغانستان, اکبر بگتی, پاکستان, پرویز مشرف, طالبان, طلال بگتی, طورخم, کراچی

سر سید اٹھارہ سو ستاون سے پہلے-۲

گذشتہ سے پیوستہ

آئین اکبری کی تدوین ، ترتیب اور تصحیح میں جو محنت اور جاں فشانی سر سید نے دکھائ وہ حیرت انگیز ہے۔ یہ کتاب ابوالفضل نے لکھی تھی.  اس کتاب کا اسلوب نہایت مشکل اور پیچیدہ تھا۔ پھر مزید مشکل یہ کہ  اس میں ہر طرح کے سنسکرت، فارسی، عربی، ترکی اور ہندی الفاظ استعمال کئے گئے تھے۔۔ مختلف نسخوں میں کاتبوں کی غلطی کی وجہ سے عبارت میں فرق آ گیا تھا۔ سر سید نے مختلف نسخوں کا تقابلی مطالعہ کیا۔  مشکل اور نامانوس الفاظ کی تشریح کی۔ اکبر کے زمانے کی اشیاء کے نام، طرز بو دو باش، رہائیش و استعمال کی اشیا، غرض کہ ہر شے کی تصاویر دلی کے لائق مصوروں سے بنوا کر کتاب میں شامل کیں۔

واقعات کے سن و سال ، اس زمان کی ٹیکس کی رقوم اور محاصل، اکبر کے عہد کی شاہی محاصل کی رقوم آئین اکبری کے مختلف نسخوں میں مختلف درج تھیں۔ سر سید نے انہیں تحقیق کر کے درست کیا۔  ہر طرح کی جدولوں کی تصحیح کی۔ در حقیقت یہ کام

سر سید

کے علاوہ کسی کے بس کا نہ تھا۔ اس کتاب کو یوروپ میں بڑی پذیرائ ملی۔ اس کتاب میں مسلمانوں کے ایک بادشاہ یعنی اکبر کے کارناموں کو بڑے دلنشیں پیرائے میں بیان کیا گیا تھا جس سے یوروپ آشنا نہ تھا۔۔۔ اس کتاب کی تقریظ سر سید نے مرزا غالب سے لکھوانی چاہی۔ انہوں نے سوچا کہ مرزا غالب ہی انکی اس محنت کی قدر جان سکتے ہیں۔ غالب نے بجائے نثر کے اسکی تقریظ فارسی نظم میں ایک مثنوی کے پیرائے میں لکھی۔

اس تقریظ

کے تذکرے سے پہلے  یہ جاننا چاہئیے کہ  یہ وہ زمانہ تھا  جب غالب اپنا مشہور زمانہ پینشن کا مقدمہ لڑ رہے تھے اور اسکے لئے انہیں کلکتہ کا سفر کرنا پڑا۔  کلکتہ شہر کی صفائ، دفتری کاموں کے طریقے اور انتظام اس سے غالب بہت متائثر ہوئے۔ پانی پہ چلتی بھاپ کے انجن سے چلنے والی کشتی نے انہیں حیران کر دیا۔ یہ سب  دیکھ کر غالب  انگریزوں کی ترقی  اور حسن انتظام کے قائل ہو گئے۔  کلکتہ شہر کی اس خوبی کا تذکرہ اپنے دیوان میں اس طرح کرتے ہیں کہ

کلکتہ کا جو تونے ذکر کیا اے ہم نشیں

اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

اس تقریظ کو ڈاکٹر خورشید رضوی کے الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے  کہ

اس دفتر پارینہ کو زندہ کرنے کے لئے سر سید جیسے با صلاحیت آدمی کا اس قدر محنت صرف کرنا وقت کا زیاں ہے۔ یہ وقت آئین اکبری پہ نگاہ بازگشت ڈالنے کا نہیں بلکہ انگریزوں کے دستور آئین سے نظر ملانے کا ہے۔ جنہوں نے عناصر فطرت  کو تسخیر کر کے نو بہ نو ایجادات کی ہیں اور بحر و بر پہ اپنا سکہ رواں کر دیا ہے۔

سر سید کو توقع نہ تھی اور اس سے انہیں رنج پہنچا۔ انہوں نے اسے مرزا غالب کو واپس کر دیا کہ یہ مجھے درکار نہیں۔ مگر غالب کو اپنی رائے کی اہمیت کا اندازہ تھا۔ اسی لئے انہوں نے غالباً اسے نظم میں لکھا تھا۔ اور اسے اپنی کلیات فارسی میں شامل کر دیا۔ غالب نے سر سید کو لکھا۔

ابھی تک آپ اپنے پرانے آئین جہاں بانی کی ترتیب و تصحیح میں لگے ہوئے ہیں حالانکہ زندگی کا نیا آئین کلکتہ پہنچ گیا ہے اور بہت جلد ہند کی ساری تہذیبی زندگی کو اپنی گرفت میں لے لیگا۔

غالب آخر غالب رہے۔

سر سید ان سے کبیدہ خاطر تو ہوئے۔ لیکن یہ شاید اسی کا اثر تھا کہ انہوں نے اپنی اس کوشش کا زیادہ تذکرہ کبھی نہیں کیا۔ اور شاید یہی چیز ان میں ایک مصلح قوم کو مہمیز دینے باعث بنی۔ مگر تاریخ کہتی ہے کہ اگر اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی کا واقعہ نمودار نہ ہوتا تو سر سید اپنے انہی کاموں میں مصروف رہتے۔ یہ وہ لمحہ تھا جس نے انکے تصورات کی دنیا کو بدل دیا۔

حوالہ؛

سر سید احمد خان ، شخصیت اور فن۔ اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد

موج کوثر، شیخ محمد اکرام ، سروسز بک کلب، آرمی ایجوکیشن ڈائریکٹوریٹ

6:47 PM

آئین اکبری, دہلی, سر سید احمد خان, غالب, کلکتہ

سر سید اٹھارہ سو ستاون سے پہلے-۱

گذشتہ سے پیوستہ

اٹھارہ سو اٹھارہ میں سر سید کے والد کا انتقال ہوا۔ اس وقت انکی عمر اکیس سال تھی۔ تب انہوں نےملازمت کا ارادہ  کیا۔ اپنے خالو کے پاس جا کر کام سیکھنا شروع کیا جوکہ دہلی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے صدر امین تھے۔ اور وہیں سر رشتےدار ہو گئے۔ بعد میں جب دہلی کے سیشن جج نے انہیں سیشن کورٹ میں سر رشتے دار لگانا چاہ تو انکار کر دیا کہ ابھی اس کام کے لائق نہیں۔ اٹھارہ سو انتیس میں رابرٹ ہیملٹن کمشنر آگرہ مقرر ہوئے تو سر سید کو نائب منشی کا کام سپرد کر دیا۔ سر سید نے اس دوران دل لگا کر کام سیکھا اور دیوانی قوانین کا ایک خلاصہ تیار کر لیا۔ اسے دیکھ کمشنر بہت متائثر ہوا اور اسکی ایک کاپی اعلی حکام کو بھیج کر سفارش کی کہ انہیں منصف کے عہدے پہ تعینات کیا جائے۔اس عہدے کے لئے منصفی کا ایک امتحان ہوتا تھا جس میں سر سید پہلی کوشش میں کامیاب ہو گئے۔ یہ خلاصہ قوانین منصفی کے امتحان کے امیدواروں کے لئے بڑا مجرب نسخہ ثابت ہوا۔ اسکا نام سر سید نے

انتخاب الاخوین

تجویز کیا۔۔ چند ہی روز میں تمام صوبوں سے شائع ہو گیا اور کئ امیدواروں نے اسکی بدولت منصفی حاصل کی۔ اٹھارہ سو چوراسی میں انجمن اسلامیہ لاہور نے انکی لاہور آمد پہ استقبالیہ دیا اور بطور خاص اسکا تذکرہ کیا۔

ملازمت میں آنے سے پہلے وہ اپنے بڑے بھائ کے ساتھ اخبار 'سید الخبار' نکالا کرتے تھے اٹھارہ سو بیالیس میں وہ فتح پور سیکری میں منصف مقرر ہوئے۔ یہاں مولانا نور الحسن کی صحبت رہی اور انکے توجہ دلانے پہ شاہ عبدالعزیز کی شیعیت کے متعلق کتاب 'تحفہ اثنا عشریہ کے دو باب ترجمہ کئے۔ اس دوران میلاد کی مجلسوں کے لئے تین رسالے لکھے۔ اسکا خیال اس لئے آیا کہ اس وقت رسول اللہ کی ولادت، حالات زندگی اور وصال کے بارے میں موجود عام کتابچوں میں صحیح روایات نہ تھیں۔ اور ان میں بہت سی بے بنیاد اور توہم پرست باتیں راہ پا گئ تھیں۔ دوسرا رسالہ تحفہ حسن  کے نام سے لکھا۔ جس میں اہل تشیع کے حضرت ابو بکر صدیق  پہ بے جواز طعن و تشنیع کا جواب لکھا اور تولا اور تبرہ پہ عقلی نکتہ چینی  کر کے انکی اصلیت واضح کی۔ ایک تیسرا رسالہ تسہیل فی جرالثقیل کے نام سے لکھا جو ایک عربی رسالے کا ترجمہ تھا۔ سید احمد بریلوی، شاہ اسمٰیل شہید اور شاہ عبد العزیز محدث دہلوی سے عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ اس زمانے میں اپنے آپکو علی الاعلان وہابی کہتے تھے جب سب وہابی باغی سمجھے جاتے تھے۔ سید احمد کی تحریک اصلاح سے متائثر تھے۔ انہوں نے سید احمد اور شاہ اسمعیل کی تائید میں کئ کتابیں لکھیں۔ ان میں راہ سنت و رد بدعت بھی شامل ہے۔ یہ کتاب اٹھارہ سو پچاس میں لکھی۔ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کا جواب لکھتے ہوئے سر سید لکھتے ہیں کہ

مولانا سید احمد اور ٹھیک ٹھیک سمجھو تو شاہ اسمعیل کی تمام کوشش اس بات پہ مبذول تھی کہ ہندوستان میں اپنے مذہب اسلام کی تہذیب اور اصلاح کرنی چاہئیے۔

سر سید کے عقائد میں بعد میں تبدیلیاں ہوئیں لیکن مولانا سید احمد بریلوی کا اصلاحی جوش ان میں تمام عمر باقی رہا۔

اٹھارہ سو چھیالیس میں انہیں دہلی شہر کے نواح میں موجود پرانی عمارتوں کی تحقیق کا شوق ہوا۔۔ انہوں نے بڑے ذوق و شوق سے اس پہ کام کیا اور ایسی شاید ہی کوئ دستاویز اس موضوع پر میسر ہو۔ انہوں نے سو کے قریب پرانی عمارتوں کا بغور جائزہ لیا۔ انکے کتبے پڑھے۔ پھر انکی نقلیں تیار کیں اور یہ اہتمام کیا کہ ان میں وہی رسم الخط رکھا جائے جس میں کتبے کی اصل عبارت موجود تھی۔ ہر عمارت کے بنانے والے کے حالات، عمارت کی تعمیر کا مقصد،، اسکی مختصر تاریخ، عمارت کا اسکیچ، اسکی شکست و ریخت اور اس میں اضافوں کا حال، اسکے نقشے اور تعمیر کی فنی باریکیاں غرض ہر ممکنہ تفصیل انہوں نے اس میں ڈالی۔

سر سید لکھتے ہیں کہ

قطب صاحب کی لاٹ کے بعض کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہیں جا سکتے تھے انکے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے محاذی بندھوا  لیا کرتے تھے۔ میں خود اوپر چڑھ کر ہر کتبے کا چربہ اتارتا تھا۔

یہ کتاب صرف ڈیڑھ سال کے عرصے میں مکمل کی گئ اور طبع بھی ہو گئ۔۔

اس کتاب کا چوتھا باب دلی کے مشہور اور نامور لوگوں کے ذکر پہ ہے جس میں ایک سو بیس مشائخ، علماء، فقراء، مجذوبوں، اطباء، قراء، شعراء، خوش نویسوں یا خطاطوں، مصوروں اور موسیقاروں  کا تذکرہ ہے۔

کتاب کا پہلا ایڈیشن امام بخش صہبائ کے زیر اثر ادق اور پیچیدہ  تھا۔ جس کا جلد ہی سرسید کو اندازہ ہو گیا اور دوسرا ایڈیشن انہوں نے  ازسرنو لکھا اور مطالب کو آسان زبان میں بیان کیا۔

دہلی کے ڈپٹی کمشنر کو یہ کتاب اتنی پسند آئ کہ وہ اسے اپنے ساتھ لندن لے گیا۔ واپسی پہ اس نے سر سید کے ساتھ بیٹھ کر اسکا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ لیکن یوروپ میں جو انگریزی ترجمہ پھیلا وہ موسیو گارسن دتاسی کا فرانسیسی ترجمہ تھا جو انہوں نے اٹھارہ سو ساٹھ میں کیا تھا۔ یہ کتاب یوروپ کے علمی حلقوں میں بڑی سراہی گئ اور اسکی وجہ سے لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سرسید کو اپنا آنریری  فیلو بنا لیا۔

سر سید نے ایک اور رسالہ لکھا جس میں انہوں اس موضوع پہ دلائل جمع کئیے کہ زمین حرکت نہیں کرتی مگر بعد میں اپنے اس خیال سے رجوع کر لیا ور حرکت زمین کے قائل ہو گئے۔ اس کتاب کا نام ہے قول متین و رابطال حرکت زمین۔

پیری مریدی کے مروجہ طریقے کے خلاف ایک رسالہ کلمۃ  الحق لکھا۔  سلسلہ نقشبندیہ میں تصور شیخ کے حق اور اسکی وضاحت میں ایک رسالہ اٹھارہ سو تریپن میں لکھا۔ سلسلۃ الملوک کے نام سے ایک رسالہ لکھا جس میں پانچ ہزار سال تک کے ان راجاءوں، فرماں رواءوں اور سلاطین اور بادشاہوں کی فہرست مرتب کی جو دہلی کے حکمران رہے۔  اور انکی تعداد راجہ یدہشٹر سے لیکر ملکہ  قیصر ہند تک تقریباً دو سو دو بنتی ہے۔ انکے مختصر کوائف بھی اس میں موجود ہیں۔

اٹھارہ سو پچپن میں انہیں بجنور میں صدر امین مقرر کیا گیا تو تو انہوں نے بجنور کی مفصل تاریخ لکھنا شروع کی اور آئین اکبری پہ کام شروع کیا۔

جاری ہے

5:03 PM

آئین اکبری, آثار الصنادیہ, انتخاب الاخوین, بجنور, دہلی, سر سید احمد خان, لندن

باغی کا حوصلہ

ابھی کچھ دن پہلے فیس بک پہ ایک صاحب سے بات چیت ہو رہی تھی۔ اگرچہ میں چیٹنگ سے اجتناب کرتی ہوں۔ لیکن خیر  یہ صاحب چونکہ ایک دلچسپ پس منظر رکھتے ہیں اس لئیے وقت انکے ساتھ ضائع ہوتا ہوا نہیں لگتا۔ باتوں  باتوں میں انہوں نے کہا کہ زندگی ایک بھوت بنگلہ ہے جو ہر کسی کو ڈراتی ہے۔ کامیاب وہ رہتا ہے جو اسے ڈرا دے۔ اگر اس جملے میں غلطی ہو تو وہ اسے درست کر سکتے ہیں۔

 میں اس خیال میں انکے ساتھ ہوں۔   کسی نے کہا تھا کہ ہر چیز کی قیمت ہوتی ہے۔ اسے مزید سادہ کرنا چاہونگی۔ ہر چیز کی قیمت ہوتی ہے اور کرنسی آپکا حوصلہ اور بغاوت کرنے کے جراثیم ہوتے ہیں۔ یوں دنیا میں کوئ چیز نا ممکن نہیں رہتی۔

 ابھی میں نے ایک کتاب پڑھنا شروع کی ہے جسکا نام ہے۔

الکیمسٹ

۔ نہ نہ یہ کتاب کیمسٹری کے متعلق نہیں ہے۔ بلکہ نرا فکشن ہے۔ یہ ناول برازیلین ادیب

پاءولو کوایلیو

کا تحریر کردہ ہے۔ اسکی ابتک چھ کروڑ سے زائد کاپیاں بک چکی ہیں اور سڑسٹھ زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہے۔ ابھی میں نے اسکے صرف پچیس صفحے پڑھے ہیں اور اس نے بالکل باندھ لیا ہے۔پورا ناول صرف ایک سو بہتر صفحات کا ہے انگریزی میں۔

اس سے اخذ کردہ کچھ دلچسپ باتیں حاضر ہیں۔ تقدیر یا قسمت وہ چیز ہے جو عالم شباب میں ہر شخص کو معلوم ہوتی ہے کہ اوہ کیا ہے وہ اسکی چاہت کرتا ہے۔ انکی زندگی کے ایک حصے میں ہر چیز بالکل واضح ہوتی ہے اور ہر چیز ممکن ہوتی ہے۔ وہ اپنے خوابوں سے خوفزدہ نہیں ہوتے اور خواہش کرتے ہیں کہ ہر وہ چیز جو وہ چاہتے ہیں کہ وقوع پذیر ہو انکی زندگیوں میں ہو جائے۔ لیکن جسی جیسے وقت گذرتا جاتا ہے۔ ایک پر اسرار قوت جنم لیتی ہے جو انہیں قائل کرتی ہے کہ یہ نا ممکن ہے کہ وہ اپنی تقدیر کو جان سکیں۔یہ ایک منفی قوت ہوتی ہے۔ لیکن اسی سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تم اپنی تقدیر کو کیسے جان سکتے ہو۔ اس کائنات کا ایک اصول ہے اور وہ یہ کہ تم جو کوئ بھی ہو اور جہاں کہیں بھی رہتے ہو۔ جب تم واقعی کسی چیز کی چاہت رکھتے ہو تو زمین پہ وہ تمہارا مشن بن جاتا ہے۔ کیونکہ یہ وہ خواہش ہوتی ہے جو کائنات کی روح  سے جنم لیتی ہے۔ زندگی میں ایک لمحہ ایسا ضرور آتا ہے جب تم وہ کرنے کا اختیار رکھتے ہو جو تم کرنا چاہتا ہو۔لیکن ایسے وقت میں کچھ اور چیزیں ایسے گھیر لیتی ہیں کہ تقدیر اپنی اہمیت کھو دیتی ہے۔

اب آگے کیا ہوگا؟ یہ بات کتنی سچ ثابت ہوگی یہ تو آگے پڑھنے پہ ہی پتہ چلے گا۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ خاصی صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اپنی تقدیر کا مالک ہے اور زندگی میں ہمیں یہ احساس ملکیت بارہا ملتا ہے مگر ہم میں سے اکثر لوگ اپنے حوصلوں کی بلندی اور خوابوں کی سچائ پہ پوری طرح یقین نہیں رکھتے۔ ہم کچھ ایسے رسوم و رواج، وراثت میں چلے آنے والے خیالات، ثقافتی یلغار اور معاشرتی رویوں کے دباءو میں ہوتے ہیں کہ تقدیر کی باندی ہمارے اوپر حکومت کرنے میں آزاد ہو جاتی ہے۔ اگر آپ اس بات پہ یقین نہیں رکھتے تو ایک دفعہ آزمائشی طور پہ اپنی پوری سچائ، استقامت اور حوصلے سے کھڑے ہو جائیں۔ اور پھر دیکھیں خدا کیا کرتا ہے۔

ہمم، اس ناول سے لی گئ ایک پنچ لائن تو رہ گئ۔

جب تم وہ کرنا چاہتے ہو، جسکی واقعی خواہش رکھتے ہو تو کائینات کی ہر چیز تمہارے ساتھ شامل ہو جاتی ہے۔

11:30 PM

Paulo Coelho, الکیمسٹ, پاءلو, فیس بک, کوایلیو

عظیم بیٹی

گذشتہ چار پانچ دن ایک جمود میں گذر گئے۔ یہ جمود جو ایک خلاء کی وجہ سے پیدا ہوا۔ جسے کوئ نہیں بھر سکتا۔ لیکن اس دوران بہت سارے لوگوں سے ملنا ہوا۔ اور جب فضا میں ایک جمود ہو تو اسے سیاست کے موضوع سے بآسانی توڑا جا سکتا ہے۔   بات گھوم پھر کر شہر کے حالات پہ آجاتی۔ کراچی میں ہنگاموں کا تسلسل کبھی ٹوٹنے نہیں پاتا۔ تازہ ترین جلاءو گھیراءو اس امریکی عدالتی فیصلے کے خلاف ہے جس میں  عافیہ صدیقی کو چھیاسی برس کی سزا سنائ گئ۔

 ایک ہی گھر میں لوگوں کےمختلف گروپ ملے۔ جہاں ایک گروپ  کو اس سزا پہ افسوس تھا اور وہ اس عظیم دختر پہ کسی قسم کے الزام کو بے بنیاد قرار دیتا ہے اور انکی ہر قسم کی مشکوک سرگرمیوں کو ایک سازش قرار دیتا ہے۔ وہاں دوسرا گروہ الزامات میں موجود حقائق سے تو انکار نہیں کرتا البتہ ملنے والی سزا کو جائز قرار نہیں دیتا کہ یہ چوری کے جرم میں سزائے موت ہے۔  ایک تیسرا  جہادی گروپس سے بے زار گروہ بھی موجود تھا جو  قوم کی 'عظیم بیٹی'  بننے کے اس نسخے سے شدید اختلاف رکھتا تھا۔ اس طریقے سے عظمت حاصل کرنے کو بدعت قرار دیتا ہے اور سیاسی جماعتوں کی خوش قسمتی۔  وہ اسے امریکن ایجنٹ سمجھتے ہیں جسے ایک امریکی افسر پہ رائفل تاننے کی سزا نہیں ملی، بلکہ ڈبل کراسنگ کی سزا ملی ہے۔

عافیہ صدیقی کو مظلوم مسلم خاتون سمجھنے والوں سے جب انکی مشکوک سرگرمیوں کے بارے میں سوال کیا جاتا تو وہ  اول تو اس سے قطعاً لا علم ہوتے یاپھر اسے بالکل سننا اور سمجھنا نہیں چاہتے۔ انہوں نے جو کچھ کیا اسلام کی فتح کے لئے کیا۔  اپنے گھر اور بچوں کی قربانی تک دے ڈالی۔ اور تم میں سے کوئ اس وقت تک بھلائ حاصل نہیں کر سکتا جب تک اپنی سب سے پیاری چیز اللہ کی راہ میں قربان نہ کر دے۔  حوالہ ء قرآن۔

کچھ لوگ سوال کرتے ہیں ایک اچھی خاصی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کرنے والی عورت اس ذہنی بیماری کا کیوں شکار ہوئ۔ جس کے لئے اس نے اپنی ذات ، اپنے والدین اور اپنی اولاد کے برے اور بھلے کا بھی نہیں سوچا۔  حتی کہ اس نے  دوسری شادی بھی ایک مبینہ القاعدہ کارکن سے کی۔ پہلے شوہر سے  تین بچے جو اس وقت واللہ اعلم کہ کہاں کہاں درگور ہو رہے ہیں۔  لیکن لوگوں کا ایک گروہ عافیہ صدیقی کو ایک مثالی مسلم عورت کے روپ میں پیش کرنے کی کوششوں میں مصروف۔

 ایک سوال کسی نے پوچھا، ایک عورت جب اپنے بچوں کو زہر دیتی ہے تو وہ معتوب ٹہرتی ہے لوگ کہتے ہیں کیسی ماں ہے، کیا زمانہ آگیا ہے ماں کو اپنے بچوں سے محبت نہیں رہی۔  مگرایک عورت جب اپنے بچوں کو  باپ اور ماں سے محروم کر کے  انہیں دنیا میں در بدر کر دیتی ہے تو حالات کی اصل نوعیت کو جانے بغیر یہ قابل حمد و ثناء ٹہرتا ہے۔ آخر کیوں؟

ایک اور گروہ یہ کہتا ہے کہ تقریباً ستر کے قریب اسلامی ممالک نے عافیہ کو ملنے والی سزا پہ ایک حرف نفرین نہیں کہا۔ عافیہ پہ جو بھی الزامات ہیں انکا تعلق صرف پاکستان سے نہیں۔ انکے تعلقات القاعدہ جیسی تنظیم سے بتائے جاتے ہیں۔ اس طرح اسکے حامیوں کے نزدیک تو وہ عالم اسلام کی سر بلندی کی جنگ لڑ رہی ہں۔ لیکن اس چیز کا دوسرے مسلم ممالک کو کیوں احساس نہیں۔ دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک نے اس آواز میں اپنی آواز کیوں شامل نہیں کی۔

آج شہر میں ایم کیو ایم عافیہ کے حق میں ایک ریلی نکالی۔ وہ شاید اس راستے سے ان مذہب پرستوں کے دل تک پہنچنا چاہتے ہیں جنہیں ہر چیز کسی مذہبی ایشو کی کوٹنگ میں قابل قبول ہوتی ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی انکے نمائیندے فاروق ستارعافیہ کے والدین سے مل چکےہیں اور انکے گھر جا چکے ہیں مگر جب سب عظمت کی اس گنگا میں ہاتھ دھو رہے ہیں تو وہ اس سے کیوں محروم رہیں۔ امید ہے ایم کیو ایم کی  اس ریلی کے نتیجے میں شہر میں جو افراتفری پھیلے گی وہ سب کے لئے قابل قبول ہو گی۔

شہر سے گذرتے ہوئے اس سلسلے میں ایک احتجاجی بینر پہ نظر پڑی۔ ڈاٹرز آر ناٹ فار سیل۔  اس وقت پاکستانی قوم کی ایک ہی بیٹی ہے۔ ہر روز جو لاکھوں بیٹیاں بکتی ہیں انکا کوئ پرسان حال نہیں۔

تو جناب، عظیم بیٹی بننے کے لئے اگر حجاب پہن لیا جائے، جہادی تنظیموں کے لئے چندہ بھی جمع کر لیا جائے، انکے خفیہ نیٹ ورکنگ کے لئے فنڈنگ کا بندو بست بھی کر لیا جائے ایسے کہ ساتھ رہنے والے  شوہر کو اور گھر والوں کو سن گن بھی نہ لگے۔ پھر اس شوہر سےعلیحدگی ہو جانے کے بعد کسی القاعدہ کے کارکن سے شادی بھی کر لی جائے۔ اتنا حوصلہ پیدا کر لیا جائے کہ کسی بھی قسم کے تشدد کو برداشت کر لیا جائے۔

  لیکن ایک عورت جو اچھے خاصے کریئیر کے ساتھ زندگی گذار کے اپنے پیدا کئے ہوئے بچوں کو ایک پر سکون اور مطمئن زندگی دے سکتی تھی وہ  کتنے عظیم دل کی مالک تھی جو

انکی بر بادی

کو اپنے ہاتھوں سے منتخب  سے کرتی ہے۔ کس کاز کے لئے اس نے کم از کم تین لوگوں کو عمر بھر کی اذیت میں مبتلا کیا۔ ایسے میں مجھے تو وہ عورت بہت عظیم لگتی ہے جو اپنے بچوں کو دو وقت کی روٹی دینے کے لئے جسم فروشی کرتی ہے، لوگوں کی جھڑکیاں سنتی ہے، مگر انہیں خاطر میں نہیں لاتی ۔ کیا محض عظمت کے حصول کے لئے ممتا قربان کر دینا ایک مہنگا سودا نہیں۔

1:08 AM

Aafia Siddiqui, امریکہ, پاکستان, طالبان, عافیہ صدیقی, کراچی

سر سید سے پہلے

 مشعل کے داد جی کی طبیعت اچھی نہیں۔ اس لئے کچھ تحریر کرنے کا  موڈ نہ ہوا۔ خدا انہیں صحت دے اور ہمارے گھر کی رونق بحال ہو۔

تو میں سر سید کی کہانی جاری رکھتی ہوں۔ سر سید پہ مزید تذکرے سے پہلے ہندوستان میں چلنے والی ایک اور تحریک کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ہندوستان میں ایک عرصے تک حکمرانی تو مسلمانوں کی رہی تھی۔ مگر ہندو انکی رعیت کا ایک بڑا حصہ تھے۔ زوال آیا تو دونوں اسکا شکار ہوئے۔  اٹھارہویں صدی کے ہندوستان میں ذہنی پستی دونوں قوموں پہ طاری تھی۔ لیکن جب انگریزوں کی یلغار نے زور پکڑ لیا تو ہندءووں نے بھانپ لیا کہ کہ اب اس سیلاب کے آگے بند باندھنا مشکل ہےچنانچہ انہوں نے اپنے دفاع کے لئے پسپائ اختیار کی ایک طرف تو انہوں نے اپنے پرانے حکمرانوں یعنی مسلمانوں کی گرتی ہوئ دیواروں کو مزید دھکا دیا اور انگریزوں کا ساتھ دینے پہ آمادہ ہو گئے  اور دوسرےاپنے  سماج کو سدھارنے کے لئے نئ روشنی کو قبول کرنے پہ آمادہ ہو گئے اور ہندوستان میں ایسے اداروں کے قیام کے لئے سر گرم عمل ہوئے جن سے قدامت کے اندھیروں کو مٹایا جا سکے۔ اسکے نتیجے میں برہمو سماج تحریک نے جنم لیا اسکا مقصد ہندو مذہب میں مناسب تبدیلی سے سیاسی بہبود اور سماجی فلاح کی راہ ہموار کرنا تھا۔

تحریک کا جغرافیائ مرکز بنگال اور اس سے مسلکہ علاقہ رہا۔ اس تحریک  کے بانی اونچی ذات کے معزز برہمن ہندو

راجہ رام موہن رائے

تھے وہ سترہ سو چوہتر میں پیدا ہوئے۔ ان میں قدامت اور جدیدیت کا امتزاج موجود تھا۔ انکا خاندان پانچ پشتوں سے صوبہ ء بنگال میں مغلوں کے ساتھ تعلقات میں رہ چکا تھا۔ وہ ہندوستانی فلسفے کے عالم، سنسکرت، فارسی اور عربی کے ماہر اور ہندءووں اور مسلمانوں کے مشترکہ کلچر کی پیداوار تھے انہوں نے بت پرستی پہ براہ راست اعتراض کیا اور ستی کی رسم کو ممنوع قرار دینے کے لئے اس تحریک کو عملی طور پہ استعمال کیا۔ ستی ہندوءووں کی وہ رسم ہے جس میں بیوی کو اپنے مرے ہوئے شوہر کی لاش کے ساتھ زندہ جل کر مرنا ہوتا تھا۔ سن اٹھارہ سو تہتر میں جب لارڈ ایمبسٹ نے علوم شرقیہ کے فروغ کا منصوبہ بنایا تو انہوں نے اسکی مخالفت کی  کہ یہ وہ علوم ہیں جو یہاں دو ہزار سال پہلے سے رائج ہیں اسکے بر عکس انہوں نے ایک ایسے کالج کی تشکیل پر زور دیا  جس میں یوروپ کے تعلیم یافتہ اور قابل استاد مغربی علوم مثلاً طبیعیات، کیمیا، اور اناٹومی وغیرہ کی تعلیم دیں۔ انکی اس درخواست کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوئ لیکن انکے نئے خیالات کے بیج برگ و ثمر دینے لگے۔ اس تحریک کی اصلاحی کوششوں میں اسکی تعلیمی سرگرمیوں کو اہمیت دی گئ۔ قدامت پسندی کو رفع کرنے کے لئے مغربی سائینس اور انگریزی زبان کی تلقین کی گئ۔

راجہ رام موہن رائے اوائل عمری میں انگریزی اقتدار سے نفرت پہ مائل تھے. پلاسی کی جنگ میں انگریزوں کی کامیابی، انکے آبائ مقام سے ڈورئیے اور ململ کی صنعت کی تباہی، مفلس عوام کی زبوں حالی اور بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی لوٹ مار نے انہیں انگریزی حکومت سے نفرت پہ مائل کر دیا تھا۔  تاہم جب انہیں احساس ہوا کہ ہندوستان کے زوال کے اسباب اندرون ملک موجود ہیں تو انہوں نے نئے علوم کی ترویج کے لئے انگریزوں سے مفاہمت پیدا کی۔

انہوں نے اپنے خیالات کی ترویج  اور اشاعت کے لئے اور نئے تصورات کے فروغ کے لئے بنگالی زبان کا پہلا اخبار نکالا اور اس میں ہندوستانی نکتہ نظر پیش کیا۔ یہ اخبار اتنا موئثر ثابت ہوا کہ لارڈ منرو نے  اسکے خلاف اپنے شبہات کا اظہار کیا۔

اگر ساری رعایا ہماری ہم وطن ہوتی تو میں اخباروں کی انتہائ آزادی کو ترجیح دیتا۔ مگر چونکہ وہ ہمارے وطن نہیں اس لئے اس سے زیادہ خطرناک اور کوئ چیز نہِں۔

اسکے علاوہ انہوں نے ایک فارسی اخبار بھی نکالا ۔  اس طرح انہوں انگریز قوم کو مشرق کی عظمت، تہذیب، اور روحانیات سے آگاہی بخشی۔

اس تحریک نے ہندوستان کی مفلسی اور غلامی کو دور کرنے کے لئے مثبت کردار انجام دیا ۔   تحریک میں صرف وہ لوگ شامل ہو سکتے تھے جو خدائے واحد پہ یقین رکھتے ہوں اور بت پرستی سے نفرت کرتے ہوں۔ راجہ رام موہن رائے، اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ راسخ الاعتقاد ہندءووں کی شدید مخالفت کے باوجود اس تحریک نے صرف دو سال کے عرصے میں قدیم ہندو مت سے الگ ہو کر برہمو فرقے کی صورت اختیار کر لی۔ راجہ رام موہن رائے کا  انتقال اٹھارہ سو تینتیس میں ہوا۔

راسخ العقیدہ ہندو اس تحریک کے شدید مخالفین میں سے تھے۔ اسکے رد عمل میں آریہ سماج تحریک پیدا ہوئ جو ہندو مذہب کے احیاء کی تحریک تھی۔ یہ شاید ایک قدرتی رد عمل تھا۔ تمام مذاہب کو اس صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ جدیدیت کے مقابلے میں قدامت پسندی کے اس رجحان نے ہندوستانی قومیت کا جذبہ پیدا کیا۔ اور یوں جتنا انگریز حکومت اپنا تسلط مضبوط کرتی گئ اتنا ہی ہندو قدیم مذہب کے احیاء میں سنجیدگی اختیار کرتے گئے اس تحریک نے تدبر کے بجائے جبر اور عقل کے بجائے جوش کو استعمال کیا۔

برہمو سماج کی تحریک اگرچہ کہ بنگال تک ہی محدود رہی لیکن اس  نے ہندءووں کو مسلمانوں سے  سبقت لے جانے کا موقع فراہم کیا۔ کیونکہ مسلمانوں میں اس وقت تک اس چیز کا احساس ہی پیدا نہ ہو سکا تھا کہ وہ کیا عظیم نقصان ہے جس سے وہ دو چار ہونے جا رہے ہیں اور اگر کسی سطح پہ یہ عالم مایوسی میں موجود بھی تھا تو انکو یہ معلوم نہ تھا کہ اس سے بچاءو اور دفاع کس طرح ممکن ہے۔

ماخذ؛

اردو ادب کی تحریکیں، مصنف ڈاکٹر انور سدید، پبلشر انجمن ترقی اردو پاکستان۔

10:31 PM

Raja Ram Mohan Roy, Sir Syed Ahmed Khan, انڈیا, انگریز, برہموازم, بنگال, پلاسی کی جنگ, راجہ رام موہن رائے, سرسید, ہندوستان

سر سید کا عہد-۲

گذشتہ سے پیوستہ

اب ان تمام باتوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ 1870 میں مسلمانوں کی کیا حالت تھی۔ ملازمتوں میں وہ نہ ہونے کے برابر تھے۔ سرکاری ملازمتوں کے ہاتھ میں کئ طرح کا اختیار ہوتا ہے اس لئے یہ کمی انہیں مہنگی پڑ رہی تھی۔ شمالی ہندوستان کے مسلمانوں نے تجارت میں کبھی امتیاز حاصل نہیں کیا اور زمینیں قرضے کی وجہ سے انکے ہاتھ سے نکلی جا رہی تھیں۔

حالات اتنے خراب تھے کہ سر سید نے خود ہندوستان چھوڑ کر مصر کی سکونت اختیار کرنے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے بعد میں اپنے ایک لیکچر میں کہا

میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور عزت پائے گی۔ اور جو حال اس وقت قوم کا  تھا، مجھ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔

لیکن بعد ازاں انہوں نے اپنا یہ ارادہ ترک کیا اور فیصلہ کیا کہ

نہایت نا مردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر خود کسی گوشہ ء عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں، اس مصیبت میں شریک رہنا چاہئیے اور جو مصیبت پڑے اسکے دور کرنے کی ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔

اس وقت مسلمانوں کے تمام تر مسائل اقتصادی نہ تھے بلکہ زندگی کے ہر شعبے سے متعلق تھے۔ یہ اقتصادی اور ذہنی پستی ایک ہی ذریعے دور ہو سکتی تھی اور وہ یہ کہ مسلمان تعلیم  حاصل کریں اور وہ تعلیم حاصل کریں جو انہیں حکمرانوں کی زبان اور مزاج سمجھنے میں آسانی دے۔ کیونکہ انگریز اپنی حکمرانی میں اپنا ذریعہ ء تعلیم نہیں تبدیل کرنے والے تھے۔  اس لئے مسلمانوں کے لئے یہ لازمی عنصر ہو چلا تھا کہ وہ انگریزی تعلیم میں دلچسپی لیں۔

علی گڑھ کی تحریک نے یہ سب ذمہ داری اٹھائ۔ ایک ایسے دور بیں مصلح کی حیثیت سے سر سید احمد خان آگے بڑھے  جبکہ مسلمانوں کی اس حالت زار کے باوجود علماء  کی اکثریت انگریزی تعلیم کو حرام قرار دے رہی تھی انہوں نے مسلمانوں کو اس چیز کے لئے تیار کیا کہ اپنی بقاء کے لئے یہ کام کرنا ہی پڑے گا۔

انہیں اس چیز کا ادراک اس قدر زیادہ تھا کہ تحریک پاکستان کے وجود میں آنے سے بھی کئ دہائیاں پہلے وہ، وہ پہلے شخص تھے جنہوں نےاس ہندوستان کا تصور کیا جو انگریزوں کے ہندوستان سے رخصت ہو جانے کے بعد ہو جاتا۔

وہ لکھتے ہیں کہ

فرض کریں کہ تمام انگریز انڈیا چھوڑ جاتے ہیں تو کون انڈیا کی حکمرانی کرے گا۔ ان موجودہ حالات میں کیا یہ ممکن ہے کہ دو قومیں مسلمان اور ہندو ایک ساتھ حکمرانی کر سکیں اور طاقت میں برابر کے شراکت دار ہوں۔ ایسا یقیناً نہیں ہوگا۔ یہ بالکل ضروری ہوگا کہ ان میں سے ایک دوسرے کو فتح کرے اور اسے ہٹا دے۔

یہ وہ نکتہ تھا جسے انکی وفات کے چالیس سال بعد قیام پاکستان کی تحریک کی بنیاد بنایا گیا۔ سر سید کی دور بیں بصارت نے اس منظر کو اس وقت دیکھا جب انگریزوں کے ملک سے جانے کے متعلق عام شخص سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

اسی موضوع پہ پچھلی تحاریر

یہاں

دیکھئیے۔

3:36 PM

Sir Sayed Ahmed Khan, اودھ, بنگال, پاکستان, پنجاب, تحریک پاکستان, سر سید احمد خان, سندھ, مسلمان, مغل سلطنت, ہندوستان

سر سید کا عہد-۱

سر سید پہ مزید بات  کرنے سے پہلے ہمیں اس زمانے کے حالات پہ ضرور ایک نظر ڈالنی چاہئیے۔ جب سر سید احمد خان نے بر صغیر کے مسلمانوں کے جمود کو توڑنے کی کوشش کی۔ کیونکہ ہر بڑی شخصیت پہ اپنے عہد کا عکس ہوتا ہے اور وہ اپنے عہد کے مسائل کو اسی عہد میں میسر علمی اور ذہنی وسائل سے دیکھتا اور انکے حل تلاش کرتا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اٹھارہویں صدی کے ایک شخص پہ ہم حیران ہوں کہ اس نے کمپیوٹر کیوں نہیں بنایا۔ انسانی عقل نے بتدریج ترقی کی اور اسے ہی ارتقاء کہتے ہیں۔

جب مغل سلطنت اپنے انحطاط کا شکار تھی تو ایسٹ انڈیا کمپنی نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ بنگال میں  1757 میں پلاسی کی جنگ ہوئ اور میر جعفر کی  حکمرانی میں کمپنی کی  حکومت قائم ہوئ۔  ادھر پنجاب می، رنجیت سنگھ نے مسلمان حکمرانوں کو شکست دے کر انکا  تقریباً ہزار سال کا دور اقتدار ختم کیا اور ملتان سے لے کر پشاور تک اپنی حکومت قائم کی۔ اپنی حکومت کا صدر مقام اس نے لاہور کو منتخب کیا۔ 1839 میں اسکے انتقال کے بعد وہاں انگریزوں کو قدم جمانے کا موقع ملا۔ اٹھارہ سو پینتالیس میں یہ علاقہ بھی انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔سندھ 1843 میں اور اودھ 1856 میں کمپنی نے ملحق کئے۔ اسکے بعد بھی اگر کوئ علامتی اقتدار مسلمانوں کا باقی تھا تو اسے جنگ آزادی اٹھارہ سو ستاون کے ہنگامے نے مٹا دیا۔

اس سیاسی انقلاب کے ساتھ مسلمانوں کا اصل اقتصدای اور تمدنی انحطاط شروع ہوا۔

ڈاکٹر ویلیئم ہنٹر کی کتاب ' آور انڈین مسلمانز' میں اس وقت مسلمانوں کی حالت زار کی ایک تصویر موجود ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ

مسلمانوں کو حکومت سے بہت سی شکایات ہیں۔ ایک تو یہ کہ تمام اہم عہدوں کا دروازہ ان پہ بند کر دیا گیا ہے۔ طریقہ ء تعلیم ایسا ہے کہ ان میں انکی قوم کے لئے کوئ انتظام نہیں۔ قاضیوں کا نظام ختم کر کے جو انگریزی نظام عدلیہ آیا ہے اس سے ہزاروں خاندانوں کو جو فقہ اور اور اسلامی علوم کے پاسبان تھے بے کار اور محتاج کر دیا ہے۔ انکے اوقاف کی آمدنی، جو انکی تعلیم پہ خرچ ہونی چاہئیے تھی وہ غلط مصارف پہ خرچ ہو رہی ہے۔  وہ مسلمان جو پہلے جاگیروں کے مالک تھے وہ اب قرض کی دلدل میں ڈوبے ہوئے ہیں اور کوئ ہندو قرض خواہ ان پہ نالش کرتا ہے اور اور وہ رہی سہی جمع پونجی سے بھی جاتے ہیں۔

وہ لکھتا ہے کہ

مسلمانوں کی بد قسمتی کا صحیح نقشہ ان محکموں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جن میں ملازمتوں کی تقسیم پر لوگوں کی اتنی نظر نہیں ہوتی۔ 1869 میں ان محکموں کا یہ حال تھا کہ اسسٹنٹ انجینیئروں کے تین درجوں میں چودہ ہندو اور مسلمان صفر۔ امیدواروں میں چار ہندو، دو انگریز اور مسلمان صفر۔ سب انجینیئروں اور سپر وائزروں میں چوبیس ہندو اور ایک مسلمان۔ اوور سیئروں میں تریسٹھ ہندو اور دو مسلمان۔ اکائونٹس ڈیپارٹمنٹ میں پچاس ہندو اور مسلمان معدوم۔

سرکاری ملازمتوں کے علاوہ ہائ کورٹ کی فہرست بڑی عبرت آموز تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ یہ پیشہ بالکل مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا۔ اسکے بعد 1851 تک بھِ مسلمانوں کی حالت اچھی رہی اور مسلمان وکلاء کی تعداد ہندءووں اور انگریزوں کے مقابلے میں کم نہ تھی۔ لیکن اسکے بعد تبدیلی شروع ہوئ۔ نئ طرز کے آدمی آنا شروع ہوئے اور امتحانات کا طریقہ بدل دیا گیا۔ 1852 سے ۱868 تک جن ہندوستانیوں کو وکالت کے لائسنس ملے۔ ان میں 239 ہندو تھے اور ایک مسلمان۔

ڈاکٹر ہنٹر مزید لکھتے ہیں کہ

اگلے دن ایک بڑے سرکاری محکمے میں دیکھا گیا کہ سارے ڈیپارٹمنٹ میں ایک بھی اہلکار ایسا نہ تھا جو مسلمانی زبان سے واقف ہو اور حقیقتاً اب کلکتے میں شاید ہی کوئ سرکاری دفتر ایسا ہوگا، جس میں کسی مسلمان کو دربانی، چپڑاس یا دواتیں بھرنے اور قلم درست کرنے کی نوکری سے زیادہ کچھ ملنے کی امید ہو سکتی ہو۔' چنانچہ انہوں نے کلکتہ کے ایک اخبار کی شکایت نقل کی ہے کہ  تمام ملازمتیں اعلی ہوں یا ادنی آہستہ آہستہ مسلمانوں سے چھینی جا رہی ہیں اور دوسری قوموں بالخصوص ہندءووں کا بخشی جاتی ہیں۔ حکومت کا فرض ہے کہ رعیت کے تمام  طبقوں کو ایک نظر سے دیکھے۔ لیکن اب یہ عالم ہے کہ حکومت سرکاری گزٹ میں مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں سے علیحدہ رکھنے کا کھلم کھلا اعلان کرتی ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ ملک جب ہمارے قبضے میں آیا تو مسلمان سب قوموں میں بہتر تھے۔ نہ صرف وہ دوسروں سے زیادہ بہادر اور جسمانی طور پہ زیادہ توانا اور مضبوط تھے بلکہ سیاسی اور انتظامی قابلیت کا ملکہ بھی ان میں زیادہ تھآ۔ لیکن یہی مسلمان آج سرکاری ملازمتوں اور غیر سرکاری اسامیوں سے یکسر محروم ہیں۔

جاری ہے

3:34 PM

Sir Sayed Ahmed Khan, اودھ, بنگال, پاکستان, پنجاب, تحریک پاکستان, سر سید احمد خان, سندھ, مسلمان, مغل سلطنت, ہندوستان

ایک فلم ، ایک تعارف

امر محبوب، ایک دستاویزی فلم میکر ہیں۔ عید کے موقع پہ انکے موبائل فون پہ آنے والے ایس ایم ایس کی پیپس پہ جب میں نے ان سے پوچھا کہ بڑے پیغامات آ رہے ہیں۔ تو جواب ملا ہاں، آ تو رہے ہیں۔ مگر مبارکباد بھیجنے والے زیادہ تر تھر کے ہندو کمیونٹی سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔

اسکی ، میرے خیال میں کئ وجوہات ہیں۔ ایک تو تھر میں ہندو آبادی خاصی بڑی تعداد میں موجود ہے۔ تقریباً چالیس فی صد ہندو اور ساٹھ فی صد مسلمان اور دوسرے یہ کہ امر محبوب نے تھر کے اوپر ایک بہت اچھی دستاویزی فلم بنائ ہے ۔ فلم میں تھر کو ثقافتی، ماحولیاتی اور تاریخی ہر پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئ۔ یوں انہوں نے تھر کے لوگوں کے ساتھ ایک بھر پور وقت گذارا۔ اسی چکر میں مجھے بھی وہاں رہنے کا اتفاق حاصل ہوا۔  اس دوران میں پابندی سے ڈائری لکھتی رہی۔  وہ سامان ابھی ایک طرف رکھا ہے۔ لیکن مختصراً تھر ایک طلسماتی سحر رکھتا ہے۔ سندھ کے لوک شاعر، شاہ لطیف بھٹائ بھی اسکے حسن سے بے حد متائثر تھے انکی کہانیوں کا ایک کردار ماروی کا تعلق بھی اسی علاقے سے تھا۔ یہاں میں نے وہ کنواں بھی دیکھا جو ماروی سے وابستہ خیال کیا جاتا ہے۔

اب اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تھر میں ہندو اور مسلمان کس طرح مل جل کر رہتے ہیں۔ تو آپکو یہ فلم دیکھنا چاہئیے۔ کیا آپکو معلوم ہے کہ جین اور بدھ مذاہب کے لوگ بنیادی طور پہ سبزی خور ہوتے ہیں مگر گوشت کھانا انکے لئے کس وقت جائز ہوتا ہے، کیا آپ جانتے ہیں کہ تھر کے ہندءووں کو مسلمان کرنے کی نیکی تبلیغی جماعتیں کماتی ہیں مگر بعد میں کیا ہوتا ہے، کیا اپ جانتے ہیں کہ تھر میں ایک ایسا قبیلہ بھی موجود ہے جس نے احتجاجاً اپنے آپکو دنیا کی ہر جدید چیز سے دور رکھا ہوا ہے اور انکی خواتین صرف کالے کپڑے پہنتی ہیں، کیا آپکو معلوم ہے کہ تھر کسی زمانے میں اپنے موروں اور ہرنوں کے لئے مشہور تھا۔ جو شکار کا شکار ہو گئے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ تھر میں اگر دس دن بارش ہو جائے تو یہ صحرا، سبزے کا وہ لبادہ اوڑھتا ہے کہ پاکستان کا سوئٹزر لینڈ بن جاتا ہے۔

یہ سب جاننا ہے تو تھر پہ بنی ہوئ یہ فلم دیکھنی پڑے گی جسکا نام ہے۔

ریت کے رنگ

۔ یہ فلم اب یو ٹیوب پہ چار حصوں میں موجود ہے۔ میں یہاں اسکا لنکس دے رہی ہوں۔ فلم کا دورانیہ پچپن منٹ ہے۔  ایک دفعہ دیکھنا شروع کیجئیے مجھے یقین ہے یہ آپکو باندھ لے گی۔

10:07 AM

، دستاویزی فلم, Colors of Sand, امر محبوب, پارکر, پاکستان, تھر, ریت کے رنگ, سندھ, صحرا

عید کا پیغام

آج رمضان ختم ہوئے اور دنیا بھر کے مسلمانوں  نے عید منائ۔ یعنی رمضان کی آزمائش ختم اور انعام کا وقت آ گیا۔ ماہ رمضان کے آغاز میں پورے مہینے کے اعمال و اوراد کے بارے میں نصیحتیں شروع ہوتی ہیں۔ سارا مہینہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف صبر کی تلقین اور دوسری طرف طمع کے مظاہرے ایک طرف ضبط کی تعلیم اور دوسری طرف نفسا نفسی۔ آج عید کا دن ہے۔ ذرا ایک دفعہ اپنے آپ سے پوچھئیے کہ اس پورے ایک مہینے میں کوئ ایسی اخلاقی خوبی آپ نے اپنے اندر پیدا کی جو پہلے نہیں تھی۔ کوئ ایسی خوبی، جسکی آپ تبلیغ کرتے ہوں کیا آپ اسے اپنے اوپر بھی نافذ کر پاتے ہیں اور کوئ ایسی اخلاقی کمی جسکا آپکو اس مہینے میں اپنی تربیت کے دوران  اندازہ ہوا ہو  کہ آپ میں موجود تھی مگر اسکا آپکو پہلے پتہ نہیں تھا۔ اگر آج کے دن آپ اپنے آپکو پچھلے ایک مہینے کے مقابلے میں ایک بہتر انسان سمجھتے ہیں، آپکو دوسرے انسان زیادہ بہتر طور پہ خدا کی مخلوق لگتے ہیں  اور یہ احساس آپکو ایک ایسی روحانی خوشی دیتا ہے جس کی وجہ  سے آپکا دل اطمینان اور سکون کے ہلکورے لیتا ہے تو آپکو بے حد عید مبارک۔

2:40 PM

اسلام, پاکستان, عید, مسلمان

سر سید احمد خان-تعلیم۔ ۲

گذشتہ سے پیوستہ

سر سید کی تعلیم کا آغاز گھر سے ہوا۔ بسم اللہ قرآن حکیم سے ہوئ۔ اپنی والدہ اور ایک استانی سے جو انکے خاندان کے بچوں کو پرھاتی تھیں پڑھنا لکھنا سیکھا پھر فارسی اور عربی کی ابتدائ کتابیں پڑھیں۔ گلستان اور بوستان کے مطالعے میں بھی انکی والدہ انکی مدد کرتی رہیں۔ مکتب کی تعلیم میں مولوی حمید الدین انکے اتالیق تھے۔ تعلیمی استعداد پیدا ہونے پہ اپنے ننہیالی تلخصص ریاضی کی طرف آئے۔ پھر آلات رصد کے علوم کی تحصیل کا شوق ہوا۔ پھر اپنے خاندانی حکیم غلام حیدر کے زیر اثر طب میں دلچسپی لینے لگے۔ طب کی ابتدائ کتابیں ان سے پڑھیں اور کچھ عرصے انکی شاگردی میں طبابت کا تجربہ حاصل کیا۔ یہ دلچسپی بھی زیادہ عرصے نہ رہی۔ طبیعت کے رجحان اور افتاد طبع کے مطابق مختلف کتابیں انکے زیر مطالعہ رہیں مگر علم کے کسی خاص شعبے میں کوئ قابل لحاظ قابلیت پیدا کرنے کا خیال نہیں آیا۔ البتہ دہلی کی علمی و ادبی مجلسوں میں بیٹھنے کا موقعہ انہیں اکثر ملتا رہتا تھا۔ اہل علم و ادب سے انکی ملاقات رہتی۔ اس وقت کے مشہور شعراء و ادباء میں مرزا غالب، مفتی صدر الدین خان آزردہ۔ اور امام بخش صہبائ کے ہاں انکا آنا جانا تھا۔

سن  ۱۸۴۶میں انکے عزیز بڑے بھائ سید محمد خان چند روز بیماری میں مبتلا رہ کر وفات پا گئے۔ اس صدمے نے انکے دماغ پہ گہرا اثر ڈالا۔ دنیا کی رنگینیوں سے دل اچاٹ ہو گیا۔انکی کایا ہی پلٹ گئ۔ داڑھی بڑھا لی۔ زہد و تقوی میں مستعد ہو گئے۔ علم کی پیاس ازسر نو عود کر آئ دینی کتب کا کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ لڑکپن میں جو رسائل سرسری پڑھے تھے انہیں دوبارہ غور خوض سے پڑھا۔ مولوی واعظ علی جو دلی کے مشہور واعظ تھے ان سے علم فقہ پر کتابیں پڑھیں۔ مولوی فیض  الحسن سے مقامات حریری اور سبعہ معلقہ کے چند قصیدے سبقاً پڑھے۔ شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے اور شاہ رفیع الدین کے خلف الصدق سے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ پھر انہی سے علوم القراں کی تحصیل کی اور سند لی۔

اس دوران صہبائ، آزردہ اور غالب کے یہاں بھی باقاعدگی سے حاضر ہوتے رہے۔ اور ان سے اکتساب فیض کرتے رہے۔ غالب کے خاندان سے انکے ننہیال کے خاندانی روابط تھے۔ وہ انہیں اپنا چچا کہتے تھے اور غالب ان سے بیٹوں جیسا سلوک کرتے اور شفقت فرماتے۔

تو صاحب، یہ ان لوگوں کے قصوں میں سے ایک کا قصہ ہے جو اپنی جہالت پہ فخر کر کے اسے بیان نہیں کرتے تھے بلکہ اسے کم کرنے کی جدو جہد میں لگے رہتے تھے۔ یہ کہانی ابھی جاری ہے۔

8:05 AM

Sir Sayed Ahmed Khan, ادب, تاریخ, دہلی, صہبائ, غالب

سر سید احمد خان-تعلیم۔ ۱

گذشتہ سے پیوستہ

سر سید کا نام انکے والد کے پیر و مرشد ، شاہ غلام علی نے احمد خان رکھا تھا۔ وہ پیدائیش کے وقت بڑے تندرست اور صحت مند تھے۔ جب انکے نانا نے انہیں پہلی دفعہ دیکھا تو کہا ' یہ تو ہمارے گھر میں جاٹ پیدا ہوا ہے'۔

وہ اپنے بچپن میں شوخ، شرارتی اور مستعد تھے۔ ایک دفعہ اپنے ہمجولی کو مکا دے مارا اس نے ہاتھ پہ روکا تو اسکی انگلی اتر گئ۔ بچپن میں وہ پڑھائ لکھائ میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے، نہ انہوں نے تعلیم کے دوران کسی غیر معمولی ذہانت یا طباعی کا مظاہرہ کیا۔لیکن وہ اپنا سبق باقاعدگی سے یاد کرتے تھے۔ گھر میں پڑھنے لکھنے کا ماحول تھا۔ انکی والدہ اور نانا انکی تدریس اور تعلیم کا خیال رکھتے تھے۔اپنے نانا کے ساتھ کھانے کا تذکرہ سر سید اس طرح کرتے ہیں۔

میرے نانا صبح کا کھانا اندر زنانہ میں کھاتے تھے۔ بچوں کے آگے خالی رکابیاں ہوتی تھیں۔ نانا صاحب ہر ایک بچے سے پوچھتے تھے کہ کون سی چیز کھاءوگے؟ جو کچھ وہ بتاتا وہی چیز چمچے میں لے کر اپنے ہاتھ سے اسکی رکابی میں ڈال دیتے۔ تمام بچے  بہت ادب اور صفائ سے انکے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ سب کو خیال رہتا تھا کہ کوئ چیز گرنے نہ پائے۔ ہاتھ کھانے میں زیادہ نہ بھرے اور نوالہ چبانے کی آواز منہ سے نہ نکلے۔ رات کا کھانا وہ دیوان خانے میں کھاتے تھے ہم سب لڑکے انکے ساتھ بیٹھتے تھے۔ ہم کو بڑی مشکل پڑتی تھی۔ نہایت سفید چاندنی کا فرش بچھا ہوا ہوتا تھا کسی کے پاءوں کا دھبہ سفید چاندنی پر لگ جاتا تھا تو اسکو بھگا دیتے تھے کہ کتے کے پاءوں کیوں رکھتا ہے۔ روشنائ وغیرہ کا دھبا کسی کے کپڑے پر ہوتا تھا تو اس سے بھی نا خوش ہوتے تھے۔

سر سید میں اظہار بیان کا ایک قدرتی جوہر تھا۔ جو بعد میں انکی شخصیت کا وصف بن کر سامنے آیا۔ اسکا اندازہ اس واقعے سے ہوتا ہے۔

سر سید ایک دن اپنے نانا حضور کو سبق سنا رہے تھے کہ اس مصرعے پہ پہنچے۔ طمع را سہ حرف است، ہر سہہ تہی۔

سر سید نے ترجمہ کیا طمع کے تین حرف تینوں خالی۔ وہ خفا ہوئے بولے۔ 'بے پیر، سبق یاد نہیں کرتا۔'۔ سر سید کہتے ہیں مجھے اتنا رنج ہوا کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔  بعد میں خیال آیا کہ است کا ترجمہ نہیں کیا۔ ورنہ فقرہ یوں ہوتا۔ طمع کے تین حرف ہیں تینوں خالی۔ لیکن دیکھا جائے تو سر سید کا بے ساختہ ترجمہ زیادہ رواں، فصیح اور اردو محاورے کے قریب ہے۔

جاری ہے

8:01 AM

Sir Sayed Ahmed Khan, ادب, تاریخ, دہلی, سر سید احمد خان, صہبائ, غالب

ایک دن کے بعد

مشعل ، میری بیٹی جب پانچ چھ مہینے کی تھی۔ خاصی گول مٹول ، صحتمند تھی اور جیسا کہ اس عمر کے بچوں کی عادت ہوتی ہے وہ اپنے سے قریب بیٹھے شخص کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑنے کی کوشش میں اسے اتنی زور سے ہاتھ رسید کرتیں کہ اسے چوٹ لگ جانے کا اندیشہ رہتا۔  کچھ ایک اوسط بچے کے مقابلے میں وہ لوگوں سے دوستی کرنے کی اس عمر سے ہی بڑی شوقین تھیں۔ داداجی کو تشویش رہتی۔ تھوڑی بڑی ہوگی تو یہ تو دوسرے بچوں کی پٹائ لگا دے گی۔ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ مارتی نہیں ہے بس سرگرم زیادہ ہو جاتی ہے۔ اب چلنا پھرنا یا باتیں کرنا تو نہیں آتا اس لئے زور زور سے ہاتھ مارنے لگ جاتی ہے۔ بہر حال، تب سے ہی اسکی تربیت شروع کی گئ۔ کس بات کی؟  ہاتھ اتنے زور سے نہیں چلانا، دوسروں کو نہیں مارنا۔ اسی طرح دن گذر رہے تھے مشعل ڈیڑھ سال کی ہو گئ کہ ایکدن۔۔۔۔۔

ایکدن ایک جاننے والی آگئیں  انکی سب سے چھوٹی بچی مشعل کی ہی عمر کی تھی۔ مشعل نے اسے دیکھ کر انتہائ گرمجوشی کا مظاہرہ کیا۔  میں  نے دیکھا کہ وہ اپنے کھلونوں کے ساتھ اسے کھلا رہی ہیں تو میں اطمینان سے اس بچی کی ماں سے باتیں کرنے لگ گئ۔ لیکن دو منٹ ہی گذرے ہونگے کہ چٹاخ چٹاخ کی آواز آئ ۔ انکی بیٹی نے ایک ہی ہلے میں مشعل کے گال پہ تین تھپڑ عنایت فرما دئیے۔ مشعل روتی دھوتی میرے پاس آگئیں۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو سمجھایا اور معذرت کرنے لگیں کہ اپنے بڑے بہن بھائیوں کی وجہ سے انکی بیٹی کے اندر یہ جارحانہ رویہ آگیا ہے۔ مشعل اس بچی سے مزید تعلقات بنانے سے انکار کر کے باہر اپنے بابا کے پاس چلی گئیں۔

اسکے بعد اس میں یہ تبدیلی آئ کہ اس عمر کے بچوں سے دور رہتی اور اگر وہ پاس آتے تو وہ اس سے فوراً دور ہٹ جاتی اور شور مچانا شروع کر دیتی کہ یہ میرے پاس آرہا ہے۔ اس روئیے کی اصلاح میں بھی وقت لگا کہ ہم یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ خوامخواہ کا خوف دل میں پال رکھیں۔

پھر کچھ مہینے پہلے وہ دن آیا کہ انہوں نے اپنی مونٹیسوری شروع کی۔ ایک خوش باش بچے کی طرح انہوں نے اسکول جانا شروع کیا۔ انکی پرنسپل نے تعریف کی کہ آپکی بچی نے بالکل پریشان نہیں کیا ورنہ بچے شروع کے دو تین دن کافی روتے دھوتے ہیں۔ میں نے ذرا فخر کیا کہ اسکول کے لئے ہم نے اسے جذباتی طور پہ تیار کرنا شروع کر دیا تھا اس لئے یہ مسئلہ نہیں ہوا۔ دس پندرہ دن آرام سے گذر گئے کہ ایکدن ۔۔۔۔۔۔۔۔

ایکدن مشعل نے اسکول جانے سے انکار کر دیا۔ اس دن انہیں سمجھا بجھا کر لے جایا گیا کہ اسکول جانے سے انکار نہیں کرنا چاہئیے۔ خیال ہوا کہ شاید اکتاہٹ کا شکار ہو گئ ہیں۔ اگلے دن انہوں نے رونا دھونا شروع کر دیا تھا۔ اب انکے تحت الشعور کو جھانکنے کی کوشش شروع ہوئ۔  معلوم ہوا کہ اسکول میں ایک نوید نامی بچہ ہے جو مار پیٹ کرتا ہے اور دھکا دیتا ہے۔ میں نے سمجھایا کہ اب اگر وہ ایسا کرے تو ٹیچر سے شکایت کر دینا۔ اگلے دن پھر وہی انکار اور تکرار۔ لامحالہ مجھے پرنسپل سے ملنا پڑا۔

پتہ چلا کہ اور والدین بھی اس قسم کی شکایت کر چکے ہیں۔ پھر وہ صفائ دینے لگیں کہ وہ بچہ ذرا شرارتی زیادہ ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ بچوں میں مار پیٹ کا عنصر زیادہ ہونا شرارتی کی تعریف میں نہیں آتا۔ اس بچے کو اسکے والدین کے بے جا لاڈ پیار نے خراب کیا ہوا ہے آپ ان سے بات کریں کہ وہ اسے درست کرنے کے لئے عملی قدم اٹھائیں۔ ورنہ مشعل تو محض اسکی وجہ سے اسکول آنے سے انکار کر چکی ہے۔ بچے مار پیٹ کرتے ہیں خاص طور پہ لڑکے اور والدین انکی پشت پناہی کرتے ہیں یہ کہہ کر کہ کیا جاندار ہے ہمارا بچہ۔ چاہے دیگر سرگرمیوں میں انکا بچہ صفر ہو۔ جارحانہ روئیے کو قابل تعریف نہیں سمجھا سکتا۔

انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ کریں گی۔ کلاس ٹیچر سے کہیں گی کہ مشعل اور اس بچے کو دور دور رکھا جائے۔  بعد میں مشعل کی باتوں سے مجھے احساس ہوا کہ ٹیچر شاید اسے ٹائم آءوٹ قسم کی سزا دیتی ہیں۔ نوید اسکے لئے ایک آل ٹائم بیڈ گائے ہے۔ ہر برائ  کی علامت۔

ابھی ایک ہفتہ پہلے مشعل نے بتایا کہ اسکی کلاس میں دو نوید ہو گئے ہیں۔ کیا کوئ اورنوید بھی آگیا ہے۔ نہیں ماما، وہ جو سکینہ بی بی ہے ناں وہ بھی نوید ہو گئ ہے۔ کیوں وہ نوید کیوں ہو گئ ہے؟ کیونکہ وہ بھی مارنے لگی ہے، گندی بچی۔

اب روز روز پرنسپل سے اسکی شکایت کیا کی جائے۔ صرف اسکول بچوں کی اصلاح نہیں کر سکتا۔ جبکہ والدین اسے سرے سے کوئ برائ نہ سمجھتے ہوں۔ اس لئے ایکدن۔۔۔۔۔۔

ایکدن، تنگ آ کر میں نے مشعل سے کہا کہ اب اگر کوئ تمہیں ایک تھپڑ مارے تو اسے دو تھپڑ زور سے لگانا۔ اور کہنا کہ جو مجھے مارتا ہے میں ایسے اسکا بھرتہ بنا دیتی ہوں۔ تین سال کی ہو گئ ہو تم سپر گرل ایسے ہی نہیں بنتے۔ انہوں نے انتہائ فرمانبرادری سے سر ہلایا، جسے میں نے انتہائ شک سے دیکھا کہ ایسا شاید نہیں ہوگا۔  لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ  تشدد کے خلاف جنگ بھی تشدد سے ہی لڑنی پڑتی ہے۔

دادا جی  نے خاموشی سے سنا کہ میں نے کیا نصیحت کی ہے۔ اسی روز شام کو میں نے دیکھا کہ وہ مشعل کو اپنے ہاتھ کی مٹھی بنا کر دکھا رہے ہیں کہ صحیح سے مکا کیسے بنایا جاتا ہے۔ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔

6:39 AM

بچوں کی تربیت, تشدد, مشعل, مونٹیسوری

حکمران یا نظام

یہ میرے گھر کا ٹی وی لاءونج ہے, ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جانے کے لئے یہاں سے گذرنا پڑتا ہے۔ میری بچی کے کھلونے اور سائیکلیں بھی یہاں پڑی رہتی ہیں۔  اکثر جب میں گذرتی ہوں تو آپکو بھی ساتھ شریک کر لیتی ہوں۔ یہ سماء ٹی وی کی جیسمین  منظور ہیں جو اس وقت بلوچستان ڈیرہ مراد جمالی ، میں سیلاب کے متائثرین کے ساتھ موجود ہیں۔ جی یہ وہی علاقہ ہے جو سیلاب کے پانی سے اس لئے متائثر ہوا کہ سندھ کے زمینداروں نے اپنے علاقے میں آنے والے سیلابی پانی کا رخ اس طرف موڑ دیا۔ جیسمین میرے گھر میں کچھ لوگوں کو بہت پسند ہے یہ قصہ پھر کبھی سہی۔

جیسمین ایک دیہاتی عورت کو پرسہ دیکر فارغ ہوئ

تھی کہ میں نے اس پروگرام کو دیکھنا شروع کیا۔ اسکے دو بچے مر گئے  اور وہ اپنے خاندان سمیت کھانے کے انتظار میں ان چارپائیوں کے ساتھ بیٹھی ہے جہاں سے بچوں کی میتیں روانہ ہوئ ہونگیں۔ جیسمین انہیں دلاسہ دیتی ہے کھانا ملے گا سب کو ملے گا۔ مجمع تنبو یعنی ٹینٹ کے نہ ہونے کی شکایت کر رہا ہے۔ جیسمین ان سے بھی کہتی ہے سب ملے گا۔ ابھی ہم یہاں سے جا کر بات کرتے ہیں آپ سب لوگوں کو سب ملے گا کھانا بھی اور تنبو بھی۔  وہاں سے نکل کر وہ میرے جیسے ناظرین کو بتاتی ہے کہ اس وقت یہاں فوج کے جوانوں کے علاوہ کوئ شخص انکی مدد کے لئے موجود نہیں ہے۔

لیکن یہ کیا، اسکے پیچھے ایک امدادی کیمپ نظر آرہا ہے۔ اس پہ ایک بڑا سا بینر لگا ہے کہ یہ کیمپ جماعت اسلامی کی طرف سے لگایا گیا ہے۔ جیسمین، جماعت والوں کے تنبو کے اندر پہنچتی ہے تنبو یعنی شامیانے کے اندر ایک ڈنڈے کے ساتھ ایک بکری بندھی ہوئ ہے خالی زمین پہ دو تین دیہاتی بیٹھے ہوئے ہیں اور کچھ نہیں ہے۔ یہ امدادی کیمپ اندر سے بالکل خالی، پارٹی کا کوئ کارکن تک موجود نہیں ، امداد کا تو تذکرہ ہی کیا۔ جیسمین اس سے آگے بڑھتی ہے۔ یہ ایک اور شامیانہ لگا ہے جس پہ عمران خان کی ایک بڑی سی اسٹائلیش تصویر موجود ہے نیچے انکی پارٹی کا نام موجود ہے۔ تحریک انصاف۔ ابھی چند دن پہلے انہوں نے ایک پریس کانفرنس میں  سنہری چمکدار کرسیوں پہ بیٹھےم پیچھے لاکھوں روپے سے پرنٹ کئے ہوئے بڑے سے بینر جس پہ سیلاب زدگان کی قد آدم تصویریں موجود ہیں انکی موجودگی میں  اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کہا تھا کہ ہمیں امداد کی رقم دیں۔ ہم آپکو ایک ایک پائ کا حساب دیں گے۔ یہ شامیانہ بھی اندر سے خالی پڑا ہے۔ اور یہ کہہ رہا ہے کہ عمران خان اس شامیانے کے پیسوں کا حساب دو۔

اس سے آگے ایک اور شامیانہ لگا ہے۔ اس میں تو لال دریاں بھی بچھی ہیں اور ایک اسٹیج بھی بنا ہے۔ یہ ایک میڈیکل ریلیف کیمپ ہے یہ بھی اندر سے بالکل خالی پڑا ہے۔ یہ پاکستان اسلامک کلچر والوں کی طرف سے لگایا گیا ہے۔ جتنی دیر میں جیسمین اپنی بے زاری کو پوری طرح ظاہر کرتی ہوئ اس میڈیکل کیمپ کی حالت دکھاتی ہے ایک داڑھی والے صاحب بھاگے بھاگے پہنچتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دراصل دو بجے کیمپ کی چھٹی ہوجاتی ہے اس لئے یہ اس وقت آپکوخالی ملا۔ مجمع جو جیسمین کے ساتھ ہے بتاتا ہے کہ یہ صبح سے اسی طرح خالی ہے۔ سیلاب زدگان کے لئے قائم کیمپ میں وقت کی پابندی شاید سب سے زیادہ ہوگی۔

تین کیمپ اور تینوں خالی، باقی وہاں اور کوئ نہیں۔ فوج کا ایک ہیلی کاپٹر مصروف بہ عمل ہے۔ جیسمین وہاں سے اپنے ناظرین کو خدا حافظ کہہ کر نکل آئ۔

میں بھی جیسمین کے ساتھ اس منظر سے رخصت ہوئ۔ پیچھے رہ گئے متائثرین۔ ایسے وقت میں انکا خدا پہ یقین رکھنا بہت ضروری ہے۔ خدا نے ہی یہ عذاب بھیجا ہے ان پہ تاکہ اس نظام کی کمزوری ان پہ عیاں نہ ہو جسکے وہ پروردہ ہیں۔ اور وہ یہ سمجھتے رہیں کہ یہ سب اللہ سائیں کی مرضی ہے۔ اور اب خدا ہی باقی رہ گیا ہے کہ وہ اس زندگی کو ان پہ آسان کرے اور مخیر افراد  خدا کے ڈر سے اپنے مال کا صدقہ انہیں عطا فرمائیں۔۔

ان لوگوں کو خدا پہ چھوڑتے ہوئے میں واپس آ کر اردو سیارہ کو چیک کرتی ہوں پتہ چلا کہ جیو ٹی وی پہ کامران خان کا کہنا ہے پاکستان کے سو فی صد عوام کو نظام کی پرواہ نہیں  بلکہ وہ ایک مسلمان حکمران چاہتے ہیں جو خود اسلامی تعلیمات پہ عمل کرے اور ملک کو اسلامی تعلیمات کے مطابق چلائے اور اسکے حساب سے انکا خیال رکھے۔

لیکن معزز قارئین، جیسا کہ ابھی آپ نے میرے ساتھ، جیسمین منظور کے ساتھ

ایک علاقے کے متائثرین کو دیکھا۔ تو آپ کو پتہ چلا ہوگا کہ یہ بھی پاکستان کے عوام ہیں اور انہیں کیا چاہئیے؟

جو لوگ انہیں امداد پہنچا رہے ہیں انکے بارے میں انہیں کوئ فکر نہیں کہ وہ شراب پیتا ہے یا زنا کرتا ہے یا اسکے گھر کی عورتیں بے پردہ پھرتی ہیں، یہ امداد حق حلال کے پیسوں کی ہے یا حرام سے کمائے گئے روپے کا صدقہ ہے، یہ امداد ہندو، عیسائ یا یہودی بھیج رہے ہیں یا کوئ راسخ العقیدہ مسلمان، یہ ہمارے دشمن ملک بھیج رہے ہیں یا دوست، دہشت گرد یا امن پسند، طالبان یا لبرل۔ انہیں بس ایک ایسا نظام چاہئیے جس میں انہیں سیلاب کے بعد کھانا اور بے گھری سے بچنےکے لئے کچھ نہیں ایک تنبو تو ملے۔

یہ  پاکستان کے سو فی صد عوام میں شامل نہیں ہیں۔  یہ کبھی بھی پاکستان کے عوام میں نہیں گنے جاتے۔ کیونکہ یہ اپنی گنتی کا حق اپنے کسی انسانی رب کے حوالے کر چکے ہیں۔ انکی گنتی امداد کے حصول کے وقت یا سیاسی چالوں کے وقت صحیح سے ہوگی۔ بہر حال باقی سب جو گنتی جانتے ہیں یہ سمجھ  کے کہ یہ اپنے نظریات کو چمکانے کا سنہرا وقت ہے یہی وقت ہے  لوگوں کواللہ نامی دیوتا کے غیض و غضب سے عذاب سےڈرانے کا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ عوام اسکے بجائے کسی اور نظریہ حکومت میں پناہ تلاش کرنے لگیں۔ اپنی اپنی دوکانیں لگائے بیٹھے ہیں۔ آئیے صاحبان، ڈھونڈھتے ہیں ایک حکمران جو ہو اصل مسلمان، جو کرے وہ سرداری دور ہوگی ہر بیماری، جو نہیں سنوگے ہماری بات، تو نازل ہونگے ایسے ہی عذاب۔  یہ اصل مسلمان حکمران انکے پاس چھپا ہوا ہے، جب سب تائب ہو جائیں گے تو وہ باہر آئے گا۔

جو مصیبت جھیل رہے ہیں وہ توبہ کی نمازوں میں کھڑے ہونے کے بجائے، کھانے اور تنبو کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ یا اپنے اپنے بیمار بچوں کی دواءووں کے انتظار میں ہیں ان میں اتنی ہمت بھی نہیں کہ ڈوبتی نبضوں پہ اپنا ہاتھ ہی رکھ دیں۔ ان میں سے بیشتر کو صحیح سے نماز بھی نہیں پڑھنی آتی۔ بس یہ کہنا آتا ہے کہ مالک ہے اللہ سائیں  اور پیر سائیں ۔

جو اس مصیبت سے دور ہیں وہ ایکدوسرے کو توبہ اور استغفار کی نصیحتیں کر رہے ہیں۔ جو ایکدوسرے سے جلے ہوئے ہیں وہ ایکدوسرے کو بد دعائیں دے رہے ہیں خدا تمہیں بھی ایسی مصیبت سے دو چار کرے۔ حالانکہ بات تو اتنی ہے کہ ہوئے تم دوست جسکے اسکا دشمن آسماں کیوں ہو۔

اب بات یہ ہے کہ سائینسداں کہہ رہے ہیں کہ دنیا بھر میں موسمی حالات تبدیل ہو رہے ہیں۔ اگررررررر۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہم اس سیلاب سے بچ نکلے تو بہت ممکن ہے کہ اگلے سال پھر یہ سیلاب حاضر ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ دو،  تین، چار سال بعد پورے ملک کو قحط سالی بھگتنی پڑ جائے۔ اگلی دفعہ کیا کریں گے؟ حکمران تبدیل کریں گے یا نظام؟

9:37 AM

pakistan, بلوچستان, پاکستان, جیسمین منظور, ڈیرہ مراد جمالی, سیلاب

کیمیکل کامبی نیشنز-۳

گذشتہ سے پیوستہ

مختلف تناسب کا قانون

 Law of mutiple proportion

یہ قانون

جان ڈالٹن

نے پیش کیا۔ اسکے مطابق

اگر ایک عنصر دوسرے عنصر کے ساتھ دو مختلف مرکبات بناتا ہے تو ان دونوں مرکبات میں اس عنصر کی مقررہ مقدارکے لئے درکار دوسرے عنصر کی مقداروں میں جو تناسب ہوگا وہ ایک مکمل صحیح عدد ہوگا۔

اب ہم یہاں

یائیڈرجن

کی  مثال  لیتے ہیں۔

ہائیڈروجن

آکسیجن

کے ساتھ دو قسم کے آکسائیڈ بناتا ہے۔ پہلا

ہائڈروجن آکسائیڈ

یعنی پانی ہے جس میں

ہائیڈروجن

اور

آکسیجن

کے درمیان تناسب اس طرح بنتا ہے۔ آکسیجن کا ایک ایٹم وزن سولہ،

ہائڈروجن

کے دو ایٹم وزن دو۔  2:16= 1:8

 یعنی  اس میں ہر ایک

ہائڈروجن

کے لئے آکسیجن کا وزن برابر ہے آٹھ کے۔

دوسرا آکسائیڈ ہے۔

ہائڈروجن پر آکسائیڈ

۔ جس میں

آکسیجن

ہیں دو، سولہ ضرب دو یعنی وزن بنا بتیس،

ہائڈروجن

ہیں دو یعنی وزن بنا دو۔ اب اس میں

ہائڈروجن

اور

آکسیجن

کی نسبت ہوگی۔ 2:32 = 1:16

 یعنی

ہائڈروجن پر آکسائیڈ

میں ہر

ہائڈروجن

کے لئے

آکسیجن

کا وزن بنا سولہ کے برابر۔

دونوں مرکبات میں

آکسیجن

کی جو نسبت نکلی وہ ہے دو۔ دو ایک مکمل صحیح عدد ہے۔ اس طرح یہ قانون ثابت ہوتا ہے۔

اب مزید آسانی کے لئے ایک اور مثال دیکھتے ہیں۔ کاربن کے دو آکسائیڈز ہیں۔ انہیں کاربن کو

آکسیجن

کی موجودگی میں جلا کر تیار کیا جا سکتا ہے۔ اب اگر ان دونوں آکسائیڈز کی تیاری کے لئے ہم سو سو گرام کاربن کی مقررہ مقدار استعمال کرتے ہیں۔

کاربن مونو آکسائیڈ

کی تیاری میں  ہمیں سو گرام کاربن کے لئے 133 گرام

آکسیجن

چاہئیے ہوگی۔ جبکہ

کاربن ڈائ آکسائیڈ

کی تیاری  میں ہمیں سو گرام کاربن کے لئے

آکسیجن

کی دگنی مقدار چاہئیے ہوگی یعنی 266 گرام۔

اس طرح سے ان دونوں مرکبات میں

آکسیجن

کا تناسب ہے دو۔ اور دو ایک مکمل صحیح عدد ہے۔

اب یہاں تک کچھ بوریت ہو گئ ہوگی۔ اس لئےایک گانا سنتے ہیں۔ آئیے

اس لنک

پہ چلتے ہیں۔

 جاری ہے

10:51 AM

کیمیکل کامبی نیشنز-۲

گذشتہ سے پیوستہ

مستقل تناسب کا قانون

 Law of definite proportion or constant composition

شیکسپیئر نے کہا تھا کہ گلاب کو کسی بھی نام سے پکارو گلاب ہی رہے گا۔ کیمیا داں

جوزف پراءوسٹ

نے بھی ایک اس سے ملتی جلتی بات کہی۔ جسے مستقل تناسب کے قانون کا نام دے دیا گیا۔

اس قانون

کے تحت ایک کیمیائ مرکب میں موجود عناصر کی مقدار ہمیشہ یکساں رہتی ہے چاہے اسے کسی بھی کیمیائ طریقے سے تیار کیا جائے۔

مثلاً

کاربن ڈائ آکسائیڈ

کے فارمولے میں ایک

کاربن

کا مالیکیول اور دو

آکسیجن

کے مالیکیول ہوتے ہیں۔ ایک

کاربن

کےایٹم کا وزن تقریباً 12 اور ایک

آکسیجن

کے ایٹم کا وزن تقریباً سولہ ہوتا ہے۔ اس فارمولے میں

آکسیجن

کے دو ایٹم ہیں تو اسکی مقدار 32 ہے۔

کاربن ڈائ آکسائید

گیس کو مختلف طریقوں سے تیار کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں۔

   کیلشیئم کاربونیٹ پہ تیزاب کے عمل سے

کاربن کو آکسیجن کی موجودگی میں جلانے سے

اوپر بیان کردہ طریقوں سے حاصل شدہ گیس کا جب تجزیہ کیا جائے تو اس میں کاربن اور

آکسیجن

کی مقداری نسبت وہی نکلتی ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں یعنی 3:8۔

کاربن

کے

دو آکسائیڈز

ہوتے ہیں۔ ایک میں کاربن اور

آکسیجن

کی مقداری نسبت  3:8 اور دوسرے میں 3:4 ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دوسرے مرکب میں

آکسیجن

کی مقدار پہلے والے کی نسبت آدھی ہے۔ یعنی یہ

کاربن مونو آکسائیڈ

کا فارمولا ہے۔ اور

کاربن مونو آکسائیڈ

کی مقداری نسبت اس قانون کے تحت ہمیشہ 3:4 ہوگی، چاہے ہم اسے کسی بھی طریقے سے تیار کریں۔

اب اس قانون کے ساتھ ایک مسئلہ بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ ہمیشہ صحیح ثابت نہیں ہوتا۔ اسکی وجہ مختلف عناصر کے مختلف آئسوٹوپس کا ہونا ہے۔ آئیسو ٹوپس جیسا کہ ہم جانتے ہیں۔ ایک ہی عنصر کے ایسے ایٹم ہوتے ہیں جو اس سے وزن میں مختلف ہوتے ہیں۔ وزن میں اس اختلاف کی وجہ سے یہ کمیتی تناسب یکساں نہیں رہ پاتا۔

مرکبات کی ایک جماعت جنہیں

نان اسٹیکیئومیٹرک کمپاءونڈز

کہتے ہیں وہ بھی اس اصول پہ پورے نہیں اترتے۔ کیونکہ ان میں عناصر ایک خاص نسبت میں ملنے کے بجائے دو مقداروں کی درمیان رینج میں ملتے ہیں۔ جیسے

فیرس آکسائیڈ

کا  فارمولا نیچے دی گئ شکل کے حساب سے 'اے؛ ہونا چاہئیے، لیکن یہ 'بی' کے قریب ہوتا ہے وجہ اسکی اسکے مالیکیولز کی کرسٹل جالی میں  ترتیب ہے۔

فیرس آکسائیڈ کی کرسٹل جالی میں ترتیب

کرسٹل جالی میں ممکنات

جاری ہے

10:27 AM

پراءوسٹ, کاربن ڈائ آکسائیڈ, کاربن مونو آکسائیڈ, کیمیکل کامبی نیشنز, مستقل تناسب کا قانون، کیشیئم کاربونیٹ

کیمیکل کامبی نیشنز-۱

جب مرکبات آپس میں تعامل میں کرتے ہیں تو انکا یہ عمل چند قوانین کے ماتحت ہوتا ہے۔ یہ قوانین 'کیمیکل کامبی نیشنز' کہلاتے ہیں۔  بنیادی طور پہ یہ چار قوانین ہیں جو کسی تعامل کے ہونے  میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ درج ذیل ہیں

قانون بقائے کمیت

law of conservation of mass

مستقل تناسب کا قانون

 law of constant proportion

مختلف تناسب کا قانون

law of multiple proprtions

 متبادل تناسب کا قانون

 law of reciprocal proportions

اب ہم ان قوانین کے کسی تعامل پہ اثرات کو باری باری دیکھتے ہیں۔

  بقائے کمیت کا قانون

قدیم یونانی فلسفے میں کہا جاتا تھا کہ کچھ نہیں سے کچھ نہیں جنم لیتا۔ یعنی عدم سے عدم ہی وجود میں آتا ہے۔ جین فلسفہ کے بانی

مہاویرا

ہے کہتا ہے کہ کائنات اور اسکے اجزاء مثلاً مادہ نہ ہی پیدا کیا جا سکتے ہیں اور نہ ہی ختم کیا جا سکتے ہیں۔ تیرہویں صدی کے ایرانی عالم

ناصر الدین الطوسی

کا کہنا تھا کہ ایک مادی جسم مکمل طور پہ ختم نہیں ہوتا۔ یہ صرف اپنی ماہیئت، حالت، ترکیب،رنگ اور اسی طرح کی دوسری خصوصیات تبدیل کرتا ہےاور ایک دوسرے مرکب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

بقائے کمیت کا قانون پہلی دفعہ مکمل طور پہ

انٹونی لوائزے

نے بیان کیا اور اس نے اپنے تجربات سے اسے ثابت کیا۔ اسکی وجہ سے اسے جدید طبیعیات کا بانی بھی سمجھا جاتا ہے۔ ان تجربات میں اس نے مختلف تعاملات کو دیکھا۔  مثلاً زنگ لگنے کا عمل۔ اس عمل سے پہلےلوہے کے ایک ٹکڑے کو ایک سیلڈ بند ٹیوب میں بند کر کے اس  ٹیوب کا وزن کیا گیا اور زنگ لگنے کے بعد بھی اسکا وزن کیا گیا۔  نتیجہ یہ نکلاکہ ہر دو صورتوں میں وزن برابر تھا۔

یہ قانون کہتا ہے کہ

ایک بند نظام میں وقت گذرنے کے ساتھ نظام کی کمیت مستقل رہتی ہے۔ یعنی ایک کیمیائ تعامل اگر کسی بند نظام میں ہو رہا ہو تو مادہ نہ وجود میں آتا ہے اور نہ ختم ہوتا ہے اس طرح مادے کی مقدار وہی رہتی ہے جو تعامل کے آغاز میں ہوتی ہے البتہ مادے کے اجزاء اپنی ترتیب یا ماہیت تبدیل کر لیتے ہیں۔

اس قانون کی وجہ سےکیمیاء کی نئ بنیاد پڑی اور یہ ممکن ہو سکا کہ ری ایکٹنٹس کی مقدار متعین کی جا سکے اور حاصل پروڈکٹس کی مقدار کا پہلے سے اندازہ کیا جا سکے۔  اس طرح سے

اسٹیکییئومیٹری

یا مقداری کیمیاء کا تصور جنم لے سکا۔

اب ہم اسکی ایک مثال دیکھتے ہیں۔

مثال ؛

  ہائیڈروجن  اور آکسیجن مل کر پانی بناتے ہیں۔ اگر چار گرام ہائیڈروجن استعمال کرنے سے چھتیس گرام پانی بن رہا ہے تو آکسیجن کے کتنے گرام چاہیئِں ہونگے۔

سب سے پہلے اس تعامل کی مساوات دیکھتے ہیں۔

 اور پھر پروڈکٹس میں سے جس ری ایکٹنٹ کی مقدار دی ہوئ ہے اسے منفی کر دیں۔ دوسرے متعامل یا ری ایکٹنٹ کی مقدار معلوم ہو جائے گی۔

اس مثال میں جب ہم نے چھتیس گرام جو کہ پروڈکٹ کا وزن ہے اس میں سے ہائیڈروجن کے چار گرام نکال دئیے تو آکسیجن کے بتیس گرام حاصل ہوئے اس طرح سے مساوات میں تیر کے نشان کے دونوں جانب تعامل کے بعد بھی  مقدار گرام میں برابر رہی۔

اسکی ایک  ویڈیو ہے۔

مزید دیکھنے کے لئے ان لنکس پہ جائیں۔

قانون بقائے کمیت

قانون بقائے کمیت-

۲

جاری ہے

نوٹ؛ یہ تحریر زینب ضیاء کی فرمائیش پہ لکھی گئ ہے۔ ان سے درخواست ہے کہ مختلف الفاظ کا اردو ترجمہ صحیح کر دیں۔ فی الوقت میرے پاس اردو کی کتاب موجود نہیں ہے۔

12:26 PM

law of conservation of mass،, آکسیجن, انٹونی لوائزے, کمیت, کیمیکل کامبی نیشنز, مہاویرا, ناصر الدین الطوسی, ہائڈروجن

تشدد اور چند سوال

میں اب تک

اس ویڈیو

کو دیکھنے کی ہمت نہیں مجتمع کر پائ۔ جسکی  مذمت اس وقت ہر کوئ کر رہا ہے۔ شاید میں ایسا کبھی نہیں کر پاءونگی۔ مجھے اپنی اس کمزوری پہ ندامت ہے۔ میں ایک پر تشدد معاشرے کا حصہ تو ہو سکتی ہوں مگر اس سے سرزد ہونے والے ایسے حیوانیت کے مظاہروں کو دیکھنے سے کیوں گریز کرتی ہوں۔

اب جبکہ تمام لوگ اس واقعے کی کما حقہ مذمت کر چکے تو ہمیں اس سے اگلے مرحلے میں داخل ہونا چاہئیے۔ اور وہ ہے اسکی وجوہات کا تعین۔ کیونکہ ان دو لڑکوں کی جگہ کل آپ یا میں بھی اس مقام پہ ہو سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے قتل ہونے والوں میں یا ہو سکتا ہے تماشہ دیکھنے والوں میں۔ ایک غلط وقت میں اگر آپ غلط جگہ پہ، غلط لوگوں کے ساتھ  موجود ہوں تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہجوم کا پر  تشدد ہونا اپنی نوعیت کا پاکستان میں پہلا واقعہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی یہ واقعات ہوئے البتہ انکی ویڈیوز اس طرح سامنے نہیں آ سکیں۔

وجوہات کے جاننے سے قبل ایک اہم مرحلہ ہوتا ہے اور وہ ہے اپنے آپ سے سوالات۔

یہ مندرجہ ذیل چند سوالات ہیں جو میرے ذہن میں آتے ہیں ہو سکتا ہے آپکے ذہن میں اور مختلف سوالات بھی ہوں۔ تو ان  سوالوں اور انکے جوابوں میں ایکدوسرے کو شریک کرتے ہیں۔

کیا ایسے واقعات کی روک تھام ہونی چاہئیے یا مذمت کرنے کے چھوڑ دینا چاہئیے؟

کیا بد دعائیں

لوگوں کو انکے انجام تک پہنچا دیں گی، کیا ان واقعات کا سد باب بد دعاءووں سے کیا جا سکتا ہے؟ کیا بد دعا دینے والے اپنی کم ہمتی کو ظاہر نہیں کرتے؟

کیا یہ واقعات محض معاشرے میں موجود کچھ لوگوں کی پر تشدد فطرت کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتے ہیں یا ہم من حیث القوم ایک اخلاقی تنزلی کا شکار ہیں؟ ہماری اس اخلاقی تنزلی کا باعث مذہب سے ہماری دوری، یا تعلیم کی کمی یا  ہماری ایک مہذب قوم کے طور پہ تربیت نہ ہونا ہے؟

ہماری مذہب سے ظاہراً گہری وابستگی بھی ہمیں کیوں تشدد سے دور نہیں رکھ پاتی؟

کچھ لوگوں کے خیال میں مذہب سے دوری ، ان واقعات کا باعث ہے۔ تو وہ ممالک جو بالکل سیکولر ہیں وہاں ایسے واقعات کیوں اس تسلسل سے پیش نہیں آتے؟

جب ہم اس چیز پہ یقین رکھتے ہیں کہ ہمارے ایسے افعال ہمارے اوپر عذاب کا باعث بنتے ہیں تو پھر بھی ہم کیوں انکو کرنے میں ذرا تامل نہیں کرتے؟

کیا کچھ لوگ موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی بالا دستی کے جذبے کو کمزوروں پہ ظلم کر کے تسکین دیتے ہیں اس لئے یہ واقعات ہو پاتے ہیں؟

کیا تشدد پسند فطرت، فیوڈل نظام کی دین ہے؟

کیا ایسا اجتماعی بہیمانہ تشدد، معاشرتی نا انصافیوں کا حصہ ہے؟ تو پھر ہم اسے اپنے اوپر ظلم کرنے والے طاقتور طبقے کے خلاف کیوں استعمال نہیں کرتے؟

کیا تشدد انسانی فطرت ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیا اسے سدھار کر کسی مثبت جذبے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے؟

9:14 AM

pakistan, Sialkot, پاکستان, تشدد, سیالکوٹ

جمود سے باہر

اٹھائیس جولائ کو سیلاب آنے کی پہلی اطلاع آئ۔ اور گذشتہ تین ہفتوں میں پاکستان کی اب تک کی تاریخ کے اس شدید سیلاب نےہمارے حکمرانوں کی بے حسی کے نئے باب رقم کر دئیے۔

ٹی وی پہ وزیر اعظم جیلانی ڈی آئ خان کے ایک اور جعلی کیمپ پر بذریعہ جہاز پہنچے۔ ایک بیان دیا اور پھر جہاز میں نڈھال ہو کر سیٹ پہ پڑے تھے کہ ٹی وی کے ایک اینکر پرسن نے انہیں جا لیا۔ وہ اس طرح سیٹ پہ نیم لیٹی حالت میں اسکے سوالوں کا نیم مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیتے رہے۔ اس سوال پہ کہ سیلاب کے بعد لوگوں کی بحالی کا کیا پروگرام ذہن میں ہے انہوں نے اپنے اسی مجاورانہ اطمینان سے جواب دیا۔ پہلے اس مرحلے سے تو نکلیں۔ یہ ہیں ہمارے سیلاب زدہ ملک کے مطمئن راضی بہ تقدیر، وزیر اعظم۔

زلزلہ آنے کے بعد مجھے یاد ہے کہ مشرف نے قوم سے خطاب کیا تھا۔ وہ تقریر خاصی پر جوش تھی۔ جس میں انہوں نے کہا تھا کہ قوموں کی تاریخ میں ایسے حادثات ایک نئ تبدیلی کا باعث بن جاتے ہیں۔ اس میں انہوں نے حکومت کے اس وقت تک کئے گئے امدادیاقدامات بتائے اور آئیندہ کا لائحہ عمل واضح کیا  اور میسر پیسوں کے بارے میں بتایا۔ یہ الگ کہانی کے آگے کیا ہوا۔ لیکن اس چیز نے سراسمیہ قوم کے اندر ایک جذبہ تو پیدا کیا تھا۔ رضاکاروں کی ایک بڑی تعداد وہاں پہنچی۔ لوگوں نے مسائل کے مختلف حل تجویز کئے، وغیرہ وغیرہ۔ معاشی حالات اس وقت کافی اچھے تھے لوگوں نے دل کھول کر امدادی کاموں میں حصہ لیا۔

لیکن آج دیکھیں۔ اس وقت جب عوام مہنگائ کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں ہر نیا دن چیزوں کے نرخ میں اضافے کی ہوشربا خبر لاتا ہے۔ ہم سنتے ہیں کہ زرداری صاحب کا فرانس میں محل ہے جو کسی زمانے میں انگلینڈ کے بادشاہ نے اپنی ملکہ کے لئے خریدا تھا۔ انکا کہنا ہے کہ یہ محل تو دراصل انکے والد صاحب نے اسّی کی دھائ میں خریدا تھا۔ البتہ یہ نہیں بتایا کہ اس وقت انکے والد گرامی کراچی کا بمبینو سینما کسی کے ساتھ شراکت میں چلا کر اتنی بڑی رقم کیسے اکٹھا کر پائے کہ اس سے قوم کے موجودہ نوجوانوں میں کم از کم پیسہ کمانے کی لگن تو پیدا ہوجاتی۔

ایک ایسی حکومت جسکے سربراہ اعلی سے لیکر ہر ہر نمائیندے کے بارے میں کرپشن کی کہانیاں زبان زد عام ہوں۔ انہیں کوئ شخص اپنا پیٹ کاٹ کر امدادی رقوم کیوں دے گا۔ اس لئے کہ آج سے دو سال بعد ان کے دنیا کے کسی امیر ترین ملک میں محل کی خبر سنے۔

حکومتی مشینری اس قدر نا اہل ہے کہ ان تین ہفتوں میں ان لوگوں کو قوم کو جذبہ دینے کے لئے الفاظ بھی نہ مل سکے۔ سندھ میں سیلابی پانی سے بیراجوں کو بچانے کے لئے بند توڑنے کے مسئلے پہ پارٹی کے درمیان پھوٹ پڑ گئ۔ ہر ایک چاہ رہا تھا کہ اسکا علاقہ بچ جائے۔ نتیجۃً جب خورشید شاہ، ممبر سندھ اسمبلی اپنے علاقے میں پہنچے تو لوگوں نے انکی گاڑی پہ پتھراءو کر دیا۔ ادھر وزیر خاتون حنا ربانی کھر جب اپنے علاقے پہنچیں تو انکے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔

مولانا فضل الرحمن سیلاب کے ایک ہفتے بعد سعودی عرب عمرے کے لئے روانہ ہوگئے۔ انکے انتخابی حلقے میں اس وقت آٹھ لاکھ افراد متائثرین میں شامل ہیں۔ انکے گھر اور مدرسے کو بچانے کی خاطر کہا جاتا ہے کہ وہاں سے گذرنے والی سڑک نہیں توڑی گئ اور سیلاب نے دوسرے علاقوں کو شدید متائثر کیا۔

یہ وہ جمہوریت ہے جسکے لئے ہم پچھلے دو سال سے سن رہے ہیں کہ بدترین جمہوریت بہترین آمریت سے بہتر ہوتی ہے۔ ایک حکومت جسے لوگ ووٹ تو دیتے ہیں خدا جانے کیسے لیکن اسے اپنے نوٹ کی قدر کا صحیح حقدار نہیں سمجھتے۔

نوبت یہ ہے کہ اقوام متحدہ بھی ممبر ممالک کو

پاکستان کو قابل ذکر امداد دینے پہ راضی نہ

کر سکی۔ ایک اندازہ، پاکستان کی کرپشن اور دہشت گردی کی وجہ سے مشہوری۔

اپوزیشن لیڈر نواز شریف

نے کہہ دیا ہے کہ پاکستان اپنے پیروں پہ کھڑا ہونے کے قابل ہے ہمیں بین الاقوامی امداد نہیں چاہئیے۔ وزیر اعظم نے کہا ہمیں ہر امداد کی ضرورت ہے جو ہماری مدد کرے گا وہی ہمارا دوست ہوگا۔ مولانا فضل الرحمن کے ترجمان وزیر مولانا عطا الرحمن کے مطابق مولانا فضل الرحمن عمرہ ادا کرنے کے ساتھ سعودی حکومت اور خیراتی داروں سے پیسے جمع کرنے بھی گئے ہیں۔

عوام کی بڑی تعداد اپنے جاننے والے سماجی خدمت انجام دینے والے لوگوں سے رابطہ کر رہی ہے تاکہ انکی مدد مناسب حقدار تک پہنچے۔ عام لوگ اپنے طور پہ امداد جمع کر کے پہنچانے کا بند و بست کر رہے ہیں۔، وہ حکومت پہ، سیاسی رہنماءووں پہ کوئ اعتماد نہیں رکھتے۔ لوگ اپنے جاننے والوں کو باہر سے فنڈ جمع کر کے بھیج رہے ہیں مگر حکومت کو نہیں دینا چاہتے۔

   لیکن جہاں متائثرین کی تعداد دو کروڑ ہو وہاں یہ انفرادی کوششیں اتنی زیادہ نتیجہ خیز کیسے ثابت ہو سکتی ہیں۔  بلدیاتی نظام اس وقت مدد کر سکتا تھا لیکن سیاسی طاقتوں نے اسےاپنے پیسہ بٹورنے کے راستے میں ایک رکاوٹ سمجھا اور اسے ختم کر دیا۔ کسی نے اس قدم کے خلاف آواز تک نہ اٹھائ۔

جب تک حکومت اس میں دلچسپی نہ لے یہ عوامی منتشر کوششیں کیسے اتنے سنگین حادثے کو قابو میں لا سکتی ہیں۔  حکومتی ذرائع ان انفردای کوششوں سے کہیں زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ انکے پاس پورا انفرا اسٹرکچر ہوتا ہے، وسائل اور افرادی قوت ہوتی ہے۔

 ایسے ہی کراچی سے سندھ کے سیلابی علاقوں کی مدد کے لئے جانے والے  ٹرکس متائثرین تک پہنچنے سے پہلے راستے میں لوٹ لئے گئے۔ ادھر چار سدہ سے آنے  والے ایک دوست نے بتایا کہ امداد کی تقسیم صحیح طور پہ نہ ہونے سے ایسی ہی لوٹ مار ہو رہی ہے۔ حالات کا فائدہ اٹھا کر ڈاکو بھی سرگرم عمل ہو گئے ہیں۔ یہاں سندھ میں بھی ایسے واقعات کی بازگشت سنائ دے رہی ہے۔ آج ہی متائثرین کے ایک کیمپ میں امدادی سامان کی تقسیم کے وقت وہ بھگد ڑ مچی کہ پولیس کو شدید لاٹھی چارج کرنا پڑا۔ ٹی وی ہی کی ایک خبر کے مطابق ایک اور جگہ،  ہجوم میں مچ جانےوالی بھگدڑ کو قابو میں لانے کے لئے کی جانے والی فائرنگ سے ایک شخص ہلاک ہو گیا۔

یہ ہے ایک دھندلی سی تصویر حالات کی۔ ایک ایسی قوم کی جو ایک مضبوط مرکز نہیں رکھتی، ایک منتشر قوم جسے سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ وہ اس مصیبت میں کس کی طرف منہ اٹھا کر دیکھے۔ اس سب افراتفری سے کیسے باہر نکلیں، کون حالات سنبھالے، بے گھر لوگوں کو دوبارہ آباد کرنے میں کون مدد کرے، زمینوں کو شاداب کرنے کے وسائل کیسے ملیں۔ کون لوگ سر جوڑ کر بیٹھیں گے اور ایک لائحہ ء عمل بنائیں گے جس پہ تمام قوم کو یقین اور بھروسہ ہوگا۔ ایک لا وارث اور تنہا ہونے کا احساس،  جو حالات پہ طاری ہے۔

 ان حالات میں کوئ اس انتشار کے درمیان ذرا بھی اتحاد کی علامت بنا ہوا ہے تو وہ پاک افواج ہیں۔ لیکن افواج کی تربیت تحفظ کے لئے ہوتی ہے۔ ملک کی ترقی کی منصوبہ سازی کرنا، عوام کو ایک بہتر زندگی گذارنے کی سہولیات دینا ان میں ایک کامیاب قوم ہونے کا جذبہ پیدا کرنا یہ انکا کام نہیں۔

کتنی عجیب بات ہے کہ ہر دفعہ جمہوریت اپنی آزمائیش کے وقت ناکام ہوجاتی ہے۔ اس لئے کہ یہ جمہوریت، جمہور کے لئے نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ معاشرے کے اعلی طبقات کو احساس طاقت دیتی ہے اور بس۔ اس تمام پس منظر میں لگتا  ہے کہ ہمیں متحد رہنے کے لئے ایک نئے سیاسی اور سماجی نظام کی ضرورت ہے۔ شاید وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے کئ دہائیوں کے جمود سے باہر نکلیں۔ اور عوام اور خواص کی تعریف کو بدل ڈالیں، بھیڑ بکریوں کی طرح زندگی گذارنے والوں کو اپنے انسان ہونے کا احساس بیدار کرنا ہوگا۔ یہ سیلاب شاید ایک نئ مضبوط تبدیلی سے قوم کو روشناس کرانے کا موقع ہے، ابھی نہیں تو کبھی نہیں۔

11:54 PM

Flood in pakistan, پاکستان, ڈی آئ خان, زرداری, سندھ, سیلاب, فضل الرحمن, کراچی, یوسف رضا جیلانی

اردو زبان کا ارتقاء

یہ وہ موضوع ہے جس پہ تحقیق دانوں نے اپنے طور پہ کافی اندازے لگانے کی کوشش کی۔ کچھ عرصے قبل جب میں نے ایک بلاگر ساتھی کے بلاگ پہ یہ دعوی پڑھا کہ اردو نے دراصل پنجابی سے جنم لیا ہے تو میں نے اپنی ایک دوست سے جو اردو ادب میں ماسٹرز کر چکی ہے اور کراچی کے ادبی افق پہ مصروف اور سرگرم ہیں ان سے یہ سوال کیا۔ کئ ادبی محافل میں مختلف ادباء سے یہ پوچھا اور جواب ملا کہ بھئ ہر علاقے کے لوگ کھڑے ہوتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ یہ انکے علاقے کی زبان ہے۔  اسکی وجہ اس زبان کی ہمہ گیریت ہے۔ میں نے انکی تحریر پہ بھی اسی قسم کے تبصرے کی کوشش کی مگر انہوں نے اس وقت اسے خاطر میں نہ لانے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔

اب مزید بلاگرز نے اس قسم کے ثقافتی تسلط  میں اپنا حصہ ڈالنے کی کوشش کی۔ تو میں نے سوچا کہ ڈاکٹر انور سدید کا یہ اقتباس سب کو ضرور پڑھنا چاہئیے۔ یہ مجھ جیسے کسی شخص نے نہیں بلکہ انہی کے درمیان کے ایک شخص نے لکھا ہے جو اس وقت اپنی عمر کی آٹھویں دہائ میں ہے لیکن ان لوگوں کی بد قسمتی کہ یہ شخص بھی ایک علم دریاءو ہے جو انہیں راس نہیں آتے۔

ڈاکٹر انور سدید کے نام سے میرے وہ قارئین اب اچھی طرح واقف ہونگے جو پچھلے نو دس مہینے سے میرے بلاگ پہ آرہے ہیں۔ انہوں نے جامعہ پنجاب سے اردو ادب میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انکی کتاب 'اردو ادب کی تحریکیں' دراصل انکا پی ایچ ڈی کا تھیسس ہے جو انیس سو پچاسی میں منظر عام پہ آیا اور اپنی مقبولیت کی وجہ سے اسکے اب تک چار ایڈیشن آچکے ہیں۔ یہ اسوقت پاکستان کی تمام جامعات کے نصاب میں شامل ہیں۔ آئیے دیکھتے ہیں کہ وہ اسکے ارتقاء کے بارے میں اس کتاب میں کیا کہتے ہیں۔

مغلوں کی آمد سے پہلے مسلمان سلاطین نے قریباً دو سو سال تک اکناف ہند پر حکومت کی اور دہلی کو جہاں پہلے ترک شہ سواروں نے ڈیرے ڈالے تھے اتنی اہمیت حاصل ہو گئ کہ مسلمانوں نے اسے اپنا دارالسلطنت بنایا اور ترکوں کی یہ چھاءونی علم و ادب کا مرکز بن گئ۔ اس عرصے میں مسلمانوں اور مقامی باشندوں میں اختلاط کا سلسلہ غیر محسوس طور پہ جاری ہوا اور اس ادغام کا ایک غیر معمولی نتیجہ اردو زبان تھی۔ بقول حافظ محمود شیرانی

اردو کی داغ بیل اس دن پڑنی شروع ہو گئ تھی جس دن سے مسلمانوں نے ہندوستان میں آ کر توطن اختیار کیا۔

یہ نا موسوم یعنی بغیر نام کی زبان ہر علاقے میں مقامی بولی کے نام سے پہچانی گئ۔ چنانچہ شاہ میراں جی شمس العشاق نے اسے ہندی کا نام دیا امیر خسرو نے غرۃ الکمال میں مسعود سعد سلمان کے ہندوی دیوان کا تذکرہ کیا ہے۔ ملا وجہی نے سب رس میں اردو کو زبان ہندوستان کہا ہے۔ شاہ ملک بیجا پوری نے اسے دکنی اور محمد امین نے مثنوی یوسف زلیخا میں اسےگوجری سے موسوم کیا ہے یعنی گوجری کا نام دیا ہے۔ شیخ خوب محمد اسے گجراتی بولی کہتے ہیں۔ شیخ باجن نے اسے زبان دہلوی قرار دیا۔ مرور ایام سے زبان کے لئے ریختہ کا لفظ استعمال ہوا اور میر و غالب کے زمانے میں مروج رہا۔ اسی لئے غالب نے کہا

ریختہ کے تم ہی استاد نہیں ہو غالب

کہتے ہیں کہ اگلے زمانے میں کوئ میر بھی تھا

اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اردو اگرچہ بے نام  اور بے عنوان تھی لیکن سماجی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے وسیع علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ چنانچہ اردو کے ارتقائ خاکے میں جو اولین نقوش نظر آتے ہیں ان میں پنجاب ، سندھ، گجرات، دکن، راجستھان اور گونڈیانہ وغیرہ کے بہت سارے الفاظ  موجود ہیں۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے رگ وید کو اردو کی تاریخ کا پہلا سرا قرار دیا ہے۔ اور یہ اس بات کی وضاحت ہے کہ اس زبان کا خام مواد مقامی بولیوں کی صورت میں رگ وید کے زمانے میں بھی موجود تھا۔ عربی کے الفاظ عرب تاجروں اور مسلمان فاتحین کی بدولت ہندوستان میں در آمد ہوئے اور جب مسلمان فاتحین دلی کی طرف بڑھے تو ان الفاظ کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔

دلی چونکہ مسلمانوں کا پایہ ء تخت تھا اس لئے یہی مقام اردو کا بھی دارلخلافہ قرار پایا۔ علاءوالدین خلجی کی فتح دکن اور محمد تغلق کے دارالخلافے کی تبدیلی سے یہ اثرات جنوب میں پہنچے اور ایک مخلوط زبان وجود میں آگئ۔ جسکے اولین شعراء میں مسعود سعد سلمان لاہوری، فرید گنج شکر، بو علی قلندر، امیر خسرو، اور قطبن وغیرہ شامل تھے۔ چنانہ سید سلمان ندوی کے اس نظرئیے سے انکار ممکن نہیں کہ

یہ مخلوط زبان سندھ، گجرات۔ دکن، پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبائ زبانوں سے مل کر ہر صوبہ میں الگ الگ پیدا ہوئ، یہ کسی ایک قوم یا زبان کا نہیں بلکہ مختلف قوموں اور زبانوں کے میل جول کا ایک ناگزیر اور لازمی نتیجہ ہے۔ اور غوریوں ، خلجیوں اور تغلقوں کے زمانے میں پیدا ہو چکی تھی۔

10:58 AM

Urdu, اردو ادب, اردو ادب کی تحریکیں, اردو کا رتقاء, اردو، زبان, پاکستان, جامعہ پنجاب, ڈاکٹر انور سدید

ایک ماں اپنے بیٹے کی زبانی-۲

گذشتہ سے پیوستہ

سر سید کہتے ہیں کہ جو کچھ آمدنی ہوتی تھی اس میں سے پانچ فی صد کے حساب سے میری والدہ ہمیشہ الگ رکھتی جاتی تھیں۔ اور اس سرمایہ کو حسن انتظام کے ساتھ نیک کاموں میں صرف کرتی تھیں۔ کئ جوان لڑکیوں کا انکی امداد سے نکاح ہوا اکثر پردہ پوش عورتیں جو معاش سے تنگ ہوتیں انکی ہمیشہ خبر گیری کرتیں۔ غریب خاندانوں کی جوان لڑکیاں جو بیوہ ہو جاتیں انکو دوسرا نکاح کرنے کی نصیحت کرتیں۔ دوسرے نکاح کو برا سمجھنے والوں سے نفرت کرتیں۔ غریب رشتے داروں کے یہاں جاتیں اور خفیہ حیلے بہانے سے انکی مدد کرتیں۔ بعض رشتے دار مردوں نے ایسی عورتوں سے شادی کر لی تھی جن سے ملنا معیوب سمجھا جاتا مگر وہ برابر انکے گھر جاتیں اور انکی اولاد سے شفقت سے پیش آتیں۔

انکی والدہ کو شاہ غلام علی سے عقیدت تھی  اور وہ ان سے بیعت تھیں۔ لیکن انہوں نے کبھی کوئ منت یا نذر یا نیاز نہیں مانی۔ تعویذ یا گنڈے پر تاریخوں یا دنوں کی سعادت یا نحوست پر انکو مطلق یقین نہ تھا۔ لیکن اگر کوئ کرتا تو اسکو منع نہ کرتیں اور یہ کہتیں کہ اگر انکو منع کیا جائے اور اتفاق سے وہی امر پیش آجائے جسکے خوف سے وہ ایسا کرتے ہیں تو انکو یقین ہو جائے گا کہ ایسا نہ کرنے سے یہ ہوا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو نہ ہوتا۔

سر سید کے ننہیال والے شاہ عبدالعزیز سے عقیدت رکھتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز کے یہاں بچوں کو ایک گنڈا دیا کرتے تھے۔ جس میں ایک ہندسہ یا حرف سفید مرغ کے خون سے لکھا ہوتا۔ اور جس بچے کو دیا جاتا اسے بارہ برس تک انڈہ یا مرغی کھانے کی ممانعت ہوتی۔ سرسید کے صاحبزادوں کو بھی انکے ننہیال والوں نے یہ گنڈے پہنائے۔ اسکے باوجود جب یہ بچے انکی والدہ کے ساتھ کھانا کھاتے تو وہ کھانے میں موجود انڈہ یا مرغی بلا تامل کھلا دیتیں۔

سر سید کو بچپن میں باہر تنہا جانے کی اجازت نہ تھی اور ہر چند کے نانا کی اور انکی والدہ کی حویلی میں صرف ایک سڑک درمیان میں تھی جب کبھی وہ نانا کے یہاں جاتے تو ایک آدمی ساتھ میں جاتا۔ اس لئے بچپن میں گھر سے باہر عام صحبتوں میں بیٹھنے یا آوارہ پھرنے کا بالکل اتفاق نہ ہوا۔

سر سید کو انکی ایک خادمہ نے جیسا کہ صاحب حیثیت خاندانوں کا دستور تھا،  پالا تھا اور وہ اسے ماں بی کہہ کر بلاتے تھے۔

انہیں ان سے بہت محبت تھی۔ جب وہ پانچ برس کے تھے تو انکا انتقال ہو گیا۔ انہیں اسکے مرنے کا بہت رنج ہوا۔ والدہ نے سمجھایا کہ وہ خدا کے پاس گئ ہے۔ بہت اچھے مکان میں رہتی ہے۔ بہت سے نوکر چاکر اسکی خدمت کرتے ہیں اور اسکی بڑے آرام سے گذرتی ہے تم مطلق فکر نہ کرو۔ مدت تک اسکی ہر جمعرات کو فاتحہ ہوتی۔ مرتے وقت اس نے کہا تھا کہ میرا سارا زیور سید کا ہے۔ مگر والدہ اسکو خیرات کرنا چاہتی تھی۔ ایکدن انہوں نے مجھ سے کہا کہ اگر تم کہو تو یہ گہنا ماں بی بی کے پاس بھیج دوں۔ میں نے کہا ہاں بھیج دو۔ والدہ نے وہ سب گہنا مختلف طرح سے خیرات کر دیا۔

سر سید کا بیان ہے کہ

میں جب دلّی میں منصف تھا تو میری والدہ کی یہ نصیحت تھی کہ جہاں تم کو ہمیشہ جانا ضرور ہے وہاں کبھی سواری پہ جایا کرو اور کبھی پیادہ پا جایا کرو۔ زمانے کا کچھ اعتبار نہیں۔ کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ پس ایسی عادت رکھو کہ ہمیشہ اسے نبھا سکو۔

ایک دفعہ کا ذکر بتاتے ہیں کہ وہ ایک زیبن نامی بڑھیا کی خبر گیری کرتی تھیں۔ اتفاق سے وہ دونوں ایک ساتھ بیمار پڑ گئیں۔ حکیم  نے افاقے کے لئے والدہ صاحبہ کے لئے ایک معجون کا نسخہ تیار کیا جو قیمتی تھا مگر مقدار میں صرف اتنا ہوا کہ ایک شخص اسے استعمال کر لے۔ انہوں نے وہ اپنی والدہ کو پہنچا دی۔ انکی والدہ کو خیال آیا کہ زیبن کو کون تیار کروا کے دے گا تو انہوں نے وہ معجون پابندی سے زیبن کو کھلا دیا۔ چند دنوں بعد جب میں نے ان سے پوچھا کہ معجون نے آپکو بہت فائدہ کیا تو ہنسیں اور کہا کہ کیا بغیر دوا کے خدا صحت نہیں دے سکتا۔ معلوم ہوا کہ دوا تو صرف زیبن نے کھائ لیکن صحت خدا نے دونوں کو دی۔

اب اس آخری واقعے کے بعد، محترم قارئین، دوا علاج کرنا مت چھوڑ دیجئیے گا۔  خدا توکلی اچھی چیز ہے مگر اونٹ کو رسی ڈالنا ضروری ہے۔ تو یہ تھا سر سید کی والدہ کا ایک اجمالی خاکہ، ایک ایسی مسلمان خاتون جو آج سے دو  سو سال پہلے موجود تھیں۔ سرسید کی طبیعت اور مزاج پر اپنی والدہ کی عادات و خصائل کا خاصہ اثر تھا۔

مندرجہ بالا واقعات حالی کی حیات جاوید سے لئے گئے ہیں۔

3:46 PM

Sir Syed Ahmed Khan, حالی، حیات جاوید, دہلی, سرسید احمد خان, کراچی، عزیزالنساء بیگم, والد

ایک ماں اپنے بیٹے کی زبانی-۱

اگست کا مہینہ شروع ہونے سے قبل میرا مصمم ارادہ تو یہ تھا کہ اس مہینے سرسید پہ جو کچھ لکھنا چاہ رہی ہوں اسے لکھ دوں۔ کہ دستور جو کچھ ہو لیکن موقع اچھا ہے۔ لیکن ایک تو میں سات سمندر پار بمعہ اپنے خاندان کے ہجرت نہیں کر گئ  ہمیشہ کے لئے۔ اور یہ کہہ کر مٹی پاءوں کہ سانوں کی۔ دوسرے یہ کہ تباہ کن سیلاب جیسا کہ زرداری صاحب نے بھی فرمایا بغیر اطلاع کے آ گیا۔ تیسرے یہ کہ کراچی میرا جائے توطن اور متوقع جائے مدفن ہے۔ اس طرح میرا قلم شہر کراچی اور ملک کے درمیان ایک فری الیکٹرون کی طرح حرکت میں آگیا۔  ادھر جو لوگ شہر سے باہر تھے انکا شہر میں آ کر اٹک گیا۔ پھر یہ کہ جوتم پیزار مجھے پسند تونہیں کہ جمہوری طریقہ نہیں، لیکن پھر بھی جمہور اور جوتے کے درمیان چلی جنگ، یہاں بھی جگہ پا گئ کہ یہی رائج الوقت جمہوریت ہے۔

خیر، سر سید احمد خان پہ اردو وکیپیڈیا پہ ایک تفصیلی مضمون موجود ہے۔ تو پھر میرا  دل کیوں چاہ رہا ہے کہ ان پہ لکھوں؟

بات یہ ہے کہ  یہ مضمون  دستاویزی قسم کا ہے۔ اس سے انکے کارنامے تو پتہ چلتے ہیں لیکن بحیثیت ایک زندہ انسان انکی شخصیت محسوس نہیں ہوتی۔

ادھر میں نے انکے حوالے سے کچھ کتابیں دیکھیں، جنکا تذکرہ آگے کسی تحریر میں آئے گا۔ لیکن ایک دن میں نارتھ ناظم آباد کراچی سے گذرتے ہوئے وہاں واقع ایک چھوٹی سی لائبریری میں داخل ہو گئ۔ اسکا نام تیموریہ لائبریری ہے۔ یہاں مجھے ایک چھوٹی سی کتاب ملی جسکا نام ہےسر سید احمد خان، شخصیت اور فن۔ اس کتاب کے مصنف ہیں جمیل یوسف اور اسے اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد نے شاٰئع کیا ہے۔ مجھے یہ کتاب اس حوالے سےخاصی پسند آئ۔

 اس سلسلے کی پہلی تحریر انکی والدہ کے حوالے سے ہے۔

  سر سید کے خاندان ددھیالی خاندان کے دہلی کے مغل خاندان سے روابط تھے۔انکے دادا کو بادشاہ کی طرف سے خطابات اور عہدہء احتساب و قضا دیا گیا۔ انکے والد کو بھی شاہ کی طرف سے یہی خطبات اور منصب پیش کیا گیا۔ مگر اپنی آزاد طبیعت اور درویشی کی وجہ سے انہوں سے اسے قبول کرنے سے معذرت کر لی۔

انکے نانا، خواجہ فرید الدین احمد خان بہادر،  ۱۸۱۵ء میں اکبر شاہ عالم ثانی کے وزیر اعظم رہے۔ اور دبیرا لدولہ امین الملک مصلح جنگ کے خطابات پائے۔ گورنر جنرل ولزلی نے انہیں اپنا وزیر بنا کر ایران بھیجا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے منصب وزارت کی پیش کش کو اپنی سب سے بڑی بیٹی عزیزالنساء بیگم  جو کہ سرسید کی والدہ تھیں، انکے مشورے پہ قبول نہ کیا۔

سر سید کی والدہ ماجدہ غیر معمولی سیرت و کردار کی مالک اور بڑی دانشمند خاتون تھیں۔  وہ نہ صرف بڑی راسخ العقیدہ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ صحیح العقیدہ مسلمان تھیں۔ سر سید ااپنی والدہ کے فہم دین کے متعلق لکھتے ہیں

اس زمانہ میں جبکہ میرے مذہبی خیالات اپنی ذاتی تحقیق پر مبنی ہیں اب بھی میں اپنی والدہ کے عقائد میں کوئ ایسا عقیدہ جس پر شرک یا بدعت کا اطلاق ہو سکے نہیں پاتا۔

سرسید کی عظیم شخصیت اور بے مثل سیرت و کردار کی تشکیل و تعمیر میں زیادہ تر انکی والدہ کی تربیت کا حصہ ہے۔ انکے والد میر متقی ایک آزاد منش اور درویش صفت انسان تھے اور زیادہ وقت اپنے مرشد حضرت شاہ غلام علی کی خانقاہ پہ گذارتے اور انکی صحبت میں رہتے تھے۔ گھر کا انتظام و انصرام سر سید کی والدہ کے سپرد تھا۔

اپنی والدہ کے بارے میں بتاتے ہیں

جب میں انکو سبق سناتا یا نئے سبق کا مطالعہ انکے پاس بیٹھ کر دیکھتا تو ایک لکڑی جس میں سوت کی گندھی ہوئ تین لڑیں باندھ رکھی تھیں۔ اپنے پاس رکھ لیتیں۔ وہ خفا تو اکثر ہوتی تھیں مگر ان سوت کی لڑوں سے کبھی مجھے مارا نہیں۔

دس گیارہ برس کی عمر میں ایک دفعہ ایک بوڑھے نوکر کو تھپڑ مار دیا، والدہ نے گھر سے نکال دیا۔  نوکرانی نے چپکے سے خالہ کے گھر پہنچا دیا۔ دو دن خالہ کے گھر چھپے رہے تیسرے دن خالہ لیکر والدہ کے پاس گئیں۔ تاکہ قصور معاف کرائیں، انہوں نے نوکر سے معافی مانگنے کی شرط پہلے رکھی۔ ڈیوڑھی میں جا کر نوکر کے آگے ہاتھ جوڑے تو قصور معاف ہوا۔

سر سید کے بڑے بھائ کا جواں عمری میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ مرض الموت میں وہ انکے پاس ہی بیٹھی رہتیں۔ ایک مہینہ اسی حالت میں رہ کر انتقال کر گئے۔ انکی آنکھوں سے آنسو جاری تھے کہ فجر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ وضو کر کے نماز پڑھی اور اشراق تک مصلے پہ بیٹھی رہیں۔ انہی دنوں ایک رشتے دار کی بیٹی کی شادی ہونے والی  تھی۔ شادی میں صرف چار دن رہ گئے تھے کہ یہ حادثہ پیش آگیا۔ لوگوں نے حسب دستور شادی کو ملتوی کرنا چاہا انکی موت کے تین دن بعد وہ انکے گھر گئیں اور کہا میں شادی والے گھر میں آئ ہوں۔ ماتم تین دن سے زیادہ نہیں ہوتا۔ جو خدا کو منظور تھا ہو چکا۔ تم شادی کو ہرگز ملتوی نہ کرو۔

جاری ہے

3:40 PM

ب, حیات جاوید، حالی, دہلی, زرداری, سرسید احمد خان, سیلا، Sir Syed Ahmed Khan, عزیزالنساء, کراچی

ناراض کیوں ہوتے ہو

جیو چینل بند کر دیا گیا اور پی پی کے جیالوں نے اسکے آفس پہ حملہ کیا۔

کیوں؟

یہ بتانے کی مجھے ضرورت تو نہیں کہ زرداری صاحب انگلینڈ میں ڈیوڈ کیمرون سے 'کامیاب ملاقات' کے بعد  اپنے حمائتیوں سے کنونشن ہال میں خطاب کر رہے تھے کہ ان پہ ایک ادھیڑ عمر شخص نے جوتے پھینکنے کی کوشش کی۔ واقعے کے فورا بعد،  انکے ترجمان فرحت اللہ بابر نے اس واقعے کے پیش آنے سے انکار کیا۔ جبکہ وفاقی وزیر اطلاعات قمرزماں کائرہ نے پہلے اقرار اور پھر انکار کی پالیسی اپنائ۔

بش پر پڑنے والے جوتے نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ اب ہر ناراض شخص یہ کرنے کو تیار نظر آتا ہے۔ اس واقعے کے پیش آنے کے بعد لوگوں کے ہاتھ ایک نئ دلچسپی لگی۔ مغرب جہاں جوتوں کا یہ استعمال پہلے نہ تھا اس سے روشناس ہوا۔ اور نیٹ کی دنیا میں کئ گیمز آئے جن میں جوتوں کو استعمال کیا گیا تھا۔

یہی گیمز اس وقت زرداری صاحب

کے لئے بھی آگئے ہیں۔

پیپلز پارٹی کے اقتدار میں آنے کے بعد پی پی کی ایک خاتون نے سابق وزیر اعلی سندھ ارباب رحیم کو سندھ اسمبلی کی عمارت کے اندر جوتوں سے مارا۔ اسکے بعد، وہ جا کر دبئ میں بیٹھ گئے۔ ایسی روائیتوں کی بنیاد پڑنے کے بعد تو یہی ہونا تھا۔ اس واقعے سے بھی لوگوں نے لطف لیا تھا۔ کل رات ارباب غلام رحیم نے ٹی وی کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے اسے مکافات عمل سے تعبیر کیا۔ معلوم نہیں صدر صاحب واپس پاکستان آئیں گے یا وہ بھی دبئ میں رہنا پسند کریں گے۔

تازہ ترین واقعے کے منظر عام پہ آتے ہی پاکستان میں کھلبلی مچ گئ۔ صدر صاحب کا یہ دورہ پہلے ہی حد سے زیادہ تنقید کا شکار رہا، ملک میں اسے عالمی پیمانے پہ پاکستان کی بے عزتی اور صدر صاحب کے بے حسی سے تعبیر کیا جا رہا تھا۔

جیو چینل بند کر دیا گیا، کیونکہ انہوں نے جوتا مارنے والے شخص شمیم خان کا انٹرویو حاصل کر لیا تھا۔ صدر کے ترجمان فرحت اللہ بابر نے چیلینج کیا تھا کہ اگر اسکی کوئ فوٹیج موجود ہے تو لائیں۔  کیونکہ ہال کے اندر کسی کو کیمرہ یا موبائل لےجانے کی اجازت نہ تھی۔ لیجئیے جناب شمیم خان نے تو پورا انٹرویو دے دیا۔

You need to install or upgrade Flash Player to view this content, install or upgrade by

clicking here

.

یہ ہے پاکستان میں جیالوں کے ناراض ہونے کی وجہ۔

ناراض نہ ہو تو عرض کروں، اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔  آج ہم کل تمہاری باری ہے۔ برا ماننے کی ضرورت نہیں، شاید کل آپکی باری آجائے یہ کہنے کی کہ یہ مکافات عمل ہے۔

3:48 PM

pakistan, Shoe, Zardari, انگلینڈ، فرحت اللہ بابر, پاکستان, جوتے, زرداری, قمرزماں کائرہ

عذاب کا خواب

اب قوم پہ عذاب کی پیشن گوئیاں پورا ہونے کا وقت لگتا ہے آ ہی پہنچا ہے۔ عبدالقادر حسن صاحب ہمارے سینیئر صحافی ہیں۔ انکی سب سے اچھی بات جو مجھے  پسند ہے کہ انہوں نے ہر اچھے اور برے وقت میں شریف برادران سے وفاداری نبھائ۔

ابھی کچھ دنوں پہلے انہوں نے ٹرانسپیرینسی انٹر نیشنل کے مرتب کردہ نتائج پہ ایک کالم لکھا۔ جس میں پاکستان کے صوبوں پہ مہربانی کرتےہوئے انکی بھی گریڈنگ کی گئ اور پنجاب کو سب سے کم کرپشن کا حامل صوبہ قرار دیا گیا۔ جناب عبدالقادر حسن صاحب نے اس بات پہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے صوبے میں کم کرپشن کا باعث پنجاب کے نیک نیت حکمرانوں کو لکھا۔

ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ اپنے 'پنجاب کے رہنے والے بھائیوں' سے دریافت کروں کہ کیا نیک حکومت کے مزے لوٹ رہے ہیں آپ اکیلے ہی اکیلے اور ہمیں خبر بھی نہیں۔ رشوت کا خاتمہ ہو چکا ہو گا، مجرمین سب جیلوں میں ہونگے، ملزمین پہ قانون کے حساب سے مقدمے چل رہے ہونگے، امیر اور غریب سب ایک جگہ سے خریداری کر رہے ہونگے۔ کیا سہانی زندگی اس زمین پہ آپکو حاصل ہے ۔

لیکن میں تو سوچتی ہی رہ گئ، انہوں نے اپنے

تازہ کالم

میں آنے والی قدرتی آفات پہ روشن خیالوں  اور لبرلزکے اس خیال پہ دو حرف بھیجے کہ یہ سب قدرتی توازن خراب ہونے کی وجہ سے ہو رہا ہے۔  بحیثیت ایک 'پاکستانی لبرل' میں تو یہ بھی سوچتی ہوں کہ ان قدرتی عوامل کے عدم توازن کی وجہ سے وہ علاقے زیادہ تباہی کا شکار ہوتے ہیں جہاں پسماندگی اور غربت زیادہ ہو۔ لیکن ایک بزرگ، جہاندیدہ صحافی جب یہ بات کہہ رہے ہیں تو میں نے بھی اپنے اس شیطانی خیال سے رجوع کیا۔ لیکن رجوع کرنے کے بعد جب آگے پڑھتی ہوں تو آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ

یاد کریں کہ قوم پہ آفات کا یہ بے رحم سلسلہ کیا اس سانحے کے بعد شروع نہیں ہوا جب لال مسجد کی بچیوں پہ ٹینک چڑھا دئیے گئے۔

نظریہ ٹھونسنا کسے کہتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ کیسے ہوتی ہے برین واشنگ شاید ایسے۔ کیونکہ میں اپنے دماغ کو پہلے سے کافی ستھرا پاتی ہوں۔

اگرچہ کہ یہ خیال بھی آتا ہے کہ  دنیا کا کوئ بھی شخص جب ظلم کا شکار ہوتا ہے تو چیختا ہے، چاہے وہ خودکش حملہ آور کے بم سے پھٹ کر مرے، طیارے کے پھٹنے سے مرے، زنا بالجبر کا شکار ہو رہا ہو، سڑک پہ برہنہ پھرایا جا رہا ہو، تین تین دن کچھ کھانے کو نہ ملے اور خود کشی کرنے جا رہا ہو، اپنے آزاد پیدا ہونے کے حق کو حاصل کرنے کے بجائے کسی زمیندار کی ذاتی جیل میں پڑا ہو، اپنی زندگی بھر کی پونجی لٹیروں کو حوالے کرنے کے بعد اب اپنے بچوں کو اور اپنے آپکو دینے کے لئے کچھ نہ رہا ہو، اکلوتی اولاد سر راہ چلتی ہوئ گولی سے مرے، صحن میں کھڑے بچے دو منشیات کے مافیا کے درمیان فائرنگ کی زد میں آکر مر جائیں، ایک مختلف مذہب یا زبان یا ثقافت رکھنے کی وجہ سے مارے جائیں۔ یہ واقعات پچھلی کئ دہائیوں سے تسلسل کے ساتھ جاری ہیں۔ مجھے یقین ہے ان میں سے ہر ایک اپنے اس غیر متوقع، اندوہناک انجام سے پہلے ضرور چیختا ہوگا، مدد، مدد، مجھ پہ ظلم ہورہا ہے، بچاءو۔

 کیا دنیا میں عذاب صرف ان مظلومین کی وجہ سے آتا ہے جو قرآن کی تلاوت کرتے ہیں یا ہر مظلوم کی آہ عرش تک پہنچتی ہے اسے ہلا دیتی ہے اور باریابی پاتی ہے۔

پھر یاد آتا ہے کہ پاکستان کی تاریخ کا دل ہلا دینے والا زلزلہ سانحہ ء لال مسجد سے دو سال قبل آیا تھا۔ لیکن، چونکہ یہ سانحہ انکے اخذ کردہ نتیجے سے نہیں ملتا اس لئے اسکا تذکرہ یہاں بے کار ہے۔

اب میں میں اپنی اس رائے سے رجوع کر رہی ہوں کہ یہ سیلاب کی مصیبت قدرتی تبدیلیوں کی طرف ایک اشارہ ہے۔ اور میں اس رائے کی طرف بڑھ رہی ہوں کہ یہ دراصل اللہ کا ایک عذاب ہے جو اس قوم پہ نازل ہو رہا ہے۔ لیکن ایک خیال جو میرے قدم پکڑے لیتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر یہ عذاب ہے کیونکہ اب زیادہ تر لوگ یہی کہہ رہے ہیں تو آخر یہ عذاب سب سے زیادہ خیبرپختونخواہ میں کیوں ہو رہے ہیں۔ اپنی پہلے والی حالت میں تو میں یہی کہتی کہ چونکہ غربت اور پسماندگی ہر طرح کی چاہے وہ معاشی ہو، تعلیمی ہو یا معاشرتی سب سے زیادہ ان علاقوں میں ہے تو قدرتی عوامل کی وجہ آنے والی مصیبت ،عذاب بن گئ  ہے۔ لیکن نہیں، میں تو اب اسی سوچ پہ ہوں کہ یہ عذاب ہے۔ لیکن یہ کیسا عذاب ہے جو ان علاقوں کو زیادہ متائثر کر رہا ہے جہاں زیادہ دینی مزاج کے حامل لوگ رہتے ہیں، وہ پچھلی کئ دہائیوں سے جہاد جیسے عظیم مقصد کے پیچھے اپنی جانیں بھی قربان کر رہے ہیں ۔ ایسا کیوں ہے کہ وہی لوگ اس تباہی کا سب سے زیادہ شکار ہو رہے ہیں۔

اب اسے کیا سمجھا جائے، عذاب، یا قدرتی عمل، نامناسب منصوبہ بندی اور پسماندگی کا گٹھ جوڑ۔

11:48 AM

Kyberpakhtunkhwa, پنجاب, خیبر پختون خواہ, زلزلہ, شریف, عبدالقادر حسن, لال مسجد

سیلاب سے سیر تک

ملک میں سیلاب آیا ہوا ہے۔ ڈیڑھ ہزار سے زائد لوگ ہلاک ہو چکے ہیں۔  صرف خیبر پختونخواہ میں بیالیس لاکھ کے قریب  لوگ متائثر ہوئے ہیں۔ مال مویشی، فصل کا نقصان الگ۔

ادھر کراچی میں فسادات کے نتیجے میں اسی سے زائد افراد تین دن میں ہلاک ہو چکے ہیں۔ پولیس اور رینجرز کو فسادیوں کو دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم لیکن یہ دیکھنا باقی ہے کہ یہ گولی کس پہ چلے گی۔ شاید ابھی تک ٹاس ہو رہا ہے۔ شہر میں کاروباری سرگرمیاں ماند۔ ظاہر سی بات ہے کہ اس قسم کی تمام سرگرمیاں کسی جگہ کے سیاسی استحکام سے جڑی ہوتی ہیں۔  حکومت کو اس سلسلے میں جو ٹھوس اقدامات کرنے چاہئیں وہ انہیں کرنے سے قاصر نظر آتی ہے۔ اس لئے اہم سوال یہ ہے کہ شہر کی معیشت کا پہیہ دوبارہ ہمواری سے چلنے کے قابل کیسے ہوگا۔

 ایک ایسی افراتفری کے عالم میں صدر صاحب، فرانس اور انگلینڈ کی سیرپہ روانہ ہو گئے۔ حالانکہ کچھ لوگوں نے سمجھانے کی کوشش بھی کی۔ پاکستان کی تاریخ کا بد ترین سیلاب آیا ہوا ہے آپکی با برکت ذات یہاں رہے گی تو دل کو ڈھارس رہے گی۔ مگر انہوں اسی رقت سے کہا کہ ۔ لیکن  داءود کامران میرا مطلب ہے ڈیوڈ کیمرون کا کیا کروں اس نے

دشمن ملک میں بیٹھ کر کہا

کہ پاکستان دہشت گردی برآمد کر رہا ہے۔ میری غیرت اسے گوارا نہیں کرتی۔ میں جاءونگا اوئے مجاوراں۔ پاکستان کھپے کھپے۔

پھر لوگوں نے سمجھایا کہ حضور وہاں جانے کے بجائے گھر پہ ہی رہئیے اور یہاں سے بیان جاری کر دیں کہ ہمیں تمہاری بک بک قطعاً پسند نہیں آئ۔ ہم تم پہ تھوکتے بھی نہیں۔ اس وقت آپکا جانا غیرت کے منافی ہے۔ مگر انہوں نے کہا کہ نہیں یہ پتر ہٹاں تے نئیں مل دے۔ میں انہیں

انکے گھر میں

ذلیل کر کے آءونگا، ورنہ ہم جشن آزادی کیسے منائیں گے۔  مذاق سمجھا ہوا ہے انہوں نے ہر بات کو۔ اگر پاکستان دہشت گردی بر آمد کر رہا ہے تو اسکے کمیشن میں میرا حصہ کہاں ہے۔

پہلا

ذلیل کرنے والا بیان

انہوں نے فرانس میں ایک بہترین ہوٹل سے نکلنے کے بعد دیا۔ اپنے اس بیان میں انہوں ے کہا کہ بین الاقوامی کمیونٹی طالبان سے جنگ ہار رہی ہے۔

چغل خوروں کا کہنا ہے کہ انکا فرانس میں ایک محل موجود ہے پھر بھی انہوں نے پاکستانیوں پہ اس ہوٹل کی رہائیش کا بوجھ ڈالا۔ یہ دو ٹکے کے چغل خور بھول جاتے ہیں کہ وہ اس وقت  پاکستان کی جگ ہنسائ کے آفیشل ٹور پہ ہے۔

انکی پارٹی کی ایک جیالی خاتون فوزیہ وہاب کا کہنا ہے کہ پاکستان کے ان گنت حکمرانوں میں صرف زرداری صاحب ایسے ہیں جو برطانیہ کے وزیر اعظم سے انکی ذاتی رہائیش گاہ پہ ملیں گے باقی سب تو آفس میں ملتے رہے۔ اس پہ کچھ دل جلوں نے کہا کہ سنجیدہ ٹورز تو آفس میں ہی ہوتے ہیں۔ البتہ جائداد وغیرہ کی ڈیل ذاتی رہائیش گاہ پہ ہوتی ہے۔ اس فارن پالیسی کے ٹور میں فارن منسٹر کے ساتھ میں نہ ہونے کی وجہ انہوں نے یہ بتائ کہ صدر زرداری کو کیا کسی فارن منسٹر کی ضرورت ہے۔ تب تو فارنمنسٹر کو ابھی ابھی برخواست کر کے انکی بچنے والی تنخواہ کو سیلاب زدگان کے فنڈ میں ڈالدینا چاہئیے۔

برطانیہ کے اخبار جو پہلے ڈیوڈ کیمرون کی مذمت میں لگے ہوئے تھے کہ اس نے ایسا بیان دیا ہی کیوں۔ اب اس بات پہ اپنی حیرانی کا واویلہ مچائے ہوئے ہیں کہ صدر زرداری اپنے ملک کے اتنے بد ترن حالات میں ڈیوڈ کیمرون کی رہائیش گاہ کا جائزہ لینے کیوں آئے ہیں؟ گورے تو ہیں ہی ہمیشہ کے ایسے ہی فساد کے بیج بونے والے۔

گوروں کو نہیں معلوم کہ یہ غیرت کا معاملہ ہے۔ انکے یہاں غیرت ہوتی جو نہیں ہے۔

یہاں وطن میں غیرت کے معنوں پہ نئ ریسرچ شروع ہو گئ ہے کہ

امریکی ہیلی کاپٹر سوات

میں پھنسے لوگوں کو ریسکیو کرنے سے لگے ہوئے ہیں۔ کیا امریکیوں سے اس طرح کی امداد لینا جائز ہے۔

گیلانی صاحب، انہیں صاحب لکھتے  ہوئے کچھ کچھ ہوتا ہے کہ انہیں دیکھ کر مسٹر بین خدا جانے کیوں یاد آتا ہے حالانکہ اس کمبخت کی اتنی پیاری مونچھیں بھی نہیں ہیں۔ خیر انہوں نے بھی میانوالی میں سیلاب زدگان کے لئے ایمرجینسی میں ایک اسکول میں قائم کئےجانےوالے ہسپتال میں جا کر ایک کامیاب فوٹو سیشن کرایا اور کہا کہ صدر کےملک میں موجود ہونے کی کوئ ضرورت تو نہیں میں ہوں ناں تصویری سیشنز کے لئے، میرا چہرہ زیادہ فوٹو جینک ہے۔ خطرہ یہ پیدا ہو چلا ہے کہ انکی عدم ضرورت کہیں بڑھ کر ہمیشہ کے لئے نہ ہو جائے۔

گیلانی صاح\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_ب، اب کراچی بھی آئیں گے تاکہ یہاں کے حالات کے ساتھ ایک فوٹو سیشن ہو سکے۔  یہ تمام تصویریں بعد از وزارت عظمی سند رہیں گی اورانکی اگلی نسل کی بڑھکوں میں  نہ صرف کام آئیں گی بلکہ دوبارہ وزارت عظمی کے لئے انکی نسل میں سے لوگوں کو ترجیح دینے کا باعث بھی بنیں گی۔ کلاءون وزیر اعظم بنے رہنے کا نسلی تجربہ۔ لیکن انہوں نے ایک کام کی بات اور کہی کہ  اگر زرداری صاحب نہ جاتے اور ملک میں ہی رہتے تو بھی ایشوز کھڑے ہوتے رہتے، زرداری صاحب کی شخصیت ہے ہی ایسی۔

دل جلوں نے کہا کہ ڈیڑھ  ہزار سے اوپر لوگ تو سیلاب کی نظر ہو گئے کچھ نہ ہوا، وہ کہتے ہیں کہ ایک زرداری سب پہ بھاری۔ اگر وہ ہوتے تو آزما کر دیکھ لینے میں کیا حرج تھا۔

12:42 AM

زرداری، یوسف رضا گیلانی، پاکستان، کراچی، خیبر ہختونخواہ، سیلاب، فرانس، ڈیوڈ کیمرون، سوات ، میانوالی،

ایک دوست کا نقصان

یہ ایسا موقع ہے پہ جب کچھ لوگ یہ ثابت کرنے پہ لگے ہوئے ہیں کہ ایم کیو ایم کے منتخب رکن صوبائ اسمبلی

رضا حیدر کا قتل

عین اصولی ہے۔ اور جو ہوا وہ بالکل صحیح ہوا اور اس پارٹی کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئیے۔ باقی سب دہشت گردوں کے ساتھ ہم راضی باضی ہیں۔ اور دوسری طرف ایم کیو ایم کے نوجوان افسوس اور غصے میں سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کر ڈالیں۔ اور کسے انجام تک پہنچا دیں۔ پارٹی نے اسکا سارا الزام اے این پی پہ ڈالا ہے۔  بعد میں پیش آنے والے واقعات میں جو کہ حکومت سندھ کی نا اہلی کا واضح ثبوت ہیں۔  شہر میں ساٹھ کے قریب لوگ مارے جا چکے ہیں۔ یوں شہر ایک دفعہ پھر دہشت کی زد میں ہے۔

چونکہ میں اس نسل سے ہوں جس نے کراچی میں جنم لیا اورانیس سوچھیاسی میں بپا ہونے والے ہنگاموں میں قتل و غارت گری کو قریب سے نہ صرف  دیکھا بلکہ سینکڑوں خاندانوں کو ایکدن میں تباہ ہوتے دیکھا  اور اسکے بعد کراچی کو ایک لمبے عرصے تک اپنی بقا کی جنگ لڑتے دیکھا بلکہ خود بھی اس میں شامل رہی مع اپنے خاندان کے اس لئے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ سلسلہ کہاں تک جا سکتا ہے۔   چونکہ اس بات کی امید ہے کہ میں دفن بھی اسی شہر میں ہونگی تو میں ان لوگوں میں سے نہیں ہو سکتی جو اس واقعے پہ دلی چین  اور سکون پائیں اور یہ سوچیں کہ خس کم جہاں پاک۔ در حقیقت اس شہر سے تھوڑی سی بھی انسیت رکھنے والا شخص ایسا نہیں سوچ سکتا۔

آج  ڈان اخبار پہ سے گذرتے ہوئے جب میں نے لیٹرز ٹو ایڈیٹر میں کراچی کے فسادت کے حوالے سے خط پڑھے تو میری نظر

ڈاکٹر شیر شاہ سید

کے خط پہ رک گئ۔ وہ کراچی کی ان شخصیات میں سے ہیں جن سے مل کر ہی نہیں صرف دور سے ہی دیکھ کر مجھے کیا سینکڑوں کو بڑی خوشی ہوتی ہے۔ اہل کراچی کو ان پہ فخر ہے۔ انکے والدین انڈیا کے صوبے بہار سے آکر کراچی میں آباد ہوئے۔ تعیلم اور پیشے کے لحاظ سے وہ ایک گائناکولوجسٹ ہیں  اور اپنے پیشے ہی نہیں اپنے مریضوں کے بھی وفادار۔ انہوں نے اپنی کوششوں سے

ایک ہسپتال

کراچی کے نواح میں واقع ایک گاءوں کوہی گوٹھ میں کھولاہے۔ اس گوٹھ کی بیشتر آبادی سندھی اور بلوچی خاندانوں پہ مشتمل ہے۔ یہاں غریب خواتین کے امراض اور بالخصوص فسچولا کا علاج  اور آپریشن مفت کیا جاتا ہے۔

 وہ  کراچی کے ایک محنت کش طبقے کی آبادی

اورنگی ٹاءون

میں واقع سندھ  گورنمنٹ قطر ہسپتال  سے بھی وابستہ ہیں۔  اور یہاں  گائنی کا شعبہ دیکھتے ہیں۔  انکی خدمات کی ایک لمبی لسٹ ہے جس کا تذکرہ فی الوقت ممکن نہیں۔ غیر ممالک سے انہوں نے اس سلسلے میں بہت سے ایوارڈ وصول کئے البتہ حکومت پاکستان انکی خدمات کی پذیرائ کرنے سے قاصر ہے۔  اپنے سوشل ویلفیئر کے کاموں کی وجہ سے بالخصوص خواتین کی صحت کے سلسلے میں کئے جانے والے کاموں کی وجہ سے وہ ایک ہر دلعزیز ڈاکٹر ہیں۔  وہ ایک ادیب بھی ہیں۔ میں نے انہیں کبھی سیاسی جانبداری برتتے نہیں دیکھا۔

اورنگی ٹاءون سے میری دلی وابستگی بھی ہے کہ میں اس سے ملحق آبادی علی گڑھ کالونی میں پیدا ہوئ اور اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ وہاں گذارا۔ جی وہی آبادی جو انیس سو چھیاسی میں کراچی میں ہونے والے بد ترین فسادات کا شکار ہوئ۔ میں اس وقت وہاں موجود تھی۔ اورنگی ٹاءون میں نہ صرف انڈیا کے مختلف حصوں سے ہجرت کر کے آئے ہوئے لوگ موجود ہیں بلکہ بنگلہ دیش سے آئے ہوئے بہاریوں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ یہ  پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے اور ان پہاڑوں پہ پٹھانوں کی بستیاں آباد ہیں۔  اسکا کچھ حصہ بلوچ آبادیوں سے بھی جڑا ہوا ہے۔ اسی میں پنجاب سے مزدور طبقے کے لوگ بھی آکر رہتے ہیں۔ اس طرح اس ہسپتال سے فائدہ اٹھانے والوں میں ہر طبقے کے غریب لوگ موجود ہیں۔

وہ اپنے اس خط مِں لکھتے ہیں کہ  رضا حیدرسندھ گورنمنٹ  قطر ہسپتال کے حقیقی سپورٹر تھے۔ انہوں نے اس چیز کے لئے ان تھک محنت کی کہ زچگی کے کے ایمرجینسی سیکشن میں غریب خواتین  کو ضروری سہولیات میسر رہیں۔

انکی شروع کی گئ کوششوں کی وجہ سے ہزاروں خواتین کا علاج کیا گیا اورسینکڑوں ماءووں اور بچوں کی زندگیاں بچائ گئیں۔

وہ اکثر اوقات ہسپتال آ جایا کرتے تھے اور کبھی بھی ڈاکٹرز، نرسز اور پیرا میڈیکل عملے کے ساتھ برے سلوک سے پیش نہیں آتے تھے جیسا کہ اکثر ایم پی ایز اور ایم اینز کرتے ہیں۔ وہ ہسپتال کی انتظامیہ کی مدد کے لئے ہمیشہ موجود رہتے اور بہتر نگہداشت کے منصوبوں میں مددگار رہتے۔ انہوں نے کبھی اپنی اتھارٹی دوسروں پہ جمانے کی کوشش نہیں کی۔

سندھ گورننٹ قطر ہسپتال  کے مریضوں اور خاص طور پہ کمیونٹی کی خواتین نے اپنا ایک عظیم  دوست کھو دیا۔ رضا حیدر نے ثابت کیا کہ  ایک ایم پی اے اپنی ذاتی توجہ سے ایک ہسپتال کو بالکل تبدیل کر سکتا ہے اور اس طرح لوگوں کی سچی خدمت کر سکتا ہے۔ یہ مریضوں اور کمیونٹی کے لئے ایک عظیم نقصان ہے۔

اورنگی کی خواتین کی حالت زار سے واقفیت رکھتے ہوئے مجھے بھی دکھ ہے کہ ایک بہتر امید رکھنے والے شخص کو قتل کیا گیا۔ اور ڈاکٹر شیر شاہ سید کے اس خط کو سراہنا بھی چاہونگی کہ انہوں نے بغض و عناد  کے اس زمانے میں قتل ہونے والے شخص کی انسان دوستی کا تذکرہ کیا۔

خط کا انگریزی متن

MPA Raza Haider was a real supporter of the Sindh Government Qatar Hospital, Orangi. He worked very hard to make sure that emergency obstetrical care was available to poor women.

Because of his initiative thousands of women were treated and hundreds of lives of mothers and children were saved in the maternity unit of the SGQH.

He used to visit the hospital at odd hours and never misbehaved with doctors, nurses and paramedics, unlike the usual practice followed by many MNAs and MPAs. He was always available for the hospital administration and supported plans for better patient care. He never tried to thrust his authority on the staff.

The SGQH, patients in Orangi, especially women of the community, have lost a great friend. Raza Haider showed that with personal interest, an MPA can improve hospitals drastically and truly serve the people. This is a great loss for patients and the community. DR SHERSHAH SYED Qatar Hospital Karachi

4:58 PM

کراچی، رضا حیدر، شیر شاہ سید، کوہی گوٹھ، اورنگی ٹاءون، ایم کیو ایم، بہاری، گائنی،

گگا۔۔۔۔۔۔۔گالی

میں منی بس میں بیٹھی محو انتظار کہ کب ڈرائیور صاحب، اس پیار سے میری طرف نہ دیکھو پیار ہو جائے گا' کے اثر سے باہر نکلتے ہیں۔ میں آدھ گھنٹہ لیٹ ہو چکی ہوں اور یہ بس پچھلے دس منٹ سے اس اسٹاپ پہ کھڑی ہے جب تک اگلی بس نہیں آجائے گی یہ یہاں سے نہیں ہلے گی۔ تو دیر ہونےمیں خطا کس کی ہے۔  میری۔ اس لئے میں ڈرائیور کو دہائ دینے کے بجائے صبر و سکون سے بیٹھی دل ہی دل میں، مستقبل میں اینگر مینجمنٹ کے کورس کروانے کے پلان بنا تی ہوں۔ ڈرائیور کی طرف دیکھنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ تیسری دفعہ 'اس پیار سے میری طرف نہ دیکھو' سن رہا ہے۔ اور اس قدر غرق ہے کہ 'کسی ' کے غصے کو بھی اسی نظر سے دیکھے گا، جس سے منع کیا جا رہا ہے۔

یکایک ایک پیلی ٹیکسی منی بس کے سامنے آ کر چر چراتے ہوئے رکتی ہے۔اس میں ایک کھلتے ہوئے رنگ اور درمیانے قد و قامت کا نوجوان کالے رنگ کے کپڑوں میں بجلی کی تیزی سے بر آمد ہوتا ہے۔ اسکے منہ سے دنیا کا ہر وہ لفظ موسلا دھار برس رہا ہے۔ جسے یہاں لکھنے کے لئے مجھے کچھ خلائ زبان استعمال کرنی پڑے گی۔ مثلاً

@\*^#~@&$\*#?

اسی طوفانی اسٹائل میں وہ آکر ڈرائیور گیٹ پہ بیٹھے ڈرائیور کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر اسے نیچے کھینچ لیتا ہے۔ اور پھر دے دھنا دھن۔ گالی اور تشدد کا ظالم ادغام۔  ڈرائیور صاحب اس حالت میں  کہہ رہے ہیں ارے دیکھومجھے بچاءو، لیکن سب پتھر کے بت بنے بیٹھے ہیں کیونکہ اگر انہیں دیکھا تو آپکو معلوم ہے کیا ہو جائے گا۔

حالانکہ تھوڑی دیر پہلے مسافروں میں سے ہر ایک اسکی یہی درگت بنانا چاہ رہا ہوگا۔ مگر اب سب سکتے میں ہیں۔ کیا یہ سکتہ اس چھبیس ستائیس سال  شخص کی تشدد سے بھر پور اینٹری پہ ہے یا گالیوں کی روانی و فراوانی پہ۔ میں خود بھی سانس روکے بیٹھی رہتی ہوں۔ ماحول خاموش ہے۔  گانوں کی کیسٹ ابھی بھی چلے جا رہی ہے۔ لیکن چونکہ ڈرائیور موجود نہیں اس لئے نیا گانا آگیا۔ لڑکی  کمال کی نظروں سے گولی مارے۔  ہاتھوں، اور پیروں اور زبان سے پٹنے کے بعد یہ گانا گولی ہی لگ رہا ہوگا۔  اس سارے طوفان کے ذرا ٹھنڈا ہونے پہ پتہ چلا کے پیار ومحبت کے اس پر سکون مگر دل جلے منظر میں ہنگامہ بپا کرنے والے وہ صاحب اس منی بس کے پیچھے پھنس گئے تھے اور اسے ہارن پہ ہارن دئیے جا رہے تھے  مگر یہ تو مجھے، دیگر سواریوں یا اب آپکو پتہ ہے کہ وہ اس وقت کس دنیا میں تھے۔

 گالیوں کے بارے میں تحقیق داں کہتے ہیں کہ غصہ برداشت نہ کر سکنے کی اہلیت کی بناء پہ منہ سے نکلتی ہیں بلکہ لکھی بھی جاتی ہیں۔  غصہ جو انسان کسی اور ذریعے سے  نکال کر تسلی نہیں پا سکتا وہ اس ذریعے سے نکالتا ہے۔ میں اس سے اتنا متفق نہیں کہ اکثر تشدد اور گالی دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھا۔ جتنی زیادہ طاقت سے کوئ دوسرے کو پیٹتا ہے اتنی ہی شدید گالیاں بھی ہوتی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ یہ  انسانی شخصیت کی شدت پسندی کا حصہ ہوتی ہیں۔ ورنہ کیوں کچھ لوگوں کی گفتگو کا تکیہ کلام، فل اسٹاپ اور کومہ بھی کوئ گالی ہی ہوتی ہے۔ اور اگر جوش بڑھا ہوا ہو تو تین گالیاں ایک ساتھ۔ ہر ایک میں ٹارگٹ کی قریبی خواتین سے تعلقات پوشیدہ کی کشیدہ خواہش۔

شدت پسندی یہ  ہے کہ جو گالی انتہائ غصے میں دی جاتی ہے وہی انتہائ پیار میں بھی نکلتی ہے۔ ایسوں کے لئے ہی کہا جاتا ہے کہ نہ انکی دوستی اچھی نہ انکی دشمنی اچھی۔

میں اپنی ایک عزیزہ کے رشتے کے سلسلے میں انکے خاندان والوں کے ساتھ لڑکے والوں کے گھر میں موجود تھی۔ وہ پانچ بھائ اور ایک بہن تھے۔ ایک بھائ کا حال ہی میں پہلا بچہ ، ایک بیٹا ہوا تھا جسکی خوشی انکے چہرے سے ہویدا تھی۔ پندرہ دن کے اس بچے کو کوئ لا کر انکے بڑے بھائ کے حوالے کر گیا۔ بڑے ابا، اسے کپڑوں  میں لپیٹتے ہوئے، ایک لاڈ بھری مسکراہٹ سے کہنے لگے۔ خبیث ابھی پندرہ دن کا ہے مگر بڑا تیز ہے۔

گھر آکر میری رائے مانگی گئ۔ میں نے کہا جو پیار میں، پندرہ دن کے بچے کو خبیث کہہ رہے ہیں انکے غصے کا اندازہ کر لیں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ تعلیم یافتہ لوگوں کو اپنی گفتگو میں گالیاں نہیں استعمال کرنی چاہئیں۔ کیوں بھئ، وہ بھی تو اسی نظام کی پیداوار ہیں۔ گالی سنے تو گونگا بولے۔ گالی اور اسکے اثر سے واقف، صرف اس لئے گالی استعمال نہ کریں کہ تعلیم یافتہ ہیں۔ بھاڑ میں گئ ایسی تعلیم کہ ایک انسان دوسرے کے خاندان کی زبانی ہی سہی ایسی تیسی نہ کر سکے۔  ایک تعلیم یافتہ شخص، قتل کر سکتا ہے، کسی دوسرے کو پیٹ سکتا ہے، تو گالی کیوں نہیں دے سکتا۔

یہاں تعلیم سے متعلق انتہائ متنازعہ قسم کی بحث چھڑنے کا امکان ہے۔ لیکن معذرت کے ساتھ، تعلیم بنیادی انسانی فطرت کو تبدیل نہیں کرتی۔  یہ صرف آگاہی دیتی ہے اور اسکے اظہار کو سدھا سکتی ہے وہ بھی اگر فرد متعلقہ چاہے تو۔ باقی یہ کہ چاقو کی طرح اسے ہر بری اور اچھی سمت میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔   یہی وجہ ہے کہ آکسفورڈ سے تعلیم یافتہ، انگریزی لٹریچر سے آشنا، پر وجیہہ شخصیت کے مالک نواب اکبر بگٹی کی سفاکیت کی داستانیں کسی دیو مالائ دنیا کی کہانی لگتی ہیں۔  یہ سفاکیت انکے ماحول، رواج اور تربیت کا حصہ تھے۔ جس سے وہ فرار حاصل نہ کر سکے۔  بھٹو جیسا تعلیم یافتہ شخص اپنی عبادت میں مصروف رہتا ہے۔ بے نظیر جیسی خاتون زرداری سے شادی کرتی ہیں۔

یہاں پہ دینی اور دنیاوی تعلیم کا فرق چھیڑا جا سکتا ہے۔ مگر  پھر معذرت کے ساتھ جس طرح تشدد کی فطرت کو، دین میں مقدس جنگوں کے نام پہ روا رکھنے والے دینی عالم ہی ہوتے ہیں، اسی طرح اس زبان کو اپنے حریفوں کے لئے استعمال کرنے میں انہیں کوئ عار نہیں ہوتا۔ دین لوگوں کے درمیان کچھ بنیادی چیزوں کو اتحاد کی علامت بنانا چاہتا ہے تاکہ وہ دیگر انسانی سرگرمیوں پہ یکسو ہو کر توجہ دیں مگر یہ وصف بھی کوئ کوئ ہی حاصل کر پاتا زیادہ تر لوگ  فروعات میں الجھے رہتے ہیں جو دین کا مقصد نہیں۔ یوں دینی تعلیم بھی کوئ اعلی وصف پیدا نہیں کر پاتی۔ ایک نامور مرحوم عالم کے متعلق سنا کہ انہوں نے ایک خاتون صحافی کو نا مناسب لباس میں دیکھ کر کہا، مغرب نے حرامزادی کا حلیہ ہی بگاڑ دیا ہے۔ ہمارے ٹی وی کے ایک  عالم جو آن لائن بھی ہوتے ہیں انکے متعلق بھی متعدد لوگوں سے سنا کہ وہ یہ زبان بے دریغ  استعمال کرتے ہیں۔

میں نے پہلی دفعہ اپنے ایک کولیگ کو روانی میں گالی دیتے سنا۔ سوچا، شاید انہیں خود بھی خیال نہیں کہ وہ کیا کہہ گئے ہیں،  اس وقت میں پی ایچ ڈی کر رہی تھی۔ اس وقت یہ سوچ کر نظر انداز کیا کہ انہوں نے کراچی سے باہر زیادہ تر ایسے تعلیمی اداروں میں تعلیم پائ ہے جہاں صرف لڑکے ہوتے تھے۔  اس لئے اس طور سے واقف نہیں ہیں کہ کم از کم خواتین  کی موجودگی میں زبان شستہ رکھنی چاہئیے۔

 گئے زمانوں میں شرفاء کے یہاں یہ اہتمام ہوتا تھا کہ خواتین کے سامنے گالیوں سے اجتناب کیا جائے۔ مگر اب اس بکھیڑے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ دلیل یہ کہ جب مردوں کے شانہ بشانہ رہنے کا فیصلہ کیا ہے تو یہ بھی سنو۔  یہ تو مردانہ اسٹائل ہے۔

یہ عنصر بالکل نا معلوم ہے کہ شدید گالیوں میں انسان کی جنس اور اسکے جنسی معاملات کو کیوں نشانہ بنایا جاتا ہے  فرائڈ  اس بارے میں کچھ اندازے لگاتا ہے اور اسکے مطابق ہر گالی کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ دوسرے انسان کو جانوریا اس  سے بھی کم ثابت کیا جا سکے۔ چاہے براہ راست اسے اس جانور کا نام دیا جائے یا شدید صورت میں جانوروں کے جنسی افعال سے مماثلت دی جائے۔ اس حساب سے بھی جانوروں کی درجہ بندی ہے اور کسی کو گالی میں الّو یا گدھا کہنا کوئ اوقات نہیں رکھتا جبکہ الو کے پٹھے کی قدرے اہمیت ہے اور کسی کو گدھے کا بچہ کہہ کر تو دیکھیں۔ کتے یا کتے کا بچے کا اثرایک جیسا ہوتا ہے۔

خواتین تشدد کے ذریعے کم ہی دل کی بھڑاس نکال پاتی ہیں اور یوں انہیں گالیوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ وہ بھی جب گالیاں دیتی ہیں تو دوسری خواتین کو اسی پس منظر میں گالی دیتی ہیں۔ لیکن جب انکی گالیوں میں شدت آتی ہے تو بد دعا بھی شامل ہوجاتی ہے۔

کچھ گالیاں تفریحاً دی جاتی ہیں۔ اب جو شخص تفریح کے لئے گالی کا استعمال کرے اس سے اسکے ذوق جمالیات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔  بعض علاقوں میں ذاتی مخاصمتیں اتنی بڑھی ہوئ ہوتی ہیں کہ کچھ لوگ فرصت کے اوقات میں  نئ گالیاں گھڑتے  یا ایجاد کرتے ہیں تاکہ اگلی جھڑپ میں کام آئیں۔ تخلیقی کام چونکہ اپنی زبان میں ہی بہتر ہوتا ہے اس لئے گالیاں بھی اپنی ہی زبان کی مزہ دیتی ہیں اور اس سے وہ آتش لگتی ہے جو بجھائے نہ بجھے۔

  گالی کو سن کر رد عمل ظاہر ہونا بھی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ

دشنام یار طبع حزیں پہ گراں نہیں

اے ہم نفس، نزاکت آواز دیکھنا

ایسی گالیوں کو گالیاں سہانیاں کہتے ہیں۔ اور انہیں سننے کے لئے لوگ بڑی جدو جہد سے گذرتے ہیں کہ کام اس سے آ پڑا ہے جسکا جہان میں،  لیوے نہ کوئ نام ستم گر کہے بغیر۔

اگر انسانی مقصد ، وقت کی بھیڑ چال کے مخالف سمت میں ہو تو بھی کرنے والے کو ایسی گالیوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ لیکن ٹھان لینے والے ان گالیوں کی پرواہ نہیں کرتے کہ دینے والے کے پاس اسکے علاوہ ایک خالی پن ہی ہوتا ہے اور کچھ نہیں۔ سر سید احمد خان کی مثال اس سلسلے میں موجود ہے۔

لیکن ایک گالی بعض اوقات ایک شخص کو زندگی بھر کے لئے معذور کر دیتی ہے۔ وہ ذلت کے اس  لمحے سے باہر نہیں نکل پاتا اور تمام عمر اسکے کرب میں مبتلا رہتا ہے۔ شاید گالی کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے۔

10:54 AM

Profanity, غصہ, فحش کلامی, فرائڈ, کراچی, گالی, منی بس

قدرتی عذاب یا قدرتی عمل

ایک دفعہ پھر ہم قدرتی آفات کی زد میں ہیں اور ملک کا بڑا حصہ  شدید بارشوں اور سیلاب سے متائثر ہے۔ لوگوں کی بڑی تعداد جاں بحق ،  متعدد لوگ لاپتہ ہیں اور ہزاروں بے گھر۔ لیکن ایک دفعہ پھر ہم یہ سوچتے ہیں کہ یہ اللہ کا عذاب ہے ہمارے اوپر، آزمائش یا قدرتی عوامل کی پرواہ نہ کرنے کی سزا۔

اگر یہ اللہ کا عذاب ہے اور ہمارے سیاہ کرتوتوں کی سزا ہے تو کیا وجہ ہے صرف غریب غرباء ہی اسکا شکار بن رہے ہیں۔ ہمارے طبقہ ء اشرافیہ کے تمام لوگ زندگی کی تمام نعمتوں سے بہرہ مند ہوتے اپنے آرام دہ ، سہولتوں سے آرستہ محلوں میں سٹیلائٹ ٹی وی پہ کوئ دل بہلانے والا پروگرام دیکھ رہے ہونگے۔ جبکہ نوشہرہ فیروز شہر ڈوب رہا ہے۔ اور اسکے غریب اور مسکین لوگ شاید سارے سارے دن بھوکے رہ کر اپنے لئے جائے پناہ تلاش کر رہے ہونگے۔ اقبال  اپنی نظم شکوہ  میں کہتے ہیں کہ برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پہ۔  اسلامی جمہوریہ پاکستان میں تو پچانوے فی صد مسلمان ہیں ۔ لیکن یہاں بھی برق گرتی ہے اور برق ہمیشہ بے آسرا، کمزور لوگوں پہ گرتی ہے۔

کون زیادہ گنہگار ہے۔ شاید غریب ہونا سب سے بڑا گناہ ہے۔ لیکن کیا یہ پھر یہ خدا کی نا انصافی نہیں کہ وہ غریب پیدا کرے، غریب رکھے اور غریب ہی  کی پکڑکرے۔

اس لئے میں تو اس خیال کو خاطر میں نہیں لاتی۔

یہ سوچ لینا آسان ہے کہ یہ آزمائش ہے۔ لیکن پھر سوچ وہیں جاتی ہے کہ ایسی آزمائش کا سامنا معاشرے کے کمزور طبقے کو ہی کیوں کرنا پڑتا ہے اور وہ لوگ جو پہلے سے اللہ کی طرف سے نوازے ہوئے ہیں انہیں کیوں خدا محفوظ رکھتا ہے اور انکی آزمائش نہیں لیتا۔ بلکہ مزید نوازے جاتا ہے۔

اس لئے یہ چیز بھی عقل میں نہیں آپاتی۔ در حقیقت، جس وقت تک ہم اس چیز پہ یقین رکھتے ہیں کہ خدا کسی پہ اسکی قوت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا اس وقت تک ہمیں اس چیز پہ یقین آ نہیں سکتا۔

کیا یہ تباہ کاریاں، قدرتی عوامل کا نتیجہ ہیں؟

ساری دنیا میں موسموں میں تبدیلی کو عمل آتا محسوس ہو رہا ہے۔ تحقیق دانوں کے نزدیک اسکی وجہ گرین ہاءوس ایفیکٹ بھی ہو سکتا ہے کہ اسکے نتیجے میں زمین پہلے کی نسبت گرم ہو رہی ہے۔ زمین پہ موجود برف کا ذخیرہ اس گرمی سے گھل رہا ہے۔ فضا میں پانی کی مقدار زیادہ ہو رہی ہے۔ سمندر کی سطح بلند ہو رہی ہے۔ بارشیں پہلے سے زیادہ ہو رہی ہیں اور امکان ہے کہ اب بارشیں زیادہ سے زیادہ ہوتی چلی جائیں گی۔

یعنی دنیا میں بیشتر ممالک کو جلد یا بدیر سیلاب کا سامنا کرنا پڑے گا اور اسکے بعد خشک سالی کا۔ کارخانہ ء قدرت کا ایک نظام اور کاز اینڈ ایفیکٹ کا نظام بھی خدا نے مقرر کیا ہوا ہے۔  خدا نے یہ مقرر کیا ہوا ہے کہ اگر آپ سرد موسم میں اپنے بدن کو گرم نہیں رکھتے تو آپکو سردی لگے گی اور آپ بیمار ہونگے۔ اس صورت میں بیماری خدا کا عذاب نہیں بلکہ کاز اینڈ ایفیکٹ کے کھاتے میں جائے گی۔

گرین ہاءوس ایفیکٹ کو کم کیا جا سکتا ہے؟

جی ہاں اسے کم کیا جا سکتا ہے اسکے لئے دنیا کے تمام ممالک کو ان گیسوں کی مقدار کو کنٹرول کرنا پڑےے گا جو اس ایفیکٹ کو بڑھانے کی ذمہ دار ہیں۔ دنیا کے غریب ممالک کو متحد ہو کر دنیا کے امیر ممالک پہ دباءو ڈالنا ہوگا کہ وہ اپنی ترقی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ان مضر گیسوں کی مقدار کو کم کرنے میں انکا ساتھ دیں۔

ہم اس سے کیسے نمٹیں؟

ہمیں سیلاب کی پیشگی اطلاع کو موءثر بنانا ہوگا۔ ہمیں اپنے عوام کی تربیت کرنی ہوگی کہ وہ اپنے گھر کیسے بنائیں تاکہ سیلاب کے نتیجے میں انہیں کم سے کم نقصان پہنچے۔ سیلاب آنے کی صورت میں وہ کس طرح جانی نقصان کو کم سے کم رکھ سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں کیا احتیاطی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ محلے کی سطح پہ کیا احتیاط کی جا سکتی ہے۔ سیلاب کے بعد وبائ امراض کا اندیشہ رہہتا ہے اس سے کیسے بچا جا سکتا ہے۔ ان سب کے لئے میڈیا کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔

حکومتی سطح پہ اس سے نمٹنے کے لئے ماہرین کی ایک ٹیم موجود ہونی چاہئیے۔ خاص طور پہ ان علاقوں میں جو سیلاب کے لئے رسکی ہیں۔ ان ماہرین میں اس علاقے کے لوگ بھی شامل ہونے چاہئیں تاکہ علاقے کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنے میں دشواری نہ ہو۔

یہ ایک دستاویز کا لنک ہے۔ چاہیں تو آپ میں سے کوئ اسکے اہم نکات کا ترجمہ کر کے اپنے بلاگ پہ ڈالدے۔ یا پھر ایک دو روز میں، میں ہی وقت نکالتی ہوں۔

سیلاب سے حفاطت

12:22 AM

pakistan, اقبال، شکوہ, بارشیںFlash flooding, پاکستان, خیبر پختون خواہ, سیلاب

اسلام آباد فضائ حادثہ

آج کے دن تک آپ میں سے بیشتر لوگ یہ اندوہناک خبر سن چکے ہونگے کہ ائیر بلو کے

جہاز کے کریش

ہونے کی وجہ سے اس پہ سوار تمام ایک سو باون لوگ ہم سے جدا ہو گئے۔ وہ لوگ جو اپنے مستقبل کے منصوبے بناتے ہوئے اپنے پیاروں کو خدا حافظ کہہ کر گئے۔ پھر کبھی  لوٹ کر نہ  آئیں گے۔

میں نے پورے دن میں تین دفعہ ٹی وی دیکھنے کی کوشش کی۔ اور ہر دفعہ پانچ منٹ بعد بند کر دیا۔ اس طرح اندوہناک عالم میں مرنے والوں کے خاندانوں کا غم اپنا ہی لگ رہا  ہے مگر میں اس خبر کی خریدار نہیں بننا چاہتی۔

جہاز پہاڑ کی چوٹی سے ٹکرایا اور پاش پاش ہو گیا۔ اس پہاڑی علاقے میں لوگوں کی باقیات بکھر گئیں جہاں عام طریقے سے پہنچنا مشکل تھا۔ مددگاروں کو اس جگہ تک پہنچنے کے لئے ایک راستہ بنانا پڑا کہ پہلے سے کوئ راستہ اس پہاڑی پیچیدہ علاقے میں موجود نہ تھا۔ بارش کی وجہ سے پھسلن شدید تھی اورمدد کا پہنچنا مزید مشکل ہو گیا۔

 میڈیا کے وارے نیارے ہو گئے۔ بہت دنوں بعد ایسی خبر ملی جس میں لوگوں کی دلچسپی ہوتی کہ باقی خبروں کہ ہم عادی ہو گئے ہیں۔وارے نیارے کیوں؟  ایک منہ چرانے والی حقیقت یہ بھی ہے کہ عام لوگوں کو ایسے منظر اپنی طرف کھینچ کر رکھتے ہیں جس میں لوگ رو رہے ہوں، تڑپ رہے ہوں، بے بس نظر آرہے ہوں۔

اگر کاروباری نظر سے دیکھا جائے تو بہت دنوں بعد کسی خود کش حملے کے بجائے کسی اور ذریعے سے اتنے بہت سے لوگ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ سو میڈیا نے حسب کاروبار اس پہ سارا دن خرچ کر دیا۔ ایک ہی فوٹیج کو بار بار دکھانا، بربادی اور اندوہناکی کو اس جگہ سے دکھانا جہاں سے وہ زیادہ ہولناک لگیں۔ غمزدہ خاندانوں کے گھر پہنچ کر انکے رشتے داروں سے تاءثرات لینے کی کوشش میں سبقت حاصل کرنے میں لگے رہنا۔ حالانکہ ابھی تو انہوں نے مرنے والے کو دیکھا بھی نہیں ہوگا اور شاید ابھی تو وہ یقین کرنے کے مراحل سے گذر رہے ہونگے کہ ایسا ہوا بھی ہے۔ لاشیں نہیں دکھا سکتے تو کیا  شناختی کارڈ تودکھا سکتے ہیں۔ چینلز کے درمیان

شناختی کارڈ کی تعداد کا مقابلہ

۔

 اس افراتفری میں کسی مددگار کے منہ سے جو نکلا اسے خبر بنا کر نشر کر دیا۔ ایک چینل پہ دی جانے والی خبر کہ ایک خاتون زندہ بچ  گئیں غلط ثابت ہوئ۔ کسی چینل نے فوراً ہی یہ قیاس ظاہر کیا کہ طیارہ نو فلائ زون میں اڑ رہا تھا۔ یعنی حادثہ راکٹ کے لگنے سے بھی ہو سکتا ہے۔ یہ خبر بھی غلط نکلی کیونکہ  جہاز رن وے پہ جگہ نہ ہونے کے باعث فضا میں چکر کاٹ رہا تھا۔  ویسے بھی ایئر پورٹ سے اتنے قریب نو فلائ زون کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ دونوں خبریں تو میں نے دیکھیں۔

ایک بلاگ

پہ یہ قیاس تک ظاہر کیا گیا کہ جعلی ڈگریوں کے سلسلے سے توجہ ہٹانے کے لئے شاید یہ حادثہ کیا گیا۔ حادثے ساری دنیا میں ہوتے ہیں اصل بات یہ معلوم کرنا ہوتی ہے کہ  اس میں انسانی لا پرواہی تھی یا کوئ ٹیکنیکل خرابی۔

 ایسے حادثوں کے فوراً بعد جن اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں مدد کا فوری طور پہ جائے حادثہ تک پہنچنا  اور جہاز میں موجود لوگوں کے بارے میں آگاہ ہونا۔ تاکہ انکے رشتے داراور دوستوں  کومعلوم ہو کہ متعلقہ شخص جہاز میں تھا یا نہیں۔

اس سلسلے میں میڈیا کو کچھ باتوں کا پابند ہونا چاہئیے۔ مثلاً مرنے والوں کی تعداد کا جب تک تصدیق نہ ہوجائے اپنے طور پہ اعلان نہ کریں۔ ایک شدید زخمی بے ہوش شخص اور مردہ جسم کے درمیان ایک اخباری رپورٹر دور سے دیکھ کر کیسے رائے دے سکتا ہے۔ یہ تو ایک ڈاکٹر ہی بتا سکتا ہے۔ اپنی سنسنی خیز خبروں کو کم از کم ایک دن کے لئے تو معطل رکھیں تاکہ وہ جو اس اندوہناک حادثے سے گذرے ہیں وہ اس چیز کو تسلیم کرنے کے قابل ہو سکیں۔ ہم لاکھ کہیں کہ انکا غم ہمارا غم ہے یہ محض الفاظ ہی رہیں گے کہ جو اس سے گذرتا ہے وہی جانتا ہے اور صبر بھی آتے آتے ہی آتا ہے۔ اس قسم کی خبروں کے دوہرانے کی تعداد اور انکے درمیان وقفے کو بھی مقرر کیا جانا چاہئیے۔ ایک ہی فوٹیج، ایک ہی رپورٹ کو اتنی دفعہ دکھایا جاتا ہے کہ سنجیدہ ترین بات کی بھی اہمیت نہیں رہتی۔ یوں ایک اندوہناک حادثہ بھی زندگی کا روزمرہ بن جاتا ہے۔

اسکے علاوہ ایک ہی خبر کو مرکز توجہ بنا لینا کہاں تک درست ہے۔

پشاور میں  بارشوں  اورسیلابی ریلوں

میں کل سے اب تک ایک سو دس سے زائد افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ مگر اس سے آگے ہم نہیں جانتے کہ یہ کون لوگ ہیں انکے اہل خانہ پہ کیا گذری۔ ایسا کیا ہوا کہ اتنے لوگ سیلابی ریلے کا شکار ہوئے۔ کیا سیلابی ریلے سے بچاءو کی کوئ صورت ہے عوام اپنے آپکو کیسے محفوظ رکھ سکتے ہیں اور کیسے اپنے پیاروں کو بچا سکتے ہیں۔  پچھلے ہفتے

بلوچستان میں سیلابی ریلوں

میں پچاس سے زیادہ افراد مر گئے،متعدد لا پتہ ہو گئے اور ہزاروں بے گھر۔ بچ جانے والےلوگوں کے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ آخر اس میں انسانی زندگی کا نقصان بھی تو نقصان ہے اور اتنا ہی ہولناک ہے۔ میڈیا کسی خبر کو ترجیحات دینے میں کیا چیزیں سامنے رکھتا ہے؟

کل ہی کے دن

کراچی میں ایک گھر کے گر جانے

کی وجہ سے ایک ہی خاندان کےسات لوگ جن میں خواتین اور بچے بھی شامل ہیں مر گئے۔ معلوم نہیں کہ اس طرح کے دھچکے سے گذرنے کے بعد باقی بچ جانے والے لوگ کس حالت میں ہیں۔ یہ نہیں معلوم کہ وہ لوگ اب تک اس مخدوش عمارت میں کیسے رہ رہے تھے ۔ اس حادثے سے کیسے بچا جا سکتا تھا۔ معلومات زیرو۔  ہر سال بارش میں ایک ایسی خبر ضرور آتی ہے۔ جس سے مناسب اقدامت کے ذریعے بچا جا سکتا ہے۔  اسی طرح کراچی میں حالیہ بارشوں میں دو افراد بجلی کا کرنٹ لگنے سے مر گئے۔ ہر موسم برسات میں ایسا بھی ضرور ہوتا ہے۔

یہاں یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ میڈیا کن لوگوں کے مرنے کو اہمیت دیتا ہے اور کن لوگوں کے اہل خانہ کے پیچھے بھاگنے سے انکی قیمت صحیح سے وصول ہوتی ہے؟

لوگ میڈیا کو بے حس قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ ہم سب کا مجموعی رویہ ہے۔ میڈیا یہ سب چیزیں جنہیں بیچ رہا ہے وہ ہم ہیں۔ ہم ہیں اسکے خریدار۔

4:27 PM

اسلام آباد, ایئر بلو, بارش, بلوچستان, پاکستان, پشاور, حادثہ, ریلہ, سیلاب, کراچی, میڈیا

ایک شکریہ

بچوں کی شخصیت کی تشکیل میں صرف جینزاور ماحول کا ہی اثر نہیں ہوتا۔ ان کتابوں کا بھی اثر ہوتا ہے جو انہیں پڑھنے کے لئے میسر آتی ہیں۔ اس طرح سے ہمارے یہاں دہشت گردی، کرپشن اور اخلاقی زبوں حالی کا ایک باعث اگر بچوں کی بڑی تعداد کا اسکول تک نہ پہنچ پانا ہے تو وہیں  بچوں کا بہتر کتابوں تک رسائ نہ ہونا  بھی  ہے یہاں بہتر کتابوں سے میری مراد وہ کتابیں جو بچوں کے تخیلاتی عمل کو جِلا دیتی ہے۔

ہمارے جن اسکولوں میں بچوں کو لائبریری کی سہولت  ہے۔ انکی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہوگی. ۔ یوں اسکولوں ، کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکلنے والے لوگ ایک مخصوص نصاب سے آگے شاید ہی کچھ جانتے ہوں۔ نصاب کا بھی اتنا ہی پڑھنا روا ہے جتنا امتحانی نکتہ ء نظر سے ضروری ہو۔ جبکہ ریاست نصاب کو اپنے پس منظر سے تشکیل دینے کی کوشش میں لگی رہتی ہے۔ یوں ایک جنریشن چندر گپت موریہ کو پڑھنے میں کامیاب ہوتی ہے اور دوسری محمد بن قاسم سے تاریخ پاکستان شروع کرتی ہے۔ ایک کی اسلامیات بنیادی اخلاقیات پہ مشتمل ہوتی ہے اور دوسری کی جہاد کے فضائل پہ۔

کتاب پڑھنے کی عادت بچوں میں بچپن سے ہی ڈالنی پڑتی ہے۔  ٹیکنالوجی کے اس زمانے میں جبکہ والدین کمپیوٹر بچوں کے حوالے کر کے سمجھتے ہیں کہ اس پہ گیمز کھیل کر انکے لاڈلے کوئ غیر معمولی کام کر رہے ہیں، وہاں وہ اپنے بچوں کے اندر مطالعہ کا شوق پیدا کرنے میں دلچسپی نہیں لیتے۔ کسی سے پوچھیں کہ بچے کتاب پڑھنے میں کیوں دلچسپی نہیں لیتے جواب ملے گا کہ کمپیوٹر کا  دور ہے صاحب۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ مغربی معاشرہ جو ٹیکنالوجی میں ہم سے کہیں آگے ہے، وہاں اب تک مطالعے کی عادت ترک نہیں ہوئ۔ ہر اسکول لائبریری رکھتا ہے۔ اسکول کے ٹائم ٹیبل میں لائبریری کے پیریڈز ہوتے ہیں۔ ہر بچے کو ٹارگٹ ملتا ہے کہ اتنی کتابیں پڑھنی ہیں۔اسکول سے باہر نکلیں،  ائیر پورٹ سے لیکر تمام عوامی مقامات پہ  آپ کو لوگ مطالعہ کرتے نظر آئیں گے۔

صاحب حیثیت والدین، کے ایف سی اور مکڈونلڈز قسم کے ریسٹورنٹ سے جنک فوڈ تو بہ رضا و رغبت بچوں کو دلاتے ہیں اور کسی محفل میں فخریہ بتاتے ہیں کہ انکے بچے کون سی جنک فوڈ یا کپڑوں کا کون سا برانڈ پسند کرتے ہیں۔ مگر ایک کتاب خرید کر دینا انہیں پیسے کا زیاں لگتا ہے اور اسکا شاید ہی کوئ تذکرہ ہم کبھی سنتے ہوں۔

یہ سب باتیں مجھے کیوں اس وقت یاد آرہی ہیں؟

ابھی چار پانچ دن دن پہلے مجھے ایک دعوت نامہ ملا۔ جو مسعود احمد برکاتی صاحب کی نونہال کے ادارت کے پچاس سال پورے ہونے پہ ایک اعزازی تقریب کے سلسلے میں تھا۔ میں اس میں شریک ہوئ بمعہ  اپنی بیٹی کے۔ وہ اگرچہ ابھی ساڑھے تین سال کی ہے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ کتاب کا شوق پیدا کرنا اور ایسی محافل میں جو کتاب لکھنے والے سے اسے تعارف دیں۔ جانا ضروری ہے۔

پاکستان میں بچوں کی ایک بڑی تعداد نونہال پڑھ کر بڑی ہوئ ہے۔ ان میں سے ایک میں بھی ہوں۔ میرے ایک عزیز، اخبارات و رسائل کی ترسیل کا کام کرتے تھے۔ انکی وجہ سے اپنے بچپن میں کراچی کا شاید ہی کوئ اخبار ہو جو میں نے نہ پڑھا ہو اور پاکستان کا شاید ہی کوئ میگزین ہو جو میری نظر سے نہ گذرا ہو۔ اس میں میرا شوق اور انکی مہربانی شامل رہی۔ انکے گھر جانا مجھے پسند تھا کہ میں اس ڈھیر میں گم ہو جاتی تھی جو وہاں جمع ہوتا۔

نونہال، آنکھ مچولی، تعلیم و تربیت اور نجانے کتنے بچوں کے رسالے۔ ان میں نونہال بہت باقاعدگی سے آتا رہا۔ اگرچہ عین اس زمانے میں، میں سسپنس ڈائجسٹ اور نسیم حجازی کے ناول بھی پڑھ لیتی تھی۔ مگر کبھی نونہال کا ناغہ نہیں ہوتا۔ یہ بلا شرکت غیرے ہم بچوں کا رسالہ ہوتا اور یہ بھی نہیں سننا پڑتا کہ بچوں کو بڑوں کے رسالے نہیں پڑھنے چاہئیں۔

بچوں کا ادب لکھنا آسان نہیں۔ پہلے بچوں جیسی حیرت اور تجسس پیدا کریں۔ دنیا کو ایک اجنبی آنکھ سے دیکھیں اور پھر لکھیں۔ بچوں کے ادب کی درجہ بندی بھی بڑوں کے ادب کی طرح کی جا سکتی ہے۔ ان میں سب سے پہلے وہ کہانیاں جو مافوق الفطرت، طلسماتی کرادر رکھتی ہیں اور زمانہ ء قدیم سے سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہیں، یہ بچوں میں تصوراتی دنیا سجانے کی اہلیت پیدا کرتی ہیں اور انہیں اخلاقی خوبیاں بھی بتاتی ہیں۔ پھر وہ کہانیاں جو کسی علاقے کی ثقافت کے زیر اثر وجود میں آتی ہیں اور اپنے ماحول، رواج اور جغرافیہ سے روشناس کراتی ہیں۔ پھر انکے موجودہ مسائل سے متعلق کہانیاں۔ کہانیوں سے باہر نکلیں تو مختلف لوگوں کی سوانح حیات اور زندگی کی جدو جہد۔ اور آجکے زمانے پہ نظر کریں تو سائینس اور ٹیکنالوجی کی دنیا۔ اور دنیا کا کوئ ادب شاعری کے بغیر مکمل ہو سکتا ہے کیا۔  تو جناب مزے مزے کی نظمیں۔

ان سب چیزوں کو اگر سستے طریقے سے بچوں تک پہنچانا ہو تو بچوں کے رسائل اسکا ایک بہترین ذریعہ ہیں۔ نونہال بھی ایک ایسا ہی رسالہ ہے۔ جو

حکیم محمد سعید مرحوم

کے ادارے ہمدرد کے زیر سایہ شائع ہونا شروع ہوا۔

پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن

  کے تعاون سے ہونے والی یہ سادہ سی تقریب

پی ایم اے ہاءوس کراچی

میں  منعقد ہوئ۔   اس سادہ سی تقریب نے بچپن کو سامنے لا کھڑا کیا۔ مسعود صاحب کا کہنا تھا کہ کھیل کے میدان میں کھلاڑیوں کو تو پھر بھی تحفے تحائف سے نوازا جاتا ہے۔ کسی میچ کے جیتنے کی صورت میں انہیں لاکھوں روپے ملتے ہیں۔ مگر یہ ادیب ہیں جنہیں ہمارے یہاں اپنی کاوشوں کا کوئ صلہ نہیں ملتا ۔ اور بچوں کے ادیب کو تو ادیب بھی نہیں سمجھا جاتا۔

 انکا کہنا ہے کہ حکمراں طبقہ جس چیز ، قدر یا صلاحیت کو ابھارنا چاہتا ہے وہ علم و ادب نہیں۔ موجودہ صورت حال میں آخر علم کی طرف کوئ کیوں جائے، اور اپنی جان کھپائے۔

انکے الفاظ میں ہمارا معاشرہ اب جرم کش نہیں رہا بلکہ جرم قبول ہو گیا ہے اور اب جرم پروری کی طرف بڑھ رہا ہے۔

برکاتی صاحب نے پچاس سال، نونہال کی ادارت کی۔ اور اس رسالے کے پڑھنے والے ننھے منے قارئین اب پختہ شخصیات کے روپ میں دنیا کی بساط پہ جانے کہاں کہاں، جہد زندگی سے نبرد آزما ہیں۔ ان لوگوں کے بچپن کو کتاب کی خوشبو سے مہکانے والے اس  شخص کا شکریہ ان سب پہ واجب ہے۔ شکریہ برکاتی صاحب۔

12:17 AM

Hakim Muhammad Saeed, ادب, بچے, پاکستان, پی ایم اے, حکیم محمد سعید, کراچی, مسعود احمد برکاتی, نونہال

معالج

ڈاکٹر محبوب میرے ساس سسر کے یونیورسٹی کے زمانے کے  دوست ہیں۔  نظریاتی طور پہ بائیں بازو سے قربت رکھنے والے۔  شادی کے بعد میری ان سے جان پہچان ہوئ اور میری بیٹی کی پیدائش کے بعد وہ میرے بھی دوست بن گئے کیونکہ وہ بچوں کے معالج یعنی ایک پیڈیئٹریشن ہیں۔ وہ  بچوں کے ایسے ڈاکٹر ہیں کہ والدین  کچھ عرصے میں خود اپنا کلینک چلانے لگ جائیں۔ میرے کیس میں دوا کے اجزاء تک بھی بتا دیتے  اور موڈ آف ایکشن بھی۔  پچھتر سال سے زائد  عمر اور ریٹائر ہوئے عرصہ ہوا، مگر اب بھی اپنے کلینک  جاتے ہیں اور خاصی کم فیس میں اپنے مریضوں کا علاج کرتے ہیں۔ ہر مریض اپنی پوری توجہ حاصل کرتا ہے اور تربیت بھی۔   اتنا زیادہ کہ اکثر لائن میں لگے بوریت ہوا کرتی کہ کیا کرتے رہتے ہیں وہ مریضوں کے ساتھ۔

وہ اگرچہ ہمارے خاندان کے اتنے ہی دوست ہیں کہ دوست کم رشتےدار زیادہ لگتے ہیں۔ لیکن میں انکے کلینک پہ اپنی باری کا انتظار کرتی ہوں۔ نہ میں نے ان سے اس تعلق کی وجہ سے کوئ آسانی چاہی اور نہ انہوں نے کبھی آفر کی کہ پہلے مجھے بلا لیا جائے۔

ایک دفعہ ، انکی ملک سے غیر موجودگی میں مجھے اپنی بچی کو کراچی کے مشہور پرائیویٹ ہسپتال کے مشہور پیڈیئٹریشن کے پاس لے جانا پڑا۔  ڈاکٹر کے کمرے میں ایک ساتھ تین والدین اور انکے چار بچوں نے وہ افراتفری مچائ کہ وہ ہمیں بمشکل پانچ منٹ دے پائے۔ جلدی سے ایک اینٹی بائیوٹک لکھی اور ہماری چھٹی ہو گئ۔ اس دن بحیثیت ڈاکٹر انکی خوبیاں زیادہ سامنے آئیں۔

ڈاکٹر محبوب کو اندازہ ہے کہ مجھے اینٹی بائیوٹک دینا پسند نہیں۔ اس لئیے پہلےدو تین دن انتظار میں رکھتے اور پھر جب لکھتے تو اچھی طرح بتا دیتے کہ اب دینا کیوں ضروری ہے۔ ایک دفعہ میری بچی کا سینہ خاصہ جکڑا ہوا تھا اور بخار ایک سودو، عمر دو مہینے ، اتفاقاً گھر کے تمام لوگ ملک یا شہر سے باہر تھے۔ ساری رات وہ مجھے فون کر کے اپ ڈیٹ لیتے رہے۔ انہیں سخت ٹینشن تھی کہ کہیں اسے نمونیا نہ ہو جائے، ہسپتال میں نہ داخل کرانا پڑ جائے، ایسی صورت میں، میں اکیلے کیا کرونگی۔   اگلے دن گھر پہ حاضر۔

ایسے حالات میں جب گھر پہ کوئ نہ ہو تو وہ اسکی ویکسینیشن بھی کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر دیتے۔ بخار ہو گیا اسے تو کہاں اکیلی سنبھالتی پھروگی۔ حالانکہ میں انہیں اتنا یقین دلاتی کہ باقی لوگ ہوں تو بھی سنبھالنا تو مجھی کو ہوگا۔ لیکن ایک 'نہیں'۔ میری بیٹی  کی دیکھ بھال میں وہ میرے بہترین رفیق رہے۔

ایکدم چست، توانا اور مصروف، لیکن ہفتے بھر پہلے اطلاع ملی کہ انہیں پھیپھڑوں کا کینسر ہو گیا ہے۔ ہم سب کو صدمہ ہوا۔ انکی بیگم اور بچے سب ہی مختلف میدانوں کے ڈاکٹر ہیں۔ چالیس سال سے برٹش قومیت رکھنے کے باوجود پاکستان میں ہی رہتے رہے۔ وہ تو شوکت خانم ہسپتال کے لئے روانہ ہو رہے تھے کہ سب نے زور دیا ، مزید علاج کے لئے اب جلد سے جلد لندن چلے جائیں، آسانی رہے گی۔

تین دن پہلے وہ چلے گئے۔ بیگم محبوب کی بیمار والدہ یہاں اکیلی ہیں ۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہیں سو اس سفر پہ انکے ساتھ  اپنی نوے سالہ بیمار ماں کی وجہ سے نہ جا سکیں۔  ایک غیر یقینی سفر کے لئے خدا حافظ کہہ کر آئیں تو دل گرفتہ کہنے لگیں کہ پینتالیس سال سے زیادہ ہو گئے ہماری شادی کو دو دفعہ محبوب کو روتے دیکھا۔ ایک ڈھاکہ فال کے وقت اور دوسرے آج ائیر پورٹ پہ۔

10:46 PM

اینٹی بائیوٹک, پیڈیئٹریشن, ڈاکٹر محبوب, شوکت خانم ہسپتال, کینسر, لندن, ویکسینیشن

خود کشی اور دور جدید

ایک دانا کا کہنا ہے کہ خودکشی انسان کا خدا کو جواب ہے کہ آپ مجھے نہیں نکال سکتے، میں خود نکل رہا ہوں۔ آسان زبان میں ہم نہیں مانتے ظلم کے ضابطے کا نعرہ لگائیں، ایک خود کشی نوٹ چھوڑیں کہ پیچھے رہ جانے والوں کو آسانی ہو اور میں نہیں کھیل رہا کہہ کر باہر۔

اسی طرح خود کشی کو عارضی مسائل کا مستقل حل کہا جاتا ہے۔ کچھ تخلیق کار بھی اپنے عروج کے دور میں خود کشی کر لیتے ہیں، انہیں شبہ ہوتا ہے کہ وہ اس سے بہتر تخلیق نہ دیں پائیں گے, تو کیوں نہ خود کشی کر لیں۔ شاید اس لئے گانا بنا کہ آ خوشی سے خود کشی کرلیں۔ کچھ جسمانی طور پہ ہمیشہ کے لئے تخلیق کے کرب سے نجات پا لیتے ہیں  اور کچھ تخلیقی طور پہ خود کشی کر کے اپنے آپ کو اس مقام تک لے جاتے ہیں جہاں ان پہ دوسروں کو رحم آنے لگتا ہے۔ کچھ ذی حس اس لئے خود کشی کرنے پہ آمادہ ہوجاتے ہیں کہ ہائے میں نے تو ویسے بھی خود کو ختم کر دیا ہے، اب جسمانی رسم بھی پوری کئے لیتے ہیں۔

یہ تحریر ان خودکشیوں کے متعلق نہیں،  جو کوڑے کے ڈھیر سے کھانا اٹھا کر کھانے کی ہمت نہ پیدا ہونے کی وجہ سے کی جاتی ہیں کہ مرنے والے کو آخری وقت تک اپنے انسان ہونے کا یقین ہوتا ہے۔ اور نہ ان کے متعلق جو  حیات ابدی کی خوشی کے یقین اور بھروسے پہ جدید ٹیکنیکل سہولیات سے مستفید ہوتے ہوئے اپنے ساتھ کئ لوگوں کو بالجبر حیات بعد الموت میں اپنا ہم سفر چن لیتے ہیں۔ اس پہ بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اور ابھی لکھنے والے بہت کچھ  لکھیں گے۔

کچھ تہذیبیں آپ اپنے خنجر سے خود کشی کر لیتی ہیں یہ الگ بات کے دم آخر بھی یہ خنجر انہیں دوسری تہذیب  کےہاتھ میں نظر آتا ہے اور وہ اسے قتل عمد میں ڈال کر وقت رخصت کے ساتھیوں کو اسکا بدلہ لینے کی نصیحت بلکہ وصیت کرتے ہیں۔ یوں نصیحت اور وصیت کا یہ سلسلہ کئ سو سالوں تک کامیابی سے چل سکتا ہے ۔ ساتھی ایسی نصیحتوں پہ دل و جان سے عمل کرتے ہوئے کیوں اس شمع کو اپنی پوری توانائیوں سے  جلائے رکھتے ہیں یہ ایک معمہ ہے۔ ایسے معموں کو سلجھانے میں نفسیات داں ہی مدد کر سکتے ہیں۔

مجھے تو سارا قصور اس میں خنجر کا ہی نظر آتا ہے کہ نہ ہوتا اور نہ اتنے خیالات فاسدہ ذہن میں آتے۔ اب آپ میں سے کوئ اس مِیں جدید تہذیب کا ہاتھ بتائے تو یقیناً وہ صحیح ہوگا۔ یہ جدید تہذیب وہ شاطر ہے جو مختلف تہذیبوں کو وقفے وقفے سے ایکدوسرے کے سامنے کھڑا کر رہی ہے۔

کچھ نا آسودہ خواہشات بھی اسکا باعث ہوتی ہیں۔ مثلاً جب دوسری تہذیبیں ہاتھ میں خنجر رکھنے اور  مسلسل بد دعاءووں کے باوجود  اس سے خود خود کشی نہیں کرتیں  تو تنگ آکر اس خنجر کو کارآمد بنانے کے لئے اس خنجر کو بد دعا دینے والا ہی استعمال کر لیتا ہے۔  اس دوسری تہذیب سے اس خنجر کی چھین جھپٹ ایک الگ داستان ہے۔ نفسیات داں اسے فرسٹریشن کہتے ہیں۔ اور غالب کہتے ہیں کہ

جب دیکھا کہ وہ ملتا نہیں

اپنے ہی کو کھو آئے

کبھی کبھی، کسی خودکشی کا انداز عوام الناس کو اتنا بھاتا ہے کہ یکے بعد دیگرے اس طرح سے خودکشی کرنے کے واقعات سامنے آجاتے ہیں۔ اسے

کاپی کیٹ

سوسائیڈ

  بھی کہتے ہیں جس پہ وردر اثر ہوتا ہے۔ اس میں لوگ خودکشی کرنے والے کے ماحول اور حالات سے اپنی یکسانیت دیکھتے ہیں، پسند آیا کہتے ہیں اور عدم کے سفر پہ روانہ ہو جاتے ہیں۔

اب صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ خودکشی کرنے کی جلدی کیا ہے یہ کام  کسی بھی وقت کیا جا سکتا ہے اور امکان غالب یہ ہے کہ جب بھی کریں گے کامیابی قدم چومے گی کہ ایک دفعہ یہ سوچ لیا جائے کہ یہ ہم کر سکتے ہیں تو آدھی فتح تو ویسے بھی حاصل ہو جاتی ہے۔  اس وقت تک  ایک مناسب آلہ ء خود کشی دریافت کریں۔

مناسب آلہ ء خود کشی  مرنے کے بعد کسی شخصیت کا مکمل اظہار ہوتا ہے ۔ اگرچہ تحقیق داں اسکا تعلق معیشت سے بھی جوڑتے ہیں۔ اور بزبان شاعر کہلواتے ہیں کہ

غریب شہر تو فاقوں سے مر گیا عارف

امیر شہر نے ہیرے سے خود کشی کر لی

 فی الوقت جو آلات میسر ہیں ان میں سر فہرست خودکار بم کہ بعد از مرگ حیات میں بھی کٹ لگانے والوں کی ایک تعداد ساتھ ہی ساتھ روانہ ہوگی یوں عقابی روح، آسمانوں میں بعد از مرگ بھی مصروف بہ عمل رہے گی، اپنا خنجر، دوسروں کی تہذیب،یا اپنی تہذیب دوسروں کا خنجر اگر پوری قوم ایک ساتھ خودکشی کرنا چاہ رہی ہو تو انتہائ مناسب، کیڑے مار ادویات ، ٹرین کے آگے یا پل پر سے دریا یا سمندر میں چھلانگ لگا دینا یہ بچوں کے ساتھ خاندانی  طور پہ خودکشی کرنے کے لئے کافی آزمودہ ہے حکومت اسکی ترویج کے لئے مناسب انتظامات بھی کر رہی ہے، اس لئے کم سے کم مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا، ہیرے وغیرہ سے خود کشی کرنا آسان نہیں کہ ہیرے کے حصول سے پہلے کئ بار مرنا پڑے گا۔

یہ موضوع ذہن میں تھا کہ  میں ایکدن ادارہ ء معارف اسلامی جا پہنچی۔ مقصد تو کچھ اور تھا۔ مگر برآمدے میں ایک میز پہ کچھ کتابوں کے ساتھ پچاس فی صد سیل کا بورڈ نظر آیا۔  کسی بھی چیز پہ سیل کا بورڈ، مجھ جیسوں کو صراط مستقیم سے ہٹا سکتا ہے۔ سو اگلے لمحے میں وہاں اپنے آپکو کچھ کتابوں کی خریداری کے لئے راضی کرتی ہوئ پائ گئ۔ سیل سے کچھ نہ لینا نعمت سے انکار ہے۔  میں منکروں میں سے نہیں۔ اور پچاس فی صد سیل پہ شکر گذاروں میں بآسانی شامل ہوا جا سکتا ہے۔

کچھ کتابیں ہاتھ لگیں ان میں  پچپن صفحوں کی ایک کتاب خود کشی کے موضوع پہ ملی۔ میں نے اسے فوراً لے لیا۔  گھر آکر پڑھا تو پتہ چلا کہ 'خود کشی اور دور جدید'، جناب راشد نسیم نے لکھی ہے۔ یہ مضمون پہلے پہل فرائیڈے اسپیشل میں تین اقساط میں شائع ہوا اور پذیرائ ملنے کی وجہ سے انیس سو ننانوے میں کتاب کی شکل میں چھاپ دیا گیا۔ اسکا دیباچہ جناب منور حسن موجودہ امیر جماعت اسلامی نے لکھا ہے۔

یہاں اسکے دو صفحات کا عکس حاضر ہے۔  یہاں آپ خود اندازہ لگائیں کہ تجزیہ اور نتائج کس طرح مرتب کئے جاتے ہیں۔ اور پھر انکی نظریاتی ترویج کیسے کی جاتی ہے۔

نوٹ؛  تصویر کو واضح دیکھنے کے لئے اس پہ کلک کریں۔

12:07 PM

جماعت اسلامی, خود کش دھماکہ, خود کشی, کاپی کیٹ خود کشی، وردر خودکشیsuicide, ناصر کاظمی

آشنائیاں کیا کیا

ب

نگلہ دیش

کبھی پاکستان کا ہی حصہ تھا۔ اور آزادی کی جدو جہد دونوں حصوں کے لئے کی گئ اور دونوں ممالک کے لوگوں نے تاریخی طور پہ حصہ لیا۔ لیکن حالات ایسے رہے کہ مشرقی پاکستان انیس سو اکہتر میں بنگلہ دیش بن گیا۔ اور اس واقعے پہ مسرور اس وقت کی بھارتی رہ نما اندرا گاندھی نے اس دن کہا کہ آج کے دن نظریہ ء پاکستان کو خلیج بنگال میں ڈبو دیا گیا ہے۔

اسی بنگلہ دیش سے موصول حالیہ دو خبریں پاکستانی منظر نامے کے لئے اہم ہیں۔

پہلی خبر سیاسی پس منظر رکھتی ہے۔

مولانا مودودی صاحب

کی تمام تصنیفات پہ بنگلہ دیش میں پابندی لگا دی گئ ہے۔

اور تقریباً چوبیس ہزار لائبریریوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ انکی کتابیں ہٹادیں۔

وجہ یہ بتائ گئ ہے کہ انکی تصنیفات عسکریت پسندی اور دہشت گردی کی ترویج کرتی ہیں۔ اور یہ کہ انکے نظرئیے پہ چلنے والی جماعت حصول اقتدار کے لئے اسلام کا نام استعمال کرتی ہے۔ مزید تفصیلات کے لئے یہ

لنک

  دیکھ سکتے ہیں۔

یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ بنگلہ دیش بننے کے بعد نئے ملک نے اپنے آئین کو سیکولر رکھا کہ ملک میں غیر مسلموں کی خاصی بڑی تعداد موجود ہے۔ لیکن نئ مملکت بننے کے چالیس سال بعد اس پابندی کی کیا ضرورت آ پڑی؟ پچھلےپندرہ بیس سالوں میں

بنگلہ دیش میں بھی انتہا پسندی

میں خاصہ اضافہ ہوا ہے۔ اسکی وجہ؟

ایک اور اہم سوال، کیا اس قسم کی پابندیاں بنیادی حقائق کو تبدیل کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہیں؟

دوسری خبر، معاشرتی حالات سے متعلق ہے۔ اور وہ ہے بنگلہ دیش میں خواتین کو جنسی بنیاد پہ ہراساں کرنے کے واقعات میں شدت۔ اسکی وجہ سے خواتین میں خودکشی کا رجحان بہت زیادہ  بڑھا ہے اور نہ صرف نو عمر لڑکیاں بلکہ انکے والدین بھی بدنامی کے خوف سے ایسا کرنے پہ مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس سال اب تک بائیس لڑکیاں اس سلسلے میں خودکشی کر چکی ہیں۔

ایک رپورٹ

کے مطابق اسی طرح کے واقعے میں ایک ٹین ایجر لڑکی کو پٹرول ڈال کر آگ لگا دی گئ۔ کیونکہ اس نے آگ لگانےنے والے کے بھیجے گئےشادی کے رشتے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ لڑکی مر گئ یہ کہہ کر کہ اسے اس حالت تک پہنچانے والے کو ہر ممکن سزا دی جائے۔ یہ خبر ہم میں سے بیشتر  کو سنی سنی سی لگے گی۔ صرف پٹرول کو تیزاب سے بدلنے کی ضرورت ہے۔

ایک خاتون وکیل کے بقول اس طرز عمل نے ہمارے لئے بے پناہ مشکلات کھڑی کر دی ہیں۔ ایک طرف یہ جارحانہ رویہ ہے اور دوسری طرف ان حالات میں والدین اور معاشرہ لڑکیوں میں ہی خامیاں نکالتا ہے اور انہیں مزید دباءو میں رکھتا ہے۔ مثلاً ہنسی کیوں تھیں۔ سر جھکا کر کیوں نہیں چلتیں،   مردوں کے جارحانہ ردعمل  کی وجہ خواتین کی لاپرواہی ہوتی ہے۔  یہ بھی آپکو سنا سنا سا لگے گا۔

ہمارے ساتھ آزادی حاصل کرنے والے تیسرے ملک کے حالات بھی اس سے مختلف نہیں۔

بھارتی فلموں کی آزاد روی سے الگ دہلی جیسے دارالحکومت میں کوئ خاتون رات کو آٹھ بجے کے بعد تنہا نہیں نکل سکتی۔ یہ بات میں نے ایک محفل میں ایک ایسی خاتون سے سنی جو کسی پروجیکٹ کے سلسلے میں دہلی گئ تھیں۔

ان حالات کو جان کر مجھے تو کراچی ایکدم جنت لگتا یے جہاں خواتین کی اکثریت تعلیمی اور پیشہ ورانہ سرگرمیوں سے وابستہ ہے روزانہ خواتین لاکھوں کی تعداد میں اپنے گھروں سے نکلتی ہیں اور اکثر بس اسٹاپس پہ خواتن تنہا کھڑے نظر آتی ہیں۔ اورعمومی طور پہ ایک ایسی ہراساں کر دینے والی صورت نہیں کہ ابا ، بھائ اور شوہر کے حفاظتی حصار کے بغیر کچھ نہ کیا سکے۔

لیکن بنگلہ دیش میں ہونے والے یہ واقعات ہمیں کیوں سنے سنے سے لگتے ہیں؟

12:05 PM

انڈیا, بنگلہ دیش, بھارت, پاکستان, دہشت گردی, مولانا مودودی

ایک شام

 ٹریفک جام دنیا کے اکثر بڑے شہروں میں ہوتا ہے۔ لیکن کراچی کا ٹریفک جام  کا مرکز اگر معلوم کریں تو وہاں کئ گاڑیاں غلط سمت سے آ کر ایکدوسرے کے سامنے کھڑی ہونگیں، یوں کسی کے بچ نکلنے کا رستہ نہیں رہتا۔  ہمیں رشین سینٹر آف سائینس اینڈ کلچر پہنچنا تھا جو کہ عرف عام میں

فرینڈ شپ ہاءوس

کہلاتا ہے۔ وہاں ایک موسیقی کے پروگرام کی دعوت تھی۔ اس پروگرام کی دو خصوصیات تھیں۔ ایک تو اس میں روسی لوک موسیقی کوطبلے کے ساتھ مدغم کر کے پیش کیا جا رہا تھا۔ اور دوسرے طبلہ بجانے کا کام ایک خاتون انجام دے رہی تھیں۔

لیکن ہفتے کے دن کراچی میں ٹریفک کا رش معمول سے زیادہ ہوتا ہے کہ اسی دن شوہروں کی بڑی تعداد بیگمات کے ہاتھ لگتی ہے یوں شاپنگ سے لے کر رشتے داروں کے یہاں ہفتے وار چکر کے لئے ایک موقع نکل آتا ہے۔ دوسرا اگلا دن چونکہ چھٹی کا ہوتا ہے اس لئے شادی کی تقریبات کے لئے خاصہ آسان قرار پاتا ہے۔ لیکن کراچی کی سڑکوں پہ ہفتے کی شام خاصی بھاری گذرتی ہے۔ یوں شہر کی مختلف سڑکوں پہ ٹریفک جام کو برداشت کرتے ہوئے طارق روڈ کی ایک جانبی سڑک پہ بیس منٹ سگنل پہ اپنی باری کا انتظار کرنے کے بعد جب ہم دوسری طرف کی جانبی سڑک میں داخل ہوئے تو آدھی سڑک کھدی ہوئ تھی اور مٹی کے پہاڑ کو عین درمیان میں انتہائ سلیقے سے  جما کر مہم جو ڈرائیورز کوایک چیلینج دیا گیا تھا کہ گذرو تو جانیں۔ ہمارے ڈرائیور نامدار یہاں اگر آپ انہیں ہمارے شوہر نامدار سمجھیں تو بالکل صحیح ہونگے انہوں نے بھی اسے قبول کیا کہ ازل سے بس گئ ہے مہم جوئ میری فطرت میں۔ لیکن

مرفی کا قانون

اس قبولیت کا منتظر تھا۔ جیسے ہی جناب نے احتیاط سے اس پہاڑ کے ایک طرف چلنا شروع کیا دوسری طرف موجود پیپل کے درخت کی لٹکتی جڑوں نے گاڑی کی چھت سے کہا، کہاں میاں، ہم بھی تو کھڑے ہیں راہوں میں۔ ہماری اونچی گاڑی نےان سے شکست کھائ۔  قریب میں ایک گلی نظر آئ۔ پیچھے جا نہیں سکتے تھے کہ مزید گاڑیاں اس چیلیج کا سامنا کرنے کے لئے لائن بنائے کھڑی تھیں۔ اس گلی میں مڑ گئے۔ اب یہاں دو گاڑیاں آرام سے گذرنے کی جگہ تھی۔ لیکن کسی نے لوگوں کے صبر و قرار کا امتحان لینے کے لئے ایک گاڑی کو کچھ اس طرح ترچھے انداز میں کھڑاکیا گیا تھا کہ اگلی گاڑی جان کی امان پا کر ہی اسکے قریب سے گذر سکتی تھی۔ نیم اندھیرے میں اس مرحلے سے سرخرو ہوئے تو پتہ چلا کہ بیچ گلی میں مزید دو گاڑیاں اس طرح پارک ہوئ ہیں کہ آگے جانے کا رستہ نہیں رہا۔ کسی کے اس نیک عمل پہ اسے دعائیں دیتے ہوئے گاڑی کو ریورس گیئر میں ڈالا۔ اور ہمارے ڈرائیور نے جنکی خوبیوں میں سے ایک یعنی ڈرائیونگ میں مہارت کی میں ہمیشہ معترف رہی ہوں اس تنگ گلی میں آڑی ترچھی پارک کی ہوئ گاڑیوں کے درمیان ملی میٹرز کا صحیح حساب رکھتے ہوئے گاڑی کو وہاں سے نکال ہی لیا۔

اس ساری تگ ودو کے بعد یہ خیال پیدا ہو چلا تھا کہ اب شاید ہی یہ پروگرام ہمارے لئے بچا ہو۔  کیونکہ ہم تو روڈز پہ پرفارمنس دینے میں مصروف تھے۔ بہر حال مقررہ وقت کے تقریباً پچاس منٹ بعد ہم وہاں پہنچے تو پروگرام جاری تھا۔

روسی الیکسی اپنا گٹار اور پاکستانی

لینا احمد

اپنا طبلہ سنبھالے ہوئے تھے۔ موسیقی کے ایسے پروگرامز لاِئیو دیکھنا ایک الگ لطف رکھتا ہے۔ ہال میں گنجائش سے زیادہ مہمان موجود تھے۔

گٹار کے ساتھ طبلے کی سنگت میں الیکسی  نے روسی شاعری اور موسیقی کا تعارف دیا۔ ہر گیت سے پہلے وہ اسکا ترجمہ اور پس منظر بتاتے جاتے۔ الیکسی خوش آواز بھی ہیں۔ لینا بہت اچھا طبلہ بجاتی ہیں اور انہوں نے الیکسی کی لے میں اپنی لے خوب ملائ۔  یوں مزہ آیا۔

پروگرام کے آخر میں ایک سرپرائز ملا جب استاد دلاور نے پکھاوج پہ اپنی پرفارمنس پیش کی۔ انکے تعارف میں کہا گیا کہ

پکھاوج

طبلے سے پہلے رائج تھا۔

امیر خسرو

نے طبلہ متعارف کروایا اور جلد ہی یہ اتنا رائج ہو گیا کہ پکھاوج متروک ہو گیا۔ میرا یہ پہلا موقع تھا اسے سننے کا۔ اور صحیح بات تو یہ ہے کہ میں اس سے بہت متائثر ہوئ۔ فنکار صاحب ہر پرفارمنس سے پہلے اس سے منسلکہ منظر کھینچ دیتے۔ اور پھر جب تا تھئ کی تال دیتے تو سماں باندھ دیتے۔ اسکی وجہ اس پرفارمنس کا اردو میں ہونا بھی تھا۔

10:30 AM

Freindship house, امیر خسرو, پکھاوج, رشین سینٹر آف سائینس اینڈ کلچر, طبلہ, فرینڈشپ ہاءوس, کراچی, لینا احمد

طاقت

میں بنکاک ایئر پورٹ پہ جب اتری تووہاں سے تھائ لینڈ کے شہر پھوکٹ جانے والی پرواز میں ابھی چار گھنٹے باقی تھے۔ میرے ساتھ ایک پاکستانی دوست فیملی بھی تھی۔ ہم ایئر پورٹ پہ ونڈو شاپنگ کرنے لگے۔ یعنی چیزیں دیکھ  دیکھ کر انکی تصوراتی خریداری سے دل بہلانا۔ چاہے جیب میں دھیلا نہ ہو۔ میرا دل تو دنیا کی بیشتر چیزوں سے اسی طرح بہل کر بھر گیا۔ ہم ٹہلتے ہوئے ایک دوکان میں داخل ہوئے جہاں سچے موتیوں کے زیورات تھے۔ لیکن ہمارے ساتھ موجود خاتون جو میری والدہ کی عمر کی ہونگیں۔ انکی نظریں، سیلز پرسن کے چہرے سے چپک گئیں۔ پھر وہ سرگوشی میں بولیں۔ ائے کیسا ملک ہے۔ یہاں ہیجڑے بھی کام کرتے ہیں۔ انکے لہجے میں ایک کراہیت تھی۔ تو کیا ہوا، اچھی بات ہے کچھ تو کرتے ہیں ہمارے یہاں کی طرح جسم فروشی اور بھیک مانگنے کا کام تو نہیں کرتے۔ یہ دوسرا جملہ میں نے دل میں سوچا۔  بآواز بلند کہتی تو لبرل ہونے کا طعنہ ملتا۔

پھوکٹ میں ایکدن ہمیں اتنا وقت ملا کہ پھوکٹ کے نزدیک واقع

پی پی آئلینڈ

کا

بوٹ ٹرپ

لے لیا۔ یہ ٹرپ بہت زیادہ مزے کا تھا۔ لیکن ہماری بڑی خاتون جیسے ہی بوٹ میں داخل ہوئیں ایک دفعہ پھر جھٹکے سے دو چار ہوئیں کہ ٹرپ کا گائڈ یا لیڈر ایک ہیجڑا تھا۔ وہ اسی طرح وقفے وقفے سے ناز ا ادا دکحا کر اور کبھی سنجیدہ ہو کر ہم سب کی توجہ اپنی طرف رکھے رہا۔

جب ہم سب سمندر میں مچھلیوں کو کھانا کھلاتے سینکڑوں مچھلیوں کو اچھلتے کودتے دیکھ رہے تھے ہماری بزرگ خاتون اس گائڈ کے اوپر نظر رکھی بیٹھی رہیں۔ جب ہم سمندر میں آڑی ترچھی اسنارکلنگ  کی کوششیں کر رہے تھے اور مشعل یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ کتنی اچھی تیراک ہیں اپنے دونوں ہاتھوں کو جوڑتیں اور سمندر میں چھلانگ لگانے سے قبل ہم سب کوڈانٹ کر توجہ چاہتیں ہماری بزرگ خاتون  ریتیلے ساحل پہ پڑے ہجوم میں اس گائڈ کو تلاش کر رہی ہوتیں۔

حتی کہ پاکستان  واپس آکر بھی انہیں یاد آتا رہا کہ تھائ لینڈ کتنا عجیب ملک ہے وہاں ہیجڑے بھی کام کرتے ہیں۔

چار دن پہلے میں اپنے گھر کے نزدیک لگنے والے بچت بازار گئ۔ یہ ہفتے میں تین دن لگتا ہے اور میں یہاں سے پورے ہفتے کی سبزیاں اور پھل لے لیتی ہوں۔ یہاں افغانی بچے پھرتے رہتے ہیں جنکی عمریں پانچ سال سے لیکر چودہ پندرہ سال تک ہوتی ہیں۔ چھوٹے بچے پلاسٹک کی تھیلیاں بیچتے ہیں اور ذرا بڑے بچے سامان بھی اٹھا لیتے ہیں۔ غربت کی سطح اتنی بڑھ چکی ہے کہ جب میں ان میں سے کسی مناسب عمر کے بچے کوسامان اٹھانے میں مدد کے لئے ڈھونڈھ رہی ہوتی ہوں تو چھ سات سال کے بچے بھی سامان اٹھانے کے لئے منتیں کر رہے ہوتے ہیں۔

بہر حال ، ایک بچے نےمجھے ڈھونڈ لیا کہ ہر ہفتے جاتی ہوں۔ اور باقی بچوں کو مجھ سے دور کر دیا۔

خریداری کے بعد جب میں اسکے ساتھ سامان رکھنے میں مصروف تھی تو وہاں پہ ایک ہیجڑا آگیا۔ اور پیسے مانگنے لگا۔ بازار میں آجکل ایسے چار پانچ ہیجڑے پھرتے رہتے ہیں۔ پھر اس نے اپنا سبق شروع کر دیا۔ اللہ تیرے صاحب کو اور دے۔ خدا تجھے چاند سا بیٹا دے۔ اللہ تیری خوشیوں کو قائم رکھے۔ ہم غریبوں کو ہمارا حق دیتی جا۔ میں نے معاف کرنے کا کہا اور خاموشی سے سنی ان سنی کر کے اس بچے کے ساتھ مصروف رہی۔ پھر وہ کہنے لگا کہ روپے دو روپے دینے میں تمہاری دولت کم نہیں ہو جائے گی۔ ہماری تو زندگی ہی تم لوگوں کی خیرات سے ہے۔ تب میں نے اس سے کہا کہ  کیوں ہے تمہاری زندگی ہماری خیرات سے۔ اس بچے کو دیکھا تم نے بمشکل دس گیارہ سال کا ہے میرے ساتھ سامان اٹھا کر بازار سے گاڑی تک اٹھا کر لایا ہے۔ آخر تم میں اس سے زیادہ طاقت ہے۔ تم کیوں نہیں سامان اٹھانے کا کام شروع کر دیتے۔ میں اس بچے کو پچیس روپے دیتی ہوں۔ وہی تمہیں دے دونگی۔ ارے میں اپنی چھوٹی بہن کے صدقے، ہم ہیجڑوں میں کہاں طاقت ہوتی ہے۔ یہی تو رونا ہے کہ ہم میں طاقت نہیں ہوتی۔ خدا نے تو ہمیں خالی ہی پیدا کر دیا ہے۔

مجھے تھائ لینڈ کا سیلزمین یاد آگیا جب وہ مجھے اپنے لمبے سنہرے کئے ہوئے بالوں سے ڈھکی گردن پہ سچےموتیوں کی مالا سجا کر دکھا رہا تھا۔ یا وہ گائڈ جو ہنس ہنس کر پورا دن ہمیں مصروف رکھے رہا۔ ان لوگوں میں کہاں سے طاقت آتی ہے۔

نوٹ؛ ان تصویروں میں، میں کہیں نہیں ہوں، البتہ یہ تصاویر میرے کیمرے کی ہیں۔

11:20 AM

افغانی بچے, بچت بازار, بنکاک, پھوکٹ, تھائ لینڈ, کراچی, ہیجڑا

ورنہ

پنجاب اسمبلی میں

میڈیا کے خلاف قرار

داد پاس ہوئ جس میں میڈیا کی مذمت کی گئ۔  پنجاب جو ہمارے ملک کی آبادی کا ساٹھ فی صد ہے۔ اس ساٹھ فی صد آبادی کے اقتدار میں موجود نمائندوں نے میڈیا کے روئیے کی مذمت کی ہے۔

کیوں؟

اس کی نمایاں وجوہات میں یہ کہ میڈیا نے جعلی ڈگریوں کے ضمن میں غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا۔  میڈیا ، حکومت مخالف سرگرمیوں میں مصروف ہے جس سے جمہوریت کو خطرہ ہے۔ یہ جعلی ڈگریوں اور جمہوریت والا مسئلہ چونکہ عام لوگوں کو سمجھ میں نہیں آتا اور نہ یہ انکا 'روزمرہ' ہے۔ تو اس میں عوام کو بھی شامل رکھنے کے لئے ایک وجہ اور بیان کی گئ ہے وہ پارلیمنٹ کی خواتین کے حوالے سے میڈیا میں ایک فضول  ویڈیو کی تشہیر، جو میں نے ابھی تک نہیں دیکھی۔

یہ اس پنجاب اسمبلی کی قرارداد مذمت ہے جس نے ایک آمر کی حکومت کو گرانے کے لئے میڈیا کی پیٹھ ٹھونکی۔ جس نے لال مسجد کو ایک سانحے میں تبدیل کرنے کے لئے میڈیا کو شاباش کہا۔ اور جس نے انتہا پسند گروہوں کو عوامی ہیرو بنانے میں میڈیا کے تعاون خیر پہ انہیں بھی جنت میں اپنے ساتھیوں میں شامل کہا ہوگا۔

آج پنجاب ، جبکہ سیاسی ماحول کے حساب سے ایک گرم صورت حال میں ہے۔ جناب نواز شریف اور شہباز شریف پہ الزام ہے کہ وہ انتہا پسند گروپوں کی حمایت حاصل کرنے اور انہیں تحفظ دینے میں سرگرم عمل ہیں۔   یہی نہیں بلکہ جھوٹی جعلی ڈگریوں کے بل بوتے پہ سیاسی طاقت حاصل کرنے والے، ملک کی تقدیر کا فیصلہ کرنے کے دعوے دار اور معاشرے کو عدل اور انصاف کی صبح نو کا پیغام دینے والے ہیں۔ یقیناً، میڈیا کو اس چیز کو بے نقاب کرنے اور اس پہ شور وغوغا کرنے پہ، مذمت کا سامنا کرنا چاہئیے۔

کیوں؟

اس لئے کہ اس سے جمہوریت کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس جمہوریت کو جس کے نتیجے میں ہماری اسمبلیوں میں، ملک کے امیر ترین اشخاص اپنے غلیظ ترین ذہنوں کے ساتھ ہمارے مستقبل کا سہارا لے کراسکی لگامیں تھامتے ہیں۔ جب کہ انہیں  یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ہمارا مستقبل انکے مستقبل سے کتنا الگ ہے۔ کیونکہ وہ اس خزانے پہ جسے ہمارے مستقبل کے تحفظ پہ خرچ ہونا چاہئیے۔ اپنی اور اپنی نسل کے مستقبل کی بقا کے  لئے وقف سمجھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس ملک کے عوام کا فرض ہے کہ وہ اس اقتدار کے مسند پہ براجمان گروہ کی حفاظت کے لئے اپنے مسائل بھول جائے اور اپنے وسائل ان پہ نچھاور کرتا رہے۔ جسکے نتیجے میں، نسل در نسل بادشاہی خاندان جنم لیتے ہیں۔ چند شاہی خاندان آپس میں حکومتی طاقت کو مل بانٹ کر استعمال کرنے کے عمل کو جمہوریت کا نام دیتے ہیں۔ اور جب انکی یہ پول پٹی کھلنے لگتی ہے تو لازماً اس سے اس جمہوریت کو نقصان پہنچتا ہے۔ ہر وہ عمل جس سے انکے اثر و رسوخ کو ذرہ برابر بھی نقصان پہنچے، وہ جمہوریت کی راہ میں حائل ہے۔

وہ تمام لوگ جو اس ملک میں عوام کی حاکمیت اعلی دیکھنا چاہتے ہیں۔ جو سمجھتے ہیں کہ  جمہوریت اسکا نام ہے کہ عوام کی حکومت، عوام کے لئے عوام کے ذریعے سے۔  وہ سوال کرتے ہیں کہ کیا اس طرح طاقت کے سہارے پہ میڈیا سنسر ہونا چاہئیے؟ کیا کسی کو یہ حق ہونا چاہئیے کہ جب تک اسکے مفادات کے حق میں کوئ چیز جا رہی ہو تو وہ ہر غلط اور صحیح چیز کی حمایت کرتا رہے اور جب اسے اسی طرز عمل سے نقصان پہنچنے لگے تو وہ قرار داد مذمت پاس کرے؟ کیا ہمیں ایک ایسی جمہوریت کی حفاظت کی تگ و دو میں لگا رہنا چاہئیے جو تمام مجرمین کو، جھوٹے اور کرپٹ لوگوں ، نظام کو محض با اثر لوگوں کی بقاء اور انکی نسلوں کی فلاح کے لئے استعمال کرنے والوں کو تحفظ دینے کے لئے قوانین بناتا رہے؟

مجھ سے پوچھیں، جوتے پڑنے چاہئیے انہیں۔ ان سب کو۔ اور انہیں ان اسمبلیوں سے گندے انڈوں کی طرح نکال کر باہر پھینک دینا چاہئیے۔  انہیں وہاں ہم نے اپنے بچوں کا مستقبل بہتر بنانے کے لئے، اپنے مسائل کے حل کے لئے بھیجا ہے اور یہ ہمارا بنیادی حق ہونا چاہئیے کہ وہ اگر ہم سے جھوٹ بولتے ہیں، وہ اپنے ذاتی مفادات کو ہمارے مفادات پہ ترجیح دیتے ہیں، وہ حکومتی مصارف کو ادا کرنے کے لئے ہمارے ٹیکس کی صورت میں جمع کردہ چندے کو اپنی اور اپنے خاندانوں کی عیاشی پہ خرچ کر کے ہمیں دن بہ دن حقیر فقیر بنا کر ہمارا مذاق اڑانے پہ تلے ہوئے ہیں تو ہم اپنی طاقت استعمال کر سکتے ہیں۔ ہم ان سے کہہ سکتے ہیں۔ اب بہت ہو گیا، اب دفع ہو جاءو ہمیشہ کے لئے۔ جان چھوڑو ہماری، ورنہ-----------۔

1:09 PM

انتہا پسند, پاکستان, پنجاب اسمبلی, جعلی ڈگری, شہباز شریف, لال مسجد, میڈیا, نواز شریف

محافظ

مظفر گڑھ، میر والا میں دو خواتین جو کہ ماں بیٹی تھیں۔

چودہ افراد نے برہنہ

کر کے سر بازار پھرایا اور پھر انکی اچھی طرح پٹائ لگائ۔ ماں کی عمر پچاس کے قریب اور بیٹی کی عمر محض چودہ سال تھی۔

یہ واقعات یا اس سے ملتے جلتے واقعات تیسری دنیا کے غریب ممالک میں پیش آتے رہتے ہیں۔

 اس قسم کا پہلا واقعہ جس نے شہرت حاصل کی ضیاء الحق کے زمانے میں

نواب پور

میں پیش آیا۔ پچھلے چند سالوں میں اس قسم کے واقعات کی شدت میں اضافہ ہو اہے۔ آخر خواتین کے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس ضمن میں اگر ہم دیکھیں تو  بھارت میں بھی ایسے واقعات پیش ہوتے نظر آتے ہیں۔ خاص طور پہ ان ممالک میں جہاں زمینداری کا نظام قائم ہے ہے یا کچھ عرصے پہلے تک قائم تھا۔ خواتین کے ساتھ اس ہتک آمیز سلوک کی بنیادی وجہ انہیں مال مویشی کی طرح جائداد کا حصہ سمجھنا ہوتا ہے۔ جس طرح ایک زمیندار اپنی زمین کے بارے میں، اپنے مویشیوں کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنی عورتوں کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتا ہے اور ٹھیک اسی طرح اگر کسی زمیندار کو اسکی زمین پہ کھڑی فصل کو تباہ کر کے نقصان سے دوچار کیا جا سکتا ہے اسی طرح ایک مرد کو زیادہ بہتر طور پہ ذلت سے دوچار کرنے کے لئے انکی خواتین کے ساتھ جنسی زیادتی سے لیکر برہنہ پھرانے کے واقعات سمیت تک ہر چیز روا رکھنا جائز ہے بلکہ افضل ہے کہ مخالف پہ ایسی چوٹ لگتی ہے جس کے عذاب سے وہ ساری زندگی کیا کئ نسلیں نہیں نکل سکتا۔

ہمارے یہاں اسے غیرت اور عزت کے ساتھ وابستہ قرار دیا جاتا ہے اور یوں قبیلے اور خاندان کی عزت کی ضامن عورتیں ہو جاتی ہیں۔ اغوا ہونے والی عورت اگر رہائ بھی پالے تو اسکا احسن انجام موت ٹہرتا ہے کہ اسکی زندگی پورے قبیلے اور خاندان کی غیرت کی موت ہوتی ہے۔ عصمت کا تصور خالصتاً ایک عورت کے ساتھ وابستہ ہے، مرد اس سے مبرا ہیں۔ اور اس وجہ سے مرد جتنے چاہے ناجائز جنسی تعلقات رکھیں،یہ انکی امارت کی علامت یا مردانگی کی تعریف تو ہو سکتا ہے مگر اس سے خاندان کی نیک نامی پہ دھبہ نہیں آتا۔ اسکی شادی کے مسائل یا معاشرے میں با عزت زندگی گذارنے کے خواب چکنا چور نہیں ہوتے۔  اسکے اس جرم کی وجہ سے کوئ اور قبیلہ یا قوم انہیں موت کے گھاٹ اتار سکتی ہے لیکن اسکے اپنے قبیلے والے ایسا نہیں کریں گے۔ وہ جواں مرد اپنے قبیلے کی آنکھ کا تارا ہوتا ہے۔

یہ سوچ، زمینداری کے نظام سے اس لئے جنم لیتا ہے کہ ایک جسمانی طور پہ طاقتور مرد اپنی زمین سے زیادہ پیداوار حاصل کر سکتا ہے۔ جسمانی طور پہ زیادہ طاقتور مرد، زیادہ خوشحالی کا باعث بنیں گے جبکہ خواتین نئے مرد بچے پیدا کر کے زیادہ خوشحال میں اضافہ کر سکتی ہیں۔ اس لئے ایک مثالی زمیندار نظام میں اس عورت کی آءو بھگت بھی زیادہ ہوتی ہے جو زیادہ مرد بچوں کو پیدا کر چکی ہو۔ یا کم از کم ایک وارث مرد بچہ تو رکھتی ہو۔

اگر افریقی ممالک کی طرف نظر کریں ۔ جہاں کچھ قبائل میں عورت اور مرد کی تخصیص نہیں ہے وہاں مجھے ایک افریقن ملک

کیمرون

کی خاتون نے بتایا کہ شادی کے لئے ہمارے یہاں اس لڑکی کو ترجیح دی جاتی ہے جسکے شادی سے پہلے بچے ہوں۔ چاہے کسی بھی مرد سے ہوں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ بچے پیدا کر سکتی ہے۔ اس طرح اس سوچ سے متائثرہ نظام میں ایک ایسی عورت کی اہمیت نہیں رہتی جو بچے پیدا نہیں کر سکتی۔ کسی بھی قدرتی وجہ سے۔ خیر یہ اایک الگ موضوع ہے۔

سر دست، ہمیں معاشرے کے اس اٹھان پہ غور کرنا ہے جہاں خواتین کو بھی انسان تصور کیا جائے۔ ایسا انسان جسے سر بازار، بقائمی ء ہوش و حواس، بزور قوت برہنہ گھمائے جانے پہ نفسیاتی اور روحانی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ صرف عورت کے اوپر عزت اور غیرت کی بھاری ذمہ دریاں نہ ڈالی جائیں  جسکے نتیجے میں اسے زندگی جیسی مسحور کن نعمت سے محروم کر دیا جائے۔ زندگی کی مسرتوں پہ ہر ایک کا حق ہے۔ انسان ہونے کا احترم اور شرف ہر ایک کو حاصل ہے۔

9:53 AM

Cameroon, pakistan, پاکستان, جنسی زیادتی, عورت, فیوڈل سسٹم, کشمیر, کیمرون, مظفر گڑھ،

نا معلوم

نواز شریف خانہ ء کعبہ کا طواف کر رہے تھے کہ اچانک دل میں شدید تکلیف اٹھی۔ لگا کہ شاید دل کا دورہ پڑنے والا ہے۔ جس وقت انہیں ایمبولینس میں منتقل کیا جا رہا تھا انہوں نے اپنے ایک ایک چاہنے والے سے کہا فوراً لاہور فون کر کے کہو کہ داتا دربار پہ چالیس دیگیں چڑھا دیں۔

یہ ایک لطیفہ ہے جو آپ میں سے بیشتر لوگ برسوں سے سنتے آرہے ہونگے۔ یہ یقیناً اس عقیدت کی مبالغہ آرائ ہے جو اہلیان لاہور داتا دربار سے رکھتے ہیں۔ لیکن اسی دربار میں کل رات ایک خود کش حملہ آور نے جو کسی نا معلوم قومیت کا تھا اور ہم میں سے بیشتر اس خیال کے حامی ہیں کہ اسکا کوئ مذہب نہ تھا۔ اپنے آپکو بم سے اڑا دیا اور ساتھ ہی چالیس سے زائد معصوم، بے گناہ لوگوں کی جو اپنے مسائل کے حل کے لئے یا داتا صاحب کی محبت میں وہاں موجود تھے انہیں بھی خدا کی عطا کردہ بیش قیمت نعمت، زندگی سے محروم کر دیا۔

ابھی ابھی میں ایک پتلی سی کتاب پڑھ کر فارغ ہوئ ہوں جو انیس سو ننانوے میں ادارہ ء معارف اسلامی کی سرپرستی میں شائع ہوئ۔ جس میں مصنف نے سارا زور اس بات پہ دیا کہ خود کشی سیکولر سماج کی پیداوار ہے۔ اور پاکستان میں جہاں کہیں خودکشی ہوتی ہے یہ وہ علاقے ہیں جہاں سیکولیرزم اپنے قدم جما چکا ہے۔ اس کتاب کے دلچسپ اقتباسات پھر کبھی۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں اس واقعے کی مذمت کرنی چاہئیے؟

یہ مذمت حکومت وقت کے خلاف ہونی چائیے؟ پاکستان کے ایک عملی طور پہ اسلامی مملکت نہ ہونے کے خلاف ہونی چاہئیے؟ خود کش حملوں کے خلاف ہونی چاہئیے؟ خود کش حملہ آوروں کے خلاف ہونی چاہئیے؟

نامعلوم خودکش حملہ آوروں کے خلاف ہونی چاہئیے یا معلوم خود کش حملہ آوروں کے خلاف؟

اگر ہم یہ مذمتی بیان نامعلوم خودکش حملہ آوروں کے خلاف کرتے ہیں جنکی قومیت اور مذہب نہیں معلوم، تو کیا وجہ ہے کہ ہم اپنے آپکو اول درجے کامنافق نہ کہیں؟

کیا مذمت کرتے وقت ایسے نامعلوم خود کش حملہ آوروں کا تذکرہ کر کے  ہم مرنے والوں کا اور انکے لواحقین کا مذاق نہیں اڑاتے؟

ان نامعلوم حملہ آوروں کی جنکی کوئ قومیت اور مذہب نہیں ہے مذمت اور مرنے والوں کی تعزیت ہم کب تک کرتے رہیں گے؟

وہ کون سے فضائ، بری اور بحری راستے ہیں جنکے ذریعے یہ خود کش حملہ آور ہمارے ملک میں داخل ہو کر ہمارے شہریوں کو جان سے ختم کر دیتے ہیں؟

 مختلف علاقوں میں جو نام نہاد خود کش حملہ آور تیار کرنے کے کیمپس ہیں اور جہاں سے کچھ انتہائ بے وقوف لوگوں کی اطلاعات کے مطابق  یہ دھڑا دھڑ پھٹنے کے لئے بھیجے جا رہے ہیں کیا وہ سب کچھ بالکل جھوٹ پہ مبنی ہے؟

اور کیا کسی اور قوت نے انسانی کلوننگ کے ذریعے خود کش حملہ آور تیار کرنے کا طریقہ معلوم کر لیا ہے؟ کیا ہم یہ طریقہ اپنے دشمن پہ نہیں لگا سکتے؟ کیا ایسا ممکن ہے کہ ہم خود کش حملہ آور بھیج کر دنیا بھر میں موجود اپنے دشمنوں کا قلع قمع کر دیں تاکہ ہمارے شہری اپنی عبادت گاہوں میں تو سکون سے جا سکیں؟

ان سوالوں کی فہرست خاصی طویل ہوتی جاتی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے بجائے کسی واقعے پہ اپنے تاثرات لکھنے کے میں صرف ذہن میں آنے والے چند سوالات لکھ دیتی ہوں۔ تاکہ ہمارے دیگر لوگ جو زیادہ بہتر طریقے سے کسی مسئلے کو حل کر لیتے ہیں وہ انکے مناسب جوابات دے سکیں۔

کیونکہ یہ سوالات ہیں جنہیں جانے بغیر ہم اپنا دفاع کرنے سے محروم ہیں۔ ایک خود کش حملہ آور کہیں بھی، کسی بھی وقت نمودار ہوگا اور خود جنت حاصل کر کے اپنے پیچھے سینکڑوں لوگوں کی زندگی جہنم بنا جائے گا۔

مذمتی بیانات تو سب ہی ڈال کر اپنا فرض پورا کرتے ہیں۔ اس وقت یہ مذمت ذرا الگ انداز سے کرتے ہیں۔ جس سے مجھ جیسے کم علم لوگ بھی مستفید ہو سکیں۔ اور انہیں صحیح سے معلوم ہو کے انہیں کیا کرنا ہے۔ مذمت کرنی ہے، تعزیت کرنی ہے، تبرہ کرنا ہے، یا لعنت بھیجنی ہے۔ اور ان سب کا ٹارگٹ کسے بنانا ہے۔

اور ہاں ایم کیو ایم اور الطاف حسین کو خدا پوچھے۔ وہ  ایک نمبر کے دہشت گرد ہیں بس ان میں اوردیگر دہشت گردوں میں  یہ فرق ہے کہ انکے خود کش حملہ آور عام لوگوں کے درمیان نہیں پھٹتے۔ لیکن یہ بھی میں غلط ہی کہتی ہوں یہ دوسرے دہشت گرد ہمارے ملک سے تعلق ہی کہاں رکھتے ہیں۔ یہاں تو صرف ایک ہی طرح کے دہشت گرد ہیں اور وہ ہیں الطاف حسین کے دہشت گرد۔

9:14 PM

الطاف حسین, ایم کیو ایم, پاکستان, خودکش حمل آور, لاہور, نواز شریف

دیر آید

اگرچہ کہ میں کھانا دن میں ضرورتاً ہی کھاتی ہوں مگر تیسری دنیا کے ایک پسماندہ اور اپنے ہوش و حواس کی دنیا بحال ہونے کے بعد سے اسے حالت جنگ میں دیکھ دیکھ کر میں سارا سارا دن بھی لکھتی رہوں تو اس میں اچنبھے یا حیرانی کی بات نہیں ہونی چاہئیے۔ تیسری دنیا کا ایک غریب ملک، حالت جنگ، نامساعد سیاسی حالات، جہالت، دقیانوسیت, جذباتیت، اور ترقی کے لئے کام کرنے کے بجائے کام کرنے والوں سے حسد،  یہ سب مل کر ایک ایسا جادوئ جوہر بناتے ہیں  کہ جو شخص معمولی سی بھی حساسیت رکھتا ہو یہ اسے تخلیق کی سطح پہ خاصہ سرگرم کر دیتی ہے۔ ایسے حالات سے گذرنے کے بعد اگر کسی لکھنے والے کو لکھنے کے موضوعات کی قلت کا سامنا ہے تو یہ یقیناً وہ ہونگے جو صاحبان تسلیم و رضا سے ہیں۔

اس ہفتے دو دلچسپ خبریں سامنے آئیں۔

پہلی خبر کا

تعلق سندھ سے ہے۔ جہاں ایک پینتالیس سالہ خاتون شہزادی چانڈیو  نے ایک سترہ سالہ لڑکے کو شادی کرنے کی غرض سے اغواء کر لیا۔ پولیس اسٹیشن میں لڑکے نے بیان دیا کہ وہ تو اسے جانتا تک بھی نہیں۔ یہ زیادتی ہے کوئ آپکو جانتا بھی نہ ہو اور اسے اغواء کر لیا جائے۔ مگر پھر بھی صد شکر کے اجتماعی زیادتی نہیں ہے۔

دوسری خبر  انڈیا کے شہر لکھنوء سے ہے ایک مسلم خاتون نشاط فاطمہ نے شہر میں واقع ایک شریعت کورٹ میں فتوی دینے مولوی صاحب کی پٹائ لگادی۔ یقیناً پڑھی لکھی نہیں ہونگیں ورنہ صرف لفّاظی کرتی رہ جاتیں۔ اور اسی فلسفے پہ غور کرتی رہتیں کہ جب اس خبیث شوہر نے ہی خباثت دکھا ڈالی تو کسی مولوی کا اس میں کیا قصور۔ اس تمام تر ہاءو ہو کے بعد  پھر انہوں نے  جو کچھ کہا  اسکا مطلب یوں نکلتا ہے کہ  ٹھنڈ پے گئ۔

اخبار ٹائمز آف انڈیا  کے الفاظ

میں

دل کو کتنا سکون ملا ہے ان لوگوں کو پیٹ کر بتا نہیں سکتی۔

خاتون شیعہ فقہے سے تعلق رکھتی ہیں اور پڑوسیوں کی زبانی یہ جان کر کہ انکے شوہر نے انہیں طلاق دے دی ہے وہ سخت صدمے میں تھیں۔ شیعہ قوانین کے مطابق بیوی کو صفائ کا موقع دئِے بغیر طلاق نہیں ہو سکتی۔  خاتون کے شوہر صاحب عرصہ ء دو سال سے ایک اور خاتون کے ساتھ عارضہ ء قلب میں مبتلا تھے۔ اسکا علاج انہوں نے یہ نکالا کہ ان سے شادی کر لی جائے۔ لیکن اس سلسلے میں ماضی کی غلطی کو ان ڈو کرنے کے لئے انہیں مولوی صاحب سے خدمت لینی پڑی۔  تاکہ زمانہ ء حال میں یہ غلطی دوبارہ کر سکیں۔  لکھنوء کے سلطان المدارس کے مولوی صاحب نے مبلغ ڈھائ ہزار روپے انہیں پہلی بیوی سے علیحدگی کا سرٹیفیکیٹ دیا۔  نشاط آپا نے یہ سنتے ہی آءو دیکھا نہ تاءو کہ اب اسکا وقت نہیں رہا تھا اس شریعت عدالت میں گھس کر مولوی صاحب کی پٹائ لگا دی۔  نہ رہے بانس اور نہ ہی بانسری۔  ہماری خاتون نے اسی پہ بس نہیں کی بلکہ مزید خواتین کو مشورہ دیا کہ وہ جو ان مولویوں کے قوانین سے تنگ آئی ہوئ ہیں وہ بھی باہر نکلیں اور انہیں سبق سکھائیں۔

باقی مسلمان خواتین چاہے انکے مشورے پہ عمل کریں یا نہ کریں ایک خیال یہ  آتا ہے کہ بچپن میں اماں جان و ابا جان سے پٹنے کے بعد عین بڑکپن میں دوسرے کی بیگم سے پٹنے کے انوکھے تجربے کے بعد مولوی صاحب کی  ذہانت میں بیش بہا اضافہ ہوا ہوگا اور اب وہ مولوی صاحبان یقیناً اس کار خیر کی فیس بڑھا دیں گے کہ اس میں بعد از پٹائ علاج معالجہ کا خرچہ بھی شامل ہوگا۔

میری ہمدردیاں مولوی صاحب کے ساتھ ہیں اس لئے برائے مہربانی اس پوسٹ کے سلسلے میں مجھ پہ دین کے خلاف جانے کا الزام نہ لگایا جائے۔ حالات کہہ رہے ہیں کہ مبینہ شوہر صاحب نے بھی اسی طرح باری باری اماں، ابا اور بیگم سے پِٹ پِٹ کر ذہانت استعمال کرنا سیکھی ہوگی۔ بہر حال دیر آید درست آید۔

11:11 AM

سلطان المدارس, سندھ، شہزادی چانڈیو, شریعت کورٹ, لکھنوء, مسلم شادی, نشاط فاطمہ

مزید الٹا سیدھا-۲

گذشتہ سے پیوستہ۔

ہمارا یہ پورا خطہ جس میں چین، انڈیا اور پاکستان آتے ہیں۔ سیدھے ہاتھ کی تعظیم کا خطّہ ہے۔ ہندءووں اور مسلمانوں دونوں میں سیدھے ہاتھ کے استعمال کو ترجیح دی جاتی ہے اور بچوں کو ابتداء ہی سے یہ چیز بزور قوت سکھائ جاتی ہے کہ وہ اپنا سیدھا ہاتھ استعمال کریں۔ حال ہی میں ایک ٹی وی اینکر یہ کہتے سنے گئے کہ انہیں پروگرام کے دوران الٹے ہاتھ سے پانی پیتے دیکھ کر انہیں لا تعداد پیغامات محض اس لئے ملے کہ الٹے ہاتھ سے پانی پینا غیر اسلامی ہے۔

مغرب میں اس خیال کا باعث عیسائ تعلیمات سے جوڑا جاتا ہے۔  لیکن اسلامی تعلیمات کو اگر دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ صفائ کو نصف ایمان قرار دیا گیا ہے۔ اور ایک ایسے زمانے میں جب خود کو صاف رکھنے کے لئے آجکی طرح کی  چیزیں جیسے صابن اور دوسری اشیاء موجود نہ تھیں سیدھے ہاتھ کے استعمال کو شاید اس لئے احسن قرار دیا گیا کہ جس ہاتھ سے گندگی صاف کی گئ ہے اس سے کھانا کھانے کا احتمال نہ رہے اور اس طرح بیماریوں سے محفوظ رہا جا سکے۔ یہاں ہمیں یہ بات اچھی طرح یاد رکھنی چاہئیے کہ آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے جب اسلام کا ظہور ہوا یہ بات معلوم نہ تھی کہ بیماریاں، جراثیم سے ہوتی ہیں اور ان سے بچاءو کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ الٹا ہاتھ اتنا نجس ہوتا  تو خدا انسان کو صرف ایک ہاتھ دیتا اور وہ ہوتا دایاں ہاتھ۔

اگرچہ کہ سائینسی سطح پہ یہ بات پایہء ثبوت کو نہیں پہنچی کہ کیوں انسانوں کی ایک تعداد اپنا بایاں ہاتھ استعمال کرنے کو ترجیح دیتی ہے۔ اس سلسلے میں جینیاتی وراثت سے لیکر ماں کے پیٹ میں بچے کی حالت اور ہارمونز کو بھی ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ الٹے ہاتھ کی جین بھی دریافت کر لی گئ ہے۔ لیکن یہ سب ابھی تک صداقت کی منزل کو نہیں پہنچے۔

  یہ بات واضح ہے کہ انسانی دماغ دو حصوں میں منقسم ہے۔ جیسا کہ نیچے دی گئ تصویر میں ہے۔

 یہ بات بھی طے ہے کہ یہ دونوں حصے جسم میں مختلف اعمال و افعال کو کنٹرول کرتے ہیں۔ دماغ کا الٹا حصہ جن افعال کے ساتھ جڑا ہوا ہے وہ لکھائ، زبان، سائینسی طرز فکر، ریاضی، دلیل ہیں۔ جبکہ دماغ کا دایاں حصہ جذبات کے اظہار، تخلیقی جوہر، فضائ مقامیت، اور ان سب کی مدد سے ایک پوری تصویر کو تشکیل دینے سے وابستہ ہے۔ یہ بات دلچسپی کا باعث ہوگی کہ جسم کے دائیں حصے کو دماغ کا بایاں حصہ اور جسم کے بائیں حصے کو دماغ کا دایاں حصہ کنٹرول کرتا ہے۔

ہم اپنے جس عضو کا استعمال کم کر دیتے ہیں اس سے منسلکہ دماغی حصے کی سرگرمی کو بھی کم کر دیتے ہیں۔ جسم کے تمام اعضاء کو استعمال میں لانا چاہئیے۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو انکی مکمل قوت سے استعمال کریں۔ کبھی غور کریں کہ جب ہر ماہر صحت ہمیں ورزش کی نصیحت کرتا ہے تو اسکا کیا اثر ہمارے اوپر ہوتا ہے؟ اور یہ ورزش چاہے ایروبک ہو یا یوگا یہ کیا کرتی ہے؟ یہ ہمارے تمام اعضاء کا دوران خون بڑھاتی ہے اور ہمارے دماغ کو تمام اعضاء کے بارے میں سرگرم کر دیتی ہے۔ یوں ہم ایک زیادہ صحت مند زندگی کی طرف جاتے ہیں۔

تحقیقدانوں کا یہ کہنا ہے کہ الٹا ہاتھ زیادہ استعمال کرنے والوں کا شرح تناسب دیکھا جائے تو ان میں با صلاحیت افراد کی خاصی تعداد نظر آتی ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ الٹا ہاتھ استعمال کرنے والے زیادہ دماغی صلاحیتوں کے حامل ہوتے ہیں اور زیادہ آئ کیو رکھتے ہیں۔

  اسکے باوجود الٹے ہاتھ کی ترجیح رکھنے والے بے پناہ مسائل کا بھی شکار ہو تے ہیں۔ اس میں سر فہرست انہِں شروع سے سیدھا ہاتھ استعمال کرنے پہ مجبور کرنا۔ یہ صرف ہمارے معاشرے مِں نہیں کیا جاتا بلکہ مغربی معاشرے میں بھی  بیسویں صدی کے آغاز تک بچوں کو الٹے ہاتھ سے لکھنے پہ پٹائ لگانا معمول کی بات تھی۔   تقریباً سات الٹا ہاتھ استعمال کرنے والے

امریکی صدو

ر میں سے ریگن کے بارے میں کہا جاتا ہے الٹے ہاتھ کا رجحان رکھنے کے باوجود انکی تربیت سیدھے ہاتھ کی ، کی گئ تھی۔ اس لئے وہ اپنے دونوں ہاتھ بخوبی استعمال کر لیتے تھے۔

اس لئے تربیت کے پہلے مرحلے پہ اس زبردستی کا شکار ہونے والے کچھ لوگ اس ساری مشق سے نالاں ہو کر اس سے فرار اختیار کر لیتے ہیں یوں یہ بات اور مشہور ہوتی ہے کہ الٹے ہاتھ کو استعمال کرنے والے غبی ہوتے ہیں۔

اسکے علاوہ آجکی دنیا میں کمپیوٹر ہوں، گاڑی ہو یا قینچی انکی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ یہ اکثریت یعنی دائیں ہاتھ کو استعمال کرنے والے کو آسانی دیتے ہیں۔

دنیا کے بہت سارے

مشہور لوگ

  بائیں ہاتھ استعمال کرنے والے ہیں۔

الٹا ہاتھ استعمال کرنے والے باراک اوبامہ اس قوم کے صدر ہیں جو سوال کرتی ہے کہ آخر باقی دنیا کے لوگ ہمیں کیوں ناپسند کرتے ہیں؟

اسامہ بن لادن کے مداحین بھی یہی سوال کرتے ہیں۔ آخر ان دونوں میں الٹا ہاتھ استعمال کرنے کے علاوہ اور کیا قدر مشترک ہے؟

12:28 AM

اسامہ بن لادن, امریکہ, انڈیا, اوبامہ, پاکستان، مسلمان، ہندو, عیسائ

مزید الٹا سیدھا-۱

بنیادی سائینس جس کسی نے بھی پڑھی ہو۔ اسکی نظر سے یہ بات محفوظ نہیں رہ سکتی کہ چاہے یہ مادے کی بنیاد ایٹم جیسے آنکھ سے نظر نہ آنے والے جسم کی کہانی ہو یا کائنات میں موجود کہکشاءووں کی۔ عالم تمام عالم رقص میں ہے اور مطلق سکون کوئ چیز نہیں۔ اسی طرح مزید اس مشاہدے کو آگے بڑھائیں تو دیکھیں گے کہ بظاہر اسپیس میں سمت کا حساس نہ رکھنے کے باجود اسپیس سمت کے قابو میں ہے۔ ہم زمینی سطح پہ مشرق مغرب کی بات کرتے ہیں اور خلاء میں وقت سمت کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ ایٹم کے اندر موجود الیکٹران جوڑے کی شکل میں ہوتے ہیں ان میں سے ایک جس سمت میں گھومتا ہے دوسرا اسکے بالکل بر عکس سمت میں گھومتا ہے۔ اس طرح سے حیران کن طور پہ  دونوں  کی مشترکہ توانائ کم رہتی ہے۔ اور وہ ایک ساتھ رہنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

کیمیاء کی سطح پہ ہم دیکھتے ہیں کہ بالکل ایک ہی جیسے ساخت رکھنے والے مالیکیول بھی ایک دوسرے سے الگ الگ خواص ظاہر کرتے ہیں۔ اسے

کائریلیٹی

کہتے ہیں۔ اس خاصیت کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہ مالیکیول جب فضا میں موجود ہوتے ہیں تو یہ اپنا مقام ایسا رکھتے ہیں کہ ایک دوسرا کا عکس نظر آتے ہیں۔ مگر ان میں وہی فرق ہوتا ہے جو عکس اور حقیقت میں ہوتا ہے۔  عکس کا دایاں ہاتھ حقیقت کے دائیں ہاتھ کے سامنے نہیں ہوتا۔

اوپر دی گئ تصویر میں دیکھیں،

تھیلیڈو مائیڈ کے دونوں مالیکیول

بظاہر بالکل ایک جیسے لگ رہے ہیں۔ مگر یہ ایک جیسے نہیں ہیں بلکہ ایکدوسرے کا عکس ہیں۔ ان میں سے ایک دوا کے طور پہ ساٹھ دہائ میں حاملہ خواتین کے لئے استعمال کیا گیا۔ تاکہ انہیں اس صورت میں آنے والی قے سے آرام ملے۔ لیکن بے شمار بچوں کے جسمانی و ذہنی طور پہ معذور پیدا ہونے کے بعد اندازہ کیا گیا کہ یہ دوا جنین میں جنیاتی خامیاں پیدا کرتی ہے۔یوں اس دوا پہ اس طرح کے استعمال کی پابندی لگا دی گئ۔ اسکا عکسی مالیکیول ایسے کوئ خواص نہیں رکھتا کہ اسے دوا کے طور پہ استعمال کیا جا سکے۔

شاید کچھ لوگوں کو یہ جان کر حیرت ہو کہ ہمارا جسم جن امائنو ایسڈز سے بنا ہوا ہے وہ فضا میں ایک ہی طرح کی مقامیت رکھتے ہیں۔ اور تمام جاندار اس کرہ ء ارض پہ دوسری طرح کے امائنو ایسڈز سے پروٹین نہیں بنا سکتے۔ اسی طرح ہمارا جسم صرف ایک ہی طرح کی مقامیت رکھنے والی شکر کو ہضم کر سکتا ہے۔

اس پہ مزید سوچنے کا کام میں آپ پہ چھوڑتی ہوئ آگے بڑھتی ہوں۔ مقامیت کی یہ مخصوصیت صرف انہی چیزوں کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ یہ جانوروں اور انسانوں میں ایک اور طرح سے بھی عمل کرتی ہے۔

 ہاتھی کے دانت کھانے کے اور اور دکھانے کے اور، یہ تو ایک محاورہ ہے۔ لیکن ہاتھی اپنے دانتوں کے معاملے میں قدرتی طور پہ

یہ انتخاب

رکھتے ہیں کہ دائیں یا بائیں ان میں سے کوئ ایک زیادہ استعمال کریں۔ جو زیادہ قوی دانت ہوتا ہے۔ وہ زیادہ بڑا ہوتا ہے۔

طوطے، پکڑنے کے لئے زیادہ تر اپنا داہنا پنجہ استعمال کرت ہیں۔ برفانی ریچھ شکار کو مارنے کے لئے زیادہ تر بایاں ہاتھ استعمال کرتے ہیں۔

  اور یہاں سے انسانوں کی کہانی شروع ہوتی۔

انسانوں میں اپنے مختلف

جانبی اعضاء کو استعمال

کرنے کا مختلف تناسب پایا جاتا ہے۔ مثلاً اٹھاسی فی صد افراد اپنا سیدھا ہاتھ استعمال کرتے ہیں، اکیاسی فی صد دایاں پاءوں، اکہتر فی صد دائیں آنکھ، انسٹھ فی صد دایاں کان، چوراسی فی صد ایک جیسے ہاتھ پاءوں اور اکسٹھ فی صد ایک جیسے کان اور آنکھ استعمال کرتے ہیں۔

انسانی آبادی کا تقریباً دس فی صد حصہ اپنا الٹا ہاتھ زیادہ استعمال کرنے کا قدرتی رجحان رکھتا ہے اور الٹے ہاتھ سے لکھنے کو ترجیح دیتا ہے۔ کچھ لوگ اپنے دونوں ہاتھ یکساں مہارت سے استعمال کر سکتے ہیں۔ حتی کہ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے دو مختلف زبانیں بیک وقت لکھ سکتے تھے۔

یہاں

ایک صاحب اپنے دونوں ہاتھوں سے دو مختلف تصاویر بنا رہے ہیں۔ باقی کے لوگ قدرتی طور پہ اپنا دایاں ہاتھ زیادہ کام میں لاتے ہیں۔

دنیا کی

زیادہ تر تہذیبوں میں الٹا ہاتھ برے کام سے وابستہ ہے

۔ اور مختلف زبانوں میں جن میں انگریزی جیسی عام مستعمل زبان اور فرنچ جیسی اعلی و ارفع زبان بھی الٹے اور سیدھے ہاتھ کے بارے میں امتیاز کرتی نظر آتی ہیں۔ الٹا ہاتھ استعمال کرنا پھوہڑ پن و بد سلیقگی کی علامت ہے اسے استعمال کرنے والا غبی کہلاتا ہے۔ ۔جب یہی شدت بڑھتی ہے تو الٹا ہاتھ استعمال کرنے والا خبیث الفطرت نظر آنے لگتا ہے۔ اس میں کچھ شیطانی قوتیں حلول کر جاتی ہیں۔ الٹے ہاتھ سے سلام کرنا بے عزتی کا نشان ہے  غیر زبانوں سے ہٹ کر اردو میں بھی محاورہ ہے کہ الٹے ہاتھ سے سلام تو ڈوم کرتے ہیں۔ ڈوم بھنگی کو کہتے ہیں۔

الٹا ہاتھ بے شرمی کی، نا انصافی کی ،جھوٹ اور دغابازی کی علامت ہے، خدا کی طرف سے سزا ہے۔

لیکن دنیا کے کچھ حصوں میں الٹا ہاتھ بالکل الگ معنی رکھتا ہے۔ امریکہ کی قدیم تہذیب 'انکا' میں الٹا ہاتھ روحانیت کی علامت ہے۔ جادو اور شفا کی قوتیں اس ہاتھ سے وابستہ ہیں۔ تنترا بدھءووں میں بھی الٹا ہاتھ عقلمندی کی علامت ہے۔

جاری ہے۔

12:20 AM

America, chirality, Inca, left handers, امریکہ, انکا, بایاں ہاتھ, بدھ مذہب, تنترا, تھیلیڈومائیڈ, دایاں ہاتھ،, کائیریلیٹی

الٹا سیدھا

میری ایک عزیزہ ایک دن صبح صبح ہی تشریف لے آئیں۔ معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کو ہمارے گھر کے نزدیک ایک

مونٹیسوری

میں داخل کرادیا ہے اور چونکہ آج پہلا دن ہے تو وہ اسے چھوڑنے آئ تھیں۔ لگے ہاتھوں ہماری باری بھی آ گئ۔ ناشتے میں انکی گپیں بھی شامل ہو گئیں۔ پوچھا کہ اپنے گھر سے اتنی دور یہاں کیوں داخل کرایا ہے۔ کہنے لگیں۔ کافی لوگوں سے اسکی تعریف سنی تھی کہ اسلامی ماحول رکھتے ہوئے بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ پوچھا، لیجئِے اسلامی جمہوریہ ملک بنانے کے بعد  اب اس میں بھی اسلامی اسکول کی ڈیمانڈ آگئ۔ سوچ لیں، اسکا آغاز تو خوشنما ہے، اسکا انجام اچھا نہیں ہے۔ ویسے اک بات بتائیں موبٹیسوری کی تعلیم اسلامی ہے کہ غیر اسلامی۔ کوئ جواب دئیے  بغیرمسکرا دیں۔

وہ کچھ عرصے پہلے سعودی عرب میں تین مہینے گذار کر آئی تھیں اوروہاں انہیں احساس ہوا کہ وہ ایک بہتر مسلمان نہیں ہیں۔ تو اپنے آپ کو بہتر مسلمان بنانے کے لئے انہوں نے اسکارف  پہننا شروع کیا۔ اور اپنے سب سے چھوٹے چار سالہ بچے کو اسلامی مونٹیسوری میں ڈالنے کا فیصلہ۔

خیر، ہلکی پھلکی باتوں کے ساتھ وہ کچھ دیر رکیں اور چلی گئیں۔ اسکے تین چار مہینے بعد ایک خاندانی تقریب میں ملاقات ہوئ۔ میں نے شکوہ کیا ۔ آپکے بچے کا اسکول ہمارے گھر کے پاس آگیا مگر پھر بھی آپ دوبارہ نہیں آئیں۔ کیسا چل رہا ہے اسکا اسکول۔ کہنے لگیں کہ  کہاں، ہم نے تو اسے ایک مہینے بعد ہٹا لیا۔ وہ کیوں؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ اب انکے پاس ایک کہانی موجود تھی۔

ہوا یوں کہ اس بچے کے ساتھ انکے محلے کا ایک اور بچہ بھی وہاں داخل ہوا تھا۔ اسکول آتے جاتے جب اس بچے کو پندرہ دن ہو گئے تو ایکدن وہ اس دوسرے بچے کے گھر گئیں۔ دیکھا تو وہ بچہ اپنا اسکول ہوم ورک کرنے میں مصروف تھا۔ معلوم ہوا کہ اس بچے کو روزانہ ہوم ورک ملتا ہے۔ انہوں نے سوچا میرے بچے کو تو کوئ ہوم ورک نہیں ملتا اگلے دن اسکے اسکول گئیں۔ اسکول والوں نے کہا کہ آپکے بچے کو تو ہم ابھی

پینسل پکڑنا سکھا

رہے ہیں ابھی تو اسے پینسل پکڑنا ہی نہیں آتی۔ انہوں نے کہا ، نہیں تو وہ تو اچھا خاصہ لکھ لیتا ہے۔ جواب ملا نہیں، وہ تو پینسل بھی ٹھیک سے نہیں پکڑتا۔ اب انہوں نے دل میں سوچا کہ ہو سکتا ہے ابھی اسکول کے ماحول سے شناسا نہ ہوا ہو اور ہچکچاتا ہو۔ زیادہ اصرار کرنے پہ ایسا نہ ہو کہ بچہ سب کے سامنے سبکی کرادے۔ واپس آگئیں۔

اسی طرح مزید پندرہ دن گذر گئے۔ پھر جی کڑا کر کے  اسکول گئیں۔ وہی جواب ملا، ابھی تو اسے پینسل پکڑنا ہی نہیں آتی۔ ماں تھیں۔ اس دن اپنے بچے کے اس احساس محرومی سے شدید دلبرداشتہ تھیں کہ اسے ہوم ورک نہیں ملتا۔  کہنے لگیں بلائیے ذرا میرے بیٹے کو اور میرے سامنے لکھوائیے۔ گھر پہ تو آرام سے لکھتا ہے آپ کہتی ہیں اسے لکھنا تو الگ پینسل پکڑنا  نہیں آتی۔ بچے کو بلایا گیا۔ اسکے ہاتھ میں پینسل کاغذ دیا گیا۔ ماں نے چمکارا بیٹا الف ب لکھ کر دکھاءو۔ اس نے پینسل پکڑی اور الف ب لکھنا شروع کر دیا۔

اب عزیزہ کا اعتماد بحال ہوا تو پرنسپل کے کمرے میں موجود ٹیچر کو شعلہ برساتی نظروں سے دیکھا کہ دیکھ لیں پینسل بھی پکڑی ہوئ ہے اور لکھ بھی رہا ہے۔ جواب ملا۔ یہ تو

الٹے ہاتھ

سے لکھ رہا ہے۔ آپ نے اپنے بچے کو یہ نہیں سکھایا کہ اسے سیدھے ہاتھ سے لکھنا چاہئیے۔ الٹا ہاتھ استعمال کرنا غیر اسلامی ہے۔

بس اسکے اگلے دن سے انہوں نے اسے وہاں نہیں بھیجا۔

باز آئے ایسی محبت سے

اٹھا لو پاندان اپنا

یہاں اس شعر میں پاندان کی جگہ کامران کر دیجئیے کہ یہی اس بچے کا نام ہے۔

10:34 PM

Monressori school, اسکول, اسلامی, پینسل, کراچی, لکھائ, مونٹیسوری

آئیے بچوں کو لکھنا سکھائیں

بچوں کو لکھنا کیسے سکھائیں۔ یہاں میری مراد دستی تحریر سے ہے۔ فکشن، کالم یا علمی تحریر لکھنے سے مراد نہیں۔ اسکا ایک ہی مجرب مگر مشکل نسخہ ہے اور وہ یہ کہ خوب پڑھیں اور مختلف النوع چیزیں پڑھیں۔ پھر خوب لکھیں، اس موضوع کے حق میں بھی اور خلاف میں بھی۔ اپنے نظریات کے حق میں بھی اور خلاف میں بھی۔

چھوٹے بچوں کو لکھائ سکھانا ایک مشکل امر ہے۔ اور مقابلے کے اس دور میں جب آپکے اندر جتنی صلاحیتیں ہوں کم ہے۔ والدین اپنے بچوں کی بہت سی مشکلوں کو اپنی سوجھ بوجھ سے آسان کر سکتے ہیں۔

جب آپکے بچے ڈیڑھ دو سال کی عمر میں داخل ہوتے ہیں تو انہیں کھیلنے کے لئے ایسی چیزیں دیں جس میں ہاتھ کا پنجہ اور انگلیاں استعمال ہوتی ہوں۔ اس سے انہیں اندازہ ہوگا کہ وہ اپنی انگلیوں کو کتنی سمت میں گھما سکتے ہیں اور انکی چیزوں پہ گرفت بڑھتی ہے،  انکے ہاتھ کے عضلات مضبوط ہونگے۔ لیکن اتنے چھوٹے بچوں کے ساتھ کام کرتے ہوئے ہمیشہ خیال رکھنا چاہئیے کہ اس عمر کے بچے زیادہ دیر ایک شے پہ اپنا دھیان نہیں رکھ سکتے اس لئے وہ اگر اس میں دلچسپی لینا چھوڑ دیں تو انہیں مجبور نہ کریں۔ کچھ وقفے سے جو کچھ گھنٹوں سے چند دنوں تک ہو سکتا ہے پھر سے تیاری پکڑیں۔

عام طور پہ دوسال سے اوپر کے بچے پینسل پکڑنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ انہیں رنگوں کی مومی پینسلیں لے دیں۔ خیال رکھیں کہ ڈبے پہ اسکے زہریلے نہ ہونے کے متعلق لکھا ہو۔ جب آپ ان سے ان پینسلوں کے ذریعے کام کرائیں تو انکے ساتھ موجود رہیں۔ مبادا وہ انہیں کھالیں۔ چاہے یہ زہریلے نہ بھی ہوں تب بھی انکا کھانا درست نہیں ہے۔ انہیں اپنی مرضی سے لائینیں لگانے دیں۔ چاہیں تو خود کر کے بتاتے رہیں کہ یہ ایک دائرہ ہے اور یہ ایک سیدھی لائن اور یہ ایک تکون ہے اور یہ ایک چوکور۔ دلچسپی کے لئے ان ساختوں میں آنکھ ناک بنادیں، انہیں کوئ نام دے دیں۔ یا رنگ بھر دیں۔

اب جبکہ وہ ان مومی پینسلوں سے کاغذ پہ آڑھی ترچھی لائینیں بنانے لگیں ہیں تو آپ یہ کر سکتے ہیں کہ ایک ٹرے میں کچھ ریت یا اگر وہ میسر نہ ہو تو خشک آٹا پھیلادیں اور اس پہ انگلی کی مدد سے دائرہ اور سیدھی لائینز بنانے کی مشق کرائیں۔ مٹائیے پھر بنائیے۔ یہ ذہن میں رہنا چاہئیے کہ دائرے اور سیدھی لائینیں ہی تحریر کی طرف پہلا قدم ہیں۔

کچھ دنوں میں ہی وہ بآسانی یہ پینسل پکڑنے لگے تو اب مومی پینسلوں کے ساتھ رنگ کی وہ پینسلیں استعمال کرائیں جو لکڑی سے بنی ہوتی ہیں۔ خیال رکھیں کہ دوران مشق آپ انکے ساتھ موجود رہیں اور جب کام ختم ہو تو ان سے یہ سامان لیکرانکی پہنچ سے دور رکھ دیں۔

چند دن دیجئیے جب وہ ان پینسلوں کو بھی پکڑنے لگیں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ وہ پینسل کو اتنا دباءو دے کر نہیں لکھتے۔ تو اب تربیت کے اگلے مرحلے پہ چلتے ہیں۔ آپکے گھر میں ایسے کھلونے یا چھوٹے چھوٹے برتن ہونگے یا پھر اسٹیشنری کی دوکان سے ایسی چیزیں بآسانی مل جائیں گی کہ انکے گرد پینسل گھما کر ڈیزائن بنایا جا سکے یا انکے اندر سطح کے ساتھ پینسل سے نشان لگایا جا سکے۔ اور کچھ نہیں تو انکے ہاتھوں اور پیروں کے گرد پینسل سے نشان لگا کر ڈیزائین بنایا جا سکتا ہے۔ پینسل انکے ہاتھ میں دیکر یہ کام کروائیں۔ خیال رکھیں کہ یہ ساختیں مختلف شکل کی ہوں۔ یعنی گول، چوکور، مستطیل، تکونی، اس طرح انکا ہاتھ مختلف زاویوں پہ گھومے گا۔ بناتے وقت ان ساختوں کے نام بھی لیتے رہیں کچھ دنوں میں وہ اسکے ماہر ہو جائیں گے۔ اور اس سے انکی انگلیاں اور کلائیاں مضبوط ہونگیں اور وہ پپینسل پہ زیادہ دباءو ڈالنے کے قابل ہو جائیں گے۔

آرام سے اور شانت رہئیے۔ اور ہر کام کو جلدی کرنے کے چکر میں اپنے بچے پہ غیر ضروری دباءو نہ ڈالیں ورنہ وہ اس سے بے زار ہو جائے گا۔ اپنے ان سیشنز کا وقت مقرر کریں اور کوشش کر کے روزانہ اسی وقت کریں۔ اس طرح آپکے بچے کو اسکا انتظار رہے گا۔ بچے رنگوں کو پسند کرتے ہیں اانہیں حق انتخاب دیں کہ وہ آج کس رنگ کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

 اوپر والی تصویر جو ساختیں دی ہیں انکی مشق کروائیں۔ پہلی دفعہ نکتہ دار ساختیں استعمال کر سکتے ہیں مگر بچے کو انکی عادت نہ ڈالیں۔ ورنہ اس میں خود سے لکھنے کا اعتماد دیر سے پیدا ہوگا۔ میں نے ایک آسان سا طریقہ اور نکالا ہے۔ ایک میز پہ شیشہ بچھا دیا ہے جس سے آرپار دیکھا جا سکتا ہے۔ اسکے نیچے مختلف حروف اور نمبر کے پرنٹ نکال کر لگا دئیے ہیں اور اس طرح شیشے کے اوپر سے وائٹ بورڈ مارکر یا ایسے مارکر جو پانی سے صاف ہوجاتے ہیں ان پہ لکھنے سے تحریر میں روانی پیدا ہوتی ہے۔ آپ کے لئے آسانی ہو تو آپ بھی یہ کر سکتے ہیں۔ اگر گھر میں شیشہ نہیں ہے تو ایک چھوٹا سا شیشے کا ٹکڑا لیکر کہیں بھی لگا لیں۔ اور ایک لمبے عرصے تک چلنے والی سلیٹ تیار ہے۔

مونٹیسوری تربیت میں پہلے لوئر کیس کے یعنی انگریزی کے اسمال لیٹرز پہلے سکھائے جاتے ہیں اور اپر کیس یعنی کیپیٹل لیٹرز بعد میں۔ درج ذیل تصویروں میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ان حروف کو بنانے میں انکے گھماءو کے لئے تیر کے نشان دکھائے گئے ہیں انہیں یاد کر لیجئیے۔ آپ دیکھیں گے زیادہ تر گولائیاں کو ضد گھڑی وار طریقے سے بنایا گیا ہے۔ اردو حروف کو بناتے ہوئے یہ عمل عام طور پہ الٹا ہو جاتا ہے اور زیادہ تر گولائیاں گھڑی وار طریقے سے بنائ جاتی ہیں۔ تمام سیدھی لائنیں اوپر سے نیچے کی طرف بنائ جاتی ہیں۔  یہ اصول بچوں کو تحریر کے راز سمجھنے میں آسانی دیتے ہیں اور تھوڑی مشق سے خود سے چیزیں کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ شروع میں انہیں انہی آصولوں کا پابند بنائیے تاکہ وہ بنیادی تحریر سیکھ لیں۔ اس مرحلے پہ انہیں لائینوں والی کاپی استعمال کروائیں تاکہ حرف کا سائز انکے ذہن میں پختہ ہو۔ ہر حرف کو لکھتے وقت اسکا نام لیں تاکہ وہ اسے پہچان لیں۔

 بچے جب بنیادی تحریر سیکھ لیتے ہیں تو آپ انکو تحریر کو مزید خوبصرت کرنے کے لئے خوشخطی کی مشقیں کروا سکتے ہیں۔ جیسے انگریزی حروف کو لکھنے کے لئیے ایک طریقہ کرسو تحریر کا کہلاتا ہے اس میں حروف نیچے دی گئ تصویر کی طرح لکھے جاتے ہیں۔

 اردو میں بھی خوشخطی کے مختلف قاعدے دستیاب ہیں۔ جو اگر ممکن ہوا تو ہم بعد میں اسکین کرکے  ڈال پائیں۔ سر دست وہ میسر نہیں ہیں۔

آخیر میں یہ کہ اپنے بچوں کے سیکھنے کے عمل کو دلچسپ بنائیے، اور انکے اوپر بوجھ نہ بنائیں۔ زندگی کو ایک دفعہ پھر ایک بچے کی حیثیت سے انکے ساتھ گذاریں۔ یہ آپکی تخلیقی صلاحیتوں کو آب حیات دے گا۔

انگلش حروف کے لئے

یہ ویڈیو

بھی حاضر ہیں۔

مزید معلومات کے لئے

اس لنک

پہ جائیں۔

12:17 PM

Hand writing, اردو تحریر, انگلش تحریر, بچوں, بچے, لکھائی

میرے بلاگ کو کیا ہوا ہے؟

میرے بلاگ کی نئ پوسٹ نہ اردو سیارہ پہ آرہی ہے، نہ اردو بلاگز پہ اور نہ فیس بک سے نیٹ ورک کے ذریعے فیڈنگ ہو رہی ہے۔ آخر ایسا کیا ہوا ہے بھئ؟

9:16 PM

اردو بلاگز, بلاگ

وبائے مرگ اور محبت

انگریزی بلاگز پہ کہیں زیادہ خون گرما دینے والی تحاریر آتی ہیں، لوگ اس میں دلچسپی لیتے ہیں اور میں اپنے دندان ساز ڈاکٹر کے بلاگ پہ دیکھتی ہوں کہ ایک پوسٹ پہ تین سو سے بھی زائد تبصرے ہوئے ہیں۔ مگر رشک آتا ہے انگریزی زبان کے صحت افزاء اثر پہ کہ کسی کو فشار خون لا حق نہیں ہوتا۔  مگر ہمارے اردو بلاگرز کا نظام ہاضمہ بس مخصوص چیزوں کو ہی ہضم کر پاتا ہے اور یوں عالم یہ ہوتا ہے کہ نمکدان قریب ہو تو اس سے بھی فشار خون بلند ہو جاتا ہے۔  یہاں تو اگر غالب کی وہ غزل جو نمک کے قافئیے پہ ہے اسی کو ڈالدیں تو کچھ لوگوں کےدنیا سدھار جانے کا پروگرام  فی الفور بن جائے گا اور الزام 'کسی اردو بلاگر' کے سر آئے گا۔

ویسے اگر بلاگرانہ ہم آہنگی صرف اسی صورت میں قائم رہ سکتی ہے کہ اپنے اپنے کینے دل میں پال کے رکھیں اور مصنوعی مسکراہٹوں ، رسمی خیر سگالی کے جملوں کا وقتآ فوقتآ تبادلہ ہوتا رہے۔ لوگ باگ اپنے بچوں کی خوبصورت تصاویر لگاتے رہیں، کچھ اشتہا انگیز کھانوں کی تصاویر آتی رہیں، کچھ سینیئر بلاگرز کا چاہے وہ کچھ بھی لکھیں ،احترام کیا جاتا رہے، کچھ جونیئر بلاگرز، عمر میں جونیئر کا لاڈ اٹھایا جاتا رہے، کچھ لوگوں کی باتوں پہ جزاک اللہ اور کچھ کی باتوں پہ سبحان اللہ ہوتا رہے، کچھ لوگ ایکدوسرے کو زبردست تحاریر پہ مبارکباد دیتے رہیں وہ جو انکے نظریات سے ملتی ہیں، کچھ اپنے تئیں منٹو اور عصمت چغتائ بننے والے، بالغوں کو نا بالغ بناتے رہیں اور خوش رہیں۔ تو بہتر ہے کہ انسان کچھ ڈائجسٹ پڑھکر دل بہلائے مثلآ خواتین ڈائجسٹ اور اس پہ وقتاً فوقتاً سسپنس یا جاسوسی ڈائجسٹ کا چھینٹا مارتا رہے اور ان سب کو پڑھنے سے پہلے برکت کے لئے روحانی ڈائجسٹ پڑھا کرے۔

اس میں یہ تمام ملغوبہ اس توازن سے ہوتا ہے کہ جن گھروں میں پڑھا جاتا ہے وہاں کسی کو بلاگنگ جیسی فضولیات میں وقت ضائع کرنے کا خیال نہیں آتا علاوہ ازیں گھروں کے اندر ہم آہنگی کی ایک آِئڈیئل فضا جنم لیتی ہے جس سے  ڈائیجسٹ والوں کے روزگار پھلنے پھولنے کے مواقع بڑھتے رہتے ہیں۔ اسکے لئے کمپیوٹر کی بھی ضرورت نہیں ہوتی اور انسان ان پہ پیسے صرف نہ کرنا چاہیں تو محض پڑوسیوں سے اچھے تعلقات پہ ہی کام چل جاتا، اس صورت میں نمک مانگنے کے بجائے یہ کہنا ہوگا کہ خالہ جی بلکہ آنٹی جی، آپ نے اپنا ڈائجسٹ ختم کر لیا تو ہمیں دے دیں۔ مجھے اس میں سے نہاری کی  ترکیب آزمانی ہے۔

نہاری ہم آہنگی پیدا کرنے کا ایک آزمودہ نسخہ ہے۔ اب یہاں ایک ایک سیدھا سادہ سا سوال پیدا ہوتا ہے کہ نہاری سے کیسے بلاگرانہ ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی ہے۔ میں تمام اردو بلاگرز کو اس سلسلے میں ٹیگ کرتی ہوں کہ نہاری، اسکی مختلف تراکیب، طریقہ ء استعمال، کھانے کے آداب، لوگوں کو اسکی دعوت پہ بلانے کے آداب، گھر میں ایک اس طرح کی دعوت منعقد کرنے کے سو طرائق اور نہاری پیش کرنے کے سلیقہ مند طریقوں کو بیان کریں۔

خبردار کسی نے گوشت کی بڑھتی ہوئ قیمتوں، لوگوں کے کھانا نہ ملنے کی وجہ سے خودکشی کرنے کے واقعات کا تذکرہ، مختلف لسانی اکائیوں کے اس بارے میں وہم اور خیالات، کھونٹوں کی گئیوں، کولہو کے بیل اور گلی کے گدھوں کا تذکرہ کیا۔ اس سے ہم آہنگی جیسے عظیم مقصد کو ٹھیس پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ جو صرف اسی صورت میں برقرار رہ سکتا ہے کہ ہم کوہ قاف کی کہانیاں دوہراتے رہیں۔

میں زیادہ گھمبیر مسئلے کی طرف آتی ہوں کہ اس سے ہم آہنگی بھی برقرار رہے اور سب لوگ اس میں شامل رہیں۔ مسئلہ ہے، آج کیا پکائیں، حالانکہ پچھلے دو دن سے میں ایک احساس جرم میں مبتلا ہوں کہ یہ کیسے ہوتا ہے کہ ایک خاندان کے پانچ لوگ مفلسی کی وجہ سے خدا کے بنائے ہوئے قانون کو توڑتے ہیں اور اپنی زندگی ختم کر لیتے ہیں اور ہم یہ سوچتے ہیں کہ آج کیا پکائیں۔ مگر ان تمام باتوں پہ گفتگو ہمیشہ ایسے نکات کی طرف مڑے گی جہاں سے ہم آہنگی کے نازک بت کو ضرر پہنچ سکتا ہے۔ میں اسی مجرمانہ احساس کے ساتھ نہاری کی ترکیب کو ذہن میں دوہراتی ہوں۔

اسکے لئے چاہئیے ہوگا ایک کلو گوشت بونگ کا، کچھ مصالحے اور آپکے کچن کو ایسی جگہ ہونا چاہئیے جہاں سے بھننے والے گوشت اور حلووں کی خوشبو ان لوگوں تک نہ پہنچے جو زہر کی گولیاں ہاتھ میں لئے بیٹھے ہیں۔

ویسے برسبیل تذکرہ کسی نے

گارسیا

کی  کتاب

وبائے مرگ میں محبت

پڑھی ہے۔

11:18 AM

اردو بلاگرز, انگریزی بلاگرز, خواتین ڈائجسٹ, سسپنس ڈائجسٹ, گبریل گارسیا مارکیز

تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

یہ تحریر نیٹ پہ  سفر کرتے ہوئے میرے پاس  آگئی۔ آپکی توجہ کے لئے حاضر ہے۔

11:42 AM

پاکستان, ترجمان القرآن, قیام پاکستان, مساوات, مولانا مودودی

دھندہ

یہ کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے۔ میں یونیورسٹی سے واپس آرہی تھی۔ منی بس نیپا کے بس اسٹاپ پہ رکی تو ایک عورت چڑھی۔ لمبے قد اور اچھی جسامت کی چالیس سال سے اوپر کی یہ عورت ایک معقول گھرانے کی لگ رہی تھی۔ اچھی تراش کے کپڑے پہنے ہوئ اور اس پہ کشیدہ کی ہوئ چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ اسکا چہرہ لگ رہا تھا کہ کسی پارلر کی توجہ لیتا رہتا ہے کہ بھنویں تھریڈنگ کے ذریعے بنی ہوئیں، بال مناسب انداز میں سدھارے ہوئے، ہاتھ اور پیروں کے ناخنوں پہ باسی ہوتی ہوئ نیل پالش ۔ پھر اس نے ایک عجیب حرکت کی کہ اچانک  مانگنا شروع کر دیا۔ میرا شوہر خاصہ بیمار ہے، اسکے علاج کے لئے پیسے چاہئیں، اور پھر ایک  ہمدردی حاصل کرنے والی تقریر۔ خواتین نے تو اسکو زیادہ لفٹ نہ دی اور وہ اس گیٹ کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئ جو مردانے کی طرف کھلتا ہے۔ وہاں سے اسے کچھ خیرات ملی۔

آئیندہ چار پانچ بس اسٹاپ تک وہ اس میں اسی طرح موجودرہی۔ پھر وہ اکثر اس وقت نظر آنے لگی اسی طرح مردوں کے حصے کی طرف منہ کئے اور انکے گیٹ سے لگی۔ میں نے سوچا یہ عورت یقیناً بھیک کے پردے میں جسم فروشی کا دھندہ کرتی ہے۔ ورنہ ایسے حلئیے میں کیوں بھیک مانگتی ہے۔ ایکدن ایک ماسی نے اسے ڈانٹ بھی دیا۔' مجھے دیکھو تم سے کمزور ہوں پر سارادن بنگلوں میں صفائ کا کام کر کے حلال کی روزی کماتی ہوں۔ تم اتنی اچھی ہٹی کٹی عورت ہو بھیک مانگتے شرم نہیں آتی'۔

اسے شرم نہیں آتی تھی کیونکہ اسکے بعد بھی میں نے اسے یہی کرتے دیکھا۔ پھر میرا راستہ تبدیل ہو گیا۔

رمضان میں، میں نے دیکھا، اچھی خاصی لڑکیاں جن کی عمریں سترہ اٹھارہ سال سے لیکر زیادہ سے زیادہ تیس سال تک ہونگیں، بازاروں میں نظر آتیں۔ سر سے پیر تک اسمارٹ، رائج الفیشن برقعوں میں ملبوس، چہرے پہ حجاب کیا ہوا۔ ساتھ میں ایک اور خاتون۔  بھیک مانگنا اور وہ بھی بالخصوص مردوں سے انکے کندھےپہ اپنا نازک سا ہاتھ مارکر۔ میں نےسوچا یہ بھی شاید گاہک پکڑنے کا ایک طریقہ ہے۔

ابھی کچھ دنوں پہلے میں

میکرو

کے پارکنگ ایریا میں رابعہ اور مشعل کے ساتھ موجود تھی۔ ہم تینوں خریدے گئے سامان کی ٹرالی میں سے سامان نکال کر ڈگی میں رکھنے میں مصروف تھے۔ میں سامان رکھنے سے زیادہ ان دونوں میں تصفیہ کرارہی تھی کہ کون ، کون سا سامان رکھے گا۔ اور ادھر مشعل ہر تھوڑی دیر بعد شور مچاتی کہ اسکی خدمات سے صحیح سے فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے۔

میکرو

ایک ہول سیل کا سپر اسٹور ہے۔ یہاں آرام یہ ہے کہ بچوں کے ساتھ ائیر کنڈیشنڈ ماحول میں آرام سے خریداری کر لیں۔ لیکن سامان رکھنے کے لئے پلاسٹک کے تھیلے خریدنے ہوتے ہیں۔ میں دنیا میں پلاسٹک کی آلودگی اپنے تئیں بڑھانے کی کوشش نہیں کرتی البتہ کچھ تھیلے ڈگی میں رکھتی ہوں تاکہ بار بار کام آتے رہیں۔ اس لئے نہیں خریدے۔

اب ڈگی میں یہ سب سامان صحیح سے رکھنا تھا۔ اچانک مجھے پیچھے سے آواز آئ۔ میڈم۔ دیکھا تو ایک چھبیس ستائیس سال کے صاحب کھڑے تھے۔ کریز لگی ہوئ ٹرائوژرز اور ڈریس شرٹ پہنے ہوئے۔ پالش سے چمکتے ہوئے جوتے اور سر کے بال جیل لگا کر جمائے ہوئے۔ میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ کہنے لگا 'ماں بیمار ہیں، میں نوکری کرتا ہوں مگر پورا نہیں پڑتا۔ ماں کے علاج کے لئے پیسے چاہئیں۔ میں بھیک نہیں مانگتا۔ یہ نوٹ بک بیچ رہا ہوں آپ خرید لیں' میں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ 'ٹیوشن کیوں نہیں پڑھاتے'۔ جی میں ایک نوکری کرتا ہوں۔ کچھ وقت ماں کو بھی دینا ہوتا ہے'۔ اچھا میں نے اسکے ہاتھ میں موجود نوٹ بک کی طرف دیکھا۔ کتنے کی ہے یہ۔ کہنے لگا سو روپے کی۔ پہلے حیرانی سے میرا منہ کھلا پھر الفاظ نکلے۔ یہ تو زیادہ سے زیادہ دس، پندرہ روپے کی ہوگی۔ اس پہ اس نے انتہائ رسان اورکچھ مسکراہٹ سے کہا میں نے آپکو بتایا تو ہے کہ مجھے ماں کے علاج کے لئے پیسے چاہئیں۔ اس لئے ان نوٹ بکس کی قیمت تھوڑی زیادہ ہے۔

دیکھیں جناب، میں نے ان سے کہا۔ آپ یہ فیصلہ کریں کہ آپ بھیک مانگ رہے ہیں یا محنت کے پیسے چاہتے ہیں۔  میں آپکو اسکے زیادہ سے زیادہ پچیس روپے دے سکتی ہوں اس سے زیادہ حاصل کرنے کے لئے آپ کوئ ڈھنگ کا کام کریں۔ اتنی دیر میں مشعل بور ہو چکی تھی۔ اور اس نے شور مچا دیا کہ رابعہ اسے سامان نہیں رکھنے دے رہی جبکہ یہ اسکی باری ہے۔ میں پھر ٹرالی خالی کرنے لگی۔ اس نے پھر آواز دی میڈم، آپ یہ لے رہی ہیں۔ ارے میں نے بتا تو دیا کہ میں آپکو اسکی کیا قیمت دونگی۔ آپکو دینی ہے تو مزید بات کریں۔ وہ ان آٹھ دس نوٹ بکس کو بغل میں دبا کر، پھر وہیں ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ گاڑی کی ڈگی بند ہوئ۔ میں نے گاڑی پارکنگ سے نکالی۔ وہ وہیں کھڑا ہوا تھا۔

اب سوچتی ہوں خواتین کو تو دھندے والی سوچ لیا تھا۔ اس ہٹے کٹے، بھلی شکل اور ہیئت کے شخص کو کس کھاتے میں ڈالوں۔

9:02 AM

makro, جسم فروشی, کراچی، کراچی یونیورسٹی, گداگری, میکرو, نیپا

پیریاڈک ٹیبل، ترتیب اور خصوصیات-۲

گذشتہ سے پیوستہ

گروپ میں رجحانات؛

ایک گروپ کے تمام ارکان ویلینس شیل یعنی سب سے آخری والے شیل میں ایک جیسے الیکٹرون رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے انکی خصوصیات ملتی جلتی ہوتی ہیں۔ تمام ارکان اسی حساب سے اپنے ایٹمی قطر یا ریڈیئس، آئونازیشن انرجی اور الیکٹرو نیگیٹیویٹی یا برقی منفیت میں تبدیلی دکھاتے ہیں۔کسی گروپ میں اوپر سے نیچے آتے ہوئے ایٹمی نمبر بڑھتا ہے یعنی الیکٹرون کی تعداد بڑھتی ہے انہیں زیادہ مدار یا شیل چاہئیے ہوتے ہیں، وہ نیوکلیئس سے دور ہوتے جاتے ہیں اور یوں عناصر کے ایٹموں کا سائز بڑھتا ہے۔

 زیادہ دور ہونے کی وجہ سے نیوکلیئس کا الیکٹرون پہ اثر کم ہو جاتا ہے وہ انہیں اپنے ساتھ مضبوطی سے باندھ کر نہیں رکھ سکتا یوں اس ایٹم کو آئن بنانے کے لئے سب سے باہر والے الیکٹرون یعنی ویلینس الیکٹرون کو اس ایٹم پہ  سے ہٹانے کے لئے کم توانائ خرچ کرنا پڑتی ہے یعنی  کم آئیونائزیشن انرجی۔ اوپر سے نیچے جاتے ہوئے چونکہ الیکٹرون مرکزے سے دور ہوتے جاتے ہیں اس لئے انکی برقی منفیت بھی کم ہو جاتی ہے۔

پیریڈ میں رجحانات؛

ہر پیریڈ الکلی دھات سے شروع ہوتا ہے اور نوبل گیس پہ ختم ہوتا ہے. اس میں جو رجحانات نظر آتے ہیں وہ ایٹمی قطر ریڈیئس، آئیونائزیشن انرجی، اور برقی منفیت شامل ہیں۔ الکلی دھاتوں کی طرف سے جیس جیسے ایک پیریڈ میں آگے بڑھیں یعنی نوبل گیس کی طرف جائیں تو ایٹمی قطر کم ہوتا جاتا ہے۔ الیکٹرون مرکز کے قریب آجاتے ہیں اور مرکزے کا اثر بڑھتا جاتا ہے جسکے نتیجے میں الیکٹرون کو اس ایٹم پر سے ہٹانے کی توانائ یعنی آئیونازیشن انرجی بڑھتی جاتی ہے۔ جتنا مضبوطی سے الیکٹرون  جڑے ہونگے آئیونازیشن انرجی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ایٹم کی برقی منفیت بھی بڑھ جاتی ہے۔ یعنی بانڈ بنانے کی صورت میں وہ دوسرے ایٹم کے الیکٹرونز کو بھی اپنی طرف کھینچ کر رکھے گا۔

جدید پیریاڈک ٹیبل کے علاوہ بھی عناصر کو مختلف ٹیبلز میں ترتیب دیا گیا ہے۔ اگر آپ اس میں دلچسپی رکھتے ہیں تو ضرور

اس لنک

پہ جائے۔ یہاں اس حوالے سے ایک خزانہ موجود ہے۔

اب آپ تھک گئے ہونگے تو آپکے لئے موسیقی کا بندو بست ہے مگر خیال رہے یہ پوسٹ پیریاڈک ٹیبل سے متعلق ہے۔ آئیے سنتے ہیں۔

کیمیائ موسیقی

اور اگر اپنے بچے کو کیمیاء پڑھانے سے دلچسپی پیدا ہو گئ ہے تو اسے یہ والاگانا سنائیے۔ یاد کر لے تو دنیا کی مشہور کیمیاء سے متعلق اداروں کے خواب دکھانا شروع کر دیں۔

بچوں کے لئے

حوالہ

10:46 AM

Periodic table, آئیونایزیشن انرجی, ایٹمی قطر, برقی منفیت, پیریاڈک ٹیبل، دوری جدول

پیریاڈک ٹیبل، ترتیب اور خصوصیات

گذشتہ سے پیوستہ

اب تک یہ بات تو سمجھ میں آگئ ہوگی کہ جدید پیریاڈک ٹیبل میں عناصر اپنے ایٹمی نمبر کے لحاظ سے ترتیب دئیے گئے ہیں۔  ایٹمی نمبر اس عنصر میں موجود الیکٹرونز یا پروٹونز کی تعداد ظاہر کرتا ہے۔ اسکی وجہ سے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ آپ ایک نظر ٹیبل پہ ڈالیں اور کسی عنصر کے مقام سے اندازہ کر لیں کہ اسکے ممکنہ کیمیائ خواص کیا ہونگے۔ اس طرح سے نئے دریافت ہونے والے عناصر کی خصوصیات کی بھی پیشنگوئ کی جا سکتی ہے۔

جدید پیریاڈک ٹیبل میں اب تک یعنی سن  دو ہزار دس تک دریافت ہونے والے ایک سو اٹھارہ عناصر موجود ہیں۔ ان میں سے چورانوےعناصر قدرتی طور پہ پائے گئے جبکہ باقی عناصرتجربہ گاہ میں

پارٹیکل ایکسیلیریٹر

میں تیار کئے گئے ہیں۔  اس طرح سے یہ ممکن ہے کہ مزید مصنوعی عناصر تیار کے جا سکیں مگر ان میں سے قابل حصول وہی ہونگے جن کی نصف زندگی زیادہ ہوگی۔ کم نصف زندگی رکھنے والے پیدائش کے فوراً بعد ہی ختم ہوجائیں گے۔ ٹیبل میں آپکو کچھ عناصر نظر آئیں گے جنکے نام یو این سے شروع ہو رہے ہیں ۔ ان عناصر کے مناسب نام ابھی تک نہیں رکھے گئے اور انہیں

ناموں کے ایک عارضی طریقے

کے مطابق نام دئیے گئے ہیں۔ اس پہ ہم پھر کبھی بات کریں گے۔

یہ ہے ایک سادہ  جدید پیریاڈک ٹیبل کی تصویر۔

 اس سادہ سے پیریاڈک ٹیبل میں ہر خانے میں ایک عنصر کو ظاہر کرنے والی علامت، اسکا ایٹمی نمبر اور ایٹمی کمیت دئیے ہوئے ہیں۔ ٹیبل میں مختلف رنگ نظر آرہے ہیں جو کہ مختلف اقسام کے عناصر کو ظاہر کر رہے ہیں۔ ان رنگوں کی چابی یا کی ٹیبل کے اوپر موجود ہے اس ٹیبل میں نیلا رنگ ٹرانزیشن عناصر کو،  ہلکا آسمانی دھاتوں کو گلابی غیر دھاتوں کو، جامنی دھات نما اورنج نوبل گیسوں کو اور ہرا اندرونی ٹرانزیشن عناصر کو ظاہر کر رہا ہے۔ یہ رنگ مختلف ٹیبلز میں مختلف ہو سکتے ہیں۔ بعض ٹیبلز میں الیکٹرونی تشکیل یعنی مختلف ایٹموں کی کسی ایٹم کے مداروں میں الیکٹرونز کی ترتیب بھی دی گئ ہوتی ہے۔ اسی

الیکٹرونی تشکیل

کی وجہ سے مختلف عناصر اپنی کیمیائ خواص میں ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ در حقیقت، آخری یا

ویلینس شیل

میں موجود

ویلینس الیکٹرونز

اس سلسلے میں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔اسکے لئے نیچے والی تصویر دیکھئیے۔

ایک زیادہ بہتر ٹیبل کے لئے

اس لنک

پہ جائیے۔

اس لنک

والے ٹیبل سے آپکو پتہ چلے گا کہ ٹیبل میں جو عمودی قطاریں نظر آرہی ہیں وہ

گروپ

کہلاتے ہیں انکی تعداد اٹھارہ ، جبکہ افقی قطاریں پیریڈز کہلاتی ہیں جو کہ سات ہیں۔

سب سے آخری شیل کی اہمیت کی وجہ سے ٹیبل کے مختلف حصے بلاک بھی کہلاتے ہیں۔ انکے نام اس سب شیل کے حساب سے ہوتے ہیں جن میں سب سے آخری الیکٹرون موجود ہوتا ہے۔ ایس بلاک میں شروع کے دو گروپ آتے ہیں جو

الکلی دھاتیں

اور

الکلی ارتھ دھاتیں

کہلاتی ہیں اسے ایس بلاک کہتے ہیں۔ اسی میں ہائڈروجن اور ہیلیئم بھی شامل ہیں۔ پی بلاک میں آخیر کے چھ گروپس آتے ہیں۔ یعنی گروپ تیرہ سے اٹھارہ۔  اسی میں تمام نیم دھاتیں  اور

نوبل گیسیں

بھی شامل ہیں۔ ڈی بلاک میں تیسرے سے لے کر بارہویں گروپ تک کے ارکان شامل ہیں اور یہ سب

ٹرانزیشن دھاتیں

ہیں۔ یعنی وہ جنکی ایک سے زیادہ ویلینسی ہوتی ہیں۔ بلاک ایف میں باقی کے عناصر شامل ہیں جو ٹیبل میں نیچے کی طرف ہیں اور

ریئر ارتھ دھاتیں

بھی کہلاتی ہیں۔

جاری ہے

پارٹیکل ایکسیلیریٹر

particle accelerators

الیکٹرونی تشکیل

electron configuration

ویلینس شیل

valence shell

یو این سے شروع ہونے والے کچھ عناصر کے نام انگریزی میں  درج ذیل ہیں۔

ununtrium

ununquadium

ununpentium

حوالہ

جاری ہے

10:39 AM

Periodic table, پارٹیکل ایکسیلیریٹر, پیریاڈک ٹیبل, دوری جدول, ویلینس الیکٹرون، الیکٹرونی تشکیل, ویلینس شیل

پیریاڈک ٹیبل یا دوری جدول کی تاریخ-۲

گذشتہ سے پیوستہ

مینڈیلیف

سترہ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا، ایک روسی استاد کا بیٹا تھا۔ اس زمانے کے مروّجہ علوم یعنی کلاسیکی زبانوں میں اسکی دلچسپی نہ ہونے کی وجہ سے اسے ایک اچھا طالب علم خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ حالانکہ اسکا دماغ حساب اور سائینس میں کافی زرخیز تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے یونیورسٹی میں داخلے کے وقت کافی آزمائش سے گذرنا پڑا۔ ماسٹرز کرنے کے بعد جرمنی میں اس نے کیمیاء کے مطالعے میں دو سال گذاارے اور پھر سینٹ پیٹرز برگ یونیورسٹی میں ایک پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ یہ وہی یونیورسٹی تھی جہاں اسے گریجوایشن میں داخلہ دینے سے انکار کر دیا گیا تھا۔

اپنی ایک کتاب پرنسپلز آف کیمسٹری کے لئے مواد جمع کرنے کے دوران اسے خیال آیا کہ عناصر کے خاندان بنانے چاہئیں جو ایک جیسے خواص رکھتے ہیں۔ اور اس پہ غورو فکر کرتے ہوئے اس نے  مختلف عناصر کے درمیان خصوصیات کی ہم آہنگی کو نوٹ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ مینڈیلیف تاش کھیلنے کا بہت شوقین تھا۔ اس نے اس وقت تک کے معلوم عناصر کے کارڈز تیار کئے اور اپنے لمبے سفروں کے دوران ان سے سولیٹیئر تاش کا کھیل 'پیشنس' کھیلتا تھا۔ ہر کارڈ پہ عنصر کی علامت، ایٹمی وزن، اور نمایاں طبعی و کیمیائ خصوصیات لکھی ہوئ تھیں۔ جب اس نے ایک میز پہ ان کارڈز کو پھیلایا اور انکے ایٹمی وزن کے حساب سے ترتیب دیا تو پیریاڈک ٹیبل وجود میں آگیا۔ اٹھارہ سو انہتر میں مینڈیلیف نے اپنا کام پیریاڈک ٹیبل کے حوالے سے شائع کروایا ۔

اسکے پیش کردہ ٹیبل کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں عمودی، افقی اور وتری ہر طریقے سے ہم آہنگیت موجود تھی۔ انیس سو چھ میں اسے اس سلسلے میں نوبل پرائز ملا۔

حالانکہ اس وقت اتنی سہولیات موجود نہ تھیں کہ وہ عناصر کے بالکل صحیح اوزان معلوم کر پاتا۔ اسکے باوجود اس نے کئ عناصر کے وزن میں غلطیاں درست کیں ۔ مثلاً بریلیئم کے وزن چودہ کو صحیح کر کے نو کیا۔ اس وجہ سے بریلیئم دوسرے گروپ میں میگنیشیئم سے پہلے آگیا۔  کیوں کہ اسکی خصوصیات اس گروپ سے ہم آہنگیت دکھاتی تھِں۔   اس نے کل سترہ عناصر کو نئ جگہیں دیں اسکے پیش کردہ ٹیبل میں نامعلوم عناصر کے لئےخالی جگہیں موجود تھیں۔  اس طرح نامعلوم عناصر کے وزن اور خصوصیات کی بھی پیشن گوئ کر دی جیسے بعد میں دریافت ہونے والے عناصر گیلیئم، اسکینڈیئم اور جرمینیئم کے لئے اس نے ٹیبل میں جو جگہیں چھوڑی تھیں وہاں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان متوقع عناصر کی متوقع خصوصیات کیا ہونگیں۔ جب یہ بعد میں دریافت ہوئے تو انکی خصوصیات وہی تھیں جو مینڈلیو نے بیان کی تھیں۔

اس طرح مینڈیلیف نے دس نئے عناصر کی موجودگی کی پیشن گوئ کی۔ اسکے ٹیبل میں کچھ ٹیکنیکل خرابیاں تھیں۔ جنکی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک اس ٹیبل کو بنانے کے لئے ایٹمی وزن ہی کو معیار بنایا جاتا تھا۔

اسکے بنائے ہوئے ٹیبل میں کچھ خامیاں تھیں۔ ایک تو اس میں نوبل گیسز کا کوئ تصور نہ تھا اور دوسرے آئیسو ٹوپس کے بارے میں کچھ معلومات نہ تھیں۔

لوتھر میئر

نے بھی عین اس وقت  اپنے نتائج  پیش کئے جب مینڈلیو نے کئے۔ یہ نتائج مینڈیلیف کے نتائج سے ملتے جلتے تھے۔ کچھ مئورخین کے نزدیک وہ اور مینڈیلیف اس سلسلے میں ہم پلّہ ہیں اور دونوں ہی کو بابائے پیریاڈک ٹیبل کہنا چاہئیے لیکن یہاں مینڈیلیف کو ایک برتری حاصل ہے۔ اس نے

میئر

کے مقابلے میں زیادہ عناصر اپنے ٹیبل میں پیش کئے اور نئے عناصر کے دریافت کی پیشن گوئ بھی کی۔ میئر اس خیال کو نہیں پا سکا۔ میئر کے علاوہ ایک اور کیمیاداں

ویلیئم اوڈلنگ

نے بھی مینڈلیو سے ملتا جلتا ٹیبل سن اٹھارہ سو چونسٹھ میں پیش کیا۔

اسکے بعد

لارڈ ریلے

کی نوبل گیسز کی دریافت نے پیریاڈک ٹیبل میں مزید تبدیلیاں پیدا کیں۔

ویلیئم رامسے

نے نئے دریافت شدہ عنصر آرگن کو ہیلیئم کے ساتھ رکھنے کا مشورہ دیا۔ ان عناصر کی ویلینسی صفر تھی اس لئے اسے زیرو گروپ کا نام دیا گیا۔

بیسویں صدی کے سائنسدانوں کے اعزاز میں یہ آیا کہ وہ مینڈلیو کے ترتیب کردہ ٹیبل کی وجوہات بیان کر سکیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کچھ عناصر ایک جیسی کیمیائ خصوصیات رکھتے ہیں۔

ردر فورڈ

نے مرکزے کا چارج معلوم کر کے اطلاع دی کہ نیوکیئر چارج اور ایٹمی وزن کے درمیان ایک راست تعلق ہوتا ہے۔ یعنی ایٹمی وزن کے بڑھنے سے ایٹمی چارج بڑھے گا اور کم ہونے سے کم ہوگا۔

ہنری موزلے

نے انیس سو تیرہ میں ایک تجربے کے نتیجے میں بتایا کہ ایٹمی نمبر اور عناصرایکس رے طول موج کے درمیان  تعلق ہے۔ اور اس طرح یہ ہوا  کہ ایٹمی چارج کو ناپا جا سکتا ہے۔ یعنی ایٹمی نمبر معلوم کیا جا سکتا ہے۔  اسکے ساتھ ہی آئسوٹوپ کی دریافت ہوتی ہے اور یہ بات پتہ چلتی ہے کہ یہ دراصل ایٹمی وزن نہیں ہے جو عناصر کی کیمیائ خواص کو ظاہر کرتا ہے بلکہ اس میں ایٹمی نمبر کا عمل دخل ہے۔ کیونکہ آئیسو ٹوپ ایک ہی عنصر کے ایٹم ہوتے ہیں جنکا ایٹمی نمبر ایک جیسا ہوتا ہے مگر ایٹمی وزن مختلف ہوتا ہے۔

یہ تو آپکو یاد ہوگا کہ مینڈلیو تک جتنے بھی سائنسداں تھے سب ایٹمی وزن کے حساب سے پیریاڈک ٹیبل میں عناصر کو ترتیب دے رہے تھے تو اس موڑ پہ پیریاڈک ٹیبل کی ترتیب میں ایک بڑی تبدیلی آئ۔

یہ سوال کہ کیوں عناصر خصوصیات کو دوہراتے ہیں اسکا جواب اس وقت ملا جب عناصر کی الیکٹرونی تشکیل کرنا ممکن ہوئ یعنی مختلف آربٹلز میں یا مداروں میں الیکٹرون کی موجودگی اور انکی تقسیم۔ اور یہ سب ممکن بنایا

نیلس بوہر

نے جس نے

جی این لیوس

کی دریافت الیکٹرونی جوڑوں کی تشکیل سے مدد لی۔ اسے اس وجہ سے نوبل پرائز بھی دیا گیا۔ نیچے دی گئ تصویر میں کچھ عناصر کی الیکٹرونی تشکیل دی گئ ہے۔

پیریاڈک ٹیبل میں آخری اہم تبدیلیاں بیسویں صدی کے وسط میں پلوٹونیئم کی دریافت کے بعد ہوئیں جو

گلین سیبورگ

نے انیس سو چالیس میں کی۔ اس نے مینڈلیو کے ٹیبل میں تبدیلی کر کے ایکٹینائیڈ سیریز کو لینتھینائیڈ سیریز کے نیچے جگہ دی۔ انیس سو اکیاون میں اسے نوبل پرائز دیا گیا۔ اور ایک سو چھواں عنصر کو اسکا نام دیا گیا یعنی سی بورگیئم جسکی علامت ہے ایس جی۔

  Seaborgium (Sg)

نوٹ؛ اس تحریر میں دئیے گئے سائنسدانوں کے پورے نام انگریزی ہجوں میں ذیل میں درج ہیں۔ آپکا ہوم ورک یہ ہے کہ انکا صحیح تلفظ معلوم کریں۔

مینڈلیف

Dmitri Mendeleev

نام کا صحیح تلفظ سننے کے لیئے

اس لنک

پہ جائیں۔

ہنری موزلے

Henry Moseley

ویلیئم اوڈلنگ

William Odling

لوتھر میئر

Lothar Meyer

ردر فورڈ

Ernest Rutherford

نیلس بوہر

Niels Bohr

جی این لیوس

Gilbert N. Lewis

گلین سیبورگ

 Glenn T. Seaborg

 مزید حوالہ

جاری ہے

11:12 AM

پیریاڈک ٹیبل, جی این لیوس, دوری جدول, ردر فورڈ, گلین سیبورگ, لوتھر میئر, منڈلیو

پیریاڈک ٹیبل یا دوری جدول کی تاریخ-۱

کسی بھی کیمسٹری کی لیبارٹری میں داخل ہو جائیں وہاں آپکو ایک چیز ضرور نظر آئے گی اور وہ ہے پیریاڈک ٹیبل یا دوری جدول۔ میں اسکے لئے پیریاڈک ٹیبل کی اصطلاح ہی استعمال کرنا چاہونگی۔  سائینسی اصطلاحات ساری دنیا میں ایک جیسی رہیں تو مزید معلومات کا حصول آسان رہتا ہے۔

بظاہر تو پیریاڈک ٹیبل ایک حاضری کے رجسٹر کی طرح لگتا ہے۔ جہاں تمام عناصر کے حاضر ہونے یا موجود ہونے کی اطلاع ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہے یہ ٹیبل اس سے کہیں زیادہ معلومات رکھتا ہے اور اسکی وجہ اس میں عناصر کو ترتیب دیتے وقت انکی خصوصیات کے اتار چڑھاءو کو مد نظر رکھنا ہے۔

انسان نے زندگی کے ہر شعبے میں ارتقائ طریقے سے چیزیں سیکھیں اور انہیں آگے بڑھایا ۔ یہی ، سب کچھ پیریاڈک ٹیبل کو ترتیب دینے کے دوران ہوا۔

لوائزے

وہ پہلا شخص ہے جس نے ایسی اشیاء کی لسٹ دی جنہیں مزید نہیں توڑا جا سکتا تھا۔ اس نے انہیں عناصر کہا۔ اس لسٹ میں نائٹروجن، ہائیڈروجن، فاسفورس، مرکری یعنی پارہ، زنک یعنی جست اور سلفر یعنی گندھک کے علاوہ روشنی اور حرارت بھی شامل ہیں۔ جنہیں اس نے مادہ اشیاء سمجھا۔ اس لسٹ میں عناصر کو صرف دھات یا غیر دھات کے طور پہ لیا گیا اس لئے  یہ ایک مکمل تجزیہ نہیں تھا۔ اس وقت کے دیگر کیمیاء دانوں نے اس میں دلچسپی نہیں لی۔

ڈابیرینر

نے نے ایک ابتدائ کوشش کی کہ عناصر کی جماعت بندی کر دی جائے۔ اپنی اس کوشش میں اس نے معلوم کیا کہ بعض بنیادی خواص بعض عناصر دوہراتے ہیں۔ اس طرح سے ایک جیسے خواص دوہرانے والے عناصر کے اس نے گروہ بنادئیے۔ ہر گروہ میں تین ارکان تھے۔ ہر گروہ کو اس نے ٹرائیڈاز کا نام دیا۔

ہر ٹرائیڈز کے درمیانی رکن کا ایٹمی وزن باقی دو کے اوزان کا اوسط تھا۔

اسکے کچھ گروہوں کی مثال ذیل میں ہے۔

۱

کلورین، برومین، آئیوڈین

۲

کیلشیئم، اسٹرونشیئم، بیریئم

۳

سلفر، سیلینیئم، ٹیلیریئم

۴

 لیتھیئم، سوڈیئم، پوٹاشیئم

سن اٹھارہ سوانہترتک تریسٹھ عناصر دریافت ہو چکے تھے۔ عناصر کی تعداد بڑھنے کے ساتھ ہی ان میں دوہرائے جانے والے رجحانات بھی زیادہ واضح ہوو کر سامنے آئے اور اس طرح سائینسدانوں نے انکی درجہ بندی پہ غور کرنا شروع کیا۔

الیکزینڈر ایمائیل

وہ پہلا شخص تھا جس نے اس چیز پہ توجہ کی کہ مختلف عناصر اپنی خصوصیات کو دوہراتے ہیں۔ اور اگر انہیں انکے ایٹمی وزن کے حساب سے ترتیب دیا جائے تو ایک خاص وقفے کے بعد ایسا عنصر آتا ہے جو اس خاص وقفے سے پہلے والے عنصر جیسے خواص رکھتا ہے۔ اس نے پیریاڈک ٹیبل کی ایک ابتدائ شکل بنائ۔ جو پیچ دار تھی۔ اس طرح ترتیب دیتے ہوئے ایک جیس خصوصیات رکھنے والے عناصر ایک عمودی قطار میں آگئے۔ اسکے اس چارٹ میں عناصر کے علاوہ آئینز اور دیگر مرکبات بھی تھے۔ اسکا پیپر اٹھارہ سو باسٹھ میں شائع ہوا۔ چونکہ اس میں کوئ تصویر بھی نہ تھی تو اسے اتنی پذیرا

ئ

بھی نہ مل سکی۔

اٹھارہ سو پینسٹھ میں

جان نیو لینڈز

نے چھپن عناصر کو جو کہ دریافت ہو چکے تھے گیارہ گروپس میں بانٹ دیا۔ اس نے دیکھا کہ اگر عناصر کو ایک فہرست میں لکھ لیا جائے انکے ایٹمی اوزان کے مطابق تو ہر آٹھواں یا آٹھ کا ضربی نمبر یا ملٹی پل عنصر سب سے پہلے والے عنصر جیسے خواص رکھتا ہے۔

اسکی وضاحت کے لئے ہم  دوسری والی تصویر میں ایل آئ یعنی  لیتھیئم سے گننا شروع کریں

تو اسکے بعد بی ای یعنی بریلیئم، بی یعنی بورون، سی یعنی کاربن، این یعنی نائٹروجن، او یعنی

آکسیجن، ایف یعنی فلورین  کے بعد  آٹھویں عنصر این اے یعنی سوڈیئم پہ پہنچیں تو یہ لیتھیئم کے بعد ٹھیک آٹھواں عنصر ہے اور اسکے کیمیائ خواص لیتھیئم جیسے ہونگے۔ اس طرح پہلے ٹیبل میں  این اے یعنی سوڈیئم سے گننا شروع کریں تو پھر آٹھویں عنصر پوٹاشیئم پہ پہنچیں گے یعنی لیتھیئم کے حساب سے آٹھ کا دوضربی نمبرسولہواں عنصرتقریباً لیتھیئم جیسے کیمیائ خواص رکھتا ہوگا۔

علی ہذالقیاس۔

جان

کا مذاق اڑایا گیا کہ کیا موسیقی کے سروں سے گن کر آٹھ کا گروہ بنادیا۔ دراصل اس وقت تک ویلینس بانڈ نظریہ بھی سامنے نہ آیا تھا اور نہ آٹھ کا نظریہ یعنی آکٹیٹ رول بھی دریافت نہ ہوا تھا۔

جاری ہے

نوٹ؛ اس تحریر میں دئیے گئے سائنسدانوں کے پورے نام انگریزی ہجوں میں ذیل میں درج ہیں۔ آپکا ہوم ورک یہ ہے کہ انکا صحیح تلفظ معلوم کریں۔

لوائزے

Antoine Lavoisier

ڈابیرینر

Johann Wolfgang Döbereiner

الیکزینڈر ایمائیل

 Alexandre-Emile Béguyer de Chancourtois

جان نیو لینڈذ

 John Alexander Newlands

 مزید حوالہ

جاری ہے

11:11 AM

پیریاڈک ٹیبل، دوری جدول، لوائزے، ڈابعرینر، جان نیولینڈز، الیکزینڈر ایمائیل، ،

اگر

یہ کسی دوست نے مجھے ایک انگلش تحریربھیجی ، مجھے تو مزے کی لگی۔ آپ کے لئے اسکا کچھ حصہ ترجمہ کیا  اور اسکی روح برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

اصل تحریر یہاں

دیکھ سکتے ہیں۔

اگر طوفان پیٹ پاکستان میں اپنی پوری طاقت کے ساتھ داخل ہو جاتا تو ہمارے انگریزی اخبار اسے کس طرح رپورٹ کرتے؟ یہ ہیں چند نمونے۔

روزنامہ 'ڈان'؛

طوفان نے سندھ، بلوچستان میں تباہی مچا دی، ساحلی علاقوں میں بہت سے افراد مر گئے اور کئ لاپتہ، زرداری، اسماء جہانگیر، بیلجیم کے وزیر اعظم کی تعزیت۔

روزنامہ 'دی نیوز'؛

کیا طوفان سے ہونے والی تباہی کے ذمہ دار زرادری؟ افتخار چوہدری کی وارننگس کو با بار نظر انداز کیا گیا، این آر او سے فائدہ اٹھانے والوں کے مزے جبکہ لوگ مصیبت میں، جیو وہ پہلا چینل جس نے اس تباہی کو رپورٹ کیا۔

روزنامہ ڈیلی ٹائمز؛

سندھ، بلوچستان  میں ہونے والی تباہی سے سلمان تاثیر صدمے میں؛ پی پی پی کا تباہی سے نمٹنے کا عزم ، نواز شریف لندن روانہ، رانا ثناءاللہ کا طالبان کے ملوث ہونے سے انکار ،حامد میر کی نئ جاری ہونے والی ریکارڈنگز میں اسکے لنک، سارا تاثیر شعیب کی جیولری کی دوکان ایک دن کے سوگ میں بند ، پوچو کی سالگرہ پارٹی ملتوی ، امریکہ کے تھنک ٹینکس کا پاکستان پہ زور 'ڈو مور'۔

روزنامہ ایکسپریس ٹریبیون؛

کراچی میں ڈی ایچ اے میں تباہی ، طوفان کا بہت سارے فیزز پہ ہلّہ ، ہر طرف خوف پیٹ کی وجہ سے بے شمار ڈرائیوروں، ماسیوں، چوکیداروں، نامعلوموں،  ٹوئٹروں، بلاگروں اور فیس بکروں کا باقی دنیا سے رابطہ منقطع ، دور ددراز کے علاقوں جیسے کیماڑی، نیلم، اور شیریں جناح کالونی میں سینکڑوں جاں بحق، خوبصورت مگر محروم ماہی گیری کے گاءوں میں بچوں کے حقوق مزید متائثر ہونے کا خطرہ، ، کراچی گرامر اسکول کے  سابق طلباء کی ملن پارٹی ملتوی۔،

روزنامہ دی نیشن؛

طوفان سے سندھ، بلوچستان عدم استحکام کا شکار، بالآخر انڈین اور بلیک واٹر کی سازشیں بارآور ، سینکڑوں مر گئے مگر نیوکیئر اثاثے ہندءووں اور یہودیوں کی دسترس سے محفوظ، کیانی اور حمید گل کو صدمہ، نواز شریف کا اپنا دورہ ء لندن  کلثوم کی صحتیابی کی صورت میں مختصر کرنےکا ارادہ، نظریہ ء پاکستان اور ماجد نظامی محفوظ۔۔

یہ تو تھے چند انگریزی اخبارات کے متوقع بیانات۔

لیکن خیال آیا کہ  طوفان آنے کے بعد ہماری بلاگنگ کی دنیا میں مبصروں کے متوقع تبصرے کیا ہوتے؟

پہلے طالبان، اب طوفان، کیا کرے پاکستان۔

خبردار جو کسی نے طالبان کے بارے میں کچھ کہا۔ یہ سب خدا کا عذاب ہے جو کراچی پہ نازل ہوا، ٹارگٹ کلنگ میں پٹھانوں کو مارتے ہوئے کسی کراچی والے یعنی اردو اسپیکنگ کو تکلیف نہ تھی اب طوفان  میں سندھی، پٹھانوں کے مرنے کا طوفان اٹھایا ہوا ہے۔

کراچی والے صرف اردو اسپیکنگ نہیں۔ یہاں دوسری زبانوں کے لوگ بھی بستے ہیں۔ اس شہر پہ سب کا حق ہے۔

لیکن یہ بات کراچی والے میرا مطلب اردو اسپیکنگ یعنی بھائ لوگ مانیں تب ناں۔

اس سارے طوفان کے پیچھے ایم کیو ایم کا ہاتھ ہے۔ وہ امدادی کام کر کے اپنا نام  بھی بنانا چاہتے ہیں اور پیسے بھی ہتھیانا چاہتے ہیں۔ اسکے ساتھ ہی تیسرے درجے کے اخبارات سے سنسنی خیز خبروں کی فہرست کا حوالہ۔

طوفان میں متائثرین کی بڑی تعداد سندھی، بلوچی اور پٹھان قومیت سے تعلق رکھتی تھی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کراچی کی فاشسٹ جماعت ایم کیو ایم نے اس طوفان کی تربیت کی تھی۔

الطاف بھائ کب اپنا لندن کا دورہ مختصر کر کے آ رہے ہیں۔ اب تو بھابھی بھی  وہاں نہیں رہیں۔

سب طوفان کے مرنے والوں کو رو رہے ہیں انکے بارے میں کوئ نہیں سوچتا جو بارہ مئ کو مارے گئے۔

تعصب نہیں کرنا چاہئیے۔  عصبیت کرنے والا ہم میں سے نہیں۔ ایسے سنگین مواقع پہ ہمیں استغفار کرنی چاہئیے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگنی چاہئیے۔ خدا ہم سب کو صراط مستقیم پہ چلنے کی توفیق دے۔ آمین۔ اردو بولنے والوں کو میرا مطلب بھائ لوگوں کو  بھی اپنی دنیا سے باہر دیکھنا چاہئیے۔

بلوچستان میں درجنوں لوگ لاپتہ ہو گئے، یہ ہندءووں اور یہودیوں کی سازش بھی ہو سکتی ہے۔ سنا ہے کہ اب یہودیوں کی سائینس اتنی ترقی کر گئ ہے کہ دشمن ممالک پہ طوفان بھی لا سکتی ہے۔ آخر یہودی ہولوکاسٹ کے دوران اپنے اوپر ہونے والے مظالم کا بدلہ ہم سے کیوں لے رہے ہیں۔

یہ سب روشن خیالوں کے کرتوتوں کا نتیجہ ہے ان سب کو جہنم رسید کر کے  ہمیں خدا سے اجتماعی استغفار کرنی چاہئیے۔ اس خدا سے جو صرف فلاں فلاں فقہے سے تعلق رکھتا ہے۔ اور فلاں فلاں سے نظریاتی تعلق۔

یہ سب پنجابیوں کا کیا دھرا ہے، وہ سمندر کراچی میں ہونے کا مزہ کراچی والوں کو چکھانا چاہتے ہیں۔ خدا کرے انکے دریاءووں میں سیلاب آجائے۔

جھوٹ کیندا اے سالا۔ او نئیں چائیے سمندر شمندر۔ جا رکھ اپنے کول تے آپی ڈبکیاں کھا۔ سمندر کا پانی، او پی کے تو وکھا سمندر کا پانی۔ نوی ای سنائ اے۔ غارت ہو جا کے سمندر وچ۔

کسی مسلمان کو بد دعا نہیں دینی چاہئیے۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ اللہ ہم سبکو گناہوں سے بچائے۔ استغفار کریں۔

مرنے والوں میں خواتین کم مری ہیں اور مرد زیادہ، اسکا مطلب ہے کہ خدا نے مرد کو افضل بنایا ہے اور وہ مرنے کے بعد بھی انکی بالادستی چاہتا ہے۔ طوفان میں مرنے والے سب شہید ہیں۔ آئیے انکی مغفرت کے لئے دعا کریں۔ اور اپنے لئے استغفار۔

طوفان کا شکار ہونے والی عورتوں کو امداد پہنچانے کے دوران پردے کا خیال نہیں رکھا گیا، یہ کیسا اسلامی ملک ہے، کیا پاکستان اسی دن کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ ایسے کافر نما مسلمانوں پہ خدا کی مار۔

کسی مسلمان کو کافر نہیں کہنا چاہئیے۔ اس پہ سخت عذاب ہے۔ استغفار کریں۔ خدا ہمیں ہدایت دے۔

یہ سب تعیلم یافتہ لوگوں کی بے کار کی  منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے۔ ان تعلیم یافتہ لوگوں کے پاس ایک کاغذ کے ٹکڑے کے سوا ہوتا کیا ہےجو یہ کچھ کرسکیں۔ گمان ہے کہ طوفان کسی پی ایچ ڈی کے کراچی میں بچے رہنے  کے باعث آیا۔ ان سب کو فوراً کسی اور ملک کی شہریت دے کر یہاں سے فارغ کیا جائے۔ اور ہاں، ہولوکاسٹ کی کہانیاں سب جھوٹ ہیں۔ یہودیوں پہ کوئ ظلم نہیں ہوا۔ یہ زمانہ آگیا ہے۔ پڑھے لکھے بہت ہیں مگر یہودیوں کی اصل تاریخ سے بے بہرہ۔ ایسی تعلیم کا کیا فائدہ، جو یہودیوں کے بارے میں بھی صحیح سے پتہ نہ ہو۔ ہمارے زمانے میں-----۔

تعلیم کو برا نہ کہیں، یہودیوں کو برا کہیں۔

یہودیوں نے ہی تعلیم کا شوشہ چھوڑا ہے، اس سلسلے میں ہمارے پاس بہت اہم شواہد ہیں۔ جن پہ ہم بعد میں تفصیل سے لکھیں گے۔ یہودیوں نے ----۔

ایم کیو ایم

طوفان

مرنے والے

استغفار

مغفرت

تعلیم یافتہ لوگ

کاغذ کے ٹکڑے

طوفان

ایم کیو ایم

فاشسٹ

طوفان

یہودی

دیسی گالیاں

طوفان

اور ہماری بلاگنگ کی دنیا کا ایک اہم تبصرہ تو رہ گیا جو کچھ اس طرح ہوتا۔

مزہ آیا طوفان میں آنٹی۔

Lets see if you mind it.

8:10 PM

ایکسپریس ٹریبیون, بی نیشن, پاکستان، ڈان, دی نیوز, ڈیلی ٹائمز, طوفان پیٹ, کراچی

وہ آیا، اس نے دیکھا اور چلا گیا

رات کے ایک بجے جب بجلی کی پہلی کڑک سنائ دی تو میں نے ذرا جوش میں ہی اسکی آواز سنی۔ تو یہ ہے وہ

'طوفان پیٹ'

جو اپنے آنے کی گرج سنا رہا ہے۔ لیکن رپورٹ تو یہ تھی کہ کل دوپہر کو پہنچے گا۔ جواب ملا، یہ تو اسکا ہراول دستہ ہے۔ طوفان ابھی بہت پیچھے ہے۔ صبح اٹھ کر چیک کیا۔ شام کو متوقع ہے۔ لیکن بارش ساری رات وقفے وقفے سے ہوتی رہی۔

صبح سے موسم خاصہ سہانا تھا اور وقفے وقفے سےہلکی بارش کا سلسلہ بھی چل رہا تھا۔ مگر طوفان، نہیں آیا۔ دن میں مشعل نے بارش میں نہانے کا شور مچایا۔ میں نے سوچا بارش اس وقت خاصی ہلکی ہے شام کو جب طوفان آئے گا تو ہو سکتا ہے اس میں  تیزی ہو، اس میں بھیگنے کا کچھ مزہ بھی آئے گا۔ مشعل کو تسلی دی کہ ابھی کچن کے کام نبٹا لوں تو آپ کے ساتھ میں بھی بارش کا مزہ لونگی۔ بس اسکے بعد بارش بالکل ہی رک گئ۔

اب شام سے کیا مراد ہے، اب تو ساڑھےچھ ہو رہے ہیں۔ باہر ہوا تھوڑی تیز ہو گئ ہے۔ شاید طوفان گذر رہا ہے۔ مگر یہ طوفان ہے  یا ساجن کے ساتھ وقت گذار کر واپس آنے والی سجنیا۔ کیا خراماں خراماں اپنی مستی میں چل رہا ہے۔ اتنا شور مچا کہ بس اب آیا اور یہ طوفان

چلیں جناب، کچھ میڈیا نے اپنا  وقت نکالا، کچھ قائم مقام سٹی گورنمنٹ نے اس بہانے اس ' متوقع تباہ کن ایمرجنسی' کو دور کرنے کے لئے فنڈز حاصل کر کے اپنا الّو سیدھا کیا۔ ایمرجنسی فنڈز کے لئے نہ ٹینڈر چاہئیے ہوتا ہے، اور نہ زیادہ چھان پھٹک ہوتی ہے۔ باقی کے لوگ کاٹھ کے الّو بنے جنوب کی طرف منہ کئے بیٹھے گانے سنتے اور پوری پکوڑے کھاتے رہے، اس میں ہم بھی شامل ہیں کہ کاٹھ کا الّو بننے کے لئے بس کاہل ہونا ضروری ہے اور کاہلی چھوت کا مرض ہے۔ کراچی سے باہر والوں کی وضاحت کے لئے سمندر ہمارے جنوب میں ہے۔

اصل میں ایک دلچسپ خبر بھی ٹوئٹر پہ ملی آپ کے لئے حاضر ہے۔

عبداللہ شاہ غازی

کے مزار کے ایک طرف کی دیوار گر گئ اور سترہ افراد زخمی ہو گئے انکے ایک معتقد کا کہنا ہے کہ طوفان بہت طاقت والا تھا اسے روکنے میں، سارا لوڈ دیوار پہ گیا۔ خیر ہم، انکے بھی شکر گذار ہیں کہ ان پہ اعتماد ہمیں طوفان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے والا بنائے رکھتا ہے۔ ورنہ کیا ہو؟

  اس سہانے موسم میں جبکہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شاید اب بھی طوفان ، طوفان بن جائے چھوٹا ہی سہی۔ ایک گانا میں سن رہی تھی، دل چاہے اور وقت ہو تو آپ بھی سن لیں۔

7:09 PM

طوفان پیٹ، کراچی، عبداللہ شاہ غازی،

کراچی میں سمندری طوفان

دو دن سے جتنے فون بیرون ملک سے آرہے ہیں۔ سبھی ہماری خیریت کے بعد کراچی میں

'پیٹ' یعنی آنےوالے سمندری طوفان

کے متعلق معلوم کر تے ہیں۔ ادھر کراچی میں لوگوں میں خاصہ جوش و خروش پایا جاتا ہے  جو ساحل تک پہنچ سکتے ہیں وہ، روزانہ وہاں کے چکر لگا رہے ہیں۔ وہاں کے رہائیشی اپنی کھڑکیوں سے باہر کے منظر پہ نگاہیں جمائے بیٹھے ہیں کہ دیکھیں کس وقت

'پیٹ' طوفان

اپنی پہلی جھلک دکھاتا ہے۔ پیٹ تھائ زبان کا لفظ ہے اور اسکا مطلب ہے 'ہیرا'۔

ہماری ایک عزیزہ کا کہنا ہے کہ ایک دفعہ اسی طرح کے طوفان کی اطلاع پہ وہ بھی کراچی کے ساحل سی ویو پہ اہل خانہ کے ہمراہ پہنچیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ ساحل پہ رینجرز تعینات ہے۔ اور گنوں کا رخ سمندر کی طرف ہے۔ تو کیا گنوں کا رخ شہر کی طرف ہونا چاہئیے تھا۔ پھر آپکو اعتراض ہوتا کہ شہریوں کو ہراساں کر رہے ہیں۔ میں نے کہا تو انہوں نے چبانے والی نظروں سے دیکھا اور کہنے لگیں تو کیا طوفان ان سے ہراساں ہو رہا تھا۔ انکی برستی ہوئ نظروں کی تاب نہ لاکر ہم فوراً صراط مستقیم پہ رواں ہوئے اور فرماںبرداری سے کہا کہ وہ دراصل لوگوں کو سمندر میں جانے سے روکنے لئے ہوگا۔ اس وقت بھی ساحل پہ دفعہ ایک سو چوالیس لگی ہوئ ہے۔ اور صرف دو افراد ایکدوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالکر چل سکتے ہیں اس سے زیادہ کی ممانعت ہے۔

آپ میں سے کچھ کے بے حد پسندیدہ 'بھائ صاحب' نے بھی شہر میں جنگی بنیادوں پہ طوفان سے نبٹنے کی تیاری پہ زور دیا ہے۔ انکا تذکرہ میں نے بہ احتیاط کر دیا ہے کہ میری پوسٹ پہ انکے نام کے مصالحے کا تڑکا کوئ اور نہ لگا پائے۔ ویسے بھی چونکہ انکا تعلق ہمارے شہر اور ہماری 'برادری' سے ہے تو مناسب یہی ہے کہ ہم انکا تذکرہ کریں۔ کوئ اور کرے تو رقابت کی بو آتی ہے۔

میں بھی گھر میں سبزیوں کا ذخیرہ جماکر کے فارغ ہوئ ہوں۔ ابھی جا کر آٹا چاول لانے کے بارے میں بھی سوچ رہی تھی کہ  معلوم نہیں طوفان کے آنے کے بعد کیا ہوگا۔

تین سال پہلے کراچی میں آنے والا طوفان دو سو کلومیٹر کے فاصلے سے گذر گیا۔ شہر میں تین دن تک بجلی غائب ہو گئ، سڑکیں اڑ گئیں اور پگڈنڈیاں باقی رہ گئیں، اگلے دن شہر میں ہو کا عالم تھا۔  لگتا تھا کہ کوہ قاف کا کوئ دیو ابھی سارے آدم زادوں کو کسی بوتل میں بند کر کے لے گیا ہو۔

 آج صبح

محکمہ ء موسمیات

والوں نے

اطلاع

دی کہ طوفان کا زور عمّان کے ساحل سے ٹکرانے کے بعد خاصہ ٹوٹ گیا ہے۔ اس محکمے کی یاد بھی ایسے ہی موسم میں آتی ہے۔ رویت ہلال کے سربراہ اعلی کا پتہ رمضان کے مہینے میں چلتا ہے، نیب کے عالی مقام کا پتہ نئ حکومت کے آنے کے بعد، دیگر اور بہت سے محکموں کا انکے چیئرمین کے گرفتاری کے چھاپوں  یا استعفی کے بعد پتہ چلتا ہے۔

محکمہ ء موسمیات

والوں کے بھاگ بارش کے موسم میں کھلتے ہیں۔ اطلاع ہو کہ انکے ڈائیریکٹر جنرل کا نام ڈاکٹر قمرالزماں چوہدری ہے۔

ہاں تو جب یہ اطلاع پہنچی کہ طوفان کا زور کم ہو گیا ہے تو لوگوں کو خاصی مایوسی ہوئ۔ اسی وقت ایک فون آِیا۔ انہیں معلوم کرنا تھا کہ طوفان کی آمد کے لئے ہم نے کچھ تیاری کر لی کے نہیں۔ ہم نے انہیں مطلع کیا کہ کراچی میں طوفان ہمیشہ آنے کی اطلاع دیتا ہے۔ اور پھر نجانے کیوں چپ چپاتے پتلی گلی سے نکل لیتا ہے۔ اب ایسے توانائ سے خالی کسی اور کے ساحل پہ الہڑ پن دکھا کر فارغ ہونے والے پھسپھسے طوفان کا کیا استقبال کریں ۔ اس لئے ہم تو چلے ذخیرہ کی ہوئ سبزیوں میں سے آلو پالک پکانے۔

توقع تھی کہ ساحل پہ براجمان لوگ بھی اپنے خیمے اکھاڑ کر گھرواپسی کا رستہ لیں گے۔ اور ساحل کے نزدیک کلفٹن کے مزار میں رہائیش پذیر

عبداللہ شاہ غازی

کے اور معتقد ہو جائیں گے کہ انکی وجہ سے کراچی میں طوفان آنے کی ہمت نہیں کر پاتا۔ لیکن نہیں جناب،

قمرالزماں صاحب نے نئ اطلاع

بھجوادی کہ طوفان اب بھی خطرناک حد میں ہے اور طوفانی بارشوں کا سلسلہ کراچی میں ہفتے سے شروع ہونے کی توقع ہے۔

طوفان نہ ہوا باغیوں کا کوئ گروہ ہو گیا، ادھر کچلا اور دوبارہ تیار۔ یہاں میں جان بوجھ کر طالبان کا نام نہیں استعمال کرنا چاہ رہی کہ میری یہ پوسٹ سیاسی اثرات سے بالا، غیر جانبدار اور آفاقی مزاج کی حامل رہے۔

لوگوں کو اس جذبے سے طوفان کے لئے سرشار دیکھ کر، بس یونہی دل میں ایک شیطانی خیال آیا کہ اگر کبھی کراچی میں سچ مچ کا سمندری طوفان آگیا تو کراچی کا جو ہوگا سو ہوگا،  عبداللہ شاہ غازی کے معتقدین کیا کریں گے۔ اب میں اس خیال کو شیطانی خیال کے علاوہ کیا کہہ سکتی ہوں۔ خدا مجھے معاف کرے۔

5:32 PM

کراچی میں سمندری طوفان، عبدالل شاہ غازی، کلفٹن، قمرالزماں چوہدری، Cyclone phet

مرمت یا مذمت

میں اپنے

ایک ساتھی کے بلاگ

پہ تبصرہ کرتے کرتے رک گئ۔ امید ہے کہ برا نہیں مانیں گی، تبصرے کا نہیں، یہاں لکھنے کا۔ لکھنے جا رہی تھی کہ پاکستان کا نام تبدیل کر کے مرمتستان رکھ لیتے ہیں۔

جس کسی کی مرمت لگانی ہو  یا لگوانی ہو ہم حاضر ہیں۔ سروس میں اعلی، خدمت میں آگے۔ ایسی مرمت لگائیں گے کہ اسے اور ہمیں دونوں کو اپنی پیدائش کا وقت یاد آجائے گا۔ نتیجہ چاہے کچھ بھی نکلے ہم مرمت لگا کر رہیں گے۔ ہم سے ایک دفعہ مرمت لگوانے کا معاہدہ کر کے دیکھئیے۔ پھر آپ اپنے معاہدے سے پھر بھی جائیں لیکن ہم مرمت لگاتے رہیں گے۔ ہماری اعلی سروس کی مثال کے لئے، ہم نے اپنے ہی ملک میں مرمت لگانے کے شو روم کھول رکھے ہیں۔ یہاں آنے کی ضرورت نہیں، اپنے اخبار کھولیں اور ہماری اعلی کار کردگی ملاحظہ فرمائیے۔ مرمت لگانے کے معاملے میں ہم اتنے جذباتی ہیں کہ وہ سارے الفاظ جو م کی پیش والی آواز سے شروع ہوتے ہیں جب تک انکی اچھی طرح چھان پھٹک نہیں کر لیتے انہیں قابل مرمت ہی سمجھتے ہیں جیسے محبت ، مروت  وغیرہ وغیرہ۔

نہیں ، پھر خیال آیا کہ ایسا تو نہیں ہے ابھی بھی پاکستان میں ایک قابل ذکر تعداد ان لوگوں کی ہے جو عدم مرمت کے قائل ہیں۔ اور وہ مرمت نہیں بلکہ مذمت پہ اکتفا کرتے ہیں۔ اس لئے پاکستان کا نام مذمتستان ہونا چاہئیے۔

یہ بھی ہمارے ملک کی خوبصورتی ہے کہ ہر تھوڑے دن پہ کسی کی ایسی مرمت ہوتی ہے کہ پھر مذمت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یوں صورت حال ایسی بنتی ہے کہ

پھر ایک مذمت کا سامنا تھا مجھے

میں ایک مذمت کے پار اترا تو میں نے دیکھا

اس میں مذمت کو مرمت سے تبدیل کر لیں اور دوہرا مزہ لیجئے۔ یاد رکھئیے کہ بہرحال اثر میں مرمت ، مذمت سے کہیں برتر ہے۔ یہ لگنے والے پہ جو بھی اثر چھوڑے لگانے والے کا مورال کافی بلند ہو جاتا ہے۔ اور بہت دنوں تک رہتا ہے۔ اگر کوئ مذمتی سلسلہ شروع نہ ہو جائے تو پھر مرمت لگانے والے کی تسلی نہیں ہوتی یوں مرمت کا ایک اور چکر چلنے کا اندیشہ رہتا ہے تو مرمت کی تیزی کو مذمت کے دف سے مارا جاتا ہے یوں مرمت کے بعد مذمت سے ، مرمت لگانے والا ٹن ہو کر کچھ دنوں تک انٹاغفیل رہتا ہے۔

لیکن یہاں کہانی میں ایک ٹوئسٹ آتا ہے۔ اور وہ یہ کہ جب مرمت لگانے والے کی ، مرمت لگتی ہے تو کیا ہوتا ہے؟  پھر ہم فوراً ہی کرکٹ کے میدان میں اپنا بلا چھوڑ کر بھاگتے ہیں اور واشنگٹن جا کر حاضری دیتے ہیں۔ ڈیئر سر، ہمارے سپہ سالار کا دماغ خراب تھا۔ اس نے ہمارے علم میں لائے بغیر ہمارے دشمنوں کی مرمت کرنی چاہی۔ ڈیئر سر اسکی مذمت کرتے ہیں۔ وہ بھی چاہتے ہیں کہ سپہ سالار کی ایسی مرمت لگائیں کہ یاد رکھے۔ مگر قسمت کی ستم ظریفی دیکھیں، ڈیئر سر اس بد تمیز سپہ سالار کو کچھ عرصے بعد ملک کا صدر بنا دیتے ہیں اور بلّا چھوڑ کر حاضری دینے والے حیران پریشان اسکی مذمت کرتے ہیں۔ اب انکی مرمت کی باری شروع ہوتی ہے۔

خیر رات کو جب

تابکاری والی تحریر

کو توڑ کر تین ٹکڑے کر کے پوسٹ کیا، ایک بوجھ اتارا تو سوچا کہ اب اپنی سونے کی باری آئ۔  ٹی وی لاءونج سے گذرتے ہوئے، میری نظر ٹی وی پہ پڑی۔ ایک جملہ لکھا تھا۔ کیا اسلام میں لونڈی کی اجازت ہے؟ اور لقمان صاحب چند مولانا صاحبان سے گفتگو فرما رہے تھے۔  میں نے سوچا موضوع اچھا ہے مجھے بھی سننا چاہئیے۔ میری ایک مبصر نے

اس بارے میں سوال

بھی کیا تھا۔ میں خاموش ہو گئ تھی کہ کیسے اسکا جواب دیا جائے۔ تو اس کیسے کا جواب ملے گا۔ یہ الگ بات کہ پروگرام تقریباً اپنے خاتمے پہ تھا۔ چونکہ چار معزز صاحبان گفتگو فرما رہے تھے۔ تو اب میں ان میں سے ہر ایک کی تفصیلات نہیں لکھ سکتی۔

ایک مولانا صاحب نے اس وقت کا نقشہ کھینچا کہ کس ضرورت کے تحت جنگ میں گرفتار خواتین کو لونڈی بنایا جاتا تھا اورچونکہ ان مردوں کی پہلے سے چار بیویاں موجود ہوتی تھیں اس لئے ان گرفتار خواتین کو لونڈی بنا کر مرد ان سے بغیر نکاح کے تعلقات رکھتے تھے۔ قرآن اور سنت کے تحت یہ بالکل صحیح ہے۔ بقیہ دو نے بھی انکی تائید کی۔ ان میں سے تو ایک صاحب بہت جوش سے گردن ہلا رہے تھے۔ لقمان صاحب نے ان سے دریافت کیا تو پھر اگر پاکستان کشمیر کی آزادی کے سلسلے میں مقبوضہ کشمیر پہ حملہ کرے اور اسے فتح ہو تو کیا حاصل ہونے والی خواتین کو لونڈی بنانا درست ہوگا۔ مولانا صاحب تھوڑا سا رکے اور کہنے لگے کہ جن ممالک سے ہمارے سفارتی تعلقات ہیں ان سے اقوام متحدہ کے اصولوں کے مطابق بات چیت ہو گی اور اقوم متحدہ اس چیز کی اجازت نہیں دیتی کہ گرفتار خواتین کو لونڈی بنایا جائے۔

اس پہ لقمان صاحب نے کہا کہ اچھا چلیں اسرائیل سے ہمارے سفارتی تعلقات نہیں ہیں۔ اس پہ حملہ کریں اور ہمیں فتح حاصل ہو تو ایسا کرنا درست ہوگا۔ جواب ملا کہ اس صورت میں یہ درست ہوگا۔

تو اے مرد مومن، اب اسرائیل  کی مرمت کرنے میں دیر کس بات کی ہے۔ امریکہ کی ناجائز اولاد کو ایسی ہی سزا دینی چاہئیے جس سے انکی غیرت کا جنازہ نکل جائے۔ لیکن سنا ہے کہ وہ غیرت کے معاملے میں ایسے ہی ہیں جیسا کہ کسی کی نزاکت کے بارے میں سن کر ایک صاحب نے حیرانی سے کہا کہ

سنا ہے کہ انکی کمر ہی نہیں

تو وہ ازار بند کہاں باندھتے ہیں

یعنی سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر بے شمار قتل و غارت گری جو ہمارے یہاں غیرت کے نام پہ کی جاتی ہے وہ اسکے لئے کیا بہانہ کرتے ہونگے۔  یہ ایک علیحدہ موضوع ہے۔

 انکے یہاں غیرت کی عدم موجودگی کے شک کی بناء پہ ایک نامعلوم راوی کہتا ہے کہ فلسطین میں اسرائیلی ریاست کے قیام کے بعد انکی خواتین نے بلا فرق جائز اور ناجائز بچے پیدا کئے کہ انکی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوکیونکہ ہولوکاسٹ کے بعد انکی آبادی بہت کم ہو گئ تھی۔ سو معلوم نہیں کہ اس صورت میں وہ خواتین  اور وہ خود کیا کریں گے۔

کیونکہ  اس اسرائیلی مملکت کی نظریاتی بنیاد ہی 'مرمت کرو اور مذمت کرواءو'  کے نعرے پہ رکھی گئ تھی تو پیدا ہونے والے ہر بچے کو ریاست نے ایک کارآمد شہری بنانے کے لئے مکمل منصوبہ بندی کی۔ اور اس طرح سے وہ بڑے ہو کراتنے اچھے طریقے سے مرمت لگانے کے قابل ہو گئے کہ چنگیز خان بھی انکے سامنے پانی بھرے۔ کون سا پانی، یہ بتانے میں حد ادب مانع ہے۔

 وہیں پہ ایک مبصر کا خیال ہے کہ اگر اسرائیل کی مرمت لگانے کے نتیجے میں جوابی مرمت ہو گئ تو کیا ہوگا۔ ایسا تبصرہ کرنے والے افراد ہی مرمت لگانے کا حوصلہ رکھنے والوں کی ہمت شکنی کرتے ہیں۔ ہم انکی مذمت کرتے ہیں۔ایک مرمت لگانے والا ہی دوسرے مرمت لگانے والے کی نفسیات سمجھ سکتا ہے۔

دعا کرتے ہیں کہ ہمارے یہاں دن رات مرمت کی دھما چوکڑی مچانے والے اسرائیل کے صحن میں کود جائیں تاکہ ہم بھی کسی دن مرمت اور مذمت کے چکر سے باہر نکل کر آرام سے سوچیں کہ آج کیا پکے گا۔

10:12 AM

اسرائیل, اقوام متحدہ, بلینک پوائینٹ, پاکستان, پاکستان میں دہشت گردی, لقمان مبشر

تابکاری، ایک مختصر تعارف-۳

گذشتہ سے پیوستہ

یہ تابکار اشعاع، انسانی جسم کے لئے بے حد خطر ناک ہوتی ہیں کیونکہ ان میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ جسم  میں نفوذ کر کے انسانی جینز میں تبدیلی لے آئیں۔ اس طرح یہ انسانی جسم کے طبعی افعال کو متائثر کر کے مختلف اقسام کے کینسر اور دیگر بیماریوں کا باعث بن جاتی ہیں۔

ان تابکار شعاعوں کی نفوذ پذیری اس طرح ہوتی ہے۔

اس تصویر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایلفا شعاعوں سے بچت تو موٹے کپڑے پہن کر بھی حاصل ہو سکتی ہے لیکن گیما شعاعیں زیادہ تباہ کن ہوتی ہیں۔ یہ لیڈ سے بنی ہوئ موٹی دیوار سے بھی تھوڑا بہت گذر جاتی ہیں۔ اور ان سے بچاءو کے لئے کنکریٹ کی موٹی دیوار استعمال کرنی پڑتی ہے۔

یہ شعاعیں انسانی جسم کو کسطرح متائثر کر سکتی ہیں۔ یہ مندرجہ ذیل تصویر سے پتہ چلتا ہے۔

تابکار عناصر اگر ہمارے ماحول میں موجود ہوں تو ان سے چھٹکارا پانا آسان نہیں۔ اور ہمیں اسکے ایک مستحکم عنصر میں تبدیل ہونے کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ایک تابکار عنصر جب ایک مستحکم عنصر کے مرکز میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ تو  وہ اس میں اپنا مخصوص وقت لیتا ہے۔ صرف ایک ایٹم کو سامنے رکھ کر اسکا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔  اس لئے اسکے بجائے ایک اور طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ جس میں کسی عنصر کی  معلوم مقدار سے یہ پتہ چلاتے ہیں کہ اتنی مقدار میں سے نصف ایٹم کو مستحکم حالت حاصل کرنے میں کتنا وقت لگے گا۔ اسے اس عنصر کی

نصف زندگی

کہتے ہیں۔ یہ نصف زندگی ہر تابکار عنصر کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔ جن عناصر کی نصف زندگی کم ہو وہ بہت جلد اپنی تابکاری خارج کر کے استحکام حاصل کر لیتے ہیں جبکہ جنکی زیادہ ہو انہیں خاصہ عرصہ چاہئیے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس جگہ تابکاری کی آلودگی پھیل جائے۔ اسے بند کر کے انسانوں کے لئے ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے۔ تابکار عناصر کی ایک لسٹ اور انکی نصف زندگی دیکھنے کے لئے

یہاں جائیے۔

نیچے دئیے ہوئے ٹیبل میں یورینیئم 238 آئیسوٹوپ کی فرسودگی سے حاصل ہونے والے عناصر کی زنجیر دی ہوئ ہے۔جو آخر میں لیڈ206 کے مستحکم آئیسوٹوپ پہ ختم ہوتا ہے۔ ساتھ ہی انکی نصف زندگی دی ہوئ ہے۔ جس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یورینیئم کی ایک مخصوص مقدار کو کسی مستحکم عنصر تک پہنچنے میں کتنا عرصہ لگے گا اور اس دوران اس سے کون کون سے عناصر وجود میں آئیں گے۔

اب آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ راجندر محض اپنی جان سے نہیں گیا بلکہ ہر وہ جگہ جہاں وہ اسے لے کر گیا اور

ہر وہ شخص جس نے اسے چھوا

۔ اس نے دراصل تابکاری کا سامنا کیا۔ اور امکان غالب ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو ایک تکلیف دہ انجام سے دو چار ہونا پڑے۔

9:59 PM

Half life, Radioactivity, تابکار عناصر کی فرسودگی, تابکاری, عناصر کی نصف زندگی, یورینیئم کی فرسودگی

تابکاری ایک تعارف-۲

گذشتہ سے پیوستہ

کائنات میں ہر چیز مستحکم حالت یعنی کم توانائ کی حالت میں جانا پسند کرتی ہے اور جا رہی ہے۔ یوں ان  تابکارعناصر کے مرکزے میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ وہ اس زائد توانائ سے چھٹکارا پا کر ایک مستحکم حالت میں چلے جائیں۔

یہ زائد توانائ باردار ذرات یا  شعاعوں کی شکل میں خارج ہوتی ہے یہ شعاعیں ایک خاص کمیت نمبر، ایٹمی نمبر اور چارج کی حامل ہوتی ہیں۔ اور اس طرح تین اقسام کی شعاعیں جنم لیتی ہیں۔

ایلفا شاعیں

؛ جو ہیلیئم کے مرکزے پہ مشتمل ہوتی ہیں۔ اور دو پروٹونز کی وجہ سے دوہرا مثبت چارج رکھتی ہیں، سب سے زیادہ بھاری ہوتی ہیں اور زیادہ دور تک سفر نہیں کر سکتیں۔۔

بیٹا شعاعیں

؛ الیکٹرون اور اسکے ضد ذرے پوزیٹرون  کے ذرات پہ مشتمل ہوتی ہیں۔ ان دونوں کا وزن ایک ہی ہوتا ہے البتہ چارج اور اسپن کا فرق ہوتا ہے۔ اس طرح یہ دونوں پروٹون سے ہلکے ہوتے ہیں۔ الیکٹرون پہ منفی اور پوزیٹرون پہ مثبت چارج ہونے کی وجہ سے یہ دونوں چارج کی حامل ہو سکتی ہیں۔ یہ ایلفا شعاعوں سے ہلکی ہوتی ہیں اور اس لئے انکے مقابلے میں زیادہ دور تک سفر کر سکتی ہیں اور زیادہ اندر نفوذ کر سکتی ہیں۔

گیما شاعیں

؛ خالص توانائ کی شعاعیں ہوتی ہیں۔۔ روشنی رفتار سے سفر کرتی ہیں۔ اور زیادہ توانائ رکھنے کی وجہ سے زیادہ تباہ کن ہوتی ہیں۔ یہ کوئ چارج نہیں رکھتیں۔

ان تینوں کو جن علامتوں سے ظاہر کیا جاتا ہے وہ

شعاعوں کی نفوذ پذیری

کی تصویر میں موجود ہیں۔ ہم یہاں ٹیکنیکلی اس قابل نہیں کہ انکی علامتیں لکھ سکیں۔

شعاعوں کا یا ذرات کا یہ اخراج تابکاری کہلاتا ہے۔ اور یہ عناصر جو اسکا اخراج کرتے ہیں انہیں تابکار عناصر کہتے ہیں۔ یہ اس وقت تک توانائ کا اخراج کرتے ہیں جب تک کسی مستحکم مرکز میں تبدیل نہ ہو جائیں۔ یہ مندرجہ بالا شاعوں میں سے کسی ایک یا مختلف طرح کی شعاعیں ایک وقت میں خارج کر سکتے ہیں اس طرح انکے ایٹمی نمبر اور ایٹمی کمیت نمبرتبدیل ہو جاتا ہے اور وہ ایک اورعنصر میں تبدیل ہو جاتے ہیں جو اپنے مدری عنصر سے مختلف ہوتا ہے۔ یہ شعاعیں، تابکار شعاعیں بھی کہلاتی ہیں۔

جاری ہے۔

8:48 PM

Radioactivity, تابکار شعاعیں،Radiation, تابکاری

تابکاری ایک مختصر تعارف-۱

تقریباً ڈیڑھ مہینے پہلے، انڈیا میں ایک اندوہناک واقعہ پیش آیا۔ یونیورسٹی انتظامیہ نے اس سال یعنی دو ہزار دس،  اپریل کے شروع میں نیلام میں ایک مشین بیچی جو انیس اسّی میں خریدی گئ تھی۔ لیکن کبھی استعمال نہیں ہوئ۔ خریدنے والے کباڑئیے کو مشین کے اندر سے دھاتی پینسلیں ملیں۔ ان پہ موجود حفاظتی تہہ کو جب رگڑ کر ہٹایا گیا تو اندر سے چمکدار دھات نکل آئ۔ اس دھات کی پر اسرار چمک سے

راجندر

کو اندازہ ہوا کہ یہ کوئ قیمتی دھات ہے اور شاید اسکے پیسے بھی زیادہ ملیں۔ وہ اسے اپنی پتلون کی جیب میں ڈالے مختلف ممکنہ گاہکوں کے پاس لے کر گیا تاکہ اسکی صحیح قیمت حاصل کر سکے۔

چھبیس اپریل کو پینتیس سالہ

راجندر یادیو

نے ایک ہسپتال میں پر اسرار علامتوں کے ساتھ زندگی کی جنگ ہار دی۔  وہ مر گیا۔ اسکے ساتھیوں میں سے کچھ اور لوگ بھی بیمار ہوئے، دوکان کے مالک دیپک جین کو انتہائ جلی ہوئ جلد کے ساتھ ہسپتال پہنچایا گیا۔ باقی لوگ بھی شدید زخمی تھے۔ معاملے کی تحقیقات شروع ہوئیں۔

یہ مشین آسیب زدہ نہ تھی، اور نہ ہی وہ دھات کسی مافوق الفطرت مخلوق کی ملکیت تھی۔ وہ دھات ایک تابکار عنصر

کوبالٹ

60

کی تھی۔ یہ کوبالٹ کا ایک

آئسو ٹوپ

ہوتا ہے۔ اس میں سے نکلنے والی تابکاری  نے

راجندر کو موت

سے ہمکنار کیا۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنے ساتھ موت کا آسیب لئے گھوم رہا ہے۔

یہاں سے ان ذہنوں میں ایک سوال پیدا ہوگا کہ تابکاری کیا ہے، جو اس سے واقف نہیں ہیں۔

یہ تحریر، تابکاری کے متعلق ایک مختصر سا تعارف ہے۔

یہ تو آپکو معلوم ہی ہوگا کہ ہماری دنیا مختلف

عناصر

سے مل کر بنی ہے۔ عناصر وہ مرکب ہیں جو ایک ہی قسم کے ایٹموں سے مل کر بنے ہوتے ہیں۔ جیسے

کاربن

صرف ان ایٹموں سے ملکر بنا ہے جن میں الیکٹرون اور پروٹون دونوں چھ ہوتے ہیں،

آکسیجن

میں الیکٹرون اور پروٹون دونوں آٹھ ہوتے ہیں اور

نائٹروجن

ان ایٹموں سے جن میں الیکٹرون اور پروٹون دونوں سات ہوتے ہیں۔

ایٹم کسی عنصر کا بنیادی حصہ ہوتا ہے۔ جو مختلف قسم کے ذرات سے مل کر بنا ہے۔ یہ ذرات بنیادی طور پہ تین طرح کے ہوتے ہیں الیکٹرون، پروٹّون اور نیوٹرون۔

ایٹم

کےمرکز میں نیوٹرونز اور پروٹونز موجود ہوتے ہیں جبکہ مرکز کے اطراف میں الیکٹرونز ہوتے ہیں۔ الکیٹرونز کی تعداد اتنی ہی ہوتی ہے جتنی کہ پروٹونز کی تعداد ہوتی ہے۔  نیوٹرونز کی تعداد پروٹّونز کے برابر بھی ہو سکتی ہے اور زیادہ بھی۔ ان سے کم بہر حال نہیں ہوتی۔

بعض اوقات الیکٹرون اور پروٹون تو تعداد میں ایک ہوتے ہیں لیکن نیوٹرونز کی تعداد اسی عنصر میں مختلف ایٹموں میں مختلف ہوتی ہے۔ انہیں اس عنصر کے

آئسوٹوپ

کہا جاتا ہے۔ جیسے کاربن میں ایک کاربن میں چھ نیوٹرونز ہوتے ہیں اور چھ پروٹونز اس طرح اسکا کمیتی وزن بارہ ہو جاتا ہے اور یہ کاربن 12 کہلاتا ہے۔ دوسرے میں نیوٹرونز آٹھ ہوتے ہیں اور پروٹونز وہی چھ ہوتے ہیں اس طرح اس ایٹم کا کمیتی وزن چودہ ہوجاتا ہے اور اسے کاربن14  کہتے ہیں یوں یہ دونوں کاربن کے

آئسوٹوپس

ہیں یہ بات تو سمجھ میں آگئ ہوگی کہ

آئسوٹوپس

کا ایٹمی نمبر ایک جیسا مگر ایٹمی کمیتی نمبر علیحدہ ہوتا ہے۔ الیکٹرونز پہ منفی، پروٹونز پہ مثبت چارج ہوتا ہے۔ اور نیوٹرونز پہ کوئ چارج نہیں ہوتا۔

 چھوٹے سے مرکزے میں جیسے جیسے پروٹونز کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔  پروٹونز کے اوپر مثبت چارج ہونے کی وجہ سے ایک جیسے چارج رکھنے والے ذرات ایکدوسرے سے بے حد قریب ہوجاتے ہیں اور  ایک دوسرے کو دفع  کرتے ہیں۔ اس حالت میں نیوٹرونز کی موجودگی کی وجہ سے ایک اور قوت جنم لیتی ہے جو دفع کرنے والی قوت کے اثر کو زائل کرتی ہے اوران سب کو جوڑے رکھتی ہے۔ زیادہ ایٹمی نمبر کے عناصر میں نیوٹرونز کی تعداد پروٹونز سے زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اس طرح وہ مرکز کو مستحکم رکھنے میں سرگرمی سے حصہ لینے کے قابل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ کوششیں بھی ایک خاص تعداد سے آگے کامیاب نہیں ہو پاتیں۔  مرکزے میں دفع کی قوتیں زیادہ ہوتی ہیں، اس سے مرکزے کی توانائ زیادہ ہو جاتی ہے اور وہ غیر مستحکم ہوجاتا ہے۔

جاری ہے

8:28 PM

آئسوٹوپ, تابکار شعاعیں, تابکار عناصر, تابکاری, کوبالٹ ۶۰

ایک اور سانحہ

کل جب میں اپنی نئ پوسٹ کا مواد اکٹھا کر رہی تھی تو ٹی وی کی آواز کان سے ٹکرائ۔ کچھ ہلاکتوں کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ دل میں سوچا یا اللہ خیر، اب کون جان سے گیا۔ معلوم ہوا کہ

ستر سے زائد قادیانی افراد

اپنی عبادت سر انجام دیتے ہوئے جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔  اقلیت کے ساتھ اس قدر بہیمانہ سلوک، اسکے بعد ہم شکایت کرتے ہیں کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

دوسری طرف ایک اور سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ جب ہم انہیں  جان اور مال کا تحفظ فراہم کرنے سے قاصر ہیں تو ہم یہ مطالبہ کیوں کرتے ہیں کہ وہ اپنی شناخت کوظاہر کریں۔ کوئ بھی شخص جسے یہ احساس ہو کہ اسکی  مذہبی شناخت، اسکی اور اسکے اہل و عیال کے لئے زندگی کا خطرہ پیدا کر سکتی ہے وہ اسے بتانے میں تامّل کرےگا۔ ریاست اگر اقلیت کو تحفظ نہیں دے گی تو وہ ان قوتوں کے ایجنٹ بنیں گے جو مملکت کو غیر مستحکم بنانا چاہتے ہیں۔

اسی طرح ہم دوسرے ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت میں موجود ہیں ان سے مسلمانوں کی جان و مال کا تحفظ مانگنے کا حق کیسے رکھ سکتے ہیں۔ جو کام ہم کرنے سے قاصر ہیں اسکے لئے دوسروں کے پاس بھی بالکل وہی بہانے ہونگے جو ہمارے پاس ہوتے ہیں۔

ڈان  اخبار کے ایڈیٹوریئل کے مطابق

، جائے وقوعہ پہ ٹی وی سے تعلق رکھنے والے افراد، پولیس کے پہنچنے سے پہلے موجود تھے۔

دہشت گردوں کا تعلق جنوبی پنجاب

سے بتایا جاتا ہے یہ وہ جگہ ہے جہاں عرصہ ء دراز سے مذہبی شدت پسندوں کی سرگرمیاں جاری ہیں اور حکومت پنجاب ان پہ کسی بھی قسم کی قدغن لگانے سے معذور نظر آتی ہے۔ پنجاب میں شریف برادران کے ان انتہا پسند گروہوں سے تعلقات اتنے بڑھے ہوئے ہیں  کہ انہوں نے، ان علاقوں سے حالیہ ضمنی الیکشنز جیتنے کے لئے ان گروہوں کہ حمایت لینے سے بھی دریغ نہیں کیا۔

انکے اس انتہائ اقدام کی وجہ سے پنجاب میں جو صورت حال جنم لے رہی ہے اور جس طرح گذشتہ چند مہینوں میں لاہور میں دہشت گردی کے پے درپے واقعات ہوئے ہیں۔ اس میں تنقید نگار اب پنجاب کو

طالبنائیزیشن کا پوٹینشل بم

کہہ رہے ہیں۔

مرنے والوں کے ساتھ ہماری ہمدردیاں ہیں، یہ ایک نہایت سفاک واقعہ ہے۔ اگرچہ کہ حکومت ایسے کسی مسئلے میں دلچسپی لیتی نظر نہیں آتی، جس کا تعلق عوام سے یا مفاد عامہ سے ہو۔ لیکن پھر بھی ہم وہی روائیتی جملے تو دوہرا سکتے ہیں کہ ان ظالموں کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ جو جان سے گذر گئے۔ انہیں واپس نہیں لایا جا سکتا۔ لیکن ہم اپنے لوگوں کو تو کہہ سکتے ہیں کہ خدا کے لئے رواداری کے سبق کو اپنا لیں۔ اور کسی سے نہیں خدا سے ہی یہ سبق سیکھ لیں۔ وہ اپنے سب سے نافرماں برادر شخص کو بھی دنیا کی ہر نعمت سے مالا مال رکھتا ہے۔ اسکی زندگی کی بھی حفاظت کرتا ہے اور اسکے جینے کا سامان بھی پیدا کرتا ہے۔

1:10 PM

دہشت گردی, قادیانی, لاہور, لاہور میں قادیانیوں کا قتل

انکار یا فرار

گوگل سرچ انجن

نے انیس سو چھیانوے میں کام کرنا شروع کیا۔ اس تحریر کو پڑھنے والے لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس بات سے واقف ہوگی کہ اس سے پہلے معمولی سی بات کو جاننے کے لئے لائبریریوں کے چکر لگانے پڑتے تھے۔ اور اگر وہاں متعلقہ مواد موجود نہ ہو تو کسی بھی سنی سنائ بات سے آگے بات بڑھ نہ پاتی تھی۔ اس نئ ٹیکنیک نے دنیا میں معلومات کی ترسیل کا انداز ہی بدل دیا۔ اور آج دنیا کے کسی حصے میں کیا ہو رہا ہے اسکا علم صرف چند سیکنڈز میں ہمارے پاس ہوتا ہے۔ لیکن جس طرح سے یہ علم عام انسان کی فلاح کے لئےکام آرہا ہے وہاں شر پسند بھی اسکے مناسب استعمال کے طریقے ڈھونڈھتے رہتے ہیں یوں طبل جنگ اب  میدان جنگ میں نہیں بلکہ ایک ایسے مجازی میدان جنگ میں بھی ہو سکتا ہے جہاں ہمارا حریف دنیا کے کسی بھی حصے میں ہو سکتا ہے۔ اگر ہم اسکی سواری کے ماہر نہیں تو یہ ممکن ہے کہ ہم آگے بڑھنے سے پیشتر خود ہی ناکام ہو جائیں۔ اور نتیجے میں میدان بلا مقابلہ ہمارے حریف کے ہاتھ رہے۔

لیکن نہیں ایک صورت یہ بھی ہے کہ ہم اس ٹیکنیک کو استعمال کرنے سے انکار کر دیں اور نتیجے میں رضاکارانہ طور پہ یہ میدان اپنے حریف کے حوالے کر کے خود بغلیں بجائیں۔

ٹیکنالوجی کی  اس ترقی سے ملکوں کے سیاسی معاملات میں دوسری طاقتوں کے نفوذ و اثر کا امکان زیادہ بڑھ گیا۔ اور ایسا بھی ہوا کہ مختلف ممالک میں انکی دسترس پہ پابندی لگائ گئ۔ جیسے

فیس بک پہ پابندی

۔ اب تک پانچ ممالک اس پہ پابندی لگا چکے ہیں۔ ان میں چین، ایران، شام، ویتنام اور پاکستان شامل ہیں۔ پاکستان کے علاوہ باقی تمام ممالک نے مختلف اوقات میں اپنے اندرونی معاملات میں بیرونی عناصر کے اثر کو کم کرنے کے لئے یہ انتہائ قدم اٹھایا۔

چین

وہ واحد ملک ہے جہاں  سن دو ہزارنو میں لگائ جانیوالی

فیس بک پہ پابندی

آج بھی موجود ہے۔ چین کی آبادی اس وقت سوا ارب کے قریب ہے۔ اس پابندی سے چین میں ایک عام انٹر نیٹ صارف کے متائثر نہ ہونے کی وجوہات میں جو چیزیں اہم ہیں وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں چین کی خود انحصاری ہے۔ وہ انٹر نیٹ کے سلسلے میں اپنا انفرا اسٹرکچر رکھتے ہیں۔ دوسری اہم وجہ چین میں چینی زبان کی ترویج ہے یوں بیرونی ذرائع جو کہ زیادہ تر انگریزی میں ہوتے ہیں وہاں زیادہ پذیرائ حاصل نہیں کر پائے۔ اس سب کے باوجود

آزاد ذرائع

کہتے ہیں کہ

پروکسی سرور

کے ذریعے فیس بک تک رسائ حاصل کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد چین میں اب بھی فیس بک سے مستفید ہو رہی ہے۔ اور یوں فیس بک کو اس سلسلے میں کوئ بہت زیادہ نقصان نہیں ہے۔

دنیا بھر میں نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد اس وقت انٹر نیٹ استعمال کر ہی ہے۔ اگر ہم اپنے ملک میں ہی دیکھیں تو اس وقت اسے استعمال کرنے والوں میں نوجوان ہی زیادہ شامل ہیں۔ یہ بھی ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ اس ٹیکنالوجی کے مختلف حصوں کو نوجوانوں نے ہی ترتیب دیا۔ یوں ثابت ہو گیا کہ ہر عہد اپنے نوجوانوں کا ہوتا ہے۔

مارک ایلیئٹ زکربرگ

، نیویارک میں انیس سو چھیاسی میں پیدا ہوا۔ نسلاً یہودی اور مذہباً دہریہ ہے۔ فیس بک کے بانیوں میں سے ایک ہے۔ شاید اسی وجہ سے مسلمان فیس بک کو یہودیوں کی سازش قرار دیتے ہیں۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ ہمارے مایہ ناز کرکٹر

عمران خان

نے ایک

یہودی النسل خاتون

کو  مسلمان کر کے شادی کی۔ اس طرح یہودیوں سے بننے والے تعلقات کے نتیجے میں انکے کینسر کے لئے قائم ہسپتال کو کافی ڈونیشنز ان ذرائع سے ملیں۔ لیکن اسے یہودیوں کی سازش نہیں سمجھا جاتا۔ اس وقت

مارک

کی ذاتی جائداد کی مالیت چار ارب امریکی ڈالر ہے۔ اسکے دیگر ساتھیوں میں شامل ہیں،

ایڈوآرڈو سیورن

،

ڈسٹن ماسکووٹس

،

کرس ہیوز

، یہ سب لوگ اسّی کی دھائ میں پیدا ہونے نوجوان ہیں۔

انیس سو اٹھتر میں پیدا ہونے والا

اسٹیون شی چن

، آٹھ سال کی عمر میں تائیوان سے ہجرت کر کے امریکہ پہنچا۔

پےپل

میں دوران ملازمت  اسکی ملاقات

چیڈ ہرلے

اور

جاوید کریم

سے ہوئ اور یوں سن  ۲۰۰۵ میں

یو ٹیوب

وجود میں آئ۔

چیڈ ہرلے

، امریکہ میں انیس سو چھتّر میں پیدا ہوا۔

جاوید کریم

، انیس انّاسی میں جرمنی میں پیدا ہوا۔ اسکے والد کا تعلق بنگلہ دیش سے تھا جو جرمنی میں ایک تحقیقداں کے طور پہ کام کر رہا تھے۔ جبکہ اسکی ماں ایک جرمن سائینسداں تھی۔

جب

یوٹیوب

کو گوگل کے حوالے کیا گیا تو

اسٹیون

کو تین سو پچاس ملین امریکی ڈالر مالیت کے شیئرز ملے۔

چیڈ ہرلے

کو تین سو چھبیس ملین امریکی ڈالر اور

جاوید کریم

کے حصے میں چونسٹھ ملین امریکی ڈالر کی مالیت کے شیئرز آئے۔

گوگل ویب بیسڈ سرچ انجن کی بنیاد دو پی ایچ ڈی کرنے والے اسٹوڈنٹس نے انیس سو چھیانوے میں رکھی۔ یہ انکا پی ایچ ڈی کا پروجیکٹ تھا۔ جسکا مقصد ایک یونیورسل ڈیجیٹل لائبریری کا قیام تھا۔ یہ دو طالب علم تھے لارنس اور سرجے۔

لارنس لیری پیج

انیس سو تہتر میں امریکہ میں پیدا ہوا۔ اسکا ساتھی

سرجے برن

بھی انیس سو تہتر میں،  روس میں پیدا ہوا اور چھ سال کی عمر میں امریکہ ہجرت کر گیا۔

فوربس

کے مطابق وہ دونوں اس وقت دنیا کے چوبیسویں امیرترین اشخاص ہیں۔ اور انکی ذاتی دولت کا شمار ساڑھے سترہ ارب امریکی ڈالر لگایا جاتا ہے۔ یہ دولت انکے پاس اپنے پروجیکٹ میں کامیاب ہونے کی صورت میں آئ جسکا نتیجہ آج ہم گوگل کی صورت دیکھتے ہیں۔

ان نوجوانوں نے نہ صرف  اپنی صلاحیتوں کو بہترین طور پہ استعمال کیا، دولت کمائ بلکہ آج کی دنیا میں انسانی ترقی اور تاریخ کا رخ اور رفتار موڑ دی۔ یہ وہ نوجوان ہیں جنہیں یہ قوت حاصل ہے کہ وہ آجکی دنیا پہ اثر انداز ہو سکیں۔

اب ہم اپنے یہاں ستر اور اسّی کی دھائ میں پیدا ہونے والے لوگوں کو دیکھتے ہیں ۔ کیا واقعی انہیں ان نوجوانوں سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار کیا گیا۔ جنکا تذکرہ میں نے اس طویل تحریر میں کیا ہے۔ یہ جو موجودہ رویہ ہمیں اپنے نوجوانوں کا نظر آتا ہے۔ یہ کسی احساس محرومی کی وجہ سے ہے، احساس ذمہ داری سے بھاگنے کی وجہ سے ہے یا مقابلے کی فضا میں فرار حاصل کرنے کی وجہ سے ہے۔

7:52 AM

pakistan, انٹرنیٹ پہ پابندی, پاکستان, چین, عمران خان, فیس بک پہ پابندی, گوگل سرچ انجن, یوٹیوب

ردّ شر

یوروپ ایک مدت تک اسلام کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے جاننا چاہا تو مدت دراز تک عجب حیرت انگیز مفتریانہ خیالات اور توہمات میں مبتلا رہا۔ ایک یوروپین مصنف لکھتا ہے

عیسائیت اسلام کی چند ابتدائ صدیوں تک اسلام پر نہ تو نکتہ چینی کر سکی اور نہ سمجھ سکی۔ وہ صرف تھراتی اور حکم بجا لاتی تھی۔ لیکن جب قلب فرانس میں عرب پہلے پہل روکے گئے تو انکی قوموں نے جو انکے سامنے سے بھاگ رہی تھیں۔ منہ پھیر کر دیکھا جس طرح کہ مویشیوں کا گلّہ جبکہ اسکا بھگا دینے والا کتا دور نکل جاتا ہے۔

یوروپ نے مسلمانوں کو جس طرح جانا اسکو فرانس کا مشہور مصنف ہنری دی کاستری جسکی تصنیف کا عربی زبان میں ترجمہ ہو گیا ہے یوں بیان کرتا ہے

وہ تمام قصص اور گیت جو اسلام کے متعلق یوروپ میں قرون وسطی سے رائج تھے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ مسلمان انکو سن کر کیا کہیں گے؟ یہ تمام داستانیں اور نظمیں ، مسلمانوں کے مذہب کی ناواقفیت کی وجہ سے بغض و عداوت سے بھری ہوئ ہیں۔ جو غلطیاں اور بد گمانیاں اسلام کے متعلق آج تک قائم ہیں انکا باعث وہی قدیم معلومات ہیں۔ ہر مسیحی مسلمانوں کو مشرک اور بت پرست سمجھتا تھا اور حسب ترتیب درجات انکے تین خدا تسلیم کئے جاتے تھے۔ ماہوم یا ماہون یا نافومیڈ یعنی محامڈ اور اپلین اور تیسرا ٹرگامان۔ انکا خیال تھا کہ محمد نے اپنے مذہب کی بنیاد دعوائے الوہیت پر قائم کی  اور سب سے عجیب تر یہ ہے کہ محمد یعنی وہ محمد جو  بت شکن اور دشمنان اصنام تھا لوگوں کو اپنے طلائ بت کی دعوت دیتا تھا۔

اسپین میں جب عیسائ مسلمانوں پہ غالب ہوئے اور انکو سرقوسطہ کی دیواروں تک سے ہٹا دیا تو مسلمان لوٹ  کر آئے اور اپنے بتوں کو انہوں نے توڑ ڈالا۔ اس عہد کا ایک شاعر کہتا ہے کہ

اپلین مسلمانون کا دیوتا وہاں ایک غار میں تھا۔ اس پر وہ پل پڑے اور اسکو نہایت سخت سست کہا۔ اور اسکو گالیاں دیں اور اسکے دونوں ہاتھ باندھ کر ایک ستون پر اسکو سولی دی اور اسکو پاءوں سے روندا اور لاٹھیوں سے مار مار کر اسکے ٹکڑے کر ڈالے اور ماہوم کو یعنی جو انکا دوسرا دیوتا تھا۔ ایک گڑھے میں ڈالدیا اسکو سور اور کتوں نے نوچ ڈالا۔ اس سے زیادہ اس سے پہلے کسی دیوتا کی تحقیر نہیں ہوئ ۔ اسکے بعد مسلمانوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور اپنے دیوتاءووں سے معافی مانگی اور ازسرنو تلف شدہ بتوں کو بنایا۔ اسی بناء پہ جب شہنشاہ چارلس سر قوسطہ میں داخل ہوا تو اس نے اپنے ہمراہیوں کو حکم دیا کہ تمام شہر کا چکر لگائیں ، وہ مسجدوں میں گھس گئے اور لوہے کے ہتھوڑوں سے ماہومیڈ اور تمام بتوں کو توڑ ڈالا۔

ایک دوسرا شاعر ریچہ خدا سے دعا کرتا ہے کہ

وہ ماہوم کے بت کے پجاریوں کو شکست دے

اسکے بعد وہ امراء کو جنگ صلیبی کے لئے ان الفاظ میں آمادہ کرتا ہے

اٹھو اور ماہومیڈ اور ٹرماگان کے بتوں کو اوندھا کر دو اور انکو آگ میں ڈالدو اور انکو اپنے خداوند کی نذر کردو

اس قسم کے خیالات ایک مدت تک قائم رہے۔

اٹھارہویں صدی میں نادر الوجود عربی کتابوں کے بعد یوروپ اس قابل ہوا کہ اسلام کے متعلق خود اسلام کی زبان سے کچھ سن سکا۔

اس دور کی خصوصیت اول یہ ہے کہ عامیانہ خیالات کے بجائے کسی قدر تاریخ اسلام و سیرت پیغمبر اسلام کی بنیاد عربی زبان کی تصانیف پر قائم کی گئ۔ یوروپی مصنفین یا انکی تصنیفات میں جو نکتہ چینیاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق پہ کی جاتی ہیں یا جو خودبخود ناظرین کے دل میں پیدا ہوتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

رسول اللہ کی زندگی مکہ معظمہ تک پیغمبرانہ ہے لیکن مدینہ جا کر جب زور وقوت حاصل ہوتی ہے تو دفعتہً پیغمبری شاہی میں بدل جاتی ہے۔ اور اسکے جو لوازم ہیں یعنی لشکر کشی، قتل، انتقام، خونریزی خود بخود پیدا ہوجاتے ہیں۔

 کثرت ازدواج اور میل الی النّساء

مذہب کی اشاعت جبر اور زور سے

لونڈی غلام بنانے کی اجازت اور اس پر عمل

دنیا داروں کی سی حکمت عملی اور بہانہ جوئ

یہ تھا اقتباس، مولانا شبلی نعمانی کی کتاب 'سیرت النبی؛ کی جلد اول سے۔ جس میں مولانا صاحب نے تفصیلات دیتے ہوئے یہ وضاحت کی کہ کیوں انہیں سیرت النبی پہ اتنی تفصیلی کتاب لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئ۔

   معزز قارئین، اس تمام چیز سے نتائج اخذ کرنے کی ذمہ داری میں آپ پر چھوڑتی ہوں۔ مگر یہ ضرور چاہونگی کہ جو بھی نتیجہ آپ نکالیں اسے اپنے تبصرے میں ضرور تحریر کریں۔

8:24 PM

Islam in Europe, Shibli Nomani, سیرت النبی, علامہ شبلی نعمانی, یوروپ میں اسلام

عام لوگ، خاص باتیں

عدالت کے مشورے پہ مستعفی ہونے والے

جمشید دستی

دوبارہ الیکشن میں  اٹھ کھڑے ہوئے اور تقریباً پچپن ہزار عوامی ووٹوں سے جیت کر دوبارہ اسمبلی میں موجود ہیں۔ معلوم نہیں کہ یہ توہین عدالت کے زمرے میں آتا ہے کہ نہیں۔ لیکن میرا دل اس پہ بہت کڑھا۔ بہت سارے دیگر لوگوں کو بھی صدمہ ہوا اور انہوں نےبرملا اپنی تحریروں میں اسکا اظہار کیا۔  لیکن عوامی عدالت نے یہ فیصلہ مسترد کر دیا۔ اپنے ایک وکیل ساتھی سے مشورہ لوں کہ اپنے دل کڑھنے کا کیا کروں تو وہ یہی کہیں گے کہ عدالت سے دوبارہ رجوع کریں۔

لیکن میں  ایسا نہیں کر رہی ، اسکی بہت ساری ٹیکنیکل وجوہات ہں جنکا آپکو اندازہ ہوگا۔ اور اس طرح میں بھی  تماش بینوں میں شامل ہوں۔ میں ان تماش بینوں میں بھی شامل ہوں جو ایک بلاگر  کی کراچی پریس کلب میں شامت آتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ انہوں نے توہین عدالت کی اور یہ بھی درست ہے کہ انہیں عدالتی فیصلے کے خلاف عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہئیے تھا۔

ہمارے ایک اور ساتھی نے اس امرپہ افسوس کا اظہار کیا کہ پاکستان میں لبرل مسلمان زیادہ ہو گئے ہیں۔ ابھی کل ہی میری سوفٹ ویئر ہائوس میں کام کرنے والے ایک شخص سے بات ہو رہی تھی۔ انہوں نے کہا کہ چار سال پہلے جو شخص ہمارے یہاں کلین شیو اور پینٹ شرٹ میں ملبوس آیا تھآ۔ آج وہ ایک بالشت کی داڑھی، سر پہ ٹوپی گھٹنوں سے نیچی جبہ نما قمیض اور ٹخنوں سے اوپر شلوار کے ساتھ موجود ہے۔ انکے بقول یہ صرف ایک شخص نہیں بلکہ میرے آفس میں اب ستر فی صد لوگ اس سے ملتے جلتے حلئیے میں ہیں جو نہیں ہیں وہ اندر سے ایسے ہی  ہیں جیسا کہ یہ اصحاب ظاہری طور پہ ہیں۔

انکے اس بیان سے تو لگتا ہے کہ یہ تائثر صحیح نہیں ہے کہ لبرل مسلمان بڑھ رہے ہیں۔

مزید انہوں نے کہا کہ لیکن اس ظاہری حلئے کی تبدیلی اور بعض موضوعات میں اپنے شدت پسند نطریات کے علاوہ ان میں وہ ہر برائ موجود ہے جو ایک نالائق، کم محنتی قوم کے افراد میں ہوتی ہے۔  ان میں جو صاحب نوے ہزار روپے ماہانہ لے رہے ہیں انہوں نے امریکہ میں مقیم ہمارے ایک پاکستانی مسلمان کلائینٹ کو جو پروجیکٹ تیار کر کے دیا ۔ اس میں کلائینٹ نے دو چار غلطیاں نکالیں ان صاحب نے دن بھر بیٹھ کر انہیں صحیح کیا اور شام کو اس کلائینٹ کو ای میل کیا کہ ہم نے اس پروجیکٹ کو اچھی طرح دیکھ لیا ہے اس میں ایسی کوئ غلطی نہیں ہے وہ اسے دوبار دیکھے۔ یہ ایک جھوٹ تھا انہوں نے اس غلطی کو درست کیا تھا لیکن سچ کا اعتماد دینے والے اس ظاہری حلئے سے قطع نظر انہوں نے بلا جواز جھوٹ بولا۔ انکے افسر مجاز ان تمام لوگوں کی ایسی غلطیوں اور نااہلیوں کے لئے ڈھال بنے رہتے ہیں کیونکہ انکے رحجانات ملتے جلے ہیں۔ اور نتیجے میں ہماری کمپنی  چھ سال  پہلے جو معیار رکھتی تھی اب اسکا پچاس فی صد بھی نہیں رہا ہے۔

میں ایک عام پاکستانی مسلمان انٹر نیٹ یوزر سے پوچھتی ہوں کسی مسلم ملک میں یہ پابندی نہیںلگائ گئ۔ آپکا کیا خیال ہے یہاں کیوں ہے۔ جواب ملتا ہے کسی اور مسلم ملک میں صدر زرداری نہیں ہے۔ میں ان سے کہتی ہوں کہ لیکن آپکا یہ بیان جمہوریت کے خلاف سازش ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ بھاڑ میں جائے ایسی جمہوریت۔ لیکن میں اسکے بھاڑ میں جانے سے پہلے ہی اسکی راہ میں دیوار بن جاتی ہوں۔ اگر جمہوریت سے آپکو مطلوبہ نتائج نہیں مل رہے ہیں تو اسکا علاج ہے مور ڈیموکریسی، سمجھے آپ۔ مور ڈیموکریسی۔ دو جوتوں کی کمی تھی ورنہ اسکے بیچ میں مجھے سیج دیتے۔ مور ڈیمو کریسی۔

 ان لوگوں سے ہٹ کر اتوار کا اخبار اٹھاتی ہوں۔ ڈان، جنگ، ایکسپریس، کسی بھی اخبار میں کوئ ایسا ایسا نامی گرامی کالم نگار یاد نہیں آرہا جسکا اتوار کے اخبار میں اسکے متعلق کوئ مضمون ہو۔ حالانکہ اتوار کے اخبار میں کوئ مضمون آنا بڑا اہم ہوتا ہے۔ یہ سب شاید روشن خیال ہو چکے ہیں، یا یہ سب لبرل مسلمان ہو گئے ہیں۔ اور اصلی تے وڈے اور سُچے مسلمان صرف بلاگنگ اور خاص طور پہ اردو بلاگنگ کی دنیا میں نظر آتے ہیں جنہوں نے اپنے روائیتی طریقہ ء کار کو استعمال کرتے ہوئے جلدی سے روشن خیال ، لبرل اور قدامت پسند مسلمانوں کی صف بندی کر کے گنتی کر لی۔ سب پورے ہیں۔ خیر ہے۔

یہ اپنی جگہ ایک سوال ہے کہ کیوں ایسا ہوا کہ اس تمام چیز کے لئے جو ریلیاں منعقد کی گئیں ان میں سولہ ، سترہ کروڑ عوام میں سے، سولہ سو لوگ بھی موجود نہ تھے۔

ہمارے ایک ساتھی نے اپنی تحریر میں مصری علماء کا فتوی لگایا کہ فیس بک حرام ہے۔ کیونکہ اسکی وجہ سے میاں بیوی کے درمیان طلاقوں کی شرح میں ا ضافہ ہوا ہے۔

ایک اور فتوی

انڈین دیو بندی مسلم علماء

کی طرف سے جاری ہوا کہ وہ عورتیں جو ان آفسز میں کام کرتی ہیں جہاں مرد بھی ساتھ کام کرتے ہیں ان عورتوں کی کمائ حرام کی کمائ ہے۔ انہیں فی الفور اپنی ملازمتیں چھوڑ دینی چاہئیں۔ انڈیا وہ ملک ہے جہاں تیس فیصد سے بھی زیادہ عوام غربت کی سطح سے نیچے زندگی گذار رہے ہیں۔ اور جہاں مسلمان اس وقت ایک اقلیت میں ہیں۔ اس اقلیت میں مسلمان عوام کی اکثریت جنکے بارے میں مجھے نہیں معلوم کہ وہ  نحوست مارے روشن خیال ہیں، لبرل ہیں یا قابل فخر قدامت پسند انہوں نے اس فتوی کے خلاف نکتہ چینی کی اور ان علماء کو یہ کہنا پڑا کہ یہ انہوں نے فتوی نہیں دیا بلکہ کسی کے پوچھنے پہ مشورہ دیا تھا۔

میرا خیال ہے کہ کسی مسئلے کا سامنا کرنے کے لئے محض ایسے فتاوی کو پیش کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس سے آپ اپنے فتووں کی حیثیت خود ہی کم کر دیتے ہیں۔

میرے سوفٹ ویئر ہاءوس والے ساتھی کا کہنا ہے کہ انکے کولیگ نے جو آئ ٹی کے شعبے سے متعلق ہونے کی وجہ سے نوے ہزار ماہانہ کماتے ہیں کہا کہ فیس بک اور دیگر سائیٹس پہ پابندی اس کرپٹ حکومت کا وہ واحد فیصلہ ہے جو مسلم حکومت کا فیصلہ لگتا ہے اور یہ کہ ایک مسلمان کو ہر وقت اپنا دنیاوی فائدہ نہیں اس سے بڑھ کر بھی دیکھنا چاہئیے۔

وہ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ اگر اس بندش کے نتیجے میں کمپنی کو پہنچنے والے معاشی نقصان کو انکی تنخواہ میں سے کاٹ لیا جائے تو کیا وہ یہ قربانی دیں گے۔

 میں جواب دیتی ہوں ان سے پوچھیں۔ وہ حیران ہو کر کہتے ہیں ان سے پوچھوں۔ یہ توایسا ہی ہوگا کہ کسی چرچ میں دہریت کی تعلیم دینے لگوں، ہائیڈل پارک میں طالبان کو برا بھلا کہوں، نائن زیرو میں الطاف حسین کو برا کہوں۔ کیا آپ کو یاد نہیں کراچی پریس کلب میں

عواب علوی

کے ساتھ کیا ہوا؟

وہی جو ایک شہرت کی خواہش رکھنے  والا دوسرے شہرت کی خواہش رکھنے والے کے ساتھ کرتا ہے۔ جبکہ میدان شہرت ایک ہی ہو۔ کسی اور نے لقمہ دیا۔ یقین رکھیں وہ 'کوئ اور'  میں نہیں تھی۔

ہمارے ایک ساتھی کے خیال میں کتنے لوگ انٹر نیٹ استعنمال کرتے ہیں کہ اسکے بند ہونے سے جہالت پھیل جائے گی۔ میرا حسن ظن ہے کہ انہوں نے مذاقاً کہا ہے۔ جنکے مقدر میں جہالت لکھ دی گئ ہے انکے علاوہ پاکستان کی سولہ کروڑ کی آبادی میں پونے دو کروڑ لوگ انٹر نیٹ استعمال کرتے ہیں۔ اگر آپ اس چیز کے حق میں ہیں کہ انٹر نیٹ کی تمام سائیٹس پہ پابندی لگا دی جائے تو آپ کتنے لوگوں کو جاہل بنانے پہ تلے ہوئے ہیں۔ اسکا اب آپکو علم ہو گیا ہوگا۔

اب ان ساری باتوں کا یہاں لکھنے کا مقصد ان سب چیزوں کا آموختہ نہ تھا بلکہ اپنے اصل موضوع کی طرف آنے سے پہلے یہ سب بیان کرنا ضروری تھا۔ آگے کی باتیں، آگے کی پوسٹ میں۔

11:29 AM

فیس بک ی بندش، پاکستان، الطاف حسین، عواب علوی،جمشید دستی، انٹر نیٹ،face book banned in Pakistan

خوشامد -۲

دل خوشامد سے ہر ایک کا راضی ہے

آدمی جن و پری بھوت بلا راضی ہے

بھائ فرزند بھی خوش باپ چچا راضی ہے

شاہ مسرور غنی شاد گدا راضی ہے

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے

سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

اپنا مطلب ہو تو مطلب کی خوشامد کیجئیے

اور نہ ہو کام تو اس ڈھب کی خوشامد کجیئیے

انبیاء اولیا اور رب کی خوشامد کیجئیے

اپنے مقدور غرض سبکی خوشامد کیجئیے

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے

سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

چار دن جسکو خوشامد سے کیا جھک کے سلام

وہ بھی خوش ہو گیا اپنا بھی ہوا کام میں کام

 بڑے عاقل بڑے دانا نے نکالا ہے یہ دام

خوب دیکھا تو خوشامد ہی کی آمد ہے تمام

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے

سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

مفلس ادنی و غنی کی بھی خوشامد کیجئِے

یا بخیل اور سخی کی بھی کوشامد کیجیئے

اور جو شیطاں ہو تو اسکی بھی خوشامد کیجیئے

گر ولی ہو تو ولی کی بھی خوشامد کیجیئے

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے

سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

پینے اور پہننے کھانے کی خوشامد کیجیئے

ہیجڑے بھانڈ زنانے کی خوشامد کیجیئے

مست و ہشیار و دوانے کی خوشامد کیجیئے

بھولے نادان سیانے کی خوشامد کیجیئے

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے

سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

خوب دیکھا تو خوشامد کی بڑی کھِتی ہے

غیر کیا اپنے ہی گھر بیچ یہ سکھ دیتی ہے

ماں خوشامد کے سبب چھاتی لگا سیتی ہے

نانی دادی بھ خوشامد سے بلا لیتی ہے

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے

سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

بی بی کہتی ہے میاں آ ترےصدقے جاءوں

ساس بولے کہیں مت جا ترے صدقے جاءوں

خالہ کہتی ہے کہ کچھ کھا ترے صدقے جاءوں

سالی کہتی ہے بھیّا ترے صدقے جاءوں

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے

سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

آپڑا ہے جو خوشامد سے سروکار اسے

ڈھونڈھتے پھرتے ہیں الفت کے خریدار اسے

آشنا ملتے ہیں اور چاہتے ہیں سب یار اسے

اپنے بیگانے غرض کرتے ہیں سب پیار اسے

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے

سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

جو کہ کرتے ہیں خوشامد وہ بڑے انساں

جو نہیں کرتے وہ رہتے ہیں ہمیشہ حیراں

ہاتھ آتے ہیں خوشامد سے ہزاروں ساماں

جس نے یہ بات نکالی ہے میں اسکے قرباں

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے

سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

ہم نے ہر دل میں خوشامد کی محبت دیکھی

پیار اخلاص و کرم مہر ومحبت دیکھی

دل بروں میں بھی خوشامد ہی کی الفت دیکھی

عاشقوں میں بھی خوشامد ہی کی چاہت دیکھی

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے

سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

اس نظم کے خالق نظیر اکبر آبادی ہیں۔

حوالہ جات؛

کلیات نظیر، مولانا عبدالباری صاحب آسی نے مرتب و مدون کیا، پبلشر، مکتبہ ء شعر و ادب لاہور۔

نظیر اکبر آبادی کا ایک شعر

خوشامد-۱

تربوز اور محبوب

12:35 PM

Nazir Akbar Abadi, خوشامد, نظیر اکبر آبادی

خوشامد-۱

خوشامد کسے اچھی نہیں لگتی۔ لیکن اگر کسی کو خوشامدی کہہ دیا جائے تو یہ بڑی غیر اخلاقی بات ہوتی ہے۔ اس طرح سے لگتا ہے کہ خوشامد ایک برا پہلو ہے انسانی ذات کا۔

وارث میر اپنی کتاب 'حریت فکر کے مجاہد' میں پاکستانی معاشرے کی تنزلی کے دو اسباب گنواتے ہیں ایک جھوٹ اور دوسرا خوشامد۔ انکے اس مضمون میں سے لئیے گئے کچھ اہم نکات پہ آگے کی تحریر ہے۔

علامہ اقبال اپنی نوٹ میں خوشامد کو ایک مبالغہ آمیز خوش خلقی کا نام دیتے ہیں سر سید نے بھی اپنے مضامین میں اسکی مذمت کی ہے۔لیکن جدید تشریحات اسے ایک قابل قبول عنصر بناتی ہیں۔

ہمارے ایک ادیب اظہر ادیب نے اس پہ انشائیہ لکھا۔ اسکا نام ہے در مدح خوشامد۔ بقول وارث میراس سے نہ اتفاق کرنے کو جی مانتا ہے اور نہ اختلاف کرنے کی ہمت ہوتی ہے۔

خوشامد وہ لوری ہے جو انسان کے وحشی پن کو سلا دیتی ہے اور صبح کی پہلی کرن بن کر معصومیت کے گلابی گالوں کو چھوتی ہے اور اسے بیدار کرتی ہے۔ خوشاد کرنے والا شاید ہی کسی جابر آدمی سے زک اٹھاتا ہووہ ہر آن انسان کومہذب ہونے کا درس دیتا ہے۔ خوشامد کرنے والے کو اپنی جھوٹی انا سے زیادہ اپنے بچوں کا مستقبل عزیز ہوتا ہے۔ وہ ایک منجھے ہوئے کھلاڑی کی طرح خود کو کیموفلاج کئے رہتا ہے اور اپنی حکمت عملی سے نہ صرف خلق خدا کو فساد سے بچائے رکھتا ہے بلکہ خود بھی تلوار اٹھائے بغیر اپنی جگہ محفوظ رہتا ہے۔اور کبھی شکست کا منہ نہیں دیکھتا۔

لیکن یہ صلاحیت ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کے حصے میں نہیں آتی اسکے لئے بھی فہم و دانش درکار ہوتی ہے۔ خوشامد کرنے والے کا قیافہ شناس اور ماہر نفسیات ہونا ضروری ہے۔ انسانی چہرے کی تحریر پڑھنے والا ہی اس اعلی مقام تک پہنچنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس مقام کو حاصل کرنے والے سے لوگ حسد کرنے لگتے ہیں۔ اور اس قابل تعظیم شخص کو خوشامدی کا نام دے دیتے ہیں۔

مجھے ہمیشہ ان لوگوں سے چڑ رہی ہے جو کہتے ہیں کہ انہوں نے کبھی خوشامد نہیں کی۔ حالانکہ زندگی کے خاکے میں سے خوشامد کا رنگ اڑ جائے تو بے رنگ لکیروں کے سوا کچھ نہیں بچتا۔

خوشامد وہ علم ہے جو سلیقہ سکھتا ہے۔ خوشامد کرنے والا منہ پھاڑ کر اپنا مدعا نہیں بیان کرتا۔ بلکہ پہلے زمین کے ایک قطعے کی صفائ کر کے اسے ہموار کرتا ہے، اس پہ چھڑکاءو کرتا ہے، ایک مرصع اور منقش تخت بچھاتا ہے، اگر بتیاں سلگاتا ہے، آپکے گلے میں موتیا اور چنبیلی کے ہار پہنا کر آپکے سر پر زریں تاج رکھنے کے بعد آپکو اس تخت پر بٹھاتا ہے اور خود سائل بن کر آپکے سامنے دست بستہ کھڑآ ہو جاتا ہے۔ اس وقت آپکے اندر کا حاتم طائ زقند لگا کر باہر آجاتا ہے اور آپ بے حیل و حجت سائل پہ سخاوت کے موتی نچھاور کرنے لگتے ہیں۔ خوشامد صلح کا سفید جھنڈا ہے جو فوراً متحارب شخصیتوں کو فائر بندی پہ مجبور کر دیتا ہے۔ البتہ اسے لہرانا حوصلے، جراءت، فراخدلی اور امن دوستی کے بغیر ممکن نہیں۔ ہمیں اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کے لئے خوشامد کی باقاعدہ تعلیم اور تربیت کا بندو بست کرنا چاہئیے اور کامیاب خوشامدی کو امن کا نوبل پرائز دینا چاہئیے۔

اس طرح اظہر ادیب کے مضمون کا میرے ہاتھوں تیار گجر بھتہ یہاں ختم ہوتا ہے۔البتہ وارث میر یہ لکھتے ہیں کہ

پاکستان کے بیمار معاشرے میں لکھنے والوں کی مجبوری اور بے بسی کا یہ عالم ہے کہ وہ آج جھوٹ بولنے والے کو جھوٹا، فریب دینے والوں کو فریبی اور خوشامد کر کے اپنا الو سیدھا کرنے والے کو خوشامدی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے ضمیر داری کا مظاہرہ کرنے والےکو ذلیل و خوار اور اخلاقی لحاظ سے ہکلاتے کرداروں کو ترقی کے زینے طے کرتے دیکھا ہے

اس تحریر پہ تاریخ نہیں ہے۔ چونکہ انکا انتقال انیس سو ستاسی میں ہوا تھا تو یہ کم سے تئیس سال پرانی تحریر ہے۔  کیا واقعی یہ تئیس برس پرانی تحریر ہے۔

میرے پیارے قاری، اب جبکہ آپ نے مجھ ناچیز کی اس جسارت کو پورا پڑھ ہی ڈالا ہے تو اے محترم انسان میں آپ سے تہہ دل سے یہ درخواست کرونگی کہ خوشامد پہ ایک نظم پڑھنے کے لئے دوبارہ یہاں آنا مت بھول جائیے گا۔

ہمیں اور لکھنے کی چاہت نہ ہوتی، اگر تم نہ ہوتے، اگر تم نہ ہوتے

11:51 AM

خوشامد، وارث میر، حریت فکر کے مجاہد، Waris Mir

رکا ہوا گھنٹال

لکھنا تو ہولوکاسٹ پہ تھا کہ موقع بھی ہے دستور بھی ہے۔  لیکن میں پہلے ایک پیش آنیوالے واقعے پہ لکھتی ہوں۔ میں جب صبح صبح اپنی بیٹی کوموٹیسوری چھوڑنے کے لئے اسے گاڑی میں جلدی جلدی اندر بیٹھنے کا کہہ رہی تھی تو مجھے ایک آواز آئ۔ میرے پیچھے ایک دس گیارہ سال کا بچہ کھڑا تھا۔ کہنے لگا ، باجی صفائ کروانی ہے۔ میں نے کہا نہیں صفائ  نہیں کروانی ہے۔ باجی صفائ کروالو۔ پھر اس نے باہرگرے ہوئے درخت کے پتوں کی طرف اشارہ کیا۔ سب صاف کر دونگا۔ میں نے کہا نہیں تم اس کام کے لئے بہت چھوٹے ہو اب جاءو مجھے دیر ہو رہی ہے۔ اسکے فوراً بعد میں روانہ ہو گئ۔ لیکن میرے دل میں ایک کھٹک تھی۔ اتنے چھوٹے بچے سے کیا کام کرایا جا سکتا ہے۔ اتنے چھوٹے بچوں کی کیا مدد کی جا سکتی ہے۔ کیا مجھ جیسے تنخواہ دار شخص کو جو اپنے گھر سے گاڑی بھی فاصلہ گن گن کر نکالتا ہو کہ ذرا سا بھی زیادہ ہونے پہ میرا بجٹ متائثر ہوتا ہے۔ گھر کے بلب گن کر روشن کرتا ہو گھر کا اے سی پورے سال میں تین مہینے سے زیادہ نہیں استعمال کرتا ہو اور وہ بھی ایک دن میں پانچ گھنٹے سے زیادہ نہیں اوروہ بھی اپنی بچی کی پیدائش کے بعد کہ سب ہی والدین اپنے بچے کو زندگی میں کچھ آسانیاں دینا چاہتے ہیں۔ جو سبزی  اور پھل لینے کے لئے بچت بازار کا رخ کرتا ہو اور جو عام گھریلو خواتین کی طرح ہر مہینے نہیں، ہر سال نہیں کبھی ہی پارلر کا رخ کرتا ہو، جو دوکاندار سے اس سال کے نئے پرنٹس پہ اصرار کرنے کے بجائے پچھلے سال کے پرانے پرنٹس بھی لے لیتا ہو کہ وہ سستے ملیں گے۔ میں ایسے بچوں کی  معاشی حالت میں کیا بہتری لا سکتی ہوں۔

واپسی میں جب میں سگنل پہ رکی تو وہاں گیارہ بچے موجود تھے۔ کسی کے ہاتھ میں وائپر اور پانی کی چھوٹی سی بالٹی موجود تھی کہ گاڑیوں کے شیشے صاف کرنے ہیں اور کوئ یونہی پھر رہا تھآ کہ کوئ بھیک دے دے۔ لوگ انکے ہاتھوں پہ چند سکے رکھ کر آگے بڑھ گئے۔ میں اس گیارہ سالہ لڑکی کو گاڑی کا شیشہ صاف کرنے سے منع کر دیتی ہوں۔ باجی شیشہ نہ صاف کرواءو، کچھ پیسے ہی دے دو۔ مگر گداگری ایک لعنت ہے۔ یہ انسان میں سے عزت نفس ختم کر کے انہیں تن آسان بنا دیتی ہے۔ پھر یہ لوگ معاشرے کی ترقی میں کام آنے کے بجائے بوجھ بن جاتے ہیں۔ میں اپنے ہاتھ اور کان سختی سے بند کر دیتی ہوں۔

ملک بھر میں ان بچوں کی ، ان لاوارث اور بے گھر بچوں کی تعداد لاکھوں میں پہنچتی ہے۔ صرف شہر کراچی میں ایسے بچوں کی تعداد ایک محتاط اندازے کے مطابق پندرہ ہزار سے زائد ہے۔ یہ گھروں سے بھاگے ہوئے بچے، غریب والدین کی عدم توجہ کا شکار ہوتے ہیں۔ اور اسکی بنیادی وجہ والدین کے معاشی حالات کا درست نہ ہونا ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے بچوں کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کرتے ہیں جنکی لاتعداد کہانیاں ہمارے اطراف میں پھیلی ہوئ ہیں۔

یہ بچے ان گینگز کے ہتھے لگ جاتے ہیں جو ان سے بہت کم پیسوں کے عیوض ہر کام کراتے ہیں۔ اس میں لوگوں کی جنسی ہوس پورا کرنے کا کام بھی ہے۔ ایک سروےکے مطابق ان میں سے اسی فی صد بچے تیرہ سے اٹھارہ سال کے، پندرہ فی صد نو سے بارہ سال کے اور تقریباً چھ فی صد آٹھ سال تک کے بچے شامل ہیں۔ ان بچوں میں سے نوے فی صد مختلف اقسام کی نشہ آور اشیاء استعمال کرتے ہیں اور اسی سے نوے فی صد بچے جنسی زیادتی کا شکار ہوتے ہیں۔

صرف بے گھر بچے ہی نہیں، بلکہ اکثر اوقات یہ بچے اپنے خاندانوں کے ساتھ بھیک مانگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ماں باپ، اپنے نو زائیدہ بچوں کو بھی اس مقصد کے لئے استعمال کر لیتے ہیں۔

میں محسوس کرتی ہوں کہ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان بچوں کی فلاح و بہبود کے لئے کچھ کرے۔ یوں میں وہاں سے اندرونی طور پہ مطمئن، کسی طرح جان چھڑا کر بھاگنے میں کامیاب ہو جاتی ہوں۔

  گھر واپس آتی ہوں وہ بچہ وہیں بیٹھا ہے۔ اسے اندازہ تھا۔ میں کتنی دیر میں واپس آءونگی۔۔ وہ پھر وہی بات کہتا ہے مجھ سے کام کروالو۔ میں اس سے کہتی ہوں کہ نہیں پاکستان میں چائلڈ لیبر کا قانون موجود ہے اسکی رو سے اگر میں نے تم سے گھر کے باہر کے پتے اٹھوائے تو یہ جرم ہوگا۔ تمہاری عمر اٹھارہ سال سے کم ہے اور تم اس قانون میں آتے ہو۔ میں نے صبح سے ناشتہ نہیں کیا۔ تو میں تمہیں اپنے گھر کا بچا کھچا ناشتہ آج کے دن کے لئے دے سکتی ہوں۔ کل کا وعدہ نہیں کرتی جو پہلے آئے گا وہ لے لے گا۔ باجی میں بہت اچھی صفائ کرونگا اور سب کوڑا اٹھا کر کچرا کنڈی تک پھینک آءونگا۔ کچرا ، یہاں روزانہ جمعدار آتا ہے۔ یہاں تو کوئ کچرا نہیں ہے۔ یہ جو درخت کے گرے ہوئے پتے ہیں یہ جمعدار کل لے جائے گا ۔ میں تم سے کوئ کام نہیں کروا سکتی۔

اچھا سنو نادر، یہی نام بتایا تھآ ناں تم نے تمہارے بہن بھائ کتنے ہیں۔ چھ ہیں ایک مجھ سے بڑا ہے باقی سب چھوٹے ہیں۔ ابا کیا کرتا ہے۔ کام کرتا ہے وہ اپنے پیسوں کا کیا کرتا ہے۔ وہ دادی کی آنکھیں بنانے کے لئے پیسہ جمع کر رہا ہے دادی پنجاب میں رہتی ہے۔ مجھے شبہ ہوا ابا جھوٹ بولتا ہے وہ اس سے نشہ پانی کرتا ہوگا۔  اماں کیا کرتی ہے۔ وہ بنگلوں میں جھاڑو پونچھے کا کام کرتی ہے۔ اب اصولی طورپہ تو جیسا کہ فیشن میں ہے مجھے اس سے یہ پوچھنا چاہئیے تھا کہ تم اسکول کیوں نہیں جاتے، کیا تمہارا اسکول جانے کو دل نہیں چاہتا، جب تمہیں روٹی نہیں ملتی تو کیک کیوں نہیں کھاتے۔

رات کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ میں اپنی بچی کو سلا کر فارغ ہوتی ہوں اور اب باقی لوگوں کے لئے کھانا لگا رہی ہوں کہ پھر بیل بجی۔ رابعہ گھر جا چکی تھی ورنہ ڈور بیل وہ چیک کر لیتی ہے۔

ایک پندرہ سولہ سال کی بچی اتنا کام کر سکتی ہے۔ میں پلیٹس ٹیبل پہ رکھ کر جلدی سے اسے چیک کرتی ہوں۔ باجی صفائ کر والو۔ صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ آخر یہ بچہ میرے ہی ایمان کی آزمائش لینے کے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے۔ یہ ان لوگوں کو کیوں نہیں ملتا۔ جو ذہنی نا بالغوں کو بالغ بنا رہے ہیں۔ میں جھلا جاتی ہوں۔ اور سوچتی ہوں کہ اسے کچھ روپے بھیک میں دے دوں ان پیسوں میں سے جو میری پرانی ماسی نذیراں کا حصہ ہیں۔  تاکہ وہ آج رات کا کھانا کھالے۔ کل کا اللہ مالک ہے کسی اور کے پیچھے پڑ کر لے لے گا۔ ورنہ وہی کرے گا جو روڈز پہ پھرنے والے بے گھر بچے کرتے ہیں۔

نذیراں ڈیڑھ سال سے چھاتی اور رحم کے کینسر میں مبتلا ہے۔  اور اسی طرح اپنے پرانے لوگوں سے پیسے جمع کر کے ایک خیراتی ہسپتال سے علاج کروا رہی ہے۔ ہسپتال والے  مفت علاج تو کرتے ہیں مگر دوا کے پیسے نہیں دیتے۔ وہ عمران خآن کے ہسپتال سے بھی علاج نہیں کروا سکتی۔ بالکل مفت تو وہاں بھی نہیں ہوتا اور پھر لاہور شہر میں رہنے کا خرچہ کہاں سے لائے گی۔ مگر ٹہریں میں پہلے اس بچے سے نبٹ آءووں یہ مسلسل بیل بجا رہا ہے۔ حکومت کچھ نہیں کرتی،ہمارے لئے اور جو کچھ کر سکتے ہیں انکا  ضروری کام تو عصمت چغتائ اور بانو قدسیہ کے نقش قدم پہ چل کے 'اصل حقائق' پیش کرنا ہے۔

آپ میں سے کچھ کو یہ اتنا اچھا نہیں لگے گا۔ اس میں ، میں نے ان بچوں کے ساتھ ہونے والی جنسی زیادتی کی تفصیلات جو نہیں دی ہیں۔

لیکن میں سوچتی ہوں یہ میرے ناول کے لئے یا کہانی کے لئے ایک اچھا انداز ہو سکتا ہے۔ بجائے میری عوامی پوسٹ کے۔ آپ کیا خیال کرتے ہیں۔

7:22 AM

Street child, بے گھر بچے،, کراچی

تربوز اور محبوب

نظیر اکبر آبادی، اردو شاعری میں عوامی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ اتنے عوامی ہیں کہ انکی کلیات مرتب کرنے والے مولانا صاحب کو اس میں کئ اشعار میں خالی جگہ یا ڈیش ڈیش لکھنا پڑا۔ خیر یہ زمانہء قدیم کے مولانا صاحب تھے کیونکہ اسکا پہلا ایڈیشن انیس سو اکیاون کا ہے۔ اس بیان کے بعد امید ہے کہ انکی کلیات کو 'کچھ نوجوانوں'  میں  خاصی پذیرائ ملے گی۔

لیکن نظیر اکبر آبادی کی شاعری کی اہمیت جو مجھے نظر آتی ہے وہ الفاظ کا بے پناہ استعمال ہے۔ایسی ایسی ردیفیں اور قافئیے استعمال کئے گئے ہیں کہ ان کی زبان دانی پہ رشک آتا ہے۔ اس طرح بیت بازی سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس میں اپنے حریف کو چت کرنے کے لئے کافی اشعار مل جائیں گے۔ آزمائش شرط ہے۔ ساتھ ہی ساتھ موضوعات کا تنوع بھی بھرپور ہے۔ عام زندگی کے بے پناہ موضوعات کا احاطہ انہوں نے کیا ہے۔

انکی اس کلیات سے منتخب اشعار پھر کبھی سہی۔ آج موسم کی مناسبت سے انکی ایک  نظم ملی۔ اسکا نام ہے تربوز۔ تربوز کا یہ احسان ہی کم نہیں ہے کہ جب تک گرمیوں کی سوغات آم نہیں آجاتے یہ اپنے گلابی رس سے ہمارا دل ٹھنڈا کرتے  ہیں۔

آئیے پڑھتے ہیں، نظم 'تربوز' کے چند بند۔

 کیوں نہ ہو سبز زمرد کے برابر تربوز

کرتا ہے خشک کلیجے کے تئیںتر تربوز

دل کی گرمی کو نکالے ہے یہ اکثر تربوز

جس طرف دیکھئیے بہتر سے ہے بہتر تربوز

اب تو بازار میں بکتے ہیں سراسر تربوز

مجھ سے کل یار نے منگوایا جو دے کر پیسہ

اس میں ٹاکی جو لگائ تو کچّا نکلا

دیکھ تیوری کو چڑھا ہو کے غضب طیش میں آ

کچھ نہ بن آیا تو پھر گھور کے یہ کہنا لگا

کیوں بے لایا ہے اٹھا کر یہ مرا سر تربوز

جب کہا میں نے میاں یہ تو نہیں ہے کچا

اور کچّا ہے تو میں پیٹ میں بیٹھا تو نہ تھا

اسکے سنتے ہی غضب ہو کے وہ لال انگارا

لاٹھی پاٹی جو نہ پائ تو پھر آخر جھنجھلا

کھینچ مارا مرے سینے  پہ اٹھا کر تربوز

پیار سے جب ہے وہ تربوز کبھی منگواتا

چھلکا اسکا مجھے ٹوپی کی طرح دے ہے پہنا

اور یہ کہتا ہے کہ پھینکا تو چکھاءوں گا مزہ

کیا کہوں یارو میں اس شوخ کے ڈر کا مارا

دو دو دن رکھے ہوئے پھرتا ہوں سر پہ تربوز

حوالہ جات؛

کلیات نظیر، مولانا عبدالباری صاحب آسی نے مرتب و مدون کیا، پبلشر، مکتبہ ء شعر و ادب لاہور۔

نظیر اکبر آبادی کا ایک شعر

4:32 PM

Nazir Akbar Abadi, نظیر اکبر آبادی

نوید شب

نوید سحر تو نئے دن ، نئ امنگوں، نئے توقعات اور نئی زندگی کا پیغام  ہوتی ہیں۔ مگر جو نویدیں آدھی رات کو ملیں۔ ان سے کیا ملتا ہے؟

آدھی رات کو اطلاع ملی کہ رحمان ملک صاحب کو کورٹ کے ذریعے جو سزا ملی تھی وہ صدر صاحب کے ایک دستخط سے معاف ہو گئ۔

صبح ناشتے کی میز پہ بس سوالات اور آدھی باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔  کسی نے پوچھا، یہ امریکہ کو پاکستان کا صدر بنانے کے لئے زرداری کے علاوہ کوئ نہیں ملتا؟

پھر سوال اٹھا، یوسف رضا گیلانی چالاک ہے کہ بے وقوف؟

 ایک اور فرد نے انتہائ فلسفیانہ انداز میں کہا۔ یوسف رضا گیلانی بے نظیر کے دور میں اسمبلی کے اسپیکر تھے۔ جب وہاں سے فارغ ہوئے تو چھ سال کے لئے جیل چلے گئے۔ آجکل وزیر اعظم ہیں جب یہاں سے فارغ ہونگے تو کیا ہوگا؟

پوچھا یہ وزیر داخلہ کے بجائے گیلانی صاحب کو کیوں یاد کیا جارہا ہے۔ اس لئے کہ انہوں ے صدر کو تجویز دی کہ رحمان ملک کو معاف کر دیا جائے۔ زرداری صاحب بالکل بے قصور ہیں۔ اس طرح سے ہم خطا اپنی سمجھتے تھے، قصور انکا نکل آیا۔

کسی نے کہا کہ رحمان ملک رات کو بہت اترا رہے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ غالب نے غالباً کسی ایسے موقع کے لئے کہا تھا کہ

بنا ہے شہ کا مصاحب، پھرے ہے اتراتا

ابھی صرف یہ مصرعہ ہی اپنے رقیب کی شان میں عرض کیا تھا کہ بادشاہ کو خبر ہو گئ۔ دربار بلا کر پوچھا کہ ناہنجار میرے بارے میں کہا یا میرے ممدوح کے بارے میں۔ عقلمند آدمی تھے۔ کہنے لگے حضور یہ تو ایک مصرعہ آپ تک پہنچایا گیا ہے ۔ پورا شعر اس طرح ہے کہ

بنا ہے شہ کا مصاحب ، پھرے ہے اتراتا

وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے۔

یہ تو آپ سمجھ گئے ہونگے کہ یہاں 'غالب' سے غالب کی کیا مراد تھی۔

ویسے آپ یہ مت سوچنے لگیں کہ یہاں غالب سے مراد رحمان ملک ہیں۔ یہ فی البدیہہ شعر انہوں نے اپنے شعری رقیب محمد ابراہیم ذوق کی رقابت کے اثر سے بچنے کے لئے کہا تھا۔

11:10 AM

Zardari, پاکستان،Rhman Malik, رحمان ملک, زرداری, یوسف رضا گیلانی

اسلام کے کارٹونز

اگر ایک خاتون ساڑھی پہنے گذر رہی ہو اور اسکا پیٹ نظر آئے تو یہ ایک بہت قابل اعتراض بات ہے۔ ایسی عورت عورت کہلانے کے لائق نہیں چہ جائیکہ مسلمان عورت۔ لیکن یہی عورت جب ایک حیاتیاتی عمل سے گذرتی ہے اور ماں بننے کے عمل میں داخل ہوتی ہے تو یہ بڑی چٹخارےدار بات ہے اور اس پہ ہر طرح کا مذاق کرنا ایک اعلی مذاق ہے۔ اب اسکے پیٹ پہ نظر رکھنا اور محفل میں اسکا مزے لے لے کر تذکرہ کرنا کہ اس میں کیا ہو رہا ہے اس پہ بات کرنا ہر ایک کا بنیادی حق ہے اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہیں ساڑھی پہنی ہوئ یا بغیر آستین کی یا نیکر پہنی ہوئ عورت مجسم بے حیائ لگتی ہے اور یہ بھی انکا ایک قدرتی اور بنیادی حق بن جاتا ہے کہ وہ اس پہ جملے کسیں اور اسکا مذاق اڑائیں۔ اور مزے لے لے کر اسکی ان چیزوں کا تذکرہ کریں۔  مانع حمل ادویات اور کنڈومز  اور حمل گرانے کی تراکیب ان سے زیادہ مزے کی کوئ بات ہو سکتی ہے۔ آخر ٹی وی پہ بھی تو ان چیزوں کی تشہیر کی جاتی ہے بس ذرا مزہ نہیں ڈالتے، تو مزہ بھی نہیں آتا۔ اگر یہی اشتہارات ذرا 'مزیدار طریقے ' سے بنائیں جائیں تو دیکھتے ہیں کہ کون کافر ان میں دلچسپی نہیں لیتا۔ پھر وہ اسکا ایک نمونہ خود بنا کر دکھائیں گے۔

  یہ کوئ جاہل اجڈ نہیں ہیں۔ اور نہ ہی بڑے آزاد خیال لوگ ہیں کہ سگار کے ساتھ شراب پی رہے ہوں اور پرائ عورتوں کی کمر میں ہاتھ ڈالکر رقص کر رہے ہوں۔  یہ وہ لوگ ہیں  جو اسلام کی سر بلندی میں اتنے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں کہ اپنے علاوہ کوئ مسلمان بھی مشکل سے ملتا ہے۔ آپ انکے سامنے صرف طالبان کا کسی بھی انداز سے منفی تذکرہ کر دیں اور پھر دیکھیں کیسے کف بہتا ہے اور کیسے کشتوں کے پشتے لگتے ہیں اور زبان اور بیان کی کتنی ارزاں صورتیں سامنے آتی ہیں۔

لیکن انہیں ارزاں مت کہیں یہ تو اعلی مذاق اور طنز ہے جو کسی کسی کی سمجھ میں آتا ہے۔ یہ سارے 'کسی' ایک جیسے ہیں۔ ایک ہی جسم میں کئ مختلف اور متضاد شخصیات رکھنے والے لوگ۔ لیکن انہیں منافق مت کہیں، یہ تو اس طرح معاشرے کی سدھار کرتے ہیں۔ کیا ہوا ، جو تھوڑا سا نفسانی لطف خود اٹھایا اور دوسروں کو بھی اٹھوانے دیا۔ اعمال کا دارومدار تو نیت پہ ہوتا ہے ناں۔

باقی لوگ چاہے کتنی اچھی نیت کے ساتھ اچھآ کام کریں، انکے دین و مذہب کی چھان بین سے پہلے کچھ کہنا کفر ہے۔ البتہ یہ دنیا کا گھٹیا ترین کام بھی کریں تو واہ، واہ۔ ہاں یہ الگ بات کہ ابھی کوئ روشن خیال اسی  گھٹیا کام کو کر ڈالے جس پہ شیخ صاحب ثواب دارین کما چکے ہوں تو اس پہ کتنی لعنتیں پڑیں اور معاشرہ کس قدر اخلاقی زبوں حالی کا شکار ہو جائے۔ یوں شیخ کے ہاتھ میں شراب بھی آب زم زم ہو جاتی ہے۔

ابھی کچھ دنوں پہلے مجھے فیس بک پہ ایک صاحب کی طرف سے دوستی کی درخواست موصول ہوئ۔ اکثر لوگوں کو ہوتی ہے اور خواتین پہ یہ مہربانی زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن اس دوستی کے پیغام کے ساتھ ایک اور پیغام بھی تھا جس کا متن اس طرح تھا کہ پانچوں وقت نماز پڑھتی ہو۔ میرے کچھ مبصروں نے کہا آپ ان سے فقہ کے بارے میں بھی دریافت کر لیتیں کہ کس فقہ کے تحت دوست کے قوانین رکحنا چاہیں گے۔ کچھ کا خیال تھا کہ شاید نمازی کم پڑ گئے ہونگے اس لئے پوچھا۔ کچھ کو یہ فکر لاحق ہو گئ کہ آیا میں واقعی پانچ وقت نماز پڑھتی ہوں یا نہیں۔

ایک مسلمان مرد کی ایک خاتون کو دوستی کی یہ درخواست اتنے نیک طریقے سے۔ یہ ایک عجیب سی صورت حال ہے ایسے لوگوں کے لئے ایک طرف اسکا گھر اک طرف میکدہ۔

لطف بھی لینا چاہتے ہیں لگے ہاتھوں ثواب بھی حاصل ہونا چاہئِے۔ سوچتی ہوں ایسے چٹخارے دار اسلام سے کیوں دور رہتے ہیں لوگ۔ ایسے مسلمان بننے کے لئے تو ہم ہر وقت تیار ہیں ۔ لعنت ہو روشن خیالوں پہ، خدا کی مار ان پہ، دوزخی خود دوزخ میں جائیں گے ہم کیوں انکے ساتھ گھسیٹے جاویں۔ طالبان آوے ہی اوے۔ اب آج سے میں اس نئے مسلمان کی حیثیت سے حلف لینا چاہونگی جو رند کا رند رہے اور ہاتھ سے جنت بھی نہ جائے۔ تو اب میں بھی اسی طرح کی اعلی مذاق کی حامل تحریروں کی تیاری کرتی ہوں۔ الحمد اللہ، خدا نے مجھے بروقت ایک اعلی مسلمان بننے کا موقع عطا فرما دیا۔ بلکہ سمجھا دیا کہ ایک بہترین اعلی حس مذاق کے ساتھ ایک اسلام کا نام سر بلند کرنے والا مسلمان کیسے بنا جا سکتا ہے۔ اور کیسے میرے اس تبدیل شدہ چولے سے مجھے وفادار ساتھیوں کی ایک قطار ملے گی۔

اور ہاں ابھی بیس مئ کو پیغمبر اسلام سے محبت ظاہر کرنے کے لئے ہولوکاسٹ ڈے بھی تو منانا ہے۔ اس میں رسول اللہ کے کارٹون بنانے والی اقوام سے اپنی نفرت ظاہر کرنے کے لئے جواباً پاکستانی مسلمان ہولوکاسٹ ڈے منائیں گے۔ تاکہ انہیں بھی کچھ پتہ چلے کہ ہم ان سے کتنی نفرت کرتے ہیں۔ انشاءللہ، اس نئے منافقت کے خول کے ساتھ ان میں شامل ہونگی۔ خدا ہمیں اسکا اجر دے۔ نیکی کے اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہئیے۔ شیطانیت اور ملعونیت کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دینا چاہئیے۔ وہ دن دور نہیں جب خدا کی مدد ہمارے شامل حال ہوگی۔ اللہ اکبر۔

مگر یہ دل اندر سے ہلکے سے پوچھ رہا ہےکہ مذہب اسلام کے کارٹونز کے خلاف کون سا دن منایا جائے گا اور کب؟

4:28 PM

pakistan, بیس مئ۔ Holocaust day, طالبان, ہولو کاسٹ ڈے

صیاد کا دام

خود اپنے دام میں صیاد آرہا ہے۔ بس یہ تھا فوری خیال جو میرے ذہن میں آیا۔ جب میں نے یہ ٹیپ کہ ہوئ فون کال سنی جو

حامد میر

اور طالبان کے کسی اعلی عہدیدار کے درمیان ہوئ۔ اس فون کال کا وقت خالد خواجہ کے قتل سے کچھ دن پہلے کا واقعہ بتایا جاتا ہے۔ آپ بھی مندرجہ ذیل لنک پہ جا کر اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

حامد میر اور طالبان کے ایک عہدیادار کے درمیان گفتگو کی ٹیپ یہاں ہے

یہاں سے

بھی ڈاءون لوڈ کر سکتے ہیں

یہ بھی ایک ذریعہ ہے

  میں نے وارث میر کی کتاب 'حریت فکر' کے مجاہد پڑھی تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان جیسا لبرل سوچ رکھنے والا شخص حامد میر جیسے کسی شخص کا باپ ہو سکتا ہے۔ یہ تو بھلا ہو انٹر نیٹ کا کہ یہ انکشاف وہیں سے ہوا۔

 وارث میر کی کتاب ' حریت فکر کے مجاہد' کا پیش لفظ پروفیسرکرّار حسین  نے لکھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ

پروفیسر وارث میر نہ صرف حریّت فکر کے راہی تھے بلکہ حریّت فکر کے مبلغ بھی تھے۔ حریت فکر کے سلسلے میں انکے جو مضامین ہیں وہ اس ضرورت کے احساس کی نشاندہی کرتے ہیں کہ آج سب سے زیادہ ہماری قوم کو اپنی صحت شعور کے لئیے جس بات کی ضرورت ہے وہ اسلام اور اپنے ماضی کے متعلق رومانیت اور جذباتیت سے نکل کر خود تنقیدی کی نظر پیدا کرنا ہے تاکہ دھندلکوں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کی بجائے مستقبل کے لئے کوئ راستہ روشن ہو سکے۔ رومانیت اور جذباتیت ، جہل کی وہ خطرناک قسم ہے جس سے کہ ہر قسم کا ظلم پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ درحقیقت خود کشی کا راستہ ہے۔

وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

فکری اور سیاسی لحاظ سے پاکستان کے بیمار معاشرے کو ترقی پسندی کی کسی باقاعدہ پارٹی لائن کے مطابق چلنے والی نہ سہی، جدیدیت کی تو یقیناً ضرورت ہے۔

اس کتاب کی اشاعت انیس سو نواسی میں ممکن ہوئ۔ لیکن اسکی اشاعت سے دو سال پہلے وارث میر محض اڑتالیس کی عمر میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انہیں زہر دیا گیا تھا۔  اسکے فوراً بعد انکے بیٹے حامد میر کا صحافیانہ کیریئر شروع ہوتا ہے۔  لیکن انہیں بہت زیادہ شہرت غالباً

اسامہ بن لادن سے ملاقات

کے بعد حاصل ہوئ۔

ایک ترقی پسند باپ، جس نے اپنی تمام زندگی ہر قسم کی ملائیت کے خلاف جہاد میں گذاری، اس کے بیٹے نے جب اپنے لئے فکری نظر منتخب کی تو اسکا انتخاب طالبان جیسی رجعت پسند اور انتہا پسند قوتیں تھیں۔ اس فون کال سے وابستہ حقائق  سے قطع نظر میں حامد میر کو ان لوگوں میں سے سمجھتی ہوں جنہوں نے طالبان کو ہیرو بنانے کی مہم ، میڈیا کے ذریعے زور و شور سے لڑی۔ لال مسجد کو ایک سانحہ بنانے میں انکی کوششوں کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ محض آئ ایس آئ ہی نہیں جیسے جیسے وہ ترقی کے زینے پہ بڑھتے گئے انکا نام سی آئ اے کے ایجنٹ کے طور پہ بھی ابھرا۔ سو یہ بھی ایک سوال ہے کہ ہمارا یہ صیاد، دام کا صیاد ہے یا صیاد کے دام ہے۔

اس ٹیپ کی ہوئ فون کال کوسن کریوں لگتا ہے کہ وہ خالد خواجہ کے قتل کو ایک اخلاقی جواز دے رہے ہیں۔  خالد خواجہ بذات خود  طالبانی جہاد سے متعلق ایک متنازعہ شخصیت،  تو اپنے منطقی انجام تک پہنچ گئ۔ باقی یہ کہ پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ۔

حامد میر کا انٹرویو

وارث میر

1:08 PM

Hamid Mir, Waris Mir, پاکستانی طالبان, حامد میر, حریت فکر کے مجاہد, وارث میر

کاربن کی تیسری بہروپی شکل

 آج میں خالص سائنیس پہ ایک تجرباتی تحریر اردو میں لکھ رہی ہوں۔

کاربن پیریاڈک ٹیبل پہ چھٹے نمبر کا عنصر ہے۔ زیادہ تر لوگ اسکی دو بہروپی اشکال سے واقف ہیں۔ اور وہ ہیں گریفائیٹ اور ڈائمنڈ۔  بہروپی اشکال کسی عنصر کی ایسی اشکال ہوتی ہیں جو ایک ہی عنصر کے ایٹموں پر مشتمل ہوتی ہیں لیکن ان ایٹموں کا ایکدوسرے سے جڑنے کا انداز یا  ترتیب مختلف  ہوتی ہے۔ یوں مختلف مالیکیول وجود میں آتے ہیں۔

یہ گریفائٹ میں کاربن کے ایٹموں کی ترتیب ہے۔ ہر کونا ایک کاربن ایٹم کو ظاہر کرتا ہے۔ اس طرح سے ہمیں ان دونوں تصویروں میں تین تہیں نظر آرہی ہیں جو وضاحت کے لئے بنائ گئ ہیں۔ یہ تہیں اس سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں اور اسی وجہ سے گریفائٹ گریس جیسے خواص رکھتا ہے۔یہ اوپر والی ساختیں گریفائٹ مالیکیول کی ہیں۔

یہ دونوں اشکال ہیرے کے اندر کاربن کے ایٹموں کی ترتیب ظاہر کر رہی ہیں۔ جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ کاربن ایٹم ہر تہہ کے بعد بڑھتے جا رہے ہیں اور یہ ایکدوسرے سے مضبوط سنگل کو ویلنٹ بانڈ سے جڑے ہیں اس لئے ہیرا بہت مضبوط ہوتا ہے۔ اور امیر شہر اس سے خود کشی کر سکتا ہے۔

 بہت کم لوگوں کو پتہ ہوگا کہ کاربن کی ایک تیسری بہروپی شکل بھی ہے جسے

فلیرین

کہتے ہیں۔ اس گروپ کا پہلا ممبر انیس سو چھیاسی میں دریافت ہوا۔ یہ دریافت محض ایک اتفاق تھا۔ سائنسدان  ستاروں کے بننے کے عمل کا راز جاننا چاہ رہے تھے۔ اسکے لئے انہوں نے گریفائٹ کو ایک ایسی مشین کے اندر اونچے درجہ ء حرارت سے گذارا، جسے ہیلیئم گیس سے  ایک خاص دباءو تک بھر دیا تھا۔ یعنی ہوا کھینچ کر باہر کر دی گئ تھی۔

اسکے نتیجے میں جو آمیزہ حاصل ہوا۔ اسکا تجزیہ کرنے پہ ایک ایسا مالیکیول سامنے آیا جس میں کاربن کے ساٹھ یعنی 60 ایٹم موجود تھے۔ مزید تجزیاتی رپورٹس کو سامنے رکھ کر اسکی ساخت بنانے کا مرحلہ جب آیا تو بڑی سوچ وبچار کے بعد یہ طے کیا گیا کہ یہ ایک گول فٹبال کے گیند کی شکل کا مالیکیول ہونا چاہئیے۔

بعد میں مالیکیول کی اس ساخت کا نام امریکن انجینئیر

بک منسٹر فلّر

کے نام پہ رکھ دیا گیا کیونکہ موصوف نے مونٹریال، کینیڈا میں موجود ایک عمارت کا گنبد جس ڈیزائن پہ بنایا تھآ وہ اس مالیکیول کی ساخت جیسا تھا۔ یوں یہ مالیکیول

فلیرین

کہلایا۔ اب اگر آپ مونٹریال میں ہیں یا وہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس عمارت کو ضرور دیکھئیے گا۔ باقی لوگ اگر صرف اس وجہ سے کینیڈا جانا چاہتے ہیں تو ویزا فارم پہ ظاہر کریں اور خوبی ء تقدیر کا انتظار کریں۔ نیچے آپکو اس عمارت کی تصویر نظر آرہی ہے۔

 بعد ازاں ان سائنسدانوں کے مزید تجسس اور بے قراری  کی وجہ سےاسی آمیزے سے مزید اسی طرح کے مالیکیولز نکالے گئے۔ اس لئے بات یہ بنی کہ باغ بہشت سے مجھے اذن سفر دیا تھا کیوں، کار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر۔ یہ مزید مالیکیولز  کاربن کی تعداد مختلف  رکھتے تھے۔  جیسے ایک مالیکیول میں کاربن ستر اور دوسرے میں چوراسی تھے۔ حتی کہ یہ تعداد سینکڑوں تک جا پہنچی۔ یوں ان مالیکیولز نے ملکر فلیرین خاندان ترتیب دیا۔

یہ خاندان کیمیاء میں نئ دریافتوں کا خاندان بن گیا کیونکہ انکی وجہ سے نئے کیمیائ تعاملات نے جنم لیا۔  کچھ تعاملات انکی کروی سطح کے اوپر ہوئے، کچھ میں انکے اندر والی خلاء کو استعمال کیا گیا، کچھ میں انکی گولائ کو کہیں سے توڑ دیا گیا۔ محض چھ سال میں اس خاندان سے ایک ہزار سے زائد کیمیائ مرکبات تیار کئے گئے۔ اور اس طرح

انیس سو چھیانوے کا کیمیاء

کا نوبل پرائز فلیرین دریافت کرنے والوں کے حصے میں آیا۔

اسی خاندان نے آگے چل کر نینو ٹیوبز فراہم کئے اور یوں نینو ٹیکنالوجی وجود میں آگئ۔

  نینو ٹیوبز

بھی خالص کاربن سے بنے ہوتے ہیں۔ اور انہیں بعض اوقات

بکی ٹیوبز

بھی کہا جاتا ہے۔ یہ تو اب آپ جان گئے ہوگے کہ ایسا کیوں کہا جاتا ہے۔ یہ رہی ان نینو ٹیوبز کی مالیکیولر تصویر۔

9:33 AM

Allotropes, Fullerenes, بکی ٹیوبز, بہروپی اشکال, ڈائمنڈ, فلیرینز, گریفائٹ, نینو ٹیکنالوجی

علامت کا زوال یا زوال کی علامت

آگے پڑھنے سے پہلے نیچے دئیے ہوئے لنک پہ کلک کر لیجئیے۔ اس پوسٹ کے ساتھ یہ موسیقی کا ٹھنڈآ پانی ضروری ہے۔

میرا پسندیدہ عارفانہ کلام

سانگھڑ شہر کے اطراف میں لیکن اس سے کافی دور ریتیلے پہاڑی ٹیلوں کے درمیان واقع ایک پر سکون گاءووں میں، میں اس وقت ایک چھوٹی سی جھیل کے کنارے پندرہ بیس مقامی لوگوں کے ساتھ موجود تھی۔ سنہری ریت پہ آلتی پالتی مار کے بیٹھے جھیل کی طرف خراماں خراماں گم ہوتی لہروں کی دیکھتی اور پھر اس سولہ سترہ سالہ لڑکے کی ایلومینیئم کا تھآلی پہ تھاپ دیتے ہوئے ہاتھ۔ سارا مجمع ایک ٹرانس میں دوسرے اسی عمر کے لڑکے کو گاتا سن رہا تھا۔ اور وہ اتنے جذبے سے گا رہا تھا کہ اسکے آنسو نکل پڑے۔  جب وہ اس  مصرعے پہ پہنچا  کہ ارے ملا جنازہ پڑھ میں جا نوں میرا خدا جانے۔ تو شاید میں مسکرا دی تھی۔

محفل ختم ہونے پہ وہ میرے پاس آئے تو میں نے ان گمنام فنکاروں کی تعریف کی۔ انہوں نے جواباً اپنے ہاتھ مصافحے کے لئے میری طرف بڑھا دئیے۔ میں نے کچھ سوچا اور انکے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دے دیا۔ سندھ کے دیہاتوں میں رواجاً عورت مرد ہاتھ ملاتے ہیں۔ اور نہ ملانا تحقیر کی  مد میں آتا ہے۔

اس دن میں نے سوچا کہ شہر سے اتنی دور اتنے چھوٹے سے گاءووں میں جہاں کی کل آبادی تیس پینتیس لوگوں پہ مشتمل ہے یہاں بھی مولوی صاحب کے خلاف خیالات کو پذیرائ حاصل ہے۔ کیوں؟

مولوی یا ملا کو مذاق کا نشانہ بنانا یا انکی بات پہ طنز کرنا کوئ تیس چالیس سال پرانی بات نہیں بلکہ یہ ایک رد عمل ہے جسکے نتیجے میں تصوف کی تحریک نے جنم لیا۔ آج سے ہزار سال قبل جب عمر خیام کہتا ہے کہ

کہتے ہیں کہ بہشت اور حور عین ہوگا

وہاں شراب کا پیالہ اور دودھ اور شہد ہوگا

اگر میں نے شراب اور معشوقہ کا لطف اُٹھایا ہے تو کیا خوف ہے

جب آخر کار اسی طرح ہی ہونا ہے۔

تو وہ دراصل اس عمل کا مذاق اڑاتا ہے جو مذہب کو انسان کی روحانی ترقی کے بجائے ، ظاہری عبادت و رسوم ، قاعدے اور قانون میں بند کر کے اپنا اقتدار قائم رکھنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ اور جو اسے ایک اعلی انسان بنانے کے بجائے لالچ اور ہوس کے سراب کے پیچھے لئے جا رہا ہے۔  مولوی ازم یا ملا ازم خاص مسلمانوں کو پیش آنیوالا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ہر مذہب کے ماننے والوں کا اسکا سامنا کرنا پڑا۔

بھگت کبیر، چودہ سو چالیس میں پیدا ہوئے۔ انکی سادہ مگر پراثر شاعری نے لوگوں میں وہ تحرک پیدا کیا کہ ایک الگ مذہبی فرقہ وجود میں آگیا۔ وہ ایک جگہ کہتے ہیں کہ

نہ جانے میرا صاحب کیسا ہے

مسجد بھیتر ملا پکارے کیا تیرا صاحب بہرا ہے

چینوٹی کے پگ نیر باجے تو بھی سنتا ہے

پنڈت ہو کے آسن مارے لمبی مالا جپتا ہے

انتر تیرے کپٹ کترنی سو بھی صاحب لکھتا ہے

 ان جملوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مسجد کا ملا ہو یا لمبی مالا جپنے والا پنڈت، یہ ایک ہی چیز کا استعارہ ہیں۔

 نظیر اکبر آبادی ایک جگہ مولوی صاحب کی اس ساری محنت کو کس چیز سے تعبیر کرتے ہیں ذرا دیکھیں تو

جنت کے لئے شیخ جو کرتا ہے عبادت

کی غور جو ظاہر میں تو مزدور کی سوجھی

میر تقی میر کا کہنا ہے کہ

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا، رات کو تھا مے خانے میں

جبہ، خرقہ، کرتا، ٹوپی، مستی میں انعام کیا

یہ تو شیخ صاحب کا ایک پہلو ہے اسی کو غالب یوں بیان کرتے ہیں۔

کہاں مے خانے کا دروازہ ، غالب اور کہاں واعظ

پر اتنا جانتے ہیں ، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

اور پھر واعظ کے انہیں برا بھلا کہنے پہ ذرا برا نہیں مانتے بلکہ یوں فرما دیتے ہیں کہ

غالب، برا نہ مان جو واعظ برا کہے

ایسا بھی کوئ ہے کہ، سب اچھا کہیں جسے؟

اور اس شعر میں اکبر الہ آبادی کس سے مخاطب ہیں

کعبے سے جو بت نکلے بھی تو کیا، کعبہ ہی گیا جب دل سے نکل

افسوس کہ بت ہم سے چھٹے، قبضے سے خدا کا گھر بھی گیا

حکیم الامّت علامہ اقبال، اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ کرتا کوئ اس بندہ ء گستاخ کا منہ بند۔ ملا کے دین کی تعریف یوں کی۔ دین ملا فساد فی سبیل اللہ۔ انہوں نے ملاءووں اور مولویوں کو کہیں کا نہ چھوڑا۔ نیچے میں صرف بال جبریل کے شروع کے تیس صفحوں کا انتخاب دے رہی ہوں۔

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی

اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی؟

حاضر ہیں کلیسا میں کباب و مئے گل گوں

مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظہ و پند

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر

تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

کہتا ہوںّ وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق

نے ابلہ مسجد ہوں، نہ تہذیب کا فرزند

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے

کلیم بو ذر و دلق اویس و چادر زہرا

اے مسلماں، اپنے دل سے پوچھ، ملا سے نہ پوچھ

ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم

 حکیم الامّت سے نکلیں تو نجانے اور کتنے لوگ ہونگے جو اس علامت کی تعمیریں گرانے کی کوشش کرتے رہے۔ اور اسی لئے شاید حمایت علی شاعر سوال کرتے ہیں

  تمام گنبد و مینار و منبر و محراب

فقیہہ شہر کی املاک کے سوا کیا ہے

‌

صادقین پاکستان کے ایک نامور خطاط، ایک شاعر بھی تھے۔ انہوں نے ایک نقشہ کھینچا ہے کہ

مسند پہ کتاب دین رکھی تھی، اک پیر

اخلاق پہ کر رہا تھا کب سے تقریر

پھر میں نے بھی مسند کو وہیں سے کاٹا

مسند کے نیچے تھی جہاں ننگی تصویر

 اب ان تمام مختلف  شخصیات پہ سے گذرنے کے بعد،  جو اس وقت میرے ذہن میں آئیں، احساس ہوتا ہے کہ ملا، مولوی، واعظ یا شیخ یہ سب الفاظ علامت ہیں، مذہبی منافقت، جبر، اور ظاہر پرستی کی۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں اب سے نہیں، مسلمانوں میں تو کم از کم  پچھلے ہزار سال سے مذاق کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ ہوگا کیا، تو اقبال کہتے ہیں کہ

مرید سادہ تو رو رو کے ہو گیا تائب

خدا کرے کہ ملے شیخ کو بھی یہ توفیق

4:34 PM

اقبال, اکبر الہ ابادی, بھگت کبی, صادقین, عمر خیام, کٹھ ملائیت, میر, نظیر اکبر آبادی

نئے افکار انکا حصول اور ترویج-۱۲

شاہ ولی اللہ نے اجتہاد اور تقلید کے موضوع پہ ایک بڑی مفید کتاب عقد الجید فی احکام الاجتہاد التقلید کے نام سے لکھی۔ شاہ صاحب باب اجتہاد بند ہونے کے قائل نہ تھے لیکن وہ عوام کو حق اجتہاد نہیں دیتے۔ مجتہد کے انہوں نے مدارج مقرر کئے اور اجتہاد کے لئے مناسب شرائط لگائیں۔ انہوں نے جا بجا اس خیال کی نفی کی کہ اب اجتہاد کی گنجائش نہیں رہی۔ وہ اس کتاب کے آغاز میں کہتے ہیں کہ

پھر اب جو گمان کیا جاوے ایسے شخص عالم کے حق میں، جو اکثر مسائل میں اپنے امام کے موافق ہو، لیکن اسکے ساتھ ہی ہر حکم کی دلیل چاہتا ہو کہ وہ مجتہد نہیں تو یہ گمان اس شخص کے حق میں فاسد ہے۔ اور اس طرح جو یہ گمان کرے کہ مجتہد اس زمانے میں نہیں پایا جاتا۔ بلحاظ اعتماد کرنے کے گمان پہ تو یہ گمان بنار فاسد بر فاسد ہے۔

شاہ صاحب رسول اکرم کے طریقے کو دھیان میں رکھ کر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جزئیات کے معاملے میں تشدد نہیں کرنا چاہئیے۔ اور معمولی اختلافات سے شارع کا مقصد فوت نہیں ہوتا۔

کچھ لوگوں کو زمانہ روز بروز خراب نظر آتا ہے اور اس طرح وہ قوم میں بے ہمتی پیدا کرتے ہیں۔ اپنی کتاب حجۃ البالغہ میں وہ اپنے عہد کی اہمیت اورخوبیوں کا ذکر کرتے ہیں اور اس نظرئے کی تردید کرتے ہیں اس سلسلے میں وہ رسول اللہ کی دو حدیثوں کا حوالہ دیتے ہیں

ترجمہ؛ میری امت کی صفت بارش کی سی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ پہلا مینہ اچھا ہے یا اخیر کا۔

ترجمہ؛تم میرے صحابہ ہو اور میرے بھائ وہ ہیں جو میرے بعد آئیں گے۔

شاہ صاحب کو احساس تھا کہ مسلمانوں کے زوال کا ایک باعث فرسودہ اقتصادی نظام بھِی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اقتصادی عدم توازن کو معاشرتی برائیوں کی ایک جڑ قرار دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ

اگر کسی قوم میں تمدن کی مسلسل ترقی جاری رہے تو اسکی صنعت و حرفت اعلی کمال پر پہنچ جاتی ہے، اسکے بعد اگر حکمران جماعت آرام و آسائش اور زینت  وتفاخر کی زندگی کو اپنا شعار بنا لے تو اسکا بوجھ قوم کے کاری گر طبقے پہ اتنا بڑھ جائے گا کہ سوسائٹی کا اکثر حصہ حیوانوں جیسی زندگی بسر کرنے پہ مجبور ہوگا۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ

اقتصادی نظام کے درست اور متوازن ہونے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس زندگی میں انسانی اجتماع کے اخلاق تکمیل پذیر ہو سکیں گے۔

انکے خیال میں چونکہ تمام قوم دولت کی پیداوار میں شامل ہوتی ہے اس لئےدولت کو تمام افرد قوم میں تقسیم ہونا چاہئیے۔ اسکے علاوہ وہ دولت کے استعمال کی اقدار بھی مقرر کرنا چاہتے تھے اسکے لئے انہوں نے کچھ اصول رکھنا چاہے۔

پہلا اصول یہ کہ ایک جغرافیائ سرحد کے اندر رہنے والے لوگ اس علاقے کے وسائل کے مالک ہونگے۔ تمام لوگ اقتصادی نظام میں برابر ہونگے اور دولت کا ارتکاز کسی ایک یا چند مخصوص لوگوں تک نہ ہو۔ اور اس سلسلے میں وہ حضرت ابو بکر صدیق کی اس بات کو دوہراتے کہ مساوات بہتر ہے اقصادیات میں بجائے اسکے کہ ایک گروہ کو دوسرے پہ ترجیح دی جائے۔

دوسرا اصول، ہر شخص کو کچھ نہ کچھ حق ملکیت دینا چاہئیے۔ کیونکہ ہر شخص مختلف صلاحیتیں رکھتا ہے۔ لیکن اس سے مراد یہ نہیں کہ ہر ایک کو ایک جیسی غذا، گھر یا کپڑے ملیں۔

تیسرا اصول یہ کہ دولت کے ارتکاز کو کسی صورت نہ برداشت کیا جائے۔

ایسی متوازن صورت حال اختیار کی جائے کہ معاشرہ میں ہر شخص ترقی کرے۔

اسکے لئے وہ اس بات کے حق میں تھے کہ کوئ ایسی جماعت وجود میں لائ جائے جو ایک نئے نظام کو ترتیب دے سکے۔

یہ تھے کچھ سرسری سے اصول جو انہوں نے دینے کی کوشش کی۔ لیکن عملی طور پہ وہ اسکے لئے کچھ نہ کر سکے۔

مجدد الف ثانی کے بر عکس وہ شیعوں کو کافر نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ انہوں نے اپنی تحریروں سے سنی شیعہ اختلافات مٹانے کی کوشش کی اور اس موضوع پہ کئ سیر حاصل کتابیں لکھیں۔

چونکہ ہمارا موضوع اس وقت احیائے دین کی کوششیں نہیں ہے اس لئے ہم اس سلسلے میں اس سے صرف نظر کرتے ہیں۔

اپنی اس تمام تر روشن خیال کے باوجود شاہ ولی اللہ ہندوستان  کی دوسری غیر مسلم قوتوں کے لئے نرمی نہ پیدا کر سکے اور وہ کہتے ہیں کہ

تمام مسلمان شہریوں کو حکم دینا چاہئیے  کہ کافر اپنے تہوار کھلے عام نہ منا سکیں جیسے ہولی یا گنگا میں نہانا۔

اسی طرح انہوں نے یہ نظریہ اختیار کیا کہ ہندو ذمی نہیں کافر ہیں لہذا انہیں ذمیوں کے حقوق حاصل نہں ہونے چاہئیں اور انہیں ہر ممکن طریقے سے ذلیل کر کے رکھنا چاہئیے۔

اسی طرح وہ ثقافتی اثرات کو بھی قبول نہ کر سکے۔ ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں کہ

مسلمانوں کو خواہ وہ کسی ملک میں اپنی ابتدائ زندگی گذاریں۔ اپنی وضع قطع اور طرز بو د و باش میں اس ملک کے مقامی باشندوں سے قطعی جدا رہنا چاہئیے اور جہاں کہیں وہ رہیں اپنی عربی شان اور عربی رجحانات میں ڈوبے رہیں۔

شاہ ولی اللہ ، شاعر بھی تھے۔ انکی یہ شاعری فارسی میں ہے اس لئے میں اس میں سے کوئ انتخاب دینے سے قاصر ہوں۔

بہر حال اس تمام گفتگو سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس زمانے میں میسر علم اور اپنی دانش سے انہوں نے مسلمانوں کے اندر موجود خامیوں کو جانچنے اور انہیں دور کرنے میں خاصے تدبر سے کام لیا۔ اسی لئے کچھ لوگ انہیں حکیم الامت کہنے سے بھی نہیں ہچکچاتے۔

حوالہ جات؛

حریت فکر کے مجاہد، مصنف وارث میر، جنگ پبلشرز

اردو ادب کی تحریکیں، مصنف ڈاکٹر انور سدید، انجمن ترقی اردو پاکستان

رود کوثر، مصنف شیخ محمد اکرام، ادارہ ء ثقافت اسلامیہ۔

المیہ تاریخ، مصنف ڈاکٹر مبارک علی

شاہ ولی اللہ، ایک تعارف

نئے افکار انکا حصول اور ترویج-۱۱

.

3:48 PM

Shah Waliullah, اجتہاد, تقلید, حکیم الامت, شاہ ولی اللہ

نئے افکار انکا حصول اور ترویج-۱۱

برصغیر کے مسلمانوں میں روشن فکری کی تحریک شاہ ولی اللہ سے شروع ہوئ۔ یہ خیال ہے وارث میر کا وہ اپنی کتاب حریت فکر کے مجاہد میں لکھتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ نے کسی سائینٹیفک اقتصادی فکر اور سوچ کی نہج تو تلاش نہ کی تھی لیکن اپنی کتاب حجۃ البالغہ میں مسلمانوں کے زوال پذیر معاشرے کی برائیوں اور قیصریت و کسرویت کے نتائج کے تجزئیے میِ وہ اپنے وقت سے بہت آگے تھے۔ اس سارے تجزئیے  پہ ہم بعد میں بات کریں گے۔ پہلے انکا ایک اہم کارنامہ دیکھتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ کی تحریک کا مخاطب خواص کے بجائے عوام تھے. چونکہ آپکا روئے سخن عوام کی طرف تھا اس لئے یہ ضروری تھآ کہ وہ قرآن کو اسکے صحیح معنوں میں جانیں۔ اسکے علاوہ اکبر کے دربار میں جب مسلمان علماء اور پرتیگیزیوں کے درمیان مباحثے ہوئے تو مشنریوں نے جو قرآن کا لاطینی ترجمہ پڑھے ہوئے تھے کلام مجید کے بعض حصوں پہ اعتراض کیا اس وقت پتہ چلا کہ مسلمانوں کو صحیح سے اسکے مضآمین سے واقفیت نہ تھی حتی کہ ایسا بھی ہوا کہ پادریوں کے کسی اعتراض پہ یہ کہہ دیا جاتا کہ یہ تو قرآن میں ہے ہی نہیں اور جب قرآن کھولا جاتا تو اس میں اسکے حوالے نکلتے۔

شاہ ولی اللہ نے ان تمام چیزوں کے پیش نظر اسکا فارسی میں ترجمہ کیا جو کہ اس وقت رائج الوقت زبان تھی۔

علماء نے اسکا علم ہونے پہ تلواریں سونت لیں کہ یہ کلام پاک کی بے حرمتی ہے۔ بعض موءرخین نے یہاں تک لکھا کہ اسکی وجہ سے شاہ صاحب کی جان خطرے میں پڑ گئ۔ اور انہیں کچھ عرصَے کے لئے دہلی سے باہر جانا پڑآ۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ قرآن میں موجود حقائق کو زندگی کا دستور العمل بنانے کے لئے اسکا رائج الوقت زبانوں میں ترجمہ ضروری ہے۔

انہوں نے علم تفسیر پہ بھی کتابیں لکھیں اپنی ایک کتاب الفوز الکبیر فی اصول التفسیر میں وہ لکھتے ہیں کہ

عام مفسرین نے ہر ایک آیت کو خواہ مباحثہ کی ہو یا احکام کی ایک قصے کے ساتھ جوڑ دیا ہے اور اس قصے کو اس آیت کے لئے نزول کا سبب مانا ہے لیکن حق یہ ہے کہ نزول قرآنی سے مقصود اصلی نفوس بشریہ کی تہذیب اور انکے باطل عقاءید اور فاسد اعمال کی تردید ہے۔

فوز الکبیر کی دوسری خصوصیت شاہ صاحب کی انصاف پسندی اور اخلاقی جرءات ہے۔ مثلاً عام مسلمان زمانہ ء جاہلیت کے عربوں سے فقط برائیاں اور عیب ہی منسوب کرتے ہیں۔ لیکن انہوں نے انصاف کے اصول مدنظر تصویر کے دونوں پہلو پیش کئے ہیں۔

بعض مفسرین نے اہل کتاب سے قصے لیکر انہیں قرآنی تفاسیر اور علوم اسلامی کا جزو بنادیا ہے۔ اسکے خلاف انہوں نے آواز بلند کی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

یہاں پہ یہ جان لینا مناسب ہے کہ حضرات انبیاء سابقین کے قصے احادیث میں کم مذکور ہیں اور انکے لمبے چوڑے تذکرے جن کے بیان کرنے کی تکلیف عام مفسرین کرتے ہیں وہ سب ال ماشاءاللہ علمائے اہل کتاب سے منقول ہیں

آگے کہتے ہیں کہ

اسرائیلی روایات کا نقل کرنا ایک ایسی بلا ہے جو ہمارے دین میں داخل ہو گئ ہے۔ حالانکہ صحیح اصول یہ ہے کہ انکی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب۔

انہی وجوہات کی بناء پہ شاہ صاحب کی وصیت تھی کہ قرآن اور اسکا ترجمہ تفسیر کے بغیر ختم کرنا چاہئیے۔ اور پھر اسکے بعد تفسیر وہ بھی تفسیر جلالین بقدر درس پڑھائ جاوے۔

ایک اور اہم مسئلہ تقلید کا کا تھآ۔ تقلید جامد کے ماحول میں اجتہاد کے ماحول کو پیدا کرنا اور لوگوں کو مختلف ائمہ کے فہم کے علاوہ کسی بات کو قبول نہ کرنے کی فضا میں قرآن وسنت کی بالادستی کا علم بلند کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ ایک اہم سوال یہ تھا کہ جو مسلمان تقلید کا قائل ہے، فقہ کے چار مذاہب میں سے اسکے لئے کسی ایک کی تقلید لازمی ہے جسے لزوم مذہب معینہ کہتے ہیں یا وہ مختلف معاملات میں  مختلف مذاہب کی پیروی کر سکتا ہے۔ اس مسئلے پرعلماء میں بڑا اختلاف ہے۔ انکی تصانیف سے یوں لگتا ہے کہ وہ ایک عام آدمی کے لئے تو اسی لزوم مذہب معینہ کے ہی قائل ہیں لیکن مجتہدین اور آئمہ کے لئے اسے ضروری نہیں سمجھتے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں

اور علماء کو درست ہے کہ ہمارے آئمہ میں سے ایک کا قول کسی مصلحت وقت پر عمل کرنے کی وجہ سے اختیار کریں۔

اسی طرح انہوں نے اسی کتاب کے آخیر میں لکھا ہے  کہ

یعنی اگر انسان کسی مجتہد کے، جس کا اجتہاد جائز ہو۔ ایسے قول کی جستجو کرے جو اسکے نفس پہ سہل ہو تو ہم کو نہیں معلوم کہ شرع  نے اس عمل پر اسکی برائ کی ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جو باتیں آپکی امت پر سہولت ہوں انہی کو دوست رکھتے تھے۔

وہ تقلید کو حد سے زیادہ بڑھانے کے بھی مخالف تھے۔ اور تقلید کی ایک قسم کو تو انہوں نے حرام لکھا جس میں دانستہ یا غیر دانستہ مقلد صریح احادیث پر بھی مفتیوں اور فقیہوں کے اقوال کو ترجیح دیتے ہیں

لکھتے ہیں،

اور تقلید حرام کی صورت یہ ہے کہ کسی فقیہ کو گمان کرے کہ وہ علم میں نہایت کو پہنچ گیا ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ وہ خطا کرے تو ایسے مقلد کو جب کوئ حدیث صحیح  اور صریح پہنچتی ہے کہ مخالف اس فقیہ کے قول کے ہو تو اسکے قول کو نہیں چھوڑتا۔

نوٹ؛ شاہ ولی اللہ پہ یہ تحریر

جاری ہے۔

حوالہ جات؛

حریت فکر کے مجاہد، مصنف وارث میر، جنگ پبلشرز

اردو ادب کی تحریکیں، مصنف ڈاکٹر انور سدید، انجمن ترقی اردو پاکستان

رود کوثر، مصنف شیخ محمد اکرام، ادارہ ء ثقافت اسلامیہ۔

شاہ ولی اللہ، ایک تعارف

نئے افکار انکا حصول اور ترویج-

۱۰

3:52 PM

Muslim Progressives, Shah Waliullah, ڈاکٹر انور سدید, شاہ ولی اللہ, شیخ محمد اکرام, وارث میر

کون سے بانی ء پاکستان

اردشیر کاوسجی

جی شاید اس وقت پاکستان کے معمرترین کالم نگار ہونگے۔ انیس سو چوبیس میں پیدا ہونے والے اس بزرگ کالم نگار کو قائد اعظم کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا کہ انکے خاندان کے ان سے دوستانہ مراسم تھے۔ انکا ایک حالیہ مضمون پڑھنے کے لئے حاضر ہے۔  صاف پڑھنے کے لئے اس مضمون پہ کلک کیجئیے۔ یا

اس لنک

پہ جائیے۔

ar

4:56 PM

Qarardad e maqasid, اردشیر کاواس جی, پاکستان, قائد اعظم، جناح, قرار داد مقاصد

وہ، میں اور مئ

یہی وہ دن تھے جب اک دوسرے کو پایا تھا

ہماری سالگرہ ٹھیک اب کے ماہ میں ہے

فی الحال میں اپنے بلاگ کی سالگرہ کی بات نہیں کر رہی۔ یہ مہینہ میری زندگی میں ایک اہم تبدیلی کا باعث بنا۔ وہی تبدیلی جس کے لئے اکثر لوگ اپنی ہتھیلی پھیلا کر دست شناس کے آگے کر دیتے ہیں کہ نام کا پہلا حرف بتادیں اور یہ کہ خاندان میں ہوگی یا خاندان سے باہر۔ یا یہ گاتے پھرتے ہیں کہ زندگی اپنی گذر جائے گی آرام کے ساتھ اب میرا نام بھی آئے گا تیرے نام کے ساتھ۔ یہ تو بعد میں عقدہ کھلتا ہے کہ صرف ناموں کا ساتھ رکھنا ہی بات نہیں بلکہ مقامات جد وجہد اسکے علاوہ ہیں۔

 میرے شوہر اور میری پہلی ملاقات، جیسا کہ کراچی میں طریقہ رائج الوقت ہے ایک ڈرائنگ روم میں ہوئ۔ لیکن حالات ایسے نہ تھے کہ چپ چپ کھڑے ہو ضرور کوئ بات ہے، پہلی ملاقات ہے یہ پہلی ملاقات ہے۔ اسکی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ میں سمجھی تھی کہ لڑکا ساتھ میں نہیں آیا اور یہ باقی خاندان والے ہیں۔ اس ملاقات کے آخر میں جب انکا مجھ سے تفصیلی تعارف کرایا گیا تب مجھے اندازہ ہوا کہ ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔

خیر، شادی سے پہلے ہماری خاصی ساری ملاقاتیں گھر کے اندر ہوئیں۔ اسکا مقصد میری طرف سے قطعاً یہ نہیں تھا کہ میں انہیں مزید جان لوں، کیونکہ اس سال فروری میں، میں نے خدا کو گواہ بنا کر عالم طیش میں کہا کہ اب جو بھی پہلا پروپوزل آئیگا میں اسے بغیر چھانے پھٹکے اور سوچے سمجھے ہاں کر دونگی چاہے وہ کوئ بھی ہو۔ اب خدا سے کئے اس وعدے کی لاج بھی تو رکھنی تھی۔ میرے اس جملے کی آزمائش صرف پچیس دن بعد ہی  فہوالمطلوب ہو گئ۔ اور میں نے اس پہ ثابت قدمی دکھائ اور آج تک دکھا رہی ہوں۔

:)

اسکی وجہ نجومی یہ بتاتے ہیں کہ قائد اعظم، سوہنی اور میرا برج ایک ہے اور اسکی بنیادی خاصیت ہے مستقل مزاجی۔ اماں کا خیال ہے کہ انکی اعلی تربیت ہے، احباب کا خیال ہے کہ شکر خورے کو خدا شکر دیتا ہے، کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ میری قسمت اچھی ہے  اور میں سمجھتی ہوں کہ میں خود کافی اچھی ہوں لیکن----------- اچھوں کے ساتھ۔

تو بات یہ بنی کہ

چاہئیے اچھوں کا جتنا چاہئیے

وہ اگر چاہِیں تو پھر کیا چاہئیے

قسمت کی خوبی دیکھئیے کہ در محبوب پہ مجھ سے پہلے رقیب نے دستک دی۔ اور میری رقیب صاحبہ میری قانونی آمد سے پہلے ہماری زندگی میں گھس آئیں۔ بقول ہماری بزرگ پڑوسن کے انہوں نے تو اپنی گاڑی سے نکاح کیا ہوا ہے۔  تو میری یہ رقیب ایک رینج روور ہے۔ انہیں اگر خوش کرنا ہو تو گاڑی کی شان میں ایک تعریفی جملہ کہہ دیں۔ اگر وقت اور معاشیات کا اندازہ لگائیں تو رقیب کو مجھ پہ ایک واضح برتری حاصل ہے۔ لیکن ایسے موقعوں پہ میں ایکدم اسی طرح رہتی ہوں جیسے صوفی راہ سلوک کی منازل پہ۔ حتی کہ کسی کو یہ اندازہ لگانے میں مشکل نہیں ہونی چاہئیے کہ میرا تعلق ملامتی فرقے سے ہے۔

یہ بات تو شادی سے پہلے میرے علم میں لائ جاچکی تھی کہ محترم  لینکس اور غالب کی شان میں ہتک برداشت نہیں کرتے۔ آج بھی کمپیوٹر کی فیلڈ میں ہونے والے میرے تمام مصائب کا سہرا ونڈوز کے سر بندھتا ہے اور اسے برا بھلا کہے بغیر میرے کسی بھِی ٹیکنیکل مسئلے کو شرف باریابی عطا نہیں ہوتا۔

 اس مہینے کی اہمیت میں میرے شریک حیات کی شخصی خوبیوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ جو شخص اپنے گھر کے گیٹ پہ گاڑی کے لئے ہارن بجانے کے بجائے خود گیٹ کھولنے کو ترجیح دے تاکہ محلے والے ڈسٹرب نہ ہوں۔ان سے میری شکائیتیں ایسی ہی ہوتی ہیں کہ کپڑے بستر پہ کیوں چھوڑ دئیے۔

خاصے عقلمند ہیں اور شادی کے فوراً بعد میری تربیت میں ڈرائیونگ کو مرکز نگاہ رکھا۔ اپنی جان چھڑائ اور واہ واہ بھی ہو گئ کہ بیگم کو خود انحصاری کی منزل پہ پہنچا دیا ہے۔ حالانکہ اس میں میری دور اندیشی بھی شامل تھی۔ میں نے  ان حالات سے خاصہ سبق سیکھا جب میں شاپنگ کے لئے دوکان کے اندر بیٹھی ہوتی تھی اور میاں صاحب موبائل فون پہ دوکان کے باہر ٹہل ٹہل کر گفتگو فرما رہے ہوتے تھے۔ تو شوہر صاحب کی ان اداءووں کا خوف نکالنے کے لئے دل سے کراچی کی سڑکوں کا خوف نکالا۔ اور نتیجے میں  اب میں دن ہو یا رات اپنے کسی بھی کام کے سلسلے میں انکی محتاج نہیں۔ ڈرائیونگ آنا، خواتین کے لئے ایک نعمت ہے۔ لیکن یہ یاد رکھیں کہ کبھی اپنے شوہر صاحب سے ڈرائیونگ سیکھنے کی حماقت نہ کریں۔

روشن خیال ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میری مستقل مزاجی کا دعوی دھرا کا دھرا رہ جاتا۔ میں نے اپنی پی ایچ ڈی اپنی شادی کے بعد مکمل کی اور اس سلسلے میں مجھے انکا تعاون ہمیشہ حاصل رہا۔ ورنہ یہ تو آپکو اندازہ ہوگا کہ جبری تعاون حاصل کرنا بھی کوئ مشکل کام نہیں، بس یہ کہ دلوں میں بال پڑ جاتے ہیں۔

اسی وجہ سے مجھے شادی سے پہلے کے دوستوں کی شادی کے بعد چھانٹی نہیں کرنی پڑی اور نہ ہی کسی کی چھٹی۔ نہ ہی پچھلے کسی واقعے کے منہ سے نکل جانے پہ سنسر لگانا پڑا۔

البتہ ایسا ہے کہ پہلے میں راستے کے چھوٹے ہونے کا مطلب یہ لیتی تھی کہ وہ فاصلے میں چھوٹا ہو۔ لیکن جب اپنے میاں موصوف کو کسی جگہ جانے کے آڑے ترچھے راست اختیار کرتے دیکھتی تو ایک دن ان سے پوچھ لیا کہ اس میں کیا اسرار ہے جواب ملا کہ اس راستے میں سگنل کم آتے ہیں اور ٹریفک اتنا نہیں ہوتا۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ ایک سگنل بھی کم آتا ہو یا دو گاڑیاں بھی کم ملیں تو وہ اسی راستے کو اختیار کرتے ہیں۔

اگر ہم دونوں کو کہیں ساتھ جانا ہو تو وقت کی خاصی اہمیت ہوتی ہے۔ اور گفتگو کچھ اس طرح ہوگی۔ سوال، کتنے بجے نکلیں گے، جواب سوا نو بجے۔ سوال، یہ ساڑھے نو بجے نہیں ہو سکتا۔ اس وقت فلاں سگنل پہ رش ہوگا اس میں اتنے منٹ خرچ ہو جائیں گے۔ یا یہ کہ مجھے یہ ایک کام کرنا ہے اس میں اتنے منٹ اتنے سیکنڈز لگ جائیں گے۔ جواب، اچھا تو پھر نو بج کر سترہ منٹ کر لیں۔ سوال، مگر ساڑھے نو بجے میں کیا برائ ہے۔ جواب، نو بج کر سترہ منٹ بیس سیکنڈ، بس اسکے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ نکلتے ہم پونے دس بجے ہیں ، کیونکہ عین وقت پہ بیٹی صاحبہ کو یاد آتا ہے کہ واش روم جانا ہے۔

ہمارے درمیان جھڑپوں کا باعث منٹوں اور سیکنڈز کے پیچیدہ حساب کتاب کے علاوہ جارج بش کی فارن پالیسی پہ ہم دونوں کا اختلاف، انکی شرٹس جو کہ باریک سوراخ ہونے کے بعد زیادہ قیمتی ہوجاتی ہیں ان میں میرا انگلی ڈال کر مزید بڑا کرنے کی ناکام کوشش کرنا، اور اسی طرح کے مزید نکات ہیں۔

تجربے سے میں نے یہ سیکھا ہے کہ شوہر صاحب کے جن کپڑوں سے آپ عاجز ہیں، انکے ڈسٹر بنا لیں یا خاموشی سے انکی چھٹی کر دیں۔ بہشتی زیور کی خواتین کی طرح اجازت لینے کے چکر میں مت پڑ جائیے گا ورنہ جواب ملے گا صرف شرٹس کے پیچھے کیوں پڑی رہتی ہیں اور بھی چیزیں ہیں جن سے زندگی میں تبدیلی آ سکتی ہے خاصی نمایاں۔ اور ہاں یہاں میں اپنی پیاری بہنوں سے گذارش کرونگی کہ خدا کے لئے شادی سے پہلے بہشتی زیور مت پڑھئیے گا۔

اگرمیں موڈ میں ہوں تو کوئ بھی قصہ سناءووں ، بڑی توجہ سے سنتے ہیں اور اسکے ختم ہونے کے بعد اپنے کمپیوٹر پہ سے ایک منٹ کے بعد نظر اٹھا کر انتہائ ذمہ داری سےفرمائیں گے ہاں توکیا کہہ رہی تھیں آپ؟  ہماری اماءووں کے زمانے میں اخبار اور ٹی وی شہروں کو مصروف رکتے تھے اور آج کے شوہر حضرات کمپیوٹرمیں گم رہتے ہیں۔   چونکہ میں ایک تابعدار بیوی نہیں ہوں۔ اگر جواباً میں اسی روئیے کا مظاہرہ کروں تو کہہ دیا جاتا ہے کہ کس دنیا میں رہتیں ہیں آپ۔ اب میں اپنی بات بالکل نہیں دہرا رہا۔ اپنے اوپر میرے حملوں کے جوابات انتہائ حاضر دماغی سے دیتے ہیں اور اگر ذرا بھی شکست کاشبہ ہو تو زیر لب مسکراہٹ سے کام چلائیں گے مگرکچھ بول کر نہیں دیں گے۔

جیسا کہ کچھ دانشواران نے لکھا ہے کہ ایک اچھے شوہر کو شادی کی سالگرہ اور بیوی کی سالگرہ کا دن نہیں بھولنا چاہئیے تو اس طرح وہ ایک بے حد اچھے شوہر ثابت ہوتے ہیں۔

باقی یہ کہ پہننے والے کو پتہ ہوتا  ہے کہ جوتا کہاں سے کاٹ رہا ہے ۔

اب یہاں سے ان خواتین کی دل پشوری کا حصہ شروع ہوتا ہے جو یہ پرچار کرتی ہیں کہ اچھی عورتیں وہی ہوتی ہیں جو اپنے مرد سے چار قدم پیچھے چلتی ہوں۔ یہاں میرا قصور نہیں ہے۔ میں بھی انہی اچھی عورتوں میں شامل ہونا چاہتی ہوں مگر یہ ہیں کہ شامل نہیں ہونے دیتے، ہمیشہ اپنے ساتھ لے لیتے ہیں اور آگے ہو جاءووں تو بڑا خوش ہوتے ہیں۔ کچھ خواتین اس بات پہ آہ بھرتی ہیں کہ ہماری اماں تو اپنے شوہر کا نام نہیں لیتیں۔ لیکن تف ہے ان آجکل کی عورتوں پہ، معاشرے سے اخلاقیات اور ادب احترام کا دیوالیہ ہی نکال دیا۔ میری بیٹی کی آمد تک مجھے انکو کسی طرح تو بلانا ہی تھا کہ ہم زنان خانے مردان خانے میں نہیں بلکہ ایک ہی گھر میں، ایک ہی کمرے میں رہتے تھے اس لئے آسانی اختیار کرتے ہوئے میں نے انہیں انکے نام سے بلانا شروع کر دیا۔ بیٹی صاحبہ کی آمد تک نام لینے کی ایسی بری عادت پڑ گئ تھی کہ جیسی منہ لگی کافر کی لت لگ جائے۔ یوں ارے سنئے مشعل کے ابا کی جگہ انکا نام آگیا۔ سو  میں بھی ان خواتین میں شامل ہوں جو معاشرتی اقدار اور روایات اور ادب و احترام کے خاتمے کو شہہ دینے والے ہیں۔

اب میں اس پوسٹ کے ساتھ اپنے تمام شادی شدہ بلاگر ساتھیوں کو ٹیگ کرتی ہوں کہ وہ ایک پوسٹ اپنی یا اپنے شریک حیات کے نام کریں۔

بشکریہ محمد ریاض شاہد،

انکی ایک پوسٹ

میں اس طرف توجہ دلائ گئ۔

4:04 PM

Pakistani marriage, شادی, کراچی, مشعل

خاص آدمی-۲

تاریخ میں دو قسم کی شخصیات کو عظیم ہونے کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ ایک وہ تاریخی شخصیات جنکے بارے میں مءورخ واقعات کی چھان بین کر کے انکے کارناموں کو بیان کرتا ہے۔ اس میں مبالغہ، تعصب، اور خوشامد شامل ہو سکتے ہیں۔ مگر چونکہ واقعات تاریخی ہوتے ہیں تو غیر جانبدار مءورخ کے لئے بھی موقع ہوتا ہے کہ انکی خامیوں اور کمزوریوں کو بھی صحیح روپ میں پیش کر سکے۔

 دوسری دیو مالائ شخصیات ہوتی ہیں۔ یہ وہ خاکے ہیں جو عوام کے ذہن میں ہوتے ہیں۔ جب وہ اپنے حالات میں موجودہ حکمرانوں سے اپنے مسائل کا حل نہیں پاتے تو اس ہیرو کو تراشتے ہیں۔ ان دیومالائ شخصیات میں بہادری، شجاعت ، ذہانت و فیاضی کی خوبیاں ہوتی ہیں۔ اس طرح یہ ایک طرف خدا کے پسندیدہ بندے اور دوسری طرف عوام کے نجات دہندہ بن جاتے ہیں۔ ان جذبات سے فائدہ اٹھا کر وقتاً فوقتاً کچھ لوگ یہ دعوی کرتے ہیں کہ وہ لوگوں کی نجات کے لئے آئے ہیں۔

جو فلسفی اور مءورخ تاریخ میں افراد کی اہمیت کو مانتے ہیں۔ ان کے یہاں جمہور اور جمہوریت سے دشمنی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ یہ ہر اس نظام کے خلاف ہوتے ہیں جہاں اقتدار خاص آدمی کے دائرے سے نکل کر عوام کے ہاتھ میں چلا جائے۔ انکے نزدیک تخیلقی اقلیت ہی ذہن و شعور کی مالک ہوتی ہے اس لئے یہ مساوات، برابری ، آزادی اور ارادہ ء اجتماعی کے خلاف ہوتے ہیں

تاریخ میں شخصیات اور افراد کے تاریخ ساز کردار کی اہمیت کا اثر یہ ہوا کہ عوام میں اور معاشرے کی اکثریت میں خود اعتمادی کا جذبہ ختم ہو گیا، اور جب بھی معاشرہ بحرانوں سے دو چار ہوا یا مسائل پیدا ہوئے تو وہ اسکی توقع کرتے رہے کہ کوئ شخصیت پیدا ہوگی اور انکے مسئلے حل کر دے گی۔ نسلیں اسی موہوم امید پہ زندگیاں قربان کر دیتی ہیں کہ کوئ آئے گا اور انہیں تمام مظالم سے نجات دلا کر دنیا میں امن و انصاف قائم کر دے گا۔ اس نظریہ نے عوام کی قوت، طاقت اور عمل کو ختم کر کے انہیں ظلم کو خاموشی سے سہنا سکھایا اور اسی کے سہارے ہر آمر اور ظالم نے کامیابی سے حکمرانی کی۔

تاریخ میں اگر شخصیتوں کو عقیدت سے دیکھا جائے تو وہ تاریخ نہیں مذہب ہے۔ پھر وہ شخصیت تاریخ کے دائرے سے نکل کر معجزے، کرامات اور مافوق الفطرت باتوں سے منسوب ہو جاتی ہے۔ جس سے اسکی عظمت کم ہوتی ہے۔ اس لئے مشہور مفکر ریناں نے کہا کہ اب اگر دنیا کا ایمان حضرت عیسی پر سے اٹھے گا تو محض ان معجزوں کی وجہ سے کہ جنکی وجہ سے ابتدا میں لوگ ان پہ ایمان لائے۔

تاریخ میں شخصیتوں کی اہمیت ہے لیکن تنہا شخصیتیں تاریخ ساز نہیں ہوتیں۔ حالات انکو بنانے میں اور انکے افکار و نظریات کی تشکیل میں حصہ لیتے ہیں اور پھر یہ شخصیات حالات کو بناتی ہیں اور معاشرے کی تعمیر کرنے میں سرگرم عمل ہوتی ہیں۔

حوالہ؛

کتاب، تاریخ اور فلسفہ ء تاریخ، مصنف ڈاکٹر مبارک علی، پبلشر فکشن ہاءوس، لاہور۔

خاص آدمی

11:07 PM

Doctor Mubarak Ali, جمہوریت, ڈاکٹر مبارک علی, ریناں

خاص آدمی

.ایک بلاگ پہ سے گذری تو اس سوال پہ نظر پڑی

کتنے لوگ اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ ایک اکیلا بندہ کچھ نہیں کر سکتا ؟ اور کتنے لوگ اس کے برعکس سوچ میں یقین رکھتے ہیں ؟

مختلف تبصروں پہ سے گذرتے ہوئے کچھ خیال آیا کہ کافی عرصے پہلے ڈاکٹر مبارک علی کی ایک کتاب پڑھی تھی، تاریخ اور فلسفہ ء تاریخ۔ کتاب کوچھانا پھٹکا اور اس سوال سے قطع نظر مندرجہ ذیل تحریر کا باعث بن گیا۔

ڈاکٹر مبارک علی تاریخ کے استاد ہیں اور اس موضوع پہ کئ کتابیں لکھ چکے ہیں۔

وہ لکھتے ہیں کہ انسان اور اسکے مقاصد کو زیر بحث لاتے ہوئے ایک نظریہ یہ پیدا ہوا کہ فطرت کسی ایک شخص کو مافوق الفطرت طاقت دیتی ہے تاکہ  وہ اس مقصد کے لئے جدو جہد کرے اس میں وہ عوام کی اکثریت کو لیکر چلتا ہے۔ وہ قانون اور اخلاق سے بالاتر ہوتا جو کچھ کرتا ہے صحیح ہوتا ہے۔ تاریخ میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ان شخصیات کے عمل کا نتیجہ ہے۔ تاریخ ان لوگوں کی سوانح عمری کے علاوہ کچھ نہیں

 تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ افراد تاریخ ساز ہوتے ہیں، انکے عمل سے تاریخ کا بہاءو تیز ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ افراد تاریخ کا راستہ متعین کرتے ہیں۔ کیونکہ تاریخ کا ہر واقعہ گذشتہ واقعات اور ارتقاء کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے اور وہ افراد جو تاریخ کی تعمیر میں نمایاں کردار دا کرتے ہیں محض اک آلہ ءکار ہوتے ہیں۔

پلیخانوف کہتا ہے کہ

'

بارسوخ افراد اپنے کردار اور اپنے ذہنوں کی مخصوص صفات کی بدولت واقعات کو اور انکے مخصوص نتائج کو تو بدل سکتے ہیں لیکن وہ واقعات کے عمومی رجحان کو نہیں بدل سکتے جو دوسری قوتوں سے متعین ہوتے ہیں۔

 وہ یہ کہتا ہے کہ جب بھی عظیم افراد کے ارتقاء کے لئے سازگار حالات موجود ہوئے یہ لوگ ہر جگہ نمودار ہوئے۔ یعنی صاحب صلاحیت شخص کا نمودار ہونا معاشرتی تعلقات کی پیداوار ہوتا ہے۔ ایک عظیم انسان دوسروں کے مقابلے میں واقعات کی رفتار کو سمجھتا ہے یہی اسکی عظمت ہے۔

تاریخِ میں معاشی و سیاسی و معاشرتی قوتیں اس قدر طاقتور ہوتی ہیں کہ وہ تاریخ کو مسلسل تبدیل کرتی رہتی ہیں۔ دنیا میں انقلابات ان قوتوں کی وجہ سے آتے ہیں۔ شخصیتیں صرف ان کے عمل کو تیز کر دیتی ہیں۔ ورنہ انکے بغیر بھی وہی کام ہوگا مگراس کام کی تکمیل میں زیادہ وقت اورزیادہ لوگ چاہئیے ہونگے۔ شخصی حکومت کے زمانے میں شخصیات کو اہمیت دی جاتی تھی اور انکے کارنامے لکھے جاتے تھے اس لئے اس میں حکمراں طبقے کی تاریخ تو ہوتی ہے لیکن عوام کی نہیں۔ مذہبی علماء کی تو ہوتی ہے لیکن انکے پیروکاروں کی نہیں، زمینداروں کی تو ہوتی ہے لیکن کسانوں کی نہیں، فوجی جرنیلوں کی ہوتی  ہے سپاہیوں کی نہیں، صنعت کاروں کی ہوتی ہے مزدوروں کی نہیں۔

اس طرح روائتی تاریخ میں اس بات پہ زور دیا گیا  ے کہ تاریخ صرف عظیم شخصیتوں کے کارناموں کا مرقع ہے۔ قدرت انہیں خاص صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کرتی ہے اور یہ اپنی صلاحیتوں کے ذریعے معاشرہ کی ترقی اور تمدن کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

تاریخ کا دوسرا نظریہ یہ ہے کہ عظیم شخصیتیں بذات خود کچھ نہیں ہوتیں بلکہ یہ حالات کی پیداوار ہوتی ہیں۔ شخصیتوں کی اہمیت اسی وقت ہوتی ہے جب انکے کام کے کے لئے  حالات سازگار ہوں اور معاشرہ کا ذہن ان کے پیغام اور تسلیمات کو سننے کے لئے  اور اس پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو اگر وہ سازگار ماحول سے ہٹ کر پیدا ہوتے ہیں تو انکی عظمت ختم ہو جاتی ہے۔

بقول 'ٹالسٹائ۔'عظیم شخصیتیں بذات خود کچھ نہیں ۔ بلکہ یہ واقعات ہیں جو انکا روپ اختیار کر لیتے ہیں'۔

یہ بات کچھ تاریخی واقعات کو دیکھنے کے بعد صحیح بھی لگتی ہے۔ ورنہ ایسا کیوں کہ

گلیلو

جب یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ زمین نہیں بلکہ سورج اس کائنات کا مرکز ہے تو پابند سلاسل ٹہرتا ہے اور دس سال قید و بند میں گذارنے کے بعد اسے عدالت میں اپنے اس بیان کی معافی جمع کرانے کے بعد رہائ ملتی ہے۔ لیکن یہی بات جب

کپلر

کہتا ہے تو فلکیات کی دنیا میں انقلاب آجاتا ہے۔

کولونیل نظام کے خاتمے کے بعد ایشیا و افریقہ سمیت دیگر ممالک میں شخصیت پرستی کا فروغ ہوا۔ ، ہر نئے آزاد ملک نے شخصیتوں کے بت تراشے اور انکے گرد ایسی روایات کا ہالہ تیار ہوا کہ انکی حیثیت انتہائ مقدس و متبرک ہو گئ۔ آزادی کی تحریکوں میں انکی جدوجہد کو اس قدر مبالغہ کے ساتھ پیش کیا کہ عوام کی قربانیوں اور انکے کردار کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔

جاری ہے۔

11:27 PM

Mubarak Ali, افریقہ, ایشیا, ٹالسٹائ, ڈاکٹر مبارک علی, کپلر, گلیلیو

ایک شہادت، ایک گواہی

آج اخبار کی اس اطلاع

پہ مجھے شدید صدمہ ہوا کہ بلوچستان یونیورسٹی کی پچاس سالہ استاد کو جو وہاں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہی تھیں۔ اور انکی مدت ملازمت کو تیئیس سال ہو چکے تھے۔ ٹارگٹ کلنگ کے نتیجے میں قتل کردیا گیا۔ پروفیسر ناظمہ طالب رکشے میں سفر کر رہی تھیں کہ دو افراد  نےان پہ فائرنگ کی ۔  بلوچ لبریشن آرمی نے انکے قتل کی ذمہ داری قبول کر لی۔ انکا کہنا ہے کہ بلوچی خواتین کے قتل اور ان پہ تشدد کے خلاف انہوں نے یہ اقدام اٹھایا ہے۔ سر پہ دو گولیاں لگنے کی وجہ سے موقع پہ ہی ہلاک ہو گئیں۔ پنجاب سے تعلق رکھنے والی یہ خاتون ایک شاعرہ بھی تھیں اور مختصر کہانیاں بھی لکھتی تھیں۔ انکی میت تدفین کے لئے کراچی روانہ کر دی گئ۔

میں نے ایک دفعہ گوادر کے مضافاتی علاقے میں ایک سولہ سترہ سالہ لڑکی سے پوچھا کہ تم نے چار جماعتوں کے بعد پڑھنا کیوں چھوڑ دیا۔ اس نے جواب دیا 'ابا نے منع کر دیا تھا'۔ 'پھر تم نے ابا سے کیوں نہیں کہا کہ میں اور پڑھوں گی اور علاقے سے کونسلر کا الیکشن لڑونگی اور ایکدن بلوچ  زبیدہ جلال کی طرح اسمبلی میں جا کر وزیر بنونگی'۔' ابا یہ سنے گا تو تھپڑ مارے گا'۔ 'کیوں اس بات پہ تھپڑ کیوں مارے گا'۔ 'اسے زبیدہ جلال بہت بری لگتی ہے'۔ 'اسے زبیدہ جلال کیوں بری لگتی ہے'۔ 'وہ کہتا ہے عورت کو یہ سب نہیں کرنا چاہئیے'۔ میں نے یہ جواب سننے کے بعد اس کو مزید سوالوں سے پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ بلوچستان وہ علاقہ ہے جہاں ابھی ڈیڑھ سال پہلے

پانچ خواتین کو تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد زندہ دفن

کر دیا گیا۔ اور نہیں پتہ چلا کہ اس انسانیت سوز ظلم کا شکار ہونے والی وہ لڑکیاں کون تھیں۔  جس علاقے میں عورت کی یہ اہمیت اور عزت ہو۔ وہاں بلوچ لبریشن آرمی والے کس عورت پہ تشدد کے خلاف لڑ رہے ہیں یہ نہیں سمجھ میں آیا۔

ایک بے گناہ، استاد جیسے مرتبے پہ فائز عورت جو کسی اور شہر سے آپکے بچوں کو تعلیم دینے کے لئے اپنے بچے کو چھوڑ کر وہاں ہوسٹل میں مقیم تھی۔ اسے قتل کر کے کس سے بدلہ لیا یہ بھی نہیں معلوم۔

بلوچستان، جو تعلیمی پسماندگی کا شدت سے شکار ہے، جہاں تعلیم یافتہ اور ہنرمند لوگوں کی شدید قلت ہے۔ جہاں اگر دیگر علاقوں سے لوگ نہ جائیں تو عالم یہ ہوتا ہے کہ لوگ اپنی حجامت بھی نہیں بنوا سکتے کسی اور ہنر کی بات تو دور کی ہے۔ اس لئیے، یہ بھی نہیں معلوم کہ اس معصوم عورت کا قتل انکے سیاسی مقاصد کو کسقدر پروان چڑھائے گا۔

 مجھے تو یہ معلوم ہے کہ یہ ظلم ہے اور بہت زیادہ انسانیت سوز ظلم۔ یہ وہ ملک ہے جہاں ہر وقت اسلام کے نعرے بلند ہوتے ہیں جس میں حالت جنگ میں بھی ، دشمن کی عورتوں اور بچوں تک کو تحفظ حاصل ہوتا ہے۔

یہ خبر مجھے روزنامہ ڈان  کے پہلے صفحے سے ملی۔

اخبار جنگ میں پہلے صفحے پہ شعیب اور ثانیہ سے متعلق دو خبریں موجود ہیں لیکن ایک استاد خاتون پہ اس بہیمانہ ظلم  کی یہ خبر پہلے صفحے پہ موجود نہیں۔ یہ ہیں ہماری ترجیحات۔

 پیپلز پارٹی بلوچستان کے صدر سینیٹر لشکری رئیسانی نے اس واقعے کی مذمت کی۔ ان کا کہنا ہے کہ پیپلز پارٹی کے اراکین اسمبلی اسلام آباد میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اور وہ صوبے کے مسائل کے حل میں دلچسپی نہیں لے رہے ہیں۔

وہ کیوں دلچسپی لیں گے۔ ہر ایک وہاں پیسے کمانے کے لئے گیا ہے۔ اسلام آباد میں بیٹھے رہنے کا مطلب یہ ہے کہ پیسوں کی بندر بانٹ والے کسی لمحے سے وہ غیر حاضر نہ ہوں۔

 ۔

.

ایک پچاس سالہ استاد خاتون کو گولیاں مار کر شہید کر دیا گیا۔ پاکستان کی تاریخ میں ایک اور سیاہ کارنامے کا اضافہ ایک اور دل دکھا دینے والا سانحہ۔

اس تصویر میں ڈاکٹرز پروفیسر ناظمہ طالب کا پوسٹ مارٹم کرنے کے لئے تیار ہیں۔

9:17 PM

Balochistan University, Nazima Talib, بلوچستان, بلوچستان یونیورسٹی, کوئٹہ, ناظمہ طالب

فراز سے ایک سوال

ایک بطخ گئ ایک سکنجبین بیچنے والے کے پاس ۔ ٹخ ٹخ ٹخا ٹخ کرتی ہوئ اور کہنے لگی، کیا تمہارے پاس ہیں انگور۔ سکنجبین والے نے کہا کہ میرے پاس نہیں ہیں انگور، لیکن سکنجبین ہے میرا مشہور۔ یہ ہے تازہ، فرحت والا، جھوم اٹھے گا پینے والا۔

بطخ نے اک پر ہلایا اور نخرے سے یہ فرمایا ،کٹھا لیموں، کٹھا شربت، کٹھے کی ہے یہ ذات، مجھے تو رکھو اس سے معاف،  ۔ پھر چلی وہ کرتی، ٹخ، ٹخ، ٹخا، ٹخ۔

اگلے دن وہ پھر آگئ اور دوکاندار سے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس ہیں انگور۔ اس نے کہا 'کل تو کہا تھا، بات نہیں یہ دور۔ میرے پاس نہیں ہیں انگور ، لیکن سکنجبین میرا ہے مشہور۔ پیو نہ پیو، مرضی تمہاری، کرتے نہیں ہم مجبور۔ بطخ نے کچھ سوچا اور کہنے لگی 'نہیں چاہئیے، نہیں چاہئیے، لیموں شربت نہیں چاہئیے' اور چل پڑی واپس۔  ٹخ، ٹخ، ٹخا، ٹخ۔

اگلے دن بطخ پھر آ گئ اور پھر پوچھا کہ کیا تمہارے پاس ہیں کچھ انگور۔  اب تو دوکاندار ہوا ناراض کہنے لگا' اب جو نام لیا انگور کا تو پتہ دونگا دور کا۔ لگا کے گوند تمہاری کمر پہ۔ لٹکا دونگا کسی درخت سے۔ سارا دن جب بنی رہوگی لنگور۔ پھر پوچھوگی، کیا تمہارے پاس ہیں کچھ انگور۔ بطخ نے تحمل سے اسکی یہ بات سنی اور گئ واپس پلٹ۔ ٹخ، ٹخ، ٹخا، ٹخ۔

حیران کن طور پہ اگلے دن بطخ پھر آدھمکی۔ لیکن آج اس نے پوچھا۔ کیا تمہارے پاس ہے کچھ گوند۔ دوکاندار نےدیا رکھائ سے جواب۔  گوند نہیں ہے میرے پاس،  یہاں ہے صرف شربت لیموں۔ اب سوچو تمہیں دوں یا نا دوں۔ بظخ ایک ثانئیے کے لئے ہوئ خاموش اور کہنے لگی کیا تمہارے پاس ہیں انگور۔ دوکاندار کا چہرہ بالکل بگڑ گیا۔ بطخ نے یہ دیکھ کر فوراً واپسی کا لیا راستہ۔ ایسے میں دوکاندار نے دی اسکو ایک آواز۔ بطخ پھر جو مڑی دیکھ کے حیران ہوئ۔  اک تبسم سے وہ یوں گویا ہوا، آءو میری پیاری آءو، آج کچھ انگور کھاءو۔  یہ کہہ کر اس نے بطخ کو ساتھ لیا اور قریب کے ایک اسٹور لے گیا۔ وہاں اس نے خریدے کچھ انگور  اور دئیے بطخ کو ہو کے مسرور۔  بطخ نے دیکھے انگور اور پھر کیا انہیں اپنے سے دور۔

دوکاندار حیراں ہوا اور پریشان ہوا۔ بطخ  ہچکچاتی ہوئ یہ کہنے لگی۔ آجکا دن یہ میرا، لگتا ہےگذرے گا اچھا ذرا، مجھے آیا ہے ایک خیال ، میرے ذہن میں ہے ایک سوال، تم بتاءو نہیں ہے یہ محال

۔

۔

۔

۔

کیا اس اسٹور میں تمہارے، ملتا ہے شربت لیموں پیارے؟

۔

۔

۔

میرا سوال یہ ہے فراز

پھر دوکاندار نے کیا دیا جواب؟

اسکی ویڈیو کے مزے لینا چاہیں تو حاضر ہے۔  چھوٹے بچوں کو یقیناً پسند آئے گی۔ ویسے کبھی کبھی بڑوں کے لئے بھِی چھوٹا بن جانے میں کوئ حرج نہیں۔ یہ احساس خاصہ توانا رکھتا ہے کہ کبھی ہم خوبصورت تھے۔

7:26 AM

انگور،Duck song, بطخ, سکنجبین, لیموں کا شربت

او کون لوگ ہو تسی

اٹھارہویں ترمیم کے نتیجے میں حاصل ہونے والی شادمانی اب

عدلیہ کے دروازے پہ

دستک دے رہی ہے۔ اگرچہ کہ میرا اور آپکا اس ساری ترمیم سے کیا تعلق،  اسکے نتیجے میں صدر کے اختیارات وزیر اعظم کو حاصل ہوئے، صوبہ ء سرحد کو ایک متنازعہ نام حاصل ہوا، سیاسی پارٹیز میں جماعتی الیکشن ختم کر دئیے گئے کہ ہر وقت الیکشن کی تسیح گھمانے کے بجائے کچھ اور جوڑ توڑ بھی ہونی چاہئیے اور سیاسی جماعتیں تو ویسے بھی جسکی بھینس ہیں انہی کے حوالے ہونی چائیں۔ اس طرح سے ایک خاندان ایک جماعت کو سنبھالے رہتا ہے تو زیادہ احساس ذمہ داری پیدا ہوتا ہے اور قوم کے رہ نماءووں کو ماں کی کوکھ میں ہی مناسب نعرے سننے کو ملتے ہیں جن سے انکے اندر مسائل کے حل کے لئے ایک ماورائ قوت نمو کرتی ہے۔ یہ چیز عوام میں سے ہر کس و ناکس کو نہیں مل سکتی۔

آئین میں سے جنرل ضیا کا نام نکال دیا گیا۔ اگرچہ مجھ جیسے عوامی جہلاء کی سمجھ میں خاک نہ آیا کہ اس سے مجھے لاحق مسائل کیسے حل ہونگے، مجھے تو اس ترمیم کے نتیجے میں ہی پتہ چلا کہ انکا نام آئین کا حصہ تھا۔ چلیں آئین کے اندر کیسے کیسے سقم کتنی عرق ریزی سے نکالے گئے۔ اسکے لئے ہمارے پارلیمانی اراکین اس بات کے مستحق ہیں کہ انکی پیٹھ تھپتھپائ جائے۔

 کرائے میں اضافے کے خلاف، میری بات تو بس کا کنڈیکٹر بھی سننے کو تیار نہیں۔ وہ ضیا ء الحق کو نہیں جانتا ابھی پچیس سال کا ہے اور اسکی گھٹی میں تازہ دشمنی مشرف کے نام کی ہے۔ اسے حیرت ہے کہ مشرف کا نام آئین میں سے کیوں نہیں نکالا گیا۔

یہی نہیں، بلکہ آئین میں تیسری مرتبہ وزیر اعظم بننے کی جو پابندی مشرف کے وقت میں ڈالی گئ تھی وہ بھی ہٹا دی گئ۔ اسکے نتیجے میں ہم اور ہمارے بعد آنیوالی نسلیں بھی تین چار لوگوں کے درمیان بندر بانٹ دیکھتے رہیں گے۔ لیکن اس سے جمہوریت کی فلم کی کاسٹ محدود رہے گی جس سے زیادہ پیچیدگیاں نہیں پیدا ہونگیں اور یوں جمہوریت کو استحکام حاصل رہے گا۔

کسی سیاسی پارٹی کا سربراہ منتخب اسمبلی کے وزیر اعظم کو معطل کرنے کی صلاحیت حاصل کر لے اس سے بڑھ کر جمہوریت کی فتح کیا ہو سکتی ہے۔ یقیناً جمہوریت بہتر انتقام ہے خاص طور پہ ان سے جو اپنے ووٹوں سےمنتخب کروا کے لاتے ہیں۔

 اسی طرح کی مزید ترمیمات سے پُر

مسودہ صدرصاحب کے حضور

اسمبلی اور سینیٹ سے گذر کر پیش ہوا اور اس پہ انہوں نے دستخط کر کے اپنا نام امر کر لیا۔

 پھر اسکے بعد پاکستان کا ایک اور اہم مسئلہ بے نظیر کی شہادت کا معمہ حل کرنا تھا۔ گو کہ اس سے پہلے ہونے والے کسی بھی سیاسی قتل کو معلوم نہ کیا جاسکا اسکی وجہ شاید  مقول کےورثاء کو حکومتی عہدہ نہ ملنا ہو۔  لیکن اس دفعہ یہ ہماری منتخب جمہوری حکومت کا ایک اہم ٹاسک تھا، ورنہ اسکی عوامی شہرت مشکوک ہو جاتی کہ انہوں نے اپنی عوامی انتخابی مہم اسی نعرے پہ جیتی تھی۔ ایک وجہ یہ بھی بتائ گئ  کہ چونکہ صدر صاحب کو قاتلوں کے نام پہلے سے معلوم تھے تو انہوں نے اسے ایک پرچی پہ لکھ کر چھپا دیا اور اقوام متحدہ کی ٹیم سے کہا کہ بوجھو تو جانیں۔ اقوام متحدہ کی ٹیم کو شروع میں پتہ نہیں تھا کہ یہ ایک کھیل ہے۔ پس انہوں نے کچھ ایسی رپورٹ بنادی کہ اس میں وفاقی وزیر داخلہ رحمن ملک کو بھی مشتبہ قرار دے دیا۔ رپورٹ تیار ہو جانے کے بعد مزید پندرہ دن تک اس رپورٹ کو روک کر رکھا گیا کہ ایسی عقل سے پیدل ٹیم کو کچھ سمجھا بجھا لیں کہ یہ ایک کھیل تھا۔ لیکن انہیں یقین نہیں آیا کہ ساٹھ ملین ڈالر یعنی تقریباً پچاس کروڑ پاکستانی روپے صرف کھیل کے کیسے ہو سکتے ہیں۔

اب چونکہ حکومت یہ ارادہ پہلے ہی کر چکی تھی  کہ اس سب کے بعد مشرف کو واپس پاکستان لاءو پھانسی دلاءو جیسے عوام کے خون کو گرم کر دینے والے نعرے لگانے ہیں جس سے انکی توجہ اپنے پیٹ سے مشرف کی گردن کی طرف ہو جائے گی۔ اس لئے اقوام متحدہ کی ٹیم کی ہٹ دھرمی کے باوجود اسکرپٹ میں کوئ تبدیلی نہیں کی گئ۔ رحمن ملک ابھی بھی اپنے عہدے پہ موجود ہیں البتہ حکومت نے اس فلم میں مزید دلچسپی پیدا کرنے کے لئے کہا ہے کہ وہ مشرف پہ مقدمہ چلانے میں ذرا تاءمل نہیں کرے گی۔

آگے کیا ہوگا، کیا حکومت مشرف کو واپس لائے گی ؟، وفاقی وزیر داخلہ ترقی کر کے کس عہدے پہ پہنچیں گے؟ بی بی کی روح سے کیا گیا وعدہ کیا پورا ہوگا؟ باقی روحوں سے کئے گئے وعدے کون پورا کرےگا؟ زندہ عوام سے کئے گئے وعدوں کی باری کب آئے گی؟ اسکے لئے ہم ایک نیا بلاگ کھولنے والے ہیں جہاں ستاروں کی روشنی میں تبادلہ ء خیال ہوگا۔

ادھر اٹھارویں ترمیم پہ عدالتی چارہ جوئ نامی متوقع موڑ آ چکا  ہے۔ اپوزیشن جماعت مسلم لیگ نون نے کہا ہے کہ

عدلیہ کو اپنا احترام

برقرار رکھنا ہے تو اس ترمیم کو چیلینج کرنےوالے مقدمات کو نہ لیاجائے۔ ادھر بے نظیر کے قاتلوں کو پھانسی لگاءو سیریل بھی روانی سے چل پڑی ہے۔ اور عوام اسٹارپلس کے ساس بھی کبھی بہو تھی قسم کے ڈرامے چھوڑ کر پنڈولم کی طرح سر ہلا کر کبھی ایک فلم کے پرومو کو اور کبھی دوسری فلم کے پرومو کو دیکھتے ہیں۔

لیکن ابھی کہانی میں صحیح سے ٹوئسٹ نہیں آیا۔

اب ان دو عظیم مسائل کے ممکنہ حل اور باکس آفس پہ کامیابی کے بعد کیا بچا ہے، جسے حل کیا جائے۔ سیاسی لیڈران جپھیاں ڈالے ابھی اس بات پہ سوچ بچار کر ہی رہے تھے  کہ کسی منچلے نے کہہ دیا کہ بجلی کی کمی ہو چلی ہے، چلیں منہ کا ذائقہ بدلنے کو اسے بھی دیکھ لیں۔ ورنہ ایسا نہ ہو کہ بھری کریال میں غلیلہ لگے، کیونکہ عوام کے پاس اب غلیل کے علاوہ کیا ہے۔

سرکار نے وہیں بیٹھے  بیٹھے اپنے نائ سے جاسوسی کروائ اور پھر فوری طور پہ یہ فیصلے کر ڈالے کہ مارکیٹ روزانہ آٹھ بجے بند ہوگی، گھڑیاں آگے کردو، ہفتے کی دو چھٹیاں کر دو۔ اب کسی  نے اپنے اخروٹ کو توڑتے ہوئے کہا کہ عوام کہہ رہے ہیں کہ نئے بجلی گھر بنائے جائیں ورنہ ہم جو بچا تھا وہ لٹانے کے لئے آئے ہیں پرفارم کر کے دکھائیں گے۔ اطلاع ہے کہ انہوں نے اس اخروٹ کی گری کھاتے ہوئے عبرت کے لئے ایک اور اخروٹ دیوار پہ دے مارا، انکے خانساماں نے فوراً معاملات کو سنبھالا کہ ایک تو نئے بجلی گھر نامی ڈش کو پکنے میں وقت لگے گا کہ اسے اتنی محنت اور وقت چاہئیے جتنا کہ حلیم یا پائے کو پکنے میں چاہئیے ہوتا ہے اور  پھر یہ نہیں معلوم کہ مناسب کمیشن کس کے حصے میں چلا جائے۔  دوسرا

کرائے کے بجلی گھر

نامی ڈش کے غذائ فوائد زیادہ ہیں اور یہ سرکار کی صحت اور جیب دونوں پہ اچھا اثر ڈالتی ہے کہ اسکے نتیجے میں کمیشن کی چٹپٹی چٹنی زیادہ ملتی ہے اور فوراً ملے گی۔

اس کہانی میں عوام بھی موجود ہیں،  ایک منظر میں عوام جلاءو گھیراءو کر رہے ہیں کہہ رہے ہیں کہ

بجلی کے بڑے چوروں

کو پکڑیں۔ لیکن لگتا ہے کہ عوام  نہیں جانتے کہ  سیاں بنے کوتوال تو ڈر کاہے کا محاورہ کیوں وجود میں آیا ہے۔ ویسے بھی جب عوام خود بہتی گنگا کو اپنے ووٹوں سے چوروں کی جیب میں ڈال رہے ہیں تو کون کافر اس میں ہاتھ دھونے سے انکار کرے گا۔

یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر عوام ایسا کیوں خیال کرتے ہیں، وہ کیوں یہ چاہتے ہیں کہ ملک میں خواص نہ رہیں سب عوام بن جائیں۔  ایک تو ذرا اپنی طرف دیکھیں جیسے کرتوت ویسے سپوت۔ اور کہیں صرف عوام سے بھی کوئ ملک چلا ہے۔ او کون لوگ ہو تسی۔

حوالہ؛

بجلی کی چوری

12:21 AM

18th Amendement, load shedding, rental power house،, اٹھارویں ترمیم, بے نظیر کا قتل, جمہوریت, لوڈ شیڈنگ, مسلم لیگ ن

کون لوگ ہو تسی

آسٹریلیا پہلی دنیا سے تعلق رکھنے والا ملک ، پاکستان کے مقابلے میں تقریباً سات گنا زیادہ رقبہ رکھتا ہے۔ پاکستان کی آبادی اس وقت تقریباً سترہ کروڑ ہے اور آسٹریلیا کی آبادی تقریباً بائیس ملین یعنی دو کروڑ ہے۔ آسٹریلیا کی فی کس سالانہ آمدنی تقریباً انتالیس ہزار  ڈالر بنتی ہے۔ اور پاکستان کی فی کس سالانہ آمدنی ایک ہزار ڈالر سالانہ بنتی ہے۔

اب آپ سوچیں گے کہ اس وقت مجھے آسٹریلیا کیوں مل گیا ہے پاکستان سے مقابلے کے لئے۔ اسکی دو وجوہات ہیں ایک تو میں ابھی کچھ ہی مہینے پہلے وہاں ایک قلیل مدتی قیام کے لئے موجود تھی۔ اس سے  کچھ سال پہلے بھی میں وہاں ذرا زیادہ عرصے کے لئےرہ چکی ہوں اور اسکی دوسری بڑی وجہ لوڈ شیڈنگ سے نبٹنے کے لئے نئے حکومتی منصوبے کا اعلان ہے۔

ان دونوں میں ایک بات مشترک ہے۔ آسٹریلیا میں تمام صنعتی ادارے شام کو پانچ بجے بند ہو جاتے ہیں جس میں بازار بھی شامل ہیں۔ اور تمام کھانے پینے کی جگہیں شام کو سات بجے بند ہوجاتی ہیں۔ سوائے کچھ مخصوص جگہوں کے جن میں کھانے پینے کی کچھ جگہیں اور کچھ اور مثتنشیات شامل ہیں جو کہ رات کو دس بجے تک کھلی رہتی ہیں۔ شام کو سات بجے تمام سرگرمیاں ماند پڑ جاتی ہیں۔ بازاروں کے اس طرح سر شام بند ہونے سے وہ لوگ جو آفسز میں کام کرتے ہیں انہیں مسئلہ ہو سکتا ہے اسکے لئے ہفتے میں ایکدن ایسا ہےجسے

شاپنگ نائٹ

کہتے ہیں اس دن بازارزیادہ سے زیادہ نو  بجے رات تک کھلے رہتے ہیں۔ تمام مارکیٹس صبح سات بجے کھل جاتی ہیں۔ اور یہ بالکل ممکن ہے کہ آپ اپنے بچے کو اسکول چھوڑتے ہوئے واپسی میں خریداری کرتے  ہوئے آجائیں۔

کم و بیش یہی حال میں نے تھائ لینڈ میں دیکھا۔ تمام بازار سات بجے بند۔ شام ساڑھے چھ بجے سے شاپنگ مالز میں اعلان رخصت کی سیٹیاں بجنا شروع ہو جاتی ہیں۔ حتی کہ پہلے دن میرے ساتھیوں کے اس چیزکو سنجیدگی سے نہ لینے کی وجہ سے ہمیں تقریباً رات کو بھوکا رہنا پڑا،محض ڈبل روٹی سے کس کا بھلا ہوتا اور اتنی رات کو سوائے کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے جو ہماری جگہ سے خاصہ دور تھا کہیں سے حلال کھانا  تو دور حرام بھی ملنے کا کوئ امکان نہ تھا۔ تمام مارکٹ صبح آٹھ بجے کھل جاتی ہیں۔

اب پاکستان آئیے، کراچی میں مارکیٹ دن کے ایک بجے کھلنا شروع ہوتی ہے جو رات کو گیارہ بارہ بجے تک بند ہوتی ہے۔ گویا عملی طور پہ دن آدھے دن کے بعد شروع ہوتا ہے کہ کاروباری طبقہ اس وقت سو کر اٹھتا ہے۔ پھر رات کے بارے میں کہہ دیا جاتا ہے کہ رات تو اپنی ہوتی ہے۔

اب سے چند مہینے پہلے، جب تک شادی کے اوقات کی پابندی مقرر نہ ہوئ تھی۔ عالم یہ تھا کہ خواتین دس بجے رات کو درزی کے پاس کھڑی کپڑوں کا انتظار کرتی تھیں کہ یہ کپڑے پہن کر تیار ہو کر انہیں بارہ بجے کسی شادی میں پہنچنا ہوتا تھا اور اس شادی کا کھانا رات کو دو بجے کھایا جاتا تھا۔اور اس شادی کی تقریب کا اختتام صبح چار بجے ہوتا تھا۔

ترقی یافتہ ممالک تو اپنی بجلی بچانے کے اتنے سخت قوانین بنا کر ان پہ عمل کر ہے ہیں۔ لیکن ہم جیسے غریب ممالک میں کیا ہوتا ہے۔  پاکستانی حکومت کے اس اعلان کے بعد کے کاروبار رات کو آٹھ بجے بند کر دیا جائے

تاجروں نے اسکی عدم تعمیل کا اعلان کیا ہے۔

ایک طرف ہم بجلی کی کمی کا رونا رو رہے ہیں ہمارے کارخانوں میں، ہسپتالوں میں، اسکولوں میں بجلی نہیں ہے۔ اور دوسری طرف ہم بطور حکمران یا بطور عوام اپنی کاہلی، نکمے پن اور عیاشی سے بھی نجات نہیں پانا چاہتے ہیں۔ کون لوگ ہو تسی؟

8:57 AM

Karachi, load shedding, pakistan, بازار، تاجر، کراچی, بجلی کی کمی, پاکستان, لوڈ شیڈنگ

کزن میرج، ایک اور تجزیہ

کافی عرصے سے کزن میرج پہ لکھنا چاہ رہی تھی۔ لیکن جب اسکے متعلق ایسی تحریریں پڑھیں جس میں لوگوں نے اپنے ذاتی تجربات کے ذریعے اسکے کسی بھی نقصان دہ پہلو کو خدا پہ ڈالدیا تو یہ خیال آیا کہ اس پہ ضرور لکھنا چاہئیے۔ ذاتی تجربات تو نہیں کہ میرے خاندان میں کزن میرج کا ایسا کوئ خاص رواج نہیں۔ لیکن مشاہدات سے کزن میرج ایک صحتمند ، توانا اور ذہنی طور پہ چست نسل کے لئے کوئ بہتر خیال نہیں ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ شادی کے نتیجے میں ہر دو فریقین کی ترجیح ایک صحتمند اولاد ہی ہوتی ہے اور ایسا کم ہی ہوتا ہے بالخصوص جنوبی ایشیائ گھرانوں میں کہ شادی کا مقصد صرف ایک وفاداراور پر جوش رفاقت ہو۔

اگر میں صرف اپنے ذاتی مشاہدات گنوانے بیٹھ جاءووں جو اندرون سندھ کے کسی دور افتادہ گاءوں سے، کراچی میں ایسے خاندان جہاں خاندان سے باہر شادی ہرگز نہیں ہوتی پہ مشتمل ہے۔ تو ان سب میں بچوں کی معذوری یا پیدائش کے فوراً کسی پیچیدگی کا شکار ہونا یا کسی ایسے عارضے میں مبتلا ہونا جیسا کہ دل کے والو کی خرابی  یہ ان جوڑوں میں زیادہ پائ جاتی ہے جو کہ کزن ہوتے ہیں۔

جو تحریریں میں نے اس ضمن میں پڑھیں اس میں ایک بات کو بری طرح نظر انداز کیا گیا اور وہ یہ کہ یہ صرف کزن میرج نہیں،  بلکہ پشت ہا پشت تک ایک ہی نسل میں شادی کا رجحان ہے۔  کبھی کسی کا اپنے کزن سے شادی کرنے کا دل بہت ہو، کچھ اور معاشرتی مسائل ہوں تو الگ بات ہے۔ لیکن صرف کزن سے شادی کرنا یہ ایک صحت مند طرز عمل نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر کوئ سانحہ آپکے ساتھ نہیں ہوا تو اسکا مطلب یہ نہیں کہ اب اس عمل کو درست قرار دے دیا جائے۔ اگر میں آپکو دو طرح کے پریشر کوکر دکھاءووں اور کہوں کہ الف کے ساتھ ککر پھٹنے کے امکانات ساٹھ فی صد ہیں اور ب کے ساتھ ککر پھٹنے کے امکانات دس فیصد تو کوئ بھی عقلمند شخص دس فیصد والے کو خریدے گا۔ اگرچہ اسکی قیمت معمولی سی زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔

کزن میرج کے ساتھ بالعموم یہ مسئلہ کھڑا ہوجاتا ہے کہ اسے دین اسلام پہ حملہ تصور کر لیا جاتا ہے۔ مذہب کزن میرج کی اجازت دیتا ہے اسے لازمی نہیں بناتا۔ یہ اجازت تو اپنے لے پالک بچے کے شوہر یا بیوی سے شادی کرنے کی بھی ہے لیکن اسکے لئے اب ہر مسلمان پہ لازمی نہیں کہ وہ کوئ بچہ لے کر پالے پھر اسکی شادی کر کے اسکے اپنے جوڑے سے الگ ہونے کا انتظار کرے۔

مغربی ممالک میں بھی تقریباً  سو سال پہلے تک کزن میرج ہوتی تھی۔ مشہور زمانہ ارتقاء کا نظریہ پیدا کرنے والے سائنسداں

چارلس ڈارون کی بیوی

اسکی کزن تھی اور

آئینسٹائن کی دوسری بیوی

بھی اسکی کزن تھی۔ لیکن بعد میں مغرب نے اسکے برے اثرات کے پیش نظر اسے اتنا کم کر دیا کہ اب زیادہ تر حالات میں مغربی معاشرے میں کزن سے شادی سگے بہن بھائ کی شادی کی طرح ہی بری تصور کی جاتی ہے۔ اور اب وہاں کچھ حلقے یہ مہم چلاتے ہیں کہ کزن میرج کوئ مذہباً بری بات نہیں ہے۔

اب ہم اسکے سائینسی تجزئیے کی طرف آتے ہیں اور اسے

مینڈل کے وراثتی قانون

کے تحت دیکھتے ہیں۔

ایک نسل سے دوسری نسل تک خصوصیات

جینز

کے ذریعے منتقل ہوتی ہیں۔یہ جینز کروموسومز پر موجود ہوتے ہیں۔ ہر انسان میں کروموسومز کے تیئیس جوڑے پائے جاتے ہیں۔ عورتوں میں یہ جوڑا دو ایکس پہ مشتمل ہوتا ہے اور مردوں میں ایک ایکس ہوتا ہے اور دوسرا وائ۔ بچے اپنے کروموسومز کے جوڑوں کا ایک حصہ باپ سے اور دوسرا ماں سے حاصل کرتے ہیں۔ لڑکوں میں ماں سے کروموسوز کا ایکس حصہ اور باپ کی طرف سے وائ حصہ آتا ہے۔ اور لڑکیوں میں ماں کی طرف سے ایکس اور باپ کی طرف سے بھی ایکس حصہ آتا ہے۔ اسی لئے بعض جینیاتی بیماریاں لڑکوں کی طرف سے، بعض لڑکیوں کی طرف سے اور بعض دونوں سے چلتی ہیں۔

کروموسومز دھاگے جینز سے بنے ہوتے ہیں اور یہ جینز پیغامات رکھتے ہیں کہ ہماری ممکنہ شکل و صورت، رنگ بال، ذہن مزاج حتی کہ بیماریاں کیا ہو سکتی ہیں۔والدین کے  جینز آپس میں ملتے ہیں تو ان میں والدین کی جینز کے سب خواص موجود ہوتے ہیں۔

جینز پہ لکھے ہوئے یہ پیغامات جو ہماری نسل کے آغاز سے اس پہ موجود ہیں۔ سب کے سب ہم میں ظاہر نہیں ہوتے۔ کچھ جو مضبوط ہوتے ہیں ظاہر ہو جاتے ہیں اور جو کمزور ہوتے ہیں وہ جینز میں موجود تو ہوتے ہیں مگر اس وقت خاموش ہوتے ہیں انہیں مغلوب جینز کہتے ہیں۔ جیسے والدین میں سے ایک آنکھیں نیلی ہیں اور دوسے کی براءون تو اگر بچے کی آنکھیں نیلی ہیں تو یہ جین غالب آگئ اور براءون جین کا پیغام چھپپا ہوا ہے۔ اگلی کسی نسل میں یہ براءون جین والا پیغام ممکن ہے کہ سامنے آجائے اور نیلی جین والا مغلوب ہو جائے۔

اب اگر آپ  اس دی گئ  شکل پہ تھوڑا سا غور کریں تو ہرے رنگ کی اشکال صحتمند والدین کی ہیں انکے بچے بھی صحتمند ہونگے۔دوسرے جوڑوں میں کسی ایک کا آدھا حصہ سفید دکھایا گیا ہے اور ہم دیکھ سکتے ہیں کہ انکے بچوں میں بھی انکے اثرات موجود ہیں۔ جو بچے آدھے سفید اور آدھے ہرے ہیں ان میں بیماری کے جینز تو موجود ہیں لیکن وہ ان میں ظاہر نہیں ہوتے بلکہ ان بچوں میں یہ صلاحیت ہے کہ آگے والی نسل میں اسے ٹرانسفر کر دیں۔ انہیں کیریئر کہتے ہیں۔ یعنی خود نہ متائثر ہو لیکن اگلے کو پہنچا سکتا ہو۔ اب اگر انکا ملاپ کسی ایسے شخص سے ہوتا ہے جو خود بھی کیریئر ہے تو اس بیماری کے ہونے کے امکانات کہیں زیادہ ہونگےجیسا کہ بعد کی تصویروں سے ظاہر ہے۔

کئ پشتوں تک ایک ہی نسل کے لوگ اپنے  کزنز سے شادی کرتے رہیں

تو کمزور جینز کے غالب ہونے کے امکانات زیادہ ہو جاتے ہیں۔ اسکی مثال اس طرح ہے کہ اگرجینز میں دس نسل پہلے کسی ایک کو دل کی خرابی کا مرض لا حق تھا تو مسلسل دس نسلوں تک اآپس میں شادی کے نتیجے میں دل کی خرابی کے امکانات بڑھتے چلے جائیں گے۔ کیونکہ ہر جین کے اندر اسکا پیغام چھپا ہوگا۔ جسکی فریکوئینسی بڑھنے سے وہ زیادہ ہوتا چلا جائیگا۔

اچھا ۔جانوروں میں ایک چیز اور ہوتی جو ان بریڈنگ کہلاتی ہے۔ اس عمل میں اعلی ترین نسلی خواص رکھنے والے جانوروں کی اولادیں حاصل کی جاتی ہیں اور پھر ان اولادوں میں جنکے بہترین خواص ہوتے ہیں انکی میٹنگ کراتے ہیںیعنی کزن میرج۔ یہ عمل ہر بار اعلی خواص رکھنے والی اولادوں کیساتھ دوہرایا جاتا ہے۔ اس طرح کمزور خواص رکھنے والی جینز آہستہ آہستہ باہر ہوجاتی ہیں اور اعلی خواص رکھنے والی جینز قائم رہتی ہیں۔

یہ خاصہ ٹیکنیکل کام ہوتا ہے۔ اسکے نتیجے میں ایک اعلی خواص رکھنے والی نسل تو حاصل ہوجاتی ہے۔ لیکن ایک اور خامی پیدا ہو جاتی ہے جسے ان بریڈنگ ڈپریشن کہتے ہیں۔ اور اسکی وجہ سے اگر کوئ ایک کمزوری کسی ایک جین میں ہو تو وہ اس نسل کی تمام جینز کے اندر ہونے کے امکانات زیادہ ہو جاتے ہیں۔ جیسے میرے ایک کولیگ جن کے یہاں شادی خاندان سے باہر قطعاً نہیں ہوتی تھی۔ ان کی ایک بہن کے تین بچے تھے اور تینوں بچوں کو جلد کی ایک ایسی بیماری تھی جسکا کوئ علاج نہ تھا۔ میری سرائیکی ماسی کے خاندان میں پچھلے دو سال میں تین نوزائیدہ بچوں کا انتقال دل کے والو کے کام نہ کرنے کی وجہ سے ہو اور تین بچے دماغ کی کمزوری کا شکار ہیں۔

ایک ریسرچ

کے ذریعے یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ جتنا  کزن میرج کو دہرایا جاتا ہے اتنا ہی بچوں میں جسمانی کمزوریاں اور دماغی صلاحیتیں کم ہونے کا اندیشہ بڑھتا رہتا ہے۔ اور اسکی مثال وہ اس طرح دیتے ہیں کہ یہ اثر اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے جتنا کہ بیالیس سال کی عمر کے بعد کسی خاتون کے پیدا ہونے والے بچے میں کسی بھی قسم کی خرابی یا معذوری کا ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔

اب اگر کوئ یہ کہے کہ اپنے سے بڑی عمر کی خاتون سے شادی کرنے میں کوئ مضائقہ نہیں اور اسلام اسکی اجازت دیتا ہے بلکہ رسول اللہ نے اپنی نوجوانی کا زمانہ اپنے سے پندرہ سال بڑی خاتون کے ساتھ گذارا اور وہ بھی ایک دو تین سال نہیں پورے پچیس سال تو  سب خاموش ہو جائیں گے اپنے سے بڑی خاتون تو آنٹی ہی ہو سکتی ہیں۔دل مزید نرم کر لیں تو باجی۔ مگر بیوی، لا حول ولا قوت۔ بس۔ مگر کزن میرج پہ سب دلیلیں دینے لگتے ہیں کہ خدا کا نام لیکر کر ڈالوجی کچھ نہیں ہوتا۔

اس ساری تحریر کا مقصد یہ ہے کہ اگر آپکے خاندان میں کئ نسلوں سے کزن میرج کا سلسہ چل رہا ہے تو خاندان سے باہر نکل کر دیکھیں۔ دو مختلف جینز بہتر نسلی خصوصیات لاتی ہیں۔ معاشرے کے اندر توازن اور برداشت پیدا کرتی ہیں۔ ذہن کی تخلیقی صلاحیتوں کو مہمیز کرتی ہیں۔ اور ان سب چیزوں کی  ہمیں بے حد ضرورت ہے۔

11:12 AM

Cousin Marriage, آئینسٹائن، Genetics, جینیات, چارلس ڈارون, کزن میرج, مینڈل کا قانون

کون بنے گا قفال شاشی

وہ شہر کا مشہور قفال یعنی قفل یا تالے بنانے والا تھآ۔ اور اس معاملے میں اسکی شہرت دور دور تک تھی۔ بادشاہ بھی اسکی مہارت کے قدر دانوں میں سے تھا۔ اور اس وجہ سے اسے بھی اپنے اوپر اپنے  بڑا فخر تھا۔

اپنی قفل سازی کے مختلف نمونوں کی تعریف بادشاہ سے سننے کے لئے وہ بڑی محنت سے اپنے نمونوں پہ کام کرتا اور بادشاہ کے دربار میں انہیں لیکر حاضر ہوتا۔  بادشاہ بھی اس معاملے میں بخیل نہ تھا۔ ایک دن دربار لگا ہوا تھا۔ بادشاہ لوگوں سے ملاقات کر رہا تھآ اور قفال شاشی خاموشی سے بیٹھے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے کہ کب شرف باریابی ہو اور وہ اپنی مہارت کا ایک اعلی نمونہ بادشاہ کو دکھائیں۔ خدا خدا کر کے انکی باری آئ اور ابھی بادشاہ نے انکی تخلیق کو دیکھنا شروع ہی کیا تھا اور قفال شاشی اس لمحے کے لئے ہمہ تن گوش تھے کہ کب بادشاہ کے منہ سے تحسین کے الفاظ نکلیں کہ غلام نے ایک شخص کے آنے کا اعلان کیا۔  بادشاہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑا انکی مہارت کا نمونہ ایک طرف رکھا اور آنیوالے شخص کی تعظیم میں کھڑا ہو گیا۔ وہ شخص جب دربار میں داخل ہوا تو بادشاہ نے اسے اپنے برابر جگہ دی۔ یہ وہ تعظیم تھی جو ہزارہا تعریف کے باوجود کبھی بادشاہ نے انہیں نہ دی تھی۔ قفال شاشی کے دل کو دھچکہ پہنچا۔ یہ کون ہے جس نےانکے فخر کو دھندلا دیا۔

 معلوم ہوا کہ وہ شہر کے مشہور عالم ہیں۔ اس دن قفال شاشی کا دل بجھ گیا۔

وہ گھر واپس آئے اور اپنے اوزار ایک طرف رکھ دئے۔ اگلے دن سے قفال شاشی کی انگلیوں نے لوہے کی کھٹ پٹ چھوڑ کر کتاب کے اوراق پلٹنے شروع کر دئے۔

امام ابو بکر ابن علی ابن اسمعیل القفال الشاشی

اسلام علوم حدیث، صرف و نحو کے بڑے عالم بنے۔ انہوں نے علم کی تحصیل کے لئے دوردراز کے علاقوں کا سفر کیا۔ وہ ایک بڑے شاعر بھی تھے۔ الحکیم کا کہنا تھا کہ وہ جنوبی عراق میں سب سے زیادہ علم رکھنے والے شخص تھے۔

انکا مقبرہ ازبکستان میں ہے۔ اس مقبرے کے داخلی دروازے کی بلندی کم رکھی گئ ہے تاکہ جو بھی اس میں داخل ہو اس عالم کی علمیت کی شان میں اپنے سر کو جھکا کر تعظیم دے۔

بادشاہ کے دربار میں بجھے ہوئے قفال شاشی کے دل نے  فخر اورعظمت کی وہ شمع جلائ جو رہتی دنیا تک جلتی رہے گی۔

حوالہ؛

قفال شاشی

11:35 AM

kaffal Shashi،, ازبکستان, اسلامی عالم, تاشقند, قفال شاشی

ذوق اور فوق

اچھا یہ معلوم ہے کہ جانوروں میں عام طور پہ نر، مادہ سے زیادہ خوشگوار شخصیت رکھتے ہیں۔  میں نے موم بتی روشن کرتے ہوئے اندھیرے کا موضوع چھیڑا۔ جواب ملا مجھے تویہاں لفظ شخصیت پہ ہی اعتراض ہے۔ اور جانوروں میں ہی کیا انسانوں میں بھی نر زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں۔ میں نے فورا شخصیت لفظ واپس لیا، حالانکہ اس پہ بحث ہو سکتی تھی اور شاید میں انہیں قائل بھی کر لیتی کہ جانوروں کی بھی شخصیت ہوتی ہے۔ لیکن اس سے دوسرے موضوع کے لئے توانائ کم ہو جاتی، جبکہ ہم پہلے ہی توانائ کے بحران کی وجہ سے نیم اندھیرے میں تھے۔ توانائ کے بحران سے تو آپ آجکل اچھی طرح واقف ہونگے۔ لیکن چونکہ اس سے انسانی نروں کی خوبصورتی پہ کوئ فرق نہیں پڑتا تو ہم اس سے بھی صرف نظر کرتے ہیں۔

موم بتی کی اس روشنی میں، میں نے ان سے دریافت کیا کہ پھر خواتین کے مقابلہ ء حسن کیوں ہوتے ہیں۔ مردوں کے کیوں نہیں ہوتے, اب باڈی بلڈنگ کو اس ضمن میں مت لے آئِے گا۔ کمزور دل صاحبان پہ واضح کر دوں کہ اس سے میری انسانی نروں کی ظاہری ہتک مقصود نہ تھی۔  جواب ملا کہ اب اگر اتنی گرمی میں شمع رخ روشن کے آگے رکھ بھی لیں تو سوائے مزید گرمی لگنے کہ کوئ پروانہ نہیں آئیگا۔ پروانے برسات میں پیدا ہوتے ہیں۔ میں حیرانی سے انکا منہ دیکھتی ہوں۔ اس نیم جان حالت میں اس طرح کے تجریدی بیانات سے لو لگ سکتی ہے۔ سو، میں پھر جانوروں کو پکڑتی ہوں۔

تمام نر خوبصورت ہوتے ہیں کیونکہ انہیں مادہ کو لبھانا ہوتا ہے۔

نر مور

جو اپنے حسین ملکوتی رنگوں کے پر پھیلا کر ناچتا ہے تو وہ مورنی کو اپنے خوبصرت رنگوں اور اپنے رقص کے انداز سے سحر میں لے آتا ہے۔ اگر دو تین نر مور ہوں تو مادہ اس میں سے اسکے ساتھ رہنا چاہتی ہے جو زیادہ خوبصورت پر اور انداز رقص رکھتا ہو۔

نر ہرن کے سینگ

جتنے بڑے ہوتے ہیں مادہ ان پہ اتنی فدا ہوتی ہے۔ سینگ جتنے بڑے ہوں رقیب بھی اتنے ہی کم ہوتے ہیں۔

حتی کہ

شیر

کو بھی، شیرنی کو رجھانے کے لئے اپنے ایال کے بال، اپنی دھاڑ، دوڑ اور دوسرے نروں سے جنگ جیت کر دکھانی پڑتی ہے۔

پرندوں میں کچھ پرندے اپنے خوبصورت پر اورکچھ اپنے پروں کے سائز اور کچھ

اپنے گھونسلے

بنانے کی مہارت دکھا کر دل موہ لیتے ہیں۔

کوئل کی خوبصورت دل پگھلا دینے والی کوک مادہ کوئل نہیں بلکہ نر کوئل نکالتا ہے مادہ کوئل تو بس کک کر کے رہ جاتی ہے۔ الغرض سب ہی نر اپنے اندر موجود خصوصیات کو مادہ کے سامنے بہتر طریقے سے پیش کرتے ہیں تاکہ وہ انکی جانب ملتفت ہو۔ انہیں قبولیت بخشے اور انکے ساتھ رہنے پہ راضی ہو۔

خیریت مجھے کچھ فساد کی بو آ رہی ہے. نہیں یہ موم جلنے کی بو ہے۔ اور، اس میں فساد کی کیا بات ہے۔ ایسے ہی مجھے خیال آیا کہ انسانی مادائیں جانوروں کی ماداءووں کے مقابلے میں خاصی کم ذوق نہیں ہوتیں۔

3:16 PM

لوڈ شیڈنگ،

نئے افکار انکا حصول اور ترویج-۱۰

جب بابر نے ہندوستان فتح کیا تو اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ہندوستان پہ حکومت کے لئے مذہبی رواداری ضروری ہے۔ اس نے ہمایوں کو جو وصیت کی وہ اس میں تفصیل سے اپنے بیٹے کو لکھتا ہے کہ یہاں مختلف المذاہب لوگ آباد ہیں۔ تم مذہبی تعصب کوہرگز اپنے دل میں جگہ نہ دو، گائے ذبح کرنے سے پرہیز کرنا اس سے تمہیں لوگوں کے دل میں جگہ مل جائے گی۔ کسی قوم کی عبادت گاہ مسمار نہیں کرنا۔ اسلام کی اشاعت ظلم و ستم کی تلوار کے مقابلے میں لطف و احسان سے بہتر ہو سکے گی۔ شیعہ سنی اختلافات ہمیشہ نظر انداز کرتے رہو کہ ان سے اسلام کمزور پڑے گا۔

اکبر اپنے ابتدائ دور میں سخت مذہبی تھا لیکن اس وقت بھی وہ صلح کل اور رواداری کا حامی تھا اور اسکی مذہبیت وسیع القلبی میں حائل نہ تھی۔ تخت نشینی کے کچھ عرصے بعد اسے ہی اسے علماء کی تشدد پسندی، دنیاداری، اور ظاہرداری سے نفرت ہو گئ اور اس نے یہ کوشش کی کہ علماء کے اقتدار اور اثر کو ختم کر کے اپنی طاقت مستحکم کرے۔ اس لئے اس نے اشتراک کی تحریک اور رجحان کو سیاسی تحفظ دیا۔

ملک گیری آسان، ملک رانی مشکل، اس نے ہندوءوں میں اعتماد پیدا کرنے کی غرض سے اور مذہبی رواداری کے لئے جزئیے کو ختم کیا ، ہندوءوں سے یاترا ٹیکس اٹھایا اور حکومت کے اقتدار میں غیر مسلموں کو برابر کی شرکت دی۔ مغلیہ نظام حکومت کا ممعمار اکبر تھا۔

اکبر کی مسلسل فتوحات اور اسکے کامیاب نظم و نسق کا راز، سب سے زیادہ ان امرا ء اراکین سلطنت کی قابلیت، فرض شناسی اور وفادری میں پنہاں ہے جو اکبر نے اپنے گرد جمع کر لئے تھے۔اکبر نے تمام اہم اعلی اسامیوں کے لئے ایک منصب داری نظام قائم کر دیا، جسکے اراکین ملک کی تمام اہم اسامیوں پہ فائز ہوتے تھے۔اچھی کارکردگی پہ انکی ترقی کے امکانات تھے اور وہ ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں تبدیل ہوتے رہتے تھے، انکے انتخاب اور تربیت پر بڑی توجہ ہوتی تھی۔

اکبر کا ایک ا اہم کارنامہ معاملہ ء زمین کا بندو بست تھا۔ جس کے لئے اس نے تجربے کار اور سمجھ دار اراکین جیسے ٹوڈر مل اور امیر فتح اللہ شیرازی سے کام لیا۔

اس نے علوم و فنون کی سر پرستی کی۔ اور ملک الشعراء کا عہدہ پہلی مرتبہ اکبر کے زمانے میں قائم ہوا۔

درباری مءورخ کا آغاز بھی اسی زمانے میں ہوا۔ مصوری اور موسیقی کی وسیع سرپرستی کی گئ۔ اکبر خود ان پڑھ تھا لیکن اہل علم کی قدر کرتا اور مشہور کتابیں باقاعدگی سے پڑھوا کر سنتا، حتی کے اس نے اپنی نا خواندگی کی تلافی اس طرح کی کہ دربار میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہو گیا اور دارلخلافہ ایک طرح کی اکیڈیمی بن گیا۔ ابو الفضل کا کہنا ہے کہ مشہور کتابوں میں شاید ہی کوئ ایسی ہو جو اکبر نے پڑھوا کر نہ سنی ہو۔

اکبر کی پالیسی کے دو پہلو تھے۔ ایک انتظامی اور سیاسی معاملات میں صلح کل کی پالیسی اور دوسرے مریدان شاہی اور دوسروں کے لئے قواعد و آئین کا وہ ملغوبہ جسے کچھ دین الہی کہتے ہیں لیکن بدایونی اور ابو الفضل آئین راہنموئ یا ارادت یا مریدی کا نام دیتے ہیں۔ دین الہی کی بنیاد عبادت خانے کی تلخ اور شر انگیز بحثوں میں رکھی گئ ۔

۔ابتداء میں تو اکبر کا یہ حال تھآ کہ علماء کو ایسے عہدے اور مقامات دئے کہ پہلے کبھی نہ ملے تھے۔ صدر الصدور سے حدیث سننے انکے گھر جاتا، شہزادہ سلیم کو انکی شاگردی میں دیا اور یہ حال ہوا کہ نماز با جماعت کی پابندی کیساتھ وہ اذان بھی خود دیتا، امامت کرتا اور مسجد میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتا۔ خواجہ اجمیر سے اتنی عقیدت تھی کہ سال بسال اجمیر جاتا، بلکہ بعض اوقات پا پیادہ گیا۔ پہروں مراقبے میں بیٹھا رہتا۔

شیخ سلیم چشتی کی ارادتمندی میں میں اس نے ایک عمارت انکی خانقاہ کے قریب بنا لی۔ جسکا نام عبادت گاہ رکھا گیا۔ جہاں ہر جمعے دربار خاص منعقد ہوتا اور خدا شناسی اور حق پرستی کی حکائیتیں اور روائیتیں بیان ہوتی تھیں۔

 لیکن اسکے اسی ذوق نے اسے رستے سے ہٹایا اور انکا ایک باعث ان علماء اور فضلاء کی کمزوریاں تھیں جو ان مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ ہر شخص چاہتا تھآ کہ اپنی فضیلت اور دوسرے کی جہالت دکھاءووں جھگڑے کی وجہ بیٹھنے کی ترتیب ہی ہو جاتی تھی۔

بادشاہ کا دل کھٹآ ہو گیا۔ اس نے کہا جو کوئ نامعقول باتیں کرے  اسے محفل سے اٹھا دیا جائے۔ ملا بدایونی کو اس کام پہ مامور کیا گیا۔ ملا صاحب نے چپکے سے بادشاہ کے کان میں کہا کہ اس طرح تو بہتوں کو اٹھنا پڑے گا۔بادشاہ اس جملے سے خوش ہوا اور سب کو یہ الفاظ سنا دئیے۔

اگر معاملہ ذاتی فضیلت جتانے اور ایکدوسرے کی تذلیل و تکفیر تک رہتا تب بھی شاید اکبر اسلام سے بد ظن نہ ہوتا لیکن علماء نے اہم مسائل پہ اس طرح اختلاف کیا کہ بادشاہ حیران رہ گیا۔ ایک عالم ایک چیز کو حلال کہتا دوسرا اسکے حرام ہونے کا فتوی دیتا تھا ۔ بادشاہ نہ صرف دونوں سے بد ظن ہوا بلکہ حال اور حرام کا بھی تعین اس میں نہ رہا۔

ایک مزیدار مثال آتی ہے۔ بادشاہ کی چار سے زائد بیویاں تھیں۔ عبادت خانے میں تعدد ازواج زیر بحث آیا تو بادشاہ کو خیال آیا کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ کسی بیوی کو رخصت کئے بغیر دین کی پاسداری ہو جائے۔ دو نے متعہ کا راستہ دکھایا، جسے دوسروں نے حنفی طرقے کے متصادم قرار دیا۔ اس پہ بدایونی نے کہا کہ اگر ایک مالکی قاضی اسکے حق میں اپنے اصول کی رو سے فتوی دیدے تو ایک حنفی کے لئے بھی متعہ جائز ہو جاتا ہے۔ یہی تو بادشاہ کو چاہئیے تھا۔ حنفی قاضی رخصت ہوئے اور مالکی قاضی آ گئے۔ سب فرقوں اور طریقوں کے عالم آگئے اور شیعہ، سنی، صوفی، مہدوی خیالات اور اختلافات بادشاہ کے سامنے آئے۔

حتی کہ بعض علماء سے عاجز آکر اکبر نے انہیں سزائے موت تک دی۔ عبادت خانوں کی بحثوں کے زیادہ دلچسپ قصے بدایونی کی تاریخ میں ملتے ہیں ابوالفضل نے بھی اسکے متعلق ایک باب اکبر نامے میں لکھآ ہے۔

مختلف واقعات سے گذر کر ایک وقت ایسا آیا کہ کہ شیخ مبارک نے بادشاہ کو کہا کہ بادشاہ خود امام وقت اور مجتہد روزگار ہے اور وہ اجتہاد کا دعوی کرے اور علماء سے محضر طلب کرے۔ آیتوں اور اسناد سے اس مضمون کا ایک محضر ترتیب دیا گیا، علماء کا اجلاس ہوا اور بحث و تمحیص کے بعد اس محضرپہ علماء کی مہریں ثبت ہوئیں۔

محضر میں اس بات کو بیان کر دیا گیا تھا کہ بادشاہ کو مجتہدین اور علماء سے انہی امور میں زیادہ اختلافات ہونگے جو نص شرعی کے مخالف نہ ہوں اور عوام کی خوشحالی کا باعث ہوں۔

لیکن عملی طور پہ ایسا نہ ہو سکا۔

جب ہندو، جینی اور پارسی  سادھو اور اہل علم مذہبی مجالس میں شریک ہوئے تو ان میں سے بعض نے اسے جگت گرو کہنا شروع کیا اور اپنی کتابوں سے ثابت کیا کہ وہ اقوام و ادیان کے اختلافات مٹائے گا۔ خوشامدیوں نے حمایت کی اور بادشاہ نے لوگوں کو مرید کرنا شروع کیا۔ اس بناء پہ افواہیں اڑیں کہ اکبر نبوت کا دعویدار ہے۔ بدایونی بھی جو آخر عمر میں اکبر کے مذہبی خیالات کا سب سے بڑا مخالف ہو گیا تھا۔ اکبر سے دعوی نبوت منسوب نہیں کیا۔

اکبر اور اسکے خوشامدیوں نے جو نظام ترتیب دیا انگریز مءورخین اسے دین الہی کا نام دیتے ہیں لیکن ابو الفضل جو اس طریقے کا خلیفہ ء اعظم تھا یہ نام استعمال نہیں کرتا بلکہ اسے آئین اکبری یا آئین راہنموئ کے تحت درج کرتا ہے۔

جاری ہے

حوالہ جات؛

کتب؛

المیہ تاریخ، مصنف ڈاکٹر مبارک علی

رود کوثر، مصنف شیخ محمد اکرام

نئے افکار انکا حصول اور ترویج-۹

3:14 PM

Mubarak Ali, Sheikh Muhammad Ikram،, ابوالفضل, اکبر اعظم, بابر, سلیم چشتی, شیخ مبارک, مغلیہ سلطنت, ہندوستان، Akbar the Great

پولیو کے خلاف مہم

ڈنگ ڈونگ۔ بیل بجی، میں نے پوچھا کون ہے۔ بچہ ہے جی کوئ، پولیو کے قطرے پلانے ہیں۔ اب اگرچہ میں پاکستان کے ان بہت کم خوش نصیب لوگوں میں سے ہوں جنہیں بچے کی پیدائش کے وقت یہ ٹائم ٹیبل مل جاتا ہے کہ پانچ سال کی عمر تک بچے کو کونسے حفاظتی ٹیکے لگیں گے اور کب۔ لیکن پھر بھی میں نے فیصلہ کیا کہ گورنمنٹ کی طرف سے جو گشتی ٹیمیں آتی ہیں ۔ ان سے دوبارہ یا سہہ بارہ پلوا لینے میں کوئ حرج نہیں۔ میں صاحبزادی کو لیکر گیٹ پہ پہنچی۔ ایک خاتون ایک لمبا سا عبا پہنے اور چہرے کو سختی سے حجاب سے ڈھانکے وہاں ایک نو دس سالہ بچے کے ساتھ موجود تھیں۔ انہوں نے اپنے پاس موجود ایک کاغذ پہ ساری تفصیلات معلوم کر کے لکھیں اور پھر اپنے پاس کھڑے بچے سے کہا چلو اب تم ڈراپس ڈالدو اسکے منہ میں۔ میں ہکا بکا رہ گئ۔ بچے نے اپنے ہاتھ میں موجود تھرماس کھولنا شروع کی ا اور------۔ یہ بچہ یہ کام کر رہا ہے۔ ' ڈراپس ہی تو پلانا ہیں،  جی'۔

اسکے تقریباً دو ہفتے  بعد دوبارہ بیل بجی۔ آج پھر پولیو کے قطرے پلانے کا دن تھا۔ میں نے انہیں انٹرکام پہ اطلاع دی کہ بچی ابھی اسکول سے واپس آنے ہی والی ہے۔ آپ ایک دو گھر دیکھ لیں پھر آجائیے گا۔ اچھا تو ہمیں بچی کا نام بتادیں۔ ہم دس منٹ بعد آکر قطرے پلا جائیں گے۔ مجھے معلوم تھا کہ جو وہ کہہ رہی ہیں،  ایسا نہیں ہوگا۔ لیکن یہ پوسٹ لکھنے کے لئے میں نے اسے نام بتا دیا۔ اج شاید دو ہفتے ہو گئے مگر وہ خاتون پلٹ کر نہیں آئیں۔

جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا کہ مجھے اپنی بیٹی کو یہ مزید قطرے پلانے یا نہ پلانے سے فرق نہیں پڑتا۔ اسکے حفاظتی ٹیکوں کا کورس نجی طور پہ اپنے ٹائم ٹیبل کے حساب سے چل رہا ہے۔ لیکن جہاں میں خوش نصیب ہوں وہاں میری بد نصیبی یہ بھی ہے کہ میں ایسے ملک میں رہتی ہوں جہاں کچھ لوگ

حفاظتی ٹیکوں کے جائز اور ناجائز

کا سوال اٹھائے کھڑے ہیں اور کچھ اپنے بچوں کو اس لئے نہیں پینے دیتے کہ وہ

انہیں بانجھ کر دیں گے

۔ وہاں کچھ لوگ جو چاہتے ہیں کہ انکے بچوں کو یہ حفاظت حاصل ہو جائے انکے حصے میں یہ بے ایمان، بے حس اور ناکارہ ورکرز آتے ہیں۔

پاکستان دنیا کے ان چار ممالک

میں شامل ہے جو پولیو سے شدید متائثر ہیں۔ باقی تین ممالک میں شامل ہیں انڈیا، افغانستان اور نائیجیریا۔ پولیو کے خلاف چلنے والی مہم میں حکومت پاکستان کو یونیسف کے ادارے کی مدد حاصل ہے جسکا نام ہے۔

UNICEF’s Programme Communications Specialist for Polio and the Expanded Programme for Immunization

حکومت جاپان نے سن دو ہزار نو کے دسمبر میں اعلان کیا تھا کہ وہ حکومت پاکستان کو چار اعشاریہ چار ملین ڈالر کی گرانٹ دے گی

تاکہ وہ سن دو ہزار دس میں پولیو کے خلاف مہم بہتر طور پہ چلا سکے اور یہاں سے پولیو کا خاتمہ کیا جا سکے۔  لیکن بات وہی کہ مدعی، مدعا علیہ ناءو میں اور شاہد تیرتے جائیں۔ کیا اس سے فرق پڑتا ہے کہ جاپان یا کوئ اور ملک ہمارے مسائل کے حل کے لئے ہمارے ساتھ کیا تعاون کر رہے ہیں۔

پولیو، جیسا کہ ہم جانتے ہیں معصوم ہنستے کھیلتے بچوں کو ہمیشہ کے لئے معذور کر دینے والی بیماری ہے اور اسکا کوئ علاج نہیں ہے سوائے اسکے کہ بچوں کو حفاظتی ٹیکے لگائے جائیں  اس لئے متعلقہ حکام اور ورکرز کو اس ضمن میں پوری سنجیدگی اور ذمہ داری کا مظاہرہ کرنا چاہئیے۔ بچے ہمارا مستقبل ہیں اور اہنے مستقبل کو معذور ہونے سے بچانا ہماری پہلی ترجیح ہونی چاہئیے۔

7:32 AM

Polio Vaccination, پاکستان, پولیو کے خلاف مہم, جاپان کی گرانٹ, یونیسیفPolio in Pakistan

ارتھ ڈے، ایک طالب علم کے لئے

میں آپ سے کہوں کہ اگر آپ اس سیارے زمین سے محبت کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کل آپکے بچے اس پہ ایک محفوظ اور قدرتی  وسائل سے مالامال زندگی گذاریں تو آپ پیدل چلنے کو ترجیح دیں بجائے گاڑی سے جانے کو، اپنے گھر کے کاکروچ، مچھر اور چیونٹیاں مارنے کے لئے مختلف اسپرے یا کیمیکلز کا بے دریغ استعمال نہ کریں۔ اپنے آپکو ہر وقت اسپرے والے پرفیوم سے مہکائے نہ رکھیں۔ دودھ دہی لینے جانا ہو تو اپنے ساتھ برتن لیکر جائیں۔ چیزیں خریدتے وقت بے تحاشہ  پلاسٹک کے شاپرز استعمال نہ کریں۔ اپنے ساتھ کاٹن کا تھیلہ یا باسکٹ رکھیں، اور اگر یہ کرنے میں کوئ حجاب مانع ہے تو کم سے کم شاپرز استعمال کریں۔

یہ سن کر کچھ لوگ سوچیں گے , کیا مصیبت ہے۔ ہر وقت نصیحت،  یہ نہ کرو وہ نہ کرو۔ محبت میں بھی نصیحت۔ چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ۔  چلیں،  پہلے آگے پڑھ  لیں اور پھر سے سوچیں۔

زمین کے ماحول  کے بنیادی  حصے جس میں اسکی ساخت، فضا، پانی کے ذخائر اور زمین کو رنگینی عطا کرنے والے نباتات اور دیگر حیاتیات شامل ہیں  ایک دوسرے سے ایک ماحولیاتی توازن اور کیمیائ توازن کی زنجیروں سے جڑے ہیں اس زنجیر کی ایک کڑی بھی متائثر ہونے سے ہر چیز اپنے توازن سے ہٹ جاتی ہے۔ اور نیا توازن بننے میں نہ صرف وقت لگتا ہے بلکہ وہ نئے مطالبات بھی رکھتا ہے۔ اس تمام تعلق میں ہماری بے جا مداخلت اسے ہماری آنیوالی نسلوں کے لئے ناقابل رہائش بنا سکتی ہے۔

آئیے ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری بے جا مداخلت کیا ہے، یہ کن  تبدیلیوں کو جنم دیتی  ہیں اور کیسے  دنیا کو متائثر کرتی ہیں۔ اور پھر اس میں انسان کا کردار متعین کریں کہ وہ اسکے نتیجے میں تیزی سے ہونے والی تباہی کو کیسے روک سکتا ہے۔

۔جب ہم بہت زیادہ کیمیکلز استعمال کرتے ہیں تو ہم زمین کے ہر حصے کو آلودگی سے آشنا کر دیتے ہیں۔ یہ آلودگی  اسکی فضا، سطح اور سمندر سے ڈھکے علاقے ہر ایک کو نقصان پہنچاتی ہے۔

زمین اس وسیع کائنات میں پھیلی وہ واحد جگہ ہے ، جہاں ہم اب تک کسی ذہین مخلوق کے آثار پاتے ہیں۔ یعنی ، ہم انسان۔ اور اسکی فضا اور ماحول اس وسیع کائنات میں وہ واحد توازن رکھتی ہے جو انسان کی بقاء کے لئے ضروری ہے۔ یہ ایک فضائ غلاف سے ڈھکی ہوئ ہے جسکی  مختلف تہوں کے نام اور موٹائ مندرجہ ذیل تصویر سے واضح ہیں۔

اس تہہ کی وجہ سے سورج کی ضرر رساں شعاعیں زمین تک پہنچنے میں ناکام رہتی ہیں اور زمین کا ایک مناسب درجہ ء حرارت قائم رہتا ہے۔ زمین کی فضا میں موجود کاربن ڈائ آکسائیڈ کی مقدار بھی اس حرارت کو کنٹرول کرتی ہے۔ زیادہ کاربن ڈائ آکسائڈ موجود ہونے کا مطلب زیادہ حرارت کا محفوظ رہنا یا گرمی کا بڑھنا ہے یہ سارا عمل اصطلاحاً

گرین ہاءوس ایفیکٹ

کہلاتا ہے۔ یہ کاربن ڈائ آلسائید ایندھن کے جلنے کے دوران پیدا ہوتی ہے چاہے وہ لکڑی کا ہو یا پٹرول کا۔

کاربن ڈائ آکسائڈ کے علاوہ اور بھی گیسیں ہیں جو گرین ہاءوس ایفیکٹ میں حصہ لیتی ہیں جیسے میتھین گیس۔ جی ہاں،  وہی گیس جو ہمارے چولہوں میں استعمال ہوتی ہے۔ پچھلی صدی میں زمین کے کل درجہ ء حرارت میں اضافہ ہوا ہے جسے

گلوبل وارمنگ

کہتے ہیں اور جو ممکنہ طور پہ انسان کی صنعتی ترقی کے نتیجے میں آئ ہے۔ یعنی  فوسلزایندھن کا زیادہ استعمال اور جنگلات کا خاتمہ۔

حرارت کی مناسب مقدار وہ ہے، جس میں حیات پھلتی پھولتی ہے۔ اگر زمین کا یہ مقررہ درجہ ء حرارت بڑھ جائے تو پہاڑوں پہ موجود برف پگھل جائے گی جو شروع میں تو دریاءووں میں زیادہ پانی آجانے کی وجہ سے سیلاب کا باعث بنے گی اور بعد میں ان برفافانی ذخائر کے ختم ہو جانے کی وجہ سے بارش نہ ہونے کی وجہ بن جائے گی۔ جس سے خشک سالی اور قحط جنم لے سکتے ہیں۔

 جیسے اگر ہمارے ہمالیہ کے پہاڑ اپنی برف کھو دیں تو پاکستان کا کیا ہوگا۔ اسکے تمام دریا بنجر ہوجائیں گے۔ اسی طرح دنیا کے پول پہ موجود برف کے ذخائر اگر پگھل جائیں تو ساری دنیا میں سمندر کے پانی کی سطح بہت زیادہ  بلند ہو کر، دنیا کے بیشتر علاقے کو زیر آب کر دے گی۔

زمین کو سورج کی ضرر رساں شعاعوں سے بچانے والی

اوزون کی تہہ

اسٹریٹو اسفیئر میں پائ جاتی ہے، جسے آپ شکل نمبر ایک میں دیکھ سکتے ہیں، صنعتی اداروں سے پیدا ہونے والی گیسوں کا فضا میں اخراج، دنیا بھر میں چلنے والی گاڑیوں کے دھویں کا فضا میں شامل ہونا اور گھریلو سطح پہ کلوروفلورو کاربن مرکبات  والی اشیاء کا بے تحاشہ استعمال اس اوزون کی  قدرتی حفاظتی تہہ کو تباہ کر رہا  ہے۔

کوپن ہیگن میں کچھ عرصے پہلے ہونے والی ایک ماحولیاتی کانفرنس

میں چین اور بھارت سمیت کچھ ممالک نے ترقی یافتہ ممالک جیسے امریکہ سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ اپنے کارخانوں سے ان زہریلی گیسون کے اخراج کو ایک مناسب سطح پہ لائیں۔ اس پہ کوئ قابل ذکر پیش رفت نہ ہو سکی۔  کیونکہ کارخانوں سے ان گیسوں کی پیداوار کم کرنے کے لئے یا تو پروڈکشن لیول کو کم کرنا ہوگا یا پھر جو احتیاطیں کیجائیں گی انکے نتیجے میں انکی پروڈکٹس کی لاگت بڑھ جائے گی۔

عوامی سطح پہ ہم اپنے ارد گرد دیکھتے ہیں کہ  جمع ہونے والے کوڑے کو مناسب طریقے سے ٹھکانے لگانے کے بجائے اسے آگ لگادی جاتی ہے۔ یہ ایک غیر ذمہ دارانہ عمل ہے اور یہ بھی ماحوللیاتی آلودگی کا باعث بنتا ہے۔،

ان گیسوں کی وجہ سے بعض جگہ آلودگی اتنی زیادہ ہو گئ ہے کہ وہاں بارش میں بھی ان کیمیاَئ مرکبات کا اثر پایا جاتا ہے۔علاوہ ازیں یہ آلودہ فضا انسانی صحت کے لئے جو مسائل پدا کرتی ہے وہ الگ۔  ان میں سر فہرست مختلف اقسام کے کینسرہیں۔ اسکے علاوہ مختلف کیمیائ مرکبات مختلف پیچیدگیاں پیدا کرتے ہیں۔  مثلاً

ہوا میں لیڈ کی مقدار

زیادہ ہونے کی وجہ سے ذہنی طور پہ کمزور بچوں کی پیدائش میں اضافہ،  دماغی امراض  اضافہ یا نروس سسٹم میں خرابی ہونا۔ یہ آلودگی

عورتوں اور مردوں میں بانجھ پن

بھی پیدا کر سکتی ہے۔ اس لئے شہروں کی سطح پہ مردوں میں بانجھ پن بڑھ رہا ہے۔

  صنعتی کارخانوں کا فضلہ جسے پانی میں بہا دیا جاتا ہے اور یہ زمین کی اوپری سطح کو تباہ کرتے ہوئے زمین کے نیچے موجود میٹھے پانی کے ذخائر کو آلودہ کرتے ہوئے سمندر میں پہنچتا ہے اور وہاں کے ماحولیاتی نظام کو ختم کر کے اسے بنجر بنا دیتا ہے۔

شاید آپکو یاد ہو کہ سن دو ہزار آٹھ میں کراچی کے ساحل پہ ایک اطالوی جہاز جو خام تیل لیکر جا رہا تھا۔ تیل بہہ نکلا اور پندرہ سو ٹن تیل کراچی کے چودہ کلومیٹر ساحل پہ پھیل گیا۔ تیل کے اس طرح پھیلنے سے ایک تو اوپر کی سطح سے جانوروں کو آکسیجن نہیں مل پاتی اور دوسرے اس میں موجود بھاری عناصر سمندر کی تہہ میں بیٹھ جاتے ہیں اور وہاں موجود سمندری قشرئیوں جیسے سیپ، گھونگھے اور مرجان کی چٹانوں کو شدید نقصان پہنچاتے ہیں اور اس طرح سے اس ماحول کو تباہ کر دیتے ہیں۔ یہ تیل اور دیگر مرکبات ساحل پہ پانی کے جہازوں کی آمد ورفت سے بھی سمندر میں شامل ہوتا ہے

صرف صنعتی اداروں کے کیمیکلز ہی نہیں گھریلو سطح پہ استعمال ہونے والے کیمیکلز بھی پانی کے راستے بالآخر سمندر میں نہیں پہنچتے ہیں۔ بلکہ اسکے ذرائع ہمارے گھر میں ہو سکتے ہیں۔ جیسے گھروں میں بچی ہوئ دوائیں نالی میں بہا دینا، صفائ کے لئے مختلف کیمیکلز استعمال کرنا۔ تعلیمی  یا تحقیقی اداروں میں استعمال ہونے والے کیمیکلز کو صحیح سے ضائع نہ کرنا بلکہ بغیر سوچے سمجھے پانی میں بہا دینا۔

یہ پانی  میں موجود کیمیلز کی آلودگی کا شکار ایبنارمل مینڈک ہیں۔

 پلاسٹک  کا بہت زیادہ استعمال, جبکہ پلاسٹک کو قدرتی طریقے سے ختم ہونے میں ایک لمبا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ اندازہ لگایا ہے کہ پچاس کی دہائ میں پلاسٹک نے عام زندگی میں قدم رکھا اور اب تک اسکی ایک بلین ٹن مقدار پیدا کی جا چکی ہے۔ یہ پلاسٹک کچرا جو ہم نے پھینکا ہے اسے ختم ہونے میں ہزاروں برس کا عرصہ درکار ہوگا۔  پلاسٹک کی مصنوعات  پانی راستے سمندر میں بھی پہنچ جاتی ہیں اور سمندری مخلوقات کی تباہی کا سبب بنتا ہے۔ پلاسٹک کی وہ مصنوعات زیادہ بہتر ہوتی ہیں جو بیالوجیکلی تیزی سے ختم ہو جاتی ہیں۔

نیوکلیئر پاور پلانٹ  ہوں یا ایٹمی دھماکے ہر صورت میں تابکار فضلہ جمع ہوتا ہے جو نہ صرف انسانی صحت کے لئے مہلک ترین ہے بلکہ زمین کے لئے بھی نقصاندہ ہے۔ اس تابکار فضلے کو عام طریقے سے ضائع نہیں کیا جا سکتا۔ اور انہیں مخصوص کنٹینرز میں بند کر کے یا تو دور افتادہ مقام، جیسے کسی بیابان صحرا میں  دفن کر دیا جاتا ہے یا پھر سمندر کی تہہ میں دبا دیا جاتا ہے۔ ہر صورت میں یہ ایک محفوظ حالت نہیں ہے ، کیونکہ بہر حال تابکار فضلہ اس میں موجود ہیں اور کسی بھی حادثے کی صورت میں ارد گرد کے ماحول کو آلودہ کر دیگا۔ اور اس سے زمین کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔

اس تصویر میں ایٹمی فضلے کے کنٹینرز کسی صحرا میں دفن کئے جا رہے ہیں۔

تابکاری کا شکار ہونے والے جاندار جنیاتی تبدیلیوں کے باعث عجیب الخلقت  بچوں کو جنم دے سکتے ہیں اور انتہائ صورت میں وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ یہ تصوراتی تین آنکھوں والی مچھلی۔

جنگلات کو اپنے استعمال کے لئے بے دریغ کاٹنا، اپنے آپکو ایک قدرتی دولت سے محروم کرنا ہے۔ جیسے  کراچی کے ساحلوں کے نزدیک مینگروز نامی درخت کے جنگلات جوساری دنیا میں مینگروز کے جنگلات میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔  آہستہ آہستہ خاصے کم ہو گئے ہیں  کیونکہ ان درختوں کو مقامی آبادی نے ایندھن کے طور پہ استعمال کیا۔

اسکی وجہ سے انکی جڑوں کے ساتھ پائے جانیوالے جھینگے، کیکڑے اور دیگر جاندار اپنا وجود قائم نہ رکھ سکے اور یوں ایک ماحولیاتی توازن تباہی سے دو چار ہوا۔

اگر ہم دیگر جانداروں کے ماحول کی حفاظت نہ کریں ، انکے رہائشی جنگلات اپنے استعمال کے لئے کاٹ دیں، اپنے شہروں کو بڑھاتے چلے جائیں اورانکے سمندر میں اپنی آلودگی انڈیلتے رہیں تو وہ نایاب نسل میں شامل ہوکر دنیا سے غائب بھی ہو سکتے ہیں ۔ اور آج بہت سے جانور جو ہم دیکھتے ہیں اور ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وہ کل ہم اپنی اولادوں کو صرف تصویر میں ہی دکھا پائیں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ اپنے ماحول میں وہ جس حیاتیاتی توازن کو قائم رکھتے ہیں وہ انکی غیر موجودگی میں تبدیل ہو کر ہمارے لئے مسئلہ بن سکتا ہے۔

اسکی ایک مثال

انڈیا اور پاکستان میں پایا جانیوالا گدھ

ہے جو پہلے ایک بڑی تعداد میں ملتا تھا ۔ گدھ  مردہ جانوروں کوکو کھا کر ماحول کی صفائ کا اہم فریضہ انجام دیتے ہیں۔ مگرپندرہ سال کے اندر انکی تعداد میں ستانوے فی صد کمی آئ۔  تحقیق پہ پتہ چلا کہ مویشیوں کو دی جانیوالی دوا ڈکلوفینیک کے باقیات انکے جسم میں رہ جاتے ہیں۔ ان مویشیوں کا گوشت کھانے سے یہ دوا گدھ کے جسم میں پہنچ جاتی ہے ۔ گدھ  اس دوا سے گردے کے امراض کا   شکار ہو کر مر جاتے ہیں۔

اس لئے ، ہمیں اپنی تمام ترقی اور سرگرمیوں کے دوران یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ زمین پہ ان دیگر جانداروں کا بھی حق ہے جنہیں ہم اپنے مقابلے میں کمتر جانتے ہیں۔

 اب اس مختصر جائزے کے بعد یہ نتیجہ نکالنا آسان ہے  کہ اس سیارے کو اپنے لئے اور آئندہ آنیوالے انسانوں کے لئے محفوظ بنانے کے واسطے ہمیں اس طرز زندگی کو اپنانا ہوگا جہاں زمین اور اسکے ماحولیات کا حق سب سے پہلے ہونا چاہئیے۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کر و بیاں

 نوٹ؛ دنیا کے زیادہ تر ممالک میں

ارتھ ڈے

، بائیس اپریل کو منایا جاتا ہے۔ یہ دن، زمین کے ماحول کے متعلق علم دینے اور اسے بچانے کے ممکنہ اقدامات کے بارے میں آگاہ کرنے کے لئے اقوام متحدہ نے مقرر کیا ہے۔ اسکی تجویز سن انیس سو انسٹھ میں امن کے کارکن

جون میک کونیل

نے دی تھی۔ اور یہ اپنے ایک قاری کی فرمائش پہ لکھی گئ ایک تحریر ہے۔

:)

مزید تفصیلات کے لئے دئیے گئے لنکس دیکھیں یا سوال کریں۔ آپکی دی ہوئ مزید معلومات کے منتظر۔

حوالہ جات؛

انسان اور زمین

ایٹمی دھماکوں کے اثرات

5:07 PM

Earth day, envoirnment conservationگلوبل وارمنگ, تابکار فضلہ, جنگلات کا کٹاءو, کراچی, گرین ہاءوس ایفیکٹ, مینگروز

کر لو جو کرنا ہے

ڈان اخبار کے پہلے صفحے کی مرکزی ہیڈنگ کے ساتھ خبر اس طرح شروع ہوئ کہ پاکستان کی پارلیمنٹ نے پارلیمانی انقلاب پہ اتفاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان ترمیمات کی منظوری دےدی جو اب ایک صحیح پارلیمانی نظام کو لانے میں مددگار ہونگِں۔

مجھے نہیں معلوم کہ  صحیح پارلیمانی نظام کیا ہوتا ہے میں تو اس نسل سے تعلق رکھتی ہوں جس نے آمریت اور جمہوریت کے لگاتار چکر ہی دیکھے ہیں۔ لیکن یہ جان کر کہ ان ترمیمات میں ایک ترمیم یہ بھی منظور کی گئ کہ سیاسی جماعتوں کو اپنے اندر الیکشن کرانے کی ضرورت نہیں بلکہ نامزدگی سے ہی کام چلایا جائے۔ محو حیرت ہوں۔

یہ سب کرنے کے بعد ملک کی وہ جماعتیں جو وراثتی سیاست کے مزے لوٹتی چلی آہی ہیں۔ یقیناً چین کی نیند سوئ ہونگیں اور گمان ہے کہ انکی اولادوں نے انہیں دنیا کے مختلف حصون سے شکرئیے کا فون ضرور کیا ہوگا۔  ممبران پارلیمنٹ کے سر سے ایک بھاری ذمہداری کا بوجھ ہٹا ہوگا ۔ اور اب انہِں یقینی طور پہ پتہ ہوگا کے آنیوالوےدنوں میں انہیں کن کے لئے نعرے لگانے ہیں، کن کی جی حضوری کرنی ہے اور کن کے ماتھے کے بل گننا ہیں۔

میں اخبار پلٹ کر سب سے آخری صفحے پہ نظر ڈالتی ہوں۔  اس پہ ایک بڑی ہیڈنگ لگی ہے۔ وزیر اعظم کی بیگم صاحبہ کا تین کروڑ آٹھ لاکھ کا قرضہ معاف کر دیا گیا ہے۔ ایک خیال آتا ہے کہ صرف اڑتیس لاکھ مجھے مل جائیں تو میں کوئ ایسا کام شروع کر سکتی ہوں جس سے دس اور لوگوں کو بھی روزگار ملنے کے مواقع مل جائیں ۔ مگر میرے شریک حیات اس ملک کے وزیر اعظم نہیں، اپنی قسمت پہ آہ بھرتی ہوں اور پھر اندرونی خبروں پہ نظر ڈالتی ہوں.

جس وقت مبارکاں اور بدھئیاں کے نعروں میں یہ بل پاس ہو رہا تھا۔ اور اپنے اپنے مفادات کی متفقہ طور پہ حفاظت کی شادمانی سب  پارلیمانی ممبران کے چہروں پہ نظر آرہی تھی۔ اس وقت سندھ میں اس بل کے خلاف ہڑتال کی اپیل پہ آدھا سندھ بند تھا۔ ایک کامیاب ہڑتال۔

 عین اسی وقت ہزارہ کے لوگ اپنے صوبے کے نئے نام کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ اور میں اس وقت ایک سبزی کے بازار میں دو سبزی والوں کی گفتگو سن رہی تھی۔ 'اے بھئ کیا سترہویں، کیا اٹھارویں اور کیا انیسویں، کیا اس گنتی سے ہماری حالت پہ فرق پڑیگا'۔

اورکل جمہوریت کی اس پارلیمانی فتح پہ پنجاب میں لوگوں کا ایک ہجوم بجلی کی لوڈ شیڈنگ پہ احتجاج کیا۔ اور ایسے ہی ٹی وی کے قریب سے گذرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک بینر پہ لکھا تھا کہ ہم پاکستان کو کرغزستان بنادیں گے۔ ہم تو ایشین ٹائیگر بننے جا رہے تھے اب یہ کرغزستان بننے کے لئے کیوں تیار ہورہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ ٹائگر بننے سے پہلے آداب چیتا شاہی تو سیکھنے پڑیں گے جناب۔

جمہوریت کی اس عظیم فتح  کے بعد ہمارے مسرور، مضبوط وزیر اعظم صاحب نے اٹھارہویں ترمیم سے خود کو حاصل ہونے والے اختیارات کو جانچنے کے لئے اپنے مشیربرائے لائیو اسٹاک کا انتخاب کر کے  ان صاحب کو چنا جنہیں قومی اسمبلی میں داخل ہونے کے لئے جعلی تعلیمی ڈگری پیش کرنے پہ استعفی دینا پڑا۔ اب اس میں ایک بین السطور پیغام شاید گیلانی صاحب نے دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ اچھی حس مزاح رکھتے ہیں۔ یا ہمیں چیلینج دیا ہے کہ کر لو جو کرنا ہے۔

8:42 AM

18th Amendement, اٹھارویں ترمیم, پاکستان، یوسف رضا گیلانی, جمشید دستی, لوڈ شیڈنگ،18

ٹیکنالوجی کا المیہ

میں نے اپنی دوست کے فیس بک اسٹیٹس پہ لکھا دیکھا۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ انکا تجزیہ ہر طرح سے درست ہے۔ حالانکہ وہ اسے اپنے عدسے سے دیکھ رہے ہوتے ہیں اور پھر وہ اپنے اس تجزئیے کو دوسروں پہ نافذ کر دیتے ہیں'۔

 یہ جملہ میں نے یا آپ نے پہلی دفعہ نہیں پڑھا ہوگا۔ بلکہ اگر آپ بلاگنگ کرتے ہیں تو ہر روز نہیں تو ہر دوسرے روز اس قسم کی بات ضرور نظر سے گذرے گی۔ اور اگر آپ ٹی وی کے سارے چینل ایک دن میں دیکھ لینے کی سعادت حاصل کرتے ہیں تو روزانہ ہی دیکھنے اور سننے کو ملتا ہوگا۔

ٹیکنالوجی کی ترقی سے اب لوگوں کا مجازی طور پہ ملنا زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ڈفر کی دیکھنے میں کیا شکل ہے، جعفر کی بات کاٹی جائے تو انکے چہرے پہ کیا تائثر آتا ہے، عبداللہ ایک بیس پچیس سال کا معاشی طور پہ خوشحال شخص ہے یا محنت کر کے اپنی اور اپنے گھر والوں کی سپورٹ کرنے والا شخص۔

 اور اگر آپ اپنے اطراف میں نظر ڈالیں تو ہر طرف لوگ باتوں میں مصروف ہیں مگر ان لوگوں سے جن سے وہ طبعی طور پہ واقف نہیں یہ مجازی سائے ہیں جنہیں ہم جانتے ہیں مگر جنہیں ہم نہیں جانتے۔ گفتگو بہت زیادہ ہو گئ ہے مگر جان پہچان کا عمل کم۔ ہر طرح کے لوگ،  ہر سطح کے لوگ ایکدوسرے سے بات کر رہے ہیں۔

 اب پہلے کی طرح ایسا نہیں ہے کہ میں مخاطب کا انتخاب کر کے اس سے بات کروں۔ اس صورت میں مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ مجھے کیا کہنا چاہئیے اور جوباً مجھے کیا سننے کو ملے گا اور نتیجتاً میں اپنی پڑوس کی خاتون سے صرف سبزی دال اور بڑھتی ہوئ مہنگائ پہ بات کرتی ہوں آریاءووں کے برصغیر کے اوپر اثرات کی بات نہیں کرتی۔

سبزی اور گوشت کی بڑھتی ہوئ قیمتوں سے ہم دونوں ایک ہی طرح نالاں ہیں اور ایک ہی جیسے پریشان۔ اور اس طرح ہمارے مستحکم تعلقات برسوں سے ایک جیسے چلے آرہے ہیں۔ میں انہیں آریاءووں کے تذکرے سے خراب نہیں کرنا چاہونگی۔

لیکن اب اگر میں ان سے اقبال کی شخصیت پہ بات شروع کروں، اکبر بادشاہ کی پالیسیوں کا دفاع پیش کروں، یونیورسٹی میں طالب علموں کے مسائل تو وہ ایکدم ہکا بکا ہو کر یہی سوچیں گی کہ میں انہیں مرعوب کرنا چاہ رہی ہوں۔ مگر ،  میں سمجھتی ہوں اور ہمیشہ یہ باتیں اپنے ایک اور حلقے میں کرتی ہوں۔ جہاں ہم سب لڑجھگڑ کر ایکدوسرے کے نظریات کی دھجیاں اڑا کر، اپنے دل کو ہر کلفت سے خالی کر کے بالآخر آرام سے چائے شربت پیتے ہیں۔

 ان محدود حلقوں میں یہ سوال نہیں اٹھ کھڑا ہوتا کہ کوئ اپنا مءوقف دوسرے پہ نافذ کر رہا ہے۔ یا وہ سمجھتے ہیں کہ بس انہی کی بات صحیح ہے۔ بلکہ ہم سمجھتے ہیں کہ اپنے مشاہدے، اپنے علم اور اپنے شخصی رجحان کی وجہ سے وہ یہی نظریہ رکھتے ہیں۔ ہم ایکدوسرے کے لئے نرمی رکھتے ہیں، ہم ایکدوسرے کو کھونا نہیں چاہتے۔ یہ سب چیزیں اسی جگہ اٹھ کھڑی ہوتی ہیں جہاں تعلقات بالکل مجازی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ہم چیزوں کی تفصیلات کو نہیں دیکھتے، مخاطب کی شخصیت سے کلی طور پہ واقف نہیں ہوتے اور نہ اسے اپنے سے الگ تصور کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگلا شخص تو بالکل ہماری ہی سطح کا ہے پھر بھی اپنی افلاطونیت کیوں بھگار رہا ہے۔ یا اگلا شخص تو ہماری ہی سطح کا ہے پھر بھی ہماری بات کیوں نہیں تسلیم کرتا۔

میں اپنی دوست کو اسکے اس اسٹیٹس پہ لکھتی ہوں کہ

یہ جملہ آجکل کتنی دفعہ دہرایا جاتا ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ یہ جملہ ایک  علم  رکھنےوالاشخص بھی کہتا ہے اور ایک لا علم  شخص بھی،

یہ جملہ ایک تجربہ رکھنے والا شخص بھی کہتا ہے اور نا تجربہ کار بھی،

یہ جملہ ایک  گہرامشاہدہ رکھنے والا شخص بھی کہتا ہے اور سرسری مشاہدہ رکھنے والا شخص بھی کہتا ہے،

یہ جملہ وہ شخص بھی کہتا ہے جس نے دنیا دیکھی ہے اور وہ بھی کہتا ہے جس نے اپنے آپکو بھی صحیح سے نہیں دیکھا ہوتا۔

آخر ایسا کیوں ہے؟

11:34 AM

Dilemma of technology, ٹیکنالوجی کا المیہ

تعلیم کے ہٹلر

 مں بیکن ہاءوس اسکول سے اپنی بچی اور شوہر کیساتھ نکلی تو سوچ رہی تھی کہ تعلیم کتنا منافع بخش کاروبار ہے۔

جنریشنز اسکول، پینسٹھ ہزار ایڈمشن پیکیج اور آٹھ ہزار ماہانہ فیس، فاءونڈیشن اسکول ستر ہزار ایڈمشن پیکیج اور آٹھ ہزار ماہانہ فیس۔ بیکن ہاءوس بتیس ہزار ایڈمشن پیکیج اور ساڑھے سات ہزار ماہانہ فیس۔

میں نے ان سے کہا کہ میں اپنی بچی کو مونٹیسوری کے پہلے لیول میں جو کہ ڈھائ سے چار سال کے بچے کے لئے ہوتا ہے نہیں ڈالنا چاہتی۔ اسے پہلے ہی خاصی چیزیں آتی ہیں انہوں نے اسکا ایک ٹیسٹ اور ہمارا ایک انٹرویولیا۔ انٹرویو میں انہوں نے ہم سے ایک دلچسپ سوال پوچھا کہ جب ہماری بچی انکے اسکول سے دو سال پڑھ کر نکلے گی تو ہم اس میں کیا خصوصیات دیکھنا چاہیں گے۔ میں انہیں جواب دیا کہ  ہمارے لئے سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسکی قوت مشاہدہ اچھی ہو اور وہ اپنے اردگرد کے ماحول میں دلچسپی لیتی ہو۔ اسے سوال پوچھنے کی عادت ہونی چاہئے اور چیزوں کی وجہ معلوم کرنے کا شوق۔ اپنی بات صحیح سے دوسروں تک پہنچانا آناچاہئیے  اور اسکی جو قدرتی خوبیاں ہیں وہ قائم رہنی چاہئیں۔

  اس سب کے بعد یہ کہہ کر  انہوں نے رضامندی دے دی کہ آپکی بچی ذہین ہے اور خاصی ایکٹو بھی۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ لیول ٹوایڈجسٹ کر لے گی لیکن یہ خیال رکھئے گا کہ اس حساب سے وہ عمر کی حد کے سب سے کم والے حصے پہ ہے یعنی اپنی کلاس میں ذرا چھوٹی ہوگی۔ آپ اسے کلاس ون میں جہاں داخل کرانا چاہتی ہیں وہاں کی عمر کی حد معلوم کر لیجئیے گا۔

ہم نے چونکہ ابھی پکا فیصلہ نہیں کیا تھا کہ انکی ماہانہ فیس خاصی زیادہ تھی۔ اس لئے آگے کے طریقہ ء کار کے متعلق معلوم کر کے اٹھ آئے۔

گھر واپس آکر مییری ایک دوست ثمینہ نے فون پہ  بتایا کہہمارے گھر کے بالکل نزدیک ایک صاحب نے بہت اچھا مونٹیسوری کی طرز کا کوچنگ سینٹر اتنے چھوٹے بچوں کے لئے کھولا ہوا ہے اور میں چاہوں تو اسے جا کر دیکھ سکتی ہوں۔ انکی ماہانہ فیس بھی مناسب ہے صرف ڈھائ ہزار روپے۔ تو میں نے انکا نمبر لے لیا۔

اگلے دن میں نے صبح اس اسکول میں فون کر کے پتہ سمجھا اور بچی کے ساتھ وہاں چلی گئ۔ اتفاق سے انکے ابا جان اس دن شہر سے باہر تھے۔ لیکن اس سے پہلے بھی کئ اسکولوں میں اکیلے جا چکی تھی یہ کوئ مسئلہ نہ تھا۔

وہاں انکے آفس کے باہر انتظار کرتے ہوئے میری ایک اور خاتون سے بات ہوئ جنکے بچے کا داخلہ ایک مہینہ پہلے ہوا تھا وہ تقریباً چار سال کا تھا۔ کسی اور اسکول سے انہوں نے اسے وہاں منتقل کر دیا تھا اور اب خوش تھیں کہ اسکول والے اتنی محنت کراتے ہیں اتنا ہوم ورک دیتے ہیں میرا بچہ تو ہر وقت پڑھائ میں لگا رہتا ہے۔ یہ سنکر میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہ کوئ صحت مند علامت تو نہیں۔

اسکول بالکل اجاڑ بیابان ہو رہا تھا اور کہیں ایک چھوٹی سی تصویر بھی نہ تھی کہ پتہ چلے کہ یہ اتنے چھوٹے بچوں کا اسکول ہے۔ پانچ سو گز کے بنے ہوئے مکان میں قائم اس اسکول میں ایسی کوئ چیز نہ تھی جس سے بچے میں اسکول آنے کی دلچسپی پیدا ہوتی۔یہاں آکر تو مشعل بالکل خوش نہیں ہوگی۔ میں نے سوچا۔  یہ ایک مناسب جگہ نہیں ہے نجانے ثمینہ  کی دوست نے اسکی اتنی تعریف کیوں کی۔ خیر میری باری آئ۔

کمرے میں ایک ساٹھ سال سے اوپر کے صاحب موجود تھے جنکی خشخشی داڑھی تھی اور ایک خاتون جو شاید پچپن سال کی ہونگیں۔ اور فائلوں کا ایک ڈھیر ہر طرف نظر آرہا تھا۔ پہلے تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے انکے اسکول کے بارے میں کیسے پتہ چلا پھر کہنے لگے کہ یہ اس لئے پوچھ رہے ہیں کہ ہمارا طریقہ ء کار اوروں سے مختلف ہے۔ ہمارے یہاں کوئ کھیل نہیں ، کوئ فنکشن نہیں، نہ اسکول میں اور نہ گھر میں۔ پھر انہوں نے مجھ سے میری بچی کے پیدائش کا سال پوچھا۔ میں نے انہیں کہا کہ ہے تو دو ہزار چھ لیکن سال ختم ہونے میں صرف چار دن ہی رہ گئے تھے تو اس حساب سے وہ ابھی تین سال کی ہے۔ انکے چہرے پہ ایک تشویش کی لہر دوڑی۔ انکے والد کی تعلیم کیا ہے اور وہ کیا کرتے ہیں۔ اسکا جواب دیا گیا۔ پھر گویا ہوئے آپ کیا ڈاکٹر ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں، پی ایچ ڈی ڈاکٹر۔ یہ سنتے ہی انکے ساتھ وہ ہوا جو عام طور پہ ہمارے یہاں لوگوں کو ہوتا ہے یعنی  یہ خواہش پیدا ہونا  کہ اب ذرا انکو کسی نکتے پہ لیجا کر وہ کٹ لگائ جائے کہ انہیں پتہ چلے کہ انکی تعلیم  کی کیا اوقات ہے۔  اور یہ کہ اتنا پڑھنے کا کوئ فائدہ نہیں ہے۔  میں انکے تیور دیکھ کر اسکے لئے تیار ہو گئ۔۔حالانکہ یہ اطلاع میں نے انہیں پوچھنے پہ فراہم کی تھی اور اب تمام تعلیمی  بہتر اداروں میں والدین کی تعلیم پوچھی جاتی ہے۔

کہنے لگے آپ تو اپنی بچی کو خاصی دیر سے لائ ہیں۔ میں نے کہا میں اسے گھر پہ پڑھا رہی تھی اس لئے ضرورت نہیں محسوس کی۔ انہوں نے اپنی فائلوں کو درست کرتے ہوئے ذرا طنزیہ انداز میں کہا کیا پڑھا دیا ہے آپ نے اسے۔   میں نے انکی شکل دیکھ کر انکا دماغ پڑھا اور کہا وہی جو اس سطح پہ مونٹیسوریز میں پڑھایا جاتا ہے بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی۔  جیسے انگریزی کے تمام بڑے چھوٹے حروف کی پہچان اور انکی آوازیں ، اردو حروف تہجی کی پہچان، بیس تک گنتی اور اسکی پہچان۔تمام رنگوں کی پہچان، کافی ساری شکلوں اور ساختوں کی پہچان اسکے علاوہ یہ کافی سارے پزلز کر لیتی ہے۔ اور بہت ساری اردو اور انگریزی کی نظمیں یاد ہیں۔

لکھنا آتا ہے انہیں؟۔ میں نے کہا جی نہیں، یہ ابھی میں نے شروع نہیں کرایا۔ مونٹیسوری میں یہ چیز دوسرے لیول پہ شروع کرتے ہیں۔  اس لئے میں نے زور نہیں دیا۔ لیکن اسے پینسل بالکل صحیح پکڑنا آتی ہے۔ اور خاصی سیدھی لائن بنا لیتی ہے۔  تصویروں میں بہت اچھے رنگ بھر لیتی ہے۔اگر میں اسکے ساتھ لگ جاءووں تو مجھے امید ہے کہ دو مہینے میں بالکل صحیح طریقے سے لکھنے لگے گی۔

اپنی کرسی پہ سیدھے ہوئے اور کہنے لگے کہ بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں تین سال کا بچہ نہ صرف ایک سے سو تک سیدھی گنتی پڑھ لیتا ہے بلکہ لکھ بھی لیتا ہے اور سیدھی ہی نہیں بلکہ سو سے لیکر ایک تک  الٹی گننتی بھی پڑھ اور  لکھ لیتا ہے۔ انگریزی چھوٹے بڑے حروف تمام نہ صرف پہچانتا ہے بلکہ لکھ لیتا ہے۔ اور تین حروف ملا کر ایک لفظ بنانا بھی جانتا ہے۔ اردو الف سے لیکر ی تک نہ صرف لکھ لیتا ہے، پہچانتا ہے بلکہ حروف جوڑ کر لفظ بنا کر پڑھ لیتا ہے۔

اب آپ بتائیے دو مہینے میں تو آپ اپنی بچی کو لکھنا سکھائیں گیں۔ کیا پڑھنا بھی سکھا دیں گی۔ پھر  انہوں نے انتہائ طنز سے کہا۔  اچھا چلیں آپ کے کہنے پہ ہم اسے داخلہ بھی دے دیں تو ہم تو اس وقت دو ہزار آٹھ کے بچوں کو لے رہے ہیں۔ اپکی تو بچی دو ہزار چھ کی ہے اور اگر آپکی بات مان لی جائے تو دو ہزار سات میں شامل کر لیں۔ پھر بھی ڈیڑھ سال کا فرق آرہا ہے۔

میں نے دماغ میں حساب لگایا کہ تو اسکا مطلب ہے کہ اس وقت انکے پاس ڈیڑھ سے دو سال کے بچے ہونگے۔ لیکن مجھے وہاں اتنے چھوٹے بچوں کے لئے کوئ انتظام نظر نہیں آیا۔ اور میں یقین نہیں کر سکتی تھی کہ وہاں اتنے چھوٹے بچے ہونگے۔  باہر جو خاتون ملی تھیں انکا بچہ تو کم از کم چار سال کا تھا اور وہ کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے ایک مہینہ پہلے اس اسکول میں ڈآلا ہے۔ کس قدر جھوٹ بول رہا ہے یہ شخص اور خدا جانے کس زعم میں اتنا بڑھ بڑھ کر بول رہا ہے۔

جی یہ تو آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ میں نے ذرا مسمسی اور تھکی ہوئ شکل بنائ۔ اب تو غلطی ہو گئ۔  میں  انہیں مزید  دیکھنا اور سننا  چاہ رہی تھی۔  اس لئے میں نے اپنے چہرے پہ تھوڑی پریشانی ظاہر کی۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟

کہنے لگے آپ نے اسکا پیدائشی سرٹیفیکیٹ بنوا لیا ہے۔ میں نے کہا جی پیدائشی سرٹیفیکیٹ، پاسپورٹ حتی کہ اسکی تو نادرا میں رجسٹریشن بھی ہو چکی ہے۔فرمایا،  پھر تو معذرت کیساتھ کہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ ورنہ ایک صورت یہ ہوتی کہ آپ اپنی بچی کا دوسرا پیدائشی سرٹیفیکیٹ بنوا لیتیں۔ تو اب ہماری طرف سے معذرت ہے۔ میں انکے اس تمام طرز عمل پہ سکتے میں تھی۔  انکے اس گھٹیا اسکول میں داخلے کے لئے میں اپنی بچی کا جھوٹا پیدائشی سرٹیفیکیٹ بنواءوں ۔ اس شخص نے کیا بھنگ پی ہوئ ہے۔

میں خاموشی سےاس جیل خآنے سے نکل  آئ۔ اب سننے والے کہتے ہیں کہ آپکو اسے دس سنانی چاہئیے تھیں۔ جب بچی کو وہاں داخل ہی نہیں کرانا تھا تو کیوں چھوڑا اس جاہل کو۔ لیکن اس بات کا فیصلہ کون کرے کہ  جاہل کون؟ وہ ماں باپ جنہیں یہ نہیں معلوم کہ انہیں اپنے بچوں کو کیسی اور کہاں تعلیم دلانی ہے، جنہیں یہ نہیں معلوم کہ تعلیم کا بنیادی مقصد کیا ہے۔ یا انکی جہالت سے فائدہ اٹھانے والے یہ ہٹلر صفت لوگ۔

4:18 PM

Montessori Schools in Karachi., بیکن ہاءوس اسکول, جنریشنز اسکول, فاءونڈیشن اسکول, مونٹیسوری

پنجاب یونیورسٹی میں ہنگامہ آرائ

پنجاب یونیورسٹی میں طلباء کے ایک گروپ نے یونیورسٹی کے ایک استاد  پروفیسر افتخار بلوچ کے آفس پہ ہلہ بولا اور انہیں زد و کوب کیا۔ یہی نہیں انہوں نے وی سی پنجاب یونیورسٹی کی رہائش پہ بھی حملہ کیا۔ انکے مشتعل مزاج کی وجہ جمیعیت سے تعلق رکھنے والے اسٹوڈنٹس کا یونیورسٹی سے انخلاء کا حکم تو جو انکے خلاف نظم و ضبط پہ عمل نہ کرنے کی وجہ سے لایا گیا۔ پروفیسر بلوچ اسٹوڈنٹس ڈسیپلینری کمیٹی کے سربراہ بھی ہیں۔

پاکستانی یونیورسٹیز میںایسے واقعات پیش آنا کوئ غیر معمولی بات نہیں۔ مجھے خود محض ڈھائ سال کے عرصے میں کئ دفعہ اس قسم کے واقعات سے گذرنا پڑا کہ اسٹوڈنٹس کا ایک گروہ میرے سر پہ کھڑا ہو کہ کلاس فی الفور ختم کی جائے۔ وہ کسی واقعے کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں اور ڈپارٹمنٹ میں اس وقت کوئ کلاس نہیں ہو سکتی۔۔

اسٹوڈنٹس کو غنڈہ گردی کی طرف مائل کرنے والی ہماری سیاسی پارٹیز ہوتی ہیں کہ یونیورسٹیز اور کالجز میں یہ اپنی بچہ پارٹی کو استعمال کرتی ہیں۔ اس عمر کے اسٹوڈنٹس جنکی ابھی زندگی میں نہ کوئ اچیومنٹس ہوتی ہیں نہ شناخت لوگوں کے ہجوم میں نمایاں ہونے اوراپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے انکے آلہ ء کار بن جاتے ہیں۔ اور عالم یہ ہوتا ہے کہ اسٹوڈنٹس کو اس بات پہ اعتراض نہیں ہوتا کہ کوئ استاد انہیں پڑھانے میں کتنی نااہلیت برتتا ہے۔وہ اسکے خلاف جا کر وی سی کے آفس کے باہر مظاہرہ نہیں کر سکتے مگر یونیورسٹی کے اندر کسی پول پہ سے انکی پارٹی کا جھنڈا ہٹنا ہنگامے کا باعث بن سکتا ہے۔

ان واقعات میں اسلامی جمیعیت طلبہ کے اسٹوڈنٹس شامل بتائے جاتے ہیں۔ ویسے تو جماعت اسلامی کے سر کردہ رہنماءووں نے اس واقعے میں کسی بھی اسلامی جمعیت کے طالب علم کے ملوث ہونے کو جھٹلایا ہے۔ لیکن تمام واقعات اور شواہد انکے اس دعوی کے خلاف جاتے ہیں۔ یونیورسٹیز میں ہنگامہ آرائ کے متعلق اسلامی جمیت طلبہ کی تاریخ کوئ زیادہ اچھی نہیں ہے۔  ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ عمران خان کی درگت بھی اسلامی جمیعت طلباء کے سپوتوں کے ہاتھ بنی تھی۔ پنجاب یونیورسٹی ویسے بھی جمیعت کا ایک مضبوط گڑھ ہے۔  یہ وہ جماعت ہے جسکے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے پہلی دفعہ یونیورسٹیز میں اسلحے کی سیاست متعارف کرائ۔

اس صورتحال سے اسلامی جمیعیت کے کچھ طلباء خاصے ناراض ہوئے اور انکا کہنا ہے کہ یہ سب کچھ انتقامی کارروائ کا حصہ ہے اور ایسا اس لئے کیا گیا کہ انکے طلباء نے مارچ کے مہینے میں  یونیورسٹی میں امریکہ کے خلاف ریلی منعقد کرائ تھی۔ جمعیت کے پاس یہ وہ ٹانک ہے جو اپنے ارکان کے اندر توانائ کی لہریں دوڑا دینے کا باعث بنتا ہے اور۔جس سے انکے مزاج کی  آتش صفتی بڑھ جاتی ہے۔ گو امریکہ گو۔ امریکہ مردہ باد۔ عالمی دہشت گرد کون، امریکہ، امریکہ۔ اس سے تو میرے بھی خون کا دوران بڑھ جاتا ہے۔

سادہ دل وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی  نے وزیر اعلی ہنجاب ، میرا مطلب خادم پنجاب جناب شہباز شریف سے درخواست کی کہ وہ ان طلباء کے خلاف تادیبی کارروائیوں میں انکا ساتھ دیں۔ تاکہ یہ واقعات پھر نہ دوہرائے جا ئیں۔  لیکن یہ تو اب کوئ بھی شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ دائیں بازو کی سیاست کرنےوالے شہباز شریف دائیں بازو کے حامی عناصر کے خلاف کیسے کارروائ کر سکتے ہیں۔

  ایک زمانے میں لوگ اپنے بچوں کو استاد کے حوالے یہ کہہ کر کرتے تھے کہ ہڈی ہماری چمڑی تمہاری۔ اوراب استاد یہ کہہ کر تعلیمی اداروں کے حوالے کیا جاتا ہے کہ تپڑ ہے تو پاس کر ورنہ برداشت کر۔ اگرچہ مناسب کارروائ نہ ہونے تک اساتذہ نے بھی بائیکاٹ کا اعلان کیا ہے لیکن کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک۔

اب رہ گئے پروفیسر افتخار بلوچ تو انکے لئے اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ جب اوکھلی میں سر دیا تو موصلوں سے کیا ڈرنا۔ پٹ پٹ کر ایک دن پٹنے کی عادت ہو ہی جائے گی۔  استاد ہونے کے لئے اور خاص طور پہ اسٹوڈنٹس ڈسیپلینری کمیٹی کا سربراہ ہونے کے لئےاسکی عادت ہونا بہت ضروری ہے۔

عمران خان اور اسلامی جمیعت طلباء-

۱

عمران خان اور اسلامی جمیعت طلباء-۲

اسلامی جمیعت طلباء کی ہنگامہ آرائ

5:01 PM

Islami Jamiat talba, Punjab University, اسلامی جمیعت طلبہ, پنجاب یونیورسٹی, شہباز شریف, طلبہ کی سیاسی پارٹیاں, عمران خان

نئے افکار انکا حصول اور ترویج-۹

بر صغیر پاک ہ ہند میں اسلام کی آمد واضح تبدیلیوں کی علامت بنی۔ اس سے پہلے بدھ مذہب اور جین مذہب یہاں سنسکرتی برتری کے خلاف تحریک بن کر ابھرے،  لیکن یہاں کے عام دھارے میں شامل ہو گئے۔ مسلمان اپنے ساتھ مذہب اور معاشرت کا مضبوط تصور لیکر آئے۔ ۔البیرونی لکھتا ہے کہ 'مذہبی لحاظ سے ہندوستانیوں کا آپس میں اختلاف بہت کم تھا اور وہ معمولی اختلافات پہ اپنے جسم ، مال اور روح کو قربان کرنے کو تیار نہ تھے۔' اسکے برخلاف مسلمانوں نے اس تصادم کو خارجی حیثیت دی۔  اونچی ذات کے ہندو اسے اپنے خلاف حملہ سمجھنے لگے اور صف آرائ پہ آمادہ ہوگئے۔ یوں مسلمانوں کی آمد نے ہندو مذہب کے صدیوں پرانے جامد تصورات کو ہلا دیا۔

مشہور زمانہ خیال کے برعکس مسلمان پہلی دفعہ محمد بن قاسم کیساتھ ہندوستان میں وارد نہیں ہوئے تھے  بلکہ حضرت عمر فاروق کے زمانے میں ہندوستان کے ساحلوں پہ انکے جنگی بیڑے  اترے۔ انکا یہ جنگی بیڑہ بلوچستان کے علاقے مکران تک پہنچا لیکن اس وقت کے سپہ سالار نے جب امیر المومنین کو اس علاقے کے سخت جغرافیائ حالات، پانی کی عدم دستیابی اور علاقے کے غیر آباد ہونے کی اطلاع دی تو حضرت عمر فاروق نے انہیں آگے نہ بڑھنے کا حکم دیا۔ سپہ سالار کا قاصد جب حضرت عمر کے سامنے حاضر ہوا تو اس نے اس طرح نقشہ کھینچا۔

“ 'O Commander of the faithful!

It's a land where the plains are stony; Where water is scanty; Where the fruits are unsavory Where men are known for treachery; Where plenty is unknown; Where virtue is held of little account; And where evil is dominant; A large army is less for there; And a less army is useless there; The land beyond it, is even worse .

سو ہندوستان میں اسلام اول جنوبی ہندوستان میں تاجروں کے ذریعے پھیلا پھر سندھ میں عربوں کی فتح اور آخر میں ترکوں کی فتح کے بعد شمالی ہندوستان میں آیا۔

مسلمان اپنے ساتھ تازہ فکر لائے تھے۔ وہ  تناسخ کے برعکس حیات بعد الموت کے قائل تھے اور ان کے دین میں ذات پات کو اہمیت حاص نہ تھی۔  یہ وہ نظریات تھے جو ہندوستان کے لئے نئے تھے۔ چنانچہ  ذات پات کے بندھنوں میں جکڑی، انسان کے تناسخ میں الجھی زندگی میں بار بار کے جنموں سے وابستہ ہندو تہذیب مغلوب ہوئ اور تبدیلی ء مذہب کا سلسلہ مختلف سطحوں پہ شروع ہوا۔

نچلی سطح کے لوگ اسلامی مساوت سے متائر ہوئے، اونچے طبقے کے لوگ اسلام کو ایک ترقی پسند مذہب سمجھ کر اس میں داخل ہوئے، بعض امرائے وقت مصلحت وقت کے تحت اس میں شامل ہوگئے۔ کچھ لوگ اسلام کا مطالعہ کرنے کے بعد خالص دینی جذبے سے اس میں شامل ہوئے۔بعض مسلمان سلاطین بالخصوص قطب الدین ایبک اور شمس الدین التمش کی فیاضی نے مقامی باشندوں کے دل جیت لئے اور وہ تبدیلی ء مذہب پہ آمادہ ہوگئے۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہئیے کہ اسلام نے انکے عقائد تو بدل دئیے لیکن انکے بنیادی ثقافتی اور سماجی ڈھانچے کو تبدیل نہیں کی تھا۔ یوں ایک نئ ثقافت نے جنم لینا شروع کیا۔

  اگرچہ جن مسلمان سلاطین نے ہندوستان کو فتح کرنے کی غرض سے حملے کئے ان میں چاہے محمد بن قاسم ہو یا محمود غزنوی انکا مقصد اسلام کی تبلیغ اور ترویج نہیں تھا۔ لیکن بہرحال انہیں امور سلطنت کو مستحکم انداز میں چلانے کے لئے زیادہ مسلمان چاہئیے تھےاس لئے انہوں نے اس میں دلچسپی لی کہ مقامی لوگ مسلمان ہوں اور اس سلسلے میں لوگوں کو جاگیریں دی گئ اور انہیں مالی تحفظ فراہم کیا گیا۔

یہی وجہ ہے کہ جب فتح سندھ کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ مقامی ہندءووں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے تو حجاج بن یوسف نے علما ء و فقہاء سے مشورے کے بعد  حکم دیا کہ انکے ساتھ اہل کتاب کی طرح سلوک کیا جائے اور انہیں اپنی عبادت گاہوں کو جانے کی اوراپنی مورتیوں کی پوجا کی اجازت دی جائے۔

خود مسلمان فاتحین نے اس بات کو محسوس کرتے ہوئے کہ مسلمان اقلیت میں ہیں اور ہندو اکثریت میں۔ اپنی حکومت کو مضبوط کرنے کے لئے مذہبی تفریق کو کم رکھنے کی کوشش کی۔ اس طرح سے وہ خود بھی تبدیلی کے عمل سے گذرے۔علاءالدین خلجی نے پہلی مرتبہ اعلان کیا کہ حکومت کے انتظام ومیں وہ صرف ایک چیز کو مد نظر رکھتا ہے کہ رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے کیا ضروری ہے۔ اس نے اپنے قاضی  مغیث کو جواب دیتے ہوئے لکھا کہ'میں یہ نہیں جانتا کہ میرے احکامات شرعی ہوتے ہیں یا غیر شرعی۔ جس چیز میں اصلاح دیکھتا ہوں اور جو کچھ بھی مصلحت وقت کے مطابق نظر آتا ہے اسکا میں حکم دے دیتا ہوں'۔ یہ مصلحت اندیشی اکبر کے زمانے میں اپنے عروج پہ پہنچی۔ جب اکبر کے دربار میں ہندءووں کو اعلی درباری عہدے ملے اور ان پہ  امتیازی ٹیکس ختم کئے گئے علاوہ ازیں انہیں فوج میں بھی شامل کیا گیا۔

تبلیغ اسلام  میں  صوفیاء اکرام کا بھی ایک اہم کردار رہا۔  جنہوں نے ہندو اور مسلمان کا امتیاز کئے بغیر سب لوگوں کو یکساں طور پر بلند تر روحانی زندگی کا پیغام دیا ان درویشوں نے عوامی دربار لگائے، عوام کی زبان میں شاعری کی اور محبت اور خلوص سے لوگوں کے دلوں کو مسخر کر لیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ

'اگر یہ کہنا صحیح ہے کہ ہندوستان کو غزنی اور غور کے بادشاہوں نے فتح کیا تو اس سے زیادہ یہ کہنا درست ہے کہ ہندوستان کی روح کو خانوادہ ء چشت کے روحانی سلاطین نے فتح کیا'۔

یہ صوفی ذہنی لحاظ سے وسیع المشرب تھے۔ چشتیہ، قادریہ، امدادیہ اور غوثیہ سلسلوں کے صوفیاء نے اس بات کی کوشش کی کہ تمام مذہبوں میں یک جہتی کے اصول تلاش کر کے ان میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔

  یہاں یہ پہلو بھی مد نظر رہنا چاہئیے کہ جن جگہوں پہ ذات پات کا نظام حاوی تھا وہاں اسلام زیادہ تیزی سے نہ پھیل سکا۔ جیسے شمالی ہندوستان، جہاں برہمن ازم شدت لیساتھ موجود تھا اور اس نے اسلام میں دلچسپی نہیں لی بلکہ مراعات یافتہ طبقہ ہونے کی وجہ سے محاذ آرائ اختیار کی۔ اسلام کو وہاں کامیابی ہوئ جہاں پہلے سے ہی بدھ مت اور جین مت کا رسوخ موجود تھا۔

اس طرح سے ہندوستان میں اشاعت اسلام میں حکومت کیساتھ ساتھ ہندوستان کے مذہبی، سیاسی، ثقافتی اور سماجی حالات کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔

جاری ہے

حوالہ جات؛

اردو ادب کی تحریکیں، مصنف ڈاکٹر انور سدید

المیہ تاریخ، مصنف، ڈاکٹر مبارک علی

برصغیر میں مسلمانوں کی آمد

نئے افکار انکا حصول اور ترویج-۸

7:49 AM

Mohammad bin Qasim, Muslims in India, حجاج بن یوسف, حضرت عمر فاروق, علاءالدین خلجی, محمد بن قاسم, مسلمان ہندوستان

جیوے پاکستان

شیکسپیئر نے کہا کہ نام میں کیا رکھا ہے گلاب کو جس نام سے بھی پکارو گلاب ہی رہے گا۔

شاید اسی لئے ہمارے ایک صوبے کا نام نارتھ ویسٹ فرنٹیئر یعنی شمالی سرحدی صوبہ باسٹھ سال تک رہا۔ لیکن زمانے کے اطوار بدلے گئے۔ گلاب اب محض گلاب کہلائے جانے پہ راضی نہیں۔ یہ انہیں اپنی ترقی اور بقا کیخلاف سازش لگتی ہے۔ ہم بھی انکی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہ کیا سبھی اپنےاپنے نام رکھتے ہیں مگر وہ شمال مغربی سرحدی صوبہ۔ اس طرح تو ایک صوبے کا نام جنوب مشرقی سرحدی صوبہ اور دوسرے کا نام جنوب  مشرقی سرحدی صوبہ اور تیسرے کا نام جنوب مغربیسرحدی صوبہ ہونا چاہئیے۔

لیکن گلاب نے یہ نہیں کہا۔ گلاب کا کہناتھا کہ اس صوبے میں جو قوم اکثریت میں ہے اسکا نام اس اکثریتی قوم پہ ہے ہمارا نام بھی ہماری اکثریتی قوم کے نام پہ ہونا چاہئیے ۔ اگرچہ پاکستان میں صرف ایک قومیت کو ہی عصبیت کے طعنے ملتے ہیں اور بار بار اس چیز کا تذکرہ کیا جاتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں  جو اپنے آپکو اس ملک کے اندر ضم نہیں کر سکے۔ لیکن در حقیقت ہمارا سیاسی نظام ایسا ہے کہ ہر سیاسی پارٹی عصبیت سے ہی فائدہ اٹھاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بلاول زرداری کا نام بلاول بھٹو زرداری کرنے کی نوبت نہ آتی، نواز شریف کو جاگ پنجابی جاگ کا نعرہ نہ لگانا پرتا، بلوچ،  بلوچ لبریشن فرنٹ نہ بناتے اور آج سرحد کا نام تبدیل کر کے خیبر پختونخواہ نہ رکھا جاتا ۔ حالانکہ سرحد کا نام تبدیل کر کے کوئ بھی غیر قومیتی نام رکھا جا سکتا تھا جیسے اباسین یا صرف خیبر لیکن اسکے ساتھ پختونخواہ کا اضافہ ضروری سمجھا گیا  اور ایک دفعہ پھر یہ بات دہرائ گئ کہ پاکستان میں چار قومیں بستی ہیں۔ پنجابی، سندھی، بلوچی اور پختون۔ باقیوں کے لئےجیوے پاکستان۔

8:19 PM

Khyber pakhtunkhwah, pakstan., پاکستان, خیبر پختونخواہ, شمال مغربی سرحدی صوبہ

واہ شعیب ملک ، آہ ثانیہ مرزا

تین دن سے دیکھ رہی ہوں کہ پاکستانی نوجوان لڑکے ایکدم ہائپر ہوگئے ہیں۔ بلکہ صحیح معنوں میں کملے، دیوانے اور بملے نظر آرہے ہیں۔  روزانہ شام کو گھر کے اندر آتی ہوئ گیندوں کو انٹر کام کے ذریعے واپس کرتے ہوئے آج میں نے سوچا ذرا کچھ سن گن لینے کی کوشش تو کروں۔

کیا ہوا بھئ۔ یہ کس دنیا میں گم ہیں آپ لوگ۔ پتہ چلا کہ ثانیہ مرزا کی منگنی پاکستانی کرکٹر شعیب ملک سے ہو گئ ہے۔ سنا تھا کہ محبت اندھی ہوتی ہے لیکن یہ پوری قوم با جماعت اس مرض میں کیسے مبتلا ہو گئ۔ اب ہم تو سمجھتے تھے کہ محبت کے لئے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں۔ مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ محبت کی وباء کچھ ایسے پھیلے گی کہ شادی وہ کرنے ادھرجا رہے ہون گے اور دل لاکھوں کے ادھر دھڑک رہے ہہونگے۔

ہندءووں کے یہاں ایک ذات پانڈءووں کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پانڈو پانچ بھائ تھے۔ راجہ کی بیٹی کے لئے سوئمبر رچایا جا رہا تھآ۔ یہ پانچوں بھائ بھی وہاں پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک  کا نام ارجن تھا، جو بہترین نشانے باز تھا۔ مقابلے میں ایک گھومتی ہوئ مچھلی کا عکس دیکھ کر اسکی آنکھ پہ نشانہ لگانا تھا۔ ارجن وہ مقابلہ جیتا۔ دلہن کو لیکر جب گھر لوٹے تو گھر کی دہلیز پہ قدم رکھتے ہی ایک بھائ نے خوشی سے نعرہ لگایا 'دیکھو ماں، ہم کیا جیت کر لائے' اسے ذرا وحید مراد کے انداز میں پڑھئے گا۔ ماں نے 'چیز' دیکھے بغیر وہیں سے جواب دیا۔ جو بھی لائے ہو، آپس میں مل بانٹ کر استعمال کرنا۔ پانڈءووں کی اپنی ماں سے فرمانبرداری ضرب المثل تھی۔ چنانچہ اس دن سے وہ خاتون پانچوں بھائیوں کی بیوی بن کر رہنے لگی۔

 اب اپنے نوجوان 'بھائیوں' کی خوشی کی وجہ سے انجان اپنی نوجوان  کنواری بہنوں کی طرف دیکھتی ہوں تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ ہم میں کیا کمی ہے جو اس موئ ثانیہ مرزا پہ جا کر نظر ٹہری۔ ہمارے لئے تو یہ راگ الاپتے الاپتے گلا نہیں دکھتا کہ دوپٹہ سر سے پہنو، گھر کی چار دیواری میں رہو، خبردار جو کسی نامحرم سے بات کی۔ اب اس  حیدرآبادی چلتر باز لڑکی کو جو ابھی کچھ دن پہلے ہی اپنی ایک منگنی توڑ چکی ہے۔ کیسے بھنگڑے ڈال کر لا رہے ہیں۔ ٹینس کی اسٹار ہے۔ اسے کیوں نہیں کہتے کہ اییسے کپڑے پہنتی ہے، دوپٹہ تو ندارد کپڑے ہی پورے پہن لے تو بات ہے۔ آخر ہمارے ساتھ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ ہمیں گھروں میں بند کر کے صرف ٹی وی چینل اور شاپنگ کے کھیل میں الجھا کر رکھا ہوا ہے، ہمیں بھی ٹینس کھیلنا پسند ہے۔ ہمیں بھی شعیب ملک پسند ہے۔  اور جب شادی کی باری آتی ہے تو غیروں میں جا کر فخر سے ان لڑکیوں کو لے آتے ہیں۔ کبھی اس بہانے سے کبھی اس بہانے سے۔ انڈیا سے نفرت ہے مگر انڈین لڑکیوں سے محبت۔ منافق، دھوکے باز۔

سمجھتے ہیں ثانیہ یہاں آکر سیالکوٹ میں بیٹھ کر کھانے پکائے گی اور بھینس کو چارہ ڈالے گی۔ یہاں میں لقمہ دیتی ہون، نہیں وہ یہ بھی کہے گی' ہاہائے شعیب، یہ تمہارا پاکستان کیسا ہے'۔ اسے زرا ٹھیٹھ پنجابی انداز میں لہرا کر پڑھئیے گا

تو اے میرے پیارے نوجوانوں یہ بات میں نہیں کہہ رہی۔ یہ تو ایک دل جلی کی بات ہے۔ مجھے تو اچھی طرح معلوم ہے دل آنے کی بات ہے جب جو لگ جائے پیارا۔یہ الگ بات کے دل آنے کی رفتار دل دھڑکنے کی رفتار سے مل جائے تو حادثہ ایکدم بھی ہوجاتا ہے۔ یہ تو سہراب مرزا سے پوچھیں۔ لعنت بھیجیں اس سہراب پہ، خوشی کی بات یہ ہے کہ پاکستان کچھ کہیں سے جیت کر تولا رہا ہے۔ اگر ثانیہ نہ کر دیتی تو ہم کس کو منہ دکھاتے۔ اور قوم میں مزید کرکٹ کھیلنے کی چنگاری کیسے بھڑکتی۔   شعیب کے اس فیصلے سے انکی دور اندیشی جھلکتی ہے۔ مجھے یقین ہے اس سے ملک میں کرکٹ کے کھیل کو مزید فروغ ملے گا۔

چونکہ پنجاب میں قاف کو کاف کے برابر ہی سمجھا اور بولا جاتا ہے تو ہمیں یہ اندیشہ نہیں رہیگا کہ شعیب حیدر آبادیوں کی طرح قاف کو خ بولنے لگیں گے ۔ امید ہے کہ قورمہ، کورمہ ہی رہیگا خورمہ نہیں بنے گا۔ اگرچہ کہ ہمیشہ ایسائچ نہیں ہوتا لیکن امید پہ دنیا قائم ہے۔ البتہ حیدرآبادی کھٹے کھانے شوق سے کھاتے ہیں تو کیا خبر سیالکوٹ میں اب املی کے باغات لگ جائیں۔ اور سیالکوٹی لڑکیاں یہ گانا گائیں کہ

کھٹے لیموں کھٹے،  کبھی تو میٹھے ہونگے

چھوٹے سیاں چھوٹے،  کبھی تو بڑے ہونگے

پیارے شعیب دیکھو کہیں بیوی کے غلام نہ بن جانا کو ہم سبکی زمانے بھر میں تھو تھو ہو جائے۔ اے کاش کسی کو صحیح وقت پہ ہوش آجائے اور وہ بر وقت شعیب کو بیوی کو پہلے دن سے قابو میں رکھنے کے گر بتا دے۔ ہمارا لڑکا تو ایسا سیدھا ہے کہ کوئ بھی انڈین حیدر آبادی لڑکی اسے الو بنا لیتی ہے۔

پیاری بہنوں ایک کے بعد ایک اس قسم کے واقعات سے گذرنے کے بعد اب آپکو اندازہ ہو جانا چاہئیے کہ یہ کبوتر کس چھجے پہ بیٹھنا چاہتے ہیں۔ سو تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر لو ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو۔

11:35 AM

Sania Mirza, Shoaib Malik, انڈیا, پاکستان, ثانیہ مرزا, شعیب ملک

بچوں کے لئے ایک تحفہ

پچھلا سارا ہفتہ میں نے ایک چھوٹی سی فلم کی تیاری میں گذارا۔

اسکے لئیے میں نے پہلے فوٹو شاپ کے بنیادی اسباق سیکھے۔ غلطیاں کیں۔ پھر ان غلطیوں کو بار بار صحیح کیا۔

لیکن بالآخر اب وہ چیز مل گئ۔ جو مجھے یقین ہے کہ آپکے بچوں کواردو حروف تہجی کم وقت میں آسانی سے سیکھنے میں مدد دے گی۔ روزانہ نہیں تو ایکدن چھوڑ کر یہ ویڈیو انہیں دکھائیں۔ وقت ملے تو انکے ساتھ دہرائیں۔ اور آپ دیکھیں گے کچھ دنوں میں انہیں بآسانی الف سے لیکر ی تک تمام حروف یاد ہو جائیں گے۔۔ اور ہاں اس پہ اپنی رائے دینا نہ بھولئیے گا۔

10:41 PM

urdu alphabets, اردو, اردو حروف تہجی, امر محبوب, پاکستان, شرمین ثروت, کراچی

ٹیکنا لوجی اور اجنتا کے غار

آخر کیسے پتہ چلتا ہے کہ آج اتوار ہے اور چھٹی ہے۔ اسکول بسوں کی آوازیں نہیں ہوتیں۔ صبح سے ڈور بیل بار بار نہیں بجتی۔کوئ خواب درمیان سے نہیں ٹوٹتا۔ لیکن ایک اہم علامت بچپن سے  اس دن کے اخبار سے پتہ چلتی تھی۔ جس میں میگزین ہوتا تھا۔  جو صبح پہلے جاگتا تھا اخبار سب سے پہلے اسکے حصے میں آجاتا تھا۔ شاید میری سحر خیزی کی عادت میں یہ چیز بھی شامل ہو۔  میں سب سے پہلے اخبار پڑھ کرختم کرنا چاہتی تھی۔ اب تو اخبار والا اتنی دیر سے اخبار دیکر جاتا ہے کہ میں انٹر نیٹ پہ ایک تفصیلی چکر لگا لیتی ہوں۔

اس اتوار کو ہم سب نے اس تجویز پہ غور کیا کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ اخبارات کو بند کر دیا جائے۔ ہمارے ہر روز آنیوالے اخبارات کی تعداد اب سے کچھ عرصے پہلے تک  تین اخباراورچھٹی والے دن کو خاص رعایت دیتے ہوئے دو انگریزی کے اور دو اردو کے اخبار تھے۔ پھر یوں ہوا کہ اتنے چینل آتے ہیں پل پل کی خبر تو ان سے ہی مل جاتی ہے۔تو روز کا ایک اخبار مقرر ہوا اور چھٹی والے دن تین۔

لیکن اب کچھ لوگ سوچتے ہیں کہ اخبار کی چھٹی کر دینی چاہئیے کیونکہ جب ہر کسی کہ پاس اسکا اپنا کمپیوٹر ہے اور وہ الیکٹرونک اخبار پڑھ سکتا ہے تو اسکی کیا ضرورت ہے۔ میں اس تجویز کے حامیوں میں سے نہیں ہوں۔ اس طرح سے اس معاملے میں انتہائ قدامت پسند ہوں۔

میرا موقف یہ ہے کہ اخبار اپنی جسمانی حیثیت میں جب موجود ہوتا ہے تو ایک اخلاقی دباءو رہتا ہے کہ ایک نظر ہی سہی پڑھ لینا چاہئیے۔ دوسرا یہ کہ دن میں کسی بھی وقت کسی بھی جگہ پڑھ سکتے ہیں حتی کہ کسی قطار میں انتظار کرتے ہوئے یا چلتی گاڑی میں بھی پڑھ سکتے ہیں اور تھک جائیں تو تکئے کے نیچے دبا کر وہیں کچھ دیر کے لئے آنکھین موند لیں۔ گرمی ہو تو ہلا کر پنکھا بنا لیں، برسات میں مکھیاں اڑا لیں، کسی بات پہ سب سے چھپ کر مسکرانا ہو تو اخبار منہ کے آگے کر لیں، اور کچھ نہیں تو کباڑئے سے ہر مہینے الجھنے کا آسان بہانہ،  ماچس ختم ہو گئ تو ایک چولہے سے دوسرے تک آگ لیجانے کا آسان طریقہ، کسی کو پیار سے چپت لگا نے کا دل ہو لیکن محرمیت آڑے آتی ہو تو اخبار سے جھاڑ دیں، کیا یہ رومانیت الیکٹرنک اخبار کیساتھ میسر ہے؟

 کچھ انہی وجوہات کی بناء پہ مجھے ڈیجیٹل کیمرے انتہائ ناپسند ہیں۔ پہلے کیمروں میں رول ہوا کرتے تھے۔ ایک اخلاقی دباءو رہتا تھا کہ انکو ڈیویلپ کروا لیا جائے ورنہ خراب ہو جائیں گے۔ پھر انکو البم میں سجایا جاتا اور پھر سب لوگوں کو یہ دکھائے جاتے اور ان پہ سیر حاصل گفگتو ہوتی۔ ہائے کیا زمانہ تھا۔ کسی کی تصویر پسند آئ تو اڑالی اور پھر مدتوں پہلو میں دبا کر دیکھتے رہنا اور ان سے باتیں کرنا ۔اسی لئے تو یہ گانا بنا کہ جو بات تجھ میں ہے تیری تصویر میں نہیں۔ تصویر میں نہیں۔

اب ڈیجیٹل کیمرے کی وجہ سے تصویریں کمپیوٹر میں ہی پڑی رہ جاتی ہیں۔ اس وقت میرے پاس پانچ سو کے قریب تصاویر ہیں جنکے بارے میں ہر تھوڑے دن بعد سوچتی ہوں کہ ان کو بیٹھ کر چھانوں اور کسی چیز میں محفوظ کر کے تصاویر نکلوا لوں۔ تاکہ کسی البم میں سج جائیں لیکن وہی بات آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔

ان تصویروں کی تعداد بڑھے چلی جارہی ہے۔ اور یقیناً کچھ عرصے بعد انکو بنوانا جیب پہ خاصہ بھاری پڑیگا۔ لیکن ایک عجیب نا مکمل سا اطمینان رہتا ہے کہ کمپیوٹر میں تو ہیں۔ جب چاہیں گے جا کر بنوا لیں گے۔

سوچتی ہوں خدانخواستہ اگر کسی وجہ سے یہ دنیا اس وقت  کسی بھی وجہ سے ایکدم ختم ہو جائے تو بچ رہنے والے اس حساب سے کتنے غریب ہونگے انکے پاس کچھ بھی نہ ہوگا جس سے وہ اپنا ماضی دوبارہ نکال سکیں۔ جیسے اجنتا کے غار اور الف لیلی کی کہانیاں۔

اجنتا کے غاروں میں زمانہ قبل از مسیح کی بنی ہوئ یہ تصویر، اب تک موجود ہے)۔)

11:35 PM

Ajant caves, Arabian nights, epaper, اجنتا کے غار, الف لیلی, ڈیجیٹل ٹیکنالوجی

پاکستان ، امریکہ اور استواری ء تعلقات

پاکستان اور امریکہ کے تعلقات ہمیشہ ایک معمے کی صورت رہے ہیں۔ اور عالم یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں۔ لیکن کبھی بھی حالات اس طرح کے نہیں ہو پاتے کہ تمہیں اپنوں سے کب فرصت، ہم اپنے غم سے کب خالی۔ چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی۔

البتہ عوام کا ایک طبقہ جو یہ سمجھتا ہے کہ ہمارے تمام مسائل کی جڑ امریکہ کا ہمارے اندر مصروف رہنا ہے وہ کہتے ہیں کہ

خیر اس موقع پہ میں عوام کا تذکرہ کر کے آپکے منہ کا ذائقہ خراب نہیں کرنا چاہتی۔ آخر وہ خوامخواہ ہوتے ہی  کیوں ہیں۔

چلیں پھر خواص کی باتیں کریں۔ ماضی ء قریب میں موجودہ صدر صاحب کے سارا پالن سے ہاتھ ملالینے اور معانقے کرنے کی خواہش  کا اظہار کرنے

پہ ان لوگوں نے وہ ہلہ بولا کہ کچھ تاریخی شاہکار وجود میں آگئے۔

یہ دیکھئے یہ ہے انکے دشمنوں کے تخیل کی پرواز۔ گھٹیا حرکت۔ ایسے ہی کسی موقع پہ شاید چڑ کر غالب نے کہا کہ خواہش کو احمقون نے پرستش دیا قرار۔ کیا پوجتا ہوں اس بت بیداد گر کو میں۔ میری ہمدردیاں اپنے محبوب صدر کے ساتھ رہیں۔

آج ہم سبکی محبوب امریکن وزیر ہلیری کلینٹن نے اعلی سطح کی امریکن اور پاکستانی اسٹریٹجک میٹنگ کے بعد اسے نئے تعلقات کی استواری کا نیا دن قرار دیاہے۔ نئے تعلقات کی استواری کے اس نئے دن پہ  آپ سب کے تخیل کی بلند پرواز کے لئیے یہ تصویر حاضر ہے۔

نہیں معلوم شاہ محمود قریشی  نے کیا سوچا۔ ہم اگر شاعر ہوتے تو کہتے کہ

اول اول کی محبت کے نشے یاد تو کر

بے پئیے بھی تیرا چہرہ تھا گلستاں جاناں

10:36 AM

Hillary Clinto, Mehmood Qurshi, امریکہ, پاکستان, زرداری, سارا پالن, محمود قریشی, ہلیری کلنٹن

اقتدار کی جنگ

میں اور میری بیٹی جب بھی غسلخانے کا رخ کرتے ہیں تو میری صاحبزادی بہت اچھلتی کودتی اندر جاتی ہیں۔ نہانے اور پھر اس بہانے پانی بہانے کی خوشی انکے روئیں روئیں سے ٹپکتی ہیں۔ لیکن ہم دونوں کو اندر گئے کچھ ہی لمحے گذرتے ہیں کہ ایک افراتفری اور ہڑبونگ کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ باہر والوں کو یوں لگتا ہے کہ اندر ایک شیر اور ہاتھی کو بند کر دیا گیا ہے۔

ایک دن میری رشتے دار خاتون نے اسکی وجہ پوچھنے کی ہمت کر ڈالی۔ انہوں نے سوچا کہ ویسے تو یہ مارتی پیٹتی  دکھائ نہیں دیتیں لیکن غسلخانے میں ضرور  جا کر دن بھر کے چماٹ رسید کرتی ہونگی۔ آخر مہمانوں کے سامنے بھرم بھی تو رکھنا ہوتا ہے۔

تو انہوں نے اپنے لہجے میں ایک تجاہل عارفانہ پیدا کرتے ہوئے کہا۔ یہ تم دونوں آخر اندر کیا کرتی ہو کہ پورا گھر ہل جاتا ہے۔ میں نے انہیں انتہائ تحمل سے جواب دیا۔ کچھ ایسا خاص نہیں کرتے۔ اقتدار کی جنگ میں اتنا شور شرابہ تو ہوتا ہی ہے۔ ایکدم سنجیدہ ہوئیں اور کہنے لگیں کیا مطلب غسل خانے کے اندر کونسی اقتدار کی جنگ ہو سکتی ہے۔ میں نے  ان سے کہا کہ اگر عقابی روح سینوں میں بیدار ہو تو غسل خانے کے اندر کیا مردہ خانے کے اندر بھی شور شرابہ ہو سکتا ہے۔

کہنے لگیں، چلو اچھا اب باتیں نہ بناءو۔ میں تو بالکل دہل کر رہ جاتی ہوں۔ تم دونوں اندر اتنا چنگھاڑتی ہو۔ آخر غسل خانے میں کس چیز پہ جھگڑا ہوتا ہے۔ میں انکی طرف مڑی اور کہا آپکو یقین نہیں آرہا یہ اقتدار کی جنگ ہوتی ہے۔ جب ہم نہانے کے لئے اندر داخل ہوتے ہیں تو آپکو پتہ ہے سب سے اہم چیز پانی ہوتا ہے۔ وہ اللہ کا شکر ہے کہ ابھی تک وافر مقدار میں دستیاب ہے۔ دوسری اہم چیز اسکا منبع ہے۔ چونکہ لیڈ پوزیشن میری ہے تو ہینڈ شاور میرے ہاتھ میں ہوتا ہے  یہ صورتحال میری صاحبزادی کے حق میں نہیں جاتی کیونکہ اس طرح وہ اسے حسب منشاء استعمال نہیں کر پاتیں۔ وہ اسکے لئے جنگ کرتی ہیں اور میں اسے ہر قیمت پہ اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہوں اس طرح میری رٹ قائم ہوتی ہے۔   اگر ایسا نہ ہو تو پورا ٹینک پانی خرچ ہونے کے بعد ہمارے غسل خانے کی ہر چیز غسل کر لے گی سوائے انکے کیونکہ اس عمل کے دوران انہیں خود نہانے کی فرصت نہیں ملے گی۔ تو یہ اقتدار کی جنگ اس پورے عمل کے دوران چلتی ہے اور پچھلے دو سال چار مہینے سے ایسے ہی چل رہی ہے۔ پہلے میں خود  بھی ساری بھیگ جاتی تھی اب میں نے اپنے بچاءو کے طریقے ڈھونڈھ لئے ہیں۔

ارے تم لوگوں سے تو اب ایک بچہ قابو میں نہیں آتا۔ ہم سے پوچھودس دس بچے پیدا کئے اور اکیلے پالے پوسے-------------------------۔  سوچتی ہوں کہ اگر ماضی کی روایات کو جاری رکھتے ہوئے دو ہینڈ شاور ایکدن اپنی بیٹی کی پیٹھ پہ رسید کر دوں تو معاملہ اسی دن نبٹ ہو جائے گا۔ لیکن یہ تو بادشاہت کے زمانے کا طریقہ ہے۔ کیا جمہوری دور میں ایسا ممکن ہے۔

میں وہاں سے فوراً اٹھتی ہوں، اس سے پہلے کہ میری بیٹی پانی میں شرابور، میرے بستر پہ چڑھ کر اچھل کود مچائیں اور مجھے انکو کپڑے پہانے کے لئیے  بیڈ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک منتیں سماجتیں کرنی پڑیں صورتحال میرے قابو میں رہنی چاہئیے۔ آپکو معلوم ہے اقتدار کی اس جنگ میں وقت کی بھی بڑی اہمیت ہے۔

8:34 AM

Autocracy, Democracy, بادشاہت, جمہوریت, کراچی

نئے افکار انکا حصول اور ترویج-۸

تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل از مسیح میں، آریاءووں کی آمد،ہندوستان کی تہذیب میں نمایاں تبدیلیوں کا باعث بنی۔ اس سے پہلے یہاں دراوڑی تہذیب کا اثر تھا جس نے وادی سندھ میں جنم لیا اور جو دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں شامل ہے۔ آریا وسطی ایشیا سے آئے تھے۔ انکی زبان پہ یورپی زبانوں کا اثر تھا، آریہ بنیادی طور پہ جنگجو تھے، انکے مزاج میں آوارہ خرامی اور اضطراب تھا۔وہ سفید فام تھے اور دراوڑی گہرے رنگ کے۔ آریا اپنے آپکو اور اپنی تہذیب کو  دراوڑوں سے بہتر جانتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے دراوڑوں کو حقارت سے داس کہا جسکا مطلب ہے غلام۔ دی گئ دو تصویروں میں آپ بآسانی اندازہ کر سکتے ہیں کہ کون آریائ نسل سے ہے اور کون دراوڑی نسل سے۔

 اسکے ساتھ ہی ایک طبقاتی تقسیم نے جنم لیا۔ طبقاتی تقسیم اگرچہ آریاءووں کی آمد سے پہلے موجود تھی۔ لیکن نئ پیدا ہونے والی تقسیم خالص نسلی اثرات کے تحفظ کا نتیجہ تھی۔ کیونکہ ساتھ رہنے سے سفید فام آریاءووں کو  سیاہ فام مقامی باشندوں سے اختلاط کا اندیشہ تھا۔۔ چنانچہ مذہبی فرائض کی انجام دہی برہمنوں کو ملی، ملک کی حفاظت کشتریوں کے ہاتھ آئ، عوام ویش کہلائے اور کاروباری امور انکے حوالے ہوئے۔ سب سے نیچ ذات شودر تھے۔ جنکا کام برتر طبقات کی خدمت سر انجام دینا تھا۔ آریاءووں نے اس ساری تقسیم کو اس طرح منظم کیا کہ خود برہمن کا منصب سنبھال لیا اور اس طرح سےمذہبی امور کے ذریعے معاشرے کی رہ نمائ جیسا مضبوط ادارہ انکے پاس آگیا۔۔یہ تقسیم اتنے مضبوط اثرات رکھتی تھی کہ بر صغیر پاک و ہند میں وطن، نسل، ذات، مذہب،  اورپیشے کے لحاظ سے چھوٹی چھوٹی اکائیاں آج بھی موجود ہیں۔

آریاءووں نے اپنی داخلی جذبات کا اطہار اپنشدوں میں کیا۔ رگ وید انکی تصنیف کردہ مذہبی کتاب ہے۔  انہوں نے  فنا و بقا کے تصورات کو اہمیت دی۔ اس میں حقیقت اولی کی وحدت کی بات کی گئ۔ چنانچہ روح کو اہمیت دی گئ اور فرد کو جسم سے بلند ہونے کا سبق دیا گیا۔ یوں صورت حال یہ بنی کہ اعلی سطح پہ آریائ اثرات اور زیریں سطح پہ دراوڑی اثرات سرگرم ہونے لگے۔ اور دو مزاج سامنے آئے۔ آریائ اور دراوڑی مزاج۔

اس عہد کی دو کتابیں جو کہ ہندو دیو مالا میں شامل ہیں رامائن اور مہا بھارت ہیں۔ رامائن میں رام ، سیتا اور راون کے کرداروں سے کہانی بنی گئ۔ اور اس میں ہندو فلسفے کے بنیادی عناصر مثلاً نظریہ ء وحدت اور تیاگ وغیرہ بھی سما گئے۔ رام ایک اعلی ذات سے تعلق رکھنے والافرد ہے اور شمالی ہندوستان میں اسکی حکومت قائم ہے۔ وہ مزاجاً آریہ ہے۔ اسکے بر عکس راون راکشس ہے، برا ہے، اور جنوب سے تعلق رکھتا ہے۔ یوں شمالی ہندوستان آریہ کے مزاج میں آگیا

جبکہ جنوبی ہندوستان میں دراوڑی تہذیب کے آثار آگئے۔ چنانچہ راون کا سیتا کو اغوا کرنا دراصل دراوڑوں کا آریہ سماج کے خلاف ایک رد عمل بھی ہے۔

آریا اپنے ساتھ جو زبان لائے تھے اس نے سنسکرت کو جنم دیا۔ جبکہ دراوڑی زبان کے اثرات جنوب کی زبان میں نظر آتے ہیں جیسے تامل، تیلگو، کناڈا، بروہی، ملیالم زبانیں۔ اس تہذیب سے تعلق رکھنے والے زیادہ تر لوگ پاکستان ، بنگلہ دیش، افغانستان،  ایران  سری لنکا، اور انڈیا میں پائے جاتے ہیں۔

دراوڑی اور آریائ تضاد کا کا نتیجہ برصغیر کے مذہبی تصورات میں بھی تبدیلی لایا۔ دراوڑ کثرت کی طرف مائل تھے اور آریاءووں نے وحدت کی طرف توجہ دلائ۔ دراوڑ اپنی زمین سے جڑے رہنا پسند کرتے تھے جبکہ آریہ آزاد ہونے کے آرزومند تھے۔ چنانچہ برصغیر میں چلنے والی تحریکوں کے پیچھے اس نفسیات نے بھی کام کیا۔

دراوڑی تہذیب نے خود کو اونچی پرواز پر مائل کرنے کے بجائے اپنے اندر سمٹ جانے کی تلقین کی اور سماجی رسوم قیود کا پختہ نظام قائم کیا۔ برصغیر میں برہمنیت کو فروغ انکے اس رد عمل کی وجہ سےبھی  ملا۔

جاری ہے

حوالہ جات؛

اردو ادب کی تحریکیں، مصنف ڈاکٹر انور سدید، انجمن ترقی اردو پاکستان۔

دراوڑی لوگ

برصغیر میں طبقاتی نظام

آریا لوگ

نئے افکار انکا حصول اور ترویج-۷

7:17 AM

Aryans, Dravidians, Indian history, آریا، دراوڑ, انڈیا, انڈیا میں طبقاتی تقسیم, سندھ

مولانا رومی کی شاعری

تمہیں تو پروں کیساتھ پیدا کیا گیا ہے تم کیوں رینگنا چاہتے ہو۔

یہ الفاظ عظیم صوفی شاعر جلال الدین محمد رومی کے ہیں۔ انکا نام صوفی شاعری کے حوالے سے جس بلندی پہ نظر آتا ہے اسکی کوئ مثال نہیں ملتی۔ مثنوی مولانا رومی  اس شاعری کی معراج ہے اور انکے عشق کا اظہار۔ عشق افراد ، اشیاء، مظاہر قوت، معقولات و مجردات کا ہو سکتا ہے اور خدا سے بھی۔ مگر خدا سے عشق کی شدت کو انسان الفاظ میں ادا کرنے سے قاصر ہے۔ اور اس لئیے مجازی اشارے استعمال کرنا پڑ جاتے ہیں۔

رومی کے اوپر کچھ تحاریر سے گذرتے ہوئے خیال ہوا کہ انکی شاعری کے کچھ حصوں میں آپکو بھی شامل کر لیا جائے۔

مولانا چونکہ خیال کرتے ہیں کہ روح انسانی کی اصل خدا ہے۔ اور اس سلسلے میںمرد  وعورت کی کوئ تخصیص نہیں۔ اس وجہ سے اپنے زمانے میں مولانا رومی صوفی ازم کی تاریخ  میں ان معدودے شخصیات میں شامل ہوتے ہیں جنکے مریدوں میں خواتین بھی شامل تھیں۔ مثنوی میں ایک جگہ وہ فرماتے ہیں کہ

Mohammed said,

'women prevails over the wise and intelligent. While the ignorant dominate her'. They lack tenderness and affection because their animality prevail. Love and gentleness are human qualities, aggressiveness and lust are bestical.

 یعنی، محمد صلعم نے کہا کہ عورتیں عقلمند اور ذہین مردوں پہ چھا جاتی ہیں جبکہ جاہل مرد ان پہ حکمرانی کرتے ہیں۔ ان میں شفقت اور محبت کی کمی ہوتی ہے کیونکہ ان میں حیوانیت غالب ہوتی ہے۔ محبت اور شائستگی انسانی خواص ہیں اور جارحیت پسندی اور ہوس حیوانی خواص۔

ایک اور جگہ پہ وہ کہتے ہیں،

Women is a ray of God. She is not earthy beloved. You could say; She is creative, not created

یعنی، عورت خدا کی ایک کرن ہے۔ عورت کوئ زمینی محبوب نہیں ہے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ وہ تخلیق کار ہے تخلیق نہیں۔

vol I, 2433-2437

Mathnavi Jalaluddin Rumi.

Translated by Kabir and Camilla Helminski

Shambhala, Boston and London, 2008.

ایک اور جگہ وہ انسانی ارتقاء کی بات کرتے ہیں۔ انسان نے نہ صرف جسمانی ارتقاء حاصل کیا ہے بلکہ شعوری ارتقاء سے بھی گذرا ہے۔اور حقیقت تک رسائ حاصل کرنے کے لئیے ذہن کا پورا سہارا لیا۔ اور حسیات اور خرد سے حاصل اس معلومات نے کئ متضاد خیالات کو جنم دیا ہے۔ اور تضاد کی صورت ایسی بنتی ہے کہ

کائنات فی الواقع موجود ہے۔ فی الواقع موجود نہیں ہے محض التباس ہے۔ حقیقت غیر متغیر ہے۔ حقیقت تغیر پذیر ہے۔ اشیاء کا تغیر ذہن کی کرشمہ سازی ہے۔ فرد تمام اشیاء کا معیار ہے۔ فطرت انسانی حامل صداقت ہے۔ روح فانی ہے۔ روح غیر فانی ہے۔ کائنات میں تناسخ ارواح  کا سلسلہ جاری ہے۔ خدا ایک ہے۔ خدا بہت سے ہیں۔ خدا ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔

رومی اپنے وجدان کو استعمال کرتے ہیں اور جذبہ ء عشق سے ایک ارتقائ حالت کو اس طرح کھوجتے ہیں۔

از جمادی مُردم و نامی شدم — وز نما مُردم بحیوان سرزدم

مُردم از حیوانی و آدم شدم — پس چه ترسم کی ز مردن کم شدم

حملهء دیگر بمیرم از بشر — تا برآرم از ملایک بال و پر

وز ملک هم بایدم جستن ز جو — کل شییء هالک الاوجهه

بار دیگر از ملک پران شوم — آنچه اندر وهم ناید آن شوم

  پس عدم گردم عدم چو ارغنون — گویدم کانا الیه راجعون

ترجمہ؛

میں پہلے پہل جماد یعنی پتھرتھا پھر فنا ہو کریعنی ترقی کر کے نبات یعنی شجر ہو گیا، پھر فنا ہوا یعنی ترقی کی اور حیوان کی صورت نمودار ہوا۔

اسکے بعد میری حیوانیت بھی فنا ہو گئ یعنی میں نے مزید ترقی کی اور مجھے انسانی صفات عطا ہوئے۔ مجھے فنا ہونے کا خوف نہیں۔ کیونکہ فنا سے مجھ میں کوئ کمی نہیں پیدا ہوتی۔

حیات مادی کے بعد مجھ پر پھر فنا کا حملہ ہوتا ہے۔ میری بشریت یعنی انسانی خصوصیات معدوم ہوتی ہیں اور فرشتوں کی مانند مجھے بال و پر عطا کئے جاتے ہیں

عالم ملکوت سے میں پرواز کر کے ایسے مقام پہ پہنچ جاتا ہوں، جہاں وہم و قیاس کا گذر نہیں ہو سکتا۔

میں آخر میں عدم ہی عدم ہو جاتا ہوں اور ساز کی طرح 'ہمیں اسی کی طرف لوٹنا ہے' میرا ورد ہو جاتا ہے۔

اگرچہ  رومی اس خیال تک اپنے وجدان کی قوت سے پہنچے مگر جدید سائنس میں ایک تحقیق داں اسے اپنے علم اور تفکر  اور مشاہدے کی قوت سے حاصل کرتا ہے تفکر اور مشاہدہ جب اپنی انتہاء پہ پہنچتے ہیں تو وجدان بن جاتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ ڈارون کے ارتقاء کا نظریہ سامنے آتا ہے۔  اس سے ایک بات ہمیں محسوس ہوتی ہے کہ وجدان ہو یا تحقیق ہمیشہ کھلے ذہن پہ ہی اپنا نزول کرتے ہیں۔

 اللہ انکی مغفرت کرے۔  جب ہمیں بال و پر دئے گئے ہیں تو ہم کیوں رینگنا چاہتے ہیں۔

حوالہ جات؛

مثنوی مولانا روم ایک مختصر جائزہ

مثنوی مولانا روم میں خواتین کا تذکرہ

کتاب، تصوف اور سریت، پروفیسر  لطیف اللہ، ادارہء ثقافت اسلامیہ

9:45 PM

Mathnavi, Rumi, ڈارون, مثنوی مولانا رومی, مولانا جلال الدین رومی, نظریہ ء ارتقاء

ٹرن ٹرن

میرا موبائل فون بجے جا رہا ہے۔ اسکی وجہ میرا اتنا بیمار ہونا نہیں ہے کہ میں فون تک نہ اٹھا سکوں۔ اسکی وجہ-----۔ لیکن ٹہریں پہلے میں اس ساری بات کی تفصیلات بتاتی ہوں۔

ابھی دس دن پہلے صبح نو بجے کے قریب فون آیا کہ میں ٹیلی نار کے آفس سے بول رہا ہوں۔ اتنے میں مشعل نے آکر اپنے ایک سنگین مسئلے سے آگاہ کیا کہ وہ لان میں جانا چاہتی ہیں۔ میں نے اقرار میں سر ہلایا کہ وہ جا سکتی ہیں۔ لیکن گرل بند ہے ماما، ساتھ میں ایک چوں چوں۔ میں نے اشارے سے کہا کہ رابعہ سے کہو کھول دے گی۔ ادھر ٹیلی نار والے صاحب نے

جھلائے

ہوئے لہجے میں کہا کہ آپ ذرا بچوں کو ادھر کر دیں آپکو ایک اہم بات بتانی ہے۔ خیر اتنی دیر میں گرل کھلی اور وہ

روانہ ہوئیں۔

حالات ایسے ہوئے کہ اہم امور پہ بات کی جا سکے۔ سو، میں نے ان موصوف سے دریافت فرمایا کہ کیا بات ہے؟ کہنے لگے کہ میں اسلام آباد سے ٹیلی نار کے ہیڈ کواٹر سے بات کر رہا ہوں جی۔ آپکا سم نمبر ہمارے پاس موجود تھا جی اور ہم نے ایک قرعہ اندازی کی تھی، جی، جس میں آپکے نمبر کو پہلا انعام ملا ہے جی۔ یہ دس لاکھ کا انعام ہے ، ہیں جی۔ مجھے اسکی آواز اور انداز گفگتگو سے احساس ہوا کہ کوئ خاصہ کم پڑھا لکھا شخص ہے۔  کسی کمیونیکشن محکمے کا شخص ایسے غیر پیشہ ورانہ انداز میں بات نہیں کریگا جی ۔ یہ تو کوئ فراڈ ہے، ہیں جی۔

میں نے بات ٹآلنے کے لئے کہا 'اچھا تو اب مجھے کیا کرنا ہوگا'۔ جواب ملا۔ آپکو جی، اب میں جیسے ہی نمبر اپکا بند کرونگا جی، تو یہ کرنا ہوگا کے کہ اپنی سم نکال کر اسکا نمبر دیکھیں، ہیں جی۔ پھر انہوں نے مجھے ایک نمبر لکھوایا کہ یہ آپکا نمبر ہوگا۔ آپ کے پاس ہمارا کنٹیکٹ نمبر تو آگیا  ہوگا جی، اسی نمبر پہ پندرہ منٹ کے اندر  فون کر کےسم  نمبر کے صحیح ہونے کی اطلاع دیں، ہیں جی۔ انعام حاصل کرنے کا طریقہ آپکو بتا دیا جائیگا جی۔ یاد رکھیں پندرہ منٹ کے اندر فون کرنا ہے ورنہ پھر آپکو مشکل ہوگی، جی۔

مشکل ہوگی میری بلا سے، میں نے انکے احکامات پہ عمل کرنا وقت کا زیاں سمجھا۔ اور سمجھا کہ ایک چپ ہزار بلا ٹالتی ہے۔ اب دس دن بعد آج پھر ایک فون آیا۔ اوجی میں ٹیلی نار کے آفس سے بات کر رہاہوں، جی۔ اچھا اور میرا کوئ انعام نکل آیا ہے، میں نے ایک کامیاب اندزہ لگایا۔ جی، آپکا پانچ لاکھ کا انعام نکل آیا ہے، جی۔ اچھا تو، مجھے نہیں لینا یہ انعام اپنے پاس رکھیں۔  انکے ارمانوں پہ لٹرز کے حساب سے اوس ڈالتے ہوئے، میں نے بھنا کر لائن کاٹ دی۔ بیس سیکنڈ بعد پھر موبائل فون بجا۔ میں نے سوچا اب اس دفعہ کچھ تفصیلات لے لیتی ہوں شاید اس طرح جان چھٹ جائے۔ لیکن اب یہ کوئ اور صاحب تھے، البتہ نمبر وہی تھا۔ انہوں نے نہایت دلبرانہ انداز میں کہا۔ کیہ حال ایہہ۔، کیا کر رہے ہو آپ۔ آپ کو کس سے بات کرنی ہے یہ بتائیے۔ جی آپ ہی سے بات کرنی ہے، پوچھنا تھا ایسی کیا مصروفیت ہے، جناب۔ اب کیا کہوں الو کے پٹھے، تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں۔ لیکن نہیں الو کے پٹھے کہنا تو غیر مہذب ہونے کی علامت ہے۔ میں اپنے مہذب ہونے کا ثبوت دیتی ہوں اور خاموشی سے لائن کاٹ دیتی ہوں۔ یہ فون اب بھی بج رہا ہے۔ ٹرن ٹرن۔ اسکی وجہ تو آپ جان چکے ہونگے۔

4:53 PM

Tele nor, انعامی لاٹری, ٹیلی نار

جابر بن حیان، الکندی اور نالاں چچا جان

اس کے باوجود دورِ حاضر ميں تھوڑی سی موجود تاریخ کا ہی مطالعہ کيا جائے تو يہ حقيقت عياں ہو جاتی ہے کہ اعلٰی سطح کا پہلا مسلمان فلسفی يعقوب ابن اسحاق الکندی [800ء تا 873ء] نہيں تھے بلکہ ابو موسٰی جابر ابن حيّان تھے جو وسط آٹھويں صدی عيسوی ميں پيدا ہوئے اور 803ء ميں وفات پائی ۔ ان کا فلسفہ جديد علمِ کيمياء کی بنياد بنا ۔ دوسرے نامور فلسفی ابو عبداللہ محمد ابن موسٰی الخوازمی [780ء تا 850ء] ہيں جنہوں نے لوگرتھم اور ايلوگرتھم ۔ الجبراء اور عربی کے ہندسوں کا استعمال کرتے ہوئے اعشاریہ نظام کے نئے علم دريافت کئے ۔ مزيد يہ کہ صفر کو قيمت عطا کی ۔ يہی وہ فلسفہ اور عِلم ہے جو عصرِ حاضر کی کمپيوٹر اور ڈيجيٹل ٹيکنالوجی کی بنياد بنا ۔ اگر يہ علوم نہ ہوتے تو آج نہ کمپيوٹر ہوتا اور نہ ڈيجيٹل ٹيکنالوجی

يعقوب ابن اسحاق الکندی کا نام تيسرے نمبر پر آتا ہے

یہ ہے

اس تحریر

کا کچھ حصہ  جو غالباً میری اس

تحریر

کو غلط ثابت کرنے کے لئیے لکھی گئ ہے۔ جس میں، میں نے کندی کو دنیائے اسلام کا پہلا فلسفی لکھا۔ جذبات کے زور مِں جابر بن حیان کو کندی سے بڑھکر ثابت کرنے میں تین باتوں کا خیال نہیں رکھا گیا۔ اول یہ کہ کسی بھی شخص کے پہلے پیدا ہوجانے کا مطلب یہ نہیں لیا جا سکتا کہ وہی اب ہر چیز میں پہلا کہلائے گا۔  دوسرے یہ کہ دنیا میں دھند میں لپٹی ہوئ جابر بن حیان کی شہرت  بنیادی طور پہ ایک فلاسفر کے نہیں بلکہ کیمیاداں کی حیثیت سے ہے۔ انہیں کیمیاء کی دنیا میں کئے گئے انکی عظیم خدمات کی وجہ سے بابائے کیمیا کہا گیا کیونکہ انہوں نے کیمیا میں تجرباتی سائینس کی بنیاد رکھی۔  یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ کیمیا کا شمار فطری  یا نیچرل سائینس میں ہوتا ہے ۔ تو تیسری بات یہ بنی کہ فلسفہ خالص بنیادوں میں سائینس نہیں ہوتا اور نہ علم ریاضی کہ ریاضی کی مہارت رکھنے والے شخص کو ایک بلند فلسفی تصور کر لیا جائے۔

فلسفے کا بنیادی تعلق

انسان اور کائنات کے مابین رشتے کو انسان کی ماہیت، ذہن اور اسکی استعداد، انسانی اقدار اور انکی وجوہات اور زبان کی ماہیت سے معلوم کرنا ہے۔

  فلسفے کی دنیا میں، یونانی فلسفے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ مسلمانوں نے یونانی فلسفے سے استفادہ حاصل کیا۔ فلسفہ لفظ بھی یونانی زبان سے ہی نکلا ہے۔  ارسطو کو اس میدان میں استاد تسلیم کیا جاتا ہے اور کتاب تاریخ فلاسفۃ الاسلام میں کندی کو  نہ صرف مسلمانوں میں پہلا فلسفی کہا گیا ہے بلکہ وہ پہلے مسلمان  عرب فلسفی ہیں جنہوں نے ارسطو کی تصنیفات پہ شرحیں لکھیں اور وہ پہلے عرب فلسفی ہیں جو اسکی تصنیفات کے شارح ہیں۔ لیکن ہمارے محترم بلاگر نے اس تمام چیز کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بیک جنبش انگلی اس بات کو غلط کہہ دیا کیونکہ انکی خواہش صرف مجھ ناچیز کوغلط کہنے کی ہوتی  ہے اور اپنی اس تسکین میں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جو حوالے میں اپنی تحریروں کیساتھ دیتی ہوں انکی بھی اہمیت ہوتی ہے۔ اب یہ کتاب تاریخ فلاسفۃ الاسلام بس یونہی سی کتاب نہیں جسکا ترجمہ کرنیکی صعوبت ایک پی ایچ ڈی استاد نے اٹھائ۔ لیکن بہر حال زمانہ ء ہذا کے پی ایچ ڈیز کس گنتی میں ہیں۔  محترم بلاگر صرف قرون وسطی کے مسلمان سائینسدانوں کو ہی اس سند کا حقدار سمجھتے ہیں جو اس زمانے کا رواج نہ تھا۔ یا ان لوگوں کو جو نظریاتی طور پہ ان جیسے ہیں جیسے ڈاکٹر عافیہ صدیقی، ایک عظیم پی ایچ ڈی خاتون۔ اگر عافیہ نے یہ کہا ہوتا کہ کندی پہلا عرب فلسفی ہے تو پھر کوئ پریشانی نہ ہوتی، انکا کہا سر آنکھوں پہ۔ لیکن افسوس، وہ اس وقت تاریخ کے زیادہ اہم کام میں مصروف ہیں۔ اور اس طرح کے بے کار کے کام میرے جیسے نا ہنجار لوگ کر کےتاریخ کو ، خاص طور پہ مسلمانوں کی تاریخ کو مسخ کر رہے ہیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ وقت کسی عظیم انسان کا انتظار نہیں کرتا، کہ وہ فارغ ہو توایسے چھوٹے چھوٹے کاموں کو بھی وہی کرے۔

 خیر، اس کتاب  میں سلیمان ابن حسان کا بیان ہے کہ مسلمانوں میں کندی کے سوائے کوئ فلسفی نہ تھآ۔ اس سے مصنف نے یہ مراد لی کہ وہ مسلمان فلسفیوں میں پہلے تھے۔ یاد رہے کہ اس کتاب کے عرب مصنف ہمارے ان بلاگر ساتھی سے زیادہ استعداد اور مہارت رکھتے ہیں اس میدان میں اس لئیے انہوں نے اس پہ کتاب کو لکھنے کی جراءت کی اورانکی اس جراءت کی افادیت کو دیکھتے ہوئے اسکا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا۔

اسی کتاب کے مطابق، ارسطو کا شارح ہونے کی حیثیت سے کندی کو شرف تقدم حاصل ہے۔ کندی کی تالیفات مختلف علوم مثلاً فلسفہ، علم، سیاسیات، اخلاق، ارثما طیقی، علم کرویات، موسیقی، فلکیات، جغرافیہ، ہندسہ، نظام الکون، نجوم، طب، نفسیات العادیات پہ مشتمل ہے۔ مزید حوالہ جات حاضر ہیں جن میں کندی کی پہلے عرب فلسفی کی حیثیت کو واضح کیا گیا ہے۔ اور انہیں بابائے عرب فلاسفی بھی کہا گیا ہے۔

http://www.amazon.com/Kindi-Philosophy-Ninth-century-Calligrapher-Philosophers/dp/140420511X

http://plato.stanford.edu/entries/al-kindi/

اس کتاب  تاریخ فلاسفۃ الاسلام میں جن اہم مسلمان فلسفیوں کا تذکرہ کیا گا ہے وہ مصنف کے نزدیک وہ نہیں جو ہمارے محترم بلاگر سمجھتے ہیں۔ اس میں ان عرب عالم کی ان علماء سے ذاتی بغض یا انکی کم علمی شامل ہوگی۔ جسے میں نے مستند جان کر اخذ کیا۔ یہ میری سب سے بڑی غلطی تھی کہ میں نے اپنے محترم بلاگر سے اس تحریر کو اپنے بلاگ پہ ڈالنے سے پہلے انکی مستند  رائے نہ لی۔

اگر میں نے یہ لکھا کہ امام غزالی کے بعد زوال کا دور شروع ہوا تو یہ میری ذاتی رائے نہیں ہے۔ اس پہ مجھ سے پہلے اس میدان کے ماہرین نے یہ رائے دی کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ امام غزالی تھے جنہوں نے اجتہاد کا دروازہ بند کر کے تقلید پسندی کو رواج دیا۔ کوئ بھی تحریک یا نظریہ اچانک ہی زوال پذیر نہیں ہو جاتا ایسے ہی جیسے عروج اچانک حاصل نہیں ہوجاتا۔ امام غزالی نے اسلامی فکر پہ سے یونانی فلسفے کی چھاپ کو ختم کرنے کی کوشش کی اور فلسفے کو ناپسندیدہ بنا دیا۔ انکے مقلدین نے اس طرز کو جاری رکھا۔ ہر نظرئے کے اثرات کچھ عرصے بعد ہی سامنے آتے ہیں۔ ابن رشد نے انکی اس انتہا پسندی کی رد میں لکھا۔ لیکن بہر حال مختلف وجوہ کی بناء پہ ابن رشد کی کتابیں اس طرف نہیں بلکہ مغرب میں پہنچیں۔ امام غزالی کا اثر چلتا رہا اس دوران سائینس یعنی تجرباتی سائینس پہ لوگوں نے اپنے تئیں کام کیا لیکن یہ  اس رو کا اثر تھا جو ایک دفعہ شروع ہوئ تو حالات ناسازگار ہونے پہ بھی اپنے ثمرات دیتی رہی۔ ابن رشد کے تقریباً سو سال بعد ابن خلدون نے تاریخ کے سفر سے فلسفے کی طرف قدم رکھا اور فلسفہ ء تاریخ وجود میں آیا۔ یہ اس زمانے کے لحاظ سے ایک نئ سوچ تھی اس لئیے ابن خلدون کو زوال کے زمانے کا فلسفی کہا گیا۔ اور میرے محترم بلاگر ساتھی  یہ بھول گئے کہ یہ  بھی میری ذاتی رائے نہیں تھی بلکہ یہ نہ صرف تاریخ فلاسفۃ السلام کے عرب مصنف کا خیال ہے بلکہ ڈاکٹر انور سدید صاحب بھی اسی خیال کی تائید کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے فاضل ساتھی کو تو پی ایچ ڈیز پسند نہیں تو اب ڈاکٹر انور سدید کا کیا کریں۔

 یہ کہنا کہ مسلمان سائینسدانوں نے یہ کیا اور وہ کیا۔ میں نے اپنی ان تحریروں میں یہی کہنے کی کوشش کی ہے کہ علم کسی کی جاگیر نہیں ہوتا اسی کا ہوتا ہے جو اسے حاصل کرتا ہے۔ مسلمانوں نے کسی وحی یا کرامت کے ذریعے یہ علم حاصل نہیں کیا تھا بلکہ اس وقت تمام اقوام عالم کے پاس جو بھی علم تھا پہلے اسے حاصل کیا اور پھر اس پہ کام شروع کیا۔ جیسےریاضی کا صفر ہندوءوں سے لیا گیا تھا۔

کاغذ، چینیوں نے تیار کیا تھآ، عرب پہنچا تو عربوں نے اسے بنانے کا طریقہ آسان کیا اور کوالٹی بہتر کی، گن پاءوڈر، چینیوں کی ایجاد ہے جسے مزید ترقی اور پھیلاءو عربوں کی وجہ سے ہوا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو چین، اپنے علمی ذخیرے کی بنیاد پہ دنیا کی سب سے قدیم تہذیبوں میں ہوگا۔

 فاضل مصنف نے

ایک جگہ

لکھا کہ بہادری اپنی غلطی تسلیم کرنے میں ہے کیا مجھے توقع رکھنی چاہئیے کہ وہ اس بہادری کا مظاہرہ کریں گے۔

 یہ تمام معلومات ان لوگوں کے لئیے ہیں جنکے ذہن مِں اس سلسلے میں شبہات پیدا کئیے گئے۔ باقی یہ کہ جو حوالے میں اپنی تحریروں کیساتھ دیتی ہوں اگر پڑھنے والے ان پہ سے ایک نظر گذر جائیں تو حقائق زیادہ واضح ہو جائیں گے۔ کیونکہ بلاگ جیسی محدود جگہ پہ بہت زیادہ تفصیل سے بات ممکن نہیں۔

حوالہ جات؛

جابر بن حیان

11:25 AM

ابن رشد، Averrose, اردو ادب کی تحریکیں, تاریخ فلاسفۃ الاسلام, ڈاکٹر انور سدید, کندی، جابر بن حیان, محمد جمعہ لطفی

سرینگر ، کشمیر سے ایک تحریر

امتیاز خان کا تعارف مجھے ان تحریروں سے حاصل ہوا جو انہوں نے مجھے ازراہ مہربانی ای میل کیں۔ انکی سرگرمیاں دلچسپ ہیں کیونکہ وہ رپورٹنگ اور اسکے میڈیا کے لئے کام کرتے رہے ہیں۔  انکی یہ تحریر مجھے خاصی دلچسپ لگی۔ اگرچہ اسکے کچھ حصوں سے مجھے اختلاف ہے بہت سارے سوالات ہیں۔  آپ میں سے بیشتر علم رکھتے ہونگے کہ خواتین کو لاحق مسائل میری دلچسپی کا زیادہ عنصر ہیں۔ اس لئےآج میرے بلاگ پہ امتیاز خان کو پڑھیں۔ انکے سلسلے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لئیے دئے گئے لنک پہ جائیے۔

کشمیری لڑکی غیر روایتی میدانوں کی تلاش میں

فردوسہ(نام تبدیل کیا گیا ) سرینگر میں ایک دکان پہ بطور سیلز گرل کام کرتی ہے۔اس نے اپنے لیے یہ کام کیوں چن لیا‘اس سوال کے جواب میں وہ کہتی ہیں”میں یہ کام شوق سے نہیں کرتی ہوں۔میں بارہویں جماعت میں پڑھتی تھی لیکن حالات ہی ایسے پیدا ہوگئے کہ مجھے پڑھائی کو خیرباد کہنا پڑا۔باپ کی معمولی پنشن سے گھر کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتی ہیں اور میرا کوئی بھائی نہیں ہے ،چار چھوٹی چھوٹی بہنیں ہیں جن کی تعلیم جاری رکھنے کیلئے میں پچھلے دس سال سے یہ کام کررہی ہوں“۔اسی طرح18 سالہ شنو بھی ایک دکان پر سیلز گرل کے طور پر تعینات ہے ۔شنو نے اپنے ایک الگ انداز میں کہا”بھائی یہ کوئی سیر سپاٹا نہیں ہے۔اگر عزت محفوظ ہے تب کام کرنے میں حرج ہی کیاہے“۔

وادی میں بڑھتی ہوئی بیروزگاری کے نتیجے میں نوجوان لڑکیوں نے روزگار کمانے کیلئے مختلف نوعیت کے ایسے غیرروایتی کام کرنا شروع کئے ہیں جو ابھی تک مردوں کے لیے مخصوص سمجھے جاتے رہے ہیں۔ وادی میں بے روزگار نوجوانوں کی تعداد دن بہ دن بڑھ رہی ہے اور اس وقت اندازے کے مطابق پوسٹ گریجویٹ،گریجویٹ،میٹرک پاس،تربیت یافتہ انجینئر اور دیگر شعبہ جات میںتربیت حاصل کرنے کے بعد تین لاکھ کے قریب بے روزگار افراد روزگار کے متلاشی ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں نوجوان عمر کی حدیں پار بھی کرگئے ہیں ۔اِن تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ بے روزگاروں میں ہزاروں لڑکیاں بھی شامل ہیں۔

وادی میں ایسی سینکڑوں بے روزگار پڑھی لکھی لڑکیاں ہیں جو اپنے گھروں میں والدین کا واحد سہارا ہیں ۔معاشی اور معاشرتی مجبوریوں کے سبب یہ لڑ کیاں روز گار کے حصول کے لیے نئی راہوں کی تلاش میں چل پڑی ہیں۔سرینگر کے ایک پٹرول پمپ پہ ایسی ہی کچھ لڑکیاں اب گاڑیوں میں پٹرول اور ڈیزل ڈالنے سے لیکر روپے وصول کرنے اور حساب وکتاب رکھنے کے جیسے کام پر مامور ہیں، حالانکہ اس سے قبل وادی میں کبھی بھی خواتین پٹرول پمپوں پہ کام نہیں کرتی تھیں۔

کشمیر یونیورسٹی سے فارغ اردو کی ایک طالبہ عاصمہ اس ضمن میں کہتی ہیں” حکومت کے پاس نوجوانوں کی معاشی بحالی کے لیے کوئی پروگرام نہیں ہے۔اگر ملازمتیں نہیں ہیں تو صنعت اور تجارت بھی کہاں ہے؟یہی حالات لڑکیوں کو غیر روایتی میدونوں کی طرف دھکیل رہے ہیں“۔

یہ حالات کیوں کر پیدا ہوئے ‘یہی سوال ہم نے ماہرِ سماجیات ڈاکٹر خورشیدالاسلام سے پوچھا تو انہوں نے کہا ”مغربی افکار اورمیڈیا کے زیرِ اثر ہماری نئی پوداور خصوصاًخواتین کی سوچ ناقابلِ یقین حد تک متاثر ہورہی ہے،سماجی اور تہذیبی اقدارتبدیل ہورہی ہیں،مادیت رگ رگ میں سرایت کررہی ہے،اور مادی دوڑ نوجوانوں کو کچھ بھی کرنے پر اُکسارہی ہے“۔ایک مقامی صحافی اور تجزیہ نگار اشفاق ملک اسی تناظر میں کہتے ہیں ”جدید طرز معاشرت،اور معاشی مجبوریاں آگے چل کر بنت حوا کو کہاں کہاں لے چلیں گی،شاید آج کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا،لیکن عورتوں کی نسوانیت اور نسوانی تقاضوں کو ملحوظ اور محفوظ رکھنے کے لیے معاشرے پر بھی کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں،جن کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا جا رہا ہے ۔ لڑکیاں معاشی اور سماجی مجبوریوں کے باعث ان غیر روایتی میدانوں میں قدم رکھنے پر مجبور ہیں۔سماج اپنے کمزور طبقوں کی حالت زار سے لاتعلق ہے،لیکن جب کوئی مجبور لڑکی اس طرح کا کام کرکے اپنی اور اپنے لواحقین کی روزی روٹی کا انتظام کرتی ہے تو سماج تلملا اٹھتا ہے‘جسکا کوئی جواز نہیں ہے“۔

لیکن کیا غیر روایتی میدانوں میں لڑکیوں کی موجودگی کو یہ معاشرہ برداشت کرے گا‘ اس بارے میں ایک مقامی کالج کی خاتون پروفیسر نے کہا”برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ابتدا میں تحفظات ہوتے ہیں،لیکن آہستہ آہستہ یہ تحفظات دور ہو جاتے ہیں۔شروع شروع میں تو لڑکیوں کی تعلیم پر بھی کچھ لوگ اعتراض کرتے تھے۔آج ایسی کوئی بات نہیں ہے“۔

حوالہ؛

امتیاز خان اور انکی تحریر

7:30 AM

economical problems of women, kashmir, kashmiri women, خواتین اور انکی ملازمت کے مسائل, کشمیری خواتین

اختلاف نظر

اس اتوار کو 'ڈان' اخبار میں دو ملتے جلتے مضامین آئے۔ ملتے جلتے اس لئے کہ دونوں میں پاکستانی سیاست کے رجحانات پہ ایک جیسے حوالے سے بات کی گئ ہے۔

 پہلا مضمون ھما یوسف نے لکھا ہے جو کہ ایڈیٹوریل صفحے پہ موجود ہے۔ جہاں ایک طرف انکا کہنا ہے کہ پاکستانی قوم کو شدت سے ایک ہیرو کی ضروورت ہے وہاں انہوں نے بلوچستان کی مائ جوری کی مثال دیتے ہوئے انہیں پاکستانی سیاست مین تبدیلی کی نشانی قرار دیا ،  انکا کہنا ہے کہ پاکستانی سیاست میں اب یہ تبدیلی آرہی ہے کہ لوگ مسائل کو لیکر چلنے والی سیاست کی طرف جا رہے ہیں۔

 اس سلسلے میں مجھے اس وقت مایوسی ہوئ جب انہوں نے مسلم  لیگ نون، جماعت اسلامی اور عمران خان کی سیاست کو مسائل کو سامنے والی سیاست میں شامل کیا۔ دوسری طرف انہیں لگا کہ ایم کیو ایم نے پچھلے چند مہینوں میں یہی پالسی اپنائ ہے اور اسکا ثبوت یہ ہے کہ سندھ کے شہری علاقون سے ایم کیو ایم ملک کے دہگر حصوں کی طرف متوجہ ہوئ ہے۔

مسلم لیگ نون، جماعت اسلامی اور تحریک انصاف انکے کریڈٹ پہ عدلیہ کی جنگ ڈال دینا اور اسے ایشو بیسڈ سیاست کی طرف جانیوالا قدم قرار دینا کہاں تک صحیح ہے۔ اس طرح تو بھٹو کے دور میں اسلامی حکومت کا نفاذ اس وقت کی حزب اختلاف کا نعرہ بن گیا تھا جو جنرل ضیا الحق کی حکومت کی شکل میں منتج ہوا۔ اگر اسے معیار بنا لیا جائے تو تو پاکستان میں ہمیشہ ایشو بیسڈ سیاست ہوئ ہے یہ الگ بات کہ یہ وہ ایشوز ہوتے ہیں جو ان سیاسی جماعتوں کو وقتی طور پہ سہارا دے رہے ہوتے ہیں۔

جہاں تک ایم کیو ایم کی پالیسی تبدیلی کا تعلق ہے ایم کیو ایم اسکی کوششیں پچھلے کافی سالوں سے کر رہی ہے۔ اور وہ اس سلسلے میں مختلف مواقع پہ کام کرتے رہے ہیں یہ دراصل پچھلے چند مہینوں کا کام نہیں ہے اسی وجہ سے سے کئ سال پہلے ایم کیو ایم نے اپنا نام مہاجر قومی مومنٹ کے بجائے متحدہ قومی مومنٹ رکھ لیا تھا۔

انکی ایک بات سے ہر پاکستانی اتفاق کریگا کہ فاٹا کہ علاقے میں سیاسی لیڈران کو کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنے روائتی نظام سے نکل کر قومی دھارے میں آ سکیں اور اسکے لئے وہاں تعلیم، صحت اور انفرا اسٹرکچر پہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔

دوسرا مضمون ندیم ایف پراچہ کا ہے جس میں انہوں نے پنڈی کے حلقہ پچپن کے نتائج سے اس روئیے کو اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔  ان میں حصہ لینے والی سیاسی جماعتوں میں، مسلم لیگ نون اور شیخ رشید کی عوامی لیگ دونوں ہی دائیں بازو کی جماعتیں ہیں۔ انکے مقابل جماعت اسلامی اور تحریک انصاف وہ جماعتیں ہیں جو امریکہ کے اور دہشت گردوں کے خلاف آپریشن کے خلاف اور مشتبہ غیر ملکی سیکیوریٹی ایجنسیز کے افراد کی پاکستان کی موجودگی کے خلاف آواز اٹھاتی رہی ہیں۔ پیپلز پارٹی نے ان الیکشنز میں سیاسی وجوہات کی بناء پہ حصہ نہیں لیا۔

 ان الیکشنز میں جماعت اسلامی اور تحریک انصاف دونوں کو شکست ہوئ۔ پراچہ صاحب کے خیال میں جماعت اسلامی اپنے طور پہ کبھی بھی دو سے تین فی صد سے زیادہ ووٹ حاصل نہیں کر سکی۔ انکی پالیسی مجموعہ ہے اسلامی راسخ العقیدہ نظریات، امریکہ کے خلاف ہونا اور طالبان کا حامی ہونا۔

 انکے کہنے کے مطابق اگرچہ پاکستانی ووٹرز کے نزدیک  جماعتوں کے نظریات اہمیت رکھتے ہیں لیکن یہ بات با بار مشاہدے میں آچکی ہے کہ وہ ایسے امیدوار چاہتے ہیں جو بے روزگاری، جرائم، ہنگامہ آرائ اور ملکی ترقی جیسے معاملات کو حل کرنے کی طرف بھی توجہ دینا چاہتے ہیں۔

انکے خیال میں وہ جماعتیں جو اس طرف توجہ دے رہی ہیں وہ پیپلز پارٹی، مسلم لیگ نون، ایم کیو ایم اور اے این پی ہیں۔

جبکہ جماعت اسلامی اور تحریک انصاف اس سلسلے میں ناکام رہی ہیں۔

ایک مزے کی بات جو پراچہ صاحب کہتے ہیں  وہ یہ کہ ایک سیاستدانوں کی کرپشن، عدلیہ کی آزادی اور طالبان کے خلاف جاری جنگ پہ ٹی وی کے اینکر پرسن زیادہ اچھی طرح بول سکتے ہیں مگر کیا وہ ان بنیادوں پہ الیکشن جیت سکتے ہیں۔

 دیکھا آپ نے دو مختلف افراد ایک ہی موضوع پہ بات کرتے ہیں مگر ایک کو جو جماعت ایک چیز کرتی نظر آرہی ہے دوسرے کو وہی جماعت وہی چیز کرتی نہیں نظر آ رہی۔

تمہی کچھ بتلاءو اسکو کیا کہتے ہیں؟

 حوالہ؛

ھما یوسف کا مضمون

ندیم ایف پراچہ کا مضمون

12:08 PM

ایم کیو ایم, پاکستان، جماعت اسلامی، تحریک انصاف, پیپلز پارٹی, مسلم لیگ نون, ندیم ایف پراچہ, ھما یوسف

نئے افکار انکا حصول اور ترویج-۷

اسلام کی ابتدا سے اسکے موجودہ زوال تک ایک رو جو ہمیشہ جاری رہی اور جس نے عمل اور رد عمل کی تحریکوں کو یکساں متائثر کیا وہ تصوف کی رو تھی۔ نویں صدی عیسوی سے قبل تصوف محض ایک ذہنی  رویہ تھا۔ جو ظاہری شان و شکوہ، مادی آسودگی اور ظاہری  جاہ و جلال کے خلاف پیدا ہوا۔  اسکے بعد تصوف نے باقاعدہ ما بعد الطبیعیات مرتب کر لی ایک منظم خانقاہی نظام کو فروغ دیا اور ایک فعال تحریک کی صورت میں اسلام کی عظیم تحریک پر اثر انداز ہونے لگی۔ معتزلہ اور امام غزالی کے فلسفے کی بحث نے زندگی کے بہت سے شعبوں کو متاثر کیا۔ اور تصوف کی تحریک دو دبستانوں میں تقسیم ہو گئ۔ ایک تصوف کو شریعت کے تحت رکھنا چاہتا تھا اور دوسرا طریقت کو افضل قرار دیکر قلندری طریق رائج کرنے کا دعویدار.

 پہلا طبقہ مذہبی رسوم میں راسخ الاعتقاد اور موخر الذکر آزادی فکر اور آزادہ عمل تھا۔ قرون وسطی کے شعراء ، ادباء اور فلسفی مثلاً عمر خیام، المعری، فارابی اور ابن سینا وغیرہ جو عجمی روایت سے زیادہ متائثر تھے دوسرے دبستان سے تعلق رکھتے تھے۔

تصوف کی تحریک، فکر کے مقابلے میں باطنی وجدان اور روحانی احساس کی تحریک تھی۔ تتاہم اسکے ماخذات قرآن و سنت میں بھی تلاش کئے گئے۔ چونکہ احکام خداوندی ایک ان دیکھے وسیلے سے نازل ہوئے تھے اس لئے صوفیاء نے رسول اللہ کو بھی صوفی قرار دیا۔ اسلام کے ابتدائ دور میں قرآن پاک کی تلاوت تسلسل سے کی جاتی تھی اور بار بار دہرانے کے نتیجے میں انکے معنی کشف کے ذریعے واضح ہوجاتے تھے۔  لوگ اس کشف سے اپنے اعمال اور افعال کو صحیح کرتے تھے یہ اہل کشف کہلائے جانے لگے۔ کچھ عرصے بعد قرب خداوندی اور تعمیل احکام کے لئے ذکر، فقر اور توکل کے نظریات بھی تصوف میں شامل ہوگئے۔

نو افلاطونی نظریات نے دنیا سے نفرت پیدا کی چنانچہ ترک خواہش کو بھی تصوف میں جگہ دے دی گئ۔ اور نتیجتاً تصوف کی رسوم مذہبی فرائض پہ فوقیت پانے لگیں اور مرشد کی ذات قرب خداوندی کا وسیلہ بن گئ۔

تصوف کے اس روئے کے خلاف راسخ العتقاد حلقے میں رد عمل ظاہر ہوا اور منصور حلاج کو چند غیر محتاط جملوں  کے ادا کرنے پر دار پہ لتکا دیا گیا۔

دسویں صدی میں تصوف پہ شیعیت کے اثرات آ گئے اور نظریہ ء وحدت الوجود پہ وحدت الشہود کو فوقیت ملنے لگی۔ ایک دفعہ پھر صوفی تقسیم ہوئے اور ان میں سے جنیدی، محاسبی اور ملامتی فرقے زیادہ معروف ہوئے۔ بات آگے چلی اور ابو سعید نے فنا اور بقا کی توضیح تصوف کے نکتے سے کی اور اس طرح انتہا پسند صوفیاء منظر عام پہ آگئے۔ جنہوں نے حلول، امتزاج اور نسخ ارواح کے عقائد کو جزو ایمان بنا دیا۔ اور تصوف کی آزاد روی، قید اور پابند ہو گئ۔

راسخ العقیدہ علماء نے جنہیں حکومت وقت کی اعانت حاصل تھی اسلام کی سادگی کو قید کرنے کی کوشش کی اور شخصی حکومت کو جاہ و حشم کی نمائش کا وسیلہ بنا دیا۔ تصوف کی تحریک نے اسکے خلاف رد عمل کا اظہار کیا اور بندہ ء آقا کے درمیان حائل پردوں کو ہتا کر براہ راست قرب الہی  حاصل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ تصوف میں ریاضت نے مذہب کی جگہ لینا شروع کی۔ محبت خالص جزبہ قرار پایا، رقص و نغمات عبادت کا درجہ پا گئے۔ مطرب و ساقی، ہجر وصال، عشق و عاشقی وغیرہ مشاہدہ ء حق کی اصطلاح بن گئیں۔ اس طرح تصوف میں حرکت و عمل کم اور غنودگی و خود فراموشی کی کیفیت زیادہ تھی۔ چنانچہ مشرقی ممالک میں جہاں فنا اور بقا کے تصورات بدھ، جین اور ہندو مذہب کے زیر اثر پہلے سے موجود تھے تصوف کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئ اور عقلیت کی تحریک جو جذبے کی ماہیت کو بھی تحلیل و تجزیہ سے معلوم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ مغرب میں زیادہ پھیلی۔

نوٹ؛ اس سلسلے کی تمام تحریریں، میری ذاتی فکر کا نتیجہ نہیں ہیں۔ان تمام افکار کو میں نے مختلف کتابوں سے اخذ کر کے ایک ترتیب میں، ایک نئے موضوع کے تحت  رکھنے کی کوشش کی۔ سو،  اس سلسلے میں میرے علم کو چیلینج کرنے کے بجائے انہیں ہمارے دانشوروں کی فکر سے منسوب کرنا چاہئیے۔

جاری ہے

حوالہ؛

یہ تحریر کلیتاً ڈاکٹر انور سدید کی کتاب 'اردو ادب کی تحریکیں' سے اخذ کی گئ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب انکا پی ایچ ڈی کا تھیسس ہے۔ انکی عمر اس وقت اسی سال سے زائد ہے اور وہ اس وقت لاہور میں رہائش پذیر ہیں۔

نئے افکار انکا حصول اور ترویج-۶

9:59 AM

Sufism in Islam, تصوف، جنوبی ایشیا میں تصوف کا پھیلاءو، وحدت الوجود، وحدت الشہود۔

ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

بہانہ بنانا آنا ایک خدا داد صلاحیت ہی نہیں اسکا تعلق ضرورت سے بھی ہے۔ ورنہ ایسا کیوں ہوتا کہ شوہر بیوی سے، شاگرد استاد سے، عاشق معشوق سے ، حزب اقتدار حزب اختلاف سے زیادہ اچھے بہانے بناتی ہے۔

جو لوگ محنت کرنے کے عادی ہوتے ہیں وہ بہانوں پہ بھی بڑی محنت کرتے ہیں۔ غالب کو دیکھئیے بہانے سے ملاقات کے لئے مصوری تک سیکھنے کو تیار تھے

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئیے ہم مصوری

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئیے۔

زمانے کے چلن بدلے گئے۔ لا حول ولا قوت۔ مصوری جائز نہیں کہہ کر ایک بہانہ حاصل کیا اور دوسرا بہانہ کیا بناتے سر پہ ٹوپی جمائ اور دست دعا دراز کیا

خدا کرے کہ حسینوں کے نانا مر جائیں

بہانہ موت کا ہو ہم بھی انکے گھر جائیں

جنہیں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے سے بھی کاہلی آتی ہے انکے لئے اہل کفار نے جگہ جگہ اپنے فرنچائز ریسٹورنٹس کھول دئیے  ہیں۔ کے ایف سی کی ڈیل، تین گھنٹے تک ایک ٹیبل پہ بیٹھ کر باتیں بنانے کے لئے، تین سو روپے میں سودا برا نہیں۔ لیکن اس قدر بھیڑ میں ہوتی ہے ملاقات کہاں۔ اوپر سے اکثر محبوب کو اپنی گلی سے نکلنے کے لئیے کوئ ساتھی بھی چاہئیے ہوتا ہے۔ یوں روز ملتے ہیں مگر بات نہیں ہوتی ہے۔  ایسی ہی خواہشوں کے لئیے کہا گیا کہ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دُم نکلے۔ لیکن جب ڈارون کا نظریہ ء ارتقا پڑھا تو دل چاہا کہ صفحہ ء ہستی سے اسکا نام ہی مٹادیں۔ بد بخت کہتا ہے کہ پہلے دم تھی آہستہ آہستہ غائب ہو گئ۔ جبکہ ہم کہتے ہیں کہ پہلے نہیں تھی خواہشوں کے اسیر ہوئے تو ہو گئ۔  اور عالم یہ ہوا کہ

ہزاروں لڑکیاں ایسی کہ ہر لڑکی پہ دُم نکلے

مگر خدا بھلا کرے ہمارے یہاں دُمیں عام نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جس لڑکی پہ دُم نکلے وہ اپنے گھر سے کم نکلے۔ دم کے نقصان تو کچھ  اتنے زیادہ نہیں جب بھی دیکھے فائدے ہی دیکھے لیکن ایک تو اسے اسمارٹ رکھنے کے لئیے، ہمہ وقت ہلانا پڑتا ہے کیونکہ قدرت نے اسے رکھنے کے لئے دماغ کی طرح ایک کاسہ نہیں دیا جہاں وہ محفوظ رہ سکے۔  اور دوسرے یہ کہ جب کبھی بھاگنے کا ارادہ کریں تو اسےساتھ  دبا کر بھاگنا پڑتا ہے۔ پھر یہ کہ دم ہو تو چھلہ بھی ضرور ہوتا ہے۔ یوں  جو کام رستم سے نہ ہوا وہ آپ کر بھی ڈالیں یعنی انکے آنگن میں دھم سے کود بھی جائیں تو بعد کے حالات سے نبٹنے کے ساتھ ساتھ اسکی فکر بھی کرنی پڑ جاتی ہے۔

یوں محبت میں صوفیت کے قائل احباب اب اپنے آگے بالٹی بھر پانی لیکر بیٹھے رہتے ہیں

بالٹی کے پانی میں تیرا عکس دیکھتے ہیں

پھر اسکو ہلا کر تیرا رقص دیکھتے ہیں۔

دیکھا آپ نے رند رند کے رہے ہاتھ سے جنت بھی نہ گئ۔ لوگ سمجھتے ہیں وضو کی تیاری ہے یہ نہیں معلوم کہ عشق کی بیماری ہے۔ لیکن ہوا یوں کہ پہلے تو پانی کی کمی کا رونا تھا مگر بروز ابر مل بھی جاتا تو مہنگائ اتنی کہ بالٹی ہی نہ رہی۔ بس ادھر ادھر پھسلنے کے بہانے بنتے رہتے۔

بھلا ہو کمیونیکشن میں تیز رفتار ترقی کا، اب اپنوں سے بات ساری ساری رات۔ پہلے تکیوں کے نیچے

تصویر یار یا حسینوں کے خطوط ملتے تھے۔ اب موبائل فون ہوتا ہے۔ وہ بھی وائبریشن موڈ میں۔ اور ہلکی سی تھر تھراہٹ پہ بھی گماں ہوتا ہے کہ یہ پڑوسیوں کے خراٹے ہیں، پنکھے کی ہوا سے اڑنے والا کیلینڈر ہے کہ وہ ہیں۔ نہ میں عشق کے خلاف ہوں، نہ بہانوں کے اور نہ موبائل فون کے بس جھک کے دیکھتا ہوں جوانی کدھر گئ۔

6:39 PM

Ghalib, تصوف, غالب, موبائل فون

رقیب سے

بارے کچھ اپنی تعلیمی قابلیت کا تذکرہ ہو جائے کہ اس سے اردو بلاگنگ کی دنیا میں کچھ لوگوں کو 'کچھ کچھ' ہوتا ہے۔ اور عالم یہ ہو گیا ہے کہ

ذکر میری پی ایچ ڈی کا، اور پھر بیاں انکا

بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

تو ان سب رقیبوں کو نئے راستے دیتی ہوں۔ دل کے بہلانے کو کچھ نہ کچھ تبدیلی لاتے رہنا چاہئیے کہ یہ دل مانگے مور۔  اسکی وجہ یہ ہے کہ سب کے پاس جو اطلاعات ہیں وہ خاصی ادھوری ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ لوگ میری پی ایچ ڈی کو اپنے لئیے ایک تازیانہ سمجھتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ کارنامہ میں نے بلاگنگ کی دنیا میں آنے سے پہلے کیا تھآ اس لئے اس میں میرا قصور اتنا نہیں جتنا کہ لوگوں کی نیت میں فتور ہے۔

میں نے بیچلرز آنرز، کراچی یونیورسٹی سے کیا اور پھر وہیں سے نامیاتی کیمیاء میں ماسٹرز کیا۔ اور ابھی ہمارے ماسٹرز کا آخری سمسٹر ختم بھی نہ ہوا تھآ کہ یونیورسٹی میں واقع تھرڈ ورلڈ کے سینٹر آف ایکسیلینس کے اینٹرنس ٹیسٹ اور انٹرویو میں جا پہنچے۔ خدا کا کرنا یوں ہوا کہ دونوں مرحلوں سے بخیر و عافیت گذر گئے۔ اور بس ماسٹرز کے آخری پیپر کے بعد تمام تر مخالفتوں اور نا مساعد زمینی حالات  کے باجود ریسرچ شروع کر دی۔

پی ایچ ڈی کا مطلب ہے ڈاکٹر آف فلاسفی۔ اگر آپ اسکی تمام شرائط کو پورا کریں تو یہ محض ایک کاغذ کی ڈگری نہیں ہوتی بلکہ یہ آپکے روئیے، نظریات اور زندگی کی طرف دیکھنے کی صلاحیتوں میں واضح تبدیلیاں لے آتی ہے۔ اگر میں ماسٹرز کرنے کے بعد اس راہ پہ قدم نہ رکھتی تو آج کی نسبت بہت مختلف ہوتی۔ اسکی وجہ ریسرچ کے مطالبات ہیں۔۔

 چونکہ دراصل پی ایچ ڈی فلسفے کی طرف لیجاتی ہے جو اپنے ارد گرد کی دنیا کو عقل کی عینک سے دیکھنے کا نام ہے۔ اسکا بنیادی مقصد کسی انسان میں آزاد سوچ کو پیدا کرنا ہوتا ہے۔ ماسٹرز تک کی سطح پہ ہم ایک کورس پہ عمل کرتے ہیں اسی میں سے ہمارا امتحان ہوتا ہے۔ لیکن پی ایچ ڈی کی سطح پہ اس بات کی تربیت ہوتی ہے کہ ہم اپنے طور پہ مسائل پہ قابو پانے اور انکے حل کی طرف اپنی صلاحیتیں خود سے استعمال کرنے کے قابل ہوں اور اس سے بھی ایک قدم آگے کہ ہم مسائل کے پیدا ہونے سے قبل یہ کامیاب اندازہ لگانے کے قابل ہو جائیں کہ آنیوالے مسائل یہ ہونگے۔ انگریزی میں اسے ویژن کا پیدا ہونا کہتے ہیں۔ ویژن کا اردو ترجمہ مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت  کر سکتے ہیں۔ ایک زمانے میں جب اس طرح کی اسناد نہیں ہوتی تھیں لوگ اپنے تجربے، مشاہدے اور علم سے یہ قوت حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ ایک مشکل بات ہوتی تھی کہ ہر شخص اپنے محدود ذرائع کی وجہ سے صحیح بات تک پہنچنے کے قابل نہ ہو پاتا تھا۔ وقت کے ساتھ آسانیاں آئیں، یونیورسٹیز کی صورت میں ان تمام طریق ہائے کو ایک جگہ کر دیا گیا۔ اور سکھانے کے طریقے نکالے گئے اور یوں اب اہل طلب کے لئے مشکلات پہلے سے کم ہیں۔

لیکن سیکھنے کا عمل اتنا ہی وقت لیتا ہے جتنا آج سے ہزار سال پہلے لیتا تھا۔ اب زندگی اس لئے مشکل ہو گئ کہ مجھے اپنے کسی تحقیقی مضمون پہ تحقیق کرتے وقت گذشتہ ہزار سال میں جو کچھ ہوا اسے بھِی نظر میں رکھنا پڑتا ہے ۔ جبکہ آج سے ہزرا سال پہلے کسی شخص کی الجھنیں یہ نہیں کچھ اور تھیں۔

 اب سائینسی سطح پہ پی ایچ ڈی کرنے کے دوران مختلف مرحلے ہوتے ہیں۔ پہلا مرحلہ ریسرچ پروجیکٹ تیار کرنا ہوتا ہے، اس میں ایک سپر وائزر یہ مدد کر سکتا ہے کہ وہ مختلف موضوعات بتا دے جسکے تحت اس ادارے میں سہولیات موجود ہوں اور وہ خود بھی اسے کرانے کی اہلیت رکھتا ہو۔ اس پروجیکٹ پہ کام کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اب تک کی ریکارڈڈ تاریخ میں اس پہ کس نوعیت کا کام ہوا ہے۔ اس ساری تاریخ کو مختلف جرنلز سے کھنگالا جاتا ہے اور اس مِں ذرا سی غلطی یا صرف نظر کی گنجائش نہیں ہوتی کیونکہ اس صورت میں آپکا کام نقل کہلائے گا اور کوئ بھی اچھا ادارہ اس پہ یہ سند نہیں دیگا۔

 دوسرے مرحلے پہ اس تمام پروجیکٹ کو تجرباتی سطح پہ کر کے ایسے نتیجے نکالنے ہوتے ہیں جو آپ سے پہلے کبھی کسی نے نہ نکالے ہوں، آپکا نتیجہ بالکل نیا نکور ہونا چاہئیے۔ تیسرے مرحلے پہ آپ ان تمام نتائج کو جو آپ نے اخذ کئے ہوتے ہیں انکے لئیے دلیلیں تلاش کرنی ہوتی ہیں اور ان پہ جو کام پہلے کیا گیا تھا۔ چاہے وہ سو سال پہلے ہی کیوں نہ کیا گیا ہو۔ اپنی دلیلی کو ان تمام نتائج کی رو سے ثابت کرنا ہوتا ہے۔ اچھا، یہ تمام کام تو چلتا رہتا ہے۔ لیکن اسکے ساتھ ہی ساتھ کورسز ہوتے ہیں اور انکے امتحانات بھی جنہیں پاس کرنا ضروری ہوتا ہے تاکہ نظریات طور پہ بھی اپنے میدان کے علاوہ بھی باقی چیزوں کی معلومات رہے۔ وہ تمام نتائج جو آپ نے انپے تجربات کے دوران حاصل کئے انہیں چھوٹے چھوٹے تحقیقی مضامین کی شکل میں شائع کرانا ضروری ہوتا ہے۔ ان مضامین کو تحقیقی مقالہ کہتے ہیں۔ ان مقالوں میں  کسی نئ معلومات کو بیان کیا جاتا ہے، اسکے ثبوت اور اس پہ موجود حقائق کی داستان دی جاتی ہے۔ کسی بھی سائینسی جریدے میں چھپنے سے پہلے انکا تفصیلی مطالعہ ریفریز کرتے ہیں۔ جہاں سے میں نے پی ایچ ڈی کیا تھا۔ وہاں کی شرط غیر ملکی سائینسی جریدے تھے۔ انکے ریفریز بھی غیر ملکی ہوتے ہیں ایک پی ایچ ڈی کے لئیے کم سے کم شائع ہونے والےتحقیقی مقالوں کی تعداد مقرر ہوتی ہے۔

اسکے ساتھ ہی ساتھ، ہر پی ایچ ڈی کرنے والے کو اپنی تمام تربیت کے دوران سیمینارز کی ایک مخصوص تعداد دینی ہوتی ہے۔  جس میں تمام فیکلٹی اور ادارے کے تمام طالب علم اور اگر باہر سے کوئ مہمان سائنسداں موجود ہو سب شریک ہوتے ہیں اور ہر ایک سوال کرنے کا حق رکھتا ہے جسکا تشفی جواب دینا ضروری ہوتا ہے۔ ہر سیمینار کی طوالت ایک گھنٹہ ہوتی ہے۔ اسکی تیاری کسی طرح ایک تحقیقی مقالے سے کم نہیں ہوتی البتہ اس میں آپکی کوئ نئ تحقیق نہیں بلکہ پرانے کام کو استعمال کیا گیا ہوتا ہے۔ پرانے کام سے میری مراد  وہ کام ہے جو تحریری سطح پہ  دنیا میں کہیں بھی موجود ہے۔

اسکے علاوہ گروپ میٹنگز اور گروپ ڈسکشنز ہر ہفتے ہوتے ہیں، کانفرنسز میں شرکت اور ورکشاپس میں تربیت بھی شامل ہیں۔ اگر ہم باہر کے کسی سائنسداں کے ساتھ مل کر کسی پروجیکٹ پہ کام کر رہے ہوں تو اسے بھی رپورٹ دینی ہوتی ہے۔ اور اپنے روزانہ کے کام کی رپورٹ بھی تیار کرنا ہوتی ہے۔

پی ایچ ڈی کے آخری مرحلے میں ایک پینل کے سامنے آپ نے جو کچھ دوران پی ایچ ڈی کیا اسکا دفاع کرنا ہوتا ہے۔ اسکا ایک اور اہم مرحلہ، اپنے تمام نتائج اس پہ گفتگو، اسکی پچھلی تاریخ اور اسے تیار کرنے کے لئیے جتنے بھی حوالے آپ نے استعمال کئیے، جنکی تعداد کءی سو تک جا پہنچتی ہے سب اس تھیسس میں جمع کرنے ہوتے ہیں۔  جس پہ سند ملتی ہے۔

یہ تھیسس ، اس ادارے سے جہاں سے میں نے پی ایچ ڈی کیا وہاں سے پاکستان سے باہر کسی بھی کیمسٹری کے اعلی ادارے میں کام کرنے والے  دو مختلف تحقیق دانوں کو بھیجا جاتا ہے جو اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ یہ تحریر اس قابل ہے کہ اس کو پی ایچ ڈی کی سند دی جا سکے۔

 تو محترم قارئین، چاول کے دانے پہ تحریر لکھنے والا یقیناً بہت بڑا آرٹسٹ ہے، میرے کمپیوٹر کے ہارڈ وئیر پہ کام کرنے والا اپنے کام کا بے حد ماہر ہے، حتی کہ وہ میکینک جس  سے میں اپنی گاڑی صحیح کراتی ہوں وہ اس سلسلے میں مجھ سے کہیں زیادہ بہتر معلومات رکھتا ہے، شیف ذاکر مجھ سے اچھا کھانا پکاتے ہونگے، طاہرہ سید، مجھ سے اچھا گا تی ہیں ۔ ریما مجھ سے کہیں بہتر ڈانس کر سکتی ہیں۔  ایشوریا رائے مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے۔ لیکن ان سب نے وہ نہیں کیا جو میں نے کیا ہے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ میں تو کسی پہ اپنا علم جتاتی بھی نہیں نہ کسی بھی شخص کے بارے میں یہ جاننے کی کوشش کرتی ہوں کہ اسکی تعلیمی استطاعت کیا ہے۔ آج تک میں نے کسی کے بلاگ پہ اسکا پروفائل نہیں چیک کیا۔ میں تو لوگوں کو انکے لکھے ہوئے سے سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں۔  اب کسی کا اس بات پہ اپنا دل جلانے کا کیا فائدہ۔ کیا فائدہ کہ آپ ہر وقت اس چیز پہ اپنی انگلیاں تھکاتے رہیں کہ دراصل پی ایچ ڈی کی کوئ اہمیت نہیں اور اس چیز کی اہمیت ہے اور اس چیز کی ہے۔ اس سے صرف ایک بات مجھے پتہ چلتی ہے اور وہ یہ کہ آپ کو اپنے اوپر اعتماد نہیں۔  ایسا کہنے والا مجھے اس ٹین ایجر بچے کی طرح لگتا ہے جو اپنے ارد گرد کی دنیا سے ہر صورت بغاوت کرنا چاہتا ہے۔ بغیر اپنی صلاحیتوں کو آزمائے۔

آپ میری بیان کی ہوئ کسی چیز میں غلطی نکالنا چاہتے ہیں بصد شوق۔ مگر میری پی ایچ ڈی پہ تبرہ بھیجنے سے آپکے الفاظ کی اہمیت میں کوئ اضافہ نہیں ہوگا۔ اگر آپ میری کسی دی ہوئ معلومات کو غلط ثابت کرنا چاہتے ہیں تو کسی مستند لکھنے والے کا حوالہ دیجئیے اور پھر اپنی بات کریں۔ میری پی ایچ ڈی کی تربیت مجھ سے یہی کہتی ہے۔ کسی سنی سنائ بات پہ یقین نہ کریں جب تک اسے ایسے تجربے کی کسوٹی پہ پرکھ نہ لیں جوکوئ دوسرا کرے تو اسے بھی وہی نتیجہ ملے جو آپکو ملا ہے۔ یا اگر ایسا نہ کر سکیں تو کسی مستند ذریعے سے اسکی تصدیق نہ کر لیں۔ اور یہ مستند ذریعہ لکھے ہوئے الفاظ ہوتے ہیں۔ اس لئیے ہم اپنی مذہبی کتاب کو اتنی اہمیت دیتے ہیں۔ اب اعتماد سے بات کرنی ہے تو یہی طریقہ لگانا ہوگا۔ ورنہ دوسری صورت یہی ہوگی کہ آپ کسی کی علمی قابلیت کے بارے میں جان لیں گے تو اپنی سطح بلند کرنے کے بجائے اس میں خامیاں نکالتے رہیں گے۔ جو لوگ اپنی عمر گذار چکے انہیں چھوڑ کر باقی سب  تو ابھی عمر کے اس حصے میں ہیں جہاں انہیں ہر لحظہ کچھ نئے کی امنگ سے بھرا رہنا چاہئیے۔ پھر یہ رویہ کیوں؟

میری باتوں پہ آپکا عمل کرنا بالکل ضروری نہیں۔ کیونکہ آپ  کہہ  سکتے ہیں کہ  آپکی بات پہ کیوں عمل کیا جائے آپ تو کتاب لئیے گھڑے میں بٹھی ہیں اور لوگ بالائ چاٹ چاٹ کرایک گھڑے سے نکل کر دوسرے میں جا چکے ہیں۔

8:40 PM

Karachi, karachi University, پی ایچ ڈی تھیسس, کراچی یونیورسٹی, کراچی، پی ایچ ڈی کے مراحل

دوستی ایسا ناطہ

رابعہ، ایک پندرہ سول سال کی لڑکی ہے۔ ڈیڑھ سال پہلےوہ میرے گھر میں جب آئ تو مشعل ڈیڑھ سال کی تھی۔  اور  یہ وہ وقت تھا جب مشعل کو میری توجہ ہمہ وقت چاہئیے ہوتی تھی۔ اور اکثر جب میں کھانا بنا رہی ہوتی تھی تو مصالحہ بھونتے بھونتے مجھے ایک زوردار چیخ پہ بھاگ کر یہ دیکھنے جانا پڑتا کہ کیا ہوا ہے اور ادھر وہ مصالحہ جل بھن کر ختم ہوجاتا ۔ ایک طرف ٹی سی ایس والا ڈور بیل بجا کر گھر ہلا رہا ہوتا، دوسری طرف فون بج رہا ہوتا اور تیسری طرف میں مشعل کو پکڑدھکڑ کر نہلانے میں مصروف ہوتی۔ گھر کے بزرگان کیساتھ صحت کے علیحدہ مسائل۔ طے ہوا کہ گھر میں صبح سے شام تک کے لئیےکسی مددگار کو رکھ لیا جائے۔ تاکہ ہر وقت کی افراتفری کچھ قابو میں آئے۔

رابعہ کی طبیعت میں کافی بچپنا ہے اور مشعل  سماجی تعلقات بنانے کے فن سے واقف ،  سو دو دیوانوں کی جلد ہی خوب گذرنے لگی۔ جس میں ہم گھر والے کبھی کبھی رقیب کا کردار ادا کرتے تھے۔  مجھے یہ خدشہ بھی لاحق کہ کہیں مشعل اسکے چکر میں نخریلی نہ ہو جائیں۔  اس لئیے اسے نہ صرف مشعل کا کوئ بھی کام کرنے کی منادی تھی بلکہ مشعل کو مکھن لگانے سے بھی باز رکھا جاتا جیسے گود میں اٹھا کر پھرنا۔

رابعہ کو زیادہ کام تو ہوتا نہ تھا اور دونوں دوستیں اکثر ساتھ بیٹھ کر کارٹّونز دیکھتیں اور مختلف کھیل کھیلا کرتیں۔ مشعل اسکے ساتھ اپنی ہر چیز شیئر کرتی چاہے وہ کھلونے ہوں یا چاکلیٹ یا کوئ اچھی بری خبر۔ کھانے کی کوئ بھی چیز رابعہ کو دئیے بغیر مشعل نہیں لے سکتی تھی، چاہے وہ ڈانٹ ہی کیوں نہ ہو۔

یوں بھی ہوتا کہ میں مشعل کی مرضی کیخلاف کوئ کام رابعہ کو کرنے کو کہتی اور وہ رضامندی کے لئے مشعل کی طرف دیکھتی۔ ایسے وقتوں میں مجھے رابعہ کو یہ یاد دلانا پڑتا کہ یہ میں ہوں جس نے پہلے دن اسکو ملازمت پہ رکھنے سے پہلے اسکا انٹرویو کیا تھا۔ لیکن اسکی یاد داشت مشعل سے زیادہ بہتر نہ تھی۔

کچھ عرصے میں گھر میں یہ کسی کے لئیے ممکن نہ رہا کہ وہ مشعل کے سامنے رابعہ کو اسکی کسی بھی غلطی پہ سرزنش کرے۔ کیونکہ وہ اسکے سامنے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر دیوار چین بن جاتی۔ 'لابیہ میری دوست ہے اسے مت ڈانٹیں'۔ یہ خواب کہ میں اب مشعل کے ساتھ زیادہ آرام سے وقت گذاروں گی خواب ہی رہا۔ البتہ اب  مصالحہ بھونتے ہوئے نہیں جلتا تھا۔کیونکہ ان دونوں کا انہماک دیکھ کر میں اسکے حصے کے بھی کام کرتی رہتی۔ کبھی کبھی اسکی ان لاپرواہیوں کی وجہ سے جو وہ مشعل کے بہانے سے کرتی غصہ بھی آتا، مگررانی کی چہیتی کو کیا کہیں۔

پھر ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں نے دن کے کھانے کے لئیےپلاءو بنایا اسے دم پہ چھوڑ کر رابعہ کو اسکی نگرانی پہ معمور کیا  کہ پانچ منٹ میں چولہا بند کر دینا اور گھڑی کی طرف اشارہ کر کے یہ بھی بتا دیا کہ پانچ منٹ کب ہونگے۔ اور خود واش روم کی صفائ پہ لگ گئ۔    جلنے کی  تیز بو پہ باورچی خانے میں گئ تو کھانا اتنا جل چکا تھآ کہ قابل کھا نہیںرہا۔ دیکھا تو مشعل اور رابعہ ٹی وی پہ کارٹون دیکھ رہی تھیں۔

میں نے رابعہ کو کچن میں بلا کر ڈانٹنے کے لئیے ابھی منہ کھولا ہی تھا کہ انکی گاڈ فیری موقع کی ننزاکت کو دیکھتے ہوئے فوراً  نازل ہو گئیں اور حسب عادت اسکے آگے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دئیے۔ میں نے رابعہ پہ گرجنے سے پہلے ایک دھاڑ مشعل کو دینا ضروری سمجھا۔ متوقع طور پہ  وہ روتی ہوئ منظر سے روانہ ہو گئیں کہ ایسا لہجہ انکے ساتھ شاید ہی رکھا گیا ہو۔

تھوڑی دیر بعد، یہ طے کر کے کہ اب کیا کھایا جائے گا۔ میں جا کر لاءونج میں بیٹھی تھی کہ مشعل میرے پاس آگئ ۔'اماں، میں رو رہی ہوں'۔ میں نےتجاہل عارفانہ سے  پوچھا 'کیوں کیا ہوا؟'۔  جواب ملا 'آپ نے مجھے ڈانٹا تھا۔ اس لئیے رو رہی ہوں'۔ میں نے انکی طرف دیکھا اور آنیوالی مسکراہٹ کو چھپاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔'سوری بیٹا، لیکن رابعہ نے غلطی کی تھی۔ اس وقت آپکو نہیں بولنا چاہئیے تھا'۔ پھر میں نے انکو اپنے سے قریب کر لیا۔ انہوں نے سسکتے ہوئے  مزید کہا' اماں، آپ نے رابعہ کو بھی ڈانٹا تھا'۔ یعنی مجھے رابعہ  سے بھی سوری کہنا چاہئیے۔ میں نےیکدم اپنی بیٹی کو حیرانی سے دیکھا۔محض  ڈھائ سال کی عمر میں اسے معلوم تھا کہ

دوست کسی کی زندگی میں اس وقت آتا ہے جب کوئ ساتھ نہیں ہوتا۔

12:55 AM

رابعہ, کراچی, مشعل

نئے افکار انکا حصول اور ترویج-۶

وولٹیئر نے کہا، 'توہم پرستی کو کچل ڈالو'۔ وولٹیئر انیسویں صدی میں فرانس میں کلیسائ طاقتوں کے خلاف اٹھنے والی مضبوط آواز تھا۔ اسکے بغیر انقلاب فرانس کی کہانی ادھوری رہے گی۔ اور  اٹھارویں صدی کے انقلاب فرانس کے تذکرے کے بغیر یوروپ کی تبدیلی کی کہانی نا مکمل رہے گی۔ اس تاریخ کے کردار اتنے حقیقی ہیں کہ آج اکیسویں صدی میں بھی تلاش کئیے جا سکتے ہیں ۔خاص بات یہ ہے کہ  اس انقلاب کی بنیاد فرانس کے دانشوروں اور قلمکاروں  نے رکھی۔

فرانس میں اس وقت اہل کلیسا اور دو مذہبی جماعتوںیسوعی جماعت اور یان سینی جماعت کا اقتدار میں حصہ تھا۔ امراء اور عدلیہ ان جماعتوں کے زیر اثر تھے اور یہ سب ملکر یہ تاثر پھیلاتے تھے کہ عقلی علوم، فلسفہ اور سائینس ، بادشاہت کے لئے خطرہ ہیں۔

کلیسا کے لئیے فرانسیسی ادیب ویدیرو کا یہ جملہ بھی مسیحیت کے خلاف تھا کہ 'بہت سے لوگوں ادب کو اسی طرح قابل  احترام سمجھتے ہیں جس طرح مذہب کو یعنی نہ ادب کی حقیقت سمجھتے ہیں، نہ اس سے محبت کرتے ہیں، نہ اس پہ عمل کرتے ہیں۔'

 یہ  ایسی بات تھی جس پہ کسی کو مسیحیت کے دائرے سے باہر کر دینا ایک معمول کی کارروائ ہوا کرتی تھی۔ نتیجے میں لوگ تنگ آ کر ملحد ہوجاتے۔ ۔ویدیرو نے تین کتابیں لکھیں جن میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئ کہ اہل کلیسا، عیسائ مذہب کی ایسی تاویلیں کر رہے ہیں جو تعلیم یافتہ طبقے کو عیسائیت سے متنفر کر رہی ہیں۔ اس کی ایک کتاب 'خدا کو وسیع کرو' کو اہل کلیسا اور عدالتوں نے ملکر نذر آتش کر دیا۔ ویدیرو کو قید تنہائ سے گذرنا پڑا۔

 اسی عرصے میں بادشاہ پہ ایک مذہبی جنونی کے حملے کے بعد مذہبی جماعتوں نے اس پہ زور ڈالا کہ وہ ملکی قوانین اور حکمت عملی کو مسیحی قوانین کے تابع کرے۔ اس طرح سے امور مملکت سے متعلق فیصلوں میں پادریوں اور یسوعی جماعت کا عمل دخل بڑھا۔ فرانسیسی قوم کے مسیحی تشخص کو ابھارنے کی مہم شروع ہوئ لیکن کوئ اہم تبدیلی عمل میں نہ آسکی کیونکہ حضرت عیسی کی تعلیمات کے نتیجے میں شاہی شان و شوکت، جاگیردارانہ جاہ و چشم، سرمایہ دارانہ مفعت، انکی کوئ گنجائش نہ تھی۔

حالات اس نہج پہ پہنچے کہ وولٹیئر کے بقول وہ قوم جو شعر و شاعری، ناول، ڈرامہ نگاری، رومانی تاریخ، اخلاقی پند و نصئح اور اولیائ کرامات کی کہنیوں میں مگن تھی وہ اب بحث کرتے تھے کہ روٹی مہنگی کیوں ہوگئ ہے، بندء مزدور کے اوقات اتنے سخت کیوں ہیں، ٹیکس کا نظام اتنا ناقص کیوں ہے، زمین کے مالئیے میں یکسانیت کیوں نہیں ہے۔

ولٹیئر نےایک جگہ لکھا کہ'یہ رائے ابھر رہی ہے اور تقویت پکڑتی جا رہی ہے اور ممکن ہے کہ ایک قومی انقلاب کا باعث بن جائے۔۔۔۔۔۔۔۔ لوگوں کے ذہن احتجاج اور بغاوت کی طرف مائل ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور ہر شے ایک ایسے عظیم انقلاب کی طرف جاتی محسوس ہو رہی ہےجو مذہب میں بھی آئیگا اور حکومت میں بھی۔

اہل کلیسا میں نا اتفاقیاں شروع ہو گئیں اور کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کے درمیان فرقہ وارانہ اختلافات اتنے بڑھے  کہ فرانس کے ضلع تولوس میں میں کوئ وکیل اور ڈاکٹر پروٹسٹنٹ نہیں ہو سکتا تھا۔ پروٹسنٹ کتابیں نہیں بیچ سکتا تھا۔ ایک عورت کو محض اس بات پہ جرمانہ کیا گیا کہ اس نے وضع حمل کے لئیے پروٹسٹنٹ دایہ کی خدمات لی تھیں۔

ان سب حالات میں بھی یونانی اور مسلمانوں کے عقلی علوم کا چرچا تھا۔ اور ایک مصنف الوتیس کے خلاف اس بات پہ مقدمہ چلانا چاہا  کہ اس نے لکھا کہ کیا ترکوں میں ہم سے زیادہ مذہبی رواداری نہیں، پیرس میں ایک بھی مسجد نہیں اور قسطنطنیہ میں کئ گرجا گھر ہیں۔ اس بات پہ اسکے خلاف پہ الزام لگایا گیا کہ وہ پیرس میں مسجد بنانا چاہتا ہے۔

 الوتیس نے مزید لکھا کہ کہ یہ ضروری نہیں کہ صرف وہی قوانین نافذ کئ جائیں جنکا ذکر انجیل میں ہے اگر اس پہ اصرار کیا جائے تو ملک کا نظام چلانا مشکل ہوجائے گا مثلاً رسل و رسائل کے ضابطے جو فرانس میں نافذ ہیں انکے بارے میں کوئ حکم انجیلی مقدس میں نہیں ہے۔

لہذا مفاد عامہ کو معیار بنانا چاہئیے۔ایلوتیس کو اپنے ایسے تمام بیانات پہ ایک معذرت نامہ لکھنا پڑا۔

اور اس بات کو ڈاکٹر آغا افتخار حسین سے اس طرح لکھا کہ۔

 جب معاشرے میں اعتدال باقی نہیں رہتا تو نیکی بدی کے سامنے معذرت خواہ ہوتی ہے، صداقت کذب کے سامنے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ علم جہل کے سامنے معذرت خواہ ہوتا ہے حقیقت سراب کے سامنے معذرت خواہ ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ معاشرے میں آگہی ایک جرم ہوتی ہے اور دانشور ایک مجرم بن جاتا ہے ایک اقبالی مجرم'۔

 فرانس میں مذہب کے نام پہ دہشت گردی کار ثواب تھی۔  لیکن لکھنے والے اسکے خلاف سینہ سپر ہوئے۔  ایلوتیس ، اپنے معذرت نامے سے پھرا۔ جلاوطن ہو جانیوالے وولٹیئر نے پھر وطن کا رخ کیا اور یہ نعرہ بلند کیا کہ اندرونی دشمنوں نے اپنا حربہ مسیحیت بنا لیا ہے۔ اور انہوں نے دین کو توہم پرستی میں تبدیل کر دیا ہے اور ہر واہمے کو سمجھنے اور سمجھانے کی ذمہ داری خود اٹھا لی ہے۔ لہذا توہم پرستی کو کچل دو۔

اس نے کہا اہل فکر کو متحد ہو جانا چاہئیے۔ وہ خود نہ ملحد تھا اور نہ مسیحیت کا مخالف اس نے ایک ملحد کو لکھا کہ آپ کہتے ہیں کہ مذہب دنیا میں متعدد مصائب اکا سبب بنا ہوا ہے اسکے بجائے یہ کہئیے کہ اسکا سبب توہم پرستی ہے۔۔۔۔یہ توہم پرستی

رب العزت کی عبادت کی نہایت بے رحم دشمن ہے۔ ہمیں چاہئیے کہ اس عفریت سے نفرت کریں'۔

وولٹیئر نے اپنی مہم کتابوں کے ذریعے نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے پمفلٹ، رسالے، اشتہارات وغیرہ ہزاروں کی تعداد میں شائع کئیے۔تاریخ میں قلم کے ذریعے غالباً اس سے موئثر تحریک نہیں چلائ گئ۔بعد ازاں  ۔یسوعی جماعت کے اراکین کیخلاف ثبوت اکٹھا کئیے گئے جو انکی زر اندوزی، دولت آفرینی اور حصول اقتدار سے محبت کو ظاہر کرتے تھے

آخر کار نومبر ۱۷۷۳ میں بادشاہ نے یسوعی جماعت پہ پابندی لگا دی۔ پوپ نے اس جماعت کی مذمت کی۔

انسان کو قتل کیا جا سکتا ہے اسکی فکر کو نہیں۔

جاری ہے۔

حوالہ؛

حریت فکر کے مجاہد، مصنف وارث میر، جنگ پبلشرز

فرانسیسی انقلاب

نئے افکار انکا حصول اور ترویج-۵

9:02 PM

French revolution, الوتیس, ڈاکٹر آغا افتخار حسین, فرانسیسی انقلاب, وولٹیئر, ویدیرو

تقدیر کی تدبیر

نجانے یہ کس نےکہا کہ تقدیر کو بدل دیتی ہے دعا بھی دوا بھی۔ اب ذرا ان خاتون کے بارے میں سوچیں جو ایک رکشے میں ولادت کی تکلیف سے گذر رہی ہو اور موقع پہ موجود حکام اسے ہسپتال تک نہ جانے دیں کیونکہ صدر صاحب  اس وقت شہر میں تشریف لانے والے ہیں۔ ملک کی نہایت اہم شخصیت، صدر پاکستان کے اعزاز میں دنیا میں آنیوالے اس نئے بچے کو احترماً اپنی پیدائش میں کچھ تاخیر ہی کردینی چاہئیےتھی۔ لیکن اس ناہنجار نے ایسا نہ کیا۔ یقیناً اس خاتون نے بڑی دعائیں کی ہونگیں۔ لیکن تقدیر نہیں بدلی۔ بقول وزیر اعظم گیلانی جس بچے کو جہاں پیدا ہونا ہوتا ہے وہ وہیں پیدا ہوتا ہے۔ تو یہ اسکی تقدیر تھی۔ اس بچے کو وہیں پیدا ہونا تھا۔ صدر صاحب کی تقدیر یہ تھی کہ وہ انتہائ اہم امور نبٹانے کوئٹہ پہنچیں۔  ائیر پورٹ پہ موجود انکے استقبال کے لئیے آنیوالے وزراء کی تقدیر یہ تھی کہ وہ ائیر پورٹ پہ صدر صاحب کا انتظار کرتے رہ جائیں اور بعد میں انہیں کوئ اطلاع دے کہ ارے صدر صاحب، تو ہیلی کاپٹر سے جہاں انہیں جانا تھا، چلے گئے۔

تقدیر کی جلوہ گری یہیں نہیں ختم ہوتی۔ جس وقت وہ خاتون خدا سے دعا کر رہی ہوگی کہ کسی طرح وہ ہسپتال پہنچ جائے اور موقعے پہ موجود سیکیورٹی حکام نےاسے سیکیوریٹی کی بلو بک کے حساب سے روک رکھا  ہوگا عین اس وقت اسلامی جمہوریہ پاکستان کی محفوظ قومی اسمبلی کی تقدیر میں اس بات پہ بحث کرنا لکھا تھا کہ اسمبلی میں موجود مرد اراکین میں سے اسی فی صد مردوں نے دوسری شادی کی ہوئ ہے اور یہ کہ دوسری شادی کرنا اتنا برا نہیں جتنا برا بنا کر اسے پیش کیا جاتا ہے اور اسلام نے اسکی اجازت دی ہوئ ہے۔

اب واپس اسی کیفیت میں ان خاتون کے پاس جائیے۔ پوچھئیے کیا مردوں کو دوسری شادی کرنا چاہئیے۔ وہ کیا کہے گی۔ ارے خدا کی مار ہو تم پہ۔ مجھے پہلے اس تکلیف سے تو نجات دلاءو۔ ارے خدا کے واسطے مجھے ہسپتال لے چلو۔

لعنتیوں۔ میں بہت تکلیف میں ہوں۔ وزیر اعظم کہتے ہیں بچے پیدا ہونا تو روزمرہ کی بات ہے بچے تو ہوائ جہاز میں بھی پیدا ہوتے ہیں۔ جس بچے کو جہاں پیدا ہونا ہوتا ہے وہیں پیدا ہوتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ

پابندی تقدیر کہ پابندی احکام

یہ مسئلہ مشکل نہیں ہے اے مرد خرد مند

اسکی وجہ بتانے سے پہلے یہ دیکھتے چلتے ہیں کہ تقدیر پہ اتنا بھروسہ کرنے والے، سجادہ نشیں خاندان سے تعلق رکھنے والے مختلف روحانی سلسلوں میں گھرے ہوئے گیلانی صاحب اس تقدیر پہ اس وقت بھروسہ نہیں کرتے جب وہ نواز شریف کے پاس جا کر رائے ونڈ میں ناشتہ کرتے ہیں۔ ڈیل کرکے حالات کو اپنے حق میں کرنے کے لئیے وہ سب کچھ کر سکتے ہیں تقدیر سے لڑ بھی سکتے ہیں اس لئیے اقبال مزید کہتے ہیں کہ

اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر

ہے اسکا مقلد ابھی ناخوش، ابھی خور سند

تقدیر کی مزید خوبی دیکھیں، رکشے میں پیدا ہونے والی بچے کو صدر مملکت کی طرف سے پانچ لاکھ روپے ملے۔ اور اسکے باپ نے صدر کا یہ احسان یاد رکھنے کے لئیے اپنے بچے کا نام آصف خان رکھ دیا ہے۔ یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں صرف پانچ لاکھ میں آصف نام دو نسلوں میں تو یاد رکھا جائے گا۔ غریب آدمی جب زندگی میں پہلی بار ایک ساتھ پانچ لاکھ روپے کا چیک لے گا تو اپنا نام بھی تبدیل کر کے آصف رکھنے پہ تیار ہو جائے، نوزائیدہ بچہ کس کھاتے میں ہے۔ تقدیر کی یہ ادا بھی دیکھنے والی ہے کہ وہ بچہ خوش قسمت ٹہریگا اور پاکستان بد قسمت۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ تقدیر کو بدل دیتی ہے دعا بھی دوا بھی، میں نے یہ بسوں کے پیچھے لکھا ہوا پڑھا ہے۔ اس میں دوا سے کیا مراد ہے؟

حوالہ؛

ٹریفک جام، رکشے میں بچے کی ولادت

پاکستانی قومی اسمبلی میں دوسری شادی پہ بحث

پاکستانی قومی اسمبلی میں دوسری شادی پہ بحث-2

10:51 PM

Asif Zardadri, Quetta, آصف زرداری, پاکستان, کوئٹہ, نواز شریف, یوسف گیلانی

میرا پیغمبر عظیم تر ہے

میں یہاں اس نبی کا تذکرہ کرنے نہیں جا رہی، جسکا سایہ نہ تھا، جو اپنے لعاب دہن سے امراض کو اچھا کر دیتا تھا  جس کی انگلیوں سے پانی کی دھاریں بہیں، جس کی انگلی کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہو گیا اور جسکی پیدائش پہ  ایوان کسری کے چودہ کنگورے گر گئے، مجوس کا آتش کدہ ٹھنڈا ہو گیا، بحیرہ سادہ خشک ہو گیا اور اسکے گرجے منہدم ہو گئے۔

یہ ایک انسان کے بارے میں ہے جسے قرآن کے الفاظ میں انسانوں کے درمیان سے نبوت کے عہدے پہ فائز کیا گیا۔ تاکہ دوسرے  انسان اسکی تعلیمات سے اسی طرح سیکھیں جیسے اور انسانوں سے سیکھتے ہیں اور انہیں یہ اعتراض نہ ہو کہ  یہ تو ہے ہی ایک مافوق الفطرت شخص ہم بھلا کہاں اسکے جیسے کام کر سکتے ہیں۔

یہاں میں ایک کتاب کا حوالہ دینا چاہونگی  جسکے مصنف مائیکل ہارٹ ہے یہ میرے کتابوں کے مجموعے میں دس سال پہلے شامل ہوئ۔ انیس سو اٹھتر میں شائع ہونے والی اس کتاب میں دنیا کی تمام تاریخ سے سو افراد کو چنا گیاہے۔ سو ایسے افراد جنہوں نے انسانی تاریخ کا دھارا بدل دیا اور جنکے اثر سے دنیا آج بھی آزاد نہ ہو سکی ان سو افراد کو ترتیب دیتے ہوئے مائیکل نے جس شخصیت کو سب سے پہلا نمبر دیا وہ رسول اللہ کی ذات ہے۔

وہ کہتا ہے میرا یہ انتخاب کچھ پڑھنے والوں کو حیران کر دیگا۔ لیکن در حقیقت محمد[صلعم]  دنیا کی تاریخ میں وہ واحد شخص ہیں جنہوں نے  مذہبی اور سیکولر دونوں سطحوں پہ بے انتہا کامیابی حاصل کی۔ محمد [صلعم] نے دنیا کے عظیم مذاہب میں سے ایک کی تبلیغ کی اور ایک انتہائ پر اثر سیاسی رہ نما ثابت ہوئے۔

 تاریخ کی بہت اہم شخصیات کے بر عکس محمد[صلعم] کو دنیا کے کسی اہم  تہذیبی مرکز یا ثقافتی سطح پہ یا سیاسی طور پہ اہمیت کی حامل قوم میں موجود ہونے کا فائدہ نہیں ملا۔ بلکہ وہ علاقہ جہاں وہ موجود تھے اس وقت دنیا کا ایک پسماندہ علاقہ تھا۔ انکی اپنی زندگی آسانیوں سے مرقع نہ تھی اسلامی تعلیمات کے مطابق وہ پڑھے لکھے نہ تھے۔ عرب کے مختصر حالات یہ تھے کہ وہ بہت سارے خداءووں پہ یقین رکھتے تھے۔ کچھ یہودی اور عیسائ بھی وہاں موجود تھے لیکن وہ بھی اتنا اثر نہ رکھتے تھے۔ عرب قبائل آپس کی جنگوں میں الجھے رہتے تھے اور انہیں  بے تحاشہ معاشی مسائل کا سامنا تھا۔

 وہ مزید کہتا ہے کہ اگرچہ دنیا میں عیسائیوں کی تعداد مسلمانوں سے تقریباً دوگنی ہے تو یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ پھر محمد [صلعم] کو نمبر ایک کیوں دیا۔  اسکی وجہ اسکے مطابق  یہ ہے کہ اسلام کو مرتب کرنے میں اور اسے پھیلانے میں محمد[صلعم] نے جتنا کام کیا۔  وہ کرائسٹ یعنی حضرت عیسی نے نہیں کیا۔

حتی کہ مسلمانوں کی مذہبی کتاب قرآن کو لکھوانے  اور محفوط رکھنے کا جو کام محمد[صلعم] نے کیا

وہ حضرت عیسی بلکہ انکے نائیبین  نے بھی نہیں کیا۔

 اسی طرح کی اور مثالیں دیتے ہوئے مائیکل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تاریخ کی سب سے زیادہ کامیاب اور پر اثر شخصیت قرار دیتا ہے۔

مائیکل وہ واحد شخص نہیں جو اس چیز کا اعتراف کرتا ہے۔ یہ اعتراف ہر وہ شخص کرتا نظر آتا ہے جو رسول اللہ کی جدو جہد کی داستان کو بغیر کسی جانبداری اور عقیدت کے پڑھتا ہے۔ انہیں اپنے ماحول کے لحاظ سے اتنے انقلابی فیصلے کرتے دیکھتا ہے۔ انہیں جنگیں لڑتے دیکھتا ہے۔ حاصل ہونے والی فتح سے بردباری سے نبٹتے دیکھتا ہے۔ اور شکست ہونے پہ اپنا رد عمل ظاہر کرتے ہوئے دیکھتے ہے۔ انہیں اپنی خاندانی زندگی گذارتے دیکھتا ہے، خوشی اور غم کو برتتے دیکھتا ہے اور لوگوں  کیساتھ دیکھتا ہے اور پھر خلوت میں دیکھتا ہے۔ اپنے عزم پہ جمے دیکھتا ہے اور لوگوں کی ہمتیں باندھتے دیکھتا ہے ، ایک سپہ سالار کو دیکھتا ہے اور ایک واعظ کو دیکھتا ہے، مسلمانوں کیساتھ دیکھتا ہے اور غیر مسلموں کیساتھ دیکھتا ہے اور ان سب چیزوں کو دیکھنے کے بعد انکی ذات سے متائثر ہونا ، پھر ان دیکھے خدا پہ ایمان لے آنا کتنا ہی آسان اور صحیح کام  لگتا ہے۔ محمد مصطفی سے آشنا ہونے کے بعد کیا کوئ خدا سے نا آشنا رہ سکتا ہے۔

کشف الدجی بجمالہ

حسنت جمیع خصالہ

صلو الیہ وٰاٰلہ

 نوٹ؛ سیرت طیبہ پہ آج ڈان میں اصغر علی انجینیئر صاحب کی ایک تحریر چھپی ہے۔ اسے ضرور دیکھیں۔ لنک یہ ہے

http://epaper.dawn.com/ArticleText.aspx?article=26\_02\_2010\_006\_013

حوالہ؛

سیرت النبی، مصنف  شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی

الرحیق المختوم، مصنف مولانا صفی الرحمن مبارکپوری

The hundred by Micheal Hart

A prophet for our time by Karen Armstron

11:31 PM

Karen Armstrong, Micheal Hart, Shibli Nomani, سید سلیمان ندوی, سیرت النبی, شبلی نعمانی, کیرن آرمسٹرونگ, مائیکل ایچ ہارٹ

تین سو ساٹھ خدا

میں شہر کے وسط میں ہونے والی ایک تقریب میں شرکت کرنے کے لئیے گھر سے نکلی تو راستے میں، میں نے نوٹ کیا کہ شہر میں مختلف چو رنگیوں پہ سیمنٹ کے بنے ہوئے ایسے آرائشی ٹاورز مختلف جگہوں پہ لگائے جا رہے ہیں جن پہ اللہ کے ننانوے نام لکھے ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے طارق روڈ کے قریب اللہ کا ایک تعمیری نمونہ لگایا تھا جو اتنا مقبول ہوا کہ کہ میں نے اسے بعد میں متعدد جگہوں پہ حتی کہ گھروں کے داخلی دروازے پہ لگا ہوا دیکھا۔  شہر میں مختلف روڈز پہ دور تک اللہ کے ناموں کی تختیاں جڑی ہیں۔ کیا یہ ان ناموں کی حرمت کا تقاضہ ہے کہ انہیں اس طرح ہر جگہ لگا دیا جائے۔ کیا انکی وجہ سے ہم زیادہ مسلمان نظر آتے ہیں۔ کیا ان نمائشی اشیا کو مستقبل مین انکی جگہ سے ہٹانے پہ اسے اسلام کیخلاف کارروائ نہیں قرار دیا جائےگا۔  کیا ہم ہندوءووں اور عیسائیوں سے مقابلہ کرتے ہوئے اپنے خدا کو یہ روپ دے رہے ہیں۔

ان ٹاورز کو دیکھ کر مجھے یہ خیال آتا ہے کہ اسلام نے  خدا کا جو تصور دیا وہ  کوئ ان دیکھی، اور تصور میں نہ آنے والی چیز تھا جسے صرف اسکی صفات سے پہچانا جاتا تھا۔ اور جو سب کا خدا تھا۔ آخر کس جذبے کے تحت اسے اتنا زیادہ وجود دینے کی کوشش ہو رہی ہے حالانکہ ہمارے ایمان کی خصوصیت تو غیب پہ ایمان لانا ہے۔

  میں آگے بڑھتی ہوں اور صدر کےقریب نمائش سے گذرتی ہوں یہاں نمائش کے سگنل پہ کان پڑے آواز نہیں سنائ دے رہی۔ ایک طرف امام بارگاہ ہے جہان سوگ کے دن ختم ہونے کی تیاریاں ہیں۔ اور دوسری طرف ربیع الاول کی تیاریاں عروج پہ۔ نوجوان سر پہ امامہ باندھے ہوئے خانہ ء کعبہ پہ چڑھے کالا کپڑا چڑھا رہے ہیں یہ وہ خانہ ء کعبہ نہیں بلکہ اصل کی نقل ہے۔ اور اسکے بالکل برابر میں ایک خاصہ بڑا نمونہ مسجد نبوی کا بھی رکھا ہے جو روشنی سے جگمگا رہا ہے۔ روڈ پہ دور تک سنی تحریک کے رہ نماءووں کی بڑی بڑی تصویریںآویزاں ہیں۔

 مجھے یہ سب دیکھ کر ایک اور منظر یاد آیا کہ فتح مکہ کے بعد رسول خدا خانہ کعبہ میں داخل ہوتے ہیں جہاں ہر قبیلے نے اپنے خدا لا کر رکھے ہوئے ہیں اور اس طرح سے انکی تعداد تین سو ساٹھ تک پہنچ جاتی ہے۔ اور رسول خدا ان بتوں کو توڑتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں۔ حق آگیا اور باطل مٹ گیا۔ بے شک باطل مٹنے ہی کے لئیے تھا۔ ہر چیز ختم ہو گئ۔ باقی رہ گیا اللہ کا نام۔، وہی باقی رہ جانیوالا ہے۔

اور لگتا ہے کہ اب ہم پھر سے اس مہم پہ لگ گئے ہیں کہ ان تین سو ساٹھ خداءووں کوجمع کر لیں۔

10:31 PM

سنی تحریک. شیعہ, کراچی

اجازت ہے؟

میری اماں بہت ناراض ہو رہی تھیں۔ کہنے لگیں یہ جو ہم اس مسجد میں ہر جمعرات کو درس سننے جاتے ہیں تو آجکل یہاں جماعت اسلامی کی خواتین درس دے رہی ہیں۔ بالکل دماغ خراب ہو گیا ہے انکا۔ میں نے تو جانا چھوڑ دیا۔ میں اطمینان سے انکے روحانی ڈائجسٹوں کے مجموعے کی ورق گردانی کرتی رہی کہ روحانی ڈائجسٹ انہیں بہت پسند ہے۔  اور ویسے بھی ہم سب جانتے ہیں کہ وہ جب ایک دفعہ بولنا شروع کریں تو پھر وہی بولتی ہیں۔

کہنے لگیں یہ ان لوگوں نے اب ایک نیا تماشہ نکالا ہے۔ میں نے سر اٹھا کر انکی طرف دیکھا۔ اب یہ لوگ کہنے لگے ہیں کہ اپنے شوہروں کی دوسری اور تیسری چوتھی شادی کراءوو جبھی یہ شادی کا مسئلہ حل ہوگا۔ ارے انکی عقل تو ہمیں لگتا ہے کہ گھاس چرنے چلی گئ ہے۔

یہ وہ پہلا دن تو نہیں تھا جب میں نے یہ نظریہ سنا  اس سے پہلے بھی میں نے اس طرح کی بات سنی کہ یہ اسلامی احکامات سے رو گردانی کی وجہ سے ہے۔ حالانکہ اسلام میں دوسری شادی ک حکم نہیں اجازت ہے۔ البتہ یہ پہلا رد عمل ضرور تھآ جو مجھے ڈائریکٹ حاصل ہوا۔

اور اب جناب  پنجاب اسمبلی میں

ہماری ایک محترم خاتون ممبر

نے اس نظرئیے کی ترویج کی اور وہ بھی اسمبلی کے پلیٹ فارم سے کہ مردوں کی ایک سے زائد شادیوں پہ انکی بیگمات کو انہیں ترغیب دینا چاہئیے۔ یہی شادی کے مسئلے کا حل ہے۔ اور میں اپنی اماں کے الفاظ استعمال نہ کرنا چاہوں تو کہوں کہ انکی عقل کولہو کے بیل کی طرح ایک کولہو پہ گھومے جارہی ہے۔ یہ تو اتنی معذور ہیں کہ انکی عقل گھاس تک چرنے نہیں جا سکتی۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جن  سے قوم یہ توقع کرتی ہے کہ وہ ملک کے بہتر مستقبل کے لئیے قانون سازی کریں گے۔ کچھ ساز کرنے کے لئیے محض آواز کا ہونا کافی نہیں اس کے لئیے انسانی دماغ کو اسکی متوازن حالت میں استعمال کرنا  آنا ضروری ہے۔

اب میں بغیر کسی حدیث اور قرآنی حوالوں کے کے اس بات کو اس طرف لیجاتی ہوں جو آجکے پاکستان کے بنیادی حقائق ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی انیس سو اٹھانوے کی مردم شماری کے نتائج کے مطابق مردوں کی تعداد عوتوں سے زیادہ ہے اور سو عوتوں کے لئیے تقریباً ایک سو آٹھ مرد موجود ہیں۔ جبکہ اسلامی رواج کے مطابق ایک عورت اور ایک مرد کی شادی ہوتی ہے تو دراصل پاکستان میں خواتین کی قلت ہو گئ ہے۔ اس قلت کے اپنے اسباب ہیں جو اس وقت ہمارا موضوع نہیں ہے۔ لیکن جہاں پہلے ہی خواتین کی تعداد کم ہو وہاں مردوں کو ایک سے زائد شادی کے مشورے دینا اور اسے شادی نہ ہونے کی وجہ سمجھنا، سوائے جہالت کے اور کسی چیز کو ظاہر نہیں کرتی۔ یہاں یہ بھی جاننا چاہئیے کہ قدرتی حیاتیاتی نظام میں تقریباً ہر اسپیشی میں مادہ کی تعداد عام طور سے زیادہ ہوتی کہ اسی میں نظام کی بقا ہوتی ہے۔

یہ وہ شدت پسند روئیے ہیں جو مسائل کے صحیح اسباب جاننے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ کسی نہ کسی طور اسے مذہب سے منسلک کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس سے ثواب جو حاصل ہوتا ہے۔ شاید پاکستانی عوام کو ایک لمبے عرصے تک انتظار کرنا پڑیگا کہ کب ہمارے قانون سازی کرنیوالے ادارے اور لوگ اتنا شعور حاصل کر پائیں کہ گناہ اور ثواب کے دائروں سے نکل کر مسائل کی اصل وجوہات کو جانیں اور لوگوں کی فلاح کے لئیے کچھ کر پائیں۔

معاشرے میں شادی نہ ہونا اور خاص طور پہ خواتین کی شادی کا مسئلہ، ہمارے حرص، لالچ، نمو د و نمائش اور انسانی قدرتی ضروریات کو نظر انداز کرنے سے جڑا ہوا ہے۔ اور اسے اسکے صحیح تناظر میں دیکھ کر ہی اس مسئلے کا حل نکالا جا سکتا ہے۔ ورنہ تو ہم عوام حکومت سے اس بات کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہونگے کہ اسمبلی کی سطح  سے ایسے لطیفوں کی آمد روکی جائے اور اس قسم کے احمقانہ مشوروں کو پیش کرنے سے پہلے ممبران پہ یہ پابندی عائد کی جائے کہ وہ اعداد و شمار کو ان میں ضرور شامل کریں۔ معزز ارکان پارلیمنٹ وہاں اپنا وقت خوشگوار طریقے سے گذارنے نہیں جاتے۔ بلکہ ایک لمبے چوڑے خرچے کے بعد انہیں وہاں اس لئیے عیاشی کرائ جاتی ہے کہ وہ ملکی مسائل کا اجتماعی طور پہ کوئ حل نکالیں۔

حوالہ جات؛

پاکستان  میں مرد اور خواتین کا تناسب

پنجاب اسمبلی میں مردوں کی ایک سے زائد شادی کا مشورہ

ایک اور بلاگر کے تائثرات

12:42 PM

Samina Khawar Hayat, پاکستان, پاکستانی شادیاں, پنجاب اسمبلی, ثمینہ خاور حیات, مردوں کی ایک سے زائد شادیاں

ڈونٹ ٹیل می

میں گھر میں داخل ہوئ تو صرف فرد حاضر ہی میسر تھے کہ انہیں آجکی پیش آنیوالی داستاں سنائ جائے۔ چنانچہ میں نے سامان اٹھا کر کچن میں رکھا اور فرد حاضر کو  سنانا شروع کیا۔

میں؛ آج جب میں گھر سے نکل کر نکڑ والے راءونڈ اباءوٹ پہ پہنچی تو وہاں تو ٹریفک پولیس والوں کا پوار جلوس موجود تھا۔ ایک ٹریفک کار کھڑی تھی ، چار پانچ ٹریفک پولیس والوں کی موٹر سائیکلز اور آٹھ دس ٹریفک پولیس والے۔

فرد حاضر جو اپنے کام میں مصروف تھے میری بات میں ایک مصنوعی دلچسپی لیتے ہوئے بولے، کیوں کوئ وی آئ پی گذرنے والا تھا۔

میں؛ ہاں، پہلا خیال تو مجھے یہی آیا پھر میں نے دیکھا کہ وہ اکثر گاڑیوں کو روکے کھڑے تھے۔ اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ دیہاڑی بنانے سے لگے ہوئے ہیں۔

فرد حاضر؛ آپکو تو کچھ نہیں کہا ہوگا۔ خواتین کی تو ایسے موقعوں پہ بچت ہوجاتی ہے۔

میں؛جی میرا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن ان میں سے ایک نے انتہائ ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے سائیڈ میں لگنے کا اشارہ کیا۔

فرد حاضر؛ ڈونٹ ٹیل می، پھر کیا ہوا۔ آپ نے کسی ٹریفک رول کی خلاف ورزی کی ہوگی۔

میں؛ جی نہیں، یہی میں نے اس سے پوچھا تو اس نے اسی سنجیدگی سے ونڈ اسکرین کے اوپر والے حصے پہ لگی ایک تین انچ چوڑی پٹی کی طرف اپنی انگلی سے اشارہ کیا کہ آپکا اسکی وجہ سے چالان ہوگا۔

مجھے تو یہ سن کر غصہ آ گیا۔  اتنے عرصے میں پہلی دفعہ مجھے پتہ چلاکہ ونڈ اسکرین پہ ایک ایسی پٹی لگی ہے جو قانوناً جرم ہے۔

فرد حاضر؛ اسے معلوم نہیں ہوگا کہ پی ایچ ڈی کی کیا نشانیاں ہوتی ہیں۔ حالانکہ اسے آپکو رعایت دینی چاہئیے تھی۔

میں انکی اس بات کو نہیں سنتی اور قصہ جاری رکھتی ہوں۔ وہ کہنے لگا مجھے گاڑی کے کاغذات اور اپنا لائسنس دکھائیں۔

میں نے تو صاف کہہ دیا۔ یہ پیسہ بنانے کا دھندہ ہے۔ نہ میں اپنے کاغذات دکھا رہی ہوں اور نہ آپ میرا چالان کر سکتے ہیں۔ کہنے لگا ایسا کیسا ہو سکتا ہے۔ اگر چالان کا ڈر ہے تو چالان تو ہوگا۔

فرد حاضر؛  آپکے پاس لائسنس نہیں ہوگا اس لئیے اتنا طیش دکھا رہی تھیں۔ اکثر آپکا موبائل فون اور لائسنس گھر میں ہی پڑے ملتے ہیں۔

میں انکی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے۔ پھر وہ اپنے افسر بالا کو بلا لایا۔

فرد حاضر؛ اچھا پھر۔ اب آپکو مزہ آنا شروع ہوا ہوگا۔

میں ایک دفعہ پھر انکی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے۔ افسر بالا نے آکر یہی کہا کہ چالان ہوگا۔ میں نے کہا کس بات کا ۔ اس پٹی کے لگے ہونے کا۔  اسے اتار لیں۔

افسر بالا نے کہا کہ نہیں یہ تو اب آپ گھر جا کر اتارئیے گا۔ اب تو مجھے اور غصہ آنا ہی تھا۔ میں نے کہا دہشت گرد اپنے زخمی لیڈر کو وزیرستان سے لیکر کراچی تک پہنچ جاتے ہیں آپ لوگوں کو نظر نہیں آتے۔ میری گاڑی کے اندر کا منظر دیکھنے میں اس پٹی کی وجہ سے کوئ رکاوٹ ہے کیا؟ یہی قانون ہے ناں کہ میری گاڑی کے اندر کا منظر صاف نظر آنا چاہئیے۔ اس سے آپکو کوئ مشکل ہے۔ میری گاڑی میں کوئ بم یا اسلحہ ہے۔ میں نے ٹریفک کا کوئ اصول توڑا ہے۔اس پہ وہ چڑ گیا اور کہنے لگا اچھا جی آپکا چالان نہیں کرتے۔ صرف اپنا لائسنس دکھا دیں۔ اپنے طور پہ انہوں نے اب میری دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھا۔

فرد حاضر نے  بھی اپنا کام چھوڑ کرمسکراتے ہوئے ہاتھ اپنے سینے پہ باندھے۔ اور اس منظر کو سننے کی تیاری کرنے لگے جس میں میرے پرزے اڑنا متوقع تھے۔

میں نے انکے تجسس کو دیکھتے ہوئے ایک ادائے بے نیازی دکھائ اور بیان جاری رکھا۔ 'میں نے اپنا والٹ کھولا اور لائسنس نکال کر اسے دکھا دیا۔ بس اسکا چہرہ اتر گیا۔  کھسیانی مسکراہٹ کیساتھ کہنے لگا۔ ٹھیک ہے بس آپ جائیں۔ اتنی سی بات تھی'۔

فرد حاضر؛ ڈونٹ ٹیل می۔ قسمت سے پڑا رہ گیا ہوگا۔

میں؛ جی نہیں،آپ جانتے نہیں خواتین کی چھٹی حس تیز ہوتی ہے۔ میں نے جاتے وقت سوچا کہ پرس لینے کی کیا ضرورت ہے صرف والٹ سے کام چل جائے گا۔ اور میرے والٹ میں اکثر لائسنس ہوتا ہے البتہ موبائل فون کی اس میں جگہ نہیں۔

فرد حاضر؛ اچھا چلیں، آپکے لئیے ایک مزے کی خبر ہے۔

میں؛ وہ کیا؟

فرد حاضر؛ پشاور میں ویلنٹائن ڈے ایکدن پہلے یعنی اتوار کے بجائے ہفتے کو منایا گیا۔

میں انتہائ حیرانی سے انکا چہرہ دیکھتی ہوں۔ لیکن کیوں؟

فرد حاضر؛ کیونکہ سعودی عرب میں ہفتے کو ویلنٹائن ڈے تھا۔

میں: ڈونٹ ٹیل می۔

حوالہ؛

پشاور میں ویلنٹائن ڈے

5:26 PM

پشاور, کراچی, کراچی ٹریفک پولیس

نئے افکار انکا حصول اور ترویج-۵

 یہ ہے وہ

چھاپہ خانہ

جو سولہویں صدی کے یوروپ کی بیداری میں حصے دار ہے۔ یہ وہی چھاپہ خانہ ہے جو مغل بادشاہ اکبر کے زمانے میں جب ہندوستان کی سر زمین پہ اجازت باریابی چاہ رہا تھا تو بادشاہ نے یہ کہہ کر اسے خوش آمدید نہ نہا کہ اس سے ہندوستان میں فن کتابت ختم ہو جائیگا۔

یوروپ کے دور تاریک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آٹھ سو سن عیسوی میں شورع ہوا اور اٹھارویں صدی میں اس سے نجات پائ گئ۔ لیکن تاریخ میں ایسی تبدیلیوں کا کوئ معین دن نہیں ہوتا۔  قوموں کی پیدائش اور موت کا دن مقرر کرنا اتنا آسان نہیں۔کیونکہ یہ تبدیلیاں زیادہ تر انتہائ خاموشی سے دستک دیتی ہیں اور پھر حالات کے گرد اپنا ایسا جال بن جاتی ہیں کہ انکی وجوہات کو صحیح طور سے جانچنے پہ بھی بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ بہرحال سولہویں صدی کا یوروپ اب بیدار ہونے کو تیار تھا

چھاپے خانے نے کتابوں تک پہنچ کو آسان بنا دیا۔ اور وہ کتابیں جن سے غیر یوروپین علم نے بارہویں صدی میں یوروپ کے اندر جگہ بنائ تھی اب ان تک زیادہ تر لوگ پہنچ سکتے تھے۔ یونانی کتابوں کے میسر لاطینی تراجم کا انگریزی میں ترجمہ ہوا۔

چودھویں صدی کے وسط میں جب قسطنطنیہ کا سقوط ہوا تو یونانی مفکر اور انکی تصنیفات یوروپ میں چھا گئیں۔ انسان نے اپنی آنکھیں اپنے داخل سے ہٹا کر پھر کائنات پہ مرکوز کیں اور سائینسی انکشافات نے جنم لینا شروع کیا۔یہ سب کچھ اس لئیے  بھی ہوا کہ

ابن رشد

اور

ابن خلدون

نےعقلی تحریکوں کو تقویت دی تھی۔

یوروپ کے پر تشدد مذہبی حالات نے وہاں کے انسان کو مذہب سے ہٹا کر عقل سے قریب کر دیا تھا چنانچہ یہاں ابن رشد کا استدلالی طریقہ مشہور ہوا۔ فلپ حطی نے 'عربوں کی تاریخ' میں لکھا کہ'دور وسطی کے مغربی متکلمین  اور اہل قلم کے ذہنوں میں جتنا ہیجان ابن رشد نے برپا کیا اور کسی نے نہیں کیا'۔

مسلمانوں کی علمی شمع اب بجھ رہی تھی اس لئیے ابن رشد کی روشنی سے یوروپ نے اپنی قندیلوں کو روشن کیا۔ اس طرح سے عیسائ کلیسا کے خلاف پیدا ہونے والی تحریک سے کلیسا ابن رشد کے دشمن ہو گئے اور اسے بے تحاشہ گالیاں دینے لگے۔ اور ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ یوروپین تعلیم گاہوں میں ان کتابوں کا پڑھانا ممنوع ہو گیا اور بعض جگہ جلا بھی دیا گیا۔

 مسلمانوں کے دور زوال میں ابن خلدون نے جنم لیا وہ سائینسی طرز فکر کے حامی تھے اور جس نظرئیے پہ ابن رشد، ارسطو کی مدد سے پہنچا اس پہ ابن خلدون اپنے نظریہ ء تاریخ  سے پہنچا۔ وہ اپنی نسلی تعصبات سے بلند تھا اور عرب نژاد ہونے کے باوجود یہ کہتا تھا کہ 'عرب تہذیب و تمدن کے دشمن ہیں اور دنیائے اسلام میں علوم و فنون کے حامل عجم ہیں'۔ ابن خلدون نے عربی مزاج کی بدویت کو پہچانا اور آزاد فکر کی روش پیدا کی۔ یہ اتنا بڑا کارنامہ تھا کہ ٹائن بی نے بھی اسکی تعریف کی اور ابن خلدون کو فلسفہ ء تاریخ کا پیش رو قرار دیا۔

 چھاپہ خانہ نے بائبل کو بھی ایک عام عیسائ کے ہاتھوں میں پہنچا دیا اور اب بائبل کا مطالعہ بھی ایک عام کتاب کی طرح کیا جا سکتا تھا۔ بائبل کو اب پرانے عقائد کے بجائے نئے طریقہ ءکار سے پڑھا جاتا تھا۔

اسکے بعد

بارود

  اور

مقناطیسی گھڑی

کا استعمال ، انہوں نے نے زندگی کے دھارے کو تبدیل کر دیا۔

واسکو ڈی گاما

نے نے ہندوستان پہنچنے کا نیا بحری راستہ نکالا اور

کولمبس

نے امریکہ دریافت کر لیا۔ کوپر نیکس نے اس وسیع کائنات میں زمین کو محض ایک سیارہ قرار دیا جو سورج کے گرد حرکت کر رہا ہے اور اس سے اپنے حصے کی روشنی لیتا ہے اور اسکی اس بات کی تصدیق

گلیلیو گلیلے

نے کی۔ کائنات کے اس نئے تصور نے انسان کے کائنات میں مرتبے کو متائثر کیا اور اسکے بہت سارے نظریات کو تبدیل کر دیا۔

زمانے نے کروٹ لی اور انسان زراعت سے تجارت کی طرف متوجہ ہوا۔  جاگیر داری نظام اپنے اختتام کی طرف بڑھا اور اس طرح متوسط طبقے پہ مشتمل انسانوں کے اس گروہ نے جنم لیا۔ جو اب چیزوں کو استدلالی نکتہ ء نظر سے دیکھتا تھا۔

یہ تمام قوتیں جو تبدیلی کی قوتیں تھیں اس صدیوں کے جمود کا نتیجہ تھیں جس پر کسی محرک قوت نے اثر انداز ہونے کی کوشش نہ کی تھی۔ اس سارے ماحول کے نتیجے میں تبدیلی کے تین عناصر یعنی مذہب، فلسفہ اور سائنس ایکدوسرے کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ زندگی کی معنویت میں تبدیلی نے  ہر شعبہ ء زندگی میں کسی تحریک کا بیج ڈالدیا تھا۔

لیونارڈو ڈے ونشی

کی مونا لیزا  آنیوالے دنوں کے خیال سے مسکرا رہی تھی۔ جس کی تخلیق اسی زمانے کی ہے جب یوروپ زندگی کے نئے چلن سے آشنا ہو رہا تھا۔ صرف لیونارڈو ہی نہیں اس وقت کے بیشتر تخلیق کار اپنی اپنی سطح پہ مصروف بہ عمل نظر آتے ہیں۔ یوں تخلیقی بنجر پن ختم ہوا اور ایسا لگتا تھا کہ ساری فضا متحرک ہو گئ ہے۔

نوٹ؛ یوروپ کی تاریخ کا یہ سفر جاری ہے۔ آپ بھی کچھ شامل کرنا چاہیں تو خوش آمدید۔

جاری ہے۔

حوالہ جات؛

اردو ادب کی تحریکیں، مصنف ڈاکٹر انور سدید

تاریخ فلاسفۃ الاسلام، مصنف محمد لطفی جمعہ

خدا کے نام پہ لڑی جانیوالی جنگ، مصنفہ کیرن آرمسٹرون۔

The battle for God by Karen Armstrong

دریافتوں کا زمانہ

نئے افکار انکا حصول اور ترویج-۴

6:53 PM

European renaissance, ابن خلدون, ابن رشد, ڈاکٹر انور سدید, کوپرنیکس، لیونارڈو ڈے ونشی، یوروپ, کیرن آرمسٹرونگ

نئے افکار انکا حصول اورترویج-۴

یہ تصویر آج دنیا کے  کسی خطے کی نہیں بلکہ آج سے کئ صدیاں پہلے اس لزبن شہر کی ہے جو یوروپ کے تاریک دور میں سانس لے رہا تھا۔ اس تصویر میں ایک اجتہادی کو زندہ جلانے کی تیاری ہو رہی ہے۔ اور عوام کا ہجوم اسے ان خیالات کے پیش کئیے جانے پہ جلتا دیکھنے کے لئے جمع ہو رہے ہیں جو اس نے اپنی فکر اور تحقیق  سے صحیح جانے البتہ وہ مروجہ روایات کے خلاف ہونگے۔ یہ اس انجام کا شکار ہونیوالا کوئ پہلا یا آخری شخص نہ تھا۔

لیکن یہ جاننا چاہئیے کہ وہ کیا حالات تھے جو کہ اس بربریت کا باعث بنے جس کی تشفی انسانوں کو زندہ جلا کر بھی نہ ہوتی تھی۔

عیسائیت نے اس وقت جنم لیا جب اس دور کا انسان زمینی بادشاہت کے فروغ سے تنگ آچکا تھا۔اور ایک ایسے نظام کا آرزو مند تھا جو امارت اور غربت کے فرق کو ختم کر دے اور انسان کو خدا کے ساتھ ہمکلام ہونے کا موقعہ دے۔ عیسائیت نے اس خواہش کو کسی حد تک پورا کرنے میں مدد کی اور خدا کو مطلق حقیقت قرار دیکر تمام کائنات کو اسکے تابع کر دیا۔ اس طرح سے پست و بلند کا امتیاز ختم ہو گیا۔ اور آسمانی بادشاہت میں سب کے لئیے دروازے کھول دئیے۔

عیسائت کے فروغ نے  اس وقت کےشاہی نظام پہ بڑی کاری ضرب لگائ جس میں بادشاہ کو خدائ حیثیت حاصل تھی۔  لیکن عیسائیت کے عروج نے کلیسا کا نظام اتنا بلند کر دیا کہ ریاست کے اندر ایک اور اقتدار کا مرکز ابھر آیا جو کسی کے آگے جوابدہ نہیں تھا۔ کلیسا کی مرکزی شخصیت پوپ طاقت کا سرچشمہ بن گئ جسے  سلطنت کے معاملات میں براہ راست دخل اندازی کا موقع مل گیا اور وہ آہست آہستہ اقتدار کے حصول کا ذریعہ بن گیا۔ چنانچہ جلیل القرد بادشاہ اور حکومتیں اب مذہبی طاقت کے مرکز یعنی کلیسا کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کرنے پہ مجبور ہوگئیں۔

جسکا نتیجہ بالآخر پر تشدد کلیسا کی صورت نکلا۔ طاقت کا احساس خرابی لاتا ہے اور کامل طاقت مکمل خرابی لاتی ہے۔ کلیسا اور تخت کے درمیان کشمکش شروع ہوگئ اور مذہب کھوکھلا ہوتا چلا گیا۔ کلیسا کا یہ آہنی شکنجہ توڑنے میں مغرب کو کئ سو سال صرف کرنے پڑے۔ یہ وہ دور تھا جسے مغرب کا دور تاریک کہا جاتا ہے۔ اسے تاریک سمجھنے کی وجہ اس پورے عہد میں تخلیقی قوتوں کا بنجر پن ہے۔ ایک ایسا عہد جب ادب، تحقیق، فنون لطیفہ اور فلسفے کی نمو کے روک دیا گیا۔ کلیسا نے قریباً ایک ہزار سال تک سارے یوروپ کو عیسائیت کی ایک ایسی مضبوط تنظیم میں جکڑے رکھے جو مشین کے مشابہ تھی اور جس نے فرد کی انفرادیت کو کچل دیا تھا۔ ان اعتقادات نے زندگی کو ایک خول میں بند کر کے اس کا بیرونی چھلکا جامد کر دیا تھا۔

 یہ اس زمانے کا ہی قصہ ہے جب گلیلیو کو مذہبی عدالت میں حاضر کیا گیا۔ اس پہ الزام تھا کہ اس نے یہ کہہ کر کہ زمین حرکت کرتی ہے  بائبل میں موجود اس بیان کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے  کہ  زمین ساکن ہے اور سورج اسکے گرد حرکت کرتا ہے۔ اپنے اس باغیانہ خیال کی وجہ سے اسے قید وبند کی صعوبت سے گذرنا پڑا۔ بالآخر گلیلیو نے عدالت کے سامنے توبہ کی کہ وہ آئندہ نہیں کہے گا کہ زمین حرکت کرتی ہے لیکن عدالت سے باہر آ کر اس نے کہا ' میں نہیں کہونگا کہ زمین حرکت کرتی ہے لیکن زمین اسکے باجود حرکت کرتی رہے گی'۔

شہرہ ء آفاق کالون نے مشیل سرقیہ کو ایک طویل عرصے تک قید و اذیت کے بعد زندہ جلا دینے کا حکم دیا۔ اسکا جرم یہ تھا کہ اس نے انسان کے جسم میں دوران خون کا پتہ چلایا تھا۔ حالانکہ اسکے بعد یہی نظریہ تاریکی کے اس اندھیرے کے ہٹنے کے بعد ہاروے نے پیش کیا اور شہرت کمائ۔ ان ناموں کے علاوہ ان لوگوں کی گنتی نہیں معلوم جنہیں کسی سوچ کو حقیقت بننے سے قبل ہی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

اسی معاشرے میں معززین کو زمینیں بخشی گئیں جنکے لئیے وہ صرف بادشاہ کو یا پوپ کو جوابدہ تھے۔ اس پہ بسنے والے لوگ اسے زرخیز بنانے کے ذمہ دار تھے اور اسکی آمدنی پہ انکا کوئ حق نہ تھا۔ البتہ انہیں یہ سہولت حاصل تھی کہ کسی بیرونی حملہ آور کی صورت میں ریاست انہیں تحفظ فراہم کرے گی۔ تو اس طرح سے یہ ایک ایسی غلامی تھی جس سے نجات ممکن نہ تھی۔

اسکے علاوہ ایک محکمہ ء احتساب بھی قائم کیا گیا۔ جو لوگوں کو انکی حدوں سے باہر نکلنے پہ سزا دینے پہ قادر تھا۔ لوگوں کا قصور اجتہاد کی بات کرنا، بائبل کے متعلق کلیسا کی تشریحات میں خامیاں نکالنا، دوسری شادی کرنا، جادو گری میں دلچسپی لینا اور اسطرح کے دوسرے جرائم جنکی ہولناک سزائیں لوگوں کو پابند سلاسل رہنے پہ مجبور کرتی تھیں۔ یہودیوں کے لئیے مخصوص سزائیں الگ تھیں کہ وہ مذہبی عقائد میں انکے حریف تھے۔ محکمہ ء احتساب نےکئ ہزار یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔  اسپین سے لاکھوں کی تعداد میں یہودی جلاوطن ہوئے اور لاکھوں کی تعداد میں یہودیوں کو عیسائ ہونے پہ مجبور کیا گیا۔

جن لوگوں پہ اجتہادی سوچ کا الزام لگایا جاتا انہیں اپنی غلطی سے رجوع کر کے معافی مانگنے کے لئیے مہینہ بھر کا عرصہ ملتا اور جو ایسا نہیں کرتے انہیں شدید سزائیں دی جاتیں، جیسے جلا دینا۔، قتل کر دینا۔ عام طور پہ یہ سزائیں سر عام دی جاتی تھیں۔ احتساب کا یہ عہد تقریباً تین سو سال چلا۔ یہ قتل و غارت گری خدا مے احکامت کے نام پہ کی جاتی تھی کہ مذہبی کتاب میں دشمنون کیساتھ ایسا ہی سلوک رو رکھنے کے لئیے کہا گیا ہے۔

  ادب، تعمیر، دیگر فنون لطیفہ جیسے مصوری اورتحقیق سب پہ عیسائیت کی چھاپ ہونا ضروری تھی۔ نتیجے میں یوروپین  مصوروں نےحضرت عیسیٰ کو گورے رنگ  اور سنہرے بالوں اور رنگین آنکھوں والا یوروپین شخص بنادیا گیا۔ جس سے آج بھی عیسائ مذہب پرست چھٹکارا نہ پا سکے۔

  فرانس جہاں بادشاہت تھی۔ قوم کے مسیحی تشخص پہ زور دیا گیا اور بادشاہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ ملکی قوانین قدیم مسیحی طرز پہ مرتب کرے البتہ یہ حق مذہبی یسوعی جماعت کو ہی رہیگا کہ وہ مختلف مذہبی قوانین کی کیا تشریح پیش کرتے ہیں۔یہ قانون بھی بایا گیا کہ اگر کسی کتاب میں موجود موادمذہب یا مملکت کیخلاف پایا گیا تو ناشر، مصنف اور کتاب فروش کو سزائے موت دی جائے گی۔ یہ ایک معاشرہ تھا جہاں غریب کو غریب رہنے کا مشورہ دیا جاتا تاکہ دولت پہ ریاست کے طاقتور لوگوں کا قبضہ رہے، عوام کو قربانی اور خیرات کا حکم ملتا، اور حکومتی ارکان پہ کوئ ٹیکس نہ تھا۔

یوروپ میں کلیسا کے اس طرز عمل نے ان سائنسی، علمی اور تحقیقی تبدیلیوں کے آنے میں بہت زیادہ رکاوٹ ڈالی جنہوں نے کچھ ہی عرصے میں تہذیب انسانی کو تبدیل کر دیا۔ لیکن اس جبر نے عام انسان کو مذہب سے بیزار کرنے میں ایک اہم رول ادا کیا۔

 یہ دور جس کی کوئ مقررہ تاریخ آغاز یا اختتام نہیں ہے۔ اور اسے بعض مءورخ تسلیم کرنے سے بھی ہچکچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر یہ دور تاریک تھا تو دراصل یہ تاریکی رحم مادر کی تاریکی سے مشابہ تھی۔ یعنی تخلیق کا جذبہ درون خانہ پنپ رہا تھا۔ شاید یہ درست ہو۔ ہر جبر اور ظلم کے نیچے ایک انقلاب سانس لے رہا ہوتا ہے۔ یوروپ نے کسطرح نئے افکار کی روشنی حاصل کی۔ تحریر جاری ہے۔ آپ میں سے جو چاہے اس میں اپنے علم کا اضافہ کر سکتا ہے۔

جاری ہے۔

حوالہ جات؛

اس تحریر کی تیاری میں مندرجہ ذیل ذرائع سے مدد لی گئ ہے۔

تاریخ اور فلسفہ ء تاریخ، مصنف ڈاکٹر مبارک علی

اردو ادب کی تحریکیں، مصنف ڈاکٹر انور سدید

خدا کے نام پہ لڑی جانیوالی جنگ، مصنفہ کیرن آرمسٹرونگ

حریت فکر کے مجاہد، مصنف وارث میر

یوروپین تاریخ کا ایک حصہ

نَئے افکار انکا حصول اور ترویج-۳

11:46 PM

European renaissance, اسپین, فرانس, گلیلیو, لزبن, مغرب میں کلیسا کا کردار, یوروپ کی نشاۃ ثانیہ

فلائینگ کوئین، نسیم حمید

مجھے انڈین فلم چک دے انڈیا بہت پسند ہے۔ وجہ اسکی فلم میں شاہ رخ خان کی موجودگی نہیں ہے بلکہ فلم کی کہانی ہے جو انڈیا کے پسماندہ علاقوں سے تعلق رکھنے والی خواتین کھلاڑیوں  کی کہانی ہے۔ جن میں ایک مرد کوچ اپنی تربییت سے  وہ مہارت اور جذبہ پیدا کر دیتا ہے کہ وہ ہاکی کے ورلڈ کپ میں ایک ٹیم کے طور پہ اپنے ملک کی پہچان بن جاتی ہیں اور دنیا بھر میں اسکے فخر کا باعث۔

یہ کہانی شاید فلمی ہی لگتی، اگر نسیم حمید یہ ثابت نہ کر دیتی کہ دراصل دنیا میں کچھ بھی نا ممکن نہیں ہوتا اور اگر انسان اپنے ہدف جانتا ہو اورانکے حصول کی کوشش کرے تو اس سے فرق نہیں پڑتا کہ اپ پاکستان جیسے ملک کے پسماندہ علاقے میں رہتے ہیں۔ جہاں خواتین کی تعلیم کو عیاشی سمجھا جاتا ہے اور انکے کھیلنے کو غیر اسلامی۔

مجھے یاد ہے کہ اب سے چند سال پہلے لاہور میں ایک میراتھن ہونے والی تھی جس میں بھاگنے والوں کے تمام اہل خانہ کی شرکت متوقع تھی۔ لیکن اسکے خلاف ایک مہم چلادی گئ۔ معاشرے کے ایک طبقے کے نزدیک یہ وطن میں اخلاقی قدروں کے لئے لڑنے والا جہاد بن گیا۔ حالانکہ یہ صرف ایک دوڑ تھی۔ معاشرے میں اگر صحتمندانہ سرگرمیوں کے لئیے جگہ نہ چھوڑی جائے تو یہ توانائیاں نہ صرف کسی غیر پیداواری سرگرمی میں خرچ ہونے لگتی ہیں۔ بلکہ نوجوانوں میں مایوسی پیدا کرتی ہیں۔ تمام ترقی یافتہ ممالک میں کھیل تعلیم کا حصہ ہوتے ہیں اور ہر طالب علم کو کسی نہ کسی کھیل میں حصہ لینا ہوتا ہے۔

 کھیل انسانی توانائیوں کو نہ صرف مثبت طریقے سے سے خرچ کرنے کا نام ہے۔ بلکہ یہ انسان میں دیگر خواص بھی پیدا کرتے ہیں جیسے جہد مسلسل، برداشت، باہمی تعاون،اور باہمی میل جول کے طریقے۔

بہر حال کراچی سے تعلق رکھنے والی اس فلائنگ کوئین نے نہ صرف اس شہر کے باسیوں کا سر اونچا کیا ہے بلکہ وہ پاکستانی خواتین کے لئیے کامیابی کا ایک نیا نشان بن کر ابھری ہیں۔ انہیں ہم سب کی طرف سے اس کامیابی کی مبارکباد۔ اسکے ساتھ ہی وہ تمام لوگ بھی مبارکباد کے مستحق ہیں جنہوں نے اس بائیس لڑکی کو وہ آسانیاں فراہم کیں کہ وہ ہم سبکی فخر کا باعث بنی۔

 اگرچہ کہ یہ حق نسیم حمید کا ہے کہ وہ پیغامات دیں۔ میں انکی کامیابی کی ترجمان بن کر نوجوانوں سے یہ کہنا چاہتی ہوں  کہ کچھ کرنے کا موقع آج ہی کا ہے۔ ہر عہد اپنے نوجوانوں کا ہوتا ہے۔ ہم سے پہلے کے لوگ اپنے حصے کا کام کر گئے۔ یہ ہمارا عہد ہے اور ہمیں یہ ثابت کر دینا چاہئیے کہ ہم تمام ترمشکلوں کے باوجود اسے بدل دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہم انسانی فکر کی اس آزادی پہ یقین رکھتے ہیں جو انسانوں کو اپنے ماحول سے آگاہ کرتی ہے اور جو اسے دوسرے انسانوں کے لئیے آسانیاں پیدا کرنے کے قابل بناتی ہے۔ ہم اس قابل ہیں کہ اپنے لوگوں کو اپنے ملک کو ایک نئ پہچان دیں۔

تندی ء باد مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب

یہ توچلتی ہیں تجھے اونچا اڑانے کے لئیے

تو پھر اپنے پر، پرواز کے لئیے کھول دیں۔ بلندی کی کوئ حد نہیں ہے۔

حوالہ؛

نسیم حمید

نسیم حمید کی کہانی

8:09 AM

karachi., Naseem Hameed, pakistan, پاکستان, ڈھاکہ سیف گیمز, کراچی, نسیم حمید

فروری اے فروری

کل رات مجھے پتہ چلا کہ گوادر میں بھی بسنت کا اہتمام پتنگ اڑا کر کیا گیا۔ اس سلسلے میں سنگھار میں واقع پی سی ہوٹل میں ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں سات آٹھ خاندانوں نے شرکت کی۔ اسکے علاوہ گوادری بلوچوں نے بھی اپنے میدانوں میں پتنگیں اڑائیں۔ ویسے بلوچیوں کو فٹبال کھیلنا پسند ہے۔ اور میں نے گوادر میں اکثر کھیل کے میدانوں میں  اس کے لئیے لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ تو اب چشم تصور سے انہی گوادریوں کو پتنگ اڑاتے دیکھتی ہوں تو بڑا مزہ آتا ہے۔

میں ایک ناکام پتنگ باز ہوں۔ بچپن میں کئ دفعہ پتنگ اڑانے کی کوشش کی۔ لیکن ایک تو پتنگ سطح زمین سے میری بلندی سے زیادہ نہیں اٹھ پاتی تھی جسکی وجہ اسکا میرے ہاتھوں میں ہی رہنا تھا۔ دوسرا  مانجھے یا ڈور کی وجہ سے میری انگلیوں کا کٹ جانا تھا۔ یہ ایسا باریک کٹاءو ہوتا ہے جو اوپر سے اتنا نظر نہیں آتا جتنی تکلیف دیتا ہے۔ ان دو وجوہات کی بناء پہ میں نے اس کھیل کو خیر باد کہہ کر کنچے اور گلی ڈنڈا کھیلنا کی کوشش کی لیکن آگے کیا ہوا۔ یہ پھر کبھی سہی۔ البتہ آخر میں جو ہوا وہ آپکے سامنے ہے۔

فروری کا مہینہ ہمارے ملک میں اگرچہ شروع تو کشمیر پر احتجاج سے ہے لیکن بسنت اور ویلینٹائنز ڈے کی وجہ سے منظر ایکدم تبدیل ہو جاتا ہےاور کچھ لوگوں کی عید ہو جاتی ہے۔ جس میں  قانون بنانے والے، ،کارڈز بنانے والے، پتنگ نانے والے، کارڈز، پھول , اسٹفڈ ٹیڈی بیئر,  چاکلیٹ بیچنے والے، پتنگ بیچنے والے، عشاق اور پتنگ باز سجنا کے علاوہ لکھنے والوں کی بھی ایک بڑی تعداد شامل ہے۔ موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دینی فتووں کا بھی موسم آجاتا ہے۔

سچ ہے یہ رنگا رنگی اپنے وطن میں ہی نظر آسکتی۔ ایک طرف چھجو کے چوبارے پہ بو کاٹا ہو رہا ہے دوسری طرف شہر کے کسی گمنام گوشے میں کچھ بھاری بھاری ہاتھ کچھ نازک نازک ہاتھوں کو گجرے پہنا رہے ہیں اور سرگوشی کر رہے ہیں کاش میں تیرے حسیں ہاتھ کا کنگن ہوتا، کاش  اے کاش میں تیرے کان کا بالا ہوتا۔ جی چاہتا ہے ان نازک نازک ہاتھوں والی گوریوں کے کان میں ایک سرگوشی اور کہوں کہ یہ بالا آخر بلا کیوں بن جاتا ہے۔ مگر نہیں ان خلوت کدوں میں یہ سرگوشیاں اچھی نہیں لگتیں۔ کچھ لوگ اس سودے میں حاصل ہونے والی کمائ گن رہے ہیں۔ اور کچھ قلم اس عوامی ہنگامے کو بدعت قرار دیکر  مصروف جہاد۔

ہمارے ملک میں بسنت کی 'بدعت'  پنجاب کے پیلے سرسوں سے کھلے میدانوں سے شروع ہوئ اور اسے باقی ملک کے ان لوگوں نے جنکا تذکرہ اوپر موجود فہرست میں ہے اپنے اپنے علاقوں میں رائج کرنے کی بڑی کوشش کی۔ لیکن اسے وہ پذیرائ نہیں مل سکی جتنی کہ ویلینٹائنز ڈے کو ملی۔

آج بھی کراچی میں  ڈیفینس کے پوش علاقوں میں شاید کچھ  پتنگیں اڑتی نظر آئں۔ لیکن سرخ گلابوں کے کارڈز ہر دوکان پہ سجے ہیں۔ پھول والوں کے درمیان دوڑ لگی ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اسٹاک جمع کر لیں۔  پھولوں کی قیمتوں میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔

کچھ ذہنوں میں خیالی پلاءو پک رہے ہیں۔ کیا پہنیں گے، کیا کہیں گے اب کیا ہوگا۔ دل کو دھڑکانے اور اسے اس طرح مصروف رکھنے کے لئے ہی یہ سرگرمیاں ہوتی ہیں۔ ورنہ شاعر کیوں کہتا

دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا

وہ تیری یاد تھی، اب یاد آیا

میں اپنی انگلیوں کو دیکھتی ہوں ان پہ مانجھے کی ڈور سے کٹنے کے نشان موجود نہیں۔ ان پہ گلاب کے پھول کے ساتھ موجود کانٹے کی چبھن کے نشان بھی نہیں، مگر پھر بھی سوچتی ہوں،  یہ کیا ہوا دل بے قرار بھر آیا۔

3:40 PM

basant, Gawadar, valentine day, پنجاب میں, کراچی, گوادر, ویلینٹائن ڈے

دہشت گردی بمقابلہ دانشوری

اگرچہ مشتاق احمد یوسفی کے دوست عبد القدوس کی طرح میں بھی جھیل سیف الملوک کی چڑھائیاں کسی ٹٹو کی پیٹھ پہ چڑھ کر طے کرنے کے بجائے پا پیادہ ہی طے کرنا پسند کروں کہ کسی دوسرے کی غلطی کے بجائے اپنی غلطی سے مرنا بدرجہا بہتر ہے ۔  مگر کبھی کبھی اقبال کے فرمودات پہ بھی عمل کرنے کو دل چاہتا ہے۔ یعنی اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل۔ لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے۔

تو ایکدن جبکہ ایک اپائنٹمنٹ پر پہنچنے میں خاصہ کم ٹائم رہ گیا تھا  میں نے  باقی لوگوں سےفارغ بیٹھے ڈرائیور کو مصروف کرنے کے لئیے گاڑی چلانے کی ذمہ داری اسے دیدی۔ وہ حسب معمول تیز لین میں گاڑی اڑا رہے تھے کہ طارق روڈ کے پل پہ پہنچ کر میں نے انہیں یاد دلایا کہ  میں انہیں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ ہمیں پل پہ ہمیں الٹے ہاتھ پہ مڑنا ہے تو سگنل پہ دو لائنوں کو کاٹ کر نکلنے سے بہتر ہے کہ درمیانی لائن میں چلا جائے یا پھر پہلی لین میں آجایا جائے۔ جیسے ہی جملے کا فل اسٹاپ آیا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار تابعداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے عین اسی لمحے آگے پیچھے دیکھے بغیر لین تبدیل کی اورساتھ ہی ایک ہلکی سی ٹکر کی آواز آئ۔ گاڑی رکی اور اب وہ آگے والی گاڑی سے ٹکرا کر کچھ ترچھی حالت میں اس طرح کھڑی تھی کہ دو لینز بلاک ہو گئیں۔ ٹکر اتنی ہلکی تھی کہ بظاہر سب ٹھیک لگ رہا تھا۔ اور میں نے سوچا کہ دونوں ڈرائیورکچھ منہ ماری کے بعد چل پڑیں گے۔ لیکن سب ٹھیک نہ تھا۔

آگے والی گاڑی کا دروازہ کھلا اس میں سے ڈرائیور نکلا اور آکر ہمارے ڈرائیور کے پاس کھڑا ہو گیا۔ یہ صاحب پہلے ہی اپنا دروازہ کھول کر خوش آمدید کہنے کے منتظر تھے۔ لیکن یہ کیا ہوا اس ڈرائیور نے گاڑی میں ہاتھ ڈالا اور اگنیشن میں سے چابی نکال  کر قبضے میں کرلی۔ میں نے پیچھے بیٹھے یہ سارا تماشہ دیکھا اور سر پکڑ لیا کہ لاٹھی تو گئ اب بھینس کا کیا ہوگا۔ دونوں ڈرائیورز کے درمیان الزام تراشی جاری تھی۔ لیکن ظاہر سی بات تھی کہ غلطی ہمارے ڈرائیور کی ہی تھی۔ وہ اکثر ایسا ہی کرتا تھا۔ میں نے سوچا اب اسے بھگتنے دو۔

 بات اس نکتے پہ پہنچی کہ پانچ ہزار دینا ہونگے۔ اب یہ صاحب منہ پھاڑے کھڑے تھے کہ کچھ بھی تو نہیں ہوا ہے کس بات کے پانچ ہزار۔  کچھ دنوں پہلے اسے وارننگ دی گئ تھی کہ روڈ پہ بے احتیاطی دکھانے کی صورت میں خرچہ اسکے ذمے ہوگا۔اس موقع پہ آگے والی کار کا دروازہ ایکبار پھر کھلا اور ایک تقریباً ساٹھ پینسٹھ سال کے صاحب تھری پیس سوٹ میں بر آمد ہوئے اور آتے ہی ڈرائیور سے کہنے لگے کہ گاڑی کے کاغذات میرے حوالے کرو ورنہ پانچ ہزار دو۔ اس موقع پہ فلم میں ان خاتون نے  اپنی مداخلت ضروری سمجھتے ہوئے مس بنکاک کی طرح اینٹری دینے کی کوشش کی۔ اور وہ گاڑی سے اتر کر آگے والے ڈرائیور کے پاس پہنچیں اور اسکے ہاتھ میں لٹکی چابی پہ زور لگاتے ہوئے کہا۔' فوراً چابی واپس دو ورنہ'۔ اسکے بعد انہوں نے بغیر سوچے سمجھے کہا 'ورنہ میں قریبی پولیس اسٹیشن پہ جا کر اطلاع کرتی ہوں کہ میری گاڑی چوری کر رہے تھے تم'۔ ڈرائیور اور ان صاحب نے غضبناک ہو کر ان بالشت بھر کی خاتون کو دیکھا۔ 'ہاں چلیں کہاں جانا ہے۔ اب تو بات دس ہزار تک جائیے گی'۔ اپنے تئیں انہوں نے انکو مزید خوفزدہ کربے کی کوشش کی۔ یا اللہ، کیا مصیبت ہے۔ کیسے اس سے جان چھٹے گی۔ پل پر اور اسکے پیچھے تک ٹریفک جام ہوچکا تھا۔ اور مسئلہ حل ہونے کی کوئ صورت نظر نہ آرہی تھی کہ خاتون کے پاس ایک بائک آکر رکی۔ اس پر سے ایک چوبیس پچیس سالہ  مضبوط جثّے  اور درمیانے قد کے شخص نے چھلانگ لگائ۔ اور قریب پہنچتے ہی ڈرائیور کو چیخ کرحکم دیا کہ چابی ان خاتون کو دو۔ اتنی دیر سے تم سے کہہ رہی ہیں۔ سنتے نہیں ہو تم کیا۔ اتنی دیر سے سارا ٹریفک روک رکھا ہے۔ اسکا تحکمانہ انداز دیکھ کر وہ ابھی شش وپنج ہی میں تھا کہ اس نے ایک تھپڑ اسکو رسید کیا۔ اگلے ہی لمحے چابی میرے ہاتھ میں تھی۔ دوسرا تھپڑ پڑا تو ڈرائیور گاڑی کے اندر۔ سوٹ میں ملبوس صاحب ہکلائے 'یہ کیا ہو رہا اس گاڑی نے میری گاڑی کو ٹکر ماری تھی'۔ 'کچھ نہیں ہوا انکل، اب جا کر اپنی گاڑی میں بیٹھیں۔ آپکی گاڑی بالکل صحیح ہے۔ روڈ پہ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے '۔ وہ گھگھیائے ہوئے اپنی گاڑی میں جا بیٹھے۔ میرا ڈرائیور اپنی جگہ سنبھال چکا تھا۔ اس غیبی مددگار نے مجھے دیکھا، مسکراتی آنکھوں سے آگے چلنے کا اشارہ کیا اور یہ جا وہ جا۔

کیا  دہشت گردی کو دانشوری نہیں، دہشت گردی ہی شکست دے سکتی ہے؟

12:11 AM

Karachi, Tariq road, طارق روڈ. روڈ ایکسیڈنٹ, کراچی, مشتاق احمد یوسفی

نئے افکار کا حصول اور انکی ترویج-۳

اخوان الصفاء نے اپنے فرقے میں شامل لوگوں کو اس بات کا پابند کیا کہ انکی خاص مجالس ہوں۔ اوقات معینہ پہ ہونے والی ان مجالس میں کوئ اجنبی شرکت نہ کرے۔ اس میں وہ اپنے علوم پہ بحث کریں اور انکے اسرار پہ گفتگو ہو۔انکی بحث کے موضوعات علم نفس، حس محسوس، عقل معقول کے علاوہ کتب الہٰیہ، تنزیلات نبویہ کے اسرار اور مسائل شریعت کے معنی نیز ریاضی، عدد ہندسہ، نجوم، تالیف ہوا کرتے تھے۔

اپنے پیروکاروں کے لئیے انکا کہنا تھا کہ کسی علم سے نفرت نہ کریں، کسی کتاب کا مطالعہ ترک نہ کریں اور نہ کسی مذہب سے تعصب برتیں۔ کیونکہ اخوان الصفاء کا مذہب تمام مذاہب پہ حاوی ہے۔

انکا کہنا تھا کہ اس فریبی دنیا میں بعض لوگ ایسے ہیں جو علماء کا جامہ پہن کر اہل دین کا دھوکا دیتے ہیں وہ نہ فلسفے سے واقف ہوتے ہیں اور نہ شریعت کی انکو تحقیق ہوتی ہے۔ آگے ان لوگوں کی مزید خصوصیات بیان کرتے ہوئے جو کہ اس مضمون کو طویل کر دیں گی وہ کہتے ہیں ان لوگوں سے احتراز کیا جائے۔ انکا کہنا تھا کہ فرسودہ بوڑھوں کی اصلاح میں کوشاں نہ ہوں۔ یہ لوگ بچوں جیسے فاسد  اور ردی خیالات رکھتے ہیں اور تمہیں پریشان کریں گے۔ اور اپنی حالت کی اصلاح بھی نہ کریں گے۔  نصیحت سلیم الطبع نوجونوں کے لئے ہے۔ اللہ نے ہر نبی کو نوجوانی میں نبوت عطا فرمائ اور اپنے ہر بندے کو اس وقت حکمت دی جب وہ عالم شباب میں تھا۔

اخوان الصفاء نے اپنے پیروکاروں کے عمر کے حساب سےچار درجے متعین کئیے۔

اہل صنعت

؛ انکی عمر پندرہ سال کے قریب، یہ پہلے مرتبے کے لوگ ہیں  جنکی خصوصیات، نفس کی صفائ، حسن قبول، اور سرعت تصور ہے۔ انہیں 'ابرار'کہا جاتا تھا۔

اہل سیاست

؛ انکی خصوصیات بھائیوں کی مراعات، سخاوت نفس، شفقت، رحم ہیں۔ یہ خصوصیات تیس سال کی عمر میں حاصل ہوتی ہیں۔ اس مرتبے کے لوگوں کو 'اخیار اور فضلاء' کہا جاتا تھا۔

بادشاہ

؛ یہ تیسرا مرتبہ تھا جو چالیس سال کی عمر میں حاصل ہوتا تھا اسکا تعلق امر و نہی امداد، دفع عناد اور دشمن سے مقابلے کے وقت اسکی مخالفت کو نرمی، لطف اور مدارت کے ذریعہ دفن کرنے پہ ہے۔ انہیں 'فضلائے اکرام' بھی کہا جاتا تھا۔

نبی اور فلسفی

؛ یہ تسلیم اور تائید الہی کو قبول کرنا اور حق تعالی کا اعلانیہ مشاہدہ کرنا ہے۔ چونکہ معراج کا واقعہ لگ بھگ اسی عمر میں ہوا تھا تو یہ پچاس برس کی عمر والوں کو تفویض کیا گیا۔ اسکے ذریعے انسان عالم ملکوت کی جانب پرواز کرتا ہے اور قیامت کے حالات جیسے نشر، حشر، حساب، میزان، صراط، دوزخ اور خدائے تعالی کے قرب کا مشاہدہ کرتا ہے۔ انکو ملائکہ بھی کہا جاتا تھا۔ انکا کہنا تھا کہ فیثا غورث نے اپنے رسالہ ذہبیہ کے آخر میں اسی طرف اشارہ کیا کہ۔'اگر تو میری ہداہت پہ عمل کرے تو جسد سے علیحدہ ہونے کے بعد ہوا میں باقی رہیگا۔ نہ تو پھر اس دنیا میں لوٹے گا نہ تجھ پہ موت کا حملہ ہو گا'۔

تو جناب میں اخوان الصفاء کے فلسفے کی تفصیل میں جائے بغیر ان کی یہ دلچسپ کہانی یہاں ختم کرتی ہوں۔ لیکن ہم دیکھ سکتے ہیں کہ انسان کی عقلی قوتوں کو کھنگالنے کا کام آ ج سے ہزاروں برس پہلے بھی کیا گیا اور خود مسلمانوں  میں سے بھی کئ گروہ اس طرف تمام تر سختیوں اور پابندیوں کے باوجود متوجہ ہوئے۔ اب ہمیں سرسید کی خدمات کا جائزہ لینے سے پہلے یوروپ کے دور تاریک اور وہاں پیدا ہونے والے رد عمل پہ ضرور نظر ڈالنی چاہئیے کہ یہ ہمارے ایک مبصر کی صائب رائے ہے۔ لیکن اس سے پہلے میں سوچتی ہوں کہ اپنے کچھ قارئین کی دل پشوری کا سامان کروں کہ وہ تھک گئے ہونگے۔ ہم اکیسویں صدی میں رہتے ہیں۔ دنیا آواتار دیکھ رہی ہے اور آپ اخیار کا تذکرہ کر رہی ہیں۔

 جاری ہے۔

حوالہ جات؛

کتاب 'تاریخ فلاسفۃ الاسلام'، مصنف محمد لطفی جمعہ۔

اخوان الصفاء

نئے افکار کا حصول اور انکی ترویج-۲

نئے افکار کا حصول اور انکی ترویج-

۱

12:28 AM

Ikhwan alsafa, Mohammad lutfi Juma, اخوان الصفاء, تاریخ فلاسفۃ الاسلام, فیثا غورث

نئے افکار انکا حصول اور انکی ترویج-۲

فلسفہ ، اگر انسانی مشاہدات کو عقل کی کسوٹی پہ پرکھنے کا نام ہے تو سائینس ایک قدم آگے بڑھتی ہے اور اس میں تجربے کو بھی شامل کر دیتی ہے ۔

دور عباسی میں فلسفے کو بڑی اہمیت حاصل ہوئ خلیفہ مامون ا لرشید نے فلسفے کی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کرایا۔ اطباء نے اس میں بالخصوص دلچسپی لی۔ اس زمانے میں فلسفیوں کو الحاد کا الزام دیا جاتا تھا اور  فلسفہ اس قدر    کفر کے مماثل تھا کہ ابن تیمیہ نے اسکے متعلق لکھا کہ' میں نہیں سمجھتا کہ خدائے تعالی مامون سے غافل رہیگا۔ بلکہ اس نے امت پہ جو مصیبت نازل کی ہے اسکا ضرور اس سے بدلہ لیگا'۔

ان حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اہل فلسفہ اپنے خیالات کوچھپانے لگے اور یوں کئ خفیہ تنظیمیں وجود میں آئیں۔ ان میں سے ایک اخوان الصفاء ہے۔ جن لوگوں کو جاسوسی کہانیوں سے دلچسپی ہے انہیں یہ ساری حقیقت بھی خاصی دلچسپ لگے گی کہ انکے اجلاس پوشیدہ ہوا کرتے تھےجن میں فلسفے کی مختلف اقسام پہ گفگتگو ہوتی تھی۔ اس میں یونان، فارس اور ہند کے فلسفوں سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد انہیں اسلام کی روح میں ڈھالا گیا تھا۔

انکا خیال تھا کہ شریعت اسلامیہ جہالت اور گمراہی سے آلودہ ہو گئ ہے۔ اور اسکی صفائ صرف فلسفے سے ہی ممکن ہے۔ اور جس وقت فلسفہ ء یونان اور شریعت محمدیہ میں امتزاج پیدا ہو جائیگا تو اس وقت کمال حاصل ہوجائے گا۔

  ان تمام خیالات کا مجموعہ باون رسائل کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جنکا نام ' رسائل اخوان الصفاء' رکھا گیا۔ البتہ ان فلسفیوں کے نام پوشیدہ رکھے گئے۔

 یہ رسائل اپنے مولفین کی کامل غوروفکر اور انہماک کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور ان میں اتنے جدید خیالات بھی پائے جاتے ہیں جنکی اس زمانے میں بڑی شہرت ہے جیسے نشو ونما اور ارتقاء کے نظرئیے۔

 یہ رسائل معتزلہ اور انکی تقلید کرنیوالوں نے بھی استعمال کئیے، بعد ازاں یہ  قرطبہ لیجائے گئے۔

یہ رسائل بمقام لینبرگ ۱۸۸۳ میں طبع ہوئے اور بمبئ میں ۱۸۸۶ اور مصر میں ۱۸۴۹ اور لندن میں ۱۸۶۱ میں طبع ہوئے۔ انکا ہندوستانی زبان میں ترجمہ بھی کیا گیا۔

ان رسائل کی چار بنیادی قسمیں ہیں۔

اول: چودہ رسالے ریاضی کے متعلق

دوئم: سترہ رسالے طبعی جسمانییت سے متعلق

سوم: دس رسالے عقلی نفسیات سے متعلق

چہارم:  گیارہ رسالے احکام الہی سے متعلق

  میں انکی تفصیلات میں جانے سے گریز کرتی ہوں لیکن یہ بتاتی چلوں کہ ان باون رسالوں میں انتہائ تفصیل سے دنیا کے تقریباً ہر موضوع پہ گفتگو کی گئ ہے۔

انہوں نے اپنے علوم کے ماخذ چار قسم کی کتابوں کو قرار دیا۔ ایک تو وہ کتب جو ریاضی اور طبیعیات میں حکماء اور فلاسفہ کی تصنیف کردہ ہیں۔ دوسری وہ جو انبیاء علیہ السلام پہ نازل ہوئیں۔تیسری طبیعیات کی وہ کتابیں جن میں کائنات میں موجود چیزوں کی اشکال اور انکی مختلف قسموں پہ بحث کی جاتی ہے اس مین فلک سے لیکر نباتات، حیوانات اور انسان بھی شامل ہے۔ اور چوتھی وہ کتب الہی جنکو صرف پاکیزہ سرشت ملائکہ ہی چھو سکتے ہیں اور جو بزرگ نیکوکار فرشتوں کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ اور ان میں انسان کی تقدیر و تدبیر و تحریک  سے لیکر اسکے اعمال تک بحث میں آتے ہیں۔

یہاں تک آتے آتے میں حیران ہوتی ہوں کہ آج سے تقریباً گیارہ سو سال پہلے کسی گروہ نے اتنے نظم وضبط کے ساتھ اتنے نا مصائب حالات میں کیسے کیسےعقلی کارنامے انجام دئیے۔

اخوان الصفاء پہ گفتگو جاری ہے۔

جاری ہے۔

حوالہ؛

کتاب، 'تاریخ فلاسفۃ السلام ' مصنف  محمد لطفی جمعہ۔

اخوان الصفاء

نئے افکار کا حصول اور انکی ترویج-۱

10:19 PM

Abbasid caliphate, Ikhwan alsafa, ابن تیمیہ, اخوان الصفاء, تاریخ فلاسفۃ الاسلام, عباسی دور, مامون الرشید, محمد لطفی جمعہ

نئے افکار کا حصول اور انکی ترویج-۱

مسلمان اکابر فلسفہ کا سلسلہ کندی سے شروع ہوتا ہے اور ابن رشد پہ ختم ہوتا ہے۔ اسلامی تحریک کا دور عروج ابن رشد سے بہت عرصہ پہلے اور عثمانی فتوحات کے فوراً بعد ختم ہو چکا تھا۔ دور زوال یعنی تیرھویں صدی میں ابن خلدون کے بعد یہ پھر نہ اٹھ سکا۔  اگر ان حکماء کا وجود نہ ہوتا تو یوروپ کا کوئ جدید فلسفی عالم وجود میں نہ آسکتا تھا۔  ان علماء  کی کتابوں کے پوروپینز زبان میں ترجمے کئیے گئے اس طرح یوروپینز نے ان افکار کی نشر واشاعت کی اوراپنے اشتیاق سے اس میں مزید اضافہ کیا۔  انکی اس تجارت میں انہیں بے حد نفع ہوا۔

اسلام کے ابتدا ئ دور میں اسلام ایک مدنیت کا نام تھا۔ اور اسی قیاس کی بناء پہ اسرائیلی اور مسیحی فلسفیوں اور دوسرے آزاد خیال مفکرین کو اسلامی تمدن میں پھلنے پھولنے کے مواقع ملے اور عباسی، اموی اور فاطمی خلفاء نے غیر مسلم مصنفین، مفکرین، اور ادیبوں کو اپنا قرب بخشا ۔ انہیں حکومت کے اعلی عہدوں پہ فائز کیا۔اس سلسلے میں کچھ نام لئیے جا سکتے ہیں جیسے سعید بن یعقوب، ہموئیل بن حنفی جو یہودی تھےاور ایک اسرائیلی عالم موسی بن میمون جو میمونید کے نام سے مشہور ہے۔

اسلام کے ابتدائ سوا سو سال عروج کا زمانہ ہے جس میں جمودی فکر ختم ہوا اور لوگوں میں مطالعہ علم اور بحث نظر پیدا ہوا۔ عباسیوں نے اپنے عہد میں علم و ادب کی ترقی کے لئیے بے حد کام کیا۔ اور اس وجہ سے رعایا میں بھی علم سے محبت پیدا ہوئ۔ دور عباسی اس حدیث سے متائثر تھا کہ ایک عالم کے قلم کی سیاہی، مجاہد کے خون سے بہتر ہے۔ انکے عہد میں جو دراصل تین ادوار پہ مشتمل ہے۔  دوسری زبانوں سے مختلف علوم عربی زبان میں منتقل کئیے گئے۔ان خلفاء کے زمرے میں جنہوں نے اجنبی یا داخلی علوم کو یونانی، فارسی، سریانی اور ہندی زبانوں میں سے عربی میں ترجمہ کروایا۔ ایک تو منصور ہے جس نے فلکیات اور طب کی جانب توجہ کی۔ دوسرے ہارون رشید جسکے زمانے میں ریاضیات میں کتاب 'محیطی' کا ترجمہ ہوا۔ پھر مامون نے مختلف علوم بالخصوص فلسفے اور منطق کے ترجمے کا اہتمام کیا۔ اس طرح مختلف ادور میں جن کتابوں کا ترجمہ کیا گیا انکی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئ جن میں سے اکثر یونانی زبان سے منتقل کی گئیں۔ خود ان لوگوں کی تعداد درجنوں تک پہنچتی ہے جنہوں نے ترجمہ کرنے میں حصہ لیا۔

یہ امر واضح ہے کہ مسلمانوں نے اپنے عہد زریں میں تمام مروجہ علوم، فلسفہ، طب، فلکیات، ریاضیات اور اخلاقیات کو عربی میں منتقل کیا اور ہر قوم کا بہترین سرمایہ اپنے قبضے میں کیا۔ان تمام تالیفات، جنکا عربی میں ترجمہ کیا گیا، کی حیثت بیج جیسی تھی۔ ان سے بارآور درخت کے اثرات آج بھی موجود ہیں۔عباسیوں کے پہلے دور میں ترجمہ کرنیوالوں کی اکثریت غیر مسلم تھی۔ جب ترجمے کا کام مکمل ہو چکا تو مسلمانوں نے اصل کام کی طرف توجہ کی۔  اور اس مرحلے پہ اسلام کے پہلے فلسفی یعقوب کندی کی آمد ہوتی ہے۔ پھر اسکے بعد بہت سے فلاسفہ، حکماء، اطباء،علمائے ریاضیات، فلکیات اور کیمیا نے جنم لیا جنکی شہرت سے تمام عالم گونج اٹھا۔حکمت کا یہ سلسلہ گو کہ گیارہویں صدی تک چلا اور ابن خلدون کو شامل کریں تو تیرہویں صدی تک،  لیکن اسکے اثرات آج بھی موجود ہیں۔

 نوٹ؛ یہ سلسلہ جاری ہے اور اس کے ، اگلے حصے میں، میں سرسید احمد خاں کی اس تحریک کا تذکرہ کرنا چاہونگی جو ہند کے مسلمانوں میں  اجنبی علوم کی ترویج  کا باعث بنی۔

جاری ہے۔

حوالہ؛

اس تحریر میں موجود مواد کتاب تاریخ 'فلاسفۃ الاسلام' سے لیا گیا ہے جسکے مصنف  عرب عالم 'محمد لطیفی جمعہ' ہیں۔اسکا اردو ترجمہ ڈاکٹر میر ولی الدین پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن نے کیا ہے۔تحریر میں کچھ حصہ ڈاکٹر انور سدید کی کتاب 'اردو ادب کی تحریکیں' سے بھی لیا گیا ہے۔

عباسی خلفاء

عباسی اور اموی عہد حکومت

11:29 PM

Abbasid caliphate, ابن خلدون, ابن رشد, انور سدید, عباسی دور حکومت، کندی

کراچی میں رینجرز

تازہ ترین احکامات کے مطابق کراچی میں رینجرز کو پولیس کے اختیارات دے دئیے گئے ہیں۔  اس سے قبل انیس سو چھیاسی سے لیکر نوے کی دہائ تک کراچی میں رینجرز کا راج رہا۔ اور انہوں نے اس سونے کی چڑیا سے خوب کمایا۔ اس وقت کراچی کا ہر نوجوان ایم کیو ایم کا غنڈہ تھا۔ جسکے ساتھ رینجرز جو دل چاہے سلوک کرتی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت کراچی کے نوجوانوں کو یہ کرنے کی تربیت دی جا رہی تھی۔ اس عرصے میں رینجرز کے اختیارات اتنے زیادہ تھے کہ وہ جسکو چاہتے پکڑ کر لیجاتے۔ اور عام لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ پولیس تو ایک دو ہزار میں مک مکا کرتی ہے۔ رینجرز کے پاس جانے کا مطلب بیس پچیس ہزار سے کم نہیں ہوتا۔

انہی وقتوں میں مجھے یاد ہے ایک دفعہ ڈبل سواری پہ پابندی ہٹائ گئ تو ٹی وی پہ یہ اعلان سننے کے بعد  میرا ایک انیس بیس سالہ رشتےدارلڑکا موٹر سائیکل پہ اپنے دوست کے ساتھ نکل گیا۔ رینجرز والوں نے اسکا پیچھا کیا، اور پکڑ کر بیچ روڈ پہ اتنا مارا کہ اسکی کلائ کی ہڈی ٹوٹ گئ۔ اور بیہوشی کی حالت میں وہیں پھینک کر آگے روانہ ہوگئے۔ اسکا دوسرا ساتھی موقع سے فرار ہوا اور تب گھر والوں کو اسکی زبانی اطلاع ملی۔

ایسا اگر مقبوضہ کشمیر میں ہوتا تو تمام پاکستانی لیڈران مذمتی بیانات جاری کرتے۔ کیونکہ وہ انکے مسلمان بھائ ہیں۔ قصور ان مسلمان بھائیوں کا یہ تھا کہ رینجرز والوں کو اس حکم کی کاپی نہیں ملی تھی۔ یہ تو ایک معمولی سا قصہ ہے۔ جانے کتنے نوجوانوں کو روندا گیا کہ اب ان جوانوں کو ہتھیار اٹھاتے کوئ افسوس نہیں ہوتا۔ اور اب اس حکم کے بعد مزید کتنوں کی باری آتی ہے۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے جیو پہ حامد میر کا پروگرام دیکھا۔ جس میں ایم کیو ایم کے حیدر رضوی، پی پی کے نبیل گبول اور اے این پی کے شاہی سید صاحب سے کراچی میں ٹارگٹ کلنگ کے حوالے سے بات ہو رہی تھی۔ نبیل گبول صاحب نے اپنے جیالے انداز میں ایک نہایت'کارآمد' تجویز پیش کی کہ کراچی کے سب منتخب ممبرز کو اپنے علاقوں کا ذمہ لینا چاہئیے۔ اور میں لیاری اور ملیر کا ذمہ لیتا ہوں کہ وہاں ایسا نہیں ہوگا۔

میرے ایک جاننے والے کو نبیل گبول صاحب کے علاقے میں ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بناتے ہوئے بیس دن پہلے مار دیا گیا۔ وہ صاحب اس علاقے سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ دوران سفر انکے علاقے کی مسجد میں نماز پڑھنے چلے گئے مسجد سے نکلے تو چار افراد انہیں پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے اور شام کو ایدھی والوں کا فون آیا کہ آکر لاش پہچان لیں۔

پیپلز پارٹی نے اپنے ووٹرز کے حلقوں کو کچھ نہیں دیا سوائے مجرمانہ سرگرمیوں کی پشت پناہی کے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دوسرے لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ ہتھیار ہاتھ میں اٹھائیں۔ اور آج بھی وہ اپنی داداگیری میں مصروف ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے راول پنڈی میں مرنیوالی بے نظیر کا بدلہ کراچی کو جلا کر لیا۔ اس سارے واقعے میں کراچی والوں کا کیا قصور تھا۔ اور کیوں اس وقت پکڑے جانیوالے ملزمان چھوڑ دئیے گئے۔ اس وقت نبیل گبول یا انکی پارٹی نے اپنے علاقے کا ذمہ نہیں لیا تھا۔ یا شاید زرداری صاحب پاکستان کھپے کا نعرہ تخلیق کرنے کے مراحل میں تھے۔

 وہ لوگ جو ایم کیو ایم کے وجود پہ ناک منہ چڑاتے ہوئے اہل کراچی پہ پھٹکاریں بھیجتے ہیں کہ وہ انہیں کیوں سپورٹ کرتے ہیں کیا انہیں اب بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ اپنے ہاتھوں میں ہتھیار کیوں اٹھاتے ہیں۔

کل رات کو ساڑھے نو بجے جب میں شہر کی سڑک سے گذر رہی تھی تو اس مصروف ترین سڑک پہ پھیلے ہوئے سناٹے اور اندھیرے کو دیکھتے ہوئے سوچا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ جیسے آپکے دوست ہوں آپ بھی ویسے ہی ہوجاتے ہیں یا جیسے آپکے دشمن ہوں ویسا ہی بننا پڑتا ہے۔ کیا اس شہر کے رہنے والوں کو مجبور کر کے اپنا جیسا بنانے کی سازشیں کامیاب ہو رہی ہیں۔ کیا ہمیں بھی اب ہتھیار کی بالادستی کو مان لینا چاہئیے۔

میرے آگے ایک ٹھیلے پہ کینو سنبھالتا ہوا ایک مایوس پٹھان جا رہا تھا ۔ عام دنوں میں وہ شاید رات بارہ بجے تک کھڑا رہتا لیکن اس وقت ایسا ممکن نہیں تھا۔ کچھ پٹھان بھی تو مارے گئے ہیں۔ اسلحے کی سیاست میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کوئ نہیں بچتا۔

کراچی میں ہونیوالی ٹارگٹ کلنگ کی عدالتی تفتیش ہونی چاہئیے۔  نہ صرف یہ بلکہ عدالت کو ازخود اس بات کا نوٹس لینا چاہئیے کہ یوم عاشور پہ آگ لگانے والے لوگ کون تھے۔ جبکہ ایک بڑی تعداد عینی شایدین کی یہ کہتی ہے کہ لوٹ مار کرنیوالے لیاری سے تعلق رکھتے تھے۔ رینجرز کو یہ اختیار دینے کا مطلب ایک اور مکروہ تاریخ لکھنے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

حوالہ؛

کراچی میں رینجرز

1:04 AM

liyari, rangers in karachi, target killing in karachi, کراچی میں ٹارغت کلنگ, کراچی میں رینجرز

غالب اور بہتّر حوریں

غالب نے کہا کہ سو پشت سے ہے پیشہ آباء سپہ گری، کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے۔   تحریراً، انہوں نے بھی مغل بچہ ہونے کی وجہ سےاسی بات پہ اکتفا کیا کہ یا تو مارو یا مار رکھو۔ لیکن افسوس تلوار اپنے ہاتھ میں کبھی نہ اٹھائ کہ خانہ ء دل میں مژگاں کی تلواریں تو گڑی رہتی ہیں، دستی تلواروں کا کام نہیں۔ ویسے بھی جو گڑ سے مر رہاہو اسے تلوار سے کیا مارنا۔ اگرچہ کہ فی زمانہ گڑ سے مارنے کا طریقہ بھی استعمال ہو رہا ہے۔ لیکن اس زمانے کے بارے میں کیا کہیں ہر غیر مستعمل طریقہ مرنے اور مارنے کے لئیے استعمال ہو رہا ہے۔ جدت شاید اسے ہی کہتے ہیں۔ خیر بات غالب کی ہو رہی تھی۔ایک واضح وجہ جو سمجھ میں آتی ہے اپنے  آباء کے پیشے سے انحرف کی۔وہ انہوں نے کچھ اس طرح پیش کی کہ،

ایسی جنت کا کیا کر ے کوئ

جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں

قیاس کہتا ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ میدان جنگ میں مارے جانے کے بعد انعام میں جو حوریں ملیں گی وہ اسٹاک میں ایک دفعہ بنا لی گئ ہیں اور بس ان میں سے ہی بہتّر  اب ہر مرد مجاہد کے حصے میں آتی رہیں گی۔ ایسی بہتّر حوروں کے اپنے پہلو میں رہنے سے وہ اتنے خائف تھے کہ شاعری اور شوق خمار کے بعد انکساری سے کچھ اور تدبیروں پہ غور کیا کرتے تھے۔

مرنے کی اے دل، اور ہی تدبیر کر کہ میں

شایان دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

لوگوں کا کہنا ہے کہ ایسی ہی ایک تدبیر کے نتیجے میں انہوں نے قرض کی مے پینے کی لت پالی۔ لیکن  بعد میں اس معاملے کو بروز ابر مہتاب کبھی کبھی پہ چھوڑ کے  علم بغاوت بلند کیا اور  شدت جذبات میں حوروں کی تحقیر کرنے میں کوئ کسر نہ چھوڑی۔ کچھ بی جمالو صفت لوگوں کا کہناہے کہ معاملہ کو اس نوعیت پہ پہنچا دیا کہ خاکی خواتین اور حوروں کو آمنے سامنے کر کے خاکی خواتین کے پاءوں دھوتے رہے اور اہل تماشہ کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کی کوشش میں اس طرح کی اطلاعات پہنچائیں کہ

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لینگے قیامت میں تمہیں

کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

یوں ایسی مغرور خاکی خواتین سے بیزار ہونے والوں کا  ایک حلقہ وجود میں آگیا جو

آج حیرانی سے پوچھتا ہے کہ خاکی ناپاک عورتوں کا دنیا میں کیا کام ہے۔

انہی لگائ بجھائ کرنے والوں کا فرمانا ہے کہ محترم شاعر نے اپنی شاعری کے ہنر کو اس جنگ میں بخوبی استعمال کیا اور خاکی خواتین کا دماغ خراب کرنے میں کو ئ کسر نہ چھوڑی۔

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے

حوران خلد میں تیری صورت مگر ملے

ان عناصر کا یہ بھی کہنا ہے کہ آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے انہوں نے آج پیش آنیوالے واقعات کا میں دخل اندازی کرنے کی کوشش کرتے ہوئے جنت کو بھی بس ایسی ویسی جگہ قرار دینے کی کوشش کی، اور کہا

کم نہیں جلوہ گری میں، ترے کوچے سے بہشت

یہی نقشہ ہے، ولے اسقدر آباد نہیں

یہاں میں اتنا ہی کہہ سکتی ہوں کہ وہ دوزخ کی آبادی کو جنت میں تلاش کر رہے تھے ، اور اسکا سرا کسی کے کوچے سے ملا دیا۔ لیکن یہ بھی انکی ادا ہی تھی ورنہ وہ یہ کیوں کہتے کہ

سنتے ہین جو بہشت کی تعریف، سب درست

لیکن خدا کرے، وہ ترا جلوہ گاہ ہو

انکی اس قسم  کی باتوں پہ کچھ بد بختوں نے جب  انہیں کافر قرار دینے کی کوشش کی تو انہوں نے اس الزام کو ایک جنبش قلم سے پرے کر دیا کہ ہوں ولی پوشیدہ اور کافر کھلا۔ امتداد زمانہ سے اب اس بات پہ فخر کیا جانے لگا ہے کہ پوشیدہ طور پہ کافر ہوں مگر کھلے ولی ہوں۔ جناب گئے زمانے کے بزرگ بھی کیا طبیعت رکھتے تھے۔

کچھ دشمنوں نے یہ بھی پھیلانے کی کوشش کی یہ سب انہوں نے پریزادوں سے انتقام لینے کے لئیے کیا تھا۔ اور اسی لئیے انہوں نے کہا کہ

ان پریزادوں سے لینگے خلد میں ہم انتقام

قدرت حق سے یہی، حوریں اگر واں ہو گئیں

لیکن جیسا کہ کوئ بھی دیکھ سکتا ہے کہ اس شعر میں بھی حوروں سے انکی مراد یہی خاکی خواتین ہیں۔انکی خاکی خواتین سے یہ انس و محبت دیکھ کر یہ حقیر، انجمن آزدی ء نسواں سے یہ التماس کرنا چاہتی ہے کہ انہیں حقوق خاکی خواتین کے علمبرداروں میں سے ایک سمجھا جائے اور تمام رپورٹس اورخبروں میں انکی شاعری کی ترویج کی جائے۔مملکت خداداد میں جہاد کیخلاف چلنے والی تحریکوں میں اس بات کا تذکرہ بار بار کیا جائے کہ حاصل ہونے والی بہتّر حوریں کس قدر پرانی ہیں کہ اماں حوا کی نانی ہیں۔ انہیں بتایا جائے کہ دنیا میں ایک مخلوق عورت نامی بھی بستی ہے اور اسکے ساتھ رہنے سے لڑائ بھڑائ کی صلاحیتیں گھر کی گھر میں ہی خرچ ہو جاتی ہیں۔ اور انہیں قابو میں رکھنے کی فکر میں،مرنے کے بعد کیا ہوگا کی فکر سے نجات مل جاتی ہے۔

مخالفین سے درخواست ہے کہ اس قسم کے شعر لا کر غالب کے صحیح الدین ہونے اور جانبداریت پہ مسئلہ نہ کھڑا کریں کہ

چھوڑونگا نہ میں بت کافر کو پوجنا

چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

یہ سب دشمنوں کی اڑائ ہے۔ وہ بہرحال خاکی مسلمان خواتین کے قدردانوں میں سے تھے اور  اپنی اس غلطی سے یہ کہہ کر رجوع کر چکے  تھے کہ

دل دیا جان کے کیوں اسکو وفادار اسد

غلطی کی جو کافر کو مسلماں سمجھا

تو پیاری بہنوں ہمیں مرد حق غالب کے خلوص نیت پہ شک نہیں کرنا چاہئیے

حق مغفرت کرے عجب آزاد مردتھا۔

حوالہ؛

تحریر کے لئیے انسپیریشن

10:28 PM

Ghalib, women rights, آزادیء حقوق نسواں, غالب

زبردست کی بیوی سب کی دادی

صدر پاکستان نے لیاری کی حالت زار کو سامنے رکھتے ہوئے لیاری کے لئیے دو ترقیاتی پروجیکٹس کا اعلان کیا۔ اور ان سب کا باجماعت افتتاح وزیر اعلی ہاءوس میں کیا گیا۔اس بہانے تیسرے پروجیکٹس کے غریبوں کو بھی وزیر اعلی ہاءوس دیکھنے کو مل گیا جو پروجیکٹ کے تحت بننے والی ایک کم لاگت کے مکانوں کی بستی میں اپنے مکان کی ملکیت لینے گئے تھے۔

اب بھولپن میں یہ مت سمجھ لیجئیے گا کہ لیاری وزیر اعلی ہاءوس کے اندر ہے۔ جی نہیں، یہ کراچی شہر کے بیچوں بیچ واقع ہے۔  جب سے پیپلز پارٹی وجود میں آئ اس علاقے نے ہمیشہ انکا ساتھ دیا اور اس سے پارٹی کا مورال اتنا بلند ہے کہ صدر نے جو کہ پیپلز پارٹی کے چیئرمین بھی ہیں یہ کہا کہ بلاول کے برتھ سرٹیفیکیٹ پہ جائے پیدائش لیاری لکھا ہونے کی وجہ سے نبیل گبول صاحب  کی سیٹ کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ یعنی یہ پیشن گوئ میں بھی کر سکتی ہوں کہ بلاول وزیر اعظم بننے کے لئیے انتخاب لیاری سے لڑیں گے۔

صدر کے عہدے پہ فائز ہونے کے بعد صدر صاحب کا حس مزاح نازک خیالی کی بلندیوں پہ پہنچ گیا ہے۔ اور یہ کچھ ایسا خلاف معمول بھی نہیں کہ خدا جب حکومت دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے۔ اور صرف نزاکت ہی کیا، نجابت، فصاحت، شرارت اور رذالت سب ہی آجاتی ہیں۔ بس نہیں آتی تو ندامت نہیں آتی۔

تو اسی بے ندامتی کی حالت میں انہوں نے لیاری کے لئیےجن دو پروجیکٹس کا اعلان کیا انکے نام  انکی مرحوم اہلیہ اور پارٹی کی سابق چیئر پرسن بے نظیر بھٹو کے نام پہ رکھے گئے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ کم لاگت کے مکانوں والی بستی کا نام بھی انہی کے نام پہ رکھا گیا ہے۔

یہاں پہ میں پاکستانی عوام کو ایک بے حد اہم راز سے آگاہ کرنیوالی ہوں اور وہ یہ کہ ان پروجیکٹس پہ خرچ ہونے والی تمام رقم بے نظیر صاحبہ کی ذاتی جائیداد یا صدر صاحب کے سوئس اکاءونٹ کی زکوات سے نہیں بلکہ ان پیسوں سے ہوگی جو عنیقہ ناز سمیت ہر پاکستانی نے ٹیکس کی مد میں حکومت پاکستان کو ادا کئیے۔ یا جو بیرون ملک مالدار ملکوں کو اپنی غریب عوام کی بیچاری حالت کا واسطہ دیکر قرضہ لئیے گئے ہیں اور جنہیں ہم عوام  اپنا خون پسینہ بہا کر اور اپنا پیٹ کاٹ کر ، اپنے بچے بیچ کر اور اپنے بچے مار کر ادا کریں گے۔

  اگر ان پروجیکٹس کو کسی نہ کسی کے نام پہ رکھنا ہی ہے تو اسکے نام پہ رکھیں جو سب سے زیادہ ٹیکس ادا کرتا ہے نہ کہ انکے نام پہ جو ہمارے اس چندے میں سے جو ہم ریاست کے امور چلانے کے لئیے دیتے ہیں اور  جسے اب بھتہ کہنا زیادہ مناسب ہے  اپنی تن آسانی کے سامان پیدا کرتے ہیں اور نام اپنا یا اپنے رشتےداروں کا بنا دیتے ہیں۔

اگر بے نظیر عظیم لیڈر تھیں تو پاکستان  ان سے کہیں زیادہ عظیم لیڈروں کو برت چکا ہے اور خود پاکستان ان سے زیادہ عظیم ہے۔ اگر انہوں نے مصائب اٹھائے تو عوام نے ان سے کہیں زیادہ مصائب اٹھائے، اگر وہ ماری گئیں تو قوم اپنی اور اپنے سپوتوں کی قربانی ان سے کہیں زیادہ دے چکی ہے۔ میرا بلکہ ہم سب کا حکومت پاکستان سے مطالبہ ہونا چاہئیے کہ وہ تمام پروجیکٹس جنکا  نام کسی بھی پارٹی لیڈر کے نام پہ  رکھا گیا ہے اگر ان میں انکے ذاتی پیسے خرچ نہیں ہوئے تو انہیں عوام کے نام پہ رکھا جائے یا پاکستان کے نام پہ۔ ان تمام جگہوں اور پروجیکٹس کے نام کو فی الفور تبدیل کیا جانا چاہئیے۔  قانون بنایا جائے کہ جمہوری نظام میں ایسا کرنے کا حق کسی کو نہیں۔  کیونکہ جمہوریت کا مطلب عوام کی حکومت عوام کے لئیے ہے۔

حوالہ؛

تین نئے پروجیکٹس کا افتتاح

8:40 AM

بلاول, پاکستان، بے نظیر بھٹو, پیلپلز پارٹی, زرداری, لیاری

بات یا خرافات

میری محترم ساس یعنی شوہر صاحب کی والدہ محترمہ خاصی سمجھدار خاتون ہیں۔ خدا انکو لمبی حیات دے پڑھنے لکھنے کا خاصہ شغف رکھتی ہیں۔ اپنے زمانے میں نفسیات میں ایم اے کیا اور پوزیشن حاصل کی۔ یہ تو انکا ایک مختصر سا تعارف ہے۔ انکی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ دوسروں کو زندگی میں آسانی دیتی ہیں۔ اس طرح سے میرے گھر میں روائیتی جھگڑے کھڑے نہیں ہوئے۔ یہی نہیں بلکہ وہ ایک اچھی شریک کار بھی ہیں۔ نفسیات کا علم رکھنے کی وجہ سے وہ خاصے غیر محسوس طریقے سے اپنے تجربات کا ذکر بھی کرتی رہتی ہیں۔ ابھی انہوں نے کچھ دنوں پہلے اپنے بچپن کی کہانی سنائ جو میں نے آپ لوگوں کے لئیے لکھ لی۔ آئیے پڑھتے ہیں۔

بات کی بات

خرافات کی خرافات

بیر جھڑی کا کانٹا

ساڑھے اٹھارہ ہاتھ

اس میں بسے تین گاءوں

دو اجڑے پجڑے ایک میں بستی نہیں

جس میں بستی نہیں اس میں بسے تین کمہار

دو لولے لنگڑَ، ایک کے ہاتھ پاءوں نہیں

جسکے ہاتھ پاءوں نہیں، اس نے گھڑی تین ہانڈیاں

 دوٹوٹی پھوٹی، ایک کا پیندہ نہیں

جسکے پیندہ نہیں، اس میں پکائے تین چاول

دو کچے پکے، ایک گلتا ہی نہیں

جو گلتا نہیں، اس نے بلائے تین مہمان

دو روٹھے پھولے، ایک منتا ہی نہیں

جو منتا نہیں اسکے لگائیں تین جوتیاں

دو اوکی چوکی ایک جمتی نہیں

جو جمتی نہیں وہ جمائ کہانی سننے والے کو۔

زور سے تو نہیں لگی۔ اب دیکھیں، اس میں کچھ بات ہے اور کچھ خرافات۔ اب ہماری ہنر کاری اس میں ہے کہ بات کو خرافات میں سے الگ کریں۔ لیکن تبصرے کے خانے میں لکھ ضرور دیں تاکہ دوسروں کو بھی پتہ چلے کہ اس میں بات کیا ہے۔ بات ہے بھی  یا نری خرافات ہے۔

9:40 AM

منظوم کہانی, میری ساس

دو سوال

 ویسے تو کھانے کی میز پہ گفتگو ہوتی ہی رہتی ہے لیکن ناشتے کے وقت اسکی رونق کچھ اور ہوتی ہے۔ جہاں ایک طرف ہر تھوڑی دیر بعد اس قسم کے ڈائیلاگ سنائ دیتے ہیں کہ مشعل تمہارا ناشتہ  کوئ کھا جائیگا۔ کھاءوگی نہی تو عقل نہیں آئے گی۔ اب اپنی جگہ سے ہلنا نہیں۔وہاں اخبار بھی درمیان میں گردش کرتا رہتا ہے اور اسکی خبروں پہ مختلف لوگوں کے تاثرات اور تبصرے بھی۔

آج کسی نے کہا کہ یہ کیا خبر ہے کہ ایوان صدر میں روزانہ کالے بکروں کی قربانی دی جا رہی ہے۔ الف نے حیرانی کا اظہار کیا مگر بکروں کا وہ بھی کالے بکروں کا کیا قصور ہے کہ وہ ذبح ہو رہے ہیں۔۔ لگتا ہے ان کالے بکروں کی بد دعا انہیں لے ڈوبے گی۔ خبر سنانے والے نے کہا کہ کالا جادو اتارنے کے لئیے کالے بکروں کی قربانی دی جاتی ہے۔ الف نے کہا لیکن یہ کالا جادو کون کر رہا ہے۔ ب نے کہا ، وہی کرائے گا جسکا دل کالا ہو اور دل انکا کالا ہوتا ہے جنکی نیت خراب ہو۔  شاید حزب اختلاف یا چیف جسٹس یا کوئ اور کالا شخص ۔۔ اس پہ خبر سنانے والے نے مزید مطلع کیا کہ کالا جادو کرنے کے لئیے کرنیوالے کا کالا ہونا ضروری نہیں ہے۔

 میں نے پوچھا، تو آپکا خیال ہے کہ یہ ان دو گروہوں میں سے کوئ ہے۔ جواب میں شانے اچکا کر ان کی طرف اشارہ کر دیا گیا جنہوں نے ممکنات ظاہر کئیے تھے۔ ان کی طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔ پہلے گھورا پھر فرمایا، آجکل سب سے مشہور کالا کون ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اندازہ لگایا۔ اوبامہ۔ پھر میں صرف ایک ہنکارے کی آواز سن سکی۔ مشعل نے ایک جذباتی چیخ ماری اورکہا کہ اسکے منہ کا نوالہ پیٹ میں جا چکا ہے اور اب منہ خالی ہے اور میں چاہوں تو موقع سے فائدہ اٹھا سکتی ہوں۔ اس وقفے کے بعد کسی نے ایک سوال پوچھا کہ یہ بتائیں کہ کوئٹہ میں ہونے والی حالیہ پولیس بغاوت کے بعد اب حالات کے مزید خراب ہونے کی پیشن گوئ کی جا سکتی ہے پھر انہوں نے میز پہ موجود ان لوگوں سے جو پاکستان سے سچی محبت کرتے ہیں۔  معذرت کرتے ہوئے کہا  کہ اگرچہ میرا کوئ برا ارادہ نہیں لیکن میرا سوال یہ ہے کہ ان سب حالات کے بعد پاکستان جب اتنا کمزور ہو جائے گا کہ کوئ بھی اس پہ قبضہ کر لے تو کون سا پڑوسی ملک اس پہ قبضہ کریگا؟ سب سے پہلے میں نے ہاتھ اٹھایا۔ اور مجھے موقع بھی دیا گیا بولنے کا۔ 'افغانستان'۔ یعنی آپکا خیال ہے کہ افغانستان پاکستان پہ قبضہ کریگا۔ وجہ؟ اچانک سب اس سوال میں دلچسپی لینے لگے وہ بھی جو منہ بنا کر بیٹھے ہوئے تھے۔

اس لئیے کہ وہ ہمارا برادر اسلامی ملک ہے۔ اپنا مارے گا بھی تو سائے میں رکھے گا، اور پھر آجکل ہماری خارجہ پالیسی طالبان کا مزاج دیکھ کر بنائ جاتی ہے۔ جنکے ساتھ دائیں بازو والوں کی ہمدردیاں بھی ہیں۔ اور اگر آپ ذرا غور سے دیکھیں تو ہم وہیں جائیں گے جہاں طالبان ہمیں لیجائیں گے۔ وہ یقیناً افغانستان کا چناءو کریں گے۔

یعنی آپکا خیال ہے کہ پاکستان اور افغانستان کا فیڈریشن بن جائے گا۔ کسی نے بڑی مسرت سے پوچھا۔ 'گریٹر افغانستان'۔ اچھا، میں نے اپنی بات پہ  غور کرنا چاہا۔

مشعل نے پھر نعرہ مارا، 'میں نے اپنا آخری نوالہ بھی کھا لیا'۔ ایک بات مشعل کو سمجھا دی گئ ہے کہ وہ اگر آخری نوالہ کھائے گی تو طاقت آئے گی۔ کیونکہ ساری طاقت آخری نوالے میں ہوتی ہے۔ اسکے بعد وہ ہم سب کے ہاتھوں پہ زور آزمائ کرتی ہیں اور ہم سب تھوڑی سی ایکٹنگ کرتے ہیں کہ اف کس قدر طاقتور لڑکی ہے یہ اب، ہاتھ ہی توڑ دیا۔ بچے کتنے سادہ ہوتے ہیں۔ہاں، مگر اس سارے چکر میں بات کیا ہو رہی تھی یہ تو ہم بھول گئے۔

  آپ میں سے کوئ اس تحریر میں موجود سوالوں کے جواب دینا چاہے تو بصد شوق۔ سوال دو ہیں

جادو کون کروا رہا ہے؟

قبضہ کون کریگا؟

حوالہ؛

ایوان صدر میں بکروں کی قربانی

کوئٹہ میں پولیس کی بغاوت

10:31 PM

black magic, pakistan, افغانستان, اوبامہ, پاکستان, کالا جادو, کوئٹہ, مشعل

ایک پیاری غزل

حسب وعدہ ایک غزل حاضر ہے۔ اسکا قافیہ ہے پیارے۔ ایک دفعہ اسی قافئیے میں پڑھنے کے بعد قافیہ تبدیل کر کے 'پیاری' کر دیجئیے, بالکل الگ لظف آئیگا۔ یہ غزل جناب حفیظ جالندھری صاحب کی ہے۔

اردو شاعری میں ابو الاثر کا لقب پانیوالے یہ شاعر جیسا کہ آپ سب جانتے ہونگے کہ ہمارے قومی ترانے کے خالق بھی ہیں اور شاید اسی وجہ سے انکی باقی شاعری اس عظمت کے پیچھے چھپ گئ۔ انکی روائیتی تعلیم گرچہ کم تھی لیکن مطالعے اور محنت نے اس کمی کو ختم کر کے انہیں اردو کے بڑے شاعروں کی صف میں لا کھڑآ کیا۔ وہ بچوں کے ایک رسالے نونہال اورخواتین کے ایک رسالےتہذیب نسواں کے بلکہ رسالہ مخزن اور ہزار داستاں کے مدیر بھی رہے۔ آئیے پڑھتے ہیں۔

دل ابھی تک جوان ہے پیارے

کس مصیبت میں جان ہے پیارے

رات کم ہے نہ چھیڑ ہجر کی بات

یہ بڑی داستان ہے پیارے

تلخ کردی ہے زندگی جس نے

کتنی میٹھی زبان ہے پیارے

جانے کیا کہہ دیا تھا روز ازل

آج تک امتحان ہے پیارے

کب کیا میں نے عشق کا دعوی

تیرا اپنا گمان ہے پیارے

میں تجھے بے وفا نہیں کہتا

دشمنوں کا بیان ہے پیارے

تیرے کوچے میں ہے سکوں ورنہ

ہر زمین آسمان ہے پیارے

5:52 AM

Hafeez Jalindhri, Pakistani anthem, تہذیب نسواں, حفیظ جالندھری, قومی ترانہ, مخزن, ہزار داستان، نونہال

لے پالک بچے

ان لوگوں سے پیشگی معذرت جنہیں سماجی، سیاسی اور خواتین کے حقوق سے متعلق پڑھنے سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ آپ لوگوں کے لئے میں نے ایک پیاری سی غزل نکال کر رکھی ہے۔ لیکن اس

پوسٹ کے بعد۔

 مستنصر صاحب اردو کے ایک بہت پیارے ادیب ہیں۔ انہوں نے کسی جگہ اپنے ایک دوست کے بارے میں تحریر فرمایا کہ اس نے ایک جواب مضمون یاد کیا ہوا تھا جسکا عنوان تھا۔ میرا بہترین دوست۔  اور وہ کچھ اس طرح سے تھا۔ میرا دوست غلام رسول ہے۔ وہ میرا ہم جماعت ہے۔ وہ بہت صاف ستھرا رہتا ہے اور اسی طرح کی مزید خوبیاں۔ امتحان میں سوال آیا ہوائ جہاز کے سفر پہ مضمون لکھیں۔ انہوں نے لکھا۔ میں اپنے ابا کے ساتھ ائیر پورٹ گیا۔ ہمیں لاہور جانا تھا۔ ہم جہاز میں بیٹھ گئے۔ جہاز کی کھڑکی سے میری نظر باہر پڑی تو مجھے اپنا بہترین دوست غلام رسول نظر آیا۔ وہ میرا بہترین دوست ہے۔ وہ میرا ہم جماعت ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

تو جناب بات اس حد سے نکل ہی نہیں پاتی کہ آپ بہت مغرور ہیں، 'بہت پڑھی لکھی' ہیں اور آپ تو یہ اور آپ تو وہ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بات کی جا رہی ہوتی پاکستانی معاشرے میں خواتین کا ممکنہ کردار لیکن تبصرہ کچھ اس طرح شروع ہوتا ہے۔ آپ پنجابیوں کیخلاف ہیں، آپ مردوں سے نفرت کرتی ہیں آپ کبر و غرور کا شکار ہیں اور اسکے بعد ایسے مذہبی ھوالے جنکا میری لکھی گئ تقریر کے متن سے کوئ تعلق نہیں۔ البتہ اس چیز سے تعلق ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے دلی جذبات ان سب چیزوں کی آڑ میں پہنچائے کہ نہیں۔ یہ دوسرا تبصرہ حاضر ہے۔ میں، بہت پڑھی لکھی اور کبر سے بھرپور ایک عورت ان لاوارث بچوں کے بارے میں لکھتی ہوں جو کہ ہمارے معاشرے میں لاوارث چھوڑ دئیے جاتے ہیں ہمیشہ کے لئے۔ لیکن بات کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے کہ آپ بہت پڑھی لکھی، درپردہ آپ جیسی جاہل بھی کوئ ہے، نے یہ تبصرہ فرمایا اور اب اسکے بعد وہ اسلامی حوالے جنکا اس موضوع سے کوئ تعلق نہیں جسے میں نے بیان کیا۔ اور مزید مجھ جیسے کافر کے لئے قرآن سے ہدایات کہ غرور نہ کرو اور یہ نہ کرو اور وہ نہ کرو۔ انسان کسی بھی عمر کا ہو اسے اپنے دامن میں بھی جھانکنا چاہئیے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ میرے بلاگ پہ میری نسل کا شجرہ نہیں، میرے خاندان کا حوالہ نہیں، میری تعلیم کا قصہ نہیں اور آپ یہ سب نمائشی اشیاء رکھتے ہیں۔ مگر آپ مغرور نہیں بہت خوب۔

اس پیغام کے ساتھ کہ دنیا بھر میں ہر انسان سب سے بہتر طور پہ اپنے آپکو جانتا ہے۔ان سب لوگوں کو انکی حالتوں پہ چھوڑتے ہوئے۔ میں اپنے مستقل قارئین سے صرف ایک سوال کرنا چاہتی ہوں اور سوال یہ ہے کہ وہ بچے جو کوڑے کے ڈھیر پہ ہمیشہ کے لئے پھینک دئیے جاتے ہیں۔ اس بات کی پرواہ کئیے بغیر کہ وہ بچیں گے یا مریں گے۔ انکے والدین کو کوئ نہیں جانتا۔ ایسے بچوں کو آپ اپنے گھر میں اس لئیے نہیں رکھیں گے کہ بڑے ہونے پہ انکے ساتھ محرم اور نا محرم کا چکر کھڑا ہوگا۔ انکو آپ اپنے گھر میں اس لئیے نہیں رکھیں گے کہ باپ کے خانے میں اگر آپکا نام لکھا گیا تو یہ غیر اسلامی ہوگا ۔ تو ان سارے غیر اسلامی عوامل سے بچنے کے لئے میری جیسی کم علم اور بد تمیز خاتون آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہے کہ ان بچوں کا کیا جائے کہ بڑے ہونے پہ انکا انسانی قدروں پہ یقین بھی برقرار رہے، انہیں اپنے آپ کو حقیر سمجھنے کی اذیت سے نہ گذرنا پڑے کہ انکا اس میں  کچھ قصور نہ تھآ، اور وہ با وقار رہتے ہوئے تمام ذہنی سکون کے ساتھ  بحیثیت انسان اپنی صلاحیتوں سے انسانی معاشرے کو مثبت طور پہ فائدہ پہنچا سکیں۔ میرا سوال بالکل واضح ہے۔

 اگر آپ میرے بلاگ کے مستقل قاری ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آپ کسی بھی طور اس معاشرے میں بہتر سوچ کی طرف گامزن ہو سکتے ہیں تو یہ آپ پر میرا پہلا حق ہے جو میں کسی لاوارث بچے کے لئے استعمال کرنا چاہتی ہوں۔ آپ سب سے درخواست ہے کہ صرف اس سوال کا آپ جو مناسب جواب سمجھتے ہوں وہ دیں۔ براہ مہربانی اسے پڑھ کر یونہی مت چھوڑ دیجئیے گا۔

سمجھ لیجئیے کہ آپکے جواب سے ایک ایسے لاوارث بچے کی زندگی جڑی ہے جسکی اس پوری دنیا میں۔ کوئ شناخت نہیں۔میرا مقصد صرف ہہی ہے کہ اس مسئلے کے ممکنہ حل معلوم کئیے جا سکیں۔

حوالہ؛

لاوارث بچوں سے متعلق میری پوسٹ، ایک ہے ثریا

میرے ساتھی بلاگر کی تبصراتی پوسٹ

4:50 PM

abondoned children, child adoption, لاوارث بچے, لے پالک بچے, مستنصر حسین تارڑ

تین احمق، کہانی بالکل فلمی ہے

میں اپنے ہمراہیوں کے ساتھ سی ویو میں واقع ایک سینما ہاءوس جسے سینے پلیکس کہتے ہیں  کی طرف چلی جارہی تھی۔ یہ مت سمجھیےگا کہ این آر او سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے اتنی رقم جمع کرلی کہ ایسے مہنگے سینماءوں میں فلمیں دیکھنے لگی۔ میں تو صرف غالب کی اس نصیحت پہ عمل کر رہی تھی کہ مفت ہاتھ آئے تو برائ کیا ہے۔ ویسے بھی اس فلم کے بڑے چرچے ہو رہے تھے تو جیسے ہی یہ منصوبہ پردہ ء غیب سے ظہور میں آیا۔ میں نے اپنی ڈرائیونگ کی مہارت کو پیش کرکے یہ ڈیل پکی کرلی۔ سچ ہے ہنر رائیگاں نہیں جاتا۔

یہ فلم تھی 'تھری ایڈیٹس'۔ اگرچہ فلموں پہ ریویو لکھنے کا میرا کبھی کوئ ارادہ نہیں رہا۔ اور اسکے باوجود کہ اس فلم کی کہانی بالکل فلمی تھی۔ یہ مجھے خاصی پسند آئ۔ اور میں نے اردو کے ایک محاورے 'گو میں پڑی کوڑی کو دانتوں سے کھینچتے  ہیں' کے تحت اسکی خوبیاں بھی پیشاب بھری اسٹوری سے نکال ہی لیں۔

بظاہر تو یہ لگتا ہے کہ فلم کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ بچوں کو ڈاکٹر اور انجینئیر بننے کا سبق نہ پڑھائیں بلکہ انہیں وہ کرنے دیں جسکی طرف انکا رجحان ہے۔ لیکن اس فلم کی خوبیاں اس سے ہٹ کر ہیں۔ اور یہ وہ خوبیاں ہیں جو مجھے انسانوں میں بھی پسند آتی ہیں۔ یعنی زندگی کو زندہ رہنے کے احساس سے گذارنا۔ جہاں کہانی ہمیں یہ احساس دلانے کی کوشش کرتی ہے کہ کامیابی کوئ چیز نہیں ہوتی اور اہمیت محض منزل کی نہیں راستوں کی بھی ہوتی ہے۔ وہاں یہ اپنے دیکھنے والے میں جوش اور لگن بھی پیدا کرتی ہے۔ ایسا جذبہ جسکے بعد ہم اپنے آپکو دیکھتے ہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں، اس وسیع  وعریض کائنات، اس کھلے آسمان اور اس رنگ برنگی دنیا میں زندگی ہمیں کن چیزوں کی دعوت دے رہی ہے۔

طالب علموں کے لئے اس میں پیغام ہے کہ محض ڈگری کوئ چیز نہیں ہوتی اس سے وابستہ علم کی اہمیت ہوتی ہے۔ علم کی طاقت کے آگے بڑے بڑے سر نگوں ہو جاتے ہیں۔ اسی لئیے تو آدم کو پہلے اسماء کا علم دیا گیا تھا۔

فلم میں گانے خاصے کم، رومانس قابل گذارہ اور آئٹم سونگ کوئ نہیں ہے۔

تو جناب سینما ہال سے باہر آکر بھی دنیا کافی دیر تک اچھی لگتی رہی۔  لیکن اس اچھائ کو محسوس کرنے کے لئے آپکو اپنی یاد داشت کو اچھا انتخاب کرنے والا بنانا پڑیگا۔ ورنہ آپ کہیں گے لا حو ل ولا قوت۔ یہ فلم تھی کہ موری خانہ۔ مجھے نہیں معلوم کہ فلم کے بنانیوالوں نے اسے کمرشلی بیچنے کے لئے اس میں یہ مذاق ڈالے یا عام انڈینز کامذاق اب اسی سطح پہ پہنچ چکا ہے۔

سنا ہے پاکستان میں بھی ایک فلم اسی ٹائٹل کے ساتھ بن رہی ہے اور اسکی شوٹنگ آخری مراحل میں ہے۔ مجھے تو اس فلم کا صرف پرومو فوٹو ہی ملا ہے جو حاضر ہے۔ توقع کی جارہی ہے کہ یہ پاکستانی فلم اپنے مقابل کی انڈین فلم کے چھکے چھڑآ دیگی۔ لاج رکھ لیجیو مولا میرے۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے فلم کے ریلیز ہونے تک۔

 اس فلم کا پرومو دیکھ کر ہی لگ رہا ہے کہ کہانی بالکل فلمی ہے۔ اس پہ مجھے اعتراض نہیں۔ سینما ہاءوس میں کوئ اصل زندگی دیکھنے تو جاتانہیں۔ خیر، اس میں ملک کے نامی گرامی اداکار موجود ہیں اور سنا ہے کہ اسکرپٹ بھی دیسی رائٹر کا لکھا ہوا ہے۔ اس لئیے اس میں کچھ ڈائیلاگ اس طرح کے ہونے کے امکان ہیں کہ جج صاحب،  میرے بیس سالہ لوٹے کو اتنا تو بڑا ہونے دو کہ وہ وزیر اعظم بن جائے۔ کہانی کا کلائمیکس یہی ہے کہ لوٹا وزیر اعظم بن سکتا ہے کہ نہیں۔ کہانی میں ایک مولا جٹ بھی موجود ہے جو مشکل وقت میں قوالی گاتا رہتا ہے مجھ کو جدہ بلالے مولا میرے۔ دیسی کہانی میں ایک ریمبو بھی ہے۔ جو ہیرو کے لئیے تندہی سے  مشکل وقت لاتا ہےاور ساتھ ہی  انتہائ تندہی سے اسے ہٹانے کی مہم میں لگ جاتا ہے۔ یہ کردار خاصہ غیر واضح ہے اور کہا جاتا ہے کہ اسے فلم کی کمرشل ویلیو بڑھانے کے لئے ڈالا گیا ہے۔ اور اس کردار سے آمدنی بڑھنے کے امکان ہیں۔ کہانی زیادہ تر فلیش بیک میں چلنے کے امکان ہیں۔ اگرچہ فلم کی ہیروئین کے لئیے جس فنکارہ کو لیا گیا ہے وہ کچھ عرصے قبل ہی آنجہانی ہو چکی ہیں۔ یعنی کہ مر گئ ہیں۔ لیکن امید ہے کہ انکی میسر فوٹیج اور آواز اس کمی کو محسوس نہیں ہونے دیگی۔۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ عوام 'گو میں پڑی کوڑی کو دانتوں سے کھینچتی 'ہے کہ نہیں۔  ویسے تو عوام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انکی یاد داشت بس ایویں ہی ہوتی ہے لیکن پھر بھی ایسا نہ ہو کہ فلم کے اختتام پہ کچھ لوگ کہیں کہ فلم تھی یا موری خانہ۔ اور ہاں، اس فلم کا پیغام کیا ہوگا۔ یہ تو عوام ہی بتا سکتی ہے یا اسکرپٹ رائٹر۔

4:21 PM

india, pakistan, three idiots, تھری ایڈیٹس, زرداری پاکستان, سینے پلیکس, کراچی

تعلیم کے خلاف مہم یوں

راشد کامران صاحب نے عرصے بعد کچھ تحریر کیا، اور جیسے دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ انکی پوسٹ کا عنوان ہے۔ تعلیم کے خلاف مہم کیوں۔ اگرچہ کہ انہوں نے اپنی تحریر میں چیدہ چیدہ سوالات اٹھائے ہیں۔اس سلسلے میں ڈاکٹر انور سدید کی کتاب اردو ادب کی تحریکیں پڑھتے ہوئے کچھ مزید خیالات در آئے۔

وہ اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

'

کائنات کے باطن میں قوت کا ایک بڑا خزینہ موجود ہے۔ ہر عہد اپنے علوم کی وساطت سے اس ذخیرے تک رسائ حاصل کرنے اور نئے انکشافات سے انسان کی فکری مفلسی کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نئے انکشاف کا عمل در حقیقت تخلیقی عمل ہے۔ اور بالعموم مفکرین کی ذہنی، تجزیاتی اور تجرباتی سوچ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کسی عہد کا مفکر نہ صرف نئے خیال کو جنم دیتا ہے بلکہ اس خیال سے معاشرے کی قلب ماہیت بھی کرتا ہے چنانچہ معاشرے کی تمام ترقی اس تقلیب کا بدیہی نتیجہ ہوتی ہے۔ معاشرہ جن ذرائع کو بروئے کار لا کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل کو نسبتاً زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

مذہب؛

جو فرد کو نا معلوم، لا محدود اور ماورا کے بارے میں پختہ عقائد اور یقین کامل کا درس دیتا ہے اور ایک ضابطہ ء حیات دیتا ہے۔

فلسفہ؛

جو نا معلوم کو دانش اور خرد سے دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور معلوم کے لئیے عقلی ثبوت فراہم کرتا ہے۔

سائنس؛

جو فلسفے کی ہی ایک توسیع ہے اور ہر نئ مادی دریافت کو تجربے سے ثابت کرتی ہے

ادب؛

جو مذہبی عقائد، سائنسی ایجادات اور علمی نظریات سے براہ راست استفادہ کرتا ہے اور عامۃ الناس کو تہذیبی اور روحانی ترفع عطا کرتا ہے۔

ایک مفکر اولیں سطح پر ان میں سے بیشتر کے اثرات قبول کرتا ہے اس لئیے وہ معمول ہے لیکن جب نئے انکشافات ان پہ اثر انداز ہوتے ہیں اور انکی مکمل تقلیب کر ڈالتے ہیں تو وہ ایک اہم ترین عامل شمار ہونے لگتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ مفکر نئے خیال کو خلاء سے نہیں پکڑتا بلکہ اس کی تخلیق میں اسکے عہد کے بے شمار سیاسی، معاشرتی اور ذہنی حادثات و واقعات شامل ہوتے ہیں۔ اور اسے جمود کی یک رنگی کو توڑنے اور زندگی کی کوئ نئ جہت دریافت کرنے پر آمادہ کر رہے ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر مفکر کی ذات میں اسکا پورا عہد سمایا ہوا ہوتا ہے اور وہ اس نئے خیال کی کی مدد سے ایک بڑے گروہ کے ذہنی فکری اور مادی تصورات کی تقلیب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

یہاں پہ یہ اقتباس ختم ہوتا ہے۔ لیکن اب ہم دیکھ سکتے ہیں کہ علم کسی ایک جہت میں سفر نہیں کر سکتا۔ تعلیم کا بنیادی مقصد فکر اور دانش کے حامل لوگوں کو فراہم کرنا ہوتا ہے۔ اور یہ فکر ہم محض ایک سمت سے حاصل نہیں کر سکتے۔

اگر ہم اپنے معاشرے پہ تجزیاتی اور تنقیدی نظر ڈالیں تو یہ امر کچھ پوشیدہ نہیں کہ ہم شدید طور پہ قحط الرجال کا شکار ہے۔ اور ہماری مجموعی ذہانت ہمیں علم کے اس مقام پہ کھڑا نہیں کرتی جو ہمارے معاشرے کو ایک ترقی یافتہ نہیں، پیداواری نہیں بلکہ تخلیق کی کسی بھی سطح پہ کوئ قابل ذکر مقام دے سکے

۔

ایک ایسے عالم میں یہ چیز ایک خطرناک علامت ہی ہے کہ ہم بتدریج مذہب کی اس فارم کی طرف جا رہے ہیں جو ایک عام انسان کو الجھاوے میں ڈال رہی ہے۔  ایک طرف جو گلوکار اسٹیج پہ رقص کرتا انسانی عشق و محبت کی دعوت دیتا نظر آتا ہے اور جسکی دھن پہ لوگوں کی ایک کثیر تعداد لہراتی ہے دوسری طرف وہی گلوکار اپنا عوامی امیج بہتر رکھنے کے لئیے طالبان کو مجاہدین بھی قرار دیتا ہے۔

تعلیم یافتہ لوگ بھی الجھن میں ہیں۔ وہ کھل کر اس جہاد کو برا نہیں کہہ سکتے کہ نہیں جانتے کہ یہ واقعی جہاد ہے یا سیاست کا ایک اور رخ۔ وہ عافیہ صدیقی سے لا تعلقی ظاہر کریں کہ وہ امریکن ہے اور کہتی ہیں کہ  وہاں ٹیکس کی تنخواہ حاصل کرنے والے عدالتی نظام میں سے یہودیوں کو نکالا جائے کہ انکی موجودگی میں انہیں انصاف نہیں ملیگا۔ یا وہ عافیہ صدیقی کو پاکستانی قوم کی مسلمان بیٹی سمجھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوں۔ اور غیر مسلم قوتوں کو للکار دیں۔

آخر لوگوں میں اس الجھن کا ذمہ دار کون ہے؟

 وہ طبقہ جو انہیں  صرف حیات بعد از زندگی دلانا چاہتا ہے  یا وہ طبقہ جو انہیں اب تک زندگی اور انسان کے درمیان تعلق نہیں سمجھا پایا ہے۔

یا وہ تعلیم جو انکے اندر فیصلہ کرنے، اور تمیز کرنے کی قوت دینے سے عاجز ہے۔ اور جسکا کام صرف برین واشنگ ہے۔ کبھی ایک نظرئیے کے لئے اور کبھی دوسرے نظرئے کے لئیے۔ اور کبھی محض پیسے کمانے کا ایک بہتر ذریعہ بننے کے لئیے۔

حوالہ؛

پاکستانی ثقافتی الجھنیں

عافیہ صدیقی

راشد کامران، تعلیم کے خلاف مہم کیوں

12:18 PM

Anwer sadid, jihad, pakistani clture, انور سدید, پاکستانی تعلیم, جہاد

ایک دستر خوان ،چند پڑھے لکھے لوگ اور منافقت

نیئینڈرتھل انسانوں سے ملتی جلتی ایک مخلوق تھی جو انسانوں سے پہلے اس زمین پہ پائ جاتی تھی۔ اور اس وقت انکا تذکرہ صرف اس لئیے کیا ہے کہ انکی ایک خوبی تھی اور وہ یہ کہ وہ گوشت خور ہوا کرتے تھے۔ اب آپ کندھے اچکا کر کہیں گے کہ تو کیا ہوا۔ ہم بھی گوشت خور ہیں۔ لیکن فی زمانہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو گوشت خور نہیں ہوتے۔ اب بھی آپ کہدیں گے تو وہ ہندو ہوتے ہونگے ہم تو الحمد للہ مسلمان ہیں۔

مگر کہانی یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ وہ ہندو نہیں ہوتے۔ کبھی کبھی مسلمان بھی ہوتے ہیں یا کسی اور مذہب سے تعلق رکھنے والے بھی۔  اب ویسے تو انسان ہمہ خور مخلوق ہے یعنی سب ہی  کچھ کھا لیتا ہے جس میں چیونٹے، سانپ، بچھو کے علاوہ جوتے اور ڈنڈے بھی شامل ہیں۔ اور کچھ تو اسنیکس کے طور پہ وقتاً فوقتاًگالیاں کھانا بھی پسند کرتے ہیں۔ لیکن کچھ ایسے بھی عجیب الدماغ بھی ہیں جو آپ اپنی جبلت کا امتحان لیتے ہیں اور گوشت کھانے سے انکاری ہو جاتے ہیں۔ اور اپنے آپکو ویجیٹیریئن کہنے لگتے ہیں۔  تو یہ تحریر ایسے ہی ناہنجاروں کے خلاف ہے۔

کچھ علم دوست لوگوں کے مجمعے میں، دسترخوان پہ جب ہم ایک نئے ویجیٹیریئن دوست کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھے تو انہوں نے سبزی خوروں میں اپنی نو داخلیت کے جذبے سے تر بتر ہو کر  ماتھے پہ بل ڈال کر حقارت سے کہا آپکو معلوم ہے کہ یہ گوشت جو آپ کھا رہی ہیں یہ اس جانور کا ہے جو کسی کا بیٹا ہوگا اور کسی کا باپ۔ میں نے انکی ٹماٹر کی بھجیا کو دیکھا اور پوچھا اور اس ٹماٹر کے متعلق آپکا کیا خیال ہے۔ اسکی کتنی رشتے داریاں ہونگیں۔ آپکو معلوم ہونا چاہئیے کہ اسکی رشتے دارِیاں، میں نے اپنی پلیٹ کر طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، اس مرغی سے کہیں زیادہ ہونگیں۔ جواب ملا سبزیوں میں شعور نہیں ہوتا اور جانوروں میں شعور  ہوتا ہے۔

  اب میں نے محسوس کیا کہ گفگتگو کو کھینچ تان کر فرائڈ کی طرف لیجایا جا رہا ہے۔ تاکہ اپنے  علم نفسیات کا سکہ جمایا جا سکے اس لئیے فوراً وار کیا۔ 'جی ہاں سبزیوں میں شعور نہیں ہوتا اور انڈے میں کون سا شعور ہوتا ہے جو آپ اسے نہیں کھاتے'۔ 'اس میں اپنی نسل آگے بڑھانے کا شعور ہوتا ہے'۔ 'تو آپکا خیال ہے کہ یہ شعور سبزیوں میں نہیں ہوتا'۔ انکی پلیٹ میں موجود سبزیوں نے میرے حق میں گرمی جذبات سے باہر نکلنے کی کوشش کی لیکن بظاہر یہ لگا کہ انہوں نے اپنا کانٹا زور سے اس میں مارا تھا۔

 '

آپکو پتہ ہے جتنے زیادہ جانور آپ کھائیں گے اتنے زیادہ پیدا کرنے پڑیں گے اور جانور جتنے زیادہ ہوں اتنا ہی انکا فضلہ زیادہ ہوگا اور جتنا انکا فضلہ زیادہ ہوگا۔ اتنا ہی گرین ہاءوس افیکٹ زیادہ ہوگا اور اس گرین ہائوس افیکٹ کے زیادہ ہونے سے گرمی زیادہ ہوگی اور اس سے ہمارے گلیشیئر زیادہ تیزی سے پگھلیں گے ۔ کچھ معلوم بھی ہے آپکو  یہ گوشت کھا کر آپ دنیا کی تباہی کا کس قدر زیادہ باعث بنتی ہیں۔ دوزخ بنا رہی ہیں اپ اسے دوزخ۔

 اس وقت یہ آنیوالے زمانوں کی گرمی ہماری گفتار میں آچلی تھی۔  صاف لگ رہا تھا کہ ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی انہیں گرین ہاءوس ایفیکٹ نامی اصطلاح پتہ چلی ہے۔ گلیشییئر جب پگھلے گا تب پگھلے گا۔ اس وقت انکا دماغ پگھلانا زیادہ ضروری محسوس ہوا۔ اس لئیے  سچے مجاہد کی طرح معاشرے کو اس بدعت سے پاک کرنے کے لئیے میں نے اپنا چمچ ایک طرف رکھا۔ انکی پلیٹ میں موجود سبزیوں سے آنکھیں  چار کیں اور ان سے کہا بالکل یہی منطق ان سبزیوں پہ بھی آتی ہے۔ آپ یہ سبزیاں خلاء میں تو نہیں اگائیں گے۔ جتنی زیادہ سبزیاں اگیں گی اتنا زیادہ گرین ہاءوس افیکٹ ہوگا۔ ابکی انہوں نےفوراً طعنہ مارا۔ کچھ مطالعہ بھی کرتی ہیں۔ سائنس کے متعلق کچھ پتہ بھی ہے۔ مزید مطالعہ کریں۔ پودوں سے آکسیجن پیدا ہوتی ہے۔

دل تو چاہا کہیں کہ بھاڑ میں جائیں آپ اور آپکی سائنس۔ یہ تک تو پتہ نہیں کہ پودے رات کے وقت کاربن ڈائ آکسائیڈ پیدا کرتے ہیں۔۔ اسی وقت طنطناتی ہوئ اٹھی، اپنا لیپ ٹاپ کھولا اور گوگل سرچ پہ کی ورڈز ڈالے۔ متعلقہ ویب سائٹ کھولی اور لیپ ٹاپ جا کر انکے سامنے رکھ دیا۔ پڑھ لیجئیے۔

 ایک چھچھلتی نظر اس پہ ڈالی اور گویا ہوئے، ہو سکتا ہے آپکی بات درست ہو۔ مگر آپ نے کبھی غور کیا۔ اتنے انسانوں کا پیٹ بھرنے کے لئیے کتنے جانوروں کو کس کسمپرسی کی حالت میں رکھا جاتا ہے۔ لیجئیے، فرائڈ سے بات ماحولیاتی آلودگی اور اب جانوروں کے حقوق تک آ پہنچی۔ میں نے فی الفور تجزیہ کیا۔ جیسے انسانوں کے تو کچھ حقوق ہی نہیں ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ادا کیا کہ ایسے شیطانوں سے نبٹنے کے لئیے کیسا زر خیز دماغ دیا ہے۔ لپک کر کہا، اور زیادہ سبزیاں اگانے کے لئیے جو جینیاتی تبدیلیاں کی جاتی ہیں، جسکے نتیجے میں کم سے کم وقت، کم سے کم زمین اور کم سے کم پانی استعمال کر کے انکی کاشت کیجاتی ے، انکی قدرتی عمر پوری ہونے سے قبل ہی انہیں ختم کر دیا جاتا ہے اسکے متعلق کیا ارشادہے آپکا۔ اس دفعہ انہوں نے تلملاتے ہوئے اپنا منہ کھولا ہی تھا کہ ایک ڈکار کی آوز آئ۔ ساتھ ہی کسی نے کہا الحمد للہ۔

 ہم دونوں نے پہلے حیرانی سےایکدوسرے کو دیکھا اور پھر اس آواز کیطرف۔ وہ صاحب رومال سے اپنا منہ صاف کر رہے۔ ہم دونوں کی نظریں ایکدفعہ پھر ملیں۔ اس دفعہ ہم دونوں کے چہرے پہ ان تیسرے حضرت کے لئے حقارت تھی۔ دسترخوان پہ ڈکار لینا کس قدر آداب محفل کے خلاف ہے، بلکہ بد تہذیبی ہے۔

یہاں سے ایک نئ اہم بحث شروع ہونے والی تھی، کیا علم تہذیب بھی سکھاتا ہے۔ مگر ہم دونوں اسے ان تیسرے حضرت کی غیر موجودگی میں کرنا چاہتے تھے۔ وجہ تو آپ سمجھتے ہیں۔

نوٹ؛ اس قصے کے تمام واقعات فرضی نہیں ہیں۔ البتہ، کسی قسم کی مطابقت محض اتفاق ہوگا۔

7:34 AM

Neandertahl, vegetarian, انسانی حقوق, سبزی خور, فرائڈ, گرین ہائوس افیکٹGreen house effect, گوشت خور

کیا لیاری کراچی کا حصہ ہے؟

میری اس  لڑکی سے ملاقات کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا۔ یونہی نو دس مہینے پہلے مجھے خیال آیا کہ میں اپنے مضمون  پر اگر لوگوں کو ٹیوشن دینے لگون اور اپنی فیس  اسوقت چلنے والی فیس کے مقابلے میں آدھی رکھوں تو اس سے مجھے اور پڑھنے والے دونوں کو دلچسپی ہوگی۔ میں نے اخبار میں اشتہار دے دیا۔ اسکے نتیجے میں میرے پاس پانچ فون آئے۔ ان میں سے چار لوگوں کی خواہش تھی کہ انہیں گھر پہ پڑھایا جائے۔ جسے میں نے منع کر دیا

لیکن ایک فون مجھے لیاری سے ایک لڑکی کا آیا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ بی ایس سی کی طالبہ تھی۔ مجھے حیرانی ہوئ۔ 'مگر آپ تو میرے گھر سے خاصی دور رہتی ہیں اور ہفتے میں تین دن آنا بھی آپکے لئیے بہت مشکل ہوگا'۔  یہ سن کر اس نے مجھ سے کہا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ میں اس سے ایکدفعہ مل کر اسے جو مشکلات پیش آرہی ہیں وہ دیکھ لوں اور انکے لئیے اسے کچھ ٹپس دیدوں۔۔ اسکی یہ لگن دیکھ کر میں نے اسے اگلے دن بلالیا۔

 وقت مقررہ پہ وہ اپنے والد صاحب کے ساتھ آگئ۔ اس نے برقعہ پہنا ہوا تھا۔ اسکے والد صاحب اپنی عمر کی پانچویں دھائ میں تھے اور نیوی مرچنٹ کی نوکری کرتے تھے۔ وہ ہمارے ساتھ بیٹھے رہے۔ ہم دونوں جب اس ساری ڈسکشن سے فارغ ہو گئے  تو میں ان سے بات کی۔

انہیں میرے گھر پہنچنے کے لئیے دو بسیں اور ایک ٹیکسی لینی پڑی تھی اور انکے مبلغ دو  سو روپے خرچ ہوئے تھے۔ وہ سات بہنیں اور ایک بھائ تھے۔ میں نے جب ان سے انکے علاقے کے حالات جاننے چاہے تو اس سوال پہ اس آدمی کا چہرہ بالکل بجھ گیا۔ آپکو کیا بتاءووں۔ میرا ایک بیٹا ہے اور وہ جب گھر سے پڑھنے کے لئیے نکلتا ہے تو جب تک واپس نہیں آجاتا ہم پریشان رہتے ہیں۔ ہمارا پورا علاقہ غنڈوں اور بدمعاشوں کا علاقہ ہے۔ ہمارا نوجوان لوگ زیادہ تر نشہ کرتا ہے یا ہنگامہ۔ آپ کبھی ہمارا علاقہ آکر دیکھو۔ انسانوں کی رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ ابھی آپ دیکھو میری بیٹی کو پڑھنے کا اتنا شوق ہے لیکن ہمارے علاقے میں کوئ اچھا پڑھنے کی جگہ نہیں ہے یہ جہاں جاتا ہے وہاں کتنی مشکل سے جاتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں  کیا ہم اسی طرح جانوروں کی طرح زندگی گذارتا رہیگا۔

اب آپ اردو اسپیکنگ والوں کی پارٹی ہے۔ لوگ کہتا ہے وہ بدمعاشی کرتا ہے۔ مگر میں کہتا ہوں وہ اپنے شہر اور اپنے لوگوں کی بھلائ کے لئیے کچھ تو کرتا ہے۔ ہمارے علاقے سے ہر دفعہ ایک پارٹی آتی ہے مگر آپ وہاں جا کر دیکھیں۔ ہمارا بچہ لوگ کیا کرتا ہے۔ ہم لوگوں کا کیا بنے گا۔ یہ حکومت جب سے آیا ہے اس نے تو تھانہ بانٹ لیا ہے۔ ہمارے لیاری میں کوئ پولیس نہیں ہے صرف غنڈوں کا راج ہے۔ کوئ دن نہیں ہوتا کہ ان بدمعاشوں کی آپس میں جنگ نہ ہوتی ہو۔ ہم تو اپنے گھر کے صحن میں نہیں کھڑے ہو سکتے۔

جب وہ جانے لگے تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ ان تمام مشوروں کی فیس کیا ہوگی جو میں نے اس دوران انہیں دئیے۔ میں نے ان سے کہا کہ اسکی کوئ فیس نہیں ہے۔ میں نے بغیر کسی تیاری کے سرسری طور پہ کچھ چیزیں بتادی ہیں۔ اسکی کیا فیس ہو سکتی ہے۔ میں اگر باقاعدہ پڑھاتی تو کچھ فیس ہوتی۔ مگر وہ پھر بھی بصد اصرار کچھ پیسے میز پہ رکھ گئے۔ جب وہ نکنلے لگے تو وہ لڑکی مجھ سے کہنے لگی کہ باجی آپکا علاقہ مجھے بہت اچھا لگا۔ میں بالکل شرمندہ ہو گئ۔ معلوم نہیں کیوں۔

یونیورسٹی میں پڑھتے ہوئے جب کراچی کے کسی علاقے کے تعلیمی اوسط کا اندازہ لگانا ہوتا تو یونیورسٹی سے وہاں کے لئیے چلنے والے بسز سے لگاتے جو پوائنٹس کہلاتی تھیں۔ کراچی کے تمام علاقوں جن میں لانڈھی، کورنگی، عزیز آباد اور اورنگی ٹاءون بھی شامل ہیں انکے لئیے باقاعدگی سے پوائنٹس لگتے تھے مگر ان میں کبھی لیاری کے لئے بس نہ دیکھی۔

آج جب میں نے ایک بلاگ پہ نبیل گبول صاحب کا بیان دیکھا کہ لیاری میں کیوں آپریشن ہوتا ہے لانڈھی، کورنگی اور عزیز آباد میں کیوں نہیں ہوتا۔ تو ان سے صرف ایک سوال پوچھنے کو دل چاہا کہ پچھلےتیس پینتیس سالوں میں لیاری والوں نے شاید پیلپز پارٹی کے علاوہ کسی کو ووٹ نہیں دیا۔ کیا انہوں نے سوچا کہ لیاری میں ایک بھی اچھا اسکول اور کالج نہیں جسیا کہ لانڈھی، کورنگی اور عزیز آباد میں ہیں، وہاں چھوٹے بچوں اور عورتوں میں کیوں منشیات کا استعمال زیادہ ہے۔  شہر بھر میں کیوں جوا  سب سے زیادہ وہاں کھیلا جاتا ہے۔

لیاری کے مختلف محلے وہاں کے ڈکیتوں کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ جو ایک دو نہیں کئ ہیں۔  ایسا کوئ عمل لانڈھی، کورنگی اور عزیز آباد میں نہیں ہوتا۔۔ میں ان علاقوں میں اکیلے گاڑی میں بے دھڑک گھومتی ہوں لیکن میں لیاری میں اس طرح پھرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔

پچھلے کئ سالوں میں شہر کے باقی علاقے کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ لیاری اب تک اتنا پسماندہ کیوں ہے۔ کیوں کراچی یونیورسٹی والوں کو لیاری کے لئیے کبھی ایک بس چلانے کی نوبت نہ آئ۔ کیوں یونیورسٹی میں اتنا لمبا عرصہ گذارنے کے باوجود میری کبھی ایسے طالب علم سے ملاقات نہ ہوئ جو لیاری سے تعلق رکھتا ہو۔  کیوں لیاری کراچی کا پسماندہ ترین علاقہ ہے۔کیا نبیل گبول صاحب اس بات کا جواب دیں گے۔ کیا ابو سعد کبھی اس چیز کے بارے میں لکھیں گے کہ لیاری کیوں کراچی کا حصہ نہیں لگتا۔ اور کراچی کی رونقوں کے غم میں گھلنے والے جانتے بھی ہیں کہ لیاری بھی کراچی میں واقع ہے۔

12:45 PM

Karachi, liyari, پیپلز پارٹی, ٹارگٹ کلنگ, کراچی, گینگ وار, لیاری, نبیل گبول

کچھ آج سے الگ اور اسکے متعلق

ڈاکٹر انور سدید کی کتاب 'اردو ادب کی تحریکیں' شاید اس موضوع پہ لکھی جانیوالی کتابوں میں بہت اچھی کتاب میں ہے۔ یہ کتاب انکا پی ایچ ڈی کا تھیسس ہے۔ لیکن اسکی مقبولیت اتنی ہے کہ بارہ برس میں اسکے تین ایڈیشنز شائع ہو چکے ہیں۔

عنوان دیکھ کر تو یہ لگتا ہے کہ اردو سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کی  ضرورت ہو گی۔ لیکن چونکہ اس میں زبان کے فروغ اور اس پہ دیگر سیاسی و غیر سیاسی تحریکوں کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے تو یہ ایک عام قاری کے لئے بھی پڑھنے میں بہت اچھی کتاب ہے۔

مجھے اسے پڑھنے کی ضرورت یوں پیش آئ کہ جب میں نے ایک بلاگ پہ یہ دعوی پڑھا کہ اردو نے پنجابی زبان سے جنم لیا ہے تو سوچا کہ جو اپنی پہلے والی معلومات ہیں ان کو اپ ڈیٹ کیا جائے، جو اس میدان کے ماہرین ہیں ان سے بلامشافہ گفتگو کی جائے اور اس پہ جو لٹریچر مہیا ہے وہ پڑھا جائے۔  ورنہ بات برائے بات تو کوئ بھی کر سکتا ہے  اور کیسی بھی کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کتاب میں جو دیگر تفصیلات ہیں ان سے صرف نظر کرنا میرے لئیے ممکن نہ تھا۔

آئیے ایک اقتباس سے گذرتے ہیں جو خاصہ تفصیلی ہے۔ لیکن یہ کسی تحریک کے مختلف ادوار کے بارے میں ہے۔

صاحب تحریر کا خیال ہے کہ کوئ تحریک اپنی نمو میں چار ادوار سے گذرتی ہے۔

۱

تحریک کے اساسی تصور کی نمو کا دور

یہ تحریک کا ابتدائ دور ہوتا ہے جس میں راہنما پہلے اس تصور کے بارے میں اپنا ذہن صاف کرتا ہے اور ایک واضح نظریہ مرتب کرتا ہے۔ رائے عامہ کو متاثر کرنے کے لئیے اپنے رفقاء کے سامنے اور پھر عوام کے سامنے یہ نظریہ پیدا کرتا ہے۔ اگر یہ تصور خوبصورت اور موزوں طریقے سے پیش کیا جائے اور سابقہ جمود کے طویل دور نے تغیر قبول کرنے کے لئیے زمین ہموار کر دی ہو تو یہ نظریہ بہت جلد قبولیت کا درجہ حاصل کرنے لگتا ہے۔ بصورت دیگر تحریک اس ابتدائ مرحلے میں ہی بجھ کر رہ جاتی ہے۔

۲-

ہمدردانہ جذبے کے فروغ کا دور

اس دور میں عوام کا کا ایک بڑا طبقہ تحریک کے بنیادی تصور سے ہمدردی کا اظہار کرنے لگتا ہے جبکہ رجعت پسند طبقہ اسکے خلاف اپنے نظریات کی برتری ثابت کرنے کے لئے درپئے جنگ ہوجاتا ہے۔ اور یوں نئے تصور نے جو تحرک پیدا کیا ہے اسے روکنے کے لئے مزاحمت شروع ہو جاتی ہے۔ تحریک اگر جاندار ہو تو آگے بڑھتی ہے اور نئے تصور کو بالا دستی حاصل ہو جاتی ہے اور اسکے ساتھ ہی تحریک اپنی کامیابی کا ایک دور مکمل کر لیتی ہے۔

نوٹ؛ یہ سلسلہ جاری ہے۔ دلچسپی برقرار رکھنے کے لئیے میں نے اسے توڑ دیا ہے۔ تو پھر سے  آگے پڑھتے ہیں مگر ایک مختصر وقفے کے بعد۔

حوالہ؛

ڈاکٹر انور سدید

1:03 PM

Anwar Sadid, اردو ادب کی تحریکیں, اردو زبان, تحریک اور اسکے ادوار, ڈاکٹر انور سدید

یہودی کا بیت الخلاء

ان لوگوں سے معذرت کے ساتھ جو یہودیوں سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ میں کیا کروں، مراقبے کی یہ جگہ میں نے  تھائ لینڈ کے شہر پھوکٹ میں ایک یہودی کے ریسٹورنٹ میں دیکھی۔ اور یہ تصویر اپنے بیان کی صحت کو ثابت کرنے کے لئیے دے رہی ہوں۔

میرے اپنے گھر میں کچھ لوگ کتابیں اور اخبار لیکر اس راہ پہ روانہ ہوتے ہیں۔ اور اکثر غسل خانہ میں تولیے کے ہینگر پہ اخبار ٹنگا ملتا ہے۔ شاید ایسے لوگوں کی ہڑک کو مد نظر رکھتے ہوئے اس ریسٹورنٹ کے مالک نے اسے ایک نئ جدت کے ساتھ سجایا ہے۔ جب میں نے یہ دروازہ کھولا تو اندر کی طرف جانیوالے تنگ راستے کی دیواروں پہ قد آدم تصویروں کے چسپاں پرنٹ دیکھ کر ششدر رہ گئ۔  آگے چلکر ان میں سے کچھ  شخصیات کے اقوال بھی ساتھ لکھے نظر آئے۔ خود پڑھے اور ان میں سے کچھ آپکے لئیے جمع کر لئیے۔ واضح رہے کہ اس میں کچھ توبہ شکن تصاویر بھی شامل ہونے سے رہ گئیں۔ مثلاً الزبتھ ٹیلر کی مسکراتی اور میڈونا کی جھلملاتی تصاویر وغیرہ۔

یہ لینن صاحب ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ

اگر آپ چند لوگوں کو نہیں مار سکتے تو انقلاب کس لئیے بھئ۔

لینن کو کچھ قدرتی پیچیدگیوں کی وجہ سے ہمارے سیاستدانوں سے سیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ تو بغیر انقلاب کے بھی چند لوگوں کو مارنا خاطر میں نہیں لاتے۔

یہ آسکر وائلڈ صاحب ہیں۔ انکا کہنا ہے کہ

ہم بہت ساری چیزیں پھینکنا چاہتے ہیں مگر اس لئیے نہیں پھینکتے کہ کوئ اور نہ انہیں اٹھا لے۔

یہ پڑھ کر مجھے وہ ادیب یاد آگئے جو بہت کچھ لکھنا چاہتے ہیں مگر نہیں لکھتے کہ کوئ اور انہیں سرقہ نہ کر لے۔ اور یوں بہت ساری تحریروں کا بوجھ اپنے دل پہ لئیے رخصت ہوجاتے ہیں۔

یہ صاحب، تصویر میں آنے سے رہ گئے ہیں بہر حال انکا مقولہ ہے کہ

سب سے بڑا گناہ دوسروں کو خوش کرنے کے لئیے خود کو بگاڑنا ہے۔

پڑھنے میں تو کچھ بہت گہری بات لگ رہی ہے لیکن کوئ مثال  اگر ذہن میں آرہی ہے تو اسکا کوئ نہ کوئ تعلق ہماری خارجہ پالیسی سے جا ملتا ہے۔ جس سے موضوع کے متنازع ہوجانے کا اندیشہ ہے۔

یہ شاید عام پاکستانیوں کے موجودہ حالات کے بارے میں کہا گیا ہے۔

کل کے بارے میں پریشان نہ ہوں وہ بہرحال آ کر رہے گا۔

آج کے بارے میں پریشان ہوں۔ یہ اگر بغیر سوچے سمجھے آجائے تو بڑا لمبا ہو جاتا ہے اور پھر کل نہیں آپاتا۔

ہر عظیم آدمی کچھ نہ کچھ کہہ کر جاتا ہے۔ آئنسٹائن نے بھی فرمایا

۔ دو چیزوں کی کوئ حد نہیں ہے۔ پہلی چیز کائنات ہے اور دوسری چیز حماقت۔ اور پھر انہوں نے مزید فرمایا۔ مجھے پہلی چیز کے بارے میں  پھر بھی شبہ ہے

۔ بادی النظر میں یہ لگتا ہے کہ جیسے اس وقت سارے طبیعیات داں کائنات کا مطالعہ اسی لئیے اتنی باریک بینی سے کر رہے ہیں کہ دوسری چیز کو صحیح ثابت کیا جا سکے۔

اس مقولے کے مطابق ہر انسان کے اندر دو بھیڑئیے رہتے ہیں۔ ایک اچھا ہے اور دوسرا برا۔ ان میں سے جیتتا وہی ہے جسے آپ کھانا کھلاتے ہیں۔

لیکن کہیں ضیا الحق قاسمی کی طرح یہ نہ ہو کہ میں شکار ہوں کسی اور کا، مجھے مارتا کوئ اور ہے،،، مجھے جس نے بکری بنا دیا وہ تو بھیڑیا کوئ اور ہے۔

اس بادبانی کشتی کے ساتھ یہ نصیحت ہے کہ

اگرآپکو یہ نہیں معلوم کہ کہاں جانا ہے تو بہترین ہوا بھی آپکی کچھ مدد نہیں کر سکتی۔

شاید اسی کو سن کر سید ضمیر جعفری نے کہا کہ   ساگر کے سر شناس اگر ناخدا نہ ہوں،،بنتے ہیں کشتیوں کے کفن بادبان میں۔ واہ

امن کی ثالثی کرنیوالا مگرمچھ کو یہ سوچ کر کھلاتا ہے کہ مگر مچھ اسے سب سے آخر میں کھائے گا۔

اس پہ مجھے ایک شبہ ہے کہ بعض اوقات امن کی ثالثی کرنےوالے جسے مگر مچھ سمجھ کر کھلا رہے ہوتے ہیں وہ اصل میں کوئ سیل ہوتی ہے اور مگر مچھ کسی وقت اچانک پیچھے سے یہ کہکر حملہ کر دیتا ہے کہ مجھے کیوں نہیں کھلایا۔

زندگی میں اس چیز کی اہمیت نہیں ہوتی کہ آپ کتنی زور سے گھونسا مارتے ہیں۔ بلکہ اس چیز کی اہمیت ہوتی ہے کہ آپ کتنی تیزی سے ٹکڑے سمیٹ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

اس میں ، میں صرف یہ جمع کرنا چاہتی ہوں کہ  کتنی جلدی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، مزید گھونسے مارنے کے لئیے۔ اسکی اہمیت ہوتی ہے چندا۔

یہ جو نیچے تصویر آرہی ہے۔ یہ تو بنیادی طور پہ آپ سب کے تبصرے کے لئیے چھوڑ دی ہے۔ بس نجانے کیوں غالب کا یہ شعر یاد آگیا۔

شوق، ہر رنگ رقیب سرو ساماں نکلا

قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

نوٹ؛ ان تمام تبصروں سے آپکا متفق ہونا ضروری نہیں۔ اختلاف کی  صورت میں اپنا کوئ تبصرہ جمع کرائیے۔ آپکے نام کے ساتھ اس پوسٹ میں ڈال دیا جائےگا۔

تبصرہ، ریاض شاہد؛

رہے صاحب نقش ونگار تو وہ غالبا تصویر یار آئینہ دل کی بجائے اس جگہ زیادہ محفوظ سمجھتے ہیں اور مقاصد کے علاوہ اس کا مقصد شاید یہ بھی ہو کہ اگر جنگ یا کسی حادثے میں بازو کٹ کر گم ہو جائے تو جس صاحب کو ملے اسے اس کی محبوبہ تک پہنچانے میں آسانی رہے ۔

11:26 PM

Quotations, thailand, آئنسٹائن, آسکر وائلڈ, اقوال زریں, پھوکیٹ, تھائ لینڈ, لینن

تقلید اور جدیدیت-۲

اپنی

پچھلی پوسٹ

میں میں نے قاسم امین کا تذکرہ کیا تھا۔ یہ بات تسلیم کرنے میں مجھے کوئ عار نہیں کہ میں نہیں جانتی تھی کہ قاسم امین کون ہے۔ مجھے بھی یہ لائنیں پڑھ کر پتہ چلا کہ یہ بھی کوئ صاحب ہیں۔ تو جناب پھر میں نے نیٹ پہ جا کر انکے متعلق معلومات حاصل کی ۔قاسم امین اٹھارہ سو تریسٹھ میں پیدا ہوئے اور انیس سو آٹھ میں انتقال کر گئے۔ لیکن اس مختصر مدت میں بھی انہیں مصری نیشنل مومنٹ اور قاہرہ یونیورسٹی کے بانیوں میں شامل ہونے کا اعزاز حاصل ہو گیا۔

انہوں نے دو کتابیں لکھیں۔ پہلی کتاب اٹھارہ سو ننانوے میں اسکا انگریزی عنوان ہے 'دی لبریشن آف ویمین' اور دوسری سن انیس سو میں اور اسکا عنوان ہے ؛دی نیو ویمین'۔

چلیں, ایسی کتابیں اور اس موضوع پہ کتابیں آج ہمیں بہت ملیں گی۔ لیکن انیسویں صدی میں جب مغربی معاشرے میں آزادی نسواں کی تحریک کا نام و نشاں بھی نہ تھا۔ ۔ آخر قاسم امین کو کیا سوجھی کہ وہ اس موضوع پہ اتنا وقت لگاتے۔

انہوں نے سوچا کہ کیا وجہ ہے کہ مصر ایک لمبے عرصے تک علم اور تہذیب کا حصہ بنے رہنے کے باوجود یوروپین تسلط کا شکار ہوا؟

اس سوال کا جواب ہمارے یہاں کے باشعور مرد نے یہ نکالا کہ پاکستانی معاشرے کی اس وقت کی تباہی کی ذمہ داری ان خواتین پہ عائد ہوتی ہے جو ساٹھ اور ستر کی دھائ میں کچھ تعلیم پانے کے قابل ہو سکیں اور جنکی تعداد اس وقت شاید پانچ فیصد ہوگی۔ اور جنکی تعداد اس وقت کے پاکستانی معاشرے میں شاید بیس فیصد کے قریب ہوگی ان میں وہ خواتین بھی شامل ہیں جو اپنا نام لکھ لیتی ہیں اور اکثریت ان خواتین کی ہے جنہوں نے کسی بھی درجے میں اسکول تک کی تعلیم حاصل کی ہو۔

لیکن قاسم امین نے اسکی وجہ مصری معاشرے میں خواتین میں تعلیمی اور معاشی سمجھ کا نہ ہونا نکالا۔ انکا خیال تھا کہ قوم کے بچوں کو تربیت دینے والی ماءووں کو اپنی ذہنی صلاحیتوں کو استعمال کرنا آنا چاہئیے۔ اس وقت ہمارا موضوع قاسم امین کے خیالات کی مصری معاشرے میں اثرات معلوم کرنا نہیں ہے۔ اس لئیے ہم انکے تذکرے کو یہیں چھوڑتے ہوئے آگے چلتے ہیں۔

مسلم معاشرے میں خواتین کے تعمیری کردار کے بارے میں ہر زمانے میں  مفکروں نے غور کیا۔

جہاں ابن رشد ایک جمہوری معاشرے میں کسی عورت کی سربراہی کے خلاف نہیں بلکہ وہ تو اس چیز کے بھی خلاف نہیں کہ عورت سپہ سالار ہو ۔ وہاں محی الدین ابن عربی کہتے ہیں کہ عورت بھی ان روحانی بلندیوں پہ جا سکتی ہے جہاں تک مرد جا سکتا ہے۔

ابن عساکر لکھتے ہیں کہ قرون وسطی کی خواتین نہ صرف تعلیم اسناد حاصل کرتی تھیں بلکہ عالمہ اور استاد کے فرائض بھی انجام دیا کرتی تھیں۔ ابن عساکر نے اپنے دور کی اسی خواتین اساتذہ سے پڑھا۔

پندرھویں صدی میں ابن سخاوی نے بارہ جلدوں پہ مشتمل کتاب دعوۃ اللامی لکھی۔ جسکی ایک پوری جلد خواتین عالماءووں کے لئیے وقف کی گئ تھی۔ جنکی تعداد اس میں ایک ہزار پچھتر ہے۔

حتیٰ کہ خلافت کے زمانے میں بھی خواتین مختلف پیشوں سے وابستہ تھیں اور اپنے امور انجام دیا کرتی تھیں۔ البتہ اکیسویں صدی تک تک آتے آتے مسلمان عورت صرف مرد کی دل کی راحت کا ذریعہ رہ گئ۔

قائد اعظم کو مولانا قائداعظم بنانے والوں نے شاید انکی یہ تقریر بھی نہیں پڑھی جو انہوں نے پاکستان بننے سے تین سال پہلے انیس سو چوالیس میں دی اور اسکا انگریزی متن مندرجہ ذیل ہے۔

No nation can rise to the height of glory unless your women are side by side with you; we are victims of evil customs. It is a crime against humanity that our women are shut up within the four walls of the houses as prisoners. There is no sanction anywhere for the deplorable condition in which our women have to live.

ان میں سے وہ لوگ جو کہ اسلام کو منجمد کرنے کی سطح تک لیجانے کے ذمہ دار ہیں اور اب مزید غور وفکر سے یہ کہہ کر انکار کر چکے ہیں کہ جو کچھ سوچنا تھا ہمارے بزرگوں نے یا ہم سے پہلے کے لوگوں نے سوچ لیا۔ اب ہماری عافیت اسی میں ہے کہ خاموشی سے ایک بنے ہوئے رستے پہ چلتے رہیں۔ یہ معاشرے میں ہر وقت اس تباہی کے آثار تلاش کرتے رہتے ہیں جو خواتین کی بے راہروی اور تعلیم سے آئے ہونگے۔ البتہ انکی اس سوچ سے معاشرے پہ جو اثرات مرتب ہوئے اسکا یہ صاف دلی اور کھلے دماغ  سے مطالعہ کرنے سے قاصر ہیں۔

پاکستانی عورت کی حالت پہ گفتگو کرنا اور معاشرے کو اس چیز کے لئیے راضی کرنا کہ وہ انکی ذہنی صلاحیتوں کی نمو کے لئیے مناسب ماحول پیدا کرے۔ اسے مغرب کی گھناءونی مثالیں لا کر مانگنے سے نہیں روکا جا سکتا۔ آئن اسٹائن بننا صرف کسی مرد کا ہی مقدر نہیں ہو سکتا۔ کوئ عورت بھی اپنی ذہنی صلاحیتوں کو استعمال کر کے انسانی تاریخ میں اپنا نام لکھ سکتی ہے۔  کیا یہ ممکن نہیں کہ مرد جس نظر سے معامالات کو دیکھ رہے ہیں خواتین اس سے بہتر طور پہ اسے دیکھ پائیں۔  لیکن خواتین کو گمنامی کی سطح پر دھکیلنے والے لوگ یہ سمجھنا نہیں چاہتے کہ اگر وہ آئن اسٹائن اور بل گیٹس بن کر بھی اچھے باپ بن سکتے ہیں تو وہ کسی خاتون کو اسکی صلاحیتیں استعمال کرنے کا موقع دینے سے کیوں گھبراتے ہیں۔

اگر آپ تخلیق کے کرب سے گذرے بغیر ہی اپنے آپکو اتنا ذمہ دار سمجھتے ہیں، اگر آپ دنیا کو ہتھیاروں کی ذخیرہ گاہ بنانے کے باوجود اپنے آپکو ذمہ دار سمجھتے ہیں اور اگر آپ ہر وقت نعرہ ء جنگ کی آواز پہ لبیک کہنے اور اس میں انسانوں کو جھونک دینے کے  باوجود اپنے آپکو ذمہ دار سمجھتے ہیں تو کیا ایک ماں آپ سے زیادہ ذمہ دار نہ ہوگی۔

لیکن شاید ذہانت کی ذمہ داری صرف مردانہ خصوصیت ہے اور اسی لئے کوئ خاتون اسے استعمال کرے تو وہ مرد نما عورت کہلانے کی مستحق ہوتی ہے۔

پاکستانی خواتین اور قائد اعظم

مسلمان خواتین کا ماضی

8:06 PM

pakistani women rights, ابن رشد, ابن سخاوی, ابن عساکر, محی الدین عربی, مسلمان خواتین

کئ لائینیں

ایک مختصر ہلکا پھکا سا جملہ بہت سے پریشان چہروں پر مسکراہٹ بکھیر سکتا ہے تو کیوں نہ پھر مسکراتے چہروں کا اضافہ کیا جائے اس دنیا میں جہاں سے آج یا کل بالآخر چلے جانا ہے ۔

یہ جملہ پڑھ کر مجھے اچانک فیض کی یہ نظم یاد آگئ۔ جسکا عنوان ہے 'مرے ہمدم، مرے دوست'۔

لیجئیے پڑھئیے۔

گر مجھے اسکا یقیں ہو مرے ہمدم، مرے دوست

گر مجھے اسکا یقیں ہو کہ ترے دل کی تھکن

تیری آنکھوں کی اداسی، ترے سینے کی جلن

میری دلجوئ، مرے پیار سے مٹ جائے گی

گر مرا حرف تسلی وہ دوا ہو جس سے

جی اٹھے پھر ترا اجڑا ہوا بے نور دماغ

تیری پیشانی سے دھل جائیں یہ تذلیل کے داغ

تیری بیمار جوانی کو شفا ہو جائے

گر مجھے اسکا یقیں ہو مرے ہمدم، مرے دوست

روز وشب، شام و سحر میں تجھے بہلاتا رہوں

میں تجھے گیت سناتا رہوں ہلکے، شیریں

آبشاروں کے، بہاروں کے، چمن زاروں کے گیت

آمد صبح کے، مہتاب کے، سیاروں کے گیت

تجھ سے میں حسن ومحبت کی حکایات کہوں

کیسے مغرور حسیناءوں کے برفاب سے جسم

گرم ہاتھوں کی حرارت میں پگھل جاتے ہیں

کیسے اک چہرے کے ٹہرے ہوئے مانوس نقوش

دیکھتے دیکھتے یک لخت بدل جاتے ہیں

کس طرح عارض محبوب کا شفاف بلور

یک بیک بادہء احمر سے دہک جاتا ہے

کیسے گلچیں کے لئے جھکتی ہے خود شاخ گلاب

کس طرح رات کا ایوان مہک جاتا ہے

یونہی گاتا رہوں، گاتا رہوں تیری خاطر

گیت بنتا رہوں، بیٹھا رہوں تیری خاطر

پر میرے گیت ترے دکھ کا مداوا تو نہیں

نغمہ جراح نہیں، مونس وغمخوار سہی

گیت نشتر تو نہیں، مرہم آزار سہی

تیرے آزار کا چارہ نہیں، نشتر کے سوا

اور یہ سفاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں

اس جہاں کے کسی ذی روح کے قبضے میں نہیں

ہاں مگر تیرے سوا، تیرے سوا، تیرے سوا

دست صبا سے ایک انتخاب۔

11:58 PM

دست صبا, فیض احمد فیض

تقلید اور جدیدیت

جیسا کہ کچھ لوگوں کے علم میں ہوگا کہ آجکل میرے زیر مطالعہ جو کتاب ہے اسکا نام ہے تاریخ فلاسفۃ الاسلام۔ یہ کتاب لکھے ہوئے دیباچے کے مطابق علامہ قفطی کی مشہور و معروف کتاب تاریخ الحکما ء کےبعد غالباً اس موضوع پہ کسی مسلمان مصنف کی پہلی وسیع کتاب ہے

اسکے مصنف ایک عرب عالم جناب لطفی جمعہ ہیں۔ اس کتاب میں جن مسلمان فلسفیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہ بالترتیب اس طرح ہیں۔

کندی، فارابی، اب سینا،غزالی،ابن ماجہ،ابن طفیل،ابن رشد،اب خلدون، اخوان الصفا کے افراد،ابن الہیثم، محی الدین عربی، ابن مسکویہ۔  کتاب میں میری دلچسپی کا باعث ابن رشد کا تذکرہ ہے جس پہ مصنف نے بھی سب سے زیادہ توجہ کی ہے۔

جہاں امام غزالی تقلیدی عناصر کو استقامت دینے والے مفکر قرار پاتے ہیں وہاں ابن رشد حریت فکر کا نام ہیں۔ مفکرین کا کہنا ہے کہ جدید علوم اور سائنس پہ مسلمانوں کی گرفت  اسی وقت تک مضبوط رہی جب تک مسلمانوں میں حریت فکر موجود تھی اور جب اسکا خاتمہ ہوا اور مسلمان علماء نے تقلیدی عناصر کو پسند کرنا شروع کیا تو ان چیزوں پہ انکی گرفت بھی کمزور پڑتی چلی گئ اور بالآخر وہ تاریکی میں چلے گئے۔ کیونکہ اس بارے میں کوئ دو رائے نہیں کہ تحقیق، اور تقلید ساتھ نہیں چل سکتے۔

 ابن رشد ایک اندلسی مفکر تھے۔ انکا زمانہ امام غزالی کے سو سال بعد شروع ہوتا ہے۔ مصنف کی نظر میں ابن رشد میں تین ایسی خصوصیات پائ جاتی ہیں جو کسی اور مسلمان فلسفی میں نہیں۔اول یہ کہ وہ عرب کے سب سے بڑے فلسفی، اور فلاسفہء اسلام میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ دوئم یہ کہ وہ عام طور پہ قرون وسطی کے جلیل القدر حکماء میں سے ہیں جو حریت فکر کے بانی ہیں۔اہل یوروپ کی نظر میں انکی خاص قدر و منزلت ہے۔ سوئم یہ کہ وہ اندلسی ہیں۔

جہاں غزالی نے فلسفے کے توڑ کے لئے کتاب' کتاب تہافہ' لکھی اور تقلیدی مذہب کو رائج کیا۔  وہاں ابن رشد نے سو سال بعد کتاب تہافہ کے رد میں تہافۃ التہافہ لکھی۔ کہا جاتا ہے کہ حاسدین نے خلیفہ کو اب رشد کے خلاف بھڑکایا اور اسکے نتیجے میں ایک لمبے عرصے تک انکی صلاحیتوں کے معترف خلیفہ نے انہیں ملحد قرار دیکرملک بدر کر دیا۔ اور انکی بیشتر کتابوں کو جلا ڈالا۔ اس ملک بدری کے دوران انہیں یہودیوں نے پناہ دی۔ اور انکی کتابوں کے عبرانی ترجمے کر کے یوروپ بھجوائے گئے۔ ایک سال بعد  خلیفہ کو اپنی زیادتی کا احساس ہوا اور اس نے انہیں واپس طلب کر لیا لیکن ہوا یوں کہ واپسی کے چند ہی مہینوں کے اندر خلیفہ اور ابن رشد دونوں ہی زندہ نہ رہے۔

اگرچہ کہ جدید زمانے میں یوروپ کی نشاۃ ثانیہ کا باعث کئ مغربی مفکرین کو بتایا جاتا ہے۔ اور کئ مسلمان علماء بھی ان مغربی مفکرین پہ لعن طعن کرتے رہتے ہیں۔ مگر تاریخ سے انصاف کرنے والے  مغربی یا مسلم دونوں مورخین اسکی وجہ ابن رشد کو قرار دیتے ہیں جس کی تعلیمات کے زیر اثر کلیسا کو ریاستی معاملات سے الگ کیا گیا۔

 اسلامی دنیا انکی تصنیفات اور اسکے اثرات سے محروم رہی۔ اسکی وجہ انکی بیشتر تصنیفات کو جلا دینا ہے جو عربی میں تھیں۔پہلے یہ کام خلیفہ ء وقت نے کیا انکی ملک بدری کے دوران اور بعد میں عیسائ فاتحین اندلس نے۔ خود یوروپ میں کلیسائ قوتیں ان سے ناراض تھیں۔ اور نتیجتاً ایک زمانے میں یوروپ کے بعض حصوں میں انکی کتب پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ بلکہ انہیں جلا بھی دیا گیا۔ لیکن ایک زمانہ وہ بھی آیا جب انکی کتابیں یوروپین تعلیمی اداروں میں نصاب کا حصہ بنیں۔

فی الوقت میں اس کتاب سے ایک اقتباس دیانا چاہونگی۔ یہاں یہ امر یا درہنا چاہئیے کہ ابن رشد کی پیدائش گیارہ سو چھبیس عیسوی کی ہے اور اندازاً انکا زمانہ ہم سے ایک ہزار سال قدیم ہے۔ لیکن خواتین سے متعلق انکا بیان حقیقت حال کی ترجمانی کرتا ہے۔۔'

اسکے بعد ابن رشد نے ایک ایسی بات کہی ہے گویا اسکے نفس نے اسکے مرنے کے کے تقریباً نو سو برس بعد قاسم امین کے کانوں میں پھونکی۔ وہ کہتا ہے کہ ہماری اجتماعی حالت ہمیں ا س قابل نہیں رکھتی کہ ہم ان تمام فوائد کا استعمال کر سکیں جو ہمیں عورت کی ذات سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ بظاہر وہ حمل اور پرورش اطفال کے لئے کارآمد معلوم ہوتی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ جس غلامی کی حالت میں ہم نے عورتوں کو پالاپوسا ہے۔ اس سے انکی تمام اعلی قوتیں مضمحل ہو گئ ہیں اور اسکے عقلی اقتدار کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اس لئے اس وقت ہم کو کوئ ایسی عورت نہیں ملتی جو اعلی فضائل اور اخلاق رکھنے والی ہو۔ انکی زندگی گھاس پات کی طرح ختم ہوجاتی ہے اس طرح وہ اپنے شوہروں پہ بار ثابت ہوتی ہیں۔ یہ امر تمدن کی سخت ترین تخریب اور انحطاط کا موجب ہوا ۔ کیونکہ عورتوں کی تعداد مردوں کی تعداد کے مضاعف ہے گویا وہ وہ دنیا کی مجموعی آبادی کا دو ثلث ہیں لیکن وہ باقی ثلث کے جسم پہ مثل طفیلی حیوان کے زندگی بسر کرتی ہیں صرف اس وجہ سے کہ وہ اپنی ضروری قوتوں کی تکمیل سے عاجز ہیں'۔

تو میرے محترم قارئین، اس ایک ہزار سالہ پرانے خیالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواتین کی ابتر صورت حال کو مغرب میں پچھلی صدی میں  آزادیء حقوق نسواں کے نام سے کیش کرانے کے پیچھے چلنے والا تصوربھی کسی مسلمان مفکر سے ہی لیا گیا ہے۔ یہ الگ بات کہ پچھلے ایک ہزار سالہ  زمانے میں تقلیدی صفت نے ہم سے ہماری عقل کے تمام جوہر چھین کر مسلمان قوم کو اس عورت کی مانند بنا دیا ہے جیسی خوبیاں ابن رشد نے گنوائ ہیں۔  دوسروں پہ انحصار کرنے والی اور دوسروں کی طفیلی۔اور جس طرح ہم عورتوں کو انکی عقلی خوبیاں نہ استعمال کرنے کے عمل کو انکی خوبی اور معاشرے کے لئے سودمند سمجھتے ہیں اسی طرح ہم روائیت پسندی کے جال کو اپنے لئیے ایک تمغہ سمجھ کر اپنی جہالت پہ فخر کرتے پھرتے ہیں۔ اپنے اسلاف کے کارناموں کا تذکرہ تو کرتے ہیں مگر یہ جانے بغیر کہ ہمارے اور انکے درمیان نظریاتی اور عملی اختلاف کتنا زیادہ ہے۔ اگر وہ اس وقت ہمارے درمیان ہوتے تو یقین کامل ہے کہ ہم انہیں بھی دھتکار چکے ہوتے۔

 اس مضمون کی تیاری میں مددگار ذرائع درج ذیل ہیں۔

کتاب۔' تاریخ فلاسفۃ الاسلام'۔ مصنف لطفی جمعہ، ترجمہ ڈاکٹر میر ولی محمد، نفیس اکیڈیمی، اردو بازار کراچی۔

محی الدین کا ایک اخباری کالم

ابن رشد، ویکیپیڈیا اردو میں

7:07 AM

Ibn Rushd, Imam Ghazali, ابن رشد, امام غزالی, اندلسی حکماء, تہافہ التہافہ, کتاب تہافہ

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں

4:35 PM

، جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت،مجلس اتحاد بین المسلیمن،قادیانی،دیو بندی،اہل سنت والجماعت،اہل حدیث،

کراچی میں دھماکہ

دوپہر میں، میں نے سوچا کہ سر شام اپنی ایک پرانی دوست سے ملاقات کر لی جائے۔ گھر سے نصیحت ہوئ کہ باہر نکلنے کا کوئ بھی پروگرام مغرب سے پہلے نہ بنائیے گا۔ اگر کوئ دھماکہ ہوا تو پھنس جائیں گی۔ میں نے سوچا صحیح کہہ رہے ہیں۔ اور پروگرام ملتوی کر دیا۔

کچھ دیر پہلے فون آیا کہ شہر کے مرکز سے گذرنے والے ماتمی جلوس میں دھماکا ہو گیا ہے۔ یہ جلوس ہر سال نکلتا ہے۔ دل دھک سے رہ گیا۔ فوراً ٹی وی کھولا، خبر صحیح تھی۔ اب تک کی اطلاعات کے مطابق بیس افراد جاں بحق اور پینتالیس افراد زخمی ہوگئے۔ یہ ایک خود کش دھماکا تھا۔۔

ایک عرصے سے میں نے اس موضوع پہ لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ آخر کب تک ہم بھی سیاسی لیڈران کی طرح مذمتی تحریریں لکھ لکھ کر اپنے دکھ کا اظہار کرتے رہیں گے۔ مرنیوالے مر جاتے ہیں اور جھیلنے والے جھیلتے رہتے ہیں۔ باقی لوگ اپنے حصے کے صفحے بھرتے رہتے ہیں۔

 لیکن مختلف چینلز کو سرف کرتی ہوئ جب میں ایک چینل پہ پہنچی تو عمران خان سے تاثرات پوچھے جا رہے تھے۔ اور انکا وہی کہنا کہ جناب یہ سب دوسروں کی جنگ میں جانے کی وجہ سے ہوا ہے۔ ان سے کوئ پوچھے دوسروں کی جنگ میں تو ہم انیس سو اناسی سے شامل ہیں آخر اس وقت یہ خیال کیوں اتنی شدت سے آرہا ہے۔

اب جبکہ حالات اس نہج پہ پہنچ چکے ہیں کہ دہشت گردوں کے خلاف ہم میں سے ہر ایک کو بلا کسی تفرقے کے کھڑا ہوجانا چاہئیے۔ وہاں ایسے لیڈران کا اب بھی دہشت گردوں کا دفاع کرنا انکی عوام دشمنی کو ظاہر کرتا ہے۔ اور اگر ان رہنماءووں نے اپنا رویہ نہ بدلا تو وہ دن دور نہیں جب دھماکوں سے تنگ آئے عوام انہیں بتائیں گے کہ ایسے رہنماءووں کا اور اس سیاست کا انجام  کیا ہوگا۔

6:21 PM

Karachi blast, terrorism in Pakistan, کراچی خود کش دھماکہ، دہشت گردی کے خلاف جنگ، محرم،

ہائے فیس بک

   لیجئیے جناب اب تو مجھے بھی یقین ہو گیا کہ فیس بک یہودیوں کی مشین ہے۔ کچھ تحریریں

اسکے متعلق لکھ ڈالی تھی۔ اپنے تئیں تو ہم سمجھ رہے تھے کہ یہ کسی کے خلاف نہیں بس

یوں

ہی سی گپ شپ ہے۔ لیکن پتہ چلا کہ یہ ایک گستاخی ہے اور سزا کے طور پہ  میری فیس بک تک پہنچ ممکن نہیں رہی۔ حالانکہ میری یہ تحریریں اردو میں تھیں اور ہم جیسے لوگ تو کسی غیر زبان بولنے والے سے محبت بھی کرنے لگیں تو اسی مشکل کا رونا رہتے ہیں کہ زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم۔ مگر یہ یہودی، کسی کے دشمن ہو جائیں تو اسکی زبان تک سیکھ لیتے ہیں۔

اب کوئ اس کہانی میں بھنگ ڈالنے کے لئیے کہہ دیگا کہ بی بی، کسی نے آپکا اکاءونٹ ہیک کر لیا ہے۔ تو انکی خدمت میں عرض ہے کہ میرا کوئ ہموطن ایسا کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اگر کسی نے ایسا کیا ہے تو بھی وہ کوئ یہودی ہی ہوگا۔

 اب کیا کہوں جہنم میں جائے فیس بک اور اسکے چلانے والے۔  ان یہودیوں کا ککھ نہ رہوے جنہوں نے کریال میں غلیلہ مارا۔

لیکن اپنے ان  دوستوں کا کیا کروں جو ایک ایک کرکے جمع کئیے تھے۔ ہائے فیس بک، تونے وہ گنج ہائے گراںما کیا کئے۔

9:26 AM

Face book hacking, فیس بک ہیکنگ، فیس بک اکاءونٹ، یہودی، ترکی،

صرف ایک بچی کی ماں

ابھی کچھ دنوں پہلے کسی نے میری طنزیہ تعریف فرمائ کہ بتاءوں آپ کیا ہیں، آپ ہیں ایک بچی کی ماں۔ اپنی دانست میں تو انہوں نے مجھے میری اوقات یاد دلائ۔ لیکن ہوا یوں کہ یہ میری زندگی میں حاصل ہونے والی سب سے بہترین تعریف ہے۔ آج کا دن میری زندگی کا شاید سب سے پر مسرت دن ہے کہ آج میری بیٹی ہماری دنیا میں آئ۔ آج اسکی تیسری سالگرہ تھی۔ سو آج کی یہ پوسٹ مشعل کے نام۔

لیکن اپنی اصل میں یہ ان تمام ماءووں کے نام ہے جو ایک یا کئ مشعلوں کی ماں ہیں۔ جو اپنی صلاحیتوں، اپنے علم،اپنے مرتبے کو اپنی اولادوں کی تربیت اور بہتر مستقبل کے لئے استعمال کرتی ہیں  یا اس پہ قربان کرتی ہیں۔   مائیں عظیم ہیں اور وہ محض تخلیق کا پرزہ نہیں بلکہ انکے ہاتھ میں اس کائنات کی باگ ہے۔ لیکن اسے مہارت سے پکڑے رکھے رہنے کے لئیے  اپنے آپکو گرد و پیش میں ہونے والی تبدیلیوں سے آگاہ رکھنا جتنا ایک ماں کے لئے ضروری اتنا کسی کے لئے نہیں۔ اسی لئے تو کسی دانا نے کہا تھا کہ تم مجھے بہترین مائیں دو میں تمہیں بہترین قوم دونگا۔

ہاں تو آج میری بیٹی تین سال کی ہوگئ۔ ہر ماں باپ کی طرح مجھے بھی وہ غیر معمولی عادات اور دماغ کی حامل لگتی ہے۔ اور اسکی مسکان اور اسکا آ کر یہ کہنا کہ میں آپکو پیار کرنا چاہتی ہوں میرا دل پگھلا کر پانی بنا دیتا ہے۔

ویسے تو میں نے اسے گھر میں پڑھا پڑھا کر قابل بنانے میں کوئ کسر نہیں چھوڑی۔ اور اسکے لئے میں نے روائتی طریقے استعمال نہیں کئے۔ بلکہ گھر میں کھیل ہی کھیل میں، باتیں کرتے، واک کرتے، کھانا کھاتے،  ٹی وی دیکھتے، جہاں جہاں موقع ملتا ہے وہاں وہاں میں اسکے کان میں باتیں ڈالتی رہتی ہوں۔ ان تمام سرگرمیوں کو جاننے کے لئیے میں نے نیٹ پہ کافی سرچ کی۔ اور جتنی بھی دلچسپ اور کام کی ویب سائٹس تھیں انہیں مارک کر لیا۔ اور اب بھی مختلف سائٹس کو چیک کرتی رہتی ہوں۔ اس لحاظ سے نیٹ نے میری کافی مدد کی، اسکی دیکھ بھال سے لیکر تربیت تک میں۔  اور شاید اب اسکول والوں کا دماغ کھانے میں بھی۔

تو جناب یہ ساری چیز اتنے بہترین طریقے سے چل رہی تھی کہ ابھی تک اسے کسی اسکول میں ڈالنے کی ضرورت بھی نہیں پڑی اور میں سوچ رہی تھی کہ شاید پہلی کلاس تک ضرورت بھی نہ پڑے گی۔ لیکن اب انکی حد سے بڑھتی ہوئ سرگرمیوں اور ہم عصروں کے دباءو کی پیش نظر یہ فیصلہ کیا گیا  کہ انہیں کسی مناسب اسکول کے حوالے کیا جائے۔ اگرچہ کہ اب بھی سوچتی ہوں کہ پڑھائ کی مد میں وہ وہاں کیا کریں گی۔ اور اسکول والے کہیں اس سارے عمل کو سست نہ کر دیں۔

یہ ہم عصر انکے نہیں ہمارے ہیں۔ اور یوں لگتا ہے کہ جو بچے ڈیڑھ برس کی عمر میں کسی پلے اسکول یا ڈھائ برس کی عمر میں کسی اسکول کے حوالے نہ کئیے گئے تو انکے والدین کوئ جرم کر رہے ہیں۔ حالانکہ سچ پوچھیں تو مجھے اتنے چھوٹے بچوں پہ یہ ظلم لگتا ہے۔ یہ انکی عمر ہے کہ انہیں اپنے ارد گرد کے ماحول کو خود برت کر آزادی سے سیکھنے کا موقع دیا جائے۔ لیکن اتنی چھوٹی عمر میں انہیں اسکول کے ڈسپلن کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ مجھے یہ بالکل پسند نہیں۔ لیکن مری بیٹی کی اوسط سے تھوڑی زیادہ لمبائ اور انکی باتیں بنانے کی رفتار کی وجہ سے شاید ہی کوئ شخص ہو جو یہ نہ پوچھتا ہو کہ کونسی کلاس یا کونسے اسکول میں پڑھتی ہے آپکی بیٹی۔ اور جواب انکار کی صورت میں ہونے کے بعد وہ ہماری لاپرواہی پہ خاصہ حیران ہوتے ہیں۔

 چلیں یہ تو ابتدائ مشکلات ہیں۔ لیکن جس چیزکی مجھ سمیت ہر ذمہ دار ماں کو فکر رہتی ہے وہ ہمارے معاشرے کی زبوں حالی ہے۔ میں اپنی بیٹی کو کیا بنانا چاہتی ہوں۔ میں اسے صرف ایک عورت نہیں بنانا چاہتی۔ اس کائنات کے اندر پھیلے علم میں اسکا بھی حصہ ہے جو اسے ملنا چاہئیے۔ وہ عقل اور شعور  رکھتی ہے اور اسے کسی بھی بہترین انسان کی طرح اسے استعمال کرنا آنا چاہئیے۔ اسے محض ایک ذمہ دار عوت نہیں ذمہ دار انسان بننا ہے جو اپنے ماحول کی بہتری کے لئے اپنی قدرتی صلاحیتوں کو استعمال کر سکے۔ جسے اسے دینے میں خدائے پاک نے کسی بخل سے کام نہیں لیا۔

لیکن اس ٹہرے ہوئے معاشر ے کی بدبو دور کرنے کے لئے ہم جیسی ماءووں کو کیا کرنا چاہئیے۔ کیونکہ یہ تو واضح ہو رہا ہے کہ فی الحال ہم مزید بگاڑ اور مزید بگاڑ میں جا کر بھی شاید دم نہ لیں۔

9:30 AM

Early childhood education, بچوں کی ابتدائ تعلیم، والدین، خواتین کے حقوق،

ایک بلاگر کے لئے

آج کیا پکائیں، یہ سوال اکثر خواتین کو صبح سویرے پریشان کرتا ہے۔ وہ جو خود نہیں پکاتیں وہ بھی سوچتی ہیں آج کیا کھلائیں۔ ایسی ہی کیفیت اکثر بلاگرز کی بھی ہوتی ہیں۔ آج کیا لکھیں، اور جو لکھ رہے ہیں وہ سوچتے ہیں کیسے لکھیں۔ اسی ادھیڑ بن میں بننے سے پہلے ادھڑ جاتا ہے۔ اور ہوتا یہ ہے کہ اگلے ہی لمحے وہ خّود کو اس طرح کے کام کرتا پاتا ہے۔ موبائل پہ میسیجنگ یا فیس بک پہ کوئ گیم۔

آپ کسی عظیم موضوع پہ لکھنا چاہتے ہیں تو یاد رکھیں کہ اسکے لئے بلاگنگ کوئ آئیڈیل میڈیا نہیں۔ اس مقصد کے لئے آپکو ناول، دیوان وغیرہ سے نبرد آزمائ کرنی پڑے گی۔ جسکا آپکے پاس وقت نہیں ہوگا۔تو عظیم موضّوع کا خیال دل سے نکال دیں۔ لیکن یہاں میں احتیاطاً بتا دوں کہ اکثر اوقات عظمت کی راہ پہ قدم رکھ دینے کے باوجود چلنے والوں کو نہیں پتہ ہوتا کہ وہ کس قدر عظیم بننے جا رہے ہیں۔

کچھ لوگ اس فکر میں گھلتے رہتے ہیں کہ اگر انکے قلم سے منٹو، یوسفی یا مستنصر کے جیسے الفاظ نہ نکلے تو کیا فائدہ لکھنے کا۔  بلاگنگ کا تعلق تو ویسے بھی الیکٹرونک میڈیا سے ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ  انکی تحاریر پکوڑے لپیٹنے کے کام آجائیں۔ماحولیاتی آگہی کی اتنی فکر کرنیوالے جان رکھیں کہ  اس الیکٹرونک میڈیا میں آپ خود ایک پکوڑے سے کم نہیں۔

کچھ لکھنے والے تبصروں کی مار نہیں سہہ پاتے۔ اور اگر کوئ  نکتہ چیں انکی تحریر کی کرچیاں کرےتو انکا گھر سے بھی نکلنے کو دل نہیں چاہتا۔ اور وہ جا کر انتقاماً مافیا وارز جوائن کر لیتے ہیں۔ ایسے نازک دل اصحاب کو یہی مشورہ دیا جا سکتا ہے کہ جب اوکھلی میں سر دیا تو موصلوں کا کیا ڈر۔   لکھتے رہیں اور مبصرین کے تاثرات نوٹ کرتے رہیں۔  کچھ دنوں میں تبصرہ نگار آپکی تربیت کر دیں گے کہ کیا لکھنا چاہئیے اور کیا نہیں۔ ورنہ آپ تو ان سے نبٹ ہی رہے ہیں۔

اور اگر آپ اس درد سر مِں نہیں پڑنا چاہتے تو تبصرہ نگاروں کے درمیان خود اترنے کی کوشش نہ کریں۔ انہیں آپس ہی میں سر پھٹول کرنے دیں۔ یہ تو آپکو معلوم ہونا چاہئیے کہ جو جیتا وہی سکندر۔

اگر برسوں اپنی تربیت آپ کرنے کے نتیجے میں لوگ آپکو بندہ ء گستاخ کہنے لگے ہیں تو بلاگنگ آپکے لئے بالکل موزوں ہے اپنے دل کے جلے یہاں پھوڑیں۔ گھر والوں کو خاصہ افاقہ رہیگا۔ اور آپکے پاس بھی لکھنے کے لئیے کچھ نہ کچھ آتا رہیگا۔

اسکے باوجود کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کیا لکھیں تو کچھ روائیتی مشورے حاضر ہیں۔

کسی کتاب سے اقتباس لکھ دیں۔

اخبار کی کسی خبر کو موضوع بنا لیں یا اسے ہی من و عن چھاپ دیں۔

کسی کالم نگار کا کالم چھاپ دیں ، ہو سکتا ہے اس طرح انکی شہرت میں اضافے کے ساتھ مستقبل میں آپکو انکا تعارف بھی حاصل جائے۔

لیکن ان سب سے بھی دلچسپ یہ ہوگا کہ آپ اپنے شب وروز مِں، اپنے ماحول میں، اپنی روزمرہ کی سرگرمیوں میں کیا چیز دلچسپ دیکھتے ہیں اس پہ لکھنا شروع کر دیں۔ بالکل ایسے جیسے آپ اپنے دوستوں کو یہ قصہ سنا رہے ہوں۔ اسکی آپ فکر نہ کریں کہ آپکی زبان نستعلیق انداز میں لکھی ہے یا وہی روزانہ کی بولی ہے۔ یہ بھی ضرورری نہیں کہ آپکو اس قصے میں جان نظر آرہی ہے یا نہیں۔

اسکی بھی فکر نہ کریں کہ فلاں فلاں بلاگر اتنا زبردست لکھتا ہے اور میں ویسا نہیں لکھ پاتا۔ زندگی کو جس رخ سے آپ برت رہے ہیں۔ وہ رخ انکے پاس نہیں ہوگا۔ مجھے دیکھیں، میں نے سمندر میں گم ہوتا سورج دیکھا ہے مگر درختوں کے جھنڈ میں نہر کنارے سونے والے سورج کو نہیں جانتی۔ برسوں سے رویت ہلال کمیٹی کے سارے جھگڑے کے بعد چاند کی خبر سن لیتی ہوں لیکن خود کسی میدان میں جا کر دیکھنے کے موقع سے محروم۔ نہیں معلوم کہ چلتے چلتے اگر گھوڑا گاڑی کا ٹآئر نکل جائے تو کیا کرتے ہیں۔

اس میں بھی جان تپانے کی ضرورت نہیں کہ میری تحریر پہ کوئ تبصرہ نہیں کرتا یا فلاں کے پاس اتنے لوگ آتے ہیں میرے پاس اتنے کم۔ میں نہیں لکھتا۔ لکھتے رہئیے۔ مجھے یقین ہے لوگ تبصرہ نہ بھی کرتے ہوں تب بھی انکی اکثریت پڑھتی ضرور ہو گی۔ خاص طور پہ وہ لوگ جو اپنی زبان میں کچھ پڑھنا چاہتے ہیں۔

اگر اب بھی آپکو کچھ سمجھ نہیں آرہا تو اپنے بلاگ کو اپنی ڈائری سمجھ کر لکھنا شروع کر دیں۔ لیکن اس میں بہت ذاتی باتیں نہ لکھ ڈالئیے گا۔ جو آپ کسی سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہوں کیونکہ یہ بات کئ صدیوں پہلے معلوم کی جا چکی ہے کہ دنیا گول ہے۔

نوٹ؛ مزید مشوروں کے لئیے خوش آمدید۔

9:00 AM

blog writing, Urdu blogging, اردو بلاگنگ، بلاگ لکھنا، بلاگ کا موضوع،

کیا شہر کراچی ڈوب جائے گا؟

 یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے جو کراچی میں وافع بحریات یا سمندریات پہ ریسرچ کرنے والے ادارے کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ اس ادارے کا نام ہے۔ نیشنل انسٹیٹیوٹ آف اوشنوگرافی ۔ باقی تفصیل آپ نیچے دئیے گئے حوالے میں جا کر دیکھ سکتے ہیں۔ میری اس میں دلچسپی اسکے موضوع کی وجہ سے ہے جو سندھ ڈیلٹا کی فرسودگی کی وجوہات اور اسکے ساتھ ہی کراچی کے ساحلی علاقوں کو سطح سمندر کے بلند ہونے کی وجہ سے لاحق خطرات ہیں۔

اس سے پہلے یہ میں بتا دوں کہ یہ لکھنے کی نوبت ایک بلاگ پہ دی جانے والے اس بیان سے آئ کہ کراچی آئندہ پندرہ سے بیس سالوں میں ڈوب جائیگا۔

آئیے دیکھیں تحقیق داں اس موضوع پہ کیا کہتے ہیں۔

اس تحقیقی مقالے میں صفحہ آٹھ پہ دی گئ معلومات کے مطابق پچھلے سو سالوں میں کراچی میں ہر سال سطح سمندر ایک اعشاریہ ایک ملی میٹر سالانہ کے حساب سے بڑھی ہے۔ اور آئندہ پچاس سے سو سالوں میں یہ توقع کی جاتی ہے کہ یہ شرح دگنی سے زیادہ ہو جائے گی۔  خیال کیا جاتا ہے کہ یہ بڑھکر چالیس سے پچاس سینٹی میٹر بھی ہو سکتی ہے۔ یہاں ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ ایک انچ میں تقریباً دو اعشاریہ پانچ سینٹی میٹر ہوتے ہیں اور ایک میٹر سو سینٹی میٹر یا تقریبا چھتیس انچز سے بنتا ہے۔

اب آجاتے ہیں شہر کراچی کی سطح سمندر سے بلندی کی طرف۔ یہ صحیح ہے کہ شہر کے کچھ علاقے جو ساحل سمندر سے کچھ فاصلے پہ ہیں سطح سمندر سے نیچے آتے ہیں لیکن شہر کا زیادہ تر حصہ سطح سمندر سے کچھ نہ کچھ بلندی پہ ہے جیسے ملیر اور ناظم آباد یا لانڈھی کے علاقے۔ نارتھ ناظم آباد اور اورنگی ٹاءون کا علاقہ سطح سمندر سے کوئ تیس فٹ کی بلندی پہ ہے۔ جبکہ ویکیپیڈیا کی اطلاع کے مطابق شہر کی، سطح سمندر سے اوسط بلندی آٹھ میٹر ہے۔

 اب اگر ہم آئندہ پچاس سالوں میں ایک متوقع سطح سمندر کی بلندی جو کہ چالیس سے پچاس سینٹی میٹر ہے کا سامنا کرتے ہیں تو اس حساب کتاب سے ایک عام شخص کو بھی پتہ چل سکتا ہے کہ آئندہ پچاس سالوں میں بھی شہر کراچی ڈوبنے نہیں جا رہا ہے۔کیونکہ شہر سے مراد پورا  تین ہزار تین سو مربع کلومیٹر پہ پھیلا ہوا شہر ہے۔ نہ کہ صرف  اسکے ساحلی علاقے۔

گلوبل وارمنگ کے نتیجے میں دنیا کے تمام شہری علاقوں کو خطرے کا سامنا ہے۔ اور شاید اس وقت جس ملک کو سب سے زیادہ خطرہ ہے وہ جزائر مالدیپ ہیں۔اس ملک میں احتجاجا کیبنٹ کا حالیہ ہونے والا ایک اجلاس سمندر کے اندر منعقد کیا گیا ہے۔

اسی طرح میں نے کراچی کے سمندر کے قریب باندھے جانیوالے بند کے متعلق اپنے طور پہ نیٹ پہ سرچ کی اور مختلف ادوار سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے بھی معلوم کیا اور میں اس نتیجے پہ پہنچی کہ ایک مکمل ڈیم تو  نہیں البتہ دور دور تک  مٹی بچھا کر اسکی سطح کو بلند کیا گیا ہے۔ اسے انگریزی میں تو ریکلیمیشن  کہتے ہیں البتہ اسکے اردو مترادف سے میں واقف نہیں۔ اسی ٹیکنک کو استعمال کرتے ہوئے کراچی میں ڈی ایچ اے نے سمندر سے زمین حاصل کر کے اس پہ اپنے نئے فیز بنائے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ فاضل مصنف نے اس مٹی بچھانے کے عمل کو ڈیم سے تعبیر کیا ہے اور اسکے لئے یہ اصطلاح استعمال کی جو کہ ایک مناسب اصطلاح نہیں ہے۔

حوالے؛

متعلقہ تحقیقی مقالہ

کراچی کی سطح سمندر سے بلندی

لینڈ ریکلیمیشن

3:43 PM

Global warming. کراچی ریکلیمیشن، نیشنل انسٹیٹوٹ آف اوشنو گرافی کراچی، سندھ ڈیلٹا, Reclamation in Karachi

ایک تحقیقی مقالہ

ایک تحقیقی مقالہ جسے ہم انگریزی میں ریسرچ پیپر کہتے ہیں۔ اس میں کچھ بنیادی ضروریات کا ہونا ضروری ہے اسکے بغیر اسے ایک معلوماتی مضمون تو کہا جا سکتا ہے مگر ایک ریسرچ پیپر نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تحقیقی مقالے پی ایچ ڈی کرنے کی بنیادی ضرورت ہوتے ہیں۔ اور اپنے مضمون سے متعلق مخصوص جرائد میں شائع ہوتے ہیں جنہیں جرنلز کہا جاتا ہے۔ ان پیپرز میں عام طور سے اس مضمون سے متعلق کسی نئ معلومات کو پرانی معلومات سے جوڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔ اور اسے تجرباتی طور پہ یا اعداد شمار کے ذریعے ثابت کیا جاتا ہے۔ یہ اعداد شمار بھی مستند مشینوں یا سروے یا اسی طرح کے ذرائع استعمال کر کے پیش کئے جاتے ہیں۔ سائنسی سطح پہ ان نتائج کا ان تمام حالات کو دہراتے ہوئے خود کو دہرانا ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ اس حقیقیت کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ عام طور پہ جرنلز میں چھپنے سے پہلے انہیں ماہرین کا ایک گروپ چیک کرتا ہے کہ اس میں دی گئ اطلاعات کہاں تک درست ہو سکتی ہیں۔ نیز تمام پرانے دئے جانیوالے بیانات کو صراحت سے لکھا جاتا ہے کہ وہ کہاں سے لئیے گئے ہیں۔ اور کوشش کی جاتی ہے کہ ان بیانات کا اصل متن متائثر نہ ہونے پائے۔ کسی بھی مناسب جریدے میں شائع ہونے سے قبل ان تمام حوالوں کو بھی چیک کیا جاتا ہے اور اسے بالکل سنجیدگی سے لیا جاتا ہے۔

ایک اور صورتحال یہ ہوتی ہے کہ ان تحقیقی مقالات کو ان سے منسلکہ کانفرنسز میں پڑھا جائے۔ جہاں اس مضمون کے ماہرین اور طلباء سبھی موجود ہوتے ہیں۔ اس صورت میں اگر آپ کوئ نوبل انعام یافتہ یا غیر معمولی شہرت کے حامل اعلی تحقیق داں نہ ہوں تو بھی ماہرین کا ایک پینل آپکے اس تحقیقی مقالے کو پڑھ کر اسے کانفرنس کی پروسیڈنگز میں شامل ہونے کی اجازت دیتا ہے۔

ان تمام ریسرچ پیپر کو سیکولر طرز تحریر پہ لکھا جاتا ہے یعنی انکو پڑھکر آپکو یہ نہیں لگتا کہ وہ کسی خاص طبقے کی جانبداری میں لکھے گئے ہیں۔ یہ علم کا راستہ ہے، یہاں آپکو وہ چیز بھی مل سکتی جسکی آپکو توقع تھی اور وہ بھی جسکی آپکو توقع نہیں تھی۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ یہ علم پرانے علم کی ہر بنیاد کو اکھاڑ دے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جسے ہم قدیم کہہ کر جھٹلا چکے ہوں انہیں صحیح ثابت کر دے۔

ان جرائد کے معیار کی بھی درجہ بندی ہوتی ہے۔ اور اس پہ کسی تحقیق داں کا معیار پرکھا جاتا ہے  اس معیار یا گریڈنگ کو امپیکٹ فیکٹر کہتے ہیں۔ عام طور پہ بے حد مستند اور اعلی جرائد کا امپیکٹ فیکٹر زیادہ ہوتا ہے۔ جیسے سائنسی جریدہ 'نیچر' ایک اعلی جریدہ ہے اسکے مقابلے میں ریڈرز ڈائجسٹ محض ایک ڈائجسٹ جس کا کوئ امپیکٹ فیکٹر نہیں بنتا۔ اور ڈان اخبار صرف ایک اخبار۔

جس سائنسداں  کا ریسرچ پیپر جتنے اعلی جرائد میں شائع ہو اسکا امپیکٹ فیکٹر اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ اور اس سے اسکی ریسرچ کا معیار ظاہر ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایک ریسرچ پیپر کسی ایسے جریدے میں شائع ہو جاتا ہے کہ اسکا امپیکٹ فیکٹر تمام جریدوں پہ بھاری ہو کر اسے صف اول کے تحقیق دانوں میں شامل کر دیتا ہے جسے ڈی این اے کی مالیکیولی ساخت بتانے والا پیپر۔ اور بعض اوقات تحقیق داں ساری زندگی کام کرتا ہے مگر کوئ ایسا قابل ذکر نیا علم نہیں بڑھا پاتا کہ وہ اسے کسی معقول سطح پہ شائع کرا سکے۔ اور اس طرح سے اسکاامپیکٹ فیکٹر غیر متاثر کن رہتا ہے۔ جیسے ہمارے یہاں کے بہت سارے تحقیق داں۔

7:43 PM

Impact factor, Readers Digest, امپیکٹ فیکٹر، تحقیق مقالہ، تحقیقی جریدہ، نیچر، ریڈرز ڈائجسٹ، Nature

ایک ہے ثریا

میں ثریا کو نہیں جانتی۔وہ یہیں کہیں رہتی ہوگی۔

میں نے سنا ہے وہ ملک کے کسی دورافتادہ علاقے سے اپنے گھر والوں کے ساتھ یہاں آئ تھی۔ پھر اسکا باپ ایک ایکسیڈنٹ میں مر گیا۔ اور وہ اپنے دو چھوٹے بھائیوں اور ماں کے ساتھ زندگی جھیلنے لگی۔ اسکی ماں نے کپڑے سی کر اپنا گھر چلانے کی کوشش کی لیکن کچھ عرصے میں پتہ چلا کہ اسے کالا موتیا ہوگیا ہے اور اب وہ بہت کم دیکھ پاتی تھی۔

 ثریا نے ایک مدرسہ میں پڑھانا شروع کر دیا۔ یہاں اسے قرآن حفظ کرنے کی سہولت بھی حاصل تھی اور پڑھانے کی وجہ سے کچھ تنخواہ اور دن کا کھانا بھی۔ لیکن اسکے اوقات بہت سخت تھے۔ وہ فجر سے پہلے ہی اٹھ کھڑی ہوتی اور جب شام ڈھلے منی بس میں ڈیڑھ گھنٹے کا سفر طے کرنے کو سوار ہوتی تو کبھی کبھی شدت تھکن اور نیند سے اسکی آنکھیں بالکل بند ہو جاتیں۔ نیند تو سولی پہ بھی آجاتی ہے۔

پر اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ سولی کی نیند، اس پہ آنیوالی موت کے مقابلے میں کتنی بھیانک ہوتی۔ یہ اسے اس دن پتہ چلا جب اسکی آنکھ کھلی تو وہ ایک بیابان علاقے میں گاڑی کے ڈرائیور اور کنڈیکٹر کے ساتھ موجود تھی۔  بہت رو دھو کر جب وہ گھر واپس لوٹی تو بھی اسے اندازہ نہ تھا کہ اب اسے کتنی مدت تک جاگنا ہوگا۔ اسکا صحیح اندازہ اسے اس دن ہوا جب اپنی ماں کے بےحد اصرار پہ کہ وہ ڈاکٹر کے پاس جائے آخر اتنے دنوں سے اسکی طبیعت کیوں صحیح نہیں ہے۔ وہ محلے کی ڈاکٹر کے پاس چلی گئ۔

لیڈی ڈاکٹر کی تشخیص پہ وہ بالکل ہکا بکا رہ گئ۔ اسکی عمر تو صرف سترہ سال تھی اور اسکا تو کوئ قصور بھی نہ تھا۔ مگر بیالوجیکل سائنس ان تمام حقائق سے نا واقف تھی۔

آخر اس لیڈی ڈاکٹر نے اسکی قابل ترس حالت کو دیکھتے ہوئے اسے ایک سینئیر ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا۔ حالات اس مرحلے پہ تھے جہاں وہ جونئیر  ڈاکٹر کچھ نہ کر سکتی تھی۔

 بلکہ کوئ ذمہ دار ڈاکٹر کچھ نہ کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر نے سب دیکھا بھالا۔ اسے تسلی دی اس تکلیف دہ اطلاع کے ساتھ۔ اس نئ آنے والی زندگی کو روکا نہیں جا سکتا البتہ وہ اسکی مزید مشکل آسان کر سکتی ہے۔ اس طرح کہ اسے آنیوالی زندگی میں مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اور اس آنیوالے بچے کو بھی زندگی کا حق حاصل رہے۔

چند مہینوں بعد ثریا کی ماں کو ایک ہسپتال سے فون آیا کہ کہ وہ فوراً پہنچے اسکی بیٹی کی حالت درست نہیں۔ ہسپتال پہنچنے پہ ڈاکٹر نے اسے خاصہ ڈانٹا کہ اس نے اپنی بیٹی پہ کوئ توجہ نہ کی۔  اسکی بیٹی کے پیٹ میں خطرناک رسولی ہو گئ تھی۔ وہ آج سڑک کے کنارے بیہوش ملی۔ اور بروقت آپریشن کر کے اسے بچا لیا گیا ہے۔

میں ثریا کو نہیں جانتی، اس لئے مجھے اس ساری کہانی سے کوئ خاص دلچسپی نہیں۔

 وقت کی کسی اکائ میں ہونے والے اس واقعے سے پہلے یا بعد میں میری ایک دوست کا فون آیا کہ انہوں نے ایک بچہ گود لے لیا ہے۔

میں انکے ساتھ انکے گھر میں موجود ہوں۔ بچے کے موجودہ والدین خوش نظر آرہے ہیں۔ انہیں بے اولادی کا عرصہ گذارتے ہوئے پانچ سال ہو گئے تھے وہاں کچھ رشتے دار بھی ہیں۔ کسی نے کہا کہ بڑا نیکی کا کام کیا ہے آپ نے ۔ وہ دونوں حیران ہوئے۔ ارے ہم نے کیا نیکی کا کام کیا ہے۔ یہ تواس بچے کی مہربانی ہے جس نے ہمیں مکمل کر دیا۔۔ یہ تو خدا کا تحفہ ہے۔ انکی سرشار آوازآئ۔

 وہیں ایک اور صاحب بھی بیٹھے ہیں وہ اپنی داڑھی پہ ہاتھ پھیرتے ہیں اور کہتے ہیں بھئ بچہ آپ نے گود لے لیا بہت اچھا کیا لیکن شرعی حکم یہ ہے کہ بچے کے باپ کا نام تبدیل نہیں ہونا چاہئیے۔ تو اس بچے کے باپ کا نام معلوم کر کے اسکے ساتھ وہی نام لگانا'۔

سب لوگ خاموش ہوجاتے ہیں۔ اس خاموشی کو اس بچے کے موجودہ باپ نے توڑا۔ ' نہ مجھے اس سے غرض اور نہ ہی اس ادارے کی یہ پالیسی ہے۔ جہاں سے یہ بچہ ہماری دنیا میں آیا ہے'۔'بھئ ہم نے تو تمہیں خدا کا حکم بتا دیا۔ اب تمہاری مرضی'۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

 میں نے اپنی موجودگی کو زائد جان کر  اپنی دوست کی گود میں دنیا و مافیہا سے بے خبر نرم کمبل میں لپٹے اس بچے کی بندھی مٹھیوں میں شگون کے پیسے رکھے اور والدین کو مبارکباد دیکر نکل آئ۔ ہم میں سےکتنے لوگ اس اختیار کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں کہ ہم معلوم باپ کے گھر پیدا ہونگے یا نامعلوم باپ کے گھر۔

گاڑی سگنل پہ رکی تو وہاں بیٹھے بچوں کے غول میں سے ایک گیارہ بارہ برس کی بچی میرے منع کرنے کے باوجود تیزی سے گاڑی کا شیشہ صاف کرنے لگی۔

میں نے اسے دیکھا۔ اورمجھے لگا میں ثریا کو جانتی ہوں۔

3:45 PM

child adoption, بچوں کو گود لینا، زنا بالجبر، بچوں کے ساتھ زیادتی، Child abuse, ناجئز بچے

ترغیب، تقلید اورنتائج

ایک دفعہ ایسے ہی سائنسدانوں کی ایک ٹیم نے ایک تجربہ کیا۔ جیسا کہ بعد کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسکا مقصد قدرت کے کسی کام میں دخل اندازی نہ تھا۔ بلکہ شاید یہ وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئ ہوگی کہ کچھ لوگ کیوں قدرت کے کاموں میں دخل اندازی پسند نہیں کرتے۔

چونکہ سائنسدان ہمیشہ کھیت کی بات کر کے کھلیان کے نتیجے نکالتے ہیں تو انہوں نے

اس تجربے میں بھی پانچ بندر لئے ، جنہیں ایک پنجرے میں بند کر دیا گیا اور انکے درمیان ایک سیڑھی پہ چند کیلے لٹکا دئے گئے۔ اب آپ تو جانتے ہیں کہ بندروں کو کیلے کتنے پسند ہوتے ہیں تو ان میں سے فورا ہی ایک بندر نے سیڑھی پہ چڑھنے کی کوشش کی۔ جیسے ہی اس نے سیڑھی پہ قدم رکھا۔ باقی بندروں پہ خوب ٹھنڈا پانی پھینک دیا گیا۔ خوب ہلچل مچی اور وہ بندر بھی سراسمیہ ہو کر نیچے اتر آیا۔ اب جیسے ہی کوئ بندر سیڑھی پہ چڑھنے کی کوشش کرتا باقی بندروں پہ یہ ٹھنڈا پانی پھینک دیا جاتا۔

کچھ دیر بعد یہ حالت ہو گئ کہ جیسے ہی کوئ بندر کیلوں کو دیکھ کر للچاتا اور سیڑھی پہ پیر رکھتا، باقی بندر اسکی پٹائ شروع کر دیتے۔اچھی طرح پٹنے اور پیٹنے کے کچھ دیر بعد سب بندر سکون سے بیٹھ گئے۔ اور کسی نے بھی اوپر جانے کی خواہش چھوڑ دی۔

خیر ، یہ سائنسدان ایسے ہی شیطانی دماغ کے مالک ہوتے ہیں,  اس لیئے کچھ لوگ سائنس کو شیطانی علم بھی کہتے ہیں۔ تو انہوں نے اس مرحلے پہ سوچا کچھ نیا کیا جائے۔ اور انہوں نے ان میں سے ایک بندر کو نکال کر ایک نئے بندر کو شامل کر دیا۔ اب  اس نئے بندر نے وہی کیا جو اسے نہیں کرنا چاہئیے تھا۔ یعنی کیلا دیکھا اور سیڑھی کی طرف لپکا۔ اسے جاتا دیکھ کرباقی بندر اسکی پٹائ کرنے لگے۔  کئ دفعہ پٹنے کے بعد اس نے یہ سبق سیکھ لیا کہ سیڑھی پہ پیر نہیں رکھنا۔

اب سکون ہو گیا۔ اس سکون کے ساتھ ہی سائنسدانوں نے ایک اور بندر کو نکال باہر کیا اور اسکی جگہ ایک نیا بندر ڈالدیا۔ اس بندر نے بھی جیسے ہی سیڑھی پہ پیر رکھنے کی کوشش کی سب بندروں نے جس میں پہلا تبدیل شدہ بندر بھی تھا اس پہ ہلہ بول دیا دیا۔ کئ دفعہ پٹ کر ان بندر صاحب کا دماغ بھی ٹھکانہ آگیا۔

آہستہ آہستہ، ایک ایک کر کے پہلے سیٹ کے تمام بندروں کو تبدیل کر کے نئے بندر ڈال دئیے گئے۔ مگر وہ سب اسی طرح سیڑھی پہ پیر رکھنے والے بندر کی پٹائ شروع کر دیتے۔ حالانکہ ان میں سے کسی کے اوپر بھی ٹھنڈا پانی نہیں پھینکا گیا تھآ۔

کہا جاتا ہے کہ اگر ان نئے بندروں کے سیٹ کو قوت گویائ حاصل ہوتی اور ان سے پوچھا جاتا کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو تو وہ جواب دیتے کہ'پتہ نہیں، بس یہ ہمیشہ سے ایسے ہی ہوتا آیا ہے۔ اس لئیے ہم بھی یہی کرتے ہیں'۔

ایک بلاگ پہ پول؛

آپکا کیا خیال ہے بندروں کو بول چال سکھانا نہایت ضروری ہے تاکہ یہ بات پایہ ء ثبوت کو پہنچے کہ وہ یہ جواب دیتے یا نہیں۔

میڈیا کے اہم سوالات؛

کیا بندروں کی مثال انسانوں پہ نافذ کرنا، قدرت کے قوانین میں مداخلت ہے یا ڈارون کو خراج تحسین پیش کرنا۔

مخالف گروپ؛بندر کو کبھی بولتے سنا ہے۔ اگر بندر بھی بولنے لگ جائیں تو ہم کیا بولیں گے۔ یہ قدرت کے قوانین میں مداخلت نہیں تو اور کیا ہے۔

میری پڑوسن بزرگ خاتون؛ لا حول ولا قوت، بندر بھی کبھی بولے گا۔ یہ تو  قیامت قریب ہونے کی نشانی ہے۔

میرا ڈرائیور؛

باجی،یہ سب امریکہ اور یہودی  کا گٹھ جوڑ ہے۔ یہاں بندر سے مراد مسلمان اے۔ یہ سب جھوٹ بولتا اے۔ جھوٹی تسلی دیتا اے۔ بندروں کو بولنا سکھائےگا۔ کافر کاپلا ہوا بندر کیا بولے گا۔

میری بیٹی: ماما، ایلیفنٹ کی دم ہوتی ہے، منکی کے ہوتی ہے ہماری کیوں نہیں ہوتی۔

میں؛ پھر تم ڈائپر کیسے پہنتیں بیٹا۔

کم سے کم میری بیٹی تو خاموش ہوئ۔ اس پہ آجکل واش روم استعمال کرنے کا بڑا معاشرتی دباءو ہے۔

8:52 AM

ڈارون کا قانون، بندر، کیلے، Darwin's law

بین السطور

میں بچوں کا ایک انگریزی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ حیران مت ہوں، میں نے ابھی تک اپنے اندر کے بچے کو رخصت نہیں کیا۔ دراصل وہ جاتا ہی نہیں ہے۔ اپنے معصوم چہرے اور سوالیہ آنکھوں کے ساتھ میری دہلیز سے یوں لگا بیٹھا رہتا ہے کہ جیسی ہی میری نظر اس پہ پڑے  وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر کہتا ہے مجھے ڈھونڈیں میں کہاں ہوں۔ بس تو ہم اکثر آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔

ہاں تو، اس رسالے میں بچوں کے مسائل والے سیکشن میں ایک گیارہ بارہ سال کے بچے نے لکھا کہ اسکی تیرہ گرل فرینڈز ہیں اور وہ پریشان ہے کہ وہ کیا کرے۔ مجھے ہنسی آئ، اسکے مسئلے کی گھمبیریت سے قطع نظر،آجکل یہ لفظ گرل فرینڈ اتنا زیادہ استعمال ہونے لگا ہے کہ مجھے اکثر شبہ ہوتا ہے کہ پاکستانی یہ جانتے بھی ہیں کہ گرل فرینڈ کسے کہتے ہیں۔

دو دفعہ تو مجھے کچھ لوگوں کی تصحیح کرنی پڑی کہ میں انکی دوست تو ہو سکتی ہوں لیکن میں انکی گرل فرینڈ نہیں ہوں۔  گرل فرینڈ ایک مخصوص لفظ ہے اور خاصے مخصوص حالات میں استعمال ہو سکتا ہے۔ حتی کہ اردو کا لفظ محبوبہ، معشوقہ یا کوئ بھی رومانوی لفظ اسکی جگہ نہیں لےسکتا۔ کیونکہ یہ لفظ ہمارے معاشرے سے  اور ہماری اقدار سے تعلق نہیں رکھتا۔ لیکن بہر حال جس تواتر سے یہ استعمال ہوتا ہے۔ اس سے میں ابھی بھی یہی سمجھتی ہوں کہ لوگ اسکی تخصیص سے واقف نہیں جبکہ  مغربی معاشرے میں اس لفظ کے خاصے مختلف معنی ہیں۔

 اس سے ملتی جلتی چیز مجھے اکثر فیس بک پہ نظر آتی ہے۔ جب کبھی میں دوستی کے خواہشمند  لوگوں کے پروفائل چیک کرنے کی کوشش کرتی ہوں تاکہ انکو دوست بننے کی اجازت دینے سے پہلے مجھے انکے متعلق کچھ تو ابتدائ معلومات ہوں تو دلچسپی کے خانے میں اکثر مرد حضرات نے لکھا ہوتا ہے۔ 'خواتین'۔ یعنی انہیں خواتین میں دلچسپی ہے۔ یہاں تک بھی قابل برداشت گو کہ میں پھر ایسے لوگوں کی دوستی سے احتراز کرتی ہوں کہ بحیثیت خاتون کسی مرد سے دوستی نہیں کرنا چاہتی۔ البتہ بحیثیت انسان ایکدوسرے انسان کے خیالات سننا اور بحیثیت انسان آپکو اپنی بات کہنا چاہونگی۔ خاتون ہونا میرے ڈیفالٹ میں موجود خوبی یا خرابی ہے جبکہ میں نے عقل اور سمجھ بطور انسان حاصل کی ہے۔

لیکن اس سے آگے ایک اکثریت ان لوگوں کی بھی نظر آتی ہے جو دلچسپی کے خانے میں خواتین اور حضرات دونوں لکھتے ہیں۔ اب حسن ظن رکھتے ہوئے میں نے سوچا کہ میں غلط سمجھتی ہوں۔ اس لئیے یہ بات میں نے کچھ لوگوں سے پوچھنے کی جراءت بھی کی۔ کیونکہ میں یہ سمجھتی تھی کہ دلچسپی کا یہ خانہ ان لوگوں کے لئیے ہے جو ڈیٹنگ میں دلچسپی رکھتے ہیں اور ظاہر سی بات ہے کہ اس سے انکا جنسی رجحان معلوم کرنا مقصود ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہم جنس پرستی مغربی معاشرے میں ظاہر کرنا کوئ معیوب بات نہیں سمجھی جاتی۔

میری اس بات کی تصدیق باقی لوگوں نے کی کہ فیس بک کا آغاز ڈیٹنگ یعنی اپنی گرل فرینڈز یا بوائے فریندز ڈھونڈنے کے لئیے ہی کیا گیا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اسکا زیادہ بہتر استعمال بھی سامنے آگیا۔ اگرچہ اب بھی لوگ اسے اس مقصد کے لئے خاصہ استعمال کرتے ہیں۔

تو اب وہ لوگ جو فیس بک کے خانے میں لکھتے ہیں کہ انکی دلچسپی مرد و خواتین دونوں میں ہے۔ اس پہ نظر ثانی کر لیں۔ اس سے لوگوں کی بڑی تعداد 'وہ نہیں سمجھتی' جو آپ سمجھانا چاہتے ہیں۔

وہ حضرات جو چاہتے ہیں کہ وہ خواتین کی فیس بک میں بھی جھانک سکیں۔ انہیں اپنے پروفائل میں سے دلچسپی کے خانے میں سےخواتین کا لفظ ہٹا دینا چاہئیے۔  پاکستانی خواتین کی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات کہنا آسان ہے کہ یہ 'طریقہ صحیح نہیں ہے'۔ صحیح طریقوں کے لئیے ایک علیحدہ پوسٹ لکھنی پڑے گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر آپ 'اس طرح' کےتعلقات بنانے میں دلچسپی رکھتے ہیں تو آپ بھی دوسروں کے بارے میں 'کچھ اندازہ' لگا کر اپنی پیشکش انہیں بھیجیں ورنہ یہی کہتے رہیں گے کہ سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ"یوں"؟۔

6:34 PM

فیس بک، پروفائل ڈیٹا، ہم جنس پرستی، ڈیٹنگ، گرل فرینڈ، بوائے فرینڈ

کتاب خوانی

آج ادرہ معارف اسلامی کے پاس سے گذر ہوا تو سوچا کہ دیکھیں کون کون سی کتابیں ہیں۔ اندر کچھ کتابوں پہ سیل لگی ہوئ تھی۔ وہاں سے دو کتابیں اٹھائیں اور پھر مختلف شیلفس کو نظروں سے ٹٹولنا اور انکے اندر موجود فہرست کو جانچنا شروع کیا اورآہستہ آہستہ کچھ کتابیں جمع ہو گئیں۔ وہاں موجود صاحب نے آکر کہا کہ ہم اپنا کام جلدی کر لیں کیونکہ انہیں نماز کے لئے جانا ہے۔ میں نے انکی طرف دیکھا اور خیال آیا کہ میرے بیگ میں تو صرف بارہ تیرہ سو روپے ہونگے۔ گاڑی میں گیس ڈلوانی تھی اور باقی احتیاطاً ساتھ رکھ لئیے تھے۔ تو بس باقی چھان پھٹک وہیں روک دی۔ اب وہ صاحب پریشان ہو گئے ۔' آپ دس پندرہ منٹ اور لگا سکتی ہیں۔ میرا مطلب فوراً نہیں تھا۔' میں نے انہیں تسلی دی کہ بس فی الوقت مجھے یہی کتابیں لینی ہیں۔

اب باری آئ انکے بل بنانے کی۔ تو میں نے پیسوں کی حد اور کتابوں کی تعداد کے درمیان توازن رکھنے کے لئے، دو کتابیں اٹھا کر ایک طرف کر دیں اور ان سے کہا کہ ان کتابوں کو ہٹا کر باقی کتابوں کا بل پہلے بنا دیں۔ میرے پاس صرف ایک ہزار روپے ہیں۔ میں چاہتی ہوں میرا بل  بس اتنا ہی رہے۔ کہنے لگے بے فکر رہیں۔ میں آپکا بل بس ہزار روپے بنا دونگا۔  اس پہ میں نے ذرا محتاط رخ پہ رہتے ہوئے ان سے مزید التماس کی لیکن اگر اس سے کم بن رہا ہو تو پھر ایک ہزار مت کیجئیے گا۔ مسکرائے اور خاموشی سے اپنا کام کرنے لگے۔

خدا کا شکر بل نو سو انچاس بنا۔ کتابیں اور رسید ایک شاپر میں ڈالتے ہوئے کہنے لگے۔ ایک بات بتائیں گھر جا کر اپ اس بل کو چیک کرتی ہیں۔ میں  نے یاد کیا اور ان سے کہا نہیں صرف یہ دیکھتی ہوں کہ سب چیزیں موجود ہیں یا نہیں۔ باقی تو میں نے رسید بناتے ہوئے دیکھ لیا کہ آپ نے کیا لکھا۔ فرمایا۔ 'دیکھ لیا کریں، بھول چوک انسان سے ہی ہوتی ہے'۔

گھر آکر دیکھتی ہوں، اتنی ساری کتابیں صرف نو سو انچاس میں، آئیے آپ بھی دیکھیں میں نے اس رقم میں کیا کیا خریدا۔

مقدمہ تاریخ ابن خلدون مصنف مولانا عبدالرحمن

افکار ابن خلدون، مولانا محمد ھنیف ندوی

مسئلہ خلافت، مولانا ابوالکلام آزاد

تاریخ فلاسفۃ الاسلام، ڈاکٹر میر ولی محمد

خدا کے نام پہ لڑی جانیوالی جنگ، کیرن آرمسٹرونگ

فلسفہء سائنس اور کائنات،  ڈاکٹر محمد علی سڈنی

اسلامی نظریہ ء ادب سید اسعد گیلانی اور اختر حجازی کی مرتب کردہ

اسلام اور دہشت گردی، سید معروف شاہ شیرازی

ہندو علما ء و مفکرین کی قرآنی خدمات ترجمہ اورنگزیب اعظمی

اب میں نے سب سے پہلے ان میں سے پڑھنے کے لئیے جو کتاب اٹھائ ہے اسکا نام ہے تاریخ فلاسفۃ الاسلام۔ دیکھیں کب اختتام کو پہنچتی ہے۔ اسکے بعد تو آپکو اندازہ ہوگا کہ کیا ہوگا۔

5:12 PM

ادارہ معارف اسلامی۔ اسلامک ریسرچ اکیڈمی، کراچی، تاریخ فلاسفۃ الاسلام Idara Moarf-e-Islamni. Krarchi

باپو یا بابو

کچھ چیزیں دیکھنے اور سننے میں بہت معمولی اور غیر اہم لگتی ہیں لیکن یہ کسی انسان  یا معاشرے کی سوچ کے پیچھے چلنے والے عوامل کو ظاہر کرتی ہیں۔ ایسا ہی مجھے اس وقت محسوس ہوا جب ہمارے ایک ساتھی نے ایک صحافی کے مضمون کو اپنے بلاگ پہ جگہ دی اور اسکے ساتھ ایک ثانوی بحث نکل آئ کہ لفظ بابو کیا ہے۔

 ابتدا تو میرا مقصد ان صحافی موصوف کی جوش تحریر میں کی جانیوالی غلطی کی طرف توجہ دلانا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ انگریز ہندوستانی مسلمانوں کی تحقیر کرنے کے لئے لفظ بابو استعمال کرتے تھے جو کہ انگریزی لفظ ببون سے لیا گیا ہے اور جسکے معنی بےوقوف نقال بندر کے ہوتے ہیں۔

یہ میرے لئیے ایک بالکل نئ خبر تھی، جہاں میرے ماحول میں لوگ اپنے والد صاحب کو بابو کہتے ہوں، میرے والد صاحب اپنے بچوں کو پیار سے بابو کہہ کر بلاتے ہوں، بھارت کے صوبے بہار میں اکثر  مسلمان گھرانوں میں لوگوں کے ناموں کو بغیر بابو لگائے نہ بلایا جاتا ہو وہاں لفظ بابو کو تحقیر اور نفرت کا لفظ سمجھنا خاصہ مشکل تھا۔

یہی نہیں اردو ادب میں، پرانی انڈین اور پاکستانی فلموں مین،  اور اب بھی ہندوستانی گاءووں دیہاتوں میں پڑھے لکھے لوگوں کو بابو کے لفظ سے بلایا جاتا ہے جیسے  ڈاک بابو، ڈاکٹر بابو، کلکٹر بابو وغیرہ۔

بات آگے چلی تو ہمارے سینئیر بزرگ بلاگر اور اس بلاگ کے ساتھی دونوں ہم زبان ہو گئے کہ نہیں یہ تو استعمال ہی حقارت کے لئیے ہوتا ہے اور مزید پیچیدگی اس میں یہ پیش کی گئ کہ یہ اگر اس مطلب میں استعمال ہوتا بھی ہے تو اسکا ماخذ لفظ بابا تو ہو سکتا ہے مگر باپو نہیں، جو کہ ہندی کا لفظ ہے۔

 اسکے ساتھ ہی مجھے اس بات کا طعنہ دیا گیا کہ دراصل میں چیزوں کے صحیح حوالے دیکھنے سے گریز کرتی ہوں اور اپنی علامیت جتاتی ہوں۔ تو صاحبو، اب ہم یہ بھی

مشکل کہہ پائے کہ ہمیں انٹر نیٹ پہ تو اس لفظ کا یہ مطلب نہیں ملا۔ چونکہ ملک سے باہر ہیں اس لئیے اپنی لغات اور ڈکشنریز بھی استعمال نہیں کر سکتے۔

پاکستان پہنچنے کے بعد اگلی صبح جب میں سو کر اٹھی تو میں نے سب سے پہلے ڈکشنریز کو چیک کیا۔ میں سنی سنائ باتوں سے زیادہ کسی مستند کتاب میں لکھی ہوئ بات کو ترجیح دیتی ہوں۔

اب دیکھئیے میں نے صرف تین لغات کو دیکھا اور اسکے معنی مدرجہ ذیل نکلے۔

فیرزاللغات ؛ ماخذ ہندی، معنی شہزادہ، بالک بچہ، انگریزی پڑھا لکھا جنٹلمین، فیشن پرست نوجوان، کلرک منشی

لانگ مین ڈکشنری آف کنٹیمپریری انگلش؛ انڈین انگلش میں احترام کا ایک لفظ،برٹش انگلش میں کم درجے کا کوئ بھی سرکاری ملازم یا کلرک۔ یہاں انہوں نے انڈین یا مسلم لفظ استعمال نہیں کیا۔

ویبسٹرزانسائکلوپیڈک ان ابرجڈ ڈکشنری آف انگلش لینگوایج؛  باس، ایک ہندو ٹائٹل جو کہ سر یا مسٹر کے برابر ہے، ایک ہندو جنٹلمین، کوئ بھی مقامی انڈین باشندہ جو کہ تھوڑی بہت انگلش پڑھ لکھ سکتا ہو، ہندی میں باپ کے لئیے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اردو کو ابتدا میں ہندی کے نام سے بھی بلایا جاتا تھا۔

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس میں کہیں بھی وہ معنی نہیں اور نہ ہی وہ پس منظر جو صاحب تحریر نے دینے کی کوشش کی۔ اسی باب میں جب میں نے لفظ ببون کو دیکھا تو صرف ویبسٹر والی ڈکشنری میں مجھے اسکے ایک معنی یہ بھی ملے کہ  خام اور کم ذہانت کا انگریز یا کوئ بہت سادہ شخص۔ یہاں پر بھی ہندوستانی ہونے کی تخصیص نہیں کجا کہ بے عزت کرنے کی۔

یہی نہیں اب بھی پاکستان میں وہ لوگ جنہیں اردو اسپیکنگ کہا جاتا ہے انکے یہاں اس قسم کے محاورے ملیں گے جس میں کسی کو کہتے ہیں کہ وہ بڑا بابو بنا پھرتا ہے۔ اس جملے سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ بہت بھنے ٹھنے رہتے ہیں۔

جہاں ان دونوں صاحبان کو یہ امر ماننے میں عار رہا کہ یہ بے عزتی کا لفظ نہیں اور نہ ہی ببون سے نکلا ہے۔وہاں انکا یہ اصرار رہا کہ یہ باپو سے نہیں بن سکتا بابا سے بنا ہوگا۔ اسکی وجہ شاید یہ ہے کہ ان میں سے ایک صاحب کا  ثقافتی تعلق پنجاب سے اور دوسرے کا ثقافتی  تعلق سندھ سے ہے اور ان دونوں زبانوں میں باپ کے لئیے لفظ بابا بھی استعمال ہوتا ہے اسکی دوسری وجہ جو مجھے سمجھ میں آتی ہے وہ بیشتر لوگوں کا یہ سمجھنا کہ لفظ بابا عربی سے آیا ہے۔  اسکی تیسری وجہ دییگر اقوام کے رہن سہن اور زبان سے نا واقفیت ہے۔

ان سب وجوہات سے ہٹ کر اس بات پہ اصرار کہ یہ لفظ باپو سے نہیں بابو سے بنا ہے اس طبقہ ء فکر کی نشاندہی بھی کرتا ہے جو ہمہ وقت اس چیز سے انکار کی حالت میں رہتے ہیں کہ ایک ہزار سال سے زائد عرصے برصغیر کی دیگر اقوام کے ساتھ رہنے کی وجہ سے مسلمانوں کی طرز رہائش، بود و باش اور زبان پہ انکا اثر ہے۔  یہ یاد رہے کہ برصغیر میں آنیوالے یہ مسلمان کسی ایک علاقے سے نہیں آئے تھے بلکہ ان میں ترک، عرب اور وسط ایشیا کے مسلمان بھی شامل ہیں اور ان میں سے ہر ایک جدا طرز زندگی رکھتا تھا۔

خیر جناب، فیروز اللغات کے مطابق یہ لفظ  بابا بھی اردو میں فارسی اور ہندی سے آیا ہے۔

اب جب کہ انگریزی اور اردو کی مستند لغات میں سے یہ الفاظ کے معنی ، میں نے دیکھ لئیے ہیں اور آپ میں سے کوئ بھی انہیں جا کر دیکھ سکتا ہے تو میں یہ بتانا ضروری سمجھتی ہوں کہ میرا مقصد انگریزوں کی حمایت نہیں بلکہ محض ہر وقت دوسروں کو اپنی حالت زار کا باعث سمجھنا اور اس نکتے کو ثابت کرنے کے لئیے غلط ترین بات بھی کرنے سے نہ چوکنا اسکی طرف آپکی توجہ دلانا ہے۔

تاریخ دنیا میں دوسرے لوگوں اور دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کی جو کوششیں رہیں ہیں یا انکے جو بھی اثرات رہے ہیں انہیں انکے مسلمان نہ ہونے کی وجہ سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ اس دنیا کی جو بھی حالت آج ہے یا علم اور جہالت کے جس بھی مرحلے پہ ہم ہیں۔ اس میں مسلمانوں کے علاوہ دیگر اقوام کا بھی حصہ ہے۔ ہم بہ حیثیت مسلمان آج جس طرح دنیا اور اپنی زندگی برتتے ہیں اس میں دوسروں کی طرز فکر کا اثر بھی ہے اور اسے تسلیم کئے بغیر نہ ہم اپنی غلطیوں کو جانچ سکتے ہیں اور نہ آگے کی سمت درست قدم رکھ سکتے ہیں۔

میرے ان ساتھی کی اس پوسٹ کے کچھ اور اہم نکات ہیں جن پہ آنیوالی تحریروں میں بات کرنا چاہونگی ان میں سر فہرست

کیا خلافت مسلمانی طرز حکومت ہے اور اسی میں ہماری بقا ہے

کیا سائنس اسلام سے متصادم اور قدرت کی راہ میں مزاحم ہے۔

کیا  دنیا بھر کی قوتیں صرف اسلام کو ختم کرنے کے درپے ہیں یا اس میں مسلمانوں کا  کئ صدیوں پہ مشتمل ایک طویل علمی اور تحقیقی جمود ہے۔

 حوالہ؛

میرے ساتھی کا بلاگ

11:01 AM

اردو زبان کا ارتقاء، فیروز اللغات،

آئیے فیس بک پہ اکاءونٹ بنائیے-۲

لوگوں کی توجہ حاصل کرنا ، یہ خواہش انسان میں پیدائش کے وقت سے ہوتی ہے۔ اسی لئیے نوزائیدہ بچوں کو بھی پتہ ہوتا ہے کہ اپنے والدین اور دیگر رشتے داروں کو کیسے بے وقوف بنانا ہے۔ یہ طریقے زیادہ عرصے کارگر نہیں رہتے، خاص طور پہ جیسے جیسےملنے جلنے والے لوگوں کی تعداد بڑھتی ہے، طریقہ ءکار میں تبدیلی لانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ فیس بک اس سلسلے میں آپکی کما حقہ تربیت کرتی ہے۔

ایک زمانے میں لکس بیوٹی سوپ کا اشتہار آتا تھآ۔ 'آخر لوگ ہمارا چہرہ  ہی تو دیکھتے ہیں'۔ تو اسی انسانی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے فیس بک والوں نے آپکو یہ موقع بھی دیا  ہے کہ آپ اپنے آپکو جس طرح چاہیں ظاہر کریں۔ اگرچہ کچھ لوگ اس میں دلچسپی نہیں رکھتے یا انہیں ماورائ حالت میں رہنا پسند ہوتا ہے تو وہ فیس بک کی طرف سے دی گئ خالی جگہ پہ ہی اکتفا کر لیتے ہیں۔ اس خالی جگہ میں ایک ہیولہ موجود ہے جس کے سر پہ آئسکریم کا کون موجود ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ کسطرح اس جمے ہوئے کون کو آتش شوق کو ہوا دینے والی قوت میں تبدیل کرتے ہیں۔ میں ہوں ناں، آپکی مدد کے لئیے۔

کچھ اپنی کاہلی یا رسومات کو بادل ناخواستہ نبھاتے یا طبیعتاً  ہر جگہ دفتری التزامات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں اور  اس مصیبت کا حل بھی پاسپورٹ سائز تصویر کو سمجھتے ہیں۔ زیادہ تر پاکستانی اسکو ترجیح دیتے ہیں۔

پاکستانیوں کی ترجیحات میں جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں مذہب سب سے پہلے ہے اور ہم بہانے بہانے سے اسی لئیے ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنا اور گلے کاٹنا پسند کرتے ہیں  تو اگلے مرحلے میں اپنی شناخت اسی کے حوالے سے رکھنا آسان ہے۔

 کچھ عناصر نے سب سے پہلے پاکستان کا نعرہ بلند کرنے کی کوشش کی اور جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے کچھ لوگوں نے اس فیشن میں بھی حصہ لے ڈالا۔

لیکن تماشائے اہل کرم دیکھنا کا یہ معقول انداز نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اہل دل نے یہاں بھی تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئیے کے زیر عنوان اپنی شناختیں تیار کی ہیں۔ یہ دیکھئیے کسطرح محبت کے سمندر میں گرنے کے لئیے تیار ہیں۔ آئیے چلے آئیے۔

دیا باقی نہیں تو کیا، کسی کا دل تو جلتا ہے

چلے آءو جہاں تک روشنی معلوم ہوتی ہے

چند خوش قسمت جو اس مرحلے سے کامران گذر جاتے ہیں اپنی شادی کی تصویر ڈال رکھتے ہیں۔ ابھی جب سال بھر تک اپنے آپکو اور ساری دنیا کو یقین دلاتے رہیں گے کہ وی ڈڈ  اٹ، ہم نے کر دیا۔

تو ایک اور شناخت پیدا ہو جائے گی۔ واءو، وی ڈڈ اٹ۔ لیجئیے اسٹیٹس تبدیل ہو گیا۔ آئندہ آنیوالے سالوں میں اسی طرح آپکو اسٹیٹس کی تبدیلی سے انکی آبادی میں تبدیلی کا پتہ چلتا رہیگا۔۔

وہ لوگ جو اس بات پہ یقین رکھتے ہیں کہ اور بھی مخلوقات ہیں دنیا میں انسانوں کے علاوہ۔ انکی شناختی تصاویر جانوروں سے مستعار لی گئ ہوتی ہیں۔ یہ نہیں معلوم کہ ان مخلوقات کو یہ پتہ ہوتا ہے یا نہیں کہ انکی تصاویر کہاں استعمال ہو رہی ہیں۔

جہاں کچھ لوگ صرف اپنی ناک کی نوک، پلکوں کے سرے اور ہونٹوں کے گوشے ڈالکر خوش ہوتے ہیں وہاں کچھ لوگوں کو اپنے نام کے کچھ ٹکڑے ڈالکر بھی لطف آتا ہے۔ ذرا بتائیے یہ کسکا نام ہے۔

کچھ اپنے شوق کے پیچھے اپنے آپکو چھپا لیتے ہیں ایسے کہ بوجھو تو جانیں۔ اب بتائیے یہ کون ہیں؟

کچھ قدرتی مناظر پہ جان دیتے ہیں، انکی تصویر میں کوئ قدرتی منظر اور انکی کوئ پسندیدہ چیز انکے ساتھ ضرور ہوتی ہے۔ اس میں بتائیں کیا پسندیدہ چیز ہے۔ ویسے ممکن ہے پسندیدہ چیز سامنے ہو اور تکنیکی وجوہات کی بناء پہ تصویر میں نہ آسکی ہو۔

ویسے تو کسی شاعر نے کہا تھا کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے۔ لیکن سمجھدار لوگ ایسے مواقع کیوں ضائع جانے دیں۔ انکا پروفائل انکا تعارفی کارڈ ہے۔ یقینا یہ صاحب مارکیٹنگ کی دنیا سے تعلق رکھتے ہونگے۔

اس قسم کے پروفائل فوٹو کون بنا سکتا ہے۔ وہی جو لنکس کے عشق میں سرتاپا غرق ہو۔

ویسے تو خواتین  کو بدنام کیا جاتا ہے کہ خوبصورت پھولوں اور خوبصورت چہروں کو وہ اپنا تعارف بنا لیتی ہیں لیکن اس میدان میں بھی درحقیقت مردوں کا ہی پلہ بھآری ہے۔ یہ پروفائل فوٹو ایک صاحب کا ہے۔  اس پھول کو دیکھکر مجھےہمیشہ وہ شعر یاد آیا، جس میں شاعر کہتا ہے

اے پھول میرے پھول کو یہ پھول دے دینا

کہنا کہ تیرے پھول نے یہ پھول بھیجا ہے

اس سرخ گلاب کا عقدہ ایک اور صاحب نے اپنے پروفائل فوٹو میں حل کیا۔ معلوم ہوا کہ پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کیا ہاتھ تک کٹ سکتا ہے۔

لیکن کچھ لوگ ایسی شناختیں رکھتے ہیں کہ وہ شناخت کم اور پہیلی زیادہ بن جاتی ہے۔ مثال کے طور پہ یہ شناخت کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ کیا ہے۔ سچ پوچھیں تو لگ رہا ہے کہ کسی خاتون کی چوٹی دوپٹے میں سے نظر آرہی ہے۔لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ ڈبل روٹی ہو، تھیلی میں لپٹی ہوئ۔

جہاں کچھ لوگ اپنی حسین تصویروں پہ فدا ہو کر انہیں اپنے پروفائل میں ڈال  کر اتراتے ہیں۔ وہاں کچھ اپنے آپکو کارٹونز کے پردے میں پیش کر کے اٹھلاتے ہیں۔  انہیں اپنا آپ بھی کارٹونز میں ہی اچھا لگتا ہے۔  ذرا یہاں تو دیکھیں ایک تیر سے کتنے شکار ہوئے ہیں۔ میں بندہ ٹیکنالوجی کا، فرنچ فرائز کھاتا ہوں اپنا دل بہلاتا ہوں۔

بعض اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو پکاسو کا آرٹ بنا نے میں صرف کر دیتے ہیں۔ آخر میں کوئ ایسی تمثیلی چیز نکال لاتے ہیں کہ آپ سوچتے ہیں یہ آپ ہیں، میں ہوں یا وہ۔ کچھ سادہ دل انہیں خلائ مخلوق سمجھ کر ان پہ عاشق ہوجاتے ہیں۔ اسی لئیے ڈفر کہلاتے ہیں۔

جہاں کچھ لوگ اپنی شناخت کو اپنی برانڈ بنا لیتے ہیں وہاں کچھ سیماب صفت ہر روز ہی اپنی

شناخت تبدیل کرتے نظر آتے ہیں۔ بعض دفعہ جب بور ہو جاتے ہیں تو ایسے بہانے بناتے ہیں۔

اور اگر محبت قسمت سے ملتی ہے تو نفرت کو بھی پنپنے کے لئیے بہانے چاہئیے ہوتے ہیں۔ اور اسکے اظہار کو بھی فنکاری۔ تاکہ دل کی تسلی پوری طرح ہو جائے۔ فیس بک بھی اپنے چاہنے والوں کو یہ موقعے دینے میں تامل نہیں کرتی۔

اب جب کہ دل کی حسرتیں نکالنے کو اتنی ترغیبات موجود ہیں تو آپ بنا رہے ہیں فیس بک پہ اکاءونٹ۔ کیا کہا، میں نہیں مانتا، لیکن کیا؟، کیوں؟

9:00 PM

فیس بک، پروفائل فوٹو

ارادے باندھتا ہوں

تو جناب، ہر طرح کے امکانی حالات کو شکست دینے کے بعد جو کہ وطن عزیز میں پہنچنے کے بعد پیش آسکتے تھے اور آئے۔ ہم پھر ایکدفعہ حاضر ہیں یہ بتانے کے لئیے کہ زندہ ہیں۔ اور ابھی ہماری مونگ کی دال ختم بھی نہیں ہوئ۔

ایک دو پوسٹس ہیں جن کی نوک پلک سنوارنے کا خیال ہے۔ امید ہے آپکو آئندہ دو تین روز میں مل جائیں گی۔

پچھلے ڈیڑھ مہینے کے دوران کچھ مزیدار موضوعات دیکھنے کو ملے۔ جن میں سے کچھ کا تعلق مکی صاحب کے بلاگ سے تھا۔ اور ان میں ہمارے ساتھی ابوشامل بھی شامل ہیں۔ انکی کچھ باتوں کا جواب لکھنا چاہ رہی تھی لیکن دیار غیر میں ناکافی ذرائع کی بناء پہ لکھنے میں التواء کیا۔ اب انشاء اللہ اس پہ بھی تفصیلی نظر ڈالیں گے۔

کچھ افتخار اجمل صاحب کی تحریریں ہیں جن پہ اپنے بلاگ پہ اظہار خیال کرنا چاہتی ہوں۔ انکی باری بھی آئیگی۔

سب سے اہم بات اس  سارے سفر کی روداد اور اس سے ہم نے زندگی کے کیا تجربات حاصل کئے اس میں بھی آپکو شامل کرنا ہے۔ تو اس طرح آئندہ چند مہینوں کا لائحہء عمل تیار ہوگیا ہے۔ اب دیکھیں، اس میں سے کتنے ارادے  تکمیل تک پہنچتے ہیں۔

ویسے واپس آئے ہوئے تین دن ہوئے ہیں اور دو دھماکوں کی اطلاع آچکی ہے۔ دن میں چار سے پانچ گھنٹے لوڈٰشیڈنگ ہو رہی ہے۔ تو اس سے پہلے کہ لائٹ پھر خدا حافظ کہے۔ ملتے ہیں ایک بریک کے بعد۔

8:55 PM

ترکیب: بھیجا فرائ

بقر عید پہ ہر طرح کی ترکیبیں آزمائ جاتی ہیں۔ اور عام طور پہ یہ دیکھا گیا ہے کہ ہر شخص کو اس عید پہ اپنی دلچسپی کا سامان مل جاتا ہے۔ سچ کہوں تو مجھے بقر عید اپنی اس ادا کی بناء پہ بہت پسند ہے۔

یہ ایک ترکیب ہے بھیجا فرائ کرنے کی جسے میں آپ لوگوں کے ساتھ شیئر کررہی ہوں۔ تو جناب اسکے لئیے آپکو ایک گائے کا بھیجا چاہئیے۔ وہ گائے نہیں جس کے لئیے امیر خسرو نے لکھا ، ہم تورے بابل کھوٹے کی گئیاں۔ بلکہ وہ جسے آپ جانووروں کی منڈی سے سکہ رائج الوقت میں خرید کر لائے ہونگے اور جس کی قیمت خرید شرعی حق مہر سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

اس وضاحت کے بعد ترکیب میں ایک اور پیچیدگی پیدا ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ آپ گائے کا گوشت  کچھ نامعلوم وجوہات کی بناء پہ کھانا اپنے سماجی رتبے کے خلاف سمجھتے ہوں یا آپکا قربانی کا جانور ایک یا کئ بکرے ہوں تو اس صورت میں آپ بکرے کا بھیجا بھی لے سکتے ہیں۔ لیکن یہ  آپ سمجھتے ہونگے کہ گائے کہ اور بکرے کے وزن میں اتنا ہی فرق ہوتا ہے جتنا کہ اداکارہ انجمن اور کرشمہ کپور کے وزن میں نظر آتا ہے۔

اس وجہ سے آپکو  باقی اجزائے ترکیب کو ادھر ادھر کرنا پڑیگا یا پھر کئ بکروں کے بھیجے کو ایک گائے کے بھیجے کے وزن کے برابر لانا ہوگا۔ یہ یاد رہے کہ انجمن اور کرشمہ میں سے آپ صرف آخر الذکر کو ہی ادھر ادھر کر سکتے ہیں۔ اول الذکر کے متعلق ایسا خیال بھی دل میں نہ لائیے گا۔ ورنہ بھیجا فرائ کرنے سے پہلے آپکی چٹنی بن جائے گی۔ چوں کہ ان دونوں کا اس ترکیب سے کوئ جزیاتی تعلق نہیں۔ اس لئیے اس مرحلے کو سر کئیے بغیر ہی آپ اگلے مرحلے میں قدم رکھ سکتے ہیں۔

اب ایک پتیلی میں اتنا پانی لیں جس میں یہ بھیجا ڈوب جائے۔ اسے ابلنے کے لئیے چولہے پہ رکھ دیں۔ جب پانی ابلنے لگے تو اس میں بھیجا ڈالدیں اور گھڑی دیکھ کر دو منٹ بعد نکال لیں۔ جب بھیجا گرم ہی ہو، یہاں میری مراد پتیلی میں سے نکالے گئے بھیجے سے ہے۔ آپکو اپنا  بھیجا گرم کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس بھیجے پر سے تیزی کے ساتھ جھلی اتار دیجئیے اور خون کی جو نسیں نظر آرہی ہیں انہیں بھی صاف کر دیں۔ لیجئیے، یہ بھیجا فرائ ہونے کے لئیے بالکل تیار ہے۔ چھری سے اسکے موٹے موٹے ٹکڑے کر لیں اور ایک طرف رکھ دیں۔ اب ایک پتیلی یا کڑاہی میں میں آدھا کپ تیل گرم کریں اور اس میں آدھا چائے کا چمچ میتھی دانہ ڈالدیں۔ جب یہ خوشبو دینے لگے تو اس میں ایک کھانے کا چمچ لہسن ادرک کا پیسٹ ڈال دیں، دو کھانے کے چمچ پسی ہوئ پیاز، ساتھ ایک چائے کا چمچ پسا ہوا دھنیا، آدھ چائے کا چمچ ہلدی، ایک چائے کا چمچ پسی ہوئی لال مرچ یا جتنی آپکو پسند ہوں، اس میں ڈالکر ہلکی آنچ پہ بھون لیں۔ اگر آپ ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں ٹماٹر کے بغیر کسی چیز میں سواد نہیں آتا تو اس مرحلے پہ ٹماٹر بھی ڈال لیں اور اسے اتنا بھونیں کہ ٹماٹر گل کر مصالحے کے ساتھ یکجان ہو جائیں۔

اب اس میں صاف کیا ہوا بھیجا ڈالکر آرام سے بھونیں حتی کہ بھیجہ اور مصالحہ خوب اچھی طرح بھن جائیں۔ حسب ذائقہ نمک شامل کر دیں آخر میں اس میں آدھی چائے کی چمچی گرم مصالحہ بھی ڈالدیں اور تھوڑی سی ہری مرچ بھی کتر کر شامل کردیں۔ مرچیں چھری سے کترئیے گا۔ دانتوں سے کترنے کے نتیجے میں، آپکا اپنا بھیجا دم پخت ہونے کے امکان ہیں۔ اب یہ فرائ بھیجاڈش میں نکال کر ہرے دھنئیے سے سجا دیں۔ اور چپاتی کے ساتھ کھائیں۔

کچھ لوگوں کو فرائ کئیے بغیر ہی بھیجا کھانے کا لطف آتا ہے انہیں یہ ساری کلفت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ یہ وہ مزہ ہے جس کے آگے تمام ذائقے ہیچ ہیں۔

ساتھ ہی آپ سب کو عیدالاضحی مبارک ہو۔ اللہ ہم سب کو قربانی کے صحیح معنوں سے متعارف ہونے کا موقعہ دے۔ آمین

7:55 PM

عید الاضحی۔ بھیجا فرائ ترکیب۔Eid-ul-Azha

ایک باغ، کئ تتلیاں

اب کچھ حالات ایسے ہوئے کہ ہمیں پھوکٹ گھومنے کا موقعہ بھی ملا۔ چلیں کچھ جگہوں کی سیر آپکو بھی کرادیں کہ یہ آپکے لئے اجنبی نہ رہیں۔

یہ پھوکٹ کا تتلی باغ اور مختلف کیڑوں مکوڑوں کو جمع کرنے کی جگہ ہے۔ ہم یہاں ایک مقامی ٹیکسی جو کہ ایک ہائ لکس تھی لیکر پہنچے۔ مگر چونکہ نہ ہمیں یہ جگہ صحیح سے پتہ تھی اور نہ ٹیکسی والے کو اس لئیےہم ایک بل بورڈ پہ اسکا نام اور تیر کا نشان دیکھ کر وہیں اتر گئے۔ بس پھر ہمیں راستے کی چڑھائیاں اور نچائیاں طے کرنے پڑے جو اندازاً ایک کلو میٹر تھا۔ ایک بچے کو اسٹرولر میں ڈالکر دھکا دینا چڑھائیوں پر مشکل ہو جاتا ہے۔

تو آئیے دیکھئیے، پروین شاکر نے کہا تھا

خود پھول نے کئے تھے، اپنے ہونٹ نیم وا

چوری تمام رنگ کی تتلی کے سر نہ جائے

دیکھیں یہ بات کہاں تک صحیح ہے۔

تتلی ہوں میں تتلی ہوں

پھولوں سے میں نکلی ہوں

پھولوں کا رس پیتی ہوں

پھولوں میں، میں رہتی ہوں

10:11 AM

Butterfly, Phuket, thailand, پھوکٹ بٹر فلائ گارڈن، پیوپا، تتلی پہ نظم، Phuket butterfly Garden

مشغلہ یا ضرورت

ہمارے ایک ساتھی نے حال ہی میں اپنے بلاگ پہ سکیولرازم کے بارے میں اپنے کالم ہم سب کے علم میں لانے کے لئیے دیا۔ جس پہ میرے تبصرے پہ انہیں اعتراض بھی ہے۔ اسکا ایک واضح جواب لکھنے میں خاصہ وقت لگتا اور ہجوں کی غلطیاں بھی ہوتیں۔ اس سے بچنے کے لئیے میں نے اسے یہاں لکھنا بہتر سمجھا۔ چونکہ ان کے موضوع میں خاصے سارے نکات ہیں اس لئیے میں ان پہ الگ الگ بات کرنا چاہونگی۔تاکہ یہ فوکس رہے۔

اس سلسلے میں، میں سب سے پہلے مسلمانوں کی ان اقسام کا تذکرہ کرنا چاہونگی جو کہ آجکل تواتر سے پیش کی جا رہی ہیں۔ آئیے پہلے ایک نظر ان پہ ڈال لیں۔ کیونکہ اپنی زندگی کی ایک لمبے عرصے تک میں مسلمانوں کے  بنیادی دو گروہ ہی سمجھتی تھیں یعنی شیعہ اور سنی۔ آگہی کے راستے پہ سفر کرتے ہوئے پتہ چلا کہ یہ تفریق یہیں ختم نہیں ہوجاتی بلکہ فقہ کی بنیاد پہ اسکی مزید تقسیم بھی ہوتی ہے۔ یہی نہیں اگر اسلام کے ابتدائ شاید پچاس سالوں کو نکال دیں تو حکومت اور اقتدار کو حاصل کرنے کے لئیے جتنی تحاریک چلائ گئیں انکے بھی کچھ نہ کچھ نام رکھے گئے تھے۔ جنکی تفصیلات تاریخ کی کتابوں میں بند ہیں۔

میں اپنے تئیں یہ سمجھتی رہی کہ حالات اس نہج پہ آگئیے ہیں کہ اب جو شخص مسلمان نہیں ہوگا وہ کافر ہوگا۔ لیکن نہیں جناب اس معاملے میں بھی تخلیقی جواہر رکھنے والوں نے خوب خلاقی دکھائ۔ یہاں میں کچھ حوالے دینا چاہونگی۔ یہ میرے ذہن میں رہ گَ اور میں انہیں انکے اصل ذرائع سے ڈھونڈ کر نکال بھی سکی۔ یہ نام جو محض اس لئے وجود میں آتے ہیں کہ کوئ اور شخص ہم سے مختلف خیال رکھتا ہے۔

تو عرض کررہا تھا کہ نائن الیون کے بعد مذہبی رحجان رکھنے والوں کی طرف سے معذرت خواہانہ رویہ اپنایا گیا ہے ۔ مجھے کبھی شرمندگی نہیں ہوئی۔ میں ملا ہوں لیکن مسجد کا پیش امام یا مدرسہ کا فارغ و تحصیل مولوی نہیں ۔ اقبال کا ملا ہوں اگر چہ میں افغانی ملا ہوں لیکن میں اپنے اپنے آپ کو عالمگیر ملا سمجھتا ہوں۔

http://talkhaabau.wordpress.com/

میں اپنے آپ کو اسلام پسند کہتا ہوں لیکن میری نیٹ یا بلاگ سے شروع ہوئی دوستی ان لوگوں کے ساتھ بھی ہیں جن کو آپ ان درجوں میں تقسیم کرسکتے ہیں ۔ اسلام پسند، سیاسی اسلام کے حامی ، مذہبی رجحان رکھنے والے ، وہ جو اپنے آپ کو ماڈریٹس کہتے ہیں ، وہ جو لبرلز ہیں ، سوشلسٹ نظریات کے حامل ‘ مذہب مخالف اور دہریے وغیرہ۔ کئی دہریوں سے میری بہت گہری دوستی ہے۔

http://www.abushamil.com/tag-tag3/#comments

ہم کیونکہ آپ کی نظر میں “قدامت پسند” ہیں اس لیے ہمارے دلائل ہمیشہ “بودے” ہی ہوں گے۔

http://www.abushamil.com/secularism-shahnawaz/

باعمل مسلمان ایک گالی بنتا جا رہا ہے۔ لوگ اسے دیکھ کر ایک دم ڈر جاتے ہیں کہ کہیں وہ خودکش بمبار ہی نہ ہو۔ ماڈریٹ یعنی بے عمل مسلمان ہر جگہ آزادی سے گھوم پھر سکتا ہے مگر باریش مسلمان کی آزادی صلب ہوتی جا رہی ہے۔

http://www.mypakistan.com/?p=3692

آپ جیسے روشن خیالوں کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی آپ کے ساتھ نہیں ہے تو وہ یقینا طالبان کے ساتھ ہے اور یہ شدت پسندی نہیں شاید۔۔۔۔

http://anqasha.blogspot.com/2009/10/blog-post\_27.html#comments

وہ سیکولر مسلمانوں سے کہتا ہے کہ تم مسلمان کیوں ہو اور وہ جو صرف مسلمان ہیں ان سے کہتا ہے کہ تم سیکولر کیوں نہیں ہوجاتے,

 http://www.abushamil.com/secularism-shahnawaz/

یہ حوالے صرف اردو بلاگنگ دنیا سے لئے گئے ہیں۔ انہیں تخلیق کرنے والے کوئ ایک نام ایجاد کرتے ہیں اور پھر بڑے فخر سے اسکی ضد بنا کر اس میں اپنا نام ڈالتے ہیں اور اسی غرور کے ساتھ سوچتے ہیں کہ یہ تھی وہ خدمت دین کی جو دین ان سے چاہ رہا ہے۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ میں بھی اس سلسلے میں کچھ کام کروں اور الفاظ کی ایک فہرست تیار کروں تاکہ میرے ان ساتھیوں کو سنجیدگی کے ساتھ کچھ اور سوچنے کا وقت بھی ملے نہ صرف یہ بلکہ میں ذاتی طور پہ انہیں بہترین مسلمان اور مثالی مسلمان بھی قرار دینے پہ ہرگز کسی قسم کا تامل نہ کروں اس سےانہیں اپنے اس اعزاز سے کسی بھی وقت محروم ہونے کا نہ صرف خدشہ نہ رہےگا۔ بلکہ یہ احساس بھی انکے دل کو گرماتا رہے کہ انکی برتری تسلیم کر لی گئ ہے۔

لیکن کیا وقت کی آوز یہی ہے کہ ہم ایکدوسرے کی ایمانی حالتوں پہ دلیلیں دیتے رہیں؟

6:25 AM

مسلمانوں کی قسمیں، اقبال، افغانستان

آئیے فیس بک پہ اکاءونٹ بنائیے

آپکا کوئ دوست نہیں، سخت بوریت ہے، گھر والے دور ہیں، کیا کریں؟

فیس بک پر ایک اکاءونٹ بنا لیں۔ لیجئیے کچھ دن گذریں گے کہ ہر طرح کے دوست جمع ہو جائیں گے۔ جو دوست بنانے کی آفرز ملتی جا رہی ہیں انہیں اوکے کرتے جائیں۔ یہ کون بے وقوف ہیں جو کہتے ہیں کہ ایک دوست مل جائے تو آپکی قسمت اچھی ہے دو ہوں تو آپ خوش قسمت ہیں اور تین تو ہو ہی نہیں سکتے۔ چند مہینوں میں آپکے پاس کئی سو دوست جمع ہو جائیں گے۔ اب کیجئیے محفل آرائیاں۔

اگر زندگی میں اب تک یہ حسرت پالتے آئے ہیں کہ

یہ مزہ تھا دل لگی کا کہ برابر آگ لگتی

نہ تجھے قرار ہوتا نہ مجھے قرار ہوتا

تو جان لیجئیے کہ اسی مزے کے لئیے ہی فیس بک اک وجود عمل میں آیا۔ وہ تو زندگی کی ہر چیز میں مقسد تلاش کرنے والوں نے اسے بھی روکھا پھیکا بنانے کے طریقے تلاش کر لئیے لیکن آپ انہیں خاطر میں نہ لائیں اور اپنی خو نہ چھوڑیں۔ یہاں آپ جیسے لوگوں کی ایک لمبی قطار موجود ہے۔ فوراً اکاءونٹ بنائیں۔

فتنے بھی قاعدے سے اٹھتے ہیں جب اٹھتے ہیں

کیا سلیقہ ہے تمہیں انجمن آرائ کا

اگر آپ بھی اس سلیقے سے واقف ہیں تو دیر کس بات کی ہے۔ فیس بک ہے ناں۔ اکاءونٹ بنائیں۔ روزانہ طرح طرح کے پول منعقد کروائیں اور فتنے بنانے کے قاعدے سے مکمل طور پہ لطف اندوز ہوں۔ اگر پول بنانے کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتے تو کچھ نہ کریں اپنی وال پہ کسی فتنہ انگیز خیال کو چسپاں کر دیں اور دیکھئیے کیا ہوتا ہے۔

آپ اپنے آپ سے محبت کرتے ہیں۔ یہ آپ کا اپنے اوپر پہلا حق ہے۔ لیکن آپ دوسروں کو بھی بتانا چاہتے ہیں کہ آپ کس قدر خوبیوں کے حامل زبردست شخص ہیں جن سے ایک زمانہ واقف نہیں۔ آئیے فیس بک پہ موجود مختلف کوئز کے جوابات دیں اور انکے نتائج کو اپنے پروفائل پہ ڈالیں۔ یہ وہ نتائج ہونگے جن سے آپ خود بھی ناآشنا تھے۔ آئیے انکے لئے ہی سہی فیس بک پہ اپنا اکائونٹ بنائیں۔

آپ کی تصاویر بہت خوبصورت آتی ہیں اور آپ جیسی مارلن منرو سے دنیا واقف نہیں۔ یا آپ فوٹوگرافی اچھی کرتے ہیں یا آپ اپنے دور پرے کے رشتےداروں اور دوستوں کو مزید حسد اور رشک میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ تو کیوں دیر کر رہے ہیں اپنے کیمرے پر کلک کلک کریں تصویریں بنائیں اور ہر روز ایک تصویر فیس بک پہ ڈالیں۔ ہائے اللہ آپ کتنی خوبصورت لگ رہی ہیں، آپ تو بالکل ٹام کروز لگ رہے ہیں، کیا گاڑی ہے لش پش، کیا گھر ہے زبردست۔ مگر یہ سب پڑھنے کے لئیے فیس بک پہ اکاءونٹ کھولیں۔

دنیا یہاں پہ ختم نہیں ہوتی، اگر آپ انسانوں کی منافقت سے بیزار ہیں،نیرنگئ زمانہ کا شکار ہیں یا ہر وقت کچھ نیا کے چکر میں رہتے ہیں تو یہاں طرح طرح کے گیمز موجود ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت بھی پیش نہ آئے گی کہ ایک بار دیکھا ہے دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے۔ معاملہ کچھ یوں ہوتا ہے کہ وہ آیا، اس نے کھیلا اور پھر کہیں کا نہ رہا۔

تیرا نہیں رہوں تو کسی کا نہیں رہوں

اتنا تلاش کر مجھے اتنا تلاش کر

تو اس بات کو کہنے کی نوبت اب نہیں آئے گی، فوراً فیس بک سے مستفید ہوں اور اپنا اکاءونٹ بنائیں۔ انشاءللہ آپ کسی کے نہیں رہیں گے۔ اپنے بھی نہیں۔

اگر آپ مذہبی شدت پسندوں سے تعلق رکھتے ہیں اور پریشان ہیں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے تو فوراً فیس بک پہ اپنا اکاءونٹ بنائیں۔ آپکو پتہ چل جائیگا کہ اس سائٹ کو بین کرنے کی کتنی شدید ضرورت ہے۔ لیجئیے ثواب کمانے کا ایک اور موقع حاصل ہو گیا۔ مگر احتیاط لازم ہے کسی گیم میں نہ الجھ جائیے گا۔ کہیں جنت ہاتھ سے نہ نکل جائے۔

اگر آپکا محبوب دنیا کی اس بھیڑ میں کہیں کھو گیا ہے تو اس بے وفا کی خاطر رکشہ ، منی بس یا ٹرک چلانے کی کوشش نہ کریں۔ فیس بک ہے ناں اکاءونٹ بنائیں۔ انکا کہنا ہے کہ وہ آپکے دوستوں کو ڈھونڈ نکالیں گے۔ برسبیل تذکرہ دشمن خود آپکو ڈھونڈ نکالتے ہیں اس لئیے انہوں نے یہ سہولت نہیں رکھی ہے۔ یہ تو سمجھ میں آگیا ہوگا کہ یہاں رقیب کو تلاش کرنا بیکار ہے۔

اگر آپ کراچی میں اپنے موبائل فون کو بچاتے ہوئے جان سے گذر جاتے ہیں یا لاہور میں کسی خود کش حملے میں اجزائے زندگی کو ترتیب میں رکھنے سے ناکام ہو جاتے ہیں تو

-

-

-

تو کینیڈا کے کسی سرد علاقے کے بیسمنٹ یا اسٹوڈیو فلیٹ میں رہنے والے آپکے دوست کو کچھ دنوں تک آپکے کمنٹس یا آپکے پروفائل میں ہونیوالی تبدیلیوں کا انتظار رہیگا اور پھر یہ انتظار دیگر ساڑھے سات سو دوستوں کی پروفائلز میں ہونے والی تبدیلیوں اور انکے تبصروں میں کہیں کھو جائیگا۔ یار زندہ صحبت باقی۔

سنا ہے فیس بک والے آپکے مردہ دوستوں کے لئیے بھی ایک گوشہ بنانے کا خیال رکھتے ہیں تاکہ آپ وہاں جا کر وقتاً فوقتاً اسے اپ ڈیٹ کر سکیں۔لیکن اسکے لئے بھی آپکو فیس بک پہ ایک اکاءونٹ بنانا پڑیگا۔

8:12 AM

canada, kraci, پھول نگر، لاہور۔ بنیادی انسانی حقوق، Lahore, فیس بک، کینیڈا، کراچی، لاہور، Face book

ایک تقریب، ایک خیال

اگرچہ کہ کسی کو اس چیز کی بھنک بھی نہ پڑی ہوگی کہ ہم ٹہرے عوام الناس، اپنے ملک کے صدر نہیں۔ لیکن انکی دیکھا دیکھی، کچھ لوگوں کی شدیدخواہش، اور ایک خدائ ذریعے سے فنڈز کی فراہمی نے جس میں کچھ شائبہ ء خوبی ء تقدیر بھی ہے، ہمیں اس قابل بنادیا کہ ہم چند دنوں کا فوری دورہ جزیرہ آسٹریلیا کا بھی کر آئے۔ اب واپس تھائ لینڈ میں بیٹھے سواردیکا یعنی خوش آمدید اور کپن کا یعنی شکریہ کر رہے ہیں۔

اس سے کچھ لوگ یہ اندازہ لگانے نہ بیٹھ جائیں کہ یہ ہم پہ حکومتی ذرائع کی کوئ خفیہ مہربانی، امریکی متوقع امداد میں سے کسی حصے کی پیش کش  یاہماری کوئ لاٹری کھل گئ ہے۔ احوال یہ ہے کہ اس سب خرچے کے بعد یقیناً کافی عرصےتک پیسوں کو دانتوں سے پکڑنا پڑیگا۔

آسٹریلیا کا ہمارا یہ مختصر دورہ کیری لوگر بل کے سلسلے میں نہیں، ایک شادی میں شرکت کا بہانہ تھا۔ یہ شادی دو مختلف قومیت رکھنے اور شاید دو مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد کے درمیان تھی۔ اگرچہ کہ یہ ہوئ وہاںاکثریتی رائج الوقت طریقے کے مطابق۔

دن کے ایک بجے ایک سرکاری خاتون نے ایجاب وقبول کروایا۔  اس سے پہلے دونوں ہونے والے میاں بیوی کی ایک دوسرے کو پسند کرنے والی وجوہات کو بیان کر کے آنیوالے مستقبل کے لئے انکی ذمہ داریوں سے انہیں آگاہ کرتے ہوئے۔انکے میاں بیوی ہونے کا اعلان کیا گیا۔ شادی میں ایک فریق چونکہ پاکستان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لئے پاکستانی خاندان کی خواتین نے اپنے روائیتی شادی کے  ملبوسات اور سج دھج سے مقامی لوگوں کے لئے کافی دلچسپی پیدا کر دی تھی۔ دولہا اور دولہن کے ساتھ وہاں کے قواعد کے مظابق بیسٹ مین اور بیسٹ وومین موجود تھے۔جو سارا دن انکایعنی دولہا دولہن کا دل بہلاتے رہے۔

عصر کے وقت سے رات کے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ آسٹریلیا میں رات کا کھانا جلد کھالیا جاتا ہے۔ یعنی پانچ چھ بجے کے قریب۔ لوگ عام طور پہ نو دس بجے تک سونے چلے جاتے ہیں۔ زیادہ تر مارکٹس شام کو پانچ بجے بند ہو جاتی ہیں۔

  اس دعوت میں ہمارے سمیت تقریباً ستر افراد شامل تھے ۔ پنڈال میں داخل ہونے کی جگہ پہ آنیوالے افراد کے بیٹھنے کی نشت اور میز کا نمبر لکھا ہوا تھا۔۔ پہلے کھانے کے ابتدائ ہلکے پھلکے لوازمات آنا شروع ہوئے جنکا مقصد صرف کچھ چگتے رہنا تھا اور پھر اصل کھانا اور آخیر میں میٹھا۔ ساتھ میں محفل ناءو نوش تو جاری ہی تھی۔

 حلال کھانے کی عدم دستیابی کی بناء پر ہم نے سبزی خوروں کا کھانا کھانا چاہا۔ لیکن وہ صرف ابلے ہوئے کاجوءوں پہ مشتمل تھا۔ خدا کی ماضی میں دی ہوئ نعمتوں کا شکر کرتے ہوئے سوچا کہ ایک وقت نہ کھانے سے کوئ فرق تو نہیں پڑتا۔ اور اپنا اورنج جوس کا گلاس پکڑے تماشائے اہل کرم دیکھتے رہے رہے۔

زندگی اپنے بہاءو میں کتنی نئ چیزوں سے آشنا کراتی ہے۔ میٹھے کے بعد محفل میں موجود ہر شخص کو ایک گلاس شیمپیئن کا پیش کیا گیا۔ ہمارے استفسار پہ بتایا گیا کہ یہ صرف کھانے کے اختتام پہ دولہا دولہن کے ساتھ خوشی میں اٹھانے کے لئے ہے اسے پینا لازمی نہیں۔ چلیں جناب اس بہانے ہمیں شیمپین کا رنگ دیکھنے کو ملا کہ اس رنگ کی لپ اسٹک ہمیں خاصی پسند رہی ہے۔ لیکن اسکو اٹھانے سے ہم معذور رہے کہ یہ ہمارے بنیادی اصولوں میں شامل نہیں۔

کھانے کے بعد اس جوڑے کے والدین اور دیگر احباب نے کچھ مختصر ہلکی پھلکی تقاریر کیں، اور پھر ڈانس فلور پہ دولہا دولہن کے رقص کے ساتھ لوگوں نے بھی ان کا ساتھ دینا شروع کیا۔ اور تھوڑی دیر میں تقریباً تمام حاضرین محفل نے اس میں شرکت کی۔ یہ سلسلہ بھی کوئ ڈیڑھ گھنٹے چلا۔ یہاں بھی میری نالائقی شرکت حال رہی کہ ایسا کچھ آتا نہیں تھا۔

محفل کے اختتام پہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد وہاں کے قواعد کے مطابق گاڑی چلانے کے قابل نہ رہی۔ جی پی ایس بنانے والوں کا شکریہ کہ اسکے طفیل ہم اس نئ جگہ پہ رستہ ٹٹولتے ٹٹولتے واپس منزل مقصود تک جا پہنچے۔

غالب نے کہا کہ

مئے سے نشاط کار کس روسیاہ کو ہے

یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئیے

رات کو کمبل میں گھسے گھسے مجھے خیال آیا کہ کیا سر خوشی، سر مستی اور کیف وسرور، ہوش و خرد سے نجات پالینے کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔

5:34 AM

آسٹریلیا، شادی، غالب، جی پی ایس، شیمپین، محفل ناءونوش، Australia

پل دو پل کے شاعر-۲

یہ ہماری ایک نو عمر شاعرہ ہیں انکی ایک شعری کاوش آپ پہلے بھی پڑھ چکے ہیں۔ آج دوسری پر نظر ڈالیں۔

سوچوں میں، گھبراءوں میں، کیسے بات بناءووں

اس نے بھیجا ہے سندیسہ میں ملنے کو آءووں

سیپی کے ہیں رنگ نیارے، موتی کے ہیں مول

کھڑی کنارے سوچ رہی ہوں، کیا کھوءوں کیا پاءووں

تتلی کے ہیں اجلے رنگ، جگنو میں ہے آگ

تتلی کے میں رنگ چراءووں یا برہن کہلاءووں

دریا دریا بہتی ہوں، قطرہ قطرہ رستی ہوں

رستہ رستہ بکھر رہی ہوں کاش اسے مل جاءووں

ہاتھوں میں نہ کنگن میرے، نہ پیروں میں پائل

گجرا نہیں ہے بالوں میں کیسے اسے جگاءووں

من کی آگ کون بجھائے، نیر نہ کوئ آنکھوں میں

اندر اندر سلگے جاءووں اور جوگن کہلاءووں

6:41 AM

Poetry, شاعری

ایک جن سے ملاقات

 خالہ کی شادی کی ہلچل مچی ہوئ تھی۔ شادی میں صرف ایکدن رہ گیا تھا۔ گھر میں عجیب افراتفری تھی۔ ہر تھوڑی دیر بعد کوئ نہ کوئ بات اٹھ کھڑی ہوتی ۔ لیکن میرے ساتھ بالکل عجیب ہی واقعہ پیش آیا۔ میں تیزی سے صحن سے گزر رہی تھی کہ وہاں پہ موجود رات کی رانی میں میرا دوپٹہ جا کر اٹک گیا۔میں نے اسے تھوڑآ سا جھٹکا دیکر نکالنا چاہا مگر وہ کچھ اور پھنس گیا۔ ایک اور کوشش کی مگر دوپٹہ اور زیادہ الجھ گیا۔ اب میں نے جھنجھلاہٹ میں جو اپنا دوپٹہ کھینچا تو اچانک ایک عجیب دو سینگوں والی مخلوق میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئ جسکے پیر ندارد۔ اس نے میرا دوپٹہ پکڑا ہوا تھا۔   پہلا خیال میرے ذہن میں آیا کہ میری ملاقات ایک جن سے ہو رہی ہے۔ وہ بھی اپنی خالہ کی شادی سے ایکدن پہلے۔

اب کچھ لوگوں کو اعتراض ہو گا کہ جن تو ہوتے ہی نہیں۔ تو ایسا نہیں ہے جناب۔ ورنہ اس قسم کے شعر کیوں کہے جاتے کہ جن پہ تکیہ تھا اور پتے ہوا دینے لگے۔ پھر اس قسم کی نشانیاں کیوں بتائی جاتیں کہ جن کے ہونٹوں پہ ہنسی پاءووں میں چھالے ہونگے۔ اور وہ خود یہ نہ کہتے کہ ہم وہ جنوں جولاں گداے بے سروپا ہیں۔ یہ سب ثبوت ہے اس بات کا کہ جن ہوتے ہیں۔

اچھا قصہ آگے بڑھاتے ہیں۔ میں نے آنجناب جن سے  کانپتی ہوئ آواز میں کہا کہ میرا دوپٹہ چھوڑ دیں ۔ اس نے ایک قہقہہ لگایا ۔ ہاہا، خاخا خوں۔ اب میں اور دہل گئ۔ میرا دووووپ پ پ پ ٹ ٹ ٹ ٹ آآآ۔ میں تمہیں لینےآیا ہوں۔ میں تمہیں لے جاءوونگا۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ کیا، میری خالہ کی شادی ہے کل۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔ میں تمہیں لے جاءونگا۔ میں جو کہتا ہوں وہ کرتا ہوں۔ ہاہا، خاخا، خو ں ں ں خ خ۔

اب مجھے دل ہی دل میں صدمہ ہو گیا۔ ایک ایسے وقت میں جب سب شادی کی تیاریوں میں ایکدم غرق ہیں میری اس کمبخت جن سے کیوں ملاقات ہو گئ۔  ساتھ ہی اس بات پہ حیرت تھی کہ کسی اور کو کیوں نہیں پتہ چل رہا کہ ایک جن میرے لئے مصیبت بنا ہوا ہے۔ تم بد تمیز جن، تم یہاں سے چلے جاءو۔ میں نے زور سے چیخنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ لیکن میری آوز جیسے ایک کنوئیں سے آ رہی تھی۔ ۔  میں جا رہا ہوں لیکن چوبیس گھنٹے میں واپس آءوونگا۔ اور پھر وہ کرونگا جو میں نے کہاہے۔۔ میں تمہیں لے جاءوونگا۔ہاہاہا، خاخا خاخا، خوں خاااااار۔یہ کہہ کر وہ دھوئیں میں تحلیل ہو گیا۔

میں جنوں پہ یقین نہیں رکھتی تھی اور جب اپنے پسندیدہ شاعر کے اس قسم کے شعر پڑھتی کہ

میں نے جنوں پہ لڑکپن میں اسد

سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

تو مجھے اس نکتے پہ نہ صرف ان سے خاصہ اختلاف ہوتا بلکہ افسوس بھی۔

 اچھا اب آگے کی سنئیے۔ میں خوف اور سکتے کے عالم میں جیسے برف ہو گئ تھی۔ اور پھر برف جیسے پگھلنا شروع ہوئ۔ تو سب سے پہلے آنکھوں کی پگھلی۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ چھت پہ پنکھا گھوم رہا تھا۔  اسکی سررر کی آواز گونج رہی تھی لیکن اس جن کے قہقہے اسکی آواز پہ بھاری تھے اور ابھی تک میری سماعت پہ ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے۔ میں نے ہاتھ پھیرا میں فرش پہ بچھی چاندنی پر موجود تھی۔ یہ جناتی قہقہے کیوں ختم نہیں ہو رہے۔ میں نےگردن گھمائ۔ امی کی پھوپی جان میرے کندھے سے سر جوڑے میری طرف سر کئیےسو رہی تھیں۔ اور انکے خراٹوں کی آواز سے ہر چیز لرز رہی تھی۔ خاخاخوںخررر۔

4:06 PM

کچھ اور سیکولر لوگ اسلام پسندوں کے لئیے

آج جنگ اخبار پڑھ رہی تھی تو جناب ہارون رشید کے کالم پہ بھی گذر ہوا ابھی کچھ عرصے پہلے بھی ایک اردو بلاگ پہ کسی تبصرہ نگار کے طفیل انکا ایک اور کالم دیکھا تھا اور انکے چند ایک نکات سے اختلاف کرتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایسی تحریروں کو اس وقت کتنی زیادہ ضرورت ہے۔ انکی شخصیت کو سامنے رکھتے ہوئے یہ طعنہ بھی کسی کو دینے کی جراءت نہیں ہو سکتی کہ ہونہہ یہ سیکولر اور روشن خیال لوگ ایسا کہتے ہیں۔ آئیے، انکی یہ تحریرآپ سب کی نذر۔ امید ہے آپ میں سے جو لوگ اخبار پڑھنے کی لت میں مبتلا ہونگے وہ اس پہ سے گذر چکے ہونگے۔ لیکن ایک دفعہ پھر سہی۔ انکے ساتھ پڑھئیےجنہیں دوسروں کے ساتھ پڑھنے کی عادت ہے۔

 نوٹ؛

اس مضمون کے چھوٹا نظر آنے کی صورت میں اس پہ کلک کجئیے۔

اس تمام مضمون میں انہوں نے امریکہ  کی واپسی کا تذکرہ کیا ہے۔ یقیناً امریکہ کو واپس جانا ہے۔ لیکن اس صورت میں پاکستان کو طالبان کے جن کو قابو میں کرنے کی منصوبہ بندی کرنی ہوگی۔ چاہے وہ تحریک طالبان ہو ں یا افغانی طالبان۔ ہم سب کو یقیناً اس بات پہ سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا کہ اس ریاست کو جسکے مکین ہم سب ہیں کسطرح یہاں کے رہنے والوں کے لئیے ایک فلاحی مملکت میں بدلنا ہوگا ۔ جہاں حریت فکر موجود ہو۔

12:54 PM

Jan news paper،, ہارون رشید، دیوار پہ لکھا ہے، مضمون کا عنوان، جنگ اخبار، Haroon Rasheed

ایک بغیر سوچی سمجھی سازش

اگرچہ سازش کو میں  ہمیشہ کچھ ایسے اقوال و افعال کا مجموعہ سمجھتی رہی ہوں جسے انتہائ تفکر اور سوچ بچار کے بعد ترتیب دیا جاتا ہے۔ لیکن بہر حال کچھ لوگ اسکے ساتھ سوچی سمجھی کا لاحقہ استعمال کر نا چاہتے ہیں۔ ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے جم جم کریں، ویسے بھی ہمارے ماحول کی تربیت نے ایک چیز ہم میں پیدا کرنے کی کوشش کی اور وہ یہ کہ چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی۔ اس میں آسانی یہ ہوتی ہے کہ خود کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ جو کچھ کرتی ہے ہوا کرتی ہے۔ اب اگر کچھ غلط بھی ہو جائے تو قصور ہوا کا ہی ہو سکتا ہے ہمارا نہیں۔ اور اگر موسم حبس کا ہو اور ہوا کا دور دور تک نشان نہ ہو تو ہمارے اس طرح بے دست وپا ہونے میں یقینا کسی کی سازش اور وہ بھی سوچی سمجھی سازش ہی شامل ہوسکتی ہے۔

اگرچہ کہ یہ نہیں معلوم کہ سوچی سمجھی سازش کی علامات کیا ہوتی ہیں اور اسے کیسے پکڑا جاتا ہے لیکن ہم اپنی فطری ذہانت سے اسکا پتہ چلا لیتے ہیں۔ قدرت نے ہمیں ایسے جواہر سے بغیر کسی جانبداری کےمالا مال کیا ہے اورایسے دیدہ وروں کے لئیے ہماری زمیں بہت زرخیز ہے۔   خدا جانے علامہ نے یہ شعر کس ترنگ میں کہا کہ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ہمارے یہاں بہت کم لوگ ہی ایسے ہیں جنہیں قدرت نے دیدہ ور پیدا نہیں کیا۔ اور خیال ہے کہ ایسا صرف نرگس کے ساتھ ہی ہوا ہوگا۔ ہزاروں سال سے لگتا ہے کہ نرگس کوئ انسان نہیں جناتی مخلوق ہے۔ معلوم نہیں کہ حضرت علامہ کو جنات پہ کوئ دسترس حاصل تھی یا نہیں۔ یا کسی سوچی سمجھی سازش کے نتیجے میں انکی زندگی کا یہ باب اوجھل کر دیا گیا ہے۔

آخیر میں مجھے ایک خیال آتا ہے کہ جہاں ہم حالات حاضرہ کی الجھی لٹوں میں سے اتنے تواتر سے سازشی جوءوں کو نکالتے رہتے ہیں وہاں تاریخ کی سر کی کھجلی کو بھی کم کرنے کا بندو بست کیوں نہیں کرتے۔ مثلا میں سوچ رہی تھی کہ اس میں تو کوئ سوچی سمجھی سازش شامل نہیں کہ پاکستان کا قیام قائد اعظم جیسے بے عمل سیکولر مسلمان کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ آخر یہ کس کی سازش تھی۔

قائد اعظم کی یہ یادگار تصویر کسی سوچی سمجھی سازش کا حصہ تو نہیں۔

حلفنامہ

میں یہ حلف دیتی ہوں کہ میری یہ تحریر بغیر سوچی سمجھی سازش کا حصہ ہے۔ اور کسی دیدہ ور کی دیدہ وری کے بغیر شائع کی جا رہی ہے۔

8:34 AM

Quaid-e-Azam, قیاسی سازش، قائد اعظمConspirasy theory

ملازمتی انٹرویو کی تیاری ضروری ہے

ہاں تو جناب ہم بات کر رہے تھے جاب انٹرویوکی تیاری کی اور بیچ میں سلسلہ رک گیا تو لوٹتے ہیں اپنے اس موضوع کی طرف۔ شیکسپیئر نے کہا تھا کہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہر شخص اپنا کردار ادا کر کے چلا جاتا ہے۔ انٹرویو بھی ایک ایسا ہی اسٹیج ہےدیکھتے ہیں کہ یہاں آپ اپنا کردار کیسے نبھاتے ہیں۔

 بہتر تو یہ ہے کہ انٹرویو میں پوچھے جانیوالے ممکنہ سوالات کے جوابات سوچ کر کسی دوست یا بہن بھائ کے ساتھ بیٹھ کر پریکٹس کر لیں یعنی ریہرسل کر لیجئیے۔ اگر کوئ نہ ملے تو آئینے کی خدمات حاصل کر لیں یا پھر ٹیپ ریکارڈر میں ریکارڈ کر کے سنیں۔

سب سے پہلے تو یہ کہ انٹرویو کال ملنے کے بعد متعلقہ کمپنی یا جگہ جہاں آپ نے درخواست دی تھی اسکے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر لیں۔ آج کی نیٹ کی دنیا میں ایسا کرنے میں آپکو کوئ پریشانی نہ ہوگی۔ وہ لوگ جنہیں یہ سہولت میسر نہیں وہ اپنے جاننے والوں اور دیگر ذرائع کو استعمال کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر آپ انٹرویو لینے والے اشخاص کے بارے میں جان سکیں تو اور بھی اچھا ہے۔ اس جگہ کی تاریخ، انکی پروڈکٹس، انکے کام کرنے کا طریقہ ءکار، مستقبل کے لئے انکے پرجیکٹس، انکے حریف، سالانہ ترقی اور انکے ہدف، اسکے علاوہ اس عہدے کی ذمہ داریان اور ضروریات جسے آپ حاصل کرنا چاہ رہے ہیں۔ ان سب کے بارے میں آپکو جتنا زیادہ علم ہو اچھا ہے۔

اگرچہ آپ اپنا ریسیومہ انہیں بھیج چکے ہیں۔ لیکن اس دوران جو بھی اہلیت آپ نے حاصل کی ہے وہ بھی اس میں شامل کر کے اسے اپ ٹو ڈیٹ کر لیں۔ اسے اچھی طرھ دیکھ لیں جو چیزیں آپ نے اس میں شامل کی ہیں انکا دفاع اچھی طرح کر سکتے ہیں یا نہیں۔

انٹرویو کے مقام کے بارے میں اچھی طرح معلوم کر لیں اور وہاں تک پہنچے کا راستہ بھی۔ انکےرابطہ نمبر اپنے پاس رکھیں۔ اس سلسلے میں ٹرانسپورٹ کا بندوبست بھی ذہن میں رکھیں۔

انٹرویو کی بھی مختلف قسمیں ہوتی ہیں اگر یہ ذہن میں رہیں تو اسے ہینڈل کرنے میں آسانی رہے گی۔

ہیومن ریسورس کے ذریعے ہونے والے انٹویوز؛

ان انٹرویوز میں آپکا ایمپلائر عام طور پر موجود نہیں ہوتا بلکہ یہ کسی اور کمپنی کے توسط سے کرائے جاتے ہیں۔ ان انٹرویوز میں آپکی تعلیمی قابلیت،  آئ کیو اور ایموشنل کوشنٹ وغیرہ چیک کرنے کے لئیے تحریری یٹیسٹ بھی ہو سکتے ہیں۔

پینل انٹرویو؛

اس میں کافی سارے ماہرین موجود ہوتے ہیں جو اس کمپنی کے تجربے کار افراد بھی ہو سکتے ہیں اور مختلف میدانوں سے تعلق رکھنے والے ماہرین بھی۔

اسٹریس انٹرویو؛

ان انٹرویوز میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ آپ اسٹریس میں کسطرح کام کرتے ہیں۔ اسکے لئیے آپ سے ماہرین کا ایک پینل تابڑ توڑ سوالات کرنا شروع کر دیتا ہے جنکے جوابات سے زیادہ اس بات کو دیکھا جاتا ہے کہ آپ کس طرح اپنے آپکو ٹحنڈی سطح پہ رکھتے ہیں۔ بعض اوقات آپ کے جواب پہ ایسا ظاہر کیا جاتا ہے جیسے یہ اتنا صحیح نہیں اور بعض اوقات بہت اوٹ پٹانگ سوالات کئیے جاتے ہیں۔ جیسے اس وقت آپ کتنی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے ہیں۔ آپ کہیں گے لعنت ہو میں انٹرویو دینے آیا تھا یا سیڑھیاں گننے۔ یا بوکھلا کر یہ سوچیں گے کہ میں کتنا نالائق ہوں آتے ہوئے سیڑھیاں نہیں گنیں۔ گھبرائیے نہیں انہیں خود بھی نہیں پتہ ہوگا۔

آپکی تعلیمی قابلیت اور آپکے سابقہ تجربے سے متعلق جو چیز ضروری ہے وہ یہ کہ آپ ان دونوں چیزوں کو اس جاب سے متعلق بنانے میں کامیاب ہوں۔ یعنی آپکی تعلیم اور تجربہ کس طرح اس

جاب میں کام آئے گا۔

اب آتے ہیں انٹرویو میں پوچھے جانیوالے ممکنہ سوالات کی طرف۔ وہ یہ ہو سکتے ہیں۔

اپنے بارے میں بتائیے

 اپنے کیریئر میں آپ کس چیز کو اہمیت دیتے ہیں۔

اس ملازمت کو کیوں اختیار کرنا چاہتے ہیں

ہم آپکو کیوں یہ ملازمت دیں۔

اگر آپکے ٹیم ممبر معاونت کرنے پر تیار نہ ہوں تو آپ کیا کریں گے۔

اپنی  بہترین خوبیوں کے بارے میں بتائیے۔

آپکی کمزوریاں کیا ہیں جن سے آپ پریشان رہتے ہیں

آئندہ پانچ  یا دس سالوں میں آپ اپنے آپکو کہاں دیکھتے ہیں۔

پچھلی جاب کو چھوڑنے کی وجہ کیا تھی۔

انٹرویو کے دوران جب تک وہ خود نہ پوچھیں۔ تنخواہ کا تذکرہ نہ چھیڑیں اور نہ ہی جاب سے حاصل  ہونے والی سہولیات کا۔

جب وہ آپ سے اس بارے میں پوچھیں تو اپنا مطالبہ اتنا زیادہ بھی نہ رکھیں کہ وہ بدک جائیں اور نہ یہ ظاہر کریں کہ آپ ہر قیمت پہ یہ کام کرنا چاہتے ہیں۔

اپنی مارکیٹ ویلیو کے بارے میں اندازہ ضرور لگاتے رہیں اور انٹرویو سے پہلے اسے ذہن میں رکھیں۔ اگر وہ آپکو موجودہ تنخواہ سے زیادہ یا برابر نہیں دے رہے تو بھی اس چیز کا جائزہ ضرور لیں کہ کیا اس ملازمت کو حاصل کرنے کے بعد آپ کے سیکھنے کے مواقع بڑھ جائیں گے یا نہیں۔  اگر وہ آپکو کم تنخواہ آفر کر رہے ہوں تو پھر ضرور معلوم کریں کہ دیگر فوائد کیا ہونگے اور آپکو اپنی صلاحیتیں بڑھانے کے لئیے کیا مواقع حاصل ہونگے اور پھر اس پہ رضامندی دیتے ہوئے اس چیز کو واضح کردیں کہ آپ اپنی پیشہ ورانہ گرومنگ کو بیحد اہمیت دیتے ہیں۔

انٹرویو کے دوران ضروری نہیں کہ آپ صرف سوالوں کے جواب دیتے رہیں آپ بھی ان سے سوالات کر سکتےہیں اور اس سے آپکی ملازمت حاصل کرنے میں دلچسپی ظاہر ہوگی۔ وہ سوالات یہ ہو سکتے ہیں۔

آپکے خیال میں مجھے اس جاب کے بارے میں اور کیا معلومات ہونی چاہئیں۔

آپکی کمپنی میں مجھے کیا نئ چیزیں سیکھنے کو ملیں گی۔

مزید میرے بارے میں آپ کیا جاننا چاہتے ہیں۔

کیا میری ٹریننگ آپ کریں گے یا کوئ اور یہ کام کریگا۔

انٹرویو کہ وقت اپنی ظاہری شخصیت پہ توجہ دیں۔ اچھا فارمل لباس پہنئیے تاکہ آپ ذمہ دار نظر آئیں۔ بالوں میں جیل لگا کر اسپائکس نہ بنائیں اور نہ ہی برمودا پہن کر نکل کھڑے ہوں۔ خواتین سادے سوتی یا غیر چمکدار کپڑے پہنیں جس میں وہ اپنے آپکو با اعتماد محسوس کرتی ہوں۔ بالوں کی غیر ضروری لٹیں چہرے پہ نہ ڈالیں، بہت زیادہ آرائشی زیور، بجنے والے زیور یا کانچ کی بھری ہوئ چوڑیاں پہننے سے اجتناب کریں، گہرے میک اپ سے گریز کریں۔

کپڑے ایکدن پہلے استری کر کے رکھ لیں تمام ضروری کاغذات کو ایک لفافے میں ایک دن پہلے  ڈال کر رکھ لیں۔ دئیے ہوئے وقت سے پہلے پہنچنے کی کوشش کریں۔ انٹرویو کے وقت انتظار کرتے ہوئے کسی چیز کا رٹا لگانے نہ بیٹھ جائیں یہ اب اسکا وقت نہیں۔

 اگر آپکی جاب کی ضرورت میں ڈرائیونگ کا جاننا ضروری ہے تو اپنا ڈرائیوبگ لائسنس ضرور رکھ لیں۔ اگر تدریسی عہدے کے لئیے جا رہے ہوں تو ایک چھوٹا سا لیکچر ضرور تیار کر لیں اوراسے یاد بھی کر لیں، کسی اچھے ادارے کی صورت میں ٹرانسپیرینسیز یا سلائیدز بھی بنا لیجئیے۔ ریفرنس کے دو یا تین خطوط یا اگر آپ سےمخصوص تعداد انٹرویو کے وقت لانے کو کہا گیا ہے تو وہ ساتھ میں رکھیں۔ متعلقہ لوگوں سے یہ خطوط حاصل کرنے کے بعد انہیں مطلع رکھیں کہ آپ نے انہیں استعمال کیا ہے۔

کسی بھی پیشہ ورانہ جگہ پر رشتے داریاں بنانے سے گریز کریں۔ کسی کو انکل، آنٹی، باجی اور بھائ نہ بنائیں۔ انٹرویو لینے والوں سے بات کرتے وقت ان سے آنکھ ملا کر بات کریں۔ اپنے چہرے اور انداز میں بشاشت رکھیں۔

اپنی قابلیت، تجربے کے بارے میں جتنا بولیں اور مختلف واقعات سے اسےجتنا سپورٹ کریں کہ کیسے آپ نے مختلف مسائل کے حل تلاش کئیے، لیکن اپنی ذاتی زندگی کو بیچ میں ڈالنے سے گریز کریں۔

اور ہاں انٹرویو کے کمرے میں داخل ہونے کے بعد سلام کرنا اور ہاتھ ملانا نہ بھولیں۔ انتظار کیجئیے جب آپ سے بیٹھنے کو کہا جائے تو بیٹھ جائیے۔

نکلتے وقت سب کا شکریہ ادا کریں۔ ان سے معلوم کر لیں کے نتیجے کے بارے میں آپکو کیسے پتہ چلیگا یا اب آگے کیا ہوگا۔ چاہیں تو بعد میں خط یا ای میل کے ذریعے نتیجہ معلوم کر لیں۔

جاب نہ ملنے کی صورت میں دل چھوٹا نہ کریں۔ ہو سکتا ہے کہ آپکو زیادہ انٹرویو دینا پڑیں۔ ہر دفعہ اپنے ہر انٹرویو کا تجزیہ ضرور کریں۔ اس سے اپنے آپکو بہتر کرنے میں آسانی ہوگی۔ خدا آپکی قسمت میں ایسی آسانی دے جس سے آپ میں آگے بڑھنے کی لگن پیدا ہو اور دوسروں کا بھی بھلا ہو۔

ریفرنس؛

مزید معلومات

انٹرویو ٹپس

روحانی کوشنٹ

6:28 AM

ایموشنل کوشنٹ، آئ کیو،Job interview, ملازمتی انٹرویو،، اسٹریس انٹرویو، ہیومین ریسورس انٹرویو، شیکسپیئر

ب سے برف، چ سے چاول

اب جبکہ میرے بلاگ پہ مستقل آنیوالے قارئین کے علم میں آچکا ہے کہ میں پاکستان سے باہر ہوں تو اس تحریر پہ نظر پڑنے کے بعد آپ دھوکا مت کھائیے گا میں اب بھی پاک سر زمین سے ہزاروں میل کے فاصلے پہ ہوں۔  نہیں ابھی مجھے اتنا عرصہ نہیں ہوا کہ طالبان بھی خدا کی پیاری مخلوق لگنے لگیں اور انکے ہر دھماکے کے بعد زور زور سے انکی مظلومیت کا نوحہ پڑھنے لگوں اور امریکہ پہ تبرہ بھیجنے لگوں۔ قصہ مختصر سب کچھ ویسا ہی ہے بس فی الحال ہمارے کسی خود کش حملے میں جاں سے گذر جانے کے امکانات کم ہو گئے ہیں۔ تھائ لینڈ کی سرزمین پہ مزید کچھ پیسے خرچ کرنے کے بعد اب میرا کمپیوٹر بھی مردہ خانے سے باہر آگیا ہے۔ کون کہتا ہے کہ پیسے میں اعجاز مسیحائ نہیں۔ بس پیسے کم ہوں تو اعجاز صاحب دور رہتے ہیں۔

یہاں روٹی نہیں کھائ جاتی ہر چیز کے ساتھ چاول ملتے ہیں اور چاول بھی وہ جو ایکدوسرے سے چپکے ہوتے ہیں۔ ایسے چاول ہمارے دیس میں ہوں تو پکانے والے کے پھوہڑ پن پر ہزار لعنتیں بھیجی جائیں۔ ایک ہوٹل میں ہم نے کھانے کا آرڈر دیا ۔ یہ میٹ بال قسم کی چیز تھی اس سے ملتی جلتی چیز کو ترکی میں کباب اور ملائیشیا میں ساٹے کہا جاتا ہے۔ تھائ زبان میں نہیں معلوم کیا کہتے ہیں۔ اسکے ساتھ یہی ابلے چاول منگا لئیے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سامنے ساٹے کی یا کباب کی پلیٹ اور ایک گلاس میں برف رکھ دی۔ اب ہم نے غور کیا کہ یہ برف بھائ صاحب نے کس سلسلے میں لا کر رکھی ہے۔ نہیں اب آپ میں سے کچھ لوگ یہ نہ سوچنے لگیں کہ یہ کسی محفل ناءو نوش کی تیاری تھی کہ آئے کچھ ابر ، کچھ شراب آئے۔ اور پھر وہاں ہمارے کسی دیندار ساتھی کے پہنچنے پہ ہمارا وہ حال ہو کہ

کسی کے آنے پہ ساقی کے ایسے ہوش اڑے

شراب سیخ پہ ڈالی، کباب شیشے میں۔

ہوا یہ تھا کہ ہم نے ان سے رائس منگوائے تھے اور وہ آئس لے آئے۔

نتیجہ؛

تھائ لینڈ میں رہنے کے لئے تھوڑی بہت تھائ زبان بولنا آنا چاہئیے۔ تو اب میں ایک فہرست تیار کر رہی ہوں ضروری الفاظ کی۔ آپ مجھے مشورہ دیں کہ یہ ضروری الفاظ کون سے ہونے چاہئیں۔

11:20 AM

Turkish kebab, تھائ لینڈ، چاول، کباب، thailand

Kosher food is halal

Kosher is the term used for Jewish dietary laws.  Yesterday, I saw a restaurant here (Phuket, Thailand)  with the symbol of star of david and thought it must be some jew's restaurant. My companion told me that muslims can eat kosher food and in fact, in western countries a large number of muslims eat it without any hesitation. I have known this earlier but never thought to face it. I went through many web  sites to know its details but again found many different views. What do you think if it is halal or not?

I will  love it if you can write in urdu. Hope most of you know my problem why I am not writing in urdu these days.

Reference:

Kosher food

11:18 AM

a note to my readers

For my friends, everything is ok with me.   I just forget the charger of my laptop in Pakistan :). As soon as I get a new one you will be able to read more from me. Till then Khuda Hafiz. Miltey hein aik break ke baad. See you soon :).

Its me Aniqa.

8:49 AM

pakistan., thailand

جوتوں کے بھوت

لجئیے جناب ایک کے بعد ایک تواتر سے اتنی ساری چیزیں سامنے آکر کھڑی ہوگئیں۔ ابھی تو بلیک

واٹر اپنی جگہیں سنبھالنے بھی نہ پائے تھے کہ کیری لوگر بل سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔۔ خیال کیا جا

رہا تھا کہ اس میں کچھ امریکن نواز عناصر نے سیکیورٹی فورسز کو لگامیں ڈالنے کے لئیے ایسی شقیں ڈالدی ہیں جن سے پاکستانی افواج کو اپنی حدیں پتہ رہیں۔ہم نے سوچا کہ چلیں اب قوم اس مسئلے میں کافی دن لگی رہے گی۔ اور دیکھیں یہ معاملہ کیسے نبٹتا ہے کہ امریکہ میں ایکدفعہ جو بل پاس ہو گیا وہ اسی طرح نافذالعمل ہوتا ہے۔ یہ شقیں ڈالنے کے ضمن میں رحمان ملک کا نام لینے کی بھی کچھ لوگوں نے جرءات کر ڈالی۔ اب ہمیں خیال آیا کہ ایک کے بعد ایک صدر صاحب کے عزیز رفقاء کی باری آرہی ہے۔ شاید اس طرح انکو ایک کونے میں نمائشی طور پر رکھنے میں کامیابی ہو۔

لیکن ابھی ہم اس بل کے مطالعے میں مصروف ہی تھے کہ پتہ چلا کہ ہماری یونیورسٹی کہ محمد حسین نامی طالب علم نے ایک امریکی اسکالر کو جو پاکستان اور دہشتگردی سے متعلق کسی تعلق پر لیکچر دے رہے تھے انہیں ایک جوتا دے مارا۔ نہیں معلوم کہ یہ محمد حسین کا اپنا جوتا تھا یا کسی کا فراہم کردہ۔ بتایا جاتا ہے کہ اس لیکچر کی یونیورسٹی انتظامیہ کی طرف سے منظوری نہ تھی۔ پھر بھی کچھ سر پھروں نے انکی بابرکت شخصیت سے یونیورسٹی کو متعارف کرانے کی ٹھان لی۔ اگرچہ ڈپارٹمنٹ کا دیگر اسٹاف اس سے الگ رہا لیکن پھر بھی یہ تقریب منعقد ہوئ۔

جوتا مارنے والے طالبعلم کے بقول انہوں نے پاکستانیوں کو شدت پسند کہا تو انہیں بڑا غصہ آیا اور یہ غصہ اسوقت عروج پر پہنچ گیا جب اس میں ایران کا نام آیا۔ پاکستانیوں کو ہمیشہ اپنے برادر ممالک کی عزت اور وقار پہ حرف اٹھانے پر زیادہ غصہ آتا ہے۔ محمد حسین سے یہ کہنا چاہ رہے تھے کہ برادر خورد اتنے سالوں میں پاکستان میں رہتے ہوئے کسی اور پاکستانی کو جوتا مارنے کا خیال کیوں نہیں آیا۔ جو کہتے ہیں کہ پاکستان میں شدت پسندی بڑھ رہی ہے۔ اس بات پہ ایک اور ناراض صاحب کا کہنا ہے کہ  یہ بات کسی امریکی کو کہنے کا حق حاصل نہیں۔وہ بھی ہمارے یہاں آکر۔ اور اس سینہ زوری پہ وہ اسی قابل ہیں کہ انہیں جوتا مارا جائے۔ حالانکہ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ سینے اور جوتے کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ امید ہے امریکی بہت جلد یہ تعلق معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ابھی ہم اس پہیلی کی سلجھن دور کر رہے تھے کہ آخر یہ کون لوگ تھے جو اسکالر موصوف کو گھسیٹ کر جامعہ کراچی تک لے گئے اور زبردستی انکا لیکچر رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر وہ کون لوگ تھے جو محمد حسین جیسے قابل طالب علم کو اس سیمینار میں شرکت کر کے وقت ضائع کرنے پر اکسا سکے۔ کہ پشاور میں دھماکے کی اطلاع آگئ جس میں چالیس کے قریب لوگ مارے گئے۔ اور درجنوں زخمی ہوگئے۔ یہ چالیس لوگ بس ایسے ہی عام سے لوگ تھے اور انکی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ آٹے کی لائنوں یا کسی اور خود کش حملہ آور کے دھماکے میں مرنے سے بچ گئے تھے۔

  آج پتہ چلا کہ جناب، اسلام آباد میں جی ایچ کیو پر مسلح حملہ ہو گیا۔ حملے کی تفصیلات تو نہیں معلوم لیکن کہا یہ جارہا ہے کہ اس حملے میں دہشت گردوں سمیت مسلح افواج کے لوگ بھی مارے گئےجبکہ ایک ذریعے کا کہنا ہے کہ وہ دو افراد کو اغوا کر کے بھی لے گئے ہیں۔ یہ وہ خبر ہے جسکا کافی دنوں سے لوگ انتظار کر رہے تھے۔ حالات جس نہج پہ جا رہے ہیں اس سے اس قسم کے واقعات کا پیش آنا قرین از قیاس تو نہیں۔

اندازہ لگانے والوں کا کہنا ہے کہ چونکہ پاکستانی فوج وزیرستان میں کارروائ نہیں کرنا چاہ رہی اس لئیے یہ سب کچھ فوج کو دباءو میں لانے کے لئے کیا جارہا ہے۔ کیا یہ واقعی صحیح ہے اور کیا واقعی پاکستان کے خلاف کچھ برا ہونے جا رہا ہے۔ اور کیا ہم یہ جنگ جوتوں سے جیت لیں گے۔ میں نے یہ سوچ کر اپنے پرانے جوتے روک لئے ہیں کہ کیا جانے کب انکی ضرورت پڑ جائے۔ اتنے امریکی جو دھڑا دھڑ ہمارے یہاں گھسے چلے آرہے ہیں انکے لئیے ایک جوتا تو کافی نہ ہوگا یا ہوگا۔

کراچی یونیورسٹی میں جوتا مارنے کا واقعہ

6:02 PM

GHQ pakistan., HEC pakistan, جی ایچ کیو، کراچی یونیورسٹی، اسلام آباد، پاکستان، پشاور، Karachi university

مشت غبار صحرا

  آگ ایک فسوں ہے، ہر فرق کو مٹا دینے والی ہے۔   جب یہ انسانی وجود میں ڈھل جائے تو محبت ہے، جنون ہے، اور جب یہ تخلیق کار کے اندر سما جائے تو کُن کے بعد گایا جانے والا الوہی نغمہ ہے۔  اگر آپ تخلیق کی آتش کو ریت کے ذرات کے ساتھ رقص کرتا دیکھنا چاہتے ہیں،  تو ضرور اس ویڈیو کو دیکھیں۔

بشکریہ، عرفان احمد خان۔

11:40 PM

Sand Animation, ریت اور تصویر، روسی آرٹسٹ،

سیلف برانڈنگ، مجھے لیجئیے، میں ہی اچھا ہوں

اگرچہ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو برانڈ کے پیچھے جان دیتے ہیں اور کپڑوں سے لیکر گھر کی چھوٹی چھوٹی چیزوں تک کسی مخصوص برانڈ کی استعمال کرنا چاہتے ہیں لیکن کبھی کبھی یہ بہت ضروری ہو جاتا ہےجیسے ڈسپوزیبل انجکشن یا پینے کا پانی خریدنا ہو تو میں کسی مخصوص برانڈ کو ہی ترجیح دیتی ہوں۔

کیوں؟

اس لئے کہ برانڈ ایک وعدہ ہے جو پروڈکٹ کو کسٹمر سے جوڑتا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ ہم وہ ہیں جو سچ ہے۔  یہ ایک وعدہ ہے کہ ہم اس طرح کی دیگر تمام پروڈکٹ سے بہتر ہیں اور ہم ایسی منفرد خصوصیات کے حامل ہیں کہ آپ کو ہم پر خرچ کرکے مایوسی نہیں ہوگی۔  اگر ہم کہتے ہیں کہ یہ خالص پانی ہے تو یہ ہے اور اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ انجکشن پہلے کبھی استعمال نہیں ہوئے تو یقین جانیں یہ ایسا ہی ہے میں اس برانڈ کی اس بات کو سچ سمجھتی ہوں اور اسکی جو بھی قیمت ہو وہ ادا کرتی ہوں۔ برانڈکی کامیابی اس میں بھی ہے کہ اسکا یہ پیغام بالکل صحیح سے اپنے کسٹمر تک پہنچ بھی جائے۔

لیکن اگر میں یہ کہوں کہ آپکو اپنے آپکو برانڈ کرنا چاہئیے اگر آپ ملازمت کی تلاش میں ہیں یا اپنے لئے مزید اچھے مواقع حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ خاموش ہو جائیں گے ایک انسان خود کو کیسے برانڈ کر سکتا ہے؟

جب آپ ملازمت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو دراصل آپ اپنا علم اور اپنی مہارت کو بیچنے کے لئے نکلے ہوتے ہیں۔ اب بتائیے کیا ایسے موقع پر آپ ایک پروڈکٹ میں تبدیل نہیں ہو گئے۔ آپکا ایمپلائر آپکے ریسیومے پر سے گذرتا ہے اور آپ سے انٹرویو کے وقت بالمشافہ گفتگو کرتا ہے۔ یہ سب کلفت اس لئے اٹھائ جاتی ہے کہ وہ اندازہ کر لے کہ وہ جس چیز کے پیسے دینا چاہتے ہیں آیا آپ اتنی قیمت کے ہیں یا نہیں۔ وہ اس ساری مشق سے آپکو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ انہیں جو نظر آرہے ہیں وہ اسکے مطابق آپکو لیں گے۔ کیا انہیں آپکی صورت میں جو پروڈکٹ مل رہی ہے وہ ایک سچا وعدہ لگتی ہے، اور کیا آپ اپنے برانڈ کی تمام خوبیاں اور وعدے اس تک پہنچا پا رہے ہیں؟

 تو اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ دوسروں کو کیسے نظر آتے ہیں۔ لیکن ٹہریں دوسروں سے پہلے آپ کو تو معلوم ہو کہ آپ کیا ہیں۔ اس پر ہم پہلے بھی گفتگو کر چکے ہیں کہ خود کو جاننا ہی ہر عمل سے پہلے ضروری ہے۔ چلیں ایک کاغذ قلم لیں اور اس پر اپنی خوبیاں لکھ لیں جو آپ سمجھتے ہیں کہ آپ میں موجود ہیں۔ اسی میں ایک دوسرا خانہ بنائیں اور اسپر اپنی کمزوریاں لکھ لیں جو آپ خیال کرتے ہیں کہ آپ میں ہیں۔

اب ایک علیحدہ کاغذ لیں اور اس پر اپنے قریبی رشت داروں، دوستون اور جاننے والوں کے نام لکھیں۔ انکے ساتھ اپنا تعلق بھی تحریر فرما دیں۔ اب ان میں سے ہر ایک سے معلوم کریں کہ وہ آپ میں کون کون سی خامیاں اور کمزوریاں دیکھتا ہے، چاہیں تو انکی تعداد متعین کر لیں کہ اتنی خوبیاں اور خامیاں بتا دیں۔ یہ ایک سروے آپکے بارے میں تیار ہو گیا۔ لیکن اسکا نقص یہ ہے کہ یہ سب لوگ آپکو جانتے ہیں اس لئے ہو سکتا ہے کہ کچھ جانبداری ہو۔ چلیں کسی پارک میں جا کر بیٹھیں اور موقع محل اور حالات دیکھ کر اپنے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں سے، یا اپنے کلاس فیلوز سے یا اپنے ساتھیوں سے یہ سوال کر کے دیکھیں کہ وہ آپکے متعلق کیا سوچتے ہیں یا پہلی دفعہ

آپ سے ملکر انہوں نے آپکے متعلق کیا سوچا۔

 اب آپ اپنی لسٹ سے اسے ملائیں جو خوبیاں آپ نے اپنے متعلق خیال کیں کیا وہ دوسروں کو بھی پتہ چلتی ہیں۔ اور اپنے متعلق جو کمزوریاں آپ نے سوچیں کیا وہ واقعی آپ میں موجود ہیں۔

یہ تو آپکو اندازہ ہوگا کہ اگر اپنے متعلق جاننا ہے تو کتنا سخت ہونا پڑیگا ان سوالوں کے جواب صحیح رکھنے کے لئے۔

اب ایک علیحدہ کاغذ پر اس طرح کے مشاہدات نوٹ کریں کہ جب آپ کسی محفل میں جاتے ہیں تو اس محفل کے ماحول پر آپکی شخصیت کا کیا اثر ہوتا ہے، کیا لوگ آپ سے اپنے آپ کو آسانی سے شیئر کر لیتے ہیں یعنی انکی آپ سے دوستی آسانی سے ہو جاتی ہے، آپکے ساتھ رہتے ہوئے انکے اندر کوئ مثبت طرز فکر پیدا ہوتی ہے، اگر آپ وہاں موجود نہ ہوں تو آپکی کمی محسوس کی جائے گی، کیا آپکی وجہ سے لوگ اپنی زندگی میں بہتر تبدیلی لا پاتے ہیں، جب آپ وہاں سے اٹھتے ہیں تو کیا وہاں آپکو یاد رکھا جاتا ہے، کیا آپ یا آپکی باتوں کو لوگ اپنے لئے فائدہ مند پاتے ہیں۔

میں اور میری دوست ایک بس اسٹاپ پر دوستی ہونے سے پہلے کافی دیر کھڑے رہ کر یونیورسٹی آنے کے لئے پوائنٹ کا انتظار کرتے تھے۔ پوائنٹ نہ لینے کی صورت میں ہمیں تین یا چار بسیں بدلنی پڑتی تھیں۔ اسکا خرچہ بہت زیادہ ہوتا تھا۔ تین چار مہینے بعد ہم دونوں کی لامحالہ دوستی ہوئ اور جم گئ۔ ایکدن میں نے اس سے کہا۔ جب آپ شروع میں میرے سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہوتی تھیں تو انتہائ روکھی اور ترش رو لگتی تھیں۔ میں سوچتی تھی ایسی اکھڑ لڑکی سے کون بات کرے۔ انہوں نے کہا اور میں آپکو انتہائ مغرور اور اپنی دنیا میں گم سمجھتی تھی۔ یہ ہم دونوں کی غلطی تھی۔ جو ہم تھے وہ نظر نہیں آرہے تھے۔ معاشرتی سطح سے الگ،   یہ غلطی پیشہ ورانہ سطح پر تباہ کن ہو سکتی ہے۔

اپنے آپ کو برانڈ کریں جو آپ چاہتے ہیں دوسروں کو وہ نظر آئیں۔

 اب آئیے پروڈکٹ کے طور پر اپنی مارکٹنگ کی طرف۔ آپکی کامیابی کی رفتار سے دوسروں کو آگاہ ہونا چاہئیے، انہیں پتہ ہونا چاہئیے کہ آپ اپنا کام کتنی محنت اور جذبے سے کر سکتے ہیں، آپکو اپنے کام یا علم کے متعلقہ میدان میں کتنی مہارت حاصل ہے، مستقبل کے لئے آپکے کیا اردے ہیں اور آپ انکے لئے کتنے کو شاں ہیں۔

ٹیکنالوجی کے اس دور میں اپنی کامیابیوں کی کہانی کو ہر جگہ عام کر دیں۔ اسکے لئے آپ اپنا بلاگ، مختلف فورمز، فیس بک یا کوئ بھی کمیونٹی سائٹ استعال کر سکتے ہیں۔ ٹیوٹر کو بھی لوگوں کو اپنی سرگرمیوں سے آگاہ کرنے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن دھیان رہے یہاں میری مراد پیشہ ورانہ اور علمی سرگرمیاں ہیں۔ اس سے باقی لوگوں کو پتہ چلے گا کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ مختلف جگہوں پر چاہے وہ کلاسز ہوں، بلاگ ہو، فورمز یا کانفرنسز اور سیمینارز اپنے تبصرے اپنے سوالات اپنے خیالات سب لوگوں کے  آگے رکھیں تاکہ لوگوں کو پتہ چلے کہ آپ موجود ہیں۔ اپنی موجودگی کا اثر چھوڑتے جائیں جہاں جہاں آپ جاتے ہیں۔

جہاں آپ یہ سب کام کر رہے ہوں ، وہاں یہ یاد رکھیں کہ اپنی متعلقہ فیلڈ میں ہونے والی نئ پیش رفت سے آگاہ رہنے کی کوشش کریں اور اپنے ان دوستوں اور جاننے والوں سے ہمیشہ تعلق میں رہیں جو اس فیلڈ سے منسلک ہوں۔ اس طرح وقت ضرورت آپ مناسب رہنمائ اور مشورہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اسکے علاوہ اپنی پیشہ ورانہ مہارت اور علم کو بڑھانے کے لئیے سرکرداں رہیں تاکہ آپ سے لوگ استفادہ حاصل کرتے ہوئے با اعتماد رہیں۔

یہ سب تو پس منظر کے کام تھے اب آپنے آپ کو جب آپ پروڈکٹ کے طور پر لے رہے ہیں تو پروڈکٹ کی ظاہری خصوصیات کے بارے میں کیا خیال ہے۔ برانڈنگ کا تعلق آپکے ماضی کو آپکے مستقبل سے کامیابی کے ساتھ جوڑنا بھی ہوتا ہے۔ آپ کیا ہیں، کس کمیونٹی سے تعلق رکھتے ہیں، کونسی مادری زبان بولتے ہیں آپکی ثقافتی اقدار کیا ہیں۔ جب آپ خود سے ان چیزوں کو طے کر لیں گے تو آپ اپنے کسٹمر کے پس منظر کو جان کر اس تک بہتر طور پر اپنے آپ کو پہنچا سکیں۔

یاد رکھیں برانڈنگ کا عمل جن تین چیزوں سے وابستہ ہے وہ آپکا نظر آنا ، یا نوٹس میں ہونا،، آپکی کمیونیکیشن، اور رویہ ہے۔

اسکا بنیادی مقصد بھی اپنے آپ میں ایسی مثبت خصوصیات پیدا کرنا ہیں جس سے لوگ آپکو توجہ دیں، آپکی ضرورت محسوس کریں اور آپکو اپنی انویسٹمنٹ کے لئے محفوظ خیال کریں۔

 خوش قسمتی چاہے کتنی بار بھی آپکے دروازے پر دستک دے اگر آپ اسکے لئے تیار نہیں ہیں تو کوئ فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔ اسکی مثال ایسے ہے کہ آپکا علم جتنا اچھا ہو اور آپکے میڈیا کے اندر جتنے اچھے تعلقات ہوں اگر آپ صحیح طریقے سے بات کرنا نہیں جانتے تو کوئ بھی آپکو اپنے چینل پر اینکر پرسن کے طور پر نہیں رکھے گا۔ اپنے آپکو برانڈ کریں بتائیے کہ  آپ یہ کام  بہت بہتر

اور منفرد طریقے سے کر سکتے ہیں، اپنے آپکو مارکیٹ کریں اور اس پروڈکٹ کو بہتر بنانے کے عمل میں لگے رہیں۔

آپ سب کو اس عمل میں مصروف کرنے کے بعد اب میں گرین ٹی پیتی ہوں، اس سے دہی بنا ہوا دماغ دوبارہ سے اپنی اصلی حالت میں آجاتا ہے۔آپکو چاہئیے، خود بنائیے۔ اور ہاں ایک شعر پڑھتے جائیے

غالب خستہ کے بغیر کونسے کام بند ہیں

روئیے زار زار کیا، کیجئیے ہائے ہائے کیوں

اب آگے ملازمت کے انٹرویو کے لئے روانہ ہونا ہے۔

اس بارے میں مزید پڑھئیے

راشد کامران صاحب کا یہ مشورہ خاصہ کارآمد ہے اس لئے میں اسے یہاں ڈال رہی ہوں تاکہ وہ لوگ جو تبصرے نہیں پڑھنا چاہتے انکے علم میں بھی آجائے۔'تسلسل کے لیے ایک مشورہ کہ لنکڈان اس سلسلے میں ایک نہایت اچھا ٹول ہے۔ اپنے پیشے سے وابستہ تمام لوگوں سے نیٹ ورک استوار کریں اور زیادہ سے زیادہ لوگوں سے درخواست کریں کے آپ کی مختلف صلاحیتوں‌پر رائے دیں؛ یہ ٹول نا صرف ان تمام چیزوں میں‌آپ کی مدد کرے گا جو اس بلاگ میں بتائی گئی ہیں بلکہ انڈسٹڑی میں اس کو سنجیدگی سے لیا بھی جاتا ہے چناچہ اس کو انتہائی فارمل رکھیں'۔

6:01 PM

self branding, سیلف برانڈنگ، برانڈ، پروڈکٹ، یونیورسٹی، مارکیٹنگ،

ایک ثقافت، ایک جواب

میرے ایک سینئیر بلاگر نے اپنے بلاگ پر میری ایک تحریر کے حوالے سے اپنے تائثرات تحریر کئے۔ میں نے اپنا تبصرہ وہاں ڈالا تو سوچا کہ آپ سب کو بھی اس میں شامل کر لوں۔

میرا تبصرہ؛

اب چونکہ آپ نے میرا نام لیکر یہ سب لکھ ڈالا ہے تو لازمی ہے کہ میں کچھ تحریر کروں۔ شاید آپکے علم میں نہ ہو کہ میں ذات کے حساب سے پٹھان ہوں۔ میرے والد صاحب کو شیر شاہ سوری سے بڑی عقیدت تھی اسکی ایک وجہ انکا پٹھان ہونا بھی تھا۔ وہ جب تک زندہ رہے انہیں اس بات پہ فخر رہا اور ہماری تربیت کے دوران بھی انہوں نے اس چیز کو ہمارے اندر داخل کرنے کی کوشش کی کہ ہم کتنی اعلی نسل سے تعلق رکھتے ہیں لیکن افسوس کہ ہم میں سے بیشتر اس سحر سے باہر نکل آئے۔ البتہ اس جینز کے جنگجویانہ عناصر کبھی کبھی سر اٹھا لیتے ہیں۔ اتنی تفصیل میں جا کر بتانے کا مقصد یہ تھا کہ میں نے دس سال کی عمر میں پہلی اور آخری دفعہ انڈیا کا رخ کیا۔ کیونکہ میرے والد صاھب کی خواہش تھی کہ ہمیں اپنے اجداد اور اپنے ماضی کے بارے میں ضرور پتہ ہونا چاہئیے۔ انکے علاقے کا نام پٹھان کبئ ہے۔ کیونکہ خدا جانے کئ نسلوں سے یہ علاقہ پٹھانوں سے آباد رہا ہے۔ یہ سارا قصہ اس لفظ ڈیرے کی وجہ سے اٹھانا پرا۔ تو میرے ابو کے گائووں میں انکے رہائشی گھر سے ہٹ کر ایک اور تھوڑا چھوٹا گھر تھا اسے وہاں ڈیرہ کہتے تھے۔ اس گھر میں وہ لوگ ٹہرا کرتے تھے جن سے کوئ رشتہ داری نہ ہوتی تھی۔ وہاں روزانہ رات کو گھر کے مردوں میں سے کوئ ضرور رکتا تھا۔ میرے دادا وہیں قیام کرتے تھے اسکی وجہ میری دادی سے کوئ جھگڑا نہ تھا۔ کیونکہ دن میں قیام اور کھانا وہ عام طور پر گھر پر کھاتے تھے۔ اسکی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ علاقہ یا گھر عملی طور پر میری دادی کی سلطنت تھا۔ تمام رشتے دار مرد اور عورت وہیں رکتے تھے اور رات گئے خوب گپ لگا کرتی تھی۔ جس میں سب دور پرے کے رشتے دار مرد خواتین موجود ہوتے تھے۔

وہ لوگ جو شہر میں اپنی ملازمتوں کی وجہ سے رہتے تھے جن میں میرے تایا اور چچا بھی شامل ہیں انکے یہاں ڈیرہ نہیں تھا۔ معاشی حالات بہتر ہونے کی وجہ سے گھر بڑے تھے اور ان میں ڈرائنگ و ڈائننگ روم ہونے کے ساتھ ایک مہمان خانہ بھی تھا۔ اس مہمان خانے میں ہم بھی ایک مہینہ تک قیام پذیر رہے۔ اکثر گائووں سے آنیوالے رشتےدار بھی وہیں قیام پذیر ہوتے تھے۔ یہ مہمان خانہ گھر کا ہی حصہ تھا اور اس میں بیرونی طرف اور گھر کے اندرونی طرف کھلنے والے دروازے موجود تھے۔ چونکہ میرے تایا وہاں کے میڈیکل کالج کے پرنسپل تھے اس لئے لوگوں کی ایک معقول تعداد ان سے ملنے آتی تھی۔ خاص طور پر تہواروں کے موقع پر خاصے لوگ ہوا کرتے تھے۔ وہ سب لوگ جنہیں گھر میں رات نہ گذارنی ہو انکے لئے ڈراءنگ روم تھا جہاں وہ کچھ وقت بیٹھکر گپ شپ یا ملنا جلنا کرلیں۔

یہاں میں یہ واضح کردوں کہ ایک ایسے پس منظر سے تعلق رکھنے کے باوجود جہاں ڈیرہ موجود تھا۔ میں انہیں انتہا پسند اور شدت پسند نہیں کہہ سکتی۔ کیوں؟ کیا میں ایسے لوگوں کو انتہا پسند کہہ سکتی ہوں جن کی لڑکیاں آج سے چالیس سال پہلے مخلوط تعلیمی اداروں میں پڑھا کرتی تھیں اور جنہیں آج سے چالیس سال پہلے بھی یہ آزادی حاصل تھی کہ وہ اپنی پسند کی شادی کر سکتی ہوں۔ جن کے گائووں میں تعلیمی استطاعت ستر فیصد سے زیادہ ہو۔ جہاں تعلیمی ادروں کو بم سے نہ اڑایا جا رہا ہو، جہاں لوگوں کو اپنی پسند کے اسلام پہ عمل پیرا نہ ہونے کی وجہ سے ذبح نہ کیا جارہا ہو، جہاں پولیو کے قطرے غیر اسلامی نہ قرار پاتے ہوں، جہاں آپکو یہ آزادی حاصل ہو کہ آپ کتنے بچے پیدا کرنا چاہتے ہیں، جہاں عورتوں کو بھی انسان ہی سمجھا جاتا ہو، کیا مجھے ان لوگوں کو انتہا پسند، شدت پسند اور دہشت گرد کہنا چاہئیے۔ وہاں پر بھی ڈیرہ ہے اور جینیاتی طور پر وہ انہی لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں جن سے یہ انتہا پسند جنکے یہاں ڈیرے ہوتے ہیں۔ مگر معاشرتی سطح پر انکے درمیان کتنا فرق ہے اسکی ایک مثال میں خود ہوں۔

قدامت پسندی یا روایت پسندی بہت محدود حد تک ہی بہتر کہی جا سکتی ہے۔ جب ساری کائنات آگے کی طرف بڑھ رہی ہے تو آپ قدامت پسندی کے کمزور بند سے اسے نہیں باندھ سکتے۔ اب بہتر طرز عمل یہ ہے کہ آنیوالی تبدیلیوں کی جگہ بناتے ہوئے نئ نسل کو اپنے ساتھ لیکر چلیں۔ یا پھر ایسے وقت کے لئے افسوس کرتے رہیں جو اب پلٹ کر نہیں آئیگا۔ چونکہ میں خود بھی اور دیگر افراد بھی عمر کے سفر میں آگے کی طرف رواں ہیں تو ایک حقیقت ہم سب کو قبول کرنی ہے اور وہ یہ کہ تبدیلی آ کر رہیگی ایسا نہیں ہو سکتا کہ باہر کی دنیا میں لوگ چاند پر جا کر تازہ بستیاں آباد کر رہے ہوں یا اپنےآپ کو ایڈز کے ٹیکے لگا رہے ہوں اور ہم حدود پاکستان کے اندر بیٹھے اس فتوی کا انتظار کر رہے ہوں کہ کیا چاند پر جا کر رہنا جائز ہے اور کیا اس سفر میں خواتین بھی ساتھ جا سکتی ہیں یا یہ کہ کیا ایڈز کے ٹیکے لگوانا جائز ہے جبکہ اس مرض کے پھیلنے میں کچھ غیر اسلامی عوامل بھی موجود ہوتے ہیں۔ فیصلہ اس بات کا کرنا ہے کہ اس تبدیلی کو آپ بردباری سے اپنی مرضی شامل کرتے ہوئے آنے دیں گے یا یہ کسی زلزلے کی طرح ہر اقدار اور روایت کو ختم کر کے آئیگی۔ اگر یہ دوسرے راستے سے آئ تو ظاہر ہے کہ اس میں معاشرے کو بہت شدید المیوں سے دوچار ہونا پڑیگا۔ اور اگر آپ اس میں اپنی مرضی اور مشوروں کو شامل رکھیں گے تو یہ ہر ایک کو اپنے اندر سمو لے گی۔

حوالہ؛

افتخار اجمل صاحب کا بلاگ

میری پوسٹ جس کے لئے انہوں نے اپنے قلم کو زحمت دی یہ ہے۔

گھر کی جڑیں

12:35 PM

روحانی کوشنٹ

روحانی کوشنٹ انسان کی اس سمجھ کے ساتھ منسوب ہے جو زندگی میں کسی مقصد کو دیکھتی اور اسکے لئے جدو جہد کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔یہ صرف ہمیں کائنات کی حیران کن دنیا کو سمجھنے میں مدد نہیں دیتی بلکہ اس میں اپنا ایسا مقام متعین کرنے پر بھی مجبور کرتی ہے جو اس میں بہتری لا سکے۔

انیس سو چوراسی میں ھاورڈ گارڈنر نے ہمہ جہتی ذہانت کا نظریہ پیش کیا۔ اس نے اپنی کتاب 'فریمز آف مائنڈ-ہمہ جہتی ذہانت کا نظریہ'  میں آئ کیو کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے لکھا کہ زندگی کو سمجھنے کی  ذہانت کسی ایک قسم کی نہیں ہوتی بلکہ اسے سات مختلف اقسام میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اسکا انحصار اسکے ذریعہ ء حصول پر ہے۔ گارڈنر کے مطابق یہ زہانتیں درج ذیل ہیں۔

حساب کتاب اور دلائل سے حاصل ہونے والی ذہانت

؛ یہ مختلف حقائق کو اس طرح ترتیب دینے کا نام ہے جسے دلیل کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔ جیسے سیب کا گرنا سب دیکھتے ہیں مگر اسکے لئے دلیل تلاش کرنا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اسے آپ کیسے حاصل کر سکتے ہیں ، ظاہر ہے اپنے اطراف میں ہونے والے مختلف مظاہر کی حقیقت پر غور کرکے، ایسے پزلز پر کام کر کے جن میں دلیل اور توجیہہ ہو۔

زبان پر مہارت

؛ زبان پہ مہارت اور مختلف الفاظ کو استعمال کرنا اور انہیں نئے معنی دینا، اسکے لئے آپکو پڑھنے اور لکھنے دونوں کی عادات اختیار کرنی پڑیں گی۔ کوئ موضوع منتخب کر کے اس پر بولیں اور اسے ریکارڈ کرکے سنیں۔ آپ گفتگو میں کتنے الفاظ  بولتے ہیں ایک ہی خیال کو کتنے مختلف الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں۔ آپکی لغت کتنی وسیع ہے۔ شعر یاد کریں اور انہیں استعمال کریں۔

موسیقی کو سمجھنا

؛ موسیقی مختلف آوازوں کا ایک ترتیباور آہنگ میں ہونا ہے۔ کارخانہ ءقدرت مین مختلف آوازوں کو پہچانیں اور انکی  ترتیب اور آہنگ کا مشاہدہ کریں۔

جسمانی نظم و ضبط سے آگاہ ہونا

؛ اس سے ہمیں اپنے جسم کی نہ صرف آگہی ملتی ہے بلکہ انکو مختلف ضوابط میں استعمال کرنے کی تحریک بھی۔ رقص، کھیل مختلف ہنر جیسے سلائ، کڑھائ، حتی کہ لکڑیاں کاٹنا بھی۔

شخصی تعلقات

؛

اس سے آپکی دوسرے لوگوں کو سمجھنے، اپنے آپکو ظاہر کرنے کی صلاحیت پتہ چلتی ہے۔ نئے لوگوں سے ملنے سے اور انکے بارے میں جاننے یا دوستی کرنے میں نہ گھبرائیں۔ بلکہ سوچ لیں کہ ہر ہفتے یا ہر مہینے کتنے نئے لوگوں سے ملنا چاہئیے۔

ان سے رابطے میں رہیں۔ اپنے دوستوں کی باتوں میں دلچسپی لیں۔

تصور کرنے کی ذہانت

؛ یہ آپکے دماغ کی چیزوں کو اپنے تصور میں لانے کی صلاحیت ہے۔ کسی مقام سے اٹھکر آنے کے بعد اسکی تفصیلات کو پھر سے یاد کریں۔ کون سی چیزیں کہاں  موجود تھیں، انکی ساخت، ترتیب اور رنگ  کو دہرائیں اور معلوم کریں کہ آپ کتنی اچھی طرح اسے کر پاتے

ہین۔ اب ذہن میں ان چیزوں کی ترتیب بدلیں اور تصور کریں کہ نئ ترتیب میں چیزیں کس طرح نظر آئیں گی۔ رنگوں کے بارے میں سوچیں کن رنگوں کو ملائیں تو کون سے رنگ وجود میں آ سکتے ہیں۔ اسی تیکنیک کو ادیب، شاعر، ڈیزائنر اور مختلف تخلیق کار استعمال کرتے ہیں۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر کسی انسان میں مندرجہ ذیل خصوصیات ہیں تو وہ یقیناً ایک بہت اچھا روحانی کوشنٹ رکھتا ہے۔

طبیعت میں لچک

خود آگہی

برے حالات سے مقابلہ کرنے اور انہیں اپنے حق میں کرنے کی اہلیت

ایک ویژن کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی اہلیت

اپنے اطراف میں پھیلی مختلف اشیاء اور حقائق کے درمیاں تعلق جاننے کی اہلیت

اپنے اطراف کے ماحول اور لوگوں کو کم سے کم نقصان پہنچانے کی خواہش کا موجود ہونا

بنیادی حقائق کو کھوجنے اور انکے بارے میں سوال کرنے کی صلاحیت

روایات کے بر خلاف جا کر کام کرنے کی اہلیت

یہاں پر کچھ چیزیں جو میں اپنے قارئین سے توقع کرتی ہوں کہ وہ اپنے جونئیر ساتھیوں کی رہنمائ کے لئے ضرور اپنے تبصروں میں بیان کریں۔ وہ ویژن، تخلیقی صلاحیت کی نمو، روایات سے ہٹنا اور انہیں چیلینج کرنا اور سوال کرنے اور تقلید کرنے میں فرق کو اپنے لئے مثبت طور پر استعمال کرنا۔

   اسکے بعد میں سیلف برانڈنگ پر بات کرنا چاہونگی۔

ریفرنس؛

ھاورڈ گارڈنر

ایموشنل کوشنٹ اور ایک سوالنامہ

10:04 PM

Howard Gardner, Spiritual Quotient, روحانی کوشنٹ, سیلف برانڈنگ, ھاورڈ گارڈنر

پھول نگر کے کانٹے

ویسے تو ہمارے یہاں انسان کو انسان تسلیم کیا جائے یہی کچھ کم نہیں کہ اس پر انسانی حقوق کا واویلہ بھی مچا دیا جاتا ہے خود ایسے انسان نما انسان بھی حیران ہوتے ہیں کہ وہ بھی انسان ہیں اور انکے بھی حقوق ہیں۔ باقی ہر رویہ روا رکھنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ اس حقوق کی جنگ نے شاید ہر چیز میں بگاڑ ڈالا ہوا ہے۔

دنیا کے زیادہ ترغریب اور سماجی ناانصافی کے شکار معاشروں کی طرح ہمارے یہاں بھی خواتین کے ساتھ بد ترین مظالم کئے جاتے ہیں اور اس میں ایک شرمناک حرکت جو ہر تھڑے عرصے بعد تواتر سے کی جاتی ہے انہیں برہنہ سر بازار پھرانا، ایک ایسے معاشرے میں جہاں خواتین کے با عصمت ہونے کی نشانی انکے جسم کا کپڑوں سے زیادہ سے زیادہ ڈھکا ہونا سمجھا جاتا ہے وہاں سزاکے طور پر اسی عورت کو نہ صرف تن پر موجود کسی بھی کپڑے سے محروم کر دیا جاتا ہے بلکہ انہیں لوگوں کے سامنے  سر بازار تماشہ بنایا جاتا ہے۔

ریاستی قوانین ایسی تمام عورتوں کی حفاظت کرنے میں ناکام رہتے ہیں ، وہ عدلیہ جسے آزاد کرانے کے دعویداروں کے گلے خشک اور آنکھیں بند ہو چکی ہیں اب وہ عام شخص کیو انصاف دلانے سے معذور ہے۔ ان سب عناصر کو ابھی ملک میں جمہوریت کی جڑیں مضبوط کرنے سے فرصت نہیں۔

مذہبی جماعتیں جن کے حامی دن رات خواتین کے حجاب کے متعلق بول بول کر اور لکھ لکھ کر تھکتے نہیں۔ وہ اس بات پہ کڑھتے رہتے ہیں کہ یہاں کچھ خواتین کیوں انکے بنائے ہوئے ضابطوں

کے مطابق زندگی نہیں گذارتیں۔ وہ بھی اسے کسی قسم کی زیادتی سمجھنے سے قاصر رہیں گے کیونکہ یہ واقعہ ان عورتوں کے ساتھ پیش آیا جنہیں جسم فروشی کے کاروبار سے منسلک سمجھا جاتا ہے۔

اگر چہ کہ جسم فروشی کا عمل کبھی بھی یکطرفہ نہیں ہوتا لیکن مرد تو ہم جانتے ہیں کہ ترغیب دینے میں آجاتے ہیں اس لئیے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ قصور کس کا ہوتا ہے اور ایسی ذلیل کر دینے والی سزائیں کس کے حصے میں آنی چاہئیں۔

ہمارے باقی کے نظام کے پاس مسائل کا انبار ہے انہیں اسے مزید بڑھانے سے فرصت نہیں اور عوام اپنی آفات میں مبتلا ہیں۔ اب ان عورتوں کی دادرسی کون کریگا۔ ان جسم فروش عورتوں کے کیا کوئ انصاف کےحقوق نہیں ہوتے۔یہ بے حیائ کے واقعات آخر کب تک اسی طرح بار بار ہوتے رہیں گے۔ اسکا جواب سادہ ہے اور وہ یہ کہ جب تک اسکے مجرموں کو قابل عبرت سزا نہیں ملتی اس طرح کے واقعات ہوتے رہیں گے۔ یا پھر اس معاشرے کو ان عورتوں کے اندر انتقام اور بدلے کی آگ بھڑکنے کا انتظار کرنا چاہئیے۔

میرے اور ساتھی بلاگر بھی اس پر لکھ چکے ہیں میں انکے رابطے یہاں دے رہی ہوں۔ قلم کی زکوات اسی طرح ادا کی جا سکتی ہے کہ ان لوگوں کے لئے بھی لکھا جائے جنکا کوئ پرسان حال نہیں۔ ہم انکی زندگی آسان نہیں کر سکتے لیکن یہ ممکن ہے کہ ہم دوبارہ ان واقعات کے رونما ہونے میں رکاوٹ بن جائیں۔

سعدیہ سحر

خرم بشیر بھٹی

سید مصباح حسین جیلانی

10:33 AM

Human rights, Phool Nagar, پھول نگر، لاہور۔ بنیادی انسانی حقوق، Lahore

ایمو شنل کوشنٹ اور ایک سوالنامہ

نیچے دئیے گئے بیانیہ سوالنامے میں سے ہر سوال کے جوابات مندرجہ ذیل چھ جوابوں میں سے کوئ ایک دے سکتے ہیں۔ ہرجواب کے متعین نمبر اسکے آگے لکھے ہوئے ہیں۔

شاید ہی کبھی----0

بہت ہی کم----1

 بعض اوقات----2

کبھی کبھار----3

 اکثر وبیشتر----4

ہمیشہ----5

گروپ؛ الف

1

میں مہربان، محبت کرنے والا اور ہر ایک کو معاف کرنے والا ہوں، خاص طور پر ان لوگوں کو جو میرے ساتھ زیادتی کرتے ہیں۔

2

میں اپنی زندگی کے تمام پہلوءووں سے خوش ہوں اور میں جیسا ہوں اور جو ہوں اور جو بننے جا رہا ہوں اسے پسند کرتا ہوں۔

3

میں اپنی زندگی کے ہر پہلو میں بڑا تخلیقی اپچ رکھتا ہوں۔ میں ہر صورتحال میں اچھائ کا پہلو مد نظر رکھتا ہوں اور ہمیشہ مثبت طرز فکر رکھنا چاہتا ہوں۔

4

میں کم از کم بیس منٹ روزانہ اپنے ساتھ گذارتا ہوں اور خاموش رہ کر سوچتا ہوں جو میں نے اب تک کیا۔ میں زندگی میں بھلائ کے لئے دعا کرتا ہوں۔

5

میں نظم وضبط سے رہتا ہوں، ڈائری لکھتا ہوں، اور اپنے مسائل نہ صرفایک جگہ لکھتا ہوں بلکہ گاہے بگاہے ان پر ایک نظر بھی ڈالتا رہتا ہوں۔

6

میں اپنی زندگی میںان قدروں کو ترجیح دیتا ہوں جو عدل، انصاف، انسانی آزادی اور حق کے ساتھ جڑی ہوئ ہیں۔ میں ان پر عمل بھی کرتا ہوں۔

7

میں ترتیب کو پسند کرتا ہوں۔ میری چیزیں صاف اور مناسب ترتیب میں ہوتی ہیں اس لءیے میں افراتفری کا شکار نہیں ہوتا۔

گروپ؛ ب

8

 مجھے نصیحت کرنا پسند ہے اور جب دوسرے پریشانی میں ہوں تو میں انکا حوصلہ بڑھاتا ہوں۔

9

مجھے لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لئیےلطیفے اور کہانیاں سنانا پسند ہیں۔

10

مجھے تفریحاً بحث کرنے میں مزہ آتاہے، دوسروں کو تنگ کرنا اور متنازعہ موضوعات پر بات کرنا میں ان سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔

11

میں سگریٹ پیتا ہوں، شراب ایک ممکنہ مقدار سے زیادہ پیتا ہوں، بہت زیادہ ٹی وی دیکھتا ہوں اور بہت زیادہ فکشن کتابیں پڑھتا ہوں۔ ایسی کہانیاں جن سے تصوراتی دنیا میں ہر وقت رہیں۔

12

میں ان منفی چیزوں کے بارے میں خاصہ فکرمند رہتا ہوں جو میرے ساتھ یا کسی اور کے ساتھ پیش آسکتی ہیں۔

13

میں اس بات پہ یقین رکھتا ہوں کہ بہت سارے اصول ایسے ہیں جنہیں کسی بھی حالت میں نہیں توڑنا چاہئیے۔

14

میں اپنی زندگی میں ہمیشہ اپنے لئیے بلند ترین مقاصد کو ہدف بناتا ہوں اگر چہ ان تک پہنچنا ناممکن ہو۔

اب ان سوالوں کے دو گروپ بنا لیں۔ سوال نمبر ایک سے سات تک ایک گروپ اور سوال نمبر آٹھ سےچودہ تک دوسرا گروپ۔ تمام سوالوں کے آگے جو جواب آپکو سمجھ میں آتا ہے اسے ٹک مارک کریں اور اسکا حاصل کردہ نمبر اسکے آگے لکھ دیں جو آپ کو سوالنامے کے شروع میں دیا گیا ہے۔ پہلے گروپ کے حاصل کردہ نمبروں کو جمع کر کے اسکے مجموعے کو الف نام دے دیں۔

1+2+3+4+5+6+7=مجموعہ الف

اور دوسرے گروپ کے تمام نمبروں کو جمع کر کے اسکے مجموعے کو ب کا نام دے دیں۔

8+9+10+11+12+13+14= مجموعہ ب

اب اپنا ای کیو یا ایموشنل کوشنٹ معلوم کرنے کے لئے مجموعہ الف کو مجموعہ ب سے تقسیم کر دیں اور حاصل جمع کو سو سے ضرب دے دیں۔ لیجئیے آپکا ایک اندازاً حاصل شدہ ای کیو موجود ہے۔

لیکن یہ ساری مشق آپکا ای کیو معلوم کرنے کے لئیے نہیں کی گئ تھی۔ بلکہ اسکا مقصد آپکو یہ اندازہ دینا تھا کہ سیٹ الف میں موجود سوالات پر غور کریں اس سیٹ میں آپکے نمبر جتنے زیادہ ہونگے اتنا آپکا ای کیو زیادہ ہونے کا امکان ہو گا۔ اور سیٹ ب میں آپکےنمبر جتنے زیادہ ہونگے اتنا ہی آپکا ای کیو کم ہوتا جائے گا۔ ایک اوسط ای کیو پچاسی سے ایک سو پندرہ تک ہوتا ہے۔ اکثر کامیاب لوگوں کا ای کیو دو سو کی حد میں آتا ہے۔ ان سوالات پہ غور کیجئیے ایک اچھے ای کیو کے لئیے آپکو کیا کرنا ہوگا۔ اگر آپ اپنے روئیے میں تبدیلی لے آئیں تو ای کیو بھی تبدیل ہو جائے گا۔

اردو گرامر کی رو سے مذکر کا صیغہ مذکر مونث دونوں کے لئیے استعمال کیا گیا ہے۔ خواتین بھی اسے اسی طرح استعمال کرسکتی ہیں۔

اب ہمارا اگلا موضوع اس سیریز میں ایس کیو، اسپریچوئل یا روحانی کوشنٹ ہے جس کے بعد کم ازکم کوشنٹس کی میں چھٹی کر دونگی۔

نوٹ؛

اس سوالنامے کی تیاری میں مندرجہ ذیل لنک سے مدد لی گئ ہے۔ بلکہ یہ اسی کا ایک ترجمہ ہے جسے آسان بنانے کے لئیے متن میں بہت معمولی سی تبدیلیاں کی گئ ہے۔ آپ اسے اصل حالت میں یہاں دیکھ سکتے ہیں۔

www.comedyfixtrafficschool.com/eq.html

جذبات کی جنگ اور ایموشنل کوشنٹ

12:17 AM

Spritual Quotient، Inteliigence Quotient, آئ کیو، ای کیو، ایموشنل کوشنٹ، ایس کیو،EQ

جذبات کی جنگ اور ایموشنل کوشنٹ

دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا

وہ تیری یاد تھی اب یاد آیا

شاعر کے اس شعر کو کہنے کی وجہ کچھ بھی ہو ایک بات تو طے ہے کہ اس شعر میں ایک بڑا نکتہ ہے جس پر آجکل کی انسانی رویوں پر تحقیق کرنے والے سائنس دانوں کی گہری نظر ہے اور وہ ہے انسان اور جذبات کا تعلق۔ اسی تعلق کی جڑیں نکالتے نکالتے ایموشنل کوشنٹ کی اصطلاح سامنے آتی ہے۔جہاں آئ کیو دماغی کارکردگی کو تولتا ہے اور کہتا ہے کہ اسکی مقدار کو بڑھایا نہیں جا سکتا ۔ وہاں ایموشنل کوشنٹ وہ خاصیت ہے جو کہ مناسب تربیت سے بہتر جا سکتی ہے۔

ایموشنل کوشنٹ انسانوں کی وہ صلاحیت ہوتی ہے جس سے وہ اپنے جذبات کو محسوس کرتے، سمجھتے اور پر اثر طریقے سے اسے انسانی توانائ، معلومات، تعلقات کو استوار کرنے اور اپنے اثر ونفوذ کو بڑھانے کے لئیے استعمال کرتے ہیں۔

اسکا پہلا مرحلہ اپنے آپکو جاننا ہوتا ہے۔شاعر اپنے آپکو اس حد تک سمجھتا ہے کہ اپنے دل کے دھڑکنے پر وہ غور کرتا ہے کہ میرے دل کے غیر معمولی انداز میں دھڑکنے کی وجہ کیا ہے۔ ایک کامیابی کی تمنا رکھنے والے شخص کو سب سے پہلے اپنے آپکو سمجھنا پڑیگا۔ ہم کیا چاہتے ہیں؟ یہ بہت اہم سوال ہے۔لوگ اپنے مسائل کا انبار لئے پھرتے ہیں کہ کوئ انکا مسئلہ حل کردے۔ لیکن وہ اس بات سے آگاہ نہیں ہوتے کہ وہ خود کیا چاہتے ہیں۔ اپنے آپ سے ملاقات کریں اور اپنے آپ سے سوال کریں اور پھر اپنے اندر  سے اس جواب کو ایمانداری سےسنیں جو آپکا اندر آپکو سنا رہا ہے۔ آپکی بیشتر کمزوریاں اس طریقے سے آپکے سامنے آجائیں گی اور پھر آپ انہیں حل کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ زندگی میں پیش آنیوالی الجھنیں اکثر اسی طرح اپنے آپ سے ملاقات کر کے حل کی جا سکتی ہیں۔ شرط یہ ہے کہ اپنے سامنے حاضری پوری ایمانداری کے ساتھ دیں۔ اور بہانے نہ بنائیں۔

جس لمحے ہم حالات کی ایک مکمل تصویر اپنے سامنے لاتے ہیں عین اس لمحے اسکی ساری خامیاں بھی ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔

اس سکے کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اپنے احساسات کو بیدار رکھتے ہوئے جب ہم مختلف تجربات سے گذرتے ہیں تو ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہم اس تجربے سے کیا کیا چیزیں حاصل کر سکتے ہیں اور اس سے ہماری زندگی میں کیا تبدیلیاں آسکی ہیں

اسکی اہمیت یوں بھی ہے کہ انسانی دماغ ک کام کرنے کی بنیاد چیزوں کو آپس میں کمپیئر کر کے فرق نکالنے سے منسلک ہے۔ آپ میں سے کئ ایک نے وہ پزلز کئے ہونگے جس میں دو تصویروں کے درمیان فرق تلاش کرنے کو کہا جاتا ہے۔ اپنی عملی زندگی میں بھی انسانی دماغ اسی طرح سے آنیوالی صورتحال کو پچھلی والی سے مقابلہ کر کے نئ معلومات کو اسکے حساب سے جمع کرتا جاتا ہے۔

جب ہم اپنے آپکو پڑھنے کے ماہر ہوجاتے ہیں تو دوسروں میں بھی دلچسپی لینے لگتے ہیں اور انکے بارے میں اندازہ لگانے لگتے ہیں کہ اب اس طرح کی صور تحال میں دوسرا شخص کیا کیا کرسکتاہے۔ اگر آپ انسانی جذبات اور انکے ردعمل کو بہتر سمجھتے ہیں تو آپ بہت اچھی طرح آنیوالے حالات کو اور متعلقہ اشخاص کو اپنی آسانیوں کے لئیے استعمال کر سکتے ہیں۔

اسکی مثال ایسی ہے کہ اگر آپ کو یہ اندازہ ہو کہ انرویو ک پینل میں ایک شخص کو اس مضمون میں بڑی دلچسپی ہے تو آپ انٹرویو کے وقت اسکی متعلقہ فیلڈ کی بہتر تیاری کر کے اسے حیران کر سکتے ہیں۔ اور انٹرویو کے وقت انٹرویو پینل میں موجود اشخاص کے رد عمل سے اندازہ کر پائیں گے کہ یہ گفگتگو اب کس نہج پہ جا سکتی ہے۔

جذبات، خیالات اور سیکھنے کا عمل ایکدوسر سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہی چیزیں ہمیں چیزوں کی وجوہات کی طرف لےجاتی ہیں۔ اور وجوہات جان لینے کے بعد اس سمت میں کام کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

 دنیا صرف ذہین لوگوں کی نہیں ہے۔ بلکہ دیکھا جائے تو بے انتہا ذہین لوگ اپنے ماحول کے ساتھ نہیں چل پاتے اور بیشتر ذہین لوگ زمانے کی نیرنگی کا شکار ہونے  اور موجود نظام سے مطابقت نہ رکھنے کی وجہ سے کچھ غیر معمولی کرنے سے پہلے ہی ختم ہوجاتے ہیں۔

اسی بات کو ڈارون قوت بقاء کا نام دیتا ہے۔  اسکے مطابق جانداروں کی وہ قسمیں زندگی کی جنگ میں جیت جاتی ہیں اور انہوں نے اب تک اپنے آپ کو باقی رکھا ہوا ہے جو اپنے آپ کو ایک نظام میں اس طرح رہنے کے قابل بنا لیں جس میں انکے اندر اتنی لچک ہو کہ وہ بوقت ضرورت بدلتے ہوئے نظام کے مطابق اپنے آپکو ایڈجسٹ کر لیں اور نظام کے سخت ترین حالات کو بھی برداشت کر لیں۔ جو جاندار اس قسم کے حالات کا مقابلہ نہیں کر پاتے وہ معدوم ہو جاتے ہیں۔

بالکل اس طرح جو لوگ انسانی نظام کے چیلینجز کو نہیں سمجھتے۔ وہ اس نظام کا حصہ نہیں بن پائیں گے۔ یہ ایک تلخ ترین حقیقت ہے لیکن اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اب کوئ شخص کتنی خوبی سے اپنی مرضی اور بنیادی اخلاقیات کو نبھاتے ہوئے ان چلینجز کا سامنا کرتا ہے اسکا ایموشنل کوشنٹ اتنا ہی زیادہ ہوگا۔

یقیناً ہم میں سے ہر ایک کی کوشش یہی ہونی چاہئیے کہ سیکھنے کے عمل اور ترقی اور کامیابی کے زینے کو چڑھتے ہوئے دوسروں کو دھکا نہ دیں اور نہ انہیں دوسروں کے قدموں تلے روندنے کے لئیے چھوڑ دیں کہ باقی جانداروں اور انسان میں اسی وصف کی وجہ سے فرق ہے۔ اور وہ ہے درد دل۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

ورنہ طاعت کے لئیے کچھ کم نہ تھے کر وبیاں

تو جناب اپنے جذبات کو مناسب شکل دیں اور دوسروں کے جذبات کو اپنے مواقع بہتر بنانے کے لئیے استعمال کریں اور ہاں زندگی میں کسی بھی مرحلے پر اپنی حس مزاح کو ختم نہ ہونے دیں۔

اپنی اگلی پوسٹ میں، میں ایموشنل کوشنٹ کے ایک سوالنامے کو ضرور زیر بحث لانا چاہونگی کہ یہ نکات مزید واضح ہو جائیں۔

ریفرنس

؛

ایمو شنل کوشنٹ

آئ کیو، کم یا زیادہ

ایمو شنل کوشنٹ اور ایک سوالنامہ

11:22 AM

IQ., ایموشنل کوشنٹ، آئ کیو، Emoianal Quoien

جذبات کی جنگ اور ایموشنل کوشنٹ

دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا

وہ تیری یاد تھی اب یاد آیا

شاعر کے اس شعر کو کہنے کی وجہ کچھ بھی ہو ایک بات تو طے ہے کہ اس شعر میں ایک بڑا نکتہ ہے جس پر آجکل کی انسانی رویوں پر تحقیق کرنے والے سائنس دانوں کی گہری نظر ہے اور وہ ہے انسان اور جذبات کا تعلق۔ اسی تعلق کی جڑیں نکالتے نکالتے ایموشنل کوشنٹ کی اصطلاح سامنے آتی ہے۔جہاں آئ کیو دماغی کارکردگی کو تولتا ہے اور کہتا ہے کہ اسکی مقدار کو بڑھایا نہیں جا سکتا ۔ وہاں ایموشنل کوشنٹ وہ خاصیت ہے جو کہ مناسب تربیت سے بہتر جا سکتی ہے۔

ایموشنل کوشنٹ انسانوں کی وہ صلاحیت ہوتی ہے جس سے وہ اپنے جذبات کو محسوس کرتے، سمجھتے اور پر اثر طریقے سے اسے انسانی توانائ، معلومات، تعلقات کو استوار کرنے اور اپنے اثر ونفوذ کو بڑھانے کے لئیے استعمال کرتے ہیں۔

اسکا پہلا مرحلہ اپنے آپکو جاننا ہوتا ہے۔شاعر اپنے آپکو اس حد تک سمجھتا ہے کہ اپنے دل کے دھڑکنے پر وہ غور کرتا ہے کہ میرے دل کے غیر معمولی انداز میں دھڑکنے کی وجہ کیا ہے۔ ایک کامیابی کی تمنا رکھنے والے شخص کو سب سے پہلے اپنے آپکو سمجھنا پڑیگا۔ ہم کیا چاہتے ہیں؟ یہ بہت اہم سوال ہے۔لوگ اپنے مسائل کا انبار لئے پھرتے ہیں کہ کوئ انکا مسئلہ حل کردے۔ لیکن وہ اس بات سے آگاہ نہیں ہوتے کہ وہ خود کیا چاہتے ہیں۔ اپنے آپ سے ملاقات کریں اور اپنے آپ سے سوال کریں اور پھر اپنے اندر  سے اس جواب کو ایمانداری سےسنیں جو آپکا اندر آپکو سنا رہا ہے۔ آپکی بیشتر کمزوریاں اس طریقے سے آپکے سامنے آجائیں گی اور پھر آپ انہیں حل کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ زندگی میں پیش آنیوالی الجھنیں اکثر اسی طرح اپنے آپ سے ملاقات کر کے حل کی جا سکتی ہیں۔ شرط یہ ہے کہ اپنے سامنے حاضری پوری ایمانداری کے ساتھ دیں۔ اور بہانے نہ بنائیں۔

جس لمحے ہم حالات کی ایک مکمل تصویر اپنے سامنے لاتے ہیں عین اس لمحے اسکی ساری خامیاں بھی ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔

اس سکے کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اپنے احساسات کو بیدار رکھتے ہوئے جب ہم مختلف تجربات سے گذرتے ہیں تو ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہم اس تجربے سے کیا کیا چیزیں حاصل کر سکتے ہیں اور اس سے ہماری زندگی میں کیا تبدیلیاں آسکی ہیں

اسکی اہمیت یوں بھی ہے کہ انسانی دماغ ک کام کرنے کی بنیاد چیزوں کو آپس میں کمپیئر کر کے فرق نکالنے سے منسلک ہے۔ آپ میں سے کئ ایک نے وہ پزلز کئے ہونگے جس میں دو تصویروں کے درمیان فرق تلاش کرنے کو کہا جاتا ہے۔ اپنی عملی زندگی میں بھی انسانی دماغ اسی طرح سے آنیوالی صورتحال کو پچھلی والی سے مقابلہ کر کے نئ معلومات کو اسکے حساب سے جمع کرتا جاتا ہے۔

جب ہم اپنے آپکو پڑھنے کے ماہر ہوجاتے ہیں تو دوسروں میں بھی دلچسپی لینے لگتے ہیں اور انکے بارے میں اندازہ لگانے لگتے ہیں کہ اب اس طرح کی صور تحال میں دوسرا شخص کیا کیا کرسکتاہے۔ اگر آپ انسانی جذبات اور انکے ردعمل کو بہتر سمجھتے ہیں تو آپ بہت اچھی طرح آنیوالے حالات کو اور متعلقہ اشخاص کو اپنی آسانیوں کے لئیے استعمال کر سکتے ہیں۔

اسکی مثال ایسی ہے کہ اگر آپ کو یہ اندازہ ہو کہ انرویو ک پینل میں ایک شخص کو اس مضمون میں بڑی دلچسپی ہے تو آپ انٹرویو کے وقت اسکی متعلقہ فیلڈ کی بہتر تیاری کر کے اسے حیران کر سکتے ہیں۔ اور انٹرویو کے وقت انٹرویو پینل میں موجود اشخاص کے رد عمل سے اندازہ کر پائیں گے کہ یہ گفگتگو اب کس نہج پہ جا سکتی ہے۔

جذبات، خیالات اور سیکھنے کا عمل ایکدوسر سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہی چیزیں ہمیں چیزوں کی وجوہات کی طرف لےجاتی ہیں۔ اور وجوہات جان لینے کے بعد اس سمت میں کام کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

 دنیا صرف ذہین لوگوں کی نہیں ہے۔ بلکہ دیکھا جائے تو بے انتہا ذہین لوگ اپنے ماحول کے ساتھ نہیں چل پاتے اور بیشتر ذہین لوگ زمانے کی نیرنگی کا شکار ہونے  اور موجود نظام سے مطابقت نہ رکھنے کی وجہ سے کچھ غیر معمولی کرنے سے پہلے ہی ختم ہوجاتے ہیں۔

اسی بات کو ڈارون قوت بقاء کا نام دیتا ہے۔  اسکے مطابق جانداروں کی وہ قسمیں زندگی کی جنگ میں جیت جاتی ہیں اور انہوں نے اب تک اپنے آپ کو باقی رکھا ہوا ہے جو اپنے آپ کو ایک نظام میں اس طرح رہنے کے قابل بنا لیں جس میں انکے اندر اتنی لچک ہو کہ وہ بوقت ضرورت بدلتے ہوئے نظام کے مطابق اپنے آپکو ایڈجسٹ کر لیں اور نظام کے سخت ترین حالات کو بھی برداشت کر لیں۔ جو جاندار اس قسم کے حالات کا مقابلہ نہیں کر پاتے وہ معدوم ہو جاتے ہیں۔

بالکل اس طرح جو لوگ انسانی نظام کے چیلینجز کو نہیں سمجھتے۔ وہ اس نظام کا حصہ نہیں بن پائیں گے۔ یہ ایک تلخ ترین حقیقت ہے لیکن اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اب کوئ شخص کتنی خوبی سے اپنی مرضی اور بنیادی اخلاقیات کو نبھاتے ہوئے ان چلینجز کا سامنا کرتا ہے اسکا ایموشنل کوشنٹ اتنا ہی زیادہ ہوگا۔

یقیناً ہم میں سے ہر ایک کی کوشش یہی ہونی چاہئیے کہ سیکھنے کے عمل اور ترقی اور کامیابی کے زینے کو چڑھتے ہوئے دوسروں کو دھکا نہ دیں اور نہ انہیں دوسروں کے قدموں تلے روندنے کے لئیے چھوڑ دیں کہ باقی جانداروں اور انسان میں اسی وصف کی وجہ سے فرق ہے۔ اور وہ ہے درد دل۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

ورنہ طاعت کے لئیے کچھ کم نہ تھے کر وبیاں

تو جناب اپنے جذبات کو مناسب شکل دیں اور دوسروں کے جذبات کو اپنے مواقع بہتر بنانے کے لئیے استعمال کریں اور ہاں زندگی میں کسی بھی مرحلے پر اپنی حس مزاح کو ختم نہ ہونے دیں۔

اپنی اگلی پوسٹ میں، میں ایموشنل کوشنٹ کے ایک سوالنامے کو ضرور زیر بحث لانا چاہونگی کہ یہ نکات مزید واضح ہو جائیں۔

ریفرنس

؛

ایمو شنل کوشنٹ

آئ کیو، کم یا زیادہ

ایمو شنل کوشنٹ اور ایک سوالنامہ

11:22 AM

IQ., ایموشنل کوشنٹ، آئ کیو، Emoianal Quoien

ایمو شنل کوشنٹ اور ایک سوالنامہ

نیچے دئیے گئے بیانیہ سوالنامے میں سے ہر سوال کے جوابات مندرجہ ذیل چھ جوابوں میں سے کوئ ایک دے سکتے ہیں۔ ہرجواب کے متعین نمبر اسکے آگے لکھے ہوئے ہیں۔

شاید ہی کبھی----0

بہت ہی کم----1

 بعض اوقات----2

کبھی کبھار----3

 اکثر وبیشتر----4

ہمیشہ----5

گروپ؛ الف

1

میں مہربان، محبت کرنے والا اور ہر ایک کو معاف کرنے والا ہوں، خاص طور پر ان لوگوں کو جو میرے ساتھ زیادتی کرتے ہیں۔

2

میں اپنی زندگی کے تمام پہلوءووں سے خوش ہوں اور میں جیسا ہوں اور جو ہوں اور جو بننے جا رہا ہوں اسے پسند کرتا ہوں۔

3

میں اپنی زندگی کے ہر پہلو میں بڑا تخلیقی اپچ رکھتا ہوں۔ میں ہر صورتحال میں اچھائ کا پہلو مد نظر رکھتا ہوں اور ہمیشہ مثبت طرز فکر رکھنا چاہتا ہوں۔

4

میں کم از کم بیس منٹ روزانہ اپنے ساتھ گذارتا ہوں اور خاموش رہ کر سوچتا ہوں جو میں نے اب تک کیا۔ میں زندگی میں بھلائ کے لئے دعا کرتا ہوں۔

5

میں نظم وضبط سے رہتا ہوں، ڈائری لکھتا ہوں، اور اپنے مسائل نہ صرفایک جگہ لکھتا ہوں بلکہ گاہے بگاہے ان پر ایک نظر بھی ڈالتا رہتا ہوں۔

6

میں اپنی زندگی میںان قدروں کو ترجیح دیتا ہوں جو عدل، انصاف، انسانی آزادی اور حق کے ساتھ جڑی ہوئ ہیں۔ میں ان پر عمل بھی کرتا ہوں۔

7

میں ترتیب کو پسند کرتا ہوں۔ میری چیزیں صاف اور مناسب ترتیب میں ہوتی ہیں اس لءیے میں افراتفری کا شکار نہیں ہوتا۔

گروپ؛ ب

8

 مجھے نصیحت کرنا پسند ہے اور جب دوسرے پریشانی میں ہوں تو میں انکا حوصلہ بڑھاتا ہوں۔

9

مجھے لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لئیےلطیفے اور کہانیاں سنانا پسند ہیں۔

10

مجھے تفریحاً بحث کرنے میں مزہ آتاہے، دوسروں کو تنگ کرنا اور متنازعہ موضوعات پر بات کرنا میں ان سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔

11

میں سگریٹ پیتا ہوں، شراب ایک ممکنہ مقدار سے زیادہ پیتا ہوں، بہت زیادہ ٹی وی دیکھتا ہوں اور بہت زیادہ فکشن کتابیں پڑھتا ہوں۔ ایسی کہانیاں جن سے تصوراتی دنیا میں ہر وقت رہیں۔

12

میں ان منفی چیزوں کے بارے میں خاصہ فکرمند رہتا ہوں جو میرے ساتھ یا کسی اور کے ساتھ پیش آسکتی ہیں۔

13

میں اس بات پہ یقین رکھتا ہوں کہ بہت سارے اصول ایسے ہیں جنہیں کسی بھی حالت میں نہیں توڑنا چاہئیے۔

14

میں اپنی زندگی میں ہمیشہ اپنے لئیے بلند ترین مقاصد کو ہدف بناتا ہوں اگر چہ ان تک پہنچنا ناممکن ہو۔

اب ان سوالوں کے دو گروپ بنا لیں۔ سوال نمبر ایک سے سات تک ایک گروپ اور سوال نمبر آٹھ سےچودہ تک دوسرا گروپ۔ تمام سوالوں کے آگے جو جواب آپکو سمجھ میں آتا ہے اسے ٹک مارک کریں اور اسکا حاصل کردہ نمبر اسکے آگے لکھ دیں جو آپ کو سوالنامے کے شروع میں دیا گیا ہے۔ پہلے گروپ کے حاصل کردہ نمبروں کو جمع کر کے اسکے مجموعے کو الف نام دے دیں۔

1+2+3+4+5+6+7=مجموعہ الف

اور دوسرے گروپ کے تمام نمبروں کو جمع کر کے اسکے مجموعے کو ب کا نام دے دیں۔

8+9+10+11+12+13+14= مجموعہ ب

اب اپنا ای کیو یا ایموشنل کوشنٹ معلوم کرنے کے لئے مجموعہ الف کو مجموعہ ب سے تقسیم کر دیں اور حاصل جمع کو سو سے ضرب دے دیں۔ لیجئیے آپکا ایک اندازاً حاصل شدہ ای کیو موجود ہے۔

لیکن یہ ساری مشق آپکا ای کیو معلوم کرنے کے لئیے نہیں کی گئ تھی۔ بلکہ اسکا مقصد آپکو یہ اندازہ دینا تھا کہ سیٹ الف میں موجود سوالات پر غور کریں اس سیٹ میں آپکے نمبر جتنے زیادہ ہونگے اتنا آپکا ای کیو زیادہ ہونے کا امکان ہو گا۔ اور سیٹ ب میں آپکےنمبر جتنے زیادہ ہونگے اتنا ہی آپکا ای کیو کم ہوتا جائے گا۔ ایک اوسط ای کیو پچاسی سے ایک سو پندرہ تک ہوتا ہے۔ اکثر کامیاب لوگوں کا ای کیو دو سو کی حد میں آتا ہے۔ ان سوالات پہ غور کیجئیے ایک اچھے ای کیو کے لئیے آپکو کیا کرنا ہوگا۔ اگر آپ اپنے روئیے میں تبدیلی لے آئیں تو ای کیو بھی تبدیل ہو جائے گا۔

اردو گرامر کی رو سے مذکر کا صیغہ مذکر مونث دونوں کے لئیے استعمال کیا گیا ہے۔ خواتین بھی اسے اسی طرح استعمال کرسکتی ہیں۔

اب ہمارا اگلا موضوع اس سیریز میں ایس کیو، اسپریچوئل یا روحانی کوشنٹ ہے جس کے بعد کم ازکم کوشنٹس کی میں چھٹی کر دونگی۔

نوٹ؛

اس سوالنامے کی تیاری میں مندرجہ ذیل لنک سے مدد لی گئ ہے۔ بلکہ یہ اسی کا ایک ترجمہ ہے جسے آسان بنانے کے لئیے متن میں بہت معمولی سی تبدیلیاں کی گئ ہے۔ آپ اسے اصل حالت میں یہاں دیکھ سکتے ہیں۔

www.comedyfixtrafficschool.com/eq.html

جذبات کی جنگ اور ایموشنل کوشنٹ

12:17 AM

Spritual Quotient، Inteliigence Quotient, آئ کیو، ای کیو، ایموشنل کوشنٹ، ایس کیو،EQ

آئ کیو، کم یا زیادہ

میں کافی دنوں سے ایک موضوع پر لکھنا چاہ رہی ہوں، اور موضوع ہے ملازمتی انٹرویو کی تیاری۔ لیکن اس سے پہلے میں سمجھتی ہوں کہ کچھ اور چیزوں کو موضوع گفتگو بنا نا چاہئیے تو آج اس سیریز کی پہلی پوسٹ ہے۔ اور اس میں, میں آئ کیو ، جو کہ مخفف ہے انٹیلیجنس کوشنٹ کا، اسکے بارے میں کچھ لکھنا چاہونگی۔

ڈیوڈ ویکسلر ایک امریکن نفسیات داں،  نے انیس سو انتالیس میں اس ٹیسٹ کو ترتیب دیا۔ ویکسلر نے انسانی ذہانت کو اس طرح بیان کیا کہ یہ انسانوں کی عمومی صلاحییت ہے جس  سے وہ با مقصدعمل انجام دیتے، توجیہاتی سوچ رکھتے اور اپنے ماحول کے تقاضوں کو سمجھتے ہیں۔ آئ کیو کو متائثر کرنے والے عوامل عمومی صحت، والدین کی سماجی حیثیت اورجینیاتی سطح پر ذہانت کی منتقلی ہو سکتی ہے۔ اسکا تعلق جنین کی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں اور اس وقت کے ماحول سے بھی ہو سکتا ہے لیکن سر دست اتنی تفصیلات ہمارےلئیے ضروری نہیں۔

یہ ذہنی استعداد کو جانچنے کا ایک طریقہ ءکار ہے۔ ابتدا اسے ذہنی طور پر کمزور بچوں کے لئیے استعمال کیا جاتا تھآ۔ لیکن بعد میں اسے مختلف ملازمتوں کے لئے منعقدہ ٹیسٹس میں بھی استعمال کیا جانے لگا۔

 ۔ ایک اوسط شخص کا آئ کیو عام طور پر سو کے آس پاس ہوتا ہے۔ پچھتر سے کم آئ کیو رکھنے والے کسی ذہنی کمزوری کا شکار ہو سکتے ہیں۔ ایک سو بیس سے زیادہ رکھنے والوں کو عام طور پر بہتر قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن اس میں عام طور سے  ماحول کی تبدیلی، تعلیم اور ٹیکنالوجی سے آگاہی بھی شامل ہوجاتی ہے۔

نیٹ پر فراہم کردہ  آئ کیو ٹیسٹس معیاری ٹیسٹس نہیں ہوتے ہیں تاہم آپ کھیلنے کے لئے انہیں استعمال کر سکتے ہیں۔ اور ایک اندازہ جو کہ غلط بھی ہو سکتا ہے اپنے بارے میں حاصل کر سکتے ہیں۔

آئ کیو کے بارے میں یہ یاد رہنا چاہئیے کہ یہ ایک اندازاً یا نسبتی جانچ ہے۔  اسکا انحصار پیدائش کے وقت سے آپکو حاصل ہونے والے علم ، آپکے ارد گرد کے ماحول میں تبدیلیاں اور رنگا رنگی، مختلف لوگوں اور مختلف حالات سے ٹکراءو سے بھی ہوتا ہے۔ اگرچہ کہ کہا یہ جاتا ہے کہ سولہ سال کے بعد آئ کیو ایک لیول پہ آکر رک جاتا ہے۔ لیکن میں چونکہ انسانی صلاحیتوں کے لامحدود ہونے پر یقین رکھتی ہوں اور اس چیز پر بھی یقین رکھتی ہوں کہ کائنات میں کوئ چیز ناممکن ہونے کی اصطلاح میں شامل نہیں، بس ارادہ مستحکم اور عمل پیہم ہونا چاہئیے تو ذہنی استعداد کے یہ ٹیسٹس اپنے طور پر ایسی کوئ حیثیت نہیں رکھتے۔

 دماغی فعالیت کو بڑھانے کے لئیے بہت ساری کتابیں ایسی ملتی ہیں جو دماغی ورزش کے لئیے اچھی ہوتی ہیں ان میں موجود پزلز کو بھی وقتاً فوقتاً اپنے کھیلوں کا حصہ بنا لینا چاہئیے۔ اس سے نہ صرف ذہنی کارکردگی میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ ذہن کے پیچ کھلتے ہیں تو نئ چیزوں کے بارے میں جگہ بننے لگتی ہے۔ اسے سائنس کی زبان میں دماغ کے اندر نئے کنکشن بننا کہتے ہیں۔ یہ کنکشن جتنے زیادہ ہوں دماغ کی فعالیت اتنی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اس لئیے کہتے ہیں کہ خالی دماغ کو زنگ لگ جاتا ہے۔

دماغی فعالیت کا تعلق بہتر یا متوازن غذاء سے کسی حد تک  اور ورزش سے بھی جڑا ہے۔ جو کھائیں اسے آپکے جسم کے لئیے بہتر ہونا چاہئیے محض زبان کے لئیے نہیں۔ دوسری طرف ورزش دوران خون کو بڑھا دیتی ہے اور اس طرح سے دماغ کو بہتر خون کی فراہمی ہوتی ہے۔

عبادت آپکی ذہنی صلاحیتوں کو بڑھانے کا ایک ذریعہ ہو سکتی ہے کہ اسکے دوران ہم اپنی دماغی صلاحیتوں کو یکجا کرنے کی مشق بھی غیر شعوری طور پر کرتے ہیں۔ آپ چاہیں تو یوگا کے آسن بھی کر سکتے ہیں ، یا کسی قسم کا مراقبہ بھی۔

اپنے ماحول اور ارد گرد کے لوگوں سے جڑا رہنا بھی آپکے قوت مشاہدہ کو تحریک دیتا ہے۔ خاص طور پر وہ لوگ جنکی مصروفیت انہیں ایک جگہ بند کر دیتی ہے تو انہیں اپنی سرگرمیوں میں تبدیلی لانی چاہئیے۔ اور کچھ وقت ایک بالکل الگ اور قدرتی ماحول میں گذارنا چاہئیے۔

اگر آپکا آئ کیو کم آتا ہے تو شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں اور اگر زیادہ ہو تو اترائیں مت۔ کامیاب ہونے کے لئے محض اچھا آئ کیو ہونا کوئ ضروری نہیں, اپنی صلاحیتوں کو بہتر طور پر استعمال کرنا ضروری ہے۔ ہر وقت یہ  نہ کہیں کہ ہمارا تو آئ کیو ہی اچھا نہیں اس لئیے ہم کچھ بہتر کام نہیں کر پاتے۔ دنیا میں اکثریت اوسط ذہن کے لوگوں کی ہے اور بہت اچھی پوزیشنوں پر وہی موجود ہیں۔

فطرت نے نہ بخشا مجھے اندیشہ ء چالاک

رکھتی ہے مگر طاقت پرواز میری خاک

کامیابی کا تعلق محض آئ کیو سے نہیں ہوتا اور ریسرچ کے بعد ایک اور فیکٹر سامنے آتا ہے جسے ایموشنل کوشنٹ کہتے ہیں۔ اس بارے میں گفتگو آئندہ تحریر میں ہوگی۔

ریفرنس؛

آئ کیو

ڈیوڈ ویسکلر

آئ کیو ٹیسٹ

12:20 PM

David Wechsler, Emotinal Quotient, آئ کیو، ڈیوڈ ویسکلر، ایموشنل کوشنٹ، Inteliigence Quotient

میں، وہ اور قومی ترانہ

تم مخاطب بھی ہو, قریب بھی ہو

تم کو دیکھوں کہ تم سے بات کروں

شاید آپ بھی اس الجھن سے گذرے ہوں۔ مجھے کچھ دنوں پہلے اس صورتحال سے پھر گذرنے کا اتفاق ہوا۔ ٹی وی کے ایک معروف، خوش شکل میزبان کی ایک محفل میں مجھے بھی کسی کے اصرار پر شرکت کرنی پڑی۔ اگرچہ کہ یہ خاصی پیشہ ورانہ نوعیت کی ملاقات تھی۔ اور اسکے بارے میں بجا کہا جا سکتا ہے کہ اسقدر بھیڑ میں ہوتی ہے ملاقات کہاں۔ لیکن تین گھنٹے انکے ساتھ گذارنے کی سعادت سے یہ دل ابھی تک ہلکورے لیتا ہے۔

محفل کے آغاز میں انہوں نے غیر رسمی گفتگو کے دوران کہا کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ انہیں اردو نہیں آتی۔ اسے انکا دل چاہتا ہے کہ اپنے پیروں سے کچل دیں۔ انہوں نے شدت جذبات میں انہیں پیروں سے کچل کر دکھایا بھی۔ یہ الگ بات کہ پیروں تلے کوئ تصوراتی مخلوق کچلی گئ۔ ہم تو ویسے ہی گنگ بیٹھے تھے مزید رعب میں آگئے۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ لوگ ایسا کیوں کہتے ہیں۔ مختلف لوگوں نے اسکے مختلف جواب دئیے۔  ان جوابات سے آپ آگاہ ہی ہونگے۔

 تھوڑی دیر میں جب  حالت یہ ہوئ کہ چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبال ،  تو میں نے ان سے کہا کہ یہ سوالنامہ جو ابھی انہوں نے وہاں پر موجود شرکاء  کو تقسیم کیا ہے۔ یہ سارا کا سارا انگریزی میں کیوں ہے۔ جبکہ اس جگہ پر مختلف طبقہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ موجود ہیں۔ جن میں سے کچھ بہتر طور پر انگریزی سے واقف بھی نہیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک ادائے بے نیازی سے ہلایا اور جواب ملا، 'اردو ٹائپنگ بہت مشکل ہوتی ہے۔ بڑا چکر ہوتا ہے بس اسی لئیے سوالنامے میں اردو ترجمہ نہیں رکھا گیا'۔

خیر صاحب، محفل زیادہ تر انگریزی کمیونیکیشن کے بعد اپنے اختتام کے قریب پہنچی اور انہوں نے بر سبیل تذکرہ بتایا کہ لوگوں کو اپنا قومی ترانہ تک تو یاد نہیں ہوتا۔ میری قسمت کہ میں پھر بول اٹھی۔ 'یہ ہے بھی ذرا مشکل'۔ تس پر وہ آکر میرے سامنے کھڑے ہو گئے، اور آستینیں اوپر چڑھالیں۔کوٹ کے اندر ایک ہاتھ کمر پہ ٹکایا۔ اور اتنے ظالمانہ انداز میں مجھ پہلے سے گھائل شخص کو کہنے لگے کہ کیا مشکل ہے۔ اب میں  گھگھیائ۔' اردو میں نہیں ہے'۔ اس پر انکی پیاری پیشانی پر لا محدود بل پڑ گئے۔ ارے آپ ، اب یہ کہیں گی کہ یہ فارسی میں ہے۔ اور پھر ایسے انداز میں جس سے جھلک رہا تھا کہ تف ہے آپ پر۔ وہ میرے قریب جھک گئے اور ایک ایک کر کے ترانے کے سارے مصرعے پڑھ ڈالے۔ ہر مصرعے کے اختتام پر پوچھتے کہ سمجھ آیا کہ کیا کہا۔ میں بچہ جمورا کی طرح سر ہلا دیتی۔ پورا ترانہ ختم کرنے کے بعد فتحیاب انداز میں سیدھے ہوئے  دونوں ہاتھ جھاڑے اور فرمایا۔۔ کہاں ہے مشکل اور کہاں ہے فارسی۔

صورت حال کچھ ایسی ہو چلی تھی کہ

صرف اسی شوق میں کی تجھ سے ہزاروں باتیں

میں تیرا حسن، تیرے حسن بیاں تک دیکھوں

 اپنی قسمت پہ رشک آیا اور لمبی زبان کو دل ہی دل میں تھپتھپایا۔ اتنی لمبی گفتگو اور صرف مجھ سے۔ ایکبار پھر اس سحر سے باہر نکلی اور منمنانے کی کوشش کی کہ میرے جمعدار، مالی، ڈرائیور، ماسی کسی کو بھی سمجھ نہیں آتا۔ دل میں سوچا اسی بہانے ان لوگوں کو بھی شاید پذیرائ ملے۔ جواب ملا 'انکی یہ زبان نہیں ہے'۔ اب کیا کہتی،  یہی تو میں کہہ رہی تھی۔

کبھی آپ کو یہ لگا کہ جن کی شکل اچھی ہو انکی فارسی بھی کتنی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔

سوالات؛

اس محاورے کا مطلب بتائیں، ہاتھ کنگن کو آر سی کیا، پڑھے لکھے کو فارسی کیا۔

اس شعر کا پہلا مصرعہ بتائیں، جس نے ڈالی بری نظر ڈالی۔

عملی مشق؛

صرف اس دوکان سے خریداری کریں، جس کے سیلز مین کو پورا قومی ترانہ یاد ہو۔ بعد ازاں ایک فہرست تیار کریں کہ آپکی خریداری پہ اس سے کیا فرق پڑا۔

12:41 PM

Karachi, National anthem, کراچی، قومی ترانہ

غریبوں کا خدا

نپولین بونا پارٹ نے کہا کہ اگر مذہب نہ ہوتا تو غریب امیروں کو قتل کر ڈالتے۔

امیروں کے تحفظ کی ذمہ داری ہمارے ایک مشہور و معروف چینل نے اٹھا لی ہے اور انکے پروردہ نام نہاد عالم اپنی مکروہ مسکراہٹ سے مذہبی اداکاری کے بام عروج پر پہنچے ہوئے اسکی بجا آوری میں مستعد نظر آتے ہیں۔انکے مکالمات جب ایک دوسرے صاحب ایمان سابقہ وجہ ء شہرت گلوکاری اور موجودہ ایک ڈیزائنر بوتیک، نعت خواں، تبلیغی کارکن اور چیزوں کے حلال ہونے کے اشتہارات میں لاکھوں کے عیوض کام کرنے والے نئے دریافت شدہ مسلمان سے ہوئے تو پردہ ء سیمیں پر انکی تجلیات دیکھ کر ایک غریب مسلمان پر ہیبت چھا گئ۔ اپنے بوتیک کے ڈیزائن کردہ لال کرتے کو پہنے ہوئے جنید جمشید اپنے غریبوں کے لئیے پھٹتے ہوئے دل کے ساتھ جب یہ فتوی دیتے ہیں کہ غریب اگر تین دن تک خاموشی سے فاقہ کرے تو اللہ پاک اسکے سال بھر کے رزق کی ذمہ داری لے لیتا ہے تو میرے جیسے ذہن کے غریب ایسے خدا کو ماننے سے انکار کر دیں گے۔

آخر یہ خدا امیروں کے بوتیکس میں، انکے ایمان افروز اشتہارات میں، انکی صلاحیتوں میں اتنی برکت کیوں ڈالے جا رہا ہے۔ یہ برکت پروگرام پیش کرنے والوں کے نورانی اور صحتمند دمکتے چہروں اور ہر دفعہ ایک قیمتی نئے جوڑے کی شکل میں کیوں صرف انکے حصے میں آتی ہے۔ یہ برکت صرف اس چینل کو کیوں ملے جا رہی ہے جو ایک اخبار سے شروع ہوا اور اب ایک صحافتی اسٹیٹ بن گیا ہے۔

یہ سب لوگ خدا کی نازل کردہ نعمتوں کے حقدار کیوں بن گئے ہیں اور کیوں ایک غریب کو دن رات صبر، شکر اور وقار کے سبق دئیے جاتے ہیں۔ سبق بھی وہ دیتے ہیں جنکے جسم اور روح دونوں طمع کی دلدل میں دھنسے ہوئے ہیں۔

اب میرے جیسا غریب ناہنجار اس پروگرام میں ایک مہنگا فون کر کے صاحب پروگرام کی گریہ کرنے والی دعا کےانداز کے بارے میں صدقے واری ہونے کے بجائے ، براہ راست خود خدا سے پوچھنا شروع کر دیتا ہے ۔

 یا خدا، اے مالک تیرا دین کتنا سچا ہے جو ایک راستے سے بھٹکے ہوئے مسلمان کو نیکی کے راستے پہ لے آیا اور پھر تونے اسے نیکی کے راستے پہ آنے کے عیوض دنیا کی راحت، عزت، سہولت، محبت اور شہرت سبھی کچھ عطا فرما دیا۔ اے پر وردگار اب ہم جیسے مسکین ، نااہل، غریب ابن غریب کون سا وظیفہ پڑھیں کہ تو انکو بھی ان تمام نعمتوں سے بہرہ مند فرما۔ آخر تونے ہماری کشائش رزق کو تین دن کے فاقوں کے ساتھ کیوں باندھ رکھا ہے۔

یا خدا  آخر تونے ہمارے کشائش رزق کو تین دن کے فاقے سے کیوں باندھ رکھا ہے

مذہب کی سب سے زیادہ ذمہ داری غریبوں پر عائد ہوتی ہے۔ قیامت کے دن غریب امیروں سے بڑھکر ہونگے۔ یا خدا تونے ہمارے اوپر اتنی ذمہ داری کیوں رکھی ہے۔

نپولین بونا پارٹ کہتا ہے کہ اگر مذہب نہ ہوتا تو غریب--------۔

یا خدا ،  اگر غریب نہ ہوں تو مذہب کی سب سے زیادہ ذمہ داری کس پر ہوگی۔

-

-

-

جہنم میں جائیں نپولین بونا پارٹ، جنید جمشید، عامر لیاقت اور جیو چینل والے۔ اے خدا اگر غریب نہ ہوں تو انکا بزنس کیسے چلے گا۔

ریفرنس؛

http://vidpk.com/34502/Junaid-Jamshed-in-Aalim-On-line/

ہماری انگریزی بلاگر

2:00 AM

Amir liaqat Husain, Geo chanel, Junaid Jamshed, جنید جمشید، عامر لیاقت حسین، جیو چینل، نپولین بونا پارٹ

گھر کی جڑیں

ڈرائینگ روم کا بنیادی مقصد تو کسی زمانے میں گھر کے اندر ایک گوشے کی فراہمی تھا۔ جہاں

بیٹھکر آپ گھر والوں کی بیجا مداخلت سے ہٹ کر گفتگو کر سکیں۔ یہ حصہ ہمہ وقت صاف ہو۔

اس سے کسی افراتفری کا احساس بھی نہیں ہو۔ اور یہ آپکے حسن ذوق کا آئینہ دار بھی

بن جائے۔

گردش دوراں نے اسےکسی کی سماجی حیثیت کا آئینہ دار بنا دیا۔ اور ایسے ڈرائنگ روم وجود میں آگئے جہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری۔ اس لئیے کہ نظر اٹھتے ہی ایسے نظاروں میں کھو جاتی ہے جو اپنے ساتھ احساس محرومی، احساس کمتری، احساس کمزوری، احساس دوری، احساس مجبوری اور اس جیسے بہت سے دوسرے احساسوں کو لیکر پلٹتی ہے اور جاکر دماغ کے پردہ ء چشم پہ جیسا کہ انسانی حواس کا قدرتی فعل ہے کوئ احساس بصیرت پیدا کرنے کے بجائے سیدھا حس گفتگو پر حملہ کر کے اسے گنگ کر دیتی ہے۔جب گفتار کے کس نکل جائیں تو بکواس کے بل پڑنا شروع ہوجاتے ہیں۔ ایسے بل تعلقات میں دراڑیں ڈالنے کے لئیےتیشے کا کام انجام دیتے ہیں۔اور ان سےکوہ ستوں کے پہاڑوں سے جوئے شیر نہیں بلکہ دلوں سے جوئے لہو جاری ہو جاتی ہے۔ یہ کبھی کبھی آنکھوں سے آنسءووں کی صورت رواں ہوجاتی ہے۔ اور کبھی نالہ بن کے گھر کے درو دیوار پہ بال پھیلا کر پڑ جاتی ہیں۔

اپنے گھروں میں ایک سیدھا سادہ سا گوشہ ضرور رکھیں۔ جہاں آنیوالاپاءووں پسارے یا آلتی پالتی مارے تعلقات کی دھونی جمائے بیٹھا رہے۔ اسکے اسطرح بیٹھے رہنے سے گھروں کی بنیادوں میں جڑیں نکل آتی ہیں جو اس گھر کو گرنے نہیں دیتیں۔

6:07 PM

ڈرائینگ روم

میٹھی عید اور میٹھا

میٹھی عید تو میٹھے کے ساتھ جڑی ہوئ ہے۔ تو میں نے سوچا کہ عید مبارک کہنے سے پہلے کچھ میٹھا بھی بنا دیا جائے آپ لوگوں کے لئے۔ یہ شاہی ٹکڑوں کی ایک جینئین ترکیب ہے۔

دو کلو دودھ کو ابال لیں اور پھر آنچ اتنی کر لیں کہ وہ اس پر پکتا رہے اور پک پک کر آدھے سے بھی کم رہ جائے۔

اس دوران آپ بڑی والی ڈبل روٹی اتنی بڑی نہیں جو گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں شامل ہو بلکہ بازار سے ملنے والی عام ڈبل روٹی کا جو بڑا سائز ملتا ہے وہ لے لیں اسکے کنارے کاٹ دیں اور اسے درمیان سے اس طرح کاٹ لیں کہ دو تکون بن جائیں، آٹھ سلائس سے آپکے پاس سولہ تکون بن جائِں گے اب انہیں آئل میں ڈیپ فرائ کر لیں۔ آئل اتنا ڈالیں کہ تین دفعہ کے بعد آپ اسے ضائع کر کے تازہ تیل ڈال سکیں۔ یہ ٹکڑے جب گولڈن ہو جائیں تو اتار لیں اور انہیں ایک بڑی بیکنگ ٹرے یا پائریکس ٹرے یا اسٹیل کی ٹرے میں لگادیں۔ ایک سنگل تہہ کی شکل میں۔ جگہ کم ہو تو دو ٹرے استعمال کر لیں۔ اب ایک پتیلی میں ڈیڑھ کپ چینی لیں اور اس میں ایک کپ پانی ملادیں۔ اور اسے پکا لیں جب اس محلول کواچھی طرح ابلتے ہوئے تین منٹ ہو جائیں تو اسے اتار لیں اورڈبل روٹی کے ٹکڑوں پہ ڈالدیں۔ اب ان ٹکڑوں کو مدھم آنچ پر پانچ منٹ چولہے پر پکالیں اس دوران ٹکڑوں کو چمچ سے بالکل نہ ہلائیں جلائیں۔ تمام ٹکڑوں تک آنچ پہنچانے کے لئے ٹرے کو آگے پیچھے کر سکتے ہیں۔  خیال رکھئیے گا لگنے نہ پائے۔ اگر شیرہ کم ہو رہا ہو تو پہلے ہٹادیں۔ اب اس ٹرے کو اتار کر ایک جانب رکھ دیجئیے۔

ایک پیالی میں ایک تہائ کپ دودھ لیکر اس میں ایک کھانے کو چمچ کارن فلار اچھی طرح مکس کر لیں اور اسےپکے ہوئت دودھ میں ڈال دیں۔  اس دودھ میں تھوڑی سی زاعفران پیس کر اور چوتھائ چمچ چائے کی پسی ہوئ چھوٹی الائچی بھی ڈالدیں۔ انہیں پکا لیں جب یہ چیزیں پک کر یک جان ہو جائیں، اندازاً دو منٹ،  تو اتار لیں اس میں تھوڑا سا پستے اور بادام کی ھوائیاں بھی شامل کر لیں ۔ آدھا کپ فریش کریم بھی ملادیں اب اس آمیزے کو  شیرے میں ڈوبے ہوئے ٹکڑوں کے اوپر ڈال کر مزید پانچ منٹ کے لئیے چولہے پر ہر طرف سے پکا لیں۔ اس دوران چمچ مت لگائیے گا۔ اب ٹرے اتار کر تھوڑا ٹھنڈا ہونے دیں۔ اور اس پر پستے اور بادام کی ہوائیاں چھڑک دیں۔ اگر واقعی چاندی کا ورق مل رہا ہو تو لگا لیں۔ ہوائیوں کے ساتھ چند قطرے کیوڑے کے بھی ڈالدیں۔ فریج میں رکھ کر ٹھنڈا کر کے کھائیں سخت نہیں ہونگے۔ گرم بھی مزے کے لگیں گے۔ پکانے کے فوراً بعد کھانے کے بجائے تھوڑی دیر پڑے رہنے دیں تو یہ سیٹ ہوجائیں گے کسی چپٹے چمچ سے ایک ایک کر کے جس برتن میں چاہیں نکال لیں۔ شاہی ٹکڑے عام طور پر پھیلے ہوئے برتن میں پیش کئے جاتے ہیں۔ ہر ٹکڑے کو الگ الگ ترتیب سے رکھیں تو دیکھنے میں بھی اچھے لگیں گے اور اٹھانے والے کو بھی آسانی ہوگی۔

اسکے ساتھ ہی آپ سب کو عید مبارک ہو۔ خدا ہمیں اسکی برکتوں سے نوازے ۔

9:31 AM

Shahi Tukrey recipe, میٹھی عید، شاہی ٹکڑے، عید مبارک،Eid in Pakistan

کچھ لکھنے سے پہلے

یہ ایک ویڈیو کا لنک ہے۔۔ جو میں  نے اپنی ایک انگریزی بلاگر کے بلاگ سے لیا ہے۔ کیونکہ میں چاہتی ہوں کہ مذہب کے اس ورژن پہ بھی بات ہونی چاہئیے اور صرف انگریزی حلقے میں کیوں آپ بھی شامل ہوں۔ میں اس پہ اپنی پوسٹ بعد میں لکھونگی۔

پہلے آپ سب کی رائے۔ آپ چاہیں تو انکے بلاگ پر جا کر اسکی تفصیلات اور تبصرے بھی پڑھ سکتے ہیں۔

http://vidpk.com/34502/Junaid-Jamshed-in-Aalim-On-line/

ریفرنس؛

ہماری انگریزی بلاگر

12:08 PM

Aalim on line, Aamir Liaquat Husain, Junaid Jamshed, ٰعامر لیاقت حسین، جنید جمشید، عالم آن لائن،

میں، فیاض اور اسکا ابا

ساڑھے چار بج رہے تھے اور میں انتہائ تندہی سے اپنا کام نبٹاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ مجھے چھ بجے کچن سے نکل جانا چاہئیے تاکہ فیاض اسے صاف کر لے اور ڈرائنگ روم سیٹ کر لے اسطرح میں رات آنیوالے مہمانوں کے لئے فریش ہو جاءووں گی۔ ابھی سوچوں کو فل اسٹاپ بھی نہ لگا تھا کہ فیاض آکھڑا ہوا ۔ میں نے کہا فیاض ڈائننگ روم کی اچھی سی ڈسٹنگ------لیکن میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے وہ بول اٹھا۔ 'باجی مجھے ابھی فوراً جانا ہے'۔ کیا؟ کیوں؟ میرا منہ پہلے غصے سے چوکور اور پھر گول ہو گیا۔ 'یہ سب کام کون کریگا؟' میں نے چھری غصے میں اور تیزی سے چلاتے ہوئے اس کے آگے کاموں کی لسٹ دہرانی چاہی۔ 'باجی، میرا بھائ بھاگ گیا ہے۔' اوہ کتنا بڑا ہے وہ'۔ 'جی مجھ سے دو سال بڑا ہے'۔ اتنا بڑا شخص کہیں بھاگتا ہے۔ تمہیں کیسے پتہ وہ بھاگ گیا ہے'۔ میں نے کچر کچر کھیرے کاٹے۔' وہ میری بھابھی بھی ساتھ بھاگ گئ ہے'۔ ہائیں، اب میں نے اس میں سنجیدگی دکھائ۔ 'وہ تمہارے کون سے بھائ کی بیوی تھی'۔ ؛جی اسی کی بیوی تھی'۔  یہ تو کلاسک بھاگنے کی کہانیوں سے بالکل مختلف ہے۔ میرا دماغ بالکل سنسنا گیا۔ 'اپنی بیوی کے ساتھ بھی کوئ بھاگتا ہے۔ میرا مطلب ہے اسے بھاگنا نہیں کہتے۔  وہ الگ رہنا چاہ رہے ہونگے'۔ 'جی، میرا بھائ کراچی میں رہتا ہے اور وہ اپنی بیوی کو ساتھ میں رکھنا چاہ رہا تھا۔میرا ابا اسے منع کر رہا تھا'۔ 'تو تمہیں اپنے ابا کو سمجھانا چاہئیے'۔' نہیں باجی ہمارے یہاں ایسےہی ہوتا ہے۔ وہ بے وقوف اسکو لیکر کہیں چلا گیا ہے'۔؛ تو اب تم کیوں انکی خوشی میں روڑے اٹکا رہے ہو۔ جاءو جاکر اپنا کام کرو'۔ 'نہیں، ابا کا فون آیا تھا وہ کل کراچی پہنچ رہا ہے۔ اس نے مجھے ان کا پتہ لگا کر انکے ساتھ رہنے کو کہا ہے۔ تاکہ وہ کہیں اور نہ چلے جائیں'۔'تمہیں یقین ہے وہ کراچی میں ہونگے'۔ 'جی مجھے معلوم ہے وہ کہاں ہونگے'۔ 'ارے اپنے ابا سے کہدو مجھے نہیں معلوم وہ کہاں ہیں'۔ 'نہیں ابا کو پتہ چلا تو وہ سمجھے گا میں ان سے ملا ہوا ہوں'۔ یہ کہہ کر وہ الف لیلی کی کہانیوں کے ہیرو کی طرح ابا کی بھیجی ہوئ سپاری پر روانہ  ہوگیا۔

میں اپنے آگے ٹماٹروں اور کھیروں کے ڈھیر دیکھ کر اسکے بھائ کو برا بھلا کہنے لگی۔ کم بخت آج کا دن ملا تھا۔ اسے بھاگنے کے لئیے۔ بدبخت اب ایسی جگہ چھپا ہے کہ اسے ڈھونڈ بھی لیا جائےگا۔

یہ الگ کہانی ہے کہ کسطرح اس ظالم نے بھائ کی بیوی کو واپس پشاور لیجانے کا سلسلہ کامیابی سے سر کیا اور بھائ کو کراچی میں چھوڑ دیا۔ لیکن اسکے بھائ جیسے بے وقوفوں کے ساتھ مجھے کیا کسی کو بھی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ فیاض کامران مسکراہٹ سجائے واپس آگیا۔

اسکے ایک ہفتے بعد میں ایکدن ٹانگیں پسارے بقراط ثانی بننے کی سرگرمیوں میں مصروف تھی کہ اچانک احساس ہوا کہ فیاض کہیں پاس سے بولا۔ سر اٹھایا تو فیاض سامنے کھڑا تھا۔ فوراً پسارے کو سمیٹا۔ 'اب کیاہوا؟' 'باجی، صاحب سے کہیں، وہ میری تنخواہ بڑھا دیں'۔ 'ابھی تو تمہارا پہلا مہینہ بھی پورا نہیں ہوا اور تم نے سب کاموں کی ذمہ داری بھی پورے طور پر اٹھانی شروع نہیں کی ۔ کس سلسلے میں تمہاری تنخواہ بڑھا دیں'۔ میں نے بقراطی ذریعہ ء علم پر آنکھیں جمائے پوچھا۔ 'باجی میں شادی کرنا چاہ رہا ہوں'۔ 'کس سے؟'۔' اپنی پھوپھی کی بیٹی سے'۔' وہ کہاں رہتی ہے؟'۔ 'جی یہیں کراچی میں'۔ 'تمہارے گھر والے راضی ہیں'۔ 'جی سب ، میری پھوپھی بھی راضی ہے'۔ وہ تابڑتوڑ سوالات سے عاجز آ کر شایدبےزار ہو کر بولا۔ میں نے سر چشمہ ءبقراطی دانش کو ایک طرف رکھا۔ اور دیو جانس کلبی کی بےنیازی کو دوسری طرف کہ اس طرح موجودہ زمینی حقائق صحیح طور پر سامنے آسکیں گے۔ اور ایسا کرتے ہی ایک خیال آسمانی بجلی کی تیزی سے کوندا اور فیاض کے متوقع نشیمن پر دھائیں کر کے گرا۔ 'تم تو پہلے دن کہہ رہے تھے کہ تمہاری شادی ہوگئ ہے'۔ 'جی باجی۔ مگر میری وہ بیوی تو پشاور میں رہتی ہے'۔

اگرچہ میری اس بات کا بعد میں مذاق اڑایا گیا کہ ایک نوکر کو دوسری شادی کی خواہش ظاہر کرنے پر نوکری سے برخواست کر دیا گیا۔ یقیناً کچھ رجعت پسند مسلمان اس پر خفا ہونگے، لبرل مسلمان شادیانے بجائیں گے۔ حقوق نسواں والے میری پیٹھ ٹھونکنے کو بےتاب ہونگے۔ حقوق انسانی والے اس میں کچھ گھمبیر مسئلے تلاش کر لیں گے۔ پشاور سے تعلق رکھنے والے اسے پشاور کے خلاف سازش سمجھیں گے۔ مردوں کو مظلوم سمجھنے والے اسے ان کی جنس پر ایک نیا حملہ قرار دیں گے۔ خود فیاض کو میری شکل سے نفرت ہو گئ ہوگی۔ لیکن کوئ بتائے کہ قصور کس کا تھا۔

۔

۔

۔

۔

۔

مقصد؛

اس تحریر کا مقصد جاننے کے لئیے آپکو خلاء میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے لئے نہیں چھوڑا جا رہا ہے۔ بلکہ قرعہ اندازی کے ذریعے میں نے تین اشارے چن لئیے ہیں۔ اشارے یہ ہیں۔ شادی، پشاور، کراچی۔

سوالات؛

مرفی کے قانون کی تعریف کریں۔ اس تحریر میں مرفی کا قانون کہاں کہاں لگایا جا سکتا ہے؟

بقراطی محبت کیا ہوتی ہے؟

کیا بچپن میں بچوں کے ساتھ چھپن چھپائ کھیلنے سے، بڑے ہونے پر ان میں مناسب جگہ چھپنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے؟ دلیل سے واضح کریں۔

اس تحریر کو رجعت پسندوں کے مطابق اسلامی بنانے کے لئے اس میں کیا کیا تبدیلیاں کرنی چاہئیں؟ یا باالفاظ دیگر اس میں کن مقامات کو آپ انتہا پسند آزاد مسلمانوں کی تربیت کا نتیجہ سمجھتے ہیں؟

اس تحریر میں کن نکات کو آپ خواتین کی بے پرواہی کا نتیجہ سمجھتے ہیں؟ سماجی اور نظریاتی دونوں اگر موجود ہیں تو انہیں بیان کریں۔

کیا خواتین کو بقراطی فلسفہ پڑھنے کی اجازت ہونی چاہئیے؟ یا انکے لئیے اسٹار پلس اور شیف ذاکر کی خدمات سے ہی استفادہ حاصل کرتے رہنا چاہئیے؟ یہ سوال لازمی نہیں ہے۔

عملی سوال؛

ایک پول منعقد کرا کے اس بات کا جائزہ لیں کہ دوسری شادی اور بے روزگاری کے درمیان کیا واقعی کوئ تعلق ہے۔

ن

وٹ؛

بیشتر تحاریر کی طرح اس میں بھی ہو سکتا ہے کہ کرداروں کے نام تبدیل کر دئیے گئے ہوں۔ اس لئے براہ مہربانی ان مندرجات کو میرے اوپر انکم ٹیکس لگانے کی مد میں استعمال نہ کیا جائے۔

8:23 PM

Human rights, Karachi, Peshawar, کراچی، پشاور،

بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی

میں جب صبح نکلتی ہوں تو دیکھتی ہوں کہ ایک بڑے میاں ایک چار پانچ سالہ بچے کا بیگ پکڑے بیٹھے ہوتے ہیں۔ اتنی دیر میں اسکول بس آتی بچہ اس میں سوار ہوتا ہے اور وہ بزرگ اپنے مستقبل کی چمک اپنے چہرے پہ لئیے اس بچے کو خدا حافظ کہتے ہیں۔ انہیں اعتماد ہے کہ انکا بچہ گھر سے باہر بھی محفوظ ماحو ل میں ہے۔ لیکن تین سالہ ثناء کے والدین کا یہ اعتماد اب سے کچھ عرصے پہلے دو پولیس کانسٹیبل نے توڑ ڈالا ۔ گھر سے کھیلنے کے لئے نکلنے والی اس بچی کو ان دو افراد نے جنسی زیادتی کے بعد قتل کر ڈالا۔  رونگٹے کھڑے کر دینے والی یہ بات حیوانیت سے بھی گرا ہوا فعل ہے۔

پاکستان میں رپورٹ کئے جانےوالے واقعات کے مطابق ہر روز تین سے پانچ بچے جنسی زیادتی کا شکار ہوتے ہیں اور زیادہ تر حالات میں مجرم اپنی شناخت چھپانے کے لئیے ان معصوم پھولوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ غیر رپورٹ کئے جانیوالے واقعات کے اعداد و شمار اس سے کہیں زیادہ ہو سکتے ہیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ ذمہ دار والدین اس سلسلے میں خاصے پریشان رہتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا چاہئیے. بچوں کا یہ استحصال ساری دنیا میں کیا جاتا ہے۔ چونکہ وہ ایک آسان ٹارگٹ ہوتے ہیں۔

ریسرچ رپورٹس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بچوں کے ساتھ یہ زیادتی کرنےوالے اجنبی لوگوں کی نسبت جاننے والے ، والدین کے یا خاندان کے دوست اور  قریبی رشتے دار ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ مجرم کوئ بڑا بچہ بھی ہو سکتا ہے۔

مجرم عام طور پر بچوں کو خوفزدہ کردیتے ہیں۔ وہ اس جرم کا بوجھ بچے پر ڈالدیتے ہیں اور انہیں یہ تائثر دیتے ہیں کہ اب اگر انکے والدین کو یہ بات پتہ چلی تو وہ بہت ناراض ہونگے۔ اس طرح سے وہ بچے کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ محرومیوں کے شکار بعض بچوں میں کسی بھی قسم کا لالچ ڈال دیتے ہیں۔ بعض بچوں کو یہ ایک کھیل بنا کر پیش کرتے ہیں جو دو بہت قریبی یا محبت کرنے والے دوست کھیلتے ہیں۔ بعض بچوں کو خوفزدہ کر دیتے ہیں اور بچے یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے والدین کو بتانے کی صورت میں وہ والدین کے لئے شرمندگی کا باعث بن جائیں گے یاانکے والدین کو کوئ بہت شدید نقصان پہنچے گا۔  بعض بچے اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ وہ کوئ بھی بات سمجھ نہیں پاتے۔

اس سلسلے میں ماہرین نے خاصہ کام کیا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں حکومتیں یا غیر منافع بخش ادارے اس قسم کی معلومات سے عوام کو وقتاً فوقتاً آگاہ کرتے رہتے ہیں تاکہ عوام کی تربیت ہوتی رہے۔

یہاں میں انہی ماہرین کی رائے کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے ماحول کے حساب سے کچھ نکات دینا چاہوں گی کہ ہم اپنے بچوں کو کیسے ایک محفوظ ماحول دینے کی جدو جہد میں شامل ہو سکتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے ایسے کسی سانحے کا شکار نہ ہوں تو ہمیں انہیں آسان ٹارگٹ ہونے سے بچانا پڑیگا۔ اسکی پہلی شرط یہ ہے کہ آپ اپنے بچے سے چاہے ماں ہوں یا باپ باتیں کرنے کی یا کمیونیکیٹ کرنے کی عادت ڈالیں۔ اگر آپکا بچہ اسکول میں پڑھتا ہے تو سارے دن کے بعد اس سے کسی وقت گپ شپ کریں جس میں اسے زیادہ سے زیادہ بولنے کا موقع دیں اور اپنی باتیں بے حد کم رکھیں۔ ان باتوں میں نوٹ کرتے رہیں کہ بچے کے دوست کس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ ٹیچرز سے اسکے روابط کیسے جارہے ہیں۔ اسکول وین والا آپ کے بچے سے کیسی اور کسطرح سے گفتگو کرتا ہے۔ یہاں یہ بھی دھیان میں رکھیں کہ کوئ بڑا شخص آپکے بچے کو غیر معمولی توجہ اور تحفے تحائف کیوں دے رہا ہے۔ گفتگو میں کبھی اپنے بچے کو ٹوک کر ہوشیار نہ کریں کہ آپکو آگے کی باتیں بتانے سے جھجھک جائے۔

اپنے آپ پر سے اپنے بچے کے اعتماد کو کبھی متزلزل نہیں ہونے دیں۔ اسے اس بات کا یقین ہونا چاہئیے کہ آپ اسے سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔ بچوں کو ڈسپلن کا عادی بنانے میں یا تعلیم کی طرف توجہ دینے میں بیجا سختی سے گریز کریں۔ جو بات پیار سے سلجھ سکتی ہو اسے ڈانٹ ڈپٹ سے نہ کریں۔ ورنہ جو بھی شخص ان سے نرمی اور محبت سے بات کریگا وہ اسکی ہر بات ماننے لگیں گے۔

بچوں کو کسی بڑے کے پاس اکیلا چھوڑنے سے گریز کریں۔ اگر ایسا کرنا بہت ضروری ہو تو صورت حال اس طرح رکھیں کہ وہ جگہ کھلی ہو جہاں زیادہ سے زیادہ لوگ انہیں دیکھ سکتے ہوں۔

اگر بچہ کسی بڑے شخص کے پاس چاہے وہ آپکا قریبی دوست ہو ، رشتے دار یا اسکا بڑا کزن، جانے سے گھبراتا ہے تو اس پر دباءو نہ ڈالیں کہ وہ ضرور انکے پاس جائے۔

اگر بچہ کسی شخص کے پاس اکیلا نہیں رہنا چاہتا تو اسے مجبور نہ کریں کہ وہ اسکے ساتھ ضرور رہے۔

یاد رہے کہ اس قسم کے معاملات میں بچے جھوٹ نہیں بولتے اگر وہ کسی شخص کی چاہے وہ آپکو کتنا ہی عزیز ہو کوئ بھی اس طرح کی بات آپکو بتاتے ہیں تو انکی بات پر یقین کریں اور انکی مدد کریں۔

اکثر والدین بازار جاتے ہوئے یا باہر نکلتے ہوئے اپنے بچوں کو رشت داروں کے یہاں یا محلے پڑوس میں چھوڑ جاتے ہیں۔ کوشش کریں کہ چحوٹے بچوں کو اپنے ساتھ رکھیں، یہ اگر ممکن نہ ہو تو واپس آکر اپنے بچے سے تفصیلی پوچھیں کہ اس نے یہ وقت وہاں کیسے گذارا۔

اس بات پر بھی نظر رکھیں کہ آپکا بچہ کن لوگوں کے ساتھ وقت گذارنا زیادہ پسند کرتا ہے اور کیوں۔

جو مچے انٹر نیٹ استعمال کرتے ہیں ان کی کڑی نگرانی کی ضرورت ہے۔ انہیں اچھی طرح سمجھا دیں کہ اپنا ذاتی یا گھر کا فون نمبر کبھی نیٹ پر استعمال نہ کریں، اپنے اسکول اور کلاس کے بارے میں معلومات اجنبی لوگوں کو نہ دیں۔ کوئ اجنبی شخص اگر انہیں کوئ سائٹ دیکھنے کی آفر کرتا ہے تو وہ اسے پہلے آپ سے ڈسکس کریں اور ایسی سائیٹس کو کھولنے سے اجتناب کریں۔ گھر میں کمپیوٹر ایسی جگہ پر رکھیں کہ اس کی اسکرین آپ کو چلتے پھرتے نظر آتی رہے۔ انہیں کبھی بھی بچوں کے کمروں میں نہ رکھیں۔ اور نہ ہی کسی الگ تھلگ جگہ پر۔ ان سوفٹ وئیرز کے بارے میں معلوم کرتے رہیں جو کمپیوٹر پر مختلف سائیٹس کو فلٹر کرتے رہیں۔

اگر بچے میں اس قسم کی عالامات پائ جائیں تو ان پرتوجہ دیں؛

بلا وجہ غیر معمولی غصہ، ڈپریشن، الگ تھلگ رہنااور ایسی گفتگو کرنا جو انکی عمر کے حساب سے مناسب نہ ہوں۔ بلا وجہ انکے کپڑے پھٹے ہوں یا ان پر مخصوص داغ، جسم پر نیل یا کھرونچوں کے نشانات جن کی وجہ بچہ آپکو نہ بتا پائے۔  انکے اعضائے مخصوصہ کے پاس سرخی، سوجن، بار بار ہونے والے پیشاب کی نالی کے انفیکشن، پیٹ درد اور مستقل پریشان رہنا۔ یہ ضروری نہیں کہا کہ ان میں سے ہر علامت اسی طرف جاتی ہو۔ مگر بچوں کی ان علامتوں کی سنجیدگی سے وجہ معلوم کریں۔

   یہ بھی یاد رکھیں کہ اکثر صورتوں میں کوئ واضح علامت نہیں ہوتی ہے۔

 ماہرین کا خیال ہے کہ بچوں کو انکے جسم کے متعلق ابتدائ معلومات اس طرح دینی چاہئیے کہ انہیں یہ اندازہ ہو جائے کہ انکے جسم کے کس حصے کو لوگ چھو سکتے ہیں اور کس حصے کو نہیں۔ یعنی ان میں ستر کا احساس نہ صرف پیدا کریں بلکہ اگر کوئ اسکی خلاف ورزی کرتا ہے تو بچے کو یہ اعتماد دیں کہ وہ آپ کو فوراً بتائے۔

 بچے ہمارا مستقبل ہیں یقیناً ہم میں سے کوئ نہیں چاہے گا ان نازک پھولوں کو کوئ اپنے سخت ہاتھوں اور حیوانیت سے مسل دے۔ انکی مناسب دیکھ بھال اور کسی بھی ممکنہ خطرے سے بچانا ہم سب کا فرض ہے۔ حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو اس سلسلے میں ہوشیار کرنے کے لئے میڈیا کی مدد لے۔

یہ تحریر صرف گھریلو بچوں کے متعلق ہے۔ لاوارث بچوں اور گلیوں میں پھرنے والے بچوں کو اسکا موضوع نہیں بنایا گیا۔ کیونکہ اس حوالے سے یہ ایک خاصہ طویل موضوع ہو جائے گا۔

مزید معلومات کے لئیے ان حوالہ جات کو دیکھ لیں۔

بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی

پاکستانی معاشرے میں بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی

بچوں کا تحفظ

7:25 AM

بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی Child sex abuse،

زمین کے خدا

لیجئیے جناب نئ اور تازہ

اس وقت پاکستان میں رات کے پونے دس بج رہے ہیں ابھی دو منٹ پہلے میں نے ڈان چینل پر یہ خبر دیکھی کہ پنجاب کے ایک علاقے میں آٹا بانٹا جا رہا ہے لیکن اس آٹے پر صرف مسلمانوں کا حق ہے۔ کیونکہ مسلمانوں نے روزے رکھکر جو ثواب لا متناہی حاصل کیا ہے۔اسکی رو سے اب بھوک کے نتیجے میں کھانا صرف انہیں ملے گا۔  آنے والے کرسچن لوگوں کو خالی ہاتھ واپس بھیج دیا گیا۔ نامہ نگار نے جب منتظمین سے اس امتیازی سلوک کی وجہ پوچھی تو انہوں نے جواب دیا کہ چونکہ یہ رمضان پیکج کا حصہ ہے اسلئے یہ صرف مسلمانوں کو ملے گا اور جب انکے رمضان آئیں گے تو انہیں بھی دیں گے۔

پاکستانی قوم کے لئے شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ اب پاکستان میں بھوک کا بھی مذہب ہو گیا ہے۔ حالانکہ خدا نے اپنے سب سے منکر بندے کے لئے بھی رزق اتارا اور یہ وہ ہے جو پتھر میں کیڑے کو بھی کھانا دیتا ہے۔ اسکی حقانیت کے سب سے بڑے دعوےدار  اسے  زمین تک پہنچتے پہنچتے کسطرح مختلف طبقوں میں بانٹ دیتے ہیں۔

اور اقلیتوں کے ساتھ یہ امتیازی سلوک جناب نواز شریف کے حصے میں اتنے کیوں آتے ہیں؟ یاد رہے اس وقت پنجاب میں مسلم لیگ نون کی حکومت ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پیشتر ایک افواہ کے نتیجے میں عیسائیوں پر مسلمانوں کے ایک ہجوم نے ہلہ بول کر کئ کو قتل کر دیا۔ وزیر اعلی پنجاب چھ دن تک اس علاقے میں جانے کے قابل نہ ہو سکے، ایسا کیوں ہے؟ پچھلے دو ماہ میں ایسے دو واقعات کیوں ہو چکے ہیں؟

11:04 PM

Nawaz Sharif, Religious discrimination, نواز شریف، پنجاب، آٹا کرائسس،

جناب میئر

حالانکہ میں اپنی ایک اہم  پوسٹ کے لئے مواد اکٹھا کر رہی تھی لیکن کل جب میری نظر اتفاق سے ایک ویڈیو پر پڑی تو میں رک گئ۔میں عام طور سے ویڈیو دیکھنے سے اجتناب برتتی ہوں لیکن اسے دیکھنا پڑا کہ یہ ہمارے شہر کہ ایک محنتی میئر کاچہرہ لئیے ہوئے تھی۔

جناب مئیر، ہم سب آپ پر بڑا فخر کرتے ہیں۔ اس ویڈیو پہ نظر آنے والے واقعات کے پس منظر سے الگ میں تو صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ آپ نے اب تک جو کچھ بھی کیا اس شہر کے مکینوں کے لئے کیا۔ اس لئے بھی کیا کہ اس سے آپ موجودہ اور آنیوالے لوگوں کے لئے ایک مثال قائم کر دیں۔ اور اس لئے بھی کہ قدرت نے آپکو یہ موقع فراہم کیا کہ آپ اس شہر اور اسکے رہنے والوں کو ان سہولیات کے قریب لے آئیں جس کے وہ حقدار ہیں۔ مگر ہوا یوں کہ آفیشل ورک میں دن رات الجھے رہنے کی وجہ سے آپ یہ بھول گئے کہ آپ اسوقت اپنے آفس میں  کسی عہدیدار کو اسکی ناہلیت کا احساس نہیں دلارہے ہیں بلکہ ان غریب عورتوں سے بات کر رہے ہیں جن سے یہ شہر، یہ ملک  بھرا ہوا ہے۔ مصائب اور مسائل میں پھنسےہوئے یہ لوگ بس اسی طرح چیخ سکتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ آپکے پاس بڑے غصے والے مان میں آئیں ہوں کہ یہی ہے وہ شخص جس کو ہم اپنا غصہ دکھائیں گے تو وہ اسکی لاج رکھے گا۔

کچھ عرصہ پہلے صدر میں میری گاڑی پارکنگ میں سے اٹھالی گئ۔ جبکہ باقی سب گاڑیاں وہان اسی طرح موجود تھی۔ جب میں وہاں پہنچی کہ میری گاڑی کو کیوں اٹھا لیا گیا ہے تو جواب ملا کہ نو پارکنگ ایریا میں کھڑی تھی اس لئے۔ میں شدید گرمی سے ویسے ہی بے حال تھی مجھے شدید غصہ آیا۔ وہاں ایک میل دور تک کہیں نو پارکنگ کا بورڈ یا سائن تک نہ تھااور باقی دس گاڑیاں وہاں کیوں چھوڑ دی گئیں۔ میں نے اس وقت اپنے دھان پان وجود میں سے پوری آواز نکالی اور کہا کہ فوراً میری گاڑی ریلیز کریں ورنہ میں ابھی یہاں سے سیدھے مصطفے کمال کے پاس جا کر پوچھونگی کہ کراچی میں کون سا پارکنگ کا قانون چل رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں میں نے ایسا کیوں کہا ۔ کیوں کہ مجھے امید تھی کہ آپ کے آفس میں میری اس بات کو  اور اس دلیل کو ضرور سنا جائیگا چاہے صرف میرا دل رکھنے کو۔

بہت ممکن ہے کہ ان خواتین کو آپکا امیج بگاڑنے کے لئے بھیجا گیا ہو۔ لیکن پھر آپ اس طرح کے ٹریپ میں کیوں آگئے۔ اس معاملے سے نبٹنے کے اور بہت سے مدبرانہ طریقے ہو سکتے تھے۔ آپکو اپنے ذاتی عملے کو جو آپکے ساتھ ہر وقت رہتا ہے اسکی ٹریننگ کروانی چاہئیے تاکہ ہجوم میں کس شخص کو آپکے پاس آنا ہے وہ اسے مانیٹر کر سکے۔ دوسر ایسے ماہرین بھی آپ کے ساتھ ہونے چاہئیں جو کہ ایسے لوگوں کو منظر سے بغیر کسی افراتفری کے ہٹانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ جب آپکا سامنا ہی دن رات عوام کے مسائل سے رہتا ہے تو انکو سنبھالنے کا طریقہ بھی آپکو آنا چاہئیے۔

یہ بالکل کوئ دلیل نہیں کہ چونکہ آپ پانچ روپے کے بدلے کسی کو بیس ہزار کی سہولیات دے رہے ہیں تو اسکے ساتھ جس طرح کا سلوک دل چاہے روا رکھیں۔ آج آپکی جو بھی عزت اور مرتبہ ہے وہ انہی لوگوں کی غربت اور کمزوریوں کی وجہ سے ہے۔ اگر یہ لوگ اتنے غریب نہ ہوتے اور اگر ہمارے ملک میں لوگوں کو عرصہ ء دراز سے انکے حقوق سے محروم رکھنے کی سازش نہ کی جا رہی ہوتی تو کیا یہ آپکے پاس آتے۔ اگر یہ پل اور روڈز آج سے دس سال پہلے بنائے گئے ہوتے تو انکا کوئ بھی کریڈٹ آپکو نہ ملتا۔ اب جب کہ قدرت نے آپ کو لوگوں کے دل جیتنے کے موقع سےنوازا ہے تو اسے ضائع نہ کریں۔

چلیں اب بگڑے کو جانیں دیں ، کسی بھی صحیح کام کو کرنے کا  کوئ آخری وقت نہیں ہوتا۔ میں نے سوچا کہ اگر آپکی جگہ میں میئر ہوتی تو ایسے واقعے کے پیش آنے کے بعد میں کیا کرتی جس میں میرے عملے کی ہوسکتا ہے کہ کوتاہی بھی شامل ہو۔ میرا خیال ہے کہ میں ایک پریس کانفرنس کرتی اور اس میں ان خواتین سے اسکی معافی مانگ لیتی  اپنے اس سخت روئیے کی جو میں نے ایک دنیا کے سامنے ان سے برتا۔ کبھی کبھی پیچھے ہٹ جانے سے ہم بہت آگے نکل آتے ہیں۔

10:46 PM

City Nazim Karachi, سٹی ناظم کراچی،

گند اور گند

اپنی چھوٹی سی بیٹی کی وجہ سے مجھے پچھلے ایک مہینے میں تین مختلف عوامی جگہوں پر بیت الخلاء جانے کی اذیت اٹھانی پڑی۔ بچوں کو احتیاطاًڈائپر میں رکھنے کے باوجود انہیں غلاظت میں زیادہ دیر نہیں چھوڑا جا سکتا ورنہ انکی جلد پر چھالے ہو جاتے ہیں تو لامحالہ اس مصیبت کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ یہ تین جگہیں، کراچی سفاری پارک، باغ ابن قاسم اور قائد اعظم انٹرنیشنل ائر پورٹ ہیں۔

سفاری پارک کے واحد خواتین کے بیت الخلاء میں غلاظت سے بھرا کموڈ اور سارے میں پھیلا ہوا پانی اس بات کی عکاسی کررہا تھا  کہ صفائ ہمارے ایمان کا کتنا حصہ ہے۔ باغ ابن قاسم میں انتظامیہ نے اچھا انتظام کیا ہے اور یہاں کافی سارے بیت الخلاء ایک جگہ پر ہیں ساتھ میں ایک بڑا ھال ہے جس میں کافی سارےبیسن اور شیشے لگے ہوئے تھے۔  یہ ھال اور وہ سیکشن جہاں ٹوائلٹ اسٹالز موجود ہیں کافی ہوا دار ہیں۔یہاں خواتین کی بڑی تعدااپنے بچوں کے ساتھ موجود تھی ان میں سے بیشتر اپنے نک سک کو درست کرنے سے لگی ہوئیں تھیں۔ مجھے چار اسٹالز میں  کموڈ کھول کر بند کرنے کے بعد  پانچواں اس قابل لگا کہ اسے استعمال کیا جا سکے۔ اب منصوبہ ساز آپکو ایک چیز بنا کر تو دے سکتے ہیں لیکن وہ لوگوں کو یہ نہیں سکھا سکتے کہ جو گندگی آپ نے کموڈ کے نذر کی ہے اسے پانی سے فلش کر کے صاف کردیں۔ اسے دوسرے لوگ بھی استعمال کرتے ہیں اور یہ انکے لئے بالکل ضروری نہیں کہ آپکی چھوڑی ہوئ غلاظت کو پانی میں تیرتے دیکھیں۔ نتیجتاً باہر آکر میرا موڈ بالکل ختم ہو چکا تھا اور واپسی کے ایک گھنٹے کے سفر کو جو کسی وی آئ پی کی آمد کی وجہ سے ختم نہ ہو رہا تھا میں سختی سے منہ بند کئے گھر واپس آگئ۔

ائیر پورٹ کی حالت کچھ بہتر تھی لیکن کسی ڈٹر جنٹ کے استعمال نہ کرنے کی وجہ سے  یا مناسب طور پر صفائ کے اصولوں کو انجام نہ دینے کی وجہ سے وہاں شدید بدبو پھیلی ہوئ تھی۔ وہیں ایک کنارے پہ کلیننگ لیڈی اپنے سر کے نیچے دوپٹے کا تکیہ بنائے سو رہی تھی۔ اسے بالکل اس بدبو کا احساس نہ تھا۔

یہ تو اس شہر کا حال ہے جو پاکستان کا سب سے بڑا اور ترقی یافتہ شہر ہے۔ اگر یہاں سے باہر نکل جائیں تو بیت الخلاء کا جیسے کوئ تصور نہیں ہے۔ میں ایک دفعہ حیدر آبادکے ٹول پلازہ کے قریب واقع ایک اچھے خاصے ہوٹل میں گئ تو وہاں پر بھی غلاظت کا کم و بیش یہی عالم تھا۔

سندھ اور بلوچستان کے دیہاتوں میں جہاں تک میں گئ ہوں عام طور پر واش روم کا تصور نہیں ہوتا ۔ لیکن صفائ کے لئے جو لوٹا استعمال کیا جاتا ہے وہ بھی اتنا غلیظ ہوتا ہے کہ اسے استعمال کرنے سے کراہیت ہوتی ہے۔

کراچی سے لیکر گوادر تک ساڑھے چھ سو کلو میٹر کے راستے میں کوئ ایسی جگہ نہیں جہاں کوئ شخص اور  خواتین بالخصوص اس ضرورت کے لئے جا سکیں۔ اگر کوئ ہوٹل ہو تو اول تو وہاں یہ سہولت نہیں ہوگی اور ہوئ تو قدمچے پر سوکھی ہوئ یا گیلی  غلاظت اس تواتر سے ہوگی کہ آپ کئ دن تک اپنے آپ کو کسی بھی جمالیاتی تاءثر سے خالی سمجھنے لگتے ہیں۔

لوگوں کا خیال ہے کہ اس سلسلے میں جس گندگی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے وہ تعلیم کی کمی سے جڑا ہوا ہے۔  واش رومز کو یا بیت الخلاء کو  اور ان سے منسلکہ چیزوں کو گندگی جمع کرنے کی جگہ سمجھ کر مزید گندہ رکھا جاتا ہے۔

  میرے ذاتی خیال میں صاف رہنے اور رکھنے کا احساس کسی بھی انسان کی جمالیاتی حس سے جڑا ہوا ہے۔  خوبصورتی اور صفائ ایکدوسرے سے جڑے ہوئے ہیں بلکہ ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ صفائ کسی جگہ، یا شخصیت کے حسن کو بڑھا دیتی ہے۔ اور یہ بدصورتی کے اندر بھی کشش پیدا کر دیتی ہے۔  یہ اس بات کا اشارہ بھی دیتی ہے کہ ہم اپنے ارد گرد کے لوگوں کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ اگر شہروں میں کموڈ سے اٹھ کر جانےوالے اسکا فلش چلادیں تودوسرے آنیوالے کو اس ذہنی تکلیف سے نہیں گذرنا پڑیگا۔

اور اگر واقعی اسکا تعلیم آگہی کی کمی سے تعلق ہے تو جس طرح پولیو کی مہم چلائ جاتی اسی طرح اپنے آپ کو اور اپنے بیت الخلاء کو صاف رکھنے کے طریقے سکھانے کی مہم بھی چلانی چاہئیے۔ ہم تو اس مرحلے سے اپنی ابکائیوں کو روکتے ہوئے گذر جاتے ہیں کہ بس پاکستان میں یہی ہوتا ہے یا دوسری صورت میں ان جگہوں کے استعمال سے حتی الامکان گریز کرتے ہیں لیکن اگر ہمارے ساتھ کوئ غیر ملکی ہو تو بڑی سبکی ہوتی ہے۔

اردو میں ایک شاعر چرکی کے نام سے گذرے ہیں جن کا غلاظت کے باب میں شاعری کرنے پر نام بہت مشہور ہے۔ میرے پاس انکا کوئ مطبوعہ کلام نہیں۔ نہ ہوئے چرکی اس طرح کے پبلک ٹوائلٹس میں جانا ہوتا تو پتہ نہیں کیا کیا لکھ کر ڈھیر لگا دیتے۔

1:03 PM

باغ ابن قاسم، سفاری پارک، قائد اعظم انٹر نیشنل ائیر پورٹ، گوادر، د, بیت الخلاء اور انکی صفائ، wash room ettiquets

ایک پیشہ ورانہ ریسیومے

اپنی زندگی کے کسی حصے میں بھی آپ ملازمت کی تلاش کے لئے نکلیں۔ دیگر بنیادی ضروریات کے علاوہ جس چیز کی سب سے پہلے ضرورت پڑتی ہے وہ ہے آپکا ریسیومے، آپکا پیشہ ورانہ تعارف۔ ہمارے جونیئر ساتھی اس سلسلے میں خاصے پریشان نظر آتے ہیں۔ اکثریت ایکدوسرے کے ریسیومے چھاپ لیتی ہے۔ اور اس طرح سے اس میں کوئ انفرادیت نظر نہیں آتی۔ اور وہ دیگر ریسیومے کے ڈھیر میں دب جاتی ہے۔

آج میں اپنا علم اس سلسلے میں اپنے ان جونیئر خواتین حضرات کے ساتھ شیئر کرنا چاہونگی۔

سب سے پہلے تو یہ کہ اپنے ریسیومے کے مختلف حصے سوچ لیں اور ہر ایک کی مناسب ہیڈنگ بنا لیجیئے۔

صفحے کے شروع میں  آپ کا تعارف ہونا چاہئیے۔اس میں اپنا نام اسی تلفظ اور انداز میں لکھیں جو آپکی تعلیمی اسناد میں موجود ہے۔ کوئ تخلص یا کسی بھی اور قسم کی جمع یا تفریق نہ کریں۔ اسکے ساتھ اپنے رابطے کے مستقل اور ایسے ذرائع دیجئیے۔ جن پر آپ سے فوری رابظہ ممکن ہو۔ یعنی اپنے گھر کا پتہ، فون نمبر، فیکس یا ای میل پتہ اگر موجود ہے تو ضرور دیں۔ زیادہ سے زیادہ رابطے ڈالیں تاکہ آپ سے رابطہ ہونے میں آسانی رہے۔

پھر اسکے بعد آبجیکٹو ضرور بیان کریں۔ اس سے یہ مراد ہے کہ اگر آپ اس ملازمت کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو آپکی موجودگی سے انہیں کیا فوائد حاصل ہونگے۔ کسی بھی بات کے لئے شاید کا استعمال نہ کریں۔ اپنی صلاحیتوں کے بارے میں مستحکم اندازہونا چاہئیے۔

ملازمت سے متعلق کوالیفیکیشن کو بیان کریں۔

اسکے بعد مختلف پیشہ ورانہ مہارت جو آپکو حاصل ہے اسے لکھئیے۔

پھر ا گر آپ نے مختلف جگہ  مختلف اوقات میں ملازمت کی ہے تو اسے سلسلے واراس طرح لکھیں کہ پہلا اپنا عہدہ، پھر اس جگہ کا نام اور پتہ اورآخر میں مدت ملازمت تاریخ کے حساب سے لکھیں۔  بہتر یہ ہے کہ آپ اسے کالم کے انداز میں لکھیں اس طرح کم جگہ میں زیادہ معلومات آجائیں گی۔سب سے پہلے اس جگہ کا حوالہ دیں جہاں آپ ابھی کام کر رہے ہیں یا جہاں آپ نے سب سے آخر میں کام کیا تھا۔ اسکے بعد اسی حساب سے پیچھے چلتے جائیں۔ اگر آپکا تجربہ مختلف ملازمتوں کا بہت زیادہ ہے تو صرف پچھلے پندرہ سالوں کا لکھنا کافی ہوگا۔ یا زیادہ اہم کو درج کریں۔

اب سب سے آخیر میں تعلیم کی باری آتی ہے۔ اسے بھی سب ے آخری والی ڈگری سے شروع کریں اور ہائ اسکول تک لیجانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ صرف گریجوایشن تک بتانا کافی ہے۔ وہ بھی اگر آپکا مکمل نہیں ہوا ہے تو اسکی متوقع تاریخ اسکے ساتھ لکھ ضرور دیں۔ اپنی تمام ڈگریوں کے نام اور منسلکہ تعلیمی اداروں کے نام بھی ساتھ میں لکھیں اور آخر میں ڈگری حاصل کرنے کا سال اگر مناسب سمجھیں تو ڈالدیں۔

اسکا انداز ویسا ہی رکھیں جیسا کہ تجربہ ء ملازمت کا رکھا تھا۔

یہ تو ان مختلف حصوں کی بات ہو گئ۔ ان حصوں میں دی گئ تمام معلومات کو پوائنٹس بنا کر لکھیں۔ اور کہیں بھی لفظ میں یا میرا استعمال نہ کریں۔

  ذاتی معلومات دینے سے گریز کریں۔ جیسے تاریخ پیدائش، مذہب، شادی شدہ ہونا، بچوں کی تعداد، عمر، رنگ، نسل۔

اپنے نام کے ساتھ حضرات مسٹر اور خواتین مز لکھیں۔ خواتین مس یا مسز لکھنے سے اجتناب کریں۔

ریسیومے کے اوپر پھول پتیاں  اور رنگ برنگے حاشئیے بنانے سے گریز کریں۔

اپنے تجربے کو بڑھا چڑھا کر نہ بیان کریں کہ نوکری دینے والا سوچے کہ یہ تو کوئ بہت زبردست شخص ہے اسے ہم رکھ کر کیا کریں گے، یہ تو مصیبت بن جائے گا۔ یا یہ کہ اس عہدے کے لئے یہ کوالیفیکیشن زیادہ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ پہلے اس ملازمت کے تمام پہلو سمجھ لیں کہ انہیں کیا چاہئیے  اور آپکی متوقع ملازمت میں کیا ذمہداریاں ہونگیں،  پھر اپنا ریسیومے تیار کریں۔

اگر آپکے پاس تجربہ نہیں ہے تو بھی آپ اس سیکشن میں اپنی لائن آف سٹریٹجی بتا سکتے ہیں کہ آپ کس طرح اپنے ٹارگٹس کو پورا کریں گے۔ اور جو مہارت آپکو حاصل ہے اسے کسطرح بروئے کار لائیں گے۔

اگر آپ سے ریفرنس نہیں مانگے گئے ہیں تو انہیں ڈالنے کی کوئ ضرورت نہیں ہے۔

آپکا ریسیومے صرف چند سیکنڈز کے لئے دیکھنے والے کے سامنے ہوتا ہے اس لئے اپنی بات اس طرح لکھیں کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ بات کہہ لیں۔ پیج پر اپنی اسپیس کو عقلمندی سے استعمال کریں بہتر تو یہ ہے کہ ایک صفحے پر مشتمل ہو لیکن اگر آپکی تفصیلات بہت زیادہ ہیں تو اسے دو صفحے کا کرلیں۔ دو صفحوں کا ہونے کی صورت میں اسے اگلے صفحے کے آدھے سے زیادہ حصے پر آنا چاہئیے اگر یہ آدھے سے کم پر ہے تو اسے کوشش کر کے ایک صفحے کا کر لیں۔

کچھ اور احتیاطیں یہ ہیں کہ کبھی اپنی پہلے والی ملازمت چھوڑنے کی وجہ نہ لکھیں۔ اپنے کسی بھی سابق یا موجودہ ایمپلائر کا نام نہ لکھیں اور نہ ہی اسکا پتہ۔

ریسیومے تیار کرنے کے بعد اچھی طرح پروف ریڈ کر لیں۔ اسے ہر طرح سے غلطی سے پاک ہونا چاہئیے۔ نہ ہجوں کی اور نہ گرامر کی کوئ بھی غلطی ہو۔

یہ ذہن میں رکھیں کہ آپ اپنا علم اور مہارت بیچنے کے لئے پیش کر رہے ہیں۔ اسے متوقع ملازمت کے مطابق بنا کر پیش کریں۔ اگر آپ کو بحیثیت کوالٹی کنٹرولر مقرر کیا جانا ہے تو آپ جتنے بھی اچھے سسٹم انالسٹ ہوں، انہیں اس سے کوئ غرض نہ ہوگی۔ اس لئے ملازمت سے منسلکہ علم اور مہارت کو بالخصوص توجہ سے لکھیں۔

میں نے اب سے چند سال پیشتر ایک بہت اچھا اور جمالیاتی تاثر رکھنے والا ریسیومے دیکھا تھا جس میں پیج پر مختلف چھوٹی بڑی ونڈوز بنا کر اس میں اپنی معلومات اس طرح لکھ دی گئ تھیں کہ ایک صفحے میں کوزہ بند ہو گیا تھا۔  اسکے لئے انہوں نے ایم ایس ورڈ استعمال نہیں کیا ہوگا۔ اسکی ایک کاپی میں نے سنبھال کر رکھی تھی مگر وہ گھر بدلنے میں ادھر ادھر ہو گیا۔

ورنہ میں اسے اسکین کر کے لگا دیتی۔ یقیناً آپ میں سے بہت سوں کو بہت سی باتوں کا پہلے سے علم ہوگا۔ مگر یہ میرے ان ساتھیوں کے لئے بالخصوص ہے جو ابھی عملی زندگی میں قدم رکھنے کے لئے پر تول رہے ہیں۔  اپنے تخلیقی جوہر یہاں بھی دکھائیے۔ اس بارے میں کوئ الجھن ہوتو ضرور تبصرہ کریں۔ میں یا میرے کوئ اور بلاگر ساتھی اس سلسلے میں آپکی حتی المقدور مدد ضرورکریں گے۔ خدا آپکا حامی و ناصر ہو اور آپ میں آگے بڑھنے کا جذبہ برقرار رکھے۔

ریفرنس؛

ریسیومے، ایک سوال

ریسیومے کی تیاری

نتیجہ:

اب جب کہ یہ تحریر آپکے سامنے ہے اور اس سے منسلکہ ےتبصرے بھی تو مزید کسی الجھن میں پڑنے کے بجائے ہم اس ساری چیز کا ایک خلاصہ نکال لیتے ہیں۔ جیسا کہ تبصروں کی ضمن میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اعتراض ذاتی اطلاعات کے لئے ہیں۔ اسے متنازعہ رکھنے کے بجائے آپ اگر سمجھتے ہیں کہ اسے ضرور ڈالا جانا چاہئیے تو اس سیکشن کو سب سے آخر میں رکھیں۔ اگر آپ پاکستان میں ہیں تو مذہب اور قومیت کی کوئ ضرورت نہیں ہے۔ مذہب کے لئے بھی پاکستان سے باہر بھیجنے میں احتیاط کریں کہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے بعد روئیے خاصے تبدیل ہو چکے ہیں۔ اگرچہ ڈگری کا سال لکھنے سے ایک اندازاً عمر پتہ چل جاتی ہے پھر بھی اگر آپ تاریخ پیدائش ڈالنا چاہیں تو اسے ڈالدیجئیے۔ خواتین اگر غیر شادی شدہ ہیں تو وہ چاہیں تو اپنا اسٹیٹس لکھ دیں۔ غیر شادی شدہ خواتین کے لئیے میرا مشورہ تو یہی ہے کہ نہ لکھیں۔ اگر ڈیمانڈ ہی غیر شادی شدہ خواتین کی ہے تو پھر ظاہر ہے کہ آپ اسکے لئے اپلائ نہیں کریں گیں۔ ریفرنس ڈالنے سے پہلے جن کا ریفرنس ڈال رہے ہیں انہیں اطلاع کر دیں تو بہتر ہے۔

ہابیز کا سیکشن اسی صورت میں رکھیں جب کوئ بہت غیر معمولی کارکردگی کھیل میں ہو۔ اس سے آپکے اندر لیڈر شپ خصوصیات اور ٹیم اسپرٹ کے ساتھ کام کرنے کا پتہ چلتا ہے۔ باقی اسکی کوئ ضرورت نہیں ہے۔ مزید مشوروں اور تبصروں کے لئے پوسٹ کھلی ہے۔ تمام تبصرہ نگاروں کی رائے کا بے حد شکریہ۔

نوٹ؛ چونکہ اس بلاگ سے جہاں کے لئے یہ میں نے لکھا ہے انہوں نے ریسیومے لکھا ہوا تھا۔ یہ میں نے اردو کے خیال سے ریسیومے لکھ دیا ہے انگریزی میں اسے ریزیومے ہی بولا جاتا ہے۔

9:49 PM

Preparation of resume, ریسیومے, ریسیومے کی تیاری، Preparation of resume

رقیب اور جدید ٹیکنالوجی

 دعوی محبت ایک اچھا شغل ہے۔ ورنہ یہ سننے میں نہ آتا کہ

ہزار کام مزے کے ہیں داغ الفت میں

جو لوگ کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں

اگر اس میدان میں بھی روکھی پھیکی گذر رہی ہے تو امکان غالب ہے کہ ابھی وہ مرحلہ نہیں آیا جہاں رقیب رو سیاہ کی اینٹری ہوتی ہے۔ کچھ نا معلوم وجوہات کی بناء پر رقیب کس قدر بھی گورا ہو اسے کہا رو سیاہ ہی جاتا ہے۔ اگر اب نہیں ہے تو یقیناًآپ کا سامنا ہونے پہ اسکا چہرہ ایسا ہی ہو جائے گا۔

رقیب کی یہ اینٹری عام طور پر اس قدر غیر متوقع ہوتی ہے کہ آپ  دہل جاتے ہیں اور ہر شخص پر سے اعتبار اٹھ جاتا ہےاور پھر ایسی پیاری اور معصوم باتیں سننے میں آتی ہیں کہ

ناصح بھی ہے رقیب، یہ معلوم ہی نہ تھا

کس کو صلاح کار کیا، ہم نے کیا کیا

بعض اوقات آپ کو بعد میں پتہ چلتا ہے کہ  دوسروں سےاپنے محبوب کی زیادہ تعریفیں بھی کوئ اچھی بات نہیں، لیکن اب کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ اب آپ لاکھ اپنی سادگی  کی داستان کسی کو  سناتے پھریں کہ

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

 سب لوگ آپکو اول درجے کا بے وقوف ہی سمجھیں گے

یہاں یہ مت بھولیں کہ چونکہ آپ دونوں کے درمیان رشتہ ءرقابت ہے اس لئے آئنسٹائن کےنظریہ ء اضافیت کے تحت آپ بھی اسکے رقیب قرار پائیں گے۔ رقابت کی اس جنگ میں سب جائز ہے۔ اس لئے کافی ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ رقیب اگر آپ کو ایک اچھا کمپیوٹر ایک اچھے انٹرنیٹ کنکشن کے ساتھ لیکر تحفتاً دینے پر بضد ہے تو آپ کو اسکی نیت کا فتور فوراً سمجھ لینا چاہئیے۔

رقیب کے داخل ہوتے ہی زندگی کے شب وروز تبدیل ہو جاتے ہیں۔ رقیب اور محبوب کے درمیان ہونے والی ملاقاتوں کے احوال جاننے کے لئے مختلف لوگوں سے دوستی گانٹھنی پڑتی ہے۔ اس سے سوشل ریلیشنز خوب پھلتے پھولتے ہیں۔  یہاں گر کی بات یہ بھی ہے کہ ان مخبروں کی وجہ سے آپکی محبت کی شہرت جتنی دور تک جائے اتنا ہی رقیب کے پیچھے ہٹنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔

وہ بھی سن لیں گے یہ کبھی نہ کبھی

حال دل سب سے برملا کہئیے

یہاں وضاحت کے لئے یہ بتا دوں کہ یہ شعر ہمارے کسی بلاگ کے عنوان کے بارے میں نہیں کہا جارہا۔ کیونکہ داغ کے زمانے میں بلاگنگ کا وجود نہ تھا اور بس کچھ ایسے ویسے طریقے ہی آزمانے پڑجاتے تھے۔

کچھ  مخبروں کو تو لین دین کے بعد راضی کرنا پڑتا ہے کہ بالکل مصدقہ خبر ملے۔ اس بہانے آمدنی کے دیگر ذرائع بھی تلاش کرنے پڑجاتے ہیں۔ کچھ مخبروں کو پیار اور محبت سے راضی رکھنا پڑتا ہے اور صورت حال ایسی ہو جاتی ہے کہ تجھ سے کی ہے کہ زمانے سے محبت میں نے۔

اگر محبوب کوئ مشہور شخصیت ہے تو آپ  رقیب اور انکے تعلقات کی تفصیلات جاننے کے لئے روزانہ باقاعدگی سے اخبار پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ کوئ اچھی علامت نہیں اس سے کسی بھی دن اگر نظریں پھسلتے ہوئے ملکی حالات کی خبروں پر چلی گئیں تو آپ اچانک تلوار سونت کر رقیب کے دئیے ہوئے کمپیوٹر پر  بلاگ لکھنے بیٹھ جائیں گے، اور حاصل ہونے والے تبصروں کی تابڑ توڑ لہر آپکو اس کنارے پر لے جائے گی جہاں آپ ہونگے اور آپکا کی بورڈ اور آپکی حب الوطنی کی شان میں کہے گئے الفاظ کا سرور۔ اسی کے لئے تو رقیب نے اتنی منصوبہ بندی کی تھی۔   رقیب اس مرحلے پر بلاگنگ سے سخت بیزاری کے باوجود اسکی تعریف میں دو حرف لکھوا کر دوبارہ پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں ڈالکر بیٹھ جائے گا وقتاً فوقتاً وہ آپکے تبصرہ نگاروں کو ہوا دینے کے لئے اپنا تبصرہ بھی فرضی نام سے ڈالتا رہے گا۔۔ اور آپ کاٹھ کے الو بنے ساری ساری رات کھٹ کھٹ کرکے کی بورڈ بجاتے رہیں گے۔

اسکے علاوہ رقیب اگر گورا ہے تو آپکو گورا کرنے والی کریموں کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنی پڑجائیں گی۔ بعد از بسیار خرابی جب محبوب امریکہ والی مصیبت کے ساتھ روانہ ہوجائے گا تو آپ جمع کی ہوئ معلومات کو کام میں لاتے ہوئے اسکا کاروباکر سکتے ہیں۔ محبت ایک شغل ہو سکتی ہے لیکن علم کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔

رقیب اگر ہر وقت آئنسٹائن  اور غالب کے حوالے دیتا ہو۔ تو ان دو افراد پر ہزار لعنتیں بھیجنے کے بعد بھی آپ کو انکے متعلق پڑھنا پڑ جاتا ہے لیکن خیال رہے کہ رقیب کے سامنے اپنی علمیت بگھارنے کی کبھی کوشش نہ کریں۔ مرفی کا قانون اس موقعے کے لئیے اچھی پیشن گوئ نہیں کرتا۔ اور ہو سکتا ہے کہ رقیب اس موقع پر کارل ساگاں اور فرائڈ کے محفوظات سے آپکا بھرتہ بنادے۔ ثانی الذکر دو افراد بھی اول الذکر سے کچھ کم پیچیدہ نہیں۔

رقیب کو کھلا خط بھیجنے سے گریز کریں وہ اسے محبوب کے آگے ڈالدے گا اور کہے گا

تمہیں رقیب نے بھیجا کھلا ہوا پرچہ

نہ تھا نصیب لفافہ بھی آدھ آنے کا

اس سے آپ کی بیستی بڑی خراب ہوگی۔

  رقیب میں ہر وہ عادت ہونے کے امکانات ہوتے ہیں جن سے آپکی جان جاتی ہے اور آپ حیران ہوتے رہتے ہیں کہ اس چمپو میں کیا ہے جس پر محبوب اسے اپنے حلقہ احباب میں رکھتے ہیں۔ وہ اللہ کی شان تنکے میں جان اور ہم تیغوں کے سائے میں پلے جوان۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئیے کہ اس میں رقیب کا کوئ قصور نہیں یہ سب کچھ محبوب کے دل اور آپکی قسمت اور محبوب اور آپکے  دماغ کی خرابی سے جڑا ہوا ہے۔

رقیب کا مکمل سماجی بائیکاٹ آپکے عشق کے لئے اچھا نہیں۔اس سے وہ آپکے عشق کی جڑیں کاٹنے میں تندہی سے مصروف رہے گا۔  اسکی توجہ بانٹے رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ اسکے ساتھ لگے رہیں اور اسکا حربہ اسی پہ لگا دیں۔ اگر اسے بلاگنگ سے دلچسپی نہیں تو فیس بک یا دیگر کمیونٹی سائیٹس کی افادیت کے بارے میں پوشیدہ و غیر پوشیدہ معلومات بہم پہنچا ئیں۔ اور کوئ آپ سے اتنی قربت کی وجہ دریافت کرے تو کہہ دیں آپ درست کہہ رہے ہیں

گو محفل رقیب میں جانا نہ چاہئیے

دیکھیں گے ہم بلا سے تماشہ تو کچھ نہ کچھ

جہاں لوگوں کی ایک بڑی تعداد رقیبوں سے بھنائ ہوئ رہتی ہے۔ وہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو رقیب سے مل کر ایک پریشر گروپ بنا لیتے ہیں۔اور محبوب کوبد دعائیں دینے لگتے ہیں کہ

اللہ کرے تو بھی ہو بیمار محبت

صدقے میں چھٹیں گے تیرے گرفتار محبت

کچھ کاہل اتنا بھی بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں ہوتے اور پٹھان کے ہوٹل پر رقیب کے ساتھ پڑے دودھ پتی کی چائے کی سڑکیاں لگاتے ایکدوسرے سے یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غم الفت کے

اتنے احسان کہ گنواءوں تو گنوا نہ سکوں

ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے

جز ترے اور کو سمجھاءوں تو سمجھا نہ سکوں

اور اگر دنیا انہیں اٹھتے بیٹھتےکچھ ایسے طعنے دینے لگے جس میں لفظ غیرت بھی آتا ہو تو وہ ہونٹوں پہ بعد از نروان حاصل ہونے والی مسکراہٹ سجائے بے نیازی سے کہتے ہیں

دنیا میں دو ہی تو با ذوق آدمی ہیں عدم

ایک میں اور ایک میرا رقیب

   رقیب کی تاریخ اتنی پرانی ہے جتنی کہ ہابیل اور قابیل کا قصہ۔ یعنی کہ بہت پرانی ہے۔ اور تب سے اب تک کسی بھی عشق کو اسکے بغیر مکمل نہیں سمجھا گیا ۔اگرآپ کی اب تک اس راستے پر رقیب سے ملاقات نہیں ہوئ تو یا تو راستہ بدل ڈالیں یا قاصد۔ تاکہ آپ بھی محبوب کی  محفل میں بآوز بلند یہ کہہ سکیں کہ

تیری محبت نے مار ڈالاہزار ایذا سے مجھ کو ظالم

رلا رلا کر، گھلا گھلا کر،جلا جلا کر، مٹامٹا کر

محبوب کو مار ڈالا والے اشعار کافی پسند آتے ہیں۔ امید ہے آپکا رقیب فیس بک پر مصروف ہوگا۔ لیکن یہ کیا،

  آپ ایک عدد نیا بلاگ لکھنے بیٹھ گئے۔ دھت ترے کی۔

ریفرنس؛

مرفی کا قانون

12:54 AM

Dagh, Faiz Ahmed Faiz, Ghalib, رقیب، فیض، داغ، غالب، پٹھان کا ہوٹل، عدم،

ایک اور فرزند کراچی

اب جبکہ انیس سو بیانوے کے کراچی آپریشن کا چرچا اٹھا ہوا ہےاور اس سے متاثر ہونے والے تو اتنا نہیں جتنا اس سے نہ متاثر ہونے والے اس پر اپنے گراں خیالات کا اظہار کر رہے ہیں تو اپنی پرانی کتابوں میں سے گذرتے ہوئے میری نظر اس کتاب پر پڑی ، اسکا عنوان ہے کراچی۔ یہ ایک شاعر کا مجموعہ ء شاعری ہے جنکا نام ہے ذی شان ساحل۔ جسے شائع کیا ہے ادارہ 'آج کی کتابیں' نے۔اسکے تقسیم کار کراچی میں ویلکم بک پورٹ، مکتبہ ء دانیال، اور ٹامس اینڈ ٹامس  جبکہ لاہور میں گورا پبلشرز، دستاویز مطبوعات اور کلاسیک تھے۔ تاریخ اشاعت ہے ستمبر ۱۹۹۵۔

اسکا انتساب معروف صحافی اور ادیب جناب ضمیر نیازی کے نام ہے۔ اور انکے انتساب کے ساتھ ڈان میں چھپنے والی ایک خبر کا تراشہ ہے۔ جسکے مطابق انہوں نے پرائڈ آف پرفارمنس کا ایوارڈ یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ وہ کراچی سے شائع ہونے والے  بیک وقت چھ اخبارات کے بین کے خلاف احتجاجاً یہ ایوارڈ نہیں لیں گے۔ خبر کے مطابق انہوں نے مزید کہا کہ اس وقت جب کراچی جل رہا ہے اور اسکے شہریوں کو بندوق سے ختم کیا جا رہا ہے۔ صدر، وزیر اعظم ، انکی اسمبلی اور انکی انتظامیہ کے افسران اور ہماری افواج کے افسران اعلی ڈنر پارٹیز میں محفل موسیقی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔یہ سب عوام کے خرچے پہ کیا جا رہا ہے اور کراچی کے عوام کے منہ پر ایک طمانچہ ہے کہ یہ لوگ انکی رہنمائ کرتے ہیں۔

یہ خبر ہے تین جولائ انیس سو پچانوے کی جو کہ ڈان میں شائع ہوئ۔

یہ ایک نظم ہے جو اس کتاب سے لی گئ ہے۔ اسکا عنوان ہے کراچی۔  اس کتاب میں بہت خوبصورت  نثری نظمیں ہیں اور ہر نظم سے میرا شہر سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

کراچی

ایک جنگل ہے

جہاں تاریکی، شور

اور خوف کے ہزاروں درخت

آسمان سے باتیں کرتے نظر آتے ہیں

اتنی اونچی آواز میں کہ

کراچی کے اندر یا باہر رہنے والوں

کسی کی چیخ بھی

سنائی دیتی نہیں

اصل میں اب کراچی

کوئ شہر نہیں

بلکہ خطرے کی حالت میں

حلق سے نکلنے والی چیخ ہے

جو چاروں طرف گونج کر رہ گئ ہے

کسی کو اس بات کا احساس تک نہیں

کہ یہ چیخ مدد کے لئے بلانے والے

کسی تنہا شخص کی بھی ہوسکتی ہے

مدد کے لئے نہ آنے والوں نے

کراچی کو

ایک غیر انسانی ہجوم سمجھ لیا ہے

یا اندھوں کی ایسی بھیڑ

جس کو بھوک لگنے پر

صرف کھیر کھلائ جا سکتی ہے

آواز نکالنے پر صرف تقریر سنائ جا سکتی ہے

اور ایکدوسرے کا ہاتھ تھام کر

یا تھامے بغیر

حرکت کرنے پر فائرنگ کی جا سکتی ہے

مگر کراچی میں اب فائرنگ محض ہوا تک محدود نہیں رہی ہے

 گولیاں اور انکی آوازیں

شہریوں کے خوابوں تک پہنچ رہی ہیں

 مگر کراچی خوابوں کا شہر نہیں

خوابوں کے لئیے صرف ایک انتظار گاہ ہے

اپنی آسانی کے لئیے

ہم اسے بندر گاہ

یا ایک عارضی تجربہ گاہ کے طور  بھی

استعمال کرتے ہیں

اس تجربہ گاہ میں ہم

انسانی جسموں پر کوئ تجربہ نہیں کرتے

جیسا کہ سب جانتے ہیں

اس مقصد کے لئے خرگوش کام آتے ہیں

یا سفید چوہے

جن کی افزائش نسل

خطرے کی حد کو چھو لینے پر

چوہے مار دوائیں

اور بلیاں

دارالحکومت سے آتی ہیں

ریفرنس؛

ضمیرنیازی

4:56 PM

Zamir Niazi, Zeeshan Sahil, ذیشان ساحل، کراچی، شاعری، ضمیر نیازی۔ آپریشن ۱۹۹۲ کراچی، Karachi operation 1992

ہوس ثواب

میں ہمیشہ یہ سمجھتی رہی کہ زکوِٰت اس زائد مال پر فرض ہوتی ہے جو آپکے پاس سال بھر پڑا رہا ہو۔ یہاں زائد سے میری مراد صاحب نصاب ہونا ہے۔ اپنی شادی والے دن جب مختلف حاصل ہونے والے تحائف کی وجہ سے میں صاحب نصاب ہو گئ تو میں نے فیصلہ کیا کہ ہر سال اپنی شادی کے سالگرہ کے دن کو زکوٰت کا حساب لگانے کا دن بنا لیا جائے۔ اور اگر اس درمیان خدا کسی اور چیز کی توفیق دے تو اسکی زکوٰت وقت خرید پر ادا کر کے اسے باقی چیزوں کے حساب کتاب میں ڈالدوں۔ یعنی اب اسکی زکوٰت بھی باقی چیزوں کے ساتھ ادا کی جائے گی۔

کچھ عرصے بعد رمضان آگیا۔ گھر میں نئے پرانے کام کرنے والے زکوٰت کا مطالبہ کرنے لگے۔ اس وقت ابھی سال ہونے میں کافی عرصہ تھا۔ اس لئے میں نے زکوٰت سے تو معذرت کر لی البتہ جو کچھ اور ممکن ہوا وہ کر دیا۔

لیکن اب ذہن میں سوال پیدا ہوا کہ آخر رمضان میں کیوں اتنے جوش و خروش سے زکوٰت دی جاتی ہے۔ کسی نے ہمیں کہا کہ ارے اپنی علامیت ایک طرف رکھ دیں۔ آپ نے بے شک پڑھا لکھا ہے لیکن آپ سے بہتر اسلامیات ہمیں معلوم ہے جو بات آپ کہہ رہی ہیں اسکے حساب سے تو صاحب حیثیت شخص کو ایک رجسٹر رکھنا پڑ جائے گا کہ کونسی چیز کب خریدی۔ ہاں تو،  میں نے دلیل دی مال جمع کرنا آسان کام تو نہیں۔ اسکی ذمہ داری ہوتی ہے۔جواب ملا،' اور  اسکا کیا کیا جائے کہ آپکو صحیح سے علم نہیں  کہ زکوٰت رجب اور رمضان میں دی جاتی ہے'۔ لیجئیے، کہاں تو رمضان کا عقدہ نہ حل ہو رہا تھا۔ کہاں یہ رجب بھی آگیا۔یہ شرمندگی الگ کہ اتنا پڑھنے کے باوجود یہ چیز آج تک کیوں نہ پتہ چلی کہ رجب سے بھی زکوٰت کا تعلق ہے۔

اس لمحہ ء غور وفکر میں اپنی ایک سینئیر دوست کا خیال آیا کہ وہ ان دنوں اپنی پی ایچ ڈی مکمل کرنے کے بعد ادارہ الھدی میں قرآنی تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ یعنی تفسیر کے ساتھ پڑھنے میں مصروف تھیں۔ انہیں فون کھڑکھڑایا۔

باتوں باتوں میں، میں نے انہیں اپنا مسئلہ بتایا۔ کہنے لگیں، 'آج ہی زکوٰت والا سبق ختم کیا ہے۔ رجب کی کہانی یہ ہے کہ اس حکم سے پہلے عرب اپنے دیوی دیوتاءووں کے نام سے پیسے نکالا کرتے تھے جس کے لئے انہوں نے رجب کا مہینہ مقرر کیا تھآ۔ جس سال زکوٰت فرض ہوئ اس سال رسول اللہ نے رجب کے مہینے اپنے قاصد تمام قبائل کو بھیجے تاکہ انہیں نئے حکم کا پتہ چل جائے اور جو رقم انہوں نے اس سال اپنے  بتوں کے لئے نکالی تھی اسے وصول کر لیا جائے۔ بس اس سال اس مہینے وصولی کے بعد یہ چیز ختم ہو گئ۔ کیونکہ زکوٰت سال بھر رکھے رہے زائد مال پر فرض ہے'۔

اچھا، میں نے مزید کہا۔ 'اب لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دیں کہ رمضان سے اسکا کیا تعلق ہے'۔ اب وہ تھوڑا سا جھجھکیں۔' ویسے تو کوئ تعلق نہیں ہے۔ لیکن دیکھو ناں رمضان میں ہر نیکی کا ثواب کئ گنا بڑھ جاتا ہے۔ اور پھر عید پر لوگوں کو پیسے چاہئیے ہوتے ہیں اس لئے لوگ رمضان میں زیادہ زکو٘ دیتے ہیں'۔

 یہ جو ثواب کمانے کی ایک نئ لہر پاکستانی مسلمانوں میں نظر آتی ہے۔ کیا واقعی اس سے انہیں اتنا ہی ثواب ملتا ہے۔اگر آپ پر محرم کے مہینے زکوٰت فرض ہوتی ہے تو آپ نو مہینے رمضان کےمہینے کا انتظار کریں گے تاکہ زیادہ ثواب ملے۔

میں گاڑی سگنل پہ روکے اپنی باری کا انتظار کر رہی ہوں۔ ہر طرف بل بورڈز لگے ہیں۔ خوب بڑے۔

ایک طرف عمران خان کالی شیروانی پہنے کھڑے مسکرا رہے ہیں.  انہیں زکوٰت چاہئیے اپنے ہسپتال کے لئے۔  دوسری طرف ایک بورڈ پر ایک غریب بچی کا چہرہ سوال کر رہا ہے، زکوٰت مجھے نہیں دیں گے کیا۔ ایک اور جانب کسی اور ادارے کا اشتہار لگا ہے، ہم ہیں اسکے صحیح مستحق۔گاڑی کے شیشے پر تین چار لوگ ہاتھ مار رہے ہیں، زکوٰت، زکوٰت۔ میری چھوٹی سی بچی پیچھے اپنی کار سیٹ میں بندھی مجھ سے سوال کرتی ہے۔ اماں، یہ کیا کر رہے ہیں۔ میں گاڑی آگے بڑھاتی ہوں اور سوچتی ہوں۔ یہ سب زیادہ ثواب حاصل کرنے والوں کی مدد کر رہے ہیں۔

11:16 PM

Imran Khan, Ramazan, Zakat, رمضان المبارک، کراچی، عمران خان

ایک سڑک اور بہت سے خواب

یہ سن دو ہزار ایک کا اکتوبر تھا۔ جب میں نے پہلی دفعہ بلوچستان کا رخ کیا۔ ہمیں بذریعہ سڑک گوادر جانا تھا۔ گوادر کراچی سے ساڑھے چھ سو کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ مشرف کو حکومت سنبھالے دو سال ہو رہے تھے۔ اور انکی حکومت کے بہترین فیصلوں میں سے ایک کراچی سے گوادر کوسٹل ہائ وے کی تعمیر شروع ہو چکی تھی۔یہ سڑک مختلف مقامات پر بن رہی تھی اور اس وقت تک زیادہ تر راستہ کچا تھا۔ ہمیں ایک رینج روور گاڑی میسر تھی۔ اور ان راستوں پر جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا فور وہیل ڈرائیو کے بغیر چلنا ناممکن تھا۔ اسکے باوجود ہمیں کراچی سے گوادر پہنچنے میں تقریباً ڈھائ دن لگے۔ اس سفر کی روداد روزنامہ جنگ میں قسط وار شائع ہو چکی ہے۔ جن لوگوں کو اسے پڑھنے سے دلچسپی ہو وہ دئیے ہوئے لنک پر جا سکتے ہیں۔  اس وقت میرا مقصد اس کی تفصیلات بیان کرنا نہیں ہے۔

 یہ سڑک تقریباً ساحل کے ساتھ ہے۔  راستے میں مختلف آبادیاں ملیں۔ گوادر جو کہ مکران ضلع کا سب سے بڑا شہر ہے اسوقت ایک قصباتی شہر سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ اسکی آبادی چالیس ہزار کے قریب تھی۔ شہر کے مرکز سے بس ایک سڑک گذر رہی تھی ۔ بیشتر گھر پتھروں سے بنے ہوئے تھے۔ جس ہوٹل میں ہم جا کر ٹہرے یہ چار کمروں کا ایک ریسٹ ہاءوس تھا۔ پانچ سال بعد یہی ہوٹل متوقع ترقیاتی منصوبوں کے باعث دس کمروں تک بڑھا دیا گیا۔ اسکے علاوہ پی سی والوں نے بھی اپنا ایک ہوٹل بنا لیا تھا۔ ہوٹل والوں کے بقول روڈ بن رہی، زمین کے دام چڑھے ہوئے ہیں اور لوگ آرہے ہیں۔ گوادر ایک نئے، روشن مستقبل کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اسکے بعد سے اب تک میں لا تعداد بار وہاں جا چکی ہوں۔ پہلے ہوٹل میں رکنا پڑتا تھا۔ پھر ایک عزیز نے ایک چھوٹا سا گھر بھی وہاں بنا لیا۔ جہاں سمندر اتنے نزدیک کہ جب وہ مد پر ہوتا تو اسکی لہریں چہار دیواری سے ٹکراتیں۔اس گھر کو بنانے میں جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا انکی ایک الگ داستان ہے۔ اسکی بنیادی وجہ وہاں کاریگروں، راج، مستری مزدور کا نہ ہونا تھا۔ وہاں کی بیشتر آبادی ماہی گیری کے پیشے سے منسلک ہے اور جو کچھ لوگ ہیں انہیں صرف مقامی پرانے انداز سے کام کرنا آتاہے۔ سب بلڈنگ مٹیریئل کراچی سے گیا۔ حتی کہ بڑھئ کو ایک دفعہ دروازوں کے ناپ کے لئے لیجایا گیا اور دوسری دفعہ انکو لگوانے کے لئیے۔ یہ ایک بہت سادہ سا گھر ہے لیکن اتنے سادہ گھر کو بنانے کے لئے بھی انہیں خاصی مشقت سے گذرنا پڑا۔

اس دوران یہاں پر بے پناہ ترقیاتی منصوبوں پر کام ہوا۔ عام لوگوں نے اتنا کام ہوتے دیکھا تو انہوں نے بھی اپنے کاروبار نکال لئے۔ حتی کہ آج گوادر میں ایک سپر مارکٹ بھی موجود ہے۔ پچھلے سال جب مجھے جہاز کے ذریعے ایک دفعہ پھر گوادر جانے کا اتفاق ہوا تو اوپر سے یہ دیکھکر دنگ رہ گئ کہ کالی سڑکوں کی لائینیں کتنی دور تک نظر آرہی تھیں۔ گوادر  اور اسکے اطراف میں اب سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے۔

کوسٹل ہائ وے ایک بہت خوبصورت سڑک ہے جو سیاحوں کے لئے کشش کا باعث بن سکتی تھی۔ پیسے نے جب گوادر کا رخ کیا تو اب یہاں بھی ایسے گھر نظر آتے ہیں۔ جو کراچی میں  پوش علاقوں میں نظر آتے ہیں۔ اب سے دو سال پہلے مقامی لوگ اتنے مالدار ہو رہے تھے کہ انکے پاس قیمتی گاڑیاں اور ہاتھوں میں سیٹیلائٹ فون ہوا کرتے تھے۔ مقامی لوگ تو فائدہ اٹھا ہی رہے تھے مگر باہر سے بھی لوگ آکر نئے کاروبار متعارف کروا رہے تھے۔ یہ وہ گوادر اور یہ وہ ضلع مکران نہیں تھا جسے میں نے سن دو ہزار ایک میں دیکھا۔ عام لوگوں کا معیار زندگی بلند ہو رہا تھا کہ ایکدم سب چیزوں کو بیک گئیر لگ گیا۔ مشرف کو ہٹانے کی تگ و دو شروع ہو گئ۔ اور بالآخر ان سے نجات پانے کے جشن منا لئے گئے۔

اب ہر چیز جیسے رک گئ ہے۔ ہر جگہ ایک غیر یقینی صورتحال ہے۔ اس صورتحال کو پیدا کرنے والے اپنے لوگوں کے ساتھ مخلص نہیں۔ صرف ایک کوسٹل ہائ وے جو کہ ایک آمر کے دور میں بنی جسنے اس علاقے کی سوچ کو تبدیل کردیا۔ اسے انکے سرداروں نے کبھی بنانے میں دلچسپی نہ لی۔ انہیں وسائل چاہئیں مگر اپنی فلاح اور اپنی ذاتی ترقی کے لئے۔ ان سرداروں کے بچے ملک سے باہر بہترین یونیورسٹیوں میں تعلیم پاتے ہیں۔ مگر گوادر جیسے شہر میں یہ ایک ہسپتال، ایک بہتر تعلیمی ادارہ، کوئ وو کیشنل انسٹیٹیوٹ نہیں بنوا سکتے تھے۔

میں اخباروں میں خان آف قلات کے بیانات پڑھتی ہوں اور بگتی جیسے ظالم شخص کو شہید قرار دینے کے بیانات پڑھتی ہوں۔ کل ٹی وی پر ایک صاحب کو سن رہی تھی کہ کتنے جوش اور جذبے سے ان ظالموں کے مارنے کی تحقیقات کروانا چاہ رہے تھے۔ کوئ کمیشن ایسا کیوں نہیں بنانے کو کہتے جو ان سرداروں کے خلاف تحقیقات کرے جو لاکھوں لوگوں کو جانوروں جیسی زندگی گذارنے پر مجبور کرتے ہیں اور اپنے تھرل کے لئے ایک قوم کو نیست و نابود کر دیتے ہیں۔  بگتی جو کہا جاتا ہے کہ آکسفورڈ سے پڑھا ہوا تھا کتنے اسکول انہوں نے قائم کروائے اپنے علاقے میں۔ ظلم کی جو داستانیں اسکے نام سے زبان زد عام تھیں۔ شاید ہی کسی اور کے نام پر اتنی ہوں۔

دے رہے ہیں جو تمہیں اپنی رفاقت کا فریب

انکی تاریخ پڑھو گے تو دہل جاءوگے

میں سوچتی ہوں کہ جب یہ نام نہاد آزادی کے رہنما بلوچستان کو آزاد کروا لیں گے تو انکے بچے تب بھی ملک کے باہر پڑھیں گے۔ یہ علاج کے لئے تب بھی بلوچستان  سےباہر جایا کریں گے۔ لیکن اس وقت یہ کیا بہانہ بنایا کریں گے؟

یہاں پر مزدور سے لیکر انجینیئر باہر سے آیا کریں گے۔ کیونکہ فی الحال تو انکے علاقے میں نہ کوئ اچھا تعلیمی ادارہ ہے نہ ہسپتال۔ نہ کسی اور شعبے میں مہارت رکھنے والے لوگوں کی کوئ قابل ذکر تعداد۔ یہ حکومتی انتظامی معامالات کو اپنے ہاتھ میں رکھیں گے اور حکومتی عہدوں کو اپنے درمیان بانٹ لیں گے۔ یہ کس چیز کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ عہدوں کی جنگ۔

اگر انہیں اپنے لوگ عزیز ہوتے تو یہ سڑک مشرف کے دور میں نہیں اس سے بہت پہلے بن چکی ہوتی۔ نواز شریف نے موٹر وے نہیں یہ سڑک بنوائ ہوتی۔ اس وقت تو بگتی زندہ تھا اور شریف جیسے محب وطن لوگ حکمران تھے۔

لیکن یہ توفیق مشرف کو ملی۔ اور اب انکے جانے کے بعد یہ سڑک پھر ویران ہے۔  اسپر چلنے والے ٹرالر اور ٹرکس  ابھی رواں بھی نہ ہوئے تھے کہ رک گئے۔ نجانے وہ پہئیے کب چلیں گے جو ترقی کے خوابوں کو ہر آنکھ میں بانٹیں گے اور انکی تعبیریں ہر گھر میں نظر آئیں گی۔ یا یہاں کے لوگ پھر اپنے دشمنوں کو اپنا مہربان سمجھتے ہوئےانکے ہاتھوں کو چومتے رہیں گے۔ کیا بلوچ عوام اب بھی نہیں سمجھیں گے کہ آزادی کے جو جھوٹے خواب یہ انہیں دکھا رہے ہیں یہ  دراصل انکے تا ابد قائم رہنے والی آقائیت کے خواب ہیں۔  یاایسا ہے کہ

جو ہاتھ کھیلتے ہیں ان سے توڑتے ہیں انہیں

کچھ ان سے ہوتے ہیں مانوس تو کھلونے بھی

ریفرنس؛

شائع شدہ سفر نامہ

 یہ انکے دئیے ہوئے لنک کے ساتھ کچھ مسئلہ ہے۔ بہر حال اسکی پہلی قسط ۲۲ اکتوبر ۲۰۰۸ کو شائع ہوئ۔ اور یہ شاید نو قسطوں پر مشتمل ہے۔ آپ اسے دئیے ہوئے لنک پر جا کر تلاش کرسکتے ہیں۔

کوسٹل ہائ وے

8:53 AM

coastal high way, gwadar, Khan of Kalat, Nawab Bugti, مشرف، بگتی، کوسٹل ہائ وے،

یوم فوٹو گرافی

قصہ گوادر میں ایک صبح مچھلی پکڑنے کا، بزبان تصویر۔

وقت؛ دسمبر، ۲۰۰۸

ہم جائے وقوع پر پہنچے تو سورج نکل رہا تھا۔

ناشتہ کیا گیا۔

 دادا جی اور انکی پوتی نے تصویریں بنوائیں۔

  اب ذرا فشنگ راڈ سیٹ کر لی جائے

  مدد چاہئیے جناب۔

ہمیں تو یہاں مزہ آرہا ہے۔

 یہ جگہ بڑی اچھی ہے۔ دور تک نظر آرہا ہے۔

۔

کیا بوریت ہے

ارے یہ تو مچھلی پکڑی گئ۔

7:39 AM

a fishing day, gwadar, گوادر، گوادر میں مچھلیاں،

یوم ٹیگ

آپ کا نام یا نک؟ اگر اصل نام شیئر کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔

میرا نام عنیقہ ناز ہے۔ بعض لوگ الجھن کا شکار لگتے ہیں کہ یہ شاید انیقہ ہے۔ اس لفظ کے دو منبع ہیں۔ ایک فارسی اور دوسرا عربی۔ انیقہ فارسی کا لفظ ہے۔ اگرچہ اسے فارسی ذریعے سے لیا گیا لیکن میرے ابا نے اسے عربی کے طریقے یعنی ع سے لکھنا پسند کیا۔ مجھے انکی پسند ، پسند ہے۔ اپنے اماں اور اباکی جانب سے دئیے گئے اس نام کو میں نے شادی کے بعد بھی تبدیل نہیں کیا جیسا کہ آجکل رواج ہے۔

آپ کے بلاگ کا ربط اور بلاگ کا نام یا عنوان؟ بلاگ کا عنوان رکھنے کی کوئی وجہ تسمیہ ہو تو وہ بھی

شیئر کر سکتے ہیں۔

میرے بلاگ کا نام ہے شوخی ء تحریر۔ اسکی کوئ وجہ ءتسمیہ نہیں۔ بلاگ بناتے ہوئے جس وقت یہ کالم سامنے آیا غالب کا ایک شعر ذہن میں آیا۔ جس سے یہ نام نکالااور لکھ دیا۔

آپ کا بلاگ کب شروع ہوا؟

یہ مئ ، دو ہزار نو میں شروع کیا۔

آپ اپنے گھر سے کون سے ایک ، دو یا زائد لوگوں کو بلاگنگ کا مشورہ دیں گے یا دے چکے ہیں؟ ربط پلیز

نہیں کسی کو مشورہ نہیں دیا۔

سب اتنے مصروف رہتے ہیں کہ میرے اس مشورے پر میری پٹائ لگ سکتی ہے، لفظوں سے۔

کوئی ایک ، تین یا پانچ یا زائد ایسے موضوعات جن پر لکھنے کی خواہش ہے مگر ابھی تک نہیں لکھ سکے یا آئندہ لکھنا چاہیں ؟

ابھی تو لکھتے ہوئے کچھ ہی عرصہ ہوا ہے۔ موضوعات بہت ہیں۔ تیسری دنیا میں رہنے کا فائدہ یہ ہے کہ کبھی موضوعات کی کمی نہیں ہو سکتی۔

آپ کا بلاگ اب تک کس کی بدولت فعال یا زندہ ہے ؟ آپ خود یا کوئی دوسرا نام ؟ (مؤخرالذکر کی صورت میں نام بھی لکھ دیں۔ اگر ربط دیا جا سکتا ہے تو ربط بھی)

میرا خیال ہے کہ ابھی تک اسکے فعال ہونے کی وجہ میری مستقل مزاجی ہے۔یقینی طور پر اسکی دوسری وجہ وہ تبصرہ نگار ہیں جو اپنا دل کی بورڈ کے ذریعے نکال کر رکھ دیتے ہیں۔ پھر ان لفظوں کو جوڑ کر دوبارہ دل بنانا یہ کسی جگسا پزل سے کم نہیں۔ مجھے مزہ آتا ہے۔

اپنے موبائل سے کم از کم کوئی ایک ، تین یا پانچ اچھے ایس ایم ایس شیئر کریں

مجھے موبائل فون ایک آنکھ نہیں بھاتا ہے۔ اور یہ لکھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ میں فیس بک پر ایک گروپ بنا سکتی ہوں۔ آئ ہیٹ موبائل فون۔ ارد گرد پچاس لوگ بیٹھے ہوں مگر آپ کسی ایسے شخص سے مشین کے ذریعے بات کرنے میں مصروف رہتے ہیں جو خدا جانے کس کرہ ء ارض پہ ہوتا ہے۔

آپ کی اردو زبان سے دلچسپی کس نام کے سبب سے ہے ؟ (استاد ؟ گھر کا کوئی فرد؟ یا کوئی دوسرا نام؟ یا کوئی الگ وجہ ؟)

میری مادری زبان اردو ہے۔ میرے والدین میں سے ایک کا تعلق لکھنوء سے ہے۔ اب بھی اس میں دلچسپی نہ لوں تو مرحوم نانا بڑے لتے لیں گے۔

کیا آپ اردو بلاگ دنیا روزانہ وزٹ کرتے ہیں اور مختلف بلاگز کسی ترتیب سے وزٹ کرتے ہیں یا جو بھی بلاگ سامنے آ جائے؟

اپنا بلاگنگ روٹ شیئر کریں ۔

میں اردو سیارہ پہ تقریباً روزانہ آتی ہوں۔ کوئ خاص ترتیب نہیں۔ کسی کا موضوع دلچسپ لگے تو ضرور پڑھتی ہوں ۔ چاہے اس سے میرا نظریاتی اختلاف جتنا بھی ہو۔ تقریباً ہر نئے پرانے بلاگر کو پڑھ لیتی ہوں۔ سوائے اسکے کہ اسکا بلاگ کھلنے میں بہت وقت لگ رہا ہو۔ وقت کی کمی ہے جناب۔ جیسے شاہدہ اکرم اور راشد کامران کا بلاگ میرے پاس بڑی مشکل سے کھلتا ہے۔ ڈفر بھی خاصہ ٹائم لیتے ہیں۔ خود اردو سیارہ پانچ دفعہ کلک کرنے سے پہلے نہیں کھلتا۔

آپ کے بلاگ پر پہلے پانچ یا دس تبصرہ نگار کون سے تھے؟

مشکل سوال ہے، محض یادداشت پہ بتا دیتی ہوں کہ اسوقت خاصی کاہلی ہو رہی ہے جاکر دیکھنے میں۔ یہ ہیں اجمل صاحب، جعفر، ڈفر، عبداللہ، جویریہ طارق، م م مغل، ابو شامل، نومان۔ اور بھی ہیں کرم فرما ابھی یاد نہیں آرہا۔

ہفتہ بلاگستان یا اردو بلاگ دنیا سے مختلف تحریروں پر ہونے والے تبصروں میں سے چند دلچسپ یا مفید تبصرے شیئر کیجیے۔ ربط دینا نہ بھولیں ۔

چھٹی کرنی پڑے گی ایکدن کی اسے نکالنے میں۔ لیکن کچھ لوگ جو تبصرہ کرتے وقت بھی چھان پھٹک سے کام لیتے ہیں ان میں جاوید گوندل، عبداللہ، ابو شامل اور نومان شامل ہیں کچھ لوگ جو فوراً اپنی تحریروں سے متعلق چیزوں پر رد عمل ظاہر کرتے ہیں۔ ان میں جعفر اور ڈفر ہیں۔ شاید باقی لوگ بھی کریں لیکن میں نے انکی تحریروں پہ کچھ لکھا نہیں اسلئے نہیں کیا ہوگا۔

ہفتہ بلاگستان یا اردو بلاگ دنیا سے مخلتف تحریروں سے منتخب جملے جو آپ کو پسند آئے ہوں یا جنہیں آپ تعمیری اور مفید سمجھیں۔ (اگر تعداد معین کرنا چاہیں تو تین ، پانچ ، دس یا جتنے مرضی)

اسکے لئے بھی ایک اور چھٹی چاہئیے ہوگی۔ سب گھر والے میرا بائیکاٹ کر دیں گے۔ ابھی بالکل ماضی قریب میں ایک جملہ پڑھا تھا۔ پلے نہیں ہے دھیلہ، کردی پھرے ایں میلہ میلہ۔

اور ہاں ایک شعر جو میں نے اپنے پاس لکھ بھی لیا تھا۔

یہی کہا تھا کہ برسوں کا پیاسا ہوں فراز

اس نے میرے منہ میں پائپ ڈالکر موٹر چلا دیا

اب نہیں معلوم کہ یہ کتنے تعمیری یا مفید ہیں۔ میں انہیں پڑھکر کافی دیر ہنستی رہی۔ ویسے اس سوال کے جواب میں ایک طویل پوسٹ لکھی جا سکتی ہے۔ اور بھی لکھنے والے بہت اچھے ہیں۔ ان سب کی باتوں کو نظر انداز کرنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ لیکن فی الحال کوئ ایسا طریقہ نہیں بن رہا کہ دریا کو کوزے میں بند کر دوں۔ ایک ترکیب جسے میں نے کافی سارے لوگوں کو بتایا بھی 'جسم کے خفیہ حصے'۔ جعفر کے کئ جملوں پہ میں پوری پوسٹ لکھ چکی ہوں۔ ڈفر کے بھی کچھ جملے بڑے پسند آئے۔ اجمل صاحب، راشد کامران، خرم بھٹی انکے بھی کچھ جملے ذہن میں آرہے ہیں۔ وارث صاحب نے جو مثویاں غالب کی نکالیں۔ زبر دست ہیں۔ وارث صاحب اور محمد احمد کی غزلیں بہت اچھی۔ لیکن وہ اشعار صحیح سے یاد نہیں آرہے۔ کہاں تک سنوگے کہاں تک سنائیں۔

ہفتہ بلاگستان کے بعد اب ہم “یوم بلاگستان” منایا کریں گے آپ کے خیال میں “یوم بلاگستان” ہر ہفتہ میں ایک دن منایا جائے یا ہر ماہ میں ایک دن منایا جائے؟

بڑا مشکل سوال ہے یہ بھی۔ ہفتہ ء بلاگستان میں بڑا خیال رکھنا پڑا کہ کچھ نہ کچھ لکھ ضرور دیں ورنہ باقی بلاگرز کہیں گے کہ پتہ نہیں کیا سمجھتی ہیں خود کو، ہونہہ مغرور کہیں کی۔ پس یہ ثابت کرنے کے لئے کہ یہیں کی ہوں۔ اسکے لئے بھی وقت نکالا۔ یوم بلاگستان، میرا خیال ہے ہفتہ ء بلاگستان ہی بہتر رہے گا۔ اور وہ بھی ہر سال یوم آزادی کے موقع پر۔

مختلف بلاگرز کو کوئی شعر یا جملہ انہیں ٹائٹل کے طور پر منسوب کریں۔

یہ کچھ اشعار ہیں۔ ان میں سے پہچان پر ہے ناز تو پہچان جائیے۔ آپ نکال لیں۔ میں لکھ رہی ہوں۔

خط لکھیں گے گر چہ مطلب کچھ نہ ہو

ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

مشہور ہیں سکندر و جم کی نشانیاں

اے داغ چھوڑ جائیں گے ہم یادگار دل

طوفاں ہے تو کیا غم مجھے آواز تو دیجئیے

کیا بھول گئے آپ میرے کچے گھڑے وہ

ہمیں ہی جراءت اظہار کا سلیقہ ہے

صدا کا قحط پڑے گا تو ہم ہی بولیں گے

بوجھی ہیں اس نے کیسے نظر کی پہیلیاں

وہ شخص تو بلا کا نظر نا شناس تھا

ہر نظر بس اپنی انپی روشنی تک جا سکی

ہر کسی نے اپنے اپنے ظرف تک پیایا مجھے

ہم کیا جانیں یار سلیم نفرت کیسی ہوتی ہے

ہم بستی کے رہنے والے شہر میں آئے پہلی بار

فضا میں پھیل چلی میری بات کی خوشبو

ابھی تو میں نے ہواءووں سے کچھ کہا بھی نہیں

میں خود ہی جلوہ ریز ہوں خود ہی نگاہ شوق

شفاف پانیوں پہ جھکی ڈال کی طرح

اس راہ سے گذر جاتے ہیں طوفان کی مانند

رکتے ہیں جہاں گردش دوراں کے قدم بھی

دلنوازی کے فن جاننا چاہئیے

حسن چاہے بہت خوبصورت نہ ہو

یہی انداز ہے میرا سمندر فتح کرنے کا

میری کاغذ کی کشتی میں کئ جگنو بھی ہوتے ہیں

دئیے بجھاتی رہی، دل بجھا سکے تو بجھائے

ہوا کے سامنے یہ امتحاں رکھناہے

اب اس سے کیا کیجئیے شکو ہائے کم نگہی

بہت دنوں میں تو اس نے ادھر نظر کی ہے

زمانہ دیکھا ہے ہم نے ہماری قدر کرو

ہم اپنی آنکھوں میں دنیا بسائے بیٹھے ہیں

بولے تو سہی جھوٹ ہی بولے وہ بلا سے

ظالم کا لب و لہجہ دلآویز بہت ہے

اگرچہ کام مشکل ہے مگر یہ کام کرنا ہے

کسی آغاز پہ لا کر اسے انجام کرنا ہے

امیدحور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو

یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں

ہم دعا لکھتے رہے وہ دغا پڑھتے رہے

ایک نکتے نے ہمیں محرم سے مجرم کر دیا

ہفتہ بلاگستان اور بلاگ دنیا میں شامل کوئی بھی اپنی پسند کی تصاویر شیئر کریں جو بلاگرز کی اپنی فوٹو گرافی ہو؟ ربط ضرور دیجیے ۔

انتظار کرنا پڑیگا۔ یہاں وہاں پڑی ہیں۔

کن بلاگرز کو آپ کے خیال میں باقاعدگی سے لکھنا چاہیے ؟

ہر ایک کو باقاعدگی سے لکھنا چاہئیے۔ یہ بھی ایک تاریخ ہے جو آپ رقم کر رہے ہیں۔ آپ جہاں رہتے ہیں جیسا لکھنا آتا ہے جو محسوس کرتے ہیں لکھیں۔ اس بات کا میں آپ کو یقین دلادوں کہ میں آپکو ضرور پڑھتی ہوں۔

بلاگ دنیا میں آپ اپنا کردار کس انداز میں ادا کرنا چاہتے ہیں یا کر رہے ہیں؟

جو میں محسوس کرتی ہوں وہ میں لکھتی ہوں۔ میں اپنے انداز تحریر کو رواں کرنے کے لئے نہیں لکھتی۔ اسکے بارے میں مجھے خاصی خوش فہمیاں ہیں۔ میں کمیونیکیشن کے لئے لکھتی ہوں۔ ہر ایکس وائ زیڈ کیا سوچتا ہے، زبان کو کسطرح لکھتا ہے۔ ایک چیز جسے میں ایک نظر سے دیکھتی ہوں اسے دوسرے کس نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ لوگ عمومی طور پر زندگی کی مختلف سطحوں کو کس طرح برتتے ہیں۔ یہ میری دلچسپی کے میدان ہیں۔ فی الحال تو میں یہاں فیضیاب ہونے والوں میں سے ہوں۔گنتی کے لکھنے والے چند لوگوں میں کوئ کیا کردار ادا کر سکتا ہے۔ جبکہ ان گنتی کے لوگوں نے بھی اپنے بلاکس بنائے ہوئے ہیں۔

ہفتہ بلاگستان کے بارے میں آپ کے تاثرات

اچھا رہا۔

10:58 AM

یوم ٹیگ

کون سی تعلیم

اب وقت ملا کہ کچھ تعلیم پر بھی لکھا جائے۔ سب نے اپنے طالب علمی کے زمانے کو یاد کیا۔ فی الحال میں ان خوش نصیبوں میں سے ہوں جنہیں اب سے تین سال پہلے تک بہت مختصر عرصے کے لئے تدریس سے بھی وابستہ رہنے کا موقعہ ملا وہ بھی پاکستان کی سب سے بڑی جامعہ اور ایک اور پبلک یونیورسٹی میں۔ تو میرے پاس پڑھانے کا بھی تجربہ ہے اور اپنے طالب علموں سے آگاہ ہونے کا ایک ذریعہ بھی۔

اس سے پہلے یہ بتادوں کہ طالب علمی کے زمانے میں اسکولوں کی عمارت سے قطع نظر اور ہمارے ٹوٹے پھوٹے نظام کے باوجود کچھ انتہائ اچھے استاد ملے خاص طور پر اسکول کی سطح پر اور پھر یونیورسٹی میں کہ انکی بدولت دماغ کی گرہیں کھل گئیں۔ میری اردو کی اچھائ ساری کی ساری چھٹی سے میٹرک تک ملنے والی اردو کی ٹیچرز پہ جاتی ہے۔ اسلامیات کے استاد نے گیارہ سال کی عمر میں قرآن ہاتھ میں لیکر مختلف آیتوں اورانکے حوالے اور انکے پس منظر دیکھنے کی عادت ڈالی۔ اور سائنس کے ٹیچر نے جستجو کے جذبے کو ہوا دی۔ جبکہ مطالعہ ء پاکستان کی استاد نے تاریخ سے دلچسپی پیدا کرائ۔ کچھ معاشی اور معاشرتی مسائل کی بناء پر کوچنگ سینٹر اور ٹیوشن پڑھنے کی لعنت سے محفوظ رہے اور اس طرح خود سے تلاش کرنے اور کورس کی کتابوں کے علاوہ کتابں پڑھنے کو ملیں۔ اس نے یقین پیدا کیا اپنے آپ پر۔ جہاں استاد اچھے ملے وہاں قدرت نے بھی کچھ خوبیوں سے نوازا تھا ، جنکو میرے اسکول ٹیچرز نے خاصہ ابھارا۔ یہ میری پی ایچ ڈی کے دوران کا قصہ ہے جب میں نے انسانوں کے مکروہ چہرے زیادہ دیکھے۔ لیکن خیر اندھیرا دیکھنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ اسکے بغیر روشنی کا احساس صحیح سے نہیں ہوتا۔ اسکا ایک فائدہ یہ ہوا کہ لوگوں سے اور ارد گرد کے ماحول سے توقعات رکھنا چھوڑ دیں۔ جو کچھ ہے وہی ہے۔ اور جو خود کر سکتے ہیں وہی ہوگا۔

بہ حیثیت استاد میرے تجربات بہت دلچسپ رہے۔ کیونکہ شومی ء قسمت مجھے پی ایچ ڈی کرنے کا موقع مل گیا تھا اور وہ بھی ملک کے بہترین ادارے سے تو اب لوگ اس چیز سے خائف ہوتے تھے خاص طور پر وہ لوگ جو اپنی اہلیتوں کو جانتے تھے اور علم سے مقابلے کرنے کی بجائے اپنے بےکار انسانی خواص کا مظاہرہ کرنے لگے۔ نجانے کیوں ہمارے معاشرے میں ذہنی مریض اتنے زیادہ کیوں ہیں۔

اپنے سیکشن کے چودہ ٹیچرز میں سے صرف چار کے متعلق میں کہہ سکتی ہوں کہ وہ انسانوں کی طرح سوچ سکتے تھے جبکہ تین کے متعلق مجھے یقین تھا کہ وہ شیزوفرینیا کے مریض ہیں وہ بھی مکمل طور پر اور ان تین میں سے دو کے ساتھ مجھے تین سمسٹر گذارنے پڑے۔ کوئ اور جونیئر ٹیچر انکے ساتھ جانے کو تیار نہ تھا اور میں کسی بھی سیاسی پارٹی کے ساتھ شامل نہ ہونا چاہتی تھی جو سپورٹ دے۔ خیر یہ ایک الگ دلچسپ کہانی ہے۔

سلیبس کی تیاری کے وقت ہمارے سینیئر ٹیچر جو دس پندرہ سالوں سے ٹیچنگ سے وابستہ تھے۔

جس قسم کی تجاویز دیتے تھے۔ انکو سن کر عقل حیران ہوتی تھی۔ مثلاً فرسٹ ایئر آنرز کا سلیبس

ان میں سے کوئ تیار کر کے لایا۔ اسکا معیار اتنا کم تھا کہ مجھے میٹنگ میں کہنا پڑا کہ اس سے بہتر سلیبس توانٹر میں کالج کی سطح پر پڑھایا جاتا ہے۔ انکی بات سنیں۔ کیونکہ کالجز میں کچھ نہیں پڑھایا جاتا اس لئےکورس کو آسان رکھنا چاہئیے۔ تاکہ آنیوالے اسٹوڈنٹس کو پریشانی نہ ہو۔

میں اور میری ایک اور جونئیر ساتھی نے کہا کہ یہ ہماری ذمہ داری نہیں ہے کہ اسٹوڈنٹس کو کالج میں کسطرح پڑھایا جا رہا ہے۔ ہمیں یونیورسٹی کو دیکھنا چاہئیے۔ یونیورسٹی کی سطح پر کورسز کو دیگر بین الاقوامی یونیورسٹیوں کے معیار کا ہونا چاہئیے ۔ اسٹوڈنٹس کے اوپر دباءو پڑنا چاہئیے کہ وہ پڑھیں۔ یونیورسٹیاں اسٹوڈنٹس کو آسانیاں دینے کے لئے نہیں ہوتی ہیں۔ بلکہ ان میں محنت کی عادت کو ترقی دیکر انہیں کندن بناتی ہیں۔خیر اس بات پر کافی گرم بحث ہوئ۔ کیونکہ سلیبس کو جدیدکرنے کا مطلب یہ تھا کہ انہیں اپنے پرانے نوٹس صحیح کرنے پڑیں اور خود بھی کچھ نئے سرے سے پڑھنا پڑے۔ جبکہ یہ بھی ہماری یونیورسٹیز کا خاصہ ہے کہ استاد کو لآئبریری جانے سے مبرا سمجھ لیا جاتا ہے۔ وہ تو استاد ہیں انہیں سب آتا ہے۔ فی زمانہ استادکی یہ تعریف بھی بدل چکی ہے۔استاد کو بھی علم کی دوڑ میں شامل رہنا پڑتا ہے ہر لمحے، ہر لحظہ۔

کوچنگ سینٹرز اور ٹیوشنز سے فیضیاب ہونے کی وجہ سے اسٹوڈنٹس خود سے کچھ نہیں کرنا چاہتے۔ میں نے دیکھا کہ ہر اسٹوڈنٹ صرف لیکچر تک محدود رہنا چاہتا ہے۔ ریفرنس کی کتابوں کو کھولنے والے اور لیکچر کے مواد پر مشتمل پرابلمز کو حل کرنے میں دلچسپی لینے والے ایک سو بیس کی کلاس میں سے چار پانچ سے زیادہ نہ تھے۔ کسی بھی مضمون کو پڑھکر اسے اپلائ کرنے کی صلاحیت نہ پیدا ہو تو اسکا پڑھنا نہ پڑھنا برابر ہے خاص طور پر سائنس نظریات کو یاد کرنے کا نام نہیں۔ لیکن اب اسٹوڈنٹس اتنے سہل پسند ہو گئے ہیں کہ اگر انہیں کلاس میں مثال کے لئے دو جمع دو چار سکھایا ہے اور امتحان میں تین جمع تین دے دیا جائے تو یہ سوال آءوٹ آف کورس قرار دیا جاتا ہے۔

اسٹوڈنٹس کا دماغ دیگر سرگرمیوں میں اتنا مصروف رہتا ہے کہ بلیک بورڈ سے صحیح مساوات اتارنے میں دشواری ہوتی ہے۔ خود میں نے تو یہ طریقہ بھی رکھا کہ پریکٹیکل کلاسز میں جہاں میرا اندازہ کہتا تھا کہ اس مساوات میں ذرا پیچیدگی ہے اور ان آرام پسندوں میں سے چند ایک کے علاوہ کوئ صحیح اتارنے کے قابل نہ ہو گا۔ اسکے لئے میں چاکلیٹ کا تحفہ بھی رکھتی تھی۔ جی، یہ ہیں ہمارے یونیورسٹی لیول کے طالب علم۔

لڑکے یونیورسٹی میں آکر سیاست کو رعب جمانے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ کیونکہ انہیں پتہ ہوتا ہے کہ نوکری تو بعد میں اماں ابا سفارش سے دلا ہی دیں گے یا پھر اس نظام کو برا بھلا کہہ کر کہہ دیں گے کہ یہاں رکھا کیا ہے۔انہیں تو یہاں سے کاغذ کا ایک ٹکڑا لیکر نکلنا ہے۔ نظام بھی چونکہ آسان طلب لوگوں پر مشتمل ہے اس لئے ایک سو بیس کی کلاس میں جہاں میں سمجھتی ہوں کہ صرف بیس اسٹوڈنٹس بھی بمشکل کامیاب ہونگے۔ وہاں ساٹھ ستر لوگوں کو اضافی نمبر دیکر پاس کرنا پڑتا ہے، ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ کی ہدایت پر۔

ادھر اساتذہ میں ذاتیات کو اہمیت دینے کا یہ عالم کہ ہمارے سینئیر ٹیچر ہم سے نمبروں کی شیٹ منگاتے ہیں اور جس اسٹوڈنٹ کو ہم نے سب سے زیادہ نمبر دئے ہوتے تھے اسکو کہیں ساتویں آٹھویں نمبر پر پہنچا دیتے میرے چھ اسٹوڈنٹس کے ساتھ انہوں نے ایسا کیا۔ محض ان اسٹوڈنٹس سے اپنی ذاتی پرخاش نکالنے کے لئے۔ اور مجھے میری حیثیت جتانے کے لئے جبکہ میں ان نمبروں کو ڈسپلے بورڈ پر لگا بھی چکی تھی۔ ایسا کرتے ہوئے انہیں ذرا بھی احساس ندامت نہ ہوتا کہ وہ بہ ہر حال مجھ سے اور ان بچوں سے بڑے ہیں۔ اور اس طرح وہ کس قسم کی مثال قائم کر رہے ہیں۔

تو جناب نطام کی خرابی میں ہر ایک کا حصہ ہے۔ اور جب تک معاشرے کی سوچ تبدیل نہ ہو فرد واحد کے لئے کچھ کرنا ممکن نہیں۔

میرے ایک بلاگر ساتھی نے اس بات پر مجھے ایچ ای سی کی ڈائریکٹرشپ عنایت فرمائ ہے کہ میں یہ کہتی ہوں کہ یونیورسٹی کی تعلیم ایک عیاشی ہے اور یہ صرف ان لوگوں کے لئے ہوتی ہے جو اسکا رجحان رکھتے ہیں۔ انکا خیال ہے کہ اس طرح طبقاتی فرق پیدا کیا جائےگا۔ جناب تمام ترقی یافتہ ممالک میں ایسا ہی ہوتا ہے وہاں ہمارے یہاں سے زیادہ طبقاتی فرق نہیں ہے۔ حتی کہ بعض ممالک میں اسکول کی سطح پر ان اسٹوڈنٹس کو مارک کر لیا جاتا ہے جو یونیورسٹی تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

ہماری پبلک یونیورسٹیاں عوام کے پیسے سے اور انکے دئیے گئے ٹیکس سے چلتی ہیں۔ یہاں سے ایسے لوگوں کو سامنے آنا چاہئیے جو ملکی سطح پر اپنی ذات سے کچھ فائدہ پہنچا سکیں۔ نہ کہ یہ سیاست کا گڑھ بن جائیں۔ ویسے بھی یونورسٹیاں بنیادی طور پر تحقیقی ادارے ہوتی ہیں اور کسی قوم کے مستقبل کی ترجیحات کے لئے کام کرتی ہیں۔ اگر وہاں تحقیق نہیں ہو رہی ہے تو ان اداروں کو یونیورسٹی نہیں کہنا چاہئیے۔ اس لئیے ہماری یونیورسٹیاں دنیا میں کسی رینک میں شامل نہیں ہیں۔ ذہین مگر غریب اسٹوڈنٹس کے لئے وظائف کا اجراء ہوتا ہے۔ تاکہ انہیں یہ شکایت نہ ہو کہ انکے ساتھ پیسوں کی وجہ سے امتیاز کیا گیا ہے۔

وہ لوگ جو یونورسٹی تعلیم حاصل کرنے کا رجحان نہیں رکھتے۔ انکو اپنے رجحان کو دیکھتے ہوئے تعلیم حاصل کرنی چاہئیے۔ لوگوں میں روزگار کے حصول میں آسانیاں پیدا کرنے کے لئے ووکیشنل انسٹی ٹیوٹ کا جال بچھانا چاہئیے۔ تاکہ وہ بھی کسی قسم کے احساس کمتری کا شکار نہ ہوں۔

مکینک، ٹیکنیشنز، شیف، پلمبر ، درزی اور اسطرح کے دیگر پیشے، یہ بھی علم کی ہی شاخیں ہیں۔

ان علوم کے لئے بھی ادارے ہونے چاہئیں۔ان میں مہارت حاصل کر کے اس علم کے ذریعے بھی پیسہ کمایا جا سکتا ہے۔

محض یونیورسٹی کی تعلیم کو تعلیم سمجھنا بھی بہت بڑی لا علمی یا بچپنا ہے۔ قدرت نے مختلف لوگوں کو مختلف صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ جس شخص کو حساب کی تھیورمز سمجھنے سے دلچسپی نہیں یا وہ انٹرنیشنل افئیرز نہیں جاننا چاہتا۔ وہ ایک ناکارہ انسان تو نہیں۔ انکی دیگر صلاحیتوں کی قدر کر کے ہی انہیں کارآمد شہری بنایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ کسی بھی قسم کی تعلیم کا بنیادی مقصد یہی ہوتا ہے۔ زیادہ شعور اور زیادہ دیکھنے کی صلاحیت، اس میڈیم یا راستے سے جو آپکو دلچسپ لگتا ہو۔ یہ آپکی ذہانت اور خوش قسمتی ہے کہ آپ اسے اپنے ذریعہ ء روزگار میں تبدیل کر لیں۔

ریفرنس؛

میرے ایک بلاگر ساتھی

5:56 AM

HEC pakistan, karachi University, pakistani universities, جامعہ کراچی، ایچ ای سی پاکستان،

کچھ پکائیں

میرے ایک سینیئر کولیگ کا خیال تھا کہ کچھ لوگ اپنے دانتوں سے اپنی قبر کھودتے ہیں۔ پڑھنے میں تو یہ خاصہ مشکل کام لگتا ہے لیکن دانت سے قبر کھودنے میں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی۔ جو الابلا سامنے آئے کھا لیں۔ خاص طور پر وہ اشیاء جو رنگین ہوں یا وہ جن میں خوب مرچ مصالحہ پڑا ہو۔ لیکن پھر بھی کچھ لوگ لا علمی میں مارے جاتے ہیں۔ تو یہ چند ایک بصیحتیں انکے لئے ہیں۔ باقی جنہوں نے تہیہ کیا ہوا ہے کہ کچھ کھا کر ہی مرنا ہے تو وہ اپنی پرانی ستمگر مشقیں جاری رکھیں۔

بظاہر رنگین کھانے بڑے اشتہا انگیز لگتے ہیں۔ بریانی میں پیلے چاول، پیلا یا رنگ برنگا زردہ، رنگ برنگی آئسکریم اور اس طرح کی لا تعداد چیزیں جن کو مزید اشتہا انگیز بنانے کے لئیے ان میں خوشبوئیں مثلاً کیوڑہ کا ایسنس یا دیگر ایسنسن بھی ڈالے جاتے ہیں۔

یہ تمام رنگ اور خوشبوئیں مصنوعی طریقوں سے تیار کئے جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں زیادہ تر فوڈ کلر کے بجائے کپڑے رنگنے والے رنگ استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ کینسر پیدا کرنے کی بڑی وجوہات میں سے ایک ہیں۔ حتی کہ فوڈ کلرز اور ایسنس بھی انسانی صحت کے لئے بالکل محفوظ نہیں۔ ان سب سے آپکے جسم کینسر پیدا ہونے کا خطرہ بڑھ سکتا ہے۔ بریانی اور زردہ پیلے رنگ کے بغیر بھی اچھے بنتے ہیں اور بہت دل چاہے تو زعفران استعمال کر لیں۔ بازار میں تیار کیچپ میں سرخ رنگ ملا ہوتا ہے۔ ہری چٹنی میں ہرا رنگ، ریسٹورنٹ میں تیار ہرے چکن میں ہرا رنگ۔ تو اس قماش کی تمام چیزِیں آپ خود عمومی ذہانت استعمال کرتے ہوئے نکال لیں۔ اور اپنی زندگی سے بھی نکال دیں۔ یا انکی مقدار بہت کم کر دیں۔

آج میں آپکو بغیر کسی لاگ لپٹ کے اصلی بڑے کے پائے بنانے کی ترکیب بتا رہی ہوں۔جسکو بنانا آتے ہیں وہ وقت ضائع نہ کرے۔ جنہیں پسند نہیں وہ اسکے فوائد ضرور جان لیں۔

درکار اشِاء

؛

بڑے کے پائے دو عدد۔ جتنے بڑے جانور کے ہوں زیادہ مزے کے بنتے ہیں۔ اگر بھینس کے نہ ملیں تو بڑی گائے کے اور دیکھ کر موٹے اور بڑے لیں۔ قصائ سے صاف کروا لیں۔ جان چھٹے گی اور وقت بچے گا۔

ایک پریشر ککر میں اچھی طرح دھو کر ڈال دیں۔ دو چائے کے چمچ ہلدی اور دو چائے کے چمچ نمک بھی ڈالدیں۔ اب اس میں تین گنا پانی پائے کے مقابلے میں وہ بھی جمع کر دیں۔ اور اپنے ککر کی کارکردگی کو سامنے رکھتے ہوئے گوشت کے مقابلے میں دگنے وقت کے لئے چولہے پر رکھدیں۔ یہ گوشت جس سے مقابلہ کیا جا رہا ہے۔ نہاری کا یا بونگ کا گوشت ہے۔۔ بیچ میں شبہ ہو کہ پانی کم نہ ہو رہا ہو تو اسےبند کر کے چیک کر لیں۔ پائے اتنے گل جانے چاہئیں کہ نہ صرف گوشت، ہڈی سے بآسانی علیحدہ ہو جائے بلکہ شوربے میں چپچپاہٹ اچھی طرح محسوس ہو جب آپ اسے اپنی دو انگلیوں کے درمیان دبا کر کھولیں۔ یاد رہے اچھی طرح گلے ہوئے پائے کامیاب ڈش کی طرف ضروری قدم ہے۔

گل جانے کے بعد شوربے کو چھلنی سے الگ کر لیں۔ گودے والی نلیوں میں سے گودا نکال کر ان نلیوں کو پھینک دیں۔ باقی جو زیادہ بڑی ہڈیاں ہیں ان پر سے بھی گوشت صاف کرکے ، ان ہڈیوں کو بھی ڈسٹ بن میں ڈال دیں۔

تین پاءو پیاز باریک لمبی کاٹ کر تل لیں اور اسے براءون ہونے سے پہلے نکال لیں۔ براءون ہوجانے کی صورت میں شوربے میں کڑواہٹ سی آجاتی ہے اس لئے جیسیے ہی براءون ہونا شروع ہو اتار لیجیئیے۔ایک بڑی گٹھی لہسن کی لے لیں، ڈیڑھ انچ ادرک۔ پیاز لہسن اور ادرک کو ایکساتھ پیس لیں۔ اب اس میں دو کھانے کے چمچ پسا دھنیا، دو کھانے کے چمچ پسی مرچ اور آدھ چائے کا چمچ ہلدی ڈالدیں۔

ایک پتیلی میں آدھ کپ تیل لے لیں اور جب یہ ہلکا سا گرم ہو جائے تو اس میں تیز پتہ کڑ کڑا لیں۔ پسے ہوئے مصالحوں کا پیسٹ اس میں ڈالدیں احتیاط سے۔ اور ہلکی آنچ پہ اسے بھون لیں حتی کہ یہ تیل چھوڑ دے۔ ہلکی آنچ پہ بھوننے سے مصالحے بہترین مزہ دیتے ہیں۔ اب اس میں صاف کیا ہوا پایوں کا گوشت ڈالکر کچھ دیر بھونیں اور پھر جو شوربہ الگ کر کے رکھا تھا اسے بھی شامل کر دیں۔ اگر زیادہ گاڑھا لگے تو پانی کو ابال کر حسب ضرورت ڈالدیں۔ اور تیز آنچ پہ پکنے دیں۔

جب خوب کھد بد کرنے لگے تو آنچ بالکل ہلکی کردیں یعنی دم والی۔ اب اسمیں ایک کھانے کا چمچ پسا گرم مصالحہ ڈالدیں ۔ تین چار ہری مرچ کاٹ کر ڈالدیں۔ نمک دیکھ لیں کم ہو تو اور ڈال لیں۔ اگر دن میں پکا کر رات میں کھانے کا ارادہ ہوتو۔ نمک کم رکھیں۔ پائے رکھے رہنے پر نمک چھوڑتے ہیں رات کو گرم کرتے وقت نمک پھر دیکھ لیجئے گا۔ اور دھیمی آنچ ہپر کم ازکم آدھ گھنٹہ پڑا رہنے دیں۔چولہا بند کر کے مزید پندرہ بیس منٹ پڑا رہنے دیں۔ ڈش میں نکال کر ہرے دھنئیے سے سجا لیں۔ ایک الگ پلیٹ میں کٹا ہوا ہرا دھنیا، ہری مرچ اور لیموں کے ساتھ پیش کریں۔ نان کے ساتھ کھائیں۔ پائے ختم ہوجائیں اور شوربہ پھر بھی باقی ہو تو اس میںابلے ہوئے سفید چھولے شامل کرلیں۔ اور کچھ دیر دم پر ہلکی آنچ پہ رکھدیں۔ یہ ڈش گریبی میں تیار ہو جائے گی۔

زیادہ بولنے والے مردوں کے لئے اکسیر ہے۔ زبان تالو سے اور ہاتھ پلیٹ سے چپک جاتے ہیں۔

ریفرنس؛

فوڈ کلرز

12:26 PM

Food colors, Food essences, فوڈ کلرز، پائے کی ترکیب،

کم بخت شہرت

میں گاڑی میں بیٹھی ڈرائیور کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ کم بخت سموسے خرید رہا ہے کہ بیچنے لگا۔ اچانک ایک دبلا پتلا لڑکا عینک پہنے ہوئے اچھے خاصے حلئیے میں میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ باجی، اس نے مسکین بھرے لہجے میں آواز نکالی۔ اسے دیکھ کر مجھے اور غصہ آیا۔ ایسے حلئیے میں بھی بھیک مانگ رہے ہیں۔ ان معاملات میں، میں خاصی روائیتی ہوں۔ میں نے منہ پھیر لیا ، باجی وہ دوسری طرف آگیا۔ مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہئیے۔ بس تھوڑی سی۔ کیا تھوڑی سی۔ میں نے دانت پیسے۔ ایک دفعہ پھر اس ڈرائیور کو کمبخت کہا۔ بس باجی تھوڑی سی۔ ارے کیا تھوڑی سی، تھوڑی سی ہیروئین دیدوں۔ نہیں ہے میرے پاس۔ میں نے منہ بائیں طرف پھیر لیا پھر کچھ خیال آیا۔ میں ہیروئین نہیں بیچتی، ایک لحظہ اور سوچا اور مزید کہا اور خریدتی بھی نہیں۔ بھاگو یہاں سے۔ باجی ہیروئین نہیں چاہئیے۔ بس تھوڑی سی مشہوری چاہئیے۔ہائیں ۔ میں نے اسے ابھی حیرانی میں صحیح سے گھورا بھی نہ تھا کہ اتنی دیر میں ڈرائیور سموسے بیچ اور خرید کرواپس آگیا۔ گاڑی چل پڑی، میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس نے اپنا منحنی ہاتھ ہلایا۔ مجھے یقین ہو گیا اگر اسی استقامت سے وہ یہ کرتا رہے اور دو تین گھنٹے روزانہ اس میں لگا دے تو کوئ شک نہیں کہ آئندہ دو تین مہینوں میں وہ مشہور نہ ہوجائے۔

آخر شہرت کیا ہے؟ ایسے لوگوں کا آپکو جاننا جنہیں آپ بالکل نہیں جانتے اور جن کا آپ کو خیال بھی نہیں آتا۔ لیکن پھر بھی لوگ اسکی خواہش کرتے ہیں۔ کچھ لوگ پیدائشی مشہور ہوتے ہیں جیسے بلاول بھٹو زرداری اور شہزادہ چارلس، کچھ کو شہرت بڑی محنت اور منصوبہ بندی کے بعد ملتی ہے جیسے زرداری صاحب، کچھ لوگوں کے اوپر شہرت ٹھونس دی جاتی ہے جیسے آپکا نواز شریف۔ اتنے پپو لگتے ہیں، انکو دیکھکر خیال آتا تھا کہ خدا گنجے کو اگر ناخن دیتا ہے تو اسے ایک مشرف بھی عنایت فرما دیتا ہے۔ مگر اباجی کے مرحوم ہو جانے کی وجہ سے اب پھر صرف ناخن رہ گئے ہیں۔ اچھا خیر، معذرت، آپ لوگوں کو اندازہ تو ہے کہ میں کتنی جلدی پھسل جاتی ہوں۔ ہمارے غالب ٹھونسی ہوئ شہرت کے بہت خلاف تھے۔

انکی موت کسی اور کے لئے باعث شہرت نہ بن جائے تو احتیاطاً انہوں نے اپنے انتقال پر ملال کے بعد کے لئے ایک وصیت بھی کر دی تھی،

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل

میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

ویسے تو ہمارے یہاں ہر طرح کے شوقینوں کی کچھ کمی نہیں تھی۔ لیکن یہ شہرت کا انفیکشن شاید ٹیکنالوجی کے پھیلاءو کی وجہ سے ایکدم پھیل گیا ہے۔ یہاں شوقین ہر طریقہ آزما رہے ہیں۔۔کوئ گا بجا کر، کوئ تعلیم حاصل کر کے، کوئ کاروبار میں، کوئ افئیر چلاکر، کوئ ظلم کے نئے باب رقم کر کے، کوئ مظلومیت کے اعلی درجوں پہ پہنچ کر، کوئ حسین نظر آکر ، کوئ ذہین ثابت کر وا کے، کوئ بہت مذہبی بن کر اور کوئ بالکل آزاد ہوکر۔ اور ہاں کوئ لکھ کر، کمپیوٹر پر، اخباروں میں، دیواروں پر، لکھیں گے گر چہ مطلب کچھ نہ، ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے ۔۔

شہرت کی خواہش رکھنا جوان ہونے کی علامت ہے۔ ابھی میں نوجوانوں کے ایک فورم سے گذری ہوںجن کی عمرین پندرہ سولہ سال کے لگ بھگ ہونگیں ۔ سب کے اندر ایک قدر مشترک تھی۔ سب مشہور ہونا چاہتے ہیں۔ یہ شاید فیشن میں ہے آجکل اور نوجوانوں سے زیادہ کس کو فیشن کی فکر رہتی ہے۔ ابھی ایک نوجوان شکوہ کر رہے تھے۔ میری کوئ گرل فرینڈ نہیں۔ میرے سارے جاننے والوں کی ایک نہیں کئ ہیں یہ آجکل فیشن میں ہے۔ سب میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ میں شدید قسم کے احساس کمتری کا شکار ہوں کیا کروں۔ اب اگر ایسے فیشن آرہے ہیں تو میرے جیسی نیک اولادیں کیا مشورہ دے سکتی ہیں جو یہ سمجھتی ہیں کہ پائنچے چھوٹے بڑے ہونا اور قمیضیں اونچی نیچی ہونا ہی فیشن ہے۔ہماری ایک انگریزی بلاگر بھی حیران ہیں کہ یہ اتنے سارے لوگ کیوں مشہور ہونا چاہتے ہیں۔ اب نفسیات داں اسکی کچھ اوٹ پٹانگ وجوہات بتاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ بھی مشہور ہونا چاہتے ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں، ابھی اسکی کوئ ٹھوس وجہ نہیں نکالی جا سکی۔ کیونکہ وہ ابھی کسی ایک بات پر متفق نہیں ہیں۔ ادھر حیاتیاتداں ڈی این اے کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔لیکن ابھی تک وہ بھی شہرت کی جین دریافت کرنے سے قاصر ہیں۔اس لئیے شہرت کے خواہشمند وں کو ہٹ اینڈ ٹرائ پر ہی کام چلانا پڑیگا۔

شہرت حاصل کرنا ہی کچھ کم جان جوکھم کا کام نہیں اسے برقرار رکھنے کے لئے بھی ہر وقت جلتے توے پر کھڑا رہنا پڑتا ہے۔ بالخصوص وہ جنہوں نے شہرت توے پر کھڑے رہ کر حاصل کی ہو۔ ایسے ہی کسی دل جلے نے کہا، شہرت شہد کی مکھی کی طرح ہے، یہ ایک گیت گاتی ہے ایک سہانا گیت، اسکے ڈنک بھی ہوتا ہے۔ لیکن سب سے افسوسناک امر یہ ہے کہ اسکے پر بھی ہوتے ہیں۔ اگر آپ مشہور ہونا چاہتے ہیں تو ایسے دل جلوں کی باتوں پر بالکل دھیان نہ دین۔ تندیء باد مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب، یہ تو چلتی ہیں تجھے اونچا اڑانے کے لئے۔ جیسے جیسے شہرت بڑھتی ہےدل میں ہزار وسوسے بھی جنم لینے لگتے ہیں۔ جہاں بیری ہو وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں جان لیں کہ شہرت اور دولت آنی جانی اشیاء ہیں۔ ہمیشہ قائم رہنے والی چیز حماقت ہے۔ اگر آپ نے شہرت اپنی کسی حماقت کی وجہ سے حاصل کی ہے تو قیاس ہے کہ یہ لوٹ گھوم کر آپکے پاس آتی رہے گی۔

اب جب تک لوگ اس تحریر میں سے کچھ غیر اسلامی نکات کو دریافت کرتے ہیں۔ میں بازار جا کر ایک کتاب تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ اسکا نام ہے مشہور ہونے کے ایک سو ایک طریقے۔ ہمارے ایک  ساتھی کو مشہور ہونے کا بڑا شوق ہے اور مجھے کچھ سوشل ورک کرنے کا۔ اگر  انہیں حسب خواہش شہرت نہ ملی تو ہو سکتا ہے کوئ اور طریقہ کارگر ہو جائے۔ ویسے بھی ہیں لوگ جہاں میں وہی اچھے آتے ہیں جو کام دوسروں کے۔

ریفرنس؛

ہماری ایک انگریزی بلاگر

9:15 AM

پل دو پل کے شاعر

یہ ایک انیس بیس سالہ پل دو پل کی گمنام شاعرہ ہے جہاں اساتذہ کو پڑھتے ہیں۔ وہاں اسکے ایک نامکمل دیوان سے ایک نظم آپکے سب کے لئے۔ عنوان ہے اسکا۔'چاند' ۔ یہ صدیوں سے چاند نے انسانوں کو اپنے سحر میں کیوں رکھا ہوا ہے۔ حالانکہ اب سب کہتے ہیں کہ چاند تو اک ویرانہ ہے۔

کیسا البیلا ہوں، وہ دکھاتا رہا

آسماں اپنی چھب سے سجاتا رہا

چومتا تھا کبھی وادیاں وہ حسیں

کبھی صحرا میں جادو جگاتا رہا

کبھی آیا قریب، کبھی ہوا وہ دور

شوخی ہر موج کو یوں دکھاتا رہا

ایک پل یوں ہوا جاکے تالاب میں

ٹہرے پانی کو چندن بناتا رہا

پھر چھپا جاکے وہ نیم کے پیڑ میں

روشنی سےپر اپنی بلاتا رہا

میں کہ بے چین تھا رات پچھلے پہر

تھپکیوں سے وہ مجھکو سلاتا رہا

کبھی روٹھا بھی، وہ کبھی برہم ہوا

کتنا نادان تھا یوں ستاتا رہا

رات یوں بھی ہوا چاند رویا بہت

چاندنی بن میں پھر بھی لٹاتا رہا

ہیں ستارے بہت آسماں ہے میرا

یہ سناتا رہاچاند گاتا رہا

اتنی تنہائ تھی وہ اکیلا بہت

سنگ دریا کے خود کو بہاتا رہا

چاند ہرجائ ہے کیوں میرا نہ ہوا

چاند سنتا رہا مسکراتا رہا۔

3:22 PM

اردو شاعری

مدد-۲

دو مسائل ہیں،

ایک تو یہ کہ اردو ایڈیٹر کو بلاگسپاٹ پر کیسے ڈالا جائےگا

دوسرے یہ کہ ورڈ پریس پر اردو میں بلاگ کیسے بنایا جائے۔ آپ سب سے التماس ہے کہ اس سلسلے میں اپنے قیمتی مشوروں سے نوازیں۔ جیسا کہ آپ نے پہلے بھی کیا۔ میں آپکی انتہائ ممنون ہونگی۔

12:54 PM

دیدہ ء دل

اقبال کہتے ہیں کہ

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشہ کرے کوئ

ہو دیکھنا تو دیدہء دل وا کرے کوئ

ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر

ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئ

اڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پہ کلیم

طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئ

اس سے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ دیکھنا بھی کئ طرح کا ہوتا ہے۔ ظاہری آنکھ سے دیکھنا بس چیزوں کی ظاہریت پہ سے گذر جانے کا نام ہے یعنی تماشہ کرنے کے برابر ہے۔ ایسا دیکھنا جو کہ دکھائ دینے والی چیزکے اندر سے تعلق جوڑ دے اسے دل کی آنکھ سے دیکھنا پڑتا ہے۔ اور اندر کو دیکھنے کے لئے بڑی طاقت اور برداشت ہونی چاہئیے۔اس میں ہماری عقل بصارت اور عشق بصارت بھی شامل ہے۔ محض اڑے رہنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا

آئنسٹائن نے انیس سو پانچ میں نظریہ اضافت مخصوصہ کے بارے میں اپنا نکتہ ء نظر پیش کرکے لفظ دیکھنے کو ایک نئ جہت دی۔ اس نظرئے کے سائنسی پس منظر سے ہٹ کر اسکی کئ فلسفیانہ اور سماجی تشریحات کی گئیں۔اضافیت مخصوصہ سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ تجربات، واقعات اور ثقافت کے کچھ عناصر کا انحصار دوسرے عناصر پر بھی ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے ایک ہی واقعہ دو لوگ مختلف طرح سے دیکھتے ہیں۔

جیسے یہ ہمارے روزمرہ کے بیانات ہیں،

یہ آپکے لئے صحیح ہو سکتا ہے میرے لئے نہیں۔

خوبصورتی دیکھنے والے کی نظر میں ہوتی ہے۔

آپ دوسروں کی ثقافت کو اپنے معیار سے نہیں جانچ سکتے۔ اس لئے کبھی کبھی یہ بھی سنائ دیتا ہے کہ مطلق سچائ کوئ چیز نہیں۔ سچ بھی کچھ دوسری حقیقتوں کے تعلق سے جڑا ہوتا ہے۔ کیا سچ بھی ایک اکتسابی علم ہے۔ یہ ایک دلچسپ بحث ہو سکتی ہے۔

دنیا کی مختلف ثقافتوں کا ایک تقابلی جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ کسطرح ایک ثقافت میں رائج العام چیز دوسری ثقافت میں اپنے ماحول اور ضروریات کے حساب سے ایک بالکل تناظر میں لی جاتی ہے۔

ایک دلچسپ مثال اسکیمو ہیں جو دنیا کے سرد ترین مقام انٹارکٹیکا میں رہتے ہیں۔ یہ سارا سال برف سے ڈھکے رہنا والا وہ مشکل مقام ہے جہاں میلوں آبادی کے آثار نہیں ہوتے۔ اسکیمو برف کے بنے ہوئے گھروں میں رہتے ہیں جنہیں اگلو کہا جاتا ہے۔اگر انکے پاس کوئ مسافر بھٹکتا ہوا پہنچ جائے تو وہ اسے گرم کمرہ، کھانا پینا اور وقت گذارنے کے لئے اپنی بیوی بھی دیتے ہیں۔

یوں تو خواتین کے پردے کے بارے میں خاصی بحث ہوتی ہے مگر ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ افریقہ میں ایک قبیلہ ایسا بھی ہے جہاں مرد پردہ کرتے ہیں۔ خود ہماری داستانوں میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انکے بے مثال حسن کی انسانی نظر تاب نہ لا سکتی تھی اس لئے وہ ہمہ وقت ایک نقاب پہنے رہتے تھے۔ اس لئے غالب نے فرمایا کہ

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنان مصر سے

ہیں زلیخا خوش کہ محو ماہ کنعا ں ہو گئیں

خیر اس تحریر کا مقصد اس وقت مختلف ثقافتی اختلافات اور انکی وجوہات پہ غور کرنا نہیں۔ یہ میں اپنے قاری کی صوابدید پر چھوڑتی ہوں کہ وہ اپنے ارد گرد کی دنیا سے ایسی مثالیں نکالیں اور انکی ممکنہ وجوہات تلاش کریں۔

دانشوروں کا کہنا ہے کہ غیر جانبدار نظرایک امر محال ہے۔ لیکن اسکے ساتھ ہی ساتھ اگر انسان دنیا کو جیسی وہ ہے اسی طرح دریافت کرنا چاہتا ہے تو اسےہر قسم کےذہنی اور فکری تعصبات حتی کہ بعض جگہ اپنے آپ کو بھی الگ کر کے سوچنا پڑے گا۔ شاید اسے ہی مراقبہ کہتے ہیں۔ جس کے بعد گوتم بدھ کو نروان حاصل ہوا۔

ہم واپس اپنے موضوع یعنی دیکھنے کی طرف آتے ہیں۔ ایک چیز نظر بندی کہلاتی ہے۔ سامنے چیز موجود ہوتی ہے مگر نظر نہیں آتی۔ اسی کے لئے شاید یہ محاورہ بنایا گیا کہ

بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورا۔ اسکی مثال دیکھنا ہو تو ایچا کی پینٹنگز دیکھنا پڑیں گی۔ میرا اندازہ ہے کہ اس ڈچ نژاد مصور کا نام اردو میں شاید اسی طرح لکھا جائے۔

آخری تصویر جسکا نام ہے بارہ گھڑسوار، اس میں اگر ہم میں سے کچھ لوگ پہلی نظر میں ایک طرف جاتے ہوئے گھوڑے دیکھتے ہیں اور کچھ دوسری طرف جاتے ہوئے۔ جبکہ کچھ پہلی ہی نظر میں دونوں طرح کے گھوڑے دیکھ لیتے ہیں۔ درمیانی تصویر کا نام ہے۔

Escher's relativity

اس تصویر میں مختلف جہتوں میں جاتی ہوئ سیڑھیاں نظر آ رہی ہیں۔ جن پر لوگ بھی موجود ہیں۔ مختلف جہتوں میں جانےوالے لوگوں کو ایک ہی فریم میں موجود چیزیں ایک جیسی نہیں نظر آئیں گی یہ تو ہم اندازہ کر سکتے ہیں۔ لیکن مشکل بات یہ ہوتی ہے کہ ہم ایک جہت کی سیڑھیاں چلنے کے بعد اگر دوسری جہت کی سیڑھی پہ قدم رکھیں تو ہمیں کتنا وقت لگے گا کہ ہم پچھلی جہت کے سمتی اثر سے باہر نکل پائیں اور اگر ہمیں دوسری جہت کی سمت کی سیڑھیاں چلنے کا طبعی موقع نہ مل پائے تو کیا ہم اتنی اہلیت رکھتے ہیں کہ محض اپنے تخیل سے اس دوسری جہت میں جاکر اسی فریم کو اس جہت کے حساب سے دیکھ سکیں۔

اس موضوع پر ایک اچھی بحث ممکن ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اپنی زندگی سے یا اپنے سنے ہوئے قصوں کو اس میں شامل کر سکتے ہیں۔ جب تک میں بلھے شاہ کی کافی سنتی ہوں۔ بلھے شاہ کی جاناں میں کون۔

ریفرنس؛

البرٹ آئنسٹائن

Albert Einstein

(pronounced

/ˈælbərt ˈaɪnstaɪn/

;

German:

[ˈalbɐt ˈaɪ̯nʃtaɪ̯n]

; 14 March 1879 – 18 April 1955) was a

theoretical physicist

. He is best known for his theories of

special relativity

and

general relativity

. Einstein received the 1921

Nobel Prize in Physics

"for his services to

Theoretical Physics, and especially for his discovery of the law of the

photoelectric effect

."

نظریہ ء اضافت مخصوصہ کے بارے میں مزید معلومات مندرجہ ذیل لنکس پہ مل سکتی ہے

The theory is termed "special" because it applies the

principle of relativity

only to

frames in uniform relative motion

.

The term often refers to

truth

relativism

, which is the doctrine that there are no

absolute truths

, i.e., that truth is always relative to some particular frame of reference, such as a language or a culture. Another widespread and contentious form is

moral relativism

.

افریقہ میں موجود قبائل جہاں مرد پردہ کرتے ہیں انکے بارے میں تفصیلات اس کتاب میں موجود ہیں۔

Veiled Men, Red Tents, and Black Mountains

The Lost Tomb of Queen Tin Hinan

Series: Adventure & Exploration - 70

ISBN: 1-58976-206-1

ایچا کا تعارف

http://www.math.wichita.edu/history/men/escher.html

Maurits Cornelis Escher

(17 June 1898 – 27 March 1972), usually referred to as

M.C. Escher

(

Dutch pronunciation:

[ˈɛʃə]

was a

Dutch

-

Frisian

graphic artist

.

2:25 AM

Escher's painting. Albert Einstein, Theory of relativity, آئنسٹائن کا نظریہ ء اضافت، اقبال، ایسکر کی تصویریں،

میرے بچپن کے دن

بچی نے نہایت معصومیت اور تشویشناک لہجے میں اپنی ماں سے پوچھا۔ ' اماں، جب میں چلتی ہوں تو چاند میرے ساتھ چلنے لگتا ہے اورآسمان پر بادلوں کی پہاڑیاں میرے پیچھے بھاگنے کے لئے ایکدوسرے سے ٹکراتی ہیں اور جب میں تیز بھاگنے لگتی ہوں تو زمین کے سب درخت بھی میرے ساتھ بھاگتے ہیں۔ اماں کیا میں انکو بھی اتنی اچھی لگتی ہوں جتنی آپ کو۔

تو جناب، اس بچی کی طرح میں بھی اپنے گھر کے بالکل نزدیک ایک وسیع میدان میں سر شام باقی بچوں سے الگ تھلگ بادلوں، چاند اور سورج کی یہ محبت اکثر جانچتی رہتی۔ اور توقع کے مطابق یہ بالکل ایسے ہی نکلتیں تھیں۔ کچھ دنوں بعد مجھے یہ جان کر اورخوشی ہوئ کہ نانی کے گھر کے پاس جو چاند اوربادل ہیں وہ بھی مجھ سے کم محبت نہیں کرتے۔ میرا ددھیال سارے کا سارا انڈیا میں تھا اور کچھ سیاسی و معاشی بنیادوں پہ یہ امتحان وہاں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ درختوں کے لئے کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ وہ میدان ایسے ہی لق و دق پڑا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آبادی کے پھیلاءو نے اس میدان کو کھا لیا اور اب وہاں مکان، دوکانیں اور راستے بن گئے۔

ان سب امکانات کے وجود میں آنے کے بعد پتہ چلا کہ اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ اور یہ کہ ہر صبح سورج مجھے جگانے کے لئے نہیں اٹھتا بلکہ یہ اس کا اپنا لگا بندھا معمول ہے جس میں کچھ سائنسی اصول کارفرما ہوتے ہیں۔ چاند کی بڑھیا کا چاند سے کوئ تعلق نہیں دراصل جھوٹ تھا جو کچھ کہ سنا ، جو سنا افسانہ تھا، چاند میں سچ مچ نور کہاں چاند تو ایک ویرانہ ہے۔ یہ جھلملاتے ستارے تو دہکتی آگ کے گولے ہیں۔ اور یہ آسمان پرہر وقت شکلیں بدلتے بادل جو کوہ قاف کا منظر پیش کرتے ہیں۔ یہ تو صرف پانی کے بخارات کا مجموعہ ہیں۔ اسی طرح کے تلخ حقائق نے رفتہ رفتہ ان جاں نثار دوستوں سے بھی محروم کردیا۔

انہی دنوں میں تتلیوں کے پیچھے محض یہ جاننے کے لئے بھاگا کرتے تھے کہ یہ شاخ شاخ سرگرداں کس کی جستجو میں ہیں، کونسے سفر میں ہیں۔ اسی اندھا دھند جاسوسی میں کئ دفعہ کیچڑ میں جا کر گرے مگر تتلیوں نے کھل کر نہ دیا۔ یہ راز بھی بعد میں کسی کتاب سے معلوم ہوا۔ میں نے انہیں پکڑنے کی کوشش کبھی نہِں کی کیونکہ میرا خیال تھا کہ پکڑنے سے انکے پر ٹوٹ جائیں گے۔ ویسے بھی کراچی میں تتلی نظر آنا بہت ہی نایاب واقعہ ہوا کرتا ہے اور آلودگی بڑھنے کے ساتھ اب تو شاید ہی کبھی نظر آتی ہیں۔

بہت سارے بچوں کے برعکس مجھے یہ امتیاز حاصل رہا کہ مجھے اپنی بہت چھوٹی عمر کے واقعات بھی خاصی صراحت کے ساتھ یاد ہیں۔ میری یاد داشت کی لوح پر جو پہلا نقش ہے وہ تقریباً ڈیڑھ سال کی عمر کا ہے۔ یہ چھوٹا اور معصوم سا قصہ جو میں آپ کو بتانے جا رہی ہوں اس وقت میری عمر تین سال دو مہینے کی تھی۔ میرا ایک بھائ جو مجھ سے تقریباًتین سال چھوٹا ہے اسوقت تین مہینے کا تھا کہ ایک دن محلے میں کچھ خاندانوں نے ملکر کراچی چڑیا گھر جانے کا پروگرام بنایا اور ایکدن سب چل پڑے۔

ہم جیسے ہی چڑیا گھر سے اندر داخل ہوئے، گیٹ کے قریب پہلے انکلوژر کے پاس جمع ہو گئے یہ کوئ باقاعدہ لوہے کی سلاخوں سے بنا انکلوژر نہ تھا بلکہ ایک چوڑی سی, تین چار فٹ اونچی دیوار اٹھی ہوئ تھی جس کے ساتھ ساتھ لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ کیونکہ اس جانور کو سلاخوں کی ضرورت نہ تھی اسکے روکنے کے لئے یہی دیوار کافی تھِی۔ کسی نے شوق میں مجھے بھی کمر سے اٹھا کر انکا دیدار کرانے کی کوشش کی۔ لیکن گینڈے پر نظر پڑتے ہی میرے حواس گم ہو گئے۔ مجھے آج بھی وہ جذباتی صدماتی لمحہ اسی طرح یاد ہے۔ ایسی بھیانک، بے ڈھنگی اور عظیم الجثہ مخلوق کسی طرح بھی میرے تصور میں گھسنے کے لئے تیار نہ تھی۔ جبکہ میرے خیال میں وہ بلا روک ٹوک میری طرف بڑھی چلی آہی تھی۔

میں نے وہی بچوں اور خواتین کا کا آزمودہ ہتھیار استعمال کیا۔ اور دھاڑیں ما ر کر رونا شروع کیا سب نے مجھے اسوقت میری سمجھ کے مطابق جھوٹی تسلیاں دیں کہ وہ تو اس دیوار کے پیچھے بند ہے۔ پھرکافی دیر تک بہلاتے بھی رہے۔ سب سے پہلے مجھے گینڈا دکھانے کی سزا سب کو اس صورت ملی کہ پھر میں نے گود سے اتر کر نہ دیا۔ کیاپتہ میرے زمین پر پیر رکھتے ہی گینڈا اگر زمین پھاڑ کر نکل آئے تو۔ بچوں میں تخلیقی قوت اور طرح طرح کے تصور باندھنے کی کتنی زبردست صلاحیت ہوتی ہے۔

میں سوچتی ہوں ایسے ہی کسی واقعے سے گذر کر فلم ٹریمر کا مرکزی خیال اخذ کیا گیا ہو گا۔ کبھی کبھی لوٹ کر جب بچپن کے دامن میں پناہ لیتے ہیں تو جیسے ڈزنی لینڈ جانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہاں سے وہ توانائ ملتی ہے جو پوپائے دی سیلر کو پالک کھا کر ملا کرتی تھی۔یہیں سے سوچ کے وہ توانا اور نئے جذبے پھوٹتے ہیں جو انسان کے اندر جینے کی خواہش کو بڑھاوا دیتے ہیں۔ ہماری زندگیوں کا یہ آب حیات صرف ایک خیال کی رو کے فاصلے پر ہوتا ہے۔ پھر بھی ہم اس سے محروم رہتے ہیں کیوں؟

11:23 PM

Disney land, Karachi zoo, میرا بچپن، کراچی چڑیاگھر، انڈیا، گینڈا، ڈزنی لینڈ،

صلائے عام-۳

یہ ایک درخواست ہے جو سزائے موت کے منتظر ایک شخص نے محترمہ رئیس فاطمہ سے کی ہے۔ محترمہ رئیس فاطمہ روزنامہ ایکسپریس کے لئے لکھتی ہیں۔ انکے آج، اتوار۱۶ اگست، ۲۰۰۹ میں چھپنے والے کالم کے ذریعے یہ درخواست میرے علم میں آئ ہے۔ ان صاحب کا کہنا ہے کہ وہ دس سال سے اپنی سزا کاٹ رہے ہیں اور سزائے قید کے منتظر ہیں۔ انہیں مطالعے کا شوق ہے اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ انتظار کے اس کرب کو کم کرنے کے لئے انہیں کچھ کتابیں، رسالے کوئ بھی ناول، سفر نامے یا کسی بھی قسم کی پڑھنے کی چیز روانہ کر دی جائے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ہم سب کے لئے ایک نئ تاریخ مرتب کرنے کا وقت ہے۔ ہم سب نے اپنے بڑے بڑے لیڈروں کو ایسی اپیلوں پر کیا نہیں دہیا۔ آج اس ایک عام سے شخص کی اپیل پر کھڑے ہوجائیں اور اپنے گھر میں جس چیز کو آپ سمجھتے ہوں کہ ایک عرصے سے پڑی ہے اور اب نہیں پڑھی جائے گی اسے مندرجہ ذیل پتے پر روانہ کر دیں۔ آپ میں سے جو لوگ نئ کتابیں بھیج سکتے ہوں وہ نئ خرید لیں۔ لیکن خدا کے لئے اس درخواست سے بس یونہی مت گذر جائیں۔ چاہے کتنے مصروف ہوں اس شخص کو ضرور وقت دیں۔چاہے اپنی ردی اسے بھیجیں لیکن پوسٹ آفس تک جانے کی زحمت ضرور کریں۔یہ ہمارے زندہ ہونے کی علامت ہوگی۔

پتہ ہے

علی اصغر گجر

وارڈ نمبر ۷، قیدی سزائے موت

ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

ریفرنس؛

نجانے کیوں انکا یہ کالم آج کے ایکسپریس کے انٹر نیٹ اشاعت میں موجود نہیں ہے۔ اور اسکی جگہ امجد اسلام امجد کا کالم موجود ہے۔ بہر حال کوئ تصدیق کرنا چاہے تو اسے آج کا ایکسپریس اخبار خریدنا پڑیگا یا محترمہ رئیس فاطمہ سے رابطہ کریں۔ انکا ای میل پتہ یہ ہے۔

raeesfatima17@yahoo.com

یہاں میں یہ واضح کر دوں کہ محترمہ سے میرا صرف اخباری تعلق اتنا ہے کہ اخبار کا ایڈیٹوریل صفحہ پڑھتے ہوئے انکے کالم پر سے بھی گذرتی ہوں۔

3:35 PM

، علی اصغر گجر، ایکسپریس اخبار، رئیس فاطمہ،, Ali Asghar Gujjar, Daily Express Raees Fatima

سنگ سنگ

دنیا میں بہت سے دن منائے جاتے ہیں ایکدن ایسا بھی منانا چاہئیے جس دن ہم ان لوگوں کی جنہیں ہم جانتے ہیں کوئ ایک اچھائ جو ہمیں دل سے پسند ہو بغیر کسی لاگ لپٹ کے ان سے کہدیں۔ نامعلوم وجوہات کی بناء پرکسی بھی انسان کے لئے یہ کہنا تو آسان ہوتا ہے کہ میں تمہاری صورت نہیں دیکھنا چاہتا مجھے تم سے نفرت ہے یا تمہاری خامی یہ ہےکہ تم یہ اور تم وہ-------۔ لیکن نجانے کیوں یہ کہتے ہوئے یہ زبان تالو سے چپک جاتی ہے کہ آپ کی یہ خصوصیت ہمیں پسند ہے، اور یہ کہ ہم آپ سے محبت کرتے ہیں اور یہ کہ ان تمام خامیوں کے باوجود آپ کے اندر یہ خوبی پائ جاتی ہے۔ اس دن کا نام کیا ہونا چاہئے, یہ آپ لوگ بتائیں۔

تو آج اردو ویب پر سرفنگ کرتے ہوئے مجھے افتخار اجمل صاحب کی تصویر دیکھ کر یہ خیال آیا کہ آج کے دن ان تمام لوگوں کو جو ہمارے اردگرد ہیں ہمیں انکے متعلق کوئ اچھی بات کہنی چاہئیے۔ اتنی آسانی سے جتنی آسانی سے ہم یہ کہتے ہیں کہ اونہہ تم نے یہ کیا۔

تو جناب سب سے پہلے ہمارے سینئر بلاگر اجمل صاحب سے میں یہ کہونگی کہ آپکی یہ چیز مجھے بے حد پسند ہے کہ آپ اس عمر میں بھی نئ چیزیں سیکھنے کا جذبہ رکھتے ہیں اور اپنے وقت کو صحیح مصرف میں لاتے ہیں۔میں اگر اس عمر تک پہنچ پائ تو یقیناً آپکی اس خوبی کو اختیار کرنے کی کوشش کرونگی۔

ابو شامل آپ اپنی تحریروں کو درست رکھنے میں بڑی محنت کرتے ہیں اور اسے خاصہ تعمیری رکھتے ہیں۔ نومان جب مجھے پتہ چلا کہ آپ اپنی دودھ کی دوکان کے ساتھ یہ سارا کام بھی کرتے ہیں تو مجھے آپ پر بڑا فخر محسوس ہوا۔ آپ جیسے نوجوان ہمارا سرمایہ ہیں۔وارث صاحب، آپ کے علم شاعری کو میں بہت رشک کی نظر سے دیکھتی ہوں۔ محمد احمد آپ نے اردو ری اسٹور کرنے میں بڑی مدد کی، اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ آپ بلا کہے بہت ساری باتیں سمجھ جاتے ہیں۔ جاوید گوندل صاحب، میرا خیال ہے کہ آپ ملک سے باہر ہیں اسکے باوجود یا تو آپ کے پاس کافی ساری کتابوں کا ذخیرہ وہاں موجود ہے یا پھر آپکو زبانی چیزیں یاد ہیں ہر دو صورت میں آپ خاصہ پڑھتے لکھتے ہیں۔ جعفر ، آپ بڑی جلدی چیزیں بھلا دیتے ہیں کچھ کچھ میرے جیسے ہیں۔ ڈفر مجھے آپکی نہ صرف آجکی پوسٹ بلکہ کچھ اور پوسٹیں بھی خاصی پسند آئیں بالخصوص نمازی والی۔اسماء، آپ کو یہ جعفر اتنا کیوں پسند ہے۔عبد اللہ،آپ جب جذباتی ہوکر لڑتے ہیں تو مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔ بلا کھٹکے اپنی بات کہنا یہ بھی تو ایک خوبی ہے۔

م م مغل آپ نے اس دن اپنے سینئر حضرات کی مصلحت پسندی کے باوجود جو تنقید کی تو جناب آپ تو چھا گئے۔ منیر عباسی، آپ نے نئے ڈومین کے لئے اتنی محنت کی آپ کی یہ محنت مجھے پسند آئ۔ راشد کامرن، محد علی مکی اور یاسر عمران آپ لوگوں نے پائریسی کےخلاف جو لائن آف ایکشن لی وہ قابل تعریف ہے۔ خاور آپکی پنجابی تحریروں سے مجھے پنجابی محاورہ سمجھنے میں خاصی آسانی ہوئ۔ سوائے اس ایک تحریر کے جس پر مجھے کچھ اعتراضات ہیں مجھے آپکے مشاہدات خاصے دلچسپ لگتے ہیں۔شعیب صفدر صاحب آپکے فراہم کئے ہوئے لنکس کی وجہ سے مجھے اپنا بلاگ بنانے میں کافی آسانی ہوئ۔ آپ نے مکمل اجنبیت کے باوجود جس طرح محض میری ایک ای میل پر جواب دیا اسکے لئے آپکی مشکور ہوں۔ وہاب اعجاز خان اردو ادب کے حوالے سے مجھے آپکے مضامین ایک خزانے سے کم نہیں لگتے۔شاہ فیصل آپ سے تو میں فوٹو گرافی سیکھ رہی ہوں۔ریحان علی آپکے بلاگ پر وہ کارٹون مجھے اچھا لگتا ہے۔ شاہدہ اکرام اور خرم بھٹی آپ لوگوں کے ساتھ کھانے پکانے کی تراکیب شیئر کرنے کا موڈ ہوتا ہے۔ شاہدہ آپکے بیٹے کی تصاویر مجھے بہت اچھی لگی تھیں اور خرم آپکی اہلیہ تو خاصی خوش قسمت ہیں۔ اتنے سگھڑ شوہر ملے ہیں۔

تو جناب یہ ہیں کچھ وہ لوگ جنہیں میں نے ہلکا سابرتا۔ آپ سب میں بلاشبہ اور بھی اچھائیاں ہونگیں لیکن آج تو مجھے صرف ایک خوبی کا تذکرہ کرنا تھا۔

3:27 PM

independence day, یوم آزادی

برسبیل تذکرہ

میں اپنے کمرے میں آنیوالی لیب کی تیاری کر رہی ہوں کہ کمرے کے دروازے پہ دستک ہوتی ہے۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ یہ فرسٹ ائیر آنرز کی دو لڑکیاں ہیں۔ ایک برقعہ پہنتی ہے اور دوسری برقعے کے بغیر۔ میری ایک سو بیس اسٹوڈنٹس کی کلاس میں یہ لڑکیاں ان پانچ چھ اسٹوڈنٹس میں شامل ہیں جو کلاس کے بعد مجھ سے ملتے ہیں، اس لیکچر کو ڈسکس کرتے ہیں، مزید حوالے چاہتے ہیں اور ان سے منسلک سوالات کو حل کر کے مجھے دکھانے بھی ضرور آتے ہیں۔ انکی اس ساری مشق کے پیچھے نہ صرف انکی علم حاصل کرنے کی لگن شامل ہے۔ بلکہ میرا وہ رویہ ہے جو میرے بیشتر سینئیر استادوں کو جو کچھ عرصہ پہلے میرے بھی استاد رہ چکے ہیں ایک نظر نہیں بھاتا۔

میں نے ٹیچرز کی ایک غیر رسمی میٹنگ میں اپنے کچھ سینئیر اساتذہ کو یہ بات کہتے سنا کہ یہ کتنا عجیب ہے کہ جونئیر اساتذہ کے کمرے میں اسٹوڈنٹس بغیر کسی جھجھک کے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح تو استاد کی کوئ عزت اور احترام اور رعب دبدبہ نہیں رہتا۔ اور اس طرح سے اسٹوڈنٹس میں کتنا بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ یہ سینئیر اساتذہ اپنے ریٹائرمنٹ کے قریب ہیں اور میں نے ابھی آغاز کیا ہے۔انکے اور میرے درمیان ایک نسل کا ہی نہیں اس لامتناہی علم کا بھی فرق ہے جو ٹیکنالوجی کی بے پناہ ترقی کی وجہ سے ایک آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھوٹ پڑا ہے۔ آج استاد ہونےکی تعریف کچھ مختلف ہو گئ ہے۔

ہاں، میری ان اسٹوڈنٹس میں سے برقعہ پوش خاتون کا نام نزہت اور دوسری کا نام سائرہ ہے۔ ناموں سے آسانی رہتی ہے اور مخاطب کرنے کے مناسب القاب ڈھونڈنے کے تردد سے بچ جاتے ہیں جو بعض اوقات خاصہ خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ وہ موٹی، چھوٹی فٹبال نما لڑکی اور وہ کالا سا زرافہ مخنچو، یہ نہ صرف ان افرادکی بلکہ مخاطب کرنے والے کی صحت کےلئے بھی مفید نہیں ہوتا۔

ان لوگوں نے دستک دینے کے ساتھ سلام کیا اور کہنے لگیں میم عید مبارک۔ کیسی گذری آپکی عید۔ جواباً میں نے ان سے ان کی عید کے بارے میں پوچھا۔ سائرہ مذہباً عیسائ ہے یہ مجھے اسکے نام کے بقیہ حصے سے پتہ چلا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے حیرت ہوئ جب وہ امتحان کے زمانے میں اسلامیات یاد کر رہی تھی۔ آپ لوگوں کے لئے تو اخلاقیات کا مضمون ہوتا ہے۔ پھر اسلامیات کیوں پڑھی جا رہی ہے۔ میم سب اسکی تیاری کر رہے ہوتے ہیں اب میں کیا الگ سے ایک مضمون کی تیاری کروں۔ لیکن ہمیشہ اسلامیات پڑھنے کے باوجود وہ عیسائ ہے۔ وہ نہ صرف میرے مضمون کے دونوں حصوں میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کر چکی ہے بلکہ دیگر مضامین میں بھی اسکی کارکردگی نمایاں ہے۔ ان سے کچھ رسمی بات کرنے کے بعد میں پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئ۔ پھر انہیں اسی استقامت سے کھڑا دیکھ کر مجھے کچھ شبہ ہوا۔ کوئ خاص بات ہے۔ میں نے دریافت کیا۔ میم عیدی چاہئیے۔ یہ لیجئیے میرا خرچہ آگیا ۔

میں مسکرا دی۔ روزے رکھےتھے۔ نزہت نے بڑے جوش میں جواب دیا سب رکھے تھے۔ اور عید بھی اتنی اہتمام سے منائ۔ سائرہ خاموش کھڑی آہستہ سے مسکراتی رہی۔ میں نے اپنا بیگ چھانا اور دس روپے کا ایک تازہ نوٹ ٹوکن عیدی کے طور پر نزہت کو دیا۔ وہ چیخ پڑی۔ میم اسے تو میں پلاسٹک کوٹنگ کرواکے رکھ لونگی۔ سائرہ نے آواز نکالی اور میری عیدی۔ عیدی روزے رکھنے والوں کو ملتی۔ میں نے اسے چھیڑا۔ اب آپ لوگ بھاگیں میری لیب شروع ہونے میں دس منٹ رہ گئے ہیں۔ وہ خامشی سے چلے گئے۔ میں اپنا لیب کوٹ پہننے لگی کہ دفعتاً مجھے لگا کہ میرا دل اندر سے خالی ہو گیا ہے۔ میں نے کوٹ میں سے ہاتھ نکالااور دروازے کی طرف دوڑ لگائ۔ وہ لوگ کوریڈور کے آخری سرے پہ پہنچ کر مڑنے والی تھیں۔ تہذیب کے برخلاف میں نے وہاں سے آواز لگائ۔ سائرہ۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں کمرے میں آنے کا کہا۔اب وہ کمرے میں موجود ہیں۔ میں نے ایک اور تازہ نوٹ نکالا اور سائرہ کو دیا۔ یہ آپکی عیدی ہے میں تو آپ کو چھیڑ رہی تھی۔ اسکے خاموش چہرے پہ وہی مدھم مسکراہٹ پھیل گئ جو مجھے بےحد پسند ہے۔

وہ لوگ جا چکی ہیں۔ میں آخری پانچ منٹ گذرنے کے انتظار میں کھڑکی کے ساتھ کھڑی ہوں۔ ذرا سی بلندی پر آجانے سے چھوٹی چھوٹی بدصورتیاں ختم ہوجاتی ہیں۔زمین کتنی وسیع اور آسمان کتنا کھلا لگتا ہے۔ میں نے کبوتروں کی غٹر غوں کے ساتھ سوچا۔

7:38 AM

karachi University, کراچی یونیورسٹی

شبستان وجود

اگر غصے اورپیار کو دو فنکشنز سمجھ کر انسان کو انکے تیسرے محور پہ ڈالکر ایک گراف بنایا جائے تو دنیا میں دو طرح کے انسان نکل آئیں گے۔ اس جملے کی بناوٹ میں کوئ حسابداں میری مدد کرسکتے ہیں۔ کیونکہ حساب میرا بنیادی مضمون نہیں۔ ہاں تو ،ان میں سے ایک طرح کے انسان وہ ہیں جنہیں پیار پہ غصہ آتا ہے اور دوسری طرح کے وہ جنہیں غصے پر پیار آتا ہے اور وہ پٹنے اور گالیاں کھانے کے بعد بھی یہیں کہتے ہیں کہ،

مرتا ہوں اس آواز پہ، ہر چند کہ سر اڑ جائے

جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ 'ہاں اور'

غصہ ختم ہونے کے بعد فلموں میں محبت بھرے گانے ہوتے ہیں اور پھر اسکے بعد سویا ہوا سماج اٹھ کھڑاہوتا ہے اور انہیں آڑے ہاتھوں لیتا ہے۔ سیدھے ہاتھوں اس لئے نہیں لیتا کہ کہ اسطرح معاملات سیدھے رہتے ہیں۔ اس سے زیادہ تر لوگوں کے صراط مستقیم پر چلنے کے امکانات پیدا ہوجاتے ہیں۔ اس سے فلم میں کلائمکس نہیں پیدا ہوتا۔ اتنی زیادہ پیار محبت دکھانے پر فلم بینوں کو بے حد غصہ آتا ہے۔جس سے ایک چین ری ایکشن پیدا ہوتا ہے جو چپس اور کولڈ ڈرنک بیچنے والوں، سینما ھال کے مالک، ڈائریکٹر اور فنانسر سمیت کسی کو نہیں پسند ہوتا۔ کیونکہ اس سے کچھ اقتصادی مسائل جو کہ بعد میں معاشرتی مسائل میں تبدیل ہوجاتے ہیں، کھڑے ہوجاتے ہیں۔یہ کھڑے ہوجائیں تو قومی ترانہ ختم ہونے کے بعد بھی بیٹھتے نہیں ہیں۔ حتی کہ فلموں پر پابندی لگانی پڑ جاتی ہے۔

لیکن معزز قارئین، جیسا کہ ہم سمجھتے ہیں اصل زندگی فلموں سے مختلف ہوتی ہے۔ اور یہاں پٹائ لگانےاور گالیاں دینے کے بعد مزید پٹائ اور مزید گالیاں ہوتی ہیں۔ اس عمل میں سماج کے بھی ہوش ٹھکانے آجاتے ہیں اور وہ انہی ٹھکانوں پر پڑا ہائے اوئ کرتا رہتا ہے۔ اور اس وقت کے قریب آنے کی دعا کرتا ہے جب وہ بھی گالیاں اور پٹائ لگانے کے قابل ہوگا۔ہم سب اس بات کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں کہ ڈنڈے اور گالی کے بغیر سماج کو قابو میں نہیں رکھا جا سکتا۔ سماج بھی یہ بات جانتا ہے لیکن اسکے پاس ٹھکائ لگانے والوں کے لئے ڈنڈا نہیں ہے اس مثلث میں سماج صرف گالی سے کام نہیں چلا سکتا۔ وقت کے اس کھیل میں وہ یہ ڈنڈا حاصل کر پائے گا یا نہیں۔ اسکے لئے آپکو کسی تھیٹر جا کر دیکھنےکی ضرورت نہیں۔ اپنی لمبی عمر کی دعائیں مانگیں جس دن سماج کو یہ ڈنڈا ملے گا۔ باہر کی آوازوں سے آپ کو بھی لگ پتہ جائیگا۔ اس وقت تک کچھ لوگ طبلہ سن کر خوش ہورہے ہیں۔ اور کچھ شادیانے بجا کر۔ ہم ان کے ساتھ اپنا وقت گذارتے ہیں۔

اسد محمد خان اسوقت اردو ادب کے افق پر ایک اہم نام ہے۔ انکے افسانوں کے مجموعے 'غصے کی فصل' سے یہ ایک اقتباس آپکی نظروں کی نذر۔

'مردوزی اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ آدمی کا مزاج محبت اور غصے، عقیدت اور نفرت سے مل کر تشکیل پاتا ہے۔ مگر اپنی تہذیب اور تمدنی تقاضوں سے مجبور ہو کے انسان اپنا غصہ اور اپنی نفرت ظاہر نہیں ہونے دیتا، جس سے فتور واقع ہوتا ہے اور نفرت مزاج کی سطح سے نیچے جا کر سڑنے لگتی ہے۔ پھر یہ آدمی کے اندر ہی پلتی بڑھتی ہے۔ آدمی سمجھتا ہے کہ وہ غصے سے پاک ہو چکا ہے اور اسکے مزاج کی ساخت غصے اور نفرت کے بغیر ممکن ہو گئ۔

مردوزی کہتے ہیں، ایسا نہیں ہوتا۔ غصہ آدمی میں ساری زندگی موجود مگر پوشیدہ رہتا ہے۔ تاہم اگر دن کے خاتمے پر اسے ظاہر ہونے، یعنی خارج ہونے کا موقع دیا جائے تو ایکدن ایسا آئےگا کہ آدمی غصے اور نفرت سے پوری طرح خالی ہوجائے گا۔ مردوزی اس کیفیت کو تکمیل کا نام دیتے ہیں ۔

اسیلئے، اسی تکمیل کو پانے کے لئے، مردوزی فرقے کا ہر فرد رات کو حلقے میں بیٹھتا ہے اور چیخ پکار کرکے اپنی دن بھر کی کمائ ہوئ نفرت اور دن بھر کا پالا غصہ خارج کردیتا ہے، اور باقی رات اور تمام دن کے لئے ایک مہذب، مکمل، مہر و محبت سے بھرا ہوا انسان بن جاتا ہے'۔

غصہ بظاہر ایک منفی لفظ لگتا ہے، لیکن درحقیقت یہ ایک بہت اہم انسانی وصف ہے۔ مثبت طریقے سے استعمال کرنے پرانسان پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹ سکتا ہے۔البتہ مرد ناداں جب تک چاہیں گالی اور ڈنڈے سے کام چلائیں۔ ہیرے کے متعلق سنا ہے کہ وہ دنیا کی سخت ترین چیز ہے۔ مگر اسکی چمک آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔

ریفرنس؛

اسد محمد خاں

4:32 PM

Asad Muhammad Khan، اسد محمد خاں، غصے کی فصل،

پاکستان زندہ باد

یہ واقعہ ذرائع کے مطابق بدھ کو پیش آیا۔ جمعرات کو یہ خبر میڈیا پر موجود تھی۔ لیکن یا تو لوگ ابھی تک مشرف کو پھانسی لگانے کے انتظامات میں مصروف ہیں یا پھر انتظار کر رہے ہیں کہ کب پتہ چلے کہ وہ شہید ہوئے ہیں یا نواب بگتی کی طرح مظلوم کی موت مرے ہیں تاکہ اس حساب سے اپنے جذبات کا اظہار کر سکیں۔ لیکن جناب عبدالقادر حسن اور ارشاد احمد حقانی نے بارش کا پہلا قطرہ بننے کی سعادت حاصل کرلی۔

میں اہل پاکستان کو اس شکرانے میں شامل کرنا چاہتی ہوں کہ ہمیں ظلم اور بر بریت کے نشان بیت اللہ محسود سے نجات ملی۔ درندگی کو اپنے عروج پر پہنچانے والے اس انسان نے بالآخر اسکا مزہ چکھ لیا جسے ہر نفس کو چکھنا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں عبرت ناک سزائیں ملنے کی دعا کی جاتی ہے اور اس موت کو انکےلئے سہل سمجھتے ہوئے یوم حساب کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔

یوم آزادی قریب ہے اور یہ شاید خدا کی طرف سے ایک خوشخبری ہے۔ میرے گھر کے دروازے پر لٹکی ہوئ چائمز ہوا کے اشارے پر جیسے ہولے ہولے گا رہی ہیں۔

اے وطن پیارے وطن پاک وطن

اے میرے پیارے وطن

تجھ سے ہے میری تمناءووں کی دنیا پر نور

عزم میرا تبھی میرے ارادے ہیں غیور

میری ہستی میں انا ہے میری مستی میں شعور

جاں فزا میرا سخن گر ہے تو شیریں ہے سخن

ریفرنس؛

بیت اللہ محسود مارا گیا

4:23 PM

Baitullah Mehsud, Idependence day, یوم آزادی، عبدالقادر حسن، ارشاد احمد حقانی، نواب بگتی،

میری ہم جولیاں

آرٹس کونسل کراچی میں، میں بھی ان بے تحا شہ تالیاں بجانے والی ہر طبقہ سے تعلق رکھنے والی خواتین میں شامل تھی جب مدیحہ گوہر کا ڈرامہ بری اپنے اختتام پر پہنچا۔

کہانی کے کئ زنانہ کرداروں میں جو کہ جیل میں اپنے مقدمات کے فیصلے کا انتظار کر رہی تھیں ایک کردار جمیلہ کا تھا۔ سولہ سال کی عمر میں ایک ساٹھ سال کے بیمار بڈھے سےسوہنی جمیلہ کی شادی، یہی سوچ کر کی گئ تھی کہ وہ اپنے شوہر کے اپنے سے بڑے بچوں کی اور بیمار شوہر کی خدمت کرے گی۔ لیکن وہ اس گاءوں کے ایک نوجوان کے عشق میں مبتلا ہو کر اپنے شوہر اور اسکے بچوں کے ہاتھوں اچھی طرح پٹنے کے بعد اس رات کلہاڑی لیکر اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اور اپنے شوہر کو للکار کے اٹھاتی ہے۔ یہاں سے ڈرامہ اپنے کلائمیکس میں داخل ہوتا ہے۔ وہ اپنی کلہاڑی لہراتی ہوئ اسکے سینے پر مارتی ہے اور کہتی ہے، 'جا میں نے تجھے طلاق دی'۔ اسی طرح تین کلہاڑیوں کے وار کے ساتھ تین طلاقیں اس مرد کے حصے میں آتی ہیں۔ سوہنی سی جمیلہ کو پھانسی ہوجاتی ہے۔ لیکن جمیلہ کا کردار معاشرتی نا انصافیوں کے خلاف اٹھنے والی ایک مضبوط آواز ہے اور وہ جہاں کہیں بھی ہے، میں اسکے ساتھ ہوں۔

اب سے کچھ عرصے پہلے ٹی وی پر ایک بسکٹ کا اشتہار آتا تھا۔ جس میں ایک لڑکی جو غالباً کسی ہوسٹل میں رہ رہی ہوتی ہے اپنی ماں سے بسکٹ کھاتے ہوئے فون پر باتیں کر رہی ہوتی تھی۔ اور وہ بسکٹ کھانے میں اتنی مگن ہوتی ہے کہ جب اسکی ماں کہتی ہیں کہ ہم نے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے تو جواب میں وہ کہتی ہے۔'سپر'۔ یہ بسکٹ کا نام ہے۔ اس وقت فون رکھنے کے بعد وہ لڑکی سوچتی ہے یہ تو کوئ غیر معمولی بات ہوئ۔ پھر بھی بسکٹ کی لذت جیت جاتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایک برانڈ کے بسکٹ کے ساتھ زندگی نہیں گذاری جاتی۔ اور زندگی میں اچھے بسکٹوں کے علاوہ بہت سارے تلخ حقائق ہیں جنہیں بسکٹوں کے سہارے نہیں اڑایا جا سکتا۔

یونیورسٹی میں میری وہ دوستیں جو ہوسٹل میں رہا کرتی تھیں۔ جب کبھی ہم لوگوں کی زبانی یہ بات سنتیں کہ ہمارے دو ہم جماعتوں یا جاننے کی آپس میں پسند کی شادی ہو رہی ہے تو ذرا اترا کر کہتیں۔ ہمارے یہاں ایسا نہیں ہوتا۔ بھئ ہمارے یہاں تو کسی دن اماں یا ابا کا فون آئیگا کہ اگلے ہفتے تمہاری شادی ہو رہی ہے۔ آجاءو۔ بس ہم جائیں گے اور شادی ہو جائے گی۔ میں نے انکے غرور کو کبھی تحسین سے نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے یہ فیوڈل روایات ہیں اور ان پر فخر کرنا اس نظام کو مضبوط کرتا ہے۔

میں ابھی دو دن پہلے تک یہی سمجھتی رہی کہ گھروں سے بھاگ کر شادی کرنے والے اس فرسودہ روائتی نظام کی پیدا وار ہیں۔ لیکن بھلا ہو ہمارے ایک ساتھی بلاگر کا انہوں نے میرے جیسے لوگوں کے علم میں اضافہ فرمایا اور انکشاف کیا کہ یہ وبا ان علاقوں میں ہوتی ہے جہاں ٹیوب ویل نہیں ہوتے ہیں اور ان سے منسلکہ کمرے۔ جہاں جہاں یہ سہولت بہم میسر ہے وہاں وہاں گھروں سے بھاگنے کی زحمت کوئ نہیں کرتا۔ اے کاش، جب آدم اور حوا کو زمین پر نا فرمان کہہ کر بھیجا گیا تھا تو ایک ٹیوب ویل بھی بھیج دیا جاتا اس سے ہابیل قابیل کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچ جاتے اور ہمیں بھی اس وقت اس مسئلے کا سامنا نہ ہوتا۔ یعنی ہمارے نوجوان گھروں سے بھاگ کر شادیاں نہ کرتے۔ صرف اسی انکشاف پر انکی انگلیاں نہیں رکتیں۔ بلکہ وہ روائت پسندوں کی اس بات کو دہراتے ہیں کہ عورتیں تو ہوتی ہیں ریا کار، اور جیسے ہی انہیں موقع ملتا ہے وہ اپنی تخلیق میں موجود برائیوں کو سامنے لے آتی ہیں۔ مختصراً یہ کہ عورت کی تخلیق بس برائ کے خمیر سے اٹھائ گئ ہے۔ خیر، یہ وہ چیز ہے جو انہوں نے اپنی زندگی کے سفر میں مختلف مراحل سے گذر کر سیکھی ہو گی۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ انکے چاہنے والوں میں چند ایک کے علاوہ سب انکے عظیم خیالات کو سراہتے ہیں۔ ان میں سے بھی چند کو صرف یہ اعتراض ہے کہ بات کہنے کا انداز مناسب نہیں۔ اس غضب کی بات کو ذرا مناسب الفاظ میں کہا جاتا تو----------۔

اول تو میں ان سے یہ پوچھنا چاہونگی ہمارے صدر صاحب کے بارے میں کیا خیال ہے جب وہ اپنی مرحومہ بیگم کی تصویر گلے میں لٹکائے بیرون ملک امداد کی درخواست کرتے نظر آتے ہیں۔ اور پھر نیو یارک کے ایک فلیٹ کے قصے-----ریاکاری کی مثالیں اگر آپ ڈھونڈنے نکلیں تو شاید آپکی صنف کا کوئ مقابلہ نہ کرسکے۔ جب لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ عورت تھی جس کی وجہ سے ہم جنت سے نکلے تو نا انصافی کا پہلا بیج وہاں بویا جاتا ہے۔اس سے ملتے جلتے تمام بیانات یہودیوں اور عیسائیوں کے ذرائع سے حاصل کر کے ہماری تفسیروں میں ڈالے گئے ہیں۔تاکہ پدری نظام کو سپورٹ ملتی رہے۔ ہماری مذہبی کتاب میں اس بہکانے کے متعلق کوئ ہلکا سا اشارہ بھی موجود نہیں۔البتہ رسول للہ جب پہلی وحی کے بعد جب کسی کو اس میں شامل کرنا چاہتے ہیں تو یہ ایک خاتون ہی ہوتی ہیں۔

آپکے نظام میں یہ معاشرتی کمزوریاں ابھی سے نہیں آئ ہیں۔ بلکہ یہ اس وقت بھی موجود تھیں جب سوہنی کچے گھڑے پر دریا تیر کر پہنچ رہی تھی، جب ہیر رانجھے کی بانسری سن رہی تھی اور جب صاحباں اپنے مرزا کے ساتھ بھاگنے کے تیار کھڑی تھی۔ ان کہانیوں کا دلچسپ عنصر یہ ہے کہ یہ سب شادی شدہ خواتین کہی جاتی ہیں۔ انہیں گھڑے ہوئے قصے کہا جا سکتا ہے لیکن ایسے قصے اس دور کے مزاج اور سوچ کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ وہ وقت تھا کہ ٹیوب ویل وجود میں نہیں آیا تھا شاید اسی لئے ان برائیوں کو اپنے پیر جمانے کے موقع مل گیا۔

میرا تعلق اس شہر سے ہے جسے ایک عورت مائ کولاچی کے نام سے بسایا گیا۔ اپنے ساتھی بلاگر کی معلومات میں ، میں بھی کچھ اضافہ کرنا چاہونگی کہ اسی زمین سے ماروی اور سسی جیسی عورتوں نے جنم لیا۔ شاید آپکے علم میں ہو کہ ماروی ایک سال تک اپنے شوہر سے الگ بادشاہ کے محل میں رہی مگر اس نے اس محل میں رہنے سے انکار کر کے اپنے شوہر کے ساتھ رہنے پر ترجیح دی۔ اسکے بیحد اصرار پر جب وہ واپس آئ تو بعض روایات کے تحت اسے اپنی پاکیزگی ثابت کرنے کے لئے ایک آزمائسشی امتحان سے گذرنا پڑا۔ جبکہ سسی اپنے محبوب شوہر سے ملنے کی کٹھنائیوں سے گذرتے ہوئے مر گئ۔ دنیا کی تاریخ اور ادب جو کہ بیشتر مردوں نے لکھا ہے اس میں بھی ایماندار اور غیر جانبدار مردوں کے لکھے ہوئے الفاظ عورتوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اگر عورت صرف ریاکاری اور جسمانی تعلق کے لئے ہر کام کر گذرنے والی مخلوق کا نام ہوتا تو آج اقبال فاطمہ بنت عبداللہ پر نظم نہ لکھتے۔ یہی نہیں فاضل قلمکارجب چالیس سالہ مردوں کےحیات کے گوشوں پر سے پردے اٹھاتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ خود کسقدر فیوڈل نظام کی سوچوں کے زیر اثر ہیں۔

ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ اسی ڈیڑھ کروڑ سے زائد آبادی والے کراچی میں یہ واقعات بہت کم سننے میں آتے ہیں۔ جبکہ یہاں ٹیوب ویل بھی نہیں ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ روزانہ لاکھوں مرد اور عورت صبح اپنے گھروں کو چھوڑتے ہیں اور نو دس گھنٹے گذار کر اپنے گھروں کو واپس پہنچتے ہیں۔ اچھی خاصی خواتین کے شوہر شہر یا ملک سے باہر رہتے ہیں۔ نو جوان لڑکیاں بلا کھٹکے ادھر ادھر بازاروں، تعلیمی اداروں، ملازمتی مقامات اور تفریح کے لئے اپنے مرد رشتے داروں کے تحفظی ساتھ کے بغیر آتی جاتی ہیں۔ ان میں سے بیشتر اپنے والدین کی مرضی سے شادی کرتی ہیں اور شادی شدہ جوڑوں کی اکثریت ایک مطمئن زندگی گذارتی ہے۔ یہاں اگر آنر کلنگ کے واقعات سنائ بھی دیتے ہیں تو انکا تعلق شاید ہی یہاں بسنے والی اکثریتی طبقے سے ہو۔ اب یہاں ٹیوب ویل نہ ہونے کے باوجود ایسا کیوں ہے۔ اسپر کوئ کچھ روشنی ڈالنا پسندکرے گا۔ یا ابھی آپ اسی قسم کا کوئ چٹخارے دار بلاگ پڑھ رہے ہیں۔

ڈرامہ بری

آنر کلنگ-

۱

آنر کلنگ-

۲

مرکزی خیال ماخوذ

8:44 AM

Honour killing, Karachi, مدیحہ گوہر، آرٹس کونسل کراچی، خواتین کے حقوق،

قصہ ایک دودھ والے کا

ِ

پہلے تو میں آپ کو اطمینان دلادوں کہ اس قصے کا دودھ والوں کی ملاوٹ سے کوئ تعلق نہیں۔ نہ ہی آپ مجھے اس قسم کے جملے لکھ کر بھیجنے میں اپنا وقت ضائع کریں کہ باجی، دودھ والوں سے کہیں کہ وہ کوٹری کے اسطرف والی نہر سے پانی ملایا کریں۔ وہاں پلا مچھلی بھی آتی ہے۔ اور اکثر مینڈک نکلنے کے بجائے کبھی کبھی مچھلی بھی نکل آئے تو کیا حرج ہے۔ تو ان باجی کادودھ والوں تک ایسی کوئ فرمائش پہنچانے کا ارادہ نہیں۔ بعد میں وہ پلا مچھلی کی قیمت بھی دودھ میں شامل کر دیں گے تو یہ سب لوگ کہیں گے کہ ہم دودھ والوں سے کمیشن کھارہے ہیں۔

جیسا کے عنوان سے ظاہر ہے کہ یہ صرف ایک دودھ والے کا قصہ ہے اور انکی باقی کمیونٹی سے اسکا کوئ تعلق نہِں۔ مزید یہ کہ اگر آپ کو دودھ والے اور طوطے کےدرمیان ہونےوالی گفتگو سن کر بڑی ہنسی آتی ہے تو میں معذرت کے ساتھ یہ کہنا چاہونگی کہ پوسٹ کے لمبا ہوجانے کے ڈر سے اسے یہاں پھرنہیں لکھا جا سکتا۔ آج آپ کچھ نئ باتوں پر ہنسنے کی کوشش کریں۔ زیادہ کمزور دل احباب کا دل بھر آئے تو رو بھی سکتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے میں یہ بھی واضح کردوں کہ میں روشن خیال ہونے کے باعث صرف ڈسپوزیبل ٹشو پیپر استعمال کرتی ہوں اور اس نازک موقع پر جیسا کہ روایت ہے آپ کو کوئ بھی رومال عطا کرنے سے قاصر ہوں۔ ویسے بھی مجھے معلوم ہے کہ آپ اس سے صرف آنسو نہیں صاف کریں گے بلکہ سڑکیاں بھی ماریں گے۔کیا کہا، مگرمچھ کے آنسو بہانے میں ناک سڑکتی نہیں ہے۔ میں اس وقت بحث نہیں کرنا چاہتی۔ کیونکہ اس ساری بحث سے پہلے ہی اس قصے کا حسن ختم ہو رہا ہے۔کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کوئ محکمہ ء تحفظ حسن و جمالیات بھی ہونا چاہئیے۔

وہ کراچی کی ایک حسین جولائ کی سہ پہر تھی۔ کراچی میں جولائ ہمیشہ حسین ہوتا ہے اس وقت بھی جب جولائ نہیں ہوتا تھا۔ خیر، موسم کی دلداری کے لئیے میں نے سوچا کہ کچھ دوستوں سے ملا جائے۔قرعہ ءفال ایک ایسی دوست کے نام نکلا جن کی دو بہینیں اور تھیں۔ اتنی ساری لڑکیاں ہونگیں۔ ادھر کی غیبت، ادھر کے تبصرے، کچھ نئ خبرِیں، کچھ پرانی خبریں تازہ بگھار کے ساتھ، خوب چیں پیں ہوگی کتنا مزہ آئے گا۔ میں نے تصور میں ایسے ہی معصوم سپنے سجائے۔ نہیں معلوم تھا کہ ایک دودھ والا ان سب سپنوں کو روندنے کے لئے تیار بیٹھا ہے۔ اب وہاں پہنچتی ہوں تو کیا دیکھتی ہوں ۔ ساری قوم جیسےایک عالم خواب میں ہے۔سب سے پہلے سب سے چھوٹی والی داخل ہوئیں۔ بنّا کہہ رہی ہیں آج انکی باری ہے۔ اور میں بتا دوں میں تیار ہوں اور اب میرے علاوہ کوئ دودھ لینے نہیں جائے گا۔ مجھے ذرا جھٹکا لگا۔ دل میں اپنے گھر والوں کو برا بھلا کہا۔ ایک ہمارا گھر ہے، بیچارا بیل بجا بجا کر تنگ آجاتا ہے ہر

شخص جو کام کر رہا ہوتا ہے اسی میں مصروف رہتا ہے زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد۔ ابھی دو دن

پہلے وہ دھمکی دے چکا تھا کہ اگر اب دوسری بیل پر کوئ نہ آیا ےتو وہ قیامت تک اپنی شکل نہیں دکھائے گا۔ اتنی بھیڑ میں کسے انکی شکل دیکھنے سے دلچسپی ہوگی۔ کسی گل محمد نے یہ دھمکی بھی اڑادی۔

چلیں، اتنی دیر میں بنّا بھی لال پیل ہوتی آگئیں۔ چھوٹے ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم دوسروں کی باری نہ آنے دو۔ میری دوست نے دونوں کو دیکھا اور دانت پیسے۔ اور بڑے ہونے کا یہ مطلب ہے کہ ہر دفعہ میں قربانی کا بکرا بنی رہوں۔ میں ہکا بکا ایک کے بعد ایک کی صورت دیکھتی ہوں۔ ہم بھی اپنے گھر میں اسی طرح ہر تھوڑے دن بعد حقوق کی جنگ لڑتے ہیں۔ لیکن اس سے بالکل الٹ مقصد کے لئے۔ 'میں جاتی ہوں ہر دفعہ دودھ لینے کے لئے'۔ 'تین دن سے تو میں لے رہی ہوں۔ آپ نے روز ازل ہی یہ فریضہ انجام دیا ہوگا'۔ 'یہ آپ کس روز ازل کی بات کر رہی ہیں۔ ابھی پچھلے پورے ہفتے یہ میں تھا جو خدمت کرتا رہا ہوں'۔ اس قسم کے سارے ڈائیلاگ ذہن میں گڈ مڈ ہونے لگے۔

بیساختہ منہ سے نکلا تم لوگ کتنے عظیم ہو اور ایک ہم ہیں خودغرض، ایکدوسرے کو طعنوں سے مار ڈالنے والے، ذرا جو ہمارے اندر مل بانٹ کر کام کرنے کی عادت ہو۔ یا احساس ذمہ داری۔ آخر ہم ایسے کیوں ہیں۔ چندا میری دوست ایک ادا سے بولیں، تمھارا دودھ والا کیا اتنا گلفام ہے جتنا ہمارا ہے۔ کیا اسے دیکھ کر آپ کے چہرے پر اتنی رونق آجاتی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔اور جس کے بعد غالب کا یہ شعر یاد آتا ہے کہ

لو، ہم مریض عشق کے بیماردار ہیں

اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

میرا منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا اگر انہوں نے توجہ نہ دلائ ہوتی کہ کہ جولائ اتنا حسین ہوتا ہے کہ مکھیاں بھی بڑی سیلانی ہوجاتی ہیں، کچرے کے ڈھیر اور ہمارے منہ میں خاص فرق روا نہیں رکھتیں۔بنّا نے چندا سے کہا کہ آج وہ کھڑکی سے دیکھ لیں کیونکہ آج کے دن بنّا کے حق پر کوئ ڈاکا نہیں ڈال سکتا۔ چندا کو شدید غصہ آیا، کھڑکی سے کیا نظر آتا ہے 'پیٹھ۔' ۔ اور وہ غصے میں بھری کچن میں چلی گئیں غصہ خالی کر کے کچھ کھانا بھرنے کے لئے۔ بعض لوگ کچھ کھا کر غم غلط کرتے ہیں بالخصوص وہ جو دوسروں کو کچھ ایسا کھلانے کی سکت نہیں رکھتے مثلاً مار، جوتے، ڈانٹ۔ بیل بجی، بنّا دروازے پر دودھ کی بالٹی پکڑے تیار کھڑی تھیں۔ 'آج اس نے پیلا کرتا پہنا ہوا ہے'۔ انہوں نےدروازے میں موجود سوراخ سے جھانکتے ہوئے سرگوشی کی اور دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھول دیا۔ چھوٹی نے اپنا سوجا ہوا چہرہ دیوار کی طرف کر لیا۔میں کھڑکی پر جا کر کھڑی ہوگئ، یہاں سے منگھوپیر کی پہاڑیوں پر آباد گھروں کی روشنیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ لیکن دن کے وقت کہاں یہ منظر نظر آسکتا ہے۔ویسے چندا ٹھیک کہہ رہی تھی کھڑکی سے تو اسکی صرف پیٹھ نظر آتی ہے۔ ایک بات اور، جولائ کے حسین مہینے میں پیلا رنگ اتنا برا نہیں لگتا۔

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ محکمہء تحفظ حسن و جمالیات بھی ہونا چاہئیے۔ پھر خیال آتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

11:48 AM

Ghalib, July, Karachi, Kotri, کوٹری، کراچی، غالب، دودھ والا

صلائے عام-۲

جن بچوں کو اسکول کی فیس یا کتابوں کے سلسلے میں پریشانی ہے۔ وہ بغیر کسی جھجھک کے ان نمبروں پر رابطہ کریں۔

03463525202, 03332286189, 03332365362

یہ درخواست معروف گلوکارشہزاد رائے کے ٹرسٹ زندگی کی طرف سے کی گئ ہے۔ انکا کہنا ہے کہ نہ صرف وہ فیس میں مدد کریں گے بلکہ کتابیں مفت فراہم کی جائیں گی۔قارئین سے مزید درخواست ہے کہ اس پیغام کو جہاں تک ممکن ہو پہنچا دیں

7:55 PM

free books, zindagi trust, شہزاد رائے، ٹرسٹ زندگی، مفت کتابیں، Shehzad Roy

مجھے تم سے محبت ہے

مجھے لغات پڑھنے کا شوق ہے۔ اکثر اوقات اس پر ہنس دیتے ہیں احباب۔ لغت کوئ پڑھنے کی چیز ہے۔ یہ تو صرف اس وقت استعمال کرتے ہیں جب کسی لفظ کا مطلب نہ سمجھ میں آرہا ہو۔ لیکن میرے لئے لغت چہار اطراف پھیلی کائنات کی طرح ہے۔ میں اسے بہت دیرتک پڑھ کر بھی بور نہیں ہوتی۔

لفظ پڑھنا تو میری عادت ہے

تیرا چہرہ کتاب سا کیوں ہے

میں اس میں اتنی ترمیم چاہتی ہوں کہ تیرا چہرہ لغات سا کیوں ہے۔ ابھی ابھی مجھے یہ جان کر خوشی ہوئ کہ لاطینی امریکہ کے نوبل انعام یافتہ ادیب گبرئیل گارسیا مارقیس بھی ہر صبح اٹھ کر لغت کےدو تین صفحے پڑھتے تھے۔ یقین آگیا کہ دنیا کے عظیم دماغ ایک طرح سوچتے ہیں۔ اسی یقین پر میں بلاشبہ اگلے تیس سال آرام سے لکھ سکتی ہوں۔

اور آج اس یقین کا پہلا دن ہے۔

گبرئیل گارسیا نے یونیورسٹی میں قانون اور صحافت میں تعلیم حاصل کی۔ صحافی کی حیثیت سے خاصہ کام کیا۔ لیکن انکی وجہ ء شہرت انکی وہ تحریریں بنیں جن کا تعلق فکشن سے ہے۔ تنہائ کے سو سال اور ہیضے کے دنوں میں محبت انکے دو مشہور ناول ہیں۔ جس میں سے انکے ناول تنہائ کے سو سال کو نوبل انعام کا حقدار قرار دیا گیا۔ اس ناول کے اردو میں تراجم ہو چکے ہیں۔ناقدین کی نظر میں زینت حسام کا کیا گیا ترجمہ اصل سے زیادہ قریب ہے۔ اتفاق سے مجھے ان میں سے کوئ ترجمہ پڑھنے کا موقعہ نہیں ملا۔ میں نے اسکا انگریزی ترجمہ پڑھا ہے۔

انکے کام سے قطع نظر میں اس وقت ان سے منسوب ایک ایسی نظم پیش کرنا چاہ رہی تھی جو انکے نام سےلاطینی امریکہ کے اخباروں میں چھپی۔ بعد میں یہ بات ثابت ہوئ کہ یہ کسی غیر معروف ادیب کی نظم ہے۔ مارقیس نے اسکے بارے میں خاموشی اختیار کی۔ نظم کا عنوان ہے۔

کٹھ پتلا

اگر ایک لمحے کے لئے خدا یہ بھول جائے کہ میں کپڑے اور گودڑ کی گڑیا ہوں اور مجھے زندگی کی ایک رمق دے دے تو شاید میں وہ سب نہ کہہ سکوں جو میں سوچتا ہوں، مگر میں جو کہتا ہوں یقیناً سوچ کر کہوں گا۔

میں چیزوں کی قدر اس لئے نہیں کرونگا کہ انکی قیمت کیا ہے، بلکہ اس لئے کہ ان کے معنی کیا ہیں۔

میں کم سوءونگا، خواب زیادہ دیکھوں گا۔ مجھے معلوم ہےکہ ہم ایک منٹ کے لئے بھی آنکھیں بند کرتے ہیں تو روشنی کے ساٹھ سیکنڈ سے محروم ہوجاتے ہیں۔

میں سنوں گا جب دوسرے بولیں گے اور میں عمدہ چوکلیٹ آئس کریم کا کس طرح مزہ لوں گا۔

اگر خدا مجھے زندگی کی ایک رمق بخش دے تو میں سادہ کپڑے پہنوں گا، اپنے آپ کو سورج کے سامنے ڈھیر کر دوں گا، صرف اپنے بدن کو نہیں روح کو بھی کشادہ کروں گا۔

میرے خدا، اگر میرا دل ہوتا تو میں برف پر اپنی نفرت تحریر کر کے سورج نکلنے کا انتظار کرتا۔

وان گاف کے خواب کے ساتھ میں ستاروں پر بینڈیٹی کی ایک نظم مصور کر دیتا اور سیراٹ کا گیت چاند کے لئے رومانی نغمہ ہوتا۔

اپنے آنسوءوں سے میں گلابوں کو پانی دیتا، انکے کانٹوں کا درد محسوس کرتا اور انکی پنکھڑیوں کے مجسم بوسے------میرے خدا اگر میرے پاس زندگی کی بس ایک رمق ہوتی---۔

میں کوئ دن ایسا نہ جانے دیتا جس میں ان لوگوں سے جن سے مجھے محبت ہے، یہ نہ کہتا کہ مجھے ان سے محبت ہے۔

میں ہر عورت اور مرد کو یہ باور کراتا کہ وہی میرے سب سے پسندیدہ لوگ ہیں اور میں عشق کے عشق میں مبتلا ہو کر زندہ رہتا۔

میں مردوں پر یہ ثابت کر دیتا کہ انکا یہ خیال کسقدر غلط ہے کہ وہ بوڑھے ہونے کے ساتھ محبت میں گرفتار نہیں ہو سکتے-----یہ جانے بغیر کہ وہ بوڑھے جبھی ہوتے ہیں جب محبت میں گرفتار ہونا بند کردیتے ہیں۔

ایک ایک بچے کو میں پروں کا تحفہ دیتا مگر انہیں اڑنا خود سیکھنے کے لئے چھوڑ دیتا۔ بوڑھیوں کو میں سکھاتا کہ موت بڑھاپے سے نہیں بلکہ بھول جانے سے آتی ہے۔ میں نے اتنا کچھ سیکھا ہے تم لوگوں سے-----

میں نے یہ سیکھا ہے کہ ہر ایک پہاڑ پر چوٹی پر رہنا چاہتا ہے، یہ محسوس کیے بغیر کہ سچی خوشی اس راستے سے آتی ہے جس سے ہم اونچائ پر چڑھتے ہیں۔

میں نے یہ سیکھا ہے کہ جب ایک نو مولود بچہ اپنے باپ کی انگلی کو اپنی ننھی منی مٹھی میں دباتا ہے تو اسے ہمیشہ کے لئے اپنا بنا لیتا ہے۔

میں نے یہ سیکھا ہےکہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو بلندی سے اسی وقت دیکھنے کا حق رکھتا ہے جب کھڑے ہونے میں اسکی مدد کر رہا ہو۔ میں نے اتنی بہت سی باتیں سیکھی ہیں تم لوگوں سے مگر انجام کار ان میں سے زیادہ تر باتیں میرے کسی کام نہ آئیں گی اسلئے کہ جب وہ مجھے اس سوٹ کیس میں رکھ رہے ہونگے تو بد قسمتی سے میں مر رہا ہوں گا۔

یہ ترجمہ غالباً آصف فرخی نے کیا ہے کیونکہ اس پر انکا نام نہیں لکھا ہے۔ میں نے اسے انکی زیر ادارت چھپنے والے پرچے دنیا زاد کی دوسری کتاب سے لیا ہے۔ آصف فرخی اردو ادب کی دنیا میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں اور اپنی ادبی خدمات کے سلسلے میں تمغہ ء امتیاز حاصل کر چکے ہیں۔

آصف فرخی

گبرئیل گارسیا مارقیس

نوٹ؛ جاوید گوندل صاحب کی توجہ دلانے پر گبرئیل گارسیا مارقیس کے نام کا تلفظ صحیح کر دیا گیا ہے۔

11:20 PM

Asif Farrukhi،مارکیز آصف فرخی، گبرئیل گارشیا, Gabriel garcia marquez

مشرف تو ہے ناں

جب میں کہتی ہوں کہ مجھے مودودی صاحب کی تفہیم القرآن بے حد پسند ہے اور انکی کتاب جس پر کچھ لوگ خاصے چیں بہ جبیں ہوتے ہیں، خلافت اور ملوکیت، وہ مجھے خاصی زبر دست کتاب لگتی ہے۔ تو سب لوگ تو نہیں لیکن زیادہ تر لوگ مجھے جماعت اسلامی کا بندہ سمجھیں گے۔ وہ لوگ جو بہ نفس نفیس میرے ساتھ موجود ہونگے حیرت سے کہیں گے کہ آپ حلئیے سے تو بالکل جماعتی نہیں لگتیں۔ پھر بھی ایسا ہے۔ ارے جناب ، جماعت یوں، جماعت ووں۔ مجھے انکی بات پہ مسکرانا پڑتا ہےکہ تھوڑی دیر بعد وہ مجھے کسی اور چیز کی اصلیت سے واقف کرا رہے ہونگے یا ہونگیں۔

جب میرے منہ سے نکل جاتا ہے کہ ایم کیو ایم کے وجود میں آنے کی بالکل ٹھوس وجوہات ہیں اور اگر یہ ضیا الحق کے زمانے میں وجود میں نہ آتیں تو شہید بے نظیر، یا آپکے نواز شریف کے زمانے میں آجاتی۔ ان وجوہات کو ختم کئیے بغیر اسے پیدا ہونے سے کوئ نہیں روک سکتا تھا۔ یہ سنتے ہی احباب مجھے طعنے دینے لگیں کہ یہ ہیں وہ جو یہاں آکر نواب بنے بیٹھے ہیں۔ یہ بات کہتے ہوئے یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ اگر کچھ لوگ نواب بنے بیٹھے ہیں تو انہوں نے اسی سرزمین پر بھوکے رہ کر کر لالٹین کی مدھم روشنی میں دن رات محنت کرکے اپنے شب وروز کو سنوارا ہے۔ انہیں لیموں کے چھلکوں سے مندروں کی گھنٹیاں صاف کرنے کے منظر دکھائ دیتے ہیں۔ حالانکہ جو وہاں رہتے ہیں ان میں سے کسی کو میں نے گھنٹے اور گھنٹیاں صاف کرتے نہیں دیکھا۔ البتہ یہاں لوگوں کے دلوں میں جگہ بنانے کے لئے جوتے صاف کرتے اور گھنٹیاں بجاتے ضرور دیکھا ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی ان باتوں پر مجھے فوراً سماج دشمن عناصر میں ڈالکر غدار وطن میں شامل کر دیا جائے گا۔ کیونکہ اس ارض پاک کی محبت میں گھلنے والے اور اس کی بلندی سرفرازی میں اپنے خون کو پسینہ بنانے کی سعادت صرف انہیں حاصل ہے۔

اگر میں مروجہ مذہبی اصولوں سے اختلاف کروں جنہیں میں سمجھتی ہوں کہ ایک خاص طبقے نے لوگوں کو مذہب سے متنفر کرانے اور اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کے لئے تشکیل دیا ہے تو لوگ میرے عقائد کی تحقیق پر لگ جاتے ہیں۔اور جناب میرےسائنس سے متعلق اس تھیسیس کو جسکے متعلق میں آپ سب لوگوں کو کچھ بتانا ضروری نہیں سمجھتی اسے کھوج نکالتے ہیں اور اس بات پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ اسکے آغاز پر بسماللہ اور ایک قرآنی آیت کا حوالہ بمعہ ترجمہ کیسے موجود ہے یہ تھیسس ملک سے باہر ایک جرمن اور ایک جاپانی سائنسدان کے پاس اس غرض سے گیا کہ وہ تصدیق کر دیں کہ اس تھیسس کو پی ایچ ڈی کی ڈگری مل سکتی ہے ہا نہیں۔ یہ باہر کے غیر مسلم عقائد کے سائنسدان بھی اس بات پر حیران ہوتے ہیں کہ بھلا سائنس کے تھیسس پر اپنے عقائد کا لیبل کیوں چسپاں کیا جاتا ہے۔ تو انہیں شنید ہوں کہ ایسے مواقع پر کام میں لانے کے لئیے جب خدا سے زیادہ بندوں کو اسکی ضرورت ہوتی ہے۔ ویسے انکی اس انتھک محنت کا شکریہ، میں خود بھی بھول گئ تھی کہ اس میں کتنے صفحے ہیں۔ آپ تو تجسس، تحیر اور تہمت سبھی مراحل سے شادمانی سے گذر گئے۔

اگر میں معاشرے میں موجود ناانصافیوں کو خواتین اور بچوں کے حوالے سے بیان کرنا چاہوں تو میری تحریر کو مشرف کی پھیلائ ہوئ بےحیائیوں اور آزدی اظہار رائے سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ مشرف سے پہلے عصمت چغتائ، بانو قدسیہ، ممتاز مفتی اور اسی قبیل کے دوسرے لکھنے والوں کے نام ان لوگوں کے ذہنوں سے محو ہوجاتے ہیں۔ اب جب کہ وہ لوگ مزید لکھنے کے قابل نہیں رہے تو ہماری بیان کی سرزمین کو بنجر ہوجانا چاہئیے یا پھر ان موضوعات پر سوائے مردوں کے کسی اور کو لکھنے کی اجازت نہیں۔ کیونکہ وہ بے حد حیا دار طریقے سے لگتے ہیں اور اسے پڑھ کر نہ صرف جذبہ ء مسلمانی تازہ ہوتا ہے بلکہ بڑا مزہ آتا ہے۔خاص طور پر نفسانی مزہ۔

اگر میں یہ کہوں کہ جسم فروشی انسانی تاریخ کا سب سے پرانا پیشہ ہے اور یہ پاکستان میں بھی ہر زمانے میں ایک ہی شرح سے موجود رہی جبھی تو منٹو سمیت اردو کے ہر بڑے لکھنے والے نے انکے متعلق لکھا اور یہ دراصل مشرف کی پھیلائ ہوئ بےحیائیوں کا حصہ نہیں ہے۔ تو مجھے فحاشی پھیلانے والوں کا ایجنٹ سمجھ لیا جائے گا۔ اور مشرف کے حصے میں سو گالیاں الگ سے۔

اگر میں کہوں کہ شراب پینے والے بھی ہمارے معاشرے میں ہمیشہ اسی رفتار سے موجود رہیں ہیں۔ حتی کہ ہماری تاریخ کے ایک بڑے نام سید احمد شہید کو کسی غیر مسلم نے شہید نہیں کیا تھا بلکہ جب وہ بالا کوٹ کے علاقے میں اسلامی شریعت نافذ کرنے کے عمل سے گذر رہے تھے تو شراب پر پابندی لگانے کی وجہ سے وہاں پر ایک طبقہ انکے سخت خلاف ہو گیا تھا۔ جس نے انکو ختم کرکے دم لیا تو نہ صرف میرے خلاف حد جاری ہوجائےگی بلکہ شاید یہ خیال کیا جائے گا کہ میرا اس کی خرید و فروخت سے کوئ تعلق ہے۔ مشرف کے حصے میں ہزار گالیاں الگ سے۔

حالانکہ امیر مینائ کہہ گئے ہیں کہ

کیا ہند میں کمی مے و معشوق کی امیر

شیراز جائیے نہ خراسان جائیے

حضرت علی کا ایک مشہور قول ہے کہ یہ مت دیکھو کہ کون کہہ رہا ہے یہ دیکھو کہ کیا کہہ رہا ہے۔ مگر نہیں جناب یہ بھی ایک ہمارا عمومی مزاج ہے کہ ہم پہلے کہنے والے کو ایک ٹھپہ لگائیں گے۔ اور پھر درے۔ پھر ایکطرف اسے پھینک کر کہیں گے لو جی میں نےتو اپنے حصے کا کام کردیا۔ اب باقی سب چھتر لگاءو اس لعنتی کوایسے کہ اسکی تشریف کیا اسکی روح تک لال ہو جائے۔ ایسے بدعقیدہ اور مصیبتی لوگ اب تک ہماری صفوں میں گھسے ہمارے ساتھ مکاری کر رہے تھے۔ او جی انکا تو ماضی حال مستقبل یہی ہے۔ مزید گالیاں۔ چونکہ اس وقت مشرف آسانی سے میسر ہے تو ای بہانے لاکھ پھر اس شیطان کو۔۔

اگر میں ان سب صورت حالات سے بچنا چاہتی ہوں تو مجھے ہر وقت اپنی باتوں میں ایک مصنوعی جذبے کو شامل رکھنا چاہئیے۔ مجھےانکی پیشانی پر نظر رکھنی چاہئیے۔ اور اس پہ نمودار ہونے والی لائنوں کے حساب سے اپنے آپ کو ظاہر کرنا چاہئیے۔ کیونکہ وہی تو ہیں سچے اور پکے مسلمان، اور اس ملک کو تا ابد قائم رکھنے والے۔

میں تو سمجھتی ہوں کہ ایک نظام وضع ہونا چاہئیے اور پاسپورٹ کی طرز پر ایک سرٹیفیکیٹ جاری ہونا چاہئیے جس میں لکھا ہو کہ انکے بنیادی مذہبی عقائد اور پاکستان سے انکی محبت کو دیکھ لیا گیا ہے اور یہ تصدیق کی جاتی ہے کہ یہ ہمارے منظور شدہ عقائد اور محبت کی جانچ سے قریب تر ہیں۔ فی الحال اگلے تین برسوں تک ان میں کسی واضح تبدیلی کے آثار نہیں۔ تین سال بعد حامل سند کو دوبارہ اس جانچ سے گذرنا ہو گا ۔ اس مدت کے بعد یہ بیان مستند نہیں رہے گا۔

کسی پر زیادہ شبہ ہوتو اسے یہ سرٹیفیکیٹ بہت کم مدت کے لئیے دیا جائےاور جو ان پر پورے نہ اتریں انکے لئیے پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے۔

جب تک یہ نہ ہو ہم اپنی زبان صاف کرتے ہیں۔ کیوں لالے کی جان، مشرف تو ہے ناں۔

سید احمد شہید

سید احمد شہید اور افغان

8:20 AM

maudoodi, Musharrfمودودی، مشرف، خلافت اور ملوکیت، امیر مینائ

need help

Dear fellows.

Somhow, I lost urdu support on my computer. Muhammad Ahmad guided me and gave me a link of urdu Mehfil. I followed that procedure but failed. Urdu did not appear by clicking the another language key.

So, if anybody faced this problem or know solution will be most welcomed.

Look forward to your kind help, its Aniqa :)

12:05 AM

شاہین بچے

اقبال کہتے ہیں کہ

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا

شباب جس کا ہو بے داغ، ضرب ہو کاری

لیکن فی زمانہ آنکھ کا تارا اسے کہا جاتا ہے جو آنکھوں کے آگے تارے روشن کر دے اور کاری ضرب سے مراد شاید ہاتھ کی وہ صفائ ہے جس سے آپ پر وہ کاری ضرب لگے کہ آپ یہ کہنے پر مجبور ہوں، رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو۔

ایک تو ہمارا دل پہلے ہی دکھا ہوا تھا کہ ہمارا قیمتی ڈیجیٹل کیمرہ کراچی چڑیا گھر میں کسی نے انتہائ مہارت سے اڑالیا۔ لوگوں نے کہا کہ ایسی جگہوں پر ایسی چیزیں لیکر نہیں جاتے۔ حالانکہ ہم اپنی نیچرل فوٹوگرافی کے شوق میں اسے لے گئے تھے۔

پھر اس مور کی مہربانی کہ وہ سارے پر پھیلا کر ناچا بھی۔ بس اسکے بعد جب تالاب میں تیرتے ہنس کی کسی ادا پر ہمارا دل آیا تو کیمرہ ندارد۔ ہماری ساتھی خاتون نے کہا کہ چڑیا گھر کے شعبہ ء بازیافت سے معلوم کر لیں وہاں کسی نے پہنچا دیا ہوگا۔ میں انکو غیر یقینی انداز سے دیکھتی ہوں کیا یہاں پر کسی ایسے شعبے کا وجود ہوگا اور فرض کریں کہ کسی زمانے میں کسی خوش امید نے ایسا شعبہ قائم بھی کیا ہوتو یقیناً مہینوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے رکھنے کے بعد انہوں نے اس نیک کام سے ہاتھ اٹھا لیا ہوگا۔ بھلاہاتھ آئ نعمت سے کوئ اس طرح بھی ہاتھ دھوتا ہے کیا۔پھر بھی انکا دل رکھنے کو معلوم کیا۔ اور ہمارا خیال صحیح نکلا۔ ایسا کوئ شعبہ وجود نہ رکھتا تھا۔ پتہ نہیں لوگ کیوں ہمارے اندازوں کو بغیر اپنےتجربے کے ماننے سے انکار کر دیتے ہیں بلکہ کہتے ہیں۔ اوہو تو آپ دلوں کے حال بھی جانتی ہیں۔

کچھ دن افسوس رہا اس میں کچھ ایسی یادگار تصویروں کا لوڈ موجود تھا جو ابھی اپ لوڈ بھی نہ کیا گیا تھا۔ بس دل ہی میں محفوظ رہ گئیں۔ اب گردن جھکا کر دیکھنے کا تکلف تو کر لیں مگر ہمارے دل کی تصویریں کوئ اور بھلا کیسے دیکھ سکتا ہے۔ پھر اپنے مسلمان ہونے کا شکر بجا لائے کہ خدا اس سے بہتر کوئ چیز دیگا، اور ہر کام میں اوپر والے کی کوئ مصلحت ہوتی ہے اس لئے وہ نیچے والوں کے کام پر مصلحتاً خاموشی اختیار کر لیتا ہے۔ اگر روز قیامت اپنے ساتھ ہونے والی یہ نا انصافی یاد رہی تو اس بد بخت کی نیکیوں کا کچھ حصہ اپنے پلڑے میں ڈال کر حساب چکتا کروالیں گے۔

ابھی دماغ میں سود زیاں اور حساب کتاب کی یہ کھچڑی مناسب طور پر دم سے بھی نہ لگی تھی کہ گھر میں اعلان ہوا کہ کچھ لوگوں کو دعوت پہ بمعہ ء اہل و عیال بلایا گیا ہے۔ وہ سب ملا کر بارہ لوگ تھے۔ جن میں ان دو خاندانوں کے سات بچے بھی شامل تھے۔ چار بچے بڑے تھے جن کی عمریں تیرہ سے اٹھارہ سال تھیں۔

دعوت اپنے اختتام پر پہنچی سب لوگ رخصت ہو گئے۔ اور اسکے بعد جب میں چیزوں کو جگہ ٹھکانے سے لگا رہی تھی تو مجھے احساس ہوا کہ کھانے کے کمرے میں جس جگہ میرا موبائل فون ہمیشہ اپنے چارجر کے ساتھَ پڑا رہتا تھا وہ وہاں نہیں ہے۔ یہ ایچ پی کا ایک خاصہ قیمتی فون تھا۔ اگر مجھے تحفے میں نہ ملا ہوتا تو میں اپنے آپ کو یہ عیاشی کبھی نہ کراتی۔ پہلا خیال تو یہ آیا کہ میں نے شاید بازار میں کہیں گرادیا ہے۔ نہیں، پھر یاد آیا کہ صبح میں نے اسے چارج کرنے کے لئے لگایا تھا اور ان لوگوں کے آنے سے آدھ گھنٹہ پہلے تک یہیں موجود تھا۔ اور اگر کہیں باہر گرایا تو چارجر کہاں ہے۔ یہ کام تو کسی بےحد ہوشیار اور معلوماتی شخص کا تھا کہ اسنے وہ فون چارجر کے ساتھ اٹھایا۔ تمام حقائق کو جوڑتی ہوں تو یقین آجاتا ہے کہ یہ ان تین لڑکوں میں سے ایک کا کام ہے جو دعوت کھانے آئے تھے۔ اور باقی چیزوں کو حل کرتی ہوں تو ایک اور چیز کا یقین ہو جاتا ہے کہ یہ سب سے بڑے بچے کا کام ہے جس کی عمر اٹھارہ سال تھی۔

گھر کے بزرگ حضرت نے فوراً انکی نانی کو فون کیا اور ماں سے بھی بات کی کیونکہ والد صاحب گھر پر موجود نہ تھے۔ انکا جواب یہ تھا کہ بڑے بچے کو تو ابھی ایک ہفتہ پیشتر نیا بلیک بیری خرید کر دیا گیا ہے وہ نہیں اٹھا سکتا۔ ویسے بھی وہ گھر بھر کا لاڈلا اور پسندیدہ بچہ ہے۔کیا ایسی پیاری شکل والا بچہ ایسا مکروہ کام کر سکتا ہے۔۔ دوسرے بچے کو فون سے کوئ دلچسپی نہیں ہے اور اس نے اپنا ذاتی فون بھی نہیں لیا ہے۔ باقی کے بچے بھی ایسی حرکت نہیں کرسکتے وہ سب بے حد تمیز دار بچے ہیں۔ یہ آپکی ماسی کا کام ہے یا آپ کہیں رکھ کر بھول گئی ہیں۔ جبکہ ماسی اس پورے عرصے کے دوران کچن میں میرے ساتھ مصروف رہی۔ بزرگ ان سے یہ کہتے ہیں کہ فون چلا گیا کوئ بات نہیں لیکن اگر آپ نے بروقت اپنے بچے کو نہیں پکڑا تو اسکی زندگی تباہ ہو جائے گی۔

گھر کا لاڈلا بچہ اٹھارہ سال کی عمر میں میٹرک کا امتحان دیتا ہے اور بغیر لائسنس کے گاڑی اعتماد سے چلاتا ہے۔ والدین کیوں سمجھتے ہیں کہ اسطرح بچوں کی زندگی کو آسانیوں سے بھر دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اب مزید کی طلب نہیں کریں گے اور اس مزید کے لئیے غلط ذرائع استعمال نہیں کریں گے۔ہر شخص اپنے ہی تجربے سے سیکھنا چاہتا ہے۔اور بعض نہ تجربہ کرنا چاہتے ہیں اور نہ سیکھنا۔ زندگی جس طرح بغیر چھیڑ چھاڑ کے گذر رہی ہے اچھی ہے۔

میں اداس ہوں میرے پاس جدید ٹیکنالوجی کی دو چیزیں تھیں اور اب نہیں ہیں۔ میں حیران ہوں میرے گھرسےدعوت کھا کر جانے والے مجھے نقصان پہنچا کر گئے۔ اب اپنے لیپ ٹاپ کو دیکھتی ہوں یہ اس ٹیکنالوجی کے زمانے میں میرے موجود ہونے کی واحد نشانی ہے یہ ایسی نشانی ہے جس میں دوسری اور نشانیاں محفوظ ہیں۔ خدا نہ کرے اس پہ کوئ بد نظر ڈالے۔ورنہ میں بھوں بھوں رو پڑونگی اور بہانہ بھی نہیں کرونگی کہ مجھے نزلہ ہوگیا ہے۔ روئیں گے ہم ہزار بار کوئ ہمیں رلائے کیوں۔

8:44 PM

Iqbal, Karachi zoo, Natural photography, کراچی چڑیا گھر، اقبال،

ترسا ہوا معاشرہ یا خود ترسیت

ہو سکتا ہے اس سے کچھ لوگوں کو شدید صدمہ ہو اور کچھ فخر سے کہیں کہ ہمیں تو معلوم تھا کہ یہ ایسے ہی ہیں۔ جب میں یہ کہوں کہ مجھے پرویز مشرف پسند ہے۔ لیکن اس ساری پسندیدگی کے باوجود مجھے اس دن بڑا آصدمہ پہنچا تھا جب انہوں نے نیو یارک میں بیٹھ کر کہا کہ خواتین ملک سے باہر جانے کے لئَے ریپ کرواتی ہیں۔ باتوں کو اس طرح عمومی طور سے لینے سےکچھ کو صدمہ ہوتا ہے۔ حالانکہ ان تمام خواتین میں سے میں نہیں ہوں لیکن لگتا ایسا ہے جیسے یہ بات میرے متعلق کہی گئی ہے۔کیونکہ یہ میری کمیونٹی کے ایک شخص کے متعلق کہی گئی تھی۔اگر بالفرض محال کسی نے واقعتاً اپنے مقصد کے حصول کے لئےایسا بھی کیا ۔ پھر بھی ذمہ داری کا تقاضہ یہ ہے کہ ان باتوں کو عمومی شکل دینے سے گریز کیا جائے۔خاص طور پہ وہ لوگ جنکے رتبے ہیں سوا۔

ایسا ہی اکثر ہم جیسے ناچیزوں کی تحریروں کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔

ہمارے کچھ ساتھیوں کے خیال میں پاکستانی معاشرہ ایک ترسا ہوا معاشرہ ہے۔ شاید کچھ خواتین بھی ایسا سوچتی ہوں۔ لیکن یہ نکتہ ء نظر فی الحال میرے سامنے کچھ مرد حضرات کے توسط سے آیا۔ یہ بات اس ضمن میں بالخصوص کہی جاتی ہے جب پاکستانی مردوں کی اخلاقی گراوٹ کی بات ہوتی ہے۔میں اس چیز سے اختلاف رکھتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ پاکستانی معاشرہ اپنے بنیادی رویئے میں ہندو معاشرہ سے زیادہ متاثر ہے۔ ہندءووں کے یہاں عورتوں کا وجود مردوں کی دل پشوری کے لئے پیدا کیا گیا ہے اسکا الگ سے کوَئ وجود نہیں ہے۔ قدرت نے اسے جن خوبیوں سے نوازا ہے وہ سب مرد کو خوش رکھنے کے لئیے ہیں۔ انکے عبادت کے مراکز میں داسیوں کا تصور، عورت کا پتی ورتا ہونا، عورت کا ستی ہوناحتی کہ شوہر کی لمبی حیات کے لئے یہ عورت ہی ہوتی ہے جو سارا دن ایک طرح کا روزہ رکھتی ہے۔ مرد کو اپنی بیوی کی لمبی حیات سے کوئ سروکار نہیں۔ بھگوان کے چاک پر ایسی ہزاروں چیزیں روزانہ بنتی ہیں۔ یہ سب خیالات اور رسومات معاشرے میں مردوں کی برتری قائم رکھنے کے لئے بنائیں گئ ہیں۔ سینکڑوں سال انکے ساتھ گذارنے کے بعد ہمارے اندر بھی کچھ اسی قسم کی روایات نے جنم لے لیا ہے۔ اور یہ کوئ ابھی کی بات نہیں ہے بلکہ ان سب چیزوں کو جنم لئے ہوئے بھی صدیاں گذر گئیں۔

یہاں پر بھی مرد کو ہر اچھائ اور برائ کا اختیار حاصل ہے وہ اگر کسی برائ کا شکار ہے تو یا تو اس میں کہیں نہ کہیں سے عورت کا قصور ہوتا ہے یا پھر یہ اسکی جبلت کا حصہ قرار دیا جاتا ہے۔ یا پھر معاشرے کی گھٹن۔ جس سے کچھ نامعلوم وجوہات کی بناء پر خواتین کو امیونٹی حاصل ہے۔

میں اپنی ماسی سے پوچھتی ہوں تمہارے کتنے بچے ہیں جواب ملتا ہے چار بیٹے ہیں جی۔ مگر کچھ دنوں پہلے تو تم کہہ رہی تھیں کہ تمہاری بیٹیاں بھی ہیں دو۔ وہ جواب دیتی ہے۔ہیں جی پر بیٹیاں تو پرائ ہوتی ہیں۔ کیوں تم نے انہیں پیدا نہیں کیا تھا ۔ مجھے غصہ آگیا۔ میرے تیور دیکھ کر وہ تھوڑا پریشان ہو گئ۔ سوچ رہی ہوگی اس میں ناراض ہونے والی کون سی بات ہے۔ یہ باجیاں بھی بس غصہ ہونے کا بہانہ تلاش کرتی ہیں۔

نذیراں ، میری ماسی یہ پورا معاشرہ نہیں ہے۔ لیکن وہ اس معاشرے کی اکثریت کو ظاہر کرتی ہے۔ سماج کا نظام انہی سوچوں پہ چلتا ہے جو اکثریت روا رکھنا چاہتی ہے ۔ جدید زبان میں اسے جمہوریت کہتے ہیں۔ میری دوست جس کی عمر تیرہ سال تھی اور وہ ہمارے گھر کے نزدیک کچی آبادی میں رہا کرتی تھی۔ اسے ہماری کالونی کے ایک کھاتے پیتے گھرانے کے سترہ اٹھارہ سالہ لڑکے نے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ لڑکی کی والدہ جب اس لڑکے کے والد کے پاس پہنچیں اور دبے لفظوں میں انہیں اس زیادتی کے بارے میں بتایا۔ انہوں نے جواب دیا۔ لڑکا ہے ابھی اسکی عمر ہی کیا ہے۔ کر لیتے ہیں مرد ایسے بھی۔ تم اپنی بیٹی سے کہو ذرا خود احتیاط برتا کرے۔ کس کس کے گھر جا کر شکائیتیں لگاءوگی۔ اب یہاں اس لڑکے سے میری مراد ہمارے بلاگر ساتھیوں میں سے کوئ نہیں ہے۔ لیکن وہ لڑکا اسکے گھر والے، ہمارے معاشرے کی ایک عمومی سوچ کو ظاہر کرتے ہیں۔

یہ سن کر اگر میں یہ کہوں کہ مرے بھائ اور میرے شوہر یا مجھ سے منسلک مرد تو ایسا نہیں کرتے ، اور کسی نے اسے گھڑا ہے۔تو یہ اتنا ہی غلط ہوگا جتنا کہ یہ بات کہ اب اس معاشرے کا ہر مرد اورا سکے گھر والے اتنے ہی غیر ذمہ دار ہیں۔ ایسا نہیں ہے یہاں ایسے لوگ بھی ہیں جن سے مل کر زندگی سے محبت ہو جاتی ہے اور میں دوسروں کو یہاں انعام لینے کا موقع کیوں دوں۔ دراصل میں وہ انسان ہوں جس سے مل کر آپ کو زندگی سے محبت ہو جائے۔ چاہے میری عداوت میں ہی کیوں نہ ہو۔

یہا ں لڑکے دھڑلے سے اپنی ساتھی یا رشتےدار خواتین کے ساتھ اپنے تصوراتی افئیرز کے بارے میں گفتگو اور مذاق کریں کوئ اس بات کا برا نہیں مانتا۔ لیکن اگر کوئ خاتون اپنے کسی تصوراتی عشق کے بارے میں اس طرح کوئ بات مذاقاً کہے تو سب کی پیشانی پر بل پڑ جاتاہے۔ مرد حضرات چاہے تنقید کے لئیے ہی سہی خواتین کے جسمانی تذکرے اتنی تفصیل سے کریں گے کہ تفصیلات میں ہی نفسانی مزہ آنے لگے تو کسی کو کچھ احساس نہیں ہوتا لیکن اگر میں یہ کہوں کہ مرد حضرات سڑکوں کے کنارے جب قدرتی ضروریات سے فارغ ہو رہے ہوتے ہیں تو کتنی بےحیائ لگتی ہے تو لوگ الٹا مجھے ہی بے حیا بنا دیں گے کیوں کہ میں خاتون ہوں۔ ایسی باتیں کرتی ہوں۔

ہمارے ہی ملک میں وہ گھرانے جہاں اس قسم کا رویہ نہیں رکھا جاتا وہاں مرد ایسی سوچ نہیں رکھتے۔ آخر یہ جو عورتوں کی ایک بڑی تعداد یہاں نکل رہی ، علم حاصل کر رہی ہے، اپنی صلاحیتیں استعمال کر رہی ہے تو انکے پیچھے ایسے ہی مردوں کی حوصلہ افزائ بھی شامل ہے۔ ورنہ ایک ایسے معاشرے میں جہاں خواتین اپنے گھر کے مردوں کی پسند کے کپڑے پہنتی ہوں، انکی پسند کا کھانا کھاتی ہوں، انکے دئیے ہوئے پیسوں سے اپنا گھر چلاتی ہوں۔ وہاں اتنی بڑی تبدیلی کچھ مردوں کے ساتھ دینے پر ہی آسکتی ہے۔ ان گھرانوں کے مرد بھی خدا جانے کیوں ایسی گھٹن کا شکار نہیں ہوتے۔ اور اس گھٹن سے لیس وہ گھرانے ہی کیوں نظر آتے ہیں جہاں خواتین کی اخلاقیات پر بڑی نظر رکھی جاتی ہے۔

ہاں تو میں نے یہ کہا کہ ہم یعنی عورتیں اور مرد مل کر اپنے مردبچوں کی تربیت اس طرح کرتے ہیں کہ ان میں موجود خامیوں کو بھی انکی مردانہ خوبیاں بنا کر پیش کریں۔ چاہے ہمارے اس طرز عمل سے ہمیں سماجی بنیادوں پر کتنا ہی نْقصان اٹھانا پڑے۔لوگ اپنی بیٹیوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہیں گے بیٹیاں بڑی شریف ہوتی ہیں درپردہ یہ کہنا ہوتا ہے کہ بیٹیوں کو شریف ہو نا چاہئیے۔ پھر ایک زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ، تمتماتے ہوئے گالوں کے ساتھ ایک ایک بڑی گالی اور پھر اس قسم کا جملہ لڑکے تو ہوتے ہی بڑے خبیث ہیں۔ یعنی اب وہ جو کچھ بھی کریں انہیں اجازت ہے یہ تو دراصل ہوتے ہی ایسے ہیں۔ کیا کریں جناب انکو کون سیدھا کر سکتا ہے۔

مجھے اس سے کوئ فرق نہیں پڑتا کہ میرا کوئ بیٹا نہ ہو لیکن اب میں سوچتی ہوں کہ ایک تو ہونا چاہئیے چاہے اڈاپٹ کر لوں تاکہ اپنے ارد گرد کے لوگوں کو بتایا جا سکے کہ کس طرح ہوتی ہے مرد بچوں کی تربیت۔ لیکن اسکا صحیح حل مرد بچوں کو اڈاپٹ کرکے انہیں بہترین انسان بنانا نہیں ہے۔ بلکہ خدا نے جنہیں اولاد جیسی نعمت سے نوازا ہے انہیں یہ کرنا ہوگا کہ اپنے بچوں کو انکی جنس سے الگ بنیادی انسانی خوبیوں سے بہرہ مند کریں۔ ہمیں ایک خااتون سے لڑائ جھگڑا یا گالی گلوچ نہیں کرنا چاہئیے اسکے بجائے بیان یہ ہونا چاہئیے کہ ہمیں کسی سے بھی گالی گلوچ نہیں کرنا چاہئیے اور زبان کو بہتر طور پہ استعمال کرنا چاہئیے۔ ہماری بچیوں کو حیا سے رہنا چاہئیے، اسکے بجائے یہ ہونا چاہئیے کہ حیا انسانی خواص میں سے بہترین خاصیت ہے اور ہمارے ایمان کا جز ہے اسے ہر انسان کو اختیار کرنا چاہئیے۔ مرد کو بے غیرت نہیں ہونا چاہئیے، اسکے بجائے یہ ہونا چاہئیے کہ ہر انسان کے اندر غیرت، عزت نفس اور خود داری ہونا چاہئیے۔ لڑکی کی عزت آبگینے سے زیادہ نازک ہوتی ہے اور اس طرح محض ایک لڑکی کو سراسمیہ حالت میں رکھنے کے بجائے یہ ہونا چاہئیے کہ جسمانی تعلقات میں ہر انسان کو ذمہ داری کا مظاہرہ کرنا چاہئیے۔ کیونکہ یہ نسل انسانی کو آگے چلانے کا ایک ذریعہ ہے۔اسے خواتین سے منسلک کر کے بھونڈے مذاق کرنےکے بجائےبچوں کو اس بات کی آگاہی دیں کہ ہر آنیوالا بچہ اپنے حقوق رکھتا ہے زندہ رہنے کے اور بہتر طور پہ زندگی گذارنے کے، اپنے تعلقات میں لا پرواہی کرکے اس بچے کی حق تلفی نہ کریں۔

ان سب باتوں سے بھی بڑی بات اپنے بچوں کا اعتماد حاصل کرنا ہے تاکہ وہ اپنے کسی بھی قسم کے مسئلہ کو اپنے والدین سے شیئر کرنے میں جھجھک محسوس نہ کریں۔ انکے ساتھ شریک ہوں ایک نئے سرے سے زندگی دریافت کرنے کے لئے اس سے پہلے کہ وہ اپنے ماحول سے ایک ضروری معلومات غلط طریقے سے لیں۔ یہ آپ ہوں جو انہیں وہی بات ایسے طریقے سے سمجھائیں کہ ان میں کسی قسم کا ہیجان پیدا نہ ہو۔ اگر ہم اپنے طور پر چیزیں صحیح کرنا شروع کریں تو ایک نسل کے فاصلے کے بعد بہت سی چیزیں آج سے بہت مختلف اور بہتر ہو سکتی ہیں۔

اب آخیر میں یہ کہ یہ سب اپنے ایک بلاگر ساتھی کی وضاحت کے لئے لکھنا پڑا۔ وہ جان گئے ہونگے کیوں نام لیا جائے۔

8:48 PM

Gender discrimination, Perwaiz Musharrafپرویز مشرف ، ہندو معاشرہ، جنسی امتیاز ،, Reproductive health issues

رقص مار

یہ وہ رقص نہیں ہے جو مارنے پر کیا جاتا ہے اسے رقص بسمل کہتے ہیں۔ اور اسکے نتیجے میں مضروب جان سے گذر جاتا ہے۔ یہاں جان کسی بس اسٹاپ کا نام نہیں ہے نہ یہ وہ ہے جس کے متعلق ایک بچے نے اپنی امی سے پوچھا کہ جان کہاں سے جاتی ہے۔ ماں بہت دیر سوچتی رہی اور پھر کچھ ہکلاتے ہوئے کہنے لگیں۔ پیروں سے۔ جی نہیں بچے نے انتہائ وثوق سے کہا۔ کھڑکی سے جاتی ہے۔ اب ماں حیران ہو گئیں۔ تمہیں کیسے پتہ چلا بیٹا۔ انہوں نے اپنے معصوم بچے پر صدقے واری ہوتے پوچھا۔ کہنا لگا۔ ابو کل آنٹی کو کہہ رہے تھے۔ جان، کھڑکی سےچلی جاءو وہ دروازے پر موجود ہے۔ یقیناً اسکے بعد وہ اپنے شوہر کی معصومیت پر بھی فدا ہوئیں ہونگیں۔ لیکن ہم اس واقعے کی جو کہ بعد میں ایک سانحے میں تبدیل ہوگیا مزید تفصیلات میں اس پوسٹ کے طویل ہونے کی وجہ سے نہیں جا سکتے۔ حالانکہ مجھے معلوم ہے کچھ لوگوں کو دراصل ابھی مزہ آنا شروع ہوا ہوگا۔ لیکن ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اسی لئے شاعر کہتا ہے کہ یہ دنیا ہے یاروں۔ حالانکہ وہ، وہ دنیا ہے یاروں بھی کہہ سکتا تھا۔ لیکن محض یہ کہہ دینے سے جو معنوی حسن پیدا ہوا ہے وہ، وہ کہہ دینے سے کہاں پیدا ہو سکتا تھا۔ ایسے ہی شاعروں کے آگے وہ کیا کہتے ہیں زانوئے تلمذ تہہ کرنے کو دل کرتا ہے۔ مشکل لفظ ہےلیکن کچھ مشق کے بعد نہ صرف بولنا ، لکھنا بلکہ تہہ کرنا بھی آجائے گا۔ کچھ لوگوں کو شاعری کا بالکل پسند نہیں ہوتی اور وہ اسے دنیا میں سوائن فلو سے کم نہیں سمجھتے جبکہ کچھ لوگ ایک ہاتھ میں اپنا دل اور دوسرے میں دیوان لئے پھرتے ہیں۔ اگر دونوں ایکدوسرے کے ساتھ بیٹھے ہوں تو لگتا ہے کہ کسی بھی وقت بھینس کے آگے بین بجنا شروع ہو جائے گی۔ ایسے موقعوں پر سمجھدار افراد کسی نقص امن کے پیدا ہونے کے ڈر سے کچھ کرتے ہیں۔ ہاں لیکن کیا ہے کہ بین پر یاد آیا کہ مجھے رقص مار کے متعلق کچھ بتانا تھا۔ اور باتیں ہیں کہ سانپ کی طرح ہاتھ سے پھسلے جا رہی ہیں۔ ہاں تو مار، سانپ کو بھی کہتے ہیں۔ اب یہ تو مجھے یاد آرہا ہے کہ کئ شاعروں نے محبوب کی زلف کو مار سیاہ سے تشبیہ دی ہے لیکن شعر کی پٹاری خالی ہے کیونکہ اس وقت وہاں ایک عدد سانپ براجمان ہے۔ میں نے اسے ہلکا سا ہش کیا تو وہ چل پڑا۔ جی میں آئ کہ سپیرن بن کر دیکھوں کیا میری دھن پر بھی یہ لہرائے گا۔ یہ تو جا رہا ہے۔

یہ دھن اگرچہ انتخاب میرا ہے لیکن کہیں اور سے اٹھائ گئ ہے۔ پانی میں کیمرہ مینی امر محبوب نے کی ہے۔ اس مختصر سی فلم کی ایڈیٹنگ کرنے کا موقع بھی مجھے ملا۔ یہ ملائیشیا کے سمندر میں پایا جانے والا دھاریدار سانپ ہے۔ ہمارے ملک کے پانیوں میں بھی ملتا ہے آئیے دیکھیں رقص مار۔

ریفرنس؛

امر محبوب

سمندری دھاریدار سانپ

8:28 AM

amar mahboob, banded snake, malysia, scuba diving, under water phtography, زیر آب کیمری مینی, غوطہ خوری، سانپ کا رقص، امر محبوب

چھم چھم کا غم

بات شروع ہوئ تھی گھنگھور گھٹاءوں سے بیچ میں برئ پراٹھے اور آم آئَے۔ ابھی بھی عذاب نہیں آئے۔ ہم اپنی قسمت پہ اترائے۔ سوچا کہ خدا ہم ناہنجاروں سے کچھ زیادہ ناراض نہیں۔ رحمت بھی ہے اور نعمت بھی۔ اپنے آپ کو بنی اسرائیل سے افضل جانا۔

پھر نیرہ نور نے بڑا ساتھ دیا اور ہم کافی دیر انکی آواز میں بولتے امیرخسرو کو سنا کئے،

جھولا کنے ڈالا رے ہمریاں

دو سکھی جھولیں، دو ہی جھلائیں

دو سکھی جھولیں ، دوہی جھلائیں

چاروں مل گئیاں، بھول بھلیاں

جھولا کنے ڈالا رے ہمریاں

پھر برآمدے میں بیٹھے مشتاق یوسفی کے مضمون کراچی کی بارش کے جملوں کو یاد کرتے رہے۔ پھر اسکےبعد------------------چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

غرور کا سر نیچا، اندھیرا جب حد سے آگے بڑھا تو تسلی دی کہ یہ تو لوڈشڈنگ ہے ابھی کچھ دیر میں باری آنے پر ہماری قسمت کا ستارہ چمکے گا۔ اور یہ رو سیاہی جس میں اپنی قسمت اور دوسروں کی تدبیر کا بھی دخل ہے، دور ہوگی لیکن ہمارے گھر میں موجود بجلی بابا نے کہا رات بغیر بجلی کے گذارنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ کیونکہ جنریٹر کام نہیں کر رہا ہے۔ آپ کے منہ میں خاک۔ ابھی تو ساون کے کے اتنے گیت باقی ہیں۔ لیکن مرفی کا قانون ہمارے اوپر مسکرا رہا تھا۔ساری رات میں جہاں آئنسٹائن کے نظریہ ء اضافت کے پر پیچ گوشے کھلے وہاں یہ اندازہ ہوا کہ بجلی کے نہ ہونے سے کتنا وقت نکل آتا ہے۔

کہاں وقت ہے کہ دوڑا جاتا ہےاور ہماری اور اسکی رفتار میں دوستانہ تعلقات پیداہونے سے قبل ہی لمحہ ء فراق آجاتا ہے اور کہاں رات ایک پہاڑ کی طرح سامنے کھڑی ہے۔ایک ایک جھینگر، اور مینڈک کے ٹرانے کا فرق پتہ چل گیا۔ سات جھینگر اور دو مینڈکوں کے سروں کے درمیان اڑوس پڑوس کی آوازیں کہ یہ کس گھر سے آرہی ہیں۔ درمیان میں اپنے گھر کی آوازیں نفی کرتی جاتی ہوں۔ مگر رات اسی طرح پل پل گذر رہی ہے۔ تھوڑی دیر میں اتنی مہارت حاصل ہو جاتی ہے کہ باہر برسنے والی بارش کا اندازہ کر سکوں کہ اتنی دیر میں کتنے ملی میٹر برس چکی ہے اور ابھی کتنی باقی ہے۔ اتنا علم حاصل ہو جانے کے بعد بھی محکمہ ء بجلی کی تسلی نہ ہوئ۔ وہ ہمیں علم کے ثریا کے بام عروج پہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر انہیں گالیاں دینے کے بجائے ہم اسی طرح صبر و تحمل سے علم کے حصول میں لگے رہیں تو کچھ دنوں میں مسلمان دنیا میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر لیں گے۔

اب اندازہ ہوا کہ یہ کم بخت ویلیئم گلبرٹ نے ۱۵۵۰ میں بجلی دریافت کر کے مسلمانوں کے خلاف سازش کی بنیاد رکھی۔ اگر وہ یہ نہ دریافت کرتا تو آج ہم کتنے آگے ہوتے۔ ان ناہنجار سوچوں کا بھی کوئ فائدہ نہیں۔ ایڈیسن کے ایجاد کئے ہوئے بلب اسی طرح بجھے ہوئے ہیں۔ ڈرائیو وے میں بلی کے بچے کو کھانا چاہئیے یہ پتہ نہیں کہاں سے تین دن پہلے آگیا ہے۔ اسکی میاءوں پر غور کرتی ہوں۔ مگر پہلو سے آواز آتی ہے اماں پنکھا کیوں نہیں چل رہا۔ میں اس آواز کو ویلئم گلبرٹ کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں، لیکن رک جاتی ہوں۔ جھینگر، مینڈک، بلی، پڑوسی، بارش کی چھم چھم ۔، اور دور تک چھائے اندھیرے میں ایک نا معقول شخص کا نام کیوں لیا جائے جس نے ہمیں ترقی کی راہ سے بھٹکا دیا اور فحاشی، بے غیرتی اور بے حیائ کے رستے پہ روانہ کردیا۔ میں اسے تسلی دیتی ہوں۔ پنکھا سو رہا ہے تھک گیا ہے۔

صبح ہو گئ، دوپہر، سہ پہر اور اب رات ہونے کو ہے۔ سوچتی ہون یہ اتنی بیکلی کیوں ہے، وہ مجھے بھول گیا ہو جیسے۔کیا ایک اور رات فطرت کے قریب رہنے کا موقع ملے گا۔ وہی جھینگر، مینڈک اور بلی، پڑوسی---------

ادھر ادھر فون کرتی ہوں۔ کچھ لوگوں کی لائٹ آگئ ہے۔ سسٹم آہستہ آہستہ بحال ہو رہا ہے۔ نئ توقع باندھتی ہوں۔۔

اماں پنکھا اٹھ گیا، لائٹ آگئ۔ ایک باریک آواز نے اطلاع دی۔ ویسے بھی مجھے اندازہ ہوگیا تھا۔ وہ ساری آوازیں گم جو ہو گئ تھیں۔ جھینگر ، مینڈک، بلی، پڑوسی اور ہاں بارش کی چھم چھم بھی۔ کیا مصیبت ہوتی ہے یہ بارش بھی۔ میں پھر نیرہ نور کو سنتی ہوں۔

ہاں یاد مجھے تم کرلینا، آواز مجھے تم دے لینا

اس راہ محبت میں کوئ در پیش جو مشکل آجائے

اے جذبہ ء دل گر میں چاہوں، ہر چیز مقابل آجائے

نوٹ؛ چونکہ یہ واقعہ کراچی میں پیش آیا ہے اس لئے اس شہر کا نام لیا گیا ہے۔ دوسرے شہروں کے رہنے والے کسی بھی قسم کے احساس محرومی کا شکار نہ ہوں۔ میں نے کسی بھی قسم کا تعصب برتنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

ریفرنس؛

ویلیئم گلبرٹ

8:32 PM

Karachi, Mushtaq Ahmad Yousfi, William Gilbert, کراچی، مشتاق احمد ےوسفی، نیرہ نور، برئ پراٹھے، بارش، لوڈشیڈنگ،

تین مزار، تین کہانیاں

یہ سردیوں کی ایک ٹھٹھرتی رات تھی۔ جب میں نے لاہور ائیر پورٹ پر قدم رکھا۔ ہمارے میزبان وہاں پر ایک ایسا جوڑا تھا جو حال ہی میں امریکہ سے پاکستان سیٹل ہونے کے ارادے سے واپس آگئے تھے ۔ صاحب کا تعلق سندھ سے تھا۔ ہمارے پاس چار دن تھے اور لاہور میں درجہء حرارت تین ڈگری سینٹی گریڈ۔ کوئ لاہوری جس نے کچھ سردیاں کراچی کی بھی دیکھی ہوں اندازہ کرسکتا ہے کہ میری کیسی قلفی جمی ہوگی۔حالت یہ تھی یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زبان میری۔ کیونکہ منہ کھلنے میں اندیشہ تھا کہ سرد ی منہ سے اندر چلی جائے گی۔

ایک شام جب ہم داتا گنج بخش کے مزار کے قریب سے گذرے تو میں نے اور انکی نومسلم انڈین بیگم نے نہایت شدت سے مزار کے اندر جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ہمیں مزار کے داخلی دروازے پہ اتار دیا گیا۔ جب ہم اپنی سینڈلیں جمع کرا رہے تھے اسوقت وہاں شور مچ گیا تھا کہ کراچی والے آئے ہیں بھئ۔ یہ مجھے نہیں معلوم کہ کراچی والوں کی پہچان کیا ہے۔ یہ میرا کسی پاکستانی مزار میں جانے کا پہلا اتفاق تھا۔ ان سب کو نظر انداز کر کے ہم دونوں اندر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے حجلہء خاص میں پہنچ گئے احاطے میں بہت سارے لوگ ادھر ادھر لیٹے بیٹھے ہوئے تھے۔ حجلہءخاص میں اندھیرا سا تھا کچھ لوگ کھڑے تھے اور کچھ دو زانو بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا جب یہاں تک آئے ہیں تو فاتحہ بھی پڑھ لیتے ہیں۔ ابھی فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھا کر ابتدائ کلمات پڑھے تھے کہ ایک چھڑی کی نوک کندھے میں چبھی۔ اور آوز آئ۔ عورتیں یہاں سے چلی جائیں۔ ہم دونوں نے ایکدوسرے کو دیکھا اور خاموشی سے باہر آگئے۔ کچھ مذاق اڑا۔معلوم نہیں تھا آپکو کہ انہوں نے تمام عمر شادی نہیں کی تھی۔ اور انہی کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کھڑی ہوگئیں۔

میں سردی اور صدمے سے خاموش رہی۔

اس بات کو کچھ عرصہ بیت گیا۔ کسی نے کہا۔ شاہ عبدالطیف کے مزار ہر ہر روز بڑے اچھے راگ گائے جاتے ہیں۔ یہ راگ شاہ صاحب کے ترتیب دئیے ہوئے ہیں اور انکی وفات سے اب تک بلا ناغہ انکے مزار میں ہوتے ہیں۔ جمعرات کے دن خاص سر گائے جاتے ہیں۔ہم نے بھی پلان بنا لیا ایک رات وہاں خرچ کرنے کا۔ کراچی سے تقریباً ڈھائ تین گھنٹےکی مسافت طے کرکے بھٹ شاہ پہنچے۔ مزار کے احاطے میں واقع ایک کمرہ رات بھر کے لئے کرائے پہ لیا۔ یہیں احاطے میں سندھ کے مشہور شاعرشیخ ایاز کا مقبرہ بھی ہے۔ ایک فٹپاتھی ہوٹل سے کھانا کھایا اور مزار پہ پہنچ گئے۔ وہاں شیعوں کی ایک مجلس جاری تھی۔ پتہ چلا کہ راگ رات کو بارہ بجے شروع ہوتے ہیں۔ کچھ وجوہات کی بنای پر اب شیعہ فقہے کے لوگ بھی مزار کے احاطے میں اپنی سرگرمیاں انجام دینے لگے ہیں۔ یہ ختم ہو جائے گی تو روزانہ کی چیزیں شروع ہونگیں۔ پونے بارہ بجے کے قریب راگ گانے والے اپنے ساز وسامان کے ساتھ آئے۔ ایک نیم دائرہ بنا کر حجلہء خاص کے سامنے بیٹھ گئے کچھ رسومات انجام دی گئیں۔ چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں دودھ بھر کر تمام حاضرین محفل کو پیش کیا گیا۔ ہمارے علاوہ وہاں چند اور لوگ تھے۔ مزار کے احاطے میں کچھ لوگ سو رہے تھے بچے کھیل رہے تھے۔ اور پھر انہوں نے اپنا راگ چھیڑا۔ ایک کے بعد ایک کئ راگ پیش کئے گئے۔اور ان راگوں نے ایسا سماں باندھا ک سب اسکے کیف سے فجر کے وقت باہر نکلے راگ کے اختتام پر حجلے کے سامنے فاتحہ پڑھی گئ اور ہم ہوٹل واپس آگئے تاکہ تین گھنٹے آرام کر کے واپسی کا سفر شروع کریں۔

یہ ایک اور مزار ہے اسکے لئے ہمیں پاکستان سے باہر نکلنا پڑا اور استنبول پہنچ کر ٹور ارینج کرانے والون سے بڑی بحث کرنی پڑی۔ جن جگہوں پہ ہم جانا نہیں چاہتے تھے ان ٹور پروگرامز میں یہ جگہ شامل تھی۔ اور جہاں ہم جانا چاہتے تھے ان میں نہیں تھی۔ بہر حال ایک ٹور پروگرام کو توڑ مروڑ کرہم قونیہ پہنچنے کے قابل ہو گئے۔ جہاں مولانا جلال الدین رومی کا مزار ہے۔ ہمیں یہاں ٹہرنے کے لئے ایکدن ملا تھا پورے شہر میں اور کوئ قابل ذکر جگہ نہ تھی۔ اور اتنی بڑی شخصیت کے بعد کسی اور کے رکنے کی جگہ بھی کہاں ہو سکتی تھی۔مزار کے چاروں اطراف میں پارک ہے۔ ایک مسجد ہے وضو خانہ ہے۔ داخلی دروازے پہ بڑے بڑے ٹوکرے رکھے ہیں۔ ان میں اسکارف موجود ہیں۔ کچھ پیسے لیکر ایک شاپر مل جائے گا جس میں جوتے ڈال کر بند کرلیں اب آپ اندر بھی اس تھیلے کو لیکر پھر سکتے ہیں۔اندر داخل ہونے سے پیشتر ان میں سے اسکارف اٹھالیں۔ مجھے دوپٹے کی وجہ سے ضرورت نہیں پڑی اندر سر ڈھنکنے کی کوئ پابندی نہیں۔ اندر ایکطرف ایک بڑی سی قبر ہے جو انکی ہے۔اس کے ساتھ اور قبریں بھی ہیں۔ جو انکے ساتھیوں کی ہیں۔ دیواروں پہ فارسی اشعارجابجا تحریر ہیں یا طغروں میں لگے ہیں۔ ایک خاتون کھڑی مثنوی مولانا روم پڑھ رہی تھیں اور کئ صاحبان قرآن پاک۔ ایک خاتون مکمل طور پر مغربی لباس میں، آنکھیں کاجل، مسکارا اور آئ شیڈو سے سجی ہوئیں لیکن اشکبار۔ اندر بیٹھنے کی جگہ نہیں ہے۔ کھڑے رہیں یا چلتے رہیں یہاں میں نے دیوار پہ لکھی ہوئ عبارتیں اپنی نوٹ بک میں اتاریں۔ میرے قریب کھڑے تیرہ چودہ سالہ بچے نے انتہائ حیرت سے اپنی ماں کو بتایا۔ شی نوز دی اسکرپٹ۔ یعنی میں وہ تحریر جانتی ہوں۔ ترکی اب انگریزی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ اس کمرے سے باہر نکلیں توایک اور ہال ہے جہاں انکی یادگاریں شوکیسوں میں لگی ہوئ ہیں۔

یہاں سے باہر آکر اسکارف واپس ٹوکروں میں ڈالدیں۔مزار کے باہر ایک نمائش لگی ہوئ ہے خطاطی کےمختلف نمونوں کی اور سوینیئرز کے طور پہ لیجانے والی چیزوں کی۔ جہاں سے میں نے چینی کے کپ لئے جن پر انکا ایک مشہور بند لکھا ہوا ہے۔

آءو آءو، تم جو کوئ بھی ہو اس سے فرق نہیں پڑتا

چاہے تم ایک کافر ہو، بت پرست یا آتش پرست

آءو، یہ جگہ مایوسی کی نہیں آءو، حتی کہ

اگر تم اپنی توبہ سو بار بھی توڑ چکے ہو، پھر آءو

ہم ہوٹل چھوڑ چکے تھے بقیہ سارا دن اسی احاطے میں گذارا۔ کتابیں پڑھتے ہوئے۔ شام کے وقت پارک لوگوں سے بھرگیا۔ زیادہ تر خواتین اسکارف باندھے ہوئے اپنے ساتھیوں کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گھوم رہی تھیں۔ بچے دوڑ رہے تھے۔ قریب ہی وہ جگہ ہے جہاں ہفتے کے مخصوص دنوں میں رقص درویش ہوتا ہے جو ہم نہ پا سکے ویسے بھی اسکا ٹکٹ اتنا مہنگا تھا کہ ہم جیسے سیاحوں کی جیب اسکا خرچہ برداشت نہیں کر سکتی۔

میں تمام نمازوں کے لئے وضو خانے میں جاکر وضو کرتی ہوں اور آرام سے مسجد میں مخصوص خواتین کے حصے میں نماز پڑھ آتی ہوں۔وضو خانہ اگر چہ کچھ فاصلے پر تھا مگر یہاں مجھے گھورنے والا اور آوزیں کسنے والا کوئ نہ تھا۔ میں بلا کھٹکے اکیلے مزار کا پورا احاطہ دیکھ ڈالتی ہوں۔کیونکہ میرے ساتھی پر سستی سوار تھی۔

یہ سیکولر ترکی ہے جسے ہم سب حقارت سے دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ ہم سے کم مسلمان ہیں۔

خیال جلوہء گل سے خراب ہیں میکش

شرابخانے کے دیوار و در میں خاک نہیں

نوٹ؛ رومی کے بند کا ترجمہ اس کپ پر لکھے ہوئے انگریزی ترجمے سے کیا گیا ہے۔ اگر کسی کے پاس اس سے زیادہ اچھاترجمہ موجود ہے تو براہ مہربانی ہمیں بھی شریک کریں۔

6:44 PM

Jalaluddin Rumi, ترکی, داتا گنج بخش, شاہ عبدالطیف بھٹائ, شیخ ایاز, مولاناجلال الدین رومی

مجھے اماں چاہئیں

یہ میری ڈھائ سالہ بیٹی کا سمر کیمپ فن میں پہلا دن تھا۔ یہاں وہ اس لئے ہے کہ میں محسوس کرتی ہوں کہ اسے دیگر بچوں کے ساتھ رہنا پسند ہے۔ مگر کلاس میں ماں کے ساتھ ہونے پر پابندی کی وجہ سے میں باہر برآمدے میں بیٹھی ہوئ تھی۔ مبادا اسکول والوں کو اسے بہلانے میں پریشانی کا سامنا ہو۔ مجھے اندر سے اسکے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اسے اماں چاہئیں۔ مگر میں دل کڑا کئے بیٹھی رہی۔ دس منٹ بعد آیا اسے میرے پاس واپس لے آئ۔ رونے سے اسکی آواز بیٹھی ہوئ تھی۔ وہ آتے ہی میرے گھٹنوں سے لپٹ گئ۔ میں نے اسے تسلی دی اور پوچھا کیا ہوا تھا۔ اس نے آنسو بھری آنکھیں میری طرف کیں اور سسکیاں لیتی کہنے لگی۔ 'اماں، آپ کہا ں چلی گئ تھیں۔ مشعل لوئ۔ مشعل بہت لوئ۔ مشعل نے کہا۔ اماں کہاں ہیں۔ اماں کہاں ہیں'۔ میں اسے سمجھاتی ہوں کچھ وقت بچوں کو دوستوں کے ساتھ بھی رہنا چاہئے۔ اماں ہر وقت ساتھ نہیں ہوتیں۔ دوستوں کے ساتھ بڑا مزہ آتا ہے۔ اسکول میں ٹیچر بڑے مزے کے گیمز کھیلتی ہیں، کتابیں پڑھتی ہیں اور پنسل بھی دیتی ہیں لکھنے کے لئے۔ اسے پنسلوں سے بڑی محبت ہے۔ مگر وہ میری یہ ساری باتیں سمجھنے سے انکار کر دیتی ہے اگر اماں نہیں تو پھر کچھ نہیں۔ وہ جواب دیتی ہے'اماں , یہ اچھا نہیں لگتا'۔

دفعتاً مجھے خیال آتا ہے اگر کوئ میرے جسم میں اسکے سامنے تیز خنجر سے اٹھارہ وار کرے کہ ہر وار سے میرے جسم کے سوتوں سے خون کی دھار پھوٹ پڑے اور میرے شوہر جب مجھے بچانا چاہیں تو ارد گرد کھڑے پولیس والے بجائے مجرم کو پکڑنے کہ گولی میرے شوہر پہ چلادیں۔ خنجر کے ان واروں کی تاب نہ لا کر میں موقع پر ختم ہو جاءوں۔ اور میرے شوہر کو ہسپتال کے انتہائ نگہداشت کے شعبے میں پہنچا دیا جائے۔میرا وجود اس دنیا میں نہیں رہے۔ میری بیٹی کسی گوشے میں کھڑی سسک رہی ہو اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہوگی کہ کسی نے اسکی ماں کو دوپٹہ سر سے نہ پہننے کی پاداش میں جان سے ختم کردیا ہے۔ اسے اماں چاہئیں۔ کیونکہ اماں کے بغیر اتنے بڑے بچے کو کچھ اچھا نہیں لگتا۔

لیکن میں ابھی زندہ ہوں۔ البتہ مجھ سے ملتی جلتی ایک مصری مسلمان عورت ماروا ایک تین سالہ بچے کی ماں جو ایک ترقی یافتہ ملک جرمنی کی ایک عدالت میں موجود تھی اپنے بچے کے سامنے اسی انجام سے دوچار ہوئ۔ایک احساس سے عاری خنجر کے اٹھارہ وار اسے زندگی جیسی خوبصورت نعمت سے محروم کر گئے جبکہ اسکی کوکھ میں ایک اور زندگی بھی پل رہی تھی۔ اس بچے نے اپنی ماں کو کھونے کا سانحہ کیوں دیکھا۔ کیونکہ اس کی ماں نے اپنے سر کو چار گرہ کپڑے سے لپیٹے ہوا تھا۔ جسے اس معاشرے کا ایک طبقہ سخت نہ ناپسند کرتا ہے۔ ایک ترقی یافتہ معاشرہ جو کپڑوں سے آزاد عورت کو اپنے اندر سمونے میں کوئ جھجھک محسوس نہیں کرتا لیکن چند کپڑے زیادہ پہن لینے پر ایسا ردعمل سامنے آتا ہے۔ ایک ہمارا معاشرہ ہے جہاں خواتین کی اکثریت نہ صرف کپڑوں بلکہ دیواروں کے اندر لپٹی ہوئ ہیں وہاں کچھ عورتوں کے ذرا سا کپڑے کم کر دینے ، ان دیواروں سے باہر آنے پہ ایک شور و غل مچ جاتا ہے۔ جہاں میں اور میری جیسی مزید عورتیں جو اس چار گرہ کپڑے کوسر سے لپیٹنے سے دلچسپی نہیں رکھتیں۔ وہاں ماروا جیسی عورتیں ہیں جو اسے اپنانا چاہتی ہیں۔ آخر معاشرہ عورتوں کو اپنے حساب سے زندگی گذارنے کی اجازت دینے میں کیوں اتنا شدت پسند ہے۔

آخر دنیا عورتوں کے کپڑوں کے بارے میں کیوں فکرمند رہتی ہے۔۔

صاحبو، میں اپنی بیٹی کی طرف پلٹتی ہوں ۔ اسے اماں چاہئیں۔چاہے اس نے دوپٹہ سر سے اوڑھا ہو یا نہ اوڑھا ہو۔ اسے اماں کے بغیر کچھ اچھا نہیں لگتا۔

ریفرنس؛

مصری خاتون کا قتل

مصری خاتون کا قتل ایک رپورٹ

8:07 AM

شدت پسندی، پردہ اور خاتون،ماروا مصری خاتون، جرمنی، سمر کیمپ، Germany

بات وہ آدھی رات کی

آدھی رات کو جب یہ دنیا والے خوابوں کی سیج سجاتے ہیں تو ایسے میں ہم شہروں کے رہنے والے ایکدوسرے کے فون کھڑ کھڑاتے ہیں۔ کیا کریں یہی وہ وقت ہوتا ہے جب اپنے آپ سے ملاقات کرنے کا موقع ملتا ہے اورپھرکسی بہانے دوسرے ساتھیوں کو یادکرنے لگتے ہیں ۔یہ کچھ اوکھی سی گفتگو کا خلاصہ ہے۔ آنکھوں پر عقیدت کی پٹی باندھ کر پھرنے والے اور انسانی محبوبوں کو خدا سمجھنے والے اگر نہ پڑھیں تو انکا کچھ نقصان نہیں ہوگا۔ یہ دوسرا شخص، ایک ہمراہی ہیں۔ انکی اور میری ہم آہنگی ایسی ہے کہ باوجود مختلف طرز فکر رکھنے کے میں انہیں غدار پاکستان اور کافر نہیں سمجھتی اور وہ بھی مجھے اس وطن کے وفاداروں میں اور مسلمانوں میں خیال کرتے ہیں۔ یاد رہے اردو گرامر میں اگر تانیث ظاہر کرنا مقصود نہ ہو تو مذکر کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔ تو یہ کوئ بےوقوف خاتون بھی ہو سکتی ہیں اور عقلمند مرد بھی۔

شش،آرام سے سنیں۔

میں؛ کیا ہو رہا ہے سونا تو یقیناً نہیں چل رہا ہوگا۔

ہمراہی؛ نہیں کل کی تیاری چل رہی ہے۔ کس لئے یاد فرمایا آپ نے۔

میں: بھئ ایک موضوع چھڑا ہوا ہے۔قاضی صاحب کے حوالے سے۔

ہمراہی ؛ کون سے قاضی؟

میں؛ جناب قاضی حسین احمد، انہوں نے اقبال اور قائد اعظم کے حوالے سے اپنے ایک مضمون میں جس کے اقتباسات ڈان میں بھی کچھ دنوں پہلے شائع ہوئے تھے۔ یہ کہا ہے کہ اس ملک کو دراصل اسلامی مملکت بننا ہے ورنہ یہاں کا مسئلہ حل ہونے والا نہیں۔ انہوں نے اقبال کی نظم وطنیت کے ان اشعار کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات کہی کہ اقبال وطنیت کے سخت مخالف تھے۔

ان تازہ خداءوں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیراہن ہےاس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے

میرے ہاتھ میں اس وقت کلیات اقبال ہے۔ انکی نظم وطنیت بانگ درا میں موجود ہے اور اس نظم سے کوئ سو صفحے پہلے انکی نظم ہندی ترانہ موجود ہے جس میں انہوں نے ہندوستاں کو اپنا وطن قرار دیتے ہوئے اسے اپنی محبتوں کا مرکز قرار دیا ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

ہم بلبلیں ہیں اسکی یہ گلستاں ہمارا

غربت میں ہوں اگر ہم، رہتا ہے دل وطن میں

سمجھو وہیں ہمیں بھی، دل ہو جہاں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

میں الجھن میں ہوں۔ علامہ کی بات میں تضاد کیوں ہے۔

ہمراہی؛ دراصل علامہ ابتدائ طور پر تو نہیں البتہ بعد میں پین اسلام ازم کی طرف مائل ہو گئے تھے ان کی دوسری نظم وطنیت اسی دور کی ہے اور اپنے انتقال کے وقت تک وہ اسی پر قائم رہے۔ جبکہ نظم ہندی ترانہ پہلے دور سے تعلق رکھتی ہے۔

میں؛ مزید بات قائد اعظم کی اس پالیسی ساز تقریر کے حوالے سے جو انہوں نے قیام پاکستان سے دو دن قبل دی تھی۔

’آپ آزاد ہیں عبادت کے لیے اپنے مندروں میں جانے میں آزاد ہیں ،آپ اپنی مسجدوں میں جانے میں آزاد ہیں آپ مملکت پاکستان میں اپنے عقیدے کے مطابق اپنی عبادت گاہوں میں جانے میں آزاد ہیں آپ خواہ کسی مذہب،فرقے یا عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں امور مملکت کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ۔ ۔ ہم سب ایک ہی مملکت کے شہری ہیں اوربرابر کے شہری۔ ۔ ۔ پس ہمیں اس نصب العین کو ہر وقت اپنے سامنے رکھنا چاہیے اور آپ وقت کے ساتھ ساتھ دیکھیں گے کہ نہ ہندو،ہندو رہے گا اور نہ مسلمان ،مسلمان ،مذہب کے معنوں میں نہیں کیونکہ یہ تو ذاتی عقیدت کا معاملہ ہے بلکہ سیاست کے معنوں میں جب ہر شخص مملکت کا شہری ہوتا ہے ‘‘۔

اسکے بارے میں قاضی صاحب کا کہنا ہے کہ صرف اس تقریر کے پیچھے سب پڑ گئے ہیں حالانکہ اس سے پہلے اور اسکے بعد انہوں نے کتنی دفعہ ایسی باتیں کیں جس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہئے کہ وہ ایک اسلامی مملکت چاہتے تھے۔ ایک اسلامی مملکت جہاں اسلامی قوانین کا نفاذ ہو۔ مجھے تو قاضی صاحب کی یہ بات صحیح لگتی ہے۔

ہمراہی؛ تو ان سے آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ خود قائد اعظم کسطرح کے مسلمان تھے اور وہ اسلام کو کیسا سمجھتے تھے۔ محترمہ شاید آپ نے وہ واقعہ نہیں سنا کہ جناح صاحب کو نماز پڑھنا نہیں آتی تھی۔ ایکدفعہ کسی اجلاس کے دوران جب انہیں جماعت نماز پڑھنی پڑی تو عین نماز کے دوران جب سب لوگ رکوع میں چلے گئے تو وہ کھڑے رہ گئے اور انتہائ حیرت سے بولے کہ واٹ اے ڈسپلن۔

میں؛ یہ تو ایکدم مذاق ہے گھڑا ہوا۔

ہمراہی؛ جب انسان صدمے سے زیادہ حیرت میں ہو تو اسے چیزیں یونہی مذاق لگتی ہیں۔ وہ تو کہتے تھے کہ رسول اللہ نے آج سے تیرہ سو سال پہلے جمہوری طرز حکومت کی بنیاد رکھ دی تھی۔ وہ خودتو سرتاپا ایک سیکولر انسان تھے۔امیر اتنے کہ اصلی ریشم کی ٹائ بھی ایکدفعہ کے بعد دوسری نہیں پہنتے تھے۔مغربی پینٹ کوٹ کے ہاتھ کے سلے ہوئے سینکڑوں سوٹ انکے پاس اس وقت موجود تھے۔

میں؛ انہوں نے مسلمانوں کے لئے پاکستان حاصل کرنے کی جنگ لڑی آپ کو معلوم ہے انکے جلسوں میں لوگ نعرے لگایا کرتے تھے کہ پاکستان کا مطلب کیا لا الہ اللہ۔

ہمراہی؛ اول تو انہوں ے یہ نعرہ کبھی خود نہیں لگایا اور دوئم انہوں نے یہ نعرے بھی کبھی نہیں لگوائے۔ مختلف تحریکوں میں جذبہ پیدا کرنے کے لئے نعرے تخلیق کئے جاتے ہیں۔ انیس سو پینسٹھ کی جنگ میں نام نہاد جیت میں بھی ملکہء ترنم نورجہاں کے گانوں کا بڑا حصہ ہے۔ کیا آپ اس سے واقف نہیں۔ اب آپ کہیں جنگ اور اسکے لوازمات جیسے کھڑاگ کی کیا ضرورت ہے۔ دو چار نورجہانوں سے کام چل جائے گا۔ اور مزید یہ کہ حکومت وقت نے جنگ کو اسی مْصد کے لئے جیتا کہ نورجہاں اور گانے گائیں۔

میں؛ تو آپ سمجھتے ہیں کہ وہ سیکولر پاکستان چاہتے تھے۔

ہمراہی؛ میرا خیال ہے کہ وہ مسلمانوں کے لئے ایک ایسی مملکت چاہتے تھے جس کے قاعدے قوانین مسلمان اپنے فائدے، نقصان اور اپنی ثقافت کو مد نظر رکھ کر بنائیں۔ آپ یا دوسرے لوگ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ پاکستان محض جناح کی کوششوں سے نہیں بنا۔ کوئ بھی تحریک صرف لیڈر کے بل بوتے پہ نہیں چل سکتی بلکہ ان لوگوں کا عزم بھی اس میں کام کرتا ہے جو اس سے متاثر ہوتے ہیں جن کے لئے وہ تحریک چلائ گئ ہوتی ہے۔ اب آپ بتائیں۔ پاکستان کی تحریک کی اصل جنگ ان علاقوں میں لڑی گئ جو آج پاکستان میں شامل نہیں۔ وہاں کے مسلمان، مسلمانوں کے لئے ایک الگ وطن کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ وہ مسلمان خود جیسی زندگی گذار رہے تھے ویسی ہی زندگی گذارنا چاہتے ہونگے یا اپنے مزاج سے الگ کسی نئے اسلام کی طلب کر رہے تھے۔ وہ اپنے آپ کو مسلمان ہی کہتے تھے ناں۔ یا پاکستان بننے کے بعد سب نئے سرے سے مسلمان ہونا چاہتے تھے۔ انکی پریشانی یہ نہیں تھی کہ انگریز حکومت انہیں انکے مذہب پر عمل پیرا نہیں ہونے دے رہی تھی بلکہ انکی پریشانی یہ تھی کہ انگریزوں کے جانے کے بعد وہ ہندو اکثریت کے رحم و کرم پہ رہ جائیں گے۔ اور اس صورت میں انہیں معاشی اور ثقافتی طور پہ ہراساں کیا جائے گا۔ مسلمان کمیونٹی کے مفادات کو ضرب لگتی تھی نہ کہ اسلام کو۔ اب جناح صاحب شراب بھی پیتے تھے، غیر مسلمانوں کے ساتھ ہوتے تو ایسا کوئ حلال حرام کا بھی خیال نہ رکھتے تھے۔ کوئ ایسے نماز روزے کے پابند نہ تھے۔ اب وہ کیسا اسلامی ملک چاہتے ہونگے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے پہلا وزیر قانون ایک ہندو کو اور پہلا وزیر خارجہ ایک قادیانی کو بنایا۔ آج لوگ انہیں ایک مذہبی شخصیت بنانے پہ تلے ہوئے ہیں۔ مجھے حیرت ہے قاضی صاحب ایسا کہہ رہے ہیں۔ انکی جماعت کے جد اعلی مولانا مودودی تو کہتے تھے کہ جس جماعت کی قیادت ’جناح جیسے آدمی‘ کے ہاتھوں میں ہے اس سے ایک اسلامی ریاست کے قیام کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے؟

میں؛ انہوں نے آخری عمر میں شراب چھوڑ دی تھی۔ باقی چیزوں کے بارے میں مجھے معلوم نہیں اور نہ کوئ خواہش ہے معلوم کرنے کی۔ انکی شخصیت پاکستان کی تخلیق کی جدوجہد میں سب سے نمایاں اور اہم ہے۔ میں نے تو کسی کی رائے یہ بھی پڑھی کہ اگر کانگریس کے پاس جناح جیسا ایک بھی لیڈر ہوتا تو پاکستان نہ بن پاتا۔ تو پاکستان کی تخلیق انکی دانائ اور زیرک شخصیت کی وجہ سے ممکن ہوئ۔

ہمراہی؛ انکا انتقال پھیپھڑوں کی ٹی بی کی وجہ سے ہوا تو وہ تو ڈاکٹری ہدایت ہوگی کہ ترک کر دیں۔ البتہ میں آپکی بات سے متفق ہوں کہ کسی شخص کی ذاتی زندگی کو اسکی قابلیت اور اہلیت سے الگ رکھنا چاہئیے۔ لیکن آپ اسی دنیا میں رہتیں اور دیکھتی ہونگیں کہ جب کسی کے خلاف کچھ بن نہیں پڑتا تو پھر ایسے ہی باتیں کی جاتیں ہے کہ وہ شراب پیتا ہے وہ یہ غیر اسلامی کام کرتا ہے وہ، وہ غیر اسلامی کام کرتا ہے اور پھر آخر میں یہ کہ وہ تو مسلمان یہ نہیں ہے کافر ہے۔۔ میرا سوال تو یہ ہے کہ جناح بھی یہ کرتے تھے اب انکی شخصیت کو اتنا مذہبی کیوں بنایا جارہا ہے۔ جناح کی پیدائش ایک کھوجے شیعہ گھرانے میں ہوئ اور وہ بعد میں اثناء عشری شیعہ میں چلے گئے۔ پاکستانیوں کی اکثریت سنی فقے سے تعلق رکھتی ہے۔ اب یہاں پہ کس فقہ کی حکومت ہوگی۔ وہ جس پر عوام کی اکثریت رضا مند ہے یا وہ جس پہ ہمارے قائد عمل پیرا تھے۔

میں: مجھے تو نہیں معلوم۔

ہمراہی؛ توپھر آپ جا کر بھنڈی پکائیں۔ ایک تو عورتیں، مردوں کی سیاست سے واقف ہوتی نہیں ہیں۔ اور چلی آتیں ہیں بیچ میں لقمہ دینے۔ اب ناراض ہونگی کہ مجھ جیسی علامہ کو یہ کہہ دیا۔

میں؛ آپ مجھے زیادہ طعنے نہ دیں۔ کبھی کبھی معاملات کو قابو میں رکھنے کے لئے بھی لاعلمی کا ڈرامہ کرنا پڑتا ہے۔ سنا نہیں آپ نے لا علمی ایک نعمت ہے۔مجھے معلوم ہے یہ قرار داد مقاصد کا بھی اس میں کچھ چکر ہے۔ اب میں اتنی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتی۔ میں صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ یہ تضاد ان بڑے ناموں کے کردار کا حصہ تھا یا اب کچھ لوگ معاملات کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کے لئے انکا نام استعمال کرتے ہیں۔

ہمراہی؛ تو آپ نے مجھے عام لوگوں میں سے نکال کر قاضی صاحب کے مد مقابل کھڑا کر دیا۔

میں؛ جی، میری خواہش ہے کہ ہر عام آدمی ان خاص لوگوں کے سامنے کھڑا ہو جائے۔

ہمراہی؛ اس طرح تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ عام آدمی کے لئے بھی اور خاص آدمی کے لئے بھی۔ سو میری دعا ہے تیری آرزو بدل جائے۔

ریفرنس؛

قاضی حسین احمد کا مضمون

قائد اعظم کی سوانح حیات ۱

قائد اعظم کی سوانح حیات

۲

پاکستان ایک مذہبی ریاست

فیصلے کا مرحلہ

11:03 PM

Iqbal, pakistan, اقبال قائد اعظم، پاکستان، اسلام، سیکولرزم، ملائیت, قاضی حسین احمد، Quaid-e-Azam

ایک تعارف

آتے جاتے خوبصورت آوارہ سڑکوں پہ۔ کبھی کبھی اتفاق سےکتنے انجان لوگ مل جاتے ہیں۔ اس سے آگے جو مرحلہ ہوتا ہے وہ تعارف کا ہے۔ خوبصورتی بذات خود ایک اچھا تعارف ہے۔ اگر تعارف ہو جائے تو خوبصورت سڑکوں پہ اچھی آوارگی ہو سکتی ہے یا آوارہ سڑکیں بھی خوبصورت لگنے لگتی ہیں۔ خوبصورتی اور بد صورتی سے الگ کبھی کبھی یہ تعارف زندگی کے معنی تبدیل کر دیتے ہیں اور کبھی اسے بے معنی بنا دیتے ہیں۔

اجنبی کو آشنا بننے کے لئے بھی ایک تعارف کی ضرورت ہوتی ہے کبھی کوئ واقعہ ہمیں نئے لوگوں سے متعارف کراتا ہے۔ کبھی ہمارے جاننے والوں کے طفیل ہمیں نئے تعارف حاصل ہوتے ہیں اور کبھی کچھ ہٹ کر کرنے میں زندگی کے نئے تعارف سامنے آتے ہیں۔ جیسے اس بلاگ کے طفیل مجھے کتنے سارے لوگوں سے واقفیت حاصل ہوئ اور جنہیں نہیں ہے انہیں بتادوں کہ میرا نام عنیقہ ناز ہے۔ حالانکہ شیکسپیئر نے کہا تھا کہ نام میں کیا رکھا ہے گلاب کو کسی نام سے پکارو وہ گلاب ہی رہے گا۔ لیکن ہم سب اس بات سے واقف ہیں کہ جولیا رابرٹس، رچرڈ گیئر، کترینہ کیف اور ٹام کروز کے نام پہ دل کی دھڑکن کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے وہ لیاقت کیبل والے یا جمیلہ پاپڑ والی کے نام سے نہیں ہوتا۔

اب شیکسپیئر سے کون بحث کرے۔ لیکن میں یہ خود کلامی کیوں کر رہی ہوں۔ آں، یاد آیا، یہ ایک نظم ہے ن م راشد کی اس کا عنوان ہے تعارف۔ اسکے مطالعے میں آپ سب کو شریک کرنا تھا۔ یہ ایک عجیب سا تعارف ہے، شاید آج ہم سب اس سے واقف ہیں۔ چلیں اسے پڑھتے ہیں۔

اجل، ان سے مل،

کہ یہ سادہ دل

نہ اہل صلٰوت اور نہ اہل شراب،

نہ اہل ادب اور نہ اہل حساب،

نہ اہل کتاب۔۔۔۔

نہ اہل کتاب اور نہ اہل مشین

نہ اہل خلاء اور نہ اہل زمین

فقط بے یقین

اجل ان سے مت کر حجاب

اجل، ان سے مل،

بڑھو، تم بھی آگے،

اجل سے ملو،

بڑھو، نو تونگر گداءو

نہ کشکول دریوزہ گردی چھپاءو

تمہیں زندگی سے کوئ ربط باقی نہیں

اجل سے ہنسو اور اجل کو ہنساءو

بڑھو، بندگان زمانہ بڑھو بندگان درم

اجل، یہ سب انسان منفی ہیں،

منفی زیادہ ہیں، انسان کم

ہو ان پر نگاہ کرم

ریفرنس؛

ن م راشد

ن م راشد

7:34 PM

ن م راشد

کچھ خرابات

آج کچھ لوگوں کی فرمائش پہ چند اشعار کی تشریح حاضر ہے۔ چونکہ ان اشعار کے تخلیق کار اب اس دنیا میں نہیں رہے تو کسی اور کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ ان سے اتفاق نہ کرے.

لیجئیے پہلا شعر حاضر خدمت ہے۔

جو تمہاری مان لیں ناصحا تو بچے گا دامن دل میں کیا

نہ کسی عدوکی عداوتیں، نہ کسی صنم کی حکائیتیں

یہاں کچھ الفاظ کا تعارف پہلے سے دینا ضروری ہے۔ جیسے ناصحا یا نا اور صحا، اس کا مطلب بظاہر یہ لگتا ہے، وہ شخص جو کبھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ اب اسکے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ یا تو یہ کہ اسکی بات کبھی صحیح ثابت نہیں ہو سکتی اور یا یہ کہ انکی شخصیت کے ٹیڑھ پن کو کبھی صحیح نہیں کیا جا سکتے۔ بادی النظر میں یہ کوئ سیاستداں لگتے ہیں۔ لیکن شعر میں کیا مراد ہے اس پہ ہم بعد میں بحث کرتے ہیں۔

دامن دل، اس پہ کچھ اصحاب کو حیرت ہوتی ہے اور وہ خیال کرتے ہیں کہ دل کا دامن کیسے ہو سکتا ہے۔ تو جناب اگر دل کو قمیض کی طرح پہن لیا جائے تو دامن تو کیا اسکا گلا اور آستین بھی بن جاتے ہیں۔ اور کچھ لوگ تو سراپا دل ہوتے ہیں۔ ایسے دل عوامی جگہوں پہ بہ کثیر دستیاب ہوتے ہیں۔ دل اگر سینے سے نکل جائے تو اسکی غیر حاضری کو عقلمندی سے عشق و محبت کے خانے میں ڈالا جا سکتا ہے۔ کیونکہ دماغ کو کاسہء سر سے نکالنا خاصہ دقت طلب اور محنت کا کام ہے اسلئے دماغ سے اس قسم کی کوئ چیز تیار کرنا مشکل ہے۔ اتنی محنت کے بعد اسے صرف کھایا جا سکتا ہے۔ اسے فرائ کر لیا جائے تو بھیجا فرائ کہلاتا ہے۔ کچھ دماغ بغیرنکالے فرائ ہو جاتے ہیں نہیں معلوم کہ اس میں خوبیءدماغ ہوتی ہے یا خوبیءترکیب ۔

دوسرے مصرعے کے پہلے حصے میں لگتا ہے کہ کچھ دعوتوں کا تذکرہ ہے، کیونکہ حروف کی ترتیب ادھر ادھر ہے اس لئے کچھ الجھن پیدا ہو گئ ہے۔ ہوسکتا ہے یہ دواتوں کے بارے میں کچھ کہا گیا ہو۔ فی زمانہ دوات تو استعمال ہوتی نہیں اس لئے اب صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔ کچھ احباب کا خیال ہے کہ ان الفاظ کا دشمنی اور دشمنوں سے بھی تعلق ہوتا ہے۔ لیکن ہم چونکہ صرف محبت کے فلسفے پر یقین رکھتے ہیں اس لئے اس خیال کے پیچھے نہیں جاتے۔ اسکے پیچھے جائیں ہمارے دشمن جو ایک نہیں کئ ہیں۔ اس بہانے کچھ دنوں تک ہماری جان ان سے چھوٹی رہے گی۔

اب رہا حکائتیں اور صنم کا تعلق۔ یہ سب سے زیادہ مشکل تعلق ہے۔ حکائیتیں وہ باتیں ہوتی ہیں جو حقہ پیتے ہوئے کی جاتی ہیں۔حقے کئ اقسام کے ہوتے ہیں اور باتیں کئ طرح کی۔ جتنے حقے اتنی باتیں۔ اب بظاہر تو یہ لگتا ہے کہ صنم کی ان باتوں کا تذکرہ ہو رہا ہے جو وہ حقہ پیتے ہوئے کرتا ہے لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حقہ کوئ اور پی رہا ہو اور باتیں صنم کر رہا ہو۔ یااسکے برعکس صورتحال ہو۔ دراصل اس

سارے شعر کی جان اور مطلب انہی دو الفاظ میں پوشیدہ ہے۔ کہاں ہے میرا حقہ، اسکے بغیر دماغ

فرائ کرنے میں مزہ نہیں آتا۔ ایک لمبی گڑ گڑ کے بعد۔ میرا خیال ہے کہ اب اس شعر کا مطلب بالکل

واضح ہے۔ اس سے زیادہ وضاحت سے شعر کی شعری خوبصورتی ختم ہو جائے گی۔

یہ دوسرا شعر ہے

تونے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کردیا

میں ہی تو ایک راز تھا سینہء کائنات میں

لیکن اس سے پہلے میں آپکی شکل کی طرف دیکھتی ہوں ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ منہ میں نیم کی پتیوں کا بھرتہ دبائے بیٹھے ہیں۔ ایک اور گڑ گڑ۔ اور میرے حقے کو اتنی خشمناک نگاہوں سے کیوں دیکھ رہے ہیں۔ یہ تو اقبال کے شعر کی تشریح کرتے وقت پینا پڑتا ہے۔ ورنہ ماحول کیسے بنے گا۔ کیا کہا بہت بری بات ہوتی ہے عورتوں کا حقہ پینا۔ چلئیے بھئ ایسا ہے تو لے جا یہ حقہ۔اب اس دوسرے شعر کی تشریح کسی اور دن، جب یہ والے صاحب نہیں ہونگے۔ کیا کہایہ ہمیشہ موجود رہتے ہیں اور جہاں انکی پسند کے خلاف کام ہورہا ہو۔ وہاں سے تو ٹلتے نہیں۔ اوئے، فیر یہ حقہ ان باءو جی کو دے ۔ تھوڑی گڑ ہی گڑ ہی کرلیں۔ پرشان نہ ہوں جی، جب تک نیم کی پتیوں کے بھرتے کا اثر زائل ہوتا ہے کچھ انکی سنتے ہیں۔ غالب سے معذرت کے ساتھ،

پھر دیکھئے انداز گل افشانی گفتار

رکھدے کوئ حقہ وچلم میرے آگے

امید ہے دوسرے شعر کا مطلب بھی سمجھ آگیا ہوگا

6:54 PM

ِGhalib, Huqqah, Iqbal, اقبال، غالب، حقہ

ایک تعلق کی بابت

سائنس اور تجربات سے تنگ آجانے والے لوگ چاہیں تو یہ پیرا نہ پڑھیں۔تو ایک دفعہ یوں ہوا کہ ایک سائنسداں تھا۔ وہ ایک مینڈک پر تجربہ کر رہا تھا۔ اس نے مینڈک کی ایک ٹانگ کاٹی، اسے میز پہ رکھا اور میز پہ ایک زور کا ہاتھ مارا اور کہا اچھل۔ مینڈک اچھلا اور دھپ سے میز پر بیٹھ گیا۔ اگلے مرحلے میں

اس نے دوسری ٹانگ کاٹی اور دوبارہ اسے میز پہ رکھا اور زور سے میز پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا اچھل۔ مینڈک موصوف پہلے کے مقابلے میں تھوڑا کم اچھلے اور پھر میز پہ آرہے۔ اس سائنسداں نے باری باری چاروں ٹانگوں کے ساتھ ایسا ہی کیا اور اخیر میں جب انہوں نے مینڈک کو اچھلنے کا حکم دیا تو اس نے اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کی۔آپ میں سے بیشتر کو اندازہ ہوگیا ہوگاکہ ایسا کیوں ہوا۔ اس سائنسدان کو بھی اندازہ ہوا۔ اس نے اپنی نوٹ بک نکالی اور اس پر ان تجربات کا نتیجہ لکھا جو کچھ یوں تھا کہ اگر مینڈک کی چاروں ٹانگیں کاٹ دی جائِں تو اسے کچھ سنائ نہیں دیتا۔

خدامزید مینڈکوں کو ایسے سائنسدانوں سے بچائے۔ یہ میں ان لوگوں کی تسلی کے لئے کہہ رہی ہوں جو سائنس اور اس کی سفاکیت پہ اب تک افسردہ ہونگے۔ کچھ ایسے نتائج ہم بھی اخذ کرتے ہیں جیسے پسند کی شادیوں کی وجہ سے طلاق کا تناسب بڑھ گیا ہے۔یہ اکثر ان لوگوں کا اخذ کیا ہوا نتیجہ ہوتا ہے جو اس سلسلے کے خلاف ہیں۔ اب اگر میں اپنے اطراف میں ہونے والی پسند کی شادیوں پہ نظر ڈالوں اور ان کی خوشحال زندگیوں پہ رشک کرتے ہوئے یہ بیان دوں کہ کہ طلاق کا تناسب اس لئے بڑھ گیا ہے کہ اب تک زیادہ تر شادیاں والدین کی مرضی سے ہوتی ہیں اور فریقین اسے غلط ثابت کرنے کے لئے معاملات کو اس مقام تک لیجاتے ہیں یعنی طلاق لینا اور دینا چاہتے ہیں تو یہ میری کوتاہ نظری ہو گی ۔یعنی یہ بات بھی کچھ ایسی صحیح نہ ہوگی۔

اس بات پہ مزید آگے بڑھنے سے پہلے میں یہ ضرور چاہوں گی کہ آپ اپنے نزدیک اتوار کا جنگ اور ڈان کا اشتہارات کا اخبار رکھ لیں۔ جنگ اخبار کے سلسلے میں آپ کو فیصلہ کرنا مشکل ہوگا کہ اخبار اور اشتہار کے درمیان حد بندی کہاں ہوتی ہے تو اس سلسلے میں مزید اشارے دیدوں کہ ضرورت رشتہ کا اشتہار والا اخبار لے لیں۔اور اس میں ضرورت رشتہ کے وہ اشتہار پڑھئیے گا جوکسی میرج بیورو کی طرف سے نہیں بلکہ لڑکے یا لڑکی کے والدین کی طرف سے ہوتے ہیں۔

لڑکے کے سلسلے میں اکثر اشتہارات میں یہ مطالبہ ہو گا کہ لڑکی بہت خوبصورت، لمبی، دبلی، پتلی اور واقعی گوری ہو۔ یا لکھا ہوگا کہ واقعی خوبصورت ہو۔۔ اس کےعلاوہ کم عمر، تعلیم یافتہ اور اچھے مختصر گھرانوں سے تعلق ہو۔ مختصر گھرانوں سے مراد لڑکی کے بہن بھائ زیادہ نہ ہوں۔ اور اگر اکلوتی ہو تو کیا بات ہے نہیں تو اس کے نام کوئ زمین جائیداد ہو یا بزنس میں سپورٹ کر سکتے ہوں۔

دوسری طرف ایک آیئڈیل لڑکے میں کیا خصوصیات ہونی چاہئیں ان کا اندازہ بھی ان کو پڑھ کر ہو سکتا ہے۔ ان کو میں ترجیح کے لحاظ سے ایسے لکھ سکتی ہوں۔

تنخواہ، چھ، سات ہندسوں میں ہو۔

کسی باہر ملک، یعنی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، انگلینڈ یا کسی بھی فرسٹ ورلڈ دنیا کی شہریت ہو۔

کوئ پیشہ ورانہ ڈگری ہو۔

اور اگر یہ سب چیزیں نہ بھی ہوں اور وہ صرف ہماری بیٹی سے شادی کرنے کے لئیے تیار ہو تو ہم دیکھیں گے کہ ہم اس کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔ ہم صرف دیکھیں گے نہیں بلکہ جو بھی مال مصالحہ خرچ کر سکتے ہیں ضرور کریں گے۔

ان دونوں فہرستوں میں ہم دیکھیں گے کہ ایسی کسی بات کا مطالبہ نہیں کیا گیا جو ایک کامیاب شادی شدہ زندگی کے لئے چاہئیے ہوتی ہے۔ یہاں یہ بات سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس باب میں بھی کامیابی کے اصول اور ضابط سب کے لئے یکساں نہیں ہوتے۔ اگرکسی لڑکی کی شادی ایک ایسے گھرانے میں ہوئ ہو جہاں پیسے کی ریل پیل ہو تو وہاں کسی کو اس بات کی فکر نہیں ہوگی کہ آپ پلاءو کتنا شاندار بناتی ہیں اس کے لئے ان کے پاس ایک باورچی ہوگا۔ البتہ سب یہ ضرور دیکھیں گے کہ آپ بات چیت کسطرح کرتی ہیں اور سماجی تعلقات کس طرح نبھاتی ہیں۔ اسی طرح اگر آپ کےجیون ساتھی نے اپنی زندگی خود تعمیر کی اور وہ ایک مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ اسے آپ کا بچت کرنا، کھانا پکانا، سلائ کرنا یہ سب چیزیں خاصا سمجھداری کا کام لگے۔ اسی طرح اگرآپکی جیون ساتھی ایک گھریلو خاتون ہوں تو شاید وہ آپکی انکے حسن یا کھانے یا بہتر طور پہ گھر سنبھالنے کی تعریفوں سے خوش ہو جائیں۔ لیکن اگر آپکی بیگم خود بھی جاب کرتی ہیں تو پھر انہیں آپ کا گھریلو امور میں ہاتھ بٹانا، مل بیٹھ کر بجٹ بنانا بہت اچھا لگے۔ لیکن ان سارے امور میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ظاہری خصوصیات کا اثر کچھ دنوں کے لئے ہی ہوتا ہے۔ اور باہمی ہم آہنگی کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے۔

چونکہ بیشتر شادی کے یہ اشتہارات والدین کی طرف سے ہیں تو یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ والدین کتنی ذمہ داری سے اپنا یہ فرض نبھا رہے ہیں۔ اب کوئ ایک ہزار لڑکیاں دیکھنے کے بعد انہیں ایک صحیح لڑکی مل جاتی ہے تو شادی کے ایک مہینے بعد وہی صحیح لڑکی ایک دم غلط ہوتی ہے۔ توبہ، بات کرنے کی تمیز نہیں اسے تو، انڈہ تک ابالنا نہیں آتا، کیا ڈگری کو لیکر چاٹے گا ہمارا بیٹا، اپنے بستر کی چادر تک ٹھیک کرنے کی تو فیق نہیں ہوتی۔ ہر وقت بیوٹی پارلر کے چکر، اےتنا پیسہ برباد کرتی ہیں، لگتا ہے ماں باپ نے کوئ تمیز نہیں سکھائ۔ لڑکے کے سلسلے میں یہ سننے کو ملے گا کہ ہماری بیٹی کا کوئ خیال نہیں کرتا، بہت مذہبی ہیں یا بہت آزاد خیال، کنجوس ہے یا فضول خرچ اسی طرح کی دیگر باتیں۔ اب اگر ان سے کوئ پلٹ کر پوچھے کہ دیکھتے وقت تو آپ نےیہ سب نہیں دیکھا تھااس وقت آپ کی ترجیحات کچھ اور تھیں۔ خریدتے وقت آپ کو ٹماٹر چاہئیے تھے اور اب آپ اس میں آلو کی خصوصیات تلاش کر رہی ہیں۔ یعنی غالب کی زبان میں عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا۔ دنیا کی بنیادی سائنس جس میں کوئ اختلاف نہیں یہ کہتی ہے کہ ٹماٹر ہمیشہ ٹماٹر رہے گا اور آلو ہمیشہ آلو۔۔

جس چیز کی بنیاد ہی غلط ہو وہ کیسے مضبوطی کی طرف جا سکتی ہے۔ نتیجتاً وہی ماں با بہن بھائ جو کچھ عرصے پہلے تک رشتہ کرانے میں تندہی سے مصروف ہوتے ہیں۔ وہی اب دونون فریقین کے اوپر زورآزمائ کرنے سے لگ جاتے ہیں۔ یہ بات آپ نے بھی اکثر لڑکوں کے والدین کو کہتے سنی ہے کہ ہمارے لڑکے کو لڑکیوں کی کوئ کمی نہیں۔ ابھی چھوڑ دے تو چار اور مل جائیں گی جبکہ لڑکیوں کے والدین بس یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری لڑکی ہم پہ بوجھ نہیں یا یہ کہ وہ خود اپنا بوجھ اٹھا سکتی ہے۔

پسند کی شادیاں بھی اسی صورت میں ناکام ہوجاتی ہیں جب آپ ٹماٹر پسند کرکے اسے آلو بننے پہ مجبور کریں ۔ دوسری اہم وجہ ہمارے معاشرے میں پسند کی شادیوں کو نا پسند کرنا ہے۔ اسے عام طور پہ لڑکیوں کی بے حیائ سے وابستہ کیا جاتا ہے حالانکہ رسول اللہ کے زمانے میں بھی خواتین اورمردحضرات اپنےپسند کے مرد اور خواتین کو اپنا رشتہ بھیجا کرتے تھے۔ لیکن خدا جانے کیوں اب ہمارے یہاں اس کے لئے اتنے سنگین الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ جہاں خواتین کا اپنی پسند کے متعلق کچھ کہنا نری بے حیائ ہے وہاں جیسے ہی کوئ لڑکا اپنے والدین کے سامنے یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ فلاں لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اب چاہے اس لڑکی کو خود بھی نہ پتہ ہو کہ وہ موصوف ایسا چاہتے ہیں۔ لڑکے کے گھر میں ایک ناگواری پھیل جاتی ہے۔ اور کئ صورتوں میں تو میں نے یہ دیکھا کہ لڑکے کی والدہ اور بہنیں فوری طور پہ ایک عدد لڑکی کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی ہیں کہ کسی صورت اس لڑکی سے شادی نہ ہوجائے۔ وجہ پوچھیں کیوں؟ انتہائ تگ و دو کے بعد جو جواب نکلے گا وہ کچھ اس طرح سے ہو گا کہ شادی سے پہلے اگر ان کا بیٹا اسےکے لئے انکی مرضی کے خلاف جانے کو تیار ہے تو شادی کے بعد تو انکے بالکل قابو میں نہیں رہے گا۔ ایک تو یہ لفظ قابو ، قابو میں ہی نہیں آتا اور زندگی بے قابو ہوجاتی ہے۔

یہاں پسند کی شادیوں سے میری مراد مغربی انداز کی کورٹ شپ نہیں ہے۔ نہ ہی میری مراد ٹین ایجرز کےانفیچوایشن سےہے۔ جو وہ اپنے زمانے کے فلمی ہیرو اور ہیروئن سے متائثر ہو کر کرتے ہیں۔

بلکہ یہ وہ پسندیدگی ہے جس میں ہم اپنے ارد گرد کےماحول میں کسی شخص کو زندگی بسر کرتے دیکھتے ہیں اور اس کے انداز اور شخصیت کو اپنے لئے پسندیدہ پاتے ہیں۔ اور یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں اسکے ساتھ زندگی گذارنے میں آسانی ہو گی۔

طلاق کی شرح کے بڑھنے کا تعلق اپنی یا والدین کی پسند سے شادی کرنے سے نہیں ہے بلکہ جیسا کہ من حیث القوم ہم زندگی کے ہر شعبے میں یہ کرتے ہیں کہ ہماری ضرورت تو کچھ اور ہوتی ہے لیکن بھیڑچال یا لالچ میں لیتے کچھ اور ہیں، اسی میں مضمر ہے کچھ صورت خرابی کی۔۔ جب نیت میں فتور ہو تو تعلق میں برکت کیسے ہو سکتی ہے۔

9:13 AM

first world, infatuation, ارینجڈ شادیاں, پسند کی شادیاں, ڈان اخبار

مرفی کی برفی

جہاز اپنی سرنگ میں ایک بڑی تعداد اسکول کے بچوں کی لئیے ہوئے اپنی منزل کے قریب ہو رہا ہے۔ ہمارے ملک کے دارالحکومت میں متوقع امیرالمومنین دھڑکتے دل کے ساتھ بیٹھے آنیوالے لمحے کا انتظار کر رہے ہیں۔جہاز میں اچانک کھلبلی مچ گئ۔ ایئر پورٹ کی تمام لائٹس بند ہو گئ ہیں اور جہاز کے پائلٹ سے کہا جا رہا ہے کہ وہ کسی دوسرے ملک چلا جائے چاہے وہ انڈیا ہی کیوں نہ ہو۔ جہاز میں اس وقت کا ملک کا سپہ سالار بیٹھا ہے۔ اسکول کے بچے ہیں۔ ایندھن خاتمے کے قریب ہے اور ادھر متوقع امیرالمومنین انتظار کر رہے ہیں ایک ایسی ساعت کا جس میں سانحہ ہو جائے۔ شطرنج کی بساط پہ سارے مہروں کو ہٹاتے ہوئے وہ اس مرحلے تک پہنچے ہیں۔ لیکن یہ کیا ہوا۔ ہائیں۔ مومنین منتظر رہ گئے۔ کچھ ایسا خاص نہیں ہوا۔ مرفی کا قانون حرکت میں آیا۔ اور امیر المومنین وہاں پہنچ گئے جہاں سے انکو بھی کچھ انکی خبر نہیں آتی تھی۔ مرفی کا قانون کہتا ہے کہ غلط ترین صورت حال وقوع پذیر ہو کر رہتی ہے۔

کسے گمان تھا کہ زرداری جیل سے نکلیں گے اور تخت پہ براجمان ہو جائیں گے۔ وہ بھی عوام کی

اکثریت کی حمایت سے۔ بےنظیر جو انتہائ اندرونی ذرائع کے مطابق تہیہ کئے ہوئے تھیں کہ اس دفعہ حکومت ملنے کے بعد زرداری کو سات سمندر پار ہی رکھیں گی۔ آسمانوں کے اس پار چلی گئیں۔

مشرف سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ بازی اس طرح ان کے ہاتھ سے نکل جائے گی کہ اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئ اور انکے بعد ان کی جگہ سنبھالے گا بھی گا تو کون۔ زرداری۔ لگتا ہے وہ بھی مرفی کے قانون کو نہیں جانتے تھے۔ مرفی کا قانون کہتا ہے کہ غلط ترین صورتحال وقوع پذیر ہو کر رہتی ہے۔

لیکن عقلمند وہی ہے جو دوسروں کو دیکھ کر عبرت پکڑتا ہے۔ یہاں میری مراد اخبار عبرت نہیں ہے۔ اگر یہ بات آپ کو سمجھ آرہی ہے تو باقی کی باتیں بھی سمجھ آجائیں گی۔یہ ناہنجار مرفی ایک انجینیئر تھا۔ ایکدن کسی پروجیکٹ پہ کام کر رہا تھا۔ اسکے ساتھ کچھ اور لوگ بھی کام کر رہے تَھے۔ جب ہر چیز بظاہر اس حالت میں آگئ کہ اس کی آزمائش کی جائے تو وہ ناکام ہو گئے۔ پتہ چلا کہ کسی معمولی سی غلطی کی بناء پر وہ اپنے ہدف تک نہ پہنچ سکے۔ مرفی نے تنکتے ہوئے اس کا ذمہ دار اپنے اسسٹنٹ کو ٹہرایا اور کہا۔' یہ شخص جہاں بھی غلطی کرنے کا موقع ہو ۔ ضرور کریگا۔' بس لوگ اس کی اس بات پہ واری واری ہو گئے۔ حالانکہ آپ میں سے بہتوں کے لئیے یہ مکالمہ نیا نہ ہوگا۔ اور انہوں نے کھوج کھوج کر اس کے حق میں جانے والی باتیں تیار کر لیں۔ جس سے اس قانون کی حیثیت مسلمہ ہو گئ۔ یہاں میرا مطلب حقیقت کے مسلمان ہونے سے نہیں ہے۔ یا تو حقیقت ہمیشہ مسلمان ہوتی ہے یا پھر کچھ نہیں ہوتی۔ اسکے کچھ نہ ہونے سے کوئ فرق نہیں پڑتا۔

اب ان لوگوں نے اس قانون کو جانچنے کے لئے کچھ مثالیں پیش کیں جن میں سے میں صرف دو بیان کرنا چاہونگی۔۔ مثلاًڈبل روٹی کا سلائس اگر آپکے ہاتھ سے گرے گا تو ہمیشہ اس کا مکھن لگا ہوا حصہ قالین سے ٹکرائے گا۔ اسکے اس حصے سے گرنے کے امکانات اتنے ہی زیادہ ہوتے ہیں جتنا قیمتی قالین ہوتا ہے۔

آپ کسی مشین کو درست کر رہے ہوں تو اس کا باریک سا اسکرو جو کہ بہت اہم ہوتا ہے آپکے ہاتھ سے چھٹ کر کمرے کے بھاری ترین فرنیچر کے سب سے کونے والے حصے میں پہنچ جاتا ہے۔

تو سب سے پہلے اس قانون کے چیدہ چیدہ نکات ذہن نشین کر لیں جو حسب ذیل ہیں؛

اگر کوئ غلط صورت حال پیدا ہو سکتی ہے تو وہ ضرور ہو گی

اگر ایک بات کے ساتھ بہت ساری غلط صورت احوال ہونے کے امکانات ہیں تو سب سےبد ترین صورتحال سامنے آئےگی۔

اگر کئ چیزیں ایک ساتھ غلط ہونے کے امکانات ہیں تو وہ سب ایک ساتھ وقوع پذیر ہونگی۔

اگر کوئ چیز کسی بھی طریقے سے غلط سمت میں نہیں جا سکتی تو وہ کسی نہ کسی طریقے سے جائے گی ضرور۔

اگر آپ سمجھتے ہیں کہ کسی بھی چیز کے غلط سمت میں جانے کے چار طریقے ہو سکتے ہیں تو کوئ پانچواں طریقہ کہیں نہ کہیں سے جنم لے لیگا۔

اگر حالات کو ایسے ہی چھوڑ دیا جائے تو وہ کم بری سے زیادہ بری حالت کی طرف جاتے ہیں۔

قدرت ہمیشہ اس خفیہ غلطی کے ساتھ ہوتی ہے جس کا حل آپ نے نہیں سوچا ہوتا بلکہ جس کا تصور بھی آپ نے نہیں کیا ہوتا۔

قدرت اتنی مہربان نہیں جتنا آپ خیال کرتے ہیں۔

اب اس قانون کی مزید وضاحت کے لئے میں آپ کو آپ سب کی زندگی میں سے کچھ مثالیں دینے کی کوشش کرتی ہوں۔ امید ہے کہ آپ اپنی والی نہایت عقلمندی سے نکال لیں گے۔ میرا مطلب ہے مثال۔ ویسے مثال میری پڑوس کی لڑکی کا نام بھی ہے۔ انہوں نے بی اے کر لیا ہے اور بیاہ کے لئے تیار ہیں۔ آپ میں سے جو لوگ شادی جیسے بندھن میں بندھنا چاہتے ہیں وہ چاہیں تو انہیں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن زیادہ جلدی کی ضرورت نہیں پہلے یہ والی مثالیں دیکھ لیں۔

ٹریفک جام اس دن سب سے زیادہ ہو گا جس دن آپ گھر سے دیر سے نکلے ہونگے۔

جس دن آپ کو آفس پہنچنے میں دیر ہوگی اس دن داخلہ دروازے پہ آپ کی ملاقات باس سے ہوگی۔

امتحانات میں اسی فی صد پیپر ان اسباق میں سے آتے ہیں جنہیں آپ دوران تیاری چھوڑ دیتے ہیں۔

جب پیپر شروع ہونے میں دس گھنٹے رہ جاتے ہیں اس وقت مضمون اچھی طرح سمجھ میں آنا شروع ہوتا ہے اور آپ کہتے ہیں۔ اے کاش، ایکدن اور مل جاتا تو پیپر زبردست ہو جاتا۔ اب اگر اگلے دن اس وجہ سے ہڑتال ہوگئ کہ آپ کے اس وقت کے محبوب رہنما ، پھانسی چڑھ گئے، یا جہاز پھٹ جانے سے ہلاک ہو گئے یا بم دھماکے میں مارے گئے یا انہوں نے اپنے لئے کوئ بھی اور طریقہ اختیار کیا جس کے نتیجے میں انکی غیر طبعی موت واقع ہونا ضروری ہے تو آپ کا پیپر مزید پندرہ دن کے لئے ٹل جائے گا۔ یاد رکھیں۔ اب بھی مضمون آپ کو دس گھنٹے پہلے ہی سمجھ میں آنا شروع ہو گا۔ اور آپ پھر کہیں گےکہ اے کاش،---- یہ بھی یاد رکھیں کہ ایک ہی محبوب رہنما بار بار غیر طبعی موت نہیں مرتا اور اگلے کی باری اتنی جلد نہیں آتی۔

اپنی اماں کو آپ جتنا مہنگا تحفہ لیکر دیں گے امکان غالب ہے کہ اتنا ہی کم وہ استعمال ہو گا۔

ماں کی وہ نصیحت جو آپ نظر انداز کر دیتے ہیں ۔بالکل صحیح اور انکی بتائ ہوئ تمام نصیحتوں میں سب سے بہترین نکل آتی ہے۔

آپ کے چھوٹے سےبچے کے ہنگامہء بدتمیزی کا انحصار ارد گرد موجود لوگوں کی تعداد پہ ہوتا ہے۔ جتنے زیادہ لوگ اتنا زیادہ ہنگامہ۔

خواتین کے لئے خاص طور پہ۔ جب آپ کہیں دعوت میں جانے کے لئے سب سولہ سنگھار سے لیس ہوجاتی ہیں تو آپ کے بچے کو اسی وقت واش روم جانا ہوتا ہے۔

پڑوس کے کرائے داروں کی جس بیٹی پہ آپ کا دل آیا ہے اسے پہلے ہی کوئ لے اڑا ہو گا۔

آپ کے آفس کا ہینڈ سم لڑکا جس کے خاموش عشق میں آپ مبتلا ہیں ایکدن کسی جمائمہ خان کو آپ کے سامنے لا کر کھڑا کر دیگا اور اپنی اسی نرم میٹھی مسکان سے جس پہ آپ فدا ہیں کہے گا۔ ان سے ملئیے یہ آپ کی بھابی ہیں۔

جس دن آپ گھر کے غلیظ ترین کپڑوں میں انتہائ نکمے پن سے پھر رہی یا پھر رہے ہوں۔ اسی دن آپ کو شادی کے ارادے سے دیکھنے کچھ لوگ نازل ہوجائیں گے اور سوئے اتفاق انہیں سب سے پہلے آپ ہی ملیں گے۔

جس لمحے کوئ آپ کو اچھا لگنے لگتا اسی لمحے اس کا کوئ دعوی دار نکل آتا ہے۔

محلے کا لڑکا جسے آپ بچپن سے اس کی فاسٹ باءولنگ کی وجہ سے پسند کرتے تھے حتی کہ دل ہی دل میں اسے اپنا داماد بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ ایکدن صبح صبح، داڑھی سجائے، ٹخنوں سے اونچی شلوار پہنے نیچی نظروں کے ساتھ آپ کی بیٹی کا رشتہ مانگنے نہیں بلکہ جہاد پر جانے کے لئے آپ سے آشیرباد لینے آئیگا۔

غالب بھی مرفی کے قانون سے بڑے خائف تھے کہتے ہیں،

رات کے وقت مئے پئے، ساتھ رقیب کو لئے

آئے وہ یاں خدا کرے، پر نہ خدا کرے کہ یوں

کیا اس وقت بھی مرفی کا قانون موجود تھا، کیا مرفی نے ان کے ساتھ رعایت کی، کیا غالب کا خدشہ صحیح ثابت ہوا۔ غالب اور مرفی کی آپس میں کیسی بنتی تھی۔ یہ سب جاننے کے لئے شاید خطوط غالب پڑھنا پڑیں گے۔ کیا کہا پوسٹ پڑھ کر فارغ ہونگے تو کچھ اور پڑھیں گے۔ پڑھیں،کچھ اور نہیں پڑھیں گے تو بڑے آدمی کیسے بنیں گے۔

ریفرنس؛

مرفی کا قانون

3:41 PM

Muphy's law, Musharrf, طیارہ کیس، نواز شریف, غالب، مشرف،مرفی کا قانون،زرداری.

سرمایہ اور ایجاد تمنا

اگر آپ کو یقین ہے کہ آپ مسائل کے حل تلاش کرنے میں ماہر ہیں۔ آپ کسی آئنسٹائن اور مادام کیوری سے کم نہیں۔ لیکن آپ یہ بھی سوچتے ہیں کہ روکڑہ یعنی پیسہ ملے تو کچھ کرنے میں مزہ آئے۔ اس سے انکار نہیں۔ پیسے کی ایک باعزت مقدار ہر ذی روح کے لئے ضروری ہے۔ اس یو آر ایل پہ جا کر دیکھئے یہ آپ کو ڈالر دے رہے ہیں اگر آپ انکی مدد کر سکیں انکے مسائل کو حل کرنے میں۔ دیکھ لیں اور کسی اور کو روانہ کر دیں۔ ہو سکتا ہے کوئ سینہ ٹھنوک کر کام سے لگ جائے۔

http://www.innocentive.com/

8:17 AM

Einstein. Madam Curie, آئسٹائن، مادام کیوری

تیری رسوائیوں سے ڈرتا ہوں

چلئیے۔

آج کچھ ادھر ادھر چلتے ہیں۔ یہ آج سے کچھ سال ادھر کی بات ہے۔ میں سانگھڑ کے ایک مضافاتی گاءوں میں موجود ہوں۔ جہاں پہنچنے کے لئیے ہمیں پہلے فور وھیل ڈرائیو کرنی پڑی۔ اور پھر کشتی کے ذریعے ایک جھیل کو پار کیا اور ریت کے ٹیلوں پر سے پھسلتے چڑھتے ہم بالآخر ایک گاءوں کی اوطاق تک جا پہنچے۔ یہاں موجود پندرہ بیس گھر سب کے سب مٹی کے گارے اور گھاس پھونس کی مدد سے بنائے گئے تھے۔ قریب میں موجود ایک ہینڈ پمپ سے پانی لیا منہ ہاتھ دھو کر جب آنکھوں سے مٹی صاف ہوئ تو احساس ہوا کہ کچھ گھر بالکل نزدیک ہیں۔ ابھی کھانا آنے میں وقت تھا اس لئے میں اٹھی۔ اپنا بیک پیک اٹھایا اور ایک گھر کی طرف چل پڑی کہ خواتین سے ملاقات کرکے آجاءوں۔

ایک گھر میں داخل ہوئ تو مجھے دیکھتے ہی ایک عورت جلدی سے ایک سندھی رلی نکال کر لے آئ اور لپک کر اسے چارپائ پر بچھا دیا۔ میں اسے منع کرتی رہ گئ کہ مجھے کھری چارپائ پر بیٹھنے میں کوئ اعتراض نہیں لیکن اسے اردو آتی نہ تھی اس لئے اس نے میری بات پہ کوئ دھیان نہ دیا۔ کمرے میں ایک دیوار پہ پیر پگارا کی تصویر لگی ہوئ تھی۔ یہ ان کا علاقہ ہے اور علاقے کے لوگ انکے معتقد ہیں۔ تھوڑی دیر ہم ایکدوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر میں نے اپنی سندھی آزمائ جوکہ بولنے کے ضمن میں بمشکل پچاس الفاط پر مشتمل ہے۔ البتہ سمجھ خاصی آجاتی ہے۔ اس نے مجھے سندھی بولتے دیکھا تو حیران ہوئ۔ تم کہاں سے آئ ہو۔ میں نے جواب دیا۔ کراچی سے۔ وہ بالکل ٹھٹھک گئ۔ کیا پنجابی ہو۔میں ہنسی, اپنے حلئے پر نظر ڈالی ایک مثالی سکنہ کراچی۔نہیں تو سندھی ہوں۔ نہیں کراچی میں تو پنجابی رہتے ہیں۔ اس نے بھی ہنس کر جیسے میری بات ہنسی میں اڑائ۔ نہیں سب پنجابی نہیں ہوتے۔ میں نہیں ہوں ۔ اچھا تمہاری ذات کیا ہے؟ اس نے جیسے امتحان لیا۔سندھ میں ذات کی بڑی اہمیت ہے۔ اب میں پھر مسکرائ۔ میں پٹھان ہوں۔ سندھی تو پٹھان نہیں ہوتے اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔ آگے کی گفتگو کا کیا تذکرہ کہ میں نے کیسے پچاس الفاظ سے اسکا دل موم کیا۔ لیکن یہ ضرور سوچا کہ پنجابی ہونے کے ذکر پہ وہ اس قدر تذبذب میں اور کھنچی ہوئ کیوں تھی۔

اس بات کو ایک وقت گذر گیا اب ایک نئے منظر میں ، میں بلوچستان کے شہر گوادر کے مضافاتی علاقے میں ہوں۔ یہ چھوٹا سا گھر ہمارا ذاتی ہے جسے بلوچیوں کے کھلے دل، اس علاقے کے سکون اور سمندر سے نزدیکی کی بناء پر بنایا گیا ہے۔ اطلاع ملی کہ اکبر بگتی مارا گیا۔ ابھی شام کا دھندلکا پھیلے زیادہ دیر نہ ہوئ تھی کہ پندرہ سولہ لوگ گھر کی باءونڈری وال پھاند کر گھس آئے۔ان سب کے ہاتھوں میں ڈنڈے تھے۔ ہم نے سوچا اب شامت آئ۔ ساری شیشے کی کھڑکیاں جائیں گی جو صرف سمندر کا نظارہ کرنے کے لیئے لگائ گئیں تھیں۔گھر کے بزرگ حضرت آگے بڑھے۔ کیا بات ہے؟تم لوگ پنجابی ہو اور یہاں سے فوج کے لئے مخبری کرتے ہو۔ تمہارے پاس مخبری کی مشینیں بھی ہیں۔ کوئ غرایا۔ نہیں ہم پنجابی نہیں ہیں۔ کراچی کے رہنے والے ہیں۔ اردو بولتے ہیں۔ اور اس گھر میں ایسی کوئ مشین نہیں ہے۔ چاہو تو تم میں سے دو تین لوگ جا کر پورے گھر کی تلاشی بھی لے سکتے ہیں۔ بزرگ حضرت نے پر امن پیش کش کی۔ ان میں سے تین آگے بڑھے۔ پورے گھر کی تلاشی ہوئ۔ اس دوران بزرگوار انہیں اپنے غیر پنجابی ہونے کے مزید ثبوت بتاتے رہے۔ اتنی دیر میں محلے کے ایک دو لوگ بھی آگئے انہوں نے بھی کہا کہ یہ پنجابی نہیں ہیں۔ بچت ہوئ، وہ جن ارادوں سے آئے تھے انہیں پورا کئے بغیر چلے گئے۔

ان دونوں علاقوں کے درمیان ہزار کلو میٹر سے زیادہ فاصلہ ہے ان دونوں علاقوں کے رہن سہن اور ثقافت میں فرق ہے مگر ان دونوں علاقوں کے لوگ اپنے ملک کے ایک صوبے کے رہنے والوں سے نالاں کیوں ہیں۔

غالب تمہیں کہو کہ ملیگا جواب کیا

مانا کہ تم کہا کئے، اور وہ سنا کئے

ریفرنس؛

سانگھڑ

گوادر

11:57 PM

ethnicity, gwadar, Sindh, گودار، سانگھڑ، غالب، بلوچستان، اردو، سندھی

کریلہ اور کترینہ کیف

آج میں ایسا کچھ نہیں لکھ رہی جس میں کوئ مقصد ہو سوائے کچھ لوگوں کی دل پشوری کے۔ خاص طور پر انکے لئے جو کریلہ کھانا سخت نا پسند کرتے ہیں۔ کریلہ پکانے کی یہ تر کیب اگرچہ ایک ماہر امور خانہ داری خاتون سے متائثر ہو کر بنائ گئ ہے۔ جی، یہ وہی خاتون ہیں جو ٹی وی پہ کھانا پکانے کا پروگرام کرتے ہوئے اپنی جوانی کی تصویر اپنے کچن میں لگا کر رکھتی ہیں۔

گھبرا ئیے نہیں، اگر آپ میں سے کچھ لوگ عین عالم شباب میں بھی بڑھاپے کی تصویر نظر

آتے ہیں۔ تو ان پر واضح ہو کہ اس تر کیب کے لئے جوانی کی تصویر کچھ ضروری نہیں۔ دل چاہ رہا ہو تو کسی اور کی جوانی کی تصویر لگا لیں۔ اور اگر کوئ نہ ملے تو پھر ظالمانہ حد تک خوبصورت لگنے والی خاتون کی تصویر لگا لیں۔ سنا ہے آجکل یہ اعزاز کترینہ کیف کو ملو ہوا ہے۔ لیکن میں یہ بھی آپکی پسند

پہ چھوڑتی ہوں۔ جو بھی ظالمانہ حد تک خوبصورت لگتا ہو چاہے زرداری ہی کیوں نہ ہو ۔

اس سے اس ڈش کے ذائقے پر کوئ فرق نہیں پڑے گا۔

ہماری یہ خاتون ہر ڈش کے اندر کہیں نا کہیں چکن ضرور استعمال کرتی ہیں۔ اگر وہ زردہ بناتی ہیں

تو بھی کسی نہ کسی ککڑ کا آس پاس ہونا ضروری ہوتا ہے۔ تاکہ اس کی ککڑوں کوں اس میں

وقفے وقفے سے شامل ہوتی رہے۔ اور دسترخوان پہ بیٹھ کر آپ یہ کہہ سکیں کہ گھٹ گئ مرغی، بڑھ گیا سالن۔ وجہ صاف ظاہر ہے پانی سے۔ یہاں میں آپ کو مرغیوں کے بھاءو، اور ہمارے محبوب صدر

کےبیرونی دوروں کے حوالے سے کوئ تعلق نہیں بتانا چاہ رہی۔ ایسا اگر کوئ کرتا ہے تو

وہ اپنی صوابدید پہ کر رہا ہے۔ میرا اس سے کوئ تعلق نہیں ہے۔

اب اگر آپ عاجز آ کر اس پوسٹ کو بند کرنا چاہ رہے ہیں تو بتا دوں کہ ابھی کچھ الفاظ کے بعد آپ کی خدمت میں کریلہ پکانے کی ایک ایسی ترکیب پیش کی جارہی ہے۔جو ملک کے کچھ غیر متوقع سائنسدانوں نے چوری چھپے سوچی۔ فنڈز کی کمی کی بناء پر اس کو فوری طور پر آزمایا نہیں گیا۔ لیکن جب تک فنڈز ملنا شروع ہوئے یعنی ان میں سے کچھ لوگوں کی شادی ہو گئ تو پتہ یہ چلا کہ نئ اینٹریز کریلوں کو ارتقاء کے راستے میں پیدا ہونے والی کڑواہٹ سمجھتے ہیں اور اسے دیکھنے کے بھی روادار نہیں چہ جائیکہ پکانے کے۔ اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ اب میں آپ سے کریلوں کی فلا ح و بہبود کے لئے چندہ مانگنے والی ہوں۔ اس سے مقصود صرف اتنا تھا کہ آپ کو پتہ رہے کہ یہ ترکیب اتنی نادر ہے ابھی تک آزمائ بھی نہیں گئ۔ اور اس کے جملہ حقوق بالکل محفوظ نہیں ہیں۔اب آپ مجھے گالیاں دینے والے ہونگے یہ مرحلہ اس ڈش کے لئے بہت ضروری ہے۔ اس سے جو ذائقہ پیدا ہوگا وہی اس کا راز ہے۔

سو،اب میں وہ کرنے جا رہی ہوں جس کے لئے اقبال اپنی زندگی میں اور میری پیدائش سے قبل ہی مجھے لعن طعن کر کے جا چکے ہیں۔ انہوں نے کہا اور میں نے سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی اس بات کو انتہائ خنداں پیشانی سے سنا۔

تو نے یہ کیا غضب کیا، اس کو بھی فاش کردیا

یہ ہی تو ایک راز تھا سینہء کائنات میں

تو جناب اس ترکیب کے لئے آپ کو چاہئےایک مرگی یعنی چکن، کہیں مرغی مت لے لیجئے گا۔ ورنہ ساری محنت اکارت جائے گی۔ مزید چیزوں میں ایک مکھن کی ٹکیہ اور ایک کنور کیوب۔ مکھن جتنا زیادہ ہو اتنا اچھا ہے۔ اس کے زیادہ استعمال سے طبقہء اشرافیہ سے آپکے اٹوٹ رشتوں کا پتہ چلتا ہے۔ نہیں نہیں اس کا مشرف سے کوئ تعلق نہیں۔ نہ ہی آپکے چوکیدار اشرف سے۔ کیا کہا، کریلہ کہاں ہے۔ اوہ ہاں ، ایک عدد کریلہ بھی لے لیں۔ اگر نہیں ملے تو تصویر سے بھی کام چلے گا لیکن کریلے کی۔ ظالمانہ حد تک خوبصورت لگنے والی خاتون کی تصویر آپ کے لئے ہے۔ مر گی یا مکھن کو اس سے کوئ دلچسپی نہیں۔ اور صحیح بات تو یہ ہے کہ ان خاتون کو بھی اس سے کوئ دلچسپی نہیں اور ان تینوں کا نام ایک ساتھ ایک جملے میں لینے پر آپ کے خلاف ہتک حسن کا دعوی بھی دائر کیا جا سکتا ہے۔ ڈرئیے نہیں حسین کافی خود بیں و خود آرا ہوتے ہیں اور انہیں پڑھنے کی فرصت نہیں ہوتی پھر بھی حیران کن طور پہ وہ پڑھاتے اچھا ہیں۔

اب ہم واپس چکن کی طرف آتے ہیں۔اگر آپ نے ذبح کی ہوئ مرگی لی ہے تو وہ اب تک اپنی جگہ پر ہوگی ورنہ دوسری صورت میں آپ کو ایک عدد اور چاہئیے ہوگی۔ مرگی، کترینہ نہیں۔ وہ صرف ایک ہے اور بھاگ جانے کی صورت میں آپ کو اسکا ککھ بھی نہیں ملے گا۔ اچھا اب کریلے کو اچھی طرح دھولیں۔ چھیلیں خوب اچھی طرح اور پھر دھوئیں۔ اب اس کریلے کو مرگی کے پیٹ کے اندر رکھ دیں۔ زندہ نہیں ذبح کی ہوئ اور صاف کی ہوئ۔ زندہ کے پیٹ میں اس کا انڈہ ہو گا جس سے اور مرگیاں بنیں گی اور آلائیشیں اندر سے صاف نہ کی جائیں تو کچھ لوگوں کو زیادہ کیا بالکل مزہ نہیں آتا۔ ویسے یہ آپکی پسند پہ ہے۔۔ اب اس کے ساتھ تھوڑا سا مکھن اور کنور کی ٹکیہ بھی رکھدیں۔ مرگی کے باہر اچھی طرح مکھن لگائیں۔ یہاں تک کہ سارا مکھن ختم یعنی خلاص ہو جائے۔ ورنہ یہ بچا ہوا مکھن کسی اور کے لگانے کے کام آئیگا۔ اور مرگئیوں کو یہ بات کچھ خاص پسند نہیں۔

اب اسے دھیمی آنچ پہ ایک منٹ پکائیں۔ اگر اس سلسلے میں اسٹاپ واچ استعمال کریں تو بہتر ہے۔ ورنہ ساٹھ تک گنتی گن لینا کافی ہے۔ اب ڈھکن کھولیں اور کریلے کو نکال کر باہر پھینک دیں۔ اس کی ساری غذائیت مرگی میں منتقل ہو چکی ہے۔ اب اس کی ضرورت نہیں۔ مرگی کو مکھن میں اچھی طرح تل لیں۔ اس مرحلے پہ آپ کو چلو بھر پانی کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ لاہور میں رہائش پذیر بھاگ کر نہر سے لے آئیں۔ کراچی والے سرکاری نل کی ہوا پہ گذارا کریں۔ سمندر کے پانی میں نمک زیادہ ہوتا ہے اس سے مرگی کا بلڈ پریشر ہائ ہوسکتا ہے۔ خیال رہےاس پانی میں آپ کو ڈوبنا نہیں ہے اور نہ ہی کسی کترینہ کو پلانا ہے وہ منرل واٹر پیتی ہے۔ اس سے صرف تلنے کے دوران مرگی کو چھینٹا دینا ہے۔ اس طرح آپ کو پتہ چلے گاکہ یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے۔ اگلے مرحلے میں جتنے مصالحہ جات کے نام آپ کو آتے ہیں اس میں ڈالدیں۔ کلچہ نان کے ساتھ جو موجاں ہونگیں۔ وہ تو آپ اور نان ہی جان سکتے ہیں۔ کیا کہا کریلے کا کیا ہوا۔ کریلوں کی فکر کرنے کی کوئ ضرورت نہیں۔ یہ تعصب کہلاتا ہے۔ انہیں اپنی بقاء کی جنگ خود لڑنے دیں۔ ورنہ پڑا سڑنے دیں۔ اہل پنجاب کی وضاحت کے لئیے سڑنے کے معنی یہاں بمطابق اردو ہیں۔ مزید معلومات کے لئے اگر ناگوار خاطر نہ گذرے تو کسی کراچی والے سے پوچھ لیں۔ زیادہ دل نہ جلائیے گا۔ یہی تو ایک چیز ہے سینہء کائنات میں۔

نوٹ: کریلوں کی بقاء کی فکر میں گھلنے والے اس مضمون کی کاپی کرواکے جہاں دل چاہے بھجوا دیں۔ وہ یعنی کریلے ارتقاء کے عمل میں کہیں بھی کوئ رخنہ پیدا کرنے کے قابل نہیں۔

ریفرنس؛

مرکزی خیال ماخوذ

کھانا پکانا

10:35 PM

ethnicity, Katerina Kaif, ارتقاء, پنجاب, تعصب, زرداری, کترینہ کیف, کراچی, کریلہ, مشرف

نوائے سروش

ابھی کچھ دنوں پہلے مجھے ٹیلیفون پر ایک ادبی اجلاس میں اپنی کہانی پڑھنے کے لئےبلایا گیا۔ میں نے اپنے قریبی حلقہء احباب میں اس خبر کو پھیلانے کی کوشش کی۔ کس نے بلایا ہے؟ ترقی پسندوں نے۔ اچھا ابھی تک موجود ہیں۔ کسی نے حیرانی کا اظہار کیا۔ ایک اور مبصر کہنے لگے۔' جائیں اپنا شوق پورا کرلیں۔ مگر زیادہ جذباتی ہو کر مت جائیے گا۔ وہاں سب ریٹائرڈ لوگوں کا مجمع ہو گا۔ اب اس عمر میں انکے پاس اور کچھ کرنے کو نہیں تو یہ ان کی ایک سرگرمی ہے'۔' تو اچھی بات ہے ناں کہ انسان اپنے آپ کو ہر عمر میں مصروف رکھے۔ سنا نہیں خالی ذہن شیطان کا کارخانہ ہوتا ہے۔' 'اور بھراذہن شیطان کا شو روم ہوتا ہے'۔ اب ایسے لوگوں سے کوئ کیا کہے۔ مجھے اس سے کیا۔ ویسے بھی کسی کی دعوت ٹھکرانا سخت غیر اسلامی فعل ہے۔ اور لوگ تو چاہتے نہیں کہ ہمیں بھی عزت اور احترام ملے اور ہم بھی لائق توقیر ٹھریں اس لئے ایسی باتوں کا پروپیگنڈہ کرتے ہیں تاکہ ہم نہ جائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ نوجوانوں کو تو موبائل فونز والوں نے مصروف رکھا ہوا ہے تو اب ایسی سرگرمیوں میں کون آئے گا۔ لازماً وہی ریٹائرڈ لوگ۔ وہ اپنی روایات کے ساتھ ہیں۔ بزم ادب میں رونق انہی کے دم سے ہے۔

لیجئیے مزید لوگوں کو کچھ بتانے سے کان پکڑے ۔ اور اگلے لمحے کان چھوڑ کر اپنی شائع شدہ

کہانیوں میں سے چھاننے لگی کہ کیا پڑھنا چاہئیے ۔ دعوتی پیغام میں تو یہ کہا گیا تھاکہ بالکل نئ تخلیق ہونی چاہئیے ۔ لیکن میں نے معذرت کر لی۔ ایک ہفتے کے نوٹس پہ یا تو اخبار میں آرٹیکل لکھا جا سکتا ہے ۔ یا کسی اور کے محبوب کے نام خط۔ ۔ ایک معیاری کہانی اگر لکھ بھی لی جائے تو اسے پال میں لگے رہنےکے لئے وقت چاہئیے ہوتا ہے ۔ اور یہ کچھ دنوں کا کام نہیں ہوتا۔ کم از کم میرے لئے ۔

حسب پیشنگوئ وہاں تقریباً بیس افراد ایسے تھے جن کی عمریں ساٹھ سال سے زیادہ تھیں۔چار پانچ احباب درمیانی عمروں کے اور دو تین لوگ ان میں سے کہے جاسکتے ہیں جن کے لئے اقبال نے کہا کہ

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں

نظر آتی ہے انکو اپنی منزل آسمانوں میں

محفل کے پہلے نثری حصے میں ہم اپنے حصے کا کام کر کے فارغ ہوئے۔ اب راقم کے لئے جو کچھ کہا گیا اسکے نتیجے میں تو مجھے اس پوسٹ کا بقیہ حصہ نہیں لکھنا چاہئیے۔ تعریف اور توصیف کا گوند اتنا ہی موئثر ہوتا ہے۔ لیکن پھر یہ مقام آتا ہے کہ کہنا پڑتا ہے کہ

کچھ شہر دے لوگ وی ظالم سیں

کچھ سانوں مرن دا شوق وی سی

اب اس شعر میں پنجابی زبان کی جو غلطیاں ہوں انہیں درست کر کے براہ شکریہ مجھے بھی بتا دیجئیے گا۔ محفل کا دوسرا اور متنازعہ حصہ شروع ہوا۔ اس حصے میں ایک شاعرہ کو تنقید کے لئے اپنی غزل پیش کرنی تھی۔ غزل کی ایک کاپی سب کو عنایت کی گئ۔

میں کوئ شاعر نہیں، اور نہ ان کیفیات میں مبتلا ہوں جس میں احباب کہتے ہیں۔ جب سے دیکھا میں نے تجھ کو شاعری آگئ۔ لیکن شاعری بقول شخصے روح کا نغمہ ہے تو جس بات کی فریکوئنسی روح کے ساتھ تال میل کھا جائے وہی شاعری لگنے لگتی ہے۔

ہمارے ایک کرمفرما کے مطابق کراچی میں اتنے شاعر ہیں کہ ایک پتھر اٹھاءو تو ہزار نکلتے ہیں۔ میرا خیال ہے جو پتھر جہاں پڑا ہے اسے وہیں پڑا رہنے دیجئیے کوئ خود ہی زور لگا کر نکل آئے تو ٹھیک ہےورنہ ان میں سے جو فوسلز میں تبدیل ہو جائیں انہیں بعد میں شاعر تسلیم کر لیا جائے ۔کم از کم اس غزل پر ایک نظر ڈالنے کے بعد یہ خیال راسخ ہو گیا۔

دلچسپ صورتحال اس وقت پیدا ہوئی۔ جب اس شعر پر تنقید کی گئ،

میری نظریں بھی نئے رنگ طلب کرتی ہیں

گھر کا سائیں، سر وسامان بدل کر دیکھیں

ہمارے پہلے تنقید نگار نے سوال آمیز تنقید میں پوچھا کہ شعر کا مفہوم تو یہ معلوم ہو رہا ہے کہ وہ اپنا گھر والا بھی گھر کے سروسامان کے ساتھ تبدیل کرنا چاہتی ہیں۔ شاعرہ موصوفہ میرے پڑوس میں تھیں اور میں انکی آواز بخوبی سن سکتی تھی۔ وہ بالکل جھینپ گئیں اور کہنے لگیں کہ میں نے کومہ تو ڈالا ہے یہ مخاطب کرنے کے لئے ہے۔ سچ پوچھیں تو میں بھی اس کا وہی مطلب سمجھی تھی جو ان تنقید نگار نے کیا۔ ان شاعرہ کی وضاحت باقی لوگوں کے کانوں تک اس صفائ سے نہ پہنچ سکی اور ترقی پسندوں کی اس محفل میں اس بات پہ داد دی گئ کہ اردو شاعری میں یہ پہلا موقع ہے جب ایک عورت نے بھی مرد کی طرح اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ وہ بھی اپنے ساتھی کی تبدیلی چاہتی ہے۔ یاد رہے وہ اس کی تردید کر چکی تھیں لیکن اس خیال کو اس شعر کی خوبی سمجھا گیا۔ اسی طرح ایک اور شعر میں ایک مصرعہ کچھ اس طرح تھا کہ من کے اندر کا ہی بھگوان بدل کر دیکھیں۔ ایک اور سینیئر تنقید نگار نے اس بات پہ داد دی کہ شاعرہ نے بڑی جراءت دکھائ کہ ہندی کے الفاظ اپنی شاعری میں استعمال کئے۔ حالانکہ انکے علم میں خدا جانے کیوں ان لاتعداد شاعروں کے نام نہ تھے جنہوں نے اپنی شاعری میں پوربی اردو استعمال کی ہے جس میں بےشمار ہندی کے الفاظ ہوتے ہیں۔ اس وقت فوری طور پر جس قریبی شاعر کا نام میرے ذہن میں آرہا ہے وہ پرتو روہیلہ اور مجید امجد ہیں۔ محض روایت سے ہٹنے کا نام ترقی پسندی نہیں ہو سکتا۔ اگر کوے کی تین ٹانگیں ہو جائیں کسی بھی جینیاتی تبدیلی کے نتیجے میں تو اسے ترقی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ ایک عیب ہے۔

سب سے مایوس کن صورتحال اس وقت لگی جب ہمارے ایک نوجوان شاعر نے حاضرین محفل کو غزل میں موجود فنی خرابیوں سے آگاہ کیا اور شاعری کی باریکیوں سے آگاہ کرتے ہوئے اسے ایک نچلے درجے کی غزل قرار دیا۔ یوں لگا کہ سب حاضرین کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ انکی اس ماہرانہ تنقید کے بعد باقی سینئر حضرات نے اس کا اثر مٹانے کی بھر پور کوشش کی اور آخر میں اسے ایک ترقی پسند اچھی غزل قرار دیا گیا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ چونکہ مجھے ان شاعرہ کی ہم جلیسی میسر تھی۔ تو محفل کے اختتام پہ میں نے سنا کہ وہ اور انکے ساتھی اس بات پہ ناراض ہوئے کہ چھوٹے بڑے کی کوئ تمیز نہیں انہوں نے اس طرح کی تنقید آخر کیوں کی۔

میں گھر واپس آگئ۔ اگر ہم تنقید کے لئے کوئ چیز سب کے سامنے پیش کرتے ہیں تو ہمیں اس بات کی فکر نہیں کرنی چاہئیے کہ اس پر ہمارے سینیئر رائے دیں گے یا ہمارے جونیئر۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ جو شخص اس چیز کی مہارت رکھتا ہے وہ کیا کہہ رہا ہے۔۔اس بات کو بھی مسئلہ نہیں بنانا چاہئیے کہ وہ رائے مثبت ہو گی یا منفی۔ اور جو شخص کوئ منفی رائے دے گا وہ ہماری بے عزتی کریگا یا یہ روایت کے خلاف ہوگا اور ہر ایک کو سب اچھا ہے کی گردان الاپنی چاہئیے۔ تخلیق کی دنیا میں سب برابر ہیں فرق صرف اس بات کا ہے کہ کوئ اپنی خدا داد صلاحیت کو کسطرح استعمال کرتا ہے۔ غالب تو مومن کو اس شعر کے بدلے اپنا دیوان دینے کو تیار تھے کہ۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا

جب کوئ دوسرا نہیں ہوتا

اگرچہ اس محفل کے آغاز میں یہ کہا گیا کہ اس قسم کی سرگرمیوں کا مقصد نوجوانوں میں تخلیقی جذبہ پیدا کرنا اور ساتھ میں ان کی اصلاح اور سیکھنے سکھانے کا ماحول پیدا کرنا ہے۔ لیکن جس طرح سیکھنا صبر اور استقامت کا کام ہوتا ہے سکھانا اس سے زیادہ صبر اور استقامت اور غیر جانبدار رہنے کا مرحلہ ہوتا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر عطا الرحمن نے ایک دفعہ کہا کہ پاکستان میں زیادہ تر اداروں کی تباہی کا ایک بنیادی سبب سینیاریٹی سنڈروم ہے۔ میری بات سنی جائے، میری رائے کو صائب سمجھا جائے، صرف میرے بتائے ہوئے مشوروں پہ عمل کیا جائے کیونکہ میں سینیئر ہوں۔ یہ سوچ ہمارے بہت سارے اداروں کی نہ صرف تباہی کا باعث بنی بلکہ ہمارے ملک کے نوجوان ذہین دماغوں کے ملک چھوڑنے کی بنیادی وجوہات میں سے ایک ہے۔حالانکہ میں سمجھتی ہوں کہ اس نوجوان تنقید نگار نے تنقید کا حق ادا کر دیا تھا۔ اور بجائے اس کی تنقیدی صلاحیت کو سراہنے کے اس غزل میں ایسی ایسی خوبیاں کھوج کھوج کر بیان کی گئیں جو صاحب تحریر کے علم میں بھی نہ تھیں۔

ہمارے عمومی روئیے کچھ اسی طرح کے ہیں۔ آخر ہم کسطرح کسی بھی میدان میں بلندی حاصل کر سکتے ہیں جب ہم اپنی خامیاں سننا برداشت نہیں کرتے۔ اور کوئ بھی چیز اپنے اعلی معیار پہ کیسے پہنچ سکتی ہے جب ہم اسکی جانچ کے لئے سخت معیار متعین نہیں کریں گے اور محض دوستی اور جان پہچان نبھانے کے لئے حقدار کو اسکے حق سے محروم رکھیں گے۔ گروپ بندی کر کے ہو سکتا ہے کہ آپ اپنے ضمیر کو سپورٹ دے لیں کیونکہ اس طرح آپ وہی سنتے ہیں جو سننا چاہتے ہیں۔ لیکن اس سے آپ کے کسی ہنر کی تعمیر نہیں ہو پا تی۔

ریفرنس؛

پروفیسر ڈاکٹر عطا الرحمن

9:37 AM

Prof Atta ur Rahman, ترقی پسند ادب، جدید اردو شاعری، ڈاکٹر عطا لرحمن، اردو تنقید،،کراچی میں شاعری

مبارک تمہیں خوشی کا یہ سماں

مبارکاں، بدھیاں

1:05 AM

پاکستاں، ورلڈ کپ، T20

فتراک کے نخمچیر

میرے بھائ کو مدرسے سے نکال دیا گیا۔ اور یہ صرف اسی کے ساتھ نہیں ہوا بلکہ مزید پندرہ طلباء اس سلوک کے حقدار ٹہرے۔ جی، وہ مدرسے میں شیطانیاں کرتے ہوئے یا باتیں کرتے ہوئے نہیں پکڑے گئے تھے بلکہ مدرسے کی انتظامیہ کا کہنا تھا کہ یا تو قرآن کی تعلیم حاصل کریں یا پھر اسکول کی۔ یہ جو آپ چالاکی دکھاتے ہوئے دونوں کام کرنا چاہ رہے ہیں تو ایسا ہم نہیں کرنے دیں گے۔ یہ واقعہ بھی ابھی کا نہیں جب کچھ معصوم سوچتے ہیں کہ ایسا اس لئے ہوا کہ مشرف نے آ کر ماڈرن اسلام کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی اور اسلام پسندوں نے اسلام بچانے کی، اس وجہ انتہا پسندوں نے جنم لیا۔ بلکہ یہ واقعہ اسی کی دھائ کا ہے جب جنرل ضیاءالحق پاکستان کو مشرف بہ اسلام کر چکے تھے۔ لیکن ابھی ہمارے محبوب صدر کا طیارہ فضا میں نہیں پھٹا تھا۔

میری اماں حیران رہ گئیں۔ ارے اسکول نہیں جائیں گے تو کیسے اپنی زندگی گذاریں گے۔ وہ اتنی معصومیت اور حیرانی سے ہر ایک سے یہ بات پوچھتیں۔ اگرچہ کہ انہوں نے یہ فیصلہ مدرسے کے منتظم کے پاس کھڑے کھڑے کر لیا تھاکہ وہ اپنے بچوں کو وہاں نہیں پڑھوائیں گی۔ پاگل ہو گئے ہیں یہ مدرسے والے۔ انہوں نے تو اس وقت اس قصے پہ بڑی سادگی سے یہ کہہ کر مٹی ڈالدی۔ مگر شاید پوری قوم کو پاگل بنانے کی تیاری اس وقت شروع کر دی گئ تھی۔

اس بات کو عرصہ گذر گیا، میں اپنی پی ایچ ڈی کے کاموں میں منہمک تھی۔ اس دوران میری ملاقات ایک نوجوان سے ہوئ۔ ہمارے گرائیں یعنی کراچی سے تعلق رکھتے تھے آئ سی ایم اے میں فائنل ائیر کے طالب علم تھے۔ مجھ سے کہنے لگے۔یہ ریسرچ وغیرہ تو میں سمجھتا ہوں کہ بیکار چیزیں ہیں۔ اگر انسان قرآن کو صحیح سے پڑھے تو ان جدید علوم کی کوئ ضرورت نہ پڑے۔ یعنی آپ بیمار نہیں پڑیں گے اگر قرآن کو پڑھیں گے تو۔ جی بالکل، اور اگر پڑ بھی گئے تو اس کا علاج قرآن میں موجود ہے۔ آپ کو بسوں اور جہازوں کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ کہنے لگے آپ نے ان صوفیوں اور بزرگوں کے بارے میں نہیں سنا جو ہوا میں اڑتے تھے اور پلک جھپکتے میں ایک شہر سے دوسرے شہر میں موجود ہوتے تھے۔میں حیرت سے انہیں دیکھنے لگی تو پھر آپ کیوں پڑھ رہے ہیں۔ پیسہ کمانے کے لئے۔ میں نےتو ایسے بزرگوں کے بارے میں بھی سنا ہے جن کی جائے نماز کے نیچے خزانہ موجود رہتا تھا وہ اس کا کونہ اٹھاتے اور ضروریات پہ خرچ کرتے تھے۔ کہنے لگے لڑکیوں کو میٹرک سے زیادہ نہیں پڑھنا چاہئیے۔ بہت شیطانی باتیں سوچنے لگتی ہیں۔ افسوس، میں ان کے گھر کی لڑکی نہ تھی۔ پھرمزید گویا ہوئے۔ ضرورت کا علم حاصل کرنے میں کوئ قباحت نہیں۔ لیکن اگر ہم قرآن شناسی بڑھا لیں تو پھر اس کی بھی چنداں ضرورت نہ رہے۔

ضرورت کا علم، کتنا منافقانہ لفظ لگتا ہے۔ آخر مذہب کے خود ساختہ متولیوں کے پاس ایسے منافقانہ الفاظ کا ذخیرہ کیسے جمع ہو جاتا ہے۔ ایسے بے روح، شکستہ، نیم مردہ الفاظ ، یہ الفاظ جو پھر اپنی کوکھ سے موت کو اورخود کش حملہ آوروں کو جنم دیتے ہیں۔میں نے ان سے کہا تھوڑا خاموش ہو جائیں۔ میں اس وقت جس مشین پہ کام کر رہی ہوں یہ آواز کے ارتعاش سے حتی کہ جسم کی حرارت سے بھی متائثر ہوتی ہے۔ اپنا کام پورا کرنے کے بعد میں ان کی طرف مڑی اور انہیں بتایا کہ اس مشین کے ذریعے میں نمک کے ایک ریزے کااور آپکی آنکھ کی ایک پلک کا بھی وزن بالکل صحیح معلوم کر سکتی ہوں۔ اور یہ جرمنی سے تیار ہو کر یہاں آئ ہے۔ حقیقت میں ، میں نے انہیں مزید بتایا اس وقت اس لیبارٹری کے اندر یہ جو اتنی بڑی بڑی مشینیں آپ دیکھ رہے ہیں ان میں سے کوئ ایک بھی کسی مسلمان ملک میں نہیں بنی۔ انکی در آمد پہ کروڑوں روپے خرچ کئے گئے ہیں۔ دراصل یہ پورا ریسرچ سینٹر جس کی مالیت شاید اس وقت اربوں میں ہو گی۔ اس میں ایک معمول سی مشین بھی کسی مسلمان ملک کی نہیں۔ ایسا نہیں کہ اس ادارے کو مسلمان ممالک سے کوئ بیر ہے بس ایسا ہے کہ مسلم ممالک میں اتنا دم نہیں کہ انہیں بنا سکیں یا اس پائے کا بنا سکیں۔

کیا ہوتا ہے ضرورت کا علم، آپ ایف سکسٹین ان سے لیکر اڑانا سیکھ لیں۔ البتہ بناتے وہ اسے رہیں اور اپنی ضرورت کے حساب سے اس میں نئ تبدیلیاں وہ لاتے رہیں۔ پھر ان نئ تبدیلیوں کو آپ ان سے پیسہ دیکر سیکھیں۔ کیا ہوتا ہے ضرورت کا علم، آپ اپنی فوجوں کی صحت کے لئے، جان بچانے والی اشیاءاور دوائیں ان سے خریدیں اور ان کا طریقہ ء استعمال بھی۔ البتہ وہ اس چیز پہ تحقیق کرتے رہیں کہ اسے مزید بہتر اور سستا کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ کتاب ہم سے مخاطب ہوتی ہے کہ کوئ ہے جو ان نشانیوں پہ غور کرے جو رب ذوالجلال نے اپنی پہچان کے لئے اس کائنات میں قدم بہ قدم بکھیر دیں ہیں۔ لیکن یہ وہ ہیں جوستاروں پہ کمندیں ڈالتے ہیں اور کائنات کی بیکراں وسعتوں کی خبر لاتے ہیں۔ چونکہ فی الحال آپ کی ضرورت یہ ہے کہ موسم کا حال پتہ چل جائے یا آپ ٹی وی پر کرکٹ میچ دیکھ لیں، اس لئے آپ ان سے یہ سہولت ایک مقررہ مدت کے لئے خرید لیتے ہیں۔

وہ اندھوں کی طرح اپنے تخیل کی انگلیوں سےٹٹول ٹٹول کر اس تخلیق گاہ کو دریافت کر رہے۔ ہیں اور آپ کتاب بغل میں دبا کر خوش ہیں کہ ہم ہیں خدا کی بہترین امت اور اس نے ہمیں یہ کتاب دی جس میں ان تمام رازوں کے اخفاء کے طریقے موجود ہیں، البتہ ان رازوں سے پردہ اٹھانے کی سعادت آپ نے انہیں دیدی ہے۔ کیوں ان مسلمانوں کو کسی اندیکھے ذریعے سے یہ بات پتہ ہے کہ ان کے لئے صرف ضرورت کا علم رکھا گیاہے حالانکہ اب وحی کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا ہے۔ کسی ایسی صورت کے لئے اقبال نے کہا کہ

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو

کتاب خواں ہے صاحب کتاب نہیں

حکیم الامت نے یہیں پر بس نہیں کی بلکہ وہ آگے کہتے ہیں کہ

اسی قرآن میں ہے اب ترک جہاں کی تعلیم

جس نے مومن کو بنایامہ و پرویں کا امیر

تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز

تھی نہا ں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

تھاجو 'ناخوب' بتدریج وہی 'خوب' ہوا

کے غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

چلیں اتنی بڑی باتوں پہ جی کیا جلانا ۔ یہ مجھے کسی نے باہر سے سلائ کی مشین تحفے میں لا کر دی ہے۔ اسکی خوبی یہ ہے کہ یہ بہت ہلکی اور چھوٹی سی ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ لیکر کہیں بھی پھر سکتی ہوں۔ اس کا وزن کسی گنتی میں نہیں۔ لیکن لانے والا اس کا مینوئل وہیں بھول آیا ۔ باہر سے کوئ سوراخ نظر نہیں آتا اندر سے یہ بالکل بند لگتی ہے۔ اب میں نیٹ پر بیٹھی سرچ کر رہی ہوں کہ اس میں تیل ڈالنےکا کیا طریقہ ہوگا۔ یہ مشین یہاں کسی نے استعمال نہیں کی اور کوئ مجھے کچھ بھی بتانے سے قاصر ہے۔ کیونکہ ہم سب نے صرف ضرورت کا علم حاصل کیا ہے۔

5:28 PM

اقبال, پاکستانی مدرسے, جنرل ضیا الحق, مشرف، ایف سکسٹین جہاز

قیاس کہتا ہے

جمائمہ خان، لا تعداد پاکستانی لڑکیوں کے دلوں کو چکنا چور کرتی ہوئیں، لاکھوں پاکستانیوں کی بھابھی بن کر یہاں آئیں۔ لیکن ان کے سلسلے میں بھی تاریخ نے اپنے آپ کو دھرایا۔ اور ہوا یہ کہ جتھوں دی کھوتی اتھےآنکھلوتی۔ یعنی پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تَھا۔

لیکن اکثر جب بیتے دن یاد آتے ہیں تو وہ اپنے دیدار سے ہی نہیں بلکہ اپنے بیانات سے بھی ہمیں نوازتی ہیں۔ ابھی کچھ دنوں پہلے انہوں نے پاکستان کا دورہ کیا اور اس سلسلے میں اخبار سنڈے ٹائمز میں اپنے تاءثرات بھی لکھے۔

وہ لکھتی ہیں کہ پاکستانی معاشرہ ایک نہ ختم ہونے والے تضادات کا مجموعہ ہے۔ لوگ مہربان بھی اور خونخوار بھی، چیزوں کو ڈھکے چھپے انداز میں برتتے ہیں اور پھر بالکل کھلے ڈلے ہوتے ہیں، کہاں تو روحانیت میں گم تو کہاں ظاہریت پہ جان دینے والے۔وہی ظالم اور وہی مظلوم۔

ان تضادات میں کچھ اور چیزیں بھی شامل کی جا سکتی ہیں لیکن فی الوقت یہ ہمارا موضوع نہیں۔ وہ بیچاری پانچ سال ایک پاکستانی گھرانے سے جڑے رہنے کے باوجود نہ جان سکیں کہ ایک مثالی پاکستانی ہونے کا مطلب ہی دراصل مجموعہء اضداد ہے۔خیر، یہ موضوع پھر کبھی۔

آگے انہوں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ پاکستان اس وقت شدت سے قیاسی سازش کی زد میں ہے۔ قیاسی سازش ، یہ میں نے ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے اس ترکیب کی جسے انگریزی میں کانسپیریسی تھیوری کہتے ہیں۔ اگر کوئ اس سے بہتر اردو مترادف اس لفظ کا جانتا ہے تو براہ مہربانی اس سے آگاہ کرے۔ میں مشکور ہونگی۔ الفاظ کی یہ ترکیب انیس سو پانچ میں پہلی دفعہ منظر عام پہ آئ۔ شروع میں اسے ایک نیوٹرل لفظ کے طور پہ لیا جاتا تھا۔ لیکن وقت گذرنے کے ساتھ۔ اسے منفی معنوں میں زیادہ استعمال کیا جانے لگا۔

یہ قیاس آرائ ذہن کی ایک ایسی رو ہوتی ہے جس میں ہم ہر واقعے کے پیچھے کسی سازش کو کارفرما دیکھتے ہیں۔ کیونکہ حقائق، واقعات اور ان سے منسلکہ لوگ کچھ اس طور پہ دھند میں ہوتے ہیں کہ ذہن صحیح بات تک بمشکل پہنچ پا تا ہے۔۔ نظریہ دان کہتے ہیں یہ رویہ لیڈرشپ کے کرپٹ ہونے کی وجہ سے دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے۔ لیڈرشپ کا کرپٹ ہونا، ایک ایسی لیڈر شپ کا نہ ملنا جس سے عوام مطمئن ہوں، یالیڈرشپ کا سامنے نہ آپانا، صرف پاکستانیوں کا مسئلہ نہیں دیگر اقوام بھی اس سے دوچار ہیں۔

ہر ملک اور قوم اپنے حالات اور معاشرے کی بنت کی وجہ سے مختلف قیاسی سازشوں کو جنم دیتے رہتے ہیں۔ اس کا اندازہ تاریخ کی کچھ مشہور قیاس آرائیوں پہ ڈالنے سے ہو سکتا ہے۔

ان میں سر فہرست گیارہ ستمبر، ۲۰۰۱ کو ورلڈ ٹریڈ ٹاور کو جہاز سے اڑانا ہے۔ امریکہ سے باہر لوگوں کی ایک کثیر تعداد کا خیال ہے کہ اس میں امریکن سی آئ اے شامل ہے۔ اورحادثہ بش انتظامیہ نےترتیب دیا۔۔ بظاہر اس کے حق میں کئ شہادتیں بھی جاتی ہیں۔ جیسے اس واقعے سے سب سے زیادہ فائدہ کس نے اٹھایا۔ جواب یہ ہے کہ امریکہ نے۔ امریکیوں کا خیال ہے کہ انکے پیارے صدر ایسا نہیں کر سکتے کہ اس طرح امریکیوں کا قتل کروا کے اس سے فائدہ اٹھائیں۔ کافی حد تک یہ بات صحیح بھی لگتی ہے امریکی ہمیشہ غیر امریکی کو مار کر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی انہوں نے واقعات کو سیدھا رکھنے کے لئے امریکیوں کی قربانی دی بھی ہے جیسے صدر ضیا الحق کے طیارے کا پھٹنا حالانکہ اس میں اس وقت امریک نمائندگان بھی موجود تھے۔ لیکن ہو سکتا ہے یہ اسٹریٹجی انہوں نے ہم سے یعنی پاکستانیوں سے سیکھی ہو۔

۱۹۴۱، دسمبر میں جاپان نے ایکدن ہمت دکھائ اور امریکی بحری بیڑے یو ایس پیسیفک کو ہنولولو کے پرل ہاربر پہ جا لیا۔کہا جاتا ہے کہ اس حملے کی اطلاع امریکیّوں کو مل گئ تھی جو انہوں نے ایک کوڈڈ پیغام کو ڈیکوڈ کر کے حاصل کی تھیں لیکن وہ جگہ کا نام نہ معلوم کر سکے۔ اس حملے میں لگ بھگ ڈھائ ہزار امریکی ہلاک ہوئے۔ یہ واقعہ امریکہ کو دوسری جنگ عظیم میں گھسیٹ لایا۔۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس وقت کے امریکی صدر روزویلٹ کو اسکی پیشگی اطلاع تھی اور انہوں نے اس سے جنگی فائدہ اٹھانے کے لئے اسے وقوع پذیر ہو جانے دیا۔

ایک اور واقعہ لیڈی ڈیانا کے اپنے مسلمان ساتھی کے ہمراہ پیرس میں حادثے کے دوران ہلاکت ہے۔ بیشتر لوگ یقین رکھتے ہیں کہ برطانوی شاہی حکومت نے یہ آنر کلنگ کروائ ہے۔ انگلش چرچ کے متوقع متولی کی ماں ایک مسلمان کے ساتھ عیاشی کرتی پھر رہی ہوں اس پر تو اسے زندگی سے فراغت دے دینا ہی بہتر ہے۔ انگلینڈ میں اس خیال کے حامی اور مخالف دونوں پچاس فی صد ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ڈیانا مسلمان ہونے والی تھیں اور زیادہ راسخ العقیدہ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ہوچکی تھیں اس لئے انہیں قتل کروا دیا گیا۔۔مسلمان ہونے سے پہلے وہ شاید یہ چیک کر رہی تھیں کہ مسلمان اچھے شوہر ہوتے ہیں یا نہیں اس لئے پہلے انہوں نے ڈاکٹر حسنات اور پھر ڈوڈی الفوائد کے ساتھ تعلقات بنانے کی کوشش کی ۔ ڈوڈی الفوائد نے مسلمانوں کا سر فخر سے بلند کردیا اور ان کے ساتھ موت میں بھی ہمراہی قبول کی۔

کالوں کو بھی کچھ کم تحفظات نہیں ہیں۔ ہر تین میں سے ایک افریقی النسل شخص اس بات پہ یقین رکھتا ہے کہ ایڈز کے جراثیم جان بوجھ کر امریکہ نے انکی سر زمین پہ متعا رف کرائے اور اس طرح انسانوں کی لیبارٹری تیار کی۔ اف یہ امریکی کبھی کبھی تو مجھے ان سے بڑی ہمدردی ہوتی ہے۔ ڈسٹ بن قوم، بیشتر لوگ اپنے موجودہ اور غیر موجودہ مسائل انہی کے سر منڈھ دیتے ہیں۔

یہی نہیں گلوبل وارمنگ کے بارے میں بھی دوستوں کا یہ کہنا ہے کہ یہ ہوّا ترقی یافتہ ممالک نے اس سے معاشی فوائد حاصل کرنے کے لئے کھڑا کیا ہے۔لیجئیے ہر سال جب گرمی پڑتی ہے ہر ایک ہر دوسرے سے یہ کہتا سنائ دیتا ہے کہ اس سال کیا قیامت کی گرمی پڑی ہے۔ پڑھے لکھے لوگ جن میں سے وہ جو سائنس سے تعلق رکھتے ہیں اس کا ذمہ دار گلوبل وارمنگ کو سمجھتے ہیں اس معاشی فوائد والی بات پہ بالکل چیں بہ جبیں ہو جاتے ہیں۔ ہونہہ، جب مریں گے کینسر کی وجہ سے تو پتہ چلے گا۔ یہاں تو ہر بات میں کوئ سازش ہے۔

اور یہ بات تو کچھ ایسی پرانی نہیں۔ جب ہمارے موجودہ محبوب صدر، پاکستان کے سب سے کرپٹ صدر کو ٹھوکر مار کے عوامی امنگوں کے مطابق صدر بنے۔ جب سب ہوا دے نال اڈ اڈ کے تھک گئے تو دشمنوں نے اڑایا کہ اس کار خیر کو انجام دینے کے لئے انہوں نے اپنی بیوی اور اس وقت کی مشہور لیڈر خاتون کی جان لینے سے بھی گریز نہ کیا۔ اب وہ ان کی تصویر اٹھائے اٹھائے پھرتے ہیں اور گاتے ہیں۔

جو بات تجھ میں نہیں ، تصویر میں وہ ہے، تصویر میں وہ ہے۔

حق کی راہ میں ایسی قربانی وہ اس سے پہلے بھی لے چکے ہیں۔ اور اس وجہ سے شہیدوں کا ایک خانوادہ وجود میں آیا۔ جس سے مستقبل کے شہیدوں کی چاروں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاھی میں ہے۔ اور عالم یہ ہے کہ چلے گئے تھانیدار جی اب ڈر کاہے کا۔

ایک زمانے میں یہ قیاس کیا جا رہا تھا کہ کوئ دن جاتے ہیں کہ کراچی جناح پور بن جائے گا اور ایم کیو ایم والے اس پہ حکومت کریں گے۔ حالانکہ ہم سمجھتے ہیں کہ جب گھی سیدھی انگلیوں سے نکل رہا ہو تو انہیں ٹیڑھا کرنے کا فائدہ۔ اپنے غیر کراچی دوستوں کو دھمکایا کرتے تھے کہ اگر زیادہ آئیں بائیں شائیں کی تو ویزہ لگوا کر آنا پڑیگا۔ اور آپ کا ویزہ تو لگنے نہیں دونگی۔ میرے سینے پہ مونگ دلنے کے لئیے انہوں نے کراچی میں ہی رہائش اختیار کر لی۔ کر لو جو کرنا ہے۔ اس وقت یہ نہیں سمجھ میں آتا تھا کہ محمد علی جناح نے جو ملک بنایا اس کا نام تو پاکستان رکھ دیا۔ اب اس کا نام جناح پور کیوں رکھیں گے۔ ہم کوئ پختون تھوڑی ہیں کہ اسلامی ملک بنانے کے بعد یا تو اپنےنام پر لڑ رہے رہیں یا اسلام پہ۔ کام پکا ہونا چاہئیے۔ بس اس وجہ سے جناح پور بنتے بنتے رہ گیا۔

اب میرے سواتی ڈرائیور نے بتایا کہ باجی یہ طالبان مسلمان نہیں ہوتا۔ یہ غیر مسلمان ہوتا ہے۔ میں نے پوچھا کیا سب کےسب غیر مسلمان ہوتے ہیں۔ کہنے لگا نہیں تو، یوں سمجھ لو کہ ہزار میں صرف سو طالبان ہوتا ہے اور باقی غیر مسلمان۔ اچھا یہ بتاءو میں نے اس سے مزید پوچھا۔ یہ صوفی محمد اور فضل اللہ یہ سب بھی غیر مسلمان ہے۔ تھوڑا سا جھجھکا اور کہنے لگا باجی یہ سب بکا ہوا مسلمان ہے۔ باجی ان سب کو پیسہ چاہئیے پیسہ۔

میڈیا میں اس حوالے سے چند تصاویر گردش میں ہیں۔ لیکن ہزاروں کی تعداد میں بر سر پیکار عسکریت پسندوں کے لشکر پاکستان میں کیسے داخل ہو گئے۔ یہ کوئ نہیں بتاتا۔ آج ہی میں اخبار میں پڑھ رہی تھی کہ بیت اللہ محسود اپنے سینکڑوں ساتھیوں کے ہمراہ وزیرستان میں موجود ہے۔ ان کی مقامی آبادیوں سے دوستی کیسے ہو گئ۔ جبکہ اسلامی ظاہری علامتوں کی اس تمام علاقے میں سختی سے پابندی بھی کی جاتی ہے۔آخر لوگ کیوں اس حقیقت کو جھٹلانا چاہتے ہیں کہ یہ عکسریت پسند دراصل طالبان ہیں جو ایمان اور امن دونوں راستوں سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ طالبان کی حمایت میں گوڈوں گوڈوں ڈوبے ہوءووں کے ساتھ ایسا نہ ہو کہ،

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے

یہ جانتا اگر، تو لٹاتا نہ گھر کو میں

اب میں تھوڑا اور اپنے قریب دیکھتی ہوں۔ میری ماں۔ ان کا خیا ل ہے کہ سائنسداں جھوٹ بولتے ہیں کہ وہ چاند پہ پہنچ چکے ہیں۔ کسی صحرا میں جا کر تصویریں بنا لی ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم چاند سے ہو کر آرہے ہیں۔ صرف وہ ہی نہیں بلکہ کچھ اور لوگ بھی ایسا سمجھتے ہیں۔ میں انکے حامی لوگوں سے بھی مل چکی ہوں۔ اور ان سے اکثر سوال کرتی ہوں۔ ڈاکٹر اسی سائنس کی مشین سے آپ کا بلڈپریشر چیک کر کے بتاتا ہے۔ اس وقت آپ اسکی بات پہ اس سے زیادہ یقین رکھتی ہیں۔ اور فورا فکر کرنے لگتی ہیں کہ میرا بلڈ پریشر کس وجہ سے بڑھ گیا ہے۔ ٹی وی آپ دیکھتی ہیں۔ یہ سائنس کی ایجاد ہے۔ یقین کرتی ہیں۔ جہاز سے اڑ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی ہیں یقین کرتی ہیں کہ وہاں ہو آئیں۔ ٹیلیفون پہ کی ہوئ بات پہ یقین کرتی ہیں۔ آخر چاند کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ وہ مسکرا کے خاموشی سے اپنا کام کرنے لگتی ہیں۔

چاند کسی کا ہو نہیں سکتا، چاند کسی کا ہوتا ہے

چاند کی خاطر ضد نہیں کرتے، اے میرے اچھے انشاء چاند

جمائمہ خان

ورلڈ ٹریڈ ٹاور کی تباہی

پرل ہاربر پر حملہ

روزویلٹ کا فیصلہ

ڈیانا کی موت

گلوبل وارمنگ

12:52 AM

conspiracy theory, Jemima Khan, ابن انشاء, پاکستان, جمائمہ خان, جناح پور, طالبان ،ڈیانا، ایڈز, غالب, گلوبل وارمنگ

ن م راشد کی نظم اندھا کباڑی

ن میم راشد یا راجہ نذر محمد راشد نے اردو نثری نظم کا مزاج تبدیل کر کے اسے عالمی ادب میں روشناس کرادیا۔ ن میم راشد اور فیض ہم عصر شاعر ہیں۔ ناقدین کی نظر میں راشد کا مقام فیض سے بڑھ کر ہے۔ لیکن شہرت کی دیوی فیض پر مہربان ہوئ۔ راشد کی بے شمار نظمیں دل میں کھب جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہاں حاضر ہے۔ اسے ضیا محی الدین نے کمال کاتحت اللفظ میں پڑھا ہے۔ ویسے راز کی بات ہے اتنا برا میں بھی نہیں پڑھتی بس کچھ یہ ہے کہ سب کہیں گے۔ 'ارے ضیا محی الدین کی نقل اتاری ہے'۔

اندھا کباڑی

شہر کے گوشوں میں ہیں بکھرے ہوئے

پا شکستہ سر بریدہ خواب

جن سے شہر والے بےخبر

گھومتا ہوں شہر کے گوشوں میں روزوشب

کہ ان کو جمع کر لوں

دل کی بھٹی میں تپاءوں

جس سے چھٹ جائے پرانا میل

ان کےدست و پا پھر سے ابھر آئیں

چمک اٹھیں لب ورخسار و گردن

جیسے نو آرستہ دولھوں کے دل کی حسرتیں

پھر سے ان خوابوں کو سمت رہ ملے

'خواب لے لو خواب'۔

صبح ہوتے چوک پہ جا کر لگاتا ہوں صدا۔

خواب اصلی ہیں کہ نقلی؟'۔

یوں پرکھتے ہیں کہ جیسے ان سے بڑھ کر

خوابداں کوئ نہ ہو

خواب گر میں بھی نہیں

صورت گر ثانی ہوں بس۔۔

ہاں مگر میری معیشت کا سہارا خواب ہیں

شام ہوجاتی ہے

میں پھر سے لگاتا ہوں صدا۔۔۔

'مفت لے لو مفت، یہ سونے کے خواب'۔۔۔۔۔۔۔

'مفت سن کر اور ڈر جاتے ہیں لوگ

اور چپکے سے سرک جاتے ہیں لوگ۔۔

'دیکھنا یہ مفت کہتا ہے

کوئ دھوکا نہ ہو؟

ایسا کوئ شعبدہ پنہاں نہ ہو؟

گھر پہنچ کر ٹوٹ جائیں

یا پگھل جائیں یہ خواب؟

بھک سے اڑ جائیں کہیں

یا ہم پہ کوئ سحر کر ڈالیں یہ خواب۔۔

جی نہیں کس کام کے؟

ایسے کباڑی کہ یہ خواب

ایسے نابینا کباڑی کے یہ خواب'؟

رات ہو جاتی ہے

خوابوں کے پلندے سر پہ رکھ کر

منہ بسورے لوٹتا ہوں رات بھر پھر بڑ بڑاتا ہوں

'یہ لے لو خواب'۔۔۔

اور لے لو مجھ سے ان کے دام بھی

خواب لے لو، خواب۔۔۔۔

میرے خواب۔۔۔

خواب۔۔۔۔۔میرے خواب۔۔۔۔۔۔۔

خواا، اب۔۔۔۔۔۔۔۔

ان کے داااام بھی ی ی ی۔'۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ریفرنس؛

ن میم راشد ایک تعارف

ن میم راشد کی کچھ اور نظمیں

ن میم راشد ایک تعارف ۲

4:11 PM

N M Rashid, اردو نثری شاعری, اندھا کباڑی, ضیا محی الدین, فیض احمد فیض, ن م راشد

آوارگی کا عذاب

یورپ میں ۱۴۸۴ سے ۱۷۵۰ کے درمیان کم از کم ایک لاکھ عورتوں اور دیگر ذرائع کے دعوے سے دو لاکھ عورتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ان عورتوں کو مارنے سے پہلے چڑیل ثابت کیا جاتا تھا۔ ان عورتوں کی کثیر تعداد بوڑھی اور غریب عورتیں ہوتی تھیں۔ چڑیلوں کی کچھ نشانیاں مقرر کر لی گئ تھیں جیسے چہرے پہ تل یا مسہ یا کسی اور قسم کا نشان حتی کہ کیڑے کے کاٹے کا نشان بھی اس میں شمار تھا۔ اس کے ساتھ اگر ان کے پاس بلی موجود ہو توپھر کیا کہنا۔ اس سلسلے میں ایک شخص جس کا ذکر خاصہ کیا جاتا ہے اس کا نام میتھیو ہوپ کنس تھا ، پیشے کے حساب سے ایک ناکام وکیل۔چڑیلوں کو مارنے میں بہت کامیاب رہا اور ایک ایکدن میں انیس چڑیلوں کی حیات کا چراغ گل کیا۔ اسے وہاں کے مذہبی حلقوں کی حمایت حاصل تھی اور اس کے بدلے میں اسے مختلف ریاستی حاکموں کی طرف سے کثیر رقم ملی۔ تاریخ میں اس کا نام'چڑیل کھوجی جنرل' کے طور پہ مشہور ہے۔ یورپ میں مظالم کا یہ سلسلہ اس وقت بتدریج ختم ہوا جب لوگوں کے اندر علم کی روشنی پھیلی اور انہوں نے توجیہی علم کی طرف توجہ کی یعنی علم کی بنیاد الفاظ کیوں اور کیسے بنے۔

آج مجھے یہ کہانی اس مضمون کو پڑھ کر یاد آئ۔ جو میں نے اردو سیارہ پہ دیکھا۔صاحب مضمون نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئیے پہلے مذہبی جذبات کو استعمال کیا ہے اور اسکے بعد انہوں نے مضمون کے اخیر میں این جی اوز سے وابستہ خواتین کونہ صرف آوارہ مزاج بلکہ ان کوملک کی موجودہ صورت حال کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ میرا کسی این جی او سے چاہے وہ مردانہ ہو یا زنانہ کوئ تعلق نہیں۔ لیکن میں صاحب تحریر سے اس بات کی وضاحت ضرور چاہوں گی کہ جب خدا نے اس ملک کو مردوں کو ان کی آوارگی پہ کوئ سزا نہیں دی تو میں اپنے اسی خدا سے اس چیز کی توقع نہیں رکھتی کہ وہ اتنی نا انصافی کریگا کہ این جی اوز کی چند درجن خواتین کی وجہ سے اس ملک کو اس حشر تک پہنچا دے۔

خدا اتناجانبدار نہیں ہو سکتا کہ ملک کی دیگر عورتوں اوربچوں کے ساتھ چاہے جس طرح کا بھی سلوک روا رکھا جائے مگر اگر کسی کی آواز پہ وہ لبیک کہے تو وہ صرف جامعہ حفصہ کی خواتین اور بچے ہوں۔ اگر وہ حفصہ کی خواتین اور بچوں کا خدا ہے تو وہ اس دھرتی اور اس کرہء ارض پہ بسنے والے ہر شخص کا خدا ہے۔

مقام حیرت ہے کہ چند عورتیں اپنی آوارگی سے ملک کو اس حشر تک پہنچا سکتی ہیں۔ وہ ملک جہاں کہ حکمرانوں کی اکثریت بنیادی اخلاق کی کجی کا شکار رہی ہو۔ اور جو معاشرہ مردوں کا معاشرہ کہلاتا ہو۔ جہاں کے قوانین مردوں کی اکثریت اپنے مفادات دیکھ کر بناتی ہو۔ جس ملک کا یہ عالم ہو کہ الیکشن کے وقت اس ملک کی تمام بڑی جماعتیں جن میں مسلم لیگ، تمام مذہبی پارٹیاں، جناب عمران خان کی تحریک انصاف اور کچھ اور جماعتیں جن کے نام میرے ذہن سے محو پورہے ہیں ملکر ایک معاہدے پہ دستخط فرماتے ہیں کہ ہمارے ان حلقوں سے کوئ خاتون ووٹ نہیں ڈالے گی۔ جی جناب جہاں خواتین کو اس قدر اختیارات حاصل ہوں وہاں خدا کا عذاب عورتوں کی وجہ سے نہیں آئے گا تو کہاں آئے گا۔

لال مسجد آپریشن سے پہلے اسلام آباد میں ایک خاتون کو فحاشی کا اڈا چلانے کے جرم میں لال مسجد کے خدائ فوجدار ا پکڑ کر لے گئے اور کچھ دنوں تک اسے اپنی تحویل میں بھی رکھا۔ جب تک ان سے یہ وعدہ نہ لے لیا کہ تم یہ دھندہ نہیں کروگی انہیں نہیں چھوڑا گیا۔ انہوں نے بھی اپنی جان چھڑانے کے لئیے یہ وعدہ کر لیا ہو گا۔ درپردہ تو انہیں معلوم ہو گا کہ ہوتا کیا ہے۔

اب اگر آپ میں سے کوئ صاحب یا صاحبہ ہمت رکھتے ہوں تو ڈیٹا جمع کریں ۔ فحاشی کے ان اڈوں پہ، عورتوں کے ان بازاروں میں روزانہ کتنے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ مرد جاتے ہیں انکی عمر کیا ہوتی ہے اور وہ کن خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ سارے حساب کتاب کے بعد انہیں پتہ چلے گا کہ پاکستانی مردوں کی کل آبادی کا خاصہ بڑا حصہ ان سے مستفید ہوتا ہے اور انہی شماریات سے اندازہ ہو گا کہ پاکستان کی عورتوں کی کل آبادی کا ایک بہت چھوٹا سا حصہ اس پیشے سے باوجوہ وابستہ ہے جبکہ پاکستانی مرد محض عیاشی کے لئیے ان جگہوں کا رخ کرتے ہیں۔ یا ان خواتین کو اپنے پاس بلاتےہیں۔ معاشیات کا ایک بالکل بنیادی اور سادہ سا اصول ہے اور وہ یہ کہ جب تک ڈیمانڈ ہے سپلائ رہے گی۔ اگر اپ اس سارے خطے کی خواتین کو بالکل پاکباز بنا دیں تب بھی یہ مرد باہر سے اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئیے کسی اور کو لے آئیں گے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ صوبہء سرحد جہاں سے آج مذہب کے احیاء کی تحریکیں پیش کی جا رہی ہیں یہاں پاکستان میں سب سے زیادہ ہم جنس پرستی عام تھی اور ہے۔ یہ چیز وہاں اسٹیٹس سمبل یعنی خوشحالی کی علامت سمجھی جاتی ہے ۔ معاشی طور پہ مستحکم مرد کے پاس کچھ نو عمر لڑکے ضرور ہوتے ہیں۔ آج تک اس صوبے کے اندر رائج اس عادت قبیح کا آپ کبھی کسی مذہبی جماعت سے تذکرہ بھی نہیں سنیں گے۔ حالانکہ یہ وہ چیز ہے جس پہ خدا نے ایک قوم پہ اپنا عذاب نازل کیا۔مگر ایک صوبے میں یہ برائ عام ہونے کے باوجود وہاں کوئ عذاب نہ آیا۔عذاب آیا تو ان عورتوں کی وجہ سے۔

تو آج تک کبھی ان مردوں کے خلاف کوئ موءثر کارروائ نہ ہو سکی۔ در حقیقت پوچھا جائے کہ آوارگی کی کیا تعریف ہے تو اس کی کوئ ڈھنگ کی تعریف بھی نہ پیش کی جاسکے گی۔ سوائے خواتین کے اوپر تنقید کرنے کے۔ اس لئیے نہیں کہ کوئ تعریف ہے نہیں بلکہ اس لئیے کہ پھر اس نظام کو اس کرپٹ نظام کو کون بچائے گا۔ مرد ایکدوسرے کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ آخر انہیں ہی اس نظام کو چلانا ہے۔

یہ ایک تبصرہ نگارہیں ایک بلاک پہ فرماتے ہیں کہ یہ رافضی عورتوں کی کوکھ ہی ایسی ہے۔ میر جعفر اور میر صادق کو ہی جنم دیں گی۔ اس مرد محترم کو یہ نہیں معلوم کہ زمین کیسی بھی ہو پھل میں خصوصیات بیج کی آتی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عوتوں کے معاملے میں ہم دن بہ دن کہاں جارہے ہیں۔

لال مسجد والوں نے اپنے وجود کو جب سہارا دینا چاہا تو انہوں نے بھی چند عورتوں کو پکڑ لیا۔ نام نہاد مذہبی تنظیمیں جب اپنی اجارہ داری کو طاہر کرنا چاہتی ہیں تو خواتین کو ہی ہر برائ کی جڑ بنا دیا جاتا ہے یا انکی حیثیت انسان سے بھی کمتر ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اقبال ایک جگہ کہتے ہیں کہ

ہند کے شاعروصورتگر و افسانہ نویس

آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اگر اس دور میں زندہ ہوتے تو ضرور ہمارے مذہبی حلقوں کو بھی اس فہرست میں شامل کرتے۔ جس جنونیت کے ساتَھ اب وہ اس راستے پہ گامزن ہیں۔ اس سے لگتا ہے کہ کوئ دن جاتا ہے کہ یہاں پر بھی کوئ میتھیو ہوپ کنس برآمد ہوجائیں گے۔

مغربی معاشرے میں لا دینیت کی تحریک نے ایکدم سے جڑ نہیں پکڑ لی تھی بلکہ ان جیسے عوامل نے لوگوں کے دلوں میں وہاں مذہب کے لئیے نفرت پیدا کی۔ وہاں پہ بھی ایک وقت میں یہی عالم تھا کہ عورتوں کو حقیر، اور ہر برائ کی جڑ سمجھا جاتا تھا۔ ماشاللہ سے ہم بھی انکے نقش قدم پہ جا رہے ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہم ہر اس چیز کو اپنا لیتے ہیں جسے برتنے کے بعد وہ بےکار کہہ کر پھینک دیتے ہیں۔

ایک حدیث جس کا میں ان تمام اصحاب کو حوالہ دینا چاہونگی وہ یہ ہے کہ

جس نے ایک انسان کی زندگی بچائ اس نے ساری انسانیت کو بچا لیا اور جس نے ایک بے گناہ انسان کو قتل کیا تو گویا اس نے ساری انسانیت کو قتل کیا۔

اگر ان آوارہ مزاج عورتوں میں کوئ ایک کسی ایک انسانی جان کو بچا لیتی ہے تو اس نے سارے انسانوں کو بچا لیا۔ اور اگر آپ مذہب کو استعمال کرتے ہوئے کسی ایک بے گناہ کی جان لیتے ہیں تو آپ نے سارے انسانوں کو قتل کردیا۔

آپ نے اپنے معاشرے کے اندر اتنی ناہمواریاں کیسے پنپنے دی ہیں کہ ان عورتوں کو آپ کے درمیان جمنے کا موقع ملا۔ کبھی اس بات پہ بھی غور فرمائیں گے۔ یا ہر وقت خدا کی پھٹکار سے ہی نوازتے رہیں گے۔

میں سمجھتی ہوں ایسے تمام اصحاب کی سختی سے مذمت کرنی چاہئیے۔ آپ کسی کے طرز عمل پہ انگلی اٹھانے سے پہلے اپنے اعمال کو چھان پھٹک کر دیکھ لیں۔ تاریخ کا خوب مطالعہ کریں۔ ذہن اور نظرکی تنگی جہاں لے جاتی ہے۔ ہم سب الحمد للہ وہیں جا رہے ہیں۔

ریفرنس؛

متعلقہ مراسلہ، منیر اے طاہر کے بلاگ پہ موجود ہے

یورپ میں چڑیلیں ۱

یورپ میں چڑیلیں ۲

یورپ میں چڑیلیں ۳

11:38 AM

witch craft, اقبال, پاکستان میں ہم جنس پرستی, عمران خان, لال مسجد, مسلم لیگ, میتھیو ہوپ کنس, یورپ میں چڑیلیں

میں نہ مانوں

میں پاکستان سے باہر چند پاکستانی خواتین کے ساتھ بیٹھی خوش گپیوں میں مصروف تھی کہ کسی نے ٹکڑا لگایا۔' یار پاکستانی لڑکیاں بہت میک اپ کرتی ہیں۔ معلوم ہے ان کے کمروں میں جا کر دیکھو تو ڈریسنگ ٹیبل پہ طرح طرح کا سامان بھرا پڑا ہوتا ہے اسکے باوجود پاکستانی اپنے آپ کو غریب کہتے ہیں۔' وہاں موجود ہر ذی روح نے اس کی تائید کی، سوائے میرے۔ کتنی پاکستانی لڑکیوں کے پاس اپنے ذاتی کمرے اور ان میں ڈریسنگ ٹیبل موجود ہوتا ہے چہ جائیکہ بھانت بھانت کا میک اپ کا سامان۔ ہم اس خطے سے تعلق رکھتے ہیں جہاں ایک کمرے میں پانچ چھے لوگ سوتے ہیں۔لوگوں کے پورے گھر ایک کمرے پہ مشتمل ہوتے ہیں۔ کراچی یونیورسٹی کی حد تک میں نے یہ دیکھا کہ نوے فی صد لڑکے اور لڑکیاں شام کو ٹیوشن پڑھاتے ہیں۔ جواب ملا لیکن یونیورسٹی کی نوے فیصد لڑکیاں لپ اسٹک لگاتی ہیں۔ اتنی ٹیوشن پڑھا کہ چھ مہینے میں سو روپے کی ایک لپ اسٹک لگا لینا نہ کوئ عیاشی ہےاور نہ وہ اس جملے کی حقدار ٹھیرتی ہیں۔یہ تو بس ایک شوق ہے۔ کوئ اور زندگی میں تبدیلی نہیں لا سکتے چلو لپ اسٹک لگا لی۔ یہاں میں یہ وضاحت کردوں کہ اپنی اسٹوڈنٹ لائف میں اور اب بھی، میں کبھی لپ اسٹک کی شوقین نہیں رہی لیکن کسی کےایسے بے ضرر شوق کو برا بھی نہیں کہتی۔ خیر تمام تر غربت کے ڈیٹا اور کاسمیٹکس کے استعمال کی شرح کی معاشیات کے ان سب نے یہ تسلیم نہیں کیا کہ وہ غلط کہہ رہے ہیں۔ اس لئیے کہ وہ سب پاکستانی معاشرے کے اعلی طبقات سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے اپنی محدود دنیا کے علاوہ پاکستان کے بیشتر حصے کو نہ دیکھا تھا نہ محسوس کیا تھا۔

اب یہ ایک اور منظر ہے میں اپنے دوستوں کو اندرون سندھ اپنے قیام کے بارے میں بتا رہی تھی۔ 'یار سانگھڑ کے اطراف میں بڑی خوبصورت جھیلیں ہیں۔ اور بعض جو کنول کے پھولوں سے ڈھکی ہوئ ہیں بہت زبردست لگتی ہیں۔' میرے ایک دوست جن کا تعلق سندھ سے نہیں تھا ایکدم بول اٹھے۔ 'دیکھا پھر بھی سندھ والے شور مچاتے ہیں کہ ہمارے لئیے پانی نہیں ہے'۔ میں نے ان کی طرف حیرانی سے دیکھا ۔ ' مگر آپ نے دریائے سندھ کا ڈیلٹا شاید نہیں دیکھا ۔ ایکدم خشک ہے اور اسے صحرائے سندھ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اس میں تو خشک ریت کے ٹیلے جا بجا نظر آتےہیں۔' 'ارے نہیں ابھی مشرف نے اپنی تقریر میں کہا کہ سالانہ کتنا پانی ڈیلٹا سے گر کے ضائع ہوتا ہے۔' مشرف کا مخالف ہونے کے باوجود انہوں نے اس کا حوالہ دیا۔'ہاں میں نے بھی انکی یہ تقریر سنی اور مجھے حیرانی ہے کہ کون انہیں یہ ڈیٹا پیش کرتا ہے اگر وہ ہیلی کاپٹر سے ایک دفعہ ڈیلٹا کا چکر لگا لیں سب لگ پتہ جائے۔ اور جو ان جھیلوں کی میں آپ سے بات کر رہی ہوں ان میں سے بیشتر پانی کی کمی کی وجہ سے نمکین ہو گئ ہیں۔ میرے پاس ان نمکین جھیلوں کی کافی تصویریں موجود ہیں اور آپ کو ضرور دکھاءونگی'۔ مگر انہوں نے میری بات تسلیم نہیں کی وہ ہمیشہ کراچی جہاز سے آتے جاتے رہے اور انہوں نے کبھی دریا کے ڈیلٹا پہ سے گذر کر نہیں دیکھا تھا۔ بس ان کا خیال تھا کہ جو بات انہوں نے اپنے جیسے لوگوں سے سنی ہے وہی صحیح ہے۔

یہاں ایک اور خاتون کا تذکرہ جن سے میری ایک تقریب میں اتفاقاً ملاقات ہو گئ ۔ انہیں معروف انگریزی صحافی ارد شیر کاءوس جی بہت پسند ہیں۔ مجھے بھی ان کی بے باک تحریر پسند ہے۔ تو میں نے ان سے کہا۔'آپ کو معلوم ہے کاءوس جی نے ایک دلچسپ بات کہی اور یہ بات وہی کہہ سکتے تھے ۔ ٹی وی پہ ان کا انٹرویو آرہا تھا اور میزبان بضد تھے کہ وہ بتائیں اگر انہیں وزیر اعظم بنا دیا جائے تو وہ کیا کریں گے۔ انہوں نے جواب دیا۔ میں کیوں بنوں چودہ کروڑ جٹوں کا وزیر اعظم۔' ان خاتون نے اس بیان کو ماننے سے انکار کردیا۔ کیونکہ وہ ان چودہ کروڑ لوگوں میں شامل تھیں اور سمجھتی تھیں کہ وہ کاءوس جی کو پسند کرتی ہے اور وہ اس پسندیدگی کے بدلے میں انکے بارے میں ایسی بات نہیں کہہ سکتے۔ حالانکہ میں بھی ان چودہ کروڑ لوگوں میں شامل تھی مگر مجھے مزہ آیا۔ میں صرف یہ کہہ سکتی تھی کہ آپ کو اس پروگرام کی ریکارڈنگ کہیں سے مل جائے یا آپ خود انہیں میل کرسکتی ہوں تو ضرور ان سے پوچھ لیں۔ میں نے یہ پروگرام اپنے گھر والوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ کہیں تو ان سب کی گواہی دلوادوں۔ مگر ادھر وہی بات۔ میں نہ مانوں۔

یہ تو چند چیدہ چیدہ واقعات تھے جو میری یاد داشت میں رہ گئے۔

لیکن ان جیسے واقعات کی یاد تب تازہ ہوئ جب میں نے کچھ حقیقی واقعات کے حوالے اپنی تحریروں میں دئیے اور لوگوں نے کچھ ایسے ہی تبصرے دئیَے ۔ مثلاً پٹھانوںکا خواتین کو ہراس کرنا۔ کہا گیا کیایہ حسن اتفاق ہے کہ آپ کو پٹھان ملتے ہیں۔ اے کاش آپ کو خدا عورت کی حیثیت سے کراچی میں پیدا کرے اور آپ کا گھر یا آفس یا تعلیمی ادارہ ان کی کسی بستی کے آس پاس ہو۔تو آپ کو پتہ چل جائے گا کہ خواتین ان سے اتنا کیوں بدکتی ہیں۔ ورنہ آپ کے لئیے مشکل ہےسمجھنا۔ گھبرائیے نہیں، خدا اپنی سنت کے حساب سے ایسا کریگا نہیں۔ اس لئیے میں بس ہنس دیتی ہوں۔

یہ ایک اور حیران صاحب ہیں انہیں حیرت ہے کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ خاندان میں اتنے لوگ بھی نہ ہو کہ خاندان کے مردوں میں سے دو گواہ نہ نکل سکیں۔ اب میں کیا کروں۔ قسم تو کھا نہیں سکتی کہ جو کچھ کہتی ہوں سچ کہتی ہوں۔اگر آپ سے بھی ڈرنے لگی تو پھر یہ بھی کوئ زندگی ہے۔۔اگر وہ کراچی میں رہائش پذیر ہیں تو مجھ سے رابطہ کریں۔ میں انہیں اس تجاہل عارفانہ سے نکالنا چاہوں گی اور کراچی میں واقع ایسے لا تعداد گھروں میں لیجا ءونگی جہاں گھروں میں آسٹیوپوریسس کی ماری خواتین یا ضعیف جوڑے اکیلے رہتے ہیں۔ اور سارا دن اپنے کمپیوٹر پہ بیٹھے اپنے ہزاروں میل پر موجودبچوں اور پوتا پوتیوں سے چیٹنگ کرتے رہتے ہیں۔ مگر وہ تبصرہ نگار ، خود بھی چونکہ دن رات کمپیوٹر پہ مصروف رہتے ہیں اس لئیے انہیں معلوم نہیں کہ ان کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔کمپیوٹر اتنی ہی بری چیز ہے۔ اور یہ انٹر نیٹ ایج کا المیہ ہے۔ اس کا بھی کوئ حل نکالنا ہوگا۔

کیا ایسا ممکن نہیں کہ ہم اپنی لا علمی کو کھلے دل سے تسلیم کریں۔ ہر انسان ہر چیز تو نہیں جان سکتا۔ ہہر شخص بہترین مشاہداتی قوت نہیں رکھتا اور جو رکھتے ہیں وہ صحیح نتیجہ نہیں نکال پاتے۔ مگر محض یہ سوچنا کہ نہیں جناب، اگر ہم نے آپ کی بات تسلیم کر لی تو ہم آپ کے مقابلے میں کم علامہ ثابت ہو جائیں گے۔ ہم اپنے نظرئیے سے الگ ہوجائِں گے ہمارے وہ ساتھی جن کے ساتھ ہم نے نظریاتی طور پہ ساتھ جینے اور مرنے کی قسمیں کھائیں ہیں ہم ان سے بیوفائ کریں گے۔ یقین جانیں ایسا کچھ نہیں ہوگا کم از کم میرے ساتھ اب تک ایسا نہیں ہوا۔بلکہ آپ حقائق سے زیادہ قریب ہونگے۔اور بہت سارے ایسے لوگوں سے قریب ہونگے جن سے آپ کا نظریاتی اختلاف ہوگا اور پھر اختلاف کی نئ راہیں نکلیں گی۔ زندگی میں کچھ تو نیا ہونا چاہئیے۔

اب میں ایک ایسی پوسٹ لکھنے والی ہوں جس میں ، میں یہ بتاءونگی کہ مجھے کتنی سادہ سادہ باتیں پہلے نہیں معلوم تھی جومیرے ساتھیوں کی وجہ سے میرے علم میں آئیں۔ ان سب کا پیشگی شکریہ۔

1:53 PM

ارد شیر کاءوس جی, انٹرنیٹ, پٹھان, دریائے سندھ, ڈیلٹا, سانگھڑ, سندھ, کراچی, کراچی یونیورسٹی, کمپیوٹر, مشرف

لاگ اور لگاءو

تھائ لینڈ میں میری دلچسپی تھائ کھانوں کی وجہ سےیا ان کے شاہی نظام حکومت کی وجہ سے رہی تھی۔ بادشاہوں سے ہمارا لگاءو شاید اس وجہ سے بھی ہوتا ہے کہ ہم برصغیر پاک و ہند کے رہنے والے جنہیں اب لوگ جنوبی ایشیائ کہنے لگے ہیں۔ بچپن میں جب کہانیاں سنتے ہیں تو وہ اکثر اس طرح شروع ہوتی ہیں کہ ایک تھا بادشاہ۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ جیسے جیسے شعور کی منازل طے کیں تو اس بات کو ہضم کرنے میں بڑا ٹائم لگا کہ کہانی بادشاہ کے بغیر بھی شروع ہو سکتی ہے۔

ہاں تو جب میں نے تھائ ائر لائن کی پرواز نمبر فلاں فلاں پہ قدم رکھا تو سب سے پہلے ان کی ائر ہوسٹس اور انکی یونیفارم پہ فدا ہوئ۔ پھر ان کی سروس پہ۔ تھائ لینڈ کے شہر پھوکٹ پہنچنے کے بعد اندازہ ہوا کہ تھائ کسقدر صفائ پسند اور معمولی چیزوں میں سے بھی تزئین کی جدت نکالنے والے لوگ ہیں ۔ یہاں کی روزانہ بارش خوبصورت آرکڈ کے پھولوں کے لئیے بہت سازگار ہے جن کے گملے ہر جگہ ٹنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔اتنی بارش کے باوجودشہر اانتہائ صاف ۔دھلی دھلائ سڑکیں، ہر طرف سبزہ اور ہاتھیوں کے ہر طرح کے مجسموں کے ساتھ زندہ ہاتھی چہل قدمی کرتے نظر آجاتے ہیں۔ سمندر سے گھرا، سیاحوں کو خوش آمدید کہتا یہ شہر مجھے بےحد پسند آیا۔

لیکن جس چیز سے تکلیف ہوئ۔ وہ ان کی اپنی زبان تھائ سے محبت ہے۔ کسی سپر اسٹور میں چلے جائیں یا مقامی جمعہ بازاروں میں ہر چیز پر تھائ لکھی ہوتی ہے۔ اپنی ضرورت کی چیز چھٹی حس کو استعمال کر کے، چیز کی شکل صورت دیکھ کر، یا کہیں کہیں انگریزی میں لکھے چند الفاظ کی مدد سے ہی خریدی جا سکتی ہے۔ اور پھر بھی شک رہتا ہے کہ یہ وہی ہے جو ہمیں چاہئیے تھا۔تھائیوں کو فخر ہے کہ وہ کبھی کسی کے غلام نہیں رہے۔ اس لئے وہ بغیر انگریزی استعمال کئے ہم سے زیادہ تیزی سے ترقی کر رہے ہیں۔

اس سفر کے دوران ایک دفعہ ہم ایک ریسٹورنٹ میں کھانے کے لئے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے مینو پہ کافی تفصیلی غور وخوض کے بعد پائن ایپل رائس آڈر کئے۔ تھائ لینڈ میں ، میں تھائ کھانوں سے اتنا لظف اندوز نہ ہو سکی کیونکہ اب آپ کو حلال اور حرام بھی دیکھنا پڑ جاتا ہے حلال کھانے آسانی کے ساتھ بوٹنگ کے دوران مل سکتے ہیں کیونکہ سمندر سے منسلکہ کاروبار پہ مسلمان چھائے ہوئے ہیں۔

خیر، سب لوگوں کا کھانا آگیا۔ مگرمیرے چاول غیر حاضر۔جب سب اپنا ایک تہائ کھانا کھا چکے تو ویٹر میرے پاس آیا ۔ اسکی ٹوٹی پھوٹی تھائ آمیز انگریزی سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کہ رہا کہ فرائیڈ رائس نہیں ہیں۔ میں نے اس سے کہا کہ میں نے پائن ایپل رائس منگوائے تھے فرائیڈ رائس نہیں۔ اس نے پھر کچھ کہنے کی کوشش کی اور اب کی بار مجھے صرف پائن ایپل کے کچھ سمجھ نہ آیا۔ اور میں نےاندازے سے اسے او کے کہہ دیا۔ اب پھر انتظار کی گھڑیاں شروع ہوئیں۔ سب لوگ اپنے کھانے کے اختتام پہ پہنچنے والے تھے اور میں سوچ ہی رہی تھی کہ اپنا آڈر کینسل کروادوں کہ وہ ویٹر ایک بڑی سی ٹرے میں ایک پائن ایپل لے آیا اور لا کر بڑے سلیقے سے میرے سامنے رکھدی۔ میں بالکل حیران ہوگئ تو گویا اتنے انتطار کی کلفت اٹھانے کے بعد مجھے یہ انناس کھانے کو ملے گا۔ اور یہ موصوف شاید مجھ سے فرما رہے تھے کہ چاول تو ہیں نہیں پائن ایپل البتہ موجود ہے۔ میں نے جھنجھلا کر کہا یہ کیا ہے، مجھے کھانا چاہئے۔ اب پھر ایک عجیب سی زبان، جس سے میں نے یہ معنی اخذ کئے کہ آپ نے یہی تو منگوایا تھا۔ میرے ساتھی نے کہا۔ اب آپ اسے اپنےہوٹل لے چلیں اور رستے میں کچھ اور کھا لیجئیے گا۔ 'کیا مطلب میں اس ریسٹورنٹ میں یہ انناس خریدنے آئ تھی اتنا مہنگا انناس۔ میں اسے کہیں نہیں لے جا رہی '۔ پھر میں نے اس ویٹر سے کہاں براہ مہربانی اےسے لے جائیں مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ اب وہ کچھ گومگوں حالت میں کھڑا تھا۔ یہ سارا منظر ہمارا تھائ ڈرائیور ذرا فاصلے سے دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے پاس آیا کہ کیا ہوا ہے۔ قصہ مختصر اس کی انگریزی بھی اتنی اچھی نہ تھی لیکن اس ویٹر سے بہتر تھی۔

ان دونوں نے اس موضوع پر تھائ میں تبادلہء خیال کیا کہ ان خاتون کو یعنی مجھے کیا مسئلہ ہے۔ اس تفصیلی گفت و شنید کے بعد ویٹر آگے بڑھا اور اس نے اس انناس کو ہاتھ لگایا۔ انناس کا اوپری حصہ ہٹا اندر اس کے خا لی حصے میں پائن ایپل فرائیڈ رائس بھرے ہوئے تھے۔ اور ان پہ چھ جمبو جھینگے رکھے ہوئے تھے۔میرا منہ کھلا اور پھر بند ہوگیا۔ ویٹر اپنے حصے کی معذرت وصول کرنے کے بعد مسکراتا سینے پہ ہاتھ رکھے رخصت ہو گیا۔ چاول بے حد مزیدار تھے۔ لیکن میں اس دن، سارا دن ان کی مہارت کی داد دیتی رہی اور شرمندہ ہوتی رہی۔ کتنی مہارت سے انناس جیسے مشکل پھل کو کاٹا تھا کہ ذرا نہ پتہ چل رہا تھا کہ یہ کٹا ہوا انناس ہے۔ غالب نےصحیح کہا ہے،

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاءو

جب کچھ بھی نہ ہو تو دھوکا کھائیں کیا

ریفرنس؛

پھوکٹ، تھائ لینڈ

7:56 PM

Phuket, thailand, آرکڈ کے پھول, انناس، غالب, پائن ایپ, پائن ایپل فرائیڈ رائس, پھوکٹ, تھائ زبان, تھائ لینڈ, ہاتھی

جو ڈر گیا

ٹرین کے ایک ڈبے میں صرف دو افراد تھے۔ رات اندھیری اور ایک سرنگ بھی قریب آ رہی تھی۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا کیا تم بھوتوں پہ یقین رکھتے ہو۔ اگلے نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور قطعیت سے کہا۔'نہیں'۔ اگلے ہی لمحہ پہلا شخص دھواں بن کر تحلیل ہو گیا۔

لو جی، اب کیا اتنی پرانی کہانیاں نکال کر سنانے لگیں۔ او جی کچھ نیا لاءو۔ ہن یہ چالبازیاں نئیں چلیں گی۔ ٹہرئیے، یہ تو میں چیک کر رہی تھی آپ کو ڈر لگتا ہے یا نہیں۔ میں نے تو آپ کو ڈرانے کی کوشش کی تھی۔ کیا کہاطالبان کے علاوہ کسی سے ڈر نہیں لگتا۔

اچھا چھوڑیں، آپ لوگوں نے کالے جادو کے متعلق تو سنا ہوگا۔ بچپن میں میرا خیال تھا کہ کالا جادو کالے لوگ کرتے ہونگے۔ جہاں بڑے ہو کر اور بہت سی باتیں غلط ثابت ہوئیں۔ وہاں اس بات کی حقیقت میں بھی کوئ سچائ نہ تھی۔ اس جادو کے لئے دل کا کالا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ خیر اب ہمیں کیا پتہ چلے کے کسی کے دل کا کیا رنگ ہے۔ لیکن ہماری پڑوسن کہتیں تھیں ایک کالا جادو بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ مٹی کی چھوٹی سی ہنڈیا میں کچھ تعویذ رکھ کر اور پڑھ کر پھونک دیتے ہیں اور اسے روانہ کردیتے ہیں۔ 'کس سے بس یا ٹرین سے'۔ 'یہ لڑکی بڑی دخل اندازی کرتی ہے۔ چپکے بیٹھی رہو'۔ وہ ایکدم گھرک دیتیں۔'ہاں تو ہوا میں اڑتی ہوئ جاتی ہے اور ٹھیک اسی جگہ پہنچتی ہے جہاں بھیجا جائے۔ اور جب وہاں پہنچ جائے تو جس کے نام پہ بھیجتے ہیں اس کی جان جا کر رہتی ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے عمل الٹا ہوجائے اور ہنڈیا واپس آجائے تو عمل کرنے والے کی زندگی نہیں رہتی تھی'۔ اب میں چشم تصور سے دیکھتی کہ فضا میں ایک ہنڈیا چلی جا رہی ہے۔ لیکن ہم نے حقیقت میں کبھی نہیں دیکھی۔ پڑوسن کہتی تھیں انہوں نے تو جاتی ہوئ دیکھی۔

اب کیا سچ ہے اور کیا افسانہ۔ آپ کہیں گے یہ کیا کسی عامل کا تعارف کرانے والی ہیں جو ادھر ادھر کی باتیں کئے جارہی ہیں۔بات یہ ہے کہ میں تو خیال کے اس دھاگے کو وزیرستان لے جا رہی ہوں۔ چلیں گے اب آپ کا چہرہ کھل اٹھا۔ اڈرینالن ہائپ؟ اب ہونگیں کچھ جنگ وجدل کی باتیں۔ جی نہیں جناب یہاں تو جنگ کی گھاتیں ہیں۔ چلیں جناب اسی میں تو کراماتیں ہیں۔

تو یہ کرامت امریکن ٹیکنالوجی کے طفیل آئ ہے۔ امریکیوں نے، خدا کی مار ہو ان پہ، ایک ایسا مائکرو چپ بنایا ہے جس کا سائز معمولی سی کنکری کے برابر ہوتا ہے۔ یہ کنکری ڈرون طیارے کے لئے نشانے کا کام انجام دیتی ہے۔ اور ڈرون میزائل کسی طالبان کے اڈے پہ نہیں دراصل اس کنکری پہ حملہ کرتا ہے۔ امریکن اس کنکری کو جسے مقامی زبان یعنی پشتو میں 'پتھرئ' کہتے ہیں۔ اپنے کسی ایجنٹ کے ذریعے اپنے نشانے تک پہنچا دیتے ہیں۔بلوچستان کے کسی ائر بیس پہ موجود یہ بغیر پائلٹ کے جہاز دراصل اس لیور سے چلتے ہیں جو امریکہ میں لاس ویگاس کے جنوب سے پینتیس میل کے فاصلے پہ موجود ایک آپریٹر گھماتا ہے۔ اور ڈرون میزائل چل پڑتا ہے جہاں اسکے لئے سگنل موجود ہوتا ہے یعنی اس پتھرئ کی طرف۔ پتھرئ کی وجہ سے ڈرون حملے اب پہلے سے بہتر ہو گئے ہیں۔آمریکیوں کے لئے ڈرون حملے خاصے مددگار ثابت ہوئے ہیں۔ اور اب ان کا نشانہ بھی خاصہ بہتر ہو گیا ہے۔ اس سال جنوری کے آغاز میں ایک کینیا کا رہنے والا عسکریت پسند مارا گیا جس کے پچھلے سال میریٹ ہوٹل کے دھماکوں میں ملوث ہونے کے شواہد ملے تھے۔

پچھلے اٹھارہ مہینوں میں امریکہ پچاس سے زائد حملے کر چکا ہے جن میں امریکی دعوی کے مطابق القاعدہ کی اعلی قیادت کے بیس میں سے نو افراد مارے گئے ہیں۔ اس کےعلاوہ اخباری اطلاعات کے مطابق ۲۰۰۶ سے اب تک تقریباً سات سو لوگ مارے گئے ہیں جن میں سے زیادہ تر بےگناہ ہیں۔

'شہر میں آجکل اسی کا چرچا ہے۔ ہر ایک خوفزدہ ہے کہیں اس کے گھر کے پاس پتھرئ نہ ہو کیونکہ پھر چند گھنٹوں یا دنوں میں ڈرون حملہ یقینی ہے۔'

مقامی لوگوں اور طالبان کے مطابق امریکن سی آئ اے قبائلیوں کو اس پتھرئ کو القاعدہ یا طالبان کے ٹھکانوں تک پہنچانے کے پیسے دے رہی ہے۔پچھلے دنوں طالبان نے ایک ویڈیو جاری کی جس میں انیس سالہ حبیب الرحن نے کانپتی ہوئ آواز میں اقرار کیا کہ وہ سگریٹ کی پنی میں پتھرئ لپیٹ کر لے جا رہا تھا۔' انہوں نے وعدہ کیا تھا کے ڈرون کے کامیاب حملے کی صورت میں وہ مجھے ہزاروں پاءونڈز دیں گے اور پکڑے جانی کی صورت میں تحفط بھی۔' لیکن طالبان اپنے وعدے کے زیادہ پکے نکلے اور حبیب الرحمن کو ویڈیو کے آخیر میں سر اڑا کرجنت الفردوس پہنچا دیا۔

جنوبی وزیرستان کے مرکزی علاقے وانا میں باہر سے آئے ہوئے عسکریت پسند بازاروں اور دوکانوں میں جانے سے احتراز کرتے ہیں جبکہ مقامی افراد جو پہلے ان کے ساتھ گھلے ملے رہتے تھے اب ان سے دور رہنے لگے ہیں۔ مرنا تو ہر ایک کو ہے لیکن چیتھڑوں کی صورت مرنے میں دفن ہوتے وقت کافر اور غیر کافر کی تمیز نہیں رہتی۔ شاید اس لئے طالبان کو ڈرون حملے پسند نہیں ہیں۔ رہے عام افراد تو وہ انسانوں کی گنتی میں کہاں ہیں۔

عسکریت پسند اب اس سلسلے میں خاصے محتاط ہیں ان کا خیال ہے کہ پتھرئی افغانستان سے لائ جاتی ہے اور اس لئے بلاوجہ افغانستان جانے والے سے پوچھ گچھ ہوتی ہے۔

کہاں گئے ہمارے عامل جو ہنڈیا میں بند کرکے موت بھیجا کرتے تھے۔ طالبان ان سے کیوں نہیں فائدہ اٹھاتے۔اس کے لئے تو انہیں کوئ ایجنٹ بھی نہیں چاہئیے ہوگا۔ اور مٹی کی ہنڈیا تو پتھرئ کے مقابلے میں خاصی سستی پڑے گی۔ اس طریقے میں بےگناہ لوگوں کے مرنے کا احتمال بھی نہیں۔

ریفرنس؛

پتھرئ ایک مائکرو چپ

http://www.guardian.co.uk/world/2009/may/31/cia-drones-tribesmen-taliban-pakistan

5:22 PM

ڈرون حملہ، پتھرئ، طالبان، وانا، وزیرستان۔ پاکستان، کالا جادو۔ بھوت، کینیا، میریٹ ہوٹل، القاعدہ

میں گواہی دیتی ہوں

ہمارے ملک میں شادی ہو تو جہاں جہیز، شادی ہال، بیٹی پارلر، کھانا اور مہمان تفصیلات میں آتے ہیں وہاں دولہا اور دلہن کے بعد سب سے اہم شخصیات قاضی صاحب، اور گواہان ہوتے ہیں۔ اب آپ باقی انتظامات کسی ویڈنگ پلانر سے کروا بھی لیں تو بھی کچھ عجیب سے مسائل سر اٹھا لیتے ہیں۔ مثلاً فلاں رشتےدار کو بلایا جائے یا نہیں۔ کوئ وی آئ پی کیسے شریک ہوگا۔اب یہ خالصتاً آپ کا درد سر ہے۔ اس میں وہ بیچارے بھی کچھ نہیں کر سکتے۔

اس قحط االرجال میں جو ہمارے شہر میں اس وقت سے پیدا ہوا ہے جب گھرانوں کے گھرانے دوسری ہجرت پہ روانہ ہو چکے ہیں۔ اور اہل نظر بن چکے ہیں جیسا کہ کسی شاعر نے کہا تھا کہ کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد۔ تو جناب وہ تو ایک کے بعد ایک تازہ بستیاں آباد کر رہے ہیں۔ اور یہاں، پیچھے رہ جانے والوں کو ڈپریشن اور نوسٹیلجیا جیسی چیزیں دے گئے ہیں۔ یہ لوگ اس وقت بڑے یاد آتے ہیں جب خاندان میں کوئ شادی ہونے والی ہو۔ اور اس وقت خاص طور پہ جب شادی کے لئیے گواہ مقرر کئے جا رہے ہوں۔

ایسی ہی ایک تیاری میں میں بھی موجود تھی۔ دلہن کے خاندان کے زیادہ تر لوگ دیار غیر کو کوئے آشنا میں تبدیل کر چکے تھے۔ یہاں اس بد نام شہر میں بس اکا دکا لوگ رہ گئے تھے۔ مسئلہ یہ در پیش تھا کہ ایک وکیل صاحب اور ایک گواہ تو ہو گئے اب دوسرا گواہ لڑکی والوں کی طرف سے کون ہو۔ دوسرا مرد قریبی رشتے داروں میں نہیں مل رہا ۔ اب کیا کریں۔ کیونکہ کوئ قریبی رشتےدار ندارد۔ بھائ خدا نے دیا نہیں۔ والد صاحب واپس لے لئیے۔ اب خدا کے اس لین دین کے بعد، سب اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ میں نے اپنی خدمات پیش کردیں۔ محفل کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ میں نے کہا بھئ ایسی کیا بات ہے، اسلام میں عورت بھی گواہ بن سکتی ہے بس کرنا یہ ہو گا کہ ایک مرد کی جگہ دو عورتیں ہوجائیں گی تو عورتیں تو اس وقت خاصی ہیں۔ آپ ان میں سے کسی کو بھی لے لیں ۔ لیکن وہ سناٹا کم نہ ہوا۔ لڑکی کی والدہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ہائے کیا وقت آگیا کہ ہماری بیٹی کو دو مرد گواہوں کی کمی پڑ گئ۔ اب اس خاندان کے مردوں کے تذکروں کے اوراق کھل گئے۔ نتیجتاْ پڑوس کے ایک صاحب سے درخواست کی گئ کہ وہ گواہ بن جائیں۔ بظاہر تو معاملہ خوش اسلوبی سے طے پا گیا۔ لیکن پتہ نہیں کیوں میرے دل میں اک پھانس چبھی رہ گئ۔ دل بھی کیا چیز ہے----

میں نے اپنے جاننے والون میں ان لوگوں سے جو مذہب کا خاصا علم رکھتے ہیں ان سے معلوم کیا خود اپنے طور پہ تحقیق کی۔ کیا شادی عورتوں کی گواہی سے منعقد نہیں ہو سکتی؟ تو مذہبی کتا بیں کوئ ایسی جانبداری نہیں دکھاتیں۔ جو بات میں سمجھ رہی تھی وہ ٹھیک تھی۔ نہ صرف یہ کہ عورت گواہ بن سکتی ہے بلکہ وہ نکاح کو منعقد بھی کرا سکتی ہے۔ اگر قاضی صاحب نکاح پڑھانے کے لئے میسر نہ ہوں تو ان کے خطبہء نکاح کے بغیر بھی شادی ہوجاتی ہے۔ نکاح کی بنیادی ضرورت گواہ ہیں۔ اور چونکہ ہر معاہدے کو لکھ لینا چاہئے اس لئیے شادی کے معاہدے کو بھی لکھ لینا چاہئیے تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ مروجہ قانون کے مطابق اس کی رجسٹریشن اس لئے ضروری ہے کہ آپ اپنے قانونی حقوق و فرائض سے آگاہ ہوجائیں جو اس رشتے میں بندھنے کے بعد ریاست آپ پہ لاگو کرتی ہے۔

پھر یہ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیوں میری بات پہ ایسا بلک کر روئیں۔ عورتیں کیوں اپنے آپ کو اتنا کمتر اور گرا ہوا سمجھتی ہیں۔ اور وہ کب اس احسا س کمتری سے باہر آئیں گی۔ آپ کو معلوم ہے اس کے بعد میں نے لاتعداد لوگوں سے پتہ کیا اور کسی ایک کی شادی میں کوئ خاتون گواہ نہ تھی۔ وہ لوگ جو مسلمان عورت کی آدھی گواہی پہ ناک چڑھاتے رہتے ہیں انہیں علم ہو کہ مذہب کی دی ہوئ یہ آدھی گواہی کا حق جو کہ کچھ صورتوں میں پوری گواہی کے برابر بھی ہوتا ہے اسے بھی ہم اپنے سماجی ، ثقافتی اور معاشرتی دباءو کی وجہ سے نہیں استعمال کرتے۔ البتہ ہماری زبانیں سارا سارا دن اللہ کی تذکیر و تہلیل اور اپنے مذہب کی فضیلت گنواتے ہوئے گذارتی ہیں۔

میں نکاح کی اس تقریب میں مرد گواہوں کو دستخط کرتے ہوئے دیکھتی ہوں اوراپنے آپ سے عہد کرتی ہوں کہ میرے بچوں کی شادی میں خدا نے اگر مجھے اور انہیں زندگی دی تو ضرور دو عورتیں گواہ ہونگیں ۔ ہم اگر تبدیلی کے لئے کسی کو مجبور نہیں کرسکتے تو ہم خود تبدیلی کا نشان بن سکتے ہیں یہ زیادہ واضح اور مضبوط نشان ہوگا۔

تو میری بیٹی تمہارے بڑے ہونے تک مجھے اس لئے بھی زندہ رہنا ہوگا۔ تم نے میری زندگی کو کتنے معنی دئیے ہیں۔ خدا تمہیں لمبی اور مطمئن حیات دے اور میں تمہارے نام سے جانی جاءوں۔

اسلامی شادی کے اصول

پاکستان شادی سے متعلق قوانین

4:15 PM

، پاکستان شادی کے قوانین ،اسلامی شادی، گواہ، ویڈنگ پلانر، دوسری ہجرت

مدد محمد بن قاسم مدد

پہلی گولی میں تینوں ایس لیے ماراں گا کہ توں میری بھین دا دوپٹہ کھنچیاں سیں---- آگے کی

گولیوں کی وجوہات مجھے یاد نہیں. ہو سکتا ہے کہ اس جملے میں پنجابی گرامر کی غلطیاں بھی ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے پنجابی دوستوں نے مجھ پہ کبھی پنجابی سیکھنے کے لئے دباءو نہیں ڈالا۔ میں ان کی گنگناتی ہوئ اردو میں چاہے جتنی خامیاں نکالوں، وہ میری اردو نما پنجابی سے خوش رہتے تھے۔ خدا انہیں اور خوش رکھے۔

لیکن ایک بات طے ہے اور وہ یہ کہ ہیرو کی غیرت جگانی ہو یا پاکستانیوں میں جذبہ پیدا کرنا ہو جب تک عورتون کی عزت اور ان کے دوپٹوں کا تذکرہ نہ ہو ایسا کرنا ممکن نہیں۔ یہ اوپر تھا کسی پنجابی فلم کا ڈائیلاگ جو میں نے لکھنے کی کوشش کی۔ لیکن اب جناب یہ ایک مضمون ہے جو زید حامد صاحب کے کسی ٹی وی پروگرام کو نثری شکل دینے پہ وجود میں آیا ہے۔

ان کی ویب سے حاصل کی گئ اطلاعات کے مطابق وہ بنیادی طور پہ ایک دفاعی مبصر اور تجزیہ کار ہیں۔ میرا ان سے تعارف بس اتفاقیہ طور پہ ہوا۔ اس کے لئے آزاد میڈیا کا شکریہ جو مشرف کی مہربانی سے ہمیں ملا۔ اب کچھ لوگ مجھے دیسی گالیوں سے نوازیں گے۔ گالیوں پہ مجھے کچھ شعر آتے ہیں جیسے غالب کا یہ شعر

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب

گالیاں کھا کہ بے مزہ نہ ہوا

میں باقاعدہ ٹی وی دیکھنے والوں میں سے نہیں۔ لیکن گھر میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اگر ٹی وی نہ دیکھیں تو دل جلانے کے لئیے کوئ واضح بہانہ نہیں رہتا۔ ایسے لوگوں کی وجہ سے میں خاصی باخبر رہتی ہوں۔

تو ہوا یوں کہ ایک دن ایسے ہی ٹی وی لاءونج سے گذرتے ہوئے ایک صاحب کی تیز جذباتی انداز میں بولنے کی آواز آئ۔ میں نے یونہی اسکرین پہ نظر ڈالی یہ کون ہیں جو جماعتیوں کے انداز میں بول رہا ہے۔ خیر ان سے معزرت کے ساتھ کہ میں نے ان کا ناطہ اپنی کم علمی کی بناء پہ جماعت اسلامی سے جوڑا۔ اس وقت ان کا موضوع دنیا کو درپیش حالیہ معاشی صورتحال تھی۔ تو بس پھر میں انہیں سننے بیٹھ گئ۔ کافی سیر حاسل بات چیت تھی۔مزہ آیا۔

کچھ دنوں بعد کسی نے مجھے ان کا مضمون 'پاکستان ایک عشق ایک یقین' کا لنک بھیجا۔ اپنی دیگر مصروفیات کی بناء پر میں اسے اس وقت نہ پڑھ سکی۔ اب جو کچھ فارغ لمحات میسر آئے تو میں نے اس مضمون کو پڑھا۔ اور جیسے ایکدم پنجابی فلموں کی یاد تازہ ہو گئ۔

اس مضمون کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ انہوں نے مہاجرین کی قربانیوں کو سراہا ہے اور اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ یہ ان مہاجرین کی بے غرضی اور بے انتہا قربانیوں کا نتیجہ ہے جو آج ہم اس مملکت خداد میں ایکدوسرے کو آرام سے بیٹھ کر طعنے تشنیع دیتے ہیں اور وہ ہتھیار جو متحدہ ہندوستان میں ہندءووں کے خلاف استعمال کرتے انہیں ایکدوسرے کے خلاف آزادانہ طور پہ استعمال کرنے میں نہیں جھجھکتے۔ وہ الفاط جس سے ہمارے دشمن کے دلوں میں سوراخ ہوجائیں ان سے اپنے ہم وطنوں کے سینوں کو ڈرل کرتے رہتے ہیں۔تو ان مہاجرین کے ایثار کو پہچاننے کا شکریہ۔ شکریہ زید حامد صاحب۔

دوسری طرف مجھے اس بات پہ ہنسی آئ کہ اس مضمون کا ایک تہائ سے زائد حصہ پاکستانیوں کی غیرت کو للکار رہا ہے کہ بے غیرتوں ان ہندءووں نے تمہاری عورتوں کے ساتھ یہ کیا، ان کے سروں سے دوپٹے چھینے ان کی عزتیں پائمال کیں، انہیں اپنے گھر کی باندیاں بنا کر رکھا مگر پھر بھی تم ان کے خلاف اٹھ کھڑے نہیں ہوتے۔ اب تو اٹھو۔ اور کہو پہلا بم میں تینوں اس لئے ماراں گا کہ توں میری بھین دا دوپٹہ کھنچیاں سیں------------------- دھائیں۔

متحدہ ہندوستان کے اندر جس میں موجودہ پاکستان بھی شامل ہے ۔ عزتیں لٹنے اور دوپٹوں کے کھینچنے کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوا جس کے نتیجے میں لوگوں کا ایک سیلاب اٹھ کھڑا ہوا۔۔ اور پاکستان وجود میں آیا۔ لیکن اس میں اتنی سنسنی نہیں کہ وہ غیرت کو جگا سکے۔

پھر اسکے بعد انہوں نے موجودہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت زار کا نقشہ کھینچا ہے اور اس میں انہوں نے ایکدفعہ پھر زور دیا مسلمان عورتوں کی عزتوں کا۔ کسطرح وہاں مسلمان اپنی بیٹیوں کی شادیاں ہندءووں سے کرنے پہ مجبور ہیں اور ایکدفعہ پھر وہ جیسے کہتے ہیں کہ اے بے غیرت پاکستانیوں ااب بھی تمہیں شرم نہ آئ تو کب آئیگی۔ تمہاری مسلمان بہنیں ہندءووں سے شادیاں کر رہی ہیں۔ یہاں میں ان سے تعظیماً ایک بات کہنا چاہتی ہوں کہ ایسا تو وہاں موجود مسلمان لڑکے یعنی مسلمان مرد بھی کر رہے ہیں یعنی ہندو عورتوں سے شادی کر رہے ہیں۔ آخر انہوں نے ان مسلمان مردوں کی غیرت کو کیوں نہیں للکارا۔

خیر جنگ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور عورتیں اور بچےجسمانی طور پہ اور سماجی طور پہ کمزور ہونے کی وجہ جنگ کو زیادہ جھیلتے ہیں۔ اور انکے وجود کو بس اسی طرح کے مقاصد کے لئیے استعمال کیا جاتا ہے۔

اچھا اب اسی بات پہ آگے سوچتی ہوں ۔ قیام پاکستان کے بعدکئ ایسے واقعات حدود پاکستان کے اندر ہوئے جن میں عورتوں کو برہنہ کر کے سر بازار پھرایا گیا، اسی پاکستان میں سالانہ نجانے کتنی عورتوں کے ساتھ گینگ ریپ ہوتا ہے۔ کتنی عورتیں ویسےہی مردوں کی زیادتی کا شکار ہوتی ہیں۔ عورتوں کی ایک بڑی تعداد جاگیرداروں، وڈیروں سرداروں اور دوسرے مردوں کے تصرف میں بغیر کسی مذہبی، سماجی یا قانونی حیثیت کے ساتھ رہنے پہ مجبور ہے۔ ان عورتوں کو زبان کے مزے کے لئیے یا یا نفس کی تسکین کے لئیے کوئ بھی نام دیدیں ۔ ذاتی دشمنیوں کا بدلہ لینے کے لئیے خدا جانے کتنی عورتیں کاروکاری اور اسی قماش کے مظالم کا شکار ہوتی ہیں۔ زندہ عورتوں کو سبق سکھانے کے لئے ان پہ شکاری کتے چھوڑ دئیے جاتے ہیں ان کے چہروں پہ تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ اور اسی پہ بس نہیں اسلام کا نام لیکر اسی عورت کو سر عام چار مرد اپنی ٹانگّوں میں دبا کر کوڑے بھی لگاتے ہیں۔ یہاں میں ان بنگالی خواتین کا تذکرہ نہیں کرنا چاہتی جو بنگلہ دیش بننے سے پہلے اپنے ہم مذہب لوگوں کی ظلم زیادتی کا شکار ہوئیں اور جن کا تذکرہ حمود الرحان رپورٹ میں بھی ہے۔ زید حامد صاحب کو شاید یہ معلوم نہیں کہ یہ سارے مظالم پاکستانی عورتوں پہ کسی غیر مسلم مرد نے نہیں مسلم مرد نے کئے اور کرتا ہے۔

اب میں ان سے یہ پوچھنا چاہونگی کہ اگر ایک غیر مسلم مرد مسلمان عورت کے ساتھ یہ کرتا ہے تو اس کے خلاف جہاد کرنا چاہئیے اور اس کی نسلوں کو سبق سکھا دینا چاہئے کہ تو نے ہماری عورتوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو تیری آنکھیں نکال کر ان میں بم رکھ دیں گے۔ لیکن اگر ایک مسلمان مرد یہ کرتا ہے تو کیا کرنا چاہئیے۔

میں ایک عورت ہونے کے ناطے یہ سوچ سکتی ہوں کہ اگر عورت کے ساتھ یہ زیادتی کوئ غیر مسلم مرد کرے یا مسلم مرد۔ وہ ان دونوں سے ایک جیسی نفرت کرے گی۔ نفسیات کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلم مرد سے زیادہ کرے گی۔

اگر آپ مسلم عورت کی پکار پہ محمد بن قاسم بننے کے لئیے تیار ہیں جس کا حوالہ اس مضمون میں موجود ہے تو آپ سب سے پہلے کس کے خلاف جہاد کریں گے۔ غیر مسلم مرد سے یا مسلم مرد سے۔ میں آپ کا جواب جاننا چاہتی ہوں۔ جناب محمد بن قاسم ----- ؛

حمودالرحمن رپورٹ

محمد بن قاسم

محمد بن قاسم حالات زندگی

زید حامد کامضمون دیکھنے کے لئے یہاں کلک کریں

8:22 PM

زید حامد، حمودالرحمن رپورٹ،محمد بن قاسم ، اندیا، پاکستان میں گینگ ریپ

صلائے عام

آپ یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کی فیس آپ کے لئے ایک مسئلہ ہے تو میں آپ کو مایوس نہیں دیکھنا چاہتی۔ ہیں لوگ وہی اچھے آتے ہیں جو کام دوسروں کے۔ اقوام متحدہ کے ایک ادارے نے آپ کی مشکل آسان کرنے کے لئے ایک آن لائن یونیورسٹی قائم کی ہے ان کا دعوی ہے کہ آپ کو معمولی رجسٹریشن فیس جو کہ صرف پندرہ ڈالر ہے اس کے علاوہ کچھ ادا نہیں کرنا پڑے گا۔ ہاتھ کنگن کو آر سی کیا فوراً اس لنک پہ جائیے۔ کام کی ہے تو دیگر لوگوں کو بھی بتائیے اور خود کام کے انسان بن جائیں۔کسی کام کی نہیں تو اقوام متحدہ والوں کو برا بھلا کہئیے۔ اور مجھے بھول جائیے گا۔

http://www.uopeople.org/

Default.aspx

12:08 AM

اقوام متحدہ،مفت آن لائن یونیورسٹی

بنوں میں خدا کے عاشق

میری ایک عزیزہ کے یہاں بیٹی کی پیدائش ہوئ تو میں نے سوچا کہ ان کو مبارکباد بھی دیدوں اور لگے ہاتھوں باقی گھر والوں سے ملاقات بھی کرلوں۔ چلیں اب میری ان کی بات چیت کا سیشن شروع ہوتا ہے۔

میں؛ مبارک ہو بھئ آپ والدہ محترمہ بن گئیں۔

عزیزہ؛ الحمدللہ، جزاک اللہ۔

میں؛ کیسی ہے آپ کی بچی؟

عزیزہ؛ ماشاءاللہ، خیریت سے ہے۔ میری بچی تو سبحان اللہ برکتوں والی رات یعنی شب معراج کو پیدا ہوئ ہے۔

میں؛ اور آپ کی خیریت کیسی ہے؟

عزیزہ؛ الحمدللہ، میں ٹھیک ہوں۔

میں؛ اور ان کے والد صاحب اور اہل خانہ کیسے ہین؟

عزیزہ؛ الحمد للہ وہ سب خیریت سے ہیں

اتنے میں میری ڈیڑھ سالہ بیٹی پاءوں مڑنے کی وجہ سے چلتے ہوئے ذرا لڑکھڑائ۔ عزیزہ کی والدہ کی آواز آئ۔ بسم اللہ ابھی گرتے گرتے بچی ہے۔ میں نے کہا 'آنٹی اتنے گرنے کی فکر نہ کریں۔ بچوں کا تو سارا دن کام ہی یہی ہے۔ زیادہ توجہ دیں تو ذرا ذرا سی چوٹ پہ ہنگامہ کھڑا کرنے لگتے ہیں۔' انہیں میری بات کچھ زیادہ پسند نہیں آئ۔ پھر گویا ہوئیں۔ 'ائے تم نے اسے کلمہ سکھایا۔' میں ہنسی۔'پہلے صحیح سے بولنا تو سیکھے۔ کلمہ، نماز روزہ سب سیکھے گی۔ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئ ہے ۔ مسلمان ملک میں رہتی ہے۔' ان پڑھے لکھے لوگوں کی تو دینداری بھی ایسی ہی ہوتی ہے انہوں نے سوچا ہو گا اور پان کترتے ہوئے گویا ہوئیں ۔' بچہ جب بولنا شروع کرے تو سب سے پہلے اسے کلمہ سکھانا چاہئیے ۔ ہماری ایک نواسی ابھی سوا سال کی ہے پوچھو دعا کیسے مانگتے ہیں تو ہاتھ اٹھا کہ دکھاتی ہے '۔ میں نے انہیں زیادہ پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا اور وہاں سے اٹھ کر ان کی بہو کے کمرے میں آگئ۔ وہ اپنے چار مہینے کے بچے کے ساتھ مصروف تھیں۔ جو بری طرح رو رہا تھا۔ کہنے لگیں 'بس ایسے ہی روئے جا رہا ہے صبح سے۔' 'ہوں، پہلے بچے میں تو مسئلہ ہوتا ہے۔ سمجھنے میں ٹائم لگتا ہے۔ میں اس لئے مختلف لوگوں سے معلومات لیتی رہتی ہوں اور انٹر نیٹ سے بھی انفارمیشن لیتی رہتی ہوں۔ تاکہ مسائل کا کم سے کم سامنا کرنا پڑء۔ اب آپ نے اسے اتنے موٹے پولیسٹر کے کپڑے اتنی گرمی میں پہنا رکھیں۔ روئے گا نہیں تو کیا کرے گا۔ بولنا تو آتا نہیں کہ کہے اماں مجھے گرمی لگ رہی ہے'۔ اس بات پہ وہ جھلا گئیں ۔ 'میں نے کہاں پہنائے ہیں۔ یہ ہماری ساس ہیں۔ میری امی نے جو ہلکے کپڑے بنا کر دئے تھے وہ پہناءوں تو فوراً اتار کہ پھینک دیتی ہیں۔ کہ انہوں نے بنائے ہیں۔ شوہر صاحب بازار جا نہیں سکتے مصروف ہیں۔ مجھے وہ بازار نہیں جانے دیتی کہ مسلمان عورت کو اکیلے بازار نہیں جانا چاہئے۔ ۔ اب میں کیا کروں۔ کل ڈاکٹر کے یہاں گئ تھی تو وہ بھی یہی کہ رہا تھا'۔ 'خیریت ڈاکٹر کے پاس کیوں جانا ہوا'۔'مجھے اکثر پیچش رہتی ہے اس لئے۔ 'پانی ابال کر پئا کریں۔ پانی کی وجہ سے مسئلہ ہوتا ہے'۔ ' نہیں پانی تو ابلا ہوا ہوتا ہے دراصل امی کے گھر میں تو بہت کم مرچیں کھائیں جاتی ہیں اور یہاں بہت زیادہ ۔ مجھے زیادہ مرچوں والے کھانوں کی عادت نہیں۔ ان مرچوں کی وجہ سے میرے پیٹ میں جلن رہتی ہے'۔'تو اپنے لئے تھوڑا الگ کھانا کم مرچوں والا بنا لیا کریں'۔ میں نے اپنے طور پہ ایک آسان سا مشورہ دیا۔'جی، ایک دفعہ میں نے سوچا کہ اپنے لئے الگ سے کچھ بنا لوں تو یہاں سب خواتین نے شور مچا دیا کہ الگ ہونے کی تیاری کر رہی ہیں۔ تو بس ہر تھوڑے دن پہ جا کر دوا لینی پڑتی ہے'۔ اب میری ساس کہتی ہیں کہ تم تو ہر وقت بیمار رہتی ہو۔ میرے کان میں ان کی ساس کی آوز آئ اللہ اکبر، یہ کس قدر رو رہا ہے لاءو مجھے دیدو اس کی نظر اتاردوں۔ میں وہاں سے اٹھی۔ انہیں خدا حافط کہا۔ ان کی بیٹی نے ایک دفعہ پھر کہا جزاک اللہ آپ تشریف لائیں۔ بزرگ خاتون نے مجھے نصیحت کی کہ اللہ حافط کہنا چاہئیے۔ مجھے اس سے کوئ فرق نہیں پڑتا۔ شاید خدا کو بھی اس سے فرق نہیں پڑتا۔ لیکن خدا کو اس سے ضرور فرق پڑتا ہے کہ ہم اسکے بندوں، اور اس کی مخلوق کو کتنی آسانی دیتے ہیں۔ میں نے انہیں دوبارہ اللہ حافظ کہا۔میرے نکلنے کے بعد انہوں نے کہا ہو گا۔ ہوں یہ عورتیں کیا اپنے بچوں کو مذہب سکھائیں گی۔ بیشتر لوگ نہیں جانتے کہ علامتوں کو دہرانا اور انہیں نہ سمجھنا کسی کی زندگی میں کوئ فرق نہیں لاتا۔ اور نہ ہی ان کے کاز کو کوئ فائدہ پہنچتا ہے۔

یہ ایک اور صاحب میرے سامنے بیٹھے ہیں اور اپنے پچھلے ہفتے کی مصروفیات کے بارے میں بتا رہے ہین۔ اپنی داڑھی میں خلال کرتے ہوئے انہوں نے انکشاف کیا کہ ان کے علاقے کی مسجد پہ ایک اور گروپ قبضہ کرنا چاہ رہا تھا لیکن انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے کیسےاسے ناکام بنا دیا۔'غیرمسلم تھے کیا'۔ میں نےحیرانی سے پوچھا۔ کہنے لگے ۔ جی نہین دیو بندی تھے۔ اور آپ کیا ہیں۔ ہم ماشاللہ سے بریلوی ہیں۔ تو دیو بندی اور بریلوی ایک مسجد میں نماز نہیں پڑھ سکتے۔ جی نہیں۔ پھر بات کا رخ بدلنے کے لئیے میں نے ان سے پوچھا کہ ان کے بھائ کی شادی کا سلسلہ جو میری ایک دوست خاتون کے ساتھ چل رہا تھا اس کا کیا ہوا۔ کہنے لگےآپ نے بتایا نہیں وہ تو دیو بندی ہیں۔ یعنی دیو بندی اور بریلویوں کی آپس میں شادی نہیں ہو سکتی۔ کہنے لگے کوئ کرنا چاہے تو کر لے ۔ لوگ تو غیر مسلموں سے بھی شادی کرلیتے ہیں۔لیکن دیو بندی ہمارے میلاد اور فا تحہ سے بڑے چڑتے ہیں۔ حتی کہ وہ فاتحہ کی چیزیں بھی نہیں کھاتے۔ میری طرف انہوں نے فاتحہ کا لڈو بڑھایا۔ اور میں نے اسے کترنا شروع کر دیا۔ کہنے لگے آپ کیا ہیں۔ 'جی، والدین نے کبھی بتایا نہیں کہ ہم دیو بندی ہیں یا بریلوی'۔ فرمانے لگے آپ کی حس مزاح اتنی اچھی نہیں۔ جی مجھے اس سے اتفاق ہے۔ میں نے جلدی سے ان کا فقرہ پکڑا۔ کسی کوتو فالو کرتی ہونگیں۔ جی میں پوچھ کر بتاءونگی۔ آپ سمجھتے ہیں ناں یہ بڑے نازک مسائل ہوتے ہیں۔

لیکن ان کے جانے کے بعد جب میں نے اپنے آپ سے سوال پوچھا تو لگا کہ اس کا جواب تو مجھے آتا تھا میں اس اسلام کو فالو کرتی ہوں جو اپنی ابتدائ حالت میں تھا۔ جس کا مقصود انسان کو اشرف المخلوقات بنانا تحا۔ اسے چند رٹے رٹائے جملے یاد کرانا نہیں تھا۔ وہ مذہب تو انسان دوستی پہ مبنی تھا جہاں رسول اپنے سجدے کو اس لئے لمبا کر دیتے ہوں کہ ان کی پیٹھ پہ ان کا کم عمر نواسہ کھیل رہا ہے۔ اپنی دودھ پلانے والی ماں کے استقبال کو کھڑے ہوکر ان کے لئے اپنی جگہ خالی کرتے ہوں۔ اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لئے اس کے ساتھ دوڑ لگاتے ہوں گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہوں۔ اس زمانے کے مروجہ طریقے کے مطابق جب آپ کے داماد آکر دوسری شادی کی اجازت مانگتے ہیں تو آپ ایک شفیق باپ بن جاتے ہیں اور کہتے ہیں میری فاطمہ کو دکھ ہو گا۔ ان کے داماد ان کی بات کی پاسداری کرتے ہوئے ان کی بیٹی کی زندگی میں دوبارہ شادی نہیں کرتے۔

خلیفہء اول خلیفہ بن جانے کے بعد بھی اپنے قبیلے کی بیوہ اور ضعیف عورتوں کی خیر خیریت معلوم کرنےجاتےہیں ان کو پانی بھر کے لا کے دیتے ہیں ان سے مصافحہ کرتے ہیں۔ خلیفہ دوئم جو اپنی سخت گیری کی بنا پر مشہور ہیں لیکن میری پسندیدہ شخصیت ہیں۔ انصارکی کسی عورت نےان سے کسی مسئلہ پہ اختلاف کیا۔ اور آپ سے رائے تبدیل کرنے کو کہا تو آپ نے فرمایا'عورتیں ایسی جری تو نہ ہوتی تھیں'۔اس خاتون نے کہا۔ ' کیوں نہیں۔ رسول اللہ کی بیویاں آپ سے مباحثے کیا کرتی تھیں اور اپنی اصابت رائے سےرسول اللہ کو قائل کر لیا کرتی تھیں۔' حضرت عمر نے اس عورت کے دلائل کے سامنے سر جھکا دیا اور خاموش ہو گئے۔

تاریخ کے یہ چھوٹے چھوٹے جھروکے ہمارے سامنے ان انسانون کو لاتے ہین جن کو ظاہری اصولوں اور عقیدت کی مصنوعی دیواروں کے پیچھے جان بوجھ کر دفن کردیا گیا ہے۔ بس یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یا تو وہ ہر وقت صرف کفار سے جنگ اور جہاد میں مصروف رہتے تھے اور وہاں ہر وقت نعرہء تکبیر اللہ اکبر کہتے تھے۔ یا ہر وقت سب تسبیح ہاتھ میں لئے اللہ اکبر کرتے رہتے تھے۔ اخر وہ سب ایک انسانی معاشرے میں رہتے تھے۔ ان کی خانگی زندگی بھی تھی اور خاندانی زندگی بھی۔ نظریات اور سمجھ بوجھ میں اختلاف بھی ہوتا تھا انہی سے انسانی زندگی عبارت ہے۔ ہم نے مذہب کو اپنی ثقافتوں سے قریب کرنے کےلئے اس کی شکل بگاڑ دی ہے لیکن اس کے باوجود ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جتنی سختی سے اس کی ظاہری علامتوں کو نبھاہیں گے اتنے اچھے مسلمان ہونگے۔ حالانکہ سفید رنگ میں رنگ جانے سے کوا کبوتر نہیں بن جاتا۔

اب اقبال کا ایک شعر ہے جسے کسی نے یہ ثابت کرنے کے لئے سنایا تھا کہ انکے بنوں میں خدا کے عاشق بہت ہیں۔

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے

میں اسکا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

رسول اللہ کے حالات زندگی

شہیدالمحراب، عمر بن الخطاب، سید عمر تلمسانی ترجمہ حافظ محمد ادریس ، البدر پبلیکیشنز، اردو بازار، لاہور۔

4:56 PM

محمد صلعم، سدیق اکبر،عمر خطاب، دیو بندی، بریلوی، اقبال

احسان فراموش کراچی والے

اوریا مقبول جان ایکسپریس میں کالم لکھتے ہیں ۔ اور جو چاہتے ہیں لکھتے ہیں۔ اس کے لئے تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ نہ ہی سچ جاننے کی۔ سنی سنائ بات کو آگے بڑھانے والے کے لئے تاریخ میں کچھ زیادہ اچھے الفاظ نہیں۔اور اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے بد دعائیں دینے والے کے لئے اس سے زیادہ برے الفاظ ہیں۔ انکے ایک کالم کو ہمارے ایک کرم فرما شعیب صفدر صاحب نے اپنے بلاگ پہ جگہ دی۔ عنوان تھا اس کا 'ڈر اس کی دیر گیری سے'۔میں نے اس بلاگ پہ اس پہ تبصرہ کیا لیکن میری خواہش ہے کہ یہ تبصرہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے علم میں آجائے۔ معمولی ایڈیٹنگ کے ساتھ یہاں دوبارہ دے رہی ہوں۔ اوریا مقبول جان صاحب سے عقیدت رکھنے والے لوگ، اپنے نکتہء نظر سے ہٹ کر نہ برداشت کرنے والے لوگ براہ مہربانی اسے پڑھنے سے گریز کریں۔۔ باقی خیر ہے۔

اوریا مقبول جان نے روایت کو قائم رکھا یعنی اپنے مطلب کی آدھی بات تو بیان فرما دی اور باقی آدھی بات کا تذکرہ گول کر گئے۔ جہاں انہوں نے اپنے اتنے احسانات گنوائے وہاں اگر وہ کچھ اور باتیں بھی بتا دیتے تو اچھا تھا۔ مثلاً انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ جب پاکستان بناتو حالات ایسے تھے کہ حکومت پاکستان کے پاس ایک مہینے کی تنخواہ دینے تک کے پیسے نہ تھے۔ ان مہاجریں نے کسطرح اپنی ذاتی املاک سے فنڈز اکٹھے کئے اس کا کوئ تذکرہ نہیں۔

ذرا اس واقعے کا بیان دیتے جس میں نطام دکن نے میر لائق علی کے ہاتھ اس مملکت خداد معاف کیجئے گا آپکی سر زمین کو مدد کے لئے ایک خطیر رقم بھیجی۔ اس کے علاوہ ناموں کی ایک لمبی لسٹ جو اس وقت میرے دماغ سے محو ہو گئے ہیں۔ذرا دو چار نام ان کے بھی گنوا دیتے یا معلوم کر لیتے تو اچھا تھا۔۔

آپنے اس وقت کی وفاقی ملازمتوں میں مہاجرین کی تعداد کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ اسوقت مغربی

پاکستان میں تعلیم یافتہ اور تجربے کار لوگوں کا کس قدر قحط الرجال تھا۔ آپ کا یہ خطہ جس میں اس وقت کا پاکستان موجود

ہے یہاں کی تعلیمی زبوں حالی اور ذہنی معاشرتی زبوں حالی کا تذکرہ بھی کر لیتے تو آپ کے الفاظ دھاک بیٹھ جاتی۔اگر وہ

لوگ آکر یہ سب نہ سنبھالتے تو گاندھی اور جواہر لعل نہرو کی یہ پیشن گوئ کہ یہ ملک تو چند دنوں کے لئے بنا ہے اسے

پورا ہونے سے کون روک سکتا تھا۔ آپ کے جاگیردار یا سردار۔ جن سے اس وقت قائد اعظم کو ڈیل کرنی پڑی تھی کیونکہ وہ

اپنی بات کو ہر صورت پورا کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت ان سے کی گئ ڈیل کے نتیجے میں یہ ملک کبھی جاگیرداری کے آسیب

سے آزاد نہ ہو سکا حالانکہ جواہر لعل نہرو نے آزادی کے فوراً بعد زمینداری نطام کے خاتمے کااعلان کیا۔

مزید اطلاع کے لئے عرض کر دوں کہ ان میں سے بیشتر لوگوں کو حکومت پاکستان نے اپنی درخواست پر یہاں بلا یا تھا ایسا

نہیں تھا کہ وہ لوگ اس وقت وہاں بغیر کسی ملازمت کے پڑے ہوئے تھے اور آپ نے انہیں یہاں بلا کر روزی روزگار دیا۔۔ اس

سلسلے میں اس وقت فوری طور پہ جو نام مجھے یاد آرہا ہے وہ بھوپال کی ولعیہد شہزادی عابدہ سلطان ہیں۔ شہزادی بھوپال

کا محل چھوڑنے کے بعد کراچی میں ملیر کے ایک سادہ سے گھر میں آکر رہیں انہیں حکومت ہندوستان ہر قسم کی

سہولیات دینے کو تیار تھی مگر انہیں آپ کا احسان اٹھانا مقصود تھا اس لئے وہ یہاں آگئیں۔ کبھی موقع ملے یا دوسروں کے

احسانات جاننے کا دل چاہے تو ان کی خود نوشت سوانح حیات ضرور پڑھئے گا۔ جس میں انہوں نے بڑی تفصیل سے آپکی

سرزمین پہ ان کے ساتھ کیا گذری بیان کیا ہے۔ ایسے لوگوں کے ناموں کی ایک لمبی لسٹ ہے بیشتر تو گمنامی کے

اندھیروں مییں ڈوب گئے۔

پھر جناب آپ نے کلیمز کا تذکرہ کیا ہے ان کلیمز سے پنجابی مہاجرین نے فائدہ اٹھایا ہو تو ہو۔ لیکن اگر کراچی میں رہنے والوں

نے اسی رفتار سے فائدہ اٹھایا ہوتا تو آج اس شہر کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ ان کلیمز کے بارے میں بھی آپ ان کی کتاب

میں تفصیل سے پڑھ سکتے ہیں۔ کہ کسطرح مقامی لوگوں نے یہ کلیمز ہتھیائے۔ حتی کہ آپ کے پسندیدہ حکمراں ایوب خان

نے اپنے وقت میں ایک آڈر جاری کیا جس کی رو سے کلیمز کے صحیح حقدار صرف وہ لوگ تھے جن کی چھوڑی ہوئ جگہوں

کی سرحدیں موجودہ پاکستان سے ملتی ہوں۔ یعنی صرف پنجابی مہاجرین کے کلیمز کے مطابق انہیں واجبات دئے جائیں

گے اور اندرون انڈیا سے آنے والوں کے کلیمز زیادہ سے زیداہ تین لاکھ کی حد تک ادا کئے جائیں گے۔ یہ کھلی تعصبیت

پسندی تھی۔ مگر جناب ہم تو آپ کے احسان مند تھے اس لئے بغیر کسی چوں چرا کے اس فیصلے کو قبول کر لیا۔

آپ نے ان بیس لاکھ جانوں کی قربانی کا تذکرہ نہیں کیا اور انکی جو نہ یہاں کبھی آئے نہ یہاں کے وسائل سے کوئ فائدہ لیا

مگر اپنا سب کچھ اس نعرے کے پیچھے گنوا دیا۔ بٹ کے رہے گا ہندوستان، بن کے رہیگا پاکستان۔ ان کی نسلوں کو آپ کی

عیاشیوں کا بھگتان بھگتنا پڑا۔ اگر یہ لاکھوں قربان نہ ہوتے تو آج آُ پ ہندو مہاجنوں کے قرضدار ہوتے جو قیام پاکستان کے وقت

یہاں سے چلے گئے اور آپ کو برسوں کے قرضوں سے نجات ملی۔ پاکستان تو آپ کو ان کی بے غرض اور بے لوث قربانیوں کے

انعام میں ملا۔ جس کی آپ کو کوئ قدر نہیں۔ قدر بھی کیسے ہو، مال مفت دل بے رحم۔ آپ کے خطے کا تو یہ علم تھا کہ ایک

صبح اٹھے تو پتہ چلا کہ پاکستان بنا ہے اور ایک اورصبح اٹھے تو پتہ چلا کہ پاکستان ٹوٹ گیا ہے۔ بن گیا تو ہمارا ہے اور ٹوٹ گیا

تو چلو اچھا ہوا جان چھوٹی۔ یہ تو ان لوگوں سے پوچھیں جنہوں نے اپنے رشتے ناطے، زمین مال متاع ، جاہ و حشمت یہ

جاننے کے لئے چھوڑی کہ ان کے کتنے محسنین ہیں۔ کیسے کیسے لوگ ایسے ایسے ہوگئے، ایسے ایسے لوگ کیسے

کیسے ہوگئے۔

اگر اسوقت آپ نے لیاقت علی خان سے آپ کے بقول محبت کا اظہار کیا جس کا ثبوت ان کے سینے کو پھاڑنے والی گولی ہے

تو انہیں یہی زیبا تھا۔ ایک شخص جو کہیں کا نواب ہو، اپنا سب فخر چھوڑ کر آپکی زمین کو آزاد کرانے والے لوگوں میں شامل

ہو اور ایک بھرے پرے مجمعے میں پاکستان کے قیام کے صرف تین سال بعد اپنے سینے کا خون روکنے کی ناکام کوشش کرتے

ہوئے یعنی مرتے وقت بھی پاکستان کا نام لے اور مرنے کے بعد اس کی شیروانی کے نیچے پھٹی بنیان موجود ہو۔ کیا آپ

اپنی تاریخ سے ایسی کوئ دوسری مثال ڈھونڈ کر لا سکتے ہیں۔ افسوس آپ کے پاس صرف احسانات کی تاریخ ہے۔

اگر ان مہاجرین نے جس وقت وہ پاور میں تھے آپ جیسی دور اندیشی دکھائ ہوتی یعنی ہر جگہ اپنے نا اہل رشتے دار یا

برادری کے بندے کو ڈالا ہوتا تو آج بھی ان جگہوں پہ وہی ہوتے یا ان کی آل اولاد۔نجانے کیوں ان بیوقوفوں نے نے نئے وطن سے

اتنی محبت اور اصول پسندی دکھائ۔ انہوں نے اپنی روشن خیالی ، وسیع النظری سے آپ لوگوں کے لئَے جگہ خالی کی آپ

کی تربیت کرنے کی کوشش کی۔ آپ نے ان کا صفایا اس طرح کیا کہ دامن پہ کوئ داغ نہ خنجر پہ کوئ چھینٹ۔ ان کے

پاکستان میں ہر کسی کے لئے احترام تھا محبت تھی ۔ ترقی کے آثار تھے۔ آپ کے پاکستان میں تنگ نظری ہے، شدت پسندی

ہے اور آپ کی بات سے اختلاف کرنے والے کے لئے ذلت، خواری اور خاتمہ بالخیر ہے۔ یہاں ہر چیز تنزلی کی طرف ہے۔ صرف

تنگ نظری ہے جو ماشاللہ خوب پھل پھول رہی ہے۔

اس پر بھی جب آپ نے دیکھا کہ یہ احساس ندامت سے عاری لوگ اپنے لئے نئ منزلوں کے سراغ نکالنے میں لگے ہوئے

ہیں۔تو آپ نے انہیں کوٹہ سسٹم کی کند چھری سے ذبح کرنا شروع کیا۔ تاکہ تکلیف زیادہ ہو۔ ہم نے اس تحفے کو بھی ہنس

کے سہا۔اور اپنے لئے دوسری راہیں تلاش کیں۔ لیکن جناب ابھی ہماری سزا پوری کہاں ہوئ۔

مہاجروں کےطرے کا خم نکالنے کے لئے چودہ دسمبر ۱۹۸۶ کو پٹھانوں کے لشکر بھیج کر ان کے نہتے لوگوں کو وہ سبق

سکھایا کہ اس نسل کے لوگ کے سینوں پہ نقش ہوگیا۔ نہ نہ آپ اس سلسلے میں ایم کیو ایم کا نام نہ لیں یہ جماعت تو

اس وقت عملی طور پہ تھی ہی نہیں۔ اس وقت تو اس شہر پہ آپ کا راج تھا۔ موجودہ نسل کو یہ تاثر دیا جات ہے کہ بشری

زیدی کے حادثے کے بعد ایم کیو ایم نے فسادات شروع کروائے چونکہ یہ واقعہ اتنا پرانا نہیں تو اس کی عینی شہادت میں

دینے کو تیار ہوں۔ ایک علاقے کے مظلوم اور نہتے لوگوں پر جو اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھے ان پر پٹھانوںکے

لشکروں نے جو راکٹ لانچر سمیت ہر جدید ہتھیار سے لیس تھے انہوں نے حملہ کرکے مہاجروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

اس کی وجہ میں اپنے فاضل کالم نگار کو ضرور بتانا چاہوںگی اور وہ یہ تھی کہ اس سے پچھلی رات سہراب گوٹھ پر ہیروئن اور

اسلحے کی بازیافت کے لئے چھاپا پڑا تھا۔۔ یہ جگہ اس وقت بھی پٹھانوں کے بیشتر جرائم کا اڈہ تھی اور آج بھی اس کی

شہرت اچھی نہیں ہے۔ آپ کی ساری انتطامیہ چھ گھنٹوں کے لئے خاموش کھڑی تھی۔ اوپر سے آڈر نہیں تھا۔۔ اور پولیس کا

کام صرف یہ تھا کہ علاقے سے باہر کے لوگ ان مطلوموں کی مدد کو نہ پہنچ جائیں۔ ان لوگوں کو باہر روک دیا جائے۔ اس کا انہیں

آڈر تھا۔ جب کئ سو لوگوں کو قتل کر ڈالا گیا اور ہر گھر سے آگ کے شعلے بلند ہوئے تو وہ لوگ واپس ہوئے لال مسجد کے

لئے آنسو بہانے والوں کو شاید یہ واقعہ معلوم ہی نہیں۔یہ وہ منحوس دن تھا جس دن آپ کے احسانات کی حدوں سے نکلنے

کی خواہش پیدا ہوئ۔

آپ کا شکریہ کہ آپ نے ہمیں کچھ اور سوچنے پہ مجبور کیا۔ ہمیں بتایا کہ الطاف حسین نامی شخص بھی اس شہر میں

موجود ہے۔ آپ کا شکریہ کے ہمارے نوجوانوں کے دلوں سے ہتھیار کا خوف نکالا۔ انہیں بتایا کہ طاقت ہتھیار سے حاصل کی

جاتی ہے قلم اور علم تو بیوقوفوں کے لئے ہیں۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا تو حضور ، اب آپ پھر ناراض ہیں۔ آپ نے اپنے احسان

فراموشوں کی ایک نسل کو تباہ و برباد کر دیا۔ ایسوں کے ساتھ تو ایسا ہی کرنا چاہئیے۔ جناب ہم تو آپ کے احسانات کے بوجھ

تلے کچلے ہوئے ہیں ہمیں تو ہر لحظہ جناب کے ماتھے کے بل گنتے رہنا چاہئیں۔ اور کسی بھی احسان فراموشی کا تصور

بھی ذہن میں نہیں لانا چاہئے۔ لیکن حضور ایسا ہے کہ ہم آپ سے ابھی تک ڈرے ہوئے ہیں۔ کیا عالی مرتبت اس خوف کو

ہمارے سینوں سے نکالنے کا نیک کام کریں گے۔ یا اس شہر میں مزید پٹھانو ں کی مافیاز قائم کرنے کے منصوبے بناتے رہیں

گے۔ کیا اس دفعہ آپ ہمیں طالبانوں کے ہاتھوں سبق سکھانا چاہتے ہیں۔ وہ سبق جو آپ نے اپنے معصوم ہموطنوں کو رٹوادیا

ہے اور جس سے ماشاللہ آپ کے درو دیوار سرخ ہو رہے ہیں۔ عالی قدر سر میں تو اتنی خوفزدہ ہوں کہ سوچتی ہوں کہ کسی

اور ملک کی شہریت اختیار کرلوں میری ایک چھوٹی سی خواہش ہے کہ میرے بچوں کے، میری آنیوالی نسلوں کے دل نارمل

انداز میں دھڑکیں۔اور ان کے سینوں میں کوئ خوف نہ ہو۔اور نہ احسان کا بوجھ ۔ یہ بہت بھاری ہوتا ہے جناب۔

ریفرنس؛

عابدہ سلطان، یہ شہزادی صاحبہ کی خود نوشت سوانح عمری ہے جسے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا۔ پاکستان کی پڑھی لکھی خواتین کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے یہ کتاب ایک عورت کی جہد مسلسل کی داستان ہے وہ بھی مسلمان عورت کی۔

شہزادی عابدہ سلطان

عابدہ سلطان

اوریا مقبول جان کا مضمون اس بلاگ میں ہے۔ 'ڈر اس کی دیر گیری سے'۔

شعیب صفدر کے بلاگ میں اس کی تاریخ ہے پچیس مئ، ۲۰۰۹

8:34 PM

چودہ دسمبر ۱۹۸۶، علی گڑھ کالونی سانحہ، عابدہ سلطان، لیاقت علی خان،

رحیم یار خان کی ریحانہ

میری ماسی کا نام ریحانہ ہے۔ وہ میرے گھر کے قریب کچی آبادی میں نالے کے کنارے پہ رہتی ہے۔ اس کا تعلق رحیم یار خان سے ہے۔ یہ تعلق میں اکثر اس لئے بتاتی ہوں کہ ہر انسان اپنی ثقافت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے ماحول سے ہٹ کر سوچنے سمجھنے اور عمل کرنےکی صلاحیت رکھتے ہوں۔ یہی لوگ وقت سے آگے اور اس سے الگ ہو کر دیکھ سکتے ہیں۔ اور نا محسوس طریقے پہ انہی لوگوں سے دنیا کا مستقبل جڑا ہوتا ہے۔ لوگوں کی اکثریت اپنے اسی روائتی نظام سے جڑی رہتی ہے اور بلآخر وہ اس نظام کی اور وہ نظام ان کی شناخت بن جاتا ہے۔

ہاں تو میں اپنی علامیت ایک طرف رکھ دیتی ہوں کیونکہ اس قصے میں جو بہت سادہ سا ہے اور اس میں نہ کوئ گہرئ اہے، نہ سنسنی نہ نیاپن اور نہ کوئ سبق۔ لیکن بات یہ ہے کہ دنیا کی کتاب بس ایسے ہی بھرتی کے صفحات سے زیادہ بھری ہوئ ہے۔اب جو لوگ کچھ نئے کے لئے یہاں آئے ہیں وہ برائے مہربانی یہیں سے پلٹ جائیں۔ اس سے ان کا وقت کم ضائع ہوگا۔

ہاں تو مجھے اسکا گھر صحیح سے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہےیعنی اختر شیرانی کی طرح میں انگلی آٹھا کہ یہ نہیں کہ سکتی کہ یہی ہے وہ گلی ہمدم جہاں ریحانہ رہتی ہے۔ کچھ لوگ اگر اختر شیرانی سے میرا رشتہ جاننا چاہتے ہیں تو بتا دوں کہ وہ عرصہ دراز ہوا اس دار فان سے کوچ کر چکے ہیں شاعر تھے خواتین کا نام اپنی شاعری میں خوب استعمال کرتے تھے لیکن افسوس میرا نام کبھی استعمال نہیں کیا۔ ایک طرح میری بچت ہو گئ وگرنہ کراچی سے باہر کے ہر ایک شخص کو یقین دلانا پڑتا کہ وہ عالم بالا سے افیئر چلانے کی صلاحیت نہیں رکھتےاور نہ ہی مجھے روحوں سے کوئ دلچسپی ہے۔

خیر بات کسی اور طرف چلی گئ۔ میں واپس ریحانہ کیطرف آتی ہوں۔ وہ پچھلے دو سال سے میرے پاس ہے۔ اس کے پانچ بچے ہیں اور چھٹا آنے کی تیاری کر رہا ہے۔ اس سے پہلے ایک زمانہ ایسا گذرا کہ جھاڑو ایک ماسی لگاتی اس اثناء میں وہ ڈس مس ہوجاتی اور پھر پونچھا لگانے دوسری عورت آتی۔کبھی کبھی میں ہی صبح سے رات تک گھر کے کاموں مین گھن چکری بنی رہتی۔ ریحانہ صفائ کے معاملے میں جیسی بھی ہو۔ لیکن اچھی بات یہ ہے کہ وہ خاموشی سے اپنا کام کرتی رہتی اور میں اپنا۔ اگر میں اسے کسی غلطی سے آگاہ کروں تو بغیر کسی جھک جھک کے اسے صحیح کر دیتی ہے۔ مجھے سرائکی لوگوں کی طبیعیت کا یہ ٹھنڈا پن پسند ہے۔

ابھی دو دنوں سے وہ نہیں آرہی تھی تو میں نے اس کی نند سے جو اتفاق سے گھر میں کچھ اور اور کام انجام دیتی ہے اس کے بارے میں دریافت کیا۔

اس نے مجھے بتایا کہ ریحانہ کا اپنے شوہر سے کچھ جھگڑا ہو گیا تھا تو بس اس دوران میں اسے چوٹ لگ گئ اور اس کے ہاتھ کا جوڑ اپنی جگہ سے کھسک گیا۔ ریحانہ نے اپنی جگہ کام کرنے کے لئے ایک اور ماسی کو بھیجا ہے وہ تھوڑی دیر میں آئے گی۔ وہ آئ تو ایک بڑی بی نکلیں، لگ بھگ ساٹھ سال کی۔ میں اسے دیکھ کر خاموش ہو گئ۔ جب وہ جانے لگی تو میں نے اس سے پوچھا کہ میں نے سنا تھا تمہاری بیٹی کام کریگی۔ کہنے لگی وہ کسی اور جگہ جاتی ہے یہاں نہیں آ سکتی۔ اب میں کچھ سوچنے لگی تو اس نے دھیمی آواز میں مجھ سے پوچھا ' کیوں میرا کام پسند نہیں آیا؟' ' آں، نہیں یہ بات نہیں ہے۔ کام کافی زیادہ ہے اور تم خاصی کمزور اور بوڑھی ہو'۔ مجھے بالآخر کہنا پڑا۔ ' کیوں باجی، کیا بوڑھوں کا پیٹ نہیں ہوتا۔ پیٹ تو جوان بوڑھے سب کے ساتھ لگا ہے'۔ اس نے جیسے میرے منہ پہ اسکا چ ٹیپ لگا دیا ۔

اگلے روز ریحانہ مجھ سے ملنے آئ اس کے ہاتھ پہ پلاستر چڑھا ہوا تھا۔ کیا ہو اتھا ریحانہ میں نے اس کے ہاتھ پہ ہمدردی کی نظر ڈالی۔ 'باجی چھوٹی بچی کی طبیعیت خراب تھی۔ میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ ڈاکٹر کے پاس اسے لے جاءّو۔ کہنے لگا تم لے جاءو میں تھکا ہو ہوں۔ اب آپ بتائیں کیا میں تھکی ہوئ نہیں تھی۔ میں بھی سارا دن کام کرتی ہوں۔ بس یہ بات میں نے اس سے کہی تو مجھے مارنے لگ گیا اور ساتھ ساتھ میری ماں بہنوں کو گالیاں دینے لگا۔ اب آپ بتائیں۔ ہمارے جھگڑے میں میری ماں بہنوں کے لئے کیوں گالیاں نکالیں۔ اتنا مارامجھے۔ پھر اسٹیل کے چمچے سے مارنے لگا بس وہ ہاتھ پہ لگ گیا۔ ہڈی میں فریکچر ہو گیا۔ میں تو ناراض ہو گئ تھی اپنی ماں کے پاس چلی گئ۔ پر بعد میں رونے لگا کہتا ہے میرے اوپر کسی نے جادو کردیا ہے۔ مجھے مارتے ہوئے احساس نہیں ہوا میں کتنا مار رہا ہوں۔ بچوں کو بھی مارا۔ میں بالکل پاگل ہو گیا تھا۔ آپ بتائیں کام تو ہم اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے پیسوں میں پورا نہیں ہوتا۔ ہم تو ان کی مدد کرتے ہے۔ لیکن یہ سمجھتے نہیں۔ میں واپس گھر آگئ وہ اتنا رو رہا تھا۔' میں خاموشی سے اس کی کہانی سنتی رہی۔ وہ سرائکی انداز میں بہے جا رہی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرے پاس کسی جادو کا توڑ نہیں۔ اور میں دریا کے کنارے پڑے پتھر کی طرح اسے تک رہی تھی۔

دیکھا آپ نے یہ کتنی عام سی بات تھی۔ لیکن بس اتنی عام باتوں پہ کوئ اپنے بچوں کے گلے کاٹ کر خود کشی کر لیتا ہے اور کوئ مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگا لیتا ہے۔ میں ریحانہ کے ساتھ ملکر ان جادو کرنے والوں کو کوستی ہوں۔ وے تیرا ککھ نہ رہوے۔

12:20 PM

اختر شیرانی، ریحانہ، رحیم یار خان

کراچی میں آم

شہر میں آم ہیں، اور کوڑیوں کے دام ہیں۔ سب کہیں گے بک رہی ہیں جنوں میں کیا کیا کچھ۔ حالانکہ میں شاعری کرنے کی کوششش کر رہی ہوں اس لئے آموں کے دام میں غلط بیانی کرنی پڑی ورنہ قافیہ کیسے ملتا۔ اچھا چلیں یوں کرلیتی ہوں شہر میں آم ہیں، شہد کے جام ہیں۔ اب ہر ایک مجھے لعن طعن کریگاخاتون اورجاموں کا تذکرہ۔ یہ ہے مشرف کے زمانے کی بے حیائ۔ میری توبہ۔ چلیں یہ تو ممکن ہے کہ شہر میں آم ہیں سب تمہارے نام ہیں۔ اب آم بیچنے والے میری شامت لائیں گے۔ ایسے کس کا نام ہے ہر ایک کا دام ہے ۔ لیجئیے بات پھر دام پر آگئ۔ چلیں خواب دیکھتے ہیں، شہر میں آم ہیں کوڑیوں کے دام ہیں۔

غالب کا آموں سے عشق کوئ ڈھکی چھپی بات نہیں۔ نہیں معلوم کہ یہ ان کا پہلا عشق تھا یا دوسرا لیکن راوی لکھتا ہے کہ انکی آم کے متعلق دو خواہشات تھیں۔ اول یہ کہ میٹھے ہوں اور دوئم یہ کہ بہت ہوں۔کراچی کے راوی کا کہنا ہے کہ اگر سب کے سب انورٹول ہوں تو کون پاجی امریکہ اور کینیڈا کی شہریت اختیار کرے گا۔

یہ غالب کے قصائد میں سے لئے گئے کچھ شعر ہیں۔ آم کھانے کے بعد پڑھئے۔ آم کھا کر پیدا ہونے والی غنودگی ختم ہو جائے گی۔ آزمائ ہوئ بات تو نہیں پر آپ پہ آزما لینے میں کیا نْقصان ہے۔

بارے آموں کا کچھ بیاں ہوجائے

خامہ نخل رطب فشاں ہوجائے

آم کا کون مرد میداں ہے؟

ثمروشاخ، گوئے چوگاں ہے

تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں آئے،

یہ گوئے اور یہ میداں

آم کے آگے پیش جاوے خاک

پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک

نہ چلا جب کسی طرح مقدور

بادہء ناب بن گیا انگور

یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے

شرم سے پانی پانی ہونا ہے

مجھ سے پوچھو ، تمہیں خبر کیا ہے

آم کے آگے نیشکر کیا ہے

نہ گل اس میںنہ شاخ و برگ، نہ بار

جب خزاں آئے تب ہو اس کی بہار

اور دوڑائیے قیاس کہاں

جان شیریں میں یہ مٹھاس کہاں

جان میں ہوتی گر یہ شیرینی کوہکن باوجود غمگینی

جان دینے میں اس کو یکتا جان پر

وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر

کہ دواخانء ازل میں مگر

آتش گل پہ قند کا ہے قوام

شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام

یا یہ ہوگا کہ فرط رافت سے

باغبانوں نے باغ جنت سے

انگبیں کے بحکم رب الناس

بھر کے بھیجے ہیں سر بمہر گلاس

یا لگا کر خضر نے شاخ نبات

مدتوں تک دیا ہے آب حیات

تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل

ہم کہاںورنہ، اور کہاں یہ نخل

تھا ترنج زر ایک خسرو پاس

رنگ کا زرد، پر کہاں بو باس

آم کو دیکھتا، اگر اک بار

پھینک دیتا طلائے دست افشار

رونق کارگاہ برگ ونوا

نازش دودمان آب و ہوا

رہرو راہ خلد کا توشہ

طوبی و سدرہ کا جگرگوشہ

صاحب شاخ برگ و بار ہےآم

ناز پروردہء بہار ہے آم

ریفرنس؛

یہ اس دیوان غالب سے لیا گیا ہے جس کے ناشر و طابع ہیں۔ فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹڈ اردو بازار، کراچی

fazlee@cyber.net.pk

8:52 PM

غالب، آم، قصیدہ

خبردار ہم ایک ایٹمی قوت ہیں

اپنے بچپن میں میں ہم ایک کھیل کھیلتے تھے جس میں ہم بچے ایک تخت پہ چڑھ کر بیٹھ جاتے اور ایک فرضیہ بھوت کو تخت کے نیچے محسوس کرتے اور زور زور سے چیختے تھے ایک فرض کئے ہوئے خوف کے زیر اثر۔چیخنے کے بعد بڑا مزہ آتا۔ اور ہر تھوڑی دیر بعد یہ سیشن ہوتا۔ میری نانی کے گھر میں ایک کونے میں پڑا ہوا تخت بس اسی مقصد کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اسے اڈرینالن ہائپ کہتے ہیں۔ ایک سنسنی سے گذرنا اور پھر اس سے لطف اندوز ہونا کیونکہ کافی دیر تک خون رگوں میں پارہ بن کر بھڑکتا اور دوڑتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں،

پلٹنا جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا

لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

لیکن بات پلٹنے جھپٹنے سے کہیں آگے بڑھ چکی ہے۔ اب میدانوں میں شمشیر کے کمال دکھا نے والے شمشیر زن نہیں رہےبلکہ کسی لیبارٹری میں ایک میز پہ جھکا وہ خود غرض شخص ہے جو طاقت کے کھیل میں شامل فریقین کے اڈرینالن ہائپ سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ کیوں اسے بھی تو ناموری کا شوق ہے۔ بد نام جو ہونگے تو کیا نام نہ ہوگا۔ لاکھوں انسانوں کو بیک جنبش انگلی اس صفحہء ہستی سے مٹا دینا اب ہوا کتنا آسان۔ ایٹم بم کی بدولت۔ اب ہمیں کس کا شکریہ ادا کرنا چاہئیے۔اڈرینالن ہائپ کے شکار حکمرانوں اور انہیں شہہ دینے والی قوتوں کا۔ فوجی ھتھیاروں کی سپلائ کرنے والی صنعتوں کا۔ یا انسانیت کے دشمنوں کاجو انسان نامی مخلوق کو اس دنیا سے مٹانے کی کوششوں میں رات دن مصروف ہیں اور اسی تندہی سے مصنوعی طریقوں انسان پیدا کرنے کی کوششوں میں بھی۔

آئنسٹائن کے نظریہء اضافت کو استعمال کرکے امریکہ نے ایک پروجیکٹ کی بنیاد رکھی۔ جس کا نام رکھا گیا۔ پروجیکٹ مین ہیٹٹن۔اس پروجیکٹ کو جناب آءنسٹائن کی تائید حاصل تھی۔ اس پروجیکٹ میں امریکہ، برطانیہ، کینیڈا اور یورپ کے طبعیات دان، انجینیئرز اور حساب دان شامل تھے۔ اسکے نتیجے میں بننے والے پہلے ایٹم بم کو دی گڈگت کا نام دیا گیا۔ ۱۹۳۹ ء میں بم بنانے کے کام کا آغاز ہوا۔ اور ۱۹۴۵ میں اسمیں کامیابی حاصل ہوئ۔ اس وقت ان چھ سالوں ،میں اسپروجیکٹ پردو بلین ڈالر کا خرچہ آیا۔ پہلا دھماکہ ا۱۹۴۵ کی جولائ میں میں نیو میکسیکو میں امریکہ صاحب بہادر نے کیا۔

پروجیکٹ مین ہیٹن کے نگراں رابرٹ اوپنار نے پہلے دھماکے کے بعد سر خوشی کے عالم میں کہا۔

'I am become death, the destroyers of world.

'اب میں موت ہوں، دنیاءووں کو نیست ونابود کرنے والا۔

اور اگلے دو دھماکے جاپان کے شہر ہیروشیما اور ناگاساکی میں بالترتیب چھ اور نو اگست کو کئے گئے۔انسانی تاریخ میں یہ ایک گھناءونے دن کے طور پہ یاد رکھا جائے گا۔ لاکھوں انسان ، زندہ انسان چشم زدن میں صفحہء ہستی سے نابود ہو گئے۔اور جو بچ گئے وہ نشان عبرت بن گئے ان کی ان نسلوں نے بھی اسے بھگتا جو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئ تھیں۔ دھماکے کے فوراً بعد ہیروشیما میں بم گرنے کے مرکز سے لیکر ڈھائ میل کے علاقے میں ہر جلنے والی چیز جل کر ختم ہو گئ۔ آپ کو پتہ تو ہوگا کہ انسان بھی آگ سے مامون نہیں۔ باقی بچ جانے والے لوگ ایٹم بم سے نکلنے والی تابکار شعاعوں کے شکار ہوئے اور مختلف لاعلاج قسم کے امراض میں مبتلا ہوئے۔ ان کی آنے والی نسلوں میں خون کا کینسر عام تھا۔ اور آج بھی وہ مکمل طور پر اس سے چھٹکارا نہیں پاسکے۔ یہ عذاب خدا نے ان پہ نہیں اتارا تھا۔ یہ بہت سارے انسانوں کی مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ قدرت نے تو بس ہمیں اشارہ دیا کہایٹم بم کی تابکار شعاعیں اگر ہمارے دشمن کی نہیں تو ہماری بھی نہیں ہیں۔

ان دھماکوں کے نتیجے میں جاپان نے دس اگست ۱۹۴۵ کو ہتھیار ڈال دئیے۔ یوں دوسری جنگ عظیم کا خاتمہ ہوا۔ جاپانیوں نے بعد میں ایٹم بم تیار کرنے کی کوشش نہیں کی انہوں نے اپنی تعلیم اور ہنر مندی میں اضافہ کیا اور ایک وقت ایسا آیا کہ خود امریکہ کے اندر امریکی مصنوعات کے بجائے جاپانی مصنوعات کو ترجیح دی جانے لگی۔یوں آج جاپانی دنیاکی سب سے محنتی قوم ہے۔

پاکستان نے۲۸ اور ۳۰ مئ ۱۹۹۸ میں پانچ ایٹمی دھماکے کئے۔ یہ دھماکے ان دھماکو ں کے جواب میں کئے گئے جو انڈیا نے اسی مہینے کی گیارہ اور تیرہ تاریخ کو کئے گئےتھے۔خیال تھا کہ اس طرح دونوں ملکوں کے درمیان تناءو کم ہوگا اور دونوں ممالک اپنے دفاعی بجٹ کو کم کر کے اپنے عوام کی بہتری کے لئے کچھ کام کریں گے۔ اب تک تو ایسا ہونے کے کوئ آثار نہیں۔

انڈیا اس سے پہلے بھی ۱۹۷۴ میں اپنا پہلا ایٹمی دھماکہ کر چکا تھا۔ اگر آپ ہنسنا چاہیں تو اس پروجیکٹ کا نام بھی سن لیجئے اس کا نام تھا 'مسکراتا ہوا بدھا۔' یہ کسی بڈھے یا بدھ کے نام پر نہیں۔ بلکہ گوتم بدھ کے نام پہ تھا۔ جنہوں نے راج پاٹ چھورا اور نروان حاصل کرنے کے جنگلوں کا رخ کیا۔ اورایک لمبا عرصہ کی تپسیا کے بعد یہ عقدہ کھولا کہ انسان ہر جاندار سے محبت کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

خیر اس قسم کے مذاق ہمارے پڑوسی اکثر کرتے رہتے ہیں۔ ان پہ کیا دل جلانا۔ دل تو اس بات پہ جلائیے کہ ان پانچ ٹیسٹوں پہ جو پاکستان نے کئے قریباً ۱۰۰ملین ڈالر کا خرچہ آیا۔ یقیناً انڈیا کا بھی اتنا ہی خرچ ہوا ہوگا۔ پاکستان اپنے بجٹ کا ایک چوتھائ حصہ دفاع پہ خرچ کرتا ہے یہی حال انڈیا کا بھی ہے۔ دونوں ملکوں کی کل آبادی ساری دنیا کی آآبادی کا پانچواں حصہ ہے اور دونوں ملکوں کے غریبوں کی کل تعداد دنیا بھر کے غریب لوگوں کا چھٹا حصہ ہے۔آنڈیا میں کل آبادی کا ۲۰فی صد حصہ غربت کی سطح سے نیچے زندگی گذار رہا ہے۔ پاکستانابھی غربت کے اس اسکیل پہ تو نہیں پہنچا مگر خودکشی کرنے والوں کی شرح میں اضافہ ہے جو گھریلو مسائل سے تنگ آکر خودکشی کرتے ہیں۔ معاشرے کےاندر بڑھتی ہوئَ شدت پسندی کا رحجان بھی پیسے کی غیر منصفانہ تقسیم کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ بھوکے کو تو چاند سورج بھی روٹیاں نظر آتے ہیں۔اور جب یہ صحیح طریقے سے حاصل نہ ہو تو محبت اور جنگ کی طرح اس کے حصول میں بھی ہر چیز جائز ہو جاتی ہے۔

جنگ میں، ایکدوسرے کو مار ڈالنے کا جذبہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ ہابیل اور قابیل کی تاریخ۔ ایک زمانے میں جنگیں اپنی بقاء، جذبہء انتقام یا حکمرانی کے دائرے کو بڑھانے کے لئے استعمال ہوتی تھیں۔ فی زمانہ اپنا ابنایا ہوا اسلحہ بیچنے کے لئے بھی جنگیں کرائ جاتی ہیں یا ایسے حالات پیدا کئے جاتے ہیں جن میں متعلقہ فریق احساس خوف کا شکار ہو کر ان لوگوں سے ان کی شرائط پہ اسلحہ خریدنے کے لئے مجبور ہو۔ نتیجتاً مختلف ممالک کے اندر شورشیں برپا کی جاتی ہیں ۔ پھر شورش برپا کرنے والے کو بھی اسلحہ ملتا ہے اور ان کو روکنے والوں کو بھی۔ یوں اسلحے کے بازار میں کساد مندی نہیں پیدا ہو پاتی۔

دنیا بھر کے جی ڈی پی کا دو فیصد حصہ اسلحے کی تیاری پہ خرچ ہوتا ہے۔ اس کے بڑے سپلائرز میں امریکہ، روس ، برطانیہ، جرمنی اور چین شامل ہیں۔ امریکہ چھتیس فیصد اسلھہ سپلائ کرتا ہے۔ سوچیں ذرا اگر آج دنیا بھر کے انسان تہیا کرلیں کہ وہ جنگ میں شامل ہونے کے بجائے اپنے عوام کی فلاح کو ترجیح دیں گے تو ان ممالک کو کتنا نقصان ہو۔اس لئےفوج، معاشیات اور سیاست کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ کسی بھی ملک کی اصل طاقت اس کے عوام ہوتے ہیں۔وہ اس کا اسلحہ ہوتے ہیںاور بلڈنگ میٹیریل بھی، اسکو تعمیر کرنے والے بھی اور اسے ختم کرنے والے بھی۔ اگر کسی ملک کے لوگ ایک اکائ بن کر نہیں سوچتے تو کوئ ایٹم بم انہیں جوڑ کر نہیں رکھ سکتا۔اپنے پڑوسی انڈیا کی ہمیں تعریف کرنی چاہئیے کہ وہ ہم سے زیادہ مخلص ہو کر اپنے ملک کے لئے سوچتے ہیں اور اس پہ فخر کرتے ہیں۔ کہنے کو ہماری زبانیں اسلام کا نام لیتےنہیں

تھکتیں۔

لیکن جب بھی ہمارے یہاں کوئ شورش برپا ہوتی ہے اس میں ہمارے ہی مسلمان بھائ ان سے پیسہ اور اسلحہ

لیکر ہماری جڑیں کاٹتے ہیں۔ دو فریقین ایکدوسرے پہ اللہ اکبر کہ کر حملہ آور ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی گردنیں کاٹتے ہیں۔آفریں ہے ہماری منافقت پہ۔

اس وقت دنیا میں کم از کم نو ممالک کے پاس یہ مہلک ہتھیار موجود ہے۔ایٹم بم اس توانائ سے حاصل کیا جاتا ہے جو ایٹم کے مرکز کو جوڑ کر رکھتی ہے۔ ہم مرکز توڑتے ہیں اور یہ توانائ ہمیں مل جاتی ہے۔ اس توانائ کا حصول دیگر بہت ساری ماحولیاتی مسائل کو جنم دیتا ہے کیونکہ اس کے نتیجے میںپیدا ہونے والے تابکارفضلے کو اسی دنیا میں جمع کرتے ہیں جس میں آپ اور میں رہتے ہیں اور اپنے بچوں کے لئے خواب بنتے ہیں۔ اگر دنیا میں اتنی ہی تیزی سے ایٹمی تابکاری پھیلتی رہی تو وہ دن دور نہیں جب یہ آلودہ دنیا انسانوں کے رہنے کے قابل نہ رہے گی۔ ہم تو اس وقت نہ ہونگے لیکن آنے والی انسانی نسل ہم سب سے شدید نفرت کریگی۔

خیر ہمیں اس سے کیا، ہمارے گذر جانے کے بعد کوئ ہم سے نفرت کرے یا محبت۔

اس وقت ایک بس کا شعر یاد آرہا ہے

قتل کرنا ہے تو نظروں سے کر تلوار میں کیا رکھا ہے

سفر کرنا ہے تو ون ڈی سے کر ، کار میں کیا رکھا ہے

ہائے یہ سادہ دل بس والے اور میں، یہ میری سادہ دلی مار نہ ڈالے مجھ کو۔

ریفرنس؛

ایٹم بم کی ایجاد

پہلا ایٹمی دھماکہ

پاکستانی فوج

1:49 PM

اڈرینالن, ایٹم بم, جاپان, دفاعی بجٹ

SCUBA Diving غوطہ خوری

لفظ اسکوبا مخفف ہے۔

کا۔ Self Contained Underwater Breathing Apparatus

یعنی آپ کمپریس کی ہوئ ہوا کا ٹینک سانس لینے کے لئے ساتھ لیکر سمندر کی گہرائیوں میں اترتے ہیں اور اس طرح وہاں زیادہ وقت گذارنے کے قابل ہوتے ہیں

اسکوبا ڈائیونگ یا غوطہ خوری ایک مشغلہ بھی ہو سکتا ہے اور پیشہ بھی۔ پاکستان میں کیونکہ پچھلی کئ دہائیوں

سےجہادی سیاست کا کھیل چل رہا ہے اس لئے نوجوانوں کو مثبت سرگرمیوں کے لئے نہ موقع مل پاتاہے اور نہ تحرک۔

نتیجتاً جن کھیلوں کے ہیرو تھے ان میں بھی زیرو ہوگئے ہیں۔

آپ کو زمینی حقائق کے علاوہ اگر کائنات کے دیگرحقائق اور ان کی خوبصورتیاں بھی اپنی جانب بلاتی ہیں۔ اور آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید ۔ کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکن تو آئیے ہم آپ کا تعارف ایک اسکوبا ڈائیور سے کراتے ہیں یہ نہ صرف غوطہ خوری کرتے ہیں بلکہ چونکہ خود دستاویزی فلم کے تخلیق کار بھی ہیں اس لئے سمندر کے اندر کی دنیا ہمارے لئے فلمبند کر لاتے ہیں۔ آپ نے شاید پہلے بھی اس نوعیت کی فلمیں دیکھی ہوں مگر خاص بات یہ ہے کہ امر محبوب کا تعلق وطن عزیز کے شہر کراچی سے ہے وہ خود تعلیم کے حساب سے کمپیوٹر انجینیئر ہیں ۔ پیشہ ہے ان کا دستاویزی فلموں کی تیاری۔ اسکوبا ڈائیونگ انکے مشاغل میں سے ایک ہے۔اس کے علاوہ وہ ایک افسانوں کے مجموعہ کے بھی خالق ہیں۔ جس کا نام ہے چیونٹیوں کی قطار یہ فضلی سنز پبلشرزسے دستیاب ہے۔

تو آئیے دیکھتے ہیں۔ امر محبوب کو تھائ لینڈ کے سمندر میں یہ کہتے ہوئے۔ بول میری مچھلی کتنا پانی۔ اتنا پانی۔

ریفرنس؛

اسکوبا ڈائیونگ کے بارے میں معلومات

4:20 PM

اسکوبا ڈائیونگ، امر محبوب، چیونٹیوں کی قطار، دستاویزی فلم

کراچی کے طالبان

لکھنا تو کچھ اور تھا مگر اخبار ڈان میں چھپنے والے ایک مضمون جسے ندیم ایف پراچہ صاحب نے لکھا ہے ساری توجہ اپنی طرف لے لی۔ اسکی سرخی ہے،

'More and more does one now hear about incidents and tales where young urban

women are being asked by total strangers to ‘dress properly’ or more so, wear a dupatta over their heads or observe hijab.

'

یعنی اب ہم آئے دن اسطرح کے واقعات نوجوان شہری خواتین سے سنتے ہیں جہاں انہیں کوئ بالکل اجنبی شخص مناسب طریقے سے کپڑے پہننے خاص طور پردوپٹہ سر پر رکھنے یا حجاب پہننے کو کہتا ہے۔

اب ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ ان رونما ہونے واقعات سے انکار کر دیں جیسا اس ویڈیو کے ساتھ ہوا جس میں سوات میں ایک لڑکی کو کوڑے لگائے جا رہے تھے۔یہ انکار اس لئے ہوگا کہ یہ واقعہ ان کے ساتھ پیش نہیں آیایا ابھی تک ان کے کسی جاننے والے کے ساتھ نہیں ہوا۔یا کچھ لوگ کہیں گے کہ آخر خواتین عزت اور شرافت سے کیوں نہیں رہتیں۔ گویا سر پہ دوپٹہ رکھنا شریف ہونے کی پہچان ہے۔اور صرف اس عورت کی عزت کی جائے جو دوپٹہ سر سے آوڑھے ہو۔اور اگر ایک لمحے کے لئے سوچ لیں کہ آپ صحیح سوچ رہے ہیں تو اب آپ کو حق حاصل ہو گیا ہے کہ جس کے پیچھے چاہیں لٹھ لیکر پڑ جائیں-مجھے اپنی قبر

میں جانا ہے اور میرے ساتھ شاید آپ کی بھی تدفین ہونے والی ہے۔ بلکہ یہ بھی میں غلط سوچتی ہوں

ْآپ تو اب مجھے قبر میں پہنچا کر دم لیں گے کیونکہ خدا کو چاہے اس کی پرواہ ہو یا نہ لیکن آپ اس دنیا کو

اپنے تئیں ہر برائ سے پاک کر دیںگے اور وہ برائ صحیح نہ ہوئ تو آپ اسکے کرنے والے کو اپنی نگرانی

میں جہنم رسید کردیں گے۔غالب اس زمانے میں ہوتے تو کیوں شکوہ کرتے کہ

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پہ نا حق

آدمی کوئ ہمارا دم تحریر بھی تھا

آپ ہونگے خدا ئ فوجدار، عقل سے نادار۔

اب ہوا یوں کہ اسی قسم کا واقعہ میری ایک عزیزہ کے ساتھ پیش آیا۔ کراچی میں ڈیفنس سے نارتھ ناظم آباد بس میں آتے ہوئے۔ ایک پٹھان بڑے میاں اچانک اس کے سامنے کھڑے ہو گئے اور پشتو میں مغلظات بولنا شروع ہو گئے۔ وہ صرف ان کی گالیاں کسی حد تک سمجھ سکتی تھی اور حیران تھی کہ آخر اس نے ایسا کیا کر دیا ہے کہ وہ اسقدر چراغ پا ہے۔ پھر ان کے جسمانی حرکات و سکنات سے اندازہ ہوا کہ وہ اسے سر پہ دوپٹہ اوڑھنے کو کہ رہا ہے۔ اس نے بالکل نرم آواز میں اس سے کہا کہ وہ جا کر اپنی سیٹ پہ بیٹھے۔ اس پر وہ صاحب اسے مارنے کے لئے دوڑے اتنے میں کنڈیکٹر بیچ میں آگیا اور معاملہ کو رفع دفع کرنے کے لئے اسے سر پہ دوپٹہ اوڑھنا پڑا اس وقت تک کے لئے جب تک وہ اس بس میں تھی۔ اگرچہ کہ میرا خدا سے کوئ وحی کے ذریعے تعلق نہیں لیکن اتنا جانتی ہوں کہ اس سے ان صاحب کو خدا کے حضور کوئ فائدہ نہیں ہوا، سر پہ دوپٹہ رکھنے سے ان خاتون کی ذاتی اخلاقیات میں بھی کوئ فرق نہیں آیا۔اور سوائے اس کے کہ وہ خاتون ہراس ہوئیں اور کچھ مزید خواتیں یہ سن کرہراس بھی ہوئ اور انہیں اس بات پہ شرمندگی ہوئ کہ ہم اس وقت دنیا کے کس حصے میں موجود ہیں جہاں ایک اجنبی مرد ہمیں اس لئے مارنے کو دوڑے کہ ہم اس کَے سوچے ہوئے طریقے کے مطابق کپڑے نہیں پہنے ہوئے ۔

اب جناب ندیم ایف پراچہ کہتے ہیں کہ آخر شہری خواتین اس قسم کے لوگوں کو تھپڑ کیوں نہیں رسید کرتیں۔ پراچہ صاحب یہ بات تو خود مجھے حیران کرتی ہے کہ خواتین اس قسم کے لوگوں کو پلٹ کر تھپڑ کیوں نہیں مارتیں۔ جو صورت حال کا فائدہ اٹھا کر اس طرح خواتین کو تنگ کر رہے ہیں۔ یہ وہ مرد ہیں جو عام حالات میں اان سے بات کرنے کی جرءات بھی نہ کریں۔

میں سمجھتی ہوں کہ یہ ذہنی طور پر بیمار ہیں۔ اور انسانی معاشرے کواپنی ایک ذہنی حد سے آگے دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ آخر خواتین اور وہ بھی اس دور اور اس شہر کی خواتین کیوں اس انتظار میں ہے کہ کوئ مرد آئے اور انہیں اس مصیبت اور ان بیمار لوگوں سے نجات دلائے۔ یہ بیمار لوگ جو اپنے حالات، ثقافت اور تربیت کی پیداوار ہیں۔

اب دو دن پہلے ایک دوست نے بتایا کہ وہ گاڑی ڈرائیو کر رہی تھیں کہ ایک افغانی ڈرائیور نےانہیں سگنل پہ آلیا وہ اس چکر میں گاڑی سے اتریں کہ گاڑی میں کچھ خرابی ہو گئ ہے اور وہ اسے کچھ بتانا چاہ رہا ہے۔ تو اس افغانی نے اسے گالیاں دینی شروع کر دیں کہ وہ کتنی بے غیرت ہے جو گاڑی چلا رہی ہے۔ لیجئے اب گاڑی چلانا بے غیرتی کی بات ہے۔ وہ گاڑی میں خاموشی سے بیٹھیں اور اسے نظر انداز کر کے گاڑی چلانی شروع کی تو اس نے اپنی یلو کیب سے اسے ٹکریں مارنا شروع کردیں۔قصہ اس وقت مختصر ہوا جب وہ ایک ٹریفک سارجنٹ کے پاس جا کر رکیں۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگوں کو اس میں مزہ آئے۔ خاص طور پر وہ لوگ جنہیں خواتین کو تکلیف دہ حالات میں دیکھ کر مزہ آتا ہے۔ لیکن اس قسم کے حالات سے گذرنا کافی شاکنگ ہوتا ہے۔

اب یہ واقعہ سننے کے بعدایک اور دوست پریشان ہیں کہ انکی بوڑھی نانی ایک ایسے علاقے میں رہتی

ہیں جہاں جانے کے لئے انہیں ایک مخصوص علاقے سے ہو کر گذرنا پڑتا ہے۔ وہاں انہیں اس قسم کے بیماروں سے ملنے کا اتفاق ہو سکتا ہے ۔ اب وہ اکیلے گاڑی ڈرائیو کرکے ان سے ملنے جانے کے لئَے

ہچکچا رہی ہیں حالانکہ پہلے وہ وہاں سے آدھی رات کو بھی مزے سے آجاتی تھیِں۔ نہ جانے کون ان کی

گاڑی کو ٹکر مار دے جان بوجھ کر۔

اب میں پھر وہی بات سوچتی ہوں کہ خواتین کس کا انتظار کر رہی ہیں۔ کم از کم ایک بات کا میں نے تہیہ کیا ہوا ہے اور وہ بھی پراچہ صاحب کے مشورے سے پہلے کہ مجھ سے اگر کسی نے راہ چلتے یہ کہا تو میں اسے ماروں گی ہر اس چیز سے جو میرے ہاتھ میں ہو گی یا میری پہنچ میں۔

دوسری عجیب بات یہ ہے کہ کوئ مرد اس قسم کی شکایت کرتا ہوا نظر نہیں آتا کہ اسے کسی نے کہیں روک کر داڑھی نہ رکھنے پہ ، یا شلوار ٹخنوں سے اوپر نہ پہننے پہ پٹائ لگا دی ہو۔

یہ کھلی علامت ہے اس بات کی کہ یہ بیمار مردوں کا ایک ٹولہ ہے۔

کیا مجھ جیسی صحت مند دماغ اور مثبت سوچ رکھنے والی عورت کو ایک بیمار ذہن کے مرد سے شکست ماننی چاہئیے۔ وہ بیمار مرد جو صلاحیت میں، استعداد میں، علم میں اور عقل میں پیچھے رہ گیا ہے وہ اب مذہب کا ڈنڈا لیکر میرے اوپر حملہ آور ہو گا ۔ جواب یہ ہے کہ نہیں کبھی نہیں۔ اسے معلوم ہونا چاہئیے کہ وہ بیمار ہے۔ اور ہم نے اسے ابھی ٹھیک نہ کیا تو کل وہ میری بیٹی کو ایک نارمل زندگی نہیں گذارنے دے گا۔ مجھے اس سے آج اور ابھی لڑنا چاہئے اور پوری طاقت سے۔ مجھے اسے بتانا ہو گا کہ وہ اپنے احساس کمتری کو مذہب کی آڑ میں نہیں چھپا سکتا۔۔ اب سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ کیسے۔ آئیے میرے ساتھ یہ مسئلہ حل کریں۔

ریفرنس؛ندیم ایف پراچہ کا مضمون مکمل پڑھنے کے لئے اس یو آر ایل پہ جائیں۔

ندیم ایف پراجہ

ڈان اخبار بروز اتوار، بتاریخ۱۷ مئ،۲۰۰۹

7:05 PM

ندیم ایف پراچہ، کراچی کے طالبان

نظیر اکبرآبادی کا ایک شعر

نظیر اکبر آبادی کو عوامی شاعر کہا جاتا ہے۔ انہیں فطری شاعر بھی قرار دیا جاتا ہے۔ نقاد ان کے بارے میں کیا سوچتے ہیں اس بات سے قطع نظر میں ان کی بے حدطویل بحر کا ایک شعر پیش کرنا چاہتی ہوں۔ مزہ لیں اور زبان پر ان کی قدرت پہ حیران ہوں۔

پہلا مصرع

ایک دن باغ میں جا کر، چشم حیرت زدہ وا کر، جامہء صبر قبا کر، طائر ہوش اڑا کر

شوق کو راہ نما کر، مرغ نظارہ اڑا کر، دیکھی رنگت جو چمن کی، خوبی نسرین و سمن کی

شکل غنچوں کے دہن کی، تازگی لالہ کے تن کی، تازگی گل کے بدن کی، کشت سبزے کی،

ہری تھی، نہر بھی لہر بھری تھی، ہر خیاباں میں تری تھی، ڈالی ہر گل کی ہری تھی، خوش نسیم

سحری تھی، سروشمشاد وصنوبر، سنبل و سوسن وعرعر، نخل میوے سے رہے بھر، نفس باد

معنبر، درو دیوار معطر، کہیں قمری تھی مطوق، کہیں انگور معلق، نالے بلبل کے مدقق،

کہیں غوغائ کی بق بق، اس قدر شاد ہوا دل، مثل غنچے کے گیا کھل غم ہوا کشتہ و بسمل

شادی خاطر سے گئ مل، خرمی ہو گئ حاصل، روح بالیدہ ہو آئ، شان قدرت نے دکھائ

جان سے جان میں آئ، باغ کیا تھا گویا اللہ نے اس باغ میں جنت کو اتارا

دوسرا مصرع

نا گہاں صحن چمن میں، مجمع سرو و سمن میں، جیسے ہو روح بدن میں، جیسے ہو شمع لگن میں

جیسے خورشید کرن میں، ماہ پرویں وپرن میں، دیکھا اک دل بر رعنا، وطرحدار جفا کار، دل آزار

نمودار، نگہ ہمسر شمشیر، مژہ ترکش پر تیر، سر زلف گرہ گیر، دل خلق کی زنجیر، جبیں نور کی

تصویر، وہ رخ شمس کی تنویر، زباں شہد بیاں شیر، نظر روح کی اکسیر، دہن غنچہء خاموش

سمن برگ بر دوش، سخن بحر گہر جوش، بدن سرو قبا پوش، چھڑی گل کی ہم آغوش، وفا رحم

فراموش، ہر اک آن ستم کوش، عجب حسن دل آرا، نہ کبھی مہر نے دیکھا، نہ کبھی ماہ نے دیکھا، نہ کسی فہم

میں آیا، نہ تصور میں سمایا، وہ نظر مجھکو جو آیا، مجھے حسن اپنا دکھایا، دل نے اک جوش اٹھایا

جی نے سب ہوش اڑایا، سر کو پاءوں پہ جھکایا، اشک آنکھوں سے بہایا، اس نے جب یوں

مجھے پایا، یہ سخن ہنس کے سنایا، کہ'تو ہے عاشق شیدا، لیکن عاشق نہیں پیدا، ہووے تجھ پر

یہ ہویدا، کہ اگر ہم کو تو چاہے یا محبت کو نباہے، نہ کبھی غم سے کراہے، نہ کسی غیر کو چاہے

نہ کبھی گل کی طرف دیکھ، نہ سنبل کی طرف دیکھ، نہ بلبل کی طرف دیکھ، نہ بستاں پہ نظر کر

نہ گلستاں میں گذر کر، چھوڑدے سب کی مودت، ہم سے رکھ دل کی محبت،

ایسے میں ہم بھی تجھے چاہیں، تجھ سے الفت کو نبا ہیں، ہیں یہی چاہ کی راہیں، گر یہ

مقدور تجھے ہو، اور یہ منظور تجھے ہو، تو نظیر آج سے تو چاہنے والا ہے ہمارا

تو جناب یہ تھے ایک شعر کے دو مصرعے، کہئے کیسی رہی۔

ریفرنس

کلیات نظیر جسے مولانا عبدالباری صاحب نے مرتب و مدون کیا۔ اور چھاپا ہے مکتبہء شعر و ادب، سمن آباد، لاہور نے۔

8:41 PM

نظیر اکبر آبادی، لمبی بحر کا شعر

چھوٹے دماغ کا آدمی

ڈاکٹر شیر شاہ سید کا نام کراچی کے لئے اور طب کی دنیا سے تعلق رکحنے والے لوگوں کے لئے انجان نہیں۔ وہ ایک قابل اور محنتی گائناکولوجسٹ ہی نہیں بلکہ اپنے پیشے سے اور اس ملک کے لوگوں سے مخلص بھی ہیں۔ انہوں نے خواتین کے مختلف پیچیدہ امراض کے علاج کے لئے فلاحی بنیادوں پر کراچی کے مضافات میں واقع کوہی گوٹھ میں ایک ہسپتال بھی کھولا ہے جہاں فسچولا سمیت دیگر امراض کا علاج مفت یا بہت ہی کم پیسوں میں کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر شیرشاہ سید کا نام فسچولا کی مریض خواتین کے لئے زندگی کے فرشتے سے کم نہیں۔ جب میں نے فسچولا سے صحت مند ہونے والی ایک خاتون کو فرط جذبات سے ڈاکٹر شیر شاہ کےہاتھ چومتے دیکھا تو احساس ہوا کہ حقیقی مسرت کیا چیز ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ بھی انہوں نے خواتین کی صحت کو بہتر بنانے کےمختلفالنوع کام کئے ہیں جن کا یہاں تذکرہ ممکن نہیں اور نہ ہی یہ میرا مقصد ہے۔ لیکن بحیثیت ایک خاتون کے میں ان کا شکریہ ضرور ادا کرنا چاہوں گی۔ شکریہ ڈاکٹر شیر شاہ سید۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب خود کئی افسانوں کے مجموعوں کے خالق بھی ہیں۔ خیر یہ تو ان کا ایک مختصر سا تعارف تھا۔

تو جناب یہ واقعہ مجھے خود ان کی زبانی سننے کو ملا۔ گفتگو کے ضمن میں وہ ایک بہت دلچسپ آدمی ہیں۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید سے معذرت کے ساتھ کہ یہ واقعہ ان کی اجازت کے بغیر تحریر کر رہی ہوں۔ امید رکھتی ہوںکہ وہ اس جسارت کو درگذر کریں گے۔ اب آجائیں اصل واقعے کی طرف۔ تو ہوا یوں کہ ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب کاکوئٹہ کسی کام کے سلسلے میں جانا ہوا۔ کہیں جانے کے لئے ٹیکسی کی ضرورت پڑی۔ آدمی اکیلا ہو اور باتوں کا شوقین بھی تو ٹیکسی ڈرائیور خا صا کارآمد ثابت ہوتاہے ان کی ڈرائیور سے گفتگو شروع ہو گئ اب ادھر ادھر کی باتوں کے دوران ڈرائیور کی ذاتی زندگی بھی گفتگو میں آگئے۔ اس نے خوشی خوشی بتایا کہ اس کے چار بیٹے ہیں۔ اب ان کے ڈائیلاگ حاضر ہیں۔

ڈاکٹر صاحب؛ کیا کرتے ہیں تمہارے چاروں بیٹے؟

ڈرائیور؛ صاب ابھی چھوٹا ہے۔ بڑا والا کوئ گیارہ سال کا ہے اور صب سے چھوٹا چھ سال کا۔ چاروں ابھی مدرسہ جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب: اسکول نہیں جاتا تمہارا کوئ بچہ۔

درائور: نہیں صاب ، اسکول کوئ نہیں جاتا۔

ڈاکٹر صاحب: بھئ تم انہیں اسکول کیوں نہیں بھیجتے۔ دیکھو وہ اسکول جائیں گے تو ان میں سے کوئ انجینیئر بنے گا اور کوئ ڈاکٹر بنے گا۔ لوگوں کا علاج کرےگا۔ تمہیں معلوم ہے پاکستان میں ہر سال تیس ہزار سے زیادہ عورتیں بچے کی پیدائش کے دوران مر جاتی ہیں۔

ڈرائیور: صاحب ہمارابچہ مدرسے جاتا ہے وہ وہاں زیادہ بڑا کام کرے گا۔

ڈاکٹر صاحب حیرانی سے: وہاں کیا زیادہ بڑا کام کرے گا

ڈرائیور: صاب ، وہ ساری دنیا میں کافروں سے لڑائ کرے گا۔ ساری برائ ان کافروں نے پھیلائ ہے ان کو صحیح کرے گا۔ادھر وہ عراق میں مسلمانوں کو مارتا ہے۔ کشمیر میں مارتا ہے افغانستان میں مارتا ہے۔ ان سب لوگوں سے جہاد کرے گا۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک دفعہ پھر اسے بتانے کی کوشش کی: تم میری بات نہیں سمجھ رہے تمہارے بچے ڈاکٹر بنیں گے اور ان عورتوں کی جان بچائیں گے تو سوچو پاکستان میں ہر سال تیس ہزار عورتوں کی جان بچے گی۔ اس کا ان کو کتنا ثواب ملے گا۔

اب ڈرائیور بالکل سیخ پا ہو گیا کہنے لگا۔ "تم کتنے چھوٹے دماغ کا آدمی ہے ہم پوری دنیا کی بات کرتا ہے اور تم صرف پاکستان کی اور پاکستانی عورتوں کی بات کرتا ہے"۔

اس بات کے آخیر میں ہم سب زوردار قہقہہ لگا کر خاموش ہو گئے۔ وہ ڈرائیور بھی حیران ہو گا کہ عورت کی جان بچانے کا بھی ثواب ہوتا ہے۔۔ شکر ہے اس نے پلٹ کر یہ نہیں کہا کہ ابے تو جان بچاتا ہے کافی نہیں ہے۔ یہ قصہ تقریباً تین سال پرانا ہے۔ لیکن میں سوچتی ہوں کہ یہ ہیں ہماری ترجیحات جس کی وجہ سے آج ہماری فوجیں ان لوگوں سے لڑ رہی ہیں جو کہنے کو اس ملک کا حصہ کہلاتے ہیں۔ جس کیوجہ سے آج دس لاکھ سے زائد لوگ گھر سے بے گھر ہوگئے ہیں۔ جس کیوجہ سے آج باقیماندہ ملک کا ہر شہری خوف اور بے یقینی کا شکار ہے۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھیں کہ وہ مذہب جسے امن کا مذہب کہا جاتا ہے آج اسے ہی نقص امن کا باعث بنادیا گیا ہے۔ آئیے اس بات پہ ہم سب مل کر ہنستے ہیں ایک کھسیانی ہنسی۔ ہی ہی ہی

ریفرنس: ہسپتال کے بارے میں معلومات یہاں سے حاصل کریں۔

کوہی گوٹھ ہسپتال

فسچولا کی انکہی کہانی

11:40 PM

Fistula, Sher Shah Sayed, ڈاکٹر شیر شاہ سید, فسچولا, کوہی گوٹھ ہسپتال برائے فسچولا

حلقہء دام خیال

ہمارے گھر سے ملحقہ پچھلا پلاٹ ایک نا مکمل اسٹرکچر کے ساتھ خدا معلوم کب سے خالی پڑا تھا۔ ایکدن گھر میں کچھ لوگوںجن میں میں بھی شامل ہوں نے منصوبہ بنایاکہ گھر کی پچھلی دیوار میں ایک شگاف کر کے راستہ بنا لیا جائے اور اس خالی پلاٹ پر مرغیاں پال لی جائیں یا بکریاں۔ اس طرح سے ہمیں آرگینک انڈے اور دودھ مل جائیں گے اور ہمارے گھر میں صفائ کے مسائل بھی نہ کھڑے ہونگے۔ آپ لوگ تو واقف ہیں کہ آجکل مغربی دنیا میں لفظ آرگینک معاشی خوشحالی کی علامت ہے۔۔ جنہیں ہم دیسی انڈے کہتے ہیں انہیں وہ آرگینک پروڈکٹ کہتے ہیں۔مرغیاں خالی پلاٹ کی صفائ کرتی پھریں گی اور بکریاں یہاں وہاں کدکڑے لگائیں گی۔ اور خوشی خوشی تازہ دودھ دیں گی۔ روزانہ ملاوٹی دودھ کی قیمت میں اضافہ کا سن کر جو خون جلتا ہے وہ پھر چہرے پہ شادابی کا باعث بنے گا۔ اور اپنے غیر ملکی دوستوں پہ رعب بھی جمائیں گے کہ ہم تو آرگینک انڈے کھاتے ہیں اور دودھ پیتےہیں۔ غریب تیرے خواب۔ اس تجویز کا آنا تھا کہ برسوں سے خوابیدہ کارخانہء قدرت میں حرکت ہوئ اوردودن بعد کھٹپٹ کی آواز پہ

کھڑکی سے جو جھانکا تو کیا دیکھتے ہیں کہ خالی پلاٹ پر اگے ہوئے جنگل جھاڑ پر کلہاڑیاں چل رہی ہیں۔لیجئے ابھی دو دن پہلے ہی تو ہم نے کچھ منصوبے بنائے تھے۔ خیر آنا تیرا مبارک تشریف لانے والے۔ اگر معلوم ہوتا کہ آپ کے آنے کے لئے کچھ ایسے بے ضرر منصوبے پردہءخیال پہ ظہور پذیر ہونے چاہئیں تو برسوں پہلے سوچ لیتے یا بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ برسوں نہ سوچتے۔ لیکن جناب قدرت نے اسی پر بس نہیں کی اور ہمیں مستقبل میں کسی بھی منصوبہ بنانے کے ارادے سے باز رکھنے کے لئے آئندہ چند مہینوں کا پروگرام بھی بنا لیا گیا۔اب چاہے ہم سے جیسی بھی قسم لے لیں ہم اس سارے پلان سے ناواقف تھے۔

ایکدن باورچی خانے میں حلوہ پکاتے ہوئے چمچہ ایک پلیٹ میں رکھا اور چند منٹوں کے لئے وہاں سے غائب ہو کر جو دوبارہ نمودار ہوئے تو عجب ماجرہ تھا، پورا چمچہ باریک چیونٹیّوں سے ڈھکا ہوا تھا۔دیکھتے ہی ایک جھرجھری پورے بدن میں دوڑ گئ۔ فوراً ایک اینٹی انسیکٹ اسپرے کیا۔ اور اپنے تئیں سمجھا کہ نمرود کی فوج کا صفایا کر دیا۔ اسی دن شام کو دودھ کے ایک قطرے پہ پھر چینوٹیوں کے ایک لشکر کا حملہ ہوا۔ آئندہ ایک ہفتے میں ہم نے ایک کے بعد ایک کئ لشکر غارت کیے۔ مگر یہ تو لگ رہا تھا کہ اتنا ہی ابھریں گے جتنا کہ دبا دیں گے۔

ادھر پڑوس میں مکان کی تعمیر تیزی سے جاری تھی ادھر ہم اتنی ہی جاں فشانی سے چیونٹیّوں سے نبرد آزما مگر کچھ ہوتا نظر نہیں آرہا تھا۔اب روزمرہ کے انسیکٹ کلر پر سے اعتماد اٹھ چلا تھا۔ ادھر یہ بھی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ عذاب ہم پہ کہاں سے اور کس سلسلے میں نازل ہوا ہے۔ کچھ عرصے چیونٹیوں کی لاتعدا قطاروں کو صاف کرنے کے بعدہم نے یہ فیصلہ کیا کہ پورے گھر پر ایک ساتھ یلغار کی جائے تاکہ اس مصیبت سے نجات ہو۔ گھر کے چاروں طرف بنیاد کے ستھ ساتھ چونا ڈالا گیا اور لان میں چیونٹیاں مار دوا ڈالی گئ۔ کچھ دنوں کے لئے سکون ہوا مگر چاردن بعد وہی کہانی۔ یعنی ڈھاک کے تین پات۔ اب گھر کے باہر چونا ڈالنے کے بجائے چیونٹی مار دوا ڈالی گئ۔ پھر کچھ سکون ہوا۔ مگر کچھ دنوں بعد ہم پھر اپنی پرانی حالت پہ واپس آگئے۔ پھر مختلف ذرائع سے پتہ چلا کہ اینٹی انسیکٹ کا اتنا ستعمال ہمارے خود کے لئے بہتر نہیں۔ جہاں ان سے مختلف قسم کی الرجیز ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے جن میں سرفہرست دمہ ہے وہاں یہ نہ صرف کینسر کا باعث بھی ہو سکتے ہیں بلکہ بانجھپن بھی پیدا کرتے ہیں۔ یا خدا اب کیا کریں۔ ادھر پڑوسیوں کا مکان تکمیل کو پہنچ رہا تھا اور اب اسپر رنگ و روغن ہو رہا تھا۔ ایک دن دل میں اتنا گداز پیدا ہوا کہ خدا سے شکوہ کناں ہوئے۔ یا اللہ ہمارا اس پلاٹ پر ْتو دلوں کے حال بہتر جانتا ہے۔قبضہ کرنے کا کوئ ارادہ نہ تھا وہ تو صرف ایک خیال تھا۔ اور اگر ہم اس پر عمل کر بھی لیتے تو یقین جانیں کہ جس دن ان کی آمد کے آثار ہوتے ہم وہ مرغیاں اور بکریاں کسی کی دعوت میں استعمال کر لیتےممکن ہے انہی کی دعوت کردیتے۔ اس مکالمہء صفائ کے بعد جب سوچنا شروع کی تو لگا کہ دماغ کے انجن نے کام کرنا شروع کیا۔ اب جو غور کیا تو اندازہ ہوا یہ چیونٹیاں پڑوسیوں کے گھر کی تھیں۔ انہوں نے جو جنگل صاف کیا تو یہ ہمارے گھر آدھمکیں۔

اب سوال یہ تھا کہ ان سے جان کیسے چھڑائ جائے۔یکدم خیال آیاآخر ہم انٹرنیٹ کیوں نہیں استعمال کرتے۔ دماغ کے جالے لگتا تھا کہ ایکدم صاف ہو گئے۔ اب دو دن نیٹ پرخوب سرچ ماری اور بلآخر ایک نتیجے پہ پہنچ گئے۔ اگلے دن بازار سے بورک ایسڈ لےکر آئے دیکھنے والوں نے کہا ۔ اور کیرم بورڈ وہ کہاں ہے۔ وہی کھیلنے کے لئے ہم نے ہمیشہ بورک ایسڈ استعمال کیاہے۔ ایسے تبصروں پر ہم نے غور نہیں کیا یہ لوگ ہمیشہ چیونٹی کاٹے پر روتے ہیں اور اس کا ذمہ دار بھی ہمیں سمجھتے ہیں۔اب ہم نےاسی سنجیدگی سے چینی کاشیرہ تیار کیا اور اس میں بورک ایسڈ کو ملادیا۔ پھر اسے چھوٹی چھوٹی پلاسٹک کی پیالیوں میں نکالا اور چینٹیوں کے بل جو ہم اس سارے عمل سے پہلے نشانزدہ کر چکے تھے ان کے قریب لے جا کر رکھ دیا۔ اگلے دن ماسی نے ہمیں اطلاع دی کہ پیالیوں میں کچھ رکھا ہے اس میں چیونٹیاں آرہی ہیں۔ آنے دو ہم نے شان بے نیازی سے جواب دیااور ایک میگزین پڑھتے رہے۔ اطمینان قلب دنیا کی سب سے بڑی چیز ہےاسی سے اعتماد پیدا ہوتا ہے۔۔' انہیں وہاں سے ہلانا نہیں۔' ہم نے اسے نصیحت کی۔ گھر میں کھلبلی مچ گئ۔ لیجئے اب تو چیونٹیّوں کو انکے دروازے پر ہی غذا مل رہی ہے اب دیکھءے گا کیسی یلغاریں ہوتی ہیں ۔ کسی نے کہا کہ اب یقیناً ہمیں دوسرا گھر دیکھ لینا چاہئے۔ وہ دن دور نہیں جب یہاں صرف چیونٹیوں کا راج ہو گا۔ اور ہاتھیوں کا آنا منع ہوگا۔ میں نے لقمہ دیا۔ آہستہ آہستہ چیونٹیوں کی قطاریں ہر شکر کی پیالی کے ساتھ بندھ گئیں۔ صبح سے شام تک چیونٹیاں آرہی ہیں چیونٹیاں جا رہی ہیں اور ہم ہیں کہ ٹی وی پہ کھانا پکانے کی ترکیبیں دیکھ رہے ہیں۔۔رسالوں کو چاٹ رہے ہیں اب ہمارے شوہر صاحب کی پریشانی شروع ہوئ۔ 'یہ کیا ہو رہا ہے اس دفعہ آپ نے اینٹی انسیکٹ بھی نہیں لیا اور نہ ہی چیونٹیّوں کا کوئ اور علاج ہو رہا ہے'۔ خاموش میں نے انگلی سے اشارہ کیا۔ اگرچہ چیونٹیوں کے کان نہیں ہوتے مگر تجربات یعنی میرے ذاتِی تجربات سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ ماحول میں اپنے خلاف ہونے والی ہر کارروائ سے آگاہ ہو جاتی ہیں خوش قسمتی سے قدرت نےعورتوں سمیت ہر جاندار کو اس حس سے نوازا ہے۔ اچھا جناب اب میرے شوہر صاحب سوچ رہے تھے کہ میں نے شاید کوئ روحانی عمل شروع کیا ہو اہے ۔ اور کچھ عرصہ لگے گا جب میں اپنی غلطی تسلیم کر لونگیاس قسم کے مسائل حقیقت کی دنیا میں رہ کر ہی حل ہو سکتے ہیں۔ باقی لوگ شاید سوچتے تھے کہ میں نے اپنی کاہلی کے اوپر بڑی ذہانت سے پردہ ڈالا ہوا ہے۔ ۔لیکن ایکدن جب یہ موضوع جب دوبارہ زیر بحث آیا تو پھر توپوں کا رخ میری جانب ہوا۔ لوگ میری خاموشی اور سکون سے نالاں تھے۔ میں نے جب ان سے مزید پندرہ دن کی مہلت چاہی تو وہ ایکدم پھٹ پڑے۔ چیونٹیاں نہ ہوئیں طالبان ہوگئیں۔ اب میں ہر ایک چیونٹی سے درخواست کرنے سے رہی یہ لیجئے دوا اور خدا کے لئے غارت ہو جائیں۔ خیر اجلاس میں میں نے سب کو یقین دلایا کہ میں کوئ روحانی عمل نہیں کر رہی ہوں۔ میں بورک ایسڈ بذریعہ شیرہ چیونٹیوں کو دے رہی ہوں، بورک ایسڈ ان کا معدہ ہضم نہیں کرتا اور معدہ پھٹ جانے کے نتیجے میں وہ اس دار فانی سے کوچ کر جاتی ہیں۔ 'تو کیا اب ایک ایک چیونٹی کے مرنے کا انتظار کیا جائے گا اور اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ ان کے انڈوں سے چیونٹیاں پیدا نہیں ہونگیں۔ ' تابڑ توڑ سوالات۔ میری تیاری بھی مکمل تھی۔ بات یہ ہے کہ اس شیرہ کو چیونٹیوں نے اپنے بل میں بھی لے جا کر جمع کیا ہو گا اور اسے ان کی ملکہ بھی استعمال کرے گی جو ان کے بل میںانڈے پیدا کرنے کی ذمہ داری اٹھاتی ہے اب جب وہ ہی نہیں رہے گی تو نئ چیونٹیاں کہاں سے آئیں گی۔ پھر ہم نے بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے ان کی توجہ چیونٹیوں کی قطاروں میں ہونے والی واضح کمی کی طرف دلائ۔ لوگوں نے اس فرق کو محسوس تونہیں کیا تھا لیکن ہمیں کچھ دنوں کی مہلت ضرور مل گئ۔ آج اس بات کو اس ایک سال ہوگئے۔ اب ہمارے گھر میں کبھی کبھار کوئ چیونٹی اس لئے نظر آجاتی ہے کہ بچوں کو بتایا جا سکے یہ ہوتی ہے چیونٹی جس کے کبھی کبھی پر نکل آتے ہیں۔ اس تمام محنت سے ہم نے یہ سیکھا کہ آئندہ کبھی مرغیاں نہیں پالیں گےہاں بازار سے خرید کر کھانے میں کچھ مضائقہ نہیں۔ عوام سے خواص میں داخل ہونا آسان نہیں۔ کیا خیال ہے۔

نوٹ: اس طریقےکو طالبان کے خلاف استعمال کرنے والے نتائج کے خود ذمہ دار ہونگے۔

ریفرنس؛

چیونٹیوں سے بچاءو کا طریقہ

2:43 PM

Boric acid, Organic food, آرگینک غذا, بورک ایسڈ, چیونٹیاں

میرا پٹھان ڈرائیور چلا گیا

میرا پٹھان ڈرائیور چلا گیا۔ میں نے اسے قطعاً جانے کے لئے نہیں کہا۔ میں نے اس کے سامنے ہمیشہ اپنی کم علمی کا اعتراف کیا۔ اس نے بھی کبھی مجھے با خبر رکھنے میں بخیلی سے کام نہیں لیا۔ وہ اکثر خود اندازہ کر لیتا تھاکہ یہ بات مجھے معلوم نہیں یا صحیح طریقے سے معلوم نہیں۔ ایکدن جب دوران سفر اسے اندازہ ہوا کہ میں شاید کبھی سینماہال کے اندر نہیں گئ اور میں یہ بات نہیں سمجھ سکتی کہ وہاں اتنے سارے لوگ کسی مشکل کے بغیر فلم دیکھ لیتے ہیں اور کسی کا سر کسی کے دیکھنے کی راہ میں حائل نہیں ہوتا تو اس نے مجھے اس بارے میہں کافی اطلاعات دیں۔پھر مجھ کوڑھ مغز کو مزید سمجھانے کے لئے اس نے ہاتھوں کی مدد سے نشستوں کی ڈھلواں ترتیب بھی سمجھائ۔ آخر میں اسے خاصی خوشی ہوئ کہ کس طرح اس نے مجھے وہاں کا معاملات سمجھا دئے۔ کسی کویہ جان کر اگر خوشی ہوتی پہے کہ ہماری جہالت کو وہ کم کر سکتا ہے تو کچھ وقت کے لئے جاہل بنے رہنے میں کیا مضائقہ ہے۔کم از کم میں اسے کوئ برائ نہیں سمجھتی۔ چھوٹے بچے تو اس طرح بڑے خوش ہوتے ہیں۔ویسے بھی عورتوں کو عقل دیکر سب مرد خوش ہوتے ہیں اور عورتِں مردوںکو خوش دیکھ کر خوش ہوتی ہیں۔

میں جب اس کے ساتھ سفر میں ہوتی تو وہ اکثر کچھ نہ کچھ بتاتا رہتا۔ اسی نے ایکدن بتایا کہ عباسی شہید ہسپتال اب بہت اچھا ہو گیا ہے۔ ایسا کیسے ہوگیا میں نے پھر معصوم حیرانی کا اظہار کیا۔ 'باجی، جب سے پیپلز کا حکومت آیا ہےہسپتال کا انتظام بہت اچھا ہو گیا ہے۔' چلو کسی نے تو پیپلز حکومت کی تعریف کی۔ لیکن پہلے کیسا تھا۔ 'باجی پہلے جب ایم کیو ایم کی حکومت تھا تو بڑا برا حال تھا۔ ہر جگہ اندھیرا رہتا تھا۔ اور پٹھانوں کے ساتھ بڑا ظلم ہوتا تھا'۔ کسی کے ساتھ زبان کی بنیاد پر ظلم ہو یہ بڑی غلط بات ہے ۔ کون کرتا ظلم اور کیسے۔ میں نے ہمدردی کی۔ 'باجی جب پٹھان علاج کے لئے آتا تو وہ لوگ اسے زہر دے دیتے تھے۔ مگر تمہیں کیسے پتہ چلا میں نے اسے کریدا۔لوگ بتاتے تھے باجی اچھا بھلا آدمی لیکر ہسپتال جاتے اور وہ مر کر واپس آتا تھا'۔ میرے خدا اچھے بھلے آدمی کو لیکر ہسپتال کیوں جاتے تھے۔' میں نے حیرت سے پوچھا۔ اس نے بھی حیرت سے میری طرف دیکھا۔اور پھر جیسے سوچا۔ لوگ ٹھیک کہتا ہے یہ عورت لوگ کے پاس عقل نہیں ہوتی۔ سامنے سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اپنے طور پہ بات کو سنبھالا اور ڈرائیور کو سمجھایا۔ 'تم اب بھی وہاں جانے میںاحتیاط کیا کرو۔ تمہیں معلوم نہیں کراچی میں اب بھی ایم کیو ایم کا کنٹرول ہے۔ اس پر اس نے مجھے پھر سمجھایااللہ سب کی حفاظت کرنے والا ہے۔ اور پرائویٹ ہسپتال عوام کے زیادہ وفادار ہوتے ہیں۔ میں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا، اختلاف کر کے میں اسے ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔آخر اس کی وجہ سے میں اتنی باخبر رہتی تھی۔

لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ سوئے اتفاق کہ ہم سب گھر والوں کو شہر سے باہر جانا پڑا۔ ڈرائیور کی ذمہداری یہ لگائ گئی کہ وہ ہماری غیر موجودگی میں آئے گا۔ اس طرح صفائ کرنے والی ماسی آکر ڈرائیو وے صاف کر دے گی اور درفتوں کے پتوں کا ڈھیر نہیں جمع پو پائے گا۔ وضاحت کے لئے یہ بھی بتادوں کہ اس سرائیکی ماسی کی بہن بھی ہمارے اوپر والے حصے میں کام کرتی تھی۔

ہم جب پندرہ دن بعد لوٹے تو کراچی میں فسادات کے بعد بظاہر سب ٹھیک ٹھاک لگ رہا تھا۔ فسادات کے نتیجے میں اطلاع یہ تھی کہ پٹھانوں کا کافی نقصان ہوا۔ڈرائیور نے بتایا کہ ماسی اس دوران بالکل نہیں آئ اور صحن کی صفائ کا کام اس نے خود انجام دیا۔ ہم نے اس کی تعریف کی اور ماسی کو برا بھلا کہا۔اور اسے تسلی دی کہ ماسی جب آئے گی تو اس کی خوب سرزنش کی جائے گی۔اگلے دن ماسی کی آمد کسی نے اس ڈانٹ بھی دیا۔ اور کیا کرتے۔ اگلے دن اس کے پٹھان مالی دوست نے ہم مجھ سے کہا کہ وہ مجھسے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔ 'کیا ہوا ؟' مجھے اس کے پراسرار انداز پہ حیرت تھی۔ ''وہ باجی، وہ جو ماسی ہے اس نے ڈرائیور کی بڑی بےعزتی کی۔' کس بات پر ' میری حیرانی اور بڑھی۔ "وہ باجی، ماسی کی بہن گلی میں سے جا رہی تھی ڈرائیور نے اسے روک کر پوچھا کہ اس کی بہن کیوں نہیں آرہی۔ تو اس نے اس کی بےعزتی کر دی۔' کیا کہا اسنے.' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔'باجی وہ کہنے لگی کہ وہ آءندہ اس چرھ اس سے راستے میں کھڑے ہو کر نہ پوچھےورنہ وہ اس کا منہ بگاڑ دے گی۔ جو کچھ پوچھنا ہے میری بہن سے پوچھو۔ باجی سامنے والوں کا ڈرائیور بھی کھڑا تھا۔ اس کی بڑی بے عزتی ہوئ۔ وہ کہتا ہے جی کہ ماسی اس سے معافی مانگے۔ ' میرے خدا۔ اب میں کیا کروں۔ اب سوال یہ تھا کہ ان موصوف اتنی کارکردگی کیوں دکھائ اور دوسرا سوال یہ تھاکہ اگر وہ ماسی سے کھڑے ہو کر نہ پوچھتا تو کیا لیٹ کر پوچھتا۔ یہ ماسی بھی بس یایک اکھڑ دماغ کی ہے۔ مالی کو تسلی دی۔ اس ماسی کو بات کرنے کی تمیز نہیں۔ میں نے اسے بہلانے کی کوشش کی۔ بہرحال میں اسے سمجھا دونگی۔

اگلے دن ماسی آئ تو میں نے ڈرائیور کو بلوالیا۔ اب جناب پہلے تو بضد ہوءے کہ سامنے والے ڈرائیور کو بھی بلوا لیا جائے۔ ان کی اس بات پر توجہ نہ کی گئ۔ اور ماسی سے پوچھ شروع ہوئ۔تو ماسی نے منہ بگاڑنے والی دھمکی سے صریح انکار کیا۔ لو کر لو بات۔ 'باجی اس طرح روک کرکوئ بھی ہم سے بیچ راستے میں بات کرنے لگ جائے تو دیکھنے والے کیا سمجھیں گے۔ اب کسی کو کیا پتہ یہ مجھ سے کیا بات کر رہا ہے'۔ بہرحال میں نے پھر بھی ڈرائیور کا دل رکھنے کو ماسی سے کہا کہ بات احتیاط سے کیا کرو۔ اب میں ناقص العقل تو یہ سمجھی کہ معاملہ نمٹ گیا۔ لیکن عین اس وقت جب کوئ مولانا صاحب ٹی وی پر بتا رہے تھے کہ خواتین کا نا محرم کے ساتھ نکلنا کس قدر نقص امن کا باعث ہے اور اس کی ممکنہ اسلامی سزا کیا ہے اور کس طرح اس مسئلہ کے حل ہونے سے عالم اسلام کے دیگر معاشی و معاملاتی مسائل حل ہو جائیں گے۔ ڈرائیور آیا۔ گاڑی کی چابی میرے سامنے میز پہ رکھی اور ہمیشہ کے لئے جانے کی اجازت مانگی۔ میں تو ویسے ہی اس پروگرام کو سن کر دہشت زدہ تھی کہ کس طرح ایک نا محرم ڈرائیور کے ساتھ سارے شہر میں پھرتی رہی۔ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اب سوچتی ہوں کہ اس میں صوفی محمد کی کارستانی تو نہیں یا میرا اردو اسپیکنگ ہونا حالانکہ میںنے ہمیشہ کسی بھی سیاسی جماعت سے اپنی لا تعلقی کا اظہار کیا۔ آخر اس نے ایسا کیوں کیا۔ کوئ بتلائے۔

6:04 PM

Abbasi Shaheed hospital, ایم کیو ایم, پٹھان ڈرائیورMQM, عباسی شہید ہسپتال